منٹو نمبر

مرتب

محمد طفیل

ادارہ فروغ اردو - لاہور

ترتیب

منٹو کی غیر مطبوعہ کہانیاں

منٹو کی منتخب تخلیقات

منٹو کا فن

منٹو کی شخصیت

شخصیات نمبر کے بارے میں

مولوی عبدالحق	نیاز فتحپوری	عبدالمجید سالک
عرشی رامپوری	رشید احمد صدیقی	مالک رام
احتشام حسین	مسعود حسن رضوی	کرشن چندر
ڈاکٹر سید اعجاز حسین	ایس اے رحمٰن	خواجہ احمد فاروقی
غلام عباس	آغا اشرف	شاد عارفی
حجاب امتیاز علی	فکر تونسوی	ابن انشا
فارغ بخاری	جیلانی بانو	مختار صدیقی

طلوع

"یار منٹو نمبر نکالو"

"جی!"

"میں کہتا ہوں۔ نقوش کا منٹو نمبر نکالو"

"آج یہ آپ کیسی باتیں ـــــ"

"تمہارا خیال یہ ہے کہ میں نشہ میں ہوں اور بکواس کر رہا ہوں"

"آخر اتنی جلدی کیا ہے۔ چھپ جائے گا"

"میں اس کا انتظار نہیں کر سکتا۔ کہ پہلے مر کے دکھاؤں۔ پھر نمبر چھپے"

"مرنے کا نام نہ لیجئے۔ ابھی آپ کی بڑی ـــــ"

"اب جی کر بھی کیا کروں گا۔ اب تو میں خود مرنے پر راضی ہو گیا ہوں"

"اچھا یہ بتائیے، اس نمبر میں کیا کیا ہو گا؟"

"اب تک جتنی گالیاں ملی ہیں۔ وہ سب سے پہلے چھپیں گی۔ اور جتنے بیوقوفوں نے میری تعریف کی ہے سب سے آخر میں چھپے گی۔ بیچ میں میرے تین چار غیر مطبوعہ افسانے اور اسکیچ ہوں گے۔ بہرحال تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ نمبر تمہیں میں مرتب کر دوں گا"

"اگر آپ مرتب کر دیں گے۔ تو میں کیا کروں گا؟"

"تم جھک مارنا"

"اس صورت میں تو آپ خود ہی ایک مجموعہ مرتب کریں۔ اور اسے کتابی صورت میں چھاپ دیں"

"میں چاہتا ہوں۔ نقوش کا منٹو نمبر نکلے"

"تو پھر آپ کا اس نمبر کی ترتیب و تدوین سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔ میں کسی کی رائے تک برداشت نہ"

"تو اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔ کیا تو مجھ سے زیادہ قابل ہے"

"قابلیت کو چھوڑیئے۔ یہ معاملہ ذمہ داری کا ہے"

"ذمہ داری کو چھوڑو۔ یہ معاملہ قابلیت کا ہے"

"اس معاملہ میں مجھے آپ کی قابلیت سے انکار ہے"

"اچھا تو تم پھر جیسی میری دُرگت بنانی چاہتے ہو۔ میری زندگی ہی میں بنا ڈالو"

اگرچہ یہ واقعہ ایک برس پہلے کا ہے، لیکن میں آج بھی یہ نمبر منٹو کی زندگی ہی میں شائع کر رہا ہوں اس لئے کہ منٹو کسی اور کے خیال میں مرا ہو تو مرا ہو، میرے نزدیک نہیں مرا۔

محمد طفیل

(۱)

منٹو کی بیس غیر مطبوعہ کہانیاں

(جو ایک دن کے وقفہ سے لکھی گئیں)

بائی بائی

(۱۱ر مئی ۱۹۵۴ء)

نام اس کا فاطمہ تھا پر سب اُسے پھاتو کہتے تھے۔ بانہال کے درّے کے اس طرف اُس کے باپ کی پن چکی تھی جو بڑا سادہ لوح معمر آدمی تھا۔ دن بھر وہ اس پن چکی کے پاس بیٹھی رہتی۔ پہاڑ کے دامن میں چھوٹی سی جگہ تھی جس میں یہ پن چکی لگائی گئی تھی۔ پھاتو کے باپ کو دو تین روپے روزانہ باتے جو اُس کے لئے کافی تھے۔ پھاتو البتہ ان کو ناکافی سمجھتی تھی، اس لئے کہ اُس کو بناؤ سنگار کا شوق تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ امیروں کی طرح زندگی بسر کرے۔

کام کاج کچھ نہیں کرتی تھی۔ بس کبھی کبھی اپنے بوڑھے باپ کا ہاتھ بٹا دیتی تھی۔ اُس کو آٹے سے نفرت تھی، اس لئے کہ وہ اُڑ کر اُس کی ناک میں گھستا تھا۔ وہ بہت جھنجھلاتی اور باہر نکل کر کھلی ہوا میں گھومنا شروع کر دیتی، یا چناب کے کنارے جا کر اپنا منہ ہاتھ دھوتی اور عجیب قسم کی ٹھنڈک محسوس ہوتی۔

اُس کو چناب سے پیار تھا۔ اُس نے اپنی سہیلیوں سے سن رکھا تھا کہ یہ دریا عشق کا دریا ہے، جہاں سوہنی مہینوال، ہیر رانجھا کا عشق مشہور ہوا۔ بہت خوبصورت تھی۔ اور بڑی مضبوط جسم کی جوان لڑکی۔ ایک پن چکی والے کی بیٹی شاندار لباس تو پہن نہیں سکتی۔ میلی شلوار۔ اوپر پھیرن، ماکرنہ۔۔۔ چندارو۔

نذیر مچیت گڑھ سے لے کر بانہال تک اور بھدرواہ سے کشتواڑ تک خوب گھوما پھرا تھا۔ اُس نے جب پہلی بار پھاتو کو دیکھا تو اُسے کوئی حیرت نہ ہوئی جب اُس نے دیکھا کہ پھاتو کے کُرتے کے نچلے تین بٹن نہیں ہیں، اور اُس کی جوان چھاتیاں باہر جھانک رہی ہیں۔

نذیر نے اس علاقے میں ایک خاص بات نوٹ کی تھی کہ وہاں کی عورتیں ایسی قمیصیں یا کُرتے پہنتی ہیں جن کے نچلے بٹن غائب ہوتے ہیں۔ اُس کی سمجھ میں نہ آتا کہ آیا یہ دانستہ توڑ دیئے جاتے ہیں، یا وہاں کے دھوبی ایسے ہیں جو ان کو اتار لیتے ہیں۔

نذیر نے جب پہلی بار سیر کرتے ہوئے پہاتو کو اپنی نیم کام بٹنوں والی قمیص میں دیکھا تو اُس پر فریفتہ ہو گیا۔ وہ حسین تھی۔ ناک نقشہ بہت اچھا تھا۔ بہت گندہ میلی ہونے کے باوجود چمکتی تھی۔ اُس کا لباس بہت گندہ تھا، مگر نذیر کو ایسا محسوس ہوا کہ یہی اُس کی خوبصورتی کو نکھار رہا ہے۔

نذیر وہاں ایک آوارہ گرد کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ صرف کشمیر کے دیہات دیکھنے اور اُن کی سیاحت کرنے آیا تھا اور قریب قریب تین مہینے سے اِدھر اُدھر گھوم پھر رہا تھا۔

اُس نے کشتواڑ دیکھا، بھدرواہ دیکھا، کٹرہ اور بٹوت میں کئی مہینے گزارے، مگر اُسے پہاتو ایسا حسن کہیں نظر نہیں آیا تھا۔

بانہال میں پن چکی کے باہر جب اُس نے پہاتو کو ترمئی بٹنوں سے بے نیاز کرنے میں دیکھا تو اُس کے جی میں آئی کہ اپنی قمیص کے سارے بٹن علیحدہ کر کے اُس کی قمیص اور پہاتو کا کرتہ آپس میں خلط ملط ہو جائیں، کچھ اس طرح کہ دونوں کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آئے۔

اُس سے ملنا نذیر کے لیے مشکل نہیں تھا۔ اس لیے کہ اُس کا باپ دن بھر گندم، مکئی اور جوار پیسنے میں مشغول رہتا تھا۔ اور وہ تھی ہنس مکھ۔ ہر آدمی سے کھل کر بات کرنے والی بہت جلد گھل مل جانے والی تھی۔ چنانچہ نذیر کو اُس کی قربت حاصل کرنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی۔ چند دنوں ہی میں اُس نے اُس سے راہ و رسم پیدا کر لی۔

یہ راہ و رسم تھوڑی دیر میں محبت میں تبدیل ہو گئی۔ پاس ہی چناب، جسے عشق کا دریا کہتے ہیں۔ اور جس کے پانی سے پہاتو کے باپ کی پن چکی چلتی تھی۔ اس دریا کے کنارے بیٹھ کر نذیر اُس کو اپنا دل نکال کر دکھاتا تھا جس میں سوائے محبت کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ پہاتو سنتی ——— اس لیے کہ وہ اُس کے جذبات کا مذاق اُڑانا چاہتی تھی ——— اصل میں وہ تھی ہی ہنسوڑ۔ ساری زندگی وہ کبھی روئی نہ تھی۔ اُس کے ماں باپ بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ ہماری بچی بچپن میں کبھی نہیں روئی۔

نذیر اور پہاتو میں محبت کی پینگیں بڑھتی گئیں۔ نذیر پہاتو کو دیکھتا تو اُسے یوں محسوس ہوتا کہ اُس نے اپنی رُوح کا عکس آئینے میں دیکھ لیا ہے اور پہاتو تو اُس کی گرویدہ تھی، اس لیے کہ وہ اُس کی بڑی خاطر داری کرتا تھا۔ اُس کو یہ چیز ——— جسے محبت کہتے ہیں پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے وہ بہت خوش تھی۔

بانہال میں تو کوئی اخبار ملتا نہیں تھا، اس لیے نذیر کو بٹوت جانا پڑتا تھا۔ وہاں وہ دیر تک ڈاک خانے کے اندر بیٹھا رہتا۔ ڈاک آتی تو اخبار پڑھ کے پن چکی پر چلا آتا۔ قریب قریب چھ میل کا فاصلہ تھا، مگر نذیر اس کا کوئی خیال نہ کرتا۔ یہ سمجھتا کہ چلو ورزش ہی ہو گئی ہے۔

جب وہ پن چکی کے پاس پہنچتا تو پہاتو کسی نہ کسی بہانے سے باہر نکل آتی اور دونوں چناب کے پاس پہنچ جاتے اور پتھروں پر بیٹھ جاتے۔

پہاتو اُس سے کہتی۔ نذیر ——— آج کی خبریں سناؤ؟

اُس کو خبریں سننے کا خبط تھا۔ نذیر اخبار کھولتا اور اُس کو خبریں سنانا شروع کر دیتا۔ اُن دنوں فرقہ وارانہ فسادات تھے ——— امرتسر سے یہ قصہ شروع ہوا تھا۔ جہاں سکھوں نے مسلمانوں کے کئی محلے جلا کے راکھ کر دیئے تھے۔ وہ یہ سب خبریں اُس کو سناتا۔ وہ سکھوں کو اپنی گنوار زبان میں بُرا بھلا کہتی۔ نذیر خاموش رہتا۔

ایک دن اچانک یہ خبر آئی کہ پاکستان قائم ہو گیا ہے اور ہندوستان علیحدہ ہو گیا ہے۔ نذیر کو تمام واقعات کا علم تھا، مگر جب اُس نے پڑھا کہ ہندوستان

[illegible] اُدھار ادا نہ کرنے پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے تو وہ بہت پریشان تھا۔ مگر اُس نے اپنی اس پریشانی کو چھاؤ پر ظاہر نہ ہونے دیا۔

معدوق کا عشق اب بہت استوار ہو چکا تھا۔ اِس کا علم چھاؤ کے باپ کو بھی ہو گیا تھا وہ خوش تھا کہ میری لڑکی ایک معزز اور شریف گھرانے میں جائے گی، وہ چاہتا تھا کہ اُس کی بیٹی سیالکوٹ نہ جائے، جہاں کا نذیر رہنے والا تھا۔ اُس کی یہ خواہش تھی کہ نذیر اُس کے پاس رہے۔

وہ مست ملنگ کا بیٹا ہے —— پن چکی کے پاس کافی زمین پڑی ہے۔ اُس پر ایک چھوٹا سا مکان بنا لے اور معدوق میاں بیوی اُس میں رہیں جب چاہیں کبھی کبھی سری نگر پہنچ گئے۔ وہاں ایک دو مہینے رہے، پھر واپس آ گئے۔ کبھی کبھار سیالکوٹ بھی چلے گئے کہ وہ بھی اتنی دور نہیں

چھاؤ کے باپ سے نذیر نے مفصل گفتگو کی۔ وہ اس سے بہت متاثر ہوا اور اُس نے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ نذیر اور چھاؤ بہت خوش ہوئے۔

اُس روز پہلی مرتبہ نذیر نے اُس کے ہونٹوں کو چوما۔ اور خود اپنے ہاتھ سے اُس کے کرتے میں تین بٹن لگائے۔

دوسرے دن نذیر نے اپنے والدین کو لکھ دیا کہ وہ شادی کر رہا ہے کشمیر کی ایک دیہاتی لڑکی ہے جس سے اُس کو محبت ہو گئی۔ ایک ماہ تک خط و کتابت ہوتی رہی ہے۔ آدمی روشن خیال تھے۔ اس لئے وہ مان گئے، حالانکہ وہ اپنے بیٹے کی شادی اپنے خاندان میں کرنا چاہتے تھے۔

اُس کے والد نے جو آخری خط لکھا اُس میں اِس خواہش کا اظہار کیا گیا تھا کہ نذیر، فاطمہ کا فوٹو بھیجے، تاکہ وہ اپنے رشتے داروں کو دکھائیں جن سے کہ وہ اُس کے حسن کی بڑی تعریفیں کر چکا تھا۔

لیکن بانہال جیسے دور افتادہ علاقے میں وہ چھاؤ کی تصویر کیسے حاصل کرتا۔ اُس کے پاس کوئی کیمرہ نہیں تھا۔ نہ وہاں کوئی فوٹوگرافر۔ جموں اور کُد میں بھی اُن کا نام و نشان نہیں تھا۔

اتفاق سے ایک دن سری نگر سے موٹر آئی۔ نذیر سڑک پر کھڑا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ اُس کو اُس کا دوست رنبیر سنگھ ڈرائیو کر رہا ہے۔ اُس نے بلند آواز میں کہا "رنبیر یار —— ٹھہرو۔"

موٹر ٹھہر گئی۔ دونوں دوست ایک دوسرے سے گلے ملے۔ نذیر نے دیکھا کہ اُس کی موٹر میں کیمرہ پڑا ہے۔ رولی فلیکس۔ نذیر نے اُس سے کچھ دیر باتیں کیں، پھر پوچھا "تمہارے کیمرے میں فلم ہے؟"

رنبیر نے ہنس کر کہا "خالی کیمرہ اور خالی بندوق کس کام کی ہوتی ہے —— میرے کیمرے میں سولہ ایکسپوژر موجود ہیں۔"

نذیر نے فوراً چھاؤ کو ٹھہرایا اور اپنے دوست رنبیر سے کہا "یار اس کے تین چار فوٹو لے لو۔ اور تم، میرا خیال ہے، سیالکوٹ جا رہے ہو وہاں سے ڈیویلپ اور پرنٹ کرا کے مجھے دو دو کاپیاں جموں کے ڈاک خانے کی معرفت بھجوا دینا۔"

رنبیر نے بڑے غور اور بڑی دلچسپی سے چھاؤ کو دیکھا۔ اُس کی موٹر میں ڈوگرہ فوج کے تین چار سپاہی تھے۔ تھری ناٹ تھری بندوقیں لئے۔

رنبیر جو مقام فوٹو لینے کے لئے پسند کرتا، یہ سپاہی فوراً اُس کے پیچھے پیچھے ہوتے۔ نذیر اُن کے ہمراہ ہونا چاہتا تھا۔ یہ ڈوگرے اُسے روک دیتے۔

کشمیر میں بلوہ ہو رہا تھا۔ اِس کے متعلق نذیر کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ہندوستان اس پر قابض ہونا چاہتا ہے مگر پاکستانی اس کی مدافعت کر رہے ہیں۔

فوٹو لے کر جب نذیر کا دوست رنبیر اپنی موٹر کے پاس آیا تو اُس نے نذیر کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ چھاؤ ڈوگرے سپاہیوں کی گرفت میں تھی۔ اُنہوں نے زبردستی موٹر کے اندر ڈالا۔ وہ چیخی چلائی۔ نذیر کو اپنی مدد کے لئے پکارا —— مگر وہ عاجز تھا —— ڈوگرے فوجی سنگینیں تانے کھڑے تھے۔

جب موٹر اسٹارٹ ہوئی تو نذیر نے اپنے دوست رنبیر سے بڑے عاجزانہ لہجے میں کہا "یار، رنبیر یہ کیا ہو رہا ہے؟"

رنبیر سنگھ نے جو کہ موٹر چلا رہا تھا، نذیر کے پاس سے گزرتے ہوئے ہاتھ ہلا کر صرف اتنا کہا۔

"ٹاٹا"

مائی جنتے

(۱۲ مئی ۱۹۵۴ء)

مائی جنتے سلیپر پہنے گھسٹتی گھسٹتی کچھ اس انداز میں اپنے میلے چکٹ میں داخل ہوئی تھی کہ سب گھر والوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ آ پہنچی ہے۔ وہ جس گھر میں تھی وہ خواجہ کریم بخش مرحوم کا تھا، اپنے پیچھے کوئی جائداد، ایک بیوہ اور دو جوان بچیاں چھوڑ گیا تھا۔ آدمی پرانی وضع کا تھا۔ جونہی یہ لڑکیاں نو دس برس کی ہوئیں، ان کو گھر کی چار دیواری میں بٹھا دیا اور پردہ بھی ایسا کہ وہ کمرے کی کھڑکی کے پاس کھڑی نہیں ہو سکتیں۔ مگر جب وہ اللہ کو پیارا ہوا تو ان کو آہستہ آہستہ تھوڑی سی آزادی ہو گئی۔ اب وہ کھلے بندوں ناول بھی پڑھتی تھیں۔ اپنے کمرے کے دروازے بند کر کے پوڈر اور لپ اسٹک بھی لگاتی تھیں۔ ان کے پاس ولایت کی بنی ہوئی انگیا بھی تھیں — معلوم نہیں یہ سب چیزیں کہاں سے مل گئی تھیں۔ بہرحال اتنا ضرور ہے کہ ان کی ماں کو جو ابھی تک اپنے خاوند کے صدمے کو بھول نہ سکی تھی ان باتوں کا کوئی علم نہیں تھا۔ وہ زیادہ تر قرآن مجید کی تلاوت اور پانچ وقت کی نمازوں کی ادائیگی میں مصروف رہتی اور اپنے مرحوم شوہر کی روح کو ثواب پہنچاتی رہتی۔

گھر میں کوئی مرد نوکر نہیں تھا، مرحوم کے باپ کی زندگی میں، نہ مرحوم کے زمانے میں۔ یہ ان کی پرانی وضعداری کا ثبوت ہے۔ عام طور پر ایک یا دو ملازمائیں ہوتی تھیں جو باہر سے سودا سلف بھی لائیں اور گھر کا کام بھی کریں۔

دسویں جماعت تک مرحوم نے اپنی بچیوں کو پڑھا کر پاس کرائی تھی۔ کالج کی تعلیم کے وہ یکسر خلاف تھے۔ وہ ان کی فوراً شادی کر دینا چاہتے تھے، مگر یہ حسرت ان کے دل ہی میں رہی۔ ایک دن اچانک فالج گرا۔ اس موذی مرض نے ان کے دل پر اثر کیا اور وہ ایک گھنٹے کے اندر اندر ہی ملک عدم ہو گئے۔

باپ کی وفات سے لڑکیاں بہت اداس رہنے لگیں۔ انھوں نے ایک دن ماں سے التجا کی کہ وہ ان کو کسی کالج میں داخل کرا دیں۔ پر جب بہت احتجاج ہوا اور انھوں نے کئی دن کھانا نہ کھایا تو اس نے مجبوراً ان کو ایک زنانہ کالج میں داخل کرا دیا۔

مائی جنتے نے وعدہ کیا وہ ہر روز اُن کو صبح کالج چھوڑ آئے گی۔ سارا وقت وہیں رہے گی اور جب کالج بند ہوگا تو اُنہیں اپنے ساتھ لے آیا کرے گی۔

اُس نے اپنی مالکن سے یہ وعدہ کچھ ایسے پُرخلوص انداز میں کیا کہ وحیدہ بانو مرحوم خواجہ کریم بخش کی بیوہ کو یہ بیٹیاں نہیں خود اُس کی بچیاں ہیں۔

اُس نے بیٹیوں کو پردے میں رکھنے کی حمایت میں اپنے اطوار میں مولویوں کی طرح ایک لمبی چوڑی تقریر بھی کی، لیکن پھر یہ کہا تعلیم بھی ضروری ہے کیونکہ اسلام اِس سے منع نہیں کرتا۔ پر دیکھ بھال بہت ضروری ہے۔ جوان جہان ہیں۔ اِن پر بڑی کڑی نگرانی ہونی چاہیئے —— میں تو اُن کے پاس کوئی مکھی بھی نہ پھٹکنے دوں۔ کوئی ایسی ویسی شرارت کریں گی تو وہ کان اینٹھوں کہ بلبلا اُٹھیں گی اور یاد کریں گی کس بُڑھیا سے پالا پڑا ہے —— لیکن یہ کیسی باتیں کرنے لگیں۔ شریف خاندان کی بچیاں۔ دونوں نماز کی پابند ہیں —— ایسے کبھی نہیں۔ نیک ہیں۔ وہ ایسی طرح لگتی ہیں؟

دونوں لڑکیوں میں کوئی زیادہ فرق نہیں تھا۔ ایک برس کے فرق کے بعد ہی چھوٹی جس کا نام نسرین تھا پیدا ہوئی تھی۔ بڑی کا نام پروین تھا۔

دونوں خوبصورت تھیں۔ چہرے مہرے سے خاصی اچھی۔ قد موزوں۔ شکل آپس میں کافی ملتی تھی۔ دونوں ہر وقت کھلی کھلی رہتیں۔ مگر گڑیوں کا زمانہ عرصہ ہوا گزر چکا تھا، اب جوانی کی شرارتوں کے دن تھے۔ کالج میں جاتے ہی اُنہوں نے پر پُرزے نکالے اور اِدھر اُدھر اُن تتلیوں کی طرح جن کو کسی پھول کی تلاش ہو، اِدھر اُدھر پھڑپھڑانا شروع کر دیا۔

مائی جنتے ساتھ ہوتی تھی —— وہ کالج کی پرانی چپڑاسن کے ساتھ اس وقت حقہ پیتی رہتی جو پاس ہی کوارٹر میں رہتی تھی۔ دونوں ہم عمری کے باعث بہت جلد گہری سہیلیاں بن گئی تھیں۔ جب دونوں ایک ساتھ بیٹھتیں تو اُس زمانے کی باتیں چھڑ جاتیں جب کہ وہ بھی جوان تھیں۔ چپڑاسن کو کسی لڑکی سے رغبت یا محبت نہیں تھی۔

وہ مائی جنتے کو بڑی پُرانی کہانیاں سناتی۔ فلاں سن میں ایک بیرسٹر کی لڑکی کو حمل ہو گیا تھا جو بڑی مشکل سے گرایا گیا۔ پرنسپل صاحب کو دس ہزار روپے رشوت کے ملے کہ اُس کا منہ بند رہے —— پچھلے سال ایک لڑکی جو بڑے اُونچے گھرانے کی تھی اِس سے دینیات کے مولوی صاحب کو عشق ہو گیا، چنانچہ موقعہ پا کر اِس کونڈیا کو دبوچ لیا۔ پکڑے گئے اور کالج سے داڑھی اور رضہ دونوں پولیس کے ہاتھوں میں۔ داڑھی تو پانچ سال کی قید بھگت رہی ہے۔ معلوم نہیں اُس ریشمی بُرقع کا کیا ہوا —— پر میں تو ایسی باتوں پہ دھیان ہی نہیں دیتی —— مجھے کیا غرض پڑی ہے کہ اِن گُھنّوں کے کارناموں پر اپنا وقت ضائع کروں۔"

مائی جنتے نے حقے کی نے منہ سے الگ کر دی" نہ بوا ایسی باتیں نہیں کیا کرتے —— وہ کیا کہاوت ہے کہ وہ کون سا شہسوار ہے جو نہیں گرا —— اور وہ کون سا پتا ہے جو نہیں ہلا —— خدا تمہارا بھلا کرے —— ہم لوگوں کو خاموش ہی رہنا چاہیئے اور اللہ میاں سے دعا کرنی چاہیئے کہ وہ کسی کی بہو بیٹی کو بُرے کاموں کی طرف نہ لے جائے۔ اُن کی عزت آبرو اپنے کرم سے سنبھالے رکھے۔"

چپڑاسن اُس کی باتوں سے بہت متاثر ہوئی کہ کتنی نیک عورت ہے —— اُس کو دل ہی دل میں بڑی ندامت ہوئی کہ اُس نے اتنی لڑکیوں میں کیچڑ ڈالے اور اُن کے راز افشا کئے۔ اُس نے چنانچہ فوراً مائی جنتے سے معافی مانگی اور کانوں کو ہاتھ لگایا کہ آئندہ وہ ایسی باتوں سے دور ہی رہے گی۔ کسی لڑکی کے بارے میں اُسے کچھ پتہ بھی چل گیا تو وہ اپنی زبان بند رکھے گی۔

مائی جنتے نے اُسے بڑی شاباشیاں دیں۔ اتنے میں کالج چھوٹ گیا۔ اُس نے پروین اور نسرین کو ساتھ لیا اور گیٹ سے باہر جا کر اُس نے اُن

بھلا آج تمہیں شام کو یہاں نہیں آنا چاہیے گا؟

پروین نے جواب دیا۔ نہیں تو کسی نے نہیں کہا:

"اصل میں تم بڑی بہت بے وقوف ہو ۔۔۔ ذرا دھیان سے بات سنا کرو ۔ میں تمہیں کسی سے پوچھ کر بتا دوں گی۔" گھر پہنچ کر مائی جھنّے نے اُن کے لئے چائے بنائی اور بڑی پھرتی سے میز پر لگا دی۔ پھر وہ اُن کی ماں کے پاس اپنی پیالی لے کر بیٹھ گئی اور چپڑاسن سے جو باتیں اُس کی ہوئی تھیں من و عن سنا دیں۔ اُس نے تو میں اس کو مشورہ دیا کہ پیدل آنا جانا ٹھیک نہیں۔ ۔۔۔ میرا خیال ہے آپ کسی تانگے کا بندوبست کر دیں تو ٹھیک رہے

۔۔۔۔ پیدل چلنا تو کوئی خندہ کشیدہ بات نہیں مگر جوان بیٹیوں کے ساتھ۔

مائی جھنّے کا یہ مشورہ بڑا معقول تھا چنانچہ تانگے کا بندوبست دوسرے ہی روز ہو گیا ۔۔۔ مائی جھنّے نے ایک تانگے والے سے مہینے بھر کا کرایہ طے کر لیا۔

دوسرے تیسرے روز اپنی مالکن وحیدہ بانو کو یہ خبر سنائی کہ پڑوس میں دیوار کے ساتھ جو جگہ خالی ہوئی تھی، اس میں نئے کرایہ دار آن بسے ہیں۔

وحیدہ بانو نے پوچھا "کون لوگ ہیں؟"

"جانے کا ماں ۔۔۔ ہوں گے کوئی ایسے ویسے نتھو خیرے ۔۔۔ میں نے تو کسی سے پوچھا نہیں۔"

ایک دن دوسری طرف سے کسی شخص نے ایسے ہی جھانک کر اُن کے صحن میں دیکھا ۔ ۔ ایک ہنگامہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔"

مائی جھنّے کہیں باہر گئی تھی۔ وحیدہ بیگم نے فوراً کواڑ کی اوٹ میں کھڑے ہو کر محلے کے ایک چھوٹے سے لڑکے کو بلایا اور کہا، اگر پڑوس والے مکان میں جو نئے کرایہ دار آئے ہیں، اُن میں کوئی عورت ہو تو اس سے کہو، آپ کی ہمسائی بیگم صاحبہ آپ سے درخواست کرتی ہیں کہ دو گھڑی کے لئے تشریف لے آئیے ۔۔ بڑی مہربانی ہوگی۔"

لڑکا پیغام لے کر چلا گیا ۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ پروین اور نسرین اپنے کمرے میں پڑھ رہی تھیں، اس لئے اس نے خود دروازہ کھولا ۔ دہلیز پر ایک سفید برقعہ پوش خاتون کھڑی تھی۔ اس نے بڑے ملائم لہجے میں وحیدہ بیگم سے پوچھا "کیا آپ ہی نے مجھے یاد فرمایا ہے؟"

وحیدہ بیگم نے جواب دیا "جی ہاں ۔۔ تشریف لے آئیے۔"

وہ اندر چلی آئی۔ دونوں باہر بچھے ہوئے تخت پر بیٹھ گئیں۔ وحیدہ بیگم کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ گفتگو کا آغاز کیسے کرے ۔۔۔ دونوں چند لمحات ایک دوسرے کی شکل صورت اور لباس وغیرہ کا جائزہ لیتی رہیں۔ آخر ہمسائی ہی نے مہرِ خاموشی توڑی اور پوچھا۔ فرمایئے، آپ نے مجھے دولت خانے میں کیسے بلایا؟"

اس پر وحیدہ بیگم کو اپنی شکایت کے اظہار کا موقع مل گیا اور اس نے بڑی بردباری اور تحمل سے سارا ماجرا بیان کر دیا اور پوچھا "وہ کون صاحبزادے ہیں جو اس طرح ہمارے گھر میں تاک جھانک کرتے ہیں؟"

"میرا لڑکا ہے جی ۔۔۔ وہ تو ایسا نہیں ۔ بڑا شریف لڑکا ہے ۔ چونکہ ہم نئے نئے اٹھ کر یہاں آئے ہیں اسی لئے اس نے کوٹھے پر

پڑھنے کے لئے دیکھا جاتا کہ اُس پاس کیا ہوگا ـــــ ویسے میں اُس کو منع کر دوں گی کہ خبردار تُم نے اِدھر کیا کسی بھی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا ـــــ بڑا بھولا بھالا بچہ ہے ـ ضرور میرے حکم کی تعمیل کریگا ـ میں نے اگر اُس کے باپ سے آپ کی شکایت کی تو وہ تو اُس کی مار مار کے کھال اُدھیڑ دیں گے ـــــ بڑے سخت مزاج ہیں وہ اِس معاملے میں ـــ ویسے مجھے افسوس ہے۔"

ـ نہیں میں نے صرف آپ کے کانوں تک یہ بات پہنچائی تھی کہ بدمزگی نہ ہو ـــــ یہ کہہ کر وحیدہ بیگم اُٹھی اور پکاری "پروین ـــــ نسرین، اِدھر آؤ ذرا"۔

دونوں لپک کر باہر نکلیں، لیکن ایک نادیدہ عورت کو دیکھ کر ٹھٹک گئیں ـ دوپٹے کے بغیر فوراً اندر بھاگیں اور دوپٹے اوڑھ کر باہر آئیں، نووارد عورت کو جھک کے سلام کیا اور اپنی ماں سے پوچھا "کیوں امّی جان؟"

وحیدہ بیگم نے اپنی ہمسائی سے اپنی بیٹیوں کو متعارف کرایا ـــــ اُس نے اُن کو گلے لگا کر دعائیں دیں اور اُن کی خوبصورتی کی بڑی تعریف کی کہ ماشاءاللہ چندے آفتاب چندے ماہتاب ـــ پھر اُس نے کہا "میرا بیٹا بالکل انہی کی طرح شریف اور شرمیلا ہے"۔

چند دنوں ہی میں وحیدہ اور ہمسائی جس کا نام نادرہ بیگم تھا، بڑے گہرے مراسم ہو گئے۔ وحیدہ بیگم اُن کے یہاں نہیں جاتی تھی۔ اس نے نادرہ بیگم سے کہا "میں ضرور آنکھوں پر آتی ـــ سو سو دفعہ آتی، پر جب سے خواجہ صاحب کا انتقال ہوا ہے میں نے دل میں قسم کھائی تھی، اس گھر سے باہر ایک قدم نہ رکھوں گی ـ بہن دیکھو خدا کے لئے مجبور نہ کرنا"

اس اثنا میں کالج میں شام کی فنکشن ہوئے ـ کبھی کوئی مباحثہ ہے ـ کبھی لینڈن شو ہے، کبھی مشاعرہ ـــــ کبھی کچھ کبھی کچھ ـ پروین اور نسرین دونوں ان پروگراموں میں شامل ہوتی تھیں، مگر مائی جیندے ساتھ ہوتی اور اُن کو لے کر بحفاظت واپس گھر آتی ـ خواہ جلدی خواہ دیر سے۔

عید سے چار روز پہلے سلیم واپس آیا ـ ساتھ اُس کے اُس کا بغلی دوست قادر تھا ـ وحیدہ بیگم نے اُس کو مندرجہ بالا واقعہ کے بعد جب اُس نے اُتنا تا وحیدہ بیگم کے صحن کو ایک نظر دیکھ لیا، گوجرانوالہ بھیج دیا تھا جہاں اُس کے والد کی آبائی اجداد و املاک تھیں ـــــ اُس نے اب اُسے خط لکھ کر بلایا تھا کہ عید سے پہلے پہلے یہاں لاہور چلے آؤ۔ وہ آگیا اور ساتھ اپنے جگری دوست کو بھی لے آیا ـ گھر میں اُسے سب جانتے تھے ـ اس لئے کہ وہ اکٹھے اسکول اور کالج میں پڑھے ـ یہاں لاہور میں اُٹھ آنے کی صرف ایک وجہ تھی کہ سلیم کے والد اُس کے لئے اپنے اثر و رسوخ سے کوئی اچھی ملازمت تلاش کرنا چاہتے تھے۔

دوسرے روز شام کو قادر نے سلیم سے کہا "چلو یار آج عیاشی کریں ـــ گوجرانوالہ میں کیا پڑا ہے"۔

سلیم نے پوچھا "عیاشی کیسی"؟

قادر مسکرایا "تُم تو نرے کھرے چغد ـــــ چلو آؤ باہر تمہیں بتاتا ہوں ـــــ دیکھیں گے قسمت میں کیا لکھا ہے"۔

دونوں دوست چلے گئے ـ اتنے میں وحیدہ بیگم کے پاس اُس کی ہمسائی آئی ـــــ اُس نے اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اپنا مدعا بیان کر دیا کہ وہ اپنے سلیم کے لئے نسرین کا رشتہ مانگنے آئی ہے۔

زیادہ میل محبت کوئی بھی نہ ہوئی ـ وحیدہ اُن لوگوں کے اخلاق سے بہت متاثر ہوئی ـ چند ہی باتیں ہوئیں، اس کے بعد دونوں رضامند ہو گئیں

کہ نکاح عید کی تقریب سعید پر ہو جائے اور رخصتی ایک ماہ کے بعد۔

رات کو سلیم دیر سے آیا۔ مگر اُس کی ماں نے کوئی باز پرس نہ کی کیونکہ وہ بہت خوش تھی کہ اتنی جلدی اُس کے بیٹے کی شادی کا معاملہ نسرین کے چچا جمیل اللہ باجوہ کی منظوری سے طے پا گیا۔ اُس نے چچا نے سلیم کو یہ خوش خبری سنا دی۔ وہ بھی بہت خوش ہوا ۔۔۔ تجرد کی زندگی اور بیکاری سے وہ تنگ آ گیا تھا۔ اُس نے سوچا۔ روپیہ پیسہ باپ کے پاس کافی ہے۔ کیا پروا ہے۔ ملازمت کی فکر ہوتی رہے گی۔

اُس کا دوست واپس گوجرانوالہ چلا گیا۔ بعد اس کے کہ اُس نے جیسا اپنے گھر جانا تھا۔ سلیم نے اپنی ماں سے کہا "دیکھئے امی جان، میں نے آپ کی بات کتنی جلدی مان لی ۔۔۔ اب آپ میری مانیے"۔

اُس کی ماں نے پوچھا "کیا بیٹا؟"

"مجھے نسرین کی ایک جھلک دکھا دیجیے ۔۔۔ خواہ وہ تصویر ہی سے کیوں نہ ہو" ۔۔۔ اُس کے لہجے میں التجا تھی "میرا خیال ہے کہ وہ انکار کریں تو اُس کا کوئی فوٹو ہی دکھا دیجیے ۔۔۔ آخر وہ کل یا پرسوں میری ہونے والی ہے۔"

اُس کی ماں کو سلیم کی یہ درخواست ناپسند نہ ہوئی "میں پوری کوشش کروں گی بیٹا"۔

عید آگئی۔ مگر تصویر نہ آئی ۔۔۔ لیکن سلیم نے کسی خفگی کا اظہار نہ کیا۔ نکاح کی رسم بخیر و خوبی ختم ہو گئی۔ جب وہ باہر نکلا تھا تو اُس کی ماں نے کواڑ ذرا سا کھولا اور اُس کو آواز دی۔ وہ مڑ گیا۔ ہاتھ باہر نکال کر اُس نے سلیم سے کہا "یہ سنبھالو ۔۔۔ دیکھو میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔"

سلیم سمجھ گیا ۔۔۔ آس پاس کوئی بھی نہیں تھا۔ اُس میں تاب انتظار کیسے ہوتا۔ اُس نے لفافہ وہیں کھڑے کھڑے کھولا ۔۔۔ دھڑکتے ہوئے دل سے تصویر باہر نکالی۔ اِدھر اُدھر دیکھا اور تصویر پر پہلی نگاہ ڈالی۔ اُس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا۔ تصویر اُس کے کانپتے ہاتھوں سے گر پڑی ۔۔۔ اتنے میں سامنے والا دروازہ جس میں سے اُس کی ماں نے ہاتھ نکالا تھا کھلا اور بڑھیا نکلی ۔۔۔ سلیم نے اُس کو حیرت زدہ آنکھوں سے دیکھا "مائی! تم یہاں کیسے پہنچ گئیں ۔۔۔؟ تو اُس رات تم ہی ۔۔۔"

اُس نے اِس سے اور زیادہ کچھ نہ کہا اور تصویر کو زمین ہی پر چھوڑ کر تیز تیز قدموں سے اپنے ایک دوست ڈاکٹر جمیل کے پاس گیا اور ساری بات بتا دی۔ جمیل نے اُس کو ہسپتال میں داخل کرا دیا جہاں اُس کے جھوٹ موٹ کے مرض کا علاج ہوتا رہا ۔۔۔ آخر ڈاکٹر جمیل نے سلیم کے والد کو بلا کر تخلیے میں کہا کہ یہ شادی نہ ہو۔ آپ کا لڑکا عورت کے قابل نہیں ہے۔

جان محمد

(۱۳ر مئی ۱۹۵۴ء)

میرے دوست جان محمد نے جب میں بیمار تھا، میری بڑی خدمت کی۔ میں تین ہفتے ہسپتال میں رہا۔ اس دوران میں وہ باقاعدہ شام کو آتا رہا۔ بعض اوقات جب مجھے ذرا تکلیف ہوتی تو وہ رات کو بھی وہیں ٹھہرتا، تاکہ میری خبرگیری میں کوئی کوتاہی نہ ہو۔

جان محمد بہت مخلص دوست ہے۔ میں قریب قریب بیس دن تک بے ہوش رہا۔ اس دوران میں وہ آتا تھا — لیکن مجھے اس کا علم نہیں تھا۔ جب مجھے ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ وہ بہت پریشان تھا۔ روتا بھی تھا، اس لئے کہ میری حالت بہت نازک تھی۔

جب میں اس قابل ہو گیا کہ بات چیت کر سکوں، تو اس نے مجھ سے پوچھا "آپ کو تھکاوٹ تو محسوس نہیں ہوتی؟"

میرے اعضا بالکل مفلوج ہو چکے تھے۔ معلوم نہیں کتنی دیر ہو گئی تھی مجھے بستر پہ پڑے ہوئے۔ میں نے اس سے کہا "جان محمد —— میرا انگ انگ دُکھتا ہے"

اس نے فوراً میری بیوی سے کہا "کل زیتون کا تیل منگا دیجئے —— میں صبح آ کے مالش کر دیا کروں گا"

زیتون کا تیل آگیا۔ اور جان محمد بھی۔ اس نے میرے سارے بدن پر مالش کی۔ قریب قریب آدھ گھنٹہ اس کا اس مشقت میں صرف ہوا۔ مجھے بڑی راحت محسوس ہوئی۔

اس کے بعد اس کا معمول ہو گیا کہ ہر روز دفتر جانے سے پہلے ہسپتال میں آتا، اور میرے بدن پر مالش کرتا —— مجھے راحت ضرور ہوتی تھی، لیکن وہ اس زور سے اپنے ہاتھ چلاتا کہ میری ہڈیاں تک دُکھنے لگتیں، چنانچہ میں اس سے اکثر بڑے درشت لہجے میں کہتا "جان محمد، تم تو میری جان لے لو گے"

یہ سن کر وہ مسکرا دیتا "منٹو صاحب، آپ تو بڑے سخت جان ہیں —— اس مٹھی چاپی سے گھبرا گئے!"

میں خاموش ہو جاتا، اس لئے کہ اس کی مٹھی چاپی میں کوئی جارحانہ چیز نہیں تھی، وہ سرتاپا خلوص تھا۔

تین مہینے ہسپتال میں کاٹنے کے بعد میں گھر آ گیا ۔۔۔ جان محمد بدستور برابر آتا رہا۔

پھر اس کی دوستی تقاضا ہو گئی تو۔ ایک روز میں صحن میں بیٹھا تھا کہ ایک ناٹے قد کے چھوٹی چھوٹی مونچھوں والے جوان نے مسکرا کر سفید دانت دکھا کر

دی۔ میں نے جب اس کا تعارف چاہا تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ میرا قاری ہے۔ "منٹو صاحب ۔۔۔ میں نے آپ کو صرف اس لئے تکلیف دی

ہے کہ میں آپ کو اپنا تعارف کرانا چاہتا تھا ۔۔۔ میں نے قریب قریب آپ کی سب تصانیف پڑھی ہیں۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس دوران میں رسمی طور پر شکریہ ادا کیا تو اس کو بڑی حیرت ہوئی "منٹو صاحب ۔۔۔ آپ تو رسم و قیود کے قائل ہی

نہیں۔ پھر یہ تکلف کیوں؟"

میں نے کہا: "نو واردوں سے بعض اوقات یہ تکلف برتنا ہی پڑتا ہے۔"

جان محمد کی چھوٹی چھوٹی مونچھوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی "مجھ سے آپ یہ تکلف نہ برتیئے۔"

چنانچہ یہ تکلف فوراً دور ہو گیا۔

اس کے بعد جان محمد نے روزانہ میرے گھر آنا شروع کر دیا۔ شام کو وہ جب دفتر سے فارغ ہوتا تو سیدھا میرے یہاں چلا آتا۔

میری عادت ہے کہ میں کسی دوست کا حسب نسب دریافت نہیں کرتا۔ اس لئے کہ میں اس کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا ۔۔۔ میں تو کسی سے طول تو اس سے اس کا نام بھی نہیں پوچھتا۔

یہ تمہید کافی لمبی ہو گئی، حالانکہ میں اختصار پسند ہوں۔ جان محمد دیر تک میرے یہاں آتا رہا۔ اس کی معلومات خاصی اچھی تھیں۔ ادب سے بھی اسے خاصا شغف ہے۔ مگر میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ وہ زندگی سے کسی قدر بیزار ہے۔

مجھے زندگی سے پیار ہے، لیکن اس کو اس سے کوئی محبت نہیں تھی۔ ہم دونوں جب باتیں کرتے تو وہ کہتا "منٹو صاحب! آپ میرے لباس کو دیکھئے میں ایک شلوار اور قمیض جو ملگجیا سی ہے۔ آپ یقیناً نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہوں گے ۔۔۔ مگر مجھے اچھے لباس کی کوئی خواہش نہیں ۔۔۔ مجھے کسی خوبصورت چیز کی خواہش نہیں۔"

میں نے اس سے پوچھا "کیوں؟"

"بس ۔۔۔ میرے اندر یہ حس ہی نہیں رہی ۔۔۔ میں ننگے فرش پر سوتا ہوں ۔۔۔ نہایت واہیات ہوٹلوں میں کھانا کھاتا ہوں ۔۔۔ یہ دیکھئے ۔۔۔ میرے ناخن کتنے بڑھے ہوئے ہیں ۔۔۔ ان میں کتنا میل بھرا ہے ۔۔۔ میرے پاؤں ملاحظہ فرمائیے ۔۔۔ ایسا نہیں لگتا کہ کیچڑ میں لت پت ہوتے ہیں۔ مگر مجھے ان غلاظتوں کی کچھ پروا نہیں۔"

میں نے اس کی غلاظتوں کے متعلق اس سے کچھ نہ کہا۔ در حقیقت یہ ہے کہ ہر وقت میلا کچیلا رہتا تھا۔ اس کو صفائی کے متعلق کبھی خیال ہی نہ آتا تھا۔

ایک دن حسب معمول جب وہ شام کو میرے پاس آیا تو میں نے محسوس کیا کہ اس کی طبیعت مضمحل ہے۔ میں نے اس سے [illegible] "کیوں جناب

ہے آج ۔۔۔ تھکے تھکے سے معلوم ہوتے ہو۔"

اُس نے اپنی جیب سے بجلی کی ڈبیا نکالی اور ایک سگریٹ سلگا کر جواب دیا۔ "تھکاوٹ شعر میں ہی جاتی ہے ——— کوئی خاص بات نہیں۔"
اس کے بعد ہم دیر تک غالب کی شاعری پر گفتگو کرتے رہے۔ اُس کو یہ فارسی کا شعر بہت پسند آیا۔ ؎

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالبؔ
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما

ہم غالب کی شاعری پر تبصرہ کر رہے تھے کہ اتنے میں ہمارے ایک ہمسائے کی لڑکی میری بیوی سے ملنے چلی آئی۔ چونکہ وہ پردہ نہیں کرتی تھی اس لئے وہ ہمارے درمیان بیٹھ گئی۔ جان محمد نے آنکھیں جھکا لیں اور خاموش ہو گیا۔

اس لڑکی کا نام شمیم تھا۔ دیر تک وہ بیٹھی میری بیوی اور مجھ سے باتیں کرتی رہی، لیکن اس دوران میں جان محمد اُسی طرح آنکھیں جھکائے خاموش رہا۔ کچھ اس طرح کہ اُسے کوئی پہچان نہ لے۔

اس کے بعد دوسرے دن رات کے دس بجے میرے دروازے پر دستک ہوئی۔ نوکر اوپر سو رہا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ جان محمد ہے۔ نہایت خستہ حالت میں۔ میں بہت پریشان ہوا اور اُس سے پوچھا "کیوں جان محمد ——— خیریت تو ہے؟"

اُس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ پیدا ہوئی، جس سے میں بالکل نا آشنا تھا۔ "خیریت ہے ——— مجھے نیند نہیں آ رہی تھی ——— اس لئے میں آپ کے پاس چلا آیا۔"

مجھے سخت نیند آ رہی تھی، مگر جان محمد ایسے مخلص دوست کے لئے میں اِسے قربان کرنے کے لئے تیار تھا، مگر جب اُس نے اوٹ پٹانگ باتیں شروع کیں تو مجھے وحشت ہونے لگی ——— اُس کا دماغ غیر متوازن تھا۔ کبھی وہ آسمان کی بات کرتا، کبھی زمین کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اچانک اُسے کیا ہو گیا۔

ایک دن پہلے جب وہ مجھ سے ملا تو اچھا بھلا تھا۔ ایک دم اُس میں اتنی تبدیلی کیسے پیدا ہو گئی؟

ساری رات اُس نے مجھے جگائے رکھا۔ آخر صبح میں نے اُس کو غسل کرنے کے لئے کہا۔ اپنے کپڑے اُسے پہننے کے لئے دیئے کہ اُس کے میلے کچیلے تھے۔ پھر اُس کو لاریوں کے اڈے پر لے گیا کہ وہ سیالکوٹ اپنے والدین کے پاس چلا جائے۔

غلطی میں نے یہ کی کہ اُس کو لاری میں نہ بٹھایا۔ کرایہ وغیرہ میں نے اُسے دے دیا تھا۔ میں مطمئن تھا کہ وہ اپنے گھر چلا جائے گا، مگر اُسی دن رات کے تین بجے دروازے پر بڑے زور سے دستک ہوئی۔ میں باہر صحن میں سو رہا تھا۔ ہڑبڑا کر اٹھا، سوچا کہ شاید کوئی تار آیا ہو۔ دروازہ کھولا تو سامنے جان محمد ——— میرے اوسان خطا ہو گئے۔

میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ سیالکوٹ کیوں نہیں گیا۔ اُس نے اِس سوال کا کوئی معقول جواب نہ دیا۔ اُس کا دماغ پہلے سے زیادہ غیر متوازن تھا۔ لیٹ کر اپنی کنپٹیوں پر زور زور سے گھونسے مارنے لگا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا، کیا کروں۔ وہ یقیناً جنون کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ میں نے سوچا، پیار محبت سے کام لینا چاہیئے، چنانچہ بہت دیر تک میں اُس [illegible] تھپکتا رہا۔ اِس کے بعد اُس سے پوچھا "جان محمد تمہیں کیا تکلیف ہے؟"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا اور فرش پہ بکھری چیزوں کو جو ادھر پڑے ہوئے تھے، اُن سے کھیلنے لگا۔ اس کے بعد اس نے ہر ایک کو سجدہ کیا اور ہنسنے لگا۔

میں نے پھر اُس سے بڑی محبت سے پوچھا، "جان محمد، یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

اُس کی آنکھیں سرخ انگارہ تھیں جیسے کئی دنوں سے شراب نوشی میں مست ہے۔ اُس نے مجھے اُن آنکھوں سے دیکھا اور پوچھا "تم اتنے بڑے نفسیات دان بنتے ہو —— کیا یہ نہیں جان سکتے کہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟"

"میں اپنی کم مائیگی تسلیم کرتا ہوں —— اب تم خود بتا دو۔"

جان محمد مسکرایا۔ "مجھے شمیم ہو گیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"اب بھی مطلب پوچھتے ہیں آپ۔"

میں نے اس سے کہا "بھئی یہ کوئی بیماری تو نہیں۔"

جان محمد ہنسا۔ "بہت بڑی بیماری ہے منٹو صاحب —— یہ کئی لوگوں کو ہو چکی ہے۔ اُن میں سے میں بھی ایک ہوں —— پہلے ڈلہوزی میں ہوتی تھی —— اب یہاں لاہور بھی آ گئی ہے۔"

میں سمجھ گیا۔ جان محمد کئی برس ڈلہوزی میں رہ چکا تھا۔ "شمیم کی بیماری" میں نے اُس سے کہا "میں ابھی تک نہیں سمجھا —— تم اب سو جاؤ —— چلے آؤ —— اندر صوفے پر لیٹ جاؤ۔ خبردار جو تم نے شور مچایا۔"

وہ اندر چلا آیا اور صوفے پر لیٹ گیا —— میں صبح جلدی اُٹھنے کا عادی ہوں۔ ساڑھے پانچ کے قریب اُٹھا تو دیکھا کہ جان محمد غائب ہے۔ سات بجے پتہ چلا کہ شمیم بھی اپنے فلیٹ میں نہیں ہے —— کہیں غائب ہو گئی ہے۔

———————

بارش

(۱۴ مئی ۱۹۵۰ء)

موسلا دھار بارش ہو رہی تھی، اور وہ اپنے کمرے میں بیٹھا جل تھل دیکھ رہا تھا — باہر بہت بڑا لان تھا جس میں دو درخت تھے۔ ان کے سبز پتے بارش میں نہا رہے تھے۔ اس کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ پانی کی اس یورش سے خوش ہو کر ناچ رہے ہیں۔

ادھر ٹیلی فون کا ایک کھمبا گڑا تھا۔ اس کے فلیٹ کے عین سامنے۔ یہ بھی مسرور نظر آتا تھا، حالانکہ اس کی مسرت کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس بے جان شے کو بھلا مسرور کیا ہونا تھا — لیکن تنویر نے جو کہ بہت مغموم تھا یہی محسوس کیا، کہ اس کے آس پاس جو بھی شے ہے، خوشی میں ناچ گا رہی ہے۔

ساون گزر چکا تھا، اور بارانِ رحمت نہیں ہوئی تھی۔ لوگوں نے مسجدوں میں اکٹھے ہو کر دعائیں مانگیں، مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ بادل آتے اور جاتے رہے، مگر ان کے تھنوں سے پانی کا ایک قطرہ بھی نہ ٹپکا۔

آخر ایک دن اچانک کالے کالے بادل آسمان پر گھر آئے اور چھاجوں پانی برسنے لگا۔ تنویر کو بادلوں اور بارشوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی — اس کی زندگی چٹیل میدان بن چکی تھی، جس کے منہ میں پانی کا ایک قطرہ بھی کسی نے نہ ٹپکایا ہو۔

دو برس پہلے، اس نے ایک لڑکی سے جس کا نام ثریا تھا، محبت کرنا شروع کی۔ مگر یہ یک طرفہ محبت تھی۔ ثریا نے اسے درخورِ اعتنا ہی نہ سمجھا۔ ساون کے دن تھے۔ بارش ہو رہی تھی۔ وہ اپنی کوٹھی سے باہر نکلا، یہ سوچ کر کہ نہائے اور بارش کا لطف لے۔ آم بالٹی میں پڑے تھے، وہ اکیلا بیٹھا انہیں چوس رہا تھا کہ، اچانک اسے چیخیں اور قہقہے سنائی دیے۔

اس نے دیکھا کہ ساتھ والی کوٹھی کے لان میں دو لڑکیاں بارش میں نہا رہی ہیں اور خوشی میں شور مچا رہی ہیں۔ اس کی کوٹھی اور ساتھ والی کوٹھی کے درمیان صرف ایک جھاڑیوں کی دیوار حائل تھی۔

ٹھہرا ہوا تھا ——— آم کا رس چوستے چوستے وہ باڑ کے پاس گیا اور غور سے ان دونوں لڑکیوں کو دیکھا۔

دونوں ململ کے کرتے پہنے تھیں، جو اُن کے بدن کے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔ شلواریں چونکہ لٹھے کی تھیں، اس لئے تنویر کو ان کے بدن کے نچلے حصے کے صحیح خدوخال کا پتہ نہ چل سکا۔

اُس نے پہلے کبھی عورت کو اپنی نظروں سے کبھی ایسے نہیں دیکھا تھا، جیسا کہ اُس روز جب کہ بارش ہو رہی تھی، اُس نے اُن دونوں لڑکیوں کو دیکھا ——— دیر تک وہ اُن کو دیکھتا رہا جو بارش میں بھیگ بھیگ کر خوشی کے نعرے بلند کر رہی تھیں۔

تنویر نے ان کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، اس لئے کہ وہ طبعاً کچھ اس قسم کا لڑکا تھا کہ وہ کسی لڑکی کو بری نظروں سے دیکھنا گناہ سمجھتا تھا۔ مگر اس روز اُس نے بڑی بھوکی نگاہوں سے اُن کو دیکھا ——— دیکھا ہی نہیں، بلکہ ان کے گیلے بدنوں میں انگارہ بن کر پارے کی طرح جذب کرتا رہا۔

تنویر کی عمر اُس وقت بیس برس کے قریب ہوگی۔ ناتجربہ کار تھا۔ زندگی میں اُس نے پہلی مرتبہ جوان لڑکیوں کے شباب کو گیلی ململ میں لپٹے دیکھا، تو اُس نے پہلا محسوس کیا کہ اُس کے خون میں چنگاریاں دوڑ رہی ہیں۔

اُس نے اُن دو لڑکیوں میں سے ایک کو منتخب کرنا چاہا —— دیر تک وہ غور کرتا رہا —— ایک لڑکی بڑی شریر تھی ——— دوسری اُس سے کم۔ اُس نے سوچا شریر ہی ٹھیک رہے گی جو اُس کو شرارتوں کا سبق دے سکے۔

یہ شریر لڑکی خوبصورت تھی، اُس کے بدن کے اعضا بھی بہت متناسب تھے۔ بارش میں نہاتی بھلی بھلی معلوم ہوتی تھی ——— تھوڑی دیر کے لئے تنویر شاعر ہو گیا۔ اُس نے کبھی اس حد تک نہیں سوچا تھا لیکن اِس لڑکی نے جس کا کرتہ دوسری کے مقابلے میں بہت زیادہ مہین تھا، اُس کو ایسے ایسے شعر یاد کرا دیئے، جن کو وہ عرصہ ہوا بھول چکا تھا۔

اِس کے علاوہ ریڈیو پر سنے ہوئے فلمی گانوں کی دھنیں بھی اُس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ اور اُس نے باڑ کے پیچھے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ وہ اشوک کمار ہے ——— دلیپ کمار ہے ——— پھر اُسے کامنی کوشل اور نلنی جیونت کا خیال آیا ..... مگر اُس نے جب اُس لڑکی کی طرف اس غرض سے دیکھا کہ اُس میں کامنی کوشل اور نلنی جیونت کے خدوخال نظر آجائیں، تو اُس نے اِن دونوں ایکٹرسوں پر لعنت بھیجی ——— وہ اُن سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ اُس کے ململ کے کرتے میں جو شباب تھا، اُس کا مقابلہ، اُس نے سوچا، کوئی بھی نہیں کر سکتا۔

تنویر نے آم چوسنے بند کر دیئے، اور اُس لڑکی سے جس کا نام پروین تھا، عشق لڑانا شروع کر دیا۔

شروع شروع میں اسے بڑی مشکلات پیش آئیں، اس لئے کہ اُس لڑکی تک رسائی تنویر کو آسان نہیں معلوم ہوتی تھی۔ پھر اُسے اپنے والدین کا بھی ڈر تھا۔ اس کے علاوہ اُسے یہ بھی یقین نہیں تھا کہ وہ اُس سے ملتفت ہوگی یا نہیں!

بہت دیر تک وہ اِنہی الجھنوں میں گرفتار رہا ——— راتیں جاگتا ——— جھاڑیوں کی پشت پر جھاڑ کے پاس جاتا مگر وہ نظر نہ آتی۔ گھنٹوں وہاں کھڑا رہتا، اور وہ بارش والا منظر جو اُس نے دیکھا تھا، آنکھیں بند کر کے اپنے ذہن میں دہراتا رہتا۔

بہت دنوں کے بعد آخر اُس کو ایک روز اُس سے ملاقات کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ اپنے باپ کی کار میں گھر کے کسی کام کی غرض سے جا رہا تھا کہ پھاٹک سے اُس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ کار اسٹارٹ کر چکا تھا، کہ سامنے والی کوٹھی میں سے تنویر کے خوابوں کی شہزادی نکلی۔ اُس نے ہاتھ سے اشارہ کیا، سعادت مند

تنویر گھبرا گیا ——— ہر عاشق ایسے موقعوں پر گھبرا ہی جایا کرتا ہے۔ اُس نے موٹر کچھ ایسے بے ڈھبے انداز میں روکی کہ اُس کو زبردست دھچکا ——— اُس کا سر زور سے اسٹیرنگ وہیل کے ساتھ ٹکرایا، مگر اُس وقت وہ شراب کے نشے سے زیادہ مخمور تھا۔ اُس کو اُس کی محبوبہ نے خود طلب کیا تھا۔

پروین کے ہونٹوں پر گہرے سُرخ رنگ کی لپ اسٹک تھپی ہوئی تھی ——— اُس نے سُرخ مسکراہٹ سے کہا "معاف فرمائیے گا، میں نے آپ کو تکلیف دی ——— بارش ہو رہی ہے ——— تانگہ اِس دُور دراز جگہ ملنا محال ہے ——— اور مجھے ایک ضروری کام سے جانا تھا، آپ میرے ہمسائے ہیں، اس لئے آپ کو یہ زحمت دی"

تنویر نے کہا "زحمت کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے ——— میں تو ——— میں تو ———" اُس کی زبان لڑکھڑا گئی "آپ سے میرا تعارف تو نہیں، لیکن آپ کو ایک بار دیکھا تھا"

پروین اپنی سُرخ مسکراہٹوں کے ساتھ کار میں بیٹھ گئی اور تنویر سے پوچھا "آپ نے مجھے کب دیکھا تھا؟"

تنویر نے جواب دیا "آپ کی کوٹھی کے لان میں ——— جب آپ ——— جب آپ، اور آپ کے ساتھ ایک اور لڑکی بارش میں نہا رہی تھی"

پروین نے اپنے گہرے سُرخ لبوں میں سے چیخ نما آواز نکالی "ہائے ——— آپ دیکھ رہے تھے؟"

"یہ گستاخی میں نے ضرور کی ——— اس کے لئے معافی چاہتا ہوں"

پروین نے ایک ادا کے ساتھ اُس سے پوچھا "آپ نے دیکھا کیا تھا؟"

یہ سوال ایسا تھا کہ تنویر اُس کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ آئیں بائیں شائیں کر کے وہ گیا "جی کچھ نہیں ——— بس آپ کو ——— میرا مطلب ہے کہ وہ لڑکیاں تھیں جو بارش میں نہا رہی تھیں اور ——— اور خوش ہو رہی تھیں ——— میں اُس وقت آم چوس رہا تھا"

پروین کے گہرے سُرخ لبوں پر شریر مسکراہٹ پیدا ہوئی "آپ آم چوستے کیوں ہیں ——— کاٹ کر کیوں نہیں کھاتے؟"

تنویر نے موٹر اسٹارٹ کر دی۔ اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اِس سوال کا جواب کیا دے۔ چنانچہ وہ گول کر گیا "آپ کو میں کہاں ڈراپ کر دوں؟"

پروین مسکرائی "آپ مجھے کہیں بھی ڈراپ کر دیں، وہی میری منزل ہوگی"

تنویر نے یوں محسوس کیا کہ اُسے اپنی منزل مل گئی ہے۔ لڑکی جو اُس کے پہلو میں بیٹھی ہے، اب اُسی کی ہے۔ لیکن اُس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ اُس کا ہاتھ دبائے، یا اُس کی کمر میں ایک دو سیکنڈ کے لئے اپنا بازو حمائل کر دے۔

بارش ہو رہی تھی۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ اُس نے کافی دیر سوچا۔ موٹر کی رفتار اُس کے خیالات کے ساتھ ساتھ تیز ہوتی گئی۔ آخر اُس نے ایک جگہ اُسے روک لیا، اور جذبات سے مغلوب ہو کر اُس کو اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ اُس کے ہونٹوں سے اپنے ہونٹ پیوست کر دیئے ——— اُس کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ کوئی بہت ہی لذیذ آم چوس رہا ہے۔ پروین نے کوئی مزاحمت نہ کی ——— لیکن فوراً تنویر کو یہ احساس بڑی شدت سے ہوا کہ اُس نے بڑی ناشائستہ حرکت کی ——— وہ خفا ہو گئی تھی کہ اُس کو یہ حرکت پسند نہیں آئی، چنانچہ ایکدم سنجیدہ ہو کر اُس نے کہا "آپ کو کہاں جانا ہے؟"

پیدرو کے چہرے پر یوں تو تشکیک کے کوئی آثار نہیں تھے، لیکن تنویر یوں محسوس کر رہا تھا، جیسے وہ اُس کے خون کی پیاسی ہے۔

پیدرو نے اسے بتا دیا کہ اُسے کہاں جانا ہے ——— جب وہ اس جگہ پہنچا تو اُسے معلوم ہوا کہ وہ رنڈیوں کا چکلہ ہے ——— جب اس نے پیدرو کو سامنے آتا دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر [illegible] رنگ کی مسکراہٹ ابھر رہی تھی۔ اس نے [illegible] انداز میں اس سے کہا، شام کو [illegible] ہوتی ہیں ——— آپ بھی ضرور تشریف لایئے۔

تنویر جب [illegible] تو [illegible] ایسا لگا کہ وہ بھی ایک کسبی عورت ہے، جسے وہ ہر روز چلاتا ہے۔ اُس کی [illegible] [illegible] تھی۔

وہ واپس اپنی کوٹھی چلا آیا ——— بارش ہو رہی تھی ——— اور تنویر بے حد مغموم تھا ——— اُس کو ایسا محسوس ہوا کہ اُس کی آنکھوں کے آنسو کے قطرے بن کے ٹپک رہے ہیں۔

افشائے راز

(۱۵ مئی ۵۴ء)

"ہائے گڈو کیسے نہ دیکھو رے، نئے نئے دی زون تکا ہے جانا!"

"یہ آپ نے گانا کیوں شروع کر دیا ہے؟"

"ہر آدمی گانا گاتا ہے —— کونسا گناہ کیا ہے؟"

"کل آپ غسل خانے میں بھی یہی گیت گا رہے تھے۔"

"غسل خانے میں تو ہر شریف آدمی اپنی استطاعت کے مطابق گاتا ہے ... اس لئے کہ وہاں کوئی اور سننے والا نہیں ہوتا —— میرا خیال ہے، تمہیں میری آواز پسند نہیں آئی۔"

"آپ کی آواز تو ماشاء اللہ بڑی اچھی ہے۔"

"مجھے بنا رہی ہو —— مجھے اس کا علم ہے کہ میں کن سرا ہوں۔ میری آواز میں کوئی کشش نہیں —— کوئی بھی اسے پھٹے بانس کی آواز کہتا ہے۔"

"مجھے تو آپ کی آواز بڑی سریلی معلوم ہوتی ہے۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے —— لیکن میں پوچھتی ہوں، ہر وقت پنجابی بولی وردِ زبان کیوں ہے؟"

"مجھے اچھی لگتی ہے —— بیگم تم کو اگر ادب اور شعر سے ذرا سا بھی شغف ہو ——"

"یہ شغف کیا بلا ہے —— آپ ہمیشہ ایسے الفاظ میں گفتگو کرتے ہیں جسے کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا۔"

"شغف کا مطلب —— بس تم یہ سمجھ لو —— کہ اس کا مطلب لگاؤ ہے۔"

مجھے شادی سے نفرت کیوں ہو — بیوی وہ بہت چیز ہے؟

یعنی شادی بھی ایک چیز ہو گئی — یہ تمہاری بڑی زیادتی ہے — زحمت کے لمحات میں اپنے اندر ذوق پیدا کیا کرو۔

میں بچے پیدا کر چکی ہوں — اب میں اور کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتی؟

میں نے تم سے کئی بار کہا کہ معاملہ ختم ہو جانا چاہیے، پہلے تم ہی نہیں مانیں — چھ بچے پیدا کر کے تم تھک گئی ہو۔ تمہارے بڑے دو بچے [illegible] آدمی ہیں۔ ان کے آگے [illegible] بچے ہیں؟

اس کا مطلب ہے کہ میں ہی نے کہا تھا پیدا کرو؟

میں نے یہ کب کہا ہے — میں [illegible]

میں اچھی طرح جانتی ہوں — جب میرے بچے [illegible] تو آپ اسی بہانے سے دوسری شادی کر لیتے۔

میں تو ایک بیوی شادی سے بیزار ہو چکا ہوں — تم [illegible] زندگی [illegible] کافی ہو — بیوی دوسری شادی کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا۔

اور [illegible] پہلی کس لئے کی جا رہی تھی؟

یہی تو میں کہہ چکا ہوں کہ مجھے [illegible] ہے — تم ہی ناپسند ہو تو میں کیا کہہ سکتا ہوں — میری گھر کی [illegible] دیکھی [illegible] زندگی [illegible] ہو گیا۔

ذرا بتائیں آپ کو کیا لذت محسوس ہوتی ہے؟

[illegible]

میں اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

آپ نے اب تک کوئی بات وثوق سے نہیں کی۔

وہ فرشتہ نہیں — وثوق — یعنی یقین کے ساتھ؟

آپ نے آج تک کوئی بات [illegible] یقین [illegible] ہو؟

لو [illegible] باتوں پہ آ [illegible] کیوں نہیں؟

مردوں کی باتوں کا اعتبار ہی کیا ہے؟

عورتوں کی باتوں کا اعتبار [illegible] گھر [illegible] آپ ہی [illegible] آپ ہی رفو کرتی ہیں — سمجھ میں نہیں آتا یہ آج کل [illegible] بات پر [illegible]؟

آپ ایسے [illegible] رہیں اور [illegible] چپ رہوں — اب تو قرآن درمیان [illegible] آپ نے ہمیشہ مجھ سے بے اعتنائی کی — میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو غزلوں اور گیتوں سے اتنی دلچسپی کیوں ہے — ابھی پچھلے دنوں آپ حسن پہ شعر گنگناتے رہتے۔ —

[illegible]

[illegible]

یہ عام محاورہ ہے — کوئی شریف آدمی ایسا فقرہ نہیں کہتا — آپ سے

تیری طلعت سے اُجلی سویری

میری بار کیوں دیر اتنی کری

سمجھے آپ؟

- لاحول ولا — تم بھی کیسی اوٹ پٹانگ باتیں کرتی ہو۔"

- "یہ باتیں گویا آپ کے نزدیک اوٹ پٹانگ ہیں! — اس لئے کہ پاکیزہ ہیں!"

- "تمہارے نزدیک ہر چیز پاکیزہ ہے؟"

- "آپ بھی؟"

- "میں تو ہمیشہ صاف ستھرا رہتا ہوں۔ تم نے کئی مرتبہ اس کی تعریف کی ہے۔ دن میں دو مرتبہ کپڑے بدلتا ہوں۔ سخت سردی بھی ہو تو غسل کرتا ہوں۔ تم تو تین چار دن چھوڑ کے نہاتی ہو۔ تمہیں پانی سے نفرت ہے۔"

- "اجی واہ — میں تو ہر ہفتے باقاعدہ نہاتی ہوں۔"

- "ہر ہفتے کا نہانا تو سفید جھوٹ ہے — قرآن کی قسم کھا کے بتاؤ، تمہیں نہائے ہوئے کتنے دن ہو گئے ہیں؟"

- "میں قرآن کی قسم کھانے کے لئے تیار نہیں — آپ بتائیے، کب غسل کیا تھا؟"

- "آج صبح۔"

- "جھوٹ — آپ کا اصلی جھوٹ، آخر جھوٹ — آج صبح تو نل میں پانی ہی نہیں تھا — میں نے ساڑھے نو بجے کے قریب دو مشکیں منگوائی تھیں۔"

- "میں بھول گیا — واقعی آج میں نے غسل نہیں کیا۔"

- "آپ کو بھول جانے کا مرض ہے۔"

- "بھولنا انسان کی فطرت ہے — اس پر تمہیں اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں — چند روز ہوئے تم دس کا نوٹ کہیں رکھ کے بھول گئی تھیں۔ اور مجھ پہ الزام لگایا کہ میں نے چوری کر لیا ہے — یہ کتنی بڑی زیادتی تھی۔"

- "جیسے آپ نے میرے روپے کبھی نہیں چرائے — پچھلے مہینے میری الماری سے آپ نے سو روپے نکالے اور غائب کر گئے۔"

- "ہو سکتا ہے وہ کسی اور نے چرائے ہوں — اگر تمہیں مجھ پہ شک تھا تو بتا دیا ہوتا — یہ بھی ممکن ہے کہ تم نے وہ سو روپے کا نوٹ کسی محفوظ جگہ رکھا ہو اور بعد میں بھول گئی ہو — کئی مرتبہ ایسا ہوا ہے —"

- "کب؟"

- "پچھلے سال اسی مہینے تم نے پانچ سو روپے کے نوٹ اپنے پلنگ کے بستر کے نیچے چھپا رکھے تھے۔ اور تم ان کے متعلق بالکل بھول گئی تھیں

——— مجھ پر یہ الزام لگا دیا گیا تھا کہ میں نے چرائے ہیں۔ آخر میں نے ہی تلاش کر کے نکالے اور تمہارے حوالے کر دیئے۔"

"کیا پتہ ہے کہ آپ نے چرائے ہوں اور بعد میں میرے شور مچانے پر اپنی جیب سے نکال کر بستر کے نیچے رکھ دیئے ہوں۔"

"میری سمجھ میں تمہاری یہ منطق نہیں آتی۔"

"آپ کی سمجھ میں تو کوئی چیز بھی نہیں آتی ——— کل میں نے آپ سے کہا تھا کہ دہی کھانا آپ کے لئے مفید ہے لیکن آپ نے مجھے ایک گھر چلا کر دہی فضول چیز ہے۔"

"دہی تو میں ہر روز کھاتا ہوں۔"

"کتنا کھاتے ہیں؟"

"یہی کوئی آدھ سیر۔"

"میں ہر روز سیر منگواتی ہوں ——— باقی پڑا جھک مارتا رہتا ہے۔"

"دہی کو جھک مارنے کی کیا ضرورت ہے ——— جو بچ جاتا ہے، اس کی تم کڑھی بنا لیتی ہو۔"

"میں دہی کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی ——— کڑھی بناتی ہوں تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ میں سلیقہ شعار عورت ہوں ——— میں نے آپ سے صرف اتنا پوچھا تھا کہ آپ آج کل ایک خاص پنجابی بول کیوں ہر وقت گاتے رہتے ہیں۔"

"اس لئے کہ مجھے پسند ہے۔"

"کیوں پسند ہے؟ ——— اس کی وجہ بھی تو ہونی چاہیئے۔"

"تمہیں کالا رنگ کیوں پسند ہے ——— اس کی وجہ بتاؤ ——— تمہیں بھنڈیاں مرغوب ہیں ——— کیوں؟ ——— تمہیں سینما دیکھنے کا شوق ہے ——— اس کا جواز پیش کرو ——— تم لٹھے کے بجائے ریشم کی شلواریں پہنتی ہو۔ اس کی وجہ کیا ہے؟"

"آپ کو کوئی حق حاصل نہیں کہ مجھ سے اس قسم کے سوال کریں ——— میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔"

"اپنی مرضی کا مالک میں بھی ہوں ——— کیا مجھے یہ حق حاصل نہیں کہ جو شعر مجھے پسند ہو اپنی بھونڈی آواز میں دن رات گاتا رہوں۔"

"مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ——— لیکن میں سمجھتی ہوں ———"

"رُک کیوں گئیں؟"

"دیکھئے، آپ میری زبان نہ کھلوائیے ——— میں نے آج تک آپ سے کچھ نہیں کہا۔ حالانکہ میں سب کچھ جانتی ہوں۔"

"تم میرے متعلق کیا جانتی ہو؟"

"سب کچھ۔"

"کچھ مجھے بھی بتا دو، تاکہ میں اپنے متعلق کچھ جان سکوں ——— میں تو سالہا سال کے غور و فکر کے بعد بھی اپنے متعلق کچھ جان نہ سکا۔"

"آپ کو اس پنجابی بول میں جو آپ مسلسل گنگناتے رہتے ہیں ——— سب کچھ جان سکتے ہیں۔"

"تم اس قدر شاکی کیوں ہو؟"

"ہر مرد بے وفا ہوتا ہے"

"میں نے تم سے کہا ہے بدگمانی کی ہے —— اصل میں عورتیں جا و بے جا اپنے شوہروں پر شک کرتی رہتی ہیں ——"

"ٹھہریے —— دروازے پر دستک ہوئی ہے —— میرا خیال ہے، ڈاکیہ ہے"

* * * * *

"یہ خط میرا ہے —— لاؤ ادھر"

"میں کھولتی ہوں —— پڑھ کے آپ کے حوالے کر دوں گی"

"تمہیں میرے خط پڑھنے کا کوئی حق حاصل نہیں"

"میں ہمیشہ آپ کے خط پڑھتی رہی ہوں —— یہ حق آپ نے کب سے چھین لیا؟"

"اچھا، یہ بتا دو کہ خط کس کا ہے"

"آپ ہی کا ہے"

"کس نے لکھا ہے؟"

"آپ کی ایک سہیلی نے —— جس کا نام فردا ہے —— وہ پنجابی بولی جو آپ گاتے پھرتے ہیں اس کاغذ کی پیشانی پر لکھی ہے ——

میری نگڈی کسے نہ ویکھی وے   نہ ڈھنڈی نوں جگ جاندا

یہ ٹوٹ ہی جائے تو بہتر ہے۔

آمنہ

(۱۶ مئی ۵۴ء)

پکے ہوئے پیلے دھان کی بالیوں سے کھیت پیلے ہو گئے تھے۔ جُمّے کا نوجوان لڑکا بُندو کٹے ہوئے دھان کے پولے اٹھا رہا تھا اور ساتھ ساتھ گا بھی رہا تھا۔

دھان کے پولے دھر کاندھے
بھر بھر لائے
کھیت سنہرا۔ دھن دولت برسے۔

بُندو کا باپ جُمّا، گاؤں میں بہت مقبول تھا۔ ہر شخص کو معلوم تھا کہ اُس کو اپنی بیوی سے بہت پیار ہے۔ اُن دونوں کا عشق گاؤں کے ہر شخص کو معلوم تھا۔ اُن کے دو بچے تھے۔ ایک بُندو، جس کی عمر تیرہ برس کے قریب تھی، دوسرا چندو۔

سب خوش و خرم تھے مگر ایک روز اچانک جُمّے کی بیوی بیمار پڑ گئی۔ حالت بہت نازک ہو گئی۔ بہت علاج کئے۔ ٹونے ٹوٹکے آزمائے مگر اُس کو کوئی افاقہ نہ ہوا۔ جب مرض مہلک شکل اختیار کر گیا تو اُس نے اپنے شوہر سے نحیف لہجے میں کہا: "تم مجھے کبوتری کہا کرتے تھے اور خود کو کبوتر ——— ہم دونوں نے دو بچے پیدا کئے ——— اب یہ تمہاری کبوتری مر رہی ہے ——— کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے مرنے کے بعد تم کوئی اور کبوتری اپنے گھر لے آؤ۔"

تھوڑی دیر کے بعد اُس پر نزع کی کیفیت طاری ہو گئی۔ جُمّے کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور اُس کی بیوی کہے چلی جا رہی تھی "تم اور کبوتری لے آؤ گے ——— وہ سوچے گی کہ جب تک میرے بچے زندہ ہیں تم اُس سے محبت نہیں کرو گے ——— چنانچہ وہ اُن کو ذبح کر کے کھا جائے گی۔"

بجّہ نے اپنی بیوی سے بڑے پیار کے ساتھ کہا "سکینہ! میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ زندگی بھر دوسری شادی نہیں کروں گا ——— مگر تم انشاءاللہ بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گی"

سکینہ کو جونہی یہ پتہ چلا کہ اس کا شوہر وفادار رہے گا، اس کے فوراً بعد اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ بجّہ کو بہت صدمہ ہوا۔ جب اس نے اپنے ہاتھوں سے اس کو دفن کیا تو اس کو ایسا محسوس ہوا کہ اس نے اپنی زندگی منوں مٹی کے نیچے گاڑ دی ہے۔

اب وہ ہر وقت مغموم رہتا۔ کام کاج میں اسے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ ایک دن اس کے ایک وفادار مزارعے نے اس سے کہا "سرکار! بہت دنوں سے آپ کی یہ حالت دیکھ رہا ہوں اور جی ہی جی میں کڑھتا رہا ہوں۔ آج مجھ سے نہیں رہا گیا، تو آپ سے یہ عرض کرنے آیا ہوں کہ آپ اپنے بچوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اپنی زمینوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے ——— آپ کو اس کا علم ہی نہیں، کتنا نقصان ہو رہا ہے"

بجّہ نے بڑی بے توجہی سے کہا "ہونے دو ——— مجھے کسی چیز کا ہوش نہیں"

"سرکار ——— آپ ہوش میں آئیے ——— چاروں طرف دشمن ہی دشمن ہیں، ایسا نہ ہو وہ آپ کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر آپ کی زمینوں پر قبضہ نہ کر لیں۔ آپ سے مقدمہ بازی کیا ہو گی ——— میری تو یہی مخلصانہ رائے ہے کہ آپ دوسری شادی کر لیں ——— اس سے آپکے غم کا بوجھ ہلکا ہو جائیگا اور وہ آپکے لڑکوں سے پیار محبت بھی کریگی"

بجّہ کو بہت غصہ آیا "بکواس نہ کرو رمضانی۔ تم سمجھتے نہیں کہ سوتیلی ماں کیا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ تم یہ بھی تو سوچو میری بیوی کی روح کو کتنا صدمہ پہنچے گا"

بہت دنوں کے اصرار کے بعد آخر رمضانی اپنے آقا کو دوسری شادی پر رضامند کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جب شادی ہو گئی تو اس نے اپنے لڑکوں کو ایک علیحدہ مکان میں بھیج دیا ——— ہر روز وہاں کئی کئی گھنٹے رہتا اور بدھو اور چندو کی دلجوئی کرتا رہتا۔

نئی بیوی کو یہ بات بہت ناگوار گذری۔ ایک بات اور بھی تھی کہ مکھن دودھ کا بیشتر حصہ اس کے سوتیلے بیٹوں کے پاس چلا جاتا تھا۔ اس سے وہ بہت جلتی۔ اس کا تو یہ مطلب تھا کہ گھر بار کے مالک وہ ہی ہیں۔

ایک دن بجّہ جب کھیتوں سے واپس آیا تو اس کی نئی بیوی زار و قطار رونے لگی۔ بجّہ نے اس آہ و زاری کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا "تم مجھے ماں نہیں سمجھتے ——— اسی لئے بچوں کو دوسرے مکان میں بھیج دیا۔ میں ان کی ماں ہوں۔ کوئی دشمن تو نہیں ہوں۔ مجھے بہت دکھ ہوتا ہے جب میں سوچتی ہوں کہ بچارے اکیلے رہتے ہیں"

بجّہ ان باتوں سے بہت متاثر ہوا اور دوسرے ہی دن بدھو اور چندو کو لے آیا اور ان کو سوتیلی ماں کے حوالے کر دیا، جس نے ان کو اتنے ناز محبت سے رکھا کہ آس پاس کے تمام لوگ اس کی تعریف میں رطب اللسان ہو گئے۔

نئی بیوی نے جب اپنے خاوند کے دل کو پوری طرح موہ لیا تو ایک دن ایک مزارعہ کو بلا کر اکیلے میں اس سے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا "میں تم سے ایک کام لینا چاہتی ہوں ——— بولو کرو گے؟"

اس مزارعہ نے جس کا نام شیرانی تھا، ہاتھ جوڑ کر کہا "سرکار، آپ مائی باپ ہیں ——— جان تک حاضر ہے"

تو بیوی نے کہا "دیکھو، کل دریا کے پاس بہت بڑا میلہ لگ رہا ہے — میں اپنے سوتیلے بچوں کو تمہارے ساتھ بھیجوں گی۔ ان کو کشتی کی سیر کرانا اور کسی نہ کسی طرح جب کوئی نہ دیکھتا ہو انھیں گہرے پانی میں ڈبو دینا۔"

شبراتی کی نیت بہت خراب تھی۔ اس کے علاوہ اس کو بہت بڑے انعام کا لالچ دیا گیا تھا۔ وہ دوسرے روز بندو اور چندو کو اپنے ساتھ لے گیا۔ انھیں کشتی میں بٹھایا۔ اس کو خوب کھیتا ہوا دریا میں دور تک چلا گیا، جہاں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا — اس نے چاہا کہ انھیں دھکا دے کر ڈبو دے، مگر ایک دم اس کا ضمیر جاگ اٹھا۔ اس نے سوچا، ان بچوں کا کیا قصور ہے — سوائے اس کے کہ ان کی اپنی ماں مر گئی ہے اور یہ اب سوتیلی ماں کے ظلم و کرم پر ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ میں انھیں کسی شخص کے حوالے کر دوں اور سوتیلی ماں سے جا کر کہہ دوں کہ دونوں ڈوب چکے ہیں۔

دریا کے دوسرے کنارے اتر کر اس نے بندو اور چندو کو ایک تاجر کے حوالے کر دیا — جس نے ان کو ملازم رکھ لیا۔

شاید بندو کھیل کود کا عادی، محنت مشقت سے بہت گھبراتا تھا — تاجر کے ہاں سے بھاگ نکلا، اور پیدل چل کر دوسرے شہر میں پہنچا، گھر وہاں اسے ایک دولت مند نے — جس کا نام قلندر بیگ تھا، پناہ دینا پڑی۔ قلندر بیگ نیک دل آدمی تھا، اس نے چاہا کہ بندو کو اپنے ہاں نوکر رکھ لے، چنانچہ اس نے اس سے پوچھا "برخوردار کیا تنخواہ لو گے؟"

بندو نے جواب دیا "جناب میں تنخواہ نہیں لوں گا۔"

قلندر بیگ کو کسی قدر حیرت ہوئی۔ لڑکا شکل و صورت کا اچھا تھا۔ اس میں گنوار پن بھی نہیں تھا۔ اس نے پوچھا "تم کس خاندان کے ہو — کس شہر کے باشندے ہو؟"

بندو نے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموش رہا، پھر رونے لگا۔ قلندر بیگ نے اس سے مزید استفسار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ جب بندو کو اس کے یہاں رہتے ہوئے کافی عرصہ گزر گیا تو قلندر بیگ اس کی خوش اطواری سے بہت متاثر ہوا۔ ایک دن اس نے اپنی بیوی سے کہا۔

"بندو مجھے بہت پسند ہے — میں تو سوچتا ہوں اس سے اپنی ایک لڑکی بیاہ دوں۔"

بیوی کو اپنے خاوند کی یہ بات بری لگی۔ لیکن آخر میں اس نے کہا "آپ پہلے اس کے خاندان کے متعلق تو دریافت کیجیے۔"

قلندر بیگ نے کہا "میں نے ایک مرتبہ اس سے اس کے خاندان کے متعلق پوچھا تو وہ زار و قطار رونے لگا — پھر میں نے اس موضوع پر اس سے کبھی گفتگو نہیں کی۔"

بندو کئی برس قلندر بیگ کے ہاں رہا۔ جب بیس برس کا ہو گیا تو قلندر بیگ نے اپنا سارا کاروبار اس کے سپرد کر دیا۔ کافی عرصہ گزر گیا۔ ایک دن بندو نے بڑے ادب سے اپنے آقا سے درخواست کی "دریا کے اس پار دور جو ایک گاؤں ہے، وہاں میں چھوٹا سا مکان بنوانا چاہتا ہوں — کیا مجھے آپ اتنا روپیہ مرحمت فرما سکتے ہیں کہ میری یہ خواہش پوری ہو جائے۔"

قلندر بیگ نے کہا "تم جتنا روپیہ چاہو لے سکتے ہو بیٹا — لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم دریا پار اتنی دور مکان کیوں بنوانا چاہتے ہو؟"

بندو نے جواب دیا "یہ راز آپ پر عنقریب کھل جائے گا۔"

بندو اور چندو کا باپ اپنے بیٹوں کے فراق میں گھل گھل کے مر چکا تھا۔ مزارعوں کی بڑی ابتر حالت تھی۔ اس لیے کہ زمینوں کی دیکھ بھال

[illegible] تھا۔

بندو بہت سا روپیہ لے کر اپنے گاؤں پہنچا ایک پکا مکان بنوایا اور رشتہ داروں کو خوش حال کر دیا۔

بندو کا بھائی چندر جس شخص کے ہاں ملازم ہوا تھا، اس نے اس کو بیٹا بنا لیا تھا۔ ایک دفعہ وہ خطرناک طور پر بیمار پڑ گیا تو اس شخص کی بیوی نے جس کا نام صفاوتی تھا، اپنی بیٹی آمنہ سے کہا کہ وہ اس کی تیمارداری کرے۔

آمنہ بڑی نازک اندام حسین لڑکی تھی۔ دن رات اس نے چندر کی خدمت کی۔ آخر وہ صحت مند ہو گیا۔ تیمارداری کے اس دوران میں وہ کچھ اس طرح گھل ملے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہو گئی۔

مگر چندر سوچتا تھا کہ آمنہ ایک دولت مند کی لڑکی ہے اور وہ مفلس کنگلا۔ ان کا آپس میں کیا جوڑ ہے۔ اس کے والدین بھلا کب ان کی شادی پر راضی ہوں گے۔ لیکن آمنہ کو کسی قدر یقین تھا کہ اس کے والدین راضی ہو جائیں گے، اس لیے کہ وہ چندر کو بڑی اچھی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔

ایک دن چندر گائے بھینسوں کے ریوڑ کو جوہڑ پر پانی پلا رہا تھا کہ آمنہ دوڑتی ہوئی آئی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ ننھا سا سینہ دھڑک رہا تھا۔ اس نے خوش خوش چندر سے کہا "ایک بہت اچھی خبر لائی ہوں۔ آج میری ماں اور باپ میری شادی کی بات کر رہے تھے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ تم بڑے اچھے لڑکے ہو۔ اس لیے تمھیں میرے ساتھ بیاہ دینا چاہیے۔"

چندر اس قدر خوش ہوا کہ اس نے آمنہ کو اٹھا کر ناچنا شروع کر دیا۔

ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ ایک سال کے بعد ان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام جمیل رکھا گیا۔

جب بندو اپنے گاؤں میں اچھی طرح جم گیا تو اس نے بھائی کا پتہ لیا۔ جا کے اس سے ملا۔ دونوں بہت خوش ہوئے۔ بندو نے اس سے کہا "اب اللہ کا فضل ہے۔ چلو میرے ساتھ اور دیوانی سنبھالو۔ میں چاہتا ہوں تمھاری شادی اپنی سالی سے کرا دوں ---- بڑی پیاری لڑکی ہے۔"

چندر نے اس کو بتایا کہ وہ پہلے ہی شادی شدہ ہے۔ سارے حالات سن کر بندو نے اس کو سمجھایا "قلندر بیگ بے حد دولت مند آدمی ہے۔ اس کی لڑکی سے شادی کر لو ---- ساری عمر عیش کرتے رہو گے ---- آمنہ کے باپ کے پاس کیا پڑا ہے؟"

چندر اپنے بھائی کی یہ باتیں سن کر لالچ میں آ گیا، اور دولت کی خاطر آمنہ کو چھوڑ دیا۔ طلاق نامہ کسی کے ہاتھ بھجوا دیا اور اس سے ملے بغیر چلا گیا۔

چند روز کے بعد ہی بندو نے اپنے بھائی کی شادی قلندر بیگ کی چھوٹی لڑکی سے کرا دی۔ آمنہ حیران و پریشان تھی کہ اس کا پیارا چندر ایکدم کہاں غائب ہو گیا۔ لیکن اس کو یقین تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ ایک دن ضرور واپس آ جائے گا۔ بڑی دیر اس نے اس کی واپسی کا انتظار کیا اور اس کی یاد میں آنسو بہاتی رہی۔ جب وہ نہ آیا تو آمنہ کے باپ نے جمیل کو ساتھ لیا اور بندو کے گاؤں پہنچا۔ اس کی ملاقات چندر سے ہوئی۔ وہ دولت کے نشے میں سب کو بھول چکا تھا۔

آمنہ کے باپ نے اس کی بڑی منت سماجت کی اور اس سے کہا "اور کچھ نہیں تو اپنے اس کمسن بیٹے ہی کا خیال کرو ---- تمھارے بغیر اس بچے کی زندگی کیا ہے؟"

چندر نے بگڑ کر جواب دیا "میں اپنی دولت اور عزت اس بچے کے لیے چھوڑ سکتا ہوں؟ ---- جاؤ اسے لے جاؤ اور میری نظروں سے دور کر دو

جب آمنہ کے باپ نے اور زیادہ منت سماجت کی تو چند ڈنڈوں نے اس بڈھے کو دھکے دے کر باہر نکال دیا۔ ساتھ ہی [illegible]
بوڑھا باپ غم و اندوہ سے چور گھر پہنچا اور آمنہ کو ساری داستان سنا دی۔ آمنہ کو اس قدر صدمہ پہنچا کہ پاگل ہو گئی۔

چند دن پہلے اتنے مصائب آئے کہ اس کی ساری دولت اجڑ گئی۔ بھائی نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ بیوی لڑ جھگڑ کر اپنے میکے چلی گئی۔ اس کو آمنہ یاد آئی۔ وہ اس سے ملنے کے لئے گیا۔ اس کا بیٹا جمیل، جو دس برس کا تھا، اس سے گھر کے باہر ملا۔ اس نے اس کو پیار کیا اور آمنہ کے متعلق اس سے پوچھا۔

جمیل نے اس سے کہا "آؤ تمہیں بتاتا ہوں، میری ماں آج کل کہاں رہتی ہے۔"

وہ اسے لے گیا اور ایک قبر کی طرف اشارہ کر کے "یہاں رہتی ہے آمنہ اماں۔"

تصویر

(۱۸ / مئی ۵۴ء)

"بچے کہاں ہیں؟"

"مر گئے ہیں!"

"سب کے سب؟"

"ہاں سب کے سب ــــ آپ کو آج اُن کے متعلق پوچھنے کا کیا خیال آ گیا؟"

"میں اُن کا باپ ہوں۔"

"آپ ایسا باپ خدا کرے کبھی پیدا ہی نہ ہو۔"

"تم آج اتنی خفا کیوں ہو ــــ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ گھڑی میں رتّی گھڑی میں ماشہ ہو جاتی ہو ــــ دفتر سے تھک کر آیا ہوں اور تم نے یہ چخ چخ شروع کر دی ہے ــــ بہتر تھا کہ میں وہاں دفتر ہی میں پنکھے کے نیچے آرام کرتا۔"

"پنکھا یہاں بھی ہے ــــ آپ آرام طلب ہیں ــــ یہیں آرام فرما سکتے ہیں۔"

"تمہارا طنز کبھی نہیں جائے گا ــــ میرا خیال ہے کہ یہ چیز تمہیں جہیز میں ملی تھی۔"

"میں کہتی ہوں، کہ آپ مجھ سے اس قسم کی خرافات نہ بکا کیجئے ــــ آپ کے دیدوں کا تو پانی ہی ڈھل گیا ہے۔"

"یہاں تو سب کچھ ڈھل گیا ہے ــــ تمہاری وہ جوانی کہاں گئی! ــــ میں تو اب ایسا محسوس کرتا ہوں، جیسے سو برس کا بڈھا ہوں۔"

"یہ آپ کے اعمال کا نتیجہ ہے ــــ میں نے تو خود کو کبھی عمر رسیدہ محسوس نہیں کیا۔"

"میرے اعمال اتنے سیاہ تو نہیں ــــ اور پھر میں تمہارا شوہر ہوتے ہوئے کیا اتنا بھی محسوس نہیں کر سکتا کہ تمہارا شباب اب رُو بہ تنزل ہے۔"

• مجھ سے ایسی زبان میں گفتگو کیجئے جس کو میں سمجھ سکوں ——— یہ تم کو یہ تنزل کیا ہوا؟

• چھوڑو اسے ——— آؤ محبت پیار کی باتیں کریں۔“

• آپ نے ابھی ابھی تو کہا تھا کہ آپ کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سو برس کے بڈھے ہیں۔“

• لیکن دل تو جوان ہے۔“

• آپ کے دل کو میں کیا کہوں ——— آپ اسے دل کہتے ہیں۔ مجھ سے کوئی پوچھے تو میں یہی کہوں گی کہ پتھر کا ایک ٹکڑا ہے جو اس شخص نے اپنے پہلو میں دبا رکھا ہے، اور دعویٰ یہ کرتا ہے کہ اس میں محبت بھری ہوئی ہے ——— آپ محبت کرنا کیا جانیں ——— محبت تو صرف عورت ہی کر سکتی ہے۔“

• آج تک کتنی عورتوں نے مردوں سے محبت کی ہے ——— ذرا تاریخ کا مطالعہ کرو ——— ہمیشہ مردوں ہی نے عورتوں سے محبت کی اور اسے نبھایا ——— عورتیں تو ہمیشہ بے وفا رہی ہیں۔“

• جھوٹ ——— اس کا اول جھوٹ، اس کا آخر جھوٹ ——— بے وفائی تو ہمیشہ مردوں نے کی ہے۔“

• اور وہ جو انگلستان کے بادشاہ نے ایک معمولی عورت کے لئے تخت و تاج چھوڑ دیا تھا ——— وہ کیا جھوٹی اور فرضی داستان ہے۔“

• بس ایک مثال پیش کر دی اور مجھ پر رعب ڈال دیا۔“

• لیکن تاریخ میں ایسی ہزاروں مثالیں موجود ہیں ——— مرد جب کسی عورت سے عشق کرتا ہے تو وہ کبھی پیچھے نہیں ہٹتا۔ کم بخت اپنی جان قربان کر دیگا، مگر اپنی محبوب کو ذرا سی بھی ایذا پہنچنے نہیں دیگا۔ تم نہیں جانتی ہو، مرد میں جب کہ وہ محبت میں گرفتار ہو، کتنی طاقت ہوتی ہے۔“

• سب جانتی ہوں ——— آپ سے تو کل الماری کا جما ہوا دروازہ بھی نہیں کھل سکا ——— آخر مجھے ہی زور لگا کر کھولنا پڑا۔“

• دیکھو، جانم ——— تم زیادتی کر رہی ہو ——— تمہیں معلوم ہے کہ میرے داہنے بازو میں ریح کا درد تھا۔ میں اس دن دفتر بھی نہیں گیا تھا اور سارا دن اور ساری رات پڑا کراہتا رہا تھا ——— تم نے میرا کوئی خیال نہ کیا اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ سینما دیکھنے چلی گئیں۔“

• آپ تو بہانہ کر رہے تھے۔“

• لاحول ولا ——— یعنی میں بہانہ کر رہا تھا۔ درد کے مارے میرا برا حال ہو رہا ہے، اور تم کہتی ہو کہ میں بہانہ کر رہا تھا ——— لعنت ہے ایسی زندگی پر۔“

• یہ لعنت مجھ پر بھیجی گئی ہے!“

• تمہاری عقل پر تو پتھر پڑ گئے ہیں ——— میں اپنی زندگی کا رونا رو رہا تھا۔“

• آپ تو ہر وقت روتے ہی رہتے ہیں۔“

• تم تو ہنستی رہتی ہو ——— اس لئے کہ تمہیں کسی کی پروا ہی نہیں۔ بچے جائیں جہنم میں۔ میرا جنازہ نکل جائے ——— یہ مکان جل کر راکھ ہو جائے مگر تم ہنستی رہو گی ——— ایسی بے دل عورت میں نے آج تک اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھی۔“

• کتنی عورتیں دیکھی ہیں آپ نے اب تک؟

"پتا نہیں، دیکھوں —— سڑکوں پر تو آج کل عورتیں ہی عورتیں نظر آتی ہیں۔"

"مجھ پر شک نہ کیجئے —— آپ نے کوئی نہ کوئی عورت خاص طور پر دیکھی ہے۔"

"خاص طور پر سے تمہارا مطلب کیا ہے؟"

"میں آپ کے راز کھولنا نہیں چاہتی —— میں اب چلتی ہوں۔"

"کہاں؟"

"ایک سہیلی کے یہاں —— اس سے اپنا دکھڑا بیان کروں گی۔ خود روؤں گی، اس کو بھی رلاؤں گی —— اس طرح کچھ جی ہلکا ہو جائے گا۔"

"دکھڑا جو تمہیں اپنی سہیلی سے بیان کرنا ہے، مجھے ہی بتا دو —— میں تمہارے غم میں شریک ہونے کا وعدہ کرتا ہوں۔"

"آپ کے وعدے! —— کبھی ایفا ہوئے ہیں؟"

"تم بہت زیادتی کر رہی ہو —— میں نے آج تک تم سے جو بھی وعدہ کیا، پورا کیا —— اس پچھلے دنوں تم نے مجھ سے کہا کہ چائے کا ایک سیٹ لا دو —— میں نے ایک دوست سے روپے قرض لے کر بہت عمدہ سیٹ خرید کر تمہیں لا دیا۔"

"بڑا احسان کیا مجھ پر —— وہ تو دراصل آپ اپنے دوستوں کے لیے لائے تھے —— اس میں سے دو پیالے کس نے توڑے تھے —— ذرا یہ تو بتایئے؟"

"ایک پیالہ تمہارے بڑے لڑکے نے توڑا —— دوسرا تمہاری چھوٹی بچی نے۔"

"سارا الزام آپ ہمیشہ انہیں پر دھرتے ہیں —— اچھا اب یہ بحث بند ہو —— مجھے نہا دھو کر کپڑے پہننا اور جوڑا کرنا ہے۔"

"دیکھو، میں نے آج تک کبھی سخت گیری نہیں کی۔ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ نرمی سے پیش آتا رہا ہوں۔ مگر آج میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم باہر نہیں جا سکتیں۔"

"اجی واہ —— بڑے آئے، مجھ پر حکم چلانے والے —— آپ ہیں کون؟"

"اتنی جلدی بھول گئی ہو —— میں تمہارا خاوند ہوں۔"

"میں نہیں جانتی، خاوند کیا ہوتا ہے —— میں اپنی مرضی کی مالک ہوں —— میں باہر جاؤں گی اور ضرور جاؤں گی۔ دیکھتی ہوں، مجھے کون روکتا ہے۔"

"تم نہیں جاؤ گی —— بس یہ میرا فیصلہ ہے۔"

"فیصلہ اب عدالت ہی کرے گی۔"

"عدالت کا یہاں کیا سوال پیدا ہوتا ہے —— میری سمجھ میں نہیں آتا، آج تم کیسی اوٹ پٹانگ باتیں کر رہی ہو —— ڈھنگ کی بات کہو —— جاؤ نہالو تاکہ تمہارا دماغ کسی حد تک ٹھنڈا ہو جائے۔"

"آپ کے ساتھ رہ کر میں تو سر سے پیر تک برف ہو چکی ہوں۔"

"کوئی عورت، اپنے خاوند سے خوش نہیں ہوتی، خواہ وہ بیچارہ کتنا ہی شریف کیوں نہ ہو —— اس میں کیڑے ڈالنا عورتوں کی سرشت میں داخل ہے —— میں نے تمہاری کئی خطائیں اور غلطیاں معاف کی ہیں۔"

"میں نے خدا نخواستہ کون سی خطا کی ہے؟"

"پہلے پہر تم نے شلغم کو شب دیگ ... سے ملاقات سے بچانے کا ارادہ کیا ۔۔۔ شام کو چولہے پر ہنڈیا رکھ کر تم ایسی سوئیں کہ صبح اٹھ کر جب میں باورچی خانے میں گیا تو دیکھا کہ دیگچی میں سارے شلغم کوئلے بنے ہوئے ہیں ۔۔۔ ان کو نکال کر میں نے انگیٹھی سلگائی اور چائے تیار کی ۔۔۔ تم سو رہی تھیں۔"

"میں یہ بکواس سننے کے لئے تیار نہیں۔"

"اس لئے کہ اس میں جھوٹ کا ایک ذرہ بھی نہیں ۔۔۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ عورت کو سچ اور حقیقت سے کیوں چڑ ہے ۔۔۔ میں اگر کہہ دوں کہ تمہارا بایاں گال تمہارے دائیں گال کے مقابلے میں کسی قدر زیادہ موٹا ہے، تو شاید تم مجھے ساری عمر نہ بخشو ۔۔۔ مگر یہ حقیقت ہے، جسے شاید تم بھی اچھی طرح محسوس کرتی ہو ۔۔۔ دیکھو یہ پیپر ویٹ وہیں رکھ دو ۔۔۔ اٹھا کے میرے سر پر دے مارا تو تمہارا مقتول ہو جائے گا!"

"میں نے یہ پیپر ویٹ اس لئے اٹھایا تھا کہ یہ آپ کے چہرے کے عین مطابق ہے ۔۔۔ اس کے اندر جو ہوا کے بلبلے سے ہیں، وہ آپ کی آنکھیں ہیں ۔۔۔ اور یہ جو لال سی چیز ہے، وہ آپ کی ناک ہے، جو ہمیشہ سرخ رہتی ہے ۔۔۔ میں نے جب آپ کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو مجھے ایسا لگا تھا جیسے آپ کی آنکھوں کی بیچ جو گھانسے کی گٹھلیاں ہیں، ایک گاجر دی اور منہ بیٹھا ہے۔"

"تمہارا دل ہلکا ہو گیا؟"

"میرا جی کبھی ہلکا نہیں ہوگا ۔۔۔ مجھے آپ جانے دیجئے ۔۔۔ زیادہ ہوا تو میں شاید یہاں سے ہمیشہ کے لئے چلی جاؤں۔"

"جانے سے پہلے یہ تو بتا دو کہ یہ جانا کس بنا پر ہے؟"

"میں بتانا نہیں چاہتی ۔۔۔ آپ تو اوّل درجے کے بے شرم ہیں۔"

"بیوی! تمہاری اس ساری گفتگو کا مطلب ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا ۔۔۔ معلوم نہیں، تمہیں مجھ سے کیا شکایت ایک دم پیدا ہو گئی ہے۔"

"ذرا اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالئے۔"

"میرا کوٹ کہاں ہے؟"

"لاتی ہوں ۔۔۔ لاتی ہوں۔"

"میرے کوٹ میں کیا ہو سکتا ہے ۔۔۔ وسکی کی بوتل تھی ۔۔۔ وہ تو میں نے باہر ہی ختم کر کے پھینک دی تھی ۔۔۔ لیکن ہو سکتا ہے رہ گئی ہو۔"

"یہ لیجئے، آپ کا کوٹ یہ رہا۔"

"اب میں کیا کروں؟"

"اس کی اندر کی جیب میں ہاتھ ڈالئے ۔۔۔ اور اس رنگ کی تصویر نکالئے جس سے آپ آج کل عشق لڑا رہے ہیں۔"

"لاحول ولا ۔۔۔ تم نے میرے اوسان خطا کر دیئے تھے ۔۔۔ یہ تصویر میری جان، میری بہن کی ہے، جس کو تم نے ابھی تک نہیں دیکھا ۔۔۔ تمہارے ۔۔۔ تم نے پیچھے نہیں دیکھا ۔۔۔ ساتھ ہی تو تھا ۔۔۔ یہ لو۔"

× × × × ×

"ہائے، کتنی خوبصورت لڑکی ہے ۔۔۔ میرے بھائی جان کے لئے بالکل ٹھیک رہے گی۔"

ملاوٹ

(۱۹ مئی ۵۴ء)

امرت سر میں علی محمد کی منہاری کی دکان تھی۔ چھوٹی سی، مگر اُس میں ہر چیز موجود تھی۔ اُس نے کچھ اِس قرینے سے سامان رکھا تھا کہ ٹھنسا ٹھنسا دکھائی نہیں دیتا تھا۔

امرت سر میں دوسرے دکاندار بلیک کرتے تھے، مگر علی محمد واجبی نرخ پر اپنا مال فروخت کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ دور دور سے اُس کے پاس آتے اور اپنی ضرورت کی چیزیں خرید کرتے۔

وہ مذہبی قسم کا آدمی تھا۔ زیادہ منافع لینا اُس کے نزدیک گناہ تھا۔ اکیلی جان تھی، اُس کے لیے جائز منافع ہی کافی تھا۔

سارا دن دکان پر بیٹھتا۔ گاہکوں کی بھیڑ لگی رہتی۔ اُس کو بعض اوقات افسوس ہوتا جب وہ کسی گاہک کو سنلائٹ صابن کی ایک ٹکیہ نہ دے سکتا، یا کبھی فریزین پولی تیل کی بوتل۔ کیونکہ یہ چیزیں اُسے محدود تعداد میں ملتی تھیں۔

بلیک نہ کرنے کے باوجود وہ خوش حال تھا۔ اُس نے دو ہزار روپے پس انداز کر رکھے تھے۔ جوان تھا ——— ایک دن دکان پر بیٹھے بیٹھے اُس نے سوچا کہ اب شادی کر لینی چاہیئے ——— بڑے بڑے خیال دماغ میں آتے ہیں۔ شادی کر لوں کہ زندگی میں لطافت پیدا ہو جائیگی۔ بال بچے ہوں گے۔ اُن کی پرورش کے لئے میں اور زیادہ کمانے کی کوشش کروں گا۔

اس کے والدین عرصہ ہوا، اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ اُس کی کوئی بہن تھی نہ بھائی۔ وہ بالکل اکیلا تھا۔ شروع شروع میں، جب کہ وہ دس تھا، اُس نے اخبار بیچنے شروع کئے۔ اس کے بعد خوانچہ لگایا۔ قلفیاں بیچیں۔ جب اُس کے پاس ایک ہزار روپیہ جمع ہو گیا تو اُس نے ایک دکان کرائے پر لے لی اور منہاری کا سامان خرید کر بیٹھ گیا۔

آدمی ایماندار تھا۔ اُس کی دکان تھوڑے ہی عرصے میں چل نکلی ——— جہاں تک آمدن کا تعلق تھا وہ اس سے بے فکر تھا، مگر وہ چاہتا تھا کہ اپنا

گھومتا تھا۔ اُس کی بیوی ہو، بچے ہوں، اور وہ اُن کے لئے زیادہ سے زیادہ کمانے کی کوشش کرے۔ اس لئے کہ اُس کی زندگی مشین ایسی بن گئی تھی۔ صبح دکان کھولتا۔ گاہک آتے، انھیں سودا دیتا، شام کو دکان بند کرتا اور ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں جو اُس نے شریف پورہ میں لے رکھی تھی سو رہتا۔ گھنٹے کا ہوٹل تھا۔ دن میں وہ کھانا کھاتا صرف ایک وقت۔ صبح ناشتہ ہمیل سنگھ کے کڑھے میں شاہجے حلوائی کی دکان میں کرتا۔ دکان کھولتا اور شام تک اپنی گدی پر بیٹھا رہتا۔

اُس کے اندر شادی کی خواہش شدت اختیار کر گئی۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اس معاملے میں اُس کی مدد کون کرے۔ امرتسر میں اُس کا کوئی دوست بھی نہیں تھا جو اس کے لئے کوشش کرتا۔

وہ بہت پریشان تھا۔ شریف پورہ کی کوٹھڑی میں رات کو سوتے وقت وہ کئی مرتبہ رویا کہ اُس کے ماں باپ اتنی جلدی کیوں مر گئے۔ انھیں اور کچھ نہیں تو اس لئے ضرور زندہ رہنا چاہیئے تھا کہ وہ اُس کی شادی کا بندوبست کر جائیں۔

اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ شادی کیسے کرے۔ بہت دیر تک سوچتا رہا۔ اس دوران میں اُس کے پاس تین ہزار روپے جمع ہو گئے۔ اُس نے ایک چھوٹا سا گھر کرایہ پر جو اچھا خاصا تھا لے لیا۔ مگر زیادہ شریف پورے ہی میں تھا۔

ایک دن اُس نے اخبار میں ایک اشتہار دیکھا جس میں یہ لکھا تھا کہ شادی کے خواہش مند اصحاب ہم سے رجوع کریں۔ بی اے پاس، لیڈی ڈاکٹر، ہر قسم کے رشتے موجود ہیں۔ خط و کتابت کیجئے، یا خود آ کے ملئے۔

اتوار کو وہ دکان نہیں کھولتا تھا۔ اُس دن وہ اُس پتے پر گیا اور اُس کی ملاقات ایک داڑھی والے بزرگ سے ہوئی۔ علی محمد نے اپنا مدعا بیان کیا۔ داڑھی والے بزرگ نے میز کی دراز کھول کر بیس پچیس تصویریں نکالیں اور اُس کو ایک ایک کر کے دکھائیں کہ وہ اُن میں سے کوئی پسند کر لے۔

ایک لڑکی کی تصویر علی محمد کو پسند آگئی۔ چھوٹی عمر کی اور خوبصورت تھی۔ اُس نے شادیاں کرانے والے ایجنٹ سے کہا "جناب ——— یہ لڑکی مجھے پسند ہے۔"

ایجنٹ مسکرایا۔ "تم نے ایک ہیرا چن لیا ہے۔"

علی محمد کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ لڑکی اُس کی آغوش میں ہے۔ اُس نے گڑگڑانا شروع کر دیا "بس ——— جناب آپ بات پکی کر دیجئے۔"

ایجنٹ سنجیدہ ہو گیا۔ "دیکھو برخوردار ——— یہ لڑکی جو تم نے چنی ہے، علاوہ حسین ہونے کے، ایک بہت بڑے خاندان سے تعلق رکھتی ہے ——— لیکن میں تم سے زیادہ فیس نہیں مانگوں گا۔"

— آپ کی بڑی نوازش ہے ——— میں یتیم لڑکا ہوں ——— اگر آپ میرا یہ کام کر دیں تو آپ کو ساری عمر اپنا باپ سمجھوں گا۔"

ایجنٹ کے مونچھوں بھرے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی جیسے وہ کہہ رہا ہو ——— میں تم سے صرف تین سو روپے فیس لوں گا۔"

علی محمد نے بڑے ممنونانہ لہجے میں کہا "جناب کا بہت بہت شکریہ ——— مجھے منظور ہے۔"

یہ کہہ کر اُس نے جیب سے تین نوٹ سو سو روپے کے نکالے اور اُس بزرگوار کو دے دیئے۔

تاریخ مقرر ہو گئی۔ نکاح ہوا۔ رخصتی بھی ہو گئی۔ علی محمد نے سیدھا سادا مکان جو کرائے پر لے رکھا تھا اب سجا سجایا تھا۔ وہ اس میں بڑے ٹھاٹ سے اپنی دلہن

ے کر آیا۔ پہلی رات کا تصور معلوم نہیں، اُس کے دل و دماغ میں کس قسم کا تھا۔ مگر جب اُس نے دُولہن کا گھونگھٹ کانپتے ہاتھوں سے اُٹھایا تو اُس کو غش سا آ گیا۔

نہایت بدشکل عورت تھی ——— صوبا اُس مرد بزرگ نے اُس کے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ مل محمد لڑکھڑاتا کمرے سے باہر نکل گیا اور شہر لوٹ پہنچ کے جا کر اپنی کوٹھڑی میں دیر تک سوچتا رہا کہ یہ ہوا کیا ہے۔ لیکن اُس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔

اُس نے اپنی دکان نہ کھولی ——— دو ہزار روپے وہ اپنی بیوی کا حق مہر اُسی رات ادا کر چکا تھا۔ تین سو روپے اُس ایجنٹ کو۔ اب اُس کے پاس صرف سات سو روپے تھے ——— وہ اِس قدر دل برداشتہ ہو گیا تھا کہ اُس نے سوچا شہر ہی چھوڑ دے۔ ساری رات جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ آخر اُس نے فیصلہ کر ہی لیا۔ صبح دس بجے اُس نے اپنی دکان ایک شخص کے پاس پانچ ہزار روپے میں یعنی اُونے پَونے داموں بیچ دی اور ٹکٹ کٹا کر لاہور چلا گیا۔

لاہور جاتے ہوئے گاڑی میں کسی جیب کترے نے بڑی صفائی سے اُس کے تمام روپے غائب کر دیئے۔ وہ بہت پریشان ہوا ——— لیکن اُس نے سوچا کہ شاید خدا کو یہی منظور تھا۔

لاہور پہنچا تو اُس کی دوسری جیب میں جو کتری نہیں گئی تھی صرف دس روپے اور گیارہ آنے تھے۔ اِس سے اُس نے چند روز گذارہ کیا۔ لیکن بعد میں فاقوں کی نوبت آ گئی۔

اِس دوران میں اُس نے کہیں نہ کہیں ملازم ہونے کی بہت کوشش کی، مگر ناکام رہا ——— وہ اس قدر مایوس ہو گیا کہ اُس نے خودکشی کا ارادہ کر لیا۔ مگر اُس میں اتنی جرأت نہیں تھی۔ اِس کے باوجود، ایک رات وہ ریل کی پٹڑی پر بیٹھ گیا۔ ٹرین آ رہی تھی، مگر کانٹا بدلا اور وہ دوسری لائن پر چلی گئی کہ اُسے اُدھر ہی جانا تھا۔

اُس نے سوچا کہ موت بھی دھوکا دے جاتی ہے، چنانچہ اُس نے خودکشی کا خیال چھوڑ دیا اور ہلدی اور مرچیں پیسنے والی ایک چکی میں بیس روپے ماہوار پہ ملازمت اختیار کر لی۔

یہاں اُسے پہلے دن ہی معلوم ہو گیا کہ دُنیا دھوکا ہی دھوکا ہے۔ ہلدی میں پیلی مٹی کی ملاوٹ کی جاتی تھی، اور مرچوں میں سُرخ اینٹوں کی۔ دو برس تک وہ اِس چکی میں کام کرتا رہا۔ اُس کا مالک ہر مہینے کم از کم سات سو روپے ماہوار کماتا تھا۔ اس دوران میں مل محمد نے پانچ سو روپے پس انداز کر لیے تھے۔ ایک دن اُس نے سوچا جب ساری دُنیا میں فریب ہی فریب ہے، تو وہ بھی کیوں نہ فریب کرے۔

اُس نے چنانچہ ایک علیحدہ چکی قائم کر لی اور اُس میں مرچوں اور ہلدی میں ملاوٹ کا کام شروع کر دیا ——— اُس کی آمدن اب کافی معقول تھی۔ اُس کو شادی کا کئی بار خیال آیا، مگر جب اُس کی آنکھوں کے سامنے اُس پہلی رات کا نقشہ آیا تو وہ کانپ کانپ گیا۔

مل محمد خوش تھا۔ اُس نے فریب کاری پوری طرح سیکھ لی تھی۔ اُس کو اب اِس کے تمام گُر معلوم ہو گئے تھے۔ ایک من لال مرچوں میں کتنی اینٹیں پیسنی چاہئیں، ہلدی میں کتنی زرد رنگ کی مٹی ڈالنی چاہیئے۔ اور پھر وزن کا حساب، یہ اب اُس کو اچھی طرح معلوم تھا۔

لیکن ایک دن اُس کی چکی پہ پولیس کا چھاپہ پڑا۔ ہلدی اور مرچوں کے نمونے بوتلوں میں ڈال کر مہر بند کیے گئے ——— اور جب کیمیکل اگزامینر کی رپورٹ آئی کہ اُن میں ملاوٹ ہے تو اُسے گرفتار کر لیا گیا۔

اُس کا وہم میں کون تھا جو اُس کی ضمانت دیتا ـــــ کئی دن حوالات میں بند رہا۔ آخر مقدمہ عدالت میں پیش ہوا اور اُس کو تین سو روپیہ جرمانہ اور ایک مہینے کی قید بامشقت کی سزا ہوئی۔

جرمانہ تو اُس نے ادا کر دیا، لیکن ایک مہینے کی قید بامشقت اُسے بھگتنا ہی پڑی۔ یہ ایک مہینہ اُس کی زندگی میں بہت کڑا اور کٹھن تھا ـــــ اِس عرصے میں وہ اکثر سوچتا تھا کہ اُس نے بے ایمانی کیوں کی جب کہ اُس نے اپنی زندگی کا یہ اصول بنا لیا تھا کہ وہ کبھی فریب کاری نہیں کرے گا۔ پھر وہ یہ سوچتا کہ اُسے اپنی زندگی ختم کر لینی چاہیئے۔ اِس لئے کہ وہ نہ اِدھر کا رہا نہ اُدھر کا۔ اُس کا کردار مضبوط نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ مر جائے تاکہ اُس کا ذہنی اضطراب ختم ہو۔

جب وہ جیل سے باہر نکلا تو وہ مضبوط ارادہ کر چکا تھا کہ خود کشی کر لے گا تاکہ سارا جھنجھٹ ہی ختم ہو ـــــ اِس غرض کے لئے اُس نے سات روز مزدوری کی اور دو تین روپے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر جمع کئے۔ اِس کے بعد اُس نے سوچا، کون سا زہر ہوگا جو کارآمد ہو سکتا ہے۔

اُس نے صرف ایک ہی زہر کا نام سُنا تھا جو بڑا قاتل ہوتا ہے ـــــ سنکھیا۔ مگر یہ سنکھیا کہاں سے ملتی؟

اُس نے بہت کوشش کی۔ آخر اُسے ایک دکان سے سنکھیا مل گئی۔ اُس نے عشا کی نماز پڑھی۔ خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی کہ وہ ہلدی اور مرچوں میں ملاوٹ کرتا رہا۔ پھر رات کو سنکھیا کھائی اور ٹاٹ پر سو گیا۔

اُس نے سُنا تھا سنکھیا کھانے والوں کے مُنہ سے جھاگ نکلتے ہیں۔ تشنج کے دورے پڑتے ہیں۔ بڑا کرب ہوتا ہے۔ مگر اُسے کچھ بھی نہ ہوا۔ ساری رات وہ اپنی موت کا انتظار کرتا رہا، مگر وہ نہ آئی۔

صبح اُٹھ کر وہ اُس دکاندار کے پاس گیا جس سے اُس نے سنکھیا خریدی تھی اور اُس سے پوچھا "بھائی صاحب، یہ آپ نے مجھے کیسی سنکھیا دی ہے کہ میں ابھی تک نہیں مرا؟"

دکاندار نے آہ بھر کے بڑے افسوسناک لہجے میں کہا "کیا کہوں، میرے بھائی ـــــ آج کل ہر چیز نقلی ہوتی ہے ـــــ یا اُس میں ملاوٹ ہوتی ہے"

بس اسٹینڈ

۲۰ مئی ۵۴ء

وہ بس اسٹینڈ کے پاس کھڑی لے رُوٹ والی بس کا انتظار کر رہی تھی۔ اُس کے پاس کئی مرد کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک ایسے بہت بُری طرح گھور رہا تھا۔ اُس کو ایسا محسوس ہُوا کہ یہ شخص برمے سے اُس کے دل و دماغ میں چھید بنا رہا ہے۔

اُس کی عمر یہی بیس بائیس برس کی ہو گی۔ لیکن اس پختہ سالی کے باوجود، وہ بہت گھبرا رہی تھی۔ جاڑوں کے دن تھے، پر اس کے باوجود اُس نے کئی مرتبہ اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کرے۔ بس اسٹینڈ سے چلی جائے۔ کوئی تانگہ لے لے، یا واپس اپنی سہیلی کے پاس چلی جائے۔

اُس کی یہ سہیلی نئی نئی بنی تھی۔ ایک پارٹی میں اُن کی ملاقات ہوئی اور وہ دونوں ایک دوسرے کی گرویدہ ہو گئیں ——— یہ پہلی بار تھی کہ وہ اپنی اس نئی سہیلی کے بلاوے پر اُس کے گھر آئی تھی۔

نوکر بیمار تھا، مگر جب اس سہیلی نے اتنا اصرار کیا تھا، تو وہ اکیلی ہی اُس کے ہاں چلی گئی۔ دو گھنٹے آپس میں گپ لڑاتی رہیں ——— یہ وقت بڑے مزے میں کٹا۔ اُس کی سہیلی جس کا نام شاہدہ تھا، اُس سے چلتے وقت کہا "سلمیٰ اب تمہاری شادی ہو جانی چاہیئے۔"

سلمیٰ شرما سی گئی "کیسی باتیں کرتی ہو شاہدہ ——— مجھے شادی نہیں کرانا ہے۔"

"تو کیا ساری عمر کنواری رہو گی؟"

"کنواری رہنے میں کیا حرج ہے؟"

شاہدہ مسکرائی "میں بھی یہی کہا کرتی تھی ——— لیکن جب شادی ہو گئی تو دنیا کی تمام لذتیں مجھ پر آشکارا ہو گئیں ——— یہی تو عمر ہے جب آدمی اچھی طرح شادی کی لطافتوں سے لطف اندوز ہو سکتا ہے ——— تم میرا کہا مانو ——— بس، ایک دو مہینے کے اندر دُلہن بن جاؤ ——— تمہارے ہاتھوں

بھی ٹھنڈی ہی نہ رہنا چاہے گی؟"

"شاہدہ! اس چیز خانی ہو!"

شاہدہ نے سلمیٰ کے گال پر ہلکی سی چپت لگائی: "یہ چیز خانی ہے؟ — اگر یہ چیز خانی ہے، تو ساری دنیا چیز خانی ہے —— مرد اور عورت کا رشتہ ہی فضول ہے —— تم کچھ نہیں جانتی، یہ رشتہ ازلی و ابدی رشتہ ہے، منکر کیوں ہو؟ —— دیکھو، اگر کوئی مرد کے بغیر کیسے زندہ ہوگی —— پاگل ہو جاؤ گی —— ہاں!"

"اچھا ہے، میں پاگل ہو جاؤں —— پاگلوں کے لیے اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں —— اتنے سارے پاگل ہیں، آخر وہ کہاں تو زندہ بھی ہی رہتے ہیں؟"

"خوش تو تم تب ہی رہو گی جب شادی کر لو گی —— میں تم سے کہتی ہوں کہ جب سے میری شادی ہوئی ہے، میری کایا ہی پلٹ گئی ہے —— میرا خاوند بہت پیار کرنے والا ہے۔"

"کیا کام کرتے ہیں؟"

"مجھے پتہ نہیں ... بس یہی ان کا کام ہے ... ویسے اللہ کا دیا بہت کچھ ہے —— میرا خیال رکھتے ہیں، انہوں نے مجھے کبھی تنگ ہونے نہیں دیا۔"

سلمیٰ نے یوں محسوس کیا کہ اس کا دل بیٹھ گیا ہے۔ "شاہدہ، مجھے تنگ نہ کرو۔ مجھے شادی نہیں کرنا ہے —— مجھے مردوں سے نفرت ہے۔"

"کیوں؟"

"بس ہے!"

"اب میں تم سے کیا کہوں —— مردوں سے مجھے بھی نفرت تھی، لیکن جب میری شادی ہوئی اور مجھ سے میرے خاوند نے محبت کی تو میں نے پہلی مرتبہ جانا کہ مرد عورت کے لیے کتنا لازمی ہے۔"

"ہوا کرے —— مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔"

شاہدہ ہنسی: "سلمیٰ، ایک دن تم خود اس بات کی قائل ہو جاؤ گی کہ مرد عورت کے لیے لازمی ہے —— اس کے بغیر وہ ایسی گاڑی ہے جس کے پہیے نہ ہوں —— میری شادی کو ایک برس ہوا ہے۔ اس ایک برس میں مجھے جتنی مسرتیں اور راحتیں میرے خاوند نے پہنچائی ہیں، میں بیان نہیں کر سکتی —— خدا کی قسم وہ فرشتہ ہے —— فرشتہ۔ مجھ پر جان چھڑکتا ہے۔"

سلمیٰ نے یوں کروٹ سی لی کہ جیسے اس کے ... پر ڈنکوں کے پھندے پھڑ پھڑا رہے ہیں —— اس نے سوچنا شروع کیا کہ شاید مرد عورت کے لیے لازمی ہی ہو —— لیکن فوراً بعد اس کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ اس کی عقل نے اس کا ساتھ نہیں دیا —— مرد کی ضرورت ہی کیا ہے؟ — کیا عورت اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔

جیسا کہ شاہدہ نے اس کو بتایا تھا کہ اس کا شوہر بہت پیار کرنے والا ہے، بہت نیک خصلت ہے —— لیکن اس سے یہ ثابت نہیں

ہوتا کہ وہ شاہد کے لئے لازمی تھا۔

سلمیٰ حسین تھی، اونچا لمبا قد، بھرا بھرا جسم، اجلا رنگ، کشادہ پیشانی، گھٹنوں تک لمبے کالے بال، ستواں ناک، اور اس کی چونکتی ہوئی آنکھیں —
جب وہ اپنی سہیلی سے اجازت مانگ کر غسل خانے میں گئی تو اس نے آئینے میں خود کو بڑے غور سے دیکھا، اور اُسے یوں لگا جیسے پہلی بار اُس نے
سوچا کہ آخر یہ جسم، یہ حسن، یہ ابھار کس لئے ہیں —— قدرت کی ساری کاریگری غارت جا رہی ہے۔

گندم پیدا ہوتا ہے، تو آدمی اس سے اپنا پیٹ پالتے ہیں —— اُس کی جوانی بھی تو کسی کھیت میں اُگی تھی —— اگر اسے کوئی کھائے گا نہیں، تو گل سڑ نہیں جائے گی؟

وہ بہت دیر تک غسل خانے میں آئینے کے سامنے سوچتی رہی۔ اُس کے ذہن میں اُس کی سہیلی کی تمام باتیں گونج رہی تھیں —— مرد، عورت کے لئے بہت ضروری ہے —— ؟

اُس کا خاوند اُس سے بہت پیار کرتا ہے۔

وہ فرشتہ ہے۔

سلمیٰ نے ایک لمحے کے لئے محسوس کیا کہ اُس کی شلوار اور اُس کا دوپٹہ فرشتوں کے پَر بن گئے ہیں —— وہ گھبرا گئی، اور جلدی فارغ ہو کر باہر نکل آئی۔

باہر برآمدے میں مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ سلمیٰ کو ایسا لگا کہ یہ بھی فرشتے ہیں جو بھیس بدل کر آئے ہیں۔

پھر جب اُس کی سہیلی اپنی کوٹھی سے ملحقہ باغ میں اُسے لے گئی، اور وہاں اُس نے چند تتلیاں دیکھیں، تو وہ بھی اُسے فرشتے دکھائی دیئے —— لیکن اُس نے کئی مرتبہ سوچا کہ ایسے رنگین، اور ایسے ننھے منے فرشتے کیسے ہو سکتے ہیں۔

اُسے بہت دیر تک فرشتے ہی فرشتے دکھائی دیتے رہے، جو اُس کے قریب آتے، اُس سے پیار کرتے، اُس کا منہ چومتے، اُس کے سینے پہ ہاتھ پھیرتے، جس سے اُس کو بڑی راحت ملتی۔ لیکن وہ اِن فرشتوں کے ہاتھ بڑی تندی سے ایک طرف جھٹک دیتی اور اُن سے کہتی "جاؤ —— چلے جاؤ یہاں سے —— تمہارا گھر تو آسمان پہ ہے —— یہاں کیا کرنے آئے ہو؟"

وہ فرشتے اُس سے کہتے "ہم فرشتے نہیں —— حضرت آدم کی اولاد ہیں —— وہی بزرگ جو جنت سے نکالے گئے تھے —— ہم تمہیں پھر جنت میں پہنچا دینے کا وعدہ کرتے ہیں —— چلو ہمارے ساتھ۔ وہاں دودھ کی نہریں بہتی ہیں، اور شہد کی بھی"
سلمیٰ نے یوں محسوس کیا کہ اُس کے سینے میں سے دودھ کے ننھے ننھے قطرے نکلنے شروع ہو گئے ہیں، اور اُس کے ہونٹ مٹھاس میں چپکے ہوئے ہیں۔

شاہدہ، اُس سے بار بار اپنے خاوند کی تعریف کرتی۔ اصل میں اُس کا مدعا یہ تھا کہ وہ اُس کے بھائی کے ساتھ سلمیٰ کا رشتہ قائم کر دے —— مگر چونکہ یہ پہلی ملاقات تھی، اس لئے وہ کھل کے بات نہ کر سکی۔ بہرحال اس نے اشاروں کنایوں میں سلمیٰ پہ یہ واضح کر دیا کہ اُس کا خاوند جو بہت شریف اور محبت کرنے والا آدمی ہے، اُس کا بھائی اُس سے بھی کہیں زیادہ شریف النفس ہے۔

سلمیٰ نے یہ اشارہ نہ سمجھا، اس لئے کہ وہ بہت سادہ لوح تھی۔ اس نے صرف اتنا کہہ دیا۔ "آجکل کے زمانے میں شریف آدمیوں کا ملنا محال ہے ——— تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں ایسا خاندان مل گیا جہاں ہر آدمی نیک اور شریف ہے۔"

"افسوس ہے کہ اس وقت یہ سعادت مند یہاں موجود نہیں، ورنہ میں تم سے انہیں ضرور ملاتی۔"

"کبھی کبھی ——— کیا کام کرتے ہیں؟"

"بس، انہیں کیا کام کرنے کی ضرورت ہے ——— لاکھوں روپے کی جائداد ہے ——— مکانوں اور دکانوں سے کرایہ ہی ہر مہینے دو ہزار کے قریب وصول ہو جاتا ہے ——— اس کے علاوہ ماشاءاللہ زمینیں ہیں۔ وہاں کی آمدن الگ ہے ——— اناج کی کوئی قلت نہیں ——— منوں گندم گھر میں پڑا رہتا ہے ——— چاول بھی ——— ہر قسم کی ترکاری بھی ہر وقت میسر ہو سکتی ہے ——— اللہ کا بڑا فضل و کرم ہے ——— ان کا چھوٹا بھائی جو آج کل لندن میں ہے، زراعت کے متعلق جانے کیا سیکھ رہا ہے ——— ایک مہینے تک واپس آ رہا ہے ——— وہ اپنے بڑے بھائی کے مقابلے میں زیادہ خوبصورت ہے ——— تم اسے دیکھو گی ——— تو ———"

سلمیٰ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا "ہاں ہاں ——— جب وہ آئیں گے تو آپ سے ملنے کا اتفاق ہو جائے گا۔"

شاہدہ نے کہا "بڑا شریف لڑکا ہے ——— بالکل اپنے بڑے بھائی کی مانند۔"

"ہاں ہاں ——— ضرور ہوگا، آخر شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔"

"وہ بس آنے ہی والا ہے ——— تم مجھے اپنی ایک تصویر دے دو۔"

"کیا کرو گی؟"

"میں ضرور اسے دکھا دوں گی۔"

یہ کہہ کر شاہدہ نے سلمیٰ کا منہ چوم لیا اور پھر اپنے خاوند کی تعریفیں شروع کر دیں۔ سلمیٰ تنگ آگئی۔ اس نے تھوڑی دیر کے بعد کوئی بہانہ بنا کر رخصت چاہی اور بس اسٹینڈ پر پہنچ گئی، جہاں سے اسے بس پکڑنا تھی۔

وہ جب وہاں پہنچی تو ایک مرد نے اسے بہت بری نگاہوں سے گھورنا شروع کر دیا ——— وہ پریشان ہو گئی۔ جاڑوں کے دن تھے، مگر اس نے کئی مرتبہ اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھا۔

اسٹینڈ پر ایک بس آئی۔ اس نے اس کا نمبر نہ دیکھا اور جب چند مسافر اترے تو وہ فوراً اس میں سوار ہو گئی ——— وہ آدمی بھی اس بس میں داخل ہو گیا۔ اس کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی۔

اتفاق ایسا ہوا کہ بس کے انجن میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی جس کے باعث اسے رکنا پڑا۔ سب مسافروں سے کہہ دیا گیا کہ وہ اتر جائیں کیونکہ کافی دیر تک یہ بس نہیں چل سکے گی۔

سلمیٰ نیچے اتری تو وہ آدمی جو اسے بہت بری طرح گھور رہا تھا، وہ بھی اس کے ساتھ باہر نکلا ——— سڑک پر ایک تانگہ جا رہا تھا، اس نے اسے فوراً ٹھہرا کر آواز دی "الہم دین!"

سلمیٰ نے موٹر ایک دم روک لی۔ اُس آدمی نے سلمیٰ کا ہاتھ پکڑا اور اُس سے کہا۔ "چلئے —— یہ میری اپنی کار ہے —— جہاں بھی آپ جانا چاہتی ہیں میں آپ کو چھوڑ آؤں گا۔"

سلمیٰ انکار نہ کر سکی۔ موٹر میں بیٹھ گئی۔ اُس کو ماڈل ٹاؤن جانا تھا مگر وہ اُسے کہیں اور لے گیا —— اور ——!

× × × × ×

سلمیٰ نے محسوس کیا کہ مرد واقعی عورت کے لئے لازم ہوتا ہے —— اُس نے اپنی زندگی کا بہترین دن گزارا —— گو اُس نے پہلے بہت حیل و حجت اور احتجاج کیا، مگر اُس آدمی نے اُسے رام کر ہی لیا ——!

تین چار گھنٹوں کے بعد جب سلمیٰ نے اُس شخص کا بٹوہ کھول کر یونہی دیکھا تو اس میں ایک طرف شاہدہ کا فوٹو تھا —— اُس نے ہچکچاہٹ کے ساتھ پوچھا: "یہ —— یہ —— عورت کون ہے؟"

اُس شخص نے جواب دیا "میری بیوی"

سلمیٰ کے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی "آپ کی بیوی؟"

شاہدہ کا خاوند مسکرایا "کیا مردوں کی بیویاں نہیں ہوتیں؟"

نعیمہ

(۲۱ مئی ۱۹۵۴ء)

تالیوں کے شور میں پرنسپل اپنی کرسی سے اٹھتا ہے اور طلبا اور طالبات سے مخاطب ہوتا ہے۔

یہ رسم ہے۔ میں اس کالج میں پرنسپل مقرر ہوا ہوں۔ ہر سال باقاعدہ ادا کی جاتی ہے۔ ہر سال اس موقعے پر تالیوں کے شور کے ساتھ میں اپنی کرسی سے اٹھتا ہوں اور قریب قریب وہی تقریر کرتا ہوں جو میں نے مجھ سے دس سال پہلے کی تھی۔ تمہیں دیکھ کر میرے دل میں وہی جذبات پیدا ہوتے ہیں جو اس سلسلے کے آغاز میں ہوتے تھے ——— آج جب میں نے غور کیا ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں پوسٹ ماسٹر ہوں اور کالج کی یہ بلڈنگ بہت بڑا ڈاک خانہ۔ تم سب خطوط ہو جو کچھ دیر اس بلڈنگ میں رہ کر اپنے اپنے ٹھکانے پہنچا دیئے جاتے ہو ——— تم میں سے کچھ بیرنگ ہو جاتے ہیں جس کے باعث تمہارے والدین کو جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ کچھ غلط ایڈریس کی وجہ سے اِدھر اُدھر بھٹکتے رہتے ہیں۔ بہرحال یہ کھیل ہے بہت دلچسپ ——— ہر سال امتحانوں کا ایک چکر شروع ہوتا ہے ——— اس میں کچھ کامیاب ہوتے ہیں، کچھ ناکام ——— مسرت اور غم کی ملی جلی لہرا میں ہر سال دیکھتا ہوں۔ اس وقت میرے سامنے ایسے کئی چہرے ہیں جو کامیابی کے باعث تمتما رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ میں چند ایسے چہرے بھی دیکھ رہا ہوں جو ناکامی کے صدمے سے مرجھائے ہوئے ہیں ——— خزاں اور بہار کا یہ رنگا رنگ موسم ہر سال آتا ہے اور گذر جاتا ہے ——— وہ لڑکیاں اور لڑکے جو بی۔ اے کا امتحان پاس کر چکے ہیں یا تو آگے تعلیم حاصل کرنے کے لئے کسی بڑے کالج میں داخل ہو جائیں گے یا تعلیم کا سلسلہ ختم کر کے دنیوی کاموں میں مصروف ہو جائیں گے۔ وہ جو اس امتحان کی دیوار نہیں پھاند سکے، دوبارہ کوشش کریں گے ——— جو یہاں سے جا رہے ہیں، ان کو میں الوداع کہتا ہوں اور ان کی کامیاب زندگی کے لئے دعا کرتا ہوں۔ جو نئے آئے ہیں، میں ان کو خوش آمدید کہتا ہوں اور ان کے فائدے کے لئے کہتا ہوں کہ اس تعلیم گاہ میں داخل ہوتے وقت اُن لوگوں کو ایک نظر ضرور دیکھ لیں جو باہر جا رہے ہیں ——— جو خواہش کے باوجود اپنی کمزوریوں کے باعث یا کسی اور وجہ سے باہر نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ ان سے مجھے پوری پوری ہمدردی ہے۔ خاص طور پر نعیمہ سے جو محنت کرنے کے باوجود اس سال بھی امتحان

کامیاب نہ ہو سکی۔ اب میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں ——— خدا کرے آئندہ سال نعیمہ کامیاب ہو جائے۔"

تقریر ختم کرنے کے بعد جلسہ برخواست ہو جاتا ہے۔

کالج کی لڑکیوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو جاتی ہیں۔

نسیمہ ۔ خجندہ ... کیا نعیمہ ہال میں موجود تھی۔

خجندہ ۔ نہیں تو۔

نسیمہ ۔ تو پھر وہ آئی ہی نہیں۔

خجندہ ۔ بے چاری غم سے نڈھال ہو گی۔

نسیمہ ۔ ایک بار فیل ہونے ہی سے آدمی کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ وہ بے چاری تو دو مرتبہ فیل ہوئی ہے۔

خجندہ ۔ محنت تو بہت کرتی تھی۔

نسیمہ ۔ اصل میں یہ سب اس کے مزاج کی خرابی کا نتیجہ ہے کسی سے مدد لینے میں کیا مضائقہ ہے۔ امتحان شروع ہونے سے دو مہینے پہلے میں نے کئی بار اس سے کہا نعیمہ تم میرے گھر آجایا کرو۔ میں تمہیں ساری اکنامکس ازبر کرا دوں گی ——— بس یہ سنتے ہی جیسے اس کے مرچیں لگ گئیں ——— کہنے لگی تم اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھنے لگی ہو۔ تمہارے بغیر کیا اکنامکس کسی کو آ ہی نہیں سکتی ——— میں تو گدھی ہوں۔ بیوقوف ہوں اب وحمد... بتاؤ کیا میں نے چھیڑ خانی کے لئے اس کو اپنی مدد پیش کی تھی۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ وہ اکنامکس میں بالکل صفر ہے ——— بس دماغ ہی خراب پایا ہے کوئی اچھی بات بھی کہے تو اسے بری لگتی ہے۔

خجندہ ۔ میرے ساتھ بھی بالکل ایسا ہی ہوا۔ میں نے کہا، دیکھو نعیمہ ایسا نہ ہو تمہارا سال بیکار ہی جائے... کہو تو میں اپنے لکھے ہوئے نوٹ دے دوں۔ بس یہ سنتے ہی آگ بگولا ہونے لگی۔ نوٹوں کی تو اس کو ضرورت ہوتی ہے جو کتاب سے کچھ نہ سیکھ سکے ——— ویسے بازار میں عام بکتے ہیں۔ کوئی اتنی بڑی رقم خرچ تو نہیں ہوتی —— یعنی وہ دن اور یہ دن۔ میری زبان جلے جو میں نے پھر اس سے ایسی بات کی ہو۔

جمیلہ ۔ کسی کو کیا پڑی ہے جو۔

نسیمہ ۔ یہ تو موٹی سی بات ہے جمیلہ —— ہمارے دل پتھر کے تو نہیں۔ اس کو دیکھ کر کیسے رحم نہیں آتا ——— اور ایسے لمحات میں منہ سے ہمدردی کا کوئی کلمہ نکل ہی جاتا ہے۔

خجندہ ۔ بہانے تو ہمدردی کی ضرورت ہی نہیں ——— کاٹنے کو دوڑتی ہے اگر اس سے ہمدردی کا ایک لفظ بھی کہہ دیا جائے۔

نسیمہ ۔ جانے اس کے مزاج میں تلخی کہاں سے آ گئی۔

جمیلہ ۔ تلخی تو خیر سب کو معلوم ہے کہ بے حد مفلس ہے۔ لیکن اگر اس سے کہو نعیمہ تم ہر روز یہ سبز ساڑھی ہی کیوں پہنتی ہو تو بگڑ کر جواب دے گی۔ میرے پاس ایک نہیں۔ ایسی کئی ساڑھیاں ہیں۔ مجھے یہ رنگ پسند ہے۔

خجندہ ۔ ... تیل ایسا ڈالتی ہے کہ اس کی بدبو سے ناک پھٹ جاتی ہے۔ اس سے پوچھو تو کہے گی۔ یہ خاص تیل ہے ... بال لمبے ہوتے ہیں۔

۔ بالوں کی بچی ۔

نفیسہ ۔ نہیں جمیلہ ایسا نہ ہو اس کا تتلیاں پن دور ہو جائے تو اس جیسی اچھی بھلی تمیز چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے ۔

وہ دیکھ رہی ہیں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک لڑکا انور اُدھر سے گذرا ۔ کافی خوبصورت تھا اس نے سب سے پوچھا کیا باتیں ہو رہی ہیں ؟

ذکیہ ۔ ہم نفیسہ کا ذکر کر رہے ہیں ——— آپ دوستوں وغیرہ سے مل چکے ۔

انور ۔ دوستوں وغیرہ سے تو نہیں ملا ۔ البتہ نفیسہ سے مل کے آ رہا ہوں ۔

فرخندہ ۔ کہاں ہے وہ ؟

انور ۔ باہر باغ میں ۔

جمیلہ ۔ میں دیکھ آؤں ۔

انور ۔ نہیں نہیں اس وقت آپ اسے باتوں نہ لگائیں ۔ اس کی طبیعت بے حد مغموم ہے ——— کسی نے اس کو ذرا بھی چھیڑا تو آفت برپا ہو جائیگی ۔

ذکیہ ۔ یہ بڑی مصیبت ہے ۔ جب کوئی اس سے ہمدردی کا اظہار کرنا چاہے تو کیا کرے ۔

انور ۔ نفیسہ نامعقول ہے ۔

ذکیہ ۔ نہیں

انور ۔ دراصل یہ بات ——— یہ بات مجھے کل معلوم ہوئی ۔ جب گذرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ وہ بینچ پر بیٹھی ہے اور اس کی آنکھوں میں نامکمل آنسو ہیں ——— میرے قدم رک گئے میں نے غور سے دیکھا اور میں نے اس کی طرف ۔ اس کے نامکمل آنسو تکمیل کی آرزو میں تڑپ گئے ——— اور میں یہاں چلا آیا ۔

ذکیہ ۔ تو آپ کو اس کے پاس ضرور جانا چاہیے ۔

انور ۔ وہ اس وقت غضبناک حالت میں ہے ۔ ناامیدی کا اثر ایسے آدمیوں پر اسی قسم کا ہوتا ہے جنھیں ضرورت سے زیادہ خود پر **اعتماد ہوتا ہے** ——— دراصل میں کوشش کے باوجود نفیسہ کو نہیں سمجھ سکا ۔

ذکیہ ۔ لیکن کلاس میں اس سے آپ کا سلوک ویسا ہی تھا جیسے ایک باپ کا اپنی بیٹی سے ہوتا ہے ۔

انور ۔ لیکن اس کے باوجود وہ میری شفقت ٹھکراتی اور میری ہمدردی کو روندتی رہی ——— کچھ سمجھ میں نہیں آتا ۔ اس لڑکی کا انجام کیا ہوگا ۔ تم نے غور نہیں کیا کہ وہ کس قدر دبلی ہو گئی ہے ۔ اس کی ہڈیاں باہر نکل آئی ہیں ——— میں اکثر سوچتا ہوں ایک دن وہ اپنی زندگی کے پراسرار محاذ پر لڑتی لڑتی تنہا ماری جائے گی ۔

یہ کہہ کر انور ان لڑکیوں سے رخصت لے کر چلا گیا ——— اس کے قدم غیر ارادی طور پر اسے باغیچہ کی طرف لے گئے ۔ نفیسہ بینچ پر بیٹھی تھی ۔ انور اس کے پاس پہنچا ۔

انور ۔ نعیمہ ——— کیا میں تمھارے پاس آ سکتا ہوں؟

نعیمہ ۔ تمہیں کس نے روکا ہے۔

انور ۔ تم یہاں بہت دیر کی بیٹھی ہو۔

نعیمہ ۔ تھکنے پر تو اٹھ کر چلی جاتی ہوں۔

انور ۔ یہ کیسی باتیں کرتی ہو ——— میں پوچھتا ہوں تنہائی میں تم کیا بالکل نہیں گھبراتی ہو۔

نعیمہ ۔ کیسی تنہائی ——— میں بالکل تنہا نہیں۔

انور ۔ ہاں، اب تم تنہا نہیں ہو۔

نعیمہ ۔ اور پہلے بھی تنہا نہیں تھی ——— تم چلے جاؤ گے تو پھر بھی تنہا نہیں ہوں گی ——— تم ہمیشہ مجھے غلط سمجھتے رہے ——— تم کیا سب، سب کے سب ——— مجھ میں کیا نقص ہے ——— کیا خرابی ہے جو دوسروں کے دل میں خواہ مخواہ ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے ——— ہمدردی ——— جاؤ اس ہمدردی کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔

انور ۔ تم نے رونا شروع کر دیا۔

نعیمہ ۔ جھوٹ بولتے ہو تم ——— میں تو ہنس رہی ہوں ——— تم سمجھتے ہو کہ میں تنہا ہوں۔ بے یار و مددگار ہوں ——— اسی لئے تم مجھے اپنی ہمدردی کے سوکھے ٹکڑے دیتے ہو ——— میں یہ بھیک نہیں لینا چاہتی ——— جاؤ ——— جاؤ ——— یہاں سے چلے جاؤ۔

انور محسوس کرتا ہے کہ اگر اس نے اس موضوع پر مزید گفتگو کی تو شاید نعیمہ کا دماغی توازن بگڑ جائے۔ اس لئے وہ خاموشی سے چلا جاتا ہے۔ نعیمہ پھوٹ پھوٹ کے رونا شروع کر دیتی ہے۔ مگر کوئی آواز پیدا نہیں کرتی۔

انور اپنے گھر چلا گیا۔ وہ اکثر نعیمہ کے بارے میں سوچتا۔ اس نے کئی بار اس کو خط لکھے۔ مگر اس کو اس کا ایڈریس معلوم نہیں تھا۔ اس لئے پھاڑ دیئے۔

ایک دن وہ باہر برآمدے میں بیٹھا کوئی ناول پڑھ رہا تھا کہ نوکر ایک خط لایا ——— یہ نعیمہ کا تھا جس پر صرف ایک سطر تھی ———

"مسٹر انور ——— میں مرنے کے قریب ہوں۔ آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔"

انور سخت گھبراہٹ میں اٹھا۔ اس کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ اس نے اپنے باپ کی موٹر لی۔ خط میں ایڈریس موجود تھا۔ وہاں پہنچا۔

اندھیرا اور غلیظ سا کمرہ تھا ——— انور کو کچھ نظر نہ آیا۔

انور ۔ نعیمہ نعیمہ ——— کہاں ہو تم۔

نعیمہ ۔ آ جاؤ ——— ادھر میرے پاس آ جاؤ۔

اب اندھیرے میں انور کو سجھائی دینے لگا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک شکستہ سی چارپائی پر نعیمہ کی ہڈیوں کا ڈھانچہ لیٹا ہے۔ انور اس کے پاس بیٹھ گیا۔

نعیمہ ۔ تمہیں حیرت ہو رہی ہے۔ اس غلیظ کمرے کو دیکھ کر ——— اسے نہ دیکھو۔ یہاں جس شے کو بھی دیکھو گے تمہیں حیرت ہو گی ——— سب سے بڑی حیرت انگیز

چیز تو میں ہوں —— مجھے دیکھو، جتنا حیرت زدہ ہونا چاہو ہو لو۔

انور۔ یہ کیا ہو گیا نعیم؟

نعیمہ۔ انور میری کشتی پاش پاش ہو چکی ہے —— جینے اور تمہارے دل کے بغیر زیست کی ہوس مٹ گئی۔ میں کھیتی رہی ہوں۔ اب میں اپنے ساتھ قبر میں لے جاؤں گی —— انور —— کیا وہاں اس کی مرمت ہو جائے گی؟ —— تم ہنستے کیوں نہیں۔

انور۔ میں سن رہا ہوں۔

نعیمہ۔ میں اپنی ٹوٹی ہوئی کشتی کے تختے ادھر ادھر سے سمیٹ کر کے ماروں بناتی رہی، لیکن طوفانوں نے بڑی بے رحمی سے ان کو چیر پھاڑ دیا —— انور، مجھے بتاؤ۔ یہ طوفان اتنے بے رحم کیوں ہوتے ہیں؟

انور۔ طوفان ہمیشہ بے رحم ہوتے ہیں نعیمہ۔

نعیمہ۔ تم نہیں سمجھ سکتے ہو —— میں نے بہت تکلیفیں برداشت کیں۔ صرف اس لئے کہ بی۔ اے کا امتحان پاس کر لوں اور خود کمانے کے قابل ہو جاؤں —— لیکن ان تمام قربانیوں کا انجام تمہارے سامنے ہڈیوں کے ڈھانچے کی صورت میں لیٹا ہے۔

نعیمہ کی آواز آہستہ آہستہ مدھم ہوتی جا رہی تھی۔ انور کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔

نعیمہ۔ میں مر رہی ہوں انور۔ اور تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا —— اب ایسا کرنا کہ میری یہ دو سبز ساڑھیاں جو اسٹول پر پڑی ہیں اور یہ ساری کتابیں اٹھا کر میرے ساتھ ہی دفن کر دینا —— ممکن ہے، ہاں یہ چیزیں اور بھی زیادہ مہنگی تھیں —— میں نے بڑی مصیبتوں سے خریدی تھیں —— اور دیکھو کسی اور کو میری موت کی خبر نہ ہو —— مجھ سے اب زیادہ بولا نہیں جاتا —— میرا خیال ہے مجھے اور بھی کچھ کہنا تھا۔"

انور نے دیکھا کہ اس پر حالت نزع طاری ہے —— اس نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ نعیمہ نے جس کی آنکھیں بند رہی تھیں، بڑی مشکل سے کروٹ بدلی اور انور کے آنسو اپنے میلے دوپٹے سے پونچھے اور کہا۔ مجھے یاد آ گیا ہے —— جو مجھے تم سے کہنا تھا۔

انور۔ کیا کہنا تھا؟

نعیمہ مسکرائی۔ ایک بے وقوفی کی بات ہے —— اپنے ہونٹ میرے مردہ ہونٹوں کے ساتھ لگا دو۔

انور نے اس کی تعمیل کی —— نعیمہ کو جو مسرت حاصل ہوئی وہ اس کی تاب نہ لا سکی اور اپنا آخری سانس اس بوسے کے سپرد کر دیا۔

بدتمیزی

(۲۲ مئی ۵۴ء)

- میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کیسے سمجھاؤں۔"

- جب کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو اس کو سمجھانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔"

- آپ تو بس ہر بات پر گلا گھونٹ دیتے ہیں ـــــ آپ نے یہ تو پوچھ لیا ہوتا کہ میں آپ سے کہنا کیا چاہتی ہوں۔"

- اس کے پوچھنے کی ضرورت ہی کیا تھی ـــــ تم بس فقط لڑائی مول لینا چاہتی ہو۔"

- لڑائی میں مول لینا چاہتی ہوں کہ آپ ـــــ سارے ہمسائے اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپ آئے دن مجھ سے اینٹھتے جھگڑتے رہتے ہیں۔"

- خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ایک برس تک میں نے تم سے کوئی تلخ بات کی ہے نہ شیریں۔"

- شیریں بات کرنے کا آپ کو سلیقہ ہی کہاں آتا ہے ـــــ زور زور آواز دے کر بلائیں گے، تو سارے محلے کو پتہ چل جائے گا کہ آپ اُسے گلی سے ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔"

- میرے پاس بندوق ہی نہیں ـــــ ویسے میں خرید سکتا ہوں، مگر اس کو چلائے گا کون؟ ـــــ میں تو پٹاخے سے ڈرتا ہوں۔"

- آپ بچے نہیں ـــــ میں آپ کو اچھی طرح جانتی ہوں ـــــ یہ فراڈ میرے ساتھ نہیں چلے گا آپ کا۔"

- اب میں فراڈ بن گیا؟

- آپ ہمیشہ سے فراڈ تھے ـــــ

- یہ فیصلہ آپ نے کن وجوہ پر قائم کیا۔"

- آپ جب پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے، تو کیا آپ نے اپنے اباجی کی جیب سے دو روپے نہیں نکالے تھے؟

"نکالے تھے؟"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ بھنگن [illegible] تھی۔"

"بھنگن کی [illegible] تمہاری کیوں تھی؟"

"اس لئے کہ وہ بھنگن کی لڑکی تھی ——— بہت پیاری [illegible] والد صاحب سے اگر کہا جاتا تو وہ کبھی ایک پیسہ بھی اسے نہ دیتے۔ — میں نے اسی لئے مناسب سمجھا کہ [illegible] نکال کر اس کو دے دوں ——— یہ تو کوئی گناہ نہیں۔"

"جی ہاں — بہت بڑا ثواب [illegible] — آپ کے [illegible] پوچھا [illegible] آپ تو اپنے خیال کے مطابق جنت میں اپنی سیٹ بک کرا چکے ہوں گے، لیکن میں آپ سے کہے دیتی ہوں کہ اس کی سزا آپ کو اتنی کڑی ملے گی کہ آپ کی طبیعت صاف ہو جائے گی۔"

"طبیعت تو میری ہر روز صاف کی جاتی ہے ——— اب اتنی صاف ہو گئی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ اس طبیعت کو لیچڑ میں لت پت کر دوں، تاکہ تمہارا مشغلہ جاری رہ سکے۔"

"لیچڑ میں تو آپ ہر وقت لتھڑے رہتے ہیں۔"

"[illegible]"

"مطلب کیا ہے ——— حقیقت ہے ——— آپ صرف [illegible] کیچڑ میں دھنسے ہوئے ہیں ——— آپ کو کسی نفیس چیز سے دلچسپی ہی نہیں ہے۔ [illegible] نہانے آپ نہیں۔"

"غضب خدا کا ——— میں تو دن میں تین مرتبہ نہاتا ہوں۔"

"وہ بھی کوئی نہانا ہے ——— بدن پر دو ڈونگے پانی کے ڈالے ——— تولیے سے اپنا نیم خشک جسم پونچھا اور غسل خانے سے باہر نکل آئے ———"

"دو ڈونگے تو نہیں، کم از کم بیس ہوتے ہیں۔"

"تو اس سے بھی کیا ہوتا ہے ——— کیا آپ نے آج تک کبھی صابن استعمال کیا ہے؟"

"میں نے کئی بار کہا ہے کہ صابن جلد کے لئے بہت مضر ہے۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ [illegible] میں ایسے تیزابی مادے ہوتے ہیں جو جلد کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔"

"میری جلد کا تو آج تک ستیاناس نہیں ہوئی ——— آپ کی جلد بہت ہی نازک ہو گی۔"

"نازک ہونے کا سوال نہیں ——— یہ ایک سائنٹیفک بحث ہے ———"

"میں سائنٹیفک [illegible] کچھ نہیں جانتی ——— بس میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ صابن کیوں استعمال نہیں کرتے؟"

- "میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ یہ غنیمت ہے۔"
- "تو پھر آپ نہانے کے عادی ہیں؟"
- "نہانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے ـــــ پانی ڈالتے گئے اور نہاتے گئے۔"
- "جسم پہ آپ کوئی چیز نہیں ملتے ـــــ میرا مطلب ہے صابن نہیں تو کوئی اور چیز۔"
- "ملا کرتا ہوں۔"
- "کیا؟"
- "بیسن۔"
- "وہ کیا ہوتا ہے؟"
- "ارے بھئی، چنے کا آٹا۔"
- "آپ کی جو بات ہے نرالی ہے ـــــ میں تو آپ ایسے مسکی سے خدا قسم تنگ آ گئی ہوں ـــــ میری سمجھ میں نہیں آتا، کہاں جاؤں۔"
- "اپنے میکے چلی جاؤ ـــــ وہاں تمہیں اپنی ہم خیال مل جائیں گی۔"
- "میں کیوں جاؤں وہاں ـــــ میں یہیں رہوں گی۔"
- "میں نے تم سے آج ہی کہا ـــــ اس لیے کہ تم لاکھ مرتبہ مجھے یہ دھمکی دیتی رہی ہو کہ میں چلی جاؤں گی اپنے میکے۔"
- "مجھے جب جانا ہوگا چلی جاؤں گی۔"
- "آج تمہاری طبیعت نہیں چاہتی؟"
- "آپ مجھے چڑانے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں؟"
- "میں نے تو کوئی کوشش نہیں کی ـــــ اگر تم چاہتی ہو کہ کوشش کروں، تو یقین مانو، تم ابھی تانگے کر اسٹیشن پہنچ جاؤ گی۔"
- "کوشش کر کے دیکھ لیجیے ـــــ میں یہاں سے ایک انچ نہیں ہٹوں گی ـــــ یہ میرا گھر ہے۔"
- "آپ کا ہے ـــــ آپ کے باپ دادا کا ہے ـــــ لیکن یہ تو بتائیے ـــــ"
- "میرے باپ دادا کا نام مت لیجیے ـــــ ان بیچاروں کا کیا قصور تھا؟"
- "قصور تو سارا میرا ہے ـــــ لیکن بیگم، تم کبھی کبھی اتنا تو غور کر لیا کرو کہ میں نے آخر تمہیں کون سا جانی یا مالی نقصان پہنچایا ہے کہ تم لٹھ لے کر پیچھے پڑ جاتی ہو۔"
- "لٹھ تو ہمیشہ آپ کے ہاتھ میں رہا ہے ـــــ میں تو اسے اٹھا بھی نہیں سکتی۔"
- "تم مجھ سے بڑا گھنٹہ اٹھا سکتی ہو ـــــ تم ایسی عورتوں میں بلا کی قوت ہوتی ہے ـــــ تم عقاب ہو ـــــ تمہارے سامنے تو میری ننھی ایک چڑیا کی سی جان ہے۔"

„ باتیں نہ نالو کوئی آپ سے سیکھے ——— آپ چڑیا ہیں ——— سبحان اللہ، جب کٹکٹے نہ کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شیر دھاڑ رہا ہے"

„ اس شیر کو پہلے ایک نظر دیکھ لو"

„ کیا دیکھوں؟ ——— پندرہ برس سے دیکھ رہی ہوں؟"

„ یہ خاکسا شیر ہے کیا؟"

„ شیر ہے، مگر خال میں لپٹا ہوا"

„ اس تعریف کا شکریہ ——— آپ بتائیے کہ آپ کہنا کیا چاہتی تھیں"

„ آپ اتنے ذہین فاتن بنے پھرتے ہیں ——— سمجھئے کہ میں کیا کہنا چاہتی تھی"

„ تمہاری باتیں تو صرف خدا ہی سمجھ سکتا ہے ——— میں کیا سمجھوں گا"

„ خدا کو بیچ میں کیوں لاتے ہیں؟"

„ خدا اگر بیچ میں نہ لایا جائے تو کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا"

„ بڑے آئے ہیں آپ خدا کو ماننے والے"

„ خدا کو تو میں ہمیشہ سے مانتا آیا ہوں ——— وہ طاقت جو دنیا پر کنٹرول کرتی ہے"

„ کنٹرول تو آپ مجھ پر کرنے آئے ہیں"

„ کس قسم کا"

„ ہر قسم کا ——— میں آج تک اپنی مرضی کے موافق کوئی چیز نہیں کر سکی ——— کپڑے لیتا ہوں، تو اس میں آپ کی مرضی کو دخل ہوتا ہے ——— کھانے کے بارے میں بھی آپ کی مرضی چلتی ہے ——— آج یہ پکے، کل وہ پکے ———"

„ اس میں تمہیں کیا اعتراض ہے؟"

„ اعتراض کیوں نہیں ——— میرا جی اگر کبھی چاہتا ہے کہ اوجھڑی کھاؤں تو آپ نفرت کا اظہار کرتے ہیں"

„ اوجھڑی بھی کوئی کھانے کی شے ہے"

„ آپ کیا جانیں، کتنی مزیدار ہوتی ہے ——— چونے میں ڈال کر اسے صاف کیا جاتا ہے، اس کے بعد اچھی طرح گھی میں تلا جاتا ہے ——— اللہ قسم مزا آ جاتا ہے"

„ لاحول ولا ——— میں ایسی فاحش چیز کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا"

„ اور ٹینڈے؟"

„ بکواس ہیں ——— سبزی کی سب سے بڑی توہین ہیں۔ ان میں کوئی رس ہوتا ہے نہ لذت ——— بس فقط ٹینڈے ہوتے ہیں ——— میری سمجھ میں نہیں

تاکہ وہ پیدا کس غرض کے لئے کئے گئے تھے ——— نہایت واہیات ہوتے ہیں ——— میں تو اکثر یہ دعا مانگتا ہوں کہ اُن کا وجود سرے ہی سے غائب ہو جائے ——— شلجم بے جان ہوتے ہیں۔ اُن کے مقابلے میں کدو بدرجہا بہتر ہے، حالانکہ وہ بھی مجھے سخت ناپسند ہے۔"

"آپ کو کون سی چیز پسند ہے؟ ——— ہر ایک چیز میں آپ کیڑے نکالتے ہیں ——— بھنڈی آپ کو پسند نہیں کہ اُس میں لیس ہوتی ہے ——— گوبھی آپ کو نہیں بھاتی کہ اس میں یہ نقص نکالا جاتا ہے کہ بدبو ہوتی ہے ——— ٹماٹر آپ کو اچھے نہیں لگتے اس لئے کہ اُس کے چھلکے ہضم نہیں ہوتے۔"

"تم اِن باتوں کو چھوڑو ——— بھنڈی، گوبھی اور ٹماٹر جائیں جہنم میں ——— تم مجھے یہ بتاؤ کہ مجھ سے کہنا کیا چاہتی تھیں۔"

"کچھ بھی نہیں ——— بس، ایسے ہی آگئی ——— میں نے دیکھا کہ آپ کوئی کام نہیں کر رہے، تو آپ کے پاس آکر بیٹھ گئی۔"

"بڑی نوازش ہے آپ کی ——— لیکن کچھ نہ کچھ تو ضرور کہنا ہوگا آپ کو۔"

"آپ سے اگر کچھ کہہ بھی دیا تو اُس کا حاصل کیا ہوگا۔"

"جو شے آپ کو حاصل ہونا ہے، اسی حساب سے آج بھی حاصل ہو جائے گا ——— آپ یہاں سے کچھ حاصل کئے بغیر ٹلیں گی کیسے؟"

"میں آپ سے ایک خاص بات کرنے آئی تھی۔"

"کیا؟"

"میں ——— میں یہ کہنے آئی تھی، کہ میری سمجھ میں نہیں آتا، میں آپ کو کیسے سمجھاؤں؟"

"آپ کیا سمجھانے آئی تھیں مجھے؟"

"آپ کو تو خدا سمجھائے گا ——— میں یہ کہنے آئی تھی، کہ آپ پتلون پہن کر اُس کے بٹن بالکنی میں بند نہ کیا کریں۔ ہمسایوں کو سخت اعتراض ہے۔ یہ بہت بڑی بدتمیزی ہے۔"

قادرا قصائی

(۲۴ مئی ۵۴ء)

عیدن بائی آگرے والی چھوٹی عید کو پیدا ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی ماں زہرہ جان نے اس کا نام اسی مناسبت سے عیدن رکھا۔ زہرہ جان اپنے وقت کی بہت مشہور گانے والی تھی۔ بڑی دور دور سے رئیس اس کا مجرا سننے کے لیے آتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ میرٹھ کے ایک تاجر عبداللہ سے جو لاکھوں میں کھیلتا تھا، اسے محبت ہو گئی۔ اس نے چنانچہ اسی جذبے کے ماتحت اپنا پیشہ چھوڑ دیا۔ عبداللہ بہت متاثر ہوا اور اس کی ماہوار تنخواہ مقرر کر دی۔ کوئی تین سو روپے کے قریب۔ ہفتے میں تین مرتبہ اس کے پاس آتا اور رات ٹھہر کر صبح سویرے وہاں سے روانہ ہو جاتا۔

جو شخص زہرہ جان کو جانتے ہیں اور آگرے کے رہنے والے ہیں، ان کا یہ بیان ہے کہ اس کو چاہنے والا ایک بڑھئی تھا۔ مگر وہ اسے منہ نہیں لگاتی تھی۔ وہ بے چارہ دن رات بڑی محنت و مشقت کرتا اور تین چار مہینے کے بعد روپے جمع کر کے زہرہ جان کے پاس جاتا، مگر وہ اسے دھتکار دیتی۔

آخر ایک روز اس بڑھئی کو زہرہ جان سے مفصل گفتگو کرنے کا موقع مل ہی گیا۔ پہلے تو وہ کوئی بات نہ کر سکا۔ اس لیے کہ اس پر اپنی محبوبہ کے حسن کا رعب طاری تھا، لیکن اس نے تھوڑی دیر کے بعد جرأت سے کام لیا اور اس سے کہا:

"زہرہ جان ... میں غریب آدمی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ بڑے بڑے دھن والے تمہارے پاس آتے ہیں اور تمہاری ہر ادا پر سینکڑوں روپے نچھاور کرتے ہیں ——— لیکن تمہیں شاید یہ بات معلوم نہیں کہ غریب کی محبت دھن دولت والوں کے لاکھوں روپوں سے بڑی ہوتی ہے ——— میں تم سے محبت کرتا ہوں ——— معلوم نہیں کیوں۔"

زہرہ جان ہنسی۔ اس ہنسی سے بڑھئی کا دل مجروح ہو گیا۔ "تم ہنستی ہو ——— میری محبت کا مذاق اڑاتی ہو، اس لیے کہ یہ کنگلے کی محبت ہے

جو کنواری جسم کو اپنی روزی کماتا ہے ـــــ یاد رکھو، یہ تمہارے لاکھوں میں کھیلنے والے تمہیں وہ محبت اور پیار نہیں دے سکتے جو میرے دل میں تمہارے لئے موجود ہے۔"

زہرہ جان اکتا گئی۔ اس نے اپنے ایک میراثی کو بلایا اور اس سے کہا کہ پڑھئی کو باہر نکال دو۔ لیکن وہ اس سے پہلے ہی چلا گیا۔

ایک برس کے بعد عیدن پیدا ہوئی ـــــ اس کا باپ عبث رضا یار تھا اور اس کے متعلق کوئی بھی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بعض کا خیال ہے وہ غازی آباد کے ایک ہندو سیٹھ کے نطفے سے ہے ـــــ کسی کے نطفے سے بھی ہو، مگر بلا کی خوبصورت تھی۔

ادھر زہرہ جان کی عمر ڈھلتی گئی، ادھر عیدن جوان ہوتی گئی۔ اس کی ماں نے اس کو موسیقی کی بڑی اچھی تعلیم دی۔ لڑکی ذہین تھی، کئی استادوں سے اس نے سبق لئے اور ان سے داد وصول کی۔

زہرہ جان کی عمر اب چالیس برس کے قریب ہوئی۔ وہ اب اس منزل سے گزر چکی تھی جب کسی طوائف میں کشش باقی رہتی ہے۔ وہ اپنی اکلوتی بیٹی عیدن کے سہارے جی رہی تھی۔ ابھی تک اس نے اس سے مجرا نہیں کرایا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ بہت بڑی تقریب ہو جس کا افتتاح کوئی راجہ نواب کرے۔

عیدن بائی کے حسن کے چرچے عام تھے۔ دور دور تک عیاش رئیسوں میں اس کے تذکرے ہوتے تھے۔ وہ اپنے ایجنٹوں کو زہرہ جان کے پاس بھیجتے اور عیدن کی تھنی اترنے کے لئے اپنی اپنی پیشکش بھیجتے مگر اس کو اتنی جلدی کوئی نہیں تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ مسی کی رسم بڑی دھوم دھام سے ہو اور وہ زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرے ـــــ اس کی بیٹی لاکھوں میں ایک تھی۔ سارے شہر میں اس جیسی حسین لڑکی اور کوئی نہیں تھی۔

اس کے حسن کی نمائش کرنے کے سلسلے میں وہ ہر جمعرات کی شام کو اس کے ساتھ پیدل بازار سیر کو جاتی۔ عشق پیشہ اس کو دیکھتے تو دل تھام تھام لیتے۔

چھنی چھنی چنبیلی میں لدا ہوا جوبن، سڈول بانہیں، مخروطی انگلیاں، جن کے ناخنوں پر چھپا ہوا پیارا رنگ، ٹخنوں تک گھنگھریالے بال ـــ ہر قدم پر قیامت ڈھاتی تھی۔

آخر ایک روز زہرہ جان کی امید بر آئی۔ ایک نواب صاحب، جن پہ ایسا لٹو ہوا کہ وہ منہ مانگے دام دینے پر رضامند ہو گیا۔ زہرہ جان نے اپنی بیٹی کی مسی کی رسم کے بڑے اہتمام کئے۔ دیگیں پلاؤ اور متنجن کی چڑھائی گئیں۔

شام کو نواب صاحب اپنی بگھی میں آئے۔ زہرہ جان نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی ـــــ نواب صاحب بہت خوش تھے۔ عیدن دلہن بنی ہوئی تھی۔ نواب صاحب کے ارشاد کے مطابق اس کا بناؤ سنگھار ہوا ـــــ پھٹ پڑنے والا شباب تھا جو نغمہ سرائی کرتا تھا۔

عیدن اس شام بلا کی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی ہر جنبش، ہر ادا، سر سے لے کر پاؤں تک قابل تھی۔ نواب صاحب گاؤ تکیے کا سہارا لئے بیٹھے تھے۔ انہوں نے سوچا آج رات وہ جنت کی سیر کریں گے، جو کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔

وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک ایک بے ہنگم سا آدمی اندر داخل ہوا اور زہرہ جان کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ بہت گھبرائی۔ یہ وہی پڑھئی تھا ـــــ اس کا عاشق زار۔ بہت میلے اور گندے کپڑے پہنے تھا۔ نواب صاحب تو بہت نفاست پسند تھے، ابکائیاں آنے لگیں۔ انہوں نے

[illegible] سے کہا یہ کون بدتمیز ہے ؟

بڑھئی نے کہا۔ حضور میں ان کا عاشق ہوں۔

نواب صاحب کی طبیعت اور زیادہ مکدر ہو گئی: زہرہ جان نکالو اس حیوان کو باہر۔

بڑھئی نے اپنے تھیلے سے رندی نکالی اور بڑی مضبوطی سے زہرہ جان کو پکڑ کر اس کی گردن پر تیزی سے چلانا شروع کر دی۔ نواب صاحب اور میراثی وہاں سے بھاگ گئے۔ عیدن بے ہوش ہو گئی۔

بڑھئی نے رندا اور بڑے [illegible] ختم کیا اور خود ہی آ کر اپنے تھیلے میں ڈال کر سیدھا تھانے گیا اور اقبالِ جرم کر لیا ——— کہا جاتا ہے کہ اُسے عمر قید کی سزا ہو گئی تھی۔

عیدن اپنی ماں کے قتل ہو جانے کے [illegible] صدمہ سے ڈھائی مہینے تک بیمار رہی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ وہ زندہ نہیں رہے گی مگر آہستہ آہستہ اس کی طبیعت سنبھلنے لگی اور وہ اس قابل ہو گئی کہ چل پھر سکے۔ ہسپتال میں اس کی تیمارداری صرف اس کے استاد اور میراثی ہی کرتے تھے۔ وہ نواب اور رئیس جو اس پر اپنی جان چھڑکتے تھے، بھولے سے بھی اس کو پوچھنے کے لئے نہ آئے ——— وہ بہت دل برداشتہ ہو گئی۔

وہ گھر چھوڑ کر دہلی چلی آئی ——— مگر اس کی طبیعت بڑی اداس تھی کہ اس کا جی قطعاً مجرا کرنے کو نہیں چاہتا تھا۔ اس کے پاس بیس پچیس ہزار روپے کے زیورات تھے جو اس کی مقتول ماں کے تھے۔ وہ انھیں بیچتی رہی اور گزارا کرتی رہی۔

عورت کو زیور بڑے عزیز ہوتے ہیں۔ اس کو بڑا دکھ ہوتا تھا جب وہ کوئی چوڑی یا نیکلس اونے پونے داموں بیچتی تھی ——— لیکن آخر بالا کر اس کا جی ہی نہیں چاہتا تھا کہ [illegible] قائم رہے۔

ان دنوں پاکستان کے قیام کا مطالبہ بڑے زوروں پر تھا۔ آخر ایک دن یہ اعلان ہوا، جو عیدن نے اپنے پاکٹ والے ریڈیو سیٹ پر سنا کہ ہندوستان کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اس کے فوراً بعد فسادات شروع ہو گئے۔ ہندو مسلمانوں کو مارنے، مسلمان ہندوؤں کو ——— عجب عالم تھا۔ خون پانی سے بھی ارزاں ہو رہا تھا۔

مسلمان دھڑا دھڑ پاکستان جا رہے تھے کہ ان کی جانیں محفوظ رہیں۔ عیدن نے بھی فیصلہ کیا کہ وہ دہلی نہیں رہے گی، لاہور چلی جائے گی۔ بڑی مشکلوں سے اپنے کچھ زیورات بچا کر وہ لاہور پہنچ گئی۔ لیکن راستے میں اس کی تمام بیش قیمت پشوازیں اور باقی ماندہ زیور اس کے اپنے بھائی مسلمانوں ہی نے غائب کر دیئے۔

جب وہ لاہور پہنچی تو [illegible] ——— لیکن اس کا حسن ویسے کا ویسا تھا۔ دہلی سے لاہور آتے ہوئے ہزاروں للچائی ہوئی آنکھوں نے اس کی طرف دیکھا، مگر اس نے بے اعتنائی برتی۔

وہ جب لاہور پہنچی تو اس نے سوچا کہ زندگی بسر کیسے ہو گی؟ اس کے پاس تو چنے کھانے کے لئے بھی چند پیسے نہیں تھے ——— لیکن لڑکی ذہین تھی۔ سیدھی اس جگہ پہنچی جہاں اس کی ہم پیشہ رہتی تھیں۔ یہاں اس کی بڑی آؤ بھگت کی گئی۔

ان دنوں دو سو بیس روپے من تھا۔ ہندو جو کچھ یہاں چھوڑ گئے تھے مسلمانوں کی ملکیت بن گیا تھا پھر اللہ کی دین سے وار سے نیارے تھے۔

عیدن کو جب لوگوں نے دیکھا تو وہ اس کے عاشق ہو گئے۔ رات بھر اس کو سینکڑوں گانے سننے والوں کی فرمائشیں پوری کرنا پڑتیں۔ صبح چار بجے کے قریب جب کہ اس کی آواز جواب دے چکی ہوتی، وہ اپنے سامعین سے معذرت طلب کرتی اور اوندھے منہ اپنی چارپائی پہ لیٹ جاتی۔

یہ سلسلہ قریب قریب ڈیڑھ برس تک جاری رہا ـــــ عیدن اس کے بعد ایک علیحدہ کوٹھا لے کے بیٹھ گئی، جہاں وہ مقیم تھی اس جگہ گرو کو اپنی آدھی آمدن دینا پڑتی تھی۔

جب اس نے علیحدہ اپنے کوٹھے پہ مجرا کرنا شروع کیا تو اس کی آمدن میں اضافہ ہو گیا۔ اب اسے ہر قسم کی فراغت حاصل تھی۔ اس نے نئی زیور بنائے، جوڑے بھی اچھے سے اچھے تیار کرا لئے۔

اسی دوران میں اس کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو بلیک مارکیٹ کا بادشاہ تھا۔ اس نے کم از کم دو کروڑ روپے کما لئے۔ خوبصورت تھا۔ اس کے پاس تین کاریں تھیں۔ پہلی ہی ملاقات پہ وہ عیدن کے حسن سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے اپنی کمل سفید پیکارڈ اس کے حوالے کر دی۔

اس کے علاوہ وہ ہر شام آتا اور کم از کم دو ڈھائی سو روپے اس کی نذر ضرور کرتا۔ ایک شام وہ آیا تو چاندنی کسی قدر میلی تھی۔ اس نے عیدن سے پوچھا "کیا بات ہے، آج تمہاری چاندنی اتنی گندی ہے"

عیدن نے ایک ادا کے ساتھ جواب دیا "آجکل لٹھا کہاں ملتا ہے"

دوسرے دن اس بلیک مارکیٹ کے بادشاہ نے چالیس تھان لٹھے کے بھجوا دیئے۔ اس کے تیسرے روز بعد اس نے ڈھائی ہزار روپے دیئے کہ عیدن اپنے گھر کی آرائش کا سامان خرید لے۔

عیدن کو اچھا گوشت کھانے کا بہت شوق تھا۔ جب وہ آگرے اور دلی میں تھی تو اسے عمدہ گوشت نہیں ملتا تھا، مگر لاہور میں اسے قادا قصائی بہترین گوشت مہیا کرتا تھا ـــــ بغیر ریشے کی، ہر بوٹی ایسی ہوتی تھی جیسے ریشم کی بنی ہو۔

دکان پہ اپنا شاگرد بٹھا کر قادا صبح سویرے آتا اور ڈیڑھ سیر گوشت جس کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی ہوتی، عیدن کے حوالے کر دیتا۔ اس سے دیر تک باتیں کرتا رہتا، جو عام طور پہ گوشت ہی کے بارے میں ہوتیں۔

بلیک مارکیٹ کا بادشاہ، جس کا نام ظفر شاہ تھا، عیدن کے عشق میں بہت بری طرح گرفتار ہو چکا تھا۔ اس نے ایک شام عیدن سے کہا کہ وہ اپنی ساری جائداد، منقولہ اور غیر منقولہ اس کے نام منتقل کرنے کے لئے تیار ہے اگر وہ اس سے شادی کر لے ـــــ مگر عیدن نہ مانی۔ ظفر شاہ بہت مایوس ہوا۔

اس نے کئی بار کوشش کی کہ عیدن اس کی ہو جائے، مگر ہر بار اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ مجرے سے فارغ ہو کر رات کے دو بجے کے قریب باہر نکل جاتی تھی معلوم نہیں کہاں۔

ایک رات جب مظفر شاہ اپنا غم غلط کرکے ——— یعنی شراب پی کر [illegible] ہی چلا آرہا تھا تو اس نے دیکھا کہ سائیں ——— کے تکیے کے پاس جیوتی ایک نہایت بدنما آدمی کے پاؤں پکڑے التجا کر رہی ہے کہ خدا کے لئے مجھ پہ نظر کرم کرو [illegible] وہاں سے تم پہ فدا ہوں ——— تم بہت ظالم ہو [illegible] وہ شخص جسے فوراً دیکھتے ہی مظفر شاہ نے پہچان لیا کہ تانو قصائی ہے، اُسے دھتکار رہا ہے " چل ——— ہم نے آج تک کسی کنواری کو [illegible] نہیں [illegible] ——— مجھ [illegible] لیا کر ———

مظفر نے اُسے ٹھوکریں مار مار کر [illegible] اور جیوتی اس پہ لذت محسوس کرتی رہی۔

خودکشی

(۲۵ مئی ۵۴ء)

زاہد صرف نام ہی کا زاہد نہیں تھا۔ اُس کے زہد و اتقا کے سب قائل تھے۔ اُس نے پچیس برس کی عمر میں شادی کی۔ اُس زمانے میں اُس کے پاس دس ہزار روپے کے قریب تھے، شادی پر پانچ ہزار صرف ہو گئے، اتنی ہی رقم باقی رہ گئی۔

زاہد بہت خوش تھا۔ اُس کی بیوی بڑی خوش خصلت اور خوبصورت تھی۔ اُس کو اُس سے بے پناہ محبت ہو گئی۔ وہ بھی اُس کو دل و جان سے چاہتی تھی۔ دونوں سمجھتے تھے کہ جنت میں آباد ہیں۔

ایک برس کے بعد اُن کے ایک لڑکی پیدا ہوئی جو ماں پر تھی، یعنی ویسی ہی حسین۔ بڑی بڑی ملافی آنکھیں، اُن پر لمبی پلکیں، مہین ابرو، چھوٹا سا لب دہن ـــــــ اس لڑکی کا نام سوچنے میں کافی دیر لگ گئی۔ زاہد اور اُس کی بیوی کو دوسروں کے تجویز کئے ہوئے نام پسند نہیں آتے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ خود زاہد نام بتائے۔

زاہد دیر تک سوچتا رہا، لیکن اُس کے دماغ میں ایسا کوئی موزوں و مناسب نام نہ آیا جو وہ اپنی بیٹی کے لئے منتخب کرتا۔

اُس نے اپنی بیوی سے کہا "اتنی جلدی کیا ہے ـــــــ نام رکھ لیا جائے گا۔"

بیوی مُصر تھی کہ نام ضرور رکھا جائے "میں اپنی بچی کو اتنی دیر بے نام نہیں رکھنا چاہتی۔"

وہ کہتا "اس میں کیا حرج ہے ـــــــ جب کوئی اچھا سا نام ذہن میں آئے گا تو اس گُل کو تھنی کے ساتھ ٹانک دیں گے۔"

"میں اسے کیا کہہ کر پکاروں ـــــــ مجھے بڑی اُلجھن ہوتی ہے۔"

"فی الحال بِٹیا کہہ دینا کافی ہے۔"

"یہ کافی نہیں ہے ـــــــ میری بِٹیا کا کوئی نام ہونا چاہئے۔"

- "تم خود ہی کوئی منتخب کر لو۔"
- "یہ کام آپ کا ہے، میرا نہیں۔"
- "تو تھوڑے دن انتظار کرو ——— میں اردو کی لغت لاتا ہوں ——— اُس کو پہلے صفحے سے آخری صفحے تک غور سے دیکھوں گا ——— یقیناً کوئی اچھا نام مل جائے گا۔"
- "میں نے آج تک یہ کبھی نہیں سنا تھا کہ لوگ اپنے بچوں بچیوں کے نام ڈکشنریوں سے نکالتے ہیں۔"
- "نہیں میری جان، نکالتے ہیں ——— میرا ایک دوست ہے۔ اُس کے جب بچی پیدا ہوئی تو اُس نے فوراً اردو کی لغت نکالی اور اُس کی ورق گردانی کرنے کے بعد ایک نام چن لیا۔"
- "کیا نام تھا؟"
- "نکہت۔"
- "اس کے معنی کیا ہیں؟"
- "خوشبو۔"
- "بڑا اچھا نام ہے ——— نکہت ——— یعنی خوشبو۔"
- "تو یہی نام رکھ لو۔"

زاہد کی بیوی نے اپنی بچی کو جو سو رہی تھی ایک نظر دیکھا اور کہا "نہیں ——— میں اپنی بٹیا کے لیے پہلا نام نہیں چاہتی ——— کوئی نیا نام تلاش کیجیے ——— جائیے ڈکشنری لے آئیے۔"

زاہد مسکرایا "لیکن میرے پاس پیسے کہاں ہیں۔"

زاہد کی بیوی بھی مسکرائی "میرا پرس الماری میں پڑا ہے۔ اس میں جتنے روپے آپ کو چاہئیں نکال لیجیے۔"

زاہد نے "بہت بہتر" کہا اور الماری کھول کر اُس میں سے اپنی بیوی کا پرس نکالا اور دس روپے کا ایک نوٹ لے کر بازار روانہ ہو گیا کہ لغت خرید لے۔

وہ کئی کتب فروش دکانوں میں گیا ——— کئی لغت دیکھے۔ بعض تو بہت قیمتی تھے، جن کی تین تین جلدیں تھیں۔ کچھ بڑے ناقص ——— آخر اُس نے ایک لغت جس کی قیمت واجبی تھی خرید لیا۔ اور راستے میں اُس کی ورق گردانی کرتا رہا تاکہ نام کا مسئلہ جلد حل ہو جائے۔

جب وہ انارکلی میں سے گزر رہا تھا تو اُس کو ایک دوست مل گیا۔ وہ اُسے اپنی بوٹوں کی دکان میں لے گیا ——— وہاں اُسے قریب قریب ایک گھنٹے تک بیٹھنا پڑا، کیونکہ بہت دیر کے بعد اُس سے ملاقات ہوئی تھی۔ جب اُس کے دوست کو دورانِ گفتگو میں پتہ چلا کہ زاہد کے ہاں لڑکی ہوئی ہے تو وہ بہت خوش ہوا۔ تجوری میں سے گیارہ روپے نکالے اور زاہد سے کہا "یہ اُس بچی کو دے دینا، کہنا تمہارے چچا نے دیئے ہیں ——— نام کیا رکھا ہے اُس کا؟"

زاہد نے لغت کی طرف دیکھا جس کی جلد لال رنگ کی تھی "ابھی تک کوئی اچھا نام سوچا نہیں"

اُس کے دوست نے ہنستے ہوئے کپڑے سے صاف کرتے ہوئے کہا "یار نام رکھنے میں دقت ہی کیا پیش آتی ہے۔ شمینہ ہے۔ شاہینہ ہے۔ نسرین ہے۔ الماس ہے"

زاہد نے جواب دیا "یہ سب بکواس ہے"

اُس کے دوست نے قہقہے میں کہا "تو اب جو کچھ تم کہو گے، وہ بھی ہم سُن لیں گے" اِس کے بعد اُٹھ کر اُس نے زاہد کو گلے سے لگایا "خدا اُس کی عمر دراز کرے ——— نام ہو نہ ہو، اِس سے کیا فرق پڑتا ہے"

زاہد جب دکان سے باہر نکلا تو اُس نے سوچنا شروع کیا کہ واقعی نام میں کیا رکھا ہے۔ خیراتی کا مطلب تو نہیں کہ وہ بڑی خیرات کرتا ہے۔ عبدالحق کیا بلا ہے ——— اور گھسیٹا ——— کیا اسے لوگ گھسیٹنا شروع کر دیں ——— اور یہ نرگس ——— شیرانی؟

اُس کے جی میں آئی کہ لغت کسی گندی موری میں پھینک دے اور زور سے کہے اپنی بیوی سے کہے "میری جان، نام میں کچھ نہیں پڑا۔ بس یہ دعا کرو کہ بچی کی عمر دراز ہو ———"

وہ مختلف خیالات میں غرق تھا ——— لیکن معلوم نہیں کیوں اُس کا دل غیر معمولی طور پر دھڑک رہا تھا۔ اُس نے سوچا کہ شاید یہ اس کی پراگندہ خیالی کا باعث ہے ——— تھوڑی دور چلنے کے بعد اُس کی طبیعت بہت زیادہ مضطرب ہو گئی۔ وہ چاہتا تھا کہ اُڑ کر گھر پہنچے اور اپنی بچی کی پیشانی چومے۔ بغل میں لغت تھی ——— اِس کو اُس نے کئی بار دیکھنے کی کوشش کی، مگر اُس کا دل و دماغ متوازن نہیں تھا ——— اُس نے تیز تیز چلنا شروع کر دیا ——— مگر تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہی بہت بُری طرح ہانپنے لگا، اور ایک دکان کے تھڑے پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں ایک خالی تانگہ آیا۔ اُس نے اُس کو ٹھہرایا اور اُس میں بیٹھ کر تانگے والے کو کہا "چلو مزنگ لے چلو ——— لیکن جلدی پہنچا دو مجھے وہاں ——— ایک بڑا ضروری کام ہے"

مگر گھوڑا بہت ہی سست رفتار تھا۔ یا شاید زاہد کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کو عجلت تھی۔ وہ برق رفتاری سے گھر پہنچنا چاہتا تھا۔

اس نے کئی مرتبہ تانگے والے سے سخت سُست الفاظ کہے، جو وہ برداشت کرتا گیا۔ آخر جب اس کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو اُس نے زاہد کو تانگے سے اُتار دیا ——— ہائی کورٹ کے قریب۔ اُس نے زاہد سے کرایہ بھی طلب نہ کیا۔

زاہد بہت زیادہ پریشان ہوا۔ وہ جلد گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ وہ کچھ دیر چوک میں کھڑا رہا۔ اتنے میں ایک پشاوری تانگہ آیا۔ اس میں بیٹھا۔ وہ مزنگ پہنچا، کرایہ ادا کیا اور اپنے گھر میں داخل ہوا۔

کیا دیکھتا ہے کہ صحن میں کئی عورتیں کھڑی ہیں جو غالباً ہمسائی تھیں۔ وہ دروازے کے پاس رُک گیا۔ ایک عورت دوسری عورت سے کہہ رہی تھی "منشی جی کی بچی کو کیا پتہ تھا ——— تشنج کے یہ دورے بڑے خطرناک ہیں"

زاہد کی جو حالت غیر ہو رہی تھی، وہ دیوانہ وار اندر بھاگا اور اُس کمرے میں پہنچا جہاں وہ اور اُس کی بیوی رہتے تھے۔ اندر داخل ہوتے ہی اُس نے اپنی بیوی کی دلدوز چیخ سنی۔

اُس کی بچی دم توڑ چکی تھی ——— اور اُس کی بیوی بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ زاہد نے اپنا سر پیٹنا شروع کر دیا۔ ہمسائیاں پردے کا خیال کیے بغیر اندر آ چکی

بیگم اور زاہد کو اس کمرے سے باہر نکال دیا۔

[illegible] تک اس کی حالت [illegible] رہی۔ دو بجے ڈاکٹر آیا۔ اس نے زاہد کی بیوی کو ایک دو انجکشن لگائے جن سے وہ ہوش میں آگئی۔
[illegible] کے سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں معطل ہو گئی تھیں۔ وہ صحن میں ایک کرسی پر بیٹھا بغل میں لغت دبائے خلا میں دیکھ رہا تھا، جیسے وہ اپنی بچی کے لئے کوئی نام اس لغت میں ڈھونڈ رہا ہو۔

بچی کو دفنانے کا وقت آیا تو زاہد باہوش ہو گیا۔ اس نے کوئی آنسو نہ بہایا۔ کفن میں لپٹی بچی کو اٹھایا اور اپنے دوستوں اور ہمسایوں کے ہمراہ قبرستان روانہ ہو [illegible]۔ وہاں [illegible] پہلے سے ایک ننھی سی قبر کھودی گئی تھی۔ اس میں اس نے خود بچی کو لٹایا اور اس کے ساتھ لغت رکھ دی۔

[illegible] نے سمجھا [illegible]۔ انہیں بڑی حیرت ہوئی کہ وہ [illegible] قرآن کریم دفن کرتا ہے۔ یہ تو سراسر کفر ہے۔ لیکن [illegible] زاہد [illegible] کے متعلق [illegible] کچھ نہ کہہ رہے۔

بچی کو دفنا کر جب گھر آیا تو [illegible] معلوم ہوا کہ اس کی بیوی کو بہت تیز بخار ہے۔ [illegible] ہے۔

[illegible] ڈاکٹر [illegible] نے [illegible] دیکھ [illegible] زاہد [illegible] حالت بہت نازک ہے۔۔۔ میں علاج تو [illegible] کروں گا لیکن [illegible] کی بحالی [illegible] کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

زاہد کو ایسا محسوس ہوا کہ اس پر بجلی آن گری ہے، لیکن اس نے سنبھل کر ڈاکٹر سے پوچھا: "کیا بات ہے؟"

[illegible] ہیں۔ [illegible] یہ کہ انہیں بہت بڑا صدمہ پہنچا، دوسری یہ کہ ان کا دل بہت کمزور ہے۔۔۔ تیسری یہ کہ [illegible] ایک [illegible] زندگی [illegible] رہے۔"

ڈاکٹر نے [illegible] نسخہ [illegible] والی دوا [illegible] رکھ کے اور چلا گیا۔

زاہد [illegible] سب [illegible] دیا۔ [illegible] وہ [illegible] سے حلق [illegible] پانی [illegible]۔۔۔ لیکن [illegible] کی حالت بہتر نہ ہوئی۔
[illegible] اسے [illegible] ہوش آیا۔ [illegible] کی کیفیت [illegible] زاہد نے [illegible] [illegible] آنکھوں [illegible] وقت آیا ہے۔۔۔ میں [illegible] کی [illegible]

[illegible] آنکھوں [illegible] آنسو [illegible] کیسی باتیں کرتی ہو تم۔۔۔ تمہیں [illegible] اگر کچھ ہو گیا تو میں کہاں زندہ رہوں گا؟"

[illegible] آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ [illegible]۔۔۔ میں مر [illegible] آجا [illegible]۔۔۔ خدا آپ کو [illegible]۔۔۔ اور [illegible]۔۔۔ اور [illegible]

اس نے ہچکی لی اور [illegible] کے اندر اندر اس کی روح پرواز کر گئی۔۔۔ زاہد نے بڑے صبر و تحمل سے کام لیا۔ اس کے کفن دفن [illegible] [illegible] کا [illegible] کی۔

رات [illegible] ایک گاڑی آتی تھی۔ وہ [illegible] کی طرف روانہ ہو گیا تا کہ وہاں [illegible] پر لیٹ جائے اور [illegible] گاڑی [illegible] زندہ [illegible]۔۔۔ مجھے [illegible] کوئی خواہش نہیں۔۔۔ یہ [illegible] عابدی [illegible] اچھا [illegible] رہا۔

یادہ صدمے برداشت نہیں کر سکتا۔

جب وہ ریلوے لائن کے پاس پہنچا تو اُسے گاڑی کی تیز روشنی جو انجن کی پیشانی پر ہوتی ہے دکھائی دی ـــــ لیکن ابھی وہ دُور تھی۔ اُس نے سوچا کہ جب قریب آئے گی تو وہ پٹڑی پر لیٹ جائے گا۔

تھوڑی دیر کے بعد گاڑی قریب آ گئی ـــــ زاہد آگے بڑھا، مگر اُس نے دیکھا کہ ایک آدمی کہیں سے نمودار ہُوا اور پٹڑی کے عین درمیان کھڑا ہو گیا۔ گاڑی بڑی تیز رفتاری سے آ رہی تھی۔ اور قریب تھا کہ وہ آدمی اُس کی جھپیٹ میں آ جائے۔ وہ تیزی سے لپکا اور اُس آدمی کو دھکا دے کر پٹڑی سے اُس طرف گرا دیا ـــــ گاڑی دندناتی ہوئی گزر گئی۔

اس آدمی سے زاہد نے۔ "کیا تم خودکشی کرنا چاہتے تھے؟"

اُس نے جواب دیا۔ "جی ہاں۔"

"کیوں؟"

"بس ـــــ صدمے اُٹھاتے اُٹھاتے اب جینے کو جی نہیں چاہتا۔"

زاہد ناصح بن گیا "بھائی میرے، زندگی زندہ رہنے کے لئے ہے۔ اس کو اچھی طرح استعمال کرو۔ خودکشی بہت بڑی بزدلی ہے ـــــ اپنی جان خود لینا کہاں کی عقلمندی ہے ـــــ اُٹھو، اپنے صدموں کو بھول جاؤ ـــــ انسان کی زندگی میں صدمے نہ ہوں تو وہ خوشیوں سے کیا مزا اُٹھائے گا ـــــ چلو میرے ساتھ۔"

پشاور سے لاہور تک

(۲۶ مئی ۵۴ء)

وہ انٹر کلاس کے زنانہ ڈبے سے نکلی۔ اُس کے ہاتھ میں چھوٹا سا اٹیچی کیس تھا۔ جاوید پشاور سے اُسے دیکھتا چلا آرہا تھا۔ راولپنڈی کے اسٹیشن پر گاڑی کافی دیر ٹھہری تو وہ ساتھ والے زنانہ ڈبے کے پاس سے کئی مرتبہ گذرا۔

لڑکی حسین تھی۔ جاوید اُس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ اُس کی ناک کی پھننگ پر چھوٹا سا تل تھا۔ گالوں میں ننھے ننھے گڑھے تھے جو اُس کے چہرے پر بہت بھلے لگتے تھے۔

راولپنڈی اسٹیشن پر اُس لڑکی نے کھانا منگوایا۔ بڑے اطمینان سے ایک ایک نوالہ اُٹھا کر اپنے منہ میں ڈالتی رہی۔ جاوید دُور کھڑا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بھی اُس کے ساتھ بیٹھ جائے اور دونوں مل کر کھانا کھائیں۔

وہ یقیناً اُس کے پاس پہنچ جاتا مگر مصیبت یہ تھی کہ ڈبہ زنانہ تھا۔ عورتوں سے بھرا ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ جرأت نہ کر سکا۔

لڑکی نے کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھوئے۔ جو بہت نازک تھے۔ لمبی لمبی مخروطی انگلیاں جن کو اُس نے اچھی طرح صاف کیا، اور اٹیچی کیس سے تولیہ نکال کر اپنے ہاتھ پونچھے۔ پھر اطمینان سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

جاوید گاڑی چلنے تک اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر اپنے ڈبے میں سوار ہو گیا اور اُسی لڑکی کے خیالوں میں غرق ہو گیا۔

معلوم تو یہ ہوتا ہے کہ بڑے اچھے گھرانے کی ہے۔

دونوں کلائیوں میں قریب قریب بارہ بارہ سونے کی چوڑیاں ہوں گی۔ کانوں میں ٹاپس بھی تھے۔ دو انگلیوں میں، اگر میرا اندازہ غلط نہیں، ہیرے کی انگوٹھیاں ہیں۔ لباس بہت عمدہ۔ ساٹن کی شلوار۔ نفیشیا کی قمیص۔ شفون کا دوپٹہ۔

حیرت ہے کہ گھٹیا سے ڈبے میں کیوں سفر کر رہی ہے؟

پشاور سے آئی ہے ـــــ وہاں کی عورتیں تو سخت پردہ کرتی ہیں ـــــ لیکن یہ پردے کے بغیر وہاں سے گاڑی میں سوار ہوئی۔
اور اس کے ساتھ کوئی مرد بھی نہیں ـــــ نہ کوئی عورت۔ اکیلی سفر کر رہی ہے۔ آخر یہ قصہ کیا ہے؟
میرا خیال ہے، پشاور کی رہنے والی نہیں ـــــ وہاں کسی عزیز سے ملنے گئی ہوگی ـــــ مگر اکیلی کیوں؟ ـــــ کیا اسے ڈر نہیں لگا کہ اٹھا کر لے جائے گا کوئی ـــــ ایسے تنہا حُسن پہ تو ہر مرد جھپٹا مارنا چاہتا ہے۔
پھر جاوید کو ایک اندیشہ ہوا ـــــ کہ شادی شدہ تو نہیں؟
وہ در اصل دل میں تہیّہ کر چکا تھا کہ اُس لڑکی کا پیچھا کرے گا اور ہو سکا تو اُس سے شادی کر لے گا۔ وہ حرام کاری کا بالکل قائل نہیں تھا۔
کئی اسٹیشن آئے اور گزر گئے ـــــ اُسے صرف راولپنڈی تک جانا تھا کہ وہاں ہی اُس کا گھر تھا، مگر وہ بہت آگے نکل گیا۔
ایک اسٹیشن پر چیکنگ ہوئی، جس کے باعث اُسے جرمانہ ادا کرنا پڑا، مگر اُس نے اِس کی کوئی پرواہ نہ کی۔
ٹکٹ چیکر نے پوچھا "آپ کو کہاں تک جانا ہے؟"
جاوید مسکرایا "جی ابھی تک معلوم نہیں ـــــ آپ لاہور کا ٹکٹ بنا دیجئے کہ وہی آخری اسٹیشن ہے۔"
ٹکٹ چیکر نے اُسے لاہور کا ٹکٹ بنا دیا۔ روپے وصول کئے اور دوسرے اسٹیشن پہ اُتر گیا۔ جاوید بھی اُترا کہ ٹرین کو ٹائم ٹیبل کے مطابق پانچ منٹ ٹھہرنا تھا۔
ساتھ والے کمپارٹمنٹ کے پاس گیا۔ وہ لڑکی کھڑکی کے ساتھ لگی دانتوں میں خلال کر رہی تھی۔ جاوید کی طرف جب اُس نے دیکھا تو اُس کے دل و دماغ بھونچال زدہ ہونے لگے۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ اُس کی موجودگی سے غافل نہیں ہے۔ سمجھ گئی ہے کہ وہ بار بار صرف اُسے ہی دیکھنے آتا ہے
جاوید کو دیکھ کر وہ مسکرائی۔ اُس کا دل باغ باغ ہو گیا ـــــ مگر جاوید فرطِ جذبات کی وجہ سے فوراً وہاں سے ہٹ کر اپنے ڈبے میں چلا گیا اور مسرت کی دنیا کی سیر کرنے لگا۔ ـــــ اُس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اُس کے آس پاس کی تمام چیزیں مسکرا رہی ہیں۔
ٹرین کا پنکھا مسکرا رہا ہے ـــــ کھڑکی سے باہر تار کے کھمبے مسکرا رہے ہیں ـــــ انجن کی سیٹی مسکرا رہی ہے، اور وہ بدصورت مسافر جو اُس کے ساتھ بیٹھا تھا، اُس کے موٹے موٹے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ ہے ـــــ اُس کے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں تھی، لیکن اُس کا دل مسکرا رہا تھا۔
اگلے اسٹیشن پر جب وہ ساتھ والے کمپارٹمنٹ کے پاس گیا تو وہ لڑکی وہاں نہیں تھی۔ اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔ کہاں چلی گئی؟ ـــــ کہیں پچھلے اسٹیشن پہ تو نہیں اُتر گئی جہاں اُس نے ایک مسکراہٹ سے مجھے نوازا تھا؟ ـــــ نہیں نہیں، غسل خانے میں ہوگی۔
وہ واقعی غسل خانے ہی میں تھی۔ ایک منٹ کے بعد وہ کھڑکی میں نمودار ہوئی۔ جاوید کو دیکھ کر مسکرائی اور ہاتھ کے اشارے سے اُس کو بلایا۔
جاوید کانپتا لرزتا کھڑکی کے پاس پہنچا۔ اُس لڑکی نے بڑی مہین اور سُریلی آواز میں کہا "ایک تکلیف دینا چاہتی ہوں آپ کو ـــــ مجھے دو سیب لا دیجئے ـــــ" یہ کہہ کر اُس نے اپنا پرس نکالا اور ایک روپے کا نوٹ جاوید کی طرف بڑھا دیا۔
جاوید نے جو اِس غیر متوقع بلاوے سے قریب قریب برق زدہ تھا، ایک روپے کا نوٹ پکڑ لیا، لیکن فوراً اُس کے ہوش و حواس برقرار ہو گئے۔ نوٹ

واپس پلٹ کر اُس نے اُس لڑکی سے کہا۔ "آپ یہ رکھیے ـــــ میں سیب لاتا ہوں" اور پلیٹ فارم پر اُس ریڑھی کی طرف دوڑا جس میں پھل بکتے تھے۔ اُس نے جلدی جلدی چار سیب خریدے کیونکہ سگنل ہو چکی تھی۔

دوڑتا دوڑتا وہ اُس لڑکی کے پاس آیا۔ اُس کو سیب دیئے اور کہا "معاف کیجئے گا ـــــ سگنل ہو رہی تھی، اس لئے میں اچھے سیب چُن نہ سکا۔"

لڑکی مسکرائی ـــ وہی دلفریب مسکراہٹ ـــــ گاڑی حرکت میں آئی۔ جاوید اپنے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہوئے کانپ رہا تھا، لیکن بہت خوش تھا۔ اُس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اُس کو دونوں جہان مل گئے ہیں۔ اُس نے اپنی زندگی میں کبھی کسی سے محبت نہیں کی تھی۔ لیکن اب وہ اِس کی لذت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

اُس کی عمر پچیس برس کے قریب تھی۔ اُس نے سوچا کہ اتنی دیر میں کتنا خشک رہا ہوں۔ آج معلوم ہوا ہے کہ محبت انسان کو کتنی تروتازہ بنا دیتی ہے ـــــ وہ سیب کھا رہی ہوگی ـــــ لیکن اُس کے گال تو خود سیب ہیں۔ میں نے جو سیب اُس کو دیئے ہیں کیا وہ اُن کو دیکھ کر شرمندہ نہیں ہوں گے۔

وہ میری محبت کے اشاروں کو سمجھ گئی جبھی تو وہ مسکرائی، اور اُس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے بُلایا اور کہا کہ میں اُسے سیب لا دوں۔ مجھ سے اگر وہ کہتی کہ گاڑی کا رُخ پلٹ دو، تو میں خدا کی قسم اُس کی خاطر یہ بھی کر دیتا۔ گو مجھ میں اتنی طاقت نہیں، لیکن محبت میں آدمی بہت بڑے بڑے کام سر انجام دے سکتا ہے ـــــ فرہاد نے شیریں کے لئے پہاڑ کاٹ کر کیا نہر نہیں کھود دی تھی؟

میں بھی کتنا بے وقوف ہوں۔ اُس سے اور کچھ نہیں، تو کم از کم یہی پوچھ لیا ہوتا کہ تمہیں کہاں تک جانا ہے ـــــ خیر میں لاہور تک کا ٹکٹ تو خرید چکا ہوں ـــــ ہر اسٹیشن پر دیکھ لیا کروں گا۔

ویسے وہ اب مجھے بن بتائے جائے گی بھی نہیں ـــــ شریف خاندان کی لڑکی ہے ـــــ میرے جذبۂ محبت نے اُسے کافی متاثر کیا ہے ـــــ سیب کھا رہی ہے۔ کاش کہ میں اُس کے پاس بیٹھا ہوتا۔ ہم دونوں ایک سیب کو بیک وقت اپنے دانتوں سے کاٹتے ـــــ اُس کا منہ میرے منہ سے کتنا قریب ہوتا۔

میں اس کے گھر کا پتہ لوں گا ـــــ ذرا اور باتیں کر لوں، پھر راولپنڈی پہنچ کر امی سے کہوں گا کہ میں نے ایک لڑکی دیکھ لی ہے، اس سے میری شادی کر دیجئے۔ وہ میری بات کبھی نہیں ٹالیں گی ـــــ بس ایک دو مہینے کے اندر اندر شادی ہو جائے گی۔

اگلے اسٹیشن پر جب جاوید اُسے دیکھنے گیا تو وہ پانی پی رہی تھی۔ وہ جرأت کر کے آگے بڑھا اور اُس سے مخاطب ہوا "آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو فرمائیے؟"

لڑکی مسکرائی ـــــ وہی دلفریب مسکراہٹ "مجھے سگریٹ لا دیجئے!"

جاوید نے بڑی حیرت سے پوچھا "آپ سگریٹ پیتی ہیں؟"

وہ لڑکی پھر مسکرائی "جی نہیں ـــــ یہاں ایک عورت ہے، پردہ دار، اُس کو سگریٹ پینے کی عادت ہے۔"

"اوہ ـــــ میں ابھی لایا ـــــ کس برانڈ کے سگریٹ ہوں؟"

" میرا خیال ہے، یہ گولڈ فلیک پیتی ہے "

" میں ابھی حاضر کئے دیتا ہوں " یہ کہہ کر جاوید بک اسٹال کی طرف دوڑا۔ وہاں سے اُس نے دو پیکٹ لئے اور اُس لڑکی کے حوالے کر دیئے۔ اُس نے شکریہ اُس عورت کی طرف سے ادا کیا جو سگرٹ پینے کی عادی تھی۔

جاوید اب اور بھی خوش تھا کہ اُس لڑکی سے ایک اور ملاقات ہو گئی۔ مگر اس بات کی بڑی اُلجھن تھی کہ وہ اُس کا نام نہیں جانتا تھا۔ اُس نے کئی مرتبہ غور و فکر کیا کہ اُس نے نام کیوں نہ پوچھا۔ اتنی باتیں ہوتی رہیں، لیکن وہ اُس سے اتنا بھی نہ کہہ سکا " آپ کا نام؟ "

اُس نے ارادہ کر لیا کہ اگلے اسٹیشن پر جب گاڑی ٹھہرے گی تو وہ اُس سے نام ضرور پوچھے گا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ فوراً بتا دے گی، کیونکہ اس میں قباحت ہی کیا تھی۔

اگلا اسٹیشن بہت دیر کے بعد آیا، اس لئے کہ فاصلہ بہت لمبا تھا۔ جاوید کو بڑی کوفت ہو رہی تھی۔ اُس نے کئی مرتبہ ٹائم ٹیبل دیکھا۔ گھڑی بار بار دیکھی ——— اُس کا جی چاہتا تھا کہ انجن کو پر لگ جائیں، تاکہ وہ اُڑ کر جلدی اگلے اسٹیشن پہنچ جائے۔

گاڑی ایک دم رُک گئی۔ معلوم ہوا کہ انجن کے ساتھ ایک بھینس ٹکرا گئی ہے ——— وہ اپنے کمپارٹمنٹ سے اُتر کر ساتھ والے ڈبے کے پاس پہنچا مگر لڑکی اپنی سیٹ پر موجود نہیں تھی۔

مسافروں نے مری کٹی ہوئی بھینس کو پٹڑی سے ہٹانے میں کافی دیر لگا دی۔ اتنے میں وہ لڑکی جو غالباً دوسری طرف تماشا دیکھنے میں مشغول تھی آئی اور اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ جاوید پر جب اُس کی نظر پڑی تو مسکرائی ——— وہی دلفریب مسکراہٹ۔

جاوید کھڑکی کے پاس گیا، مگر اُس کا نام پوچھ نہ سکا۔

لڑکی نے اُس سے کہا " یہ بھینسیں کیوں گاڑی کے نیچے آ جاتی ہیں؟ "

جاوید کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ گاڑی چلنے والی تھی، اس لئے وہ اپنے کمپارٹمنٹ میں چلا گیا۔

کئی اسٹیشن آئے مگر وہ نہ اُترا۔ آخر لاہور آ گیا۔ پلیٹ فارم پر جب گاڑی رُکی تو وہ جلدی جلدی باہر نکلا۔ لڑکی موجود تھی۔ جاوید نے اپنا سامان نکلوایا اور اُس سے جس نے ہاتھ میں اٹیچی کیس پکڑا ہوا تھا کہا " لائیے یہ اٹیچی کیس مجھے دے دیجئے "

اُس لڑکی نے اٹیچی کیس جاوید کے حوالے کر دیا۔ قلی نے جاوید کا سامان اُٹھایا، اور دونوں باہر نکلے۔ تانگہ لیا۔ جاوید نے اُس سے پوچھا " آپ کو کہاں جانا ہے؟ "

لڑکی نے بڑے نرم و نازک لہجے میں جواب دیا " جی، راوی روڈ "

" چلئے، میں آپ کو وہاں چھوڑ آتا ہوں "

" بہت بہت شکریہ "

تانگہ راوی روڈ سے گذر رہا تھا ——— جاوید نے اُس لڑکی سے پوچھا " کہاں جائیے گا اب آپ؟ "

لڑکی کے ہونٹوں پر وہی دلفریب مسکراہٹ پیدا ہوئی " جی، ہیرا منڈی "

جاوید بوکھلا سا گیا " کیا آپ وہاں رہتی ہیں؟ "

لڑکی نے بڑی سادگی سے جواب دیا ——— " جی ہاں ——— میرا مکان دیکھ لیں۔ آج رات میرا مجرا سننے ضرور آیئے گا "

جاوید پشاور سے نے کر لاہور تک اپنا مجرا سن چکا تھا۔ اُس نے اُس طوائف کو اُس کے گھر چھوڑا اور اُسی تانگے میں سیدھا لاریوں کے اڈے پر پہنچا اور ... ہو گیا۔

بجلی پہلوان

(۲۷ مئی ۵۴ء)

بجلی پہلوان کے متعلق بہت سی باتیں مشہور ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہ برق رفتار تھا۔ بجلی کے مانند اپنے دشمنوں پر گرتا تھا اور انہیں بھسم کر دیتا تھا ——— لیکن جب میں نے اُسے مغل بازار میں دیکھا تو وہ مجھے بے ضرر کدو کے مانند نظر آیا۔ بڑا پھسپھس سا۔ توند باہر نکلی ہوئی، بند بند ڈھیلے گال لٹکے ہوئے۔ البتہ اُس کا رنگ سرخ و سفید تھا۔

وہ مغل بازار میں ایک بزاز کی دکان پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ میں نے اُس کو غور سے دیکھا۔ مجھے اُس میں کوئی غنڈہ پن نظر نہ آیا۔ حالانکہ اس کے متعلق مشہور یہی تھا کہ ہندوؤں کا وہ سب سے بڑا غنڈہ ہے۔

وہ غنڈہ ہو ہی نہیں سکتا تھا، اس لئے کہ اُس کے خد و خال اس کی نفی کرتے تھے۔ میں تھوڑی دیر سامنے والی کتابوں کی دکان کے پاس کھڑا اُس کو دیکھتا رہا۔ اتنے میں ایک مسلمان عورت جو بڑی مفلس دکھائی دیتی تھی، بزاز کی دکان کے پاس پہنچی۔ بجلی پہلوان سے اُس نے کہا "مجھے بجلی پہلوان صاحب سے ملنا ہے"

بجلی پہلوان نے ہاتھ جوڑ کر اسے پرنام کیا۔ "ماتا، میں ہی بجلی پہلوان ہوں"

اُس عورت نے اُس کو سلام کیا "خدا تمہیں سلامت رکھے ——— میں نے سُنا ہے کہ تم بڑے دیالو ہو"

بجلی نے بڑی انکساری سے کہا۔ "ماتا، دیالو پرمیشور ہے ——— میں کیا دیا کر سکتا ہوں۔ لیکن تم مجھے بتاؤ کہ میں کیا سیوا کر سکتا ہوں"

"بیٹا، مجھے اپنی جوان لڑکی کا بیاہ کرنا ہے ——— تم اگر میری کچھ مدد کر سکو تو میں ساری عمر تمہیں دعائیں دوں گی"

بجلی نے اُس عورت سے پوچھا "کتنے روپوں میں کام چل جائے گا؟"

عورت نے جواب دیا "بیٹا، تم خود ہی سمجھ لو ——— میں تو ایک بھکارن بن کر تمہارے پاس آئی ہوں"

بجلی نے کہا "بھگوان نے مجھے کو ـــــ میرا فرض ہے کہ تمہاری مدد کروں" اس کے بعد اُس نے بزاز سے جو تھان تہہ کر رہا تھا کہا "لالہ جی ـــــ دو ہزار روپے نکالئے"

لالہ جی نے دو ہزار روپے فوراً اپنی صندوقچی سے نکالے اور گن کر بجلی پہلوان کو دے دیئے۔ یہ روپے اُس نے اُس عورت کو پیش کر دیئے "ماتا ـــــ بھگوان کرے کہ تمہاری بیٹی کے بھاگ اچھے ہوں"

وہ عورت چند لمحات کے لئے، نوٹ ہاتھ میں لئے بُت بنی کھڑی رہی۔ غالباً اُس کو اتنے روپے ایک دم مل جانے کی توقع ہی نہیں تھی۔ جب وہ سنبھل تو اُس نے بجلی پہلوان پر دعاؤں کی بوچھاڑ کر دی۔ میں نے دیکھا کہ پہلوان بڑی اُلجھن محسوس کر رہا تھا، آخر اُس نے اُس عورت سے کہا "ماتا، مجھے شرمندہ نہ کرو ـــــ جاؤ، اپنی بیٹی کے دان دہیز کا انتظام کرو ـــــ اُس کو میری اشیرباد دینا"

میں سوچ رہا تھا کہ یہ کس قسم کا غنڈہ اور بدمعاش ہے جو دو ہزار روپے ایک ایسی عورت کو جو مسلمان ہے اور جسے وہ جانتا ہی نہیں، دو ہزار روپے پکڑا دیتا ہے۔ لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ بڑا مخیر ہے۔ ہر مہینے ہزاروں روپے دان کے طور پر دیتا ہے۔

مجھے چونکہ اُس کی شخصیت سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اس لئے میں کافی چھان بین کے بعد بجلی پہلوان کے متعلق کچھ معلومات حاصل کیں۔ متل بازار کی اکثر دُکانیں اُس کی تھیں۔ حلوائی کی دکان ہے، بزاز کی دکان ہے، شربت بیچنے والا ہے، شیشے فروخت کرنے والا ہے۔ چھاپہ ہے۔ غرضیکہ اس سرے سے اُس سرے تک جہاں وہ بزاز کی دکان میں بیٹھتا تھا۔ اُس نے ایک "لائن آف کمیونکیشن" قائم کر رکھی تھی۔ تاکہ اگر پولیس چھاپہ مارنے کی غرض سے آئے تو اُسے فوراً اطلاع مل جائے۔

دراصل اس کی دو بیٹھکوں میں جو بزاز کی دکان کے بالکل سامنے تھیں، بہت بھاری جُوا ہوتا تھا۔ ہر روز ہزاروں روپے نال کی صورت میں اُسے وصول ہو جاتے تھے۔

وہ خود جُوا نہیں کھیلتا تھا۔ نہ شراب پیتا تھا۔ مگر اُس کی بیٹھکوں میں شراب ہر وقت مل سکتی تھی۔ اس سے بھی اُس کی آمدن کافی تھی۔

شہر کے جتنے بڑے بڑے غنڈے تھے، اُن کو اُس نے ہفتہ مقرر کر رکھا تھا، یعنی ہفتہ وار اُنھیں اُن کے مرتبے کے مطابق تنخواہ مل جاتی تھی۔ میرا خیال ہے، اُس نے یہ سلسلہ بطور حفظِ ماتقدم شروع کیا تھا کیونکہ وہ غنڈے بڑی خطرناک قسم کے تھے۔

جہاں تک مجھے یاد ہے کہ یہ غنڈے سب کے سب مسلمان تھے، زیادہ تر ہاتھی دروازے کے۔ ہر ہفتے بجلی پہلوان کے پاس جاتے اور اپنی تنخواہ وصول کرتے ـــــ وہ اُن کو کبھی ناامید نہ لوٹاتا، اس لئے کہ اُس کے پاس روپیہ عام تھا۔

میں نے سنا کہ ایک دن وہ بزاز کی دکان پر حسبِ معمول بیٹھا تھا کہ ایک ہندو بنیا جو کافی مالدار تھا، اُس کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی "پہلوان جی، میرا لڑکا خراب ہو گیا ہے ـــــ اُس کو ٹھیک کر دیجئے"

پہلوان نے مسکرا کر اُس سے کہا "میرے دو لڑکے ہیں ـــــ بہت شریف۔ لوگ مجھے غنڈہ اور بدمعاش کہتے ہیں، لیکن میں نے اُنھیں اس طرح پالا پوسا ہے کہ وہ کوئی بُری حرکت کر ہی نہیں سکتے۔ مہاشہ جی یہ آپ کا قصور ہے، آپ کے لڑکے کا نہیں"

بنیئے نے ہاتھ جوڑ کر کہا "پہلوان جی ـــــ میں نے بھی اُس کو اچھی طرح پالا پوسا ہے، پر اُس نے اب چوری چوری بہت بُرے کام شروع

سکتے ہیں:

بجلی نے اپنا فیصلہ سنا دیا: اس کی شادی کر دو۔

اس واقعہ کو دس برس گذر چکے تھے کہ بجلی پہلوان ایک نوجوان لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو گیا، حالانکہ اُس سے اس قسم کی کوئی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ لڑکی کی عمر سولہ سترہ برس سے کم نہ ہوگی اور بجلی پچاس سے اوپر ہوگا۔ آدمی با اثر اور مالدار تھا۔ لڑکی کے والدین راضی ہو گئے۔ چنانچہ شادی ہو گئی۔ اُس نے شہر کے باہر ایک عالیشان کوٹھی بنائی تھی۔ دولہن کو وہ جب اس میں لے کر گیا، تو اُسے ایسا محسوس ہوا کہ تمام جھاڑ اور فانوس ماند پڑ گئے ہیں۔

لڑکی بہت خوبصورت تھی۔ پہلی رات بجلی پہلوان نے کسرت کرنا چاہی، مگر نہ کر سکا۔ اس لئے اُس کے دماغ میں اپنی پہلی بیوی کا خیال کروٹیں لے رہا تھا۔ اُس کے دو جوان لڑکے تھے، جو اسی کوٹھی کے کسی کمرے میں سو رہے تھے، یا جاگ رہے تھے۔

اُس نے اپنی پہلی بیوی کو کہیں باہر بھیج دیا تھا۔ اُس کو اس کا قطعاً علم نہیں تھا کہ اُس کے پتی نے دوسری شادی کر لی ہے ——— بجلی پہلوان سوچتا تھا کہ کم سے کم اور کچھ نہیں تو اپنی پہلی استری کو مطلع ضرور کر دینا چاہیئے تھا۔

ساری رات نئی نویلی دولہن جس کی عمر سولہ سترہ برس کے قریب تھی، چپ چاپ پلنگ پر بیٹھی بجلی پہلوان کی اوٹ پٹانگ باتیں سنتی رہی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ شادی کیا ہے۔ کیا اُسے ہر روز ایسی قسم کی باتیں سننا ہوں گی۔

"کل میں تمہارے لئے دس ہزار کے زیور اور لا دوں گا۔"

"تم بڑی سندر ہو۔"

"ہیرے لوگی، یا پنّے؟"

"یہ سارا شہر سمجھو تمہارا ہے۔"

"یہ کوٹھی میں تمہارے نام لکھ دوں گا۔"

"کتنے نوکر چاہئیں تمہیں ——— مجھے بتاؤ، ایک منٹ میں انتظام ہو جائے گا۔"

"میرے دو جوان لڑکے ہیں، بہت شریف ——— تم ان سے جو کام لینا چاہو لے سکتی ہو۔ وہ تمہارا حکم مانیں گے۔"

دولہن ہر روز اسی قسم کی باتیں سنتی رہی۔ حتٰی کہ چھ مہینے گذر گئے۔ بجلی پہلوان دن بدن اُس کی محبت میں غرق ہوتا گیا۔ وہ اُس کے تیکھے تیکھے نقوش دیکھتا تو اپنی ساری پہلوانی بھول جاتا۔

اُس کی پہلی بیوی بدشکل تھی۔ ان معنوں میں کہ اُس میں کوئی کشش نہیں تھی۔ وہ ایک عام کھترانی تھی جو ایک بچہ جننے کے بعد ہی بوڑھی ہو جاتی ہے لیکن اُس کی یہ دوسری بیوی بڑی ٹھوس تھی۔ دس بچے پیدا کرنے کے بعد بھی وہ ثابت و سالم رہ سکتی تھی۔

بجلی پہلوان کا ایک وید دوست تھا۔ اُس کے پاس وہ کئی دنوں سے جا رہا تھا۔ اُس نے بجلی کو یقین دلایا کہ اب کسی قسم کے تردد کی ضرورت سب ٹھیک ہو جائے گا۔

پہلوان خوش تھا۔ وہ سکھ کے ہاں سے آتے ہوئے اُس نے کئی اسکیمیں تیار کیں۔ راستے میں مٹھائی خریدی۔ نیز دو بڑے بڑے خوشنما کپڑے لئے۔ قیصروں اور بار شلواروں کے لئے بہترین کپڑا قیمت ادا کئے بغیر حاصل کیا، اس لئے کہ وہ لوگ جو دکان کے مالک تھے اُس سے مرعوب تھے اور قیمت سے انکاری تھے۔

شام کو سات بجے وہ گھر پہنچا۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے کمرے میں گیا۔ دیکھا، تو وہاں اُس کی دوسری بیوی نہیں تھی۔ اُس نے سوچا، شاید غسل خانے میں ہوگی۔ چنانچہ اُس نے اپنا بوجھ، میرا مطلب ہے وہ تھان وغیرہ پلنگ پر رکھ کر غسل خانے کا رُخ کیا۔ مگر وہ خالی تھا!

بجلی پہلوان بڑا متحیر ہوا کہ اُس کی بیوی کہاں گئی۔ طرح طرح کے خیالات اُس کے دماغ میں آئے مگر وہ کوئی نتیجہ برآمد نہ کر سکا۔ اُس نے ویدکی بھنگ کی گولیاں کھائیں اور پلنگ پر بیٹھ گیا کہ اُس کی بیوی آجائے گی۔ آخر اُسے جانا کہاں ہے؟

وہ گولیاں کھا کر پلنگ پر بیٹھا، قیصروں کے کپڑوں کو انگلیوں میں مسل مسل کر دیکھ رہا تھا کہ اُسے اپنی بیوی کی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ وہ چونکا۔ فوراً اُس کمرے میں گیا جو اُس نے اپنے بڑے لڑکے کو دے رکھا تھا۔ اندر سے اُس کی بیوی اور اُس کے بیٹے کی ہنسی کی آواز نکل رہی تھی۔

اُس نے دستک دی ——— لیکن دروازہ نہ کھلا۔ پھر بڑے زور سے چلانا شروع کیا کہ دروازہ کھولو۔ اُس وقت اُس کا خون کھول رہا تھا۔ دروازہ پھر بھی نہ کھلا ——— اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کمرے کے اندر اُس کی بیوی اور اُس کے بڑے لڑکے نے سانس لینا بھی بند کر دیا ہے۔

بجلی پہلوان نے بڑے کمرے میں جا کر گورمکھی زبان میں ایک رُقعہ لکھا جس کی عبارت اُردو میں کچھ یوں ہو سکتی ہے:۔

"یہ کوٹھی اب تمہاری ہے ——— میری بیوی بھی اب تمہاری بیوی ہے۔ خوش رہو
——— تمہارے لئے کچھ تحفے لایا تھا، وہ یہاں چھوڑے جا رہا ہوں۔"

یہ رُقعہ لکھ کر اُس نے ساٹن کے تھان کے ساتھ ٹانک دیا۔

———— ——— ————

ایک زاہدہ، ایک فاحشہ

(۲۸ مئی ۴۵ء)

جاوید مسعود سے میرا اتنا گہرا دوستانہ تھا کہ میں ایک قدم بھی اس کی مرضی کے خلاف اٹھا نہیں سکتا تھا۔ وہ مجھ پر نثار تھا میں اس پر۔ ہم ہر روز قریب قریب دس بارہ گھنٹے ساتھ ساتھ رہتے۔

وہ اپنے رشتے داروں سے خوش نہیں تھا، اس لیے جب بھی وہ بات کرتا تو کبھی اپنے بڑے بھائی کی برائی کرتا اور کہتا سگ باش، برادر خورد مباش۔ اور کبھی کبھی گھنٹوں خاموش رہتا، جیسے خلا میں دیکھ رہا ہے۔ میں اس کے ان لمحات سے تنگ آکر جب زور سے پکارتا "جاوید، یہ بے ہودگی ہے۔"

وہ ایک دم چونکتا اور معذرت طلب کرتا "اوہ ―― سعادت بھائی، معاف کرنا ―― اچھا تو پھر کیا ہوا؟"

وہ اس وقت بالکل خالی الذہن ہوتا ―― میں کہتا "بھئی جاوید دیکھو ―― مجھے تمہارا یہ دفعتاً فوقتاً معلوم نہیں کن گہرائیوں میں کھو جانا پسند نہیں ―― مجھے تو ڈر لگتا ہے، ایک دن تم پاگل ہو جاؤ گے۔"

یہ سن کر جاوید بہت ہنسا "پاگل ہونا بہت مشکل ہے سعادت ――"

لیکن آہستہ آہستہ اس کا خلا میں دیکھنا بڑھتا گیا۔ اور اس کی خاموشی طویل سکوت میں تبدیل ہو گئی۔ اور وہ پیاری سی مسکراہٹ جو اس کے لبوں پر ہر وقت کھیلتی رہتی تھی، بالکل پھیکی پڑ گئی۔

میں نے ایک دن اس سے پوچھا "آخر بات کیا ہے ―― تم تصویر بانی بن گئے ہو ―― ہوا کیا ہے تمہیں؟ ―― میں تمہارا دوست ہوں خدا کے لیے مجھ سے تو اپنا راز نہ چھپاؤ۔"

جاوید خاموش رہا۔ جب میں نے اس کو بہت لعن طعن کی تو اس نے اپنی زبان کھولی "میں کالج سے فارغ ہو کر ڈیڑھ بجے کے قریب آؤں گا۔ آ

جو پوچھنا ہو گا، بتا دوں گا۔"

وعدے کے مطابق وہ ٹھیک ڈیڑھ بجے میرے یہاں آیا۔ وہ مجھ سے چار سال چھوٹا تھا۔ بے [illegible]۔ اُس میں نسوانیت کی جھلک تھی۔ مائی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اِس لئے میں آوارہ گرد تھا۔ لیکن وہ باقاعدگی کے ساتھ تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

میں اُس کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ جب میں نے اُس کو سگرٹ پیش کیا تو اُس نے مجھ سے کہا، "تم میرے روگ کے متعلق پوچھنا چاہتے تھے؟"

میں نے کہا، "مجھے معلوم نہیں ـــــ روگ ہے یا سوگ، بہرحال تم نارمل حالت میں نہیں ہو ـــــ تمہیں کوئی نہ کوئی ذہنی تکلیف ضرور ہے"

وہ مسکرایا۔ "ہے ـــــ اِس لئے کہ مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔"

محبت! ـــــ میں بوکھلا گیا ـــــ جاوید کی عمر بمشکل اٹھارہ برس کی ہو گی۔ خود ایک خوبرو لڑکی کے مانند۔ اُس کو کس لڑکی سے محبت ہو سکتی ہے، یا ہو گئی ہے۔ وہ تو کنواری لڑکیوں سے کہیں زیادہ شرمیلا اور لچکیلا تھا۔ وہ مجھ سے باتیں کرتا، تو مجھے یوں محسوس ہوتا کہ وہ ایک دہقانی دوشیزہ ہے جس نے پہلی دفعہ کوئی عشقیہ فلم دیکھا ہے۔ آج وہی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔

میں نے پہلے سمجھا شاید مذاق کر رہا ہے، مگر اُس کا چہرہ بہت سنجیدہ تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ فکر کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ آخر میں نے اُس سے پوچھا "کس لڑکی سے محبت ہوئی ہے تمہیں؟"

اُس نے کوئی جھجک محسوس نہ کی "ایک لڑکی ہے زاہدہ ـــــ ہمارے پڑوس میں رہتی ہے۔ بس اُس سے مجھے محبت ہو گئی ہے۔ عمر سولہ برس کے قریب ہے، بہت خوبصورت ہے، اور بھولی بھالی ـــــ چوری چھپے اُس سے کئی ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔ اُس نے میری محبت قبول کر لی ہے۔"

میں نے اُس سے پوچھا، "تو پھر اِس اُداسی کا مطلب کیا ہے جو تم پہ ہر وقت چھائی رہتی ہے؟"

اُس نے مسکرا کر کہا، "سعادت، تم نے کبھی محبت کی ہو تو جانو ـــــ محبت اُداسی کا دوسرا نام ہے ـــــ ہر وقت آدمی کھویا کھویا سا رہتا ہے، اِس لئے کہ اُس کے دل و دماغ میں صرف خیالِ یار ہوتا ہے ـــــ میں نے زاہدہ سے تمہارا ذکر کیا اور اُس سے کہا کہ تمہارے بعد اگر کوئی ہستی مجھے عزیز ہے تو وہ میرا دوست سعادت ہے۔"

"یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"بس، میں نے کہہ دیا ـــــ اور زاہدہ نے بڑا اشتیاق ظاہر کیا کہ میں تمہیں اُس سے ملاؤں۔ تمہیں میری وہ چیز پسند ہے جسے میں پسند کرتا ہوں ـــــ بولو، چلو گے اپنی بھابی کو دیکھنے؟"

میری سمجھ میں نہ آیا کہ اُس سے کیا کہوں۔ اُس کے پتلے پتلے نازک ہونٹوں پہ لفظ بھابی سجتا نہیں تھا۔

"میری بات کا جواب دو۔"

میں نے سرسری طور پہ کہہ دیا، "چلیں گے ـــــ ضرور چلیں گے ـــــ پر کہاں؟"

"اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ کل شام کو پانچ بجے کسی بہانے سے لارنس گارڈن آئے گی ـــــ آپ اپنے پیارے دوست کو ضرور ساتھ لائیے گا ـــــ اب تم کل تیار رہنا ـــــ بلکہ خود ہی پانچ بجے سے پہلے پہلے وہاں پہنچ جانا۔ ہم جم خانہ کلب کے اِس طرف لان میں تمہارا انتظار کرتے

سکے :

میں انکار کیسے کرسکتا، اس لئے کہ مجھے جاوید سے بے حد پیار تھا۔ میں نے وعدہ کر لیا۔ لیکن مجھے اُس پر کچھ ترس آ رہا تھا۔ میں نے اُس سے اچانک پوچھا۔ "لڑکی شریف اور پاکباز ہے نا؟"

جاوید کا چہرہ غصے سے تمتمانے لگا۔ "میں زاہدہ کے بارے میں ایسی باتیں سوچ سکتا ہوں، نہ سُن سکتا ہوں ——— تمہیں اگر اُس سے ملنا ہے تو کل شام کو ٹھیک پانچ بجے لارنس گارڈن پہنچ جانا ——— خدا حافظ۔"

جب وہ ایک دم اُٹھ کر چلا گیا، تو میں نے سوچنا شروع کیا۔ مجھے بڑی ندامت محسوس ہوئی کہ میں نے کیوں اُس سے ایسا سوال کیا، جس سے اُس کے جذبات مجروح ہوئے ——— آخر وہ اُس سے محبت کرتا تھا۔ اگر کوئی لڑکی کسی سے محبت کرے تو ضروری نہیں کہ وہ بدکردار ہو۔

جاوید اُسے اپنا مخلص ترین دوست خیال کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ناراضی کے باوجود اُس سے برہم نہ ہوا اور اُس کو جاتے ہوئے کہہ گیا کہ وہ شام کو لارنس گارڈن آ جائے۔

میں سوچتا تھا کہ زاہدہ سے مل کر میں اُس سے کس قسم کی باتیں کروں گا۔ بے شمار باتیں میرے ذہن میں آئیں، لیکن وہ اِس قابل نہیں تھیں کہ کسی دوست کی محبوبہ سے کی جائیں۔ میرے متعلق خدا معلوم وہ اُس سے کیا کچھ کہہ چکا تھا ——— یقیناً اُس نے مجھ سے اپنی محبت کا اظہار بڑے والہانہ طور پر کیا ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زاہدہ کے دل میں میری طرف سے حسد پیدا ہو گیا ہو، کیونکہ عورتیں اپنے عاشقوں کی محبت بٹتے نہیں دیکھ سکتیں۔ شاید میرا مذاق اُڑانے کے لئے اُس نے جاوید سے کہا ہو کہ تم مجھے اپنے پیارے دوست سے ضرور ملاؤ۔

یہ خیال مجھے اپنے عزیز ترین دوست کی محبوبہ سے ملنا تھا ——— اِس تقریب پر میں نے سوچا کوئی تحفہ تو لے جانا چاہیئے ——— رات بھر غور کرتا رہا۔ آخر ایک تحفہ سمجھ میں آیا کہ سونے کے ٹاپس ٹھیک رہیں گے۔ انارکلی میں گیا تو سب دکانیں بند۔ معلوم ہوا کہ اتوار کی تعطیل ہے ——— لیکن ایک جوہری کی دکان کھلی تھی۔ اُس سے ٹاپس خریدے اور واپس گھر آیا۔ چار بجے تک کشمکش و پیچ میں مبتلا رہا کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ مجھے کچھ حجاب سا محسوس ہوتا ہے ——— لڑکیوں سے بے تکلف باتیں کرنے کا عادی نہیں تھا، اس لئے مجھ پر گھبراہٹ کا عالم طاری تھا۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں نے کچھ دیر سونا چاہا، مگر کروٹیں بدلتا رہا۔ ٹاپس میرے تکیئے کے نیچے پڑے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ دہکتے ہوئے انگارے ہیں ——— اُٹھا۔ ——— غسل کیا۔ اس کے بعد شیو ——— پھر نہایا اور کپڑے بدل کر ڈیڑھ بجے میں کلاک کی ٹک ٹک سُننے لگا۔

تین بج چکے تھے۔ اخبار اُٹھایا ——— مگر اُس کی ایک خبر بھی نہ پڑھ سکا ——— عجب مصیبت تھی۔ عشق میرا دوست جاوید کر رہا تھا اور میں ایک قسم کا مجنوں بن گیا تھا۔

میرا بہترین سُوٹ، دُھلی کا سلا ہوا میرے بدن پر تھا۔ رومال نیا۔ شوز بھی نئے ——— میں نے یہ سنگھار اس لئے کیا تھا کہ جاوید نے جو تعریف کے پُل زاہدہ کے سامنے باندھے ہیں، کہیں ٹوٹ نہ جائیں۔

ساڑھے چار بجے میں اُٹھا۔ اپنی ریلے کی سبز سائیکل لی اور آہستہ آہستہ لارنس گارڈن روانہ ہو گیا۔ جم خانہ کلب کے اس طرف لان میں مجھے جاوید دکھائی دیا۔ وہ اکیلا تھا۔ اُس نے زور کا نعرہ بلند کیا۔ میں جب سائیکل پر سے اُترا تو وہ میرے ساتھ چمٹ گیا۔ کہنے لگا "تم پہلے ہی پہنچ گئے۔ بہت اچھا کیا۔

زاہدہ اب آتی ہی ہوگی ـــ میں نے تو اُس سے کہا تھا کہ میں اپنی کار بھیجونگا۔ مگر وہ رضامند نہ ہوئی۔ "تانگے میں آئے گی"

جاوید کے باپ کی ایک کار تھی۔ بے بی آسٹن، خدا معلوم کس صدی کا موڈل تھا۔ زیادہ تر یہ جاوید ہی کے استعمال میں آتی تھی۔ لارنس گارڈنز میں داخل ہوتے وقت یہ مجھ پر روزگار مرتبہ کھیلی تھی۔ میں نے اُس سے کہا "آؤ بیٹھ بیٹھیں"

لیکن وہ رضامند نہ ہوا، مجھ سے کہنے لگا "تم ایسا کرو ـــ باہر گیٹ پر جاؤ ـــ ایک تانگہ آئے گا، جس میں ایک دُبلی پتلی لڑکی سیاہ بُرقع پہنے ہوگی۔ تم تانگے والے کو ٹھہرا لینا اور اُس سے کہنا۔ میں جاوید کا دوست سعادت ہوں ـــ اُس نے مجھے تمہارے استقبال کے لئے بھیجا ہے"

"نہیں جاوید ـــ مجھ میں اتنی جرأت نہیں"

"لاحول ولا ـــ جب تم نام بتا دو گے تو اُسے چوں کرنے کی بھی جرأت نہیں ہوگی ـــ تمہاری جرأت کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے ـــ یار، زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسی چیز ہونی چاہیئے جسے بعد میں یاد کرکے آدمی محظوظ ہوسکے ـــ جب زاہدہ سے میری شادی ہوجائیگی تو ہم آج کے اس واقعے کو یاد کرکے خوب ہنسا کریں گے ـــ جاؤ میرے بھائی ـــ وہ بس اب آتی ہی ہوگی"

میں جاوید کا کہنا کیسے موڑ سکتا تھا۔ بادلِ ناخواستہ چلا گیا اور گیٹ سے کچھ دُور کھڑا رہ کر اُس تانگے کا انتظار کرنے لگا، جس میں زاہدہ اکیلی کالے برقعے میں ہو۔

آدھے گھنٹے کے بعد ایک تانگہ اندر داخل ہُوا، جس میں ایک لڑکی کالے ریشمی برقعے میں ملبوس پچھلی نشست پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھی تھی۔

میں جھینپتا، سمٹتا، ڈرتا، آگے بڑھا اور تانگے والے کو روکا۔ اُس نے فوراً اپنا تانگہ روک لیا۔ میں نے اُس سے کہا "یہ سواری کہاں سے آئی ہے؟"

تانگے والے نے ذرا سختی سے جواب دیا "تمہیں اس سے کیا مطلب ـــ جاؤ اپنا کام کرو"

برقع پوش لڑکی نے مہین سی آواز میں تانگے والے کو ڈانٹا "تم شریف آدمیوں سے بات کرنا بھی نہیں جانتے"

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی "آپ نے تانگہ کیوں روکا تھا جناب"

میں نے ہکلا کے جواب دیا "جاوید ـــ جاوید ـــ میں جاوید کا دوست سعادت ہوں ـــ آپ کا نام زاہدہ ہے نا"

اُس نے بڑی نرمی سے جواب دیا "جی ہاں! ـــ میں آپ کے متعلق اُن سے بہت سی باتیں سُن چکی ہوں"

"اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ سے اِسی طرح ملوں اور دیکھوں کہ آپ مجھ سے کس طرح پیش آتی ہیں ـــ وہ اُدھر جم خانہ کلب کے پاس گھاس کے تختے پہ بیٹھا آپ کا انتظار کررہا ہے"

اُس نے اپنی نقاب اُٹھائی۔ اچھی خاصی شکل صورت تھی۔ مسکرا کر مجھ سے کہا "آپ اگلی نشست پر بیٹھ جائیے ـــ مجھے ایک ضروری کام ہے ـــ ابھی چند منٹوں میں لوٹ آئیں گے۔ آپکے دوست کو زیادہ دیر تک گھاس پر نہیں بیٹھنا پڑے گا"

میں انکار نہیں کرسکتا تھا۔ اگلی نشست پر کوچوان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ تانگہ اسمبلی ہال کے پاس سے گزرا تو میں نے تانگے والے سے کہا "بھائی صاحب یہاں کوئی سگرٹ والے کی دکان ہو تو ذرا دیر کے لئے ٹھہر جانا۔ میرے سگرٹ ختم ہوگئے ہیں۔"

ذرا آگے بڑھے تو سڑک پر ایک سگرٹ پان والا بیٹھا تھا۔ تانگے والے نے اپنا تانگہ روکا۔ میں اُترا، تو زاہدہ نے کہا، "آپ کیوں تکلیف کرتے

یہ تانگے والے لے آئے گا۔"

میں نے کہا۔ "اس میں تکلیف کی کیا بات ہے۔" وہ اس پان سگرٹ والے کے پاس پہنچ گیا۔ ایک ڈبیہ گولڈ فلیک کی لی۔ ایک ماچس اور دو پان۔ جب پانچ کے نوٹ سے باقی پیسے لے کر مڑا تو کوچوان میرے پیچھے کھڑا تھا۔ اس نے دبی زبان میں مجھ سے کہا۔ "حضور، اس عورت سے بچ کر رہیے گا۔"

میں بڑا حیران ہوا۔ "کیوں؟"

کوچوان نے بڑے وثوق سے کہا "فاحشہ ہے ——— اس کا کام ہی یہی ہے کہ شریف اور نوجوان لڑکوں کو پھانستی ہے ——— میرے تانگے میں اکثر بیٹھتی ہے۔"

یہ سن کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میں نے تانگے والے سے "خدا کے لئے تم اسے وہیں چھوڑ آؤ جہاں سے لائے ہو ——— کہہ دینا کہ میں اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتا۔ اس لئے کہ میرا دوست وہاں لارنس گارڈنز میں انتظار کر رہا ہے۔"

تانگے والا چلا گیا ——— معلوم نہیں اس نے زاہدہ سے کیا کہا۔ میں نے ایک دوسرا تانگہ لیا اور سیدھا لارنس گارڈنز پہنچا۔ دیکھا کہ جاوید ایک خوبصورت لڑکی سے محو گفتگو ہے۔ بڑی شرمیلی اور لجیلی تھی۔ میں جب پاس آیا تو اس نے فوراً اپنے دوپٹے سے منہ چھپا لیا۔

جاوید نے بڑی خفگی آمیز لہجے میں مجھ سے کہا "تم کہاں غارت ہو گئے تھے ——— تمہاری بھابی کب کی آئی بیٹھی ہیں۔"

سمجھ میں نہ آیا کیا کہوں۔ بہت بوکھلایا ——— اسی بوکھلاہٹ میں یہ کہہ گیا "تو وہ کون تھیں جو مجھے تانگے میں ملیں؟"

جاوید ہنسا "مذاق نہ کرو بھئی ——— بیٹھ جاؤ اور اپنی بھابی سے باتیں کرو۔ یہ تم سے ملنے کی بہت مشتاق تھیں۔"

میں بیٹھ گیا اور کوئی سلیقے کی بات نہ کر سکا۔ اس لئے کہ میرے دل و دماغ پر وہ لڑکی یا عورت مسلط ہو گئی تھی جس کے متعلق تانگے والے نے مجھے بڑے خلوص سے بتا دیا تھا کہ فاحشہ ہے۔

شیدا

(۳۰ مئی ۵۴ء)

شیدے کے متعلق امرتسر میں یہ مشہور تھا کہ وہ چٹان سے بھی ٹکر لے سکتا ہے۔ اُس میں بلا کی پھرتی اور طاقت تھی۔ گو تن و توش کے لحاظ سے وہ ایک کمزور انسان دکھائی دیتا تھا، لیکن امرتسر کے سارے غنڈے اُس سے خوف کھاتے اور اُس کو احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔

فرید کا چوک، معلوم نہیں فسادات کے بعد اُس کی کیا حالت ہے، عجیب و غریب جگہ تھی۔ یہاں شاعر بھی تھے۔ ڈاکٹر اور حکیم بھی، مرچی اور جلاہے، جواری اور بدمعاش، نیک اور پرہیزگار سبھی یہاں بستے تھے۔ ہر وقت گہما گہمی رہتی تھی۔

شیدے کی سرگرمیاں چوک سے باہر ہوتی تھیں، یعنی وہ اپنے علاقے میں کوئی ایسی حرکت نہیں کرتا تھا، جس پر اُس کے محلے والوں کو اعتراض ہو — اُس نے جتنی لڑائیاں لڑیں، دوسرے غنڈوں کے محلے میں۔

وہ کہا کرتا تھا "اپنے محلے میں کسی دوسرے محلے کے غنڈے سے لڑنا نامردی کی نشانی ہے — مزا تو یہ ہے کہ دشمن کو اُس کی اپنی جگہ پچھاڑا جائے"

اور یہ صحیح تھا۔ ایک بار پہلوانوں سے اُس کی ٹھن گئی۔ وہ کئی مرتبہ چوک فرید سے گزرے — بڑھکیں مارتے، نعرے لگاتے، شیدے کو گالیاں دیتے۔ وہ یہ سب سن رہا تھا، مگر اُس نے اُن سے بھڑنا مناسب نہ سمجھا اور خاموش رحمان نانبائی کی دکان میں بیٹھا رہا۔

لیکن دو گھنٹوں کے بعد وہ پہلوانوں کے محلے کی طرف روانہ ہوا۔ اکیلا — بالکل اکیلا اور پھر غیر مسلح۔

وہاں جا کر اُس نے ایک فلک شگاف نعرہ بلند کیا اور پہلوانوں کو جو اپنے کام میں مصروف تھے للکارا "نکلو باہر — تمہاری ....."

دس پندرہ پہلوان لاٹھیاں لے کر باہر نکل آئے اور جنگ شروع ہو گئی۔ میرا خیال ہے، شیدا گتکے اور بنوٹ کا ماہر تھا۔ اُس پر لاٹھیاں برسائی گئیں، لیکن اُس نے ایک بھی ضرب اپنے پر نہ لگنے دی۔ ایسے پینترے بدلتا رہا کہ پہلوانوں کی سٹی گم ہو گئی۔

آخر اُس نے ایک پہرہ دار سے بڑی چابکدستی سے لاٹھی چھینی اور حملہ آوروں کو مار مار کے ادھ موا کر دیا۔
دوسرے روز اسے گرفتار کر لیا گیا ——— دو برس قید با مشقت کی سزا ہوئی۔ وہ جیل چلا گیا، جیسے وہ اُس کا اپنا گھر ہے۔
اِس دوران میں اُس کی بوڑھی ماں وقتاً فوقتاً ملاقات کے لئے آتی رہی۔
وہ مشقت کرتا تھا، لیکن اُسے کوئی کوفت نہیں ہوتی تھی۔ وہ سوچتا تھا کہ چلو ورزش ہو رہی ہے، صحت ٹھیک رہے گی۔
اُس کی صحت، باوجود اس کے کہ کھانا بڑا واہیات ہوتا تھا، پہلے سے بہتر تھی۔ اُس کا وزن بڑھ گیا تھا۔ لیکن وہ بعض اوقات مغموم ہو جاتا اور اپنی کوٹھڑی میں ساری رات جاگتا رہتا۔ اُس کے ہونٹوں پر پنجابی کی یہ بولی ہوتی ؎

کی کھیے تیری یاری
مہناں مہناں ہو کے ٹٹ گئی

ایک برس گذر گیا مشقت کرتے کرتے ——— اب اُس کی افسردگی کا دور شروع ہوا۔ اُس نے مختلف بولیاں گانا شروع کر دیں۔ مجھے ایک قیدی نے بتایا جو اس کے ساتھ والی کوٹھڑی میں تھا کہ وہ یہ بولیاں گایا کرتا تھا ؎

بہہ جا ویں گے یار لبھ کے
ٹھیکرے تے پتناں دے

اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے اپنا گم شدہ محبوب مل جائے گا اگر تو مدتوں کے ساحل پر ٹھیکریاں چلانے والے ٹھیکرے لے۔

گڈی کٹ جاندی جنھاں دی پیچ والی
منڈے لے جاندے اونھاں دی ڈور لٹ کے

یعنی جن کی محبت کا پتنگ کٹ جاتا ہے تو لڑکے بالے بڑا شور مچاتے ہیں اور اُن کی ڈور لوٹ کر لے جاتے ہیں۔
میں اب اور بولیوں کا ذکر نہیں کروں گا کیونکہ اُن سب کا جو رشید کے ہونٹوں پر ہوتی تھیں، ایک ہی قسم کا مفہوم ہے۔
اُس قیدی نے مجھ سے کہا "ہم سمجھ گئے تھے کہ رشید کسی کے عشق میں گرفتار ہے ——— کیونکہ ہم نے کئی مرتبہ اسے آہیں بھرتے بھی دیکھا۔ مشقت کے دوران میں وہ بالکل خاموش رہتا۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ کسی اور دنیا کی سیر کر رہا ہے ——— تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد ایک لمبی آہ بھرتا اور پھر اپنے خیالات میں کھو جاتا۔"
ڈیڑھ برس کے بعد جب رشید نے خودکشی کا ارادہ کر چکا تھا، اور کوئی ایسی ترکیب سوچ رہا تھا کہ اپنی زندگی ختم کر دے کہ اسے اطلاع ملی کہ ایک جوان لڑکی تم سے ملنے آئی ہے۔ اُس کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ جوان لڑکی کون ہو سکتی ہے۔ اُس کی تو صرف ماں ہی ماں تھی جو اس سے اپنی ممتا کے باعث ملنے آیا کرتی تھی۔
ملاقات کا انتظام ہوا۔ رشید سلاخوں کے پیچھے کھڑا تھا۔ اُس کے ساتھ مسلح سپاہی۔ لڑکی کو بلایا گیا۔ رشید نے سلاخوں میں سے دیکھا کہ ایک برقع پوش عورت آہنی پنجرے کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اُس کو ابھی تک یہ حیرت تھی کہ یہ عورت یا لڑکی کون ہو سکتی ہے۔

سفید ہو گئی تھی۔ جب وہ پاس آئی تو اس نے نقاب اٹھائی ——— "شیدا چچا! تم ——— تم کیسے ......"

زلیخا جو کچھ عرصے سے گھروں کی نوکرانی تھی، زار و قطار رونے لگی۔ اُس کے حلق میں لفظ اٹک اٹک گئے "میں تم سے ملنے آئی ہوں ——— لیکن مجھے ——— مجھے معاف کر دینا اتنی دیر کے بعد آئی ہوں ——— تم ——— خدا معلوم ——— اپنے دل میں میرے متعلق کیا سوچتے ہو گے "

شیدے نے سلاخوں کے ساتھ سر لگا کر کہا "نہیں میری جان ——— میں تمہارے متعلق سوچتا ضرور رہا ——— لیکن میں جانتا تھا کہ تم مجبور ہو"

زلیخا نے روتے ہوئے کہا "میں واقعی مجبور تھی ——— لیکن آج مجھے موقع ملا تو میں آ گئی۔ سچ کہتی ہوں میرا دل کسی چیز میں نہیں لگتا تھا"

"یہ موقع تمہیں کیسے مل گیا؟"

زلیخا کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے "میرے ابا کا انتقال ہو گیا ہے۔ کل اُن کا چالیسواں تھا"

شیدا مرحوم سے اپنی ساری مخاصمت بھول گیا "خدا انہیں جنت بخشے ——— مجھے یہ خبر سن کر بڑا افسوس ہوا" یہ کہتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے "صبر کرو زلیخا ——— اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں"

زلیخا نے اپنے سفید برقعے سے آنسو پونچھے "میں نے بہت صبر کیا ہے شیدے، اب اور کتنی دیر کرنا پڑے گا ——— تم یہاں سے کب نکلو گے؟"

"بس کچھ مہینے رہ گئے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے بہت پہلے ہی چھوڑ دیں گے۔ یہاں کے سب افسر مجھ پر مہربان ہیں ———"

زلیخا کی آواز میں محبت کا بے پناہ جذبہ پیدا ہو گیا "جلدی آؤ پیارے ——— مجھے اب تمہاری ہونے سے روکنے والا کوئی نہیں۔ خدا کی قسم جو کسی نے تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو میں خود اُس سے نپٹ لوں گی ——— میں نہیں چاہتی کہ تم پھر ایسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ"

سنتری نے کہا وقت ختم ہو گیا۔ چنانچہ اُن کی ملاقات بھی ختم ہو گئی۔ زلیخا روتی روتی چلی گئی۔ اور شیدا دل میں مسرت اور آنکھوں میں آنسو لئے جیل کے اندر چلا گیا، جہاں اُس کو مشقت کرنا تھی۔ اُس دن اُس نے اتنا کام کیا کہ جیلر دنگ رہ گئے۔

دو مہینوں کے بعد اُسے رہا کر دیا گیا ——— اس دوران میں زلیخا دو مرتبہ اُس سے ملاقات کرنے آئی تھی۔ اُس نے آخری ملاقات میں اس کو بتا دیا تھا کہ وہ کس تاریخ کو جیل سے باہر نکلے گا۔ چنانچہ وہ گیٹ کے پاس برقع پہنے کھڑی تھی۔ دونوں فرطِ مسرت میں آنسو بہانے لگے۔

شیدے نے تانگہ لیا۔ دونوں اس میں سوار ہوئے اور شہر کی جانب چلے۔ لیکن شیدے کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ زلیخا کو کہاں لے جائے گا۔

"کیا تمہیں کہاں جانا ہے؟" زلیخا نے جواب دیا "مجھے معلوم نہیں ——— تم جہاں لے جاؤ گے، وہیں چلی جاؤں گی"

شیدے نے کچھ دیر سوچا اور زلیخا سے کہا "نہیں ——— یہ ٹھیک نہیں۔ تم اپنے گھر جاؤ ——— دنیا مجھے غنڈہ کہتی ہے، لیکن میں تمہیں جائز طریقے پر حاصل کرنا چاہتا ہوں ——— تم سے باقاعدہ شادی کروں گا"

زلیخا نے پوچھا "کب؟"

"بس ایک دو مہینے لگ جائیں گے ——— میں اپنی چوٹ کی بیٹھک پھر سے قائم کروں۔ اس عرصے میں اتنا روپیہ اکٹھا ہو جائے گا کہ میں تمہارے لئے زیور کپڑے خرید سکوں ———"

زلیخا بہت متاثر ہوئی "تم کتنے اچھے ہو شیدے ——— جتنی دیر تم کہو گے، میں اس گھڑی کے لئے انتظار کروں گی جب میں تمہاری ہو جاؤں گی"

شیدا جذباتی ہو گیا "جانِ من! اب بھی میری ہو ——— میں بھی تمہارا ہوں ——— لیکن میں چاہتا ہوں، جو کام ہو خوبصورت طریقے سے ہو ——— میں اُن لوگوں سے نہیں ہوں، جو مردوں کی جوان کنواری لڑکیوں کو ورغلا کر خراب کرتے ہیں ——— مجھے تم سے محبت ہے جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ تمہاری خاطر میں نے مار کھائی اور قریب قریب دو برس جیل میں کاٹے ——— خداوند پاک کی قسم کھا کے کہتا ہوں، ہر وقت میرے ہونٹوں پہ تمہارا نام رہتا تھا"

زلیخا نے کہا "میں نے کبھی نماز نہیں پڑھی تھی، لیکن تمہارے لئے میں نے ایک مسلانی سے سیکھی اور بلا ناغہ پانچوں وقت پڑھتی رہی ——— ہر نماز کے بعد دعا مانگتی کہ خدا انہیں ہر آفت سے محفوظ رکھے"

شیدے نے شہر پہنچتے ہی دوسرا تانگہ لیا اور زلیخا سے جدا ہو گیا، تاکہ وہ اپنے گھر جائے اور وہ اپنے۔

شیدے نے ڈیڑھ ماہ کے اندر اندر ایک ہزار روپے پیدا کر لئے۔ اس سے اس نے زلیخا کے لئے سونے کی چوڑیاں اور انگوٹھیاں بنوائیں گلے کے لئے ایک نیکلس بھی لیا ——— اب وہ پہلی طرح بیکار نہیں تھا۔

ایک دن وہ اپنے گھر میں اوپر برجی پر بیٹھا کھانا کھانے لگا تھا کہ نیچے سے کسی عورت کے بین کرنے جیسی آواز آئی۔ وہ اسے پکار رہی تھی اور ساتھ ساتھ کوسنے بھی دے رہی تھی۔

شیدے نے اٹھ کر کھڑکی میں سے نیچے جھانکا، تو ایک بڑھیا تھی، جو اس کے محلے کی نہیں تھی۔ اس نے گردن اٹھا کر اوپر دیکھا اور پوچھا "کیا تم ہی شیدے ہو؟"

"ہاں ہاں"

"خدا کرے تم پر اس دنیا کے تختے پر ——— تمہاری جوانی ٹوٹے ——— تم پر بجلی گرے"

شیدے نے کسی قدر غصے میں اس بڑھیا سے پوچھا "بات کیا ہے؟"

بڑھیا کا لہجہ اور زیادہ تلخ ہو گیا "میری بچی تم پر جان چھڑکے اور تمہیں کچھ پتا ہی نہیں"

شیدے نے حیرت سے اس بڑھیا سے سوال کیا "کون ہے تمہاری بچی؟"

"زلیخا اور کون؟"

"کیوں کیا ہوا اُس کو؟"

بڑھیا رونے لگی "وہ تم سے ملتی تھی، تم غنڈے ہو، اس لئے ایک تھانیدار نے زبردستی اُس کے ساتھ اپنا منہ کالا کیا"

شیدے کے ہوش و حواس ایک لمحے کے لئے غائب ہو گئے، مگر سنبھل کر اس نے بڑھیا سے پوچھا "کیا نام ہے اس تھانیدار کا؟"

بڑھیا کانپ رہی تھی "کرم داد ——— تم یہاں اوپر مزے میں بیٹھے ہو۔ بہت بڑے غنڈے بنے پھرتے ہو ——— اگر تم میں ہمت ہے

غیرت ہے، تو جاؤ اور اس تھانیدار کا سر گنڈاسے سے کاٹ کے رکھ دو۔"

شیدا نے کچھ نہ کہا۔ کھڑکی سے ہٹ کر اس نے بڑے اطمینان سے کھانا کھایا۔ پیٹ بھر کے۔ دو گلاس پانی کے پئے اور ایک کونے میں رکھی کلہاڑی لے کر باہر چلا گیا۔

ایک گھنٹے کے بعد اس نے زلیخا کے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ وہی بڑھیا باہر نکلی ——— شیدے کے ہاتھ میں خون آلود کلہاڑی تھی۔ اس نے بڑے پرسکون لہجے میں اس سے کہا: "ماں ——— جو کام تم نے مجھ سے کہا تھا کر آیا ہوں ——— زلیخا سے میرا سلام کہنا ——— میں اب چلتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ سیدھا کوتوالی گیا اور خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔

بُڈھا کھوسٹ

(۳۱ مئی ۵۴ء)

یہ جنگِ عظیم کے زمانے کی بات ہے جب میرا عزیز ترین دوست لفٹننٹ کرنل محمد سلیم شیخ (اب) ایران، عراق اور دوسرے محاذوں سے ہوتا ہوا، بمبئی پہنچا۔ اُس کو اچھی طرح معلوم تھا، میرا ٹھکانا کہاں ہے۔ ہم میں گاہے گاہے خط و کتابت بھی ہوتی رہتی تھی۔ لیکن اس سے کچھ مزا نہیں آتا تھا، اس لئے کہ ہر خط سنسر ہوتا ہے۔ ادھر جائے یا ادھر سے آئے۔ عجب مصیبت تھی۔

مگر اب ان مصیبتوں کا ذکر کیا کرنا۔ اُسے بمبئی کے بی۔ بی اینڈ سی۔ آئی۔ اے کے ڈیفینس پر اُس کی پوسٹنگ ہوئی۔ اُس وقت وہ صرف لفٹننٹ تھا۔ ہم دونوں وکٹوریہ ریلوے اسٹیشن کے 'بوفے' میں بیٹھ گئے اور دوپہر کے بارہ ایک بجے تک ٹھنڈی ٹھنڈی بیئر پیتے رہے۔ اُس نے اس دوران میں مجھے کئی کہانیاں سنائیں۔ جن میں سے ایک خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

اُس نے ایران، عراق اور خدا معلوم کن کن ملکوں کے اپنے معاشقے سنائے۔ میں سنتا رہا۔ پیشہ ور عاشق تو کالج کے زمانے سے تھا۔ اس کی داستانیں اگر میں سناؤں تو ایک ضخیم کتاب بن جائے۔ بہرحال آپ کو اتنا بتانا ضروری ہے کہ اُسے لڑکیوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا گُر معلوم تھا۔

گورڈن کالج راولپنڈی میں وہ راجہ اندر تھا۔ اُس کے دربار میں وہاں کی تمام پریاں مجرا عرض کرتی تھیں ——— خوبصورت تھا۔ کافی خوبصورت مگر اُس کا حُسن مردانہ حسن تھا۔ پتلی نوکیلی ناک جو یقیناً اپنا کام کر جاتی ہوگی۔ چھوٹی چھوٹی گہرے بھورے رنگ کی آنکھیں جو اُس کے چہرے پر لگی تھیں بڑی ہوتیں تو شاید اس کے چہرے کی ساری کشش ماری جاتی۔

وہ کھلنڈرا تھا جس طرح لارڈ بائرن صرف کچھ عرصے کے لئے کسی سے دلچسپی لیتا تھا اور پھر اُسے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا، جیسے وہ اُس کی زندگی میں کبھی آئی ہی نہیں، اسی طرح کا سلوک وہ اپنے جال میں پھنسی ہوئی لڑکیوں سے کرتا۔ مجھے اُس کا یہ رویّہ پسند نہیں تھا کہ یہ میری نظر میں بہت ظالمانہ ہے۔ مگر وہ بے پروا تھا۔ کہا کرتا، "اُڑتے کے پیچھے ——— غالب پر مرو وہ کیا کہتا ——— اُسے متن یاد کبھی نہیں رہتا تھا، مگر اُس کا مفہوم اپنے الفاظ

ا کر دیا کرتا ـــــ وہ کہتا ہے، وہی شاخِ طوبیٰ اور جنت میں وہی ایک حور ـــــ واللہ زندگی اجیرن ہو جائے گی ـــــ شہد کی مکھی بنو، کار میں چھپ ـــــ مگر کسی مصری کی نہ بنو، جو وہیں چپک کر رہ جائے" پھر اس نے اقبال کے ایک شعر کا حوالہ اپنا بیئر کا گلاس خالی کرتے ہوئے دیا ملہ ہے اقبال نے ــــ

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی تھا

ت ہوا کہ تم نہ صرف ناداں ہو، بلکہ درجہ اوّل بنا سپتی گھی کی طرح درجہ اوّل چغد بھی ہو ـــــ اب ہٹاؤ اس بکواس کو"

میں نے یہ بکواس اس طرح ہٹائی جس طرح بیرے نے میری بیئر کی خالی بوتل۔

پیشتر اس کے کہ میں اصل کہانی کی طرف آؤں، میں آپ کو شیخ سلیم سے متعلق ایک بہت دلچسپ واقعہ سناتا ہوں۔ ہم گورڈن کالج میں بی، اے ل میں پڑھتے تھے کہ کرسمس کی چھٹیوں میں ایک رکمنی کی شادی کی اُڑتی اُڑتی افواہ ہمیں ملی۔ یہ رکمنی ہماری ہی کسی کلاس میں پڑھتی تھی اور کچھ عرصہ پہلے طرح شیخ سلیم پر فریفتہ۔ شکل صورت اس کی واجبی تھی، مگر بیر اہوسنے شہد کی مکھی تھا، چنانچہ دو مہینے ان کا معاشقہ چلتا رہا۔ اس کے بعد وہ اس ن اجنبی ہو گیا۔

جب اُس کو بتایا گیا کہ رکمنی جو تمھاری محبوبہ رہ چکی تھی اور جس کی خاطر تم نے اتنے جھگڑے اپنی کلاس کے طالب علموں سے کئے۔ وہ اگر دوسری جگہ بیاہی ے تو ڈوب مرو ـــــ لیکن تم تیرنا جانتے ہو۔ ڈبونے کا کام ہم اپنے ذمے لیتے ہیں"

شیخ سلیم کو اس قسم کی باتیں عموماً کہا جاتی تھیں۔ اُس نے اپنی مہین مہین مونچھوں کو تاؤ دینے کی کوشش کی اور کہا "اچھا، تم دیکھ لینا ـــــ ہوگا"

اُس کی پارٹی کے ایک تو ہی ہیکل لڑکے نے پوچھا "کیا ہوگا"

شیخ سلیم نے اُس کو جھاگ کی طرح بٹھا دیا "ہوگا تمھاری ماں کا سر ـــــ جب شادی کا دن آئے گا، دیکھ لینا ـــــ چلو آؤ میرے ساتھ مجھے ے چند باتیں کرنی ہیں"

شادی کا دن آگیا۔ بارات جب دولہا والوں کے گھر کے پاس پہنچی تو کوئی شخص سر پہ سہرے باندھے بڑے اچھے گھوڑے پر سوار اندر داخل ہو گیا۔ دولہا موٹر میں تھا جس پر پھولوں کا جال بنا ہوا تھا۔

گھوڑ سوار سہرے سے لدا پھندا شامیانے کے پاس تھا۔ گھوڑا خود دولہا بنا ہوا تھا۔ دولہن کا باپ اور اُس کے رشتہ دار آگے بڑھے۔ گھوڑے کا مالک سہاگ ابھالا گیا تھا۔ اس سہرے سے لدے ہوئے آدمی کو اُس جگہ بٹھا دیا گیا، جہاں دولہن کو بھی ساتھ بیٹھنا تھا۔ بیچ میں ہون کنڈ تھا، جس میں چھوٹی ہوئی لکڑیوں کے ٹکڑے جل رہے تھے۔ انھوں نے ننگے بدن اُٹھ کر دولہن کو اشیرواد دی اور دولہن سے کہا "سردار جی دولہن کو جلد بلا لیجیے۔ مہورت ہو گیا ہے"

فوراً رکمنی پہنچ گئی، اور کچھ دیر کے لئے دولہا کے ساتھ بٹھادی گئی۔ پنڈت جی نے کچھ پڑھا، جس کا مطلب میری سمجھ میں نہ آیا —— لیکن ایک دم شادی کے اُس جلسے میں ایک ہڑبونگ سی مچ گئی جب کمرے سے ایک دولہا نکل کر سامنے آگیا اور بلند آواز میں تمام حاضرین کو مخاطب کیا، "یہ میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے —— میں وہ سب ادا کر دوں گا۔"

وہ دولہا جو اپنے کو پیش کر رہا تھا بڑی خوفناک آواز میں چلایا۔ "چلے جا یہاں سے ورنہ دانت کے ٹکڑے کر دوں گا!"

یہ کہہ کر اُس نے اپنے چہرے کا گھونگھٹ اٹھا دیا اور اُن ہزاروں کے قریب آدمیوں سے جو شامیانے کے نیچے تھے کچھ کہنا چاہا —— مگر قہقہے کا ایک سمندر موجیں مارنے لگا —— دوسری پارٹی کے آدمی بھی اِن قہقہوں میں شریک ہوئے، کیونکہ جب یہ پھولوں کا پردہ علیحدہ ہوا تو انھوں نے دیکھا کہ شیخ سلیم ہے۔

رکمنی بڑی خفیف ہوئی، مگر شیخ سلیم نے بڑی جرأت سے کام لے کر اُس سے بلند آواز میں پوچھا "تم اِس جعفر کے ساتھ شادی کرنے کے لئے تیار ہو؟"

رکمنی خاموش رہی۔

"اچھا جاؤ جہنم میں —— لیکن ایک دن نہیں، پورے تین مہینے تم ہمیں پوجتی رہی ہو" یہ کہہ کر وہ سیدھا دولہا کی طرف بڑھا، جس کے منہ سے غصے کے مارے جھاگ نکل رہے تھے۔ آگے بڑھ کر اُس نے اپنے سارے ہار اُس کے گلے میں ڈال دیئے —— سب براتی بت بنے بیٹھے تھے۔

ہنستا، قہقہے لگاتا وہ اپنے گھوڑے پر بڑی صفائی سے سوار ہوا اور ایڑھ لگا کر کوٹھی سے باہر نکل گیا۔ گھوڑے سے اُتر کر ہم دونوں نکل گئے تھے۔ اس سے کہ میں اس کے پیچھے گھوڑے کی تیز رفتاری سے بھاگا تھا۔ اُس نے میرا کان بڑے زور سے ہلایا "کیوں بیٹے، تم سے میں نے کیا کہا تھا —— اب دیکھ لیا؟"

ہوا تو سب کچھ ٹھیک تھا۔ مجھے ڈر تھا کہیں شیخ سلیم گرفتار نہ ہو جائے۔ میں نے اُس سے کہا "جو تم نے کیا وہ اور کوئی نہیں کر سکتا، لیکن بھائی میرے کہیں ہنسی میں پھنسی نہ ہو جائے۔ ذرا سوچو اگر رکمنی کے باپ نے تمہیں گرفتار کرا دیا؟"

وہ اکڑ کر بولا "اُس کے باپ کا باپ بھی نہیں کر سکتا —— کون اپنی بیٹی کو عدالت چڑھائے گا —— میں تو اسی وقت گرفتار ہونے کے لئے تیار ہوں —— لے جائے مجھے تھانے —— اس سالے کے سارے پول کھول دوں گا —— میرے پاس اُس کے درجنوں خطوط پڑے ہیں۔"

سارے شہر میں یہی افواہ پھیلی ہوئی تھی کہ رکمنی کا باپ شیخ سلیم کو ضرور اُس کی گستاخی کی سزا دلوائے گا کہ وہ ساری عمر یاد رکھے۔ مگر کچھ نہ ہوا۔

جب کئی دن گزر گئے تو وہ میرے پاس گاتا ہوا آیا۔ ؎

"تھی خبر گرم کہ غالب کے اُڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے پر وہ تماشا نہ ہوا"

اب میں اصل کہانی کی طرف پلٹتا ہوں، جو اِس واقعے سے بھی کہیں زیادہ دلچسپ اور معنی خیز ہے —— یہ خود اُس نے مجھے سنائی، جس کی صداقت پر مجھے سو فیصد یقین ہے —— اس لئے کہ شیخ سلیم جھوٹا کبھی نہیں تھا۔

اُس نے مجھے بتایا "میں پیرس میں تھا۔ وہاں کی لڑکیاں عام یورپین لڑکیوں کی طرح ہوتی ہیں، وہی لباس، وہی وضع قطع، البتہ ناک نقشے کے اعتبار

بے تکلفی ہوتی ہیں ـــــ جتنی خرافات وہاں ہوتی ہے شاید ہی کسی اور ملک میں ہوتی ہے ـــــ میں نے وہاں کئی شکار کیں۔ وہاں میرے بڑے افسر کرنل عثمانی تھے۔ حالانکہ اُن کا عہدہ جیسا کہ ظاہر ہے مجھ سے بہت بڑا تھا۔ لیکن وہ میرے بڑے بہترین دوست تھے۔ میس میں جب بھی مجھے دیکھتے، پکارتے ـــــ ادھر آؤ برخوردار، میرے پاس بیٹھو، اور وہ میرے لئے ایک کرسی منگواتے۔ اسکا دور چلتا تو ادھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیتے۔ عثمانی صاحب کو مجھ سے چھیڑ چھاڑ کرنے میں خاص مزا آتا ـــــ جب وہ کوئی فقرہ مجھ پر چست کرتے تو بہت خوش ہوتے ـــــ کافی معمر آدمی تھے۔ اس کے علاوہ بڑا افسر، میں خاموش رہتا ـــــ اُن کو اُن پرستانی نرسوں سے بڑی دلچسپی تھی جو وہاں ایمبولنس کور میں کام کرتی تھیں ـــــ ان پرستانی لڑکیاں بلا کی تنومند ہوتی ہیں ـــــ یہ موٹی موٹی سفید پنڈلیاں۔ بڑی مضبوط چھاتیاں بڑی بڑی اور صحت مند۔ لمبے چوڑے اور گوشت سے بھرے ہوتے، جن میں سختی ہو ـــــ لیکن ایسی سختی ـــــ میری کئی دوست تھیں، پر جب میں آئرن سے ملا تو سب کو بھول گیا۔ سالے ایمان لے گیا۔ بڑی ہی منحنی تھیں۔ نقش سب چھوٹے چھوٹے تھے۔ اگر تم اس کی چھاتیوں اور پنڈلیوں کو پیشِ نظر رکھتے تو یہی سمجھتے کہ اس کے باقی ڈول بھی تنومند ہوں گے۔ اس کی اُنگلیاں اتنی موٹی ہوں گی جیسے کسی درخت کے تھن ـــــ مگر نہیں دوست، اُس کے ہاتھ بڑے نرم و نازک تھے اور انگلیاں، تم یہ سمجھ لو کہ چغتائی کی بنائی تصویروں کی مخروطی لانبی نہیں، مگر پتلی پتلی تھیں ـــــ میں تو اس پر فریفتہ ہو گیا ـــــ چند ہی دنوں کی ملاقاتوں میں اُس کے میرے تعلقات بے تکلفی کی حد تک بڑھ گئے۔"

یہاں تک پہنچ کر شیخ رُک گیا۔ ایک نیا پیگ گلاس میں ڈالا اور سوڈا ملا کر غٹاغٹ پی لیا۔ "نہ یاد کراؤ یہ قصہ"۔ میں نے اُس سے کہا "لعنت ہے، آپ نے خود ہی تو شروع کیا تھا۔"

اُس نے ماتھے پر تیوری چڑھا کر میری طرف دیکھا۔ ایک ـــــ اور پیگ اپنے گلاس میں ـــــ تین چار پیگ ـــــ جو بوتل میں باقی بچ گئے تھے، انتقاماً میرے رہنے دئے، اور خود سوڈا بھی آیا۔ یہی بیس نیٹ پینے میں پی گیا اور کھانس کھانس کر اپنا بُرا حال کر لیا۔ "لعنت ہو تم پر!"

یعنی یہ کیا موقعہ تھا مجھ پر لعنت بھیجنے کا۔"

اُس کی کھانسی اب بند ہو گئی تھی اور وہ رومال سے اپنا منہ پونچھ رہا تھا۔ "کچھ نہ پوچھو میری جان ـــــ دوسرے روز رات کو کرنل صاحب سے ملاقات ہوئی ـــــ انھوں نے بڑے طنز سے کہا، کہو صاحبزادے، مجھے بڈھا سمجھتے ہو ـــــ وہ تم نے ضرب المثل نہیں سنی ـــــ نیا ایک دن، پرانا سو دن میں نے اُن سے عرض کی، کرنل صاحب، آپ کا میرا کیا مقابلہ ـــــ مگر میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ یہ کمبخت اس حقیقت سے اب تک غافل ہے کہ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے اور عشق فرما رہا ہے۔

میں تو خدا کی قسم جب اس عمر کو پہنچوں گا تو خودکشی کر لوں گا ـــــ اس منہ کے ساتھ جس میں آدھے دانت مصنوعی ہیں، میری آئرن سے آس لگائے بیٹھا ہے۔ کرنل ہو گا تو اپنے گھر میں۔ اس نے کبھی پھر اُس کی بات کی تو ایک ایسا گھونسہ جماؤں گا اس کی سوکھی گردن پر کہ منکا باہر آ جائے گا۔"

دیر تک اُس بڈھے کھوسٹ سے آئرن ـــــ نہایت ہی پیاری آئرن کے متعلق باتیں ہوتی رہیں اور وہ طنز کرنے سے باز نہ آیا۔ وہ کہتا تھا کہ وہ چالاک ہے، میں نے اپنے ہونٹوں پر بڑی فرمانبردار قسم کی مسکراہٹ پیدا کی اور اُس سے کہا، کرنل صاحب جو آپ کو بڈھا کہے، وہ خود بڈھا ہے۔

انشاءاللہ حاضر ہوں:

یہ محفل ختم ہوئی تو میں بہت خوش ہوا۔ آسٹن نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ دوسرے روز فلاں ہوٹل میں شام کو سات بجے ملے گی۔ اس میں زوجین کو اجازت تھی۔ اتوار تھا، اس لئے میں وردی کے بجائے نہایت اعلیٰ سوٹ پہن کر وہاں پہنچا۔ سات بجنے میں ابھی دو منٹ باقی تھے۔ میں ڈائننگ ہال میں داخل ہوا، تو میرے پاؤں وہیں کے وہیں جم گئے ——— کرنل عثمانی صاحب اس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں سے غافل آسٹن کا بڑا لمبا بوسہ لے رہے تھے ——— مجھے ایسا افسوس ہوا کہ شاید اس کرنل سے کہیں زیادہ بڈھا کھوسٹ بن گیا ہوں۔

انارکلی

(یکم جون ۵۴ء)

نام اس کا سلیم تھا، مگر اس کے یار دوست اسے شہزادہ سلیم کہتے تھے۔ غالباً اس لئے کہ اس کے خدوخال مغلئی تھے، خوبصورت تھا۔ چال ڈھال سے رعونت ٹپکتی تھی۔

اس کا باپ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی میں ملازم تھا۔ تنخواہ زیادہ سے زیادہ سو روپے ہوگی، مگر بڑے ٹھاٹ سے رہتا تھا۔ ظاہر ہے کہ رشوت کھاتا تھا یہی وجہ ہے کہ سلیم اچھے سے اچھا کپڑا پہنتا، جیب خرچ بھی اس کو کافی ملتا تھا، اس لئے کہ وہ اپنے والدین کا اکلوتا لڑکا تھا۔

بہت ممکن ہے، اس کے پاس کئی سوٹ، کئی قمیصیں تھیں، جو وہ بدل بدل کے پہنتا۔ شوز کے دس جوڑوں کے قریب ہوں گے۔

جب کالج میں تھا تو کئی لڑکیاں اس پر جان چھڑکتی تھیں ———— مگر وہ بے اعتنائی برتتا۔ آخر اس کی آنکھ ایک شوخ و شنگ لڑکی جس کا نام سیما تھا، لڑ گئی۔ سلیم نے اس سے راہ و رسم پیدا کرنا چاہا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس کا التفات حاصل کر لے گا ——— نہیں، وہ تو یہاں تک سمجھتا تھا کہ سیما اس کے قدموں میں آ گرے گی اور اس کی ممنون و متشکر ہو گی کہ اس نے محبت کی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

ایک دن کالج میں سلیم نے سیما سے پہلی بار مخاطب ہو کر کہا "آپ کتابوں کا اتنا بوجھ اٹھائے ہوئی ہیں ———— لائیے مجھے دے دیجئے ——— میرا تانگہ باہر موجود ہے۔ آپ کو اور اس بوجھ کو آپ کے گھر تک پہنچا دوں گا۔"

سیما نے اپنی بھاری بھرکم کتابیں بغل میں دابتے ہوئے بڑے خشک لہجے میں جواب دیا "آپ کی مدد کی مجھے کوئی ضرورت نہیں ——— بہرحال شکریہ ادا کئے دیتی ہوں۔"

شہزادہ سلیم کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا صدمہ پہنچا ———— چند لمحات تک وہ اپنی خفت مٹاتا رہا۔ اس کے بعد اس نے سیما سے کہا "عورت مرد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے ——— مجھے حیرت ہے کہ آپ نے میری پیش کش کو کیوں ٹھکرا دیا؟"

سیما کا لہجہ اور زیادہ خشک ہو گیا، "عورتوں کو مردوں کے سہارے کی ضرورت ہوگی ——— مگر فی الحال مجھے ایسی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ——— آپ کی پیشکش کا شکریہ میں ادا کر چکی ہوں ——— اس سے زیادہ آپ اور کیا چاہتے ہیں؟"

یہ کہہ کر سیما چلی گئی۔ شہزادہ سلیم جو نا کل کے خواب دیکھ رہا تھا، آنکھیں جھپکتا رہ گیا۔ اس نے بہت بری طرح شکست کھائی تھی۔

اس سے قبل اس کی زندگی میں کئی لڑکیاں آ چکی تھیں جو اس کے ابرو کے اشارے پر چلتی تھیں ——— مگر یہ سیما کیا سمجھتی ہے اپنے کو ——— اس میں کوئی شک نہیں کہ خوبصورت ہے۔ جتنی لڑکیاں میں نے اب تک دیکھی ہیں، ان میں سب سے زیادہ حسین ہے، مگر مجھے ٹھکرا دینا ——— یہ بہت بڑی زیادتی ہے ——— میں ضرور اس سے بدلہ لوں گا ——— چاہے کچھ بھی ہو جائے۔"

شہزادہ سلیم نے اس سے بدلہ لینے کی کئی اسکیمیں بنائیں مگر کارگر ثابت نہ ہوئیں۔ اس نے یہاں تک سوچا کہ اس کی ناک کاٹ ڈالے۔ وہ یہ جرم کر بیٹھتا مگر اسے سیما کے چہرے پر وہ ناک بہت پسند تھی۔ کوئی بڑے سے بڑا مصور بھی ایسی ناک کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔

سلیم تو اپنے ارادوں میں ناکام رہا ——— تو قدرت نے اس کی مدد کی۔ اس کی والدہ نے اس کے لئے رشتہ ڈھونڈنا شروع کیا۔ نگاہِ انتخاب آخر سیما پر پڑی جو اس کی سہیلی کی لڑکی تھی۔

بات پکی ہو گئی۔ مگر سلیم نے انکار کر دیا۔ اس پر اس کے والدین بہت ناراض ہوئے۔ گھر میں دس بارہ روز تک ہنگامہ مچا رہا۔

سلیم کے والد ذرا سخت طبیعت کے تھے۔ انہوں نے اس سے کہا "دیکھو، تمہیں ہمارا فیصلہ قبول کرنا ہوگا۔"

سلیم بہت ہٹ دھرم تھا۔ جواب میں [illegible] کا فیصلہ نہیں ——— پھر میں نے کیا جرم کیا ہے جس کا آپ فیصلہ سنا رہے ہیں۔"

اس کے والد کو یہ سن کر طیش آ گیا "تمہارا یہی جرم ہے کہ تم ناخلف ہو ——— اپنے والدین کا کہنا نہیں مانتے۔ عدول حکمی کرتے ہو میں تمہیں عاق کر دوں گا۔"

سلیم کا جوش تھوڑا سا ٹھنڈا ہو گیا "لیکن ابا جان، شادی میری مرضی کے مطابق تو ہونی چاہیئے۔"

"بتاؤ، تمہاری مرضی کیا ہے؟"

"اگر آپ ٹھنڈے دل سے سنیں تو میں عرض کروں۔"

"میرا دل کافی ٹھنڈا ہے ——— تمہیں جو کچھ کہنا ہے فوراً کہہ ڈالو ——— میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا۔"

سلیم نے رک رک کے کہا "مجھے ——— مجھے ——— ایک لڑکی سے محبت ہے۔"

اس کا باپ گرجا "کس لڑکی سے؟"

سلیم تھوڑی دیر ہچکچایا "ایک لڑکی ہے۔"

"کون ہے وہ؟ ——— کیا نام ہے اس کا؟"

"سیما ——— میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔"

"میاں [illegible] الدین کی لڑکی؟"

"ابّا جان، اس کا نام سیما افراز ہے ـــــ میرا خیال ہے وہی ہے؟"

اس کے والد بے تحاشہ ہنسنے لگے، "خیالی کے بچے ـــــ تمہاری شادی اسی لڑکی سے قرار پائی ہے ـــــ کیا وہ تمہیں پسند کرتی ہے؟"

سلیم بوکھلا سا گیا ـــــ یہ سلسلہ کیسے ہو گیا، اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ لیکن اس کا! جھوٹ تو نہیں بول رہا تھا ـــــ سلیم سے جو سوال کیا گیا تھا اس کا جواب اس کے والد کو نہیں ملا تھا، چنانچہ انھوں نے کڑک کر پوچھا "سلیم، مجھے بتاؤ کیا سیما تمہیں پسند کرتی ہے؟"

سلیم نے کہا "جی نہیں؟"

"آپ نے یہ کیسے جانا؟"

"اس سے ـــــ اس سے ایک بار میں نے مختصر الفاظ میں ـــــ محبت کا اظہار کیا ـــــ لیکن اس نے مجھے ـــــ"

"تمہیں درخورِ اعتنا نہ سمجھا"

"جی ہاں ـــــ بڑی بے رخی برتی"

سلیم کے والد نے اپنے گنجے سر کو تھوڑی دیر کے لئے کھجلایا اور کہا "تو پھر یہ رشتہ نہیں ہونا چاہیئے ـــــ میں تمہاری ماں سے کہتا ہوں کہ وہ لڑکی والوں سے کہہ دے کہ لڑکا رضامند نہیں"

سلیم ایک دم جذباتی ہو گیا "نہیں، ابا جان ـــــ ایسا نہ کیجئے گا۔ شادی ہو جائے تو سب ٹھیک ہو جائیگا۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ اور کسی کی محبت اکارت نہیں جاتی ـــــ لیکن آپ ان لوگوں کو ـــــ میرا مطلب ہے سیما کو یہ پتہ نہ لگنے دیجئے کہ اس کا بیاہ مجھ سے ہو رہا ہے، جس سے وہ بے رخی اور بے اعتنائی کا اظہار کر چکی ہے"

اس کے باپ نے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرا "میں اس کے متعلق سوچوں گا"

یہ کہہ کر وہ چلے گئے کہ انھیں ایک ٹھیکیدار سے رشوت وصول کرنا تھی۔ اپنے بیٹے کی شادی کے اخراجات کے سلسلے میں۔

شہزادہ سلیم جب رات کو پلنگ پر سونے کے لئے لیٹا تو اسے انار کی کلیاں ہی کلیاں نظر آئیں۔ ساری رات وہ ان کے خواب دیکھتا رہا۔

گھوڑے پر سوار باغ میں آیا ہے ـــــ شاہانہ لباس پہنے۔ اسپ تازی سے اتر کر باغ کی ایک روش پر جا رہا ہے ـــــ کیا دیکھتا ہے کہ سیما انار کے بوٹے کی سب سے اونچی شاخ سے ایک نوخیز کلی توڑنے کی کوشش کر رہی ہے ـــــ اس کی بھاری بھرکم کتابیں زمین پر بکھری پڑی ہیں ـــــ زلفیں الجھی ہوئی ہیں۔ اور وہ اچک اچک کر اس شاخ تک اپنا ہاتھ پہنچانے کی کوشش کر رہی ہے، مگر ہر بار ناکام رہتی ہے۔

وہ اس کی طرف بڑھا۔ انار کی جھاڑی کے پیچھے چھپ کر اس نے اس شاخ کو پکڑا اور جھکا دیا۔ سیما نے وہ کلی توڑ لی جس کے لئے وہ اتنی کوشش کر رہی تھی ـــــ لیکن فوراً اسے اس بات کا احساس ہوا کہ وہ شاخ نیچے کیسے جھک گئی۔

وہ ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ شہزادہ سلیم اس کے پاس پہنچ گیا۔ سیما گھبرا گئی، لیکن سنبھل کر اس نے اپنی کتابیں اٹھائیں اور بغل میں داب لیں، انار کلی اپنے جوڑے میں اڑس لی اور یہ خشک الفاظ کہہ کر وہاں سے چلی گئی "آپ کی امداد کی مجھے کوئی ضرورت نہیں تھی ـــــ بہرحال شکریہ ادا کئے دیتی ہوں"

تمام رات وہ اسی قسم کے خواب دیکھتا رہا۔ سیما، اس کی بھاری بھرکم کتابیں، انار کی کلیاں اور شادی کی دھوم دھام۔

شادی ہو گئی۔ شہزادہ سلیم نے اس تقریب پہ اپنی انارکلی کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھ پائی تھی۔ وہ اس لمحے کے لئے تڑپ رہا تھا جب تیما اس کی آغوش میں ہو گی۔ وہ اس کے انتظار میں رہے گا کہ وہ تنگ آ کر رونا شروع کرے گی۔

سلیم کو رونے والی لڑکیاں بہت پسند تھیں۔ اس کا یہ فلسفہ تھا کہ عورت جب رو رہی ہو تو بہت حسین ہو جاتی ہے۔ اس کے آنسو شبنم کے قطروں کے مانند ہوتے ہیں جو مرد کے جذبات کے پھولوں پہ پڑتے ہیں تو بہت ہی ایسی راحت، ایسی فرحت ملتی ہے جو اور کسی وقت نصیب نہیں ہو سکتی۔

رات کے دس بجے دلہن کو حجلۂ عروسی میں داخل کر دیا گیا۔ سلیم کو بھی اجازت مل گئی کہ وہ اس کمرے میں جا سکتا ہے۔ لڑکیوں کی چھیڑ چھاڑ اور رسوم سب ختم ہو گئی تھیں۔ وہ کمرے کے اندر داخل ہوا۔

پھولوں سے سجی ہوئی مسہری پر دلہن لمبا گھونگٹ کاڑھے ریشم کی گٹھڑی سی بنی بیٹھی تھی۔ شہزادہ سلیم نے خاص اہتمام کرایا تھا کہ پھول انار کی کلیاں ہوں —— وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ مسہری کی طرف بڑھا، اور دلہن کے پاس بیٹھ گیا۔

کافی دیر تک وہ اپنی بیوی سے کوئی بات نہ کر سکا —— اس کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کی بغل میں کتابیں ہوں گی جن کو وہ اٹھانے نہیں دے گی۔ آخر اس نے بڑی جرأت سے کام لیا اور اس سے کہا: "تیما ——"

یہ نام لیتے ہی اس کی زبان خشک ہو گئی۔ لیکن اس نے پھر جرأت فراہم کی اور اپنی دلہن کے چہرے سے گھونگٹ اٹھا دیا اور پھر ہکا بکا رہ گیا——

یہ تیما نہیں تھی، کوئی اور ہی لڑکی تھی —— انار کی ساری کلیاں، اس کو ایسا محسوس ہوا کہ مرجھا گئی ہیں۔

کمیشن

(۲؍جون ۵۴ء)

دروازہ کھلتا ہے۔ چوبدار تین مرتبہ فرش پر اپنی لاٹھی سے آواز پیدا کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے۔

چوبدار ۔ باادب، باملاحظہ ہوشیار۔ نظریں روبرو۔ شہنشاہِ عالم لنچ کے لیے تشریف لا رہے ہیں۔

شہنشاہِ عالم کے قدموں کی بھاری چاپ سنائی دیتی ہے۔ اس کے بعد وہ تشریف لاتے ہیں۔

شہنشاہ ۔ ہیڈ بٹلر کہاں ہے؟

چوبدار ایک بہت بڑی ڈش پر سے سرپوش اٹھاتا ہے۔ ہیڈ بٹلر پھدک کر باہر نکلتا ہے اور فرشی سلام عرض کرتا ہے۔

ہیڈ بٹلر ۔ غلام سیلوٹ بجا لاتا ہے جہاں پناہ۔

شہنشاہ ۔ دسترخوان پر بدولت کے لیے کیا کیا چیز حاضر ہے؟

ہیڈ بٹلر ۔ گوشت پلاؤ۔ ماہی پلاؤ۔ مٹر پلاؤ۔ نارنگی پلاؤ۔ متنجن۔ بریانی۔ زردہ۔ روغن جوش۔ قورمہ۔ ٹماٹر گوشت۔ بھنڈی گوشت۔ مرغ گوشت۔ پائے کا شوربہ۔ قیمہ۔ بھیجا۔ چکن کٹلس۔ پوٹیٹو کٹلس۔ مٹن کٹلس۔ چکن چاپس۔ مٹن چاپس۔ پوٹیٹو چاپس ——— اور خدا جہاں پناہ کو سلامت رکھے ——— ارہر کی دال۔

شہنشاہ ۔ (غصے میں) ارہر کی دال بدولت کو بالکل پسند نہیں۔

ہیڈ شیلر۔ یہ حبشی ——— آدمی تو بہت ہی شہنشاہی ولایتوں کے قدیر اعظم مدعو ہیں ——— اس لئے ———

شہنشاہ۔ خوش ہو کر، ہم بدولت تمہاری فراست کی داد دیتے ہیں اور خوش ہو کر تمہارا منہ موتیوں سے بھر دینے کا حکم جاری کرتے ہیں۔

ہیڈ شیلر۔ میری سانس رک جائے گی عالم پناہ۔

شہنشاہ۔ (مسکرا کر) تم بہت ذہین ہو ——— جہاں پناہ نے تمہیں میر کا خطاب عنایت فرماتے ہیں۔

ہیڈ شیلر۔ جہاں پناہ کی اس قدر دانی نے ذرے کو آفتاب بنا دیا۔

شہنشاہ۔ اور کس صفائی سے ——— ہر بات کی تہہ کھولی۔

ہیڈ شیلر۔ غلام سلطنتِ عالیہ کا بوڑھا حبشی۔

دروازہ کھلتا ہے ——— چوبدار تین مرتبہ فرش پر اپنی لاٹھی سے آواز پیدا کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے۔

چوبدار۔ باادب، باملاحظہ ہوشیار، نگاہ روبرو۔ باادب باملاحظہ ہوشیار، نگاہ روبرو ——— ملکۂ عالیہ کی سواری آتی ہے۔

چھوٹے چھوٹے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے ——— ملکۂ عالیہ کی سواری آتی ہے۔

ملکہ۔ جہاں پناہ کو زیادہ دیر تک میرا انتظار نہیں کرنا پڑا؟ ——— میں اپنی خادماؤں سے۔ میں جوئیں ڈلوا رہی تھی۔

شہنشاہ۔ کیوں؟

ملکہ۔ رعایا کے لئے میں ایک بلڈ بینک کھولنا چاہتی ہوں۔

شہنشاہ۔ امورِ سلطنت سے تمہاری یہ دلچسپی ہم بدولت کے لئے باعث مسرت ہوئی۔

ہیڈ شیلر۔ رعایا کتنی خوش نصیب ہے کہ آپ ایسا مخلص بادشاہ اور آپ ایسی مخلص ملکہ اس پر حکمران ہیں۔

شہنشاہ۔ پہلے تو یہی مشہور تھا کہ فلاں بادشاہ کے راج میں شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے ——— لیکن ہمارے راج میں ایسے کئی گھاٹ موجود ہیں جہاں شیر اور بکریاں اکٹھے پانی پیتے ہیں اور اس کو حلقۂ امکان میں لانے کے لئے ہم بدولت کو تمام شیروں کے دانت نکلوانے اور تمام بکریوں کے سینگ کٹوانے پڑے۔

ہیڈ شیلر۔ اس میں کیا شک ہے۔

گھنٹی کی آواز آتی ہے

شہنشاہ۔ (چونک کر) یہ کس نے ہمیں بلا لیا ——— یہ کون فریادی ہے جس نے عدل و انصاف کی آہنی زنجیر کو جنبش دی ہے؟

ملکہ۔ جہاں پناہ، کیا اسی وقت جھروکے میں تشریف لے جائیں گے؟

شہنشاہ۔ اسی وقت، اسی گھڑی، جب تک ہم اس فریادی کی فریاد نہیں سن لیں گے ارہر کی دال ہم پر حرام۔ ہم ابھی جھروکے میں جا کر فریادی سے ملاقا

کریں گے ـــ ضرور اس پر کوئی ظلم ہوا ہے۔

چوبدار تین مرتبہ مرمریں فرش پر اپنی لاٹھی سے آواز پیدا کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے۔

۔ باادب، باملاحظہ، ہوشیار ـــ نگاہیں روبرو ـــ شہنشاہ عالم فریادی کی فریاد سننے کے لئے تشریف لا رہے ہیں۔

شہنشاہ، ملکہ اور ہیڈ شیلر تینوں جھروکے میں تشریف لے جاتے ہیں۔

شاہ۔ یہ کون تھا، جس نے ہمارے عدل و انصاف کی آہنی زنجیر ہلائی اور ہمارا انصاف چاہا۔

ی۔ یہ غلام انصاف کا طالب ہے جہاں پناہ۔

شاہ۔ تمہارے ساتھ پورا انصاف ہوگا فریادی ـــ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرنا ہمارا کام ہے۔

ی۔ عالم پناہ۔ آج کل ایک سیر دودھ میں صرف دو قطرے دودھ کے ہوتے ہیں، باقی سب پانی ہوتا ہے۔

شاہ: مطمئن رہو فریادی۔ دودھ کے یہ دو قطرے بھی علیحدہ کر کے دکھا دیئے جائیں گے ـــ بولو ـــ بےخوف و خطر ہو کے بولو کہ تمہیں کس نے ایذا پہنچائی ہے ـــ کیا ملکۂ عالم کے کتوں نے تمہاری بیوی ......

ی۔ نہیں جہاں پناہ۔ ملکۂ عالم کے کتوں کی بابت میری بیوی ہلاک نہیں ہوئی۔

شاہ۔ تاریخ نے، اس کا مطلب ہے، خود کو نہیں دہرایا ـــ یہ بھی ایک بہت بڑی بات ہے ـــ بولو، تم کام کیا کرتے ہو؟

ی۔ عالم پناہ کے سائے تلے اس غلام نے ایک بہت بڑی لانڈری کھول رکھی ہے۔

شاہ۔ کپڑے گھاٹ پر تم دھوتے ہو؟

ی۔ نہیں عالم پناہ ـــ یہ ذلیل کام میں نے دوسروں کے سپرد کر رکھا ہے۔

شاہ۔ ایسا ہی ہونا چاہیئے ـــ اب بتاؤ تمہیں کیا دکھ پہنچا ہے؟

ی۔ جہاں پناہ مجھے بہت بڑا دکھ پہنچا ہے ـــ میرے پاس الفاظ نہیں جو میں بیان کر سکوں۔

شاہ۔ ہوں (تھوڑی دیر غور و فکر کرنے کے بعد) فریادی تم کوئی فکر نہ کرو ـــ ہم الفاظ کا بندوبست کر دیتے ہیں ـــ ہیڈ شیلر!

شیلر۔ غلام حاضر ہے جہاں پناہ۔

شاہ۔ تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہم نے سر کے خطاب سے تمہیں سرفراز کیا تھا۔

شیلر۔ غلام اس قدر افزائی کا شکریہ ادا کر چکا ہے۔

شاہ۔ اب خود کو اس قدر افزائی کا حق دار ثابت کرو۔ ہم تمہیں وزیر الفاظ کا رتبہ بخشتے ہیں، تاکہ تم اس فریادی کی فریاد کو مناسب و موزوں الفاظ میں ترتیب دے کر ہماری خدمت میں پیش کرو۔

شیلر۔ غلام اس فرض سے سبکدوش ہونے کی پوری پوری کوشش کریگا۔

شاہ۔ تم مطمئن ہو فریادی؟

فریادی۔ میں بالکل مطمئن ہوں عالم پناہ۔

شہنشاہ۔ وزیر الفاظ، جاؤ، فریادی کی فریاد رپورٹ کی صورت میں پیش کرو۔

ہیڈ شبلر۔ کام کی اہمیت کے پیش نظر غلام ایک ماہ کی مہلت کے لئے درخواست کرتا ہے۔

شہنشاہ۔ بادشاہ سلامت ایک ماہ کی مہلت عطا فرماتے ہیں۔

ہیڈ شبلر۔ شکریہ!

فریادی۔ شکریہ۔

دروازہ کھلتا ہے۔ چوبدار تین مرتبہ فرش پر اپنی لاٹھی سے آواز پیدا کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے۔

چوبدار۔ باادب، باملاحظہ ۔۔۔ ہوشیار ۔۔۔ نگاہ روبرو ۔۔۔ شہنشاہِ عالم دو مہینے کے بعد لانڈری والے کیس کے متعلق ہیڈ شبلر اور وزیر الفاظ کی رپورٹ سننے کے لئے تشریف لا رہے ہیں۔

شہنشاہ کمرے میں تشریف لاتے ہیں۔

شہنشاہ۔ وزیر الفاظ، لانڈری والے فریادی کی رپورٹ کتنے دنوں اور کتنے الفاظ میں تیار ہوئی؟

ہیڈ شبلر۔ دو مہینے کی مسلسل محنت، مشقت اور عرق ریزی کے بعد یہ بندہ ایک کروڑ الفاظ کی رپورٹ تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے جو پبلک کی آگاہی کے لئے سرکاری پریس میں چھپ رہی ہے۔

شہنشاہ۔ فریادی ۔۔۔ وزیر الفاظ کی رپورٹ سے کیا تم مطمئن ہو؟

فریادی۔ قطعی مطمئن ہوں عالم پناہ ۔۔۔ میں پہلے سے مطمئن ہو رہا ہوں۔

شہنشاہ۔ وزیر الفاظ ۔۔۔ ہم نے اتنے عرصے کے لئے نہیں وزیر بنا رکھا کہ اس رپورٹ کا خلاصہ پوچھنا چاہتے ہیں جو پبلک کی آگاہی کے لئے پریس میں چھپ رہی ہے۔

ہیڈ شبلر۔ رپورٹ کا مختصر خلاصہ یہ ہے عالم پناہ ۔۔۔ فریادی ایک بہت بڑی لانڈری کا مالک ہے۔ اس لانڈری میں تمام کپڑے صابن یا کسی اور چیز سے دھوئے جاتے ہیں جس کا نمونہ فریادی ہی جانتا ہے۔

فریادی۔ یہ نمونہ سینہ بسینہ چلا آ رہا ہے عالم پناہ۔

شہنشاہ۔ خوب!

ہیڈ شبلر۔ فریادی کلیننگ کے کام میں بھی فریادی پٹرول استعمال نہیں کرتا۔

فریادی۔ غلام پٹرول کا سارا اسٹاک بلیک مارکیٹ میں بیچ دیتا ہے۔

• بہت عجیب۔

—۔ فریادی کی لانڈری میں ساڑھے سات سو دھوبی کام کرتے ہیں۔ ان کو مہینہ بھر جو معاوضہ ملتا ہے وہی تنخواہ ملتی ہے جو مغلیہ بادشاہوں کے دور میں دھوبیوں کو ملا کرتی تھی۔ فریادی نے چار مہینے ہوئے محسوس کیا کہ اس کے یہ تنخواہ پانے والے اس کا سامان کھا رہے ہیں۔

•۔ فریادی نے یہ کیسے محسوس کیا۔

ی۔ ان کا رنگ روپ دن بدن اُجلا ہو رہا تھا جہاں پناہ۔

اہ۔ درست!

بلر۔ اُنہوں نے صابن کھانے ہی پر اکتفا نہ کی ——— اس غریب کا پٹرول پینا بھی شروع کر دیا۔

ناہ۔ فریادی ——— پٹرول پینے کے متعلق کیسے معلوم ہوا؟

ری۔ عالم پناہ ——— اُن کی دھواں دھار تقریروں نے غمازی کی۔

ناہ۔ درست۔

بلر۔ اپنے تنخواہ پانے والے ملازمین کی اس بلاخوری اور بلانوشی سے تنگ آ کر فریادی نے ایک اور کچھ ٹھکانے کے لئے اُن کو اُس میدان کی طرف روانہ کر دیا جہاں شہزادیاں چاندماری سیکھتی ہیں۔

شاہ۔ فکرمند ہو کر، والاشان شہزادیوں نے ان بے گناہوں کو ہلاک کر دیا؟

بلر۔ ایسا ہی ہوا جہاں پناہ ——— شہزادیوں کو یہ غلط فہمی رہی کہ وہ ساڑھے سات سو دھوبی جنگلی انسانوں کی وہ کھیپ ہے جو والاشان شہزادیوں کا نشانہ درست کرنے کے لئے ہر ہفتے فراہم کی جاتی ہے۔

شاہ۔ دھوبیوں اور جنگلی انسانوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

ٹبلر۔ عالم پناہ کا ارشاد بالکل بجا ہے ——— ساڑھے سات سو دھوبیوں کے لواحقین چنانچہ فریادی کو اُن کی ہلاکت کا ذمہ دار گردانتے ہیں۔

دی۔ غلام کا قصور صرف اتنا ہے جہاں پناہ کہ اُس نے تنگ آ کر اُن کو اُس میدان کی طرف بھیجا جہاں والاشان شہزادیاں نشانہ درست کرتی ہیں ——— لیکن اُن کی افسوسناک ہلاکت کے بعد جب غور کیا تو معلوم ہوا کہ غیر ارادی طور پر اس غلام نے جہاں پناہ کو انصاف کرنے کا ایک بہت ہی اچھا موقع فراہم کر دیا ہے۔

شاہ۔ غور کرنے کے بعد ہم بدولت بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہیں ——— تاریخ میں اس سے پہلے جہانگیر کو ایسے موقعے سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ لیکن ہم عہدِ جدید کے شہنشاہ ہیں ——— جہانگیری عدل فی زمانہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا ——— خون کا بدلہ صرف خون ہے۔

بڈ بٹلر۔ کیا والاشان شہزادیاں، خاکم بدہن ———

نشاہ۔ وزیرِ باالفلو، ہمیں اپنا فرض ادا کرنے دو۔

چوبدار تین مرتبہ فرش پر اپنی لاٹھی سے آواز پیدا کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے۔

چوبدار۔ باادب باملاحظہ ہوشیار ۔۔۔ نظریں بند ہو ۔۔۔ ملکۂ عالیہ کی سواری آتی ہے۔

ملکۂ عالیہ کی سواری چال گھوڑے بجتے آتی ہے

ملکہ ۔ جہاں پناہ ۔۔۔ یہ میں کیا سن رہی ہوں۔

شہنشاہ ۔ خون کا بدلہ خون ۔۔۔ ہماری سلطنت کے ہر در و دیوار سے یہی صدا آ رہی ہے ۔۔۔ خون کا بدلہ خون ۔۔۔ کوئی خون بہا نہ ہوگا۔

ملکہ ۔ جہاں پناہ!

ہیڈ شیلمہ ۔ عالم پناہ!!!

فریادی ۔ ساڑھے سات سو دھوبیوں کے گیتی پناہ خون کا بدلہ خون نہیں چاہئے ۔۔۔ فی دھوبی پانچ روپے کافی ہیں۔

شہنشاہ ۔ نہیں ۔۔۔ ما بدولت ہمیشہ دامن عدل پر جہانگیر کی طرح کوئی دھبہ نہیں لگنے دیں گے ۔۔۔ خون کا بدلہ خون ہے ۔۔۔ خون بہا نہیں۔

ہمیں بتاؤ ۔ عالیشان شہزادیوں کی تعداد کیا ہے؟

ہیڈ شیلمہ ۔ پچھلے برس کے اعداد و شمار کے مطابق عالی قدر شہزادیوں کی تعداد ایک سو بیس تک پہنچی تھی۔

ملکہ ۔ ان میں ہماری کوئی دختر نیک اختر شامل نہیں ۔۔۔ پھر بھی میں جہاں پناہ سے درخواست کرتی ہوں کہ ۔۔۔

شہنشاہ ۔ ہمیں اپنے فرض سے سبکدوش ہونے دو ملکہ ۔۔۔ خون کا بدلہ خون ہے۔

فریادی ۔ جہاں پناہ ۔۔۔ اُن ساڑھے سات سو دھوبیوں میں خون کا صرف ایک قطرہ تھا۔

شہنشاہ ۔ تمہیں کیسے معلوم ہے؟

فریادی ۔ اُن کا سارا خون نچوڑ کر میں نے صرف ایک ایک قطرہ باقی چھوڑ دیا تھا تاکہ اُن میں زندگی کی رمق باقی رہے۔

شہنشاہ ۔ ما بدولت کی نگاہ عدل میں خون کے ایک قطرے اور خون کے ایک سمندر میں کوئی فرق نہیں۔ اس سے پیشتر کہ رجعت پسند قوتیں ہمیں گمراہ کریں۔ مملکت کے طول و عرض میں ریڈیو اور اخباروں کے ذریعے سے اعلان کر دیا جائے کہ ہم لانڈری والے کیس کا فیصلہ کرنے میں انتہائی غیر جانبداری برتیں گے ۔۔۔ خون کا بدلہ خون ہے ۔۔۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عالیشان شہزادیوں کی رگوں میں ہمارا نیلا خون دوڑ رہا ہے۔ لیکن ایسے دھوبیوں کے سرخ خون کا بدلہ دینا ہوگا ۔۔۔ ہر چہار اکناف اعلان کر دیا جائے کہ ما بدولت نے اس سنگین مقدمے کا فیصلہ مرتب کرنے کے لئے ایک کمیشن بٹھا دیا ہے۔

ہیڈ شیلمہ ۔ کمیشن!

ملکہ ۔ کمیشن؟؟

فریادی ۔ کمیشن؟؟؟

شہنشاہ ۔ ہاں ۔۔۔ کمیشن ۔۔۔ یہ کمیشن ملک کے چار بڑے دھوبیوں، دو سب سے بڑے ڈرائی کلینروں اور چھ خطاب یافتہ سرکاری لوگوں پر مشتمل ہوگا ۔۔۔ ہیڈ شیلمہ جن کو ہم نے پہلے سر کا خطاب عنایت فرمایا تھا اور بعد میں منہ بولا الفاظ بنا دیا تھا۔ اس کمیشن کا صدر ہوگا۔

۔ ظلم ہے۔ اتنا بڑا کام سرانجام نہیں دیا جا سکے گا بڑے بخشی۔

۔ ابدولت کو اس کا علم ہے ——— تمہاری صداقت کی تحقیقاتی کمیٹی پوری تحقیق سے اپنی رپورٹ مرتب کریگا۔ عوام کی کامل تشفی کے لئے ابدولت اِس سی پر ایک اور کمیشن بٹھادیں گے۔ تاکہ عدل و انصاف کی نگاہ سے کوئی گوشہ، کوئی کونہ پوشیدہ نہ رہے۔

۔ عالم پناہ عوام کی تشفی پھر بھی نہیں ہوگی ——— انکار اُن کی سرشت میں داخل ہے۔

۔ (فکرمند ہوکر) عوام کی تشفی بہت ضروری ہے ——— سب سے مقدم ہے۔ ہم اُس وقت تک کوئی فیصلہ کرنے کے لئے تیار نہیں جب
۔ اس معاملے میں ہماری تشفی نہ ہو کہ عوام ہماری طرف سے بالکل مطمئن ہیں ——— جو انسانی کمیہ کر چنانچہ ہم سب سے پہلے، سب سے ضروری کمیشن اٹھاتے ہیں ——— اس کا نام شافی کمیشن ہوگا۔

۔ عالم پناہ زندہ باد۔

۔ عدل و انصاف زندہ باد!!

۔ شافی کمیشن پائندہ باد۔

سیاہ حاشیے

فسادات کے سلسلے میں منٹو نے جن جن لطیف
باتوں کو دیکھا اور سنا انہیں بھی قلمبند کر دیا تھا۔

جُوتا

ہجوم نے رُخ بدلا اور سر گنگا رام کے بُت پر پل پڑا۔ لاٹھیاں برسائی گئیں، اینٹیں اور پتھر پھینکے گئے۔ ایک نے مُنہ پر تارکول مل دیا۔ دوسرے نے بہت سے پرانے جوتے جمع کئے اور ان کا ہار بنا کر بُت کے گلے میں ڈالنے کے لئے آگے بڑھا۔ اور پولیس آگئی اور گولیاں چلنا شروع ہوئیں۔ جُوتوں کا ہار پہنانے والا زخمی ہو گیا۔ چنانچہ مرہم پٹی کے لئے اُسے سر گنگا رام ہسپتال بھیج دیا گیا۔

○

حلال اور جھٹکا

"میں نے اس کی شہ رگ پر چھری رکھی۔ ہولے ہولے پھیری اور اس کو حلال کر دیا۔"
"یہ تم نے کیا کیا؟"
"کیوں؟"
"اس کو حلال کیوں کیا؟"
"مزا آتا ہے اس طرح۔"
"مزا آتا ہے کے بچے، تجھے جھٹکا کرنا چاہیئے تھا ـــــ اس طرح۔"
اور حلال کرنے والے کی گردن کا جھٹکا ہو گیا۔

○

رعایت

"میری آنکھوں کے سامنے میری جوان بیٹی کو نہ مارو۔"
"چلو اسی کی مان لو ـــــ کپڑے اُتار کر ہانک دو ایک طرف۔"

○

آرام کی ضرورت

"مرا نہیں ـــــ دیکھو ابھی جان باقی ہے۔"
"رہنے دو یار ـــــ میں تھک گیا ہوں۔"


فوراً جھاگ دینے والا سنلائٹ صابن
کپڑے پٹکے بغیر سفید اور اُجلے دھوتا ہے
شفاف اور رنگین کپڑے چمکدار ہو جائیں گے۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ آپ کے کپڑے زیادہ دنوں تک کام دیں تو آپ آج ہی سے سنلائٹ صابن کا استعمال شروع کر دیجئے۔
SUNLIGHT SOAP
سن لائٹ صابن


افطاری
اور
سحری
کیلئے
خالص ڈالڈا
سے پراٹھے کو ذائقہ دار بنائیے
ڈالڈا کو ہر ایک کوئی پسند کرتا ہے، کیونکہ یہ ہر قسم کے کھانے پکانے کیلئے
موزوں ہے کیونکہ یہ ذائقہ دار اور قوت بخش بھی ہے! یہ خالص ہے
اور اسکی تیاری میں اسکو ہاتھوں سے چھوا نہیں جاتا۔ مہر بند ڈبوں
میں آپ اسے ہمیشہ صاف ستھرا پائیں گے۔
ڈالڈا
وناسپتی

(۳)

منٹو کی کہانیوں، ڈراموں اور مضامین کا انتخاب

(یہ انتخاب بھی منٹو کا ہے)

جب میرے اور منٹو کے درمیان منٹو نمبر چھاپنے کی بات چیت ہوئی تھی۔
تو میں نے کچھ منتخب تخلیقات کی شمولیت پر بھی زور دیا تھا اُس وقت
انھوں نے جن جن کہانیوں کے نام بتائے تھے۔ وہی پیش کی جا رہی ہیں۔
سوائے "نیا قانون" "شہید ساز" اور "سیاہ حاشیے" کے چند لطیفوں کے

(محمد طفیل)

ہتک

("منٹو کے افسانے" میں سے)

دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی۔ اور لیٹتے ہی سو گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی کا داروغہ صفائی جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارا کرتی تھی۔ ابھی ابھی اس کی ہڈیاں پسلیاں جھنجھوڑ کر شراب کے نشے میں چور، گھر کو واپس گیا تھا ——— وہ رات کو یہاں بھی ٹھہر جاتا مگر اسے اپنی دھرم پتنی کا بہت خیال تھا جو اس سے بے حد پریم کرتی تھی۔

وہ روپے جو اس نے اپنی جسمانی مشقت کے بدلے اس داروغہ سے وصول کئے تھے اس کی چست اور تھوک بھری چولی کے نیچے سے اوپر کو ابھرے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی سانس کے اتار چڑھاؤ سے چاندی کے یہ سکے کھنکھنانے لگتے اور اس کی کھنکھناہٹ اس کے دل کی غیر آہنگ دھڑکنوں میں گھل مل جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ان سکوں کی چاندی پگھل کر اس کے دل کے خون میں ٹپک رہی ہے!

اس کا سینہ اندر سے تپ رہا تھا۔ یہ گرمی کچھ تو اس برانڈی کے باعث تھی جس کا ادھا داروغہ اپنے ساتھ لایا تھا اور کچھ اس "بیوڑا" کا نتیجہ تھی جس کا سوڈا ختم ہونے پر دونوں نے پانی ملا کر پیا تھا۔

وہ ساگوان کے لمبے اور چوڑے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی تھی۔ اس کی باہیں جو کاندھوں تک ننگی تھیں۔ پتنگ کی اس کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ جو اوس میں بھیگ جانے کے باعث پتلے کاغذ سے جدا ہو جائے ——— دائیں بازو کی بغل میں شکن آلود گوشت ابھرا ہوا تھا جو بار بار مونڈنے کے باعث نیلی رنگت اختیار کر گیا تھا۔ جیسے نچی ہوئی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑا وہاں پر رکھ دیا گیا ہے۔

کمرہ بہت چھوٹا تھا جس میں بے شمار چیزیں بے ترتیبی کے ساتھ بکھری ہوئی تھیں۔ تین چار سوکھے سڑے چپل پلنگ کے نیچے پڑے تھے۔ جن کے اوپر منہ رکھ کر ایک خارش زدہ کتا سو رہا تھا اور نیند میں کسی غیر مرئی چیز کا منہ چڑا رہا تھا۔ اس کتے کے بال جا بجا جگہ سے خارش کے باعث اڑے ہوئے تھے، دور سے اگر کوئی اس کتے کو دیکھتا تو سمجھتا کہ پیر پونچھنے والا پرانا ٹاٹ دوہرا کرکے زمین پر رکھا ہے۔

اس طرف چھوٹے سے دیوار گیر پر سنگار کا سامان رکھا تھا۔ گالوں پر لگانے کی سرخی ہونٹوں کی سرخ بتی، پاؤڈر، کنگھی اور لوہے کے پن جو وہ غالباً اپنے جوڑے میں لگایا کرتی تھی۔ پاس ہی ایک لمبی کھونٹی کے ساتھ سبز طوطے کا پنجرہ لٹک رہا تھا جو گردن کو اپنی پیٹھ کے بالوں میں چھپائے سو رہا تھا، پنجرہ کچے امرود کے

دیوار سے لگے ہوئے سنگترے کے چھلکے سے بھرا ہوا تھا۔ ان جالہ دار کارنروں پر چھوٹے چھوٹے کالے رنگ کے بھرے پتنگے اڑ رہے تھے۔
پلنگ کے پاس ہی بید کی ایک کرسی پڑی تھی جس کی پشت سر ٹیکنے کے باعث میلی ہو رہی تھی۔ اس کرسی کے داہنے ہاتھ کو ایک خوبصورت تپائی تھی جس پر ہز ماسٹرز وائس کا پورٹیبل گراموفون پڑا تھا۔ اس گراموفون پر منڈھے ہوئے کالے کپڑے کی بہت بری حالت تھی۔ زنگ آلود سوئیاں تپائی کے علاوہ کمرے کے ہر کونے میں بکھری ہوئی تھیں۔ اس تپائی کے عین اوپر دیوار پر چار فریم لٹک رہے تھے جن میں مختلف آدمیوں کی تصویریں جڑی تھیں۔
ان تصویروں سے ذرا ہٹ کر یعنی دروازے میں داخل ہوتے ہی بائیں طرف کی دیوار کے کونے میں گنیش جی کی شوخ رنگ تصویر تھی۔ جو تازہ اور سوکھے ہوئے پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ شاید یہ تصویر کپڑے کے کسی تھان سے اتار کر فریم میں جڑائی گئی تھی۔ اس تصویر کے ساتھ چھوٹے سے دیوار گیر پر جو کہ بے حد چکنا ہو رہا تھا، تیل کی ایک پیالی دھری تھی جو دیئے کو روشن کرنے کے لئے وہاں رکھی گئی تھی۔ پاس ہی دیا پڑا تھا جس کی لو ہوا بند ہونے کے باعث ماتھے کے تلک کے مانند سیدھی کھڑی تھی۔ اس دیوار گیر پر دھوپ کی چھوٹی بڑی مروڑیاں بھی پڑی تھیں۔
جب وہ بوہنی کرتی تھی تو دور سے گنیش جی کی اس مورتی سے روپے چھوا کر اور پھر اپنے ماتھے کے ساتھ لگا کر انھیں اپنی چولی میں رکھ لیا کرتی تھی۔ اس کی چھاتیاں چونکہ کافی ابھری ہوئی تھیں۔ اس لئے وہ جتنے روپے بھی اپنی چولی میں رکھتی محفوظ پڑے رہتے تھے۔ البتہ کبھی کبھی جب مادھو پونے سے چھٹی لے کر آتا تو اسے اپنے کچھ روپے پلنگ کے پائے کے نیچے اس چھوٹے سے گڑھے میں چھپانا پڑتے تھے جو اس نے خاص اس کام کی غرض سے کھودا تھا۔ مادھو سے روپے محفوظ رکھنے کا یہ طریقہ سوگندھی کو رام لال دلال نے بتایا تھا۔ اس نے جب یہ سنا تھا کہ مادھو پونے سے آکر سوگندھی پر دھاوا بولتا ہے تو کہا تھا ——— اس سالے کو تو نے کب سے یار بنایا ہے؟ ——— یہ بڑی انوکھی عاشق معشوقی ہے! ——— سالا ایک پیسہ اپنی جیب سے نکالتا نہیں اور تیرے ساتھ مزے اڑاتا رہتا ہے۔ مزے الگ رہے تجھ سے کچھ لے بھی مرتا ہے ——— سوگندھی! مجھے کچھ دال میں کالا نظر آتا ہے۔ اس سالے میں کوئی بات ضرور ہے جو تجھے بھا گیا ہے ——— سات سال سے یہ دھندا کر رہا ہوں۔ تم چھوکریوں کی ساری کمزوریاں جانتا ہوں۔"
یہ کہہ کر رام لال دلال نے جو بمبئی شہر کے مختلف حصوں سے دس روپے سے لے کر سو روپے تک والی ایک سو بیس چھوکریوں کا دھندا کرتا تھا، سوگندھی کو بتایا ——— سالی اپنا دھن یوں برباد نہ کر ——— تیرے انگ پر سے یہ کپڑے بھی اتار کر لے جائے گا۔ وہ تیری ماں کا یار! ——— اس پلنگ کے پائے کے نیچے چھوٹا سا گڑھا کھود کر اس میں سارے پیسے دبا دیا کر۔ اور جب وہ یار آیا کرے تو اس سے کہا کر ——— تیری جان کی قسم مادھو، آج صبح سے ایک دھیلے کا منہ نہیں دیکھا۔ باہر والے سے کہہ کر ایک کوپ چائے اور ایک افلاطون بسکٹ تو منگا۔ بھوک سے میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں ——— سمجھیں! بہت نازک وقت آگیا ہے میری جان ——— اس سالی کانگرس نے شراب بند کر کے بازار بالکل مندا کر دیا ہے۔ پر تجھے تو کہیں نہ کہیں سے پینے کو مل ہی جاتی ہے۔ بھگوان قسم، جب تیرے یہاں کبھی رات کی خالی کی ہوئی بوتل دیکھتا ہوں اور دارو کی باس سونگھتا ہوں تو جی چاہتا ہے تیری جون میں چلا جاؤں۔"
سوگندھی کو اپنے جسم میں سب سے زیادہ اپنا سینہ پسند تھا۔ ایک بار جمنا نے اس سے کہا تھا۔ "نیچے سے ان بم کے گولوں کو باندھ کے رکھا کر۔ انگیا پہنا کرے گی تو ان کی سختائی ٹھیک رہے گی۔"
سوگندھی یہ سن کر ہنس دی۔ "جمنا تو سب کو اپنے سری کا سمجھتی ہے۔ دس روپے میں لوگ تیری ہڈیاں توڑ کر چلے جاتے ہیں۔ تو تو سمجھتی ہے کہ سب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہوگا ——— کوئی موا لگائے تو ایسی ویسی جگہ ہاتھ ——— ارے ہاں کل کی بات تجھے سناؤں۔ رام لال رات کے دو بجے ایک بہاری کو لایا۔ رات کا تیس روپے طے ہوا ——— جب سونے لگے تو میں نے بتی بجھا دی ——— ارے وہ تو ڈرنے لگا! ——— سنتی ہو جمنا؟ تیری قسم اندھیرا ہوتے ہی اس کا سارا ٹھاٹھ کرکرا ہو گیا! ——— وہ ڈر گیا! میں نے کہا، چلو چلو دیر کیوں کرتے ہو! تین بجنے والے ہیں، ابھی دن چڑھ آئے گا ——— بولا ——— روشنی کرو ——— روشنی کرو ——— میں نے کہا، یہ روشنی کیا ہوا ——— بولا لائٹ ——— لائٹ! ———

ں کو بھنبھوڑنا شروع کر دیا تھا۔ میں اُس سے کہا کرتی تھی کہ مجھ سے ہنسی نہ کرو۔ میں تو لوٹ پوٹ نہ کر دوں گی ــــــ اور یہ کہہ کر میں نے اُس کی گوشت بھری ران کی چٹکی لی ـــــ
پ کر اُٹھ بیٹھا اور لالٹین اُدھر کر دی۔ میں نے جھٹ سے چادر اوڑھ لی، اور کہا تجھے شرم نہیں آتی مردوے ــــ وہ پلنگ پر آیا تو میں اُٹھی اور
۔ اک لالٹین بجھا دی ــــ وہ پھر گھبرانے لگا ـــــ تیری قسم بڑے مزے میں رات کٹی، کبھی اندھیرا کبھی اُجالا، کبھی اُجالا کبھی اندھیرا ــــ
ہ کی کھڑکھڑ ہوئی تو پتلون وتلون پہن کر وہ اُٹھ بھاگا ـــــ سالے نے تیس روپے سٹے میں جیتے ہوں گے جو یوں مفت دے گیا ـــــ سوگندھی تو
ل تو مت بن، بڑے بڑے گُر یاد ہیں مجھے ان لوگوں کے ٹھیک کرنے کے لئے!"
سوگندھی کو واقعی بہت سے گُر یاد تھے جو اُس نے اپنی ایک دو سہیلیوں کو بتائے بھی تھے۔ عام طور پر وہ یہ گُر سب کو بتایا کرتی تھی ـــــ "اگر
ی شریف ہو، زیادہ باتیں نہ کرنے والا ہو، تو اُس سے خوب شرارتیں کرو، اَن گنت باتیں کرو، اُسے چھیڑو، ستاؤ، اس کے گدگدی کرو، اُس
کھیلو ـــــ اگر داڑھی رکھتا ہو تو اُس میں اُنگلیوں سے کنگھی کرتے کرتے دو چار بال بھی نوچ لو، پیٹ بڑا ہو تو تھپتھپاؤ ـــــ اُس کو اتنی مہلت
۔ دو کہ اپنی مرضی کے مطابق کچھ کرنے پائے ـــــ وہ خوش خوش چلا جائیگا اور تم بھی بچی رہو گی ـــــ ایسے مرد جو گُپ چُپ رہتے ہیں بڑے خطرناک
تے ہیں بہن ـــــ ہڈی پسلی توڑ دیتے ہیں اگر اُن کا داؤ چل جائے!"
سوگندھی اتنی چالاک نہیں تھی جتنی کہ خود کو ظاہر کرتی تھی۔ اُس کے گاہک بہت کم تھے۔ غایت درجہ جذباتی لڑکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام گُر جو اُسے
تھے اُس کے دماغ سے پھسل کر اُس کے پیٹ میں آجاتے تھے۔ جس پر ایک بچہ پیدا کرنے کے باعث کئی لکیریں پڑ گئی تھیں ! ـــــ ان لکیروں کو
لی مرتبہ دیکھ کر اُسے ایسا لگا تھا کہ اُس کے خارش زدہ کتے نے اپنے پنجے سے یہ نشان بنا دیئے ہیں ـــــ جب کوئی کتیا بڑی بے اعتنائی سے
ں کے پاس سے گزر جاتی تھی تو وہ شرمندگی دور کرنے کے لئے زمین پر اپنے پنجوں سے اسی قسم کے نشان بنایا کرتا تھا۔
سوگندھی دماغ میں زیادہ رہتی تھی۔ لیکن جونہی کوئی نرم و نازک بات ـــــ کوئی کومل بول ـــــ اُس سے کہتا تو جھٹ پگھل کر وہ اپنے
ہم کے دوسرے حصوں میں پھیل جاتی گو مرد اور عورت کے جسمانی ملاپ کو اُس کا دماغ بالکل فضول سمجھتا تھا۔ مگر اُس کے جسم کے باقی اعضا سب کے سب
ں کے بہت بری طرح قائل تھے ! وہ تھکن چاہتے تھے ـــــ ایسی تھکن جو اُنہیں جھنجھوڑ کر ـــــ اُنہیں مار کر سلانے پر مجبور کر دے ! ایسی
ند جو تھک کر چُور چُور ہونے کے بعد آئے، کتنی مزیدار ہوتی ہے ـــــ وہ بے ہوشی جو مار کھا کر بند بند ڈھیلے ہو جانے پر طاری ہوتی ہے، کتنا
ند دیتی ہے ! ـــــ کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ہو اور کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نہیں ہو ! اور اس ہونے اور نہ ہونے کے بیچ میں کبھی کبھی
یسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ تم ہوا میں بہت اونچی جگہ معلق ہو۔ اوپر ہوا، نیچے ہوا، دائیں ہوا، بائیں ہوا۔ بس ہوا ہی ہوا ! اور پھر اس ہوا میں دم
ٹنا بھی ایک خاص مزا دیتا ہے۔
بچپن میں جب وہ آنکھ مچولی کھیلا کرتی تھی، اور اپنی ماں کا بڑا صندوق کھول کر اُس میں چھپ جایا کرتی تھی، تو ناکافی ہوا میں دم گھٹنے کے ساتھ ساتھ پکڑے
جانے کے خوف سے وہ تیز دھڑکن جو اس کے دل میں پیدا ہو جایا کرتی تھی کتنا مزا دیا کرتی تھی !
سوگندھی چاہتی تھی کہ اپنی ساری زندگی کسی ایسے ہی صندوق میں چھپ کر گزار دے جس کے باہر ڈھونڈنے والے پھرتے رہیں۔ کبھی کبھی اُس کو ڈھونڈ
کالیں تاکہ وہ بھی اُن کو ڈھونڈنے کی کوشش کرے ! یہ زندگی جو وہ پانچ برس سے گزار رہی تھی، آنکھ مچولی ہی تو تھی ـــــ کبھی وہ کسی کو ڈھونڈ لیتی
ی اور کبھی کوئی اُسے ڈھونڈ لیتا تھا ـــــ بس یونہی اس کا جیون بیت رہا تھا۔ وہ خوش تھی اس لئے کہ اس کو خوش رہنا پڑتا تھا۔ ہر روز رات کو
ئی نہ کوئی مرد اس کے چوڑے ساگوانی پلنگ پر ہوتا تھا اور سوگندھی جس کو مردوں کے ٹھیک کرنے کے لئے بے شمار گُر یاد تھے۔ اس بات کا بار بار تہیہ
رنے پر بھی کہ وہ اُن مردوں کی کوئی ایسی ویسی بات نہیں مانے گی اور اُن کے ساتھ بڑے روکھے پن کے ساتھ پیش آئے گی۔ ہمیشہ اپنے جذبات کے دھارے
میں بہ جایا کرتی تھی اور فقط ایک پیاسی عورت رہ جایا کرتی تھی !

ہر رات کو اُس کا پرانا یا نیا ملاقاتی اُس سے کہا کرتا تھا: "سوگندھی، میں تجھ سے پریم کرتا ہوں!" اور سوگندھی یہ جان بوجھ کر کہ وہ جھوٹ بولتا ہے بس موم ہو جاتی تھی۔ اور ایسا محسوس کرتی تھی جیسے سچ مچ اُس سے پریم کیا جا رہا ہے ——— پریم ——— کتنا سندر بول ہے! وہ چاہتی تھی، اُس کو پگھلا کر اپنے سارے انگوں پر مل لے، اُس کی مالش کرے تاکہ یہ سارے کا سارا اُس کے مساموں میں رچ جائے ——— یا پھر وہ خود اُس کے اندر چلی جائے۔ سمٹ سمٹا کر اُس کے اندر داخل ہو جائے اور اوپر سے ڈھکنا بند کر دے۔ کبھی کبھی جب پریم کرنے اور پریم کئے جانے کا جذبہ اُس کے اندر بہت شدت اختیار کر لیتا تو کئی بار اُس کے جی میں آتا کہ اپنے پاس پڑے ہوئے آدمی کو گود میں لے کر تھپتھپانا شروع کر دے اور لوریاں دے دے کر اُسے اپنی گود ہی میں سلا دے!

پریم کر سکنے کی اہلیت اُس کے اندر اس قدر زیادہ تھی کہ ہر اُس مرد سے جو اُس کے پاس آتا تھا وہ محبت کر سکتی تھی اور پھر اُس کو نباہ بھی سکتی تھی۔ اب تک چار مردوں سے اپنا پریم نباہ ہی تو رہی تھی۔ جن کی تصویریں اُس کے سامنے دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ ہر وقت یہ احساس اُس کے دل میں موجود رہتا تھا کہ وہ بہت اچھی ہے۔ لیکن یہ اچھا پن مردوں میں کیوں نہیں ہوتا۔ یہ بات اُس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی ——— ایک بار آئینہ دیکھتے ہوئے بے اختیار اُس کے منہ سے نکل گیا تھا ——— "سوگندھی ——— تجھ سے زمانے نے اچھا سلوک نہیں کیا!"

یہ زمانہ یعنی پانچ برسوں کے دن اور اُن کی راتیں، اُس کے جیون کے ہر تار کے ساتھ وابستہ تھا۔ گو اس زمانے سے اُس کو خوشی نصیب نہیں ہوئی تھی جس کی خواہش اُس کے دل میں موجود تھی۔ تاہم وہ چاہتی تھی کہ یونہی اُس کے دن بیتتے چلے جائیں۔ اُسے کون سے محل کھڑے کرنا تھے جو روپے پیسے کا لالچ کرتی۔ دس روپے اُس کا عام نرخ تھا۔ جس میں سے ڈھائی روپے رام لال اپنی دلالی کے کاٹ لیتا تھا۔ ساڑھے سات روپے اُسے روز مل ہی جایا کرتے تھے جو اُس کی اکیلی جان کے لئے کافی تھے اور مادھو جب پونے سے بقول رام لال دلال، سوگندھی پر دھاوا بولنے کے لئے آتا تھا۔ تو وہ دس پندرہ روپے خراج بھی ادا کرتی تھی: یہ خراج صرف اس بات کا تھا کہ سوگندھی کو اُس سے کچھ وہ ہو گیا تھا۔ رام لال دلال ٹھیک کہتا تھا، اس میں ایسی بات ضرور تھی جو سوگندھی کو بہت بھا گئی تھی۔ اب اس کو چھپانا کیا ہے! بتا ہی کیوں نہ دیں! ——— سوگندھی سے جب مادھو کی پہلی ملاقات ہوئی تو اُس نے کہا تھا "تجھے لاج نہیں آتی اپنا بھاؤ کرتے! جانتی ہے تو میرے ساتھ کس چیز کا سودا کر رہی ہے؟ ——— اور میں تیرے پاس کیوں آیا ہوں؟ ——— چھی چھی چھی ——— دس روپے، اور جیسا کہ تو کہتی ہے ڈھائی روپے دلال کے، باقی رہے ساڑھے سات، رہے نا ساڑھے سات؟ ——— اب ان ساڑھے سات روپیوں پر تو مجھے ایسی چیز دینے کا وچن دیتی ہے جو تو دے ہی نہیں سکتی اور میں ایسی چیز لینے آیا ہوں جو میں لے ہی نہیں سکتا ——— مجھے عورت چاہیئے پر تجھے کیا اس وقت، اسی گھڑی مرد چاہیئے؟ ——— مجھے تو عورت بھی بھا جائے گی پر کیا میں تجھے جچتا ہوں؟ ——— تیرا میرا ناطہ ہی کیا ہے، کچھ بھی نہیں ——— بس یہ دس روپے جن میں سے ڈھائی دلالی میں چلے جائیں گے اور باقی اِدھر اُدھر بکھر جائیں گے تیرے اور میرے بیچ میں بج رہے ہیں ——— تو بھی ان کا بجنا سن رہی ہے اور میں بھی۔ تیرا من کچھ اور سوچتا ہے میرا من کچھ اور ——— کیوں نہ کوئی ایسی بات کریں کہ تجھے میری ضرورت ہو اور مجھے تیری ——— پونے میں حوالدار ہوں۔ مہینے میں ایک بار آیا کروں گا تین چار دن کے لئے ——— یہ دھندا چھوڑ ——— میں تجھے خرچ دیا کروں گا ——— کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا ———؟"

مادھو نے اور بھی بہت کچھ کہا تھا جس کا اثر سوگندھی پر اس قدر زیادہ ہوا تھا کہ وہ چند لمحات کے لئے خود کو حوالدارنی سمجھنے لگی تھی۔ باتیں کرنے کے بعد مادھو نے اُس کے کمرے کی بکھری ہوئی چیزیں قرینے سے رکھی تھیں اور ننگی تصویریں جو سوگندھی نے اپنے سرہانے لٹکا رکھی تھیں، بنا پوچھے گچھے پھاڑ دی تھیں اور کہا تھا ——— "سوگندھی بھئی، میں ایسی تصویریں یہاں نہیں رکھنے دوں گا ——— اور پانی کا یہ گھڑا ——— دیکھ، کتنا میلا ہے اور یہ ——— یہ چیتھڑے ——— یہ چندیاں ——— اُف کتنی بری باس آتی ہے، اُٹھا کے باہر پھینک ان کو ——— اور تو نے اپنے بالوں کا کیا ستیاناس کر رکھا ہے ——— اور ——— اور ———"

تین گھنٹوں کی بات چیت کے بعد سوگندھی اور مادھو دونوں آپس میں گھل مل گئے تھے اور سوگندھی کو تو ایسا محسوس ہوا تھا کہ برسوں سے وہ اس کو جانتی ہے۔ اس وقت تک کسی نے بھی کمرے میں جابجا چیتھڑوں، میلے کپڑے اور ننگی تصویروں کی موجودگی کا خیال نہیں کیا تھا اور نہ کبھی کسی نے اس کو یہ محسوس کرنے کا موقع دیا تھا کہ اس کا ایک گھر ہے۔ جس میں گھریلو پن آ سکتا ہے۔ لوگ آتے تھے اور بستر کی غلاظت کو محسوس کئے بغیر چلے جاتے تھے۔ کوئی سوگندھی سے یہ نہیں کہتا تھا: "دیکھ تو آج تیری ناک کتنی لال ہو رہی ہے کہیں زکام نہ ہو جائے تجھے ۔۔۔ ٹھہر میں تیرے واسطے دوا لاتا ہوں۔" مادھو کتنا اچھا تھا۔ اس کی ہر بات باون تولے پاؤ رتی کی تھی۔ کیا کھری کھری سنائی تھیں اس نے سوگندھی کو ۔۔۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ اسے مادھو کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ان دونوں کا سمبندھ ہو گیا۔

مہینے میں ایک بار مادھو پونے سے آتا تھا اور واپس جاتے ہوئے ہمیشہ سوگندھی سے کہا کرتا تھا: "دیکھ سوگندھی! اگر تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی ۔۔۔ اگر تو نے ایک بار بھی کسی مرد کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چٹیا سے پکڑ کر باہر نکال دوں گا ۔۔۔ دیکھ اس مہینے کا خرچ میں تجھے پونا پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا ۔۔۔ ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا ۔۔۔"

نہ مادھو نے کبھی پونے سے خرچ بھیجا تھا اور نہ سوگندھی نے اپنا دھندا بند کیا تھا۔ دونوں اچھی طرح جانتے تھے، کیا ہو رہا ہے۔ نہ سوگندھی نے کبھی مادھو سے یہ کہا تھا: "تو یہ ٹرٹر کیا کرتا ہے، ایک پھوٹی کوڑی بھی دی ہے کبھی تو نے؟" اور نہ مادھو نے کبھی سوگندھی سے پوچھا تھا: "یہ مال تیرے پاس کہاں سے آیا ہے جب کہ میں تجھے کچھ دیتا ہی نہیں" ۔۔۔ دونوں جھوٹے تھے۔ دونوں ایک ملمع کی ہوئی زندگی بسر کر رہے تھے ۔۔۔ لیکن سوگندھی خوش تھی۔ جس کو اصل سونا پہننے کو نہ ملے وہ ملمع کئے ہوئے گہنوں ہی پر راضی ہو جایا کرتا ہے۔

اس وقت سوگندھی تھکی ماندی سو رہی تھی۔ بجلی کا قمقمہ جسے آف کرنا وہ بھول گئی تھی، اس کے سر کے اوپر لٹک رہا تھا۔ اس کی تیز روشنی اس کی مندی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ٹکرا رہی تھی۔ مگر وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی ۔۔۔ رات کے دو بجے یہ کون آیا تھا؟ سوگندھی کے خواب آلود کانوں میں دستک کی آواز بھنبھناہٹ بن کر پہنچی۔ دروازہ جب زور سے کھٹکھٹایا گیا تو چونک کر اٹھ بیٹھی ۔۔۔ دو ملی جلی شرابوں اور دانتوں کی ریخوں میں پھنسے ہوئے مچھلی کے ریزوں نے اس کے منہ کے اندر ایسا لعاب پیدا کر دیا تھا جو بے حد کسیلا اور لیس دار تھا۔ دھوتی کے پلو سے اس نے یہ بدبودار لعاب صاف کیا اور آنکھیں ملنے لگی۔ پلنگ پر وہ اکیلی تھی۔ جھک کر اس نے پلنگ کے نیچے دیکھا تو اس کا کتا سوکھے ہوئے چپلوں پر منہ رکھے سو رہا تھا اور نیند میں کسی غیر مرئی چیز کا منہ چڑا رہا تھا اور طوطا پیٹھ کے بالوں میں سر دیئے سو رہا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ سوگندھی بستر پر سے اٹھی۔ سر درد کے مارے پھٹا جا رہا تھا۔ گھڑے سے پانی کا ایک ڈونگا نکال کر اس نے کلی کی اور دوسرا ڈونگا غٹ غٹ پی کر اس نے دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھولا اور کہا: "رام لال؟"

رام لال جو باہر دستک دیتے دیتے تھک گیا تھا۔ بھنا کر کہنے لگا: "تجھے سانپ سونگھ گیا تھا یا کیا ہو گیا تھا۔ ایک کلاک (گھنٹے) سے باہر کھڑا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں۔ کہاں مر گئی تھی؟" ۔۔۔ پھر آواز دبا کر اس نے ہولے سے کہا: "اندر کوئی ہے تو نہیں؟"

جب سوگندھی نے کہا: "نہیں" ۔۔۔ تو رام لال کی آواز پھر اونچی ہو گئی: "تو دروازہ کیوں نہیں کھولتی؟ ۔۔۔ بھئی حد ہو گئی ہے۔ کیا نیند پائی ہے۔ یوں ایک ایک چھوکری کو اتارنے میں دو دو گھنٹے سر کھپانا پڑے تو میں اپنا دھندا کر چکا ۔۔۔ اب تو میرا منہ کیا دیکھتی ہے۔ جھٹ پٹ یہ دھوتی اتار کر وہ سورن جالی ساڑھی پہن، پوڈر ووڈر لگا اور چل میرے ساتھ ۔۔۔ باہر موٹر میں ایک سیٹھ بیٹھے تیرا انتظار کر رہے ہیں ۔۔۔ چل چل ایک دم جلدی کر۔"

سوگندھی آرام کرسی پر بیٹھ گئی اور رام لال آئینے کے سامنے اپنے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔

سوگندھی نے تپائی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بام کی شیشی اٹھا کر اس کا ڈھکنا کھولتے ہوئے کہا: "رام لال آج میرا جی اچھا نہیں۔"

رام لال نے کنگھی دیوار گیر پر رکھ دی اور مڑ کر کہا: "تم پہلے ہی ناں دیا ہوتا۔"

سوگندھی نے ملتے اور کنپٹیوں پر ہاتھ ملتے ہوئے رام لال کی غلط فہمی دور کر دی۔ "وہ بات نہیں رام لال! ——— ایسے ہی میرا جی اچھا نہیں ——— بہت پی گئی۔"

رام لال کے منہ میں پانی بھر آیا: "تھوڑی بچی ہو تو لاؤ ——— ذرا ہم بھی منہ کا مزا ٹھیک کر لیں۔"

سوگندھی نے بام کی شیشی پائنتی پر رکھ دی اور کہا: "بچائی ہوتی تو یہ مُوا سر میں درد ہی کیوں ہوتا ——— دیکھ رام لال! وہ جو باہر موٹر میں بیٹھا ہے اسے اندر ہی لے آؤ۔"

رام لال نے جواب دیا: "نہیں بھئی وہ اندر نہیں آسکتے۔ جنٹلمین آدمی ہیں۔ وہ تو موٹر کو گلی کے باہر کھڑی کرتے ہوئے بھی گھبراتے تھے ——— تو کپڑے وپڑے پہن لے اور ذرا گلی کے نکڑ تک چل ——— سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ساڑھے سات روپے کا سودا تھا۔ سوگندھی اس حالت میں جبکہ اس کے سر میں شدت کا درد ہو رہا تھا۔ کبھی قبول نہ کرتی۔ مگر اسے روپوں کی سخت ضرورت تھی۔ اس کے ساتھ والی کھولی میں ایک مدراسی عورت رہتی تھی جس کا خاوند موٹر کے نیچے آکر مر گیا تھا۔ اس عورت کو اپنی جوان لڑکی سمیت اپنے وطن جانا تھا لیکن اس کے پاس چونکہ کرایہ ہی نہیں تھا اس لیے وہ کس مپرسی کی حالت میں پڑی تھی۔ سوگندھی نے کل ہی اس کو ڈھارس دی تھی اور اس سے کہا تھا: "بہن تو چنتا نہ کر۔ میرا مرد پونے سے آنے ہی والا ہے۔ میں اس سے کچھ روپے لے کر تیرے جانے کا بندوبست کر دوں گی۔" مادھو پونا سے آنے والا تھا مگر روپوں کا بندوبست تو سوگندھی ہی کو کرنا تھا۔ چنانچہ وہ اٹھی اور جلدی جلدی کپڑے تبدیل کرنے لگی۔ پانچ منٹ میں اس نے دھوتی اتار کر پھولوں والی ساڑھی پہنی اور گالوں پر سرخ پوڈر لگا کر تیار ہو گئی۔ گھڑے کے ٹھنڈے پانی کا ایک لوٹا پیا اور رام لال کے ساتھ ہو لی۔

گلی جو کہ چھوٹے شہروں کے بازار سے بھی کچھ بڑی تھی بالکل خاموش تھی۔ گیس کے وہ لیمپ جو کھمبوں پر جڑے تھے پہلے کی نسبت بہت دھندلی روشنی دے رہے تھے۔ جنگ کے باعث ان کے شیشوں کو گدلا کر دیا گیا تھا۔ اس اندھی روشنی میں گلی کے آخری سرے پر ایک موٹر نظر آرہی تھی۔

کمزور روشنی میں اس سیاہ رنگ کی موٹر کا سایہ سا نظر آنا اور رات کے پچھلے پہر کی بھیدوں بھری خاموشی ——— سوگندھی کو ایسا لگا کہ اس کے سر کا درد فضا پر بھی چھا گیا ہے۔ ایک کسیلا پن اسے ہوا کے اندر بھی محسوس ہوتا تھا جیسے برانڈی اور بیوڑا کی باس سے وہ بھی بوجھل ہو رہی ہے۔

آگے بڑھ کر رام لال نے موٹر کے اندر بیٹھے ہوئے آدمیوں سے کچھ کہا۔ اتنے میں جب سوگندھی موٹر کے پاس پہنچ گئی تو رام لال نے ایک طرف ہٹ کر کہا: "لیجئے وہ آگئی ——— بڑی اچھی چھوکری ہے۔ تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں اسے دھندا شروع کئے" ——— پھر سوگندھی سے مخاطب ہو کر کہا: "سوگندھی، ادھر آ، سیٹھ جی بلاتے ہیں۔"

سوگندھی ساڑھی کا ایک کنارہ اپنی انگلی پر لپیٹتی ہوئی آگے بڑھی اور موٹر کے دروازے کے پاس کھڑی ہو گئی۔ سیٹھ صاحب نے بیٹری اس کے چہرے کے پاس روشن کی۔ ایک لمحے کے لئے اس روشنی نے سوگندھی کی خمار آلود آنکھوں میں چکا چوند پیدا کی۔ بٹن دبانے کی آواز پیدا ہوئی اور روشنی بجھ گئی۔ ساتھ ہی سیٹھ کے منہ سے "اونہہ" نکلا۔ پھر ایک دم موٹر کا انجن پھڑپھڑایا اور کار یہ جا وہ جا ۔ ۔ ۔ ۔

سوگندھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ موٹر چل دی۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک بیٹری کی تیز روشنی گھسی ہوئی تھی۔ وہ ٹھیک طرح سے سیٹھ کا چہرہ بھی تو نہ دیکھ سکی تھی۔ یہ آخر ہوا کیا تھا۔ اس "اونہہ" کا کیا مطلب تھا جو ابھی تک اس کے کانوں میں بھنبھنا رہی تھی۔ کیا؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا؟

رام لال دلال کی آواز سنائی دی: "پسند نہیں کیا تجھے؟ ——— اچھا بھئی میں چلتا ہوں۔ دو گھنٹے مفت ہی میں برباد کئے۔"

یہ سن کر سوگندھی کی ٹانگوں میں، اس کی بانہوں میں، اس کے ہاتھوں میں ایک زبردست حرکت پیدا ہوئی۔ کہاں تھی وہ موٹر ——— کہاں وہ سیٹھ ——— تو "اونہہ" کا مطلب یہ تھا کہ اس نے مجھے پسند نہیں کیا ——— اس کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

گالی اُس کے پیٹ کے اندر سے اُٹھی اور زبان کی نوک پر آ کر رُک گئی۔ وہ اَنجوگالی کیسے دیتی۔ موٹر تو جا چکی تھی۔ اُس کی دُم کی سُرخ بتی اُس کے سامنے بازار کے
بادامی میں ڈوب رہی تھی اور سوگندھی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ لال لال انگارہ "اونہہ" ہے جو اُس کے سینے میں برمے کی طرح اُترا چلا جا رہا ہے۔
کے جی میں آئی کہ زور سے پکارے: "او سیٹھ —— او سیٹھ —— ذرا موٹر روکنا اپنی —— بس ایک منٹ کے لئے" پر وہ سیٹھ مٹی ہے
لی ذات پر بہت دُور نکل چکا تھا۔

سنسان بازار میں کھڑی تھی۔ پھولوں والی ساڑھی جو وہ خاص خاص موقعوں پر پہنا کرتی تھی، رات کے پچھلے پہر کی ہلکی پھلکی ہوا سے لہرا رہی تھی۔ ساڑھی
کی ریشمیں سرسراہٹ سوگندھی کو کتنی بُری معلوم ہوتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اُس ساڑھی کے چیتھڑے اُڑا دے۔ کیونکہ ساڑھی ہوا میں لہرا لہرا کر "اونہہ
ہنکار رہی تھی۔

گالوں پر اُس نے پوڈر لگایا تھا اور ہونٹوں پر سُرخی۔ جب اُسے خیال آیا کہ یہ سنگار اُس نے اپنے آپ کو پسند کرانے کے واسطے کیا تھا تو شرم کے
اُسے پسینہ آ گیا۔ یہ شرمندگی دُور کرنے کے لئے اُس نے کیا کچھ نہ سوچا —— میں نے اس موئے کو دکھانے کے لئے تھوڑی اپنے آپ کو
تھا یہ تو میری عادت ہے —— میری کیا سب کی یہی عادت ہے —— پر —— پر —— یہ رات کے دو بجے اور رام لال دلال اور —— یہ
—— اور وہ موٹر اور بیٹری کی چمک" —— یہ سوچتے ہی روشنی کے دھبے اُس کی حد نگاہ تک فضا میں اِدھر اُدھر تیرنے لگے اور موٹر کے انجن کی
پھڑپھڑاہٹ اُسے ہوا کے ہر جھونکے میں سنائی دینے لگی۔

اُس کے ماتھے پر بام کا لیپ جو سنگار کرنے کے دوران میں بالکل ہلکا ہو گیا تھا، پسینہ آنے کے باعث اُس کے مساموں میں داخل ہونے لگا اور سوگندھی
کا ماتھا کسی اور کا ماتھا معلوم ہوا۔ جب ہوا کا ایک جھونکا اُس کے عرق آلود ماتھے کے پاس سے گزرا تو اُسے ایسا لگا کہ سرد سرد ٹین کا ٹکڑا کاٹ کر اُس
ماتھے کے ساتھ چسپاں کر دیا گیا ہے۔ سر میں درد ویسے کا ویسا موجود تھا مگر خیالات کی بھیڑ بھاڑ اور اُن کے شور نے اس درد کو اپنے نیچے دبا رکھا
سوگندھی نے کئی بار اس درد کو اپنے خیالات کے نیچے سے نکال کر اُوپر لانا چاہا مگر ناکام رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اُس کا انگ انگ دُکھنے
اُس کے سر میں درد ہو، اُس کی ٹانگوں میں درد ہو، اُس کے پیٹ میں درد ہو، اُس کی باہوں میں درد ہو —— ایسا درد کہ وہ صرف درد ہی کا خیال
اور سب کچھ بھول جائے۔ یہ سوچتے سوچتے اُس کے دل میں کچھ ہوا —— کیا یہ درد تھا؟ —— ایک لمحے کے لئے اُس کا دل سکڑا اور پھر پھیل گیا
یہ کیا تھا؟ —— لعنت! یہ تو وہی "اونہہ" تھی جو اُس کے دل کے اندر کبھی سکڑتی اور کبھی پھیلتی تھی۔

گھر کی طرف سوگندھی کے قدم اُٹھے ہی تھے کہ رُک گئے: اور وہ ٹھہر کر سوچنے لگی۔ رام لال دلال کا خیال ہے کہ اُسے میری شکل پسند نہیں آئی ——
اُس نے ذکر نہیں کیا۔ اُس نے تو یہ کہا تھا: سوگندھی تجھے پسند نہیں کیا! اُسے —— اُسے —— صرف میری شکل ہی پسند نہیں آئی ——
نہ آئی تو کیا ہوا؟ —— مجھے بھی تو کئی آدمیوں کی شکل پسند نہیں آتی —— وہ جو اماوس کی رات کو آیا تھا۔ کتنی بُری صورت تھی اُس کی ——
اپنے ناک بھوں نہیں چڑھائی تھی؟ جب وہ میرے ساتھ سونے لگا تھا تو مجھے گھن نہیں آئی تھی؟ —— کیا مجھے اُبکائی آتے آتے نہیں رُک گئی تھی؟ ——
ہے، پر سوگندھی —— تو نے اُسے دھتکارا نہیں تھا، تو نے اُس کو ٹھکرایا نہیں تھا —— اس موٹر والے سیٹھ نے تو تیرے مُنہ پر تھوکا
—— اونہہ —— اس "اونہہ" کا اور مطلب ہی کیا ہے؟ —— یہی کہ اس چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل —— اونہہ ——
اور مسور کی دال —— ارے رام لال تو یہ چھپکلی کہاں سے پکڑ کے لایا ہے —— اس لونڈیا کی اتنی تعریف کر رہا ہے تو —— دس
اور یہ عورت —— خچر کیا بُری ہے ....."

سوگندھی سوچ رہی تھی اور اُس کے پیر کے انگوٹھے سے لے کر سر کی چوٹی تک گرم لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اُس کو کبھی اپنے آپ پر غصہ آتا تھا اور
لال دلال پر جس نے رات کے دو بجے اُسے بے آرام کیا۔ لیکن فوراً ہی دونوں کو بے قصور پا کر وہ سیٹھ کا خیال کرتی تھی۔ اس خیال کے آتے ہی

اُس کی آنکھیں، اُس کے کان، اُس کی بانہیں، اُس کی ٹانگیں، اُس کو سب کچھ مڑ جانا تھا کہ اُس سیٹھ کو کہیں دیکھ پائے ——— اُس کے اندر یہ خواہش شدت سے پیدا ہو رہی تھی کہ جو کچھ ہو چکا ہے ایک بار پھر ہو ——— صرف ایک بار...... وہ ہولے ہولے موٹر کی طرف بڑھے، موٹر کے اندر ایک ہاتھ بڑھا کر نکالے اور اُس کے چہرے پر روشنی پھینکے "اونہہ" کی آواز آئے اور وہ ——— سوگندھی ——— اندھا دھند اپنے دونوں ہاتھوں سے اُس کا منہ نوچنا شروع کر دے۔ وحشی بلی کی طرح جھپٹے اور ——— اور اپنی اُنگلیوں کے سارے ناخن جو اُس نے موجودہ فیشن کے مطابق بڑھا رکھے تھے اُس سیٹھ کے گالوں میں گاڑ دے ——— بالوں سے پکڑ کر اُسے باہر گھسیٹ لے اور دھڑا دھڑ مکے مارنا شروع کر دے اور جب تھک جائے ——— جب تھک جائے تو رونا شروع کر دے۔

رونے کا خیال سوگندھی کو صرف اس لئے آیا کہ اُس کی آنکھوں میں غصے اور بے بسی کی شدت کے باعث تین چار بڑے بڑے آنسو بن رہے تھے، ایکا ایکی سوگندھی نے اپنی آنکھوں سے سوال کیا "تم روتی کیوں ہو؟ تمہیں کیا ہوا ہے کہ ٹپکنے لگی ہو؟" ——— آنکھوں سے کیا ہوا سوال چند لمحات تک اُن آنسوؤں میں تیرتا رہا جو اب پلکوں پر کانپ رہے تھے۔ سوگندھی ان آنسوؤں میں سے دیر تک اُس خلا کو گھورتی رہی جدھر سیٹھ کی موٹر گئی تھی۔

پھڑ پھڑ پھڑ ——— یہ آواز کہاں سے آئی؟ ——— سوگندھی نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا لیکن کسی کو نہ پایا ——— ارے! یہ تو اُس کا دل پھڑ پھڑایا تھا۔ وہ سمجھی تھی موٹر کا انجن بولا ہے ——— اُس کا دل ——— یہ کیا ہو گیا تھا اُس کے دل کو! ——— آج ہی یہ روگ لگ گیا تھا اسے ——— اچھا بھلا چلتا چلتا ایک جگہ رک کر دھڑ دھڑ کیوں کرتا تھا ——— بالکل اُس گھسے ہوئے ریکارڈ کی طرح جو سوئی کے نیچے ایک جگہ آ کے رک جاتا تھا۔ "رات کٹی گن گن تارے" کہتا کہتا "تارے تارے" کی رٹ لگا دیتا تھا۔

آسمان تاروں سے اٹا ہوا تھا۔ سوگندھی نے ان کی طرف دیکھا اور کہا "کتنے سُندر ہیں" ——— وہ چاہتی تھی کہ اپنا دھیان کسی اور طرف پلٹ دے پر جب اُس نے "سُندر" کہا تو جھٹ سے یہ خیال اُس کے دماغ میں کودا "یہ تارے سُندر ہیں پر تو کتنی بھونڈی ہے ——— کیا بھول گئی کہ ابھی ابھی تیری صورت کو پھٹکارا گیا ہے؟"

سوگندھی بدصورت نہیں تھی۔ یہ خیال آتے ہی وہ تمام عکس ایک ایک کر کے اُس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے جو اِن پانچ برسوں کے دوران میں وہ دیکھ چکی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس کا رنگ روپ اب وہ نہیں رہا تھا جو آج سے پانچ سال پہلے تھا جبکہ وہ تمام فکروں سے آزاد اپنے ماں باپ کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ لیکن وہ بدصورت تو نہیں ہو گئی تھی۔ اس کی شکل و صورت اُن عام عورتوں کی سی تھی جن کی طرف مرد گزرتے گزرتے گھور کے دیکھ لیا کرتا ہے۔ اس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں۔ جو سوگندھی کے خیال میں ہر مرد اُس عورت میں ضروری سمجھتا ہے جس کے ساتھ اُسے ایک دو راتیں بسر کرنا ہوں۔ وہ جوان تھی، اُس کے اعضا متناسب تھے۔ کبھی کبھی نہاتے وقت جب اُس کی نگاہیں اپنی رانوں پر پڑتی تھیں تو وہ خود ان کی گولائی اور گدراہٹ کو پسند کیا کرتی تھی۔ وہ خوش خلق تھی۔ اِن پانچ برسوں کے دوران میں شاید ہی کوئی آدمی اُس سے ناخوش ہو کر گیا ہو ——— بڑی ملنسار تھی، بڑی رحم دل تھی۔ پچھلے دنوں کرسمس میں جب وہ گول پیٹھا میں رہا کرتی تھی، ایک نوجوان لڑکا اُس کے پاس آیا تھا۔ صبح اٹھ کر جب اُس نے دوسرے کمرے میں جا کر کھونٹی سے اپنا کوٹ اُتارا تو بٹوہ غائب پایا۔ سوگندھی کا نوکر یہ بٹوہ لے اڑا تھا۔ بے چارہ بہت پریشان ہوا۔ چھٹیاں گزارنے کے لئے حیدرآباد سے بمبئی آیا تھا۔ اب اُس کے پاس واپس جانے کے لئے دام نہ تھے۔ سوگندھی نے ترس کھا کر اُسے اُس کے دس روپے واپس دے دیئے تھے ——— "مجھ میں کیا برائی ہے؟" سوگندھی نے یہ سوال ہر اُس چیز سے کیا جو اُس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ گیس کے اندھے لیمپ، لوہے کے کھمبے، فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور سڑک کی اُکھڑی ہوئی ——— ان سب چیزوں کی طرف اُس نے باری باری دیکھا، پھر آسمان کی طرف نگاہیں اُٹھائیں جو اُس کے اوپر جھکا ہوا تھا مگر سوگندھی کو کوئی جواب ——— جواب اُس کے اندر موجود تھا، وہ جانتی تھی کہ وہ بری نہیں اچھی ہے۔ پر وہ چاہتی تھی کہ کوئی اُس کی تائید کرے ——— کوئی ——— کوئی ———

کہ کوئی اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر صرف اتنا کہہ دے "سوگندھی! کون کہتا ہے، تو بُری ہے، جو تجھے بُرا کہے۔ وہ آپ بُرا ہے" ——— نہیں، یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کسی کا اتنا کہہ دینا کافی تھا "سوگندھی تو بہت اچھی ہے!"

وہ سوچنے لگی کہ وہ کیوں چاہتی ہے کہ کوئی اس کی تعریف کرے۔ اس سے پہلے اُسے اس بات کی اتنی شدت سے ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی۔ آج کیوں وہ بے جان چیزوں کو بھی ایسی نظروں سے دیکھتی ہے جیسے اُن پر اپنے اچھے ہونے کا احساس طاری کرنا چاہتی ہے۔ اُس کے جسم کا ذرہ ذرہ کیوں "ماں" بن رہا تھا ——— وہ ماں بن کر دھرتی کی ہر شے کو اپنی گود میں لینے کے لئے کیوں تیار ہو رہی تھی؟ ——— اُس کا جی کیوں چاہتا تھا کہ سامنے والے گیس کے آہنی کھمبے کے ساتھ چمٹ جائے اور اُس کے سرد لوہے پر اپنے گال رکھ دے ——— اپنے گرم گرم گال اور اُس کی ساری سردی چوس لے۔

تھوڑی دیر کے لئے اُسے ایسا محسوس ہوا کہ گیس کے اندھے لیمپ، لوہے کے کھمبے، فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور ہر وہ شے جو رات کے سناٹے میں اُس کے پاس تھی ہمدردی کی نظروں سے اُسے دیکھ رہی ہے اور اُس کے اوپر جھکا ہوا آسمان بھی جو مٹیالے رنگ کی ایسی موٹی چادر معلوم ہوتا تھا جس میں جا بجا سوراخ ہو رہے ہوں۔ اُس کی باتیں سمجھتا تھا اور سوگندھی کو بھی ایسا لگتا تھا کہ وہ تاروں کا ٹمٹمانا سمجھتی ہے ——— لیکن اُس کے اندر یہ گڑبڑ کیسی تھی؟ ——— وہ کیوں اپنے اندر اُس موسم کی فضا محسوس کرتی تھی، جو بارش سے پہلے میلنے میں آیا کرتا ہے ——— اُس کا جی چاہتا تھا کہ اُس کے جسم کا ہر مسام کھل جائے، اور جو کچھ اُس کے اندر اُبل رہا ہے۔ اُن کے رستے باہر نکل جائے۔ پر یہ کیسے ہو ——— کیسے ہو؟

سوگندھی گلی کے نکڑ پر غلاظت ڈالنے والے لال بمبے کے پاس کھڑی تھی ——— ہوا کے تیز جھونکے سے اس بمبے کی آہنی زبان جو اُس کے کھلے ہوئے منہ میں لٹک رہی ہے، لڑکھڑائی تو سوگندھی کی نگاہیں یک بیک اُس طرف اُٹھیں جدھر موٹر گئی تھی مگر اُسے کچھ نظر نہ آیا ——— اُسے کتنی زبردست آرزو تھی کہ وہ موٹر پھر ایک بار آئے اور ——— اور ———

لیکن نہ آئے ——— بلا سے ——— میں اپنی جان کیوں بیکار ہلکان کروں ——— گھر چلتے ہیں۔ اور آرام سے لمبی تان کر سوتے ہیں۔ ان جھگڑوں میں کیا رکھا ہے۔ مفت کی دردسری ہی تو ہے ——— چل سوگندھی گھر چل ——— ٹھنڈے پانی کا ایک ڈونگا پی، اور تھوڑا سا بام مل کر سو جا ——— فسٹ کلاس نیند آئے گی اور سب ٹھیک ہو جائے گا ——— سیٹھ اور اُس موٹر کی ایسی تیسی ———"

یہ سوچتے ہوئے سوگندھی کا بوجھ ہلکا ہو گیا جیسے وہ کسی ٹھنڈے تالاب سے نہا دھو کر باہر نکلی ہے۔ جس طرح پوجا کرنے کے بعد اُس کا جسم ہلکا ہو جاتا تھا اُسی طرح اب بھی ہلکا ہو گیا تھا۔ گھر کی طرف چلنے لگی تو خیالات کا بوجھ نہ ہونے کے باعث اُس کے قدم کئی بار لڑکھڑائے۔

اپنے مکان کے پاس پہنچی تو ایک ٹیس کے ساتھ پھر تمام واقعہ اُس کے دل میں اُٹھا اور درد کی طرح اُس کے روئیں روئیں پر چھا گیا ——— قدم پھر بوجھل ہو گئے اور وہ اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگی کہ گھر سے بُلا کر باہر بازار میں، منہ پر روشنی کا چانٹا مار کر ایک آدمی نے اُس کی ابھی ابھی ہتک کی ہے۔ یاد آیا اُس نے اپنی پسلیوں پر کسی کے سخت انگوٹھے محسوس کئے جیسے کوئی اُسے بھیڑ بکری کی طرح دبا دبا کر دیکھ رہا ہے کہ آیا گوشت بھی ہے یا بال ہی بال ہیں ——— اُس سیٹھ نے ——— پرماتما کرے ...... سوگندھی نے چاہا کہ اُس کو بددعا دے مگر سوچا، بددعا دینے سے کیا بنے گا۔ مزا تو جب تھا کہ وہ سامنے ہوتا اور وہ اُس کے وجود کے ہر ذرے پر اپنی لعنتیں لکھ دیتی ——— اُس کے منہ پر کچھ ایسے الفاظ کہتی کہ زندگی بھر بے چین رہتا ——— کپڑے پھاڑ کر اُس کے سامنے ننگی ہو جاتی اور کہتی "یہی لینے آیا تھا نا تو ——— لے دام دیئے بنا لے جا اسے ——— پر جو کچھ میں ہوں، جو کچھ میرے اندر چھپا ہوا ہے وہ تو کیا، تیرا باپ بھی نہیں خرید سکتا ———"

انتقام کے نئے نئے طریقے سوگندھی کے ذہن میں آ رہے تھے، اگر اُس سیٹھ سے ایک بار ——— صرف ایک بار ——— اُس کی مڈبھیڑ ہو جائے تو وہ یہ کرے، نہیں، یہ نہیں یہ کرے ——— یوں اُس سے انتقام لے، نہیں یوں نہیں یوں ——— لیکن جب سوگندھی سوچتی کہ سیٹھ سے اُس کا دوبارہ ملنا ناممکن ہے تو وہ اُسے ایک چھوٹی سی گالی دینے ہی پر خود کو راضی کر لیتی ——— بس صرف ایک چھوٹی سی گالی، جو اُس کی ناک پر چپکو مکھی کی طرح بیٹھ جائے

اور ہمیشہ دیر لگاتی رہے۔

سوگندھی اندھیرے میں وہ دو دھیری زینہ طے کرتی اپنی کھولی کے پاس پہنچ گئی۔ چولی میں سے چابی نکال کر تالا کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو چابی ہوا ہی میں گھوم کر رہ گئی۔ کنڈے میں تالا نہیں تھا۔ سوگندھی نے دروازے کو اندر کی طرف دبایا تو ہلکی سی چرچراہٹ پیدا ہوئی۔ اندر سے کسی نے کنڈی کھولی اور دروازے نے جمائی لی۔ سوگندھی اندر داخل ہو گئی۔

مادھو مونچھوں میں ہنسا اور دروازہ بند کرکے سوگندھی سے کہنے لگا: "آج تو نے میرا کہا مان ہی لیا ——— صبح کی سیر تندرستی کے لیے بڑی اچھی ہوتی ہے۔ ہر روز اسی طرح صبح اٹھ کر سیر کو جایا کرے گی تو تیری ساری سستی دور ہو جائے گی اور وہ تیری کمر کا درد بھی غائب ہو جائے گا جس کی بابت تو آئے دن شکایت کیا کرتی ہے ——— وکٹوریہ گارڈن تک تو ہو آئی ہوگی تو؟ ——— کیوں؟"

سوگندھی نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ مادھو نے جواب کی خواہش ظاہر کی۔ دراصل جب مادھو بات کیا کرتا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا تھا کہ سوگندھی ضرور اس میں حصہ لے اور سوگندھی جب کوئی بات کیا کرتی تھی تو یہ ضروری نہیں ہوتا تھا کہ مادھو اس میں حصہ لے ——— چونکہ کوئی بات کرنا ہوتی تھی، اس لیے وہ کچھ کہہ دیا کرتے تھے۔

مادھو بید کی کرسی پر بیٹھ گیا جس کی پشت پر اس کے تیل سے چپڑے ہوئے سر نے میلا سا دھبہ بنا رکھا تھا اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اپنی مونچھوں پر انگلیاں پھیرنے لگا۔

سوگندھی پلنگ پر بیٹھ گئی اور مادھو سے کہنے لگی: "میں آج تیرا انتظار کر رہی تھی۔"

مادھو بڑا سٹپٹایا: "انتظار؟ ——— تجھے کیسے معلوم ہوا کہ میں آج آنے والا ہوں؟"

سوگندھی کے بھنچے ہوئے لب کھلے۔ ان پر ایک پیلی مسکراہٹ نمودار ہوئی: "میں نے رات تجھے سپنے میں دیکھا تھا ——— اٹھی تو کوئی بھی نہ تھا۔ جی نے کہا چلو کہیں باہر گھوم آئیں ——— اور ———"

مادھو خوش ہو کر بولا: "اور میں آ گیا ——— بھئی بڑے لوگوں کی باتیں بڑی پکی ہوتی ہیں۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے، دل کو دل سے راہ ہے ——— تو نے یہ سپنا کب دیکھا تھا؟"

سوگندھی نے جواب دیا: "چار بجے کے قریب۔"

مادھو کرسی پر سے اٹھ کر سوگندھی کے پاس بیٹھ گیا: "اور میں نے تجھے ٹھیک دو بجے سپنے میں دیکھا ——— جیسے تو پھولوں والی ساڑھی ——— بالکل یہی ساڑھی پہنے میرے پاس کھڑی ہے ——— تیرے ہاتھوں میں ——— کیا تھا تیرے ہاتھوں میں؟ ——— ہاں تیرے ہاتھوں میں روپوں سے بھری تھیلی تھی۔ تو نے یہ تھیلی میری جھولی میں رکھ دی اور کہا: مادھو! تو چنتا کیوں کرتا ہے؟ ——— لے یہ تھیلی ——— ارے تیرے میرے پیسے کیا ہیں؟ ——— سوگندھی تیری جان کی قسم فوراً اٹھا اور ٹکٹ کٹا کر ادھر کا رخ کیا ——— کیا سناؤں بڑی پریشانی ہے! ——— بیٹھے بٹھلائے ایک کیس ہو گیا ہے۔ اب بیس تیس روپے ہوں تو ——— انسپکٹر کی مٹھی گرم کرکے چھٹکارا ملے ——— تھک تو نہیں گئی تو؟ لیٹ جا، میں تیرے پیر دبا دوں۔ سیر کی عادت نہ ہو تو تھکن ہو ہی جایا کرتی ہے ——— ادھر میری طرف پیر کرکے لیٹ جا۔"

سوگندھی لیٹ گئی۔ دونوں بانہوں کو تکیہ بنا کر وہ ان پر سر رکھ کر لیٹ گئی اور اس لہجے میں جو اس کا اپنا نہیں تھا، مادھو سے کہنے لگی: "مادھو یہ کس موئے نے تجھ پر کیس کیا ہے؟ ——— جیل ویل کا ڈر ہو تو مجھ سے کہہ دے ——— بیس تیس کیا، سو پچاس بھی ایسے موقعوں پر پولیس کے ہاتھ میں دے دیئے جائیں تو فائدہ اپنا ہی ہے ——— جان بچی لاکھوں پائے ——— بس بس اب جانے دے۔ تھکن کچھ زیادہ نہیں ہے ——— مٹھی چاپی چھوڑ مجھے ساری بات سنا ——— کیس کا نام سنتے ہی میرا دل دھک دھک کرنے لگا ہے ——— واپس کب جائے گا تو؟"

مادھو کو سوگندھی کے منہ سے شراب کی باس آئی۔ اس نے یہ موقع اچھا سمجھا اور جھٹ سے کہا: "دوپہر کی گاڑی سے واپس جانا پڑے گا ——— اگر شام تک انسپکٹر کو سو پچاس نہ تھمائے تو ...... زیادہ دینے کی ضرورت نہیں، میں سمجھتا ہوں پچاس میں کام چل جائے گا۔"

"پچاس!" یہ کہہ کر سوگندھی بڑے آرام سے اٹھی اور ان چار تصویروں کے پاس آہستہ آہستہ گئی جو دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ بائیں طرف سے تیسرے فریم میں مادھو کی تصویر تھی۔ بڑے بڑے پھولوں والے پردے کے آگے کرسی پر وہ دونوں رانوں پر اپنے ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ میں گلاب کا پھول تھا۔ پاس ہی تپائی پر دو موٹی موٹی کتابیں دھری تھیں۔ تصویر اترواتے وقت تصویر اتروانے کا خیال مادھو پر اس قدر غالب تھا کہ اس کی ہر چیز تصویر سے باہر نکل نکل کر گویا پکار رہی تھی: "ہمارا فوٹو اترے گا۔ ہمارا فوٹو اترے گا!"

کیمرے کی طرف مادھو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فوٹو اترواتے وقت اسے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔

سوگندھی کھلکھلا کر ہنس پڑی ——— اس کی ہنسی کچھ ایسی تیکھی اور نوکیلی تھی کہ مادھو کو سوئیاں سی چبھیں۔ پلنگ پر سے اٹھ کر وہ سوگندھی کے پاس گیا: "کس کی تصویر دیکھ کر تو اس قدر زور سے ہنسی ہے؟"

سوگندھی نے بائیں ہاتھ کی پہلی تصویر کی طرف اشارہ کیا جو میونسپلٹی کے داروغہ صفائی کی تھی: "اس کی ——— منسپلٹی کے اس داروغہ کی ..... ذرا دیکھ تو اس کا تھوبڑا ——— کہتا تھا، ایک رانی مجھ پر عاشق ہو گئی تھی ——— اونہہ! یہ منہ اور مسور کی دال!" یہ کہہ کر سوگندھی نے فریم کو اس زور سے کھینچا کہ دیوار میں سے کیل بھی پلستر سمیت اکھڑ آئی۔

مادھو کی حیرت ابھی دور نہ ہوئی تھی کہ سوگندھی نے فریم کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ دو منزلوں سے یہ فریم نیچے زمین پر گرا اور کانچ ٹوٹنے کی جھنکار سنائی دی۔ سوگندھی نے اس جھنکار کے ساتھ کہا: "رانی بھنگن کچرا اٹھانے آئے گی تو میرے اس راجہ کو بھی ساتھ لے جائے گی۔"

ایک بار پھر اسی نوکیلی اور تیکھی ہنسی کی پھوار سوگندھی کے ہونٹوں سے گرنا شروع ہوئی جیسے وہ ان پر چاقو یا چھری کی دھار تیز کر رہی ہے۔

مادھو بڑی مشکل سے مسکرایا۔ پھر ہنسا: "ہی ہی ہی ....."

سوگندھی نے دوسرا فریم بھی نوچ لیا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا: "اس سالے کا یہاں کیا مطلب ہے ——— بھونڈی شکل کا کوئی آدمی یہاں نہیں رہے گا ..... کیوں مادھو؟"

مادھو پھر بڑی مشکل سے مسکرایا اور پھر ہنسا: "ہی ہی ہی ....."

ایک ہاتھ سے سوگندھی نے پگڑی والے کی تصویر اتاری اور دوسرا ہاتھ اس فریم کی طرف بڑھایا جس میں مادھو کا فوٹو جڑا تھا۔ مادھو اپنی جگہ پر سمٹ گیا جیسے ہاتھ اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک سیکنڈ میں فریم کیل سمیت سوگندھی کے ہاتھ میں تھا۔

زور کا قہقہہ لگا کر اس نے "اونہہ" کی اور دونوں فریم ایک ساتھ کھڑکی میں سے باہر پھینک دیئے۔ دو منزلوں سے جب فریم زمین پر گرے اور کانچ ٹوٹنے کی آواز آئی تو مادھو کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے۔ بڑی مشکل سے اس نے ہنس کر اتنا کہا: "اچھا کیا! ——— مجھے بھی یہ فوٹو پسند نہیں تھا۔"

آہستہ آہستہ سوگندھی مادھو کے پاس آئی اور کہنے لگی: "تجھے یہ فوٹو پسند نہیں تھا ——— پر میں پوچھتی ہوں تجھ میں ہے ایسی کونسی چیز جو کسی کو پسند آ سکتی ہے ——— یہ تیری پکوڑا ایسی ناک، یہ تیرا بالوں بھرا ماتھا، یہ تیرے سوجے ہوئے نتھنے، یہ تیرے مڑے ہوئے کان، یہ تیرے منہ کی باس، یہ تیرے بدن کی میل؟ ——— تجھے اپنا فوٹو پسند نہیں تھا، اونہہ ..... پسند کیوں ہوتا، تیرے عیب جو چھپا رکھے تھے اس نے ..... آجکل زمانہ ہی ایسا ہے جو عیب چھپائے وہی برا ———"

مادھو پیچھے ہٹتا گیا۔ آخر جب وہ دیوار کے ساتھ لگ گیا تو اس نے اپنی آواز میں زور پیدا کر کے کہا: "دیکھ سوگندھی، مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے

تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا ہے ـــــ اب تجھ سے آخری بار کہتا ہوں ......"

سوگندھی نے اس سے آگے مادھو کے لہجے میں کہنا شروع کیا: "اگر تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی۔ اگر تو نے پھر کسی کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چٹیا سے پکڑ کر تجھے باہر نکال دوں گا ـــــ اس مہینے کا خرچ میں تجھے پونا پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا ـــــ ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا؟"

مادھو چکرا گیا۔

سوگندھی نے کہنا شروع کیا: "میں بتاتی ہوں ـــــ پندرہ روپیہ بھاڑا ہے اس کھولی کا ـــــ اور دس روپیہ بھاڑا ہے میرا ـــــ اور جیسا تجھے معلوم ہے ڈھائی روپے دلال کے، باقی رہے ساڑھے سات، ہے نا ساڑھے سات؟ ان ساڑھے سات روپلیوں میں میں نے ایسی چیز دینے کا وچن دیا تھا جو میں دے ہی نہیں سکتی تھی۔ اور تو ایسی چیز لینے آیا تھا جو تو لے ہی نہیں سکتا تھا ـــــ تیرا میرا ناتا ہی کیا تھا، کچھ بھی نہیں، بس یہ دس روپے تیرے اور میرے بیچ میں بج رہے تھے۔ سو ہم دونوں نے مل کر ایسی بات کی کہ تجھے میری ضرورت ہوئی اور مجھے تیری ـــــ پہلے تیرے اور میرے بیچ میں دس روپے بجتے تھے، آج پچاس بج رہے ہیں۔ تو بھی اُن کا بجنا سن رہا ہے اور میں بھی اُن کا بجنا سن رہی ہوں ـــــ یہ تو نے اپنے بالوں کا کیا ستیاناس کر رکھا ہے!"

یہ کہہ کر سوگندھی نے مادھو کی ٹوپی انگلی سے ایک طرف اڑا دی۔ یہ حرکت مادھو کو بہت ناگوار گزری۔ اس نے بڑے کڑے لہجے میں کہا۔ "سوگندھی!"

سوگندھی نے مادھو کی جیب سے رومال نکال کر سونگھا اور زمین پر پھینک دیا: "یہ چیتھڑے، یہ چندیاں ـــــ اُف کتنی بُری باس آتی ہے، اٹھا کے باہر پھینک ان کو ....."

مادھو چلایا: "سوگندھی!"

سوگندھی نے تیز لہجے میں کہا: "سوگندھی کے بچے تو آیا کس لیے ہے یہاں؟ ـــــ تیری ماں رہتی ہے اس جگہ جو تجھے پچاس روپے دے گی؟ یا تو کوئی ایسا بڑا گبرو جوان ہے جو میں تجھ پر عاشق ہو گئی ہوں ..... کتے، کمینے، مجھ پر رعب گانٹھتا ہے؟ میں تیری دبیل ہوں کیا؟ ـــــ بھک منگے تو اپنے آپ کو سمجھ کیا بیٹھا ہے؟ ـــــ میں پوچھتی ہوں تو ہے کون؟ ـــــ چور یا گٹھ کترا؟ ـــــ اس وقت تو میرے مکان میں کرنے کیا آیا ہے؟ ـــــ بلاؤں پولیس کو؟ ـــــ پونے میں تجھ پر کیس ہو نہ ہو، یہاں تو تجھ پر ایک کیس کھڑا کر دوں ـــــ"

مادھو سہم گیا۔ دبے ہوئے لہجے میں وہ صرف اس قدر کہہ سکا: "سوگندھی تجھے کیا ہو گیا ہے؟"

"تیری ماں کا سر ـــــ تو ہوتا کون ہے مجھ سے ایسے سوال کرنے والا ـــــ بھاگ یہاں سے، ورنہ ـــــ" سوگندھی کی بلند آواز سن کر اس کا خارش زدہ کتا جو سوکھے ہوئے چپلوں پر منہ رکھے سو رہا تھا، ہڑبڑا کر اٹھا اور مادھو کی طرف منہ اٹھا کر بھونکنا شروع کر دیا۔ کتے کے بھونکنے کے ساتھ ہی سوگندھی زور زور سے ہنسنے لگی۔

مادھو ڈر گیا۔ گری ہوئی ٹوپی اٹھانے کے لیے وہ جھکا تو سوگندھی کی گرج سنائی دی: "خبردار ـــــ پڑی رہنے دے وہیں ـــــ تو جا، تیرے پونہ پہنچتے ہی میں اس کو منی آرڈر کر دوں گی۔" یہ کہہ کر وہ اور زور سے ہنسی اور ہنستی ہنستی بید کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے خارش زدہ کتے نے بھونک بھونک کر مادھو کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ سیڑھیاں اتار کر جب کتا اپنی ٹنڈ منڈ دم ہلاتا سوگندھی کے پاس واپس آیا اور اس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر کان پھڑپھڑانے لگا تو سوگندھی چونکی ـــــ اس نے اپنے چاروں طرف ایک ہولناک سناٹا دیکھا ـــــ ایسا سناٹا جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اسے ایسا لگا کہ ہر شے خالی ہے ـــــ جیسے مسافروں سے لدی ہوئی ریل گاڑی سب اسٹیشنوں

ذرا کار کو اب لوہے کے شیڈ میں بالکل اکیلی کھڑی ہے .... یہ خلا جو اچانک سوگندھی کے اندر پیدا ہو گیا تھا۔ اُسے بہت دُکھ دے رہا تھا۔ اُس نے کافی دیر تک اس خلا کو بھرنے کی کوشش کی مگر بے سُود۔ وہ ایک ہی وقت میں بے شمار خیالات اپنے دماغ میں ٹھونستی ۔ بالکل چھلنی کا سا حساب تھا۔ اِدھر دماغ کو پُر کرتی تھی۔ اُدھر وہ خالی ہو جاتا تھا۔

بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اُس کو اپنا دل پرچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اُس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اُٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی!

موذیل ؎

("سڑک کے کنارے" میں سے)

ترلوچن نے پہلی مرتبہ ـــ چار برسوں میں پہلی مرتبہ رات کو آسمان دیکھا تھا اور وہ بھی اس لئے کہ اس کی طبیعت سخت گھبرائی ہوئی تھی اور وہ محض کھلی ہوا میں کچھ دیر سوچنے کے لئے اڈوانی چیمبرز کے ٹیرس پر چلا آیا تھا۔

آسمان بالکل صاف تھا۔ بادلوں سے بے نیاز، بہت بڑے خاکستری تمبو کی طرح ساری بمبئی پر تنا ہوا تھا۔ حدِ نظر تک جگہ جگہ بتیاں روشن تھیں۔ ترلوچن نے ایسا محسوس کیا تھا کہ آسمان سے بہت سارے ستارے جھڑ کر بلڈنگوں سے جو رات کے اندھیرے میں بڑے بڑے درخت معلوم ہوتی تھیں، اٹک گئے ہیں اور جگنوؤں کی طرح ٹمٹما رہے ہیں۔

ترلوچن کے لئے یہ بالکل ایک نیا تجربہ تھا۔ ایک نئی کیفیت تھی ـــ رات کو کھلے آسمان کے نیچے ہونا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ چار برس تک اپنے فلیٹ میں قید رہا اور قدرت کی ایک بہت بڑی نعمت سے محروم۔ قریب قریب تین بجے تھے۔ ہوا بے حد ہلکی پھلکی تھی۔ ترلوچن پنکھے کی مصنوعی ہوا کا عادی تھا جو اس کے سارے وجود کو بوجھل کر دیتی تھی۔ صبح اٹھ کر وہ ہمیشہ یوں محسوس کرتا تھا۔ رات بھر اس کو مار مار کر پیٹا گیا ہے۔ پر اب صبح کی قدرتی ہوا میں اس کے جسم کا روآں روآں ترو تازگی چوس کر خوش ہو رہا تھا۔ جب وہ اوپر آیا تھا تو اس کا دل و دماغ سخت مضطرب اور ہیجان زدہ تھا لیکن گھنٹے ہی میں وہ اضطراب اور ہیجان جو اس کو بہت تنگ کر رہا تھا۔ کسی حد تک ٹھنڈا ہو گیا تھا وہ اب صاف طور پر سوچ سکتا تھا۔

کرپال کور اور اس کا سارا خاندان ـــ محلے میں تھا جو کٹر مسلمانوں کا مرکز تھا۔ یہاں کئی مکانوں کو آگ لگ چکی تھی۔ کئی جانیں تلف ہو چکی تھیں۔ ترلوچن ان سب کو لے آیا ہوتا مگر مصیبت یہ تھی کہ کرفیو نافذ ہو گیا تھا اور وہ بھی نہ جانے کتنے گھنٹوں کا ـــ غالباً اڑتالیس گھنٹوں کا ـــ اور ترلوچن لازماً مغلوب تھا۔ آس پاس سب مسلمان تھے۔ بڑے خوفناک قسم کے مسلمان۔ اور پنجاب سے دھڑا دھڑ خبریں آ رہی تھیں کہ وہاں سکھ مسلمانوں پر بہت ظلم ڈھا رہے ہیں۔ کوئی بھی ہاتھ ـــ مسلمان ہاتھ بڑی آسانی سے نرم و نازک کرپال کور کی کلائی پکڑ کر موت کے کنوئیں میں لے جا سکتا تھا۔

کرپال کی ماں اندھی تھی۔ باپ مفلوج۔ بھائی تھا، وہ کچھ عرصے سے دیولالی میں تھا کہ اسے وہاں اپنے تازہ تازہ لئے ہوئے ٹھیکے کی دیکھ

؎ یہ افسانہ سب سے پہلے 'نقوش' ہی میں چھپا تھا۔ منٹو کے نمائندہ افسانوں کی صورت میں اسے دوبارہ نقوش میں پیش کیا جا رہا ہے۔

ترلوچن کو کرپال کے بھائی نرنجن پر بہت غصہ آتا تھا۔ اس نے جو کہ ہر روز اخبار پڑھتا تھا، فسادات کی تیزی و تندی کے متعلق ہفتہ بھر پہلے آگاہ کر دیا تھا اور صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا: "نرنجن، یہ ٹھیکے ویکے ابھی رہنے دو۔ ہم ایک بہت ہی نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ تمہارا اگرچہ رہنا بہت ضروری ہے۔ لیکن یہاں سے اٹھ جاؤ اور میرے یہاں چلے آؤ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جگہ کم ہے لیکن مصیبت کے دنوں میں آدمی کسی نہ کسی طرح گزارہ کر لیا کرتا ہے" مگر وہ نہ مانا۔ اس کا اتنا بڑا لیکچر سن کر صرف اپنی گھنی مونچھوں میں مسکرا دیا۔ "یار، تم خواہ مخواہ فکر کرتے ہو ——— میں نے یہاں ایسے کئی فساد دیکھے ہیں۔ یہ امرتسر نہیں، بمبئی ہے ——— بمبئی۔ تمہیں یہاں آئے صرف چار برس ہوئے ہیں اور میں بارہ برس سے یہاں رہ رہا ہوں ——— بارہ برس سے!"

جانے نرنجن بمبئی کو کیا سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ایسا شہر ہے، اگر فساد برپا بھی ہوں تو ان کا اثر خود بخود زائل ہو جاتا ہے جیسے اس کے پاس چھو منتر ——— یا وہ کہانیوں کا کوئی ایسا قلعہ ہے جس پر کوئی آفت نہیں آ سکتی۔ مگر ترلوچن صبح کی ٹھنڈی ہوا میں صاف دیکھ رہا تھا کہ ——— محلہ بالکل محفوظ نہیں۔ وہ تو صبح کے اخباروں میں یہ بھی پڑھنے کے لیے تیار تھا کہ کرپال کور اور اس کے ماں باپ قتل ہو چکے ہیں۔

اس کو کرپال کور کے مفلوج باپ اور اس کی اندھی ماں کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ مر جاتے اور کرپال کور بچ جاتی تو ترلوچن کے لیے اچھا تھا ——— وہاں ...ل میں اس کا بھائی نرنجن بھی مارا جاتا تو اور بھی اچھا تھا کہ ترلوچن کے لیے میدان صاف ہو جاتا۔ خاص طور پر یہ نرنجن اس کے راستے میں ایک روڑا ہی نہیں بہت بڑا کھنگر تھا۔ چنانچہ جب کبھی کرپال کور سے اس کی بات ہوتی تو وہ اسے نرنجن سنگھ کی بجائے کھنگر سنگھ کہتا۔

صبح کی ہوا دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی ——— ترلوچن کا کیسوں سے بے نیاز سر بڑی خوشگوار ٹھنڈک محسوس کر رہا تھا۔ مگر اس کے اندر بے شمار اندیشے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا رہے تھے ——— کرپال کور نئی نئی اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ وہ یوں تو ہٹے کٹے کھنگر سنگھ کی بہن تھی، مگر بہت ہی نرم و نازک ...ل تھی۔ اس نے دیہات میں پرورش پائی تھی۔ وہاں کی کئی گرمیاں سردیاں دیکھی تھیں مگر اس میں وہ سختی، وہ گٹھاؤ، وہ مردانہ پن نہیں تھا جو دیہات کی عام ... لڑکیوں میں ہوتا ہے جنہیں کڑی سے کڑی مشقت کرنی پڑتی ہے۔

اس کے نقش پتلے پتلے تھے، جیسے ابھی نامکمل ہیں۔ چھوٹی چھوٹی چھاتیاں تھیں جن پر بالائیوں کی چند اور تہیں چڑھنے کی ضرورت تھی۔ عام سکھ دیہاتی لڑکیوں کے مقابلے میں اس کا رنگ گورا تھا مگر کورے لٹھے کی طرح، اور بدن چکنا تھا جس طرح مرسی رائزڈ لٹھے کی سطح ہوتی ہے۔ بے حد شرمیلی تھی۔

ترلوچن اسی کے گاؤں کا تھا مگر زیادہ دیر وہاں رہا نہیں تھا۔ پرائمری سے نکل کر جب وہ شہر کے ہائی اسکول میں گیا تو بس پھر وہیں کا ہو کے رہ گیا۔ اسکول سے فارغ ہوا تو کالج کی تعلیم شروع ہو گئی۔ اس دوران میں وہ کئی مرتبہ ——— لاتعداد مرتبہ اپنے گاؤں گیا، مگر اس نے کرپال کور کے نام کی کسی لڑکی کا نام تک نہ سنا، شاید ... اس لیے کہ وہ ہر بار اسی افراتفری میں رہتا تھا کہ جلد از جلد واپس شہر پہنچے۔

کالج کا زمانہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اڈوانی چیمبرز کے ٹیرس اور کالج کی عمارت میں غالباً دس برس کا فاصلہ تھا اور یہ فاصلہ ترلوچن کی زندگی کے عجیب و غریب واقعات سے پُر تھا۔ برما، سنگاپور، ہانگ کانگ ——— پھر بمبئی، جہاں وہ چار برس سے مقیم تھا۔

ان چار برسوں میں اس نے پہلی مرتبہ رات کو آسمان کی شکل دیکھی تھی — جو بری نہیں تھی ——— خاکستری رنگ کے تنبو کی چھت میں ہزاروں دیئے روشن تھے اور ... ٹھنڈی اور ہلکی پھلکی تھی۔

کرپال کور کے متعلق سوچتے سوچتے وہ موزیل کے متعلق سوچنے لگا۔ اس یہودی لڑکی کے بارے میں جو اڈوانی چیمبرز میں رہتی تھی۔ اس سے ترلوچن کو گوڈے گوڈے عشق ہو گیا تھا۔ ایسا عشق جو اس نے اپنی پینتیس برس کی زندگی میں کبھی نہیں کیا تھا۔

جس دن اس نے اڈوانی چیمبرز میں اپنے ایک عیسائی دوست کی معرفت دوسرے مالے پر فلیٹ لیا، اسی دن اس کی مڈبھیڑ موزیل سے ہوئی جو پہلی نظر میں اسے خوفناک طور پر دیوانی معلوم ہوئی تھی۔ کٹے ہوئے بھورے بال اس کے سر پر پریشان تھے۔ بے حد پریشان۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک یوں جمی تھی

اُٹھاتا تو ان دونوں جگہ جلد سے چمٹی ہوئی تھی۔ ڈھیلا ڈھالا لمبا سفید چغہ پہنے تھی۔ جس کے کھلے گریبان سے اس کی نیلی پڑی بڑی بڑی چھاتیاں چوتھائی سے زیادہ نظر آ رہی تھیں۔ بانہیں جو کہ کھلی تھیں مہین مہین بالوں سے اٹی ہوئی تھیں جیسے وہ ابھی ابھی کسی سیلون سے بال کٹوا کے آئی ہے اور ان کی ننھی ننھی ہوائیاں سی اُلجھ گئی ہیں۔

ہونٹ اتنے موٹے نہیں تھے، مگر گہرے عنابی رنگ کی لپ اسٹک کچھ اس انداز سے لگائی گئی تھی کہ وہ موٹے اور بھینسے کے گوشت کے ٹکڑے معلوم ہوتے تھے۔

ترلوچن کا فلیٹ اس کے فلیٹ کے بالکل سامنے تھا۔ بیچ میں ایک تنگ گلی تھی۔ بہت ہی تنگ ـــــ جب ترلوچن اپنے فلیٹ میں داخل ہونے کے لئے آگے بڑھا تو موذیل باہر نکلی۔ کھڑاؤں پہنے تھی۔ ترلوچن ان کی آواز سن کر رک گیا۔ موذیل نے اپنے پریشان بالوں کی چقوں میں سے بڑی بڑی آنکھوں سے ترلوچن کی طرف دیکھا اور ہنسی ـــــ ترلوچن بوکھلا گیا۔ جیب سے چابی نکال کر وہ جلدی سے دروازے کی جانب بڑھا۔ موذیل کی ایک کھڑاؤں سیمنٹ کے چکنے فرش پر پھسلی اور اس کے اوپر آ رہی۔

جب ترلوچن سنبھلا تو موذیل اس کے اوپر تھی، کچھ اس طرح کہ اس کا لمبا چغہ اوپر چڑھ گیا تھا اور اس کی دو ننگی ـــــ بڑی تگڑی ٹانگیں اس کے ادھر ادھر تھیں، اور جب ترلوچن نے اٹھنے کی کوشش کی تو وہ بوکھلاہٹ میں کچھ اس طرح موذیل ـــــ ساری موذیل سے الجھا جیسے وہ صابن کی طرح اس کے سارے بدن پر پھر گیا ہے۔

ترلوچن نے ہانپتے ہوئے مناسب و موزوں الفاظ میں اس سے معافی مانگی۔ موذیل نے اپنا لبادہ ٹھیک کیا اور مسکرا دی۔ "یہ کھڑاؤں ایک دم کنڈم چیز ہے۔" اور وہ اتری ہوئی کھڑاؤں میں اپنا انگوٹھا اور ساتھ والی انگلی پھنساتی کوریڈور سے باہر چلی گئی۔

ترلوچن کا خیال تھا کہ موذیل سے دوستی پیدا کرنا شاید مشکل ہو۔ لیکن وہ بہت ہی تھوڑے عرصے میں اس سے گھل مل گئی۔ لیکن ایک بات تھی کہ وہ بہت خودسر تھی۔ وہ ترلوچن کو کبھی خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ اس سے کھاتی تھی، اس سے پیتی تھی، اس کے ساتھ سینما جاتی تھی۔ سارا سارا دن اس کے ساتھ جوہو پر نہاتی تھی۔ لیکن جب وہ بانہوں اور ہونٹوں سے کچھ اور آگے بڑھنا چاہتا تو وہ اسے ڈانٹ دیتی۔ کچھ اس طور پر اسے گھرکتی کہ اس کے سارے ولولے اس کی داڑھی اور مونچھوں میں چکر لگاتے رہ جاتے۔

ترلوچن کو پہلے کسی کے ساتھ محبت نہیں ہوئی تھی۔ لاہور میں، برما میں، سنگاپور میں، وہ لڑکیاں کچھ عرصے کے لئے خرید لیا کرتا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ بمبئی پہنچتے ہی وہ ایک نہایت الھڑ قسم کی یہودی لڑکی کے عشق میں گوڈے گوڈے دھنس جائے گا۔ وہ اس سے کچھ عجیب قسم کی بے اعتنائی اور بے التفاتی برتتی تھی۔ اس کے کہنے پر فوراً سج بن کر سینما جانے پر تیار ہو جاتی تھی۔ مگر جب وہ اپنی سیٹ پر بیٹھتے تو ادھر ادھر نگاہیں دوڑانا شروع کر دیتی۔ کوئی اس کا شناسا نکل آتا تو زور سے ہاتھ ہلاتی اور ترلوچن سے اجازت لئے بغیر اس کے پہلو میں جا بیٹھتی۔

ہوٹل میں بیٹھے ہیں۔ ترلوچن نے خاص طور پر موذیل کے لئے پرتکلف کھانے منگوائے ہیں، مگر اس کو کوئی اپنا پرانا دوست نظر آ گیا ہے اور وہ نوالہ چھوڑ کر اس کے پاس جا بیٹھی ہے اور ترلوچن کے سینے پر مونگ دل رہی ہے۔

ترلوچن بعض اوقات بھنا جاتا تھا، کیونکہ وہ اسے قطعی طور پر چھوڑ کر اپنے ان پرانے دوستوں اور شناساؤں کے ساتھ چلی جاتی تھی اور کئی کئی دن اس سے ملاقات نہ کرتی تھی۔ کبھی سر درد کا بہانہ، کبھی پیٹ کی خرابی کا، جس کے متعلق ترلوچن کو اچھی طرح معلوم تھا کہ فولاد کی طرح سخت ہے اور کبھی خراب نہیں ہو سکتا۔

جب اس سے ملاقات ہوتی تو وہ اس سے کہتی "تم سکھ ہو ـــــ یہ نازک باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکتیں۔"

ترلوچن جل بھن جاتا اور پوچھتا "کون سی نازک باتیں ـــــ تمہارے پرانے یاروں کی؟"

موزیل دونوں ہاتھ اپنے چوڑے چکلے کولہوں پر لٹکا کر اپنی ٹکڑی ٹانگیں چوڑی کر دیتی اور کہتی "یہ تم مجھے ان کے طعنے کیا دیتے ہو ——— ہاں وہ میرے ں ——— اور مجھے اچھے لگتے ہیں۔ تم جلتے ہو تو جلتے رہو!"

ترلوچن بڑے وکیلانہ انداز میں پوچھتا: "اس طرح تمہاری میری کس طرح نبھے گی؟"

موزیل زور کا قہقہہ لگاتی: "تم سچ مچ سکھ ہو ——— ایڈیٹ، تم سے کس نے کہا ہے کہ میرے ساتھ نبھاؤ ——— اگر نبھانے کی بات ہے تو جاؤ وطن میں کسی سکھنی سے شادی کر لو ——— میرے ساتھ تو اسی طرح چلے گا۔"

ترلوچن نرم ہو جاتا۔ در اصل موزیل اس کی زبردست کمزوری بن گئی تھی۔ وہ ہر حالت میں اس کی قربت کا خواہش مند تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کی وجہ سے اس کی اکثر توہین ہوتی تھی۔ معمولی معمولی کرسٹان لونڈوں کے سامنے جن کی کوئی حقیقت ہی نہیں تھی، اسے خفیف ہونا پڑتا تھا۔ مگر دل سے مجبور ہو کر اس نے یہ سب کچھ برداشت کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

عام طور پر توہین اور ہتک کا ردِ عمل انتقام ہوتا ہے مگر ترلوچن کے معاملے میں ایسا نہیں تھا۔ اس نے اپنے دل و دماغ کی بہت سی آنکھیں میچ لی تھیں اور کانوں میں روئی ٹھونس لی تھی۔ اس کو موزیل پسند تھی ——— پسند ہی نہیں جیسا کہ وہ اکثر اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا "گوڈے گوڈے" اس کے عشق میں دھنس گیا تھا۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ اس کے جسم کا جتنا حصہ باقی رہ گیا ہے، وہ بھی اس عشق کی دلدل میں چلا جائے اور ختم ہو۔

دو برس تک وہ اسی طرح خوار ہوتا رہا۔ لیکن ثابت قدم رہا۔ آخر ایک روز جب کہ موزیل موج میں تھی، اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر پوچھا: "موزیل ——— تم مجھ سے محبت نہیں کرتی ہو؟"

موزیل اس کے بازوؤں سے جدا ہو گئی اور کرسی پر بیٹھ کر اپنے فراک کا گھیرا دیکھنے لگی۔ پھر اس نے اپنی موٹی موٹی یہودی آنکھیں اٹھائیں اور گھنی پلکیں جھپکا کر کہا: "میں سکھ سے محبت نہیں کر سکتی۔"

ترلوچن نے ایسا محسوس کیا کہ پگڑی کے نیچے اس کے کیسوں میں کسی نے دہکتی ہوئی چنگاریاں رکھ دی ہیں۔ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی ——— "موزیل! تم ہمیشہ میرا مذاق اڑاتی ہو ——— یہ میرا مذاق نہیں، میری محبت کا مذاق ہے۔"

موزیل اٹھی اور اس نے اپنے بھورے ترشے ہوئے بالوں کو ایک دلفریب جھٹکا دیا: "تم شیو کرا ڈالو اور اپنے سر کے بال کھلے چھوڑ دو ——— تو میں شرط لگاتی ہوں، کئی لونڈے تمہیں آنکھ ماریں گے ——— تم خوبصورت ہو۔"

ترلوچن کے کیسوں میں مزید چنگاریاں پڑ گئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر زور سے موزیل کو اپنی طرف گھسیٹا اور اس کے عنابی ہونٹوں میں اپنے مونچھوں بھرے ہونٹ پیوست کر دیئے۔

موزیل نے ایک دم "پھوں پھوں" کی اور اس کی گرفت سے علیحدہ ہو گئی۔ "میں صبح اپنے دانتوں پر برش کر چکی ہوں ——— تم تکلیف نہ کرو۔"

ترلوچن چلایا: "موزیل!"

موزیل وینٹی بیگ سے ننھا سا آئینہ نکال کر اپنے ہونٹ دیکھنے لگی۔ جس پر لگی ہوئی گاڑھی لپ اسٹک پر خراشیں آ گئی تھیں: "خدا کی قسم ——— تم اپنی داڑھی اور مونچھوں کا صحیح استعمال نہیں کرتے ——— ان کے بال ایسے اچھے ہیں کہ میرا نیوی بلو سکرٹ بہت اچھی طرح صاف کر سکتے ہیں ——— بس تھوڑا سا پٹرول لگانے کی ضرورت ہو گی۔"

ترلوچن غصے کی اس انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ جہاں وہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ آرام سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ موزیل بھی آ گئی اور اس نے ترلوچن کی داڑھی کھولنی شروع کر دی ——— اس میں جو پنیں لگی تھیں۔ وہ اس نے ایک ایک کر کے اپنے دانتوں میں دبا لیں۔

ترلوچن خوبصورت تھا۔ جب اس کے داڑھی مونچھ نہیں آئی تھی تو واقعی لوگ اس کو کھلے کیسوں کے ساتھ دیکھ کر دھوکا کھا جاتے تھے کہ وہ کوئی کم عمر خوبصورت لڑکی ہے۔ مگر بالوں کے اس انبار نے اب اس کے تمام خدوخال جھاڑیوں کے مانند اندر چھپا لئے تھے۔ اس کو اس کا احساس تھا مگر وہ ایک اطاعت شعار اور فرماں بردار لڑکا تھا۔ اس کے دل میں مذہب کا احترام تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان چیزوں کو اپنے وجود سے الگ کر دے جن سے اس کے مذہب کی ظاہری تکمیل ہوتی تھی۔

جب داڑھی پوری کھل گئی اور اس کے سینے پر لٹکنے لگی تو اس نے موذیل سے پوچھا: "یہ تم کیا کر رہی ہو؟"

دانتوں میں پنسل دبائے وہ مسکرائی: "تمہارے بال بہت ملائم ہیں ——— میرا اندازہ غلط تھا کہ ان سے میرا نیوی بلیو سکرٹ صاف ہو سکے گا ——— ترلوچن ——— تم یہ مجھے دے دو۔ میں انہیں گوندھ کر تمہارے لئے ایک فسٹ کلاس بٹوا بناؤں گی۔"

اب ترلوچن کی داڑھی میں چنگاریاں بھڑکنے لگیں۔ وہ بڑی سنجیدگی سے موذیل سے مخاطب ہوا: "میں نے آج تک تمہارے مذہب کا مذاق نہیں اڑایا ——— تم کیوں اڑاتی ہو ——— دیکھو کسی کے مذہبی جذبات سے کھیلنا اچھا نہیں ہوتا ——— میں یہ کبھی برداشت نہ کرتا۔ مگر صرف اس لئے کر رہا ہوں کہ مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے ——— کیا تمہیں اس کا پتہ نہیں؟"

موذیل نے ترلوچن کی داڑھی سے کھیلنا بند کر دیا: "مجھے معلوم ہے۔"

"پھر ———" ترلوچن نے اپنی داڑھی کے بال بڑی صفائی سے تہ کئے اور موذیل کے دانتوں سے پنسل نکال لی: "تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میری محبت بکواس نہیں ——— میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر وہ اٹھی اور دیوار سے لٹکی ہوئی تصویر کی طرف دیکھنے لگی: "میں بھی قریب قریب یہ فیصلہ کر چکی ہوں کہ تم سے شادی کروں گی۔"

ترلوچن اچھل پڑا: "سچ؟"

موذیل کے عنابی ہونٹ بڑی موٹی مسکراہٹ کے ساتھ کھلے اور اس کے سفید مضبوط دانت ایک لحظے کے لئے چمکے: "ہاں!"

ترلوچن نے اپنی نصف لپٹی ہوئی داڑھی ہی سے اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا: "تو ——— تو کب؟"

موذیل الگ ہٹ گئی: "جب ——— تم اپنے یہ بال کٹوا دو گے۔"

ترلوچن اس وقت "جو ہو سو ہو" بنا تھا۔ اس نے کچھ نہ سوچا اور کہہ دیا: "میں کل ہی کٹوا دوں گا۔"

موذیل فرش پر ٹیپ ڈانس کرنے لگی: "تم بکواس کرتے ہو ترلوچن ——— تم میں اتنی ہمت نہیں ہے۔"

اس نے ترلوچن کے دل و دماغ سے مذہب کے رہے سہے خیال کو نکال باہر پھینکا: "تم دیکھ لو گی۔"

"دیکھ لوں گی۔" اور وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ ترلوچن کی مونچھوں کو چوما اور "پھو ——— پھوں" کرتی باہر نکل گئی۔

ترلوچن نے رات بھر کیا سوچا ——— وہ کن کن اذیتوں سے گزرا، اس کا تذکرہ فضول ہے، اس لئے کہ دوسرے روز اس نے فورٹ میں اپنے کیس کٹوا دیے اور داڑھی بھی منڈوا دی ——— یہ سب کچھ ہوتا رہا اور وہ آنکھیں میچے رہا۔ جب سارا معاملہ صاف ہو گیا تو اس نے آنکھیں کھولیں اور دیر تک اپنی شکل آئینے میں دیکھتا رہا جس پر بمبئی کی حسین سے حسین لڑکی بھی کچھ دیر کے لئے غور کرنے پر مجبور ہو جاتی۔

ترلوچن وہی عجیب و غریب ٹھنڈک محسوس کرنے لگا تھا جو سیلون سے باہر نکل کر اس کو لگی تھی۔ اس نے ٹیرس پر تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ جہاں ٹینکوں اور نلوں کا ایک ہجوم تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس داستان کا بقایا حصہ اس کے دماغ میں نہ آئے۔ مگر وہ آئے بن نہ رہا۔

بال کٹوا کر وہ پہلے دن گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اس نے اپنے نوکر کے ہاتھ دوسرے روز چٹ موذیل کو بھیجی کہ اس کی طبیعت ناساز ہے تھوڑا

ـے۔ موذیل ہنسی۔ ترلوچن کو بالوں کے بغیر دیکھ کر پہلے وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکی۔ پھر "مائی ڈارلنگ ترلوچ" کہہ کر اس کے ساتھ لپٹ گئی اور اس کا چہرہ عنابی کر دیا۔

اس نے ترلوچن کے صاف اور ملائم گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے چھوٹے انگریزی وضع کے کٹے ہوئے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کی اور عربی میں نعرے مارتی رہی۔ اس نے اس قدر شور مچایا کہ اس کی ناک سے پانی بہنے لگا ——— موذیل نے جب اسے محسوس کیا تو اپنی سکرٹ کا گھیرا اٹھایا اور اسے پونچھنا شروع کر دیا ——— ترلوچن شرما گیا۔ اس نے سکرٹ نیچی کی اور سرزنش کے طور پر اس سے کہا "نیچے کچھ پہن تو لیا کرو۔"

موذیل پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ باسی اور جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی لپ اسٹک لگے ہونٹوں سے مسکرا کر اس نے صرف اتنا ہی کہا "مجھے بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے ——— ایسے ہی چلتا ہے"

ترلوچن کو وہ پہلا دن یاد آ گیا۔ جب وہ اور موذیل دونوں ٹکرا گئے تھے اور آپس میں کچھ عجیب طرح گڈمڈ ہو گئے تھے۔ مسکرا کر اس نے موذیل کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ "شادی کل ہو گی؟"

"نہیں پرسوں" موذیل نے ترلوچن کی ملائم ٹھوڑی پر اپنے ہاتھ کی پشت پھیری۔

طے ہوا کہ شادی پونے میں ہو۔ چونکہ سول میرج تھی۔ اس لیے ان کو دس پندرہ دن کا نوٹس دینا تھا۔ عدالتی کارروائی تھی۔ اس لیے مناسب خیال کیا گیا کہ پونہ بہتر ہے۔ پاس ہے اور ترلوچن کے وہاں کئی دوست بھی ہیں۔ دوسرے روز انھیں پروگرام کے مطابق پونہ روانہ ہو جانا تھا۔

موذیل، فورٹ کے ایک اسٹور میں سیلز گرل تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر ٹیکسی اسٹینڈ تھا۔ بس یہیں موذیل نے اس کو انتظار کرنے کے لیے کہا تھا ——— ترلوچن وقت مقررہ پر وہاں پہنچا۔ ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آئی۔ دوسرے روز اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے ایک پرانے دوست کے ساتھ جس نے تازہ تازہ موٹر خریدی ہے، دیولالی چلی گئی ہے اور ایک غیر معین عرصے کے لیے وہیں رہے گی۔

ترلوچن پر کیا گزری؟ ——— یہ ایک بڑی لمبی کہانی ہے۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ اس نے جی کڑا کیا اور اس کو بھول گیا ——— اتنے میں اس کی ملاقات کرپال کور سے ہو گئی اور وہ اس سے محبت کرنے لگا اور تھوڑے ہی عرصے میں اس نے محسوس کیا کہ موذیل بہت واہیات لڑکی تھی۔ جس کے دل کے ساتھ پتھر لگے ہوئے تھے اور جو چڑوں کے مانند ایک جگہ سے دوسری جگہ پھدکتا رہتا تھا۔ اس احساس سے اس کو ایک گونہ تسکین ہوئی تھی کہ وہ موذیل سے شادی کرنے کی غلطی نہ کر بیٹھا تھا۔

لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی موذیل کی یاد ایک چٹکی کے مانند اس کے دل کو پکڑ لیتی تھی اور پھر چھوڑ کر کدکڑے لگاتی غائب ہو جاتی تھی ——— وہ بے حیا تھی ——— بے مروت تھی، اس کو کسی کے جذبات کا پاس نہیں تھا، پھر بھی وہ ترلوچن کو پسند تھی۔ اس لیے کبھی کبھی وہ اس کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ وہ دیولالی میں اتنے عرصے سے کیا کر رہی ہے۔ اسی آدمی کے ساتھ ہے۔ جس نے نئی نئی کار خریدی تھی یا اسے چھوڑ کر کسی اور کے پاس چلی گئی ہے۔ اس کو اس خیال سے سخت کوفت ہوتی تھی کہ وہ اس کے سوا کسی اور کے پاس ہو گی۔ حالانکہ اس کو موذیل کے کردار کا بخوبی علم تھا۔

وہ اس پر سینکڑوں نہیں ہزاروں روپے خرچ کر چکا تھا لیکن اپنی مرضی سے۔ ورنہ موذیل مہنگی نہیں تھی۔ اس کو بہت سستی قسم کی چیزیں پسند آتی تھیں۔ ایک مرتبہ ترلوچن نے اسے سونے کے ٹوپس دینے کا ارادہ کیا جو اسے بہت پسند تھے، مگر اسی دکان میں موذیل جھوٹے اور بھڑکیلے اور بہت سستے آویزوں پر مر مٹی اور سونے کے ٹوپس چھوڑ کر ترلوچن سے منتیں کرنے لگی کہ وہ انھیں خرید دے۔

ترلوچن اب تک نہ سمجھ سکا کہ موذیل کس قماش کی لڑکی ہے۔ کس آب و گل سے بنی ہے۔ وہ گھنٹوں اس کے ساتھ لیٹی رہتی تھی۔ اس کو چومنے کی اجازت دیتی تھی۔ وہ سارا کا سارا صابن کی مانند اس کے جسم پر پھر جاتا تھا۔ مگر وہ اس کو اس سے آگے ایک انچ بڑھنے نہیں دیتی تھی۔ اس کو چڑانے

بالکل اتنا کہہ دیتی تھی: "تم سکھ ہو ——— مجھے تم سے نفرت ہے!"

ترلوچن اچھی طرح محسوس کرتا تھا کہ موزیل کو اس سے نفرت نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اس سے کبھی نہ ملتی۔ برداشت کا مادہ اس میں رتی بھر بھی نہیں تھا۔ وہ کبھی دو برس تک اس کی صحبت میں نہ گزارتی۔ دو ٹوک فیصلہ کر دیتی۔ انڈرویئر اس کو ناپسند تھے۔ اس لئے کہ ان سے اس کو الجھن ہوتی تھی۔ ترلوچن نے کئی بار اس کو ان کی اشد ضرورت سے آگاہ کیا۔ اس کو شرم و حیا کا واسطہ دیا، مگر اس نے یہ چیز کبھی نہ پہنی۔

ترلوچن جب اس سے حیا کی بات کرتا تھا تو وہ چڑ جاتی تھی: "یہ حیا ویا کیا بکواس ہے ——— اگر تمہیں اس کا کچھ خیال ہے تو آنکھیں بند کر لیا کرو ——— مجھے یہ بتاؤ کون سا لباس ہے جس میں آدمی ننگا نہیں ہو سکتا ——— یا جس میں سے تمہاری نگاہیں پار نہیں ہو سکتیں ——— مجھ سے ایسی بکواس نہ کیا کرو ——— تم سکھ ہو ——— مجھے معلوم ہے کہ تم پتلون کے نیچے ایک سلی سا انڈرویئر پہنتے ہو جو نیکر سے ملتا جلتا ہے ——— یہ بھی تمہاری داڑھی اور سر کے بالوں کی طرح تمہارے مذہب میں شامل ہے ——— شرم آنی چاہیئے تمہیں۔ اتنے بڑے ہو گئے ہو اور ابھی تک یہی سمجھتے ہو کہ تمہارا مذہب انڈرویئر میں چھپا بیٹھا ہے!"

ترلوچن کو شروع شروع میں ایسی باتوں پر غصہ آتا تھا۔ مگر بعد میں غور و فکر کرنے پر وہ کبھی کبھی لڑھک جاتا تھا اور سوچتا تھا کہ موزیل کی باتیں شاید نادرست نہیں اور جب اس نے اپنے کیسوں اور داڑھی کا صفایا کرا دیا تھا تو اسے قطعی طور پر ایسا محسوس ہوا کہ وہ بیکار اتنے دن بالوں کا اتنا بوجھ اٹھائے اٹھائے پھرا جس کا کچھ مطلب ہی نہیں تھا۔

پانی کی ٹینکی کے پاس پہنچ کر ترلوچن رک گیا۔ موزیل کو ایک بڑی موٹی گالی دے کر اس نے اس کے متعلق سوچنا بند کر دیا ——— کرپال کور، ایک پاکیزہ لڑکی، جس سے اس کو محبت ہوئی تھی، خطرے میں تھی، وہ ایسے محلے میں تھی جس میں کٹر قسم کے مسلمان رہتے تھے اور وہاں دو تین وارداتیں بھی ہو چکی تھیں ——— لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس محلے میں اڑتالیس گھنٹے کا کرفیو تھا مگر کرفیو کی کون پرواہ کرتا ہے۔ اس چالی کے مسلمان ہی اگر چاہتے تو اندر ہی اندر کرپال کور، اس کی ماں اور اس کے باپ کا بڑی آسانی کے ساتھ صفایا کر سکتے تھے۔

ترلوچن سوچتا سوچتا پانی کے موٹے نل پر بیٹھ گیا۔ اس کے سر کے بال اب کافی لمبے ہو گئے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ ایک برس کے اندر اندر یہ پورے کیسوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ اس کی داڑھی تیزی سے بڑھی تھی مگر وہ اسے بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ فورٹ میں ایک باربر تھا وہ اس صفائی سے اسے تراشتا تھا کہ ترشی ہوئی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

اس نے اپنے لمبے اور ملائم بالوں میں انگلیاں پھیریں اور ایک سرد آہ بھری ——— اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اسے کھڑاؤں کی کرخت آواز سنائی دی۔ اس نے سوچا کون ہو سکتا ہے؟ ——— بلڈنگ میں کئی یہودی عورتیں تھیں جو سب کی سب گھر میں کھڑاؤں پہنتی تھیں ——— آواز قریب آتی گئی۔ یکلخت اس نے دوسری ٹینکی کے پاس موزیل کو دیکھا، جو یہودیوں کی خاص قطع کا ڈھیلا ڈھالا کرتہ پہنے بڑے زور کی انگڑائی لے رہی تھی ——— اس زور کی کہ ترلوچن کو محسوس ہوا اس کے آس پاس کی ہوا چٹخ جائے گی۔

ترلوچن پانی کے نل پر سے اٹھا۔ اس نے سوچا: "یہ ایکا ایکی کہاں سے نمودار ہو گئی ——— اور اس وقت ٹیرس پر کیا کرنے آئی ہے؟"

موزیل نے ایک اور انگڑائی لی ——— اب ترلوچن کی ہڈیاں چٹخنے لگیں۔

ڈھیلے ڈھالے کرتے میں اس کی مضبوط چھاتیاں دھڑکیں ——— ترلوچن کی آنکھوں کے سامنے کئی گول گول اور چپٹے چپٹے نیل ابھر آئے۔ وہ زور سے کھانسا۔ موزیل نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا ردعمل بالکل خفیف تھا۔ کھڑاؤں گھسیٹتی وہ اس کے پاس آئی اور اس کی ننھی منی داڑھی دیکھنے لگی: "تم پھر سکھ بن گئے ترلوچن؟"

داڑھی کے بال ترلوچن کو چبھنے لگے۔

موزیل نے آگے بڑھ کر اس کی ٹھوڑی کے ساتھ اپنے ہاتھ کی پشت رگڑی اور مسکرا کر کہا: "اب یہ برش اس قابل ہے کہ میری نیوی بلیو سکرٹ صاف ـــــــ مگر وہ تو وہیں دیولالی میں رہ گئی ہے۔"

ترلوچن خاموش رہا۔

موزیل نے اس کے بازو کی چٹکی لی: "بولتے کیوں نہیں سردار صاحب؟"

ترلوچن اپنی پچھلی بیوقوفیوں کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تاہم اس نے صبح کے ملگجے اندھیرے میں موزیل کے چہرے کو غور سے دیکھا ـــــــ کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ایک صرف وہ پہلے سے کچھ کمزور نظر آتی تھی۔ ترلوچن نے اس سے پوچھا: "بیمار رہی ہو؟"

"نہیں"۔ موزیل نے اپنے ترشے ہوئے بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دیا۔

"پہلے سے کمزور دکھائی دیتی ہو؟"

"میں ڈائٹنگ کر رہی ہوں"۔ موزیل پانی کے موٹے نل پر بیٹھ گئی اور کھڑاؤں فرش کے ساتھ بجانے لگی: "تم گویا کہ ـــــــ اب پھر ـــــــ نئے سرے سے سکھ بن رہے ہو۔"

ترلوچن نے کسی قدر ڈھٹائی کے ساتھ کہا: "ہاں!"

"مبارک ہو"۔ موزیل نے ایک کھڑاؤں پیر سے اتار لی اور پانی کے نل پر بجانے لگی: "کسی اور لڑکی سے محبت کرنی شروع کر دی؟"

ترلوچن نے آہستہ سے کہا: "ہاں!"

"مبارک ہو ـــــــ اسی بلڈنگ کی ہے کوئی؟"

"نہیں"۔

"یہ بہت بری بات ہے"۔ موزیل کھڑاؤں اپنی انگلیوں میں اڑس کر اٹھی: "ہمیشہ آدمی کو اپنے ہمسایوں کا خیال رکھنا چاہیے۔"

ترلوچن خاموش رہا۔ موزیل نے اٹھ کر اس کی داڑھی کو اپنی پانچوں انگلیوں سے چھیڑا: "کیا اسی لڑکی نے تمہیں یہ بال بڑھانے کا مشورہ دیا ہے؟"

"نہیں"۔

ترلوچن بڑی الجھن محسوس کر رہا تھا جیسے کنگھا کرتے کرتے اس کی داڑھی کے بال آپس میں الجھ گئے ہیں۔ جب اس نے "نہیں" کہا تو اس کے لہجے میں تیکھا پن تھا۔

موزیل کے ہونٹوں پر لپ اسٹک باسی گوشت کی طرح معلوم ہوتی تھی۔ وہ مسکرائی تو ترلوچن نے ایسا محسوس کیا کہ اس کے گاؤں میں جھٹکے کی دکان پر قصائی نے چھری سے موٹی رگ کے گوشت کے دو ٹکڑے کر دیے ہیں۔

مسکرانے کے بعد وہ ہنسی: "تم اب یہ داڑھی منڈا ڈالو تو کسی کی بھی قسم لے لو، میں تم سے شادی کر لوں گی۔"

ترلوچن کے جی میں آئی کہ اس سے کہے کہ وہ ایک بڑی شریف، باعصمت اور پاک طینت کنواری لڑکی سے محبت کر رہا ہے اور اسی سے شادی کرے گا ـــــ موزیل اس کے مقابلے میں فاحشہ ہے۔ بدصورت ہے، بے وفا ہے۔ بے مروت ہے مگر وہ اس قسم کا گھٹیا آدمی نہیں تھا۔ اس نے موزیل سے صرف اتنا کہا: "موزیل! میں اپنی شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ میرے گاؤں کی ایک سیدھی سادی لڑکی ہے ـــــــ جو مذہب کی پابند ہے۔ اسی کے لئے میں نے بال بڑھانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

موزیل سوچ بچار کی عادی نہیں تھی، لیکن اس نے کچھ دیر سوچا اور کھڑاؤں پر نصف دائرے میں گھوم کر ترلوچن سے کہا: "وہ مذہب کی پابند ہے تو تمہیں کیسے قبول کرے گی؟ ـــــــ کیا اسے معلوم نہیں کہ تم ایک دفعہ اپنے بال کٹوا چکے ہو؟"

"اس کو ابھی تک معلوم نہیں — داڑھی میں نے تمہارے یہاں جانے کے بعد ہی بڑھانی شروع کی تھی — محض انتقامی طور پر — اس کے بعد میری کرپال کور سے ملاقات ہوئی۔ مگر میں پگڑی اس طریقے سے باندھتا ہوں کہ سو میں سے ایک ہی آدمی مشکل سے جان سکتا ہے کہ میرے کیس کٹے ہوئے ہیں — مگر اب یہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔" ترلوچن نے اپنے لمبے ملائم بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنا شروع کی۔

موزیل نے لمبا کرتا اٹھا کر اپنی گوری دبیز ران کھجلانی شروع کی۔ "یہ بہت اچھا ہے ...... مگر یہ کم بخت مچھر یہاں بھی موجود ہے — دیکھو کس زور سے کاٹا ہے۔"

ترلوچن نے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ موزیل نے اس جگہ جہاں مچھر نے کاٹا تھا انگلی سے لب لگائی اور کرتا چھوڑ کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ "کب ہو رہی ہے تمہاری شادی؟"

"ابھی کچھ پتہ نہیں۔" یہ کہہ کر ترلوچن سخت متفکر ہو گیا۔

چند لمحات تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد موزیل نے اس کے تفکر کا اندازہ لگا کر اس سے بڑے سنجیدہ انداز میں پوچھا۔ "ترلوچن — تم کیا سوچ رہے ہو؟"

ترلوچن کو اس وقت کسی ہمدرد کی ضرورت تھی، خواہ وہ موزیل ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ اس نے اس کو سارا ماجرا سنا دیا۔ موزیل ہنسی۔ "تم اول درجے کے ایڈیٹ ہو — جاؤ اس کو لے آؤ۔ ایسی کیا مشکل ہے؟"

"مشکل — موزیل، تم اس معاملے کی نزاکت کو کبھی نہیں سمجھ سکتیں — کسی بھی معاملے کی نزاکت — تم ایک لاابالی قسم کی لڑکی ہو — یہی وجہ ہے کہ تمہارے اور میرے تعلقات قائم نہیں رہ سکے، جس کا مجھے ساری عمر افسوس رہے گا۔"

موزیل نے زور سے اپنی کھڑاؤں پانی کے نل کے ساتھ ماری۔ "افسوس بی ڈیمڈ — سلی ایڈیٹ — تم یہ سوچو کہ تمہاری اس ..... کیا نام ہے اس کا ..... اس محلے سے بچا کے لانا ہے ..... تم بیٹھ گئے ہو تعلقات کا رونا رونے۔ تمہارے میرے تعلقات کبھی قائم نہیں رہ سکتے تھے — تم ایک سلی قسم کے آدمی ہو — اور بہت ڈرپوک۔ مجھے نڈر مرد چاہیے ..... لیکن چھوڑو ان باتوں کو ..... چلو آؤ، تمہاری اس [illegible] کو لے آئیں۔"

اس نے ترلوچن کا بازو پکڑ لیا — ترلوچن نے گھبراہٹ میں اس سے پوچھا۔ "کہاں سے؟"

"وہیں سے، جہاں وہ ہے — میں اس محلے کی ایک ایک اینٹ کو جانتی ہوں — چلو آؤ میرے ساتھ۔"

"مگر سنو تو — کرفیو ہے۔"

"موزیل کے لئے نہیں — چلو آؤ۔"

وہ ترلوچن کو بازو سے پکڑ کر کھینچتی اس دروازے تک لے گئی تھی جو نیچے سیڑھیوں کی طرف کھلتا تھا۔ دروازہ [illegible] کہ وہ اترنے والی تھی کہ رک گئی اور ترلوچن کی داڑھی کی طرف دیکھنے لگی۔

ترلوچن نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

موزیل نے کہا۔ "یہ تمہاری داڑھی ..... لیکن خیر ٹھیک ہے۔ اتنی بڑی نہیں ہے ..... ننگے سر چلو گے تو کوئی نہیں سمجھے گا کہ تم سکھ ہو۔"

"ننگے سر!" ترلوچن نے کسی قدر بوکھلا کر کہا۔ "میں ننگے سر نہیں جاؤں گا۔"

موزیل نے بڑے معصوم انداز میں پوچھا۔ "کیوں؟"

ترلوچن نے اپنے بالوں کی ایک لٹ ٹھیک کی۔ "تم سمجھتی نہیں ہو۔ میرا وہاں پگڑی کے بغیر جانا ٹھیک نہیں۔"

"یہ ٹھیک نہیں ہے۔"

"تم سمجھتی کیوں نہیں ہو کہ اس نے مجھے ابھی تک ننگے سر نہیں دیکھا ——— وہ یہی سمجھتی ہے کہ میرے کیس ہیں۔ میں اس پر یہ راز افشا نہیں کرنا چاہتا۔"

موذیل نے زور سے اپنی کھڑاؤں دروازے کی دہلیز پر ماری "تم واقعی اوّل درجے کے ایڈیٹ ہو ——— گدھے کہیں کے ...... اس کی جان کا ن ہے ——— کیا نام ہے تمہاری اس کور کا جس سے تم محبت کرتے ہو۔"

ترلوچن نے اسے سمجھانے کی کوشش کی "موذیل، وہ بڑی مذہبی قسم کی لڑکی ہے ——— اگر اس نے مجھے ننگے سر دیکھ لیا تو مجھ سے نفرت کرنے لگے۔"

موذیل چڑ گئی "اوہ، تمہاری محبت بی ڈیمڈ ——— میں پوچھتی ہوں۔ کیا سارے سکھ تمہاری طرح کے بیوقوف ہوتے ہیں ——— اس کی جان کا خطرہ اور تم کہتے ہو کہ پگڑی ضرور پہنو گے ——— اور شاید وہ اپنا انڈر ویئر بھی جو نیکر سے ملتا جلتا ہے۔"

ترلوچن نے کہا "وہ تو میں ہر وقت پہنے ہوتا ہوں۔"

"بہت اچھا کرتے ہو ——— مگر اب تم یہ سوچو کہ معاملہ اس محلے کا ہے جہاں میاں بھائی ہی میاں بھائی رہتے ہیں اور وہ بھی بڑے بڑے دادا اور بڑے بڑے موالی ——— تم پگڑی پہن کر گئے تو وہیں ذبح کر دیئے جاؤ گے۔"

ترلوچن نے مختصر سا جواب دیا "مجھے اس کی پروا نہیں ——— اگر میں تمہارے ساتھ وہاں جاؤں تو پگڑی پہن کر جاؤں گا ——— میں اپنی محبت خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا!"

موذیل جھنجھلا گئی۔ اس زور سے اس نے پیچ و تاب کھائے کہ اس کی چھاتیاں آپس میں بھڑ بھڑ گئیں "گدھے ——— تمہاری محبت ہی کہاں رہے گی۔ جب تم نہ ہو گے ——— تمہاری وہ ——— کیا نام ہے اس بھڑوی کا ——— جب وہ بھی نہ رہے گی۔ اس کا خاندان تک نہ رہے گا ——— تم سکھ ہو ——— خدا کی قسم تم سکھ ہو اور بڑے ایڈیٹ سکھ ہو!"

ترلوچن بھنا گیا "بکواس نہ کرو!"

موذیل زور سے ہنسی۔ مہین مہین بالوں کے غبار سے اٹی ہوئی باہیں اس نے ترلوچن کے گلے میں ڈال دیں اور تھوڑا سا جھول کر کہا "ڈارلنگ، چلو تمہاری مرضی ——— جاؤ پگڑی پہن آؤ۔ میں نیچے بازار میں کھڑی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ نیچے جانے لگی۔ ترلوچن نے اسے روکا "تم کپڑے نہیں پہنو گی؟"

موذیل نے اپنے سر کو جھٹکا دیا "نہیں ——— چلے گا اسی طرح۔"

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ کرتی نیچے اتر گئی۔ ترلوچن نچلی منزل کی سیڑھیوں پر بھی اس کی کھڑاؤں کی چوبی آواز سنتا رہا۔ پھر اس نے اپنے لمبے بال انگلیوں سے پیچھے کی طرف سمیٹے اور نیچے اتر کر اپنے فلیٹ میں چلا گیا۔ جلدی جلدی اس نے کپڑے تبدیل کئے۔ پگڑی بندھی بندھائی رکھی تھی۔ اسے اچھی طرح سر پر جمایا اور فلیٹ کا دروازہ مقفل کر کے نیچے اتر گیا۔

باہر فٹ پاتھ پر موذیل اپنی تگڑی ٹانگیں چوڑی کئے سگرٹ پی رہی تھی۔ بالکل مردانہ انداز میں۔ جب ترلوچن اس کے نزدیک پہنچا تو اس نے شرارتاً منہ بھر کے دھواں اس کے چہرے پر دے مارا۔ ترلوچن نے غصے میں کہا "تم بہت ذلیل ہو۔"

موذیل مسکرائی "یہ تم نے کوئی نئی بات نہیں کہی ——— اس سے پہلے اور کئی مجھے ذلیل کہہ چکے ہیں۔" پھر اس نے ترلوچن کی پگڑی کی طرف دیکھا "یہ پگڑی تم نے واقعی بہت اچھی طرح باندھی ہے ——— ایسا معلوم ہوتا ہے تمہارے کیس ہیں۔"

بازار بالکل سنسان تھا ——— ایک صرف ہوا چل رہی تھی اور وہ بھی بہت دھیرے دھیرے ——— جیسے کرفیو سے خوفزدہ ہے۔ بتیاں روشن تھیں۔

سے اس کو روشنی بیمار سی معلوم ہوتی تھی۔ عام طور پر اس وقت ٹریمیں چلنی شروع ہو جاتی تھیں اور لوگوں کی آمد و رفت بھی جاری ہو جاتی تھی۔ اچھی خاصی گہما گہمی ہوتی تھی۔ پر اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سڑک پر کوئی انسان گزرا ہے نہ گزرے گا۔

موذیل آگے آگے تھی۔ فٹ پاتھ کے پتھروں پر اس کی کھڑاؤں کھٹ کھٹ کر رہی تھی۔ یہ آواز اس خاموش فضا میں ایک بہت بڑا شور تھی۔ ترلوچن دل ہی دل میں موذیل کو برا بھلا کہہ رہا تھا کہ دو منٹ میں اور کچھ نہیں تو اپنی واہیات کھڑاؤں ہی اتار کر کوئی دوسری چیز پہن سکتی تھی۔ اس نے چاہا کہ موذیل سے کہے کھڑاؤں اتار دو اور ننگے پاؤں چلو۔ مگر اس کو یقین تھا کہ وہ کبھی نہیں مانے گی۔ اس لئے خاموش رہا۔

ترلوچن سخت خوفزدہ تھا۔ کوئی پتا کھڑکتا تو اس کا دل دھک سے رہ جاتا تھا۔ مگر موذیل بالکل بے خوف چلی جا رہی تھی۔ سگرٹ کا دھواں اڑاتی جیسے وہ بڑی بے فکری سے چہل قدمی کر رہی ہے۔

چوک میں پہنچے تو پولیس مین کی آواز گرجی: ”اے — کدھر جا رہا ہے؟“

ترلوچن سہم گیا۔ موذیل آگے بڑھی اور پولیس مین کے پاس پہنچ گئی اور بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر کہا: ”اوہ، تم — ہم کو پہچانا نہیں تم نے — موذیل“ پھر اس نے ایک گلی کی طرف اشارہ کیا: ”ادھر اس باجو — ہمارا بہن رہتا ہے۔ اس کی طبیعت خراب ہے — ڈاکٹر لے کر جا رہا ہے۔“

سپاہی اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے خدا معلوم کہاں سے سگرٹ کی ڈبیا نکالی اور ایک سگرٹ نکال کر اس کو دیا: ”لو پیو۔“

سپاہی نے سگرٹ لے لیا۔ موذیل نے اپنے منہ سے سلگا ہوا سگرٹ نکالا اور اس سے کہا: ”ہیر از لائٹ!“

سپاہی نے سگرٹ کا کش لیا۔ موذیل نے داہنی آنکھ اس کو اور بائیں آنکھ ترلوچن کو ماری اور کھٹ کھٹ کرتی اس گلی کی طرف چل دی — جس میں سے گزر کر انہیں — محلے جانا تھا۔

ترلوچن خاموش تھا۔ مگر وہ محسوس کر رہا تھا کہ موذیل کرفیو کی خلاف ورزی کر کے ایک عجیب و غریب قسم کی مسرت محسوس کر رہی ہے — خطروں سے کھیلنا اسے پسند تھا۔ وہ جب جوہو پر اس کے ساتھ جاتی تھی تو اس کے لئے ایک مصیبت بن جاتی تھی۔ سمندر کی پیل تن لہروں سے ٹکراتی بھڑتی وہ دور تک نکل جاتی تھی اور اس کو ہمیشہ اس بات کا دھڑکا رہتا تھا کہ کہیں وہ ڈوب نہ جائے۔ جب واپس آتی تو اس کا جسم نیلوں اور زخموں سے بھرا ہوتا تھا مگر اسے ان کی کوئی پروا نہیں ہوتی تھی۔

موذیل آگے آگے تھی۔ ترلوچن اس کے پیچھے پیچھے۔ ڈر ڈر کے ادھر ادھر دیکھتا رہتا تھا کہ اس کی بغل میں سے کوئی چھری مار نمودار نہ ہو جائے۔ موذیل رک گئی۔ جب ترلوچن پاس آیا تو اس نے سمجھانے کے انداز میں اس سے کہا: ”ترلوچ ڈیئر — اس طرح ڈرنا اچھا نہیں — تم ڈرو گے تو کچھ نہ کچھ ہو کے رہے گا — سچ کہتی ہوں، یہ میری آزمائی ہوئی بات ہے۔“

ترلوچن خاموش رہا۔

جب وہ گلی طے کر کے دوسری گلی میں پہنچے، جو اس محلے کی طرف نکلتی تھی جس میں کرپال کور رہتی تھی تو موذیل چلتے چلتے ایک دم رک گئی — کچھ فاصلے پر بڑے اطمینان سے ایک مارواڑی کی دکان لوٹی جا رہی تھی۔ ایک لحظے کے لئے اس نے اس معاملے کا جائزہ لیا اور ترلوچن سے کہا: ”کوئی بات نہیں — چلو آؤ۔“

دونوں چلنے لگے۔ ایک آدمی جو سر پر بہت بڑی پرات اٹھائے چلا آ رہا تھا۔ ترلوچن سے ٹکرا گیا۔ پرات گر گئی۔ اس آدمی نے غور سے ترلوچن کی طرف دیکھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ سکھ ہے۔ اس آدمی نے جلدی سے اپنے نیفے میں ہاتھ ڈالا — کہ موذیل آ گئی۔ لڑکھڑاتی ہوئی جیسے نشے میں چور ہے۔ اس نے زور سے اس آدمی کو دھکا دیا اور نشے بھرے لہجے میں کہا: ”اے کیا کرتا ہے — اپنے بھائی کو مارتا ہے — ہم اس سے شادی

کہتا ہے " پھر وہ ترلوچن سے مخاطب ہوئی " کرپان ——— اٹھاؤ یہ پرات اور رکھ دو اس کے سر پر"

اس آدمی نے تھیلے میں سے ہاتھ نکال لیا اور شہوانی آنکھوں سے موذیل کی طرف دیکھا، پھر آگے بڑھ کر اپنی کہنی سے اس کی چھاتیوں میں ایک ٹہوکا دیا۔
ن کے سالی ——— عیش کر" پھر اس نے پرات اٹھائی اور یہ جا وہ جا۔

ترلوچن بڑبڑایا " کیسی ذلیل حرکت کی ہے حرامزادے نے!"

موذیل نے اپنی چھاتیوں پہ ہاتھ پھیرا " کوئی ذلیل حرکت نہیں ——— سب چلتا ہے ۔۔۔۔ آؤ"

وہ پھر تیز چلنے لگی ——— ترلوچن نے بھی قدم تیز کر دیئے۔

یہ گلی طے کر کے دونوں اس محلے میں پہنچ گئے جہاں کرپال کور رہتی تھی۔ موذیل نے پوچھا " کس گلی میں جانا ہے؟"

ترلوچن نے آہستہ سے کہا " تیسری گلی میں ——— نکڑ والی بلڈنگ!"

موذیل نے اس طرف چلنا شروع کر دیا۔ یہ راستہ بالکل خاموش تھا۔ آس پاس اتنی گنجان آبادی تھی مگر کسی بچے تک کے رونے کی آواز سنائی دیتی تھی۔

جب وہ اس گلی کے قریب پہنچے تو کچھ گڑبڑ دکھائی دی ——— ایک آدمی بڑی تیزی سے اس کنارے والی بلڈنگ سے نکلا اور دوسرے کنارے والی بلڈنگ میں گھس گیا۔ اس بلڈنگ سے تھوڑی دیر کے بعد تین آدمی نکلے۔ فٹ پاتھ پر انہوں نے ادھر ادھر دیکھا اور بڑی پھرتی سے دوسری بلڈنگ میں چلے گئے۔ موذیل ٹھٹک گئی۔ اس نے ترلوچن کو اشارہ کیا کہ اندھیرے میں ہو جائے۔ پھر اس نے ہولے سے کہا " ترلوچن ڈیئر ——— یہ پگڑی اتار دو!"

ترلوچن نے جواب دیا " میں یہ کسی صورت میں بھی نہیں اتار سکتا!"

موذیل جھنجھلا گئی " تمہاری مرضی ——— لیکن تم دیکھتے نہیں سامنے کیا ہو رہا ہے"

سامنے جو کچھ ہو رہا تھا دونوں کی آنکھوں کے سامنے تھا ——— صاف گڑبڑ ہو رہی تھی اور بڑی پُراسرار قسم کی۔ دائیں ہاتھ کی بلڈنگ سے جب دو آدمی اپنی پیٹھ پر بوریاں اٹھائے نکلے تو موذیل ساری کی ساری کانپ گئی۔ ان میں سے کچھ گاڑھی گاڑھی سیال سی چیز ٹپک رہی تھی۔ موذیل اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ غالباً وہ سوچ رہی تھی۔ جب یہ دونوں آدمی گلی کے دوسرے سرے پر پہنچ کر غائب ہو گئے تو اس نے ترلوچن سے کہا " دیکھو ایسا کرو ——— میں بھاگ کر نکڑ والی بلڈنگ میں جاتی ہوں ——— تم میرے پیچھے آنا ——— بڑی تیزی سے جیسے تم میرا پیچھا کر رہے ہو ——— سمجھے ——— مگر یہ سب ایک دم جلدی جلدی میں ہو"

موذیل نے ترلوچن کے جواب کا انتظار نہ کیا اور نکڑ والی بلڈنگ کی طرف کھڑاؤں کھٹکھٹاتی بڑی تیزی سے بھاگی۔ ترلوچن بھی اس کے پیچھے دوڑا۔ چند لمحوں میں وہ بلڈنگ کے اندر تھے ——— سیڑھیوں کے پاس۔ ترلوچن ہانپ رہا تھا۔ مگر موذیل بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ اس نے ترلوچن سے پوچھا۔
[illegible]؟

ترلوچن نے اپنے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیری " دوسرا"

" چلو"

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ ترلوچن اس کے پیچھے ہو لیا۔ زینوں پر خون کے بڑے بڑے دھبے پڑے تھے۔ ان کو دیکھ دیکھ کر اس کا خون خشک ہو رہا تھا۔

دوسرے مالے پر پہنچے تو کوریڈور میں کچھ دور جا کر ترلوچن نے ہولے سے ایک دروازے پر دستک دی۔ موذیل دور سیڑھیوں کے پاس کھڑی تھی۔

ترلوچن نے ایک بار پھر دستک دی اور دروازے کے ساتھ منہ لگا کر آواز دی ۔ "مہنگا سنگھ جی ۔۔۔ مہنگا سنگھ جی!"

اندر سے مہین آواز آئی: "کون؟"

"ترلوچن!"

دروازہ دھیرے سے کھلا ۔۔۔ ترلوچن نے موزیل کو اشارہ کیا۔ وہ لپک کر آئی۔ دونوں اندر داخل ہوئے ۔۔۔ موزیل نے اپنی بغل میں ایک دبلی پتلی لڑکی کو دیکھا ۔۔۔ جو بہت سہمی ہوئی تھی۔ موزیل نے اس کو ایک لحظے کے لیے غور سے دیکھا۔ پتلے پتلے نقش تھے۔ ناک بہت ہی پیاری تھی مگر زکام میں مبتلا۔ موزیل نے اس کو اپنے چوڑے چکلے سینے کے ساتھ لگا لیا اور اپنے ڈھیلے ڈھالے کرتے کا دامن اٹھا کر اس کی ناک پونچھی۔

ترلوچن سرخ ہو گیا۔

موزیل نے کرپال کور سے بڑے پیار کے ساتھ کہا: "ڈرو نہیں، ترلوچن تمہیں لینے آیا ہے۔"

کرپال کور نے ترلوچن کی طرف اپنی سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور موزیل سے الگ ہو گئی۔

ترلوچن نے اس سے کہا: "سردار صاحب سے کہو کہ جلدی تیار ہو جائیں ۔۔۔ اور ماتا جی سے بھی ۔۔۔ لیکن جلدی کرو۔"

اتنے میں اوپر کی منزل پر بلند آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی چیخ چلا رہا ہے اور دھینگا مشتی ہو رہی ہے۔

کرپال کور کے حلق سے دبی دبی چیخ بلند ہوئی: "اسے پکڑ لیا انہوں نے!"

ترلوچن نے پوچھا: "کسے؟"

کرپال کور جواب دینے ہی والی تھی کہ موزیل نے اس کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹ کر ایک کونے میں لے گئی: "پکڑ لیا تو اچھا ہوا ۔۔۔ تم یہ کپڑے اتارو۔"

کرپال کور ابھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ موزیل نے آناً فاناً اس کی قمیص اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ کرپال کور نے اپنی بانہوں میں اپنے ننگے جسم کو چھپا لیا اور سخت وحشت زدہ ہو گئی۔ ترلوچن نے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔ موزیل نے اپنا ڈھیلا ڈھالا کرتا اتارا اور اس کو پہنا دیا۔ خود وہ ننگ دھڑنگ تھی۔ جلدی جلدی اس نے کرپال کور کا ازاربند ڈھیلا کیا اور اس کی شلوار اتار کر، ترلوچن سے کہنے لگی: "جاؤ، اسے لے جاؤ ۔۔۔ لیکن ٹھہرو۔"

یہ کہہ کر اس نے کرپال کور کے بال کھول دیے اور اس سے کہا: "جاؤ ۔۔۔ جلدی نکل جاؤ۔"

ترلوچن نے اس سے کہا: "آؤ" مگر فوراً ہی رک گیا۔ پلٹ کر اس نے موزیل کی طرف دیکھا جو دھوئے دھائے دیدے کی طرح ننگی کھڑی تھی۔ اس کی بانہوں پر مہین مہین بال سردی کے باعث جاگے ہوئے تھے۔

"تم جاتے کیوں نہیں ہو؟" موزیل کے لہجے میں چڑچڑا پن تھا۔

ترلوچن نے آہستہ سے کہا: "اس کے ماں باپ بھی تو ہیں۔"

"وہ جہنم میں جائیں ۔۔۔ تم اسے لے جاؤ۔"

"اور تم؟"

"میں آ جاؤں گی۔"

ایک دم اوپر کی منزل سے کئی آدمی دھڑا دھڑ نیچے اترنے لگے۔ دروازے کے پاس آ کر انہوں نے کوٹنا شروع کر دیا جیسے وہ اسے توڑ ہی ڈالیں گے۔

کرپال کور کی اندھی ماں اور اس کا مفلوج باپ دوسرے کمرے میں پڑے کراہ رہے تھے۔

موزیل نے کچھ سوچا اور بالوں کو خفیف سا جھٹکا دے کر اس نے ترلوچن سے کہا: "سنو، اب صرف ایک ہی ترکیب میری سمجھ میں آتی ہے۔ میں دروازہ کھولتی ہوں ۔ ۔ ۔"

کرپال کور کے خشک حلق سے چیخ نکلتی نکلتی دب گئی: "دروازہ!"

موذیل نے ترلوچن سے مخاطب ہو کر کہا: "میں دروازہ کھول کر باہر نکلتی ہوں —— تم میرے پیچھے بھاگنا —— میں اوپر چڑھ جاؤں گی —— تم بھی آ جانا —— یہ لوگ جو دروازہ توڑ رہے ہیں، سب کچھ بھول جائیں گے اور ہمارے پیچھے چلے آئیں گے....."

ترلوچن نے پھر پوچھا: "پھر؟"

موذیل نے کہا: "یہ تمہاری —— کیا نام ہے اس کا —— موقع پا کر نکل جائے —— اس لباس میں اسے کوئی کچھ نہ کہے گا۔"

ترلوچن نے جلدی جلدی کرپال کور کو ساری بات سمجھا دی۔ موذیل زور سے چلائی۔ دروازہ کھولا اور دھڑام سے باہر کے لوگوں پر گری —— سب بوکھلا گئے۔ اس نے اوپر کی سیڑھیوں کا رخ کیا۔ ترلوچن اس کے پیچھے بھاگا۔ سب ایک طرف ہٹ گئے۔

موذیل اندھا دھند سیڑھیاں چڑھ رہی تھی —— کھڑاؤں اس کے پیروں میں تھی —— وہ لوگ جو دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے سنبھل کر ان کے پیچھے دوڑے۔ موذیل کا پاؤں پھسلا —— اوپر کے زینے سے وہ کچھ اس طرح لڑھکی کہ ہر پتھریلے زینے کے ساتھ ٹکراتی، لوہے کے جنگلے کے ساتھ الجھتی نیچے آ رہی —— پتھریلے فرش پر۔

ترلوچن ایک دم نیچے اترا۔ جھک کر اس نے دیکھا تو اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا، منہ سے خون بہہ رہا تھا، کانوں کے رستے بھی خون نکل رہا تھا۔ وہ جو دروازہ توڑنے آئے تھے، ارد گرد جمع ہو گئے —— کسی نے بھی نہ پوچھا کیا ہوا ہے۔ سب خاموش تھے اور موذیل کے ننگے اور گورے جسم کو دیکھ رہے تھے جس پر جا بجا خراشیں پڑی تھیں۔

ترلوچن نے اس کا بازو ہلایا اور آواز دی: "موذیل —— موذیل!"

موذیل نے اپنی بڑی بڑی یہودی آنکھیں کھولیں جو لال بوٹی ہو رہی تھیں اور مسکرائی۔

ترلوچن نے اپنی پگڑی اتاری اور کھول کر اس کا ننگا جسم ڈھک دیا۔ موذیل پھر مسکرائی اور آنکھ مار کر اس نے ترلوچن سے منہ میں خون کے بلبلے اڑاتے کہا: "جاؤ، دیکھو —— میرا انڈرویئر وہاں ہے کہ نہیں —— میرا مطلب ہے وہ ..."

ترلوچن اس کا مطلب سمجھ گیا مگر اس نے اٹھنا نہ چاہا۔ اس پر موذیل نے غصے میں کہا: "تم سچ مچ سکھ ہو ... جاؤ دیکھ کر آؤ!"

ترلوچن اٹھ کر کرپال کور کے فلیٹ کی طرف چلا گیا۔ موذیل نے اپنی دھندلی آنکھوں سے آس پاس کھڑے مردوں کی طرف دیکھا اور کہا: "یہ میاں بھائی ہے —— لیکن بہت دادا قسم کا ... میں اسے سکھ کہا کرتی ہوں۔"

ترلوچن واپس آ گیا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں موذیل کو بتا دیا کہ کرپال کور جا چکی ہے ... موذیل نے اطمینان کا سانس لیا —— لیکن ایسا کرنے سے بہت سا خون اس کے منہ سے بہہ نکلا ... "اوہ ڈیم اِٹ ..." یہ کہہ کر اس نے اپنی ملائم بالوں بھری کلائی سے اپنا منہ پونچھا اور ترلوچن سے مخاطب ہوئی: "آل رائٹ ڈارلنگ —— بائی بائی!"

ترلوچن نے کچھ کہنا چاہا مگر لفظ اس کے حلق ہی میں اٹک گئے۔

موذیل نے اپنے بدن پر سے ترلوچن کی پگڑی ہٹائی: "لے جاؤ اس کو —— اپنے اس مذہب کو" اور اس کا بازو اس کی مضبوط چھاتیوں پر بے حس ہو کر گر پڑا۔

ممّی

(" یزید " میں سے)

نام اس کا مسز سٹیلا جیکسن تھا مگر سب اسے ممی کہتے تھے۔ درمیانے قد کی ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ اس کا خاوند جیکسن پچھلی سے پچھلی جنگِ عظیم میں مارا گیا تھا اس کی پنشن سٹیلا کو قریب قریب دس برس سے مل رہی تھی۔

وہ پونہ میں کیسے آئی کب سے وہاں تھی اس کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔ دراصل میں نے اس کے حسب و نسب کے متعلق کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ وہ اتنی دلچسپ عورت تھی کہ اس سے مل کر سوائے اس کی ذات سے اور کسی چیز سے دلچسپی نہیں رہتی تھی۔ اس سے کون وابستہ ہے، اس کے بارے میں کچھ جاننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی اس لئے کہ وہ پونہ کے ہر ذرے سے وابستہ تھی۔ ہو سکتا ہے یہ ایک حد تک مبالغہ ہو مگر پونہ میرے لئے وہی پونہ ہے اور اس کے وہی ذرے، اس کے تمام ذرے ہیں جن کے ساتھ میری چند یادیں منسلک ہیں ——— اور ممّی کی عجیب و غریب شخصیت ان میں سے ہر ایک میں موجود ہے۔

اس سے میری پہلی ملاقات پونے ہی میں ہوئی۔ میں نہایت سست الوجود انسان ہوں۔ یوں تو سیر و سیاحت کی بڑی بڑی امنگیں میرے دل میں موجود ہیں۔ آپ میری باتیں سنیں تو آپ سمجھیں گے کہ میں عنقریب کنچن چنگا یا ہمالہ کی اسی قسم کے نام کی کسی اور چوٹی کو سر کرنے کے لئے نکل جانے والا ہوں۔ ایسا ہو سکتا ہے۔ مگر یہ زیادہ اغلب ہے کہ میں یہ چوٹی سر کر کے وہیں کا ہو رہوں۔

خدا معلوم کتنے برس سے بمبئی میں تھا۔ آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جب پونے گیا تو بیوی میرے ساتھ تھی۔ ایک لڑکا ہو کر اس کو مرے قریب قریب چار برس ہو چکے تھے۔ اس دوران میں۔ ٹھہریئے میں حساب لگا لوں۔ آپ یہ سمجھ لیجئے کہ آٹھ برس سے بمبئی میں تھا۔ مگر اس دوران میں مجھے وہاں کا وکٹوریہ گارڈن اور میوزیم دیکھنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی تھی۔ یہ تو محض اتفاق تھا کہ میں ایک دم پونہ جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ جس فلم کمپنی میں ملازم تھا اس کے مالکوں سے ایک نکمی سی بات پر دل میں ناراضی پیدا ہوئی اور میں نے سوچا کہ یہ تکدر دور کرنے کے لئے پونہ ہو آؤں۔ وہ بھی اس لئے کہ پاس تھا اور وہاں میرے چند دوست رہتے تھے۔

مجھے پربھات نگر جانا تھا جہاں میرا فلموں کا ایک پرانا ساتھی رہتا تھا۔ اسٹیشن کے باہر معلوم ہوا کہ یہ جگہ کافی دور ہے۔ مگر اس وقت ہم تانگے لے چکے تھے۔

سُست رَو چیزوں سے میری طبیعت سخت گھبراتی ہے۔ مگر میں اپنے دل سے کدورت دُور کرنے کے لئے آیا تھا اس لئے مجھے یہ بات مگر پہنچنے میں کوئی عجلت میں تھی۔ تانگہ بہت واہیات قسم کا تھا۔ علی گڑھ کے اکّوں سے بھی زیادہ واہیات۔ ہر وقت گرنے کا خطرہ رہتا ہے۔ گھوڑا آگے چلتا ہے اور سواریاں پیچھے ہٹتی رہتی ہیں۔ بہت سے بیٹھے ہوئے بازار افتاں وخیزاں طے ہوئے تو میری طبیعت گھبرا گئی۔ میں نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا اور پوچھا کہ ایسی صورت میں کیا کرنا چاہیئے۔ اس نے کہا دھوپ تیز ہے۔ میں نے جو اور تانگے دیکھے ہیں وہ بھی اسی قسم کے ہیں۔ اگر اسے چھوڑ دیا تو پیدل چلنا ہوگا، جو ظاہر ہے کہ اس سواری سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ میں نے اس سے اختلاف مناسب نہ سمجھا ——— دھوپ واقعی تیز تھی۔

گھوڑا ایک فرلانگ آگے بڑھا ہوگا کہ پاس سے اسی ہونق ٹائپ کا ایک تانگہ گزرا۔ میں نے سرسری طور پر دیکھا۔ ایک دم کوئی چیخا۔ "مسٹر گھوڑے"!

میں چونک پڑا۔ چڈہ تھا۔ ایک گمسن ہوئی میم کے ساتھ۔ دونوں ساتھ ساتھ جڑ کے بیٹھے تھے۔ میرا پہلا ردِ عمل انتہائی افسوس کا تھا کہ چڈے کی جمالیاتی حس کہاں گئی جو ایسی لال لگامی کے ساتھ بیٹھا ہے۔ عمر کا ٹھیک اندازہ تو میں نے اس وقت نہیں کیا تھا مگر اس عورت کی جھریاں پاؤڈر اور روغن کی تہوں میں سے بھی صاف نظر آ رہی تھیں۔ اتنا شوخ میک اپ تھا کہ بصارت کو سخت کوفت ہوتی تھی۔

چڈے کو ایک مدت کے بعد میں نے دیکھا تھا۔ وہ میرا بے تکلف دوست تھا۔ "اوئے منٹو کے گھوڑے" کے جواب میں یقیناً میں نے بھی کچھ اسی قسم کا فقرہ بلند کیا ہوتا، مگر اس عورت کو اس کے ساتھ دیکھ کر میری ساری بے تکلفی جھریاں جھریاں ہو گئی۔

میں نے اپنا تانگہ رکوا لیا۔ چڈے نے بھی اپنے کوچوان سے کہا کہ ٹھہر جائے۔ پھر اس نے اس عورت سے مخاطب ہو کر انگریزی میں کہا "ممی جسٹ اے منٹ" ۔ یہ کہہ کر وہ میری طرف اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے چیخا "تم! ——— تم یہاں کیسے آئے" پھر اپنا بڑھا ہوا ہاتھ بڑی بے تکلفی سے میری بیوی سے ملاتے ہوئے کہا "بھابی جان ——— آپ نے کمال کر دیا ——— اس گل محمد کو آخر آپ کھینچ کر یہاں لے ہی آئیں"۔

میں نے اس سے پوچھا "تم جا کہاں رہے ہو؟"

چڈے نے آدھے سروں میں کہا "ایک کام سے جا رہا ہوں ——— تم ایسا کرو ... سیدھے ..." وہ ایک دم پلٹ کر میرے تانگے والے سے مخاطب ہوا "دیکھو صاحب کو ہمارے گھر لے جاؤ ——— کرایہ وغیرہ مت لینا ان سے"۔ ادھر سے فوراً ہی فارغ ہو کر اس نے ٹھیٹھ کے انداز میں مجھ سے کہا "تم جاؤ، غلام ... وہاں ہوگا ——— باقی تم دیکھ لینا"۔

اور وہ پھدک کر اپنے تانگے میں اس بوڑھی میم کے ساتھ بیٹھ گیا جس کو اس نے ممی کہا تھا۔ اس سے مجھے ایک گونہ تسکین ہوئی تھی۔ بلکہ یوں کہیئے کہ وہ بوجھ جو ایک دم دونوں کو ساتھ ساتھ دیکھ کر میرے سینے پر آ پڑا تھا کافی حد تک ہلکا ہو گیا تھا۔

اس کا تانگہ چل پڑا۔ میں نے اپنے تانگے والے سے کچھ نہ کہا۔ تین یا چار فرلانگ چل کر وہ ایک ڈاک بنگلہ نما قسم کی عمارت کے پاس رکا اور نیچے اتر گیا "بیٹھے صاحب ......"

میں نے پوچھا "کہاں؟"

اس نے جواب دیا "چڈہ صاحب کا مکان یہی ہے"۔

"اوہ" میں نے سوالیہ نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ اس کے تیوروں نے مجھے بتایا کہ وہ چڈے کے مکان کے حق میں نہیں تھی۔ سچ پوچھئے تو وہ بمبئی کے حق میں ہی نہیں تھی۔ اس کو یقین تھا کہ مجھے وہاں پینے پلانے والے دوست مل جائیں گے۔ کدورت دُور کرنے کا بہانہ پہلے ہی سے موجود ہے، اس لئے واپسی ... ٹلے گی ——— میں تانگے سے اُتر گیا۔ چھوٹا سا اٹیچی کیس تھا، وہ میں نے اُٹھایا اور اپنی بیوی سے کہا "چلو!"

وہ غالباً میرے تیوروں سے پہچان گئی تھی کہ اسے ہر حالت میں میرا فیصلہ قبول کرنا ہوگا۔ چنانچہ اس نے حیل و حجت نہ کی اور خاموش میرے ساتھ

بہت معمولی قسم کا مکان تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ملٹری والوں نے عارضی طور پر ایک چھوٹا سا بنگلہ بنایا تھا تھوڑی دیر اسے استعمال کیا اور پھر چلتے بنے۔ چونے اور [illegible] کا کام ہوا تھا۔ جگہ جگہ سے پلستر اکھڑا ہوا تھا۔ اور گھر کا اندرونی حصہ ویسا ہی تھا جیسا کہ ایک بے پرواہ کنوارے کا ہوسکتا ہے، جو فلموں کا ہیرو ہو، اور ایسی کمپنی میں ملازم ہو جہاں ماہانہ تنخواہ ہر مہینے ملتی ہے، اور وہ بھی کئی قسطوں میں۔

مجھے اس کا پورا احساس تھا کہ وہ عورت جو میری بیوی ہے ایسے گندے ماحول میں یقیناً پریشانی اور گھٹن محسوس کرے گی، لیکن میں نے یہ سوچا تھا کہ چڈہ آجائے گا اس کے ساتھ ہی یہ بات بگڑ جائے گی۔ وہاں جو ہیرو فلموں کا پرانا ساتھی رہتا تھا، اس کی بیوی اور بال بچے بھی تھے۔ وہاں کے ماحول میں میری بیوی تھوڑی دیر رہ جانے میں دو تین دن گزار سکتی تھی۔

نوکر بھی عجیب لاابالی آدمی تھا۔ جب ہم گھر میں داخل ہوئے تو سب دروازے کھلے تھے، مگر وہ خود وہاں نہیں تھا۔ جب آیا تو اس نے ہماری موجودگی کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ جیسے ہم سالہا سال سے وہیں بیٹھے تھے، وہ اس طرح بیٹھے رہنے کے عادی تھے۔

جب وہ کمرے میں داخل ہوکر ہمارے پاس سے گزر گیا تو میں سمجھا شاید کوئی آوارہ ایکٹر ہے جو چڈہ کے ساتھ رہتا ہے۔ پھر جب میں نے اس سے نوکر کے بارے میں استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ وہی ذات شریف چڈہ صاحب کے چہیتے ملازم تھے۔

مجھے اور میری بیوی دونوں کو پیاس لگ رہی تھی۔ میں نے پانی مانگنے کو کہا تو وہ گلاس ڈھونڈنے لگا۔ بڑی دیر کے بعد اس نے ایک ٹوٹا ہوا الماری کے نیچے سے نکالا اور بڑبڑایا: "رات ایک درجن گلاس منگوائے تھے، معلوم نہیں کدھر گئے۔"

میں نے اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے شکستہ مگ کی طرف اشارہ کیا: "کیا آپ اس میں تیل لینے جا رہے ہیں؟"

تیل لینے جانا بمبئی کا ایک خاص محاورہ ہے۔ میری بیوی اس کا مطلب نہ سمجھی، مگر ہنس پڑی۔ نوکر کسی قدر بوکھلا گیا: "نہیں صاحب۔ میں تلاش کر رہا تھا کہ گلاس کہاں ہیں۔"

میری بیوی نے اس کو پانی لانے سے منع کر دیا۔ اس نے وہ ٹوٹا ہوا مگ واپس المار ی کے نیچے اس انداز سے رکھا کہ جیسے وہی اس کی جگہ تھی۔ اگر اسے کہیں اور رکھ دیا جاتا تو یقیناً گھر کا سارا انتظام درہم برہم ہو جاتا۔ اس کے بعد وہ یوں کمرے سے باہر نکلا جیسے اس کو معلوم تھا کہ ہمارے منہ میں کتنے دانت ہیں۔

میں پلنگ پر بیٹھا تھا جو غالباً چڈہ کا تھا۔ اس سے کچھ دور ہٹ کر دو آرام کرسیاں تھیں۔ ان میں سے ایک پر میری بیوی بیٹھی پہلو بدل رہی تھی۔ کافی دیر تک ہم دونوں خاموش رہے۔ اتنے میں چڈہ آگیا۔ وہ اکیلا تھا۔ اس کو اس بات کا قطعاً احساس نہیں تھا کہ ہم اس کے مہمان ہیں اور اس ناطے سے ہماری خاطرداری اس پر لازم تھی۔ کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے مجھ سے کہا: "ویٹ، ویٹ —— تو تم آ گئے اولڈ بوائے —— چلو ذرا اسٹوڈیو تک ہو آئیں۔ تم ساتھ ہو گے تو ایڈوانس ملنے میں آسانی ہو جائے گی۔ ... آج شام کو ..." میری بیوی پر اس کی نظر پڑی تو وہ رک گیا اور کھکھلا کر ہنسنے لگا: "بھابی جان! کہیں آپ نے اس کو مولوی تو نہیں بنا دیا؟" پھر اور زور سے ہنسا: "مولویوں کی ایسی تیسی — شوٹنگ بھابی جان، ہم ابھی آ جائیں گے۔"

میری بیوی کو اس کے بولنے کا ڈھنگ تو پسند آیا، لیکن وہ رکھ لگئی تھی۔ میں اٹھا اور چڈہ کے ساتھ ہو لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ تھوڑی دیر تک وہ تاب کھا کر ویسا ہی ہو جائے گا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اسٹوڈیو پاس ہی تھا۔ افراتفری میں اس نے سیٹھ سے مجھے پچاس روپے دلوا دیئے۔ اور پون گھنٹے میں جب واپس آئے تو دیکھا کہ وہ آرام کرسی پر بڑے آرام سے سو رہی تھی۔ ہم نے اسے بے آرام کرنا مناسب نہ سمجھا اور دوسرے کمرے میں چلے گئے جو گیراج نما تھا۔ اس میں جو چیز تھی حیرت انگیز طریقے پر ٹوٹی ہوئی تھی کہ سب کی سب ساتھ مل کر ایک ساتھ گری تھیں۔

چونکہ گھر آگیا تھی، اور اس آلودگی میں ایک ضروری پن تھا جیسے اس کی موجودگی اس کمرے کی بوسیدہ فضا کی تکمیل کے لئے لازمی تھی۔ چڈے نے فوراً نئے نوکر کو ڈھونڈ نکالا، اور اسے سو روپے کا نوٹ دے کر کہا "چین کے شہزادے ...... وہ تین تھرڈ کلاس رم کی بوتل لے آؤ ــــ میرا مطلب ہے بلیک ڈرم کی اور نصف درجن گلاس"

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا نوکر صرف چین ہی کا نہیں، دنیا کے ہر بڑے ملک کا شہزادہ تھا۔ چڈے کی زبان پر جس ملک کا نام آجاتا، وہ اسی کا شہزادہ بن جاتا ــــ اس وقت وہ چین کا شہزادہ سو کا نوٹ انگلیوں سے کھڑکھڑاتا چلا گیا۔

چڈے نے ٹوٹے ہوئے سپرنگوں والے پلنگ پر بیٹھ کر اپنے ہونٹ تھرڈ کلاس رم کے استقبال میں چٹخارتے ہوئے کہا "ویٹ اِز ویٹ ــــ تو آخر پرامپٹ آہی نکلے ــــ لیکن ایک دم متفکر ہو گیا "یار بھابی کا کیا ہو ... وہ تو گھبرا جائے گی؟"

چڈے بے بیوی کے تھا مگر اس کو دوسروں کی بیویوں کا بہت خیال رہتا تھا۔ وہ ان کا اس قدر احترام کرتا تھا کہ ساری عمر کنوارا رہنا چاہتا تھا۔ وہ کہا کرتا "احساسِ کمتری ہے جس نے مجھے ابھی تک اس نعمت سے محروم رکھا ہے۔ جب شادی کا سوال آتا ہے تو فوراً تیار ہو جاتا ہوں۔ لیکن بعد میں یہ سوچ کر کہ میں بیوی کے قابل نہیں ہوں ساری تیاری کو کولڈ اسٹوریج میں ڈال دیتا ہوں"

رم فوراً ہی آگئی۔ گلاس بھی۔ چڈے نے چھ منگوائے تھے۔ اور چین کا شہزادہ تین لایا تھا۔ باقی راستے میں ٹوٹ گئے تھے۔ چڈے نے اس کی کوئی پروا نہ کی اور خدا کا شکر کیا کہ بوتلیں سلامت رہیں۔ ایک بوتل جلدی جلدی کھول کر اس نے کنوارے گلاسوں میں رم ڈالی اور کہا "تمہارے پونے تین کی خوشی میں۔"

ہم دونوں نے لمبے لمبے گھونٹ بھرے اور گلاس خالی کر دیئے۔

دوسرا دور شروع کر کے چڈہ اٹھا اور دوسرے کمرے میں دیکھ کر آیا کہ میری بیوی ابھی تک سو رہی ہے۔ اس کو بہت ترس آیا اور کہنے لگا "میں سمجھتا ہوں ان کی نیند مکمل ہو جائے گی ــــ پھر ایسا کریں گے ..... ٹھہرو ... پہلے میں چائے منگواتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے رم کا ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا اور آواز دی "جمیکا کے شہزادے"

جمیکا کا شہزادہ فوراً ہی آگیا۔ چڈے نے اس سے کہا "دیکھو، ممی سے کہو، ایک دم فرسٹ کلاس چائے تیار کر کے بھیج دے ــــ ایک دم!"

وہ چلا گیا۔ چڈے نے اپنا گلاس خالی کیا اور شریفانہ پگ ڈال کر کہا "میں فی الحال زیادہ نہیں پیوں گا۔ پہلے چار پگ مجھے بہت جذباتی بنا دیتے ہیں۔ مجھے بھابی کو چھوڑنے تمہارے ساتھ پربھات نگر جانا ہے۔"

آدھے گھنٹے کے بعد چائے آگئی۔ بہت صاف برتن تھے اور بڑے سلیقے سے ٹرے میں چنے ہوئے تھے۔ چڈے نے ٹی کوزی اٹھا کر چائے کی خوشبو سونگھی اور مسرت کا اظہار کیا "ممی از اے جیول ... !" پھر اس نے ایتھوپیا کے شہزادے پر برسنا شروع کر دیا۔ اتنا شور مچایا کہ میرے کان بلبلا اٹھے۔ اس کے بعد اس نے ٹرے اٹھائی اور مجھ سے کہا "آؤ"

میری بیوی جاگ رہی تھی۔ چڈے نے ٹرے بڑی صفائی سے شکستہ تپائی پر رکھی اور مؤدبانہ کہا "حاضر ہے بیگم صاحب!"

میری بیوی کو یہ مذاق پسند نہ آیا، لیکن چائے کا سامان چونکہ صاف ستھرا تھا، اس لئے اس نے انکار نہ کیا اور دو پیالیاں پی لیں۔ ان سے اس کو کچھ فرحت ہوئی اور اس نے ہم دونوں سے مخاطب ہو کر معنی خیز لہجے میں کہا "آپ اپنی چائے تو پہلے ہی پی چکے ہیں!"

میں نے جواب نہ دیا مگر چڈے نے جھک کر بڑے ایماندارانہ طور پر کہا ــــ "جی ہاں یہ غلطی ہم سے سرزد ہو چکی ہے لیکن ہمیں یقین تھا کہ آپ معاف کر دیں گی۔"

میری بیوی مسکرائی تو وہ کھلکھلا کے ہنسا "ہم دونوں بہت اونچی نسل کے سؤر ہیں ... جن پر ہر حرام شے حلال ہے ــــ چلئے اب ہم آپ

کو سٹیشن تک چھوڑ آئیں؟"

میری بیوی کو بھڑ چڈے کا یہ مذاق پسند نہ آیا۔ دراصل اس کو چڈے ہی سے نفرت تھی، بلکہ یوں کہیے کہ میرے ہر دوست سے نفرت تھی لیکن چڈہ اسے بہت کھلتا تھا، اس لیے کہ وہ بعض اوقات بے تکلفی کی حدود میں پھاند جاتا تھا مگر چڈے کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ میرا خیال ہے اس نے کبھی اس بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ ایسی فضول باتوں میں دماغ خرچ کرنا ایک ایسی اِن ڈور گیم سمجھتا تھا جو لوڈو سے کہیں گنا لایعنی ہے۔ اس نے میری بیوی کے جلے بھنے تیوروں کو بڑی ہشاش بشاش آنکھوں سے دیکھا اور نوکر کو آواز دی: "کبابستان کے شہزادے ——— ایک عدد تانگہ رولز رائس قسم کا!"

کبابستان کا شہزادہ چلا گیا اور ساتھ ہی چڈہ۔ وہ غالباً دوسرے کمرے میں گیا تھا۔ تخلیہ ملا تو میں نے اپنی بیوی کو سمجھایا کہ کباب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ انسان کی زندگی میں ایسے لمحات آہی جایا کرتے ہیں جو وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتے۔ ان کو بسر کرنے کا سب سے اچھا طریقہ یہی ہے کہ ان کو گزر جانے دیا جائے۔ لیکن حسب معمول اس نے میری اس فلسفیانہ نصیحت کو پلے نہ باندھا اور بڑبڑاتی رہی۔ اتنے میں کبابستان کا شہزادہ رولز رائس تانگہ لے کر آ گیا۔ ہم پربھات نگر روانہ ہو گئے۔

بہت ہی اچھا ہوا کہ میرا الفت کا پرانا ساتھی گھر میں موجود نہیں تھا۔ اس کی بیوی تھی۔ چڈے نے میری بیوی اس کے سپرد کی اور کہا: "خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے۔ بیوی بیوی کو دیکھ کر رنگ پکڑتی ہے۔ یہ ہم ابھی حاضر ہو کے دیکھیں گے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا: "چلو منٹو! [illegible] تمہارے سے وہ بہت کر کر رہی ہیں۔"

چڈہ کچھ ایسی افراتفری مچا دیا کرتا تھا کہ مخالف قوتوں کو سمجھنے سوچنے کا بہت کم موقع ملتا تھا۔ اس نے میرا بازو پکڑا اور باہر لے گیا اور میری بیوی سوچتی ہی رہ گئی۔ تانگے میں سوار ہو کر چڈے نے اب کچھ سوچنے کے انداز میں کہا: "یہ تو ہو گیا ——— اب کیا پروگرام ہے؟" پھر کھلکھلا کر ممی ——— گریٹ ممی!"

میں اس سے پوچھنے ہی والا تھا، یہ ممی کس توتنخ آمون کی اولاد ہے، کہ چڈے نے باتوں کا کچھ ایسا سلسلہ شروع کر دیا کہ میرا استفسار غیر موت مر گیا۔

تانگہ واپس اسی ڈاک بنگلہ نما کوٹھی پر پہنچا جس کا نام سعیدہ کاٹیج تھا، مگر چڈہ اس کو کبیدہ کاٹیج کہتا تھا۔ اس لیے کہ اس میں رہنے والے سب کے سب کبیدہ خاطر رہتے تھے۔ حالانکہ یہ غلط تھا جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔

اس کاٹیج میں کافی آدمی رہتے تھے حالانکہ بادی النظر میں یہ جگہ بالکل غیر آباد معلوم ہوتی تھی۔ سب کے سب اسی فلم کمپنی میں ملازم تھے جو مہینے ہر سہ ماہی کے بعد دیتی تھی اور وہ بھی کئی قسطوں میں۔ ایک ایک کر کے جب اس کے ساکنوں سے میرا تعارف ہوا تو پتہ چلا کہ سب اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھے۔ کوئی چیف اسسٹنٹ ڈائرکٹر، کوئی اس کا نائب، کوئی نائب در نائب۔ ہر دوسرا کسی پہلے کا اسسٹنٹ تھا اور اپنی ذاتی فلم کمپنی کی بنیادیں استوار کرنے کے لیے سرمایہ فراہم کر رہا تھا۔ پوشش اور وضع قطع کے اعتبار سے ہر ایک ہیرو معلوم ہوتا تھا۔ کنٹرول کا زمانہ تھا، مگر کسی کے پاس راشن کارڈ نہ تھا۔ وہ چیزیں بھی جو تھوڑی سی تکلیف کے بعد آسانی سے کم قیمت پر دستیاب ہو سکتی تھیں، یہ لوگ بلیک مارکیٹ سے خریدتے تھے۔ پکچر ضرور دیکھتے۔ ریس کا موسم ہو تو ریس کھیلتے تھے ورنہ سٹہ۔ جیتتے شاذ و نادر تھے، مگر ہارتے ہر روز تھے۔

سعیدہ کاٹیج کی آبادی بہت گنجان تھی۔ چونکہ جگہ کم تھی اس لیے موٹر گراج بھی رہائش کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس میں ایک فیملی رہتی تھی۔ شیریں کی ایک عورت تھی جس کا خاوند شاید محض یکسانیت توڑنے کے لیے اسسٹنٹ ڈائرکٹر نہیں تھا۔ وہ اسی فلم کمپنی میں ملازم تھا مگر موٹر ڈرائیور تھا۔ معلوم نہیں وہ کب آتا تھا ——— اور کب جاتا تھا، کیونکہ میں نے اس شریف آدمی کو وہاں کبھی نہیں دیکھا ——— شیریں کے بطن سے ایک چھوٹا سا لڑکا تھا جب

کالج کے تعلیمی مشاغل سے فرصت کے اوقات میں پیار کرتے۔ شیریں جو قبول صورت تھی اپنا بیشتر وقت گراج کے اندر گزارتی تھی۔

کالج کا معزز حصہ چڈے، مدراس کے دو ساتھیوں کے پاس تھا۔ یہ دونوں بھی ایکٹر تھے، مگر بیروزگار تھے۔ ایک سعید تھا جس کا فلمی نام رنجیت کمار تھا۔ ... تھا۔ سعید کا تیج اسم خرافات کے نام کی رعایت سے مشہور ہے ورنہ اس کا نام کبیدہ کا تیج ہی تھا۔ خوش شکل تھا اور بہت کم گو۔ چڈہ کبھی کبھی اسے کچھوا ... اس لئے کہ وہ ہر کام بہت آہستہ آہستہ کرتا تھا۔

دوسرے ایکٹر کا نام معلوم نہیں کیا تھا مگر سب اسے غریب نواز کہتے تھے۔ حیدرآباد کے ایک متمول گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ ایکٹنگ کے شوق میں یہاں ... تھا۔ تنخواہ ڈھائی سو روپے ماہوار مقرر تھی۔ ایک برس ہو گیا تھا ملازم ہوئے مگر اس دوران میں اس نے صرف ایک دفعہ ڈھائی سو روپے بطور ایڈوانس ... بھی چڈے نے لئے کہ اس پر ایک بڑے خونخوار پٹھان کے قرض کی ادائیگی لازم ہو گئی تھی۔ ادب لطیف قسم کی عبارت میں فلمی کہانیاں لکھنا اس کا ... کبھی کبھی شعر بھی موزوں کر لیتا تھا۔ کالج کا ہر شخص اس کا مقروض تھا۔

شکیل اور عقیل دو بھائی تھے۔ دونوں کسی اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے اسسٹنٹ تھے اور برعکس نام نہند نام زنگی کافور کی ضرب المثل کے ابطال کی کوشش میں مصروف رہتے تھے۔

بڑے تینوں، یعنی چڈہ، سعید اور غریب نواز شیریں کا بہت خیال رکھتے تھے لیکن تینوں اکٹھے گراج میں نہیں جاتے تھے۔ مزاج پرسی کا کوئی وقت بھی مقرر ... تھا۔ تینوں جب کالج کے بڑے کمرے میں جمع ہوتے تو ان میں سے ایک اٹھ کر گراج میں چلا جاتا اور کچھ دیر وہاں بیٹھ کر شیریں سے گھریلو معاملات پر بات کرتا رہتا۔ باقی وہ اپنے اشغال میں مصروف رہتے۔

جو اسسٹنٹ قسم کے لوگ تھے، وہ شیریں کا ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔ کبھی بازار سے اس کو سودا سلف لا دیا۔ کبھی لانڈری میں اس کے کپڑے دھلنے کے ... اور کبھی اس کے روتے بچے کو بہلا دیا۔

ان میں سے کبیدہ خاطر کوئی بھی نہ تھا۔ سب کے سب مسرور تھے۔ شاید اپنی کبیدگی پر۔ وہ اپنے حالات کی نامساعدت کا ذکر بھی کرتے تھے تو بڑے شاداں و ... انداز میں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی زندگی بہت دلچسپ تھی۔

ہم کالج کے گیٹ میں داخل ہونے والے تھے کہ غریب نواز صاحب باہر آ رہے تھے۔ چڈے نے ان کی طرف غور سے دیکھا اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ... نکالے۔ بغیر گنے اس نے کچھ غریب نواز کو دیئے اور کہا۔ "چار بوتلیں اسکاچ کی چاہئیں۔ کمی آپ پوری کر دیجئے گا۔ بیشی ہو تو وہ مجھے واپس مل جائے۔"

غریب نواز کے حیدرآبادی ہونٹوں پر گہری سانولی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ چڈہ کھلکھلا کر ہنسا اور میری طرف دیکھ کر اس نے غریب نواز سے کہا۔ ... سرزون تو ہیں ...... لیکن ان سے مفصل ملاقات کی اجازت اس وقت نہیں مل سکتی۔ یہ رم پیتے ہیں۔ شام کو اسکاچ آ جائے تو .... لیکن ... جائیے۔"

غریب نواز چلا گیا۔ ہم اندر داخل ہوئے۔ چڈے نے ایک زور کی جمائی لی اور رم کی بوتل اٹھائی جو نصف سے زیادہ خالی تھی۔ اس نے روشنی میں ... سرسری اندازہ کیا اور نوکر کو آواز دی۔ "قزاقستان کے شہزادے!" جب وہ نمودار نہ ہوا تو اس نے اپنے گلاس میں ایک بڑا پیگ ڈالتے ہوئے کہا۔ "وہ پلا کہاں ہے کم بخت؟"

یہ گلاس ختم کر کے وہ کچھ فکرمند ہو گیا۔ "یار، بھائی کو تم خواہ مخواہ یہاں لائے ——— خدا کی قسم مجھے اپنے سینے پر ایک بوجھ سا محسوس ہو رہا ہے۔" پھر ... نے خود ہی اپنے کو تسکین دی۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ بور نہیں ہوں گی وہاں؟"

میں نے کہا۔ "ہاں وہاں رہ کر وہ میرے قتل کا فوری ارادہ نہیں کر سکتی۔" اور میں نے اپنے گلاس میں رم ڈالی جس کا ذائقہ پکے ہوئے گڑ کی طرح تھا۔

جس کمرے میں ہم بیٹھے تھے اس میں سلاخوں والی دو کھڑکیاں تھیں جن سے باہر کا غیر آباد حصہ نظر آتا تھا۔ ادھر سے کسی نے بآواز بلند چڈہ کا نام

نے گربجارا۔ میں چونک پڑا۔ دیکھا کہ میونک ڈائریکٹر وان کرتسے ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس نسل کا ہے۔ منگول ہے، حبشی ہے، آریہ ہے، یا کیا بلا ہے۔ جب کبھی اُس کے کسی خد و خال کو دیکھ کر آدمی کسی نتیجے پر پہنچنے ہی والا ہوتا تھا کہ اُس کے تفاصیل میں کوئی ایسا نقش نظر آ جاتا کہ فوراً ہی نئے سرے سے غور کرنا پڑ جاتا تھا۔ ویسے وہ بنگالی تھا، مگر شیوا جی کی تکیں ناک کے سامنے اُس کے چہرے پر بڑے حیرت ناک طریقے پر مزی ہوئی چپٹی ناک جو اُس کے خیال کے مطابق اُن سروں کے لئے بہت ضروری تھی جن کا تعلق براہِ راست ناک سے ہوتا ہے۔ اُس نے مجھے دیکھا تو چلایا۔ منٹو ۔۔۔۔۔ فوٹو سینئر؟

چڈے نے اُس سے زیادہ اونچی آواز میں کہا۔ "سیٹھ کی ایسی تیسی۔ چل اندر آ"

وہ فوراً اندر آ گیا۔ اپنی جیب سے اُس نے ہشنے ہوئے رم کی ایک بوتل نکالی اور تپائی پر رکھ دی۔ "میں سالا اُمیر تھا کے پاس گیا۔ وہ بولا۔ تمہارا فریبٹنگ لا ۔۔۔۔۔ میں بولا سالا یہ فریبٹنگ کون بہن ۔۔۔۔۔ کر سکتا ہے ۔۔۔۔۔ سالا مالوم تھا سالا منٹو ہے"

چڈے نے وان کرتسے کے کدو ایسے سر پر ایک دھول جمائی۔ "اب چپ کر سالے کے ۔۔۔۔۔ تو رم لے آیا ۔۔۔۔۔ بس ٹھیک ہے" وان کرتسے اپنا سر سہلانے لگا۔ میرا خالی گلاس اُٹھا کر اپنے لئے ایک پیگ تیار کیا۔ "منٹو ۔۔۔۔۔ یہ سالا آج سے ہی کہنے لگا۔ آج پیسے کوئی جا سکتا ہے ۔۔۔۔۔ میں ایک دم کر ڈالا ۔۔۔۔۔ سوچا کیا کروں ۔۔۔۔۔"

چڈے نے ایک اور دھپا اُس کے سر پر جمایا۔ "چپ بے، جیسے تو نے کچھ سوچا ہی ہو گا"

"سوچا نہیں تو سالا ۔ اتنی بڑی باٹل کہاں سے آیا ۔۔۔۔۔ تیرے باپ نے دیا مجھ کو" وان کرتسے نے ایک ہی جرعے میں رم ختم کر دی۔ چڈے نے اُس کی بات سنی اَن سنی کر دی اور اُس سے پوچھا "تو یہ تو بتا کہ تم کیا بولی؟ ۔۔۔۔۔ پوری تمنی؟ ۔۔۔۔۔ مرڈیل کب ہٹے گی؟ ۔۔۔۔۔ ارے ہاں وہ پلیٹنم بلونڈ!"

وان کرتسے نے جواب میں کچھ کہنا چاہا، مگر چڈے نے پیالا دا کچڑ کر کہنا شروع کر دیا: "منٹو ۔۔۔۔۔ خدا کی قسم کیا چیز ہے ۔۔۔۔۔ سنا کرتے تھے کہ ایک شے پلیٹنم بلونڈ بھی ہوتی ہے۔ مگر دیکھنے کا اتفاق کل ہوا ۔۔۔۔۔ بال ہیں، جیسے چاندی کے مہین مہین تار ۔۔۔۔۔ گریٹ ۔۔۔۔۔ خدا کی قسم منٹو بہت گریٹ ۔۔۔۔۔ ممی زندہ باد" پھر اُس نے قہر آلود نگاہوں سے وان کرتسے کی طرف دیکھا اور کڑک کر کہا "وان کرتسے کے بچے ۔۔۔۔۔ نعرہ کیوں نہیں لگاتا ۔۔۔۔۔ ممی زندہ باد!"

چڈے اور وان کرتسے دونوں نے مل کر "ممی زندہ باد" کے کئی نعرے لگائے۔ اس کے بعد وان کرتسے نے چڈے کے سوالوں کا پھر جواب دینا چاہا مگر چڈے نے اُسے خاموش کر دیا۔ "چھوڑو یار ۔۔۔۔۔ میں جذباتی ہو گیا ہوں ۔۔۔۔۔ اس وقت یہ سوچ رہا ہوں کہ عام طور پر معشوق کے بال سیاہ ہوتے ہیں جنہیں کالی گھٹا سے تشبیہ دی جاتی رہی ہے ۔۔۔۔۔ مگر یہاں کچھ اور ہی سلسلہ ہو گیا ہے ۔۔۔۔۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "منٹو ۔۔۔۔۔ بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اُس کے بال چاندی کے تاروں جیسے ہیں ۔۔۔۔۔ چاندی کا رنگ بھی نہیں کہا جا سکتا ۔۔۔۔۔ معلوم نہیں پلیٹنم کا رنگ کیسا ہوتا ہے، کیونکہ میں نے ابھی تک یہ دھات نہیں دیکھی ۔۔۔۔۔ کچھ عجب ہی سا رنگ ہے ۔۔۔۔۔ فولاد اور چاندی دونوں کو ملا دیا جائے ۔۔۔۔۔"

وان کرتسے نے دوسرا پیگ ختم کیا۔ "اور اُس میں تھوڑی سی تھرڈ کلاس رم مکس کر دی جائے"

چڈے نے بھنا کر اس کو ایک فربہ اندام گالی دی "بکواس نہ کر" پھر اس نے بڑی رحم انگیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "یار ۔۔۔۔۔ میں واقعی جذباتی ہو گیا ہوں ۔۔۔۔۔ ہاں ۔۔۔۔۔ وہ رنگ ۔۔۔۔۔ خدا کی قسم لاجواب رنگ ہے ۔۔۔۔۔ وہ تم نے دیکھا ہے ۔۔۔۔۔ وہ جو مچھلی کے پیٹ پر ہوتا ہے ۔۔۔۔۔ نہیں نہیں ہر جگہ ہوتا ہے ۔۔۔۔۔ پومفریٹ مچھلی ۔۔۔۔۔ اُس کے وہ کیا ہوتے ہیں؟ ۔۔۔۔۔ نہیں نہیں ۔۔۔۔۔ سانپوں کے ۔۔۔۔۔ وہ ننھے ننھے کھپرے ۔۔۔۔۔ ہاں کھپرے ۔۔۔۔۔ بس اُن کا رنگ ۔۔۔۔۔ کھپرے ۔۔۔۔۔ یہ لفظ مجھے ایک ہندوستانی نے بتایا تھا ۔۔۔۔۔ اتنی خوبصورت چیز اور ایسا واہیات نام ۔۔۔۔۔ پنجابی میں ہم انہیں چانے کہتے ہیں۔ اِس لفظ میں چھنا ہٹ ہے ۔۔۔۔۔ وہی ۔۔۔۔۔

نکل دو یا جوان کی منگبا ہوں میں ہے ..... میں نئی نئی سنپولیاں معلوم ہوتی ہیں جو رینگ رہی ہوں .....“ وہ ایک دم اٹھا ”سنپولیوں کی ایسی تیسی،
بھنا تو ہو گیا ہوں؟“

ڈون کرٹس نے بڑے بھولے انداز میں پوچھا ”وہ کیا ہوتا ہے؟“

چندے نے جواب دیا ”سیمی مینٹل ..... لیکن تو کیا سمجھے گا ..... ناچی باجی راؤ اور نانا فرنویس کی اولاد ..... “

ڈون کرٹس نے اپنے لئے ایک اور پیگ بنایا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ”یہ سالا چندے سمجھتا ہے میں انگلش نہیں سمجھتا ہوں۔ میں بھی کرسچین ہوں .....
میرا باپ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا ..... اُس نے ..... “

چندے نے چڑ کر کہا ”اُس نے تجھے تان سین بنا دیا ..... تیری ناک مروڑ دی کہ نکوڑے سُر آسانی سے تیرے اندر سے نکل سکیں ..... بچپن ہی میں
اس نے تجھے دھرپد گانا سکھا دیا تھا۔ اور وہ ... پینے کے لئے تو میاں کی ٹوڑی میں رو دیا کرتا تھا اور پیشاب کرتے وقت اڑانا میں ..... اور تو نے بھی بات
... دیکھی ہی کی تھی۔ اور تیرا باپ ..... جگت استاد تھا۔ بیجو باؤرے کے بھی کان کاٹتا تھا ..... اور تو آج اس کے کان کاٹتا ہے، اس لئے تیرا نام
ٹرسے ہے؟“ اتنا کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا ”منٹو ..... یہ سالا جب بھی پیتا ہے اپنے باپ کی تعریفیں شروع کر دیتا ہے ..... وہ اس سے
محبت کرتا تھا تو مجھ پر اُس نے کیا احسان کیا اور اُس نے اسے میٹرک پاس بنا دیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اپنی بی اے کی ڈگری پھاڑ کے پھینک
دوں؟“

ڈون کرٹس نے اس پرچار کی مدافعت کرنا چاہی مگر چندے نے اس کو وہیں دبا دیا ”چپ رہ ..... میں کہہ چکا ہوں کہ سیمی مینٹل ہو گیا ہوں .....
... وہ ڈھنگ ..... پومفریٹ مچھلی کے ..... نہیں نہیں .... گئے تھے نئے کپڑے ..... بس انہی کا رنگ ..... تم نے خدا معلوم اپنی
... کونسا راگ گا کر اس ناگن کو باہر نکالا؟“

ڈون کرٹس سوچنے لگا ”پونگی بجاتا ہوں“

چندے کھلکھلا کر ہنسنے لگا ”تیرے باپ بیچارے کو ... پکڑ ...“ اس نے رم کی بوتل میں سے رم کی باقیات اپنے گلاس میں انڈیلیں اور
مجھ سے کہا ”منٹو، اگر یہ چینیز بلونڈ سرپٹی تو ... سیدھا ہمالیہ پہاڑ کی کسی اونچی چوٹی پر صوفی بن کر بیٹھ جائے گا .....“ اور اس نے گلاس خالی کر دیا۔

ڈون کرٹس نے اپنی لال لال آنکھیں ... کہا ”... لڑکی ایک دم جانگلی ہے ..... “

میں نے کہا ”دیکھ لیں گے۔“

”آج ہی ..... تمہارا رات میں ایک پارٹی دے رہا ہوں۔ یہ بہت ہی اچھا ہوا کہ تم آ گئے اور مسٹر ایک سو آٹھ ... نے تمہاری وجہ سے
اندھا دھند روپے دے دیا، ورنہ بڑی مشکل ہو جاتی ..... آج کی رات ..... آج کی رات .....“ چندے نے بڑے جوش سے گانا
شروع کر دیا۔

”آج کی رات ساز دردِ نہ چھیڑ!“

ڈون کرٹس بیچارہ اس کی اس زیادتی پر صدائے احتجاج بلند کرنے ہی والا تھا کہ نواب نواز اور رنجیت کمار آ گئے۔ دونوں کے پاس اسکاچ کی
دو بوتلیں تھیں۔ یہ انہوں نے میز پر رکھیں۔ رنجیت کمار سے میرے اچھے خاصے مراسم تھے، مگر بے تکلف نہیں۔ اس لئے ہم دونوں نے تھوڑی سی
... آئے، آج ہی آیا، ایسی رسمی گفتگو کی اور گلاس ... پینے میں مشغول ہو گئے۔

چندے واقعی بہت جذباتی ہو گیا تھا۔ ہر بات میں اس چینیز بلونڈ کا ذکر لے آتا تھا۔ رنجیت کمار دوسری بوتل کا چوتھائی حصہ چڑھا گیا تھا۔ نواب نواز
... پیتے تھے ... نشے کے معاملے میں ان سب کی سطح اب تک ایسی تھی۔ میں چونکہ زیادہ پینے کا عادی ہوں اس لئے میرے جذبات

مقدر اپنے ... میں نے اُن کی گفتگو سے اندازہ لگایا کہ وہ چاروں اس نئی لڑکی پر بہت بُری طرح فریفتہ تھے۔ جو ممی نے کہیں سے پیدا کی تھی۔ اس کا باپ [illegible] [illegible] فلم فیلس تھا۔ پڑھنے میں کوئی ہیروئن [illegible] سیلون تھا جہاں وہ ملازم تھی۔ اُس کے ساتھ عام طور پر ایک ہیرو نما [illegible] کا رہتا تھا [illegible] لڑکی کو فلم [illegible] وہ چند دن [illegible] کے قریب تھی۔ غریب نواز تو بیان [illegible] اُس پر گرم تھا کہ وہ حیدرآباد میں اپنے حصے کی جائداد بیچ کر بھی اس عورت پر لگانے کے لئے تیار تھا۔ چڈھے کا تپ کا صرف ایک ہی تھا۔ اپنا قبول صورت ہونا۔ [illegible] کا جرم خود یہ خیال تھا کہ اُس کی [illegible] کہ وہ پہلی ضرور شیشے میں اُتر آئے گی۔ اور کمبخت کا جا [illegible] اعظم [illegible] ... لیکن سب آخر جلد ہی سوچتے تھے کہ دیکھئے وہ کس پر مہربان ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس [illegible] [illegible] میں نے چڈھے کے سلسلہ زندگی میں دیکھا تھا، کسی کے بھی حوالے کر سکتی تھی۔

وہ اُس کی باتیں کرتے کرتے چڈھے نے اچانک اپنی گھڑی دیکھی، اور مجھ سے کہا: "جہنم میں جائے یہ زندگی ——— چلو یار ... بھائی وہاں کہاں: ہوگی ——— لیکن مصیبت یہ ہے کہ یہی کہیں وہاں بھی [illegible] نہ ہو جاؤں ... خیر ——— تم مجھے سنبھال لینا۔" اپنے گلاس کے چند آخری قطرے حلق میں ٹپکا کر اُس نے زور کی آواز دی: "[illegible] ملک مصر کے شہزادے!"

ممی کے ملک مصر کا شہزادہ آنکھیں ملتا نمودار ہوا، جیسے کسی نے اُس کو صدیوں کے بعد کھود کر [illegible] باہر نکالا ہے۔ چڈھے نے اُس کے چہرے پر کے چھینٹے مارے اور کہا: "دو عدد [illegible] لاؤ ... جو [illegible] معلوم ہوں؟"

[illegible] ہم سب [illegible] پربھات نگر روانہ ہوئے ——— میرا [illegible] کا ساتھی ہریش گھر پر موجود تھا۔ اس [illegible] جگہ پر [illegible] خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا۔ چڈھے نے [illegible] کے اشارے سے اس کو سارا معاملہ سمجھا دیا تھا، چنانچہ یہ بہت [illegible] ثابت ہوا۔ میری بیوی نے غیظ و غضب کا اظہار نہ کیا۔ اُس کا وقت وہاں کچھ اچھا ہی کٹا تھا۔ ہریش نے جو عورتوں کے نفسیات کا ماہر تھا، [illegible] کیں اور آخر میں میری بیوی سے درخواست کی کہ وہ اُس کی شوٹنگ دیکھنے چلے جو اُس روز ہونے والی تھی۔ میری بیوی نے پوچھا "[illegible] گانا [illegible] ہے آپ کا؟"

ہریش نے جواب دیا: "جی نہیں ——— وہ کل کا پروگرام ہے ... میرا خیال ہے آپ کل چلئے گا۔"

ہریش کی بیوی شوٹنگ وغیرہ دیکھ کر [illegible] آ چکی تھی۔ اُس نے فوراً ہی میری بیوی سے کہا: "ہاں کل ٹھیک رہے گا ——— آج انہیں سفر کی تھکن بھی ہے۔"

ہم سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ ہریش نے پھر کچھ دیر تک پُر لطف باتیں کیں۔ آخر میں مجھ سے کہا: "چلو یار ——— تم چلو میرے ساتھ" اور میری بیوی کی طرف دیکھا "ان کو چھوڑو ... سیٹھ صاحب تمہاری کہانی سننا چاہتے ہیں۔"

میں نے بیوی کی طرف دیکھا اور ہریش سے کہا "ان سے اجازت لے لو۔"

میری [illegible] بیوی جال میں پھنس چکی تھی۔ اس نے ہریش سے کہا: "میں نے ان سے چلتے وقت ان سے کہا بھی تھا کہ اپنا [illegible] ساتھ لے لو [illegible] انہوں نے کہا کوئی ضرورت نہیں ——— اب یہ کہانی کیا سنائیں گے۔"

ہریش نے کہا: "زبانی سنا دے گا۔" پھر اُس نے میری طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہے کہ ہاں کہو چلیں۔

میں نے اطمینان سے کہا: "ہاں ایسا ہو سکتا ہے!"

چڈھے نے [illegible] "[illegible] پر چلتے ہیں۔" اور وہ ممی [illegible] کو سلام [illegible] کر کے چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم لوگ ہریش کے پربھات نگر کے باہر ٹانگے [illegible] تھے۔ چڈھے نے ہمیں دیکھا تو [illegible] کا نعرہ بلند کیا "راجہ ہریش چندر زندہ باد ....."

ہریش کے سوا ہم سب ممی کے گھر روانہ ہوگئے۔ اُس کا ابھی ایک [illegible] سے ملنے جانا تھا۔

یہ ایک کاٹیج تھی۔ شکل و صورت اور ساخت کے اعتبار سے سعیدہ کاٹیج جیسی۔ مگر بہت صاف ستھری جس سے ممی کے سلیقے اور قرینے کا پتہ چلتا تھا
۔ تھا، گھر جو چیز جہاں تھی سجی ہوئی تھی۔ پربھات نگر سے چلتے وقت میں نے سوچا تھا کوئی قحبہ خانہ ہوگا، مگر اس گھر کی کسی چیز سے بھی بصارت کو ایسا شک
تھا۔ وہ ویسا ہی شریفانہ تھا جیسا کہ ایک اوسط درجے کے عیسائی کا ہوتا ہے۔ لیکن ممی کی عمر کے مقابلے میں وہ جوان جوان دکھائی دیتا تھا۔ اس پر وہ
نہیں تھا جو میں نے ممی کے جھریوں والے چہرے پر دیکھا تھا جب ممی ڈرائنگ روم میں آئی۔ تو میں نے سوچا کہ گرد و پیش کی جتنی چیزیں ہیں وہ ممی کی
... صرف ممی آگے نکل کر بوڑھی ہو گئی ہے اور وہ ویسی کی ویسی پڑی رہی ہیں —— ان کی جو عمر تھی وہ وہیں کی وہیں رکی ہے ...
جب میں نے اس کے گہرے اور شوخ میک اپ کی طرف دیکھا تو میرے دل میں نہ جانے کیوں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ بھی اپنے گرد و پیش کے ماحول
جیسی رہتی یا پھر جوان ہو جائے۔
چڈے نے ممی سے میرا تعارف کرایا، جو بہت مختصر تھا، اور اختصار ہی کے ساتھ اس نے ممی کے متعلق مجھ سے یہ کہا "یہ ممی ہے ......
بیسٹ ممی ... "
ممی اپنی تعریف سن کر مسکرا دی، اور میری طرف دیکھ کر اس نے چڈے سے انگریزی میں کہا "تم نے چائے منگائی تھی حسب معمول نہایت افراتفری
—— معلوم نہیں انہیں اسپیشل سی آئی ہوگی یا نہیں" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی "مسٹر منٹو، میں بہت شرمندہ ہوں ... اصل میں سارا قصور تمہارے
بیٹے کا ہے —— جو میرا ناقابل اصلاح لڑکا ہے۔"
میں نے مناسب و موزوں الفاظ میں چائے کی تعریف کی اور اس کا شکریہ ادا کیا۔ ممی نے مجھے فضول کی تعریف سے منع کیا اور چڈے سے کہا: "ولت
ہے ... یہ میں نے اس لئے کیا کہ تم عین وقت پر میرے سر پر سوار ہو جاؤ گے ... "
چڈے نے ممی کو گلے سے لگا لیا: "یو آر اے جیول ممی ... یہ کھانا اب ہم کھائیں گے۔"
ممی نے چونک کر پوچھا: "کیا؟ ... نہیں، ہرگز نہیں۔"
چڈے نے اسے بتایا: "مسٹر منٹو کو ہم پربھات نگر چھوڑ آئے ہیں۔"
ممی چلائی: "خدا تمہیں غارت کرے —— یہ تم نے کیا کیا ——"
چڈہ کھلکھلا کر ہنسا: "آج پارٹی جو ہونے والی تھی۔"
"وہ تو میں نے مسز منٹو کو دیکھتے ہی اپنے دل میں کینسل کر دی تھی۔" میں نے اپنا سگرٹ سلگایا۔
چڈے کا دل ڈوب گیا۔ "خدا اب تمہیں غارت کرے ... اور یہ سب چیزیں ہم نے صرف اس پارٹی کے لئے بنایا تھا۔" وہ کرسی پر بیٹھ
گیا اور کمرے کے ہر ذرے سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: "تمہارے سارے خواب ملیا میٹ ہو گئے ... پلیٹنم بلونڈ ...... اور ننھے ننھے سانپ کے
سے رنگ والے بال ......" ایک دم اس نے اٹھ کر ممی کو بانہوں سے پکڑ لیا: "کینسل کی تھی —— اپنے دل میں کینسل کی تھی نا ......
میں سارا پلاؤ بنا رہا ہوں۔" اور اس نے ممی کے دل کے مقام پر انگلی سے بہت بڑا صاد بنا دیا اور باآواز بلند پکارا: "ہرے ——!"
ممی متعلقہ لوگوں کو اطلاع پہنچا چکی تھی کہ پارٹی منسوخ ہو چکی ہے، لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ چڈے کو دلگیر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے
شفقت سے اس کے گال تھپتھپائے اور کہا: "تم فکر نہ کرو ... میں ابھی انتظام کرتی ہوں۔"
وہ انتظام کرنے باہر چلی گئی۔ چڈے نے خوشی کا ایک اور نعرہ بلند کیا اور وان کٹر سے کہا: "جنرل وان کٹر —— جاؤ ہیڈ کوارٹرز سے
[illegible] لے آؤ۔"
وان کٹر نے سیلوٹ کیا اور حکم کی تعمیل کے لئے چلا گیا۔ سعیدہ کاٹیج بالکل پاس تھی، دس منٹ کے اندر اندر وہ بوتلیں لے کر واپس آ گیا۔ ساتھ اس

چھپٹے کا ذکر تھا۔ چڈے نے اس کو دیکھا تو اُس کا استقبال کیا: "آؤ، آؤ ـــــ میرے کوہ قاف کے شہزادے . . . . . وہ ـــــ وہ سانپ کے پھولوں جیسے رنگ کے بالوں والی لونڈیا کہاں ہے . . . . . تم اپنی قسمت آزمائی کر چکے؟"

رنجیت کمار اور غریب نواز دونوں کو چڈے کی یہ صلواتیں عادت ہے یا اپنی نکتہ دانی کے لئے، والی بات بہت ناگوار معلوم ہوئی۔ دونوں نے مجھ سے کہا کہ چڈے کو بہت بے ہودگی ہے۔ اس بیہودگی کو انہوں نے بہت محسوس کیا تھا۔ چڈہ حسبِ عادت اپنی بکواس کرتا رہا اور وہ خاموش ایک کونے میں بیٹھے آہستہ آہستہ رم پی کر ایک دوسرے سے اپنے دُکھ کا اظہار کرتے رہے۔

میں ان کے متعلق سوچتا رہا۔ ڈرائنگ روم میں غریب نواز اور رنجیت کمار ادھر ادھر بیٹھے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ان کو ان کا باپ گھر سے نکالتا ہے۔ یہ سب منظر ہیں۔ چڈہ کا خیال ہے کہ یہ سب بے بس اور اچھا کھلونا سمجھے گا۔ اس لئے کہ وہ اپنی ماں کا چہیتا ہے۔ باقی دو کا غم چونکہ ایک جیسا تھا اس لئے وہ ایک دوسرے کے مونس بن گئے تھے . . . مگر اب اس ماحول میں وہ دو معلوم ہوتی تھی اور وہ پلیٹینم بلونڈ . . . اُس کا تصور ایک چھوٹی سی گڑیا کے مانند دماغ میں آتا تھا ـــــ جو شاید ابھی ہونٹوں کی اپنی موسیقی ہوتی ہے . . . اُس وقت جو موسیقی میرے دل کے کانوں تک پہنچ رہی تھی اُس میں کوئی سُر اشتعال انگیز نہیں تھا۔ ہر شے دھار اور اُس کے نیچے [illegible] کی طرح قابلِ فہم اور یقینی تھی۔

میں نے جب اس کو تھوڑی دیر چڈے کے ساتھ دیکھا تھا تو میری سمجھ میں آیا کہ جس کو صدمہ پہنچا تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میرے دل میں اُن دونوں کے متعلق برا بھلا خیال پیدا ہوئے۔ لیکن یہ چیز مجھے بار بار ستا رہی تھی کہ وہ شوخ میک اپ کیوں کرتی ہے جو اُس کی معصومیت کی توہین ہے۔ اُس ہنسی کی تضحیک ہے جو اُس کے دل میں ہے۔ غریب نواز اور رنجیت کمار کے لئے موجود ہے اور خدا معلوم اور کس کس کے لئے

باتوں باتوں میں چڈے سے میں نے پوچھا: "یار یہ تو بتاؤ تمہاری ممی اتنا شوخ میک اپ کیوں کرتی ہے؟"

"اس لئے کہ دنیا ہر شوخ چیز کو پسند کرتی ہے . . . تمہارے اور میرے جیسے آرٹسٹ اس دنیا میں بہت کم بستے ہیں جو مدھم سُر اور مدھم رنگ پسند کرتے ہیں۔ وہ جوانی کو جوانی کے روپ میں نہیں دیکھنا چاہتے۔ اور جو بڑھاپے پر جوانی کا ملمع پسند نہیں کرتے . . . ہم جو خود کو آرٹسٹ کہتے ہیں، اُلو کے پٹھے ہیں۔ میں تمہیں ایک دلچسپ واقعہ سناتا ہوں . . . جیسا کہ میرا خیال تھا تمہارے آرٹسٹ ہیں . . . اس باغ کے اُس بازو میں جہاں گھمبا بنا ہوا رہتی ہیں جانتے ہو کون رہتی ہے . . . ایک موٹی منہ چڑائی سے . . . خاص دودھ اور مکھن پر پلے ہوئے جوان نے، جس کی نئی جوتی اُس کی ایڑی پر بازو کرتی تھی اُدھر ایک کتے کی طرف دیکھا جس کی دم چڑی ہوئی بیرا . . . اُس کے ماتھے پر بسنے بد نما طریقے پر جمی ہوئی تھیں اور اپنے ساتھی کی پسلیوں میں ٹھوکا دے کر کہا . . . اوئے لنا ساں . . . ویکھ اوئے آپر دِنگ . . . اس دے پنڈ وچ مجھ اں . . . آخری لفظ وہ خدا معلوم کیوں گول کر گیا۔ حالانکہ وہ شائستگی کا بالکل قائل نہیں تھا۔ کھلکھلا کر ہنسنے لگا اور میرے گلاس میں رم ڈالی۔ بولا: "اس جاٹ کے لئے وہ چڑیل ہی اُس وقت کوہ قاف کی پری تھی اور اُس کے گاؤں کی حسین رنگیلی مٹیاریں بھی ڈول جیسیں . . . ہم سب چغد ہیں . . . درمیانے درجے کے . . . اس لئے کہ اس دنیا میں کوئی چیز اوّل درجے کی نہیں . . . تیسرے درجے کی ہے یا درمیانے درجے کی . . . لیکن . . . لیکن . . . خاص الخاص درجے کی چیز ہے . . . . . . وہ سانپ کے کپڑوں۔"

وہ اُٹھا . . . اپنا گلاس اٹھا کر چڈے کے سر پر انڈیل دیا: "کپڑے . . . تمہارا دماغ پھر گیا ہے!"

چڈے نے منہ ملتے ہوئے رم کے ٹپکتے ہوئے قطرے زبان سے چاٹنے شروع کر دیئے اور ذرا اکڑ کے کہا: "اب سُنا . . . تیرا باپ سالا مجھ سے کتنی محبت کرتا تھا . . . . . میرا دماغ اب کافی ٹھنڈا ہو گیا ہے؟"

وہ کرتے بہت سنجیدہ ہو کر مجھ سے مخاطب ہوا: "ہاں تو . . . وہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا . . . . . میں فضول [illegible] اُس نے میری

شہزادہ سُوری

چڈہ زور سے ہنسا: تمہیں کار فرما دیا اُس سالے نے... بیگم صاحبہ شملہ گئی ہیں کسی کی بیٹی سے کہ وہاں بھی اُسے کہا ہے کہ تمہاری شادی کے لئے کوئی
...ت حور ڈھونڈتا ہے؟

تمہارو بھابی کی ایسی تیسی... ... فی لس کی بات کرو... ... اُس سے زیادہ اور کوئی خوبصورت نہیں ہو سکتا! چڈے نے غریب نواز اور رجیت کمار
... دیکھا جو کونے میں بیٹھے فی لس کے حسن کے متعلق اپنی رائے کا اظہار ایک دوسرے سے کرنے والے تھے بیگن پاؤڈر پلوٹ کے بابو... ... سنو تمہاری
...ارش کامیاب نہیں ہوگی ——— میدان چڈے کے ہاتھ رہے گا... ... کیوں ویلنگ کے شہزادے؟

ویلنگ شہزادہ وہم کی خالی ہوتی ہوئی بوتل کو طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ چڈے نے قہقہہ لگایا اور اُس کو آدھا گلاس بھر کے دے دیا۔
غریب نواز اور رجیت کمار ایک دوسرے سے فی لس کے بارے میں گھل مل کے باتیں کر رہے تھے مگر اپنے دماغ میں وہ اُسے حاصل کرنے کی مختلف اسکیمیں علیحدہ
...ا رہے تھے۔ یہ اُن کے طرزِ گفتگو سے صاف عیاں تھا۔

ڈرائنگ روم میں اب بجلی کے بلب روشن تھے، کیونکہ شام گہری ہو چلی تھی۔ چڈہ مجھ سے بمبئی کی فلم انڈسٹری کے تازہ حالات سن رہا تھا کہ باہر برآمدے میں
تیز آواز سنائی دی۔ چڈے نے نعرہ بلند کیا، اور باہر چلا گیا۔ غریب نواز نے رجیت کمار کی طرف اور رجیت کمار نے غریب نواز کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا،
...روازے کی جانب دیکھنے لگے۔

...ہ چہکتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اُس کے ساتھ چار پانچ اینگلو انڈین لڑکیاں تھیں۔ مختلف قد و قامت اور خط و خال والوں کی۔ پولی، ڈولی، کٹی، ایلما اور تھیلما...
... ہیبر فا... ... اس کو چڈہ سیسی کہہ کر پکارتا تھا۔ فی لس سب سے آخر میں نمودار ہوئی اور وہ بھی چڈے کے ساتھ۔ اُس کا ایک بازو اس پٹیم بلونڈ کی
...میں حمائل تھا۔ میں نے غریب نواز اور رجیت کمار کا ردِ عمل نوٹ کیا۔ ان کو چڈے کی یہ مالکانہ فتحمندانہ حرکت پسند نہ آئی تھی۔

لڑکیوں کے آتے ہی ایک شور برپا ہو گیا۔ ایک دم اتنی انگریزی برسی کہ وہی کثرت سے میٹرک کے امتحان میں کئی بار فیل ہوا۔ مگر اس نے کوئی پرواہ کی
...ہ پرواہ۔ جب اُس سے کسی نے التفات نہ برتا تو وہ ایلما کی بڑی بہن تھیلما کے ساتھ ایک صوفے پر الگ بیٹھ گیا اور پوچھنے لگا کہ اُس نے ہندوستانی
...نے اور کتنے نئے توڑے سیکھے ہیں۔ وہ اِدھر رقص کی نئی ناکٹ اور تانگ کی تھی، تو انسر ہی بتا بتا کر اُس کو توڑے تیار کر رہا تھا۔ اُدھر چڈہ باقی لڑکیوں کے
...میں انگریزی کے ننگے ننگے لطیفے سنا رہا تھا۔ جو اس کو ہزاروں کی تعداد میں زبانی یاد تھے ——— سوڈے کی بوتلیں اور گزک کا سامان منگوا رہی تھی ———
...سگرٹ کے کش لگا کر ٹکٹکی باندھے فی لس کی طرف دیکھ رہا تھا اور غریب نواز مجھ سے بار بار کہتا تھا کہ روپے کم ہوں تو وہ اُس سے لے لے۔

...کا کھلی اور پہلا دور شروع ہوا۔ فی لس کو جب شامل ہونے کے لئے کہا گیا تو اُس نے اپنے پلیٹنی بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر انکار کر دیا کہ وہ
...ہیں پیا کرتی۔ سب نے اصرار کیا مگر وہ نہ مانی۔ چڈے نے بددلی کا اظہار کیا تو میں نے فی لس کے لئے ہلکا سا مشروب تیار کیا اور گلاس اس کے ہونٹوں کے ساتھ
...سے پیار سے کہا "بہادر لڑکی بنو اور پی جاؤ۔"

فی لس انکار نہ کر سکی۔ چڈہ خوش ہو گیا، اور اُس نے اپنی خوشی میں بیس پچیس اور لطیفے سنائے۔ سب مزے لیتے رہے ——— میں نے سوچا، عریانی سے تنگ آ کر
...نے ستر پوشی اختیار کی ہو گی، یہی وجہ ہے کہ اب وہ ستر پوشی سے اُکتا کر کبھی کبھی عریانی کی طرف دوڑنے لگتا ہے۔ شائستگی کا ردِ عمل یقیناً ناشائستگی ہے۔
...کا اصل طور پر ایک دلکش پہلو بھی ہے۔ آدمی کو اس سے ایک مسلسل ایک آہنگی کی گرفت سے چند گھڑیوں کے لئے نجات مل جاتی ہے... ...
...نے ممی کی طرف دیکھا جو بہت ہشاش بشاش جوان لڑکیوں میں گھلی ملی چڈے کے ننگے ننگے لطیفے سن کر ہنس رہی تھی اور قہقہے لگا رہی تھی ——— اُس کے
...ہرے پر وہی واہیات میک اپ تھا۔ اس کے نیچے اس کی جھریاں صاف نظر آ رہی تھیں مگر وہ بھی مسرور تھیں... ... میں نے سوچا، آخر لوگ کیوں فراڈ کو بُرا
...ہیں... ... وہ فراڈ جو میری آنکھوں کے سامنے تھے، اُس کا ظاہر گو بدنما تھا، لیکن باطن اُس کا بے حد خوبصورت تھا... ... اُس پر کوئی بناؤ سنگھار کوئی
...

پتہ نہیں وہ ایک کونے میں رنجیت کمار کے ساتھ کھڑی اپنے نئے فراک کے بارے میں بات چیت کر رہی تھی اور اُسے بتا رہی تھی کہ صرف اپنی ہوشیاری سے اس نے بہت سستے داموں پر ایسی عمدہ چیز تیار کرا لی ہے۔ دو ٹکڑے جو بظاہر بالکل بیکار معلوم ہوتے تھے، مگر اب وہ ایک خوبصورت پوشاک میں تبدیل ہو چکے تھے ——— اور رنجیت کمار بڑے خلوص کے ساتھ اس کو دو تین فلموں میں ہیروئین بنانے کا وعدہ کر رہا تھا۔ حالانکہ اُسے فلم کمپنی سے اپنے لئے پلاٹ ملنے کی ہرگز ہرگز امید نہیں تھی۔ ڈاکٹر غریب نواز سے کچھ قرض مانگنے کی کوشش کر رہی تھی اور اُس کو یقین دلا رہی تھی کہ دفتر سے تنخواہ ملنے پر مع سود قرض ضرور لوٹا دے گی۔ غریب نواز کو قطعی طور پر معلوم تھا کہ وہ یہ روپیہ حسب معمول کبھی واپس نہیں دے گی مگر وہ اس کے وعدے پر اعتبار کئے جا رہا تھا۔ بتیلال، ڈن کٹر سے تانڈو ناچ کے بڑے مشکل توڑے سیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ڈن کٹر کو معلوم تھا کہ ساری عمر اُس کے پیر کبھی اُن کے بول ادا نہیں کر سکیں گے، مگر وہ اس کو بتائے جا رہا تھا اور تقلید میں ایسی محو جا رہی تھی کہ وہ بیکار اپنا اور ڈن کٹر کا وقت ضائع کر رہی ہے، مگر بڑے شوق اور انہماک سے سبق یاد کر رہی تھی۔ ایمیا اور کرتی دونوں بیٹھی جا رہی تھیں اور آپس میں کسی اور ہی کی بات کر رہی تھیں جس نے پچھلے برس تب ان دونوں سے خدا معلوم کب کا بدلہ لینے کی خاطر غلط گپ دی تھی۔ اور پیشہ ذی کس کے ساتھ کچھ ایسے رنگ کے داروں کو بھیگے ہوئے سونے کی رنگ کی اسکاچ میں ملا ملا کر پی رہا تھا۔ ذی کس کا چہرہ لال تھا، وہ دست بار بار جیب سے کنگھی نکالتا تھا اور اپنے بال سنوار رہا تھا۔ ممی کبھی اس سے بات کرتی تھی، کبھی اس سے، کبھی سوڈا کھلواتی تھی، کبھی ٹوٹے ہوئے گلاس کے ٹکڑے اٹھواتی تھی۔ اُس کی نگاہ سب پر تھی، اس بلی کی طرح، جو بظاہر آنکھیں بند کئے اونگھ رہی ہے، مگر اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے پانچوں بچے کہاں کہاں ہیں اور کیا کیا شرارت کر رہے ہیں۔

اس دلچسپ تصویر میں کون سا رنگ، کون سا خط غلط تھا؟ ممی کا وہ بھڑکیلا اور شوخ میک اپ بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس تصویر کا ایک ضروری جزو ہے۔

غالب کہتا ہے ——

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

قید حیات اور بند غم جب اصلاً ایک ہیں تو یہ کیا فرض ہے کہ آدمی موت سے پہلے تھوڑی دیر کے لئے نجات حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے ——— اس نجات کے لئے کون ملک الموت کا انتظار کرے۔ کیوں آدمی چند لمحات کے لئے خود فریبی کے دلچسپ کھیل میں حصہ نہ لے۔

ممی سب کی تعریف میں رطب اللسان تھی۔ اُس کے پہلو میں ایسا دل تھا جس میں سب کے لئے ممتا تھی ——— میں نے سوچا، شاید اسی لئے اُس نے اپنے چہرے پر رنگ مل لیا ہے کہ لوگ ان کو اُس کی اصلیت معلوم نہ ہو۔ اس میں شاید اتنی جسمانی قوت نہیں تھی کہ وہ ہر ایک کی ماں بن سکتی۔ اس نے اپنی شفقت اور محبت کے لئے چند آدمی چن لئے تھے اور باقی ساری دنیا کو چھوڑ دیا تھا۔

ممی کو معلوم نہیں تھا کہ پولی ایک گز آگے ذی کس کو بلا چکا تھا۔ چوری چھپے نہیں سب کے سامنے، مگر ممی اُس وقت اندر باورچی خانے میں پڑنیلو چپس تل رہی تھی۔ ... ذی کس نشے میں تھی، ہلکے ہلکے سرور میں، جس طرح اُس کے پاس کٹے ہوئے فولاد کے رنگ کے بال آہستہ آہستہ لہراتے تھے، اسی طرح وہ خود بھی لہراتی تھی۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ڈن کٹر ایمیا کو توڑے سکھا سکھا کر اب اُسے بتا رہا تھا کہ اُس کا باپ سالا اُس سے بہت محبت کرتا تھا۔ چنانچہ میں اُس نے اُس کی شادی بنا دی تھی۔ اُس کی وائف بہت ... فل ہے۔ اور غریب نواز، ڈاکٹر کو قرض دے کر بھول بھی چکا تھا۔ رنجیت کمار ... کو اپنے ساتھ کہیں باہر لے گیا تھا۔ ایمیا اور کرتی دونوں جان بھر کی باتیں کر کے اب تنگ آ گئی تھیں اور آرام کرنا چاہتی تھیں ——— تپائی کے اردگرد ... اُس کا ہیبرا اور اسائی اور ممی بیٹھے تھے۔ پیڈرو اب ... باقی نہیں تھا۔ ذی کس اُس کے پہلو میں بیٹھی تھی جس نے پہلی دفعہ شراب کا سرور چکھا تھا ——— آہ

پاس کرنے کا عزم اُس کی آنکھوں میں صاف موجود تھا۔ ممی اس سے غافل نہیں تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد فیلس کا ہیرڈریسر دوست اُٹھ کر صوفے پر دراز ہو گیا اور اپنے بالوں میں کنگھی کرتے کرتے سو گیا ——— غریب نواز اور آئیا اٹھ کر کہیں چلے گئے۔ ایلما اور کٹی نے آپس میں کسی مارگریٹ کے متعلق باتیں کرتے ہوئے ممی سے رخصت لی اور چلی گئیں ..... ڈی کوسٹا نے آخری بار اپنی بیوی کی خوبصورتی کی تعریف کی اور فیلس کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا، پھر تبیلا کی طرف جو اُس کے پاس بیٹھی تھی اور اُس کو بازو سے پکڑ کر چاند کا منہ دکھانے کے لئے باہر میدان میں لے گیا۔

ایک دم جانے کیا ہوا کہ چڈے اور ممی میں گرم گرم باتیں شروع ہو گئیں۔ چڈے کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ وہ ایک ناخلف بچے کی طرح ممی سے بدزبانی کرنے لگا۔ فیلس نے دونوں میں مصالحت کی بہتیری کوشش کی مگر چڈہ ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا۔ وہ فیلس کو اپنے ساتھ سعید کے کاٹیج میں لے جانا چاہتا تھا۔ ممی اس کے خلاف تھی۔ وہ اس کو بہت دیر تک سمجھاتی رہی کہ وہ اِس ارادے سے باز آئے، مگر وہ اس کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ بار بار ممی سے کہہ رہا تھا: "تم دیوانی ہو گئی ہو ..... بڑھی دلّالہ ..... فیلس میری ہے ——— پوچھ لو اس سے۔"

میں نے بہت دیر تک اُس کی گالیاں سنیں، آخر میں نے سمجھانے والے انداز میں اُس سے کہا: "چڈہ، مائی سن ..... تم کیوں نہیں سمجھتے ..... شی از ینگ ——— شی از ویری ینگ!"

اُس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ ایک التجا تھی، ایک سرزنش تھی، ایک بڑی بھیانک تصویر تھی، مگر چڈہ بالکل نہ سمجھا۔ اُس وقت اس کے پیش نظر صرف فیلس تھی اور اُس کا حصول تھا۔ میں نے فیلس کی طرف دیکھا، اور میں نے پہلی دفعہ بڑی شدت سے محسوس کیا کہ وہ بہت چھوٹی عمر کی تھی، بمشکل پندرہ برس کی ..... اُس کا سفید چہرہ، نقرئی بادلوں میں گھرا ہوا بارش کے پہلے قطرے کی طرح لرز رہا تھا۔

چڈے نے اُس کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور فلموں کے ہیرو کے انداز میں اُسے اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا ——— ممی نے احتجاج کی چیخ بلند کی: "چڈہ ..... چھوڑ دو ..... فور گاڈز سیک ..... چھوڑ دو اسے!"

جب چڈے نے فیلس کو اپنے چوڑے سینے سے جدا نہ کیا تو ممی نے اُس کے منہ پر ایک چانٹا مارا: "گٹ آؤٹ ..... گٹ آؤٹ!"

چڈہ بھونچکا رہ گیا۔ فیلس کو جدا کر کے اُس نے دھکا دیا اور ممی کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھتا باہر چلا گیا۔ میں نے اُٹھ کر رخصت لی اور چڈے کے پیچھے چلا گیا۔

سعید کے کاٹیج پہنچ کر میں نے دیکھا کہ وہ پتلون، قمیص اور بوٹ سمیت پلنگ پر اوندھے منہ لیٹا تھا۔ میں نے اُس سے کوئی بات نہ کی اور دوسرے کمرے میں جا کر بڑے میز پر سو گیا۔

صبح دیر سے اُٹھا۔ گھڑی میں دس بج رہے تھے۔ چڈہ صبح ہی صبح اُٹھ کر باہر چلا گیا تھا۔ کہاں، یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ میں جب غسل خانے سے باہر نکل رہا تھا تو میں نے اُس کی آواز سنی جو گراج سے باہر آ رہی تھی۔ میں رک گیا۔ وہ کسی سے کہہ رہا تھا: "وہ لاجواب عورت ہے ——— خدا کی قسم وہ لاجواب عورت ہے ..... دعا کرو کہ اُس کی عمر کو پہنچ کر تم بھی ویسی ہی گریٹ ہو جاؤ۔"

اُس کے لہجے میں ایک عجیب و غریب تلخی تھی ——— معلوم نہیں اس کا رُخ آیا اس کی اپنی ذات کی جانب تھا یا اس شخص کی طرف جس سے وہ مخاطب تھا ——— میں نے زیادہ دیر وہاں رکنا مناسب نہ سمجھا اور اندر چلا گیا۔ نصف گھنٹے کے قریب میں نے اس کا انتظار کیا، جب وہ نہ آیا تو میں پربھات نگر روانہ ہو گیا۔

میری بیوی کا مزاج معتدل تھا ——— ہریش گھر میں نہیں تھا۔ اُس کی بیوی نے اُس کے متعلق استفسار کیا تو میں نے کہہ دیا کہ وہ ابھی تک سو رہا ہے۔ پونے میں کافی تفریح ہو گئی تھی۔ اس لئے میں نے ہریش کی بیوی سے کہا کہ ہمیں اجازت دی جائے۔ مگر اُس نے چاہا کہ [illegible] سعید کا کاٹیج

یہ سے فیصلہ کرکے چلا تھا کہ رات کا واقعہ میرے لئے ذہنی جگالی کے واسطے بہت کافی ہے ــــ ہم چل دیئے ...... راستے میں ہم کوئی باتیں ہوئیں۔ جو کچھ ہوا تھا۔ میں نے اس کو من و عن سنا دیا۔ اس کا ردِ عمل یہ تھا کہ فلس اس کی کوئی رشتہ دار ہوگی۔ یا وہ اسے کسی اچھی اسامی کو پیش کرنا چاہتی تھی جس پر اس نے چڈے سے لڑائی کی ...... میں خاموش رہا۔ اس کی تردید کی نہ تائید۔

کچھ دن گزرنے پر چڈے کا خط آیا جس میں اس رات کے واقعے کا سرسری ذکر تھا۔ اور اس نے اپنے متعلق یہ کہا تھا: میں اس روز حیوان ہو گیا تھا ــــ لعنت ہو مجھ پر!

تین مہینے کے بعد مجھے ایک ضروری کام سے پونے جانا پڑا۔ سیدھا سعیدہ کاٹیج پہنچا۔ چڈہ موجود نہیں تھا۔ غریب نواز سے اس وقت ملاقات ہوئی، جب وہ گراج سے باہر نکل کر شیر پہ کے خورد سال بچے کو پیار کر رہا تھا۔ وہ بڑے تپاک سے ملا۔ تھوڑی دیر کے بعد رنجیت کمار آ گیا، چہرے کی چال ڈھال اور خاموش بیٹھ گیا۔ میں اگر اس سے کچھ پوچھتا تو وہ بڑے اختصار سے جواب دیتا۔ اس سے باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ چڈہ اس رات کے بعد فلس کے پاس نہیں گیا اور نہ وہ کبھی یہاں آئی ہے۔ فلس کو اس نے دوسرے روز ہی اپنے ماں باپ کے پاس بھجوا دیا۔ وہ اس ہیجڑے نما لڑکے کے ساتھ گھر سے بھاگ کر آئی ہوئی تھی۔ رنجیت کمار کو یقین تھا کہ اگر وہ کچھ دن اور پونے میں رہتی تو وہ ضرور اسے لے اڑتا۔ غریب نواز کو ایسا کوئی زعم نہیں تھا، اسے صرف یہ افسوس تھا کہ وہ چلی گئی۔

چڈے کے متعلق یہ پتہ چلا کہ دو تین ماہ سے اس کی طبیعت ناساز ہے۔ بخار رہتا ہے مگر وہ کسی ڈاکٹر سے مشورہ نہیں لیتا ــــ سارا دن ادھر ادھر گھومتا رہتا ہے۔ غریب نواز نے جب مجھے یہ باتیں بتانا شروع کیں تو رنجیت کمار اٹھ کر چلا گیا۔ میں نے سلاخوں والی کھڑکی میں سے دیکھا اس کا رخ گراج کی طرف تھا۔

میں غریب نواز سے گراج والی شیریں کے متعلق کچھ پوچھنے کے لئے خود کو تیار ہی کر رہا تھا کہ ون کٹرے منٹ گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ چڈے کو سخت بخار تھا۔ وہ اسے تانگے میں یہاں لا رہا تھا کہ راستے میں بیہوش ہو گیا ...... میں اور غریب نواز باہر دوڑے۔ تانگے والے نے بیہوش چڈے کو سنبھالا ہوا تھا۔ ہم سب نے مل کر اسے اٹھایا اور کمرے میں پہنچا کر بستر پر لٹا دیا۔ میں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ واقعی بہت تیز بخار تھا۔ ایک سو چھ ڈگری سے قطعاً کم نہ ہوگا۔

میں نے غریب نواز سے کہا کہ فوراً ڈاکٹر کو لانا چاہیے۔ اس نے ون کٹرے سے مشورہ کیا۔ وہ "ابھی آتا ہوں" کہہ کر چلا گیا۔ جب واپس آیا تو اس کے ساتھ ممی تھی جو ہانپ رہی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے چڈے کی طرف دیکھا اور قریب قریب چیخ کر پوچھا "کیا ہوا میرے بیٹے کو؟"

ون کٹرے نے جب اسے بتایا کہ چڈہ کئی دنوں سے بیمار تھا تو ممی نے بڑے رنج اور غصے کے ساتھ کہا "تم کیسے لوگ ہو ــــ مجھے اطلاع کیوں نہ دی" پھر اس نے غریب نواز، مجھے اور ون کٹرے کو مختلف ہدایات دیں۔ ایک کو چڈے کے پاؤں سہلانے کی، دوسرے کو برف لانے کی اور تیسرے کو پنکھا کرنے کی۔ چڈے کی حالت دیکھ کر اس کی اپنی حالت بہت غیر ہو گئی تھی۔ لیکن اس نے تحمل سے کام لیا اور ڈاکٹر لانے چلی گئی۔

معلوم نہیں رنجیت کمار کو گراج میں کیسے پتہ چلا۔ ممی کے جانے کے بعد فوراً وہ گھبرایا ہوا آیا۔ جب اس نے استفسار کیا تو ون کٹرے نے اس کو چڈے کے بیہوش ہونے کا واقعہ بیان کر دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ ممی ڈاکٹر کے پاس گئی ہے۔ یہ سن کر رنجیت کمار کا اضطراب کسی حد تک دور ہو گیا۔

میں نے دیکھا کہ وہ تینوں بہت مطمئن تھے، جیسے چڈے کی صحت کی ساری ذمہ داری ممی نے اپنے سر لے لی ہے۔

اس کی ہدایات کے مطابق چڈے کے پاؤں سہلائے جا رہے تھے۔ سر پر برف کی پٹیاں رکھی جا رہی تھیں۔ جب ممی ڈاکٹر لے کر آئی تو وہ کسی قدر ہوش میں آ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے معائنے میں کافی دیر لگائی۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ چڈے کی زندگی خطرے میں ہے۔ معائنے کے بعد ڈاکٹر نے ممی کو اشارہ کیا اور وہ کمرے سے باہر چلے گئے ــــ میں نے سلاخوں والی کھڑکی میں سے دیکھا گراج کے ٹاٹ کا پردہ ہل رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ممی آئی۔ غریب نواز، وِن کرٹسے اور رجیت کا رسے اس نے فرداً فرداً کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ چڈّہ اب آنکھیں کھولے پڑا تھا۔ ممی کو اس نے حیرت کی نگاہوں سے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن وہ الجھن سی محسوس کر رہا تھا۔ چند لمحات کے بعد جب وہ سمجھ گیا کہ ممی کیوں اور کیسے آئی ہے تو اس نے ممی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور دبا کر کہا "ممی، یو آر گریٹ!"

ممی اس کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی۔ وہ شفقت کا مجسمہ تھی۔ چڈّے کے تپتے ہوئے ماتھے پر ہاتھ پھیر کر اس نے مسکراتے ہوئے صرف اتنا کہا "میرے ... میرے غریب بیٹے!"

چڈّے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، لیکن فوراً ہی اس نے ان کو جذب کرنے کی کوشش کی اور کہا "نہیں ——— تمہارا بیٹا اول درجے کا اسکاؤنڈرل ہے ... جاؤ اپنے مرحوم خاوند کا پستول لاؤ اور اس کے سینے پر داغ دو!"

ممی نے چڈّے کے گال پر ہولے سے طمانچہ مارا "فضول بکواس نہ کرو۔" پھر وہ چست و چالاک نرس کی طرح اٹھی اور ہم سب سے مخاطب ہو کر کہا "لڑکو ——— وہ بیمار ہے، اور مجھے ہسپتال لے جانا ہے اسے ——— سمجھے؟"

سب سمجھ گئے۔ غریب نواز نے فوراً ٹیکسی کا بندوبست کر دیا۔ چڈّے کو اٹھا کر اس میں ڈالا گیا۔ وہ بہت کہتا رہا کہ اتنی کونسی آفت آ گئی ہے جو اس کو ہسپتال کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ مگر ممی یہی کہتی رہی کہ بات کچھ بھی نہیں۔ ہسپتال میں ذرا آرام رہتا ہے۔ چڈّہ بہت ضدی تھا۔ مگر نفسیاتی طور پر وہ اس وقت ممی کی کسی بات سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔

چڈّہ ہسپتال میں داخل ہو گیا ——— ممی نے اکیلے میں مجھے بتایا کہ مرض بہت خطرناک ہے، یعنی پلیگ۔ یہ سن کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ خود ممی بہت پریشان تھی۔ لیکن اس کو امید تھی کہ یہ بلا ٹل جائے گی، اور چڈّہ بہت جلد تندرست ہو جائے گا۔

علاج ہوتا رہا۔ پرائیویٹ ہسپتال تھا۔ ڈاکٹروں نے چڈّے کا علاج بہت توجہ سے کیا مگر کئی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ اس کی جلد جگہ جگہ سے پھٹنے لگی اور رِسنا لیا۔ ڈاکٹروں نے بالآخر یہ رائے دی کہ اسے بمبئی لے جاؤ، مگر ممی نہ مانی۔ اس نے چڈّے کو اسی حالت میں اٹھوایا اور اپنے گھر لے گئی۔

میں زیادہ دیر پونے میں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ واپس بمبئی آیا تو میں نے ٹیلی فون کے ذریعے سے کئی مرتبہ اس کا حال دریافت کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ پلیگ کے حملے سے جانبر نہ ہو سکے گا۔ مگر مجھے معلوم ہوا کہ آہستہ آہستہ اس کی حالت سنبھل رہی ہے۔ ایک مقدمے کے سلسلے میں مجھے لاہور جانا پڑا۔ وہاں سے دس روز کے بعد لوٹا تو میری بیوی نے چڈّے کا ایک خط دیا۔ جس میں صرف یہ لکھا تھا "عظیم المرتبت ممی نے اپنے ناخلف بیٹے کو موت کے منہ سے بچا لیا ہے۔"

ان چند لفظوں میں بہت کچھ تھا۔ جذبات کا ایک پورا سمندر تھا۔ میں نے اپنی بیوی سے اس کا ذکر خلافِ معمول بڑے جذباتی انداز میں کیا تو اس نے متاثر ہو کر صرف اتنا کہا "ایسی عورتیں عموماً خدمت گذار ہوا کرتی ہیں۔"

میں نے چڈّے کو دو تین خط لکھے، جن کا جواب نہ آیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ممی نے اس کو تبدیلی آب و ہوا کی خاطر اپنی ایک سہیلی کے ہاں لوناولہ بھجوا دیا تھا۔ وہ وہاں مشکل سے ایک مہینہ رہا اور اکتا کر چلا آیا۔ جس روز وہ پونے پہنچا اتفاق سے میں وہیں تھا۔

پلیگ کے زبردست حملے کے باعث وہ بہت کمزور ہو گیا تھا، مگر اس کی غوغا پسند طبیعت اسی طرح تندروں پر تھی۔ اپنی بیماری کا اس نے اس طرح ذکر کیا کہ جس طرح آدمی سائیکل کے معمولی حادثے کا ذکر کرتا ہے۔ اب کہ وہ جانبر ہو گیا تھا، اپنی خطرناک علالت کے متعلق تفصیلی گفتگو اسے بیکار معلوم ہوتی تھی۔

سعیدہ کاٹیج میں چڈّے کی غیر حاضری کے دوران میں چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ اہل برادران یعنی عقیل اور شکیل کہیں اور اٹھ گئے تھے کیونکہ ان کو اپنی ذاتی فلم کمپنی قائم کرنے کے لئے سعیدہ کاٹیج کی فضا مناسب و موزوں معلوم نہیں ہوتی تھی۔ ان کی جگہ ایک بنگالی میوزک ڈائرکٹر آ گیا تھا، اس کا

کم حسین تھا۔ [illegible] کے ساتھ لاہور سے آیا تھا [illegible] ایک لڑکا رام [illegible] رہتا تھا۔ سعیدہ کاٹیج والے سب اس سے کام لیتے تھے۔ طبیعت کا بہت شریف اور خدمت گزار تھا۔ چڈے کے پاس اس وقت آیا تھا جب وہ ممی کے کہنے پر آتا جاتا تھا۔ اس نے غریب نواز اور رنجیت کمار سے کہہ دیا تھا کہ اسے سعیدہ کاٹیج میں رکھ لیا جائے۔ تینوں کے کمرے میں چونکہ جگہ نہ تھی، اس لیے اس نے وہیں اپنا ڈیرہ جما دیا تھا۔

رنجیت کمار کو کمپنی کے نئے فلم میں [illegible] کر لیا گیا تھا اور اس سے [illegible] وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر فلم کامیاب ہوا تو اس کو دوسرا فلم ڈائریکٹ کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ چڈہ [illegible] تنخواہ میں سے ڈیڑھ ہزار روپیہ ایڈوانس حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس نے رنجیت کمار سے کہا تھا "میری جان، اگر کچھ [illegible] ــــ یہ [illegible] سے میرا تو خیال ہے یہی بہتر ہے۔"

غریب نواز تازہ تازہ [illegible] سے واپس آیا تھا۔ [illegible] سعیدہ کاٹیج کسی قدر مرفع الحال تھی۔ میں نے دیکھا کہ گیراج کے باہر الگنی پر ایسی قمیصیں اور شلواریں لٹک رہی تھیں [illegible] اس نے کھڑے کیے تھے۔

مجھے پونے [illegible] ممی کی محبت میں گرفتار ہونے کی کوشش میں مصروف تھا، مگر ڈرتا تھا کیونکہ [illegible] چڈے نے اس کو حوصلہ دیا تھا "کچھ پروا نہ کرو، اس سلسلے کی [illegible] جس [illegible] کرتا ہے ــــ بس اتنا کرو کہ سو روپے [illegible] نکال [illegible] بہت کام آیا کریں گی۔"

[illegible] عشق کے راستے میں کوئی ایسی خاص مشہور [illegible] تھا۔

ممی کے گھر [illegible] اور تانڈیو نارج کی [illegible] اور وہاں [illegible] فرض لے رہا تھا اور رنجیت کمار [illegible] جس [illegible] چڈے کے نئے نئے [illegible] گراسی طرح [illegible] صحیح تشبیہہ ڈھونڈنے میں چڈے نے کافی وقت صرف کیا تھا۔ [illegible] چڈے کی نظر [illegible] جب چڈے کی نظریں ممی کی نظروں سے ٹکرا کر جھک جاتی تھیں تو میں محسوس کرتا تھا [illegible] افسوس [illegible] اس کو تکلیف ہوتی ہے۔ چنانچہ [illegible] کے بعد کسی وقت اس قسم کا جملہ اس کی زبان سے بے اختیار نکل جاتا "چڈہ ــــ یو آر اے ڈیم بروٹ!"

[illegible] بیٹ بیٹ کر یہ کہہ رہی ہے "ڈونٹ لک بروٹ"

[illegible] اپنے باپ کی تعریف میں یا اپنی بیوی کی خوبصورتی کے متعلق کچھ کہنے لگتا تو وہ [illegible] جیب میں ڈال لیتا۔

ممی [illegible] رنجیت [illegible] کی چیزوں اور [illegible] کے ساز و سامان کے [illegible] چہرے کا میک اپ [illegible] ان کے کپڑے اسی طرح شوخ و شنگ [illegible] تھے۔ [illegible] مجھے [illegible] دکھائی دیتی تھیں [illegible] کے پلیگ کے کیڑے ان تک [illegible] چڈے کے جسم سے [illegible] بھاگے تھے [illegible] جھریوں کا سایہ تھا [illegible] ان جھریوں کا جو [illegible] نہایت واہیات رنگوں میں لتھڑی رہتی تھیں۔

ون کٹرسے کی خوبصورت بیوی کے جب استعفاط ہوا تھا تو ممی ہی کی بروقت امداد سے اس کی جان بچی تھی۔ ببیلا جب ہندوستانی رقص سیکھنے کے شوق میں پاگل ایک کتھک کے ہتھے چڑھ گئی تھی، اور اس سودے میں ایک روز جب اس کو اچانک معلوم ہوا تھا کہ اس نے ایک مرض خرید لیا ہے تو ممی نے اس کو بہت سنبھالا تھا۔ ... اس کو جہنم رسید ہونے کے ... ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس سے قطع تعلق کرنے کا تہیہ کر لیا تھا، مگر اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس کا دل پسیج گیا تھا۔ اس ... اسی شام کو اپنے بیٹوں کو ساری بات سنا دی تھی، اور ان سے درخواست کی تھی کہ وہ ببیلا کا علاج کرائیں۔ کوئی ایک ... حاصل کرنے کے سلسلے میں ... سو روپے کا انعام ملا تھا، تو اس نے مجبور کیا تھا کہ وہ کم از کم اس کے آدھے روپے غریب نواز کو دے دے، کیونکہ اس غریب کا ہاتھ تنگ ہے۔ اس ... سے کہا تھا "تم اس وقت اسے دے دو ——— بعد میں لیتی رہنا" اور مجھ سے اس نے پندرہ روزہ قیام کے دوران میں کئی مرتبہ بڑی حسرت کے ساتھ ... پوچھا تھا، اور تشویش کا اظہار کیا تھا کہ پہلے بچے کی موت کو اتنے برس ہو گئے ہیں، دوسرا بچہ کیوں نہیں ہوا۔ رنجیت کمار سے زیادہ رغبت کے ساتھ ... نہیں کرتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی نمائش پسند طبیعت اس کو اچھی نہیں لگتی۔ میرے سامنے اس کا اظہار وہ ایک دو مرتبہ لفظوں میں بھی کر چکی تھی۔ ... ڈاکٹر سین سے وہ نفرت کرتی تھی۔ چڈہ اس کو اپنے ساتھ لاتا تھا تو وہ اس سے کہتی تھی "ایسے ذلیل آدمی کو یہاں مت لایا کرو۔" چڈہ اس سے وجہ پوچھتا تو وہ بڑی سنجیدگی سے یہ جواب دیتی تھی کہ "مجھے یہ آدمی ادھر ادھر کا ایسا معلوم ہوتا ہے ——— ... نہیں بیٹھتا میری نظروں میں۔" یہ سن کر چڈہ ہنس دیتا تھا۔

ممی کے گھر کی محفلوں کی پرخلوص گرمی لیے میں واپس بمبئی چلا گیا۔ ان محفلوں میں رندی تھی، بلانوشی تھی، جنسیاتی رنگ تھا۔ مگر کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔ ہر چیز حاملہ عورت کے پیٹ کی طرح قابل فہم تھی۔ اسی طرح ابھری ہوئی۔ بظاہر اسی طرح بے ڈھب، بھونڈی اور دیکھنے والے کو گڑبڑ کی حالت میں ڈالنے والی۔ مگر اصل میں ٹھیک صحیح، باسلیقہ اور اپنی جگہ پر قائم۔

دوسرے روز صبح کے اخباروں میں یہ پڑھا کہ سعیدہ کاٹیج میں بنگالی موزک ڈائرکٹر سین مارا گیا ہے۔ اس کو قتل کرنے والا کوئی رام سنگھ ہے جس کی عمر تو وہ پندرہ برس کے قریب بتائی جاتی ہے۔ میں نے فوراً پونے ٹیلیفون کیا مگر کوئی نہ مل سکا۔

ایک ہفتے کے بعد چڈے کا خط آیا جس میں حادثۂ قتل کی پوری تفصیل تھی۔ رات کو سب سوئے تھے کہ چڈے کے پلنگ پر اچانک کوئی گرا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ روشنی کی تو دیکھا کہ سین ہے۔ خون میں لت پت۔ چڈہ اچھی طرح اپنے ہوش و حواس سنبھالنے بھی نہ پایا تھا کہ دروازے میں رام سنگھ نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں چھری تھی۔ فوراً ہی غریب نواز اور رنجیت کمار بھی آ گئے۔ ساری سعیدہ کاٹیج بیدار ہو گئی۔ رنجیت کمار اور غریب نواز نے رام سنگھ کو پکڑ لیا اور اس کے ہاتھ سے چھری چھین لی۔ چڈے نے سین کو اپنے پلنگ پر لٹایا۔ اور اس سے زخموں کے متعلق کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ اس نے آخری ہچکی لی اور ٹھنڈا ہو گیا۔

رام سنگھ، غریب نواز اور رنجیت کمار کی گرفت میں تھا، مگر وہ دونوں کانپ رہے تھے۔ سین مر گیا تو رام سنگھ نے چڈے سے پوچھا "بھاپا جی ——— مر گیا؟"

چڈے نے اثبات میں جواب دیا تو رام سنگھ نے رنجیت کمار اور غریب نواز سے کہا "مجھے چھوڑ دیجیے، میں بھاگوں گا نہیں۔" چڈے کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے فوراً نوکر بھیج کر ممی کو بلایا۔ ممی آئی تو سب مطمئن ہو گئے کہ معاملہ سلجھ جائے گا۔ اس نے رام سنگھ کو آزاد کر دیا اور تھوڑی دیر کے بعد اپنے ساتھ پولیس اسٹیشن لے گئی جہاں اس کا بیان درج کرا دیا گیا۔ اس کے بعد چڈہ اور اس کے ساتھی کئی دن تک سخت پریشان رہے۔ پولیس کی پوچھ گچھ، بیانات، پھر عدالت میں مقدمے کی پیروی۔ ممی اس دوران میں بہت دوڑ دھوپ کرتی رہی تھی۔ چڈے کو یقین تھا کہ رام سنگھ بری ہو جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ماتحت عدالت ہی نے اسے صاف بری کر دیا۔ عدالت میں اس کا وہی بیان تھا جو اس نے تھانے میں دیا تھا۔ ممی نے اس سے کہا تھا "بیٹا گھبراؤ نہیں۔ جو کچھ ہوا ہے سچ سچ بتا دو" ——— اور اس نے تمام واقعات من و عن بیان کر دیے تھے کہ سین نے

لیکن اس نے خود ہی بیرا ایک گلاس چوم لیا، اور گھسیٹ کر ناچنے والوں کے جھرمٹ میں لے گئی۔ چڈھا ایک دم پکارا "بند کرو ——— اب شراب کا دور چلے گا" پھر اس نے نوکر کو آواز دی "اسکاٹ لینڈ کے شہزادے ——— وسکی کی نئی بوتل لاؤ" اسکاٹ لینڈ کا شہزادہ نئی بوتل لے آیا۔ نشے میں وحشت تھا۔ بوتل کھولنے لگا تو ہاتھ سے گری اور ٹوٹ گئی۔ ممی نے اس کو ڈانٹنا چاہا تو چڈھے نے روک دیا اور کہا "ایک بوتل ٹوٹی ہے ممی۔ جانے دو، یہاں دل ٹوٹے ہوئے ہیں"

محفل ایک دم سونی ہو گئی۔ لیکن فوراً ہی چڈھے نے اس لمحاتی افسردگی کو اپنے قہقہوں سے درہم برہم کر دیا۔ نئی بوتل آئی۔ ہر ایک نے گلاس میں گرانڈیل پیگ ڈالا گیا۔ چڈھے نے ایک سی تقریر شروع کی "لیڈیز اینڈ جنٹلمین ... آپ سب جہنم میں جائیں ... منٹو ہمارے درمیان موجود ہے۔ بہ زعم خود بہت بڑا افسانہ نگار بنتا ہے۔ انسانی نفسیات کی ——— وہ کہتا ہے میں بڑی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے ... مگر میں کہتا ہوں کہ کنوئیں میں اترنے والے ... کنوؤں میں اترنے والے" اس نے ادھر ادھر دیکھا "افسوس کہ یہاں کوئی ہندوستانی نہیں۔ ایک حیدرآبادی ہے جو قاعدہ اخلاق کہتا ہے۔ اور جس سے دس برس پہلے ملاقات ہوئی ہو تو کل کا پرسوں آپ سے ملا تھا ——— لعنت ہو اس کے نظام حیدرآباد پر جس کے پاس کئی لاکھ ٹن سونا ہے۔ کروڑوں جواہرات ہیں، لیکن ایک ممی نہیں ... ہاں ... وہ کنوئیں میں اترنے والے ... میں نے کہا تھا کہ سب بکواس ہے ... پنجابی میں جنہیں ٹوبھے کہتے ہیں ... وہ غوطہ لگانے والے، وہ اس کے غیب انسانی نفسیات کو بہتر سمجھتے ہیں ... اس لئے میں کہتا ہوں

سب نے زندہ باد کا نعرہ لگایا۔ چڈھا چیخا "یہ سب سازش ہے ——— اس منٹو کی سازش ہے۔ ورنہ میں نے ہٹلر کی طرح تم لوگوں کو مردہ باد کے نعرے کا اشارہ کیا تھا ... تم سب مردہ باد ... لیکن پہلے میں ... میں ..." وہ جذباتی ہو گیا "میں جس نے اس رات اس ... سانپ کے پیٹ کے کپڑوں ایسے رنگ والے بالوں کی ایک لڑکی کے لئے اپنی ممی کو ناراض کر دیا ... میں خود کو خدا معلوم کہاں کا ڈون جوان سمجھتا تھا ... لیکن نہیں ... اس کو حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ مجھے اپنی جوانی کے ایک ہی برسے میں اس پلاٹنم بلونڈ کے کنوار پنے کا سارا عرق میں اپنے ان موٹے موٹے ہونٹوں سے چوس سکتا تھا ... لیکن یہ ایک بہت نامناسب حرکت تھی ... وہ کم عمر تھی ... اتنی کم عمر ... اتنی کمزور ... اتنی لیر لیر لٹس ... اتنی ..." اس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا "بتاؤ یار اسے اُردو، فارسی یا عربی میں کیا کہیں گے ... کیرکٹرلس ... لیڈیز اینڈ جنٹلمین ... وہ اتنی چھوٹی، اتنی کمزور اور اتنی لاکردار تھی کہ اس رات گناہ میں شریک ہو کر یا تو وہ ساری عمر پچھتاتی رہتی، یا اسے قطعاً بھول جاتی ... ان چند گھڑیوں کی لذت کی یاد کے سہارے جینے کا سلیقہ اس کو قطعی طور پر نہ آتا ... مجھے اس کا دکھ ہوتا ——— اچھا ہوا کہ ممی نے اُس رات میرا حقہ پانی بند کر دیا ... میں اب اپنی بکواس بند کرتا ہوں۔ میں نے اصل میں ایک بہت لمبی چوڑی تقریر کرنے کا ارادہ کیا تھا، مگر مجھ سے کچھ بولا نہیں جاتا ... میں ایک پیگ اور پیتا ہوں"

اس نے ایک پیگ اور پیا۔ تقریر کے دوران میں سب خاموش تھے۔ اس کے بعد بھی خاموش رہے۔ ممی نہ معلوم کیا سوچ رہی تھی۔ غازے سُرخی کی تہوں کے نیچے اس کی جھریاں بھی ایسا دکھائی دیتا تھا کہ غور و فکر میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ بولنے کے بعد چڈھا جیسے خالی سا ہو گیا تھا۔ ادھر اُدھر گھوم رہا تھا، جیسے کوئی چیز کھونے کے لئے ایسا کونہ ڈھونڈھ رہا ہے جو اس کے ذہن میں اچھی طرح محفوظ رہے۔ میں نے اس سے ایک بار پوچھا "کیا سوچ رہے ہو چڈھے؟"

اس نے قہقہہ لگا کر جواب دیا "کچھ نہیں ... بات یہ ہے کہ آج وسکی میرے دماغ کے چوتڑوں پر جما کے لات نہیں مار رہی"

ون ٹرسے نے تھیلما کو اُٹھا کر مجھے اپنے پاس بٹھا لیا اور ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اپنے باپ کی تعریف شروع کر دی کہ وہ بڑا گُنی آدمی تھا۔ ایسا ہارمونیم بجاتا تھا کہ لوگ وجد میں آ جاتے تھے۔ پھر اس نے اپنی بیوی کی خوبصورتی کا ذکر کیا اور بتایا کہ بچپن ہی میں اس کے باپ نے یہ لڑکی چُن کر اس سے بیاہ دی تھی۔ بنگالی میوزک ڈائرکٹر سیٹھی کی بات نکلی تو اس نے کہا "مسٹر شیٹھی ——— وہ ایک عظیم آدمی تھا ... کہتا تھا میں خاں صاحب عبدالکریم خاں کا شاگرد ہوں ... جھوٹ ... بالکل جھوٹ ... وہ تو بنگال کے کسی بھڑوے کا شاگرد تھا ..."

گھڑی نے دو بجائے۔ چڈّے نے جب رنگ بند ایا کی گردن مروڑ کے گرامافون طرف لگایا اور پھر کہا ون ٹرسے کے گلے ... سر پہ دوہتڑ مار کے تھا اس بند رہے ... اُبھر ... اور کچھ گا ... میں جو وار اگر تو نے کوئی بکار راگ گایا"

ون ٹرسے نے فوراً گانا شروع کر دیا۔ آواز ابھی تک نہیں تھی، مگر لوگوں کی نوک پلک واضح طور پر اس کے گلے سے نہیں نکلتی تھی، لیکن جو کچھ گا رہا تھا پورے خلوص سے گا رہا تھا۔ ماکوس میں اس نے اوپر تلے دو تین فلمی گانے سنائے جن سے فضا بہت اداس ہو گئی۔ ممی اور پولی ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تھے اور مدہم کسی اور سمت ہٹ کر بیٹھے تھے ... غریب نواز اس قدر متاثر ہوا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ چڈّے نے زور کا قہقہہ بلند کیا اور ... حیدرآباد والوں کی آنکھ کا مثانہ بہت کمزور ہوتا ہے ... موقع بے موقع ٹپکنے لگتا ہے۔"

غریب نواز نے اپنے آنسو پونچھے اور پالیما کے ساتھ ناچنا شروع کر دیا۔ ون ٹرسے نے گرامو فون کے توے پر فاروڈ رکھ کر سوئی لگا دی۔ گھسی ہوئی ٹیون بجنے لگی۔ چڈّے نے ممی کو پھر گود میں اٹھا لیا اور گرد و پیش کو گھس کر ناچنے لگا۔ اس کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ ان میراثنوں کی طرح جو شادی بیاہ کے موقعوں پر اونچے سروں میں گا گا کر اپنی آواز کا ناس مار لیتی ہیں۔

اس اُچھل کود اور چیخم دھاڑ میں چار بج گئے۔ ممی ایک دم خاموش ہو گئی۔ پھر اس نے چڈّے سے مخاطب ہو کر کہا "بس، اب ختم!"

چڈّے نے بوتل سے منہ لگایا، اسے خالی کر کے ایک طرف پھینک دیا اور مجھ سے کہا "چلو منٹو چلیں!"

میں نے اُٹھ کر ممی سے اجازت لینی چاہی کہ چڈّے نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا "آج کوئی الوداع نہیں کہے گا!"

ہم دونوں باہر نکل رہے تھے کہ میں نے ون ٹرسے کے رونے کی آواز سنی۔ میں نے چڈّے سے کہا "ٹھہرو، دیکھیں کیا بات ہے" مگر وہ مجھے دھکیل کر لے گیا۔ "اس سالے کی آنکھوں کا مثانہ بھی خراب ہے"

ممی کے گھر سے سعیدہ کاٹیج بالکل نزدیک تھی۔ راستے میں چڈّے نے کوئی بات نہ کی۔ سونے سے پہلے میں نے اس سے اس عجیب و غریب پارٹی کے متعلق استفسار کرنا چاہا تو اس نے کہا "مجھے سخت نیند آ رہی ہے" اور بستر پر لیٹ گیا۔

صبح اُٹھ کر میں غسل خانے میں گیا۔ باہر نکلا تو دیکھا غریب نواز گراج کے ٹاٹ کے ساتھ لگ کر کھڑا ہے اور رو رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ آنسو پونچھتا وہاں سے ہٹ گیا۔ میں نے پاس جا کر اس سے رونے کی وجہ دریافت کی تو اس نے کہا "ممی چلی گئی!"

"کہاں؟"

"معلوم نہیں" یہ کہہ کر غریب نواز نے سڑک کا رُخ کیا۔

چڈّہ بستر پر لیٹا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سویا تھا۔ میں نے اس سے ممی کے بارے میں پوچھا تو اس نے مسکرا کر کہا "چلی گئی ——— صبح کی گاڑی سے ... پونہ چھوڑ گیا تھا"

میں نے پوچھا "مگر کیوں؟"

چڈّے کے لہجے میں تلخی آ گئی "حکومت کو اس کی ادائیں پسند نہیں تھیں ——— اس کی وضع قطع پسند نہیں تھی۔ اس کے گھر کی محفلیں اس کی نظر میں قابل

ایک عرصے سے اس کا ایک کیس زیر تفتیش تھا۔ آخر حکومت پولیس کی تحقیقات سے مطمئن ہو گئی اور اس کو تڑی پار کر دیا...... شہر بدر کر دیا...... وہ اگر قحبہ تھی۔ دلالہ تھی ——— اس کا وجود سوسائٹی کے لئے مہلک تھا تو اس کا خاتمہ کر دینا چاہیئے تھا ——— پونے کی غلاظت سے یہ کیوں کہا گیا کہ تم یہاں سے چلی جاؤ۔ اور جہاں چاہو ڈھیر ہو سکتی ہو۔ چڈے نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا اور تھوڑی دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے بڑے جذبات بھرے لہجے میں کہا۔ مجھے افسوس ہے منٹو کہ اس غلاظت کے ساتھ ایک ایسی پاکیزگی چلی گئی ہے جس نے اس رات میری ایک بڑی غلط اور غلیظ ترنگ کو میرے دل و دماغ سے دھو ڈالا ——— لیکن مجھے افسوس نہیں ہونا چاہیئے ——— وہ پونے سے چلی گئی ...... مجھ ایسے جوانوں میں اپنی غلیظ اور غلط ترنگیں وہاں بھی پیدا ہوں گی، جہاں وہ اپنا گھر بنائے گی ...... میں اپنی ممی ان کے سپرد کرتا ہوں ——— زندہ باد ممی ...... زندہ باد پونا ——— چلو غریب نواز کو ڈھونڈیں۔ رو رو کر اس نے اپنی جان ہلکان کر لی ہو گی ——— ان حیدر آبادیوں کی آنکھوں کا مثانہ بہت کمزور ہوتا ہے ——— وقت بے وقت ٹپکنے لگتا ہے۔“

میں نے دیکھا، چڈے کی آنکھوں میں آنسو اس طرح تیر رہے تھے جس طرح مقتولوں کی لاشیں۔

———————————

بابو گوپی ناتھ

("چغد" میں سے)

بابو گوپی ناتھ سے میری ملاقات سن چالیس میں ہوئی۔ ان دنوں میں بمبئی کا ایک ہفتہ وار پرچہ ایڈٹ کیا کرتا تھا۔ دفتر میں عبدالرحیم سینڈو ایک ناٹے قد کے آدمی کے ساتھ داخل ہوا۔ میں اس وقت لیڈ لکھ رہا تھا۔ سینڈو نے اپنے مخصوص انداز میں بآواز بلند مجھے آداب کیا اور اپنے ساتھی سے متعارف کرایا۔ "منٹو صاحب۔ بابو گوپی ناتھ سے ملئے۔"

میں نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ سینڈو نے حسب عادت میری تعریفوں کے پل باندھنے شروع کر دیئے۔ "بابو گوپی ناتھ، تم ہندوستان کے نمبر ون رائٹر سے ہاتھ ملا رہے ہو۔ لکھتا ہے تو دھڑن تختہ ہو جاتا ہے، لوگوں کا۔ ایسی ایسی کنٹی نیوٹلی ملاتا ہے کہ طبیعت صاف ہو جاتی ہے۔ پچھلے دنوں وہ کیا چٹکلا لکھا تھا آپ نے منٹو صاحب۔ مس خورشید نے کار خریدی۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔ کیوں بابو گوپی ناتھ۔ ہے نہ اینٹی کی پینٹی پو؟"

عبدالرحیم سینڈو کے باتیں کرنے کا انداز بالکل نرالا تھا۔ کنٹی نیوٹلی، دھڑن تختہ اور اینٹی کی پینٹی پو ایسے الفاظ اس کی اپنی اختراع تھے جن کو وہ گفتگو میں بے تکلف استعمال کرتا تھا۔ میرا تعارف کرانے کے بعد وہ بابو گوپی ناتھ کی طرف متوجہ ہوا جو بہت مرعوب نظر آتا تھا۔ "آپ ہیں بابو گوپی ناتھ۔ بڑے خانہ خراب۔ لاہور سے جھک مارتے مارتے بمبئی تشریف لائے ہیں۔ ساتھ کشمیر کی ایک کبوتری ہے۔"

بابو گوپی ناتھ مسکرایا۔

عبدالرحیم سینڈو نے تعارف کو ناکافی سمجھ کر کہا۔ "نمبر ون بے وقوف ہو سکتا ہے تو وہ آپ ہیں۔ لوگ ان کے مسکا لگا کر روپیہ بٹورتے ہیں۔ میں صرف باتیں کر کے ان سے ہر روز پولسن بٹر کے دو پیکٹ وصول کرتا ہوں۔ بس منٹو صاحب۔ یہ سمجھ لیجئے کہ بڑے انٹی فلوجسٹین قسم کے آدمی ہیں۔ آپ آج شام کو ان کے فلیٹ پر ضرور تشریف لائیے۔"

بابو گوپی ناتھ نے جو خدا معلوم کیا سوچ رہا تھا چونک کر کہا۔ "ہاں ہاں ضرور تشریف لائیے منٹو صاحب۔" پھر سینڈو سے پوچھا۔ "کیوں سینڈو، کیا آپ کچھ اس کا شغل کرتے ہیں؟"

اس سے گفتگو ممکن ہے۔"

سینڈو نے مجھے فلیٹ کا پتہ لکھا دیا۔ جہاں میں حسبِ وعدہ شام کو پہنچ گیا۔ تیسری منزل پر صاف ستھرا فلیٹ تھا جس پر بالکل نیا فرنیچر سجا ہوا تھا۔ سینڈو اور بابو گوپی ناتھ کے علاوہ بیٹھنے والے کمرے میں دو مرد اور دو عورتیں موجود تھیں جن سے سینڈو نے مجھے متعارف کرایا۔

ایک تھا غفار سائیں۔ تہمد پوش۔ پنجاب کا ٹھیٹ سائیں۔ گلے میں موٹے موٹے دانوں کی مالا۔ سینڈو نے اس کے بارے میں کہا: "آپ بابو گوپی ناتھ کے لیگل ایڈوائزر ہیں۔ میرا مطلب سمجھ جائیے آپ۔ ہر آدمی جس کی ناک بہتی ہو یا جس کے منہ میں سے لعاب نکلتا ہو، پنجاب میں خدا کو پہنچا ہوا درویش بن جاتا ہے۔ یہ بھی بس پہنچے ہوئے ہیں یا پہنچنے والے ہیں۔ لاہور سے بابو گوپی ناتھ کے ساتھ آئے ہیں، کیونکہ نہیں وہاں کوئی اور بیوقوف ملنے کی امید نہیں تھی۔ یہاں آپ بابو صاحب سے کریون اے کے سگریٹ اور وسکی کے پیگ پی کر دعا کرتے رہتے ہیں کہ انجام نیک ہو ۔ ۔ ۔"

غفار سائیں یہ سن کر مسکراتا رہا۔

دوسرے مرد کا نام غلام علی تھا۔ لمبا تڑنگا جوان۔ کسرتی بدن۔ منہ پر چیچک کے داغ۔ اس کے متعلق سینڈو نے کہا: "یہ میرا شاگرد ہے۔ اپنے استاد کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے۔ لاہور میں ایک نامی طوائف کی کنواری لڑکی اس پر عاشق ہو گئی۔ بڑی بڑی کنٹی نینٹلیاں ملائی گئیں اس کو لپٹانے کے لئے مگر اس نے کہا: 'واہ اور ڈالی۔ میں لنگوٹ کا پکا رہوں گا' ایک تکئے میں بات چیت کرتے ہوئے بابو گوپی ناتھ سے ملاقات ہو گئی۔ بس اس دن سے ان کے ساتھ چپکا ہوا ہے۔ ہر روز کریون اے کا ڈبہ اور کھانا پینا مقرر ہے۔"

یہ سن کر غلام علی بھی مسکراتا رہا۔

گول چہرے والی ایک سرخ و سفید عورت تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ وہی کشمیر کی کبوتری ہے۔ جس کے متعلق سینڈو نے دفتر میں ذکر کیا تھا۔ بہت صاف ستھری عورت تھی۔ بال چھوٹے تھے۔ ایسا لگتا تھا کٹے ہوئے ہیں مگر درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ آنکھیں شفاف اور چمکیلی تھیں۔ چہرے کے خطوط سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ بے حد الھڑ اور ناتجربہ کار ہے۔ سینڈو نے اس سے تعارف کراتے ہوئے کہا: "زینت بیگم۔ بابو صاحب پیار سے زینو کہتے ہیں۔ ایک بڑی خرانٹ نائکہ کشمیر سے یہ سیب توڑ کر لاہور لے آئی۔ بابو گوپی ناتھ کو اپنی سی آئی ڈی سے پتہ چلا اور ایک رات لے اڑے۔ مقدمے بازی ہوئی۔ تقریباً دو مہینے تک پولیس عیش کرتی رہی۔ آخر بابو صاحب نے مقدمہ جیت لیا اور اسے یہاں لے آئے ــــــ دھڑن تختہ!"

اب گہرے سانولے رنگ کی عورت باقی رہ گئی تھی جو خاموش بیٹھی سگریٹ پی رہی تھی۔ آنکھیں سرخ تھیں جن سے کافی بے حیائی مترشح تھی۔ بابو گوپی ناتھ نے اس کی طرف اشارہ کیا اور سینڈو سے کہا: "اس کے متعلق بھی کچھ ہو جائے۔"

سینڈو نے اس عورت کی ران پر ہاتھ مارا اور کہا: "جناب یہ ہے، ٹین پٹوٹی۔ فل فل فوٹی۔ مسز عبدالرحیم سینڈو عرف سردار بیگم ــــــ آپ بھی لاہور کی پیداوار ہیں۔ سن چھتیس میں مجھ سے عشق ہوا۔ دو برسوں ہی میں میرا دھڑن تختہ کر کے رکھ دیا۔ میں لاہور چھوڑ کر بھاگا۔ بابو گوپی ناتھ نے اسے یہاں بلوا لیا ہے تاکہ میرا دل لگا رہے۔ اس کو بھی ایک ڈبہ کریون اے کا راشن میں ملتا ہے۔ ہر روز شام کو ڈھائی روپے کا مورفیا کا انجکشن لیتی ہے۔ رنگ کالا ہے۔ مگر ویسے بڑی ٹٹ فور ٹیٹ قسم کی عورت ہے۔"

سردار نے ایک ادا سے صرف اتنا کہا: "بکواس نہ کر۔" اس ادا میں پیشہ ور عورت کی بناوٹ تھی۔

سب سے متعارف کرانے کے بعد سینڈو نے حسبِ عادت میری تعریفوں کے پل باندھنے شروع کر دیئے۔ میں نے کہا: "چھوڑو یار۔ آؤ کچھ باتیں کریں۔"

[illegible]

بابو گوپی ناتھ نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سو سو کے نوٹوں کا ایک پلندہ نکالا اور ایک نوٹ سینڈو کے حوالے کر دیا۔ سینڈو نے نوٹ لے کر اس کی طرف غور سے دیکھا اور کھڑکھڑا کر کہا: "او گوڈ۔ ـــــ او میرے رب العالمین ـــــ وہ دن کب آئے گا جب میں بھی لب لگا کر یوں نوٹ نکالا کروں گا ـــ جا بھئی غلام علی۔ دو بوتلیں جانی واکر سٹل گوئنگ سٹرانگ کی لے آؤ۔"

بوتلیں آئیں تو سب نے پینا شروع کی۔ یہ شغل دو تین گھنٹے تک جاری رہا۔ اس دوران میں سب سے زیادہ باتیں حسبِ معمول عبدالرحیم نے کیں۔ پہلا گلاس ایک ہی سانس میں ختم کر کے وہ چلایا: "دھڑن تختہ منٹو صاحب وسکی ہو تو ایسی۔ حلق سے اتر کر پیٹ میں انقلاب زندہ باد لکھتی چلی گئی ہے ـــ جیو بابو گوپی ناتھ جیو۔"

بابو گوپی ناتھ بے چارہ خاموش رہا۔ کبھی کبھی البتہ وہ سینڈو کی ہاں میں ہاں ملا دیتا تھا۔ میں نے سوچا اس شخص کی اپنی رائے کوئی نہیں ہے۔ دوسرا جو کچھ کہے مان لیتا ہے۔ ضعیف الاعتقادی کا ثبوت غفار سائیں موجود تھا جسے وہ بقول سینڈو اپنا لیگل ایڈوائزر بنا کر لایا تھا۔ سینڈو کا اس سے دراصل یہ مطلب تھا کہ بابو گوپی ناتھ کو اس سے عقیدت تھی۔ یوں بھی مجھے دوران گفتگو میں معلوم ہوا کہ لاہور میں اس کا اکثر وقت فقیروں اور درویشوں کی صحبت میں کٹتا تھا۔ یہ چیز میں نے خاص طور پر نوٹ کی کہ وہ کھویا کھویا سا تھا۔ جیسے کچھ سوچ رہا ہے۔ میں نے چنانچہ اس سے ایک بار کہا: "بابو گوپی ناتھ کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

وہ چونک پڑا: "جی میں ـــــ میں ـــــ کچھ نہیں۔" یہ کہہ کر وہ مسکرایا اور زینت کی طرف ایک عاشقانہ نگاہ ڈالی۔ "ان حسینوں کے متعلق سوچ رہا ہوں ـــــ اور ہمیں کیا سوچ ہو گی۔"

سینڈو نے کہا: "بڑے خانہ خراب ہیں یہ منٹو صاحب۔ بڑے خانہ خراب ہیں ـــــ لاہور کی کوئی ایسی طوائف نہیں جس کے ساتھ بابو صاحب کی [illegible] نہ رہ چکی ہو۔"

بابو گوپی ناتھ نے یہ سن کر بڑے بھونڈے انکسار کے ساتھ کہا: "اب کمر میں وہ دم نہیں منٹو صاحب۔"

اس کے بعد واہیات گفتگو شروع ہو گئی۔ لاہور کی طوائفوں کے سب گھرانے گنے گئے۔ کون ڈیرہ دار تھی؟ کون نٹنی تھی؟ کون کس کی نوچی تھی؟ نتھ اتارنے کا بابو گوپی ناتھ نے کیا دیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ یہ گفتگو سردار، سینڈو، غفار سائیں اور غلام علی کے درمیان ہوتی رہی۔ ٹھیٹ لاہور کے کوٹھوں کی زبان میں۔ مطلب تو میں سمجھتا رہا۔ مگر بعض اصطلاحیں سمجھ میں نہ آئیں۔

زینت بالکل خاموش بیٹھی رہی۔ کبھی کبھی کسی بات پر مسکرا دیتی۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اسے اس گفتگو سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہلکی وسکی کا ایک گلاس بھی پیا بغیر کسی دلچسپی کے۔ سگرٹ بھی پیتی تھی تو معلوم ہوتا تھا۔ اسے تمباکو اور اس کے دھوئیں سے کوئی رغبت نہیں لیکن لطف یہ ہے کہ سب سے زیادہ سگرٹ اسی نے پئے۔ بابو گوپی ناتھ سے اسے محبت تھی؟ اس کا پتہ مجھے کسی بات سے نہ ملا۔ اتنا البتہ ظاہر تھا کہ بابو گوپی ناتھ کو اس کا کافی خیال تھا کیونکہ زینت کی آسائش کے لئے ہر سامان مہیا تھا۔ لیکن ایک بات مجھے محسوس ہوئی کہ ان دونوں میں کچھ عجیب سا کھنچاؤ تھا۔ میرا مطلب ہے، وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہونے کے بجائے کچھ ہٹے ہوئے سے معلوم ہوتے تھے۔

آٹھ بجے کے قریب سردار، ڈاکٹر مجید کے ہاں چلی گئی کیونکہ اسے مورفیا کا انجکشن لینا تھا۔ غفار سائیں تین پیگ پینے کے بعد اپنی تسبیح اٹھا کر قالین پر سو گیا۔ غلام علی کو ہوٹل سے کھانا لینے کے لئے بھیج دیا گیا۔ سینڈو نے اپنی دلچسپ بکواس جب کچھ عرصے کے لئے بند کی تو بابو گوپی ناتھ نے جو اب نشے میں تھا۔ زینت کی طرف وہی عاشقانہ نگاہ ڈال کر کہا: "منٹو صاحب میری زینت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

میں نے سوچا کیا کہوں۔ زینت کی طرف دیکھا تو وہ جھینپ گئی۔ میں نے ایسے ہی کہہ دیا: "بڑا نیک خیال ہے۔"

جواب کیا دیا معلوم ہے آپ کو؟ ——— کیا کروں گی مکان لے کر۔ میرا کون ہے ——— منٹو صاحب موٹر کتنے میں آ جائے گی؟"

میں نے کہا: "مجھے معلوم نہیں۔"

بابو گوپی ناتھ نے تعجب سے کہا: "یہ بات کرتے ہیں منٹو صاحب ——— آپ کو اور کاروں کی قیمت معلوم نہ ہو۔ کل چلئے میرے ساتھ، زینت کے لئے ایک موٹر لیں گے۔ میں نے اب دیکھا ہے کہ بمبئی میں موٹر ہونی ہی چاہیئے۔"

زینت کا چہرہ ردِ عمل سے خالی رہا۔

بابو گوپی ناتھ کا نشہ تھوڑی دیر کے بعد بہت تیز ہو گیا۔ ہمہ تن جذبات ہو کر اس نے مجھ سے کہا: "منٹو صاحب آپ بڑے لائق آدمی ہیں۔ میں تو بالکل گدھا ہوں ——— لیکن آپ مجھے بتائیے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ کل باتوں باتوں میں سینڈو نے آپ کا ذکر کیا۔ میں نے اسی وقت ٹیکسی منگوائی اور اس سے کہا، مجھے لے چلو منٹو صاحب کے پاس۔ مجھ سے کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو معاف کر دیجئے گا ——— بہت گنہگار آدمی ہوں ——— وسکی منگاؤں آپ کے لئے اور؟"

میں نے کہا: "نہیں نہیں ——— بہت پی چکے ہیں۔"

وہ اور زیادہ جذباتی ہو گیا: "اور پیجئے منٹو صاحب۔" یہ کہہ کر جیب سے سو سو کے نوٹوں کا پلندہ نکالا اور ایک نوٹ جدا کرنے لگا۔ لیکن میں نے سب نوٹ اس کے ہاتھ سے لئے اور واپس اس کی جیب میں ٹھونس دیئے: "سو روپے کا ایک نوٹ آپ نے غلام علی کو دیا تھا، اس کا کیا ہوا؟"

مجھے دراصل کچھ ہمدردی سی ہو گئی تھی بابو گوپی ناتھ سے۔ کتنے آدمی اس غریب کے ساتھ جونک کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔ میرا خیال تھا بابو گوپی ناتھ بالکل گدھا ہے۔ لیکن وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور مسکرا کر کہنے لگا: "منٹو صاحب اس نوٹ میں سے جو کچھ باقی بچا وہ یا تو غلام علی کی جیب سے گر پڑیگا یا ـ

بابو گوپی ناتھ نے پورا جملہ بھی ادا نہیں کیا تھا کہ غلام علی نے کمرے میں داخل ہو کر بڑے دکھ کے ساتھ یہ اطلاع دی کہ ہوٹل میں کسی حرامزادے نے اس کی جیب میں سے سارے روپے نکال لئے۔ بابو گوپی ناتھ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ پھر سو روپے کا ایک نوٹ جیب سے نکالا اور غلام علی کو دے کر کہا: "جلدی کھانا لے آؤ۔"

پانچ چھ ملاقاتوں کے بعد مجھے بابو گوپی ناتھ کی صحیح شخصیت کا علم ہوا۔ پوری طرح تو خیر انسان کسی کو بھی نہیں جان سکتا لیکن مجھے اس کے بہت سے حالات معلوم ہوئے جو بے حد دلچسپ ہیں۔

پہلے تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرا یہ خیال کہ وہ پرلے درجے کا چغد ہے غلط ثابت ہوا۔ اس کو اس امر کا پورا احساس تھا کہ سینڈو، غلام علی اور سردار وغیرہ جو اس کے مصاحب بنے ہوئے ہیں مطلبی انسان ہیں۔ وہ ان سے جھڑکیاں، گالیاں سب سنتا تھا لیکن غصے کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا: "منٹو صاحب میں نے آج تک کسی کا مشورہ رد نہیں کیا۔ جب بھی کوئی مجھے مشورہ دیتا ہے میں کہتا ہوں سبحان اللہ۔ وہ مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں۔ لیکن میں انہیں عقلمند سمجھتا ہوں اس لئے کہ ان میں کم از کم اتنی عقل تو تھی جو مجھ میں ایسی بے وقوفی کو شناخت کر لیا جس سے ان کا الو سیدھا ہو سکتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں شروع سے فقیروں اور کنجروں کی صحبت میں رہا ہوں۔ مجھے ان سے کچھ محبت سی ہو گئی ہے۔ میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے سوچ رکھا ہے جب میری دولت بالکل ختم ہو جائے گی تو کسی تکیے میں جا بیٹھوں گا۔ رنڈی کا کوٹھا اور پیر کا مزار۔ بس یہ دو جگہیں ہیں جہاں میرے دل کو سکون ملتا ہے۔ رنڈی کا کوٹھا تو چھوٹ جائے گا اس لئے کہ جیب خالی ہونے والی ہے۔ لیکن ہندوستان میں ہزاروں پیر ہیں، کسی ایک کے مزار پر چلا جاؤں گا۔"

کچھ دیر سوچ کر اس نے جواب دیا: "اس لئے کہ ان دونوں جگہوں پر فرش سے لے کر چھت تک دھوکا ہی دھوکا ہوتا ہے۔ جو آدمی خود کو دھوکا دینا چاہے اس کے لئے اس سے اچھا مقام اور کیا ہو سکتا ہے۔"

میں نے ایک اور سوال کیا: "آپ کو طوائفوں کا گانا سننے کا شوق ہے کیا آپ موسیقی کی سمجھ رکھتے ہیں؟"

اس نے جواب دیا: "بالکل نہیں اور یہ اچھا ہے کیونکہ میں کن سُری سے کن سُری طوائف کے ہاں جا کر بھی اپنا سر ہلا سکتا ہوں ۔۔۔ منٹو صاحب مجھے گانے سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن جیب میں سے دس یا سو روپے کا نوٹ نکال کر گانے والی کو دکھانے میں بہت مزا آتا ہے۔ نوٹ نکالا اور اس کو دکھایا۔ وہ اسے لینے کے لئے ایک ادا سے اٹھی۔ پاس آئی تو نوٹ جراب میں اڑس لیا۔ اس نے جھک کر اسے باہر نکالا تو ہم خوش ہو گئے۔ ایسی بہت فضول فضول سی باتیں ہیں جو ہم ایسے تماش بینوں کو پسند ہیں ورنہ کون نہیں جانتا کہ رنڈی کے کوٹھے پر ماں باپ اپنی اولاد سے پیشہ کراتے ہیں اور مقبروں اور تکیوں میں انسان اپنے خدا سے۔"

بابو گوپی ناتھ کا شجرۂ نسب تو میں نہیں جانتا۔ لیکن اتنا معلوم ہوا کہ وہ ایک بہت بڑے کنجوس بنئے کا بیٹا ہے۔ باپ کے مرنے پر اسے دس لاکھ روپے کی جائداد ملی جو اس نے اپنی خواہش کے مطابق اڑانا شروع کر دی۔ بمبئے آتے وقت وہ اپنے ساتھ پچاس ہزار روپے لایا تھا۔ اس زمانے میں سب چیزیں سستی تھیں لیکن پھر بھی ہر روز تقریباً سو سوا سو روپے خرچ ہو جاتے تھے۔

زینت کے لئے اس نے فیئٹ موٹر خریدی۔ یاد نہیں رہا۔ لیکن شاید تین ہزار روپے میں آئی تھی۔ ایک ڈرائیور رکھا لیکن وہ بھی لفنگے ٹائپ کا۔ بابو گوپی ناتھ کو کچھ ایسے ہی آدمی پسند تھے۔

ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھ گیا۔ بابو گوپی ناتھ سے مجھے تو صرف دلچسپی تھی۔ لیکن اسے مجھ سے کچھ عقیدت ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دوسروں کی بہ نسبت میرا بہت زیادہ احترام کرتا تھا۔

ایک روز شام کے قریب جب میں فلیٹ پر گیا تو مجھے وہاں شفیق کو دیکھ کر سخت حیرانی ہوئی۔ محمد شفیق طوسی کہوں تو شاید آپ سمجھ لیں کہ میری مراد کس آدمی سے ہے۔ یوں تو شفیق کافی مشہور آدمی ہے۔ کچھ اپنی جدت طراز گائکی کے باعث اور کچھ اپنی بذلہ سنج طبیعت کی بدولت۔ لیکن اس کی زندگی کا حصہ اکثریت سے پوشیدہ ہے۔ بہت کم آدمی جانتے ہیں کہ تین سگی بہنوں کو یکے بعد دیگرے تین تین چار چار سال کے وقفے کے بعد داشتہ بنانے سے پہلے اس کا تعلق ان کی ماں سے بھی تھا۔ یہ بھی بہت کم مشہور ہے کہ اس کو اپنی پہلی بیوی جو تھوڑے ہی عرصے میں مر گئی تھی اس لئے پسند نہیں تھی کہ اس میں طوائفوں کے غمزے اور عشوے نہیں تھے۔ لیکن یہ تو خیر ہر آدمی جو شفیق طوسی سے تھوڑی بہت واقفیت بھی رکھتا ہے جانتا ہے کہ چالیس برس (اس زمانے کی عمر ہے) کی عمر میں سینکڑوں طوائفوں نے اسے رکھا۔ اچھے سے اچھا کپڑا پہنا۔ عمدہ سے عمدہ کھانا کھایا۔ نفیس سے نفیس موٹر رکھی۔ مگر اس نے اپنی گرہ سے کسی طوائف پر ایک دمڑی بھی خرچ نہ کی۔

عورتوں کے لئے۔ خاص طور پر جو کہ پیشہ ور ہوں۔ اس کی بذلہ سنج طبیعت میں جس میں میراثیوں کے مزاح کی جھلک تھی، بہت ہی جاذب نظر تھی۔ وہ کوشش کئے بغیر ان کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔

میں نے جب اسے ہنس ہنس کر زینت سے باتیں کرتے دیکھا تو مجھے اس لئے حیرت نہ ہوئی کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ میں نے صرف یہ سوچا کہ وہ دفعتہً یہاں پہنچا کیسے۔ ایک سینڈو اسے جانتا تھا۔ مگر ان کی بول چال تو ایک عرصے سے بند تھی لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ سینڈو ہی اسے لایا تھا۔ ان دونوں میں صلح صفائی ہو گئی تھی۔

بابو گوپی ناتھ ایک طرف بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ میں نے شاید اس سے پہلے ذکر نہیں کیا۔ وہ سگرٹ بالکل نہیں پیتا تھا۔ محمد شفیق طوسی میراثیوں کے لطیفے سنا رہا تھا۔ جس میں زینت کسی قدر کم اور سردار بہت زیادہ دلچسپی لے رہی تھی۔ شفیق نے مجھے دیکھا اور کہا: "اوہ السلام علیکم۔ بسم اللہ۔ کیا آپ کا گذر بھی اس

وادی میں ہوتا ہے؟"

سینڈو نے کہا: "آشر ابنسطا آپ عزدانیل صاحب یہاں دھڑن تختہ۔"

میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔

تھوڑی دیر گپ بازی ہوتی رہی۔ میں نے نوٹ کیا کہ زینت اور محمد شفیق طوسی کی نگاہیں آپس میں ٹکرا کر کچھ اور بھی کہہ رہی ہیں۔ زینت اس فن میں کوری تھی لیکن شفیق کی [illegible] زینت کی خامیوں کو چھپاتی رہی۔ سردار دونوں کی نگاہ بازی کو کچھ اس انداز سے دیکھ رہی تھی جیسے کھلنڈے اکھاڑے کے باہر بیٹھ پہلوانوں کے داؤ پیچ کو دیکھتے ہیں۔

اس دوران میں بھی زینت سے کافی بے تکلف ہو گیا تھا۔ وہ مجھے بھائی کہتی تھی جس پر مجھے اعتراض نہیں تھا۔ اچھی ملنسار طبیعت کی عورت تھی کم گو۔ سادہ لوح۔ صاف ستھری۔

شفیق سے مجھے اس کی نگاہ بازی پسند نہیں آئی تھی۔ اول تو اس میں بھونڈا پن تھا۔ اس کے علاوہ کچھ یوں کہیئے کہ اس بات کا بھی اس میں دخل تھا کہ وہ مجھے بھائی کہتی تھی۔ شفیق اور سردار اٹھ کر باہر گئے تو میں نے شاید بڑی بے رحمی کے ساتھ اس سے نگاہ بازی کے متعلق استفسار کیا۔ یکا یک اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور روتی روتی وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ بابو گوپی ناتھ جو ایک کونے میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا اٹھ کر تیزی سے اس کے پیچھے چلا گیا۔ سردار نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے کچھ کہا لیکن میں مطلب نہ سمجھا۔ تھوڑی دیر کے بعد بابو گوپی ناتھ کمرے سے باہر نکلا اور "منٹو صاحب ذرا آئیے" کہہ کر مجھے اپنے ساتھ اندر لے گیا۔

زینت پلنگ پر بیٹھی تھی۔ میں اندر داخل ہوا تو وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر لیٹ گئی۔ میں اور بابو گوپی ناتھ دونوں پلنگ کے پاس کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بابو گوپی ناتھ نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہنا شروع کیا: "منٹو صاحب مجھے اس عورت سے بہت محبت ہے۔ دو برس سے یہ میرے پاس ہے۔ میں حضرت غوث اعظم جیلانی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس نے مجھے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اس کی دوسری بہنیں، میرا مطلب ہے اس پیشے کی دوسری عورتیں دونوں ہاتھوں سے مجھے لوٹ کر کھاتی رہیں مگر اس نے کبھی ایک زائد پیسہ مجھ سے نہیں لیا۔ میں اگر کسی دوسری عورت کے ہاں مہینوں پڑا رہا تو اس غریب نے اپنا کوئی زیور گروی رکھ کر گزارہ کیا۔ میں جیسا کہ آپ سے ایک دفعہ کہہ چکا ہوں بہت جلد اس دنیا سے کنارہ کش ہونے والا ہوں۔ میری دولت اب تھوڑے دنوں کی مہمان ہے۔ میں نہیں چاہتا اس کی زندگی خراب ہو۔ میں نے لاہور میں اس کو بہت سمجھایا کہ تم دوسری طوائفوں کی طرف دیکھو جو کچھ وہ کرتی ہیں سیکھو۔ میں آج دولت مند ہوں۔ کل مجھے مفلس ہونا ہے۔ تم لوگوں کی زندگی میں صرف ایک دولت مند کافی نہیں۔ میرے بعد تم کسی اور کو نہیں پھانس سکیں تو کام نہیں چلے گا۔ لیکن منٹو صاحب اس نے میری ایک نہ سنی۔ سارا دن شریف زادیوں کی طرح گھر میں بیٹھی رہتی۔ میں نے غفار سائیں سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا بمبئی لے جاؤ۔ مجھے معلوم تھا کہ اس نے ایسا کیوں کہا۔ بمبئی میں اس کی دو جاننے والی طوائفیں ایکٹرس بنی ہوئی ہیں۔ لیکن میں نے سوچا بمبئی ٹھیک ہے۔ دو مہینے ہو گئے ہیں اسے یہاں لائے ہوئے۔ سردار کو لاہور سے بلایا ہے کہ اس کو سب گر سکھائے۔ غفار سائیں سے بھی یہ بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔ یہاں مجھے کوئی نہیں جانتا۔ اس کو یہ خیال تھا کہ بابو تمہاری بے عزتی ہو گی۔ میں نے کہا تم چھوڑو اس کو۔ بمبئی بہت بڑا شہر ہے۔ لاکھوں رئیس ہیں۔ میں نے تمہیں موٹر لے دی ہے۔ کوئی اچھا آدمی تلاش کر لو ——— منٹو صاحب میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں میری دلی خواہش ہے کہ یہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے۔ اچھی طرح ہوشیار ہو جائے۔ میں اس کے نام آج ہی بینک میں دس ہزار روپیہ جمع کرانے کو تیار ہوں۔ مگر مجھے معلوم ہے دس دن کے اندر اندر یہ باہر بیٹھی ہوئی سردار اس کی ایک ایک پائی اپنی جیب میں ڈال لے گی ——— آپ بھی اسے سمجھائیے کہ چالاک بننے کی کوشش کرے۔ جب سے موٹر خریدی ہے سردار اسے ہر روز شام کو اپولو بندر لے جاتی ہے۔ لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ سینڈو آج بڑی مشکلوں سے محمد شفیق کو یہاں لایا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے اس کے متعلق؟"

میں نے اپنا خیال ظاہر کرنا مناسب نہ سمجھا۔ نہ جانے کیوں بابو گوپی ناتھ نے خود ہی کہا "اچھا لگتا ہے، اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے اور خوبصورت بھی ہے ——— کیوں زینو جانی ——— پسند ہے نہیں؟"

زینو خاموش رہی۔

بابو گوپی ناتھ سے مجھے زینت کو بمبئی لانے کی غرض و غایت معلوم ہوئی تو میرا دماغ چکرا گیا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن بعد میں مشاہدے نے میری حیرت دور کر دی۔ بابو گوپی ناتھ کی یہی آرزو تھی کہ زینت بمبئی میں کسی اچھے مالدار آدمی کی داشتہ بن جائے یا ایسے طریقے سیکھ جائے جس سے وہ مختلف آدمیوں سے روپیہ وصول کرتے رہنے میں کامیاب ہو سکے۔

زینت سے اگر چھٹکارا ہی حاصل کرنا ہوتا تو یہ کوئی اتنی مشکل چیز نہیں تھی۔ بابو گوپی ناتھ ایک ہی دن میں یہ کام کر سکتا تھا۔ چونکہ اس کی نیت نیک تھی اس لئے اُس نے زینت کے مستقبل کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ اُس کو ایکٹرس بنانے کے لئے اُس نے کئی جعلی ڈائرکٹروں کی دعوتیں کیں۔ گھر میں ٹیلیفون لگوا دیا۔ لیکن زینت کسی کروٹ نہ بیٹھا۔

محمد شفیق طوسی تقریباً ڈیڑھ مہینہ آتا رہا۔ کئی راتیں بھی اس نے زینت کے ساتھ بسر کیں لیکن وہ ایسا آدمی نہیں تھا جو کسی عورت کا سہارا بن سکے۔ بابو گوپی ناتھ نے ایک روز افسوس اور رنج کے ساتھ کہا "شفیق صاحب تو خالی خولی جنٹلمین ہی نکلے۔ ٹھسّہ دیکھئے۔ لیکن بے چاری زینت سے چار چادریں، چھ تکیوں کے غلاف اور دو سو روپے نقد ہتھیا کر لے گئے۔ سنا ہے آجکل ایک لڑکی الماس سے عشق لڑا رہے ہیں۔"

یہ درست تھا۔ الماس نذیر جان پٹیالے والی کی سب سے چھوٹی اور آخری لڑکی تھی۔ اس سے پہلے تین بہنیں شفیق کی داشتہ رہ چکی تھیں۔ دو سو روپے جو اس نے زینت سے لئے تھے۔ مجھے معلوم ہے۔ الماس پر خرچ ہوئے تھے۔ بہنوں کے ساتھ لڑ جھگڑ کر الماس نے زہر کھا لیا تھا۔

محمد شفیق طوسی نے جب آنا جانا بند کر دیا تو زینت نے کئی بار مجھے ٹیلیفون کیا اور کہا اُسے ڈھونڈ کر میرے پاس لائیے۔ میں نے اُسے تلاش کیا لیکن کسی کو اس کا پتہ ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ ایک روز اتفاقیہ ریڈیو اسٹیشن پر ملاقات ہوئی۔ سخت پریشانی کے عالم میں تھا۔ جب میں نے اس سے کہا کہ تمہیں زینت بلاتی ہے تو اس نے جواب دیا "مجھے یہ پیغام اور ذریعوں سے بھی مل چکا ہے۔ افسوس ہے آج کل مجھے بالکل فرصت نہیں۔ زینت بہت اچھی عورت ہے لیکن افسوس ہے کہ بے حد شریف ہے ——— ایسی عورتوں سے جو بیویوں جیسی لگیں مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔"

شفیق سے جب مایوسی ہوئی تو زینت نے سردار کے ساتھ پھر اپولو بندر جانا شروع کیا۔ پندرہ دنوں میں بڑی مشکلوں سے کئی گیلن پٹرول پھونکنے کے بعد سردار نے دو آدمی پھانسے۔ ان سے زینت کو چار سو روپے ملے۔ بابو گوپی ناتھ نے سمجھا کہ حالات اُمید افزا ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ایک نے جو ریشمی کپڑوں کی مل کا مالک تھا زینت سے کہا تھا کہ میں تم سے شادی کروں گا۔ ایک مہینہ گزر گیا۔ لیکن یہ آدمی پھر زینت کے پاس نہ آیا۔

ایک روز میں جانے کس کام سے ہارنبی روڈ پر جا رہا تھا کہ مجھے فٹ پاتھ کے پاس زینت کی موٹر کھڑی نظر آئی۔ پچھلی نشست پر محمد یسین بیٹھا تھا۔ نگینہ ہوٹل کا مالک۔ میں نے اس سے پوچھا "یہ موٹر تم نے کہاں سے لی؟"

یسین مسکرایا "تم جانتے ہو موٹر والی کو؟"

میں نے کہا "جانتا ہوں۔"

"تو بس سمجھ لو میرے پاس کیسے آئی ——— اچھی لڑکی ہے یار۔" یسین نے مجھے آنکھ ماری میں مسکرا دیا۔

اس کے چوتھے روز بابو گوپی ناتھ ٹیکسی پر میرے دفتر میں آیا۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ زینت سے یسین کی ملاقات کیسے ہوئی۔ ایک شام اپولو بندر سے ایک آدمی لے کر سردار اور زینت نگینہ ہوٹل گئیں۔ وہ آدمی تو کسی بات پر جھگڑ کر چلا گیا۔ لیکن ہوٹل کے مالک سے زینت کی دوستی ہو گئی۔

بابو گوپی ناتھ مطمئن تھا کیونکہ دس پندرہ روز کی دوستی کے دوران میں یسین نے زینت کو چھ بہت ہی عمدہ اور قیمتی ساڑھیاں لے دی تھیں۔

بابو گوپی ناتھ اب یہ سوچ رہا تھا کچھ دن اور گذر جائیں زینت اور یٰسین کی دوستی اور مضبوط ہو جائے تو لاہور واپس چلا جائے ——— مگرا نہ ہوا۔

نگینہ ہوٹل میں ایک کرسچین عورت نے کمرہ کرائے پر لیا۔ اس کی جوان لڑکی میبل سے یٰسین کی آنکھ لڑ گئی چنانچہ زینت بے چاری ہوٹل میں رہتی اور یٰسین اس کی موٹر میں صبح شام اس لڑکی کو گھماتا رہتا۔ بابو گوپی ناتھ کو اس کا علم ہوا تو اسے بہت دکھ ہوا۔ اس نے مجھ سے کہا: "منٹو صاحب یہ لوگ ہیں بھئی۔ دل اچاٹ ہو گیا ہے تو صاف کہہ دو۔ لیکن زینت بھی عجیب ہے۔ اچھی طرح معلوم ہے کیا ہو رہا ہے مگر منہ سے اتنا بھی نہیں کہتی کہ میاں اگر تمہیں اس کرسٹان چھوکری سے عشق لڑانا ہے تو اپنی موٹر کا بندوبست کرو۔ میری موٹر کیوں استعمال کرتے ہو ——— میں کیا کروں منٹو صاحب بڑی شریف اور نیک بخت عورت ہے ——— کچھ سمجھ میں نہیں آتا ——— تھوڑی سی چالاک تو بننا چاہیے۔"

یٰسین سے تعلق قطع ہونے پر زینت نے کوئی صدمہ محسوس نہ کیا۔

بہت دنوں تک کوئی نئی بات وقوع پذیر نہ ہوئی۔ ایک دن ٹیلی فون کیا تو معلوم ہوا بابو گوپی ناتھ، غلام علی اور غفار سائیں کے ساتھ لاہور چلا گیا ہے روپے کا بندوبست کرنے۔ کیونکہ اس کے پاس ہزار ختم ہو چکے تھے۔ جاتے وقت وہ زینت سے کہہ گیا تھا کہ اسے لاہور میں زیادہ دن لگیں گے کیونکہ اسے چند مکان فروخت کرنے پڑیں گے۔

سردار کو مورفیا کے ٹیکوں کی ضرورت تھی۔ سینڈو کو پرسن کی، چنانچہ دونوں نے متحدہ کوشش کی اور ہر روز دو تین آدمی پھانس کر لے آتے۔ زینت سے کہا گیا کہ بابو گوپی ناتھ واپس نہیں آئے گا اس لیے اسے اپنی فکر کرنی چاہیے سو سوا سو روپے روز کے ہو جاتے جن میں سے آدھے زینت کو ملتے باقی سینڈو اور سردار دبا لیتے۔

میں نے ایک دن زینت سے کہا: "یہ تم کیا کر رہی ہو؟"

اس نے بڑے الھڑپن سے کہا: "مجھے کچھ معلوم نہیں ہے بھائی جان۔ یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں مان لیتی ہوں۔"

جی چاہتا تھا کہ دیر تک پاس بیٹھ کر سمجھاؤں کہ جو کچھ تم کر رہی ہو ٹھیک نہیں۔ سینڈو اور سردار اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے تمہیں بیچ بھی ڈالیں گے مگر میں نے کچھ نہ کہا۔ زینت اکتا دینے والی حد تک بے سمجھ، بے امنگ اور بے جان عورت تھی۔ اس کم بخت کو اپنی زندگی کی کچھ قدر و قیمت ہی معلوم نہیں تھی۔ جسم بیچتی مگر اس میں بیچنے والوں کا کوئی انداز تو ہوتا۔ واللہ مجھے بہت کوفت ہوتی تھی اسے دیکھ کر۔ سگرٹ سے، شراب سے، کھانے سے، گھر سے، ٹیلیفون سے، حتیٰ کہ اس صوفے سے بھی جس پر وہ اکثر لیٹی رہتی تھی اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

بابو گوپی ناتھ پورے ایک مہینے کے بعد لوٹا۔ ماہم گیا تو وہاں فلیٹ میں کوئی اور ہی تھا۔ سینڈو اور سردار کے مشورے سے زینت نے باندرہ میں ایک بنگلے کا بالائی حصہ کرائے پر لے لیا تھا۔ بابو گوپی ناتھ میرے پاس آیا تو میں نے اسے پورا پتہ بتا دیا۔ اس نے مجھ سے زینت کے متعلق پوچھا۔ جو کچھ مجھے معلوم تھا میں نے کہہ دیا لیکن یہ نہ کہا کہ سینڈو اور سردار اس سے پیشہ کرا رہے ہیں۔

بابو گوپی ناتھ اب کی دس ہزار روپیہ اپنے ساتھ لایا تھا جو اس نے بڑی مشکلوں سے حاصل کیا تھا۔ غلام علی اور غفار سائیں کو وہ لاہور ہی چھوڑ آیا تھا۔ ٹیکسی نیچے کھڑی تھی۔ بابو گوپی ناتھ نے اصرار کیا کہ میں ابھی اس کے ساتھ چلوں۔

قریباً ایک گھنٹے میں ہم باندرہ پہنچ گئے۔ پالی ہل پر ٹیکسی چڑھ رہی تھی کہ سامنے تنگ سڑک پر سینڈو دکھائی دیا۔ بابو گوپی ناتھ نے زور سے پکارا: "سینڈو!"

سینڈو نے جب بابو گوپی ناتھ کو دیکھا تو اس کے منہ سے صرف اس قدر نکلا: "دھڑن تختہ!"

بابو گوپی ناتھ نے اس سے کہا: "آؤ ٹیکسی میں بیٹھ جاؤ اور ساتھ چلو" لیکن سینڈو نے کہا: "ٹیکسی ایک طرف کھڑی کیجیے۔ مجھے آپ سے کچھ پرائیویٹ

میں کہنا چاہتا۔"

ٹیکسی ایک طرف کھڑی کی گئی۔ بابو گوپی ناتھ باہر نکلا تو سینڈو اسے کچھ دُور لے گیا۔ دیر تک اُن میں باتیں ہوتی رہیں۔ جب ختم ہوئیں تو بابو گوپی ناتھ اکیلا ٹیکسی کی طرف آیا۔ ڈرائیور سے اس نے کہا: "واپس لے چلو۔"

بابو گوپی ناتھ خوش تھا۔ ہم دلکد کے پاس پہنچے تو اس نے کہا: "منٹو صاحب زینو کی شادی ہونے والی ہے۔"

میں نے حیرت سے پوچھا: "کس سے؟"

بابو گوپی ناتھ نے جواب دیا: "حیدر آباد سندھ کا ایک دولتمند زمیندار ہے۔ خدا کرے وہ خوش رہیں۔ یہ بھی اچھا ہے جو میں عین وقت پر آ پہنچا۔ روپے جو میرے پاس ہیں ان سے زینو کا جہیز بن جائے گا ——— کیوں کیا خیال ہے آپ کا؟"

میرے دماغ میں اس وقت کوئی خیال نہیں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ حیدر آباد سندھ کا دولت مند زمیندار کون ہے۔ سینڈو اور سردار کی جعل سازی تو نہیں۔ لیکن بعد میں اس کی تصدیق ہو گئی کہ وہ حقیقتاً حیدر آباد کا متمول زمیندار ہے جو حیدر آباد سندھ ہی کے ایک میوزک ٹیچر کی معرفت زینت سے متعارف ہوا۔ یہ میوزک ٹیچر زینت کو گانا سکھانے کی بے سود کوشش کیا کرتا تھا۔ ایک روز یہ اپنے مربی غلام حسین (یہ اس حیدر آباد سندھ کے رئیس کا نام تھا) کو ساتھ لے کر آیا۔ زینت نے خوب خاطر مدارات کی۔ غلام حسین کی پُر زور فرمائش پر اس نے غالب کی غزل ———

نکتہ چیں ہے غمِ دل اُس کو سنائے نہ بنے

سنائی۔ غلام حسین سو جان سے اُس پر فریفتہ ہو گیا۔ اُس کا ذکر میوزک ٹیچر نے زینت سے کیا۔ سردار اور سینڈو نے مل کر معاملہ پکا کر دیا اور شادی طے ہو گئی۔

بابو گوپی ناتھ خوش تھا۔ ایک دفعہ سینڈو کے دوست کی حیثیت سے وہ زینت کے ہاں گیا۔ غلام حسین سے اس کی ملاقات ہوئی۔ اس سے مل کر بابو گوپی ناتھ کی خوشی دوگنی ہو گئی۔ مجھ سے اُس نے کہا: "منٹو صاحب خوبصورت، جوان اور بڑا لائق آدمی ہے ——— میں نے یہاں آتے ہوئے داتا گنج بخش کے حضور جا کر دعا مانگی تھی جو قبول ہوئی ——— بھگوان کرے دونوں خوش رہیں۔"

بابو گوپی ناتھ نے بڑے خلوص اور بڑی توجہ سے زینت کی شادی کا انتظام کیا۔ دو ہزار کے زیور اور دو ہزار کے کپڑے بنوا دیئے اور پانچ ہزار نقد دیئے۔

محمد شفیق طوسی، محمد یٰسین پروپرائٹر نگینہ ہوٹل، سینڈو، میوزک ٹیچر، میں اور گوپی ناتھ شادی میں شامل تھے۔ دولہن کی طرف سے سینڈو وکیل تھا۔

ایجاب و قبول ہوا تو سینڈو نے آہستہ سے کہا: "دھڑن تختہ!"

غلام حسین سرج کا نیلا سوٹ پہنے تھا۔ سب نے اس کو مبارکباد دی جو اس نے خندہ پیشانی سے قبول کی۔ کافی وجیہہ آدمی تھا۔ بابو گوپی ناتھ اس کے سامنے مجھے چھوٹی سی بٹیر معلوم ہوتا تھا۔

شادی کی دعوتوں پر خورد و نوش کا جو سامان بھی ہو سکتا ہے بابو گوپی ناتھ نے مہیا کیا تھا۔ دعوت سے جب لوگ فارغ ہوئے تو بابو گوپی ناتھ نے سب کے ہاتھ دھلوائے۔ میں جب ہاتھ دھونے کے لئے آیا تو اس نے مجھ سے بچوں کے سے انداز میں کہا: "منٹو صاحب ذرا اندر جائیے اور دیکھئے زینو دلہن کے لباس میں کیسی لگتی ہے۔"

میں پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوا۔ زینت سرخ زربفت کا شلوار کرتہ پہنے تھی ——— دوپٹہ بھی اسی رنگ کا تھا جس پر گوٹ لگی تھی۔ چہرے پر ہلکا ہلکا میک اپ تھا۔ حالانکہ مجھے ہونٹوں پر سرخی لپ اسٹک کی سرخی بہت بری معلوم ہوتی ہے۔ مگر زینت کے ہونٹ سجے ہوئے تھے۔ اس نے شرما کر مجھے آداب

کیا تو بہت پیاری لگی۔ لیکن جب ہم نے دوسرے کمرے میں ایک مسہری دیکھی جس پر پھول ہی پھول تھے تو مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ میں نے زینت سے کہا: "یہ کیا مسخرہ پن ہے؟"

زینت نے میری طرف بالکل معصوم کبوتری کی طرح دیکھا: "آپ مذاق کرتے ہیں بھائی جان۔" اس نے یہ کہا اور آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا گئے۔ مجھے ابھی غلطی کا احساس بھی نہ ہوا تھا کہ بابو گوپی ناتھ اندر داخل ہوا۔ بڑے پیار کے ساتھ اس نے اپنے رومال کے ساتھ زینت کے آنسو پونچھے اور بڑے دکھ کے ساتھ مجھ سے کہا: "منٹو صاحب میں سمجھا تھا آپ بڑے سمجھدار اور لائق آدمی ہیں ——— زینو کا مذاق اڑانے سے پہلے آپ نے کچھ سوچ لیا ہوتا۔"

بابو گوپی ناتھ کے لہجے میں وہ عقیدت جو اسے مجھ سے تھی زخمی نظر آئی۔ لیکن پیشتر اس کے کہ میں اس سے معافی مانگوں، اس نے زینت کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بڑے خلوص کے ساتھ کہا: "خدا تمہیں خوش رکھے۔"

یہ کہہ کر بابو گوپی ناتھ نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ان میں ملامت تھی ——— بہت ہی دکھ بھری ملامت ——— اور چلا گیا۔

کالی شلوار

(”دھواں“ میں سے)

دہلی آنے سے پہلے وہ انبالہ چھاؤنی میں تھی جہاں کئی گورے اس کے گاہک تھے۔ ان گوروں سے ملنے جلنے کے باعث وہ انگریزی کے دس پندرہ جملے سیکھ گئی تھی، ان کو وہ عام گفتگو میں استعمال نہیں کرتی تھی۔ لیکن جب وہ دہلی میں آئی اور اس کا کاروبار نہ چلا تو ایک دن اس نے اپنی پڑوسن طمنچہ جان سے کہا۔ ”دس لیف ـــــ ویری بیڈ۔“ یعنی یہ زندگی بہت بری ہے۔ جبکہ کھانے ہی کو نہیں ملتا۔

انبالہ چھاؤنی میں اس کا دھندا بہت اچھی طرح چلتا تھا۔ چھاؤنی کے گورے شراب پی کر اس کے پاس آجاتے تھے اور وہ تین چار گھنٹوں ہی میں آٹھ دس گوروں کو نمٹا کر بیس تیس روپے پیدا کر لیا کرتی تھی۔ یہ گورے اس کے ہم وطنوں کے مقابلے میں بہت اچھے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایسی زبان بولتے تھے جس کا مطلب سلطانہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر ان کی زبان سے یہ لاعلمی اس کے حق میں بہت اچھی ثابت ہوتی تھی۔ اگر وہ اس سے کچھ رعایت چاہتے۔ تو وہ سر ہلا کر کہہ دیا کرتی تھی ”صاحب، ہماری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آتا“ اور اگر وہ اس سے ضرورت سے زیادہ چھیڑ چھاڑ کرتے تو وہ ان کو اپنی زبان میں گالیاں دینا شروع کر دیتی تھی۔ وہ حیرت میں اس کے منہ کی طرف دیکھتے تو وہ ان سے کہتی ”صاحب تم ایک دم الو کا پٹھا ہے۔ حرامزادہ۔ سمجھا“ یہ کہتے وقت وہ اپنے لہجے میں سختی پیدا نہ کرتی۔ بلکہ بڑے پیار کے ساتھ ان سے باتیں کرتی ـــــ گورے ہنس دیتے اور ہنستے وقت وہ سلطانہ کو بالکل الو کے پٹھے دکھائی دیتے۔

مگر یہاں دہلی میں وہ جب سے آئی تھی۔ ایک گورا بھی اس کے یہاں نہیں آیا تھا۔ تین مہینے اس کو ہندوستان کے اس شہر میں رہتے ہو گئے تھے۔ جہاں اس نے سنا تھا کہ بڑے لاٹ صاحب رہتے ہیں۔ جو گرمیوں میں شملے جاتے ہیں۔ مگر صرف چھ آدمی اس کے پاس آئے تھے۔ صرف چھ یعنی مہینے میں دو۔ اور ان چھ گاہکوں سے اس نے خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کئے تھے۔ تین روپے سے زیادہ پر کوئی مانتا ہی نہیں تھا۔ سلطانہ نے ان میں سے پانچ آدمیوں کو اپنا ریٹ دس روپے بتایا تھا۔ مگر تعجب کی بات ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے یہی کہا ”بھئی ہم تین روپے سے ایک کوڑی زیادہ نہیں دیں گے۔“ نہ جانے کیا بات تھی کہ ان میں سے ہر ایک نے اسے صرف تین روپے کے قابل سمجھا۔ چنانچہ جب چھٹا آیا تو اس نے خود اس سے کہا ”دیکھو، میں تین روپے ایک ٹیم کے لوں گی۔ اس سے ایک دھیلا تم کم کہو تو نہ ہوگا۔ اب تمہاری مرضی ہو تو رہو ورنہ جاؤ۔“ چھٹے آدمی نے یہ بات سن کر تکرار نہ کی اور اس کے ہاں ٹھہر گیا۔

جب دوسرے کمرے میں دروازے بند کرکے وہ اپنا کوٹ اتارنے لگا تو سلطانہ نے کہا: "لائیے ایک روپیہ دودھ کا۔" اس نے ایک روپیہ تو نہ دیا لیکن نئے بادشاہ کی چمکتی ہوئی اٹھنی جیب میں سے نکال کر اس کو دے دی اور سلطانہ نے بھی چپکے سے لے لی کہ جو آیا ہے غنیمت ہے۔

ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینوں میں ——— بیس روپے ماہوار تو اس کوٹھے کا کرایہ تھا۔ جس کو مالک مکان انگریزی زبان میں فلیٹ کہتا تھا۔ اس فلیٹ میں ایسا پاخانہ تھا جس میں زنجیر کھینچنے سے ساری گندگی پانی کے زور سے ایک دم نیچے نل میں غائب ہو جاتی تھی اور بڑا شور ہوتا تھا۔ شروع شروع میں تو اس شور نے اسے بہت ڈرایا تھا۔ پہلے دن جب وہ رفع حاجت کے لئے اس پاخانے میں گئی تو اس کی کمر میں شدت کا درد ہو رہا تھا۔ فارغ ہو کر جب اٹھنے لگی تو اس نے لٹکی ہوئی زنجیر کا سہارا لے لیا۔ اس زنجیر کو دیکھ کر اس نے خیال کیا چونکہ یہ مکان خاص ہم لوگوں کی رہائش کے لئے تیار کئے گئے ہیں یہ زنجیر اس لئے لگائی گئی ہے کہ اٹھتے وقت تکلیف نہ ہو اور سہارا مل جایا کرے۔ مگر جونہی اس نے زنجیر کو پکڑ کر اٹھنا چاہا۔ اوپر کھٹ کھٹ سی ہوئی اور پھر ایک دم پانی اس زور کے ساتھ باہر نکلا کہ ڈر کے مارے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

خدا بخش دوسرے کمرے میں اپنا فوٹوگرافی کا سامان درست کر رہا تھا اور ایک صاف بوتل میں ہائیڈروکونین ڈال رہا تھا کہ اس نے سلطانہ کی چیخ سنی۔ دوڑ کر وہ باہر نکلا اور سلطانہ سے پوچھا: "کیا ہوا؟ ——— یہ چیخ تمہاری تھی؟"

سلطانہ کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس نے کہا: "یہ موا پاخانہ ہے یا کیا ہے۔ بیچ میں یہ ریل گاڑیوں کی طرح زنجیر کیا لٹکا رکھی ہے۔ میری کمر میں درد تھا۔ میں نے کہا چلو اس کا سہارا لے لوں گی، پر اس موئی زنجیر کو چھیڑنا تھا کہ وہ دھماکا ہوا کہ میں تم سے کیا کہوں۔"

اس پر خدا بخش بہت ہنسا تھا اور اس نے سلطانہ کو اس پاخانے کی بابت سب کچھ بتا دیا تھا کہ یہ نئے فیشن کا ہے جس میں زنجیر ہلانے سے سب گندگی زمین میں دھنس جاتی ہے۔

خدا بخش اور سلطانہ کا آپس میں کیسے سمبندھ ہوا یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ خدا بخش راولپنڈی کا تھا۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد اس نے لاری چلانا سیکھا۔ چنانچہ چار برس تک وہ راولپنڈی اور کشمیر کے درمیان لاری چلانے کا کام کرتا رہا۔ اس کے بعد کشمیر میں اس کی دوستی ایک عورت سے ہو گئی۔ اس کو بھگا کر وہ ساتھ لے آیا۔ لاہور میں چونکہ اس کو کوئی کام نہ ملا۔ اس لئے اس نے عورت کو پیشے بٹھا دیا۔ دو تین برس تک یہ سلسلہ جاری رہا اور وہ عورت کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی۔ خدا بخش کو معلوم ہوا کہ وہ انبالہ میں ہے۔ وہ اس کی تلاش میں آیا۔ جہاں اس کو سلطانہ مل گئی۔ سلطانہ نے اس کو پسند کیا۔ چنانچہ دونوں کا سمبندھ ہو گیا۔

خدا بخش کے آنے سے ایک دم سلطانہ کا کاروبار چمک اٹھا۔ عورت چونکہ ضعیف الاعتقاد تھی۔ اس لئے اس نے سمجھا کہ خدا بخش بڑا بھاگوان ہے جس کے آنے سے اتنی ترقی ہو گئی ہے۔ چنانچہ اس خوش اعتقادی نے خدا بخش کی وقعت اس کی نظروں میں اور بھی بڑھا دی۔

خدا بخش آدمی محنتی تھا۔ سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک فوٹوگرافر سے دوستی پیدا کی جو ریلوے اسٹیشن کے باہر منٹ کیمرے سے فوٹو کھینچا کرتا تھا۔ اس سے اس نے فوٹو کھینچنا سیکھا۔ پھر سلطانہ سے ساٹھ روپے لے کر کیمرہ بھی خرید لیا۔ آہستہ آہستہ ایک پردہ بنوایا، دو کرسیاں خریدیں اور فوٹو دھونے کا سب سامان لے کر اس نے علیحدہ اپنا کام شروع کر دیا۔

کام چل نکلا۔ چنانچہ اس نے تھوڑی ہی دیر کے بعد اپنا اڈا انبالے چھاؤنی میں قائم کر دیا۔ یہاں وہ گوروں کے فوٹو کھینچتا۔ ایک مہینے کے اندر اندر اس کی چھاؤنی کے متعدد گوروں سے واقفیت ہو گئی۔ چنانچہ وہ سلطانہ کو وہیں لے گیا۔ یہاں چھاؤنی میں خدا بخش کے ذریعہ سے کئی گورے سلطانہ کے مستقل گاہک بن گئے۔

سلطانہ نے کانوں کے لئے بندے خریدے۔ ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں بھی بنوائیں۔ دس پندرہ اچھی اچھی ساڑھیاں بھی جمع کر لیں۔ گھر میں فرنیچر وغیرہ بھی آ گیا۔ قصہ مختصر یہ کہ انبالہ چھاؤنی میں وہ بڑی خوش حال تھی مگر ایکا ایکی جانے خدا بخش کے دل میں کیا سمائی کہ اس نے دہلی جانے کی ٹھان لی

انکار کیسے کرتی جبکہ خدا بخش کو اپنے لئے بہت مبارک خیال کرتی تھی۔ اس نے خوشی خوشی دہلی جانا قبول کر لیا۔ بلکہ اس نے یہ بھی سوچا کہ اتنے بڑے شہر میں جہاں لاٹ صاحب رہتے ہیں۔ اس کا دھندا اور بھی اچھا چلے گا۔ اپنی سہیلیوں سے وہ دہلی کی تعریف سن چکی تھی۔ پھر وہاں حضرت نظام الدین اولیا کی خانقاہ تھی۔ جس سے اسے بے حد عقیدت تھی۔ چنانچہ جلدی جلدی گھر کا سارا سامان بیچ باچ کر وہ خدا بخش کے ساتھ دہلی آ گئی۔ یہاں پہنچ کر خدا بخش نے بیس روپے ماہوار پر یہ فلیٹ لیا۔ جس میں دونوں رہنے لگے۔

ایک ہی قسم کے نئے مکانوں کی لمبی سی قطار سڑک کے ساتھ ساتھ چلی گئی ہے۔ میونسپل کمیٹی نے شہر کا یہ حصہ خاص کسبیوں کے لئے مقرر کر دیا تھا تاکہ وہ شہر میں جگہ جگہ اپنے اڈے نہ بنائیں۔ نیچے دوکانیں تھیں اور اوپر دو منزلہ رہائشی فلیٹ۔ چونکہ سب عمارتیں ایک ہی ڈیزائن کی ہیں۔ اس لئے شروع شروع میں سلطانہ کو اپنا فلیٹ تلاش کرنے میں بہت دقت محسوس ہوئی تھی۔ پر جب نیچے لانڈری والے نے اپنا بورڈ گھر کی پیشانی پر لگا دیا تو اس کو ایک پکی نشانی مل گئی "یہاں میلے کپڑوں کی دھلائی کی جاتی ہے" یہ بورڈ پڑھتے ہی وہ اپنا فلیٹ تلاش کر لیا کرتی تھی۔ اسی طرح اس نے اور بہت سی نشانیاں قائم کر لی تھیں مثلاً بڑے بڑے حروف میں جہاں "کوئلوں کی دکان" لکھا تھا۔ وہاں اس کی سہیلی ہیرا بائی رہتی تھی جو کبھی کبھی ریڈیو گھر میں گانے جایا کرتی تھی۔ جہاں "شرفا کے لئے کھانے کا اعلیٰ انتظام ہے" لکھا تھا وہاں اس کی دوسری سہیلی مختار رہتی تھی۔ نواڑ کے کارخانے کے اوپر انوری رہتی تھی جو اسی کارخانے کے سیٹھ کے پاس ملازم تھی۔ چونکہ سیٹھ صاحب کو رات کے وقت اپنے کارخانے کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی اس لئے وہ انوری کے پاس ہی رہتے تھے۔

دکان کھولتے ہی گاہک تھوڑے ہی آتے ہیں۔ چنانچہ جب ایک مہینے تک سلطانہ بیکار رہی تو اس نے یہی سوچ کر اپنے دل کو تسلی دی۔ پر جب دو مہینے گذر گئے اور کوئی آدمی اس کے کوٹھے پر نہ آیا تو اسے بہت تشویش ہوئی۔ اس نے خدا بخش سے کہا "کیا بات ہے خدا بخش۔ پورے دو مہینے ہو گئے ہیں ہمیں یہاں آئے ہوئے، کسی نے ادھر کا رخ بھی نہیں کیا ——— مانتی ہوں آج کل بازار بہت مندا ہے، پر اتنا مندا بھی تو نہیں کہ مہینے بھر میں کوئی شکل دیکھنے ہی میں نہ آئے"۔ خدا بخش کو بھی یہ بات بہت عرصہ سے کھٹک رہی تھی مگر وہ خاموش تھا پر جب سلطانہ نے خود بات چھیڑی تو اس نے کہا "میں کئی دنوں سے اس کی بابت سوچ رہا ہوں۔ ایک بات سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ کہ جنگ کی وجہ سے لوگ باگ دوسرے دھندوں میں پڑ کر ادھر کا رستہ بھول گئے ہیں ——— یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ . . . . . ." وہ اس کے آگے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی۔ خدا بخش اور سلطانہ دونوں اس کی آواز کی طرف متوجہ ہوئے۔ تھوڑی دیر کے بعد دستک ہوئی۔ خدا بخش نے لپک کر دروازہ کھولا۔ ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ یہ پہلا گاہک تھا۔ جس سے تین روپے میں سودا طے ہوا۔ اس کے بعد پانچ اور آئے۔ یعنی تین مہینے میں چھ، جن سے سلطانہ نے صرف ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کئے۔

بیس روپے ماہوار تو فلیٹ کے کرایہ میں چلے جاتے تھے۔ پانی کا ٹیکس اور بجلی کا بل جدا۔ اس کے علاوہ گھر کے دوسرے خرچ۔ کھانا پینا، کپڑے لتے دوا دارو اور آمدن کچھ بھی نہیں تھی۔ ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینے میں آئے تو اسے آمدن تو نہیں کہہ سکتے۔ سلطانہ پریشان ہو گئی۔ ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں جو اس نے انبالے میں بنوائی تھیں۔ آہستہ آہستہ بک گئیں۔ آخری کنگنی کی جب باری آئی تو اس نے خدا بخش سے کہا "تم میری سنو اور چلو واپس انبالے ——— یہاں کیا دھرا ہے ——— بھئی ہو گا، پر ہمیں تو یہ شہر راس نہیں آیا۔ تمہارا کام بھی وہاں خوب چلتا تھا، چلو، وہیں چلتے ہیں۔ جو نقصان ہوا ہے اس کو اپنا سر صدقہ سمجھو۔ اس کنگنی کو بیچ کر آؤ۔ میں اسباب وغیرہ باندھ کر تیار رکھتی ہوں آج رات کی گاڑی سے یہاں سے چل دیں گے"۔

خدا بخش نے کنگنی سلطانہ کے ہاتھ سے لے لی اور کہا "نہیں جان من! انبالے نہیں جائیں گے۔ یہیں دہلی میں رہ کر کمائیں گے۔ یہ تمہاری چوڑیاں سب کی سب یہیں واپس آ جائیں گی۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہ بڑا کارساز ہے۔ یہاں بھی وہ کوئی نہ کوئی اسباب بنا ہی دیگا"۔

سلطانہ چپ ہو رہی۔ چنانچہ آخری کنگنی بھی ہاتھ سے اتر گئی۔ ننگے ہاتھ دیکھ کر اس کو بہت دکھ ہوتا تھا۔ پر کیا کرتی۔ پیٹ بھی تو آخر کسی حیلے سے بھرنا تھا۔

جب پانچ مہینے گزر گئے اور آمدن خرچ کے مقابلے میں چوتھائی سے بھی کچھ کم رہی تو سلطانہ کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی۔ خدا بخش بھی سارا دن گھر سے غائب رہنے لگا تھا۔ سلطانہ کو اس کا بھی دکھ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پڑوس میں اس کی دو تین ملنے والیاں موجود تھیں جن کے ساتھ وہ اپنا وقت کاٹ سکتی تھی۔ پر ہر روز ان کے ہاں جانا اور گھنٹوں بیٹھے رہنا اس کو بہت برا لگتا تھا۔ چنانچہ آہستہ آہستہ اس نے ان سہیلیوں سے ملنا جلنا بالکل ترک کر دیا۔ سارا دن وہ اپنے سنسان مکان میں بیٹھی رہتی۔ کبھی چھالیا کاٹتی رہتی، کبھی اپنے پرانے اور پھٹے ہوئے کپڑوں کو سیتی رہتی اور کبھی باہر بالکنی میں آ کر جنگلے کے ساتھ کھڑی ہو جاتی اور سامنے ریلوے شیڈ میں ساکت اور متحرک انجنوں کی طرف گھنٹوں بے مطلب دیکھتی رہتی۔

سڑک کی دوسری طرف مال گودام تھا جو اس کونے سے اس کونے تک پھیلا ہوا تھا۔ داہنے ہاتھ کو لوہے کی چھت کے نیچے بڑی بڑی گانٹھیں پڑی رہتی تھیں اور ہر قسم کے مال اسباب کے ڈھیر سے لگے رہتے تھے۔ بائیں ہاتھ کو کھلا میدان تھا جس میں بے شمار ریل کی پٹڑیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دھوپ میں لوہے کی یہ پٹڑیاں چمکتیں تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی جن پر نیلی نیلی رگیں بالکل ان پٹڑیوں کی طرح ابھری رہتی تھیں۔ اس لمبے اور کھلے میدان میں ہر وقت انجن اور گاڑیاں چلتی رہتی تھیں۔ کبھی ادھر، کبھی ادھر۔ ان انجنوں اور گاڑیوں کی چھک چھک پھک پھک سدا گونجتی رہتی تھی۔ صبح سویرے جب وہ اٹھ کر بالکنی میں آتی تو ایک عجیب سماں نظر آتا۔ دھندلکے میں انجنوں کے منہ سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکلتا اور گدلے آسمان کی جانب موٹے اور بھاری آدمیوں کی طرح اٹھتا دکھائی دیتا تھا۔ بھاپ کے بڑے بڑے بادل بھی ایک شور کے ساتھ پٹڑیوں سے اٹھتے اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں ہوا کے اندر گھل مل جاتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انجن نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہو، اکیلے پٹڑیوں پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے زندگی کی پٹڑی پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود جا رہی ہے۔ دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جا رہی ہے —— نہ جانے کہاں۔ پھر ایک روز ایسا آئے گا جب اس دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہو گا اور وہ کہیں رک جائے گی۔ کسی ایسے مقام پر جو اس کا دیکھا بھالا نہ ہوگا

یوں تو وہ بے مطلب گھنٹوں ریل کی ان ٹیڑھی بانکی پٹڑیوں اور ٹھہرے اور چلتے ہوئے انجنوں کی طرف دیکھتی رہتی۔ پر طرح طرح کے خیال اس کے دماغ میں آتے رہتے تھے۔ انبالہ چھاؤنی میں جب وہ رہتی تھی تو اسٹیشن کے پاس ہی اس کا مکان تھا۔ مگر وہاں اس نے کبھی ان چیزوں کو ایسی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ اب تو کبھی کبھی اس کے دماغ میں یہ بھی خیال آتا کہ یہ جو سامنے ریل کی پٹڑیوں کا جال سا بچھا ہے اور جگہ جگہ سے بھاپ اور دھواں اٹھ رہا ہے ایک بہت بڑا چکلہ ہے۔ بہت سی گاڑیاں ہیں جن کو چند موٹے موٹے انجن ادھر ادھر دھکیلتے رہتے ہیں۔ سلطانہ کو تو بعض اوقات یہ انجن سیٹھ معلوم ہوتے جو کبھی کبھی انبالہ میں اس کے ہاں آیا کرتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ کسی انجن کو آہستہ آہستہ گاڑیوں کی قطار کے پاس سے گزرتا دیکھتی تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی آدمی چکلے کے کسی بازار میں سے اوپر کوٹھوں کی طرف دیکھتا جا رہا ہے۔

سلطانہ سمجھتی تھی کہ ایسی باتیں سوچنا دماغ کی خرابی کا باعث ہے۔ چنانچہ جب اس قسم کے خیال اس کو آنے لگے تو اس نے بالکنی میں جانا چھوڑ دیا۔ خدا بخش سے اس نے بارہا کہا "دیکھو میرے حال پر رحم کرو۔ یہاں گھر میں رہا کرو۔ میں سارا دن یہاں بیماروں کی طرح پڑی رہتی ہوں۔" مگر اس نے ہر بار سلطانہ سے یہ کہہ کر اس کی تشفی کر دی۔ "جان من! میں باہر کچھ کمانے کی فکر کر رہا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو چند دنوں میں ہی بیڑا پار ہو جائے گا"

پورے پانچ مہینے ہو گئے تھے مگر ابھی تک نہ سلطانہ کا بیڑا پار ہوا تھا نہ خدا بخش کا۔

محرم کا مہینہ سر پر آ رہا تھا مگر سلطانہ کے پاس کالے کپڑے بنوانے کے لئے کچھ بھی نہ تھا۔ مختار نے لیڈی ہیملٹن کی ایک نئی وضع کی قمیص بنوائی تھی جس کی آستینیں کالی جارجٹ کی تھیں۔ اس کے ساتھ میچ کرنے کے لئے اس کے پاس کالی ساٹن کی شلوار تھی جو کاجل کی طرح چمکتی تھی۔ انوری نے ریشمی جارجٹ کی ایک بڑی نفیس ساڑھی خریدی تھی۔ اس نے سلطانہ سے کہا تھا کہ وہ اس ساڑھی کے نیچے سفید بوسکی کا پیٹی کوٹ پہنے گی۔ کیونکہ یہ نیا فیشن ہے۔ اس ساڑھی کے

ساتھ پہننے کو اُودی کالی ململ کا ایک دوپٹہ تھا جو بڑا نازک تھا۔ سلطانہ نے جب یہ تمام چیزیں دیکھیں تو اس کو اس احساس نے بہت دُکھ دیا کہ وہ محرم منانے کے لئے ایسا لباس خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتی۔

انوری اور مختار کے پاس یہ لباس دیکھ کر جب وہ گھر آئی تو اس کا دل بہت اُداس تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک پھوڑا سا اس کے اندر پیدا ہو گیا ہے۔ گھر بالکل خالی تھا۔ خدابخش حسب معمول باہر تھا۔ دیر تک وہ دری پر گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹی رہی۔ پر جب اس کی گردن اونچائی کے باعث اکڑ سی گئی تو باہر بالکنی میں چلی گئی تاکہ غم افزا خیالات کو اپنے دماغ میں سے نکال دے۔

سامنے پٹڑیوں پر گاڑیوں کے ڈبے کھڑے تھے پر انجن کوئی بھی نہ تھا۔ شام کا وقت تھا ــــ چھڑکاؤ ہو چکا تھا۔ اس لئے گرد و غبار دب گیا تھا۔ بازار میں ایسے آدمی چلنے شروع ہو گئے تھے جو تاک جھانک کرنے کے بعد چپ چاپ گھروں کا رُخ کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک آدمی نے گردن اونچی کر کے سلطانہ کی طرف دیکھا۔ سلطانہ مسکرا دی اور اس کو بھول گئی۔ کیونکہ اب سامنے پٹڑیوں پر ایک انجن نمودار ہو گیا تھا۔ سلطانہ نے غور سے اس کی طرف دیکھنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ یہ خیال اس کے دماغ میں آیا کہ انجن نے بھی کالا لباس پہن رکھا ہے۔ یہ عجیب و غریب خیال دماغ میں سے نکالنے کی خاطر جب اس نے سڑک کی جانب دیکھا تو اسے وہی آدمی بیل گاڑی کے پاس کھڑا نظر آیا جس نے اس کی طرف للچائی نظروں سے دیکھا تھا۔ سلطانہ نے ہاتھ سے اسے اشارہ کیا۔ اس آدمی نے اِدھر اُدھر دیکھ کر ایک لطیف اشارے سے پوچھا۔ کدھر سے آؤں۔ سلطانہ نے اسے راستہ بتا دیا۔ وہ آدمی تھوڑی دیر کھڑا رہا۔ مگر پھر بڑی پھرتی سے اوپر چلا آیا۔

سلطانہ نے اسے دری پر بٹھایا۔ جب وہ بیٹھ گیا تو اس نے سلسلۂ گفتگو شروع کرنے کے لئے کہا۔ "آپ اوپر آتے ڈر کیوں رہے تھے۔" وہ آدمی یہ سن کر مسکرایا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا ــــ ڈرنے کی بات ہی کیا تھی؟" اس پر سلطانہ نے کہا۔ "یہ میں نے اس لئے کہا کہ آپ دیر تک وہیں کھڑے رہے اور پھر کچھ سوچ کر ادھر آئے۔" وہ یہ سن کر پھر مسکرایا۔ "تمہیں غلط فہمی ہوئی۔ میں تمہارے اوپر والے فلیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہاں کوئی عورت کھڑی ایک مرد کو ٹھینگا دکھا رہی تھی۔ مجھے یہ منظر پسند آیا۔ پھر بالکنی میں سبز بلب روشن ہوا تو میں کچھ دیر کے لئے ٹھہر گیا۔ سبز روشنی مجھے پسند ہے۔ آنکھوں کو بہت اچھی لگتی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سلطانہ نے پوچھا۔ "آپ جا رہے ہیں؟" اس آدمی نے جواب دیا۔ "نہیں میں تمہارے اس مکان کو دیکھنا چاہتا ہوں ــــ چلو مجھے تمام کمرے دکھاؤ۔"

سلطانہ نے اس کو تینوں کمرے ایک ایک کرکے دکھا دیئے۔ اس آدمی نے بالکل خاموشی سے ان کمروں کا معائنہ کیا۔ جب وہ دونوں پھر اسی کمرے میں آ گئے جہاں پہلے بیٹھے تھے تو اس آدمی نے کہا۔ "میرا نام شنکر ہے۔"

سلطانہ نے پہلی بار غور سے شنکر کی طرف دیکھا۔ وہ متوسط قد کا معمولی شکل و صورت کا آدمی تھا مگر اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر صاف اور شفاف تھیں۔ کبھی کبھی ان میں ایک عجیب قسم کی چمک پیدا ہوتی تھی۔ گٹھیلا اور کسرتی بدن تھا۔ کنپٹیوں پر اس کے بال سفید ہو رہے تھے۔ خاکستری رنگ کی گرم پتلون پہنے تھا۔ سفید قمیص تھی جس کا کالر گردن پر سے اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔

شنکر کچھ اس طرح دری پر بیٹھا تھا کہ معلوم ہوتا تھا شنکر کے بجائے سلطانہ گاہک ہے۔ اس احساس نے سلطانہ کو قدرے پریشان کر دیا۔ چنانچہ اس نے شنکر سے کہا۔ "فرمایئے....."

شنکر بیٹھا تھا یہ سن کر لیٹ گیا۔ "میں کیا فرماؤں، کچھ تم ہی فرماؤ۔ بلایا تمہیں نے ہے مجھے۔" جب سلطانہ کچھ نہ بولی تو وہ اٹھ بیٹھا۔ "میں سمجھا، لو اب مجھ سے سنو، جو کچھ تم نے سمجھا، غلط ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کچھ دے کر جاتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی طرح میری بھی فیس ہے۔ مجھے جب بلایا جائے تو فیس دینی پڑتی ہے۔"

سلطانہ یہ سن کر چکرا گئی مگر اس کے باوجود اسے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ "آپ کام کیا کرتے ہیں؟"

شنکر نے جواب دیا: "یہی جو تم لوگ کرتے ہو۔"

"کیا؟"

"تم کیا کرتی ہو؟"

"میں... میں... میں کچھ بھی نہیں کرتی۔"

"میں بھی کچھ نہیں کرتا۔"

سلطانہ نے بھنا کر کہا: "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی ـــــ آپ کچھ نہ کچھ تو ضرور کرتے ہوں گے۔"

شنکر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا: "تم بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرتی ہو گی۔"

"جھک مارتی ہوں۔"

"میں بھی جھک مارتا ہوں۔"

"تو آؤ دونوں جھک ماریں۔"

"حاضر ہوں مگر جھک مارنے کے دام میں کبھی نہیں دیا کرتا۔"

"ہوش کی دوا کرو ـــــ یہ لنگر خانہ نہیں۔"

"اور میں بھی والنٹیر نہیں۔"

سلطانہ یہاں رک گئی۔ اس نے پوچھا: "یہ والنٹیر کون ہوتے ہیں؟"

شنکر نے جواب دیا: "اُلو کے پٹھے۔"

"میں اُلو کی پٹھی نہیں۔"

"مگر وہ آدمی خدا بخش جو تمہارے ساتھ رہتا ہے ضرور اُلو کا پٹھا ہے۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ وہ کئی دنوں سے ایک ایسے خدا رسیدہ فقیر کے پاس اپنی قسمت کھلوانے کی خاطر جا رہا ہے جس کی اپنی قسمت زنگ لگے تالے کی طرح بند ہے۔" یہ کہہ کر شنکر ہنسا۔

اس پر سلطانہ نے کہا: "تم ہندو ہو۔ اسی لئے ہمارے ان بزرگوں کا مذاق اُڑاتے ہو۔"

شنکر مسکرایا: "ایسی جگہوں پر ہندو مسلم سوال پیدا نہیں ہوا کرتے۔ بڑے بڑے پنڈت اور مولوی بھی یہاں آئیں تو شریف آدمی بن جائیں۔"

"جانے کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہو ـــــ بولو رہو گے؟"

"اسی شرط پر جو پہلے بتا چکا ہوں۔"

سلطانہ اُٹھ کھڑی ہوئی: "تو جاؤ رستہ پکڑو۔"

شنکر آرام سے اُٹھا۔ پتلون کی جیبوں میں اپنے دونوں ہاتھ ٹھونستے اور جاتے ہوئے کہا: "میں کبھی کبھی اس بازار سے گذرا کرتا ہوں۔ جب بھی تمہیں میری ضرورت ہو بلا لینا ـــــ بہت کام کا آدمی ہوں۔"

شنکر چلا گیا اور سلطانہ کالے لباس کو بھول کر دیر تک اس کے متعلق سوچتی رہی۔ اس آدمی کی باتوں نے اس کے دکھ کو بہت ہلکا کر دیا تھا۔ اگر وہ ... میں آیا ہوتا جہاں کہ وہ خوشحال تھی تو اس نے کسی اور ہی رنگ میں اس آدمی کو دیکھا ہوتا اور بہت ممکن ہے کہ اسے دھکے دے کر باہر نکال دیا ہوتا۔ مگر یہاں

چونکہ وہ بہت اُداس رہتی تھی اس لئے شنکر کی باتیں اسے پسند آئیں۔

شام کو جب خدا بخش آیا تو سلطانہ نے اس سے پوچھا: ”تم آج سارا دن کدھر غائب رہے ہو؟“

خدا بخش تھکن سے چور چور ہو رہا تھا۔ کہنے لگا: ”پرانے قلعہ کے پاس سے آ رہا ہوں۔ وہاں ایک بزرگ کچھ دنوں سے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ انہی کے پاس ہر روز جاتا ہوں کہ ہمارے دن پھر جائیں——“

”کچھ انہوں نے تم سے کہا؟“

”نہیں، ابھی وہ مہربان نہیں ہوئے —— پر سلطانہ، میں جو ان کی خدمت کر رہا ہوں۔ وہ اکارت کبھی نہیں جائے گی۔ اللہ کا فضل شاملِ حال رہا تو ضرور وارے نیارے ہو جائیں گے۔“

سلطانہ کے دماغ میں محرم منانے کا خیال سمایا ہوا تھا۔ خدا بخش سے رونی آواز میں کہنے لگی: ”سارا سارا دن باہر غائب رہتے ہو —— میں یہاں پنجرے میں قید رہتی ہوں۔ کہیں جا سکتی ہوں نہ آ سکتی ہوں۔ محرم سر پر آ گیا ہے، کچھ تم نے اس کی بھی فکر کی کہ مجھے کالے کپڑے چاہئیں۔ گھر میں پھوٹی کوڑی تک نہیں۔ کنگنیاں تھیں سو وہ ایک ایک کر کے بک گئیں۔ اب تم ہی بتاؤ کیا ہوگا؟ یوں فقیروں کے پیچھے کب تک مارے مارے پھرا کرو گے۔ مجھے تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہاں دلی میں خدا نے بھی ہم سے منہ موڑ لیا ہے۔ میری سنو تو اپنا کام شروع کر دو۔ کچھ تو سہارا ہو ہی جائے گا۔“

خدا بخش دری پر لیٹ گیا اور کہنے لگا: ”پر یہ کام شروع کرنے کے لئے بھی تو تھوڑا بہت سرمایہ چاہیئے —— خدا کے لئے اب ایسی دکھ بھری باتیں نہ کرو۔ مجھ سے اب برداشت نہیں ہو سکتیں۔ میں نے سچ مچ انبالہ چھوڑنے میں سخت غلطی کی۔ پر جو کرتا ہے۔ اللہ ہی کرتا ہے اور ہماری بہتری ہی کے لئے کرتا ہے۔ کیا پتہ ہے کچھ دیر اور تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد ہم ......“

سلطانہ نے بات کاٹ کر کہا: ”تم خدا کے لئے کچھ کرو۔ چوری کرو یا ڈاکہ ڈالو پر مجھے ایک شلوار کا کپڑا ضرور لا دو۔ میرے پاس سفید بوسکی کی قمیص پڑی ہے۔ اس کو میں رنگوا لوں گی۔ سفید نینون کا ایک نیا دوپٹہ بھی میرے پاس موجود ہے۔ وہی جو تم نے مجھے دیوالی پر لا کر دیا تھا۔ یہ بھی قمیص کے ساتھ ہی رنگوا لیا جائے گا۔ ایک صرف شلوار کی کسر ہے۔ سو وہ تم کسی نہ کسی طرح پیدا کر دو ...... دیکھو تمہیں میری جان کی قسم کسی نہ کسی طرح ضرور لا دو —— میری بھتی کھاؤ اگر نہ لاؤ۔“

خدا بخش اٹھ بیٹھا: ”اب تم خواہ مخواہ زور دیئے چلی جا رہی ہو —— میں کہاں سے لاؤں گا —— افیم کھانے کے لئے تو میرے پاس ایک پیسہ نہیں۔“

”کچھ بھی کرو مگر مجھے ساڑھے چار گز کالی ساٹن لا دو۔“

”دعا کرو کہ آج رات ہی اللہ دو تین آدمی بھیج دے!“

”لیکن تم کچھ نہیں کرو گے ...... تم اگر چاہو تو ضرور اتنے پیسے پیدا کر سکتے ہو۔ جنگ سے پہلے یہ ساٹن بارہ چودہ آنے گز مل جاتی تھی۔ اب سوا روپے گز کے حساب سے ملتی ہے۔ ساڑھے چار گزوں پر کتنے روپے خرچ ہو جائیں گے؟“

”اب تم کہتی ہو تو میں کوئی حیلہ کروں گا۔“ یہ کہہ کر خدا بخش اٹھا: ”لو اب ان باتوں کو بھول جاؤ۔ میں ہوٹل سے کھانا لے آؤں۔“

ہوٹل سے کھانا آیا۔ دونوں نے مل کر زہر مار کیا اور سو گئے۔ صبح ہوئی۔ خدا بخش پرانے قلعے والے فقیر کے پاس چلا گیا اور سلطانہ اکیلی رہ گئی۔ کچھ دیر لیٹی رہی۔ کچھ دیر سوئی رہی۔ اِدھر اُدھر کمروں میں ٹہلتی رہی۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اس نے اپنا سفید نینون کا دوپٹہ اور سفید بوسکی کی قمیص نکالی اور نیچے لانڈری والے کو رنگنے کے لئے دے آئی۔ کپڑے دھونے کے علاوہ وہاں رنگنے کا کام بھی ہوتا تھا۔ یہ کام کرنے کے بعد اس نے واپس آ کر فلموں کی کتابیں پڑھیں۔ جن میں اس کے دیکھے ہوئے فلموں کی کہانی اور گیت چھپے ہوئے تھے۔ یہ کتابیں پڑھتے پڑھتے وہ سو گئی۔ جب اٹھی تو چار بج چکے تھے۔ کیونکہ دھوپ آنگن میں سے موری کے پاس پہنچ چکی تھی۔ نہا دھو کر فارغ ہوئی تو گرم چادر اوڑھ کر بالکنی میں آ کھڑی ہوئی۔ قریباً ایک گھنٹہ سلطانہ بالکنی میں کھڑی رہی۔ اب شام

ہوگئی تھی۔ بتیاں روشن ہو رہی تھیں۔ نیچے سڑک پر رونق کے آثار نظر آنے لگے۔ سردی میں تھوڑی سی شدت ہو گئی ——— مگر سلطانہ کو یہ تاکنا معلوم نہ ہوئی۔ وہ سڑک پر آتے جاتے تانگوں اور موٹروں کی طرف ایک عرصے سے دیکھ رہی تھی۔ دفعتاً اسے شنکر نظر آیا۔ مکان کے نیچے پہنچ کر اس نے گردن اونچی کی اور سلطانہ کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ سلطانہ نے غیر ارادی طور پر ہاتھ کا اشارہ کیا اور اسے اوپر بلا لیا۔

جب شنکر اوپر آ گیا تو سلطانہ بہت پریشان ہوئی کہ اس سے کیا کہے۔ دراصل اس نے ایسے ہی بلا سوچے سمجھے اسے اشارہ کر دیا تھا۔ شنکر بے حد مطمئن تھا جیسے اس کا اپنا گھر ہے۔ چنانچہ بڑی بے تکلفی سے پہلے روز کی طرح وہ گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ جب سلطانہ نے دیر تک اس سے کوئی بات نہ کی تو اس نے کہا: "تم مجھے سو دفعہ بلا سکتی ہو اور سو دفعہ کہہ سکتی ہو کہ چلے جاؤ ——— میں ایسی باتوں پر کبھی ناراض نہیں ہوا کرتا۔"

سلطانہ شش و پنج میں گرفتار ہو گئی۔ کہنے لگی: "نہیں بیٹھو، تمہیں جانے کو کون کہتا ہے۔"

شنکر اس پر مسکرا دیا: "تو میری شرطیں تمہیں منظور ہیں۔"

"کیسی شرطیں؟" سلطانہ نے ہنس کر کہا۔ "کیا نکاح کر رہے ہو مجھ سے؟"

"نکاح اور شادی کیسی! ——— نہ تم عمر بھر کسی سے نکاح کرو گی نہ میں۔ یہ رسمیں ہم لوگوں کیلئے نہیں ——— چھوڑو ان فضولیات کو۔ کوئی کام کی بات کرو۔"

"بولو کیا بات کروں؟"

"تم عورت ہو ——— کوئی ایسی بات شروع کرو جس سے دو گھڑی دل بہل جائے۔ اس دنیا میں صرف دکانداری ہی دکانداری نہیں، کچھ اور بھی ہے۔"

سلطانہ ذہنی طور پر اب شنکر کو قبول کر چکی تھی۔ کہنے لگی: "صاف صاف کہو، تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔"

"جو دوسرے چاہتے ہیں۔" شنکر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تم میں اور دوسروں میں پھر فرق ہی کیا رہا۔"

"تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔ ان میں اور مجھ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایسی بہت سی باتیں ہوتی ہیں جو پوچھنا نہیں چاہئیں خود سمجھنا چاہئیں۔"

سلطانہ نے تھوڑی دیر تک شنکر کی اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ پھر کہا: "میں سمجھ گئی۔"

"تو کہو، کیا ارادہ ہے۔"

"تم جیتے، میں ہاری۔ پر میں کہتی ہوں، آج تک کسی نے ایسی بات قبول نہ کی ہو گی۔"

"تم غلط کہتی ہو ——— اسی محلے میں تمہیں ایسی سادہ لوح عورتیں بھی مل جائیں گی جو کبھی یقین نہیں کریں گی کہ عورت ایسی ذلت قبول کر سکتی ہے جو تم بغیر کسی احساس کے قبول کرتی رہی ہو۔ لیکن ان کے نہ یقین کرنے کے باوجود تم ہزاروں کی تعداد میں موجود ہو ——— تمہارا نام سلطانہ ہے نا؟"

"سلطانہ ہی ہے۔"

شنکر اٹھ کھڑا ہوا اور ہنسنے لگا: "میرا نام شنکر ہے ——— یہ نام بھی عجب اوٹ پٹانگ ہوتے ہیں۔ چلو آؤ اندر چلیں۔"

شنکر اور سلطانہ دری والے کمرے میں واپس آئے تو دونوں ہنس رہے تھے۔ نہ جانے کس بات پر۔ جب شنکر جانے لگا تو سلطانہ نے کہا: "شنکر میری بات مانو گے؟"

شنکر نے جواباً کہا: "پہلے بات بتاؤ۔"

سلطانہ کچھ جھینپ سی گئی: "تم کہو گے کہ میں دام وصول کرنا چاہتی ہوں مگر ..."

"کہو کہو ——— رک کیوں گئی ہو۔"

سلطانہ نے جرأت سے کام لے کر کہا: "بات یہ ہے کہ محرم آ رہا ہے اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں کالی شلوار بنوا سکوں ——— یہاں کے سارے

تم دیکھتی ہو یہ جو قمیص اور دوپٹہ میرے پاس موجود تھا جو میں نے آج رنگنے کے لیے دے دیا ہے۔"

شنکر نے یہ سن کر کہا: "تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں کچھ روپے دے دوں جو تم یہ کالی شلوار بنوا سکو۔"

سلطانہ نے فوراً ہی کہا: "نہیں میرا مطلب یہ ہے کہ اگر ہو سکے تو تم مجھے ایک کالی شلوار لا دو۔"

شنکر مسکرایا: "میری جیب میں تو اتفاق ہی سے کبھی کچھ ہوتا ہے۔ بہرحال میں کوشش کروں گا۔ محرم کی پہلی تاریخ کو تمہیں یہ شلوار مل جائے گی۔ لے بس اب خوش ہو گئیں۔" سلطانہ کے بندوں کی طرف دیکھ کر پھر اس نے پوچھا: "کیا یہ بندے تم مجھے دے سکتی ہو؟"

سلطانہ نے ہنس کر کہا: "تم انہیں کیا کرو گے۔ چاندی کے معمولی بندے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ پانچ روپے کے ہوں گے۔"

اس پر شنکر نے کہا: "میں نے تم سے بندے مانگے ہیں۔ ان کی قیمت نہیں پوچھی۔ بولو دیتی ہو؟"

"لے لو!" یہ کہہ کر سلطانہ نے بندے اتار کر شنکر کو دے دیئے۔ اس کے بعد اسے افسوس ہوا مگر شنکر جا چکا تھا۔

سلطانہ کو قطعاً یقین نہیں تھا کہ شنکر اپنا وعدہ پورا کرے گا مگر آٹھ روز کے بعد محرم کی پہلی تاریخ کو صبح نو بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ سلطانہ نے دروازہ کھولا تو شنکر کھڑا تھا۔ اخبار میں لپٹی ہوئی چیز اس نے سلطانہ کو دی اور کہا: "ساٹن کی کالی شلوار ہے —— دیکھ لینا شاید لمبی ہو —— اب میں چلتا ہوں۔"

شنکر شلوار دے کر چلا گیا اور کوئی بات اس نے سلطانہ سے نہ کی۔ اس کی پتلون میں شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی سو کر اٹھا ہے اور سیدھا ادھر ہی چلا آیا ہے۔"

سلطانہ نے کاغذ کھولا۔ ساٹن کی کالی شلوار تھی۔ ایسی ہی جیسی کہ وہ مختار کے پاس دیکھ کر آئی تھی۔ سلطانہ بہت خوش ہوئی۔ بندوں اور اس سودے کا جو افسوس اسے ہوا تھا۔ اس شلوار نے اور شنکر کی وعدہ ایفائی نے دور کر دیا۔

دوپہر کو وہ نیچے لانڈری والے سے اپنی رنگی ہوئی قمیص اور دوپٹہ لے آئی۔ تینوں کالے کپڑے جب اس نے پہن لئے تو دروازے پر دستک ہوئی۔ سلطانہ نے دروازہ کھولا تو مختار اندر داخل ہوئی۔ اس نے سلطانہ کے تینوں کپڑوں کی طرف دیکھا اور کہا: "قمیص اور دوپٹہ تو رنگا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ پر یہ شلوار نئی ہے —— کب بنوائی؟"

سلطانہ نے جواب دیا: "آج ہی درزی لایا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں مختار کے کانوں پر پڑیں: "یہ بندے تم نے کہاں سے لئے؟"

مختار نے جواب دیا: "آج ہی منگوائے ہیں۔"

اس کے بعد دونوں کو تھوڑی دیر خاموش رہنا پڑا۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ

("پھندنے" میں سے)

بٹوارے کے دو تین سال بعد پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کو خیال آیا کہ اخلاقی قیدیوں کی طرح پاگلوں کا تبادلہ بھی ہونا چاہیئے یعنی جو مسلمان پاگل، ہندوستان کے پاگل خانوں میں ہیں انہیں پاکستان پہنچا دیا جائے اور جو ہندو اور سکھ پاکستان کے پاگل خانوں میں ہیں انہیں ہندوستان کے حوالے کر دیا جائے۔

معلوم نہیں یہ بات معقول تھی یا غیر معقول، بہر حال دانشمندوں کے فیصلے کے مطابق ادھر ادھر اونچی سطح کی کانفرنسیں ہوئیں اور بالآخر ایک دن پاگلوں کے تبادلے کے لئے مقرر ہو گیا۔ اچھی طرح چھان بین کی گئی۔ وہ مسلمان پاگل جن کے لواحقین ہندوستان ہی میں تھے۔ وہیں رہنے دیئے گئے تھے۔ جو باقی تھے ان کو سرحد پر روانہ کر دیا گیا۔ یہاں پاکستان میں چونکہ قریب قریب تمام ہندو سکھ جا چکے تھے۔ اس لئے کسی کو رکھنے رکھانے کا سوال ہی نہ پیدا ہوا۔ جتنے ہندو سکھ پاگل تھے سب کے سب پولیس کی حفاظت میں سرحد پر پہنچا دیئے گئے۔

اُدھر کا معلوم نہیں۔ لیکن اِدھر لاہور کے پاگل خانے میں جب اس تبادلے کی خبر پہنچی تو بڑی دلچسپ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ایک مسلمان پاگل جو بارہ برس سے ہر روز باقاعدگی کے ساتھ "زمیندار" پڑھتا تھا اس سے جب اس کے ایک دوست نے پوچھا "مولبی ساب، یہ پاکستان کیا ہوتا ہے" تو اس نے بڑے غور و فکر کے بعد جواب دیا "ہندوستان میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں استرے بنتے ہیں"

یہ جواب سن کر اس کا دوست مطمئن ہو گیا۔

اسی طرح ایک سکھ پاگل نے ایک دوسرے سکھ پاگل سے پوچھا "سردار جی ہمیں ہندوستان کیوں بھیجا جا رہا ہے ——— ہمیں تو وہاں کی بولی نہیں آتی"

دوسرا مسکرایا "مجھے تو ہندوستوڑوں کی بولی آتی ہے ——— ہندوستانی بڑے شیطانی آکڑ آکڑ پھرتے ہیں۔"

ایک دن نہاتے نہاتے ایک مسلمان پاگل نے "پاکستان زندہ باد" کا نعرہ اس زور سے بلند کیا کہ فرش پر پھسل کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

بعض پاگل ایسے بھی تھے جو پاگل نہیں تھے۔ ان میں اکثریت ایسے قاتلوں کی تھی جن کے رشتہ داروں نے افسروں کو دے دلا کر پاگل خانے بھجوا دیا تھا کہ

پھانسی کے پھندے سے بچ جائیں۔ یہ کچھ کچھ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کیوں تقسیم ہوا ہے اور یہ پاکستان کیا ہے۔ لیکن صحیح واقعات سے وہ بھی بے خبر تھے۔ اخباروں سے کچھ پتا نہیں چلتا تھا اور پہرہ دار سپاہی ان پڑھ اور جاہل تھے۔ ان کی گفتگو سے بھی وہ کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو صرف اتنا معلوم تھا کہ ایک آدمی محمد علی جناح ہے جس کو قائد اعظم کہتے ہیں۔ اس نے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ملک بنایا ہے جس کا نام پاکستان ہے — یہ کہاں ہے۔ اس کا محل وقوع کیا ہے۔ اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پاگل خانے میں وہ سب پاگل جن کا دماغ پوری طرح ماؤف نہیں ہوا تھا اس مخمصے میں گرفتار تھے کہ وہ پاکستان میں ہیں یا ہندوستان میں۔ اگر ہندوستان میں ہیں تو پاکستان کہاں ہے۔ اگر وہ پاکستان میں ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ عرصہ پہلے یہیں رہتے ہوئے بھی ہندوستان میں تھے۔

ایک پاگل تو پاکستان اور ہندوستان، اور ہندوستان اور پاکستان کے چکر میں کچھ ایسا گرفتار ہوا کہ اور زیادہ پاگل ہو گیا۔ جھاڑو دیتے دیتے ایک دن درخت پر چڑھ گیا اور ٹہنے پر بیٹھ کر دو گھنٹے مسلسل تقریر کرتا رہا جو پاکستان اور ہندوستان کے نازک مسئلے پر تھی۔ سپاہیوں نے اسے نیچے اترنے کو کہا تو وہ اور اوپر چڑھ گیا۔ ڈرایا دھمکایا گیا تو اس نے کہا — "میں ہندوستان میں رہنا چاہتا ہوں نہ پاکستان میں — میں اس درخت ہی پر رہوں گا۔"

بڑی مشکلوں کے بعد جب اس کا دورہ سرد پڑا تو وہ نیچے اترا اور اپنے ہندو سکھ دوستوں سے گلے مل مل کر رونے لگا۔ اس خیال سے اس کا دل بھر آیا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر ہندوستان چلے جائیں گے۔

ایک ایم۔ ایس۔ سی پاس ریڈیو انجینئر میں جو مسلمان تھا اور دوسرے پاگلوں سے بالکل الگ تھلگ باغ کی ایک خاص روش پر سارا دن خاموش ٹہلتا رہتا تھا یہ تبدیلی نمودار ہوئی کہ اس نے تمام کپڑے اتار کر دفعدار کے حوالے کر دیئے اور ننگ دھڑنگ سارے باغ میں چلنا پھرنا شروع کر دیا۔

چنیوٹ کے ایک موٹے مسلمان پاگل نے جو مسلم لیگ کا سرگرم کارکن رہ چکا تھا اور دن میں پندرہ سولہ مرتبہ نہایا کرتا تھا یک لخت یہ عادت ترک کر دی۔ اس کا نام محمد علی تھا۔ چنانچہ اس نے ایک دن اپنے جنگلے میں اعلان کر دیا کہ وہ قائد اعظم محمد علی جناح ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی ایک سکھ پاگل ماسٹر تارا سنگھ بن گیا۔ قریب تھا کہ اس جنگلے میں خون خرابہ ہو جائے مگر دونوں کو خطرناک پاگل قرار دے کر علیحدہ علیحدہ بند کر دیا گیا۔

لاہور کا ایک نوجوان ہندو وکیل تھا جو محبت میں ناکام ہو کر پاگل ہو گیا تھا۔ جب اس نے سنا کہ امرت سر ہندوستان میں چلا گیا ہے تو اسے بہت دکھ ہوا۔ اسی شہر کی ایک ہندو لڑکی سے اسے محبت ہوئی تھی۔ گو اس نے اس وکیل کو ٹھکرا دیا تھا مگر دیوانگی کی حالت میں بھی وہ اس کو نہیں بھولا تھا۔ چنانچہ وہ ان تمام ہندو اور مسلم لیڈروں کو گالیاں دیتا تھا جنہوں نے مل ملا کر ہندوستان کے دو ٹکڑے کر دیئے — اس کی محبوبہ ہندوستانی بن گئی اور وہ پاکستانی۔

جب تبادلے کی بات شروع ہوئی تو وکیل کو کئی پاگلوں نے سمجھایا کہ وہ دل برا نہ کرے۔ اس کو ہندوستان بھیج دیا جائے گا۔ اس ہندوستان میں جہاں اس کی محبوبہ رہتی ہے۔ مگر وہ لاہور چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے کہ اس کا خیال تھا کہ امرت سر میں اس کی پریکٹس نہیں چلے گی۔

یورپین وارڈ میں دو اینگلو انڈین پاگل تھے۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ ہندوستان کو آزاد کر کے انگریز چلے گئے ہیں تو ان کو بہت صدمہ ہوا۔ وہ چھپ چھپ کر گھنٹوں آپس میں اس اہم مسئلے پر گفتگو کرتے رہتے کہ پاگل خانے میں اب ان کی حیثیت کس قسم کی ہوگی۔ یورپین وارڈ رہے گا یا اڑا دیا جائے گا۔ بریک فاسٹ ملا کرے گا یا نہیں۔ کیا انہیں ڈبل روٹی کے بجائے بلڈی انڈین چپاتی تو زہر مار نہیں کرنا پڑے گی۔

ایک سکھ تھا جس کو پاگل خانے میں داخل ہوئے پندرہ برس ہو چکے تھے۔ ہر وقت اس کی زبان سے یہ عجیب و غریب الفاظ سننے میں آتے تھے "اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی لالٹین۔" دن کو سوتا تھا نہ رات کو۔ پہرہ داروں کا یہ کہنا تھا کہ پندرہ برس کے طویل عرصے میں وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سویا۔ لیٹتا بھی نہیں تھا۔ البتہ کبھی کبھی کسی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لیتا تھا۔

ہر وقت کھڑے رہنے سے اس کے پاؤں سوج گئے تھے۔ پنڈلیاں بھی پھول گئی تھیں مگر اس جسمانی تکلیف کے باوجود لیٹ کر آرام نہیں کرتا تھا۔ ہندوستان، پاکستان اور پاگلوں کے تبادلے کے متعلق جب کبھی پاگل خانے میں گفتگو ہوتی تھی تو وہ غور سے سنتا تھا۔ کوئی اس سے پوچھتا کہ اس کا کیا خیال ہے تو وہ بڑی سنجیدگی سے جواب دیتا: "اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی پاکستان گورنمنٹ۔"

لیکن بعد میں "آف دی پاکستان گورنمنٹ" کی جگہ "آف دی ٹوبہ ٹیک سنگھ گورنمنٹ" نے لے لی اور اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے جہاں کا وہ رہنے والا ہے۔ لیکن کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں۔ جو بتانے کی کوشش کرتے تھے وہ خود اس الجھاؤ میں گرفتار ہو جاتے تھے کہ سیالکوٹ پہلے ہندوستان میں ہوتا تھا پر اب سنا ہے کہ پاکستان میں ہے۔ کیا پتا ہے کہ لاہور جو اب پاکستان میں ہے کل ہندوستان میں چلا جائے۔ یا سارا ہندوستان ہی پاکستان بن جائے اور یہ بھی کون سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کسی دن سرے سے غائب ہی ہو جائیں۔

اس سکھ پاگل کے کیس چھدرے ہو کر بہت مختصر رہ گئے تھے۔ چونکہ بہت کم نہاتا تھا اس لئے داڑھی اور سر کے بال آپس میں جم گئے تھے۔ جس کے باعث اس کی شکل بڑی بھیانک ہو گئی تھی۔ مگر آدمی بے ضرر تھا۔ پندرہ برسوں میں اس نے کبھی کسی سے جھگڑا فساد نہیں کیا تھا۔ پاگل خانے کے جو پرانے ملازم تھے وہ اس کے متعلق اتنا جانتے تھے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اس کی کئی زمینیں تھیں۔ اچھا کھاتا پیتا زمیندار تھا کہ اچانک دماغ الٹ گیا۔ اس کے رشتہ دار لوہے کی موٹی موٹی زنجیروں میں اسے باندھ کر لائے اور پاگل خانے میں داخل کرا گئے۔

مہینے میں ایک بار ملاقات کے لئے یہ لوگ آتے تھے اور اس کی خیر خیریت دریافت کر کے چلے جاتے تھے۔ ایک مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پر جب پاکستان، ہندوستان کی گڑبڑ شروع ہوئی تو ان کا آنا بند ہو گیا۔

اس کا نام بشن سنگھ تھا مگر سب اسے ٹوبہ ٹیک سنگھ کہتے تھے۔ اس کو یہ قطعاً معلوم نہیں تھا کہ دن کون سا ہے، مہینہ کون سا ہے، یا کتنے سال بیت چکے ہیں۔ لیکن ہر مہینے جب اس کے عزیز و اقارب اس سے ملنے کے لئے آتے تھے تو اسے اپنے آپ پتا چل جاتا تھا۔ چنانچہ وہ دفعدار سے کہتا کہ اس کی ملاقات آ رہی ہے۔ اس دن وہ اچھی طرح نہاتا، بدن پر خوب صابن گھستا اور سر میں تیل لگا کر کنگھا کرتا، اپنے کپڑے جو وہ کبھی استعمال نہیں کرتا تھا نکلوا کے پہنتا اور یوں سج بن کر ملنے والوں کے پاس جاتا۔ وہ اس سے کچھ پوچھتے تو وہ خاموش رہتا یا کبھی کبھار "اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی لالٹین" کہہ دیتا۔

اس کی ایک لڑکی تھی جو ہر مہینے ایک انگلی بڑھتی بڑھتی پندرہ برسوں میں جوان ہو گئی تھی۔ بشن سنگھ اس کو پہچانتا ہی نہیں تھا۔ وہ بچی تھی جب بھی اپنے باپ کو دیکھ کر روتی تھی، جوان ہوئی تب بھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔

پاکستان اور ہندوستان کا قصہ شروع ہوا تو اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔ جب اطمینان بخش جواب نہ ملا تو اس کی کرید دن بدن بڑھتی گئی۔ اب ملاقات بھی نہیں آتی تھی۔ پہلے تو اسے اپنے آپ پتا چل جاتا تھا کہ ملنے والے آ رہے ہیں، پر اب جیسے اس کے دل کی آواز بھی بند ہو گئی تھی جو اسے ان کی آمد کی خبر دے دیا کرتی تھی۔

اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ لوگ آئیں جو اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے تھے اور اس کے لئے پھل، مٹھائیاں اور کپڑے لاتے تھے۔ وہ اگر ان سے پوچھتا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے تو وہ یقیناً اسے بتا دیتے کہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ ہی سے آتے ہیں جہاں اس کی زمینیں ہیں۔

پاگل خانے میں ایک پاگل ایسا بھی تھا جو خود کو خدا کہتا تھا۔ اس سے جب ایک روز بشن سنگھ نے پوچھا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں، تو اس نے حسب عادت قہقہہ لگایا اور کہا: "وہ پاکستان میں ہے نہ ہندوستان میں۔ اس لئے کہ ہم نے ابھی تک حکم نہیں دیا۔"

بشن سنگھ نے اس خدا سے کئی مرتبہ بڑی منت سماجت سے کہا کہ وہ حکم دے دے تاکہ جھنجھٹ ختم ہو مگر وہ بہت مصروف تھا اس لئے کہ اسے اور بے شمار حکم دینے تھے۔ ایک دن تنگ آ کر وہ اس پر برس پڑا "اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف واہے گورو جی دا خالصہ اینڈ واہے گورو جی کی فتح ———— جو بولے سو نہال، ست سری اکال"

اس کا شاید یہ مطلب تھا کہ تم مسلمانوں کے خدا ہو ———— سکھوں کے خدا ہوتے تو ضرور میری سنتے۔

تبادلے سے کچھ دن پہلے ٹوبہ ٹیک سنگھ کا ایک مسلمان جو اس کا دوست تھا ملاقات کے لئے آیا۔ پہلے وہ کبھی نہیں آیا تھا۔ جب بشن سنگھ نے اسے دیکھا تو ایک طرف ہٹ گیا اور واپس جانے لگا مگر سپاہیوں نے اسے روکا: "یہ تم سے ملنے آیا ہے ———— تمہارا دوست فضل دین ہے"

بشن سنگھ نے فضل دین کو ایک نظر دیکھا اور کچھ بڑبڑانے لگا۔ فضل دین نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "میں بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ تم سے ملوں لیکن فرصت ہی نہ ملی ———— تمہارے سب آدمی خیریت سے ہندوستان چلے گئے تھے ———— مجھ سے جتنی مدد ہو سکی میں نے کی ———— تمہاری بیٹی روپ کور۔ . . . . "

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا ——— بشن سنگھ کچھ یاد کرنے لگا "بیٹی روپ کور"

فضل دین نے رک رک کر کہا "ہاں . . . . . وہ . . . وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے . ——— ان کے ساتھ ہی چلی گئی تھی"

بشن سنگھ خاموش رہا۔ فضل دین نے کہنا شروع کیا "انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہاری خیر خیریت پوچھتا رہوں ———— اب میں نے سنا ہے کہ تم ہندوستان جا رہے ہو ———— بھائی بلبیر سنگھ اور بھائی ودھاوا سنگھ سے میرا سلام کہنا ———— اور بہن امرت کور سے بھی . . . . . بھائی بلبیر سے کہنا فضل دین راضی خوشی ہے ———— دو بھوری بھینسیں جو وہ چھوڑ گئے تھے۔ ان میں سے ایک نے کٹا دیا ہے ———— دوسری کے کٹی ہوئی تھی پر وہ چھ دن کی ہو کے مر گئی . . . . اور . . . میرے لائق جو خدمت ہو، کہنا، میں ہر وقت تیار ہوں . . . . اور یہ تمہارے لئے تھوڑے سے مرونڈے لایا ہوں"

بشن سنگھ نے مرونڈوں کی پوٹلی لے کر پاس کھڑے سپاہی کے حوالے کر دی اور فضل دین سے پوچھا "ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے"

فضل دین نے قدرے حیرت سے کہا "کہاں ہے ———— وہیں ہے جہاں تھا"

بشن سنگھ نے پھر پوچھا "پاکستان میں یا ہندوستان میں؟"

"ہندوستان میں ——— نہیں نہیں پاکستان میں" فضل دین بوکھلا سا گیا۔

بشن سنگھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا "اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی پاکستان اینڈ ہندوستان آف دی دُر فٹے منہ!"

تبادلے کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر آنے والے پاگلوں کی فہرستیں پہنچ گئی تھیں اور تبادلے کا دن بھی مقرر ہو چکا تھا۔

سخت سردیاں تھیں جب لاہور کے پاگل خانے سے ہندو سکھ پاگلوں سے بھری ہوئی لاریاں پولیس کے محافظ دستے کے ساتھ روانہ ہوئیں متعلقہ افسر بھی ہمراہ تھے۔ واہگہ کے بورڈر پر طرفین کے سپرنٹنڈنٹ ایک دوسرے سے ملے اور ابتدائی کارروائی ختم ہونے کے بعد تبادلہ شروع ہو گیا جو رات بھر جاری رہا۔

پاگلوں کو لاریوں سے نکالنا اور ان کو دوسرے افسروں کے حوالے کرنا بڑا کٹھن کام تھا۔ بعض تو باہر نکلتے ہی نہیں تھے۔ جو نکلنے پر رضامند ہوتے تھے، ان کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا۔ کیونکہ ادھر ادھر بھاگ اٹھتے تھے، جو ننگے تھے ان کو کپڑے پہنائے جاتے تو وہ پھاڑ کر اپنے تن سے جدا کر دیتے ———— کوئی گالیاں بک رہا ہے۔ کوئی گا رہا ہے۔ آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں۔ رو رہے ہیں، بلک رہے ہیں۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی ——— پاگل عورتوں کا شور و غوغا الگ تھا اور سردی اتنی کڑاکے کی تھی کہ دانت سے دانت بج رہے تھے۔

پاگلوں کی اکثریت اس تبادلے کے حق میں نہیں تھی۔ اس لئے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انہیں اپنی جگہ سے اکھاڑ کر کہاں پھینکا جا رہا ہے۔ وہ چند جو کچھ سوچ سمجھ سکتے تھے "پاکستان زندہ باد" اور "پاکستان مردہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے۔ دو تین مرتبہ فساد ہوتے ہوتے بچا، کیونکہ بعض مسلمانوں اور سکھوں کو یہ نعرے سن کر طیش آ گیا تھا۔

جب بشن سنگھ کی باری آئی اور واہگہ کے اس پار متعلقہ افسر اس کا نام رجسٹر میں درج کرنے لگا تو اس نے پوچھا: "ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے ——— پاکستان میں یا ہندوستان میں؟"

متعلقہ افسر ہنسا: "پاکستان میں"

یہ سن کر بشن سنگھ اچھل کر ایک طرف ہٹا اور دوڑ کر اپنے باقی ماندہ ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا۔ پاکستانی سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا اور دوسری طرف لے جانے لگے، مگر اس نے چلنے سے انکار کر دیا: "ٹوبہ ٹیک سنگھ یہاں ہے ———" اور زور زور سے چلانے لگا: "اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف ٹوبہ ٹیک سنگھ اینڈ پاکستان"

اسے بہت سمجھایا گیا کہ دیکھو اب ٹوبہ ٹیک سنگھ ہندوستان میں چلا گیا ہے ——— اگر نہیں گیا تو اسے فوراً وہاں بھیج دیا جائے گا، مگر وہ نہ مانا۔ جب اس کو زبردستی دوسری طرف لے جانے کی کوشش کی گئی تو وہ درمیان میں ایک جگہ اس انداز میں اپنی سوجی ہوئی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا جیسے اب اسے کوئی طاقت وہاں سے نہیں ہلا سکے گی۔

آدمی چونکہ بے ضرر تھا اس لئے اس سے مزید زبردستی نہ کی گئی، اس کو وہیں کھڑا رہنے دیا گیا اور تبادلے کا باقی کام ہوتا رہا۔

سورج نکلنے سے پہلے ساکت و صامت بشن سنگھ کے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی ——— ادھر ادھر سے کئی افسر دوڑے آئے اور دیکھا کہ وہ آدمی جو پندرہ برس تک دن رات اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہا تھا، اوندھے منہ لیٹا ہے۔ ادھر خاردار تاروں کے پیچھے ہندوستان تھا ——— ادھر ویسے ہی تاروں کے پیچھے پاکستان۔ درمیان میں زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا، ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑا تھا۔

میلوڈراما

اِس منجدھار میں

("پھندنے" میں سے)

کردار

بیگم ... ماں

امجد ... } بیگم کے بیٹے ... شکستہ

مجید ... ثابت و سالم

سعیدہ ... امجد کی نئی نویلی بیوی

صغریٰ ... خادمہ

کریم اور غلام محمد ... نوکر

پہلا منظر

انتظار۔ لا کا ایک کمرہ — اس میں خوبصورت شیشے لگی کھڑکیاں پہاڑی کی ڈھلوانوں کی طرف کھلتی ہیں۔ حدِ نظر تک پہاڑ ہی پہاڑ نظر آتے ہیں جو آسمان کی حاکمیت ... افق میں گھل مل گئے ہیں۔ کھڑکیوں سے ریشمی پردے صبح کی ہلکی ہلکی ہوا سے ہوتے ہوئے سرسرا رہے ہیں۔ یہ کمرہ جیسا کہ ساز و سامان سے معلوم ہوتا ہے ... دائیں ہاتھ کو کھڑکیوں کے پاس ... کی مسہری ہے۔ اس کے سامنے ہی ایک ... میں شیشے کی تپائی ... اور گلاس کے علاوہ ایک ٹائم پیس رکھی ہے۔ ذرا پیچھے ہٹ کر ... لفافے میں ملبوس صوفہ سیٹ ہے، اس پر ملائم گدیاں ... ہیں — اس سے ذرا ہٹ کر ایک نوجوان خادمہ جو معمولی شکل و صورت کی ہے آتشدان پر سجائی ہوئی مختصر چیزوں کو اور زیادہ سجانے کی کوشش کر رہی ہے۔ کمرے کی فضا میں ایسی سنجیدگی ہے جو ذرا سی جنبش سے ... میں تبدیل ہو سکتی ہے — باہر ... کی آواز آتی ہے۔ تینوں خادم ... اپنے اپنے کام میں مشغول رہتے ہیں — دروازے سے ایک ادھیڑ عمر کی سنجیدہ عورت ... اندر آتی ہے اور کمرے کا جائزہ لے کر اپنے اطمینان کا اظہار کرتی ہے۔

بیگم صاحب - (بیساکھیوں کی مدد سے کمرے میں اِدھر اُدھر پھر کر تمام چیزوں کو صحیح مقام پر دیکھ کر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے) ٹھیک ہے! (ایک کرا پنی بغل سے الگ کر کے صوفے کے بازو کے ساتھ رکھ کر بیٹھنا چاہتی ہے، مگر فوراً ہی اپنا ارادہ ترک کر دیتی ہے۔ ایسا کرتے ہوئے اس کا ہاتھ سہارے کے لئے صوفے کے بازو کی چکیلی سطح کے ساتھ چھوا تھا اور اس پر نشان پڑ گیا تھا۔ اپنے دوپٹے کا ایک کونہ پکڑ کر وہ یہ خود بخود جانے والا نشان مٹا دیتی ہے اور پھر بیساکھی اپنی بغل میں جما کر (نوجوان خادمہ سے مخاطب ہوتی ہے) اصغری!

اصغری - (ذرا متوجہ ہو کر) جی!

بیگم صاحب - (ایک دم یہ محسوس کر کے کہ وہ بھول گئی ہے کہ اس نے اصغری سے تخاطب کیوں کیا تھا) میں کیا کہنے والی تھی؟

اصغری - (مسکراتی ہے) آپ یہ کہنے والی تھیں کہ آپ کا اطمینان نہیں ہُوا۔۔۔ میں بڑی بھی سمجھتی ہوں بیگم صاحب ـــــ دولہن بہت خوبصورت ہے اس کمرے کی تمام سجاوٹیں اس کے سامنے ماند پڑ جائیں گی۔ (وہ آتشدان کے عین درمیان میں ریشمی ڈوریوں سے آویزاں، دولہن کی تصویر کی طرف دیکھتی ہے)۔

بیگم صاحب - (مسکراتی ہوئی ـــــ آتشدان کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتی ہے اور اپنی بہو کی تصویر کو غور سے دیکھتی ہے ـــــ خوش ہوتی ہے ایک دم گھبرا سی جاتی ہے) اصغری!

اصغری - جی!

بیگم صاحب - صبح سے میری طبیعت ـــــ کچھ گھبرا سی رہی ہے۔

اصغری - امجد میاں جو آ رہے ہیں اپنی دولہن کے ساتھ۔

بیگم صاحب - (اپنے خیالات میں کھوئی کھوئی) ہاں۔۔ بس آنے ہی والا ہے۔ کمال موٹر لے گیا ہے اسٹیشن پر۔

اصغری - اگلے سال مجید میاں کی شادی کر دیجیے ـــــ گھر میں رونق ہی رونق ہو جائے گی۔

بیگم صاحب - انشاء اللہ ـــــ وہ بھی انشاء اللہ اسی طرح بخیر و خوبی انجام پائے گی۔ (زیرِ لب) انشاء اللہ۔

اصغری - (دولہن کی تصویر کی طرف دیکھتی ہے اور اس کے حسن سے بہت متاثر ہوتی ہے) اللہ نظرِ بد سے بچائے۔

بیگم صاحب - (غیر ارادی طور پر قریب قریب چیخ کر) اصغری!

اصغری - (سہم کر) جی!

بیگم صاحب - کچھ نہیں۔ گاڑی کب آتی ہے کراچی سے؟

اصغری - معلوم نہیں بیگم صاحب۔

بیگم صاحب - (ایک خادم سے) دیکھو کریم۔ تم ٹیلیفون کر دو اور پوچھو۔ بلکہ گاڑی تو کل ہی کی راولپنڈی پہنچ چکی ہے ـــــ مجید کا تار جو آیا تھا۔

کریم - جی ہاں!

بیگم صاحب - اور میں نے کمال کو کس اسٹیشن پر بھیجا ہے۔ (اگر اگر) خدا معلوم میرے دماغ کو کیا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ امجد میاں کو رات راولپنڈی ٹھہرنا تھا۔ اپنے دوست سعید کے پاس۔۔۔ اور وہ تو میرا خیال ہے اب وہاں سے چل بھی چکے ہوں گے (دوسرے خادم سے) غلام محمد!

غلام محمد - جی؟

بیگم صاحب - تم دیکھو کمال کہاں ہے۔۔ موٹر کہاں لے گیا ہے؟

غلام محمد - بہت اچھا! (چلا جاتا ہے)

م صاحب ۔ (اصغری کے کاندھے کا سہارا لے کر) آج صبح سے میری طبیعت ٹھیک نہیں ——— چلنے پھرنے سے معذور نہ ہوتی ——— اس کم بخت ڈاکٹر نے بہت اصرار کیا۔ شاید ... نے مجھے منع نہ کیا ہوتا تو میں دولہن کو ساتھ لاتی (دور سے ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سنائی دیتی ہے) میرا خیال ہے، شاید امجد میاں کے دوست کا ٹیلیفون ہے کہ وہ چل پڑے ہیں، جاؤ اصغری ... بھاگ کے جاؤ۔ (اصغری دوڑی باہر جاتی ہے)

صاحب ۔ (کریم سے ——— اپنی افسردگی دور کرنے کی خاطر) بس اب آتے ہی ہوں گے امجد میاں ۔

۔ خدا خیر خیریت سے لائے ۔

صاحب ۔ (قریب قریب چیخ کر) کیا مطلب تمہارا ۔

یم ۔ (ڈر کر) جی یہی کہ ... جی یہی ...

(اصغری کی چیخیں سنائی دیتی ہیں "بیگم صاحب، بیگم صاحب")

م صاحب ۔ (سراسیمہ ہو کر) کیوں کیا ہوا ؟

(اصغری سخت اضطراب کی حالت میں اندر داخل ہوتی ہے)

مغری ۔ بیگم صاحب ——— بیگم صاحب ۔

صاحب ۔ (بیساکھیوں کو دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑ کر) کیا ہے ؟

مغری ۔ جی ...... مجید میاں کا ٹیلیفون آیا ہے کہ گاڑی ... گاڑی ٹکرا گئی ہے ۔

صاحب ۔ (بیساکھیوں پر ہاتھوں کی گرفت اور زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے) پھر ؟

غری ۔ مجید میاں اور ان کی دولہن دونوں زخمی ہوئے ہیں اور ہسپتال میں پڑے ہیں ۔

بیگم صاحب ۔ (ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے ——— بیساکھیاں بغل سے گر پڑتی ہیں۔ ایک لمحے کے لئے وہ یوں کھڑی رہتی ہے جیسے پتھر کا بت ——— پھر اس میں تھوڑی سی جنبش ہوتی ہے۔ اور وہ دروازے کی جانب بڑھتی ہے) کہاں ہے کہو، موٹر نکالے ——— ہم راولپنڈی جا رہے ہیں ۔

(بیگم دروازے کی جانب بڑھ رہی ہے ——— غلام محمد اور اصغری دونوں حیرت زدہ ہیں۔
اصغری زور سے چیختی ہے ——— بیگم پلٹ کر اس کی طرف دیکھتی ہے)

بیگم صاحب ۔ کیا ہے ؟

مغری ۔ آپ ——— آپ چل رہی ہیں ——— چل سکتی ہیں ۔

بیگم صاحب ۔ میں ؟ (اپنی بغلوں میں بیساکھیوں کی عدم موجودگی کا احساس کرتے ہوئے) میں ؟ ... میں کیسے چل سکتی ہوں ؟

(ایک دم چکراتی ہے اور فرش پر گر کر بے ہوش ہو جاتی ہے)

مغری ۔ (بیگم کے پاس جاتے ہوئے، غلام محمد سے) غلام محمد جاؤ ڈاکٹر صاحب کو ٹیلیفون کرو ۔

(غلام محمد چلا جاتا ہے ——— اصغری، بیگم کو ہوش میں لانے کی کوشش کرتی ہے)

پردہ

دوسرا منظر

وہی کمرہ جو پہلے منظر میں ہے ——— ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جو ساز و سامان پہلے پڑا تھا۔ اب اپنا نیا نویلا پن کھو چکا ہے۔ اب ہر چیز دیر کی استعمال شدہ معلوم ہوتی ہے ——— صبح کا وقت ہے۔ کھڑکیوں کے ریشمی پردے صبح کی ہلکی پھلکی ہوا سے سرسرا رہے ہیں ——— دائیں ہاتھ کی سالگرہ

کی مسہری پر مدہوش سعیدہ کمبل اوڑھے لیٹی ہے — شیشے کی تپائی پر پڑی ہوئی ننھی ٹائم پیس جس میں نو بجے ہیں الارم بجانا شروع کر دیتی ہے — ہلکی سی گھنٹی کی آواز پیدا ہوتی ہے — کمبلوں میں جنبش پیدا ہوتی ہے — سعیدہ کروٹ بدلتی ہے اور آنکھیں کھولتی ہے۔ جھک کر ننھی ٹائم پیس کی طرف دیکھتی ہے اور مسکراتی ہے۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے خوبصورت چہرے پر چھائی ہوئی گھنی پلکیں پھڑپھڑاتی ہیں — کروٹ بدل کر وہ بستر میں تکیوں کا سہارا لے کر ذرا اوپر اٹھ آتی ہے اور باہر حد نظر تک پھیلی ہوئی پہاڑیوں کا دلکش منظر دیکھ کر ہلکی سی مسرت محسوس کرتی ہے — پھر ایک دم ٹانگیں چلا کر کمبل اوپر سے ہٹاتی ہے اور اچک کر مسہری سے اترتی ہے اور کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر دیکھنا شروع کر دیتی ہے — کسی خوش الحان پرندے کی آواز سنائی دے رہی ہے — سعیدہ اپنے خیالوں میں محو ہے۔ وہ جوان ہے۔ شب خوابی کا ڈھیلا ڈھالا ریشمی لباس ہی جو اس کے بدن سے دور دور اپنی ہری ہری دنیا الگ بسائے ہے، اس کے خوبصورت خطوط سے غافل نہیں اور خود سعیدہ کا ادراک بھی۔ اس کا سراپا حسین و جمیل ہے اور اپنے حسن و جمال سے آگاہ۔ اصغری کی کرخت آواز پرندے کی خوش الحانی کا تقابل پیش کرتی ہے۔ سعیدہ چونکتی ہے)

سعیدہ ۔ (نگاہوں ہی نگاہوں میں) کیا ہے؟ (پوچھتی ہے)

اصغری ۔ مجید میاں ابھی ابھی ہسپتال سے آئے ہیں۔ کہتے تھے، جا کے دیکھو، اب جگ گئیں یا نہیں!

سعیدہ ۔ کیا خبر لائے ہیں؟

اصغری ۔ میں انھیں بھیجتی ہوں ۔

(اصغری چلی جاتی ہے۔ سعیدہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر سنگھار میز کے پاس آتی ہے۔ آئینے میں ایک لحظے کے لئے اپنے آپ کا جائزہ لیتی ہے۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے بکھرے ہوئے بال سرسری طور پر ٹھیک کر کے مسہری کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتی ہے۔ مسہری کے سرہانے اس کا جارجٹ کا سفید دوپٹہ لٹک رہا ہے۔ اسے اتارتی ہے اور بڑی بے ترتیبی سے اپنے کاندھوں پر ڈال لیتی ہے — باہر سے بوٹوں کی چرچر آواز آتی ہے خفیف سے ردِعمل کے ساتھ سعیدہ دروازے کی جانب دیکھتی ہے — مجید — سانولے رنگ کا متوسط قد نوجوان، جو مضبوط ہاتھ پاؤں رکھتا ہے اور جس کے چہرے کے خطوط عمر کے مقابلے میں زیادہ پختہ اور سنجیدہ ہوئے ہیں، اندر داخل ہوتا ہے) ۔

مجید ۔ سلام بھابھی جان!

سعیدہ ۔ سلام۔

مجید ۔ (صوفے کے پاس آکر رکتے ہوئے) طبیعت کیسی ہے آپ کی؟

سعیدہ ۔ (بے دلی سے) ٹھیک ہے (صوفے پر بیٹھ جاتی ہے) سنائیے کیا خبر لائے راولپنڈی سے؟

مجید ۔ (سعیدہ کے سامنے آکر) کوئی خاص نہیں (ٹھنڈی سی آہ بھر کر) بس اب انہیں لے آئیں گے یہاں ۔

سعیدہ ۔ کیوں؟

مجید ۔ وہ تنگ آ گئے ہیں (ایک موڑھا گھسیٹ کر اس پر بیٹھتے ہوئے) ان کی جگہ میں ہوتا تو . . . بہت ممکن ہے میں نے خودکشی کر لی ہوتی ۔

سعیدہ ۔ (اٹھ کر کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے) کیا معلوم تھا کہ میری قسمت میں یہ لکھا ہے . . . اتنے آدمی مرے . . . . میں بھی ساتھ ہی مر گئی ہوتی ۔

مجید ۔ مگر یہ اللہ کو منظور نہیں تھا۔

سعیدہ ۔ (کھڑکی سے باہر پہاڑیوں کا منظر دیکھتی ہے) ہاں، یہ اللہ کو منظور نہیں تھا — اللہ کو یہ منظور تھا کہ میری ٹانگ۔ یہ ہلکی سی خراش آئے پر میری ساری زندگی زخموں سے چور چور ہو جائے (آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں — سفید دوپٹے سے وہ انھیں پُرنزاکت طریقے سے پونچھتی ہے

کرتی ہے۔ اللہ کو یہ منظور تھا کہ میرے سہاگ کی ڈور ٹوٹ جائے اور میں ساری عمر ہوا میں کٹے ہوئے پتنگ کی طرح ڈولتی رہوں۔

(سسکیاں لیتی ہے)

مجید - (اُٹھتا ہے) بھابی جان حوصلے سے کام لینا چاہیئے ... کیا پتا ہے وہ ٹھیک ہو جائیں۔

سعیدہ - (سرزنش کے طور پر) مجید، کم از کم تم تو مجھے دھوکا دینے کی کوشش نہ کرو —— چھ مہینے ہو گئے ہیں انھیں ہسپتال کی چارپائی کے ساتھ لگے ہوئے ... ڈاکٹروں کا جو فیصلہ ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں ... وہ کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتے ... ان کی دونوں ٹانگیں بیکار ہو چکی ہیں ... لیکن ... لیکن، میں ایک بات مانتی ہوں کہ ان میں بہت حوصلہ ہے ... میں جب بھی ان کے پاس گئی۔ انھوں نے مجھے پاس بٹھا کر کہا، سعیدہ، کچھ فکر نہ کرو، میں بہت جلد تندرست ہو جاؤں گا ... اور پھر میں تمھیں ان پہاڑیوں کی سیر کراؤں گا جن کا ذکر تم کراچی میں اتنی بار میرے منہ سے سن چکی ہو ... مجھے ان پہاڑیوں سے پیار ہے ... اتنا پیار ہے کہ تم ان کے متعلق اور سن کر رشک کرو گی ... اور وہ مجھے حوصلہ دینے لگتے۔ سعیدہ دنیا حادثوں کا دوسرا نام ہے ... میں تو خدا کا شکر کرتا ہوں کہ میری جان نہیں گئی ... ورنہ ... پھر وہ ایسی بات کہتے کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔

مجید - کیا!

سعیدہ - (نمناک آنکھوں سے خلا میں دیکھتے ہوئے) کہ تم ... کہ تم میرے بعد کسی اور کی ہو جاؤ گی ... (کانپ جاتی ہے) ... وہ ... ایسی باتیں کیوں سوچتے ہیں مجید؟

مجید - معلوم نہیں۔

سعیدہ - تمھیں معلوم ہونا چاہیئے (آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی صوفے پر بیٹھ جاتی ہے —— دوپٹہ ڈھلک آتا ہے —— حریری لباس میں اس کا متلاطم سینہ ریشمی آتار چڑھاؤ پیدا کرتا ہے) تم مرد ہو ... تم اس کے بھائی ہو ... اگر اس حادثے کے تم شکار ہوتے ... تو؟

مجید - میں کبھی ایسی باتیں نہ سوچتا جو امجد بھائی سوچتے ہیں!

سعیدہ - کیوں؟

مجید - ہم دونوں مرد ہیں - دونوں بھائی ہیں —— مگر دل اور دماغ کے اعتبار سے ہم دونوں بہت مختلف ہیں۔

سعیدہ - (بڑبڑاتی ہے) دل ... اور دماغ۔

(اصغری داخل ہوتی ہے)

اصغری - مجید میاں، آپ کو بیگم صاحب بلاتی ہیں۔

مجید - چلو، میں آتا ہوں۔

اصغری - انھوں نے کہا ہے جلدی آئیے۔

مجید - اچھا ... (سعیدہ کی طرف دیکھ کر) میں ابھی آتا ہوں۔

(چلا جاتا ہے)

اصغری - (فرش پر بچھے ہوئے شُدرگ پر سعیدہ کے قدموں میں بیٹھ جاتی ہے اور اس کے پاؤں کی انگلیاں چٹخانا چاہتی ہے)

سعیدہ - (پاؤں ایک طرف کھینچ کر) جانے دو اصغری۔

اصغری - (پاؤں سے قریب قریب لپٹ کر) نہیں دولھن بیگم۔ (انگلیاں چٹخانا شروع کر دیتی ہے) ... کیا خبر لائے ہیں مجید میاں۔

سعیدہ - کہتے تھے، وہ یہاں آنا چاہتے ہیں۔

اصغری - یہ تو بڑی خوش خبری کی بات ہے۔

سعیدہ - (دکھ کے ساتھ) ہاں!

اصغری - یہ بیگم صاحب تو بہت ناراض ہو رہی تھیں کہ اتنی دیر کیوں لگا دی مجید میاں نے۔

سعیدہ - کہاں؟

اصغری - یہاں —— آپ کے پاس۔

سعیدہ - میرے پاس؟ —— کیا کہتی تھیں بیگم صاحب۔

اصغری - کچھ نہیں —— ان کا مزاج آج کل بہت چڑچڑا سا رہتا ہے —— انہیں کوئی بات اچھی نہیں لگتی —— انہیں . . . . امجد میاں کا اتنا فکر نہیں جتنا آپ کا ہے . ہر وقت آپ ہی کے متعلق سوچتی رہتی ہیں —— تو . امجد میاں ٹھیک ہو گئے ہیں نا؟

سعیدہ - (چونک کر، بنا پاؤں ہٹا کر اٹھتے ہوئے) ہاں ٹھیک ہو گئے ہیں۔

(بیگم کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ اصغری اٹھ کھڑی ہوتی ہے)

سعیدہ - سلام خالہ جان۔

بیگم صاحب - سلام بیٹا —— جیتی رہو (پاس آ کر سعیدہ کے سر پر پیار کا ہاتھ پھیرتی ہے) تمہیں معلوم ہو گیا مجید سے کہ . . . .

سعیدہ - جی ہاں!

بیگم صاحب - غریب تنگ آ گیا ہے وہاں ہسپتال میں . . . (اصغری کی طرف دیکھ کر) اصغری تم جاؤ۔

(اصغری چلی جاتی ہے)

بیگم صاحب - اس کی اس کی خواہش ہے کہ وہ تمہارے پاس رہے . . اس نے مجھ سے کہا کہ اگر مجھے مرنا ہی ہے تو میری سعیدہ میری نظروں کے سامنے ہونی چاہیئے۔

سعیدہ - (آنکھوں میں سے آنسو چھلک پڑتے ہیں۔ بیگم کے گلے سے لگ جاتی ہے)

بیگم صاحب - (آنکھوں سے آنسو رواں ہیں) وہ وہ تم سے بے اندازہ محبت کرتا ہے . . لیکن . . . لیکن اس نے کہا تھا، تم سے پوچھ لیا جائے کہ تمہیں اس کے یہاں آ کر رہنے میں کوئی اعتراض تو نہیں۔

سعیدہ - اعتراض . .

بیگم صاحب - ہاں بیٹا —— ہو سکتا ہے، یوں تمہارے دکھ میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

سعیدہ - وہ ایسا کیوں سوچتے ہیں —— خالہ جان وہ ایسا کیوں سوچتے ہیں۔

بیگم صاحب - بیٹا، وہ کچھ ایسے ہی دل و دماغ کا آدمی ہے —— اس کو دوسروں کا ہمیشہ خیال رہتا ہے۔

سعیدہ - آہ . . . . کیوں نہ آئیں (لہجے میں چیخ سی پیدا ہو جاتی ہے) وہ ایسی باتیں نہ کیا کریں۔

بیگم صاحب - ڈاکٹروں نے کہا ہے، اگر وہ خوش رہے تو انشاء اللہ ایک دو مہینے میں بیساکھیوں کی مدد سے چل پھر سکے گا . . . . (ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے) بیساکھیاں . . . جو اس کے کار لمبی کے حادثے کی خبر سن کر میری زندگی سے الگ ہو گئی تھیں . . . . مجھے معلوم ہوتا کہ یہ پھر کی زندگی میں داخل ہونے والی ہیں تو میں ان کو مضبوطی سے پکڑ کے رکھتی . . . مگر بیٹا اس سنجیدہ میں جسے زندگی کہتے ہیں۔ مضبوط سے مضبوط کتنے

سے ڈرتی ہے اور ایک معمولی تنکا ہی کانٹے لگا دیتا ہے ..... (توقف کے بعد) سعیدہ بیٹا، امجد نے مجھ سے ایک اور بات تم سے پوچھنے کو کہا تھا؟

سعیدہ - کیا خالہ جان؟

بیگم صاحب - کیا تم اس سے محبت کرو گی؟

سعیدہ - (بوکھلا کر) محبت ......

بیگم صاحب - (سعیدہ کے سر پہ ہاتھ پھیرتی ہے) میں تمہیں زیادہ پریشان نہیں کرنا چاہتی .....

(چلی جاتی ہے)

سعیدہ - (دوپٹے سے اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے بڑبڑاتی ہے) محبت ـــــ محبت؟ ـــــ دل و دماغ (آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی آتشدان کے عین وسط میں ریشمی ڈوریوں سے لٹکی ہوئی اپنی تصویر کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے) تا ـــ کیا تو اس سے محبت کرے گی؟

(ٹرے میں رکھی ہوئی پیالیوں کی آواز آتی ہے ـــ اصغری ناشتہ لئے اندر داخل ہوتی ہے اور پھیتوں والی تپائی صوفے کے آگے لے جاتی ہے اور اس پہ ناشتہ چن دیتی ہے)

اصغری - دولہن بیگم، امجد میاں سے محبت نہیں کریں گی تو اور کون کرے گی؟

سعیدہ - (ایک دم چونکتی ہے) کیا کہا؟

اصغری - جی کچھ نہیں ..... ایسے ہی اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی ـــــ ناشتہ کر لیجئے۔

سعیدہ - تم جاؤ۔

اصغری - جی اچھا۔

(اصغری، ایک نظر سعیدہ کو اور ایک نظر اس کی تصویر کو دیکھتی باہر چلی جاتی ہے۔ سعیدہ، آہستہ آہستہ سوچ میں مستغرق مسہری کی طرف بڑھتی ہے اور مسہری پر لیٹ جاتی ہے۔)

سعیدہ - (چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑاتی ہے) دولہن بیگم، امجد میاں سے محبت نہیں کریں گی تو اور کون کرے گی ـــ (اونچی آواز میں) اور کون کرے گی؟ ـــ اور کون کر سکتی ہے؟

(پردہ)

تیسرا منظر

(نگار ولا سے ملحقہ باغیچہ ـــــ وسط میں پست قد ترشی ہوئی جھاڑیوں کے درمیان فوارہ ہے جس میں سے پانی کی پھوار دھڑک دھڑک کر باہر نکل رہی ہے۔ دھوپ کھلی ہے۔ آسمان نکھرا ہوا ہے۔ فضا میں عجیب سا کنوارپن ہے ـــ بے حجاب۔ ہر ذرہ نظارے کی دعوت لئے گویا قبولیت کا منتظر ہے ـــ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ ہوا چلتے چلتے ٹھہر سی گئی ہے کہ باغ کی بیلیں پھر سے اپنی زلفیں سنوار لیں، پھول اپنے گالوں کی سرخی درست کر لیں، اور بھنورے ان کو، ان کلیوں کا منہ چومنا ہے بے خوف و خطر چوم لیں ـــ اس فضا میں گھاس کے ہموار قالین پر کرسیاں بچھی ہیں۔ ایک میں سعیدہ گلابی لباس میں ملبوس خود اپنا ہی عکس بنی بیٹھی ہے۔ دھوپ کی حدت سے اس کے غازے کے ہلکے سے غبار سے اس کی اپنی گلابیاں، سرخیاں بن بن کر باہر نکل رہی ہیں۔ دوسری کرسی میں مجید ہے جو ہولے ہولے سگریٹ کے کش لگا کر دھوئیں کے نیلے نیلے چھلے منہ سے نکال رہا ہے۔ اس کا چہرہ مطمئن ہے۔ سامنے امجد ہے ـــــ اپاہجوں کی کرسی میں ـــ اس کے چہرے پہ اپاہجوں کی کرسی والی کیفیت ہے جو کسی اور کی مدد کے بغیر نہیں چل سکتی ـــ اس کا رنگ بہت زرد ہے مگر اس کی آنکھوں میں چمک ہے جو سعیدہ کے حسن و جمال کی بازگشت ہے)۔

امجد - (اپنے دائیں بائیں دیکھ کر) آج موسم کتنا دلفریب ہے۔

سعیدہ - (ذرا متوجہ ہو کر) جی ہاں۔

امجد - مجید، جاؤ۔ سعیدہ کو گھما لاؤ ۔۔۔ ان پہاڑیوں کی سیر کرا لاؤ ۔۔۔ (پیچھے مڑ کر دیکھنا چاہتا ہے) افسوس ہے، مجھ سے مڑا نہیں جاتا ۔۔۔ مجید اٹھو ۔۔۔ میری کرسی گھما کر ادھر کر دو ۔۔۔ یہ منظر میری آنکھوں کے سامنے ہونا چاہیئے۔

(مجید اٹھتا ہے۔ لیکن سعیدہ اس سے پہلے اٹھ کر امجد کی کرسی کا رُخ پھیر دیتی ہے۔ اب تینوں کا منہ پہاڑیوں کی طرف ہے جو دھوپ میں حدِ نگاہ تک اپنے منہ دھو رہی ہیں)

امجد - (پہاڑیوں کے منظر کو اپنی نگاہوں سے پیتے ہوئے) سعیدہ، یہی ہیں وہ پہاڑیاں جن سے مجھے پیار ہے ۔۔۔ اتنا پیار کہ میں بیان نہیں کر سکتا ۔۔۔ (مجید سے) جاؤ، مجید، سعیدہ کو ساتھ لے جاؤ اور ان کی سیر کراؤ (سعیدہ سے) سعیدہ، جب تم ان پر چڑھتے چڑھتے ہانپنے لگو گی اور تمھاری سانس رکنے لگے گی تو تمہیں ایسا محسوس ہوگا کہ اس سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی لذت نہیں ۔ میں مجید کو زبردستی ساتھ لے جاتا تھا مگر یہ ایک چڑھائی کے بعد ہی ہمت ہار دیتا تھا ۔ مجھ سے کہتا تھا، بھائی جان مجھے آپ کا یہ شغل پسند نہیں ۔۔۔ یہ کیا کہ آدمی بیکار میں ہانپ ہانپ کر بیہوش ہو جائے (ہنستا ہے) پہاڑیوں !! ان کی سیر کرنے کا حسن اس کی سمجھ میں کبھی نہیں آئے گا۔ کیوں سعیدہ؟

سعیدہ - (مسکرا کر) جی ہاں۔

امجد - (مجید سے) جاؤ ۔۔۔ سعیدہ کو لے جاؤ ۔۔۔ کبھی کام بھی کیا کرو۔

مجید - (سعیدہ سے) چلئے بھابی جان ۔۔۔ مگر میں شرط لگاتا ہوں آج تو یہ چلی جائیں گی ۔ لیکن پھر کبھی ادھر کا رُخ نہیں کریں گی۔

سعیدہ - نہیں، نہیں ۔۔۔ یہ آپ کیونکر کہتے ہیں؟

امجد - اس لئے کہ یہ اور دل و دماغ کا آدمی ہے۔

سعیدہ - دل و دماغ؟ ۔۔۔ کیا مطلب ہے دل و دماغ؟

مجید - آپ کو ایک ہی پہاڑی چڑھنے سے معلوم ہو جائے گا۔

امجد - (ہنستا ہے) تم بکتے ہو مجید ۔ سعیدہ کی زندگی کے سامنے تو ایک پہاڑ ہے ۔۔۔ کہ یہ ایک معمولی سی پہاڑی کی چڑھائی ہی سے اُکتا گئی تو

سعیدہ - چلئے مجید میاں

مجید - چلئے۔

(دونوں چلے جاتے ہیں ۔۔۔ امجد مسکراتا ہے ۔۔۔ اصغری داخل ہوتی ہے ۔۔۔ اس کے ہاتھ میں پلیٹ ہے جس میں چھلے اور کٹے ہوئے سیب ہیں۔ وہ معنی خیز نظروں سے مجید اور سعیدہ کو دیکھتی امجد کی جانب آتی ہے اور اس سے مخاطب ہوتی ہے)

اصغری - تھوڑے سیب کھا لیجیے۔

امجد - (جو سعیدہ اور مجید کو ڈھلوانوں میں گزرتے دیکھ رہا ہے) کھا لوں گا۔

اصغری - (انہی کی طرف دیکھ کر) آج دولہن بیگم کتنی خوبصورت دکھائی دے رہی ہیں۔

امجد - (ایک دم پلٹ کر اصغری کو دیکھتے ہوئے) دکھائی دے رہی ہیں؟

اصغری - (خفیف سی بوکھلاہٹ کے ساتھ) جی ۔ جی ہاں۔

امجد - (پھر سعیدہ اور مجید کو دیکھتے ہوئے) خوبصورت ہے خوبصورت دکھائی نہیں دیتی ۔۔۔ ہونے اور دکھائی دینے میں زمین و آسمان کا فرق ہے اصغری۔

صغریٰ - جی ہاں --- یہ تو ہے۔

امجد - لاؤ سیب۔

صغریٰ - (پلیٹ بڑھاتے ہوئے) حاضر ہیں --- پر چھلے ہوئے ہیں۔

امجد - تمہارا مطلب؟

صغریٰ - چھلا ہوا پپیتہ تو نہیں دھوکا کھا سکتا ہے (ہنس کر) ... اس کے سرخ سرخ گال تو چھری سے اتر چکے ہیں۔

امجد - (ہنستا ہے) صغریٰ! --- تم اب بہت شیطان ہو گئی ہو۔

صغریٰ - (سنجیدگی سے) شیطان؟ --- امجد میاں - آپ نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ شیطان خدا کا سب سے بڑا فرشتہ تھا جس نے آدم ---
یعنی مٹی کے پتلے کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

امجد - ہاں ہاں ......

صغریٰ - اور فرشتوں کے اس ہیڈ ماسٹر کو اس کی سزا دی گئی تھی . . .

امجد - درست ہے . .

صغریٰ - تو یہ بھی درست ہے۔

امجد - کیا؟

صغریٰ - کچھ بھی نہیں --- درست آخر ہوتا کیا ہے؟ --- وہی جسے آپ درست کہہ دیں، یا درست سمجھنے کی کوشش کریں یا وہ غلطی جو آپ ایک دفعہ
طے کر لیں کہ آئندہ درست ہوتی رہے گی - یا وہ درستی جسے آپ غلطی میں تبدیل کرنے یہ سمجھتے ہیں کہ آپ پھر درست کر سکتے ہیں --- لیکن یہ سب
درس ہے --- میں ایک موٹی عقل کی عورت ہوں امجد میاں۔

امجد - تم آج کیسی باتیں کر رہی ہو؟

صغریٰ - میں ایک موٹی عقل کی عورت ہوں --- لیکن ایک عورت ہوں امجد میاں۔

امجد - میں کچھ نہیں سمجھا۔

صغریٰ - (سیب کی ایک قاش اٹھاتی ہے اور امجد کے منہ کے پاس لے جاتی ہے) آپ سیب کھائیے۔

امجد - (سیب کی قاش دانتوں میں لیتے ہوئے) تم پہلے کبھی ایسی باتیں نہیں کیا کرتی تھیں۔

صغریٰ - آج موسم ہی کچھ ایسا دلفریب ہے۔

امجد - کیا نہیں ہے؟

صغریٰ - (سیب کی دوسری قاش اٹھا کر) کیوں نہیں ... یہ لیجئے ایک اور قاش . . .

(دوسری قاش امجد کے کھلے ہوئے منہ میں ڈالتی ہے)

امجد - (سیب کھاتے ہوئے کچھ توقف کے بعد) صغریٰ!

صغریٰ - (جو پہاڑیوں کا منظر دیکھنے میں محو تھی - چونک کر) جی؟

امجد - تمہاری شادی کر دیں؟

صغریٰ - شادی؟

امجد ۔ ہاں ——— اب تمہاری شادی ہو جانی چاہیئے ۔

اصغری ۔ کیوں امجد میاں !

امجد ۔ شادی بڑی اچھی چیز ہے ۔ — دنیا میں ہر شے کی شادی ہو جانی چاہیئے ——— زندگی میں شادی سے بڑھ کر اور کوئی خوشی نہیں ——— میں اتی جلد سے کہوں گا کہ اصغری کی جلدی شادی کر دیجئے ۔

اصغری ۔ نہ امجد میاں !

امجد ۔ کیوں ؟

اصغری ۔ مجھے ڈر لگتا ہے ۔

امجد ۔ کس سے ؟

اصغری ۔ (سینے پر بیٹھ جاتی ہے ۔ لہجہ فکرمند ہوتا ہے) شادی سے ۔

امجد ۔ (ہنستا ہے) پگلی !

اصغری ۔ ٹھیک کہتی ہوں امجد میاں ——— مجھے ایسی ڈر لگتا ہے ۔ — اوّل تو ایک نوکرانی کی شادی ہی کیا ہے ۔ ہوئی ہوئی نہ ہوئی نہ ہوئی ——— کی ذلیل پڑتا ہے ۔ لیکن ہو گئی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ گاڑی پٹڑی سے اتر جائے اور ۔

امجد ۔ (دکھ کے ساتھ) اصغری !

اصغری ۔ (کہے جاتی ہے) گاڑی پٹڑی سے اتر جائے اور صغری قیمہ قیمہ ہونے سے بچ جائے ——— ایک ٹانگ سے لنگڑی ، ایک بازو سے ٹونڈی اور ایک آنکھ سے اندھی ہو جائے ——— آدھی اصغری غائب ہو جائے ——— آدھی بچ جائے ——— نا امجد میاں ——— میری شادی کا نام نہ لیجئے ۔ شادی تو ایک سالم چیز ہے ——— آدھی یا چوتھائی چیز کی شادی نہیں ہو سکتی ۔

امجد ۔ (سوچتے ہوئے) اصغری !

اصغری ۔ (گھٹی گھٹی آواز میں) جی !

امجد ۔ تم ٹھیک کہتی ہو (آواز میں انتہا درجے کا درد پیدا ہو جاتا ہے) لیکن دیکھو مجھے رنجیدہ نہ کرو ...... میں خوش رہنا چاہتا ہوں ——— اپنی ان شکستہ ٹانگوں پر بھی خوش رہنا چاہتا ہوں ——— مجھے نہ چھیڑو ——— میرے دل میں درد ہوتا ہے ———

اصغری ۔ (امجد کے پاؤں پکڑ لیتی ہے) مجھے معاف کر دیجئے امجد میاں (آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں) جانے میں کیا بک گئی ——— آپ خوش رہیں ۔ خدا آپ کو خوش رکھے ۔

امجد ۔ (بہادری کے ساتھ) خدا کا نام نہ لو ——— اگر اس کو مجھے خوش رکھنا ہوتا تو مجھے اس حادثے کا شکار ہی کیوں کرتا ——— کیا تھا اگر مار کر ہی قصہ ختم کر دیتا ، قصیلے میں کیوں نہ ڈال دیتا ۔ اس کا نام نہ لو ——— میری اس کی دوستی ختم ہو چکی ہے ——— مجھے اگر خوش رہنا ہے تو اپنے لیے سہارے کے سہارے خوش رہنا ہے ——— انہی ٹوٹی ہوئی ٹہنیوں پر چند تنکے ہیں کہ مجھے اپنی خوشی کے آشیانے بنانا ہیں ۔

اصغری ۔ صرف اپنی خوشی کے !

امجد ۔ (بہت زیادہ دکھ کے ساتھ) اصغری خدا کے لیے ——— تم اتنی کیوں ظالم ہو گئی ہو ——— تمہارے منہ میں اگر زبان پیدا ہوئی ہے تو یہ کہ تم میرے دکھ میں اضافہ کرو ...... میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ میری مدد کرو ——— ایک اپاہج کی مدد کرو کہ وہ اپنی ٹوٹی ہوئی زندگی کے چند دن ——— صرف چند دن گزارے ۔

اصغری - آپ درخواست نہ کیجئے امجد میاں ——— میرا کلیجہ پھٹتا ہے ——— آپ مالک ہیں، حکم دے سکتے ہیں ——— میری زندگی حاضر ہے۔

(اس کے موٹے موٹے آنسو امجد کے سلیپروں پر گرتے ہیں ——— اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور ایک طرف چل جاتی ہے)

امجد - (گردن جھکا کر اپنے سلیپروں کی طرف دیکھتا ہے جن پر سے اصغری کے آنسو لڑھک جاتے ہیں ——— گردن اٹھا کر اصغری کو دیکھتا ہے جو کہ جا رہی ہے)

(کرسی کی جانب سے بیگم نمودار ہوتی ہے۔ شال اوڑھے ہاتھ میں زیورات کے ڈبے لئے وہ امجد کے پاس آتی ہے)

بیگم صاحب - امجد بیٹا۔

امجد - (جلدی سے اپنے پاؤں کمبل میں چھپا کر) جی!

بیگم صاحب - سعیدہ کے لئے جو زیورات تم نے پسند کئے ہیں تیار ہو کر آ گئے ہیں۔ لو ......

(ڈبے امجد کی گود میں رکھ دیتی ہے)

امجد - (بچوں کے سے اشتیاق سے ہر ڈبہ کھول کر سارے زیورات دیکھتا ہے اور اُچٹتی ہوئی خوشی کا اظہار کرتا ہے) بہت اچھے ہیں ——— بہت عمدہ ہیں

- - بہت حسین ہیں ——— لیکن اتنے نہیں جتنی سعیدہ ہے ... اصغری ——— اصغری! ——— ادھر آؤ۔

(اصغری جو ایک سرو کے ساتھ لگ کر کھڑی تھی۔ امجد کے پاس آتی ہے۔ امجد اسے تمام زیورات دکھاتا ہے)

امجد - کہو۔ کیسے ہیں؟

اصغری - آپ خود کہہ چکے ہیں ——— حسین ہیں لیکن اتنے نہیں جتنی دولہن بیگم ہیں۔

امجد - (ماں سے) امی جان۔ کپڑے کب آئیں گے۔

اصغری - کل تک آ جائیں گے۔

امجد - اور وہ بائیسکوپ مشین ——— کیوں نہیں آئی ابھی تک۔

بیگم صاحب - بیٹا ——— مجید آرڈر دے آیا تھا۔ ایک دو روز میں آ جائے گی۔

امجد - اچھا (رک کر) امی جان!

بیگم صاحب - جی بیٹا!

امجد - کچھ اور بھی منگوانا چاہیے سعیدہ کے لئے ——— میں اسے ایک لحظے کے لئے بھی اداس نہیں دیکھنا چاہتا ——— ہر روز اس کیلئے کوئی نہ کوئی نئی چیز ضرور ہونی چاہیے۔

بیگم صاحب - سب کچھ تمہارے اختیار میں ہے۔ جو چاہو کرو۔

امجد - اختیار؟ (رک کر) ہاں ... تو ... امی جان۔

بیگم صاحب - جی!

امجد - نائی کو بھیجئے ——— اسپورٹس کی دکان میں جائے ——— جتنے کھیل اسے مل سکیں لے آئے ... سعیدہ اور مجید کھیلا کریں گے اور میں دیکھا کروں گا ... اور دیکھئے ... اس سے کہیئے کچھ ایسے کھیل بھی لے آئے جو میں ... میں بھی سعیدہ کے ساتھ کھیل سکوں۔

بیگم صاحب - (بے حد متأثر ہو کر امجد کا سر اپنے ہاتھوں میں لے کر) میرے بچے!

(امجد بلک بلک کر رونا شروع کر دیتا ہے ——— اصغری ضبط نہیں کر سکتی اور چیختی ہوئی ایک طرف دوڑ جاتی ہے ——— بیگم کی آنکھوں سے خاموش آنسو رواں ہیں)

پردہ

چوتھا منظر

(وہی کمرہ جو پہلے اور دوسرے منظر میں ہے ــــ رات کا وقت ۔ فضا بالکل خاموش ہے ۔ بڑے بے ڈھنگے طریق پر مسہری پر سعیدہ تین چار گدلے تکیوں میں اپنا نیم سنہرے بالوں والا سر دبائے کوئی کتاب پڑھنے میں مشغول ہے ۔ ..... نظریں کتاب کے حروف کے بجائے اس کے اپنے دل کی جانب معلوم ہوتی ہیں ۔ سینے کے مقام پر ململ کی سلوٹیں چٹکیاں لے رہی ہیں اور ننھے سے تالاب میں جوار کا نقشہ پیدا ہو رہا ہے ــ ۔ بائیں طرف لمبے لمبے ہسپتالوں جیسی چارپائی بچھی ہے ــــ اس کے ساتھ ہی پائیوں والی کرسی میں امجد بیٹھا ہے ۔ اس کے ہاتھ میں کتاب ہے ۔ وہ اسے یوں پکڑے ہے جیسے کوئی شیشے کی چیز ہے ۔ اس کی نظر بے پرواہ ہیں ۔ کتاب کے حروف سے اٹھ کر کبھی وہ سعیدہ کے ہاتھوں پر جا بیٹھتی ہیں ۔ کبھی اس کے سنہرے بالوں والے سر پر جو تکیوں میں دھنسا ہے ــــ آخر اس سے نہیں رہا جاتا ــــ کتاب بند کر کے اپنی گود میں رکھتا ہے اور بڑی آہستگی کے ساتھ سعیدہ سے مخاطب ہوتا ہے)

امجد ۔ سعیدہ !

سعیدہ ۔ (چونک کر) جی !

امجد ۔ میرا خیال ہے اب سو جاؤ ۔

سعیدہ ۔ (کروٹ بدل کر امجد کو دیکھتے ہوئے) آپ سونا چاہتے ہیں تو میں غلام محمد اور کریم کو بلاؤں کہ وہ آپ کو لٹا دیں ۔

امجد ۔ (کھوکھلی آواز میں) لٹا دیں ..... نہیں سعیدہ ــــ میں لیٹ لیٹ کے تھک گیا ہوں ــــ آج یہیں کرسی پر سو جاؤں گا ــــ تمہیں تکلیف نہ ہو تو اٹھ کے یہ بتی بجھا دو ، اور سبز بتی روشن کر دو ۔

سعیدہ ۔ (ناخوش ہے) آپ بار بار میری تکلیف کا ذکر کیوں کرتے ہیں ۔

امجد ۔ میں خود جو تکلیف میں ہوں ۔

سعیدہ ۔ (چڑ کر) مجھے اس کا احساس ہے امجد صاحب ــ ۔ مگر بتائیے میں آپ کے لئے کیا کر سکتی ہوں ۔ ..... مجھ سے جو ہو سکتا ہے ، میں کرنے کے لئے تیار ہوں ــ ۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ آپ کو ہر وقت میری تکلیف کی پڑی رہتی ہے ــــ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی ۔

امجد ۔ سعیدہ ، تم بہت اچھی ہو ۔

(سعیدہ بتی اوف کرتی ہے ..... چند لمحات کیلئے اندھیرا چھا جاتا ہے ۔ ۔ پھر کمرے کی ہر چیز ہلکی ہلکی سبز روشنی میں نہانا شروع کر دیتی ہے)

سعیدہ ۔ کاش میں اچھی ہوتی ــــ اچھی ہو سکتی (صوفے پر بیٹھ جاتی ہے ــ ۔ سینے سے اس کا اضطراب ظاہر ہے)

امجد ۔ اس سے زیادہ تم اور کیا اچھی ہو سکتی ہو سعیدہ ۔

سعیدہ ۔ (تیزی سے) جی نہیں ــــ آپ نہیں جانتے ۔

امجد ۔ (بہت ہی ملائم آواز میں) اگر کسی وجہ سے میں نے تمہیں ناراض کر دیا ہے تو مجھے معاف کر دو ۔

سعیدہ ۔ (امجد کی طرف دیکھتی ہے ــــ ۔ اٹھتی ہے اور مسکراتی ہوئی اپنی لمبی لمبی انگلیوں سے امجد کے بالوں میں کنگھی کرتی ہے) سچ تو یہ ہے امجد صاحب کہ میں آپ کے لائق نہیں ہوں ۔

امجد ۔ (سعیدہ کا ہاتھ پکڑ کر) ..... یہ تمہارے دل کی اچھائی ہے اگر تم ایسا سمجھتی ہو ، ورنہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے ۔

سعیدہ ۔ (بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے) سو جائیے ۔ ــ کئی راتوں سے آپ جاگ رہے ہیں ــــ بلکہ جب سے یہاں آئے ہیں ، ایک لمحے کے لئے آپ کی آنکھ نہیں لگی ۔

امجد - مجھے نیند نہیں آتی سعیدہ۔

سعیدہ - کیوں؟

امجد - معلوم نہیں کیوں — بس ایسا لگتا ہے کہ نیند کبھی آئی تھی نہ آئے گی... میں تو وہ راتیں بھی یاد کرنا بھول گیا ہوں جب سویا کرتا تھا۔

سعیدہ - کاش، میں آپ کو اپنی نیند دے سکتی۔

امجد - نہیں سعیدہ — میں اتنی عزیز چیز تم سے نہیں چھیننا چاہتا — یہ تمہاری آنکھوں ہی کے لئے سلامت رہے جو نیند میں اور بھی زیادہ خوبصورت ہو جاتی ہیں — جاؤ، اب سو جاؤ۔

سعیدہ - میں کم بخت تو سو ہی جاؤں گی۔

امجد - ایسا نہ کہو — خدا تمہارے بخت بلند کرے جاؤ سو جاؤ۔

سعیدہ - (چڑ کر) آپ کیوں میرے ساتھ اتنی نرمی سے پیش آتے ہیں... امجد صاحب، مجھے اس سے بڑی وحشت ہوتی ہے — خدا کی قسم آپ کی یہ نرمی، یہ حلیمی، یہ انکسار، ایک دن مجھے پاگل بنا دے گا۔

(جھنجھلا کر تیزی سے مسہری کی طرف بڑھتی ہے اور خود کو بستر میں گرا دیتی ہے)

امجد - مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرے منہ سے جو باتیں نکلتی ہیں، وہ بھی ٹوٹی پھوٹی ہوتی ہیں۔

(سعیدہ خاموش رہتی ہے۔ کروٹ بدل کر وہ اپنا منہ دوسری طرف کر لیتی ہے — امجد اپنی گود میں سے کتاب اٹھاتا ہے اور اس کی ورق گردانی شروع کر دیتا ہے — سکوت کا عالم ہے۔ ہلکی ہلکی سبز روشنی میں یہ سکوت اور بھی زیادہ کثیف ہو گیا ہے — کافی لمبا عرصہ خاموشی میں گزرتا ہے، بڑی پُراسرار سی خاموشی میں — امجد کے چہرے پر روشنی لیمپ کے سبز غلاف کی طرح چڑھی ہے — اس کی نگاہیں کتاب سے ہٹ کر بار بار سعیدہ کی جانب اٹھتی ہیں، اور شرمسار ہو کر بے پاؤں لوٹ آتی ہیں — تھوڑی دیر کے بعد امجد بہت زیادہ مضطرب ہو جاتا ہے)۔

امجد - سعیدہ!

سعیدہ - جی!

امجد - میں — میں تم سے ایک درخواست کرنی چاہتا ہوں۔

سعیدہ - (کروٹ نہ بدلتے ہوئے) کیا؟

امجد - کیا... کیا آج ہماری پہلی رات ہو سکتی ہے.....

سعیدہ - (بستر میں لرزسی جاتی ہے)

امجد - ...رات — جو ابھی تک نہیں آئی۔

(سعیدہ خاموش رہتی ہے)

وقفہ

امجد - سعیدہ۔

سعیدہ - جی!

امجد - کیا تم میری یہ درخواست قبول کر سکتی ہو؟

سعیدہ - (کروٹ بدل کر امجد کو دیکھتی ہے ۔۔۔ اس کی آنکھوں میں سپردگی کی زخمی خواہش تیر رہی ہے) کیسے امجد صاحب!

امجد - جھوٹ موٹ ۔۔ محض میرے بہلاوے کے لئے ۔ تو یہ فرض کر لو کہ میں تمہارے پہلو میں لیٹا ہوں ۔۔ میں یہاں فرض کر لوں گا کہ تم میرے پہلو میں لیٹی ہو ۔۔ میں تم سے وہ باتیں شروع کر دوں گا جو پہلی رات کو مجھے تم سے کہنا تھیں ۔ تم اسی طرح جواب دینا، جس طرح کہ تمہیں دینا تھا ۔ میرے لئے ۔ میرے لئے تم یہ جھوٹ موٹ کا کھیل کھیل سکتی ہو سعیدہ ۔

سعیدہ - (آنکھوں میں سپردگی کی زخمی خواہش لئے ۔ گم سے آنسو تیر رہے ہیں) میں حاضر ہوں امجد صاحب ۔

امجد - شکریہ ۔

(طویل وقفہ)

امجد - آج ہماری پہلی رات ہے ۔۔ وہ رات جس میں جوانیاں ارض جنت کی طرف پہلا قدم اٹھاتی ہیں ۔۔۔ وہ رات جس کی تمام پہنائیوں میں وہ ہی قوس قزح لہلاتے ہیں اور ۔۔ ہو جاتے ہیں ۔۔ فرماؤ نہیں ۔ یہ رات تو وہ ہے جب تمام پوشیدہ حقیقتوں کے گھونگھٹ اٹھنے کے لئے بیتاب ہوتے ہیں ۔ ہلکی سی سرگوشی ۔۔ ایک چھوٹا سا مس، پیوستہ سانس کا ننھا سا ہلکورا بھی ان گھونگھٹوں کے پٹ کھول دیتا ہے ۔۔۔ اس قدر آہستہ کہ ۔۔ معلوم سرسراہٹ تک بھی نہیں ہوتی اور آدمی ۔۔ بیدار ۔۔۔ پورے دیدار کے تمام مراحل طے کر جاتا ہے ۔۔۔ یہ وہ رات ہے جب ۔۔ ستارے بھڑتی ہیں اور یہ افشاں دونوں زندگیوں کے ایک ماتھے پر چُنی جاتی ہے ۔ یہ وہ رات ہے ۔۔۔ پہلی رات ۔ سب سے پہلی ۔ جب آدم کی پسلیاں چیر کر حوا نکالی گئی تھی ۔۔۔ یہ وہ رات ہے جس کی درازیٔ عمر کے لئے شاعر دعائیں مانگ مانگ کر ۔۔ نہیں تھکا ۔۔۔ یہ وہ رات ہے جس کے حصول کے لئے جوانی کی جائے نماز بچھا کر زندگی اکثر سجدہ ریز رہی ہے ۔۔ یہ وہ رات ہے جس میں حجاب کی تمام گرہیں فطرت کے ناخن خود کھولتے ہیں ۔۔۔ یہ وہ رات ہے جب قدرت کے تمام کارخانے صرف ایک ہی پرزہ ڈھال رہے ہوتے ہیں ۔۔۔ وہ پرزہ جس نے کائنات کے ان تمام کارخانوں کو حرکت بخشی تھی ۔۔۔ یہ وہ رات ہے جب تمام آوازیں واپس اپنے گھروں میں چلی جاتی ہیں کہ اس آواز کا جلوس انتہائی آرام و سکون سے گذر جائے ۔ جس میں ۔۔ کی گونج ہے ۔۔۔۔ یہ وہ رات ہے جس کا پردہ اجالے سے بنا ہے ۔۔۔ یہ وہ رات ہے ۔۔ آنے والی رات جس کے حضور قبول پھیلائے بھیک کی منتظر کھڑی ہے ۔ یہ وہ رات ہے جب بدن ۔۔ ۔۔ کھول کے ۔۔ اور ۔۔ کھول کے سنتا ہے ۔ بڑے بڑے ان کہے راز ۔۔۔ بڑے بڑے ان کہے راگ ۔۔ دام ۔۔ لو ۔ ڈھانپ لو ۔۔ ڈھانپ لو ۔ سعیدہ اپنا بدن ڈھانپ لو ۔ یہ مجھے ڈس رہا ہے ۔۔۔ اس کا ایک ایک خط تلوار کی دھار ۔۔ میری روح خواہشوں پر پھر رہا ہے ۔ ڈھانپ لو ۔۔۔ خدا کے لئے اپنا جسم ڈھانپ لو ۔

سعیدہ - (ہلکی ہلکی سبز روشنی میں گھاس کی نرم نرم پتیوں سے بنی ہوئی لاش کے مانند لیٹی ہے ۔ اس کا بدن لرز رہا ہے ۔۔۔ ایک ایک انگ کانپ رہا ہے) جی!

امجد - ایک ایک ۔۔ نکلتا ہے، اپنا بدن ڈھانپ لو ۔

(سعیدہ اپنا لرزتا ہوا بدن کمبل سے ڈھانپ لیتی ہے ۔ امجد آنکھوں کے سامنے ہاتھ رکھے روتا رہتا ہے)

پردہ

پانچواں منظر

(نکاہ ولایت ۔۔ باغیچہ ۔۔۔ شام ۔۔ ۔ فوارے کا پانی کمل کھیل رہا ہے ۔ سائے گہرے ہو چکے ہیں ۔ پس منظر میں خاکستری پہاڑیاں

شام کے دھندلکوں میں رنگینی اختیار کر گئی ہیں۔ آسمان نے ایسا لگتا ہے اپنے بدن پر بھبوت مل لی ہے۔ تختوں کے سینے پر سبزہ خاموش لیٹا ہے۔ کرسیاں خالی ہیں —— ساری فضا خالی ہے۔ اس فریم کی طرح جس میں تصویر جڑی جانے والی ہے —— مجید اور سعیدہ کی ہنسی کی آواز آتی ہے —— چند لمحات کے بعد دونوں ہنستے، بڑی مشکل سے اپنی تھکاوٹ کا بوجھ اٹھاتے داخل ہوتے ہیں —— سعیدہ نڈھال ہو کر خود کو کرسی میں گرا دیتی ہے مجید اس کے پاس کھڑا رہتا ہے)

سعیدہ ۔ (رانوں پر مکیاں مارتے ہوئے) اُف —— ف!

مجید ۔ (ہنستا ہے) آپ تھک گئیں —— دبا دوں آپ کو؟

سعیدہ ۔ (گھبرا کر) نہیں نہیں —— اصغری کو بھیج دیجئے —— مجھ سے تو اب دو قدم بھی چلنا دشوار ہے۔

مجید ۔ (مسکراتا ہے) بہتر —— (آگے بڑھ کر سعیدہ کے چہرے پر پڑے سنہرے بالوں کی آوارہ لٹ انگلیوں سے اٹھا کر ایک طرف کر دیتا ہے)

سعیدہ ۔ (بہت زیادہ گھبراہٹ سے) میں جاتی ہوں اندر۔ (اٹھنے لگتی ہے)

مجید ۔ (ایک طرف دیکھ کر) لو وہ اصغری خود ہی آ گئی —— آؤ، اصغری —— بھابی جان کے پاؤں دبا دو۔

(اصغری داخل ہوتی ہے —— اس کے ہونٹوں سے اختتامی لہرے کپکپا رہے ہیں جیسے کچھ کہنے کے لئے تڑپ رہے ہیں۔ پاس آ جاتی ہے)

اصغری ۔ (سعیدہ سے) دلہن بیگم تھک گئیں آج؟

سعیدہ ۔ (رانوں پر مکیاں مارتے ہوئے) ہاں!

اصغری ۔ (گھاس پر بیٹھ کر، سعیدہ کی ایک پنڈلی دبانا شروع کرتی ہے۔ خطاب مجید سے ہے) یہ سب مجید میاں کا قصور ہے۔ ... اتنی بڑی سیر اور اتنی جلدی ... (بیچ میں ٹکا پوچھے) ہر چیز دھیرے دھیرے ہونی چاہیئے (ہولے ہولے دباتی ہے، اس طرح —— ہولے ہولے (سعیدہ سے) کیوں دلہن بیگم —— کچھ آرام محسوس ہوا آپ کو؟

سعیدہ ۔ (دوسری ٹانگ جو اصغری کی گرفت سے آزاد ہے، اضطراب کا شدید مظاہرہ کرتی ہے) ٹھیک ہے، ٹھیک ہے!

اصغری ۔ (مجید سے) مجید میاں، آپ جائیں —— منہ ہاتھ دھو آئیں —— گرد و غبار سے آپ کا چہرہ بالکل ان دھویا آلو بنا ہوا ہے۔

مجید ۔ (تیزی سے) تم بہت گستاخ ہو گئی ہو —— یہ سب ...

اصغری ۔ (مجید کی بات کاٹ کر) دلہن بیگم کا قصور جنہوں نے سب کچھ منہ لگا لیا ہے (سعیدہ کے چہرے کی طرف دیکھ کر) ایسا خوبصورت منہ!

(مجید نگاہوں ہی نگاہوں میں غصہ برساتا چلا جاتا ہے)

اصغری ۔ (ہنستی ہے) مجید میاں کی شکل و صورت یوں تو ماشاء اللہ بڑی اچھی ہے —— مگر غصے میں ہمیشہ بگڑ جاتی ہے —— آپ کا کیا خیال ہے۔

سعیدہ ۔ تم مجھ سے ایسی باتیں نہ کیا کرو (اٹھنا چاہتی ہے مگر اصغری کی مضبوط گرفت کے باعث نہیں اٹھ سکتی) چھوڑ دو مجھے۔

اصغری ۔ (دباتے ہوئے) میں اس خدمت سے خود کو چھڑانا نہیں چاہتی (سعیدہ کے پاؤں سے سینڈل اتارتی ہے) مجید میاں کہہ رہے تھے، میں گستاخ ہو گئی ہوں —— کیا یہ درست ہے دلہن بیگم۔

سعیدہ ۔ بالکل درست ہے۔

اصغری ۔ (بڑے اطمینان سے سعیدہ کے پاؤں کی انگلیاں چٹخاتے ہوئے) تو یہ بہت بری بات ہے —— نوکرانی کو گستاخ کبھی نہیں ہونا چاہیئے —— آپ میرے کان کھینچئے۔

سعیدہ ۔ خاموش رہو!

اصغری - یہ ظلم ہے —— زبان بندی بہت بڑا ظلم ہے دولہن بیگم —— میں نے ایسی کونسی بات کی جو آپ کو ناگوار گذری۔

سعیدہ - (اضطراب کے ساتھ) تمہاری سب باتیں مجھے ناگوار گزرتی ہیں۔

اصغری - اصغری بے چاری اب کیا کہے۔ (توقف کے بعد) میں تو یہ سمجھتی تھی کہ آپ جیسی لکھی پڑھی بیگم کی نوکری میں اس ایک برس کے اندر اندر مجھے سب کچھ آگیا ہے۔ پر اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں غلط سمجھی تھی —— میں نے آپ سے کچھ بھی نہیں سیکھا؟ —— لیکن یہ کس کا قصور ہے؟ سیکھنے والے کا یا سکھانے والے کا؟

سعیدہ - (اپنی دونوں آنکھیں ایک حد تک میچتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں) تم کہنا کیا چاہتی ہو؟

اصغری - (مصنوعی حیرت سے) میں؟

سعیدہ - ہاں تم —— کیا کہنا چاہتی ہو تم؟

اصغری - (سوچتے ہوئے) کہنے کو تو میں بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں ——

سعیدہ - (اٹھ کر ننگے پاؤں گھاس پر چلتے ہوئے) تو کہہ ڈالو سچ —— مجھے تمہاری ہر روز کی مہین مہین چٹکیاں پسند نہیں —— جو تم کہنا چاہتی ہو، میں سننے کے لئے تیار ہوں۔

اصغری - آپ بڑی ہمت والی ہیں دولہن بیگم۔

سعیدہ - میں ہمت والی ہوں، یا بزدل ہوں تم اسے چھوڑو... جو کہنا چاہتی ہو آج اگل ڈالو۔

اصغری - یہ بات آپ کو اور مجھے دونوں کو تکلیف دے گی

سعیدہ - میری تکلیف کا تم کچھ خیال نہ کرو —— میں برداشت کر لوں گی۔

اصغری - (ہنستے ہوئے) میں سمجھی تھی میرے دانتوں سے دبی ہوئی انگاری دیکھ کر آپ ڈر جائیں گی۔ پر اب ایسا لگتا ہے کہ آپ چلتی چلتی ایسی جگہ پہنچ گئی ہیں جہاں زمانہ کی کوئی پروا نہیں رہتی —— اب تو مجھے خوف آنے لگا ہے آپ سے۔

سعیدہ - (اضطراب سے ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے) اصغری!

اصغری - (چونک کر) جی!

سعیدہ - تم مجھے یہ بتاؤ —— اگر امجد میاں گاڑی کے حادثے میں مر جاتے تو میں کیا کرتی؟

اصغری - آپ! —— مجھے معلوم نہیں آپ کیا کرتیں۔

سعیدہ - میں جوان ہوں، خوبصورت ہوں —— میرے سینے میں ایسے ہزاروں ارمان ہیں جو میں سترہ برس تک اپنے خیالوں کا شہد پلا پلا کر پالتی رہی ہوں۔ میں ان کا گلا نہیں گھونٹ سکتی —— میں نے بہت کوشش کی ہے اصغری —— میرا خدا جانتا ہے، میں نے بہت کوشش کی ہے، لیکن میں اپنے ہاتھوں کو اس قتل پر آمادہ نہیں کر سکی —— تم مجھے کمزور کہہ لو —— بزدل کہہ لو —— اخلاق باختہ کہہ لو..... تم ایک نوکرانی ہو —— میں تمہارے سامنے اعتراف کرتی ہوں کہ میں اپنی جوانی کا باغ، جس کے پتے پتے، بوٹے بوٹے میں میرے کنوارے ارمانوں کا گرم گرم خون دوڑ رہا ہے، اپنے ہاتھوں سے نہیں اجاڑ سکتی... ویسے میں کسی کو بھی اجازت دے سکتی ہوں کہ وہ میری آنکھیں بند کر کے —— نہیں —— میرے تمام حواس میں تالے لگا کر بڑھاپے اور رنڈاپے کی عمیق ترین گہرائیوں میں اتار دے —— یا ایک ہی بار دھکا دے کر مجھے اپنے ارمانوں کی لرزتی ہوئی چٹانوں کی چوٹیوں پر سے نیچے گرا دے۔ جن پر میں اس وقت تک دامن سمیٹے تند ہواؤں کا مقابلہ کرتی رہی ہوں —— میں تم کو بھی اس کی اجازت دیتی ہوں۔

اصغری ۔ (شکست خوردہ اُٹھتی ہے) بس دولہن بیگم ۔

سعیدہ ۔ میں ایک ایسے دوراہے پر کھڑی ہوں اصغری، جہاں زمین میرے قدموں کے نیچے گھوم رہی ہے ۔ جب بھی راستے کی طرف منہ کرتی ہوں وہی مجھ سے منہ موڑ لیتا ہے ——— میں جو ارادہ کرتی ہوں، مجھ سے اپنا دامن چھڑا کے بھاگ جاتا ہے، میں اس کے پیچھے بھاگتی ہوں ——— اندھا دھند دوڑتی ہوں اور جب اسے پکڑ لیتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ریت کا بنا تھا ۔ میرے پکڑتے پکڑتے ہی ڈھیر ہو جاتا ہے ——— اصغری تم نہیں جانتی ہو، میں کتنی دیر سے انگاروں کے بستر پر لوٹ رہی ہوں ۔ بجھانے کے لئے میں ان پر پانی ڈالتی ہوں تو بھاپ کے ایسے بگولے اُٹھتے ہیں جو مجھے اپنے ساتھ اونچائیوں میں لے جاتے ہیں اور جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر ایک دم نیچے دے پٹکتے ہیں ——— میری قسمت پھوٹی، اس کی پسلی چور ہو چکی ہے اصغری ...... کیا ہی اچھا ہوتا اگر امجد صاحب کے بدلے میں اپاہج ہوئی ہوتی ۔

(طویل وقفہ ——— اصغری خاموش کھڑی رہتی ہے ——— سعیدہ اضطراب میں اِدھر اُدھر ٹہلتی رہتی ہے)

سعیدہ ۔ بتاؤ، مجھے کیا کرنا چاہیئے ۔

اصغری ۔ (محویت کے عالم سے بیدار ہوتی ہے) کیا کرنا چاہیئے؟ ——— آپ کو ——— آپ کو امجد میاں کی موت کا انتظار کرنا چاہیئے ۔

سعیدہ ۔ (کچھ دیر سوچ کر) تم مجھے انتہا درجے کی سنگدل کہو گی ——— لیکن میں پوچھتی ہوں ——— انہیں کب موت آئے گی ۔

اصغری ۔ جب اللہ میاں کو منظور ہو گا (بڑبڑاتی ہے) لیکن امجد میاں کی دوستی تو ان سے ختم ہو چکی ہے ۔

سعیدہ ۔ کیا کہا؟

اصغری ۔ جی، کچھ نہیں ۔

(اکھڑے اکھڑے قدم اُٹھاتی اصغری چلی جاتی ہے ——— سعیدہ ننگے پاؤں گھاس کے ٹھنڈے ٹھنڈے فرش پر اضطراب کی حالت میں ٹہلتی رہتی ہے)

پردہ

چھٹا منظر

(نگار ولا ——— ڈرائینگ روم ——— وسیع و عریض کمرہ جو پرانی وضع کے ساز و سامان سے آراستہ ہے ہر چیز وزنی اور پائیدار ہے ——— دیواروں پر آئل پینٹنگز آویزاں ہیں ۔ جو خاندان کے مختلف افراد کی ہیں ۔ ایک پینٹنگ بیگم کی ہے ۔ جب کہ وہ جوان تھی ۔ اس پینٹنگ کے نیچے بیگم ایک صوفے پر بیٹھی تقابل پیش کر رہی ہے ۔ تصویر میں وہ بے فکر ہے مگر صوفے میں سخت فکرمند ۔ اس کا چہرہ غم واندوہ کا مجموعہ ہے کوئی اندرونی چیز گھل رہی ہے ۔ اگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے خیالات (انگار) کے اُلجھے ہوئے دھاگے کبھی سلجھاتی ہے کبھی کھولتی ہے ——— اصغری داخل ہوتی ہے)

بیگم صاحب ۔ نجید میاں ملے؟

اصغری ۔ جی ہاں ۔

بیگم صاحب ۔ کہاں تھے؟

اصغری ۔ باغیچے میں ۔

بیگم صاحب ۔ کیا کر رہے تھے؟

اصغری۔ جی! — (ڈرنگ کر) جو لیکے بیٹھے تھے۔
بیگم صاحب۔ (اصغری کی طرف دیکھ کر نگاہیں نیچی کر کے) آ رہے ہیں۔
اصغری۔ جی ہاں!
بیگم صاحب۔ تم جاؤ۔

(اصغری چلی جاتی ہے —— مجید اس کی طرف دیکھتا اندر داخل ہوتا ہے)

مجید۔ کیا بات ہے امی جان!
بیگم صاحب۔ کچھ نہیں —— بیٹھ جاؤ۔
مجید۔ (پاس ہی صوفے کی دوسری کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) یہاں سردی ہے۔
بیگم صاحب۔ ہاں —— یہاں سردی ہے۔

(وقفہ)

مجید۔ (بے چینی محسوس کرتے ہوئے) میرا خیال ہے —— آپ نے مجھے یہاں کچھ کہنے کے لئے بلایا ہے۔
بیگم صاحب۔ ہاں!
مجید۔ فرمائیے!
بیگم صاحب۔ میں تمہیں یہاں سے بھیجنا چاہتی ہوں۔
مجید۔ مجھے! (اٹھ کر) کہاں؟
بیگم صاحب۔ بیٹھ جاؤ۔
مجید۔ (بیٹھ جاتا ہے) یہ بھیجئے۔
بیگم صاحب۔ میں نے ابھی امجد سے بات نہیں کی۔
مجید۔ (پھر اٹھ کھڑا ہوتا ہے) کون سی۔
بیگم صاحب۔ یہی تمہیں یہاں سے بھیجنے کی۔
مجید۔ لیکن آپ مجھے یہاں سے کیوں بھیج رہی ہیں ... میرا مطلب ہے کوئی خاص کام ہے یا!
بیگم صاحب۔ بیٹھ جاؤ۔
مجید۔ (بیٹھ جاتا ہے) کوئی خاص کام ہے!
بیگم صاحب۔ نہیں۔
مجید۔ تو پھر مجھے یہاں سے کہیں باہر بھیجنے کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی ہے۔
بیگم صاحب۔ کہ میں اسی میں بہتری سمجھتی ہوں۔
مجید۔ بہتری! — کس کی بہتری؟
بیگم صاحب۔ ہم سب کی — اس گھر کی۔
مجید۔ (اٹھ کھڑا ہوتا ہے) آپ پہیلیوں میں بات کر رہی ہیں امی جان۔

بیگم صاحب ۔ مجید تم میرے لڑکے ہو، میں تمہاری ماں ہوں ـــــ میرے تمہارے درمیان کوئی ایسی گفتگو نہیں ہونی چاہیئے جو اس مقدس رشتے پر
دھبہ سا بن کر لگ جائے ـــــ میں چاہتی ہوں کہ تم آج ہی کراچی چلے جاؤ اور جب تک میں کہوں وہیں رہو۔

مجید ۔ لیکن امی جان ـــــ

بیگم صاحب ۔ (بات کاٹ کر) تمہارے وہاں بے شمار دوست موجود ہیں۔ مجھے یقین ہے، تم ان کی مدد سے، یا خود اپنی ہمت سے اس منجدھار میں
سے جسے زندگی کہتے ہیں اپنی کشتی صحیح و سلامت کنارے لے جاؤ گے۔

مجید ۔ (کچھ کہنا چاہتا ہے مگر کہہ نہیں سکتا اور بیٹھ جاتا ہے) بہت بہتر ـــــ میں چلا جاؤں گا۔

بیگم صاحب ۔ تمہارا فیصلہ ...... (ایک دم خاموش ہو جاتی ہے)۔

(کمرے میں امجد اپاہجوں والی کرسی میں داخل ہوتا ہے جسے کریم چلا رہا ہے)

امجد ۔ (مجید سے) یار مجید، تم بھی عجیب آدمی ہو ـــــ میں وہاں کمرے میں بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا تھا کہ تم آؤ گے تو ہم دونوں سعیدہ کی سالگرہ کے تحفے
کے متعلق سوچیں گے ـــــ لیکن تم یہاں بیٹھے ہو (بیگم صاحب سے) امی جان ـــــ آپ نے کیا سوچا ـــــ کیسا تحفہ ہونا چاہیئے ـــــ میں تو سوچ
سوچ کر پاگل ہو گیا ہوں۔

بیگم صاحب ۔ تم سعیدہ سے کیوں نہیں پوچھتے۔

امجد ۔ لو اور سنو (ہنستا ہے) حد کر دی آپ نے امی جان ـــــ اس سے مشورہ لیا تو تحفے کا مزا کیا خاک آئے گا (مجید سے) کیوں مجید؟

(مجید خاموش رہتا ہے)

امجد ۔ بولو یار۔

مجید ۔ (اُٹھ کر) آپ امی جان سے پوچھئے ـــــ میں تو جا رہا ہوں۔

امجد ۔ (حیرت سے) جا رہے ہو؟ ـــــ کہاں جا رہے ہو؟

مجید ۔ کراچی!

امجد ۔ یقیناً تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے ـــــ کیا کرنے جا رہے ہو کراچی؟

مجید ۔ کیا کرنے جا رہا ہوں (پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ) منجدھار میں سے اپنی کشتی نکالنے۔

امجد ۔ (بیگم سے) کیا ہو گیا ہے اسے (مجید سے) بیٹھو یار ـــــ پرسوں اس کی سالگرہ ہے ـــــ ابھی ابھی فیصلہ ہو جانا چاہیئے۔

مجید ۔ فیصلہ تو ہو چکا ہے۔

امجد ۔ کیا؟

مجید ۔ کہ میں کراچی جا رہا ہوں اور پھر کبھی واپس نہیں آؤں گا۔

امجد ۔ کیا بکتے ہو (بیگم سے) امی جان، یہ قصہ کیا ہے؟

بیگم صاحب ۔ کچھ نہیں ـــــ ماں بیٹے میں لڑائی ہو گئی کسی بات پہ۔

امجد ۔ کس بات پر؟

بیگم صاحب ۔ تم نہیں پوچھ سکتے۔

امجد ۔ معمولی سی تو ہوتی ہے ـــــ لیکن مجید میرا بھائی ہے ـــــ آپ کے اور اس کے درمیان اگر کوئی رنجش یا غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے تو اسے دور کرنا

میرا فرض ہے — مجید کو میں آپ سے زیادہ جانتا ہوں — اس سے ایسی کوئی غلطی سرزد نہیں ہو سکتی۔ جو آزار کا موجب ہو —
(مجید سے) ادھر آؤ مجید۔

مجید۔ بھائی جان، مجھے اپنا اسباب بندھوانا ہے۔

امجد۔ لاحول ولا — یہ سب کیا ہے — (بیگم سے) امی جان — خدا کے لئے اسے روک لیجئے — میرے لئے نہیں تو سعیدہ کے لئے روک لیجئے۔ اس گھر میں ایک صرف یہی ہے جس نے ابھی تک اسے اداس نہیں ہونے دیا — میری خاطر اتنی زحمت برداشت کرتا ہے — اگر آپ نے اسے جانے دیا تو امی جان، میں نہیں جانتا میرا کیا حال ہوگا — سعیدہ کو سیر کے لئے لے جاتا ہے تو میں تصور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس کے ہمراہ ہوں۔ اس کے ساتھ کوئی کھیل کھیلتا ہے تو وہ خلا بہت حد تک پورا ہو جاتا ہے جو قدرت کے بے رحم ہاتھوں نے میری زندگی میں پیدا کر رکھا ہے — میں تو کئی بار سوچتا ہوں، مجید، اگر تیرا بھائی مجید نہ ہوتا تو کیا تیری شکستہ زندگی کا ملبہ تو اس قابل نہیں تھا کہ گھورے پر پڑا ہوتا — امی جان اسے روک لیجئے — یہ تو میرا بازو ہے . . . کیوں آپ اس کو مجھ سے جدا کر رہی ہیں — اللہ میاں کی جگہ نہ لیجئے امی جان (رونے لگتا ہے)

مجید۔ میں جا رہا ہوں امی جان۔

بیگم صاحب۔ ٹھہرو!

مجید۔ (رک جاتا ہے)

بیگم صاحب۔ (اٹھتی ہے اور امجد کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہے) امجد بیٹا — روؤ نہیں جانِ مادر — مجید نہیں جائے گا — جو چیز جہاں ہے وہیں رہے گی اس لئے کہ اسے یہی منظور ہے (مجید سے) مجید — بھائی کے پاس بیٹھو اور سعیدہ کی سالگرہ کے متعلق سوچو (چلی جاتی ہے)

(مجید کچھ دیر سوچتا ہے۔ پھر امجد کی کرسی کی طرف بڑھتا ہے)

مجید۔ (آہستہ) بھائی جان، آپ مجھے جانے دیں۔

امجد۔ (جھکا ہوا سر اٹھا کر) جانے دوں؟ — کہاں جانے دوں! — پاگل مت بنو۔

مجید۔ آپ نہیں سمجھتے بھائی جان۔

امجد۔ میں سب سمجھتا ہوں — اپنا رومال نکالو اور ذرا میرے یہ آنسو پونچھ دو۔

مجید۔ (تھوڑے توقف کے بعد اپنا رومال نکالتا ہے اور امجد کے آنسو پونچھتا ہے — جلدی جلدی)

امجد۔ کیا کرتے ہو یار — تمہیں تو آنسو پونچھنا بھی نہیں آتا — (مسکراتا ہے) اتنا معمولی سا کام ہے۔

مجید۔ یہ معمولی کام نہیں بھائی جان۔

امجد۔ (مسکرا کر) اچھا بھائی بڑا بھاری جوکھوں کا کام ہے — آؤ ادھر بیٹھو — سعیدہ کی سالگرہ کے تحفے کے متعلق سوچیں۔ بیٹھو۔

مجید۔ (امجد کے پاس کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) سوچئے۔

امجد۔ (آہ بھر کر) سوچتے ہیں بھائی سوچتے ہیں — سوچنے کے علاوہ اب اور کام ہی کیا ہے۔ لیکن ذرا تم بھی سوچو۔

(مجید اور امجد دونوں سوچ میں مستغرق ہو جاتے ہیں)

پردہ

ساتواں منظر

(نگار دلہ سے ملحقہ بغیچہ ——— شام کا وقت۔ فوارے کا پانی بند ہے جیسے وہ اُبل اُبل کر عاجز آچکا ہے۔ پس منظر میں خاکستری پہاڑیاں دھندلکوں میں اپنی سنگینیاں جیسے چھپا رہی ہیں۔ فرش پر سبزہ روندا ہُوا سا معلوم ہوتا ہے۔ دائیں طرف، فوارے سے دور ہٹ کر گھنی جھاڑیاں جن کے عقب میں امجد اپاہجوں والی کرسی میں بیٹھا ہے۔ پُشت پہ اصغری کرسی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہے ——— وہ اسے چلانے لگتی ہے)

امجد۔ نہیں اصغری ——— کچھ دیر ٹھہرو۔

اصغری۔ (ٹھہر جاتی ہے) لیکن امجد میاں . . .

امجد۔ میں آج اپنی زندگی کا آخری زخم کھانا چاہتا ہوں۔

اصغری۔ یہ زخم کھانا اگر آپ ضروری سمجھتے ہیں تو اپنے تصوّر ہی میں کھا سکتے ہیں ——— لیکن . . . . یہ زخم تو آپ کے لگ چکا ہے . . . . اسے دوبارہ کیوں کھلوانا چاہتے ہیں آپ ؟

امجد۔ (مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے) میری حالت میں جو آدمی ہو اس کے بدصورت ہونے کی کوئی حد نہیں رہتی ——— اپنے زخموں کے ٹانکے کھول کھول کر دیکھتا ہے۔ انگوروں کی زبانی ٹیلیوں کی داستانیں سنتا ہے اور خود کو بہت بڑا شہید سمجھتا ہے . . . (ہنستا ہے) اصغری تمہاری کبھی کوئی چیز ٹوٹی نہیں، اس لئے تم لوگوں کا دردناک حال نہیں جانتی ہو جو عجز کی انتہا کو پہنچ کر شکست و ریخت میں بلند بام عمارتیں بناتے ہیں۔

اصغری۔ (مسکراتی ہے) میں تو ان حدوں سے بھی آگے نکل گئی ہوں امجد میاں ——— بڑی اونچی اونچی عمارتیں بنا کر خود اپنے ہاتھوں سے ڈھا چکی ہوں ——— ایسا کرتے کرتے تو میرے دل میں بل گئے پڑ چکے ہیں۔

امجد۔ (کانپ جاتا ہے) اصغری ——— تم بڑی خوفناک ہو۔

اصغری۔ (ہنستی ہے) ہر اجاڑ خوفناک ہوتی ہے ——— حالانکہ بیچاری کیا خوفناک ہو سکتی ہے۔ اسے اپنے ماتم سے اتنی فرصت ہی کہاں ملتی ہے جو دوسروں کو ڈرائے ——— وہ تو خود دبکی ہوئی سہمی ہوئی ہوتی ہے۔

امجد۔ تمہاری زندگی بھی کسی حادثے سے دوچار ہوئی !

اصغری۔ جی نہیں ——— اس جی کی زندگی کسی حادثے سے کیا دوچار ہوگی جو کہ خود ایک حادثہ ہے۔

امجد۔ تمہاری باتوں سے جلے ہوئے گوشت کی بو آتی ہے۔

اصغری۔ اس لئے کہ اب آپ کی سونگھنے کی حِس جاگی ہوئی ہے۔

امجد۔ پہلے سو رہی تھی۔

اصغری۔ جی ہاں ——— بہت گہری نیند۔

امجد۔ اسے جگایا کس نے ہے ؟

اصغری۔ اس گاڑی نے جو پٹڑی سے اُتر گئی۔

امجد۔ (بڑبڑاتا ہے) اس گاڑی نے ——— جو پٹڑی سے اُتر گئی . . . (ذرا بلند آواز میں) کیا یہ پھر پٹڑی سے اُترے گی ؟

اصغری۔ جو اللہ میاں کو منظور ہے وہی ہوگا۔

امجد۔ اللہ میاں کا نام مت لو ——— میری اس کی دوستی ختم ہو چکی ہے۔

اصغری۔ نہیں امجد میاں، اس شخص سے ہم ایسوں کی دوستی کبھی ختم نہیں ہوتی ——— ٹوٹ ٹوٹ کے آپ جڑتی رہتی ہے۔

امجد۔ یہ سب بکواس ہے۔

(دونوں ایک دم جھجکتے ہیں۔ قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے ——— مجید اور سعیدہ ہانپتے ہوئے نمودار ہوتے ہیں ——— سعیدہ جو بہت تھکی ہوئی ہے، تالاب کی منڈیر پر بیٹھ جاتی ہے۔ مجید کھڑا رہتا ہے)

سعیدہ۔ آج تو میں بہت تھک گئی ہوں۔

مجید۔ حالانکہ ہم زیادہ دور نہیں گئے۔

سعیدہ۔ ہاں!

(وقفہ)

مجید۔ کیا ہی اچھا ہوتا، اگر میں کراچی چلا گیا ہوتا۔

سعیدہ۔ اچھا ہی ہوتا۔

مجید۔ میری جان عجب مشکل میں پھنس گئی ہے ——— میں کراچی چلا جاتا ... لیکن سوال ہے کیا میں اس منجدھار میں سے اپنی کشتی کھے کر کنارے لے جاتا؟ ——— نہیں ——— میں ضرور ناکام رہتا۔

سعیدہ۔ مجھے معلوم ہے۔

مجید۔ تمہیں معلوم ہے ——— مجھے معلوم ہے ——— سوائے بھائی جان کے اور سب کو معلوم ہے اور یہی اس کہانی کا سب سے المناک حصہ ہے۔

سعیدہ۔ میں نے کئی بار سوچا ہے کہ انہیں کہہ دوں، لیکن (آنکھ بھر آتی ہے) مجھے ڈر ہے، وہ اس صدمے کی تاب نہ لا سکیں گے۔

مجید۔ مجھے خود اس بات کا ڈر ہے ——— ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ایک برس اور زندہ رہیں گے ... غریب سے زندگی کا مختصر عرصہ چھیننا ظلم ہے۔

(جھاڑیوں کے عقب میں امجد اپنے دانت بھینچ لیتا ہے ——— اصغری مضبوطی سے اس کا کندھا پکڑ لیتی ہے)

سعیدہ۔ ہمیشہ کوشش کرنی چاہیئے کہ جب تک وہ زندہ رہیں، خوش رہیں۔ ان کے احساسات کے نازک آبگینوں کو ہلکی سی ٹھیس بھی نہ لگے ....

مجید۔ اور اگر ہمارا کوئی بھالا رنگ ڈھنگ کے پھوٹ پڑا تو ..

سعیدہ۔ (قریب قریب چیخ کر) تو قیامت آ جائے گی۔

مجید۔ اسی لئے میں سوچتا ہوں کہ میں چلا جاؤں ..... جب تک بھائی جان ....

سعیدہ۔ (ایک دم بات کاٹ کر) ایسا نہ کہو مجید ——— اتنے ظالم مت بنو۔

(امجد، اپاہجوں کی کرسی میں لرز جاتا ہے، اصغری اس کا دوسرا کندھا بھی مضبوطی سے پکڑ لیتی ہے)

مجید۔ محبت بڑی ظالم اور خود غرض ہوتی ہے سعیدہ ——— کم بخت دوسروں کی موت پہ ناچنے کی خواہش کرتے ہوئے بھی نہیں شرماتی۔

سعیدہ۔ ہمیں ایسے خیال اپنے دماغ میں نہیں لانے چاہئیں۔

مجید۔ ٹھیک ہے ——— لیکن آ جائیں تو کیا کریں۔

سعیدہ۔ کیا کر سکتے ہیں ——— چلو۔

(سعیدہ، کرنش کی جانب چلتی ہے ——— مجید اس کے پیچھے آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہے ——— جھاڑیوں کے عقب میں اپاہجوں والی کرسی میں امجد کا سر جھکا ہوا ہے۔ اس کے پیچھے اصغری بُت بنی کھڑی ہے)

اصغری۔ چلیں ؟

امجد۔ (اسی طرح سر جھکائے) نہیں ——— ابھی نہیں ——— میں سوچ رہا ہوں۔

اصغری۔ کیا ؟

امجد۔ معلوم نہیں ——— شاید یہ سوچ رہا ہوں کہ مجھے اب کیا سوچنا چاہیئے۔

اصغری۔ ایسی سوچ بچار بالکل فضول ہوتی ہے۔

امجد۔ (سر اُٹھا کر) فضول تو ہوتی ہے ——— مگر پھر کیا کروں ——— (وقفے کے بعد) وہ اتنے ظالم نہیں ہیں جتنی تم ہو ——— تم تو مجھے سوچنے سے بھی منع کرتی ہو ——— تم بڑی ظالم ہو اصغری!

اصغری۔ (مسکرا کر) محبت بڑی ظالم اور خود غرض ہوتی ہے امجد میاں ——— کم بخت اپنی موت پر بھی تلملانے سے باز نہیں آتی۔

امجد۔ میرے سامنے آؤ۔

(اصغری، امجد کے سامنے آتی ہے۔ امجد اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا ہے ——— کچھ سوچتا ہے اور بڑبڑاتا ہے)

امجد۔ یہ کتاب اب تک کہاں پڑی تھی۔

اصغری۔ کہیں ردی کی ٹوکری میں ——— اپنی صحیح جگہ !

امجد۔ چلو ——— مجھے لے چلو۔

(اصغری کرسی کھینچتی ہے اور کرنش کی جانب چلتی ہے)

پردہ

آٹھواں منظر

(وہی کمرہ جو پہلے، دوسرے اور چوتھے منظر میں ہے۔ رات کا وقت ——— چھت سے سبز روشنی کی پھوار گر رہی ہے ——— ہر شئے کا اصلی رنگ بدلا ہوا ہے۔ جیسے اعصاب زدہ مریضوں کا ——— مسہری خالی ہے۔ کچھ اس طور پر خالی جیسے وہ کبھی آباد ہی نہیں تھی ——— اصغری، امجد کو اپاہجوں والی کرسی میں اندر لاتی ہے)

اصغری۔ دولہن بیگم، بیگم صاحب کے کمرے میں کیوں چلی گئیں ؟

امجد۔ ڈرتی تھی۔

اصغری۔ آپ سے ؟

امجد۔ (مسکرا کر) مجھ سے کوئی کیا ڈرے گا ——— وہ اپنے آپ سے ڈرتی تھی۔

اصغری۔ وہ اتنی کمزور نہیں ہیں امجد میاں۔

امجد۔ وقت بڑے بڑے پہاڑ کھوکھلے کر دیتا ہے ——— وہ تو ایک جوان لڑکی ہے۔

اصغری۔ (توقف کے بعد) آپ سونا چاہیں گے اب ؟

امجد۔ سنا! ...... (ہنستا ہے) مذاق مت اُڑاؤ اصغری ـــ میرے جلتے ہوئے زخموں کی توہین ہوتی ہے۔

اصغری۔ (توقف کے بعد) کیا آپ کو سعیدہ سے محبت ہے؟

امجد۔ نہیں۔

اصغری۔ تو پھر یہ جلتے ہوئے زخم کیسے؟

امجد۔ مجھے سوچنے دو ...... بولو اجازت دیتی ہو سوچنے کی؟

اصغری۔ آپ سوچئے۔

(طویل وقفہ جس میں امجد سوچ میں غرق رہتا ہے)

امجد۔ مجھے سعیدہ سے محبت نہیں ہے ـــ جس طرح مارکٹ سے آدمی اچھی چیز چن کے لاتا ہے ـــ اسی طرح میں نے سینکڑوں لڑکیوں میں سے اسے انتخاب کرکے اپنی بیوی بنایا تھا ـــ مجھے اپنے اس انتخاب پر ناز تھا اور بجا ناز تھا ـــ سعیدہ مبالغے کی حد تک خوبصورت ہے ـــ اس پر میرا صرف اتنا حق ہے کہ میں نے اُسے چنا اور اپنی رفیقۂ حیات بنایا ـــ اس حیات کا جواب کٹی ہوئی اسی کرسی میں ڈھیر ہے ـــ جو کبھی دوسرے کی مدد کے بغیر ہل تک نہیں سکتی ...... ڈاکٹروں نے مجھے زیادہ سے زیادہ ایک سال اور زندہ رہنے کے لئے دیا ہے ...... مجھ میں نہیں آتا میں کیوں اس عرصے تک اس کو ایسی زنجیروں میں باندھ کے رکھنا چاہتا ہوں، جن کا ہر حلقہ میری اپنی زندگی کی طرح غیر یقینی ہے ...... کچھ سمجھ میں نہیں آتا ...... (سوچتے ہوئے) اس کی جوان خوبصورتی ہی ایک وجہ ہو سکتی ہے (ایک دم چونک کر) یہی ایسی ـــ یہی وجہ ہے اور کوئی نہیں ...... (تکلیف محسوس کرتا ہے) اوہ ـــ اوہ ...... وہ نظارہ ـــ وہ نظارہ ...... مجھے بھول سکتا ہے۔ کبھی وہ نظارہ ...... اس مسہری میں جوان خوبصورتی اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ لیٹی دُنیا کی حسین ترین ملبوسات کو شرمسار کر رہی تھی ...... یہ نظارہ میرے ساتھ چمٹ گیا ہے ـــ نہیں، میں اس کے ساتھ چمٹ گیا ہوں ...... (وقفے کے بعد) اصغری!

اصغری۔ (چونک کر) جی!

امجد۔ کوئی ایسی صورت ہو سکتی ہے جو یہ چمل کر پنجہ میرے وجود سے علیحدہ ہو جائے۔

اصغری۔ ہر مشکل کی جو لی میں اس کو آسان کرنے کی ترکیب چھپی ہوتی ہے۔

امجد۔ تو ڈھونڈنی چاہیئے ...... لیکن ...... لیکن مجھے حجاب کیوں محسوس ہوتا ہے۔

اصغری۔ معلوم نہیں کیوں ـــ یہ مشکل، آپ ہی کی مشکل ہے۔ اس کے لیے آپ کا ہاتھ کسی نامحرم کا ہاتھ نہیں ہوگا۔

امجد۔ جانتا ہوں ...... میں اپنے دل کی ان تمام ناخلف نسوں سے واقف ہوں جو اس غلط جذبے کی دھڑکنیں پیدا کرتی ہیں ـــ لیکن آج اس کا فیصلہ ہو جائے گا۔

اصغری۔ کس کا؟

امجد۔ میرے سامنے آؤ۔

(اصغری امجد کے سامنے آ جاتی ہے)

امجد۔ جاؤ، مسہری میں لیٹ جاؤ۔

اصغری۔ (جھجکا کر) امجد میاں ـــ مجھ میں وہ جوان خوبصورتی نہیں ہے۔ جس کی رعنائیاں دُنیا کے حسین ترین ملبوسات کو شرمسار کر سکیں ـــ میری جوانی زنگ خوردہ ہے اسے ٹاٹ کی شرمندۂ احسان ہونا چاہیئے ہے۔

امجد - مسہری میں لیٹ جاؤ اصغری -

اصغری - (آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے ہیں) نہیں امجد میاں —— مسہری کو تکلیف ہوگی —— یہ دولہن بیگم کے نرم اور نازک بدن کی عادی ہے -

امجد - میں تمہیں حکم دیتا ہوں -

اصغری - (سر جھکا کر) آپ مالک ہیں (مسہری میں لیٹ جاتی ہے —— آنکھیں چھت میں گڑ جاتی ہیں) -

امجد - جانتی ہو آج کون سی رات ہے ؟ . . . . . وہ رات ہے - جب ایک تڑپتی ہوئی جوانی اور زیادہ تڑپ کر سالمیت اختیار کرنے والی ہے —— یہ قیامت کی رات ہے ! فنا کی رات —— - اس کے اندھیاروں میں وجود ، عدم کی بھٹیوں میں پگھل کر ایک غیر فانی قالب اختیار کرے گا . . . . . . یہ وہ رات ہے جس کے بعد اور کوئی رات نہیں آئے گی ، اس کی اندھی آنکھوں میں ایسے کاجل سے تحریریں ہوں گی جو انہیں ہمیشہ کے لئے روشن کر دیں گی —— یہ وہ رات ہے ، جب موت کے پھڑکتے ہوئے تھنوں سے زندگی کے آخری قطرے ٹپک کر خود بخود ہی باہر آ جائیں گے —— یہ وہ رات ہے جب شکستگی اپنی کوکھ سے سربلند ایوانوں کو جنم دے گی —— ایسے سربلند ایوان جن کے کنگروں کو عرش کی بلند ترین اونچائیوں سے ہمکلام ہونے کا شرف حاصل ہوگا - یہ وہ رات ہے ، جب زمزم کا سارا پانی رینگ رینگ کر زمین کی تہوں میں چھپ جائے گا . اس کے بدلے خاک اڑے گی - جس سے پاکیزہ روحیں تیمم کریں گی —— یہ وہ رات ہے - جب کاتب تقدیر اپنا قلمدان اوندھا کر کے عرش کے کسی کونے میں منہ دے کر روئے گا . . . . یہ وہ رات ہے جس میں امجد اس دنیا کی تمام خوبصورتیوں کو تین دفعہ طلاق دیتا ہے اور ایک بدصورتی کو اپنے رشتۂ مناکحت میں لاتا ہے . . . . (ایک دم چیختا ہے) اصغری —— اصغری !

(اس دوران میں اصغری مسہری پر سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس پہنچ کر اسے کھول چکی ہے
اور اس کی سل پر کھڑی ہو کر نیچے گہرائیوں میں دیکھ رہی ہے)

امجد - (چیخ کر) یہ کیا کر رہی ہو اصغری ؟

اصغری - (کھڑکی کی سل پر مڑ کر امجد کو دیکھتی ہے) ایجاب و قبول ضروری ہے میرے مالک !

(نیچے کود جاتی ہے)

امجد - (دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ڈھانپ کر) اصغری ! . . (ہاتھ ہٹاتا ہے اور چند لمحات کھلی کھڑکی کے اندھیرے کو دیکھتا رہتا ہے جو سبز دیوار میں تاریک زخم کے مانند منہ کھولے ہے) ایجاب و قبول ! . . . . . (بڑبڑاتا ہے) ایجاب و قبول واقعی ضروری ہے (زور لگا کر دونوں ہاتھوں سے اپنی کرسی آگے کو کھینچتا ہے —— بڑی مشکل سے کھڑکی کے پاس پہنچ جاتا ہے) . . . . مجھے مشکل کو آسان کرنے کا یہ راستہ معلوم تھا . . . . . مگر شاید کسی انگلی پکڑنے والے کی ضرورت تھی . . . .

(کھڑکی کی سل دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ پکڑتا ہے اور اپنا اپاہج جسم
بڑی دقتوں سے اوپر اٹھاتا ہے اور دوسری طرف لٹکنا شروع کر دیتا ہے)

امجد - میری پہاڑیاں —— میری پیاری پہاڑیاں —— میری پیاری اصغری !

(اگلا دھڑ نیچے کھسکتا ہے اور ایک دم اس کا سارا وجود اندھیرا کھا جاتا ہے)

(پردہ)

نیا قانون

(منٹو کے افسانے' میں سے)

منگو کوچوان اپنے اڈے میں بہت عقلمند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈے کے وہ تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ اُستاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔

پچھلے دنوں جب اُستاد منگو نے اپنی ایک سواری سے اسپین میں جنگ چھڑ جانے کی افواہ سُنی تھی۔ تو اس نے گاما چودھری کے چوڑے کاندھے پر تھپکی دے کر مدبرانہ انداز میں پیش گوئی کی تھی "دیکھ لینا چودھری، تھوڑے ہی دنوں میں اسپین کے اندر جنگ چھڑ جائے گی"

اور جب گاما چودھری نے اس سے یہ پوچھا تھا کہ اسپین کہاں واقع ہے تو اُستاد منگو نے بڑی متانت سے جواب دیا تھا "ولایت میں اور کہاں؟"

اسپین میں جنگ چھڑی اور جب ہر شخص کو اس کا پتہ چل گیا تو اسٹیشن کے اڈے میں جتنے کوچوان حلقہ بنائے حقہ پی رہے تھے۔ دل ہی دل میں اُستاد منگو کی بڑائی کا اعتراف کر رہے تھے اور اُستاد منگو اس وقت مال روڈ کی چمکیلی سطح پر تانگہ چلاتے ہوئے اپنی سواری سے تازہ ہندو مسلم فساد پر تبادلۂ خیال کر رہا تھا۔

اس روز شام کے قریب جب وہ اڈے میں آیا تو اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر تمتمایا ہوا تھا۔ حقے کا دور چلتے چلتے جب ہندو مسلم فساد کی بات چھڑی تو اُستاد منگو نے سر پر سے خاکی پگڑی اتاری اور بغل میں داب کر بڑے مفکرانہ لہجے میں کہا:۔

"یہ کسی پیر کی بد دعا کا نتیجہ ہے کہ آئے دن ہندوؤں اور مسلمانوں میں چاقو، چھریاں چلتے رہتے ہیں اور میں نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ اکبر بادشاہ نے کسی درویش کا دل دکھایا تھا اور اس درویش نے جل کر یہ بد دعا دی تھی، جا، تیرے ہندوستان میں ہمیشہ فساد ہوتے رہیں گے ——— اور دیکھ لو جب سے اکبر بادشاہ کا راج ختم ہوا ہے۔ ہندوستان میں فساد پر فساد ہوتے رہتے ہیں" یہ کہہ کر اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور پھر حقے کا دم لگا کر اپنی بات شروع کی "یہ کانگرسی ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ میں کہتا،

یہ لوگ ہزار سال بھی سر پٹکتے رہیں تو کچھ نہ ہوگا۔ بڑی سے بڑی بات یہ ہوگی کہ انگریز چلا جائے گا اور کوئی اٹلی والا آجائے گا۔ یا وہ روس والا جس کی بابت میں نے سنا ہے کہ بہت تگڑا آدمی ہے۔ لیکن ہندوستان سدا غلام رہے گا۔ ہاں میں یہ کہنا بھول ہی گیا کہ پیر نے یہ بددعا بھی دی تھی کہ ہندوستان پر ہمیشہ باہر کے آدمی راج کرتے رہیں گے۔"

استاد منگو کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی اور اس نفرت کا سبب تو وہ یہ بتلایا کرتا تھا کہ وہ اس کے ہندوستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں مگر اس کے تنفر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اسے بہت ستایا کرتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے گویا وہ ایک ذلیل کتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے ان کا رنگ بھی بالکل پسند نہ تھا۔ جب کبھی وہ گورے کے سرخ و سپید چہرے کو دیکھتا تو اسے متلی سی آجاتی۔ نہ معلوم کیوں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ان کے لال جھریوں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجاتی ہے جس کے جسم پر سے اوپر کی جھلی گل گل کر جھڑ رہی ہو!

جب کسی شرابی گورے سے اس کا جھگڑا ہو جاتا تو سارا دن اس کی طبیعت مکدر رہتی اور وہ شام کو اڈے میں آکر ہل مارکہ سگریٹ پیتا یا حقے کے کش لگاتے ہوئے اس گورے کو جی بھر کر سنایا کرتا۔

"......" یہ موٹی گالی دینے کے بعد وہ اپنے سر کو ڈھیلی پگڑی سمیت جھٹکا دے کر کہا کرتا تھا: "آگ لینے آئے تھے۔ اب گھر کے مالک ہی بن گئے ہیں۔ ناک میں دم کر رکھا ہے ان بندروں کی اولاد نے۔ یوں رعب گانٹھتے ہیں۔ گویا ہم ان کے باوا کے نوکر ہیں......"

اس پر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا۔ جب تک اس کا کوئی ساتھی اس کے پاس بیٹھا رہتا۔ وہ اپنے سینے کی آگ اگلتا رہتا۔

"شکل دیکھتے ہو نا تم اس کی...... جیسے کوڑھ ہو رہا ہے —— بالکل مردار، ایک دھپے کی مار اور گٹ پٹ گٹ پٹ یوں بک رہا تھا جیسے مار ہی ڈالے گا۔ تیری جان کی قسم، پہلے پہل جی میں آئی کہ ملعون کی کھوپڑی کے پرزے اڑا دوں۔ لیکن اس خیال سے ٹل گیا کہ اس مردود کو مارنا اپنی ہتک ہے"...... یہ کہتے کہتے وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو جاتا اور ناک کو خاکی قمیص کی آستین سے صاف کرنے کے بعد پھر بڑبڑانے لگ جاتا۔

"قسم ہے بھگوان کی، ان لاٹ صاحبوں کے ناز اٹھاتے اٹھاتے تنگ آگیا ہوں۔ جب کبھی ان کا منحوس چہرہ دیکھتا ہوں۔ رگوں میں خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ کوئی نیا قانون وانون بنے تو ان لوگوں سے نجات ملے۔ تیری قسم جان میں جان آجائے۔"

اور جب ایک روز استاد منگو نے کچہری سے اپنے تانگے پر دو سواریاں لادیں اور ان کی گفتگو سے اسے پتہ چلا کہ ہندوستان میں جدید آئین کا نفاذ ہونے والا ہے۔ تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

دو مارواڑی جو کچہری میں اپنے دیوانی مقدمے کے سلسلے میں آئے تھے۔ گھر جاتے ہوئے جدید آئین یعنی انڈیا ایکٹ کے متعلق آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔

"سنا ہے کہ پہلی اپریل سے ہندوستان میں نیا قانون چلے گا —— کیا ہر چیز بدل جائے گی؟"

"ہر چیز تو نہیں بدلے گی مگر کہتے ہیں کہ بہت کچھ بدل جائے گا اور ہندوستانیوں کو آزادی مل جائے گی۔"

"کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟"

"یہ پوچھنے کی بات ہے۔ کل کسی وکیل سے دریافت کریں گے۔"

ان مارواڑیوں کی بات چیت استاد منگو کے دل میں ناقابل بیان خوشی پیدا کر رہی تھی۔ وہ اپنے گھوڑے کو ہمیشہ گالیاں دیتا تھا اور چابک سے بہت بری طرح پیٹا کرتا تھا۔ مگر اس روز وہ بار بار پیچھے مڑ کر مارواڑیوں کی طرف دیکھتا اور اپنی بڑھی ہوئی مونچھوں کے بال ایک انگلی سے

بڑی صفائی کے ساتھ اُڈ بچے کے گھوڑے کی پیٹھ پر باگیں ڈھیلی کرتے ہوئے بڑے پیار سے کہتا: "چل بیٹا - چل بیٹا ——— ذرا ہوا سے باتیں کرکے دکھا دے۔"

مارواڑیوں کو ان کے ٹھکانے پہنچا کر اُس نے انارکلی میں دینو حلوائی کی دکان پر آدھ سیر دہی کی لسی پی کر ایک بڑی ڈکار لی اور مونچھوں کو منہ میں دبا کر ان کو چوستے ہوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہا: "ہت تیری ایسی کی تیسی۔"

شام کو جب وہ اڈے کو لوٹا تو خلاف معمول اُسے وہاں اپنی جان پہچان کا کوئی آدمی نہ مل سکا۔ یہ دیکھ کر اس کے سینے میں ایک عجیب و غریب طوفان برپا ہو گیا۔ آج وہ ایک بڑی خبر اپنے دوستوں کو سنانے والا تھا ——— بہت بڑی خبر، اور اس خبر کو اپنے اندر سے باہر نکالنے کے لئے وہ سخت مجبور ہو رہا تھا۔ لیکن وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔

آدھ گھنٹے تک وہ چابک بغل میں دبائے اسٹیشن کے اڈے کی آہنی چھت کے نیچے بے قراری کی حالت میں ٹہلتا رہا۔ اُس کے دماغ میں بڑے اچھے اچھے خیالات آ رہے تھے۔ نئے قانون کے نفاذ کی خبر نے اُس کو ایک نئی دنیا میں لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ وہ اس نئے قانون کے متعلق جو پہلی اپریل کو ہندوستان میں نافذ ہونے والا تھا، اپنے دماغ کی تمام بتیاں روشن کرکے غور و فکر کر رہا تھا۔ اُس کے کانوں میں مارواڑی کا یہ اندیشہ "کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟" بار بار گونج رہا تھا اور اُس کے تمام جسم میں مسرت کی ایک لہر دوڑا رہا تھا۔ کئی بار اپنی گھنی مونچھوں کے اندر ہنس کر اُس نے ان مارواڑیوں کو گالی دی: "   غریبوں کی کھٹیا میں گھسے ہوئے کھٹمل ——— نیا قانون ان کے لئے کھولتا ہوا پانی ہوگا۔"

وہ بے حد مسرور تھا۔ خاص کر اس وقت اُس کے دل کو بہت ٹھنڈک پہنچی جب وہ خیال کرتا کہ گوروں ——— سفید چوہوں (وہ اُن کو اسی نام سے یاد کیا کرتا تھا) کی تھوتھنیاں نئے قانون کے آتے ہی بلوں میں ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائیں گی۔

جب نتھو گنجا، پگڑی بغل میں دبائے، اڈے میں داخل ہوا تو استاد منگو بڑھ کر اس سے ملا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بلند آواز سے کہنے لگا: "لا ہاتھ ادھر   ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے ——— تیری اس گنجی کھوپڑی پر بال اُگ آئیں۔"

اور یہ کہہ کر منگو نے بڑے   مزے لے لے کر نئے قانون کے متعلق اپنے دوست سے باتیں شروع کر دیں۔ دوران گفتگو میں اُس نے کئی مرتبہ نتھو گنجے کے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مار کر کہا: "تو دیکھتا رہ، کیا بنتا ہے۔ یہ روس والا بادشاہ کچھ نہ کچھ ضرور کرکے رہے گا۔"

استاد منگو موجودہ سوویٹ نظام کی اشتراکی سرگرمیوں کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا اور اُسے وہاں کے نئے قانون اور دوسری نئی چیزیں بہت پسند تھیں۔ اسی لئے اُس نے "روس والے بادشاہ" کو "انڈیا ایکٹ" یعنی جدید آئین کے ساتھ ملا دیا اور پہلی اپریل کو پرانے نظام میں جو نئی تبدیلیاں ہونے والی تھیں۔ وہ انہیں "روس والے بادشاہ" کے اثر کا نتیجہ سمجھتا تھا۔

کچھ عرصے سے پشاور اور دیگر شہروں میں سرخ پوشوں کی تحریک جاری تھی۔ استاد منگو نے اس تحریک کو اپنے دماغ میں "روس والے بادشاہ" اور پھر نئے قانون کے ساتھ خلط ملط کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ جب کبھی وہ کسی سے سنتا کہ فلاں شہر میں اتنے بم ساز پکڑے گئے ں۔ یا فلاں جگہ اتنے آدمیوں پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا ہے، تو ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیش خیمہ سمجھتا اور دل ہی دل ں بہت خوش ہوتا تھا۔

ایک روز اُس کے تانگے میں دو بیرسٹر بیٹھے نئے آئین پر بڑے زور سے تنقید کر رہے تھے اور وہ خاموشی سے اُن کی باتیں سن رہا تھا۔ ےمیں سے ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا:

"جدید آئین کا دوسرا حصہ فیڈریشن ہے جو میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا۔ ایسی فیڈریشن دنیا کی تاریخ میں آج تک نہ سنی نہ دیکھی گئی ہے۔ اسی نظریے کے اعتبار سے بھی یہ فیڈریشن بالکل غلط ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ یہ کوئی فیڈریشن ہے ہی نہیں!"

ان بیرسٹروں کے درمیان جو گفتگو ہوئی چونکہ اس میں بیشتر الفاظ انگریزی کے تھے۔ اس سے استاد منگو صرف اوپر کے جملے ہی کو کسی قدر سمجھا اور اس نے خیال کیا۔ یہ لوگ ہندوستان میں نئے قانون کی آمد کو برا سمجھتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ ان کا وطن آزاد ہو۔ چنانچہ اس خیال کے زیر اثر اس نے کئی مرتبہ ان دو بیرسٹروں کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھ کر دل ہی دل میں کہا "ٹوڈی بچے!"

جب کبھی وہ کسی کو دبی زبان میں "ٹوڈی بچہ" کہتا تو دل میں یہ محسوس کرکے بڑا خوش ہوتا تھا کہ اس نے اس نام کو صحیح جگہ استعمال کیا ہے اور یہ کہ وہ شریف آدمی اور "ٹوڈی بچے" میں تمیز کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اس واقعے کے تیسرے روز وہ گورنمنٹ کالج کے تین طلبا کو اپنے تانگے میں بٹھا کر مزنگ جا رہا تھا کہ اس نے ان تین لڑکوں کو آپس میں یہ باتیں کرتے سنا۔

"نئے آئین نے میری امیدیں بڑھا دی ہیں اگر ..... صاحب اسمبلی کے ممبر ہو گئے تو کسی سرکاری دفتر میں ملازمت ضرور مل جائے گی۔"

"ویسے بھی بہت سی جگہیں اور نکلیں گی۔ شاید اسی گڑبڑ میں ہمارے ہاتھ بھی کچھ آ جائے۔"

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں۔"

"وہ بیکار گریجویٹ جو مارے مارے پھر رہے ہیں۔ ان میں کچھ تو کمی ہو گی۔"

اس گفتگو نے استاد منگو کے دل میں جدید آئین کی اہمیت اور بھی بڑھا دی اور وہ اس کو ایسی "چیز" سمجھنے لگا جو بہت چمکتی ہو۔ "نیا قانون ...!" وہ دن میں کئی بار سوچتا۔ "یعنی کوئی نئی چیز!" اور ہر بار اس کی نظروں کے سامنے اپنے گھوڑے کا وہ نیا ساز آ جاتا جو اس نے دو برس ہوئے چوہدری خدا بخش سے بڑی اچھی طرح ٹھونک بجا کر خریدا تھا۔ اس ساز پر جب وہ نیا تھا۔ جگہ جگہ لوہے کی نکل چڑھی ہوئی کیلیں چمکتی تھیں اور جہاں جہاں پیتل کا کام تھا۔ وہ تو سونے کی طرح دمکتا تھا۔ اس لحاظ سے بھی "نئے قانون" کا درخشاں و تاباں ہونا ضروری تھا۔

یہاں تک استاد منگو نے جدید آئین کے خلاف اور اس کے حق میں بہت کچھ سنا۔ مگر اس کے متعلق جو تصور وہ اپنے ذہن میں قائم کر چکا تھا، بدل نہ سکا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پہلی اپریل کو نئے قانون کے آتے ہی سب معاملہ صاف ہو جائے گا اور اس کو یقین تھا کہ اس کی آمد پر جو چیزیں نظر آئیں گی۔ ان سے اس کی آنکھوں کو ضرور ٹھنڈک پہنچے گی۔

آخر مارچ کے اکتیس دن ختم ہو گئے اور اپریل کے شروع ہونے میں رات کے چند خاموش گھنٹے باقی رہ گئے۔ موسم خلاف معمول سرد تھا اور ہوا میں تازگی تھی۔ پہلی اپریل کو صبح سویرے استاد منگو اٹھا اور اصطبل میں جا کر تانگے میں گھوڑے کو جوتا اور باہر نکل گیا۔ اس کی طبیعت آج غیر معمولی طور پر مسرور تھی ——— وہ نئے قانون کو دیکھنے والا تھا۔

اس نے صبح کے سرد دھندلکے میں کئی تنگ اور کھلے بازاروں کا چکر لگایا مگر اسے ہر چیز پرانی نظر آئی ——— آسمان کی طرح پرانی۔ اس کی نگاہیں آج خاص طور پر نیا رنگ دیکھنا چاہتی تھیں مگر سوائے اس کلغی کے جو رنگ برنگ کے پروں سے بنی تھی اور اس کے گھوڑے کے سر پر جمی ہوئی تھی، اور سب چیزیں پرانی نظر آتی تھیں۔ یہ نئی کلغی اس نے نئے قانون کی خوشی میں ۳۱ مارچ کو چوہدری خدا بخش سے ساڑھے چودہ آنے میں خریدی تھی۔

گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز، کالی سڑک اور اس کے آس پاس تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر لگائے ہوئے بجلی کے کھمبے، دکانوں کے بورڈ، اس کے گھوڑے کے گلے میں پڑے ہوئے گھنگھرو کی جھنجھناہٹ، بازار میں چلتے پھرتے آدمی ..... ان میں سے کون سی چیز نئی تھی! ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں، لیکن استاد منگو مایوس نہیں تھا۔

"ابھی بہت سویرا ہے۔ دکانیں بھی تو سب کی سب بند ہیں۔" اس خیال سے اُسے تسکین تھی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچتا تھا: "ہائی کورٹ میں نو بجے کے بعد ہی کام شروع ہوتا ہے۔ اب اس سے پہلے نئے قانون کا کیا نظر آئے گا؟"

جب اُس کا تانگہ گورنمنٹ کالج کے دروازے کے قریب پہنچا۔ تو کالج کے گھڑیال نے بڑی رعونت سے نو بجائے۔ جو طلبا کالج کے بڑے دروازے سے باہر نکل رہے تھے۔ خوش پوش تھے۔ مگر اُستاد منگو کو نہ جانے اُن کے کپڑے میلے میلے سے کیوں نظر آئے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس کی نگاہیں آج کسی خیرہ کُن جلوے کا نظارہ کرنے والی تھیں۔

تانگے کو دائیں ہاتھ موڑ کر وہ تھوڑی دیر کے بعد پھر انارکلی میں تھا۔ بازار کی آدھی دکانیں کھل چکی تھیں اور اب لوگوں کی آمد و رفت بھی بڑھ گئی تھی۔ حلوائی کی دکانوں پر گاہکوں کی خوب بھیڑ تھی۔ منہاری والوں کی نمائشی چیزیں شیشے کی الماریوں میں لوگوں کو دعوت نظارہ دے رہی تھیں اور بجلی کے تاروں پر کئی کبوتر آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ مگر اُستاد منگو کے لئے ان تمام چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی ـــ وہ نئے قانون کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ اپنے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔

جب اُستاد منگو کے گھر میں بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ تو اُس نے چار پانچ مہینے بڑی بے قراری میں گذارے تھے۔ اُس کو یقین تھا کہ بچہ کسی نہ کسی دن ضرور پیدا ہوگا۔ مگر وہ انتظار کی گھڑیاں نہیں کاٹ سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے بچے کو صرف ایک نظر دیکھ لے۔ اس کے بعد وہ پیدا ہوتا رہے۔ چنانچہ اسی غیر مغلوب خواہش کے زیر اثر اس نے کئی مرتبہ اپنی بیمار بیوی کے پیٹ کو دبا دبا کر اور اس کے اوپر کان رکھ رکھ کر اپنے بچے کے متعلق کچھ جاننا چاہا تھا مگر ناکام رہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ انتظار کرتے کرتے اس قدر تنگ آگیا تھا کہ اپنی بیوی پر برس بھی پڑا تھا۔

"تو ہر وقت مُردے کی طرح پڑی رہتی ہے۔ اُٹھ ذرا چل پھر، تیرے انگ میں تھوڑی سی طاقت تو آئے۔ یوں تختہ بنے رہنے سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ تو سمجھتی ہے کہ اس طرح لیٹے لیٹے بچہ جن دے گی؟"

اُستاد منگو طبعاً بہت جلد باز واقع ہوا تھا۔ وہ ہر سبب کی عملی تشکیل دیکھنے کا نہ صرف خواہشمند تھا بلکہ متجسس تھا۔ اس کی بیوی گنگا دئی اس کی اس قسم کی بیقراریوں کو دیکھ کر عام طور پر یہ کہا کرتی تھی۔ "ابھی کنواں کھودا نہیں گیا اور تم پیاس سے بیحال ہو رہے ہو۔"

کچھ بھی ہو مگر اُستاد منگو نئے قانون کے انتظار میں اتنا بے قرار نہیں تھا جتنا کہ اُسے اپنی طبیعت کے لحاظ سے ہونا چاہئے تھا۔ وہ آج نئے قانون کو دیکھنے کے لئے گھر سے نکلا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے وہ گاندھی یا جواہر لال کے جلوس کا نظارہ کرنے کے لئے نکلتا تھا۔

لیڈروں کی عظمت کا اندازہ اُستاد منگو ہمیشہ اُن کے جلوس کے ہنگاموں اور اُن کے گلے میں ڈالے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے کیا کرتا تھا۔ کوئی لیڈر گیندے کے پھولوں سے لدا ہو تو اُستاد منگو کے نزدیک وہ بڑا آدمی تھا اور اگر کسی لیڈر کے جلوس میں بھیڑ کے باعث دو تین فساد ہوتے ہوتے رہ جائیں تو اُس کی نگاہوں میں وہ اور بھی بڑا تھا۔ اب نئے قانون کو وہ اپنے ذہن کے اسی ترازو میں تولنا چاہتا تھا۔

انارکلی سے نکل کر وہ مال روڈ کی چمکیلی سطح پر اپنے تانگے کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا کہ موٹروں کی دکان کے پاس اُسے چھاؤنی کی ایک سواری مل گئی۔ کرایہ طے کرنے کے بعد اُس نے اپنے گھوڑے کو چابک دکھایا اور دل میں یہ خیال کیا۔

"چلو یہ بھی اچھا ہوا ـــ شاید چھاؤنی ہی سے نئے قانون کا کچھ پتہ چل جائے۔"

چھاؤنی پہنچ کر اُستاد منگو نے سواری کو اس کی منزل مقصود پر اُتار دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر بائیں ہاتھ کی آخری دو انگلیوں میں سلگایا اور اگلی نشست کے گدے پر بیٹھ گیا ـــ جب اُستاد منگو کو کسی سواری کی تلاش نہیں ہوتی تھی یا اُسے کسی بیتے ہوئے واقعے

پھر مڑکر نا ہوتا تو وہ عام طور پر اگلی نشست چھوڑ کر پچھلی نشست پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر اپنے گھوڑے کی باگیں دائیں ہاتھ کے گرد لپیٹ لیا کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کا گھوڑا تھوڑا سا ہنہنانے کے بعد بڑی دھیمی چال چلنا شروع کر دیتا تھا۔ گویا اُسے کچھ دیر کے لئے بھاگ دوڑ سے چھٹی مل گئی ہے۔

گھوڑے کی چال اور اُستاد منگو کے دماغ میں خیالات کی آمد بہت سست تھی۔ جس طرح گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اُٹھا رہا تھا۔ اُسی طرح اُستاد منگو کے ذہن میں نئے قانون کے متعلق نئے قیاسات داخل ہو رہے تھے۔

وہ نئے قانون کی موجودگی میں میونسپل کمیٹی سے تانگوں کے نمبر ملنے کے طریقے پر غور کر رہا تھا اور اس قابلِ غور بات کو آئین جدید کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کر رہا تھا۔ وہ اس سوچ بچار میں غرق تھا۔ اُسے یوں معلوم ہوا جیسے کسی سواری نے اُسے بلایا ہے۔ پیچھے پلٹ کر دیکھنے سے اُسے سڑک کے اُس طرف دور بجلی کے کھمبے کے پاس ایک "گورا" کھڑا نظر آیا جو اُسے ہاتھ سے بلا رہا تھا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، اُستاد منگو کو گوروں سے بے حد نفرت تھی۔ جب اُس نے اپنے تازہ گاہک کو گورے کی شکل میں دیکھا تو اُس کے دل میں نفرت کے جذبات بیدار ہو گئے۔ پہلے تو اُس کے جی میں آئی کہ بالکل توجہ نہ دے اور اُس کو چھوڑ کر چلا جائے مگر بعد میں اُس کو خیال آیا: "ان کے پیسے چھوڑنا بھی بیوقوفی ہے۔ کلغی پہ جو مفت میں ساڑھے چودہ آنے خرچ کر دیئے ہیں۔ ان کی جیب ہی سے وصول کرنے چاہئیں۔ چلو چلتے ہیں۔"

خالی سڑک پر بڑی صفائی سے تانگہ موڑ کر اُس نے گھوڑے کو چابک دکھایا اور آنکھ جھپکنے میں وہ بجلی کے کھمبے کے پاس تھا۔ گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اُس نے تانگہ ٹھہرایا اور پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھا:۔

"صاحب بہادر کہاں جانا مانگتا ہے؟"

اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا۔ صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھنچ گیا اور پاس ہی گال کے اس طرف جو مدھم سی لکیر ناک کے نتھنے سے ٹھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آ رہی تھی۔ ایک لرزش کے ساتھ گہری ہو گئی گویا کسی نے نکیلے چاقو سے شیشم کی سانولی لکڑی میں دھاری ڈال دی ہے۔ اس کا سارا چہرہ ہنس رہا تھا اور اپنے اندر اس نے اس "گورے" کو سینے کی آگ میں جلا کر بھسم کر ڈالا تھا۔

جب "گورے" نے جو بجلی کے کھمبے کی اوٹ میں ہوا کا رُخ بچا کر سگرٹ سلگا رہا تھا۔ مڑ کر تانگے کے پائیدان کی طرف قدم بڑھایا تو اچانک اُستاد منگو کی اور اس کی نگاہیں چار ہوئیں اور ایسا معلوم ہوا کہ بیک وقت آمنے سامنے کی بندوقوں سے گولیاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشیں بگولا بن کر اُوپر کو اُڑ گئیں۔

اُستاد منگو جو اپنے دائیں ہاتھ سے باگ کے بل کھول کر تانگے پر سے نیچے اُترنے والا تھا۔ اپنے سامنے کھڑے "گورے" کو یوں دیکھ رہا تھا۔ گویا وہ اس کے وجود کے ذرے ذرے کو اپنی نگاہوں سے چبا رہا ہے اور گورا کچھ اس طرح اپنی نیلی پتلون پر سے غیر مرئی چیزیں جھاڑ رہا ہے۔ گویا وہ اُستاد منگو کے اس حملے سے اپنے وجود کے کچھ حصے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

گورے نے سگرٹ کا دھواں نگلتے ہوئے کہا "جانا مانگتا یا پھر گڑبڑ کریگا؟"

"وہی ہے" یہ الفاظ اُستاد منگو کے ذہن میں پیدا ہوئے اور اس کی چوڑی چھاتی کے اندر ناچنے لگے۔

"وہی ہے" اُس نے یہ الفاظ اپنے منہ کے اندر ہی اندر دہرائے اور ساتھ ہی اُسے پورا یقین ہو گیا کہ وہ گورا جو اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہی ہے جس سے پچھلے برس اُس کی جھڑپ ہوئی تھی اور اس خواہ مخواہ کے جھگڑے میں جس کا باعث گورے کے دماغ میں چڑھی ہوئی

شراب تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ بہت سی باتیں سہنا پڑی تھیں۔ اُستاد منگو نے گورے کا دماغ درست کر دیا ہوتا بلکہ اُس کے پرخچے اُڑا دیئے ہوتے مگر وہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر خاموش ہو گیا تھا۔ اُس کو معلوم تھا کہ اس قسم کے جھگڑوں میں عدالت کا نزلہ عام طور پر کوچوانوں ہی پر گرتا ہے۔

اُستاد منگو نے پچھلے برس کی لڑائی اور پہلی اپریل کے نئے قانون پر غور کرتے ہوئے گورے سے کہا "کہاں جانا مانگتا ہے؟"

اُستاد منگو کے لہجے میں چابک ایسی تیزی تھی۔

گورے نے جواب دیا "ہیرا منڈی۔"

"کرایہ پانچ روپے ہوگا" اُستاد منگو کی مونچھیں تھرتھرائیں۔

یہ سُن کر گورا حیران ہو گیا۔ وہ چلّایا "پانچ روپے۔ کیا تم ——؟"

"ہاں، ہاں، پانچ روپے" یہ کہتے ہوئے اُستاد منگو کا داہنا بالوں بھرا ہاتھ بھنچ کر ایک وزنی گھونسے کی شکل اختیار کر گیا۔ "کیوں جاتے ہو یا بیکار باتیں بناؤ گے؟"

اُستاد منگو کا لہجہ زیادہ سخت ہو گیا۔

گورا پچھلے برس کے واقعے کو پیشِ نظر رکھ کر اُستاد منگو کے سینے کی چوڑائی نظر انداز کر چکا تھا۔ وہ خیال کر رہا تھا کہ اس کی کھوپڑی پھر کھجلا رہی ہے۔ اس حوصلہ افزا خیال کے زیرِ اثر وہ تانگے کی طرف اکڑ کر بڑھا اور اپنی چھڑی سے اُستاد منگو کو تانگے پر سے نیچے اُترنے کا اشارہ کیا۔ بید کی یہ پالش کی ہوئی پتلی چھڑی اُستاد منگو کی موٹی ران کے ساتھ دو تین مرتبہ چھوئی۔ اس نے کھڑے کھڑے اُوپر سے پستہ قد گورے کو دیکھا۔ گویا وہ اپنی نگاہوں کے وزن ہی سے اُسے پیس ڈالنا چاہتا ہے۔ پھر اُس کا گھونسہ کمان میں سے تیر کی طرح سے اُوپر کو اُٹھا اور چشم زدن میں گورے کی ٹھوڑی کے نیچے جم گیا۔ دھکا دے کر اُس نے گورے کو پرے ہٹایا اور نیچے اُتر کر اُسے دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔

ششدر و متحیر گورے نے اِدھر اُدھر سمٹ کر اُستاد منگو کے وزنی گھونسوں سے بچنے کی کوشش کی اور جب دیکھا کہ اس کے مخالف پر دیوانگی کی سی حالت طاری ہے اور اس کی آنکھوں میں سے شرارے برس رہے ہیں تو اُس نے زور زور سے چلّانا شروع کیا۔ اس چیخ و پکار نے اُستاد منگو کی باہوں کا کام اور بھی تیز کر دیا۔ وہ گورے کو جی بھر کے پیٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ کہتا جاتا تھا:۔

"پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں ... پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں —— اب ہمارا راج ہے بچہ؟"

لوگ جمع ہو گئے اور پولیس کے دو سپاہیوں نے بڑی مشکل سے گورے کو اُستاد منگو کی گرفت سے چھڑایا۔ اُستاد منگو اُن دو سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اُس کی چوڑی چھاتی پھولی ہوئی سانس کی وجہ سے اُوپر نیچے ہو رہی تھی۔ منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا اور اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے حیرت زدہ مجمع کی طرف دیکھ کر وہ ہانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔

"وہ دن گزر گئے جب خلیل خاں فاختہ اُڑایا کرتے تھے —— اب نیا قانون ہے میاں —— نیا قانون!"

اور بیچارہ گورا اپنے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ بیوقوفوں کے مانند کبھی اُستاد منگو کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی ہجوم کی طرف۔

اُستاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے میں لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر کمرے میں وہ "نیا قانون، نیا قانون" چلّاتا رہا مگر کسی نے ایک نہ سُنی۔

"نیا قانون، نیا قانون، کیا بک رہے ہو —— قانون وہی ہے پرانا!"

اور اُس کو حوالات میں بند کر دیا گیا!

شہید ساز

('نمرود کی خدائی' میں سے)

میں گجرات کاٹھیاواڑ کا رہنے والا ہوں۔ ذات کا بنیا ہوں۔ پچھلے برس جب تقسیم ہندوستان کا ٹنٹا ہوا تو میں بالکل بیکار تھا۔ معاف کیجئے گا میں نے لفظ ٹنٹا استعمال کیا۔ مگر اس کا کوئی حرج نہیں۔ اس لئے کہ اردو زبان میں باہر کے الفاظ آنے ہی چاہئیں۔ چاہے وہ گجراتی ہی کیوں نہ ہوں۔

جی ہاں، میں بالکل بیکار تھا۔ لیکن کوکین کا تھوڑا سا کاروبار چل رہا تھا۔ جس سے کچھ آمدن کی صورت ہو ہی جاتی تھی۔ جب بٹوارہ ہوا اور ادھر کے آدمی ادھر اور ادھر کے ادھر ہزاروں کی تعداد میں آنے جانے لگے تو میں نے سوچا چلو پاکستان چلیں۔ کوکین کا نہ سہی کوئی اور کاروبار شروع کر دوں گا۔ چنانچہ وہاں سے چل پڑا اور راستے میں مختلف قسم کے چھوٹے چھوٹے دھندے کرتا پاکستان پہنچ گیا۔

میں تو چلا ہی اس نیت سے تھا کہ کوئی موٹا کاروبار کروں گا۔ چنانچہ پاکستان پہنچتے ہی میں نے حالات کو اچھی طرح جانچا اور الاٹمنٹوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مسکہ پالش مجھے آتا ہی تھا۔ چکنی چپڑی باتیں کیں۔ ایک دو آدمیوں کے ساتھ یارانہ گانٹھا اور ایک چھوٹا سا مکان الاٹ کرا لیا۔ اس سے کافی منافع ہوا تو میں مختلف شہروں میں پھر کر مکان اور دکانیں الاٹ کرانے کا دھندا کرنے لگا۔

کام کوئی بھی ہو انسان کو محنت کرنا پڑتی ہے۔ مجھے بھی چنانچہ الاٹمنٹوں کے سلسلے میں کافی تگ و دو کرنا پڑی۔ کسی کے مسکہ لگایا۔ کسی کی مٹھی گرم کی، کسی کو کھانے کی دعوت دی۔ کسی کو ناچ رنگ کی، غرضیکہ بے شمار بکھیڑے تھے۔ دن بھر خاک چھانتا، بڑی بڑی کوٹھیوں کے پھیرے کرتا اور شہر کا چپہ چپہ دیکھ کر اچھا سا مکان تلاش کرتا جس کے الاٹ کرانے سے زیادہ منافع ہو۔

انسان کی محنت کبھی خالی نہیں جاتی۔ چنانچہ ایک برس کے اندر اندر میں نے لاکھوں روپے پیدا کر لئے۔ اب خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ رہنے کو بہترین کوٹھی۔ بینک میں بے اندازہ مال پانی ۔۔۔ معاف کیجئے گا۔ میں کاٹھیاواڑ گجرات کا روزمرہ استعمال کر گیا۔ مگر کوئی مائندہ نہیں۔ اردو زبان میں باہر کے الفاظ بھی شامل ہونے چاہئیں ۔۔۔ جی ہاں، اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ رہنے کو بہترین کوٹھی، نوکر چاکر، پیکارڈ موٹر، بینک میں ڈھائی لاکھ روپے۔ کارخانے اور دکانیں الگ ۔ ۔ ۔ یہ سب کچھ تھا۔ لیکن میرے دل کا چین جانے کہاں اڑ گیا۔ یوں تو کوکین کا دھندا کرتے ہوئے

میں دل پر کبھی کبھی بوجھ محسوس ہوتا تھا۔ لیکن اب تو جیسے دل رہا ہی نہیں تھا۔ یا پھر یوں کہیئے کہ بوجھ اتنا آن پڑا کہ دل اس کے نیچے دب گیا۔ پر یہ بوجھ کس بات کا تھا؟

آدمی ذہین ہوں، دماغ میں کوئی سوال پیدا ہو جائے تو میں اس کا جواب ڈھونڈ ہی نکالتا ہوں۔ ٹھنڈے دل سے (حالانکہ دل کا کچھ پتا نہیں) میں نے غور کرنا شروع کیا کہ اس گڑبڑ گھوٹالے کی وجہ کیا ہے؟

عورت؟ ...... ہو سکتی ہے۔ میری اپنی تو کوئی تھی نہیں۔ جو تھی وہ کاٹھیاواڑ گجرات ہی میں اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ لیکن دوسروں کی عورتیں موجود تھیں۔ مثال کے طور پر اپنے مالی ہی کی تھی۔ اپنا اپنا ٹیسٹ ہے۔ سچ پوچھئے تو عورت جوان ہونی چاہیئے اور یہ ضروری نہیں کہ پڑھی لکھی ہو۔ ڈانس کرنا جانتی ہو۔ اپن کو تو ساری ہوا کی عورتیں چلتی ہیں (کاٹھیاواڑ گجرات کا محاورہ ہے جس کا اردو میں نعم البدل موجود نہیں)

عورت کا تو سوال ہی اٹھ گیا اور دولت کا پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ بندہ زیادہ لالچی نہیں جو کچھ ہے اسی پر قناعت ہے۔ لیکن یہ دل والی بات کیوں پیدا ہو گئی تھی۔

آدمی ذہین ہوں۔ کوئی مسئلہ سامنے آجائے تو اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کارخانے چل رہے تھے۔ دکانیں بھی چل رہی تھیں۔ روپیہ اپنے آپ پیدا ہو رہا تھا۔ میں نے الگ تھلگ ہو کر سوچنا شروع کیا اور بہت دیر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا۔ کہ دل کی گڑبڑ صرف اس لئے ہے کہ میں نے کوئی نیک کام نہیں کیا۔

کاٹھیاواڑ گجرات میں تو میں نے بیسیوں نیک کام کئے تھے۔ مثال کے طور پر جب میرا دوست پانڈورنگ مر گیا تو میں نے اس کی رانڈ کو اپنے گھر ڈال لیا اور دو برس تک اس کو دھندا کرنے سے روکے رکھا۔ ونائک کی لکڑی کی ٹانگ ٹوٹ گئی تو اسے نئی خرید دی۔ تقریباً چالیس روپے اس پر اٹھ گئے تھے۔ جمنا بائی کو گرمی ہو گئی سالی کو (معاف کیجئے گا) کچھ پتا ہی نہیں تھا۔ میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ چھ مہینے برابر اس کا علاج کراتا رہا۔ ... لیکن پاکستان آکر میں نے کوئی نیک کام نہیں کیا تھا اور دل کی گڑبڑ کی یہی وجہ تھی۔ ورنہ اور سب ٹھیک تھا۔

میں نے سوچا۔ کیا کروں؟ ---- خیرات دینے کا خیال آیا۔ لیکن ایک روز شہر میں گھوما تو دیکھا کہ قریب قریب ہر شخص بھکاری ہے۔ کوئی بھوکا ہے کوئی ننگا۔ کس کس کا پیٹ بھروں، کس کس کا انگ ڈھانکوں؟ ---- سوچا ایک لنگر خانہ کھول دوں، لیکن ایک لنگر خانے سے کیا ہوتا اور پھر اناج کہاں سے لاتا؟ بلیک مارکیٹ سے خریدنے کا خیال پیدا ہوا تو یہ سوال بھی ساتھ ہی پیدا ہو گیا کہ ایک طرف گناہ کر کے دوسری طرف کارِ ثواب کا مطلب ہی کیا ہے؟

گھنٹوں بیٹھ بیٹھ کر میں نے لوگوں کے دکھ درد سنے۔ سچ پوچھئے تو ہر شخص دکھی تھا۔ وہ بھی جو دکانوں کے تھڑوں پر سوتے ہیں اور وہ بھی جو اونچی اونچی حویلیوں میں رہتے ہیں۔ پیدل چلنے والے کو یہ دکھ تھا کہ اس کے پاس کام کا کوئی جوتا نہیں۔ موٹر میں بیٹھنے والے کو یہ دکھ تھا کہ اس کے پاس کار کا نیا ماڈل نہیں۔ ہر شخص کی شکایت اپنی اپنی جگہ درست تھی۔ ہر شخص کی حاجت اپنی اپنی جگہ معقول تھی۔

میں نے غالب کی ایک غزل اللہ بخشے شولاپور کی امینہ بائی چتلے کر سے سنی تھی۔ ایک شعر یاد رہ گیا ہے ؎

کس کی حاجت روا کرے کوئی

معاف کیجئے گا یہ اس کا دوسرا مصرع ہے اور ہو سکتا ہے پہلا ہی ہو۔

جی ہاں، میں کس کس کی حاجت روا کرتا جب سو میں سے سو ہی حاجتمند تھے۔ میں نے پھر یہ بھی سوچا کہ خیرات دینا کوئی اچھا کام نہیں۔ ممکن ہے آپ مجھ سے اتفاق نہ کریں۔ لیکن میں نے مہاجرین کے کیمپوں میں جا جا کر جب حالات کا اچھی طرح جائزہ لیا تو مجھے معلوم ہوا۔ کہ خیرات نے بہت سے مہاجرین کو بالکل ہی نکما بنا دیا ہے۔ دن بھر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ تاش کھیل رہے ہیں۔ جگا ہو رہی ہے (معاف کیجئے گا جگا کا مطلب

ہے جہاں یعنی قمار بازی پر گالیاں بک رہے ہیں اور نوکرشاہی مفت کی روٹیاں توڑ رہے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ایسے لوگ بھلا پاکستان کو مضبوط بنانے میں کیا مدد دے سکتے ہیں۔ چنانچہ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ بھیک دینا ہرگز نیکی کا کام نہیں۔ لیکن پھر نیکی کے کام کے لئے اور کون سا رستہ ہے؟

کچھ دن میں دھڑا دھڑ آدمی مر رہے تھے۔ کبھی ہیضہ پھوٹتا تھا کبھی پلیگ۔ ہسپتالوں میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ مجھے بہت ترس آیا۔ قریب تھا کہ ایک ہسپتال بنوا دوں مگر سوچنے پر ارادہ ترک کر دیا۔ پوری اسکیم تیار کر چکا تھا۔ عمارت کے لئے ٹنڈر طلب کرنا۔ داخلے کی فیسوں کا روپیہ جمع ہو جاتا۔ اپنی ہی ایک کمپنی کھڑی کر دیتا اور ٹنڈر اس کے نام نکال دیتا۔ خیال تھا ایک لاکھ روپے عمارت پر صرف کروں گا۔ ظاہر ہے کہ ستر ہزار روپے میں بلڈنگ کھڑی کر دیتا اور پورے تیس ہزار روپے بچا لیتا مگر یہ ساری اسکیم دھری کی دھری رہ گئی۔ جب میں نے سوچا کہ اگر مرنے والوں کو بچا لیا گیا تو یہ جو زائد آبادی ہے وہ کیسے کم ہو گی۔

غور کیا جائے تو یہ سارا لفڑا ہی فالتو آبادی کا ہے۔ لفڑا کا مطلب ہے جھگڑا، وہ جھگڑا جس میں فضیحتا بھی ہو۔ لیکن اس سے بھی اس لفظ کی پوری معنویت میں بیان نہیں کر سکا۔

جی ہاں غور کیا جائے تو یہ سارا لفڑا ہی اس فالتو آبادی کا باعث ہے۔ اب لوگ بڑھتے جائیں گے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ زمینیں بھی ساتھ ساتھ بڑھتی جائیں گی۔ آسمان بھی ساتھ ساتھ پھیلتا جائے گا۔ بارشیں زیادہ ہوں گی۔ اناج زیادہ آئے گا۔ اس لئے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ہسپتال بنانا ہرگز نیک کام نہیں۔

پھر سوچا مسجد بنوا دوں۔ لیکن اللہ بخشے شولا پور کی جینا بائی چکلے کا گایا ہوا ایک شعر یاد آ گیا ؎

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا

وہ منظور کو منجور اور فیض کو فیج کہا کرتی تھی۔ نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا۔ پل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا۔

کس کم بخت کو نام و نمود کی خواہش ہے۔ وہ جو نام اچھالنے کے لئے پل بناتے ہیں۔ نیکی کا کیا کام کرتے ہیں؟ خاک! میں نے کہا نہیں یہ مسجد بنوانے کا خیال بالکل غلط ہے۔ بہت سی الگ الگ مسجدوں کا ہونا بھی قوم کے حق میں ہرگز مفید نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ عوام بٹ جاتے ہیں۔

تھک ہار کر میں حج کی تیاریاں کر رہا تھا کہ اللہ میاں نے مجھے خود ہی ایک راستہ بتا دیا۔ شہر میں ایک جلسہ ہوا۔ جب ختم ہوا تو لوگوں میں بدنظمی پھیل گئی۔ اتنی بھگدڑ مچی کہ تیس آدمی ہلاک ہو گئے۔ اس حادثے کی خبر دوسرے روز اخباروں میں چھپی تو معلوم ہوا کہ وہ ہلاک نہیں بلکہ شہید ہوئے تھے۔

میں نے سوچنا شروع کیا۔ سوچنے کے علاوہ میں کئی مولویوں سے ملا۔ معلوم ہوا کہ وہ لوگ جو اچانک حادثوں کا شکار ہوتے ہیں۔ انہیں شہادت کا رتبہ ملتا ہے یعنی وہ رتبہ جس سے بڑا کوئی اور رتبہ ہی نہیں۔ میں نے سوچا کہ اگر لوگ مرنے کی بجائے شہید ہوا کریں تو کتنا اچھا ہے۔ وہ جو عام موت مرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی موت بالکل اکارت جاتی ہے۔ اگر وہ شہید ہو جاتے تو کوئی بات تھی۔

میں نے اس باریک بات پر اور غور کرنا شروع کیا۔

چاروں طرف جدھر دیکھو خستہ حال انسان تھے۔ چہرے زرد، فکر، تردد اور غم روزگار کے بوجھ تلے پسے ہوئے۔ دھنسی ہوئی آنکھیں، بے جان چال۔ کپڑے تار تار۔ ریل گاڑی کے کنڈم مال کی طرح یا تو کسی ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں پڑے ہیں۔ یا بازاروں میں بے مالک مویشیوں کی طرح منہ اٹھائے بے مطلب گھوم رہے ہیں۔ کیوں جی رہے ہیں۔ کس کے لئے جی رہے ہیں اور کیسے جی رہے ہیں۔ اس کا کچھ پتا ہی نہیں۔ کوئی وبا پھیلی۔ ہزاروں مر گئے اور کچھ نہیں تو بھوک اور پیاس ہی سے گھل گھل کر مرے۔ سردیوں میں اکڑ گئے۔ گرمیوں میں سوکھ گئے۔ کسی کی موت پر کسی نے دو آنسو بہا دیئے۔ اکثریت کی موت خشک ہی رہی۔

زندگی سمجھ میں نہ آئی، ٹھیک ہے۔ اس سے حظ نہ اُٹھایا، یہ بھی ٹھیک ہے۔ . . . . . وہ کس کا شعر ہے۔ اللہ بخشے [illegible] چھنٹ کر کیا درد بھری آواز میں گایا کرتی تھی —

مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

میرا مطلب ہے اگر مرنے کے بعد بھی زندگی نہ سدھری تو لعنت ہے سُسری پہ۔

میں نے سوچا کیوں نہ یہ بچارے بدقسمت سکھائے، دروکے ٹھکرائے ہوئے انسان جو اس دُنیا میں ہر اچھی چیز کے لئے ترستے ہیں۔ اس دنیا میں ایسا رُتبہ حاصل کریں کہ وہ جو یہاں ان کی طرف نگاہ اُٹھانا پسند نہیں کرتے وہاں ان کو دیکھیں اور رشک کریں۔ اس کی ایک ہی صورت تھی۔ وہ عام موت نہ مریں بلکہ شہید ہوں۔

اب سوال یہ تھا کہ یہ لوگ شہید ہونے کے لئے راضی ہوں گے؟ میں نے سوچا، کیوں نہیں۔ وہ کون مسلمان ہے جس میں ذوقِ شہادت نہ ہو۔ مسلمانوں کی دیکھا دیکھی تو ہندو اور سکھوں میں بھی یہ رُتبہ پیدا کر دیا گیا ہے۔ لیکن مجھے سخت نا اُمیدی ہوئی جب میں نے ایک مریل سے آدمی سے پوچھا: "کیا تم شہید ہونا چاہتے ہو؟" تو اس نے جواب دیا: "نہیں"۔

سمجھ میں نہ آیا کہ وہ شخص جی کر کیا کرے گا۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ دیکھو بڑے میاں، زیادہ سے زیادہ، زیادہ سے زیادہ تم ڈیڑھ مہینہ اور جیو گے۔ چلنے کی تم میں سکت نہیں۔ کھانستے کھانستے غوطے میں جاتے ہو تو ایسا لگتا ہے کہ بس دم نکل گیا۔ پھوٹی کوڑی تک تمہارے پاس نہیں۔ زندگی بھر تم نے سکھ نہیں دیکھا۔ مستقبل کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر اور جی کر کیا کرو گے۔ فوج میں تم بھرتی نہیں ہو سکتے۔ محاذ پر اپنے وطن کی خاطر لڑتے لڑتے جان دینے کا خیال بھی عبث ہے۔ اس لئے کیا یہ بہتر نہیں کہ تم کوشش کر کے یہیں بازار میں یا ڈیرے میں جہاں تم رات کو سوتے ہو، اپنی شہادت کا بندوبست کر لو۔ اس نے پوچھا: "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

میں نے جواب دیا: "یہ سامنے کیلے کا چھلکا پڑا ہے۔ فرض کر لیا جائے کہ تم اس پر سے پھسل جاؤ۔ . . . ظاہر ہے کہ تم مر جاؤ گے اور شہادت کا رتبہ پاؤ گے۔" پر یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ کہنے لگا: "میں کیوں آنکھوں دیکھے کیلے کے چھلکے پر پاؤں دھرنے لگا — کیا مجھے اپنی عزیز نہیں" — اللہ اللہ کیا جان تھی۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ جھریوں کی گٹھڑی!!

مجھے بہت افسوس ہوا اور اس وقت اور بھی زیادہ ہوا جب میں نے سُنا کہ وہ کمبخت جو بڑی آسانی سے شہادت کا رتبہ اختیار کر سکتا تھا۔ خیراتی ہسپتال میں لوہے کی چارپائی پر کھانستا کھنکارتا مر گیا۔

ایک بڑھیا تھی منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ آخری سانس لے رہی تھی مجھے بہت ترس آیا۔ ساری عمر غریب کی مفلسی اور رنج و غم میں گزری تھی۔ میں اسے اُٹھا کر ریل کے پٹڑے پر لے گیا۔ معاف کیجئے گا۔ ہمارے یہاں پٹڑی کو پاٹا کہتے ہیں۔ لیکن جناب جونہی اس نے ٹرین کی آواز سُنی ہوش میں آ گئی اور کوک بھرے کھلونے کی طرح اُٹھ کر بھاگ گئی۔

میرا دل ٹوٹ گیا۔ لیکن پھر بھی میں نے ہمت نہ ہاری۔ بنیا کا بیٹا اپنی دھن کا پکا ہوتا ہے۔ نیکی کا جو صاف اور سیدھا راستہ مجھے نظر آیا میں نے اس کو اپنی آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیا۔

مغلوں کے وقت کا ایک بہت بڑا احاطہ خالی پڑا تھا۔ اس میں ایک سو اکاون چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ بہت ہی خستہ حالت میں۔ میری تجربہ کار آنکھوں نے اندازہ لگا لیا کہ پہلی ہی بڑی بارش میں سب کی چھتیں ڈھے جائیں گی۔ چنانچہ میں نے اس احاطے کو ساڑھے دس ہزار روپے میں خرید لیا اور اس میں ایک ہزار مفلوک الحال آدمی بسا دیئے۔ دو مہینے کرایہ وصول کیا۔ ایک روپیہ ماہوار کے حساب سے۔ تیسرے مہینے جیسا کہ میرا اندازہ تھا۔ پہلی ہی بڑی بارش میں سب کمروں کی چھتیں نیچے آ رہیں اور سات سو آدمی جن میں بچے بوڑھے سبھی شامل تھے،

ہو گئے۔

وہ جو میرے دل پہ بوجھ پہ بوجھ سا تھا کسی قدر ہلکا ہو گیا۔ آبادی میں سے سات سو آدمی کم بھی ہو گئے۔ لیکن انھیں شہادت کا رتبہ بھی مل گیا ——— ادھر کا پلڑا بھاری ہی رہا۔

جب سے میں یہی کام کر رہا ہوں۔ ہر روز حسبِ توفیق دو تین آدمیوں کو جام شہادت پلا دیتا ہوں۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ کام کوئی بھی ہو انسان کو محنت کرنا ہی پڑتی ہے۔ اللہ بخشے شولا پور کی امینہ بائی چتلے کو ایک شعر گایا کرتی تھی۔ لیکن معاف کیجئے گا وہ شعر یہاں ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ کچھ بھی ہو، کہنا یہ ہے کہ مجھے کافی محنت کرنا پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک آدمی کو جس کا وجود جھکڑے کے پانچویں پہئے کی طرح بے معنی اور بیکار تھا۔ جام شہادت پلانے کے لئے مجھے پورے دس دن جگہ جگہ کیلے کے چھلکے گرانے پڑے لیکن موت کی طرح جہاں تک میں سمجھتا ہوں شہادت کا بھی ایک دن مقرر ہے۔ دسویں روز جا کر وہ پتھریلے فرش پر کیلے کے چھلکے پر سے پھسلا اور شہید ہوا۔

آج کل میں ایک بہت بڑی عمارت بنوا رہا ہوں۔ ٹھیکہ میری ہی کمپنی کے پاس ہے۔ دو لاکھ کا ہے۔ اس میں سے پچھتر ہزار تو میں صاف اپنی جیب میں ڈال لوں گا۔ بیمہ بھی کرا لیا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ جب تیسری منزل کھڑی کی جائے گی تو ساری بلڈنگ اڑا اڑا دھڑام گر پڑے گی کیونکہ مصالحہ ہی میں نے ایسا لگوایا ہے۔ اس وقت تین سو مزدور کام پر لگے ہوں گے۔ خدا کے گھر سے مجھے پوری پوری امید ہے کہ یہ سب کے سب شہید ہو جائیں گے۔ لیکن اگر کوئی بچ گیا تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ پرلے درجے کا گناہگار ہے۔ جس کی شہادت اللہ تبارک تعالیٰ کو منظور نہیں تھی۔

بڑا نامور افسانہ نگار تھا

۱۳۷۴ھ

مختصر حالات

پیدائش	۱۱ مئی ۱۹۱۲ء
مقام پیدائش	سمبرالہ، ضلع لدھیانہ
اولاد	نگہت، نزہت اور نصرت
تعلیم	امرتسر اور علی گڑھ میں
قیام	امرتسر، علی گڑھ، لاہور، دلی اور بمبئی
انتقال	۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء بمقام لاہور [illegible]

پہلی کہانی	تماشا
آخری کہانی	کبوتر اور کبوتری

جن کہانیوں پر مقدمے چلے

کالی شلوار	دھواں
بو	کھول دو
ٹھنڈا گوشت	اوپر نیچے اور درمیان

افسانوں کا پہلا مجموعہ "منٹو کے افسانے" ہے جو ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا

تصانیف

منٹو کے افسانے	منٹو کے ڈرامے
افسانے اور ڈرامے	دھواں
چغد	لذتِ سنگ
یزید	ٹھنڈا گوشت
نمرود کی خدائی	سیاہ حاشیے
خالی بوتلیں خالی ڈبے	تلخ ترش شیریں
سڑک کے کنارے	گنجے فرشتے
بادشاہت کا خاتمہ	اوپر نیچے اور درمیان
سرکنڈوں کے پیچھے	پھندنے
برقعے	شکاری عورتیں
منٹو کے مضامین	آؤ
جنازے	تین عورتیں
کروٹ	عصمت چغتائی
نور جہاں سرور جہاں	سرگذشتِ اسیر (ترجمہ)
ویرا (ترجمہ)	گورکی کے افسانے (ترجمہ)

ان کے علاوہ منٹو کی سات آٹھ کتابیں زیرِ طبع ہیں

(۳)

منٹو کے فن اور شخصیت پر مضامین

(جن میں منٹو بھی ہے اور سعادت حسن بھی)

فن پر لکھنے والے

ممتاز شیریں
وقار عظیم
محمد حسن عسکری
عابد علی عابد
ابواللیث صدیقی
عبادت بریلوی
ممتاز حسین

شخصیت پر لکھنے والے

عصمت چغتائی
اوپندر ناتھ اشک
احمد ندیم قاسمی
ہاجرہ مسرور
ابوسعید قریشی
حامد جلال
غلام عباس
محمد طفیل

منٹو کی فنی تکمیل

ممتاز شیریں

منٹو کے آخری دَور کی وہ تحریریں، میری نظر میں، منٹو کی ادبی تکمیل کی مظہر ہیں۔ ڈرامہ "اس منجدھار میں" اور افسانہ "سڑک کے کنارے"۔

"بابو گوپی ناتھ" ایک بڑا اہم موڑ تھا جس سے منٹو کی افسانہ نگاری کا دوسرا دَور شروع ہوتا ہے۔ اس میں منٹو نے خلافِ معمول بڑا بھرپور اور مکمل کردار پیش کیا تھا اور اس کردار کو پیش کرتے ہوئے منٹو کا رویہ بھی ایک سچے فن کار کا رویہ تھا۔ ایک مکمل کردار کے ساتھ اس افسانے میں ایک مکمل اور بھرپور تجربہ بھی تھا۔ جیسا کہ عسکری صاحب نے کہا ہے منٹو عموماً چھوٹے چھوٹے انفرادی تجربوں کو فوراً رقم کر کے افسانے کی گرفت میں لے آتا تھا اس سے پہلے کہ یہ چھوٹے چھوٹے تجربے آپس میں مل کر اور وقت گزرنے پر فن کار کے ذہن میں وصل کر ایک مکمل اور بڑے تجربے کی تشکیل پائیں۔ البتہ "بابو گوپی ناتھ" میں ایک بڑے تجربے اور اس تکمیل کا احساس پایا جاتا تھا۔

منٹو کے فن کے اس تدریجی ارتقا کی تکمیل آخری دَور کی ان دو تحریروں میں پائی جاتی ہے۔ جن میں ایک تکمیل، ایک وسعت، ایک کائناتی گہرائی کا احساس ہے۔ زندگی اور وجود کا ایک فلسفہ ہے۔ سماج اور زندگی کی حقیقتوں کو بڑی بے رحم صداقت اور بے باکی سے بیان کرنے میں منٹو کے قلم کی قوت منفی طور پر تھی۔ بعد میں منٹو میں اثباتی اقدار تو پیدا ہو ہی چلے تھے۔ لیکن آخر میں منٹو اس درجے تک پہنچ چکا تھا جس میں کہ ایک فن کار میں زندگی اور وجود کا ایک مثبت فلسفہ پیدا ہوتا ہے۔

اگر کوئی "اس منجدھار میں" کی گہرائیوں کو سمجھ سکے تو اسے یہ احساس ہوگا کہ اس میں منٹو نے منفی عناصر NEGATIVE ELEMENTS کو جن میں زندگی کی قوت نہیں، عدم اور فنا کی طرف جاتے ہوئے دکھایا ہے۔ اور اُن اثباتی عناصر POSITIVE ELEMENTS کو آپس میں ملایا ہے جن سے حیات کی تجدید ہوتی ہے اور زندگی آگے بڑھتی ہے۔

یوں تو پہلی نظر میں "اس منجدھار میں" کا موضوع وہی نظر آتا ہے جو ڈی ایچ لارنس کے LADY CHALLERLEY'S LOVER کا ہے۔ کردار بھی تقریباً وہی ہیں، ایک شوہر جو شادی کے فوراً بعد مفلوج ہو جاتا ہے، اس کی حسین، جوان صحت مند بیوی، ایک نوجوان صحت مند مرد جو اس کی بیوی کو زندگی کی قوت دے سکتا ہو۔ اور ایک خادمہ جو اس مفلوج شوہر سے ہمدردی اور لگاؤ رکھتی ہے۔ لیکن لارنس کی اس موضوع پر پیش کش سے

منٹو کی پیش کش کہیں اونچی اور فنکارانہ ہے، اس سے قطع نظر کہ ایک ناول ہے، دوسرا ڈرامہ، اس میں ایک فلسفہ ہے، لارنس سے مختلف معاملہ گو لارنس کا بھی ایک فلسفہ تھا بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ لارنس نے جنس ہی کا ایک فلسفہ بنا لیا تھا۔

منٹو کی اس تحریر میں (اس منجدھار میں) ایک جمالیاتی (AESTHETIC) احساس ہے اور ایک جمالیاتی رویہ (AESTHETIC APPROACH) یوں تو زندگی کی قوت کو منٹو نے بھی لارنس کے معنی میں لیا ہے، یعنی جنس، لیکن یہاں منٹو نے حسن کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے اور ان دوسرے اثباتی عناصر کو بھی جو حسن اور زندگی کی تکمیل کرتے ہیں۔

حسن ایک اثباتی عنصر ہے۔ حسن، جوانی، صحت، لطیف جذبات، محبت کی قوت یہ سب اثباتی عناصر ہیں جو بیوی میں بدرجۂ اتم موجود ہیں اور کم و بیش اس کے شوہر کے چھوٹے بھائی میں بھی موجود ہیں۔ لیکن شوہر، جب وہ کسی حادثہ کی وجہ سے اس طرح مفلوج ہو جاتا ہے کہ اس میں زندگی کی قوت ختم ہو جاتی ہے، ایک منفی عنصر بن جاتا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ منٹو کے ہاں اس مفلوج شوہر کو پیش کرتے ہوئے وہ ہلکی سی تحقیر نہیں پائی جاتی جو لارنس کے لہجہ میں پائی جاتی ہے۔ اس کے برخلاف منٹو کو اس کردار سے پوری پوری ہمدردی ہے۔ بلکہ منٹو نے اس بے پناہ ذہنی کرب، اذیت اور کشمکش کو ڈرامہ کا اہم حصہ بنایا ہے۔ اس میں یہ محسوس کرنے کی صلاحیت ہے کہ آخر اس کی حسین اور نوجوان بیوی کو اس کا پورا حق حاصل ہے کہ اس کے بجائے کسی طرف متوجہ ہو جس سے اسے صحیح معنوں میں مثبت محبت مل سکتی ہے، اور ان دونوں کی آپس میں بے اختیار کشش ایک فطری امر ہے۔ وہ خود اپنے مفلوج جسم، نفسیاتی کمزوری اور احساس کمتری کے ساتھ ایک منفی عنصر بن چکا ہے جس سے ہمدردی کی جا سکتی ہے، محبت نہیں۔ محبت اسے ایک خادمہ سے ملتی ہے جو خود محبت کے قابل نہیں جو بدصورت ہے، اور بدصورتی بجائے خود ایک منفی عنصر ہے۔ یہ دونوں منفی عناصر (یعنی مفلوج شوہر اور خادمہ) ایک دوسرے کے قریب آ سکتے ہیں، لیکن ان کی قربت اور آپس میں ملاپ کوئی اثباتی قوت پیدا نہیں کر سکتے، لہذا وہ زندگی کی بجائے موت میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں، ایک ساتھ خودکشی کرتے ہیں۔ اس طرح یہ منفی عناصر فنا کی طرف جاتے ہیں۔

دوسری طرف مثبت عناصر بے اختیار ایک دوسرے کی طرف کھنچ جاتے ہیں، آزاد کھلی فضاؤں میں، قدرت کے رنگین نظاروں میں ان کی محبت پروان چڑھتی ہے اور جب مثبت عناصر آپس میں ملتے ہیں تو زندگی پر بہار آ جاتی ہے۔

منٹو یوں تو ایک فطری فن کار ہے لیکن اپنی چند ایک تحریروں میں چنانچہ "بو"، "ٹھنڈا گوشت" (منٹو نے خود "ٹھنڈا گوشت" پر جو کچھ لکھا ہے اس سے اس بات کی پوری تصدیق ہوتی ہے) "سڑک کے کنارے" اور "اس منجدھار میں" وغیرہ میں وہ بڑا ہی شعوری فن کار (CONSCIOUS ARTIST) نظر آتا ہے۔

ایک اور اہم بات جو منٹو کے آخری دور کی ان دو تحریروں میں پائی جاتی ہے اور منٹو کی ادبی تکمیل کی طرف اشارہ کرتی ہے، وہ وژن کی وسعت ہے۔ ان دونوں تحریروں میں ایک کائناتی وژن (COSMIC VISION) ہے۔ یہاں منٹو کے وژن میں وہ وسعت پیدا ہو چکی ہے جو انفرادی اور خصوصی (PARTICULAR) کو آفاقی اور کائناتی (UNIVERSAL AND COSMIC) میں تبدیل کر دے۔

ایک خاص واقعہ، ایک خاص تجربہ، ایک خاص، انوکھا، انفرادی کردار پیش کرنا منٹو کی ایک خصوصیت تھی۔ "سڑک کے کنارے" میں بھی ایک خاص واقعہ ہی ہے لیکن یہاں خصوصیت، آفاقیت میں حلول ہو گئی ہے۔ افسانے کے سارے جزئیات میں صرف ایک چیز ایسی ہے جو خصوصیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ مرد کی نیلی آنکھیں۔ لیکن ان نیلی آنکھوں سے آسمان کی نیلاہٹ کی تشبیہ (آسمان اس کی آنکھوں کی طرح ایسا ہی نیلا تھا) اس خصوصیت میں بھی وہی وسیع کائناتی وژن کا احساس پیدا کر دیتی ہے۔

یہاں ہم زمان و مکان (TIME AND SPACE) کی تخصیص بھی بھول جاتے ہیں، یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ واقعہ کسی خاص عورت اور خاص مرد سے متعلق تھا، وہاں ازلی عورت اور ازلی مرد ہے، ان کا ملاپ، وجود کی تکمیل، وہ ازلی بنیادی گناہ، اور اس بنیادی گناہ کا کفارہ جو صرف عورت ادا کرتی ہے۔

"دو روحوں کا سمٹ کر ایک ہو جانا، اور ایک ہو کر والہانہ وسعت اختیار کر جانا، وہ روحیں سمٹ کر اس ننھے سے نقطے پہ پہنچتی ہیں جو پھیل کر کائنات بنتا ہے۔"

یہاں منٹو کا جنس کا تصور بھی کتنا مختلف اور کتنا بلند ہے۔ گو منٹو کا نظریہ جنس کے متعلق ہمیشہ صحت مند رہا ہے اور وہ اسے ایک ازلی فطری صحت مند جذبہ سمجھتا رہا ہے۔ لیکن پہلے منٹو کے ہاں جنس کا تصور محض جسمانی تھا۔ لیکن یہاں منٹو کا یہ تصور اتنا بلند ہو چکا ہے کہ اسے 'وجود کی تکمیل' اور 'روحوں کے ملاپ' سے تعبیر کیا ہے۔

'وجود کی تکمیل' اور 'روحوں کے ملاپ' کے اس تصور کے ساتھ ہی یہاں بنیادی گناہ کا تصور بھی شامل ہے اور "مرنے کے گناہ" میں بنیادی گناہ کا تصور اتنا گہرا ہے جتنا کہ ہمیں ہاتھورن کے ہاں ملتا ہے۔

اس گناہ کا نشان عورت کے سینے پہ داغ دیا گیا ہے۔ اور عورت اپنے سینے پر اس دہکتے ہوئے انگارہ کو دیکھ کر اپنے آپ سے یہ پوچھتی ہے "کیا یہ واقعی گناہ تھا؟ اور کیا یہ صرف میرا گناہ تھا؟"

"میں نے اپنی پھڑ پھڑاتی ہوئی روح اس کے حوالے کر دی تھی، اس کے وجود کی تکمیل کی تھی، اور اس کے وجود کے ذرّوں سے اپنی ہستی کی تعمیر و تکمیل کی تھی . . . ."

یہ اس کی شخصیت کی تکمیل تھی کہ وہ ماں بن رہی تھی، ایک موتی اس کی کوکھ کی سیپ میں تشکیل پا رہا تھا۔ مامتا کی گرمی اس کی ساری رگوں میں سرایت کر گئی تھی اور اس کی وہ دودھ بھری چھاتیوں کی گولائیوں میں مسجد کے آنچلے پاکیزہ میناروں کی سی تقدیس آ رہی تھی۔ وہ ماں بن رہی تھی، اس کی تکمیل تو آج ہوئی تھی۔ لیکن اب جبکہ اس کی تکمیل ہو گئی تھی وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا . . .

"اس کائنات میں ایک روح کبھی کبھی کیوں گھایل چھوڑ دی جاتی ہے؟"

عورت یوں محسوس کرتی ہے جیسے وہ ہاتھورن کی ہیسٹر کی طرح ایک چوراہے پر کھڑی ہے "یہ دنیا ایک چوراہا ہے، یاد رکھ تجھ پر انگلیاں اٹھیں گی" اور جب اس کی کوکھ کا موتی سیپ سے باہر نکلے گا تو گناہ کی زندہ علامت بن جائے گا۔ (ہاتھورن کے SCARLET LETTER میں بھی موتی گناہ کی زندہ علامت ہے۔ موتی (PEARL) ہیسٹر کی ناجائز بچی کا نام ہے اور اس نام میں بھی گویا ایک رمزی معنویت SYMBOLIC-SIGNIFICANCE ہے۔

"انگلیاں اٹھیں گی بیٹی کی طرف بھی اور موتی کی طرف بھی . . . . یہ انگلیاں سنپولیاں بن بن کر ان دونوں کو ڈسیں گی اور اپنے زہر سے ان کو نیلا کر دیں گی . . . ."

اس کی زندگی تباہ ہو جائے گی، زندگی موت سے بدتر ہو گی، اس کی بھی اور بچی کی بھی، اس سے بہتر ہے کہ اس ننھی زندگی کو آغاز ہی میں ختم کر دیا جائے۔

اور جب ایک 'ماں' اپنے سارے جذبات اور احساسات کو کچل کر 'اپنی مامتا کا آپ گلا گھونٹ کر' جب اس زندگی کو ختم کرنے لگتی ہے، جو اس کی اپنی زندگی کا ایک حصہ تھی، اس کے اپنے خون سے بنی تھی، اس کی کوکھ میں تشکیل پائی تھی، وہ ماں کس بے پناہ ذہنی و روحانی کرب سے گزرتی ہو گی! اور یہ کتنا بڑا المیہ ہے!

اور اخبار میں چھپی ہوئی وہ چند سطریں، چند سرد، منجمد سطریں اس المیہ کو کہاں پا سکتی ہیں؟ لیکن فن کار منٹو اخبار کی ان چند سطروں میں وہ گہرا المیہ تلاش کر لیتا ہے، جو عورت اور ماں کا المیہ ہے۔

اس المیہ کو اپنی ساری گہرائیوں اور ساری PIOGNANCY کے ساتھ پیش کر چکنے کے بعد جب منٹو اچانک اپنا افسانہ اس اخباری رپورٹ

پر ختم کرتا ہے تو ہم گویا ایک دھچکے کے ساتھ بہت بلندیوں پر سے سطح زمین پر آگرتے ہیں یا گہرائیوں سے اچانک باہر نکل آتے ہیں اور سطح پر۔

اور کائناتی وسعت اور گیرائی سمٹ کر ایک خصوصی نقطہ پر آجاتی ہے۔

افسانہ کے اختتام پر یہ اخباری رپورٹ پہلی نظر میں، کچھ غیر ضروری معلوم ہوتی ہے، اور غیر فن کارانہ بھی، جس سے افسانے کے ٹیمپو، فن اور کیفیت کو ایک دھچکا سا لگتا ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ اختتام ٹھیک معلوم ہوتا ہے، اور اس اختتام میں بھی جو غیر ضروری معلوم ہوتا ہے، مصنف نے ایک معنوی ایک خاص SIGNIFICANCE پیدا کی ہے۔

اس افسانے میں جو سارا ذہنی کیفیات سے مرتب ہے، واقعاتی طور پر یہ بتانا کہ عورت آخر میں بچی کو مارنے کی کوشش کرتی ہے بالکل مناسب اور موزوں نہ تھا۔ مصنف نے اس بات کا انکشاف اخباری رپورٹ کے ذریعہ کر دیا ہے، یہ زیادہ بہتر صورت ہے۔ علاوہ بریں اس رپورٹ سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بچی زندہ رہ جاتی ہے۔ اور اس دوسرے انکشاف پر کئی اور سوال ہمارے ذہن میں ابھرتے ہیں۔ یہ بچی زندہ رہ کر سماج کے ہاتھوں کیا کیا دکھ اٹھائے گی، وہ عورت بن کر شاید ہی گناہ کرے گی، (یا گناہ پر مجبور کی جائے گی) جو اس کی ماں نے کیا تھا، شاید وہ بھی ماں بنے گی اور اپنے گناہ کے پھل کو اپنے ہاتھوں ... مرتی اپنے

کیا یہ داستان پھر دہرائی جائے گی؟ اور کہانی ایک دائرہ میں گھوم کر اسی نقطہ پر آجائے گی؟ بچی کا زندہ رہنا بھی گویا IRONY OF FATE ہے۔

اور پھر اس اختتام سے ایک تضاد کی کیفیت پیدا کی گئی ہے۔ آفاقیت (UNIVERSAL) اور انفرادیت PARTICULAR کا تضاد۔۔۔

ازلی مرد اور ازلی عورت، دو روحوں کا ملاپ، وجود کی تکمیل، پہلا بنیادی گناہ اور اس گناہ کا کفارہ...... اور پھر اختتام پر اچانک یا احساس کہ یہ محض ایک عام واقعہ تھا، ان بیسیوں واردات میں سے ایک جو آئے دن ہوتی رہتی ہیں۔ کائناتی وسعت اور گیرائی سمٹ کر ایک خصوصی نقطہ پر آجاتی ہے

اور حقیقت کے دو پہلوؤں، حقیقت کی دو سطحوں کا تضاد!...

ایک خارجی، واقعاتی، سطحی حقیقت جو اخبار کی چند سطروں میں سمو دی گئی ہے۔ ایک نوزائیدہ بچی سردی سے ٹھٹھرتے سڑک کے کنارے پائی گئی، کسی سنگدل نے بچی کی گردن کو کپڑے میں مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا اور عریاں جسم کو پانی سے گیلے کپڑے میں باندھ رکھا تھا تاکہ وہ سردی سے مر جائے۔

اور سنگدل کے لفظ پر ہم چونکتے ہیں۔

سنگدل کون تھا؟

وہ ماں جس نے اپنی رگوں میں سرایت کرتی ہوئی ممتا کا خون کر کے بچی کو مرنے کے لئے چھوڑ دیا تھا؟

یا وہ مرد (بچی کا باپ) جو عورت سے سب کچھ حاصل کرنے کے بعد اسے دھوکا دے کر اور اس نازک حالت میں چھوڑ کر چلا گیا تھا؟

یا وہ سماج جس کے خوف نے عورت کو یہ غیر فطری حرکت کرنے پر مجبور کیا تھا، وہ سماج جو عورت کے سب سے اہم وجود "ماں" کا بھی گلا گھونٹ دیتی ہے؟

ایک خارجی، واقعاتی حقیقت جو صرف یہ بتاتی ہے کہ ایک عورت نے گناہ کیا تھا اور اپنی نوزائیدہ بچی کو مارنے کی کوشش کی تھی۔

اور دوسری گہری باطنی حقیقت جو سارے افسانے میں عورت کی ذہنی کیفیات اور محسوسات کے ذریعہ بیان کی گئی ہے۔ عورت کی مضطرب ذہنی کیفیت جذباتی ہلچل (DISTURBED EMOTIONS) کے ذریعہ، جب وہ ماں بن رہی ہوتی ہے۔

کچھ بعد دیکھیے وہ ساری کیفیات ـــــ جب عورت نے اپنی پھڑپھڑاتی ہوئی روح مرد کے حوالے کر دی تھی اور محسوس کیا تھا کہ وہ دونوں سمٹ کر ایک ہو گئے ہیں، اس نے مرد کے وجود کی تکمیل کی ہے، اور اس کی اپنی تکمیل اب ہوئی ہے جب وہ ماں بننے والی ہے۔

عورت کے ماں بننے کی کیفیت جب وہ ایک بلند و برتر اور مقدس ہستی بن جاتی ہے، جب ممتا کا گرم گرم خون اس کی رگوں میں بہتا ہے اور اس کے سینے کی دودھ بھری گولائیوں میں مسجد کے پاکیزہ میناروں کی تقدیس اور طہارت آجاتی ہے۔

پھر وہ اذیت ناک احساس ـــــ نہیں یہ تقدیس اور طہارت کچھ بھی نہیں۔ . . وہ تو دنیا کی نگاہوں کے سامنے ایک چوراہے پر کھڑی ہے۔ اس کے سینے پر گناہ کی علامت ایک سرخ نشان دہک رہا ہے، انگلیاں اس کی طرف اٹھ رہی ہیں، یہ سب لوگ اسے سنگسار کرنے کے لئے کھڑے ہوئے ہیں مگر اس پر پہلا پتھر اٹھانے کا ان میں سے کوئی بھی مجاز نہیں۔

اور پھر وہ ہلچل، وہ جذباتی طوفان، وہ کرب و اضطراب، وہ کشمکش اذیت وہ کشمکش۔
اور مجبوری اور بے بسی کی وہ آخری چیخ! "مت چھینو، اسے مت چھینو، میری روح کا یہ ٹکڑا
مجھ سے مت چھینو!"
خارجی حقیقت کا پردہ چاک کرکے جب منٹو ہمیں یہ باطنی حقیقت دکھاتا ہے تو وہاں صرف ایک روح نظر آتی ہے۔
ایک عورت اور ایک ماں کی زخمی پھڑپھڑاتی ہوئی روح!

منٹو کا فن

وقار عظیم

منٹو کو اس کی حقیقت نگاری، اس کی نفسیاتی موشگافی، اس کی دوربین اور دوررس نگاہ، اس کی جرأت آمیز اور بے باکانہ حق گوئی، سیاست، معاشرت اور مذہب کے اجارہ داروں پر اس کی تلخ لیکن مصلحانہ طنز اور اس کی مزے دار فقرہ بازیوں کی وجہ سے سراہا گیا ہے۔ اور سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور ان سب سے بڑھ کر جنسی زندگی پر اس نے مخصوص اور منفرد انداز سے نظر ڈالی ہے اس پر اسے مطعون کیا گیا ہے اور اس داد و تحسین اور ہجو و تضحیک میں لوگوں کا جو رویہ رہا ہے اس میں حق پسندی اور توازن بھی ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ افراط و تفریط کا جذبہ غالب نظر آتا ہے۔ تنقید و تبصرہ کے اس سارے کھیل میں جو برسوں سے منٹو کی زندگی اور اس کے افسانوں کے محور پر کھیلا جا رہا ہے، منٹو ایک مثالی ہیرو بھی نظر آتا ہے اور مثالی ولین بھی۔ کچھ نظریں اس بات کی عادی ہو گئی تھیں کہ اسے بس حسن کا مجسمہ بنا کر دیکھیں اور کچھ نگاہوں کو اس میں برائیوں کے سوا کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان دونوں طرح دیکھنے والوں کو جذباتی شدت پسندی نے اصل حقیقت تک پہنچنے اور اس کے کھوٹے کھرے کو پہچاننے کا موقع نہیں دیا۔ دنیا کی ہر دوسری چیز کی طرح منٹو نہ "محض" اچھا ہے اور نہ "محض" برا۔ اس کے افسانے نہ خالصتاً حسن و جمال کے مظاہر ہیں اور نہ محض برائیوں کے حامل۔ اس کی حقیقت نگاری، اس کی نفسیاتی موشگافی، اس کی دوررس اور دوربیں نظر، اس کی جرأت آمیز حق گوئی، اس کی تلخ مصلحانہ طنز اور اس کی شگفتہ فقرہ بازی کے اچھے اور برے دونوں پہلو ہیں ——— کبھی بہت اچھے اور کبھی بہت برے۔

ان اچھے، برے اور کبھی کبھی بہت اچھے اور بہت برے پہلوؤں کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی جائے تو سب سے پہلے انسان کی نظر ان چند موضوعات پر پڑتی ہے جن تک منٹو کی نظر پہنچی ہے ——— کلرک، مزدور، طوائف، رندِ خرابات اور زاہدِ پاک باز، کشمیر، بمبئی، دہلی، لاہور، فلم اسٹوڈیو، کالج، بازار، گھر، ہوٹل، چائے خانے، بچے، بوڑھے، جوان، عورتیں، مرد اور ان سب کی ذہنی الجھنیں اور ان ساری چیزوں سے بڑھ کر جنس اور اس کے گوناگوں مظاہر منٹو کے افسانوں کے موضوعات ہیں۔ ان موضوعات میں سے بعض منٹو کو زیادہ عزیز ہیں۔ بعض کوچوں میں پہنچ کر اس پر جو سرشاری طاری ہوتی ہے وہ دوسری جگہوں پر نظر نہیں آتی۔ بعض افراد کا ذکر وہ جس ادائے خاص سے کرتا ہے وہ ادا ہر موقع پر نمایاں نہیں ہوتی اور بعض باتیں کہنے اور رمز آشکار کرنے میں اسے جو مزا آتا ہے وہ دوسری باتیں کہتے اور کرتے وقت شاید محسوس نہیں ہوتا لیکن ذکر کسی کوچے کا ہو، کسی شخص کا ہو، کسی

بات کا بھی کہیں نہیں معلوم ہوتا کہ منٹو اس کوچے کے سارے پیچ و خم، اس شخص کے دل کے سارے بھید اور اس بات کی ساری نزاکتوں اور نقطوں سے واقف نہیں ہے ——— جہاں تک ان گوناگوں موضوعات کا تعلق ہے ان کے سلسلہ میں ایک اور چیز بھی سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ بعض موضوعات نے اپنے افسانوں میں بکھیرے کہ منٹو نے بہت سوں کی دل آزاری کی ہے، بہت سوں کی برائی مول لی ہے اور بہت سوں کی گالیاں سُنی ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بہت سے پڑھنے والوں نے انہیں گالیوں کو معیار بنا کر منٹو کے فنی مرتبہ کا اندازہ لگانے کی کوشش کی ہے اور یہ بات بہت کم کہی گئی ہے اور اکثر دبی زبان سے کہی گئی ہے کہ افسانہ نگار کی حیثیت سے منٹو کو پہچاننے کے لئے اس کے فن پر سب سے پہلے نظر ڈالنی ضروری ہے اس لئے کہ منٹو کی افسانہ نگاری میں ان موضوعات کی بھی اہمیت ہے جن کا منٹو نے اپنی فنی ذمہ داری سے انتخاب کیا ہے اور اس نقطۂ نظر کی بھی اہمیت ہے جہاں موضوعات کے انتخاب کا دار و مدار ہے، لیکن حقیقت میں جس چیز نے منٹو کو منٹو بنایا، جس چیز نے اسے وہ بڑائی دی جس میں کوئی دوسرا افسانہ نگار اس کا ہمسر نہیں، وہ اس کا فن ہے۔ اور منٹو کی شخصیت اور اس کی افسانہ نگاری کے خواہ کسی پہلو پر کچھ لکھا جائے اس کے فن کا ذکر ناگزیر ہے اور جب ہم یہ کہتے ہیں فن کا ذکر ناگزیر ہے تو ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ منٹو نے جو بے شمار باتیں اپنے افسانوں کے ذریعے اپنے پڑھنے والوں تک پہنچائی ہیں ان کے اظہار کا اسلوب کیا ہے اور اس اسلوب کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں۔

لیکن اس بات کا جائزہ لینے سے پہلے کہ منٹو کی افسانہ نگاری کا فن کیا ہے اور منٹو کے اسلوب فن کی کیا خصوصیات ہیں، شاید اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ جب منٹو کے موضوعات اور اس کے نقطۂ نظر سے الگ ہم اس کے فن کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں فن کا کیا مفہوم ہوتا ہے ——— اس ضمن میں سب سے پہلی چیز جو منطقی طور پر بحث کرنے والے کے سامنے آتی ہے تکنیک کے وہ مبادیات اور مطالبات ہیں جو ادب کی ایک صنف اور دوسری صنف میں مابہ الامتیاز سمجھے جاتے ہیں۔ داستان، ناول، ڈراما اور افسانہ بنیادی طور پر کہانی ہونے کے باوجود تکنیک کے اصول و قواعد کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اچھا داستان گو، ناول نگار، ڈرامہ نگار اور افسانہ نگار داستان، ناول، ڈراما یا افسانہ لکھتے وقت ان اصول و قواعد کی پابندی کو اپنا فرضِ اوّلین جانتا ہے۔ ایک خاص صنفِ ادب کے ساتھ اس نے جو رشتہ قائم کیا ہے اس کے خلوص اور صداقت کا تقاضا ہے کہ وہ اس صنفِ ادب کے ان امتیازی اصول و قوانین سے پوری طرح واقف ہو کر انہیں پوری طرح برتے۔ ان اصول و قواعد کو جن کا دوسرا نام اس صنف کی تکنیک، اس کی روایات یا اس کا فن ہے۔ جاننا، سمجھنا اور ان کا صدقِ دل سے احترام کرنا اس کا دوسرا مطالبہ ہے جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا۔ اس لئے کسی فن کار کے فن کا جائزہ لینے کی پہلی منزل ہی یہ دیکھنا ہے کہ اس فن کار نے ان ابتدائی مطالبات کو، ان اصول و قوانین کو، اس کی روایت کو کس حد تک جانا، سمجھا، محترم جانا اور اپنے فن میں برتا ہے۔

فنی جائزہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ فن کار نے فن کی روایات کی پابندی کرنے کا حق ادا کر کے اپنے خیال اور احساس کو دوسروں تک پہنچانے کے کیا کیا وسیلے استعمال کئے ہیں۔ ان مختلف وسائل کے استعمال میں فن کار کے تخیل، فکر اور ذہنی کاوش اور انہماک و توجہ کو خاصا دخل ہوتا ہے۔ اس لئے فن کار اپنے فن کو جس حد تک زیادہ عزیز رکھتا ہے اور جس حد تک اسے اس فن سے اپنے رشتہ اور تعلق کا احساس زیادہ گہرا اور شدید ہوتا ہے اسی حد تک اس کی توجہ، انہماک اور ذہنی کاوشوں کی بدولت اظہار اور ابلاغ کے اچھے سے اچھے اور نئے سے نئے وسیلے اس کے ہاتھ آتے ہیں۔ اظہار و ابلاغ کی یہی منزل ہے جہاں مصنف کا تخیل اور فکر جو حقیقت میں اس کی شخصیت کے مختلف اجزا اور عناصر ہیں اظہار اور ابلاغ کے وسائل میں نئے نئے رنگ بھرتا ہے۔ یوں رنگ، مصنف کے انداز اور اسلوب کی خصوصیت کا مظہر ہے اور اسے اس فنی جائزہ کا ایک اہم جزو سمجھا جانا ہے جس میں فنی روایات اور اظہار و ابلاغ کے دوسرے وسائل شامل ہیں۔

فنی جائزہ لیتے وقت اور اس جائزہ کی بنا پر فن کار کے فنی مرتبہ کا اندازہ لگاتے وقت چند اور باتیں بھی ایسی ہیں جو پیش نظر رکھی جائیں تو فنی جائزہ بھرپور رہتا ہے۔ ان میں سے ایک بات تو یہ ہے کہ فن کار اپنے انہماک، توجہ اور کاوش سے اظہار کے وسائل میں جو نئے نئے پہلو پیدا کرتا ہے

اور اپنی شخصیت کی قوت اور انفرادیت سے جو رنگ ابھرتا ہے ان پہلوؤں کا یکساں پن اور اس رنگ کی شوخی ہمیشہ قائم نہیں رہتی۔ فن کار کے احساس ایک خاص منزل پر پہنچ کر اس انہماک اور کاوش کے اہل نہیں رہتے جن سے اظہار کے وسائل کو نیا پن اور بلندی ملتی ہے، اور ایک خاص حد پر پہنچ کر اس کی شخصیت کے مختلف عناصر پر انتشار کا غلبہ ہوتا ہے تو فن کا رنگ بھی پھیکا ہونے لگتا ہے۔ یہ باتیں فنی جائزہ لینے والا نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس مسئلہ کے ان حقائق کو پیش نظر رکھے بغیر فن کار کے فن کے ارتقا کا سراغ لگانا ممکن نہیں۔

اس سلسلہ کی دوسری اہم کلیہ بات یہ ہے کہ گو شخصیت کے عناصر کے انتشار کے ساتھ ساتھ فن میں انحطاط پیدا ہونا لازمی ہے لیکن فن کار کو فن کے ساتھ ایک خاص مدت تک تعلق رکھنے کی بنا پر اظہار کے وسائل پر ایک قدرت حاصل ہو جاتی ہے، اور یہ قدرت اس کی شخصیت کے انتشار اور انہماک اور کاوش کی کمی کے باوجود اس کے اسلوب اظہار میں ان عناصر کو باقی اور قائم رکھتی ہے جو اس کے فن کی امتیازی خصوصیت سمجھے جاتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ یہ عناصر ہمیشہ ظاہر ہونے کے بجائے صرف کبھی کبھی ابھرتے اور اندھیرے میں چمک دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں۔ منٹو کے افسانوی فن میں فن کے یہ سارے مدارج بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس کے فن نے یہ ساری منزلیں جس طرح طے کی ہیں اردو کے کسی اور افسانہ نگار کے یہاں ان کا سراغ نہیں ملتا۔

افسانہ، ناول، ڈراما، داستان، کہانی —— ان سب میں بعض عناصر مشترک ہیں۔ کوئی نہ کوئی واقعہ، اس قصے سے تعلق رکھنے والے کردار، واقعہ کی ابتدا اور اس کے خاتمہ تک اس کے مختلف مدارج، مصنف کا ایک مخصوص انداز فکر و نظر، یہ سب کچھ اس کہانی میں بھی ہوتا ہے جو چوپال میں بیٹھنے والے بڑی سادگی سے ایک دوسرے کو سناتے ہیں، اس کہانی میں بھی جو بڑی بوڑھیاں رات کی خاموشی میں بچوں کو سناتی ہیں۔ اس افسانے ناول اور ڈرامہ میں بھی جو فن کے پورے احساس کے ساتھ لکھا جاتا ہے لیکن ان کئی مشترک پہلوؤں سے قطع نظر کہانی کی ان مختلف اصناف میں سے ہر ایک کی ایک نہ ایک امتیازی خصوصیت بھی ہوتی ہے جو اسے دوسری صنف سے منفرد کرتی ہے۔ داستان میں تخیل اور تصور کی رنگینی، ڈرامے میں کوئی نہ کوئی کشمکش، ناول میں زندگی کی وسعت اور گہرائی اور افسانہ میں موضوع کی اکائی یہ امتیازی اور انفرادی خصوصیات ہیں۔ افسانہ دوسری طرح کی کہانیوں سے اسی لحاظ سے منفرد اور ممتاز ہے کہ اس میں واضح طور پر کسی ایک چیز کی ترجمانی اور مصوری ہوتی ہے —— ایک کردار، ایک واقعہ، ایک ذہنی کیفیت، ایک جذبہ، ایک مقصد، مختصر یہ کہ افسانے میں جو کچھ بھی ہو ایک ہو۔ عام طور پر افسانہ نگار افسانہ کی اس بنیادی خصوصیت کی طرف سے غفلت برت کر افسانہ لکھتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ افسانے پڑھنے والے کے ذہن پر وہ گہرا تاثر قائم نہیں کر سکتے جو ہر اچھے افسانہ کے ساتھ وابستہ ہونا چاہئے۔ اردو کے افسانہ نگاروں میں پریم چند نے اکثر افسانہ کی امتیازی خصوصیت کو پیش نظر رکھا ہے لیکن کبھی کبھی جذبات کی رو میں بہ کر ان سے بھی اس معاملہ میں کوتاہی ہوئی ہے۔ ایک فن کار کی حیثیت سے منٹو نے اپنی پہلی فنی زندگی میں بھی اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا کہ انہیں اپنے افسانہ میں کوئی ایک بات کہنی ہے اور اس طرح پڑھنے والے کے ذہن پر ایک خاص تاثر قائم کرنا ہے۔ ان کے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے افسانہ کا مطالعہ کرنے کے بعد پڑھنے والے کے سامنے بے شمار چیزیں آتی ہیں —— یعنی منٹو کا ہمہ گیر مشاہدہ جس ماحول پر اپنی نظر ڈالتا ہے اس کے باریک سے باریک پہلو کو نظر میں رکھ کر اسے اپنے افسانہ کا پس منظر بناتا ہے۔ واقعہ اور کردار کے ذکر میں منٹو بہت کم اس جرم کے مرتکب ہوتے ہیں کہ وہ واقعہ اور کردار کی پوری تفصیلات پر عبور حاصل کئے بغیر اس کے متعلق کچھ لکھنے کی کوشش کریں۔ لیکن ایک مخصوص ماحول یا کردار کے ہر پہلو اور اس کی ہر فروعی اور جزوی کیفیت سے پوری طرح واقف ہونے کے بعد بھی وہ اس ماحول یا کردار کی مصوری کو اپنی افسانہ نگاری کا مقصد نہیں بناتے۔ یہ سارا علم عموماً ایک مخصوص تاثر پیدا کرنے کے لئے پس منظر یا وسیلہ کا کام دیتا ہے۔ یہی حقیقت میں اس پس منظر کے پیچھے کوئی ایک تاثر، جذبہ، ذہنی کیفیت موجود ہوتی ہے جسے سامع یا ناظر کے ذہن تک پہنچانا افسانہ نگار کا مقصود ہے۔ مثلاً ان کے افسانے 'نیا قانون'، 'خوشیا'، 'ممی' اور 'نیا سال' پڑھ کر پڑھنے والا افسانہ نگار کے مشاہدے، اس کے تخیل، فکر اور تجزیہ کیا

کی بدولت سب بے شمار چیزوں کا عکس اپنی آنکھوں کے سامنے محسوس کرتا ہے۔ لیکن ان بے شمار چیزوں کا مشاہدہ مجموعی طور پر اس کے ذہن میں ایک خاص کردار کی ذہنی کیفیت کا نقش بٹھاتا ہے۔ افسانہ پڑھتے وقت ایک نئے ماحول اور ایک نئی فضا کی ان گنت تصویر اس کی نظر کے سامنے آتی اور رخصت ہوتی رہتی ہیں اور ان سے حسب موقع پڑھنے والا لطف و حظ محسوس کرتا رہتا ہے، لیکن افسانہ ختم کر چکنے کے بعد افسانہ نگار کے مصورانہ قلم کے بنائے ہوئے یہ بے شمار نقش رخصت ہو جاتے ہیں اور خود رخصت ہوتے وقت صرف ایک چیز پڑھنے والے کے ذہن پر چھوڑ جاتے ہیں ــــ یہ چیز 'یا قانون'، 'خوشیا'، 'نعرہ' اور 'نیا سال' کے مرکزی کردار کی ایک مخصوص ذہنی کیفیت ہے۔ یہ سب افسانے اپنی واقعاتی اور نفسیاتی ... نگی کے باوجود مجموعی حیثیت سے صرف اس گہرے تاثر اور اس جذباتی کیفیت کے ترجمان ہیں جس میں ایک خاص فرد مبتلا ہے۔ 'منتر' اور 'میرا ... اس کا انتقام' اپنی دلچسپ اور رومانی تفصیلات کی بنا پر شروع سے آخر تک پڑھنے والے کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔ ان افسانوں میں جو کردار ... پڑھنے والے کے سامنے آتے ہیں ان کی ایک ایک بات میں ان کے مخصوص مزاج اور اس مزاج کی منفرد خصوصیات کا عکس ہے لیکن افسانہ پڑھ چکنے کے بعد پڑھنے والا جس چیز کا سب سے نمایاں اثر قبول کرتا ہے وہ صرف ایک واقعہ ہے ــــ ایک صورت میں واقعہ کی ہلکی پھلکی ہنسانے والی کیفیت اور دوسری صورت میں رومان اور مزاح کا ایک ملا جلا تاثر پڑھنے والے کے ذہن پر ہر دوسری چیز کے مقابلہ میں اپنا نقش چھوڑ کر جاتا ہے ... طرح بلکہ ایک مخصوص ماحول اور فضا اور اس ماحول اور فضا میں رہنے بسنے والے گوناگوں کرداروں کی انفرادیت کا نقش ہونے کے باوجود مجموعی طور پر ہنک کی ہیروئن 'سوگندی' کے کردار کی ایک مکمل تصویر ہے۔ وہ ساری فضا جو افسانہ نگار نے مشاہدہ، تخیل اور فکر کی پوری قوتوں سے کام لے کر تخلیق کی ہے اور وہ سارے کردار جن کی مدد سے اس فضا کا خصوصی رنگ واضح ہوتا ہے مل جل کر سوگندی کے کردار کو مکمل کرنے میں حصہ لیتے ہیں اور اس طرح افسانہ میں بہت کچھ ہونے کے باوجود 'سوگندی' ہی سب کچھ ہے۔ افسانہ ختم کرنے پر ہم سوگندی کے علاوہ باقی سب چیزوں کو، باقی کرداروں کو بھول جاتے ہیں۔ وہ گردوپیش کی ہر چیز پر غالب آ کر اس طرح سما جاتی ہے کہ ہمارے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ ہی نہیں رہتا کہ صرف 'سوگندی' کو یاد رکھیں اور اس طرح یاد رکھیں جیسے ہم اسے برسوں سے جانتے پہچانتے ہیں۔ اس کی ہر چھوٹی بڑی بات اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے اور اس کے دل کا ہر راز ہمارا راز ہے۔

منٹو کی افسانہ نگاری فن کی مختلف منزلوں سے گذری ہے۔ ان منزلوں میں سے بعض منزلیں ترقی کی ہیں اور بعض تنزل کی۔ لیکن ان میں سے ہر منزل میں منٹو نے اپنے اس منصب کو برابر یاد رکھا ہے کہ اسے کہانی کے ذریعہ صرف ایک چیز یا ایک بات قاری کے ذہن تک پہنچانی اور اس کے دل میں طاری اور جاگزیں کرنی ہے۔ افسانہ نگاری کے اسی بنیادی اصول نے یہ بات بھی سکھائی ہے کہ کہانی ختم ہونے کے بعد قاری کے ذہن پر ایک واحد تاثر قائم ہونا چاہئے لیکن یہ واحد تاثر پیدا کرنے اور اسے قائم رکھنے کے لئے اسے مختلف فنی وسیلے استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ یہ فنی وسیلے اگر پوری ہمواری اور پورے فنی احساس اور خلوص کے ساتھ کام میں نہ لائے جائیں تو مجموعی تاثر کا حصول بھی ناممکن ہو جاتا ہے اور کہانی کی اس وحدت میں بھی ... پیدا ہو جاتا ہے جو اس کی بنیادی اور امتیازی خصوصیت ہے۔

افسانہ نگار یہ سوچ کر اور یہ فیصلہ کر لینے کے بعد کہ اسے اپنے افسانے کے ذریعہ قاری کے ذہن پر کون سا واحد نقش قائم کرنا ہے، اپنے افسانہ کا ایک ڈھانچا بناتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ افسانہ کس طرح ختم ہوگا، کس طرح آہستہ آہستہ آگے بڑھے گا اور کس طرح ختم ہوگا۔ اچھی کہانی کی خصوصیت جہاں ایک طرف یہ ہے کہ وہ ختم ہو چکے تو پڑھنے والے کے ذہن کو تاثرات کے انتشار میں مبتلا نہ کر دے، دوسری اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ لکھنے والے نے کہانی کے مختلف حصوں میں آہستہ آہستہ ایسی فضا بنائی ہو کہ پڑھنے والے کا ذہن اس مجموعی تاثر کو بڑے فطری انداز میں قبول کرے۔ فضا بنانے اور ذہن کو ایک خاص تاثر قبول کرنے پر آمادہ کرنے کا مشکل کام یوں تو پوری کہانی میں جاری رہتا ہے لیکن اس کا نقطۂ آغاز افسانے کے وہ ابتدائی الفاظ یا جملے ہیں جنہیں ہم افسانے کی تمہید کہتے ہیں۔ افسانہ کی تمہید افسانوی فن کی بڑی اہم، بڑی دشوار اور افسانہ نگار کے نقطۂ نظر سے بڑے کام کی منزل ہے

افسانہ نگار نے اپنے ہم سفر کی ابتدا اگر پوری طرح قدم جما کر ہمواری اور استواری کے ساتھ کی ہے تو آگے کا سفر اس کے لئے خود بخود آسان ہو جائے گا۔ سب سے بڑی بات یہ ہوگی کہ اسے اپنے سفر کے بالکل شروع ہی سے ایسے ہم سفر مل جائیں گے جو قدم سے قدم ملا کر اس کے ساتھ چلیں گے۔ یہ ہم سفر وہ قاری ہیں جو افسانہ کی موزوں تمہید سے متاثر ہو کر افسانہ کے آنے والے حصّوں کو دلچسپی اور اشتیاق کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے افسانہ نگار کبھی اپنے افسانے کی تمہید کی طرف سے غفلت نہیں برتتے۔ قاری کے ذہن پر پوری طرح چھا جانے کا جو نصب العین افسانہ نگار کے سامنے ہے وہ مناسب اور موزوں تمہید کے ذریعہ آدھا بلکہ بعض اوقات آدھے سے بھی زیادہ اس کے قبضے میں آجاتا ہے۔ منٹو نے ایک دیانت دار اور مخلص فن کار کی طرح ہمیشہ اپنی تمہید اس میں جانی ہے کہ وہ موزوں تمہید سے شروع ہی سے قاری کے ذہن پر چھا جائے۔ منٹو نے اچھے اور برے جتنے افسانے بھی لکھے ہیں ان کے موضوع اور خیال سے پڑھنے والا خواہ متفق ہو یا نہ ہو لیکن افسانہ کی تمہید میں اسے ضرور ایک دلکشی محسوس ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو افسانہ پڑھنے پر مجبور سا پاتا ہے۔

منٹو نے اپنے افسانوں کی تمہید سے مختلف موقعوں پر مختلف کام لئے ہیں، لیکن کام خواہ کچھ بھی لیا ہو قاری کے ذہن پر چھا جانا ہی سے ایک گہرا نقش بنا دینے میں کامیابی ضرور حاصل کی ہے۔ منٹو کے چند افسانوں کی تمہیدیں دیکھ کر اندازہ لگتا ہے کہ تمہید کو پڑھنے والے کے لئے دل نشین بنانے کے علاوہ اس نے اسے کن کن فنی مقاصد کے لئے استعمال کیا ہے۔

'نیا قانون' اس طرح شروع ہوتا ہے:

> "منگو کوچوان اپنے اڈے میں بہت عقلمند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈے کے وہ تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے، استاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔"

اسی طرح 'بلاؤز' کی تمہید یہ ہے:

> "کچھ دنوں سے مومن بہت بے قرار تھا۔ اس کا وجود کچا پھوڑا سا بن گیا تھا۔ کام کرتے وقت، باتیں کرتے ہوئے حتیٰ کہ سوچنے پر بھی اسے ایک عجیب قسم کا درد محسوس ہوتا تھا۔ ایسا درد جس کو اگر وہ بیان بھی کرنا چاہتا تو نہ کر سکتا۔"

ان دونوں تمہیدوں کے ذریعہ قاری کا تعارف دو کرداروں سے ہوتا ہے لیکن ایک ایسے انداز میں ہوتا ہے کہ اس کے دل میں ان دونوں کے متعلق کچھ اور جاننے کی خواہش پیدا ہوتی اور اسے افسانہ کا باقی حصہ پڑھنے پر اکساتی اور مجبور کرتی ہے۔

دو تمہیدیں اور دیکھئے:

> "گھر میں بڑی چہل پہل تھی۔ تمام کمرے لڑکے لڑکیوں، بچے بچیوں اور عورتوں سے بھرے تھے اور وہ شور برپا ہو رہا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اگر اس کمرے میں دو تین بچے اپنی ماؤں سے چمٹے دودھ پینے کے لئے بلبلا رہے ہیں، تو دوسرے میں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ڈھولکی لئے بے سری تانیں اڑا رہی ہیں۔ نہ تال کی خبر ہے نہ لے کی، بس گائے جا رہی ہیں، نیچے ڈیوڑھی سے لے کر بالائی منزل تک مکان مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ کیوں نہ ہو، ایک مکان میں دو بیاہ رچے تھے۔ میرے دونوں بھائی اپنی چاند سی دلہنیں بیاہ کر لائے تھے۔"

"میری اور اس کی ملاقات آج سے ٹھیک دو برس پہلے اپولو بندر پر ہوئی۔ شام کا وقت تھا۔ سورج کی آخری کرنیں سمندر کی ان دور دراز لہروں کے پیچھے غائب ہو چکی تھیں جو ساحل کے بنچ پر بیٹھ کر دیکھنے سے موٹے کپڑے کی تہیں معلوم ہوتی تھیں۔ میں گیٹ آف انڈیا کے اس طرف پہلا بنچ چھوڑ کر جس پر ایک آدمی چمپی والے سے اپنے سر کی مالش کرا رہا تھا، دوسرے بنچ پر بیٹھا تھا اور حدِ نظر تک پھیلے ہوئے سمندر کو دیکھ رہا تھا۔ دور، بہت دور جہاں سمندر اور آسمان گھل مل رہے تھے، بڑی بڑی لہریں آہستہ آہستہ اٹھ رہی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت بڑا گہرے رنگ کا قالین ہے جسے اُدھر سے اِدھر سمیٹا جا رہا ہے۔"

پہلی تمہید "شوشو" کی ہے اور دوسری "بانجھ" کی۔ دونوں تمہیدوں میں افسانہ نگار نے آنے والے واقعات کیلئے ایک فضا تیار کی ہے اور اس سماں میں دونوں موقعوں پر اتنے زیادہ رنگ بھرے ہیں کہ دیکھنے والا خود کو ان رنگوں کی کثرت میں ڈوبتا اور جذب ہوتا ہوا محسوس کرتا ہے اور پھر یہ سوچ کر کہ دیکھیں اس کے بعد کیا ہوتا ہے افسانوں کو آگے پڑھتا ہے۔

"پھاہا" کی تمہید صرف ایک جملہ ہے۔ لیکن اس جملے سے افسانہ نگار نے اپنا کام ایک دوسری طرح نکالا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

"گوپال کی ران پر جب یہ بڑا پھوڑا نکلا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔"

گوپال کے متعلق افسانہ نگار نے اچانک جو خبر سنائی ہے اس سے قاری کے اوسان بھی تھوڑے بہت ضرور خطا ہو جاتے ہیں اور وہ گھبرا کر اپنے دل سے سوال کرتا ہے کہ اس کے بعد کیا ہوا ہوگا۔ ــــــ یہی افسانہ نگار کی جیت ہے۔ اس نے ایک معمولی سی خبر سنا کر قاری کو اپنے ساتھ اپنے پیچھے چلنے پر مجبور کر دیا۔

ایک اور افسانے کی تمہید دیکھئے:

"ایک نہایت ہی تھرڈ کلاس ہوٹل میں دیسی وسکی کی بوتل ختم کرنے کے بعد طے ہوا کہ باہر گھوما جائے اور ایک ایسی عورت کی تلاش کی جائے جو ہوٹل اور وسکی کے پیدا کردہ تکدّر کو دور کر سکے۔"

یہ تمہید "پہچان" کی ہے۔ اس میں نہ کسی کردار کا تعارف ہے نہ کوئی فضا یا ماحول بنانے یا پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، نہ کوئی چونکا دینے والی خبر سنائی گئی ہے۔ بلکہ بڑے واضح اشاروں میں یہ بتا دیا گیا ہے کہ آگے کیا کچھ ہونے والا ہے اور اس طرح آنکھ کے اشارے سے قاری کو گویا یہ دعوت بھی دی گئی ہے کہ "آؤ، اگر تم بھی ان شرابیوں کی سرگردانی دیکھنا چاہتے ہو تو آ جاؤ" ــــ اور معصوم قاری فوراً یہ دعوت قبول کر لیتا ہے۔

اور سنئے:

"اسے یوں محسوس ہوا کہ اس سنگین عمارت کی ساتوں منزلیں اس کے کاندھوں پر دھر دی گئی ہیں۔"

یہ "نعرہ" کی تمہید ہے اور اس میں افسانہ کے مرکزی کردار کیشو لال کی ذہنی کیفیت کا نقش قاری کے دل میں بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے اور ہر شخص یہی کہے گا کہ افسانہ نگار اپنی کوشش میں کامیاب ہوا ہے۔ اس لئے کہ کیشو لال کے اس شدید احساس کے پیچھے کیا واقعہ کام کر رہا ہے، اس کے دل میں یہ جاننے کی خلش پیدا ہو گئی ہے اور اس طرح یوں سمجھئے کہ افسانہ نگار کا تیر نشانہ پر بیٹھا۔

"دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی اور لیٹتے ہی سو گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی کا داروغہ صفائی، جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارا کرتی تھی، ابھی ابھی اس کی ہڈیاں پسلیاں جھنجھوڑ کر شراب کے نشے میں چور گھر کو واپس گیا تھا ــــ وہ رات کو یہیں ٹھہر جاتا، مگر اسے اپنی دھرم پتنی کا بہت خیال تھا جو اس سے بے حد

پریم کرتی تھی۔

یہ تمہید "مہلک" کی ہے اور اس میں افسانہ نگار نے ایک کے بجائے کئی باتیں کہی ہیں۔ ایک تیر سے کئی شکار کئے ہیں، اس لئے کہ افسانہ آگے چل کر جو گھمسان شروع ہونے والا ہے اس کا تقاضا ہی یہ ہے کہ وہ بات سیدھے سادے انداز میں کہنے کے بجائے ذرا تیکھے تیور کے ساتھ کہے۔ قاری افسانہ نگار کے ان تیکھے تیوروں کو پہچان جاتا ہے اور یہ سوچ کر کہ دیکھیں یہ تھک ہار کر سو جانے والی اور اپنی بیوی کا مجرب واسطۂ صفائی آگے چل کر کیا گل کھلاتے ہیں، افسانہ کے منجدھار میں کود پڑتا ہے۔

منٹو نے افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنے منصب کو پوری طرح پہچانا اور اپنے ترکش کے ہر تیر کی اہمیت کا صحیح اندازہ لگایا ہے۔ انھی تیروں میں سے ایک تیر اس کے افسانہ کی تمہید ہے، جو ہر افسانہ میں ایک نیا کام کرتی ہے، کردار کو متعارف کرنے کا، ایک خاص فضا یا ماحول بنانے کا، ایک پھڑکتی ہوئی خبر سنانے کا، کسی کردار کی ذہنی کشمکش کی مصوری کرنے کا، آنے والے واقعات کے لئے زمین ہموار کرنے کا اور کبھی کبھی بہ یک وقت کئی ملے جلے مقصد پورے کرنے کا، لیکن ان گوناگوں کاموں کے علاوہ جو کام منٹو کے افسانہ کی ہر تمہید نے اپنے ذمے لیا ہے یہ ہے کہ وہ قاری کے ذہن کو بیدار کر دے، اس کے دل میں گدگدی پیدا کر کے یا اس کے ذہن میں آگے بڑھنے کی خواہش پیدا کر کے افسانہ پڑھ لینے پر آمادہ کر دے۔ منٹو کی فنی کامیابی کی یہ پہلی اہم منزل ہے اور یہ منزل طے کرنے کے لئے اس نے عموماً پورے سوچ بچار سے قدم اٹھایا ہے۔

تمہید افسانہ کا پہلا قدم ہے اور اس کا انجام اس کی آخری منزل۔ افسانہ نگار اپنی تمہید کے ذریعہ پڑھنے والے کے ذہن اور دل پر تسلط جماتا اور اسے افسانہ کے آنے والے عنصروں میں دلچسپی لینے کی طرف مائل کرتا ہے۔ آنے والے عنصر سفر کی مختلف منزلیں ہیں جن میں طرح طرح کی صعوبتیں مسافر کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ نہ جانے کیسے کیسے کانٹے ہیں جو اس کے تلووں میں چبھنے کے لئے بے قرار نظر آتے ہیں۔ افسانہ پڑھنے والا ان صعوبتوں کو آسان بنانے اور راستے میں پھیلے اور بکھرے ہوئے کانٹوں کو راستے سے ہٹانے کے لئے افسانہ نگار کی رہنمائی اور مدد کا طالب ہوتا ہے۔ آخر افسانہ نگار کی رہنمائی اسے اس منزلِ مقصود تک پہنچاتی ہے، جسے ہم افسانہ کا انجام کہتے ہیں۔ راہ کی ساری کٹھن منزلیں طے کرنے اور چبھنے والے کانٹوں کی خلش کو گوارا اور آسان بنا لینے کے بعد اس کی سب سے بڑی خواہش اور تمنا یہ ہوتی ہے کہ اس کی منزل اس کے قلب و ذہن کے لئے سکون و راحت کا سرمایہ بہم پہنچا سکے۔ پڑھنے والے کے ذہن کو یہ سکون اور اس کے دل کو یہ راحت دینے کے لئے افسانہ نگار کو ایک ایسے انجام کی جستجو کرنی پڑتی ہے جو فنی حیثیت سے طے کی ہوئی منزلوں کا منطقی نتیجہ بھی معلوم ہو اور پڑھنے والے کے لئے قابلِ قبول بھی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ نگار کو اپنے انجام کی تلاش میں پوری ذہنی کاوش کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ افسانہ کے خاتمہ پر افسانہ نگار کی ذرا سی سستی، ذرا سی تن آسانی، سہل انگاری اور بالکل معمولی سی غفلت اور لغزش اس کے افسانہ کا خون بھی کر سکتی ہے اور پڑھنے والے کے لئے کوفت اور خلش کا باعث بھی بن سکتی ہے ——— منٹو نے اپنے افسانوی فن میں انجام کی ان نزاکتوں کو پوری طرح محسوس کر کے عموماً اپنا فنی منصب پورا کرنے کی طرف توجہ دی ہے۔ اس نے اس "انجام" سے قاری کے ذہن کو متاثر کرنے کی خدمت بھی انجام دی ہے اور افسانہ کو افسانہ کی حیثیت سے مکمل کرنے کا بھی کام لیا ہے۔ منٹو کے بعض افسانوں کے انجام دیکھ کر اس کے فن کی اس خصوصیت کا اندازہ لگائیے۔

ان کا افسانہ "نیا قانون" اس طرح ختم ہوتا ہے:

استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے لے گئے ——— راستے میں اور تھانے کے اندر وہ نیا قانون نیا قانون چلاتا رہا مگر کسی نے ایک نہ سنی۔

"نیا قانون، نیا قانون کیا بک رہے ہو ——— قانون وہی ہے پرانا!"

اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

"پھاہا" کا انجام یہ ہے:

نرملا بڑے انہماک سے پھاہا تراش رہی تھی۔ اس کی پتلی پتلی انگلیاں قینچی سے بڑا نفیس کام لے رہی تھیں پھاہا کاٹنے کے بعد اس نے تھوڑا سا مرہم نکال کر اس پر پھیلایا اور گردن جھکا کر اپنے کرتے کے بٹن کھولے سینے کے داہنی طرف چھوٹا سا اُبھار تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تکلی پر صابن کا چھوٹا سا نامکمل بلبلا اٹکا ہوا ہے۔

نرملا نے پھاہے پر پھونک ماری اور اس ننھے سے اُبھار پر جما دیا۔

"شہ نشین پر" کے آخری الفاظ یہ ہیں:

وہ دیر تک سوچتی رہی۔ وہ اب زیادہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا، "میں زندہ رہا ہوگا۔"

اس کے اس دھیمے لہجے میں عزم کے آثار تھے۔ اس ننگی ہوتی جوانی کو اونگھتی ہوئی چاندنی میں چھوڑ کر میں اپنے فلیٹ پر چلا آیا اور سو گیا۔

"ہتک" کی ہیروئن 'سوگندی' ہم سے اس طرح رخصت ہوتی ہے:

"بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اس کو اپنا دل پرچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔"

"...... اس کے حلق سے ایک نعرہ ...... کان کے پردے پھاڑ دینے والا نعرہ، پگھلے ہوئے گرم گرم لاوے کے مانند نکلا —— ہٹ تیری ......!

جتنے کبوتر ہوٹل کی منڈیروں پر اونگھ رہے تھے ڈر گئے اور پھڑ پھڑانے لگے۔ نعرہ مار کر جب اس نے اپنے قدم زمین سے بڑی مشکل کے ساتھ علیحدہ کئے اور واپس مڑا تو اسے اس بات کا پورا یقین تھا کہ ہوٹل کی عمارت اڑا اڑا دھم نیچے گر گئی ہے۔

اور یہ نعرہ سن کر ایک شخص نے اپنی بیوی سے جو یہ شور سن کر ڈر گئی تھی، کہا یہ پگلا ہے!"

(نعرہ)

"...... پہلے پہل تو میں بہت متحیر ہوا کہ یہ کس کی حرکت ہے۔ مگر فوراً ہی سب معاملہ صاف ہو گیا —— سیوا جی میری غیر حاضری میں اپنی ہمسایہ سلطنت پر نہایت کامیابی سے چھاپا مار گئے تھے۔" (میرا اور اس کا انتقام) "اس واقعہ کو ایک زمانہ گزر چکا ہے مگر جب کبھی میں اس کو یاد کرتا ہوں، میرے ہونٹوں میں سوئیاں سی چبھنے لگتی ہیں —— یہ نامکمل بوسہ ہمیشہ میرے ہونٹوں پر انگارہ رہے گا۔"

(نامکمل تحریر)

"جب اس کو غسل دینے گئے تو ہسپتال کے ایک نوکر نے مجھے بلایا اور کہا "ڈاکٹر صاحب! اس کی مٹھی میں کچھ ہے" میں نے اس کی بند مٹھی کو کھول کر دیکھا۔ لوہے کے دو کلپ تھے۔ اس کی بیگم کی یادگار! "ان کو نکالنا نہیں، یہ اس کے ساتھ ہی دفن ہوں گے" میں نے غسل دینے والوں سے کہا اور دل میں غم کی ایک عجیب و غریب کیفیت لئے دفتر چلا گیا۔"

(بیگو)

وہ گھبرا کر اٹھا اور سامنے کی دیوار کے ساتھ اس نے اپنا ماتھا رگڑنا شروع کر دیا جیسے وہ اس سجدے کا نشان مٹانا چاہتا ہے۔ اس عمل سے اسے جب جسمانی تکلیف پہنچی تو وہ پھر کرسی پر بیٹھ گیا — سر جھکا کر اور کاندھے ڈھیلے کر کے اس نے تھکی ہوئی آواز میں کہا "اے خدا! میرا سجدہ مجھے واپس دے دے ...."

(سجدہ)

منٹو کی مختلف کہانیوں کے یہ سب خاتمے جہاں ایک طرف اس مشترک خصوصیت کے حامل ہیں کہ ان سے پڑھنے والے کو اپنے ذہنی انتشار سے مخرج کرنے میں مدد ملتی ہے اور وہ کہانی کے انجام میں اپنے اس اشتیاق کی تسکین تلاش کر لیتا ہے جو کہانی کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس میں پیدا ہوتا اور ابھرتا رہا تھا، دوسری طرف وہ ان میں سے ہر ایک خاتمہ کو اس منطقی ربط کی آخری کڑی بنا کر جو کہانی کی تمہید سے شروع ہو کر بار بار زیادہ مستحکم بنتا رہا تھا، افسانہ کی فنی زنجیر کو مکمل کر لیتا ہے۔ ان میں سے ہر خاتمہ کی ایک نفسیاتی اور جذباتی حیثیت ہے اور دوسری فنی۔ منٹو نے جذبات نفسیات اور فن کے رشتے جوڑنے اور انہیں منضبط بنانے میں ہمیشہ اپنی کہانیوں کے انجام سے کوئی نہ کوئی کام لیا ہے۔

"نیا قانون" کے خاتمہ میں استاد منگو خاں کی اس جذباتی شدت کا ایک متضاد ردِ عمل ہے جس سے پڑھنے والے کے دل میں درد کی ایک ٹیس اٹھتی ہے۔ "پھاہا" کا انجام واقعہ نگاری اور نفسیاتی تجزیہ کا بڑا سیدھا سادا اور ایک ایسا غیر محسوس امتزاج ہے جو ایک معمولی سے واقعہ کو اس کی نظر میں بڑی اہمیت دے دیتا ہے۔ "شہ نشین پر" کا انجام جذباتی کھنچاؤ، کشمکش اور اس کے بڑے سادہ مگر فن کارانہ حل کی تصویر ہے۔ "مہک" کے انجام میں افسانے کے وسیع پس منظر، ایک خاص کردار کے شدید ردِ عمل اور زندگی کے ایک بڑے دُکھتے ہوئے ناسور کو بظاہر ایک معمولی سے واقعے کے ذکر سے اس طرح حل کیا گیا ہے کہ تاثر کی شدت کم ہونے کے بجائے ایک مستقل صورت اختیار کر لیتی ہے اور پڑھنے والا سوگندی کی جذباتی شدت میں اس کا یہ نوا ہو کر ہر اس چیز سے نفرت کرنے لگتا ہے جو سوگندی کے نزدیک قابلِ نفرین ہے۔ "نعرہ" کے آخری چند جملوں میں کہانی کے مرکزی کردار کیشولال کی جذباتی شدت اور اعصابی کشمکش کو تھوڑے سے لفظوں میں بیان کر کے افسانہ کو جس جملے پر ختم کیا ہے اس کی سادگی کی شدت کو اور بھی نمایاں کر کے زندگی کی ٹریجڈی کو تلخ تر بنا دیتی ہے۔ جذباتی شدت اور فضا کی تلخی کو اس طرح کی سادگی سے نمایاں کرنا منٹو کے بعض خاتموں کی ایک واضح خصوصیت ہے۔ "بیگو" کا انجام منٹو کے فن کی ایک اور خصوصیت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وہ یہ کہ منٹو اپنے افسانے کے خاتمہ پر ایک بظاہر بالکل غیر اہم اور معمولی بات کہہ کر پڑھنے والے کے ذہن کو ایک بار پھر بڑی تیزی سے ان سارے واقعات میں گذار دیتے ہیں جو افسانے میں اس سے پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ اس مرتبہ یہ معمولی سی غیر اہم بات گذرے ہوئے واقعات میں ایک ایسا رنگ بھر دیتی ہے جو اس سے پہلے پڑھنے والے کی نظر سے اوجھل رہا تھا۔ "میرا اور اس کا انتقام" میں آخری جملے میں چھپی ہوئی ہلکی سی ایمائیت کہانی کے دونوں مرکزی کرداروں کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کو آئینہ کی طرح روشن کر دیتی ہے۔ دونوں کرداروں نے کہانی میں شروع سے آخر تک جو کچھ کیا اور کہا ہے اس سے پڑھنے والے جو مختلف نتائج اخذ کرتے ہیں اس سیدھے سادے جملے سے ان میں مکمل ہم رنگی اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے اور ہر پڑھنے والا صرف

ایک واضح اور معین نتیجے کے سوا کسی دوسرے نتیجے پر نہیں پہنچتا۔ "نامکمل تحریر" میں آخری جملے میں بات کہنے کے ایک نئے انداز سے ایک معمولی سے رومانی واقعہ کو ایک ناقابلِ فراموش یاد کی حیثیت مل جاتی ہے۔ "سجدہ" کا انجام منٹو کی اس منفرد خصوصیت کی ترجمانی کرتا ہے جس میں افسانہ نگار کوئی ایسی بات کہہ کر جس سے پڑھنے والوں میں سے بعض کے تصورات پر ایک چوٹ سی لگتی ہے، اپنے فن کے لئے زندگی کا سامان مہیا کرتا ہے۔

منٹو کی مختلف کہانیوں کے ان خاتموں پر نظر ڈال کر ان افسانوں کا فنی تجزیہ کرنے والا واضح طور پر یہ بات محسوس کرتا ہے کہ فن کے نقطۂ نظر سے سب خاتمے افسانے کے مجموعی تاثر کو مکمل کرنے کی خدمت انجام دینے کے علاوہ پڑھنے والے کے ذہن کے لئے اس مسرت کا باعث بنتے ہیں جو ہر اچھی فنی تخلیق کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ ان سب خاتموں میں لکھنے والے کی قدرتِ بیان اور اس کے اندازِ فکر کی ندرت اور شوخی ہر جگہ ایک نیا رنگ پیدا کرتی ہے۔ کبھی محض سادگیٔ بیان سے، کبھی تضاد سے، کبھی تکرار سے، کبھی مزاح کی شوخی سے، کبھی طنز سے اور کبھی مشاہدہ، فکر اور تخیل کے امتزاج سے وہ اپنے فن کی تکمیل میں مدد لیتا ہے اور پڑھنے والا اگر غور سے دیکھے تو یہ محسوس کرنے میں دقت نہیں ہوتی کہ افسانے کے خاتمے کا انداز پوری طرح سوچا سمجھا ہوا ہے۔ افسانہ نگار نے خاتمے کے وہ چند جملے جن میں ہر جگہ اس کی فطانت، فطنت اور شوخی نمایاں ہے محض اتفاق کا نتیجہ نہیں۔ افسانہ اتار چڑھاؤ کے مختلف مرحلے طے کر کے یہاں تک پہنچا ہے —— بلکہ شاید یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ افسانہ نگار نے اسے اس منزل تک پہنچایا ہے اور اس طرح پہنچایا ہے کہ تھکن کا شائبہ کبھی پیدا نہیں ہونے پایا۔ افسانے کے انجام میں وہی تازگی و توانائی یہاں بھی ہے جو اس کے آغاز میں تھی۔ یہ نتیجہ ہے افسانہ نگار کی اس فنی توانائی کا جو ہر مرحلہ پر اور ہر منزل میں اس کی ہم عناں و ہم سفر ہے۔

افسانہ کا آغاز اور اس کا انجام —— ان دونوں مرحلوں کے درمیان افسانہ نگار کو جن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے وہ اگر ان میں سے کسی ایک کی اہمیت کی طرف سے بھی غفلت یا بے نیازی برتے تو افسانے کے مجموعی تاثر میں فرق پیدا ہو جانا ضروری ہے۔ منٹو کو فن کے ان مراحل کا پورا احساس ہے اسی لئے ان کا ہر افسانہ آغاز سے انجام تک بعض واضح مرحلے طے کرتا ہے اور اس طرح ہر انجام میں ایک ایسی منطق ہوتی ہے جس کا پڑھنے والے کو احساس تو نہیں ہوتا لیکن اس سے وہ متاثر اور مسرور ضرور ہوتا ہے۔ افسانہ شروع ہو کر بڑی دھیمی لیکن نپی تلی چال سے، بڑے نرم لیکن بڑے توانا قدم رکھتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور جوں جوں آگے بڑھتا ہے پڑھنے والے کے دل و دماغ پر اس کا قبضہ زیادہ مستحکم اور زیادہ یقینی ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ اس دھیمی اور نپی تلی رفتار سے افسانہ اپنے انجام کو پہنچتا ہے اور افسانے کے ہر مرحلہ پر اس کا ساتھ دینے والا قاری سفر کے اختتام پر ایک طرح کا سکون، ایک طرح کی مسرت محسوس کرتا ہے۔ اسے یوں لگتا ہے کہ اس نے کوئی بہت بڑا مرحلہ طے کیا ہے اور بڑی کامیابی سے طے کیا ہے۔ یہ احساس ہی حقیقت میں افسانہ نگار کی فنی کامیابی کی دلیل ہے —— ایک ایسی کامیابی جو یوں ہی اتفاقاً ہاتھ نہیں آجاتی۔ اس میں لکھنے والے کو بڑے سوچ بچار سے کام لینا پڑتا ہے۔ آغاز اور انجام کے درمیان کی ہر چھوٹی بڑی کڑی کو بڑی احتیاط سے اس جگہ جوڑنا پڑتا ہے جو اس کے لئے سب سے موزوں ہو۔ کوئی کڑی اگر ذرا بھی جگہ سے بے جگہ ہو جائے تو ساری زنجیر درہم برہم ہو جائے۔ اس کے ابتدائی سرے اور آخری سرے میں جو ہموار ربط ہے اس میں جھٹکے پڑ جائیں اور پڑھنے والے کے لئے اس ربط میں ایک خوش گوار جھنکار کا جو تصور پوشیدہ ہے وہ ریزہ ریزہ ہو جائے۔ ہمارے [illegible] افسانہ نگاروں نے کڑیوں کے ربط کی اس جھنکار کے احساس کو اہمیت دی ہے اور جنہوں نے دی ہے انہوں نے ہمیشہ اس کے فنی مطالبات کو بہت ضروری نہیں سمجھا۔ منٹو کے فن کا یہ اور امتیاز ہے کہ اس نے آغاز اور انجام کو ایک زنجیر میں منسلک کرنے کی اہمیت کبھی نہ بھلاتے ہوئے ہمیشہ افسانہ کی ضرورت کے مطابق اس کے درمیانی حصوں کی ساخت، ترتیب، رفتار اور اتار چڑھاؤ کو پوری فنی ذمہ داری کے ساتھ برتا ہے۔ منٹو کے ہاں فن کے ان مراحل کی جو اہمیت ہے اس کا اندازہ منٹو کے بعض افسانوں پر نظر ڈال کر کیجئے۔

"نیا قانون" کے استاد منگو خاں کے جذبات کی پہلی منزل تو وہ ہے جب وہ ہندوستان میں نافذ ہونے والے جدید آئین کی خبر سن کر خوشی سے پھولا نہیں سماتا اور اس کا انجام یہ ہے کہ نیا قانون نافذ ہو جانے کے بعد بھی اسے ایک گورے سے لڑنے کے جرم میں حوالات میں بند کر دیا جاتا ہے۔

اس آغاز اور انجام کے درمیانی حصوں کو اس طرح پڑکنا کہ افسانے کا انجام پڑھنے والے کے لئے حد درجہ کرب انگیز بن جائے، منٹو کے فنی احساس اور احساس کی پیدا کی ہوئی ترتیب و تنظیم کا مظہر ہے۔ نیا قانون نافذ ہونے کی خبر سُن کر منگو خاں کو جو خوشی ہوئی تھی اس کے مطلعے قانون کے نافذ ہونے کی تاریخ تک منٹو نے کئی ایسے مرحلے پیدا کئے جن پر منگو خاں کی حالت دیکھ کر قاری برابر یہ اندازہ لگاتا رہتا ہے کہ اس کی مسرّت آہستہ آہستہ وارفتگی اور دیوانگی کا درجہ اختیار کر رہی ہے اور بالآخر جب وہ روزِ سعید آپہنچتا ہے تو اس کی مسرّت وارفتگی اور دیوانگی، شوقِ آزادی کو مجسّم دیکھنے کے لئے بیتاب نظر آنے لگتی ہے اور عین اس وقت جب اس وارفتگی، شوق کو بظاہر اپنی تکمیل کا موقع مل جاتا ہے اسے حوالات میں داخل ہونا پڑتا ہے —— اور اس طرح منگو خاں نے جذبات و احساسات کے جو متعدد نازک مرحلے طے کئے تھے ان کا یہ غیر متوقع انجام دیکھ کر وہ تو غرقِ استعجاب ہو جاتا ہے اور قاری کے ذہن پر ایک ایسی ٹریجیڈی کا نقش مرتسم ہو جاتا ہے جو اپنی انتہائی سادگی کے باوجود حد درجہ تڑپا دینے والی ہے۔

"نیا قانون" منٹو کی بڑی مشہور اور بڑی اہم کہانی ہے اس لئے اس میں آغاز اور انجام کے درمیان واقعات کا یہ فنی اتار چڑھاؤ، یہ نازک الیکٹریٹی اور ایک شدید قسم کا نقطۂ عروج شاید بعض لوگوں کو یہ سوچنے کی طرف مائل کرے کہ منٹو اس طرح کے مرحلے صرف ایسے افسانوں میں طے کرتا ہے جو موضوع کے لحاظ سے اہم ہیں۔ حالانکہ غور سے دیکھا جائے تو یہ بات نہیں۔ منٹو فن کے نقطۂ نظر سے اپنے ایک افسانے اور دوسرے افسانے میں امتیاز برتنے کا قائل نہیں۔ فن کے جو مراحل اہم اور ضروری ہیں وہ اس کی ہر کہانی میں یکساں توجہ اور انہماک کے ساتھ پورے ہوتے ہیں اس اندازے کے لئے منٹو کی چند اور کہانیوں پر ایک سرسری سی نظر ڈال لیجئے۔

"منتر" اور "میرا اور اس کا انتقام" موضوع کے اعتبار سے دو بالکل سیدھی سادی اور غیر اہم سی کہانیاں ہیں جن کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ پڑھنے والا انہیں پڑھ کر یہ محسوس کرے کہ اس نے ایک ہلکی پھلکی تفریحی چیز پڑھی ہے۔ ان دونوں افسانوں کا مجموعی تاثر کسی طرح کے قاری پر بھی اس تفریحی تاثر کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا لیکن منٹو نے ان دونوں کی ترتیب میں بھی پورے فنی انہماک سے کام لیا ہے۔ دونوں افسانوں کا آغاز، دونوں کا انجام، اور دونوں کے آغاز اور انجام کے درمیان کی منزلیں سب پورے فنی رکھ رکھاؤ کے ساتھ طے ہوتی ہیں۔

"پھاہا" "بلاؤز" اور "کالی شلوار" ایسے موضوعات کی کہانیاں ہیں جنہیں منٹو کے محبوب موضوع کہا جا سکتا ہے اور جن محبوب موضوعات کے قریبی تعلق نے منٹو کو اردو کا سب سے بدنام افسانہ نگار بنا دیا۔ "پھاہا" اور "بلاؤز" میں ایک لڑکے اور ایک لڑکی کے ان بھولے بھالے اور معصوم جنسی احساسات کی مصوری ہے جو شباب کی صبر آزما اور کٹھن منزل میں قدم رکھنے سے پہلے دل میں ابھرتے اور عجیب و غریب شکلیں اختیار کرتے ہیں۔ ان دونوں افسانوں کو بڑے سیدھے سادے انداز میں شروع کرنے اور اسی سیدھے سادے انداز میں ختم کرنے کے علاوہ آغاز اور انجام کو گہری معنویت دینے کے لئے افسانہ نگار نے بہت سے چھوٹے چھوٹے غیر اہم واقعات کو جوڑ کر ایسی فضا تیار کی ہے جو پوری توجہ اور پورے انہماک کے بغیر ظہور میں نہیں آ سکتی۔ افسانہ نگار کے اسی فنی انہماک اور غور و فکر نے دو سیدھے سادے افسانوں کو ایک حیثیت دے دی ہے، لیکن کمال یہ ہے کہ افسانے نفسیاتی نقطۂ نظر سے دو اہم مطالعے ہونے کے باوجود فن کے ان حدود سے باہر نہیں جاتے جہاں سے نکل کر کہانی کہانی نہیں رہتی۔

یہی صورت "کالی شلوار" کے ساتھ ہے۔ کالی شلوار میں طوائف کی زندگی اور اس کے گھناؤنے ماحول سے تعلق رکھنے والی بہت سی چیزیں پڑھنے والے کے سامنے آتی ہیں۔ اسی ماحول میں واقعات میں ایسا اتار چڑھاؤ پیدا ہوتا ہے اور وہ ایسے پیچ در پیچ مراحل سے گزرتے ہیں کہ پڑھنے والا ماحول کے گھناؤنے پن کی طرف متوجہ ہوئے بغیر صرف ان نفسیاتی محرکات میں دلچسپی لیتا ہے جو کرداروں کو ایک خاص طرح کے عمل کی طرف مائل کرتے ہیں۔ "کالی شلوار" طوائفوں کی گندی کہانی ہونے کے باوجود پڑھنے والے کو اس لئے متاثر کرتی ہے کہ اس میں اس ماحول کے دو کرداروں کی ذہنی کیفیتوں کا ایسا تجزیہ ہے جس میں کہانی کی ساری دلکشی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ افسانہ نگار نے تولا

سے آخر تک افسانے میں جتنی چھوٹی بڑی باتوں کو ایک زنجیر میں مربوط کیا ہے ان میں ایک ایسا رشتہ پیدا ہو گیا ہے جو کسی سخت سے سخت حادثے سے بھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ کہانی کے مختلف ٹکڑوں میں یہ کبھی نہ ٹوٹنے والا رشتہ قائم کرنا، اس کے آغاز اور انجام کو اس طرح چھوٹی بڑی بہت سی اہم اور غیر اہم باتوں کے ذریعہ آپس میں جوڑنا کہ دونوں آپس میں لازم و ملزوم معلوم ہونے لگیں اور دونوں منطقی طور پر یوں شیر و شکر ہو جائیں کہ ایک دوسرے کا سبب اور نتیجہ بن جائیں منٹو کے فن کی ایسی خصوصیت ہے جو ان کے ہر افسانہ میں (یا کم از کم اکثر افسانوں میں) موجود نظر آتی ہے۔ منٹو نے اپنی اسی خصوصیت کے ذریعہ بہت سے پڑھنے والوں کو اپنا گرویدہ بنایا ہے۔

(۲)

منٹو کے افسانوی فن کا ایک پہلو وہ ہے جس کا ذکر میں اب تک کرتا رہا ہوں اور جس میں افسانہ کی مجموعی ساخت، ترتیب، تشکیل اور تعمیر جیسی چیزیں شامل ہیں۔ افسانہ کی تمہید، اس کی اٹھان، اس کے واقعات کا اتار چڑھاؤ، ان واقعات کے پیچ اور الجھاؤ، اس اتار چڑھاؤ، پیچ اور الجھاؤ کے بعد افسانہ کا نقطۂ عروج اور اس کا خاتمہ۔ ان سب چیزوں کا تعلق افسانے کے ڈھانچے اور اس کی ساخت سے ہے، اور اس ساخت میں افسانہ کی ظاہری ہیئت اور اس ہیئت کا مجموعی تاثر پڑھنے والے کے لئے دوسب سے اہم چیزیں ہیں۔ منٹو نے افسانوی فن کے اس ظاہری اور خارجی پہلو کو اور اس کے مختلف اجزاء و عناصر کو جو اہمیت دی ہے اس سے ہمیں یہ اندازہ لگانے اور یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی کہ وہ ایک فن کار کی حیثیت سے فن کے ان ظاہری پہلوؤں کو اپنے افسانے کی ساخت اور تشکیل میں ایک بنیادی اور اہم حیثیت دیتے ہیں اور ان کی اہمیت ان کے نزدیک اس لئے ہے کہ یہ پڑھنے والے کے ذہن اور قلب پر ایک مخصوص تاثر قائم کرنے کے یقینی وسائل ہیں۔ گویا ان کا مقصود بالذات فن کے یہ ظاہری پہلو ہرگز نہیں وہ تو ان ظاہری پہلوؤں سے ایک اہم وسیلہ کا کام لے کر تاثر پیدا کرنے کا وہ مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے جو ہر اچھے فن کی مشترک خصوصیت ہے۔

اس لئے منٹو کے فن کا تجزیہ کرنے کی یہ ابتدائی منزل طے کر لینے کے بعد ہمیں یہ سوچنا پڑتا ہے کہ منٹو نے اپنے افسانوں میں تاثر انگیزی کی خصوصیت کو فن کی بنیاد بنا کر اس کے حصول کے لئے ان خارجی اور تکنیکی چیزوں کے علاوہ اور کیسے کون کون سے طریقے برتنے اور استعمال کئے ہیں جنہیں ہم اس کے اسلوب نگارش کی خصوصیت کہہ سکیں۔ یہ صحیح ہے کہ کسی افسانے کے مجموعی تاثر کو ایک خاص رنگ دینے میں فن کے ان ظاہری پہلوؤں کا بھی ایک خاص مقام ہے جن کا ذکر اب تک ہوتا رہا ہے لیکن ان سے بھی خاص حیثیت اظہار اور ابلاغ کے ان طریقوں کو حاصل ہے جنہیں ہر مصنف اپنی اپنی پسند، اپنی اپنی صلاحیت اور مذاق کے مطابق برتتا ہے۔ ایک سیدھی سادی یا پیچیدہ سے پیچیدہ بات کہنے کا انداز کیا ہو، اس کے لئے کسی خاص محل پر سیدھے سادے فقرے، اشارے، کنایے، تشبیہ، استعارے، تضاد یا تکرار میں سے کون سا حربہ زیادہ مؤثر ثابت ہوگا۔ یہ بات ہر مصنف اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق سوچتا اور انہیں صلاحیتوں کے مطابق ان میں سے جس حربہ یا وسیلہ کو جس خاص محل کے لئے موزوں اور مؤثر سمجھتا ہے استعمال کرتا ہے۔ لفظوں، فقروں، اشاروں، کنایوں، تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال کا یہی مخصوص اور منفرد انداز ایک مصنف اور دوسرے مصنف کے اسلوب میں فرق پیدا کرتا ہے۔

منٹو کے افسانوی فن کو اگر اسلوب اور اظہار کے ان وسائل کے نقطۂ نظر سے پرکھنے اور جانچنے کی کوشش کی جائے تو سب سے پہلی چیز جو پڑھنے والے کو شدت کے ساتھ متاثر کرتی ہے یہ ہے کہ منٹو کے پاس معمولی سے معمولی بات کے اظہار کے لئے ایک غیر معمولی انداز موجود ہے۔ فقرہ کی ساخت میں معمولی سی تبدیلی، لفظوں کے برتنے میں تھوڑی سی جدت پسندی اور بہت اہم اور بڑی گہری بات کو اس طرح ادا کر دینے کی قدرت کہ جیسے وہ بات ذرا اہم نہ ہو یہ ہیں منٹو کے اندازِ اظہار کے بعض واضح پہلو ہیں۔

بعض گوشے دیکھ کر ان کے اسلوب کی ان خصوصیتوں کو پرکھنے اور جانچنے کی کوشش کیجئے۔

(۱) سب سے پہلی مثال 'نیا قانون' کی ہے۔ استاد منگو نئے قانون کی خبر سن کر آیا ہے اور یہ خبر کسی دوسرے تک پہنچانے کے لئے بے قرار ہے
اتنے میں نتھو گنجا اڈے پر آتا ہے۔ منگو بلند آواز سے اس سے کہتا ہے:
"ہاتھ لا ادھر، ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے ـــــــ تیری اس گنجی کھوپڑی پر بال اگ آئیں۔"

(۲) 'پھاہا' میں بازار حسن کی عورتوں کے متعلق کہا گیا ہے ـــــــ "یہ رنگ برنگی عورتیں مکانوں میں پکتے ہوئے پھلوں کے مانند لٹکتی رہتی ہیں۔
آپ نیچے سے ڈھیلے اور پتھر مار کر انہیں گرا سکتے ہیں۔"

(۳) 'پھاہا' ہی میں ایک لڑکی کا ذکر یوں آیا ہے ـــــــ "مرونڈیاں اس کے ہاتھوں سے کچے فرش پر گر رہی تھیں اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا
اناج رو رہا ہے اور یہ مرونڈیاں اس کے آنسو ہیں۔"

(۴) 'پھاہا' میں ایک اور بازاری عورت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں "وہ اس انداز سے اپنا ہاتھ ہلا رہی تھی جیسے مکار دوکاندار کی طرح ڈنڈی
مارے گی اور کبھی پوری تول نہیں تولے گی۔"

(۵) "شوشو" میں ایک جگہ کہا گیا ہے ـــــــ شوشو ... شوشو ...... ارے یہ کیا؟ دو تین بار اس کا نام میری زبان پر آیا تو میں نے یوں
محسوس کیا کہ پپرمنٹ کی گولیاں چوس رہا ہوں۔

(۶) "شوشو" ہی میں سونے سے پہلے کی کیفیت یوں بیان ہوتی ہے "میری پلکیں آپس میں ملنے لگیں۔ ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں دھنکی ہوئی
روئی کے بہت بڑے انبار میں دھنسا جا رہا ہوں۔"

(۷) "شوشیا" میں کانتا کا ننگا جسم موم کے پتلے کے مانند اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا اور پگھل پگھل کر اس کے اندر جا رہا تھا۔"

(۸) "آپ کو ایسے آدمی نظر آئیں گے جو محبت کرنے کے معاملہ میں بانجھ ہیں۔" (بانجھ)

(۹) ...... "محبت کا اسقاط بھی ہو سکتا ہے۔" (بانجھ)

(۱۰) "اندر ہی اندر اس نے اپنے ہر ذرے کو بم بنا لیا تھا کہ وقت پر کام آئے۔" (نعرہ)

(۱۱) "جب شکیلہ نے سینے کی ہوا خارج کی تو مومن کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کے اندر ربڑ کے کئی غبارے پھٹ گئے ہیں۔" (بلاؤز)

(۱۲) "نتھو کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ دوپہر کی دھوپ میں اڑنے والی ساری چیلیں اس کے دماغ میں گھس کر
چیخنے لگی ہیں۔" (اس کا پتی)

(۱۳) "کبھی کبھی اسے ایسا محسوس ہوتا کہ ہوا میں بہت اونچی جگہ لٹکی ہوئی ہو ـــــــ اوپر ہوا، نیچے ہوا، دائیں ہوا، بائیں ہوا، بس ہوا ہی ہوا ہے
اور پھر اس ہوا میں دم گھٹنا بھی ایک خاص مزا دیتا ہے۔" (اینک)

(۱۴) "فضا میں نیندیں گھلی ہوئی تھیں، ایسی نیندیں جن میں بیداری زیادہ ہوتی ہے اور انسان کے اردگرد نرم نرم خواب یوں لپٹ جاتے ہیں
اونی کپڑے۔" (دھواں)

(۱۵) "میں نے انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنگھی کرنا شروع کر دی ـــــــ میں یہ محسوس کرنے لگا کہ اس کے بال میرے الجھے ہوئے خیال
ہیں جن کو میں اپنے ذہن کی انگلیوں سے ٹٹول رہا ہوں۔"

(۱۶) "اسے صرف اپنے آپ سے غرض تھی اور بس۔ دوسروں کی جنت پر وہ ہمیشہ اپنی دوزخ کو ترجیح دیتا رہا تھا۔" (نیا سال)

(۱۷) "محبت ایک عام چیز ہے۔ حضرت آدم سے لے کر ماسٹر نثار تک سب محبت کرتے آئے ہیں۔" (نفض)

(۸) زندگی کیا ہے؟ —— میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک اُونی جراب ہے جس کے دھاگے کا ایک سرا ہمارے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے۔ ہم اس جراب کو اُدھیڑتے رہتے ہیں۔ جب اُدھیڑتے اُدھیڑتے دھاگے کا دوسرا سرا ہمارے ہاتھ میں آجائے گا تو یہ طلسم جسے زندگی کہا جاتا ہے، ٹوٹ جائے گا۔ (مصری کی ڈلی)

منٹو کے افسانوں کے یہ متفرق اقتباسات اس کے اندازِ بیان کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہیں۔ مثال نمبر ۱ میں منٹو نے جب یہ بات کہی کہ "یہی [illegible] سناؤں کہ جی خوش ہو جائے" تو یہ معمولی سی بات تھی۔ لیکن یہ بظاہر معمولی معلوم ہونے والی بات منگو کے نزدیک بہت اہم تھی۔ منٹو نے منگو کے مزاج، اس کی ذہنی سطح اور رنگیلے [illegible] کی مختلف خصوصیتوں کو جمع کر کے ایک ایسا جملہ لکھا جو منگو کی ذہنی کیفیت کی پوری ترجمانی کرتا ہے۔ منگو کی جذباتی شدت کے اظہار کے لئے منٹو نے جو جملہ وضع کیا ہے وہ منٹو کا منفرد رنگ ہے۔ ایک چلتے ہوئے غیر سنجیدہ فقرے کو ایک بے حد اہم اور گہرے مفہوم کا حامل اور ترجمان بنانا منٹو کے جدت پسند اسلوب کی ایک خصوصیت ہے۔

مثال نمبر ۲ میں پڑھنے والے کے سامنے جو تشبیہ آتی ہے اسے دیکھ کر پڑھنے والے کو اس کے تیکھے پن کا احساس تو ضرور ہوتا ہے۔ لیکن وہ سوچتا ہے کہ اس تشبیہ میں کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں کہ منٹو کے سوا کسی اور کا ذہن اس تک نہ پہنچ سکتا۔ لیکن منٹو یہ کہتے ہیں کہ "آپ پیچھے سے ڈھیلے اور پتھر مار کر انہیں گرا سکتے ہیں" تو پوری تشبیہ پر منٹو کے منفرد اور امتیازی اسلوب کا رنگ چھا جاتا ہے، اس لئے کہ یہ جملہ جو خیال یا بیان کے اعتبار سے بالکل معمولی سا اور چلتا ہوا ہے، بازاری عورت کے کردار اور اس کی ان خصوصیات کو پوری طرح بے نقاب کر دیتا ہے جو اس جماعت کی عورتوں کی زندگی کا امتیاز سمجھی جاتی ہیں۔

تیسری مثال میں ابتدائی ٹکڑے میں مشاہدہ کی جو باریک بینی ہے وہ خود اپنی جگہ منٹو کے طرزِ فکر کی ایک خصوصیت ہے، لیکن جس عورت کے اندر سے وہ مروڑیاں نیچے گر رہی تھیں اس کے لئے منٹو کے دل میں گھن بھی ہے اور نفرت بھی۔ اس گھن اور نفرت کا اظہار کرنے کے لئے کتنے لکھنے والوں کو بحرِ فکر میں غوطہ زنی کر کے نہ جانے کیسے کیسے گوہرِ آبدار نکالنے کی فکر ہوتی۔ لیکن منٹو کے پاس شدید سے شدید جذبہ کے اظہار کے لئے آسان سے آسان لفظ موجود ہیں اور ان لفظوں کو ایک ایسی ترتیب دینا کہ جملے کی ظاہری حیثیت تو سادہ و حقیر ہو جائے لیکن اس کی معنویت کئی گنا زیادہ ہو جائے منٹو کی قدرتِ بیان کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے —— ادنیٰ اس لئے کہ یہ کرشمہ کبھی کبھی نہیں ہمیشہ ظہور پذیر ہوتا رہتا ہے۔

یہی صورت مثال نمبر ۴ کی ہے جہاں منٹو نے اسی طرح کی ایک اور عورت کا ذکر کیا ہے جو ان کے نزدیک قابلِ نفرین ہے۔ لیکن نفرت اگر ایسے لفظوں کے ذریعہ ظاہر کی جائے جو بدیہی طور پر جذبۂ نفرت کے مظہر ہوں تو بیان میں عمومیت آجاتی ہے۔ منٹو نے اپنے انداز کو اسی عمومیت سے بچایا اور سادگیٔ بیان کو گہری معنویت کا ترجمان بنایا ہے۔

مثال نمبر ۵ تاثر انگیزی کی خصوصیت کے لحاظ سے اوپر کی دونوں مثالوں سے ملتی جلتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہاں پیپرمنٹ کی ایک سادہ سی مثال نے پڑھنے والے کے لئے بھی شوشو کے نام میں وہی لذت پیدا کر دی ہے جس سے افسانہ نگار کا دل پوری طرح آشنا ہے۔

چھٹی اور ساتویں مثال منٹو کے اندازِ بیان کی ندرت اور قدرتِ کلام کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ منٹو انسانی ذہن کے شدید سے شدید تاثر اور اس کے دل کے نازک سے نازک اور لطیف سے لطیف جذبہ کا بیان ایسے لفظوں میں کر دیتے ہیں کہ وہ شدید تاثر اور وہ لطیف جذبہ مجسّم ہو کر پڑھنے والے کے سامنے آجاتا ہے۔ ایک غیر مرئی اور غیر مادی حس ایک ٹھوس اور مرئی حقیقت بن کر نظر کے سامنے آتی ہے۔

آٹھویں اور نویں مثالوں میں منٹو نے دو نئے تصورات پیش کئے ہیں۔ 'بانجھ' اور 'اسقاط' کا ایک واضح لغوی مفہوم ہمارے ذہنوں میں موجود ہے

اس لئے جب منٹو محبت کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ وہ بانجھ ہوسکتی ہے یا اس کا اسقاط ہوسکتا ہے تو ہمارا ذہن اس کا جو فوری تاثر قبول کرتا ہے اس پر الجھن اور تکدر کی ایک ہلکی ہلکی کیفیت ہوتی ہے لیکن جب آہستہ آہستہ وہ نئے سیاق و سباق میں ان لفظوں کے مفہوم پر غور کرنا شروع کرتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ منٹو نے ایک گہرے فلسفیانہ خیال کے اظہار کے لئے دو ایسے لفظوں کا انتخاب کیا ہے جو کسی طرح بھی اس فلسفہ اور فکر کا بوجھ اٹھانے کے اہل نہیں تھے۔ لیکن منٹو کی چابک دستی کی بدولت ان دونوں معمولی اور حقیر لفظوں کی حیثیت بالکل بدل گئی۔ انہوں نے نہ صرف ایک ایسی حقیقت کا اظہار بڑی کامیابی سے کر دیا جس کے وہ اپنی ذاتی حیثیت سے اہل نہیں تھے، بلکہ پڑھنے والے کے لئے سوچ بچار کے دروازے بھی کھول دئے۔ منٹو کے اسلوب کی جدت پسندی نے بعض اوقات چھوٹے لفظوں سے بڑا کام لیا ہے اور اس طرح معمولی لفظوں میں وقتی طور پر ایک گہرائی اور گیرائی پیدا ہو گئی ہے ——— یہی صورت ان دونوں مثالوں میں ہے۔

دسویں سے لے کر پندرھویں مثال تک ہر جملہ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ منٹو کے طرز اور اسلوب نگارش کی اس خصوصیت کا حامل ہے کہ وہ کسی کردار کی ذہنی کیفیت کی ساری شدتوں اور گہرائیوں کو کبھی بالکل سادہ جملوں سے، کبھی ایسی تشبیہوں اور مثالوں سے جو دوسرے لکھنے والے کو یقیناً اس موقع پر بے محل معلوم ہوتیں جہاں منٹو نے انہیں کامیابی سے برتا ہے، اور کبھی بہت سی ملی جلی واضح تصویروں سے اس طرح بیان کر دیتے ہیں کہ پڑھنے والا کسی طرح کی حیرت کے احساس کے بغیر اس جذباتی شدت اور گہرائی کا مکمل تاثر قبول کر لیتا ہے ——— دل کی بات ایک زندہ اور مرئی حقیقت بن کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے اور بالاعلان کہتی ہے کہ دیکھو میں یہ ہوں، مجھے اچھی طرح پہچان لو۔ اور دیکھنے والا ایک ہی نظر میں اس زندہ حقیقت کو اس طرح پہچان لیتا ہے کہ وہ اس کے لئے ناقابلِ فراموش بن جاتی ہے۔

سولھویں مثال میں منٹو کے اسلوب کی یہ خصوصیت نمایاں ہے کہ کسی واقعہ یا کردار کے سلسلہ میں قاری کو کوئی خبر سنا کر فوراً ایک دوسرے جملے سے اس خبر کی وضاحت کرتے ہیں اور اسی وضاحت کے بعد واقعہ کا وہ پہلو یا کردار کی وہ مخصوص کیفیت جس کا بیان مقصود ہے [illegible] کی طرح روشن اور سورج کی طرح نمایاں ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔

سترھویں مثال بھی اسی طرح کی وضاحت کی ایک دوسری شکل ہے۔ یہاں افسانہ نگار نے ہمیں ایک خبر یہ کہہ کر سنائی کہ محبت ایک عارضہ ہے اور اس خبر کی وضاحت کے لئے جو مثال پیش کی وہ بظاہر مذاق اور طنز کی ایک بات معلوم ہونے کے باوجود اس قدر منطقی ہے کہ کوئی اسے جھٹلانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ منٹو کے فلسفہ کی طرح ان کی منطق بھی غیر معمولی سہاروں کی محتاج نہیں یہاں بھی سادگی بیان اور اہم [illegible] کو حد درجہ معمولی سمجھ کر اس کی اہمیت بڑھانے کی خصوصیت برابر کارفرما ہوتی ہے۔

آخری مثال میں بھی منٹو کے فکر اور اسلوب کی اسی خصوصیت کی آمیزش اور امتزاج ہے جہاں گہرے خیال اور سیدھی سادی عبارت اور معمولی تشبیہہ کو اس طرح ایک ہی زنجیر کی کڑیاں بنایا جاتا ہے کہ پڑھنے والا سوچنے لگتا ہے کہ گہری باتیں اور فلسفیانہ حقیقتیں واضح کرنے کا بہترین اور مؤثر ترین انداز وہ ہے جسے منٹو نے اپنایا ہے۔

منٹو نے اپنے افسانوں میں سیدھے سادے روزمرہ کی بول چال کے جملوں سے، ایسی مثالوں اور تشبیہوں سے جو دوسروں کی نظر میں بالکل [illegible] بے حیثیت ہیں اور ایسے چبھتے ہوئے فقروں سے جن میں سنجیدگی و متانت کا شائبہ تک نہیں ہوتا، گہری سے گہری، سنجیدہ سے سنجیدہ، مؤثر سے مؤثر بات کہنے کا کام لیا ہے اور ہر جگہ اس سادگی اور معمولیت کو لطف آفریں، فکر انگیز اور خیال افروز بنایا ہے۔ پھر بھی بہت کم [illegible] ایسے ہیں جنہیں پڑھ کر قاری [illegible] بات آئی ہو کہ دوسروں کے فکر اور تخیل کی شمع جلانے والے منٹو نے یہ باتیں کہنے کے لئے اپنے [illegible] زور دیا ہے۔ منٹو نے جو کچھ کہا ہے [illegible] اور [illegible] ایک [illegible] شخصیت کے زور اور اس کے بے لوث خلوص کی مظہر [illegible] اسلوب [illegible] بے تکلفی اور بے ساختگی چھائی ہوئی ہے۔ اس کا پرتو ہمیں منٹو کی ان تشبیہوں میں بھی نظر آتا ہے جو اس کے ترکش فن کے بہت

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے ——— تشبیہوں کی منٹو کے ترکش میں کوئی کمی نہیں۔ بے شمار تشبیہوں میں سے چند پر نظر ڈال کر اندازہ لگائیے کہ منٹو کا یہ رنگ لیے ہر صفت فن ان تشبیہوں سے کب کب اور کس کس طرح کام لیتا ہے۔

استاد منگو نے فوجی گوروں کے چہرے کا جو تصور ہمارے سامنے پیش کیا ہے دیکھیے وہ کس قدر مکروہ اور گھناؤنا ہے :

"ان کے لال جھریوں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آ جاتی ہے جس کے جسم پر سے اوپر کی جھلی گل گل کر جھڑ رہی ہو۔"
(نیا قانون)

منٹو کے دل میں (یا منٹو کے کسی کردار کے دل میں) کسی چیز، کسی واقعہ یا شخص کا جو تصور ہے اسے دوسرے کے ذہن تک جوں کا توں پورا پورا منتقل کرنے کے لئے منٹو کے پاس الفاظ، فقروں اور جملوں کی کمی نہیں، اسی طرح ان کا ذہن تازہ شکل سے مشکل ذہنی اور جذباتی تجربہ کو اس کی مکمل شدت اور لطافتوں کے ساتھ دوسروں تک پہنچانے کے لئے ایسی تشبیہیں وضع کر لینے پر قادر ہے جن کی طرف کسی اور کا ذہن منتقل بھی نہیں ہوتا۔ یہی خصوصیت اوپر کی مثال میں ہے۔

منٹو جس طرح الفاظ اور جملوں کے ذریعہ محبت، نفرت، حقارت، رشک، حسد، خلوص، صداقت اور رحم و کرم کے احساسات میں قاری کو پوری طرح اپنا ہم نوا بنا سکتے ہیں اسی طرح تشبیہوں کی مدد سے ——— اور اکثر بالکل معمولی معمولی تشبیہوں سے ——— وہ ہر طرح کے احساس اور جذبہ کو اس طرح جیتا جاگتا بنا کر پڑھنے والے کے ذہن میں اتار دیتے ہیں وہ جذباتی طور پر پوری طرح اپنے آپ کو افسانہ نگار کے سپرد کر دیتا ہے ———
استاد منگو کی زبان سے مارواڑیوں کو غریبوں کی کھٹیا میں گھسے ہوئے کھٹمل کہلوانے اور اس بات کو اس طرح مکمل کہلاتے ہیں کہ "نیا قانون ان کے لئے کھولتا ہوا پانی ہوگا" منٹو کے فن کی یہ خصوصیت نمایاں ہے۔

جب استاد منگو کی نگاہیں گورے کی آنکھوں سے چار ہوئیں تو ایسا معلوم ہوا کہ بیک وقت آمنے سامنے کی بندوقوں کی گولیاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشیں بگولا بن کر اوپر کو اڑ گئیں۔ بندوقوں سے نکلی ہوئی گولیوں کی تشبیہ میں کوئی نئی بات نہیں لیکن اس کے برمحل صرف نے ایک شدید احساس کو ایک واضح اور مرئی شکل دے دی ہے۔

ایسی تشبیہیں جن میں یوں بظاہر کوئی نیاپن نہ ہو دوسروں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتیں لیکن منٹو کا دُور رس تصور ہمیشہ دو چیزوں میں موزوں ترین مماثلت تلاش کر کے اسے بڑی برجستگی سے صرف کرتا ہے اور ایک معمولی اور بظاہر بے حقیقت سی تشبیہ ایک مکمل مفہوم کی حامل اور ایک گہرے جذبہ کی عکاس بن جاتی ہے۔ بندوقوں سے نکلی ہوئی گولیوں جیسی اور بہت سی سیدھی سادی لیکن اپنے تاثر کے لحاظ سے اہم تشبیہیں منٹو کے ہر افسانہ میں قدم قدم پر ملتی ہیں۔ ایسی چند مثالیں ملاحظہ کیجئے :

"وہ بڑی خوفناک عورت تھی۔ اس کا منہ کچھ اس انداز سے کھلتا تھا جیسے لیموں نچوڑنے والی مشین کا کھلتا ہے" (پھاہا)

"اس کی آنکھیں مست تھیں اور ہونٹ تلوار کے تازہ زخم کے مانند کھلے ہوئے تھے" (شو شو)

خوشیا کے مردانہ وقار کو اس بات سے سخت دھکا لگا ہے کہ کانتا برہنہ اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اور اپنی اس حرکت کا جواز یہ کہہ کر پیش کیا "کیا ہرج ہے، اپنا خوشیا ہی تو ہے" یہ بات خوشیا کے دماغ میں طرح طرح کے روپ بھر کر اسے ستاتی اور پریشان کرتی ہے۔ ان بے شمار روپوں میں سے ایک یہ ہے :

"خوشیا نہ ہوا سالا وہ بلّا ہو گیا جو اس کے بستر پر ہر وقت اونگھتا رہتا ہے" (خوشیا)

'بانجھ' میں ایک منظر کا تصور منٹو نے اس طرح پیش کیا ہے:

کبھی کبھی کسی آنے یا جانے والی موٹر کے ہارن کی آواز بلند ہوتی اور یوں معلوم ہوتا کہ بڑی دلچسپ کہانی سننے کے دوران میں کسی نے زور سے 'ہوں' کی ہے۔ (بانجھ)

یہ تشبیہ بھی غیر معمولی نہ سہی لیکن اس تک منٹو کے سوا کسی اور کے ذہن کی نارسائی اسے غیر معمولی بھی بنا دیتی ہے اور منٹو کی فنی عظمت کی طرف اشارہ بھی کرتی ہے۔

"گالی ـــــ یوں سمجھئے کہ کانوں کے راستے پگھلا ہوا سیسہ شائیں شائیں کرتا اس کے دل میں اتر گیا" (نعرہ)

"بار بار یہ دو گالیاں، جو سیٹھ نے بالکل پان کی پیک کے مانند اپنے منہ سے اگل دی تھیں، اس کے کانوں کے پاس زہریلی بھڑوں کی طرح بھنبھنانا شروع کر دیتی تھیں" (نعرہ)

"دو گالیاں، جیسے اس نے اپنی گدے دار کرسی میں سے دو کھٹمل نکال کر پھینک دئے ہیں" (نعرہ)

"دو گالیاں ـــــ اس کے جی میں آئی کہ اپنے سینے کے اندر ہاتھ ڈال کر وہ ان دو پتھروں کو جو کسی چھلے گلتے ہی نہ تھے، باہر نکال لے" (نعرہ)

ایک گالی یا دو گالیاں ـــــ میرے اور آپ کے لئے روزمرہ کی سنائی بے حقیقت باتیں ہیں جنہیں آدمی صبح سے شام تک ہر ایک کے منہ سے نکلتے سنتا ہے۔ لیکن کیشو لال کے دل پر ان گالیوں نے جو اثر کیا ہے اس کی شدت اور تڑپ کو منٹو ان گنت تشبیہوں کے ذریعہ پوری طرح واضح کر دینے پر قادر ہیں۔ اوپر کی چاروں تشبیہوں میں کوئی نیا پن نہیں، لیکن ان فرسودہ تشبیہوں سے منٹو نے بار بار جو کام لیا ہے اس سے عمومیت میں خصوصیت پیدا ہوئی ہے، سطحیت میں گہرائی آئی ہے۔

منٹو نے ایک ہی تشبیہ سے ایک بہت وسیع منظر کی تصویر کھینچنے اور فضا قائم کرنے کی جو خدمت لی اس کی چند اور تصویریں دیکھئے۔ پہلی دو تصویریں 'دھواں' کی ہیں:

"موسم کچھ ایسی ہی کیفیت کا حامل تھا جو ربڑ کے جوتے پہن کر چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔" (دھواں)

"ایک کبوترا اور ایک کبوتری پاس پاس پر پھلائے بیٹھے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں دم پخت کی ہوئی ہنڈیا کی طرح گرم ہیں" (دھواں)

"وہ کچھ اس طرح سمٹی جیسے کسی نے بلندی سے ریشمی کپڑے کا تھان کھول کر نیچے پھینک دیا ہے" (مصری کی ڈلی)

دو ایک مزے دار تشبیہیں اور دیکھئے اور اندازہ لگائیے کہ منٹو چیزوں کو کیسے کیسے گوشوں میں سے نکال کر منظر عام پر لاتا اور پڑھنے والے کے ذہن کو ہر دم ایک نیا نقش بنانے میں مدد دیتا ہے:

"یہ اشوک کمار بھی عجیب چیز ہے۔ پردے پر عشق کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کاسٹرائل پی رہا ہے" (سجدہ)

"اپنے آپ کو چھپانے کی بھونڈی کوشش میں وہ ایک ایسا بے جان لطیفہ بن کے رہ گیا تھا جو بڑے ہی خام









انداز میں ٹھٹا گیا ہو۔" (سجدہ)

"وہ کرسی پر اس انداز سے اکیلا بیٹھا تھا جیسے شطرنج کا پٹا ہوا مہرہ بساط سے بہت دور پڑا ہے" (سجدہ)

"اس کی شرارت اب دُم کٹی گلہری بن کر رہ گئی تھی۔" (سجدہ)

"نئے سال کی آمد پر وہ خوش تھا — جس طرح اکھاڑے میں کوئی نامور پہلوان اپنے نئے مدِ مقابل کی طرف خم ٹھونک کر بڑھتا ہے۔" (نیا سال)

یہ سب تشبیہیں پڑھنے والے کے تصور اور تخیل کو زندگی کی ایک لہر دے کر اسے ایک ایسی تصویر بنانے میں مدد دیتی ہیں جس کا ہر رنگ تیکھا ہر نقش واضح ہے۔ منٹو کی تشبیہوں کا یہ امتیاز ہے کہ ان میں سے کوئی زندگی کی تڑپ اور تیزی سے خالی نہیں۔ ہر تشبیہ کے پیچھے ایک مکمل اور واضح تصویر چھپی ہوئی ہے جسے منٹو کی فنی چابک دستی اس طرح برمحل استعمال کرتی ہے کہ پڑھنے والا اس تصویر کا پورا تاثر قبول کرتا ہے اور وہی ذہنی اور جذباتی نتائج اخذ کرتا ہے جو افسانہ نگار کے ذہن میں ہیں۔ منٹو کا اسلوب اظہار جس میں الفاظ، فقروں اور تشبیہوں کو یکساں اہمیت ہے۔ مکمل تاثر کی تخلیق کو اپنا نصب العین بناتا ہے اور شاید بہت کم موقعے ایسے ہیں جن پر اسے اپنا فنی مقصود حاصل کرنے میں پوری کامیابی حاصل ہوئی ہو۔ اس کی اس کامیابی میں تشبیہوں کے علاوہ ایک اور خاص چیز کو بھی دخل ہے — اور وہ ہے "تکرار"

"تکرار" مشرقی اسلوبِ اظہار کی ایک ایسی خصوصیت ہے جسے نثر سے زیادہ نظم میں برتا گیا ہے۔ لیکن اردو اور فارسی میں عموماً "تکرار" کو ایک لفظی صنعت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس لفظی صنعت سے لکھنے والوں نے عموماً صوتی ترنم اور تاثر انگیزی کا کام لیا ہے۔ مگر کبھی کبھی یہ تاثر محض صوتی ترنم و تاثر کے علاوہ جذباتی کیفیات کے اظہار کا وسیلہ بھی بنتا ہے۔ نثر میں مغربی اسالیب کے اثر سے لفظوں اور فقروں کی تکرار خاصی عام ہو گئی ہے۔ چنانچہ ہمارے افسانہ نگاروں کے یہاں جا بجا اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن کسی افسانہ نگار نے اظہار کے وسیلہ کو اپنے فن میں اس طرح شامل نہیں کیا جیسے منٹو نے۔ منٹو کے مشہور افسانوں میں سے خوشیا، "نعرہ"، بلاؤز، مہتک، "نیا قانون"، اور نسبتاً کم معروف افسانوں میں "آر کا پٹھا"، اور "قبض" اس فن کے بڑے کامیاب مظہر ہیں۔

دو تین افسانوں پر نظر ڈال کر دیکھیئے کہ اس تکرار سے منٹو نے کیا کیا کام لئے ہیں۔

"نعرہ" میں کیشو لال اپنے سیٹھ کے ساتویں منزل والے بالاخانے سے نیچے اترا تو افسانہ نگار کے لفظوں میں:

"اسے یوں محسوس ہوا کہ اس سنگین عمارت کی ساتوں منزلیں اس کے کاندھوں پہ دھر دی گئی ہیں۔"

اس لئے کہ دو مہینے کا کرایہ ادا نہ کرنے کی سزا میں سیٹھ نے اسے دو گالیاں دی تھیں اور وہ گالیاں اس کے پورے وجود میں سمائی جا رہی تھیں ان گالیوں سے کیشو لال کے دل پر جو کچھ بیت رہی ہے اس کے اظہار کا بہترین ذریعہ منٹو نے تکرار کو بنایا ہے۔ یہ گالیاں اس کے ذہن اور جذبات بلکہ اس کے وجود پر کس طرح چھائی ہوئی ہیں اس کی تفصیل منٹو کی زبانی سُنئے:

.... مالک مکان نے غصے میں آ کر اسے گالی دی — گالی .... یوں سمجھئے کہ کانوں کے راستے پگھلا ہوا سیسہ شائیں شائیں کرتا اس کے دل میں اتر گیا اور اس کے سینے کے اندر جو ہلڑ مچ گیا اس کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہ تھا ....

اس کے جی میں آئی کہ اس گالی کو جسے وہ بڑی مشکل نگل چکا تھا، سیٹھ کے جھریاں پڑے چہرے پر قے کر دے

مگر وہ اس خیال سے باز آگیا کہ اس کا غرور تو باہر فٹ پاتھ پر پڑا ہے......

سیٹھ نے اسے پھر گالی دی۔ اتنی ہی موٹی جتنی اس کی چربی بھری گردن تھی —— اور اسے یوں لگا کہ کسی نے اوپر سے اس پر کوڑا کرکٹ پھینک دیا ہے.......

ایک نہیں دو گالیاں —— بار بار یہ دو گالیاں جو سیٹھ نے بالکل پان کی پیک کے مانند اپنے منہ سے اگل دی تھیں اس کے کانوں کے پاس زہریلی بھڑوں کی طرح بھنبھنانا شروع کر دیتی تھیں اور وہ سخت بے چین ہو جاتا تھا۔

چلتے چلتے ایک لنگڑے کتے سے اس کی ٹکر ہوئی۔ کتے نے اس خیال سے کہ شاید اس کا زخمی پیر کچل دیا گیا ہے "چاؤں" کیا اور پرے ہٹ گیا، اور وہ سمجھا کہ سیٹھ نے اسے پھر گالی دی ہے..... گالی..... گالی ٹھیک اسی طرح اس سے الجھ کر رہ گئی تھی جیسے جھڑبیری کے کانٹوں میں کوئی کپڑا۔ وہ جتنی کوشش اپنے آپ کو چھڑانے کی کرتا تھا اتنی ہی زیادہ اس کی روح زخمی ہوتی جا رہی تھی۔

سیٹھ نے ایک گالی دی اور وہ کچھ نہ بولا —— دوسری گالی دی تو بھی وہ خاموش رہا جیسے وہ مٹی کا پتلا ہو —— پر مٹی کا پتلا کیسے ہوا؟ اس نے ان دو گالیوں کو سیٹھ کے تھوک بھرے منہ سے نکلتے دیکھا، جیسے دو بڑے بڑے چوہے موریوں سے باہر نکلے ہوں۔

جب اس کے سامنے ایک موٹر نے اپنے ماتھے کی بتیاں روشن کیں تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ دو گالیاں پگھل کر اس کی آنکھوں میں دھنس گئی ہیں۔

گالیاں —— گالیاں —— کہاں تھیں وہ دو گالیاں؟ اس کے جی میں آئی کہ اپنے سینے کے اندر ہاتھ ڈال کر وہ ان دو پتھروں کو جو کسی حیلے گلتے ہی نہ تھے باہر نکال لے اور جو کوئی بھی اس کے سامنے آئے اس کے سر پہ دے مارے۔

اس کا دماغ آگ کا ایک چکر سا بن گیا۔ اس چکر میں اس کے سارے پرانے اور نئے خیال ایک ہار کی صورت میں گندھ گئے —— دو مہینے کا کرایہ، اس کا بہتر کی بلڈنگ میں درخواست لے کر جانا —— سات منزلوں کے ایک سو بارہ زینے، سیٹھ کی بھدی آواز، اس کے سر پر سرکتا آتا ہوا بجلی کا لیمپ اور...... یہ موٹی گالی..... پھر دوسری..... اور اس کی خاموشی...... یہاں پہنچ کر آگ کے اس چکر میں تڑ تڑ گولیاں سی نکلنا شروع ہو جاتیں اور اسے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کا سینہ چھلنی ہو گیا۔

'نعرہ' میں گالیوں والے واقعہ کی تکرار سے منٹو نے آہستہ آہستہ کیشو لال کے ذہنی اور جذباتی ہیجان کو واضح کرنے میں مدد لی ہے اور اس تکرار اور بڑھتے ہوئے ہیجان میں مکمل ہم آہنگی پیدا کر کے اس انجام کے لئے نفسیاتی اور فنی جواز پیدا کیا ہے جس میں کیشو لال کے دل کا سارا درد اور اس کی شخصیت کا سارا کرب و اضطراب سمٹ کر وہ نعرہ بن گیا جس سے کیشو لال کے دل کو ضرور تسکین مل گئی لیکن سننے والوں نے صرف یہ تبصرہ کیا کہ "پگلا ہے"۔

منٹو اپنے فن میں افسانہ کی تمہید، اس کی اٹھان، اس کے نقطۂ عروج اور اس کے انجام کو جو اہمیت دیتے ہیں اور ان مختلف مراحل کے درمیان پورے خلوص اور انہماک سے ربط اور تسلسل کا جو رشتہ قائم کرتے ہیں وہ 'نعرہ' میں گالیوں کے ذکر کی تکرار سے پورا ہوا ہے۔ تکرار ہی نے اس افسانے میں ایک خاص کردار کی ذہنی کیفیت کے اضطراب کی مصوری کی ہے، تکرار ہی نے افسانہ کو آہستہ آہستہ اٹھان کی طرف لے جا کر ایک سوچے سمجھے انجام تک پہنچایا ہے اور تکرار ہی سے اس تاثر کی تکمیل کی ہے جو تاثر کے نقطۂ نظر سے اس کا مقصود ہے۔

'بلاؤز' شباب کی نازک اور جاں گداز منزل میں قدم رکھنے والے مومن کی اس جنسی بیداری کی کہانی ہے جس کے معنی اسے خود بھی اچھی طرح معلوم نہیں۔ اس نازک نفسیاتی موضوع کی کہانی منٹو نے چند تاثرات اور تصورات کو ایک ہی لڑی میں پرو کر تصورات کی تکرار کی زبانی سنائی ہے۔ اس کی ابتدا یوں ہوئی ہے کہ ایک دن مومن کو :

"شکیلہ کی سفید بغل میں کالے کالے بالوں کا ایک گچھا نظر آگیا۔ ... یہ گچھا اسے بہت بھلا معلوم ہوا۔ ایک سنسنی سی اس کے سارے بدن میں دوڑ گئی۔ ایک عجیب، غریب خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی کہ یہ کالے کالے بال اس کی مونچھیں بن جائیں۔"

مومن کے دل میں اس کے بعد دھندلے دھندلے خیال پیدا ہوتے رہے لیکن وہ ان کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہا اور بالآخر ایک دن جب اس نے ٹرنک کھول کر اپنے عید کے لئے بنے ہوئے نئے کپڑوں پر نظر ڈالی تو ......

"رومی ٹوپی کا خیال آتے ہی اس کے سامنے اس کا پھندنا آگیا اور پھندنا فوراً ہی ان کالے کالے بالوں کے گچھے میں تبدیل ہو گیا جو اس نے شکیلہ کی بغل میں دیکھا تھا۔"

"... پھر کمرہ صاف کرتے ہوئے اس نے صاٹن کی چمکیلی کترنیں اپنی جیب میں رکھ لیں اور اگلے دن یوں ہی الگ بیٹھ کر ان کے دھاگے الگ کرنے شروع کر دیئے ....

"حتیٰ کہ دھاگے کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں کا ایک گچھا سا بن گیا۔ اس کو ہاتھ میں لے کر وہ دباتا رہا، مسلتا رہا ــــ لیکن اس کے تصور میں شکیلہ کی وہی بغل تھی جس میں اس نے کالے کالے بالوں کا ایک چھوٹا سا گچھا دیکھا تھا۔"

اس کے بعد وہ جب بھی اندر آکر بلاؤز کو دیکھتا تو ......

"اس کا خیال فوراً ان بالوں کی طرف دوڑ جاتا جو اس نے شکیلہ کی بغل میں دیکھے تھے۔"

اور بالآخر ایک رات کو :

"جب وہ سویا تو اس نے کئی اوٹ پٹانگ خواب دیکھے ــــ ڈپٹی صاحب نے پتھر کے کوئلوں کا ایک بڑا ڈھیر

اس سے کچھ ملنے کو کہا۔ جب اس نے ایک کوئلہ اٹھایا اور اس پر ہتھوڑے کی ضرب لگائی تو وہ نرم نرم بالوں کا ایک گچھا بن گیا ـــــ یہ کالی کھانڈ کے مہین مہین تار تھے جن کا گولا بنا ہوا تھا ـــــ پھر یہ گولے کالے رنگ کے غبارے بن کر ہوا میں اڑنے شروع ہوئے ـــــ بہت اوپر جا کر یہ پھٹنے لگے۔ پھر آندھی آ گئی اور مومن کی روئی کا پھندنا کہیں غائب ہو گیا ـــــ پھندنے کی تلاش میں نکلا۔ دیکھی اور ان دیکھی جگہوں پر گھومتا رہا ـــــ ایک کالی ساٹن کے بلاؤز پر اس کا ہاتھ پڑا۔ کچھ دیر تک وہ کسی دھڑکتی ہوئی چیز پر اپنا ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر دفعتاً ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا تھوڑی دیر تک وہ کچھ نہ سمجھ سکا کہ کیا ہو گیا ہے ......"

اس نفسیاتی افسانے کی فنی ترتیب، اس کے ارتقا، اس کے اٹھان، اس کے منتہا اور اس کے انجام اور پھر سب کے باہمی ربط اور توازن میں منٹو نے ایک خاص تصور کی تکرار کو فن کی بنیاد بنایا ہے۔ افسانے کے مرکزی کردار نے ذہنی کشمکش کے جو مراحل طے کئے ہیں ان کے اظہار کے اور طریقے بھی ہو سکتے تھے، لیکن منٹو کے اس افسانے کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے تصورات کی جس تکرار کو ایک خاص تاثر پیدا کرنے کا فنی وسیلہ بنایا ہے وہی وسیلہ اس مقصد کے حصول کا بہترین ذریعہ ہو سکتا تھا۔ فن کار کی حیثیت سے منٹو نے اپنے لئے یہ امتیاز حاصل کیا ہے کہ جب کسی خاص محل پر وہ کسی فنی اسلوب سے کوئی تاثر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہی فنی اسلوب اس محل کا بہترین اسلوب معلوم ہوتا ہے۔ 'نعرہ' اور 'بلاؤز' کی مثالوں سے منٹو کے فن میں تکرار کی جس اہمیت کی وضاحت ہوتی ہے وہی ایک نئے اسلوب سے 'ٹھنڈا گوشت'، 'اُلّو کا پٹھا' اور 'قبض' جیسے افسانوں میں بھی اُجاگر ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

منٹو نے 'تکرار' کی طرح 'تضاد' کو بھی اپنے تاثرات کے اظہار کا ایک وسیلہ بنایا ہے اور اسے طرح طرح سے اپنے افسانوں میں برتا ہے ـــــ ہماری سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی زندگی میں قدروں کا جو حیرت انگیز تضاد ہے اسے منٹو نے ہمیشہ بڑے اندیشہ اور تشویش کی نظر سے دیکھا اور اپنے افسانوں کے ذریعہ اس تضاد کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ سماج کے مختلف طبقوں میں اونچ نیچ اور معاشرتی اور معاشی کشمکش زندگی کے متعلق دو مختلف افراد کے خیالات اور نظریات میں اختلاف اور ضد، ایک ہی فرد کے ظاہر اور باطن میں بدیہی فرق اس تضاد کی بعض شکلیں ہیں۔ منٹو نے اس تضاد کو اور اس کے علاوہ زندگی کے مختلف شعبوں میں ظاہر ہونے والے ہر ایسے تضاد کو جو انسان کو فریب میں مبتلا اور اس کے سکون و مسرت کی بربادی کا باعث بنتا ہے، ایسے اسلوبِ ادا سے جس میں لفظ، فقرے اور افسانے کے مختلف اجزا مل جل کر ایک خدمت انجام دیتے ہیں بے نقاب کیا ہے۔

تضاد کی یہ مختلف صورتیں کس کس شکل میں ان کے افسانوں میں نمایاں ہوتی ہیں اس کی چند مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

پہلا اقتباس 'نعرہ' کا ہے جس میں کیشو لال کے جذبات کی مصوری میں تصورات کے اس تضاد سے مدد لی گئی ہے جو طبقاتی اونچ نیچ کا پیدا کیا ہوا ہے:

"اس کے گھر کا اندھا لیمپ کئی بار بجلی کے اس بلب سے ٹکرایا جو مالک مکان کے گنجے سر کے اوپر مسکرا رہا تھا کئی بار اس کے پیوند لگے کپڑے ان کھونٹیوں پر لٹک کر، پھر اس کے بدن سے چمٹ گئے، جو دیوار میں گڑی چمک رہی تھیں۔"

اسی طبقاتی تضاد کی ایک شکل 'بلاؤز' میں اس طرح دکھائی دیتی ہے:

"...... نوکروں کے متعلق کون غور کرتا ہے؟ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک وہ تمام منزلیں پیدل طے کر جاتے ہیں اور آس پاس کے آدمیوں کو خبر تک نہیں ہوتی۔"

وہ کس طرح ایک ہی صورت حال کو اپنے اپنے جذبات اور تصورات کی روشنی میں کس کس رنگ میں دیکھتے ہیں، اس کا اظہار 'ہتک' میں کئی جگہ مادھو اور سوگندھی کے جذبات کو واقعات کی شکل دے کر کیا گیا ہے۔ ان کی تصویروں میں سے ایک یہ ہے:

"ایک ہاتھ سے سوگندھی نے پگڑی والے کی تصویر اتاری اور دوسرا ہاتھ اس فریم کی طرف بڑھایا جس میں مادھو کا فوٹو جڑا تھا۔ مادھو اپنی جگہ سمٹ گیا جیسے ہاتھ اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک سیکنڈ میں فریم کیل سمیت سوگندھی کے ہاتھ میں تھا۔

زور کا قہقہہ لگا کر اس نے 'اونہہ' کی اور دونوں فریم ایک ساتھ کھڑکی میں سے باہر پھینک دئے۔

دو منزلوں سے جب فریم زمین پر گرے اور کانچ ٹوٹنے کی آواز آئی تو مادھو کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے۔ بڑی مشکل سے اس نے ہنس کر اتنا کہا "اچھا کیا ــــ مجھے بھی یہ فوٹو پسند نہیں تھا۔"

آخری جملہ میں مادھو نے جو کچھ کہا ہے وہ اس کے دل کی بات نہیں۔ اس مجبوری اور بے بسی نے ایک پُر فریب جھوٹ کی شکل اختیار کی ہے ــــ اس مجبوری اور بے بسی اور ظاہر و باطن کے تضاد کی ایک اور تصویر دیکھئے:

"...... مادھو ڈر گیا۔ وہ گری ہوئی ٹوپی اٹھانے کے لئے جھکا تو سوگندھی کی گرج سنائی دی۔ "خبردار ــــ پڑی رہنے دے وہیں ــــ تو جا، تیرے پونا پہنچتے ہی میں اس کو منی آرڈر کر دوں گی۔"

سوگندھی کے اس تلخ طنز بھرے جملے میں کئی تضاد ایک جگہ آ کر جمع ہو گئے ہیں ــــ ایک تضاد تو وہ ہے جو سوگندھی کے ان جذبات کی شکل میں ظاہر ہوا ہے، جن میں حالات نے ایک نمایاں تغیر اور انقلاب پیدا کیا ہے۔ دوسرا تضاد اس طنز میں پوشیدہ ہے جس میں سوگندھی کا ایک ایک لفظ ڈوبا ہوا ہے۔ تیسرا تضاد الفاظ کے اس مفہوم سے ظاہر ہے جو گزرے ہوئے واقعات اور موجودہ صورت حال میں تصادم بن کر رونما ہوا ہے۔

'ہتک' کا خاتمہ جذباتی کشمکش کے اس تضاد کی ایک نفسیاتی اور فن کارانہ تصویر ہے:

"بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اس کو اپنا دل پرچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔"

معاشرتی، جذباتی اور نفسیاتی کیفیتوں کے تضاد کو ظاہر کرنے پر منٹو کو جو قدرت حاصل ہے اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں یہ تضاد بعض دوسری لفظی اور معنوی صورتوں میں بھی رونما ہوتا ہے۔ ان کے فن کے دوسرے پہلوؤں کی وضاحت کے لئے اب تک جو بہت سی مثالیں پیش کی گئی ہیں ان میں جگہ جگہ اس کے مختلف رنگ چمکتے دکھائی دیتے ہیں ــــ مثلاً 'نعرہ' کے پورے افسانے میں ابتدا اور انجام کا تضاد، دو طبقوں کی زندگی کے انداز کا تضاد اور دو آدمیوں کے ایک ہی بات کو دو متضاد رنگوں میں دیکھنے کا تضاد پوری طرح نمایاں ہے اور اس ذکر کو ختم کرتے وقت محبت کے سلسلہ میں منٹو کی کہی ہوئی وہ بات اب بھی میرے ذہن میں تازہ ہے کہ حضرت آدم سے ماسٹر نثار تک ہر انسان نے محبت کی ہے۔

منٹو کے فن کی وہ ساری خصوصیتیں جن کا تعلق ایک طرف تو فن کے ان مطالبات سے ہے جنہیں ہم تکنیک کے مبادیات اور اس کے لوازم کہہ سکتے ہیں اور دوسری طرف زبان و بیان اور اظہار و ابلاغ کے ان وسائل سے جن کی بدولت افسانہ نگار کا خیال، اس کے تاثرات و تصورات دوسروں کے ذہن اور قلب میں جگہ کرتے ہیں۔ لیکن افسانہ نگار زندگی کے متعلق جو کچھ کہتا ہے وہ صحیح مشاہدہ کی مدد سے اور کسی خاص تجربہ کی تفصیلات میں سے اپنے کام کی جزئیات منتخب کر کے، تفصیلات کا مکمل مشاہدہ اور کسی خاص محل کی ضروریات کے مطابق ان میں سے موزوں جزئیات کا انتخاب افسانہ نگاری کے فن کے بڑے ضروری مطالبات ہیں۔ ہمارے اکثر اچھے افسانہ نگار ان مطالبات سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوتے ہیں ــــ فرق

صرف یہ ہے کہ ہر ایک نے اپنی مخصوص شخصیت اور منفرد اندازِ فکر کی بنا پر جزئیات نگاری کا ایک نیا انداز قائم کیا ہے۔ چنانچہ اس خاص لحاظ سے منٹو کا ایک اپنا رنگ ہے جو کسی دوسرے کے رنگ سے نہیں ملتا۔ منٹو نے ہمیشہ کسی واقعہ یا کردار کے تاثرات و نقوش کی وضاحت کیلئے ایسی جزئیات کو زیادہ اہمیت دی ہے، جنہیں دوسرے عموماً غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتے۔ منٹو جس طرح بیان و اظہارِ خیال کے معاملے میں اور تصورات کی وضاحت کے لئے تشبیہوں کا استعمال کرتے وقت غیر اہم کو اہم اور غیر ضروری کو ضروری اور معمولی کو غیر معمولی پر ترجیح دے کر تاثر کی شدت اور گہرائی پیدا کرتے ہیں اسی طرح جزئیات کے انتخاب کے سلسلہ میں بھی انہوں نے بظاہر غیر اہم اور معمولی پہلو کو اہم اور غیر معمولی پہلوؤں پر ترجیح دی ہے اور اپنی تصویر کو خواہ وہ واقعہ کی ہو یا کردار کی انہیں معمولی رنگوں سے شوخ اور تیکھا بنایا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل چند مثالوں میں:

"مار واڑیوں کو ان کے ٹھکانے پہنچا کر اس نے انارکلی میں دینو حلوائی کی دوکان پر آدھ سیر دہی کی لسّی پی کر ایک بڑی ڈکار لی اور مونچھوں کو منہ میں دبا کر ان کو چوستے ہوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہا "ہت تیری ایسی کی تیسی۔"

یہ استاد منگو ہیں "نیا قانون" میں — اسی افسانے میں انہی کی دو تصویریں اور ملاحظہ ہوں:

چھاؤنی پہنچ کر منگو نے سواری کو اس کی منزلِ مقصود پر اتار دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر بائیں ہاتھ کی آخری دو انگلیوں میں دبا کر سلگایا اور اگلی نشست کے گدے پر بیٹھ گیا۔

گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس نے تانگہ ٹھہرایا اور پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھا:

"صاحب بہادر! کہاں جانا مانگتا ہے؟"

اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا۔ صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھنچ گیا اور پاس ہی گال کے اس طرف جو مدھم سی لکیر ناک کے نتھنے سے ٹھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آ رہی تھی، ایک لرزش کے ساتھ گہری ہو گئی۔

انہی چھوٹی چھوٹی جزئیات سے ہمیں استاد منگو کو پوری طرح پہچاننے اور اس کی شخصیت کی گہرائیوں میں جذب ہونے کا موقع ملتا ہے۔

"پھاہا" میں گوپال کے پتا جی کا ذکر ایک جگہ اس طرح آیا ہے:

"اس کو اپنے پتا جی کی وہ ڈانٹ اچھی طرح یاد تھی۔ . . . اس کے پتا جی لالہ پرشوتم داس تھانیدار لنگوٹ باندھے نل کی دھار کے نیچے اپنی گنجی چندیا رکھے اور بڑی بڑی ترشی ہوئی مونچھوں میں سے آم کا رس چوس رہے تھے۔"

"بھان" میں کچھ نیم زندہ داروں نے جن کمروں کا جائزہ لیا تھا ان میں سے ایک کی تصویر منٹو نے یوں بنائی ہے:

"کوٹھے میں ایک بہت بڑا پلنگ تھا جس کے پائے رنگین تھے۔ اس پر میلی سی چادر بچھی ہوئی تھی۔ تکیہ بھی پڑا تھا جس پر سرخ دھاگے کے پھول کڑھے ہوئے تھے۔ پلنگ کے ساتھ والی دیوار کی کارنس پر تیل کی ایک میلی بوتل اور کنگھی کی کنگھی پڑی تھی۔ اس کے دندانوں پر ... بال پھنسے ہوئے تھے۔ پلنگ کے نیچے ایک ٹوٹا ہوا ٹرنک تھا جس پر ایک کالی گرگابی رکھی تھی۔

کپڑے اس کے خستہ حالت میں تھے لیکن میلے نہیں تھے۔ کوٹ کی آستینوں کے آخری حصے کثرتِ استعمال کے باعث گھس گئے تھے اور پھوسڑے نکل آئے تھے۔ کالر کھلا تھا اور قمیص بس ایک اور دُھلائی کی مار تھی۔"

(بانجھ)

باورچی خانہ میں گرم مصالحہ کوٹتے وقت جب لوہے سے لوہا ٹکراتا اور دھمکوں سے چھت میں ایک گونج سی دوڑ جاتی تو مومن کے ننگے پیروں کو یہ لرزش بہت بھلی معلوم ہوتی۔

(بلاؤز)

وہ ساگوان کے لمبے اور چوڑے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی تھی۔ اس کی باہیں جو کاندھوں تک ننگی تھیں، پتنگ کی کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں جو اوس میں بھیگ جانے کے باعث پتلے کاغذ سے جدا ہو جائے۔ دائیں بازو کی بغل میں شکن آلود گوشت ابھرا ہوا تھا، جو بار بار مونڈنے کے باعث نیلی رنگت اختیار کر گیا تھا، جیسے نچی ہوئی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑا وہاں رکھ دیا گیا ہے۔

(ہتک)

منٹو کی جزئیات نگاری کی صرف چند مثالیں ہیں اور جن کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ منٹو نے کسی واقعہ کی مصوری کرنے، کسی ماحول یا فضا کا مجموعی تاثر نمایاں کرنے یا کسی کردار کی ظاہری ہیئت اور باطنی کیفیات بتانے کے لئے جو باتیں بیان کی ہیں ان میں کبھی چھوٹی چیز اور چھوٹی بات کو چھوٹا سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا۔ منٹو فن کار تھا اور فن کار کے نزدیک کوئی بات اور کوئی چیز معمولی اور حقیر نہیں ہوتی ——— دوسروں کو معمولی اور حقیر نظر آنے والی چیزیں غیر معمولی تاثرات اور نتائج کی حامل بن سکتی ہیں، بشرطیکہ فن کار انہیں صحیح انداز سے اور برمحل برتنے پر قادر ہو۔ اور یہ قدرت منٹو میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی جزئیات انہیں عزیز بھی ہیں اور ان کی نظروں میں محترم بھی۔ جزئیات کی قدر پہچاننے، انہیں عزیز رکھنے اور محترم سمجھنے نے منٹو کے فن کو اکثر نگاہوں میں پسندیدہ بنایا ہے۔

منٹو کے فن کے مختلف پہلو، جن میں افسانہ کی ساخت، تشکیل اور اس کے اجزاء کے علاوہ اسلوبِ نگارش کی ساری خصوصیتیں شامل ہیں۔ جن تشبیہیں، استعارے، کنایے، الفاظ اور فقروں کی تکرار اور ان کے استعمال میں تضاد کا صرف اس کی شخصیت، مزاج اور اندازِ نظر سے متاثر ہوتے ہیں۔ منٹو کے سوچنے کا ایک خاص انداز ہے۔ وہ زندگی اور اس کے مسائل کو مختلف اوقات میں مختلف زاویوں سے دیکھتا ہے اور جو کچھ دیکھتا اور سوچتا ہے، اسے بغیر جھجک، خوف اور اندیشے کے جرأت کے ساتھ بیان کر دیتا ہے ——— ان سب باتوں میں اس کے جدت پسند مزاج اور انوکھی شخصیت کو بڑا دخل ہے۔

منٹو کی نظر میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔ سیاست، معاشرت، دین، اخلاق ——— معاشرہ اور فرد ان سب پر اس کی گہری نظر ہے۔ اس کی حقیقت بیں اور نکتہ رس نگاہ ہر ایک کے حسن و قبح، اچھائی برائی اور عیب و ہنر کو اس طرح دیکھتی ہے کہ اجتماعی اور انفرادی زندگی کی کوئی حقیقت اس سے پوشیدہ نہیں رہتی۔ اس طرح عیب و ہنر پر پوری طرح احاطہ کر لینے کے بعد وہ ان میں سے ہر ایک کا اس نظر سے تجزیہ کرتا ہے کہ ان میں سے کون سی چیزیں فرد اور جماعت کو دھوکے میں رکھتی ہیں، کن سے انسانی زندگی عذاب میں مبتلا ہے اور کن سے انسانی زندگی اس سکون و مسرت سے محروم ہو رہی ہے جو فطرت کا مقصود ہے۔ منٹو انسانی زندگی کو اس کے سب اجتماعی اداروں یعنی سیاست، معیشت، دین اور اخلاق میں فطرت کے بتائے ہوئے راستے پر اور اس کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق پوری طرح پروان چڑھتے دیکھنا چاہتا ہے اور جب اس پہلو سے زندگی کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ انسان نے انسان کے ساتھ سخت ناانصافی کی ہے اور ایک ایسے انداز سے کی ہے کہ ناانصافی کا شکار ہونے والے خود نہیں جانتے

کہ ان کے ساتھ کون ناانصافی کر رہا ہے اور کس کس طرح کر رہا ہے۔ منٹو نے اس ناانصافی کو مٹانے، اس کا پردہ فاش کرنے اور اس کا طلسم توڑنے کو اپنے فن کا مقصود بنایا ہے۔

زندگی کے اس بہت بڑے اور بے حد اہم کام کا بیڑا اٹھانا بجائے خود ایک مہم ہے، لیکن اس سے سخت تر مہم یہ ہے کہ اسے کوئی عملی شکل دی جائے۔ منٹو کی مخصوص نظر نے انہیں جو کچھ دکھایا اور اس مشاہدہ کے بعد ان کے احساسِ درد نے انہیں جس کام کی طرف مائل کیا اس کے راستے میں بڑی رکاوٹیں ہیں ـــــ ہر ناانصافی کرنے والا، سیاست، معیشت، دین اور اخلاق کے اداروں میں اجارہ داری کی لذتوں کے راز جاننے والا ایسے لوگوں کا سب سے بڑا دشمن ہے جو اس کے رخ سے فریب اور طلسم کے پردے اٹھا کر اس کی حقیقت کے گھناؤنے پن کو رسوا کرتا ہے۔ اس لئے اس اہم کام کا بیڑا اٹھانے والے کو اتنا نڈر، اتنا بے خوف اور جری ہونا چاہئے کہ وہ ہر دشمن کے مقابلے کے لئے سینہ سپر رہے۔ منٹو کو فطرت کی طرف سے یہ بے خوفی، یہ جرأت اور یہ مردانگی عطا ہوئی تھی۔ اس کے اعصاب میں اتنی قوت تھی کہ وہ ہر وار کو دلیری سے روکے اور اس کی ضرب کو بے نیازی اور شگفتہ طبعی سے جھیل لے۔

منٹو کے فن پر ان کی اس بے خوفی نے بڑا گہرا اثر ڈالا ہے ـــــ اچھا بھی اور برا بھی۔ اچھا اس طرح کہ زندگی کی خرابیوں کا تجزیہ کر کے انہیں بے نقاب کر کے اور اس پر اکثر اوقات ایسی کاری ضرب لگا کے کہ چوٹ کھانے والا تلملا کر رہ جائے، انسان اور زندگی کی بڑی خدمت کی ہے اور برا اس طرح کہ حیاتِ انسانی کے بعض مستور پہلوؤں اور پوشیدہ رازوں کو اپنی دزدیدہ نگاہی سے یوں بے نقاب کیا ہے کہ چھپے ہوئے ناسوروں کی نمائش کے سوا کوئی نتیجہ نہیں نکلا ـــــ اور کبھی کبھی حقیقت بینی اور حقیقت نگاری سے دنیا والوں کو صرف عریانی سکھائی ہے۔ یہاں برے پہلو کا ایک اچھا پہلو یہی ہے اور اس کی اچھی تاویل یہی کہہ کر کی جا سکتی ہے کہ یہ سب کچھ منٹو کا مزاج تھا، اس کی شخصیت تھی اور منٹو فریب کی طرح فریب دینے کو بھی گناہ سمجھتا ہے۔ اس نے اپنے فن میں اپنے آپ کو پوری طرح بے نقاب کیا ہے۔

منٹو کے مزاج کی یہ سب خصوصیتیں، جنہوں نے ان کی شخصیت اور فن دونوں میں امتیاز اور انفرادیت کے پہلو نمایاں کئے ہیں سیاسی ماحول، معاشرتی انتشار، معاشی کشمکش اور بعض صورتوں میں ذاتی اور نجی حالات سے متاثر ہوتی رہی ہیں۔ منٹو نے اپنی زبردست قوتِ ارادی سے ہر طرح کے انتشار، کشمکش اور رکاوٹیں پیدا کر دینے والے حالات کا مقابلہ بڑی دلیری اور جوانمردی سے کیا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا ہے کہ اکثر منٹو نے ان سب قوتوں کو مغلوب کر کے اپنے لئے فتح کی راہ نکالی اور اپنے فن کو زندہ رکھا ہے۔ لیکن دیکھنے والوں نے بڑے درد و غم کے ساتھ حالات کے انتشار اور کشمکشوں کی ٹکر اور ریلے سے اس کے پیروں کو ڈگمگاتے بھی دیکھا ہے۔ زندگی کے دشوار گزار سفر کے بعض سخت مرحلوں پر اور بعض موڑ میں اس نے اپنے آپ کو بے دست و پا محسوس کیا اور اپنے آپ کو عارضی شکست قبول کر لینے پر آمادہ پایا ہے۔ شکست کے احساس نے اس کے اعصاب پر بڑا اثر ڈالا اور جب اس نے اعصاب کی قوت برقرار رکھنے کے لئے کسی آبِ زندگی کو اپنا سہارا بنایا تو اس کے اعصاب پہلے سے بھی زیادہ بے بس اور مجبور ہو گئے۔ یوں کبھی کبھی اعصاب کی اس سخت کشمکش اور خارجی ماحول اور بیرونی زندگی کے اس تصادم میں بھی اس کی شخصیت کی توانائی ہر چیز پر غالب بھی آئی ہے اور منٹو کی شخصیت کی عظمت اور بھی نمایاں ہوئی ہے ـــــ لیکن یہ عارضی فتح عموماً اعصاب کو زیادہ مغلوب اور پسپا بنانے کا پیش خیمہ بنی ہے۔ منٹو کی زندگی میں ماحول اور اعصاب کی یہ جنگ یوں تو اس کی حیاتِ فن کے ہر دور میں کسی نہ کسی جاری رہی ہے لیکن اس کے فن کا آخری دور اس تصادم اور کشمکش کا سخت ترین دور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منٹو نے اس دور میں جو کچھ لکھا ہے اس میں اس شکست و فتح کے تواتر کی جھلک نمایاں ہے۔ کبھی ایسا ہوا ہے کہ منٹو نے مدتوں کچھ نہیں لکھا، کبھی ایسا ہوا ہے کہ اس نے کئی کئی دن تک مسلسل ہر روز ایک افسانہ لکھا ہے، اور اس طرح تواتر اور تسلسل سے لکھے ہوئے افسانوں میں بھی کسی ایک سلسلہ میں وہ کوئی اچھا افسانہ نہیں لکھ سکا اور کبھی ہر روز ایک اچھا افسانہ لکھا۔ مثلاً منٹو کے مجموعے ٹھنڈا گوشت کے سب افسانے رسالے ٹھنڈا گوشت کے، ۲۳ اور ۲۴ ہوئی

کے درمیان لکھے گئے، بادشاہت کا خاتمہ، مجموعہ کے سب افسانے یکم جون اور ۱۴ جون کے درمیان لکھے گئے۔ اسی طرح یزید مجموعہ کے سب افسانے ۱۴ اکتوبر اور نومبر کے درمیان لکھے گئے۔ منٹو کے آخری دور کے بعض اور مجموعے جو زیر ترتیب زیر اشاعت ہیں منٹو کی اس ذہنی کیفیت کی ترجمانی کرتے ہیں اور ان افسانوں کو پڑھ کر پڑھنے والا نمایاں طور پر تین باتیں محسوس کرتا ہے ــــ ایک بات تو یہ ہے کہ اس دور کے لکھے ہوئے افسانوں میں سے اکثر مجموعی حیثیت سے منٹو کے کمتر درجے کے افسانے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس دور میں بھی جب بظاہر منٹو کا فن انحطاط کی منزلوں سے گزر رہا ہے اس نے چند اچھے اور بہت اچھے افسانے بھی لکھے ہیں۔ اور تیسرے یہ کہ ان افسانوں میں بھی جنہیں ہم مجموعی حیثیت سے ان کے اچھے افسانے نہیں کہہ سکتے جا بجا منٹو کی ذہانت، ان کی جدت پسندی ان کی شوخیٔ طبع، ان کی گہری طنز اور فن کے ساتھ ان کی فطری مناسبت جلوہ گر نظر آتی ہے۔ منٹو کی قادر الکلامی اور اس سے بھی بڑھ کر ان کی یہ خصوصیت کہ وہ کہانی کہنا جانتے ہیں، اس دور میں بھی اسی تازگی اور توانائی کے ساتھ نمایاں ہے۔

منٹو کے ہر دور کے افسانے ــــ بہت اچھے، اور بُرے سب افسانے ــــ دیکھ کر پڑھنے والا ان کی جس خصوصیت سے سب سے زیادہ متأثر ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ ان افسانوں میں کہانی کی لذت ہے۔ منٹو کو فطرت نے ایک قصہ گو بنا کر بھیجا تھا۔ اس نے جب افسانہ نگاری شروع کی جب بھی اس میں فطرت کی دی ہوئی اس صلاحیت کو برتنے کی پوری قوت تھی، اور جب اس نے مجبور اور بے بس ہو کر مرنے سے چند دن پہلے تک افسانے لکھے تو اس کی یہ صلاحیت اس میں اپنے پورے فطری محاسن کے ساتھ موجود تھی۔

منٹو کو ایک قصہ گو کی حیثیت سے کئی گُر کی باتیں معلوم تھیں اور قصہ گوئی کے ساتھ اس کے فطری میلان اور فن کے ساتھ اس کے بے پایاں لگاؤ نے اس میں ان گُر کی باتوں سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کی عادت پیدا کر دی تھی۔ منٹو کو علم تھا کہ زندگی میں ہر قدم پر ایک کہانی ہے۔ ہر انسان اور ہر واقعہ خواہ وہ کتنا ہی کم حیثیت اور کیسا ہی معمولی کیوں نہ ہو کہانی کا بڑا موزوں اور دلچسپ موضوع ہے ــــ لیکن اس کے لئے ایک شرط ہے، اور بظاہر بہت معمولی معلوم ہونے کے باوجود یہ شرط قصہ گوئی کے لئے بڑی اہم ہے۔ اور وہ شرط یہ ہے کہ کہانی کہنے والا ایک ایسا انداز اختیار کرنا جانتا ہو کہ کہانی شروع ہوتے ہی اس میں اور کہانی سننے یا پڑھنے والے میں انتہائی یگانگت و بے تکلفی کا رشتہ قائم ہو جائے۔ پڑھنے یا سننے والا یہ محسوس کر سکے کہ قصہ گو اسے اپنا ہمراز سمجھ کر اسے اپنے دل کی بڑی سے بڑی بات بتانے میں بھی تامل نہیں کرے گا، وہ اپنی خوشی اور غم میں اسے پوری طرح شریک کرے گا۔ کہانی سننے والے کے دل میں اپنی طرف سے اعتماد پیدا کرنا اور ایک جان دو قالب ہو کر اس سے معمولی سے معمولی بات بھی اس طرح کہنا کہ جیسے وہ بے حد اہم ہے، کہانی کہنے والے کی بڑی جیت ہے۔ منٹو قصہ گوئی کے میدان میں یہ جیت حاصل کرنے میں ماہر تھا۔ وہ بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی بات اس طرح بیان کرنے کے انداز میں دوسروں سے کہہ سکتا تھا کہ دوسرے اس کے جھوٹ کو، اس کے پُر فریب تخیل کو، اس ذہانت کی آغوش میں پلے ہوئے عجیب و غریب تصوّر کو سچ سمجھ کر قبول کرتے اور اس سے لطف لیتے تھے۔ معمولی سی بے حقیقت بات کس طرح کہانی بن سکتی ہے، اس کی مثال منٹو کا افسانہ "چوہے دان" ہے۔ کہانی میں کس طرح باتوں کا مزا پیدا کر کے اپنے اور پڑھنے والے کے احساسات میں مکمل یگانگت پیدا کی جا سکتی ہے اس کا اندازہ "چغد"، "مس ٹین والا"، "میرا نام رادھا ہے"، "ڈرپوک"، "ننگی آوازیں"، "حامد کا بچہ"، "رحمتِ خداوندی کے پھول"، "خورشید"، "ٹیٹوال کا کتا"، "چور"، "نکی" اور "حالد صاحب" جیسے افسانوں کو پڑھ کر ہو سکتا ہے۔ اور کس طرح عجیب و غریب اور ناقابلِ اظہار خیال افسانے میں جگہ پا کر اور منٹو کی چابک دستی کے حلقہ بگوش بن کر پڑھنے والوں کا دل موہ سکتے ہیں یہ "بیرن"، "صاحبِ کرامات"، "بادشاہت کا خاتمہ"، "کالی شلوار" اور "عورت کے لئے" جیسے افسانے پڑھ کر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ منٹو اپنے قریبی ماحول میں سے اتنی آسانی سے کوئی کہانی پیدا کر لیتا تھا کہ دیکھنے والے کو حیرت ہوتی تھی۔ وہ گپ کو کس طرح سنجیدہ مقاصد کے لئے استعمال کر سکتا تھا، یہ بات اور بھی زیادہ حیرت کی تھی ــــ لیکن

یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ منٹو کہانی کہنا جانتا تھا اور اپنی اور بہت سی فنی کمزوریوں کے باوجود اپنے آخری دور انحطاط میں بھی وہ کہانی کہنا بھولا نہیں تھا۔ اسی لئے اس انحطاط کے زمانہ میں منٹو کے افسانے شوق سے پڑھے جاتے تھے۔

یہی ساری باتیں ہیں جو مل جل کر منٹو کے فن میں زندگی بھی پیدا کرتی ہیں اور انفرادیت اور عظمت بھی لیکن منٹو میں اگر اسکینڈل کو افسانوں کا موضوع بنانے کی کمزوری نہ ہوتی، پڑھنے والوں میں کبھی کبھی ایک ہنگامہ اور گرماگرمی پیدا کر دینے کے لئے وہ اگر چونکا دینے والی باتیں کہنے اور لکھنے پر اصرار نہ کرتا، وہ اگر اپنی طنز کو اصلاح کے بلند مقاصد کے لئے استعمال کرنے کے بجائے کبھی کبھی اسے زہر میں بجھے ہوئے تیروں کی طرح بے تحاشا دوسروں کو کچوکے دینے اور اس میں لذت محسوس کرنے کی عادت ترک کر سکتا اور جنسی تجزیہ کو نفسیات کی نازک حدود میں رکھنے کے بجائے اسے کوچہ و بازار میں رسوا کرنے سے احتراز کر سکتا تو منٹو یقیناً اس سے بھی بڑا فن کار ہوتا جیسا کہ وہ اب تھا —— اس لئے کہ اس سے انکار کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں کہ وہ ان چند کمزوریوں کے باوجود بہت بڑا فن کار تھا۔ اس کے مشاہدہ، تخیل، تصور، فکر اور احساس پر اس کی شخصیت کا بڑا گہرا رنگ ہے۔ اور شخصیت میں غیر معمولی قوت و توانائی —— وہی قوت و توانائی اس کے پورے فن پر چھائی ہوئی ہے اور آنے والے ہر دور میں ہر طرح کے حوادث کے خلاف سپر بن کر اس فن کی حفاظت کرے گی اور اسے زندہ رکھے گی —— منٹو مر گیا۔ لیکن اس کا فن اسے مرنے نہیں دے گا۔

منٹو کا مقام

محمد حسن عسکری

جس دن منٹو مرا تھا اُس دن بھی میں نے یہی کہا تھا کہ منٹو جیسے آدمی کی زندگی یا موت کے بارے میں جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں، ہمیں تو اس کی زندگی اور موت دونوں کے معنی متعین کرنے چاہئیں۔ منٹو تو اُن لوگوں میں سے تھا جو صرف ایک فرد یا ایک ادیب سے کچھ زیادہ ہوتے ہیں۔ پھر اب تو جذبات پرستی کی گنجائش یوں بھی نہیں رہی کہ منٹو کو مرے دو مہینے سے زیادہ ہو گئے، اور ہمارے لئے یہ سوال زیادہ اہم ہو گیا ہے کہ اُردو ادب میں، یا کم سے کم پچھلے بیس سال کے اُردو ادب میں منٹو کی جگہ کیا ہے۔ بعض لوگوں کے خیال میں منٹو اُردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ منٹو چاہے موپاساں وغیرہ کی صف میں نہ آ سکے، لیکن یورپ کے اچھے خاصے افسانہ نگاروں سے اس کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ میں ان دونوں باتوں سے متفق ہوں۔ بلکہ میں تو یہ بھی کہتا ہوں کہ اگر منٹو موپاساں کے برابر نہیں پہنچ سکا تو اس میں اتنا قصور خود منٹو کا نہ تھا جتنا اُس ادبی روایت کا جس میں وہ پیدا ہوا۔ جس بات میں منٹو موپاساں سے پیچھے رہ جاتا ہے وہ موپاساں کی نثر ہے۔ اور موپاساں کو جس قسم کی نثر درکار تھی وہ فرانس میں اور کچھ نہیں تو کوئی دو سو سال سے نشو و نما پا رہی تھی۔ موپاساں کے پیچھے روش فوکو تھا، والتیئر تھا، اسنتاں دال تھا، فلوبیئر تھا۔ منٹو کے پیچھے کون ہے؟ میری بات کا وہ مطلب نہ سمجھئے جو اُردو کے ایم اے سمجھیں گے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اُردو نثر بالکل فضول ہے۔ اس میں بھی بہت سی خوبیاں ہیں۔ لیکن منٹو کو جن چیزوں کی ضرورت تھی وہ اُردو نثر کی روایت میں موجود نہ تھیں۔ منٹو کو پانی پینے کے لئے اپنے آپ کنواں کھودنا پڑا۔ موضوع اور ہیئت دونوں میں منٹو کی حیثیت ایک پیش رو کی ہے۔ اس لئے منٹو کے متعلق کوئی آخری فیصلہ کرنے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ اُس سے پہلے اُردو میں کیا تھا، اُس کے ہم عصر کیا کر رہے تھے، منٹو کیا کر سکا اور کیا نہیں کر سکا۔ یہ باتیں دیکھے بغیر ہم منٹو کو اچھا یا بُرا تو کہہ لیں گے، مگر اُردو ادب میں منٹو کی حیثیت ہماری سمجھ میں نہ آئے گی۔

منٹو نے جو کنواں کھودا تھا وہ ٹیڑھا بھینگا سہی، اور اس میں سے جو پانی نکلا وہ گدلا یا کھاری سہی۔ مگر دو باتیں ایسی ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک تو یہ کہ منٹو نے کنواں کھودا ضرور، دوسرے یہ کہ اُس میں سے پانی نکالا۔ اب ذرا گنئے تو سہی کہ اُردو کے کتنے ادیبوں

کے متعلق یہ دونوں باتیں کہی جاسکتی ہیں۔

میں اس بات سے بے خبر نہیں ہوں کہ آج سے نہیں بلکہ شروع سے ہی بہت سے "خوش مذاق" حضرات کو منٹو کی ان دونوں خوبیوں سے انکار رہا ہے۔ اس کے برخلاف ہم نے یہ بھی دیکھا کہ اقبال کی وفات سے لے کر آج تک کسی اردو ادیب کا ماتم اس طرح نہیں ہوا جس طرح منٹو کا۔ آخر کوئی چیز تو تھی جس نے لوگوں کو اتنا سوگ منانے پر مجبور کیا۔ خیر بعض لوگ اتنی مقبولیت کو بھی منٹو کی پستی کا آخری اور قطعی ثبوت سمجھیں گے کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ ادیب کو ہر آدمی کے لئے نہیں لکھنا چاہیئے۔ ایسے لوگوں کو بیس سال سے منٹو پر یہی اعتراض رہا ہے کہ منٹو ایسی باتیں کرتا ہے جس سے لوگ چونک پڑیں۔ شاید یہ کوئی غیر شریفانہ یا غیر ادیبانہ بات ہو۔ لیکن میں نے جو تھوڑا بہت ادب پڑھا ہے اس سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ لوگوں کو چونکانا ادب کا ایک مقدس فریضہ رہا ہے۔ بلکہ میلول نے تو ایسے لوگوں پر لعنت بھیجی ہے جو چونکانے سے ڈرتے ہیں۔ منٹو کو چھوڑیئے۔ بودلیئر جیسے عظیم شاعر کو کیا کہیئے گا جس کا ایک ادبی اصول ہی یہ تھا کہ متوسط طبقے کو چونکایا جائے؟ اگر چونکانا کوئی بہت بڑا ادبی نقص ہے تو چونکنے سے ڈرنا ایک ذہنی بیماری ہے، کمزور شخصیت کی نشانی ہے۔ جو آدمی دوسروں کو چونکانا چاہے اس میں پہلے خود چونکنے کی صلاحیت ہونی چاہیئے۔ جس شخص کے جسمانی، ذہنی اور اخلاقی اعصاب زندہ نہ ہوں وہ کسی کو کیا چونکائے گا۔ ننگی کیا نہائے گی کیا نچوڑے گی۔ اگر کوئی ادیب اپنے پڑھنے والوں کو چونکاتا ہے تو یہ کوئی شکایت کی بات نہیں۔ ورنہ پھر تو بڑھئی کی شکایت کیجیئے کہ اس نے کرسی کیوں بنائی۔ ایسا ادیب تو محض اپنا فریضہ ادا کرتا ہے۔ ہاں، ادیب سے آپ یہ ضرور پوچھ سکتے ہیں کہ تم نے ہمیں چونکانے کے بعد دکھایا کیا۔ اگر ہمیں جھنجھوڑ کر جگانے کے بعد منٹو نے ہمیں انسانی فطرت اور انسانی معاشرے کا کوئی تماشا نہیں دکھایا، اگر اس نے ہمارے اندر زندگی کا کوئی نیا شعور پیدا نہیں کیا تو پھر ہم اسے گالیاں دینے میں حق بجانب ہوں گے کہ اس نے ہمیں چین سے سونے بھی نہیں دیا۔ جو لوگ کسی قیمت پر جاگنا ہی نہیں چاہتے انھیں تو ان کے حال پر چھوڑیئے۔ لیکن کیا آپ "نیا قانون"، "ہتک"، "بابو گوپی ناتھ" جیسے افسانے پڑھ کر دیانت داری کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ منٹو نے ہمیں چونکا کر مفت میں ہماری نیند خراب کرائی؟

اچھا، منٹو نے چونکایا بھی ہے دو طریقے سے۔ ایک تو اس کے اچھے افسانے ہیں جنھیں پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ انسانی حقیقت ہمارے لئے کچھ بدل سی گئی ہے۔ دوسری طرف اس کے بُرے افسانے ہیں۔ منٹو کا ڈھنڈورچی ہونے کے باوجود مجھے تسلیم ہے کہ اس نے بعض بہت ہی خراب افسانے لکھے ہیں، لیکن اس کے بُرے سے بُرے افسانے میں بھی آپ کو دو ایک فقرے ایسے ضرور ملیں گے جو کسی نہ کسی آدمی یا چیز یا احساس کو منور کر کے رکھ دیں گے ـــــ چاہے یہ روشنی ایسی ہو جو آپ کو پسند نہ آئے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں بھی آورد [illegible] ہے، یہ بھی منٹو کا مداری پن تھا۔ مگر پہلی بات تو یہ ہے کہ آمد اور آورد کا فرق ادب میں کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کوئی چیز آمد ہو یا آورد، فیصلہ کن بات تو یہ ہے کہ اس سے نتیجہ کیا برآمد ہوا۔ اگر آورد کے ذریعے کسی تجربے کو اظہار مل گیا تو وہ آمد سے بہتر ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ [illegible] بھی دو طرح سنی جاتی ہے، کبھی تو سروش اپنے آپ بول پڑتا ہے، کبھی اس کے کان مروڑنے پڑتے ہیں۔ سروش کی فیاضی سے تو ہر آدمی ہی ادیب بن سکتا ہے، لیکن سروش کو زبردستی بلوانے کے لئے ہمت درکار ہے۔ کیونکہ سروش کے کان مروڑنے کا مطلب ہے اپنے کان مروڑنا۔ آپ یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ بعض دفعہ منٹو نے سروش کے کان اس طرح مروڑے کہ وہ بولنے کے بجائے چیخ پڑا یا اول فول بکنے لگا۔ لیکن منٹو نے جو صدا تو دکھا یہ کہہ دینا تو آسان ہے کہ منٹو کرتا ہی کیا تھا، وہ بے جوڑ باتوں کو جوڑ دیتا تھا، مگر یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اس ان مل بے جوڑ میں آدمی کا حلیہ بگڑ جاتا ہے

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار

منٹو کے اندر اس شعبدے بازی کی تہ میں جو چیز کام کر رہی تھی وہ یہ کہ منٹو اپنے کسی چھوٹے سے چھوٹے احساس یا جذبے کو دبانے یا روکنے کا قائل نہ تھا۔ ہر چیز اس کے اندر کوئی نہ کوئی ردِ عمل پیدا کرتی تھی، اور وہ اس ردِ عمل کو قبول کر لیتا تھا۔ ان چھوٹے چھوٹے اور وقتی تجربات کو ایک

دوسرے سے متعلق اور منضبط کرتے رہنے کی عادت اُس میں نہ تھی۔ وقتی ردِعمل کو وہ اتنا دلچسپ یا دقیع سمجھتا تھا کہ اس پر انضباط و ارتباط کو قربان کر دیتا تھا۔ اسی لئے اُس کے افسانے کبھی تو بہت اچھے ہوتے تھے، کبھی بہت بُرے، اور کبھی افسانے میں ایک آدھ فقرہ ہی کام کا نکلتا تھا۔ منٹو میں یہ بہت بڑا نقص تھا۔ لیکن اُردو کے دوسرے افسانہ نگاروں کا حال یہ رہا ہے کہ وہ یا تو اپنے احساس کو ایک ڈھرّے پر لگا دیتے ہیں، اس ڈھرّے سے ہٹ کر کسی اور قسم کے تجربے کی صلاحیت اُن میں باقی ہی نہیں رہتی، یا بیہودہ چھوٹے چھوٹے اور ہنگامی تجربات کو حقیر سمجھ کر رد کرتے چلتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ادیب دو چار اچھے افسانے لکھ کے ختم ہو جاتے ہیں۔ اُردو افسانے میں بس منٹو ایک ایسا آدمی ہے جو کسی جذبے یا احساس سے نہ ڈرتا تھا، اور جس کے لئے کوئی احساس حقیر یا غیر دلچسپ نہ تھا۔ بعض حضرات نے منٹو کے کارناموں کو یہ کہہ کر اُڑانے کی کوشش کی ہے کہ منٹو کے یہاں افسانے کا خام مواد تو ہے، افسانے نہیں ہیں۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اُردو کے دوسرے افسانہ نگاروں کے پاس خام مواد تک نہیں ہے۔ کیونکہ خام مواد تو احساسات اور جذبات ہی فراہم کرتے ہیں۔ جب آدمی اپنے اعصاب پر پہرے بٹھا دے تو نتیجہ ظاہر ہے۔ منٹو کی شخصیت اُردو کے افسانہ نگاروں میں سب سے زیادہ آزاد تھی۔ اس معنی میں کہ اُس نے اپنے احساسات پر کسی قسم کی بندشیں نہیں لگائی تھیں۔ جب اُس کے احساسات ایک دوسرے سے آزاد ہونے لگے تھے تو یہی چیز اُس کے افسانے کے لئے مہلک بھی بن جاتی تھی۔ لیکن اُردو میں کوئی افسانہ نگار ایسا نہیں جو احساسات کی آزادی سے اتنا کم ڈرتا ہو۔ احساسات اور انفعالات کی ہلچل میں منٹو کی شخصیت ضرور پاش پاش ہو گئی، لیکن اپنی زندگی اور موت سے منٹو نے ہمیں اتنا ضرور دکھا دیا کہ فن کار اپنا مواد کس طرح حاصل کرتا ہے۔ کیونکہ اُس نے مواد جمع کرنے کا کام برسرِ عام اور سب کی نظروں کے سامنے کیا۔ اسی لئے اُردو میں اُس کی حیثیت محض ایک ادیب سے زیادہ ہے۔ اسی لئے اُس کی موت اُس کی زندگی کی معنویت کو مکمل کرتی ہے۔ اور اسی لئے اُس کے بُرے افسانوں کو بُرا سمجھنے کے باوجود میں بھی منٹو کو اُردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار کہتا ہوں۔

گنجا فرشتہ

سیّد عابد علی عابدؔ

منٹو (مرحوم) مجھ سے عمر میں کوئی پانچ سال کے قریب چھوٹا تھا۔ لیکن جب وہ امرتسر سے لاہور آیا تو میں ایم اے کر چکا تھا۔ اور وہ اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر اُلجھنوں میں گرفتار ہو چکا تھا۔ اس کا اور میرا ایک مشترک دوست تھا (اور ہے)، وہ مجھ سے دیال سنگھ کالج میں پڑھ چکا تھا۔ اور کبھی کبھی نثر کی کوئی چیز لے کر آ جاتا تھا۔ ایک دن وہ منٹو کو لے آیا۔ ان دنوں بھی (اور یہ مدت کی بات ہے) منٹو کے انداز میں ایک نخوت اور پندار کا رنگ تھا۔ جو خودداری سے بڑھ کر تھا۔ ان دنوں بھی منٹو کسی نفسیاتی اُلجھن کا مریض نہ تھا۔ عمر بھر منٹو کو یہی چیز پریشان کرتی رہی۔ کہ وہ کسی نفسیاتی اُلجھن کا مریض نہیں ہوا۔ اور جن لوگوں سے سلسلہ پڑتا تھا اور پڑتا تھا۔ وہ کم و بیش مختلف نفسیاتی بیماریوں کے شکار رہتے۔ بے باک نگاری، حق گوئی، صداقت شعاری، خلوص، دیانتداری، ادب میں کسے نصیب ہوں گی جو حقائق کو نفسیاتی تعصبات اور اُلجھنوں کی عینک چڑھائے بغیر دیکھے گا۔ ورنہ چیز اور حقیقت کی شکل مسخ ہو جائے گی۔ میٹھی چیز تلخ معلوم ہوگی۔ اور تلخ شیریں۔ مستطیل مربع معلوم ہوگا۔ اور دائرہ مکعب۔ حقائق کے مسخ کرنے کی صلاحیت خود مشاہدہ کرنے والے کی ذات میں مخفی ہوتی ہے۔ اور وہ ان کا بیان کرتے وقت ان تمام باتوں سے (سرسری تم جہاں سے گذرے) کے انداز میں گذر جاتا ہے۔ جو اُسے تکلیف دیتی ہیں۔ یا جن سے کوئی تلخ یاد وابستہ ہوتی ہے یا جن سے کسی نفسیاتی اُلجھن کا تعلق ہوتا ہے۔

منٹو حقائق کا نقاش نہیں تھا۔ عکاس تھا۔ فنونِ لطیفہ میں عکاسی اور مصوری میں یہی فرق بتایا گیا ہے۔ کہ عکاسی حقائق و اشیا کو اس طرح دیکھتی ہے جس طرح وہ موجود ہوتی ہیں۔ اور مصوری اس طرح، جس طرح مصور کے ذہن میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ اس طرح مصور کی تخلیق میں اور اس نمونے یا موضوع میں، جو تخلیق کا موجب ہے۔ بعض اوقات ایسا بُعد ہوتا ہے کہ پہچان نہیں پڑتا۔ کیوبسٹ آرٹ، تجریدی آرٹ کی مختلف قسمیں۔ اس قسم کے مشاہدے کی مثالیں ہیں۔ جہاں مصور کی ماہیت اور موضوع کی معنویت کی جستجو میں، علامات و رموز سے کام لیتا ہے۔ اور اصل چیز جس کی تصویر بنائی جاتی ہے۔ محض ایک محور ہو جاتی ہے جس کے گرد مصور کے تصورات و افکار گھوم جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف عکاسی میں کیمرہ اشیا یا حقائق کو بعینہٖ اس طرح دیکھتا ہے۔ اور دکھاتا ہے۔ جس طرح وہ ہوتا ہے یعنی موجود فی الخارج۔

میں نے عرض کیا ہے۔ منٹو حقائق کا عکاس تھا۔ وہ نہایت استغنا، اور بے پروائی سے اور بہ کمالِ اطمینانِ خاطر وہ تمام نقشے الفاظ میں اُتار کر رکھ

ہے گرد و پیش کی دنیا میں نظر آتے تھے۔ یہ نقشے اپنے اصل خد و خال اور رنگ روپ میں بہت سے آدمیوں کو کم پہچانتے تھے۔ ایک گروہ تو وہ تھا جو آگاہ ہی نہ تھا کہ حقیقت کی یہ شکلیں بھی ہیں۔ دوسرا گروہ وہ تھا جو آگاہ تو تھا لیکن مشرق کی وضعداری اور متانت کے خلاف کسی بات کو (وہ مختصر افسانہ ہی کیوں نہ ہو) گوارا نہ کر سکتا تھا۔ ایک وہ گروہ تھا جس کے دل کے چور پکڑے جاتے تھے بلکہ افسانوں میں ان کے دل چوری کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ ان کی جھنجھلاہٹ جائز تھی، وہ اب تک قائم ہے۔ اور غالباً رہتی دنیا تک قائم رہے گی۔

یہ مقام کہ کوئی شخص کسی نفسیاتی بیماری کا شکار نہ ہو، بہت کم آدمیوں کو نصیب ہوتا ہے۔ منٹو کے تکبر، نخوت اور پندار کو مرض نہ سمجھا جائے۔ یہ فن کار کو اپنی مہارت پر جو ناز تھا، اس کا اظہار تھا۔ اور صرف ان موقعوں پر ہوتا تھا جب فن زیر بحث ہوتا تھا۔

حقیقت کی عکاسی میں، فن کار کو، جزئیات کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ اور اپنے ماحول کی اجتماعی تصویر کھینچنے کے لئے اس کو طے کرنا پڑتا ہے کہ زندگی کے یہ پہلو دکھائے جائیں گے اور یہ نہیں۔ منٹو نے یہ کام بہت سلیقے سے کیا تھا۔ اس کے افسانوں کے مطالعے سے ہماری معاصرانہ زندگی اور اس کے ملحوظ کے بہت سے پہلو اسی طرح اجاگر ہوتے ہیں کہ مختلف افسانوں کو ملا کر ایک مکمل تصویر بنتی ہے۔ اس تصویر میں جنس کے رنگ بھی چوکھے ہیں۔ لیکن بات یہ ہے کہ جنسی معاملات میں، ہمارے ملک میں، ہر لڑکا اور ہر لڑکی کسی واہیات کتاب سے یا کسی واہیات دوست سے یا سہیلی سے جنسی معلومات حاصل کیا کرتی ہے اور یہ معلومات ایسی ناقص اور بیہودہ ہوتی ہیں کہ بہت سی جنسی گمراہیوں اور کج رفتاریوں کا موجب ہوتی ہیں۔ منٹو اس گمراہی اور کجروی کی عکاسی کرتا ہے۔ (اور جنسی بھوک کا تذکرہ بھی کرتا ہے) بات ذرا طول پکڑ گئی۔ میں کہہ رہا تھا کہ حقیقت کی عکاسی کے لئے ضروری ہے کہ عکاس کسی بیماری میں مبتلا نہ ہو۔ یعنی ذہنی بیماری میں۔ منٹو اس اعتبار سے اپنے دور کا بڑا صحت مند ادیب تھا۔ اس نے ایسے افسانے بھی لکھے ہیں جن کو بالغ عمر کے بچے اور بچیاں پڑھیں تو ان کے اخلاق پر برا اثر ہو سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ خود منٹو کی نیت کا کیا عالم تھا؟

حقیقت کے عکاسوں کو دنیا نے ہمیشہ برا بھلا کہا ہے کہ اس کے بغیر بات نہیں بنتی۔ انہیں تو وہ نقاش پسند آتے ہیں جو وہ نقش لگائیں کہ دلربا معلوم ہوں۔ موضوع تصویر کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ ایسی موہنی شکل پیدا کریں کہ آدمی گھنٹوں دیکھا کرے۔ لیکن ادب کو پہلے عکاس کی ضرورت ہے، پھر نقاش کی۔ اصلیت معلوم ہوگی تو وہ تصویر بنائی جائے گی جو مطلوب ہے۔ اور فسانے دل ہے۔ دنیائے باطن اس وقت تک خارج میں متشکل نہیں ہو سکتی جب تک پہلے فن کار کے ضمیر کے اندر پیدا نہ ہو۔ یہ دنیا تبھی وجود میں آسکتی ہے کہ ادب میں ہر مرحلے پر عکاس پیدا ہوتے رہیں۔ تاکہ انسان حقیقت سے آگاہ رہے اور آنکھیں بند کر کے یہ نہ سمجھ لے کہ سب کچھ ٹھیک ہے۔

دنیائے خارج میں کوئی معیاری معاشرت اس وقت تک وجود میں نہیں آسکتی جب تک حقیقت کے عکاس برابر ظہور میں نہ آتے رہیں۔ اور پیپلشا رہ کر بھی یہ سکون قلب اجزا کو دیکھ کر ایک اجتماعی تصویر نہ بناتے رہیں۔ کہ نقاشوں کو معلوم ہو سکے کہ اصل صورت کیا ہے۔ نئی دنیا بنانے کے لئے نئی اقدار دریافت کرنے کے لئے، نئی انفرادی تربیت کے لئے، اجتماعی اصلاح کے لئے پہلے اس دنیا کی عکاسی کی ضرورت ہے، جو ہے۔ تاکہ وہ، جو ہونا چاہئے وجود میں آسکے۔

افسانوں میں فن کار اپنی مخلوقاتِ ذہنی اپنے کرداروں کے ذریعے بات کرتا ہے۔ اس لئے جو کچھ اُسے کہنا ہوتا ہے، وہ بالواسطہ کہا جاتا ہے بعض افسانوں میں اگرچہ مصنف کی اخلاقی اقدار مترشح ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن اس کے ذاتی عقائد کا زندگی پر اس کے نقطۂ نظر کا سراغ بہت کم ملتا ہے عین ممکن ہے کہ افسانے میں مصنف ان تمام خیالات سے اختلاف کرے۔ جو کرداروں کی زبانی ظاہر کئے گئے ہیں۔ عکاسی کے افسانوں میں ایسا ہوتا ہے۔ افسانوں کے متعلق، فن کے متعلق، زندگی کے متعلق، اور بہت سے دوسرے مسائل کے متعلق، منٹو کا نقطۂ نظر زیادہ وضاحت سے اس کتاب گنجے فرشتے کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے۔ یوں بھی یہ کتاب منٹو نے جو فن کی منزلیں طے کی ہیں، ان میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ سوانح اور ذاتی تاثرات کے امتزاج سے کم و بیش اردو میں ایک نئی صنفِ ادب وجود میں آئی ہے۔ یہ طے کرنا کہ اس صنفِ ادب کا نام کیا رکھا جائے۔ چند

ضروری نہیں۔ صرف یہ کہ پاجامہ ضروری ہے۔ "گنجے فرشتے" میں منٹو نے بہت سے مشاہیر کو پیش کر کے سوانح نگاری کا ایک نیا اسلوب پیدا کیا ہے۔ اس کتاب میں قائد اعظم (مرحوم)، آغا حشر (مرحوم)، اختر شیرانی (مرحوم)، میرا جی (مرحوم)، باری (مرحوم)، عصمت چغتائی، اشوک، پری چہرہ نسیم بانو، نرگس، ڈیسائی اور بابو راؤ پٹیل کے متعلق مضامین ہیں۔ ان مضامین میں منٹو کے سوانح حیات کے بہت سے تار الجھے ہوئے ہیں۔ صنعت فلم سازی کے تذکرے موجود ہیں۔ پیشہ ور نقادوں پر جگہ جگہ چوٹیں بھی ہیں۔ بعض اکٹروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کا کردار اور ان کی شخصیت منفرد ہے۔ لیکن ان کے تذکرے میں ایک قدر مشترک ہے۔ منٹو کا بے تکلفانہ انداز نگارش جو اس طرح ہے کہ تمام شخصیتوں کو گویا ایک لڑی میں پرو دیتا ہے۔ (ذاتی تعلقات تو ظاہر ہیں کہ تھے۔ قائد اعظم مرحوم کے سوا) بظاہر یہ مجموعہ بارہ آدمیوں کے متعلق ہے۔ لیکن درحقیقت اس کا موضوع ایک تیرھواں آدمی بھی ہے۔ اور وہ خود منٹو ہے۔ جس کی شخصیت اس کتاب میں سب پہ چھائی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ منٹو ابھی کی حد درجہ پر آشوب فلمی دنیا میں رہ کر بھی جذباتی، خلوص کا خواہاں اور حامل رہے کی بات یہ ہے کہ منٹو نے اپنی جذباتیت کو اپنی خوبیوں کو اور اپنے خلوص کو بڑے اہتمام سے پڑھنے والوں سے مخفی رکھنا چاہا ہے لیکن جو شخصیت اس کتاب میں سب سے زیادہ ابھری ہے۔ وہ منٹو کی ذات ہے۔ معلوم نہیں کہ ترتیب میں ترتیب زمانی کس حد تک ملحوظ ہے لیکن مسلسل مطالعے سے منٹو کی ایک شخصیت ابھرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ پہلے نوجوان، حوصلہ والے فنکاروں اور مصنفوں پر فریفتہ۔ پھر دنیا کی منافقت سے دوچار، کارزار حیات میں برد آزما، اور آخر اپنی ہی ذات کی ایک کمزوری سے شکست کھا کر مایوس و نامراد انسان۔ آغا حشر سے جن دو ملاقاتوں کا منٹو نے ذکر کیا ہے۔ اس میں ہمیں وہ کم عمر منٹو نظر آتا ہے۔ جس کی طبیعت پڑھائی سے اچاٹ ہو چکی تھی۔ اور جو اپنے اردگرد کے حالات کو تیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس زمانے میں اس پر مشہور صحافی اور مورخ باری کا بہت اثر تھا۔ جو منٹو کے خیال میں حد درجہ بزدل واقع ہوئے تھے۔ اختر شیرانی سے جو ملاقات کا تذکرہ کیا ہے۔ اس سے منٹو کے جذباتی ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔ "تین گولے" میں (یہ میرا جی سے متعلق مضمون ہے) منٹو نے پُراسرار تثلیث کا افسانہ شروع کر کے بڑی پتے کی باتیں کہی ہیں۔ میرا جی کے متعلق جو کچھ اس نے لکھا ہے۔ اس سے کسی کو اتفاق ہو یا اختلاف، یہ اور بات ہے۔ لیکن منٹو نے جو دادِ نکتہ دانی دی ہے۔ اس سے انکار کی جرأت کسی کو نہیں ہو سکتی۔ وہ لکھتا ہے۔

"حسن، عشق اور موت ... اس تثلیث کے نظام اقلیدسی کا زاویہ صرف ان تین گولوں کی بدولت اس کی سمجھ میں آسکتا تھا۔ لیکن حسن اور عشق کے انجام کو چونکہ اس نے شکست خوردہ عینک سے دیکھا تھا۔ جس کے شیشوں میں تریڑے تھے۔ اس لئے اس کو جس شکل میں اس نے دیکھا تھا۔ صحیح نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اس کے سارے وجود میں ایک ناقابل بیان ابہام کا زہر پھیل گیا تھا جو ایک نقطے سے شروع ہو کر ایک دائرے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس طور پر کہ اس کا ہر نقطہ اس کا نقطۂ آغاز ہے۔ اور وہی نقطۂ انجام۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اس کا ابہام نوکیلا نہیں تھا۔ اس کا رخ موت کی طرف تھا۔ نہ زندگی کی طرف۔ رجائیت کی سمت نہ قنوطیت کی جانب۔ اس نے آغاز اور انجام کو اپنی مٹھی میں اس طرح بھینچ رکھا تھا کہ ان دونوں کا عرق نچڑ نچڑ کر اسی میں سے ٹپکتا رہتا تھا۔ لیکن ملامتیت پسندوں کی طرح وہ اس سے مسرور نظر نہیں آتا تھا بلکہ پھر اس کے جذبات گول ہو جاتے تھے۔ ان تین آہنی گولوں کی طرح جن کو میں نے پہلی مرتبہ حسن بلڈنگ کے فلیٹ نمبر ایک میں دیکھا تھا۔"

منٹو کو اپنے معاصروں سے، فن کاروں سے خاص طور پہ اور انسانوں سے عام طور پہ، کتنی محبت تھی۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس نے میرا جی کے مرنے پر یہ لکھا کہ "اچھا ہوا کہ وہ جلدی مر گیا۔ کیونکہ اس کی زندگی کے مرحلے بس اور خراب ہونے کی گنجائش نہیں تھی"۔ بظاہر ان فقروں سے سنگدلی ٹپکتی ہے۔ لیکن ان کے بین السطور پر غور کیجئے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ منٹو کا دل رحم سے جیسے بھر آیا ہے۔ وہ میرا جی کی، انسان کی مزید ذلت برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لئے اس کے مرنے پر "اچھا ہوا" کے کلمات استعمال کرتا ہے۔

آدمیت احترامِ آدمی
باخبر شو از مقامِ آدمی

باری پر منٹو کا مضمون نہایت شگفتہ لیکن نہایت دقیق مشاہدات پر مبنی ہے۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ کہ منٹو باری کو بہت بزدل تصور کرتا تھا۔ اپنے کاروبار کی جو سکیم وہ بناتا تھا۔ اس میں فرار کا چور دروازہ ضرور ہوتا تھا۔ کہ اگر حالات ناخوشگوار ہو جائیں۔ اور محاذ سے پیچھے ہٹنا پڑے۔ تو ایک راہ کھلی رہے۔ باری کو جس طرح منٹو نے دیکھا ہے۔ اس کے کردار کا تشخص ایک جملے میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔

"باری صاحب قبر میں ہیں۔ معلوم نہیں۔ اس میں بھی کوئی ایسی کھڑکی ہے جس سے وہ کود کر باہر نکل سکیں"

باری کے متعلق منٹو کے مضمون میں طنز کا رنگ بہت چوکھا ہے۔ اور بذلہ سنجی کے گل بوٹے بھی جا بجا نظر آتے ہیں۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے۔ گویا منٹو کو باری سے جو محبت تھی۔ وہ اُسے طنزیہ جملوں کے پردے میں چھپانا چاہتا ہے۔ تاکہ پڑھنے والے کہیں یہ نہ کہیں۔ کہ منٹو ایک بزدل کو دوست رکھتا ہے۔ لیکن سارا مضمون پڑھ جائیے۔ دوبارہ پڑھ جائیے۔ تو معلوم ہو گا کہ منٹو نے دوستی کو دشمنی کا سا رنگ دے دیا ہے۔ یہ باری کی یہ عجیب و غریب شکل ہے۔ لوگ مصلحت کو مدِ نظر رکھ کر دشمن کو بھی دوست کہتے ہیں۔ منٹو دوست کے گن بھی حسبِ دلخواہ نہیں گاتا۔ کہ لوگ اس کی اس کمزوری پر مطلع نہ ہو جائیں۔ کہ وہ جذباتی قسم کا آدمی ہے۔ اور دوستوں کے تمام عیب معاف کر دینے پر قادر ہے۔ منٹو کے اپنے بیان کے مطابق باری کی زندگی کے کچھ پہلو ریڈیائی ڈرامے جرنلسٹ میں بیان کئے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں منٹو کا ایک فقرہ اس کی اصل نسبت کی غمازی کرتا ہے "لیکن ٹریجڈی یہ تھی۔ کہ ان صحافیوں سے اس کے خلاف (یعنی ڈرامے) لکھوایا گیا۔ جن کی ناگفتہ بہ حالت کی عکاسی اس میں کی گئی تھی"

اب معلوم ہو گیا۔ کہ منٹو کا جو مضمون باری پر ہے۔ اس میں وہ صرف باری پر ہی نہیں۔ اپنی ذات پر بھی طنز کر رہا ہے۔ کیونکہ خود اُس نے بھی زندگی صحافت سے شروع کی تھی۔ اس مضمون میں درپردہ منٹو نے اس زمانے کو یاد کیا ہے۔ جب اُس نے کارزارِ حیات میں قدم رکھا ہی تھا۔ وہ اعتراف کرتا ہے۔ کہ تصنیف و تالیف کا چسکا پیدا کرنے کا محرک باری مرحوم ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے۔ جب منٹو یہ دریافت کر رہا تھا۔ کہ اس کی فطرت کے ممکنات کیا ہیں۔ اور تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہو جانے کے بعد اُسے یقین ہو گیا تھا۔ کہ وہ کامیاب ہو گا۔ وہ کامیاب ضرور ہوا۔ لیکن لازوال شہرت، بے پناہ مقبولیت، تیز مشاہدہ، اور نکات لکھنے کی قدرت، کوئی چیز بھی آڑے اس معاشی بحران سے نہ بچا سکی۔ جس کے صدمات کو بھلانے کے لئے وہ شراب پیتا تھا۔ باری پر جو مضمون ہے۔ وہ دائرے کی طرح ہے۔ اس میں منٹو جہاں سے چلا ہے۔ وہیں واپس آ جاتا ہے معاشی بے اطمینانی سے معاشی بے اطمینانی تک۔ ان دونوں حدود کے درمیان وقتی ثروت کی کئی منزلیں ہیں۔ لیکن ان سے منٹو نے کبھی فائدہ نہیں اُٹھایا۔ تو باری پر جو مضمون ہے۔ وہ صرف باری کا نہیں۔ منٹو کا اپنا مرثیہ بھی ہے۔ اور کم و بیش ہر صحافی، ادیب اور فنکار کا مرثیہ ہے۔ اس مضمون کا زہرخند غالباً بے نظیر ہے۔ اور منٹو کی کسی اور ذہنی تخلیق میں ایسے تیکھے فقرے نہیں ملیں گے۔ مثلاً:-

"یہ بھی ہو سکتا تھا۔ کہ وہ پرائمری سکول کے استاد سے ترقی کرتے کرتے کسی یونیورسٹی کے ریڈر ہو جاتے"

"جاؤ کوئی اور کام کرو۔ ہیگل اور کارل مارکس تمہاری سمجھ میں نہیں آئیگا۔ غریب باری بھی ابھی تک ان کے فلسفے کو اچھی طرح نہیں سمجھا"

"اقبال کی خودی کا فلسفہ ان کو اس قدر پسند آ گیا تھا۔ کہ اس کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا مگر سردیوں میں معلوم ہوا۔ کہ کام نہیں دے سکتا"

"ان کی طبیعت صلح کل تھی۔ دل کا عارضہ ان کو بہت دیر سے تھا۔ مگر اس کا علاج انہوں نے جب بھی کیا۔ مصالحت آمیز طریقے سے کیا۔ اس کی مدافعت میں ان سے کبھی جارحانہ قدم نہ اٹھا"

"وہ انگریزوں کے سخت مخالف تھے۔ لیکن یہ طرفہ تماشا ہے۔ کہ جب انگریز چلا گیا۔ تو وہ اسی کے ذکر ہو گئے"

منٹو ادب کے معاملے میں بڑی سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ لیکن اس کا مطالعہ بہت وسیع نہیں تھا۔ اس لئے جب وہ نقاد کا بہروپ بھرتا تھا۔ تو بڑی پُرلطف کیفیت پیدا ہوتی تھی۔ اس کی ذہانت اور فطانت بعض اوقات اسے ایسے نکتے سجھاتی تھی۔ کہ ہمیشہ ور نقاد منہ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ اور کبھی وہ ایسے دعوے کرتا تھا۔ جن کا ثبات ممکن ہی نہیں۔ عصمت چغتائی پر جو اس نے مضمون لکھا ہے۔ اس میں اسی قسم کے تضاد کا نہایت پُرلطف مظاہرہ ہے۔ ایک بار عصمت سے زبان کے مسئلے پر جو گفتگو شروع ہوئی۔ تو عصمت نے بھی شاہد کی تائید کی۔ کہ منٹو سے زبان کی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔ اسی سلسلے میں عصمت نے لفظ "دست درازی" استعمال کیا۔ منٹو نے کہا "صحیح لفظ دراز دستی ہے"

"شاہد قصہ ختم کرنے کے لئے دوسرے کمرے سے لغت اٹھا لایا۔ دال کی تختی میں لفظ دست درازی موجود تھی"

اس کا مطلب یہ ہے کہ منٹو ہم سے کہنا چاہتا ہے۔ کہ دست درازی کرنا، کوئی محاورہ ہی نہیں۔ نہ دست درازی کوئی صحیح ترکیب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لغات میں دست درازی مندرج ہے۔ اور اس کے معنی بھی طاقت اور زبردستی وغیرہ بصراحت لکھے ہیں۔ معلوم نہیں۔ شاہد نے کونسی لغت دیکھی۔ یہی ہوا عصمت کے افسانوں پر انتقاد کرتے ہوئے اس نے عزیز احمد صاحب کی تنقید پر جو انتقاد کیا ہے۔ وہ اس کی ژرف نگاہی کا ثبوت ہے۔ لیکن اس کا یہ کہنا کہ عصمت کے عورت ہونے کا اثر اس کے ہر ہر نکتے میں موجود ہے۔ جو اس کے سمجھنے میں ہر ہر قدم پر ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ اس کے ادب کی خوبیوں کو ہم مصنف کی جنس سے علاحدہ نہیں کر سکتے "سراسر زیادتی ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ عورت کے لکھے ہوئے افسانے پڑھ کر فوراً پتہ چل جاتا کہ مصنف عورت ہے اور مرد کے افسانے کا بھی پتہ لگ جاتا ہے۔ کہ مصنف مرد ہے۔ یہ غلط مبحث ہے۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کہ عورت مردوں کی فطرت کی تصویر کشی میں مرد مصنفوں سے کم رتبہ ہے۔ نہ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔ کہ صرف مرد ہی مردوں کے جذبات سے آگاہ ہوتے ہیں۔ فن کار کے جگر میں سارے جہان کا درد ہوتا ہے۔ وہ مشاہدے، مطالعے اور تخیل سے مدد لے کر جنس مقابل کے جذبات کی صحیح تصویر کھینچ سکتا ہے۔ عورت اور مرد کے جذبات زیادہ طور پر یکساں ہوتے ہیں۔ کہ انسانیت دونوں میں مشترک ہے۔ اور انسان نے جو کچھ محسوس کیا ہے۔ اس میں عورت اور مرد کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ ہاں کسی افسانے کے متعلق ہمیں معلوم ہو۔ کہ لکھنے والی عورت ہے۔ تو ہم پر نفسیاتی اثر ضرور ہوگا۔ اور ہم کہیں گے۔ کہ جذبات کی یہ لطافت اور یہ نفاست صرف عورت ہی کے افسانوں میں مل سکتی ہے۔ منٹو بھی اسی غلط فہمی کا شکار ہو کر عصمت کے بعض افسانوں کو عورت کے نازک اور ملائم افسانے کہتا ہے۔ منٹو کی سعی میں یہ افسانے عورت کی ادائیں ہیں۔ صاف شفاف۔ ہر قسم کے تصنع سے پاک۔ میں نے عرض کیا تھا۔ کہ منٹو جب نقاد کا روپ دھارتا ہے۔ تو نرد و کلا کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے۔ عورتوں نے ایسے ایسے غیر نازک اور نا ملائم افسانے لکھے ہیں۔ کہ باید و شاید۔ ادھر مردوں نے بھی ایسی نزاکت خیال دکھائی ہے کہ سبحان اللہ۔ اس سلسلے میں ہیجڑے کے ادب کا ذکر بھی منٹو نے کیا ہے۔ بطرس پر منٹو نے یہ پھبتی چُست کی تھی۔ کہ یہ "ٹھیٹ بطرسی فقرے بازی ہے" اب یہ ہیجڑے کے ادب کا ذکر جو آیا ہے۔ تو کہا جا سکتا ہے۔ کہ یہ خالص منٹو طرازی ہے۔ بدلہ سنجی انتقاد کے سلسلے میں دلیل کی نعم البدل نہیں بن سکتی دعوے اور دلیل میں بھی فرق ہوتا ہے۔ اسی مضمون میں فنی تعمیر کے متعلق بھی ایک آدھ انتقادی فقرہ ہے۔ اس سے بھی درگذر ہی کر لیا جائے۔ تو اچھا ہے۔

عصمت چغتائی کے بعد جن لوگوں سے منٹو ہمارا تعارف کراتا ہے۔ وہ سب فلم کے مصنوعی آسمان کے درخشندہ لیکن رو بہ زوال ستارے ہیں۔ فلم کے متعلق لڑکے لڑکیوں کے دلوں میں جو رومانی تصورات پرورش پاتے رہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو ان مضامین کے مطالعے کے بعد مزید نشوونما پاتے ہیں

حد کچھ چھپا کے الگ طرح جیتے جاتے ہیں۔ قلم کی دنیا خود منٹو کی ذات کی طرح متضاد باتوں کا مجموعہ ہے۔ منٹو نے بڑی چابکدستی سے اس تضاد کو نمایاں کیا ہے۔ بیشتر مضامین کا اسلوب ہمدردانہ ہے۔ ان مضامین میں بھی منٹو کے مد جذباتی نظر آتا ہے۔ اور حسب معمول اپنی جذباتیت کے اظہار میں مصروف۔ جس وقت برصغیر ہند و پاک کی تقسیم عمل میں آئی ہے۔ منٹو بمبئی کے نگار خانوں میں مستحکم ادبی حیثیت اور وجاہت رکھتا تھا۔ ہزاروں روپے ماہوار کماتا تھا۔ اس کے پاکستان[۹] آنے کی کوئی معقول وجہ نہ تھی۔ ہاں ایسا تھا۔ کہ بمبئی ٹاکیز میں بڑے بڑے منصب مسلمانوں کے تصرف میں تھے۔ تقسیم کے بعد بمبئی ٹاکیز کے ارباب اقتدار کو گمنام خطوط موصول ہونے لگے۔ کہ مسلمانوں کو الگ کرو۔ ورنہ سٹوڈیو جلا کر راکھ کر دیں گے۔ منٹو نے دل میں سوچا۔ کہ بمبئی ٹاکیز کے ارباب اقتدار یعنی اشوک کمار اور واچا کو تکلیف میں مبتلا کرنا ٹھیک نہیں۔ اس نے بمبئی ٹاکیز جانا ترک کر دیا۔ پاکستان آنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور خود اس کے لفظوں میں:۔

"میں چپ چاپ باجرکی گلی سے پاکستان چلا آیا"

اس کے بعد:۔

تجھ سے مخفی ہے جو مجھ پہ گذری
تو قریب رگِ جاں رہتا ہے

منٹو نے اپنے آپ کو بہت سنبھالا۔ لیکن فارغ البالی اور آسودگی کے بعد ایکا ایکی معاشی بے اطمینانی میں مبتلا ہو جانے کے نتائج ظاہر ہو کر رہے۔ اور وہ منٹو جو کسی سے نہیں ڈرا تھا۔ جس نے کسی سے شکست نہیں کھائی تھی۔ خود اپنے آپ سے شکست کھا گیا۔ ڈاکٹروں نے اس سے کہا شراب پینی ترک کر دو۔ ورنہ مر جاؤ گے۔ کچھ عرصہ اس نے اس مشورہ پر عمل بھی کیا۔ لیکن:۔

پیران نمی پرند
مریدان نمی پرانند

والا نقشہ ہوا۔ اور آخر شراب نوشی کی کثرت نے منٹو کو بھی ہلاک کر دیا۔ یہ اتفاق دیکھئے گا۔ کہ "گنجے فرشتے" میں تین اور بھی ادیب ایسے ہیں۔ جن کو شراب نے ڈبو دیا۔ یعنی، آغا حشر، اختر شیرانی، اور میراجی۔ آدمی سوچنے پر مجبور ہوتا ہے۔ کہ ہمارے ہاں زندگی کے تلخ حقائق سے فرار کا سوائے شراب کے شاید اور کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔ باری مرحوم دل کے مریض تھے۔ معلوم نہیں۔ شراب کس حد تک ان کی موت کی ذمہ دار ہے۔

میں ذرا بہک گیا ہوں۔ اس کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ میں نے شروع ہی میں عرض کیا تھا۔ کہ "گنجے فرشتے" بارہ آدمیوں کے حالات پر مشتمل نہیں۔ اس میں ایک تیرھویں شخصیت بھی ہے۔ یعنی خود منٹو۔ ایک طرح یہ کتاب منٹو کے خود نوشت سوانح حیات کے چند ٹکڑوں پر مشتمل ہے۔ اور چونکہ منٹو کا ذکر کتاب میں گویا ضمناً آیا ہے۔ اس لئے اس کتاب کے مندرجات منٹو کی شخصیت کو اجاگر کرنے میں مضمون "منٹو" سے کہیں زیادہ معاون ہوتے ہیں۔ جو "سرکنڈوں کے پیچھے" کا آخری جزو ہے۔ کیونکہ اس مضمون یعنی "منٹو" میں مصنف کچھ باتوں کو مخفی رکھنے میں کامیاب ہوا ہے۔ یوں بھی اپنے سوانح حیات لکھنے کی شعوری کوشش میں ریاکاری کو زیادہ دخل ہوتا ہے۔ اور مختلف مضامین میں بغیر سوچے ہوئے مصنف جو کچھ لکھ جاتا ہے۔ اس سے انکشافِ ذات وصفات میں زیادہ مدد ملتی ہے۔

"گنجے فرشتے" کا پہلا مضمون "میرا صاحب" ہے۔ اس میں قائد اعظم کا شوفر اپنی زبان میں ان کی زندگی کے بعض پہلوؤں کا ذکر کرتا ہے۔ یہ شوفر محمد حنیف آزاد ہے۔ اس مضمون میں شروع سے لے کر آخر تک عقیدت و احترام کا بڑا رنگ چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ اور وہ جو میں نے کہا تھا۔ کہ منٹو شدید قسم کا جذباتی انسان تھا۔ اس کا مزید ثبوت ملتا ہے۔

منٹو بمبئی کے نگار خانوں میں کامیابی کے تمام مراحل طے کر چکا تھا۔ ایسی کہانیاں لکھ چکا تھا۔ جو مقبول ہوئیں تھیں۔ مکالمات قلمبند کر چکا تھا۔ سیناریو

ا تھا لیکن تعجب کی بات ہے کہ اس کے ڈرامے اس معیار تک نہیں پہنچے جو اس کے افسانوں نے حاصل کیا۔ پاک ناولٹ میں اس کی فلمی کہانی "۔۔۔" رہی تفصیلات کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ کہانی کا موضوع یہ ہے کہ ایک نواب صاحب ہیں (بڑی سرکار) جنہوں نے جوانی میں وہ سب کچھ کیا جو نوابوں کو کرنا چاہئے۔ یہاں تک کہ اپنے مالی کی بیوی سے بھی عشق فرمالیا تھا۔ ان کے صاحبزادے ہیں (چھوٹی سرکار)۔ وہ باپ کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں بلکہ ٹیلی گرام پر عمر کی اس منزل پر ہیں کہ چھوٹی سرکار کو محبت کے جال میں شکار پھانستے دیکھ کر خوش ہو لیتے ہیں اور بس۔ بڑی سرکار کا مالی ایک لڑکی کا باپ ہے جس کا نام چنبیلی ہے۔ دراصل یہ لڑکی بڑی سرکار کی ہے جو مالن کے گھر پیدا ہوئی تھی۔ مرتے وقت مالن نے خاوند کو حالات کی صحیح صورت سے مطلع کیا تھا اور تمنا کا اظہار کیا تھا کہ حرامی لڑکی کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ لیکن مالی کے دل میں شیطان جاگ اٹھا۔ اس نے بڑی سرکار کی لڑکی کو اپنی لڑکی بنا کر پالا اور جب وہ بڑی ہوئی تو چھوٹی سرکار کو موقع دیا کہ اس بچی سے بھی وہی کھیل دہرائیں جو ان کے باپ نے مالی کی بیوی سے کھیلا تھا۔ یوں مالی نے خوفناک قسم کا انتقام لے کر اپنے دل کی آگ بجھائی۔ اس کہانی کا موضوع ایسا ہیبت ناک تھا کہ اگر منٹو چاہتا تو چھوٹی سرکار، بڑی سرکار، مالی، مالن اور اس کی لڑکی چنبیلی انہی کرداروں کے اردگرد تمام واقعات گھوم جاتے۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ اس تیس صفحے کی فلمی کہانی میں بڑی سرکار کے منشی کا لڑکا گلاب ہیرو ہے اور خانہ بدوشوں کے قبیلے کی ایک لڑکی کتاری ہیروئن ہے۔ جیسا کہ ڈرامے کے نام سے ظاہر ہے۔ یوں بھی واقعات کے اتار چڑھاؤ کے اعتبار سے یہ کھیل میلو ڈرامہ سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن میلو ڈرامہ بھی کمزور سا ہے۔ کتاری اور گلاب کی داستانِ معاشقہ جو چھوٹی اور بڑی سرکار کی ہوس رانیوں کے متوازی چلتی ہے کچھ ایسا زور نہیں۔ آخری سین میں گلاب اور چنبیلی کی تقدیر میں جو مشابہت ہے اس کا ذکر کرکے منٹو نے کتاری کے معاملے کو بھی ڈرامے کا ضروری جزو بنا دیا جا ہے لیکن بات بنی نہیں۔ یوں بھی ڈراموں میں منٹو کی زبان میں وہ صناعانہ اختصار جو ایجاز کی حد تک پہنچا ہوا ہونا چاہئے، موجود نہیں۔ زبان روزمرہ کی ہے۔ یہ کوئی عیب نہیں بلکہ نقص یہ ہے کہ ہر چیز بیان کی جاتی ہے اس پر منٹو زیادہ توجہ صرف نہیں کرتا۔ چھوٹی سرکار اور بڑی سرکار کی کوئی واضح تصویر بھی پڑھنے والے کے ذہن میں نہیں ابھرتی اور کتاری اگرچہ ڈرامے میں برابر متحرک رہتی ہے لیکن اس کے باوصف بے جان سی ہے۔ اس کے مقابلے میں چنبیلی میں جان سی معلوم ہوتی ہے۔ خانہ بدوشوں کے قبیلے کی ایک لڑکی کا معاشقہ اس معاملے میں ثانوی حیثیت رکھتا ہے جو آغا حشر کے ڈراموں میں دوسرا ضمنی پلاٹ رکھتا تھا۔ کتاری کی داستان خارج کر دینے سے اصل ڈرامہ کسی طرح متاثر نہیں ہوتا۔ ڈرامہ جہاں ایک لفظ بھی فالتو نہیں ہوتا وہاں منٹو نے پوری داستان کی داستان فالتو لگا دی ہے۔ یوں بھی اس کھیل میں ان انگریزی فلموں کے مناظر کا اثر صاف دکھائی دیتا ہے جو خانہ بدوشوں کی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ خانہ بدوشوں کا سردار ڈمرو وہ تمام باتیں کرتا ہے جس سے پڑھنے والے کی توجہ اس کے حیرت انگیز کردار کی طرف منعطف ہو جاتی ہے اس کے پاس ایک باجا ہے جس کے تار نہیں۔ گھڑی ہے جس کی سوئیاں نہیں۔ لیکن اس کے باوصف وہ کسی انگریزی فلم کا سیلولائیڈ کا ٹکڑا ہے جسے منٹو نے کسی انگریزی فلم سے نکال کر یہاں چپکا دیا ہے۔

یہی موضوع اگر منٹو اپنے افسانے کے لئے انتخاب کرتا تو آپ دیکھتے کہ کیا صورت پیدا ہوتی۔

منٹو کے ڈرامے (ریڈیائی) میں بھی یہی بات ہے کہ منٹو الفاظ کو بنایت اختصار استعمال نہیں کرتا۔ ان میں سے "کبوتری" خالص میلو ڈرامہ ہے لیکن منٹو نے اس میں کچھ (PROBLEM PLAY) کا سا انداز پیدا کر دیا ہے۔ اس ڈرامے کی ہیروئن دُرگی ہے۔ جس پر ایک لال لال آنکھوں والا بل پوش مرتا ہے۔ دُرگی کی شادی ایک تھانیدار سے ہوتی ہے اور اسے آخری سین میں کوئی گولی سے مار ڈالتا ہے۔ یہ اشارہ ملتا ہے کہ قاتل تھانیدار ہے لیکن کمبل پوش عاشق قتل کا اعتراف کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے منٹو کے خیال میں دُرگی کو دو آدمیوں نے قتل کیا ہے۔ اس کے جسم کو اس کے شوہر تھانیدار نے جسے شبہ ہو گیا تھا اس کی کبوتری کسی کمبل پوش کے من میں بھی بستی ہے۔ اور اس کے وجود معنوی کو کمبل پوش نے جو اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کرتا ہے کمبل بھی علامتی اہمیت کا حامل ہے۔ مراد یہ ہے کہ عشق کے متعلق یہ دریافت کرنا مشکل ہوتا ہے کہ اس کی نوعیت کیا ہے۔ "انتظار" کا دوسرا رُخ "۔۔۔" کو بار پڑھنے کے بعد بھی کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہوا۔ ایک لڑکی بلقیس نے ساڑھے آٹھ بجے کسی سے ملنے کا وعدہ کیا ہے۔ اس کہانی کا مسئلہ کیا چاہتا ہے

لیکن وہ بھائی کی مدد سے بہانہ بنا کر آخر گھر سے نکل جاتی ہے۔ دوسرے منظر میں جس سے ملنے کے لئے نکلتی ہے اس کے متعلق یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ملا کہ وہ ... مسئلہ کیا ہے۔ اس میں بھی (PROBLEM PLAY) کا سا رنگ ہے لیکن (PROBLEM) یا مسئلہ کوئی نہیں۔

اس ڈرامے میں "کیا میں اندر آ سکتا ہوں" نہایت سلجھی ہوئی اور ستھری ذہنی تخلیق ہے اس میں نسیم ایک آزاد خیال اور تعلیم یافتہ نوجوان جو حقیقت میں ... مہذب آدمی کی علامت ہے جو ہر قسم کی نفسیاتی الجھنوں اور بیماریوں سے آزاد ہے مختلف جگہوں سے نکالا جاتا ہے۔ باغ میں بیٹھنا چاہتا ہے تو ...نا کا حق جھٹ آڑے آتا ہے۔ ایک مجلس میں شریک ہونا چاہتا ہے تو دعوت نامے کی عدم موجودگی پریشان کرتی ہے۔ ایک کلب میں ایک لڑکی ...ے باتیں کرنا چاہتا ہے وہ اپنے پتا سے اجازت لینا چاہتی ہے۔ یہ لڑکی آج کل کی وہ پڑھی لکھی شائستہ لڑکی ہے جو اپنے حسن، اپنی شائستگی اور ... تعلیم کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرنا چاہتی ہے۔ تعلیم کے لئے موٹر، حسن کے لئے کوٹھی اور شائستگی کے لئے سماج میں ایک اونچا مقام۔ آخر ... اپنے گھر پہنچتا ہے اور نوکر سے کہتا ہے کہ یہاں تو نہ آسمان میرا ہے نہ زمین نہ ہوا اور پانی۔ آخر وہ ایک طوائف کے ہاں پہنچتا ہے جس کے بالا خانے سے "...سیاں بن ناہیں آوت چین" کے بولوں کی آواز آتی ہے۔ یہ طوائف زندگی سے گریز کی علامت ہے۔ مامن ہے جہاں انسان پناہ لینا چاہتا ہے لیکن خود طوائف اپنے پیا کی منتظر ہے۔ اس سارے کھیل میں مکالمات کا اختصار، کرداروں کا تشخص اور کرداروں کی علامتی اہمیت کی طرف اشارے منٹو کی ...مہارت فن کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوصف، میرا خیال ہے کہ یہی چیز منٹو افسانے کی صورت میں لکھتا تو اس سے یقیناً بہتر لکھتا۔ آخری ڈرامہ ...ہتک منٹو کے اسی نام کے مشہور افسانہ پر مبنی ہے۔ اس ڈرامے کا مرکزی خیال یہ ہے کہ طوائف کے اندر بھی ایک خوددار عورت مخفی ہوتی ہے اور اس کے منہ پر پوڈر کی کتنی تہیں کیوں نہ چڑھ جائیں لیکن نیچے رگوں میں خون حرکت کرتا ہے جو وقت آنے پر کھول بھی سکتا ہے۔ ڈرامے اور افسانے کا مقابلہ ...سے معلوم ہوگا کہ جو نفاست اور جو فنکاری افسانے میں ہے وہ ڈرامے میں نہیں۔

منٹو کے افسانوں پر تبصرہ ایک نہایت مفصل مضمون کا تقاضا کرتا ہے۔ مجھے اس مضمون میں زیادہ تر "گنجے فرشتے" کے مطالب اور ان کی اہمیت سے ...ث کرنا تھی لیکن ظاہر ہے کہ منٹو کا ذکر ہو اور اس کے افسانوں کے متعلق کچھ نہ کہا جائے تو یہ عجیب و غریب بات ہوگی۔

منٹو کے افسانوں کے کردار زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں دلال ہیں، مولوی ہیں، استاد ہیں، پہلوان ہیں، کالج کے لڑکے لڑکیاں ہیں ...یب قریب ہر معاشرتی طبقے کے افراد منٹو کے افسانوں میں ملیں گے لیکن ظاہر ہے کہ جس معاشرت کو منٹو نے بہت قریب سے دیکھا ہے اور جس کے ...گردوپیش، منٹو کے حمام میں سب ننگے ہیں۔ وہ متوسط الحال طبقہ ہے جو غریبوں اور امیروں کے درمیان گھڑی کے پنڈولم کی طرح متحرک رہتا ہے ...طبقے میں سے کچھ اوپر کے طبقے میں چلے جاتے ہیں اور نودولتیے کہلاتے ہیں۔ کچھ نیچے اترتے ہیں اور اس قسم کے ناموں سے پہچانے جاتے ہیں ...، کسان، کلرک وغیرہ۔ منٹو کے افسانوں میں دو خصوصیات ایسی ہیں جو اسے اپنے معاصروں سے بالکل علیحدہ کر دیتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ کبھی ایسی ...افسانے کا موضوع نہیں بناتا جس کے کیف وکم سے وہ بخوبی آگاہ نہ ہو۔ اس کی حیرت انگیز قوت مشاہدہ، اس کے ذہن میں واقعات کا تحفظ اسکی ...ذہنی یہ چیزیں اسی سلسلے میں نظر آتی ہیں۔ اس کی دوسری خصوصیت جس کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے یہ ہے کہ وہ کسی نفسیاتی الجھن کا شکار نہیں۔ ذہنی طور پر غالباً [illegible] کا سب سے زیادہ توانا اور صحت مند ادیب ہے۔ اس لئے ذہنی بیماری، نفسیاتی الجھن کو وہ فوراً پہچانتا ہے۔ یعنی ان چیزوں کو وہ اپنی ذات کی ...نسبت سے پہچانتا ہے۔ اصطلاح میں یوں کہنا چاہئے کہ اس کی ذات ذہنی الجھنوں اور نفسیاتی بیماریوں کے لئے SYSTEM OF REFERENCE ہے۔ یعنی نظام نسبتی۔ (ہم کسی چیز کے متعلق تبھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ متحرک ہے۔ اگر ایک نظام نسبتی ایسا موجود ہو جس میں مسلمہ طور پر چیزیں ساکن ...ہوں۔ ورنہ یہ کہنا ناممکن ہے کہ فلاں چیز ساکن ہے اور وہ متحرک) ذہنی الجھن اور نفسیاتی امراض کا وجود تبھی ثابت ہوتا ہے کہ ایک ...نظام نسبتی ان کے لئے بھی موجود ہو۔ منٹو اپنی ذات میں ایک مکمل نظام نسبتی تھا۔ اس لئے جہاں کہیں وہ نفسیاتی الجھن یا مرض کا ذکر کرتا ہے

نہایت شدت نگاہی سے کرتا ہے جو عوارض اُسے اپنی ذات میں نظر نہیں آتے۔ انھیں وہ ناصحت مند کیفیات تصور کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ وہ دل کے چور بڑی آسانی سے پکڑ لیتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ لکھتے وقت کوئی سماجی یا ثقافتی ممنوعات اس کے راستے میں کھڑی نہیں ہوتیں اُس کے ہاں TABOOS یعنی ممنوعاتِ ذہنی بالکل نہیں ہیں۔ پڑھنے والوں کی جھنجھلاہٹ اور پیچ و تاب کا اصلی راز اسی خصوصیت میں مخفی ہے۔ ان ممنوعات کو جب منٹو راستے سے ہٹاتا ہے تو جو لوگ اس کے سائے تلے یا ان کی دیواروں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے، ان کو اپنی اس دنیا کے ستون لرزتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ چھتیں کانپتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اور وہ دیوار باہر کی طرف گر پڑتی ہیں۔ اس طرح بعض لوگوں کو ننگے ہونے کا بے آسرا ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اور وہ منٹو کو گالیاں دے کر اپنی شکست خوردگی کی خفت مٹاتے ہیں۔ تہذیب و تمدن، معاشرہ، ثقافت، یا سماج، جو چاہے کہہ لیجئے، اُن کے مفروضات، معتقدات، ظنیات اور توہمات کو منٹو از سرِ نو پرکھتا ہے۔ اس طرح زندگی کی اقدار بھی پرکھی جاتی ہیں۔ اور جو لوگ کچھ ظنیات اور ممنوعات کو ہی اقدار سمجھ کر تاریک حجروں میں رہتے تھے۔ ان کو میدان میں کھڑے ہو کر سورج کی روشنی میں اپنی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ یہ بڑا تکلیف دہ عمل ہے۔

یہ دو خصوصیات تو منٹو کی اپنی ہیں۔ کہ ان میں غالباً اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ ایک اور خصوصیت بھی اُس کے افسانوں میں ہے۔ جو پچھلے سات آٹھ سال کے عرصے میں بنیادی ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے افسانوں کے کردار اس طرح گفتگو کرتے ہیں۔ جیسے اصطلاح میں "SPEAKING IN CHARACTER" کہتے ہیں۔ مشرقی ادب میں یہ خصوصیت بلاغت کا ایک جزو ہے۔ اور اس کے معنی ہیں۔ کلام کا مقتضائے حال کے مطابق ہونا۔ منٹو کے افسانوں میں پنجاب کے سکھ واقعی پنجاب کے سکھ ہیں مراد آباد کے ظروف ساز نہیں ہیں۔ منٹو کے افسانوں میں کوچوان واقعی گھوڑا ہانکتے ہیں۔ ریلیس نہیں فرماتے۔ ان کی بات چیت سے گھٹیا بیڑیوں اور جلی ماچسوں کی، گرم قہووں کی، پسینے کی بُو آتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے بھی "صنم خانے" ہوتے ہیں۔ اور وہ بھی معناً یہ شعر پڑھ کر چابک پھٹکارتے ہیں کہ ؎

انیسؔ دم کا بھروسہ نہیں ذرا ٹھہرو
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

منٹو

ابواللیث صدیقی

منٹو بھی عجیب آدمی تھا اور اتنا ہی عجیب افسانہ نگار۔ شروع شروع میں مجھے منٹو کی شخصیت اور اس کے افسانوں دونوں میں سے کسی سے کوئی خاص دلچسپی پیدا نہیں ہوئی، شاید اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ منٹو کے بعض افسانوں میں اس طرح کی گندگی تھی جس کا اظہار کوئی مقصد نہ رکھتا تھا سوائے اس کے کہ منٹو نے اس میں اپنی مریضانہ ذہنیت کا اظہار کیا تھا۔ اور یہ غلاظت محض جنسی قسم کی تھی اور مجھے اس اعتبار سے منٹو اور میراجی ایک دوسرے سے بہت قریب آتے نظر آتے تھے۔ کبھی میں یہ سوچتا کہ میراجی کے پاس جو تین گولے تھے اُن میں سے ایک گولہ تو منٹو تھا، اتنا ہی مبہم اور اتنا ہی دلچسپ۔

تقسیم کے بعد مجھے اکثر منٹو سے ملنے اور اس کے افسانے اسی کی زبانی سننے کا موقعہ ملا، اسی قسم کی ایک صحبت میں منٹو نے ایک افسانہ پڑھا، افسانے میں ایک اُدھیڑ سپاہی کا کردار تھا جو بات بات پر گالی بکتا اور اکثر گالیاں خاص مغلظات تھیں۔ لوگ منٹو پر برس پڑے، یہ بار بار سمجھانے کی کوشش کی کہ گالی منٹو نے نہیں بکی، اس سپاہی نے بکی، یہ جہاں آپ کو ناخوش لگے آپ اس کی توضیح کریں، منٹو نے اسے اپنے افسانے میں پیش کر دیا ہے۔ اس افسانے میں اور کئی باتیں بھی ہیں، آپ اس گالی کے پیچھے پڑ گئے۔ ان باتوں کو سننے اور سمجھنے کے لئے آمادہ نہیں، آپ کا جی چاہے آپ گالی دے لیں لیکن افسانے کو ضرور سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں سمجھتا ہوں منٹو نے ٹھیک کہا تھا، بلاشبہ اس کے بعض افسانوں کے موضوعات ایسے جنسی مسائل ہیں جو ہمارے ادب اور معاشرہ میں ابھی [illegible] ہیں، یہ بھی درست ہے کہ بعض افسانوں میں محض لذت لینے کی خاطر ایسے مسائل کی تشریح، ایسی تشبیہیں، استعارے، اور کنائے [illegible] کا مقصد محض آتشِ شوق کو بھڑکانا اور بھڑکتے شعلوں سے اس آگ کو پھیلانا ہوتا ہے، کہیں وہ جزئیات نگاری میں ایسا [illegible] لگتا ہے جیسے کوئی سرجن ہو، لیکن یہ عمل جراحی کسی اسپتال کے آپریشن تھیٹر میں ہو تو کوئی ہرج نہیں، منٹو اسے شارع عام [illegible] کرتا ہے، کہیں منٹو علاج بالمثل اور کہیں علاج بالضد کا قائل معلوم ہوتا ہے۔ وہ زہر کا علاج زہر سے کرنا چاہتا ہے، لیکن مشکل یہ ہے [illegible] وہ علاج نہ ہر طبیب کے بس کا ہے اور نہ ہر مریض پہ آزمایا جا سکتا ہے، اور منٹو جیسے شرابی کیلئے ان حدود کا لحاظ رکھنا ممکن

تھا، لیکن ان سب باتوں کے علاوہ منٹو کے یہاں کچھ اور بھی ہے اور اس "کچھ اور" نے منٹو کو بحیثیت انسان نہ سہی بحیثیت افسانہ نگار یکسر مرتبہ بخشا ہے۔

اپنے افسانوں کے بارے میں منٹو نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "زمانے کے جس دور سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں اگر آپ اس سے واقف نہیں تو میرے افسانے پڑھیے۔ اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ زمانہ ناقابلِ برداشت ہے، میری تحریر میں کوئی نقص نہیں جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے وہ دراصل موجودہ نظام کا ایک نقص ہے ——" اس بیان میں بھی کچھ صداقت ضرور ہے کیونکہ منٹو کے علاوہ اور ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کی تحریروں کا جائزہ لیجیے تو یہ نقص ان میں بھی کہیں کہیں مل جائے گا، میرا جی کی شاعری کا بڑا حصہ، راشد کی بعض چیزیں، اسلام مچھلی شہری کی بعض نظمیں، عصمت چغتائی کے بعض افسانے اس طرح کے ہیں جو بہت سے لوگوں کے لئے "قابلِ برداشت نہیں"۔ یہ سچ ہے کہ ان میں ایک طرح کی فرسودگی اور مریضانہ ذہنیت پائی جاتی ہے لیکن اس صورتِ حال اور نفسیاتی کیفیات کے پیدا ہونے کی ذمہ داری اس ماحول پر ہے جن میں ان لوگوں کی نشو و نما ہوئی۔ ان کی تہہ میں ایک طرح کی بھوک، ایک تشنگی اور محرومی جھلکتی ہے اور جب ان چیزوں کی تسکین کے فطری ذرائع مسدود ہوتے ہیں یا ان کی راہوں میں روڑے اٹکتے ہیں تو یہ پھر اپنے لئے نئی راہیں تلاش کر لیتی ہیں۔ اور یہ آج ہی نہیں ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔ اردو شاعری میں امرد پرستی، معاملہ بندی یا بقول میر چوما چاٹی اسی ذہنیت کی ترجمان ہے۔ نظیر جیسا شاعر جس کے یہاں فنی شعور کی معراج تک پہنچنے کے امکانات سب سے زیادہ تھے اس کیچڑ میں پھسل پڑتا ہے اور آج تک اس کی سزا پا رہا ہے۔ تو ظاہر ہے آج کے زمانے میں جب "شستہ کلامی، صحت، اور نفاست پسندی" ہمارے ماحول میں آبِ حیات کی طرح ظلمات کے ہزار پردوں میں چھپی ہیں ان لوگوں کو کیسے میسر آ سکتی تھیں۔

ایک بات آپ ضرور کہہ سکتے ہیں وہ یہ کہ اس طرح کے لکھنے والے بیماریوں کی تشہیر کرتے ہیں، غلاظت کے ڈھیروں پر سے خس و خاشاک کے غلاف اتار کر پھینک دیتے ہیں لیکن ان بیماریوں کا علاج نہیں بتلاتے، اس غلاظت کو پیدا ہونے سے روکنے کے لئے کچھ نہیں کر سکتے، یہ خامی ان میں البتہ ہے، یہ مجتہد اور مصلح نہیں ہو سکتے، اس کے لئے ان کے پاس ساز و سامان نہیں۔

لیکن میں منٹو کے افسانوں کے اس پہلو پر زیادہ نہیں لکھ سکتا، کیونکہ اس کے لئے بعض بنیادی طویل بحثیں درکار ہیں، ہم کس چیز کو فحش کہتے ہیں، کیا "فحش" کا تصور کوئی بنیادی تصور ہے یا محض اضافی ہے کہ حالات کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے؟ اور جنس کے ساتھ فحش کا تصور کب اور کیوں وابستہ ہو گیا۔ ایک فطری فعل اور اس میں شریک بعض اعضا کی نمائش اور ان کا ذکر کب اور کیوں ایک گناہ سمجھا جانے لگا، یہ بحثیں ہمیں معاشرتی ارتقا، مذہب اور اخلاق کی تاریخ اور نفسیات کی پرپیچ راہوں پر لا ڈالیں گی جس کا یہاں موقع نہیں، شاید اس سے یہ بھی غلط فہمی پیدا ہو جائے کہ میں منٹو کی فحش نگاری کی معذرت پیش کرنا چاہتا ہوں لیکن اس وقت میرا مقصد یہ نہیں میں منٹو کے افسانوں کو صرف افسانوں کے فنی معیار سے دیکھنا چاہتا ہوں، ان میں ایسے افسانے بھی ہیں جو فحش ہیں اور ایسے بھی جو فحش نہیں ہیں۔ اس بحث میں میرے سامنے منٹو کے تین مجموعے ہیں، 'منٹو کے افسانے'، 'دھواں' اور 'سرکنڈوں کے پیچھے'۔

'منٹو کے افسانے' میں پہلا افسانہ 'نیا قانون' ہے۔ منگو کوچوان جو سیاست داں اور لیڈر نہیں صرف ایک کوچوان ہے انگریزوں سے نفرت کرتا ہے، اس لئے نفرت کرتا ہے کہ وہ ہندوستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں، طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں اور منگو کوچوان کو ستاتے ہیں، شرابی گوروں سے اس کا اکثر جھگڑا ہوتا ہے اور ایک روز منگو کوچوان کو خبر ملتی ہے کہ نیا قانون بننے والا ہے جس سے ہندوستان کو آزادی مل جائے گی، استاد منگو نے لینن اور کارل مارکس کی کتابیں نہیں پڑھی تھیں۔ لیکن وہ 'روس والے بادشاہ'

وہاں کے قانون اور دوسری نئی چیزوں کو بہت پسند کرتا تھا اور اس نے ہندوستان میں ہونے والی تبدیلیوں کو "روس والے بادشاہ کے تخیل سے وابستہ کر دیا، نئے قانون کے نفاذ کا دن آگیا اور استاد منگو کے دل میں نئی امنگوں نے کروٹ لی، اب وہ گوروں سے نہ ڈرے گا، استاد منگو کی ملاقات ایک شرابی گورے سے ہوئی جو پہلے ایک مرتبہ اس سے جھگڑا کر چکا تھا، آج بھی جھگڑا ہوا۔ لیکن نیاقا ہو چکا تھا، گورے کی بید کی پالش کی ہوئی چھڑی استاد منگو کی ران سے چھوئی اور اس کے جواب میں استاد کا گھونسا گورے کے منہ پر جم گیا وہ گورے کو پیٹ رہا تھا، وہ دن گزر گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑاتے تھے، اب نیا قانون ہے نیا قانون۔

"نیا قانون، نیا قانون، کیا بک رہے ہو ——— قانون وہی پرانا ہے"

اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

اس افسانے میں منٹو کا کوئی کمزور پہلو نہیں ابھرتا، یہ ہماری سیاسی جدوجہد کے دور کا آئینہ دار ہے جس میں ہماری آرزوئیں اور امنگیں تمنائیں اور ناکامیاں جھلکتی ہیں۔ اور فنی معیار سے بھی یہ ایک کامیاب افسانہ ہے۔ اچھے مختصر افسانے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں واقعات کا تانا بانا زیادہ نہ بکھرا ہو، بات سے بات نکل کر طوالت نہ پیدا ہو جائے، مرکزی خیال ایک رہے، کردار، واقعات اور مکالمات لمحہ ایک خیال کو اُجاگر کرنے اور تاثر میں شدت پیدا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوں، یہ بات بھی یہاں پوری طرح حاصل ہو گئی ہے۔ کردار صرف ایک ہی ہے، استاد منگو، واقعات اور مکالمات، مناظر اور پس منظر کا محور بھی ایک ہے یعنی نئے قانون کے نفاذ کا انتظار لیکن اس ایک محور پر مشاہدہ اور مطالعہ کی بڑی اچھی مثالیں ملتی ہیں، مثلاً

"اس نے صبح کے سرد دھندلکے میں کئی تنگ اور کھلے بازاروں کا چکر لگایا، مگر اُسے ہر چیز پرانی نظر آئی ——— آسمان کی طرح پرانی، اس کی نگاہیں آج خاص طور پر نیا رنگ دیکھنا چاہتی تھیں مگر سوائے اس کلغی کے جو رنگ برنگ کے پروں سے بنی تھی اور اس کے گھوڑے کے سر پر جمی ہوئی تھی اور سب چیزیں پرانی نظر آتی تھیں، یہ نئی کلغی اس نے نئے قانون کی خوشی میں ۳۱ مارچ کو چودھری خدا بخش سے ساڑھے چودہ آنے میں خریدی تھی ———"

مختصر افسانہ میں جزئیات نگاری کا موقع نہیں ہوتا لیکن چابکدست افسانہ نگار مختصر اشاروں میں بھی جزئیات نگاری کا حق ادا کر دیتا ہے۔ استاد منگو کی ملاقات گورے شرابی سے ہوتی ہے اور وہ تانگہ ٹھہرا کر پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھتا ہے۔

"صاحب بہادر کہاں جانا مانگتا ہے"

اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا، صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھچ گیا، اور پاس کے گال کے اس طرف جو مدھم سی لکیر ناک کے نتھنے سے ٹھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آ رہی تھی، ایک لرزش کے ساتھ گہری ہو گئی گویا کسی نے نوکیلے چاقو سے شیشم کی سانولی لکڑی میں دھاری ڈال دی ہے"

اس طرح کی مثالیں اور افسانوں میں بھی ملتی ہیں:-

"ساڑھیوں کی ریشمیں سرسراہٹ، کلف لگی شلواروں کی کھڑکھڑاہٹ اور چوڑیوں کی کھنکھناہٹ ہوا میں تیرنے لگی، تمتماتے ہوئے مکھڑوں پر بار بار گرتی ہوئی لٹیں، ننھے ننھے سینوں پر زور دے کر نکالی ہوئی بلند آوازیں، اونچی اونچی ایڑی کے بوٹوں پر تھرکتی ہوئی ٹانگیں، لچکتی ہوئی انگلیاں، دھڑکتے ہوئے لہجے، پھڑکتی ہوئی رگیں اور پھر ان الھڑ لڑکیوں کی آپس میں سرگوشیاں......
یہ سب کچھ دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ گلی کے پتھریلے فرش پر حسن و شباب اپنے قلم سے اپنے معانی لکھ رہا ہے"

اسی مجموعے میں ایک اور افسانہ "ہتک" ہے، اس میں بھی اس طرح کی جزئیات نگاری کی مثالیں موجود ہیں اور پھر یہ ایک ہی مجموعے پر

منحصر نہیں۔ سارے مجموعوں میں بکھری پڑی ہیں۔

عام حالات میں اس تکنیک سے افسانہ نگار بڑا فائدہ اٹھا سکتا ہے لیکن منٹو جہاں بعض اعضا اور اعمال و افعال، حرکات و سکنات کے
بیان میں اسے استعمال کرتا ہے وہاں قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ منٹو دراصل صرف مزے لے لیکر اسے لکھ رہا ہے۔ اس کا مقصد لذتیت کے
سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔ دھواں، بلاؤز، کالی شلوار، مصری کی ڈلی، بھابا، خوشیا اور مسز ڈی کوسٹا پڑھنے سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔
منٹو کے افسانوں میں ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے، یہ نفسیاتی مطالعہ ہے۔ ویسے اُردو میں یہ روایت نئی نہیں، مولوی نذیر احمد کے
یہاں کم از کم توبۃ النصوح میں اس کی دو مثالیں نصوح اور کلیم کے کرداروں کی تخلیق میں موجود ہیں اور پھر یہ سلسلہ مرزا رسوا کی امراؤ جان ادا
سے ہوتا ہوا ہمارے زمانے تک پہنچا ہے۔ مختصر افسانے میں یہاں بھی تفصیلات کی گنجائش کم ہوتی ہے لیکن اشاروں اور کنایوں میں کو
کی ذہنی کیفیات اور ان کے ردعمل کا جائزہ لے لیا جاتا ہے۔ منٹو کے کردار طرح طرح کے ہیں اور وہ ان سب کی نفسیات کا مطالعہ کرتا ہے
وہ طبیب نہیں کہ نفسیاتی بیماریوں کا علاج تجویز کرے لیکن اس کی نظر ان بیماریوں پر ضرور رہے۔ اس طرح کی ایک مثال منٹو کے بدنام
افسانے 'دھواں' میں ملتی ہے۔ اس افسانے میں دو باتیں خاص طور پر قابل غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ ماں باپ کے تعلقات کا اثر نوجوان اولاد
پر کس طرح ہوتا ہے۔ منٹو نے یہاں بات اشاروں میں کی ہے جس کا وہ کم عادی ہے لیکن بات صاف ہو گئی ہے:۔

"ادھر اُدھر جتنے کمرے تھے سب کے سب بند تھے، بارش اب رُک گئی تھی۔ مسعود نے ہاکی اور گیند نکالا اور صحن میں کھیلنا
شروع کیا۔ ایک بار جب اس نے زور سے ہٹ لگائی تو گیند صحن کے داہنی ہاتھ والے کمرے کے دروازے پر لگی، اندر سے
مسعود کے باپ کی آواز آئی، کون، جی میں ہوں مسعود، اندر سے آواز آئی کیا کر رہے ہو۔ جی کھیل رہا ہوں۔ کھیلو، پھر تھوڑے
توقف کے بعد اس کے باپ نے کہا تمہاری ماں میرا سر دبا رہی ہے۔ زیادہ شور نہ مچانا"

ماں باپ کا سر دبا رہی ہے۔ وہ خود تھوڑی دیر پہلے اپنی بہن کی کمر دبا چکا تھا، اور دوسرے کمرے میں اس نے ایک اور عجیب منظر دیکھا،
اس کی بہن کلثوم اور اس کی سہیلی بملا..... اس افسانے میں بلاشبہ نفسیات فاسدہ کا مطالعہ ہے، اور پڑھنے والے کو ایک جگہ تو کچھ گھن
سی محسوس ہوتی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایک خاص ماحول کی وجہ سے ہمارے یہاں صحت مند
جنسی تعلیم کا امکان نہیں اور اسی لئے اس طرح کی پیچیدگیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ "بھابا" بھی اسی طرح کا ایک افسانہ ہے اور مصری
میں بھی تحت شعور میں یہی مسئلہ ہے۔

طوائفوں اور عیاش عورتوں کے نفسیاتی مطالعے منٹو کو خاص طور پر بہت مرغوب تھے، منٹو نے جس طرح کی زندگی خاص طور
پونہ، دہلی اور بمبئی میں گزاری تھی اس نے منٹو کو ان طبقوں کے کرداروں کو بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع دیا تھا۔ اس
کی ایک مثال خوشیا میں ملتی ہے۔ خوشیا ایک پیشہ ور دلال ہے، اسے علاقے کی چھوکریوں کا سارا حال معلوم ہے۔ لیکن کانتا جب
اس کے سامنے بالکل ننگی چلی آتی ہے تو وہ گھبرا جاتا ہے کیونکہ اسکی آنکھوں نے کبھی عورت کو یوں اچانک طور پر ننگا نہیں دیکھا تھا۔ یہ
سے قصے کا تانا بانا شروع ہوتا ہے اور خوشیا کا کردار پوری طرح نمایاں ہو جاتا ہے۔
نفسیاتی مطالعوں کے سلسلے میں "نعرہ" بھی ایک دلچسپ افسانہ ہے۔ کیشو لال ایک سیٹھ کے مکان میں کرایہ دار ہے۔ بر
کرایہ ادا کرتا رہتا ہے۔ اور پھر ایک وقت آتا ہے کہ وہ دو مہینے کا کرایہ ادا نہیں کر سکتا اور سیٹھ اسے گالی دیتا ہے۔ اس گالی کا
کیشو لال پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اس کا منٹو نے بڑی خوبی سے تجزیہ کیا ہے اور بلاشبہ یہ افسانہ منٹو کے اس طرح کے ن

فسانوں کے مجموعے پاک اور مثالی افسانہ کہا جا سکتا ہے۔ تفصیل کا موقع نہیں، 'ہتک' اور 'کالی شلوار' بھی اسی طرح کے افسانے ہیں۔

ایک اور عنصر جو منٹو کی تمام تحریروں میں جاری و ساری ہے طنز ہے۔ ایسا بھر پور طنز جس کا وار کبھی خالی نہیں جاتا، جس میں تندی بھی ہوتی ہے اور تلخی بھی۔ اس طنز میں ہی منٹو کبھی کبھی ننگا ہو جاتا ہے لیکن وہ کیا کرے، جن زخموں کو وہ دکھانا چاہتا ہے وہ ہمارے معاشرے کے جسم پر صدیوں سے چلے آ رہے ہیں اور رِس رِس کر ناسور بن چکے ہیں، ہم ان کا علاج کرنے کی بجائے انھیں کپڑوں کی تہوں میں چھپانا چاہتے ہیں، اور اس طرح خود فریبی کا شکار رہیں۔ ہم نے اخلاق اور شرافت کا ایک معیار بنا رکھا ہے، لیکن ہمارا معاشرہ اخلاقی اعتبار سے دیوالیہ ہو چکا ہے۔ اور ہم صرف کپڑوں اور نعروں کے سہارے زندہ رہنا چاہتے ہیں، جنھوں نے منٹو کا افسانہ 'ہتک' پڑھا ہے وہ اس زخم کو دیکھیں جو طوائف کہلاتی ہے۔ اب یہ موضوع نیا نہیں رہا۔ نذیر احمد کی ہریالی سے مرزا رسوا کی امراؤ جان اور قاضی عبدالغفار کی لیلیٰ تک ہم اپنے افسانوی ادب میں اس کے بہت سے روپ دیکھ چکے ہیں۔ نذیر احمد بےچارے مولوی تھے، یہی کیا کم تھا کہ انھوں نے ایک طوائف کو ادب کے مقدس ایوان میں آنے کی اجازت دے دی، یہ اور بات ہے کہ انھیں اپنے اس کردار سے آخر تک مولویانہ کد رہی ہے۔ امراؤ جان ادا بڑی شستہ قسم کی طوائف ہے، اس کی شاعری، شستہ مذاق، سخن فہمی، سخن سنجی، فقرے بازیاں، اس کے ٹھاٹ باٹ سب کچھ لکھنؤ کے تعلقہ داری نظام کا ایک جزو معلوم ہوتے ہیں۔ امراؤ جان ادا آج کی طوائف نہیں، یہی حال قاضی عبدالغفار کی لیلیٰ کا ہے۔ اس میں رومان اور شاعری زیادہ ہے لیکن منٹو کی طوائف کے یہاں رومان اور شاعری کی جگہ زندگی کی وہ تلخ حقیقت ہے جس سے طوائف دوچار ہے اور یہ تلخی منٹو کے افسانے 'ہتک' میں سوگندھی کا کردار بن کر پوری طرح نمایاں ہوتی ہے۔ سوگندھی ایک طوائف ہے لیکن ایک عورت بھی اور اس عورت کو طوائف بننے پر کس نے مجبور کیا؟ وہ عورت جو بہن بن سکتی ہے۔ ماں بن سکتی ہے۔ بیٹی بن سکتی ہے اس روپ میں کیسے آجاتی ہے؟ 'ہتک' پڑھنے والا اسی سوال کو بار بار دہراتا رہتا ہے۔ اور ڈرامہ پڑھتے وقت بھی یہی طنز بار بار ابھرتا ہے۔ 'بانجھ'، 'جانکی'، 'قبرستان'، 'کا قحبہ خانہ' صرف منٹو کے ذہن کی تخلیق نہیں ہمارے آس پاس کہیں موجود ہے لیکن ہمارے دلوں میں چور ہے اس لئے ہم اس سے نظریں بچا کر گزر جاتے ہیں، اسی طرح کے کردار منٹو کے افسانے 'دس روپے' میں بھی موجود ہیں۔

منٹو کی کردار نگاری کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ یہ سارے کردار محض اس کے تخیل کی پیداوار نہیں اس نے اپنے مطالعہ اور مشاہدے سے انھیں اچھے برے افسانوں کی اس بھیڑ میں سے چھانٹ لیا ہے جس میں ہم سب کھو جاتے ہیں۔ افسانہ نگار کا کام محض مطالعہ اور مشاہدہ نہیں، انتخاب بھی ہے اور منٹو انتخاب کے معاملے میں ایک ہوشیار فن کار ہے۔ اس کے کردار ناٹک کی اسٹیج پر کام کرنے والے کرداروں کی طرح اپنے منہ پر نقلی چہرے چڑھائے نظر نہیں آتے، بلکہ وہ تو اپنے جسم پر بے لباس ہی آتا ہے، ہمیں لگتے ہیں کہ ہم ان کے خط و خال، ان کے دلآویز خطوط اور ابھار، یا پھر رِستے ہوئے ناسور اور سڑتے ہوئے زخم بھی دیکھ لیں، ان کی گفتگو بھی ایسی ہی بےتکلف اور برجستہ ہوتی ہے۔ گالی بکنے والا کردار گالی ہی بکتا ہے، موقع بے موقع اقبال کا شعر نہیں پڑھ سکتا، اور معلوم نہیں کیوں منٹو کو اپنے افسانوں میں شعر استعمال کرنے سے ایک طرح کی چڑ سی معلوم ہوتی ہے، شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ منٹو کے کرداروں کی دنیا میں زندگی کے تلخ حقائق شعر و شاعری پر غالب آگئے ہیں۔

ہم نے منٹو کے جن افسانوں اور کرداروں کا ذکر کیا ہے اُن سے منٹو کے افسانوں کے موضوعات کا اندازہ ہو جاتا ہے یہ زیادہ تر آس پاس کی زندگی ہے۔ اس میں دیہات کی رومان پرور فضا کی جگہ وہ بارونق شہر ہیں جہاں منٹو نے زندگی کو گناہوں میں ڈھلتے دیکھا تھا۔ اور اس طوفان میں اس کی حیثیت اس تماشائی کی سی نہیں تھی جو ساحل سے کھڑا طوفانی لہروں کا مشاہدہ کرتا ہو، وہ خود اس طوفان میں گھر چکا تھا طوفانی موجوں اور بپھری ہوئی لہروں کا رُخ موڑنے کی طاقت اس کے کمزور جسم اور نحیف بازوؤں میں نہ تھی اس لئے وہ ان موجوں اور لہروں کے ساتھ بہتا چلا گیا اور بالآخر ایک بہت بڑی طوفانی موج نے اسے ایسے ساحل پر پہنچا دیا جہاں کے طوفانوں کا کسی کو پتہ نہیں۔

منٹو کی حقیقت نگاری

عبادت بریلوی

منٹو اُردو کا سب سے بڑا نہیں، تو بہت بڑا افسانہ نگار ضرور ہے — اُس نے بہت اچھے افسانے بھی لکھے ہیں اور بہت بُرے بھی — اس کے یہاں بلندی اور پستی، روشنی اور تاریکی سب سے بہ یک وقت دوچار رہنا پڑتا ہے — اس کیفیت کو مجموعی طور پر اس کی خامی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ کیونکہ پستی اور بلندی کا یہ تفاوت فکر و فن کو استواری سے محروم کر دیتا ہے — لیکن منٹو کے یہاں اس خامی میں ایک خوبی بھی نظر آتی ہے — اور وہ خوبی یہ ہے کہ منٹو نے زندگی کے بُرے اور بھلے، صاف اور کثیف، ہر پہلو کو دیکھا ہے اور اُن میں سے ہر ایک کی ترجمانی کچھ اس انداز سے کی ہے کہ اُس کے تمام اسرار و رموز کھل جاتے ہیں اور سارے نشیب و فراز آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں — منٹو کی خوبی یہ ہے کہ جو باتیں اس کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہیں، ان میں بھی زندگی کی حقیقت کا کوئی نہ کوئی رُخ اور اس کی اصلیت کا کوئی نہ کوئی پہلو ہوتا ہے — زندگی کے مختلف حقائق تک اس کی نظریں بڑی بےباکی اور دیدہ دلیری کے ساتھ پہنچتی ہیں اور ان کو پوری طرح نمایاں کر دیتی ہیں — منٹو اس اعتبار سے اپنا ثانی نہیں رکھتا — اُس نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے، اس کے رنگا رنگ پہلوؤں کو شدت سے محسوس کیا ہے اور اسی لئے انسانی زندگی اور اس کے مختلف حقائق اپنے تمام تنوعات کے ساتھ اس کے افسانوں میں ملتے ہیں — اسی کو اُس کی حقیقت نگاری کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔

حقیقت نگاری کا ادبی تنقید میں آج جو صحیح مفہوم ہے، وہ پوری طرح تو منٹو کے افسانوں میں نہیں اُبھرتا — کیونکہ زندگی کے بارے میں ایک واضح نقطۂ نظر جس کو موجودہ دَور میں حقیقت نگاری کی بنیاد سمجھا جاتا ہے، وہ منٹو کے افسانوں میں نہیں ہے۔ منٹو نے زندگی کو دیکھا ضرور ہے اس کو سمجھنے کی کوشش ضرور کی ہے لیکن اس سلسلے میں ان معیاروں اور قدروں کو اُس نے اپنے پیشِ نظر نہیں رکھا ہے، جن کے ماتحت نقطۂ نظر اور نظریۂ حیات ذہن نشیں ہوتا ہے — اسی لئے منٹو کے افسانوں میں کوئی مخصوص فکر و فلسفہ نہیں ملتا۔ یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ وہ زندگی کو کس طرف لے جانا چاہتا ہے۔ اس کو کس سانچے میں ڈھالنے اور کس شیشے میں اتارنے کا خواہشمند ہے — اس کو منزل کا علم نہیں ہے۔ وہ تو صرف راستے کا ایک مسافر ہے اور سفر ہی کو اپنی منزل سمجھتا ہے — منزل سے بے نیازی اور صرف راستے پر گامزن رہنے کی خواہش نے منٹو کو اس کے تمام نشیب و فراز سے آگاہ کر دیا ہے۔ اس کے سارے اسرار و رموز اس پر روشن ہو گئے ہیں — چنانچہ اس سفر میں زندگی کے اَن گنت پہلو اُس کے سامنے

گئے ہیں — اس نے ان سب کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے ۔ اور انہیں سے اپنے فن کی محفل سجائی ہے — زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تفصیل و جزئیات موجودہ افسانہ نگاروں میں جیسی منٹو کے یہاں ملتی ہیں، کسی اور کے یہاں اس کی عشر عشیر بھی نظر نہیں آتیں — اس لئے نقطۂ نظر اور نظریۂ حیات نہ ہونے کے باوجود اور معیاروں اور قدروں کے نہ ہونے کے باوصف اس نے زندگی کے حقائق کو اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ اس کے یہاں خود بخود زندگی پیدا ہو گئی ہے — اس زندگی میں جو کچھ بھی ہے، جو کچھ بھی ہو رہا ہے، جو کچھ بھی تھا جو کچھ بھی ہونا چاہیے، منٹو اس تفصیل و جزئیات کو پیش کرنے کا فنکار ہے — یہی اس کی واقعیت ہے — یہی اس کی حقیقت نگاری ہے — یہ جانتے ہوئے بھی کہ حقیقت نگاری کا یہ تصور جدید نظریات سے ہم آہنگ نہیں ہے، جی چاہتا ہے کہ اس کو حقیقت نگاری سے تعبیر کیا جائے — کیونکہ اس میں انسانی زندگی کے ماضی اور حال کے حقائق کی تفصیل و جزئیات موجود ہیں۔ مستقبل کا احساس بھی اس میں ہوتا تو اس کی تکمیل ہو جاتی لیکن منٹو نے ماضی اور حال کی مصوری میں جو کمال دکھایا ہے اور اس سلسلے میں جس طرح مختلف رنگوں کی آمیزش سے ایک پیش کی ہوئی تصویروں میں زندگی کی کلیاں جھری ہیں، وہ مستقبل کے خیال کو نظروں سے اوجھل کر دیتا ہے — لیکن ماضی اور حال کے مختلف پہلوؤں سے زندگی کے بے شمار حقائق سامنے آتے ہیں — منٹو نے ان حقائق کو ایک فوٹو گرافر کی طرح پیش نہیں کیا ہے، بلکہ ایک مصور کی طرح ان کی تصویریں بنائی ہیں اور مرقعے تیار کئے ہیں — اسی لئے حقیقت نگاری کے موجودہ مفہوم سے پوری طرح ہم آہنگ نہ ہونے کے باوجود منٹو کی یہ ترجمانی حقیقت نگاری معلوم ہوتی ہے ۔

یہ ٹھیک ہے کہ منٹو نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کی جو ترجمانی کی ہے، اس کو حقیقت نگاری سے تعبیر کرنا ایک بہت بڑا دعویٰ ہے بعضوں کو اس سے اختلاف ہو سکتا ہے — خصوصاً وہ لوگ اس سے ذرا بھی متفق نہیں ہو سکتے جو بعض اصول اور نظریات کو حقیقت سمجھتے ہیں ۔ ایسے لوگوں کے نزدیک تو منٹو کو زیادہ سے زیادہ ایک واقعیت نگار یا فطرت نگار (NATURALIST) کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے بیشتر افسانے ایسے ہیں جن میں اس نے زندگی کو جس طرح دیکھا ہے بس ہو بہو اسی طرح پیش کر دیا ہے — اپنی طرف سے کوئی خاص بات نہیں کہی ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو منٹو کے افسانوں کے بارے میں یہ خیال پوری طرح صداقت پر مبنی نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا خاص میدان واقعیت نگاری ہے۔ زندگی جس روپ میں بھی اس کے سامنے آئی ہے، اس نے ہو بہو اس کو اسی طرح پیش کر دیا ہے۔ لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ اس کو پیش کرتے ہوئے وہ کھل کر بہت کچھ نہ کہنے کے باوجود کچھ نہ کچھ کہنا چاہتا ہے — انسان اور انسانیت کی آواز جگہ جگہ اس کے یہاں سنائی دیتی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ اس زندگی کے سماجی پہلو کا گہرا شعور نہیں رکھتا — اس لئے اس کے یہاں انسان اور انسانیت کی آواز بڑی حد تک صدائے بازگشت (MERE ECHOES) بن جاتی ہے۔ لیکن اس کا احساس اتنا شدید، اس کی نظر اتنی گہری اور اس کا تخیل اتنا بلند ہے کہ وہ اس محدود دائرے میں رہتے ہوئے بھی زندگی کے سمندر سے حقائق کے موتی نکال ہی لاتا ہے — منٹو کے یہاں اس سلسلے میں بڑی صداقت نظر آتی ہے۔ بڑی ہی جذب و شوق کا احساس ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ ایسا کرتے ہوئے ان حقائق کو بھی سامنے لاتا ہے جو عام طور پر نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ لیکن انسانی زندگی میں جن کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں — منٹو کے یہاں حقیقت نگاری کا کوئی ایک مخصوص تصور نہیں ہے، بہت سے تصورات ہیں۔ کہیں وہ زندگی کے سماجی اور عمرانی پہلوؤں کو حقائق کے روپ میں دیکھتا ہے، کہیں انسانی زندگی سے علم و اقفیت اس کے یہاں حقائق کو روشناس کرتی ہے۔ غرض اس کے یہاں حقائق کے مختلف روپ ہیں — اس نے ان حقائق کو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے — مختلف پہلوؤں سے ان پر نظر ڈالی ہے — لیکن ان سب کی تہہ میں انسانی زندگی سے دلچسپی کا ایک خیال ضرور کارفرما نظر آتا ہے۔ یہی انسانی زندگی منٹو کے فن میں حقیقت و واقعیت کا رنگ بھرتی ہے۔ اور اسی کے سہارے اس کا فن حقیقت نگاری سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

منٹو کے افسانوں کا بنیادی محور عام انسانی زندگی ہے۔ اس کے تمام موضوعات اسی محور کے گرد گھومتے ہیں۔ اس کے تمام خیالات کی بنیاد اسی عام انسانی زندگی پر استوار ہے۔ منٹو اس دائرے سے باہر نکل کر کسی چیز کو نہیں دیکھتا۔ ہر حال میں وہ اسی کو اپنے سامنے رکھتا ہے — انسانیت اس کے

نزدیک ترقی سے عبارت ہے۔ اس لئے وہ ہر انسان کو ترقی پسند دیکھنا چاہتا ہے ــــ اس نے ایک جگہ لکھا ہے "ادب یا تو ادب ہے ورنہ وہ نہیں ہے۔ آدمی یا تو آدمی ہے ورنہ آدمی نہیں ہے، گدھا ہے، مکان ہے، میز ہے، یا کوئی اور چیز ہے۔ کہا جاتا ہے سعادت حسن منٹو ترقی پسند افسانہ ــــ یہ کیا بیہودگی ہے۔ سعادت حسن منٹو انسان ہے اور ہر انسان کو ترقی پسند ہونا چاہئیے۔ ترقی پسند کہہ کر لوگ میری صنعت بیان نہیں کرتے اپنی بینائی کا ثبوت دیتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود ترقی پسند نہیں ہیں یعنی وہ خود ترقی نہیں چاہتے ــــ میں زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کا حامی ہوں" اور ترقی سے اس کی مراد انسان اور انسانیت کی تکمیل ہے ــــ یہ جذبہ اس کے یہاں برابر کارفرما رہتا ہے ــــ البتہ اس جذبے کے اس کے یہاں مختلف روپ ہیں ــــ کہیں انسانیت کا سدھار ہے، کہیں انسانی جذبات کی تہذیب ہے، کہیں انسانی روابط کی اہمیت کا احساس ہے، کہیں انسانی رشتوں کی ضرورت کا خیال ہے ــــ کہیں انسانی زندگی کی کمزوریاں ہیں، کہیں اس کی خامیاں ہیں، کہیں اس کی بے راہروی ہے، کہیں بے عنوانی ہے ــــ کہیں اس کی بے بسی ہے، مجبوری ہے، ــــ غرض انسانی زندگی کے ان گنت روپ منٹو نے اپنے افسانوں میں پیش کئے ہیں ــــ

انسانی زندگی کے ان تمام پہلوؤں کو پیش کرنے میں منٹو کے یہاں جو رنگا رنگی ملتی ہے، وہ بدلتے ہوئے حالات کے شدید احساس کا نتیجہ ہے ــــ منٹو تبدیلی کے عمل کا قائل ہے۔ وہ تغیر کے قانون پر ایمان رکھتا ہے ــــ اس کے خیال میں حالات کی یہی تبدیلی ادب اور فن کو تغیرات سے ہمکنار کرتی ہے ــــ ایک دور کا ادب دوسرے دور کے ادب سے اسی لئے مختلف نظر آتا ہے ــــ اس کے خیال میں "حالات کا اختلاف ہی ادب میں مختلف رنگ پیدا کرتا ہے۔ پہلے فارغ البالی تھی۔ لوگ آرام پسند اور عیش پرست تھے۔ اس زمانے کے ادب میں آپ کو بہت سی دماغی عیاشیاں نظر آ سکتی ہیں۔ وہ عنودگی بھی آپ محسوس کر سکتے ہیں جو اس زمانے کے ادیبوں پر طاری تھی۔ اس زمانے کا شاعر اپنے اصیل مرغ کی جوانمرگی پر نوحہ لکھتا تھا اور بہت بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا تھا۔ آج کا شاعر اپنی جوانمرگی کے نوحے لکھتا ہے جو جنوں اور پریوں سے کہیں زیادہ دلچسپ ہیں۔ اس دور کا ادیب مطمئن انسان تھا۔ آج کا ادیب ایک غیر مطمئن انسان ہے۔ اپنے ماحول، اپنے نظام، اپنی معاشرت، اپنے ادب، حتی کہ اپنے آپ سے بھی غیر مطمئن ہے۔ اس کی اس بے اطمینانی کو لوگوں نے غلط نام دے رکھے ہیں۔ کوئی اسے ترقی پسندی کہتا ہے، کوئی فحش نگاری اور کوئی مزدور پرستی ــــ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان ادیبوں کے اعصاب پر عورت سوار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہبوط آدم سے لے کر اب تک ہر مرد کے اعصاب پر عورت سوار رہی ہے اور کیوں نہ رہے؟ مرد کے اعصاب پر کیا ہاتھی گھوڑوں کو سوار ہونا چاہیئے؟ جب کبوتر کبوتریوں کو دیکھ کر گٹکتے ہیں تو مرد عورت کو دیکھ کر غزل یا افسانہ کیوں نہ لکھیں ــــ عورتیں کبوتریوں سے کہیں زیادہ خوبصورت اور فکر خیز ہیں" ــــ اس لئے اس نے ان عورتوں کے بارے میں بھی افسانے لکھے ہیں۔ اور عورت کی زندگی کے ہر پہلو کو پیش کر دیا ہے ــــ اس سلسلے میں اس کی حقیقت نگاری کا ثبوت یہ ہے کہ بدلتے ہوئے حالات کے زیر اثر وہ عورت سے متعلق محض جذباتی اور رومانی پہلوؤں ہی کی طرف متوجہ نہیں ہوتا ــــ اس سے ماوراء ہو کر اس کی زندگی کے بڑے ہی تلخ پہلوؤں کی طرف بھی توجہ کرتا ہے ــــ چنانچہ عورت اس کے یہاں طوائف کے روپ میں بھی آتی ہے ــــ لیکن یہ طوائف تعیش کا ذریعہ اور وسیلہ نہیں رہتی، ایک بھیانک صورت بھی اختیار کر لیتی ہے۔ کیونکہ منٹو اس کی زندگی کے تلخ اور تاریک پہلوؤں کو بھی بے نقاب کرتا ہے ــــ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ان پہلوؤں پر اس کی نظر زیادہ پڑتی ہے ــــ اور نسبتاً زیادہ گہرائی کے ساتھ پڑتی ہے۔ ــــ منٹو سیدھی سادی باتوں پر اکتفا نہیں کرتا۔ اس کی نظریں دُور تک پہنچتی ہیں۔ اور وہ بڑی ٹیڑھی باتوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس کی جدت پسند طبیعت چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی اہم پہلو تلاش کر لیتی ہے ــــ اس نے خود اس صورت حال کو واضح کیا ہے ــــ کہتا ہے "جب میں ٹرین میں بیٹھا بیٹھا اپنا نیا خریدا ہوا قیمتی پین (قلم) نکالتا ہوں، صرف اس غرض سے کہ لوگ اسے دیکھیں اور مرعوب ہوں تو مجھے اپنا سفلہ پن بہت دلچسپ معلوم ہوتا ہے ــــ میرے پڑوس میں اگر کوئی عورت ہر روز خاوند سے مار کھاتی ہے اور پھر اس کے جوتے صاف کرتی ہے تو میرے دل میں اس کے لئے ذرہ برابر ہمدردی پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن جب

میرے پڑوس میں کوئی عورت اپنے خاوند سے لڑکر اور خودکشی کی دھمکی دے کر سینما چلی جاتی ہے اور میں خاوند کو دو گھنٹے سخت پریشانی کی حالت میں دیکھتا ہوں تو مجھے دونوں سے ایک عجیب و غریب قسم کی ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ کسی لڑکے کو لڑکی سے عشق ہو جائے تو میں اسے زکام کے برابر بھی اہمیت نہیں دیتا۔ مگر وہ لڑکا میری توجہ کو ضرور کھینچے گا جو ظاہر کرے کہ اس پر سینکڑوں لڑکیاں جان دیتی ہیں، لیکن درحقیقت وہ محبت کا اتنا ہی بھوکا ہے، جتنا بنگال کا فاقہ زدہ باشندہ ——— اس بظاہر کامیاب عاشق کی رنگین باتوں میں جو ٹریجڈی سسکیاں بھرتی ہوگی، اس کو میں اپنے دل کے کانوں سے سنوں گا۔ اور دوسروں کو سناؤں گا ——— چکی پیسنے والی عورت جو دن بھر کام کرتی ہے اور رات کو اطمینان سے سو جاتی ہے میرے افسانوں کی ہیروئن نہیں ہو سکتی۔ میری ہیروئن چکلے کی ایک ٹکھیائی رنڈی ہو سکتی ہے جو رات کو جاگتی ہے۔ اور دن کو سوتے میں کبھی کبھی یہ ڈراؤنا خواب دیکھ کر اٹھ بیٹھتی ہے کہ بڑھاپا اس کے دروازے پر دستک دینے آیا ہے ——— اس کے بھاری بھاری پپوٹے جن پر برسوں کی اچٹی ہوئی نیندیں منجمد ہو گئی ہیں، میرے افسانوں کا موضوع بن سکتے ہیں۔ اس کی غلاظت اس کی بیماریاں، اس کا چڑچڑاپن، اس کی گالیاں، یہ سب مجھے بھاتی ہیں ——— میں ان کے متعلق لکھتا ہوں۔ اور گھریلو عورتوں کی شستہ کلامیوں، ان کی صحت اور ان کی نفاست پسندی کو نظر انداز کر جاتا ہوں"۔ ——— گویا انسان کیا ہوتا ہے، حالات اُسے کیا بنا دیتے ہیں، زندگی اس سے کیا کیا کچھ کراتی ہے، اُسے زندگی کو بسر کرنے کے لئے کن کن راہوں سے گزرنا پڑتا ہے، منٹو کے یہاں ان سب کی طرف توجہ زیادہ ملتی ہے۔ اور اس غیر معمولی توجہ کا سبب یہ ہے کہ وہ زندگی کے مذموم پہلو دیکھتا ہے ——— اس کی ناسازگار حالت پر آنسو بہاتا ہے ——— اسی لئے زندگی کے ان پہلوؤں کو پیش کرتے ہوئے اس کے یہاں نشتریت پیدا ہو جاتی ہے ——— اور اس نشتریت میں حالات کو سدھارنے اور ان کو کسی نئے سانچے میں ڈھالنے کا ایک دبا ہوا احساس بھی کام فرما رہتا ہے ——— اور یہی کیفیت اس کے فن کو حقیقت نگاری سے قریب کرتی ہے۔

منٹو زندگی کی تلخیوں اور اس کی خون آشامیوں کا فنکار ہے ——— اس کی لذتوں اور مسرتوں کا احساس اس کے یہاں نہ ہونے کے برابر ہے ——— زندگی کی ناسازگار حالت کے شدید احساس نے منٹو کو ان لذتوں اور مسرتوں کے احساس سے بڑی حد تک محروم کر دیا ہے ——— وہ مسرتوں کو دیکھتا ضرور ہے۔ لذتیں اُسے نظر ضرور آتی ہیں لیکن زندگی کی بے عنوانیوں کا شدید احساس، ان لذتوں اور مسرتوں سے اُسے متعلق نہیں ہونے دیتا ——— اسی لئے اس کے افسانے بعض اوقات ناقابلِ برداشت معلوم ہونے لگتے ہیں ——— لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ جن حالات کی ترجمانی اور جس ماحول کی عکاسی وہ کرتا ہے وہ خود ناقابلِ برداشت ہیں ——— اس نے خود لکھا ہے" زمانے کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اگر آپ اس سے ناواقف ہیں تو میرے افسانے پڑھیے۔ اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ زمانہ ناقابلِ برداشت ہے ——— مجھ میں جو برائیاں ہیں وہ اس عہد کی برائیاں ہیں ——— میری تحریر میں کوئی نقص نہیں۔ جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے، دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے ——— میں ہنگامہ پسند نہیں۔ میں لوگوں کے خیالات و جذبات میں ہیجان پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ میں تہذیب و تمدن کی اور سوسائٹی کی چولی کیا اتاروں گا جو ہے ہی ننگی ——— میں اُسے کپڑے پہنانے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ اس لئے کہ یہ میرا کام نہیں درزیوں کا ہے"۔ ——— منٹو نے سوسائٹی اور تہذیب و تمدن کو ننگا دیکھا ہے ——— اور اسی لئے اُسے ننگا دکھایا بھی ہے ——— اسی لئے لوگ اُسے دیکھ کر بدکتے بھی جاتے ہیں۔ ان میں گھبراہٹ بھی پیدا ہو جاتی ہے ——— لیکن اس حقیقت کا وجود اپنی جگہ باقی رہتا ہے کہ سوسائٹی ننگی ہے، تہذیب و تمدن برہنہ ہے ——— اس کو کپڑے پہنانے کا کام بھی منٹو کو اپنے ذمے لینا چاہیئے تھا۔ اس کام کو درزیوں کے سپرد کر دینا کوئی اچھی بات نہیں ہے ——— بہرحال منٹو اس برہنگی کا فنکار ہے ——— اسی لئے زندگی کے مذمومات پر اس کی نظر بڑی گہری پڑتی ہے ——— وہ اس سلسلے کی تمام حقیقتوں کو معلوم کر لیتا ہے ——— اور اسی کا یہ اثر ہے کہ منٹو کے یہاں رومانیت نام کو بھی نہیں ہے ——— اس نے زندگی کی سنگین اور تلخ حقیقتوں کی نقاب کشائی کو اپنا مزاج بنا لیا ہے۔ شاید جدید افسانہ نگاروں میں وہ واحد فنکار ہے جس کے مزاج میں رومانیت کا اثر نہیں ملتا ——— اس کی وجہ یہ ہے کہ منٹو تخیل پرست

نہیں ہے۔ وہ جو کچھ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا ہے، اُسی کو اپنے فن کا موضوع بناتا ہے ـــ خارجی حالات کو دیکھ کر جو باتیں اس کے ذہن میں ہیں انھیں کی تفصیل و جزئیات کو پیش کرتا ہے ـــ منٹو نے اپنی طرف سے خیالی دنیا میں قائم نہیں کی ہیں ـــ اپنی طرف سے اس نے بہت کم باتیں کہی ہیں ـــ جو کچھ اُس کی آنکھوں نے دیکھا ہے، وہ اُس کے لبوں پہ آگیا ہے اور اس کی تفصیل اس کے قلم سے افسانوں کی شکل میں جگہ پڑ گئی ہے ـــ اسی لئے رومانی پہلو اس کے یہاں ذرا بھی نمایاں نہیں ہوتا ـــ وہ شروع سے آخر تک زندگی کی سنگین اور تلخ حقیقتوں کا اور شکار ہی بنا رہتا ہے۔

یہ صورتِ حال منٹو کی بڑائی پر دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ جس وقت اس نے لکھنا شروع کیا ہے، اس کے آس پاس اور گرد و پیش رومانیت اور رومانیت خاصی مستحکم صورت میں موجود تھی۔ ہر چند کہ اس وقت تک جذباتی رومانیت کی اس تحریک کا خاتمہ ہو چکا تھا جس نے ایک زمانے تک رومانیت کے گیت گائے تھے لیکن اس کے بعد واقعیت کا جو نیا رجحان پیدا ہوا تھا، اس میں بھی رومانیت کا رنگ خاصا گہرا تھا۔ انقلاب کے تصورات تک اس زمانے میں جذباتی اور رومانی تھے ـــ اس میں لکھنے والوں کے رومانی مزاج اور جذباتی افتادِ طبع کو بڑا دخل تھا۔ اس کے نتیجے میں ان کی واقعیت اور حقیقت بھی رومانیت سے ملی جلی معلوم ہوتی تھی۔ افسانے میں اس رومانیت کے اثرات کچھ زیادہ ہی نمایاں تھے ـــ پریم چند نے اس رومانی روایت کے بت کو توڑا تھا لیکن ان کی یہ بت شکنی بتکدوں کا خاتمہ نہ کر سکی تھی۔ اس زمانے میں بھی رومانیت کی یہ روایت روپ بدل بدل کر اپنے آپ کو مختلف افسانہ نگاروں کے یہاں رونما کر رہی تھی۔ کرشن چندر اور عصمت اس زمانے کے چوٹی کے فن کار تھے۔ انھوں نے حقیقت نگاری کی طرف قدم بڑھایا ضرور ہے لیکن چونکہ رومانیت اُن کے ضمیر میں داخل تھی اس لئے ان کا فن بھی اس سے اپنا دامن بچا نہیں سکا ہے ـــ غرض رومانیت کے اثرات اس وقت تک موجود تھے۔ منٹو نے اس رومانیت کے بت کو پوری طرح توڑا۔ اس کے مزاج میں رومانیت نہیں تھی ـــ اس لئے اس کے اثرات اس کے افسانوں میں بھی نظر نہیں آتے ـــ منٹو کا کمال یہ ہے کہ انسانی زندگی کے بڑے ہی نازک جذباتی معاملات کو پیش کرتے ہوئے بھی وہ جذباتی نہیں ہوتا ـــ اس کے یہاں جذبات کی اہمیت کا احساس تو ہے لیکن جذباتیت نہیں ہے ـــ اُسے محض تخیل کے دھارے پر بہنا نہیں آتا۔ اسی لئے اس کے یہاں رومانیت کا اثر نہیں ملتا ـــ وہ اپنی ذات کو شامل کئے بغیر زندگی میں اُس حقیقت کو دیکھتا ہے جو ایک خارجی وجود رکھتی ہے ـــ اسی لئے منٹو کے یہاں حقیقت کا ادراک ہے لیکن اس میں محسوسات کو دخل نہیں ہے ـــ برخلاف اس کے گہرا شعور ہر جگہ کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ حقیقت منٹو کے یہاں ایک خارجی وجود رکھتی ہے اور وہ حقیقتوں کو اسی طرح دیکھتا ہے۔ اسی لئے اس کے فن میں حقیقت نگاری کے خد و خال اس درجہ نمایاں ہیں۔

منٹو کی حقیقت نگاری کچھ تو زندگی کے شدید احساس اور صحیح شعور کا نتیجہ ہے ـــ اور کچھ فرانس اور روس کے بعض حقیقت پسند افسانہ نگاروں کے گہرے اثرات بھی اس میں شامل ہیں۔ منٹو زندگی اور اس کے مختلف شعبوں سے قریب رہا ہے۔ اُس نے ان میں سے ہر ایک میں گہری دلچسپی لی ہے ـــ اُس کی ایک ایک بات کو اس نے شدت سے محسوس کیا ہے۔ ایک ایک پہلو کو سمجھنے کی کوشش کی ہے ـــ اور اس طرح زندگی کی بہت سی حقیقتیں اس پہ بے نقاب ہو گئی ہیں ـــ زندگی سے گہری دلچسپی اور اس کے حقائق سے وابستگی نے منٹو کو بعض اہم حقیقت پسند افسانہ نگاروں کا گرویدہ بنایا ہے ـــ اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی دور میں منٹو نے روس اور فرانس کے افسانہ نگاروں سے گہرے اثرات قبول کئے ہیں کیونکہ وہاں کے افسانہ نگاروں کے یہاں اُسے زندگی اور اس کی حقیقتیں اپنے اصل روپ میں بے نقاب ملی ہیں ـــ چیخوف، ترجنیف، ٹالسٹائی، موپاساں، بالزاک اور فلابیر وغیرہ کے اثرات اس پر بہت گہرے ہیں۔ منٹو نے ان افسانہ نگاروں کو بہت غور سے پڑھا ہے ـــ ایک زمانہ اس پر ایسا گزرا ہے کہ جب اس نے ان افسانہ نگاروں کے بہت اچھے ترجمے بھی کئے ہیں ـــ اس لئے ان کی حقیقت نگاری نے منٹو کو براہ راست متاثر کیا ہے ـــ اور پھر جب آگے چل کر اس نے خود افسانے لکھے ہیں تو ان افسانہ نگاروں کے رنگوں کی جھلک خود اس کے فن میں پیدا

ہے —— لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ منٹو نے ان افسانہ نگاروں کی تقلید کی ہے —— اس کے یہاں اس سلسلے میں تقلید نہیں بلکہ ہے —— اس نے ان سب کو سامنے رکھ کر اپنا ایک مخصوص انداز پیدا کیا ہے —— اس لئے اس کی حقیقت نگاری ترگنیف، چیخوف، آن ماہدو بالزاک سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ ان سب کے یہاں حقیقت کی ترجمانی میں ایک دھیما پن ملتا ہے، منٹو کے یہاں اس کے برخلاف ایک تیزی تندی اور تیکھا پن ہے۔ جس کے اثرات اس کے فن میں ہر جگہ اپنے آپ کو نمایاں کرتے ہیں —— منٹو کی حقیقت نگاری اسی تیزی تندی اور تیکھے پن سے پہچانی جاتی ہے۔

جدید افسانہ نگاروں میں سے ہر ایک نے اپنے فن کے لئے ایک مخصوص میدان تلاش کیا ہے، ایک مخصوص راہ نکالی ہے۔ منٹو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس کے افسانوں کا بھی ایک مخصوص میدان ہے۔ اس نے بھی اپنے فن کے لئے ایک نئی راہ نکالی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ منٹو کا یہ میدان دوسرے افسانہ نگاروں کی طرح محدود نہیں ہے —— موضوعات کے تنوع سے اس نے اس میدان میں وسعت پیدا کی ہے۔ منٹو زندگی کا فنکار ہے۔ اور زندگی تنوع سے عبارت ہے —— اس لئے اس کے افسانوں کے موضوعات میں زندگی ہی کی طرح تنوع نظر آتا ہے —— منٹو نے زندگی کے سماجی معاملات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ عام انسانی مسائل کو سلجھانے کی کوشش بھی کی ہے۔ نفسیاتی حقائق پر روشنی بھی ڈالی ہے —— غرض اس کے یہاں زندگی کے تمام پہلو اپنی ساری رنگا رنگی کے ساتھ بے نقاب نظر آتے ہیں —— منٹو نے ان سب کی تفصیل و جزئیات کو گہرے مشاہدے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اور ان سب کو پیش کرتے ہوئے ہمیشہ اس کا زاویۂ نظر انسانی رہا ہے۔ منٹو کے یہاں اس انسانی زاویۂ نظر کے مختلف روپ ہیں۔ اور اس کے ہر افسانے میں اس کا کوئی نہ کوئی روپ ضرور دکھائی دیتا ہے —— منٹو نے اپنے افسانوں کے مختلف اور متنوع موضوعات کی بنیاد بھی اسی انسانی زاویۂ نظر پر استوار کی ہے —— یہ انسانی زاویۂ نظر منٹو کے یہاں زندگی کے عام حقائق کی ترجمانی اور عکاسی میں ممد و معاون ہوتا ہے۔ اور اس طرح اس کی حقیقت نگاری اس کو اپنے وجود کے لئے ایک سہارا بنا لیتی ہے۔

یہ بات کسی قدر عجیب ضرور ہے کہ منٹو کے فن نے سیاسی انتشار اور معاشی افراتفری کی آغوش میں آنکھ کھولنے کے باوجود، ان معاملات کی طرف کچھ زیادہ توجہ نہیں کی ہے —— وہ سیاسی اور سماجی اقدار کی ناہمواری کا احساس رکھتے ہوئے بھی ان معاملات سے متعلق کوئی بڑی گہری بات نہیں کہہ سکا ہے —— صرف جگہ جگہ چند تاثرات کا اظہار ہے —— ان تاثرات میں کسی قسم کی کوئی گہرائی پیدا نہیں ہوتی۔ البتہ ماحول کی ایک تصویر ضرور سامنے آجاتی ہے۔ حالات کا ایک نقشہ ضرور آنکھوں میں پھر جاتا ہے —— جستہ جستہ تو یہ کیفیت منٹو کے بہت سے افسانوں میں مل جاتی ہے لیکن مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس سلسلے میں اس کے افسانے "نیا قانون" اور "نعرہ" ایک نمایاں حیثیت کے مالک نظر آتے ہیں۔ ان میں گہرا سیاسی اور سماجی شعور تو نہیں ہے لیکن ان کو پڑھنے کے بعد یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ اپنے زمانے کے بعض حالات نے منٹو کو متاثر ضرور کیا ہے —— انھیں تاثرات کا اظہار ان افسانوں میں ملتا ہے —— اور یہ تاثرات محض بعض حالات کی عکاسی تک محدود ہو کر رہ جاتے ہیں —— اس سے زیادہ آگے نہیں بڑھتے۔

'نیا قانون'، یوں دیکھئے تو ایک کوچوان استاد منگو کے بعض خیالات اور چند حرکات و سکنات سے متعلق ایک کہانی ہے، لیکن ان سب کو پیش کرتے ہوئے منٹو نے اس زمانے کی سیاسی حالت کی ایک تصویر بھی بنائی ہے —— اور سیاسی حالت نے جس کشمکش کو پیدا کیا ہے، اس کا نقشہ بھی کھینچا ہے لیکن کوئی ایسی بات نہیں کہی ہے، جس سے اس کشمکش کا کوئی حل بھی نکل سکے —— منٹو کی پرواز اس حد تک نہیں ہے۔ اس کی نظر تو صرف کشمکش میں کھو کر رہ جاتی ہے —— لیکن ویسے اس کیفیت کی ترجمانی اس نے بڑی ہی چابکدستی سے کی ہے۔ دراصل وہ دکھانا یہ چاہتا ہے کہ استاد منگو جس کو سب نہایت عقلمند آدمی سمجھتے ہیں، ایک ہونے والی سیاسی تبدیلی کو سمجھتا نہیں۔ اس کا فریب کھاتا ہے —— یہ نہیں جانتا کہ حقیقت کیا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں اسے جیل خانے کی ہوا کھانی پڑتی ہے۔ استاد منگو کا یہ خیال تھا کہ پہلی اپریل کو جو نیا قانون نافذ ہونے والا ہے، وہ زندگی کے عا

کر ڈالے گا۔ اس لئے وہ خوش تھا کہ نیا قانون اُسے انگریزوں کی غلامی سے نجات دلا دے گا —— کیونکہ اُستاد منگو کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی۔ اور اس نفرت کا سبب وہ یہ بتلایا کرتا تھا کہ وہ اس کے ہندوستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں۔ مگر اُس کے تنفر کا سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اُسے بہت ستایا کرتے تھے۔ وہ اُس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے گویا وہ ایک ذلیل کتا ہے —— وہ اکثر کہا کرتا: قسم ہے بھگوان کی، ان لاٹ صاحبوں کے ناز اُٹھاتے اُٹھاتے تنگ آ گیا ہوں —— جب کبھی اُن کا منحوس چہرہ دیکھتا ہوں، رگوں میں خون کھولنے لگ جاتا ہے —— کوئی نیا قانون وانون بنے تو ان لوگوں سے نجات ملے۔" —— نئے قانون کے ساتھ اُستاد منگو کے دل میں صرف غلامی سے چھٹکارے ہی کا خیال نہیں آیا، یہ بھی امید تھی کہ مارواڑیوں، اور ان کے سود پر بھی اس کا اثر پڑے گا۔ اور اس کے بعد وہ غریبوں کا خون نہیں چوس سکیں گے —— غریبوں کی کٹیا میں گھسے ہوئے کھٹمل —— نیا قانون ان کے لئے کھولتا ہوا پانی ہوگا' —— اور پھر یہ بات بھی اس کے ذہن میں آئی کہ اس کے بعد روس کا بادشاہ بھی کچھ نہ کچھ ضرور کر کے رہے گا' —— اس کے علاوہ جب کبھی وہ کسی سے یہ سنتا کہ فلاں شہر میں اتنے بم ساز پکڑے گئے ہیں یا فلاں جگہ اتنے آدمیوں پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا تو وہ ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیش خیمہ سمجھتا۔ اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا —— نئے قانون کی اہمیت اس کے دل میں اور بھی بڑھ گئی جب اس نے دو گریجویٹ طالب علموں کی زبانی یہ سنا کہ جو بیکار گریجویٹ مارے مارے پھر رہے ہیں، ان میں کچھ ترقی ہوگی —— لیکن پہلی اپریل کو ہوا یہ کہ نیا قانون تو نافذ ہو گیا لیکن زندگی نہ بدل سکی، نظام تبدیل نہ ہو سکا۔ اور اُستاد منگو کو اس حقیقت کا احساس اُس وقت ہوا جب چھاؤنی میں ایک گورے کو پیٹنے کے سلسلے میں اُسے جیل خانے کی ہوا کھانی پڑی —— وہ سمجھتا تھا کہ نئے قانون کے تحت حالات بدل چکے ہیں اس لئے اپنے دل کی بھڑاس نکالی جا سکتی ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ پولیس آئی تو وہ نیا قانون، نیا قانون چلاتا رہا لیکن انھوں نے ایک نہ سنی اور اُس کو حوالات میں بند کر دیا —— اس مختصر سی کہانی میں کئی حقیقتوں کا اظہار ہے۔ ہندوستانی عوام کی انگریز سے نفرت، تبدیلی کی خواہش، آزاد ہونے کا خیال، سرمایہ داروں کی دست درازی، انتظامی نظام کی استواری، تعلیم یافتہ لوگوں کی بیکاری، سب اپنی اپنی جگہ پر حقیقتیں ہیں —— منٹو نے ان کی ترجمانی بڑی خوبی سے کی ہے —— ہرچند کہ ان حقیقتوں کے پیش کرنے میں کوئی بہت واضح سیاسی نقطۂ نظر نہیں ہے لیکن جو حالات ہیں ان کی عکاسی ہی نے اس کو حقیقت نگاری کی سرحدوں میں داخل کر دیا ہے۔

منٹو سیاسی معاملات کے ساتھ ساتھ معاشی اقدار کی ناہمواری کے باعث پیدا ہونے والی اُلجھنوں اور پریشانیوں کو بھی شدت سے محسوس کرتا ہے —— بہت سے افسانوں میں اس کی طرف اشارے ہیں —— لیکن "نعرہ" میں اس نے اس صورت حال کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ "نعرہ" ایک ایسے شخص کی اُلجھنوں اور پریشانیوں کی کہانی ہے جو افلاس کا شکار ہے۔ اور جس کو موجودہ سماجی نظام اقدار میں مفلسی سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوئی راہ نکلتی ہوئی نظر نہیں آتی —— کیشو لال کی مفلسی کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنی کھولی کا کرایہ تک ادا نہیں کر سکتا، اور جب اس کھولی کا مالک اس سے دو مہینے کا بقایا کرایہ طلب کرتا ہے تو اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے۔ وہ گھبرا جاتا ہے، پریشان ہو جاتا ہے، اور زمانے نے مختلف اوقات میں اس کے دل پر جو زخم لگائے ہیں وہ سب کے سب ہرے ہو جاتے ہیں —— کل کے تمام دُکھ درد اس کے لئے آج کی تکلیفیں بن جاتے ہیں اور وہ اپنی زندگی کی باسی روٹیاں پھر انگاروں پر سینکنا شروع کر دیتا ہے —— وہ سوچنے لگتا ہے اور تھوڑے سے وقت میں بہت کچھ سوچتا ہے —— اور اس کی نظریں اپنے گھر کے اندھے لیمپ کو کئی بار بجلی کے اس بلب سے ٹکراتے ہوئے دیکھتی ہیں جو مالک مکان کے گنجے سر پر مسکرا رہا تھا۔ کئی بار اس کے ننگے کپڑے ان کھونٹیوں پر لٹک کر پھر اُس کے میلے بدن پر چمٹ جاتے ہیں جو دیوار میں گڑی جھک رہی تھیں۔ کئی بار اُسے اُن داتا بھگوان کا خیال آتا ہے جو بہت دُور نہ جانے کہاں بیٹھا اپنے بندوں کا خیال رکھتا ہے —— اسی حالت میں مکان دار اُسے گالی دیتا ہے —— اور یہ گالی اس کے دل میں کچھ اور بھی ہنگامہ برپا کر دیتی ہے —— وہ اُسے پی جاتا ہے لیکن اس کے جی میں یہ بات ضرور آتی ہے کہ اس گالی کو جسے وہ بڑی مشکل سے نگل چکا تھا، سیٹھ کے جھریاں پڑے چہرے پر قے کر دے۔ مگر وہ اس خیال سے باز آ گیا کہ اُس کا غرور تو باہر فٹ پاتھ پر پڑا ہے ——

غرض اس کا دماغ اَن گنت خیالات کی آماجگاہ بن جاتا ہے ـــــ وہ یہ سوچنے لگتا ہے کہ وہ غریب ہے ، اسی لئے اُسے گالی دی گئی ہے ۔ اور اسی لئے اُسے یہ گالی سننا پڑی ہے ـــــ اگر اس کا راج ہوتا تو وہ اس سیٹھ کو مزہ چکھا دیتا جو اُسے اوپر تلے دو گالیاں سنا کر اپنے گھر میں یوں آرام سے بیٹھا تھا جیسے اس نے اپنی گدے دار کرسی میں سے دو کھٹمل نکال کر باہر پھینک دیئے ہیں ـــــ سچ مچ اگر اس کا اپنا راج ہوتا تو وہ چوک میں بہت سے لوگوں کو اکٹھا کر کے سیٹھ کو بیچ میں کھڑا کر دیتا اور اس کی گنجی چندیا پر اس زور سے دھپّا مارتا کہ بلبلا اٹھتا ، پھر وہ سب لوگوں سے کہتا کہ ہنسو ، جی بھر کر ہنسو ، اور خود اتنا ہنستا کہ ہنستے ہنستے اس کا پیٹ دُکھنے لگتا ـــــ پر اس وقت اُسے بالکل ہنسی نہیں آتی تھی ـــ کیوں ؟ ـ وہ اپنے راج کے بغیر بھی تو سیٹھ کے گنجے سر پر دھپّا مار سکتا تھا ۔ اُسے کس بات کی رکاوٹ تھی ؟ ـــــ رکاوٹ تھی تو وہ گالیاں سن کر خاموش رہا ـــــ لیکن اس کے سوچنے کے عمل میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو سکی اور اس نے کہیں تڑ تڑ گولیاں چلتی ہوئی دیکھیں ، کہیں اسے آگ کا ایک بڑا الاؤ نظر آیا جو گھومتے شعلوں کی ایک بہت بڑی گیند سی بن گئی جو اس کے آگے آگے زمین پر اُچھلنے کودنے لگی ـــــ وہ سڑک پر چلتا رہا ـــ اور سڑک پر چلتے چلتے اُسے انتقام کا خیال بھی آیا ـــ ۔ انتقام کا خیال آتے ہی اُسے اپنی زبان پر لہو کا نمکین ذائقہ محسوس ہوا اور اس کے بدن میں ایک جھرجھری سی پیدا ہوئی ـــ لہو ـــــ لہو ـــــ اسے آسمان زمین سب لہو میں رنگے ہوئے نظر آنے لگے ـــ لہو ـــ اس وقت اس میں اتنی قوت تھی کہ پتھر کی رگوں میں سے بھی لہو نچوڑ سکتا تھا ـــــ لیکن انتقام اس کے بس میں نہیں تھا ۔ اُس کی اس ذہنی کیفیت نے بہت سے حقائق اس پر روشن کئے ـــ ۔ اپولو بندر اور گیٹ وے آف انڈیا کے سامنے جب اس نے بہت سے موٹریں قطار اندر قطار کھڑی ہوئی دیکھیں تو اس نے یہ سمجھا کہ بہت سے گدھ ، پر جوڑے کسی لاش کے ارد گرد بیٹھے ہیں" ـــــ ان حقائق پر غور کرتا ہوا انتہائی کرب کے عالم میں وہ اب عالیشان ہوٹل تک پہنچا ـــ اور وہاں پہنچ کر بے اختیار اس کے حلق سے ایک نعرہ نکلا ـــــ کان کے پردے پھاڑ دینے والا نعرہ ، پگھلے ہوئے گرم لاوے کی مانند نکلا ـــ ہیبت تیری ـــ ۔ اسے یقین تھا کہ اس نعرے سے ہوٹل کی عمارت زمین پر آجائے گی لیکن ایسا نہ ہو سکا ۔ ایک شخص جس نے اس نعرے کو سنا اپنی بیوی سے کہنے لگا ـــــ "پگلا ہے" ـــــ منٹو نے اس افسانے میں مفلسوں کی زبوں حالی اور اس زبوں حالی کے زیر اثر پیدا ہونے والی ذہنی اور جذباتی کیفیت کی حقیقت سے بڑی بھرپور تصویر بنائی ہے ۔ منٹو اس نظام میں ایک فرد کی بے بسی کو بڑے غور سے دیکھتا ہے ۔ اور اس بے بسی کو پیش کر کے اس نظام کے تضاد کو واضح کرتا ہے ۔ جگہ جگہ اس میں عمل کی طرف اشارے بھی ملتے ہیں ـــ ۔ انقلاب کا خیال بھی کہیں کہیں اپنی جھلک دکھاتا ہے ۔ ایک نئے نظام کی تمنا بھی اپنے آپ کو کہیں کہیں رونما کرتی ہے لیکن ان سب باتوں کی تان ایک احساسِ شکست ہی پر جا کر ٹوٹتی ہے ۔ منٹو اسی حقیقت کو دکھانا چاہتا ہے کیونکہ موجودہ نظام کے ہاتھوں یہی بات ایک حقیقت بن گئی ہے ـــــ اسی لئے منٹو کے یہاں ان معاملات کو پیش کرتے ہوئے کوئی جارحانہ انداز پیدا نہیں ہوتا ـــــ اس کے کردار عمل اور انقلاب کے بارے میں سوچتے ضرور ہیں لیکن کچھ کر نہیں پاتے ـــــ حالات نے انہیں بے بس بنا دیا ہے ـــــ منٹو اسی لئے زندگی کے ان پہلوؤں کا صرف عکاس بن کر رہ جاتا ہے ۔ اس سے آگے نہیں بڑھتا ـــــ لیکن اس کی یہ عکاسی بے مقصد نہیں ہوتی ـــــ اس عکاسی میں قدم قدم پر کچھ کہتا ہوا محسوس ہوتا ہے ۔ زندگی کو سدھارنے کا پیام دیتا ہوا معلوم ہوتا ہے ـــــ اور اسی خصوصیت کا سہارا لے کر حقیقت نگاری اس کے فن میں اپنے آپ کو رونما کرتی ہے ۔

روسی افسانے میں حقیقت نگاری کے جو مختلف روپ ملتے ہیں ان کے اثرات منٹو کے فن پر پڑے گہرے ہیں ـــــ چیخوف اور گورکی سے خاص طور پر وہ متاثر ہوا ہے ۔ گورکی کے یہاں زندگی کے نظامِ اقدار کا جو واضح اور گہرا شعور ملتا ہے ، وہ منٹو کے یہاں نسبتاً کم ہے ۔ اس لئے وہ گورکی کے مقابلے میں چیخوف کی طرف زیادہ مائل معلوم ہوتا ہے ۔ کیونکہ گورکی کے یہاں زندگی کا تجزیہ ہے ، چیخوف کے یہاں اس کی عکاسی ہے منٹو کا ایک افسانہ "شغل" ہے جو میکسم گورکی کی یاد میں لکھا گیا ہے ۔ اس افسانے میں منٹو نے گورکی کے مشہور افسانے TWENTY SIX MEN AND A GIRL

کی تکنیک استعمال کرنے کی شعوری کوشش کی ہے ۔ لیکن اس کے باوجود اس میں گورکی کی حقیقت نگاری کا انداز پیدا نہیں ہوتا —— اس کا موضوع بھی بہت پامال ہے —— کچھ مزدور ہیں جو صبح سے شام تک ایک پہاڑی سڑک پر کام کرتے رہتے ہیں —— روزانہ بارہ گھنٹے کام کرتے رہنا ان کی قسمت میں لکھ دیا گیا ہے ۔ کیونکہ اسی طرح وہ اپنا پیٹ پال سکتے ہیں ۔ ایک دن اس سڑک پر ایک موٹر آئی ۔ اس میں سے ایک نوجوان نکلا —— اور وہ سنتو چمار کی لڑکی رام دئی کو لے کر گم ہو گیا —— بعض مزدور اس واقعے کی تہہ تک پہنچ گئے ۔ بعضوں نے اس سے چشم پوشی کی ۔ وہ پنڈت جس نے رام دئی کو اس نوجوان کے ساتھ موٹر میں بٹھا دیا تھا ۔ اس نے مزدوروں کے اضطراب کو دیکھ کر صرف یہ بات بتائی کہ میں نے ان سے دریافت کیا ہے ، کوئی بات نہیں ۔ وہ لڑکی کو ذرا موٹر کی سیر کرانا چاہتے تھے ۔ انسپکٹر صاحب کے مہمان ہیں اور ڈاک بنگلے میں ٹھہرے ہوئے ہیں —— تھوڑی دور لے جا کر چھوڑ دیں گے —— امیر آدمی ہیں ، ان کے شغل اسی قسم کے ہوتے ہیں —— یہ سن کر یہ کام کرنے والے دیر تک خدا معلوم کن گہرائیوں میں غرق رہے کہ دفعتہً فضل کی آواز نے انھیں چونکا دیا ۔ دو مرتبہ زور سے تھوک کر اس نے اپنے ہاتھوں کو گیلا کیا اور بیلچے کو سنگریزوں کے ڈھیر میں گاڑتے ہوئے کہا ۔ "اگر امیر آدمیوں کے یہی شغل ہیں تو ہم غریبوں کی بہو بیٹیوں کا اللہ بیلی ہے" ——

جیسا کہ اس افسانے سے ظاہر ہے یہ سپاٹ ہے ۔ اس میں ایک سماجی بدحالی کا تذکرہ ضرور ہے لیکن کسی گہرائی کے ساتھ اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی نہیں ڈالی گئی ہے ۔ اسی لئے اس میں وہ تیکھا پن پیدا نہیں ہو سکا ہے جو منٹو کے بعض دوسرے افسانوں میں ملتا ہے —— لیکن بہرحال اس افسانے کے حقیقت ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ کیونکہ ایسی باتیں ایک غلط سماجی نظام میں عجیب نہیں ہیں ۔ منٹو اس افسانے میں اسی حقیقت کو پیش کرنا چاہتا ہے —— اس کے اظہار میں نشتریت نہ سہی لیکن سماجی زندگی کے ایک تاریک پہلو کا اظہار تو ہے —— اسی لئے اس حقیقت کے اظہار میں گورکی سے کہیں زیادہ چیخوف کی آواز سنائی دیتی ہے —— اس میں وہ سادگی اور دھیما پن ہے جو چیخوف کے ساتھ مخصوص ہے —— وہ گہرائی نشتریت اور تیکھا پن نہیں جس سے گورکی کی حقیقت نگاری پہچانی جاتی ہے ۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ منٹو کی سماجی حقیقت نگاری نشتریت اور تیکھے پن سے یکسر خالی ہے ۔ ایسا نہیں ہے —— منٹو کے یہاں اس کا احساس البتہ کم ہوتا ہے لیکن نشتریت اور تیکھا پن اس کی سماجی حقیقت نگاری میں جگہ جگہ اپنا اثر دکھاتے ہیں ۔ اور یہ صورت حال اس وقت اس کے افسانوں میں خاص طور پر پیدا ہوتی ہے جب وہ انسانی زندگی کے حد درجہ تاریک پہلوؤں کی پردہ دری کرتا ہے ۔ جب وہ انسانیت کے جسم پر سڑتے ہوئے زخموں کو بڑی بے رحمی سے کریدتا ہے ۔ اس خیال سے کہ افراد کو ان زخموں کی اصل حالت کا صحیح اندازہ ہو —— اور منٹو کی حقیقت نگاری کے جوہر یہیں کھلتے ہیں —— یہاں وہ اصل حقیقت کو دکھانے کے ساتھ ساتھ بہت کچھ کہتا ہوا بھی معلوم ہوتا ہے —— اس سلسلے میں اس کے سب سے اچھے افسانے وہ ہیں جو اس نے طوائفوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں لکھے ہیں —— اور جن میں اس نے ان حقیقتوں کو واضح کیا ہے کہ طوائف انسانی زندگی کے خوشنما چہرے پر ایک بدنما داغ ہے ۔ وہ ایک ایسا ناسور ہے جو سالہا سال سے رس رہا ہے —— اس ناسور کو دکھاتے ہوئے منٹو نے طوائف کو ایک انسانی مخلوق کی طرح دیکھا ہے ۔ اسی لئے وہ اس کی مسرتوں ، اس کے غموں ، اس کی حسرتوں ، اس کی ناکامیوں اور اس کی مایوسیوں کے تمام پہلوؤں کو بے نقاب کرتا ہے ۔ منٹو کے ایسے افسانوں کو پڑھ کر طوائف سے ہمدردی اور غلط نظام اقدار سے گھن اور نفرت کا احساس ہوتا ہے ۔ اور یہیں سے منٹو کی کامیابی کی حد شروع ہوتی ہے —— اس موضوع پر منٹو نے یوں تو بہت سے افسانے لکھے ہیں لیکن ہتک ، خوشیا ، کالی شلوار اور پہچان اس رجحان کے سب سے اچھے نمونے ہیں —— منٹو نے ان افسانوں میں اپنی مخصوص حقیقت نگاری کو معراج کمال پر پہنچا دیا ہے ۔

ہتک ، سوگندھی کی کہانی ہے —— وہ سوگندھی جو ایک طوائف بھی ہے اور ایک عورت بھی —— بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ طوائف ہوتے ہوئے بھی ایک عورت ہے ۔ جس کو عورت بننے کی تمنا ہے لیکن حالات جس کو طوائف ہی رہنے دیتے ہیں ۔ اور وہ ہمیشہ ایک

طوائف بن رہتی ہے — سوگندھی دس روپے میں اپنا جسم بیچتی تھی جس میں سے ڈھائی روپے اُسے رام لال دلال کو دینے پڑتے تھے — سوگندھی اپنے کام میں بڑی ہوشیار رہتی — اُسے بے شمار گُر یاد تھے — عام طور پر وہ یہ گُر سب کو بتایا کرتی تھی — "اگر آدمی شریف ہو زیادہ باتیں نہ کرنے والا ہو، تو اُس سے خوب شرارتیں کرو، اَن گنت باتیں کرو، اُسے چھیڑو، ستاؤ، اس کے گدگدی کرو۔ اگر داڑھی رکھتا تو اس میں انگلیوں سے کنگھی کرتے کرتے دو چار بال بھی نوچ لو، پیٹ بڑا ہو تو تھپتھپاؤ — اس کو اتنی مہلت ہی نہ دو کہ اپنی مرضی کے مطابق کچھ کرنے پائے — وہ خوش خوش چلا جائے گا اور تم بھی بچی رہوگی — ایسے مرد جو چُپ چُپ رہتے ہوں بڑے خطرناک ہوتے ہیں — ہڈی پسلی توڑ دیتے ہیں اگر ان کا داؤ چل جائے" — غرض اس میں طوائف کی تمام خصوصیات موجود تھیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ ایک جذباتی عورت بھی تھی۔ اُسے بے شمار گُر مردوں کے ٹھیک کرنے کے لئے یاد تھے۔ اس بات کا بار بار تہیہ کرنے پر بھی کہ وہ ان مردوں کی کوئی ایسی ویسی بات نہیں مانے گی اور ان کے ساتھ بڑے روکھے پن کے ساتھ پیش آئے گی، ہمیشہ اپنے جذبات کے دھارے میں بہہ جایا کرتی تھی اور فقط ایک پیاسی عورت باقی رہ جایا کرتی تھی۔ ہر روز اس کا پرانا یا نیا ملاقاتی اُس سے کہا کرتا تھا۔ "سوگندھی میں تجھ سے پریم کرتا ہوں" — اور سوگندھی یہ جان بوجھ کر کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے بس موم ہو جاتی تھی اور ایسا محسوس کرتی تھی جیسے سچ مچ اُس سے پریم کیا جا رہا ہے — پریم کتنا سندر بول ہے۔ وہ چاہتی تھی اس کو پگھلا کر اپنے سارے انگ پر مل لے، اُس کی مالش کرے تاکہ یہ سارے کا سارا اُس کے مساموں میں رچ جائے — یا پھر وہ خود اس کے اندر چلی جائے — اس نے چار مردوں سے اس پریم کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا — اور ان کی تصویریں اپنے سامنے لٹکا لی تھیں۔ لیکن یہ مرد اُس کے نہ ہو سکے۔ انھوں نے سوگندھی کو ایک طوائف ہی سمجھا — ایک زمانے میں مادھو کی باتوں نے اس پر بڑا اثر کیا تھا — مادھو پونا میں حوالدار تھا — اور اس حوالدار کی میٹھی باتیں سُن سُن کر وہ چند لمحات کے لئے خود کو حوالدارنی سمجھنے لگی تھی — مادھو ہر ہفتے پونا سے آتا اور میٹھی میٹھی باتیں کرکے اُسے خوب سہانے سپنے دکھایا کرتا — لیکن کبھی بھی وہ سوگندھی کے کام نہ آیا — اس نے کچھ نہ کچھ لے ہی لیا تھا — اور وہ دے دیتی تھی — ایک دن مادھو نے سوگندھی سے پچاس روپے طلب کئے۔ اس بہانے سے کہ اس پر کوئی کیس ہو گیا ہے اور یہ رقم اُسے داروغہ کو دینی ہے — سوگندھی کا کاروبار جاری تھا لیکن اب اس کی گرم بازاری نہیں تھی — چند روز ہوئے ایک سیٹھ بڑی مشکل سے اُس کے پاس آیا تھا اور ٹارچ کی روشنی میں اس کے چہرے کو دیکھ کر اُسے ناپسند کرکے رخصت ہو گیا تھا۔ گویا اس نے سوگندھی کی ہتک کی تھی — سوگندھی پر اس واقعے کا گہرا اثر تھا — چنانچہ جب مادھو نے پچاس روپے کا سوال کیا تو اسے کچھ اس بات کا احساس ہوا کہ مادھو اُسے بیوقوف بنا رہا ہے — چنانچہ اُس نے اسے خوب آڑے ہاتھوں لیا — کھری کھری سُنائیں۔ اور اس کے خارش زدہ کُتے نے مادھو کو کمرے سے باہر نکال دیا — اور جب مادھو چلا گیا تو سوگندھی نے اپنے خارش زدہ کُتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اُسے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔"

منٹو نے اس کہانی میں طوائفوں کے ماحول کی جو ہو بہو تصویر کھینچی ہے، اور اُس کی نفسیات کا زندگی سے جو بھرپور نقشہ بنایا ہے، اس میں قدم قدم پر حقیقتوں کے پیکر ابھرتے ہیں — طوائف بہرحال ایک عورت ہوتی ہے لیکن طوائف کو عورت ہونے کے باوصف ایک طوائف ہونا پڑتا ہے — حالات اُسے ایسا کرنے کے لئے مجبور کرتے ہیں — اس سے بڑی حقیقت اور کیا ہو سکتی ہے؟ — اس کہانی میں سوگندھی کی زندگی، اس کے جذبات و احساسات، رام لال دلال سے اس کے روابط، اپنی ہم پیشہ عورتوں سے اس کی ہمدردی، سیٹھ کے ہاتھوں ہونے والی اس کی ہتک، ایک چھوڑ چار مردوں کے بارے میں اس کی غلط فہمی، لیکن اصل حقیقت کو معلوم کرنے کے بعد مادھو سے اس کی سخت کلامی، ان تمام باتوں میں حقیقت کی جھلکیاں موجود ہیں — منٹو نے اس میں اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں کیا ہے — صرف حالات، فضا اور ماحول کے بعض ایسے پہلوؤں کو اُجاگر کر دیا ہے جن سے اس زندگی کی بعض بڑی ہی اہم حقیقتیں ذہن نشین ہوتی ہیں — منٹو نے اپنی حقیقت نگاری

کا بھلا بڑی حد تک انھیں حقیقتوں سے تیار کیا ہے۔

خوشیا کا موضوع ہتک سے ذرا مختلف ہے لیکن ماحول یہی ہے، اور منٹو نے اس افسانے میں بھی زندگی کے بعض ایسے پہلوؤں کی ترجمانی کی ہے جو حقیقت پر مبنی ہیں ـــــ کانتا اور خوشیا ایک ہی پیشے میں شریک تھے۔ کانتا پیشہ کرتی تھی اور خوشیا اس کا دلال تھا ـــــ ایک دن خوشیا کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے کانتا کی کھولی میں داخل ہو کر اُسے بالکل برہنہ دیکھا۔ وہ اس پر گھبرایا لیکن کانتا نے اس بات کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ اور یہ کہہ کر اس کی حیرت کو دُور کرنے کی کوشش کی "جب تم نے کہا خوشیا ہے تو میں نے سوچا کیا ہرج ہے اپنا خوشیا ہی تو ہے آنے دو......" ـــــ اس بات نے خوشیا کی حیرت کو تو کسی حد تک دُور کر دیا لیکن اس فقرے میں اس نے بہت سے مطلب کر چننے شروع کر دیئے۔ لیکن وہ کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ مگر اس کو ایک اُلجھن سی رہی۔ دس برس کی دلالی کے عرصے میں ایسے واقعے سے کبھی بھی دوچار نہیں ہوا تھا ـــــ اس لئے اس ننگی عورت کو دیکھ کر اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ خود ننگا ہو گیا ہے۔ اس کے جذبات میں ہیجانی کیفیت طاری ہو گئی ـــــ اور کانتا کے جسم کے خطوط نے اس کے دل میں اس خیال کو بیدار کیا کہ کانتا دس روپے میں مہنگی نہیں ہے ـــــ انھیں خیالات میں وہ گھر پہنچا اور اپنے آپ کو خوب سجایا بنایا، نئی دھوتی پہنی، بالوں میں کنگھی کی، داڑھی منڈوائی ـــــ اور پھر ایک ٹیکسی لی ـــــ ٹیکسی لے کر وہ ایک اور دلال کے ساتھ کانتا کے گھر پہنچا ـــــ دلال معاملہ طے کر کے کانتا کو ٹیکسی میں لے آیا ـــــ اور جب وہ ٹیکسی میں داخل ہوئی تو سامنے خوشیا کو دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی اور اس نے کہا "خوشیا تم" ـــــ خوشیا نے جواب دیا "ہاں میں ـــــ لیکن تمھیں روپے مل گئے ہیں نا؟" ـــــ خوشیا کی موٹی آواز بلند ہوئی۔ "دیکھو ڈرائیور ـــــ جوہو لے چلو"

ـــــ اس واقعہ کے بعد خوشیا پھر اس بازار میں نظر نہ آیا ـــــ اس افسانے میں منٹو نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ مرد بھی ہر حال میں مرد ہوتا ہے ـــــ دلال تک اس سے مستثنیٰ نہیں ہوتے۔ خوشیا کے کردار میں اس نے ایک ایسے مرد کو دکھایا ہے جس کے جذبات دس سال کی دلالی کے بعد بھی سرد نہیں ہوئے ہیں۔ اور جو ایک زمانے تک کانتا کی دلالی کرنے کے بعد خود اس کی نسائیت کا شکار ہو جاتا ہے ـــــ زندگی کی اس بنیادی حقیقت سے کس کو انکار کی جرأت ہو سکتی ہے؟

منٹو کی ایک اور کہانی "پھاہا" بھی طوائفوں سے متعلق ہے لیکن اس میں ایسی طوائفوں کا ذکر ہے جو بازار میں نہیں اپنے گھروں میں پیشہ کرتی ہیں۔ منٹو نے ان پیشہ ور عورتوں کی زندگی کی ساری زبوں حالی اور ان کے سارے کرب کو اس افسانے میں مجسم کر دیا ہے ـــــ چار دوست شراب سے سرشار ہو کر یوں تو تفریح کی غرض سے عورت کی تلاش میں نکلتے ہیں لیکن چار جگہ جانے کے بعد بھی انہیں تفریح کی جگہ تنغص حاصل ہوتا ہے۔ سب سے پہلے تانگے والا انہیں "میموں" کے یہاں لے جاتا ہے ـــــ ایک ایسی جگہ جہاں کمرے میں گھپ اندھیرا تھا ـــــ اور جہاں انھیں دو کالی بھجنگ انتہائی بدصورت عورتیں نظر آئیں۔ اور جن کو دیکھ کر ان دوستوں میں سے ایک نے کہا "کیا لذیذ ٹافیاں ہیں" ـــــ یہ بات سن کر میموں میں سے ایک جس کا سیاہ چہرہ سُرخی لگانے کے باعث زیادہ پکی ہوئی اینٹ کی سی رنگت اختیار کر گیا تھا، ہنسی ـــــ یہ لوگ بھی ہنس دیئے ـــــ اور ان دوستوں میں سے ایک نے پوچھا ـــــ "کیا نام ہے آپ کا؟"

بولی ـــــ "لوسی"

دوسرے دوست نے آگے بڑھ کر پوچھا ـــــ "آپ کا؟"

اُس نے جواب دیا "میری"

تیسرا بھی آگے بڑھ آیا ـــــ "کیوں صاحب آپ کیا کام کرتی ہیں؟"

دونوں لجا گئیں ـــــ ایک نے ادا سے کہا ـــــ "کیسا بات کرتا ہے تم؟"

دوسری نے کہا ــــ "چلو جلدی کرو ـــ رہنا مانگتا ہے یا نہیں۔ ہمیں روٹی پکانا ہے"
اور ان لوگوں نے اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھا تو وہ گیلے آٹے سے بھرے ہوئے تھے اور وہ اس کی مروڑیاں بنا رہی تھی ـــ تانگے والا
قطعی طور پر غلط سمجھ کر انھیں یہاں لے آیا تھا۔ مروڑیاں اُس عورت کے ہاتھوں سے کچے فرش پر گر رہی تھیں اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ آٹا رو رہا ہے اور یہ مروڑیاں اُس کے آنسو ہیں ـــ" اس منظر سے تنگ آ کر وہ لوگ وہاں سے چل دیئے۔ اور اس کے بعد تانگے والا انھیں ایک پنجابن کلرا کے یہاں لے گیا جو بڑی ہی خوفناک عورت تھی ـــ وہاں سے یہ لوگ اُلٹے پاؤں واپس ہوئے ـــ اور پھر انھیں تانگے والا ایک میلے کچیلے گھر میں لے گیا جہاں ایک بڑھیا چولہا جھونک رہی تھی ـــ یہ لوگ اس مکان میں اندر جا کر بیٹھ گئے اور وہاں انھیں ایک لڑکی نظر آئی۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔ بدن کی ساخت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بڑی تیزی سے چلی ہوئی گاڑی ہے جو اب ایک دم رک گئی ہے۔ اس کے پہیوں میں بریک لگ گئے ہیں اور وہ ہیں کھڑے کھڑے اُس کا سارا رنگ روغن دھوپ اور بارش میں اُڑ گیا ہے۔ اس عمر میں بھدی سے بھدی لڑکی کے جسم میں جو ایک قسم کی شورہ جاذبیت ہوتی ہے، اُس میں بالکل نہیں تھی ـــ کپڑوں کے باوجود وہ ننگی دکھائی دیتی تھی ـــ بہت ہی بھونڈے اور ناواجب طریقہ پر ننگی ـــ اس کے جسم کا نچلا حصہ قطعی طور پر غیر نسوانی تھا ـــ یہاں سے بھی یہ لوگ جان چھڑا کے بھاگے ـــ تانگے والے نے بھی کہا "بابو جی آپ کو پہچان نہیں" ـــ اور یہ کہہ کر اس نے کرائے کے روپے جیب میں ڈالے اور ـــ "سالا" ان کے نطفے میں کانا ہوا چلا گیا ـــ اس افسانے میں زندگی کے متضاد پہلوؤں کو دکھا کر منٹو نے حقیقت کو واضح کیا ہے ـــ ایک طرف تفریح اور عیاشی کا خیال اور اس کی جستجو و تلاش ہے لیکن اس کا حصول بے معنی ہے کیونکہ جس ماحول میں اس کو تلاش کیا جا رہا ہے، اس میں ایک کرب کی سی کیفیت ہے ـــ جہاں بھی یہ لوگ پہنچتے ہیں وہاں منٹو کی نظر پر گندگی اور تاریکی کو دیکھتی ہیں، لالٹینوں کی اندھی روشنی میں بڑی مشکل سے انھیں راستہ ملتا ہے ـــ ساتھ ہی ہر جگہ آٹا گوندھا ہوا اور روٹی پکتی ہوئی نظر آتی ہے ـــ کہ اسی کے لئے یہ سارا کاروبار چلتا ہے ـــ منٹو اسی حقیقت کو دکھانا چاہتا ہے ـــ اور اسی لئے کالی بلبسائی عورت کے ہاتھوں سے آٹے کی جو مروڑیاں کچے فرش پر گرتی ہیں، ان کو دیکھ کر اُسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آٹا رو رہا ہے اور یہ مروڑیاں اُس کے آنسو ہیں:

اسی طرح کالی شلوار میں بھی اس نے زندگی کے انھیں پہلوؤں میں سے ایک اہم پہلو کی تصویر کشی کی ہے ـــ "کالی شلوار" سوگندھی اور کانتا ہی کی طرح ایک طوائف سلطانہ کی کہانی ہے۔ سلطانہ پہلے انبالے میں پیشہ کرتی تھی۔ وہاں اس کے دلال خدا بخش نے چند گوروں کو مستقل گاہک بنا لیا تھا لیکن پھر نہ جانے خدا بخش کے دل میں کیا سمائی کہ اُس نے سلطانہ سمیت دلی منتقل ہونے کا ارادہ کر لیا ـــ سلطانہ تیار ہو گئی اور وہ دونوں دلی آ گئے۔ لیکن دلی میں ان کا کاروبار نہ چلا ـــ سلطانہ کی چوڑیاں تک بک گئیں۔ پیٹ بھی تو آخر کسی حیلے سے بھرنا تھا۔ محرم کا مہینہ آیا تو سلطانہ کو ایک کالی شلوار بنانے کی فکر ہوئی۔ کیونکہ اس کی پڑوسنوں میں انوری اور مختار نے بھی محرم کے موقع پر کالے کپڑے بنانے کا اہتمام کیا تھا ـــ خدا بخش اس سلسلے میں کوئی مدد نہ کر سکا ـــ ایک شخص شنکر نامی ایک دن سلطانہ کے یہاں آیا۔ اس کو دیکھ کر سلطانہ کی باچھیں کھل گئیں لیکن وہ اچھا گاہک ثابت نہ ہوا ـــ دوسری دفعہ جب وہ آیا تو سلطانہ نے اس سے کالی شلوار لانے کی فرمائش کر دی۔ شنکر نے کہا کہ وہ کوشش کرے گا۔ اور چلتے وقت سلطانہ کے بندے مانگے جو اس نے اُتار کر دے دیئے ـــ محرم کی پہلی تاریخ کو شنکر آیا اور ایک اخبار میں لپٹی ہوئی اس کے پاس کالی شلوار تھی ـــ شنکر نے کہا "یہ ساٹن کی شلوار ہے۔ دیکھ لینا شاید لمبی ہو" اور یہ کہہ کر وہ چلا گیا ـــ سلطانہ نے اخبار کھول کر دیکھا تو اُسے ساٹن کی شلوار نظر آئی۔ ایسی ہی شلوار جو اس نے انوری کے پاس دیکھی تھی ـــ محرم کے موقع پر سلطانہ نے یہ شلوار پہنی ہی تھی کہ دستک ہوئی اور انوری داخل ہوئی ـــ اور اس نے کہا کہ "شلوار تو بالکل نئی معلوم ہوتی ہے" ـــ اس پر سلطانہ نے جواب دیا۔ "آج ہی درزی لایا ہے" ـــ یہ کہتے ہوئے اس کی نظر انوری کے کانوں پر پڑی۔ "یہ بندے تم نے کہاں سے لئے" انوری نے جواب دیا "آج ہی منگوائے

—— دونوں کو تھوڑی دیر خاموش رہنا پڑا —— اس کہانی میں بھی منٹو نے طوائف کی زندگی کی زبوں حالی کو پیش کیا ہے۔ اس کی کس مپرسی اور زبوں حالی کی پوری تصویر اس کہانی سے آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے —— اس کی ہر بات اور ہر پہلو میں زندگی کی سنگین اور ٹھوس حقیقتوں کا احساس ہوتا ہے۔

منٹو نے اس موضوعات پر اور بھی افسانے لکھے ہیں لیکن حقیقت نگاری کا جو کمال ان چار افسانوں میں ملتا ہے وہ کسی اور میں نظر نہیں آتا۔ ان افسانوں میں طوائف کے ذکر کے ساتھ کسی قسم کی لذت، کسی طرح کی جنسی تسکین یا جسمانی آسودگی کا خیال نہیں پیدا ہوتا —— اسی لئے طوائف منٹو کے یہاں دلچسپی کا سامان باقی نہیں رہتی۔ برخلاف اس کے انسانیت کے جسم پر ایک ناسور کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ منٹو طوائف کو اسی زاویۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ اسی لئے اس کے یہاں طوائف کی زندگی سے متعلق تاریک پہلو نسبتاً زیادہ نظر آتے ہیں۔ منٹو ان پہلوؤں کی وضاحت بہت تفصیل سے کرتا ہے۔ یہ تفصیل ایک طرف تو گھن کا احساس پیدا کرتی ہے اور دوسری طرف انسانی ہمدردی کا خیال بیدار ہوتا ہے —— گھن تو اس ماحول سے پیدا ہوتی ہے جس میں گندگی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، اور ہمدردی کے خیال کو وہ حسرتیں اور مایوسیاں بیدار کرتی ہیں، جن کا اس ماحول کے افراد کو قدم قدم پر سامنا کرنا پڑتا ہے —— منٹو کی حقیقت بیں نگاہیں یہ دیکھتی ہیں کہ طوائف پیٹ کی خاطر انسانیت کی سطح سے نیچے گرنے کے باوجود اپنا پیٹ نہیں پال سکتی۔ اس کی زندگی معاشی بدحالی میں گزرتی ہے —— اس کو ساری زندگی جذباتی اعتبار سے ناآسودگی کے عالم میں رہنا پڑتا ہے —— "ہتک" کی سوگندھی، "خوشیا" کی کانتا، اور "کالی شلوار" کی سلطانہ سب معاشی اعتبار سے بدحال اور جذباتی اعتبار سے ناآسودہ ہیں۔ منٹو نے ان طوائفوں کی نفسیات کے ہر پہلو کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے، اور جس ماحول میں یہ زندگی بسر کرتی ہیں۔ اس ماحول کی زندگی کی بڑی بھرپور تصویریں کھینچی ہیں —— منٹو جب ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے تو گویا ایک غلط سماجی نظام اقتدار کے خلاف احتجاج کرتا ہے، جس نے صدیوں سے طوائف کو باقی رکھا ہے —— وہ اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتا لیکن جن حالات کی تصویر کشی کرتا ہے، ان سے یہ حقیقت ضرور واضح ہوتی ہے کہ منٹو اس غلط سماجی نظام کا جانی دشمن ہے —— وہ اس نظام اقتدار کو نئے سانچے میں ڈھالنے کا کوئی واضح لائحہ عمل پیش نہیں کرتا لیکن اس کے خلاف نفرت کے جذبات کو ضرور ابھار دیتا ہے۔ لیکن یہ نفرت محض نفرت نہیں رہتی۔ کیونکہ اس کی حدیں انسانی ہمدردی سے ملی ہوتی ہیں —— طوائف کے [illegible] اور اس کے معاملات و مسائل کو پیش کرتے ہوئے انسانی ہمدردی کا عنصر منٹو کے یہاں ہر جگہ کام کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے —— اور انسانی ہمدردی کی یہی خصوصیت اس کی حقیقت نگاری میں جان ڈال دیتی ہے۔

یہ بات بظاہر تو عجیب ہے کہ منٹو نے جذباتی رومانی موضوعات پر افسانے نہیں لکھے ہیں لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو یہ بات اتنی عجیب معلوم نہیں ہوتی۔ منٹو فطرتاً جذباتی اور رومانی نہیں ہے —— اس کے یہاں جب کبھی یہ پہلو نمایاں بھی ہوتے ہیں تو ان میں سے بھی کوئی نہ کوئی حقیقت ابھرتی ہے۔ زندگی کا کوئی نہ کوئی اہم رمز سامنے آتا ہے —— اس لئے اس کی جذباتیت اور رومانیت اپنے آپ کو کہیں رونما نہیں کرتی —— اس پہ اگر کبھی اس کا دورہ پڑتا بھی ہے تو اس کی صورت یہ ہوتی ہے —— "میں نے ازراہِ مذاق اس سے محبت کا ذکر کیا تھا۔ دراصل اس وقت فضا ایسی دلفریب تھی کہ اگر کسی عورت پر عاشق ہو جاتا تو مجھے افسوس نہ ہوتا۔ جب دونوں وقت آپس میں مل رہے ہوں۔ نیم تاریکی میں بجلی کے قمقمے اندر قطار آنکھیں جھپکنا شروع کر دیں، ہوا میں خنکی پیدا ہو جائے اور فضا پر ایک افسانوی کیفیت سی چھا جائے تو کسی اجنبی عورت کے پاس ہونے کی ضرورت محسوس ہوا کرتی ہے —— ایک ایسی ضرورت جس کا احساس تحت شعور ہی میں چھپا رہتا ہے" —— اور یہ ایک حقیقت ہے —— کیف آور دلآویز فضا میں عورت کی ضرورت کا احساس انسانی زندگی کی بہت بڑی حقیقت ہے —— منٹو اس سلسلے میں کسی رومانی فضا کو پیدا نہیں ہونے دیتا۔ موسم اور فضا میں تھوڑی سی رومانیت کا رنگ وہ ضرور دے دیتا ہے لیکن اس کی تان زندگی کی ایک بڑی ہی اہم حقیقت پر جا کر ٹوٹتی ہے —— یوں بعض افسانے جذباتی رومانی موضوعات پر منٹو کے یہاں مل ضرور جاتے ہیں لیکن ان افسانوں کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے ——

خود منٹو نے ان افسانوں کو اہمیت نہیں دی ہے۔ اور اسی لئے انہیں دماغی عیاشی کی پیداوار بتایا ہے ــــ ایک جگہ اس نے لکھا ہے "مجھے اپنے سب افسانے یاد نہیں اور خاص طور پر وہ تو بالکل یاد نہیں جو رومانی ہیں ــــ میں اپنی زندگی میں بہت کم عورتوں سے ملا ہوں ــــ وہ افسانے جو میں نے عورتوں کے متعلق لکھے ہیں یا تو کسی خاص ضرورت کے ماتحت لکھے گئے ہیں یا محض دماغی عیاشی کے لئے ــــ میرے ایسے افسانوں میں چونکہ خلوص نہیں ہے، اسی لئے میں نے کبھی ان کے متعلق غور نہیں کیا ــــ ایک خاص طبقے کی عورتیں میری نظر سے گزری ہیں اور ان کے متعلق میں نے چند افسانے لکھے ہیں، مگر وہ رومان نہیں ہیں" ــــ وہ کسی نہ کسی حقیقت کے گرد گھومتے ہیں ــــ منٹو کی طبیعت کا رجحان ہی رومان کی طرف نہیں ہے ــ یہاں تک کہ جب محبت کا تذکرہ ہو تب بھی وہ اپنے گرد رومانیت کا حصار نہیں کھینچتا۔ اس کی نگاہیں یہاں بھی حقیقت پر گڑی رہتی ہیں ــــ محبت کے ساتھ اسے یہ خیال آتا ہے کہ "محبت کی یوں تو بہت سی قسمیں ہمارے باپ دادا بیان کر گئے ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ محبت خواہ مدینے میں پیدا ہو یا سائبیریا کے یخ بستہ میدانوں میں، سردیوں میں پیدا ہو یا گرمیوں میں، امیر کے دل میں پیدا ہو یا غریب کے دل میں ــــ محبت خوبصورت کریں یا بدصورت، بدکردار کرے یا نیکوکار، محبت محبت ہی رہتی ہے۔ اس میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ جس طرح بچے پیدا ہونے کی صورت ہمیشہ ایک سی چلی آرہی ہے، اسی طرح محبت کی پیدائش بھی ایک ہی طریقے پر ہوتی ہے۔ یہ جدا بات ہے کہ سعیدہ بیگم ہسپتال میں بچہ جنے اور راج کماری جنگل میں ــ غلام محمد کے دل میں بھنگن محبت پیدا کرے اور نٹورلال کے دل میں کوئی رانی۔ جس طرح بعض بچے وقت سے پہلے پیدا ہوتے ہیں اور کمزور رہتے ہیں۔ اسی طرح وہ محبت بھی کمزور رہتی ہے جو وقت سے پہلے جنم لے۔ بعض دفعہ بچے بڑی تکلیف سے پیدا ہوتے ہیں، بعض دفعہ محبت بھی بڑی تکلیف دے کر پیدا ہوتی ہے جس طرح عورتوں کا حمل گر جاتا ہے اسی طرح محبت بھی گر جاتی ہے۔ بعض دفعہ بانجھ پن پیدا ہو جاتا ہے ــــ ادھر بھی آپ کو ایسے آدمی نظر آئیں گے جو محبت کرنے کے معاملے میں بانجھ ہیں ــــ اس کا یہ مطلب نہیں کہ محبت کرنے کی خواہش ان کے دل سے ہمیشہ کے لئے مٹ جاتی ہے، یا ان کے اندر وہ جذبہ ہی نہیں رہتا، نہیں، یہ خواہش ان کے دلوں میں موجود رہتی ہے مگر وہ اس قابل نہیں رہتے کہ محبت کر سکیں۔ جس طرح عورت اپنے جسمانی نقائص کے باعث بچے پیدا کرنے کے قابل نہیں رہتی، اسی طرح یہ لوگ چند روحانی نقائص کی وجہ سے کسی کے دل میں محبت پیدا کرنے کی قوت نہیں رکھتے ــــ محبت کا اسقاط بھی ہو سکتا ہے" ــــ جو شخص محبت کا ذکر ایسے غیر شاعرانہ انداز میں کرے اس کے یہاں رومان بھلا کس طرح پیدا ہو سکتا ہے؟ ــــ منٹو کے یہاں محبت بھی حقیقت پسندانہ انداز میں سامنے آتی ہے ــــ اسی لئے اگر کہیں رومان پیدا بھی ہوتا ہے تو حقیقت پسندی کی اس فضا میں اس کا دم گھٹنے لگتا ہے ــــ اور دیکھتے دیکھتے اس کی ہستی دم توڑ دیتی ہے۔

ویسے منٹو نے بعض افسانے محبت اور عشق کے موضوع پر لکھے ضرور ہیں لیکن وہ رومانیت اور خصوصاً جذباتی رومانیت سے محروم ہیں۔ ان میں شروع سے آخر تک حقیقت و واقعیت کی ایک فضا ملتی ہے ــــ بانجھ، اگرچہ محبت سے متعلق ایک کہانی ہے لیکن کسی ایک جگہ بھی اس کہانی میں رومانی ماحول پیدا نہیں ہوتا ــــ کہانی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ خاصی دیر تک اس بات کا علم ہی نہیں ہوتا کہ اس کا موضوع محبت ہے ــــ نعیم ایک لاابالی زخم خوردہ انسان کی طرح سامنے آتا ہے ــ کئی ملاقاتوں کے بعد وہ ایک دن کھلتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ اس نے اپنے ایک دولت مند مالک کی لڑکی، زہرہ سے محبت کی ہے ــــ وہ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو کر لکھنؤ سے باہر چلے جاتے ہیں اور اطمینان سے رہنے لگتے ہیں لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ زہرہ مر جاتی ہے، اور نعیم اس دنیا میں تنہا رہ جاتا ہے ــــ نعیم بیان کرنے کو تو یہ داستان بیان کر دیتا ہے لیکن آخر میں اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ یہ حقیقت افسانہ ہی رہے ــــ چنانچہ وہ خط میں یہ عبارت لکھتا ہے "آپ کو یاد ہوگا میں نے آپ کے مکان پر اپنی داستانِ عشق سنائی تھی ــــ وہ محض افسانہ تھا، ایک جھوٹا افسانہ ــــ نہ کوئی زہرہ ہے نہ کوئی نعیم ــــ میں ویسے موجود ضرور ہوں مگر وہ نعیم نہیں ہوں جس نے زہرہ سے محبت کی تھی" ــــ کہانی میں اگرچہ موٹر ڈرائیور اپنے مالک کی لڑکی سے

عشق کرتا ہے لیکن اس کے باوجود کہانی میں کہیں رومان پیدا نہیں ہوتا۔ زہرہ اور نعیم دونوں حقیقت پسند ہیں ——— وہ جو کچھ کہتے ہیں۔ سوچ سمجھ کر کہتے ہیں ——— زندگی ان کا ساتھ نہیں دیتی ——— اور بہت تھوڑے عرصے میں ان کی ساری آرزوؤں کا خون ہو جاتا ہے ——— اور یہ حقیقت رہ جاتی ہے کہ انسان بے بس ہے ——— خدا کے علاوہ ایک اور طاقت بھی ہے جو بڑی حاسد ہے، جو کسی کو خوش دیکھنا نہیں چاہتی ——— منٹو نے اس کہانی میں کسی بہت بڑے موضوع کو نہیں اپنایا ہے ——— صرف ایک کردار کی ذہنی کیفیت کی تصویر کشی کی ہے اور اس طرح زندگی کی بعض اہم اور بنیادی حقیقتوں کو بے نقاب کیا ہے ——— اس لئے اس کا موضوع رومانیت سے قریب ہوتے ہوئے بھی رومانیت سے کوسوں دور ہے ——— غرض منٹو نے محبت اور عشق کے موضوعات پر جو گنتی کی چند کہانیاں لکھی ہیں ان میں سطحیت اور سستا پن نہیں ہے ——— وہ کسی بڑے اہم بنیادی خیال کے گرد گھومتی ہیں ——— کیونکہ منٹو زندگی کے جذباتی اور رومانی پہلوؤں سے کہیں زیادہ ان بے شمار حقیقتوں پر نظر رکھتا ہے جو مرتے دم تک انسان کے دم کے ساتھ رہتی ہیں۔

منٹو انسانی نفسیات کا گہرا نباض ہے۔ اس کی ہر کہانی گویا نفسیاتی شعور حقیقت سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ اس شعور کے سہارے رومانی موضوعات تک اس کے یہاں حقیقت کا روپ اختیار کر لیتے ہیں ——— زندگی کے ہر پہلو کی ترجمانی میں اس نے کسی نہ کسی اہم نفسیاتی حقیقت کو بے نقاب کیا ہے ——— بعض افسانے تو اس نے ایسے لکھے ہیں جن کی بنیاد کسی نہ کسی نفسیاتی حقیقت پر استوار ہے لیکن جو افسانے نفسیاتی حقائق کو بنیاد بنا کر نہیں لکھے گئے ہیں ان میں بھی قدم قدم پر نفسیاتی حقائق کی ترجمانی نظر آتی ہے ——— زندگی کے معاملات اور کرداروں کی حرکات و سکنات کو پیش کرتے ہوئے یہ نفسیاتی شعور اپنے شباب پر دکھائی دیتا ہے ——— "شوشو" میں ایک نوجوان لڑکی سے اچانک مڈبھیڑ کا تجربہ ہوتا ہے: "میں نے پھر نیلی ساڑھی کی طرف غور سے دیکھا اور ایسا کرتے ہوئے میری نگاہیں ایکا ایکی اس لڑکی کی نگاہوں سے ٹکرائیں۔ کچھ اس طور پر کہ اس کو دھکا سا لگا۔ وہ سنبھلی اور فوراً ہی منہ سے لال جیب نکال کر میرا منہ چڑایا۔ اپنی سہیلی سے کان میں کچھ کہا ——— اس سہیلی نے ... سے میری طرف دیکھا۔ میرے ماتھے پر پسینہ آگیا" ——— خوشیا جس کی آنکھوں نے کبھی کسی عورت کو یوں اچانک طور پر برہنہ نہیں دیکھا تھا ... جب اچانک کانتا ننگی ہو کر اس کے سامنے آجاتی ہے تو وہ سٹ پٹا سا جاتا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا ہے۔ اس کی نظریں جو ایک دم عریانی سے ... ہو گئی تھیں۔ اپنے آپ کو کہیں چھپانا چاہتی تھیں ——— اس نے جلدی جلدی صرف اتنا کہا جاؤ ——— جاؤ، تم نہا لو ——— پھر ایک دم اس کی زبان کھل گئی۔ پر جب تم ننگی تھیں تو دروازہ کھولنے کی کیا ضرورت تھی ——— اندر سے کہہ دیا ہوتا، میں پھر آجاتا ——— لیکن جاؤ ——— تم نہا لو ——— کانتا مسکرائی "جب تم نے کہا خوشیا ہے تو میں نے سوچا کیا ہرج ہے اپنا خوشیا ہی تو ہے آنے دو" ——— پھر خوشیا یہ سوچنے لگتا ہے وہ دل میں کہتا ہے ——— "یعنی یہ ایمان نہیں ہے تو کیا ہے ——— یعنی ایک چھوکری ننگ دھڑنگ تمہارے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے اور کہتی ہے کہ اس میں ہرج ہی کیا ہے ——— تم خوشیا ہی تو ہو ——— خوشیا نہ ہوا سالا وہ بلا ہو گیا جو اس کے بستر پر ہر وقت اونگھتا رہتا ہے" ——— یہ بات خوشیا پر ایک خوشی کی کیفیت طاری کر دیتی ہے۔ چنانچہ ایک رات وہ دلال سے ایک گاہک بن جاتا ہے ——— اور کانتا اس کے پہلو میں ہوتی ہے ——— ایک مرد کی نفسیات کی تصویر کشی یہاں حقیقت سے کتنی بھرپور کھینچی گئی ہے ——— اسی طرح "نعرہ" میں کیشو لال جب سیٹھ سے گالیاں سنتا ہے تو اسے بہت برا لگتا ہے لیکن پھر اس کے دل میں اس طرح کے خیالات بھی آنے لگتے ہیں ——— "اماں ہٹاؤ، یہ سب کہنے کی باتیں ہیں ... تم نے تو سیٹھ سے یوں گالیاں سنیں جیسے میٹھی میٹھی بولیاں تھیں ——— میٹھی میٹھی بولیاں تھیں۔ بڑے مزے دار گھونٹ تھے، چلو یوں ہی سہی ——— اب تو میرا پیچھا چھوڑ دو، ورنہ سچ کہتا ہوں، دیوانہ ہو جاؤں گا ——— یہ لوگ جو بڑے آرام سے ادھر ادھر چل پھر رہے ہیں۔ میں ان میں سے ہر ایک کا سر پھوڑ دوں گا۔ بھگوان کی قسم اب مجھے زیادہ تاب نہیں رہی۔ میں ضرور دیوانے کتے کی طرح سب کو کاٹنا شروع کر دوں گا ——— لوگ مجھے پاگل خانے میں بند کر دیں گے اور میں دیواروں کے ساتھ اپنا سر ٹکرا کر مرجاؤں گا ——— مرجاؤں گا، سچ کہتا ہوں، مرجاؤں گا" ——— یہ

جو نفسیات شکست کو آنکھوں کے سامنے لا کر کھڑا کر دیتے ہیں ——— "بو" "ہتک" کی سوگندھی کو دیکھئے۔ اس پر جو کیفیات طاری ہوتی ہیں وہ حقیقت سے کتنی قریب ہیں ——— "سوگندھی دماغ دار عورت تھی لیکن جونہی کوئی نرم و نازک بات، کوئی کول بول، اس سے کہتا تو جھٹ پگھل کر وہ اپنے جسم کے دوسرے حصوں میں پھیل جاتی۔ گو مرد اور عورت کے جسمانی ملاپ کو اس کا دماغ بالکل فضول سمجھتا تھا مگر اس کے جسم کے باقی اعضاء سب کے سب اس کے بُری طرح قائل تھے۔ وہ تھکن چاہتے تھے ——— ایسی تھکن جو انہیں جھنجھوڑ کر ——— انہیں مار کر سُلانے پر مجبور کر دے ——— ایسی نیند جو تھک کر چور چور ہو جانے کے بعد آئے، کتنی مزیدار ہوتی ہے ——— وہ بے ہوشی جو مار کھا کر بند بند ڈھیلے ہو جانے پر طاری ہوتی ہے کتنا آنند دیتی ہے؟ ——— سوگندھی ایک طوائف ہے لیکن وہ عورت بھی ہے چنانچہ جب بھی وہ کسی شخص سے محبت کا سندیسہ سنتی ہے تو موم ہو جاتی ہے ——— یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ سب فریب ہے، جھوٹ ہے، مکاری ہے ——— "ہر روز رات کو اس کا بیاہا یا نیا ملاقاتی اس سے کہا کرتا تھا "سوگندھی میں تجھ سے پریم کرتا ہوں" ——— اور سوگندھی یہ جان بوجھ کر کہ وہ جھوٹ بولتا ہے، بس موم ہو جاتی تھی ——— اور ایسا محسوس کرتی تھی جیسے سچ مچ اس سے پریم کیا جا رہا ہے ——— پریم، کتنا سندر بول ہے ——— وہ چاہتی تھی اس کو پگھلا کر اپنے سارے انگ پر مل لے، اس کی مالش کرے تاکہ یہ سارے کا سارا اس کے مساموں میں رچ جائے ——— یا پھر وہ خود اس کے اندر چلی جائے سمٹ سمٹا کر اس کے اندر داخل ہو اور اوپر سے ڈھکنا بند کر دے" ——— غرض اس طرح انسانی نفسیات کے اَن گنت حقائق منٹو نے اپنے افسانوں میں پیش کئے ہیں ——— منٹو کا کمال یہ ہے کہ وہ ان حقیقتوں کو نئے زاویوں سے دیکھتا ہے ——— اس کی نگاہیں اس سلسلے میں اس جگہ جا پہنچتی ہیں جہاں عام افرا کی نظروں کا پہنچنا آسان نہیں ہوتا ——— منٹو انسانی نفسیات کو انسانی زاویۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ اس لئے اس میں حقیقت کے بے شمار پہلو رونما ہوتے ہیں ——— اس کی دور بین نگاہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی انسانی زندگی کی بڑی اہم حقیقتیں بنا دیتی ہے ——— اس کے افسانوں کے یہ پہلو اس کی حقیقت نگاری کو سہارا دیتے ہیں ———

یہ نفسیاتی شعور یوں تو منٹو کے ہر افسانے میں ملتا ہے لیکن بعض افسانے اس نے ایسے بھی لکھے ہیں جن کا بنیادی موضوع ہی کوئی نہ کوئی نفسیاتی حقیقت ہے ——— ان میں سے بیشتر انسانی زندگی کے جنسی پہلوؤں سے متعلق ہیں ——— لیکن ان جنسی پہلوؤں کو پیش کرتے ہوئے منٹو نے انسانی نفسیات کے بہت سے اسرار و رموز کی حقیقت واضح کی ہے ——— "شوشو"، "بلاؤز"، "پھاہا" اور اسی طرح کے بعض اور افسانے اسی نفسیات جنسی کے مختلف حقائق کو پیش کرتے ہیں ——— "شوشو" ایک نوجوان لڑکی کی کہانی ہے جو کسی شادی میں شرکت کی غرض سے آتی ہے اور اپنی سہیلی کے ساتھ رات گزار رہی ہے ——— وہ آپس میں دلہنوں کے متعلق بے شمار باتیں کرتی ہیں ——— جن سے ان کے جنسی دباؤ کا اندازہ ہوتا ہے ——— شوشو یہ باتیں کرتے ہوئے بار بار اپنی سہیلی عفت کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ جما دیتی ہے لیکن عفت معترض نہیں ہوتی، خاموش بیٹھی رہتی ہے ——— اور پھر تھوڑی دیر کے بعد دونوں ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈال کر سو جاتی ہیں ——— منٹو نے یہاں نوجوان لڑکیوں کے جنسی جذبات کی حقیقت سے بھرپور ترجمانی کی ہے ——— "بلاؤز" مومن، شکیلہ اور رضیہ کی کہانی ہے جو بلوغ کی منزلوں سے گزر رہے ہیں ——— شکیلہ ساٹن کا ایک بلاؤز سیتی ہے۔ اور رضیہ کو دکھاتی ہے ——— مومن کے دماغ میں یہ بلاؤز عجیب و غریب خیالات پیدا کرتا ہے ——— "ادھر ساٹن کا یہ بلاؤز سیا جا رہا تھا۔ اُدھر مومن کے دماغ میں عجیب و غریب خیالوں کے ٹانکے اُدھڑ رہے تھے ——— جب اُسے کمرے میں بلایا جاتا اور اس کی نگاہیں ساٹن کے بلاؤز پر پڑتیں تو اُس کا جی چاہتا کہ وہ ہاتھ سے چھو کر اُسے دیکھے ——— صرف چھو کر ہی نہیں ——— بلکہ اس کی ملائم اور روئیں دار سطح پر دیر تک ہاتھ پھیرتا رہے ——— اپنے کھردرے ہاتھ ——— اس میں بھی ایک نفسیاتی حقیقت پنہاں ہے ——— "پھاہا" بھی کم و بیش اسی طرح کی کہانی ہے۔ گوپال کی ران پر پھوڑا نکل آتا ہے ——— وہ اور اس کی بہن اس پر پھاہا لگاتے ہیں ——— لیکن آخر میں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نرملا بھی اپنے لئے بھی ایک پھاہا تراشتی ہے ——— اور پھر جو کچھ ہوتا ہے اُس کو منٹو ہی کے الفاظ میں سنیئے ——— "پھاہا کاٹنے کے بعد اُس

تھوڑا سا حصہ نکال کر اس پر پھیلایا اور گردن جھکا کر اپنے کرتے کے بٹن کھولے۔ پیٹ کے داہنی طرف چھوٹا سا ابھار تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چھوٹا سا نا کمل بلبلہ اٹکا ہوا ہے —— نرملا نے پھاہے پر تھوڑا نمک مالی اور اسے لیتے ہوئے ابھار پر جما دیا تھا —— اس افسانہ میں منٹو نے بچوں کی نفسیات کو واضح کیا ہے —— غرض اسی طرح اس نے بہت سے افسانے اس موضوع پر لکھے ہیں —— ان افسانوں کا کوئی خاص مقصد نہیں ہے —— لیکن یہ زندگی کے بعض بنیادی نفسیاتی حقائق کو ضرور پیش کرتے ہیں —— دوسروں کی حقیقتوں پر پردہ ڈالتے ہیں —— منٹو ان حقیقتوں کی پردہ دری کرتا ہے۔ اس لئے ان افسانوں میں بھی اس کی حقیقت نگاری اپنی جھلک دکھاتی ہے۔

منٹو نے خالص جنسی موضوعات پر جو چند افسانے لکھے ہیں، اور جن پر خاصا ہنگامہ ہوا ہے، وہ بھی نفسیاتی حقائق کی ترجمانی کے سلسلے ہی کی کڑیاں ہیں —— اس میں شک نہیں کہ ان افسانوں میں سے اکثر کے موضوعات بڑی حد تک مہمل ہیں لیکن ان میں جگہ جگہ فرد کی نفسیات بڑی باریکی سے پیش کیا گیا ہے —— اور اس نفسیات کے مختلف پہلوؤں کی جو ترجمانی منٹو نے کی ہے، اس کے حقیقت ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا —— "دھواں" اور "ٹھنڈا گوشت" منٹو کے ایسے ہی افسانے ہیں —— "دھواں" کا کوئی خاص اہم موضوع نہیں ہے صرف اتنی سی بات ہے کہ مسعود ایک سکول کو جاتا ایک قصائی کو گوشت لے جاتے ہوئے دیکھتا ہے —— اس گوشت میں سے اسے دھواں سا اٹھتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے دل میں اس گوشت کو چھونے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اسے انگلی سے چھوتا ہے، اور گوشت کی گرمی اسے بھلی معلوم ہوتی ہے —— یہ روداد وہ اپنی ماں اور بہن کلثوم کو سناتا ہے —— اس کی بہن پر یہ روداد سن کر عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے اور وہ مسعود سے یہ کہتی ہے کہ اس کی کمر میں شدید درد ہو رہا ہے۔ اور وہ مسعود سے کمر دبوانا چاہتی ہے —— چنانچہ وہ دباتا ہے —— پھر اس کی بہن کلثوم اپنی سہیلی بملا کے ساتھ ایک پلنگ پر دیکھی جاتی ہے —— یہ اور اس طرح کی بہت سی باتیں اس افسانے کا موضوع ہیں۔ اس کے موضوع کے سطحی پن سے قطع نظر اس میں جگہ جگہ ایسے مقامات آتے ہیں جہاں گہرے نفسیاتی حقائق کا پتہ چلتا ہے۔ —— مسعود اور کلثوم کی گفتگو اور کلثوم اور بملا کی حرکات میں ان حقائق کا پتہ چلتا ہے —— "ٹھنڈا گوشت" کا جو موضوع ہے اس کا بھی تقریباً یہی حال ہے —— موضوع اس کا بھی کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ البتہ نفسیاتی حقائق اس میں بھی جگہ جگہ ملتے ہیں —— منٹو نے ان کو اپنے گہرے نفسیاتی شعور سے کام لے کر حقیقت کا روپ ضرور دے دیا ہے —— اور اس طرح اس کی حقیقت نگاری میں یہ باتیں معاون ہوتی ہیں لیکن ان کا کوئی بڑا مقصد نہیں ہے ——

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ منٹو کے یہاں زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں لیکن ان چھوٹی چھوٹی باتوں ہی میں اس نے زندگی کی حقیقتوں کو دیکھا ہے —— ان حقیقتوں کی تلاش میں وہ ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کو ٹٹولتا ہے —— اس کی ساری تفصیل اور جزئیات کو سمجھتا ہے —— یہ جزئیات حقیقتوں کو ابھارنے میں بڑا کام کرتی ہے —— اور اس پر منٹو کا مشاہدہ سونے پر سہاگے کا کام کرتا ہے —— اس کی نگاہیں ان جزئیات میں ایسے پہلوؤں کو بھی دیکھ لیتی ہیں جن کو دیکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی —— اسی لئے منٹو کے یہاں جزئیات کی حقیقت اور حقیقت کی جزئیات بیک وقت اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ مشاہدہ کی تیزی کے سہارے جزئیات کی حقیقت اور حقیقت کی جزئیات جس طرح منٹو کے یہاں نمایاں ہوتی ہے شاید ہی اردو کے کسی اور افسانہ نگار کے یہاں اس طرح نمایاں ہوتی ہو —— کیونکہ اس میں منٹو کے تخیل کو بہت کم دخل ہوتا ہے —— منٹو صرف دیکھتا ہے اور دیکھتے ہوئے اس کی نظر ہی خارجی مظاہر کی انتہائی گہرائیوں تک پہنچتی ہے اور جب وہ ان کی تفصیل بیان کرتا ہے تو اس میں زندگی کی بے شمار حقیقتیں نمایاں ہوتی ہیں —— اصل میں حقیقتوں کی تلاش ہی تو خارجی مظاہر کی تفصیل و جزئیات کی طرف متوجہ کرتی ہے —— اور وہ اس کی جستجو اور تلاش میں بہت دور نکل جاتا ہے —— لیکن کرنے کے باوجود یہ جیتی جاگتی دنیا ہے —— منٹو کے یہاں خیالی باتیں نہیں ہیں۔ اسی دنیا کی باتیں ہیں —— اسی ماحول کی باتیں ہیں۔ اسی فضا

کی باتیں ہیں —— منٹو ان باتوں کو بہت نمایاں کرکے پیش کرتا ہے —— اور ان باتوں کو نمایاں کرکے پیش کرنے ہی میں اس کے یہاں حقیقت کی جزئیات اور جزئیات کی حقیقت اپنے آپ کو رونما کرتی ہے —— گوپال جس کی ران پر پھوڑا نکلا تھا، اس کے باپ کے کردار کی تفصیل یہ ہے کہ "اس کے پتا جی لالہ پرشوتم داس تھانیدار لنگوٹ باندھے نل کی دھار کے نیچے اپنی گنجی چندیا رکھے اور یہ بڑی توند ڈھلکائے مونچھوں میں سے آم کا رس چوس رہے تھے۔ سامنے بالٹی میں ایک درجن کے قریب آم پڑے تھے جو انہوں نے ایک ٹھیلے والے سے اس کا چالان کاٹ کر حاصل کئے تھے۔ گوپال باپ کی پیٹھ مل رہا تھا اور میل کی مروڑیاں بنا رہا تھا۔ جب اس نے ہاتھ صاف کرنے کے لئے بالٹی میں ڈالے تھے اور چپکے سے ایک آم اڑانا چاہا تھا تو لالہ جی نے بڑے زور سے اس کا ہاتھ جھٹک کر چھوٹے سے آم کو مونچھوں سمیت منہ میں ڈالتے ہوئے کہا تھا بے شرم تجھے بڑوں کا لحاظ کرنا جانے کب آئے گا" —— اور نتھو کے کردار کی جزئیات ان جملوں میں موجود ہے "نتھو کو گاؤں کے ہر جھونپڑے اور اس کے اندر رہنے والے کا حال معلوم تھا۔ مثال کے طور پر اسے معلوم تھا کہ چودھری کی گائے نے صبح سویرے ایک بچھڑا دیا ہے اور مادھو کے لنگڑے بھائی کی بیساکھی ٹوٹ گئی ہے۔ گاما حلوائی اپنی مونچھوں کے بال چنوا رہا تھا کہ اس کے ہاتھ سے آئینہ گر کر ٹوٹ گیا۔ اور ایک سیر دودھ کے پیسے نائی کو بطور قیمت دینا پڑے —— اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ دو آدمیوں پر پرسرام اور گنگو کی پنچ پنچ ہوتے ہوتے رہ گئی تھی اور سائنک رام نے اپنے بچوں کو پاپڑ بھون کر کھلائے تھے حالانکہ دیدجی نے منع کیا تھا کہ ان کو مرچوں والی کوئی شے نہ دی جائے" —— اور ایک فلم کمپنی کے ماحول کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے —— "پالپوں کی گٹھڑی کی شوٹنگ تمام شب ہوتی رہی تھی۔ رات کے تھکے ماندے ایکٹر لکڑی کے کمرے میں جو کمپنی کے ولن نے اپنے میک اپ کے لئے خاص طور پر تیار کرایا تھا اور جس میں فرصت کے وقت سب ایکٹر اور ایکٹرس سیٹھ کی مالی حالت پر تبصرہ کیا کرتے تھے، صوفوں اور کرسیوں پر اونگھ رہے تھے۔ اس چوبی کمرے کے ایک کونے میں میلی تپائی کے اوپر دس پندرہ چائے کی خالی پیالیاں اوندھی سیدھی پڑی تھیں جو شاید رات کو نیند کا غلبہ دور کرنے کے لئے ان ایکٹروں نے پی تھیں۔ ان پیالیوں پر سینکڑوں مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ کمرے کے باہر ان کی بھنبھناہٹ سن کر کسی نو وارد کو یہی معلوم ہوتا کہ اندر بجلی کا پنکھا چل رہا ہے ......" اور سوگندھی کے ماحول کی تصویر اس طرح بنائی ہے "دروازے پر دستک ہوئی —— رات کے دو بجے یہ کون آیا تھا؟ سوگندھی کے خواب آلود کانوں میں دستک کی آواز بھنبھناہٹ بن کر پہنچی۔ دروازہ جب زور سے کھٹکھٹایا گیا تو وہ چونک کر اٹھ بیٹھی —— دو ملی جلی شرابوں اور دانتوں کی ریخوں میں پھنسے ہوئے مچھلی کے ریزوں نے اس کے منہ کے اندر ایسا لعاب پیدا کر دیا تھا جو بے حد کسیلا اور بدبودار تھا۔ دھوتی کے پلو سے اس نے یہ بدبودار لعاب صاف کیا اور آنکھیں ملنے لگی۔ پلنگ پر وہ اکیلی تھی۔ جھک کر اس نے پلنگ کے نیچے دیکھا تو اس کا کتا سوکھے ہوئے چپلوں پر منہ رکھے سو رہا تھا" —— اور "شوشو" میں حسن و شباب کے طوفان رنگ و بو کی مصوری اس طرح کی ہے "ساڑھیوں کی ریشمیں سرسراہٹ، کلف لگی شلواروں کی کھڑکھڑاہٹ اور چوڑیوں کی کھنکھناہٹ ہوا میں تیرنے لگی۔ تمتماتے ہوئے مکھڑے پر بار بار گرتی ہوئی لٹیں، ننھے ننھے سینوں پر زور دے کر نکالی ہوئی بلند آوازیں، اونچی ایڑی کے بوٹوں پر تھرکتی ہوئی ٹانگیں، لچکتی ہوئی انگلیاں دھڑکتے ہوئے سینے، پھڑکتی ہوئی رگیں، اور پھر ان الھڑ لڑکیوں کی آپس میں سرگوشیاں! —— یہ سب کچھ دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ گلی کے بچے فرش پر حسن و شباب اپنے قلم سے اپنے معانی لکھ رہا ہے" —— منٹو کے افسانے اس طرح کی تفصیل و جزئیات سے بھرے پڑے ہیں۔ اس تفصیل جزئیات سے اس فضا اور ماحول کا صحیح اندازہ ہوتا ہے جس میں حقیقتیں پرورش پاتی ہیں۔ اسی لئے منٹو کی یہ تفصیل و جزئیات زندگی کی ان گنت حقیقتوں کو ظاہر کرنے کا ایک وسیلہ اور ذریعہ بن جاتی ہے —— اور اس میں شک نہیں کہ منٹو نے اپنے ہر افسانے میں تفصیل و جزئیات سے بھی کام لیا ہے۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا منٹو کے یہاں محض خیالی باتیں نہیں ہیں۔ اس نے حقیقتوں کو اجاگر کرنے کی بنیاد تخیل پر نہیں رکھی ہے۔ اور

ہو بہو اور من وعن پیش کر دیا ہے۔ لیکن جگہ جگہ حقیقتوں کو واضح کرنے میں جو اندازِ بیان اختیار کیا ہے، اس میں تخیل کی رنگ آمیزی ضرور نظر آتی ہے۔ اس رنگ آمیزی سے منٹو نے حقیقتوں کو نمایاں طور پر پیش کرنے میں بڑا کام لیا ہے ـــــ اس کے افسانوں میں تخیل کی رنگ آمیزی کا مقصد صرف اسلوب کی پُرکاری ہی نہیں، بعض بنیادی معاملات کی توضیح و تشریح ہے ـــــ اسی لئے تخیل کی رنگ آمیزی منٹو کے یہاں مقصد نہیں ذریعہ بن جاتی ہے ـــــ اور اس ذریعے سے مختلف حقیقتوں کو واضح کرنے کا جو مقصد ہے، اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ منٹو کے افسانوں میں ایسے ہی مقامات پر حقیقت کا حسن بھی نمایاں ہوتا ہے اور حسن کی حقیقت بھی ـــــ بلکہ شاید یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ جب یہ صورتِ حال پیدا ہوتی ہے تو حقیقت حسن بن جاتی ہے اور حسن حقیقت کا روپ اختیار کر لیتا ہے ـــــ منٹو کے ہر افسانے میں ایسے مقامات آتے ہیں اور ان کے بنیادی موضوعات میں جو مختلف حقیقتیں چھپی ہوئی ہیں، ان پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتے ہیں ـــــ یہ جملے تخیل کی رنگین کاری کے باعث کتنے حسین لیکن حقیقت سے کتنے بھرپور ہیں :ـ

"پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انجن نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہو اکیلے پٹڑیوں پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے زندگی کی پٹڑی پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود جا رہی ہے۔ دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جا رہی ہے۔"
(کالی شلوار)

"شام کا جھٹپٹا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور فضا میں ایک عجیب قسم کی اُداسی گھلی ہوئی تھی جو ان کنوارے آدمیوں کے دل میں ایسی اُداسی ضرور موجود ہوتی ہے جو پھیل کر ایسے موقعوں پر بہت وسعت اختیار کر لیا کرتی ہے۔ میرے بدن پر ایک کپکپی سی طاری ہو گئی۔ جب میں نے جوہو کے سمندری کنارے کا تصور کیا جہاں شام کو نم آلود ہوائیں یوں چلتی ہیں جیسے بھاری بھاری ریشمی ساڑھیاں پہن کر عورتیں چلتی ہیں۔"
(پریشانی کا سبب)

"ہر شے بوجھل دکھائی دیتی تھی جیسے بادلوں کے وزن کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ موسم کچھ ایسی ہی کیفیت کا حامل تھا جو ربڑ کے جوتے پہن کر چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔"
(دھواں)

"وہ کچھ اس طرح سمٹی جیسے کسی نے بلندی سے ریشمی کپڑے کا تھان کھول کر نیچے پھینک دیا ہے۔"
(مصری کی ڈلی)

"اُس کے خارش زدہ کُتے نے بھونک بھونک کر مادھو کو ... نکال دیا۔ سیڑھیاں اُتار کر جب کُتا اپنی ٹنڈ منڈ دُم ہلاتا سوگندھی کے پاس واپس آیا اور اس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر کان پھڑپھڑانے لگا تو سوگندھی چونکی ـــ ـــ اس نے اپنے چاروں طرف ایک ہولناک سناٹا دیکھا ـــ ـــ ایسا سناٹا جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا ـــــ اُسے ایسا لگا کہ ہر شے خالی ہے ـــــ جیسے مسافروں سے لدی ہوئی ریل گاڑی سب اسٹیشنوں پر مسافر اُتار کر اب لوہے کے شیڈ میں بالکل اکیلی کھڑی ہے۔"
(ہتک)

"لاجو کی ماں کھڑکی کے ساتھ لگی، خاموش اور نیم روشن سڑک پر پھیلی ہوئی کیچڑ کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ کھڑکی کے اُس طرف لوہے کے کھمبے پر ایک لالٹین دسمبر کی سردی میں مجبور سنتری کی طرح اونگھ رہی تھی۔ سامنے بھٹیارے کی بند دکان کے باہر چبوترے پر انگیٹھی میں سے کوئلوں کی چنگاریاں ضدی بچوں کی طرح مچل مچل کر نیچے گر رہی تھیں۔"
(موم بتی کے آنسو)

"میرے دائیں ہاتھ کو ایک اونچا ٹیلہ تھا جس کے ڈھلوانوں میں گندم کے ہرے پودے نہایت ہی مدھم

سرسراہٹ پیدا کر رہے تھے۔ یہ سرسراہٹ کانوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ آنکھیں بند کرو تو یہ معلوم ہوتا کہ تصور کے گدگدے قالینوں پر کئی کنواریاں ریشمی ساڑھیاں پہنے چل پھر رہی تھیں "

(موسم کی شرارت)

" ہمارا جیٹھا تھا وہاں دو بالو تھی، ایک گجراتی اور ایک پارسی نہ جانے کب سے بچے ہوئے تھے، دونوں گجراتی بولتے تھے، مگر مختلف لب و لہجہ سے۔ پارسی کی آواز میں دو سُر تھے۔ کبھی بار یک سُر میں بات کرتا تھا کبھی موٹے سُر میں۔ جب دونوں تیزی سے بولنا شروع کر دیتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے طوطے مینا کی لڑائی ہو رہی ہے "

(بانجھ)

" شو شو میں بانجو کے تھرکتے ہوئے تاروں کی جھنکار سی پائی جاتی ہے۔ آپ یہ نام پکاریے تو ایسا معلوم ہوگا کہ آپ نے کسی ساز کے تنے ہوئے تاروں پہ زور سے گز پھیر دیا ہے "

(شو شو)

" اُس بازار کا راستہ ہم جانتے تھے، جہاں عورتیں مل سکتی ہیں ـــــ کالی، نیلی، پیلی، لال اور جامنی رنگ کی عورتیں، پیڑوں کی طرح ان کے مکان ایک قطار میں دور تک دور تک چلے گئے ہیں۔ یہ رنگ برنگ عورتیں ان میں پکے ہوئے پھلوں کے مانند لٹکی رہتی ہیں۔ آپ نیچے سے ڈھیلے اور پتھر مار کر انہیں گرا سکتے ہیں "

(پہچان)

ان اقتباسات میں تخیل کی رنگ آمیزی اپنے شباب پر ہے۔ اور اس رنگ آمیزی نے ان میں بلا کا حسن پیدا کر دیا ہے لیکن یہاں تخیل کی رنگ آمیزی بذات خود اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنی کہ وہ حقیقتیں جن کو منٹو پیش کرنا چاہتا ہے ـــــ اسی لئے ان میں سے ہر ایک میں کوئی نہ کوئی مقصد پوشیدہ نظر آتا ہے ـــ ان کا حسن برائے حسن نہیں ہے بلکہ حسن برائے حقیقت ہے ـــــ اور اسی لئے ان میں بہ یک وقت حقیقت کا حسن بھی نظر آتا ہے اور حسن کی حقیقت بھی!

منٹو اس اعتبار سے ایک منفرد حیثیت کا مالک ہے ـــ اس میں اُس کا کوئی ثانی نہیں!

اب تک منٹو کی حقیقت نگاری پر جو بحث ہوئی ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ منٹو کے یہاں حقیقت نگاری کا میدان محدود نہیں ہے۔ اس کے فن میں اس حقیقت نگاری کے بے شمار پہلو ہیں۔ اَن گنت روپ ہیں۔ اور اس کی حقیقت کو دیکھنے والی نگاہیں ان تمام متنوع پہلوؤں کو دیکھتی ہیں ـــ یہ سارے مختلف روپ اُس کے سامنے آتے ہیں۔ اس نے عام انسان کی زندگی کے حقائق کو بھی دیکھا ہے، سماجی زندگی کے معاملات و مسائل کی حقیقتیں بھی اس کے سامنے آئی ہیں ـــ انسانی نفسیات کے نارمل اور ایب نارمل دونوں پہلوؤں کے حقائق اس کی نظر کے سامنے رہے ہیں ـــ لیکن ان سب کو پیش کرنے میں وہ خود نارمل رہا ہے ـــ کہیں کہیں ایب نارمل نفسیات کو پیش کرتے ہوئے تھوڑی سی انتہا پسندی اس کے یہاں ضرور پیدا ہو جاتی ہے لیکن ایسا کرتے ہوئے بھی وہ عام انسانی سطح سے نیچے نہیں گرتا ـــ بر خلاف اس کے ایسے مقامات پہ تو اُس کی حقیقت نگاری اپنی انتہائی بلندیوں پہ پہنچ جاتی ہے ـــ "بابو گوپی ناتھ" "ممد بھائی" اور "موذیل" اس کے ایسے ہی شاہکار افسانے ہیں ـــ بظاہر یہ تینوں کردار دیکھنے میں عجیب معلوم ہوتے ہیں لیکن عجیب دکھائی دینے کے باوجود منٹو انہیں انسانوں کی حیثیت سے پیش کرتا ہے ـــ اور اسی لئے ان کی تمام حرکات و سکنات حقیقت سے بہت قریب نظر آتی ہیں۔ منٹو نے ان سب کو حقیقت کے روپ میں دیکھا ہے یا ان میں اُسے حقیقت کے مختلف روپ نظر آئے ہیں ـــ ان حقیقتوں کو کہیں کہیں اس نے حالات و واقعات اور معاملات و مسائل میں بھی تلاش کیا ہے ـــ اور اسی لئے اس کے یہاں فضا اور ماحول کے بھی بعض بہت اچھے افسانے ملتے ہیں لیکن حقیقتوں کو دیکھنے کا جو ملکہ اسے

کردار نگاری میں حاصل ہے، اس کی مثال سارے اُردو افسانے میں کہیں اور نہیں مل سکتی۔ اسی لئے اس کے بہترین افسانے کرداروں کے مطالعے پر مشتمل ہیں — اور ان افسانوں میں حقیقت نگاری کا کمال نظر آتا ہے — بہرحال منٹو کے یہاں متنوعات کی حقیقت نگاری اور حقیقت نگاری کے نمونے ملتے ہیں — لیکن ان میں ایک چیز مشترک ہے — اور وہ ہے ایک انسانی زاویۂ نظر:

یہ انسانی زاویۂ نظر منٹو کی حقیقت نگاری کی بنیاد ہے — اور اسی زاویۂ نظر کا یہ اثر ہے کہ منٹو کے تمام افسانوں میں انسانیت اور انسان دوستی کی ایک لہری دوڑتی ہوئی نظر آتی ہے — وہ بنیادی طور پر ایک انسان دوست (HUMANIST) ہے۔ اور اس انسان دوستی ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ انسانی زندگی اور اس کے مختلف مظاہر سے گہری دلچسپی رکھتا ہے — انسان جو کچھ بھی کرتا ہے، جو کچھ بھی محسوس کرتا ہے، جو کچھ بھی سوچتا ہے، منٹو ان سب کو دیکھنے کا شیدائی ہے — اسی لئے اس کے یہاں عام انسانوں کے جذبات و احساسات، واردات و کیفیات، ان کی آرزوئیں اور تمنائیں، ان کی حسرتیں اور مایوسیاں سب کی حقیقت سے بھرپور تصویریں موجود ہیں — اس سلسلے کے کسی پہلو کو بھی منٹو نے چھوڑا نہیں ہے — ہر پہلو کی ترجمانی کی ہے — لیکن منٹو کی انسانیت اور انسان دوستی صرف اسی حد تک محدود نہیں ہے — وہ سماجی معاملات سے بھی گہرا تعلق رکھتی ہے۔ منٹو کے یہاں اس حقیقت کا گہرا شعور ہے کہ انسانی زندگی میں فرد ہی سب کچھ نہیں ہے۔ سماجی معاملات بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ فرد بہرحال سماج کا ایک جز ہوتا ہے اور سماجی حالات اس کو ہر اعتبار سے متاثر کرتے ہیں — چنانچہ سماجی زندگی کے ایسے معاملات کی ترجمانی جن سے افراد کی زندگی براہ راست یا بالواسطہ طور پر متاثر ہوتی ہے۔ منٹو نے بھی کی ہے۔ اس سلسلے میں اس نے ان مظالم کو خاص طور پر پیش نظر رکھا ہے جو زندگی کے غلط نظام اور اقدار نے تاریخ کے مختلف ادوار میں افراد پر روا رکھے ہیں، اور جن کی وجہ سے انسانیت کا چہرہ مسخ ہو گیا ہے — زندگی کو جس سانچے میں ڈھلنا چاہیئے تھا نہیں ڈھل سکی ہے — اور اس کی رفتار ارتقا کا جو اندازہ ہونا چاہیئے تھا، وہ اُسے میسر نہیں آسکا ہے — اس میں گندگی اور تاریکی ہے — اور منٹو اس گندگی اور تاریکی پر کڑھتا ہے۔ اس پر خون کے آنسو بہاتا ہے — اس طرح اس کے تمام پہلو افراد پر روشن ہو جاتے ہیں، لیکن خود منٹو ان کے متعلق کچھ نہیں کہتا — ان حالات کو ٹھیک کرنے کے لئے کوئی واضح لائحۂ عمل منٹو کے یہاں موجود نہیں ہے — وہ ان کو دیکھتا اور دکھاتا ہے — اُسے اس بات کی فکر نہیں ہوتی کہ ان حالات کو ٹھیک کس طرح کیا جائے — بہتر کس طرح بنایا جائے — لیکن اس کی تحریر دیکھ کر ان حالات سے بیزاری ضرور محسوس ہوتی ہے — وہ ان سے باہر نکلنے کا احساس دلاتا ہوا ضرور معلوم ہوتا ہے — منٹو کے یہاں ان حالات کی تنقید نہیں ہے — عکاسی ہی عکاسی ہے، ترجمانی ہی ترجمانی ہے — اس عکاسی اور ترجمانی میں کہیں کہیں نشتریت کا احساس ضرور ہوتا ہے — اور اس نشتریت سے کسی حد تک تنقید کی کمی پوری ہو جاتی ہے — زندگی کی ترجمانی اور عکاسی میں دو چیزیں منٹو کا دامن کبھی نہیں چھوڑتیں — ایک تو عقلی زاویۂ نظر اور دوسرے عام انسانی ہمدردی — منٹو انسانی ارتقا کا قائل ہے۔ اسی لئے انسانی زندگی اور اس کے مختلف معاملات و مسائل کو پیش کرتے ہوئے ہمیشہ ایک عقلی زاویۂ نظر اختیار کرتا ہے — اُسے جذبات کے دھارے پر بہنا نہیں آتا — اسی لئے اس کے یہاں جذباتیت نام کو بھی پیدا نہیں ہوتی — عقل و شعور ہر جگہ کام کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں — اور ان سب کی تان انسانی ہمدردی پر جا کر ٹوٹتی ہے — یہی باتیں اُسے انسان دوست بتاتی ہیں — اس انسان دوستی نے اس کی حقیقت نگاری کو زندگی بخشنے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اور انسان دوستی سے بڑی حقیقت اس زندگی میں اور کوئی نہیں —

منٹو اشتراکی نہیں ہے۔ اسی لئے اس کے یہاں اشتراکی حقیقت نگاری کا وہ تصور نہیں اُبھرتا۔ جس کی بنیاد سماجی زندگی کے طبقاتی

اور عہد ایا تو شعور پر استوار ہوتی ہے ـــ منٹو کے یہاں یہ شعور نہ ہونے کے برابر ہے۔ لیکن اشک [illegible] اس نے اپنے محدود شعور کی روشنی میں زندگی کی مختلف اور متنوع حقیقتوں کو نمایاں کیا ہے۔ اس کے یہاں اشتراکی اور تنقیدی حقیقت نگاری نہ سہی لیکن جن حقیقتوں کو اس نے اپنا موضوع بنایا ہے وہ ہماری عام زندگی سے گہرا تعلق رکھتی ہیں ـــ اس نے اپنے زمانے کی بدلتی ہوئی زندگی کے بدلے ہوئے معاملات و مسائل سے موضوعات منتخب کئے ہیں۔ اور اس سلسلے میں اس کا زاویۂ نظر ہمیشہ ترقی پسندانہ رہا ہے ـــ اس کے افسانوں میں جو حقیقتیں نظر آتی ہیں وہ اس کے تخیل کی پیداوار نہیں ہیں ـــ ان میں سے ہر ایک اپنا مستقل وجود رکھتی ہے ـــ منٹو نے خارجی طور پر انھیں سماجی زندگی میں دیکھا ہے ـــ اُسے ان کی تلاش و جستجو میں کوئی بڑی کاوش نہیں کرنی پڑی ہے ـــ زندگی کے شدید احساس اور حالات کے گہرے شعور نے انھیں اس کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا ہے ـــ اس کی دور رس اور دوربیں نظریں ان سب پر حاوی معلوم ہوتی ہیں ـــ اسی لئے اس نے ان حقیقتوں کی ترجمانی کچھ اس طرح کی ہے کہ اس کے یہاں جگہ جگہ ان میں سے بعض نئی حقیقتوں کے پہلو ابھرتے ہوئے ضرور نظر آتے ہیں۔

اور یہی اس کی حقیقت نگاری ہے!

سعادت حسن منٹو کی یادیں

ممتاز حسین

چونکہ منٹو کا تعلق کسی خاص ادبی فرقے (SECT) سے نہ تھا اس لئے اس بات کا خدشہ محسوس کیا جاتا تھا کہ کہیں ان کی لاش پر لاہور کے مختلف ادبی فرقوں کے درمیان لڑائی نہ ہو۔ لیکن خوش قسمتی سے منٹو کو اس وقت موت آئی جبکہ "ادب میں جمود تھا" اور سیاسی فضا کسی قسم کے ہنگامے کے لئے سازگار نہ تھی۔ پھر بھی سُنا ہے کہ جب ان کے انتقال کی خبر، انتقال کیوں موت کی خبر لاہور ریڈیو اسٹیشن سے نشر کی گئی جہاں سے ان کے ڈرامے نشر نہیں ہو پاتے تھے، تو کچھ فرقہ پرست قسم کے لوگ مرحوم کے گھر پر اس نیت سے بھی گئے لیکن وہ لوگ اتنی دیر میں پہنچے کہ ان کی لاش پر قبضہ کیا جا چکا تھا۔ یہ قبضہ نہ تو ادیبوں کے کسی فرقے نے کیا تھا اور نہ شہر کے رؤسا اور عمائد نے اور نہ حکومت نے بلکہ اس انبوہ کثیر نے جس میں اکثر و بیشتر کے کیریکٹر "سوسائٹی" کی نگاہ میں مشتبہ تھے۔ ان میں سے شاذ و نادر ہی کوئی ایسا تھا جس کا تعلق دولت کی پیداوار سے براہ راست رہا ہو، ورنہ وہ سب کے سب دولت اڑانے والوں کے لئے سامانِ تفریح بہم پہنچانے والوں میں سے تھے۔

اکثریت یقیناً انہی لوگوں کی تھی لیکن ان میں جابجا ادیبوں کو چھوڑ کر غیر مشتبہ کیریکٹر کے لوگ بھی تھے۔ انہی میں ایک مولوی صاحب اور کچھ سکھ لوگ بھی تھے جو اپنے مخصوص حلیے کی وجہ سے خواہ مخواہ نمایاں معلوم ہو رہے تھے۔ چونکہ مرحوم مولوی اور سکھ دونوں کو برداشت نہیں کر پاتے تھے اس لئے ان کی موجودگی پر مشتبہ کیریکٹر کے لوگوں کے درمیان کھسر پھسر بھی رہی جو جلد ہی دب گئی۔ کیونکہ اتنی سی بات پر وہ ان سے مخالفت مول لے کر اپنا بزنس قربان کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ ان کی یہ کاروباری رواداری کس قدر سطحی تھی اور وہ اپنے عقائد میں کس قدر رجعیت پرست واقع ہوئے تھے اس کا اندازہ اس وقت ہوا جبکہ مولوی صاحب نے نماز جنازہ کی تیاری میں اپنی داڑھی اور پٹا اتار کر زمین پر رکھ دیا۔ یہی گروہ جو چند منٹ پہلے بزنس کا خیال کر کے خاموش ہو رہا تھا احتجاج پر اتر آیا۔ مولوی صاحب نے اعتراض کی نوعیت کو بھانپ لیا اور مجمع سے مخاطب ہو کر کہا "حضرات! میں نے جو یہ داڑھی اور پٹا اتار کر رکھ دیا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ مرحوم بالخصوص میری ذات سے متعلق اسے کفر کا آلۂ کار تصور کرتے تھے۔ وہ مذہب کی اسپرٹ یعنی خدمتِ خلق اور اس قسم کے دوسرے اصولِ حسنہ کے مخالف نہ تھے لیکن ان حلیوں اور لبادوں کے ضرور مخالف تھے جن کی کمین گاہ سے انسان کو شکار کیا جاتا ہے۔ مرحوم کی ایک کہانی "صاحبِ کرامات" تو آپ حضرات نے

پڑھی ہی ہوگی۔ میں بھی اس کہانی کا ہیرو یا ولین ہوں اور یہ داڑھی اور پاجامہ جس کے اتارنے پر اتنا احتجاج ہو رہا ہے وہی ہے جسے ایک بار میں مرحوم کے گھر چھوڑ آیا تھا۔" مولوی کے اس "اعتراف" پر مشتبہ کیریکٹر کے لوگوں کے درمیان اور بھی زیادہ احتجاج بڑھا۔ وہ علانیہ کہنے لگے "ہم کبھی بھی ایسے مولوی کے پیچھے نماز پڑھنے کے لئے تیار نہیں جو بد باطن جوان ہے۔" اعتراض کی یہ عجیب و غریب نوعیت مولوی صاحب کے لیے سخت پریشان کن تھی۔ چنانچہ انہوں نے مجمع کو ایک بار پھر مخاطب کیا۔ "حضرات ہمارا تعلق قوم یہود سے نہیں کہ ہر نیک کام کے افتتاح کے لئے کسی معصوم ہستی کو تلاش کریں اور نہ مرحوم نے کبھی ایسی تلاش کو جائز سمجھا۔ وہ تو سب سے زیادہ گنہگار آدمی کو سب سے زیادہ نیک کام کا اہل سمجھتے تھے اور یہ بات حق پر مبنی ہے جیسا کہ آپ کو اپنے ذاتی تجربے سے بھی علم ہوگا کہ نیکی کا ردِ عمل صرف گنہگار آدمیوں ہی پر ہوتا ہے ورنہ نیک آدمیوں کو تو برائی ہی کی طرف جھکتے پایا ہے۔" مولوی صاحب کے اس جملے پر "NO PERSONAL REMARK" کا ایک زبردست شور اٹھا لیکن مولوی صاحب کی آواز اسے کچل بنا کر آگے بڑھ چکی تھی۔ "آپ کے ذہن میں میری ذات سے متعلق کچھ غلط فہمیاں ہیں جو غالباً فقہ کی ناواقفیت سے پیدا ہوئی ہیں۔ میں نے جو کچھ کیا اس کا جواز فقہ میں موجود ہے۔ کسی بھی مطلقہ کو اس کا طلاق دینے والا شوہر اس وقت تک عقدِ ثانی میں نہیں لا سکتا ہے جب تک وہ مطلقہ عورت کسی دوسرے مرد سے شادی نہ کرے اور وہ دوسرا مرد اسے طلاق نہ دیدے فرض کیجئے اگر مرحوم کی مطلقہ عورت یعنی بھابی کو میں اپنے نکاح میں نہ لاتا اور دوسرے ہی دن صبح اپنی مرضی سے اسے طلاق نہ دے دیتا تو پھر مرحوم کی شادی دوبارہ بھابی سے کیونکر ہوتی۔ کیونکہ اس کا امکان بھی پایا جاتا تھا کہ اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بھابی کو طلاق بھی نہ دیتا۔ میں نے جو کچھ کیا مرحوم اور بھابی کی بھلائی کے لئے کیا۔ اس میں بظاہر میری بزرگی ہے نہ کہ جوانی۔" اس پر مجمع خاموش ہو گیا حالانکہ اعتراض بد باطن پر تھا۔ اور ایسی خاموشی چھا گئی کہ پھر کسی بھی بدعت پر لوگوں نے اعتراض نہیں کیا۔

جب نمازِ جنازہ ختم ہو چکی اور مرحوم کی لاش کو قبر میں اتارنے کا وقت آیا تو بابو گوپی ناتھ، مس موزیل، ممی اور ٹوبا سنگھ نے نمایاں طور حصہ لیا۔ گو اردگرد اور لوگ بھی تھے اور جب یہ رسم بھی پوری ہو چکی اور مرحوم کی لاش مٹی کے حوالے کی جا چکی تو مولوی صاحب نے لوگوں سے درخواست کی کہ وہ مرحوم کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالیں لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی کہ کوئی شخص مرحوم کے الفاظ میں اپنا صرف مطلب تلاش نہ کرے۔ اس پر ناقدین حضرات پیچھے ہٹ گئے اور صرف افسانہ نگار حضرات آگے بڑھے۔

اردو کے ایک مشہور افسانہ نگار جنہوں نے اپنی زندگی کے کئی سال منٹو کے ساتھ گزارے تھے، ان کی شخصیت کو آئینہ دکھانا چاہا۔ لیکن وہ جذبات سے اس قدر مغلوب ہو گئے کہ ایک ہی آدھ جملے کے بعد یہ کہہ کر رونے لگے کہ "یار منٹو بڑا پیارا دوست تھا" افسانہ نگار کے اس ایک جملے نے وہ کام کیا جو غالباً کسی لمبی چوڑی تقریر سے ممکن نہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہر شخص کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور مرحوم کی شخصیت، فراخدلی، راست گوئی اور دردمندی کی تصویر بن کر چھا گئی۔ اب ان کی جگہ ایک دوسرے مشہور افسانہ نگار تشریف لائے جنہوں نے شخصیت سے ہٹ کر ان کی افسانہ نگاری کو اپنا موضوع بنایا۔

"حضرات! منٹو کی افسانہ نگاری اس کی شخصیت کا آئینہ ہے اور شخصیت کا یقین خواہ غلط ہو یا صحیح ہم لوگ بالعموم آدمی کے مزاج سے کیا کرتے ہیں۔ حکیم جالینوس کا خیال ہے کہ آدمی کے مزاج میں سودا، صفرا، بلغم اور خون ان چار چیزوں کے مختلف النوع تناسب کو دخل ہوتا ہے لیکن مرحوم نے اپنی شخصیت سے اس حکم کو جھٹلا دیا۔ ان کے مزاج میں سودا، صفرا اور خون تو تھا لیکن بلغم بالکل نہ تھا۔ وہ نہ تو غبی واقع ہوئے تھے اور نہ ہنسوڑ۔ ان کے افسانوں میں تلخی اور ترشی ہے نہ کہ سٹھیا پن یا حمق، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ان کے افسانوں میں تلخی اس وجہ سے ہے کہ وہ افسانہ لکھنے سے پہلے کوئی کڑوا گھونٹ اتار لیتے تھے لیکن میں اسے بالکل ہی غلط سمجھتا ہوں، آزما کر دیکھ چکا ہوں نہ تو تلخی اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور نہ اس وجہ سے کہ کسی کے ایام تلخ ہیں، یہ بھی آزما کر دیکھ چکا ہوں حضرات اس کے افسانوں کے تلخ

اور ترش ہونے کا سبب یہ ہے کہ وہ ہم لوگوں سے زیادہ حساس اور زیادہ ذہین واقع ہوا تھا۔ اس کا ردِعمل اور اس کی گرفت دونوں ہی ہم لوگوں سے زیادہ تیز اور چست تھیں۔ وہ جس قسم کے سماج میں رہ رہا تھا اس میں صرف عفونت اور سڑاند ہی نہ تھی بلکہ شدید قسم کی جسمانی اور ذہنی بے حسی بھی تھی۔ بڑے سے بڑے حادثات اس طرح پاس سے گزر جاتے جیسے وہ کسی ہوائی بندوق کے دہانے سے نکلے ہوں۔ منٹو ہمارے اسی بے حسی سے اکتا کر کبھی کبھی اصلی بندوق چلا دیا کرتا اور بالکل ہی سنجیدہ رہتا۔ کیونکہ نہ تو وہ رونے کے لئے ہنستا تھا اور نہ ہنسنے کے لئے روتا تھا۔ وہ جو کچھ کرتا وہی اس کا مقصد ہوتا۔ اس کا مقصد سوسائٹی کی روح کو سنسنا دینا یعنی ڈھرے پر چلنے والے پہیئے کو روک دینے کا تھا۔ ایسا آدمی یقیناً باغی ہی کہلائے گا لیکن اس کی بغاوت میں ڈیماگاگی نہیں ہے بلکہ "ہالٹ" بولنے والا انداز ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کے آرٹ کی طرف وہی آتے ہیں جن پر بقول افلاطون جنون سوار ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہنا پڑے گا کہ آرٹ سے وہ بڑا بھی وہی ہوتے ہیں جو اپنے بھوت کو بھگا دیتے ہیں۔ سعادت حسن منٹو کی خوبی یہی ہے کہ آسیب زدہ ہونے کے باوجود اس نے اپنے بھوت کو بھگا دیا تھا۔ وہ صدیوں تک عوام کے توہمات پر زندہ رہنے والے سچ بولنے کے بجائے "منکشف جھوٹ" بولتا۔ زندگی کے ان تجربات کے ذریعے نہیں جن کا سہارا لے کر ہم سو جاتے ہیں بلکہ ان تجربات کے ذریعے جو ہمیں خواب میں بیدار رکھتے ہیں۔ چونکہ فکشن کے لئے اس قسم کا میٹیریل مشکل سے ملتا ہے اس لئے اس کی کم مقدار ہی پر قناعت کرنی پڑتی ہے اور اسی قناعت کا نتیجہ ہے کہ فن کار اپنے آپ کو دہرایا بھی کرتا ہے۔ سعادت حسن منٹو نے بھی اپنے کو دہرایا ہے لیکن اس طرح نہیں کہ ہم اسے پکڑ لیں۔ وہ ہر بار اپنے تجربات کے پہلو بدل دیا کرتا۔ منٹو کے اس منکشف جھوٹ کی بنیاد صرف اتنی سی بات پر ہے کہ اگر دنیا کے سارے انسانوں کی کھال یکساں ہے بہ اعتبار ردِعمل تو ان کی روح بھی یکساں ہے "جیسی روح ویسے فرشتے" اسے وہ بزرگوں کا تراشا ہوا اصول بتلاتے۔ اگر کھال راحت اور تکلیف کے اصول کی پابند ہے تو روح بھی یکساں طور پر نیک و بد کی تمیز کی پابند ہے۔ کیونکہ توریت میں لکھا ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو اس وقت باغ عدن سے نکالا جبکہ ان میں نیک و بد کی تمیز پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ ان کا خیال ہے کہ ایک زندہ آدمی کو اس کی زندگی میں انہی دو اصولوں کی کارفرمائی سے پہچانا جا سکتا ہے وہ اپنے سماج کو مخاطب کر کے پوچھتے "آخر یہ کس قسم کا کلچر ہے، یہ کون سی تہذیب ہے جس میں اگر کھال راحت و تکلیف کی جواب دہی سے بے نیاز ہو جاتی ہے تو روح نیک و بد کی تمیز ضائع کر دیتی ہے؟" "کالی شلوار" سے لے کر "کھول دو" تک میں جہاں انسان کی روح پروانہ کر جاتی ہے اور صرف شلوار رہ جاتی ہے اسی تمدن اور کلچر پر طنز ہے، ایٹمی طنز ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ منٹو کسی خاص نظام کا نام نہیں لیتا ہے لیکن کیا کہانی کا پس منظر نظام کی طرف اشارہ نہیں کرتا ہے۔ منٹو کی کہانیاں اسباب کی طرف نہیں بلکہ اثرات کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس پر سڈیشن کا مقدمہ نہیں چلایا گیا بلکہ اس بات کا کہ وہ جو سٹیر یا اثرات پیش کرتا ہے اس سے ہمارے کلچر اور تمدن کا مریض ہونا لازمی ثابت ہوتا ہے۔ وہ اپنی کہانیوں میں آدمی کو آدمی کے خلاف نہیں بلکہ آدمی کو خود اس کی ذات کے خلاف بھڑکاتا ہے۔ اور چونکہ مرحوم کا آدمی ناخواندہ تھا جیسا کہ ہم آپ ہیں اس لئے وہ سٹیر کو اس کے حواس تک لے جاتا۔ اس سے بہت سے لوگ چڑ جاتے۔ لیکن چڑنے کا اصلی سبب یہ نہ تھا کہ جو چیز اشارے اور کنایے سے بتلانے کی ہے اسے وہ ہماری ناک میں کیوں ٹھونسے دیتا ہے بلکہ یہ تھا کہ کیوں نہیں وہ خیر محض کی باتیں کرتا ہے، کیوں خیر کی بقا کے لئے شر کی ماہیت کو بھی بے نقاب کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ اس سے خیر کا اکلوتا پن جاتا رہتا ہے۔ آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں ہی جڑواں بچے ہیں، ایک کی ہنسی دوسرے سے لگی ہوئی ہے میر کا شعر ہے ؎

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنہیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامنگیر ہوتی ہے خدا ہوتے

اگر خدا گنے میں بھی شرم کا ایک پہلو ہے تو پھر بندگی کی خواہش کیوں کی جائے لیکن کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ ہم صرف اپنی بندگی ہی پہ فخر کرتے ہیں۔ قصہ یہ ہے کہ یہ آدمی جس کو فلسفیوں نے مختلف نام دے رکھے ہیں بڑا فلسفہ ساز بھی ہے۔ اگر ایک طرف وہ آدمی کو شکار کرنے والا فلسفہ گھڑتا ہے تو دوسری طرف شکاری کو صید کرنے والا فلسفہ بھی وہی گھڑ کر لاتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں مرحوم کے پاس کوئی فلسفہ اسفر تھا یا نہیں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ان کی ہر کہانی میں شکاری کے لئے اشتعال اور سوچنے والے کے لئے تحریک ہوتی۔ اس ایک گر کے علاوہ ان کے پاس لڑنے بھڑنے کا کوئی اور داؤ پیچ نہ تھا۔ نہ تو وہ اپنے افسانوں میں ہمارے شعرا کی طرح نیزہ لہکاتے رجز پڑھتے یمین و یسار کو آواز دیتے اور نہ ہمارے جادوگر نثاروں کی طرح ہم وزن فقروں کے گنبد ہوا میں اچھالتے اور نہ ہمارے کرتب باز طنزیہ اور مزاحیہ مضمون نگاروں کی طرح لفظ سے لفظ اور جملے سے جملے کی پٹی نکالتے جاتے۔ وہ اس قدر براہ راست قسم کے آدمی تھے کہ وہ ان چیزوں کو بھی فراڈ سمجھتے وہ تو صرف آرٹسٹ تھے۔ لفظوں کے انبار کو چیر کر مقصد تک پہنچا جانتے تھے۔ ان کی تشبیہات اور استعاروں میں الفاظ کم اور حقیقت زیادہ ہے۔ ہمارے بعض نازک مزاج شرفا کو ان کے اس کمال سے بھی چڑ تھی۔"

فاضل افسانہ نگار کی یہ تقریر اس قدر بے مغز ہو چلی تھی نہ سامعین کے درمیان سخت قسم کی کسمساہٹ پیدا ہو گئی۔ لیکن چونکہ منٹو ہوشیار تھا جیسا کہ بتلایا جاتا ہے کہ وہ افسانہ نگاری چھوڑ کر مزاحیہ کالم لکھنے لگا ہے اس لئے اس نے اپنی تقریر کا رُخ موڑ دیا۔

"حضرات آپ گھبرائیں نہیں ابھی میں مرحوم کی زندگی سے متعلق مزے دار باتیں سناؤں گا۔ مرحوم نے ایک بار اردو کے مشہور افسانہ نگار دلیندر ستیارتھی کی داڑھی کو شراب سے رنگ دیا اور یہ مصرع پڑھا:

ع ایں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ

اس پر مجمع اور بھی برافروختہ ہو گیا اور انہیں بیٹھ جانا پڑا۔ ان کا بیٹھنا تھا کہ جیب کترے صاحب جنہیں ساری دنیا جیب کترا ہی کہتی کھڑے ہو گئے اور بغیر مولوی صاحب کی اجازت کے تقریر کرنے لگے:

"حضرات! منٹو صاحب کے آرٹ اور زندگی پر بولنے کا حق جیسا مجھے ہے کسی کو نہیں ہے کیونکہ میں انہیں اندر سے جانتا ہوں لیکن قبل اس کے کہ میں ان کے آرٹ اور زندگی پر روشنی ڈالوں، میں اپنا تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ میں وہی جیب کترا ہوں جس نے ایک "جھوٹی کہانی" میں بیگم پیرزمان کے ہینڈ بیگ سے ان کا Love Letter اڑا دیا تھا اور میں نے ہی ایک ریڈیائی ڈرامے میں بلا کر اس کا ہینڈ بیگ واپس کیا تھا۔ میرا نام نہ تو کانشی ہے اور نہ گھانسی، نام اس کو دیا جاتا ہے جس کی کوئی انفرادیت ہوتی ہے۔ لہٰذا چونکہ میں اپنے خالق کے ہاتھوں اس صفت سے محروم رہا ہوں اس لئے وہ مجھے صرف جیب کترا کہہ کر یاد کرتے اور شارٹ فارم میں صرف جیک (TACK) کہہ کر بلایا کرتے۔ جہاں کسی (HYPOCRITE) کو ملمع پوش کو جاتے دیکھا، بولے جیک اس کا پچھوا پاکٹ مار دے۔ گویا جیب کترا نہ کر میں، چنانچہ مجھے دوسرے کا چور کہا جائے کیونکہ مجھ میں اپنی انفرادیت تو ہے ہی نہیں تو یہ نام غیر مناسب نہ ہوگا۔ منٹو صاحب نے میرے وجود کی اس کمزوری سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ جب کبھی انہیں اپنے طنزیات کے لئے کوئی دوسرا نہ ملتا تو مجھے بلا لیتے، اور یہ بات تو آپ حضرات جانتے ہی ہیں کہ طنز نہ صرف منفی ہوتا ہے بلکہ اصلی تناسب سے بھی عاری ہوتا ہے۔ اس میں آدمی کی کمزوریاں سامنے آ جاتی ہیں اور وہ خود بیک گراؤنڈ میں چلا جاتا ہے۔ ایک طنز نگار کو برداشت کرنے کے لئے بہت ہی مہذب قسم کی سوسائٹی کی ضرورت ہے جسے آئینہ توڑنا آتا ہی نہ ہو، منٹو صاحب اصل میں اسی پیشے کے آدمی تھے اور اس کی اخلاقیات کو سختی سے برتتے، جس میں آدمی کے دشمن پر طنز کیا جاتا ہے نہ کہ اپنے دشمن پر۔ چنانچہ وہ غالب کو بہت پسند کرتے۔ ایک بار یونہی میں نے پوچھ لیا: "میں نے آپ کی زبان سے کبھی اکبر الٰہ آبادی کا کوئی مصرع نہیں سنا۔" بولے "جیک میں فرسٹ کلاس آدمی کو پسند کرتا ہوں، فرسٹ کلاس آدمی کے پاس

کوئی محتسب کوئی جیب پاکٹ نہیں ہوتا ہے۔ اکبر الٰہ آبادی کی شیروانی کے استر میں بائیں جانب زپ لگا ہوا چور پاکٹ تھا جہاں سے اکثر ایک سلائی پڑا رہتا۔ غالب کے فرغل میں اس قسم کا کوئی بھی چور پاکٹ نہ تھا: اس پر میں نے پوچھا: "آخر آپ HYPOCRITE سے اس قدر کیوں خفا ہوتے ہیں؟" بولے "تو نہیں جانتا ہے، ہپوکرٹ اسٹیج کے ایکٹر کو کہتے ہیں جو زندگی میں اپنا رول نہیں بلکہ دوسروں کا رول ادا کرتا رہتا ہے۔ اس سے نہ صرف اس کی بلکہ دوسروں کی بھی ہلاکت اور اخلاقی جرأت ماری جاتی ہے۔ کیونکہ اس کا عیب دوسروں کو کھلتا رہتا ہے، بڑا آدمی مریض ہوتا ہے نہ کہ بُرا۔" چنانچہ یہ سب اسی کا ردِ عمل تھا۔

حضرات! وہ آپ لوگوں کے درمیان جاتے یعنی اچھے آدمیوں کے درمیان جانے جو اپنے پیشے میں ہر چند درمیانی سہی یعنی دونوں پارٹیوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اپنی ذات سے بالکل تندرست ہیں، کیونکہ وہ اپنے پیشے کو نہ چھپانے پر مجبور ہیں۔ کہیں کہیں سے تالی کی آواز سنائی دیتی ہے۔ منٹو صاحب حقیقت تک پہنچنے اور سوسائٹی سے اس کے مرض کو خارج کرنے کا جو یہ راستہ اختیار کرتے اس پر ان کے بعض دوستوں سے بڑی بحث رہتی۔ وہ کہتے منٹو تم مسئلے کو کیوں اخلاقی سرے سے پکڑتے ہو۔ کیوں نہیں سیاسی، اقتصادی سرے سے پکڑتے ہو، کیوں نہیں طبقات، ستیز اندر ستیز، ارتقا اور انقلاب کی منطق میں سوچتے ہو؟ اس کے جواب میں منٹو صاحب کہتے "تم لوگ بعض اوقات فوری مقاصد پر اتنا زور دیتے ہو کہ دُور کا نصب العین نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے، بعض اوقات نظام پر اتنا زور دیتے ہو کہ آدمی گم ہو جاتا ہے بعض اوقات راستوں پر اتنا زور دیتے ہو کہ مقصد کھو بیٹھتے ہو۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ تم لوگ مجھے سکھانے کے بجائے میرے آرٹ کی اسپرٹ کو دیکھ سکو، اگر ایک طرف میرے لئے فرد، فرد کے مجرد یونیورسل تصور سے زیادہ اہم ہے اور میں اپنے افسانوں میں وہ سب پیش کرتا ہوں جو کچھ کہ انسان کرتے ہیں نہ کہ وہ سب ناپید جو کہ انہیں کرنا چاہئے۔ تو دوسری طرف مجھ میں ایک اخلاقی حس (SENSE) بھی ہے جو ان کے اعمال کے تانے بانے میں نیکی کے دھاگے کو ڈھونڈھ بھی نکالتی ہے، یہی میرے آرٹ کا وہ اخلاقی پہلو ہے جو کہ "ہونا چاہئے" میں پایا جاتا ہے۔"

حضرات! منٹو صاحب نے اپنے آرٹ میں "ہے" کو "ہونے" سے کچھ ایسا ملا دیا ہے کہ ان کا پروپیگنڈا یا ایجی ٹیشن آرٹ بن گیا ہے نہ کہ ان کا آرٹ پروپیگنڈا یا ایجی ٹیشن ہو کر رہ گیا ہے۔ منٹو صاحب ایک مورلسٹ اور ریلسٹ دونوں ہی ہیں جیسا کہ دنیا کے تمام بڑے فنکار گزرے ہیں۔ بدنصیب تاجر کے کلچر پر جس نے اپنی زر اندوزی اور نفع اندوزی کی دھن میں کیا کچھ نہیں دیا، حتیٰ کہ ایٹم بم بھی دیا آج سے نہیں بلکہ صدیوں سے حملہ کیا جا رہا ہے، اور یہ حملہ اس کے کلچر پر ماسبق کی تمام صدیوں میں اخلاقی پہلو ہی سے کیا گیا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ سیاست کا پہلو اس سے رنگا نہیں کھاتا، کیونکہ ایسا ناممکن ہے۔ منٹو صاحب اسی گرانڈ اولڈ ٹریڈیشن کے آدمی تھے۔ وہ بالزک، گوگول، زولا، موپساں، ٹالسٹائی، چیخوف، گورکی اور پریم چند کی روایت کے آدمی تھے، گو یہ صحیح ہے کہ وہ روایت پرست نہ تھے۔

حضرات! انسانی مسائل کو دیکھنے کے یہی دو طریقے ہیں، یا تو انہیں سیاسیات اور اقتصادیات کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے یا پھر اخلاقیات کی روشنی میں، ہمارے ادبا ان دونوں طریقِ کار کی اثر آفرینی اور زود رسی پر بحث و تمحیص کر سکتے ہیں۔ لیکن جو چیز بحث میں لانے کی نہیں ہے وہ یہ کہ ان میں سے کوئی بھی طریقِ کار واحد طور پر کسی فن کار کے آرٹ کو بلند نہیں کر سکتا ہے۔ یہاں لفظ واحد بہت ہی اہم ہے، اس کے لئے کچھ اور چیزیں بھی چاہئیں جن پر ہمارے ناقدین برابر روشنی ڈالتے رہتے ہیں۔ آرٹ وہی بلند ہو گا جو زندہ ہو گا، نہ کہ ٹھس اور جامد، منٹو صاحب کے آرٹ میں وہ جان موجود ہے جو کہانی کو ایک داخلی وحدت اور سالمیت میں ڈھالنے اور امیجز یا تصورات کو حواس سے مخاطب کرنے سے پیدا ہوتی ہے، اس لحاظ سے منٹو صاحب ایک بڑے فن کار تھے جو کہ ان کے ہم عصر افسانہ نگار نہیں ہیں خواہ وہ اُردو میں لکھتے ہوں، ہندی میں لکھتے ہوں یا انگریزی میں، منٹو صاحب کو موپساں کے ساتھ ہی تُلانا ہو گا۔ لیکن یہ بات ادھوری رہ جائے گی اگر اس میں

خلاف ہو تو میں ان کی افسانہ نگاری کی کچھ تنقید نہ شامل کر لوں۔ منٹو صاحب کی تنقید تجارتی کلچر پر INFERENTIAL ہے بجائے کہ
براہِ راست، وہ آدمی پر زیادہ اور اس کے گلے میں جو پتھر ہے اس پر کم توجہ دیتے ہیں (یہاں کم کا لفظ بھی کافی اہم ہے) ان کی زیادہ تر توجہ
اسی بات پر رہتی ہے کہ دیکھو اس شعلۂ روزگار، اس اوباش، اس نکھٹو اور بدترے کو یہ تجارتی کلچر کے کولہو میں پھنس کر بھی انسان ہے، اس
نیکی کا جوہر — ہمدردی اور قربانی کا جذبہ زندہ ہے، منٹو کا یہ رجحان جو ان کی انسان دوستی کا نشان ہے رومانٹک ہے۔ اس لئے نہیں
ایسا نہیں ہوتا ہے، ایسا تو اکثر ہوتا ہے بلکہ اس لئے کہ اس سے آدمی کو کولہو سے نکلنے میں مدد نہیں ملتی ہے۔ یوں تو مرحوم کو نہ تو آرٹ سے
دلچسپی ہے (معلوم نہیں یہ کون سا فلسفی ہے) اور نہ کانٹ سے اور نہ کارل مارکس سے اور نہ فرائیڈ سے لیکن ان کے اس رجحان کو دیکھ کے
ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کونس برگ کے چینامین (CHINAMAN) کی طرح وہ بھی اسی کو ٹھیک سمجھتے تھے کہ انسان میں اخلاقی حس
(SENSE) فطری ہوتی ہے، اب یہ بات دوسری ہے کہ مرحوم اس METAPHYSICS کو ڈھونڈنے وہاں جاتے جہاں اس کی تو
وہ چھپا ہی بھی نہ کرتا۔ مرحوم کی کہانیوں میں جو ڈرامائیت ہے ان کی اسی نرالی ادا سے متعین ہوتی ہے، وہ ہر کام غیر متوقع کرتے تھے لیکن وہ
ایک اس ڈرامائیت میں اس قدر زیادہ پھنس گئے تھے کہ وہ عنصری ذہانت سے زیادہ اور اکتسابی ذہانت سے کم کام لیتے۔ اس میں شبہ نہیں
ابھی ہمارے یہاں پڑھے لکھے اور ناخواندہ لوگوں میں کم ہی فرق ہے، کیونکہ اگر ایک علم سے بے بہرہ ہے تو دوسرا اضافی حیثیت سے علم کے
تخلیقی جوہر اور تطبیق سے بے بہرہ ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ علم کا میکانکی پتلا ہمارے لئے بالکل ہی بے کار ہے۔ کیونکہ ہمیں اپنے سماج کی
ہیئت کو بھی دیکھنا ہوگا۔ ہمارے یہاں صدیوں سے کتاب انسان کے عمل سے علیحدہ رہی ہے۔ ہم بقراط، ارسطو اور اقلیدس کو اس زمانے
میں بھی پڑھتے رہے ہیں جبکہ ان کی کتابوں پر خطِ تنسیخ کھینچا جا چکا تھا۔ ہمیں کچھ دنوں تک موٹی موٹی کتاب پڑھنے والے، چشمہ لگانے والے،
دوسروں کے قول اقوال کو پیش کرنے والے، کٹھ ملاؤں کو برداشت کرنا پڑے گا۔ کیونکہ انہی کی غلط باتوں سے ہمیں صحیح باتوں کا علم ہوگا۔
لیکن مرحوم اس قسم کے ملا کی سماجی اور نفسیاتی باریکیوں میں نہ جاتے، وہ جہاں کہیں کسی آدمی کو دوسرے کا قول پیش کرتے سنتے اسے ڈپٹ
کر دیتے۔ ممکن ہے یہ سب اس وجہ سے رہا ہو کہ کچھ لوگ انہیں غلط طور سے پڑھنے سے پہلے چند دیگر قسم کے منکرین کا نام لے لیا کرتے
تھے چنانچہ ایک بار کسی شخص نے فرائڈ کے نام سے بسم اللہ کر کے یہ لکھ دیا کہ منٹو کی عورت "مزے دار" ہے۔ اس پر وہ سخت خفا ہوئے،
بولے "جیسے تو جانتا ہی ہے منٹو کی عورت کتنی کرکری ہے، وہ تو مرد کا بھوت بھگا دیتی ہے بھلا وہ مزے دار کیا ہوگی؟" لیکن میں نے ان کے
اس وقتی ردِ عمل پر زیادہ توجہ نہ دی کیونکہ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ان میں دوسروں کی بات کو رد کر دینے کی بھی عادت ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی
عورت، میری مراد ان کے مونث کردار سے ہے کہ نہ تو مزے دار ہے اور نہ کرکری بلکہ وہی ہے جو ان کی ایک کہانی "سڑک کے کنارے" میں
ہے "عورت اور مرد دونوں مل کر ایک نقطہ بناتے ہیں۔ لیکن ایسا کیوں ہے؟" منٹو صاحب پوچھتے ہیں کہ "اس کائنات میں ایک روح کبھی کبھی
گھائل چھوڑ دی جاتی ہے، کیا اس مقصد پر کہ اس نے دوسری روح کو اس نکتے پر پہنچنے میں مدد کی تھی؟" لیکن ناانصافی کے اس زخم کے باوجود اس کی
ماتا سرد ہونے نہیں پاتی ہے وہ چیختی رہتی ہے "میرے بھرے ہوئے دودھ کے برتن کو اوندھا کر دو۔" منٹو صاحب نے اپنی زندگی میں
یہی ایک لیرک (LYRIC) لکھی ہے۔ اس لئے نہیں کہ ان میں لیریزم کسی سے کم ہے یا یہ کہ ان کے منہ کا مزا کڑوا رہتا جیسا کہ بعض نقادوں
کے کہنے کا انداز ہے بلکہ اس لئے کہ ان کے سینے میں بہت سی گرہیں پیوست تھیں جس سے ان میں انتقام کا جذبہ ابھر آیا تھا وہ کوئی سیاسی آدمی نہ تھے
لیکن جب اپنی گوشہ نشینی کے باوجود دوسروں کی سیاست سے مجروح ہو جاتے تو وہ گریبان پھاڑ کر باہر نکل آتے۔ پہلی دفعہ جب انہیں جلیانوالہ باغ
میں زخمی کیا گیا تو انہوں نے دو کہانیاں لکھیں۔ "نیا قانون" اسی کا ردِ عمل تھا۔ دوسری دفعہ جب ۱۹۴۷ء میں انہیں خود اپنے شہر میں زخمی کیا گیا
تو وہ بہت ہی زیادہ زخمی ہو گئے تھے۔ ایک دن بہت ہی رازدارانہ انداز میں مجھ سے پوچھا "کیا آدمی کو اس وقت تک بڑھایا جا سکتا ہے

ب تک کہ اس میں برطرف کرنے کا مادہ نہ ہو؟" میں نے کہا "استار ناممکن ہے" اس پر انہوں نے پوچھا "تو اچھا یہ بتاؤ یہ مادہ کیونکر نکلے گا؟" میں نے کہا
یک طرف سے بند کر دیتے ہیں اور دوسری طرف سے کھول دیتے ہیں" انہوں نے ٹھیٹھ پنجابی محاورے میں کہا "تو یزید کا بچہ نہیں بلکہ
رہ ہے" تقریباً سات سال تک وہ اسی یزید کو پالتے رہے کہ ایک گولی ان کے سینے میں پیوست ہوئی۔ ایک دن بیٹھے بٹھائے کسی طرح
ان سے چچا سام کی طرف سے کہانی لکھنے کی پیشکش کر دی، ناشر لوگوں سے وہ اپنی کہانی کا برابر پیسہ لیتے اور کبھی کبھار ایڈوانس بھی لے لیتے
معلوم نہیں اس پیشکش میں کیا تھا کہ وہ سخت بوکھلا گئے۔ پوچھنے لگے "آخر اسے اس بات کی ہمت کیونکر ہوئی؟" میں نے کہا "دیکھئے مجھ سے
ل بھارتانہ تو برتئے نہیں کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ہماری روح کی مخالفت کے لئے جو حصار کھینچا جا رہا ہے اس میں فحش لٹریچر اور فحش تصویروں
فروغ دیا جا رہا ہے" حضرات! ترقی پسند تو وہ تھے ہی اس پوائنٹ (POINT) پر بالکل چت ہو گئے۔ پہلے تو یہ سمجھے کہ شاید میں نے ان پر
حملہ کیا ہے، لیکن جب انہوں نے غور و فکر سے کام لیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ میں نے ایک معمولی مشاہدے کی بات کہی تھی۔ چنانچہ انہوں نے
دو خطوط چچا سام کو لکھے سب اسی کا ردِّ عمل تھا۔ یقیناً ہالی وڈ کی ایکٹریس کو طلب کرنا کوئی پسندیدہ بات نہ تھی لیکن میں جانتا تھا کہ ان کی یہ
ملاہٹ کس چیز کا نتیجہ تھی، وہ سوسائٹی میں ناجائز بچوں کو پسند کرتے نہ کہ فطری بچوں کو۔ اس وقت جرمنی اور جاپان میں ٹہل رہے ہیں۔ وہ جس قدر
سوشلسٹ اور ڈیموکریٹ جمہوریت پسند تھے اتنے ہی کٹے ترقی پسند تھے" یہ کہنے کے بعد جیب کترے نے اپنی انگلیوں کے درمیان سے
رقعہ نکالا اور ہوا میں لہرا کر بولا "حضرات! یہ میری آخری کارستانی ہے، میں نے یہ رقعہ مرحوم کے جیب کفن سے اڑا لیا ہے سنئے وہ اس
میں تحریر کرتے ہیں: "میں آج بہت افسردہ ہوں پہلے مجھے ترقی پسند تسلیم کیا جاتا تھا بعد میں یکدم مجھے رجعت پسند بنا دیا گیا اور اب
دینے والے سوچ رہے ہیں اور پھر سے یہ تسلیم کرنے کے لئے آمادہ ہو رہے ہیں کہ میں ترقی پسند ہوں اور فتووں پر اپنا فتویٰ دینے والی سرکار
رجعت پسند" یقین کرتی ہے یعنی ایک سرخا ایک کمیونسٹ، کبھی کبھی جھنجھلا کر مجھ پر فحش نگاری کا الزام لگا دیتی ہے اور مقدمہ چلا دیتی ہے
طرف یہی سرکار اپنی مطبوعات میں اشتہار دیتی ہے کہ سعادت حسن منٹو ہمارے ملک کا بہت بڑا ادیب اور افسانہ نگار ہے۔ اس کا قلم
ہنگامی دور میں بھی رواں دواں رہا۔ میرا افسردہ دل لرزتا ہے کہ متلون مزاج سرکار خوش ہو کر ایک تمغہ میرے کفن سے ٹانک دے گی جو
باغِ عشق کی بہت بڑی توہین ہوگی۔" (جیب کفن)

حضرات!" جیب کترے نے رقعے کو جیب میں رکھتے ہوئے کہا "کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم لوگ مرحوم کی افسردگی کے دونوں اسباب
سمجھ سکیں؟"

میرا دوست، میرا دشمن!

عصمت چغتائی

اڈلفی چیمبر کی چوبی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے مجھے گھبراہٹ سی ہو رہی تھی۔ جیسی کبھی امتحان کے ہال میں داخل ہونے سے پہلے ہوا کرتی تھی۔ مجھے ویسے ہی نئے آدمیوں سے ملتے گھبراہٹ ہوا کرتی تھی۔ لیکن یہاں تو وہ "نیا آدمی" منٹو تھا۔ جس سے میں پہلی بار ملنے جا رہی تھی۔ میری گھبراہٹ وحشت کی حدوں کو چھونے لگی۔ میں نے شاہد سے کہا "چلو واپس چلیں شاید منٹو گھر پہ نہ ہو۔" مگر شاہد نے میری امید پر پانی پھیر دیا۔

"وہ شام کو گھر ہی پر رہتا ہے۔ کیونکہ وہ شام کو روز پیتا ہے۔"

یہ جیسے مرے پہ سو دُرّے ایک تو منٹو، اور وہ بھی پیتا ہوا منٹو۔ مگر میں نے جی کڑا کر لیا۔ ایسا بھی کیا، مجھے کھا تو نہیں جائے گا، ہوئے وہ جو اُس کی زبان کی نوک پر ڈنک ہے۔ میں بلبلہ تو ہوں نہیں جو پھونک ماری تو بیٹھ جاؤں گی۔ چرچراتی گرد آلود سیڑھیاں طے کر کے ہم دوسری منزل پر پہنچے۔ فلیٹ کا دروازہ نیم وا تھا۔ ڈرائنگ روم نما کمرے میں ایک کونے میں صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ دوسری طرف ایک بڑا سا سفید صاف پلنگ پڑا تھا۔ کھڑکی سے ملی ہوئی ایک لدی پھندی بڑی سی میز کے سامنے ایک بڑی سی کرسی میں ایک باریک سکوڑے کی شکل کا انسان اُکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔

"آئیے آئیے۔" بڑی خندہ پیشانی سے منٹو کھڑا ہو گیا۔ منٹو ہمیشہ کرسی پہ اکڑوں بیٹھا کرتا تھا اور بہت مختصر نظر آتا تھا۔ لیکن جب کھڑا ہوتا تھا تو کھنچ کر اُس کا قد خاصا لمبا نکل آتا تھا۔ اور بعض وقت جب منٹو یوں رینگ کر کھڑا ہوتا تھا تو بڑا زہریلا معلوم ہوتا تھا۔ اُس جسم پہ کھدر کا کُرتہ پاجامہ اور جواہر کٹ صدری تھی۔

"ارے میں سمجھتا تھا آپ نہایت کالی دُبلی سوکھی مریل سی ہوں گی۔" اُس نے دانت نکال کر ہنستے ہوئے کہا۔

"اور میں سمجھتی تھی آپ نہایت دبنگ قسم کے گھبرو چنگھاڑتے ہوئے پنجابی ہوں گے۔" میں نے سوچا رسید دیتے چلو کہیں یہ ایک نہ لپیٹے پر لے لے۔

اور دوسرے ہی دم ہم دونوں پوری تندہی سے جٹ کر بحث کرنے لگے کہ جیسے اتنے عرصہ ایک دوسرے سے ناواقف رہ کر ہم نے بڑا گھاٹا اٹھایا ہو اور اُسے پورا کرنا ہو۔ دو تین بار بات اُلجھ گئی لیکن ذرا سا تکلف باقی تھا لہٰذا دوسری ملاقات کے لئے اٹھا رکھی۔ کئی گھنٹے ہمارے جٹے مشینوں کی طرح مختلف موضوعات پر جھگڑتے رہے۔ اور میں نے جلد ہی معلوم کیا کہ میری طرح منٹو بھی بات کاٹنے کا عادی ہے۔ پوری بات سننے سے پہلے ہی بول اٹھتا ہے۔ اور جو رہا سہا تکلف تھا وہ بھی غائب ہو گیا۔ باتوں نے بحث اور بحث نے باقاعدہ نوک جھونک کی صورت اختیار کر لی اور صرف چند گھنٹوں کی جان پہچان کے بل بوتے پر ہم نے ایک دوسرے کو نہایت ادبی قسم کے لفظوں میں احمق جھکی اور کج بحث کہہ ڈالا۔

گھمسان کے بیچ میں میں نے ایک بار کنارے ہو کر غور سے دیکھا۔ موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے لپکتی ہوئی بڑی بڑی سیاہ پتلیوں والی ملسی جھنیں دیکھ کر مجھے بے ساختہ مور کے پر یاد آ گئے۔ مور کے پر اور آنکھوں کا کیا جوڑ؟ یہ مجھے کبھی نہ معلوم ہو سکا۔ مگر جب بھی میں نے ان آنکھوں کو دیکھا مجھے مور کے پر یاد آ گئے۔ شاید رعونت اور گستاخی کے ساتھ ساتھ ان میں بیساختہ شگفتگی مجھے مور کے پروں کی یاد دلاتی تھی۔ ان آنکھوں کو دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ انہیں تو میں نے کہیں دیکھا ہے۔ بہت قریب سے دیکھا ہے قہقہہ لگاتے سنجیدگی سے مسکراتے۔ طنز کے نشتر برساتے اور پھر نزع کے عالم میں پتھراتے۔ وہی نازک نازک ہاتھ پیر، سر پہ ٹوکرا بھر بال پچکے زرد زرد گال اور کچھ بے تکے سے دانت بیٹھے بیٹھے اچانک منٹو کو اچھو لگا اور وہ کھانسنے لگا میرا ماتھا ٹھنکا۔ یہ کھانسی تو جانی پہچانی سی تھی ایسے میں نے بچپن سے سنا تھا۔ مجھے کوفت ہونے لگی نہ جانے کس بات پر میں نے کہا۔

"یہ بالکل غلط" اور ہم باقاعدہ لڑ پڑے۔

"آپ کج بحثی کر رہی ہیں"

"حماقت ہے یہ"

"دھاندلی ہے۔ عصمت بہن"

"آپ مجھے بہن کیوں کہہ رہے ہیں" میں نے چڑ کر کہا۔

"بس یونہی۔ عموماً میں عورتوں کو بہن کم کہتا ہوں۔ میں اپنی بہن کو بھی بہن نہیں کہتا"

"تو پھر مجھے چڑانے کو کہہ رہے ہیں"

نہیں تو وہ کیسے جانا آپ نے؟"

"اس لئے کہ میرے بھائی مجھے ہمیشہ جلانے چڑانے اور مارتے پیٹتے رہے۔ یا پکڑ کر پٹوانے رہے"۔ منٹو زور سے ہنسا۔

"تب تو میں ضرور آپ کو بہن ہی کہوں گا"

"تو اتنا یاد رکھئے کہ میرے بارے میں میرے بھائیوں کے خیالات بھی کچھ خوشگوار نہیں ہیں۔ یہ آپ کو کھانسی ہے اس کا علاج کیوں نہیں کرتے؟

"علاج؟ ڈاکٹر گدھے ہوتے ہیں۔ تین سال ہوئے ڈاکٹروں نے کہا تھا سال بھر میں مر جاؤ گے تمہیں ٹی۔ بی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ میں نے مر کر ان کی پیشین گوئی کو سچا ثابت نہ ہونے دیا۔ اور اب تو بس میں ڈاکٹروں کو احمق سمجھتا ہوں۔ ان سے تو مسمریزم اور جادو کرنے والے زیادہ عقلمند ہوتے ہیں"

"یہی آپ سے پہلے ایک بزرگ فرمایا کرتے تھے"

”کون بزرگ؟“

”میرے بھائی عظیم بیگ، دو من مٹی کے نیچے آرام فرما رہے ہیں۔“

تھوڑی دیر ہم عظیم بیگ کے فن پر بحث کرتے رہے۔ ہم نے مختصر ملاقات کرنے لیکن باتوں میں رات کے گیارہ بج گئے، شاہد بے چارے ہی جمائیاں الگ تھلگ بیٹھے دیکھ رہے تھے بھوک سے تنگ آ چکے تھے۔ ملاڈ پہنچتے پہنچتے ایک بج جائے گا لہٰذا کھانا کھا ہی لیا جائے۔ منٹو نے مجھ سے الماری سے پلیٹیں اور چمچے نکالنے کو کہا اور خود ہوٹل سے روٹی لینے چلا گیا۔

”ذرا اس برنی سے اچار نکال لیجئے۔“ منٹو نے تیزی سے میز پر کھانا لگایا اور کرسی پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ وہی میز جو دم بھر پہلے ادبی کارگزاریوں کا میدان بنی ہوئی تھی ایک دم کھانے کی میز کی خدمات انجام دینے لگی۔ اور بغیر کسی سے ”پہلے آپ“ کہے ہم لوگوں نے کھانا شروع کر دیا جیسے برسوں سے اسی طرح کھانے کے عادی ہوں۔

کھانے کے بیچ میں گرما گرم مباحثہ چلتا رہا۔ گھوم پھر کر منٹو ”لحاف“ کے بخیے ادھیڑنے لگتا جو ان دنوں میری دکھتی رگ بنا ہوا تھا۔ میں نے بہت ٹالنا چاہا مگر وہ ڈھٹائی سے اڑا رہا اور اس کا ایک ایک تار گھسیٹ ڈالا۔ اسے بڑا دھکا لگا یہ سن کر کہ مجھے ”لحاف“ لکھنے پر افسوس ہے۔ خوب ہی کھری کھری سنا ڈالیں اور مجھے نہایت بزدل اور کم نظر کہہ ڈالا۔ میں ”لحاف“ کو اپنا شاہکار ماننے پر تیار نہیں تھی اور منٹو مصر تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ”لحاف“ سے بھی بڑھ چڑھ کے ہم نے بحث کر ڈالی نہایت کھل کر۔ اور مجھے تعجب ہوا کہ منٹو گندی سے گندی اور بیہودہ سے بیہودہ بات دھڑلے سے اس معصومیت اور بھولپن سے کہہ جاتا ہے کہ ذرا جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ یا وہ مہلت دیتا ہی نہیں۔ اس کی باتوں پر ہنسی آجاتی ہے مگر غصہ نہیں آتا۔

چلتے وقت اس نے پھر صفیہ کا ذکر کیا۔ اتنی دیر ہم بیٹھے رہے اور منٹو کو صفیہ کی یاد نے کئی بار ستایا۔

”صفیہ بہت اچھی لڑکی ہے۔“

”صفیہ بہت عمدہ سالن پکاتی ہے۔“

”آپ اس سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔“

”بہت یاد آ رہی ہے۔ تو اسے بلا کیوں نہیں لیتے۔“ میں نے کہا۔

”ارے..... کیا سمجھتی اس کے بغیر سو نہیں سکتا۔“ وہ اپنی اصلیت پر اترنے لگا۔

”نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے۔“ میں نے بات ٹالی اور وہ ہنس پڑا۔

”آپ کو صفیہ سے بہت محبت ہے؟“ میں نے رازداری کے انداز میں پوچھا۔

”محبت!“ وہ چیخ پڑا جیسے میں نے اسے گالی دی ہو۔ ”مجھے اس سے قطعی محبت نہیں۔“ اس نے کڑوا منہ بنا کر بڑی بڑی پتلیاں گھمائیں۔ ”میں محبت کا قائل نہیں۔“

”ارے آپ نے کبھی کسی سے محبت ہی نہیں کی؟“ میں نے معمولی حیرت سے کہا۔

”نہیں۔“

”اور آپ کے کبھی گلسوئے بھی نکلے، خسرہ بھی نہیں ہوئی۔ مگر کالی کھانسی تو ضرور ہوئی ہوگی۔“ وہ ہنس پڑا۔

”محبت سے آپ کا مطلب کیا ہے۔ محبت تو ایک بڑی لمبی چوڑی چیز ہے۔ محبت ماں سے بھی ہوتی ہے بہن اور بیٹی سے بھی۔ بیوی سے بھی محبت ہوتی ہے۔ چپلوں اور بوٹ جوتے سے بھی محبت ہوتی ہے۔ میرے ایک دوست کو اپنی کتیا سے محبت ہے، ہاں مجھے

اپنے بیٹے سے محبت تھی؟" وہ بیٹے کے خیال پر ایک کرسی پر اُدھا ہو گیا۔ خدا کی قسم اتنا سا پیروں چلتا تھا۔ بڑا شریر تھا۔ گھٹنوں چلتا تھا تو فرش کی دراز وں میں سے مٹی نکال کر کھا لیا کرتا تھا۔ میرا کہنا بڑا مانتا تھا۔" عام باپوں کی طرح منٹو نے اپنے بیٹے کے عجیب و غریب پن کا یقین دلانا شروع کیا۔

"آپ یقین کیجئے چھ سات دن کا تھا کہ میں اُسے اپنے پاس سلانے لگا۔ میں اُسے خود تیل مل کر نہلاتا۔ تین مہینہ کا بھی نہیں تھا کہ ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگا تھا۔ بس صفیہ کو کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ دودھ پلانے کے سوا اُس کا کوئی کام نہ کرتی۔ رات کو تو بس پڑی سوئی رہتی میں چپ چاپ بچے کو دودھ پلوا لیتا۔ اُسے خبر بھی نہ ہوتی سنیے کہ دودھ پلانے سے پہلے یوڈی کلون یا اسپرٹ سے صاف کر لینا چاہیئے۔ نہیں تو بچے کے منہ میں دانے ہو جاتے ہیں۔" وہ بڑی سنجیدگی سے بولا اور میں حیرت سے اُسے دیکھتی رہی کہ یہ کیسا مرد ہے جو بچے پالنے میں مشاق ہے۔

"مگر وہ مر گیا۔" منٹو نے مصنوعی مسرت چہرہ پر لا کر کہا ۔۔۔ "اچھا ہوا جی وہ مر گیا۔ مجھے تو اُس نے آیا بنا ڈالا تھا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو آج میں اُس کے پوتڑے دھوتا ہوتا۔ نکما ہو کر رہ جاتا مجھ سے کوئی کام تھوڑی ہوتا۔ سچ ہے عصمت بہن مجھے اس سے عشق تھا۔"

"چلتے چلتے اُس نے پھر کہا کہ صفیہ آنے والی ہے بس جی خوش ہو جائے گا آپ کا اس سے مل کر۔"

اور واقعی صفیہ سے مل کر میرا جی خوش ہو گیا۔ منٹوں میں ہماری اتنی گُھٹ گئی کہ سر جوڑ کر پوشیدہ باتیں بھی ہونے لگیں۔ جو صرف عورتیں ہی کہتی ہیں عورتیں ہی سُنتی ہیں جو مردوں کے کانوں کے لئے نہیں ہوتیں۔

مجھے اور صفیہ کو یوں سر جوڑے کھسر پھسر کرتے دیکھ کر منٹو جل گیا۔ اور طعنے دینے لگا۔ اُس نے پچھلے کمرے کی چوبی دیوار سے کان لگا کر ہماری ساری سرگوشیاں سُن لی تھیں۔ وہ شریر بچوں کی طرح بولا۔

"توبہ توبہ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ عورتیں بھی اتنی گندی گندی باتیں کرتی ہیں۔"

صفیہ کے شرم سے کان لال ہو گئے۔

"اور آپ سے تو عصمت بہن مجھے قطعی اُمید نہ تھی کہ یوں محلّے کی جاہل عورتوں کی طرح باتیں کریں گی۔ کب شادی ہوئی، شادی کی رات کیسی گذری۔ بچہ کب اور کیسے پیدا ہوا۔ توبہ ہے۔" وہ چڑانے لگا۔

میں نے فوراً لگام لگائی۔ "حد ہے منٹو صاحب میں آپ کو اتنا تنگ نظر نہ سمجھتی تھی۔ ارے آپ بھی ان باتوں کو گندی کہتے ہیں۔ ان میں گندگی کیا ہے؟ بچہ کی پیدائش دُنیا کا حسین ترین حادثہ ہے۔ اور یہ کانا پھوسی ہی تو ہمارا ٹریننگ اسکول ہے۔ کیا سمجھتے ہیں آپ کا کالج میں بچے دینا سکھایا گیا ہے۔ وہاں کے بوڑھے پروفیسر بھی آپ کی طرح ناک بھوں چڑھا کر توبہ توبہ کہتے رہے۔ محلے کی عورتوں ہی سے تو ہم نے زندگی کے اہم ترین راز جانے ہیں۔

"یہ صفیہ سخت جاہل ہے۔ ادب وب کچھ نہیں سمجھتی ہر بات پر تھو تھو کرتی ہے۔ آپ کی تحریروں سے سخت خفا ہے۔ آپ کا جی نہیں گھبراتا اس سے گھنٹوں باتیں کر کے۔ کہ قورمے میں کتنی ہلدی، اور کی دال کے دہی بڑے۔۔۔"

"اے منٹو صاحب قورمے میں ہلدی کہاں پڑتی ہے۔" صفیہ نے ہیبت زدہ ہو کر کہا۔

اور منٹو لڑ پڑا۔ وہ بضد تھا کہ ہلدی ہر کھانے میں پڑنی چاہیئے اور جو نہیں پڑتی تو یہ سراسر ظلم اور ناانصافی ہے۔" میرا ایک راجپوت دوست تھا وہ گھی اور ہلدی پی کر جاڑوں میں کسرت کیا کرتا تھا۔ پورا پہلوان تھا۔" اور ہم مصر تھے کہ آپ کا دوست گھی اور ہلدی چھوڑ کیچڑ پیتا تھا ہم کسی شرط پہ ہلدی ڈالنے کو تیار نہیں۔ اور منٹو کو قائل ہونا پڑا۔

میں اور منٹو اگر پانچ منٹ کے ارادے سے بھی ملتے تو پانچ گھنٹے کا پروگرام ہو جاتا۔ منٹو سے بحث کر کے ایسا معلوم ہوتا جیسے کسی نے تلوار پر دھار رکھی جا رہی ہے۔ جالا صاف ہو رہا ہے دماغ میں جھاڑو سی دی جا رہی ہے۔ اور بعض وقت بحثیں اتنی طویل اور گھن دار ہو جاتیں کہ ایسا معلوم ہوتا بہت سے کچے سوت کی پونیاں اُلجھ گئی ہیں۔ اور واقعی سوچنے اور سمجھنے کی قوت پر جھاڑو پھر گئی۔ مگر دونوں بحثتے بحثتے تھک جاتے، بدمزگی پیدا ہونے لگتی۔ مجھے تو اپنی شکست کو چھپانے کا ملکہ تھا۔ مگر منٹو بالکل روہانسا ہو جاتا آنکھیں مور پنکھیوں کی طرح تن کر پھیل جاتیں۔ نتھنے پھڑکنے لگتے منہ کڑوا کسیلا ہو جاتا اور وہ جھنجھلا کر اپنی حمایت میں شاہد کو پکارتا۔ اور جنگ ادب یا فلسفے سے پلٹ کر گھریلو صورت اختیار کر لیتی۔ منٹو بھنا کر چلا جاتا۔ شاہد مجھ سے لڑتے کہ "تم میرے دوستوں سے اتنی بدتمیزی سے کیوں باتیں کرتی ہو۔ منٹو آج خفا ہو گیا ہے اب وہ ہمارے ہاں نہیں آئے گا اور نہ میری ہمت ہے کہ اُس کے ہاں جاؤں وہ بدتمیز آدمی ہے۔ کچھ کہہ بیٹھے گا تو میری اُس کی پرانی دوستی ختم ہو جائے گی۔"

اور مجھے بھی کبھی محسوس ہوتا کہ واقعی میں نے منٹو کو کڑوی بات کہہ دی ممکن ہے روٹھ جائے اور ہماری اور صفیہ کی دوستی بھی ختم ہو جائے جو اب منٹو سے زیادہ گہری اور پائیدار ہو گئی تھی۔ منٹو کی خودداری رعونت کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ وہ اپنے دوستوں پر رعب جمانے کا بڑا شوقین تھا۔ اور اگر اُن دوستوں کے سامنے جن کو وہ مرعوب کر چکا ہو کوئی اُس کا مذاق بنا دے تو وہ بُری طرح چڑ جایا کرتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ جیسے وہ اور میں تو پلے کے ہیں ایک دوسرے کو کہہ سن سکتے ہیں مگر عام لوگوں کے سامنے ایک دوسرے پر چوٹیں نہ کرنی چاہئیں۔ وہ زیادہ تر اپنے ملنے والوں کی ذہنی سطح کو اپنے سے نیچا سمجھتا تھا۔

لیکن صبح لڑائی ہوتی اور اتفاق سے شام کو پھر ملاقات ہو جاتی تو وہ اس قدر جوش سے ملتا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو اور ویسے ہی گھل مل کر باتیں ہوتیں۔ تھوڑی دیر ہم ایک دوسرے سے بڑے ادب اور ضرورت سے زیادہ نرمی سے بولتے۔ ہر بات پر ہاں میں ہاں ملاتے۔ مگر بہت جلد ہی اس تصنع سے دل اُکتا جاتا۔ اور اُس کا بھی۔ اور پھر چلنے لگتی دونوں طرف سے آتش بازی۔ اور گولیوں کی سی تندی آ جاتی۔ کبھی لوگ ہم دونوں کو یوں اُلجھا کر مزے لینے لگتے اور ہم پھر مل کر ایک دوسرے سے مل جاتے۔ ہم بحث کرتے تھے اپنی دلچسپی کے لئے نہ کہ اُن کے لئے بٹیر بن کر لطف پیدا کرتے۔ منٹو کی بھی یہی رائے تھی کہ گھر پر چاہے جتنی اُلٹی سیدھی بحث کر لیں مگر محفلوں میں ہمیں مورچہ بنا کر جانا چاہیئے۔ اور ہمارا مورچہ اتنا مضبوط ہو گا کہ لوگوں کے چھکے چھڑا دے گا۔ مگر مجھے عموماً مورچے سے اپنی وفاداری کا احساس نہ رہتا اور مورچہ بھڑوں کے چھتے کی طرح بھنکارنے لگتا۔

مجھے کبھی نہ معلوم ہو سکا کہ منٹو پی کر بہکتا ہے یا بہک کر پیتا ہے۔ میں نے اُس کی چال میں لڑکھڑاہٹ یا زبان میں لکنت نہ پائی۔ مجھے تو کبھی کوئی فرق ہی نہیں محسوس ہوا۔ ہاں بس اتنا معلوم ہوتا تھا کہ جب زیادہ پئے ہو تو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا تھا کہ وہ بالکل نشے میں نہیں اور جان کو آ جاتا تھا۔

"میں آپ سے سچ کہتا ہوں عصمت بہن میں بالکل نشے میں نہیں۔ اور میں آج پینا چھوڑ سکتا ہوں۔ میں جب چاہوں پینا چھوڑ دوں آپ شرط لگا لیجئے۔"

"میں شرط نہیں لگاؤں گی کیونکہ آپ ہار جائیں گے۔ آپ پینا نہیں چھوڑ سکتے۔ اور آپ نشے میں ہیں۔"

کیسا کیسا منٹو ثبوت دیتا کہ وہ نشے میں نہیں وہ اسی وقت پینا چھوڑ سکتا ہے صرف شرط لگانے کی دیر ہے۔ ایک دن تنگ آ کر مجھے شرط لگانی پڑی اور منٹو شرط ہار گیا۔ میں جیت گئی۔ مگر کیا؟ شرط تو لگی تھی لیکن کوئی رقم مقرر نہ ہوئی تھی۔ اُس کے بعد جب منٹو کو بہت چڑھ جاتی اور وہ شرط لگانے پر اڑ جاتا اور سوائے شرط لگانے کے کوئی خلاصی نظر نہ آتی تو ہار کر مجھے شرط لگانا ہی پڑتی۔

خود کو ہندوستانی کی عادت تھی۔ مگر عموماً میرے سامنے اپنے ساتھ مجھے بھی گھسیٹ لیا کرتا تھا۔ اور اس وقت میرے اور اپنے سوا دنیا بھر میں کسی کو ادیب نہ مانتا۔ خاص طور پر کرشن چندر اور دیوندر ستیارتھی کے خلاف ہو جاتا۔ اگر ان کی تعریف کرو تو سلگ اٹھتا۔ میں کہتی آپ کوئی تنقید نگار تو ہیں نہیں جو آپ کی بات مانی جائے اور وہ تنقید نگاروں کو جلی کٹی سنانے لگتا۔ ایک عرصے سے ان کے وجود کو ہی مہمل سمجھتا خاص طور پر ادب کے لئے۔

"کیا خاک کہتے ہیں یہ لوگ" وہ جل کر کہتا "جو یہ کہنے جائیں بس اس کا الٹا کہتے جاؤ۔ یہی لوگ جو اعتراض کرتے ہیں چھپ چھپ کر میری کہانیاں پڑھتے ہیں اور ان سے کچھ سیکھنے کے بجائے لطف اندوز ہوتے ہیں اور پھر اس لطف کی یاد پر نادم ہو کر اول فول لکھتے ہیں۔ وہ کبھی ناراض ہو جاتا گو میں اسے تسلی دینے کو کہتی جب آپ کو یقین ہے کہ یہ اول فول لکھتے ہیں تو آپ ان کا جواب کیوں دینے لگتے ہیں۔ اگر تنقید سے آپ کو مدد نہیں ملتی تو نہ لیجئے مگر رائے عامہ کو تو ملعون نہ کیجئے۔ مگر وہ بھناتا رہتا۔

ایک دن بڑی سنجیدہ صورت بنائے آئے اور کہنے لگے۔

"مقدمہ دائر کریں گے"

میں نے کہا "کون؟"

کہنے لگے "ہم۔ یعنی میں اور آپ۔ اس مردود نے میری اور آپ کی کہانی ایک مجموعہ میں یہ لکھ کر چھاپی ہے کہ یہ فحش ہے ایسے ادب سے ملک کو بچانا چاہئے اب اس کمبخت سے پوچھو کہ کیسی الٹی بات کر رہا ہے۔ ایک تو اسے کتاب میں چھاپ کر مشتہر کر رہا ہے دوسرے بیہ کہ اس کا الگ انتظام کر رہا ہے۔ اس نے ہماری اجازت کے بغیر کیوں کہانیاں چھاپی ہیں اسے نوٹس دلوا رہا ہوں کہ ہرجانہ دے" پھر نہ جانے بھول بھال گئے۔

منٹو اپنی ڈینگوں سے زیادہ میرے سامنے اپنے دوستوں کی شیخی بگھارا کرتا تھا۔ رفیق غزنوی سے کچھ عجب قسم کی محبت تھی جو میری سمجھ میں نہ آئی۔ جب اس کا تذکرہ کیا یہی کہا "بڑا بدمعاش لفنگا ہے۔ ایک ایک کر کے چار بہنوں سے شادی کر چکا ہے۔ لاہور کی کوئی رنڈی ایسی نہیں ہوگی اس نے اپنے جوتے پر ناک نہ گھسوائی ہو"

بالکل رفیق کا ایسے ذکر کرتا جیسے بچے بڑے بھیا کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے عشقوں کے قصے تفصیلوں سے سنایا کرتا۔ ایک دن مجھے اس سے ملنے کو کہا۔ میں نے کہا کیا کروں گی مل کر، آپ تو کہتے ہیں لفنگا ہے وہ۔

کہنے لگے ارے جبھی تو ملا رہا ہوں۔ یہ آپ سے کس نے کہا کہ لفنگا اور بدمعاش برا آدمی ہوتا ہے۔ رفیق نہایت شریف آدمی ہے۔

میں نے کہا "منٹو صاحب لفنگا، شریف، بدمعاش یہ آخر کیسا آدمی ہے میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ مجھے جتنا ذہین اور تجربہ کار سمجھتے ہیں شاید ویسا نہیں"

"آپ ملتی ہیں" منٹو نے برا مان کر کہا "جبھی تو میں آپ کو رفیق سے ملانا چاہتا ہوں ــــ بڑا دلچسپ آدمی ہے۔ کوئی عورت بغیر عاشق ہوئے نہیں رہ سکتی"

"میں بھی تو عورت ہوں" میں نے فکرمند بن کر کہا۔ اور وہ کھسیانا ہو گیا۔

"میں آپ کو اپنی بہن سمجھتا ہوں"

"مگر آپ کی بہن بھی تو عورت ہو سکتی ہے" منٹو نے قہقہہ لگایا۔

"ہو سکتا ہے! یہ خوب کہا" "اگر منٹو کو ضد ہو گئی" "آپ کو اُس سے ملنا پڑے گا۔ دیکھئے تو سہی"
"میں اسٹیشن پر دیکھ چکی ہوں۔ آپ نے میرے ایسے کان بھر دیئے تھے کہ میں بھاگ آئی کہ کہیں کمبخت پھر عاشق نہ ہونا پڑے"
اور رفیقہ سے ملنے کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ منٹو کا مطالعہ کتنا گہرا ہے۔ باوجود دُنیا کے سارے عیب گنانے کے رفیقہ میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ایک مہذب انسان میں ہونا چاہئیں۔ وہ ایک عجیب بدمعاش ہو سکتا ہے۔ ساتھ ہی نہایت ایمان دار اور شریف بھی۔ یہ کیسے اور کیوں؟ یہ میں نے سمجھنے کی کوشش نہ کی یہ منٹو کا میدان ہے وہ دُنیا کی ٹھکرائی کمو لے پر پھینکی ہوئی غلاظت میں سے موتی چن کر نکال لاتا ہے۔ گھورا کو بیٹے کا اُسے شوق ہے کیونکہ دُنیا کے سنوارنے والوں پر اُسے بھروسہ نہیں۔ اُن کی عقل اور فیصلہ پر بھروسہ نہیں۔ وہ اُن کی شریف اور پاکباز بیویوں کے دل کے چور پکڑ لیتا ہے۔ اور کوٹھے میں رہنے والی رنڈی کے دل کے تقدس سے اُس کا موازنہ کرتا ہے۔ عطر میں ڈوبی ہوئی بیش پسند دولہن سے میلی اور پسینے میں سڑتی ہوئی گھاٹن زیادہ خوشبودار معلوم ہوتی ہے۔ "بُو" میں حالانکہ جسم ہی جسم ہے۔ غور سے دیکھئے تو جسم کے اندر روح بھی ہے۔ عیش پرست طبقہ کی بھٹے ہوئے دو دمہ کی طرح پھٹکیوں دار روح اور گلے ہوئے مجھے کی تعفن سے دور اصلیت۔ اگر طبقاتی تفریق کا سوال نہیں تو ہم اسے قطعی طور پر جسمانی سوال بھی نہیں کہہ سکتے۔ منٹو کے ذہن میں ضرور دو طبقوں کے فرق کا خیال تھا۔ اور وہ اُس بُت کو جس کی دُنیا پوجا کرے زمین پر پٹخنے میں بڑی بہادری محسوس کرتا تھا۔

وہ ہمیشہ اپنے بدمعاش دوستوں کے کارنامے فخر سے سنایا کرتا۔ ایک دن میں نے جلانے کو کہہ دیا یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ اصل میں نہ ہزاروں رنڈیوں سے ان کا تعلق رہا اور نہ ہی انھوں نے کبھی کسی عورت کی آبرو ریزی کی۔ اور وہ طرح طرح سے مجھے یقین دلانے لگا کہ یہ لوگ واقعی بدمعاشیاں کرتے ہیں اتنی ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

"سب جھوٹ" میں دھاندلی کرنے لگی۔

"ارے آپ کو یقین کیوں نہیں آتا۔ بازار میں جو چاہے جا سکتا ہے"

"مگر ان لوگوں کی اتنی ہمت نہیں جو طوائفوں کے کوٹھوں پر جا سکیں۔ بہت کرتے ہوں گے گانا سن کر چلے آتے ہوں گے"

"مگر میں خود گیا ہوں رنڈی کے کوٹھے پر"

"گانا سننے" میں نے چڑایا۔

"جی نہیں، اپنے دام وصول کرنے۔ اور ہمیشہ میرے دام وصول ہو گئے" پھر بھی میں نے کہا۔

"میں نہیں یقین کرتی"

"وہ کیوں؟" وہ اُٹھ کر بالکل میرے سامنے قالین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔

"بس میری مرضی۔ آپ میرے اوپر رعب ڈالنا چاہتے ہیں"

"بھئی خدا کی قسم میں کہتا ہوں میں گیا ہوں"

"خدا پر آپ کو یقین نہیں بیکار اُسے نہ گھسیٹئے"

"اپنے مرحوم بچے کی قسم کھاتا ہوں میں ایک بار نہیں بلکہ......"

"مرحوم بچے کو اب آپ جھوٹی قسم کھا کر کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں"

اور منٹو وہیں پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا۔ کہ آج تو منوا کر رہوں گا کہ میں رنڈی باز ہوں۔ صفیہ کی گواہی دلوائی۔ میں نے دو منٹ میں صفیہ کو چت کر دیا کہ ممکن ہے یہ تم سے کہہ کر گئے ہوں کہ رنڈی کے یہاں جا رہے ہیں۔ اور اگر گئے بھی ہوں تو سلام کر کے چلے آئے ہوں گے۔

صفیہ چپ سی ہو گئی "۔ اب یہ تو میں نہیں کہہ سکتی کہ سلام کر کے آ گئے یا . . . " وہ عجیب گومگو میں رہ گئی ۔
منٹو غصے اور جوش میں کچھ زیادہ تیزی سے پی ڈالی اور بری طرح لڑنے لگا کہ یہ تو آج منوا کر چھوڑ دوں گا کہ میں پکا رنڈی باز ہوں۔ اور میں نے
سوچا آج اودھر کی دنیا اودھر ہو جائے میں مان کے دوں گی نہیں ۔
ایک تو نشہ دوسرے منٹو کے مزاج کو چڑ لگی اگر بس چلتا تو میرا منہ نوچ لیتا ۔
صفیہ نے بہت کہا۔ بھئی جاؤ شاہد کہا اب گھر چلو گر منٹو نے شاہد کی ٹانگ لینی شروع کی ۔ اور کہہ دیا کہ بغیر قائل ہوئے جانے نہیں دوں گا۔
ما ہنگامہ ہو گیا ۔
بڑی سنجیدگی سے منٹو نے شاہد سے کہا چلو رنڈی کے یہاں ابھی اسی وقت آج میں قائل نہ کر دوں تو میں نے ماں کا دودھ نہیں شوز کا
دھ پیا "۔ مگر میں نے اور چڑایا ۔
" آپ جائیں وائیں گے نہیں یونہی باہر کلا بورج پر گھوم کر آ جائیں گے ۔ اور ہم یقین نہیں کریں گے کیا فائدہ "؟
اب تو منٹو کے سر میں لگی تو ایڑی میں جا کر شاید بجھی ہو۔ غصہ ضبط کر کے پوچھا ۔
" پھر کیسے یقین دلایا جائے "
میں نے کہا " ہمیں بھی مجھے اور صفیہ کو بھی ساتھ لے چلیے "
" میں نہیں جاؤں گی " صفیہ بگڑی " تمہارا تو دماغ خراب ہوا ہے تم ہی جاؤ "
" جانے کی کیسے نہیں " منٹو غرّایا ۔
" چلو چلو " صفیہ کو ہم نے آنکھ ماری اور چاروں چلے ۔ دروازے سے ہم دونوں تو نکل آئے منٹو کو صفیہ نے نہ جانے کیسے قابو میں کیا
ی دفعہ جب ملاقات ہوئی تو منٹو نے خوب قہقہے لگائے اور پھر چپکے سے کہا " مگر اب تو مان جاؤ "
میں نے کہا " قطعی نہیں "
مجھے نہیں معلوم منٹو کو تجربہ تھا یا جو کچھ اس نے رنڈی کے بارے میں کہا ہے وہ اس کے اپنے اصول اور یقین کی بنا پر ہے ۔ کیونکہ اگر وہ
ے کو ٹھے پر گیا بھی ہو گا تو وہاں رنڈی سے زیادہ اس نے ایک عورت کا دل دیکھا ہو گا جو باوجود یکہ موری کا کیڑا ہے مگر زندگی کی
لو پیار کرتی ہے ۔ اچھے اور برے کو ناپنے کے جو پیمانے عام طور پر بنا دیے گئے ہیں وہ انہیں توڑ پھوڑ کر اپنی بنائی ہوئی تول سے ان کا
لگاتا تھا ۔ خوشیا جیسے ڈھیٹ اور نکمے انسان کی رگ حمیت بھی بھڑک سکتی ہے ۔ گوپی ناتھ جیسا دقیق انسان بھی دیوتاؤں پہ بازی لے جا
ہے ۔ ملنپار دھان دیوتا بھی سرنگوں ہو سکتے ہیں ۔ قومی رضا کار بدکار بھی ہو سکتے ہیں ۔ اور لاش سے زنا کرنے والا خود لاش بھی بن سکتا ہے ۔
بھی کبھی میرا اور منٹو کا جھگڑا اتنا سخت ہو جاتا کہ دوستی ٹوٹتی معلوم ہوتی ۔ ایک دن کسی بات پہ ایسا چڑا کہ آنکھوں میں خون اتر آیا دانت
لو لا ۔
ب عورت ہیں ورنہ ایسی بات کہتا کہ دانت کھٹے ہو جاتے "
ل دل کا ارمان نکال لیجئے مروّت کی ضرورت نہیں " میں نے چڑایا ۔
بہ جانے بھی دیجئے کوئی مرد ہوتا تو بتاتے "
تا بھی دیجئے ۔ ایسے کون سے تیر ترکش میں باقی رہ گئے ہیں نکال بھی دیجئے "
ب سہنب جائیں گی "

"قسم خدا کی نہیں چھینپوں گی۔"

"تو آپ عورت نہیں۔"

"کیوں کیا عورت کے لئے جھینپنا شرط ضروری ہے۔ چاہے جھینپ لگے یا نہ آئے۔ بڑا افسوس ہے منٹو صاحب آپ بھی عورتوں اور مردوں کے لئے الگ الگ اصول مانتے ہیں۔ میں سمجھی تھی آپ عام لوگوں کی سطح سے بلند ہیں۔" میں نے مسکرا دیا۔

"قطعی نہیں ۔ میں عورت اور مرد میں تفریق نہیں سمجھتا۔"

"تو پھر کہئے۔ وہ جھینپا دینے والی بات۔"

"نہیں۔ اب غصہ آ گیا۔" وہ ہنس کر بولا۔

"اچھا دوستی ہی میں سہی بتائیے وہ کونسی خطرناک بات تھی۔"

"کچھ نہیں۔ اب کچھ یاد نہیں رہا۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ شاید کوئی موٹی سی گالی دے دیتا۔"

"بس۔" میں نے نا امید ہو کر کہا۔

"یا شاید کس کے جھانپڑ مارتا۔" نادم ہو کر بولا۔

"مجھ پر کچھ بھی اثر نہ ہوتا میں نے ایسی الجھی نجیم کا لیاں سنی ہیں کہ حد نہیں اور میرے تھپڑ بھی غلطی زور کے پڑ چکے ہیں۔ مگر پہلی دفعہ آپنے عورت سمجھ کر رعایت کی۔ میرے بھائی تو لگا چکے ہیں کئی بار۔" اور ہمارا ملاپ ہو گیا۔

ایک دن دفتر میں گرمی سے پریشان ہو کر میں نے سوچا جا کر منٹو کے یہاں آرام کر لوں پھر واپس ملاد جاؤں۔ دروازہ حسب معمول کھلا ہوا تھا جا کر دیکھا تو صفیہ منہ پھلائے لیٹی ہے۔ منٹو ہاتھ میں جھاڑو لئے سناسٹ پلنگ کے نیچے ہاتھ مار رہا ہے۔ اور ناک پر کرتے کا دامن رکھے میز کے نیچے جھاڑو چلا رہا ہے۔

"یہ کیا کر رہے ہیں۔" میں نے میز کے نیچے جھانک کر پوچھا۔

"کرکٹ کھیل رہا ہوں۔" منٹو نے بڑی بڑی مورپنکھ جیسی پتلیاں گھما کر جواب دیا۔

"یہ لیجئے! ہم نے سوچا تھا ذرا آپ کے یہاں آرام کریں گے تو آپ لوگ روٹھے بیٹھے ہیں۔" میں نے واپس جانے کی دھمکی دی۔

"ارے! صفیہ اٹھو بھئی؟ آؤ آؤ۔"

"کاہے کا جھگڑا تھا۔" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں میں نے کہا کھانا پکانا گرہستی وغیرہ مردوں کا کام نہیں۔ بس جیسے تم سے الجھتے ہیں مجھ سے بھی الجھ پڑے کہ کیوں نہیں مردوں کا کام میں ابھی جھاڑو دے سکتا ہوں۔ میں نے بہت روکا تو اور لڑنے لگے کہنے لگے ایسا ہی ہے تو طلاق دے لے۔" صفیہ نے بسور کر کہا۔

منٹو سے جھاڑو چھڑانے کے لئے میں نے بن کر کہنا شروع کیا۔ "صبح ہی صبح میونسپلٹی کے بھنگی نے صحن صاف کرنے کے بہانے دھول حلق میں جھونک اب آپ ارمان نکال لیجئے۔ گرمی کے مارے جان نکل رہی ہے۔"

جلدی سے جھاڑو چھوڑ منٹو ہوٹل سے برف لانے چلا گیا۔ صفیہ ہنڈیا کھانے چلی گئی۔ برف لا کر منٹو نے تولیہ دیوار پہ مار مار کر توڑی اور پلیٹ میں بھر کر سامنے رکھ دی اور اکڑوں بیٹھ گیا۔

"اور سنائیے۔" اس نے حسب عادت کہا۔ ہانڈی کے بگھار سے مجھے زور سے ابکائی آئی۔

"اری صفیہ کیمرہ وہ جلا رہی ہے" میں نے ناک بند کر کے کہا۔ منٹو نے چونک کر مجھے دیکھا سر سے پیر تک بڑی بڑی پتلیاں گھمائیں اور پھٹ سے مار کر چھپٹا۔ باورچی خانے میں صفیہ چیختی رہی اور اُس نے بھر لوٹا پانی پتیلی میں جھونک دیا۔

واپس آکر وہ سہاسہا رسان سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور پھر کچھ جھینپ کر ہنس دیا۔

میں بیوقوفوں کی طرح دیکھتی رہی۔

صفیہ بڑبڑاتی آئی تو اسے زور سے ڈانٹا پھر بڑے شرمیلے انداز سے بولا۔

"آپ کے پیٹ میں بچہ ہے؟ جیسے بچہ میرے نہیں خود اُس کے پیٹ میں ہو" میں نے فوراً تاڑ لیا۔ جب صفیہ کے پیٹ میں بچہ تھا تو اسے بھی گھبا سے اُبکائی آتی تھی"

"منٹو صاحب خدا کے لئے دائیوں جیسی باتیں نہ کرو" میں نے چڑ کر کہا۔ وہ زور سے ہنسا۔

"ارے واہ۔ اس میں کیا بُرائی ہے۔ ارے آپ کو کھٹی جیسی چیزیں بھاتی ہوں گی۔ میں ابھی کیریاں لاتا ہوں" وہ لپک کر نیچے گیا اور کرتے کے دامن میں بچوں کی طرح کیریاں بھر کے لے آیا۔ کیریاں چھیل کر بڑی نفاست سے نمک مرچ لگا کر مجھے دیں اور خود اکڑوں بیٹھا مجھے غور سے دیکھ کر مسکراتا رہا۔

"صفیہ ارے صفیہ" وہ چلایا۔ صفیہ دھوئیں سے اُنی آنکھیں آنچل سے پونچھتی ہوئی آئی "کیا ہے منٹو صاحب کتنا چلاتے ہو"

"ارے بیوقوف۔ ان کا پیر بھاری ہے" اُس نے صفیہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

"اُف گندگی کی انتہا ہے۔ جبھی تو آپ کو لوگ فحش نگار کہتے ہیں" میرے اس بگڑنے پر منٹو خوب چہکا۔ اور بڑی بوڑھیوں جیسے مشورے دینے لگا۔

"پیٹ پر زیتون کے تیل کی مالش سے گھروندے نہیں پڑیں گے"

"نہار منہ سیب کا مربہ کھانے سے ابکائیاں نہیں آئیں"

"کھوپرہ کھانے سے بچہ گورا ہوگا اور آسانی سے ہوگا"

"جاپے میں برف نہ چاہیئے گا۔ نلے سوج جاتے ہیں کیوں صفیہ؟"

"ہٹو منٹو صاحب کیسی باتیں کرتے ہو" صفیہ کھسیا کر رہ گئی۔

اور جب سیما پیدا ہوئی تو صفیہ میرے پاس بیٹھی کانپتی رہی۔ مگر بچی کو دیکھ کر منٹو کو اپنا بیٹا بہت یاد آیا وہ دیر تک مجھے اُس کی چھوٹی چھوٹی شرارتیں بتاتا رہا۔ صفیہ کا دل کھل گیا اور سال کے اندر اندر منٹو کی بڑی بیٹی نکہت پیدا ہو گئی۔ پرانے ستنے کے بعد مجھے معلوم ہوا جب نور آگئی تو منٹو نے مکان بدل لیا تھا۔ ڈھونڈھ ڈھانڈ کر نئے مکان پہنچی تو دیکھا ڈرائنگ روم میں الگنی پر پوتڑے بچھونے ٹنگے پھیلے ہیں۔ نیا مکان بہت چھوٹا اور بغیر ہوا کا تھا۔ منٹو نے اس لئے بدل لیا کہ اُس کا فرش گندہ تھا بچی گھٹنوں چلتی تو پھانس لگ جاتی یا دھول چاٹ جاتی۔ یہاں نکہت مزے سے فرش پر کھیل سکے گی۔ حالانکہ نکہت چند ہفتوں کی تھی۔

"مجھے بچے سخت ناپسند ہیں" منٹو سنجیدگی سے کہتا "جان کو چمٹ جاتے ہیں۔ مجھے ان سے اسی لئے ڈر لگتا ہے۔ ہر وقت انہیں کا خیال رہتا ہے کسی کام میں دل نہیں لگتا" وہ دودھ کی بوتل دھو کر فلسفہ چھانٹتا۔ میری بھتیجی مینو اسے بڑی پیاری لگتی۔ گھنٹوں اُس کے ساتھ گڑیوں اور ہنڈکلیوں کی باتیں کیا کرتا۔ فرمائش پر کمرے کی سے بانس ڈال کر اس کے لئے املیاں توڑ کر نیچے سے کرتے کے دامن میں سمیٹ لاتا۔ سیما کو پاٹ پر بٹھا کر "شی شی" کرتا۔ اور بچوں کا بہت شائق تھا کیونکہ وہ اُن کی محبت میں بے بس ہو جاتا تھا۔

ایک دن جب ہم ملاڈ میں رہتے تھے۔ رات کے کوئی ساڑھے بارہ بجے ہوں گے کہ دروازے پر دستک ہوئی معلوم ہوا صفیہ بھولی بھولی سی کھڑی ہیں۔ میں نے پوچھا کیا ہوا۔ بولی "میں نے منع کیا کہ ایسی حالت میں کسی کے گھر نہیں جانا چاہیئے مگر وہ کہاں سنتے ہیں" منٹو، نذیر اجمیری اور خورشید انور کے آ گئے۔

"یہ صفیہ کرن ہوتی ہے منع کرنے والی" ہاتھ میں بوتل اور گلاس لئے تینوں در آئے۔ شاہد نے پارٹی کو لبیک کہا۔ سلے ہوا ایک بجے ہیں ہوٹل سب بند ہو چکے ہیں، ریل کا وقت گزر گیا۔ کچھ مل جائے تو خود پکا کر کھا لیں۔ بس آٹا دال دے دو خود باورچی خانے میں جا کر پکا لیں گے۔

صفیہ کو مردوں کا روٹی پکانا قطعی نہ بھایا۔ مگر وہ کہاں مانتے تھے۔ باورچی خانہ پر چڑھائی کر دی۔ منٹو آٹا گوندھنے لگے۔ نذیر اجمیری انگیٹھی پر ٹوٹ پڑے اور خورشید انور کو آلو چھیلنے کو دے دیئے گئے جو وہ چھیلنے سے زیادہ کچے کھانے پر مصر تھے۔ اور پھر بوتل بھی باورچی خانے میں آ گئی۔ لوگ پھسکڑا مار کر وہیں بیٹھ گئے اور کچے پکے پراٹھے پکاتے گئے کھاتے گئے۔ منٹو نے آٹا بہت اچھا گوندھا اور بڑے سلیقے سے روٹی پکائی۔ اور پھر محبت سے پودینے کی چٹنی پیس ڈالی۔ کھانا کھا کر یہ لوگ وہیں پھیل کر سو بھی جاتے اگر زبردستی برآمدے تک نہ گھسیٹا جاتا ——

یہ زندگی تھی جو منٹو کو سب سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوتی تھی۔ معقول آمدنی ہو۔ پینا پلانا ہو، قہقہے ہوں اور بے فکریاں۔ ہر بات مذاق معلوم ہوتی تھی۔ اُسی زمانے میں لاہور گورنمنٹ نے میرے اور منٹو پر مقدمہ چلا دیا۔ منٹو کی دیرینہ آرزو بر آئی۔ لاہور میں بھی لطف آ گیا۔ خوب دھومیں اُڑائیں۔ اسی بہانے لاہور کی زیارت ہو گئی۔ زری کے جوتے خریدنے ہم دونوں ساتھ گئے۔ منٹو کے پیر بہت نازک اور سفید تھے۔ جیسے کنول کے پھول۔ زری کے جوتے بہت پھبنے لگے۔

"میرے پیر بڑے بھدے ہیں۔ میں نہیں خریدوں گی اتنے خوبصورت جوتے" میں نے کہا۔

"اور میرے پیر اتنے زنانے ہیں کہ مجھے اُن سے شرم آتی ہے" مگر ہم دونوں نے کئی جوڑ جوتے خریدے۔

"آپ کے پیر بہت خوبصورت ہیں" میں نے کہا۔

"بکواس ہیں میرے پیر۔ لائیے بدل لیں۔"

"بدلنا ہی ہے تو لائیے سر بدل لیں" میں نے رائے دی۔

"بخدا مجھے کوئی اعتراض نہیں" منٹو نے جھک کر کہا۔

محبت کے مسئلہ پر کتنی ہی جھڑپیں ہوئیں مگر کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکے۔ وہ یہی کہتا۔

"محبت کیا ہوتی ہے۔ مجھے اپنے زری کے جوتے سے محبت ہے۔ رفیق کو اپنی پانچویں بیوی سے محبت ہے"

"میرا مطلب اس عشق سے ہے جو ایک نوجوان کو ایک دوشیزہ سے ہو جاتا ہے"

"ہاں...... میں سمجھ گیا۔ منٹو نے دورِ ماضی کے دھندلکوں میں کچھ ٹٹول کر سوچتے ہوئے خود سے کہا "کشمیر میں ایک چرواہی تھی"

"پھر؟" میں نے داستان سننے والوں کی طرح ہنکارا دیا۔

"پھر کچھ نہیں" وہ ایک دم بچاؤ کے لئے تن گیا۔

"آپ مجھے اتنی گندی باتیں تو بتا دیتے ہیں اور آج آپ شرماتے ہیں"

" کرن گجھا شرما رہا ہے"۔ منٹو نے واقعی شرما کر کہا ...... بڑی مشکل سے اس نے بتایا۔

" میں جب وہ مویشی ہانکنے کے لئے اپنی لکڑی اوپر اُٹھاتی تھی تو اس کی سفید کہنی دکھائی دے جاتی تھی۔ میں کچھ بیمار تھا۔ روز ایک کمبل لے کر پہاڑی پر جا کر لیٹ جایا کرتا تھا۔ اور سانس روکے اس لمحے کا انتظار کیا کرتا تھا جب وہ ہاتھ اوپر کرے تو آستین سرک جائے اور مجھے اُس کی سفید کہنی دکھائی دے جائے "۔

" کہنی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

ہاں ...... میں نے سوائے کہنی کے اُس کے جسم کا اور کوئی حصّہ نہیں دیکھا۔ ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے رہتی تھی اس کے جسم کا کوئی خط نہیں دکھائی دیتا تھا۔ مگر اس کے جسم کی ہر جنبش پر میری آنکھیں کہنی کی جھلک دیکھنے کے لئے لپکتی تھیں۔

" پھر کیا ہوا؟"

" پھر ایک دن میں کمبل پر لیٹا تھا وہ مجھ سے تھوڑی دور آ کر بیٹھ گئی۔ وہ اپنے گریبان میں کچھ چھپانے لگی۔ میں نے پوچھا مجھے دکھاؤ۔ تو شرم سے اُس کا چہرہ گلابی ہو گیا۔ اور بولی کچھ بھی نہیں۔ بس مجھے ضد ہو گئی۔ میں نے کہا جب تک تم دکھاؤ گی نہیں جانے نہیں دوں گا۔ وہ روہانسی ہو گئی مگر میں بھی ضد پہ اڑ گیا۔ اور آخر کو بڑی ردوکد کے بعد اُس نے مٹھی کھول کر ہتھیلی میرے سامنے کر دی اور شرم سے گھٹنوں میں منہ دے لیا۔

" کیا تھا اس کی ہتھیلی پر؟" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

" مصری کی ڈلی! اُس کی گلابی ہتھیلی پہ برف کے ٹکڑے کی طرح پڑی جھلملا رہی تھی۔"

" پھر آپ نے کیا کیا؟"

" میں دیکھتا رہ گیا۔" وہ پھر سوچ میں ڈوب گیا۔

" پھر؟"

" پھر وہ اُٹھ کر بھاگ گئی۔ تھوڑی دور سے پلٹ آئی اور وہ مصری کی ڈلی میری گود میں ڈال کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ مصری کی ڈلی بہت دنوں تک میری قمیص کی جیب میں پڑی رہی۔ پھر میں نے اُسے دراز میں ڈال دیا اور کچھ دن بعد چیونٹیاں کھا گئیں۔"

" اور لڑکی؟"

" کونسی لڑکی؟" وہ چونکا۔

" وہی جس نے آپ کو مصری کی ڈلی تھما دی؟"

" اُسے میں نے پھر نہیں دیکھا۔"

" کس قدر پھُس پھُسا ہے آپ کا عشق!" میں نے نا اُمیدی سے چڑ کر کہا۔ مجھے تو" بٹ" سے کسی شعلہ بداماں قسم کے عشق کی اُمید تھی۔

" قطعی پھُس پھُسا نہیں۔" منٹو لڑ پڑا۔

" بالکل ردّی ...... مسٹر ڈریٹ۔ مرگھلا عشق۔ مصری کی ڈلی لے کر چلے آئے۔ بڑا تیر مارا!"

" تو اور کیا کرتا۔ اس کے ساتھ سو جاتا۔ ایک حرامی پلا اس کی گود میں چھوڑ کر آج اس کی یاد میں اپنی مردانگی کی ڈینگیں مارتا!" وہ بگڑا۔

" ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ مصری کی ڈلی کڑکڑا کر کھانے کی نہیں دھیرے دھیرے چوسنے کی چیز ہے۔"

یہ وہی منٹو تھا۔ فحش نگار۔ گندہ ذہن۔

جس نے "بو" لکھی تھی۔
جس نے "ٹھنڈا گوشت" لکھا تھا۔

لیکن مرزا غالب میں جو تصویر بیگم مرزا غالب کی محبوبہ ہو یا نہ ہو اس کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا مگر منٹو کے خیالوں کی لڑکی ضرور ہے جسے وہ ہاتھ نہیں لگانا چاہتا۔ جس کی کلائی کی جھلک دیکھنے کے لئے وہ ساری زندگی بیٹھ سکتا ہے۔ یہ تھا وہ تضاد جو منٹو کی مختلف کہانیوں میں مختلف اوقات میں ظاہر ہوتا تھا۔ ایک طرف "نیا قانون" لکھتا ہے اور دوسری طرف "بو"...... دونوں میں وہ خود کو غرق کر کے لکھتا ہے۔ لوگوں کو ایک فحش نگار یاد رہ جاتا ہے اور واقعہ نگار کو وہ بھول جاتے ہیں۔ قصداً یا سہواً؟...... ایک ہی بات ہے!

ملک میں فساد شروع ہو گئے۔ بٹوارے کے بعد اس کوٹھی سے وہاں اُس کوٹھی میں کئے جانے لگے۔ منٹو اس وقت فلمستان میں قریب قریب مستقل تھا۔ وہ بڑا خوش نظر آتا تھا مدح سرائی جو اُس کی زندگی کا سہارا تھی اُسے ملتی تھی۔ کہ اُس کی فلم "آٹھ دن" کامیاب نہ ہوئی۔ نہ جانے کیوں وہ فلمستان چھوڑ کر اشوک کمار کے ساتھ بمبئی ٹاکیز چلا گیا۔ اُسے اشوک کمار بہت پسند تھا۔ مکرجی نے نہ جانے اُسے کیا کہہ دیا تھا کہ وہ ایک دم اُس کے خلاف ہو گیا۔

"بکواس ہے مکرجی۔ فراڈ ہے پکا!" وہ تلخی سے کہتا۔

بمبئی ٹاکیز میں جا کر اُس نے مجھے بھی کمپنی میں ایک سال کے لئے سینیریو ڈپارٹمنٹ میں کام دلوا دیا اور بہت ہی خوش ہوا۔ "اب ہم دونوں مل کر کہانی لکھیں گے۔ تہلکہ مچ جائے گا۔ میری اور آپ کی کہانی اشوک کمار ہیرو۔ بس پھر دیکھئے گا!"

ایک کہانی منٹو کی زیر غور تھی۔ اشوک کو وہ پسند تھی۔ اس سے پہلے اُسے مجبور کی کہانی پسند تھی پھر دل سے اُتر گئی اور منٹو کی کہانی پسند آئی۔ میرے آنے کے بعد اُسے میری کہانی ضدی پسند آ گئی۔ خیر منٹو کو ناگوار نہ گذرا۔ اب اشوک کمار نے مجھ سے منٹو کی کہانی پر کام کرنے کو کہا اور منٹو کو میری کہانی پر! نتیجہ یہ کہ منٹو مجھ سے اور میں منٹو سے شاکی ہونے لگے۔ اُدھر کمال امروہی "محل" کی کہانی لے کر آ گئے اور اشوک کمار کو وہ پسند آ گئی اور ہم دونوں کی کہانی کھٹائی میں پڑ گئی۔ اب صرف عزت کا سوال ہوتا تو اور بات تھی۔ وہاں تو یہ حال ہو گیا کہ ہماری کہانی نہیں بن رہی ہے تو ہم کسی شمار وقطار ہی میں نہیں۔ گو ہم سے کہہ دیا گیا تھا کہ چین سے بیٹھو۔ تنخواہ ملتی رہے گی کیونکہ کنٹریکٹ ہو چکا ہے۔ لیکن کہانی ہماری نہیں بنے گی۔ لہٰذا میری اور شاہد کی پوری کوششیں اپنی کہانی ضدی کو بنوانے کی طرف لگ گئیں اور بغیر اشوک کمار کے دوسرے درجہ کی تصویروں کی تعداد میں ضدی بنائی جانے لگی۔

مگر منٹو کی کہانی رہ گئی! منٹو دن بھر اپنے کمرے میں بیٹھا اپنی کہانی کی اُدھیڑ بن کیا کرتا۔ کبھی انجام کو آغاز بنا کر لکھتا کبھی آغاز کو انجام بنا کر بھی وسط سے شروع کر کے آغاز پر ختم کرتا اور وسط کو انجام بنا دیتا۔ باوجود ہزاروں آپریشنوں کے کہانی کی کوئی کل اشوک کمار کو پسند نہ ئی۔ مگر منٹو یہی کہتا۔

"آپ گنگولی کو نہیں سمجھتیں، میں سمجھتا ہوں۔ وہ میری کہانی میں ضرور کام کرے گا!"

"آپ کی کہانی میں اُس کا رول رومانٹک نہیں باپ کا ہے۔ وہ کبھی نہیں کرے گا!" اور منٹو سے پھر لڑائی ہونے لگتی۔ مگر دبی زبان سے ہاں اپنی فکر پڑی تھی۔ اور وہی ہوا کہ "ضدی" اور "محل" بن گئیں منٹو کی کہانی رہ گئی۔ منٹو کو اس کی اُمید نہ تھی اور اُسے بڑی ذلت محسوس ہوئی۔ وہ سب کچھ جھیل سکتا تھا بے قدری نہیں جھیل سکتا تھا۔ اُدھر ملک کے حالات بالکل ہی ابتر ہو گئے۔ اس کے بیوی بچے اُسے پاکستان لے گئے۔ منٹو نے ہم سے بھی چلنے کو کہا۔ پاکستان میں حسین مستقبل ہے۔ وہاں سے بھاگے ہوئے لوگوں کی کوٹھیاں ملیں گی۔ وہاں ہم ہی ہم ہونگے

ست جلد ترقی کر جائیں گے۔ میرے جواب پر منٹو مجھ سے واقعی بد دل ہو گیا۔ اتنی لڑائیاں اور جھگڑے میرے اس سے ہوئے مگر یوں کبھی سنجیدہ ہو کر بحث نہیں ہوئی۔

اور اس وقت مجھے معلوم ہوا منٹو کتنا بزدل ہے۔ کسی قیمت پر بھی وہ اپنی جان بچانے کو تیار ہے۔ اپنا مستقبل بنانے کے لیے وہ بھاگے ے لوگوں کی زندگی کی کمائی پر دانت لگائے بیٹھا ہے اور مجھے اس سے نفرت سی ہو گئی۔

اور ایک دن وہ بغیر اطلاع کئے اور ملے پاکستان چلا گیا۔ مجھے بڑی ہتک محسوس ہوئی۔

پھر جب اس کا خط آیا کہ وہ بہت خوش ہے۔ بہت عمدہ مکان ملا ہے۔ کشادہ اور خوبصورت۔ قیمتی سامان سے آراستہ۔ ہمیں اس نے بلایا تھا۔ شدت ختم ہو گئی تھی اور ہم نے آرزو شروع کر دی تھی۔ برے وقت آئے تھے اور چلے گئے تھے۔ اس کے پھر دو خط آئے ں نے بلایا تھا ایک سینما الاٹ کروانے کی امید دلائی تھی۔ مجھے بڑا دکھ ہوا۔ اس کی محبت کا پہلے بھی یقین تھا۔ مگر اب تو اور بھی مان ا پڑا۔ مگر میں نے اس کے خط پھاڑ دیئے اس بات سے چڑ کر کہ وہ میرے اصولوں کی قدر کیوں نہیں کرتا۔ میں نے تو اسے جانے سے نہیں کا۔ پھر وہ مجھے اپنے راستے پر کیوں گھسیٹ رہا ہے۔

پھر سنا منٹو بہت خوش ہے۔

مکان چھن گیا مگر دوسرا مکان بھی خاصا اچھا ہے۔

ایک لڑکی اور پیدا ہوئی۔

اور سال گزرتے گئے۔

ایک لڑکی اور پیدا ہوئی۔ منٹو کا ایک خط آیا "کوشش کر کے مجھے ہندوستان بلوا لو"۔

پھر معلوم ہوا منٹو پر مقدمہ چلا اور جیل ہو گئی۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے۔ کسی نے احتجاج بھی نہ کیا۔ بلکہ کچھ ایسا لوگوں کا رویہ تھا کہ اچھا ہوا جیل ہو گئی۔ اب دماغ درست ہو جائے گا۔ نہ کہیں جلسے ہوئے نہ میٹنگیں ہوئیں نہ ریزولیوشن پاس ہوئے۔

پھر معلوم ہوا کہ دماغ چل نکلا اور پاگل خانے میں یار دوست پہنچا آئے ہیں۔

مگر ایک دن منٹو کا خط آیا۔ بالکل ہوش و حواس میں لکھا تھا کہ اب بالکل ٹھیک ہوں۔ اگر کوشش کر کے مجھے بمبئی بلوا لو تو بہت اچھا ہو۔ ے بعد عرصہ تک کوئی خیر خبر نہیں ملی۔ نہ ہی میرے خط کا جواب آیا۔ پھر سنا کہ دوبارہ پاگل خانے چلے گئے۔ اب منٹو کی خبروں سے ڈر سا ما۔ پوچھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ خدا جانے اس کا اگلا قدم کہاں پڑا ہو۔ مگر پاگل خانے سے آگے جو قدم پڑتا ہے وہ لوٹ کر نہیں آتا۔ ماں سے آنے والے لوگوں سے بھی اتنی کڑوی خبریں سنیں کہ جی ڈوب گیا۔ بے طرح پینے لگے ہیں۔ اپنے پرائے ہر ایک سے پیسہ مانگ بیٹھتے ۔ اخبار والے بٹھا کر سامنے مضمون لکھوا لیتے ہیں پیشگی پیسہ دو تو سب لکھ جاتے ہیں۔

منٹو کا آخری خط آیا جس میں ایک مضمون اپنے اوپر لکھنے کو کہا تھا۔ اور بے ساختہ میری منحوس زبان سے نکل گیا کہ اب تو مرنے کے بعد ہی ں لکھوں گی۔

اور آج منٹو کے مرنے کے بعد میں لکھ رہی ہوں۔ منٹو ہی نہیں عرصہ ہوا میرے اور منٹو کے درمیان بہت کچھ مر چکا تھا۔ آج صرف ایک کسک ہے۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس بات کی کسک ہے؟ کیا اس بات کی ندامت ہے کہ وہ مر چکا اور میں زندہ ہوں؟ یہ میرے سینے پر پھر قرض جیسا بوجھ ہے۔ مجھے تو منٹو کا کوئی قرضہ یاد نہیں۔ اور اس کا قرضہ بھی کیا تھا یہی نا کہ اس نے مجھے بہن کہا تھا۔ مگر بہنیں تو کھڑی بھائیوں کو مرتا دیکھتی ہیں اور کچھ نہیں کر پاتیں۔ مرنے والے زخم لگا جاتے ہیں جو نہ دکھتا ہے نہ رستا ہے خاموش سلگتا رہتا ہے۔

آج مجھے صفیہ بے طرح یاد آ رہی ہے۔ جی چاہتا ہے ایک بار سر جوڑ کر ہم ویسے ہی باتیں کر سکیں جیسے برسوں ہوئے اوائلِ شباب میں کیا کرتے تھے۔ مگر وہ تھیں سہاگ رات اور پہلوٹھی کے بچے کی باتیں، یہ ہیں موت کی باتیں۔ اسی لئے ڈرتی ہوں اور میرا قلم خشک ہوا جاتا ہے۔ نہ جانے ان چند سالوں میں اس پر کیا گزری ہے۔ کس دل سے پوچھوں کہ جب ساری دنیا نے منٹو کو فراموش کر دیا تب بھی تمہاری محبت اس طوفانی ہستی کا سہارا چٹان بنی کیوں کر دیتی رہی۔ یا تمہارا پیار تھک کر نڈھال ہو چکا تھا۔ کیا یہ بارہ تیرہ برس کا بھونچال تمہیں جھنجھوڑ کر پست کر گیا یا تم اب بھی اپنے منٹو صاحب کی صفیہ رہیں۔ پاس پڑوس کے مہذب لوگ اور رشتہ دار جب اس کی بدردی پر ناک بھوں چڑھاتے تھے تو تم کیا کرتی تھیں۔ ان خاموش گھیسوں کا تمہارے پاس کیا جواب تھا جو بے مروتی اور لاپروائی سے تمہارے اردگرد منڈلایا کرتی تھیں۔ دم تو نہ گھٹ جاتا تھا۔ کیا اس نے تمہاری پیار بھری گود میں دم توڑا یا وہ تنہا اور بھرے خاندان میں اکیلا ہی سدھارا۔ کیا بچیاں اپنے باپ کو پاگل مفلس شرابی سمجھتی تھیں۔ اس نے تمہیں تنگدستی اور ندامت کے سوا کیا کچھ بھی نہیں دیا۔ مجھے کچھ بھی تو نہیں معلوم نہ جانے کیوں اس کی تحریروں میں اپنی زندگی کا دھندلا سا بھی عکس نہیں ہے۔ وہ اپنی مشکلوں کو اپنی کمزوری پر محمول کرتا رہا اس نے انہیں عیب کی طرح چھپایا۔ اسے غرّہ تھا کہ چاہے تو وہ دم بھر میں لاکھوں کما کر پھینک دے۔ جبھی تو اسے یقین نہ آتا تھا کہ وہ فاقے بھی کر سکتا ہے اور اس کا قلم بکسی سے گھسٹتا رہتا ہے۔

تو عاجز تو نہیں آ گئیں ادیبوں سے! یونہی خود گھسٹتے ہیں اور اپنوں کو دلدل میں گھسیٹتے ہیں! ..... اور پھر ایک دن اکیلا چھوڑ کر چل دیتے ہیں۔ تو بہن یہ ادیبوں ہی کی عادت نہیں ہمارے دیش کے لاکھوں کروڑوں انسان اسی طرح زندگی میں ناکامی اور نامرادی کا شکار ہوتے ہیں۔ چاہے وہ ادیب ہوں یا کلرک! ان کی یہی زندگی ہے اور کم و بیش یہی انجام۔ جو زیادہ حساس ہوتے ہیں وہ پاگل ہو جاتے ہیں اور ڈھیٹ سسکتے رہتے ہیں۔

نہ جانے دل کیوں کہتا ہے کہ منٹو کی اس جوان مرگی میں میرا بھی ہاتھ ہے۔ میرے دامن پر بھی خون کے نظر نہ آنے والے چھینٹے ہیں! جو صرف میرا دل دیکھ سکتا ہے۔ وہ دنیا جس نے اسے مرنے دیا میری ہی تو دنیا ہے۔ آج اسے مرنے دیا اور کل یونہی مجھے بھی مر جانے کی اجازت ہو گی اور پھر لوگ ماتم کریں گے۔ میرے بچوں کا بوجھ ان کے سینے پر چٹان بن جائے گا۔ جلسے کریں گے چندے جمع کریں گے اور ان جلسوں میں عدیم الفرصتی کی وجہ سے کوئی نہ آ سکے گا۔ وقت گذر جائے گا۔ سینے کا بوجھ آہستہ آہستہ ہلکا ہو جائے گا اور وہ سب کچھ بھول جائیں گے،

منٹو — میرا دشمن

اوپندر ناتھ اشک

منٹو میرا دشمن سمجھا جاتا تھا۔ ہم میں خاصی چپقلش رہتی تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جب تک ہم اکٹھے رہے، ہم نے ایک دوسرے کو سخت ضربیں پہنچائیں۔ کتب پبلشرز بمبئی سے شائع ہونے والے نئے ادب کے معمار کے سلسلے میں سعادت حسن منٹو کا جو ایک خاکہ کرشن چندر نے لکھا اس میں چپقلش کا ذکر بھی کر دیا اور ہماری یہ دشمنی روایتی ہو گئی۔ یہاں تک کہ ایک دوست نے اسی 'دشمنی' کا ذکر کرتے ہوئے مجھ سے اصرار کیا کہ اگر میں نے منٹو کے بارے میں مضمون نہ لکھا تو وہ مجھے کبھی نہ بخشے گا۔ لیکن آج جب منٹو اس دنیا میں نہیں ہے، میں سوچتا ہوں کہ —— کیا ہم واقعی دشمن تھے؟ اور پندرہ بیس برسوں کا جائزہ لیتا ہوں تو پاتا ہوں کہ اگر ہمارے تعارف کی ابتدا ہی دشمنی سے نہ ہوتی تو ہم بہت دوست ہوتے۔

منٹو کی اور میری افتاد میں زمین آسمان کا فرق تھا —— وہ لڑکپن ہی سے دبنر یا ٹنڈلر کمار کی دوکانوں کے اوپر چوباروں میں جمنے والی جوئے کی محفلوں میں شامل ہوتا تھا اور رات کو خواب بھی فلاش ہی کے دیکھتا تھا، اور میں نے کبھی تاش کو ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ رند بلانوش تھا، میں نے شراب تو دور رہی، سگریٹ بھی پہلی بار ۱۹۴۲ء میں پیا، جب میں تیئیس برس کا تھا۔ اس نے کٹڑہ گھنیاں ہو، ہیرا منڈی ہو یا فارس روڈ —— اس بازار کی خوب سیر کی تھی اور میں نے ادھر جھانک کر بھی نہیں دیکھا۔ بات یہ ہے کہ ماں نے بچپن ہی سے ان تینوں کے خلاف نفرت میرے دل میں بھر دی تھی۔ والد محترم نے ان تینوں میدانوں میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے، میرا خیال ہے کہ ہمارے خاندان کی دو نسلیں اس سلسلے میں کچھ بھی کئے بغیر ان پر فخر سے سر بلند کر سکتی ہیں۔ ان کے انہیں کارناموں کی وجہ سے گھر کی جیسی حالت ہو گئی اور ماں نے جس عسرت میں بچپن کے دن کاٹے، اس نے خون کو کچھ ایسا منجمد کر دیا کہ آج جب میں سگریٹ یا شراب کو ویسا معیوب نہیں سمجھتا، کبھی کھیلنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ پتا جی، جب ایک آدھ پیگ چڑھا لیتے تھے تو عموماً نعرہ لگاتے تھے —— کوڑی نہ رکھ کفن کے لئے! وہ حال میں رہتے تھے اور انھوں نے کبھی مستقبل کی فکر نہیں کی۔ ردعمل کے طور پر میں نے لڑکپن ہی میں زندگی کا سارا خاکہ تیار کر لیا تھا —— اور منٹو کو

اُسے زہد و صابیت، پلاننگ، کفایت شعاری اور ٹھہراؤ سے نفرت تھی۔ اپنی اس نفرت کا اظہار اُس نے کئی بار سخت ترین الفاظ میں کیا۔

...... مجھے منٹو نے فلمستان میں کام کرنے کے لئے بمبئی بلایا تھا۔ میرے بمبئی پہنچنے کے دوسرے یا تیسرے دن کا ذکر ہے۔ ہم وکٹوریہ میں آمنے سامنے بیٹھے گرانٹ روڈ کو جا رہے تھے۔ منٹو نے تھوڑی سی پی رکھی تھی۔ اچانک اُس نے انگریزی میں کہا۔ I LIKE YOU THOUGH - I HATE YOU

...... ڈیڑھ سال بعد ہم فلمستان کی کینٹین میں بیٹھے تھے۔ لنچ کا وقت تھا۔ منٹو کی میز پر حسبِ دستور راجہ مہدی علیخاں، واچا وغیرہ چند ایک دوست تھے۔ میں باہر کی میز پر اپنی یونٹ کے ایک دو دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ نہ جانے کیسے ہندوؤں کے داہ کرم سنسکار اور کپال کریا ـــــ یعنی مُردے کی کھوپڑی کو توڑنے کی رسم کا ذکر چلا تو منٹو نے دانت پیس کر کہا ـــ "اشک جب مرے گا تو اُس کی کپال کریا میں کروں گا"

...... میں کے۔ ای۔ ایم ہسپتال میں بیمار پڑا تھا۔ ڈاکٹروں نے دق کا فتویٰ دے دیا تھا۔ راجہ مہدی علیخاں مجھ سے ملنے آیا اور اُس نے کہا ـــ "منٹو کہتا ہے کہ سالا اس طرح پیسہ نہ جوڑتا تو بیمار نہ پڑتا"

جب گرانٹ روڈ کو جاتے ہوئے منٹو نے مجھ سے کہا تھا، میں تمہیں پسند کرتا ہوں، لیکن مجھے تم سے سخت نفرت ہے تو میں نے جواب میں کہا کہ یہی حال میرا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے محض جواب کے لئے جواب دے دیا تھا۔ ورنہ منٹو سے مجھے دراصل کبھی نفرت نہیں ہوئی۔ منٹو تو اس نفرت کے باوجود جس کا اظہار وہ وقتاً فوقتاً کرتا تھا، اور اس تضاد کے باوجود جو ہماری طبیعتوں میں تھا، میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ہم دونوں گہرے دوست ہوتے اگر میں نے اپنے بچپنے میں منٹو کو بنا دیکھے، بنا جانے، بنا پڑھے اُس کے خلاف ایک سخت جملہ نہ کس دیا ہوتا۔

بات شاید ۱۹۳۸ء یا ۱۹۳۹ء کے آس پاس کی ہے۔ منٹو کی ایک کہانی 'خوشیا' ایک رسالے میں چھپی تھی۔ میں اور راجندر سنگھ بیدی اُس زمانے میں ساتھ ساتھ لکھا پڑھا کرتے تھے۔ وہ کہانی لکھتے تو مجھے آ کر سناتے، اور میں لکھتا تو انہیں جا سناتا۔ دونوں مل کر ہمعصروں کے افسانوں پر تبادلۂ خیالات کرتے اور جیسا کہ نوجوانی میں ہوتا ہے، ہماری رائیں خاصی تیز اور حکمی ہوتیں۔ بیدی نے 'خوشیا' کے بارے میں میری رائے پوچھی۔

میں نے اُس وقت تک منٹو کی کوئی چیز نہ پڑھی تھی، نہ اُسے دیکھا تھا۔ 'سرگذشت اسیر' کے نام سے ہیوگو کا ایک ترجمہ منٹو کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اور میں نے کسی سے سنا تھا کہ وہ روسی افسانوں کے ترجمے بغل میں دبائے کسی ناشر کی تلاش میں اِدھر اُدھر آیا تھا۔ اس بات میں کہاں تک صداقت ہے۔ یہ میں نہیں جانتا۔ بہرحال 'خوشیا' کی اشاعت سے پہلے منٹو کے بارے میں یہی دو ایک باتیں میں جانتا تھا۔ اور چونکہ لکھنا میں نے کرشن، منٹو اور بیدی سے بہت پہلے شروع کر دیا تھا، عمر میں بھی میں تینوں سے بڑا ہوں اور اُس وقت تک میرے کچھ مشہور افسانے 'ڈاچی'، 'کونپل'، 'قفس'، وغیرہ لکھے جا چکے تھے اور مترجم کو میں طبعزاد لکھنے والے سے کمتر سمجھتا تھا، اس لئے میری نظروں میں منٹو کی کوئی خاص وقعت نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ 'خوشیا' پڑھتے وقت بھی میں پہلے ہی سے مصنف کے خلاف تھا۔ 'خوشیا' مجھے بہت اچھا بھی نہیں لگا۔ حالانکہ منٹو کی کہانیوں میں اسے خاصا درجہ حاصل ہے اور بنیادی خیال کو منٹو نے بہت اچھی طرح نبھایا ہے تو بھی مجھے یہ اعتراض تھا کہ 'خوشیا' حقیقی کردار نہیں بلکہ مصنف کے دماغ کی اختراع ہے۔ میرے ایک دوست اُس زمانے میں باقاعدہ اُس گلی کی سیر کرنے جاتے تھے اور اُن کی وساطت سے مجھے اُس کے آداب و قواعد سے

خاص معقولیت تھی۔ سچے جیتے کی حوالوں کے (جیسی کہ خوشیا کی کانتا ہے) دلال کوما اُن سے پہلے ہی جسمانی طور پر متعارف ہو جاتے ہیں، یہ بات میں یقینی طور پر جانتا تھا۔ اس لئے میرا خیال تھا کہ خوشیا کا کردار غیر حقیقی ہے۔ بیدی نے جب خوشیا کے بارے میں میری رائے پوچھی تو اُس وقت غیر شعوری طور پر یہ باتیں میرے دماغ میں تھیں۔ یوں بھی بیکر ٹھہرنے کے دن تھے۔ کسی چیز پر اتنی سنجیدگی سے غور کرنے کی عادت نہ تھی۔ جو منہ میں آیا، بے ٹھیک تھے، اس لئے میں نے کہا: "وہ کوڑی کی کہانی ہے۔"

میں نے یہ بات کہی اور بھول گیا۔ لیکن بیدی نہیں بھولا۔ اور جب کچھ عرصے کے بعد بیدی دہلی گیا اور وہاں منٹو سے (جو اُس وقت آل انڈیا ریڈیو دلی میں آگیا تھا) اپنی عادت کے مطابق اُسے پریشان کیا تو نہ جانے کیسے اور نہ جانے کس سلسلے میں بیدی نے خوشیا کے بارے میں میری رائے کا ذکر کر دیا۔

دلی سے واپس آکر بیدی نے منٹو سے اپنی ملاقات کا حال سنایا اور کہا کہ میں نے منٹو تک تمہاری بات پہنچا دی ہے۔ چونکہ مجھے کبھی یہ خیال نہ تھا کہ منٹو اور میں کبھی ایک دوسرے کا راستہ کاٹیں گے، اس لئے میں نے اس اطلاع کو سُنا اَن سُنا کر دیا۔ لیکن سنہ ۱۹۴۰ء میں جب کرشن چندر کے دوسرے برس دلی ریڈیو اسٹیشن گیا اور وہاں جاتے ہی ملازم ہو گیا تو مجھے پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ میرا وہ ریمارک کہاں تک پہنچ گیا ہے۔ دوستوں نے میری ملازمت پر اس لئے خوشی کا اظہار کیا کہ اب منٹو کو اپنا بدل ملے گا۔ یعنی اگرچہ میں اور منٹو کبھی آمنے سامنے نہ ہوئے تھے، لیکن لوگوں نے ہم کو ایک دوسرے کا حریف مان لیا تھا۔

دہلی میں اپنی نوکری پر آنے کے دوسرے ہی دن مجھے اس بات کا پتہ چل گیا اور چونکہ میں ایک بڑی تکلیف دہ اور کشمکش بھری زندگی سے نجات پا کر آیا تھا، اس لئے اس خیال سے میری روح کانپ گئی کہ مجھے پھر کسی سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ میں موقعہ ملتے ہی منٹو کو سمجھاؤں گا کہ لوگ محض تماشہ دیکھنا چاہتے ہیں، اس لئے ہم کیوں تماشہ بنیں۔ لیکن ایک تو یہ کہ ریڈیو میں اُس وقت منٹو کا طوطی بولتا تھا اور دوسرے پہلے ہی سے مجھے نیچا دکھانے کے لئے اُدھار کھائے بیٹھا تھا، اس لئے میری کوششیں بار آور نہیں ہوئیں ——— ریڈیو کا دفتر اُن دنوں علی پور روڈ کی ایک بڑی کوٹھی میں تھا۔ بڑے کمرے اسٹیشن ڈائریکٹر، پروگرام ڈائریکٹر اور میوزک ڈیپارٹمنٹ کے پاس تھے۔ چھوٹے کمروں میں سے (شاید کوٹھی کے باتھ روم رہے ہوں گے) ایک میں راشد، دوسرے میں کرشن، اور تیسرے میں منٹو بیٹھتے تھے۔ یہ کمرے ساتھ ساتھ تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، میں کرشن کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ کرشن سٹوڈیو میں (جو سڑک کے دوسری طرف ایک کوٹھی میں واقع تھا) گیا ہوا تھا اور میں کوئی چیز لکھ رہا تھا کہ منٹو ٹہلتا ہوا آیا اور اِدھر اُدھر کی بات کر کے اُس نے 'خوشیا' کی بات چھیڑی۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہیں میری کہانی خوشیا پسند نہیں آئی؟" وہ بولا۔

میں نے ٹالنے کی کوشش کی۔ لیکن منٹو یوں چھوڑنے والا نہیں تھا: "تمہیں اُس میں کیا پسند نہیں آیا؟" اُس نے پوچھا۔

میں نے اُسے سمجھایا کہ میں یہاں ہندی صلاح کار کی حیثیت سے آیا ہوں، میرا تمہارا کوئی مقابلہ نہیں۔ تم مزے سے کام کرو اور مجھے کام کرنے دو۔ دلی کے بحث مباحثے میں مت پڑو۔ لوگ تماشہ دیکھنا چاہتے ہیں، ہم کیوں تماشہ بنیں۔

لیکن منٹو نے مجھے بات نہیں ختم کرنے دی۔ اُس نے ہاتھ کی جنبش سے جیسے میری بات کو کاٹتے ہوئے وہی سوال دُہرایا اور شاید کوئی سخت بات کہی۔ مجبوراً میں نے کہا: "کہانی وہ اچھی ہے، لیکن حقیقی نہیں۔"

"کیوں حقیقی نہیں؟"

تب میں نے اپنا اعتراض بتایا: "تمہیں ایک خیال سوجھا اور تم نے اپنے آپ کو دلال کے روپ میں رکھ کر ویسی صورت میں اپنے ردِّ عمل بند کر دیا۔ حقیقی دنیا میں خوشیا واقعی دلال ہوتا، کانتا اُس کے سامنے یوں برہنہ ہو جاتی تو وہ اُسے وہیں دبوچ لیتا ——— تم نے جو کچھ لکھا

وہ ایک پڑھا لکھا شاعر سوچ سکتا ہے، اَن پڑھ دلّال نہیں؟"

کچھ اِسی طرح کی بات بڑے زوروں سے بہنے لگی۔ منٹو لمحہ بھر کو چپ رہا۔ پھر تلملا کر بولا: "ہاں ہاں، میں وہ دلّال ہوں، منٹو وہ دلّال ہے جسے افسانہ نویسی کا علم بھی ہے۔ تم خود کیا لکھتے ہو؟"

لیکن اُس وقت کرشن چندر آ گیا یا مجھے اڈوانی (اسٹیشن ڈائریکٹر) نے بلا لیا یا جانے کیا ہوا، بہرحال وہ قصہ وہیں ختم ہو گیا۔

... لیکن وہ قصہ کبھی ختم نہیں ہوا۔ دل میں جو خلش اس کے بعد رہی سو رہی، منٹو میرے اس اعتراض کو کبھی نہ بھول سکا۔ گذشتہ سال 'نقوش' کے کسی خاص نمبر میں اُردو ادیبوں کا ایک سمپوزیم شائع ہوا تھا۔ اُس وقت، جب اُردو میں کوئی نیا افسانہ لکھے ہوئے (ادھر جو افسانے اُردو میں چھپے بھی وہ ایک طرح سے ہندی سے ترجمہ ہو گئے ہیں) مجھے آٹھ برس ہو گئے ہیں اور میرے احباب اور اُردو کے ناظر تک مجھے بھول گئے ہیں، منٹو کو میں یاد رہا، "خوشیا" کے بارے میں میرے اعتراض اور اپنے جواب کا ذکر کرنا وہ اس سمپوزیم میں بھی نہیں بھولا۔

اس کے بعد اگرچہ میں نے بڑی کوشش کی منٹو سے میری چشمک نہ ہو، میں اپنی میز بھی اُٹھا کر دوسری منزل میں لے گیا، لیکن میری تمام کوششیں ناکام رہیں۔ میں جب بھی نیچے اُترتا، دوستوں میں جاتا، منٹو سخت حقارت کی نظر سے مجھے دیکھتا اور کسی نہ کسی طریقے سے اپنی نفرت کا اظہار بھی کر دیتا۔

اُن دنوں کی بڑی صاف تصویر دماغ کے پردے پر نقش ہے۔ منٹو ریڈیو کے لئے ڈرامے لکھنے پر مامور تھا۔ کرشن چندر ڈراموں کا انچارج تھا۔ میں ہندی صلاح کار تھا اور چونکہ اُس نظام میں ہندی کو اہم زبان نہ سمجھا جاتا تھا، اس لئے کچھ زیادہ کام نہ تھا اور میں فرصت کے وقت میں ایک آدھ ڈرامہ بھی لکھ دیا کرتا تھا۔

منٹو کا ڈھنگ یہ تھا کہ وہ اُردو کا ٹائپ رائیٹر لے کر بیٹھ جاتا اور کرشن سے پوچھتا: "بولو بھئی، کس موضوع پر ڈرامہ لکھا جائے؟" موضوع سنتے ہی فوراً ٹائپ کرنا شروع کر دیتا اور شام تک مسودہ کرشن کو دے دیتا۔ منٹو کو اس بات کا زعم تھا اور اس کا اعلان وہ عموماً کیا کرتا تھا کہ وہ جس چیز پر چاہے ڈرامہ لکھ سکتا ہے۔ ریڈیو کے ڈرامہ آرٹسٹ ——— غلام محمد، رفیع پیر (جو اب فلم ایکٹر ہیں) تاج محمد وغیرہ اُسے عموماً گھیرے رہتے تھے۔ منٹو لکھتے لکھتے انھیں ڈرامہ سنایا بھی کرتا تھا اور وہ سن کر "منٹو صاحب، آپ ڈرامہ کے بادشاہ ہیں" کہتے ہوئے منٹو کے خرچ پر چائے اُڑایا کرتے تھے۔ بھاٹیہ اور حسرت صاحب سے منٹو کا پینے پلانے کا رشتہ تھا۔ اور اڈوانی اُس سے اس لئے دبتے تھے کہ منٹو کے کوئی رشتے دار محکمہ اطلاعات اور براڈکاسٹنگ کے سیکرٹری تھے۔ ریڈیو اسٹیشن پر ہر وقت 'منٹو صاحب، منٹو صاحب' ہوتی رہتی اور ہر معاملے میں منٹو کی رائے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ منٹو خوشامدیوں یا دوستوں میں گھرا رہتا۔ لنچ کے وقت کبھی اُس کے، اور کبھی کرشن کے کمرے میں محفل جمتی۔ میں بھی کبھی کبھی آ کھڑا ہوتا۔ منٹو کبھی مجھے بات نہ کرنے دیتا۔ میرے بارے میں کوئی نہ کوئی تحقیر آمیز ریمارک ضرور پاس کرتا، اور اگرچہ میرے معاملے میں لوگ اُس کا ساتھ نہ دیتے مگر مجھے بڑی کوفت ہوتی۔

آخر ایک دن میں نے کرشن سے کہا: "دیکھو بھائی، تم منٹو کو سمجھا دو۔ وہ مجھے خواہ مخواہ تنگ کرتا ہے، میں طرح دے جاتا ہوں۔"

"تم بھی اُسے تنگ کرو۔" کرشن نے کہا: "میرے سمجھانے سے وہ کیا سمجھے گا؟"

اور اُس دن میں دفتر گیا تو میں نے طے کر لیا کہ آج میں منٹو کو پریشان کروں گا۔ کچھ دن پہلے اُس کی کہانی "دھواں" شائع ہوئی تھی۔ کہانی مجھے بے حد پسند تھی۔ منٹو نے ایک نازک موضوع پر بڑی نزاکت اور نفاست سے افسانہ لکھا تھا۔ لیکن میں تو شرارت پر تُلا ہوا تھا اور چونکہ میں اس دوران میں منٹو کی انانیت کے ہر پہلو کا مطالعہ کر چکا تھا اس لئے میں نے اپنا طرزِ عمل طے کر لیا۔ دفتر پہنچ کر میں منٹو کے کمرے میں گیا۔ وہ ابھی

لرجیشا ہی تھا کہ میں نے کہا — "میں نے تمہاری کہانی 'دھواں' پڑھی۔"
"کیسی لگی؟"
"اچھی ہے، اب تم چھٹی پہ لکھو۔"
منٹو لمحہ بھر کو چپ رہا۔ پھر اُس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں تقریباً باہر نکالتے ہوئے کہا: "کیا مطلب ہے تمہارا؟"
میں نے کچھ نہیں کہا اور وہی بات دُہرا دی: "بس اب تم چھٹی پہ لکھو۔"

اُس وقت عصمت نے لحاف نہ لکھا تھا۔ منٹو چڑ گیا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ تم خود کیا افسانے لکھتے ہو، لیکن کچھ دن پہلے وہ اس بات کا اعلان کر چکا تھا کہ اُس نے کبھی میرا افسانہ نہیں پڑھا، اس لیے اُس نے کہا: "تم کیا جھک مارتے ہو، میں نے تمہارے ڈرامے پڑھے ہیں۔"

اُس وقت میرا مجموعہ 'پاپی' چھپ چکا تھا اور میں کچھ بہت اچھے ڈرامے لکھ چکا تھا۔ چونکہ لڑنے کا فن مجھے خوب آتا ہے اس لیے طرح دے کر میں نے کہا: "میں تو ڈرامہ لکھنا ابھی سیکھ رہا ہوں، اس لیے میرے ڈراموں کی بات چھوڑو، لیکن تم جو ڈراموں کے بادشاہ کہلاتے ہو، جیسی جعل مارتے ہو، وہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ 'کروٹ' میں تم نے ناتم کے افسانہ 'دین' کی کہانی چرا لی ہے۔ 'روح کا ناٹک' پورے کا پورا ترجمہ کر دیا ہے۔ (اُس وقت میں نے مصنف کا نام بھی لیا تھا) اور حوالہ تک نہیں دیا۔ میں اچھے ناٹک نہیں لکھتا، لیکن طبعزاد تو لکھتا ہوں۔ بری اچھی جو بھی چیز میری اپنی ہے۔ کسی دوسرے کی چرائی تو نہیں۔"

منٹو جھلا اُٹھا، لیکن میں وہاں نہیں رُکا۔ کرشن چندر کے کمرے میں آ گیا۔ منٹو ڈرامہ لکھنے جا رہا تھا، لیکن ڈرامہ لکھنا تو دور رہا، اُس کے لیے اپنے کمرے میں بیٹھنا تک مشکل ہو گیا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے کرشن کے کمرے میں آیا۔ اُس نے پھر مجھ سے افسانہ کے فن کو لے کر بات کرنے کی کوشش کی لیکن میں پھر طرح دے کر نکل گیا اور سٹوڈیو چلا گیا۔ منٹو نے سٹوڈیو میں میرا پیچھا کیا۔ لیکن میں پھر ٹال گیا۔

اُسی شام وشوامتر عادل اپنے دوست اور بہنوئی مسٹر مدن موہن بھلہ کے ساتھ منٹو سے ملنے گیا۔ اُس نے آ کر بتایا کہ منٹو نے انہیں اپنے افسانوں کا مجموعہ دیا اور مجھے بے شمار گالیاں دیں کہ اشک سالا اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔ اُس کو افسانے کے فن کی ابجد کا بھی علم نہیں۔ 'ادبِ لطیف' میں اُس نے افسانہ کے فن پہ جو مضمون لکھا تھا، وہ کیا بکواس ہے وغیرہ وغیرہ۔

تین دن تک منٹو مجھے گالیاں دیتا رہا۔ میں اوپر اپنے کمرے میں بیٹھا وہ سب سُنتا رہا، کیونکہ تماشائی بڑے خوش تھے۔ اور منٹو کیا کہتا ہے وہ مجھے رائی رتی بتانا نہ بھولتے تھے، لیکن میں چپ رہا اور دل ہی دل میں ہنستا بھی رہا کہ جیسا میں نے سوچا تھا، ویسا ہی ہوا، اور افسوس کرتا رہا کہ بادلِ ناخواستہ مجھے وہ سب کرنا پڑ رہا ہے جس کی دوستوں کو توقع تھی۔

میں منٹو کے افسانے پسند کرتا تھا۔ 'خوشیا' کے بعد میں نے منٹو کے کئی بہت اچھے افسانے پڑھے تھے: 'نیا قانون'، 'منتر'، 'شوشو'، 'ڈرپوک'، 'موسم کی شرارت'، 'ہتک'، 'مسٹر ڈی کوسٹا'، سب مجھے بہت پسند آئے تھے۔ لیکن جب تک میں دلی میں رہا، میں نے کبھی منٹو کے سامنے اُس کے افسانوں کی تعریف نہیں کی۔ چونکہ منٹو کی نظر کافی تیز تھی، اس لیے خوشامد کرنے والے پر وہ اگرچہ وقتی طور پر خوش ہوتا تھا، لیکن خوشامدی کے لیے اُس کے دل میں کوئی عزت نہیں رہتی تھی۔ یہ عجیب بات ہے کہ کرشن نے مجھے دلی بلا کر منٹو کے مقابل لا کھڑا کیا، لیکن جب بھی ہم میں جھگڑا ہوا، اُس نے ہمیشہ منٹو کی طرفداری کی، منٹو اس طرفداری کا فائدہ اُٹھا لیتا تھا، لیکن کرشن کے لیے اُس کے دل میں عزت نہ تھی۔ وہ اُسے بھی گالیاں دیتا تھا۔ چونکہ اُن دنوں منٹو کو ہر وقت خوشامدی لوگ گھیرے رہتے تھے، اس لیے میری اس حقیقی تعریف کو بھی منٹو خوشامد پر محمول کرے، یہ میری انا کو منظور نہ تھا۔ میں دانستہ منٹو کے اچھے افسانوں کا ذکر چھوڑ جاتا اور اُس کے کمزور افسانوں کی تنقید بڑے زوروں سے کرتا۔ غرضیکہ خاصی چپقلش رہتی تھی۔

گئی تو اُن دنوں عریاں نگاری کو ترقی پسندی سمجھا جاتا تھا۔ احمد علی، عصمت اور منٹو اس کے علمبردار تھے۔ کرشن کھل کر نہ لکھتے تھے لیکن انہوں نے بھی اپنی کہانیوں کا ایک فارمولا بنا رکھا تھا جس میں وہ رومان انگیزی اور ترقی پسندانہ طنز میں تھوڑی سی عریانی بھی ملا دیتے تھے۔ میرا کہنا تھا کہ عورتوں کی عصمت فروشی اور مار دھاڑ کے علاوہ بھی بیسیوں مسائل ہیں جو اتنے ہی اہم ہیں، لیکن نہ جانے کیوں اُس وقت ترقی پسند ادیبوں کا عریاں نگاری اور گھٹیا درجے کی طوائفوں کے چوباروں میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کا مارے مارے پھرنا ہی واحد موضوع سمجھا جاتا تھا۔ جب میں یہ کہتا کہ یہ ترقی پسندی نہیں تو کرشن کہتا کہ چونکہ تم یہ سب کچھ نہیں لکھ سکتے اس لئے تمہیں منٹو اور عصمت (ان دونوں کے ساتھ وہ اپنے کو بھی شامل کر لیتا) سے حسد ہوتا ہے۔ ایک دن منٹو نے بھی کچھ ایسی ہی بڑ ہانکی، تو میں نے طے کیا کہ میں بھی ایک ایسا ہی افسانہ لکھوں گا۔ یہ یاد نہیں کہ کسی نے موضوع تجویز کیا یا میں نے اپنے آپ لکھا۔ لیکن ہم دونوں نے ایک ہی موضوع —— یعنی نوکروں کے سامنے مالکوں کی جنسی بے پروائی —— پر افسانے لکھے۔ منٹو نے "بلاؤز" اور میں نے "اُبال" دونوں افسانے 'ساقی'، دہلی کے ایک ہی نمبر میں (غالباً کسی سالنامے میں) چھپے۔ 'اُبال' کو دوستوں نے بہت پسند کیا۔ کرشن نے اُسے اُس وقت تک کے میرے افسانوں میں بہترین مانا۔ بعد میں اُس کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا تو وہ بھی کافی پسند کیا گیا۔ 'بلاؤز' اور 'اُبال' اس وقت کے میرے اور منٹو کے آرٹ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ عریانی دونوں افسانوں میں ایک جیسی ہے۔ مالکوں کی جنسی بے پروائی کا اثر دونوں افسانوں کے نوکروں پر ایک جیسا ہوتا ہے۔ لیکن جہاں بلاؤز کے انجام کی حقیقت کریہہ حقیقت ہے وہاں 'اُبال' کے انجام میں نوکر کی ذہنیت کے ساتھ سماجی ٹریجڈی بھی پنہاں ہے اور افسانہ سماجی حقیقت (SOCIAl REALISM) کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ افسانہ نگار کو حقیقت جیسی بھی ہے، اُس کا خاکہ کھینچنے تک ہی اپنے قلم کو محدود رکھنا چاہیئے یا اس حقیقت کے پس منظر میں سماج کا بھی جائزہ لینا چاہیئے۔ یہ بحث طویل ہے اور 'فن برائے فن' اور 'فن برائے زندگی' کے پیرو اس موضوع پر ہمیشہ بحث کرتے رہیں گے۔ بہرحال منٹو کے ساتھ ہونے والی چشمک میں ہم نے بھی ویسا ہی ایک افسانہ لکھا اور اگرچہ اُس کی بڑی تعریف ہوئی، لیکن پھر میں نے اس طرف کا رُخ نہیں کیا۔ اس لئے نہیں کہ ویسے افسانے لکھنا میں کچھ معیوب سمجھتا ہوں بلکہ اس لئے کہ وہ میرے مزاج اور طبیعت سے میل نہیں کھاتے۔

باری صاحب کے بارے میں منٹو نے لکھا ہے کہ وہ بڑے رنچھوڑ قسم کے آدمی تھے۔ لیکن منٹو کو جیسا کہ میں نے دیکھا، میرا خیال ہے کہ باری صاحب کا کچھ اثر اس پر بھی تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے کردار کے اس پہلو سے خود واقف نہ ہو جن حالات میں اچانک ایک دن منٹو دہلی سے غائب ہو گیا، تقریباً انہیں حالات میں وہ بمبئی سے پاکستان بھاگ گیا۔ دہلی سے اُس کے فرار کا باعث میں تھا اور بمبئی سے نذیر اجمیری۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ منٹو خود ہی اُس فرار کا باعث تھا۔ کیونکہ لڑائی میں جب تک وہ مارتا چلا جاتا تھا خوش رہتا تھا اور جب دوسرے اُس کے حربوں کو اُس پر آزماتے تھے تو وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جاتا تھا۔ بمبئی سے بھاگنے کے بارے میں نذیر اجمیری کی مخالفت کا ذکر کرتے ہوئے منٹو نے لکھا ہے :-

"میں نے بہت غور کیا، کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آخر میں نے اپنے آپ سے کہا "منٹو
بھائی —— آگے راستہ نہیں ملے گا —— کار موٹر روک لو ——
اُدھر باجو کی گلی سے چلے جاؤ —— اور میں باجو کی گلی سے پاکستان
چلا آیا۔"

دہلی سے اچانک منٹو غائب ہو گیا تو میں حیران رہ گیا تھا۔ حالانکہ یہ افواہ اُڑی تھی کہ اُسے فلم میں نوکری مل گئی ہے۔ لیکن دو سال بعد

نے خود مجھے بتایا کہ وہ کسی نوکری کے بغیر دہلی سے چلا آیا تھا ——— باجو کی گلی سے ——— آگے راستہ نہ ملنے پر ——— بالکل ہی جیسے کچھ سال بعد وہ بمبئی چھوڑ گیا۔

میرے والد زندگی بھر لڑتے رہے: کوڑی نہ رکھ کفن کے لئے کے ساتھ ساتھ جو دوسرا نعرہ لگایا کرتے تھے وہ تھا ——— برقائم جنگ ہے ——— اور وہ اپنے لڑکوں کو بھی یہی نیک صلاح دیا کرتے تھے۔ چونکہ ان کا خیال تھا کہ ان کا کوئی بیٹا شہر کا سب سے بڑا لڑاکا ہوگا، اس وہ سب کو لڑنے کے طریقے بتایا کرتے تھے۔ سب سے زیادہ زور وہ اس بات پر دیا کرتے تھے کہ جو آدمی پٹ سکتا ہے وہی پیٹ بھی سکتا پیٹنے سے پٹنا مشکل ہے۔ پٹو، لیکن پیٹنے والے کو نہ چھوڑو ——— میری صحت تو لڑکپن ہی سے خراب تھی۔ اپنے والد یا بھائیوں کی توجہ کیا لڑتا، لیکن یہ بات ضرور ذہن نشین ہوگئی اور کشمکشِ حیات میں جہاں جہاں بھی معرکہ پڑا ہے، میں نے پٹ کر آخر پیٹنے والے ٹ دیا ہے۔

منٹو سے میرا دو بار سابقہ پڑا۔ ایک بار دلی میں اور دوسری بار بمبئی میں۔ دہلی میں میں نے اسے زک دے دی، لیکن بمبئی میں ہماری جوڑ رہی۔

دھواں' کے سلسلے میں ہم میں جو جھڑپ ہوئی اس کے بعد میرے اور اس کے تعلقات اور بھی کشیدہ ہوگئے۔ چونکہ منٹو زور میں تھا اور کرشن مجھے کچھ نہ کہتا تھا لیکن ہر بار منٹو کے لئے ڈھال بن جاتا تھا، اس لئے میرا وار دھیما پڑتا تھا لیکن اس دوران میں اپنے زعم میں منٹو راشد سے زبیٹھا۔ راشد آزاد نظم کے بانی سمجھے جاتے تھے اور منٹو کو آزاد نظم سے چڑ تھی۔ انہیں دنوں راشد کی نظموں کا مجموعہ 'ماورا' کے نام سے ہوا، جس پر کرشن چندر نے دیباچہ لکھا۔ منٹو نے دونوں کا مذاق اڑایا۔ اس نے 'نیلی رگیں' کے عنوان سے ایک ڈرامہ بھی لکھا جس میں کی نظموں سے الفاظ لے کر ان کا مذاق اڑایا۔ ڈرامہ آزاد نظم سے شروع ہوتا ہے۔ دو مکالمے دیکھئے :-

سعید۔ (شاعر) کرشن، تم نے کبھی کسی عورت کے ٹھنڈے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبائے ہیں؟

کرشن۔ ٹھنڈے ہاتھ......؟

سعید۔ ٹھہرو، مجھے اپنا فقرہ درست کر لینے دو ——— اب بتاؤ کیا تم نے کسی اجنبی عورت کے ٹھنڈے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبائے ہیں ——— ایسے ہاتھ جو چاند کی طرح خنک ہوں ——— کسی اجنبی عورت کے ہاتھ جو تمہاری زندگی میں یوں داخل ہو جیسے رات کے سنسان اندھیرے میں کوئی جگنو بھٹکتا آنکلے۔

کرشن۔ (مذاق کے طور پر) اپنی دم سے لالٹین باندھے ——— نہیں ——— جاڑے کی ڈل چپ سنا ہوا ادھر آنکلے۔ نہیں آج ہو کیا گیا ہے سعید۔ یہ ٹھنڈی یخ عورت تمہاری زندگی میں کب داخل ہوئی؟

کچھ دن منٹو آزاد شاعری کا، راشد کی نادر تشبیہوں کا، اجنبی عورت کا، زمستان کی رات کا مذاق اڑاتا رہا، پھر اس نے کوئی دوسرا موضوع ڈھونڈ لیا اور بات آئی گئی ہوگئی۔ لیکن راشد اسے نہیں بھولے۔

اس کے بعد ایک دن منٹو نے کوئی ڈرامہ لکھا اور راشد کو پڑھنے کے لئے دیا۔ راشد ٹائپ شدہ مسودہ اپنے کمرے میں لے گئے اور کچھ بعد واپس آکر انہوں نے مسودہ واپس کیا۔

"کیسا ہے؟" منٹو نے پوچھا۔

"نہایت اچھا ٹائپ ہوا ہے۔" راشد نے اس استہزا آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا جو ان کی اپنی چیز تھی۔

اور منٹو بقول خود 'کباب' ہو گیا۔ اس کے بعد منٹو ہفتوں راشد اور ان کی نظموں کو کوستا رہا۔ اپنے کسی دوست سے اس نے راشد کی

نظموں پر ایک مضمون بھی لکھوایا۔

مہدی صلاح کار کی حیثیت سے میں زیادہ وقت راشد کے ساتھ گزارتا تھا اور چونکہ منٹو اور راشد میں چلنے لگی تھی، راشد میرے پڑوسی بھی تھے اس لئے منٹو مجھے زیادہ نقصان نہ پہنچا سکتا تھا۔ تاہم مجھے پریشان کرنے میں منٹو نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

پھر غالباً ۱۹۴۲ء کے اواخر یا ۱۹۴۳ء کے شروع میں (ٹھیک سن مجھے یاد نہیں) اچانک ایک دن راشد ترقی کر کے پروگرام ڈائرکٹر (پروگرام آرگنائزیشن) ہو گئے۔ راشد نے چارج سنبھالتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ کرشن کی غیر حاضری میں اُس کا تبادلہ لکھنؤ کرا دیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ راشد کو چھوڑ کر دہلی کے ریڈیو اسٹیشن پر پروگرام اسسٹنٹوں میں کرشن سب سے قابل تھا۔ اور باقی جتنے پروگرام اسسٹنٹ تھے وہ اپنا شیڈول بنانے میں کرشن سے مدد لیتے تھے اور ظاہر ہے کہ اُس کا کہنا مانتے تھے۔ پروگرام ڈائرکٹر تک بیسیوں باتوں میں کرشن سے مدد لیتے تھے اس لئے اُس کے کام میں دخل نہ دیتے تھے، اور بہت سی باتیں کرشن براہ راست ڈائرکٹر جنرل سے منظور کرا لیتا تھا۔ راشد کی فطرت میں آمریت کو کافی دخل ہے۔ انہیں یہ منظور نہ تھا کہ کرشن اُن کو نظر انداز کر جائے۔ اس لئے اُنھوں نے اُس کو لکھنؤ بھجوا دیا۔ لیکن کرشن کی تبدیلی جن حالات میں ہوئی (راشد نے اُن کی غیر حاضری میں اُن کے خلاف کچھ الزامات لگائے اور چونکہ بخاری صاحب تک راشد کی براہ راست رسائی تھی۔ اس لئے فوراً تبادلہ کرا دیا) اس سے مجھے رنج ہوا اور میں نے راشد سے اپنے اس افسوس کا اظہار بھی کیا۔ راشد اُمید کرتے تھے کہ میں اُن کی تائید کروں گا، لیکن جب میں نے کرشن کی طرفداری کی تو باوجود اس کے کہ ہم برابر کے گھروں میں رہتے تھے اور میری بیوی اور بیگم راشد میں بہت اچھے تعلقات تھے، روز کا ملنا بیٹھنا تھا، راشد مجھ سے بدظن ہو گئے۔

راشد پروگرام ڈائرکٹر ہو گئے اور کرشن چلے گئے تو منٹو نے کچھ ہی دنوں میں دوسرے پروگرام ڈائرکٹر (سربلند رجوپیاہ) کو گانٹھ لیا۔ ہم کے جنم دن پر منٹو نے ایک بڑھیا سوٹ اُسے پرزنٹ کیا اور یوں اُسے اپنی طرف بلا لیا۔ اڈوانی چونکہ مجھ سے خوش تھے اس لئے انھوں نے مجھے نئے پروگرام اسسٹنٹ کے آنے تک کرشن کی جگہ سنبھالنے کے لئے کہا۔ منٹو کا ڈرامہ شیڈول پر تھا۔ میں نے پروڈیوس بھی کیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ منٹو اُس کی ریہرسلوں میں سٹوڈیو بھی آتا رہا۔ حالانکہ وہ شاذ ہی اپنے ڈراموں میں دلچسپی لیتا تھا۔

اس دوران میں لکھنؤ سے مہدی کا ایک پروگرام اسسٹنٹ کرشن کی جگہ لینے پہنچا ــــ نہایت بدصورت۔ لمبا تڑنگا، چپٹی ناک والا نوجوان تھا۔ اڈوانی نے بھیج اُسے اور مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور اُس سے کہا کہ وہ کچھ دن تک مجھ سے کام سیکھے۔ کرشن کے کمرے میں ایک میز اور دو کرسیوں کے علاوہ زیادہ جگہ نہ تھی۔ میں میٹنگ کے بعد کرشن والی کرسی پر جا بیٹھا اور اُس دن کا کام نمٹانے لگا لیکن میٹنگ کے بعد ہی منٹو نے اُس لکھنوی پی۔ اے (پروگرام اسسٹنٹ) کو سمجھایا کہ وہ پروگرام اسسٹنٹ ہے اور اُسے کرشن والی کرسی پر بیٹھنا چاہیے وہ اپنے آپ کو سمجھتا بھی بہت کچھ تھا۔ کام سیکھنے کی بات بھی اُسے اچھی نہ لگی تھی۔ اُس نے راشد سے پوچھا تو راشد نے بھی اُس سے یہی کہا کہ ڈرامہ ڈیپارٹمنٹ کی سب ذمہ داری تمہاری ہے۔ اشک تو آرٹسٹ ہے۔ کوئی بھی خرابی ہو، جواب دہ پروگرام اسسٹنٹ ہی ہوگا۔ مجھے ان سب باتوں کا علم نہ تھا۔ میں کرشن والی کرسی پر مزے سے بیٹھا کام کر رہا تھا کہ منٹو اُس لکھنوی پی۔ اے کے ساتھ آیا۔ میرا دھیان مسودے میں لگا تھا کہ منٹو نے میری کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ آپ کی کرسی ہے" ساتھ ہی اُس نے میرے سامنے پڑی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "آپ اِدھر آجایئے"

میں نے نگاہیں اٹھائیں۔ پی۔ اے کی آنکھوں میں تحکم تھا اور منٹو کی آنکھوں میں تمسخر کی چمک۔ مجھے معاملہ سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ میں نے کہا: "میں اوپر اپنے کمرے میں جاتا ہوں۔ آپ کو میری ضرورت ہو تو وہیں آجایئے گا"

اور میں چلا گیا۔ میری آنکھوں کے آگے غصہ کے مارے اندھیرا چھا گیا۔ راشد سے میں نے ذکر کیا تو معلوم ہوا کہ لکھنوی پی۔ اے اُن سے

چکا ہے۔ یہ بھی پتہ چل گیا کہ وہ چاہتے ہیں اُن کے پروگرام اسسٹنٹ خود ہی غلطیاں کر کے سیکھیں۔ دراصل اُنھیں یہ بات پسند آئی تھی کہ اڈوانی نے بغیر اُن سے پوچھے مجھے کرشن کی جگہ کام کرنے کو کہہ دیا۔ میں اس کا شائق بھی نہ تھا۔ کیونکہ ایک بار جب جگل صاحب نے مجھے پی۔ اے کی جگہ آفر کی تھی تو میں نے انکار کر دیا تھا۔ لیکن ایک بار جب میں اس جگہ جا بیٹھا تو اس طرح اُٹھنا اور وہ بھی منٹو کے سامنے، اُس کی انگیجمنٹ پہ مجھے تل گیا۔ پہلے خیال آیا کہ اڈوانی کے پاس جاؤں کیونکہ اُنھوں نے ہی مجھے بھیجا تھا۔ لیکن پھر سوچا کہ اڈوانی کچھ نہ کر سکیں گے۔ منٹو کی آنکھوں کی فاتحانہ چمک میرے دل میں دور تک گھاؤ کرتی چلی گئی۔ اُسی غصے میں ایم سے کے لئے خیال آیا کہ استعفا دے دوں، پھر خود ہی اس پہ ہنسی آ گئی۔ جلایا ہوا اوپر اپنے کمرے میں جا بیٹھا۔ منٹو کی آنکھوں کی وہی چمک پھر سامنے آ گئی ـــــ خدا گواہ ہے اگر منٹو اُس لکھنوی پی۔ اے کے ساتھ نہ ہوتا اور اُس کی آنکھوں میں وہ چمک نہ ہوتی تو میں وہ سب نہ کرتا جو میں نے کیا اور منٹو کو دہلی نہ چھوڑنی پڑتی۔

اُس وقت کمرے میں جا کر بیٹھا تو کام کرنا میرے لئے یکسر مشکل ہو گیا۔ بار بار اپنی ہتک کا خیال آنے لگا۔ راشد پہ غصہ آتا، اُس لکھنوی پی۔ اے پہ غصہ آتا، لیکن سب سے زیادہ غصہ آتا منٹو پر! اُس کی آنکھوں میں جو چمک تھی اُس سے پتہ چل گیا تھا کہ میری ہتک کرنے والا نہ وہ پی۔ اے ہے نہ راشد، منٹو ہے اور میں نے طے کر لیا کہ منٹو کو اس سازش کا مزہ چکھاؤں گا۔ میرے غصے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جتنے دن میں نے کرشن کی جگہ کام کیا، اس میں منٹو ہی کا ڈرامہ پروڈیوس کیا اور حتی الامکان کوشش کی کہ میں اُس میں ایک لفظ نہ کاٹوں اور وہ اچھے سے اچھا پروڈیوس ہو۔ کچھ اسی کا غصہ اور کچھ تازہ ہتک کا گھاؤ، کام وام چھوڑ کر میں بس کہنیاں میز پر ٹکا، ہتھیلیوں پہ ٹھوڑی رکھ کر بیٹھ گیا۔

جانے اجداد میں سے کسی نے نہرشی چانکیہ کے آشرم میں تعلیم پائی تھی یا جانے ہمارا خاندان اُن سے وابستہ تھا یا بچپن سے والد محترم نے اُس مہرشی کے کارنامے سُن سُن کر میں نے اُسی کی طرح سوچنا سیکھ لیا تھا۔ بہرحال ہمیشہ جب مجھ پہ مصیبت آئی، میری سمجھ اور سوچ تیز اور بھی تیزی سے کام کرنے لگیں اور توہین کرنے والے کو، اگر وہ میرے برابر کا ہے یا مجھ سے اونچا ہے، میں نے کبھی معاف نہیں کیا (اور بات کتنی بھی بڑی کیوں نہ ہو) اُس سے ضرور انتقام لیا اور نہ صرف ہر مصیبت سے نکلا ہوں، بلکہ ایک دم آگے ہی بڑھا ہوں۔

سوچنے پہ مجھے محسوس ہوا کہ یہ لکھنوی پروگرام اسسٹنٹ نہایت احمق آدمی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ منٹو نے اُسے بھڑکایا، لیکن جو منٹو کے کہنے میں آ گیا، اُس کی حماقت میں کیا شک ہے۔ اُس وقت بھی ہندی میں میرا کافی نام تھا۔ اُس نے میرا نام نہ سُنا ہو، ایسی بات نہیں۔ وہ عقلمند ہوتا تو مجھے الگ لے جا کر بات کر لیتا اور یوں ٹکا سا نیچے میں مجھ سے کچھ نہ کہتا۔ سوچا کہ اس احمق ہی کو آلۂ کار بنایا جائے اور کچھ دیر بعد نیچے گیا۔ لکھنوی پی۔ اے سینہ تانے، بھنویں ناک چڑھائے، نخنے پھلائے، لکھنؤ کے اپنے قصے سُنا رہا تھا کہ کیسے چوب صاحب (جو اس وقت ہوئے سٹیشن ڈائریکٹر تھے) اُسے چاہتے ہیں اور کیسے کیسے اُس نے وہاں کارہائے نمایاں سر انجام دیئے ہیں اور منٹو (اپنی عادت کے خلاف) چپ چاپ کرسی پہ سامنے گھٹنے بانہوں میں دبائے ہمہ تن گوش اُس کی لن ترانیاں سُن رہا تھا۔ میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ کرسی تو دوسری تھی نہیں کہ بیٹھتا۔ دونوں نے ایک نظر مجھے دیکھ لیا۔ کچھ دیر کے بعد منٹو کو چوپڑہ صاحب کا چپراسی بلا کر لے گیا تو میں نے اُن لکھنوی حضرت سے کہا "مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ ہندی کے آدمی ہیں۔ اس سٹیشن پر ہندی کے ایک پروگرام اسسٹنٹ کی بڑی ضرورت تھی" اور میں نے اُسے شام کو گھر پہ چائے کے لئے مدعو کر دیا۔

میں اُن دنوں تیس ہزاری میں رہتا تھا۔ وہاں نزدیک ہی چھوٹی سی پہاڑی اور خوشنما جنگل ہے۔ برسات کی شام تھی۔ چائے پلا کر میں اُس لکھنوی کو سیر پہ لے گیا۔ بادل گھرے ہوئے تھے اور بڑی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ وہ لگاتار اپنی تعریفیں کرتا رہا کہ کس طرح اُس نے ڈرامے لکھے، کس طرح چوب صاحب نے کہا کہ ویسا سکرپٹ (SCRIPT) ہندی میں کوئی نہیں لکھتا اور کس طرح اُنھوں نے اُس کی سفارش کی کہ اُسے پروگرام اسسٹنٹ

بتا دیا۔ میں نے بھی اُسے خوب چنگ پر چڑھایا۔ اُس کی شخصیت کی تعریف کی۔ اُسے کہا کہ اگر شروع ہی سے اُس نے اپنا سکّہ جمایا تو سب اُس سے خوف کھائیں گے، نہیں آرٹسٹ تو اچھے سے اچھے کو حقّہ بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ میں نے اُس سے یہ بھی کہا کہ پی۔ اے کا کام ہے کہ جو ڈرامے براڈکاسٹ ہوں اُنہیں اچھی طرح پڑھے، ویٹ (VETT) کرے۔ اُس نے کہا کہ وہ ایک ایک چیز پڑھے اور ویٹ کئے بغیر براڈکاسٹ نہ ہونے دے گا: "اب جب آپ آگئے ہیں اور ہندی جانتے ہیں" میں نے کہا "تو میں آئندہ ڈرامے آپ کی سہولت کے لئے ہندی رسم الخط ہی میں لکھوں گا۔ باقی تو اُردو ہی میں آئیں گے، وہ آپ مجھ سے سن کر ویٹ کیا کیجئے اور یوں اچھی طرح دیکھ کر براڈکاسٹ کیجئے، کیونکہ اب اگر ڈرامہ براڈکاسٹ ہو تو ذمہ داری آپ کی ہوگی اور میٹنگ میں ڈانٹ آپ ہی کو پڑے گی۔" اس پر اُس نے اپنی قابلیت کے بارے میں میرے علم کو اور بڑھایا اور بہت خوش خوش واپس ہُوا۔

اب شیڈول تو تین مہینے پہلے بن جاتا تھا اور وہ کرشن بنا کر گیا تھا۔ میں مہینے دو مہینے ڈرامہ لکھتا تھا اور منٹو کے دو تین ڈرامے ہر مہینے ہوتے تھے۔ اگلا ڈرامہ منٹو ہی کا تھا۔ نام تھا (جہاں تک کہ مجھے یاد ہے) "آوارہ"۔ پلاٹ وغیرہ مجھے سب بھول گیا ہے۔ اتنا یاد ہے کہ وہ ڈرامہ بھی منٹو کے اُن دنوں لکھے بیشتر ڈراموں کی طرح ایک ہی دن میں لکھا ہُوا تھا۔ دوسرے ہی دن اُس لکھنوی پی۔ اے نے اُس کا مسودہ نکالا اور مجھے بلایا۔ میں اُسے سٹوڈیو میں لے گیا اور وہاں جا کر اُسے سنانے لگا۔ اُس کو زبان وغیرہ یا ڈرامہ وغیرہ کی خاک سمجھ نہ تھی۔ ڈرامہ سناتے سناتے میں کہتا "کیوں حضّت اس لفظ کی جگہ یہ لفظ ہو تو کیسا رہے؟" اور وہ کہتا — "ہاں ہاں، یہ بہتر ہے۔" اسی طرح میں لال پنسل کی مدد سے الفاظ اور محاورے بدلتا چلا گیا۔ دو چار جگہ میں نے گول نشان لگا دیئے۔ میں نے ان حضرت سے کہا کہ راشد صاحب ان الفاظ کے سخت خلاف ہیں۔ ان کے ساتھ سال ڈیڑھ سال کام کر کے میں جان گیا ہوں۔ میں ان کو نہیں بدلتا۔ یہ وہ خود بدل دیں گے اور اس طرح ان تبدیلیوں کی تمام تر ذمہ داری ان کی ہو جائیگی۔ ڈرامہ کا اختتام میں نے کاٹ دیا اور اُس کی جگہ نیا اختتام تجویز کر دیئے۔

جیسا کہ میں نے سوچا تھا، ویسا ہی ہوا۔ اُس لکھنوی پی۔ اے نے راشد پر بڑا رعب ڈالا کہ اُس نے منٹو کا ڈرامہ پڑھا ہے۔ بڑا خام ہے۔ اُس نے بڑی محنت سے ویٹ کیا ہے۔ راشد مسودہ دیکھیں اور پاس کریں تو براڈکاسٹ ہو۔ راشد تو منٹو سے پہلے ہی جلے بیٹھے تھے، اُن کو اپنا بدلہ لینے کا موقعہ ہاتھ آیا اور اُنھوں نے وہ چند الفاظ بھی، جن پر میں نے لال پنسل سے گول دائرے بنا دیئے تھے، بدل دیئے۔

جب منٹو کو معلوم ہُوا کہ اُس کا ڈرامہ ویٹ ہُوا ہے تو اُس کے سر پر خون سوار ہو گیا۔ وہ ڈائریکٹر کے کمرے میں گیا اور اُس نے راشد اور اُس لکھنوی پی۔ اے کو سخت سست سنائیں اور کہا کہ ڈرامہ ہوگا تو بنا ایک لفظ کٹے ہوگا، ورنہ نہیں ہوگا۔

میں اُوپر نوبی کلارک (انگریزی اناؤنسر) کے کمرے میں بیٹھا کرتا تھا۔ اڈوانی کے کمرے کا روشن دان میری آنکھوں کے سامنے پڑتا تھا۔ نیچے اڈوانی کے کمرے میں منٹو کچھ اتنے زور سے چلّا رہا تھا کہ میں اُٹھ کر روشندان کے پاس چلا گیا اور جھک کر اندر کا نظارہ کرنے لگا۔ راشد کہہ رہے تھے کہ اُنھوں نے خود ڈرامہ پڑھا ہے اور ہوگا تو انھیں تبدیلیوں کے ساتھ ہوگا ورنہ نہیں ہوگا اور ڈیوی ایشن (DEVIATIN) یعنی تبدیلی کے انحراف کی ذمہ داری اُن کی نہیں ہوگی۔ جب ہم باہر والوں کی چیزیں ویٹ کر سکتے ہیں تو اپنے آرٹسٹوں کی کیوں نہیں کر سکتے۔ اور منٹو پنجرے میں بند شیر کی طرح تلملا رہا تھا اور تڑپ تڑپ کر دہاڑتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ ڈرامہ ہوگا تو اسی روپ میں ہوگا ورنہ نہیں ہوگا۔

مجھے منٹو کی اس تلملاہٹ کو دیکھ کر کچھ عجیب سی شیطانی مسرّت ہوئی۔ منٹو نے مجھے جتنی گالیاں دی تھیں، میری ترقی کے راستے میں جو رکاوٹیں ڈالی تھیں، اُردو کا ٹائپ رائیٹر میرے ہاتھ بیچتے ہوئے جو چالیس روپے جھوٹ بول کر زیادہ لے لئے تھے اور اُوپر سے مجھے بنایا تھا اور جتنا بھی مجھے ستایا تھا، اُس سب کا صلہ اُن چند لمحوں کی اس کی تلملاہٹ میں مجھے مل گیا۔ "سنار دی ٹھک ٹھک، لوہار دی اکو سٹ" میں نے من ہی من پنجابی کا محاورہ دہرایا اور واپس اپنے کمرے کی طرف پھرا۔

مجھے یاد نہیں اڈوانی نے کیا فیصلہ دیا تھا، غالباً انھوں نے راشد پر سب کچھ چھوڑ دیا تھا اور پروگرام ڈائریکٹر کے کام میں مداخلت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بہرحال ایک عجیب سی شیطانی مسرت سے معمور میں واپس آ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور ٹانگیں میز پر پھیلا کر اطمینان کی سانس لی۔ لیکن اس مسرت اور اطمینان کے باوجود کچھ عجیب طرح کی تکلیف اور اداسی کا احساس دل و دماغ پر طاری ہو گیا ——— آنکھوں کے سامنے کی جھلاہٹ، اس کے خوبصورت ماتھے پر پڑی ہوئی شکنیں، اس کی باہر کو نکلی ہوئی آنکھیں ——— سب کچھ گھوم گیا ——— اور اس جھلاہٹ کا باعث میں تھا ——— میں جو درحقیقت اسے چاہتا تھا، اس کے پاس بیٹھنا چاہتا تھا، اس کے افسانوں کا اس کے نام نہاد چاہنے والوں سے زیادہ مداح تھا ——— میں، جس نے دو ایک مہینہ پہلے اپنے ڈراموں کا دوسرا مجموعہ 'چرواہے' اس کے نام معنون کیا تھا۔

'چرواہے' کا ایک نسخہ میرے پاس پڑا ہے۔ منٹو کے نام کیا ہوا انتساب میرے سامنے ہے۔

منٹو کے نام

جو مجھے کبھی بہت اچھا لگتا ہے اور کبھی سخت بُرا

میرے اس وقت کے جذبات کی کتنی صحیح تصویر یہ انتساب پیش کرتا ہے۔

دوسرے دن میٹنگ میں ڈرامہ کا قصہ پیش ہوا۔ لکھنوی پی۔ اے نے راشد کے کہنے پر ڈرامے کی تحریری تنقید پیش کی۔ آل انڈیا ریڈیو کی زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ کسی ہونے والے ڈرامے کی تنقید میٹنگ میں ہو۔ لیکن چونکہ ڈیوٹی اسٹیشن کا سوال تھا، اگر وہ ڈرامہ نہ ہوتا تو اس کی جگہ دوسرا ڈرامہ چھپنے کی بات تھی اس لئے راشد نے میٹنگ میں وہ بات اٹھائی۔ لکھنوی پی۔ اے نے پہلے ہی سے وہ تنقید تیار کر رکھی تھی اس نے پڑھ دی۔ بہرحال منٹو کی تنقید ہو اور وہ بھی بھری میٹنگ میں، یہ کبھی نہ ہوا تھا۔ منٹو اس طرح اپنی تنقید سننے کا عادی نہیں تھا۔ لکھنوی کی سمجھ کے بارے میں اس نے دو تین تیز باتیں کہیں۔ ان تیز باتیں کہتے وقت منٹو کچھ سوچتا نہ تھا۔ مجھے پھر غصہ آ گیا اور میں نے کہا یہ ڈرامہ میری نظر سے بھی گزرا ہے اور ان صاحب نے بالکل ٹھیک تنقید کی ہے —— اور چونکہ سب قطع برید میں نے کی تھی اس لئے میں نے صفائی سے اس ڈرامے کی کمزوریاں اجاگر کر دیں۔

مجھے اب یاد نہیں، منٹو نے کیا کہا، لیکن غصہ میں اس نے میری قابلیت کے بارے میں کوئی تیز بات کہی جس کا مطلب تھا کہ تکنیک کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتا، اور پوچھا کہ تم اس سے بہتر لکھ کر دکھا سکتے ہو؟

میں نے اور بھی تیز لہجہ میں کہا کہ میں تمہیں دس برس تک ڈرامہ لکھنا سکھا سکتا ہوں۔ تم اوپر میرے کمرے میں آؤ، تمہیں بتاؤں، ڈرامہ کیسے لکھا جاتا ہے اور یہ ڈرامہ بھی بہتر بنا کر دکھا دوں۔

بات بڑھ جاتی، لیکن شور سن کر اڈوانی صاحب اپنے کمرے سے آ گئے۔ طے ہوا کہ ڈرامہ تصحیح شدہ حالت میں ہو گا اور چونکہ اسٹیشن کا سوال ہے اس لئے جدول سے انحراف نہیں ہو گا۔

منٹو میٹنگ کے بعد دفتر میں نہیں رکا۔ اس نے ٹائپ رائٹر اٹھایا اور چلا گیا۔ دوسرے دن بھی وہ دفتر نہیں آیا۔ دوپہر کو خورشید صاحب ڈپٹی ڈائریکٹر انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ کا فون آیا کہ منٹو کا ڈرامہ اگر براڈ کاسٹ کرنا مقصود ہو تو منٹو کے لکھے مسودے کے مطابق کیا جائے ورنہ رد کر دیا جائے۔

(ٹھیک واقعات مجھے یاد نہیں رہے۔ غالباً ڈرامہ خورشید صاحب نے منگایا تھا اور پھر انھوں نے یہ پیغام بھیجا تھا۔ راشد چونکہ کہتے تھے کہ وہ جدول سے انحراف نہیں ہونے دیں گے اور ڈرامہ تصحیح شدہ حالت میں کریں گے اس لئے منٹو نے خورشید صاحب کے ذریعے کینسل کرا دیا تھا۔)

تیسرے دن بھی منٹو دفتر میں نہیں آیا۔ ڈرامہ اُس نے لٹکا لیا۔ چوتھے یا پانچویں یا غالباً ساتویں دن سُنا کہ وہ بمبئی چلا گیا ہے اور اُسے فلم کمپنی میں پانچ سو کی جگہ مل گئی ہے۔

گرانٹ روڈ کو جاتے ہوئے وکٹوریہ میں میرے سامنے بیٹھے بیٹھے منٹو نے بتایا کہ نوکری ووکری اُسے کچھ نہیں ملی تھی اور بمبئی میں اُسے خاصی تکلیف ہوئی۔ بیوی کو وہ دہلی ہی میں چھوڑ آیا تھا۔ بعد میں فلمستان میں اُسے ساڑھے تین سو کی نوکری ملی تو غالباً اُس کا دوست نذیر جا کر اُس کی فیملی کو بمبئی لے آیا۔

" وہ تمہارا لال کیا ہوا مسودہ اب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔" اچانک منٹو نے کہا۔ یعنی جس طرح مجھے نہ راشد پر غصہ تھا، نہ اُس لکھنوی پی۔ ایل۔ پر بلکہ منٹو پر غصہ تھا، اسی طرح منٹو کو بھی اُن دونوں کے بجائے مجھی پر غصہ تھا، اُس کا ڈرامہ میں نے کاٹا ہے، یہ بات وہ جان گیا تھا۔

" اب تمہارے کیا ارادے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

منٹو چپ رہا۔

" دیکھو، دہلی کی دہلی میں رہی۔ اگر یہیں اسی طرح لڑنا ہے تو مجھے فلمستان کی نوکری منظور نہیں۔ وہاں ساڑھے تین سو پاتا ہوں، آرام سے ہوں۔ یہاں پانچ سو بھی ملے اور چخ چخ رہی تو کیا فائدہ۔"

" نہیں نہیں۔ ویسا کچھ نہیں ہوگا۔" اور اُس نے انگریزی میں فقرہ پورا کرتے ہوئے کہا۔

اُس دن گھر واپس آ کر میں نے صفیہ بھابی سے کہا " دیکھیے، منٹو نے مجھے بمبئی بلایا ہے۔ میں آ نہیں رہا تھا۔ دوبارہ تار بھیجنے پر چلا آیا ہوں۔ منٹو نے باتوں باتوں میں بتا دیا ہے کہ وہ 'آوارہ' کا مسودہ سنبھالے ہوئے ہے اور دِلّی کے اس واقعہ کو نہیں بھولا۔ ہم دہلی میں لڑتے رہے ہیں اور لوگوں کے لئے تماشہ بنے ہیں۔ اب اُس نے مجھے بمبئی بلایا ہے تو آپ اسے سمجھا دیجئے کہ مجھے یہاں تنگ نہ کرے، کیونکہ وہ تنگ کریگا تو میں بھی تنگ کرونگا اور آخر ہم دونوں تنگ ہوں گے۔"

منٹو اور صفیہ بھابی نے مجھے یقین دلایا کہ ویسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ اور میں نے اگرچہ کانٹریکٹ پر دستخط نہیں کئے لیکن 'ہاں' کر دی۔ لیکن جب بعد میں میں نے سوچا تو میں نے طے کیا کہ میں حتی الامکان اس بات کا موقعہ ہی نہ آنے دونگا کہ منٹو سے میری لڑائی ہو۔ اور بمبئی میں جتنے میرے واقف کار تھے اُن سے مل کر میں نے 'فلمستان'، اُس کے کرتا دھرتا ششدھر مکرجی اور وہاں کے طریق کار کے بارے میں واقفیت حاصل کی۔ میں خاص طور پر اُن لوگوں سے ملا جو منٹو کے ساتھ کام کرتے تھے اور اب وہاں نہیں تھے۔ مجھے تین چار اہم باتوں کا پتہ چلا۔

۱۔ فلمستان کا باس مکرجی زمانۂ قدیم کے ساڈسٹ پسند اُن داروغوں جیسا ہے جو غلاموں کو کوڑے مار مار کر اُن سے کام لیتے تھے۔

۲۔ فلمستان میں منٹو کا ایک چھتر راج ہے۔

۳۔ جب سال بھر پہلے شاہد لطیف نے میرا نام تجویز کیا تھا تو منٹو نے فلمستان میں میرے آنے کی مخالفت کرتے ہوئے کہا تھا کہ اشک بڑا خطرناک آدمی ہے۔

۴۔ فلمستان میں ایک ہی منظر کو سب مکالمہ نویس لکھتے ہیں۔ منٹو سب کے مکالمے پڑھتے ہیں اور سب کو رد کر کے خود لکھتے ہیں — ظاہر ہے کہ وہ سب سے اچھا ہوتا ہے۔ اسی طرح اُنھوں نے شاہد لطیف اور سنتوش کو فلمستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا جبکہ شاہد لطیف ہی منٹو کو فلمستان میں لے گیا تھا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک سال پہلے منٹو مجھے خطرناک سمجھتا تھا تو سال بھر بعد میں کس طرح اتنا بے ضرر ہو گیا کہ خود اُس نے مجھے وہاں بلوایا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب منٹو نے مجھے فلمستان میں کام کرنے کے لئے خط لکھا تھا تو خود میں نے اپنے آپ سے یہی سوال کیا تھا اور پہلی بار میں نے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن ایک مہینے بعد جب منٹو نے مجھے تار دیا کہ انٹرویو کو آؤ اور سیکنڈ کلاس کا کرایہ کمپنی سے لو تو چونکہ کرشنا ٹریننگ لینے بمبئی جا رہی تھی، لہٰذا میں بھی تیار ہو گیا۔ خیال تھا کہ اور کچھ نہ سہی تو بمبئی کی سیر ہی ہو جائے گی۔ لیکن وہاں جانے کا فیصلہ کرنے کے باوجود میں سوچتا تھا کہ آخر منٹو نے مجھے کیوں بلوایا ہے۔ اُس وقت میں جس نتیجے پر پہنچا تھا، اُس میں مجھے بمبئی میں منٹو سے ملنے اور وہاں کے حالات جاننے پر تھوڑی سی ترمیم کرنی پڑی۔ لیکن اُس بنیادی وجہ میں فرق نہیں پڑا۔ چونکہ اس قصے کا ایک نفسیاتی پہلو بھی ہے اور خاصا دلچسپ ہے، اس لئے میں اس کا ذکر ناضروری سمجھتا ہوں۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے مجھے منٹو سے نفرت نہ تھی۔ نفرت یا محبت کے لئے کچھ وقت کا ساتھ ناگزیر ہے اور میں تو دہلی آنے سے پہلے منٹو سے ملا بھی نہ تھا۔ اور جب ملا تو پہلی ملاقات میں، جہاں تک شکل و صورت کا تعلق ہے وہ مجھے اچھا لگا تھا ——— گورا چٹا رنگ، پتلا چھریرا جسم، فراخ پیشانی، ستواں ناک، بڑی بڑی آنکھیں اور ہونٹوں پر استہزا آمیز مسکراہٹ ——— منٹو کی یہی پہلی جھلک ہے جو میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ اس دوران میں میں 'منتر'، 'نیا قانون'، اور شاید 'مسز ڈی کوسٹا'، پڑھ چکا تھا اور یہ افسانے مجھے بے حد اچھے لگے تھے اور منٹو نے میرے دل میں ایک مترجم کے بجائے ایک ذہین افسانہ نگار کی حیثیت سے جگہ بنا لی تھی۔ لیکن دہلی میں میرے آنے سے پہلے ہی ہمارے لئے جو پارٹ ڈھل گئے تھے اُن سے نجات نہیں ملی۔ ہمیں ایک دوسرے کا حریف ہونا تھا اور ہم باہم حریف ہو کر رہے۔

لیکن جب منٹو اچانک دہلی سے چلا گیا تو مجھے بڑا افسوس ہوا۔ کرشن لکھنؤ تبدیل ہو گیا تھا، اختر الایمان کو راشد نے جواب دلوا دیا تھا۔ چڈھا، میرا جی اور راجہ مہدی علی خاں، راشد کی خوشامد میں لگے رہتے تھے اور راشد، چونکہ مجھے کرشن کا آدمی سمجھتے تھے اس لئے مجھے تنگ کرنے کے درپے تھے۔ منٹو کی غیر موجودگی مجھے بہت شاق گزرتی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ منٹو کے رہنے پر کبھی کبھی جھپٹ ہو جاتی، خاصی چپقلش بھی رہتی تھی، لیکن اس سے اچھا لکھنے میں مدد بھی ملتی تھی اور ایک عجیب سی قربت کا احساس رہتا تھا ——— منٹو کے بمبئی جانے کے بعد اُس کی اور اُس کے افسانوں کی تعریف نہ کرنے کے سلسلے میں میں نے اپنے اوپر زبردستی جو قید لگا رکھی تھی اُسے ڈھیلا کر دیا ——— منٹو کے بمبئی جانے کے سال ڈیڑھ سال بعد ——— ٹھیک سن مجھے یاد نہیں، اُس کا افسانہ 'بُو' شائع ہوا۔ اس افسانے کے شائع ہوتے ہی اُس کے خلاف ایک شور برپا ہو گیا۔ چودھری نذیر احمد نے اس کے بارے میں میری بھی رائے مانگی۔ میں نے 'بُو' کی خوب تعریف کی۔ مجھے 'بُو' کے کنٹنٹ سے غرض نہ تھی۔ میں اُس افسانے کی تکنیک پر فدا تھا۔ ایک بڑی نازک سی تھیم کو منٹو نے جس چابکدستی سے 'بُو' میں سمویا ہے، وہ نہ صرف قابلِ داد ہے بلکہ قابلِ تقلید بھی ہے۔ میں وہ افسانہ اپنے کئی دوستوں کو سنا چکا ہوں، جن میں ہندی کے مشہور افسانہ نگار یشپال بھی شامل ہیں اور یشپال میری رائے سے متفق ہیں۔ ہر ہندی افسانہ نگار کو میرا مشورہ ہے کہ افسانہ کی تکنیک کو جاننے کے لئے وہ 'بُو' ضرور پڑھے۔ تکنیک کے کمال کے لحاظ سے اُس کے جوڑ کا افسانہ بیدی کا 'لاجونتی' ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا افسانہ اُردو ادب میں اُس کی ٹکر کا مجھے دکھائی نہیں دیتا۔ لاجونتی میں ہیئت ہی نہیں کنٹنٹ کا بھی کمال ہے۔

بہرحال مجھے خیال ہوتا ہے کہ 'بُو' کے بارے میں جو خط میں نے چودھری نذیر احمد کو لکھا، اُس نے منٹو سے اس کا ذکر کیا یا اُس کا خلاصہ اُنہیں بھیج دیا۔ کیونکہ جب میں بمبئی گیا تھا تو منٹو نے اس کا ذکر کیا تھا۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اُس خط کے بعد میرے بارے میں منٹو کا رُخ کچھ ڈھیلا ہو گیا اور یہی وجہ ہے کہ جب ڈائریکٹر نتن بوس فلمستان میں ایک فلم بنانے آئے اور ایک نئے مکالمہ نویس کو رکھنے کی بات چلی تو منٹو ہی نے میرا نام پیش کیا۔

کی ایک دوسری وجہ بھی تھی۔ غیر شعوری طور پر جس کا مجھے احساس تھا اور جس کی تصدیق بعد میں ہوئی۔ منٹو کو شراب نے پہلے ہی [illegible]
کے واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے "آوارہ" کے اُس سرقے کا ذکر نہ کرنا جسے میں نے کانٹ چھانٹ دیا تھا تو میں اسی خوش فہمی میں مبتلا رہتا کہ بہ [illegible]
منٹو کے دل میں جو کدورت تھی وہ دھل ہوگئی ہے۔ منٹو ڈھیلا پڑ گیا تھا لیکن وہ اُس واقعہ کو فراموش نہ کر سکا تھا۔ سال بھر پہلے فلمستان میں اُس کی
پوزیشن اتنی مضبوط نہ تھی۔ اُس وقت میں وہاں جاتا تو اگر میرا یا شاہد کا یا میرا یا ستنوشی کا گٹ بن جاتا تو منٹو کو تکلیف ہوتی۔ اس لئے اُس نے
میری مخالفت کی۔ جس وقت اُس نے مجھے بلایا اُس وقت شاہد لطیف اور ستنوشی فلمستان چھوڑ چکے تھے اور منٹو مکرجی کی ناک کا بال بنا ہوا تھا۔
مجھے دوستوں نے بتایا کہ منٹو تمہارے مکالموں کے پرخچے اُڑا دیگا۔ تم تنخواہ ضرور اچھی پاؤ گے لیکن تمہاری جان مصیبت میں آ جائے گی۔ اور میں
سمجھ گیا کہ میں نے اُس کے ڈرامے کی جو دھجیاں اُڑائی تھیں اُس کا انتقام لینے کی ترکیب اُس نے اِن نکالی تھی۔ اور چونکہ میں ہاں کر چکا تھا
اور دہلی میں مشہور ہو گیا تھا کہ میں نے فلم کی نوکری کر لی ہے اس لئے میں واپس تو نہ گیا لیکن میں نے فلمستان میں اپنا لائحہ عمل طے کر لیا۔
میں نے اُس وقت تک کنٹریکٹ پر دستخط نہ کئے جب تک فلمستان میں مجھے الگ کمرہ اور الگ میز کرسی نہیں مل گئی۔ (یہ پہلی احتیاط
تھی کہ منٹو میں اور مجھ میں جھگڑے کی نوبت نہ آئے) اور یہ طے نہیں ہو گیا کہ صرف میں ہی تھی بوس کے لئے مکالمے لکھوں گا اور میں ہی
ڈائیلاگ ڈائریکشن کروں گا۔

میرا پہلا فلم "مزدور" تھا اور دوسرا "سفر" جسے مترا نے ڈائریکٹ کیا۔ نہ صرف پہلے کے بلکہ دوسرے کے مکالمے بھی صرف میں نے
لکھے اور یوں فلمستان کا ڈیڑھ سال نسبتاً آرام سے گزر گیا۔ منٹو کو اس بات کا قلق ضرور رہا کہ میں نے اُس کی چال کاٹ دی لیکن میں نے اپنی
عادت کو جانتے ہوئے نہ جھگڑنے کے بدلے اس بات کا انتظام کر لیا کہ جہاں تک ممکن ہو اس سے بچا جائے۔
لیکن میری تمام احتیاط کے باوجود آخر منٹو مجھے ایک چوٹ پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔ میرا پہلا فلم "مزدور" خواہ باکس آفس پر کامیاب نہ رہا
تھا لیکن میرے مکالمے ۱۹۴۵ء کے بہترین ڈائیلاگ سمجھے گئے تھے اور مجھے ایک سند بھی ملی تھی۔ میرا دوسرا فلم "سفر" باکس آفس پر بھی کامیاب
رہا، اور ظاہر ہے کہ میرا کریڈٹ بھی بڑھ گیا۔ تب اشوک کمار نے اپنا الگ فلم پروڈیوس کرنے کی خواہش ظاہر کی اور مکرجی مان گئے۔ منٹو
کے دونوں فلم جو چل چل رہے "نوجوان" اور "شکاری" دو دو سال بننے کے باوجود ناکام رہے تھے۔ اِس لئے اشوک کمار میرے پاس آئے
اور اُنھوں نے مجھ سے ایک کہانی لکھنے کی فرمائش کی۔ میں نے اُن کو دو تین پلاٹ، جو میرے ذہن میں تھے، سنائے۔ اشوک نے ایک پسند
کر لیا اور مجھ سے کہا کہ میں ایک خاکہ سا لکھ ڈالوں۔ لیکن میں نے کہا کہ لکھنے سے پہلے ایک شرط واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں کہانی لکھنے کا
دو ہزار روپیہ پیشگی لوں گا ——— میں اُس وقت پونے سات سو کے قریب تنخواہ پا رہا تھا ——— لیکن میرا کہنا تھا کہ میں مکالمہ نویس کی حیثیت
سے ملازم ہوں، کہانی نویس کی حیثیت سے نہیں۔ کہانی لکھوں گا تو اُس کا دو ہزار لوں گا اور ڈائیلاگ نوکری کے کھاتے لکھوں گا۔ اگرچہ
اشوک کمار مکرجی کا سالا تھا لیکن اُن دنوں سالے بہنوئی کے تعلقات کچھ کشیدہ تھے۔ اشوک نے کہا "آپ مکرجی سے کہیئے۔" لیکن مکرجی
مجھ سے خوش نہ تھے۔ میں نے انکار کیا۔ تب اشوک نے کہا کہ میں سیٹھ چنی لال سے کہوں گا۔ آپ بات کر لیجئے گا۔ لیکن اس دوران میں آپ
ایک خاکہ ضرور لکھ ڈالئے۔

منٹو کو یہ خبر مل گئی کہ اشوک میرے پاس پہنچا ہے اور میں دو ہزار روپیہ مانگ رہا ہوں تو اُس نے واچا کو ساتھ ملا لیا۔ واچا اشوک
کو اپنے فلیٹ پر لے گئے۔ شراب واچا کے ہاں اعلیٰ قسم کی رہتی تھی۔ اشوک کو اُنھوں نے اُس وقت تک نہ اُٹھنے دیا جب تک یہ طے نہیں کر لیا کہ
منٹو نئے فلم کی کہانی لکھے گا اور دوسرے دن اُس کا مہورت ہو جائے گا۔
چونکہ کہانی کوئی تیار نہ تھی اور مہورت ہو گیا تھا اس لئے آٹھ دن تک فلمانے کے سلسلے میں کیا کیا دقتیں پیش آئیں یہ ایک الگ بحث

لیکن چونکہ منٹو نے یہ جانتے ہوئے کہ میں نے الگ سے معاوضہ مانگا تھا، بغیر معاوضہ لئے افسانہ لکھ دینا منظور کر لیا (یہ الگ بات ہے کہ جب آٹھ دن فلم بن گئی تو اس نے پریشان کرنا شروع کیا اور کہانی کی مد میں بھی کچھ معاوضہ لے لیا) اور اچھی خاصی سازش کر کے مجھے نیچا دکھا دیا اس لئے مجھے بہت برا لگا ـــــ خصوصاً اس وقت جب میں افسانہ کا خاکہ لکھ کر اشوک کے آنے کا انتظار کرتا رہا ـــــ صورت ہو گیا۔ مگر جی مجھ سے خوش نہ تھے اس لئے سوا اس کے کہ میں زہر کا گھونٹ پی کر رہ جاتا، اور کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن کچھ ہی دن بعد میں نے غصہ کا بدلہ لینے کی ترکیب نکال لی۔ آٹھ دن کا ڈائریکٹر فلمستان کا ایڈیٹر دتا رام پائی مقرر ہوا تھا۔ اگرچہ ڈائریکشن تو اشوک ہی کرتا تھا، لیکن چونکہ پائی بڑا قابل ایڈیٹر تھا اس لئے اس کی چلتی تھی۔ میں نے پائی کو ساتھ ملایا اور آٹھ دن میں پنڈت طوطا رام کا ایک مزاحیہ رول لے لیا۔ جب کہانی شروع ہوئی تھی تو یہ دو ایک مناظر کا رول تھا، لیکن میں نے اس خوبی سے اپنا پارٹ کیا اور بغیر ری ٹیک (RETAKE) کے کیا کہ اشوک کو بہت پسند آیا اور اس نے طے کیا کہ یہ رول بڑھا کر سارے فلم میں رکھا جائے۔ اس کے علاوہ پنڈت طوطا رام چونکہ ہندی بولتا تھا اس لئے پنڈت کے سب ڈائیلاگ میں لکھتا تھا۔ منٹو ایک لائن لکھتا تو میں چار کر دیتا، منٹو ایک سین لکھتا تو میں اس کے دو بنا دیتا۔ مجھے سٹیج ایکٹنگ تو پسند ہے لیکن فلم ایکٹنگ کو فلم ناٹک کی طرح میں کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ لیکن منٹو کو پریشان کرنے کے لئے وہ مضحکہ خیز رول ادا کرتا رہا اور منٹو اتنا پریشان ہوا کہ ایک دن سیٹ پر ہاتھا پائی تک کی نوبت آ گئی۔

اور اس بار ہم دونوں ساتھ ساتھ فلمستان سے الگ ہوئے۔ اور اگرچہ اشوک اور واچا منٹو کے دوست تھے اور منٹو ان کے ساتھ بمبئی ٹاکیز میں چلا گیا (جسے اشوک نے مکرجی سے علیحدہ ہو کر خرید لیا تھا) لیکن منٹو وہاں ایک بھی کہانی نہ دے سکا۔ جب میں پنچ گنی سے دہلی آتے ہوئے اشوک سے ملا اور میں نے پوچھا کہ منٹو کیوں چلا گیا تو اس نے کہا کہ اس نے کہانی لکھی تھی، لیکن ہم نے کمال امروہی کی کہانی 'محل' لینے کا فیصلہ کر لیا۔ منٹو کچھ کہے بغیر چلا گیا، حالانکہ ہم نے کہا تھا کہ اس کے بعد تمہاری والی کہانی بنائیں گے لیکن اس نے نہیں سنا۔

درحقیقت ساؤنڈ ریکارڈسٹ واچا (جو منٹو کا دوست تھا) اور بمبئی ٹاکیز کے مالک واچا میں فرق تھا۔ اور منٹو ایسے آدمیوں میں گھر گیا جنہیں کبھی اس نے فلمستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور جب اس نے دیکھا کہ آگے کا راستہ بند ہے، کار بروٹ نہیں چلے گی تو وہ بمبئی سے پاکستان چلا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کلیدی آسامیوں پر مسلمانوں کے آنے کی وجہ سے ایک دو چٹھیاں اشوک اور واچا کو ملی تھیں، لیکن سٹوڈیو کو آگ لگانا اور خود بیکار ہو جانا آسان نہیں۔ اس کا اثر نہ شاہد لطیف نے لیا نہ نذیر اجمیری نے۔ منٹو کے بدل جانے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ پہلی کہانی نذیر اجمیری کی چنی گئی اور دوسری کہانی کمال امروہی کی۔ جس دن کمال امروہی کی کہانی کا پتہ چلا، منٹو نے بمبئی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

لیکن منٹو کی اس رنچھوڑیت اور باری صاحب کی رنچھوڑیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ باری صاحب کی رنچھوڑیت میں غالباً بزدلی کا عنصر تھا، جبکہ منٹو کی رنچھوڑیت اس کی زبردست انانیت کے باعث تھی۔ اور اس کی اسی انانیت میں اس کی عظمت کا راز مضمر ہے۔ منٹو کو خوشامد کرنے سے عار نہیں تھا۔ مکرجی کے پاس بیٹھ کر ان کی خوشنودی کے لئے منٹو کو غالب کے اشعار سناتے میں نے دیکھا ہے (حالانکہ میں سمجھتا ہوں، مکرجی کے سامنے غالب کے شعر پڑھنا بھینس کے آگے بین بجانا ہے۔ اس سے مکرجی کی عظمت کم نہیں ہوتی، اپنے فن میں ان کا کوئی ثانی نہیں، لیکن غالب کو سمجھنا ان کے بس کی بات نہیں۔ اور پھر بنگالی ہونے کے ناتے بنگال کا چھوٹے سے چھوٹا شاعر ان کے لئے غالب سے بڑا ہے!) اشوک اور واچا کی محفل میں بیٹھ کر سوقیانہ لطیفے سناتے دیکھا ہے، ان پڑھ ایکٹروں اور میوزک ڈائریکٹروں

کی محفلوں میں بڑی سرگرمی سے بکواس، گستہ مشاہدے (جسے منٹو بکواس اور دوسرے بدتمیزی کا نام دیتے تھے) لیکن ان میں سے کسی بھی کام میں اُس کی انا کو ٹھیس نہیں پہنچی، کیونکہ اوّل تو یہ کہ وہ اُن کو اپنے سے کہیں کمتر سمجھتا رہا اور دوسرے یہ سب لوگ خواہ منٹو کو سنکی سمجھتے ہوں، شرابی سمجھتے ہوں لیکن اول درجے کا ڈائیلاگ رائیٹر سمجھتے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو کی اُس میٹنگ میں جہاں راشد نے، ہم نے اور اس لکھنوی پی۔ اے۔ نے اس کے ڈرامے کی "تنقید" کی اور بمبئی ٹاکیز کے سٹوڈیو میں جہاں اشوک اور واچا [illegible] نے اُس کی کہانی کے مقابلے میں نذیر اجمیری اور کمال امروہی کی کہانیاں لے لیں، منٹو کی انانیت کو زبردست ٹھیس پہنچی، اور جب اُس کی انانیت کو ٹھیس لگی تو پھر وہاں اُس کے لئے ٹھہرنا مشکل ہو گیا۔ کوئی موٹی کھال والا ابن الوقت مصنف ہوتا تو ہتک برداشت کرتا ہوا بھی وہیں جما رہتا، لیکن منٹو کی انانیت کے لئے وہ ہتک ناقابلِ برداشت تھی، اور چونکہ پٹ کر پیٹ بھرنے کے فن میں وہ ماہر نہیں تھا، اس لئے دونوں بار میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ دونوں بار اُسے سخت تکلیف ہوئی۔ دوسری بار تو اُس کی جان پر آ بنی، لیکن تکلیف کے خوف سے اپنی انانیت کو ٹھیس لگنے دینا اس نے منظور نہ کیا۔

پارٹی ہو، میٹنگ ہو (نارمل یا اِنفارمل) منٹو ہمیشہ پیش پیش رہنا پسند کرتا تھا۔ اگر کسی پارٹی یا محفل میں کوئی دوسرا آدمی لوگوں کی توجہ مبذول کر لے تو وہ بڑی خاموشی سے بغیر کسی کو بتائے کھسک جاتا تھا۔ یوں تو فلمستان میں اپنی ملازمت کے شروع کے دنوں میں جب میں نے کانٹریکٹ پر دستخط نہ کئے تھے، اور میری شرطیں مکرجی نے ابھی منظور نہ کی تھیں، اور میں مکرجی کو غالب کے بجائے عماد پوری وغیرہ کے گیت سنایا کرتا تھا، میں نے منٹو کی انانیت کے اس پہلو کو دیکھا تھا، لیکن ایک خاص واقعہ ہے جسے میں بھول نہیں سکا۔

۱۹۴۵ء یا ۱۹۴۶ء کے اواخر کا ذکر ہے۔ ٹھیک مہینہ مجھے یاد نہیں۔ بمبئی میں امریکہ کا (یا انگلستان کا، یہ مجھے یاد نہیں) ایک مشہور ایکٹر آیا تھا۔ میں نے اُس ایکٹر کا صرف ایک فلم دیکھا تھا جس میں وہ موٹر سائیکل ریس میں شامل ہوتا ہے اور ایسی حرکتیں کرتا ہے کہ دیکھنے والے ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔ بہرحال بمبئی میں وہ ایک دو سٹوڈیوز میں گیا۔ رائے بہادر چُنی لال نے اُسے فلمستان میں بھی بلایا۔ شام کو فلمستان کی کینٹین میں، جو کھلے میں بنی تھی اور چھت کے باوجود تین طرف سے کھلی تھی، میزیں لگا دی گئیں اور ششدھر مکرجی، گیان مکرجی، اشوک، واچا، چٹلکر، برمن، نیپالی وغیرہ اکٹھے ہوئے۔ چونکہ اُس ایکٹر کو ہمارے ہاں آنے سے پہلے فلم پروڈیوسرز کی ایسوسی ایشن میں جانا تھا، اس لئے اُسے دیر ہو گئی۔ بڑے مکرجی اُٹھ گئے، باقی لوگ وہیں بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔ منٹو حسب معمول بڑوں (BOSSES) کے ساتھ بیٹھا بقول شیام اپنی بزلہ سنجی اُن پر ضائع کرتا رہا۔ میں نیپالی، برمن، وغیرہ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ آخر ایکٹر صاحب اپنی بیوی کے ساتھ تشریف لائے۔ لمبوترا سا منہ ـــــ جیسے کسی نے دونوں جبڑوں کو شکنجے میں کس کر لمبوترا کر دیا ہو، بالکل ویسا ہی جیسا فلم میں دیکھا تھا۔ اُن کی بیوی بڑی حسین تھی۔ ظاہر ہے کہ روپیہ اور نام کی کشش نے اُس حور کو اُس لنگور کے پہلو میں بٹھایا تھا۔ بہرحال اُس کے آگے آگے رائے بہادر چُنی لال اور مکرجی آ بیٹھے۔ کینٹین میں ایک بڑی میز بچھی تھی اور اُس کے ساتھ چھوٹی میزیں لگی تھیں۔ بڑی میز مہمانوں اور کمپنی کے باسز کے لئے تھی۔ اور چھوٹی میزوں پر دوسرے لوگ بیٹھے تھے۔ میں نیپالی وغیرہ کے ساتھ ایک چھوٹی میز پر جا بیٹھا، لیکن منٹو، اشوک اور واچا کے ساتھ بڑی میز پر بیٹھا رہا۔ لیکن ایک تو اس ایکٹر کے ساتھ آنے والے لوگ زیادہ تھے، دوسرے رائے بہادر کے ساتھ بھی چند مہمان تھے۔ اشوک اور گیان مکرجی مالکوں میں سے تھے، مکرجی نے واچا اور منٹو کو اشارہ کیا کہ وہ چھوٹی میز پر جا بیٹھیں۔ واچا اُٹھ کر چھوٹی میز پر چٹلکر کے پاس جا بیٹھا۔ اُس نے منٹو کو بھی پاس بٹھانا چاہا لیکن منٹو نہیں بیٹھا۔ اس افراتفری میں جب مہمان بیٹھ رہے تھے، منٹو چپ چاپ کھسک گیا۔ میں یہ سب تماشہ دیکھ رہا تھا۔ جب وہ میرے پاس سے گزرا تو میں نے کہا "کیوں؟"

"چلو چلیں"
"کیوں؟"
"سب کچھ اس پہ ہے"
"بیٹھو" میں نے کہا "جہاں اِس بکراس کے انتظار میں ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھے ہیں وہاں آدھ گھنٹہ اس کے ساتھ بیٹھ لیتے ہیں"
لیکن منٹو نہیں رکا، خاموشی سے کینٹین سے نکل گیا۔

"گنجے فرشتے" میں منٹو نے شیام پر جو سکیچ لکھا ہے، اُس میں اس کی انانیت کے اس پہلو کی جھلک بار بار ملتی ہے۔ لاہور میں شیام آیا تو اس سے ملنے والے جانتے تھے اور وہ لوگوں کی توجہ کو اس طرح کھینچے ہوئے تھا کہ منٹو کی "انا" کو بار بار ٹھیس لگی تھی ـــــ منٹو لکھتا ہے :۔

"شیام نے مجھ سے کہا ـــــ میرے ساتھ رہو، لیکن اس کے دماغ کی مضطرب
کیفیت کے احساس نے مجھے سخت پراگندہ کر دیا۔ اُس سے وعدہ کر کے کہ رات
کو میں اُس سے فلیٹی ہوٹل میں ملونگا، چلا گیا"

لیکن جیسا کہ میں نے منٹو کو دیکھا اور جانا ہے، منٹو کے چلے جانے کی وجہ (باوجود اس کے دیرینہ دوست کی اس خواہش کے کہ وہ اُس کے ساتھ رہے) اور کچھ نہ تھی، اُس کی انا تھی۔ اُس کی اس الجھن اور گھٹن کو میں نے اس امریکی (یا انگریزی) ایکٹر کی آمد پر بھی محسوس کیا۔ میں نے جب منٹو کو اُٹھ جانے کا اشارہ کیا تو وہ بیکلوت اُداس ہو گیا اور پھر وہاں بیٹھنا اُس کے لئے مشکل ہو گیا ـــــ منٹو شیام سے ملنے گیا بھی گیا، لیکن اس ملاقات کا حشر بھی پہلی ملاقات سے مختلف نہ ہوا اور منٹو اور بھی چڑ کر واپس آ گیا۔ بمبئی میں جب وہ شیام سے ملتا تھا تو عموماً وہیں، منٹو لوگوں کی توجہ کا مرکز ہوتا تھا، کیونکہ ایکٹروں، ڈائریکٹروں میں وہ اپنی قابلیت لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی سے سننے والوں کی توجہ کو اپنی طرف لگائے رکھتا تھا۔ لیکن لاہور کی ان دو ملاقاتوں میں سننے والے آرٹسٹ نہیں تھے، عام لوگ تھے، جن میں سے شیام کو سب جانتے تھے منٹو کو جو چند ایک جانتے تھے وہ بھی ہنگامی طور پر بھول گئے تھے۔ اور میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس بات سے منٹو کو، جو اپنے آپ کو سب سے بڑا سمجھتا تھا، کتنی کوفت ہوئی ہو گی۔

منٹو جس طرح پیٹنا جانتا تھا، لیکن پٹنا نہیں۔ پڑھانا جانتا تھا لیکن پڑھنا نہیں، اُسی طرح مذاق کرنا تھا لیکن مذاق برداشت کرنے کی حس اُس میں مفقود تھی۔ وہ بہت ذکی الحس تھا (اپنے مضامین میں بار بار اُس نے اس کا ذکر کیا ہے) لیکن دوسرے بھی ذکی الحس ہو سکتے ہیں، دوسروں کو بھی بات لگ سکتی ہے، یا اسے وہ اونچے درجہ کا افسانہ نگار اور ماہر نفسیات ہونے کے باوجود نہ جانتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے اس بات کا بھی خیال آتا تھا، لیکن انسان بہ علم خالی ہے۔ ٹالسٹائی کئی بار نفس سے اندھے ہوئے، لیکن اپنے افسانوں اور ناولوں میں انھوں نے اس کے خلاف لکھا، بالزاک نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں زندگی کی بے شمار حقیقتوں کو بے نقاب کیا ہے، لیکن اپنی ذاتی زندگی میں وہ اتنی سی حقیقت نہ سمجھ سکے کہ پیسہ روپیہ بے دریغ اور بچکانی چیزوں پر نہ خرچ کرنا چاہیئے، ہوائی قلعے نہ بنانے چاہئیں اور بے دریغ قرض نہ لینا چاہیئے ـــــ قرطاس پر زندگی کی دبی چھپی حقیقتوں کو عظیم فن کار کی چابکدستی سے قلم بند کرنے والا زندگی بھر عیاں حقیقتوں کو نہ سمجھ سکا اور بے حد پریشان رہا۔ آج میں یہ سب اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ لیکن اُن دنوں حقیقت نگار ہونے کا دعوےٰ کرنے کے باوجود میں زندگی کی اس بڑی حقیقت کو نہ جانتا تھا ـــــ

میں جن دنوں دہلی گیا، منٹو کی ایک کہانی کا بڑا چرچا تھا ـــــ اُس کا نام تھا "ترقی پسند" ـــــ چرچا اُس کا یوں تھا کہ منٹو نے وہ

مندر ستیارتھی اور بیدی پر لکھی تھی۔ چونکہ بیدی میرے بہت نزدیک تھا اس لئے پہلی فرصت میں میں نے منٹو کی وہ کہانی پڑھ ڈالی۔ کہانی میں جو قصہ درج تھا وہ مجھے معلوم تھا، کیونکہ بیدی مجھے بتا چکا تھا۔ بات یہ تھی کہ لوک گیت لکھتے لکھتے ستیارتھی ایک دم افسانے لکھنے لگا تھا۔ نئے ادیب یا شاعر کو اپنے افسانے یا شعر سنانے کا مرض ہوتا ہے۔ ستیارتھی کو بھی تھا۔ ہو سکتا ہے کہ دوسروں کی نسبت کچھ زیادہ ہو۔ بہر حال وہ اپنے بیوی بچوں سمیت راجندر سنگھ بیدی کے ہاں مہمان ہو گئے اور صبح شام اُسے افسانے سنانے لگے۔ بیدی اُس وقت پوسٹ آفس میں کلرک تھا اور لاہور چھاؤنی میں رہتا تھا۔ دو کمرے اُس کے پاس تھے۔ جگہ زیادہ نہیں تھی، پھر ستیارتھی کی موجودگی میں خلوت کا میسر آنا یوں بھی مشکل ——— بیدی شام کو تھکا ہارا آتا تو ستیارتھی ایک افسانہ سنانے کے لئے تیار رہتے۔ سُن کر نہ صرف رائے لیتے بلکہ تصحیح چاہتے۔ اسی میں رات کم و بیش ہو جاتی۔ صبح اُٹھتا تو اُسے تصحیح شدہ افسانہ سننا پڑتا ——— مہینہ بھر ستیارتھی وہاں رہے اور بیدی اپنے بیوی بچوں سے بات کرنے کو ترس گیا۔ منٹو کی کہانی "ترقی پسند" کا پلاٹ یہی ہے۔ صرف آخر میں منٹو نے ذرا افسانوی ٹچ دیا ہے کہ پرمارتھی (ترقی پسند میں ستیارتھی کا بدل) اپنے میزبان سے کچھ ایسا چمٹتا ہے اور اُس کے وقت کا ہر لمحہ کچھ اس طرح لے لیتا ہے کہ وہ غریب اپنی بیوی سے پیار کرنے کے لئے بھی غسلخانہ ہی بہتر جگہ خیال کرتا ہے۔

کہانی اچھی ہے۔ اس میں چٹخارہ بھی ہے لیکن منٹو نے اس سے کہیں زیادہ اچھے افسانے لکھے ہیں۔ مجھے کہانی پڑھنے میں دلچسپ لگی۔ لیکن چونکہ بیدی کی ذاتی زندگی کا ایک واقعہ (بیدی کے منہ سے سُنا ہوا) منٹو نے قلمبند کر دیا، اس لئے مجھے بُرا لگا۔ میرے خیال میں اسے لکھنے کا حق بیدی کو تھا۔ یا پھر منٹو کو بیدی سے کہہ دینا چاہیئے تھا کہ دیکھو یار، میں اس واقعہ پر افسانہ لکھ رہا ہوں، تمہیں لکھنا ہو تو میں نہ لکھوں ورنہ میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ لیکن منٹو سے افسانہ نگار کو اتنا صبر کہاں۔ خیال آیا تو اُسے قلمبند کر دیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ اس ذاتی واقعہ کو لکھنے سے دو دوستوں میں شکر رنجی کی دیوار کھڑی ہو سکتی ہے۔

دوستوں کے درمیان دیوار نہ کھڑی ہوئی بلکہ اُنھوں نے منٹو کے خلاف ایک مشترکہ محاذ قائم کر لیا۔ اور جس طرح منٹو نے اپنی کہانی میں بیدی اور ستیارتھی کی عادات و اطوار، شکل و شباہت اور ذاتی زندگی کا مذاق اُڑایا تھا، اُسی طرح ان دونوں نے مل کر ایک افسانہ لکھ کر منٹو کی ذاتی زندگی اور اُس کی خامیوں کو اُجاگر کر دیا۔ کہانی ستیارتھی کے نام سے شائع ہوئی۔ اُنھوں نے ہی لکھی بھی تھی۔ بیدی نے اس پر نظر ثانی کرتے ہوئے کچھ ایسے چھینٹے لگائے کہ کہانی، جہاں تک کردار نگاری کا تعلق ہے، بے حد اچھی اُتری۔ نام ہے ——— "نئے دیوتا"

" اتنی بھی کیا خوشی ہے۔ میں سوچ رہا تھا، اتنا تو نفاست حسن "نئے دیوتا" میں سعادت حسن کا بدل پہلے بھی کما لیتا ہوگا۔ ڈیڑھ سو روپے کے لئے اُس نے اپنی آزادی بیچ دی اور اب خوش ہو رہا ہے۔ وہ تو شروع ہی سے باغیانہ طبیعت کا آدمی مشہور ہے۔ اس کے افسانے ترقی پسند ادب میں نمایاں جگہ پاتے رہے ہیں۔ پھر یہ نوکری اس نے کیسے کر لی ——— غریبوں پر ظلم ڈھائے جاتے ہیں، زندگی کی [illegible] کی جاتی ہے، سرمایہ دارانہ نظام مکڑی کی طرح برابر اپنا جالا بُنتا رہتا ہے اور غریب کسان مزدور آپ سے آپ اُس جالے میں پھنستے چلے جاتے ہیں ——— ان خیالات کا مالک آج خود مکھی کی طرح اس جالے میں پھنس گیا اور اس خوشی میں یار دوستوں کو دعوت دے رہا ہے ....."

اور یوں شروع کر کے "نئے دیوتا" کے لکھنے والوں نے نفاستِ حسن (یعنی سعادت حسن) کی حرکات و سکنات، عادات و اطوار، سفلے پن، شراب نوشی، چڑچڑاہٹ، انانیت اور سنک، پرورش، جنس نگاری اور دوسری کمزوریوں کا کچھ ایسے لطیف پیرائے میں مذاق اُڑایا کہ منٹو بلبلا اُٹھا۔ (بعد میں جیسا کہ اُس کی عادت تھی، اُس نے خود اپنی سنک اور سفلے پن کی تشہیر شروع کر دی[1])

---

[1] جگیشوری کالج کے طلبا کے سامنے تقریر کرتے ہوئے منٹو نے کہا "البتہ جب میں بیٹھا بیٹھا اپنا نیا خریدا ہوا قیمتی پن نکالتا ہوں تو مجھے اپنا یہ سفلہ پن بہت دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔" (لذتِ سنگ)

«نئے دیوتا» کے شائع ہوتے ہی لاہور اور دلّی کے ادبی حلقوں میں ایک شور برپا ہو گیا۔ چونکہ منٹو اپنے اچھے سے اچھے دوست کی [illegible] بھی وقت آنے پر رکھ دیتا تھا اور اپنے سامنے کبھی کسی کو کچھ نہ سمجھتا تھا اس لئے یار دوستوں کو اچھا موقعہ ہاتھ آیا۔ دوست احباب جب بھی ملتے، کسی نہ کسی بہانے اُس کہانی کا، یا ستیارتھی کا یا بیدی کا ذکر کر کے اُسے چھیڑتے —— منٹو اس کہانی کا ذکر آتے ہی کس طرح چڑ جاتا۔ دُنیا جہان کا مذاق اُڑاتے ہوئے، مذاق کئے جانے پر کس طرح سیخ پا ہو جاتا، اس کا ایک واقعہ آج بھی مجھے یاد ہے۔

لنچ کا وقت تھا، لوگ کھانا وغیرہ کھا کر کرشن کے کمرے میں آ اکٹھے ہوئے تھے۔ گپ ہو رہی تھی۔ کرشن اپنی کرسی پر سر جھکائے بیٹھا سب سن رہا تھا۔ اُس کے سامنے کی کرسی پر منٹو پاؤں اوپر کئے، گھٹنوں کو باہوں میں دبائے اکڑوں بیٹھا تھا۔ راشد، قدوس اور دوسرے پروگرام اسسٹنٹ منٹو کی کرسی کے گرد گھیرا بنائے کھڑے تھے۔ (اختر الایمان اور میراجی شاید اس وقت ریڈیو میں نہیں تھے، یا شاید مجھے یاد نہیں) حفیظ جاوید پیچھے دری پر دیوار سے پیٹھ لگائے، گھٹنے پر ٹانگ رکھے ادھ لیٹے ادھ بیٹھے خاموشی سے سب کچھ سن رہے تھے۔ میں ذرا دیر سے پہنچا تھا۔ کمرے میں جگہ نہ تھی، اس لئے کونے میں پڑے ریکارڈوں کے اونچے چیسٹ پر ٹانگیں نیچے کو لٹکائے بیٹھا تھا۔ تبھی جانے کس نے اور جانے کیسے ستیارتھی کی بات چھیڑ دی اور کہا کہ نہایت گھٹیا افسانہ نگار ہے۔

دوسرے نے کاٹا۔ "لیکن «نئے دیوتا» تو اُس نے خوب لکھی ہے۔"

"واہ!" کرشن نے سر اور دونوں ہاتھ ایک ساتھ اُٹھاتے ہوئے کہا۔ لیکن اُسی وقت اُس کی نگاہیں منٹو سے چار ہوئیں جو ستیارتھی کا نام سنتے ہی ہو چکا تھا۔ کرشن کا اُٹھا ہوا ہاتھ نیچے آ گیا اور نگاہیں پھر جھک گئیں۔

اور تب کسی نے منٹو کو چڑاتے ہوئے کہا "ارے یار ستیارتھی کیا لکھا کرے گا! افسانہ لکھے گا، وہ تو بیدی کا لکھا ہوا ہے۔"

"بیدی کا تو نہیں" تیسرے نے کہا "لکھا تو ستیارتھی ہی نے ہے، بیدی نے اُس میں پیچ لگائے ہیں اور کہانی دوآتشہ ہو کر نکلی ہے۔"

"ہم نے سنا ہے [illegible] کا بھی ہاتھ ہے ......"

اور اُس وقت منٹو نے پاؤں نیچے کئے اور سب کی آوازوں کو جیسے اپنی آواز کی گرج میں ڈبوتے اور اپنی بڑی بڑی آنکھیں جیسے گھماتے ہوئے کہا "بیدی اور فیض کیا، اُس میں تاثیر کا ہاتھ ہے، قاسم کا ہاتھ ہے، سنت سنگھ سیکھوں اور موہن سنگھ کا ہاتھ ہے، [illegible] انسٹی ٹیوشن ......"

تب مجھے نہ جانے کیا سوجھا۔ منٹو کو بات ختم کرنے کا موقعہ دیئے بغیر میں نے کہا "اپنے بارے میں یار سب کو غلط فہمی ہوتی ہے، وہ شیام لال تھا نا، [illegible] کا ایڈیٹر، وہ بھی اپنے آپ کو انسٹی ٹیوشن سمجھا کرتا تھا۔"

میں نے شیام لال کا ذکر کیا تھا کہ دوستوں نے زور کا قہقہہ بلند کیا، لیکن اس سے پہلے کہ میں بات پوری کرتا یا قہقہہ خاموش ہوتا، منٹو [illegible] تھا اور اُس نے غصّے سے پاگل ہو کر دو تین غلیظ گالیوں کے ڈھیلے میری طرف پھینک دیئے۔

کوئی دوسرا موقعہ ہوتا، منٹو مجھے گالی دیتا تو میں کھینچ کر ایک تھپڑ اُس کے منہ پر جما دیتا۔ لیکن لڑنے کی طرح مذاق کرنے کا بھی ایک فن ہے۔ مذاق میں جو چڑ جاتا ہے، گالی دیتا ہے، یا ہاتھ اُٹھاتا ہے در اصل وہی پٹ جاتا ہے۔ منٹو نے گالیاں دیں تو لوگ اور بھی زور سے ہنسے۔ کرشن نہیں ہنسا۔ اُس نے منٹو کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا "کیا کرتے ہو" اور دوسرے لمحے منٹو نے اپنے اوپر قابو پا لیا۔ بڑھ کر میرا ہاتھ [illegible] اور دھیرے سے انگریزی میں کہا "ڈونٹ مائنڈ اٹ" (DO NOT MIND IT)

اُس وقت چاہے منٹو اور دو گالیاں بھی دے لیتا تو شاید میں ہاتھ نہ اُٹھاتا۔ لیکن دوسری بار مجھے یاد ہے، منٹو نے گالی دی اور میں ہاتھ

اُٹھانے کو تیار ہو گیا۔ اگر وہ ذرا بھی منہ کھولتا تو سر پھٹول ہو جاتی۔

فلمستان کے زمانے کی بات ہے۔ "آٹھ دن" کی شوٹنگ چل رہی تھی اور میں نے اس میں پنڈت طوطا رام کا ایک مزاحیہ رول لے لیا تھا چونکہ دن کو سٹوڈیو خالی نہ تھے اور اشوک کمار نے زبردستی پروڈکشن لے لی تھی اس لئے "آٹھ دن" کی بیشتر شوٹنگ رات کو ہوتی۔ منٹو رات کو سیٹ پر آنے کا عادی نہ تھا۔ اس کے اشغال دوسرے تھے۔ لیکن جب سے میں نے تکرام بھڑا کر "آٹھ دن" میں رول لے لیا تھا اور منٹو کے لکھے مکالموں میں ردوبدل کرنے لگا تھا۔ تو منٹو رات کو بھی سیٹ پر آنے لگا تھا۔ رات کو وہ پیا پلایا کرتا تھا اور سیٹ پر آنا اسے بھلا شاق گزرتا تھا۔ لیکن میں اس کے مکالموں کو مسخ نہ کر دوں، اس بات کا اسے ڈر تھا۔ اشوک کی کہانی کے سلسلے میں میرے ساتھ اس نے جو زیادتی کی تھی، اس سے میں بے حد چڑا ہوا تھا، اور اسے تنگ کرنے کے درپے تھا۔ لیکن میری یہ عادت ہے کہ لڑائی میں بھی شاذ ہی غلطی اپنے سر لیتا ہوں۔ ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتا ہوں کہ غلطی دوسروں کے سر رہے۔ اس دفعہ پر بھی میں نے منٹو کو اتنا چڑا دیا کہ وہ بے بس ہو کر گالی دے بیٹھا، لیکن سننے والوں کو غلطی اسی کی معلوم ہوئی۔

"آٹھ دن" کی شوٹنگ کے بعد میں بیمار ہو کر پنچ گنی چلا گیا تھا، اور میں نے وہ فلم نہیں دیکھا اس لئے مجھے اس کی کہانی یاد نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ رات کی شوٹنگ تھی، شادی کا سیٹ تھا۔ مجھے پنڈت کی حیثیت سے ہیرو کی شادی کرانا تھی اور میں کمر میں دھوتی کسے ننگے بدن پر جنیو پہنے، رام نامی دوپٹہ گلے میں ڈالے، سر پر پنڈتوں کی سی پگڑی سجائے ویدی پر بیٹھا تھا اور ہیرو کی ماں سے (یہ پارٹ لیلا مصر کر رہی تھیں) میرا جھگڑا ہو رہا تھا۔ اس میں کہیں فقرہ آ گیا "تو کیا میں جھک مار رہا ہوں"۔ یا شاید یہ فقرہ تھا "میں ہرگز یہ جھک نہیں مار سکتا" بہرحال جھک مارنے کا محاورہ منٹو نے استعمال کیا تھا۔ اشوک ہدایات دے رہے تھے۔ منٹو چپ ہوئے اور چپ چاپ ایک طرف بیٹھا ہمیں شوٹ ہوتے دیکھ رہا تھا کہ اچانک مجھے شرارت سوجھی اور میں نے سنجیدگی سے کہا، "میں یہ ڈائلاگ نہیں بول سکتا۔"

"کیوں؟" اشوک نے پوچھا۔

"جھک مارنا ہنسا بھرا شبد ہے۔ ویدی پر بیٹھا ہوا، ویدوں کا وکتا، دھرم پرائن برہمن ایسا واکیہ کبھی نہیں بول سکتا۔"

"لیکن یہ تو محاورہ ہے" منٹو تنک کر اٹھا۔

"بہت سے ایسے محاورے ہیں جو بڑے معنی خیز ہیں، لیکن شریف لوگ نہیں بولتے، اسی طرح ویدی پر بیٹھا ہوا پنڈت یہ ہنسا بھرا محاورہ نہیں بول سکتا" میں بولا۔

"لیکن محاورے کا مطلب تشدد بھرا نہیں۔"

"جھک کیا ہے۔ مچھلی۔ جھک مارنا، مچھلی مارنا — مطلب اس محاورے کا کچھ بھی ہو، لیکن کوئی پنڈت اسے نہیں بول سکتا۔"

"بنگال کے پنڈت مچھلی مارتے ہی نہیں، کھاتے بھی ہیں۔"

"لیکن پنڈت طوطا رام بنگالی نہیں، نہ یہ کہانی بنگالیوں کی ہے۔"

"تم بکواس کرتے ہو" منٹو جھلا اٹھا، "تمہیں یہی فقرہ بولنا ہوگا۔"

"میں نہیں بول سکتا۔ میں ویدی پر بیٹھا ہوا برہمن ہوں۔"

"میں بھی برہمن ہوں" منٹو گرجا۔

"برہمن تمہارے اجداد ہوں گے۔ اس وقت تو تم یہاں جھک مار رہے ہو۔"

اور منٹو نے بے اختیار ہو کر زور سے مجھے گالی دی۔

آج اپنے اس اعتراض کی بات سوچتا ہوں تو مجھے بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ درحقیقت دل میں مجھے اس وقت بھی ہنسی آرہی تھی، لیکن اوپر سے میں بے حد سنجیدہ بنا ہوا تھا۔ اس بات پر زور دے رہا تھا کہ شمالی ہند کا کوئی دھرم پرائن پنڈت ویدی پرمیشر کا ایسا محاورہ نہیں بول سکتا۔ اعتراض نہایت لچر تھا، لیکن جو لوگ فلمی دنیا سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایسے لچر اعتراض وہاں سیٹوں پر شب و روز ہوتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اعتراض لچر ہے لیکن برہمن یہ بول سکتا ہے یا نہیں، اس سوال نے اسے ایک دم وزن عطا کر دیا۔ فلمی دنیا والے نہایت ڈرپوک آدمی ہوتے ہیں۔ بڑے سے بڑا نانسنک وہاں مہورت کرتا ہے (حالانکہ ان مہورتوں کے باوجود آئے دن حادثے ہوتے ہیں، فلم فیل ہوتے ہیں اور فنانسر خسارہ اٹھاتے ہیں) میری بات اشوک اور واچا کو ٹھیک لگی۔ منٹو نے گالی دی زیر لب اور بھی بھاری ہو گیا۔ اور چونکہ میں محض مذاق نہ کر رہا تھا اور لڑائی پر آمادہ تھا اس لئے میں نے کہا "دیکھو منٹو، میں پہلوان نہیں، لیکن اتنا جانتا ہوں کہ تم بھی پہلوان نہیں ہو اور تم نے اب بھی کھولے تو میں تمہیں اٹھا کر سٹوڈیو کے باہر پھینک دونگا۔"

معاملے نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ اشوک گھبرا گئے۔ شوٹنگ رک گئی۔ انہیں فکر ہوئی کہ ہم دونوں لڑتے رہے تو شوٹنگ نہ ہو سکے گی اور چار چھ ہزار کی ڈنڈ پڑ جائے گی۔ وہ منٹو کو باہر لے گئے۔ باچا مجھے لے گئے۔ مجھے یاد نہیں لیکن کچھ دیر بعد جب ہم سیٹ پر آئے تو منٹو نے میرے ہاتھ کو آہستہ سے دباتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا۔

اس کے بعد وہ پھر نہیں بیٹھا، گھر چلا گیا۔ لیکن کبھی وہ رات کو سیٹ پر نہیں آیا۔ میں نے مکالمے ہی نہیں، مناظر تک بدل ڈالے، لیکن پھر اس نے میرا راستہ نہیں کاٹا۔

منٹو کو گالی دینے کا بہت شوق تھا۔ اس بات کی اسے بڑی خواہش رہتی تھی کہ وہ کرشن کو ایک آدھ غلیظ گالی دے (سامنے والے تو وہ کھاتا ہی رہتا تھا) لیکن کرشن کبھی ایسا موقعہ نہ آنے دیتا تھا۔ منٹو مجھے بھی گالی دینا چاہتا تھا۔ دو موقعوں کا تو میں نے ذکر کر دیا۔ ایک بار اس نے اور مجھے گالی دی۔ ان دنوں ہم میں تناؤ نسبتاً کم تھا۔ (مکرجی نے اشوک اور منٹو وغیرہ کو زک دینے کے لئے سنتوشی کو پھر بلا لیا تھا اور "آٹھ دن" کے لئے اس کا ایک گیت منظور کر لیا تھا۔ مجھے اس بات کی خبر نہ تھی، لیکن منٹو سنتوشی کا وہاں آنا پسند نہ کرتا تھا، اس لئے وہ ایک گیت مجھ سے لکھوا رہا تھا) ہم میوزک روم سے دفتر کی طرف آرہے تھے، کہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے منٹو نے اچانک مجھے باتوں باتوں میں دھیرے سے گالی دی۔

کسی زمانے میں میں خود بڑی گالیاں بکتا تھا۔ والد محترم تو نئی گالیاں تصنیف کرنے میں یکتا تھے۔ یوں بھی جالندھر گالی خیز خطہ ہے۔ دوست جب ملتے ہیں تو بڑی بھاری بھرکم گالیوں سے ایک دوسرے کا خیر مقدم کرتے ہوئے ہم آغوش ہوتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں جب لاہور کے دفتر میں کام کرتا تھا، اور اپنے سینیئر ایڈیٹر جناب ساگر چند کرکیا کے ساتھ (جو بعد میں روزنامہ پرتاپ کے مزاحیہ نگار کی حیثیت سے بہت مشہور ہوئے تھے اور اب آل انڈیا ریڈیو کے کسی شعبہ میں گمنامی کی زندگی بسر کرتے ہیں) ریلوے روڈ پر جا رہا تھا کہ سامنے سے میرا لڑکپن کا دوست کرانت سنگھ آتا ہوا دکھائی دیا۔ دور ہی سے اس نے ایک موٹی سی گالی سے میرا حال چال پوچھا اور میں اس سے بھی موٹی گالی دیتا ہوا اس سے بغلگیر ہو گیا۔ آج یہ بات کچھ خواب کی سی معلوم ہوتی ہے، اور حالانکہ میری بیوی اب بھی مجھے خاصا غیر مہذب سمجھتی ہے۔ لیکن جالندھر سے لاہور بسنے والے اشک اور الہ آباد کے اشک میں زمین آسمان کا فرق ہے، کرکیا صاحب حیران و ششدر کھڑے دیکھتے رہے۔ بعد میں میں نے انہیں سمجھایا کہ وہ میرا لنگوٹیا یار تھا اور جالندھر کے لنگوٹیے یاروں میں خیر مقدم کی یہی رسم ہے۔ کاش منٹو میں اور مجھ میں ایسا یارانہ ہوتا، ہم دونوں بے تکلفی سے ایک دوسرے کو گالی دے سکتے۔ لیکن دفتر کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے اس نے دھیرے سے مجھے جو گالی دی تھی،

اُس میں بے تکلفی نہ تھی، یارانہ نہ تھا، سرپرستی کا غیر مبہم سا جذبہ تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں نے یہ گالی خاموشی سے سُن لی تو مجھے اور بھی گالیاں سُننی پڑیں گی اور بے تکلفی نہ ہونے کے باعث میں گالی دے نہ سکوں گا۔ میں نے فوراً کہا: "دیکھو منٹو، تم امرتسر کے ہو تو میں جالندھر کا ہوں میں گالیاں دوں گا تو تمہاری طبیعت صاف ہو جائے گی۔ دوبارہ تم مجھے کبھی مت گالی دینا"

اور منٹو نے مجھے پھر کبھی گالی نہ دی۔ اُس کی بے پناہ جھنجھلاہٹ میری کیا لی کہ یا کرنے کی خواہش میں ضرور ظاہر ہوئی لیکن گالی وہ مجھے نہ دے سکا۔

منٹو جب گالی دینے پر مُوافق مائل ہوتا تھا، اتنا مادہ اُس میں تھا تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم میں برابر کشیدگی رہی اور ہم لڑتے رہے۔ میں نے خود اس بات پر غور کیا ہے اور میں ہمیشہ اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ زندگی کی بساط پر ہمیں ایک دوسرے کے مقابل رکھا گیا ہے اور ہم لڑنے پر مجبور رہے۔ اگر کہیں بر برل کے بیٹھتے بھی تو ایک دوسرے سے نبرد آزما، ایک دوسرے کے مہروں کو کاٹ کر کے شکست دینے والے مہروں کی طرح!

ہم نے ایک دوسرے سے ملنے کی کوشش نہ کی ہو، ایسی بات نہیں۔ لیکن ہماری انا یا احتیاط کہ ہمارے ملنے کے راستے کی ہمیشہ دیوار بن گئی۔ میں نے ملنے کی کوشش کی تو منٹو تنا رہا، منٹو نے ملنے کی کوشش کی تو میں تنا رہا۔ ٹھیک سن یاد نہیں، لیکن کرشن لکھنؤ جا چکا تھا۔ راشد پروگرام ڈائریکٹر کی کرسی پر جا براجے۔ تھے اپوپڑا صاحب کر ابھی منٹو نے پہچانا نہیں تھا، منٹو کو مخالفت کا حلقہ اپنے گرد تنگ ہوتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ شام کا وقت تھا، دیئے جل چکے تھے اور میں میز پر بیٹھا کوئی ڈرامہ یا کہانی لکھ رہا تھا۔ کوشلیا اندر باورچی خانے میں کھانے پکانے کا انتظام کر رہی تھی کہ چانک باہر سڑک پر سے سخت اور تیکھی آواز آئی ——— "اشک"!

"منٹو!" ——— مجھے خیال آیا ——— اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔ کیونکہ اگرچہ میں اُس کے گھر (۹ حسن بلڈنگز، کشمیری گیٹ) میں تین چار بار گیا تھا، لیکن وہ گزشتہ ڈیڑھ برس میں کبھی میرے گھر نہ آیا تھا۔ حالانکہ میں بستی ہزاری میں مہیروٹ مدرسے کے سامنے رہتا تھا، اور ہمارے گھروں میں نصف میل سے زیادہ کا فاصلہ نہ تھا۔ میرے ہاں تو وُہ رہا، وہ کبھی کرشن چندر کے ہاں بھی نہ گیا جو میرے نزدیک ہی رہتے تھے۔ (میرے آنے سے پہلے آیا ہو تو میں نہیں جانتا)

لیکن میں نے فوراً جواب نہ دیا۔ اُٹھ کر دروازہ کھولا، کیونکہ آواز اگرچہ منٹو کی معلوم ہوئی لیکن یقین نہ آیا کہ منٹو ہے۔

"اشک!" وہی کرخت تیکھی، قدرے چڑچڑی آواز۔

میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ منٹو، صفیہ بھابی اور اُن کے ساتھ ایک گورا چٹا، بڑی خوبصورت آنکھوں اور تیکھے ناک نقشے والا نوجوان ——— تینوں اندر آ گئے۔

منٹو نے تعارف کرایا۔ "یہ مسعود پرویز ہے (میرا بھتیجا یا میرا دوست منٹو نے کیا کہا، مجھے یاد نہیں) تم سے ملنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا چلو ملا لائیں"

میرے پاس اُس وقت دو چھوٹے چھوٹے کمرے، ایک کوٹھڑی اور ایک کچن تھا۔ منوہر لال بھارگو میونسپل کمشنر دہلی نے کمال مہربانی کر کے ہم جیسے غریب الوطنوں کے لئے بارکوں جیسے ۲۶ کوارٹر بنا رکھے تھے۔ جس وقت کا ذکر ہے، راشد ایک نمبر میں، میں تین نمبر میں اور کرشن پانچ نمبر کے کوارٹر میں رہتے تھے۔ ایک کمرہ سونے کا اور ایک بیٹھنے کا تھا۔ بیٹھنے کے کمرے میں میں نے ایک کرسی میز کام کرنے کے لئے رکھ چھوڑی اور بیٹھنے کے لئے ایک دری اور جاجم فرش پر بچھا رکھی تھی ——— اُسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے کہا "بیٹھو بیٹھو" اور کوشلیا کو آواز

دی کہ دیکھو منٹو اور صفیہ بھابی آئے ہیں۔ منٹو اور پرویز بیٹھ گئے، صفیہ بھابی اندر باورچی خانے کی طرف چلی گئیں اور میں اس وقت تک بات چلانے کی کوشش کرتا رہا جب تک صفیہ کرشلیا کے ساتھ بیٹھک میں نہیں آگئیں۔

مجھے اس میٹنگ کی کوئی بات یاد نہیں۔ سوا اس کے کہ مسعود پرویز کی آنکھیں بڑی خوبصورت تھیں۔ اس کا ناک نقشہ بے حد دلکش تھا اور میں نے کئی بار دزدیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ یقیناً فلمی دنیا میں ہیرو کی حیثیت سے مشہور ہوگا۔ (شاید وہ اس وقت کسی فلم کمپنی میں نوکر تھا یا ہونے کی کوشش کر رہا تھا) منٹو ادھر ادھر کی بڑی اوپری باتیں کرتا رہا اور میں تنا بیٹھا رہا۔ بات کو میں نے اپنی طرف نہیں موڑا۔ پرویز سے یہ نہیں پوچھا کہ اس نے کونسی میری چیز پڑھی ہے، وہ کب دہلی آیا ہے، کیا کر رہا ہے، کب تک رہے گا۔ بات چیت میں نے ذاتی رخ نہیں دیا۔ منٹو کو باتیں کرنے کے لئے چھوڑ دیا، بلکہ جب کرشلیا آئی تو ان لوگوں کو باتوں میں مشغول چھوڑ کر میں کام کرنے کا ناٹک کرتا رہا۔

میں نے ایسا کیوں کیا، جب میں اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو پاتا ہوں کہ مجھے اس بات کا ایک منٹ کو بھی یقین نہیں آیا کہ پرویز مجھ سے ملنا چاہتا تھا اور منٹو اپنے شام کے شغل کے نشے کو چھوڑ کر اسے مجھ سے ملانے چلا آیا تھا۔ صفیہ بھابی کرشلیا سے ملنا چاہتی ہوں گی، یہ بات میری سمجھ میں آسکتی تھی، صفیہ کرشلیا کو چاہتی تھیں اور کرشلیا بھی صفیہ اور منٹو دونوں کی عزت کرتی تھی۔ لیکن منٹو نے اس بات کا ذکر نہیں کیا اور میرے ہاں آنے کا جو بہانہ اس نے بنایا، اس پر مجھے یقین نہ تھا۔ پھر منٹو کے اس طرح آنے میں، اس کے اس طرح آواز دینے میں، میرے ہاں بیٹھنے اور باتیں کرنے میں کچھ ایسا انداز تھا جیسے میرے ہاں آکر وہ مجھ پر کوئی بڑا احسان کر رہا تھا اور مجھے اس کا شکر گزار ہونا چاہیے تھا۔ باتوں میں اس نے جتا بھی دیا کہ وہ اس ڈیڑھ برس میں کرشن کے گھر بھی کبھی نہیں آیا اور مجھے اس کا یہ انداز کھل گیا تھا۔

منٹو کی بات میں نہیں جانتا، لیکن اس ملاقات کی بے کیفی مدتوں میرے دماغ پر حاوی رہی۔ میں پھکڑ آدمی ہوں، منٹو بھی اول درجے کا پھکڑ رہا ہے، لیکن ایک دوسرے کی موجودگی جانے ہماری انانیت کے کن تاروں کو چھیڑ دیتی تھی کہ ہم بے ساختہ تن جاتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں کرسی پر بیٹھا لکھنے کا بہانہ کر رہا تھا، اور پاس ہی دری پر بیٹھے منٹو اور مسعود، صفیہ بھابی اور کرشلیا باتیں کر رہی تھیں، میں سوچ رہا تھا میں کیوں ان کی باتوں میں شامل نہیں ہوتا۔ جب وہ میرے گھر آئے ہیں تو مجھے ایسا گھٹیا پن نہ کرنا چاہیے اور چونکہ میں منٹو کے آنے کا سبب جانتا تھا، جسے اس نے احساس برتری کے زیر اثر دبا رکھا تھا، اس لئے میں کھل نہیں سکا۔ ہلکا سا رنج کا جذبہ منٹو کو اپنی بلندیوں سے نیچے اترتے دیکھ کر میرے دل میں ضرور پیدا ہوا، لیکن ان بلندیوں سے اسے اتار لانے کی کامیابی پر مجھے اتنی ہی مقدار میں خوشی بھی ہوئی۔

منٹو پھر میرے گھر کبھی نہ آیا ——— دہلی میں بھی نہیں، بمبئی میں بھی نہیں، اور اس نے دہلی چھوڑ جانا منظور کر لیا لیکن اور زیادہ نیچے اترنا اسے منظور نہ ہوا۔

جو بِک نہ سکا

ہاجرہ مسرور

یہ غالباً ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے۔ لکھنؤ میں ایک صبح کو ایک پولیس والا میرے گھر کا دروازہ اپنے ڈنڈے سے کھٹکھٹا رہا تھا۔ اور مجھے میرے نام سے پکار رہا تھا۔ پولیس والے کا یہ رعب داب میرے لئے بڑی دہشت ناک شکل اختیار کر گیا کیونکہ میں جس ماحول کی باسی تھی وہاں کسی لڑکی کا نام گھر سے باہر اونچی آواز سے پکارا جانا بے حیائی سمجھا جاتا تھا۔ میں ان دنوں جگر کی تکلیف میں مبتلا تھی اور بستر پر پڑے پڑے چھٹے تو ڑمے کے نئے سند کر کے رو رہی تھی۔ پھر معلوم ہوا کہ لاہور کی کسی عدالت کا سمن میرے نام آیا ہے۔ بظاہر بہادر بنتے ہوئے کانپتے ہاتھوں سے سمن لیا اور پڑھا۔ منٹو صاحب نے "دھواں" کے مقدمے میں گواہ صفائی کے طور پر مجھے طلب کیا تھا۔ میں نے گھبرا کر دستخط کر دیئے لیکن سمن کی خوفناک عبارت نے حواس غائب کر دیئے تھے۔ ایک قانون داں عزیزہ کو فوراً بلوایا تو انہیں جا کر "عدم حاضری کی صورت میں وارنٹ گرفتاری" کا خوف دل سے نکلا — انہی قانون داں عزیزہ سے معلوم ہوا کہ میری گواہی عدالت تسلیم نہیں کرے گی۔ کیونکہ گواہ کے سلسلے میں کچھ عمر وغیرہ کی بھی قید ہوتی ہے — اس بات سے اوس سی پڑ گئی۔ میرے بچپنے کا سرٹیفکیٹ مل گیا — لیکن اس سارے قصے سے خواہ مخواہ مارے اہمیت کے برا حال ہو گیا۔ ضرورت سے زیادہ "ادیب پن" اپنے اوپر طاری کر کے سب سے کہے جا رہے ہیں کہ "جناب یہ منٹو بھی عجیب ہیں، مجھ سے تو پوچھا ہوتا۔" (کچھ یوں جیسے منٹو صاحب اپنے لئے انتہائی روزمرہ قسم کا کام) اس قصے کے تیسرے یا چوتھے دن جبکہ مجھے لاہور میں ہونا چاہیئے تھا۔ مجھے منٹو صاحب کا خط اور ان کے عدالتی بیان کی نقل ملی۔ انھوں نے نہایت پرتکلف انداز سے بلا اجازت میرا نام گواہانِ صفائی میں رکھنے پر معذرت کی تھی۔ یہ ان کا میرے نام پہلا خط تھا — (دوسرا اور آخری خط ہمیں ملا، جبکہ وہ "اردو ادب" مرتب کر رہے تھے)

منٹو صاحب کو اس وقت تک میں نے بہت کم پڑھا تھا۔ حتیٰ کہ "دھواں" بھی اس کے بعد پڑھ سکی۔ مگر "نیا قانون" میرے دل پر بڑی نقش تھا اور میں اس زمانے میں محض اسی ایک افسانے کی وجہ سے انہیں بہت بڑا افسانہ نگار مانتی تھی — منٹو صاحب کو میں نے معذرت کا طفلانہ سا خط لکھ ڈالا، جس میں میں نے اپنی بیماری کا تذکرہ کیا، لیکن عمر وغیرہ کی نازک بات گول کر گئی۔ اس خط کا کوئی جواب نہ آیا۔ مجھے ذلت سی محسوس ہوئی۔ کافی عرصے بعد جب کہ منٹو صاحب ترقی پسندوں سے بہت ناراض تھے۔ میرے اسی طفلانہ سے خط کو نقل کر کے ایک کتاب اس خط کے نام سے وہ خط شائع ہوا مگر میرا نام غائب تھا۔

منٹو صاحب جیسے بڑے افسانہ نگار میرے عدالت میں حاضر نہ ہونے سے ناراض ہو گئے ہیں۔

پھر جب مجھے بمبئی جانے کا اتفاق ہوا تو میں نے وہاں مقیم کئی مشہور ادبی شخصیتوں کو خط لکھے جس کا مفہوم کچھ یوں تھا کہ آپ جیسے بڑے افسانہ نگار سے ملنے کا بے حد اشتیاق ہے ۔۔۔ سب کا جواب آیا، مگر منٹو صاحب کا جواب نہ آیا ۔۔۔ میں اس بات کو بھول سی گئی۔ کچھ روز بعد ایک صاحب نے مجھ سے نہایت بے تکلفانہ انداز سے سوال فرمایا "آپ نے منٹو سے ملنے کے لئے خط لکھا ہے ۔۔۔" ان کا لہجہ کچھ اس قدر تعجب انگیز قسم کا تھا کہ میرے منہ سے بلا ارادہ "نہیں" نکل پڑا ۔۔۔ اپنے مخصوص قسم کے "چار دیواری ماحول" سے باہر آ کر کسی جوان کا اپنے اوپر حملہ آور سی لگتی ۔۔۔ میں "نہیں" پر اڑی رہی۔ اور ان صاحب نے قصہ یوں پاک کیا کہ "میں نے خط اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے" میں اس بات پر بہت چڑچڑائی کہ منٹو صاحب بھی کیسے عجیب آدمی ہیں۔ آخر بڑے ادیبوں سے ملنے کا شوق نئے لکھنے والوں کو ہوتا ہی ہے۔ اس میں عجیب بات کیا تھی جو انھوں نے دوسروں سے تذکرہ کر ڈالا ۔۔۔ اس کے بعد منٹو صاحب سے نہ کبھی ملاقات ہوئی نہ خط و کتابت ۔۔۔ اب جب کہ وہ ہم میں نہیں ہیں تو ان کی یہ بات بھی بڑی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ لاہور آ کر میں نے کئی بار انھیں دور سے دیکھا، مختلف ادبی جلسوں میں ۔۔۔ وہ ہمیشہ اتنے زرد نظر آتے کہ خواہ مخواہ ان کی زندگی کی دعا کرنا پڑتی۔ بڑی بڑی سبز سی آنکھیں، اور بھوؤں کے درمیان بل سا رہتا جیسے ان کی نظر کسی ایسی چیز کی تلاش میں ہوں جو کوئی نہ دیکھ سکے۔ ایک دفعہ ایک ادبی محفل میں جہاں منٹو صاحب کے فن کے بارے میں ایک صاحب مضمون پڑھ رہے تھے۔ مجھے زبردستی صدارت کے الفاظ میں کرسی صدارت پر بیٹھنا پڑا۔ یہ صرف خود اپنی جگہ ایک بہت بڑی مصیبت تھی، وہیں چپ کر بیٹھنے والوں کے لئے بے حد اذیت بخش ہوتا ہے، وہاں کی ناتجی کا ماحول اور سب پر مستزاد منٹو صاحب کی موجودگی ۔۔۔ میں نے بہت لوگوں سے سن رکھا تھا کہ منٹو صاحب اپنے فن پر کسی تنقید نہیں سن سکتے۔ اور وہاں تنقید ہی ہو رہی تھی۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر انتہائی حیرت ہوئی کہ منٹو صاحب تنقید پر تنقید کے دوران میں ایک لفظ نہ بولے۔ وہ میز پر کہنیاں رکھے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لئے بیٹھے رہے ۔۔۔ ان کے چہرے پر بڑی اذیت تھی ۔۔۔ اور ہر بولنے والے کی طرف ان کی بدصورت آنکھیں یوں جھپکتیں جیسے کچھ پانا چاہتی ہوں ۔۔۔ لیکن جب بات ختم ہوتی تو یوں ہنستیں جیسے وہاں اپنے مطلب کی بات نہ ہو ۔۔۔ اس دن منٹو کے اکھڑے پن سے بہت سے لوگ کچھ آپے میں نہ تھے بھی نہیں، اور منٹو صاحب کا چہرہ اس کا شاہد تھا ۔۔۔ منٹو صاحب کی اس بعد کی خاموشی سبھی کے لئے حیرت انگیز تھی ۔۔۔ منٹو صاحب ضبط بھی کر سکتے ہیں، یہ بڑی عجب بات تھی۔

آخری بار میں نے انھیں ترقی پسند مصنفین کے ایک جلسے میں دیکھا۔ وہ بغیر دعوت اپنی بیوی صفیہ کے ساتھ آئے۔ ان کے کسی مضمون پر تنقید ہو رہی تھی۔ سخت گرمی کا زمانہ تھا۔ اور ذرا سے گھٹے ہوئے کمرے میں بغیر پنکھے کے بہت سے لوگ جہاں موم بتیوں کی روشنی میں بیٹھے تھے ۔۔۔ منٹو صاحب اپنے مخصوص انداز سے آستینیں چڑھا کر اور ایک پاؤں کرسی پر رکھ کر بیٹھ گئے اور تنقید میں حصہ لینے لگے ۔۔۔ ان کی حالت بہت خراب تھی، بے حد زرد اور نڈھال ہو رہے تھے ۔۔۔ صفیہ کے قریب بیٹھے بیٹھے، مجھے ادیب منٹو کے بجائے صرف صفیہ کے شوہر سعادت حسن کا خیال آنے لگا ۔۔۔ صفیہ ان کی صحت کے بارے میں بہت فکرمند تھیں اور بڑی مایوس تھیں ۔۔۔ لیکن آج جبکہ منٹو صاحب اپنے افسانوں کو چھوڑ کر موت کی وادیوں میں جا کر ختم ہو گئے ہیں تو میں سوچتی ہوں، اب صفیہ کی کیا حالت ہو گی جس کا سب کچھ موت نے لوٹ لیا، تو وہ اپنی ننھی بچیوں کے ساتھ تنہائی کے کتنی دکھ بھری فکروں میں مبتلا رہتی ہوں گی ۔۔۔ منٹو صاحب کے مداحوں کو یہ بات بھی ضرور سوچنا چاہئے۔

مجھ سے منٹو صاحب پر مضمون لکھنے کو کہا گیا ہے ۔۔۔ مگر ذاتی طور پر ان سے میرا کتنا واسطہ رہا ہے، یہ ابھی تک بھی کچھ بتا رہی تھی۔ ان کی ذات کے بارے میں مشاہدہ تو نہیں، جیسے لوگ اپنی اپنی سمجھ کے مطابق منٹو صاحب کو دیکھتے اور سمجھتے ۔۔۔ ان باتوں میں خود منٹو صاحب کس حد تک ہوتے تھے، یہ میں کیا کہہ سکتی ہوں ۔۔۔ اس لئے ان کی ذات کا معاملہ اسی جگہ چھوڑ دیتی ہوں۔

رہا منٹو صاحب کا فن تو اگر اس کا تجزیہ ہی درکار ہو تو اس خدمت کے لئے باقاعدہ نقادوں کی کمی نہیں کیونکہ وہی لوگ فنی اصطلاحیں برتنے

کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ سیدھے سادے انداز سے کہی ہوئی بات کا شمار تنقید میں نہیں ہوتا۔ اس لئے منٹو صاحب کے فن پر اگر میں کچھ کہوں تو اس کی قیمت ہی کیا ہو سکتی ہے۔ منٹو صاحب کے فن پر لکھنے کا جواز اگر یوں ڈھونڈھوں کہ میں نے بھی چند افسانے لکھے ہیں تو یہ قطعی ضروری نہیں کہ جس نے افسانے لکھے ہوں وہ منٹو کے فن پر کوئی عالمانہ رائے بھی دے سکے ——— ہاں فنی ردعمل دوسری چیز ہے۔ اور میں چند سطروں میں اس ردعمل کو بیان کرنے کی کوشش کروں گی۔ جو منٹو صاحب کے افسانوں سے میں نے قبول کیا۔

منٹو صاحب حد درجہ "شدید" افسانہ نگار تھے۔ اگر افسانہ نگاروں کو ان کے فن کے مدنظر شریر، متین، شریف اور لطیف افسانہ نگار کہنے کی جرأت ہو تو میں منٹو صاحب کو "شدید" افسانہ نگار کہوں گی۔ منٹو صاحب اپنے دور کے بہت بڑے حقیقت پسند تھے اور ہر اس چیز کو شدت سے محسوس کرتے تھے جو انھیں کھٹکتی تھی۔ اور اسی شدت سے اکثر چیزوں کو نظر انداز بھی کر ڈالتے تھے۔ ریشم کی لچھیوں میں اگر سوت کا ایک ننھا سا تاگا بھی نظر آ جاتا تو وہ اس کے گرد اپنے ردعمل کا ایک ایسا جال تیار کرتے تھے کہ ان کے ذہن کی خوبی اور نفاست تک اردو افسانہ نگاری کے بہت کم استاد پہنچ سکتے ہیں۔

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ منٹو صاحب موضوع کے انتخاب میں تو انتہائی شدت پسند تھے مگر موضوع کو اظہار میں منتقل کرتے وقت حد درجے باشعور اور متوازن فن کار بن جاتے تھے۔ مختصر افسانہ نگاری کی تکنیک کی پوری تکمیل اور احتیاط سے برتنے کے فن میں اگر اردو کا کوئی دوسرا افسانہ نگار منٹو کے مقابل پایا جا سکتا ہے تو وہ راجندر سنگھ بیدی ہیں۔

منٹو صاحب بے حد جری افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے کسی قسم کی مخالفت سے کبھی شکست نہ کھائی۔ انھوں نے حکومت کی مخالفت کا مقابلہ کیا۔ نقادوں کی مخالفت پڑھنے سے منہ پھیر لیا۔ ادیبوں کی مخالفت پر ہنستے رہے۔ عجیب نظر ڈالی معاشرت کے ٹھیکیداروں اور اخلاق کے اجارہ داروں کی مخالفت کو ٹھکرا دیا اور زندگی کے کسی لمحے میں بھی اس سے ہار نہ مانی ——— یہ ضد، یہ پتھر پر لکیر قسم کا نقطۂ نظر فن کار کو نقصان بھی پہنچاتا ہے۔ کیونکہ ہر مخالفت کی بنیاد بدنیتی پر نہیں ہوتی۔ بعض دفعہ خلوص بھی نکتہ چینی کی بنیاد بنتا ہے۔ اور اس قسم کی نکتہ چینی میں فن کار کے اپنے کام کی چیز بھی نکل آتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے کہ ہر مخالفت کو ٹھکرا کر واپس ہو جانے پر مجبور کرنے کے لئے کسی شخصیت کو اپنے اردگرد ایک حصار سا بنانا پڑتا ہے۔ اور یہ حصار نہ صرف مخالفت کا منہ پھیر دیتا ہے بلکہ بسا اوقات مشاہدات اور محسوسات کو بھی محصور کر کے ٹھنڈی تازہ ہوا سے محروم کر دیتا ہے ... لیکن اگر یہ "حصار" محض اس لئے بنایا گیا ہو کہ "فن" کو کہیں اس سے کمتر درجے کا خول محسوس نہ کر ڈالے تو اس قلعہ بندی کا جواز پیدا ہو جاتا ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ منٹو صاحب کی اکثر ضد بڑی حد تک اسی زمرے میں آتی ہے ——— انھوں نے معاشرت کے چہرے پر داغ دیکھ لئے تھے اور اس لئے وہ معاشرت کے حسن پر ایمان لانے کو تیار نہ تھے۔ وہ اپنے مشاہدات کو جھٹلانے سے انکار کرتے تھے۔ اور اخلاق کی اس ترکیب قدر کو تسلیم کرنے سے بھی انکار کرتے تھے کہ داغوں کو نظر انداز کر کے معاشرت کے حسن کا قصیدہ کہو ——— یا پھر داغوں کو بھی لوازمات حسن قرار دو۔ یہ درست ہے کہ منٹو صاحب آئے دن کی نصیحتوں سے گھبرا کر بلا کے متنفر مزاج بن گئے تھے۔ اس لئے وہ معاشرت اور اخلاق کے ان مطالبات کا مذاق اڑانے کے لئے شدت پر بھی اتر آتے تھے۔ لیکن اس انتہا پسندی میں بھی شرارت کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔ البتہ شدت ضرور موجود ہے۔ اور فن میں شدت کوئی جرم نہیں ——— بعض رنگوں کو گہرا کرنا ہی پڑتا ہے، کیونکہ زندگی کا کوئی بھی رخ سپاٹ نہیں۔ جو رنگ ہلکے خوابیدہ رنگوں کو فن کا اوج قرار دیتے ہیں۔ وہ بھی دراصل رنگ کے ہلکے پن کو بالواسطہ گہرا کرتے ہیں۔

منٹو صاحب سے پہلے بھی طوائف اور بگڑی ہوئی لڑکیاں اور ان کے دلال، اردو ادب میں کہیں کہیں نظر آتے ہیں ——— لیکن ان میں ڈرامائی جان کو الگ رکھنے کے بعد، بہت کم اصلی تصویریں تھیں۔ طوائفیں یا تو نہایت ابتر اطمینان یا محض سماج کا کوڑا، جن پر ادیب تھو تھو کر کے آگے بڑھ جاتے ——— دلال بھی جھلک دکھا جاتے، مگر صرف اپنے جاہ کی۔ منٹو صاحب کا سب سے بڑا اور زندہ رہنے والا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو ادب

پہلی بار سنجیدگی سے، اس گرے ہوئے طبقے کو داخل ہونے دیا ——— اور فتویٰ صادر کرنے کے بجائے، اس طبقے کے ساتھ ساتھ نظر آئے۔ وہ
جو کچھ ہوتا ہے، جو کچھ ہے، جیسا کچھ ہے اسے بغیر کلیاں پہنانے ننگے سامنے رکھ دیتے تھے۔ اور پھر پڑھنے والے کو اجازت تھی، وہ جو چاہے
تم کرے، جو علاج مناسب سمجھے کرے۔ منٹو صاحب کی طوائفیں، بگڑی ہوئی لڑکیاں اور دلال، بدمعاش، غنڈے، ہمارے سامنے اپنے حقیقی رنگ میں
آتے ہیں۔ اور ہم آسانی سے یہ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ بھی انسان ہیں۔ اور ہماری ہی طرح ان کے بھی لطیف انسانی احساسات ہیں۔ انھیں بھی ذلت پہنچنے
سے ان کی بھی ہتک ہوتی ہے۔ یہ محبت بھی کر سکتے ہیں اور قربانی بھی دے سکتے ہیں ——— بے روزگاری کا زخم یہ بھی کھاتے ہیں، دوسروں کے امین
ہوتے ہیں، اور مددگار بھی ——— اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ منٹو صاحب نے ان "گرے" ہوئے لوگوں کو پہلی بار اردو ادب میں پوری ایمانداری
سے پیش کیا ——— اسی سلسلے میں منٹو صاحب پر الزام رکھا جاتا ہے کہ وہ عریانی پر اُتر آتے تھے ——— اب یہ ایک بحث ہے کہ عریانی کیا ہے
اور کیا نہیں۔ البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ آرٹ اور ادب کے بڑے بڑے شاہکاروں پر بھی یہ الزام عائد ہوتا ہے ——— مگر اللہ کی اتنا تو بتائیے کہ
عریانی میں بھی ایک دلکشی، ایک بے داغ سی معصومیت، ایک رنگ، ایک راگ سا نہیں ہوتا جو تخلیق اور نسل انسانی کی بقا کے تقدس تسلسل کو
قائم رکھنے کے لئے فطرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے۔ اب یہ تو محض ضد کی بات ہے کہ کوئی محترم یا محترمہ دس بچوں کے ماں باپ بن کر بھی لذتیت
اور عریانی کے نام سے بھڑکیں اور اپنے جگر گوشوں کو "سفلی جذبات" یا اسی قسم کے دوسرے بخس اتصال کا نتیجہ قرار دیں ——— مگر یہ بحث بھی منٹو
صاحب کے مخصوص فنی رنگ سے کوئی خاص تعلق نہیں رکھتی، کیونکہ منٹو صاحب کو میں جس قدر پڑھ سکی ہوں اور کچھ کو چھوڑ کر ان میں مخصوص طوائف
سے متعلق افسانوں میں اکتساب لذت یا دلچسپی بڑھنے کی اکساہٹ کہیں نہیں پائی ——— اب بعد "ہتک" کی ہیروئن ہی کو دیکھیے۔ اپنے
میلے بستر پر ٹوٹی ہوئی پڑی ہے۔ ایک بازو سر کے گرد رکھے ہوئے۔ منٹو نے اس عام انداز کے لئے چاند کے گرد ہالے کی خوبصورت تشبیہ لکھ کر ساری
رات کو یوں بغیر آستین کے کپڑے پہن کر سونے کی ترغیب نہیں دی۔ بلکہ تشبیہ دی بھی تو بغلوں کی کھال کے متعلق، یہ بچی مرغی کی فضا کی کھال کی
——— خدا جانے وہ کس دن گروے کے بندیں میں جنہیں، یہ بچی مرغی کی کھال دیکھ کر لذت کا ذرہ پڑ سکتا ہے ——— یا پھر کاغذی اور سفید انیا
کا شکار، نیند کی بڑی لموتی ہوئی آنکھوں والی سرکش کو دیکھئے۔ جو واہیات سے واہیات جنسی حرکتوں پر اور بھی بےجان ہو جاتی ہے۔ اور اپنے آپ
کو بکنے کے لائق بنانے کے لئے چرس والی سگریٹ سے دم لگاتی ہے ——— کیا کسی کو یہ ادا آگے بڑھنے کی اجازت دے سکتی ہے ——— میں نے
جہاں تک منٹو صاحب کے مشہور و معروف "عریان" کرداروں کا مطالعہ کیا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ کوئی بھی نارمل انسان انھیں پڑھ کر لذت حاصل نہیں
کر سکتا بلکہ جنسی فعل کے خلاف ایک شدید قسم کی نفرت پیدا ہو جاتی ہے ——— جو ایک سادہ انسان کے لئے ایک مسئلہ بن سکتی ہے ——— جنس
کے خلاف یہ نفرت، اس لئے بھی پیدا ہوتی ہے کہ منٹو صاحب ان جنس میں ڈوبے ہوئے کرداروں پر تشبیہوں اور استعاروں کا رنگ دروغن نہیں
پوتتے ——— یہ لیپ پوت منٹو صاحب کی فطرت کے خلاف تھی، اس لئے وہ اتنی سچائی سے ان کی تصویر اُتارتے تھے کہ وہ بگڑی ہوئی تصویریں
بھی نہیں بلکہ ایکسرے فوٹو بن جاتی ہیں ——— ایکسرے فوٹو ڈاکٹر حضرات غور سے دیکھیں تو دیکھیں، ان سے لذت اخذ کرنا عام ذہن کا کام نہیں۔

قیام پاکستان کے بعد منٹو صاحب نے اقتصادی اعتبار سے اپنے بدترین دن گزارے۔ یہ عمر یہ زمانہ منٹو صاحب کی فنی پابندی اور ذہنی پختگی
کے عروج کا زمانہ تھا۔ لیکن افسوس کہ اسی زمانے میں، اقتصادی پریشانیوں نے ان سے ایک ایک دن میں تین تین افسانے لکھوا لئے ———
ہمارے مغرب زدہ نقاد جو اپنے ملک کی ہر چیز کو حقیر گردانتے کے عادی ہیں، ذرا بتائیں تو کہ کیا یورپ اور امریکہ کے ادیبوں نے پیٹ پالنے کمانے
کے لئے ایک دن میں تین تین افسانے لکھے ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ وہاں کے معمولی سے معمولی ادیب کی ایک کتاب بازار میں آجائے تو وہ بڑی
شان سے سال دو سال کچھ نہ لکھ کر، صرف سود پر گزارہ کر سکتا ہے ——— منٹو صاحب نے تقسیم سے قبل اپنے اس قلم کے بوتے پر بہتر دن گزارے
تھے، اور پاکستان آکر بھی وہ اپنی بیوی اور بچوں کا معیار زندگی قائم رکھنے کی کوشش کرتے رہے ——— مگر ہمارے ملک میں صرف قلم ذریعۂ آمدنی

نہیں بن سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ چند روپوں کی خاطر نہایت گھٹیا قسم کے رسائل میں لکھتے رہے۔ منٹو صاحب کو اس زمانے میں کثرت سے لکھنا پڑا۔ اکثر موضوعات پر شاید وہ بمبئی کے دورانِ قیام میں کبھی قلم نہ اُٹھاتے۔ یا اگر اُٹھاتے تو دوسرے انداز سے ـــــ مگر وہ محض اگر ضروریاتِ زندگی کی طلب نے ان سے سبھی کچھ لکھوا دیا ـــــ بہت سے افسانے جو لکھے گئے انھیں بہتر حالات میں شاید تھوڑا اور سوچ کر لکھ جاتا ـــــ مگر ان تمام پریشانیوں کے باوجود منٹو صاحب کی عظمت سے کون منکر ہوگا کہ وہ دانستہ بکے نہیں۔ ایک دفعہ انھی اڈیٹروں کے دور میں جہاں سے ایک نمائندے نے ان سے تین سو روپے فی افسانہ طے کر لیا۔ مگر منٹو صاحب کی رگِ طنز پھڑکی اور انھوں نے تین سو (غیر ملکی) روپیہ فی افسانہ کے حساب سے کہانیاں لکھنے (غالباً ۲ کہانیاں نہیں لکھیں) روپیہ فی خط کے حساب سے چچا سام کے نام خطوط لکھ ڈالے ـــ منٹو صاحب کبھی بِک نہ سکے اور نہ ان کو کوئی انھیں کسی بندوں اپنے حق میں استعمال کر سکا ـــ وہ طبیعت کے کھرے تھے۔ اس لئے کسی قسم کی پابندی انھیں گوارا نہ تھی۔

آج منٹو صاحب ہم میں نہیں۔ وہ اپنی الخُث بہادری کے ساتھ ختم ہو گئے۔ لیکن ان کا فن اُردو ادب میں ناقابلِ فراموش کارنامے کی طرح زندہ رہے گا ـــ منٹو صاحب کے فن اور موضوع پر سینکڑوں اعتراض بھی ہو سکتے ہیں۔ مگر منٹو صاحب کی ایک خصوصیت سے کوئی بھی انکار نہ کر سکے گا۔ اور وہ خصوصیت تھی، انسانیت دوستی اور زندگی کو صاف اور بے داغ دیکھنے کا جذبہ جو ان کے فن کا مجموعی تأثر ہے۔ بہت ممکن ہے کہ آپ کو "بُو" بیکار کی چیز معلوم ہو لیکن کیا قارئین نے دل میں "بُو" کی کثافت کے لئے "کیوں" نہیں کو نخ اُٹھتی۔ جس کا میل اور گندی ساڑی بھی ایک جنسی بامعنی۔ کہ شنکار نوجوان کے لئے باعثِ کشش بن گئے۔ کیا خوشیا سے کوئی شخص نفرت کر سکتا ہے۔ کیا "سرکنڈوں کے پیچھے" بکنے والی بھولی بھالی لڑکی سے آپ کو محبت نہیں ہو جاتی جسے یہ نہیں معلوم کہ وہ گناہ کر رہی ہے ـــــ یہ ہمدردی اور انسانیت دوستی کی لہر ایک دو افسانوں تک محدود نہیں ان کے زیادہ تر افسانوں میں موجود ہے۔

یہ انسانیت دوستی مختلف صورتیں اختیار کر سکتی ہے ـــــ اور مختلف اشخاص میں نظر آ سکتی ہے۔ اس کے لئے کوئی سانچہ مقرر نہیں کہ یہاں نوٹ کر رکھو، یہاں پر یہ ہے۔ کہ یا یہاں سعادت حسن منٹو نہیں سما سکتے ـــــ یہ نہیں دیکھنا چاہیئے کہ اس انسانیت دوستی پر کون سی مہر ثبت ہے۔ دیکھنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ انسانیت دوستی ہے۔ کلبیت نہیں ـــ انسانیت سے نفرت نہیں۔ انسان کو فطری اور جبلی طور سے کمینہ اور رذیل قرار دینے کی عادت نہیں۔ یہاں پیٹ بھری شکن، اضمحلال اور مایوسی نہیں بلکہ یہاں تو یہ جذبہ کار فرما ہے کہ انسان بڑی ہی پیاری مخلوق ہے۔ یہ طوائف کے بازار میں بھی انسان ہی رہتی ہے ـــــ اگر اس کے معاشرتی زخم مندمل ہو جائیں جن کی طرف فن کار اشارہ کر رہا ہے تو یہ دنیا کتنی پیاری اور یہ زندگی کتنی لطیف ہو جائے۔ اور منٹو کے فن کا مجموعی تأثر یہی جیتی جاگتی انسانیت دوستی ہے۔ مضمون ختم کرنے سے پہلے ذرا اتنا سوچئے کہ سعادت حسن منٹو اگر بہتر دنیا میں پیدا ہوئے ہوتے تو ان کے موضوعات کیا ہوتے اور ان کا جاندار قلم کیا کیا حسن نہ بکھیرتا۔

رحمدل دہشت پسند

ابوسعید قریشی

آزادی کی تقریب سعید پر امرتسر میں جب پہلا فساد ہوا تو میں لاہور میں تھا۔ سعادت ممبئی میں تھا۔ غلاموں نے آزادی کی خوشی میں اپنے ہمسایوں کے گھروں کو آگ لگا کر چراغاں کیا۔ اور اس اعلان سے قبل کہ امرتسر پاکستان میں شامل ہوگا یا ہندوستان میں آدھا شہر ملبے کا ڈھیر ہو گیا۔ اس جشن کے ناٹک کا جب پہلا سین ختم ہوا تو میری بیوی نے کہا کہ جاؤ اور جو کچھ لا سکتے ہو لے آؤ۔ لیکن جب میں امرتسر پہنچا تو میرے عزیزوں نے مجھے چوک فرید ہی میں روک لیا۔ یہ مسلمانوں کا چوک تھا اور میرا گھر ہندوؤں کے علاقے میں تھا۔ مجھ سے کہا گیا "وہاں جانا خطرناک ہے۔ غالب یہی ہے کہ تم راستے ہی میں دھر لئے جاؤ گے —— ہاں اگر مسلم لیگ کی لاری آ گئی تو شاید کچھ اُدھر جانے کا بندوبست ہو سکے۔" لیکن مسلم لیگ کی لاری نہ آئی۔ میں نے اپنے عزیزوں سے پوچھا "کیا کٹڑہ جیمل سنگھ تک بھی نہیں جا سکتا؟" جواب ملا "صرف شہابے شیر فروش کی دکان تک۔" اس کے آگے ہندوؤں کا راج تھا۔ میں نے یقین دلایا کہ شہابے کی دکان سے اِدھر ہی رہوں گا، اُدھر نہیں جاؤں گا —— کٹڑہ جیمل سنگھ دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے پر برلن کا نقشہ پیش کر رہا تھا —— شہابے کی دکان سے اِدھر کوچہ وکیلاں کے سامنے ملبے کا ایک پہاڑ کھڑا تھا۔ اس گلی میں منٹو کا مکان تھا۔ گلی کے دہانے پر ملبے کا ڈھیر مجھے اپنے ماضی اور حال کے درمیان آئرن کرٹن کی طرح آویزاں نظر آیا جس کے اس پار دیکھنا محال تھا لیکن میرا دوست زندہ تھا۔ دل نے کہا "یار زندہ صحبت باقی" —— میں نے اینٹ پتھر کے اس انبار کی طرف سے منہ پھیر لیا جو کوچہ وکیلاں کی ناکہ بندی کئے ہوئے تھا۔ اور اپنے ساتھیوں سے کہا "آؤ چلیں۔" لیکن آج کہ میرا دوست دنیا میں نہیں ہے ملبے کا وہ ڈھیر آپ سے آپ اُٹھ گیا ہے۔

کوچہ وکیلاں، منٹوؤں کا محلہ تھا —— سعادت کہا کرتا تھا کہ منٹ کشمیری زبان میں ترازو کو کہتے ہیں۔ کشمیر میں ہمارے اب و جد کے یہاں دولت ترازو سے تُلتی تھی۔ اس رعایت سے ہم منٹو کہلائے۔ میں نے منٹو کے اس بیان کی تصدیق نہیں کی۔ دوستوں کو آدمی کچہریوں اور تھانوں میں نہیں لئے پھرتا۔ بعینہٖ جس طرح چاہنے والا محبوب کے خد و خال کو کتابی معیاروں کے مطابق مسطروں سے نہیں ناپتا۔ لیونارڈو نے اگر مونالیزا کے

ہونٹوں کو شیشۂ محدب سے دیکھا ہوتا تو مصوری کی دنیا اپنی حسین ترین مسکراہٹ سے محروم ہو جاتی ـــــ ان تو کوچہ وکیلاں فوٹوؤں کا [illegible]۔ گلی میں قدم رکھتے ہی دائیں طرف مسعود پرویز کے والد خواجہ حفیظ اللہ وکیل کا مکان تھا۔ اس کے باہر ایک چھوٹا سا کنواں تھا۔ اس سے آگے ملا ہوا خواجہ عبدالحمید ڈی۔ ایس۔ پی کا مکان۔ اس مکان کے سامنے ایک حویلی تھی۔ خواجہ عبدالحمید صاحب کے والد نے کوئی سو سے اوپر ہی عمر پائی ہو گی۔ وہ امرتسر کے بچے بچے کو جانتے تھے۔ انہوں نے جب مجھے پہلی بار سعادت کے یہاں دیکھا تو پوچھا کس کے بیٹے ہو؟ میں نے بتایا تو ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "اچھے اچھے تو تو اپنا بچہ ہے۔ تیرے دادا جب گاؤں سے اٹھ کر شہر آئے تھے۔ تو شروع شروع میں یہیں تو رہتا تھا مکان۔ ہمارے گھر کے سامنے جو حویلی ہے نا۔ کشن سنگھ بابا رہتے تھے ہم تمہارے گھر سے۔ اوہو ہو کیا زمانہ تھا۔ کیا لوگ تھے......"

اس حویلی کے سامنے شمال کی طرف سعادت کا مکان تھا۔ اس کا ایک دروازہ جنوب کی طرف کھلتا تھا۔ دوسرا مشرق کی طرف۔ اور یہی سعادت کے کمرے کا راستہ تھا۔ ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی دائیں ہاتھ۔ یہی کمرہ منٹو کی تحریروں میں "دارالاحمر" کے نام سے منسوب ہے۔ دروازے کے قریب ہی دیوار کے ساتھ دو گھڑے۔ رکھ کر ان پر گدا اور گدے کے اوپر ملتانی کھیس بچھا دیا گیا تھا۔ سامنے شمالی دیوار کے ساتھ کھڑکی کے قریب لکھنے کی میز تھی۔ اس کے دائیں جانب دیوار میں ایک چھوٹی الماری۔ جو کتابیں الماری میں نہیں سما سکتی تھیں میز پر دیواروں کے سہارے پڑی رہتیں۔ کتابوں کے علاوہ قلم دوات، کاغذ، پنسلیں۔ میز کے بائیں جانب آتش دان تھا۔ جس پر بھگت سنگھ کا مجسمہ رکھا تھا۔ مجسمے کے ایک طرف تیل کا ٹیبل لیمپ تھا۔ اور دوسری طرف پرانی وضع کے ٹیلیفون کا ریسیور۔ ایک پبلک ٹیلیفون سے جب متعدد کوششیں کرنے کے بعد بھی اسے مطلوبہ نمبر نہیں مل سکا تھا تو اس نے یہ کہتے ہوئے ریسیور کو کھینچ کر اور کوٹ کی جیب میں ڈال لیا تھا کہ "یہ کیا فراڈ ہے"۔ اس نے خود اپنے لئے بھی کئی بار "فراڈ" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ لیکن یہی ایک چیز تھی۔ جو اسے نہیں آتی تھی۔ اس کا ظاہر باطن ایک تھا۔ وہ بڑا صاف شفاف آدمی تھا۔ اس اجلی چاندنی کی طرح جو کمرے کی مشرقی کھڑکیوں کے پاس بچھی رہتی تھی۔

میں اس کمرے میں پہلی بار ۱۹۳۱ء میں گیا۔ میں ان دنوں ہندو سبھا کالج میں سائنس سٹوڈنٹ تھا۔ ایک روز میں نے اسے کالج کے جنوب مشرقی برآمدے میں دیکھا۔ اس نے سرخ دھاریوں کی بوسکی کی قمیص پہن رکھی تھی۔ اور سفید بوسکی کا پاجامہ۔ پاؤں میں چپل تھی۔ اور قمیص کے اوپر اونچا سا (فیشن کے مطابق) گرم کوٹ۔ وہ پہلے ایک ہندو ہم جماعت پرکاش کی تصویر اتار رہا تھا۔ پرکاش کو دیکھ کر کالج کے [illegible] سینیئر "بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را" کے حال میں مبتلا ہو جاتے۔ اور مصرع اولیٰ کے "اگر" کی خاطر اکثر ایک دوسرے سے سر پھٹول کو تیار نظر آیا کرتے۔ پرکاش کو منٹو کے کیمرے میں اترتے دیکھ کر تصویر اور مصور دونوں کو چشم تصور نے گھیر لیا۔ میں نے منٹو کو اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ یہ کون ہے؟ میں نے اپنے ایک ہم جماعت سے پوچھا۔ جواب ملا "ٹامی"۔ میں نے یہ نام سن رکھا تھا۔ وہ اپنے سکول میں اور پھر کالج میں اسی نام سے مشہور تھا۔ اس کی وجہ تسمیہ اس کی شرارتیں تھیں۔ خیر یہ "ٹامی" جو اس وقت گویا پری کو شیشے میں اتار رہا تھا۔ مجھے کچھ عجیب وضع قطع کا آدمی نظر آیا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ کوئی معقول آدمی بوسکی کا پاجامہ اور لال دھاری کی قمیص گویا نائیٹ سوٹ میں کالج بھی آ سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے اسے اور قریب سے جاننے کی کوشش نہ کی اور بات آئی گئی ہو گئی۔

کچھ عرصہ بعد میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ ان کی تصویر کی اینلارجمنٹ کے لئے میں عاشق علی فوٹوگرافر کی دکان پر گیا۔ جس کے نام کا ان دنوں بہت چرچا تھا۔ اس کے پاس ایسے ایسے کیمرے تھے۔ جو ہمارے شہر کے فوٹوگرافروں نے دیکھے بھی نہیں تھے۔ وہ بمبئی کی فلمی دنیا سے بھی گھوم آیا تھا اور اس کے شوکیس میں فلمی ستاروں کی تصویریں۔ روشنیوں اور سایوں کے عجیب و غریب امتزاج سے چمک رہی تھیں۔ کاروبار کی بہ نسبت اسے اپنے آرٹ کی زیادہ فکر تھی۔ اس کے سٹوڈیو میں گاہک کی تسلی ثانوی حیثیت رکھتی تھی۔ چنانچہ وہ اکثر ایسی تصویریں بھی بنا ڈالتا جو گاہک تو خوشی سے لے جاتے۔ لیکن وہ تصویریں نہ ہوتیں۔ مصور کا اپنا جی خوش نہ ہو۔ وہ اعلانیہ شراب پیتا۔ اور اس کا ذکر چھپ چھپ کر

تیں کی چھٹی۔ عاشق علی نے میرے والد کی دو تین تصویریں بنائیں اور پھاڑ ڈالیں۔ "کچھ بات نہیں بن رہی یار۔" بات بنانے کے لئے وقت درکار تھا۔ اس لئے میرا اکثر وہاں پھیرا رہتا۔ یہیں منٹو سے میری ملاقات ہوئی۔ "کہیئے پرکاش کی تصویر کیسی آئی؟" میں نے پوچھا۔ جواب ملا: "فلم ہی بے تکی کیسے ہیں۔"

ہماری یہ ملاقات آہستہ آہستہ دوستی میں تبدیل ہوتی گئی۔ وہ مارلین ڈیٹرچ کی ٹانگوں پر مرتا تھا اور میں گاربو کے حسنِ اداس کو دیکھ کر آہیں بھرتا تھا۔ جس مقام پر میں اب پہنچا تھا وہ اسے چار برس پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ وہ مئی ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوا تھا اور میں مئی ۱۹۱۶ء میں۔ خیر فلمی ستاروں کی کشش ان کے دو مفلوک الحال غائبانہ عشاق کو دونوں میں قریب سے قریب تر لے آئی۔ غالب نے کہا تھا ؎

"ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر جو تھا راز داں اپنا"

لیکن کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ "ذکر اس پری وش کا" رقیبوں کو راز داں بنا دیتا ہے۔ منٹو سے اپنی دوستی کے لئے میں گریٹا گاربو اور مارلین ڈیٹرچ کا احسان مند ہوں۔ ان کی تصویروں کی کشش مجھے پہلی بار کوچہ وکیلاں میں لے گئی۔ ہالی وڈ سے امرتسر کے فاصلے آنکھ جھپکتے میں طے ہو گئے۔

سعادت کی میز کے پاس الماری میں رنگا رنگ کے فلمی رسالوں کے انبار لگے تھے۔ اس نے اپنا یہ ذخیرہ میرے سامنے چاندنی پر بکھا دیا۔ اور کہا جونسی تصویر چاہو لے سکتے ہو۔

ہم نے چیدہ چیدہ تصویروں کو فریم کروانا شروع کیا۔ فریم کے لئے ان دنوں بائنڈنگ پیپر ابھی نیا نیا چلا تھا۔ فلمی قسم کی فوٹوگرافی کی طرح اسے بھی عاشق علی نے امرتسر میں رواج دیا۔ ہمارا شوق اس کا جیتا جاگتا اشتہار تھا۔ ہالی وڈ کی پنڈلیاں اس پہ کوڈک کی گوٹ۔ نتیجہ آپ خود تصور کر لیجئے۔ لیکن یہ عشق ہمیں بہت مہنگا پڑ رہا تھا۔ چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ آئندہ خود بائنڈنگ کریں گے۔ مگر گوٹ اب بھی مہنگی تھی۔ منٹو کو سوجھی کہ پیسٹل پیپر (PASTEL PAPER) آزمانا چاہیئے۔ تجربہ کامیاب رہا۔

سعادت کے والد کا ان دنوں انتقال ہو چکا تھا۔ میں نے انہیں نہیں دیکھا تھا۔ ان کی ایک بڑی سی تصویر بھگت سنگھ، مارلین ڈیٹرچ اور جون کرافورڈ کے سامنے کی دیوار پہ آویزاں تھی۔ بند کالر کا کوٹ۔ سر پہ کشمیری وضع کی پگڑی۔ خشخشی داڑھی۔ بڑی بڑی خشمگیں آنکھیں۔ یوں لگتا جیسے ہمارے مشاغل کو انتہائی ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ شاید ان کی غضب آلود نگاہوں کی زد سے بچنے کے لئے ہی سعادت بھاگ کر ایک بار بمبئی چلا گیا تھا۔ ان دنوں وہ میٹرک میں فیل ہو رہا تھا۔ کہا کرتا: "میاں جی اللہ بخشے بڑے سخت گیر آدمی تھے۔" سعادت کی بہن بتا رہی تھیں "جان خطا ہوتی تھی اس کی میاں جی کے ڈر سے۔ پتنگ اُڑا رہا تھا ایک روز کوٹھے پہ۔ میاں جی آ گئے اتنے میں ـــــ چھت سے کود پڑا یہ برابر کے کوٹھے پہ۔ چوٹ آئی۔ لیکن کیا مجال ہے جو سی تک کی ہو۔" وہ سیڑھیوں اور سہاروں کا کبھی قائل نہیں تھا۔ رحم کی التجا کرنے والوں سے اسے نفرت تھی۔ وہ زندگی بھر پتنگ اُڑاتا رہا۔ اور اسی طرح کودتا رہا۔ ایسے میں کئی بار وہ لوگوں کے سروں پہ بھی آن گرا۔ لوگ بھنائے جھلائے، گالیاں دیں۔ قانون کو مدد کے لئے پکارا۔ لیکن منٹو نے کہا مجھے بھی پتنگ اُڑانے کا حق ہے۔ آسمان کی وسعتوں پہ کسی کا اجارہ نہیں۔ جو مجھے گرانے کی کوشش کرے گا میں اس کے سر پہ کود جاؤں گا جو میرے پتنگ پہ "کانٹی" پھینکے گا میں اس کی کھوپڑی پہ ٹٹی کی اینٹ ماروں گا۔

معاشرے کے اس کھیل کے دوران میں اس نے متعدد چوٹیں کھائیں۔ لیکن رحم کی درخواست کبھی اس کی زبان پر نہ آئی۔ وہ داد طلب تھا، فریاد کی لے سے اس کے لب ناآشنا تھے۔

اس کے والد منصف تھے۔ انہوں نے دو شادیاں کیں۔ سعادت کی والدہ ان کی دوسری بیوی تھی۔ منصف صاحب نے اپنی پہلی اہلیہ کی اولاد

کی تعلیم و تربیت پر اتنی توجہ کی کہ ان کی وفات کے بعد چھوٹی بیگم اور ان کی اولاد ـــــ سعادت اور اس کی چھوٹی بہن ناصرہ اقبال کیلئے کچھ باقی نہ بچا۔ تلخ یادوں کے سوا۔ منٹو کی تحریروں میں یہی کڑواہٹ مکمل ہوئی ہے۔ جیسے قند کی گولیوں میں یکایک کونین کا ٹکڑا آجائے۔ یہ تلخی کتنی دیرپا تھی اس کا اندازہ منٹو کی موت سے ہو سکتا ہے۔ معاشرہ آدمی کا دوسرا باپ ہوتا ہے۔ وہ بھی اس سے انصاف نہ کر سکا الٹے کے چھکے مار اسے عمر بھر کچہریوں میں گھسیٹے لئے پھرے کہ یہ عریاں نویس ہے۔ فحش نگار ہے۔ جنسی باتوں کے بارے میں لکھتا ہے۔ انھوں نے یہ کبھی نہ سوچا کہ مرد و زن کے تعلقات اگر ناپاک ہیں تو حضرت آدم سب سے پہلے ناپاک بنتے (نعوذ باللہ)۔ لیکن منٹو کے ہاں جنسی تلذذ تھا ہی کہاں اس نے قوام کی گولیاں کبھی نہیں بیچیں۔ اس کی دکان میں کونین تو ضرور تھی کیپسول نہیں تھی۔ اس کا منہ کڑوا تھا۔ کڑواہٹ کے احساس کو کند کرنے کیلئے اس نے اور کڑواہٹ اپنے اندر انڈیلی۔ بوتل کو منہ لگا لیا ـــ

جاں لب پہ آئی تو بھی نہ شیریں ہوا دہن
از بسکہ تلخیٔ غم ہجراں چشیدہ ہوں

دو سال سے وہ بے تحاشا پی رہا تھا۔ وہ ہر وقت مدہوش رہتا تھا۔ شراب سے اس کا جگر چھلنی ہو چکا تھا۔ ۵۳ء کے اواخر میں وہ مرتے مرتے بچا۔ ڈاکٹروں نے اسے معجزہ سمجھا۔ اور کہا سال یا دو سال اور ـــــ اگر اب بھی نہ چھوڑی تو ..."۔ لیکن اس نے پھر بوتل کو منہ لگا لیا۔ گلاس کی بھی ضرورت محسوس نہ کی۔ اس کی تھکی ہوئی روح کو سعادت سے منٹو تک کا فاصلہ بھی بہت نظر آیا۔ اپنے اور ابدیت کے درمیان وہ جسم کا پردہ بھی برداشت نہ کر سکی۔ رہگذر زیست کا تھکا ہوا راہی جس پر معاشرے نے قدم قدم پر سنگباری کی تھی جلد از جلد اس منزل پر پہنچنا چاہتا تھا۔ جہاں بدذوق لذت سنگ کے نام سے نہیں جلایا جاتا۔ جہاں چوٹیں نہیں ہوتیں۔ پتھروں کے سوداگر نہیں ہوتے۔ ۱۸ جنوری ۵۵ء کی صبح کو اس کی طبیعت یکایک بگڑ گئی۔ لیکن وہ ہسپتال تک بھی نہ پہنچ سکا۔ اسے خون کی تے آئی۔ ایمبولنس کار راستے سے ہی واپس لے آئی۔ وہ اپنی منزل پر پہنچ چکا تھا۔ وہ صلیب کے سنے میں جیا اور صلیب کے سائے میں جان دے دی۔

مئی ۵۳ء میں کراچی سے پشاور آتے وقت جب میں اس سے ملنے گیا تو لحظہ بھر کے لئے مجھے بھی نہ پہچان سکا۔ مجھے دیکھ کر وہ چونک پڑا۔ اس کی آنکھوں سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ وہاں نہیں ہے۔ میں ٹھٹھک گیا۔ اتنے میں اس کی بہن نے کہا "سعادت! سعید آیا ہے"۔ اس کا چہرہ چمک اٹھا۔ اور آنکھیں جو کہیں خلاؤں میں دیکھ رہی تھیں یکایک میرے چہرے پر اتر آئیں ـــ "آآآ ـــ خواجہ..." ... "میری" نظریں گلاس پر گڑ گئیں۔ وہ سمجھ گیا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ لیکن اس نے مجھے بولنے کا موقع نہ دیا۔ "ٹھیک ہے یار سب ٹھیک ہے۔ مگر اس حد تک!" اس کی بیٹی بیٹی گلابی آنکھیں گلہ کر رہی تھیں کہ "تو بھی ناصح بن گیا! اسی کمبخت سے بھاگ کر تو میں نے یہاں پناہ لی ہے۔ تجھ سے مجھے بہتر سلوک کی توقع تھی"۔

اس کی بڑی بڑی بے چین آنکھوں میں بلا کا حسن تھا۔ ایک زمانے میں اسے پنجاب کی دیہاتی بولیاں جمع کرنے کا شوق ہوا تھا۔ جنھیں وہ اپنے جاننے والوں کے سامنے اکثر دہرایا کرتا۔ ان کے مقابلے میں باقی سب شاعری فراڈ تھی۔ آنکھوں کی تعریف میں یہ شعر اس نے کس کس کو نہیں سنایا ہوگا ـــ

گدرا رنگ تے شربتی اکھیاں   کھنڈ وچ قید کیتیاں

اس کی اپنی آنکھوں میں بھی یہی شربتی کیفیت تھی۔ سگریٹ کے دھوئیں کے پیچھے وہ دھند میں لپٹی ہوئی جھیلیں دکھائی دیتیں جن کی تہ میں نہ جانے کتنی حسرتوں کے سفینے دفن تھے۔ وہ عمر بھر اس محبت اور ہمدردی کی جستجو کرتی رہیں جس سے وہ بچپن میں محروم ہو گیا تھا۔ اس کے دوستوں کا خلوص اور مداحوں کی قدر دانی بھی اس کی تلافی نہ کر سکے۔

بھگت سنگھ کے بُت کے سامنے آویزاں تصویر کی آنکھیں پھر پھری چشمِ تصور میں اُبھرتی ہیں۔ اُن خشمگیں نگاہوں کے سامنے میں پھر پڑھی مردمیت کا پتہ چلتا ہے۔ مگر موضوع گفتگو بدل چکا ہے۔ فلمی ستاروں کی بجائے ادب وانقلاب زیرِ بحث ہیں۔ گہرے سانولے رنگ ایک بھاری آدمی کا آرلائیل اور گبن کے انداز تحریر میں گفتگو کر رہا ہے۔ تین نوجوانوں کے تمتماتے ہوئے چہرے اُن کی تاثیرِ سخن کے شاہد ہیں۔ ے کی فضا ایکٹروں کے قصیدوں کی بجائے والٹیر، روسو، والٹیئر، مارکس، بیبن، ٹراٹسکی، سٹالن اور گورکی کے تذکروں سے رنج رہی ہے۔ اس بزرگ کا نام باری (علیگ) ہے ـــ اس کے مریدوں کے نام سعادت حسن منٹو، حسن عباس اور ابو سعید قریشی۔

باری صاحب سے مجھے اپنی پہلی ملاقات یاد نہیں۔ یہی احساس ہوتا ہے جیسے میں انھیں ہمیشہ سے جانتا تھا۔ بہرحال یہ منٹو سے ملاقات ے بعد کی بات ہے۔ ان سے ہمارا تعارف علم وادب اور حب الوطنی سے تعارف تھا۔ فلمی رسالوں کی جگہ اب ہم کتابیں خریدنے ۔ ڈِٹ قصیدوں کی کہانیوں پر بحث کرنے کے بجائے انگریزوں کو ملک سے نکالنے کے پلاٹ سوچتے۔ دہشت پسندی کی داستانوں میں ہمیں ـف آتا۔ مستبد حکمرانوں کا تختہ اُلٹنے والوں کے آئینوں میں ذہن اپنا عکس نظر آنے لگا۔ ہم نے اپنی چشمِ تصور میں امرتسر کے گلی کوچوں بارہا مورچہ بندی کی اور انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے انگریزوں پر ٹوٹ پڑے۔ انھیں بردوبار انگلستان تک دھکیلنے ـوئے۔ یاجوج ماجوج کی طرح قید کر دیا۔ تاکہ پھر دنیا کو تاخت وتاراج نہ کر سکیں۔ اور عظمتِ افرنگ کے لازوال آفتاب کو ٹوٹے ـنے پیسے کی طرح گردش سے نکال پھینکا۔ انقلاباتِ روس وفرانس کی داستانیں بچوں کی کہانیاں بن گئیں۔ منٹو اُس زمانہ کے بارے ـں لکھتا ہے:۔

"اب سوچا جائے تو اس زمانے کی یہ سب حرکتیں چھوٹے چھوٹے کھلونے معلوم ہوتی ہیں لیکن اس وقت یہ کھلونے ہی عظیم الجثہ اور قوی ہیکل تھے۔ ان سے پنجہ لڑانا گویا کسی دیو سے زور آزمائی کرنا تھا۔ ہمارے خلیفہ صاحب یعنی باری صاحب اگر بزدل نہ ہوتے تو یقیناً ہم چاروں اس زمانے میں ان کھلونوں سے اپنا جی بہلانے کے جرم میں پھانسی پا گئے ہوتے۔ اور امرتسر کی خونیں تاریخ میں ایسے شہیدوں کے نام کا اضافہ ہو گیا ہوتا۔ جو اب خلوصِ دل سے کہہ سکتے ہیں کہ ان کو اس وقت اپنے اس جوش کے رخ کا بھی صحیح علم نہ تھا۔

باری صاحب بزدل تھے۔ خدا کی قسم بہت بزدل تھے۔ زیادہ کھا لیتے تو دستوں رہتے تھے کہ تو ہم نہ نکل آئے۔ حالانکہ فاقوں کے زمانے میں بھی ان کے جسم کا یہ حصہ بڑھتا رہا۔ زیادہ تیز نہیں بھاگتے تھے۔ کہ ان کے دل پر اس کا اثر پڑے گا۔ حالانکہ ان کے جسم کے اسی رئیس عضو نے ان کا ساتھ چھوڑا۔ بڑی بڑی سرخ کتابوں کے نیلے نقشے تیار کرتے تھے۔ اور پتاخے کی آواز سن کر زرد ہو جاتے تھے ـــــ اشتراکی ادیب باری تمام عمر اپنی زندگی کی جلی اور خفی سرخیاں جماتا رہا۔ لیکن وہ ان کے نیچے وہ مضمون نہ لکھ سکا۔ جو اس کے ذہنی رحم میں پرورش پاتے تھے۔"

(باری صاحب از منٹو۔ مجموعہ گنجے فرشتے)

اگر ہمارا مرشد بزدل نہ ہوتا تو دارالاحمر کے آتشدان پر ...... غلط بیانات کی بجائے ہیں چار ایسے نیچے آویزاں رہتے جن کے جسے ڈانٹن، روبس پیری، میزنی، لینن اور ٹراٹسکی کی گیندوں پر کھڑے ہوتے۔

لیکن بغاوت کی وہ چنگاری جو سعادت کے سینے میں سلگ رہی تھی، دبی نہ رہ سکی۔ باپ کی بے رخی، بھائیوں کی بے اعتنائی اور عزیزوں

ستم ظریفی ہے جو شعلہ بھڑکا تھا، زمانے کے حوادث نے اسے ہوا دی۔ اور وہ معاشرے کے دیکھ کر شہتیروں کو چاٹنے لگا۔ اس کے قلم کی روشنائی لاوا بن کر بہہ نکلی۔ جن لوگوں کے گھر اس کے راستے میں آئے وہ چیخ اٹھے۔ انھوں نے قانون کو مدد کے لئے پکارا۔ مذہب اور اخلاق کے قائد برگزیدہ کو حرکت میں لائے۔ لیکن لاوا نہ رکا۔ آگ نہ بجھی۔ حتیٰ کہ اس کی حدت میں اس کی اپنی زندگی کے سوتے بھی سوکھ گئے ——— وہ آتش فشاں پہاڑ اب خاموش پڑا ہے۔ اس کی آگ سے ڈرنے والے اب اس کے دامن میں پھول لگا رہے ہیں۔ لاوے کی مٹی بہت زرخیز ہوتی ہے۔

منٹو پر بہت کچھ لکھا جا رہا ہے۔ بہت کچھ لکھا جائے گا۔ آج ہر کوئی اس کا شناسا ہے۔ ہر ایک کو اس کی دو ایک باتیں ضرور یاد ہیں۔ ہر کوئی اس سے اپنی پہلی ملاقات کا حال لکھ رہا ہے۔ اس کی شخصیت اور فن کو نفسیاتی اور جمالیاتی کسوٹیوں پر پرکھا جا رہا ہے۔ ایک صاحب نے اس کی خود پسندی پر دو صفحے سیاہ کر دیئے ہیں۔ ایک نے اس کا موازنہ موپساں سے کیا ہے۔ ایک اور بزرگ نے اسے سمرسٹ کا بیٹا قرار دیا ہے۔ ان تعزیتی تحریروں میں ضبط ہوشیارپوری کے ہاں مجھے بہت خلوص نظر آیا ہے۔ لکھتا ہے :-

"منٹو کی زندگی، موت اور اس کے فن کے بہترین ترجمان، اس کے محبوب شاعر غالب کے یہ اشعار ہیں :-

جز در آئینہ ندیدیم اثر سعیٔ خیال ہر قدر بہر طلبگاریٔ انساں رفتیم
ساز ہنگامہ نہ اندر خور طاقت کردم راہ مستی نہ بہ اندازۂ ساماں رفتم
تا سبک روی من رنج گرانی نکشد شب وصل شدہ در زود بپایاں رفتم
نگہم نقد بہ گنجینۂ دلہا می زد مژدہ باد اہل ریا را کہ زمیداں رفتم

عقیدت سے آگے چل کر لکھا ہے :-

"اس نے اپنی تاریخ وفات کی فرمائش کی تھی۔ آج میں اس فرض سے سبکدوش ہو رہا ہوں :

چوں سعادت ز جہاں رفت ہمی گفت خرد تشنۂ از خمکدۂ عالم امکاں رفتم
خواند ایں مصرع تاریخ ز غالب با آہ مژدہ باد اہل ریا را کہ زمیداں رفتم"

۶ — ۱۲۶۸ + ۶ = ۱۳۷۴ھ

اپنی نوک قلم سے وہ عمر بھر ریاکاری کے پیرہن تار تار کرتا رہا۔ ان میں ایک پیرہن مذہب کا بھی تھا۔ ہمارے ملک میں ماسپورٹین کے بھی باپ بستے ہیں۔ جلالت مآب بزرگ، جن کی شرعی داڑھیوں، نورانی چہروں، مقدس دستاروں، بے داغ عباؤں اور ودر رس نگاہوں کو دیکھ کر شیطان بھی بہروپ بھرنا بھول جائے۔ خوش عقیدہ عوام ان کے دام فریب میں اس بری طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ ہل نہیں سکتے۔ یہ دلوں کی مرادیں پوری کرتے ہیں۔ راکھ کو سونا بناتے ہیں۔ ان کی خاک پالا علاج مریضوں کا علاج ہے۔ ان کے امپلائمنٹ ایکسچینج بے روزگاروں کو روزی دلواتے ہیں۔ ان کی دکانوں پر حب کے تعویذ فروخت ہوتے ہیں جن سے سنگدل محبوب رام ہوں۔ ان کے کاٹے علم سے دشمن زیر ہوں۔ اور مقدمے جیتے جائیں۔ یہ بانجھ کو بچے دیں اور کنواریوں کے آسیب اتاریں ——— منٹو کا "صاحب کرامات" (مجموعہ: یزید) کے تذکرے بھی ایک ایسا ہی بزرگ ہے جو ایک سادہ لوح کسان کو، جو جلد بازی میں اپنی بیوی پھاتاں کو طلاق دے چکا ہے۔ لیکن اب اسے دوبارہ بسانا چاہتا ہے۔ صاحب کرامات اسے چل دے کر پہلے اس کی کنواری بیٹی جیناں اور پھر اس کی بیوی پھاتاں (لڑکی کی ماں) کو نشانہ بناکر

بیٹے جلال کی آگ بھڑکتا ہے۔ اس کے کندھے پر زرد رومال ہے (جو حاجی لوگ تحفتہً لاتے ہیں) اس کی لال لال آنکھوں میں سرمے کی تحریر ہے۔ ملتزم ریشمی بندگی۔ لمبے لمبے پٹے۔ ان کے اور داڑھی کے بال کھچڑی ...... ہاتھ میں چاندی کی مٹھ والا لاٹھا ...... مولوی صاحب نے جیناں کو اپنے پاس بٹھا کر اسکی پیشانی چوم لی۔ اس نے اٹھنا چاہا۔ مگر ان کی گرفت مضبوط تھی۔ مولوی صاحب نے اُسے اپنے گلے سے لگا لیا۔ اور چودھری سے کہا۔ چودھری تیری بیٹی کا نصیبا جاگ اُٹھا۔" لیکن اس روز جیناں کا نصیبا سو گیا۔ بی بی پہ تاں (وہ مطلقہ ہے اور مولوی صاحب فرماتے ہیں جب کوئی آدمی اپنی بیوی کو طلاق دے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے — اور پھر اس کو اپنے گھر بسانا چاہے تو اس کی سزا ہے کہ پہلے وہ عورت کسی اور مرد سے شادی کرے۔ اس سے طلاق لے۔ پھر جائز ہے — ہم نے خدا کے حضور گڑگڑا کر دعا مانگی کہ ایسی کوئی سزا نہ دی جائے ... تو حکم ہوا چودھری کو اپنی بیوی سے محبت ہے۔ ارشاد ہوا از خدا کی طرف سے جو مولوی صاحب سے ہم کلام ہے) تو ہم اس کی محبت کا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ ایک دن کے لئے تو اس سے نکاح کرے۔ دوسرے دن طلاق دے کر چودھری کے حوالے کر دے ...... مولوی صاحب نے کنڈی بند کر دی۔ اور جیناں سے کہا۔ تم آج کی رات میری بیوی ہو ......" صبح جاتے وقت مولوی صاحب اپنی داڑھی اور پٹے بستر پر تکئے کے نیچے چھوڑ گئے ——— منٹو کا یہ خاص پینترا ہے، مذہب کی آڑ لیکر ہمارے یہاں اکثر ایسے جرائم کئے جاتے ہیں۔ مہذب اخبار ایسی خبروں کو گول کر جاتے ہیں۔ لیکن افسانہ نگار کی آنکھیں تہذیب کی سطح کو نہیں اسکی تہہ کو دیکھتی ہیں۔ وہ چیزوں کی ظاہری چمک دمک سے متأثر نہیں ہوتا۔ کیمیاگر دھات کی ماہیت اور اس کے عناصر ترکیبی کی جانچ پڑتال کرتا ہے۔ ملمع سے مرعوب نہیں ہوتا۔ اس کی بھٹی میں کھوٹ نہیں ٹھہر سکتا۔ وہ اسے کٹھالی سے نکال کر دوکاندار کے منہ پر دے مارتا ہے۔ کہ یہ لو اپنا سونا۔ اپنی تہذیب۔ منٹو اپنی تحریروں میں اپنے خاص ڈرامائی انداز سے جگہ جگہ معاشرے کی جعلی داڑھیاں نوچتا نظر آتا ہے۔ کہ یہ لو اپنا میک اپ!۔ اس میک اپ کے پردے سے کبھی "صاحبِ کرامات" اپنی تمام تر عریانی سمیت نمودار ہوتے ہیں اور کبھی وہ شیاطین جو سوروں کو ورغلا کر لاتے ہیں۔ اور انھیں چوک میں چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ واپس جانا چاہتے ہیں۔ لیکن وہاں رضوان کھڑا ہے۔ جنت کے دروازے ان پر بند ہو چکے ہیں۔ چودہ سو سال کی بت شکنی کے بعد بھی لات و منات دنیا میں موجود ہیں۔ اقبال نے کہا تھا ؎

جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا!

منٹو کا فن اسی فلسفۂ حیات کا ترجمان تھا۔ اقبال نے شکایت کی تھی ؎

کارگہِ حیات میں کیا کوئی غزنوی نہیں
کب سے ہیں منتظر کھڑے دیر و حرم کے سومنات

منٹو اسی سوال کا جواب تھا۔ یوم اقبال پر منٹو نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا تھا۔

" اقبال نے خدا سے دعا مانگی تھی — مرا نور بصیرت عام کر دے ——— یہ دعا جو ایک دردمند دل سے نکلی تھی ضرور قبول ہوگی۔

" منٹو اس وقت بھول گیا تھا کہ یہ دعا قبول ہو چکی تھی۔

لیکن محمود و ایاز کو الگ الگ تصور نہیں کیا جا سکتا۔ کلیم کے ساتھ آذر کا نام بھی ضرور آئے گا۔ بت شکن منٹو نے اپنے خاک و خون سے اپنے نحیف و ناتواں جسم کی خاکستر کو آنسوؤں میں گوندھ کر بہت سے بت بنائے اور انھیں اولادِ آدم کے سامنے خالی شہ نشینوں اور طاقچوں میں چن دیا۔

بابو گوپی ناتھ اور ممی کی مورتیوں میں مجھے آدم و حوا کا عکس نظر آتا ہے۔ ان کا گناہ آدم و حوا کا گناہ ہے۔ لیکن ان کی روحیں آلودگی سے پاک ہیں۔ منٹو ہمیں یاد دلاتا ہے۔ کہ ان کا خمیر کس مٹی سے اٹھایا گیا تھا۔ منٹو کے مذہب میں انسان اپنے بارِ عصیاں کے باوجود انسان ہے۔

معبود و مالک! ان بتوں کا خالق - ان کے آستانے پر اپنا سر جھکانے کو کفر نہیں گردانتا ۔ غالباً یہی وہ رنگ ہے جسے اقبال نے

" آدم خاکی نہاد بندۂ مولیٰ صفات "

کا نام دیا تھا ۔ اس سے مجھے " میلادِ آدم " کی یاد آتی ہے ۔ منٹو نے اپنے کتبہ میں لکھا ہے " یہاں سعادت حسن منٹو دفن ہے ...... وہ اب بھی منوں مٹی کے نیچے سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ نگار ہے یا خدا ؟ ...... کیا ہم اسے اتنے بھی غلو کی اجازت نہیں دے سکتے ؟ - وہ کشمیری تھا - جرم و عصیاں کے آتشکدوں سے وہ ان قدیم عورتوں کی طرح جو ریل کی پٹریوں سے ایندھن اکٹھا کرتی ہیں - یاس و حرماں کی راکھ میں لپٹی ہوئی محبت کی چنگاریاں چن چن کر اپنی کانگڑی " بھرتا رہا تاکہ رسوم و قیود کے پالے کی ماری ہوئی دنیا اپنا سینہ گرم کر سکیں - سراج کی سرد مہری - بسم اللہ کی اداس آنکھوں اور شاردا کے سگریٹ کے ڈبے میں اسی آگ کی چنگاریاں پوشیدہ ہیں - سڑک کے کنارے کے جملے جن پر بن بلائے مہمان کی خاطر داریاں چھپی ہیں - ایسی ان دیکھی آگ سے گرم ہیں ۔ وہ لپٹے ہوئے ہوئے پیٹ میں یہی کانگڑی چھپائے ہوئے ہے ...... وہ خود بھی اسی پالے کا شکار تھا ۔ اس نے بھی پرومیتھیس PROMETHEUS کی طرح دیوتاؤں کے آستانے کی آگ چرالی - اس جرم کی پاداش میں اسے چٹان سے باندھ دیا گیا - اور محاسبہ کے گدھ اس کا جگر نوچنے لگے - آگہی سب سے بڑا گناہ ہے ـــــ منٹو کا آتشدان اسی آگ سے روشن ہے - لیکن اس کے اوپر بھگت سنگھ کا بت کیا کر رہا ہے ؟ ـــ تخریب و تخلیق کہ شاید ساتھ ساتھ چلتے ہیں ۔

منٹو کی تخلیقی کاوشوں کی ابتدا ترجموں سے ہوئی - پہلا ترجمہ (جہاں تک مجھے یاد ہے) ایک پُراسرار طویل افسانہ ' دستِ بریدہ بھوت ' تھا - اپنی قسم کا یہ پہلا اور آخری ترجمہ اور تجربہ تھا ۔ باری صاحب تاریخ و معاشیات کے طالب علم تھے ۔ انھیں افسانوی ادب سے کچھ ایسا شغف نہیں تھا ۔ مگر ایسا بھی نہیں کہ وہ اپنے مریدوں کو اچھے برے کی پہچان نہ بتا سکتے ۔ ذوقِ سلیم نے مدد کی اور دارالاحمر میں وکٹر ہیوگو ، لارڈ لٹن ، گورکی ، چیخوف ، پوشکن ، سلوگب ، گوگول ، دوستو وسکی ، اندریف ، آوسکر وائیلڈ ، اور موپاساں کی کتابیں نظر آنے لگیں ۔ وکٹر ہیوگو ، باری صاحب کے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا ناولسٹ تھا ۔ ہم نے اس کی تصانیف دور دور سے منگوائیں اور انھیں درسی کتابوں کی طرح پڑھا ۔ باری صاحب چاہتے تھے کہ اس کی LES MISRABLE کا ترجمہ کیا جائے لیکن اس کی ضخامت دیکھ کر ہمت نہ ہوئی ۔ منٹو نے البتہ سرگذشتِ اسیر کے عنوان سے LAST DAYS OF A CONDEMNED کا ترجمہ کر دیا ۔ یہ کتاب سزائے موت کے خلاف پرجوش احتجاج ہے ۔ مصنف صاحب کا چھوٹا بیٹا ہر ناانصافی کے خلاف احتجاج کرتا ہے ۔ آسکر وائیلڈ کی " ویرا " کا ترجمہ بھی اسی دور کی یادگار ہے ۔ منٹو نے باری صاحب کے بارے میں اپنے مضمون میں اس کتاب کی اشاعت کا مفصل ذکر کیا ہے ـــ " یہ ڈرامہ روس کے دہشت پسندوں اور نراجیوں کی سرگرمیوں سے متعلق تھا - جن کے پاس قسم قسم کے ہتھیار موجود تھے ۔ امرتسر میں ان دنوں اگر کوئی ہوائی بندوق سے بھی مسلح ہونا چاہتا تو ترپ دم کر دیا جاتا " چنانچہ جب اس کے اشتہار شہر کی دیواروں پر نظر آئے اور لوگوں کو " مستبد حکمرانوں کے عبرتناک انجام - روس کے گلی کوچوں میں صدائے انتقام کی خبر دی گئی " اور " زاریت کے تابوت میں آخری کیل " گاڑا گیا تو کوچہ وکیلاں میں بھگت سنگھ اور دت کے ان چیلوں کے بارے میں پوچھ گچھ شروع ہوئی - جو امرتسر کے گلی کوچوں میں ماسکو کا ناٹک کھیلنا چاہتے تھے ۔ اور ہندوستان میں انگریز کی شہنشاہیت کے خاتمے کے خواب دیکھ رہے تھے ۔ لیکن خواجہ عبدالمجید صاحب ریٹائرڈ ڈی - ایس - پی - نے پولیس کے سفید پوشوں کو یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ یہ تو اپنے بچے ہیں میاں ۔ جاؤ اپنا کام کرو - اور بلا ٹل گئی ۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر پولیس نے بچوں کے اس کھیل کا اپنی روایتی تندہی سے تعاقب کیا ہوتا تو منٹو میں بھگت سنگھ بننے کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں - اس کا افسانہ " تماشا " (مجموعہ : منٹو کے افسانے) انہی صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے ۔

اسی میں ۱۹۱۹ء کے مارشل لا کے ہنگامے کو ایک بچے کی نظروں سے دیکھا گیا ہے اس کا ہیرو خود منٹو ہے۔ اس وقت وہ کوئی سات برس کا تھا۔ قارئین کی بے اعتنائی نے اس بچے کو بڑا ہونے سے روک دیا۔ عزیزوں کی بے اعتنائی کیا کم تھی کہ وہ ادھر کا رخ کرتا۔ اس کے علاوہ اسے بچپن ہی سے ماسٹروں سے نفرت تھی۔ لیڈروں کی خود غرضی سے یہ نفرت اور بڑھ گئی۔ وہ خلوص کا بھوکا تھا۔ لیکن ان لوگوں میں خلوص کہاں تھا۔ وہ چیخ اٹھا: "ہندوستان کو لیڈروں سے بچاؤ"

"ہندوستان کو ان لیڈروں سے بچاؤ جو ملک کی فضا بگاڑ رہے ہیں یہ نام نہاد لیڈر اپنی اپنی بغل میں ایک ایک صندوقچی دبائے پھرتے ہیں جس میں یہ لوگوں کی جیبیں کتر کتر کر روپیہ جمع کرتے ہیں ...... ان کے ہر سانس میں آپ ریا کاری اور دغا بازی کا تعفن محسوس کرتے ہیں لمبے لمبے جلوس نکال کر منوں بھاری ہاروں کے نیچے دب کر۔ چوراہوں پر طویل طویل تقریروں کے کھوکھلے الفاظ بکھیر کر یہ نام نہاد رہنما اپنے لیے راستہ بناتے ہیں۔ جو عیش و عشرت کی طرف جاتا ہے ..... یہ لوگ چندے اکٹھے کرتے ہیں۔ مگر کیا انھوں نے آج تک بے کاری کا حل پیش کیا ہے ......
یہ لوگ جن کی روح لنگڑی، دماغ اپاہج، زبان مفلوج اور ہاتھ تدبیر شل ہیں۔ ملک و قت کی رہبری کیسے کر سکتے ہیں ...... ہندوستان کو بے شمار لیڈروں کی ضرورت نہیں صرف ایک لیڈر کی ضرورت ہے جو حضرت عمرؓ کا سا اخلاق رکھتا ہو۔ جس کے سینہ میں اتاترک کا سپاہیانہ جذبہ ہو ......"

(منٹو کے مضامین مطبوعہ ۱۹۴۲ء)

یہ مضمون جیسا کہ اس کی تاریخ اشاعت سے ظاہر ہے۔ آزادی سے بہت پہلے لکھا گیا اور منٹو کی زندگی میں بمبئی کے پہلے دور کی پیداوار ہے۔ دارالامر کے زمانے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اسے پڑھنے کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی کہ سیاست اور لیڈروں کی دنیا کے بارے میں اس کا کیا ردِ عمل تھا اسی مجموعہ میں آگے چل کر اس نے اپنا خیال اور واضح کر دیا ہے۔

"سیاست سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیڈروں اور دوا فروشوں کو میں ایک ہی زمرے میں شمار کرتا ہوں۔ لیڈری اور دوا فروشی دونوں پیشے ہیں۔ خیر کہنا یہ ہے کہ سیاسیات سے مجھے اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی گاندھی جی کو سنیما سے۔ گاندھی جی سنیما نہیں دیکھتے میں اخبار نہیں پڑھتا۔ اصل میں ہم دونوں غلطی کرتے ہیں۔ گاندھی جی کو فلم ضرور دیکھنے چاہئیں اور مجھے اخبار ضرور پڑھنے چاہئیں"

(باتیں، منٹو کے مضامین)

بادی النظر میں یہ چند سطور "شوخیِ تحریر" ہیں اور بس۔ درحقیقت گاندھی جی اور فلموں کا تعد لیڈروں میں ذہنی توازن اور SENSE OF HUMOR کے فقدان کے 'نشان' ہیں۔ گاندھی جی اور فلم محض علامتیں۔ سعادت نے اپنے خاص منٹوی انداز میں ایک حقیقت سے بری حقیقت کو بے نقاب کرنے کا کام لیا ہے۔ تضاد کو ابھارنا طنز کی خاص ٹیکنیک ہے منٹو اس کا ماہر تھا۔

"وہی بمبئی تھا۔ جہاں کانگرس نے امتناعِ شراب کا قانون پاس کر کے ان ہزارہا مزدوروں کو بیکار کر دیا تھا جو تاڑی نکالتے تھے وہی عروس البلاد تھی۔ جس کے گھونگھٹ کا ایک حصہ حریری ہے اور دوسرا کھردرے ٹاٹ کا ــــ وہی بمبئی جہاں اونچی اونچی خوبصورت عمارتوں کے قدموں میں فٹ پاتھوں پر ہزارہا مخلوق رات کو سوتی ہے۔"

"مسلم لیگ مسجد ہے۔ کانگرس مندر ہے۔ کانگرس مندر بچانا چاہتی ہے۔ مسلم لیگ بھی۔ لیکن
دونوں مل کر کام نہیں کرسکتے ...... ان کے خون کا ملاپ مندروں اور مسجدوں میں ہوگا۔" (باقی)

ایسے میں سیاسیات سے اس کی دلچسپی قدرتی بات تھی ـــــ لیکن میں امرتسر سے بمبئی پہنچ گیا ـــ جلیانوالہ باغ کے شہر میں منٹو کا مشغلہ اپنے اختتام کے بعد ہی ٹوٹ گیا۔ اس کی بہن سیفری، بڑے پتلے ڈائریکٹر کے گھر میں منتقل ہوگئے اور بعد میں کباڑیے کے بھاؤ لاہور کے ایک کتب فروش نے خرید لیے۔ دنگلوں، مویشیوں کے میلوں، منشیات کے ٹھیکوں، عصمت فروشی اور اس طرح کے دوسرے کھیل تماشوں کی طرح کتاب چھاپنا بھی ایک تماشہ تھا۔ اور یہ کتاب (ویرا) زیر بحث کا ناٹک تھا۔ جس کے لئے لائسنس ضروری تھا لیکن لائسنس نہ ملا۔ اور پروڈیوسر بھاگ گیا۔ باری صاحب غائب تھے۔ انھیں اس ناٹک کا انجام بھی یاد نہیں رہا تھا وہ بھول گئے تھے کہ PICTURE OF DORIAN GRAY کا مصنف دہشت پسندی سے اتنا ہی دور تھا۔ جتنے گاندھی جی بیلنا سے۔ ناٹک کے اختتام پر ویرا، آسکر وائلڈ کی ہیروئن وہی خنجر جسے وہ زار روس کے سینے میں گھونپنے کے لئے لائی تھی، اپنے سینے میں گھونپ لیتی ہے ـــ اسے زار روس سے عشق تھا۔ محبت فتح یاب ہوئی۔ فرض منہ دیکھتا رہ گیا۔

لیکن تماشہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ "بچوں کا کھیل" ابھی جاری ہے ـــ پندرہ دن غائب رہنے کے بعد "ویرا کے" پروڈیوسر" باری صاحب پھر آموجود ہوئے۔ اب کے ایک ہفتہ وار اخبار کے ایڈیٹر پبلشر کے "میک اپ" میں۔ اخبار کا نام خلق تھا۔ ہمیں حکم ہوا کہ فوراً کام شروع کیا جائے۔ تاکہ اخبار کی اشاعت میں مزید تاخیر نہ ہو۔ منٹو کا افسانہ "تماشہ" خلق کے پہلے شمارے میں شامل تھا۔ میں نے بھی اپنی دانست میں ایک بڑا انقلابی مضمون لکھا۔ "مزدور"۔ جس میں جذباتیت کی خام کاری بدرجہ اتم موجود تھی۔ اور سرمایہ دار کو خوب موٹے موٹے "مفرس و معرب" الفاظ میں کوسا گیا تھا۔ یہ مضمون "آدم" کے فرضی نام سے شائع ہوا۔ منٹو نے بھی مارے ڈر کے اپنے افسانے کے مصنف کا اعلان نہ کیا۔ باری صاحب نے ہیگل اور مارکس کے بارے میں اپنے خاص خطیبانہ انداز میں کچھ لکھا۔ جسے شاید میں آج بھی نہ سمجھ سکوں۔ مگر وہ ہمارے پیرومرشد تھے۔ جن کے روحانی فیض نے ہمیں اپنے تمام ہم عمروں سے ممتاز و ممیز کر دیا تھا۔ اور نو اور کالج میں ہمارے پروفیسر بھی (جن میں فیض احمد فیض۔ اور صاحبزادہ محمود الظفر جیسے لوگ بھی شامل تھے) ہمیں ادب و احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ ایسے میں ہمارے استاد باری صاحب کوئی بے معنی اور بے مصرف بات کیونکر کہہ سکتا تھا۔ اس مضمون کا مطلب کسی کی سمجھ میں آیا ہو یا نہ ہو۔ اتنا ضرور ہوا کہ مارکس کے نام سے پولیس کے کان کھڑے ہوگئے۔ لیکن "خلق" اپنے پہلے ہی شمارے کے بعد مالی مشکلات میں مبتلا ہو چکا تھا۔ اور باری صاحب کا اخبار کی دنیا میں انقلاب بپا کرنے کا خواب بھی چکنا چور ہو گیا۔

باری صاحب بڑے بڑے منصوبے بناتے۔ اور انھیں چائے کی پیالی میں گھول کر پی جاتے۔ وہ عجیب عجیب خواب دیکھا کرتے۔ وہ کہا کرتے کہ جذبۂ انقلاب کو جلا دینے کے لئے قید ہونا ضروری ہے۔ لیکن سعادت کہا کرتا تھا "باری صاحب آپ بکواس کرتے ہیں۔ آپ وہاں دو دن زندہ نہیں رہ سکتے"۔ لیکن باری صاحب کا خواب عقیدہ کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ "تم دیکھنا۔ وہ دن دور نہیں جب تم مجھ سے جیل میں ملنے آیا کروگے" ـــ "جیل میں" وہ اپنی ڈائری لکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ہلکے گلابی ـــ (مجھے رنگ اچھی طرح یاد نہیں) رنگ کا نہایت ہی عمدہ کاغذ لے کر شہر کے بہترین جلد ساز سے کالے چمڑے کی ایک ڈائری بنوائی گئی۔ اس کے پہلے ورق پر آہنی سلاخوں والے دروازے کی ایک کٹنگ نہایت نفاست سے چپکائی گئی۔ اس تصویر کے اوپر کاتب سے "دریچۂ زنداں" کا عنوان نہایت ہی عمدہ خط میں لکھوایا گیا ـــ

اشتراکی ادیب باری بہت بڑا رومان پسند تھا!

اس کے چیلے اپنے گورو کی طرح مارکس اور اینگلز کا چلّہ نہ کھینچ سکے۔ مادہ پرستی کا یہ وظیفہ ان کی سبک اور نازک روحوں کے لئے بہت بوجھل تھا۔ ان کی انفرادیت، اجتماعیت سے سمجھوتہ نہیں کرسکتی تھی ـــ منٹو کی "انا" ہجوم کو خدا نہیں مان سکتی تھی۔ مگر "انا الحق" کی منزل ابھی دور تھی +

منٹو ماموں کی موت

حامد جلال

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ منٹو ماموں میانی صاحب کے قبرستان سے اُٹھ کر گھر چلے آئے تو میں ان سے کیا کہوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میں ان کی حیاتِ ثانی کے معجزے کو نظر انداز کر کے ان سے صرف اتنا کہوں گا ــــ "منٹو ماموں۔ آپ نے آج تک جتنی غیر ذمہ دارانہ حرکتیں کی ہیں ان میں سب سے زیادہ غیر ذمہ دارانہ حرکت آپ کی موت تھی۔"

بہاول پور میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کرکٹ کا دوسرا ٹسٹ میچ ہو رہا تھا اور میں ڈرنگ سٹیڈیم میں بیٹھا طالع یار خاں کو میچ کا چشم دید حال نشر کرنے میں مدد دے رہا تھا کہ لاہور سے میرے نام ایک ٹرنک کال آئی اور مجھے بتایا گیا کہ آج صبح سعادت حسن منٹو کا انتقال ہو گیا۔ میں فوراً غم سے بے قابو نہیں ہو گیا بلکہ مجھ میں شدید برافروختگی پیدا ہو گئی۔ مجھے منٹو ماموں پر انتہائی شدید غصہ آ رہا تھا کہ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ یہ سلوک کس طرح کر سکتے ہیں؟ لیکن میں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ اور جب میں بولا تو میری آواز سے غیر معمولی تشویش نمایاں تھی۔ میں نے پوچھا "کہاں انتقال ہوا؟" جواب ملا "گھر پر" اس جواب سے مجھے بڑا اطمینان ہوا۔ کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ اچانک گھر سے باہر کسی اور مقام پر موت سے ہم آغوش نہ ہو گئے ہوں۔ عین ممکن تھا کہ کسی تانگے پر، کسی ریستوران میں، کسی پبلشر کے دفتر میں بیٹھے بیٹھے یا کسی فلم سٹوڈیو میں انھیں اچانک موت آ گئی ہو۔ . . . . .

جب میں اپنی جگہ پر واپس گیا تو میچ کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرنے والے ساتھیوں نے اشاروں سے پوچھا کہ کیا بات تھی۔ میں نے ایک کاغذ پر یہ جملہ لکھ دیا "امپائر نے سعادت حسن منٹو کو آخر آؤٹ دے ہی دیا۔ آج صبح ان کا انتقال ہو گیا۔"

منٹو ماموں کو آؤٹ دینے کے لئے امپائر سے کئی بار اپیلیں کی جا چکی تھیں لیکن ہر بار اپیل مسترد کر دی گئی تھی۔ اب ان کی بے صبر اور ڈانواں ڈول اننگس ختم ہو گئی تھی۔ وہ کرکٹ کے کھلاڑی ہوتے تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ کبھی حنیف محمد کی طرح ہوشیار اور محتاط کھلاڑی نہیں بن سکتے تھے جیسے وہ لاہور کے تیسرے ٹسٹ میچ میں کھیلتے ہوئے دیکھنے کے بے حد مشتاق تھے۔ اس کا علم مجھے ان کی موت کے چوبیس گھنٹے بعد گھر پہنچ کر ہوا۔ درحقیقت ان کی زندگی کی آخری دو خواہشوں میں سے ایک خواہش یہ بھی تھی۔

اپنی موت سے ایک دن پہلے انھوں نے ایک ریستوران میں اپنے دوستوں سے کہا تھا "حالات بحال کو واپس آجانے کے بعد میں ٹیم کے ساتھ ٹسٹ میچ میں حنیف کا کھیل دیکھنے جاؤں گا"

ان کی دوسری خواہش اس بے یار و مددگار عورت کی موت پر افسانہ لکھنے کی تھی جس کی برہنہ لاش گجرات میں سڑک کے کنارے پائی گئی تھی۔ اخباروں میں شائع ہونے والی اطلاعات کے مطابق اس عورت اور اس کی ننھی سی بچی کو بس کے اڈے سے اغوا کیا گیا اور نصف درجن کے قریب ہوس پرستوں نے اپنی بہیمانہ خواہشات کی تکمیل کی اور جب وہ کڑکڑاتی سردی میں ان کے چنگل سے نکل کر بھاگی تو اس کے جسم پر لباس کا ایک تار بھی نہ تھا چنانچہ دونوں ماں بیٹی نے منجمد کر دینے والی سردی میں دم توڑ دیا۔ اس المیہ سے منٹو ماموں بے حد متاثر ہوئے تھے۔ اسی روز شام کو گجرات سے کچھ لوگ ان کے پاس آئے تھے اور انھوں نے حادثہ کی مزید تفصیلات بتائی تھیں۔ اس سے ان میں ضرور اشتعال اور ہیجان پیدا ہوا ہوگا اور میرا خیال ہے کہ اس کے بعد منٹو ماموں نے معمول سے زیادہ شراب پی لی ہوگی جو ان کے لئے مہلک ثابت ہوئی۔

وہ کافی شام گزرنے کے بعد گھر واپس آئے، تھوڑی دیر بعد انھیں خون کی قے ہوئی۔ میرے چھ سالہ بچے نے جو ان کے قریب ہی کھڑا تھا، خون کی دھاریوں کی طرف انھیں متوجہ کیا تو انھوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ کچھ نہیں یہ تو پان کی پیک ہے۔ انھوں نے اسے یہ تاکید بھی کر دی کہ وہ اس کا کسی سے ذکر نہ کرے۔ اس کے بعد انھوں نے حسبِ معمول کھانا کھایا اور سو گئے۔ گھر بھر میں کسی کو وہم گمان بھی نہ تھا کہ کوئی بات خلافِ معمول ہوئی ہے۔ کیونکہ میرے لڑکے نے منٹو ماموں کا راز کسی پر ظاہر نہیں کیا تھا۔ ممکن ہے خود منٹو ماموں کو بھی اس کے متعلق کوئی تشویش نہ ہوئی ہو۔ یوں بھی وہ گھر والوں کو ایسے معاملات سے بے خبر رکھنا ہی پسند کرتے تھے کیونکہ ہر طرف سے شراب ترک کرنے کا مطالبہ شروع ہو جاتا تھا۔

رات کا پچھلا پہر تھا کہ انھوں نے اپنی بیوی کو اٹھا کر بتایا کہ وہ شدید درد محسوس کر رہے ہیں اور اب تک بہت سا خون ضائع ہو چکا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کا جگر پھٹ گیا ہے۔ ان کی بیوی نے جب یہ دیکھا کہ وہ اس صورتِ حال کا تن تنہا مقابلہ نہیں کر سکتیں تو انھوں نے گھر کے دوسرے لوگوں کو جگایا۔ اور انھیں موت کے منہ سے نکالنے کی جد و جہد شروع ہو گئی۔ اس سے پہلے کئی شدید علالتوں کے بعد وہ شفایاب ہو چکے تھے اس لئے کسی کو یہ خیال تک نہیں ہو سکتا تھا کہ اب وہ صرف چند گھنٹوں کے مہمان ہیں۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ انھیں آؤٹ دینے کے لئے امپائر کی انگلی اسی وقت سے فضا میں بلند ہونی شروع ہو گئی تھی جب منٹو ماموں کو خون کی پہلی قے آئی تھی۔

منٹو ماموں کے آخری لمحات کے متعلق میں نے جو کچھ سنا ہے، اس سے میں یہی اندازہ لگا سکا ہوں کہ کافی دیر تک انھیں خود بھی یقین نہیں تھا کہ ان کا وقت اب آگیا ہے۔ ڈاکٹر کے انجکشن وغیرہ لگانے کے گھنٹہ ڈیڑھ بعد تک وہ مایوس نہیں ہوئے تھے۔ لیکن اس علاج کے بعد بھی ان کی حالت خلافِ معمول نہیں سنبھلی۔ ان کی نبض برابر ڈوبتی گئی اور درد میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ خون کی قے بھی بند نہیں ہوئی۔ صبح کو ڈاکٹر نے تجویز پیش کی کہ منٹو ماموں کو ہسپتال پہنچا دیا جائے۔

اس وقت منٹو ماموں کے ہوش و حواس بالکل بجا تھے اور ہسپتال کا نام سنتے ہی وہ بول اٹھے "اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ مجھے ہسپتال نہ لے جاؤ اور یہیں سکون سے پڑا رہنے دو۔"

گھر کی عورتوں کے لئے یہ منظر ناقابلِ برداشت تھا۔ انھوں نے رونا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر منٹو ماموں فوراً مشتعل ہو گئے۔ اور انھوں نے غضبناک آواز میں کہا "خبردار جو کوئی رویا!" یہ کہہ کر انھوں نے اپنا منہ رضائی سے بند کر لیا۔

منٹو کا یہ اصلی روپ تھا۔ جس شخص کی زندگی کا کوئی گوشہ آج تک دُنیا کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہا تھا، وہ کس طرح برداشت کر سکتا تھا کہ لوگ اسے مرتا ہُوا دیکھیں۔ منٹو ماموں مجسم غیظ و غضب بنے ہوئے تھے۔ معلوم نہیں وہ اپنے آپ سے ناراض تھے یا شراب سے ---- جو ان کی قبل از وقت موت کی ذمہ دار تھی۔

ایمبولنس آنے سے پہلے صرف ایک یا دو بار اُنھوں نے اپنے منہ سے رضائی ہٹائی۔ انھوں نے کہا "مجھے بڑی سردی لگ رہی ہے۔ اتنی سردی شاید قبر میں بھی نہیں لگے گی۔ میرے اوپر اور رضائیاں ڈال دو۔" کچھ دیر کے توقف کے بعد ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نمودار ہوئی اُنھوں نے آہستہ سے کہا: "میرے کوٹ کی جیب میں ساڑھے تین روپے پڑے ہیں۔ ان میں کچھ اور پیسے ملا کر تھوڑی سی وہسکی منگا دو۔ . . . . . ."

شراب کے لئے ان کا اصرار جاری رہا اور ان کی تسلی کے لئے ایک پوا منگا لیا گیا۔ انھوں نے بوتل کو بڑی عجیب اور آسودہ نگاہوں سے دیکھا اور کہنے لگے "میرے لئے دو پیگ بنا دو" اور یہ کہتے ہوئے درد اور شدید تشنّج دورے کے باعث وہ کانپ سے اُٹھے۔

منٹو ماموں کی آنکھوں میں اس وقت بھی اپنے لئے رحم کا کوئی شائبہ موجود نہ تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ ان کا وقت آپہنچا ہے۔ لیکن ایک بار بھی اور ایک لمحے کے لئے بھی انھوں نے اپنے اُوپر جذباتیت نہیں طاری ہونے دی۔ انھوں نے اپنے بچوں یا کسی اور کو اپنے پاس نہیں بلایا۔ وہ الوداعیہ یا وصیت کے کبھی قائل نہیں تھے۔ ان جیسی شخصیتوں کے لئے زندگی اور موت کے درمیان حدِ فاصل بہت ہی مبہم اور غیر واضح ہوتی ہے اور یہی ہونا بھی چاہئیے، کیونکہ ان کی زندگی اور روح تو پہلے ہی ان کے جسم سے ان کی کتابوں میں منتقل ہو چکی ہوتی ہے ---- وہاں پہنچ کر انھیں غیر فانی ہونے کا یقین ہو جاتا ہے۔ وہاں وہ ابد تک زندہ رہتے ہیں۔ ہنستے بولتے رہتے ہیں۔ محبت کرتے رہتے ہیں۔

بسترِ مرگ پر منٹو ماموں نے شراب کے سوا کوئی اور چیز نہیں مانگی۔ انھیں بہت پہلے معلوم ہو چکا تھا کہ شراب ان کی جانی دشمن ہے اور وہ اسے موت کا ہم معنی سمجھنے لگے تھے جس پر جسمانی فتح کسی صورت میں ممکن نہیں ہے۔ جس طرح موت کے آگے کوئی انسان پیش نہیں پا سکتا اسی طرح منٹو ماموں شراب کے سامنے بالکل بے بس ہو گئے تھے۔ لیکن ان کی فطرت چونکہ ہمیشہ سے باغیانہ تھی اس لئے انھوں نے موت سے بھی بغاوت کی تھی۔ انھیں شکست سے بھی سخت نفرت تھی خواہ وہ موت کے ہاتھوں ہی کیوں نہ ہو۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ موت سے تنہائی میں آنکھیں چار کرنا چاہتے تھے۔ جہاں کوئی انھیں مرتا نہ دیکھ سکے۔ جہاں کوئی ان کی شکست کا نظارہ نہ کر سکے۔

ان سے کم درجے کا آدمی شاید ایک ڈرامائی موت کا اہتمام کرتا تاکہ اس کے مرنے کے بعد لوگ اس کا چرچا کریں۔ اس پر مضامین لکھے جائیں اور اس کے اعزا و احباب کہہ سکیں کہ اس کی زندگی ضرور ایسی تھی جسے ہم پسند نہیں کرتے تھے، لیکن مرنے سے پہلے وہ منفعل ہو گیا تھا اور اچھا آدمی بن گیا تھا۔ لیکن منٹو ماموں ریاکار نہیں تھے۔ اُنھوں نے اس خواہش کا سختی سے مقابلہ کیا۔ ان کی موت کے وقت صرف ایک پہلو ڈرامائی تھا یعنی شراب طلب کرنے کا منظر۔ لیکن اس کا فائدہ بھی مرکزی کردار کو پہنچ سکتا تھا کیونکہ اس کا صحیح مفہوم صرف وہی سمجھ سکتا تھا۔

میں اس وقت موجود ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے ذہن کو ایک حد تک میرے سامنے بے نقاب کر دیتے۔ اور یہ کچھ مشکل بھی نہیں تھا کیونکہ انھیں صرف اتنا کہنے کی ضرورت تھی۔ سانپ اور انسان کی کہانی نہ بھولنا۔ میں اپنے سر کو اثبات میں جنبش دیتا اور شراب کا

آخر ان کا جام انھیں پینے کو دے دیا۔ صرف یہی ایک جملہ ہر بات واضح کر دینے کے لئے کافی ہوتا۔ سانپ اور انسان کی کہانی صرف اتنی تھی کہ ایک آدمی نے اپنے دشمنوں کے منع کرنے کے باوجود ایک زہریلا سانپ پال رکھا تھا اور ایک دن سانپ نے اپنا سارا زہر اس کے جسم میں اتار دیا، تو اس نے بھی سانپ کو پکڑ لیا اور اس کا سر کاٹ کر پھینک دیا۔

ایمبولینس جیسے ہی دروازے پر آکر کھڑی ہوئی، انھوں نے شراب کا پیگ طلب کیا۔ ایک چمچہ وسکی ان کے منہ میں ڈال دی گئی۔ لیکن شاید ایک قطرہ مشکل سے ان کے حلق سے نیچے اتر سکا ہوگا۔ باقی شراب ان کے منہ سے گر گئی اور ان پر غشی طاری ہوگئی۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ انھوں نے اپنے ہوش و حواس کھوئے تھے۔ انھیں اسی حالت میں ایمبولینس میں لٹا دیا گیا۔

ایمبولینس ہسپتال پہنچی اور ڈاکٹر انھیں دیکھنے کے لئے اندر گئے تو منٹو ماموں مر چکے تھے۔ دوبارہ ہوش میں آئے بغیر راستے ہی میں ان کا انتقال ہو چکا تھا۔

معذرت

ہمیں بے حد افسوس ہے کہ پریس مین کی نااہلی سے اس نمبر کی طباعت بے حد خراب ہوئی ہے۔ چونکہ ہم اس سلسلے میں بالکل ہی بے بس و مجبور تھے۔ اس لئے کچھ بھی نہ کر سکے ـــ یہ صدمہ نقوش کی نفاست پسندی کے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔ اس حادثہ پر ادارۂ نقوش اہلِ قلم اور قارئین سے معذرت خواہ ہے۔

مدیر

منٹو کی موت

غلام عباس

منٹو کی موت پر مجھے کچھ زیادہ تعجب نہیں ہوا۔ کیونکہ کچھ دنوں پہلے ہی سے میں نے یہ بُری خبر سننے کے لئے جی کڑا کر رکھا تھا۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اُس کی کیفیت سچ مچ سرکس کے اُس تماشہ گر کی سی ہو گئی تھی، جو عمر بھر بہت بلندی پر تار پر چلنے کا خوفناک کھیل دکھاتے دکھاتے تھک چکا ہو۔ اور ہر لمحہ اُس کے گر پڑنے کا اندیشہ ہو۔ منٹو مُصر تھا کہ وہ کبھی نہیں گرے گا، مگر اُس کے پاؤں میں لرزش پیدا ہو گئی تھی۔ سب جانتے تھے کہ وہ قضا سے کھیل رہا ہے۔ اور یہ کھیل عنقریب ختم ہوا چاہتا ہے۔

منٹو زبان سے خواہ کچھ بھی کہتا رہا ہو مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ وہ اس کھیل سے اُکتا گیا تھا اور چاہتا تھا کہ جلد سے جلد اس سے مخلصی پا جائے۔ فحش نگاری کے سلسلے میں کراچی میں اُس پر جو آخری مقدمہ چلا۔ اُس کی کارروائی چند ہی لمحوں میں ختم ہو گئی۔ منٹو نے نہ اپنی مدافعت میں کوئی دھواں دھار تقریر کی، اور نہ قانونی مشیروں سے ہنگامہ ہی برپا کرایا۔ یہاں تک کہ احتجاج میں ایک لفظ بھی اُس کی زبان سے نہ نکلا چپکے سے جرمانہ ادا کیا۔ اور گھر کی راہ لی۔

وہ مقدمہ بازی ہی سے نہیں ادب سے بھی بلکہ زندگی سے بھی اُکتا گیا تھا۔ وہ گھریلو بندھنوں، سماج کے رکھ رکھاؤ اور عام دنیوی علائق سے بیگانہ سا ہو گیا تھا۔ گراوٹ کا یہ وہ درجہ ہے کہ کم زور انسان خودکشی کر لیا کرتے ہیں۔ مگر منٹو کا رہا سہا دم خم آڑے آ گیا۔ اُس نے خودکشی نہیں کی۔ یہ اور بات ہے۔ کہ اُس نے اپنے کو ایک ایسے راستے پر ڈال لیا جو انجام کار خودکشی ہی کا مترادف بنا۔

ادب کے متعلق یہ حکم لگانا کہ کونسی چیز زندہ رہے گی۔ اور کونسی مٹ جائے گی، بہت مشکل ہے۔ مگر منٹو کے متعلق یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے۔ کہ وہ ایک باغی کی حیثیت سے ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اور اُس کے کردار کے بغیر اس دَور کی داستانِ ادب مکمل نہ ہو سکے گی۔ یہ ایک ایسا اعزاز ہے۔ کہ اُس کے ہم عصروں کو باوجود

بسیار نویس اور شہرت تک حاصل نہیں ہوسکا۔

منٹو نے آزادیٔ تحریر کے لئے جو بغاوت کی وہ سب ادیبوں کے لئے خواہ وہ کسی گروہ سے بھی تعلق رکھتے ہوں، بہت فائدہ مند ثابت ہوئی ہے۔ اس سے ایک تو ادب پر احتساب کی گرفت اتنی کڑی نہیں رہی، جتنی کہ پہلے تھی، دوسرے لکھنے والے چاہے کمتر درجے کا ادب ہی کیوں نہ پیش کر رہے ہوں، مگر جہاں تک فن کے ساتھ خلوص اور صداقت برتنے کا تعلق ہے، وہ پہلے سے کہیں بلند اور بے باک نظر آتے ہیں۔

منٹو کی ایک اور خصوصیت جو اسے دوسرے ادیبوں سے ممتاز کرتی ہے، یہ تھی کہ اس نے عمر بھر کبھی سیکنڈ فڈل (SECCND FIDDLE) بننے یعنی کسی کے ماتحت محض سنگت کا فرض ادا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے خود کو کسی جماعت یا گروہ کے ساتھ منسلک نہ ہونے دیا۔ وہ اپنا راگ، بلند یا پست جیسا بھی وہ تھا، اکیلا ہی الاپتا رہا۔ اس کو نہ کسی کی اعانت کی ضرورت تھی نہ پرواہ۔ یہی وہ بے نیازی تھی جس نے زندگی میں اور ادب میں اس کے بہت سے مخالف پیدا کر دیئے تھے۔ مگر ان کی مخالفت اس قبولِ عام کے سامنے ہیچ ثابت ہوئی، جو اپنی زندگی ہی میں اسے حاصل ہو گیا تھا، اور جس میں آج اس کے مرنے کے بعد اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

منٹو کا ایک خط

محمد طفیل

برادرم، السلام علیکم

مجھے یہاں آئے ہوئے ساڑھے تین مہینے گزر چکے ہیں۔ لیکن میں تمہیں اپنی خیریت کا خط تک نہ لکھ سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کا ماحول مجھے لکھنے نہ دیتا۔ بہرحال اس ماحول سے یقیناً بہتر ہے۔ جس میں میں نے ۴۳ برس تک جنگ لڑی تھی ——— وہاں جب تک رہا مسائل پر لکھتا رہا۔

جب سے یہاں آیا ہوں۔ نہ صفیہ نے مجھ سے کوئی فرمائش کی ہے اور نہ ہی نکہت، نزہت اور نصرت میں سے کسی نے، ورنہ اکثر یہ ہوتا تھا کہ فلاں چیز لا دو۔ فلاں چیز لا دو۔ تمہیں تو علم ہے کہ مجھے اپنی بچیوں سے بہت محبت تھی۔ یہی وجہ تھی۔ کہ جب ان کی فرمائش اپنی تنگدستی کی بنا پر پوری نہیں کرتا تھا۔ تو خون کے آنسو رویا کرتا تھا۔ حتیٰ کہ بعض منحوس حالات ایسے بھی آئے تھے کہ بچی کی سالگرہ تھی۔ اور جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں۔

ایسے ماحول میں میں کب تک رہ سکتا تھا۔ قدرت تو مجھے ایسے انسان کش ماحول میں اور رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن میں نے خود ایسے وسائل اختیار کر لئے کہ آپ کے جہنم زار سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

میں جب تک وہاں رہا۔ آپ لوگوں ہی کے غموں میں گھلتا رہا۔ نہ صرف گھلتا رہا۔ بلکہ آہستہ آہستہ معدوم ہی ہو رہا تھا۔ میں بھی تمہارے دکھوں اور غموں کو اس لئے رقم کرتا رہا ہوں۔ تاکہ آنے والی نسلیں تم سب کو مظلوم کی حیثیت سے یاد رکھ سکیں۔

میں یہاں ہر وقت یہی دعا کیا کرتا ہوں۔ کہ یہ زندگی میرے تمام ہمعصر افسانہ نگاروں کو جلد نصیب ہو۔ اس لئے کہ وہاں رہ کر میں نے جیسی ان کی زندگی بسر ہوتے دیکھی تھی۔ وہ تو مجھ سے بھی بدتر تھی۔ جب مجھی کو وہاں سے آنا پڑا۔ تو نہ جانے وہ کیوں ٹکے ہوئے ہیں۔

آپ کے تمام لکھنے والوں سے تعلقات ہیں۔ جو لاہور میں موجود ہیں۔ اُن سے زبانی کہہ دیں۔ جو لاہور سے باہر ہیں۔ انھیں بذریعہ خط مطلع کر دیں کہ وہ سب اپنے بیوی بچوں سمیت میرے پاس آ جائیں۔ میں نے یہاں تمام ابتدائی معاملات طے کر لئے ہیں۔ اس لئے کسی کو کوئی تکلیف نہ ہو گی۔

زمانے نے نہ میری قدر کی اور نہ دوسرے اہلِ قلم کی۔ تمہیں علم ہے۔ اگر ہم لوگ تمہارے ہاں نہ ہوتے۔ تو سوائے علم، ادب اور آتش

سب کچھ ہوتا۔

یہاں جو میں پہنچ گیا ہے۔ مزے میں ہے۔ اکثر قلمکاروں سے ملاقات رہتی ہے۔ سب میری ہی طرح پھولے بیٹھے ہیں۔ بعض نے تو تمہارے ش آباد کی شان میں ایسی ایسی ہجویات سپردِ قلم کی ہیں۔ کہ جب تک کلیجہ کو دونوں ہاتھوں سے نہ تھام لیا جائے۔ سنی ہی نہیں جا سکتیں۔ اگر چھپ گئیں۔ تو تمہارے ہاں کے بعض سرپھرے سر بازار پیٹیں گے۔

بہرحال ہجویات کا وہ مجموعہ جب بھی شائع ہوا۔ تمہیں اس کا ایک نسخہ ضرور بھیجوں گا۔ نقوش ہی میں اس پر تبصرہ کر دینا۔

تمہارے ہاں کے ادیب اور تمہارے پڑوسی ملک کے ادیب اپنے اپنے ناخداؤں سے جو بڑی خوشگوار قسم کی امیدیں وابستہ کئے بیٹھے ہیں۔ سراسر حماقت ہے۔ ان خوشگوار قسم کی امیدوں کے پیٹ میں تو صرف بھن خوش فہمی لمبی تانے سو رہی ہے۔

تمہارے ہاں کی سیاست تو بڑی دھڑن تختہ قسم کی ہے۔ آج کوئی وزیر ہے۔ تو کل جیل میں ہے۔ اگر کوئی چند دن پہلے جیل میں تھا اور تھا ہی غدارِ وطن بھی، تو آناً فاناً وزیر ہو جاتا ہے۔ یہاں پر میرے احباب جب تمہارے ہاں کی سیاست کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ تو یقین نا میں مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔

تمہیں علم ہے۔ کہ مجھ پر آپ کے ہاں پانچ مقدمے صرف فحاشی کے جرم میں چلے تھے۔ حالانکہ میں نے کوئی فحش تحریر نہیں لکھی تھی۔ اس ضمن میں پہ کیا کیا ستم نہیں ڈھائے گئے تھے۔ کبھی وارنٹ نکلے کبھی گرفتار ہوا۔ کبھی دوستوں سے ادھار مانگ کر جرمانہ ادا کیا۔ اس کے باوجود میں نے صاف زندہ باد کا نعرہ لگایا تھا۔ اگر میں کچھ دن اور وہاں رہ جاتا۔ تو بہت ممکن تھا۔ مجھ پر قتل، ڈاکہ زنی اور زنا بالجبر کے جھوٹے مقدمے بنائے جاتے۔ جہاں ناکردہ گناہوں کی سزا ملتی ہو۔ وہاں کون مسخرہ رہے۔

اگر حکومت کے عتاب سے بچ جاؤں۔ تو نقاد پیچھا نہیں چھوڑتے۔ تم تو جانتے ہی ہو۔ کہ میں ساری عمر نقادوں سے دور بھاگا ہوں۔ یہ بھی ہے۔ کہ بعض نقاد بھی مجھ سے دور بھاگتے ہیں۔ اصل میں یہ لوگ وہ ہیں۔ جو بگڑے ہوئے افسانہ نویس اور بگڑے ہی ہوئے شاعر ہوتے ہیں۔ ر جب تخلیق کی قوت سے محروم ہوتے ہیں۔ تو تنقید میں علامہ بن جاتے ہیں۔ مجھے ان سب سے خدا واسطے کا بیر رہا ہے۔ اس لئے کہ جب یہ قلم میں لے کر بیٹھتے ہیں تو اچھی بھلی چیز میں سو سو عیب نکالتے ہیں۔ لیکن ان حضرات کو اپنی تحریر کے عیوب کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ خدا کے لئے یہاں تماشا کھلے پڑھوں سے بچانا۔ ایسا نہ ہو کہ میرے موجود نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے اپنے قلم تیز کریں۔ اور میرے فن کی دوشیزگی کا جھٹکا کر دیں۔

آج ادب جبھی ترقی کرے گا کہ جو نقاد سکے، اس کا کشا کیا جائے۔ نقادوں کا منشا بھی یہی ہوتا ہے۔ لیکن اسے میرے سوا سمجھا کوئی ہا ہے۔

کاش مجھے یہاں کوئی نقاد مل جائے۔ تاکہ میں اس سے تنقیدی بحث کر سکوں۔ تنقیدی بحث کرتے ہوئے اگر کسی نے ان تین لفظوں کا بے جا استعمال تو سمجھ لیجئے بازی لے گیا۔ وہ تین الفاظ یہ ہیں۔ اگر، مگر اور لیکن۔

جب تک نقاد تخلیق کی قوتوں سے مالا مال نہ ہوں گے۔ ان کی تحریروں میں نہ توازن پیدا ہوگا۔ اور نہ واقعیت کے ساتھ خلوص، جب فنکار ل کے ساتھ نقاد کا بھی دل دھڑکے گا۔ تو پھر جو کچھ لکھا جائے گا۔ اس پر ایمان لانا ہی پڑے گا۔ (۱)

یہاں شراب طہور عام ہے۔ بانی خیر پیجئے شراب طہور نوش کیجئے۔ تمہارے ہاں تو بڑی تھرڈ کلاس قسم کی شراب ملتی تھی۔ اور اس جگہ پالش پ کے لئے بھی مجھے کیا کیا جتن نہیں کرنے پڑتے تھے۔ بعض اوقات اس نامراد کے لئے ذلیل تک ہوا۔ دوستوں میں میری عزت نہ رہی۔ بجھر

۱۔ نقادوں کے بارے میں منٹو کے جو خیالات ہیں۔ مجھے ان سے اتفاق نہیں ہے۔ لیکن مجھے ان کی رائے کے سلسلے میں خود کوئی ترمیم کرنے کا حق بھی نہیں۔ (محمد طفیل)

جاتا تھا۔ احباب مُنہ موڑ لیتے تھے۔ راستہ تک چھوڑ کر انجان بن جاتے تھے۔ اگر کسی سے مڈبھیڑ ہو جاتی۔ تو وہ میرے منہ پر جھوٹی قسمیں کھا کھا کر کہتا تھا۔ کہ میری جیب میں دھیلہ تک نہیں ہے۔ حالانکہ میں جانتا تھا۔ کہ اس کی جیب میں دھیلہ چھوڑ اتنے روپے ہیں۔ کہ وہ مجھے اس خانہ خراب کی کئی بوتلیں خرید کر دے سکتا ہے۔ میں نے شراب کو خانہ خراب اس لئے کہا ہے۔ کہ اس کی بنا پر کئی بار خانہ میں خرابی پیدا ہوئی تھی۔

ایک بڑی خطرناک مگر راز کی بات کہتا ہوں۔ اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ ورنہ پٹو گے۔ یہاں جتنی لڑکیاں ہیں۔ وہ سب ہزار دں برس پرانی ہیں۔ لیکن ان کمبختوں کا جسم اور بانکپن تقدس توڑ ہے۔ اس مسئلہ پر تم سے بات کرنا تضیع حماقت ہے۔ اس لئے کہ تم اس مسئلے میں نرے چغد واقع ہوئے ہو۔ تمہاری چغدیت کا احترام کرنے کے باوجود میں یہ کہوں گا کہ ان سب میں ایسی پروقار کشش اور سپردگی سی پائی جاتی ہے۔ کہ تمہارے ہاں کی لڑکیاں ان کے سامنے بالکل بکر اس ہیں۔

یہاں ایسے ایسے جمال آور لڑکے بھی ہیں کہ تمہارے ہاں کا کوئی شاعر اور ادیب دیکھ لے۔ تو اُس کمبخت کے بے ہوش ہونے کے قطعی امکانات موجود ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ جانبر ہی نہ ہو سکے۔

میں ساری عمر ادبی تخلیقات کے سلسلے میں اپنے ہمعصروں سے شرمندہ نہیں ہُوا تھا۔ اس لئے بھی کہ میرے مقابلہ ہی کا کون تھا۔ لیکن یہاں آیا تو غالب نے بڑا پریشان کیا۔ بڑا پھبتی باز ہے۔ کہنے لگا۔ تو تو میرا چور ہے۔ میرے شعروں سے تُو نے اپنے افسانوں کے عنوان چنے۔ کتابوں کے نام تک جب نہ سوجھے تو میرے شعروں کو دھر رگڑا۔ اور محسن کشی ایسی کی کہ میرے بارے میں جو فلمی کہانی لکھی۔ اُس میں بجائے میری شکر گذاری کے اظہار کے میری کسی خوبی کا ذکر تک نہیں کیا۔ بلکہ اُلٹی میری کمزوریاں گنوا کے رکھ دیں۔ کہ میں بڑا وہ تھا۔ رنڈی باز تھا۔ جوا کھیلتا تھا۔ اور اس کی پاداش میں جیل تک ہو گئی تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔

نہیں علم ہے۔ کہ میں تمام لکھنے والوں میں صرف غالب ہی کو تو مانتا تھا۔ جب اُس نے بھی مجھ سے ایسی ایسی باتیں کہیں تو میں نے دل میں کہا۔ لعنت ہے تو سعادت حسن منٹو تمہاری حقیقت نگاری پر۔

لیکن غالب ہے بڑا زندہ دل قسم کا انسان، میری اتنی زیادتی کے باوجود گاڑھی چھنتی ہے۔ ہم اکثر ایک ساتھ پیتے ہیں۔ اور پیتے ہی ہیں جب ہم حقیقت آشنا ہو جاتے ہیں اور ہماری انا بیدار ہوتی ہے۔ تو غالب کہتا ہے۔ میں تم سے بڑا افسانہ نگار ہو سکتا تھا۔ لیکن میں نے اسے فضول چیز سمجھ کر ہاتھ ہی نہیں لگایا تھا۔ اور میں اُس سے کہتا ہوں۔ شعر کہنا کونسا کمال ہے مرزا صاحب، میری تو نثر کی ہر ہر سطر میں ایک شعر کیا پوری غزل کی غزل پنہاں ہوتی ہے —— بات دونوں کی غلط ہے۔ اس کا علم اُسے بھی ہے اور مجھے بھی۔ لیکن ہم اپنی اپنی انا کا کیا کریں۔

چچا سام کا دبدبہ تو تمہارے ہاں دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ مبارک ہو!

بڑوں کی عزت ضرور کرنی چاہیئے۔ لیکن سعادت مندی کے معنی یہ بالکل نہیں ہیں۔ کہ تم اپنی ننھی سی جان بھی خطرے میں ڈال دو۔ میں نے یہ خبر بھی سنی ہے۔ کہ اب تو تمہارے ہاں کا سارا کام وہی کرتے ہیں۔ اور تم سب اُلوؤں کی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھے اندھیرے کے منتظر ہو۔ اتنی تن آسانی اچھی نہیں۔ ورنہ پچھتاؤ گے —— حتیٰ کہ تم لوگوں نے اپنی خودداری تک کو قفل لگا کے الماریوں میں رکھ دیا ہے۔

مصیبت یہ ہے کہ میں یہاں سے چچا سام کے نام کوئی خط نہیں لکھ سکتا۔ ورنہ میں اُن سے اپنی حدود میں رہنے کی درخواست ضرور کرتا۔ دعا کرو کہ وہ خود ہی میرے پاس جلد سے جلد آ جائیں تاکہ تمہاری جان چھوٹے۔ میں تو ان سے نمٹ ہی لوں گا۔ فراڈ کو فراڈ ہی پچھاڑ سکتا ہے۔

میں نے یہ بھی سنا ہے۔ کہ جب سے یہاں آیا ہوں۔ تمہارے ہاں میرا بڑا سوگ منایا گیا۔ خدا کی قسم یہ سننے ہی میرا دل کباب ہو گیا۔ اس لئے کہ جب تک میں وہاں رہا۔ سب نے لی تھی کہ مجھے اپنے ان سے دُور کرنا چاہا۔ جب یہاں کچھ دوسروں کی اور کچھ اپنی مرضی سے آ گیا ہوں۔ تو ریڈیو پر اس ناچیز کی گمشدگی کے اعلانات کیوں کئے جاتے ہیں۔ یہ وہی ریڈیو والے ہیں۔ جو مجھے اچھے ان ناک تک صاف نہیں

کر دیتے تھے۔ رسالے اور اخبار والے بھی میرے روپوش ہونے پر خصوصی ماتم کیوں کر رہے ہیں۔ ان کا بھی میرے ساتھ یوسف کے بھائیوں جیسا سلوک تھا ـــــ ان حالات میں تمہیں اپنے اس منافقانہ رویہ پر شرم آنی چاہیئے۔

یہاں میرے کچھ قدر دان پیدا ہو گئے ہیں۔ اور پچھلے دنوں انھوں نے میرے ذمہ یہ کام کیا تھا۔ کہ میں یہاں کے بارے میں اپنی سالانہ رپورٹ پیش کر دوں۔ یہ فریضہ میرے سپرد اس لئے کیا تھا۔ کہ ان کے خیال کے مطابق مجھ جیسا حقیقت نگار یہاں کوئی نہیں ہے۔ میں نے بھی اپنی عادت کے مطابق سب کچھ لکھ دیا ہے۔ اس میں اپنے ایک دوست کی خوب ڈٹ کر مخالفت بھی کی ہے۔ اور اس کا جو معاشقہ اندر ہی اندر چل رہا تھا۔ اُس کا بھی کچا چٹھا لکھ دیا ہے۔

حتیٰ کہ میں نے رپورٹ میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ یہاں جو داڑھی نہ منڈانے کا دستور ہے۔ وہ بعض نستعلیق قسم کی طبیعتوں پر گراں گزرتا ہے۔ اس لئے اس کی اجازت ہونی چاہیئے۔ کہ جس کا دل چاہے داڑھی رکھے جس کا دل نہ چاہے نہ رکھے۔

اتنے بڑے حاکم کے سامنے اتنا کہہ دینا اور کسی قسم کی جھجک محسوس نہ کرنا۔ خالہ جی کا گھر نہ تھا۔ تمھارے ہاں ایسی کوئی کھری بات کہہ دیتا۔ تو میری زبان گُدی سے نکلوا دی جاتی۔

اطلاعاً عرض ہے۔ یہاں میری کتاب "گنجے فرشتے" کافی پسند کی گئی ہے ـــــ ہو سکے تو میری بیوی بچوں کا خیال رکھنا۔

خاکسار

سعادت حسن منٹو

۳۰ اپریل ۱۹۵۵ء

منٹو کی چند یادیں اور چند خطوط

احمد ندیم قاسمی

میرے اور منٹو مرحوم کے تعلقات کی کہانی اٹھارہ برس پر پھیلی ہوئی ہے اور اس دوران میں منٹو نے اگر مجھے ایک سطر کا بھی خط لکھا ہے تو میں نے اسے محفوظ کر لیا ہے۔ اس کی وجوہ دو ہیں۔ مجھے منٹو کی شخصیت سے بھی پیار تھا اور اس کے فن سے بھی عقیدت تھی اور ایک ادیب کے خطوط میں اس کی شخصیت اور اس کے فن کی جھلکیاں کچھ اس طرح یکجان ہو کر رہ جاتی ہیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے مجتبیٰ نصیر انور نے بتایا ہے کہ جن دنوں میں نے رسالہ "سنگ میل" میں منٹو کے نام ایک کھلی چٹھی لکھی تھی تو منٹو نے اس چٹھی کو پڑھے بغیر ایک روز میرے ان خطوط کا بنڈل لیا جو میں نے گزشتہ دس برس میں اسے لکھے تھے انھیں ایک ایک کر کے نذر آتش کر دیا۔

سنہ ۱۹۳۶ء میں اختر شیرانی مرحوم کے توسط سے ہمارا تعارف ہوا اور چار برس کی خط و کتابت نے ہمارے درمیان خلوص کا ایک ایسا رشتہ قائم کر دیا جس کے بارے میں منٹو کو سنہ ۱۹۴۰ء تک یہ ڈر لگا رہا کہ اگر کہیں ہم دونوں کی ملاقات ہو گئی تو یہ رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ منٹو اس انداز سے کیوں سوچتا ہے۔ شاید میرے خطوط سے اس نے زندگی اور اخلاق سے متعلق میرے نظریات کا اندازہ لگا لیا ہو اور اسے محسوس ہوا ہو کہ ہم ایک ہی راہ پر تو کیا ——— متوازی راہوں پر بھی نہیں چل سکیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جب (سنہ ۱۹۴۰ء میں) منٹو بمبئی سے آیا اور مجھے ملتان سے دہلی بلا بھیجا تو مجھے اس کے وہ تمام خطوط یاد آ گئے جن میں اس نے ہماری ملاقات کی خطرناکی کا خدشہ ظاہر کیا تھا۔ میں دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر اترا اور تانگے والے کو اپنی "منزل" کا پتہ بتایا تو وہ مسکرانے لگا۔ میں سمجھا یہ شخص میری بڑی سی "گھیرے دار" شلوار اور اس کوٹ کے تیل دھبے سے محظوظ ہو رہا ہے جسے اگرچہ پتلون پر پہننے کے لئے تیار کیا گیا ہے لیکن جسے میں نے شلوار پر لٹکا رکھا ہے۔ ان دنوں میری صحت پہلوانوں جیسی تھی اور کوچوان "منحنی" قسم کا آدمی تھا۔ اس لئے میں نے سوچا ممکن ہے اس جسمانی تقابل نے اس کے پھیپھڑوں میں ارتعاش پیدا کیا ہو۔ مگر کوچوان کی مسکراہٹ کا راز اس وقت کھلا جب ہم اپنی "منزل" کے قریب پہنچے۔

میں دہلی میں پہلی بار آیا تھا اس لئے کوچوان کے رحم و کرم پر تھا۔ پہلے تو مجھے کچھ ایسا احساس ہوا جیسے یہ کوچوان کوئی غنڈا ہے اور میرے اجنبی تیوروں کی شہ پا کر اس بازار میں آ نکلا ہے جہاں ہر طرف ہارمونیم بج رہے ہیں۔ بکھرے بالوں اور لپ اسٹک سے لتھڑے ہوئے ہونٹوں کی

چھاؤنی بجا رہی ہے۔ خواتین کھڑکیوں اور دریچوں میں یوں بیٹھی ہیں جیسے نمبردار اپنی چوپال پر اور کبڈی کے کھلاڑی اپنے دوستوں کے کندھوں پر بیٹھے ہیں۔ یہاں سے وہاں تک کھلے چبوتروں کے نیچے ماتمے تھوکتے اور پان کی پیکیں اور مرجھائے ہوئے پھول بکھر رہے ہیں اور کوچوان کہہ رہا ہے: "کیوں میاں؟ کیا آپ دلی میں پہلی بار آئے ہیں؟ یہ چاوڑی ہے۔ آپ نے چاوڑی بازار جانے کو کہا تھا۔ کہاں اُتریئے گا؟"

منٹو نے مجھے چاوڑی بازار ہی کا پتہ لکھا تھا۔ اور میں حیران تھا کہ کیا پنڈت کرپا رام کو رسالہ "مورویز" کے دفتر کے لئے ساری دلی میں چاوڑی سے بہتر کوئی جگہ نہیں مل سکی؟ لیکن اب لوگوں سے اس دفتر کا پتہ پوچھتے ہوئے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ میں سوچتا تھا کہ اگر کسی نے یہ کہہ دیا کہ "میاں یہاں رسالوں کے دفتر کہاں، یہاں تو دوسرے دفتر کھلے ہیں" تو میں سوائے جھینپ جانے کے اور کیا کر سکوں گا۔ میں نے سوچا کھاری باؤلی میں رسالہ "ساقی" کا دفتر ہے۔ وہیں چلتے ہیں۔ مگر اچانک "مورویز" کا بورڈ نظر آ گیا اور میں تانگے سے اُتر کر اندر چلا گیا۔

میں نے منٹو کو پہچان لیا۔ وہ ریلوے ٹائم ٹیبل میں سے اس گاڑی کا وقت دیکھ رہا تھا جس سے اُتر کر میں چاوڑی میں پہنچ چکا تھا۔ منٹو سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ عام جسمانی صحت بُری سی تھی مگر آنکھوں میں چمک اور رنگت میں سنہرا پن تھا۔ شام کو ہم نئی دہلی کے ایک الٹرا ماڈرن سینما ہال کی چوتھی منزل پر بذریعہ لفٹ منتقل کر دیئے گئے۔ جہاں ہم نے ایک مرہٹہ ادیب کھانڈیکر کی فلمی کہانی "دھرم پتنی" کے مکالمے اور گیت لکھنے شروع کئے اور منٹو نے ان مکالموں اور گیتوں کو ٹائپ کرنے کا کام سنبھال لیا۔ دن بھر ہم یہ "تخلیقی اور ٹکنیکل" کام کرتے اور شام کو نیچے بازار میں چلے جاتے، منٹو شراب پیتا اور میں "پوٹیٹو چپس" کھاتا۔ دو تین دن کے بعد اس نے کہا "معاف کرنا احمد ندیم قاسمی۔ تم میری شراب کے مقابلے میں آلوؤں کی یہ کترنیں کھاتے ہوئے بھلے نہیں لگتے ہو۔" اور دوسرے دن اس "تنہائی" کو ختم کرنے کے لئے شاہد لطیف کو جو اُن دنوں علی گڑھ یونیورسٹی میں ایم اے کے طالب علم تھے، دہلی بلا لیا اور ہم سینما ہال کی چوتھی منزل پر دس بارہ روز تک مقیم رہے۔

میں اس دوران میں سوچتا رہا کہ آخر منٹو محض میری خاطر اتنی محنت کیوں کر رہا ہے۔ کہانی کھانڈیکر کی ہے، مکالموں اور گیتوں کا معاوضہ مجھے ملے گا مگر منٹو کیوں دن بھر بیٹھا درجنوں صفحے ٹائپ کر ڈالتا ہے بلکہ اکثر فلمی ٹکنیک کے سلسلے میں میری رہنمائی کرتا ہے اور بعض ایسے سین تو اس نے خود ہی لکھ کر ٹائپ کر ڈالے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ میری مدد کرنا چاہتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مجھے بحیثیت سب انسپکٹر آبکاری صرف ساڑھے بہتر روپے ماہانہ ملتے ہیں مگر میں بھی تو یہ جانتا ہوں کہ منٹو بمبئی کے ہفت روزہ "مصور" کی ادارت کا حق الخدمت صرف پچاس روپے ماہانہ کی صورت میں حاصل کرتا ہے۔ پھر وہ کون سا جذبہ ہے جس نے منٹو کو بمبئی سے دہلی لا کر اسے میری خاطر اندھا دھند مشقت پر مجبور کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جذبہ اس بے لوث خلوص کا تھا جو منٹو کی اور میری افتادِ طبع میں واحد قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا تھا۔ ایک دوسرے سے پیار اور ایک دوسرے کا احترام کرنے کے سوا ہم اپنی اپنی زندگی کی بیشتر سرگرمیوں میں ایک دوسرے کا ساتھ نہ دے سکے۔ طبائع کے اس واضح اختلاف کے باوجود ہمارے دوستانہ تعلقات ہمیشہ قائم رہے۔ ہمیں ایک دوسرے سے شکایتیں ضرور رہیں اور ان شکایتوں کا علی الاعلان اظہار بھی ہوتا رہا۔ مگر ہم جب بھی ایک دوسرے سے ملے، میل دُھل گیا اور ہم آج سے سترہ اٹھارہ برس پہلے کے منٹو اور ندیم بن گئے۔

منٹو سے میری دوسری ملاقات اس سے اگلے سال ہوئی۔ وہ بمبئی کو چھوڑ کر مستقل طور سے دہلی آ گیا تھا۔ یہاں وہ آل انڈیا ریڈیو میں ملازم تھا اور نکلسن روڈ پر سن بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔ ان دنوں دہلی ریڈیو اسٹیشن میں اُردو کے بہت سے ادیب اور شاعر جمع تھے۔ مولانا چراغ حسن حسرت شاید نیوز سیکشن سے منسلک تھے۔ ان کے علاوہ کرشن چندر، میراجی، اوپندر ناتھ اشک اور ن۔ م۔ راشد بھی موجود تھے۔ اردو شاعری کے نئے رجحانات کے نمائندہ شعرا کو ریڈیو والوں نے مدعو کیا تھا۔ تاثیر مرحوم اس محفل کے صدر تھے۔ اور اس محفل میں فیض احمد فیض، حفیظ جالندھری، راشد، میراجی، مجاز، تصدق حسین خالد، سیماب مرحوم، روش صدیقی اور ساغر نظامی کے ناموں کے علاوہ اپنا نام یاد رہ گیا ہے۔ منٹو کا فن ان دنوں انتہائی عروج پر تھا۔ صحت بھی بُری نہیں تھی۔ طبیعت میں شوخی اور بے باکی تو ہمیشہ سے تھی لیکن ان دنوں

ہی کی شخصیت کے یہ پہلو بھی اپنے عروج پر تھے۔ ایک دن اچانک بولا "آؤ یار، خواجہ حفیظ صاحب کو چھیڑیں" پھر وہ بھری محفل میں حفیظ صاحب سے پوچھ گیا "میں نہایت ادب سے پوچھتا ہوں کہ شاہنامۂ اسلام کے ایک شعر کے سلسلے میں آپ سے استفادہ کرنا ہے۔ بہت گہرا شعر ہے۔ آپ نے فلسفے کی گتھی نظم فرمایا ہے۔ میں نے بہت سر مارا۔ پڑھے لکھے دوستوں سے بھی مشورہ لیا مگر وہ مجھے مطمئن نہیں کر سکے۔ آپ کا وہ شعر یہ ہے

یہ لڑکا جو کہ بیٹھا ہے وہ لڑکی جو کہ بیٹھی ہے
یہ پیغمبر کا بیٹا ہے وہ پیغمبر کی بیٹی ہے"

ساری محفل کشتِ زعفران بن گئی اور حفیظ صاحب بھی مسکرا کر ٹال گئے۔

پھر ایک دن منٹو نے مولانا چراغ حسن حسرت کو چھیڑنے کا پروگرام بنایا۔ مولانا شاید میراجی کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ کرشن، اشک اور میں منٹو کے ہمراہ ان کے پاس پہنچے اور منٹو نے بیٹھتے ہی علامہ اقبال پر برسنا شروع کر دیا۔ "بانگِ درا کے پہلے حصے سے آگے کے اقبال کو میں شاعر کے بجائے مولانا سمجھتا ہوں۔ آخر یہ بھی کوئی شاعری ہے کہ فلسفے کے نظریات کو بغیر کسی مقصد کے نظم کرتے جاؤ اور ہر نظریے کے کوٹ کے کالر میں خودی کا پھول سجاتے پھرو۔" پہلے تو مولانا حسرت صاحب نے اقبال کی حمایت میں چند نہایت ٹھوس باتیں کہیں مگر انھیں منٹو کے تیوروں سے اس کی نیت کا جلد ہی پتہ چل گیا اور انھوں نے ایسی ایسی شگفتہ چٹکیاں لینا شروع کیں کہ منٹو کی تجویز کے مطابق ہم وہاں سے نکل بھاگ آئے۔

میں چند روز منٹو ہی کے ہاں رکا۔ منٹو کے گھر میں مجھے سلیقہ، صفائی اور سادگی کا وہ معیار نظر آیا جو بڑے بڑے گھروں میں بھی محض ذوقِ لطیف کی کمی کے باعث غائب ہوتا ہے۔ منٹو کے لکھنے پڑھنے والے کمرے میں سفید چاندنی کا فرش بچھا رہتا۔ فٹ ڈیڑھ فٹ اونچے ڈیسک میں منٹو کے مسودے بند رہتے۔ اتنی ہی بلند تپائی پر منٹو کا ٹائپ رائٹر رکھا رہتا۔ کتابیں نہایت سلیقے سے ایک لمبے شیلف میں سجی رہتیں اور خود اجلا دودھ سا سفید براق لباس پہنے وہاں بیٹھا لکھتا اور ٹائپ کرتا نظر آتا۔ وہ اپنی شراب کی بوتل کو بھی اسی ڈیسک کے نیچے "چھپاتا" تھا۔ اس لئے کہ ان دنوں منٹو کی بڑی بہن اس کے ہاں مقیم تھیں اور منٹو کہتا تھا "میں آپی بہن سے ڈرتا ہوں اور پھر آجکل کے بچے اتنے تیز ہیں کہ انہیں بتا کر چھپایا جائے کہ اس بوتل میں تیل بھرا ہے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے گھورتے رہیں گے۔ سو ان سے بھی چھپانا پڑتا ہے۔ رہی صفیہ تو جب اس نے دیکھ لیا ہے کہ میں چھوڑ نہیں سکتا تو اس نے ایک پیمانہ مقرر کر دیا ہے۔ اور اس پیمانے سے میری سیری نہیں ہوتی۔ سو یہ فراڈ کرنا ہی پڑتا ہے۔"

منٹو کے مکان کی اس نہایت خوبصورت سادگی سے مجھے ۱۹۴۸ء کا ایک اور واقعہ یاد آ گیا ہے۔ منٹو میرے پاس آیا۔ ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھے چند منٹ تک باتیں کرتے رہے کہ اچانک اس نے چونک کر کہا "یہ معلوم ہوتا ہے اس کمرے میں تازہ تازہ سفیدی ہوئی ہے۔" میں نے اسے بتایا کہ سفیدی کو بس ایک ہفتہ ہی گزرا ہوگا۔ وہ بولا "تم شاعر ہو کر ایسی بھونڈی سفیدی کو برداشت کئے بیٹھے ہو!" میں نے اسے اطلاع دی کہ سفیدی خود میں نے کی ہے اس لئے عدم برداشت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر مجھے اپنے گھر لے گیا اپنے ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر بولا "سفیدی اسے کہتے ہیں!"

تیسری مرتبہ خود منٹو نے مجھے دہلی بلا بھیجا۔ منٹو اور کرشن چندر نے بنجارا کے نام سے ایک فلمی کہانی لکھی تھی اور مجھے اس کے گیت لکھنا تھے۔ مجھے کوئی ایک مہینہ منٹو کے ہاں رہنے کا موقع ملا۔ اس دوران میں منٹو نے مجھ سے ریڈیو کے لئے ایک طویل اوپرا اور چند منظوم ڈرامے بھی لکھوائے اجرت کے معاملے میں ریڈیو کے حکام سے خوب خوب لڑائیاں کیں۔ پھر جب مجھے خاصی معقول رقم دلوا چکا تو مجھے چاندنی چوک میں لے گیا۔ وہاں اس نے ایک امرتسری دکاندار سے میرے لئے نیلون اور کوٹوں کے کپڑے خریدے۔ دو تین دنوں میں میرا یہ لباس تیار ہو گیا اور یوں میں نے

زندگی میں پہلی بار پتلون پہنی اور ٹائی لگائی۔

چوتھی ملاقات "بو" پر مقدمے کے سلسلے میں ہوئی۔ جب منٹو بمبئی میں تھا اور میں ادبِ لطیف لاہور کا ایڈیٹر تھا۔ پانچویں ملاقات انارکلی بازار میں محض اتفاق سے ہوئی جب میں "سویرا" کے خلاف ایک مقدمے کے سلسلے میں لاہور آیا ہوا تھا اور منٹو مستقل طور سے لاہور آ گیا تھا چند روز کے بعد وہ پشاور میں میرے پاس پہنچا اور وہاں پندرہ بیس روز مقیم رہا۔ ہمارے نظریاتی اختلاف کی ابتداء یہیں سے ہوئی۔

ہم دن بھر ریڈیو اسٹیشن میں گزارتے شام کو منٹو کسی نہ کسی شخص کو اپنے ساتھ لے آتا۔ اور پھر شراب کے دور چلتے۔ ادب میں حقیقت اور جنس پر بحثیں ہوتیں۔ منٹو کو ان تمام مقدمات پر عبور حاصل تھا جو دنیا کے بڑے بڑے ممالک میں مختلف ادیبوں پر عریانی کے الزام میں چلائے گئے۔ وہ ان مصنفین اور ان کی تحریروں کی مثالیں دیتا اور اس وقت اس کی زبان اتنی تیز ہو جاتی کہ اس پر ایک شعلہ نوا مقرر کا دھوکا ہوتا۔ ایک روز میں نے کہا کہ ٹالسٹائی نے موپساں کے کسی افسانے کے بارے میں لکھا ہے کہ اگر موپساں کو اپنی ننگی ہیروئن کو نہاتے ہوئے دکھانا تھا تو کیا اتنا کہہ دینا کافی نہیں تھا کہ وہ نہا رہی تھی۔ یا چلیے یہ بھی کہہ دیجئے کہ وہ نہا چکی تو اس کے جسم پر پانی کے بے شمار قطرے تھے رہ گئے۔ لیکن موپساں کو یہ لکھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی کہ پانی کے ان قطروں کا رنگ ہیروئن کے جسم کی رنگت کی طرح ہلکا سنہری یا ہلکا گلابی تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے ادب میں لذتیت کی ابتداء ہوتی ہے۔" اور یہ سن کر منٹو بھڑک اٹھا۔ بولا: "تم کیا جانو عورت کے جسم کے راز۔ تم نے تو ابھی تک شادی نہیں کی۔ تم نے تو شراب تک نہیں چکھی۔ تم تو اس روز چاؤڑی میں یوں نظر آ رہے تھے جیسے راج ہنسوں کے ہجوم میں کوا گھس آئے۔ تم کیا جانو موپساں نے قطروں کی رنگت کا اظہار کیوں ضروری سمجھا۔ اگر وہ رنگت کا ذکر نہ کرتا تو یہ عورت کیسی پھیکی پھیکی اور سپاٹ لگتی۔ ان گلابی قطروں ہی نے تو اسے زندگی کی شگفتگی دی ہے۔ تم کسانوں کی کہانیاں لکھ لیتے ہو تو یہ ضروری نہیں کہ تم کسان عورتوں کی نفسیات کو بھی سمجھ سکو۔ عورت پر لکھتے وقت عورت بن جانا پڑتا ہے۔ کبھی تم تخیل کے لمحوں میں عورت بنے ہو؟ تمہیں کبھی کسی نے چھیڑا ہے؟ کبھی کسی اجنبی نے تمہارے جسم پر ہاتھ رکھا ہے؟ کوئی جھرجھری محسوس کی ہے؟ تمہارے اعصاب کبھی اس اجنبی لمس کے مضراب سے بھی جھنجھنائے ہیں؟ سو میری جان ٹالسٹائی کبھی کبھی اسی طرح گاندھی جیسے پیر نظر آتا تھا مگر کیا تمہارے خیال میں اس نے اپنی ایناکرینینا کے ننگے پاؤں پر ٹپکتے ہوئے وہ کیفیت محسوس نہیں کی ہوگی جو موپساں نے اپنی ہیروئن کے جسم پر پانی کے گلابی قطرے دیکھنے میں محسوس کی؟ سو احمد ندیم قاسمی۔ بات یہ ہے کہ تم ادب کے وزیر خارجہ ہو اور ہم ادب کے وزیر داخلہ ہیں۔ ہماری اپنی اپنی راہیں اور اپنی منزلیں ہیں نہ ندیم منٹو بن سکتا ہے نہ منٹو ندیم۔ ٹالسٹائی ٹالسٹائی ہے اور موپساں موپساں ہے۔ اور میرے نہال ہم نے آج ایک پیگ زیادہ چڑھا لیا ہے، چلو اب سو جائیں۔"

ان دنوں میں نے تہیہ کر لیا کہ منٹو سے اس کے بعض افسانوں کے عریاں ٹکڑوں کی عریانی کی حقیقت تسلیم کرا لوں۔ میں پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گیا اور آخر ایک روز منٹو ایسی تلخ کلامی پر اتر آیا جس کا میں تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ پھر ایک روز میں نے اسے وہیں پشاور میں بہت زیادہ شراب پینے سے روکا تو وہ تنک کر بولا: "یہ میرا پرائیویٹ معاملہ ہے اور تم میرے دوست ضرور ہو مگر میں نے تمہیں اپنے ضمیر کی مسجد کا امام مقرر نہیں کیا۔"

دوسرے ہی دن اسے اپنے اس خوبصورت فقرے کی تلخی کا احساس ہو گیا کیونکہ اس کی باتوں اور تیوروں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھے منا رہا ہے۔ پھر یہاں لاہور میں، جب ہمارے درمیان مہینوں تک کوئی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ وہ ایک دن میرے ہاں آیا مجھے اپنے گھر لے گیا اور اندھادھند پی کر سنہ ۱۹۳۷ء سے لے کر سنہ ۱۹۵۴ء تک کی تمام باتوں کو تفصیل سے دہراتا رہا کہ میں اس کی بے پناہ یادداشت پر حیران رہ گیا۔ پھر وہ بولا: "یہ باتیں نوٹ کر لو میری جان۔ شاید چند دنوں بعد تمہیں یہ باتیں مرحوم منٹو کی یاد میں لکھنا پڑیں۔" یہ سن کر میں خلافِ معمول آپے سے باہر ہو گیا اور میں نے یہ سوچے بغیر کہ منٹو نشے میں ہے کہنا شروع کیا: "اگر آپ کو میری دوستی اتنی عزیز ہے تو پھر آپ کو شراب چھوڑنی پڑے گی

آپ تو پاگلوں کی طرح پیتے ہیں۔ کیا آپ کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ جس گھر میں آپ پی رہے ہیں اس میں نگہت بیٹی بھی رہتی ہے۔ یہ وہی بچی ہے جس کی ایک نہایت پیاری تصویر آپ نے بمبئی سے مجھے بھیجی تھی اور جو میرے پاس اب تک محفوظ ہے۔ آپ تو ادب کے وزیر داخلہ ہیں لیکن کیا آپ نگہت بیٹی کے اس داخلی ردِ عمل کو ابھی سے محسوس نہیں کر سکتے جو چند برس کے بعد آپ کو اس کیفیت میں دیکھ کر اس کے ذہن پر وارد ہوگا؟ اور اگر آپ کو اس بات کا احساس نہیں تو اب اپنے آپ کو ادب کا وزیر بے قلمدان کہیے کیونکہ جو ادیب صرف اپنے اندر بند رہتا ہے ——" اور منٹو نے کہا: "اس فراڈ کی کوئی خاص ضرورت تو نہیں"۔ اور اس کے بعد اس نے تہہ سے صاف صاف کہہ دیا کہ اس کی ذات کے معمولات میں دخل دینے کا مجھے کوئی دور دراز کا بھی حق حاصل نہیں۔ میں خفا ہوئے بغیر چلا آیا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ کل ہوش میں آ کر ان باتوں پر پچھتائے گا۔ مگر وہ نہیں پچھتایا بلکہ چند روز بعد سرِ راہے ملاقات ہوئی اور میں نے شکایت کی تو معلوم ہوا کہ اس روز جو کچھ اس نے کہا تھا وہ حرفِ آخر تھا اور وہ نشے کی نہیں، ہوش کی باتیں تھیں۔

تب میں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس دوران میں گاہے گاہے ملاقات ہوتی رہی مگر یہ حقیقت اپنی جگہ قائم رہی کہ نہ منٹو کو اپنی انتہا پسندیوں میں میری رفاقت گوارا ہے اور نہ مجھ میں اتنا حوصلہ ہے کہ اسے آہستہ آہستہ ختم ہوتے دیکھوں اور کچھ نہ بولوں۔ میں نے بول کر دیکھ لیا تھا۔ مگر اب مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں نے بزدلی دکھائی تھی۔ میں اس کا پہرہ دار بن کر کیوں نہ بیٹھ گیا۔ میں اس کی جھڑکیاں اور گالیاں تک سہتا مگر اسے زندہ رکھنے کی کوشش کرتا۔ اسی مہم میں اس کے گھرانے کے افراد اور اس کے چند نیک نفس دوست میرا ساتھ دیتے۔ اور ہم سب مل کر قوم کی اس متاع کو اتنی جلد نابود ہونے سے بچا لیتے۔ اور منٹو نے ایک بار مجھے یہ بھی تو لکھا تھا کہ "مجھے آپ کی ہمیشہ ضرورت رہے گی"۔ سو اب دو ماتم میرے سپرد ہوئے ہیں۔ ایک منٹو کا اور دوسرا اپنی عزتِ نفس کے تحفظ کے ڈھونگ کا۔

آج میں منٹو کے چند خطوط ایک عظیم فن کار کی ایک نہایت پیاری یادگار کی صورت میں پیش کر رہا ہوں۔ منٹو کے کوئی ایک سو خط میرے پاس محفوظ ہیں۔ ان میں ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے منٹو کی نہایت سچی جھلکیاں جمع ہیں۔ میں انہیں کتابی صورت میں بھی چھاپنے کا ارادہ رکھتا ہوں (... ان کے حقوق منٹو ہی کے نام محفوظ ہوں گے) مگر یہ سب خود فریبیاں اور حیلے بہانے ہیں۔ کیونکہ یہ ٹیس کسی وقت بھی میرے ضمیر سے نہیں نکل سکتی کہ میں نے اور میرے جیسے کتنے کم ہمت اور شکست خوردہ "خیر خواہوں" نے منٹو کو زندگی کے ویرانے میں اکیلا چھوڑ دیا تھا کہ ۔ ع

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

معرفت ہفت روزہ 'سماج'
۳ پیرخان اسٹریٹ بمبئی ۸
۱۱ مئی ۴۷ء

برادرِ مکرم

وعلیکم السلام۔ آپ کا نوازش نامہ ملا اس سے قبل میں آپ کی خدمت میں ایک خط روانہ کرچکا ہوں، امید ہے وصول فرما لیا ہوگا۔

ناسک سے مایوس ہو کر میں معتور سے علیحدہ ہوگیا تھا اور یہ بات کوئی اتنی اہمیت نہیں رکھتی کہ اس کے متعلق میں کچھ کہوں یا سنوں۔ مانک معتور سے میرے تعلقات دوستانہ ہیں۔ علیحدہ ہونے پر بھی میں اُن کے قریب ہوں —— یہ میری عقیدت ہے۔

آپ کی اسٹوری میں سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ وہ "فلمی" نہیں۔ وہ فلمی کس طرح نہیں؟ اس سوال کے جواب کے لئے کئی صفحات درکار ہیں اور میرا خیال ہے کہ یہ صفحات لکھ کر بھی میں آپ کو اپنا مدعا بطریقِ احسن نہ سمجھا سکونگا۔ شاید میں اس سے قبل عرض کرچکا ہوں کہ فلمی افسانہ نگاری کو سمجھنے کے لئے اسکرین بہترین اُستاد ہے۔ آپ پردے پر فلموں کو بغور دیکھ کر بھی کچھ سبق حاصل کرسکتے ہیں مگر پھر بھی سلسلہ ہائے میں چند ضروری نقطوں پر روشنی ڈالنے والا مرجود ہونا چاہیئے۔

آپ اچھے افسانے لکھ سکتے ہیں، اس کا اندازہ مجھے آپ کے "بے گناہ" سے ہوگیا تھا۔ مجھے بہت کم افسانے یاد رہتے ہیں مگر آپ کا "بے گناہ" مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ وہ چند معمولی خامیوں کے باوصف آپ کا بہترین افسانہ تھا۔

گو میں خود حوصلہ ہارتا رہتا ہوں مگر میری التدعا ہے کہ آپ ہرگز حوصلہ نہ ہاریں۔

مجھ میں بحیثیت ایک انسان کے بے حد کمزوریاں ہیں، اس لئے مجھے ہر وقت ڈر رہتا ہے کہ یہ کمزوریاں دوسروں کے دل میں میرے متعلق نفرت پیدا کرنے کا موجب نہ ہوں اور اکثر اوقات ایسا ہُوا ہے کہ انہی کمزوریوں کے باعث مجھے کئی صدمے اُٹھانے پڑے ہیں۔ میں اسی تلخ حقیقت کے پیشِ نظر شاید آپ سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ آپ میرے متعلق کوئی رائے مرتب نہ کریں۔

میں بمبئی میں پچاس روپیہ ماہوار کماتا ہوں اور بے حد فضول خرچ ہوں۔ اگر آپ یہاں چلے آئیں تو میرا خیال ہے کہ ہم دونوں گزر کرسکیں گے، میں اپنی فضول خرچیاں بند کرسکتا ہوں۔ مجھے آپ کی مجبوریوں کا کامل احساس ہے، اس لئے کہ میں ان مجبوریوں سے خود گزر چکا ہوں۔ میں آپ کو کرایہ روانہ کر دیتا اور روانہ کرسکتا تھا، اس لئے کہ ابھی آٹھ روز ہوئے میرے پاس پانچ سو روپے تھے اور اب یہ حالت ہے کہ صرف بیس پیسے باقی ہیں۔ مجھے کتابیں خریدنے اور یونہی روپیہ فضول برباد کرنے کا خبط ہے اور میں اس سے لطف اُٹھاتا ہوں۔ خیر!۔ زندگی ہے تو روپیہ پیدا کیا جاسکتا ہے۔ آپ یہاں تشریف لاسکتے ہیں مگر یہ بات یاد رکھیئے کہ آپ کو میری زندگی کی دھوپ چھاؤں میں رہنا ہوگا۔ میرے پاس ایک چھوٹا سا

کمرہ ہے جس میں ہم دونوں رہ سکتے ہیں۔ کھانے کو ملے نہ ملے مگر آپ کو کتابیں پڑھنے کے لئے مل جایا کریں گی اور اگر آپ کوشش کریں گے تو بہت ممکن ہے کہ اچھی اچھی کتابوں کے ساتھ اچھے اچھے کھانے بھی مل جائیں۔ اگر میرا یا آپ کا لکھا ہوا افسانہ کوئی فلم کمپنی خرید لے تو دو تین مہینے عیش میں گزر سکتے ہیں۔ کہئے کیا ارادہ ہے؟

"سماج" میرا پرچہ نہیں۔ یہ پرچہ دراصل میرے ایک عزیز دوست یہاں سے نکال رہے ہیں۔ پہلی جلد شائع ہو گئی ہے، آپ کے پاس پہنچ جائیگا۔
آپ کی نظم میں نے 'ہمالیہ' میں پڑھی ہے۔ افسوس ہے کہ نہ مجھے شعر پڑھنا آتے ہیں اور نہ میں اُن APPRECIATE کر سکتا ہوں۔ چونکہ آپ نے لکھی ہے اس لئے یقیناً اچھی ہو گی۔ "شعل" کے متعلق رائے عالیہ کا شکریہ۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے

خاکسار

سعادت حسن منٹو

۱۷۔ اڈیلفی چیمبرز
کلیئر روڈ۔ بمبئی نمبر ۸
نومبر ۳۸ء

برادرِ مکرم

وعلیکم السلام۔ آپ کا لفافہ ملا۔ تبصرہ اور تصویر کا شکریہ۔ آپ کو ناحق اتنی زحمت اُٹھانا پڑی۔

"مرم بتی کے آنسو" آپ نے پسند کیا ـــ شکریہ۔ مجھے معلوم تھا کہ آپ اسے پسند کریں گے۔ میں نے اس کو لکھتے وقت انتہائی کوشش کی تھی کہ کوئی لفظ بھی غیر ضروری نہ ہو اور جیسا کہ آپ نے اپنی رائے میں لکھا ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنی اس کوشش میں کامیاب رہا ہوں۔

ہمارے "ادبی رسائل" صحیح ادب کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بہت کچھ لکھا جا سکتا تھا۔

پتی ورتا استریوں اور نیک دل بیویوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اب ایسی داستانیں فضول ہیں۔ کیوں نہ ایسی عورت کا دل کھول کر بتایا جائے جو اپنے پتی کے آغوش سے نکل کر کسی دوسرے مرد کی بغل گرما رہی ہو اور اُس کا پتی کمرے میں بیٹھا سب کچھ ایسے دیکھ رہا ہو گویا کچھ ہو ہی نہیں رہا۔

زندگی کو اُس شکل میں پیش کرنا چاہئے جیسی کہ وہ ہے، نہ کہ وہ جیسی تھی، یا جیسے ہو گی اور یا جیسے ہونی چاہیئے۔

"دیوالی نمبر" میں کیا آپ نے "دیوالی کے دیئے" پڑھا۔ اُس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔

آپ کے گیت خوب ہیں خاص کر جوگی سوگی والا۔ اس میں ایک مصرع ہے ــ تو کیا جانے کس کی خاطر ـــ اگر "کس کی خاطر" کے بجائے "کس کے کارن" ہو جائے تو میرا خیال ہے کہ آپ کے گیت میں "خاطر" کا تیز سُر نکل جائے گا۔

مجھے آپ کے افسانے کا انتظار رہے گا۔

میری صحت اب قدرے اچھی ہے۔ امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

میں نے فلم کے لئے ایک افسانہ "کیچڑ" کے عنوان سے لکھنا شروع کیا تھا۔ آدھا افسانہ لکھ کر رُک گیا ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کے مطالعہ کے لئے بھیجدوں، شاید آپ کوئی رائے دے سکیں۔

خاکسار

سعادت حسن منٹو

اگر کوئی صاحب میرے ساتھ وعدہ کریں کہ وہ میرے دماغ میں سے سارے خیالات نکال کر ایک بوتل میں ڈال دیں گے تو منٹو آج مرنے کو تیار ہے۔ منٹو، منٹو کے لئے زندہ نہیں ہے ...... مگر اس سے کسی کو کیا! —— منٹو ہے کیا بلا؟ —— چھوڑئیے اس فضول قصّے کو —— آئیے کوئی اور بات کریں۔

کرشن چندر صاحب خوب لکھتے ہیں۔ ہمایوں، ادبی دنیا وغیرہ میں اُن کے افسانے پڑھنے کا اتفاق ہُوا ہے۔

آپ کا افسانہ پڑھا۔ بہت اچھا ہے۔ بہت اچھا ہے۔ آپ کا یہ فقرہ مجھے بہت پسند آیا۔

"اُس کے دل سے آواز آئی اور اُسے شبہ ہونے لگا کہ شاید انسپکٹر نے بھی یہ آواز سُن لی ہے"

آپکے اس افسانے میں مجھے "چیخوف" کا رنگ نظر آیا۔ تازہ پرچے میں چھپ جائیگا۔ آپ اسی طرح کبھی کبھی اپنا افسانہ بھیجدیا کریں۔

آپ نے "منتر" پسند کیا۔ شکریہ!

رفیق صاحب آپ کی ایک غزل اس مہینے ریڈیو پر گا رہے ہیں۔ "انڈین لسنر" میں آپ کا نام دیکھا تھا۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

خلش صاحب اور نذیر صاحب آداب عرض کرتے ہیں۔

خاکسار

سعادت حسن منٹو

---

۱۷ ایڈلفی چیمبرز

کلیر روڈ۔ بمبئی ۸

۲۶ر جون ۳۹ء

پیارے ندیم

تمہارے دونوں خط ملے۔ سوچ رہا ہوں کہ تم میں اتنا اخلاص کیوں ہے؟ —— میں ڈرتا ہوں۔ اندھیرے میں رہنے والا زیادہ تیز روشنی کو دیکھنے کی تاب نہیں رکھتا۔ تمہارا ہر خط مجھے ڈرا دیتا ہے۔ کیا کروں، عمر بڑھنے کے ساتھ مجھ میں بچپن آتا جاتا ہے۔ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب گھٹنوں کے بل چلوں گا اور تتلا تتلا کے باتیں کرونگا۔ لوگ پھیلتے ہیں، میں سکڑ رہا ہوں۔

زندگی کے جن ادوار سے میں گذر رہا ہوں اُس پر نظر کرنے کی میرے پاس فرصت نہیں۔ کئی اسٹیشن آتے ہیں جن پر میری زندگی کی گاڑی ٹھہرتی ہے مگر میں تھکاوٹ سے چُور سفر کے آغاز ہی سے تنگ آیا ہُوا وہ بورڈ ہی پڑھ سکتا جس سے مجھے اسٹیشن کا نام معلوم ہو جائے۔ عجب حالت ہے۔ پہ سمجھ میں نہیں آتا اور سمجھ میں آئے بھی کیسے جب کہ سمجھنے کی فرصت ہی نہیں۔

کرشن چندر کہتے ہیں میں اُن کے لئے نیا افسانہ لکھوں —— جی چاہتا ہے اُن کو اپنا تازہ فوٹو کھچوا کر بھیجدوں۔ آنکھوں والے اُسے دیکھ کر کئی افسانے پڑھ لیں گے۔

تم نے بہت تاکید کی ہے کہ میں "نئے زاویئے" کے لئے کچھ غیر مطبوعہ افسانہ لکھوں۔ مجھ سے پُوچھو تو یہ افسانہ نگاری بالکل بکواس ہے جس کے عوض صرف شکریہ ملے —— میرا ڈاکٹر جو ہر روز مجھے دوا بھیجتا ہے شکرئیے کے علاوہ روپے بھی مانگتا ہے۔ کل اُس نے ایک روپیہ واپس بھیجدیا تھا اس لئے کہ اُس میں کھنکناہٹ کم تھی۔ خیال تھا کہ کل افسانہ شروع کرونگا مگر اس کم کھنکھناہٹ والے روپے کو ہتھیلی پر رکھا تو میری سب کھنکھناہٹ غائب ہو گئی ——

بہرحال افسانہ لکھ دوں گا اس لئے کہ تمہاری سفارش ہے اور کرشن چندر سے بھی مجھے پیار ہے۔ کرشن چندر صاحب کو اتنا ضرور لکھ دو کہ میری

[illegible] ہے اُس کا نام کرنے کے لئے مجھے جو فرصت مل سکتی ہے وہ میں اُن کے حوالے کر دوں گا۔

مکتبۂ اُردو والوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ دس جون کو ۵۰ روپے میں سے پہلی قسط پچاس روپے کی بھیج دیں گے مگر اب تک منتظر ہوں۔ مجھے اس ماہ تو ہری چاندی کی آمد کا شدید انتظار ہے۔ دیکھئے وہ مجھ پر کب کرم کرتے ہیں۔

"قاضی جی کا فیصلہ" لکھنؤ بھیجا تھا مگر واپس آیا۔ اب دہلی بھیجا ہے، دیکھئے کیا جواب آتا ہے۔ حیدرآباد والوں نے تو ابھی تک رسید سے مطلع نہیں کیا۔ "پلکمٹ" پر ۲۳ جولائی میں بک ہو گیا ہے۔ "قاضی جی کا فیصلہ" اگست میں ہوگا۔ (یہ دونوں بمبئی سے براڈکاسٹ ہوں گے)۔

طبیعت بہت اُداس رہتی ہے۔ جی چاہتا ہے کچھ کروں ——— یہ کچھ کیا ہے! ——— سوچ رہا ہوں۔

اس وقت کرپا رام صاحب کے گھر میں بیٹھا ہوں۔ بارش ہو رہی ہے۔ پنڈت جی سلام لکھواتے ہیں۔ وہ علیحدہ خط بھی لکھیں گے۔

صفیہ بصحت ہے۔ آداب عرض کرتی ہے۔ اس وقت سامنے بیٹھی نگہت کے لئے ڈورہ بنا رہی ہے۔

میں بہت دکھی ہوں۔

(۱) "پلکمٹ" پر ۲۳ جولائی کو بمبئی سے براڈکاسٹ ہوگا۔ اس کا حق التصنیف بیس روپے ملے گا۔ خواجہ ظہیرالدین کے نام سے نشر ہوگا۔

(۲) مکتبۂ اُردو والوں نے آج ۵۰ روپے منی آرڈر کے ذریعے سے بھیجے ہیں۔

سعادت حسن منٹو

دہلی

۲۱، جولائی ۱۹۴۱ء

برادرِ عزیز

السلام علیکم۔ آپ کا محبت نامہ مل گیا تھا۔ افسوس کہ اس دوران میں میری طبیعت ناساز رہی۔ پرسوں سے پھر شدت کا درد ہو رہا ہے۔ حالت اس قدر خراب ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ یہاں کے سول سرجن کے زیر علاج ہوں۔ وہ کہتا ہے ہسپتال میں داخل ہو جاؤ مگر ادھر چھٹیاں ملتی ہیں تو تنخواہ نہیں ملتی۔ عجب مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ ایک صرف کرشن کی ہمدردی مجھے یہاں میسر ہے مگر اکیلی ہمدردی کیا کر سکتی ہے۔

آپ کا خط ملتے ہی میں نے بمبئی لکھ دیا تھا۔ وہاں سے آج جواب آیا ہے۔ انھوں نے پندرہ روپے بھیجے ہیں، باقی پندرہ وہ اگلے مہینے بھیجیں گے۔ ظاہر ہے کہ وہاں بھی مشکلات پیدا ہو گئی ہوں گی۔ سوچتا ہوں یہ پندرہ میں خرچ کر لوں اور آپ کو کچھ نہ بھیجوں۔ اگلے مہینے جب پندرہ آئیں تو اکٹھے تیس روانہ کر دوں گا۔ کیا خیال ہے آپ کا۔

مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی مدد نہیں کر سکا۔ میں خوفناک طور پر مفلس ہو رہا ہوں۔ اس کا عملی ثبوت میں نے آپ کو دے دیا ہے۔

یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ نے "ڈرپوک" پسند کیا۔ میں علالت کے باعث آپ کا کوئی تازہ افسانہ نہیں پڑھ سکا۔

صفیہ بمبئی گئی ہوئی تھی، اب واپس آگئی ہے۔ آپ کو سلام لکھواتی ہے۔

خط لکھتے رہا کریں۔ یہ زندگی بہت مختصر ہے۔

جواب آل انڈیا ریڈیو کے پتے سے دیجئے گا۔ یہاں خط مجھے آسانی سے مل جاتے ہیں۔

خاکسار

سعادت حسن منٹو

۱۴۔ ایڈلفی چیمبرز
کلیئر روڈ۔ بمبئی ۸
۱۹ فروری ۴۳ء

پیارے ندیم

مجھے معاف کر دینا بھائی۔ میں سخت شرمندہ تھا اسی لئے خط نہ لکھ سکا۔ تمہارے گیت منگوائے، مگر یہاں وہ صاحب ہی غائب ہو گئے جو لینا چاہتے تھے۔ ناچار معذور ہو جانا پڑا۔ میری تقصیر معاف کر دینا۔ میں بہت شرمندہ ہوں بھیا۔

یہاں ہر روز تمہاری باتیں ہوتی ہیں۔ صفیہ کہتی ہے کہ ندیم بھائی کو یہاں اپنے پاس بلا لو۔ میں بھی یہی سوچتا ہوں۔ شاہد لطیف اور عصمت بھی یہی چاہتی ہیں۔ میں نے تمہیں خط بلکہ تار بھیج دیا ہوتا مگر ادھر اس کم بخت گاندھی نے روزہ رکھ لیا اور یہ بات کھٹائی میں پڑ گئی۔

ہاں، تم یہ لکھو کہ لاہور میں تمہارے گزارے کی کیا صورت ہے۔ مجھے تمہاری بہت فکر رہتی ہے۔ خدا وہ دن جلد لائے جب ہم تم دونوں ایک جگہ رہ سکیں۔

ہاں بھئی۔ وہ تم نے ماہنامہ مصور کے لیے جو مضمون شروع کیا تھا بھیجا ہی نہیں۔ پہلا نمبر شائع ہونے میں اب بس کچھ دیر نہیں۔ خدا کے واسطے اپنا مضمون جو کہ شاید گیتوں پر تھا اپنی چند تازہ غزلوں یا نظموں کے ہمراہ فوراً بھیج دو اور مجھے ممنون کرو۔ تمہارے مضمون اور تمہاری غزل کے بغیر پرچہ شائع نہیں ہوگا۔ اس نمبر میں تم اپنے تمام دوستوں کو پاؤ گے۔

نذیر صاحب آداب عرض کرتے ہیں۔
مضمون اور غزلیں جلد بھیجو۔
صفیہ سلام لکھواتی ہے۔

تمہارا بھائی
سعادت

۱۷۔ ایڈلفی چیمبرز
کلیئر روڈ ۔ بمبئی ۸
۱۰ ر مئی ۴۳ء

ندیم بھیا

آپ کا محبت نامہ ملا۔ مجھے آپ کے خلوص پر نہ پہلے کبھی شک تھا اور نہ اب ہے۔ اگر میرے دل میں ذرہ برابر میل بھی آپ کی طرف سے موجود ہوتا تو مجھ سے پہلے آپ کو شاید اس کا علم ہو جاتا۔ میرے دل کی کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی اور نہ میں کسی بات کو چھپانا چاہتا ہوں۔

چند روز ہوئے جبکہ صفیہ بستر علالت پر پڑی تھی، دیوندر ستیارتھی کا ٹیلی فون آیا۔ میں نے اس کو گالیاں دیں۔ میرے دل میں اس کے متعلق جو خیالات بھی تھے ان کا اظہار کر دیا اور اس سے کھلے لفظوں میں کہہ دیا کہ میں تم سے ملنا نہیں چاہتا۔ اس نے اس کے بعد کمال ڈھٹائی سے دو تین مرتبہ پھر فون کیا لیکن میں نے اپنا ارادہ تبدیل نہ کیا بلکہ اس کی اس ڈھٹائی نے مجھے اور متنفر کر دیا۔ اگر وہ جواب میں مجھے گالیاں دیتا اور اس حملے کا جواب دیتا جو میں نے اس پر کیا تھا تو بہت ممکن ہے میں خود اس کے پاس جا کر اپنے یہاں مہمان ٹھہرا لیتا۔ صفیہ نے فون پر میری یہ تمام باتیں سنیں، مجھے برا بھلا کہا لیکن میں نے اس سے کہا کہ میں دل میں نفرت رکھتے ہوئے زبان پر پیار محبت کے الفاظ نہیں لا سکتا۔

یہ واقعہ میں نے اس لئے بیان کیا کہ اگر مجھے آپ سے کوئی شکایت ہوتی تو میں نے سب سے پہلے اس کا اظہار کر دیا ہوتا۔

بات یہ ہے کہ اب میری دماغی حالت میں بہت بڑا تغیر واقع ہو گیا ہے۔ سینکڑوں چیزیں یک وقت سوچنے سے میں افراتفری کے عالم میں رہتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دوران میں میں کوئی قابلِ قدر چیز نہیں لکھ سکا۔

بہت زیادہ شراب پینے لگا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ کچھ لکھوں۔ پی کر بھی لکھ ہی نہیں سکتا۔ دراصل میں اپنے اندر وہ بات ڈھونڈ رہا ہوں جو مجھے کرنا ہے۔ اگر مجھے یہی کچھ کرنا ہے جو میں اب تک کر چکا ہوں تو یہ کچھ بھی نہیں ہے کوئی بڑا کارنامہ نہیں۔ اگر مجھے ایسے ہی افسانے لکھنا ہیں تو پھر میں ایک خاص لائحہ عمل مرتب کر دونگا اور اس کے مطابق کام کر دونگا۔ زیادہ مغز دردی کی کیا ضرورت ہے۔

مگر چھوڑیئے اس قصے کو۔

آپ گانے جلد از جلد بھیجئے۔ میں نے آپکے لئے ہمیشہ کوشش کی ہے اور آئندہ بھی کرتا رہوں گا۔ مصیبت یہ ہے کہ میری کوششوں میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی چیز حائل ہوتی رہی ہے۔ خدا کرے کہ اب نہ ہو۔

کہانی کے چند مناظر ادھر بھیج رہا ہوں۔ اس میں ٹائپ کی بے شمار غلطیاں ہیں مگر آپ فوراً سمجھ لیں گے۔ میرا خیال ہے کہ ان میں ایک گیت کی ضرورت ہے۔ وہ آپ لکھ دیں۔

یہ گیت بھی خاص طور پر اچھا ہونا چاہیئے۔ آپ منظر کو ایک دو بار پڑھیں اور غور کریں تو آپ مطلب کی چیز لکھ سکیں گے۔ سوال و جواب جذباتی قسم کے ہیں جو SITUATION کے ساتھ چسپاں ہو جائیں۔ یاد رکھیئے کہ چھپا ایک لولی لنگڑی عورت ہے اس کو سہارے کی ضرورت ہے لیکن یہ خطرہ بھی لاحق ہے کہ ممکن ہے یہ سہارا جواب نہ دے جائے اور وہ اور زیادہ گہرائیوں میں غرق ہو جائے۔ محبت میں ٹھوکر کھا کر جسم کے ساتھ اس کی روح بھی مفلوج ہو جائے —— دوسری طرف شنکر کو یقین دلانا چاہیئے کہ وہ ایماندار آدمی ہے۔ یہ مضمون آسان اور جذباتی لفظوں میں اگر آپ نے باندھ دیا تو سمجھ لیجئے کہ آپ فلمی گیت لکھنے کا گُر پا گئے۔

صفیہ آپ کے خلوص کی بہت شکر گزار ہے۔ اب اس کی طبیعت اچھی ہے۔ سلام عرض کرتی ہے۔

جونہی مصور کا ماہ نامہ چھپا میں آپ کو نئے پتے سے بھیج دونگا۔ امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔

کرشن چندر مستعفی ہو کر یہاں بمبئی آیا تھا دو روز رہ کر پونہ چلا گیا جہاں وہ ایک فلم کمپنی میں ملازم ہو گیا ہے۔

آپ کا رجسٹرڈ لفافہ مل گیا ہے۔ گیتوں اور کہانی کے متعلق پھر لکھوں گا۔

خاکسار

سعادت حسن منٹو

---

۱۷ ایڈلفی چیمبرز
کلیئر روڈ —— بمبئی ۸
ستمبر ۴۳ء

پیارے ندیم

تم اپنے دل میں خدا جانے کیا سمجھتے ہو گے کہ مجھے کیا ہو گیا ہے حقیقت یہ ہے کہ میں کچھ عرصے سے بہت پست ہمت ہو گیا ہوں۔ کئی بار دل چاہا ہے کہ تمہیں خط لکھوں، بہت ہی مفصل خط لکھوں مگر لکھنے سے طبیعت اچاٹ سی ہو گئی ہے۔ جانے کیوں؟

تمہارے اخلاص پر مجھے ناز ہے میری جان۔ خدا کے لئے دل میں کبھی اس خیال کو جگہ نہ دینا کہ میں تمہیں بھول گیا ہوں۔ تمہاری یاد سے میرا دل ہمیشہ لبریز رہتا ہے۔ اور میں ہمیشہ ایسے موقع کی تاک میں رہتا ہوں کہ ہم تم اکٹھے رہ سکیں۔

تمہاری علالت بہت افسوسناک ہے مگر یہ اور بھی زیادہ افسوسناک بات ہے کہ میں اب کسی کی علالت کے دکھ کو محسوس نہیں کر سکتا [illegible]

[illegible] جسمانی اور روحانی طور پر علیل رہتا ہوں۔ خدا میرے حال پر رحم کرے۔

میں اس کوشش میں ہوں کہ تمہیں یہاں بلا لوں۔ دعا کرو کہ میں اس کوشش میں کامیاب ہو جاؤں۔

شاہد لطیف نے تمہاری علالت کا سنا تو اُسے بہت فکر ہوا۔ وہ تمہیں سلام لکھواتا ہے اور تمہاری صحت کے لئے دعا کرتا ہے۔

صفیہ کچھ دنوں بہت بیمار رہی ہے مگر اب خدا کے فضل سے صحت ہے۔ تمہیں سلام عرض کرتی ہے۔

میں آجکل "فلمستان" میں نوکر ہوں جہاں شاہد لطیف ملازم ہے۔ صبح ساڑھے دس بجے جاتا ہوں اور رات کو گیارہ بارہ بجے لوٹتا ہوں۔ مجھے بتاؤ کہ تم "پھول اخبار" میں کیا کرتے ہو۔ اُسے چھوڑو اور یہاں چلے آؤ۔ مجھے اُمید ہے کہ تم یہاں لاہور سے زیادہ کما لیا کرو گے۔ افسوس تو یہ ہے کہ تم نے آج تک میری نہیں مانی۔

میری صحت اچھی تو نہیں لیکن ٹھیک ہے، یعنی سینے کا درد اب کچھ عرصے سے نہیں ہو رہا۔

امید ہے کہ تم اب بخیریت ہو گے۔ اپنی صحت سے فوراً مطلع کرو۔

ہمیشہ تمہارا

سعادت حسن منٹو

فلمستان لمیٹڈ۔ بمبئی

اکتوبر ۴۷ء

پیارے ندیم

میں سخت شرمندہ ہوں کہ آپ تو مجھ سے اتنی محبت کریں اور میں آپ کے خطوں کا جواب بھی نہ دے سکوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا عذر پیش کروں۔ سوائے اس کے کہ میں بے حد سست اور کاہل ہو گیا ہوں۔

جس روز آپ کے دوست چٹھی لے کر میرے پاس آئے میں اپنے مقدمے کی پریشانیوں میں غرق تھا۔ یہ کمبخت میرا لال نہایت ہی واہیات انسان ہے۔ اس نے مقدمے میں ذرہ برابر دلچسپی نہیں لی چنانچہ نتیجہ یہ ہے کہ صفائی کا کوئی گواہ پیش نہیں ہوا اور فیصلے کی تاریخ مقرر ہو گئی ہے۔ ۲۲ اکتوبر کو حاضرِ عدالت ہونا تھا مگر میں بیمار ہوں۔ نومبر کے وسط میں اگر کوئی تاریخ مل گئی تو چلا جاؤں گا۔ میرا پروگرام یہی ہے کہ لاہور پہنچ کر آپ سے ملوں، کیونکہ آپ کے دوست کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ آپ نومبر میں لاہور آنے والے ہیں۔

یہ سن کر خوشی ہوئی کہ اب پہلے سے آپ کی صحت بہتر ہے۔ خدا آپ کو تندرست رکھے۔

سمجھ میں نہیں آتا مجھے کیا ہو گیا ہے۔ خط لکھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں بیگار کی جسمانی مشقت کر رہا ہوں۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر آدمی لکھے بغیر اپنے خیالات دوسرے تک پہنچا سکتا۔

لاہور آ کر آپ سے مفصل باتیں ہوں گی اور وہیں بیٹھ کر مستقبل کے متعلق کوئی پروگرام بھی سوچیں گے۔ اصل میں اس ایٹم بم نے میری زندگی کو بہت صدمہ پہنچایا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہر شئے فضول ہے۔ مستقبل کے متعلق کیا سوچیں گے۔ میں اس کے متعلق کچھ کہہ نہیں سکتا کیونکہ حال اور مستقبل اب بالکل بے معنی سے ہو کر رہ گئے ہیں۔ بہرحال دیکھئے ہم کیا سوچتے ہیں۔

میں نے ابھی تک کوئی نئی چیز نہیں لکھی۔ ارادہ ہے کہ ساقی کے لئے ایک افسانہ لکھوں۔ صفیہ مجھ سے سخت ناراض ہے کہ میں نے اتنی دیر آپ کو خط نہیں لکھا۔ یہ خط میں اسی کے اصرار پر لکھ رہا ہوں۔ پوسٹ کرنے کا ذمہ اُس نے لیا ہے۔

خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ کے اخلاص کی مجھے ہمیشہ ضرورت رہے گی۔

آپ کا بھائی

سعادت

شخصیات نمبر

کے بارے میں

احباب کے تاثرات

(ابتدائیہ)

شخصیات نمبر، جو میری ایک برس کی محنتوں کا حاصل تھا پڑھے لکھوں کی منڈی میں جب دام لگانے کے لئے لایا تو وہاں بے داد سے اس کا استقبال ہوا ۔۔۔ نہ میں داد سے اچھلا اور نہ بیداد سے آزردہ خاطر ہوا ۔ جنہوں نے میری حوصلہ افزائی فرمائی ۔ ان کا ہمیشہ کی طرح شکر گذار ہوا جو اپنی نفاقی مصلحتوں کی بنا پر خفا ہوئے ان سے ہمدردی پیدا ہوئی ۔

میں نے اعلان کیا تھا کہ طنز نمبر کے بعد شخصیات نمبر (حصہ دوم) شائع کروں گا ۔ یہ وعدہ ایفا نہ ہو سکے گا ۔ ایک تو میں کئے دن ہی نمبر نکال نکال کر نڈھال ہوں ۔ دوسرے حصہ دوم کے لئے میں نے اپنی عادت کے مطابق پھر ایسا لمبا چوڑا پروگرام بنا لیا ہے کہ اسے کسی صورت بھی جلد پیش نہیں کر سکتا جی چاہتا ہے کہ اس نمبر کے بعد اس موضوع پر احتی الامکان کوئی تشنگی باقی نہ رہے ۔ جو نامور اہل قلم پر لکھنے والے موجود ہیں ان سے شخصی نوعیت کے مضامین لکھواؤں اور جن پر اس نوع کا آج کوئی لکھنے والا نہیں ہے ان پر سوانحی انداز کے مضامین لکھوا کر دوسرے حصہ کو اپنا سے اب تک مکمل کر دوں ۔

شخصیات نمبر سے متعلق چند کرمفرماؤں کی آراء کو ان کی اجازت سے پیش کرتا ہوں :-

بابائے اردو :

تسلیم! آپ کی شکایت بجا کہ میں نے آپ کے نئے رسالے پر رائے ظاہر نہیں کی ۔ یہ پوٹ کی پوٹ اکٹھے سات سو صفحے، خدا کی پناہ!! اسے رسالہ کون کمبخت کہتا ہے ۔ یہ تو ایک الرسائل ہے ۔ اس پر اظہار رائے آسان نہیں ۔ اتنی ساری شخصیتیں اور ان پر لکھنے والوں کی شخصیتیں اور پھر ان لکھنے والوں کی شخصیتیں ادھر پر مقالے ایک طومار ہے ۔ یہ نمبر درحقیقت قاموس شخصیات ہے جو مدتوں یاد رہے گا اور لوگ حوالہ اور استناد کے لئے اسے ڈھونڈا کریں گے ۔

آپ کا ہر نمبر کسی خاص موضوع پر ہوتا ہے اور یہ آپ کا کمال ہے کہ ہر موضوع پر اچھے اچھے لکھنے والے آپ کو مل جاتے ہیں مگر تازہ نمبر شخصیات کا سب پر سبقت لے گیا ہے۔

اب صرف آپ کی ایک شخصیت رہ گئی ہے جو عجیب و غریب ہے۔ اس کا لکھنے والا ایک نہیں ہو سکتا کئی ہوں گے۔ عجب نہیں کہ سعد پورا نمبر آپ ہی کی شخصیت پر نکلے۔

عبدالحق

نیاز فتحپوری:

تسلیم! آپ نے سالنامہ پسند فرمایا، خوشی ہوئی۔ لیکن جس وقت نقوش کے سالنامہ کا خیال آتا ہے تو مجھے شرم آتی ہے۔ کہاں شخصیات نمبر جس کا حجم قرآن سے بھی زیادہ ہے اور کہاں علما و اسلام نمبر جو کسی عملی "درود شریف" کی کتاب سے بھی ضخامت میں کم ہے جس وقت میں سوچتا ہوں کہ آپ نے اپنے سالنامہ کی ترتیب میں کتنی روحانی اور ذہنی کوفت برداشت کی ہوگی تو سالنامہ سے زیادہ آپ کے صبر و تحمل کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ شخصیات نمبر پر ماہ کے نگار میں تبصرہ ضرور شائع ہوگا۔

نیاز

عبدالمجید سالک:

"نقوش" کا شخصیات نمبر اردو کے ادبی رسالوں کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ شخصیات کی تعداد، ان کی بوقلمونی، رسالے کی ضخامت، اس کی حسین طباعت غرض ہر چیز طفیل صاحب کی خوش ذوقی، ان کی بے پناہ محنت اور اولوالعزمی کا پتہ دیتی ہے۔ بلاشبہ بعض قابل ذکر شخصیتوں کا تذکرہ حذف ہوگیا۔ لیکن ادب و شعر کی تمام شخصیتوں کا ایک مجلد میں اس طرح جمع کرنا کہ کوئی بھی نہ چھوٹ سکے قریب محال ہے اور طفیل صاحب آخر انسان ہی ہیں۔ کوئی مافوق الانسان ہستی تو نہیں ہیں۔ یہ نمبر اردو زبان کے آئندہ مؤرخین کے لئے قابل قدر مآخذ کا کام دے گا۔ اس لئے کہ ادبا و شعرا کا کلام تو ہر وقت دستیاب ہو سکتا ہے۔ ان کی شخصیتوں کی زندگی کے متعلق معلومات آسانی سے نہیں مل سکتیں۔ اس نمبر نے اس مشکل کو آسان کر دیا۔ یہ طفیل صاحب کا بہت بڑا کارنامہ ہے اور اس کی قدر نہ کرنا پرلے درجے کی سنگدلی ہے۔

سالک

امتیاز علی عرشی (رامپوری)

مکرمی! تسلیم۔ رسالہ نقوش کا شخصیات نمبر ملا۔ اس گراں ارز تحفے کا دلی شکریہ قبول فرمائیے۔ میں نے اس نمبر کو پہلی بار دیکھا تو حیرت میں رہ گیا۔ اور جب اسے پڑھ لیا تو دہشت طاری ہو گئی۔ اللہ اکبر! اتنی شخصیتوں کے متعلق ایسی دلچسپ اور مفید معلومات اتنی کم مدت میں آپ نے جمع کر کے پیش کر دیں کہ میں اسے ادبی کرامت یا معجزہ تو کہہ سکتا ہوں سعی و کوشش کا نتیجہ کہہ کر اس کی غیر معمولی اہمیت کو کم کرنا پسند نہیں کرتا۔ ان ادبی و علمی شخصیتوں میں سے جن جن سے شرف ملاقات حاصل ہے ان کے بارے میں بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں انہیں اب تک زیادہ نہیں جانتا تھا اور جو کچھ جانتا تھا وہ اس سے رہتے ہیں کہیں کم تھا جو اب معلوم ہوا ہے۔ میں نے اپنے بچوں سے کہا ہے کہ اس رسالے کو محفوظ کر لو اور وقتاً فوقتاً اس کے مضامین پڑھا کرو۔ مجھ بوڑھے سے زیادہ تمہارے لئے یہ کارآمد ہے۔ میری درخواست ہے کہ آپ اس کے دوسرے حصے کو ضرور اور جلد شائع فرمائیے۔ یہ ادبی و سیرتی ہر دو لحاظ سے بڑی کامیاب اور مفید کوشش ہے۔ اور جتنا زمانہ آگے بڑھتا جائے گا اس مجموعے کی اہمیت برابر بڑھتی چلی جائے گی۔ بعید نہیں کہ یہ مضامین آپ کو کتابی شکل میں بھی چھاپنا پڑیں۔ یہ اسی کے مستحق ہیں۔ سبحان اللہ! کتنے سنجیدہ کیسے علم افزا کس درجہ عقل آفریں اور کس قدر تجربہ آموز ملا

نقوش میرے دماغ پر اپنا نقش بٹھا رہا ہے تو نہ بے قیمت، مگر بلا محنت خود۔ نہ چندہ ادا کروں گا اور نہ ہتھ الٹھوں گا۔ ان کی بھلائی کے لئے ترقی عمر و علم و صحت جس قدر کہیں کر سکتا ہوں۔ والسلام مع الاکرام۔

احقر

امتیاز علی عرشی

رشید احمد صدیقی:

محترمی تسلیم! نقوش کا شخصیات نمبر بہت اچھا نکلا۔ اتنے بڑے پیمانہ پر جو کام کیا جائے گا ظاہر ہے اس میں کہیں نہ کہیں کچھ نقص بھی راہ پا جائے گا لیکن ان فوائد کو دیکھتے ہوئے جو اس نمبر سے اردو داں طبقہ کو پہونچیں گے وہ کہیں زیادہ بہتر آئیں گے۔ اس نمبر کے گراں بہا ہونے میں شبہ نہیں۔ اردو کے خدمت گذاروں کے بارہ میں بڑی مفید، دلچسپ اور مستند باتیں اکٹھی کر دی گئی ہیں اور آپ اس خدمت اور کارنامہ پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ امید ہے آپ مسرور و مع الخیر ہوں گے۔

خیر طلب:

رشید احمد صدیقی

مالک رام:

مکرم بندہ جناب محمد طفیل صاحب! آداب و تسلیمات۔ میں نے آپ کا شخصیات نمبر دیکھا ہے چشم بد دور، ماشاءاللہ۔ اگرچہ بعض ایسے مضامین شامل ہو گئے ہیں جو چھوڑے جا سکتے تھے لیکن جو کام آپ نے کیا ہے اس کی قدر اردو زبان کا آئندہ مؤرخ کرے گا۔

بعض زندہ شخصیتیں ایسی ہیں جن پر لکھوانے کی ضرورت ہے۔ اطہر پرویز، دل شاہجہان پوری پر لکھوا لیجئے۔ مرحوموں میں ایک اور اضافہ کیجئے، کشن پرشاد کول، اور یہ بھی بتا دوں کہ ابھی چند دن ہوئے ان سے متعلق ایک مضمون مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے ہفتہ وار اخبار صدق جدید میں لکھا تھا۔

بہرحال جو کام آپ نے کیا ہے اس کے لئے مبارکباد قبول فرمائیے۔ والسلام

خاکسار:

مالک رام

سید احتشام حسین:

برادرم طفیل صاحب! تسلیم۔ نقوش کے خاص نمبر کی داد کس طرح دوں۔ میں تو یہی حیرت کرتا ہوں کہ آپ نے یہ سات سو صفحوں کا رسالہ کس طرح شائع کیا، مضامین کس طرح حاصل کئے۔ یہ نمبر اردو ادب کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔

مضامین کے متعلق اس وقت یہی کہہ سکتا ہوں کہ ابھی تک جتنے پڑھے ہیں ان میں سے اکثر پسند آئے۔ مفصل تنقید تو اسی وقت ہو سکے گی جب تمام مضامین پڑھ لئے جائیں گے۔

میری صحت برابر خراب رہتی ہے اور جو کچھ کرنا چاہتا ہوں نہیں کر سکتا۔

مخلص:

احتشام حسین

سید مسعود حسن رضوی:

مکرمی! تسلیم۔ نقوش شخصیات نمبر وصول ہوا۔ دلی شکریہ قبول فرمائیے۔ رسالوں کے خاص نمبر نکلا ہی کرتے ہیں، آپ بھی نکال چکے ہیں۔ لیکن مجھے افسانوی ادب سے زیادہ معلوماتی ادب سے دلچسپی ہے اور آپ نے شخصیات نمبر میں مفید اور مستند معلومات کا اتنا بڑا ذخیرہ فراہم کر دیا ہے کہ اگر اپنی حالت پر قیاس کرنا درست ہو تو کہہ سکتا ہوں کہ اردو کا ہر خادم آپ کا احسان مند ہو گا اور اس قابل قدر تذکرۂ ادبا کو سینے سے لگا کر رکھے گا۔ اس نوعیت کا خاص نمبر نکالنے کے لئے آپ کو کتنی محنت کرنی پڑی ہو گی اس کا تھوڑا سا اندازہ مجھے

اس طرح اور ادبی صرف حضرت نیاز فتحپوری پر مضمون حاصل کرنے کے لئے کتنے خط آپ نے دوڑ کر لکھے لیکن مجھے یقین ہے کہ جب رسالہ چھپ کر سامنے آگیا ہوگا تو آپ نے جتنی محنت کی تھی اس سے زیادہ مسرت ہوئی ہوگی۔ آپ کو اس کامیابی پر مبارکباد دینا تو رسمی ہوگا میرے خلوص کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے احسان مندی کے جذبات کا ہدیہ پیش کروں۔ والسلام! دعاگو،

سید مسعود حسن رضوی

کرشن چندر:

بعد آداب و تسلیم۔ آپ کا شخصیات نمبر بہت خوب رہا۔ ابھی پڑھنا شروع کیا ہے۔ فراق، مجنوں، منٹو، مریم، عباس اور تسنیم کے مضامین پڑھ لئے ہیں۔ مستقل رائے بعد میں لکھوں گا۔ اس وقت تو اس تاریخی کام کے لئے مبارکباد قبول فرمائیے۔

آپ کا: کرشن چندر

ڈاکٹر سید اعجاز حسین:

عزیزی طفیل صاحب! نقوش کا شخصیات نمبر کئی لحاظ سے قابلِ قدر ہے اور آپ مستحقِ مبارکباد ہیں۔ اس شمارے میں ماضی و حال کے ادیبوں کے نجی حالات و ذاتی خصوصیات سے مستقبل کے ادبی مؤرخ کو ایسا مواد بھی مل جائے گا جو ابھی تک دستیاب نہ تھا اور جو نفسیاتی مطالعہ کے لئے بے حد مفید ثابت ہوگا۔ ان ادیبوں پر قلم اٹھانے والوں کے لئے یہ شمارہ چھوٹا موٹا کتب خانہ ہے جس کی وجہ سے آئندہ مضمون لکھنے والوں کو در بدر نہ پھرنا پڑے گا۔ ایک ہی جگہ بہت کچھ حالات مل جائیں گے۔ میں ابھی تک پورا نمبر نہیں پڑھ سکا اس لئے کہ اول تو اس کی ضخامت ایسی ہے کہ جلدی نہیں ختم ہو سکتا دوسرے یہ کہ جن ادیبوں کا ذکر اس نمبر میں آیا ہے ان میں بہت سے جانے پہچانے ہیں۔ دورانِ مطالعہ میں کبھی کبھی یہ غور کرنا پڑتا ہے کہ مضمون نگار فلاں ادیب کے بارے میں ذاتی تاثرات سے مغلوب ہو کر یہ لکھ گیا ہے یا یہ امر واقعہ ہے کہیں کہیں اختلاف رائے سے بھی الجھ کر رکنا پڑتا ہے۔

غالباً آپ کا یہ منشا بھی نہیں کہ افسانے کی طرح اس نمبر کو لوگ بغیر غور کئے پڑھ کر ختم کر دیں۔ بہرحال کچھ ادھر سے کچھ اُدھر سے پڑھ رہا ہوں۔ مجموعی حیثیت سے رسالہ بہت پسند آ رہا ہے۔ کہیں کہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ مضامین لکھنے والے حالات و واقعات کو ادبی مؤرخ یا نقاد یا سوانح نگار کے لحاظ سے نہیں لکھ سکے۔ ادیب کو ممدوح سمجھ کر نثر میں قصیدہ لکھ گئے ہیں۔ کچھ ایسے بھی لکھنے والے اس نمبر میں نظر آئے جو در پردہ اپنی تعریف چاہتے ہیں۔ بار بار اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کاش آپ اعلان کر دیتے کہ اگر موقع ملا تو ایسے مضمون نگاروں کو بھی نقوش میں کسی جگہ دی جائے گی۔ ان پر بھی مستقل مضمون کوئی لکھ دے گا تو شاید ایسے مضمون نگار بے چین ہو کر درمیان میں اپنی تعریف نہ کرتے یا کم کرتے۔ اسی طرح کچھ ایسے بھی مضمون نگار اس شمارہ میں ہیں جو اپنی طرزِ تحریر کو نمایاں کرنے کی دھن میں زیرِ بحث ادیب کے حالات ذہن نشین نہیں ہونے دیتے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کو زیادہ سے زیادہ یہ فکر ہے کہ چاہے اصل ادیب کے حالات و واقعات سامنے نہ آ سکیں لوگ میری طرزِ تحریر کے قائل ہو جائیں۔ برخلاف اس کے جن لوگوں نے سیدھے سادے انداز میں ادیبوں کے حالات قلمبند کر دیئے ہیں وہ اس منشا کو پورا کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں جس کے لئے یہ نمبر نکالا گیا ہے۔

دعاگو: اعجاز

معین الدین احمد ندوی:

مکرمی! السلام علیکم۔ نقوش کا شخصیات نمبر موصول ہوا۔ اس کو دیکھنے سے پہلے یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اتنا کامیاب ہوگا۔ آپ نے ایک بڑا کام انجام دیا۔ طبقات و تراجم مسلمانوں کا خاص فن ہے جس کے ذریعہ انہوں نے مختلف اصنافِ علوم کے ہزاروں

اصحابِ کمال کے حالات محفوظ کر دیئے۔ مگر اردو میں اس کی بڑی کمی تھی اس لئے آپ نے یہ نمبر نکال کر ایک بڑی کمی پوری کی اور نہایت مفید علمی و ادبی خدمت انجام دی ہے یہ نمبر آئندہ مؤرخین کے لئے بڑا کار آمد ہوگا۔ البتہ اس میں بعض ناموں کا اندراج کھٹکتا ہے۔ بہرحال یہ اپنا اپنا ذوق ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک نمبر میں اردو کے تمام اصحابِ قلم کا احاطہ ممکن نہ تھا امید ہے کہ اس میں جو اہم و ضروری شخصیتیں چھوٹ گئی ہیں ان کے حالات دوسرے نمبر میں آ جائیں گے۔ اس طرح دونوں نمبر مل کر اردو کے شعر و تصنیف دونوں کے اس زمانہ تک کے اصحابِ قلم کا جامع تذکرہ مرتب ہو جائے گا۔ والسلام

معین الدین احمد ندوی

ایس۔ اے رحمٰن (چیف جسٹس)

مکرمی! السلام علیکم۔ نقوش کا شخصیات نمبر ملا۔ نقوش کی روش بحر شناسی کے مترادف ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کے انتخابِ شخصیات سے اختلاف ہو لیکن جو خیال اس نمبر کا محرک ہوا ہے نہایت قابلِ قدر ہے۔ اتنی ادبی شخصیات کے ذاتی حالات و کوائف کا یکجا کر دینا میری نظر میں اردو ادب کی ایک بہت بڑی خدمت ہے۔ آپ نے ادیبوں کو دوام بخشنے کی ترکیب سے نقوش کو بھی جریدۂ عالم پر ثبت کر دیا ہے۔

طالبِ خیریت

مخلص ایس۔ اے رحمٰن

خواجہ احمد فاروقی:

محبِ مکرم! شخصیات نمبر ملا۔ دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ یہ آپ نے بڑا کام کیا جو بغیر فراست کے عزم و استقلال کے ممکن نہ تھا۔ یہ خشک مضامین کا مجموعہ نہیں۔ اس میں وہ لطف ہے جو افسانہ میں ہوتا ہے اور وہ بھی

افسانۂ آں شبے کہ با یار گذشت

ریاض کی زبان میں ؎

باہم شبِ وصال اٹھائے ہیں کیا کیا مزے
وہ بھی یہ کہہ رہے ہیں الٰہی سحر نہ ہو

یہ مواد اردو کے مؤرخ کے لئے بہت مفید ہوگا۔ بڑا اچھا ہو کہ آپ نثر کی اس داستان کو ضمیمہ میں مکمل کر دیں۔ ابھی بہت سی اہم شخصیتیں رہ گئیں۔ ڈاکٹر عابد حسین، خواجہ غلام السیدین، قاضی عبدالغفار ـــــ نیاز جیسے رندِ خراباتی پر آپ نے ایک زاہد ریاضتی سے مضمون کیوں لکھوایا؟ تصویریں بھی بہت کم ہیں۔

آپ کا،

خواجہ احمد فاروقی

غلام عباس:

برادرم طفیل صاحب! السلام علیکم۔ نقوش کو دیکھ کر خوشی ہوئی مگر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ صحت مند و توانا کے بجائے موٹاپے کا مریض معلوم ہوتا ہے۔

میراجی، فیض، تاثیر، نیاز فتح پوری سے متعلق مضامین اور خاص طور پر حامد جلال کا اسکیچ "منٹو ماموں" صد درجہ دلآویز اور کامیاب ہیں۔ ان کے علاوہ میں نے ابھی اور کچھ نہیں پڑھا۔ پہلے ہی عسکری، راشد، عزیز احمد، احمد علی، اشک وغیرہم کی عدم موجودگی بری طرح کھٹکتی ہے جسے کوئی ضمیمہ بھی پورا نہیں کر سکتے اور یہ پرچہ بیش بہا مواد مگر بے راہ روی کی عمدہ مثال ہے۔ والسلام

خاکسار،

غلام عباس

آغا محمد اشرف:

مکرمی طفیل صاحب السلام علیکم۔ شخصیات نمبر کی کامیابی پر شکریہ و مبارکباد قبول کیجیے۔ آج تک اردو صحافت میں اس شان سے کسی رسالے نے خاص نمبر نہیں نکالا تھا۔ مضامین کے اعتبار سے یہ نمبر اردو ادب کی انسائیکلوپیڈیا ہے۔

خاکسار:

(آغا محمد اشرف)

شاد عارفی:

محترمی طفیل صاحب السلام علیکم۔ شخصیات نمبر کے متعلق جتنا کچھ بھی کہا جا سکتا ہے وہ اس کی خوبیوں کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ ایک عامیانہ سی بات تو یہ ہے کہ "جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی"۔ مگر اس طرح وہ نہ کہہ سکا جو مجھے کہنا تھا۔ اس لئے کہ میں غالب مرحوم سے مشورہ کئے بغیر جو کچھ کہتا ہوں وہ مجھے خود نہیں بھاتا۔ جب معاملہ یہاں تک پہنچ جاتا ہے تو غیب سے مضامین خیال میں آنے لگتے ہیں اور میں انہیں یوں قلمبند کرنے لگتا ہوں جیسے کہ ان کا تعلق میری ذات سے ہو۔ یہ غالب مرحوم نے ہی تو کہا تھا ؎

حریف مطلب مشکل نہیں فسونِ نیاز — دعا میں خضر کو دیتا ہوں، عمرِ خضر دراز

جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ فضول بات پر بھی عمر ضائع کی جا سکتی ہے۔ اب اگر میں نقوش کو خضر مان لوں اور اسے درازیٔ عمر کی دعا دوں تو اس کے یہی معنی ہوں گے کہ جو کچھ نقوش کو پہلے سے حاصل ہے اس پر طبع آزمائی کر کے میں نے کوئی مفید اور نئی بات نہیں کی۔ ارتقا اگر واقعی کوئی چیز ہے تو اسے نقوش کے ہر نمبر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ کئی بچے ہمارے سامنے جوان ہوتے ہیں مگر اس قدر آہستہ اتنی دھیمی چال سے کہ ان کی بالیدگی اور نمو پر خط نہیں کھینچا جا سکتا۔ لیکن نقوش کا حال اس شریر اور عقلمند نوجوان سے ملتا جلتا ہے جو پتنگ لوٹنے کے شوق میں کئی کئی سیڑھیاں اولانگ کر چھت پر چڑھ رہا ہو۔ کسی بڑے پرانے اور عیاش شاعر کے اس شعر سے بھی نقوش کے کردار پر "ضعیف رائے" جیسی مصوری کی جا سکتی ہے کہ ؎

وہ چال چلنے میں چلبلاہٹ کہ دل کہیں ہے نظر کہیں ہے
کہاں کا اونچا کہاں کا نیچا خیال کس کو قدم کی چاپ کا

اس کے بعد یہی خطرہ رہ جاتا ہے کہ کہیں یہ "جوبن پھٹ نہ پڑے"۔ ادب برائے ادب والے میرے اس فقرے پر کہیں مجھے نہ کوسنے لگیں کیونکہ جنسی بھوکے تو اسی تاک میں لگے رہتے ہیں کہ کوئی جوبن پھٹ پڑے تو وہ اسے اندھیرے میں لوٹنے لگیں۔ اس لئے آپ کو میرا سنجیدہ مشورہ یہ ہے کہ آپ اپنے نقوش کے گردن میں تعویذ ڈال دیں تاکہ وہ فتنے اٹھتے جوبن کے نگہبان ہو جائیں۔

نیازمند،

شاد عارفی

حجاب امتیاز علی:

محترمی طفیل صاحب تسلیم! آپ کو اس نوعیت کا نمبر مرتب کرنے کی خوب سوجھی۔ اس خوش ذوقی اور اپنی محنت و کاوش کے لئے آپ قابل صد ستائش ہیں۔ بہت دلچسپ اور دیدہ زیب نمبر ہے۔ میری دلی مبارکباد قبول کیجیے۔ شاید یہ نمبر اور بھی دلکش اور مفید ہو جاتا اگر بعض شخصیتوں پر کئی کئی مضمون نگاروں سے طبع آزمائی کی فرمائش کی جاتی۔ ہر ایک کی اپنی اپنی نظر اور اپنا اپنا خیال ہوتا۔ پھر تماشا یہ کہ ایک ہی شخصیت میں قوس و قزح کی کئی رنگینیاں نظر آ جاتیں اور یہ بھی واضح ہو سکتا کہ جدید سوانح نگاری کیونکر تخلیقی انداز اختیار کرتی جاتی ہے

میں نقوش کا شخصیات نمبر دیر تک پڑھتی اور سنتا ہوتی رہی کہ اچانک میری نظر سے ایک مضمون کی چند ایسی سطور گذریں جنہیں پڑھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ ۱۹۵۶ء میں اس قسم کی ناشائستہ بات کسی تعلیم یافتہ شخص کے قلم سے نکل کر نقوش جیسے ترقی پسند اور معیاری رسالے میں شائع ہو سکتی ہے۔ وہ یہ کہ صفحہ ۲۴۳ کی ساتویں سطر میں ایک مضمون نگار نے لکھا ہے کہ "شاید اسی وجہ سے عورتوں کو ناقص العقل کہا گیا ہے"۔ نادان مضمون نگار نے یہ جملہ کس بے نیازی اور جرأت سے لکھا ہے جیسے ان کی عمر عزیز مرد و عورت کی ذہنیت پر ریسرچ کرتے گزر گئی ہے۔

حجاب امتیاز علی

فکر تونسوی

پیارے طفیل! تمہارا شخصیات نمبر مل گیا۔ دیکھنے میں بڑا بھی آیا اور پیارا بھی۔ نہ جانے تم اردو ادب میں طوفان برپا کرتے پر کیوں مائل ہوتے جا رہے ہو۔ یہاں جس نے بھی یہ نمبر دیکھا للچائی ہوئی نظریں ڈالیں۔ یہ نظریں تمہاری اس پروڈکشن کی عظمت کا گویا خاموش اعتراف کر رہی تھیں۔

کہو اب کیا ارادے ہیں؟

فکر تونسوی

ابن انشا:

برادرم طفیل صاحب! اسلام۔ شخصیات نمبر کے متعلق میں نے مخدومی مولوی عبدالحق سے پوچھا تھا کہ آپ کے زمانے میں یا اب سے پہلے اس زبان میں ایسی چیزیں شائع ہوتی تھیں؟ انہوں نے اس پر آپ کی محنت اور سلیقے کی داد دی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ہے بھی بڑا کام۔ میں نے نقوش پر موافق اور مخالف ریویو دیکھے ہیں۔ تقابات کے متعلق اختلاف رائے کی ہمیشہ گنجائش رہتی ہے۔ آپ نے جن لوگوں کو چھوڑ دیا ہے ان میں سے بعض کے نام واقعی کھٹکتے ہیں خواہ وہ قاضی عبدالغفار ہوں یا مجاز، عدم ہوں یا سیف، خیر ان میں سے سب کی نہیں تو بعضوں کی تلافی آپ دوسرے نمبر میں کر دیں گے ——— لیکن جن لوگوں کو زبردستی آپ نے شخصیت بنا دیا ہے ان کو نکالنے کے لئے بھی آپ کوئی الگ نمبر چھاپیں گے؟ قرۃ العین نے بہت اچھا لکھا ہے کہ شخصیت تو یا مولانا مودودی کی ہے یا بیگم رعنا لیاقت علی خاں کی، لیکن وہ مذاق کی بات ہے۔ آپ کو اس معاملے میں تھوڑی سی سختی برتنی چاہئے تھی۔ بہرحال میں ایڈیٹر اور اس کے ماحول کی مجبوریاں جانتا ہوں۔ انسان کے ہر کام میں اتنی سی مجبوری یا خرابی تو رہتی ہی ہے۔ بہر صورت یہ بہت بڑا کام تھا اور آپ ہی کے کرنے کا ——— واقعی حیرت انگیز کارنامہ ہے۔

ابن انشا

فارغ بخاری:

طفیل بھیّا! شخصیات نمبر بڑا وقیع ہے اور آپ کا ایسا کارنامہ ہے جو مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں بعض مضامین تو بے پناہ ہیں لیکن مجھے حامد جلال اور ایلس فیض کے خاکے بہت پسند آئے۔ اس نمبر کا دوسرا حصہ شائع کرنے کا جو آپ نے ارادہ ظاہر کیا ہے اس سے بہت سی بدگمانیاں رفع ہو گئی ہیں اور اس نمبر پر جو تھوڑے بہت اعتراضات وارد ہو سکتے تھے ان کی اب گنجائش نہیں رہ جاتی کیونکہ توقع ہے اس نمبر میں جو کمی رہ گئی ہے دوسرے نمبر میں آپ اسے پورا کرنے کی طرف خاص طور سے توجہ دیں گے۔ مثلاً ایک ساطری کمی تو یہی ہے کہ سرحد کی ادبی شخصیات کے ذکر سے یہ نمبر محروم رہ گیا ہے۔

مخلص:

فارغ بخاری

جیلانی بانو

مکرمی!

"نقوش" کا شخصیات نمبر ملا۔ شکریہ!

آپ کے حوصلوں کی داد دینا تو چھوٹا منہ بڑی بات لگتی ہے لیکن کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی پڑے گا۔ یہ نمبر اتنا مکمل ہے کہ اس میں دوسرے کمی کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ البتہ چند نام نظر نہیں آتے جو ایک طرح سے کافی اہم ہیں لیکن حصہ دوم میں یہ کمی بھی پوری ہو ہی جائے گی۔ شخصیات میں جو دلچسپی ہے وہ اس نمبر کو اور دلچسپ بنا رہی ہے۔ اس کے علاوہ یہ نمبر اتنا بڑا ادبی سرمایہ ہے جو ہمیشہ نقادوں کے پیش نظر رہے گا۔ ادھر چند برسوں میں نقوش نے اردو ادب میں وہ کام کیا ہے جس نے اسے "نقش جاوداں" بنا دیا ہے۔ ترتیب اور خوبصورتی کمی بے مثل ہے لیکن ٹائیٹل اتنا اچھا نہیں جتنا مکمل "غزل نمبر" کا تھا۔

جیلانی بانو

مختار صدیقی:

شخصیات نمبر شائع کر کے "نقوش" نے ہر حلقہ میں بحث کی راہیں کھول دی ہیں۔ افسانہ، غزل وغیرہ پر مواد اور ضخامت کے اعتبار سے منفرد نمبر شائع کرنے میں "نقوش" پہلے ہی سے اردو رسائل میں امتیازی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔ اب کے نقوش نے اس صدی بلکہ گذشتہ صدی کے ربع آخر کی علمی اور ادبی شخصیتوں کے بارے میں ذاتی حالات اور ان کے شخصی خاکوں کو ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کام اپنی جگہ بڑا اہم بے حد دلچسپ اور مفید ہے۔ اس سلسلے میں جو مشکلات پیش آسکتی تھیں نقوش کا یہ شمارہ بالواسطہ طور پر ان کی بھی نشان دہی کرتا ہے۔

"شخصیات" کا موضوع فی نفسہ بے حد نازک اور کٹھن موضوع ہے۔ ویسے تو ہر شخص کی شخصیت میں دلچسپی کے رنگا رنگ پہلو مخفی ہوتے ہیں اور ان پہلوؤں میں فکر و تامل کے سامان تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ تاہم بڑی بڑی علمی اور ادبی شخصیتوں کے تحریری کارناموں کا مطالعہ ہی یہ جاننے کی خواہش پیدا کر دیتا ہے کہ یہ لوگ جو شعر و ادب یا علمی تحقیق میں اتنے بلند مرتبہ ہیں بحیثیت انسان کے کیا کچھ ہوں گے اور کیسے ہوں گے۔

ظاہر ہے کہ عام انسانوں کی سطح سے ان "بلند" یا کم سے کم مختلف لوگوں کی شخصیت کو الفاظ میں اجاگر کرنا اور پھر ان شخصیتوں کا ہمہ گیر اور بھرپور جائزہ لینا بے حد مشکل کام ہے۔ اس کے لئے گہری نظر، بے لاگ رائے، موضوع کے ساتھ گہری واقفیت اور پھر ہمدردی کے علاوہ انسان شناسی کا گہرا سلیقہ درکار ہے۔ شخصی خاکہ لکھنے کے لئے اس شخصیت کے دل و دماغ سے گہری واقفیت ہی کافی نہیں بلکہ وہ "دیدہ دوری" بھی چاہئے جو انسان کو صاحب نظر کہلواتی ہے۔ شخصیت نگاری یہی نہیں کہ زیر نظر شخصیت کے ذاتی سوانح، اس کی علمی اور ادبی اہمیت، کارناموں اور زندگی میں اس کے عام رکھ رکھاؤ یا عام چلن کا تذکرہ کر دیا جائے۔ علمی اور ادبی شخصیتیں نفسیاتی اعتبار سے بے حد پیچیدہ شخصیتیں ہوتی ہیں۔ ان میں عام انسانوں کی کمزوریوں اور خوبیوں کے پردوں کے پیچھے بہت کچھ پنہاں ہوتا ہے۔ ان کی مخصوص ذہنی تحریکات، دماغی ہیجانات، واقعات اور معاملات کا ردعمل، ان کی زندگی کے مشاہدات اور تجربات، غرض ان کا ظاہر و باطن ہر لحاظ سے ان کی شخصیت کا ایک ایسا پہلو ہوتا ہے جس کی آئینہ داری لازمی ہے ـــ ظاہر ہے کہ ظاہر و باطن کے اس متوازن تذکرے کو ہی ایک اچھا شخصی خاکہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

نقوش کا شخصیات نمبر اس لحاظ سے ضرور قابل قدر ہے کہ ہمارے ادب میں شخصیت نگاری پر بہت کم مواد موجود ہے۔ شخصیتوں کے قلمی چہروں، ان کے طبعی خصائص اور ان کے کردار پر ہمارے قدیم تذکروں میں تو الّا ماشاء اللہ ہی کچھ چیزیں ملیں گی۔ مالبتہ اس سلسلے میں آب حیات نے بڑی کمی پوری کی ہے۔ ویسے خالصتاً شخصیت نگاری پر اردو میں چند ہی چیزیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں مرزا فرحت اللہ بیگ کا مضمون "مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی" مولوی عبدالحق کی کتاب "چند ہم عصر" رشید احمد صدیقی کا شاہکار "گنج ہائے گراں مایہ" اور بعض متفرق مضامین اور شوکت تھانوی کی "شیش محل"

... حسن صورت اور ... تھے" از سعادت حسن منٹو خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ منٹو نے ادب میں شخصیت نگاری ہی کا نہیں افسانہ کی ... مثالیں اور ان میں فلمی ستاروں کی بھرمار ہے جو گاندھی اور جناح اور ... سے بڑے ہیں اور قومی شہرت کے لوگ بھی ہیں جنہوں نے اس فن کو انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیا ہے۔

ہمارے ادب کے کامیاب شخصیت نگاروں میں سے پروفیسر رشید احمد صدیقی اور شوکت تھانوی بھی نقوش کے اس نمبر میں شخصیت نگار اور موضوعِ سخن دونوں حیثیتوں سے موجود ہیں۔ ویسے بڑے بڑے نامور لوگوں پر بڑے بڑے نامور اہلِ علم اور صاحبِ قلم لوگوں نے لکھا ہے۔ ان کے علاوہ چند ایسے بھی شخصیت نگار ہیں جو ادب میں جانے پہچانے نہیں اور وہ اپنے موضوعِ سخن کے یا تو رشتہ دار ہیں مثلاً بیگم اخلاق حسین جنہوں نے اپنے بزرگ والد چودھری محمد علی ردولوی پر مضمون لکھا ہے یا اپنے موضوعِ سخن کے ساتھ گہرے تعلقات رکھتے ہیں مثلاً ابوالخیر مودودی صاحب جنہوں نے نیاز فتح پوری جیسی دلچسپ اور متنازعہ قسم کی شخصیت پر قلم اٹھایا ہے۔

کل ۶۷ کے لگ بھگ شخصیتیں ہیں جو اس "شیش محل" میں ہیں۔ وہ جھلکیاں ان کے علاوہ ہیں جو شوکت تھانوی کے قابلِ قدر مضمون "لکھنؤ کی چند ادبی شخصیتیں"، شاہد احمد دہلوی کے مضمون "دلی کی چند ادبی شخصیتیں" اور پروفیسر عابد علی عابد کے مضمون "لاہور کی چند ادبی شخصیتیں" اور "دکن کی چند ادبی شخصیتیں" (از محترمہ قطب النساء ہاشمی) میں جلوہ گر ہیں۔ شخصیتوں کے اس شمارہ میں سرِفہرست مولانا محمد حسین آزاد ہیں اور اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ شاد عظیم آبادی، جلال لکھنوی، استاد داغ، امیر مینائی، رتن ناتھ سرشار، پنڈت چکبست، سرور جہان آبادی، دیا نارائن نگم، نواب نصیر حسین خیال، رضا علی وحشت، اکبر الہ آبادی، عبدالرزاق صاحب "البرامکہ" اور ایسے کئی نامور لوگوں کو نہ جانے کیوں چھوڑ دیا گیا ہے۔

یہ تو بزرگوں کا حال تھا۔ اس صدی کے اوائل اور وسط کے بعض اہم لوگوں مثلاً خوشی محمد ناظر اور حفیظ شاہ دین ہمایوں کا بھی نام نظر نہیں آتا۔ معاصر ناموروں میں کئی لوگوں کے علاوہ ن۔م۔ راشد اور اپندر ناتھ اشک وغیرہ کا نام بھی کہیں نظر نہیں آتا۔

ان شخصی مرقعوں میں غالباً سب سے کمزور وہ مرقعے ہیں جو پرانے دوستوں نے اپنے نامور ادیب دوستوں کی شخصیت کے کھینچے ہیں۔ ایک استثنا مسعود قریشی کا مطالعہ ہے "ممتاز مفتی" کے متعلق جو بڑا بھرپور، بے حد گہرا اور نہایت چابکدستی سے مفتی کے کردار کے بنیادی تضاد، ان کی جدت طرازی اور ساری خوبیوں اور ان کی کمزوریوں پر حاوی ہے۔ مگر اس بے تکلف شناسائی اور قدیم یگانگت کا غالباً سب سے افسوسناک مظاہرہ محمد خالد صاحب کا مضمون "شفیق الرحمن" ہے جس میں شفیق الرحمن سے اپنی بچپن کی دوستی کے تذکرے ہیں۔ ان کی فوجی زندگی کا ذکر ہے۔ ان کی ڈاکٹری اور کھیلوں سے شغف کی طرف اشارے ہیں اور ان باتوں کا تذکرہ ہے جو یار لوگوں نے محمد خالد کو کبھی شرارتاً بتائی ہوں گی جس کا تحریر میں لانے کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ان "سربستہ رازوں" کو فاش کر کے خالد صاحب خود اپنے نام کی تشہیر چاہتے ہیں۔ کیونکہ ان باتوں سے شفیق الرحمان کی شخصیت کا کوئی اہم پہلو اجاگر نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ (اگر یہ باتیں سچ مان لی جائیں) یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک کھلنڈرے اور البیلے نوجوان نے ہر نوجوان کی طرح کچھ "دل پھینک" بننے کی کوشش کی تھی۔ اس مضمون کا سب سے کمزور پہلو یہ ہے کہ آخر میں خالد صاحب نے شفیق الرحمن کو اپنے فن اور موضوعِ فن کے بارے میں مشورے بھی دئے ہیں اور کچھ امیدیں بھی ان کے مستقبل سے وابستہ کی ہیں۔ شخصیت نگاری سے اس کا جو واسطہ ہے وہ ظاہر ہے۔ کیونکہ اگر شخصیت نگاری یہی ہے تو پھر پند نامہ فریدالدین عطار اور حدیقۂ حکیم سنائی اور اخلاقِ جلالی بھی شخصیت نگاری کے شاہکار ہیں۔

لیکن اس شمارے میں شخصیت نگاری کے عمدہ نمونے بھی موجود ہیں اور ان کو پڑھ کر ان جلیل القدر ادبی اور علمی شخصیتوں کے خصائص و کردار اور ان کے ظاہر و باطن کی نہایت خوبصورت تصویر سامنے آجاتی ہے جن کے ادبی اور علمی کارناموں تک ہی عام قارئین بلکہ اکثر بڑے بڑے لوگوں کی رسائی رہی ہے۔ اس کی مثالیں کچھ تو وہ نہایت مختصر جھلکیاں ہیں جو لاہور، لکھنؤ، دلی اور حیدر آباد دکن کی نامور شخصیتوں پر سید عابد علی عابد،

[illegible] سب سے [illegible]

کے مقابلہ [illegible] ہے۔ اس کے علاوہ [illegible] ڈاکٹر سید عبداللہ کا مضمون ایک گوشہ نہیں مگر [illegible] شخصیت کے [illegible]

عکاسی ہے [illegible] عباس حسینی کا مضمون [illegible] عبادت بریلوی اور ڈاکٹر ذاکر حسین کا [illegible]

مضمون اور شاہد احمد دہلوی کا [illegible] عنایت اللہ مرحوم کے تاثرات سر سید احمد کے متعلق [illegible] حیثیت رکھتے ہیں

مجموعی طور پر نقوش کا یہ نمبر اس لحاظ سے بھی قابل قدر ہے کہ اتنے بڑے پیمانے پر ہمارے ادب میں یہ پہلی کوشش ہے [illegible]

اور [illegible] کی جو کمی ہے [illegible] نقش ثانی میں [illegible] کیا جا سکتا ہے۔

مختار صدیقی

اختتامیہ

(۱) شخصیات نمبر اردو رسائل کی تاریخ میں جاودانی حیثیت رکھتا ہے۔

(۲) شخصیات نمبر بیش بہا مواد مگر بے راہ روی کی عمدہ مثال ہے۔

(۳) شخصیات نمبر کی قدر آنے والا دور کرے گا۔

(۴) شخصیات نمبر اردو ادب کی انسائیکلو پیڈیا ہے۔

(۵) شخصیات نمبر جانبداری کی بہترین مثال ہے۔

(۶) شخصیات نمبر کی قدر نہ کرنا پرلے درجہ کی سنگدلی ہے۔

(۷) نقوش ابوالرسائل ہے ———

وغیرہ وغیرہ!



بچوں کو ہر روز گندگی کے
جراثیم سے ہمیشہ
رہتا ہے۔
لائف بوائے سے ان جراثیم کو
ان کے جسم سے دھو کر دور
ان کی حفاظت کیجئے
لائف بوائے کا "صحت مند
جھاگ" ان کی تندرستی کی
حفاظت کرتا ہے۔
لائف بوائے
صابن
ہر روز کی گندگی کے جراثیم سے
آپ کی حفاظت کرتا ہے
LIFEBUOY

سرکنڈوں کے پیچھے

سعادت حسن منٹو

کی زندگی میں یہ آخری کتاب چھپی تھی

اِس میں

کچھ افسانے غیر مطبوعہ اور کچھ مطبوعہ ہیں

یہ کتاب منٹو کی بہترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس لئے کہ اُن دنوں منٹو کا فن اپنی عظمت کی آخری سرحدوں تک پہنچ چکا تھا

آنچل	احمد ندیم قاسمی	۳/-	غزالہ	شوکت تھانوی	۴/-
[illegible]	نیاز فتحپوری	۲/۸	قاضی جی (دو حصے)	〃	۷/-
رخسانہ	حبیب اشعر	۲/-	سسرال	〃	۲/۴
جانِ عالم	شرر لکھنوی	۲/۴	جوڑ توڑ	〃	۴/-
معزز میم کے نام	ڈاکٹر تاثیر	۲/۸	سودیشی ریل	〃	۳/-
قول و قرار	عدم	۲/۸	مضامین شوکت		۳/-
اصحاب کہف	نیاز فتحپوری	۱/۱۲	سانچ کو آنچ		۳/۸

منٹو کے خطوط یہ خطوط وہ ہیں۔ جو منٹو نے احمد ندیم قاسمی کے نام لکھے۔ ان خطوط سے منٹو کی پوری زندگی مرتب کی جا سکتی ہے

ادارہ فروغ اردو۔ لاہور

محمد طفیل پبلشر و ایڈیٹر نے اشرف پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا۔

ٹیلیفون نمبر ۵۳۵۲۵

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۱۲

زندگی آمیز و زندگی آموز ادب کا نمایندہ

نقوش

۱۲۰

جنوری ۱۹۷۶ء

مُدیر

محمد طفیل

ماتم یک شہر آرزو

مقالے

تبصرے

محمد طفیل پرنٹر و پبلشر و ایڈیٹر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغ اردو لاہور سے شائع کیا

طلوع

ہم نے دنیا کے ادب کو گماں کے پی رکھا ہے۔ بڑے متمدّن ہیں صاحب!

کہتے ہیں کہ انسانی زندگی کے مدارج یوں طے ہوئے۔ مثلاً جمادات، نباتات اور حیوانات!
— داستان لمبی ہے۔ اسے نہیں چھیڑتے۔ لیکن وہ جو ایک مردِ قلندر نے سکوتِ لالہ و گُل سے کلام کا مشورہ دیا تھا وہ بلا وجہ نہ تھا۔

کبھی آپ نے چھوئی مُوئی کی بُوٹی کو دیکھا ہے؟ غیرت کا سمبل! — اُسے مرد چھُو لے تو وہ مارے لاج کے مُرجھا جاتی ہے۔ عورت چھُولے تو مزید کھِل اُٹھتی ہے۔ یعنی وہ حِس رکھتی ہے محسوس کرتی ہے۔ غیر محرم کو برداشت نہیں کرتی۔

اسی طرح ایک پھول ہے سُورج مُکھی! رفاقت کا سمبل! — وہ سورج سے توانائی حاصل کرتا ہے جب سورج طلوع ہوتا ہے تو وہ بھی سر اُٹھاتا ہے۔ جیسے جیسے سورج ابھرتا چلا آتا ہے۔ وہ بھی تنتا چلا جاتا ہے۔ صبح کو پھول کا رخ مشرق کی جانب ہوتا ہے۔ جیسے جیسے سورج مشرق سے مغرب کی جانب سفر کرتا ہے ویسے ویسے وہ بھی مشرق سے مغرب کی جانب مُڑتا چلا جاتا ہے اور جب سورج غروب ہونے لگتا ہے تو وہ بھی مرجھانا شروع کر دیتا ہے تا آنکہ غروبِ آفتاب کے وقت گردن ڈال دیتا ہے۔

آپ نے بیر کے درخت کو کبھی دیکھا ہوگا۔ اثر پذیری کا سمبل! — اگر بیری پھل نہ دے رہی ہو تو سورج گرہن کے دوران اس کے پاس کھڑے ہو کر دو آدمی اگر جھوٹ موٹ کبھی مکالمے بول دیں یعنی ایک یہ کہے کہ بیری پھل نہیں دے رہی اسے کاٹ دینا چاہیے۔ دوسرا کہے نہیں کاٹنا چاہیے آئندہ برس ضرور پھل دے گی تو وہ آئندہ برس پھل دینے لگ جاتی ہے۔ اُس پر گفتگو کا اثر ہوتا ہے۔

یہاں پر تشکیک زدہ ذہن کچھ سوچتا ہے۔ لیکن جواب وہی ملتا ہے۔ ہم تو جناب بڑے متمدّن ہیں۔ ہم نے تو دنیا کے علوم کو گھول کے پی رکھا ہے — اور سکوتِ لالہ و گل سے —

حالانکہ ہم تو بوٹی بھی نہیں۔ ہم تو پھول بھی نہیں۔ ہم تو درخت بھی نہیں!

محمد طفیل

ہم قلم

کرشن چندر

میں بُرائی کرنے کے موڈ میں ہوں۔ خاص کر دوستوں کی بُرائی۔ عمر کے جس حصّے میں میں ہوں۔ اُس میں یہی عارضہ لاحق رہتا ہے۔

آج صبح سے تُلا بیٹھا ہوں کہ اپنے دوست محمد طفیل مدیر نقوش ساکن لاہور پاکستان کی بُرائی کروں۔ مگر جس آدمی میں کوئی بُرائی ہی نظر نہ آئے۔ اُس کی کوئی بُرائی بھی کرے تو کیا کرے۔ حالانکہ یہ بات محمد طفیل کے حق میں نہیں جاتی۔ کیونکہ عیوب ہی سے انسان کی شخصیت دلچسپ بنتی ہے۔ نیکی ہمیشہ بور کرتی ہے۔ کہتے ہیں کہ عیوب سے خالی ذات صرف اللہ ہی کی ہے۔ اس لئے محمد طفیل میں بھی بہت سی بُرائیاں ضرور ہوں گی مگر آدمی کائیاں ہے۔ اپنی بُرائیوں کو اس طرح بھینچ بھینچ کر دل کے نہاں خانے میں چھپا کے رکھتا ہے۔ جہاں کسی قریبی سے قریبی دوست کا بھی گزر ممکن نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جب کبھی وہ اپنے آپ کو اکیلا دیکھ پاتا ہو تو دل کے خفیہ لاکر کو کھول کر اپنی بُرائیاں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہو۔

ذخیرہ اندوزی اس کی پرانی عادت ہے۔ ثبوت یہ ہے کہ نقوش کے ضخیم نمبر موجود ہیں۔ میں نے نقوش کے لیے خصوصی کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ کیونکہ اس کمبخت رسالہ کا ہر نمبر ہی خصوصی ہوتا ہے۔ کسی دن اُس لاکر کی کنجی اگر مل گئی تو طفیل کی ساری بُرائیاں طشت از بام کر دوں گا۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ موقع موقع سے اپنی بُرائیوں کو دھوپ دکھانی چاہیے۔ ورنہ بُرائیوں میں دیمک لگ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ پھر وہ دوست ہی کیا جو بُری صلاح نہ دے!

خوش قسمتی سے میرا شمار بھی طفیل کے طفیلیوں میں ہی ہوتا ہے۔ گو کہ یہ بات طفیل کو معلوم نہیں۔ طفیل کی ظاہری شکل و صورت کا کیا کہوں کہ بالکل اپنے رسالہ نقوش کی طرح گراں ڈیل اور بھاری بھرکم ہے۔ وہی سنجیدگی، وہی وقار۔ جس سے جی اُلجھتا ہے۔ طفیل کو چھپایئے نقوش کو نکال لیجئے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ ذات باری نے طفیل کو نقوش کے لئے پیدا کیا یا نقوش کو طفیل کے لئے تولد کیا۔ بہرحال دونوں ایک دوسرے کے لئے زندہ ہیں۔ کسی نے جڑواں بھائیوں میں بھی ایسی یکسانیت نہیں دیکھی ہوگی اور نہ ایسی محبت۔ اگر کبھی نقوش کے کسی نمبر کے صفحات کی تعداد ایک ہزار سے کم ہو تو طفیل کی صحت کے بارے میں اندیشے لاحق ہونے لگتے ہیں اور اب تو جب سے مجھے قلب کا عارضہ لاحق ہوا ہے۔ ڈاکٹروں نے مجھے کتابوں کی الماری سے نقوش اٹھا کر لانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا ہے۔ اب اگر مجھے نقوش پڑھنا مقصود ہے تو ایک ملازم آئے گا اور وہ بے چارہ جیسے تیسے کر کے ہانپتا کانپتا نقوش کا نمبر اٹھا کر میرے سامنے لائے گا اور اُسے میرے مطالعے کے لئے لکڑی کی رحل پر رکھ دے گا۔ صفحات اُلٹتے جایئے طفیل کے دل و دماغ کی تہیں خود بخود کھلتی جائیں گی کہ ان دنوں پاکستان کے اُردو ادب میں کیا ہو رہا ہے؟ تمام مواقع، حادثے، رونمائیاں، رسوائیاں، دوستوں کے ٹھٹھے، تخلیقات کے ہجوم، وہ سب آپ کو گھیر لیتے ہیں اور جس دن گھر میں نقوش وارد ہوتا ہے کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے۔

طفیل کسی قدر خودرس بلکہ کنجوس بھی ہے۔ ۱۹۶۱ء میں جب وہ لاہور سے دلّی میرے ہاں آیا تو میرے لئے گوجرانوالہ کے مالٹوں کی ایک پیٹی لایا۔ حالانکہ احمد ندیم قاسمی کو لا سکتا تھا۔ میرزا ادیب کو لا سکتا تھا۔ عبدالمتین عارف کو لا سکتا تھا۔ ابن انشا کو لا سکتا تھا۔ حامد علی خان، صلاح الدین احمد اور نذیر چودھری کو لا سکتا تھا۔ اور اسے کرنا بھی کیا تھا۔ ان سب دوستوں کو جن کے میں نے نام لئے اور اُن تمام احباب کو جن کے میں نے نام نہیں لئے ان سب کو مکھی بنا کر ایک چھوٹی سی ڈبیا میں بند کرکے لے آتا۔ نہ کسٹم کا ڈر نہ ویزا کا خوف۔ یہاں اگر یہ منتر پڑھتے، ڈبیا کھولتے تو وہ سب لوگ ہم میں موجود ہوتے، وہ ہمنفسانِ رفتہ اور یارانِ دل گرفتہ اور وہ سب جو ہمارے اور ان کے پیارے ہیں اور وہ سب جو خدا کو پیارے ہوئے اور وہ سب جن کو ہم نے گویا صدیوں سے نہیں دیکھا، ان سب سے ہم گلے مل لیتے۔ طفیل سے اتنا بھی نہ ہوا۔ اس لئے کہ وہ جب میرے گھر کے آنگن میں مجھ سے بغل گیر ہوا تو اتنی دیر تک نہ صرف اس کے سینے بلکہ لاہور کے دوسرے تمام احباب کے سینوں کی حرارت مجھ تک پہنچتی رہی اور جب میں نے اس سے اکیلے آنے کا سبب پوچھا تو اپنے مخصوص نیم سنجیدہ اور نیم شریر لہجے میں وہ بولا۔ کس کس کو ساتھ لاتا۔ بھئی وہ سب تو بوڑھے ہو چکے ہیں۔ میں نے کہا۔ جھوٹ مت بولو۔ لاہور میں رہ کر کوئی بوڑھا نہیں ہو سکتا۔ وہ میرا سدا بہار جگمگاتا ہوا فانوس بدن شہر اپنی لافانی جوانی کے لئے مشہور رہا ہے۔ اس شہر میں رہ کر اگر کوئی بوڑھا ہوتا ہے تو بہتر ہے کہ وہ اس شہر کو چھوڑ دے اور منڈی بہاؤالدین، بستی چھیڑاں والا اور چک نمبر چار سو بیس میں جاکر سکونت اختیار کرے مگر لاہور کے نام کو بٹہ نہ لگائے۔ اس پر وہ مجھ سے قہقہہ لگاتے ہوئے پھر بغل گیر ہوا اور بولا۔ نہیں! میرے سب دوست جوان ہیں اور خوش ہیں اور خیریت سے ہیں اور اس مالٹے کی پیٹی میں ان سب کے خلوص کی خوشبو بھری ہوئی ہے۔

مجھ پر کبھی کبھی جھک چڑھتی ہے تو بمبئی چھوڑ کر دلّی چلا آتا ہوں۔ اس لئے کہ لاہور تو جا نہیں سکتا۔ سوچتا ہوں کہ ہمیشہ کے لئے فلمی دنیا کو خیرباد کہہ دوں گا اور اپنے آپ کو ادب کے لئے وقف کر دوں گا۔ کبھی چھ مہینے اور کبھی سال بھر دلّی میں رہتا ہوں اتنے میں وہاں کے پبلشر مجھ سے اوبھ جاتے ہیں، وہ میری تہی دستی اور میں اُن کی بالادستی کا قائل ہونے لگتا ہوں اور پھر دلّی چھوڑ کر واپس بمبئی کی فلمی دنیا میں لوٹ آتا ہوں۔ ایسا دو تین بار کر چکا ہوں۔

اب کے جو طفیل سے دلّی میں ملاقات ہوئی تو میں بے حد تفریحی موڈ میں تھا۔ طفیل مسز ممتاز مرزا کے ہاں ٹھہرے تھے مگر تقریباً اُن سے ہر روز ملاقات رہتی تھی۔ وہ نو دس دن ایسی ہماہمی میں گزر گئے کہ کچھ اندازہ ہی نہیں ہوا اُن نو دس دنوں میں میں لاہور میں رہا اور وہ دلّی میں رہے۔ اور ایک ایک کرکے انہوں نے اپنے تمام دوستوں کو ڈھونڈھ نکالا اور اپنی خرابیٔ صحت کے باوجود اُس نے ہم سے زبردست دعوتیں کھائیں۔ معلوم نہیں کیا بات ہے جو مزا زبردستی کی دعوت میں ہے وہ اُن ملاقاتوں اور دعوتوں میں بھی نہیں ہوتا جہاں خود اصرار سے بلائے اور مدعو کئے جاتے ہیں شام کو اکثر ہم کہیں نہ کہیں کسی بہانے اکیلے بیٹھ جاتے۔ دن کو تو میں انھیں گھومنے کا موقع نہ دیتا تھا مگر شام ہوتے ہی انھیں پکڑ لیتا اور پھر یادوں کے گلزار میں ہم دوستوں کے جھرمٹ آباد کرتے اور محبت اور خلوص کے اُن حسین لمحوں کو یاد کرتے جن کی نشیلی چھاؤں میں اُردو ہندوستانی اور پاکستانی ادیبوں نے ادبی تخلیقات کے کیسے کیسے حسین پیکر تراشے ہیں۔

طفیل احساس کی نازکی کو بہت سمجھتے ہیں۔ خود بھی جلدی آزردہ خاطر اور زود رنج ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ طفیل صرف ایک پبلشر



یہ تصویر اُن دنوں کی ہے کہ جن دنوں کو
کرشن چندر نے یاد کیا ہے۔

ں نہیں ہے بلکہ ادیب بھی ہے۔" محترم" ان کا ایک مشہور سفر نامہ ہے جو شاہ عبداللطیف بھٹائی کے عرس پر جانے کے بعد لکھا گیا۔ مگر طفیل بالخصوص اپنے نازک خاکوں کی تخلیق کے لئے مشہور ہیں۔ جن میں انہوں نے جگر مراد آبادی سے لے کر اختر اورینوی جیسی متعدد شخصیتوں کے قصر تعمیر کئے ہیں۔ یہ سب کے سب خاکے ان کی کتابوں میں شامل ہیں۔ جن کے نام بالترتیب یہ ہیں۔ نمبر ایک "صاحب" نمبر دو "جناب" نمبر تین "آپ" ان کے بعد دو اور مجموعے ان کے آنے چاہئیں اور نمبر چار "آپ جناب" نمبر پانچ "ناپ تناپ" موخر الذکر مجموعہ طفیل کے دشمنوں سے متعلق ہو گا یا ایسے مضمون نگاروں کے متعلق جن کی تخلیقات کسی وجہ سے نقوش میں شامل نہیں ہو سکیں۔

طفیل کے یہ خاکے بڑی بے باکی سے لکھے گئے ہیں۔ ان میں فاصلے بھی ہیں اور قربتیں بھی، دُوریاں بھی ہیں اور طرفداریاں بھی مگر کہیں کیچڑ اچھالنے کی کوشش نہیں ہے کہ چھینٹے ضرور اُڑائے ہیں۔ طفیل ان خاکوں میں اُس بچے کی طرح ہے جو گھٹنوں گھٹنوں پانی میں ہے اور بار بار دوسروں پر چھینٹے اُڑائے جاتا ہے اور جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا تو اپنے آپ پر ہی چھینٹے اُڑانے لگ جاتا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ طفیل کا بچپن کیسا تھا۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے وہ ابھی تک بچپن کے عہد سے باہر نکلا ہی نہیں۔

سُنا ہے آج کل طفیل دھڑا دھڑ ٹیکسٹ بک چھاپ رہا ہے اور نقوش سے آج کل اس لئے بیزار ہے کہ اس کے دوست اس کے رسالے کے لئے اس کی پسند کی چیزیں نہیں بھیجتے۔ بیٹھے بیٹھے چلتے میں نے طفیل کی ایک برائی تو پکڑ لی۔ طفیل بھائی! تم بینک ٹیکسٹ بک کے انبار لگا دو چھاپ چھاپ کر، لیکن تمہارے نقوش کا صرف ایک شمارہ ان سب پر بھاری رہے گا۔ علم و ادب دونوں کے اعتبار سے!

آؤ کھلے طور جھوٹے کہیں کے ہر سال آنے کا وعدہ کرتے ہو اور کبھی نہیں آتے!

اِس شمارے میں

یہ شمارہ خاصی تاخیر سے حاضر ہو رہا ہے۔ تاویلیں اور دلیلیں پیش نہیں کرتا۔ سیدھی بات، معذرت خواہ ہوں۔ بہرحال یہ عرصہ بھی چند سابقہ نمبروں کی از سرِ نو ترتیب و تدوین میں گزرا۔ چونکہ پرانے نمبروں کی مانگ ہے۔ اُدھر بال بھی سفید ہو رہے ہیں۔ قدرت بھی کب تک مہلت دے گی۔ سوچتا ہوں کہ وہ کام جو روا روی میں کیے تھے۔ انھیں کامل سکون اور زیادہ سلیقے کے ساتھ پیش کر جاؤں۔

خواہشیں بہت سی ہیں۔ اُن میں ایک خواہش یہ بھی ہے کہ میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں اپنے کام سے زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ جفا کفا کر کے میں نے نقوش پر ڈھیروں خرچ کیا ہے۔ صرف اس لیے کہ میری پہچان ہو سکے۔ میں نے دنیاوی سکوں سے زیادہ ادبی دنیا سے یارانہ رکھا۔ کیونکہ دنیاوی سکے جمع کرنا اگر واقعی کوئی بڑی بات ہوتی تو آج ان گنت لوگوں کا نام زندہ ہوتا۔ مگر نام کس کا زندہ ہے؟ سعدی کا، حافظ کا، میر کا، غالب کا، حالی اور اقبال کا۔ — دھن دفن ہو گیا۔ ادب زندہ رہ گیا۔

بات مجھے اس شمارے کی کرنا چاہیے تھی۔ جا نکلی دوسری طرف! بہرحال عرض ہے کہ پچھلے شمارے میں عصمت چغتائی کا افسانہ "کمیونسٹ" شائع ہوا تھا۔ شانِ نزول اُس افسانے کی یہ تھی کہ میرے ایک جاپانی دوست جاپان جا رہے تھے۔ راستے میں وہ بمبئی رکنا چاہ رہے تھے۔ چنانچہ میں نے انھیں ایک چٹھی آپا کے نام دی جس میں یہ لکھا، ہو سکے تو آپ افسانہ ضرور عنایت فرمائیں۔ وہ دور ڈاک کی بندش کا تھا۔ خیال تھا کہ عصمت آپا اگر افسانہ عنایت فرما دیں گی تو وہ براستہ جاپان مجھ تک پہنچ جائے گا۔ جب مسٹر کتاؤکا نے میری چٹھی آپا کو دی تو انھوں نے پوچھا "آپ کب جا رہے ہیں؟" مسٹر کتاؤکا کا جواب یہ تھا "کل!" — آپا اس جواب پر خاصی پریشان ہوئیں مگر انھوں نے کہا "میرے پاس لکھا ہوا تو کوئی افسانہ موجود نہیں لیکن میں طفیل صاحب کی خاطر جاگ کر بھی آج رات افسانہ لکھ لوں گی"۔ چنانچہ دوسرے دن جب مسٹر کتاؤکا آپا کے ہاں پہنچے تو انھوں نے "کمیونسٹ" نامی افسانہ ان کے حوالے کر دیا تھا۔ جو کہ سابقہ شمارے میں چھپ چکا ہے۔

اس شمارے میں عصمت چغتائی کا افسانہ "مغل بچہ" شامل ہے۔ آپا نے مجھے لکھا "ایک بات بتاؤ بھئی کہ کمیونسٹ نامی افسانہ تو مجھے رات بھر میں لکھنا پڑا تھا۔ اب میں نے اسی افسانے کو قدرے اطمینان سے لکھا ہے۔ لہٰذا نظرِ ثانی شدہ افسانے کے بارے میں کیا رائے ہے؟" — میں نے جواب میں لکھا "آپا وہ افسانہ مجھے ہی بھیج دیں۔ اس لیے کہ جس طرح غالب کی پہلی کوشش کے بعد اس کے نظرِ ثانی شدہ کلام کی بھی اہمیت ہوتی ہے۔ اُسی طرح سے آپ کے افسانے کی بھی اہمیت ہو گی۔" چنانچہ انھوں نے وہ افسانہ بھی مجھے بھجوا دیا جو کہ زیرِ نظر شمارے کی زینت ہے۔

دراصل یہ صفحہ بعض صراحتوں اور بعض وضاحتوں کے لیے مختص ہے۔ اس لیے اس شمارے میں شامل مندرجات کے بارے میں کھل کر باتیں نہیں کی جا سکتیں ورنہ بات ہر مضمون پر ہو۔ مضمون چھوڑ، بلکہ ایک ایک صفحے اور ایک ایک سطر پر بات ہو۔ مختصر یہ کہ نقوش میں جو کچھ پیش ہوتا ہے۔ وہ اس عہد کا بہترین ادب ہوتا ہے۔

بعض اہلِ قلم کے بارے میں اس شمارے میں وافر مواد ملے گا۔ آج اگر ہم چند ادیبوں کے بارے میں چند ایک مضمون چھاپ رہے ہیں تو کل کلاں کو انہی کے بارے میں کتابیں لکھی جائیں گی۔ کیونکہ تحریر سے زیادہ باوفا کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ جس کسی نے بھی قلم سے پیار کیا وہ زندۂ جاوید ہو گیا۔

ایک خبر یہ بھی ہے کہ پاکستان کے ادیبوں نے مجھے "رائٹرز گلڈ" کا سیکرٹری جنرل چن لیا ہے — میں اُن کا شکر گزار ہوں۔

محمد نقوش

بولو

راجندر سنگھ بیدی

"بولو" انسپکٹر گپتے نے عاجز ہو کر کہا۔

اس کی آواز اب ایک بازگشت ہو کر رہ گئی تھی، بلکہ مخیث رلائی ہوئی۔ جب اس نے ملزم سے پوچھا "کہ کون تھا اس قتل کے پیچھے؟"

ملزم ونائک ونائک بدستور خاموش تھا۔

گپتے اور اس کے ساتھی اجگاؤنکر وغیرہ نے ونائک پر تیسری ڈگری کے سب گر استعمال کئے تھے۔ اور اب وہ ڈر گئے تھے کہ کہیں مار کے نشان ملزم کے بدن پہ رہ گئے تو وہ خود دھر لیے جائیں گے۔ ریمانڈ کے چودہ دنوں میں سے صرف تین دن باقی تھے۔ جبکہ انھیں ونائک کو چارج شیٹ کے ساتھ میٹروپالیٹن مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرنا تھا۔ جو خود مشکل ہی سے توانا معلوم ہوتا تھا۔ قتل کے پیچھے سازش کا ثبوت فراہم کرنے کے سلسلے میں گپتے اور اجگاؤنکر کی ہر تفتیش اندھی کالی راہوں سے ٹکرا کر خاک و خون اڑاتی، روتی چلاتی، ونائک ہی پر لوٹ لوٹ آتی تھی۔

پیلا جوکی کا یہ پولیس اسٹیشن راجدھانی کے معمار لیوٹنس نے نہیں، کسی مقامی موئی نے بنایا تھا، اور اس بات کا خیال رکھا تھا کہ کہیں ہوا کا رخ حوالات کی طرف نہ ہو۔ فضا میں کی رطوبت اس کی سیلن کا باعث ہے۔ پھر اور باتیں --- تادیب، تھرڈ ڈگری وغیرہ۔ اب تک ان دیواروں پر اذیت کے نقشے بن چکے تھے۔ انسان کے اندر کا ڈر باہر آ کر دیواروں پر مصور ہو گیا تھا۔ ان تجریدی تصویروں کے سامنے چینی، جاپانی ڈریگن، تبتی مہاکال، افریقی ممبولا وغیرہ کچھ بھی نہ تھے۔ چھت پر جو شکلیں بنی ہوئی تھیں۔ انھیں دیکھ کر تو کوئی معصوم سے معصوم بھی چلا اٹھتا---

"گھوگو کو میں نے مارا ہے، حسن توبہ کا قتل میں نے کیا ہے۔ توبہ ...."

کرسی جس پر گپتے بیٹھا ہوا تھا، اس کا ایک بازو غائب تھا۔ اور جہاں اجگاؤنکر براجمان تھے، اس کے دونو..... وہ دونو بازو، دایاں اور بایاں، یا تو ونائک پہ استعمال ہوئے تھے اور یا پھر ملکی سیاست میں حصہ لینے چلے گئے تھے۔ اوپر ہزار واٹ کا بنڈہ اور ایسی کچھ اور چیزیں جھومر کی طرح ٹنگی تھیں۔

حوالات کی سلاخوں کے پیچھے سے حبس باہر جھانک رہا تھا، جہاں ہال میں ڈیوٹی آفیسر تین چار غنڈوں کا بیان لے رہا تھا۔ وہ عادی مجرم ایک عجیب قسم کی بے نیازی سے بیٹھے پورے انسانی جرم سے منکر ہو رہے تھے۔ گویا وارداتیں انہوں نے نہیں، ہمزادوں نے کی ہیں۔ ایک تو بار بار اپنا ہاتھ ران پہ مارتا تھا، جیسے پہلوان لوگ اکھاڑے میں اترنے سے پہلے چیلنج کے

انداز میں مارتے ہیں۔ کوئی ننگا ہو اور اپنی برہنگی کا احساس رکھے تو ہر آتا جاتا اُسے دیکھتا ہے، لیکن اگر وہ اپنی اس صورت پر شرمائے نہ لجائے، اُلٹا ڈھٹائی سے دوسروں کو سمجھانا جائے تو سب کی نظر میں ہو جاتی ہے۔ کانسٹیبل، میٹروپالیٹن بمبئی کے نیلے بھوت ہتھکڑیاں [illegible] کے پس منظر میں تھا۔ صرف حکم کے منتظر تھے۔ ان کا بس چلتا تو ہر شہری کے ہاتھوں میں وہ لوہے کا زیور پہنا دیتے۔ محرر کا قلم جسے ہر وقت خارش رہتی تھی، دوات میں ڈوب رہا تھا اور وہ خود بیٹھا بیٹھا جمائیاں لے رہا تھا۔ اور ایف آئی آر کا رجسٹر اُن سب لوگوں کے کرم خوردہ مسودوں اور رجسٹروں کی طرح سے کھلا سامنے میز پر پڑا تھا۔

باہر بارش ہو رہی تھی۔ بجلیاں [illegible] کن من، کن من، کن من......

یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ بغیر کسی وجہ کے، کسی رنجش کے زنانی ایک خوب صورت نوجوان عورت کو قتل کر دے؟ ایشے [illegible] کے گلے میں منگل سوتر تھا۔ مانگ میں سیندور، بانہوں میں چوڑیاں، جن کی ٹوٹیں موجود تھیں۔ کارونر کی رپورٹ میں جبر تو ایک طرف کسی جھپٹ کا بھی اندراج نہ تھا۔ کوئی نئی یا پرانی دشمنی بھی ثابت نہ ہو سکی تھی، کیونکہ ایشے وڈالہ کے مل والے، بیرک نما کوارٹروں میں اپنے شوہر نارائن اور دو بچوں کے ساتھ رہتی تھی، جبکہ زنانی اُس سے فرسنگ پر ہے ـــــ ورلی کے کولی واڑے میں، جہاں بوملی مچھلی کی بو ہر پیس گھنٹے انسان کے جسم و ذہن کا احاطہ کیے، اُس کے پور پور میں بس جاتی.... زنانی کی محبوبہ [illegible] کے پاس رہتی تھی [illegible] کے پیچھے، [illegible] کی ریلوے لائن کے بازو میں، جہاں بے شمار جھونپڑیاں برسات اور [illegible] سے جیسے اپنے آپ اُگ آئی تھیں۔ مگر اس کا ایشے سے کیا تعلق؟

[illegible] بگو اور اُس کے ماں باپ کولی، [illegible] امبیدکر کی شہ پہ بدھ ہو گئے تھے اس لیے [illegible] سماج انہیں عزت سے [illegible] تھا۔ مورتی پوجتے ہی اُن کی جھونپڑیاں [illegible] جلا ڈالتا۔ بنیا، [illegible] پڑھی یہ لوگ اچھوت کے اچھوت ہی رہے۔ حالانکہ تاریخ کے دھندلے دور میں [illegible] سے شادی کی تھی۔ اور آج جن لوگوں کے سامنے انہیں جھکنا پڑتا ہے، اُن کی ماں [illegible] تھی..... پھر [illegible] رقیب بھی نہ تھا کوئی۔ البتہ الزام ہی لگانا ہے تو نفرت کو پیدا ہو تو ہر آدمی اُس کا رقیب ہوتا ہے جس کی عورت ایشے ہو!

ایشے معمول کی طرح اپنی [illegible] کے لیے [illegible] عورتوں کے ساتھ سیوڑی والے ساگر کی طرف گئی تھی۔ بھجوے، نشے [illegible] ...... پیٹ میں پانی ہی نہیں [illegible] پہنچتے ہیں۔ [illegible] ناچ [illegible] رہے ہیں۔ چاہے سوکھا ہو چاہے برسات، وہ ہمیشہ انہیں گھسیٹے لیے جا رہا تھا شاید۔ اور [illegible] ہوش [illegible] ہوا تھا، جب وہ کسی کی بھی بے عزتی اور کسی [illegible] توڑ دیتے اور کسی کی مجال نہ تھی انہیں کچھ کہہ سکے۔ کیونکہ پوری قوم، قومیت تھی اُن کے پیچھے اور شیوسینا..... جیسے محرم میں تعزیہ نکالنے والوں کے پیچھے پوری شیعہ قوم نہیں ہوتی؟ آٹھ بازوؤں والی درگا کے پیچھے بنگالی ہوتے، چاہے وہ [illegible] ہوں یا [illegible]۔ ایسے ہی جیسے [illegible] بنانے اور پہننے والوں کے پیچھے انڈر ورلڈ ہوتی ہے ہوتا ہے۔ ایک معمولی سے [illegible] کانسٹیبل کے پیچھے پوری سرکار ہوتی ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ زنانی کے پیچھے صرف زنانی ہو

ایک سبب اور، خیر بامون مندرے تلے گنپتی وسرجن والے مورتی لے جاتے ناچتے گاتے ہوئے جا رہے تھے — گنپتی باپا موریا، [illegible] لوکر یا — یعنی کہ اگلے برس جلدی آ۔ مگر یہ پراتھنا تو پچھلے اور اس سے پچھلے برس میں بھی کی تھی اُن لوگوں نے۔ پھر گنپتی کے واسطے گنپتی باپا نے لیا دیا تھا انھیں؟ کس کس کے گھر بھر دیئے تھے؟ اُلٹا اُس کی لمبی سونڈ اور پھیلی ہوئی توند کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا، کہ سب کے حصے کا وہ خود ہی کھا گیا ہے۔ ایرانی ہوٹل والے راشن پتی کی سفارش سے باور دیتے تھے، شکر بازار سے یونہی غائب ہو گئی تھی۔ کھاسیٹ کے لئے میل میل، ڈیڑھ ڈیڑھ میل کے کیو لگتے تھے۔ اس کی نایابی کی وجہ سے گھروں میں چولہے جلنے بند ہو گئے تھے۔ کوئی زمانہ تھا کہ عورت سونے کی کوئی چیز یا اچھی سی ساڑھی دیئے جانے پر اپنا سب کچھ دے بیٹھتی تھی، لیکن اب وہ گھاسیٹ کے ایک چھوٹے سے ٹن پر اُتر آئی تھی.....

گنپتی باپا موریا کے ورد سے یہ لوگ تھک جاتے تو کسی نل تا فیے پر چلے آتے، جو پوری زندگی ہو گیا تھا۔ پاؤڈر والے دودھ کی ملائی مار گئی یا اور پھر مار گئی کی نسبت سے وہ اس کی بے شمار گندی گردانیں کرتے ہوئے چلتے۔ بھیگی ہوئی چھوکریوں کے نمایاں کھیوں اور ان پر چسکیاں لیتے، اپنے اور اُن کے اکار سے مشتعل کرتے۔ ..... ایشے بھی اُن کے ساتھ تھی۔ اُس کا بدن جو ایک ہی مرد کے مسلسل مساس سے سو گیا تھا، جاگ جاگ اُٹھتا۔ اسے گمان بھی نہ تھا کہ پچیس برس تو ایک طرف، پچیس پل ہی بے وفائی کا راستہ ہوری جائے تو اُس کے آر پار ہو گا اور یہ انوکھا مساس اُسے کہاں سے کہاں پہنچا دے گا اور اس غریب کا اپنا وسرجن پانی کی بجائے آگ میں ہو گا۔ سر گرمیں کا ڈیرواُل کہتا ہے — آگ پانی سے کہیں بڑی ہے۔ کیا معلوم؟

[illegible] کی زندگی آئینے یعنی اُس عمر کی جس میں کہ ہر عورت اپنے وجود ہی سے کھنچی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ [illegible] کی پیداوار ہونے کی وجہ سے سب ناریل اور اُن میں کا سارا کھوپرا اُس کے بدن کو بنانے میں لگ گیا تھا۔ [illegible] بالا بال چلی آتی تھیں اور یہ [illegible] اور پرتگیزی، ولندیزیوں، عربوں کا خون مل گیا تھا جو بھارت کے پچھمی ساحل پر [illegible] لینے آتے تھے۔ اُن کے کارن نہ صرف ایشے کا رنگ سرخ و سپید تھا، جلد نیمیں، بلکہ آنکھیں بھی عرب ساگر [illegible] ہو گئی تھیں۔ پوسٹ مارٹم کے بعد جب نارائن کو اُس کی لاش ملی تو وہ اُسے اپنے ٹرک والے کوارٹروں میں [illegible] کو نکال کر اُس نے ایشے کو ایک کمرے میں بند کر لیا اور قریب ڈیڑھ دو گھنٹے اُس کے ساتھ اکیلا رہا۔ جب دروازہ کھلا تو لوگوں نے دیکھا — ایشے دُلھناپے کا کا نٹا لگائے پڑی ہے، اُس کی ناک میں پھُنّی کی بجائے کھڑا ہے، پاؤں کی انگلیوں میں [illegible]

[illegible] تھا نارائن اُس سے — شادی کے بعد ایک بار جب ایشے مائیکے گئی تو کسی نے پوچھا — کے دن رہ گئے میکے [illegible] نارائن نے تُرنت جواب دیا — بیس دن اور اکیس راتیں!

[illegible] نارائن مُسکرا بھی نہ رہا تھا.....

— اب ایشے کی ارتھی نکلی تو وہ رو بھی نہ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے آنسو کہاں چلے گئے تھے، یہ میں پھر بتاؤں گا۔ ابھی بتانا [illegible] کہ وہ سب اڑوس پڑوس کی آنکھ سے بہہ رہے تھے۔ اپنے سُرخ کانٹے، کفن میں ایشا اور بھی گوری [illegible]

ایک ایسی نیند سو رہی تھی، جو شبِ زفاف میں دلہن چار چھ بار نکل جانے کے بعد سوتی ہے ۔

ارمنی اٹھ جانے کے بعد اُس کے پیچھے — ناکھنو اور شُلبھا بار بار پوچھتے تھے —

"آئی گئیں ؟" اماں کہاں ہے ؟ اور ایک بادشاہ بھاشی جواب دیتا، آئی تو گئی ...... ایسی معمولی سی ترکیب وضع کر لینے سے اس کی ساری شہوت تسکین کو پہنچ جاتی ۔

رات دو دن رہ گئے تھے ریمانڈ میں جبکہ انسپکٹر گپتے نے ونائل کو تفتیش کا آخری تھپڑ مارا۔ ونائل اپنی جگہ سے ہل گیا۔ اس کے ہونٹ تھوڑا اینٹھ کر فوراً ہی معمول کے ہو گئے۔ ایک تندرست غصے میں جانے وہ کیا کچھ پی گیا۔ گرم غصے میں آنکھیں لال ہو جاتی ہیں۔ سر پہ بالوں کی کنپٹیوں ان میں سرخی دوڑ جاتی ہے۔ خون کا دباؤ ایکا ایکی بڑھ جانے سے تنفس گھوڑ چال ہو جاتا ہے، نتھنے پھڑکنے لگتے ہیں، ہونٹوں پہ کف چلی آتی ہے۔ بدن کی رگیں اور پٹھے تن جاتے ہیں، کوئی اور ممکن وار اپنے اوپر لینے کے لئے۔ مگر وہ —— ونائل، رنگ کا کالا، بدن کا کھردرا، جان کا کوڑی، جیسے گوشت پوست سے نہیں، کسی عقیدے کی فولاد سے بنا تھا۔ جسمانی یا روحانی مار کا اس پہ کوئی اثر ہی نہ تھا۔ اس سارے سلسلے میں یا تو وہ آگے کی بہت سی صدیاں گن گیا تھا اور یا پیچھے کی۔ وہ دلت پیشیروں کے ساتھ خلوت کرتا تھا اور کبھی کبھی شیو سینا کے رسالے "مارمک" میں کسی دوسرے نام سے لکھتا بھی تھا۔ اس وقت وہ تخفیف کے انداز میں کھڑا تھا، جیسے کوئی بھگت سنگھ دیس کی آزادی کے لئے پھانسی لگنے جا رہا ہو —— البتہ اس کی آنکھیں کچھ اور سپید ہی پڑ گئیں تھیں کفن کی تہوں میں چھپی ہوئی نیلاہٹ اُڈ آئی تھی جن میں ساگر ڈوب رہے تھے۔ اپنے اندر پورے لوکالی کا دھرم لئے ہوئے۔ اس کا غصہ اوپر اور اوپر، لاشعور کی تہوں میں جا چھپا تھا۔ جہاں ساری خدائی ملتی ہے اور وہ —— غصہ کسی ایک فرد کا ہو کر رہ جانے کی بجائے پورے اجتماع کا ہو جاتا ہے . . . .

تب وہاں ان دیکھی لا وجود نشستوں میں کیا کیا بے منطق فیصلے ہوتے ہیں، جن سے خدا بھی ڈر کر انصاف کی کرسی چھوڑ دیتا ہے اور ڈرتے کانپتا ہوا نیچے آ کر کسی اپنے خدا کے سامنے دست بدعا ہو جاتا ہے ۔

باہر آج بارش ہو رہی تھی اور انسان کے نفس اس کی سائیکی کا بیڑہ غرق کر رہی تھی۔ کہاں تو پورے جولائی اور اگست کے مہینے خالی گئے تھے اور کہاں اب ستمبر کے آخر میں یوں لگ رہا تھا، جیسے ورن دیوتا بمبئی کے لیگ سکے کیگ پی کے دنیا کو اپنی چھوٹی حاجت کا شکار بنا رہا ہے۔ خریف کی فصل تباہ ہو رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خدا فارسی نہ جاننے کی وجہ سے ربیع اور خریف کے معنی نہ سمجھتا تھا۔ فصلوں میں اسے کوئی تمیز نہ رہی تھی۔ وہ تھوڑا بھرو، تھوڑی سنسکرت اور عربی میں شُد بُد رکھتا تھا اور بس۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے ایک ہی زبان آتی ہے، جس کا نام ہے —— آہ!

جب سرکار کے میٹ ڈیپارٹمنٹ کے لوگ، خدا کے نمائندے بنے، ایک بیان شائع کر دیتے کہ خلیج بنگال میں ایک طرف ایک کونہ پیدا ہو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ ٹائی فون بن کر اڑیسہ کے بے شمار گاؤں کو تباہ کرتا ہوا ذہن کینس کے ضلع کی طرف نکل جائے۔ (جہاں کھاد کا کارخانہ ہے) اور یا پھر مدھیہ پردیش سے مراٹھواڑہ، ملبٹی کی طرف چلا جائے۔ کچھ علاقوں کو تو وہ باڑھ سے برباد کر گیا، اور کینوں میں سوکھا ہو گیا۔ اور لوگوں کو اس بات کا فیصلہ کرنے کے لئے چھوڑ گیا کہ ان کے لئے بھوک کا مرنا اچھا ہو گا یا ڈوب کر جان دینا؟ جائے

ف باد نمبو کا نقارہ بج رہا تھا — بے زبان، بے سُر، بے تال ۔

—— اور ونائی چُپ تھا ۔ جب صابر جابر کے سامنے تن جائے تو بڑے بڑوں کی گاف بند ہو جاتی ہے ۔ سازش کی تفتیش کے لے میں گپتے اتنا تنگ آ گیا تھا کہ اُس کا جی چاہتا تھا کہ پٹی اور پتلون اُتار کر ونائی کے سامنے لیٹ جائے ...... اُسے ریمانڈ کے پچھلے چند ن یاد آ رہے تھے ۔ جب اُس نے ونائی سے پُوچھا تھا —

"تم نے ایشے کو کیوں مارا ؟"

ونائی نے یونہی سا سر ہلا دیا ۔ جس کا مطلب تھا ۔ ایسے ہی ۔

"اس لیے کہ وہ اونچی جات والی تھی ؟"

"نہیں"

"امیر عورت تھی ؟"

"نہیں"

"خوب صورت اور جوان تھی ؟"

"نہیں ، نہیں ، نہیں ۔ ونائی نے قدرے برافروختگی سے کہا ۔ "شکو اس سے کہیں زیادہ سُندر ، کہیں زیادہ جوان ہے ۔"

"شکو ؟" گپتے نے اپنی کرسی پر سے اُٹھتے ہوئے کہا ۔ "وہ کالی کلوٹی ، کوڑی چھوکری ، جو آٹھ آٹھ آنے میں —"

اس سے پہلے کہ گپتے اپنی بات پوری کرتا ، ونائی ایک دم اچھل کر کھڑا ہو گیا اور بولا ۔ "باسٹرڈ ! ...... تمہاری بہن سے ن کا ریٹ زیادہ ہے ......"

یہ وہ وقت تھا ، جب گپتے نے ونائی کو پہلا اور بھرپور تھپڑ مارا ۔ اُس کی انگلیاں اس زور سے کرشن لڑکے کے گالوں میں کُھب گئیں ۔ وہ ل نہ سکا ۔ کیونکہ حوالدار اور کانسٹیبل لوگ مضبوطی سے اُسے پکڑے ہوئے تھے ۔ ونائی پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا ، نہ ہی انگلیوں کے نشان آئے ۔ کالے ناک پر نیلا کتنا دکھائی دیتا ہے ؟

گپتے نے اپنے سینیئر اجگاؤنکر کی طرف دیکھا ۔ ونائی بولتا چلا گیا ۔ "دُنیا کے نائنٹی نائن پرسینٹ لوگ اگر ایک ٹکے میں بکتے ہیں تو آپ لوگ آدھے میں ...... وہ سب دلت جاتی کے ہیں ۔ رنگ کے کالے ، پر صحت والے ......"

اور ونائی نے دایاں بازو دُہرا کر کے بائیں سے اپنے بائی سیپ چھوئے اور اکڑ کر بولا ۔ "تم سب کی مائیں بہنیں اس کا زور دیکھنا چاہتی ہیں ۔"

جبھی گپتے نے کرسی کا بازو کھینچا اور پے در پے ونائی پر برسانا ، اُسے گالیاں دینا شروع کر دیں ۔ کچھ دیر کے بعد ونائی لڑکھڑایا اور پھر اُن سب کے سامنے ڈھیر ہو گیا ۔ اور یوں اس تفتیش کا پہلا سیشن ختم ہُوا ۔

رات مرہم پٹی ہو جانے کی وجہ سے ونائی ہوش میں آ چکا تھا ۔ پوری رات وہ ایسے فرش پر پڑا رہا ۔ کپڑے پھٹ جانے کی وجہ سے وہ پورا ننگا تھا ۔ مگر دگ ٹ کا کوڑیالا کو پتا معلوم ہو رہا تھا ۔ سامنے فرش پر رات کی دو سوکھی روٹیاں پڑی تھیں جو اب تک باسی ہو گئی

تھیں۔ دال کے کٹورے میں سماروغ قسم کی ایک سفید سی جھلی چل آئی تھی۔ چاول چیونٹے سے گئے تھے اور جب وہ ختم ہوئے تو ونائی کو کاٹنے لگے۔ چیونٹوں نے جب دیکھا کہ اُسے کاٹنے سے وہ خود ہی مرنے لگے ہیں تو بھاگ کر چھپنے کی جگہ میں دبک گئے۔

انسپکٹر لوگ آئے۔ اُن کے چہروں کی رگیں اور پٹھے کچھ ارادوں سے تنے ہوئے تھے۔

"ونائی!" اجگاؤنکر نے پکارا۔

ونائی اٹھا مگر ... پھر اٹھا اور اپنا کوبرنگ چپٹی مار کر اجگاؤنکر کو درست کرنے لگا — ونائیک راؤ ... ونائیک راؤ ہے۔

"اوکے ... اوکے۔" اجگاؤنکر نے اپنے بید کو بغل میں اڑستے ہوئے کہا — "مسٹر ونائیک راؤ ....."

"THAT'S RIGHT" ونائی نے کہا۔ اُس کے چہرے پر اب نفرت کا ایک احساس تھا۔ بازو کے ایک جھٹکے سے اُس نے گردن پر لگا ہوا رات کا پسینہ اور صبح پونچھا اور اجگاؤنکر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

اجگاؤنکر نے پوچھا — "تم ہوٹل برنج کے پروپائیٹر کو جانتے ہو؟"

"نہیں۔" ونائی نے جواب دیا۔ "ہاں ایک بار کھانا کھایا تھا اُدھر۔"

"تم جانتے ہو۔ جوزف پریرا اس کا پروپرائیٹر، ٹاؤن کونسلر گلکرنی اور وڈرا سے کے کچھ منسٹروں کے ساتھ مل کر کاجو کی فینی بیچتا ہے۔ تو اُسے مہیرہ منگواتا ہے ادارن سے سکاچ۔"

"یہ تو نہیں جانتا — مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اس کا دھندہ تم مادر— کو ہفتہ کھلائے بغیر دو دن بھی نہیں چل سکتا....."

اجگاؤنکر تلملا کر رہ گیا۔ بات سچی تھی مگر یوں روڈ ٹوک تو کمشنر نے بھی نہیں کی تھی۔ اُس نے دائیں ہاتھ سے ماتھے پر کا پسینہ پونچھا اور پھر گپتے کی طرف اشارہ کیا کیونکہ یہ کیس دراصل اُسی کا بے بی تھا۔ یہ ایسے ہی تھا جیسے کورٹ میں استغاثہ جب اپنی جرح ختم کر لیتا ہے تو وکیل صفائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے — "یور کیس....."

گپتے نے کہا "راؤ صاحب .... آپ کے نالج میں ہے، جوزف پریرا ایلسٹے پر آنکھ رکھتا تھا؟"

"آنکھ رکھتا تھا کہ ٹانگ رکھتا تھا....." ونائی نے جواب دیا "کون، کسے، کتنے دھکے لگاتا ہے۔ میں کیا اس کا اکاؤنٹ رکھتا ہوں؟"

"تمھیں پتہ ہے پریرا اور علاقے کے دادا اکرم نے داورا در پریل سے کہ اس روڈ پہ جہاں جہاں بھی تی کا منہ ہے، ایلسٹے کو چھاتی سے پکڑ لیا تھا؟"

"ہوں۔"

"پھر شور مچ جانے پر پریرا بھاگ گیا، مگر اکرم پکڑا گیا۔ لوگوں نے اُسے مارا؟"

ونائی نے اس بات پر سر ہلایا اور بولا "اس لیے مارا کہ سالوں میں خود ہمت نہیں تھی چھاتیاں پکڑنے کی۔"

ونائی ہنس رہا تھا۔

"اس سے پریرا کی بے عزتی ہوئی۔" گپتے نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ایلسٹے کا دھندہ چوپٹ ہو گیا۔"

"تب؟"

چٹنے نے آواز کو بلند کیا۔ "تب۔ بدلہ لینے کے لئے اس نے ایک اجیر ایک بار تک رکھا؟"

"ہوں۔"

"اور وہ —— تم تھے ۔ ۔ ۔ تم ۔ ۔ ۔ تم ۔ ۔ ۔"

اس سے پہلے کہ ونانی جواب دیتا۔ اجگاؤنکر نے گویا چھت ہی پھاڑ دی "کے ریوں میں فیصلہ ہو؟ ۔ ۔ ۔ بولو ۔ ۔ ۔"

"بولو" چٹنے اس کے ساتھ ہی گرجا۔

ونانی خاموش رہا۔ انسان ہمیشہ اس لئے خاموش نہیں رہتا کہ وہ مجرم ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ تھک بھی جاتا ہے۔

یہ وہ وقت تھا۔ جب آدمی اس قدر بھاری بھاری باتیں کرتے ہوئے خاموشی کے سامنے نہ صرف بے بس ہو جاتا ہے، بلکہ کانپنے لگتا ہے۔ نامردی میں، غصے میں یعنی، دوسری کرسی کے بازو ونانی پر ٹوٹ ٹوٹ گئے۔ وہ پھر بے ہوش ہو گیا۔ اب وہ مفتوح ذبح تھا۔ اس کی ناک ہی سے نہیں، کان سے بھی خون بہنے لگا تھا، جو دماغ سے جریان کی علامت ہے۔ چٹنے اور اجگاؤنکر دونوں کی چھٹی ہو گئی۔۔

"ڈھوکے" چٹنے نے گھبرائی ہوئی آواز میں حوالدار سے کہا "بھاگو ۔ ۔ ۔ ۔ ناکے پہ جاؤ اور برف لاؤ۔"

حوالدار ڈھوکے نے "جی" کہا اور ریوٹ کئے تکلف میں پڑے بغیر باہر کی طرف لپکا۔ پیچھے سے چٹنے نے تائید کی آواز دی —— "پوری سل لانا۔"

۔ ۔ ۔ دو روز بعد تیسرا سیشن ہوا۔ ونانی بچ گیا، جبکہ چٹنے، اجگاؤنکر اور کچھ کانسٹیبل ونانی کے تھیس کر گرنے اور ۔ ۔ ۔ کر ۔ ۔ ۔ سمجھی ہو کر مر جانے کا پنچ نامہ تیار کرنے کی فکر میں تھے۔ تیسرے دن ڈاکٹر آئی۔ آئی۔ گھاٹی کی مدد سے انہوں نے ونانی کی زبردستی فیڈنگ کی۔ طاقت کے انجکشن دیئے تاکہ اسے تندرست بنائیں اور پھر مار یں ——

یہ دیکھ کر کہ اس وقت اذیت ٹھیک نہیں ہے۔ چٹنے اور اجگاؤنکر نے پینترہ بدلا۔ ونانی کے پاس آتے ہوئے اجگاؤنکر نے کہا۔

"ارے ۔ ۔ ۔ ۔"

ونانی چوکنا ہو گیا۔ کسی نئی حرام زدگی کے لیے تیار۔

"تم میرے بھائی ہو ——"

"ہوں۔"

"تمہارا گاؤں اڑوت اجگاؤں ہی کے پاس ہے۔"

"ہوں۔"

اس سے پہلے کہ اجگاؤنکر اپنا ہاتھ کسی مصنوعی میلان سے ونانی کے کندھے پہ رکھتا۔ ونانی نے پوری قوت سے یوں جھٹک دیا کہ وہ اجگاؤنکر کی پیٹھ سے جا لگا اور اسے موج آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ چٹنے، حوالدار ڈھوکے اور دوسرے کانسٹیبل حیران تھے کہ

اتنا سب کچھ ہو جانے، پہروں بھوکا رہنے کے باوجود اس چھوکرے میں اتنی طاقت کہاں سے چلی آئی؟!

"میں تمہاری ماں سمجھ سکتا ہوں" ونائی بولا۔ "پیار نہیں۔"

صاف دکھائی دیتا تھا کہ ونائی کی آنکھوں میں آنسو امڈ رہے ہیں اور کتنی محنت، کتنی مشقت سے وہ انہیں کہیں اوپر بھیج رہا ہے۔ مگر چونکہ آنسو اور جذبہ ہم ردیف ہوتے ہیں۔ اس نے کسی رشتے کا لحاظ کرتے ہوئے کہا "میں نے جو بولا ہے، سچ بولا ہے۔"

"سچ کہتے ہو۔" گپتے نے نرمی سے کہا۔ "اس کھات کے پیچھے کسی اور کا ہاتھ نہیں؟"

"نہیں۔"

اور پھر ونائی اپنے آپ شروع ہو گیا۔ جیسے کوئی صفائی یا تزکیہ چاہتا ہو۔ "میں اسے جانی، مت بھید کے لیے مارتا تو بدلہ لینے کی بات ہوتی۔ پیسے کے لیے مارتا تو چوری چکاری، لوٹ مار کی۔ شریر کے لئے مارتا تو ریپ کی....."

"ہوں... ہوں..." گپتے اور راجگاؤنکر نے ایک ساتھ کہا اور لمبی کرسیاں آگے سرکا لیں۔ وہ یک رکنی الفاظ صرف ونائی ہی کا ٹھیکہ نہ تھے۔

"میں نے ایلشے کو اس لئے مارا۔" ونائی نے گرج سے کہا "کیونکہ وہ سرپنچ کے پورے کراؤڑ میں وہی تھی، جس نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ جو بہت خوب صورت لگ رہی تھی، اور انوسینٹ۔"

پھر تھوڑی دیر کے لئے وہ رک گیا۔ جیسے وہ رکا تھا، ویسے ہی شروع بھی ہو گیا "میں کسی ایسے کو قتل کرنا چاہتا تھا، جو ایک دم سوم ہو، ولیوں ہو، دیوتا ہو....."

گپتے اور راجگاؤنکر کے چہروں پہ اتری پھیل گئی۔ اب جو انہوں نے کہا وہ الفاظ کی مشت زنی تھی "تمہیں پتہ تھا، ایلشے کے دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ نا سمجھ، بلبھا؟"

"اور صرف ایک پتی" ونائی نے جیسے پورے عمرانی نظام پہ چوٹ کی۔

کچھ دیر خاموشی حکومت کرتی رہی۔

"تم دلت پینتھر ہو؟" آخر راجگاؤنکر نے اس سکوت کو توڑا، قانون شکنی کی۔ ونائی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سوال کو جواب کے قابل نہ سمجھتا تھا۔

"کرانتی کاری؟" گپتے نے تضحیک کے انداز میں کہا "بلیک پینتھر؟ چے گوارا کے پیرو؟ الفتح....."

"میں ان سب کا باپ ہوں۔" ونائی نے ایک دم ایکسائیٹ ہوتے ہوئے کہا "میں نے ایک بے قصور کو مارا ہے۔" اور پھر اسی دم بولا "ان کا باپ اور تمہارا پوجنے والا دادا..."

گپتے اچھل گیا۔ مگر راجگاؤنکر نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے اسے دبا دیا۔ اور بولا۔

"جانتے ہو تمہارے جرم کی سزا موت ہے؟"

ونائی نے سر ہلایا "اسی لئے تو یہ سب میں نے کیا ہے.... تم مجھے مارنا چاہتے ہو اور میں مرنا چاہتا ہوں۔ بولو، جب

دونوں میں کس کی ہوتی ؟ ..... بکواس یہ ہے کہ اب تم میرے ساتھ کچھ اور لوگوں کو بھی مارنا چاہتے ہو۔ جیسے ایک آدمی کے مارنے سے تمہارے تو توں کی تکمیل نہیں ہوتی "

اور یہاں سے ونانی کا ٹھنڈا غصہ ایک واضح شکل اختیار کر گیا کیونکہ اس کا چہرہ بیرنگ تھا، کسی قسم کے تاثرات عاری، جبکہ گپتے نے بیسوفی اور نادانی میں ایک نہایت ہی مضحک بات کی — "مر گئے تو پتہ چلے کا مرنا کیا ہوتا ہے ؟"

"WHAT A DONKEY ?" ونانی نے ہنستے ہوئے کہا۔

گپتے اور راجگا ڈنکر نے اُوپر سے ہزار واٹ کے بلب کی روشنی ونانی پر پھینکنا شروع کر دی۔ اور بھی بہت سی چیزیں تھیں پڑھنے کی خاطر کے لیے۔ مگر اُس وقت انہوں نے ایک ڈنڈے پر مرچیں لگا کر اسے ملزم کی مقعد میں ٹھونس دیا تھا۔

دُنیا کے کسی نہ کسی حصے پر ہر سال، ہر وقت برف پڑتی ہے۔ ابھی وہ پگھل بھی نہیں پاتی کہ اُس پر اور برف پڑ جاتی ہے اور وقت کو منجمد اور بوجھل بنا دیتی ہے۔

ونانی کی دنیا کا نقطہ انجماد اسی دن سے بسیط ہونا شروع ہو گیا تھا، جبکہ وہ کولی ماں باپ کے گھر پیدا ہو گیا۔ وہ ساڑھے چار سال کا تھا جبکہ اس کا باپ، رتناکولی، ریڈ سگنل کے باوجود اپنی ناؤ سے کر سمندر میں نکل گیا۔ اسی شام چاند اور نیپچون مل کر نہ جانے کیا سازش کی کہ رتنا کو اپنے آغوش میں کھینچ لیا۔ وہی مچھلیاں جنھیں رتنا کولی کھانا، پکانا اور بیچنا چاہتا تھا، مل کر اسے ہی کھا گئیں اور ہضم کر گئیں۔ ماں ایک سپیرے کے ساتھ بھاگ گئی اور کچھ برسوں کے بعد ونانی کے لئے تین بہنیں اور دو بھائی لے کر لوٹ آئی۔ ونانی ایلکالش آرفینیج میں پڑھا جو ہم جیسوں کا آرفینیج — اناتھ آلیہ ہے۔ مگر اس میں صرف اناتھ ہی پڑھ سکتے ہیں۔ ونانی اگر وہاں پڑھتا تو یہ نادر کرنا سیس کی مہربانی تھی۔

وہ نقطہ اسی سال سمٹنا شروع ہو گیا، جبکہ لوگوں نے گنپتی کی مورتی گھر میں استھاپت کی اور پھول اُس کی سیوا میں بھینٹ کرنے لگے۔ اسی دن ونانی اپنٹوپ ہل کے دامن میں شکو سے آخری بار ملا۔

شکو ہاتھ میں گولڈ فلیک کا ایک پیانا ٹین تھامے کھڑی تھی اور بے حد پریشان نظر آ رہی تھی۔ اُس کی زلفیں دیمک کی طرح سے لمبی، دھوئیں کی طرح سے دھندلی اور بدن یقین کی طرح سے سخت تھا۔ گویا اینٹوپ ہل کے اوپر آبنوس سے بنی ایک اپسرا تھی اور آدھی فولاد سے بنی ہوئی اپسرا۔ ٹرا ہے کاری ایکٹر۔ یہ میں رتی ایکٹر کی مناسبت سے کہہ رہا ہوں کہ شکو کا پورا بدن ایک پہیتا تھا جس کی گنتی کنتی یورینیم تھی اور نس نس کوبالٹ۔ وہ معدنیات کی ایک کان تھی، جسے کسی نے ابھی تک پراسپیکٹ نہیں کیا تھا۔ وہ دھاتوں کا خزانہ، اُسے ایک ہی دھات چاہیے تھی اور وہ بھی صرف ونانی سے ..... اُسے نشچے ہو گیا تھا کہ یہ وہ مرد ہے جس کی وجہ سے اپنا آپ کم پڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے جب شکو نے بتایا کہ وہ اور اُس کے ماں باپ رات سے بھوکے ہیں، کیونکہ گھاسلیٹ کے نہ ہونے سے چولہا نہیں جلا تو ونانی نے اپنے اسی یک رُکنی انداز سے کہا — "ہوں"

"ہوں کیا ؟" شکو نے ادا سے پوچھا، جس کے جواب میں ونانی نے پھر وہی "ہوں" دُہرا دی جو آغاز پہلی ہوں سے مدھم تھی، کیونکہ وہ سمجھ سے تعلق رکھتی تھی۔

جبھی اُسے نذر والی روڈ پر ماٹنگا سائین کی طرف جاتا ہوا ایسو کمپنی کا ایک ٹینکر دکھائی دیا جس میں گھاسلیٹ تھا۔ پیچھے اس کی ٹونٹی

سے مٹی کا تیل قطرہ بہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔

ونانی نے شنکو کے ہاتھ سے گولڈ فلیک کا ٹین جھپٹ لیا اور ٹینکر کے پیچھے دوڑا۔ سامنے ایک ٹرک کے آہستہ ہو جانے سے ٹینکر کی رفتار بھی کم ہو گئی تھی۔ ونانی آہستہ آہستہ اس کے پیچھے لٹک گیا۔ ایک ہاتھ سے اس نے سیڑھی تھامی اور دوسرے سے ٹین کو ٹونٹی کے نیچے کر لیا۔ وہ چاہتا تو پھرکی گھما کر ایک ہی سیکنڈ میں وہ چھوٹا سا ٹین بھر لیتا مگر اس نے سوچا وہ صرف وہی تیل لے گا، جو گر کر سڑک پہ ضائع ہو رہا ہے ......

شنکو سینے پہ ہاتھ رکھے کھڑی دور سے اسے دیکھ رہی تھی۔

عین موڑ پر ہونے سے ٹینکر تھوڑا سا کے پر رکا اور پھر جھٹکے کے ساتھ دائیں طرف مڑ کر سائن ماٹنگا روڈ پہ ہو لیا۔ ریل کا پل پار کرتے ہی ونانی کا ٹین بھرنے لگا۔ تبھی اتھن کی ایک دوکان پہ گھاسلیٹ کے لئے لمبے کیو میں لگے ہوئے لوگوں نے اسے دیکھ اور شور مچا دیا — چور چور ...... ونانی کا ہاتھ سلپ ہو گیا اور وہ نیچے سڑک پہ گر گیا۔ ٹینکر رکا۔ لوگ لپکے اور ونانی کو پکڑ کر اسے مارنا شروع کر دیا۔ ٹینکر کا ڈرائیور اور اس کا کلینر ساتھی اسے گھسیٹتے ہوئے پاس ہی کے پولیس اسٹیشن کی طرف لے جانے لگے۔ ونانی کو صرف ایک ہی چوٹ آئی تھی اور وہ یہ کہ ٹین کے ساتھ گھاسلیٹ بھی نیچے گر گیا تھا —

ونانی نے نہیں مگر جانے کس نے شنکو کا نام دے دیا۔ اس دن بہت گرمی تھی کیونکہ بادل تنے تھے، مگر چھینٹا نہیں پڑ رہا تھا۔ تبھی پولیس کا ایک آفیسر جیپ لئے اینٹوپ ہل کی جھونپڑی میں پہنچ گیا — تفتیش کے لئے۔ اس نے شنکو اور اس کے ماں باپ کو بتایا کہ ونانی حوالات میں ہے۔ آج یہ چوری نڈر کے — پانی وے ریلوے کے روش لگے ہیں۔ شنکو ایک تو پہلے ہی بھوکی تھی۔ اس پر ونانی کے پکڑے جانے کی بات سن کر وہ کانپنے لگی۔

"اسے مارا تو نہیں؟" وہ بولی۔

آفیسر نے کوئی جواب نہ دیا۔ اسے پیاس لگی تھی۔ اس کی وجہ گرمی تھی یا شنکو، یہ نہیں معلوم۔ لیکن جب شنکو نے گھڑے سے پانی نکال کر اسے دیا۔ تو اس نے پینے سے انکار کر دیا۔ شنکو نے سوچا، کوئی بات نہیں ... اونچی جات کا ہو گا۔ آفیسر نے بتایا ونانی گھر آ سکے گا، جب کوئی اس کا ضامن بنے گا......

شنکو نے چھاتی پہ ہاتھ رکھا اور بولی: "ضامن میں بنوں گی"

"تم؟" شنکو کے باپ نے کہا۔ "تمہارے ......"

جب تک شنکو نیل کے گنڈے کی طرح سے باہر چھوٹ گئی تھی۔ آفیسر اٹھا اور شنکو کے باپ کو دلاسا دیتے ہوئے بولا "گھبراؤ نہیں کاکا جی۔ پرسنل ضمانت بھی ہو سکتی ہے......"

اور وہ باہر کھڑی جیپ کی طرف چل دیا۔

بوڑھے نے دلاسا پر شنکو کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں شک تھے۔ مگر دلاسا دی ہوئی ہے۔ کس بات کی نہیں، جوانی نہ ہو جائے تو آ جائے کی شنکو ......

وناؔئی حوالات کی سلاخوں کے پیچھے سے ڈیوٹی آفیسر کو دیکھ رہا تھا۔

"میں نے کوئی چوری نہیں کی انسپکٹر۔۔۔۔کوئی ڈاکہ نہیں ڈالا۔ بینک سے کاسا سیٹ نیک رہا تھا، سڑک پر گر کر ویسٹ ہو رہا تھا۔۔۔۔"

ڈیوٹی آفیسر بنئے کی طرح کسی امیر گاہک کی طرف متوجہ تھا۔

پولیس آفیسر کی جیپ پہلے آگئی، جس سے اتر کر وہ پولیس اسٹیشن کے پیچھے چلا گیا، جہاں راستہ کوارٹروں کی طرف جاتا تھا۔ وناؔئی نے شنکو کو دور سے آتے دیکھا۔ وہ بھاگ رہی تھی اور اس کی گھنگھور زلفیں پیچھے کی طرف اڑ رہی تھیں، کہیں برسنے جا رہی تھیں۔ اگلے ہی پل میں وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

آدھ پون گھنٹے کے بعد ایک کانسٹیبل نے حوالات کا دروازہ کھولا اور کہا "وناؔئیک راؤ۔۔۔۔باہر۔"

وناؔئی جو اس اتفاق کے لیے تیار ہی نہ تھا، بولا۔ "کیا مطلب؟۔۔۔۔کیوں؟ کیسے؟"

باہر آیا تو اس نے شنکو بائی کو ڈیوٹی روم میں نہ پایا۔

"میری ضمانت کس نے دی ہے؟۔۔۔۔کس نے بیل آؤٹ کیا ہے مجھے؟" اس نے ڈیوٹی آفیسر سے پوچھا، جس نے باہر کی طرف اشارہ کیا —

وناؔئی نے دیکھا شنکو پولیس اسٹیشن کے احاطے سے باہر جا رہی ہے اور وہ اپنی نہیں کسی اور ہی کی چال چل رہی ہے۔۔۔۔

اس سے پہلے کہ وہ باہر لپکتا، ڈیوٹی آفیسر نے اسے روکا اور ایک کاغذ سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "دستخط کرو۔۔۔۔۔۔۔ ۲ اکتوبر کو باندرا کورٹ میں حاضر ہونا مانگتا، سمجھا!"

وناؔئی نے جلدی سے کاغذ پر دستخط کئے۔ اس کی نس نس ہاتھ میں چپ رہ رہ کی اور پھر باہر کی طرف بھاگا۔ سڑک سے ادھر ٹریفک سگنل کے سامنے ہی وناؔئی نے شنکو کو آ لیا۔

"شنکو"۔ وناؔئی نے کہا۔۔۔۔

شنکو کچھ نہ بولی۔ وہ رو رہی تھی اور نہ ہنس رہی تھی۔ وہ اس عالم میں تھی جس میں انسان دیکھتا ایک چیز ہے اور سوچتا دوسری۔ اور سوال کرنے والے کی طرف مڑ کر صرف اتنا سا کہتا ہے۔ ایں؟

وناؔئی نے شنکو کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔ "کیا ہوا شنکو؟"

"کچھ نہیں۔" شنکو نے جواب دیا۔

وناؔئی اس کے پیچھے ہو لیا، اور کچھ نہیں تو ٹریفک سے اسے بچانے کے لئے۔ سگنل کے پاس پہنچ کر ایک بار وناؔئی نے مڑ کر پیچھے پولیس اسٹیشن کی طرف دیکھا، جس کی دیواریں ٹھوس کنکریٹ سے بنی تھیں۔

سگنل کے دوسری طرف سڑک پر رک کر ٹریفک ابھی راستہ نہ دے رہی تھی۔ وہ دونوں پلیٹ فارم پر کھڑے تھے۔ جبکہ وناؔئی

نے پھر پوچھا۔ ”شکو! بول تو سہی کیا ہوا؟“

شکو نے گہری نظروں سے ونائی کی طرف دیکھا۔

”تم نے میری ضمانت دی ہے؟“ ونائی نے پوچھا

”———“

”کیسے دی ہے؟ تمہارے پاس ......؟“

شکو نے حقارت کی نظر سے ونائی کی طرف دیکھا۔ اُس کی نگاہیں زبان سے زیادہ ناطق تھیں جو کہہ رہی تھیں۔ مرد کی جات کُتے کی ہے .... وہ اگر اپنی زبان کو شرمندۂ الفاظ کرتی تو ونائی کہتا — کتے کی نہیں بھیڑیے کی۔ مگر وہ وہی بیگانی چال چلتی ہوئی سڑک پار کر گئی اور ... والی روڈ کی پٹری پر ہولی۔ ونائی نے لپک کر اُس کا ہاتھ پکڑا اور جھٹکے سے اپنی طرف کھینچا اور بولا — ”شکو“

شکو پلٹ کر آلٹ کر ونائی سے آلگی۔ یوں معلوم ہوا جیسے وہ اُس کی چھاتی پر اپنا سر رکھ کر اپنا دکھ رو لے گی، سُکھ بولے گی۔ مگر نہیں، شکو نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اُسے ونائی سے نفرت تھی، اپنے آپ سے نفرت تھی .... وہ چل دی!

ونائی بھوچکا کھڑا رہ گیا اور شکو کو جاتے دیکھنے لگا جس نے اپنے گھٹنے کا پلو منہ میں ٹھونس لیا تھا اور جا رہی تھی۔ سامنے بائیں ہاتھ پر مغل پارہ برانچ کی ریلوے لائنیں اور اینٹوپ ہل کی جھونپڑیاں نظر آ رہی تھیں۔

ونائی سب جان گیا تھا، سب سمجھ گیا تھا۔ وہ کتنا کہنا چاہتا تھا شکو تم نردوش ہو، کنواری ہو .... انہی حالات میں سبزی بیچنے والی شانتا کو اُس کے پتی نے گھر سے نکال دیا تھا اور آج وہ فارس روڈ کی جنگم بائی کے قحبہ خانے میں رہتی، دھندہ کرتی ہے۔ ... چھ سات مرد اسے روندتے روندتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔ اس سے کم ہوں تو نہ وہ میڈم، نہ دلال کے پیسے دے سکتی ہے اور ... بچے ... کی ... روٹی ... کما ... ہے۔ لیکن وہ کنواری ہے کیونکہ اسے اپنے گاہکوں سے محبت ہے۔ نہ اپنے پتی سے ....

یہ کنوارپن .... یہ سب مردوں کی سازش ہے تاکہ عورت جان نہ پائے کہ مرد کیا ہوتا ہے ایک اور دوسرے میں کیا فرق ہے

مگر ... کا کیا علاج جبکہ عورت خود بھی اس سازش میں شامل ہو گئی ہے؟

ونائی کا خیال تھا شکو آخر اسے بلائے گی، لوٹ کر آئے گی، مگر نہیں۔ وہ تو اپنے آپ کو اب ونائی کے قابل نہ سمجھتی ہو — چلی گئی۔ ونائی نے آخری بار اسے اپنی نظروں کی سرحد پہ دیکھا اور چلا اٹھا — ”میں مر اکتوبر نہیں آنے دوں گا .... میں تمہیں اکتوبر آنے دوں گا ....“

اور اسی عالم میں وہ بھاگتا ہوا ماٹنگا کی بھاری ٹریفک میں کہیں گم ہو گیا .... (تمام)

مغل بچّہ

عصمت چغتائی

فتح پور سیکری کے سنسان کھنڈروں میں گوری دادی کا مکان پرانے سوکھے زخم کی طرح کھٹکتا تھا۔ ککیا اینٹ کا دو منزلہ گھٹا گھٹا سا مکان ایک مار کھائے روٹھے ہوئے بچے کی طرح لگتا تھا۔ دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا وقت کا بھونچال اس کی ڈھٹائی سے عاجز آکر آگے بڑھ گیا اور شاہی شان و شوکت پر ٹوٹ پڑا۔

گوری دادی سفید جھک چاندنی بچھے تخت پر سفید بے داغ کپڑوں میں ایک سنگِ مرمر کا مقبرہ معلوم ہوتی تھیں۔ سفید ڈھیروں بال، بے خون کی سفید دھوئی ہوئی ململ جیسی جلد، ہلکی کرنجی آنکھیں جن پر سفیدی رینگ آئی تھی پہلی نظر میں سفید لگتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر آنکھیں چکا چوند ہو جاتی تھیں جیسے پسی ہوئی چاندی کا غبار ان کے گرد معلق ہو۔

نہ جانے کب سے جئے جا رہی تھیں۔ لوگ ان کی عمر سو سے اوپر بتاتے تھے۔ کھلی کھلی گم سم بے نور آنکھوں سے وہ اتنے سال کیا دیکھتی رہی تھیں۔ کیا سوچتی رہی تھیں کیسے جیتی رہی تھیں۔ بارہ تیرہ برس کی عمر میں وہ میری اماں کے چچا دادا سے بیاہی تو گئی تھیں مگر انہوں نے دلہن کا گھونگھٹ بھی نہ اٹھایا۔ کنوارپن کی ایک صدی انہوں نے انہی کھنڈروں میں بتائی تھی۔ جتنی گوری بی سفید تھیں اتنے ہی ان کے دولہا سیاہ بھجنگ تھے۔ اتنے کالے کہ ان کے آگے چراغ بجھے۔ گوری بی بجھ کر بھی دھواں دیتی رہیں۔

سرِ شام کھانا کھا کر جھولیوں میں سوکھا میوہ بھر کے ہم بچے لحافوں میں دبک کر بیٹھ جاتے اور پرانی زندگی کی ورق گردانی شروع ہو جاتی۔ بار بار سن کر بھی جی نہ بھرتا۔ اوبدا کر گوری بی اور کالے میاں کی کہانی دہرائی جاتی۔ بیچارے کی عقل پہ پتھر پڑ گئے تھے کہ اتنی گوری گوری دلہن کا گھونگھٹ بھی نہ اٹھایا۔

اماں سال کے سال پورا لاؤ لشکر لے کر میکے پہ دھاوا بول دیتیں۔ بچوں کی عید ہو جاتی فتح پور سیکری کے پراسرار شاہی کھنڈروں میں آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے جب شام پڑ جاتی تو کھوئی کھوئی سرمئی فضا سے ڈر لگنے لگتا۔ ہر کونے سے سائے لپکتے۔ دل دھک دھک کرنے لگتے۔

"کالے میاں آ گئے!" ہم ایک دوسرے کو ڈراتے گرتے پڑتے بھاگتے اور ککیا اینٹ کے دو منزلہ مکان کی آغوش میں دبک جاتے۔ کالے میاں ہر اندھیرے کونے میں بھوت کی طرح چھپے محسوس ہوتے۔ بہت سے بچے مرنے کے بعد حضرت سلیم چشتی درگاہ پر ماتھا رگڑا تب گوری بی کا منہ دیکھنا نصیب ہوا۔ ماں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک گوری بی بڑی ضدی تھیں۔ بات بات پر اٹواٹی کھٹواٹی لے کے پڑ جاتیں جیسے ہڑتال کر دیتیں۔ گھر میں کھانا پکتا، کوئی منہ نہ جھٹالتا جوں کا توں اٹھوا کر مسجد میں بھجوا دیا جاتا۔ گوری بی نہ کھائیں تو اماں باوا کیسے نوالہ توڑتے۔

بات اتنی سی تھی کہ جب منگنی ہوئی تو لوگوں نے مذاق میں چھینٹے کسے۔

"گوری دلہن کالا دولہا۔"

مگر مغل بچے مذاق کے عادی نہیں ہوتے۔ سولہ سترہ برس کے کالے میاں اندر ہی اندر گھٹتے رہے جل کر کوئلا ہوتے رہے۔

"دلہن میلی ہو جائے گی خبردار یہ کالے کالے ہاتھ نہ لگانا۔"

"بڑے نازوں کی پالی ہے تمہاری تو پرچھائیں پڑی تو کالی ہو جائے گی۔"

"بڑا تیہا ہے ساری عمر جوتیاں اُٹھوائے گی۔"

انگریزوں نے جب مغل شاہی کا انتم سنسکار کیا تو سب سے بُری مغل بچوں پر بیتی کہ وہی زیادہ عہدے سنبھالے بیٹھے تھے۔ جاہ و جاگیر چھن جانے کے بعد لاکھوں کے گھر دیکھتے دیکھتے خاک ہو گئے۔ بڑی بڑی ڈھنڈار حویلیوں میں مغل بچے بھی پرانے سامان کی طرح پڑے بھونچکے سے رہ گئے جیسے کسی نے پیروں تلے سے تختہ کھینچ لیا۔

تب ہی مغل بچے اپنے غرور اور خودداری کی تار تار چادر میں سمٹ کر اپنے اندر ہی اندر گھستے چلے گئے۔ مغل بچے اپنے غرور سے کچھ کھسکے ہوئے ہوتے ہیں۔ کھرے مغل کی یہی پہچان ہے کہ اس کے دماغ کے دو چار پیچ ڈھیلے یا ضرورت سے زیادہ تنگ ہوتے ہیں۔ عرش سے فرش کی طرف لڑھکے تو ذہنی توازن ڈگمگا گئے۔ زندگی کی قدریں خلط ملط ہو گئیں۔ دماغ سے زیادہ جذبات سے کام لینے لگے۔

انگریزی کی چاکری پیشہ اور محنت مزدوری کسر شان، جو کچھ اثاثہ بچا اُسے بیچ بیچ کر کھاتے رہے۔ ہمارے ابا کے چچا [illegible] سے [illegible] آکھیر لیے جاتے تھے۔ زیور اور برتنوں کے بعد گھر سے لوہا لنگڑ [illegible] سے کھل کر [illegible] اور کھائیں۔ گھر کے [illegible] اور آمنے [illegible] شام کو [illegible] ساری دوپہر چھپ چھپ کر سلائی کر لیتیں۔ چار پیسوں سے چولہا جل جاتا۔ یا محلے کے بچوں کو قرآن پڑھا دیتیں تو کچھ نذرانہ مل جاتا۔

کالے میاں نے دستار بندھے خاندانی روایت کا کھادر بنا لیا۔ جیسے موت کی گھڑی نہیں ٹلتی ویسے ہی باپ ماں کی طے کی ہوئی شادی نہ ٹلی۔ کالے میاں سہرا باندھ کے دولہا بن گئے۔ کسی منہ پھٹ نے عین آرسی مصحف کے وقت اور چھیڑ دیا۔

"خبردار جو دلہن کو ہاتھ لگایا کالی ہو جائے گی۔"

مغل بچہ چوٹ کھائے ناگ کی طرح پلٹا، سر سے پھولوں کا آنچل نوچا اور باہر چلا گیا۔

ہنسی میں کھسی ہو گئی۔ ایک ماتم برپا ہو گیا۔ مردانے خانے میں اس بدتمیزی کی خبر منٹوں میں اُڑ گئی۔ بغیر آرسی مصحف کے رخصتی ایک قیامت تھی۔

"بخدا میں اس کا غرور توڑ کر رہوں گا۔ کسی ایسے ویسے سے نہیں مغل بچے سے واسطہ ہے۔" کالے میاں پھنکارے۔

کالے میاں شمشیر کی طرح پوری مسہری پر دراز تھے۔ دلہن ایک کونے میں گٹھری بنی کانپ رہی تھی۔ بارہ برس کی بچی کی بساط ہی کیا؟

"گھونگھٹ اٹھاؤ" کالے میاں ڈکرائے۔

دلہن اور گٹھری بن گئی۔

"ہم کہتے ہیں گھونگھٹ اٹھاؤ" کہنی کے بل اٹھ کر بولے۔

سہیلیوں نے تو کہا تھا دولہا ہاتھ جوڑے گا پیر پڑے گا پر خبردار جو گھونگھٹ کو ہاتھ لگانے دیا۔ دلہن جتنی زیادہ مدافعت کرے اتنی ہی زیادہ پاکباز۔

"دیکھو بی ہم تو ایزا دی ہو گی اپنے گھر کی ہماری تو پیر کی جوتی ہو گھونگھٹ اٹھاؤ ہم تمہارے باپ کے نوکر نہیں ہیں"

دلہن پر جیسے فالج گر گیا۔

کالے میاں چیتے کی طرح لپک کر اٹھے جوتیاں اٹھا کر بغل میں دابیں اور کھڑکی سے پائیں باغ میں کود گئے۔ صبح کی گاڑی سے وہ جودھپور روانہ ہو گئے۔

گھر میں تو پہلے اٹھا ایک اٹالی جو دلہن کے ساتھ آئی تھیں جاگ رہی تھیں۔ کان دلہن کی چیخوں کی طرف لگے تھے۔ جب دلہن کے کمرے سے چوں بھی نہ آئی تو ان کے تو پیروں کا دم نکلنے لگا ہے ہے کیسی بے حیا لڑکی ہے۔ لڑکی جتنی معصوم اور کنواری ہو گی اتنا ہی زیادہ واویلا مچائے گی۔ لیا کچھ کالے میاں میں کھوٹ ہے۔ جی چاہا کوئیاں میں کود کے قصہ پاک کریں۔

چپکے سے کمرے میں جھانکا تو جی سن سے ہو گیا۔ دلہن جیسی کی تیسی دھری تھی اور دولہا غائب!

اسے غیر دلچسپ قسم کے ہنگامے ہوئے لوگ پیچ کھینچ بڑی مشکل سے دلہن نے جو بات تھی کہہ سنائی۔ اس پر طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ خاندان میں دو پارٹیاں بن گئیں۔ ایک کالے میاں کی دوسری گوری بی کی طرفدار۔

"مرد خدا کا مجازی ہے۔ اس کا حکم نہ ماننا گناہ ہے" ایک پارٹی کہتی تھی۔

"کہیں کسی دلہن نے خود گھونگھٹ اٹھایا ہے؟" دوسری پارٹی کی دلیل تھی۔

کالے میاں کو جودھپور سے بلوا کر دلہن کا گھونگھٹ اٹھوانے کی ساری کوششیں ناکام گئیں۔ وہ وہاں گھوڑ سواروں میں بھرتی ہو گئے اور کہتے بھیجتے ہیں جو گوری بی کی اماں سمدھن کے منہ پر مارا آتیں۔

گوری بی ٹال سے پھول بن گئیں۔ ہر اٹھوارے ہاتھ پیروں میں مہندی رچائی رہیں اور بندھن کے دوپٹے اوڑھتی رہیں۔ چوتھی چالے ہر سال رچتی رہیں۔ ایک زمانہ ایسا ہوا کہ باوا کی مرن گھڑی آ پہنچی۔ کالے میاں کو خبر گئی تو نہ جانے کس موڈ میں تھے کہ بھاگے آئے۔ باوا موت کی دہلیز پر کھڑے تھے۔ کالے میاں کو طلب کیا دلہن کا گھونگھٹ اٹھانے کی باریکیوں پر مسکوٹ ہوئی۔

کالے میاں نے سر جھکا دیا مگر شرط وہی رہی کہ حشر ہو جائے مگر گھونگھٹ تو دلہن کو اپنے ہاتھوں اٹھانا پڑے گا۔ "قبلہ و کعبہ میں قلم کئے دیتا ہوں میرا سر قلم کر دیجئے مگر قسم نہیں توڑ سکتا۔"

مغل بچوں کی تلواریں زنگ کھا چکی تھیں۔ آپس کی مقدمہ بازیوں نے سارا اکلف نکال دیا تھا۔ بس احمقانہ ضدیں رہ گئی تھیں ایک

انہیں کو دیکھے سے رلائے بیٹھے تھے۔ کسی نے کالے میاں سے نہ پوچھا تم نے ایسی احمقانہ قسم کھائی ہی کیوں کہ اچھی بھلی زندگی عذاب ہو گئی۔

خیر صاحب گوری بی بیاہ سے دلھن بنا دی گئیں۔ گیا ایسے والا مکان چمپا پھولوں اور شمامۃ العنبر کی خوشبو سے مہک اٹھا۔ اماں نے سمجھایا "تم ان کی منکوحہ ہو بیاہتا ہو، گھونگٹ اٹھانے میں کوئی عیب نہیں۔ ان کی ضد پوری کر دو مغل بچہ کی آن رہ جائے گی، تمہاری دنیا سنور جائے گی۔ گود میں بچے ہوں گے۔ اللہ رسول کا حکم پورا ہوگا۔"

گوری بی [illegible] سات سال میں نوخیز قیامت بن چکی تھی۔ حسن و جوانی کا ایک طوفان تھا جو اُن کے جسم سے پھوٹا نکلتا تھا۔

عورت کالے میاں کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ سارے حواس اسی ایک نکتہ پر مرکوز تھے۔ مگر ان کی قسم ایک میخ دار آہنی کوڑے کی طرح اُن کے حلق میں پھنسی ہوئی تھی۔ اُن کے تخیل نے سات سال آنکھ مچولی کھیلی تھی۔ انہوں نے سیکڑوں گھونگٹ نوچ ڈالے [illegible] بازی بٹیر بازی کبوتر بازی مرغ بازی کون بازی نہ چھوڑی مگر گوری بی کے گھونگٹ کی چوٹ دل میں پنجے گاڑے رہی جو سات سال سہنے کے بعد زخم بن چکی تھی۔ اس بار انہیں یقین تھا ان کی قسم پوری ہوگی۔ گوری بی ایسی عقل کی کوری نہیں کہ جینے کا یہ آخری موقع بھی گنوا دیں، دو انگلیوں سے ہلکا پھلکا آنچل ہی تو سرکانا ہے کوئی پہاڑ تو نہیں ڈھونے۔

"گھونگٹ اٹھاؤ۔" کالے میاں نے بڑی لجاجت سے کہا پر لہجہ میں تعلّی و دبدبہ غالب آ گیا۔

گوری بیگم غرور سے تمام سناٹے میں بیٹھی رہیں۔

"آخری بار حکم دیتا ہوں گھونگٹ اٹھا دو، ورنہ اسی طرح پڑی سڑ جاؤ گی۔ اب جو گیا پھر نہ آؤں گا۔"

مارے غصّہ کے گوری بی لال بھبھوکا ہو گئیں۔ کاش اُن کے سلگتے رخسار سے ایک شعلہ لپکتا اور وہ منحوس گھونگٹ خاکستر ہو جاتا۔

[illegible] میں کھڑے کالے میاں کوڑیالے سانپ کی طرح جھومتے رہے۔ پھر جوتے بغل میں دبائے اور پائیں باغ میں اتر گئے۔

سب وہ پائیں باغ کہاں؟ ادھر پچھواڑے کی کھڑکیوں تک [illegible] لگ گئی۔ بس دو جامن کے پیڑ رہ گئے تھے اور ایک جھاڑی [illegible] بیٹھے [illegible] کے سب [illegible]۔

جب تک اماں زندہ رہیں گوری بی کو سنبھالے رہیں۔ ان کے بعد [illegible] گوری بی نے سنبھال لی۔ ہر جمعرات کو مہندی کا لیپ کر پاؤں سے لگاتیں، دوپٹہ رنگ چن کر ٹانکتیں اور جب تک ساس [illegible] زندہ رہیں [illegible] سلام کرنے جاتی رہیں۔

اب کے جو کالے میاں گئے تو غائب ہی ہو گئے۔ برسوں اُن کا سراغ نہ ملا۔ ماں باپ رو رو کر اندھے ہو گئے۔ [illegible] کن جوہڑوں کی خاک چھانتے پھرتے کبھی سنا لکھنؤ میں ان کا سراغ ملا کبھی کسی مندر کی سیڑھیوں پر پڑے ملتے

گوری بی کے [illegible] بالوں میں چاندی گھل گئی۔ صورت کی حفاظت کا کام کرتی رہیں۔ آس پاس کی زمینیں مکان کوٹھریوں کے بکتے گئے کچھ پرانے لوگ زبردستی ڈٹ گئے۔ کنجڑے قصائی آن بسے، پرانے محل ڈھے کر نئی دنیا کی بنیاد پڑنے لگی۔ پرچون دکان، ڈسپنسری ایک مرکھلا سا جنرل اسٹور بن گیا۔ جہاں موسم کی تیلیاں اور پٹن چائے کی پڑیوں کے ہار لٹکنے لگے۔ ایک مفلوج منشی کی دولت بس کر بکھر رہی تھی۔ چند مختاط انگلیاں سمیٹنے میں لگی تھیں۔ جو کل تک اودائی پر بیٹھتے تھے۔

جھک کر سلام کرتے تھے آج ساتھ اُٹھنا بیٹھنا کسرِ شان سمجھنے لگے۔

گوری بی کا زیور آہستہ آہستہ لالہ جی کی تجوری میں پہنچ گیا۔ دیواریں ڈھے رہی تھیں چھجے جھول رہے تھے۔ بچے کچھے منھ چڑھے افیون کا استعمال کر کے پتنگوں کے پیچ لڑا رہے تھے تیتر بٹیر سدھا رہے تھے اور کبوتروں کی دموں کے پر گن کر مگن ہو رہے تھے۔ نفع مرزا جو کبھی شان اور دبدبے کی علامت سمجھا جاتا تھا مذاق بن رہا تھا گوری بیوی کولھو کے ماندے بیل کی طرح زندگی کے چکر میں جتی اپنے محور پر گھومے جا رہی تھیں۔ اُن کی کرنجی آنکھوں میں تنہائیوں نے ڈیرہ ڈال دیا تھا۔

ان کے لئے طرح طرح کے افسانے مشہور تھے کہ ان پر جنوں کا بادشاہ عاشق تھا۔ جونہی کالے میاں اُن کے گھونگٹ کو ہاتھ لگاتے جھٹ تلوار سونت کر کھڑا ہو جاتا۔ ہر جمعرات کو عشا کی نماز کے بعد وظیفہ پڑھتی ہیں تب سارا آنگن کوڑیالے سانپوں سے بھر جاتا ہے۔ پھر سنہری کلغی والا سانپوں کا بادشاہ اژدہا پر سوار ہو کر آتا ہے۔ گوری بی کی ذات پر سر دھنتا ہے پو پھٹتے ہی سب ناگ رخصت ہو جاتے ہیں۔

جب ہم یہ قصے سنتے تو کلیجے اُچھل کر حلق میں پھنس جاتے اور رات کو سانپوں کی پھنکاریں سن کر سوتے میں چونک کر چیخیں مارتے۔

گوری بی نے ساری عمر کیسے کیسے ناگ کھلائے ہوں گے۔ کیسے اُنہی نامراد زندگی کا بوجھ ڈھویا ہوگا۔ ان کے رسیلے ہونٹوں کو کبھی کسی نے نہیں چوما۔ انہوں نے جسم کی پکار کو کیا جواب دیا ہوگا؟

کاش یہ کہانی یہیں ختم ہو جاتی۔ مگر قسمت مسکرا رہی تھی۔

پورے چالیس برس بعد کالے میاں اچانک آپ ہی آن دھمکے۔ انہیں قسم قسم کے لاعلاج امراض لاحق تھے پور پور سڑ رہی تھی۔ دم بدم رس رہا تھا۔ بدبو کے مارے ناک سڑی جاتی تھی۔ بس آنکھوں میں حسرتیں جاگ رہی تھیں جن کے سہارے جان سینے میں اٹکی ہوئی تھی۔

"گوری بی سے کہو مشکل آسان کر جائیں۔"

ایک کم ساٹھ کی دلہن نے روٹھے ہوئے دولھا میاں کو منانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ مہندی گھول کر ہاتھ پیروں میں رچائی۔ پانی سموکر اُبٹنا پاک کیا سہاگ کا چکنا ہوا تیل سفید لٹوں میں بسایا۔ صندوق کھول کر پور پور ٹپکتا جھڑتا بری کا جوڑا نکال کر پہنا اور ادھر کالے میاں دم توڑتے رہے۔

جب گوری بی شرماتی لجاتی دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اُن کے سرہانے پہونچیں تو جھلنگے پر چیکٹ تکئے اور گودڑ بستر پر پڑے ہوئے کالے میاں کی بجھ ہڈیوں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ موت کے فرشتے سے جوجھتے ہوئے کالے میاں نے حکم دیا۔

"گوری بی گھونگٹ اٹھاؤ۔"

گوری بی کے ہاتھ اُٹھے مگر گھونگھٹ تک پہونچنے سے پہلے گر گئے۔

کالے میاں دم توڑ چکے تھے۔

وہ بڑے سکون سے اکڑوں بیٹھ گئیں، سہاگ کی چوڑیاں ٹھنڈی کیں اور رنڈاپے کا سفید آنچل ماتھے پر کھینچ لیا۔

کارِ جہاں دراز ہے

(دوسری قسط)

قرۃ العین حیدر

فصلِ سوم

باب انیچری فوج

چوگوشیہ ٹوپی اوڑھے بوسیدہ دُغلے میں ملبوس تاجیک نژاد بوڑھا چھوٹس قصہ گو اب قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔ مقبرۂ مبارز الدّ خاں کے گنبد اور میر بندے علی ترمذی کے بھونک کے سائے طویل ہو چلے۔ دہشت زدہ ہو کر جھیل پار شہر خموشاں پر نظر ڈالتا ہے۔ اس کے قدر دان محوِ خواب ہوئے۔ اوروں نے دنیا سنبھالی۔ اپنے بھی اب اجنبی سے نظر آتے ہیں —— یہ پیر مرد اس جہانِ گذراں کے ایک مختصر سے دور یعنی صرف بارہ سو (۱۲۰۰) سال کی ایک کہانی سنا رہا تھا لیکن دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ نئے لوگ اس سے اکتا گئے۔ کسی کو اس کی حکایات کی مطلق ضرورت نہیں۔ لہٰذا کرم خوردہ شجروں کا بستہ لپیٹ کر عدم کی تاریکی میں لامکاں میں داخل ہو جائے گا جہاں نہ گفتگو ہے نہ جستجو۔

یہ دل شکستہ نافہ کش بوڑھا دوبارہ کبھی نظر آئے گا کہ صورتیں، شخصیتیں اور انجمنیں اسی طرح مٹتی ہیں۔

محلہ سادات، حکیمان، رسولداران، تیرگران وغیرہ وغیرہ کے کھنڈروں پر نئی ٹاؤن ایریا کمیٹی کے نصب کیے ہوئے لیمپ ٹمٹماتے ہیں مگر کہیں کہیں اکا دکا شمع اب بھی جل رہی ہے۔

فصلِ اوّل میں اس قصبہ نہٹور ضلع بجنور کے دو بھائیوں میر بندے علی ترمذی و میر احمد علی کا قصہ مع ان کے بزرگوں کی داستان کے بیان کیا گیا۔ غدر میں میر احمد علی کالوں کی باغی فوج میں شامل ہو گئے تھے۔ پھانسی کی سزا ملی۔ جان بخشی ہوئی۔ احمد علی کے بیٹے جلال الدین حیدر نے اپنے لڑکوں کو ان کے بچپنے ہی میں نیچری فوج میں بھرتی کر دیا کہ زمانے کا تقاضا بھی ہے۔ کول کی نئی چھاؤنی میں یہ فوج تعینات ہے۔ اس کے سالارِ اعلیٰ نے چالیس سال قبل میر احمد علی اور ان کے رفقا کی زبردست مخالفت کی تھی۔ وہ بھی وقت کا تقاضا تھا۔ مؤرخین۔ نقاد۔ سیاست دان۔ اہلِ بصیرت اپنے اپنے فیصلے بعد میں صادر کریں گے۔ اکبر نے فرمایا:

علی گڑھ کو شرف بخشا ہے اقبالِ نصاریٰ نے
کہ جو مسلم اٹھا شوقِ ترقی میں یہیں آیا

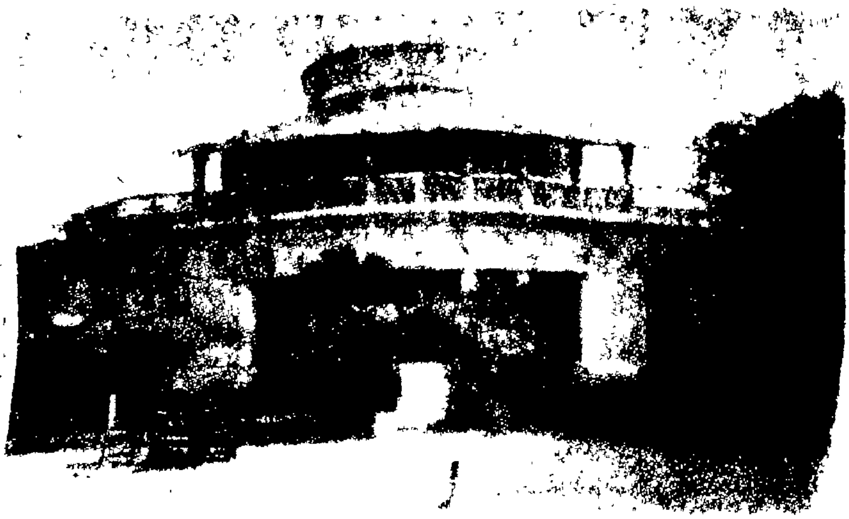
اس صورتِ حال میں مجبوری اور تضاد یہ ہے کہ لسان العصر خود بھی خان بہادر اور جج ہیں۔ اپنے بیٹے کو گویا مویا خرآبا











۱۸۵۷ء میں کلکٹر بجنور مسٹر شیکسپیئر کا
بنگلہ جس کے برآمدے میں بیٹھ کر
سر سید احمد خاں
نے ایام غدر میں رات رات بھر بیٹھ کر
اس بنگلے کے وجود کی حفاظت میں
اپنا فرض منصبی پورا کرتے ہوئے
[illegible]
۱۸۵۷ء
[illegible]



[illegible]



[illegible] کی ... جس میں
امیر یعقوب خان
سابق والی افغانستان کو نظر بند رکھا گیا تھا
[illegible]



خان بہادر سید نذر الباقر رضوی
لندن سنہ ۱۹۱۵ء -
(دائیں طرف)

غلام حسین سیالکوٹی - ملازم
(بائیں طرف)

نامعلوم

بحوالہ نفیس جہاں ساز باپ

فلائیٹ آفریدی



کے مدرسے بھیجنے کے بجائے لندن میں پڑھوا رہے ہیں۔ ع

کہ غم سے مے کدوں میں نہ رہی مئے مغانہ

اکبر موجودہ ایلیسے کے لیے گویا یونانی کورس ہیں۔ سماجی شعور بھی رکھتے ہیں۔ شیخ جی۔ بدھو۔ فتو۔ ذاتی اور بھائی صلو کا غم کھاتے ہیں۔ گورنر۔ کمپو۔ ڈنر۔ مس۔ یکیسا۔ لیشپ۔ آنر۔ پائنیر اخبار۔ کونسل۔ چندہ۔ بینڈ۔ مال روڈ۔ ہوٹل۔ نئی الناک ملامتیں ہیں ہر شعر پہ دل خون ہوتا ہے۔

چند سال بعد زمانہ ایک اور بہزاد کے ذریعے گرج کے پوچھے گا۔ اگر نہ تھا تو شریکِ محفل۔۔ وغیرہ اور وہ دیوزاد بھی تھیہ، انشوروں کی مانند مشرق کے اس اجتماعی نوسٹیلجیا کا شکار رہے گا۔

ایک بات پوچھوں۔ سب مغل۔ مرہٹے۔ سکھ۔ یورپین۔ فوجی ماہرین سے اپنے لشکروں کی تربیت کروانے میں جُٹے ہے۔ تاکہ مزید ایک دوسرے کا خون تخریر کر سکیں۔ کسی کو روس کے پیٹر اعظم یا مصر کے محمد علی کی مانند یورپ کی یونیورسٹیوں اور جدید صنعتوں سے فائدہ اٹھانے کی کیوں نہ سوجھی۔ اب جو ہارلین۔ براؤن رکھ۔ آرنلڈ۔ ایونگ وغیرہ صاحبان کھاگ امپیریلیسٹ متعصب مشنری آپ کی ہونہار اولاد کو پٹی پڑھا رہے ہیں۔ ان پر اعتراض کیوں۔ صاحب بات یہ ہے کہ گستاخی معاف۔ آپ کے محترم اجداد کو محض جاہ پرستی۔ ملوکیت اور اقتدار سے دلچسپی تھی۔

کہنے لگے وہ "تحقیرِ مولوی نہ کرائیے گریجویٹ"

مگر صاحب معاف فرمائیے گا آج کی دنیا مولوی کے بس کا روگ نہیں۔

کشورِ ہند یک بیک قرونِ وسطیٰ سے نکل کر دورِ جدید میں داخل ہو چکا ہے۔ سید اور اس کے ساتھی رکھے سب جدید مولوی دنیا اور نئی دنیا کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان نئے مولویوں کی عظمت کا اندازہ آج سے نصف صدی بعد ہی ہو سکے گا۔ علاوہ ازیں لہ آپ صاحبان ابھی غدر سے پہلے کی دنیا لیے بیٹھے ہیں آج ۱۸۹۰ء کے برٹش انڈیا کے انڈر گریجویٹ نوجوانوں کے ذہنوں ان کے رویوں اور دلچسپیوں کا اندازہ کس طرح کر سکتے ہیں۔

۱۸۳۰ء کے لگ بھگ نوجوان میر بندے علی ترمذی بیل ٹمٹمے میں سوار ہو کر نہٹور سے دلی مدرسہ فتحپوری میں درسِ نظامیہ کی تکمیل کے لیے تشریف لے گئے تھے۔

بوڑھا قصہ گو ۱۸۹۰ء کی ایک رات لالٹین ہاتھ میں لے کر اس کچے راستے پر چلتا نہٹور سے روانہ ہو کر دلی سے نواح میں ل پہنچا ہے۔

دونوں وقت مل رہے ہیں۔ کالج کی مسجد سے ابھی اذان کی صدا بلند ہو گی۔ میدان میں کرکٹ کھیلنے کے بعد لڑکے اپنے نے کمروں کی طرف جا چکے ہیں۔ لالٹین کی لو ذرا اونچی کرو تو سامنے کچی بارک ہے۔ ایک اور ملامت۔ علامتوں سے بچو خطرناک ہے جب مرہٹے دلی کے حاکم تھے۔ سندھیا کی فوج یہاں تعینات تھی۔ اب مرہٹے پونا اور بمبئی کے نئے کالجوں میں سر جھکائے وہی انگریزی نصاب پڑھنے میں منہمک ہیں جو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں پڑھایا جا رہا ہے۔ میرے عزیزو۔ اس نکتے پر بھی غور کرو

اور سر دھنو۔

بارش ابھی ابھی رکی ہے۔ سوندھی سوندھی خوشبو فضا میں طاری ہے۔ کالج کی عمارتیں اندھیری رات میں برساتی جگنوؤں کی طرح مدھم مدھم جھلملا رہی ہیں۔ جب سید گزٹ لے کر اٹھے گھر گھر جا کر بھیک مانگی تب یہ چند گھروندے جا کر کھڑے کئے۔

پیر مرد تاجیک نژاد بیوقوف نہیں۔ میکالے کا نام سن چکا ہے۔ عصا ٹیکتا سیدھا لائبریری پہنچتا ہے۔ جہاں لیمپ روشن ہیں۔ ایک میز پر بیٹھ کر قلم اٹھاتا ہے۔ بستے سے پیلے کاغذات نکالتا ہے۔ اچانک غصے سے ان کو نیچے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتا ہے۔ پھر ذرا سی دیر توقف کرتا ہے۔ ممکن ہے حاشیوں کے لئے ان قدیم ملفوظات شجروں، حکایتوں، عجائب القصص کی حاجت ہو۔ جھک کر لرزاں ہاتھوں سے وہ کاغذ چنتا ہے۔ واپس داخل دفتر کر دیتا ہے۔ جب تک زندہ ہے انھیں حرز جان بنائے رہے گا۔ گو خراسان کے قدیم داستان طراز مِل کی طرح جان گیا ہے کہ اس کا زمانہ ختم ہوا اور اب کوئی ابوالقاسم فردوسی طوسی اس کی ترجمانی اور ہمنوائی کے لئے نہیں آئے گا۔

لیکن یہ کہن سالہ قصہ گو جس کا دوسرا نام وقت ہے بڑا کائیاں ہے۔ فرنگیوں کے بنائے ہوئے اس کتب خانے میں داخل ہو کر اسے معلوم ہو چکا ہے کہ انداز بیان، موضوع اور اسالیب بدل گئے۔ یہ بھارت ورش ہے نہ ہندوستان جنت نشان۔ برٹش انڈین ایمپائر ہے اور وہ خود اب وکٹورین انگلستان کے باسی تباسی اسالیب کی نقل کرنے والا ایک کو نیل ادیب۔

چنانچہ اب وہ "بطرز جدید" ناول لکھے گا۔

باب ۲

پکی بارک کے "چہار درویش"

ع بیا اے خامۂ نیرنگ پرواز

——— آہا ہا مہتاب عالم تاب نے اچانک زمین و آسمان منور کر دیئے۔ ہوا لطیف و خوشگوار۔ دل میں عجیب مسرت و فرحت پیدا کر رہی ہے۔ ہمارا ناولسٹ دوست مناظر فطرت سے لطف اندوز ہوتا لائبریری سے نکل کر صحن چمن سے گذرتا ایک بورڈنگ ہاؤس کی سمت روانہ ہوتا ہے۔ چہار طرف زمین زمرد رنگ۔ کوہ زمرد کے ہم سنگ۔ تبارک اللہ یہ باغ جنان ہے یا روضۂ رضوان۔ در و دیوار ندرت بار۔ مشاطۂ صبا گلکار۔ سلیمانی ٹوپی پہن کر ہمارا ناولسٹ دوست ایک بلڈنگ کے برانڈے میں پہنچ کر کمروں کمروں جھانکتا ہے۔ ہر روم کے اندر نوجوانان چمن مصروف مطالعہ ہیں۔ ایک دروازے پر پہنچ کر ٹھٹکتا ہے۔ اندر کا سین دیکھتا ہے۔ سلانٹوں کا فرش، سیلی ہوئی دیواروں کے نزدیک تین چارپائیاں، سرہانے بے روغن کی میزیں، ایک ایک کرسی، کھونٹیوں پہ کپڑے۔ ٹرکش کوٹ، ترکی ٹوپیاں، چارپائیوں کے نیچے ٹرنک اور ڈاسن کے بوٹ۔

پچھلے سال ترکی اور یونان میں پھر جنگ چھڑی۔ ادہم پاشا یونانیوں کو شکست فاش دے چکے ہیں۔ بارہ تیرہ سال قبل جنگ روس و ترکیہ نے ہندی مسلمانوں کے لئے بہت ہیرو سپلائی کئے تھے۔ اس وقت وہ دیکھئے۔ دیوار پر جنرل ادہم پاشا کی تصویر فریم میں مسکرا رہی ہے۔ یہ وہ

بدبخت زمانہ ہے جب ہندوستان ۱۸۵۷ء کے سورماؤں کا نام بھی نہیں لے سکتا۔ ان پر تنقید کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ترکی بہرحال سلطنت عثمانیہ کا بہترین جذباتی نعم البدل ثابت ہوا ہے۔

اسی تصویر کے نیچے ایک تپائی پر بڑا لیمپ روشن ہے۔ اس کے چینی گلوب پر انگور کے خوشے بنے ہیں اور ایک قدیم یونانی حسینہ بربط بجا رہی ہے۔

برسات کی رات پتنگے اور اللہ میاں کی بھینسیں یعنی میٹس (انگریزی نام) لیمپ کے طواف میں مصروف۔ فرش پر لال بیگ یعنی کاکروچ (انگریزی نام) رواں ہیں۔

سچ پوچھئے تو بڑا خستہ حال سا ماحول ہے۔ مگر ایک نادار قوم نے اپنے نونہالوں کے لئے یہی میسر کر لیا غنیمت ہے۔ ایک سال چند ماہ قبل ہمارے قابل فخر محسن قوم ایجوکیشنسٹ آنریبل سر سید احمد خاں نے رحلت فرمائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تین نوجوان جنٹلمین اپنی اپنی چارپائیوں پر نیم دراز اسٹڈی میں مشغول نظر آتے ہیں۔ آئیے ذرا نزدیک جا کر دیکھیں کیا پڑھ رہے ہیں۔ او ہو یہ گیل سرخ و سفید خوبرو نوجوان کون ہے۔ ہو نہ ہو یہی ہمارا ہیرو ہے۔ یعنی مسٹر ایس ایس حیدر۔ ہاتھ میں ایک ناول ہے جو کسی اجنبی زبان میں لکھا ہے۔ حروف مانوس نہیں کسی زبان: عربی نہ فارسی، آہا ہا۔ کیا خوب یاد آیا ؎

نہ عربی نہ فارسی نہ ترکی
یہ تاریخ لکھی ہے کسی ترکی

تو شاید یہ ترکی ہے۔ خیر جو بھی ہے ابھی ہم اس کا پتہ چلا لیں گے۔

دوسرا ینگ جنٹلمین پانیر اخبار پڑھ رہا ہے۔ شکل سے بہت جوشیلا اور ذہین معلوم ہوتا ہے۔ کیوں نہ ہو۔ اس کا نام محمد علی جوہر ہے۔ تیسرا نوجوان البتہ ہم نہ پہچان سکے۔ محمد علی اس سے مخاطب ہوتے ہیں۔

"اس نہیں تو سہی یہ علی گڑھ کے کھلنڈرے کیا باتیں کر رہے ہیں"[1]

محمد علی: (پانیر اخبار زمین پر پھینک کر) بھائی سجاد کیوں نہ اب سویا جائے۔

سجاد: ضرور۔ لیمپ بجھا دو۔

محمد علی: (دوسرے نوجوان سے) میاں صاحبزادے لیمپ بجھا دیجئے۔

وہی نوجوان: آپ خود بجھا دیجئے۔ ہم مور ہے ہیں۔

محمد علی: لیمپ بجھا دو میاں صاحبزادے۔

نوجوان پھر اپنی بات دہراتا ہے۔ محمد علی زقند بھر کر میز کے قریب پہنچتے ہیں لیمپ اٹھا کر لڑکے کے پاس لے جاتے ہیں۔ یہ اصرار کرتے ہیں۔ وہ انکار۔ پھر چشم زدن میں وہ بھی پلنگ سے کودتا ہے اور کمرے سے باہر۔ محمد علی لیمپ ہاتھ میں لے کر اس کے

---

[1] یہ قصہ پدرم نے مجھے خود سنایا تھا۔ (ق ح)

پیچھے۔ سجاد حیدر ان دونوں کے تعاقب میں۔ تینوں کا جلوس صحن میں پہنچتا ہے۔ دوسرے کمروں سے لڑکے نکل کر جلوس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ لڑکا سب سے آگے۔ چراغ بکف محمد علی نعرہ لگاتے اس کے پیچھے۔

اس نوع کے چند اور چٹکلے، لطائف و ظرائف اس دور کے علی گڈھ کی اسٹوڈنٹ لائف کے قابلِ شنید ہیں مگر چونکہ اس قصے کے پلاٹ کا تعلق ہمارے ینگ ہیرو سجاد حیدر سے ہے جو ہمارے اولڈ ہیرو میر احمد علی ترمذی کے پوتے ہیں لہذا کیوں نہ ہم اُن کے ہم صفیران چمن سے درخواست کریں کہ وہ اپنے دوست کے بارے میں نوا پیرا ہوں۔

ہمارے یہ ذکی و فہیم و خورشید ہیرو جو ۱۸۸۰ء (قمری حساب سے غالباً ۱۲۹۸ھ) میں بمقام نہٹور پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم شہر بنارس میں حاصل کی جہاں اُن کے والد ماجد بحیثیت ڈی ایس پی و کوتوال شہر تعینات تھے۔ ۱۸۹۴ء میں نویں جماعت میں مدرسۃ العلوم میں شامل ہوئے۔ سید کے کالج کے ذہین ترین اور سب سے خوش پوش طلبا میں شمار کئے جاتے ہیں۔ فی الوقت بی اے میں پڑھ رہے ہیں حیدر حسن، محمد حیات، رضا علی اور سجاد حیدر "چہار درویش" کہلاتے ہیں۔

رضا علی الیف اے میں سجاد حیدر کے منجھلے بھائی نصیر الدین حیدر کے ہم جماعت ہیں۔ سب سے چھوٹے بھائی وحید الدین حیدر کے ایک ہم جماعت اور یارِ غار سید محمود اللہ ابھی سے "محمودِ قوم" کہلا رہے ہیں۔

اب ہم آپ کو مسٹر ایس رضا علی سے انٹروڈیوس کرتے ہیں۔ یہ بندا قبال صاحبزادے کندرکھی ضلع مرادآباد سے آئے ہیں اور اُس ماحول کے پروردہ ہیں جس کا نقشہ فصل دوم کے ابواب میں کھینچا گیا۔ لہذا راوی اب جینی کے مزی گلوب والا لیمپ محمد علی جوہر کے ہاتھ سے لے کر سید رضا علی کے سامنے رکھتا ہے۔ ع

مطرب بگو کہ کارِ جہاں شد بکام ما

سید رضا علی: میری پہلی ملاقات سجاد حیدر سے جولائی ۱۸۹۸ء میں ہوئی۔ حیدر حسن اور سجاد حیدر بٹے بذلہ سنج تھے۔ محمد حیات کی شگفتگی مزاج کا اظہار خاص خاص دوستوں میں ہوتا تھا۔ یہ تینوں بی اے میں پڑھ رہے تھے۔ سجاد حیدر انگریزی اور اردو دونوں بڑی اچھی لکھتے اور بولتے تھے۔ انشاپردازی کی سنہری لڑیوں میں موقع محل سے لطافت اور بذلہ سنجی کے موتی پروتے تھے۔ انگریزی زبان کا اچھا ناول شاید ہی کوئی پڑھنے سے بچا ہو۔ نصیر الدین حیدر کے دوست محمد ادریس، عبدالوہاب (اے۔ ڈبلیو) زبیری اور محمد سبطین تھے۔ نفیر کا بھی انٹرنس کے امتحان میں سارے صوبے میں دوسرا نمبر تھا مگر علی گڈھ کے ماحول میں پڑھنے والوں کی قدر نہ تھی۔

محمد ادریس کے بڑے بھائی محمد ابراہیم سجاد حیدر کے دوست تھے۔ ایک قصہ سناؤں جس سے معلوم ہوگا کہ اس دور کے علی گڈھ کا کیا رنگ تھا۔ ۱۸۹۸ء کی بات ہے۔ ادریس ابھی علی گڈھ پہنچے ہیں۔ سجاد حیدر کے کمرے میں آکر بیٹھے ہیں۔ کچھ اور طالب علم بھی وہاں موجود ہیں۔ جن میں گورکھپور کے شاکر علی بھی ہیں جو بعد میں بیرسٹر ہوئے۔ شاکر بڑے نٹ کھٹ تھے۔ ادریس سے پوچھا۔

"آپ کا نام؟"

ادریس نے جواب دیا: "محمد ادریس"

کہنے لگے "بجا ہے" کوئی دو منٹ تک خاموش رہے۔ اس کے بعد ایک چپت غریب ادریس کو رسید کیا۔ ادریس نے کوئی دو منٹ غور کیا کہ اس تواضع کا جواب زبان سے دوں یا ہاتھ سے، اگر تشدد کا جواب تشدد سے دیا تو شاکر کا کچھ نہ بگڑے گا۔ ان کے یہاں سب واقف ہیں۔ بدنامی میری ہوگی کہ آتے ہی ہاتھا پائی شروع کر دی بگڑ کر کہا "یہ کیا بدتمیزی ہے۔ مجھ سے آپ کی بے تکلفی نہیں ہے" شاکر کا خیال صحیح نکلا۔ اس دن سے دونوں بے تکلف دوست ہو گئے۔

"ظفر علی ہی بانک میں رہتے تھے۔ فٹ بال خوب کھیلتے تھے۔ بارہ بنکی کے چودھری نعمت اللہ اور پنجاب کے ملک زماں مہدی ہم سے تین درجے اوپر تھے۔ سید ابو محمد بھی اسی زمانے میں تھے وہ بعد میں خان بہادر اور ممبر یو۔پی پبلک کمیشن ہوئے۔ بارہ بنکی کے ولایت علی بمبوق بھی ہم عصر تھے۔ انہوں نے بمبوق کلب قائم کیا۔ تحریر میں بلا کی شوخی تھی۔ بعد میں کامریڈ میں طنزیہ اور مزاحیہ مضامین لکھتے رہے۔ عین جوانی میں انتقال کیا۔ مسعود الحسن (مسعود نامی) بھی جوان سال مرے۔ مراد آباد کے محمد یعقوب (بعد میں سر یعقوب) سردار محمد حیات سجاد حیدر کے دوسرے ساتھی تھے۔

"محمد حیات خاں، مشتاق احمد زاہدی اور حبیب رحمن مرحوم بھی اس زمانے کے علمی ذوق رکھنے والے طلبا میں سے تھے۔ بی۔اے پاس کرنے کے بعد مشتاق احمد نے علی گڈھ چھوڑ دیا مگر دوستوں سے ملنے اکثر علی گڈھ آتے تھے۔ یہ سب حضرات علی گڈھ کی زندگی کے گہرے نقاد تھے۔ علی گڈھ میں اس وقت تک کوئی ایسا انتظام نہ تھا کہ کوئی ہونہار طالب علم کسی خاص مضمون میں کمزور رہو تو اس کمزور مضمون کی طرف اساتذہ خاص توجہ کرتے۔ سجاد حیدر ریاضی سے بہت گھبراتے تھے۔

نواب حاجی اسمٰعیل خاں رئیس دتاؤلی، سرسید کے بے حد مخلص اور روشن خیال دوست تھے۔ ان کے والد ہجرت کر کے مکے چلے گئے تھے۔ جو اس زمانہ میں دولت عثمانیہ میں شامل تھا۔ وہیں نواب اسمٰعیل خان نے ترکی پڑھی جو عربستان کی سرکاری زبان تھی۔ ترکی کے دلدادہ بن کر ہندوستان لوٹے۔ سرسید کے ڈرامے" تماشائے عبرت" میں ترک کا پارٹ انہوں نے ہی ادا کیا۔ یلدرم ابھی ایف اے کے طالب علم تھے جب نواب اسمٰعیل خاں کے سکریٹری بن گئے۔ ان کو انگریزی پڑھاتے اور خود ان سے ترکی سیکھتے۔

نواب اسمٰعیل خاں اردو اور فارسی میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور علی گڈھ سے ایک رسالہ نکالتے تھے جس کا نام "معارف" تھا۔ اس کے ایڈیٹر مولوی وحید الدین سلیم تھے اور اسسٹنٹ ایڈیٹر سجاد حیدر۔ مولوی صاحب اور محمد علی نے سب سے پہلے اردو داں اخبار بین حضرات کو سیاسی مسائل کے سادہ دسترخوان پر ادب کی چاشنی کی لذت سے آشنا کیا۔

سجاد حیدر معارف میں خود بھی مضمون لکھتے تھے اور انگریزی رسالوں کے اعلیٰ مضامین کا ترجمہ بھی کرتے تھے۔ ۱۸۹۶ سے

لہ مقالہ" ناول نویسی" معارف یکم اکتوبر ۱۸۹۸ء میں انگریزی ناولوں کا تذکرہ کرنے کے بعد یلدرم نے لکھا: "اس بیس تیس برس کے عرصہ میں ہر اخبار ہر رسالہ ہر چھاپہ خانہ اور اگر مبالغہ نہ ہو تو ہر دماغ ناولوں سے بھر گیا ہے۔ اس سے زیادہ اس کے تسلط کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ مرحوم" تہذیب الاخلاق" پرچے کو بھی اس جبروت حاکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ اور غالباً یہ فخر بھی ہندوستان ہی کو حاصل ہے کہ باوجودیکہ کل ملک اس طرف ڈھل پڑا ہے پھر بھی اعلیٰ درجہ کے ناول نویس پیدا نہ ہوئے۔ اعلیٰ درجے کے تو کیا معمولی اور ادنیٰ درجے کے بھی پیدا نہیں ہوئے۔ اس وقت اردو میں ناول لکھنے والے

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

۱۸۹۹ء تک "معارف" میں سجاد نے چند طبعزاد افسانے لکھے۔ علی گڑھ کا پہلا دور ۱۸۷۵ء سے شروع ہو کر ۱۸۹۵ء میں ختم ہوا۔ دوسرے دور کا آخری سال ۱۹۱۵ء اور تیسرے کا ۱۹۳۵ء سمجھنا چاہیے۔

"دوسرے دور کے طلبا میں سجاد حیدر کا مرتبہ بلحاظِ علمی قابلیت، بہت بلند تھا۔ مطالعے کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ ہماری قومی زندگی میں جن نئے خیالات کو مفید سمجھتے تھے ان کی زبردست تائید تحریر و تقریر کے ذریعے کرتے تھے۔ رواداری کا یہ عالم تھا کہ دوسرے کی بات سننے اور اس پر بحث کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ بڑے خوش خلق اور سادہ مزاج تھے۔ تعلیم نسواں کے بڑے زبردست حامی تھے۔ کھیل کود سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ مسٹر تھیوڈور بیک کے چہیتے طلبا سب کھلاڑی جن کو علمی مذاق سے کوئی سروکار نہ تھا۔ انگریز کی پالیسی تھی کہ علی گڑھ کے لڑکوں کو سنجیدہ علمی مذاق سے دور رکھا جائے اور کھیل کود کا شوقین بنایا جائے۔ مسٹر بیک کہتے تھے کہ رنجیت سنگھ اور جام صاحب نوانگر کرکٹ کے کھلاڑی دادا بھائی نوروجی ممبر برطانوی پارلیمنٹ سے زیادہ اہم ہیں۔ جو انجمن الفرض" کے لئے زیادہ چندہ جمع کرے اس کی بڑی قدر کی جاتی تھی۔

محمد علی کی قدر اس وجہ سے تھی کہ وہ کرکٹ کے کپتان تھے۔ مسٹر بیک کی زبردست شخصیت نے اس مذموم رجحان کو یہاں تک پھیلایا کہ ذوقِ ادب اور کھیل کی قدر و قیمت کا جائزہ لینے کے مبحث پر شوکت علی نے پنجاب ابزرور میں ایک مضمون لکھا تو بجائے اپنا نام لکھنے کے اپنا ادبی لقب بڑے فخر سے "مسٹنڈا وحشی" مضمون کے آخر میں درج کیا۔

"اس ماحول میں سجاد حیدر کتاب کے کیڑے تھے۔ ادبی ذوق رکھنے والے طلبا کی موجودگی روا رکھی جاتی تھی مگر قابلِ تحسین نہ سمجھے جاتے تھے۔ خواجہ غلام الثقلین موردِ عتاب رہے۔ مسٹر مارلیسن نے ایک حد تک اور نواب محسن الملک نے طلبا کی قدر ان کی علمی قابلیت کے موجب کی۔

" بقول پروفیسر آرنلڈ سجاد حیدر کا شمار کالج کے ہونہار ترین طلبا میں تھا اور وہ اپنی قابلیت کی وجہ سے معاصرین میں ممتاز تھے۔ سجاد حیدرؔ انجمن اخوان الصفا کے ممبر تھے جو پروفیسر آرنلڈ نے قائم کی تھی۔ پروفیسر صاحب موصوف عربی عبایہن کر کالج کے جلسوں میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے جو چوٹی کے شمار کئے جاتے ہیں وہ افسوس کہ نصف درجن سے بھی کم ہیں۔

"ایک اور بات ہے جس کی طرف ہمارے ناول نویسوں نے توجہ نہیں کی یعنی یہ کہ ناول کے ہیرو کے لیے تعلیم یافتہ اور امیر ہونا کوئی شرط نہیں ہے۔ غریب اور غیر تعلیم یافتہ بھی اتنا ہی اچھا ہیرو ہو سکتا ہے۔ نیکی اور دوسری صفات کچھ علم اور امارت کے ساتھ ہی وابستہ نہیں مگر ہمارے ناول نویسوں نے یہ خیال کر لیا ہے کہ ہیرو کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ایک نہایت ہی اعلیٰ خاندان کا ہو۔ نواب زادہ یا شہزادہ ہو۔ ابھی تک اردو میں غربت کی زندگی کا قصہ کھینچا جانا باقی ہے یہ ایک بہت وسیع مضمون ہے جس پر اب تک کسی نے قلم نہیں اٹھایا۔ (مزید) "ہمارے ناول نویس ہر باب کا تین چوتھائی حصہ ایسے مقام کی سینری بیان کرنے میں لگتے ہیں جسے انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا۔ میں چاہتا ہوں کہ ترکی کے تمام ناول بھی اردو میں ہو جائیں مگر وہ ناول نہیں جو خود ترکی میں عام طور پر مشہور ہیں۔ مصر اور شام کے عربی ناولوں سے بھی اردو خواں پبلک کو آشنا کرنا چاہیے۔" یہ مضمون لکھتے وقت مصنف کی عمر اٹھارہ انیس کی تھی اور وہ بی اے فرسٹ ایئر کا طالب علم تھا۔

شرکت کرتے تھے۔ اس سال یعنی ۱۸۹۸ء میں سر طامس آرنلڈ لاہور چلے گئے جہاں وہ اقبال کے استاد بنے۔ ۱۸۹۹ء میں پروفیسر تھیوڈر بیک کا انتقال ہوا اور ان کی جگہ سر تھیوڈور ماریسن (بعد میں لارڈ ماریسن) کالج کے پرنسپل ہوئے۔

"لیڈی ماریسن نے چند طلبا کو ستھرے مذاق کی خطوط نویسی سکھانے کے لئے درجہ کھولا۔ سجاد حیدر، ابو محمد، اعجاز علی، محمد طریف اور میں موصوفہ سے درس لیتے تھے۔ طریقۂ تعلیم یہ تھا کہ ہم ہفتہ میں ایک دن لیڈی صاحبہ کے بنگلے پر جمع ہوتے۔ چند روز بعد معلوم ہوا کہ لیڈی صاحبہ بجائے شائستہ خطوط نویسی کی تعلیم کے یہ درس دے رہی ہیں کہ ہندوستانی جب انگریز کو خط لکھے تو کیا طرز اختیار کرنی چاہیے۔

"ہماری اس بدگمانی کی ایک وجہ یہ تھی کہ موصوفہ کے مزاج کی افتاد شاہانہ واقع ہوئی تھی۔ تھیں تو وہ پرنسپل کی بیوی مگر چاہتی تھیں کہ طلبا ان کے ساتھ وہی برتاؤ کریں جو اس زمانے کے رئیس، کلکٹر و مجسٹریٹ ضلع کی میم کے ساتھ کرتے تھے۔ ساتھ ہی اس زمانے میں جو جلیل القدر انگریز علی گڑھ آتے اکثر سر تھیوڈور کے مہمان ہوتے اور پرنسپل صاحب ان سے اپنے خاص طلبا کو ملواتے۔

"سجاد حیدر کی طبیعت میں بلا کی شوخی تھی۔ طالب علمی کے زمانے میں جو نظمیں اور مضامین انہوں نے لکھے وہ بڑے پُرلطف ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر زمانہ چین سے بیٹھنے دیتا تو وہ ملک و قوم کی عظیم الشان ادبی خدمت انجام دیتے۔ "مرزا پھویا" سجاد نے ۱۹۰۰ء میں لکھی۔ اس کی کہانی یہ ہے کہ سر سید احمد خاں کی وفات کے بعد علی گڑھ کالج کی امداد کے لئے سر سید میموریل فنڈ قائم کیا گیا۔ محسن الملک نے ملک کا دورہ کیا اور بہت سے شہروں میں جلسے کر کے تقریریں کیں کہ قوم کا فرض ہے کہ اپنے کالج کی امداد کرے اور اپنے لڑکوں کو تعلیم کے لئے علی گڑھ بھیجے۔ مرزا پھویا بڑے ناز و نعمت میں پلے تھے۔ گھر سے باہر نکلنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ محسن الملک کی سحر بیانی کا یہ اثر ہوا کہ باپ نے مرزا کو علی گڑھ بھیجنے کا تہیہ کر لیا۔"

مشتاق احمد زاہدی[1] نے مرزا پھویا کے شانِ نزول کے متعلق بتایا ہے کہ جس دن پہلی دفعہ یہ حضرت یکّے سے اُتر کر بورڈنگ میں داخل ہوئے ہیں تو ڈھیلا پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ پاؤں میں گھیتلی جوتی۔ ہاتھ میں پان دان۔ اس ہیئت کذائی کو دیکھتے ہی یار لوگوں نے ان پر خالہ اماں کی پھبتی کہہ دی جو ہمیشہ کے لئے چپک کر رہ گئی مگر سید صاحب نے اپنی نظم میں ان کو "مرزا پھویا"[2] کا خطاب دے کر ان کے حلیے کو بدل دیا۔

یہ موہان ضلع کانپور سے آئے ہوئے ایک صاحبزادے تھے جو آگے چل کر مولانا حسرت موہانی بنے۔

زاہدی صاحب سے اب مزید قصہ سنئے۔

مسٹر مشتاق احمد زاہدی: سید سجاد حیدر سے میری دوستی کی ابتدا ۱۸۹۶-۹۷ء میں ہوئی۔ ہم دونوں مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں ایف اے میں پڑھتے تھے۔ اتفاق کی بات ہے کہ ہمارے ساتھ بہت سے جماعتی تھے جنھوں نے اپنے اپنے فن میں بہت نام پایا۔ مسٹر محمد علی جو بعد میں مسٹر

---

[1] چچازاد بھائی یلدرم کے عزیز ترین دوستوں میں تھے۔ صادق ایجرٹن کالج بہاولپور کے پرنسپل رہے تھے۔ مختلف رسالوں میں لکھتے رہے۔ ۴۷ء میں دلّی سے پاکستان ہجرت کی۔ ۱۹۶۰ء میں کراچی میں انتقال ہوا۔

[2] "مرزا پھویا" سب سے پہلے علی گڑھ کالج کے ایک دو ورقی اخبار میں چھپی جو تفنن طبع سے خفیہ طور پر دستی چھاپا ہوا نکلتا تھا۔

محمد علی حسن اور مولانا نے اور اپنی قابلیت و قوم پرستی میں شہرۂ آفاق ہوئے۔ مقصود علی خاں اور ملک زماں مہدی اگرچہ ذہین تھے مگر کتابی کیڑے نہیں تھے۔ سجاد اِدھر اُدھر کی کتابوں کا مطالعہ تو بہت کرتے تھے۔ مگر امتحان والی کتابوں کو محض منہ ورثا پڑھ لیتے تھے۔ باوجود اس کے جب ایف اے کا نتیجہ آیا تو معلوم ہوا کہ سجاد صاحب انگریزی اور فارسی میں تمام الہ آباد یونیورسٹی میں اوّل مگر ریاضی میں صفر۔ محمد علی کا وقت بھی کرکٹ کھیلنے والوں کی صحبت میں ضائع ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ عبداللہ کرکٹ کپتان کے ساتھ رہتے تھے۔ تاہم محمد علی بہت ذہین تھے۔ اس لئے امتحان میں پاس تو ہو گئے۔ مگر نمبروں میں سجاد کا لگا بھی نہ کھا سکے۔ محمد علی کی قابلیت آکسفورڈ میں داخل ہو گئی۔ سجاد کی غیر معمولی قابلیت اور علمی مسابقت کی وجہ سے کالج والے ان کی دل سے قدر کرتے تھے اور ان کے ریاضی میں فیل ہو جانے سے پرنسپل اس مضمون کے متعلق کو ... دیا تھا۔ ریاضی نے ان کا بہت قیمتی وقت ضائع کر دیا جس کی وجہ سے وہ ساری عمر نہ پنپ سکے اور ملازمت کی دوڑ میں محمد علی خاں اور ملک زماں مہدی سے پیچھے رہ گئے۔ مگر طالب علمی کے زمانے میں ان باتوں پر کوئی غور نہیں کرتا اور ماؤجو اس ناکامی کے سجاد کی ... اور شہرت میں کوئی کمی نہ آئی۔ بلکہ طلبا اور پروفیسروں کو سجاد سے ہمدردی اور زیادہ ہو گئی کہ افسوس ایسا قابل شخص ریاضی کی وجہ سے رہ جائے۔ چنانچہ جب بی اے میں ریاضی سے پیچھا چھٹا تو سجاد تمام الہ آباد یونیورسٹی میں چوتھے نمبر پاس ہوئے۔
یونین میں تقریر کرنے کا شوق سجاد کو اسکول کے زمانے سے تھا۔ اخبار بینی کا بھی مرض تھا۔ اس لئے یونین کے سب عہدے ان کو حاصل ہو گئے۔ یعنی وہ سلیکٹ کمیٹی کے ممبر ہوئے پھر لائبریرین ہو گئے۔ پھر سکریٹری مقرر ہوئے۔ تقریر کرنے کا انعام اور تمغہ بھی حاصل کیا۔

مضمون نگاری[1] ایف اے سے پہلے ہی شروع کی۔ انگریزی انشا پردازی میں بھی سجاد بی اے کرنے سے پہلے ہی اپنے ہم عصروں میں ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ کالج کے طلبا اس زمانے میں انگریزی اچھی ہونے کا معیار یہ سمجھتے تھے کہ "پانیر میں مضمون چھپ جائے"[2] اکثر صاحب کو اپنی انگریزی پر ناز تھا سعی لاحاصل کی مگر سب سے پہلے سجاد کا ہی ایک مضمون شائع ہوا اس کے بعد جن صاحب کا مضمون شائع ہوا وہ محمد ... جو ان کے کلاس فیلو تھے۔ اس کے کئی سال بعد سید رضا علی کے خطوط جو اچھے طویل ہوتے تھے چھپنے لگے۔"

شادی — سجاد حیدر کی والدہ سعیدہ بانو بنت بندے علی ترمذی کا انتقال ہو چکا تھا۔ تعطیلات میں سجاد حیدر اور ان کے چھوٹے بھائی اکثر شیخ محمد علی جو تھے کے اپنے چچا خان بہادر سید کرار حیدر کے ہاں جاتے۔ ۱۸۹۹ء میں ڈاکٹر صاحب رائے بریلی میں تعینات تھے جہاں جولائی کے مہینے میں گھوڑے سے گر کر جان بحق تسلیم ہوئے۔ صرف ۴۵ سال عمر پائی۔ خان بہادر جلال الدین حیدر نے بعد از یاد میں طے کیا فرزند اصغر میاں وحید کو بھی لاہور میڈیکل کالج بھیجیں گے۔ جہاں جوانمرگ کرار حیدر مرحوم نے پڑھا تھا۔
لاہور اس وقت کالجوں، ادیبوں، صحافیوں، اخباروں اور رسالوں کا عہد آفریں اور ہنگامہ پرور شہر بن چکا تھا۔ اس ...

---

[1] مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی کا خیال ہے کہ غالباً سب سے پہلے "اردو اخبار" میں انگریزی مختصر افسانہ کے تراجم شائع ... "معارف" میں جس میں سید سجاد حیدر نے کچھ افسانے لکھے اس لحاظ سے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ جس طرح ... کہا گیا ہے۔ سید سجاد حیدر اردو زبان میں طرز جدید کے مختصر افسانے لکھنے والے پہلے شخص ہیں۔ (شمس العلماء تاجور نجیب آبادی)

[2] دیکھو جسے وہ پانیر آفس میں ہے ڈٹا — بہر خدا مجھے بھی کہیں چھاپ دیجئے (اکبر الہ آبادی)

ہمارے ایک اور قابلِ قدر اور لائق دوست شیخ عبدالقادر چند روز کے لیے لاہور سے علی گڑھ آتے ہیں اور ہمارے ہیرو کی لائف کی ایک جھلک آپ کو دکھاتے ہیں۔

شیخ عبدالقادر :

"میرے دوست سید سجاد حیدر جن کا غلغلہ بعد میں یلدرم کے نام سے ادبی دنیا میں بلند ہوا ابھی یلدرم نہیں بنے تھے اور نہ میں مدیر مخزن بنا تھا۔ جب ان سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ میں کالج سے نکل کر انگریزی اخبار "اوبزرور" کا اسسٹنٹ اڈیٹر تھا اور وہ علی گڑھ میں بی اے کر رہے تھے اور اپنے اوقات فرصت میں حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب رئیس دتاولی ضلع علی گڑھ کے سکریٹری کا کام کرتے تھے۔ ایک دن میں علی گڑھ میں حاجی صاحب سے ملنے گیا تو سجاد حیدر ایک کونے میں علیحدہ میز کرسی لگائے بیٹھے کام کر رہے تھے۔ حاجی صاحب نے ان سے میری ملاقات کرائی۔ جب میں حاجی صاحب سے بات کر کے فارغ ہوا تو سجاد میرے پیچھے پیچھے آئے اور کہنے لگے "آیئے میں آپ کو ایک عجیب چیز دکھاؤں"

"آپ شبلی نعمانی کو مشق سخن کرتے دیکھنا چاہتے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "ہاں مگر کیسے اور کہاں"

انہوں نے کہا "ابھی اور یہیں"

مولانا شبلی اس وقت حاجی صاحب کے ہاں مہمان تھے۔ اور اس بنگلہ کے ایک کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ سجاد مجھے ایک کمرے کی طرف لے گئے۔ جس کا ایک دروازہ کھلا تھا۔ مولانا شبلی دروازے کی طرف پیٹھ کئے بیٹھے تھے اور کچھ لکھ رہے تھے۔ ہم دروازے کے آئینوں میں سے انہیں دیکھ سکتے تھے۔ ان کا قلم کبھی کاغذ پر چلتا تھا اور کبھی قلم کا ایک سرا منہ سے قریب ہوتا تھا۔ جیسے فکرِ سخن

معلوم نہیں ہم دونوں کا مولانا کا اس طرح دزدیدہ دیکھنا کہاں تک مناسب یا جائز تھا۔ مگر مجھے کبھی افسوس نہیں ہوا کہ ہم نے ... لیکن مجھے تو انہیں مصروفِ سخن دیکھنا ایسا دلچسپ معلوم ہوا کہ مدتوں نہیں بھولا۔ اور سجاد حیدر کا یہ جذبہ مجھے بہت بھایا کہ مولانا کو فکر سخن کرتے دیکھنے سے انہیں جو لطف آیا اس میں انہوں نے مجھے بھی شریک کرنا ضروری سمجھا۔ اور پہلی ہی ملاقات میں ... معلوم ہو گیا کہ کس قدر ہم مذاق ہیں۔

مولانا شبلی اپنے شاگرد ... شعر ... ہم نے مشہور ... کو ...

... مذاق کو مستحکم اور ... تھا،

... کیونکہ اس سے ...

... ان سے اس گروہ سے تعلق ...

... اور اس شوق کی ...

... ان سے ...

"ایک دن جب جلسہ دوپہر کے کھانے کے لئے برخاست ہوا اور میں اپنی قیام گاہ کی طرف جا رہا تھا تو سامنے سے سجاد صاحب آتے نظر آئے مجھے دیکھتے ہی انہوں نے ایک دو چکّا اپنے گرد لگائے۔ جیسے خوشی سے رقص کر رہے ہوں اور مجھ سے کہنے لگے" کچھ نہ پوچھئے کہ میرا دماغ اس وقت آسمان پر ہے اور زمین پر کسی سے بات کرنے کو تیار نہیں۔"

"میں نے پوچھا کچھ تو بتایئے کیا دیکھا ہے کہ طبیعت اس طرح زوروں پر ہے۔" کہنے لگے "ایک ایسی عورت[1] سے باتیں کر کے آرہا ہوں جو آزادی کی حامی اور خود بھی آزادی پر عامل ہے۔"[2]

یہاں پر اب ہم کو یہ معلوم کرنا چاہیے کہ اس وقت ہماری نیشن کی معزز پردہ نشین لیڈیوں کا کیا حال تھا۔ آہ۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ ہماری بیبیاں اس زمانے میں ظالم سماج کے جور وستم کا شکار تھیں اور زیور تعلیم سے محروم رکھی جاتی تھیں۔ آئندہ باب میں مشتاق احمد زاہدی اور شیخ محمد عبداللہ بانی گرلز کالج علی گڑھ آپ کو بتلائیں گے کہ ان تمام نوجوانوں نے تحریکِ تعلیم نسواں کے سلسلے میں کس طرح جدوجہد کی۔

باب ۳

بیچلرز لاج کی "خاتون"

مشتاق احمد زاہدی داستان جاری رکھتے ہیں" بی اے کے بعد سجاد راجہ اعظم شاہ کے اتالیق مقرر ہو کر ناگپور گئے۔ مگر بعد میں گورنمنٹ نے راجہ صاحب کو علی گڑھ کالج بھیج دیا۔ ایک کوٹھی کرایہ پر لی گئی۔ اس میں دو کمرے قانون کے طلبا کے لئے مخصوص کئے گئے۔ سجاد کی کوشش سے مجھے اور مرحوم انعام الحق کو (جو بعد میں گورنمنٹ آف انڈیا پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے انڈر سکریٹری ہوئے۔) جگہ ملی۔ ساری کوٹھی ہم تین دوستوں کے قبضے میں آگئی۔ راجہ صاحب بے چارے شاگرد تھے، علیحدہ کونے میں پڑے رہتے۔

"کوٹھی کا نام بیچلرز لاج رکھا گیا۔ ہم تینوں کنوارے تھے اور یہ خیال زیر بحث رہتا تھا کہ دنیا میں ترقی کرنے اور آرام سے رہنے کے لئے متاہل زندگی موزوں نہیں۔

"اس خیال کی حقیقی وجہ یہ تھی کہ ہم لوگوں کو نئی تہذیب بہت پسند تھی۔ مسلمان عورتیں انگریزی تعلیم سے محض نابلد تھیں۔ اردو لکھنا پڑھنا بھی کسی کسی کو آتا تھا اور مغربی طرز زندگی سے سارے ہندوستان میں سوائے چند خواتین کے کسی کو واسطہ نہ تھا۔ ہم لوگ یہ چاہتے تھے کہ بیچلرز لاج میں جس طرح ہم صاحبانہ زندگی بسر کرتے ہیں ہماری رفیقۂ حیات بھی اس کی اہل ہو اور چونکہ یہ بات ناممکن معلوم ہوتی تھی، اس لئے یہ خیال دلنشین ہو گیا تھا کہ جب تک اس قسم کی بیوی نہ ملے شادی کرنی ہی نہیں چاہیے۔

"ہم لوگ عورت کی بہت عزت کرتے تھے اور مسلمان ہندی عورت کو تعلیم کے ذریعہ تدریج معراجِ ترقی تک پہنچانا ہم نے اپنا مقصدِ زندگی قائم کیا تھا۔

---

[1] عطیہ فیضی

[2] "میرے احباب" از سر عبدالقادر، لاہور سے براڈ کاسٹ ۱۹۴۹ء مطبوعہ "آہنگ" ریڈیو پاکستان کراچی۔

"ڈگری لینے کے بعد ہم لوگ تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے۔ قانون کی کلاسیں محض علی گڑھ کالج سے وابستہ رہنے کا ایک بہانہ تھا۔ سوائے نئی دنیا بنانے کے کسی قسم کا فکر نہ تھا۔ کالج کے نئے اور پرانے سربرآوردہ طلبا کو ہر ہفتے کھانے یا چائے پر مدعو کیا جاتا۔ قوم کی کوئی مقتدر ہستی کالج کے ملاحظے کے لئے علی گڑھ میں موجود ہوتی ان کے فیضانِ صحبت سے استفادہ حاصل کیا جاتا۔

"تعلیم نسواں، پردہ، مغربی طرزِ معاشرت، احکامِ شریعت، اسلام بحث کے موضوع ہوا کرتے تھے۔ سجاد ان مباحثوں میں پیش پیش ہوتے۔ جو تجاویز وہ پیش کرتے اس وقت وہ ناقابلِ عمل معلوم ہوتی تھیں مثلاً اُن کا خیال تھا کہ نماز دیسی زبان میں ہوا کرے۔ اُردو قرآن شریف کا ترجمہ بغیر عربی عبارت کے شائع کیا جائے۔ مسجدوں میں ایسے غسل خانے بنائے جائیں جن میں کوٹ پتلون اور ہیٹ استعمال کرنے والے مسلمانوں کو وضو کرنے میں سہولت ہو۔ اگر جوتوں سمیت نماز پڑھی جائے تو بوٹ پر چڑھانے کے لئے غلاف موجود ہوں۔ اسلامی قانون وراثت میں وہ مشترکہ خاندان کے طرز پر تبدیلی چاہتے تھے۔ اُردو قرآن شریف، ازدواج اور تقسیم وراثت پر سجاد کے مضامین رسالوں میں شائع ہوئے۔ اُن کے خلاف بہت کچھ لے دے ہوئی۔

"شیخ محمد عبداللہ کے رسالے "خاتون" کے پہلے نمبر میں ہمارے کنوارے گروہ کے میرالعدم الحق نے حقوقِ نسواں پر ایسا مضمون لکھا کہ جس کی دھوم ہو گئی اور ہم تینوں ہمیشہ اس رسالے میں لکھتے رہے۔"

(شادی کا بیان یہاں ختم ہوا۔)

"شیخ محمد عبداللہ ایک کشمیری نوجوان سجاد حیدر سے چند سال سینئر تھے اور سرسید کے منظورِ نظر طالب علم رہ چکے تھے۔ کسی کا سرسید اور بک صاحب پرنسپل کے یہاں مقرب ہونا آسان نہ تھا۔ تاہم عبداللہ اپنی ہوشمندی اور قومی دردمندی کے سبب سے سرسید کے حاضر باش اور بک صاحب کے عزیز شاگرد رہ چکے تھے۔ قانون کی تعلیم کے دوران لائبریرین اور پرنسپل بک کے سکریٹری بھی رہے۔ بانیٔ کالج کے انتقال کے بعد "سرسید میموریل فنڈ" اور "ون روپی فنڈ" کے سکریٹری بنے۔[1]

شیخ عبداللہ علی گڑھ میں وکالت شروع کر چکے تھے۔ جب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے انھیں شادی کی رائے دی۔ ۱۹۰۲ء میں دلی کے ایک مغل گھرانے کی تعلیم یافتہ لڑکی وحید جہاں بیگم بنت مرزا ابراہیم بیگ سے شادی ہوئی۔ بارات میں نواب محسن الملک، آفتاب احمد خاں، نواب صدر یار جنگ، مولوی حبیب الرحمٰن شیروانی، نواب سر سلطان احمد خان اور خواجہ عبدالمجید کے والد خواجہ محمد یوسف وغیرہ شامل تھے۔ دلی میں شمس العلما مولوی ذکاء اللہ، حکیم اجمل خاں وغیرہ نے تقریب میں شرکت کی اور شیخ عبداللہ "اعلیٰ بی" کو بیاہ کر علی گڑھ لے آئے۔

اب خود شیخ صاحب آپ کو قصہ سنائیں گے۔[2]

• اس وقت قوم کے بزرگوں میں مولوی سید کرامت حسین، پروفیسر قانون، علی گڑھ کالج، جسٹس سید امیر علی اور بدرالدین طیب جی

---

[1] محمد مقتدی خاں شیروانی کے ایک مضمون سے اقتباس۔

[2] "سوانح عمری عبداللہ بیگم" از شیخ محمد عبداللہ مرحوم۔ طبع ثانی باہتمام و نگرانی محمد مقتدی خاں شیروانی۔ علی گڑھ ۱۹۵۴ء

.ر نوجوانوں سید سجاد حیدر اور ان کے چند ساتھیوں کے علاوہ تعلیم نسواں کا کوئی حامی نہ تھا۔ سر سید لڑکیوں کی تعلیم کے مخالف تھے۔
۱۸۹۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا شعبۂ تعلیم قائم ہوا تھا مگر اس نے کچھ نہ کیا۔
ستمبر ۱۹۰۲ء میں ایڈورڈ ہفتم کے جشن تاجپوشی کے موقع پر آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا جس کے لیے سر آغا خاں
ر علیا حضرت سلطان جہاں بیگم فرمانروائے بھوپال تشریف لائیں۔ ایک شام میں نے دوستوں کو جمع کیا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں
اب سلطان احمد خاں، سید سجاد حیدر اور دوسرے اولڈ بوائز سے میں نے کہا کہ میں شعبۂ تعلیم نسواں کو زندہ کرنا چاہتا ہوں۔
آپ صاحبوں سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے اس کا سکریٹری مقرر کر دیجئے۔ سب نے بالاتفاق رائے مجھے سکریٹری مقرر کیا۔
عبداللہ بیگم نے بیبیوں کا جلسہ منعقد کیا۔ اس میں مسز رضا اللہ (شمس العلماء ذکاء اللہ کی بہو) اور سعید احمد بیگم نے نمایاں
حصہ لیا۔ میں نے اخبارات میں تعلیم نسواں پر مضمون لکھنے شروع کئے۔ بیحد مخالفت کی گئی۔
۱۹۰۳ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ بمبئی میں منعقد ہوا اور پہلی بار عورتوں کو پردے کے پیچھے سے کانفرنس کی تقریریں
سننے کا موقع دیا گیا۔ اس کانفرنس میں طیب جی خاندان کی عطیہ اور نازلی رفیعہ شریک ہوئیں۔ شمس العلماء مولوی ممتاز علی اور مولوی محبوب عالم
اڈیٹر پیسہ اخبار بھی موجود تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ لاہور میں زنانہ نارمل اسکول جاری کریں گر انہوں نے لاہور واپس جاکر
اطلاع دی کہ اسکول جاری کرنے کا کوئی حامی نہیں۔ اس کے بعد میں نے اور بیگم عبداللہ نے طے کیا کہ علی گڑھ میں مدرسہ قائم کیا جائے
"مجھ کو ۲۴ دسمبر ۱۹۰۵ء کو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی شرکت کے لیے لکھنؤ جانا تھا۔ اس وقت تک مدرسہ جاری کرنے کا
کوئی انتظام نہیں ہوا۔ میں بہت پریشان تھا لیکن ۱۰ دسمبر کو ڈاک کے ذریعے بھوپال سے ایک سرکاری لفافہ ملا۔ علیا حضرت مرحومہ
مغفورہ نے انتہائی ... میری ناچیز درخواست کو شرف قبولیت بخشا اور سو روپے ماہوار کی مستقل امداد کا اعلان فرمایا۔ میں علیگڑھ سے لکھنؤ بھی
مجھے امید تھی کہ نواب محسن الملک ضرور اس سے خوش ہوں گے۔ میں نواب صاحب سے راجہ سر تصدق رسول خاں صاحب مرحوم کی کوٹھی پر جاکر ملا۔ نواب صاحب ...
کسی بات پر ناخوش بیٹھے تھے۔ بہت سے احباب ان کے پاس موجود تھے۔ میں نے نواب صاحب مرحوم سے بھوپال سے عطیے ...
علی گڑھ میں لڑکیوں کا مدرسہ جاری کرنے کا ذکر کیا۔ نواب صاحب مرحوم نے اپنے غیظ و غضب میں یہ سنتے ہی اپنی ترکی ٹوپی سر سے
اتار کر چبوترے پر پھینک دی اور کہا: اب میرا علی گڑھ میں رہنا دشوار ہے۔ لوگ یوں ہی کالج کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ اب
نہ جانے کیا کہیں گے۔ راجہ صاحب نے مجھے سمجھانا شروع کیا: آپ نوجوانوں کو مناسب نہیں ہے کہ بڈھوں کی مرضی کے خلاف
کوئی کام کریں۔ آپ کو پہلے نواب صاحب سے مشورہ کر لینا چاہیے تھا۔ میں بالکل خاموش بیٹھا رہا۔ پھر چبوترے پر سے نواب ...
کی ٹوپی اٹھا کر لایا اور ان کے سامنے میز پر رکھ دی۔ نواب صاحب اسی غصے کی حالت میں اٹھ کر گاڑی میں سوار ہونے لگے۔
میں نے ان سے کہا گو پرانے خیال کے لوگ تعلیم نسواں کے خلاف ہیں لیکن جدید نسل کے خیالات کا آپ نے بالکل کوئی لحاظ نہیں کیا۔
میں جانتا ہوں کہ آپ دل سے تعلیم نسواں کے حامی ہیں۔ نواب صاحب مسکرانے لگے اور فرمایا جو کچھ میں نے کہا وہ بھی ٹھیک تھا اور جو کچھ تم
کہہ رہے ہو وہ بھی ٹھیک ہے۔ اپنا کام کئے جاؤ۔[1]

---

[1] مدرسۂ نسواں علی گڑھ ۱۹۰۶ء میں قائم ہوا۔

۱۹۰۸ء ہی میں میں نے ارادہ کیا کہ تحریکِ تعلیمِ نسواں میں جان ڈالنے کے لئے ایک رسالہ جاری کرنا چاہیے۔ سید سجاد حیدر [illegible] ابو محمد، احتشام الحق اور انعام الحق نے مجھ سے اتفاق کیا۔ رسالے کا نام غالباً سید سجاد حیدر یا خان بہادر ابو محمد نے تجویز کیا کہ "خاتون" چاہیے۔ خاتون کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۰۹ء میں شائع ہوا۔

۱۹۱۰ء ہی میں علی گڑھ میں پہلی زنانہ کانفرنس منعقد ہوئی جس کے بانی شیخ عبداللہ تھے جو گرلز کالج والے ہیں۔ نادری صاحب نے ہیں اور ہم تینوں نے اسے کامیاب بنانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ یہ کانفرنس ہمارے لئے کئی معنوں میں دلچسپ اور نرالی تھی۔ ہمیں ہوا کہ ہندوستان میں عطیہ فیضی جیسی ترقی یافتہ خواتین اور آبرو بیگم جیسی مشرقی علم و فضل میں یگانۂ روزگار مستورات موجود ہیں۔ حامیانِ نسواں کو مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔

اسی زمانے میں پروفیسر تھیوڈور مارسین (بعد میں لارڈ مارسین) پرنسپل ایم اے او کالج کے پاس برطانوی قونصل اور [illegible] پریذیڈنٹ بغداد کے ہاں سے ترجمان کی مانگ آئی۔ بہت سے طلبا نے درخواستیں دیں۔ جن میں سے بعض ایسے تھے [illegible] روزانہ پرنسپل کو سلام کرتا تھا اور جو عربی کے ایم اے تھے۔ سجاد نے بھی درخواست دی۔ گو سجاد محض بی اے تھے [illegible] سے کبھی ملتے بھی نہ تھے مگر مارسین نے سب سے زیادہ سجاد کی سفارش کی۔ نیز ان کو ترکی بھی آتی تھی۔ چنانچہ ہم لوگوں [illegible] غیر متوقع طور پر ان کا تقرر ہو گیا۔ ان کے بغداد جانے سے گرلز کالج کا خاتمہ ہو گیا۔

باب ۴

بابِ عالی

[illegible] مارچ ۱۹۰۴ء کو ہم نولار جہاز کے ذریعے کراچی سے روانہ ہوئے۔ ۱۵ اپریل کو مسقط پہنچے۔ پہاڑ ہی پہاڑ جن پر [illegible] سبز گھاس کے پتے کا نشان نہیں اور اس پر مسقط کو دعوے سلطانی ہے۔ ۸ اپریل کو بوشہر۔ دُوربین سے شہر کو دیکھا اور کچھ [illegible] ۹ اپریل ۶ بجے صبح۔ سبحان اللہ۔ سبحان اللہ ہم کس خطے میں جا رہے ہیں۔ رات بھر میں کیا طلسم ہوا۔ دو طرفہ خرمے [illegible] کی مسلسل قطاریں۔ گلاب۔ نارنجی اور انار کے درخت۔ ہمارا سفینہ دجلہ و فرات کے مجمع پانی پر چل رہا ہے۔ ایک طرف [illegible] ہے۔ دوسری طرف ایران۔ یہ سرسبز سلسلہ یہاں سے بغداد چار سو میل تک جاری رہے گا۔

[illegible] یا سوڈان کے خرمے کے درخت نہیں کہ چار پانچ ایک جگہ کھڑے ہیں۔ اردگرد سینکڑوں میل تک ریت کا چٹیل میدان [illegible] نخلستان اور خرمستان ہیں جن کے سایہ میں ہر قسم کے پھل اور پھول موجود ہیں۔

[illegible] کے بعد بصرہ کے مضافات شروع ہو جاتے ہیں۔ دریا کے کنارے درختوں کے جھنڈ [illegible]

[illegible] اور خال خال ترک عورتیں، لڑکے اور لڑکیاں [illegible]

[illegible] مگر وہ تو ایک [illegible] ہو گیا اور وہاں سے [illegible]

[illegible]

اب وجہ بارہ سو سال قبل مدینہ، کوفہ اور دمشق سے نکل کر افتاں و خیزاں دجلہ کے کنارے پہنچے تھے کشتیوں میں سوار ہو کر عجم کی راہِ فرار یا سکی تھی۔ دشتِ لوط کے اُس پار ماوراء النہر جیحون کے اُس پار داغستان قراچال[1]۔ جاگیری دور میں مدتِ مدید تک جہاں از گنگ تا سنگ[2] ان کا تسلط رہا۔

چھیلٹھ سال قبل دلی دروازہ، خونی دروازہ بنا۔ توکروں میں وکٹوریہ گیٹ تعمیر ہوا۔ اس کی محراب کے نیچے سے کئی راستے نکلے۔ پر چلنے ترکی ٹوپی فراک کوٹ پہنے نئے رہروؤں نے نئی دنیا میں قدم رکھا۔

ابعاد کی قدیم دنیا اب برطانوی کورونیل آفس کی نئی اصطلاح "مڈل ایسٹ"[3] اور محمد فاتح اور سلیمان اعظم کی سلطنت لارڈ کرزن "ایسٹرن کوئسچین" میں تبدیل ہو چکی تھی۔

دجلہ و فرات وہی ہیں۔ وہی سواحل عراقین۔ زوالِ بغداد کو آٹھ سو سال گزر چکے۔ لیکن دیکھو سلطان المعظم کا پرچم ہلالی بندرگاہ پر شان سے لہرا رہا ہے۔ برطانوی جہاز پر ضابطے کے مطابق یونین جیک کے ساتھ عثمانی نشان لگا دیا گیا ہے۔ ترک کسٹم افسر جہاز پر آگئے ہیں۔ قونصلیٹ کی عمارت میں رپ رپ بج رہے ہیں۔

بابِ عالی کے حکام۔ بابِ عالی کا نام سن کر ایک جھرجھری سی آتی ہے۔ جذبات میں تلاطم پیدا ہوتا ہے۔ آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ یہ ترقی پاشا خلیفۃ المسلمین، یہ ترقی یافتہ دولتِ عثمانیہ۔

لیکن وہ بھی دیکھو جہاز کے ڈیک پر مدقوق برطانوی افسر، سیاح، مشنری سولا ہیٹ اوڑھے، سفید کوٹ پتلون میں ملبوس کرنیلیں رس میں گرمی شروع ہو گئی ہے۔ کھڑے مونچھوں پر تاؤ دے رہے ہیں۔ جانتے ہیں سارا عالمِ اسلام اب ان کا ہے۔

اے رودِ دجلہ، اے رودِ دجلہ

ہندی نوجوان مدرسۃ العلوم علی گڑھ کا گریجویٹ۔ نیا ادیب۔ سرخ و سفید رنگ، سیاہ سوٹ، بغیر فریم کی عینک، برطانوی کو کونسل صاحب ہونہار سپوت۔ کارپٹ بیگ ہاتھ میں لیے قونصلیٹ کی عمارت سے نکل کر بصرے سے روانہ ہو۔ ہارون الرشید کے شہر میں داخل ہوتا ہے۔ موٹر گاڑی سڑک پر سکون سے رواں ہے۔ دونوں طرف نیم یورپین وضع کے مکانات، اوائل بیسویں صدی کا بغداد۔ ترکی ناولوں کے کردار دکھائی نظر آجاتے ہیں۔ حکمران طبقے کے یورپین ترک۔ نوکیلی شاندار مونچھیں۔ نیلی آنکھیں۔ بابِ عالی کے بانکے افسر۔ ان کی مہ جبیں نقاب پوش انیں۔ زہرا، حمرا، خالدہ۔

گاڑی برطانوی قونصل خانے کے پھاٹک میں داخل ہوتی ہے۔

---

[1] یسعد سالیہ۔

[2] روہیل کھنڈ کا شمالی علاقہ۔

[3] امپیریل حکومتِ ترکیہ کے لئے یورپی اصطلاح۔ ——— SUBLIME PORTE

[4] زندہ باد

صرف سو سال قبل تک عثمانیوں کی شان و شوکت و سطوت و جاہ و جلال کا یہ عالم تھا کہ وہ برطانیہ، فرانس، روس اور دوسرے مغربی ممالک میں اپنے سفیر متعین کرنا کسرِ شان سمجھتے تھے۔

قونصل خانے میں شاہ ایڈورڈ ہفتم اور ملکہ الگزینڈرا کی تصویر کے نیچے خرانٹ قونصل جنرل ٹیلی فون پر وائٹ ہال سے بات کر رہا ہے۔ پھر نو وارد نوجوان ہندوستانی ڈریگومین کے ذریعے مغرور عثمانی افسروں سے گفتگو کرتا ہے جو صرف فرنچ یا ترکی بولتے ہیں اور دل میں استہزا سے سوچتے ہیں۔ ایسے سالے تاجر ہم غازی لوگ خدا کے پراسرار بندے سات سو برس سے جہانبانی اور کشورکشائی میں مصروف ہیں۔ چھ سو برس ہم نے تم ناک چڑھے گوروں کو یورپ میں زیرِ نگیں رکھا۔ بحیرۂ روم ہمارے لیے محض ایک ترکی جھیل تھی۔ ہم تم نو دولتیوں کو بھلا کیا خاطر میں لائیں گے۔

برطانوی قونصل جنرل ایڈورڈ ڈین مونچھوں کے نیچے مسکراتا ہے۔ مردِ بیمار پر عالمِ نزع طاری ہے مگر مٹیں نہیں جاتی۔

بغداد کی گلیوں میں درویشوں، بھکاریوں اور فاقہ کش حمالوں کی ریل پیل ہے۔ کربلا میں امام حسینؑ اور جناب عباسؑ اور بغداد میں غوث الاعظمؒ کے روضوں میں ہندی اور ایرانی زائرین کا جمِ غفیر۔ مسلمان محض دعاؤں اور عظمتِ رفتہ کے خوابوں کے سہارے جی رہا ہے۔ نئی دنیا اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ کربلائے معلیٰ، نجفِ اشرف، مشہد اور قم سے حسبِ معمول گریہ و زاری کا شور بلند ہو رہا ہے اور بغداد، طہران، قاہرہ کے یورپین کلبوں میں آرکسٹرا بجتا ہے تو کہنے لگے مستقبل کے علامہ اقبال کہ

سازِ عشرت کی صدا مغرب کے ایوانوں میں سن
اور ایراں میں ذرا ماتم کی تیاری بھی دیکھ

اے صاحب ہم تو جانے کب سے معصومۂ قمؑ کے روضۂ مقدسہ کی ضریحِ مبارک سے لپٹ کر چیخ رہے ہیں السلام علیک یا بنتِ رسول اللہؐ۔ السلام علیک یا بی بی یا خواہرِ امامؑ۔ یا [illegible]۔ فریاد ہے۔ کوئی فریاد ہی نہیں سنتا۔ طہران کے کاخِ گلستان میں خسروِ کج کلاہ مظفر الدین شاہ قاچار جلالۃ الملۃ والدین کا نازنینوں کی طرف حسبِ معمول کمال استغراق ہے اور صاحب لوگ، مشنری لوگ، فوجی، سویلین اور تاجر پی اینڈ او کے جہازوں پر سوار جبل الطارق اور سوئز سے گذرتے مراکش سے لے کر افغانستان تک بادیہ نشینوں کے خیمے لوٹنے میں مصروف ہیں۔ مشرق میں ہر سمت سوا جہالت سوا پسماندگی، درماندگی، غلامی، ناداری، تباہی اور کیا نظر آتا ہے السلام علیک یا معصومہؑ یا بنتِ رسول اللہؐ۔

چھ سو برس قبل ابنِ بطوطہ نے رپورٹ کیا تھا کہ کنارِ فرات شہرِ حلّہ میں مسجد کے دروازے پر حریر کا پردہ لگا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امام مہدی قائمِ آلِ محمدؐ اسی مسجد میں داخل ہو کر مستور ہوئے۔ روز شام کو غروبِ آفتاب کے وقت شیعہ وہاں جمع ہو کر گریہ و بکا کرتے ہیں۔ اخرج یا صاحب الزمان۔ اخرج یا قائم المنتظر —— رات گئے تک روتے چلّاتے رہتے ہیں۔ حریر کا پردہ اسی طرح ساکت رہتا ہے۔ پھر وہ مایوس ہو کر اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔

مگر آج اے پاشاؤ۔ شریفو۔ آغاؤ۔ سیّدو۔ خان بہادرو۔ آج سارا دارالسلام سرنگوں ہے۔ سب مل کر پکارو اخرج صاحب الزمان۔ اخرج یا حجت اللہ۔ یا قائم المنتظر۔

خفیہ کارروائیاں ہو رہی ہیں۔ جگہ جگہ چھپے چھپے میٹنگیں کی جا رہی ہیں۔ طہران، استانبول، قاہرہ، بغداد کے قہوہ خانوں میں سازشیں ہو رہی ہیں۔ زمانہ نازک ہے اور دیکھو کل کی بات ہے جب بنی امیہ کے خلاف، بنی عباس کے خلاف، بنو فاطمہ کے خلاف کیا کیا خفیہ میٹنگیں نہ ہوئیں۔ یہی کوچہ و بازار، یہی دشت و صحرا، یہی انسان۔ ان کے اب و جد۔

آج شاہانِ قاچار اور آلِ عثمان اور خاندانِ رامنوف اور اولادِ وکٹوریہ کی باری ہے۔

طہران، استانبول، سینٹ پیٹرزبرگ، ماسکو، باکو۔ لندن، پیرس۔ کلکتہ ہر شہر میں بہروپ سے خفیہ سکوٹ کر رہے ہیں۔ زمانہ خطرناک ہے۔

مستقبل کی محراب پر تقدیر کا پردہ اسی طرح ساکت ہے۔ اور نوجوان ایشیا و افریقہ اس کے سامنے کھڑا چلا چلا کر پکار رہا ہے۔ مرحبا صاحب الزمان۔ الحذر، مژدۂ انقلاب۔

باب ۵

"نوجوانِ ترک"

۱۲ جولائی ۱۹۰۵ء۔ نمازِ جمعہ کے بعد سلطان المعظم مسجد سے نکل رہے تھے کسی نے بم کا گولہ ان پر پھینکا ۲۴ آدمی ہلاک ہوئے سلطان المعظم بال بال بچ گئے چہرے سے کسی قسم کا خوف و اضطراب ظاہر نہ ہوا۔ سلطان المعظم کے بچنے کی خبر پر لاہور میں مسلمانوں نے بعد نمازِ جمعہ شکرانے کے نفل پڑھے۔ اور بارگاہِ حق تعالیٰ میں ان کی صحت اور سلامتی کے لئے دعائیں مانگیں۔ تہذیبِ نسواں لاہور۔

نوجوان عثمانیوں کی خفیہ جماعت علی پاشا کے دور میں قائم ہوئی تھی۔ ۱۸۸۲ء میں جب سلطان عبدالحمید دوئم نے پریس پر مکمل پابندی عائد کر دی ترک انقلابیوں نے یورپ میں بکھر کر وہاں سے رسالے اور کتابچے شائع کرنا شروع کیے جو ترکیہ اسمگل کیے جاتے حکومت نے جاسوسوں کا جال پھیلا دیا۔ نامق کمال اور ضیا بے پیرس فرار ہوئے۔

انجمن اتحاد و ترقی نوجوان عثمانیوں کی جانشین جماعت تھی۔ یورپ کی ترک انقلابی انجمنیں اس سے منسلک ہو گئیں نوجوان ترکوں کا پہلا اجتماع پیرس میں ۱۹۰۲ء میں ہوا۔ اس کے بعد یہ جماعت بھی انڈر گراؤنڈ ہو گئی۔

نوجوان ترکوں کو اپنے ذرائع سے معلوم ہوا کہ ایڈورڈ ہفتم اور زار نکولس دوئم نے ایک خفیہ معاہدہ کیا ہے جس کی رو سے برطانیہ اور روس دولتِ عثمانیہ کو آپس میں تقسیم کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ یہ اطلاع ملتے ہی مصطفیٰ کمال اور چند جوشیلے نوجوان فوجی افسروں نے ایک اور خفیہ جماعت قائم کی جس میں انور بے نیازی بے اور جمال بے شامل تھے۔

مصطفیٰ کمال مع ساتھیوں کے پکڑے گئے۔ ۱۹۰۵ء میں قید سے رہا ہوئے کرد بغاوت فرو کرنے کے لئے اپنی رجمنٹ کے ساتھ انہیں صوبہ شام روانہ کر دیا گیا۔ ۱۹۰۶ء میں عصمت بے (مستقبل کے عصمت انونو) ملٹری کالج استانبول سے نکلتے ہی "نوجوان ترکوں" میں شامل ہو گئے۔

مصطفیٰ کمال کا فوجی دستہ دمشق میں تعینات تھا۔ یہاں انہوں نے ۱۹۰۶ء میں ایک اور خفیہ جماعت "وطن و حریت" کی بنا ڈالی۔

اس کی شاخیں یروشلم، نجف اور بغداد میں قائم کی گئیں۔

بغداد میں ڈرنگو میں سجاد حیدر کا وطیرہ یہ تھا کہ دوپہر کے بعد قونصل خانے کے کلب جانے کے بجائے شہر کے ترک [illegible] اور ادیبوں کے ساتھ وقت گزارتے۔ نہایت شستہ و رواں ترکی اور عربی بولتے تھے انگریزی کے ماہر اور فرانسیسی سے واقف ترکی زبان و ادب کے عاشق قلمی نام یلدرم نوجوان ترکوں کے حامی اور ان میں مقبول نہایت ولولہ انگیز زمانہ تھا۔ بیچلرز لارج علی گڑھ میں جو خواب انقلاب کے دیکھے تھے ان کی تعبیر یہاں کچھ کچھ نظر آ رہی تھی۔

مصطفےٰ کمال کی انجمن وطن و حریت کی شاخ بغداد کا پہلا جلسہ یلدرم کے مکان پر ہوا۔ یہ ایک تاریخ ساز خفیہ میٹنگ تھی۔ بابِ عالی کے جاسوسوں کے خوف سے یلدرم نے اپنا عرب ملازم مکان کے دروازے پر بٹھا دیا تھا۔ اس کے بعد ہر ہفتہ وار یا فوری میٹنگ کے مواقع پر بے حد احتیاط برتی جاتی کہ جان جوکھوں کا معاملہ تھا۔

یلدرم کے بھانجے سید عثمان حیدر ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۲ء تک بسلسلہ ملازمت ایران و عراق و فلسطین و ترکی میں مقیم رہے۔ بغداد میں ایک مرتبہ سخت بیمار پڑے اور بغرضِ علاج ترکی گئے جہاں دیارِ بکر میں ترکی کی نئی جمہوری حکومت نے بہت بڑا شفاخانہ تعمیر کروایا تھا۔ سید عثمان حیدر لکھتے ہیں۔

"خوش قسمتی سے انہی دنوں غازی عظمت پاشا یعنی عصمت انونو وزیراعظم ترکی نے ماسکو جاتے ہوئے دو دن کے لیے دیارِ بکر میں قیام کیا دوسرے سرکاری اداروں کا معائنہ کرتے ہوئے اس ہسپتال میں بھی تشریف لائے سب مریضوں سے مصافحہ اور مزاج پرسی کرتے میرے پلنگ کے نزدیک آئے۔ میرے سینے پر میرے نام اور ملک کا کارڈ لگا تھا۔ ڈاکٹر زبانی ہر مریض کا تعارف کرا تا جا رہا تھا۔ میرا نام معلوم کر کے عصمت انونو نے فرانسیسی تلفظ کے ساتھ انگریزی میں مجھ سے پوچھا۔

DO YOU KNOW YILDIRIM SAJJAD HYDER?

YES, YOUR EXECE LLENCY.

HOW? ARE YOU RELATED TO HIM?

YES, YOURS EXECELLENCY. HE IS MY UNCLE.

REAL UNLCE?

YES, YOUR EXCELLENCY. MY MOTHER, S BROTHER.

DO YOU WRITE TO HIM?

YES YOUR EXCELLENCY, I DO.

FINE. WHEN YOU WRITE TO HIM NEXT DO CONVEY MY SALAM ALEIK.'

اس کے بعد چند منٹ مزید باتیں کیں اور آگے بڑھ گئے۔ دوسرے ہی دن میں نے یہ واقعہ ماموں جان کو علی گڑھ لکھ بھیجا جس پر انہوں نے جواب میں مجھے لکھا تھا کہ عصمت پاشا کو انہوں نے اس بندہ نوازی پر شکریہ کا خط لکھا ہے۔

ل مشاہدات بلادِ اسلامیہ۔ از محمود عثمان حیدر۔ اشاعت محمد مجلس[illegible]۔ ۱۹۹۲ء میں دوبارہ شائع کی ہے

کمال اتاترک کی مشہور تقریر

SEVEN DAYS SPEECH BY GHAZI MUSTAFA KAMAL PASHA.

اس زمانے میں انگریز بہادر نے ہندوستان میں یہ کر رکھی تھی دوسرے ممالک میں بھی جہاں برطانوی تسلط تھا اس بات کی کڑی نگرانی رکھی جاتی تھی کہ ہندوستانی اسے ہاتھ نہ لگا پائیں۔ بغداد میں ایک مرتبہ ہمت کر کے میں ترکی سفارت خانے کے فرسٹ سیکریٹری سے ملا اور ان سے اظہار مدعا کیا۔ (اس وقت عراق میں انگریز کا اتنا دبدبہ تھا کہ وہ کتاب وہاں بھی بازار میں کہیں نہ بکتی تھی لوگ آکر ترکی سفارت خانے سے خرید لیا کرتے تھے۔ فرسٹ سیکریٹری نے جا کر سفیر سے یہ کتاب لینی چاہی (جو ان کی تحویل میں رہتی تھی)۔ چنانچہ مجھے سفیر صاحب کے سامنے پیش ہونا پڑا۔ موصوف نے بڑے اخلاق سے فرمایا کہ جب آپ ہندوستانی ہیں تو یہ جرأت کیسے کر رہے ہیں۔ اتنے میں فرسٹ سیکریٹری نے میرا ملاقاتی کارڈ جو ان کے ہاتھ میں تھا۔ سفیر صاحب کے سامنے رکھ دیا ان کا مطلب شاید یہ رہا ہوگا کہ میں برطانوی سفارت خانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ اور وہاں ایک ذمہ دار عہدے پر فائز ہوں لیکن سفیر موصوف نے کارڈ پر میرے نام کے ساتھ حیدر پڑھ کر بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھا۔ اور وہی عصمت انونو والا سوال دہرایا۔

میرا وہی جواب کہ "یس یور ایکسیلنسی۔"

پوچھا "آپ کے رشتہ دار ہیں؟"

میرا وہی جواب کہ "میرے سگے ماموں ہیں۔"

سفیر صاحب نے بڑے جوش سے مجھ سے مصافحہ کیا۔ چند منٹ ادھر اُدھر کی باتیں کیں اور چائے کا حکم دیا۔ میرے متعلق بہت کچھ دریافت کیا۔ پھر کہنے لگے "آپ ہماری جدید حکومت کے ایک محسن کے عزیز ہیں۔ میں آپ کو یہ کتاب بطور تحفہ دوں گا۔ مگر شرط یہ ہے کہ پڑھ کر مجھے واپس کر دیں۔ آفندی پدرم اس زمانے میں جب کہ ہم لوگوں کا شمار غداروں میں ہوتا تھا اور وہ برطانوی سفارت خانے میں بحیثیت مترجم ملازم تھے۔ ہم لوگوں کے ساتھ ہر ممکن تعاون کرتے رہے اور یوسف پاشا سے جو ابھی کچھ دنوں پہلے تک ہماری جمہوریہ کے پہلے وزیر اعظم تھے۔ ان کے بہت گہرے تعلقات ہو گئے تھے۔ آج سے آپ ہم سب کے بھانجے ہیں۔"

"میں تو کتاب لے کر اور ان کا شکریہ ادا کر کے چلا آیا مگر وہ مجھے نہ بھولے (افسوس کہ ہزار کوشش کے باوجود ان کا نام یاد نہیں آرہا۔) کسی ڈپلومیٹک دعوت میں سامنا ہو جاتا تو خود آگے بڑھ کر مجھ سے بڑی شفقت سے ملتے۔ دو مرتبہ گھر پر مدعو کیا میرے ہاں مع فیملی کے آئے۔ جب میں تبادلے پر فلسطین جانے لگا تو ہم دونوں کی دعوت کی اور کتاب واپس کرنے پر بڑی شاباش دی اور شکریہ ادا کیا وہ مجھے اب مستقل بھانجے آفندی کے لقب سے پکارتے تھے میں ان ملاقاتوں کے متعلق برابر ماموں جان کو لکھتا رہتا تھا۔ اور ماموں جان نے ایک مرتبہ ترکی زبان میں سفیر صاحب کو بھی شکریہ کا خط لکھا تھا اور ان کی فرمائش پر ان کو اپنی تازہ تصویر بھی بھیجی تھی۔ جو سفیر صاحب نے بہت خوش ہو کر ماموں جان کے خط کے ساتھ مجھے دکھائی ——"

صاحبان۔ پی اینڈ او کا جہاز کب سے کھڑا بھونپو بجا رہا ہے اب تک اس پر سے کتنی نسلیں چڑھیں اور اتر گئیں۔ کتنی مسافتیں طے ہو لیں آئیے اس پر سوار ہو کر ۱۹۰۷ء کے بغداد واپس چلیں۔

باب ٦

غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

سید سجاد حیدر سے قبل محمد حسین رامپوری نے دو ترکی ناول انگریزی سے اردو میں منتقل کئے تھے سجاد حیدر نے زمانہ طالب علمی میں تین ناولٹ "زہرا"، "مطلوب حسیناں" اور "ثالث بالخیر" ترکی[1] سے براہ راست ترجمہ کیے وقت بہت تیزی سے گذرتا ہے۔ یہ آج سے بہتّر برس قبل کی بات ہے کہ ۲۲ سالہ سجاد حیدر نے "ثالث بالخیر" کے دیباچے میں لکھا۔

"میری تمنا یہ تھی کہ کسی طرح ترکوں کے قصے ترجمہ ہوں . . . . ترکوں کی سوشل زندگی کی تصویر میں اردو میں اس لئے ضروری سمجھتا تھا کہ ہماری سوسائٹی اور طرز معاشرت میں جو انقلاب پیش آ رہا ہے وہ انھیں بھی پیش آ چکا ہے۔ سو ہمیں اس نقشے سے معلوم ہو جائے گا کہ اس منزل سے وہ کس طرح گزرے ہیں اور اب کہاں ہیں۔ ترجمہ اکھڑا اکھڑا اور انوکھا معلوم ہوگا مگر ترکوں کا طرز ادا مجھے کچھ ایسا بھلا معلوم ہوتا ہے اور مغربی اور ایشیائی طرز تحریر کا ایسا معقول میل ہے کہ میں نے لفظی ترجمے کی کوشش کی ہے گفتگو تو منہ ور انوکھی ہے۔ لیکن سنیے تو سہی۔ ع

غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد"

شیخ عبدالقادر نے "مخزن" ۱۹۰۱ء میں جاری کیا تھا اسی سال جولائی میں سجاد حیدر کی پہلی افسانہ نما نگارش "نفرت جوانمردی" اس تاریخ ساز رسالے میں شائع ہوئی۔ یہ ترک ادیب مفاخر بے کے ایک افسانے کا ترجمہ تھا۔

ایک پاکستانی محقق اور نقاد سید معین الرحمٰن نے خیالستان کا نیا ایڈیشن نئی ترتیب کے ساتھ اردو مرکز لاہور سے ۱۹۶۸ء میں شائع کیا ہے۔ مرتب نے کتاب کے مقدمے میں یہ ثابت کیا ہے کہ پریم چند کے بجائے یلدرم اردو کے پہلے باقاعدہ افسانہ نگار تھے۔ پریم چند کا پہلا افسانہ ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا۔ "دنیا کا سب سے انمول رتن" پریم چند کے افسانوں کے پہلے مجموعے "سوز وطن" ۱۹۰۹ء کا پہلا افسانہ ہے۔ اسی کو پریم چند نے اپنی پہلی کہانی قرار دیا ہے۔

ترک ادیب خلیل رشدی کے افسانے "نشے کی پہلی ترنگ" کا ترجمہ سجاد حیدر نے معارف اکتوبر ۱۹۰۰ء میں شائع کیا تھا لیکن سجاد حیدر کے تین طبع زاد افسانے "غریب وطن" اردوئے معلی علی گڑھ اکتوبر ۱۹۰۶ء، "دوست کا خط" مخزن ۱۹۰۶ء اور "حضرت دل کی سوانح عمری" دسمبر ۱۹۰۶ء میں لکھے گئے۔"

۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۷ء تک سجاد حیدر بغداد اور استانبول میں مقیم تھے بقول مولانا سلیمان ندوی سرکاری ملازم ہونے کے باعث انھوں نے اپنا نام یلدرم

---

[1] ترکی یورال التائی زبان ہے۔ اور انڈو یورپین اور سامی لسانی خاندان سے تعلق نہیں رکھتی گو عہد عثمانیہ میں عربی اور فارسی الفاظ داخل ہوئے۔ یہ عثمانی یا عثمانلی ترکی آذربائیجان اناطولیہ اور بلقان میں رائج ہے۔ اور وسط ایشیا کی مشرقی چغتائی ترکی سے مختلف ہے۔

رکھا جو مشہور ترک سلطان بایزید اول (۱۳۸۹ء تا ۱۴۰۲ء) کا لقب تھا۔ کیوں کہ وہ اپنے دشمنوں کی بے خبری میں ان کے سروں پر بجلی کی سی تیزی سے آگرتا تھا۔"

بقول زاہدی "اس لفظ کے معنی پر غور کرنے سے خیال ہوتا ہے یلدرم نے معنی گرج کے ہوں گے۔ نہ کہ محض برق کی چمک کے۔ اگر اس کے معنی گرج لئے جائیں تو سجاد کے نام کے ساتھ یہ ہرگز موزوں نہ تھا کیوں کہ وہ خیالات کی بارش تو کرتے رہے مگر کبھی گرجے نہیں۔"

ترک ادیب، شاعر اور صحافی تازہ ترین فرانسیسی ادبی اور سیاسی تحریکوں سے اس وقت وابستہ تھے جب ہمارے ہندوستان کا بیچارہ کولونیل ادیب والٹر اسکاٹ اور ٹھیکرے کا وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ ہمارے غلام نوجوان اعلیٰ تعلیم کے لئے "مدر کنٹری" کے دارالسلطنت لندن یا آکسفورڈ اور کیمبرج جاتے تھے اور زیادہ تر برطانوی سامراجی روایات سے سرشار ہو کر واپس لوٹتے تھے۔

لیکن یہ کیفیت اردو والوں کو باہر کی ہوا لگنے تک تھی۔ 'مخزن' کا اولین دور اس نئی خوش آئند سماجی تبدیلی کا عکاس ہے۔ مثال کے طور پر صرف ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۴ء کے فائل دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ متعدد نوجوان ادیب اور شاعر بیرونی ممالک سے اپنی تخلیقات بھیج رہے ہیں۔ شیخ محمد اقبال اور سید علی بلگرامی (بعد میں شمس العلماء) کیمبرج سے محمد علی آکسفورڈ سے سجاد حیدر یلدرم بغداد سے مدیر رسالہ شیخ عبدالقادر استانبول سے لالہ لاجپت رائے (جی ہاں لالہ لاجپت رائے) روم سے مشرف الحق اڈنبرا سے وغیرہ وغیرہ۔ مدیر مخزن نے یورپ کے لکھاڑ

بخت آزمانے نکلو، جنگل بسانے نکلو

گھر سے نکل کے دیکھو ہندوستان والو!

ہمت والا پنجابی کسان اور کاروباری امریکہ اور کینیڈا تک میں جا بسا تھا۔ 'مخزن' میں ایک مضمون کسی سید حاکم شاہ کا جزائر کینری سے آیا۔

یہ آج سے تقریباً ستر برس قبل کی باتیں ہیں۔ مخزن کے دوسرے مضمون نگار فصیح الملک داغ دہلوی، خواجہ حسن نظامی، شاد عظیم آبادی، حسرت موہانی، سرور جہان آبادی، ونائیک پرشاد۔ طالب بنارسی، وحشت کلکتوی، ناظر کاکوروی، ذوالفقار علی گوہر اکبر آبادی، عزیز لکھنوی، غلام بھیک نیرنگ، احسن لکھنوی، لالہ سری رام، مرزا احمد سعید، محمد اکرام، راشد الخیری، ڈپٹی لال گم، آغا شاعر قزلباش، آغا حشر کاشمیری وغیرہ ہیں اور ایک پردہ نشین نو عمر خاتون مس نذر الباقر بھی جن کا ذکر بعد میں آئے گا۔

سجاد حیدر، جو "مخزن کے نورتنوں" میں شمار کئے جاتے تھے ایک خوش شکل گلیمرس اور ہر دلعزیز نوجوان ادیب تھے اور ایک CHARISMATIC شخصیت کے مالک تھے۔ "مخزن" میں تصویر کیا چھپی تہلکہ مچ گیا۔ سید نظام الدین شاہ دلگیر نے ایک نہایت رقت خیز نثر پارہ لکھا۔ "تصویر سجاد کو دیکھ کر" اس کا عنوان تھا "سجاد۔ سجاد کون سجاد۔ وہی فطرت شناس سجاد آزاد سجاد ظرافت پسند سجاد جس کی تصویر ہنستی بولتی اکتوبر کے "مخزن" میں شائع ہوئی ہے۔ دلوں کو اپنی طرف بے طرح کھینچتی ہے۔ وہی روشن خیال سجاد کے مضامین کی نسبت بجا طور سے کہا جا سکتا ہے۔

عطا کیا طبع نکتہ رس نے تیرے قلم کو سخن وری میں خیال انوکھا، بیان اچھوتا، زمین نئی اور روش نرالی" وغیرہ وغیرہ (فروری ۱۹۰۵ء)

قیام بغداد کے زمانے میں پدرم نے سلطنت عثمانیہ اور اس کے یورپین صوبوں کی سیاحت کی جو ہندوستانی نوجوان باہر جاتا ہے اس کا کم از کم ایک سنجیدہ رومانس ایک غیر ملکی لڑکی سے برحق ہے پدرم نے ترک خواتین کو پہلے سے آئیڈیل بنا رکھا تھا۔ راوی کہتا ہے کہ استانبول کی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خانم نے ان سے اصرار کیا کہ شادی کر کے ترکیہ میں سکونت اختیار کر لیں لیکن ترکی سے شدید عشق کے باوجود پدرم ترک وطن پر راضی نہ ہو سکے۔ وہ خانم علاوتاً ہند میں آکر رہنے پر تیار نہ تھیں۔

نومبر ۱۹۰۴ء میں پدرم ہندوستان واپس آئے تو پھر دھوم مچی ایک بے تکلف دوست قاری سرفراز حسین عزمی دہلوی (مصنف شاہد رعنا) نے رسالہ اولڈ بوائے میں لکھا۔

آ گئے سجاد حیدر آ گئے   آ گئے قند مکرر آ گئے
چھوڑ آئے اپنی ترکن کو وہاں   رو کے وہ سینے پہ پتھر آ گئے

ان کے دوست اور پڑوسی مشتاق احمد زاہدی لکھتے ہیں سجاد بغداد میں کئی سال اپنے فرائض منصبی نہایت شرافت اور خوش اسلوبی سے ادا کرتے رہے۔ شرافت میں نے اس لئے کہا کہ سیاسی کاموں میں بہت کچھ لگائی بجھائی کرنی پڑتی ہے اور اپنے ہم مذہب اور ہم قوم لوگوں کے گلے کاٹنے پڑتے ہیں مگر یہ کام سجاد حیدر نے نہیں کیا اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس اہم عہدے کے باوجود ان کو کوئی خطاب نہیں ملا۔ اور نہ یہ عہدہ ان کی ترقی کا زینہ بن سکا۔"

غالباً اسی سال کراچی میں مسلمانوں کی تعلیمی کانفرنس سر آغا خان کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ شیخ عبدالقادر فرماتے ہیں۔ "جب جلسہ دوپہر کے کھانے کے بعد برخاست ہوا اور میں اپنی قیام گاہ کی طرف جا رہا تھا تو سامنے سے سجاد صاحب آتے نظر آ گئے۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے ایک دو چکر اپنے گرد لگائے جیسے خوشی سے رقص کر رہے ہوں۔ اور کہنے لگے۔ کچھ نہ پوچھئے۔ اس وقت میرا دماغ آسمان پر ہے اور میں زمین پہ کسی سے بات کرنے کو تیار نہیں۔"

"میں نے پوچھا کچھ تو بتایئے کیا دیکھا کہ طبیعت اس طرح زوروں پر ہے۔ کہنے لگے ایک ایسی خاتون سے مل کر آ رہا ہوں جو آزادی کی حامی اور خود بھی اس پر عامل ہے۔"

یہ خاتون عطیہ فیضی تھیں جنہوں نے سروجنی نائیڈو کی طرح اس زمانے میں بہت سارے ذہن پرست نوجوانوں کو گرویدہ کر رکھا تھا (نوجوانوں کے علاوہ ان کے پرستاروں میں چند جید جاگیرداری بزرگ بھی شامل تھے)

"مخزن" میں شائع شدہ مضامین کا مجموعہ خیالستان کے نام سے ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا۔ علامہ اقبال نے اسے پنجاب یونیورسٹی کے بی۔ اے کے نصاب میں شامل کروایا۔ اقبال سے پدرم کی دوستی کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ہوئی تھی۔ اپنے اولین دور

لہ انڈین پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ اسی محکمے میں پدرم کے دو دوست تھے۔ عبدالانعام الحق دہلوی بلوچ والے اور مرزا سکندر علی بیگ ملازم تھے۔ موخر الذکر جنرل اسکندر مرزا کے نام سے چند سال پاکستان کے گورنر جنرل رہے۔

میں اقبال اپنا تازہ کلام اشاعت سے قبل یلدرم کے پاس بھیجا کرتے تھے[1]

پینتیس سال بعد سید احمد شاہ بخاری پطرس نے اپنے ایک انگریزی مضمون میں یلدرم کی وفات کے بعد لکھا:۔

"...... یہ واقعہ کہ ان کی موت پر اتنی خاموشی رہی المناک ضرور ہے اردو ادب پر ان کا اثر بہت عظیم تھا ـ بڑی شوخی اور بڑے لطف کے ساتھ انھوں نے اُردو زبان و ادب کے بوڑھے چہرے کو جوانی اور تازگی بخشی اور گو ان کے تجربے کی جسارت کو اب تقریباً فراموش کر دیا گیا ہے رنگ روپ کی بہت سی لطافتیں جو انہوں نے پیدا کیں ابھی باقی ہیں۔ ..... خیالستان اپنی اشاعت کے چند ہفتوں کے اندر اردو کی ایسی مقبول تصنیف بن گیا جو بڑی رغبت سے بار بار پڑھی گئی[2] آج ہم اس سے ایک سنگِ میل کی حیثیت سے واقف ہیں اور جب ادبی فیشن بدلے گا اور شاید لوگ خیالستان کے شستہ اور شائستہ حسن کی طرف متوجہ نہ ہوں گے اس وقت بھی ہمیں ادبی مطالعے کی خاطر اس کتاب کی طرف رجوع کرنا پڑے گا اور ہمیں ان خصوصیات کا سراغ ملے گا جنھوں نے بڑی حد تک اردو کو اس کا دم خم اور روح بخشا ہے۔

"...... یلدرم مسلمانوں کی نئی خود آگہی کے دھارے میں شامل تھے۔ وہ اس دور کی پیداوار بھی تھے اور کمسنی ہی میں انہوں نے علی گڑھ میں تعلیم پائی اور ساری دنیا میں ان کو نہایت فخر کے ساتھ اس دل پذیر گروہ میں شامل سمجھا گیا جس نے اس مرکز کے باہر آ کر ایک نئے طرزِ فکر اور طرزِ زندگی کی تزئین کی ـ ابھی ہم اس عہد سے اتنے قریب ہیں کہ غالباً آسانی سے یہ نہیں جان سکتے کہ اس تحریک و تزئین کی قدر و قیمت کیا ہے ـ لیکن قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مستقبل کے مورخ کو اس اولین دور میں اس قومی وجاہت اور امید کو دوبارہ حاصل کرنے کی تمنا ضرور کار فرما نظر آئے گی جو سلطنت مغلیہ کے خاتمے کے بعد ہندوستانی مسلمان اپنی زندگیوں میں کھو چکے تھے۔

"اقتدار کی خواہش بعد کے عہد میں پیدا ہوئی ـ اور اس میں سجاد حیدر اور ان کے ہم عصر شریک نہ تھے۔ لہذا عمرانیات کے لحاظ سے اقبال کے برعکس سجاد حیدر موجودہ دور سے تعلق نہیں رکھتے اقبالؒ دونوں ادوار میں شامل تھے ـ چنانچہ عظیم ہونے کے ساتھ ساتھ زیادہ لوگوں کی زبانوں پر رہے ....

"سجاد حیدر اس نسل کے فرد تھے جس نے مسلمانوں کی زندگی میں ایک ترکیب نو پیدا کرنا چاہی ـ اس کے اجزائے ترکیبی قدیم و جدید مغرب و مشرق سائنس اور مذہب عربی اور انگریزی پر مشتمل تھے یہی نظریہ تھا جس نے علی گڈھ کالج کے لیے "اینگلو اورینٹل" کا نام اختراع کیا۔ اس نظریے کے چند مظاہر نے اکبر الہ آبادی جیسے لوگوں کو بہت طول کیا مگر وقت آگے بڑھتا گیا اور جدید مدنیت کے پیغمبر اپنے مشن میں کامیاب رہے۔

"اس جدید مدنیت اور شائستگی کے لیے سجاد حیدر نے ایک متناسب اور مناسب طور پر ترقی پسندانہ نگارش جس سے اُردو زبان کو روشناس کیا ترکی ٹوپی مغل شیروانی اور انگریزی پتلون میں ملبوس نوجوان ادیبوں کی ایک پوری نسل اس طرزِ تحریر کی طرف جوش و خروش سے لپکی گویا صرف یہی چیز تھی جس کا وہ اب تک انتظار کر رہے تھے ـ اور یہ واقعہ بھی تھا ـ اس طرزِ تحریر میں وہ سب کچھ تھا جس کی انھیں آرزو تھی۔ ...... الفاظ عربی اور فارسی کے تھے لیکن اسے یعنے ـ پل کی پل میں ان کی سختی اور بھاری پن غائب ہو گیا ـ گویا کسی

---

[1] سجاد حیدر یلدرم ۔ از امتیاز علی تاج ۔ تہذیب نسواں ۲۹ مئی ۱۹۴۳ء۔

[2] اگلے پندرہ برسوں میں خیالستان کے سولہ[16] اڈیشن شائع ہوئے۔

نے ملٹن کے زورِ بیان میں آسکر وائلڈ کے رنگ کی آمیزش کر دی ہو۔

"قومی نشاۃ ثانیہ کے ساتھ تجدید ماضی کے خواہش مند نوجوان نے اس نئے اندازِ تحریر کو بڑے غرور اور پیار سے اپنایا۔ ان کو مسرت اس بات کی تھی کہ یہ نفیس ترقی پسند نرم و نازک اور آزاد خیال تھا۔ مغرور اس وجہ سے تھے کہ یہ اندازِ بیان قوم کے شاندار ماضی سے بھی وابستہ تھا مشرقی تھا۔"

اس مضمون میں پطرس نے ایک اہم نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے[1]۔ "یلدرم کی بیشتر کہانیاں اور ڈرامے تراجم ہیں۔ لیکن مجھے معلوم نہیں کہ اصل تصانیف سے ان تراجم کا مقابلہ کیا گیا ہے یا نہیں۔ اس لئے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ سجاد حیدر نے اپنے آپ کو صحیح معنوں میں مترجم کی ہی حیثیت سے پیش کیا ہے یا یہ محض ان کا حسنِ بیان ہے یا محض انکسار جو انھیں ایک نئی تکنیک برتنے کی معذرت کے طور پر برتنا پڑا۔ چند داخلی شہادتوں کی بنا پر مجھے شبہ ہے کہ تراجم دراصل تقریباً طبع زاد تخلیقات ہیں اور جیسا سمجھا جاتا ہے اس سے کہیں زیادہ اوریجنل واقع ہوئی ہیں۔ ان کی ترغیب سجاد حیدر کو ترکی کے پس منظر نے دلائی۔ کیوں کہ جدید مدنیت یورپ کی بجائے ترکی لیبل کے ساتھ کہیں زیادہ دل آویز نظر آسکتی تھی۔۔۔۔۔۔

"انہوں نے ایک ترکی قلمی نام یلدرم اختیار کیا جس نے قلمی نام اختیار کرنے کے نئے فیشن کی بنا ڈالی۔ یہ تفصیل گو غیر اہم ہے۔ لیکن اپنی جگہ۔ یہ ایک علامت کی حیثیت رکھتی ہے۔"

پطرس مرحوم نے یہ مضمون ۱۹۳۴ء میں لکھا تھا۔ دنیا اس وقت سے بھی اونتیس برس آگے نکل گئی۔ اردو ادب میں ان تیس برسوں میں مزید انقلاب آچکے ہیں۔

باب ۷

افغان باقی! کہسار باقی!

جنوری ۱۹۰۱ء میں سجاد حیدر یلدرم نے امیر یعقوب خان سابق شاہ افغانستان کے اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ کی حیثیت سے دہرہ دون میں نجف علی خان[2] سے اپنے نئے عہدے کا چارج لیا۔ پولیٹیکل ایجنٹ انگریز تھا۔ اس کا تعلق براہِ راست برٹش فارن آفس سے تھا۔

---

[1] سید سجاد حیدر یلدرم از پطرس بخاری۔ روزنامہ سٹیٹسمین۔ نئی دہلی۔ مئی ۱۹۷۳ء تلخیص و ترجمانی۔ ن ا

[2] نجف علی خان غالباً پنجاب کے باشندے تھے۔ ان کی نواسی رودح افزا سجاد حیدر عصمت کی منگنی ہوئی تھیں۔ سجاد حیدر صاحب پاکستان فارن سروس کے سینئر ڈپلومیٹ ہیں۔ کچھ عرصہ نئی دہلی میں پاکستان کے ہائی کمشنر رہ چکے ہیں۔

تیسری اینگلو افغان جنگ اور امیر یعقوب خان کی معزولی یلدرم کی پیدائش سے پہلے کے واقعات تھے[1] مگر آج ۲۷ سالہ سجاد حیدر ان بوڑھے شیروں کے انچارج بنا کر دہرہ دون بھیجے گئے تھے۔ برطانیہ کا اقبال عجیب و غریب کرشمے دکھا رہا تھا۔ موسم گرما میں وہ قیدی در نذرکستان چھ ماہ کے لیے مع اہل و عیال دہرہ دون سے مسوری منتقل کر دیا جاتا۔

مسوری میں اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ کی سرکاری کوٹھی کا نام (BELLEVUE) تھا۔ جو ایک آدھ ادیب مسوری آتا اس کا اڈہ بن گئی۔ نیاز فتح پوری بھی بسلسلہ ملازمت مسوری ہی میں مقیم تھے۔ اتوار کا دن اکثر یلدرم کے ہاں گزارتے۔ ابوالکلام آزاد آئے۔ چند روز کے لئے قاری سرفراز حسین دہلوی آئے اور اس صحبت میں شریک ہوئے۔ نیاز صاحب فرماتے ہیں "میرے مخصوص ادبی ذوق کو ابھارنے میں یلدرم کا بڑا ہاتھ تھا۔ رومانی افسانہ نگاری میں ان کی حیثیت یقیناً ایک موجد کی سی ہے اور میری مقلد کی سی۔ سلطان حیدر جوش کا مقصد چاہے کچھ رہا ہو لیکن تھے وہ یلدرم کے مقلد۔ جب مسوری ہی میں تھا کہ جوش کا افسانہ "مخزن" میں شائع ہوا۔ جب یلدرم سے اس کا ذکر آیا تو وہ صرف یہ فقرہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔"

یلدرم روزانہ صبح کو پولیٹیکل افسر کے دفتر جاتے شام شاہی قیدیوں کے ساتھ گزارتے کام وام کرنے کو کچھ خاص تھا نہیں سابق امیر شہزادوں اور سرداروں کے ساتھ فر فر فارسی بولا کرتے شعر و شاعری پر گفتگو رہتی جس نے بیشتر اسلامی سلطنتوں کو اکھاڑا۔

بغداد کے جاندار انقلابی ماحول کے بعد یہ عجیب غیر حقیقی سا وقت تھا۔ امیر کابل کی کوٹھی کے نیچے کہرا نیلے پہاڑوں پر پھیل جاتا۔ شہر کے بل کھاتے راستوں پر گیس کی روشنیاں ٹمٹماتیں بارش ہوتی تو لاؤنج کے شیشے دھندلا جاتے۔ آتش دان میں آگ کی روشنی زیادہ تیز معلوم ہونے لگتی نفیس قالینوں اور دبیز مخملیں پردوں سے آراستہ کوٹھی میں نظر بند شاہی قیدیوں کے لئے ہر موسم یکساں تھا۔ دوست محمد کا پوتا بوڑھا یعقوب خان مسند پر نیم دراز اکثر دن دن بھر چپ چاپ دیوان حافظ پڑھا کرتا۔

سہ پہر کو اندھیرا پڑے اکثر نوجوان اسسٹنٹ پولیٹیکل افسر تیز تیز ہلکے پھلکے قدموں سے زینہ چڑھتا اوپر آتا علیک سلیک ہوتی مارے ادب کے ہندی نوجوان بزرگ امیر کابل کے سامنے سگریٹ نہ پیتا امیر کا قلیان تازہ کیا جاتا خشک میوے اور تازہ پھلوں کے طشت کشمیری تپائیوں پر رکھے ہوتے۔ نقرئی سماوار آتشدان کے شعلوں کی روشنی میں جھلملاتا۔ بغیر دودھ کی چائے اور قہوے کے فنجانوں کا دور چلتا رہتا۔

ایک سردار سابق امیر کے سامنے شطرنج کی بساط بچھاتا۔ ہاتھی دانت کے صندوقچے میں سے مہرے نکالے جاتے۔ یعقوب خاں اور یلدرم اپنی اپنی چال سوچنا شروع کر دیتے اکثر سوچتے سوچتے بوڑھا بادشاہ عقابی نظروں سے دریچے کے باہر دیکھتا۔ حد نظر تک پہاڑ

---

[1] نومبر ۱۸۷۸ء میں برطانیہ نے افغانستان پر حملہ کیا۔ امیر شیر علی نے کابل سے فرار ہو کے چند ماہ بعد المناک حالات میں وفات پائی۔ ان کے فرزند اور جانشین امیر یعقوب خان کو درہ خیبر، وادی کرم، پشین، سبی اور بہت سا قبائلی علاقہ برطانیہ کے حوالے کرنا پڑا۔ افغان امور خارجہ بھی برطانیہ کے سپرد کئے گئے۔ ستمبر ۱۸۷۹ء میں کابل کے عوام اور فوجیوں نے ریذیڈنسی پر حملہ کر کے برطانوی ریذیڈنٹ کو قتل کیا۔ ۱۲ اکتوبر کو جنرل رابرٹ نے کابل پر قبضہ کر لیا۔ امیر یعقوب خان تخت و تاج سے دستبردار ہوئے مع خاندان برٹش انڈیا جلا وطن کئے گئے۔ دہرہ دون اور مسوری میں نظر بند رہے۔

۲۔ سلطان حیدر جوش کا یلدرم سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔

تھے ۔ ان پہاڑوں کے آخری سلسلے کے اُس پار مغرب میں افغانستان تھا ۔ پختونوں کا دیس ۔ خوشحال خاں کے اشعار اس وقت کتنے صحیح معلوم ہوتے تھے ۔ جلا وطنی کا آتنا بڑا ناقابلِ عبور فاصلہ کوئی بادِ صبا کوئی سحاب رواں وہاں سے کرب ناک یادوں کے علاوہ کوئی پیغام بھی نہیں لا سکتے ۔ جلال آباد ۔ کابل ۔ قندھار ۔ اپنا وطن ۔ دادا کا قلعہ ۔ وہ ضیغم صفت دادا جس نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ ساتھ اور تنہا انگریزوں کو ناک چنے چبوا دیئے تھے ۔

وہ نیم تاریک ایوان ۔ روشن صحن ۔ مٹی کی فصیلیں سکھ اور برطانوی جنگوں کی یادگار ۔ ڈھالیں اور ہتھیار زنگ خوردہ توپیں ۔ ناکامی پرسیج شکست ۔ ان چنار کے درختوں سے گھر سے آبائی قلعوں کے نزدیک اب برطانوی فوجی کیمپ جگمگا رہے تھے ۔ ۱۸۸۰ء آج کی بات معلوم ہوتی ہے وہ سارا لرزہ خیز المیہ اکثر رات کو خواب میں دہرایا جاتا ہے ۔ جنرل رابرٹ کی دہشت ناک آمد ۔ برطانوی فوج کی یلغار ۔ گھوڑوں کی ٹاپیں ۔ میدان جنگ میں اللہ اکبر کے نعرے ۔ کس طرح برطانوی کیمپ میں پناہ لی ۔ ان بدبخت کاغذات پر لرزتے ہاتھوں سے دستخط کیے ۔ کس وقت زنان خانے کا کاروان درۂ خیبر کی سمت روانہ ہوا ۔ جلا وطنی کے اٹھائیس سال ۔

اٹھائیس سال گزر گئے جب انگریزوں نے دوست محمد خان کے دوسرے پوتے عبدالرحمان خاں کو اپنا مطیع امیر کابل تسلیم کیا ۔ عین وہی زمانہ تھا جب امیر بخارا ۔ امیر خیوا ۔ امیر خوقند سب کی روسی جنرل کاف مِن چھٹی کر رہا تھا ۔

برادر ایوب خان نہ مانا ۔ لڑتا رہا انگریزوں کے چھکے چھڑا دیئے ۔ اپنی خستہ حال فوج کے ساتھ کس بے جگری سے لڑا ۔ آخر دوست محمد کا پوتا تھا ۔ مگر ہندوستانی شاعر حالی نے جس کے اشعار ترجمہ کر کے ہندی سید زادہ اکثر سناتا ہے ٹھیک کہا ہے گھٹا ادبار کی زبردست چھا رہی ہے ۔ برادر ایوب کو بھی جنرل رابرٹ کے آگے ہار ماننا پڑی غلامستان ہند جلا وطن کیا گیا ۔

امیر عبدالرحمان خان کی وفات کو بھی سات سال ہو چلے اخباروں میں چھپا ہے کہ حبیب اللہ خان کچھ اصلاحات نافذ کرنے میں مشغول ہے " اصلاحات " کی ہوا سارے مشرقِ وسطیٰ میں چل پڑی ہے ۔ پچھلے سال برخوردار حبیب اللہ خان علی گڑھ کالج آیا تھا بے حد پُرجوش اس کا استقبال کیا گیا ۔ ہندی مسلمان مشرقِ وسطیٰ کے مسلمانوں پر فدا ہوا جاتا ہے مستقل افغانوں ترکوں عربوں ایرانیوں کا غم کھاتا ہے ان کی ترقی سے خوش اور ان کی ہزیمت سے پژمردہ ہوتا ہے ۔ ان کے لئے روتا مسجدوں میں دعائیں مانگتا اور چندے جمع کرتا ہے عجیب بات ہے ۔ ہم مشرقِ وسطیٰ کے مسلمانوں نے کبھی ان کے متعلق سوچا بھی نہیں ۔۔۔

اس دلچسپ سعادت مند ہندی سید زادے نے اپنا تخلص ہی ترکی رکھ لیا ہے ۔ بے حد جوش و مسرت سے ترک انقلاب کے قصے سناتا ہے ۔ کہتا ہے یہ ۱۹۰۸ء ترک انقلاب کا سال ہے ابھی ۲۴ جولائی کو خلیفۃ المسلمین سلطان اعظم نے نوجوان ترکوں کے مطالبات منظور کر لیے ۔ عوام کو دستوری حقوق عطا فرمائے ۔

دستوری حقوق کیا شے ہے عجیب نئی نئی اصطلاحات اس نئی پود نے ایجاد کی ہیں بہت خون خرابہ اس کی وجہ سے ہو رہا ہے ۔ ابھی حال ہی میں ہمارے ہمسائے مظفر الدین شاہ قاچار نے بھی اپنی رعایا کو کچھ حقوق عطا کیے ہیں ۔ برادر زادہ حبیب اللہ خاں کابل میں انگریزی کالج کھول رہا ہے ۔

شہ —

شہ —

مات —

شطرنج کی دوسری بازی شروع ہوتی ہے۔ نوجوان سید زادہ اچھا کھلاڑی ہے۔ اگر اتنا منکسر المزاج شرمیلا اور قناعت پسند نہ ہو تو زندگی میں آئندہ بہت ترقی کرے گا۔ یا شاید نہ کر سکے۔ اسے زمانہ سازی نہیں آتی۔

سردار عمر خان اندر آتے ہیں۔ عرض کرتے ہیں کھانا تیار ہے۔ بوڑھا امیر اللہ کا نام لے کر گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر مسند سے اٹھتا ہے۔ دوسرے کمرے میں دسترخوان بچھا ہے۔ بھاپ چھوڑتی ہوئی قابیں لاکر سامنے رکھی جاتی ہیں۔ افغان ہمیشہ سے جمہوری رہا ہے۔ دسترخوان پر بوڑھا بادشاہ ان کے بھائی بھتیجے رشتے دار اور خدام ایک ساتھ بیٹھتے ہیں۔

بسم اللہ کہہ کر کھانا شروع کرتے ہیں۔ خداوند تعالےٰ جس حال میں رکھے اس کا شکر ہے۔

افغان باقی کسا باقی!

الحکم للہ! الملک للہ!

باب ۸

اپنے وقت کا ابدال

۲۹ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو پدرم کے والد خان بہادر سید جلال الدین حیدر کا انتقال ہو گیا۔ سید رضا علی نے اعمال نامہ میں لکھا ہے۔

"وہ بڑے نامور کوتوال تھے۔ مجھے پہلی دفعہ ۱۹۰۰ء میں بنارس جانے کا اتفاق ہوا۔ اس وقت تک سید جلال الدین حیدر کے کارنامے لوگوں کی زبان پر تھے۔ چھوٹے طبقے کی عورتیں ان کے گیت بھی گاتی تھیں"۔

"...۱۹۰۰ء کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے کیونکہ سید صاحب بنارس میں ۱۹۰۵ء تک رہے۔ اس زمانے میں لکھنو، بنارس، بریلی اور شاید مراد آباد (یا الہ آباد) قمار بازی کے عظیم الشان اڈے تھے۔ ان کی آمدنی میں کوتوال شہر کا حصہ مقرر تھا۔ کوتوال بنارس کا حصہ ایک

---

(۱) امیر یعقوب خان کے انتقال کے بعد بھی جلاوطن شاہی خاندان پدرم کا اسی طرح پرستار رہا۔ راقم الحروف کے بچپن میں دہرہ دون میں مقیم افغان شہزادے صاحبان میں سردار عمر خان مجھے اب تک یاد ہیں) اور شہزادیاں ہمارے یہاں اکثر آیا کرتے تھے۔ ۱۹۵۶ء میں میری ملاقات لاہور میں ایک افغان شہزادی سے ہوئی جو دہرہ دون میں نظر بند رہ چکی تھیں۔ وہ پدرم کا نام لیتے ہی رونے لگیں۔ موصوفہ کے بیٹے سردار شاہ نواز خان ایران میں سفیر رہ چکے ہیں اور بیٹی ڈاکٹر مس محبوب شاہ زمان خان نے جو پہلے کالج آف ہوم سائنس لاہور کی پرنسپل تھیں اب امریکہ میں سکونت اختیار کر لی ہے۔ امیر یعقوب خان کے خاندان کے دوسرے افراد بھی پاکستان میں رہتے ہیں۔ کچھ دہرہ دون میں سکونت اختیار کر چکے ہیں۔

لاکھ سالانہ تھا۔

رنجیت سنگھ ہیڈ کانسٹیبل جو مسلمان ہو کر رنجیت خاں کہلاتا تھا اور خان بہادر صاحب کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھا۔ ایک بار ہمارے ہاں گھسٹ آیا۔ بوڑھا پھونس ہو چکا تھا۔ دوپہر کو نیم تلے کھاٹ پر بیٹھکر حقہ گڑ گڑاتا اور ہم نونہالان چمن کو دادا جان مرحوم کے پر معقول قصے سنایا کرتا۔

" ابی وہ کوئی بندہ بشر تھا اپنے وقت کا ابدال تھا۔"

" ابدال کون ہوتے ہیں؟ " میں نے پوچھا۔

" وہ بھی ہوتے ہیں۔ چپ رہو۔ ہاں۔ رنجیت خاں پھر کیا ہوا؟ " ایک کزن نے اشتیاق سے پوچھا " ابا جان نے گیند دور پھینک دی۔ پھر کیا ہوا۔؟ گیند گم گئی تو ابا جان رونے لگے۔ پھر کیا ہوا؟ "

" بس پھر وہ لونڈے نے ہاتھ بڑھایا۔ اتنا لمبا کہ دس کمرے کمرے ایک کر دوسرے گھاٹ پر سے گیند اٹھائی۔ جن کا لونڈا تھا دادا تمہارے سے قرآن پاک پڑھنے آیا کرتے تھا۔ بس اس دن کے بعد سے نہ آیا۔ تمہارے ابا بچا سب حیران کہ لونڈا جو روز آکر ان کے سنگ گیند کھیلے تھا کہاں کو غائب ہو گیا۔"

ہم سب دریائے حیرت میں غوطہ زن ہوئے۔ رنجیت خاں نے آنکھیں نیم وا کر کے کہنا شروع کیا۔" ابی ان ہاتھوں سے اشرفیوں کی تھیلیاں چھن چھن کرتی ہم نے اٹھائی ہیں۔ خان بہادر صاحب کے حکم سے سب واپس۔ ایک لاکھ سالانہ ان کے نام بندھا اگر لیتے۔ مگر حق حلال کی کمائی صرف ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ تھی۔ نوے روپے مہینہ تم سب کے باوا چچاؤں کی تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیج دیتے تھے۔ ساٹھ روپے میں تنگی ترشی سے بسر کریں تھے۔ کوتوالی کیا تھی خانقاہ تھی۔"

درست۔ بلا دم ہمیشہ وظیفے حاصل کر کے یا حاجی انیس خاں کا ٹیوشن کر کے کالج میں پڑھے۔ گو بوجہ خوش سلیقگی کالج کے سب سے زیادہ خوش پوش طلبا میں شمار کیے جاتے تھے۔

" ایک لاکھ روپیہ کتنا ہوتا ہے رنجیت خاں؟ " میں نے سوال کیا۔

" اوہ۔ اگر دادا جان مرحوم لے لیا کرتے سال کے سال تو حساب لگاؤ۔ ہم لوگوں کے حصے میں کتنی خطیر رقوم آتیں۔ رؤسائے کرام ہوتے ہم سب کے سب۔" ایک کزن نے کہا۔

" توبہ کرو میاں توبہ" رنجیت خاں نے دفعتاً غصے سے کہا۔" دادا اولیا اللہ اور پوتے کے خیالات کا یہ حال۔ رشوت کی کمائی کی لالچ۔"

ہم سب منہ لٹکا کر بیٹھ گئے۔

" مہاراجہ بنارس ان مرحوم کا چیلا تھا۔ ہر تقریب میں پہلے ان کا ہاتھ لگاتا۔ ہندو کی برات کوتوالی کے نیچے سے گذرتی۔ دولہا گھوڑے سے اتر کر پیدل چلتا تعظیم کی خاطر۔"

درست، مگر وہ ایک لاکھ روپے والی بات زیادہ دلچسپ تھی۔ اچھا فرض کرو۔ اے کاش ———

خان بہادر جلال الدین حیدر ۱۹۰۵ء میں بنارس سے ریٹائر ہوئے۔ رخصتی جلسے میں پنڈتان بنارس نے بزبان سنسکرت قصائد پڑھے۔ عوام نے طشت ہائے زریں و نقرئی، در مہاراجہ بنارس نے بندوق گراں بہا و شمشیر با قبضہ مطلا مع سنہری مرصع و دیگر اشیا نفیس نذر کیں۔" (تذکرہ سادات نہٹور)

ان میں سے ایک طشت نقرئی اس فقیر حقیر راقم الحروف کے حصے میں آیا ہے۔

جب ۱۸۰۵ء میں سنبھل کے بشندے سردار امیر خاں نے مع لشکر غارت گراں نہٹور پر حملہ کیا ہے اس وقت جان بچانے کے لئے اخوند سید امام بخش ترمذی مع اپنی حاملہ بی بی اور بچوں کے محلہ سادات سے ایک میل دور جنگل میں مقبرہ مبارز اللہ خاں کے اندر جا چھپے تھے۔ وہیں رات کے وقت مشعل کی روشنی میں اُن کے فرزند (یادش بخیر) میر بندے علی ترمذی پیدا ہوئے۔ زمانے کے داؤ پیچ ملاحظہ کیجیے۔ لارڈ لیک نے سردار امیر خان کو ریاست ٹونک کا نواب بنایا۔ سو سال بعد ان میر بندے علی کے بھتیجے اور داماد جلال الدین حیدر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس انگریزی عملداری کے عہدے سے سبکدوش ہو کر کہاں بلائے گئے؟ سردار امیر خاں کے پڑپوتے نواب ٹونک کنے۔ وہاں سپرنٹنڈنٹ پولیس اور آئی۔ جی رہے۔ خواص و عوام میں مقبول ہوتے صاحبزادہ عبدالقیوم خاں سید صاحب کے متعدد چشم دید واقعات کشف و کرامات کے راوی ہیں۔

وفات کے متعلق علی گڑھ کے بزرگ معلم سید محمد[1] ٹونکی فرماتے ہیں: "اس وقت میری عمر نو دس برس کی تھی۔ صرف دو باتیں یاد ہیں۔ شاید ابتدائی سردی میں مغرب کے بعد کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ان کی وفات کی اطلاع دی اور کہا مرحوم نے وصیت کی تھی کہ مولوی سید حیدر علی کے قبرستان میں دفن کیا جائے۔ اس لیے اجازت چاہیے۔

" خبر سن کر گھر والوں پر سناٹا چھا گیا۔ بچے بوڑھے سب غمزدہ تھے۔ جیسے کوئی اپنا چلا گیا۔ شہر میں عوام و خواص مرحوم کے خلوص نیکی اور نرم دل کے تجربے بیان کرتے اور روتے۔ جنازے میں ہندو مسلمان ہزاروں شریک تھے۔

"۱۹۱۷ء میں سید الطاف حسین مرحوم ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی اسکول امارہ چند لڑکوں کی حرکتوں سے سخت ناراض ہوئے کلاس میں تقریبا، گھنٹہ اچھائی اور بُرائی پر لیکچر دیا۔ نیک لوگوں میں جلال الدین حیدر صاحب مرحوم کی مثال دی اور فرمایا کہ پولیس کا محکمہ ظلم اور رشوت کے لیے بدنام ہے۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس خصوصاً بے رحمی کے لئے مشہور ہیں لیکن جلال الدین حیدر اپنی مثال آپ تھے۔ سزا سے زیادہ اصلاح کا خیال کرتے۔ اور ڈنڈے کے بجائے نرم زبان استعمال کرتے۔ جب ان کا انتقال ہوا سارے شہر ٹونک میں کہرام تھا۔ بیوائیں۔ یتیم۔ غریب۔ بوڑھے لاوارث اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے تھے جیسے اُن کا بزرگ اُٹھ گیا۔ سید صاحب مرحوم کی شرافت مری نہیں زندہ ہے۔ شریفوں کی شرافت زندہ رہتی ہے اور دوسروں کو شریف بناتی ہے

جلال الدین حیدر صاحب مرحوم کے متعلق میری ایک تھیوری ہے۔ موصوف کے اندر کسی بُرکھ ولی اللہ کی روحانیت عود کر آئی تھی۔ جیسا کہ اس تذکرے کے آغاز میں واضح کیا گیا پہلے ہمارے ہاں صرف فقرا پیدا ہوا کرتے تھے۔ عادت ان کی یہ تھی۔

---

[1] سید محمد ٹونکی مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول کے ۱۹۲۷ء سے ۱۹۴۵ء تک ہیڈ ماسٹر تھے ۸ ستمبر ۱۹۶۷ء میں علی گڑھ میں انتقال فرمایا۔

جھولا لٹکا۔ ڈنڈا سنبھال کھڑاؤں پہن چل کھڑے ہوئے۔ جہاں موقع ملا۔ کھڑے ہو کر آج کے عیسائی پادریوں کی طرح تبلیغ شروع کر دی اور دو بات دسے وظیفے پر وظیفہ چلتے۔ روزینے۔ گزر اوقات کا ذریعہ فتوح جنہیں بن مانگا نذرانہ جو لوگ دے دیں۔ شاہی حکام اور امراء سے اجتناب۔ فتوح میں سے جو بچا اسے تقسیم کرنا واجب۔

کبھی کبھی بادشاہ وقت بنجر زمینوں پر کاشت کی اجازت دے دیتا تھا۔ پوچھو بنجر زمین پر کاشت ہو سکے ہے؟

اسی نسل سے جد بزرگ میر کمال الدین ترمذیؒ ترمذ سے ہرو دی مشنری ٹریننگ سنٹر سے فارغ التحصیل ہو کر ہندوستان آئے اور ہوئے تھے۔ ان کی اولاد میں چند پشتوں تک فقیری چلی۔ جب درگاہیں بنیں فقیری سرمایہ داری میں تبدیل ہوئی یا ان کی اولاد سلاطین کی حاشیہ بردار ہوئی۔ جاگیریں ملیں گویا پیری کی برکت سے میں پائی۔ آخر میں ڈپٹی کلکٹر ہوئے یا میونسپٹی۔

اگر اپنے اجداد کی تصانیف ملفوظات کمالیہ اور الدر المنظوم[1] کو غور سے پڑھتے یہ نوبت نہ آتی جو اس وقت ہے۔

بہر حال سید جلال الدین حیدر تو اس بازار خود فروشی میں سے اپنا دامن بچا لے گئے۔

دوسری تھیوری یہ ہے کہ خان بہادر صاحب اپنی نیکی اور شرافت میں منفرد نہ تھے۔ اس معاشرے پر مذہب روحانی اور اخلاقی اقدار کا گہرا اثر ابھی باقی تھا۔ عموماً ہندو دھرم کرم کے پابند اور عموماً مسلمان ایمان دار اور شریف ہوتے تھے۔ گرداگر کرپشن دور حاضرہ خصوصاً آزادی کے بعد کے حالات کی دین ہے۔

قصہ کوتاہ سید صاحب کی رحلت کے بعد معلوم ہوا کہ انہوں نے بھٹور میں ایک مکان چھوڑا ہے جو اپنے والد میر احمد علی ترمذی کے ترکے کے روپیہ سے ۱۸۹۷ء میں بنوایا تھا اور چند ایکڑ آبائی زمین جو فدر کی ضبطی سے بچ رہی تھی اور صرف پانچ سو روپیہ نقد۔ سکہ دولت بنام آل حیدر تو زندہ کہاں سے ہوتا۔ چاروں بیٹوں کے لئے ایک عدد منظوم نصیحت نامہ البتہ تصنیف کر گئے تھے۔

چاروں لڑکے جنھیں وہ اپنے چار گاؤں کہا کرتے تھے۔ برسر روزگار تھے سید اعجاز حیدر فرزند اکبر متاہل تھے اور کچھ عرصے نواب احمد سعید خاں نواب چھتاری کے سکریٹری رہے۔ سجاد حیدر مسوری میں تعینات تھے۔ میاں نصیر یوپی میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ نسبت پھوپھی کی لڑکی وحیدہ بیگم سے ہو گئی تھی۔ سب سے چھوٹے میاں وحید کا بیاہ اپنے ماموں سید اکرام حیدر ترمذی کی لڑکی سے ہو چکا تھا۔ رہے میاں سجاد تو وہ سمندر پار ہو آئے تھے۔ شادی کو منع کریں تھے۔ اب ادھر سننے میں آ رہا ہے کہ ایک انگریزی پڑھی لکھی لڑکی جو اخبار دن تک میں چھپے ہے لوگ باگ اس کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔ ون کا خاندان ہے تو کہرا سید۔ یو۔ پی کا۔ مگر ہیں شیعہ اور رہتے ہیں کالے کوسوں دور صوبہ سرحد میں۔ اب پتہ نہیں وہاں کے نقشے کیا ہیں۔ جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا۔

---

[1] ملفوظات۔ ہند و مہاراشٹر

فصل چہارم۔ باب ۱

فلائینگ آفریدی

نوشہرہ چھاؤنی ضلع پشاور میں دریائے کابل کے کنارے واقع ہے۔ یہ سرد اور پُر فضا خطہ عمرانی لحاظ سے افغانستان و توران سے قریب اور وادیِ گنگ و جمن سے اتنا دور ہے کہ شمال مغرب کے جاٹ اور چوہدری ہیکل باشندے ستلج پار کے باسیوں کو "کالے ہندوستانی" اور "پوربیے" کہتے ہیں۔ فرحت بخش ہوائیں، ترکستانی اونٹوں کے قافلے، سرد چشمے، برف پوش پہاڑ، آسمان پر اُڑتے باز۔ ہمیں ضرور جاننا چاہیے کہ اقبال نے اپنی امیجری کہاں سے حاصل کی۔

ہر سمت وہ میدانِ کارزار پھیلے ہیں جہاں سو سال سے شاہین صفت افغانی اور پختون برطانوی افواج کا مقابلہ کر رہا ہے۔ مردان۔ درہ ملاکنڈ۔ علی مسجد۔ سفید کوہ۔

درہ خیبر کے اس پار سبزوار، دشت لیلیٰ۔ نادِ علی۔ چہل زینہ۔ دلآرام۔ درہ بوم۔ شہر بہلول۔ بالا مرغاب۔ قزل قلعہ تخت اِل وادی سرخاب۔ شہر ضحاک۔ وادی پنج شیر۔ کوہ پہلوان۔ شہر غلغلہ ایک ایسی دنیا آباد ہے جس کے افسانے قبائلی داستان گو تاروں بھرے آسمان کے نیچے الاؤ کے گرد بیٹھ کر سناتے ہیں۔

افغانوں اور انگریزوں نے خون کے کئی دریائے سرخاب یہاں بہائے۔ ملاکنڈ۔ ٹپ درہ۔ اٹک۔ قلعہ جمرود۔ پشاور کے بازار قصہ خوانی میں بخارا اور سمرقند اور قندھار اور جلال آباد اور کاشغر اور مشہد سے کارواں آکر اب بھی اُترتے ہیں۔ چائے خانوں میں سماوار گرم کئے جاتے ہیں۔

موسم سرما میں پونا سے اپنے گلے لے کر پہاڑوں سے اُترتے ہیں اور صوبہ سرحد کی وادیوں میں بکھر جاتے ہیں۔ ماہ مارچ میں اچانک بہار آ جاتی ہے۔

صوبہ سرحد کی چھاؤنیاں اپنی خوب صورتی اور شادابی کے لئے ساری برٹش ایمپائر میں مشہور ہیں۔ صاحب اپنی جان ہتھیلی پر لئے اِن قلعہ بند بنگلوں میں بیٹھا ہے مگر باغبانی اور حسن کاری سے باز نہیں آتا۔

لیکن نوشہرہ چھاؤنی کے اندر کھپریل کی ڈھلوان چھتوں اور نازک کھمبوں والے بنگلوں میں سے ایک کے پھاٹک پر SHAH BAKAR کی جو تختی چمک رہی ہے کسی انگریز کا نام ہرگز نہیں۔ امام باڑہ لانکڑی ضلع مراد آباد کے ذاکر آغا کربلائی اگر زندہ ہوتے تو آپ کو بتاتے کہ یہ سید مذہ الباقر رضوی کی انگریزی ہجے ہے اور ان ہی کی پردہ نشین صاحبزادی "مس ندرا الباقر" نے عصری اردو ادب کے بازار قصہ خوانی سے ملحق ایک شہر غلغلہ آباد کیا ہے۔

چپراسی دریا پار سے ڈاک لے کر روز صبح گیارہ بجے مسٹر باقر کے بنگلے پر پہنچتا ہے۔ نو عمر سیالکوٹی ملازم غلام حسین پلندہ لے کر اندر جاتا ہے۔ زمانے کے عیار نے نیا کرشمہ دکھایا ہے۔ اس زنبیل میں سے ایڈیٹروں کے خطوط برآمد ہوتے ہیں اور رسالوں کے پیکٹ

مخزن ۔ الناظر ۔ البشیر ۔ پیسہ اخبار ۔ تہذیب نسواں ۔ تمدن ۔ شریف بی بی ۔ خاتون ۔ مس نذر الباقر جو چھپے برآمدے میں بیٹھی پوزیشن میم کا دیا ہوا "ہوم ورک" کر رہی ہیں ۔ ایک لفافہ کھولتی ہیں :

جناب بیگم صاحبہ تسلیم !

اس ایک ماہ کے عرصے میں ہم کو خاتون کے دو تین پرچے تیار کرنے ہیں کیونکہ ہمارا یہ مقصد ہے کہ خاتون اب وقت پہ نکلا کرے اس لئے آپ کے پاس لکھتے ہیں کہ آپ کوئی عمدہ اور بڑا مضمون بھیج کر اس کام میں ہماری امداد فرمائیں ۔ آپ کی آنکھوں کی شکایت کا لحاظ کرتے ہوئے یہ تکلیف دہی نازیبا ہے ۔ لیکن مجھے امید ہے کہ اس تکلیف دہی کو آپ معاف فرمائیں گی ۔

مورخہ ۱۷ مئی [illegible]ء	فقط نیاز مند
بخدمت بنت نذر الباقر صاحبہ	شیخ محمد عبداللہ
نوشہرہ چھاؤنی	ایڈیٹر خاتون علی گڑھ

ہم مس نذر الباقر کی ڈاک یہیں چھوڑ کر سینما لینٹرن کے ذریعے ۱۹۰۵ء کے سیالکوٹ کا ایک بہترین سین سینریوں والا بائیسکوپ لیڈیز اور جنٹلمین کو دکھلاتے اور نکلو فون آلے کے ذریعے گم شدہ آوازیں سنواتے ہیں ۔

سنیے ۔ مسٹر ایس ۔ این بیکر کے پردادا میر معصوم علی چکلہ دار[1] امروہہ کے بیٹے خان بہادر میر تراب علی سی ۔ آئی ۔ ای کو پنجاب گورنمنٹ کی طرف سے[2] اجازت ملی کہ سارے صوبے میں جس جگہ چاہیں اپنا اجلاس کریں ۔ جس وقت آپ نے بمقام گورداسپور[3] ۱۸۷۲ء میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا فرزند ان کے میر مظہر حسن سیالکوٹ میں تحصیلدار تھے (تحصیلدار اس زمانے میں میونسپلٹی کا چیئرمین ہوتا تھا ۔ انکم ٹیکس لگاتا تھا اور مجسٹریٹ درجہ اول کا کام کرتا تھا)

قدیم اسلامی مدارس اور خانقاہوں کا یہ شہر اس گئے گزرے زمانے میں بھی مردم خیز تھا ۔

شمس العلماء مولوی میر حسن اور ایک کشمیری نژاد صوفی منش بزرگ شیخ نور محمد ایک چودھری[4] خاندان جن کے آباء سکھ سے مسلمان ہوئے تھے اور خواجہ غلام محمد حاضر کے بزرگ جو چاہ خانے اور سرائے کے مالک تھے ۔ میر صاحب کے حلقۂ احباب میں شامل تھے شیخ نور محمد کا لڑکا محمد اقبالؒ میر صاحب کے فرزند اصغر میر ظہور حسنین کا ہم عمر تھا ۔ میر صاحب کے تینوں لڑکے فیض العسکری ، نذر الباقر اور ظہور حسنین مع اقبالؒ بستے اٹھائے روزانہ صبح اسکاچ مشن اسکول کا رخ کرتے اور پادریوں سے انگریزی اور مولانا میر حسن سے عربی فارسی پڑھتے ۔

میر فیض العسکری (ولادت ۱۸۸۵ء) سادات لاکڑی کے پہلے جوان تھے جنھوں نے انٹرنس پاس کیا ۔ بعد ازاں تحصیل دار "گم"

---

[1] فصل دوم باب ۴ "گومتی"

[2] یہ اجازت نامہ امروہے میں پروفیسر سید مختار حسین نقوی کے پاس محفوظ ہے ۔

[3] ملاحظہ ہو فصل دوم باب ۶ "راوی" ۔

[4] چودھری سر ظفر اللہ خاں کا کنبہ

گئے میر نذر الباقر نے آٹھویں کلاس سے اسکول چھوڑ سیالکوٹ چھاؤنی میں سپلائی ایجنٹ کا کام شروع کر دیا۔ تب اس شمع بارگاہ مرتضوی یعنی پیغمبر میر حسن نے کہ سرسید کے رفقا میں سے تھے۔ میر مظہر علی کو مشورہ دیا۔ آپ کے دونوں بڑے لڑکوں نے آگے پڑھ کر نہیں دیا آپ کم از کم میاں ظہور کو علی گڑھ بھیج دیں۔

۱۸۹۲ء میں میر ظہور حسنین انٹرنس کے بعد مدرسۃ العلوم روانہ کیے گئے۔ آپ سے قارئین پچھلے ابواب میں سرسری ملاقات کر چکے ہیں۔

۱۸۹۵ء میں شیخ محمد اقبال اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے ایف۔ اے کر کے لاہور آ گئے۔ اس کے بعد پڑھتے ہی چلے گئے۔ بے حد پڑھا۔

میر مظہر علی کے خاندان والے پنجاب کے ہندوستانی ہیں۔ آج ۱۹۰۷ء میں نصف صدی ہونے آئی یہاں قیام ہے مگر کیا مجال ایک لفظ پنجابی کا زبان پر آ جائے۔ بیبیاں بدستور گھرسواں فرشی پائجامے پہنتی ہیں۔ یہ صوبہ ہنوز "پردیس" ہے۔ اولاد کی شادیاں کنبے میں ہوتی ہیں اور دوسری اہم نجی تقاریب کی مانند مراد آباد جا کر منعقد کی جاتی ہیں۔ وہیں میر مظہر علی کی سالی اشرف جہاں بیگم کی لڑکیاں مرتضائی اور مصطفائی میر فیض العسکری اور میر نذر الباقر سے بیاہی گئیں۔ ان لڑکیوں کے بھائی میر فضل علی کا عقد میر مظہر علی کی اکلوتی بیٹی کنیز عباس عرف اکبری بیگم سے ہوا۔

اشرف جہاں بیگم کے شوہر میر مہدی علی نصور ضلع سیالکوٹ میں تحصیلدار تھے جہاں مصطفائی بیگم اور نذر الباقر کی لڑکی نذر زہرا بیگم ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئیں۔ میاں نذر الباقر فوجی آدمی فلائنگ آفریدی بنے جگہ جگہ اڑتے پھرتے تھے مصطفائی بیگم سیالکوٹ میں ساس سسر کے پاس رہتیں۔ میر مظہر علی ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لاڈلی تین سالہ پوتی کو شجاع خانی ریشم کا سرخ برقعہ اڑھا گھوڑے پر اپنے سامنے بٹھلاتے اور صبح صبح ہوا خوری کے لیے ہوا ہو جاتے۔ ماہر شہسوار تھے لیکن اجل بھی گھوڑے پر آئی۔ سیالکوٹ سے ملتان تبادلہ ہوا۔ ۱۸۹۵ء کا ذکر ہے۔ ایک روز تحصیل لودھراں میں گھوڑا اڑاتے اکیلے سائیں سائیں کرتے جنگل سے گذر رہے تھے، ایک جاٹ سکھ نے جو کسی مقدمے کی وجہ سے دشمن ہو گیا تھا درخت کی آڑ سے بندوق چلا دی۔ گولی سر میں لگی۔ زمین پر گرتے ہی جان بحق تسلیم ہوئے۔ قصبہ لودھراں میں دفن کیے گئے۔ ۱۸۳۸ء میں بعہد محمد علی شاہ بادشاہ اودھ شہر لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ مٹی کہاں سے کہاں کھینچ لے گئی۔

ملتان اس برصغیر کا سب سے بڑا گورستان اور قبر پرستی کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ سوئم کے روز میر صاحب مرحوم و مغفور کے مرقد پر پراسرار شکلوں والے قلندر چلم پیتے آن بیٹھے۔ ہفتے بھر میں باضابطہ تکیہ قائم ہو گیا۔ شاہ صاحب خلد آشیاں کی کرامات کا تذکرہ شروع ہوا۔ قبر پر سبز جھنڈیاں لہرانے لگیں۔ سرہانے بیری کی ٹہنیوں میں دھجیاں اور کلاوے بندھ گئے۔ والد ماجد میر قائم علی شاہ سی آئی ای کے مزار پر بمقام گورداسپور برسوں سے سالانہ عرس ہو رہا تھا۔ لودھراں ضلع ملتان میں "مظہر علی شاہ پیر" کے مدفن پر جمعرات کی جمعرات قوالیاں شروع ہو گئیں۔

والد کی وفات کے وقت میر نذر الباقر سیالکوٹ چھاؤنی میں VITLING AGENT تھے فوجی گوداموں سے رسد فراہم کر کے سپلائی یونٹ کو روانہ کرتے تھے طبیعت دار نوجوان تھے۔ بے تحاشا روپیہ کماتے اور اڑاتے چند سال بعد سیالکوٹ سے سرحد پہنچے

ہندوستان کی اہم ترین چھاؤنیاں اسی پُرخطر علاقے میں واقع تھیں۔ حکومت برطانیہ کے لیے سنٹرل ایشین کمپیین کا یہ نازک ترین دور تھا۔ جیحوں پار روسی ریچھ غرّاتا تھا۔ سرحدی پٹھان اُونٹوں کے ذریعے امیر کابل حبیب اللہ خان کی امداد کے لیے خانہ ساز بندوقیں سمگل کرنے میں مصروف تھے۔ ملا سرتور فقیر اعلانِ جہاد کر چکے تھے۔ چھاؤنیوں کے طعام خانوں میں جنرل رابرٹ کے معرکوں کے مناظر کی روغنی تصاویر کے نیچے بیٹھ کر فتح کے جام لنڈھانے کے بعد انگریز افسر پختونوں کا مقابلہ کرنے کے لیے نکلتے اور گرجا گھروں میں نئی مقتولین کے ناموں کی برنجی تختیوں میں اضافہ کرتے تھے۔ جاہل سرپھرے ایماندار مجاہدوں سے مقابلہ تھا جو میدانِ جنگ میں جاتے وقت اپنے گھر کا سارا اثاثہ بطور امانت کسی پیر کے مزار پر رکھ جاتے اور اسے کوئی نہ چُراتا۔

مسلح گوروں سے لدی "فلائنگ آفریدی" ٹرین جمرود اور پشاور کے درمیان بھک بھک دھواں اُڑاتی چلتی رہتی تھی۔

میر نذرالباقر خاصہ فوج والے دادا کرنل نورالدین شاہ (دیکھئے فصل دوم باب گومتی) کی مانند ایک ہم جو اور جری انسان تھے۔ گورے چٹے۔ بلند قامت وجیہہ۔ مورث اعلیٰ نیشاپور سے چار سو برس قبل آئے تھے۔ لیکن میر صاحب چہرے مہرے سے ہنوز خراسانی آغا معلوم ہوتے تھے پشتو اور افغان فارسی اور پنجابی میں برق۔ نفیس انگریزی بولتے اور لکھتے تھے۔ ہندو مسلمان سکھ اور انگریزوں کا وسیع حلقہ احباب رکھتے تھے۔

۱۹۰۰ء میں ادھر دُور دراز چین میں جنگ باکسر چھڑی، اُدھر نوشہرہ چھاؤنی میں طبل جنگ بجا۔ بی بی بچوں کو برادرِ بزرگ میر فیض العسکری کے پاس تحصیل پنڈ دادن خان ضلع جہلم پہنچا کر میر صاحب امام ضامن کی ضامنی اور گوڈ سیو دی کوین کی گت پر رائل انڈین سپلائی کور کے ہمراہ عازمِ ٹینٹسن ہوئے۔ سال بھر بعد بیش بہا نوادر کا انبار ساتھ لے کر واپس آئے۔ قدیم چینی تصاویر جیڈ کے ظروف منقش چوبی صندوق اطلس کے پردے اور لبادے اور سیاہ بانات کی ایک وسیع اسکرین جس پر کارچوب سے قدِ آدم چینی کڑھے تھے۔

میر صاحب کی دریا دلی اور شاہ خرچی ضرب المثل بن چکی تھی۔ چینی تحائف کا بیشتر حصہ دوستوں میں بانٹ کر کچھ عرصہ بعد بوئر جنگ کے لیے جنوبی افریقہ روانہ ہو گئے وہاں سے آ کر سلسلۂ جنگ وزیرستان پر تشریف لے گئے۔

میر صاحب کے جود و سخا نے ایک آفت مچا رکھی تھی۔ نصف صدی بعد راقم الحروف نے ایک شناسا کے ہاں لاہور میں ایک طویل و عریض ایرانی قالین دیکھا انہوں نے برسبیل تذکرہ بتلایا کہ ان کے والد کو کوئی خان بہادر نذرالباقر صاحب صوبہ سرحد میں تھے انہوں نے تحفتاً دیا تھا۔

چینی اسکرین نہ جانے کس طرح بچ گئی۔ اماں بتاتی تھیں کہ کوہاٹ کے بنگلے میں ڈرائنگ روم کے ایک سرے پر کھڑی رہتی تھی۔ اس کے مقابل میں آتش دان کے اوپر میر قائم علی کی رنگین تصویر آویزاں تھی جس میں وہ باضابطہ لکھنؤ کے شاہی زمانہ کا لباس پہنے بیٹھے تھے۔ لاہور کے کسی فرنگی مصور نے بنائی تھی۔ مینٹل پیس کے وسط میں میر مظہر علی کا فوٹو گراف تھا جس میں وہ دوپلی ٹوپی انگرکھے اور بہت چوڑے عرض کے پائجامے میں جلوہ افروز تھے۔ دائیں جانب ان کے فرزندِ اکبر میر فیض العسکری طرے دار سرحدی صافہ کلاہ شلوار فراک کوٹ کے ساتھ ٹائی باندھے کھڑے تھے۔ بائیں جانب میر نذرالباقر انگریزی فوجی وردی میں اور میر ظہور حسنین ایم اے او کالج کے یونیفارم میں۔ یہ پانچ تصویریں گویا تین نسلوں کی تہذیبی تاریخ کی عکاس تھیں۔

دو نادر چینی امریکن رن (راقم الحروف نے بچشم خود دیکھی) غازی پور تک ہمارے یہاں موجود تھی۔ باغات میں گیدڑوں نے سوراخ کر دیئے تھے بین کار چوبی چینی اسی طرح چینیاں مسکراتے مونچھیں جھکائے آستینوں میں ہاتھ دیئے کنفیوشس کے فلسفے میں مستغرق تھے۔ اماں اکثر کہا کرتی تھیں "فلاں چیز جو باپا چین سے لائے تھے" یا "جب باپا چین گئے تھے۔۔"

باپا پیدائشی روشن خیال تھے۔ ایک عدد یوریشین بڑھیا میم لڑکیوں کی تعلیم کے لئے ملازم رکھی تھی۔ بڑی لڑکی نذر زہرا کو ڈاکٹری پڑھوانے کا ارادہ رکھتے تھے۔

بہن ان کی اکبری بیگم غیر معمولی طور پر ذہین اور لکھنے کی خداداد صلاحیت رکھتی تھیں۔ مگر لکھیں تو چھپوائیں کہاں۔ زنانہ تحریر اور نام تک کا پردہ تھا۔ میر صاحب نے ان سے کہا "بھینا تم فکر نہ کرو۔ اس کا بندوبست بھی کرتا ہوں" لاہور سے اخبار "تہذیب نسواں" جاری ہو چکا تھا۔ اس کے ناشر مولوی سید ممتاز علی کو خط لکھ کر بہن کے نام پرچہ جاری کروا لیا۔ اکبری بیگم کی عید ہو گئی۔

اکبری بیگم کے شوہر میر فضل علی لاہور میں ملازم تھے۔ دیور تفضل علی لاہور میڈیکل کالج میں پڑھ رہے تھے۔ پنجابی جدت پسندی اور اولوالعزمی کی وجہ سے لاہور نے دلی اور لکھنؤ کے مقابلے میں جدیدیت زیادہ سرعت سے قبول کی تھی۔ کالجوں، ادیبوں اور صحافیوں کا نیا مرکز بن چکا تھا۔

کہاں بے چارہ مرادآباد جو بادشاہ فرخ سیر، صوبیدار رستم خاں اور سید برادران کے عہد سے چند سال ہی آگے بڑھا تھا۔

۱۹۰۳ء میں میر نذر الباقر، اکبری بیگم اور سارا کنبہ ایک بار پھر وطن پہنچا جہاں اکبری اور میر فضل علی کے پانچ سالہ بچے میر افضل علی کی سنتوں کی تقریب منائی جانے والی تھی۔

باب ۲

محلسرا

میر قائم علی کے پرنواسے میر مہدی علی کے پوتے میر فضل علی کے سپوت جائے میر افضل علی کی سنتوں کی تقریب کے لئے نانی امین محلے محلے "نویل"[1] پھیر آئیں۔ بتیے نے بلاوے میں آم کے پتے پرو کر قائم علی کی محلسرا[2] کے صدر دروازے پر بندہ وار باندھے۔ سامنے چوک میں شہر کے نامی بھانڈ اور نقال جمع تھے۔ ڈیوڑھی پر چوبدار۔ پالکیاں ڈولیاں لا لا کر رکھی جا رہی تھیں۔ اندر صحن میں کلاونت بچیاں گلا پھاڑ پھاڑ کر گا رہی تھیں۔ لڑکیاں بالیاں اہلی گہلی پھر رہی تھیں۔ صدر دالان میں رشتے دار بیبیاں پنجاب سے آئی ہوئی مہمانوں کو حیرت سے دیکھ کر آپس میں سرگوشیاں کرنے میں مشغول تھیں "مصطفائی بھابی کی بوڑھیوں نے جو پہن رکھا ہے۔ کیا کہلاوے ہے؟"

"گون اور جاکٹ"

---

[1] نیوتہ۔ [2] مراٹھیں۔

"بال چھڑ کاٹے ہوئے پریوں جیسی۔"
"کنواری بالیاں مانگ کاڑھنے لگیں۔"
"پرفندازوں کی طرح کمر کس کے پیٹیاں باندھ رکھی ہیں۔"
"پردیس میں رہ کر کرسٹان ہو گئے۔"

باہر کچھ فاصلے پر صوبیدار رستم خاں کی مسجد سے متصل میر قاسم علی کی کوٹھی میں مردانہ تھا۔ بار بار شور مچتا۔ بھائی فلاں آ گئے۔ چچا میاں تشریف لائیے۔ آہا ہا کنور صاحب۔ مزاج شریف۔

پھاٹک پر پالکیوں کا ہجوم۔ ایک راجہ صاحب باقاعدہ ہاتھی پر چڑھ کر آئے تھے۔

محلسرا کی ڈیوڑھی پر محمود پور کا ہاتھی کھڑا کان پھٹپھٹا رہا تھا۔ افضل میاں کی سواری کے لئے بھیجا گیا تھا۔ ملازم اور محلے کے فالتو لونڈے لارے شور مچا رہے تھے۔ اسے یہاں شہزادے چلے آئے ہو منہ اٹھائے دیکھ کے جو پیارے۔

اماں دیکھ رہا ہوں کیا نقشے ہو رہے ہیں۔

سید خاں کے گھر سے سواریاں آ گئیں۔ اُترو والو۔

پیر غیب والے آ گئے۔

تکیہ گل شہید۔ قاسمی کی امی

اتنے میں غل مچا۔ محمود پور والے آ گئے۔

نواب سید محمد علی خاں کی بگھی کوٹھی کے پھاٹک پر رکی۔ پیادوں اور علم برداروں کے جلو میں دو بھلیاں آگے بڑھ کر محلسرا کی ڈیوڑھی سے لگ گئیں۔ بال بال گنج موتی پروئے نواب صاحب کی بیٹیاں ولایتی بیگم، حیدری بیگم صدر دالان میں داخل ہوئیں۔ بارہ سالہ ندرہ زہرا تصویرِ حیرت بنی ان مغل تصاویر جیسی بہنوں اور بھاوجوں کو دیکھا کیں جن کے باپ اور شوہر اپنے علاقے کے مجرموں کو سزائے موت دینے کا استحقاق رکھتے تھے (ہاں بیٹا ملکہ نے ہمیں ایک خون معاف کر رکھا ہے۔ ایک روز حیدری بھابی نے بنّو بی کو بتایا) شہر مراد آباد گھسٹ گھسٹا کر انیسویں صدی تک آ پہنچا تھا۔ دوسرے رجواڑوں کی مانند محمود پور ابھی بڑے اطمینان سے اٹھارویں صدی میں موجود تھا۔

رات گئے نواب سید محمد علی خاں کے پھوپی زاد بھائی ڈپٹی آلِ نبیؐ اور ندرالباقر اندر آئے۔ اپنے چچازاد بھائی آلِ نبیؐ کو دیکھ کر اکبری بیگم کو اس غیر حقیقی ماحول میں اچانک بڑی تقویت سی محسوس ہوئی۔ سارے خاندان میں صرف وہی اکبری بیگم اور ندرالباقر کے ہم خیال تھے۔ ایک بوڑھا پھوس انگریز مشنری ملازم رکھا تھا جو پردے کے پیچھے سے ان کی اکلوتی بیٹی آلِ زہرا کو انگریزی پڑھاتا تھا۔ آلِ زہرا کا بیاہ اکبری بیگم کے علی گڑھ والے بھائی ظہور حسنین سے ہوا تھا۔ سید حسین اور ندرہ سے کم ذہین نہ تھیں۔ طب بھی پڑھ رہی تھیں۔

ندرہ زہرا اور ثروت یعنی بنّو بی پہلی بار پنجاب سے مراد آباد آئی تھیں۔ جب اسٹیشن سے محلسرا پہنچیں سامنے ہی صحنچی میں آلِ زہرا ہلکے ہلکے بادامی بنارسی کا دوپٹہ اوڑھے پلنگڑی پر بیٹھی بلیک ووڈ میگزین پڑھ رہی تھیں۔

تقریب میں پانی کی طرح روپیہ بہا۔ اکبری بیگم کی مجال نہ تھی کہ فضول خرچی، لغو رسموں اور اوہام پرستی کے خلاف احتجاج کریں۔

اُن کے دیور میر تفضل علی کا کچھ عرصہ قبل لاہور میں انتقال ہوا تھا۔ کہا جا رہا تھا۔ پرانے دکھیا کو تو وہ غارت گئے جنات اُڑا لے گئے۔ خود ان مرحوم کو بھی وہم ہو گیا تھا کہ دو جن ان کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ میڈیکل کالج لاہور کے آخری سال میں تھے۔ جنات ضلع گورداسپور میں بھی نازل ہو جاتے تھے جہاں ان کے والد میر مہدی علی تعینات تھے۔ پچھلے بڑے دن کی چھٹیوں کے بعد تفضل میاں گورداسپور سے لاہور واپس جا رہے تھے۔ ریلوے پلیٹ فارم پر اچانک بولے بھائی جان دیکھئے دونوں آ پہنچے کہہ رہے ہیں۔ اب ہم جن ہو جائیں گے۔ لاہور پہنچتے ہی نمونیہ میں مبتلا ہوا۔ اللہ کو پیارے ہوئے۔

یہاں محلہ لاکڑی والان میں میر مہدی علی کے آبائی مکان کے زینے پر ایک جن کا قیام تھا۔ جب کبھی میر صاحب پنجاب سے آکر اس مکان میں ٹکتے وہ پابند صوم و صلوٰۃ بندۂ آتشیں فجر کے وقت زینے پر سے للکارتا "مہدی علی اُٹھو نماز پڑھو"

اکبری بیگم کو جس وقت یہ قصہ سنایا گیا وہ اسی مکان کے صحن میں کھاٹ پر بیٹھی تھیں۔ جھنجھلا کر بولیں۔ "دھرا تھا جن" لو بوا فوراً ان کے کان کا بالا کسی نے نوچ لیا۔ کیا دیکھتی ہیں سامنے کھونٹی پر لٹک رہا ہے۔

اکبری بیگم نے اپنی ننھیال چوکنوں کی حویلی میں سب سے بڑی خالہ عمدہ بیگم کو دیکھا۔ اس وقت اسی برس کا سن تھا۔ غدر سے قبل نکاح ہوا تھا۔ عین برات کے دن ایک جن عاشق ہوا۔ رخصت نہ ہونے دی۔ آج تک مصلے پر بیٹھی اللہ اللہ کر رہی تھیں[1]

مالیخولیا۔ ہسٹریا۔ تپ دق۔ سل پردہ نشین عورتوں کے عام امراض تھے۔ باہر دیوان خانوں میں چوسر اور گنجفے کی بازیاں جمتی تھیں۔ مراد آباد اس وقت ہندوستان کا وی آنا کہلا رہا تھا۔ نامی گائک، بینکار اور ربابیے جلسوں میں بلائے جاتے۔ مقدمہ بازی محبوب مشغلہ تھا۔ اکثر جائدادیں بسلسلۂ فضول خرچ مہاجن کے ہاں رہن تھیں۔

چوک لاکڑی والان میں نیم کے درخت کے نیچے ایک کنواں ہے۔ اس کی کرامت یہ تھی کہ خاندان کے جس نونہال نے اس کا پانی پیا میٹرک سے آگے پڑھ کر نہ دیا۔

اکبری بیگم پنجاب واپس گئیں۔ اپنے ناولوں "گلدستۂ محبت"، "شعلۂ پنہاں"، "عفت نسواں" اور "گودڑ کا لال" کے لئے وافر مسالہ ساتھ لیتی گئیں۔

"گلدستۂ محبت" ان کا پہلا ناول تھا۔ چونکہ عورتوں کے نام کا بھی پردہ تھا مصنفہ نے اسے "عباس مرتضیٰ" کے فرضی مردانہ نام سے پبلک پریس لاہور سے چھپوایا۔ اب نایاب ہے۔ ایک نسخہ راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔

"گودڑ کا لال"[2] غالباً ۱۹۰۰ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ چھپتے ہی دھوم مچ گئی۔ بہت جلد اس نے نئی مڈل کلاس مسلمان عورتوں کی بائبل کی حیثیت اختیار کر لی۔ لڑکیوں کو جہیز میں دیا جانے لگا۔ اس کے قارئین کو یہ معلوم نہ تھا کہ "والدہ افضل علی" کون ہیں اور یہ کہ انہوں

---

[1] (دیکھئے فصل دوم باب ۵ "رام گنگا")

[2] نسیم بکڈپو لکھنؤ نے چند سال ہوئے اس کا غیر قانونی اڈیشن شائع کیا ہے۔ (ق۔ ح)

نے اس ناول کا پس منظر اور کردار کہاں سے حاصل کیے ہیں۔

باب ۳

"چُپ کی داد"

یکم جولائی ۱۸۹۸ء ایک اہم تاریخ ہے۔ اس روز لاہور سے شمس العلماء مولوی سید ممتاز علیؒ نے زنانہ ہفتہ وار اخبار "تہذیبِ نسواں" جاری کیا۔ ان کی بی بی محمدی بیگم (والدہ سید امتیاز علی تاج) نے اخبار کی ادارت سنبھالی۔

بہت جلد "تہذیب" سارے ہندوستان کے پڑھے لکھے گھرانوں میں پہنچنے لگا۔ اس کی وجہ سے معمولی تعلیم یافتہ پردہ نشین خواتین میں تصنیف و تالیف کا شوق پیدا ہوا اور دیکھتے دیکھتے انہوں نے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ ناول لکھنے شروع کر دیئے جو تکنیک اور موضوع کے لحاظ سے آج ستر برس بعد لکھے جانے والے بیشتر عام ناولوں سے کسی طرح کم نہیں۔

مخالفین کے اعتراضات کی وجہ سے نام کا پردہ ضروری تھا۔ چنانچہ "تہذیب کے سرورق پر چھپا تھا: "تہذیب النسواں جو کہ ایک شریف بی بی کی ادارت میں ہر ہفتہ شائع ہوتا ہے۔" اکبری بیگم نے "والدہ افضل علی" اور نذر زہرا نے "بنت نذر الباقر" یا "مس نذر الباقر" کے نام سے لکھا۔ مردانہ اخباروں میں یہ بحث بھی شروع ہوئی کہ کیا شریف مسلمان لڑکیوں کا خود کو انگریزی لقب "مس" سے یاد کرنا مناسب ہے یا سخت بیہودہ بات ہے۔

اصلاحِ لباس کی تحریک شروع ہوئی۔ ۱۹۰۱ء میں "تہذیب" میں یہ سوال اٹھایا گیا کہ ہم کیا پہنیں؟ "کھنچواں پاجامہ جس کی رسم اٹھتی جا رہی ہے یا شلوار۔ سب بہنیں اپنے اپنے لباس سے آگاہ کریں۔"

اکبری بیگم ہمشیرہ ابوالکلام آزاد بمبئی سے لکھتی ہیں: "میرے والد چالیس سال مکے میں رہے۔ سولہ سال قبل کلکتہ آئے۔ کلکتہ کی معزز خاتونوں کا لباس ساری اور شلوکہ ہے۔ میں دہلوی لباس کے مقابلہ میں عرب لباس کی سفارش کرتی ہوں۔"

راحت [illegible] زینب بیگم بدرالدین طیب جی بھی اس بحث میں حصہ لیتی ہیں۔ نذر سجاد کی والدہ امیر النساء قمر لکھتی ہیں: "میں آپ کو [illegible] لڑکی عطیہ خانم کے لباس کی تصویر بھیجوں گی۔ زبیدہ خانم لندن گئی تھیں وہاں ان کے لباس کی بہت تعریف ہوئی۔"

[illegible] بیگم اور نذر زہرا بیگم نے گھیر دار بھاری پاجامے اور بھاری زیورات ترک کیے۔ ہلکے پھلکے غرارے اور "گاؤن نما" پہناوے ڈیزائن کر کے پہننے شروع کیے جو فیشن ایبل طبقے میں رائج ہوئے۔

نذر زہرا بیگم نے جدید طرز کا برقعہ ایجاد کیا۔ اس کا ذکر پھوپھی نے ناول "گودڑ کا لال" میں کیا۔

ؒ [illegible] دیوبند سہارنپور کے رہنے والے اور سرسیدؒ کے گہرے دوست تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد اور مولوی محمد قاسم نانوتوی کے شاگرد رہے۔ [illegible] میں لاہور آکر پنجاب ہائی کورٹ کے مترجم مقرر ہوئے، ۱۸۹۱ء میں رفاہ عام پریس قائم کیا۔ "دربار اکبری" اپنے پریس سے شائع کی۔

۱۹۰۵ء سجاد حیدر یلدرم کی پھوپھی زاد بہنیں یعنی خان بہادر صفیہ حسین کی لڑکیاں حمیدہ بیگم، وحیدہ بیگم چھوٹے چھوٹے مضامین "تہذیبِ نسواں" میں لکھتی ہیں۔ یلدرم کی چچا زاد بہن نثار فاطمہ بنتِ خان بہادر ڈاکٹر ارشید "نصیحتِ منظوم" میں فرماتی ہیں :-

شکر اللہ کا کہ ہم علم سے ہیں بہرہ مند
اس سے بڑھ کر نہیں دولت مری پیاری بہنو
اچھا کرتی ہو منگاتی ہو جو "تہذیب" اخبار
اس سے بڑھتی ہے لیاقت مری پیاری بہنو

ن۔ ف۔ نہٹور، ضلع بجنور

پلول سے ایک بی بی نے لکھا "تہذیب سے ہمیں بہت فائدے ہو رہے ہیں۔ پیشتر دنیا کے حالات کی خبر نہیں تھی۔ اب سب خبریں معلوم ہو رہی ہیں۔ یہ مضمون میں نے بہت کوشش کر کے لکھا ہے اگر اس میں کچھ غلطی نظر آئے تو آپ اور دوسری بہنوں سے معافی مانگتی ہوں۔"

مزید: "یہ میرا پہلا مضمون ہے جو بعد اصلاح برادر معظم کے روانہ کرتی ہوں۔ میری بہنو میں ایک شریف باشندہ پھول کی لڑکی ہوں۔"

بنتِ نذر ابا قرا و چند اور خواتین نے زنانہ کانفرنس قائم کرنے کی تحریک شروع کی۔ ایک بی بی معترض ہوتی ہیں "کوئی شخص سیڑھیاں طے کئے بغیر ایک دم نہیں چڑھ سکتا۔ ہم عورتیں پہلے ڈولی میں بیٹھتی ہیں۔ پھر گاڑی میں، پھر ریل میں۔ ہماری تعلیم ابھی ابتدائی حالت میں ہے۔ ہم ابھی اپنے آپ کو پڑھے لکھوں میں نہیں گن سکتے۔ ہماری چند بہنوں نے زنانہ کانفرنس کے بیسیوں مردانہ رسالوں میں مضمون لکھنے شروع کر دیئے ہیں۔ کیا اچھا ہو کہ ہم پہلے زنانہ انجمنیں ہر شہر میں بنائیں۔"

عورتوں کی دلچسپیاں بدل رہی ہیں۔ اڈیٹر صاحبہ ایک نوٹ میں لکھتی ہیں "ورزش اور تفریح طبع کے لئے کھیلوں کو دریافت کرنے کی ضرورت رہتی ہے۔ ہماری بہنوں کے تجربے میں جو کھیل آ چکے ہیں ان کی ترکیبیں ہمیں لکھیں۔ غالباً ہماری مسی بہنیں اس بارے میں لکھ سکیں گی۔ ایک کھیل مجھے پسند آیا ہے اسے پن پان کہتے ہیں۔ انگریزی کھیل ہے۔" برج کماری نہرو اور دوسری کشمیری برہمن اور کائستھ خواتین بھی اکثر مضمون لکھتی ہیں۔

۱۴ اپریل شالیمار باغ لاہور میں زنانہ جلسہ ہوا۔ باغبان پورے کی بیگمات اور اڈیٹر محمدی بیگم نے شرکت کی۔ دلّی سے سلطانہ بیگم[1] آئی تھیں۔ کئی یورپین لیڈیاں بھی تھیں۔ ایک بہن فونوگراف لائی تھیں۔ اکثر لیڈیوں نے بیڈمنٹن کھیلا اور فونوگراف سنا۔

فاطمہ بیگم ہمشیرہ آبرو بیگم اطلاع دیتی ہیں کہ "آبرو بیگم کی شادی ہونے والی ہے اور انہوں نے اشارۃً مجھے سخت تاکید کر دی کہ رسوم پر روپیہ برباد کرنے کے بجائے تعلیم نسواں پر خرچ کیا جائے۔"

۱۹۰۰ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے ڈائس پر مولانا الطاف حسین حالی کھڑے، جُبّہ کی دا

۱؎ شمس العلماء ذکاء اللہ کی بہو۔ مزید تذکرہ آگے آئے گا۔

پڑھ رہے تھے:۔

" اے ماؤ بہنو بیٹیو ——— دنیا کی زینت تم سے ہے۔"

باب ۴

چاند رات

اکبری بیگم اور ان کی نوعمر بھتیجی نذر زہرا دھاچوکڑی کے ماتم سے اجتناب کرتی تھیں ۔ اب انہوں نے توہمات، بدعتوں قبر پرستی اور تعزیہ پرستی کے خلاف اعلان جہاد کر دیا" اے بی ۔ یہ ذوالجناح کو جلیبی کھلا کر اس کے کان میں بات کرنا کتنی بڑی حماقت ہے ۔ ذرا عقل سے کام لو بی بیو ۔ بے چارہ گھوڑا امام حسینؑ کو تمہاری درخواستیں کس طرح پہنچائے گا؟" (شیعوں سے خطاب)

" اے بی یہ دریاؤ پری اور شیخ سدو کون چیز ہیں؟ بی شادی ۔ دال چپاتی ۔ میاں شاہ دریا ۔ ماموں اللہ بخش ۔ شاہ سکندر پیر جھلے ۔ پیر غیب؟ ہوش کی دوا کرو۔" (سنیوں سے خطاب)

خوش قسمتی سے اس خاندان میں تیرے کا رواج نہیں تھا اور سوگ سوئم کے روز اتار دیا جاتا تھا ۔ ربیع الاول تک کا سوگ بہت بعد میں اہلِ لکھنؤ نے رائج کیا ۔

اصلاح پرستی کے ساتھ ساتھ اکبری بیگم اور نذر زہرا بے حد شیعہ اور عاشقانِ حسینؑ بھی تھیں ۔ پنجاب یا سرحد کے جس شہر یا چھاؤنی میں یہ خاندان مقیم ہوتا ۔ گھر میں اربعین تک کے لیے امام باڑہ سجایا جاتا ۔ نقرئی علم اطلسی پٹکے ۔ جو شاہی کے لکھنؤ اور بگڑ دادا میر معصوم علی ناظم اودھ کے زمانہ کی یادگار تھے اور جنہیں پردادا میر قاسم علی ساتھ لے کر لکھنؤ سے نکلے تھے سال بھر صندوق میں محفوظ رہتے جہاں جہاں میر مداساقر کا تبادلہ ہوتا وہ منقش چرمی صندوق قدیم عزائیوں کے آرک کی مانند ساتھ ساتھ چلتا ۔ عرصہ گذرا شاہ غازی الدین حیدر کے عصر کی یادگار یہ علم پنجے، نقرئی ضریح جناب عباس کی نقرئی مشک، شمعدان گلاب پاش وغیرہ وغیرہ ۔ محررایں سطور نے نانا ظہور حسنین کے مکان مراد آباد میں دیکھے ۔)

چاند رات سے اس عارضی امام باڑے کی دہلیز پہ بیٹھ کر اشرف جہاں بیگم، مرزا نسائی، مصطفائی اور اکبری بیگم سیاہ ململ کے دوپٹوں میں منہ ڈھانپ زار و قطار رونا شروع کرتیں ۔

واحمدا ——— کشتہ شد حسینؑ ———

چار سو برس قبل ان کی لکڑ دادیاں، نانیاں جو دورِ صفویہ کے نیشاپور میں روضہ خوانی اور شبیہ خوانی کرتی تھیں اور جنہوں نے مرشد آباد کے ضلع مراد آباد پہنچ کر سید بڑے کے آراستہ ہوئے امام باڑے کے کچے فرش پہ بیٹھ کر اس پہلی چاند رات رونا شروع کیا تھا ان خراسانی خاتونوں اور انیسویں صدی کی پروردہ ان ٹھیٹھ ہندوستانی بیگمات کے شدتِ گریہ میں رتی بھر جو فرق آیا ہو ۔

واحمدا ——— کشتہ شد حسینؑ ———

مولانے پردیس میں مراد آباد سے بار بار اچھے ذاکر اور سوزخوان کہاں سے جڑتے ۔ ضلع ہزارہ کی چند سرحدی اور پنجابی شیعہ بیبیوں کو مجلسی اور تانگے بھیج کر شہر سے چھاؤنی بلوایا جاتا ۔ وہ دھونتال پٹھانیاں یا قزلباش خواتین ایسا قیامت خیز دھماکے دار ماتم کرتیں کہ دل دہل جاتے ۔ فارسی، پشتو اور پنجابی میں دل دوز نوحے پڑھتیں " دیر مسافر شام دی دیلا" یہ جو چاند رات کو شمروں کی

روشنی میں پڑھا جاتا تھا خصوصاً بیسا نتہار قت ہوتی۔

یو۔پی کے شیعہ گھرانوں کی عورتیں مرثیہ خوانی کی بدولت عموماً تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا جانتی تھیں اور اسی وجہ سے ذوقِ سخن بھی رکھتی تھیں، میر انیس گھٹی میں پڑے تھے۔ اشرف جہاں، مرتضائی، مصطفائی سب اردو داں تھیں۔ مرتضائی بیگم کا خط بہت پختہ تھا۔ مصطفائی نوحے بہت عمدہ پڑھتی تھیں۔ اکبری بیگم ترخیر ایک عام ناخواندہ بی بی تھیں ان کی حدیث خوانی خاندان بھر میں مشہور تھی۔

ساتویں تاریخ سے پردے کی دوسری طرف کرسی پہ بیٹھ کر میر نذر باقر مصائب کا بیان پڑھتے اور رومال آنکھوں پہ رکھ کر خوب خوب روتے۔

ہر سال مصطفائی بیگم یہ تمنا کرتی تھیں کہ اس بار تو نہ ہو سکا، زندگی بخیر اگلے سال انشاء اللہ لکھنؤ میں محرم کروں گی اور سب تعزیے کی زیارت کر کے ہی لوٹوں گی۔

میر نذر باقر کے ڈرائنگ روم میں بھونپو والا آٹوگراف مع قوالیوں نعتوں تھیٹر کی "چیزوں" اور غزلوں کے ریکارڈوں کے انبار کے موجود تھا۔ یہ "پیٹی" جس کو عام بیٹو "توا" کہتا تھا۔ صرف مردانہ دعوتوں کے موقعوں پر بجائے جاتے تھے۔ کنواری بالیوں کو تھیٹر کی چیزیں اور غزلیں سننے کی ممانعت تھی۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول پڑھوا دو لیکن قوالیاں سنو۔ متعدد ریکارڈ انگریزی موسیقی کے بھی تھے جیسے "انگریزی باجا" "انگریزی نقل مذہبی"۔ یہ لڑکیوں کے لئے جائز تھے کہ ان کو سننے سے انگریزی کی استعداد بڑھتی تھی۔

ایک توے میں قوال گاتا تھا کہ اے مسلمانوں۔ مومنو۔ جو مسلمان بے نمازی مرے پڑھنا نہ اس کے جنازے پر تم نماز۔ خاصا وحشت ناک توا رہا ہوگا۔ نوجوان مصطفائی بیگم جب یہ ریکارڈ سنتیں خوب روتیں کیونکہ اکثر علالت کی وجہ سے پنج وقتہ نہ پڑھ پاتی تھیں۔ کیا بھلی، جنتی بیبیاں تھیں۔

باب ۶

نانی اشرف جہاں بیگم

ایک وقت تھا کہ اشرف جہاں بیگم چوکنویں کی حویلی میں محفوظ و مامون بیرونی دنیا کی خبر نہ رکھتی تھیں ۱۸۵۷ء میں بھائی کے حکم پر پانچوں بہنیں پہر دن پہ توپ کی کانک لی، باؤلی کی سیڑھیوں پر مستعد بیٹھ گئی تھیں۔ حملہ آور گورے چڑھ آئیں سمجھ کر الٹے پاؤں واپس بھاگ جائیں گے۔ آگے بڑھے باؤلی میں کود کر جان دے دیں گی۔ سنہ ۱۸۶۰ء میں لانگری والان کے دہلوی حکیموں کے ہاں میر مہدی علی سے بیاہ ہوا۔ اس وقت شمالی ہند میں ریل چل چکی تھی۔ ہر روز نماز کے بعد دعائیں مانگتیں یا رب العزت مرادآباد میں دھوئیں کی گاڑی آنے سے پہلے اس بندی کو دنیا سے اٹھا لیجیو۔ سنہ ۱۹۲۰ء تک زندہ رہیں جب پختونوں پر بم گرانے والی چیل گاڑیاں گڑگڑاتی ہوئی صوبہ سرحد میں ان کے سر کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔

نانی اشرف جہاں بڑی خوددار اور ٹھنٹھے والی بی بی تھیں۔ انقلاب زمانہ کو بڑے وقار کے ساتھ قبول کر چکی تھیں لیکن جوان

اولاد کی موت نے انھیں ہیبت زدہ کر دیا۔ پہلے کڑیل جوان تفضل علی کو دشمنوں نے ڈس لیا۔ اللہ جنت نصیب کرے میاں کو بہتیرا منع کیا تھا بچے کو عیسائیوں کے نرغے میں لاہور مت بھیجو۔ جو لے ہی گئی ڈاکٹری۔ حکمت پڑھاؤ۔ دلی کے طبیبوں کا پڑدادا۔ پردادا قلعے میں سلاطینوں کے معالج۔ پوتے پر یہ وقت پڑا کہ فرنگیوں نے اس سے لاشوں کی چیر پھاڑ کروائی۔ کھڑکھڑاتے ڈھانچے میرے لال کے سامنے کھڑے دانت کوستے تھے۔ کوئی بدروح بچے سے لپٹ گئی۔ اپنی جان سے گیا۔ ان فرنگیوں کا حشر اللہ شمر یزید کے ساتھ کرے۔ لاٹ صاحب کی بھتی میں نے کھائی۔ قطامہ ملکہ کی بھتی میں نے کھائی ——

در اصل اشرف جہاں بیگم غدر سے قبل کی نسل والے مسلمانوں کی مانند انگریزوں کو کسی طرح معاف نہیں کر سکی تھیں۔

بی مصطفائی کے مرنے کے بعد اشرف جہاں باؤلی سی ہوگئیں۔ "ملاں کی بھتی میں نے کھائی" تکیہ کلام بن گیا۔

کچھ عرصے بعد نانی کو چپ لگ گئی۔ سر جھکائے نیلے دانیاں اور تکیے چاروں طرف بکھیرے محرم کا گہوارا رکھنے کے لیے رنگ برنگے بوٹے اور علم کے پٹکے سیا کرتیں یا انگشتِ شہادت گھما گھما کر زیر لب دعائیں اور نوحے دہرائیں۔ چاند رات سے امام باڑے کی چوکھٹ سے لگ کر ساکت و صامت بیٹھ جاتیں۔ بڑی بیٹی مرتضائی جو اشرف بہن کے گھر اور بچوں کی دیکھ بھال کے لیے نوشہرہ آ گئیں۔ بی مرتضائی لاولد تھیں۔ انہوں نے اور ان کے میاں نایاب فیض العسکری نے نذر زہرا بیگم کو بیٹی بنا لیا تھا۔ تبادلہ صوبہ سرحد میں ... میر صاحب بے اولاد ہونے کے ناتے بھتیجی پر بدستور جان چھڑکتے تھے۔ خالہ[لہ] اپنی بھانجی کو دیکھ کر جیتی تھیں۔

نوشہرہ چھاؤنی خطرناک آفریدی علاقہ میں واقع تھی۔ راتوں رات سوتی ہوئی میموں کو پٹھان اٹھا لے جاتے۔

میر نذر الباقر عموماً دورے پر رہتے تھے۔ مزید حفاظت کے خیال سے کنٹونمنٹ کا بنگلہ چھوڑ کر لال کرتی بازار میں مکان لیا گیا۔ RED COATS کے زمانے میں چھاؤنیوں کے اندر یہ بازار آباد کئے گئے تھے۔ لال کرتی نوشہرہ کے فوجی کوتوال منور خاں انبالے کے باشندے تھے۔ میر صاحب کے کنبے کی ان کے گھرانے سے بہت گہری چھنی اور اب تک چھن رہی ہے۔ میر صاحب بچوں کے لاڈ پیار میں زیادہ تندہی سے مصروف ہوتے۔ لڑکیوں کی ہر فرمائش الا نذر بیگم کے شوقِ فوٹوگرافی کے کہ اس میں بے پردگی کا احتمال تھا انہوں نے پوری کی۔ دونوں لڑکیاں صحن کے اندر بیڈی بائیسکل چلایا کرتیں۔

ننھی بی یعنی نذر زہرا بیگم کی آنکھیں بہت کمزور تھیں۔ ڈاکٹر کے حکم سے پڑھائی بند کی گئی۔ اب مضمون نگاری اور خط و کتابت کے لئے فرصت وافر تھی۔

مجلسی گفتگو کی مانند خط و کتابت ایک مہذب فن اور مشغلہ تھا۔ (انگریز خواتین بھی دن بھر ایک دوسرے کو "چٹھیں" بھیجا کرتی تھیں) خط لکھنے کے لئے علیحدہ دن مقرر تھے۔

لہ مرتضائی بیگم کا انتقال ۱۹۱۸ء میں ہوا۔ نصف صدی بعد ان کی بھانجی نے ۱۹ اکتوبر ۱۹۶۷ء کو بعارضہ نمونیہ بمبئی میں رحلت کی۔ ۱۸ کی رات سے بیہوشی طاری ہوئی لیکن چند گھنٹوں بعد دفعتاً آنکھیں کھول کر آواز دی۔ خالہ — خالہ — خالہ آئی ہیں۔ پھر COMA میں چلی گئیں۔ اسی حالت میں صبح آکسیجن ٹینٹ میں انتقال کیا۔

چھوٹے بھائی سید مصطفےٰ باقر کے رخسار میں ناسور ہوا۔ آپریشن کے لئے سارا خاندان بجز تین مردان نوبی سپتال گیا تو بہن سے ایک بی بی رزانہ خط لکھتیں۔ چونکہ راستہ تانگے پہ بیٹھ کر روزانہ ات کو دیا یا مردان جاتا اور خط دے کر آتا۔ ان بی بی کے خطوط نصیحت آمیز اور فارسی اشعار سے پُر ہوتے تھے۔ جواب جلد نہ دینے کی شکایت کا ایک خط اس طرح شروع ہوتا ہے ؎

رنجیدہ رنجیدہ از من گناہ چہ دیدہ
واہم گناہ بخشیدہ از من چرا رنجیدہ

شعر و شاعری ہو رہی تھی۔ مولانا سید محمد مرتضیٰ ادیب نے بنت نذر الباقر کا ایک ابتدائی شعر کہیں درج کیا ہے ؎

حسن صورت چند روزہ حسن سیرت مستقل
اُس سے خوش ہوتی ہیں آنکھیں اس سے خوش ہوتا ہے دل

ایک بی بی شروت آرا یعنی بتول کو لکھتی ہیں "تم نے جو شعر زہرا خانم کے لئے بنایا۔ اس سے میں بہت خوش ہوئی کہ خدا نے خوب موزوں طبیعت دی ہے۔ شعر بنانے کی تعریف زہرا خانم کریں گی کہ بڑی شاعرہ ہے۔ تمہاری باجی تو مضمون نویسی پہ مائل ہوتی ہیں اور تم شعر پہ جو درخشاں اور جس وقت بمبئی جاؤ گی موٹر کار پہ تو آپ کی قدر شاعری پر ہو گی اور باجی کی قدر مضمون نویسی پر۔

خاتون آگیا۔ سب مضمون میں کچھ آپ کا مضمون مجھ کو پسند آیا۔ باتیں مفید مطلب ہیں۔ جب بچے کو بخار ہے تو آپریشن کیوں کرایا جا رہا ہے۔"

خط کیا ہے ٹیلیفون پر بات کی جا رہی ہے۔ آج کل کی لڑکیاں سہیلیوں سے گھنٹوں اسی قسم کی گفتگو فون پر کرتی ہیں۔

انہی دنوں ننھی بی یعنی مس نذر الباقر کے ایک مضمون کا ترجمہ ٹائمز آف انڈیا بمبئی کے ہفتہ وار رسالے میں کراب السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا کہلاتا ہے شائع کیا گیا۔ اس پر مہارانی بڑودہ نے سونے کا تمغہ عنایت کیا۔

علیا حضرت نواب سلطان جہاں بیگم والی بھوپال نے (جو مسلم نشاۃ ثانیہ کی ایک عظیم قائد تھیں اور اب کیسہ فراموش کی جا چکی ہیں) بنت نذر الباقر کو اپنا سکریٹری بنانے کی خواہش کی۔ مگر نذر الباقر نے ۔۔۔ فرمایا۔

۱۹۰۹ء میں مولوی سید ممتاز علی نے بچوں کا ہفتہ وار اخبار "پھول" جاری کر کے بنت نذر الباقر کو اس کا اعزازی مدیرہ مقرر کیا۔ اخبار تو شہرے میں ایڈٹ ہو کر دار الاشاعت پنجاب لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ اس زمانے میں مس نذر الباقر نے

لہ زہرہ مصنفہ۔

لہ مولانا حالی نے اپنی عمدہ ایک نظم ... کی داد ... دی تھی ؎

کرے تمہارے حامیوں کو خوش ہوں کا ... بنا
جو حق کے جانب دار ہیں ... گئے ... ہیں
بہ جو ... یہ راستہ عجیب ہے اس میں جہاں

بہ ... اک ... یونہی دنیا میں ہوتی آئی ہے
جو ... کی جانب سے ... کی یہ آواز آئی ہے
یہ حق ... سے ... امداد سلطان جہاں

بچوں کے لئے باتصویر کتابیں "سلیم کی کہانی" "پھولوں کا ہار" "دکھ بھری کہانی" "ننھی رضیہ اور اس کی بکری" وغیرہ لکھیں اور پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی نے ان کتابوں کو اسکولوں کے اردو نصاب میں شامل کیا۔

"پھول"[1] اور دارالاشاعت پنجاب نے بچوں کے لئے اعلیٰ درجے کا ادب تخلیق کیا۔ محمدی بیگم مرحومہ کی "امتیاز بخشی"، "امتیاز تیسی" اور مس نذر الباقر کی "سلیم کی کہانی" اور "پھولوں کا ہار" وغیرہ گھر گھر پڑھی جاتی تھیں۔ یہ ساری کتابیں اب نایاب ہیں۔

مصنفہ کا پہلا اور مقبول ترین ناول "اختر النساء بیگم" دارالاشاعت پنجاب لاہور نے سنہ ۱۹۱۰ء میں شائع کیا۔ "آہ مظلوماں" بھی شاید اسی سال چھپا۔ اس وقت اردو کے اکابر، علامہ راشد الخیری، ڈاکٹر اقبال، شیخ عبدالقادر، سجاد حیدر یلدرم اور بنت نذر الباقر کے حامی تھے۔[2]

لیکن ایک مخلص نقاد یعنی مصنفہ کے چچا سید ظہور حسنین نے فرمایا:

کالون ہسپتال، الہ آباد

۱۰ اپریل سنہ ۱۹۱۰ء

پیاری بی بی

تیرا خط ملا۔ تیری طرف سے سخت فکر ہے۔ اور لاٹ صاحب کی بچی سے کہہ دے کہ بس اب اچھی ہو جائے۔ بہت لاٹ صاحب کی بچی نہ بنئے۔

تو نے اپنی کتابوں کے متعلق پوچھا ہے۔ تو سن "آہ مظلوماں" کی زبان میں پنجابیت بہت سرایت کئے ہوئے ہے اور "اختر النساء بیگم" بھی اس سے پاک نہیں ہے۔ "اختر النساء" کا پلاٹ ابھی موجودہ ہندوستان کے قابل نہیں ہے بعض بعض جگہ صاحبیت بہت بڑھی ہوئی ہے۔ بہرحال دونوں کتابیں اچھی ہیں اور میں تیری محنت کی داد دیتا ہوں۔

میں خدا کے شکر سے اچھا ہوں مگر ابھی اسپتال سے نکلنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔

والدعا

تیرا چچا ظہور

سنہ ۱۹۰۸ء میں حیدرآباد دکن کی موسیٰ ندی میں قیامت خیز طغیانی ہوئی۔ بیگم صغرا ہمایوں مرزا، سروجنی نائیڈو، لیڈی اکبر حیدری کی

---

[1] "پھول" ایک ادیب ساز اخبار تھا۔ متعدد نامور ادیبوں نے بچپن میں اسی میں لکھنا شروع کیا۔ بعد کے دور میں امتیاز علی تاج، چراغ حسن حسرت، غلام عباس، حفیظ جالندھری اور احمد ندیم قاسمی اس کے مدیر رہے۔ قیام پاکستان کے بعد "پھول" اور "تہذیب" دونوں بند ہو گئے۔ (ق۔ ح)

[2] "ہم حیدرز" از خلیل عزیزی۔ السٹریٹڈ ویکلی آف پاکستان ۸ اکتوبر سنہ ۱۹۵۵ء۔ یہ نکتہ قابلِ ذکر ہے کہ مصنفہ نے شروع سے آخر تک اپنی کسی کتاب کا معاوضہ یا رائلٹی نہیں لی جو ایک انتہائی حماقت کی بات تھی۔ (ق۔ ح)

جاری کرا دیجئے۔ البشیر بھجوا دیجئے گا جس میں آپ نے میری کاروائی چھپوائی ہے۔

آپ کا رسید کا پاکٹ مجھ کو ملا

خاکسار

طیبہ بیگم

۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا۔ اسلامیانِ ہند جن کا سوز و ساز اسلامیان شرق اوسط و شمالی افریقہ کے سوز و ساز سے ازحد وابستہ تھا حسب معمول غم و غصے سے بیتاب ہوئے۔ طرابلس کے زخمیوں کے لئے چندے جمع کئے گئے۔ اقبال نے شاہی مسجد لاہور میں ہزاروں کے مجمع کے سامنے ؎

جھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

والی نظم پڑھی، تہلکہ مچ گیا۔ سامعین خون کے آنسو روئے۔ اس نظم کا ایک ایک شعر اسی وقت "نیلام" کرکے روپیہ طرابلس فنڈ میں بھیجا گیا۔ سال بھر بعد جنگ بلقان چھڑ گئی۔ بنت نذر الباقر اور دوسری جدید خواتین نے طرابلس اور بلقان کے لئے خوب خوب چندے جمع کئے۔ مرہم پٹی کا سامان اکٹھا کرکے ترکی بھیجا۔ بہت جوش و خروش اور ہنگامہ رہا۔

ان جدید خواتین میں بمبئی کے طیب جی خاندان کی لڑکیاں زیادہ خوش قسمت تھیں کہ بے پردہ گھومتی تھیں اور آئے دن انگلستان جاتی رہتی تھیں۔

نذرِ زہرا بیگم کی کھینچی ہوئی زہرا فیضی کی ایک تصویر میں نے دیکھی ہے (جو موصوفہ نے شادی کے بعد ایوانِ رفعت بمبئی میں کھینچی تھی)۔ جاپانی پنکھیا نزاکت سے سنبھالے۔ گاؤن میں ملبوس صوفے کے پاس کھڑی چھت کو تک رہی ہیں۔ عجیب افسانوی زمانہ تھا۔ وہی خاتون ۱۹۱۰ء میں نذرِ زہرا بیگم کو لکھتی ہیں۔

بے راج باغ - وارڈن روڈ
بمبئی - ۱۲ / دسمبر ۱۹۱۰ء

میری عزیز اور لائق بہن سلامت

تسلیم۔ آپ کا خیریت نامہ موصول ہوا۔ میری صحت نے دغا دیا اور اب تک روئے صحت پوری طرح ہویدا نہیں لیکن کچھ افاقہ ہے۔

ہزار شکر کہ آپ کی نسبت ایسے پڑھے لکھے نوجوان سے ہوئی ہے اور اُن کی طبیعت اس قدر آزاد ہے۔ خدا آپ کو آئندہ زندگی میں سکھ دکھائے۔ آمین۔

الہ آباد اگزیبیشن[2] میں ڈرتی ہوں کہ نہ چل سکوں گی۔ کیونکہ اب تک علیل ہوں مگر حضور نواب صاحب جنجیرہ میرے بہنوئی اور

---

[1] نواب خدیو جنگ بہادر

[2] بڑی دھوم دھام کی نمائش تھی۔ طیارے کی پرواز بھی دکھائی گئی تھی۔ لاہور سے شیخ عبدالقادر نمائش دیکھنے گئے۔

بھیا آصف ؎ ۸ دسمبر کو الہ آباد رخصت ہو گئے۔ وہ لوگ ۱۵ دسمبر تک قیام کر کے بنارس چلیں گے۔ پھر کلکتہ۔
امید ہے آپ کی ہمشیرہ خیریت سے ہیں۔ اور خالہ صاحبہ بھی۔ آپ کی شادی کی تاریخ سے مزید مطلع کیجئے۔

(تلخیص شدہ) آپ کی بہن زہرا

جن پڑھے گئے نوجوان ؎ سے بنت نذر الباقر کی نسبت طے ہو رہی تھی وہ بھی بڑا قصہ تھا۔ یہاں بھر سے قبل شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی ؎ کے ذریعہ پیغام آیا تھا۔ "لڑکے" کی جو تصویر قیام بغداد کے زمانے کی مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ نانی اشرف جہاں کو دکھلائی گئی۔ اس وقت وہ ہنکارا بھر کے حسب معمول چپ سادھے رہی تھیں۔ لیکن جب سلسلہ جنبانی آگے بڑھا نانی دفعتاً دنیا میں واپس آ گئیں۔ لوگوں کی بپتی کھانا اتفاقاً بیٹے اور بیٹی کی موت کا غم بھول نواسی کے جوڑوں کی ماہرانہ سلائی ٹکائی میں منہمک ہو گئیں۔

میر نذر الباقر مع خاندان نوشہرے سے تبدیل ہو کر سیالکوٹ اور پھر کوہاٹ چھاؤنی آ گئے۔ نانی نے ایک سے ایک حسین جوڑا سی سی کر گھر بھر دیا مگر یہ گمبڑا سلسلہ جنبانی ختم ہونے ہی میں نہ آوے۔ ایک روز جھنجھلا کر انہوں نے اپنے داماد سے پوچھا "میرے لال۔ میرے چاند۔ دیوبند کے مولوی کا کوئی خط آیا؟"

میر نذر الباقر ساس کو جو ان کی سگی خالہ بھی تھیں بہت چاہتے تھے اور اکثر انہیں چھیڑا کرتے تھے۔ ان کے پاس بیٹھتے ہوئے مصنوعی سنجیدگی سے بولے "خالہ جانی۔ دیوبندی مولوی یوں فرماتے ہیں کہ لڑکے کی دو شرطیں کڑی ہیں۔ اول یہ کہ نانی اشرف جہاں بی جو کنواں پہلے بغداد جاویں۔"

"اس بچے کے منہ میں شکر گھی۔ مجبور بھائی کو مولا جلد بلا دیں۔"

"مولانا نہیں جانا۔ لڑکے کی شرط ہے کہ نانی پہلے بغداد جا کر بڑے پیر ؎ کے مزار پر حاضری دیں۔ اس کے بعد۔"

نانی کا منہ اتر گیا۔ چپ رہیں۔ یاں نیا ناشتہ دیا کیا۔ پھر اچانک غصے سے بولیں "میاں مجھ سے آنا کانی تو کرو نہیں۔ میں جانوں بڑا جیتنے والوں نے بھانجی مار دی۔ میاں لونڈیوں کو چرخی چلانا تم نے سکھایا، کامدانی انہیں پہنائی۔ ڈاکٹری پڑھنے تم بھیجے دو تے۔ باجی بیگم کا خط آیا ہے کہ تمہارے دشمن ... یار چھائیں پھوئیں یوں طوفان جوڑتے ہیں کہ سید نذر الباقر کی بیٹیاں کلب گھر جا کر لونڈوں کے ساتھ بڑا کھانا کھاتی ہیں۔ — اللہ بری گھڑی سے بچا دے۔"

میر صاحب بھی ذرا متفکر نظر آ رہے تھے۔ مگر ساس کا دل رکھنے کے لئے بیٹھے ہنسا کئے۔

"بیٹا ایک سے ایک اچھے پیغام آئے تم نے رد کئے۔ باجی بیگم کا نواسہ اللہ رکھے کیا برا تھا۔ تم باپ بیٹیاں بی اکبری

؎ آصف اے۔ اے۔ فیضی نامور عالم اسلامیات و سابق سفیر ہند برائے مصر۔ بمبئی میں رہتے ہیں۔

؎ شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی دیوبند کے رہنے والے تھے۔

؎ الشیخ سید عبدالقادر جیلانیؒ سے عقیدت نہیں رکھتے۔

؎ [illegible] ڈائیگرینڈ ڈنر

سب کے سب ہنس ہنس کر باؤلے ہو گئے۔ اے میں پوچھوں ہوں اس میں خامی کیا تھی۔ ڈیوڑھی پر ہاتھی ہے۔ اندر باہر نوکروں اصیلوں کی ریل پیل۔ کہنے لگے گھر میں خوگیر کی بھرتی ہے۔ پوچھو اس گئے گذرے وقت میں بھی ان کے ہاں حبشی حبشنیں ملازم ہیں۔ کہنے لگے لکھنؤ کا پھیلا ہے۔ لمبے لمبے پٹے رکھے ہے۔ انٹرنس فیل ہے۔ مرغ لڑاتا ہے۔ اے اللہ کا فضل ہے۔ مرغے لڑا دے ہے۔ رئیس زادہ ہے اور کیا کرے۔ سگا رشتے دار۔ دیکھا بھالا۔ چلو خیر۔ پھر وہ آگرے شاہ گنج والے آن بی بالسٹر کا رقعہ آیا۔ نیلے والے وزیر خلیفہ کا رقعہ آیا۔ وزیروں کا خاندان امیر کبیر۔ مگر میاں تم تو اس سُنّی لڑکے پر لٹو ہو گئے۔ کہنے لگے "تھوڑی کھرے سید ہیں۔" ہوں گے۔ بہت قابل ہے۔ بہت اچھے افسانے لکھے ہے۔ بیٹا ہمارے ہاں تو افسانے دکھیا اللہ بخشے آغا کربلائی سنایا کریں تھے۔ اب لاڈو بھی افسانے لکھ رہی ہیں۔ بھینا بھی اللہ مارے ناول لکھ لکھ کر گھر بھر رہی ہیں۔ ہماری تو مجال تھی کہ چہاردہ معصومینؑ کے علاوہ کسی کتاب کو ہاتھ لگایا ہو۔ خیر یہ بھی ہوا کہ اب ان دیوبندی مولوی صاحب نے جو شگوفہ چھوڑا ہے بس اللہ ہی خیر کرے۔ تم تو میاں بیٹھے ان عالم فاضل صاحبزادے کے شناسے ہی پڑھتے رہنا۔

اشرف جہاں بیگم پر اب جلال آ چکا تھا۔ وہ پلنگ سے اٹھ کر گئیں سیدھی نماز کے تخت پر مصلے پر بیٹھ کر بڑبڑاتے ہوئے فی الفور اللہ میاں سے لو لگائی۔

اللہ میاں شاید اشرف جہاں بیگم کی ٹکسالی گفتگو خوب سمجھتے تھے۔ ان عفیفہ ضعیفہ نے نہ جانے کون سا وظیفہ پھینکا کہ چند منٹ کے اندر اندر غلام حسین کمرے میں وارد۔ ہاتھ میں ڈاک کا پلندہ۔ میر صاحب جو سامنے کی پلنگڑی پر گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز تھے فوراً اٹھ بیٹھے۔ ڈاک غلام حسین کے ہاتھ سے لی۔ دیوبندی مولوی کا لفافہ مع لڑکے کے تازہ ترین خط کے موجود تھا جو مولوی صاحب نے میر صاحب کے نام لاہور سے ری ڈائرکٹ کیا تھا۔

لیکن مولوی سید ممتاز علی اور جدید فیشن کے صاحبزادے بلند اقبال کی خط و کتابت از اول تا آخر بہت دلچسپ ہے۔ ناظرین اس کا مطالعہ فرمادیں تو یہ کہنے کوئی مضائقہ نہ ہوگا بلکہ فائدہ ہوگا۔

باب ۷

مناظرہ مابین مولینا و مسٹر

پہلا خط بنام شمس العلما مولوی سید ممتاز علی صاحب

دہرہ دون

۱۴ اپریل ۱۹۰۹ء

مکرمی و معظمی!

آداب عرض ہے۔ میں اولڈ بوائز ڈنر میں شریک ہونے کی غرض سے علی گڈھ گیا تھا۔ آج صبح یہاں واپس پہنچا اور آپ کا اس ڈاک میں پایا جو یہاں جمع ہو رہی تھی۔ حسب وعدہ مفصل عریضہ تقدیم کرتا ہوں۔

آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے اضلاع جن میں آپ کا وطن سہارنپور بھی شامل ہے کس قدر قدامت پرست ہیں۔ میرا قصبہ

معاملے میں اپنے ہم عصروں سے بڑھا ہوا ہی ہے ۔ گھٹا نہیں ۔ اور اگرچہ میرا خاندان PROGRESSIVE CONSERVATION کا حامی ہے مگر افسوس کہ اس وقت تک REACTIONARY CONSERVATION کا پابند ہے ۔ قسمت نے مجھے جو اپنے خیالات میں ریڈیکل ہے ایسے ماحول میں پیدا کیا جہاں میں جیسی لڑکی چاہتا تھا اس کا ملنا عسیر الحصول ہی نہیں بلکہ ایک حد تک ممکن الحصول ہے ۔ چنانچہ جب میں نے کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں شادی کا نہیں ہے تو میں نے اپنے مرحوم والد اور مرحومہ والدہ کی نافرمانی کی (اور افسوس ہے کہ) ان کو رنج دیا لیکن اپنی ضد پر قائم رہا ۔

جب سے میں قسطنطنیہ سے واپس آیا ہوں اہل خاندان کی مجھ پر از سر نو یورش ہے ۔ لیکن میں جس لیاقت کا طالب ہوں جو جگہ آپ نے تجویز فرمائی ہے ۔ (آپ کے فرمانے کے مطابق) وہاں موجود ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں اس تجویز سے موافقت کرتا ہوں لیکن غیر جگہ میں صورت و شکل اور مزاج اور طبیعت کا حال ہمیشہ SECOND HAND ملتا ہے ۔ مجھے خوف ہے کہ یہ THIRD HAND نہ ہو ۔

علاوہ ازیں مجھے معلوم ہوا ہے کہ خلیفہ سید حامد حسین[1] صاحب وزیر اعظم پٹیالہ نے بھی اس جگہ اپنے لئے پیغام بھجوایا ہے ۔

میں اپنے ذاتی حالات عرض کئے دیتا ہوں —

۱۔ میری عمر اس وقت تیس سال ہے ۔

۲۔ ہم چار بھائی ہیں اور ایک بہن ۔ مجھ سے بڑے بھائی سید اعجاز حیدر متاہل ہیں ۔ اور صاحب اولاد ۔ وہ میرے سوشل خیالات کے مخالف ہیں ۔ انہوں نے انٹرنس تک تعلیم پائی ہے ۔ مجھ سے چھوٹے بھائی سید نصیر الدین حیدر بی ۔ اے بارہ بنکی میں ڈپٹی کلکٹر ہیں ۔ ۲۸ برس کی عمر ہے ۔ وہ میرے خیالات کے ایک حد تک موافق ہیں لیکن پردے کے موید ۔ نصیر الدین حیدر سے چھوٹے بھائی سید وحید الدین حیدر میڈیکل کالج لاہور میں پڑھتے ہیں ۔ ان کی عمر ۲۳ برس ہے ۔ یہ متاہل ہیں ۔ خیالات میں زیادہ لبرل ہیں ۔

۳۔ میری ملازمت پانچ برس کی ہے ۔ ترقی کی بہت امید ہے ۔ ہم بھائیوں کو ترکے میں ایک بڑا مکان ملا ہے ۔ اور کچھ آبائی اراضی ۔ میرے والد خان بہادر سید جلال الدین حیدر کوتوال بنارس تھے اور بعد میں سپرنٹنڈنٹ پولس رہے ۔ انہوں نے بیحد

۱۔ خلیفہ سید حامد حسین کے والد مشیر الدولہ ممتاز الملک خان بہادر خلیفہ سید محمد حسین مخدوم جہانیاں جہاں گشت بخاری کی نسل کی اس شاخ سے تعلق رکھتے تھے جو سامانہ پٹیالہ میں آباد ہو گئی تھی ۔ اس خاندان کے بزرگ مہاراجگان پٹیالہ کے طبیب اور اتالیق رہے تھے ۔ اسی وجہ سے خلیفہ کہلانے لگے ۔ خلیفہ محمد حسین کے بڑے بھائی وزیر الدولہ مدبر الملک خلیفہ محمد حسن مصنف "اعجاز التنزیل" و مترجم سیاحت نامہ ناصر خسرو سند دست راست اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۰۵ء منعقدہ علی گڑھ کے صدر رہ چکے تھے ۔ ان دونوں بھائیوں نے علی گڑھ کالج میں شیعہ اور سنی مساجد الگ الگ بنانے کی شدید مخالفت کی تھی ۔ مئی ۱۹۰۸ء میں خلیفہ محمد حسین کے انتقال پر "مخزن" میں ایک دلچسپ مرثیہ شائع ہوا جس کے شروع میں لکھا تھا ”حضور وائسرائے وجملہ حکام و رئیس کے جلسے آتے ہیں نار ۔ خلیفہ شوق کی بہار کہ یا ابوالفضل فیضی تھے ، وہ اپنے وقت کے گویا نظام الملک طوسی تھے ۔“

ایمانداری سے کام لیا اور سوائے اس کے کہ اپنی اولاد کو اچھی تعلیم دلائیں یا نا پس انداز نہ کیا کہ خود جائیداد بناتے۔ میرے بڑے چچا خان بہادر سید کرار حیدر اسسٹنٹ سرجن تھے۔ ۲۵ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ پھوپھا خان بہادر سید صغیر حسین ڈپٹی کلکٹر اور ماموں خان بہادر سید ابوالحسن ڈپٹی کلکٹر بہت بڑی زمینداریوں کے مالک ہیں۔ دوسرے عزیزوں کے عہدوں زمینداریوں وغیرہ کے متعلق مزید تفصیلات اگر آپ چاہیں تو بھیج دوں گا گو میں اس کی مطلق ضرورت نہیں سمجھتا۔

۵۔ صحت میری بہت اچھی نہیں۔ اور اسپورٹس وغیرہ کی طرف میں نے کبھی توجہ نہیں کی۔ میرا وقت میز پر اکثر گذرتا ہے۔

آپ یہاں تشریف لانا چاہتے ہیں۔ اس کا مجھے شکریہ ادا کرنا ہے۔ لیکن آپ کیوں اس قدر دور دراز کے سفر کی تکلیف گوارا فرماتے ہیں۔ میں آپ کے خطوط کے جواب جلد جلد دے رہا ہوں۔ بہر حال اگر آپ تشریف لانا چاہتے ہیں تو سیدھے دہرہ دون تشریف لائیے۔ میں ۲۸، ۲۹ تک تو یہاں یقینی ہوں۔ اس کے بعد معلوم نہیں۔ غالباً دورے پر چلا جاؤں۔ مگر دورے پر بھی آپ آسانی سے مجھ سے مل سکیں گے کیونکہ میں جہاں ہوں گا وہاں کے قریب کے اسٹیشن پر آپ اتریں۔ میں سواری ہاتھی وغیرہ کا انتظام کر دوں گا۔ اور آپ کیمپ میں تشریف لے آئیں۔

آخر میں پھر بصراحت عرض کئے دیتا ہوں کہ میں آپ کی اس تجویز کو بحالت موجودہ منظور کرتا ہوں۔

خاکسار

سید سجاد حیدر

دہرہ دون

۲۲ اپریل ۴۰ء

مکرمی!

آداب عرض ہے۔ پرسوں مجھے آپ کا دوسرا خط ملا۔ اور حسب الامر میں نے تین خط میر نذر الباقر صاحب، میر فیض العسکری صاحب اور میر ظہور الحسنین صاحب کے نام لکھے۔ گو آپ نے فرمایا تھا کہ اپنے سنی ہونے کا ذکر نہ کرتا۔ مگر میں نے لکھ دیا ہے کہ گو میں سنی ہوں مگر ہمارے خاندان میں شیعہ سنیوں میں آپس میں رشتے ہوتے ہیں۔ کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ میرے بہت سے عزیز شیعہ ہیں۔ علاوہ ازیں میرے خاندان کا سنی ہونا چھپ تو سکتا نہیں۔ ہر شخص کو معلوم ہے۔ رہا خود میں سو میں اپنے ذاتی خیالات سے نہ سنی ہوں نہ شیعہ۔ کیونکہ خلافت کے معاملے کو محض ایک ACADEMIC INTEREST. کی چیز سمجھتا ہوں۔ میں یہ سمجھتا ہوں (برخلاف جمہور اہل سنت) کہ حضرت عثمان رضؓ کی خلافت اسلام کے لئے مفید نہ تھی۔ اور ان کا انتخاب نہیں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن ساتھ ہی میں حضرت عمرؓ کا شدت سے مداح ہوں۔ بحیثیت ایک سید کے میرا دل ضرور یہ چاہتا ہے کہ حضرت علی خلیفہ ہوتے اور ہمیشہ خلافت سیدوں ہی کو ملتی۔

نذر الباقر صاحب اس قدر بدل ہیں کہ وہ اس مہمل اور بے معنی بات کو کہ ہر شخص کو مذہب کے بارے میں CATECHISE کرتے پھریں بالکل ناپسند کرتے ہیں۔

مذہب کے بارے میں (یا ہمارے آجکل کے مخالفین کی اصطلاح میں) یونہی سمجھ لیجیے کہ پکا نیچری ہوں۔ آگے چل کر قبر پرست

یا ہیرو پرست بن جاؤں تو خبر نہیں۔

ایک مذہب رواجی ہوتا ہے اور ایک مذہب و عقیدہ قلبی۔ میں دشمنان اہلبیت کو دشمنان اسلام سمجھتا ہوں اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایک شخص جسے آل رسولؐ ہاشمی ہونے کا فخر حاصل ہو اس سلسلے میں کوئی دوسرا عقیدہ کیسے رکھ سکتا ہے۔

اوپر کے مضمون کو پڑھ کر خود مجھے ہنسی آتی ہے معاملہ تو شادی کا ہے۔ بجائے اس کے کہ یہ دیکھا جائے کہ میری طبیعت مس باقر کی طبیعت سے میل کھاسکے گی یا نہیں۔ اور بجائے اس کے کہ یہ تحقیقات کی جائے کہ مس باقر مجھ سے نفرت تو نہیں کرتیں۔ (الفت کا تو نام ہی لینا فضول ہے) بحث یہ کی جاتی ہے کہ تم حضرت علیؑ کو خلیفہ بلافصل مانتے ہو یا نہیں۔

ان تمام باتوں کا خیال کرکے میں یہ ہی مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ کو اختیار کامل دے دوں۔

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

خاکسار
سجاد حیدر

لیکن اس اثنا میں یہ افواہ اڑگئی کہ بنت نذر الباقر کی آنکھیں اتنی کمزور ہوگئی ہیں کہ اب وہ تقریباً نابینا ہیں۔

یلدرم نے مولوی ممتاز علی کو لکھا:

بل ویو۔ مسوری
۵ مئی ۱۹۰۹ء

مکرمی۔ آداب عرض ہے۔

سامی نامہ کا شکریہ۔ جس شخص کو میں قول دے چکا ہوں کہ اس کا نام ظاہر نہ کروں گا اس کا نام آپ کو کس طرح لکھ سکتا ہوں۔ بہ آپ خود اسے پسند نہ کریں گے۔ اس شخص نے خدانخواستہ اندھا ہونا تو نہیں لکھا تھا جو آپ فرماتے ہیں کہ بھلا اندھے بھی مضمون لکھا کرتے ہیں۔ معاف فرمائیے اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اپنی بات کی پچ ہے۔

میں اب مسوری آگیا ہوں۔ اکتوبر تک یہیں رہوں گا۔

خاکسار
سجاد حیدر

BLLEVUE
MUSSOORIE
27-5-09

مکرمی و معظمی

سامی نامے کا شکریہ عرض ہے اور دوسرے سامی نامے کا بھی جو ابھی ملا۔

آپ کی ناسازی طبیعت کا حال سن کر تعلق خاطر ہے۔ رخصت اتفاقیہ کے لئے بھی مجھے دقتیں پیش آتی ہیں یعنی اگر پولیٹیکل ایجنٹ[1]

---

[1] یہ بی۔ ڈبلیو۔ وڈہم جو پہلے سردار محمد ایوب خان کے پولیٹیکل ایجنٹ تھے بعد میں سردار محمد یعقوب خان سابق امیر کابل کے انچارج بنائے گئے۔ یلدرم اس وقت اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ تھے۔ امیر کابل کے انتقال کے بعد میجر وڈہم ریاست جودھپور میں برطانوی ریذیڈنٹ مقرر ہوئے۔

استغفار ہے کہ ہندوستان ہمیشہ کے لئے چھوڑ دوں۔ اور میں سوچتا ہوں کہ اپنے مصائب میں کسی دوسرے کو کیوں شریک کروں۔

خاکسار

سجاد

مولوی ممتاز علی بھی کچی گولیاں نہیں کھیلے تھے۔ سمجھ گئے کہ صاحبزادے بدک گئے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے ایک اور تکنیک استعمال کی اگلے خط میں لکھتے ہیں کہ ہمدرد، ہمدم، رفیقۂ حیات انسان کے لئے کتنی ضروری ہے۔ فرماتے ہیں۔

"یہاں ۱۹۰۴ء میں سخت بیمار ہوا اور موت کے کنارے جا لگا۔ میرے والد ماجد بھی زندہ تھے۔ کئی بھائی بھی بہنیں بھی (پہلی بیوی بھی تھی)۔ آہ میں کس طرح اس رفیق کی شب بیداریاں اور خدمت گذاریاں بیان کروں۔ منہ سے آہ نکلی اور وہ بستر سے اٹھی کروٹ بدلی اور۔ اس نے سوال کیا کہ کیا بے چینی ہے۔ اپنے ہاتھ سے کھلانا پلانا۔ دوا دینا۔ میں سو ؤں تو نگہبان بن کر جاگنا۔ نماز پڑھ کر اللہ سے دعائیں مانگنا۔ ڈاکٹر کے لئے نوٹس لکھنا۔ چارٹس تیار کرنا۔ ایک بات ہو جو میں بتاؤں۔ میں مرض سے بچ گیا۔

"ٹامس آرنلڈ[1] کو آپ جانتے ہیں۔ میری ان سے بہت دوستی تھی۔ وہ ایک شام میرے پاس زیادہ دیر تک ٹھہرے۔ اور کھانے کے مقررہ وقت پر کچھ منٹ گذر گئے مجھ سے کہا کہ مسز آرنلڈ اب مجھے ڈانٹیں گی۔ آپ میرے ہمراہ چلئے۔ میں ہمراہ گیا۔ انہوں نے تمام واقعہ بیان کیا کہ انھیں مرض ٹیوبرکلوسس ہو گیا تھا۔ مسز آرنلڈ نے کس طرح ان کی خدمت اور نرسنگ کر کے انھیں بچایا۔ مسز آرنلڈ نے مجھ سے کہا، میں ان کی بیوی ہی نہیں دوست بھی ہوں اور رفیق بھی۔"

(تلخیص شدہ)

خاکسار

ممتاز علی

---

[1] سر ٹامس آرنلڈ ایم اے او کالج میں فلسفے کے پروفیسر تھے۔ بعد میں گورنمنٹ کالج لاہور میں علامہ اقبال کے استاد رہے۔ ۲۴ مئی ۱۹۰۲ء کو انھوں نے یلدرم کو جو سرٹیفکیٹ گورنمنٹ کالج لاہور سے بھیجا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یلدرم گو اسپورٹس سے بے نیاز تھے مگر شہسواری کیا کرتے تھے۔ سر ٹامس آرنلڈ، بعد میں انڈیا آفس لندن سے منسلک ہوئے، فرماتے ہیں "سجاد حیدر نے ۱۸۹۸ء سے تین سال تک مجھ سے انگریزی ادب پڑھا۔ اپنے ہمعصر طلبا میں سب سے زیادہ نامور اور غیر معمولی طور پر ذہین تھے۔ میرے کالج چھوڑنے کے بعد ۱۹۰۱ء میں انہوں نے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ لیکن ارباب کالج نے ان کے بارے میں مجھے جو اطلاعات بھیجی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ نوعمری کے زمانے میں ان سے جو امیدیں وابستہ کی گئی تھیں ان کو انہوں نے بخوبی پورا کیا ہے۔ ان کی اعلیٰ سیرت و کردار اور کالج کے پرنسپل کے ان پر اعتماد کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ انھیں سنٹرل پروونسز کے ایک محمڈن راجہ کا اتالیق منتخب کیا گیا ہے۔ سجاد حیدر ایک تندرست و صحت مند نوجوان ہیں اور روزانہ باقاعدہ شہسواری کے عادی ہیں۔

ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ

پروفیسر آف فلاسفی

گورنمنٹ کالج لاہور

ناگپور کے ان "محمڈن راجہ" اعظم شاہ کا تذکرہ فصل سوم باب ۳ "بیچلرز لاج کی خاتون" میں کیا جا چکا ہے۔ (ق۔ ح)

مسوری

۱۰ ۱۰/اکتوبر ۰۹ء

مخدومی و کرمی

میں نے ANNFIELD TEA ESTATE سے جہاں میں گیا ہوا تھا آپ کو ایک خط لکھا تھا۔ اس کے دوسرے روز ہی آپ کا تار پہنچا میں ANNFIELD میں یکم اکتوبر تک رہا۔ ہز آنر لفٹیننٹ گورنر کو وہاں ایک پنچ دیا گیا تھا اور میری اس پنچ میں شرکت ضروری تھی۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ خان بہادر سید آل نبی کے ساتھ رشتہ کر دیا جائے گا۔ اور یہ کہ محض آپ کے اصرار سے میری طرف خیال ہوا تھا۔ میں پھر عرض کرتا ہوں کہ میرا ابھی یہی خیال ہے کہ میں خان بہادر صاحب کے مقابلے میں بالکل ہیچ ہوں۔ وہ ماشاءاللہ خان بہادر۔ نامور وکیل معزز محترم اور فقیہ! مجھ جیسے کس مپرس آدمی کے (مجھے یہ عرض کرنے میں شرم نہیں کہ غدر، کے بعد سے ہمارا خاندان مزدوروں یعنی نوکری کرنے والوں کا خاندان ہے) پاس کیا ہے۔

دارم دلے اما چہ دل صد گونہ حرماں در بغل

زیادہ زیادہ والسلام مع الاکرام

خاکسار

سجاد حیدر

رفاہ عام پریس لاہور

۲۴/اکتوبر ۰۹ء

مکرمی و معظمی تسلیم

میں آپ سے پہلے عرض کر چکا ہوں کہ میر نذر الباقر کے گھر پورا ہندوستانی پردہ ہے۔ اور سادات بارہہ کی بچیوں کی تصویریں کھینچنا ابھی تک معیوب سمجھا جاتا ہے۔ میر نذر الباقر لڑکیوں کی تصویر اتروانا ناجائز سمجھتے ہیں تصویر دینا تو جدا بات ہے۔ میں نے کبھی سنا تک نہیں کہ مسز باقر یا ان کے گھر میں کسی لڑکی کا بھی فوٹو لیا گیا ہو۔ ہاں بعض اوقات ڈاکٹروں نے مثلاً ڈاکٹر بھگت رام سول سرجن کشمیر نے لڑکیوں کو بیماری میں دیکھا اور ان سے باتیں بھی کیں۔

عزیزہ بنت نذر الباقر کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب اس کی عمر گیارہ بارہ سال کی تھی۔ اور اس نے بہت شوق سے اخبار "تہذیب نسواں" خریدنا شروع کیا تھا۔ اس وقت سے میں اس عزیزہ کو اپنی حقیقی چھوٹی بہن کی طرح سمجھتا رہا۔ اس بیچاری کا بڑا بھائی رضا باقر مر گیا تھا۔ وہ مجھے رضا باقر کی جگہ سمجھنے لگی۔ اس تعلق خاطر کی وجہ سے جو مجھے اس بچی سے ہے میں نے اس رشتے کی کوشش کی۔ اور اب کہ صرف تعیین تاریخ کا فیصلہ ہونا باقی رہ گیا تھا آپ کی فرمائش فوٹو کی وجہ سے غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔ میں خود فوٹو کا قائل نہیں۔ بعض تصویریں خوب صورت معلوم ہوتی ہیں۔ صاحب تصویر بد صورت نکلتا ہے۔ مدت کی بات ہے میں نے مولوی چراغ علی صاحب حیدر آبادی کی تصویر دیکھی تھی اور ان کو خوب صورت نوجوان سمجھتا تھا۔ دیکھا تو شکل برعکس پائی۔

اس اثنا میں لوگوں نے یہ بھی مشہور کر دیا ہے آپ کی اس سے نسبت طے ہو چکی ہے۔ عزیزہ کے پاس مسز اقبال[1]، مسز عبدالقادر[2]، مس محبوب عالم[3]

---

[1] علامہ اقبال کی بیگم۔ [2] شیخ عبدالقادر، اڈیٹر "مخزن" کی بیگم یعنی لیڈی عبدالقادر مرحومہ۔ [3] فاطمہ بیگم بنت مولوی محبوب عالم اڈیٹر "پیسہ اخبار"۔

وغیرہ کی طرف سے مبارکبادیں پہنچی ہیں اور یہ چرچا روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ اگر خدانخواستہ ان غلط فہمیوں کی بنا پر یہ نسبت ٹوٹ گئی تو میں میر صاحب کو عمر بھر منہ نہ دکھا سکوں گا۔ اور وہ میری ذلت و رسوائی ہوگی کہ خدا کسی کو نہ دے۔ میں اپنی پریشانی کی کوئی انتہا نہیں پاتا ہوں۔ اگر ضرورت ہو تو میں خود آپ کے پاس آؤں۔

جواب فوراً تار سے عنایت ہو۔

جواب کا منتظر اور نہایت مضطرب

ممتاز علی

میر ظہور حسین بنام مولوی سید ممتاز علی صاحب

بدایوں

۲۶ اکتوبر سنہ

مکرم بندہ۔ تسلیم

مسٹر ظفر عمر مجھ سے دریافت فرماتے تھے کہ میرزا الباقر کی بصارت کی کیا کیفیت ہے۔ ان کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس بات میں سجاد حیدر صاحب نے کچھ اون سے امداد چاہی ہے۔ کیونکہ اونہوں نے یہ فرمایا کہ میں اوسے مراد آباد بلواؤں تاکہ اون کی گھر میں سے جا کر بچشم خود اطمینان کر لیں۔ میں نے صاف صاف لفظوں میں اون کو لکھ دیا کہ آنکھوں میں کسی قسم کا نقص نہیں ہے۔ کمزور ضرور ہیں۔ اور وہ بچی مراد آباد نہیں آئے گی۔

میں نے ظفر عمر صاحب پر ظاہر کر دیا کہ حقیقتاً خاندان والے اس رشتے پر آمادہ نہ ہوتے اور خان بہادر سید آل نبی وکیل آگرہ کو ترجیح دیتے ہیں جو شیعہ مذہب ہیں اور اون سے خاندانی تعلق ہے لیکن بھائی صاحب قبلہ میرزا الباقر کو یہ رشتہ پسند ہے۔

آخر یہ کیا ضرورت ہے کہ میں لڑکی کو مراد آباد بلا کر مسٹر ظفر عمر کو ملاحظہ کراؤں میں صرف آپ کے جواب کا منتظر ہوں۔ کل الہ آباد واپس جا رہا ہوں۔

آپ کا نیاز مند

ظہور حسین

میرزا الباقر بنام سید سجاد حیدر یلدرم

سیالکوٹ

۲۷ اکتوبر ۱۹۰۹ء

برادر گرامی قدر سلمہٗ۔ السلام علیکم

عرصے سے مجھے اتفاق تحریر خط نہیں ہوا۔ آپ کے محبت نامے کا جواب بھی نہ دے سکا۔ کچھ مکروہات زمانہ۔ کچھ مقام سے غیر حاضری وغیرہ وغیرہ۔

---

۱ یلدرم کے دوست مصنف ناول جیتری "بہرام کی گرفتاری" وغیرہ۔ مشہور علیگ اور پولیس افسر جنہوں نے سلطانہ ڈاکو کو گرفتار کیا تھا۔ مرحوم کے صاحبزادے بوستان پاکستان کے مشہور انڈسٹریلسٹ ہیں۔

بالعموم زمانہ میں شرفا کی آبرو اور ناموس ایک ہی ہوتی ہے۔ خواہ وہ کسی رشتہ و قرابت سے منسلک ہوں یا کوئی تعلق مابین نہ ہو۔ مگر ایک زبردست تعلق شرافت، حفظ ناموس و پاس آبرو کا رہتا ہے۔ میرا اور آپ کا خون ان بزرگوں کے خون سے پیوستہ ہے جن کی اولاد ہونا ہمیں سربلند کرتا ہے۔ میں نے مولوی ممتاز علی صاحب قبلہ کی خدمت میں تحریر کیا تھا کہ تقاعدہ قدیم آپ کی طرف سے کوئی بزرگ خاتون یا مرد تشریف لاویں اور اس رشتے کی تکمیل کر جاویں۔ جس کی غرض یہی ہوتی ہے کہ بہت سے شکوک رفع ہوں اور قبل از تعلق قرابت یگانگت و انس دونوں خاندانوں میں پیدا ہو جاوے۔ مگر مولوی ممتاز علی صاحب قبلہ نے بھی یہ تصواب آں برادر گرامی قدر ہمیشہ یہی لکھا اور اس پر مصر رہے کہ کسی بزرگ خاتون اور بزرگ خاندان کا اتنی دور آنا دشوار ہے۔ اور سید سجاد حیدر صاحب ان فضولیات کے پابند بھی نہیں ہیں۔ مولوی صاحب اس تحریک کے دوران سیالکوٹ تشریف لائے۔ ان کی صاحبزادی بندہ زادی سے ملنے آئی۔ اور محض بزرگانہ محبت اور مروت سے کسی طرح کا بھی نوکر رشتہ کم نہ ہونے دیا کہ کیا غرض و غایت اس سفر کی ہے۔ اس کے بعد جیسا مولوی صاحب قبلہ نے فرمایا بسر و چشم منظور کر لیا۔ بعد طے ہوئے اور سب مراحل کے اب یہ کس قدر گرانبار خاطر ہے۔ چند معزز بے لگام خواتین نے لڑکی کی تصویر کے حصول کی کوششیں کیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کون شریف کلام مجید پر اعتقاد رکھنے والا ہوگا جو اپنی مستورات کی تصاویر کھنچوائے۔ العظمۃ للہ۔

میں امید کرتا ہوں کہ میری تحریر کی بے ربطی اور زبان کی بے ضبطی کا برا نہ مانیں گے۔ دل کو صدمہ پہنچا۔ عرض حال کر دیا۔ اور مجھے یقین ہے کہ آپ کا تحمل و بردباری اس سے اعلیٰ و ارفع ہے کہ میری یہ شکستہ دلی و پریشان گوئی آپ کو رنجیدہ کرے۔

دعا گو

نذر الباقر

یلدرم بنام مولوی سید ممتاز علی صاحب

دہرہ دون۔

۲ جنوری سنہ ۱۹۱۰ء

مخدومی و مکرمی

میں ایک ہفتے کی رخصت لے کر وطن دلی اور میرٹھ گیا تھا۔ واپسی پر آپ کے عنایت نامے ملے۔ یہ محض غلط ہے کہ میں نے ظفر عمر سے کہا کہ مسز ظفر عمر جا کر بنت نذر الباقر کو دیکھیں۔ یہ تجویز علی گڑھ کے چند دوستوں کی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خلیفہ حامد حسین سے صرف اس بات پر ناراضگی ہو گئی کہ انہوں نے خفیہ طور پر ایک عورت کو دریافت حالات کے لئے بھیجا تھا۔

بہر حال ملتجی ہوں کہ آنریبل خان بہادر سید آل نبی[1] کی جانب سے جو سلسلہ چھیڑا گیا ہے وہ آگے بڑھایا جائے۔

خاکسار

سجاد حیدر

---

[1] آنریبل سید آل نبی مرحوم وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر تھے۔ ان کے ایک صاحبزادے کراچی میں نامور سرجن ہیں۔

قصہ کوتاہ پدرم اپنی ہٹ پر قائم رہے کہ تصویر دکھاؤ (واقعہ یہ تھا کہ بنت نذر الباقر غیر معمولی طور پر حسین و جمیل خاتون تھیں) اور ان کے بزرگوں نے یہ شرط آخر تک پوری نہیں کی لیکن صاحب نظر میر نذر الباقر پدرم کے غائبانہ طور پر اس قدر مداح تھے کہ انہوں نے آنریبل آں نبی العدیر اعظم پٹیالہ خلیفہ حامد حسین دونوں کے پیغامات مسترد کرکے نوجوان ادیب کو اپنے ہاں سیالکوٹ مدعو کیا۔ اچھے دونوں بھائی اور قریبی عزیز آئے جو پدرم سے مل کر ان کے گرویدہ ہوئے۔ مگر اب صاحبزادے نے الٹی میٹم دے دیا کہ لڑکی شادی کے بعد پردہ نہیں کرے گی۔
آخر مصالحت اس پر ہوئی کہ لڑکی جدید طرز کا ترکی برقعہ اوڑھے گی۔ سب کی جان میں جان آئی۔ نانی اشرف جہاں نے فوراً حباب عباس کی منادی دلائی۔

سنہ ۱۱ء میں پدرم نے چھ ماہ کی رخصت لی اور حسب عادت قسطنطنیہ و قاہرہ اڑنچھو ہو گئے۔ اپریل سنہ ۱۹۱۲ء میں ہندوستان لوٹے تو اپنے ساتھ ایک عدد جدید وضع کا ترکی برقعہ لائے جس میں چہرہ کھلا رہتا تھا لیکن حسب ضرورت باریک نقاب ڈال لی جاتی تھی۔ یہ برقعہ انہوں نے دلی میں اپنے عزیز ترین دوست مشتاق احمد زاہدی کے پاس امانتاً رکھوا دیا۔
مئی سنہ ۱۹۱۲ء میں ایک روز مسوری سے زاہدی صاحب کے پاس تار آیا کہ برقعہ فوراً پارسل کر دو معلوم ہوا شادی بالآخر طے ہو گئی۔

باب ۸

دربار شاہ ولایتؒ

سارا قصبہ امروہہ ایک وسیع جھیل پہ منعکس ہے۔ موسم بہار کی شفاف دھوپ میں قصبے کی قدیم مساجد، مقابر اور دو منزلہ مکانات کے گنبد، مینارے اور کنگورے بگولوں سطح آب پر مغل اسکول کے کسی خوش رنگ لینڈ اسکیپ کی مانند جھلکتے ہیں۔ جاڑوں کے کہرے اور گرما کے گرد و غبار میں جھیل کے اس پار سے شہر کا یہی منظر وکٹورین انڈیا کا ایک میلا لیتھو گراف معلوم ہوتا ہے جو کسی سنسان سرکٹ ہاؤس کے برآمدے میں آویزاں ہو۔

قصبے اور اس کے نواح میں پرانی عمارتوں کے علاوہ آج سنہ ۷۲ء میں ٹیوب لائٹ لاؤڈ اسپیکر اور گل کاریوں سے مزین نئی مساجد کی افراط ہے۔ یہ مساجد نئی نویلی سفیدی سے پتی تپتی دھوپ میں جگمگاتی آج کل یو۔پی کے گاؤں گاؤں اور شہر شہر نظر آ رہی ہیں اور مسلم اہل حرفہ اور سبز انقلاب کے بعد سے مسلم کاشتکاروں کی نسبتاً خوشحالی کی مظہر ہیں۔ ان کے برعکس صوبے کے مسلم فیوڈل طبقے کا زوال ان کے کھنڈروں سے ہویدا ہے۔ ان میں سے چند ایک جو سمجھدار ہیں جدید آلات و مشین ہا کے ذریعے خود کاشت کرکے اپنی بگڑی حالت سنوار چکے ہیں۔ خصوصاً بریلی و رامپور میں انہوں نے نئی صنعتیں قائم کی ہیں۔ جنگلات کے ٹھیکے لیتے ہیں۔ اور سنہ ۴۷ء کے بعد ایک بار پھر دولت کی فراوانی ہے بلکہ پیسے سے زیادہ ہے تو از سر نو عیش و عشرت اور سیاست کے میدانوں میں کود پڑے ہیں جو مسلمان رئیسوں کے ہمیشہ سے محبوب مشاغل ہیں۔

لیکن امروہہ جو پہلے اپنے اہل علم و دانش کی وجہ سے مشہور تھا اب لوگ اسے چند نامور فلمی شخصیتوں کی وجہ سے جانتے ہیں۔

اسی طرح بھوپال کہ نواب سلطان جہاں بیگم خلد آشیانی کا نام اب کسی کو یاد نہیں۔ البتہ شرمیلا ٹیگور کہ بحیثیت عائشہ سلطان موجودہ بیگم بھوپال کی بہو ہیں۔

جس کے پیش منظر میں وہ شاہراہ ہے جو دلی سے نکل کر نہٹور اور امروہے سے گذرتی مراد آباد جاتی ہے۔ اسی قدیم سڑک کے کنارے جو اب نیشنل ہائی وے بن گیا ہے۔ سید شرف الدین نقوی شاہ ولایتؒ کی سفید درگاہ آم کے گھنے باغ میں پوشیدہ ہے۔ اندر احاطے میں معتقدین کی بھیڑ جمع رہتی ہے جو ۱۹۷۲ء کے مسائل کے حل کی امید میں شاہ ولایتؒ کے ان شیاطے کراماتی بچھوؤں کو بڑے دھیان سے دیکھتے ہیں جو مجاور نذرانے وصول کرنے کے بعد ایک چبوترے پر رینگنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ غالباً مولینا ابوالکلام آزاد نے کہیں ذکر کیا ہے کہ جب بخارا کی فصیلوں پر حملہ کرکے زار روس کی افواج فتحیاب ہو رہی تھیں امیر بخارا جامع مسجد میں ختم خواجگان کروانے میں مشغول تھے تاکہ اس کی کرامت سے روسی فی الفور واپس بھاگ جائیں۔

شاہ ولایتؒ کے مزار کے سرہانے ایک جالی دار مرمریں حجرہ ہے۔ اس کے اندر آسیب زدہ "لڑکیوں پر حال" آتا ہے۔ تو وہ اپنے لمبے لمبے بال سنگ مرمر کے فرش پر پٹکتی ہیں۔ حجرے کے سیاہ طاق میں پنجے کے سیندوری نشان کے سامنے گھی کا چراغ جلتا ہے۔ کیسا نشان ہے۔ اور چراغ کیوں جلتا ہے۔ اور موت و حیات کے اسرار کھوجنے والوں کو کون جانے گا۔

مزار کے پائنتی ایک سایہ دار برگد صدیوں سے اسی طرح لکھوکھا عوامی عقائد کے گورکھ دھندوں اور باطنی احوال کی بھول بھلیوں کی پاسبانی کر رہا ہے اس بزرگ اور عاقل برگد کی پیچیدہ جڑوں کے نیچے بی بجوئی کی قبر ہے۔ بی بجوئی شاہ ولایتؒ کی صاحبزادی نے بادشاہ وقت کا پیغام نامنظور کر دیا تھا اور احوال باطنی کی بھول بھلیوں میں گم رہی تھیں۔ صبح سے شام تلک ان بیجی ہوئی بی بی کے مزار پر منت ماننے والی برقعہ پوش عورتوں کے سائے ڈولتے رہتے ہیں۔

سائے کے اوپر سائے۔

ہلاکو کے حملے سے تباہ شدہ بغداد کے ریفیوجی سید شرف الدین نقوی ہندوستان پہنچ کر ٹکے تو کہاں ٹکے۔ مغربی دوآبہ کے اس سرسبز گاؤں میں جس کے باغوں کے آم اور اس جھیل کی روہو مچھلیاں انہیں از حد پسند آئیں۔ (امروہہ کی وجہ تسمیہ!) اُن علیہ الرحمۃ کی اولاد جہاں آباد ہوئی وہ دربار شاہ ولایتؒ اور عرف عام میں لکڑا محلہ کہلاتا ہے۔

لاکھڑی والوں کی لکڑا محلہ والوں سے قرابت داریاں دیرینہ ہیں۔

۱۹۷۲ء۔ محلے سے متصل قبرستان میں کاسنی اور سفید خودرو پھولوں کی جھاڑیوں کے درمیان بکریاں چرتی ہیں۔ پگڈنڈی پر سے سائیکل رکشائیں آ رہی ہیں جن پر سوار بیل بوٹم پائجامے پہنے برقعہ پوش لڑکیاں کالجوں کی طرف رواں ہیں۔ گلیوں میں سفید پوش نقوی اپنی اعلیٰ نسبی اور عسرت کا بوجھ کاندھوں پر اٹھائے سر جھکائے شکستہ در و بام کے نیچے سے گذر رہے ہیں۔ زمین و آسمان زندہ رہتے رہتے تھک گئے۔

مئی ۱۹۷۱ء۔ سید ظہور حسنین رضوی مراد آبادی کچھ عرصے سے بغرض علاج امروہے میں فروکش ہیں۔ چند سال سے بیمار چلے آتے

ہیں۔ اس وقت دربار شاہ ولایتؒ کے ایک ڈھنڈار مکان میں ماندہ اور مضمحل پلنگ پر لیٹے نجابت کیا سوچتے ہیں۔ ہر انسان کا ذہن اس کا اپنا دربار شاہ ولایتؒ ہے جس کے اندر کراماتی عقرب رینگتے ہیں۔ فرشتے اترتے ہیں۔ اندھیرا چھاتا ہے۔ انوار کی بارش ہوتی ہے اور ہر انسان کے سر پر موت کے بوڑھے برگد کا سایہ مسلط ہے۔ جو کیا جانے کس لیے اس کی زندگی کو اپنی مہیب پیچیدہ جڑوں کے اندر کھینچ لے۔

اور ہر انسان کے دل میں ایک اندرونی محلسرا ہے جس کی ڈیوڑھی کے باہر دنیا کا شور و غوغا جاری رہتا ہے۔ لیکن اس محلسرا کے اندر کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔ اس کے ڈھنڈار بارونق وسیع تنگ صحن میں فکروں امیدوں خواہشوں مستقبل کے اندیشوں مسرتوں آلام ایقان شکوک خوف اور از سر نو امید کی چہل پہل رہتی ہے۔ فکرِ فردا۔ یادِ ماضی۔ لیکن ماضی ہی کتنا لمبا چوڑا ہے عمر صرف انتالیس سال ابھی ساری زندگی سامنے پڑی ہے مرض تشویشناک اور تکلیف دہ۔ مگر ممکن ہے اللہ بچا لے۔

پلنگ کے سامنے میز پر دواؤں کی شیشیاں۔ کتابیں۔ کامریڈ کے پرچے۔ لڑکے جو ایک ساتھ کھیل کود کر بڑے ہوئے یکایک ان کے راستے دنیا میں مختلف ہو جاتے ہیں۔ وہ سیالکوٹ والا ہم مکتب لنگوٹیا یار کشمیری نژاد پنجابی لڑکا اقبال آج زمین آسمان کے قلابے ملا رہا ہے۔ سن سن کر جی خوش ہوتا ہے۔ علی گڑھ کے ہم مکتب دونوں رام پور والے بھائی لیڈری پر اتر آئے ہیں۔

لیکن اس وقت ڈاک میں مولانا محمد علی کا تازہ ایڈیٹوریل پڑھنے کے بجائے میر ظہور حسنین ڈاکیے کے منتظر ہیں۔ علیگڑھ کے ساتھی سجاد حیدر نے بھی خوب نام پیدا کیا۔ لیکن ان کا پیغام مناکحت جو لاڈلی بھتیجی کے لیے آیا اس کے شاخسانے بہت پریشان کن ہیں اس سلسلے میں اپنے محکمہ پولیس اور علی گڑھ کے ساتھی ظفر عمر سے بدایوں میں مڈبھیڑ ہوا۔ لاہور میں مولوی ممتاز علی سے بحثا بحثی رہی۔ بڑے بھائی فوجی ہیں گرم مزاج مرنجاں مرنج میر ظہور حسنین پولیس کے آدمی ہیں۔ اور بیحد دبنگ۔ مجال ہے کوئی بیجا بات کہے اور وہ اس کی طبیعت صاف کر دیں۔ لیکن اس بیماری نے لاچار کر دیا۔

کروٹ بدل کر تازہ کامریڈ اٹھایا۔ پھر رکھ دیا۔ اخبار کے نیچے صحیفہ کاملہ[۱] نظر آئی۔ ادب سے ہاتھ میں لی۔ اس کا مرتب عابدِ بیمار امام زین العابدینؑ تھے۔ صدر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ ڈاک کا وقت ہے۔ نجابت کو بات سے بھائی جان قبلہ کا خط [illegible] کے بیاہ کے فیصلے کے متعلق کیا آتا ہے۔

اگست ۱۹۷۰ء۔ شاہ ولایتؒ کی اولاد میں فقیر سید مختار حسین نقوی لکڑا محلے کے اندر اپنی آبائی حویلی میں رہتے ہیں۔ بصارت زائل ہو چکی ہے۔ ان کی بیوی بی بی منظور زہرا بیگم بنت سید ظہور حسنین رضوی کی جوانا مرگی کو بھی بیالیس[۲] گذر گئے۔ دوسری بی بی سلطان آرا بیگم۔ لارڈ رابرٹ کی چھوٹی بہو کی پوتی ہیں۔

مکان کی ایک بغلی کوٹھری میں تاریخ سادات امروہہ کی پرانی جلدوں کے انبار میں سلطان آرا کی انگریز دادی کے بیٹے کا البم بھی کہیں پڑا ہے۔ فاتح افغانستان فیلڈ مارشل ارل رابرٹ کے اس خاندانی البم کی جلد پر سنہرے حروف میں لندن ۱۸۷۵ء منقش ہے

---

[۱] امام زین العابدینؑ کی دعاؤں کا مجموعہ۔

امپیریل بریٹانیا اور اسکرو آئینڈ کے لندن کے اس وحشی مرقع میں حسین و جمیل برطانوی امیر زادیوں اور امرا اور نواب مظفر جنگ اور نیر سلطان کے اسلاف کی نایاب تصاویر اس عہد پر ریسرچ کرنے والے کسی برطانوی یا امریکن مورخ کے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہو سکتی ہیں۔ مگر نیم ہندوستانی بیگم سلطان آرا اصفہانی کو لارڈ رابرٹ اور اپنی دادی کے خاندان یا اس دور کے امپیریل برطانوی معاشرے سے رتی بھر دلچسپی نہیں۔ "اسے بھول گئے کرن۔ ہم سے مطلب؟"

البم میں ایک ایک انتہائی خوبرو وکٹورین حسینہ کی تصویر کے نیچے "قاہرہ" لکھا ہے۔ یہ سلطان آرا اصفہانی کی پھوپھی تھیں جنہوں نے کسی مصری پاشا سے شادی کی تھی۔ ان کا بھی کچھ پتہ نہیں کہاں گئیں۔ واقعہ یہ ہے کہ صرف دھندلی تصویریں باقی رہ جاتی ہیں۔

سلطان آرا اصفہانی لکھنؤ کی وثیقہ دار بیگم ہیں اور امروہہ ان کی سسرال اور وطن ثانی ہے۔ اکثر شام کو یہ باغ چلے وہ پڑوس کے قبرستان جا کر منظور زہرا بیگم مرحومہ اور سید ظہور حسنین رضوی مرحوم کے مزاروں پر فاتحہ پڑھتی ہیں۔ نابینا شوہر کی دیکھ بھال۔ نانی پوتوں کے لاڈ پیار جمعرات کی مجالس اور مہمانداری میں مشغول رہتی ہیں۔

مختار حسین خالو کی عمر اب ماشاء اللہ اسّی برس کی ہے۔ پنشن لینے سے قبل یو۔ پی کے مختلف گورنمنٹ کالجوں کے پرنسپل تھے۔ فارسی کے استاد ہیں۔ پچھلے برس گرمیوں کی ایک سہ پہر جب باہر لو چل رہی تھی (اور نیچے گلی میں چند ظلم زدہ لڑکے مینا کماری کی ٹریجک موت کے متعلق کمال امروہی کے تازہ اخباری بیانات پر جوش و خروش سے تبصرہ کرتے ہوئے گذر رہے تھے) مختار ماموں نے مجھے بتایا۔ ۱۹۱۲ء کے موسم گرما کی ایک سہ پہر اسی گلی میں دفعتاً غل مچا "کوئی انگریز آیا ہے۔ کورٹ صاحب کا مکان ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔" ہم سارے لڑکے بالے باہر بھاگے۔ پھاٹک پر ایک مبا تڑنگا نوکیلی مونچھوں والا فوجی انگریز تانگے سے اتر رہا تھا۔ پھر وہ ادھر ادھر دیکھتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا کورٹ صاحب کی ڈیوڑھی کی سمت چلا گیا۔

لڑکوں کا غول اس کے پیچھے پیچھے دوڑا۔ "صاحب" مردانے میں داخل ہوا۔ دالان میں سامنے ہی کورٹ صاحب بستر پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ "انگریز صاحب" لپک کر آگے بڑھا اور پلنگ پر جھک کر کورٹ صاحب سے لپٹ گیا۔

یہ نوجوان نذر الباقر تھے جو نذر باجی کے رشتے کے متعلق اپنے چھوٹے بھائی ظہور حسنین سے صلاح مشورہ کرنے کوہاٹ سے آئے تھے۔

تین چار روز بعد میر نذر الباقر صوبہ سرحد روانہ ہوئے۔ چھوٹے بھائی جو قدیم تہذیب کے مطابق اپنے بڑے بھائیوں کے سامنے ہمیشہ سر جھکا کر بات کرتے تھے بڑے میر صاحب کو رخصت کرنے کے لیے بستر سے اٹھ بھی نہ سکے۔ بڑے بھائی رومال سے اپنے آنسو پونچھتے بلدر خوردہ کو اللہ حافظ کہہ کر ڈیوڑھی سے باہر آئے۔ میر ظہور حسنین کا پلنگ صدر دروازے کے سامنے بچھا تھا وہاں سے گلی نظر آتی تھی۔ ان کے اکلوتے بیٹے گیارہ سالہ سید آل حسنین بڑے ابا کو اسٹیشن پہنچانے کے لئے تانگے پر بیٹھے۔ دیکھتے دیکھتے تانگہ دیا۔

ا لکھنؤ اور کلکتے کے نواب سید احمد علی نے لندن میں جنرل رابرٹ کی حقیقی بہن سے شادی کی تھی۔ وہ کچھ عرصے ہندوستان آکر رہی تھیں۔ ان کے فرزند نواب یوسف سلطان آرا بیگم کے والد تھے۔

نسخہ وصیت[2] کی گٹھی سے مل گیا۔

چند روز بعد کوہاٹ سے خط آیا۔ میر ظہور حسنین نے تکیے کے سہارے بیٹھ کر اس کا جواب لکھا۔

امروہہ

۹ جون ۱۲ء

جناب بھائی صاحب مخدوم و مکرم دام ظلکم۔ بعد آداب و تسلیمات دست بستہ کے عرض یہ ہے کہ میری علالت کے مدنظر اگر عذرا کی رخصتی کچھ دنوں کے لیے ملتوی ہو جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو برائے مہربانی مجھے مطلع فرما دیجیے۔ آپ اپنی جان کو ہرگز تردد اور فکر میں نہ ڈالیں بہت طوالت ہوگی۔ وہ سامان جہیز لاد کر نہٹور یا مسوری لائیں۔ لڑکی کا اصل گھر مراد آباد ہے اور سامانِ جہیز اس کو یہاں سے دیا جا سکتا ہے۔ اور اس میں فریقین کی آسانی ہے۔

بھابھی صاحبہ[1] سے میری طرف سے دست بستہ عرض کر دیجئے کہ وہ جملہ سامان کی جو دینا مقصود ہو ایک فہرست لکھ کر مجھے بھیج دیں۔ میں یہاں پڑا پڑا ہی انشاء اللہ جیسے ممکن ہوگا سب انتظام کر لوں گا۔ میں نہیں عرض کر سکتا کہ اس موقعے پر علیل ہونے، اور آپ کی خدمت نہ کر سکنے اور آپ کا ہاتھ نہ بٹا سکنے کا مجھ کو کس قدر صدمہ ہے۔ مگر مشیت ایزدی میں چارہ کار نہیں ہے۔ زیادہ حد ادب

خادم

ظہور حسنین

امروہہ شہر کا مٹیالا لیتھو گراف یک لخت زیادہ دھندلا ہو جاتا ہے۔

باب ۹

"دل انگشس رخ ترکانہ داری!"

لو بیوی۔ یہ بھی سن لو۔ نہٹوری سانچق کیا لائے ہیں۔ ایک عدد ترکی برقعہ۔ اور اللہ رکھے نوشہ میاں کی کتابوں کا سنہرا مجلد سیٹ۔ آگے آیت۔ ساڑھے چار عدد براق — اللہ رکھے نوشہ کے بڑے بھائی[1]۔

---

[1] برادر بزرگ میر فیض العسکری کی بیوی مرتضائی بیگم۔

[2] سید اعجاز حیدر مرحوم۔

سنیوں[1] - ایک بڑے دیوبندی[2] مولوی صاحب اور ایک مولوی صاحب کا جھگڑا بچہ[3]

خالی بڑی اصلاح معاشرت نہ ہوئی عذاب جان ہو گئی۔ تمام جوڑے دونوں لڑکیوں کی پیدائش کے وقت سے تیار کیے جا رہے تھے۔ سب مقفل کر کے الگ رکھ دیے گئے۔ دلہن بیگم نے سفید جینا سلک کا غرارہ پہنا ہے۔ جاکٹ اور گلابی دوپٹہ۔ ڈرائنگ روم میں صوفے پر چڑھی بیٹھی ہیں۔

ملا پوچھوں ہوں مولوی مجتہد کیوں آئے ہیں۔ کسی چمرٹشین[4] چمر پادری کو بلوا لیا ہوتا۔

جہیز دکھانے کی بھی ممانعت ہے۔ اسے بی بول بھی مراد آباد میں رہنے والے کہہ رہے ہیں میر نذر الباقر نے پردیس میں ڈیا کی شادی کی بیاض جلد میں مولانا چاکس نے دیکھا۔

لیکن ایک بار پھر نانی اشرف جہاں بیگم نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ جتنی دیر اندر باہر نانوم دار ڈنر ہوئے وہ دعائیں پڑھتی دعا صدو میں مشغول رہیں۔ اسی وقت دولہا کا نام آفتاب نوشہ تجویز کیا۔

باہر لان پر لوگوں کا ہجوم غفیر تھا۔" اہل کوہاٹ یلدرم کو دیکھنے کے بے چینی سے مشتاق تھے۔ علاوہ ان لوگوں کے جو شادی کے کھانے پر مدعو کیے گئے تھے۔ بہت سے لوگ بن بلائے آ گئے جس وقت وہ لوگ پہنچے کھانا ہو رہا تھا۔ وہ لوگ خاموشی سے باغیچے میں ٹہلنے اور پائیں باغ کی تماشا میں مصروف تھے۔ اس لیے ان کی نظر اس مجمعے کی طرف نہ گئی۔ جب کھانا ختم ہوا اور سب لوگ باغ میں آ کر بیٹھے تو پاپا دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہاں ساٹھ ستر صاحبان موجود تھے جن میں سے پاپا کسی کو پہچانتے بھی نہیں تھے۔ ان میں سے ایک صاحب نے (جو یلدرم کے زمانے کے علیگ اور بیرسٹر تھے) یلدرم سے کہا: "زہے نصیب کہ آپ کوہاٹ تشریف لائے۔ جس طرح آپ کو زیارت قاہرہ[5] کی کشش مصر لے گئی تھی ہم کو زیارت یلدرم کی کشش بنوں اور ہنگو سے کوہاٹ لے آئی۔"

"پھر ان نو وارد صاحبان کی قطار نے آگے بڑھ کر یلدرم کو اپنے حلقے میں لے لیا۔ اس وقت ذرا اندھیرا ہو چکا تھا۔ اور ان لوگوں کو یلدرم کی شکل اچھی طرح دکھائی نہ دے رہی تھی۔ بیرسٹر صاحب نے قریب سے ایک گیس کی لالٹین اٹھا کر چہرے کے برابر کر دی اور باواز بلند کہا: "اے مشتاقانِ دیدار یلدرم۔ دیکھیے۔ دل انگشش رخ ترکانہ داری!"

یہ سنتے ہی وہ سب ایک ایک کر کے سجاد صاحب کے سامنے آتے گئے اور زیارت کرتے گئے۔ بیرسٹر صاحب بھاری لالٹین

---

[1] سید برہان حیدر مرحوم۔

[2] شمس العلما مولوی سید ممتاز علی مرحوم۔

[3] سید امتیاز علی تاج مرحوم۔

[4] دیسی عیسائی مشنری جو چھکڑوں پر سوار گلی گلی گاؤں گاؤں گھوم کر تبلیغ کرتے پھرتے تھے اگلے وقتوں کے لوگ انھیں "چمرٹشین" (برونزن یوریشین) "چمر پادری" یا کالا پادری کہتے تھے۔

[5] "سید سجاد حیدر یلدرم" از نذر سجاد حیدر، مطبوعہ غالباً ماہِ نو کراچی۔

[6] یلدرم دو ماہ قبل ہی مصر سے واپس آئے تھے اور ان کا مضمون "زیارت قاہرہ" شائع ہو چکا تھا۔

ہاتھ میں لئے کھڑے رہے۔ بادامی رنگ کے جاپانا سوٹ میں ملبوس بے سہرے کے دولہا کا ایک تماشا بن رہا تھا۔ پاپا داماد کی ایسی شاندار قدردانی سے خوش ہو کر قریب کھڑے مسکرا رہے۔ بھائی ممتاز علی بھی وہیں موجود تھے۔

اس ڈرامائی واقعے کے بعد پاپا نے ان تمام مہمانوں کو کھانا کھلوایا۔"

"محترمہ بنت نذر الباقر صاحبہ کی شادی کتخدائی سید سجاد حیدر صاحب بی اے (علیگ) اسسٹنٹ پولیٹیکل افسر اکوہ مسوری) سے ہو گئی اور ۱۸ ماہ رسال کو وہ کوہاٹ سے رخصت ہو کر مسوری چلی گئیں۔

یہ تقریب پوری شرعی سادگی اور نہایت سنجیدگی کے ساتھ عمل میں آئی کوئی گانا بجانا آتش بازی یا بیہودہ رسوم کا نام نہ تھا مولوی سید محسن علی صاحب لاہوری نے خطبہ نکاح پڑھا۔ خطبہ نکاح اس قدر لطیف تھا کہ ہمارا دل اسے اخبار میں چھاپنے کو چاہتا تھا مگر افسوس ہم اسے لکھ نہ سکے۔

اگرچہ آن کل سخت گرمی کا موسم ہے مگر حسن اتفاق سے نکاح کے روز تمام دن ابر رہا۔ شام کو عقد کے وقت پر لطف ابر تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی کوہاٹ کے پہاڑوں پہ بجلی چمک چمک کر بارش کی آمد کی خبر دے رہی تھی۔

بعد نماز مغرب عقد ہونے کے بعد نہایت تکلف سے جلسہ ضیافت ہوا۔ میر نذر الباقر صاحب کثیر الاحباب اور نہایت با اخلاق بزرگ ہیں۔ لاہور۔ گجرات۔ راولپنڈی۔ نوشہرہ۔ پشاور وغیرہ اطراف سے بہت سے احباب ہندو اور مسلمان آئے تھے۔ خاکسار راقم لاہور سے سجاد حیدر صاحب کے ہمراہ ہو لیا تھا۔ ضیافت نہایت پرتکلف تھی۔ ہندو دوستوں کا جدا انتظام کیا گیا تھا اور نہایت قابل تعریف تھا۔

"ایک بزرگ سفید ریش قزلباش پیر مرد مسٹر سجاد سے مل کر بہت خوش ہوئے اور ان سے سردار محمد یعقوب خاں (سابق امیر کابل حال مقیم مسوری) کے حالات پوچھتے رہے اور رخصت کے وقت ہمارے دوست نوشہ کو سورہ اخلاص کی یہ دعائیہ رباعی پڑھ کر سنائی ؎

اے بہ کارے رفیقت قل ہو اللہ احد
وا نگہبان تن و جان تو اللہ الصمد
لم یلد یار تو لم یولد بہر جا دست گیر
لم یکن ناصر ترا بر کسے لہ کفوا احد

"ایک نوجوان مسٹر احمد جان بنگو ضلع کوہاٹ سے خاص طور پہ مسٹر سجاد سے ملنے آئے تھے۔ نوعمر آدمی ہیں اور کچھ عرصہ سرحد کی وارپان پر رہ چکے ہیں۔ کبھی انگریزی بولتے کبھی فارسی۔ کبھی پشتو کبھی پنجابی۔ وہ اس قدر دلچسپ آدمی تھے کہ مسٹر سجاد انھیں اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتے تھے اور میں اپنی طرف رات کو سوتے وقت ان کی چارپائی کے پاس ایک طرف مسٹر سجاد کا پلنگ تھا۔ ایک طرف میرا۔ اب یہ مشکل کہ میری طرف کروٹ لے کر مجھ سے باتیں کریں یا مسٹر نوشہ سے۔ آخر میں نے یہ ترکیب نکالی کہ مسٹر سجاد کے کسی اور دوست کو سمجھا دیا کہ وہ مسٹر سجاد کو اپنی باتوں میں مشغول کریں۔ میں مسٹر احمد جان سے اہواز کی تعلیم نسواں معاشرت وغیرہ کے حالات پوچھتا رہا۔

"اگلے دن میں اور مسٹر سجاد حیدر اور ان کے بہنوئی سید برہان حیدر کوہاٹ کے باغات اور چشموں کی سیر کو نکلے اور اس پہاڑ کے دامن میں پہنچے جس کی دوسری طرف یاغستان ہے۔ یہاں سرکار انگریزی کا ملک ختم ہو جاتا ہے۔ ہم میں اتنی ہمت نہ تھی نہ اتنا وقت تھا کہ اوپر چڑھ کر خود مختار زمین کا نظارہ دیکھتے۔ لیکن میں نے اور مسٹر سجاد نے ایک چشمہ کے کنارے بیٹھ کر سرزمین حریت سے آتا ہوا پانی پیا۔

شام کو سات آٹھ بجے کے درمیان ہم سوار ہوئے اور ریل پر پہنچے۔ وہاں بہت سی تہذیبی بہنیں ویٹنگ روم میں جمع تھیں جو بنت نذر الباقر صاحب کو رخصت کرنے ریل پر آئی تھیں۔

"نو بجے کے قریب ہماری گاڑی روانہ ہوئی۔ راہ میں راولپنڈی۔ گجرات۔ لاہور۔ امرتسر وغیرہ میں بھی بعض تہذیبی بہنیں اسٹیشن پر ملنے آئیں۔ بعض نے کھانا بھیجا بعض تے چائے بھی بعض تحائف لائیں۔

"**لطیفہ**: راستے میں کھانا کھاتے وقت ایک مزیدار لطیفہ ہوا۔ کسی اسٹیشن پہ نوکر آ کر ہمیں کھانا دے گیا اور پانی کی صراحی بھی رکھ دی۔ ہم نے کھانا کھانا تو شروع کر دیا مگر برف لینے کا خیال نہ رہا۔ ٹرین میں برف تو موجود نہ تھی۔ اسٹیشن دور تھا۔ میرا لڑکا کھانے میں شریک تھا۔ اس نے کہا چالیس روپے دو آنے میں ایک سیر برف ابھی اسی لحظہ مل سکتی ہے۔ میں اس کا مطلب نہ سمجھا مگر مسٹر سجاد فوراً سمجھ گئے۔ اور بچے کو شاباش دی۔ میں اس کو پہیلی قرار دے کر تہذیبی بہنوں سے اس کی بوجھ پوچھتا ہوں۔ اتا پتہ یہ ہے کہ جس درجے میں ہم سوار تھے وہ سکنڈ کلاس کا درجہ تھا۔

"آخیر میں میں اپنے عزیز دوست مسٹر سید سجاد حیدر اور اپنی عزیز بہن نذر زہرا کے حق میں اللہ تعالےٰ سے دعا کرتا ہوں۔ میں اس اتحاد کو نہ صرف قران السعدین قرار دیتا ہوں بلکہ قوم کے لیے مبارک فال سمجھتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ یہ اتحاد تہذیبی گروہ کی تقویت مدد اور ترقی کا موجب ہوگا اور وہ دونوں تعلیم نسواں کی خدمت میں آفتاب و مہتاب کی طرح چمکیں گے۔

جو بہنیں ان سے خط و کتابت کرنا چاہیں وہ لفافہ پر یوں پتہ لکھیں:

مسز این۔ سجاد بیگم دفتر اسسٹنٹ پولیٹیکل افسر

مسوری ضلع دہرہ دون۔

خاکسار سید ممتاز علی[1]"

تہذیب[2] نسواں۔ ۲۲ جون ۱۹۱۲ء

کوہاٹ

۱۸ جون ۱۹۱۲ء

ہمشیرہ مکرمہ معظمہ۔ آداب عرض اگرچہ مسافر کے پیچھے اہتمام سفر سے پیشتر خط لکھنا ہندوستانی خیال کے مطابق ٹھیک نہیں سمجھا جاتا

---

[1] سید امتیاز علی تاج مرحوم [2] بشکریہ ڈاکٹر آغا رضا بیدار۔ ڈائریکٹر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری۔ پٹنہ

لیکن اس خیال سے کہ مسوری پہنچتے ہی آپ کو دوسرے روز یہاں کی خیریت مل جائے یہ عریضہ ارسال خدمت ہے۔
ابھی تک آپ راولپنڈی سے تو نہ گذری ہوں گی۔ وہاں بھائی بیلی رام آپ کو ہر طرح سے مدد دیں گے۔
بے حد پریشان باجی کا پریشان افضل[1]

راولپنڈی

۲۰ جون ۱۹۱۲ء

میری پیاری ہمشیرہ

خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ دعا دیتا ہوں۔ امید ہے آپ اس دور دراز سفر کو طے کر کے بخیریت تمام مسوری پہنچی ہوں گی۔ افسوس یہ ہے کہ میری پیاری بہن میرے اسٹیشن سے گذر گئیں اور میں اس کی کچھ خدمت نہ کر سکا لیکن یہ امر مجبوری تھا اگر میں اسٹیشن پر موجود ہوتا تو مجھے آپ کی سیوا کا فخر حاصل ہوتا۔ بڑھیا نے مجھے خط دینے کے بجائے لالہ برج لعل تھاپڑ کے حوالے کیا جس نے پڑھ کر پھر مجھے واپس کیا۔ میں آپ کے اسباب کی بلٹی کرنے ٹکٹ وغیرہ لینے میں مشغول رہا ایک حرف بھی لکھ کر آپ کی سیوا میں پیش نہ کر سکا۔ امید ہے معاف فرمائیں گی۔

بہن۔ آپ کی رخصت کے وقت گاڑی میں آپ رو رہی تھیں ادھر میرا کلیجہ بھی پاش پاش تھا اور آنسو بار بار نکل رہے تھے کیونکہ اس خاندان کو آپ کے کنبے کے ساتھ غیر معمولی محبت ہے۔ میں میر صاحب کو اپنا بڑا بھائی سمجھتا ہوں۔ اور آپ میری دو بہنیں ہیں اور چھوٹے میاں خدا سلامت رکھے میرا چھوٹا بھائی ہے۔ بھابی جی سرگباش ہو چکی ہیں وہ میری والدہ تھیں جو مجھے ہر وقت یاد آتی ہیں۔ اور میں سچے دل سے پرارتھنا کرتا رہتا ہوں کہ اس دیوی کو خدا سورگ نصیب کرے۔ میرا سہارا یا تو خدا پر یا میرے پاپا میر صاحب[2] پر ہے۔ اس دنیا میں میں اکیلا صرف آپ لوگوں کے بھروسے پر جی رہا ہوں۔ آپ مہربانی فرما کر بھائی سجاد حیدر صاحب سے عرض کریں کہ وہ بھی اس دھرم کے رشتے کو نبھائیں۔ میں آپ لوگوں کا تاعمر نادم ہوں۔

آئندہ مارچ کو میرا ارادہ ہردوار آنے کا ہے۔ اگر حالات نے اجازت دی تو آپ کے درشن کرنے اپنی بیوی کے ساتھ حاضر خدمت ہوں گا۔ بہن جی اگر کسی چیز کی ضرورت ہوا کرے تو بلا تکلف مجھے لکھ دیا کریں میں اپنی سمرتھا شکتی کے انوسار اس کی تعمیل کروں گا۔ میں دعاگو ہوں کہ آپ کی تمام زندگی ہمیشہ خوشی میں گذرے جس کی ٹھنڈی ہوا مجھے بھی آتی رہے۔

بہن جی اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ ہر روز شام کو بھائی سجاد حیدر کے ہمراہ ہوا خوری کے لیے ضرور تشریف لے جایا کریں۔ آپ کی طبیعت چونکہ کمزور ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ چلنے پھرنے سے اچھی صحت ہوگی۔ ویسے میں آپ کے پردہ سسٹم میں دخل نہیں دینا چاہتا۔ میری ناقص عقل نے یہ محسوس کیا ہے۔

بھائی سجاد حیدر صاحب کو دست بستہ آداب عرض کریں۔

آپ کا ناچیز بھائی بیلی رام

---

[1] یہ صاحبزادے آگے چل کر پنجاب کے نامور ڈاکٹر بیلی رام بنے۔ بیلی رام بلڈنگ ان دنوں لاہور میں غالباً اب تک موجود ہے۔

[2] اکبری بیگم مصنفہ گودڑ کا لال کے صاحبزادے (مصنف تخیلات) عمر پندرہ سال۔

گڑا محلہ، امروہہ، ضلع مراد آباد
۲۳ جون ۱۲ء

میری پیاری بیٹی

تمہارے پاپا کے خطوط قریب قریب ہر دوسرے تیسرے روز اس عرصے میں آتے رہے۔ خدا کی شان ہے کہ اس موقعے پر اور ہیں میل۔ بہر حال اوس کا شکر ہے کہ تو بخیر و عافیت اپنے گھر پہنچ گئی۔ بیٹی دنیا کا یہی قاعدہ ہے۔ کون کب تک ماں باپ کے ساتھ رہا ہے کہ تو رہتی۔

تیری چچی مراد آباد تھیں۔ اب میں اون کی والدہ اور مصطفیٰ بی بی وغیرہ نوگی پورے[1] جا کر چادریں چڑھائیں گی اور منیا بوا کو اس کی نو ڈیا تیہ کا پرسا دیں گی۔

تو نے اپنے نئے گھر کا حال تو کچھ لکھا ہی نہیں مفصل لکھ کیسا مکان ہے اور تو نے اپنی تقسیم اوقات کیا کر رکھی ہے۔

ہاں تجھ سے تو میں نے مکان کو پوچھا اور اپنے مکان کا کچھ حال نہیں لکھا۔ سنو۔ میرا مکان کوئی ڈیڑھ سو برس کا بنا ہوا ہے۔ مکان نے عجم کی طرف سیمنٹ سی کیسٹ میں شکن بہت پڑا۔ ہماری مراد آباد کی محلسرا سے سے زیادہ چوڑا۔ مکان کی چھت میں کوئی تختہ سلامت نہیں مگر اللہ کی شان ہے کہ برسات کے زمانے میں ایک قطرہ بھی نہیں ٹپکتا کواڑوں کا نام نہیں اس سے ہوا دار خوب ہے۔ دن بھر اکیلا پڑا پڑا کڑیاں گنتا رہتا ہوں۔ کامریڈ یا کوئی اور اخبار آ گیا تو دیکھ لیا۔ بیماری کی وجہ سے اب بصارت بھی کمزور ہو گئی ہے۔ آل حسنین کلمہ میرے ہمراہ ہے۔ وہ نے کل ہی معلوم ہوا کہ تیری شادی ہو گئی بھائی جان کو اوس نے بڑا لمبا چوڑا خط شکایت کا لکھا ہے۔ اور کہتا تھا کہ میں باجی کو لکھوں گا۔ اوہوں نے بلا میرے پوچھے شادی کر لی۔ جب اس سے کہا بیٹیاں کہیں کہا کرتی ہیں تو بولا کہ بی بی کے یاد کے رقعے تو باجی نے لکھے تھے۔

والدعا

تیرا ابا ظہور حسنین

۱۶ مارچ ۱۹۱۳ء

لاہور سے مراد آباد جانے والی ٹرین کے پلیٹ فارم پر وردی پوش میر زندہ لباقر اور برقعہ پوش بہن اکبری بیگم مبہوت بنے کھڑے ہیں۔ اینگلو انڈین گارڈ جھنڈی دکھاتا ہے۔ اکبری بیگم گھبرا کر زنانہ درجے میں سوار ہو جاتی ہیں۔ اتنے میں آتشبار لالہ بیلی رام مسافروں کی بھیڑ چیرتے دوڑتے ہوئے آکر "پاپا" سے لپٹ جاتے ہیں۔ پرسوں ان کے پیارے چچا "ظہور" بھی سرگباش ہو گئے۔

امروہے کی ہٹرواڑہ میں ایک نیا کتبہ:

سید ظہور حسنین رضوی

پیدائش : ۱۸۶۳ء

وفات : ۱۳ مارچ ۱۹۱۳ء

۱؎ ایک شیعہ زیارت گاہ۔ ضلع بجنور۔

۸، مارچ ۱۹۱۳ء

ڈاکیہ دربار شاہ ولایتؒ عرف لکڑا محلہ کے ایک سنسان مکان کے صدر دروازے کی زنجیر کھٹکھٹاتا ہے۔ گلی میں خشک پتے اور گرد اڑ رہے ہیں۔ چند منٹ بعد ایک دلہن صورت کمسن لڑکا نیکر اور چپل پہنے اندر سے دروازہ کھولتا ہے۔

"لو بھیّے۔ تمہارے نام خط۔" ڈاکیہ سنجیدہ آواز میں کہتا ہے۔ رسید پر دستخط کرنے کے لیے کان کے پیچھے سے مختصر سی شہابی پنسل نکالتا ہے۔ (زندگی کی ہر چیز شہابی گرد آلود بے رنگ بے جان کیوں ہے؟)

بچہ بڑی احتیاط اور احساس ذمہ داری کے ساتھ دستخط کرنے کے بعد ذرا حیرت سے اپنے نام کا لفافہ کھولتا ہے جس پر گورنمنٹ ہاؤس الٰہ آباد کا طغرہ بنا ہے۔ اندر ہز آنر لفٹیننٹ گورنر یو۔ پی کا تعزیت نامہ۔ ماسٹر سید آل حسنین کے نام ——

"عزیز بیٹے۔ تمہارے پیارے والد کی بے وقت موت کی وجہ سے گویا برٹش گورنمنٹ کا ایک ستون گر گیا ——"

---

۱۵ ستمبر ۱۹۷۳ء محترمہ اندرا گاندھی کو اپنا قیمتی ووٹ دیجیے۔

امروہے کے در و دیوار پر چسپاں اندرا کانگریس، اولڈ کانگریس، بی کے ڈی، آل انڈیا مسلم مجلس، آل انڈیا مسلم لیگ، بھارتیہ جن سنگھ، کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا —— کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (مارکسسٹ) کے پوسٹروں، مشاعروں، عرسوں، قوالیوں، فلموں اور شیعہ سنی، اہل حدیث مقلد غیر مقلد بریلوی غیر بریلوی کے تنازعی جلسوں کے اشتہارات کے سامنے سے دلّی اور لکھنؤ سے آنے والی شاہراہ پر یو۔ پی روڈویز کی بسیں لگاتار گذر رہی ہیں۔ جھیل، قبرستان اور درگاہ شاہ ولایتؒ کے سامنے سے گذرتی ان بسوں میں امروہے کے تابینوں اور مراد آباد کے برتنوں کے نئے متمول مسلمان ایکسپورٹر اور کاریگر کھچا کھچ بھرے ہیں۔ آنکھوں میں سرمہ، مخملیں ٹوپیاں۔ مخملیں واسکٹیں۔ انداز میں روایتی نیں اور بانکپن۔ جس شستہ اور شگفتہ ٹکسالی اردو میں ضلع جگت اور سفلی مذاق و بحث میں آپس میں مشغول ہیں وہ آج صرف ان اضلاع ہی میں سنی جا سکتی ہے۔

شاہراہ پر سے اکا دکا فوجی گاڑی زوں سے گذر جاتی ہے۔ جنرل لارڈ رابرٹ کا پرنواسہ جمہوریہ ہند کی فوج کا میجر بنگلہ دیش کے محاذ سے دربار شاہ ولایتؒ واپس آکر والدین سے ملنے کے بعد اپنی چھاؤنی پر جا چکا ہے۔ اماں جنرل رابرٹ کو تو رکھو طاق پر۔ ان کے بنائے ہوئے نقشے تو کب کے تلپٹ ہوئے۔ مگر صرف پچیس سال اُدھر جنرل ماؤنٹ بیٹن نے جو نئی لکیریں کھینچی تھیں وہ بھی تو غتر بود ہو گئیں۔

شام ہوتی ہے۔ مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد ماموں دالان سے چل کے مردانے صحن میں بچھی آرام کرسی پر آن بیٹھتے ہیں اور تسبیح کے دانے گرانے لگتے ہیں۔ سو اب انھیں نظر نہیں آتی لیکن خوب نظر آتی ہے۔

قریب کی تاریخی مسجد سے عشاؔ کی اذان کی صدا بلند ہوتی ہے۔ سلطان آرا ممانی کھانے کی سینی ماموں کے سامنے لاکر رکھتی ہیں اور کہتی ہیں "نوش جان کیجیے۔" رات گہری ہوتی ہے۔ پڑوس کے مکان میں چھپائی کے کارخانے کا مالک پاکستانی قوالی کا ریکارڈ جو وہ کویت سے لایا ہے۔ بار بار بجا رہا ہے۔ سر لامکاں جو طلب ہوئی —— کوئی حد ہے ان کے عروج کی ——

کوئی حد ہے ــــ بلغ العلیٰ بکمالہٖ ـــ صلو علیہ و آلہ ـــ سدرۂ منتہیٰ وہ چلے نبیؐ ـــ

اور پولس لائینز میں بگل بجتا ہے ۔

سید ظہور حسنین رضوی مشہدی مراد آبادی علیگ کلف دار کڑکڑاتی وردی پر کنگز پولس میڈل اور شکسپیرین میڈل اور تمغۂ ولیم میڈل (جو انہیں ایک جرمن شہزادے نے عنایت کیا تھا) لگا کر بنگالی ڈاکے* سے وائسرائے ہند کو محفوظ رکھنے کے لیے جلتے میں بڑے لاٹ صاحب کے جلو میں چلا کرتے تھے ۔ ان کی شکستہ قبر پر اور ان کی جوان بیٹی منظور زہرا کی شکستہ قبر پر جس کے کتبے پر بیندار زہرا بیگم کے لکھے ہوئے المناک اشعار کندہ ہیں ۔ جھاڑ جھنکاڑ اُگ آئے ہیں ۔ قبروں سے متصل سترھویں صدی کے کسی مغل سپہ سالار کی بنوائی ہوئی مسجد میں سے کچھ دیر بعد فجر کی اذان کی آواز بلند ہوگی ۔ کیونکہ وہ رب ذوالجلال حی و قیوم ہے ـــ

"دل آنکھیں رنج ترکانہ" والا کلیم پرس نوجوان ادیب، ننھی بیگم، فرنگی نما نذر الباقر، نوعمر میر افضل علی، خفتہ صورت سید نساء علی، مہ جبین نہار امتیازہ علی تاج دور دراز قبرستانوں میں جھاڑ جھنکاڑ، بیری کے درختوں سفیدہ اور کاسنی خودرو پھولوں کی خاموشی میں کب کے کھو گئے ۔ اور اللہ رے سناٹا، آواز نہیں آتی ۔

درگاہ شاہ ولایتؒ کے مرمریں حجرے میں آسیب زدہ لڑکیوں پر بدستور حال آ رہا ہے ۔ طاق میں پنجے کے سیندوری نشان کے نیچے گھی کا چراغ جلتا ہے ۔

پنجاب کے صوفی شاہ حسین نے کہا تھا ـــ "خاموش رہو ۔ دنیا قابلِ ذکر جگہ نہیں"

(مسلسل)

---

* بنگال کے دہشت پسند انقلابی گروہ بھی ۱۹۰۷ء سے بہت پہلے سرگرم رہے اور انگریزی پریس اور عوام میں بنگالی ڈاکہ کہلائے ۔

ڈائری کے چند اوراق

مسعود مفتی

[قیامِ مشرقی پاکستان]

نوٹ: [میں ۲۲ مئی ۱۹۷۱ء کو لاہور سے ڈھاکہ کے لیے روانہ ہوا تو یہاں اسی وقت سے ڈائری کا آغاز کیا۔ اور سقوطِ ڈھاکہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

جون کے آخر میں لاہور آنے کا اتفاق ہوا۔ تو اس وقت تک کی لکھی ہوئی ڈائری یہیں چھوڑ گیا مگر اس کے بعد موقع نہ ملا کہ ڈائری کو یہاں بھیج سکتا۔ اس لیے آخری نوٹس کی لکھی ہوئی تحریر میرے پاس ہی رہی۔ جو ایک نیلی جلد والی کاپی میں تھی۔

چودہ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ہمارا گروپ غیر جانبدار علاقہ (ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل) میں پناہ گزین ہوا۔ اس وقت صاف عیاں تھا کہ مشرقی پاکستان کا آخری وقت آن پہنچا ہے اور کوئی اندازہ نہ کر سکتا تھا کہ بعد ازاں ہمارا کیا حشر ہوگا۔

اس لئے ہوٹل میں پہنچتے ہی مجھے اپنی ڈائری کے متعلق سخت تشویش ہوئی۔ ایک تو میں اسے کسی نہ کسی طرح مغربی پاکستان پہنچانا چاہتا تھا۔ اور دوسرے اسے ہندوستانیوں کے ہاتھ میں پڑنے سے بچانا چاہتا تھا۔

بہت سوچ بچار کے بعد میں ایک ایرانی ناظم امور مسٹر ایم ایچ کاشانی کے پاس گیا۔ جو اسی ہوٹل میں پناہ گزین تھے اور ڈھاکہ کے قیام کے دوران میں ان سے چند تعلق چلا تھا۔ انھیں درخواست کی کہ وہ اسے اپنے سفارت خانے میں رکھوا دیں تاکہ ہندوستانیوں کے ہاتھ سے بچ جائے اور پھر جب بھی انھیں موقع ملے۔ اسے پاکستان بھجوا دیں۔ چاہے یہ موقع کئی مہینوں یا کئی برسوں بعد ہی کیوں نہ ملے۔ اگر وہ کسی وقت محسوس کریں کہ اسے ہندوستانیوں سے بچایا نہیں جا سکتا تو اسے بلاتکلف تلف کر دیں۔

کاشانی صاحب بکمال مہربانی راضی ہو گئے۔

مگر حالات ایسے تھے کہ مجھے قطعاً یقین نہ تھا کہ ڈائری آسانی سے پاکستان پہنچ سکے گی۔ اس لیے ان کے سپرد کرنے سے پہلے میں نے احتیاطاً اس کے پہلے اور آخری صفحے پر نوٹ لکھ دیئے کہ اگر یہ ڈائری کسی کو ملے تو اسے فلاں فلاں پتے پر بھجوا دیا جائے۔ ایک پتہ میری بیگم کا تھا۔ اور دوسرا طفیل صاحب مدیر نقوش کا تھا۔ کاشانی صاحب سے زبانی درخواست کی تھی کہ اگر میں زندہ ہوا تو یہ میری بیگم کو بھجوا دیں۔ بصورت دیگر طفیل صاحب کو بھجوا دیں۔

ڈائری ان کے سپرد کرنے کے بعد حالات اس تیزی سے چل رہے تھے کہ میں اسے جاری رکھنا چاہتا تھا لیکن اگر ڈائری کی شکل میں لکھتا اور وہ ہندوستانیوں کے ہاتھ پڑ جاتی۔ تو وہ یقیناً مجھ سے پوچھتے کہ پچھلی ڈائری کہاں ہے۔ اس حالت میں اس کی برآمدگی کا خطرہ تھا۔

چنانچہ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے میں نے ایک ادبی رپورتاژ بعنوان "چہرے" شروع کی۔ جس میں گرد و پیش گھومنے والے چہروں کے تاثرات کے ذکر کے پردے میں حالات کا ریکارڈ تھا۔ "چہرے" اب کتابی شکل میں شائع ہو گئی ہے۔

اٹھارہ دسمبر کی دوپہر کو کاشانی صاحب سے آخری ملاقات ہوئی۔ جب ہمیں اطلاع دی گئی کہ تھوڑی دیر بعد ہمیں قیدی بنا کر چھاؤنی لے جا رہے ہیں کاشانی صاحب اور ان کی بیگم نے آبدیدہ آنکھوں اور پُرخلوص دعاؤں سے مجھے رخصت کیا۔ اس انداز سے کچھ اور ڈھارس بندھی کہ میرے کاغذات محفوظ ہاتھوں میں ہیں۔

اگلے دو سال کے لئے دشمن کی سرزمین میں ہم ہر قسم کی ہمدردی سے محروم تھے۔ ان دنوں یہ پُرنم آنکھیں بہت یاد آئیں۔ جن کی اصل تفسیر اس دن ہوئی جب قریباً آٹھ ماہ بعد جنگی قیدیوں کے کیمپ میں مجھے اپنی بیگم کا خط ملا۔ جس کے متن میں ایک چھوٹا سا فقرہ بھی تھا "آپ کی نیلی کتاب مل گئی ہے۔"

دشمن کی دو سالہ قید میں کئی لمحے ایسے بھی آتے تھے۔ جن میں یقین سا ہو جاتا تھا کہ شاید ہم کبھی بھی زندہ وطن نہ جا سکیں گے۔ ان کربناک لمحوں کا واحد سہارا یہی تسلی تھی کہ میری ڈائری تو پہنچ چکی ہے۔

آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے اس کے وہ حصے حذف کر دیئے ہیں جو بہت ہی ذاتی نوعیت کے ہیں۔]

ہفتہ، ۲۲ مئی ۱۹۷۱ء

(لاہور سے روانگی)

جہاز کی پرواز پُرسکون اور متوازن ہے۔ کھڑکی سے باہر بوئنگ ۷۰۷ کے دیو ہیکل بازو دو انجنوں کا ناگوار سا بوجھ اٹھائے فضا میں معلق ہیں۔

اپنے عظیم حجم کے باوجود ہم کبھی کبھار پیپل کے پتوں کی طرح ہلکی ہوا سے لرزتے جاتے ہیں۔ کھڑکی کا اوپر والا ایک چوتھائی حصہ نیلے آسمان سے بھرا ہوا معلوم ہوتا ہے جس کی نیلاہٹ سنہری دھوپ میں اڑتے ہوئے غبارے کی مانند لگتی ہے۔ باقی حصہ دھند سے آلودہ ہے۔ کہیں کہیں سفید بادلوں کے ٹکڑے دھنیے کے ارد گرد اڑنے والی روئی کے گالوں کی طرح معلق ہیں۔

اندر کی فضا بالکل مختلف ہے۔ لاہور کے پی آئی اے سٹاف کے آشنا ہونے کے طور پر میں فرسٹ کلاس میں بیٹھا ہوں اور جان بوجھ کر آخری سیٹ کا انتخاب کیا ہے تاکہ میں زیر مشاہدہ آنے کی بجائے حسب معمول دوسروں کو دیکھ سکوں۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنے اعصاب کو اس سکون دے سکوں جو پچھلے دو ہفتوں سے کئی قسم کے دباؤ اور بوجھ تلے دبے رہے ہیں۔ میں کسی سے بات بھی نہیں کرنا چاہتا۔ دل و دماغ کی کھڑکیاں بند کرکے اپنے اندر ہی اندر غوطہ لگانا چاہتا ہوں۔ اور ان تمام لہروں کے تھپیڑوں کو ایک ایک کرکے یاد کرنا چاہتا ہوں جو پچھلے دنوں بے پناہ تیزی سے مجھے مصروفیت اور عجلت کے سمندر میں غوطے دیتی رہی ہیں۔ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر کتنی ہی دیر تک آنکھیں بند کئے دم سادھے ڈھیلے جسم سے ٹیک لگائے رکھتا ہوں اور جہاز کی گمبھیر گونج میں اپنے آپ کو گم کر دیتا ہوں۔ اب ایک گھنٹے کا سفر گزر چکا ہے اور میں اس ڈائری کے آغاز کے طور پر یہ سطور لکھ رہا ہوں۔

اتوار، ۲۸ مارچ ۱۹۷۱ء

---

۹ بجے بعد دوپہر کراچی سے صبح نو بجے بوئنگ پر روانہ ہوا۔ اس طیارے میں ناصر محمود بھی ہیں جو اب کمشنر چٹاگانگ ہو گئے اور سید محمد حسن بھی جو گورنر کے سکرٹری ہوں گے۔ مجھے بھی اپنی پوسٹنگ کا پتہ چل گیا ہے کہ مشرقی پاکستان میں سکرٹری امور تعلیم ہوں گا۔ میرے دل میں کچھ خوشی، کچھ جوش اور کچھ اطمینان سا پیدا ہوا تھا کہ کام مشکل ہوگا۔ ہمت کی ضرورت ہوگی اور ملک کی خدمت ہوگی۔ تعلیمی اداروں کو ملک دشمن عناصر کے تسلط سے پاک کرنا۔ نصاب میں قومی رنگ کو چوکھا کرنا۔ اور ساری تعلیم میں نظریہ پاکستان کو اجاگر کرنا ایسے کام ہیں جو موجودہ حالات میں جہاد سے کم نہیں۔ کئی بنگالی اس کی مخالفت کریں گے۔ اور ہندوستان کے ایجنٹ ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اسے ناکام کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس لئے اس کام میں چیلنج ہوگا، خطرات ہوں گے، سازشیں ہوں گی اور مشکلات پیش آئیں گی، اسی لئے یہ مجھے پسند ہے۔

طیارے میں لوگ آپس میں بے تعلق ہیں۔ سوائے ہم تینوں کے جو کبھی کبھار ایک دوسرے کے پاس جا پہنچتے ہیں۔ بارہ بجنے کے بعد طیارہ ہندوستان کی راس کماری سے گزر کر لنکا کے اوپر سے گزرتا ہے۔ نیچے بڑے بڑے پہاڑ دانوں کی مانند نظر آتے ہیں۔ زمین کے لق و دق خطے دونوں طرف سے سمندر کی وسعتوں میں گھرے ہیں۔ بادلوں کے کئی جزیرے ان سیکڑوں میلوں میں تانے بانے بنتے نظر آتے ہیں۔ نیلے سمندر اور نیلے آسمان کے ملاپ میں کہیں بھی افق نظر نہیں آتی۔ بلکہ ہر جگہ چکرا دینے والا روشن سا اندھیرا ہے جس میں سب منظر راستے ہوئے بھی خلا میں نظریں گم ہو جاتی ہیں اور انسان حیران ہونے لگتا ہے کہ اس سے آگے کیا ہے۔

اس سے بھی حیران کن بات یہ ہے کہ اتنی عظیم وسعتوں میں موہوم سا ذرہ جو انسان کہلاتا ہے۔ بالکل کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ لیکن جب یہی انسان پاگل پن میں خون بہانے پر کمربستہ ہوتا ہے۔ تو یہ سارا پھیلاؤ بھک سے اڑ جاتا ہے۔ اور وہ پاگل ذرہ

اپنے ہی خون کے چند سرخ چھینٹوں سے اتنی عظیم کارگاہ کو نفی کی دھند سے ڈھک دیتا ہے۔

چھ بجے شام :- سوا تین بجے طیارہ ڈھاکہ کے ہوائی اڈے کی طرف جھپٹا۔ گھڑی کو ایک گھنٹہ آگے کرتے ہوئے میں نے نیچے سیدھی لمبی سڑکوں پر نگاہ دوڑائی۔ تو ان پر اکا دکا راہگیر تھے اور کسی بوڑھے کے اکیلے دوکیلے دانتوں کی طرح ایک آدھ رکشا یا کار نظر آئی۔ جب فضا نیچے ہوئے تو مکانات خاموش تھے اور مکین بہت کم تھے۔ عجیب بات ہے۔ ادھر تو سنتے تھے کہ سب نارمل ہے۔

اڈے پر نادر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ جو اب یہاں ڈیوٹی پر تھے۔ گلے ملے۔ تھپکی دی۔ حیرت اور خوشی سے دوہرے ہو گئے۔

ایک دو کھٹارہ سی سٹاف کاریں موجود تھیں۔ ان پر بیٹھ کر سنٹرل سرکٹ ہاؤس پہنچے۔ مظفر اور ہمایوں سے ملاقات ہوئی جو تین روز پہلے پہنچ چکے تھے۔ مگر ابھی تک چارج نہ لے سکے تھے۔ مظفر بنیادی جمہوریت کے سکرٹری تھے۔ اور ہمایوں اطلاعات کے۔ ان کو گلہ تھا کہ مشرقی پاکستان کی حکومت کی طرف سے رکھائی اور اکتاہٹ کا اظہار تھا۔ حسن ظہیر کوئی ہفتہ بھر سے یہاں تھے مگر چارج نہ ملا تھا۔ حالانکہ وہاں سے گورنمنٹ نے سب کو بھاگم بھاگ پہنچنے کو کہا تھا۔ یہاں معاملہ بالکل الٹ تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی بھی نہ تو ہماری حفاظت کے موڈ میں تھا۔ اور نہ ہمیں کوئی اور سہولت دینے میں۔ اس وجہ سے تقریباً سبھی بجھے بجھے تھے۔ سوائے نسیم کے جو شام کو ملے اور مزے میں تھے وہ میرے ساتھ متفق تھے کہ نامساعد حالات میں عام حالات سے زیادہ خوش و خرم رہنا بہت ضروری ہے۔

رات کھانے پر مختلف خبروں کا تبادلہ ہوتا رہا کہ تین مارچ سے چھبیس مارچ تک شیخ مجیب الرحمٰن کے حامیوں نے غیر بنگالیوں پر کیسے کیسے ستم ڈھائے۔ اختر حمید خان صاحب جن کو PROPHET OF COMILLA کہا جاتا ہے۔ آج کل کراچی میں ہیں۔ اور مصر بیٹھے ہیں۔ کہ کبھی بنگال واپس نہیں جاؤں گا.............. اختر حمید خاں صاحب نے ۱۹۴۲ء میں سول سروس سے اس لئے استعفا دیا تھا کہ ان کے خیال کے مطابق اس وقت کا قحطِ بنگال مصنوعی طور پر انگریز کا پیدا کردہ تھا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی ساری عمر بنگال کی خدمت میں صرف کی۔

ایسی بھی خبریں سنی گئیں کہ جو لوگ برسوں کے ہمسائے تھے۔ اور ان کے بچے ایک دوسرے کو چچا ماموں کہہ کر پکارتے تھے۔ وہاں ان بھانجوں اور بھتیجوں کو ذبح کر کے ان کی ماؤں کی گود میں ڈال دیا۔ جن سے بعد میں زنا بالجبر کئے گئے۔ حیرت ہوتی ہے تمام قصے سن کر۔

سوموار۔ ۱۴ مئی ۱۹۷۱ء

دس بجے رات :- آج صبح دفتر پہنچے۔ چارج لیا۔ سٹاف کے ساتھ چائے پی محکمے کا چکر لگایا۔ چیف سکرٹری مسٹر شفیع الاعظم سے ملے۔ شام کو ڈھاکہ چھاؤنی میں میجر شجاع (کرکٹ والے) اور کرنل شفقت بلوچ سے ملے۔ شفقت بلوچ جو ۱۹۶۵ء کی جنگ

سے ہیر دیں۔ مصلے پر بیٹھے شام کی نماز کے بعد تلاوت کر رہے تھے۔ بعد میں گفتگو بھی ہوئی۔ وہ حالات پر پرجوش اور باایمان مجاہد سے مل کر طبیعت بہت خوش ہوئی۔

دفتر میں جن لوگوں سے مجھے واسطہ پڑا۔ ان کے چہرے کسی قسم کے تاثر سے خالی تھے۔ دفتروں میں حاضری قریباً قریباً مکمل ہے۔ جو پانچ دس فی صدی لوگ ابھی نہیں آسکے۔ ان کے آنے کی اب توقع نہیں ہے۔ ہمیں دیکھ کر نہ خوشی کا اظہار ہوا۔ نہ ناخوشی کا۔ بے رنگ اور سنجیدہ چہرے ہماری مسکراہٹ اور غصے کو ایک جیسے انداز میں جھیلتے رہے۔ سر شام ہی ڈھاکہ کی تمام دکانیں بند تھیں۔ اور سڑکیں خالی خالی تھیں۔ رونق صرف صبح کے وقت اور دوپہر تک ہوتی ہے۔ جب اکثر دکانیں بھی کھلی ہوتی ہیں۔

منگل وار ۲۵ مئی ۱۹۷۱ء

گیارہ بجے رات:- آج تھوڑا وقت دفتر میں رہے۔ لوگوں نے حسب معمول چہروں پر غیریت کے نقاب پہنے تھے۔ انجینئرنگ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو گلہ تھا کہ فوج والے اس کے چند ملازمین کو پکڑ کر لے گئے ہیں جس سے سارا سٹاف ہراساں اور خوفزدہ رہتا ہے۔ یہ جواب سیدھا تھا کہ مارشل لاء کے حالات میں ایسا ہوتا ہی ہے اور ان کو چاہیے کہ اپنے سٹاف کو سمجھائیں کہ اگر ان کے ہاتھ آلودہ نہیں ہیں۔ تو انھیں خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔

جواب تو میں نے اوپر سے دے دیا مگر اندر سے تسلی نہ ہوئی۔ بعض اوقات احساس ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں غدر کے بعد جو ذہنی کیفیت دہلی کے لوگوں کی تھی۔ وہی کیفیت آج کل ڈھاکہ کے لوگوں کی ہے۔

ملکنا گرلز کالج کی پرنسپل ڈاکٹر حفیظ آئیں۔ بڑی شستہ اردو بولتی ہیں۔ فارسی میں P.H.D ہیں۔ کلکتہ کی رہنے والی ہیں۔ اور ہر لحاظ سے بنگالی لگتی ہیں۔ مگر اس کے باوجود مارچ کے پاگل پن میں مجیب کے حامیوں نے ان کے بھائی کو صرف اس لئے مار ڈالا کہ وہ اردو اچھی بولتا تھا۔ اور اس کے بھانجے کو بھی چھرا گھونپا۔ مگر وہ بچ گیا۔

وہ خوفزدہ تھیں کہ حکومت نے اعلان کیا ہے کہ سب کالجوں کا سٹاف یکم جون کو ڈیوٹی پر حاضر ہو تاکہ دو اگست کو کالج کھل سکیں۔ مگر ان حالات میں وہ کالج میں اکیلی کیسے رہ سکیں گی۔

.. ..

.. ..

سرکاری اطلاعات کے مطابق آج بھی مشرقی پاکستان میں چند واقعات ہوتے رہے۔ اکا دکا فائرنگ اندرون صوبہ میں ہوئی۔ چونکہ مواصلات پوری طرح بحال نہیں ہوئے اس لئے باغیوں اور شرپسندوں کو شرارت کا موقع مل جاتا ہے۔ ریلوے لائن نصف سے زیادہ اکھاڑی جا چکی ہے۔ اکثر پل توڑے جا چکے ہیں۔ سڑکیں بھی جگہ جگہ سے تباہ ہیں۔ اس لئے صرف دریا استعمال ہو رہے ہیں۔ جن میں کانوائے فوج کی حفاظت میں چلتے ہیں۔ لیکن اگر حفاظتی دستہ کم ہو۔ تو ادھر ادھر سے فائر ہوتے ہیں۔ پولیس کے اکتیس ہزار (۳۱۰۰۰) لوگوں میں سے ابھی تک صرف گیارہ ہزار حاضر ہوئے ہیں۔ مگر اس زمانے میں تو یہ تعداد صرف چھ ہزار تک رہ گئی تھی۔ وہ بھی صوبہ بھر

میں گھری ہوئی۔ کہیں ایک بٹالین۔ کہیں دو دو۔ ابھی چند ہفتے ہوئے۔ آج ہی نور رضا رنی صاحب کو مغربی پاکستان بھیجا گیا ہے کہ وہ وہاں سے پانچ ہزار سپاہیوں کی ترسیل کا بندوبست کریں۔

ابھی تک لاہور میں جو باتیں سنی تھیں۔ ان پر یقین کرنا گراں تھا اب دوسروں سے صحیح اور مستند باتیں پتہ چل رہی ہیں۔ صوبائی عصبیت نے جس انداز میں ظلم کئے ہیں۔ وہ ۱۹۴۷ء کے فسادات سے کہیں آگے ہیں۔ حاملہ عورتوں کے پیٹ پھاڑے گئے۔ بچوں کو ماؤں کے ساتھ بدفعلی پر مجبور کیا گیا۔ ایک کیپٹن کو ایک مجمع نے صرف مکّوں، گھونسوں اور تھپڑوں سے مار ڈالا۔ ایک اور آدمی کو قتل کرنے سے پہلے اس کے دونوں ٹخنوں پر گولیاں ماری گئیں۔ پھر دونوں گھٹنوں پر۔ پھر دونوں کندھوں پر۔ اور اسے تڑپ تڑپ کر مرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ کئی بستیوں سے خبریں ہیں کہ وہاں غیر بنگالیوں کا سارا خون نلکی کے ذریعے نکال لیا گیا۔ انسان یہ باتیں سن کر حیران رہ جاتا ہے۔ بنگلہ دیش کا تقاضا تو سمجھ میں آتا ہے۔ مگر غیر بنگالیوں کا قتلِ عام سمجھ میں نہیں آتا۔ خصوصاً جبکہ ان میں وہ لوگ ہیں جو بنگال کے علاوہ اور کسی جگہ رہے ہی نہیں۔

.. ..

.. ..

رات کو اکبر صاحب کے ہاں کھانا کھایا۔ اور بعد ازاں چند شاعروں کے بڑے اشعار سنے لیکن سب بے سود ہے۔

بدھوار۔ ۲۶ مئی ۱۹۷۱ء

ساڑھے گیارہ بجے رات ہے۔ عام سا دن۔ صبح دفتر۔ دوپہر آرام۔ شام بارش۔ ریسٹ میں گپ شپ، اور بالآخر رات کو ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل میں دعوت۔

صبح ہی صبح دفتر سے لاہور بشریٰ کو کال بک کی۔ جو بعد از خرابیٔ بسیار ساڑھے بارہ بجے ملی۔ بشریٰ ٹھیک ٹھاک تھی۔ بچوں سے بھی دو چار جملے ہوئے۔ بشریٰ نے بتایا کہ بچے بہت اداس ہیں۔ انہیں ابھی میرا خط نہیں ملا، مگر یہاں سے جانے والوں نے انہیں فون پر میرے پہنچنے کی اطلاع دے دی تھی۔

آج دفتر میں جلال الدین صاحب سے ملاقات ہوئی جو سنٹرل گورنمنٹ میں منسٹری آف انفارمیشن میں DIRECTOR OF FILM PUBLICATINS ہیں۔ وہ پچھلے چار ہفتوں سے گھوم پھر کر فلم بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کئی جگہ فوٹوگرافی کی۔ اور کئی لوگوں سے انٹرویو کئے۔ جن میں سے بعض تو خود شکار ہوئے تھے۔ اور بعض عینی شاہد تھے۔ ان کی بات چیت کی ریکارڈنگ کوئی آٹھ گھنٹے کی تھی۔

انہوں نے بتایا کہ وہ پہلے بھی آئے تھے۔ اس وقت تاریخ پندرہ مارچ تھی۔ اور مجیب کی حکومت تھی۔ صوبائی گورنمنٹ کے تمام لوگوں نے انہیں پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ بمشکل اپنے علاقے سے باہر نکل سکتے تھے۔ اور کرمی ٹولہ میں ٹھہرے تھے۔ دس دن کے بعد نامراد واپس لوٹ گئے تھے۔

اب پھر آئے تھے۔ مجیب کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ چنانچہ اس دفعہ وہ فوج کے ہمراہ ہی بھاگ گئے تھے۔ شتہ زندہ رسالے کے جو پرہند قصے سنائے جو بالکل مصدقہ ہیں۔ اس لئے کہ ان مقامات کی فوٹو بھی ساتھ لائے تھے۔ ان میں ادھر سڑی لاشوں، گدھوں اور کتوں کی تصویریں بھی تھیں اور تازہ قبروں کے منظر بھی تھے۔

میمن سنگھ کے محلہ شانکی پاڑا کو ایسٹ پاکستان رائفلز اور مجیب کے حامیوں نے گھیر لیا۔ اس محلہ میں سبھی غیر بنگالی تھے۔ سبھی مردوں کو گولیوں سے قتل کیا گیا۔ پھر ان کی بیویوں بہنوں اور ماؤں سے کہا گیا کہ ان کی قبریں کھود دیں۔ اوپر سے بارش ہو رہی تھی اور مائیں اپنے بچوں کی قبریں کھود رہی تھیں۔ کسی کی آنکھیں نکالی گئی تھیں۔ کسی کے بازو کاٹ دیئے گئے تھے۔ کسی کا سر غائب تھا۔ اور اس سارے کام کی نگرانی مسلح لوگ کر رہے تھے — قبریں کھد چکیں۔ تو جیل کے دروازے کھول دیئے گئے اور اندر سے قیدیوں کو ان عورتوں پر چھوڑ دیا گیا۔ جنھوں نے جی بھر کر بدفعلی کی۔ اور گھروں کو لوٹا۔ پھر ان سب کا قتل عام کیا گیا۔ چند عورتیں جو باقی بچ گئیں۔ آج ڈھاکہ کے ریلیف کیمپ میں اپنی کہانی سنانے کو موجود ہیں۔ جہاں صوبائی حکومت کے سپاہی کارندے مارشل لاء کے باوجود ان سے برا سلوک کر رہے ہیں۔ مگر غیر بنگالی لوگ ان کی مدد کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ وہ عورتیں بھی جو ایک مسجد میں چھپ جانے کی وجہ سے بچ سکیں۔ اس گاؤں کے اوپر اب بھی گدھ منڈلا رہے ہیں اور فرشوں پر جہاں لوگوں کو گھسیٹا گیا تھا گوشت کے گلے سڑے چیتھڑے لگے ہیں۔ تعفن سے سارا علاقہ خراب ہے۔ اور کوئی گھر ایسا نہیں جس کے صحن میں قبریں نہ بنی ہوں۔

راجشاہی سے چالیس میل دور سانتاہار (SANTA HAR) قصبہ ہے جس کی ۵۰ ہزار کے قریب آبادی تھی۔ اس میں تیس ہزار کے قریب غیر بنگالی تھے اور باقی بنگالی تھے۔ غیر بنگالیوں میں سے صرف تین ہزار زندہ بچے۔ باقی سب کو مار ڈالا گیا۔ عورت اور بچے کا کوئی لحاظ نہ کیا گیا۔ کسی لاش کو دفنایا نہ گیا۔ کئی دن بعد جب پاکستانی فوج وہاں پہنچی۔ تو انہوں نے کوئی چھ ہزار لاشوں کو دفنایا مگر ابھی بھی لاشیں کھلی فضا میں گل سڑ رہی ہیں۔ ان کے کئی ایسی فوٹو لئے گئے ہیں جن میں عورتوں کی چھاتیاں کاٹی ہوئی ہیں۔ اور پرائیویٹ حصوں کو چاقو سے پھاڑا گیا ہے۔ شیر خوار بچوں کے پیٹ آر پار کاٹے ہیں اور کئی لاشیں ایسی تھیں جن کو صرف شاہ رگ سے ذبح کیا گیا ہے تاکہ وہ تڑپ تڑپ کر مریں۔ ایسا ہی ایک آدمی ہسپتال میں ہے۔ جو نہ کھا سکتا ہے۔ اور نہ ہی تک بول سکتا ہے۔ وہ زیر علاج ہے۔

چاٹگانگ میں ذرا سائنٹفک طریقے سے موت کا تماشا دکھایا گیا۔ عوامی لیگ کے کارکن غیر بنگالیوں سے تقاضا کرتے تھے کہ بنگلہ دیش سے وفاداری کے اظہار میں خون کا عطیہ بلڈ بینک میں دیں۔ کسے انکار کی مجال تھی۔ وہاں جب خون دینے گئے تو کرسی پر بٹھا دیا۔ اور رسی سے باندھ دیا۔ اور بازو سے نلکی لگا کر سارا خون بہہ جانے دیا۔ اسی طرح خون کے کتنے ہی ڈرم اکٹھے کئے گئے۔ اور وہ لوگ کرسی میں جکڑے جکڑے مر جاتے۔ اس تماشے کے ایک شاہد کا انٹرویو لیا گیا۔ جو ایک گٹر (GUTTER) میں چار دن چھپا رہا اور آہستہ آہستہ مرنے والوں کی چیخیں سنتا رہا۔

جلال الدین ہی نے بتایا کہ سترہ مئی کے لندن ٹائمز میں پیٹر ہیزل ہرسٹ (PETER HAZEL HURST) کا مضمون ہے۔

اس نے کمتی باہینی کے ایک سیکٹر کمانڈر میجر چوہدری کا انٹرویو شائع کیا ہے۔ جس میں میجر چوہدری نے غیر بنگالیوں کے قتل کی ضرورت کا فلسفہ بیان کیا ہے وہ یہ کہ جتنے لوگ غیر بنگالی ہیں ان کی ہمدردیاں مغربی پاکستان کے ساتھ ہیں۔ اس لئے خالص بنگلہ دیش میں ان کا وجود ناقابلِ برداشت ہے۔

کرنل عبدالحئی جو ایک ڈاکٹر تھا اور جس نے شین گن سے اپنے افسر کو مارنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی ڈائری حال ہی میں پکڑی گئی ہے۔ اس میں اس نے لکھا ہے کہ ہمارے لئے سب غیر بنگالیوں کو مارنا ممکن نہیں۔ مگر ان کے دل میں دہشت پھیلانا ممکن ہے۔ اس لیے جو قابو میں آئیں انہیں اتنی اذیت دے دے کر مارو کہ باقی سب غیر بنگالی خوف اور دہشت سے بھاگ جائیں۔

ایسی کہانیاں قدم قدم پر بکھری ہیں۔ یہ بذاتِ خود افسوسناک ہے۔ مگر جو حقیقت اس سے بھی زیادہ خوفناک ہے۔ وہ یہ کہ آج بھی مشرقی پاکستان کے کئی لوگ اس بربریت کی مذمت کرنے کو تیار نہیں۔ بلکہ وہ اپنے آپ کو اس کے باوجود مظلوم گردانتے ہیں۔ سیاسی سطح پر نہیں بلکہ تشدد کی سطح پر بھی ——— چند لوگوں نے اسے ضرور بُرا بھلا کہا ہے مگر بہت بڑی تعداد صوبائی تعصب سے اتنی اندھی ہوگئی ہے کہ ان کو یہ کوئی ظلم نظر نہیں آتا۔ بلکہ اُلٹا فوج کو مطعون کرتے ہیں کہ انہوں نے ظلم کیا . . . .

. . . .

آج صبح سے ایک سوال میرے ذہن میں بار بار اُٹھ رہا ہے۔ کیا یہ بربریت جس کا مظاہرہ بنگالی قومیت کے نام پر کیا گیا۔ محض ایک وقتی جذبہ تھا یا اس کا مغربی پاکستان کے لوگوں کے کردار سے کوئی مستقل تعلق ہے؟ اور پھر جس طرح پاکستان کو توڑ کر بنگال کو ہندوستان کے مطیع کرنے یا ہندوستان کے ساتھ الحاق کی سازش کی گئی۔ کیا یہ بھی ایک عارضی جذبہ ہے یا اس کی بھی گہری جڑیں جذبات یا نفسیات میں ملتی ہیں۔

اس سوال کے مناسب جواب کے لئے مشرقی پاکستان کے خطّے کی پرانی ہسٹری کا سنجیدگی سے گہرا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ ویسے اپنی زندگی میں مجھے بین مثالیں ملی ہیں۔

سب سے پہلے ۱۹۴۶ کے فسادات تھے۔ جب پورے برعظیم میں ہندو مسلم فسادات پھیلے تھے تو سب سے زیادہ بربریت کا مظاہرہ بنگال اور بہار کے فسادات میں ہوا تھا۔ (اخباری خبروں کے مطابق) خصوصاً نواکھالی میں۔ پھر تین سال پہلے جب صدر ایوب کے خلاف مظاہرے ہو رہے تھے۔ تو امریکہ کے اخباروں نے فوٹو شائع کئے تھے جن میں چند لوگوں کو عوام دشمن قرار دے کر درختوں کے تنوں پر میخوں سے گاڑ دیا تھا۔ حالانکہ اس وقت مقامی اور غیر مقامی کا سوال نہ تھا اور مرنے والے خالص بنگالی تھے۔ اور اب ۱۹۷۱ء میں یہ سب کچھ اس شدت سے ہوا ہے کہ ۱۹۴۶ء کے فسادات بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ اب نہ صرف یہ کہ مسلمانوں نے مسلمان کو مارا۔ بلکہ بنگالی [illegible] ساتھ ان کو مسلمان کو مارا۔ اور ہندوستان کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے اعلان کیا کہ بنگلہ دیش ا[illegible]

ہندوستان [illegible]

نفرت سے ایام میں قتل و غارت ہوتا رہا ہے۔ اور قتل انہماک سے ہے۔ مگر قتل کرنے کے عمل میں ایک لذت حاصل کرنا [illegible]

[illegible]

[illegible] زمانے کی . . . .

. . . .

جمعرات ، ۲۷ مئی ۱۹۷۱ء

سات بجے شام : صبح دفتر۔ سہ پہر آرام۔ اور اب ڈائری۔ ہمایوں سے کہہ کر روزنامہ THE PEOPLES کی فائل نکلوائی ہے یہ عوامی لیگ کا ترجمان پرچہ گنا جاتا تھا۔ اس فائل میں یکم مارچ ۱۹۷۱ء سے پچیس مارچ ۱۹۷۱ء تک کے پرچے ہیں۔ یہ پرچے کیا ہیں۔ ایس میں ملی ہوئی سیڑھیاں ہیں۔ جن پر قدم بہ قدم چڑھتے ہوئے بنگال نے علیحدگی کا مسلک اختیار کیا۔

کل رات ڈیڑھ بجے تک میں یہ اخبار دیکھتا رہا۔ جن سے لحظہ بہ لحظہ پاکستان کی وحدت کے پرخچے اڑتے دکھائی دیے۔ حتیٰ کہ چوبیس اور پچیس کی درمیانی رات کو فوج نے بالکل معجزہ طور پر بنگال کو دوبارہ فتح کر کے پاکستان کا حصہ بنایا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مجیب علیحدگی پسند نہیں تھا۔ اور بنگال بھی آزاد نہیں ہونا چاہتا تھا۔ وہ صرف ۲۳ مارچ کے شمارے کے پہلے صفحے پر ایک نظر ڈال لیں تو انھیں کوئی شک نہیں رہے گا۔ من جملہ دیگر چیزوں کے ایک خاص چیز بنگلہ دیش کا جھنڈا ہے جس کی تصویر دو کالم پر پھیلی ہے۔ اس کے نیچے درج ہے:

"A NEW FLAG IS BORN TODAY — A FLAG WITH A GOLDEN MAP OF BANGLA DESH IMPLANTED ON A RED CIRCLE PLACED IN THE MIDDLE OF A DEEP GREEN RECTANGLE BASE. THIS IS THE LATEST FLAG ADDED TO THE TOTAL LIST OF THE FLAGS REPRESENTING VARIOUS STATES AND NATIONS OF THE CONTEMPORARY WORLD. THIS IS THE FLAG FOR INDEPENDANT BANGLADESH. THIS IS THE FLAG THAT SYMBOLISES THE EMANCIPATION OF 75 MILLION BANGALESE"

جو الفاظ مجیب نے اپنے لب سے نہیں کہے وہ اس کے ترجمان نے بابانگ دہل نشر کئے۔ کیا اس اعلان کے بعد بھی ۲۵ مارچ کا ایکشن غلط اور بے معنی کہا جا سکتا ہے؟ دنیا کی کس قوم نے کس زمانے میں اپنے کسی صوبے کے خلاف ایسے اعلانات کے بعد خاموشی نہیں لیا؟ دراصل ہماری قوم تاثرات کی ٹانگوں پر چلتی ہے۔ اور نعروں کے شور پر اچھلتی ہے۔ ٹھنڈے دماغ سے کوائف اکٹھے کر کے ان سے منطقی نتائج اخذ نہیں کرتی۔ اسی وجہ سے کبھی خرد کو جنوں کہہ اٹھتی ہے۔ اور کبھی جنوں کو خرد بنا جاتی ہے مگر یہ بے چاری قوم کرے بھی کیا؟ کس حکومت نے کبھی عوام کو پورے کوائف بتاتے ہیں؟ کوئی سنکی کہہ اٹھے گا کہ جیسی روح ویسے فرشتے۔ بات یہ بھی ٹھیک ہے۔

اس فائل کے اخبار اس امر کی شہادت ہیں کہ کس طرح لوگ ایک ایک کر کے بنگلہ دیش کے نعرے میں شریک ہوئے۔

بالکل ایسے لوگوں کی طرح جو ہجوم کے سامنے اپنے آپ کو بے بس دیکھ کر اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ مختلف تجارتی فرموں نے اشتہارات میں نئی قوم۔ نئے ملک اور بنگلہ دیش جیسی اصطلاحوں کا استعمال شروع کیا ہے۔

۱۲ مارچ کے پرچے کے پہلے صفحے کے ایک چوتھائی حصے پر ایک بنک کا اشتہار ہے۔ انگریزی کے اخبار میں اشتہار کا متن بنگالی میں ہے اور بنگلہ دیش کے بہت بڑے نقشے پر سورج طلوع ہوتا دکھایا گیا ہے۔

۲۳ مارچ کے صفحہ پانچ پر اتنا ہی بڑا اشتہار ہے۔ مشرقی پاکستان کے بہت بڑے نقشے پر مجیب کا فوٹو ہے۔ اوپر جلی قلم میں لکھا ہے

"DEDICATED TO THE DEVELOPMENT OF BANGLADESH"

.. ..

.. ..

فوج نے ایکشن ۲۵ مارچ اور ۲۶ مارچ کی درمیانی رات کو کیا۔ مگر اس سے چوبیس گھنٹے پہلے جو اخبار چھپا ہے۔ وہ ۲۵ مارچ کی صبح کو مندرجہ ذیل ایڈیٹوریل کے ساتھ آتا ہے۔

"AFTER THEIR SHAMELESS AND MONSTROUS PEREORMANCE IN THE FIRST WEEK OF MARCH IT WAS EXPECTED THAT THE IRRESPONSIBLE AND WORTHLESS MEMBERS OF THE ARMY WOULD DESIST FROM FURTHER ACTIVITIES OF THE ATROCITIES. WE THOUGHT SO BECAUSE OF TWO SPECIFIC REASONS; FIRSTLY BECAUSE THE NOTORIOUS ARMY OF PAKISTAN WHICH WON ONLY TWO BATTLES IE DEFEATING THE DEMOCRACY IN 1958 AND IN 1969, HAD AT LAST FOUND ITS WATERLOO AND TRAFALGAR AT DACCA AND VARIOUS OTHER PLACES OF BANGLA DESH IN 1971 THROUGH THE INDOMITABLE SPIRIT AND UNFORESEEN RESISTANCE FROM THE PEOPLE OF BANGLA DESH .. ..

اور یہ ایڈیٹوریل اس لئے لکھا گیا کہ ایک دن پہلے چھاؤنی کے علاقے میں فوج نے کالے جھنڈے کاروں سے اتروائے تھے۔

چند اور جھلکیاں

۲۴ مارچ کا اخبار۔ بہت بڑی سرخی۔

DAWN OF A NEW ERA IN BANGLA DESH

ایک اور سرخی :-

A FLAG OF FREEDOM IS BORN WITH STAINS OF MARTYRS BLOOD

اس خبر کا متن یوں ہے ۔

"A NEW NATION IS BORN. AND WITH IT HAS BORN A NEW FLAG WITH STAINS OF MARTYR'S BLOOD—THE FLAG OF SHAWDHIN BANGLA. IN THE SERENE CALM OF THE DAWN OF MARCH 23 RD THE NEW FLAG HOISTED ATOP ALL PUBLIC AND PRIVATE BUILDINGS . . . ."

اس خبر کے پہلو میں صفحے کے اوپر کارٹون ہے جس میں سارے شہر پر بنگلہ دیش کے جھنڈے ہیں ۔ صرف قلعے میں صدر یحییٰ اور بھٹو کھڑے ہیں ۔ اور ان پر پاکستان کا جھنڈا ہے ۔ قلعے سے توپیں جھانک رہی ہیں ۔ بھٹو دوربین سے دیکھنے کے بعد صدر سے کہہ رہے ہیں ۔

SIR, I DO NOT SEE ANY SIGN OF PAKISTAN ANYWHERE ELSE

نیچے ۲۳ مارچ کی تاریخ ہے ۔

اسی صفحے پر ایک بڑی تصویر ہے جس میں طلبا بنگلہ دیش کے جھنڈے کے نیچے سلیوٹ لے رہے ہیں JAYO BANGLA BAHIN کا سلیوٹ اس اخبار کے آخری صفحے پر ہے ۔

RESISTANCE DAY IN PICTURES

کے ۲۳ مارچ کی تصویریں ہیں ۔ جو پاکستان کا قومی دن ہے مگر اس اخبار نے اسے RESISTANCE DAY کے طور پر پیش کیا ہے

ان تصویروں میں شیخ مجیب الرحمان بنگلہ دیش کے جھنڈے کے نیچے سلامی لے رہے ہیں .. ..

آج شام لطف الرحمان (ہمارا بنگالی دوست) کے ہاں چائے پر گئے ۔ یہ بہت بھلا آدمی ہے ۔ جس کی شخصیت سے خلوص اور نیک دلی کی شعاعیں پھوٹتی ہیں ۔ چاپاکستانی ہے ۔ اس محفل کی وجہ سے مشرقی پاکستان میں ہماری اجنبیت کا احساس کچھ کم ہوا ۔

پچھلے ہفتے ڈھاکہ میں دس جگہ بم وغیرہ پائے گئے تھے ۔ اور چند ایک پھٹ گئے تھے ۔ اس کے نتیجے میں فوج نے کل ایک علاقے کو گھیرے میں لے کر کچھ لوگوں کا صفایا کر دیا ۔

جمعہ، ۲۸ مئی ۱۹۷۱ء

<u>شام پانچ بجے</u> :۔ آج صبح چیف سکریٹری کے پاس میٹنگ تھی ۔ اس کے بعد کیمپ دیکھنے گئے ۔ جو ان غیر بنگالی لوگوں پر مشتمل ہے۔ جو علیحدگی پسندوں اور ہندوستانی ایجنٹوں کے جنون کا نشانہ بنے ۔ محمد پور کے علاقے میں ایک سکول میں مین کیمپ بنایا گیا ہے ۔ اور ساتھ دو چھوٹے چھوٹے کیمپ ہیں ۔ وہیں ایک ہسپتال بھی ہے ۔ ویسے تو یہ کیمپ سرکاری نگرانی میں ہے ۔ مگر عام شکایت یہ ہے کہ صوبائی حکومت جو ۹۹ فی صد بنگالیوں پر مشتمل ہے جان بوجھ کر تساہل سے کام لے رہی ہے ۔ مگر یہاں مہاجرین نے اس کمی کو پورا کیا ہے ۔ اور ہر قسم کی ایسی مدد مہیا کی ۔ جو یہاں کا بنگالی ریلیف کمشنر، سنٹرل گورنمنٹ کی فیاضانہ پیش کش کے باوجود نہیں دیتا ۔ انجمن مہاجرین کے صدر دیوان وراثت علی ہیں ۔

ہمارے پہنچنے کے وقت کیمپ کی آبادی درج ذیل تھی :۔

محمد پور کیمپ	۲۳۸۰ افراد	(۶۳۹ گھرانے)
میر پور کیمپ	۶۲۶ افراد	(۱۵۵ گھرانے)
بالغ مرد	۶۱۶	
بالغ عورتیں	۱۲۱۶	
نابالغ لڑکے	۴۲۵	
نابالغ لڑکیاں	۴۵۱	
شیر خوار بچے	۲۰۱	
یتیم	۲۷	(۱۶ لڑکیاں، ۱۱ لڑکے)

دیوان وراثت علی ساٹھ سال کے بزرگ ہیں اور نحیف ہونے کے باوجود بڑے حوصلے اور جذبے سے کام کر رہے ہیں ۔۔ ۔۔ ۔۔

۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ دیوان صاحب نے بتایا: بہشتا گانگ میں بہت تباہی ہوئی ۔ میں کافی دن بعد وہ ریسٹ ہاؤس دیکھنے گیا جو MISKAH ہوٹل کے سامنے ہے ۔ اور شہر کے سترہ ذبح خانوں میں سے ایک تھا ۔ ذبح خانے سے مراد وہ جگہ تھی ۔ جہاں غیر بنگالیوں کو لے جا کر قتل کیا جاتا تھا ۔ وہاں فرش پر خون کی پپڑیاں جمی تھیں اور مکھیوں کے ہجوم بھنبھنا رہے تھے ۔ نظارہ اتنا دلدوز اور دہشت انگیز تھا کہ میں بیہوش ہو کر گر پڑا ۔

انجمن کے اراکین سے بات چیت کے بعد ہم کیمپ میں گئے ۔ بے چارگی اور کس مپرسی کی ایسی انتہا تھی کہ الفاظ بیان نہیں کر سکتے۔ ایک ایک کمرے میں پندرہ پندرہ بیس بیس عورتیں بچے اور مرد اپنے ناکافی لباس میں فرش پر بسیرا کئے تھے ۔ نالیوں میں چونے اور ان کا دکا مہتروں کے باوجود صفائی کی حالت تسلی بخش نہ تھی ۔ مگر ہم زیادہ گھوم نہ سکے ۔ کیونکہ عورتوں کی نظروں میں سوال تھے ۔ مردوں کی آنکھوں میں طعنے تھے ۔ اور مجھے کچھ احساس گناہ سا ہونے لگا کہ ان کی مصیبت کا تماشہ دیکھنے آئے ہیں ۔ اسی وجہ سے کسی سے اس کی داستان

پوچھنے کی بھی ہمت نہ پڑی۔ حالانکہ ان میں سے بیشتر کے چھوڑے کی طرح پھٹ پڑنے کو تیار تھے۔

ایک کمرے میں چند معصوم بچے تھے۔ جن کا اب کوئی سہارا نہ تھا۔ ماں۔ باپ۔ بھائی۔ بہن سب مارے گئے تھے۔ بچوں کی عمریں چار ماہ سے پانچ چھ سال تک تھیں۔ چند نیک دل عورتیں ایک دو بچوں کو دودھ پلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ بچے اس قدر سہمے ہوئے تھے کہ نہ تو کوئی رو رہا تھا اور نہ ہنس رہا تھا۔

ہسپتال کا حال بھی غیر تسلی بخش تھا۔ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق زیادہ تر SERIOUS کیس تو ٹھیک ہو کر جا چکے تھے۔ مگر ابھی کئی بری حالت میں تھے۔ چند لوگوں نے زیادہ متاثر کیا تو میں نے کیمرے سے ان کی تصویریں بھی لیں۔ مثلاً

۱۔ رابعہ سہراب بازار کی خاتون ہے۔ جوان عمر ہے۔ کوئی ۱۵ برس کی۔ کندھے پر کلہاڑی کے زخم اور ہنسلی کی ہڈی ٹوٹی ہوئی۔ زخم تو اب ٹھیک ہو رہے تھے۔ مگر بھرے پرے گھر لٹنے کے سہمے ہوئے لوگ اب کہاں سے واپس ہوں گے۔

۲۔ سہراب بازار ہی کے چار بھائی تھے۔ ماں باپ دونوں مارے گئے تھے۔ ایک شدید زخمی تھا۔ عمریں تین سال سے آٹھ نو سال تک کی ہوں گی۔

۳۔ میمن سنگھ کے عزیز الحق کے ہاتھ کی ساری انگلیاں ٹوکے سے کاٹ دی گئی تھیں اور کمر پر چھروں کے تیرہ نشانات تھے۔ اس کے بھی سارے گھر والے مارے گئے تھے۔

۴۔ بارہ سالہ شمیم بھی میمن سنگھ کا تھا۔ سر پر کہ از خم پٹی میں چھپا تھا۔ اور اس کے اندر وہ دماغ تھا جو اب چل گیا۔ لڑکا صدمے سے نیم پاگل تھا اور باپ لاپتہ تھا۔

کیمپ سے واپسی پر میرے ذہن میں بار بار یہ سوال اٹھتا تھا کہ صوبائی عصبیت میں بنگال کے لوگ انسانیت بلکہ حیوانیت کی حدوں کو بھی پھلانگ گئے اور قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ یہ اس پر نادم نہیں۔ بلکہ ان کی آنکھوں میں کچھ اور کرنے کی دبی دبی تمنا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ موقع ملتے ہی یہ پھر وہی کچھ کریں گے۔ ان کے اندر کا جذبہ صرف سویا ہے۔ مرا نہیں۔

میں سوچتا ہوں ہندو کتنا ہوشیار اور چالاک نکلا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں اس کی تلواریں ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ تو اس نے اُس کامیابی سے علاقائی تعصب اور صوبائیت کا بیج بویا کہ مسلمان خود مسلمان کا گلا کاٹنے لگ گیا۔ اور وہ انسان دوستی کا نعرہ لگا کر اب ہم پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔

مگر افسوس یہ ہے کہ مغربی پاکستان والے ابھی تک ہندو کی چال سے سبق نہیں لے سکے۔ بلکہ جو کچھ آج سے پانچ سال پہلے یہاں ہوتا رہا ہے وہی اب وہاں بھی ہونے لگا ہے اور جو آج یہاں ہو رہا ہے۔ خدانخواستہ پانچ سال ادھر نہ ہونے لگے۔ اور یہ بعید از قیاس اس لئے نہیں کہ ہم نے اپنی نئی نسلوں کو کبھی یہ بتانے کی کوشش نہ کی کہ پاکستان بنانے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ وہی نسلیں جب بڑی ہوتی ہیں تو ہندو کے اس پروپیگنڈے میں پھنس رہی ہیں کہ تقسیم ہند غیر ضروری تھی اور پاکستان کا بنانا غیر ضروری تھا۔

آج کا نظارہ ایک عبرت آموز سبق تھا کہ نظریاتی اساس رکھنے والی قوم کا یقین متزلزل ہو جائے۔ تو وہ اپنے ہاتھوں اپنا

چاک گریبان کرتی ہے ۔ اور دامن دریدہ کرتی ہے ۔ اور اُس کے دشمن۔ نہ صرف اُسی پر ہنستے ہیں بلکہ گلی کے آوارہ لڑکوں کی طرح پتھر مار مار کر لہولہان کر دیتے ہیں ۔

آٹھ بجے شام :۔ شام کو اظہر کے ہاں گئے (جو بنگالی ہے ۔ اور ہماری سروس کا ہے) کافی لوگ چائے پر مدعو تھے ۔ ادھر ادھر کی باتوں سے وقت ٹل رہے تھے کسی میں ہمت نہ تھی کہ اس سلسلے پر بات کرتا جو اس ملک اور قوم پر نہ صرف گزرا ہے بلکہ گزر رہا ہے ۔

ہماری قوم کی پرانی عادت ہے کہ حقیقتوں سے گریز کرتی ہے ۔ حالات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کر سکتی ۔ میدانِ جنگ میں بہادر ترین قوم ہونے کے باوجود عام زندگی میں بزدل ترین قوم ہے ۔ جو سچ کہنے اور سچ سننے کا حوصلہ نہیں رکھتی ۔ اور اخلاقی جرأت سے ایک دم خالی ہے ۔

ہفتہ ۲۹ رمئی ۱۹۷۱ء

صبح بارہ بجے تک گورنر ہاؤس میں ہفتہ وار میٹنگ میں مصروف رہا ۔ شام کے قریب انجمن مہاجرین کے صدر ، دیوان وراثت علی ملنے آئے ۔ (ساتھ ان کا لڑکا بھی تھا ۔ جو جگن ناتھ گورنمنٹ کالج میں اردو کا لیکچرر ہے) اور جنرل سکرٹری عبدالودود بھی تھے ۔ . . . .

. . . مشرقی پاکستان میں اکا دکا واقعات ہو رہے ہیں ۔ کہیں بم ۔ کہیں سرکاری خوراک کی لوٹ مار ۔ کہیں ریلوے کے ڈبوں کی چوری اور کہیں فائرنگ وغیرہ ۔ چار روز پہلے ڈھاکہ میں جو بم حبیب بنک کی بلڈنگ میں پھٹا تھا ۔ وہ بنک کے ڈرائیور نے رکھا تھا ۔ غالباً اسے کوڑوں کی سزا ملے گی ۔

اتوار ۔ ۳۰ رمئی ۱۹۷۱ء

کوئی دس بجے کے قریب دو اصحاب ملنے آئے ۔ تعارف کرایا ۔ کہ دیوان وراثت علی نے بھیجا ہے ۔ جن سے میں نے درخواست کی تھی کہ میں ایسے لوگوں سے ملنا چاہتا ہوں جو اس قتل و غارت کے عینی شاہد ہوں ۔

یہ دونوں حضرات کیمپ میں ٹھہرے ہوئے ہیں ۔

نثار احمد صاحب پچاس برس کے دھان پان مہاجر ہیں ۔ یوپی سے ۱۹۴۷ء میں مشرقی پاکستان آئے ۔ اور ایمن سنگھ میں اپنی چھ لڑکیوں اور دو لڑکوں کے ساتھ رہتے تھے ۔ ریلوے گارڈ تھے ۔ ان کی کالونی میں صرف دو گھر بہاریوں کے تھے ۔ مگر ذرا فاصلے پر نیو کالونی NEW COLONY تھی ۔ جس میں پندرہ بیس بہاری گھرانے تھے ۔

نثار صاحب نے بتایا ۔

"نیو کالونی میں میری بھانجی کا شوہر رہتا تھا ۔ مشرقی پاکستان کے قیام کے دوران ہم سب لوگوں کی خواہش اور کوشش تھی کہ

بنگالیوں میں ان ہی کا حصہ بن کر رہیں۔ میری دو نوں لڑکیوں نے دسویں کا امتحان بھی بنگالی میڈیم میں دیا تھا۔ مگر یہ سب کچھ ہمارے کسی کام نہ آیا۔

"فروری میں جلوس نکلنے شروع ہو گئے تھے۔ ان کے انداز خوفناک ہوتے۔ ہمارے گھر کے سامنے سے گزرتے تو نعرہ لگاتے "بنگلہ چھوڑ دو" اس وقت ہمارے ہمسائے اور دوست بھی غیر جانبدار بنے رہتے۔ شہر کے پرلے کنارے پر ایک سڑک کے قریب فوجیوں کا پڑاؤ تھا۔ یہ جلوس وہاں تک جاتے اور ان کی بے عزتی کرتے۔ مگر وہ خاموش رہتے۔

"۱۶ اپریل کی رات کو بہت تناؤ تھا۔ ہم سہمے ہوئے تھے۔ میں نیو کالونی میں اپنی بھانجی کے خاوند کے پاس مشورہ کرنے گیا۔ تو دور سے گولیوں کی آواز سنی۔ ہم خوش ہوئے کہ شاید فوج آ گئی۔ مگر تھوڑی دیر بعد امن کمیٹی کے لوگ آ گئے اور انہوں نے بتایا کہ محلہ تشائی پاڑا (بہاریوں کی کالونی ۔۔۔ آبادی آٹھ ہزار) پر حملہ ہوا ہے۔ آدھی آبادی صاف ہو گئی ہے۔ اور تھوڑی دیر میں باقی بھی ختم ہو جائے گی۔ اس لئے آپ لوگ بھاگ جائیں۔

انہوں نے بتایا کہ "فوج کی کمین ناکہ بندی کر کے ان کا راشن بند کر دیا گیا ہے"۔

"میں بھاگ کر اپنے کوارٹر میں آیا۔ اور سب ماجرا گھر والوں کو سنایا۔ بچے رونے لگے۔ کوئی دعا کرنے لگا۔ کوئی قرآن پڑھنے لگا۔ مگر رات کو ہم کہاں جا سکتے تھے۔ بہت پریشانی میں جوں توں کر کے رات کاٹی۔ صبح ہم نے بنگالی ہمسایوں کی منت کر کے مدد مانگی۔ مگر ان میں سے کوئی بھی پناہ دینے کو تیار نہ تھا۔ حیرت اس بات کی تھی کہ ان میں سے بھی بیشتر اپنے بیوی بچوں کو شہر سے باہر گاؤں وغیرہ میں بھجوا رہے تھے۔

"صبح دس بجے پھر گولیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم لوگ دعا مانگتے رہے کیونکہ اس کے علاوہ اور کچھ کر نہ سکتے تھے۔ مدد دینے کو کوئی تیار نہ تھا۔ نکل کر کہیں جا نہ سکتے تھے۔ اُن کے علاقے میں ہم بھاگ کہاں سکتے تھے۔

"ایک دفعہ سجدے میں گرا دعا مانگ رہا تھا۔ تو اچانک خیال آیا کہ جن بنگالیوں نے اپنے بچوں کو باہر بھجوا دیا ہے۔ اور ان کے کوارٹر خالی پڑے ہیں۔ کیوں نہ وہاں جا کر چھپ جائیں۔ اگر چپکے سے بھاگ کر وہاں پہنچنے تک کامیاب ہو گئے۔ تو شاید فوج کے آنے تک بچ سکیں۔

"میری چھوٹی بچی چار سال کی تھی۔ اس کو رونے سے روکنے کے لئے ہم نے روٹیاں اٹھائیں۔ اور چپکے سے قریب کے ایک کوارٹر تک پہنچ گئے۔ یا تو کسی نے ہمیں جاتے ہوئے دیکھا نہیں۔ اور اگر دیکھا تو ترس کھا کے چپ ہو رہا ہوگا۔

"ہم اپنی پناہ گاہ میں سے ایک سوراخ سے دیکھ سکتے تھے۔ گولیوں کی آوازیں قریب آنے لگیں۔ اور ساتھ مرنے والوں کی چیخیں بھی سنائی دیں۔ تو ہم سوراخ میں سے دیکھنے لگے۔

"اتنے میں سینکڑوں آدمی بندوقیں۔ رام داؤ۔ بلم اور بانس وغیرہ اٹھائے آئے اور ہمارے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ کواڑ کا دروازہ توڑ دیا۔ جی بھر کر ہماری آنکھوں کے سامنے لوٹا۔ اور پھر دوسرے مہاجر کے مکان کی طرف چلے گئے۔

"اب ہم میں دیکھنے کی ہمت نہ تھی۔ نہ ہی معلوم ہو سکا کہ ان لوگوں کا کیا حشر ہوا۔ ویسے ابھی تک کسی کیمپ میں یا ڈھاکہ میں

نظر نہیں آئے۔ یقیناً مارے گئے ہوں گے۔

"جہاں ہم چھپے ہوئے تھے۔ وہاں سامنے ایک میدان تھا۔ جس میں دو آدمی مشین گن لگا کر جم گئے۔ اور باقی سامنے والے سیدھے راستہ پر چلے گئے۔ مشین گنوں کا رخ بھی اسی راستے کی طرف تھا کہ اگر لوگ وہاں سے بھاگ کر آئیں تو انھیں مشین گن سے گولی مار دی جائے۔ یہ راستہ ایک بہاری کالونی کو جاتا تھا جو ٹکیا پاڑا (TIKIAPARA) کہلاتی تھی۔

"تھوڑی ہی دیر بعد اس کالونی سے متواتر گولیوں کی آوازیں آنے لگیں کبھی کبھار ہوا کے چلنے سے چیخوں کی آوازیں بھی سنائی دیتیں۔ فائرنگ تین گھنٹے تک جاری رہی۔ پھر ہم نے دیکھا کہ وہ لوگ بہت سی عورتوں کو مویشیوں کی طرح ہانک کر لائے اور میدان میں بسوں میں بٹھا کر کہیں لے گئے۔

"شام ہوئی۔ بھوک پیاس سے برا حال تھا۔ مگر خاموشی سے چھپے رہنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔ رات اسی طرح کانٹوں پر کاٹی۔

"اگلے دن بھی مسلح گروہ اس میدان میں بار بار آتے رہے اور مختلف اطراف میں جتھوں کی شکل میں جاتے رہے۔ ہم دن بھر سانس روک کر انھیں دیکھتے رہے اور اندر ہی اندر لرزتے رہے۔ اگلی رات بھی ویسی کٹی۔

"رات کو بھوک پیاس سے دو تین دفعہ بچی روئی۔ جسے ہم نے بڑی مشکلوں سے خاموش کرایا۔ مگر لوگوں کو شک پڑ گیا۔ اور وہ صبح کے وقت مختلف کوارٹروں میں تلاش کرتے رہے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ ہماری پناہ گاہ تک بھی پہنچے۔ اور باہر کھڑے ہو کر آپس میں مشورے کرتے رہے۔ مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ہمارے کوارٹر میں نہیں آئے۔ اور دوسری طرف چلے گئے۔

"ان ہوں توں کر کے کاٹا۔ اور رات کے وقت ہم اسی کالونی کے ایک اور خالی کوارٹر میں چلے گئے۔ جو کسی بنگالی کا تھا۔ میری لڑکیوں نے آپس میں فیصلہ کیا کہ سب خودکشی کر لیں۔ مگر میرے سمجھانے پر رک گئیں۔ لیکن اس شرط پر کہ ہم لوگ وہاں سے کہیں اور چلے جائیں۔ اور عورتیں وہیں رہیں۔ کیونکہ ابھی تک یہی دیکھا تھا کہ وہ صرف مردوں کو مار رہے تھے۔ اس لئے مردوں کا جان بچانا ضروری تھا۔

"چنانچہ عورتوں کو وہیں چھوڑ کر ہم باپ بیٹے رات کی تاریکی میں چل دیئے۔ اور قریب ہی دوسرے کوارٹر میں جا کر چھپ گئے۔ صبح تک پیاس سے برا حال تھا۔ حالانکہ گندے نالے کا پانی اوک سے پیتے رہے تھے مگر پھر بھی اس وقت پیاس نے بے تاب کر دیا۔ تو ہم اسی کالونی کے ٹیوب ویل پر چلے گئے۔ وہاں جا کر ہمیں غلطی کا احساس ہوا مگر اب کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے پچاس ساٹھ لوگ ہمارے گرد جمع ہو گئے۔ مگر وہ مسلح نہ تھے۔

خوش قسمتی سے ان میں سے ایک بنگالی ہمارا جاننے والا تھا۔ وہ ہمارا ہاتھ پکڑ کر مجمع سے باہر لے آیا۔ اور تھوڑی دور مسجد میں لے گیا۔ پھر ہماری درخواست پر وہ کالونی میں واپس گیا۔ اور کوئی دو گھنٹے بعد ہمارے گھر کی عورتوں کو بھی مسجد میں لے آیا۔

مسجد میں سینکڑوں لوگ تھے۔ وہیں میری بیوی کے بھائی کے بیٹے ملے، بھائی مارا گیا تھا۔ اسی طرح نیو کالونی میں میری بھانجی کا خاوند بھی مارا جا چکا تھا۔ مگر وہاں وہ حشر کا عالم تھا کہ کوئی کسی کو تسلی نہ دے سکتا تھا۔ اور ہر شخص آنے والے لمحات کے خوف میں غرق تھا۔

کئی ایک دن بنگالی لوگ مسجد میں کھانے کی چیزیں بھجوا رہے تھے۔ اور بنگالی امام مسجد بڑی جانفشانی سے لٹے پٹے لوگوں کی

خدمت کر رہا تھا۔ کئی بنگالی غنڈے وہاں بھی پہنچے اور امام مسجد کو دھمکایا کہ ان لوگوں کو مسجد سے باہر نکال دے۔ مگر وہ نیک مسلمان تھا اور اس نے ہر بار انکار کر دیا۔ بلکہ وہ یہاں تک ڈٹا رہا کہ چاہے اسے مار دیں مگر وہ ان بے سہارا لوگوں کو لقمۂ اجل بننے کے لئے باہر نہیں نکالے گا۔

"۲۳ تاریخ کو فوج آنے کی اطلاع ملی۔ تو ہم نے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ شور سن کر فوج ادھر پہنچ گئی اور ہمارا حال دیکھ کر بہت سے فوجی بے اختیار رو پڑے پھر انہوں نے بندوبست کیا اور تین تاریخ کو بذریعہ ریل ہم لوگ ڈھاکہ پہنچے۔

"جن دنوں ہم مسجد میں تھے تو وہاں آپس میں بات چیت سے پتہ چلا کہ شانتی پاڑا میں ایسٹ پاکستان رائفلز اور پولیس والوں نے قتلِ عام کیا تھا۔ ہندو بھی ان کے ساتھ تھے۔ اور ادھر اُدھر بھی ہندو نشان دہی کرتے تھے کہ فلاں جگہ بہاری رہتا ہے۔

"میری بیوی کا بھائی مولوی آدمی تھا۔ اس کے گھر میں ایک دم دو سو کے قریب ایسٹ پاکستان رائفلز کے فوجی گھس آئے۔ گھر میں پانچ لڑکیاں اور دو لڑکے تھے جن میں سے ایک بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

"باپ کو بیوی بچوں کے سامنے گولی ماری۔ وہ زخمی ہو کر گر پڑے اور کلمہ پڑھنے لگے تو ایک ہندو بولا" سالے یہ کیوں پڑھتا ہے۔ بولو مجیب الرحمان زندہ باد۔"

"پھر دوسرے لڑکے کو بھی سب کے سامنے مار ڈالا۔ اور عورتوں سے کہا کہ تم مسجد میں جاؤ۔

نثار محمد صاحب کی بات ختم ہوئی تو وہ لمبا سانس لے کر نڈھال سے ہو گئے۔ اور کرسی کی ٹیک پر تقریباً گر پڑے۔ میں ان کی سخت جانی پر حیران ہوا اور اپنی سنگ دلی پہ نادم ہوا کہ ان کی داستانِ مصیبت کو بغیر آنسو گرائے رقم کر رہا ہوں۔ پھر خیال آیا جب کسی خطے میں عناصر کی ترتیب یوں الٹ جائے کہ زندگی گراں اور موت ارزاں ہو جائے تو روایتی جذبات کے دھارے بھی کند ہو جاتے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں جب اخوت نے نفرت کا چولا بدلا۔ اور رحم اور رواداری اللہ کو پیارے ہوئے تو حالات کا جائزہ لینے والی آنکھ کو بھی خشک ہی رہنا چاہیے۔ اگر وہ نمناک ہوئی تو منظر دھندلا جائے گا۔ اور صحیح حالات قلم بند نہیں ہو سکیں گے۔

اس عذرِ گناہ سے اپنے آپ کو جھوٹی تسلی دینے کے بعد میں دوسرے صاحب کی طرف متوجہ ہوا یہ اعجاز احمد خان صاحب تھے۔ عمر انیس برس۔ پولی ٹیکنیک میمن سنگھ کے طالب علم۔ مگر والد بھیراب بازار میں سکونت پذیر تھے۔ جہاں وہ ریلوے میں FUEL CHECKER کا کام کرتے تھے۔ اور ان کی اولاد دو لڑکے اور چار لڑکیاں تھیں۔ سکول بند ہونے کے باعث اعجاز صاحب بھی بھیراب بازار میں ہی اپنے والدین کے پاس تھے۔

اعجاز احمد خان نے بتایا۔

"بھیراب بازار میں دو جنوری ۱۹۷۱ء سے ہی جلوس نکلنے لگے تھے۔ جس سے دن بدن کھچاؤ پیدا ہوتا گیا۔ ہماری ریلوے کالونی میں پانچ سو کے قریب کوارٹر تھے۔ جن میں سے تین سو اردو بولنے والے گھرانے تھے اور باقی دو سو کے قریب بنگالی خاندان تھے جیسے جیسے جلوسوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ اور ان کے مُوڈ میں شدت ہوئی۔ ہماری کالونی میں کھچاؤ بڑھتا گیا۔ ہم لوگ زیادہ تر سہمے ہوئے تھے۔ کہ ہم میں سے کسی کے پاس ہتھیار وغیرہ تھے۔

"۲۵ مارچ کو کنگ جارج ششم ریلوے پل پہ رنگ و روغن ہو رہا تھا کہ وہاں کام کرنے والے مزدور عوامی لیگ کے لیڈروں کے

کسانے پر اکٹھے ہو گئے اور انہوں نے ہماری کالونی پر حملہ کر دیا۔ بعد میں اندازہ ہوا کہ یہ حملہ ایک خاص مقصد کے تحت تھا۔ اور اس سے ان کا ارادہ قتل و غارت نہ تھا۔ وہ ایسے معلوم ہوا کہ جن لیڈروں نے ان کو اکسایا تھا۔ وہی ہمیں بچانے آ گئے اور ہمیں مشورہ دینے لگے کہ ایسے حملوں سے بچنے کے لئے آپ لوگ کیمپ میں منتقل ہو جائیں۔ ہمیں اندازہ ہو گیا کہ ہماری غیر موجودگی میں یہ ہمارے گھروں کو لوٹنا چاہتے ہیں۔ اس لئے ہم نے انکار کر دیا۔"

"اگلے دن پھر حملہ ہوا اور حملہ کرنے والوں میں اکثریت رام داؤ۔ بلم اور کلہاڑیوں سے مسلح تھی۔ انہوں نے ایک شخص کو مار دیا۔ مگر مزید نقصان سے پہلے عوامی لیگ کے لیڈر پہنچ گئے اور کہا کہ اگر آپ لوگ کیمپ میں نہیں جائیں گے تو یہ لوگ آپ کو مار ڈالیں گے اور ہم آپ کی حفاظت نہ کر سکیں گے۔ چنانچہ مجبوراً ہم لوگ مان گئے۔

"کیمپ پانچ عمارتوں پر مشتمل تھا۔ جن میں سے ایک عمارت یونائیٹڈ بنک کی تھی اور دوسری مسلم کمرشل بنک کی۔ دونوں بنکوں کو پہلے ہی لوٹ لیا گیا تھا۔ کیمپ میں کوئی سولہ سو لوگوں کی نفری تھی جس میں پانچ چھ سو مرد تھے۔

"کیمپ میں ہمیں باہر گھومنے پھرنے کی خاصی آزادی تھی۔ ہم شہر بھی جا سکتے تھے۔ اپنے گھروں سے جا کر چیزیں بھی لا سکتے تھے اور بعض لڑکے چھپ چھپا کر سینما بھی دیکھ آتے تھے۔ عوامی لیگی لیڈر ہمیں تسلیاں دیتے تھے کہ آپ لوگ فکر نہ کریں۔ کچھ نہ ہو گا۔ آپ دیکھ لیں آپ کے گھروں کی بھی ہم حفاظت کر رہے ہیں۔ پولیس کے اوسی نے ایک بنگالی کو رائفل دے کر ہمارا چوکیدار مقرر کیا تھا۔ اور ہم سب لوگ اسے پانچ روپے روزانہ دیا کرتے تھے۔"

"چودہ اپریل کو دو ہوائی جہاز نیچی پرواز کرتے ہوئے ہماری بستی کے اوپر سے گزرے تو نیچے سے ایسٹ پاکستان رائفل والوں نے مشین گنوں سے ان پر فائرنگ کی۔ اسی دن ہمارا چوکیدار غائب ہو گیا۔ اور ہم نے دیکھا کہ عوامی لیگ کے تمام کارکن اور لیڈر بھی چپکے سے غائب ہو گئے ہیں۔

"شام چھ بجے کے قریب عوامی لیگ کے چند لیڈر آئے اور کہا کہ پاک آرمی قریب آ گئی ہے۔ اس لئے آپ لوگوں کو ہم یہاں سے لے جانا چاہتے ہیں۔ ہمارے استفسار پر انہوں نے کہا کہ آپ کو آشو گنج منتقل کرنا چاہتے ہیں جو قریب ہی ہے۔ مگر ہم نے انکار کر دیا۔ اور دل میں خوش ہوئے کہ پاک فوج کے آنے سے ہماری مصیبت ختم ہو جائے گی۔

"لیکن تھوڑی دیر بعد ہی بہت سے لوگ رائفلوں، مشین گنوں اور برین گنوں سے مسلح ہو کر آ گئے۔ ان میں ہمارے جانے پہچانے لوگ بھی تھے۔ اور کئی ایک تو ہمارے کلاس فیلو تھے۔ ان کی قیادت وہی عوامی لیگی لیڈر کر رہے تھے۔"

انہوں نے کہا کہ آپ کو جانا پڑے گا۔ باقی چار کیمپوں سے لوگ روانہ ہو چکے ہیں اور اگر آپ ہماری بات نہیں مانیں گے تو ہم سب کو قتل کر دیں گے۔

"مجبوراً ہم سب لوگ چل دیئے۔ عورتیں بچے بھی ساتھ تھے۔ ہمیں دریا کے کنارے لے گئے۔ یہاں بڑی بڑی لانچیں کھڑی تھیں۔ چلتے چلاتے رات ساڑھے نو بج گئے۔ اور جب سفر شروع ہوا تو آشو گنج کو چھوڑ کر لانچیں آگے نکل گئیں۔ ہم نے احتجاج کیا تو عوامی لیگ والے ہمیں گالیاں دینے لگے اور کہا کہ اپنے منہ بند رکھو۔

" سات دو بجے کے قریب ہمیں پالی شہر کے قریب اتارا۔ اور پھر ازسرِ نو لانچوں میں سوار کر دیا، مگر ایسے کہ مردوں کو ایک لانچ میں اور عورتوں کو دوسری میں۔ ہماری لانچ میں پانچ چھ سو مرد اور لڑکے تھے۔ اور کوئی پینتیس کے قریب مسلح عوامی لیگی تھے۔

" ہم لڑکوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ عوامی لیگی تھوڑے سے ہیں۔ ان کو قابو کر کے بے بس کر دیا جائے اور ان کے ہتھیار لے لئے جائیں۔ مگر بزرگوں نے منع کر دیا۔ اور اس وجہ سے ہم رہ گئے۔ ویسے ہم سب لوگ بالکل نہتے تھے۔

" وہاں سے رات اڑھائی بجے کے قریب واپس روانہ ہوئے۔ اور صبح پانچ بجے آشوگنج پہنچ گئے۔ انہوں نے ہمیں لانچوں سے اتارا اور سب کو پیدل چلا کر ریلوے سٹیشن لے گئے۔ وہاں جا کر ٹرین میں بٹھا دیا۔ مگر ایسے کہ عورتیں الگ ڈبوں میں اور مرد الگ ڈبوں میں۔

" ہم نے دیکھا کہ سٹیشن کے دونوں طرف بہت سے مورچے بنے تھے اور مسلح لوگ بہت زیادہ تعداد میں گھوم رہے تھے۔

" وہیں افواہ سنی کہ بھراب بازار میں پاک فوج پہنچ گئی ہے۔ اور ہمیں امید بندھ چلی کہ شاید وہ یہاں جلدی پہنچ جائیں۔

" اب ہماری گاڑی میں ایسٹ پاکستان رجمنٹ اور بنگال رجمنٹ کے لوگ بھی بیٹھ گئے اور صبح ساڑھے چھ بجے گاڑی چل دی۔ ان لوگوں نے وردیوں کے نیچے سویلین کپڑے پہنے ہوئے تھے اور ساڑھے دس بجے کے قریب جب ہماری گاڑی برہمن باڑیہ کے سٹیشن پہ کھڑی تھی اور یہ لوگ پلیٹ فارم پر تھے۔ تو جیٹ ہوائی جہازوں کی آواز سن کر انہوں نے فورا وردیاں اتار کر چھپا دیں۔ ہوائی جہاز گزر گئے تو انہوں نے دوبارہ وہی وردیاں سویلین کپڑوں پر پہن لیں۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ یہ اصل فوجی نہیں ہیں۔ بلکہ ہندوستانی ہیں۔ جو اس طرح وردیاں پہن کر دھوکا دے رہے ہیں۔

" اس سارے عرصے میں جب یہ ہمیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں کچھ بھی کھانے کو نہیں دیا۔ بلکہ کہیں کہیں تو پانی بھی نہیں پینے دیتے تھے۔ اس وجہ سے صبح کے وقت بہت سے بچے اور عورتیں ایسی تھیں جن کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ ہمیں ساڑھے تین بجے تک برہمن باڑیہ رکھا۔ مگر اس اثنا میں سٹیشن پر سے کسی خوانچے والے کو قریب نہیں آنے دیا۔

" چار بجے کے قریب سب مسلح لوگ جو ایسٹ پاکستان رائفلز کی وردی میں تھے چلے گئے اور جاتے ہوئے لوگوں سے کہہ گئے کہ وہ ہندوستان جا رہے ہیں۔ اب ان کی جگہ بہت سے لوگ عام پبلک کے آ گئے۔ ان کی تعداد تین چار سو سے بھی زیادہ ہو گی۔ اور ہم نے دیکھا کہ انہوں نے کپڑوں میں ہتھیار چھپائے ہیں۔ ویسے کئی لوگ کھلم کھلا بھی بندوقیں اٹھائے تھے۔

" اب ہماری گاڑیاں پلیٹ فارم سے دور ہٹا دی گئیں اور سٹیشن کے غیر آباد حصے میں جہاں سامان وغیرہ لادا جاتا ہے۔ گاڑی کھڑی کر کے انجن روانہ کر دیے۔

" اب ان لوگوں نے گاڑی کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ اور حکم دیا کہ سب کھڑکیاں دروازے بند کر دیں۔ بعد ازاں ایک کمپارٹمنٹ کھلا اور لوگوں سے کہا کہ نیچے اتریں۔ سب سے پہلے ایک حافظ قرآن بزرگ نیچے اترے۔ دو چار آدمیوں نے آگے بڑھ کر انہیں گرایا اور انہیں کس لیا۔ پھر ایک آدمی نے آگے بڑھ کر بکرے کی طرح انہیں ذبح کر دیا۔

" اس کے بعد یہ ایک ایک کر کے لوگوں کو گاڑی سے اتارتے۔ اور کسی کو گولی مار دیتے۔ کسی کو بانسوں سے مار دیتے۔ کسی کو رام داؤ یا کلہاڑی سے قتل کرتے۔ چاروں طرف لوگوں کا گھیرا تھا۔ جو بھاگنے کی کوشش کرتا اسے گولیوں سے چھلنی کر دیتے۔

"جب ہمارے ابا نے سب بچوں کو الوداعی بوسہ دیا اور نیچے اترنے کی تیاری کرنے لگے تو مجھ سے اور دوسرے بھائی سے برداشت نہ ہو سکا۔ ہم نے ابا سے کہا کہ اس طرح مرنے سے کیا فائدہ۔ کیوں نہ ہم مل کر ان پر حملہ کریں اور کوشش کر کے ان سے ہتھیار چھین لیں۔ اگر مریں گے تو چند ایک کو تو مار کر مریں گے۔"

"اور لڑکوں نے بھی میری ہاں میں ہاں ملائی۔ اور ہم چند جوان لڑکے حملہ کرنے کے ارادے سے گاڑی سے نیچے اترے۔

" زمین پر پاؤں رکھتے رکھتے پہلی گولی میرے کان کے پیچھے لگی اور میں گر پڑا۔ دوسری کندھے سے چھلتی ہوئی گئی۔ پھر شاید میرے باقی ساتھی بھی کود پڑے۔ تو انہوں نے مشین گن سے باڑھ مار دی۔

"گولیوں کی اس بارش میں ایک اور گولی میری کلائی میں لگی۔ اور میں بے ہوش ہو گیا۔

" تھوڑی دیر بعد ہوش آیا تو گولیوں کی آواز کو ل رہی تھی میں نے اٹھنا چاہا تو اٹھ نہ سکا۔ اس وقت مجھے پانی پینے کی بہت شدید خواہش ہوئی۔ تو مجبور ہو کر وہ خون پیا۔ جو میرے بازو کے قریب زمین کے نشیب میں اکٹھا ہوا تھا۔ اس میں یقیناً میرا اپنا خون بھی ہو گا۔ اور میرے عزیز و اقارب کا بھی۔

" اب وہ لاشیں کھینچ کھینچ کر ایک جگہ اکٹھی کرنے لگے اور پھر ڈھیر بنانے لگے۔ مجھے بھی اسی ڈھیر میں ڈال دیا گیا اور میں نیچے دب سا گیا۔ تنگ آ کر میں نے خودکشی کی کوشش کی۔ مگر ہاتھ کام نہ کرتا تھا۔ اور میں وہیں پڑا رہا۔

" تھوڑی ہی دیر بعد ان کا ارادہ بدل گیا اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ ڈھیر کی بجائے ان لاشوں کو تالاب میں پھینک دیں۔ چنانچہ وہ اٹھا اٹھا کر ادھر پھینکنے لگے۔ جب میری باری آئی تو انھیں شک پڑا کہ میں زندہ ہوں۔ مجھے ٹٹولا۔ کچوکے دیے تو یقین ہو گیا کہ مرا نہیں۔ اس پر ایک نے کہا کہ اسی طرح سسک کر مر جانے دو۔ مگر دوسرے نے مذاق میں میرے کان کے پاس بندوق کی نالی رکھ دی اور ہوائی فائر کر دیا۔

" میں دل کر جو اچھلا۔ تو وہ بانسوں سے مجھے پیٹنے لگے۔ میرے منہ سے خون بہنے لگا۔ اور میں بے ہوش ہو گیا۔ انہوں نے مجھے مردہ سمجھا اور تالاب میں پھینک دیا اور اوپر دھان کے توشوں سے ڈھک دیا۔

" رات دو بجے کے قریب مجھے ہوش آئی۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ میں نے گربیوں یا باتوں کی آواز سننے کی کوشش کی مگر کچھ کان میں نہ پڑا۔ البتہ اتنا اندازہ ہو گیا کہ میرے چاروں طرف کتے منڈلا رہے ہیں۔ اور لاشوں کو کھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

" میں نے آواز دی کہ کوئی زندہ ہے؟"

" حیرت کی بات ہے کہ جواب میرے والد صاحب نے دیا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے تمہاری آواز پہچان لی ہے اور اگر تم میں کچھ طاقت ہے تو یہاں سے چلے جاؤ۔

" میں نے ان کی حالت پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ دو گولیاں لگی ہیں۔ ایک گردن میں اور ایک گلے میں۔ اس کے علاوہ گردن کٹی بھی ہوئی ہے۔

وہ غالباً یہ باتیں کہتے کہتے ہی فوت ہو گئے۔ کیونکہ میں بہت دیر تک آواز دیتا رہا۔ مگر ان کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔

"ایک اور آواز البتہ آئی۔ یہ بھی جوان سے لڑکے کی تھی جس نے بتایا کہ اس کا نام قیوم ہے۔ اور اس نے یہ بھی کہا کہ دونوں مل کر بھاگ چلیں۔

"مگر مجھ میں ہمت نہ تھی۔ اس سے پہلے دو تین بار میں نے اٹھ کر والد صاحب کے پاس جانے کی کوشش کی تھی۔ مگر ہر دفعہ نقاہت سے گر پڑا تھا۔

"تھوڑی دیر بعد قیوم رینگتا ہوا میرے پاس آیا۔ اور کافی دیر بیٹھا رہا۔ پھر وہ مجھے اٹھا کر دو فرلانگ تک لے گیا۔ مگر مجھ میں نہ تو ہمت تھی، نہ خواہش۔ اس لئے میں گھسٹتا ہوا واپس آ گیا۔ اور گھر والوں کی لاشیں شناخت کر کے ان کے پاس لیٹ گیا۔

"میرے گھر والوں میں سے ایک بھی زندہ نہیں بچا — مرد۔ عورتیں اور بچے سب ختم ہو گئے۔

"تھوڑی دیر بعد قیوم پھر واپس آ گیا۔ اور اس کے سمجھانے کے بعد ہم دونوں بہراب بازار کی طرف چل دیئے۔ ہمارے کپڑے بالکل پھٹ کر چیتھڑے بن گئے تھے۔ اس لئے انہیں پھینک کر اب ہم صرف انڈر ویئر پہنے ہوئے جا رہے تھے۔

"آشوگنج کے قریب پاک فوج مل گئی۔

"انہوں نے ہمیں ہینڈز اپ کرنے کو کہا۔ میرے ساتھی نے تو کر دیئے۔ مگر میں ہاتھ اٹھا نہ سکتا تھا۔ پاک فوج کو دیکھ کر ہمیں جتنی خوشی ہوئی تھی۔ اتنی ہی اب مایوسی ہوئی۔ کیونکہ وہ ہمیں ایسٹ پاکستان رائفلز کے آدمی سمجھ رہے تھے اور ہمارے بار بار کہنے کے باوجود ان کا شک دور نہ ہوتا تھا۔

"وہ ہمیں ایک جھونپڑی میں لے گئے۔ وہاں ایک میجر بیٹھا تھا۔ ہم نے اسے بھی اپنی دکھ بھری داستان سنائی۔ مگر وہ کہنے لگا یہ سب بہانہ سازیاں ہیں۔ اور ہمیں قید کرنے کا حکم دے دیا۔

"رات بھر ہم قید رہے۔ ہم نے پانی مانگا۔ مگر پاک فوج کو خود پانی راشن میں مل رہا تھا۔ اس لئے انہوں نے ہمیں پانی دینے سے انکار کر دیا۔

"ان کے پاس ڈاکٹر بھی نہ تھا۔ چنانچہ صبح ان کے ساتھ مارچ کرتے ہوئے ہم لوگ آشوگنج آئے۔ وہاں انہوں نے ہم سے مفصل پوچھ گچھ کی۔ تو ان کا شک دور ہوا اور پہلی دفعہ انہوں نے ہمیں بستر پہ لٹایا۔ دوسرے دن ان کے سٹاف نے مجھے ATS کا ٹیکہ لگایا۔

"بالآخر سترہ تاریخ کو فوج نے مجھے رہا کر دیا۔ میں پیدل بہراب بازار گیا۔ وہاں سے ریلوے سٹیشن گیا۔ وہاں پر پاک فوج کے ایک ڈاکٹر مل گئے۔ جنہوں نے پہلی دفعہ مجھے پٹی باندھی اور اس طرح میں ۱۹ تاریخ کو پھر اسی کیمپ میں واپس پہنچ گیا جس میں پہلے بنگالیوں نے رکھا تھا۔ مگر اس وقت اور اس وقت میں کتنا فرق تھا۔

"اس ساری ٹرین میں ہم دو جوان لڑکے (قیوم سمیت) اور سترہ بچے بچ گئے تھے۔ جن کی عمریں سات سال سے کم تھیں۔ باقی سب مارے گئے تھے۔"

اعجاز احمد خاموش ہو گئے۔
مگر جب وہ بول رہے تھے تو غالب کے مصرعے کے مطابق ہر بن مو سے دم ذکر خوناب ٹپکنے والا معاملہ تھا۔ اور اب جب خاموش ہوئے تو سکوت بھی چیخ اٹھا کہ

آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا

سوموار، ۳۱ مئی ۱۹۷۱ء

تین بجے بعد دوپہر۔ دفتر سے واپسی پر ابھی آرام کرنے کے لئے لیٹ ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ معلوم ہوا دیوان وراثت علی نے دو اور اصحاب بھیجے ہیں۔ ایک محمد ادریس ہے۔ جو سراج گنج میں بی اے فائنل کا طالب علم تھا۔ اور دوسرا انور قادری ہے جو اس کا کلاس فیلو تھا۔ مگر پہلے سرگودھا کیڈٹ کالج میں تعلیم پاتا رہا تھا۔ بعد ازاں ایئر فورس میں شامل ہو گیا تھا۔ مگر کسی وجہ سے معطل ہو گیا۔ اب معاملہ صدر مملکت کے پاس اپیل کی شکل میں زیر غور تھا۔ دریں اثنا اس نے کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔

محمد ادریس ضلع پبنہ میں سراج گنج میں رہتے تھے۔ ان کے والد محمد اسلام صاحب ریلوے میں ملازم تھے۔ جن کی کل اولاد چھ لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ اپنے بیان کے دوران وہ بار بار شدت جذبات سے رک جاتے اور ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ اس لئے ان کا بیان کتنے ہی وقفوں بعد مکمل ہوا۔

محمد ادریس صاحب نے بتایا۔

"میرے ایک بھائی ڈھاکہ میں ریلوے میں ملازم تھے۔ ایک شادی شدہ بہن دیناج پور میں تھی اور ایک راج شاہی میں۔ دو بھائی بھی شادی شدہ تھے جن کی بیویاں ہمارے ہی پاس سراج گنج بازار میں تھیں۔ سراج گنج میں ہمارا کنبہ والدین۔ پانچ بھائیوں۔ آٹھ بچوں اور دو بہوؤں پر مشتمل تھا۔

"ہم لوگ ریلوے کالونی میں رہتے تھے۔ یہاں سات سو گھروں میں سے صرف پچاس گھر غیر بنگالیوں کے تھے۔ باقی سب بنگالی تھے۔ ہمارے ہاں فروری اور مارچ کے مہینے بغیر کسی بڑے واقعے کے گزر گئے۔ مگر کھچاؤ بہت تھا، اور بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کی آپس میں گالی گلوچ بھی ہو جاتی تھی۔

"پچیس مارچ کے بعد مارشل لاء والوں نے حکم دیا کہ سب لوگ ہتھیار جمع کرائیں۔ اس حکم کی پابندی مقامی حکام نے بنگالیوں سے تو نہ کرائی۔ البتہ تمام غیر بنگالیوں کو بار بار کہنا شروع کیا کہ وہ اپنا اسلحہ پولیس کے حوالے کر دیں۔ بالآخر مسٹر شمس الدین سب ڈویژنل مجسٹریٹ نے پولیس کو حکم دیا کہ ان کا اسلحہ لے کر مکتی باہنی کو دے دیا جائے۔ اور یار ڈر مارشل لا کے حکم کی تعمیل کے پردے میں جاری کیا گیا۔ پولیس نے تلاشیاں لے کر اسلحہ لیا اور کھلم کھلا مکتی باہنی کے لیڈروں کو دے دیا۔ تلاشی کے دوران باورچی خانے والی چھریاں۔ ریڈیو اور گھڑیاں تک لے گئے۔ ہم نے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ ممکن ہے ان گھڑیوں میں وائرلیس یا ٹرانسمٹر ہوں۔"

"۲۹ مارچ تک پولیس کے مختلف گروپ ہماری تلاشیاں لیتے رہے۔ اور جب ہماری سب چیزیں لے چکے تو کہا کہ اب آپ

لوگوں کو حفاظت کی ضرورت ہے کیونکہ آپ نہتے ہیں۔ اس لئے اپنے گھروں سے نکل کر ایک جگہ کیمپ میں آجائیں۔ ہمارے انکار کے باوجود انہوں نے ہمیں زبردستی مجبور کر دیا اور بالآخر ۲۹ کی شام کو انہوں نے ہمارے غیر بنگالی پچاس گھرانے ریلوے کلب میں منتقل کر دیئے شہر کے باقی حصوں سے بھی غیر بنگالی وہیں ہانک کر لائے جاتے رہے۔ اسی طرح ساڑھے پانچ سو کے قریب مرد عورتیں اور بچے وہاں اکٹھے ہو گئے۔

"اسی رات ساڑھے گیارہ بجے ریلوے کلب سے روانہ کر کے ہمیں صالحہ گورنمنٹ گرلز ہائی سکول میں لے گئے۔

"تیس تاریخ کا دن بہت بے چینی سے گزارا۔ کیونکہ ہر طرف پراسرار سے مشورے ہوتے نظر آتے تھے مگر ہمیں کوئی نہ بتاتا تھا کہ ہمارے ساتھ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں۔

"اکتیس مارچ کو لوگوں نے باقاعدہ بغاوت کر کے جیل سے سب قیدیوں کو رہا کرا لیا اور پھر سب مل کر اڑھائی بجے سہ پہر کے قریب ہمارے کیمپ پر حملہ آور ہوئے۔ یہ ہجوم کوئی بیس ہزار لوگوں کا تھا۔ جن میں سے زیادہ تر رام داؤ۔ بلم۔ لاٹھی اور بندوقیں اٹھائے ہوئے تھے۔

"انہوں نے پانچ چھ لوگوں کو مار ڈالا۔ اور بیس پچیس کو زخمی کیا۔ ابھی ان کا جنون اور بھی بڑھ رہا تھا کہ ایک ہوائی جہاز کافی نیچی پرواز کرتا ہوا ادھر آیا۔ اور اس نے دو ایک چکر شہر کے لگائے۔ اس پر وہ سب بھاگ گئے۔ اور چہ میگوئیاں کرنے لگے کہ کیمپ میں کسی کے پاس وائرلیس ہے اور اس نے ہوائی جہاز کو بلا لیا ہے۔

"شام کو عوامی لیگی آ گئے اور کہا کہ ہم راضی نامے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ آپ کی اور بنگالیوں کی صلح ہو جائے اور اسی چیز کے انتظام کے لئے انہوں نے ہمیں جیل میں منتقل کرنا شروع کیا۔ ساری رات یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اور اگلے دن صبح چار بجے تک جاری رہا۔

"بارہ تاریخ تک ہم سب لوگ وہیں رہے۔ اس عرصے میں کوئی قابل ذکر واقعہ نہیں ہوا۔ سوائے اس کے کہ ہم لوگ طرح طرح کی افواہوں سے گھبرائے رہتے تھے۔ اور بنگالی جان بوجھ کر یہ افواہیں چھوڑ جاتے تھے تاکہ ہم پریشان ہوتے رہیں۔

"تیرہ تاریخ کی رات کو گیارہ بجے انہوں نے اعلان کیا کہ چونکہ شہر میں امن ہے اس لئے آپ لوگ جا سکتے ہیں۔ چنانچہ ہم واپس کالونی کو روانہ ہوئے۔

"مگر جب کالونی میں پہنچے تو ہمارے بنگالی ہمسائے ہمیں اپنے گھروں میں جانے نہ دیتے تھے اور اصرار کرتے تھے کہ ہم واپس جا کر عوامی لیگ کے لوگوں سے آرڈر لے کر آئیں کہ ہم گھروں کو جا سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ ساری رات ہم نے میدان میں کاٹی۔ بالآخر صبح پانچ بجے کے قریب اجازت ملی۔ اور ہم گھروں میں گئے۔

"مگر گھروں کا حلیہ ہی عجیب تھا۔ وسیع پیمانے پر لوٹ پڑ چکی تھی اور اتنی صفائی کی تھی کہ فرش پر تسمہ تک نہ تھا۔ جن گھروں پر ٹین کی چھتیں تھیں۔ وہ بھی اتار لی تھیں۔

"پندرہ تاریخ کو رات کے آٹھ بجے سارے شہر میں ہر غیر بنگالی کے گھر پر حملہ ہوا۔

"ہمارے گھر کوئی دو سو بنگالی گھس آئے۔ وہ سب مسلح تھے۔

"ہمارے بھائی اور بھابیاں ادھر ادھر دوسرے گھروں میں چھپی ہوئی تھیں۔ صرف امی اور ابا گھر تھے اور ان کے پاس صرف ایک

صندوق تھا جو جیل سے ہم لوگ واپس لائے تھے۔ وہ لے لیا۔ مگر انہیں قتل نہیں کیا اور چلے گئے۔ مگر دوسرے گھروں میں انہوں نے دل کھول کر قتل و غارت کیا اور یہ قتل عام صبح دس بجے تک جاری رہا۔ جس میں نصف سے زیادہ بہاری مارے گئے۔

" صبح دس بجے پھر عوامی لیگی لیڈر آ گئے اور کہنے لگے کہ آپ لوگ یہاں محفوظ نہیں۔ اس لئے جیل کی بلڈنگ میں واپس چلے چلو۔ جو کچھ رات بھر ہمارے ساتھ ہوتا رہا تھا۔ اس کے بعد ہمیں بھی اس میں عافیت نظر آئی کہ وہاں چلے جائیں۔ چنانچہ سولہ اپریل کو ہم ادھر چلے گئے۔

" میرے علاوہ گھر کے سب لوگ چلے گئے۔ اور میں ایک بنگالی دوست کے گھر چھپ گیا۔ ویسے میں اکیلا ہی نہیں تھا کئی نیک دل بنگالیوں نے دوسرے لوگوں کو بھی چھپایا۔ اور اس کوشش میں اپنی جان گنوائی۔ کیونکہ اگر کوئی بنگالی کسی غیر بنگالی کو پناہ دیتا ہوا پکڑا جاتا تو مکتی باہنی والے غیر بنگالی کے ساتھ بنگالی کو بھی مار ڈالتے۔"

" چھبیس اپریل کو مکتی باہنی والوں نے خزانہ لوٹا۔ اور پھر ایک ہجوم جیل کی طرف گیا۔ وہاں جاکر بہاریوں پر بہت زیادہ مقدار میں گیس پھینکی گئی جس سے زیادہ تر لوگ نیم بے ہوش ہوگئے۔

" پھر وہ مردوں کو قتل کرنے لگے۔ عورتوں اور بچوں کو قتل تو نہیں کیا۔ مگر جیل کے کنوئیں میں پھینکتے گئے۔ پھر ان پر پٹرول ڈالا اور ان لوگوں کو آگ لگادی۔ مردوں میں سے بھی بعض مرے نہیں تھے بلکہ گھائل پڑے تھے۔ جب وہ ذرا ہلتے تھے تو کمرے کی دیواروں پر اور فرش پر پٹرول ڈال کر آگ لگادی۔ شام چھ بجے آگ لگائی اور دس بجے تک سب کو مار ڈالا۔

" یہ محض ایک معجزہ تھا کہ دو مرد اور دو چار عورتیں بچ گئیں۔ ان ہی میں سے ایک میرا بھائی محمد اختر ہے۔ جو بری طرح جھلس گیا اور اب ہسپتال میں زیر علاج ہے۔ اسی طرح میری والدہ بھی بچ گئیں۔ مگر وہ بھی آگ میں بری طرح جل گئی ہیں اور زیرِ علاج ہیں مگر اب امید نہیں کہ زیادہ دن زندہ رہ سکیں۔

" اسی رات کو ساڑھے چار بجے پاکستانی فوج وہاں پہنچی۔ مگر اس وقت تک سب کام ختم ہوچکا تھا۔ اسی رات وہ نیشنل بنک لوٹ چکے تھے۔

" میری دیناج پور والی بہن کا خاوند بھی وہیں مارا گیا تھا۔ اب اپنے کنبے میں سے بچنے والے ہم تین ہی افراد ہیں۔ جن میں سے دو ہسپتال میں زیرِ علاج ہیں۔"

ادریس صاحب کی داستانِ الم ختم ہوئی۔ تو میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ اب مشرقی پاکستان میں بہاریوں کا مستقبل کیا ہے۔ خون کے رشتے دو قسم کے ہیں۔ ایک خون ملانے والے جن سے انسانیت پروان چڑھتی ہے۔ دوسرے خون بہانے والے جن سے صرف نفرت ابھرتی ہے۔ چوبیس سال میں پہلی قسم کے رشتے نہ بن سکے۔ مگر چار پانچ سال میں دوسری قسم کے رشتے اس شدت سے قائم ہوئے کہ اب بہاریوں کے لئے

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ

ہر بہاری کی داستان اس فقرے پر ختم ہوتی ہے کہ پھر پاکستانی فوج آگئی اور نجات ملی۔ ان کے خیال میں سیلاب بلا ختم ہوچکا ہے۔ مگر کیا واقعی ختم ہوچکا ہے؟

نوکِ سناں کے نیچے تڑپنے والے اس کی چیک نادر پڑتے ہی خوش ہو گئے۔ مگر اس ہاتھ کو نہیں دیکھتے جس نے متھیار تھاما تھا۔ ملک دشمن عناصر اور ہندوستان کی ملی بھگت کہاں خاموش بیٹھے گی خصوصاً اگر ہمارے طوں میں تیل نہ ہوا۔

دوسرے صاحب انور سلطان نادری تھے۔ یہ بھی سراج گنج کے تھے اور بی اے فائنل ایر کے طالب علم تھے۔ انہوں نے پاکستان ائیر فورس سکول سرگودھا سے ۱۹۶۵ء میں سینیئر کیمبرج کیا تھا۔ اور پھر رسالپور میں PAF اکیڈیمی میں کیڈٹ بھی تھے۔ اب سراج گنج کالج میں نیشنل کیڈٹ کور کی تنظیم کر رہے تھے۔

ان کی کہانی سولہ مارچ سے شروع ہوتی تھی۔ جب یہ سب ڈویژنل مجسٹریٹ کی کچہری کے پاس سے گزر رہے تھے۔ وہاں کچھ لوگوں کا ہجوم تھا جن میں زیادہ تر ہندو تھے۔ اس ہجوم نے کچہری پر سے پاکستان کا جھنڈا اتارا۔ اس پر تھوکا۔ پاؤں تلے روندا اور پھر جلا دیا۔

انور سلطان نادری نے اعتراض کیا تو ان سے جھگڑا ہو گیا اور یہ مشکل اپنی جان بچا کر بھاگے۔ اس دن کے بعد شر پسند عناصر اور خاص طور پر ہندو ان کی جان کے دشمن بن گئے۔ مگر عوامی لیگ کے چند لیڈروں نے انھیں اپنے گھر میں پناہ دی اور یہ محفوظ رہے۔

اس واقعہ سے چند ہی روز پہلے ایک اور واقعہ بھی ہوا تھا۔ ایک دکان پر قائداعظم کی بڑی سی تصویر لگی تھی اور مارچ کے شروع کے دنوں میں ایک ہندو لڑکے نے وہ تصویر اتار کر سر بازار پھاڑی اور پھر پاؤں تلے روندی۔ نادری صاحب کو خبر ملی تو انہوں نے جا کر اُس ہندو کی پٹائی کی۔ اس پر مسلمان بنگالی لڑکوں نے نادری صاحب کو زدوکوب کیا۔

انور سلطان نادری نے ان واقعات کی تصدیق کی جو ادریس صاحب بتا چکے تھے اور کہا۔

"جب شہر کے سب بہاریوں کو جیل کی بلڈنگ میں لے گئے تو میں بھی انہی میں تھا۔ مجھے انہوں نے پاور ہاؤس کی بلڈنگ سے لیا تھا۔ جہاں میں اپنے خاندان کے ساتھ رہتا تھا۔ میرے بھائی بجلی گھر میں ملازم تھے۔ اور وہاں کے ملازمین میں تین خاندان بہاریوں کے تھے۔ جن کے کل افراد چھبیس تھے۔ دو قوم کے بعد چار سو کے قریب مسلح لوگوں نے ہمارے گھروں کا محاصرہ کر لیا اور زبردستی ہمیں لے گئے۔

"میں چونکہ کیڈٹ کور کی تنظیم کر رہا تھا اس لئے میں نے وہاں مردوں اور جوان لڑکوں کو خفیہ انداز میں منظم کرنا شروع کیا تاکہ ہم ان کا مقابلہ کر سکیں اور مرنے سے پہلے چند ایک کو مار بھی سکیں۔ مگر ہم میں سے کسی نے ان کو اطلاع کر دی۔ آپ جانتے ہیں مسلمانوں میں غداروں کی کمی کبھی بھی نہیں رہی۔

" مگر اس اطلاع کا فائدہ یہ ہوا کہ انہوں نے سب کو رہا کر دیا اور جب چند دن بعد دوبارہ لوگوں کو جیل کی عمارت میں لے گئے تو مجھے دانستہ نہیں لے گئے۔ بلکہ چھوڑ گئے۔

"ہم تینوں خاندان بجلی گھر کے احاطے میں ہی چھپے رہے۔ اور ان کے ہجوم ہم تک آنے کی جرأت نہ کرتے تھے کیونکہ ہم نے پاور ہاؤس کے ارد گرد گیارہ ہزار کلوواٹ والی بجلی دوڑا دی تھی۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ پاور ہاؤس کے باقی بنگالی ملازمین بھی سچے پاکستانی تھے اور ہماری ہر طرح سے مدد کرتے تھے۔ مگر حیرت کی بات تھی کہ ہمارے وہ کلاس فیلو جو کالج میں ہمارے خاص

دوست تھے۔ اب ہجوم کے ساتھ آتے تو ہمارے جانی دشمن بنے ہوئے تھے۔ لیکن خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ میں ان کے شر سے محفوظ رہا۔

منگل وار۔ یکم جون ۱۹۷۱ء

نو بجے رات: مارشل لاء حکام نے نیا ضابطہ M.L.O ۱۲ نافذ کیا ہے۔ جس کے تحت کوئی بھی سرکاری ملازم پاکستان کے کسی بھی حصّے میں یا پاکستان سے باہر ملازمت کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔

آج جب دفتر جاتے ہی میں نے ایک نوٹ لکھا کہ اس آرڈر کا اطلاق یونیورسٹیوں، کالجوں اور سکینڈری بورڈوں پر بھی کیا جائے۔ مقصد یہ تھا کہ تعلیم کے میدان میں وطن دشمن عناصر کا زور توڑا جائے۔ جن لوگوں کے خلاف شرارت کی شہادت موجود ہے۔ ان کے خلاف تو باضابطہ کارروائی ہو سکتی ہے۔ لیکن جن کی سرگرمیاں تو قابلِ اعتراض ہیں اور شہادت ناکافی ہے۔ ان کو مغربی پاکستان تبدیل کر دیا جائے۔ ویسے میں نے اپنے نوٹ میں یہ مقصد نہیں لکھا۔ صرف یہی درخواست کی تھی کہ اس کا اطلاق SEMI-AUTONOMOUS BODIES پر کر دیا جائے . . . .

. . . . —

سہ پہر کو واپس آیا تو بریگیڈیئر قادر صاحب کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ جن سے صبح فون پر بات ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ پہنچ گئے . . . . —

بریگیڈیئر قادر صاحب پندرہ اپریل کو مشرقی پاکستان آئے تھے۔ اور پھر ادھر اُدھر گھوم کر حالات کا جائزہ لیتے رہے۔ وہ کہنے لگے

"جب میں نے چٹاگانگ دیکھا تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مارچ کے شروع میں اصفہانی جوٹ مل کی کلب میں عورتوں اور بچوں کو قتل کیا گیا تھا۔ وہاں میں نے خون کے چھینٹے دیکھے۔ ایک دیوار پر بچے کا سر پٹخنے کے نشانات دیکھے۔ کیونکہ کھوپڑی کے اندر سے مغز نکل کر دیوار پر چپکا تھا۔ عورتوں کے تار تار برقعے دیکھے۔ ایک چھوٹی بچی کا نیا پراندہ دیکھا جسے وہ شاید ابھی تک استعمال بھی نہ کر سکی تھی اور بالآخر ایک بچے کی کتاب دیکھی جس میں ہرن کی تصویر تھی۔ یہ وہی کتاب تھی جو میرا بچہ لاہور میں اپنے سکول میں پڑھتا ہے۔ میں نے کتاب اٹھائی تو اس پر مجھے خون کے دھبے نظر آئے۔ مجھے یوں لگا کہ یہ میرے اپنے بچے کا خون ہے اور میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔"

قادر صاحب کے جانے کے تھوڑی دیر بعد اجمل آ گئے۔ کراچی سے آئے تھے۔ پشاور سے ایک روز پہلے فون پر بات کر چکے تھے۔ تب جا کر اسے میرا خط مل گیا تھا۔

بدھوار۔ ۲ جون ۱۹۷۱ء

آج صبح دفتر سے تو صبح ہی صبح چیف سیکرٹری کی طرف سے فائل ملی جس میں میرا اس والا نوٹ تھا۔ انہوں نے گورنر کو فائل بھجوانے

انہوں نے مجھ سے سوال کیا تھا کہ اس تجویز کی کیا ضرورت ہے۔

میرے دل میں تو آیا کہ خوب کھول کر صاف صاف لکھ دوں کہ مشرقی پاکستان میں ملک دشمن جذبات کو جو فروغ ملا وہ زیادہ تر ہمارے سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں ہی کی وجہ سے ہے۔ جہاں بنگالی قومیت پر غیر ضروری زور دے کر پاکستان دشمنی اور ہندوستان دوستی کی ترغیب دی جاتی ہے۔ جہاں حقائق کو موڑ توڑ کر مغربی پاکستان کے خلاف نفرت کا سمندر پھیلا دیا گیا۔ کیونکہ مغربی پاکستان نے خود بھی حقائق کو صحیح انداز میں پیش کرنے کی زحمت نہیں کی۔

اب ان اداروں کو بدلے ہوئے حالات کے مطابق از سر نو منظم کرنا چاہیے۔ اور چند لوگوں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے۔

لیکن پھر سوچا کہ چیف سیکرٹری خود بنگالی ہیں (مسٹر شفیع الاعظم) زیادہ کھری وضاحت سے چڑ کر کہیں اس تجویز کی ہی مخالفت نہ کر بیٹھیں۔ اس لئے یہی تجویز ذرا دھیمے انداز میں لکھیں اور ساتھ یہ بھی اضافہ کر دیا کہ مارشل لا کے احکام کے تحت تمام اساتذہ تعلیمی اداروں میں یکم جون سے آ گئے تھے۔ ابھی تک کی اطلاع کے مطابق واپس آنے والوں کی تعداد ساٹھ فی صد سے پچاس فی صد کے لگ بھگ ہے ممکن ہے اگلے چند روز میں اور بھی لوگ آ جائیں۔ مگر یہ یقینی ہے کہ کافی تعداد پھر بھی غیر حاضر رہے گی۔ اسی پروگرام کے مطابق دو اگست سے کلاسیں شروع ہوں گی۔ اس عرصے میں پبلک سروس کمیشن کی طرف سے نئی بھرتی کی امید کم ہے۔ کیونکہ زندگی کی ہر بری طرح بگڑی ہوئی ہے۔ اس لئے تعلیمی اداروں کی بد نظمی دور کرنے کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہاں سٹاف پورا ہو۔ چنانچہ عارضی طور پر ملک کے دوسرے حصوں سے بھی ان آسامیوں کو پر کیا جا سکتا ہے۔

اس قسم کی باتیں لکھ کر میں نے فائل واپس بھجوا دی۔

مارشل لا کے احکام کے مطابق تمام کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ کو یکم جون سے حاضر ہونا تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے مسلمان سٹاف میں سے تو کافی غیر حاضر ہیں مگر تمام ہندو پروفیسر جن کی تعداد پچیس کے قریب ہے واپس آ گئے ہیں۔ اور آتے ہی وائس چانسلر سے مطالبہ کیا ہے کہ ان کی نا طرخواہ حفاظت کے لئے مناسب بندوبست کئے جائیں۔ کچھ ایسی ہی صورت میمن سنگھ کی زراعتی یونیورسٹی میں بھی پائی جاتی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ عام تاثر کے برعکس فوج کے اقدام اتنے سخت نہیں کہ ہندو ہراساں ہو۔ بلکہ وہ اب بھی اپنی جگہ پر قائم ہے اور پاکستان کو ڈبونے کی پوری کوشش کرے گا . . . .

. . . .

آج بیٹی کا پہلا خط ملا . . . .

. . . .

جمعرات، ۳ جون ۱۹۷۱ء

آج ڈھاکہ کی سڑکوں پر سے گزرتے ہوئے خیال آ رہا تھا کہ یہی ڈھاکہ آج سے بارہ برس پہلے تقریباً اسی موسم میں دیکھا تھا۔ اب بھی

بادل اسی طرح جھوم کر آتے ہیں۔ بارش بھی ویسے ہی چھاجوں برستی ہے۔ وہی چپنی مٹی اور مساموں میں گھسنے والی وہی نمی۔ مگر ان تمام چیزوں کے باوجود کہ

گلشن میں بند وبست بہ رنگِ دگر ہے آج

یہ ڈھاکہ اب وہ ڈھاکہ نہیں۔ خدوخال وہی ہیں مگر روح بدل گئی ہے۔ فضائیں ان دیکھے کھچاؤ سے بوجھل ہیں۔ افق بے یقین ہے۔ لوگوں کے چہرے سپاٹ ہیں۔ اگر کچھ ہے تو غیریت کی نقاب جس کے آرپار دیکھنا فی الحال ناممکن ہے۔ ذہنی فاصلے جغرافیائی فاصلوں سے بھی زیادہ ہیں اور پاکستان کا تصور کراہ کر سوچتا ہے کہ

اتنا سناٹا ہے اپنا نام یاد آتا نہیں

مگر میرے خیال میں صورتِ حال ایسی نہیں کہ درست نہ ہو سکے۔ مناسب طرزِ عمل سے ابھی صبح کا بھولا گھر واپس لایا جا سکتا ہے۔ جس طرح مارچ والی بدترین صورتِ حال درست ہو گئی تھی جس میں اندرونی غداروں نے ہندوستان کے ساتھ مل کر بنگلہ دیش کی آزادی کا نعرہ لگایا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ پچیس مارچ کو جو حل کیا گیا تھا۔ وہ ہر وقت لاگو نہیں ہو سکتا۔ اور محدود فوجی ایکشن کے بعد جو فائدے حاصل ہوئے تھے۔ ان کو سیاسی انتظامی طور پر مستحکم کرنے کی ضرورت تھی۔ مگر یوں لگتا ہے کہ اس نقطے کو سمجھا نہیں گیا اور اگر اسے نہ سمجھا گیا تو جو بچے کھچے غیر بنگالی ہیں ان کو چند ماہ تک دوبارہ خون میں نہانے کے لئے تیار رہنا چاہیے۔

دفتر میں آج مولانا عبدالمنان سے ملاقات ہوئی۔ بظاہر بڑے سرگرم پاکستانی نظر آتے ہیں۔ کسی زمانے میں صوبائی مسلم لیگ کے سکرٹری تھے۔ پھر اسلامک ایڈوائزری کمیٹی کے ممبر بنے۔ اس ضمن میں علامہ علاؤالدین صدیقی سے اپنی رفاقت کا ذکر کر رہے تھے بعد جب صوبائی اسمبلی کے ممبر بنے تو تین برس ۱۹۶۲ سے ۱۹۶۵ تک محکمہ تعلیم کے پارلیمانی سکرٹری بھی رہے۔ آج کل مدرسہ ٹیچرز ایسوسی ایشن کے صدر بھی ہیں۔

ان کے خیال میں پاکستان کی بقا کے لئے ضروری ہے کہ تعلیم کے میدان میں بنیادی اصلاحات کی جائیں۔ اس کا پہلا قدم یہ ہے کہ تعلیمی اداروں کو ہندوؤں سے پاک کیا جائے۔ اس کے علاوہ اور بھی دو تجویزوں پر زور دیا۔

۱۔ مدرسہ کی تعلیم کو سکول کی تعلیم میں شامل نہ کیا جائے۔ بلکہ حسبِ سابق علیحدہ رکھا جائے۔ اور عام تعلیمی سسٹم کی طرح اتنا ہی مضبوط بنایا جائے۔ مارچ کی بغاوت میں مدرسہ کے پڑھے ہوئے طلبا ہر حالت میں پاکستان کے ساتھ رہے اور کئی بنگالی طلبا اس کوشش میں اپنی جانیں بھی گنوا بیٹھے۔

۲۔ مدرسہ میں ذریعہ تعلیم حسبِ سابق اردو رہنا چاہیے۔ اور اس بنگالی کو نہیں ٹھونسنا چاہیے۔ عوامی لیگ کا تقاضا یہ تھا کہ مدرسہ کے تعلیمی سلسلے میں بھی ذریعہ تعلیم بنگالی کر دینا چاہیے۔

دوپہر کے کھانے پر اقبال بھی تھا اور سہ پہر تک ساتھ رہا۔ شام کو کیپٹن مسرور آ گئے۔ جو پچھلے اڑھائی سال سے مشرقی پاکستان میں ہیں۔ اور کوئی ڈیڑھ برس سے ڈھاکہ میں ہیں۔ ان کے ساتھ ہم شیخ مجیب الرحمان کا مکان دیکھنے گئے۔

یہ درمیانے سائز کی صاف ستھری کوٹھی ہے۔ جس کا شاید ایک آدھ شیشہ ٹوٹا ہوا تھا اور ان تمام خبروں کا کوئی ثبوت نہ ملا کہ گھر کو

سمار کر دیا گیا تھا اور لڑائی میں کئی لوگ مارے گئے تھے ....

....

....

شام کو اجمل کے ساتھ کرنل اسلم کے ہاں گئے۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر آ گئے۔ واپسی پر دیکھا کہ راستے میں بعض مقامات پر طیارہ شکن توپیں نصب کی جا رہی ہیں۔ کیونکہ ہندوستان کی طرف سے جنگ کی دھمکیوں اور تیاریوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔

جمعہ۔ ۴ جون ۱۹۷۱ء

آج دوپہر ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں کھانا تھا۔ سنٹرل انفرمیشن سکرٹری مسٹر ونیداد خان آئے تھے۔ اور ان کی طرف سے یہ دعوت تھی۔ وہاں سے واپس آ کر ذرا دیر کے لئے لیٹا۔ اور پھر سیکرٹری کو خط لکھ رہا تھا کہ دیوان وراثت علی کی طرف سے ایک اور صاحب تشریف لائے۔ ان سے بیٹھ کر جو بات چیت کی اس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

یہ محمد احسان الحق صاحب تھے۔ جو سٹینڈرڈ بنک کے سب منیجر تھے اور ڈھاکہ میں مغل ٹولی برانچ میں کام کرتے تھے۔ ان کی عمر دن پینتالیس برس کے لگ بھگ تھی۔

انہوں نے بتایا:

"میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ڈھاکہ میں ہی رہتا تھا۔ ہمارے باقی عزیز دیناج پور میں رہتے تھے۔ ان کی طرف سے آخری خط مجھے ۱۳ مارچ کو ملا جس کے مطابق وہ سب خیریت سے تھے۔ وہاں میرے کل عزیزوں کی تعداد پچاس کے قریب تھی۔

"چند دنوں بعد ہنگاموں اور قتل و غارت کی خبریں ملنے لگیں۔ سب سے پہلے چٹاگانگ کے قتل عام کی اطلاع ملی۔ پھر میمن سنگھ کی۔ اور بعد ازاں دیناج پور کے مظالم کی اطلاع پچیس چھبیس اپریل کو ملی۔ دراصل دیناج پور میں ساری تباہی ۲۸ مارچ اور ۱۳ اپریل کے درمیان ہوئی۔

"میں یکم مئی کو میڈیکل ریلیف کی ایک ٹیم کے ساتھ شامل ہو کر گیا تھا تاکہ اپنے عزیزوں کی خبر لے سکوں۔ ہم لوگ رنگ پور تک سپیشل ملٹری ٹرین میں گئے۔ وہاں سے آگے ایک ٹرک میں سید پور تک گئے اور وہاں سے دیناج پور پہنچے۔

"شہر سے ایک میل دور چہل غازی درویش کا مزار ہے۔ وہاں ہم دو چار لوگ اچانک ٹرک سے اتر گئے کہ فاتحہ پڑھ لیں۔ اس مزار کے ارد گرد جنگلات اور باغات میں ہم نے دیکھا کہ ان میں تین عورتیں اور درجن بھر چھوٹے بچے گھوم رہے تھے جن کی عمریں دس سال سے کم ہوں گی۔ ہمیں دیکھ کر وہ خوفزدہ سے ہو کر جنگل کے اندر کی طرف بھاگے۔ مگر ہم نے اردو میں پکارا تو رک گئے۔ اور پھر چند بچے ہمارے پاس مزار میں آ گئے۔

"ہمارے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ وہ شہر نہیں جا سکتے۔ اس لئے یہاں چھپے ہوئے ہیں۔ جو چار خاندان یہاں مارے گئے ہیں۔ ہم ان کے پیچھے بچے لوگ ہیں اور دو دو روز سے بھوکے ہیں۔ جب کبھی مزار کے مجاور کے پاس کچھ کھانے کو ہوتا ہے۔ وہ ہمیں دے دیتا ہے۔

مگر اب اس کے پاس بھی کچھ نہیں۔

" ہم نے انہیں نقدی اور کھانے کا سامان دیا۔

" تھوڑی دیر بعد شہر پہنچے تو وہ بالکل ویران تھا۔ حالانکہ وہاں پچیس تیس ہزار تو بہاری ہی تھے اور بنگالی آبادی اس کے علاوہ تھی۔ کہیں کہیں بوڑھی عورتیں اور بہت چھوٹے چھوٹے بچے جنگلی جانوروں کے غول کی طرح ادھر سے ادھر جا رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ عجیب دردناک انداز میں آہ و زاری کرتیں۔ مگر ہم ان کے لئے کیا کر سکتے تھے۔ ان کے جو گھر والے قتل کر دیے گئے تھے ان کو دوبارہ لانا کسی کے بھی اختیار میں نہ تھا۔

" ہم لوگ سرکٹ ہاؤس میں گئے جہاں پاکستانی فوج تھی۔ وہاں میجر قمر الزماں انچارج کو ریلیف کے سامان کی اطلاع دی اور ہسپتال دیکھنے گئے جہاں سید پور سے بھی ڈاکٹر آ کر زخمیوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ سید پور دیناج پور سے بیس میل دور ہے اور وہاں بھی کافی بہاری تھے۔ لوگوں نے بتایا کہ وہاں بھی کئی ہزار کے ہجوم نے بہاریوں پر حملہ کیا تھا مگر پنجاب رجمنٹ کے چالیس سپاہیوں کی وجہ سے بچ گئے۔ کیونکہ ان لوگوں نے ایسٹ پاکستان رائفل کے فوجیوں کو حملے کی مہلت نہ دی اور خود پہلے حملہ کر دیا۔ ان کے انچارج کیپٹن اسی مقابلے میں مارے گئے۔ مگر ان کی قربانی کی وجہ سے نہ صرف ایسٹ پاکستان رائفلز کے لوگ بھاگ گئے بلکہ بہاریوں کا قتل عام بھی بچ گیا۔

" ایسٹ پاکستان رائفلز کے یہی لوگ جو سید پور سے بھاگ کر آئے تھے۔ دیناج پور والوں کے لئے آفت ثابت ہوئے اور انہوں نے یہاں کے قتل عام میں بھرپور حصہ لیا۔

" دیناج پور میں کنچن ندی کے کنارے ایسٹ پاکستان رائفلز کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ ان میں کچھ لوگ پنجاب رجمنٹ کے بھی تھے جو بلڈنگ کی پہلی منزل پر رہتے تھے۔ اٹھائیس مارچ کو EPR والوں نے شام چار بجے کے قریب ان پر اچانک حملہ کر دیا اور اکثریت کو قتل کر دیا۔ مگر ان میں سے چند لوگ بھاگ کر جانیں بچانے میں کامیاب ہو گئے۔ اور وہ ٹھاکر گاؤں آ گئے۔

" اس کے بعد ایسٹ پاکستان رائفلز نے شہر کو اپنے کنٹرول میں لے لیا۔ اور سول انتظامیہ بھی ان کے ساتھ مل گئی۔ تیرہ اپریل تک یہ شہر ان کے قبضے میں رہا۔ ان دنوں وہاں ہندوستانی فوجی اور سویلین کھلم کھلا آتے تھے۔ اور ہندوستانی کرنسی بھی چلتی تھی۔

" ایک دن ہندوستانی فوجیوں نے پڑھے لکھے بہاریوں کو اکٹھا کیا اور کہا کہ یہاں سب کو امن امان سے رہنا چاہیے۔ اسی مقصد کے لیے آپ امن کمیٹیاں بنائیں۔ اس سلسلہ میں ڈپٹی کمشنر کے پاس جائیں۔ تقریباً تینتیس لوگ ڈی سی کے پاس گئے۔ جو EPR کے ہیڈ کوارٹر کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ اس نے ان کو EPR کے سپرد کر دیا۔ وہ ان تمام لوگوں کو کنچن ندی کے پاس لے گئے۔ اور سب کو گولی مار دی۔ تین دن بعد یہ خبر شہر میں پھیلی تو بہت خوف و ہراس پیدا ہو گیا۔ مگر پھر شہر میں ڈھنڈورا دلوایا گیا کہ بہاری بنگالی بھائی بھائی ہیں۔ آپ لوگ اطمینان سے اپنا اپنا کاروبار جاری رکھیں۔

" دو چار روز اسی طرح گزرے تو پھر ڈھنڈورا ہوا کہ مغربی پاکستان کی فوج قریب آ رہی ہے۔ اس سے مقابلہ کرنے کے لئے اسلحہ چاہئیے۔ اس لئے سب لوگ اپنا اپنا اسلحہ جمع کرا دیں۔ اگر لوگ ان کی نیت پر شک کرتے تو وہ قرآن پر قسمیں کھاتے اور آہستہ آہستہ کبھی دلیل سے اور کبھی دھمکا کر سارا اسلحہ لے لیا۔ اس کے ساتھ ہی اسلحہ خریدنے کے بہانے تاجروں اور دیگر بہاریوں سے بلینک چیک

(BLANK CHEQUE) پر دستخط کروا لیتے۔ اور اگر کوئی پس و پیش کرتا تو کسی بہانے اسے کنچن ندی کے پاس لے جا کر قتل کر دیتے۔

"میں کافی دنوں بعد وہاں پہنچا تھا یعنی یہ واقعات مارچ اور اپریل کے تھے اور میں جائی کو گیا تھا۔ مگر اس وقت بھی کنچن ندی کے پاس ڈیڑھ میل کے علاقے میں لاشیں ہی لاشیں تھیں۔ جس کنارے پہ ایسٹ پاکستان رائفلز کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ وہ لاشوں سے پٹا پڑا تھا۔ دوسرے کنارے پر بھی لاشیں پڑی تھیں۔ مگر نسبتاً کم تھیں۔ اور لوگوں نے بتایا کہ جو نیا گروپ قتل کرنے کے لئے لاتے وہ پچھلے گروپ کے قتل شدہ لوگوں کی قبریں کھدواتے اور پھر ان کو مار ڈالتے۔ کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ باقاعدہ کرفیو لگایا گیا تاکہ لوگ گھروں سے باہر نہ نکل سکیں۔ اور پھر فرداً فرداً بہاریوں کے گھر جا کر وہاں سے لوگوں کو نکال کر کنچن ندی تک لے جاتے۔ اس طرح پہلے پٹھانوں اور پنجابیوں کو ختم کیا اور بعد میں بہاریوں کو۔

"آخری دنوں میں بہت تیزی سے قتل کئے۔ اور جن گھروں کے مرد مار دیتے ان کی عورتوں کو بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کی طرح ادھر ادھر ہانکتے پھرتے۔ کئی ہندو بھی ہندوستان سے آئے ہوئے تھے۔ اور وہ بھی ایسٹ پاکستان رائفلز کی وردیاں پہنے ہوتے۔ اور یہ عورتیں ان کو عیاشی کے لئے پیش کر دی جاتیں۔

"بارہ اپریل کو آخری دن تھا۔ اس لئے اس دن انہوں نے سب سے زیادہ قتل عام کیا اور ہمارے گھر والے بھی اسی میں مارے گئے۔ ۱۹۴۷ء میں ہمارے خاندان کے چھبیس[۲۶] افراد مرے تھے۔ اور اب پینتالیس[۴۵] مارے گئے۔

کنچن ندی پہ ایک تنگ سا پل تھا۔ وہ لوگ عورتوں اور بچوں سے کہتے کہ اس پہ سے گزرو۔ جب وہ گزرتے۔ تو دوسرے کنارے سے گولی مارتے جیسے پرندوں کا شکار کرتے ہیں۔ اور وہ تڑپتے ہوئے ندی میں جا گرتے۔ اس ساری تباہی میں ہندو اور مارواڑی پیش پیش تھے۔ ہمارے پاکستانی علاقے میں ہندوستانی فوج نے کیمپ بنا رکھے تھے۔ جہاں بہاری عورتیں لے جا کر ان کو پیش کر دیتے۔

کنچن ندی کی ریت سفیدی مائل ہے۔ میں چار مئی کو وہاں پہنچا۔ اس عرصے میں کئی دفعہ بارش ہو چکی تھی۔ مگر پھر بھی ریت پر جا بجا بڑے بڑے خون کے نشان تھے اور کئی لاشیں گڑھوں سے باہر جھانک رہی تھیں۔ لاشوں پہ گدھ منڈلا رہے تھے۔ اور کتے منہ مار رہے تھے۔ بے شمار کھوپڑیاں ادھر ادھر پڑی تھیں۔ میں نے کئی جگہ دیکھا کہ عورتوں کے ہاتھ مٹی میں سے باہر جھانک رہے ہوتے۔ ان کی کلائیوں میں ابھی تک چوڑیاں پڑی تھیں۔

میں اگلے دن سائیکل پر سارے شہر میں گھومتا رہا۔ اقبال ہائی سکول میں خندقیں عورتوں، بچوں اور مردوں کی لاشوں سے اٹی پڑی تھیں۔ اور زمین پر جا بجا خون کے دھبے تھے۔

"میری بہن اور ان کے دو بچے مجھے دیناج پور کے نیو ٹاؤن کیمپ کے بلاک نمبر ۲ میں ملے۔ میری بہن کے سسر حاجی [illegible] اسی برس کے ہیں۔ جب ان کے بیٹے کو ان کے سامنے قتل کیا گیا تو انہوں نے کہا ظالمو مجھے کیوں چھوڑتے ہو۔ مجھے بھی مار ڈالو۔ مگر EPR والوں نے کہا کہ تمہیں بھی مار دیا تو ان کو روئے گا کون۔

"بربریت کی ایسی ایسی کہانیاں سننے میں آئیں کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ کسی آدمی کو گولی مارتے۔ وہ زخمی ہو کر [illegible] اور کلمہ پڑھتا تو گالیاں دیتے اور کہتے "بولو جے بنگلہ" اگر وہ نہ بولتا تو منہ پہ پیشاب کرتے۔ حاملہ عورتوں کے پیٹ پہ کودتے کر

بیٹے اندر والے کو ماریں گے۔ پھر تمھیں ماریں گے۔ لاشوں کو رسیاں باندھ کر گلیوں میں گھسیٹتے پھرتے۔

واپسی پر میں دوسری بستی میں گھومتا رہا۔ رنگ پور میں جانی نقصان زیادہ نہیں ہوا۔ مگر گھروں کو دل کھول کر لوٹا تھا کر گاؤں میں بھی بہاریوں کو ختم کر دیا۔ نشاب گنج میں تین ہزار کی بہاری آبادی میں سے صرف پچیس ۲۵ لوگ زندہ بچے۔ وہاں ہسپتال میں مجھے ایک بچہ ملا۔ جو چار دن تک لاشوں میں دبا رہا۔ ضلع دیناج پور میں صرف پاربتی پور جنکشن نسبتاً محفوظ رہا۔ وہاں پاکستانی فوج کے آنے سے پہلے بہاریوں نے نو گھنٹے تک EPR کا مقابلہ کیا۔ وہاں صرف تیس بہاری مارے گئے جن میں ایک ہمارا بھی عزیز تھا۔

"مجھے ایک آدمی سراج گنج بازار کا بھی ملا۔ اس نے بتایا کہ پانچ چھ سو کے قریب لوگوں کو جیل میں بند کر کے ان پر پٹرول چھڑک کر اور پھر آگ لگا دی۔ جیل میں مرنے والوں میں ڈاکٹر، انجینئر اور تاجر وغیرہ سبھی قسم کے لوگ تھے۔

جب میں دیناج پور گیا تو وہاں بازاروں میں سب اشیا ہندوستان کی بک رہی تھیں۔ اور ہندوستانی کرنسی بھی عام استعمال میں تھی۔ پاکستان کے ایک روپے کے عوض ہندوستان کے چار آنے ملتے تھے۔ یہ بھی سنا کہ پچھلے دنوں ہندوستانی آ کر کئی کئی گھنٹے میٹنگیں بھی کیا کرتے تھے۔

"بنگالیوں نے دس بارہ روز پہلے اپنے بیوی بچوں کو شہر سے باہر بھیج دیا تھا۔ اور جب شہر میں پاکستانی فوج کے داخلے میں تھوڑی دیر تھی تو مختلف حصوں میں جیپ اور کاریں لوگوں کو اس طرح اٹھا کر رہی تھیں جیسے سکول کے بچوں کو بسیں گھروں سے لیتی ہیں۔ پھر سب لوگ ہندوستان چلے گئے۔"

احسان صاحب بڑی مشکل سے اپنی داستانِ غم ختم کر سکے۔ وہ اکثر گلوگیر ہو جاتے۔ بعض دفعہ کئی کئی منٹ بول نہ سکے۔ اور وہ ایک دفعہ بھی تلخ یادوں کے بوجھ تلے اپنے آپ پر ضبط کرنے کی کوشش میں کانپتے رہے۔

آج سرکاری خبروں سے پتہ چلا کہ کومیلا، چاند پور، اور باریسال کے علاقوں میں شرپسندوں کی حرکات تیز ہو رہی ہیں۔ ایک جگہ پولیس سٹیشن کو آگ لگائی اور تھانیدار سمیت پوری نفری کو اٹھا کر لے گئے۔ . . . .

. . . .

کل سے مغربی پاکستان سے پولیس فورس آنے لگی ہے۔ ہر روز دو سو آدمی ہوائی جہاز سے اتر رہے ہیں . . . .

. . . .

یہ بھی کیا دن ہیں۔ نہ صرف یہ کہ پاکستان بہت نازک دور سے گزر رہا ہے۔ بلکہ بقول کسے جنوب مشرقی ایشیا کی تاریخ کروٹ لے رہی ہے۔ ایسے موقع پر ہم لوگوں کا عین مرکز میں موجود ہونا قسمت کی خاص مہربانی لگتی ہے۔ . . . .

. . . .

بدھ۔ ۹ جون ۱۹۷۱ء

پچھلے چار دن سے ڈائری نہیں لکھ سکا۔ جب سے یہاں آیا ہوں۔ خطوط لکھنے کی رفتار بہت کم تھی۔ چنانچہ ہفتہ اور اتوار کو

کچھ عرصہ لکھے۔ بعد میں نعیم فاروقی سے ملاقات ہوئی۔ جو AFROASIAN BOOK CLUB کے روحِ رواں ہیں . . . .

. . . .

پچھلے چار دن کے واقعات میں خاص چیز وہ میٹنگ تھی جس میں یہ اعداد و شمار ملے کہ مارچ کی بغاوت کے دوران اور بعد میں ہزار کے قریب قیدی جیلوں سے بھاگ گئے۔ اور دو ہزار کے قریب حوالاتی غائب ہو گئے۔ اسی طرح پچاس کروڑ کے قریب روپیہ سرکاری خزانوں سے لوٹا گیا۔

اتوار کی شام ریڈیو سے اعلان ہوا کہ سو روپے اور پانچ سو روپے والے نوٹ ختم ہو گئے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ تمام نوٹ جن پہ بنگلہ دیش یا جے بنگلہ کسی زبان میں بھی لکھا ہو۔ قانونی کرنسی شمار نہیں ہوں گے۔ . . . .

. . . .

سوموار کی رپورٹ سے پتہ چلا کہ تعلیمی اداروں میں طلباء کی حاضری کم ہو رہی ہے۔ ابھی تک مدرسہ نظامیہ کے اداروں میں اساتذہ کی حاضری ۵۰ فی صد اور طلباء کی ۲۶ فی صد تھی۔ دوسرے سکولوں میں اساتذہ کی تعداد ۶۰ سے ۹۰ فی صد تک ہے۔ اور طلباء کی ۱۲ فی صد سے ۲۵ فی صد تک۔ عام طور پر یہ ۲۰ فی صد سے کم ہی ہے) آج سابق پارلیمانی سکرٹری برائے تعلیم سے دفتر میں ملاقات ہوئی اور انہوں نے بتایا کہ یہ صورت حال منظم پروپیگنڈے کے تحت ہو رہی ہے۔ شرپسند عناصر نت نئی افواہوں سے لوگوں کو ہراساں کر رہے ہیں اور بدقسمتی سے سرکاری سوچ لوگوں تک نہ تو روایتی ذرائع ابلاغ سے پہنچتی ہے اور نہ ہی سینہ بہ سینہ خبروں سے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ملک دشمن عناصر بڑی کامیابی سے محض افواہوں کے ہتھیار کو مؤثر طریقے سے استعمال کر رہا ہے۔

مثال کے طور پر یہ افواہیں بچوں کے والدین تک اس شکل میں جاتی ہیں کہ فوج والے بچوں کو اٹھا کر لے جائیں گے اور ان سے پوچھیں گے کہ آیا آپ کے والدین حکومت کے ساتھ ہیں یا نہیں۔ اس لئے بہتر ہے کہ بچوں کو سکول نہ جانے دیا جائے۔ اساتذہ سے کہتے ہیں کہ سکولوں پہ کڑی نظر رکھی جا رہی ہے اور اساتذہ کو اس لئے ڈیوٹی پر بلایا جا رہا ہے کہ انہیں گرفتار کرنے میں آسانی ہو۔

مولانا عبدالمنان کا کہنا تھا کہ ہم بڑی عجیب قوم ہیں، کانا پھوسی اور افواہوں کے مارے اور غلط فہمیوں کے دانستہ شکار۔ پہلے اپنے [illegible] پیدا کرتے ہیں پھر ان کو اپنے ہی ذہن میں اتنا کھنگالتے ہیں کہ وہ چھوٹے چھوٹے وسوسے شیر اور ہاتھی سے بھی بڑے ہو جاتے ہیں اور پھر ان کو یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ چنگھاڑتے ہوئے ان کی طرف جھپٹ رہے ہیں۔ . . . .

. . . .

آج صبح دورے پر نکلے۔ مشرقی پاکستان میں یہ میرا پہلا دورہ ہے۔ کمشنر ڈھاکہ سید علمدار رضا اور انسپکٹر جنرل پولیس [illegible] اے۔ کے چوہدری بھی ساتھ ہیں۔ کوئی پچاس سپاہیوں کی جمعیت بھی دو گاڑیوں میں ہمراہ ہے۔ اب شام کے وقت میں میمن سنگھ کے واپڈا ریسٹ ہاؤس میں بیٹھا ہوا یہ ڈائری لکھ رہا ہوں۔

شام کے سات بجے ہیں۔ بارش ابھی تھمی ہے۔ درختوں کے خاکے ہر لحظہ گاڑھے ہوتے اندھیرے میں گم ہوتے جا رہے ہیں۔ ہوا میں خنکی ہے۔ اور ریسٹ ہاؤس کے سامنے بہنے والا دریائے برہم پتر خاموشی سے رینگ رہا ہے۔

آج صبح ڈھاکہ سے چلے تو ٹونگی انڈسٹریل ایریا میں داخل ہوئے۔ یہ علاقہ بہت وسیع ہے اور نرائن گنج کے علاوہ ڈھاکہ کی دوسری انڈسٹریل اسٹیٹ (INDUSTRIAL ESTATE) ہے۔ یہ ساری ترقی پاکستان کی بدولت ہے۔ جب پچھلے پندرہ بیس برس میں مشرقی پاکستان کے بعض لیڈر شور کر رہے تھے کہ ہمارا استحصال ہو رہا ہے۔ تو مرکزی حکومت نہ جانے کن مصلحتوں کی بنا پر خاموش رہی۔ اور یہ نہیں بتایا کہ مشرقی پاکستان کے ترقیاتی کاموں کے اعداد و شمار کیا ہیں۔ اس مجرمانہ خاموشی کا نتیجہ آج ہم بھگت رہے ہیں کہ مشرقی پاکستان کے لوگ ہم سے بدظن ہیں۔ اور ہماری اچھی بات کو بھی شک سے دیکھتے ہیں۔

آگے چلے تو ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ پندرہ سال پہلے بنی ہوئی سڑک بھی بہت اچھی ہے اور بیشتر جگہ پُل بنا کر پانی کے بہاؤ کا مناسب انتظام کیا گیا ہے۔ یہ سڑک ہر جگہ کھیتوں کی سطح سے دس بارہ فٹ اونچی تھی۔ اور دونوں طرف جوہڑوں میں کھڑے پانی میں نیلے پھولوں کی بہتات تھی اور کہیں کہیں ناریل لگی تھی۔ کسان کندھوں کے آر پار پھیلے ہوئے گھونسے ہیٹ (HAT) پہنے چاول کی پنیری لگانے یا پٹ سن کاٹنے میں مصروف تھے۔ فصلوں کی حالت بہت اچھی تھی۔ اور اس دفعہ بھی اس کا بیشتر حصہ مکمل ہو کر کٹنے نہ چلا گیا۔ تو خوراک کی حالت تسلی بخش رہنی چاہیے۔ اس دن کومیلا کی کانفرنس میں بھی محکمہ زراعت کی طرف سے اس خیال کا اظہار کیا گیا اور آج اتنی تک پھیلے ہوئے سبز کھیت مسکرا مسکرا کر اس بات کی تائید کر رہے تھے۔

منگلا سے میمن سنگھ تک کوئی سو میل کا فاصلہ تھا۔ اور یہ تمام علاقہ گنجان آبادیوں کے نشان نظر آتے۔ زندگی نارمل انداز میں یہاں رواں تھی یعنی کھیتوں میں کاشتکار، قصبوں کے قریب بازاروں میں بیٹھنے والوں کا ہجوم، قصبوں کے شروع اور آخر میں بازاروں پر بیکار گپ بازوں کا مجمع وغیرہ وغیرہ۔ میمن سنگھ میں ساڑھے دس بجے پہنچے۔

واپڈا ریسٹ ہاؤس میں تھوڑی دیر میٹنگ کی جس میں ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر، ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز اور کمودنی (KUMUDINI) کالج کی خاتون پرنسپل شامل تھیں۔ پھر ان سب کے ہمراہ کالج دیکھنے گیا۔ جو آج کل بند پڑا ہے۔ کیونکہ غیر سرکاری کالجوں کا سٹاف یکم جولائی کو آئے گا۔ مگر طلبا کی کلاسیں ۲ اگست کو سبھی کالجوں میں اکٹھی شروع ہوں گی۔

یہ کالج ایک ہندو MR R. P. SHAHA (مانوده پرشاد شاہا) کی ٹرسٹ نے شروع کیا تھا۔ مسٹر شاہا خود اس ٹرسٹ کا مینجنگ ڈائریکٹر ہے۔ اس نے مرزاپور میں ایک ہسپتال اور سکول بھی قائم کیے ہیں۔ پرنسپل نے بتایا کہ چودہ سٹاف ممبروں میں سے دو سٹاف ممبر ہندو ہیں۔ دو بدھ مت کے ہیں اور باقی مسلمان۔ کچھ عرصہ پہلے شاہا صاحب نے ایک خاتون کو پرنسپل لگا لیا تھا جو ہندوستانی شہریت رکھتی تھیں۔ مگر کافی تگ و دو کے بعد مقامی ایڈمنسٹریشن اور مسٹر عادری انہیں بالآخر نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ شاہا کی بیوی اب بھی ہندوستانی شہری ہے گو رہتی مرزاپور میں ہے۔

وائس پرنسپل نے بتایا کہ مسٹر شاہا نے لاکھوں روپیہ عوامی لیگ کو دیا ہے اور بہت طاقتور آدمی ہے۔ پبلک کی طرف سے عرصہ سے تقاضا ہے کہ اس کالج کو گورنمنٹ لے لے کیونکہ حالات ناگفتہ بہ ہیں مگر شاہا صاحب اپنے اثر و رسوخ سے یہ تقاضا پورا نہیں ہونے دیتے۔ کالج کی حالت دیکھنے میں بھی کافی خراب تھی۔ کمروں کی دیواریں گھاس پھونس کی اور چھتیں ٹین کی تھیں۔ یہ حال پچھلے پچیس برس سے ایسا ہی ہے۔ سٹاف کو چھ ماہ سے تنخواہیں نہیں ملیں اور ان کی تنخواہیں بھی عام سکیل سے کم ہیں۔ پرنسپل نے بتایا کہ اسے ایک پیسہ خرچ کرنے کی اجازت نہیں۔ بلکہ ٹرسٹ کے دو ہندو نمائندے شیو شنکر داس اور

سارے اخراجات کو کنٹرول کرتے ہیں۔

وہاں سے فارغ ہو کر ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر کا دفتر دیکھنے گئے۔ کیونکہ رپورٹ یہ ملی تھی کہ شرپسند اسے بالکل تباہ کر گئے ہیں جس کی مرمت کے لئے گورنمنٹ کو تقریباً سات ہزار روپے کا تخمینہ بھیجا گیا تھا۔

وہاں جا کر دیکھا تو دفتر بالکل ٹھیک تھا۔ چند دروازوں کی چٹخنیاں ٹوٹی پڑی تھیں۔ لوہے کی تین الماریوں کے دروازے اتار دیے گئے تھے۔ اور فولاد کی ایک سیف توڑی گئی تھی۔ چند فائلیں اور نئی سٹیشنری غائب تھی۔

عجیب بات ہے پڑتال کرنے سے تو اندازہ ہوا کہ تخمینہ کافی بڑھا چڑھا کر لگایا گیا ہے اور اس میں ایسی چیزیں بھی شامل کی گئی ہیں جو بالکل بیکار تھیں۔ مثلاً ایک جگہ گوند کی خالی شیشی کا نقصان بھی لکھا تھا..................

وہاں سے فارغ ہو کر میں شہر کا چکر لگانے نکلا۔ ایک سڑک پر دیکھا کہ ڈسٹرکٹ فیملی پلاننگ بورڈ کی عمارت کے ساتھ والی عمارت بالکل کھنڈر پڑی تھی۔ لوگوں نے بتایا کہ اسے فوج نے ڈائنامائیٹ سے اڑایا ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ اسد الزمان (ASAD UZ ZAMAN) کا گھر ہے جو فنانس ڈیپارٹمنٹ میں جوائنٹ سیکرٹری تھا۔ میں نے وہاں اس کے دو فوٹو بھی لئے۔

ریسٹ ہاؤس میں پہنچے تو مسٹر بدیع الزمان سپرنٹنڈنٹ پولیس سے ملاقات ہوئی۔ جو بنگالی ہیں اور ان ہنگاموں میں کافی عرصہ سے وہ بیمار رہے۔ ان کی کہانی درج ذیل ہے۔

"دو مارچ سے ۲۵ مارچ تک یہاں روزانہ مظاہرے ہوتے رہتے۔ مگر عام طور پر حالات قابو میں رہے۔ ۲۷ مارچ کو ایسٹ پاکستان رائفلز نے بغاوت کر کے اپنے انچارج میجر کو سرکٹ ہاؤس میں قید کر دیا۔ انور محمود ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر جان بچا کر میرے گھر آ گیا۔ لیکن یہاں سے بھی حالات کے مخدوش ہونے کے سبب نکلنا پڑا۔ اس کے بعد وہ کبھی میرے ہاں قیام کرتے اور کبھی ڈپٹی کمشنر کے ہاں۔ بالآخر حالات کو غیر محفوظ پا کر ہم سب لوگ ستائیس اور اٹھائیس مارچ کی رات کو ساڑھے تین بجے گھر سے نکلے۔ ہمارے گروپ میں انور محمود، ڈپٹی کمشنر جلال (بنگالی) اپنی بیوی بچوں کے اور میرے بیوی بچے شامل تھے۔ ہم سب لوگ ایک پہاڑی گاؤں میں چلے گئے جو یہاں سے چودہ میل دور ہے۔ مگر اٹھائیس کی صبح کو ایسٹ پاکستان رائفلز والے وہاں پہنچ گئے اور ہم تینوں کو گرفتار کر کے ٹنگائیل لے آئے۔

"ٹنگائیل میں EPR والوں نے بتایا کہ یہاں اعلان ہو چکا ہے کہ بدیع الزمان ایم پی اے یہاں کے کمانڈر ان چیف ہیں۔ اور اسد الزمان جوائنٹ سیکرٹری فنانس ڈیپارٹمنٹ ان کے ایڈوائزر ہیں۔ اب ان کے علاوہ ٹنگائیل میں کسی کا حکم نہیں چلے گا۔ اور ان احکام کی تعمیل ایسٹ پاکستان رائفلز والے کروائیں گے۔ مقامی پولیس بھی ان کے ماتحت ہو گی۔

"انہوں نے ہمیں ایک پرانی سی بیرک میں قید کر دیا۔ اور انور محمود کو قتل کرنے لگے کیونکہ وہ مغربی پاکستانی تھا۔ مگر ہم دونوں نے بہت منت خوشامد کی۔ اور ہمارے اصرار پر وہ اپنے ارادے سے باز رہے۔ اور راسے ایک پارٹی واپس بھیج دیا۔ اس کے بعد ہم نے اسے نہیں دیکھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ مغربی پاکستان واپس چلا گیا ہے۔ مجھے صحیح علم نہیں۔

"دو تین روز بعد انہوں نے ہمیں ایک اور گھر میں منتقل کر دیا۔ عام طور پر ہمیں باہر نہیں نکلنے دیتے تھے۔ اور سخت پہرہ رکھتے تھے۔ مگر کبھی کبھار ایک پارٹی لے جاتے تھے تاکہ ہم اپنے بچوں سے مل سکیں۔

" اتنے میں ڈھاکہ میں فوج کے ایکشن کی تفصیلات ملنے لگیں ۔ مگر اس سے بہت پہلے ایسٹ پاکستان رائفلز والے اپنے کمانڈر میجر کو قتل کر چکے تھے ۔ چنانچہ اب ان خبروں کے بعد وہ ادھر ادھر گھوم کر اپنے آپ کو اور لوگوں کو پاکستانی فوج کے مقابلے کے لئے تیار کرنے لگے ۔ وہ جہاں جاتے ہمیں ساتھ رکھتے اور ہمارے نام کا پورا پورا فائدہ اٹھا کر لوگوں سے کئی احکامات کی تعمیل ڈی سی اور ایس پی کے نام سے کرواتے ۔

" وہ ہمیں سلہٹ ، حبال پور ، شیر پور اور گوریاں پور (اسدالزماں کا گاؤں) لے گئے ہر ہر جگہ ان کے ساتھ تھے اور ۲۸ مارچ سے ۱۲ اپریل تک ان کی قید میں رہے ۔ آخری دن ہم سراج گنج میں تھے اور اسدالزماں بھی ہمارے ساتھ تھے ۔ ان کی موجودگی کی وجہ سے اس دن کوئی پہرے دار ہمارے اوپر تعینات نہ تھا

" اتنے میں خبریں آنے لگیں کہ پاکستانی فوج قریب آ گئی ہے اور اسدالزماں اور ان کے خاندان کی تلاش میں ہے ۔ اس پر اسدالزماں گھبرا کر اپنی فیملی کے ساتھ فرار کی تجاویز میں مشغول ہو گیا اور ہم دونوں موقعہ پا کر باہر نکل آئے ۔ وہاں کے منتظمین کو تاثر یہ دیا کہ ہم گھر والوں سے ملنے ناگ باڑی جا رہے ہیں ۔ اور انہی کی وساطت سے ایک کشتی کا بندوبست کر کے گھاٹ پہنچے ۔

" مگر جب کشتی میں سوار ہو رہے تھے تو کہیں سے چار پانچ ہزار لوگوں کا ہجوم نمودار ہو گیا ۔ وہ بہاریوں کی تلاش میں تھے اور انہیں قتل کر رہے تھے ۔ ہماری اپنی بہت خستہ حالت تھی ۔ داڑھیاں بڑھ گئی تھیں ۔ کپڑے میلے تھے ۔ اور بعض جگہ سے پھٹ بھی گئے تھے ۔ اس سے انہوں نے سمجھا کہ یہ بہاری بھاگ رہے ہیں ۔ چنانچہ گرفتار کر کے انصار کیمپ میں لے گئے ۔ ہمیں اندر بند کر کے وہ باہر دھواں دھار تقریریں کرنے لگے کہ شکار ہاتھ آ گیا ہے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اکٹھا کیا جائے تاکہ وہ ان کی موت کا تماشا دیکھیں ۔

" ہم دونوں اندر بیٹھے یہ تقریریں سن رہے تھے ۔ جب دیکھا کہ اب پانی سر سے گزر چکا ہے تو مجبوراً ہم نے اپنے آپ کو ظاہر کیا اور بتایا کہ ہم یہاں کے افسران ہیں ۔ مگر انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا ۔ مگر میرے اصرار پر ہمیں فون کرنے کی اجازت دی ۔

" میں نے پولیس تھانہ میں فون کیا اور وہاں کا افسر انچارج ہمارے پاس پہنچ گیا ۔ اس نے ہمیں شناخت کیا ۔ اس کے علاوہ انصار کے ایڈجوٹینٹ نے ہمیں شناخت کر لیا ۔ اور اس کی درخواست پر ہم دونوں کو اسی کے حوالے کر دیا گیا ۔

" ایڈجوٹنٹ نے ہمارے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا ۔ دو تین دن اپنے پاس رکھا ۔ اور پھر ایک کشتی دے دی جس میں ہم لوگ ناگ باڑی پہنچ گئے ۔ دو تین روز وہاں رہے ۔ اور پھر منکا ئیل واپس پہنچ گئے ۔

" ہم یہاں پہنچے تو شام کو تھے ۔ مگر غلطی یہ کی کہ فوج کو فوری طور پر اطلاع نہ دی کہ ہم آ گئے ہیں اور ایسے حالات میں سے گزرے ہیں ۔ چنانچہ انہوں نے سمجھا کہ ہم باغیوں سے ملے ہوئے ہیں ۔ اور رات کے وقت ہمیں گرفتار کر لیا گیا ۔

" گرفتاری کے بعد ہمیں ڈھاکہ چھاؤنی بھیج دیا گیا ۔ جہاں تفتیش کے ساتھ پوچھ گچھ ہوئی ۔ مگر جب کچھ ثابت نہ ہو سکا تو ہمیں واپس جا کر بھیج دیا گیا ۔

" دریں اثنا ان حالات سے تنگ آ کر میری بیوی اپنے گاؤں کے لئے روانہ ہوئی مگر کشتی میں ایک دن کا سفر چودہ دن میں طے

کر کے وہاں پہنچ سکی۔

"اس تمام عرصے میں کم از کم پانچ مواقع ایسے تھے جب ہم اپنی زندگی سے بالکل مایوس ہو گئے تھے۔ اور یہ محض خدا کا کرم ہے کہ آج ہم زندہ ہیں۔"

ٹنگائیل سے اڑھائی بجے کے قریب چلے۔ راستے میں مدھوپور بازار کا پل دیکھا جو شرپسندوں نے اڑا دیا تھا۔ یہ کنکریٹ کا ایک بھاری پل تھا جو درمیان میں اڑایا گیا تھا۔ اب اس کی مرمت ہو رہی تھی اور دونوں طرف درختوں پر مچان بنا کر مسلح فوجی جوان کام کرنے والوں کی حفاظت کر رہے تھے۔

اس پل کے ساتھ ہی مدھوپور کا قصبہ تھا جس کے کچھ حصے پاکستانی فوج نے تادیبی کارروائی کے تحت جلائے تھے۔ میں نے اس کی تصویر بھی لی۔

آگے چلے تو مدھوپور جنگل میں داخل ہوئے جو آج کل گوریلوں کی پناہ گاہ بھی ہے اور ان کا مرکز بھی ہے۔ عام خبر یہ ہے کہ ہندوستانی فوجی بھی یہاں آتے رہتے ہیں۔ خاص طور پر ہندوستانی فوج کے انجینئر جو دراصل خود پل وغیرہ اڑاتے ہیں مگر نام بنگالی گوریلوں کا ہوتا ہے۔ سڑک چھ میل تک اس گھنے جنگل سے گزرتی ہے اور کوئی ساڑھے چار بجے ہم مےمن سنگھ پہنچ گئے۔ وہاں ریسٹ ہاؤس کے ساتھ وہ دریا دیکھا جس میں ستر ہ اپریل کو تنازعہ کے بعد بہاری مسلمانوں کی لاشیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے ڈالی گئی تھیں۔ اور پاکستانی فوجیوں کو بھی قتل کر کے پھینکا گیا تھا۔

شام کو سپرنٹنڈنٹ پولیس نے بتایا کہ آج سرحد کے قریب دو پل ڈائنامائیٹ سے اڑائے گئے ہیں۔ اس کا کہنا بھی یہی تھا کہ یہ کام تو بنگالی گوریلوں کا ہے۔ مگر جس ماہرانہ انداز میں یہ کام ہو رہا ہے۔ اس سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستانی فوج کے انجینئر یہ کارروائیاں کر رہے ہیں۔ ایک پل کو اس وقت اڑایا گیا جب ایک فوجی جیپ اس پر سے گزر رہی تھی اور ایک پاکستانی فوجی افسر اس میں مارا گیا۔

تھوڑی دیر بعد ایک اور خبر ملی کہ مغربی پاکستان سے جو پولیس آئی ہے۔ ان میں سے ایک گروپ کا پہلا مقابلہ کالوکھیت کے پاس ہوا جس میں باغیوں کا ایک آدمی مارا گیا۔

رات کا کھانا ڈپٹی کمشنر حسن احمد کے گھر پر تھا۔ وہیں پر ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر تسنیم اور سب ڈویژنل پولیس آفیسر خالد مسعود سے بھی ملاقات ہوئی۔ گفتگو زیادہ تر انہی واقعات پر ہوتی رہی جو چند ہفتے پہلے اس علاقے میں پیش آئے تھے۔

خالد مسعود لاہور کا رہنے والا ہے۔ اور جمال پور سب ڈویژن (ضلع میمن سنگھ۔ جمال پور شہر، میمن سنگھ شہر سے تیس میل دور ہے) میں سب ڈویژنل پولیس آفیسر تھا۔ اس نے چند باتیں سنائیں جو میں اب درج کر رہا ہوں۔

خالد مسعود نے بتایا۔

"مارچ کے مہینے میں مظاہرے ہوتے رہے۔ مگر کوئی بدنظمی نہیں ہوئی۔ پچیس اور چھبیس کی رات کو ڈیڑھ بجے کے قریب پولیس انسپکٹر نے فون کیا کہ وائرلیس پر بڑی پریشان کن خبریں مل رہی ہیں۔ اور میں گھر پر ہی آ کر زبانی بتانا چاہتا ہوں۔ چنانچہ میں نے اسے بلا لیا۔

"اس نے گھر آکر بتایا کہ پولیس کے وائرلیس پر سنا گیا کہ فوج کے چالیس ٹرک ڈھاکہ چھاؤنی سے نکلتے ہوئے دیکھے گئے ہیں اس وقت شہر میں سے گولیوں کی آوازیں آرہی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ڈھاکہ والے وائرلیس آپریٹر نے کہا کہ گولیاں میرے بالکل قریب آگئی ہیں۔ اور میں سیٹ بند کرنے جارہا ہوں۔ یہ باتیں بتا کر انسپکٹر واپس چلا گیا۔

" اگلی صبح کچھ طلبا ہمارے گھروں کے قریب آئے۔ اور چپکے سے ہمارے ٹیلی فون کاٹ دیئے۔ تھوڑی دیر بعد ہمیں پتہ چلا کہ میری اور ایس ڈی او کی جیپ بھی چرا کر لے گئے ہیں پھر انہوں نے شہر میں ڈھنڈورا دیا کہ سید یحییٰ خاموشی سے ڈھاکہ سے چلے گئے ہیں اور اب آپ پر بمباری ہوگی سب لوگ تیار ہو جائیں۔

اسی دوران فیلڈ انٹیلی جینس کے پانچ چھ فوجی جو ہمارے علاقے میں تعینات تھے میرے پاس آئے اور خوف ظاہر کیا کہ لوگ انہیں مارنے کے لیے ڈھونڈ رہے ہیں۔ چنانچہ میں نے انھیں تھانے بھجوا دیا۔"

میں اب یہ باتیں کھانے سے واپس پر لکھ رہا ہوں۔ اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بجے ہیں بعض باتیں ذہن سے اتر گئی ہیں صرف وہی لکھی ہیں جو واضح طور پر یاد ہیں۔ اب سونا چاہیے۔ ویسے میں نے مل خالد مسعود کو یہاں بلایا ہے تاکہ ان کی موجودگی میں ان سے باتیں سن سن کر ریکارڈ کرتا جاؤں۔ ساتھ ہی تسنیم صدیقی ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر بھی ہوں گے جو ان دنوں یہاں تعینات تھے۔ مگر اب تبدیل ہو کر ستمبر جارہے ہیں۔ وہ کل ہمارے ساتھ ہی ڈھاکہ جائیں گے کیونکہ ہمارے ساتھ پولیس فورس ہے۔

جمعرات۔ ۱۰ جون ۱۹۷۱ء

صبح آنکھ کھلی۔ قدرے جلدی تھی اور میں اور سونا چاہتا تھا۔ مگر ہوا میں ایسی تازگی تھی کہ بستر میں لیٹنا اچھا نہ لگا۔

دریچہ سے جھانکا تو سامنے دریا بڑا پرسکون بہہ رہا تھا۔ خاموش، پرسکون اور پھیلا پھیلا۔ برسات کی وجہ سے رنگ گدلا تھا۔ اوپر نیلے آسمان اور نیچے افق تک پھیلے ہوئے سبزے میں اچھا لگ رہا تھا۔ اس کی پرسکون سطح سے اندازہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ چند ہی ہفتے پہلے اس میں سسکتے ہوئے ادھ موئے انسانوں کو گیندوں کی طرح اچھال اچھال کر پھینکا گیا ہے۔ اس کی لہریں ان کھوپڑیوں اور بازوؤں کو میلوں دور بہا کر لے گئی ہیں جن کے وارث کنارے پر زخموں سے تڑپ رہے تھے۔ پھر کوئی دوسرے گروہ آتے تھے تو ان تڑپتے ہوئے جسموں سے چند اور اعضا کاٹ کر اس دریا میں پھینک دیتے تھے۔ جس طرح قصائی کی دکان پر لٹکے ہوئے بکروں کا سیر سیر پاؤ پاؤ گوشت اتارا جاتا ہے۔

اس دریا نے وہ زمانہ بھی دیکھا تھا جب یہ شہر مومن شاہی کے نام سے بسایا گیا اور بعد ازاں وہ دن بھی دیکھا جب راجپوت ہندوؤں کے زیر اثر اس کا نام میمن سنگھ ہو گیا۔ اس شہر کے بازاروں میں جو بورڈ آویزاں ہیں۔ ان پر مومن شاہی اور میمن سنگھ دونوں نشان موجود ہیں بعض لوگوں نے شہر کا نام مومن شاہی لکھا ہے۔ اور بعض نے میمن سنگھ مگر یہ معاملہ بورڈ تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ اذہان کی بھی نشاندہی کر رہا ہے اور آج کسی ذہن پر مومن شاہی کا بورڈ ہے اور کسی پر میمن سنگھ کا۔

جب بیس فی صدی ہندو آبادی نے کچھ مسلمانوں کے ساتھ مل کر باقی مسلمانوں کو بے دردی سے قتل کیا تو یہ دریا ہمدردی کا مل

دہرایا جا رہا تھا جس کے نتیجے میں ماضی میں مومن شاہی کا نام بدل کر میمن سنگھ بنا یا گیا۔ آج اردو بولنے والا مسلمان اس وجہ سے مارا گیا کہ وہ بنگالی نہیں جانتا۔ مگر اردو بولنے والا ہندو قابلِ مواخذہ نہ سمجھا گیا۔ سترہ تاریخ سے تئیس تاریخ تک یہ شہر پاکستان کا حصہ نہ تھا بلکہ ہندوستان کا حصہ تھا۔ جس میں چاند تارے والا جھنڈا لہرانا غداری سمجھا جاتا تھا۔ اور یہ برہم پترا اسی سکون سے یہ تماشہ دیکھتا رہا جس انداز میں یہ آج بہہ رہا ہے۔

میں آٹھ بجے صبح میمن سنگھ کی زراعتی یونیورسٹی پہنچا . . . .

. . . .

یونیورسٹی سے واپسی پر میٹنگ کی . . . .

. . . .

میٹنگ کے بعد گورنمنٹ کالج دیکھنے گیا۔ جس کے متعلق سنا تھا کہ شرپسندوں نے ساری لیبارٹری تباہ کر دی ہے اور مرمت کے لئے ساٹھ ہزار روپے طلب کئے گئے تھے۔ وہاں جا کر دیکھا تو چند شیشیاں اور چند دوائیاں غائب تھیں اور تباہی کا کہیں نشان بھی نہ تھا۔

وہاں سے لڑکوں کے ٹیچرز ٹریننگ کالج گئے۔ جو ایک ہندو جاگیردار کے گارڈن ہاؤس میں واقع ہے۔ اردگرد وسیع باغ ہے جس میں سلیقے سے پھولوں کی کیاریاں سجی ہیں۔ اعلیٰ صناعی کے بت کھڑے ہیں۔ جن میں سے چند ایک توڑ دیئے گئے تھے۔ یہ دیکھ کر دکھ سا ہوا۔

جاگیردار کا نام شمشی کانت تھا مگر یہ اپنے علاقے میں مہاراجہ کہلاتا تھا۔ پاکستان بننے سے پہلے ہی فوت ہو چکا تھا۔ اور پاکستان بننے پر اس کے لڑکے یہ شہر چھوڑ کر کلکتے چلے گئے۔

بعد ازاں خواتین کا ٹیچرز ٹریننگ کالج دیکھنے گیا۔ یہ مہاراجہ شمشی کانت کے اصل گھر میں واقع ہے۔ جو اچھا خاصا محل ہے کالج چونکہ ابھی بند تھا۔ اس لئے گھوم پھر کر سارا گھر دیکھا۔ اور مہاراجہ کے ذوق کی داد دی۔ گذشتہ چوبیس برس میں اس عمارت کو نہ تو مرمت نصیب ہوئی۔ نہ جالوں کی صفائی ہوئی۔ اور نہ ہی چیزیں چرانے والوں کی دست برد سے نجات ملی۔ اس کے باوجود جو کچھ باقی ہے وہ جاگیردار کے ذوق کی داد طلب کرنے کے لئے کافی ہے۔ سنہری فریموں میں یورپ کے ماہرین فن کی بڑی بڑی تصاویر جن پر کائی جم رہی تھی۔ کٹ گلاس کا خوبصورت کام چھت پر خوبصورت صناعی بیش قیمت جھاڑ فانوس گرد کے غلاف کے اندر سے ماضی کی شہادت دے رہے تھے۔ سامنے بھی کھلا لان تھا۔ اور پچھواڑے کے لان میں دو خوبصورت بارہ دریاں تھیں۔ جن کے ساتھ بہت بڑی جھیل تھی۔ اس کے کنارے جاگیردار نے اپنی بیوی کے لئے چھوٹا سا خوبصورت مکان بنایا تھا۔

اس جگہ کو دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ اتنی خوبصورت چیزیں اس انداز میں ضائع ہو گئیں۔ اور تاریخی شواہد کے طور پر قائم نہیں رکھی گئیں۔

ساڑھے بارہ بجے بحالتِ مجبوری واپس ریسٹ ہاؤس آیا۔ کیونکہ تسنیم صدیقی ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر اور خالد مسعود کو وقت دیا تھا کہ ان کے ساتھ جا کر شانکی پاڑا کی بستی دیکھیں گے۔

ان کے ساتھ وہاں پہنچا تو دل دہل گیا۔

شانکی پاڑا میمن سنگھ کا ہی ایک حصہ ہے جس میں صرف غیر بنگالی رہتے تھے۔ کئی ہزار کے قریب آبادی تھی۔ یہ صاف ستھری

آبادی تھی۔ جو سرکار نے سستے داموں کی سکیم کے تحت بنوائی تھی۔ صاف ستھری کھلی سڑکیں اور گلیاں اور بیچ میں چھوٹے بلک سے مکان ہم کوئی ایک بجے کے قریب وہاں پہنچے۔ اور وقت کی کمی کی وجہ سے ساری آبادی تو نہیں دیکھ سکے۔ مگر ایک حصے میں اچھی طرح گھوم پھر کر جائزہ لیا۔

دوپہر کے وقت بھی وہاں ہو کا عالم تھا۔ نہ آدم۔ نہ آدم زاد۔ بالکل موہنجوداڑو کے کھنڈرات کا سماں تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہاں کھنڈرات کی بجائے مکمل عمارتیں تھیں۔ ان مکانوں کے بیشتر مکین مزے لے لے کر قتل کئے گئے تھے۔ ہتھیار ان سے چند دن پہلے لئے جا چکے تھے۔ اور نہتے لوگ ایسٹ بنگال رجمنٹ کے مسلح اور ٹرینڈ لوگوں کے سامنے بے بس تھے۔ خصوصاً جبکہ مقامی افسران بھی وہاں موجود تھے۔ اور موسلا دھار بارش میں قتل و غارت کا یہ ڈرامہ چند گھنٹے تک جاری رہا۔

قریباً ہر دوسرے تیسرے مکان کے ساتھ تازہ بھرے ہوئے گڑھے تھے۔ تسنیم نے بتایا کہ یہ مشترکہ قبریں (MASS GRAVES) ہیں۔ وہ خود فوج کے ساتھ ۲۰ اپریل کو یہاں آئے تھے۔ تو تعفن سے کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا۔ کوے۔ گدھ۔ کتے اور بلیاں جوق در جوق گھوم رہے تھے۔

کافی لاشیں امام مسجد نے دفن کر دی تھیں۔ مگر پھر بھی دو تین سو کے قریب کھلی پڑی تھیں۔ زیادہ تر مردوں کی۔ مگر ان میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ کسی گھر میں ایک لاش۔ کسی میں دو تین ——— کہیں گلی میں چار چھ لاشوں کا انبار ——— کوئی کھڑکی سے باہر لٹکا ہوا کوئی دروازے کی دہلیز کے آرپار ——— حشر کا سماں لگتا تھا۔ خود تسنیم نے اپنے ہاتھوں سے چند ایک لاشوں کو ایسے گڑھوں میں ڈالا۔ جن میں پہلے بھی لاشیں پڑی تھیں مگر ابھی گنجائش باقی تھی۔

اب ان قبروں کا نشان مندمل ہو رہا تھا۔ مگر بعض جگہ اب بھی صاف طور پر دیکھا جا سکتا تھا۔ کیونکہ مسلسل بارش سے وہاں مٹی بیٹھ گئی تھی۔ اور تسنیم اپنے طور پر بھی شناخت کر سکتے تھے۔

وہیں میں نے ایک دو قبروں کی فوٹو بھی لی۔

شانتی پاڑا سے لوٹے تو سراج الحق سپرنٹنڈنٹ پولیس کے ہاں کھانے پر گئے۔ مگر طبیعت اتنی خراب ہو رہی تھی کہ کھانا بھی نہ کھایا گیا۔ اور ہم ریسٹ ہاؤس آ گئے۔

اب ڈھاکہ کے لئے روانہ ہونا تھا مگر ابھی تسنیم صدیقی نہیں لوٹے تھے جو یہاں سے تبادلے پر لوگوں سے رخصت ہونے گئے تھے۔ سب لوگ ان کی انتظار میں بیٹھے تھے۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ اور خالد مسعود کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ جہاں ان کی کہانی قلم بند کرنا شروع کی۔

خالد مسعود کے بیان کی کچھ باتیں کل کی ڈائری میں درج ہیں۔ یہ سلسلہ اس سے آگے ہے۔

خالد مسعود نے بتایا۔

"...................... (چونکہ اس بیان میں ان متعدد بنگال افسران کا نام آتا ہے۔ جنہوں نے ان کی مدد کی۔ اس لئے فی الحال ان بنگالی افسران کے نام کا شائع کرنا مناسب نہیں) ....

خالد مسعود کا قصہ یہاں تک پہنچا تھا کہ نیچے سب لوگ چلنے کو تیار ہو گئے۔ اس لئے میں بادلِ ناخواستہ روئیداد کو نامکمل چھوڑ

کرہی اٹھ کھڑا ہوا ۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ دوسرے بنگالیوں کو اندازہ ہو کہ میں اس انداز میں حالات جمع کر رہا ہوں ۔

. . . .

. . . .

میمن سنگھ سے روانہ ہوئے تو تسنیم صدیقی کو میں نے اپنی گاڑی میں بٹھا لیا ۔ جب کار ان کے اپنے گھر کے سامنے سے گزری ۔ تو تسنیم کے محلے کے دس پندرہ لوگ سڑک کے کنارے کھڑے تھے ۔ انہوں نے گرمجوشی سے ہاتھ ہلا کر الوداع کہا ۔

میں نے تسنیم سے پوچھا کہ ان دنوں ان کا رویہ کیسا تھا تو انہوں نے بتایا کہ ان کے سارے ملازم ان کے ساتھ بہت اچھے رہے ۔ ان میں سے اکثر کو پتہ تھا کہ وہ کہاں چھپے ہوئے ہیں ۔ مگر انہوں نے کسی کو نہیں بتایا ۔

اس سے پہلے خالد مسعود نے مجھے بتایا تھا کہ ان کا سٹاف بہت وفادار ثابت ہوا ۔

اب ہماری کار شہر سے نکل کر اس بڑی بلڈنگ کے سامنے سے گزر رہی تھی جس پر C . A . F لکھا تھا یعنی CIVIL ARMED FORCE یہ وہ نئی تنظیم ہے جو اب E.P.R کی جگہ بنائی گئی ہے ۔

" یہ E . P . R کا ہیڈ کوارٹر تھا " تسنیم نے بتایا " اور یہ دیکھئے دیواروں پر گولیوں کے نشان ہیں " ۔

گاڑی ذرا آگے گئی ۔ تو انہوں نے اشارہ کیا ۔

" یہ کیپٹن قمر عباس کا مکان تھا ۔ اور آگے چل کر وہ جگہ بھی بتاؤں گا ۔ جہاں اسے قتل کیا گیا " ۔

دائیں ہاتھ ایک ریسٹ ہاؤس آیا جس میں ان دنوں ایک بنگالی میجر اور بنگالی کرنل ٹھہرے ہوئے تھے اور ڈھاکہ سے آئے تھے ۔ اس ریسٹ ہاؤس سے ذرا آگے سڑک ریلوے لائن کو کراس کرتی ہے ۔ ان دونوں کے سنگم کے بائیں طرف اسے قتل کیا گیا ۔ اور قریب والے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے کرنل اور میجر سب کچھ دیکھ رہے تھے ۔

" قمر عباس میرا دوست تھا " تسنیم کی آواز غمگین تھی " اکثر شام کو میرے گھر آتا تھا ۔ آخری شام بھی وہ میرے ہاں تھا ۔ اور ہم کتنی ہی دیر بیٹھ کر ملک کی حالت کا تجزیہ کرتے رہے ۔ جاتے ہوئے اس نے مجھے تسلی دی تھی کہ کوئی گڑبڑ ہو ۔ تو تم میرے پاس E . P.R کے ہیڈ کوارٹر میں آجانا ۔ وہاں میرا ایک سالا بھی آیا ہوا ہے جو میڈیکل کالج میں پڑھتا ہے " ۔

" اس کا کیا بنا ؟ " میں نے پوچھا ۔

" وہ دونوں اکٹھے ہی مارے گئے تھے ــــ تین چار دن لاشیں اسی جگہ پڑی رہیں ۔ اور پھر سڑک کے پار دوسری طرف پھینک دی گئیں ۔ تقریباً ایک مہینہ بعد جب چوبیس اپریل کو پاکستانی فوج آئی ۔ تو انہوں نے قمر عباس کی مسخ شدہ لاش کو پہچانا اور دفنایا " ۔

گاڑی چلتی گئی ۔ تسنیم خاموش تھے ۔ جب یادوں سے نکلے تو میں نے انہیں پورا قصہ سنانے کو کہا ۔

تسنیم نے بتایا ۔

" مارچ کا مہینہ جلوسوں کا مہینہ تھا ۔ طلباء اور ہجوم جو چاہتے ۔ سو کرتے ۔ آہستہ آہستہ نواحی علاقوں کے لوگ بھی ان میں شامل ہوتے گئے ۔ ۲۷ مارچ کی صبح کو وہ فہرستیں ہاتھوں میں لئے گھر گھر گھوم رہے تھے اور لوگوں سے اسلحہ جمع کر رہے تھے ۔ یہ فہرستیں ان لوگوں

ان تینوں کے پاس اسلحہ کے لائسنس تھے اور انہوں نے یہ تینوں تھانوں سے اور ڈی سی کے دفتر سے حاصل کی تھیں۔ جب کسی کے گھر یہ پہنچ جاتا۔ اس کے لئے مقابلہ کرنا ممکن نہ ہوتا اور وہ اپنا ہتھیار ان کے حوالے کر دیتا۔

"ستائیس مارچ کی شام کو کیپٹن قمر عباس میرے پاس بہت دیر تک بیٹھا رہا۔ ان دنوں EPR کا ونگ کمانڈر چھٹی پر گیا تھا۔ اور کیپٹن قمر عباس اس کی جگہ کام کر رہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں سو گیا۔

"رات تین بجے کے قریب میری آنکھ گولیوں کی آواز سے کھلی۔ میں اٹھا۔ ادھر ادھر سے خبر لینے کی کوشش کی مگر کچھ پتہ نہ چل سکا۔ اتنے میں ــــ آیا اور مجھے کہنے لگا کہ حالات کا کچھ اندازہ نہیں۔ فائرنگ بڑھتی جا رہی ہے۔ نہ معلوم کیا ہونے والا ہے۔ بہتر ہوگا کہ صحیح صورت حال معلوم ہونے تک ہم سب لوگ کلب میں چلے جائیں۔

"ہم کلب میں پہنچے تو ڈپٹی کمشنر، سپرنٹنڈنٹ پولیس اور سول سرجن بیوی بچوں کے وہاں موجود تھے۔

"صبح پانچ بجے تک ہم وہیں رہے پھر ــ نے بتایا کہ اب کوئی خطرہ نہیں اور ہم واپس آ گئے۔ میں گھر آتے ہی سو گیا۔

"صبح اٹھا تو اردلی نے بتایا کہ رات EPR میں بنگالیوں اور غیر بنگالیوں میں لڑائی ہوئی ہے۔ اور کیپٹن قمر عباس مارا گیا ہے۔"

"مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ تھوڑی دیر بعد ڈپٹی کمشنر نے بھی تائید کی ــ EPR کی عمارت پر گولیوں کے جو نشانات میں نے آپ کو ابھی دکھائے تھے یہ اسی رات کی لڑائی کے تھے۔ پانچ مغربی پاکستانی سپاہی تیسری منزل میں گھر گئے۔ انہوں نے وہیں سے لڑائی کی۔ ان کے باقی ساتھی تو رات کو ہی مارے گئے اور کیپٹن قمر عباس کو صبح سات بجے مارا گیا۔ مگر اس کے باوجود انہوں نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔ اور اگلے دن شام پانچ بجے تک اوپر سے فائرنگ کر کے مقابلہ کرتے رہے۔ سڑک پر سینکڑوں لوگوں کا مجمع کھڑا ہو کر یہ لڑائی دیکھتا رہا۔ جب کوئی مغربی پاکستانی زخمی ہوتا۔ تو یہ "جے بنگلہ" کا نعرہ لگاتے مگر جب کوئی E.P.R والا زخمی ہوتا تو یہ اسے اٹھا کر ہسپتال لے جاتے۔

"بالآخر شام پانچ بجے ان سپاہیوں کا بارود ختم ہو گیا۔ اور انہوں نے مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دیے۔ ڈپٹی کمشنر کے کہنے پر لوگوں نے انہیں مارا تو نہیں مگر جیل بھیج دیا۔ یہاں ان کو ۱۷ اپریل کو قتل عام کے دوران قتل کر دیا۔

سیکنڈ ایسٹ بنگال رجمنٹ کے تین افسر ایک ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرے تھے میجر نور الاسلام (بنگالی)۔ لفٹیننٹ شان (بنگالی) اور ایئر فورس کا فلائٹ لفٹیننٹ صفی مصطفےٰ (بہاری) یہ تینوں ستائیس اور اٹھائیس مارچ کی درمیانی رات ریسٹ ہاؤس سے غائب رہے اور صبح واپس لوٹے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ چونکہ فوج ان کے قابو میں نہیں تھی اس لئے یہ گاؤں چلے گئے تھے۔ واپسی پر یہ سارا دن ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں بیٹھے رہے۔ کھانا بھی وہیں کھایا اور اگلی رات بھی وہیں سوئے۔

"اٹھائیس مارچ کی شام کو میں اپنے دوست رضا کے ساتھ ــــ کے گھر چلا گیا۔ کیونکہ خطرہ تھا کہ مسلح لوگ اب غیر بنگالی افسروں کو مارنے ان کے گھروں میں آئیں گے۔

"۲۹ مارچ کی صبح کو میں نے ــ کے گھر سے دیکھا کہ فوج کا ایک بہت بڑا کالم آ رہا ہے۔ خیال ہوا کہ شاید پاکستانی فوج پہنچ گئی۔ مگر ان گاڑیوں پر بنگلہ دیش کے جھنڈے تھے۔ تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ یہ لوگ سیکنڈ ایسٹ بنگال رجمنٹ کے ہیں جو بغاوت

رہے آ رہے ہیں اور ۲۷ میل کا علاقہ بہاریوں سے صاف کر کے آئے ہیں۔ تب میجر نورالاسلام اور لیفٹیننٹ منان کھلم کھلا ان سے مل گئے ۔ دو روز بعد میجر نے ٹریننگ کالج میں اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کیا۔ یعنی مصطفےٰ کے متعلق متضاد خبریں ہیں۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسے پہلے ہی دن مار دیا تھا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بعد میں مارا۔ مگر مجھے کوئی قابلِ اعتبار خبر نہیں ملی ۔

نیا ہیڈ کوارٹر بنا تو لوگ بارے کہ ان کے پاس جاتے رہے اور بچہ میمن سنگھ کی ریاست کا اعلان کر دیا گیا۔ اب شہر مکمل طور پر بنگالی باغیوں کے قبضے میں تھا۔ انہوں نے ڈپٹی کمشنر، سپرنٹنڈنٹ پولیس اور مجسٹریٹ کو بلایا۔ ان کو تقریریں لکھ کر دی گئیں۔ اور لاؤڈ سپیکر پر دل کو بھی سنائے ۔

پھر پتہ چلا کہ مکتی باہنی والے ڈھاکے پر حملہ کے لئے جانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ایک سپیشل ٹرین تیار کی گئی۔ جس پر سوار ہونے سے پہلے شہر میں جلوس نکالا گیا۔ یہ بھی سنا کہ اس جلوس میں کیپٹن قمر عباس کی لاش کو جیپ کے انجن پر رکھ کر گھمایا گیا۔

"۳۱ مارچ اور یکم اپریل کی رات کو مکتی باہنی والے مع افسران کے چلے گئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ لوگ ڈھاکہ نہیں گئے ۔ بلکہ ٹنگائل گئے ہیں۔ کیپٹن عزیز جو سرحد پار کر کے ہندوستانی فوج سے رابطہ قائم کرنے گیا تھا۔ واپس آ گیا۔ اور اس نے اطلاع دی کہ ہندوستانی فوج جلد آنے والی ہے۔ اس بات پر بہت خوشیاں منائی گئیں ۔

. . . .

. . . .

"۳ اپریل کو پاکستانی فوج ٹنگائل پہنچ گئی تھی اور خیال تھا کہ چند ایک روز میں میمن سنگھ پہنچ جائیں گے۔ اس پر بہت سے لوگ شہر چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ بلکہ ایک دن تو یہ اعلان بھی ہوا کہ گھروں پر سے بنگلہ دیش کے جھنڈے اتار لئے جائیں۔ مگر جب پاک فوج کے آنے میں دیر ہوئی تو افواہیں پھیلنے لگیں کہ پاک فوج ہار رہی ہے۔ اس سے ان لوگوں کا اعتماد پھر سے بحال ہونے لگا۔ اور بھاگے ہوئے لوگ واپس آنے لگے۔

" ۹ اپریل کے قریب افواہوں کا سیلاب آ گیا۔ تمام افواہوں کا مرکزی خیال یہ تھا کہ پاکستانی فوج نے کئی لاکھ بنگالی مارے ہیں اور بہت ظلم ڈھائے ہیں۔ ۹ اپریل ہی کو تھرڈ ایسٹ بنگال رجمنٹ کے چالیس لوگ جمال پور کے راستے ہوتے ہوئے میمن سنگھ آئے۔ یہ تمام بنگال سے آئے تھے اور جمال پور میں انہوں نے اسی نوے غیر بنگالیوں کو قتل کیا تھا۔ انہوں نے لوگوں کو جیسور والے کرنل عبدالحئی کا قصہ سنا کر گرم کیا۔

" اب نئی نئی افواہیں جنم لینے لگیں۔ سب سے مشہور قصہ کرنل خلیل کا تھا جو مبینہ طور پر مغربی پاکستان میں بنگالی افسر تھا۔ اور اپنی جان بچا کر ہندوستان کے راستے مشرقی پاکستان پہنچا تھا۔ اس نے لوگوں کو بتایا تھا کہ مغربی پاکستان میں بنگالیوں کا بے دریغ قتل عام ہو رہا ہے۔ کرنل خلیل سے کوئی شخص ذاتی طور پر واقف نہ تھا۔ نہ ہی کوئی اس سے ملا تھا مگر ہر روز اس سے نت نئے قصے منسوب کئے جاتے تھے۔

"شہر میں بہت کھچاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ تھرڈ بنگال رجمنٹ کے لوگ شہر کے لوگوں سے امتیاز جاوید سب ڈویژنل آفیسر اور خالد مسعود سب ڈویژنل پولیس آفیسر کا پتہ پوچھتے پھرتے تھے میری تلاش اس لئے نہ تھی کہ میرے متعلق پہلے ہی مشہور ہو چکا تھا کہ میں مارا

گیا ہوں ....

....

۲۸ مارچ کی شام کو گولیوں کی آوازیں تسلسل سے آنے لگیں۔ معلوم ہوا کہ پولیس بھی E.P.R کے ساتھ مل گئی ہے اور اب سیکنڈ اور تھرڈ بنگال رجمنٹ کے لوگ شہر میں جیپوں پر گھوم رہے ہیں اور بہاریوں کی جتنی آبادیاں ہیں۔ ان کو ختم کر رہے ہیں۔ (شہر میں بہاریوں کی چار بڑی آبادیاں ہیں) ہم نے اپنی کمین گاہ کی کھڑکی میں سے ڈی سی کی جیپ جاتے دیکھی ....

....

"ہم ساری رات گولیوں کی آوازیں سنتے رہے۔ شانکی پاڑا ہماری پناہ گاہ کے قریب ہی تھی۔ وہاں سے بھی آوازیں آئیں۔ بعد میں دور سے بھی گولیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم آواز کے اونچا یا مدھم ہونے سے فاصلے کا اندازہ لگاتے۔ تب ہمیں یقین ہو گیا کہ سارے شہر میں بہاری کالونیوں پر حملہ ہو رہا ہے۔

"۱۸ اپریل کو دوپہر کے بعد ہم نے روشندان سے دیکھا کہ کوئی دو ہزار عورتوں اور بچوں کا جلوس جا رہا ہے۔ وہ روتے چلاتے چیختے۔ گرتے پڑتے جا رہے تھے اور مشکل سے چل سکتے تھے۔ عوامی لیگ کے رضاکار اور طلبا سفید کپڑوں میں ملبوس رائفل لٹکائے ان کو ہانکتے ہوئے بنگال کی طرف لے جا رہے تھے۔ یہ وہ بدقسمت تھے جن کے گھر والوں کو بہاری کالونیوں میں تہ تیغ کر دیا گیا تھا۔ ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ ان کو پہلے گورنمنٹ ہائی سکول میں رکھا ہوا تھا اور اب کسی اور جگہ لے جا رہے تھے"............

...................(تسنیم صدیقی کی داستان کا باقی حصہ ہم اس خیال سے حذف کیا جا رہا ہے کہ ان کی مدد کرنے والے بنگالیوں کے ناموں کا مشتہر ہونا فی الحال مناسب نہیں)...

..................."

تسنیم صدیقی کی داستان مکمل ہوتے ہوتے ہم نٹور پہنچ گئے۔ وہاں ریسٹ ہاؤس میں چائے کے لئے رکے اور شام سات بجے ڈھاکہ پہنچے۔

اس دورے میں جو باتیں ہوئیں ان سے اندازہ ہوا کہ میمن سنگھ میں بنگالیوں کی بہت بڑی تعداد ایسی تھی جو مغربی پاکستانیوں کے ساتھ ہمدردانہ رویہ رکھتی تھی مگر وہ E.P.R اور E.B.R کی مسلح غنڈہ گردی کے سامنے بے بس تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ میمن سنگھ کے ایک پولیس مین نے چوہدری صاحب کو بتایا کہ بہت سے لوگ مارے گئے۔ وہ تو میں نوشتہ تقدیر سمجھ کر برداشت کر لیتا ہوں مگر افسوس یہ ہے کہ میرے بنگالی دوستوں اور پڑوسیوں میں سے کوئی بھی تعزیت کے لئے نہ آتا تھا کیونکہ ان کو E.P.R کا خوف تھا۔ مشرقی پاکستان کا یہی المیہ ہے کہ یہاں پر شور اور بد طینت اقلیت کے سامنے وفادار اکثریت بے بس ہو گئی ہے اور مغربی پاکستان والے سمجھتے ہیں کہ ساری بنگالی قوم ہمارے مخالف ہے۔ حالانکہ یہ انتہائی غلط تاثر ہے۔

شام کو سرکٹ ہاؤس ڈھاکہ میں کھانا کھا رہے تھے تو ساتھیوں نے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل سے واپسی پر اطلاع دی کہ وہاں آٹھ بجکر دس منٹ پر تین دستی بم پھینکے گئے۔ یہ بم کسی نے سڑک سے پھینکے تھے۔ جو پورچ میں آ کر گرے۔ دو کاریں تباہ ہوئیں اور ہوٹل کے تین بڑے شیشے ٹوٹ گئے۔ دو آدمی زخمی ہوئے۔ کاریں سٹیٹ بنک آف پاکستان کی تھیں۔

ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں پرنس صدرالدین آغا خان ٹھہرے ہوئے ہیں۔ جو U.N.O کی طرف سے ریلیف کمشنر کا کام کرنے آئے ہیں۔

نیلی ساڑھی

خواجہ احمد عباس

> بمبئی: چونتیس کم عمر لڑکیاں تین رنڈی خانوں سے پچھلے ہفتے برآمد کی گئیں ——
> ان میں سے ایک کے چہرے کو ایذا پہنچانے کے لئے تیزاب سے جلایا گیا تھا —— پولیس نے پانچ عورتوں کو رنڈی خانوں کو چلانے اور طوائفوں کی آمدنی پر رہنے کے جرم میں گرفتار کر لیا ہے۔
>
> —— ایک خبر

حضور۔ میں سچ کہوں گی، سب سچ کہوں گی، اور سچ کے سوا کچھ نہ کہوں گی۔ مگر وقت ہے آپ کے پاس اور آپ کے سماج کے پاس یہ سب باتیں سننے کے لئے؟

میرا نام سلیمہ ہے۔

میرے والد کا نام —— خدا انھیں مغفرت کرے —— کریم بخش تھا۔

میرے والد کیا کرتے تھے؟ سچی بات یہ ہے، حضور، کہ کچھ نہیں کرتے تھے۔ کسی زمانے میں زمیندار تھے۔ بعد میں جب زمینوں پر سیلنگ لگیں تو ان کے بدلے میں جو معاوضے کے کاغذات ملے ان کو بیچ کر کھاتے رہے۔

میری جائے پیدائش شکوہ آباد کی ہے۔

شکوہ آباد یو پی کا ایک پرانا قصبہ ہے۔ آگرے کے قریب۔

قصبہ کیا ہے۔ پرانے کھنڈر جیسے مکانوں کا ایک مجموعہ ہے۔

ان ہی میں سے ایک کھنڈر جیسے مکان میں میرا جنم ہوا تھا۔

میری ماں میری پیدائش کا بوجھ برداشت نہ کر سکیں۔ میرے پیدا ہوتے ہی مر گئیں بیچاری۔

پھر میرے والد نے دوسری شادی کر لی۔

میری سوتیلی ماں کا نام کریمن تھا۔ وہ ذات کی نائن تھی۔ مگر صورت شکل کی ذرا اچھی تھی۔ جب ہی تو میرے والد صاحب نے بیوی کے مرنے کے دو مہینے بعد اس سے نکاح پڑھوا لیا۔ محلے والے یہ بھی کہتے تھے کہ ان کا معاملہ کریمن کے ساتھ پہلے سے چل رہا تھا۔

کریمن میری سوتیلی ماں ضرور تھی۔ مگر ایمان کی بات یہ ہے، حضور، کہ اس نے کبھی سوتیلی ماں جیسا سلوک نہیں کیا مجھ سے۔ اس کی

اپنی کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے وہ مجھے اپنی اولاد کی طرح چاہتی تھی۔ اُس نے مجھے سکول پڑھنے بھیجا۔ وہ مجھے ہمیشہ سینما ساتھ لے جاتی تھی اور ہر طرح کے ناز اٹھاتی تھی۔

جب تک میں پندرہ برس کی ہوئی تو سینما کی پکی شوقین بن چکی تھی۔ سچ بات یہ ہے کہ شکوہ آباد جیسے مردہ قصبے میں اور کوئی تفریح کی جگہ بھی تو نہیں تھی۔ جب تک میں کوئی فلم دیکھتی رہتی تو ایسا لگتا کہ میں کسی دوسری دنیا میں ہوں۔ ایک رنگین رومانی دنیا جس میں سب مرد خوب صورت تھے —— نہ صرف ہیرو بلکہ ویلین بھی — اور سب عورتیں اور لڑکیاں حسین تھیں اور سب نے اچھے اچھے کپڑے پہنے ہوتے تھے۔ فلموں سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ حضور ہمگر خاص طور سے یہ سیکھا کہ اپنی زندگی کی کٹھنائیوں اور محرومیوں سے سینما کے اندھیرے میں کیسے بچا جا سکتا ہے۔ اور کچھ بھی سیکھا۔ مثلاً ہیروئنوں کی طرح کپڑے پہننا۔ اُن کے جیسے بال بنانا یا کٹوانا۔ اُس زمانے میں سادھنا نئی نئی "لو اِن شملہ" میں آئی تھی۔ اُس کی طرح کی "ذبح" میں نے بھی بنائی کہ میرا ماتھا بھی بڑا تھا اور "فرنج" یعنی کٹے ہوئے بالوں کی جھالر میرے چہرے پر بھی اچھی لگتی تھی۔

اگلے دن ہی میرے خالہ زاد بھائی محمود علی جو مجھ سے عمر میں چار پانچ برس بڑے ہوں گے آئے تو انہوں نے پہلی جھلک ہی میں پہچان لیا کہ میں نے "لو اِن شملہ" دیکھ کر اپنے بال کاٹے ہیں۔ اس لئے وہ ہلکے سے مذاق میں کہنے لگے "کیوں سلیمہ لو اِن شملہ تو دیکھا۔ لو اِن شکوہ آباد کے بارے میں کیا رائے ہے؟"

اتنی بے شرمی کی بات سن کر میرا سارا چہرہ گلابی ہو گیا۔ سمجھ میں نہ آیا کیا جواب دوں۔ میں جلدی سے وہاں سے بھاگ گئی۔ محمود بھائی بھی دو چار پھبتیاں کس کر وہاں سے چلے گئے۔ ہاں جاتے جاتے اتنا کہہ گئے کہ دو دن کے بعد وہ علی گڑھ جا رہے ہیں کسی کو سینما چلنا ہو اُن کے ساتھ تو وہ کل چل سکتا ہے۔ میں نے اماں سے پوچھا —— میں کریمن کو اماں ہی کہتی تھی۔ چلوگی اماں؟ مگر اماں نے کوئی بہانہ کر دیا۔ ابا تو سینما جانے کو ہی تیار نہیں تھے۔ اماں نے کہا۔ اپنے گھر کا ہی لڑکا تو ہے۔ تو اُس کے ساتھ چلی جائیو برقعہ اوڑھ کر۔

اگلے دن میں محمود بھائی کے ساتھ سینما ہولی۔ رات کا وقت تھا۔ وہ بھی آخری دسمبر کی رات۔ کڑاکے کی سردی تھی۔ تانگے میں بیٹھی تو محمود بھائی پاس بیٹھے۔ اُن کا ہاتھ نہ جانے کس طرح میرے برقعہ کے اندر آ گیا۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولے "اوفوہ۔ تمہارے ہاتھ تو بالکل ٹھنڈے برف ہو رہے ہیں۔" اور اپنے ہاتھوں کی گرمی مجھے پہنچاتے رہے۔ تھوڑی دیر میں میرے ہاتھ بھی اُن کے ہاتھوں کی طرح جلنے لگے۔

سینما آ گیا تو وہ تانگہ والے کو پیسے دے کر مجھے سینما میں لے چلے۔ میں حیران رہ گئی جب میں نے دیکھا کہ انہوں نے ایک "باکس" ریزرو کر رکھا تھا۔ یہاں ہم دونوں اکیلے تھے۔ اس لئے سینما شروع ہونے پر محمود بھائی نے میرا برقعہ اتار دیا۔ اور آہستہ آہستہ اُن کا بازو میرے گرد حائل ہو گیا۔ فلم کانی بکواس تھی مگر ہیرو، ہیروئن کی محبت کے بہت سے سین تھے۔ جو میرے لئے بہت دلچسپی رکھتے تھے۔

جو نکتے میری سمجھ میں نہیں آتے تھے محمود بھائی کا ہاتھ میری تربیت کرتا رہا۔ ایک سین تھا جس میں ہیروئن گر پڑتی ہے۔

پھر اکر بھاگتا ہے اور زمین پہ بیٹھ کر پوچھتا ہے۔
"چوٹ لگی ہے؟"
ہیروئن منہ بنا کر کہتی ہے "بہت لگی ہے"
"کہاں؟" ہیرو پوچھتا ہے۔
"یہاں؟" وہ ٹخنے کی طرف اشارہ کر کے جواب دیتی ہے۔
وہ ٹخنہ دبانے لگتا ہے۔
پھر وہ کہتی ہے "یہاں" اور گھٹنے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔
وہ گھٹنہ دبانے لگتا ہے۔
پھر وہ کہتی ہے "نہیں وہاں نہیں . . . یہاں"
"کہاں؟" وہ پوچھتا ہے۔
وہ اپنے سینے کی طرف اشارہ کر کے جواب دیتی ہے "یہاں"
ہیرو کے ہاتھ بے اختیار سینے کی طرف بڑھتے ہیں . . . بڑھتے ہیں — پھر ایک دم رک جاتے ہیں۔
مگر محمود بھائی کا ہاتھ نہیں رکا۔ اور میں نے لذت بھرے درد کو محسوس کر کے اپنی آنکھیں زور سے بھینچ لیں....

اگلے دن محمود بھائی تو علی گڑھ چلے گئے اور میں ان کی یاد کو سینے سے لگائے سکول چلی گئی۔
سکول سے لوٹی تو دروازے ہی میں بہشتی آ رہا تھا اور اندر گھس رہی تھی کہ بندو سقے سے مڈبھیڑ ہو گئی۔
وہ اندر سے خالی مشک کندھے پہ لٹکائے باہر نکل رہا تھا اور میں اندر جا رہی تھی۔ ہم دونوں کا معانقہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ دو پل کے لئے ہم ایک دوسرے کے مقابل ٹھٹک کر رہ گئے۔ میں نے دیکھا کہ سقے کا لونڈا جو مجھ سے ذرا ہی بڑا تھا اور جس کے ابھی مونچھیں بھی نہ نکلی تھیں منہ پھاڑے میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے۔ میں بھلا سقے کے لونڈے کو کب خاطر میں لانے لگی تھی پھر بھی گھبراہٹ میں میں بھی دکھنی کی دکھنی رہ گئی۔ پھر بھی بندو کو جلدی ہوش آیا اور وہ دفعتاً کنی کاٹ کر میرے پاس سے نکل گیا۔ صرف اس کی مشک کی اور اس کے بدن کی بو رہ گئی۔ میں بھی چونکتی ہوئی اندر چلی گئی۔ اور یہ واقعہ دوپہر کے سناٹے میں ہوا تھا۔ کسی نے ہم کو دیکھا نہیں تھا لیکن نشۂ حسن میں ڈوبی ہوئی میری خوشی کا کیا ٹھکانہ۔ کل محمود بھائی جس صورت پہ مر مٹے تھے آج اسی صورت کو دیکھ کر ایک سانولا سلونا سقے کا لونڈا گھن چکر ہو گیا تھا۔
سقے کے لونڈے کو میں کب منہ لگانے والی تھی مگر مجھے یہ اچھا لگتا تھا کہ میرے حسن کے پجاریوں میں ایک کا اور اضافہ ہو گیا تھا۔
اس کے بعد جب بھی مجھے موقع ملتا میں کسی نہ کسی بہانے سے بندو کے سامنے آ جاتی یا اسے اپنی ایک جھلک دکھا کر فوراً پردہ کر لیتی۔ جیسے غلطی سے سامنا ہو گیا ہو۔ وہ بیچارہ یہ تو امید ہی کبھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ معاملہ آگے بڑھے گا — ایک شریف زادی سے چھیڑ چھاڑ

کی یادداشت میں اباّ اُسے مار مار کے ادھ مُوا نہ کر ڈالتے۔ مگر اِس انا کانی میں مجھے بہت مزا آتا۔ وہ مرے یا جیئے مجھے کیا غرض!

گرمیوں کی چھٹیوں میں محمود بھائی پھر سکرہ آباد آئے۔

کبھی خالہ امّاں کے گھر جانے کے بہانے ہم اُن کے ہاں ملتے۔

کبھی کچھ نہ کچھ بہانہ نکال کر ہمارے ہاں آ جاتے۔

کبھی سینما ہم امّاں کو ساتھ لے کر چلے جاتے۔

اور کبھی کبھی سینما ہم دونوں ہی جاتے۔ اُس دن میں نیلی ساڑھی پہنتی۔ نیلا میرا محبوب رنگ تھا۔ اور محمود کو بھی بہت پسند تھا۔ اور تب "باکس" میں بیٹھ کر ہی پکچر دیکھتے۔ بلکہ پکچر برائے نام ہی دیکھی جاتی! ——

ایک بار سقّے کا لونڈا بندو ہمیں وہاں مل گیا اور میں نے محمود بھائی سے کہہ دیا کہ یہ بیچارہ بھی میرا اُمیدوار ہو گیا ہے۔

"بہت خوب"۔ محمود بھائی بولے "تو شادی کر لو۔"

"اُس سے شادی کرے میری جوتی!"

"پھر کس سے شادی کرو گی؟"

"آپ کو معلوم ہے!" میں نے اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بالکل ہیروئنوں والے انداز میں کہا۔

"پھر تو امّاں سے بات کرنی ہی پڑے گی!" وہ ہنس کر بولے۔

اور میں نے اُن کے بازو میں گھس کر کچھ کھسر پُسر کیا۔

"ہئی! پھر تو دیر نہیں کرنی چاہیے۔"

"ہاں محمود۔ ورنہ میں مر جاؤں گی۔"

"ارے مریں تمہارے دشمن!"

"اُس سے تیسرے دن محمود ہمارے گھر آیا اور ابّا کو بیٹھک میں دیکھ کر اور امّاں کو سوتا پا کر مجھ سے آہستہ سے بولا۔" اماں انکار کر رہی ہیں؟"

"کیوں؟ مجھ میں کیا برائی ہے؟"

"تم میں کچھ برائی نہیں ہے۔ مگر امّاں کہتی ہیں کہ خالہ کہیں نائی خاندان سے ہیں۔ سقّے نائیوں میں پٹھان لوگ شادی کرنا نہیں چاہتے۔"

"سقّے نائیوں کا ذکر کیوں کیا؟"

"آہستہ بولو۔ امّاں اُٹھ جائیں گی۔ سقوں میں شادی کرنے کے تم بھی خلاف ہو رہی ہو نا؟"

"ہائے اللہ اب کیا ہوگا مجھے تو ابھی سے ابکائیاں آنے لگی ہیں۔ نہ جانے کب بھانڈا پھوٹ جائے!"

"فکر نہ کرو، میری جان۔ ہم تو ابھی نہیں مرے۔ بس دو چار دن انتظار کرو پھر میں کوئی ترکیب نکالتا ہوں!"

اور وہ چلا گیا۔

اُس کے بعد میں اُس سے کبھی نہیں ملی۔

تین دن بعد بُندو جب پانی کی مشک ڈالنے آیا تو نظر بچا کر ایک لفافہ میرے پاس سے گزرتے ہوئے ڈال گیا۔

اس کی یہ ہمت؟ میں نے سوچا۔ مگر خط کے اوپر پتہ محمود کی لکھائی میں تھا۔

میں نے اپنے کمرے میں دروازہ بند کر کے لفافہ کھولا۔ اندر بس تین سطریں تھیں:۔

"جانِ من - آج تم آدھی رات کے بعد کی ٹرین سے آگرہ آجاؤ۔ میں
وہاں تمہیں ملوں گا۔ وہاں میں نے قاضی کا انتظام کر رکھا ہے!
تمہارا محمود

نوٹ۔ نیلی ساڑھی پہننا۔"

میں نے خط کو کئی بار پڑھا بالکل مسلم سوشل کی نامی سچویشن تھی۔

میں نے بھی ویسی ہی تیاری کی جیسی مسلم سوشل کی ہیروئن کرتی ہے۔

دو تین جوڑے کپڑے نکالے جو بھی میرے پاس بہترین تھے۔ کاٹن کی نیلی ساڑھی رات کو پہننے کے لئے نکال۔ جو [زیور] بھی میرے پاس تھے اُن کو اٹیچی میں رکھا اور سر درد کا بہانہ کر کے سویرے سے لیٹ رہی۔

گرمی کی راتیں تھیں۔ اوپر چبوترے پر میرے والد اور والدہ سو رہے تھے۔ میں نیچے صحن میں اپنے پلنگ پر پڑی تھی۔ پاس [ہی] ...بہن مترا اپنی کھاٹ پر بیہوشش پڑی تھی۔ ہوش میں ہوتی جب بھی وہ بہری تھی اور آنکھوں میں موتیا بند اترا ہوا تھا۔ سو جب [را]ت کے بارہ بجے تو میں چپکے سے اٹھی، کوٹھری میں جا کر نیلی ساڑھی پہنی، برقعہ اوڑھا، اٹیچی کیس ہاتھ میں لیا اور ننگے پاؤں [جو]تیاں ہاتھ میں اٹھائے ہوئے [جیسے] باہر نکل گئی۔

گلی کے موڑ پر پہنچی تھی کہ سامنے بندو کھڑا دکھائی دیا۔ یہ کمبخت یہاں اس وقت کیا کر رہا تھا؟ پاس گئی تو دیکھا کہ وہ تو [میر]ے راستے میں اڑا کھڑا ہے۔

"بی بی۔ آپ اس وقت کہاں جا رہی ہیں؟"

"تم کون ہوتے ہو مجھ سے سوال جواب کرنے والے؟"

"یہ سمجھ لیجئے کہ میں آپ کا ایک ہم شہر ہوں۔ آپ کے خاندان کا نمک کھایا ہے۔ اس لئے نمک کا حق پورا کر رہا ہوں۔ [آپ] واپس چلی جائیے۔"

میں برقعہ میں سے منہ نکالے ڈراتی ہوئی سیدھی چلی گئی۔ آخیر وقت پر وہ راستے سے ہٹ گیا۔

"بی بی جی مت جائیے ......" پیچھے سے اُس کی آواز آئی۔

"بی بی جی مت ......" وہ وہیں کھڑا تھا اس لئے اُس کی آواز پوری نہ آئی۔

"بی بی جی ...."

"بی بی ...."

پھر وہ آواز — جو شاید میرے ہی ضمیر کی آواز تھی — آنا بند ہو گئی۔

سٹیشن پہنچ کر میں نے دو بجے والی گاڑی سے آگرہ کا ٹکٹ خریدا اور ایک زنانے درجے میں بیٹھ گئی۔

آگرے پہ حسب وعدہ محمود میرا انتظار کر رہا ہوگا — انتظار کی گھڑیاں بھی کتنی دلچسپ ہوتی ہیں — وہاں وہ میرے انتظار میں سٹیشن کی گھڑی دیکھ رہا ہوگا کہ کب چار بجیں اور گاڑی وہاں پہنچے —

اور یہاں میں بھی اسی انتظار کا شکار ہوں اور چلتی ہوئی ٹرین کے بند شیشے میں سے مستقبل کی جھلکیاں مجھے نظر آ رہی ہیں۔

گاڑی آگرہ سٹیشن پہ پہنچتی ہے۔

چلتی ہی گاڑی ہی میں سے میری نظر دراز قامت محمود کو ڈھونڈ نکالتی ہے۔

"محمود!" میں آواز دیتی ہوں۔

وہ ہلکی ہوتی ہوئی ٹرین کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگتا ہے۔ ڈنڈا پکڑ کر درجے میں گھس آتا ہے۔

سب لوگوں کے سامنے مجھے بھینچ کر گلے لگا لیتا ہے۔

"سلیمہ! میری اچھی سلیمہ! تم آ گئیں نا؟"

اُس کی ایک دن کی بڑھی ہوئی داڑھی مجھے اپنے گالوں پہ اچھی لگتی ہے۔

گاڑی ٹھہر جاتی ہے۔

وہ میرا اٹیچی کیس سنبھالتا ہے۔ مجھے پلیٹ فارم پہ اتارتا ہے گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے کان میں کہتا ہے "قاضی جی — لمبی داڑھی والے — ہمارا بے چینی سے انتظار کر رہے ہوں گے۔ پورے سو روپے وعدہ کیا ہے اُن کو دوں گا اس بے وقت کی شادی کا!"

ہم ٹیکسی میں بیٹھے۔ اور ٹیکسی گھڑ گھڑ کرتی ہوئی روانہ ہو گئی۔

رات کے دھندلکے میں شہر کی روشنیاں عجیب عجیب لگ رہی تھیں۔

اور یہ ٹیکسی تو ایسے چلتی ہے جیسے ریل چل رہی ہو۔ کیا لوہے کے پہیے لگے ہیں اس میں......؟

ارے یہ سب تو میرا تخیل تھا۔ ابھی تو میں ریل ہی میں تھی اور ریل کی کھڑکھڑاہٹ میرے کانوں میں۔ باہر آگئے کے شہر کی دھندلی دھندلی روشنیاں ہلکی ہوتی ہوئی ٹرین میں سے دکھائی دے رہی تھیں۔

اس بار ٹرین ایک جھٹکے کے ساتھ ٹھہر گئی۔

میں نے نیچے اُترنے سے پہلے جھانک کر دیکھا۔ مسافروں کی بھیڑ بھاڑ میں کوئی ترکی ٹوپی پہنے ہوئے سر دوسرے سروں کے اُوپر سے جھانکتا ہوا دکھائی نہیں دیا۔ اُترنے والے مسافر۔ چڑھنے والے مسافر۔ خوانچے والے۔ ریلوے بابو۔ گھمسان کا عالم تھا۔ کوئی تعجب نہیں کہ کوئی آدمی اس بھیڑ میں کھو جائے۔

میں مجال کر کھلے درجے کے دروازے میں کھڑی رہی تاکہ بھیڑ میں نہ کھو جاؤں اور محمود کو دور سے دیکھ کر پہچان لوں مگر ریل چلنے لگی اور محمود نہ آیا۔ میں نیچے گاڑی سے اتر گئی۔

پلیٹ فارم تقریباً خالی ہو چکا تھا۔

دور دور تک مجھے کوئی نظر نہیں آیا ...... سوائے ایک پستہ قد آدمی کے جو مجھے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ جو شاید ایک اکیلی لڑکی کو دیکھ کر گھورتا ہوگا۔ میں جلدی جلدی قدم بڑھاتی ہوئی زنانہ ویٹنگ روم میں داخل ہو گئی۔ سوچا محمود کو دیر لگ گئی ہوگی۔ چند منٹ میں آتا ہوگا۔ تب تک میں منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہو جاؤں۔

ویٹنگ روم سے باہر نکلی تو اسی پستہ قد آدمی کو گھورتے دیکھا۔ وہ میلی سی پتلون پر ایک دھاری دار بش شرٹ پہنے تھا۔

اب وہ میری طرف بڑھا۔

میں ادھر اُدھر دیکھ کر اندر واپس جانے والی تھی کہ وہ آدمی بولا "سنیئے جناب۔" میں ٹھٹک کر رک گئی۔ سوچا شاید محمود نے اسے مجھے لانے کے لئے بھیجا ہو۔ "آپ کسی کا انتظار کر رہی ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"کس کا؟"

"محمود علی صاحب کا۔ آپ انھیں جانتے ہیں؟"

"نہیں تو۔ میں تو انھیں نہیں جانتا۔ میں تو بومبے فلم کمپنی سے ادھر فلم سٹار بننے کے قابل لڑکے اور لڑکیاں کھوجنے آیا ہوں..... آپ دیکھنے میں قبول صورت دکھائی دیتی ہیں۔" میں نے سوچا شاید آپ کو دلچسپی ہو ـــــ

"جی نہیں۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے سوائے محمود علی صاحب سے ملنے میں۔ اگر کوئی لمبے سے صاحب کسی لڑکی کو ڈھونڈتے آئیں تو آپ مہربانی کر کے انھیں ادھر بھیج دیجئے۔" یہ کہا اور میں دروازے کے اندر چلی گئی۔

وہ آدمی سگریٹ جلا کر سامنے ٹہلنے لگا۔

میں نے کہنے کو تو کہہ دیا کہ مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ مگر فلم سٹار بننے میں کسے دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے سوچا ممکن ہے یہ سچ نہ بولتا ہو...... یا ممکن ہے سچ بولتا ہو ـــ محمود آئے گا تو اس سے مشورہ کروں گی۔

مگر صبح سے شام ہو گئی اور محمود نہیں آیا۔

میں نے وہیں کھانا منگوا کر کھا لیا۔

اب میں نے سوچا کسی وجہ سے علی گڑھ جانا پڑا ہوگا محمود کو۔ ممکن ہے یونیورسٹی کھل گئی ہو۔

میں رات کی گاڑی سے علی گڑھ کے لئے روانہ ہو گئی۔

مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا ــ یا شاید نہیں ہوا ــ کہ وہ پستہ قد آدمی بھی اسی گاڑی میں سوار ہوا۔ مگر پھر اس نے مجھ سے بات کرنے کی جرأت نہیں کی۔

علی گڑھ کے سٹیشن پر میں اتری تو مجھے تعجب ہوا — یا شاید نہیں ہوا۔ کہ وہ آدمی بھی وہیں اترا مگر پھر وہ نظر نہیں آیا۔ رات کا وقت تھا۔ میں ویٹنگ روم میں جا کر بیٹھ گئی اور صبح کا انتظار کرنے لگی۔ محمود کے ہاسٹل کا پتہ میرے پاس موجود تھا۔ صبح ہوتے ہی میں ایک سائیکل رکشا پر سوار ہو کر وہاں پہنچی۔ یونیورسٹی سنسان تھی۔ اُس کمرے میں اکثر کمروں کی طرح تو قفل لگا ہوا تھا۔

عمر برابر کا کمرہ کھلا ہوا تھا۔

اُس میں سے چک ہٹا کر ایک نوجوان باہر نکلا۔ مجھے دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔

"آپ کسی کو ڈھونڈ رہی ہیں شاید؟"

"ہاں۔ اپنے کزن محمود علی خاں صاحب کو!"

"محمود کی کزن ہیں آپ؟ پڑوسی ہونے کے ناتے میرا فرض ہے آپ کی سیوا کرنا۔ وہ تو ابھی واپس نہیں آیا۔ میں ہی اکیلا ہاسٹل میں ہوں۔ میرا کمرہ حاضر ہے۔ رکشا والے کو رخصت کئے دیتا ہوں!"

نہ جانے اس کی آنکھوں کی چمک مجھے کیوں اچھی نہیں لگی اور میں "جی نہیں شکریہ" کہہ کر برآمدے سے اتر کر رکشا میں بیٹھ گئی۔

"چلو واپس سٹیشن پر۔"

جب واپس سٹیشن پر پہنچی تو اس پستہ قد آدمی کو وہاں ٹہلتے ہوئے پایا۔

شام کی ٹرین سے میں واپس شکوہ آباد چلی آئی۔ رات کو پہنچی۔

وہ آدمی بھی اسی ٹرین میں سوار ہوا۔ مگر اس کی کوئی بات نہیں ہوئی مجھ سے۔

رات کو شکوہ آباد پہنچ کر تانگے پر سوار ہو کر میں گھر چلی۔

گلی کے نکڑ پہ تانگہ رکوایا اور میں نے تانگے کو رکنے کے لئے کہا۔ کیونکہ اب پیسے میرے پاس ختم ہو گئے تھے۔

سوچا گھر جا کر باپ ماں سے کہوں گی کسی سہیلی کے ہاں گئی تھی اور ان سے تانگے کا کرایہ دلوا دوں گی۔ مگر ڈیوڑھی تک ہی پہنچی تھی کہ ارادہ بدل گیا۔

اندر سے ابا مرحوم اور کریمن بوا کی آوازیں آرہی تھیں۔

"اس لڑکی کو کبھی سوتیلی بیٹی نہیں سمجھا۔ اپنی بیٹی سے بڑھ کر پالا۔ اور یہ ہمارے خاندان کی ناک کٹوا کر بمبئی چلی گئی فلم سٹار بننے۔ ہال بھی میں تو سینما دیکھنے کو اسی لئے منع کرتا تھا۔ محمود کہتا ہے کہ کب سے اس کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ اس سے کہتی تھی دونوں ساتھ چلیں گے۔ تم ہیرو بننا میں ہیروئن بنوں گی ..... مگر وہ تو شریف کا بچہ ہے اس نے منع کر دیا تو کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی ہے اب!"

"دو چار مہینوں میں ٹھوکریں کھا کر آ جائے گی اپنے چہیتے باپ کے پاس!"

"کیا منہ لے کر آئے گی؟ اب آئی تو میں ٹانگیں توڑ دوں گا اس کی! ....."

میں یہیں تک سن پائی تھی کہ مجھے معاً تانگے کا خیال آیا۔ دبے پیروں وہاں سے لوٹی۔
"واپس سٹیشن پر چلو۔ تانگے والے کو کہا۔
میں راستے بھر سوچتی گئی کہ پیسہ کیسے ادا کروں گی۔ شاید کوئی زیور گروی رکھنا پڑے۔ مگر اس وقت رات کو گروی کون
ئے گا ۔

مجھے تعجب ہوا — یا شاید نہیں ہوا — کہ وہ پستہ قد آدمی سٹیشن کے باہر ہی ٹہل رہا تھا۔
اُس نے تانگہ رکتے ہی اُس کا کرایہ چکا دیا۔
"آپ نے اچھا کیا کہ وقت پہ آ گئیں؟ متھرا کی گاڑی آنے والی ہی ہے۔ وہاں سے فرنٹیئر میل پکڑنی ہے بمبئی"۔
اس نے میرا ٹکٹ نہیں خریدا۔
اس کے پاس میرا ٹکٹ پہلے سے موجود تھا۔
گاڑی آنے سے پہلے اُس نے صرف اتنا کہا کہ "آپ مجھ پہ بھروسہ رکھیے۔ آپ کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ زنانے درجے میں آپ سفر کریں گی۔ کمپنی والوں کو آپ کو سپرد کرتے ہی میں تو کھسک جاؤں گا۔۔۔ کچھ بنگال سے بھی لائے ہیں"۔
وہ اپنے قول کا پکا ثابت ہوا۔
زنانے درجے میں سوار کر کے وہ صرف چائے اور کھانا پوچھنے آتا تھا۔
اور ہاں ایک بار بہت سے فلمی پرچے مجھے دے گیا اور کہنے لگا "اب دیکھنے اگلے مہینے ان سب میں آپ کی تصویریں چھپیں گی"۔
اور میں نے سوچا کہ محمود جو ان سب پرچوں کو پڑھتا تھا یہ دیکھ کر کتنا جلے گا۔
میں نے اٹیچی کیس کو تکیہ بنا کر برقعہ کو رات کو اوڑھ لیا تھا لیکن بمبئی پہنچتے پہنچتے وہ اب غیر ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے اُسے ریل کے ڈبے میں چھوڑ دیا۔
بمبئی پہنچ کر اُس نے مجھے ٹیکسی میں بٹھایا۔ خود ڈرائیور کے پاس بیٹھا اور کہا "میرین ڈرائیو چلو"۔
"کیا کمپنی کا دفتر وہاں ہے؟"
"ہاں یہی سمجھو۔ سٹوڈیو تو ہمارا دادر میں ہے۔ یہ سیٹھانی جی کا اپنا فلیٹ ہے۔ وہ تمہیں اپنے پاس ہی رکھنا چاہتی ہیں"۔
"تمہاری کمپنی کی مالکن ایک عورت ہیں؟"
"ہاں اور کیا؟ جب ہی تو جب کسی لڑکی کو لے کر ہم آتے ہیں تو راستے بھر اُس کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔۔۔۔۔"
"کیا نام ہے تمہاری سیٹھانی کا؟"
"مس للیتا کماری۔ پہلے وہ بھی ہیروئن ہوتی تھیں۔ مگر کسی اور نام سے کام کرتی تھیں۔ اب ذرا موٹی ہو گئی ہیں سو کمپنی کھول لی ہے"۔
فلیٹ کے دروازے پہ بورڈ لگا تھا "مس للیتا کماری۔ فلم پروڈیوسر"
مگر میں نے دیکھا کہ ایک جنگلہ بھی لگا ہے دروازے کے باہر گیلری میں جسے ایک چوکیدار نے کھولا اور پھر بند کر دیا قفل لگا دیا۔

مجھے یہ دیکھ کر تعجب تو ہوا۔ مگر میرے پستہ قد ساتھی نے اطمینان دلا دیا۔ "سیٹھانی بہت وہمی ہیں۔ ہمیشہ چوروں سے ڈرتی ہیں کہ کوئی ان کے ہیرے جواہرات چرا کر نہ لے جائے؟"

ایک بڑے یا روم میں لے جا کر بٹھایا گیا۔

پستہ قد آدمی باہر کے کمرے میں چلا گیا۔ دروازہ بند کر دیا۔

نہ جانے کیوں مجھے یوں محسوس ہوا کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ پرکھ رہا ہے مگر کمرہ خالی تھا۔ کوئی تھا ہی نہیں۔ شاید یہ میرا وہم ہی ہو۔

کچھ دیر کے بعد دروازہ پھر کھلا۔ اور وہی پستہ قد آدمی ایک موٹی عورت کے ساتھ داخل ہوا جو کسی زمانے میں بہت خوبصورت رہی ہوگی۔

"اچھا۔ نیلی ساڑھی۔ گڈ باؤ۔ اینڈ گڈ لک!"

اور یہ کہہ کر وہ آدمی چلا گیا۔

وہ سیٹھانی میری طرف آئیں۔

مجھے بڑے غور سے دیکھا۔ پھر ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

بڑے پیار سے میرے سر کو تھپ تھپاتے ہوئے کہا: "ابھی تو تم تھکی ہوئی ہو۔ کچھ کھا پی کر آرام کرو۔ رات کو تمہارا ٹسٹ ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ تم کامیاب ہوگی اور ریلیتا کماری کا نام روشن کروگی!"

یہ کہہ کر انہوں نے تالی بجائی۔

ایک نوکرانی ایک ٹرے میں کچھ مٹھائی اور دودھ کا گلاس لے کر آئی۔

"کھاؤ۔ بیٹی!"

"آپ نہیں کھائیں گی؟"

"نہیں۔ میں ابھی کھا پی کر اٹھی ہوں۔ یہ سب تمہارے لئے ہے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے ایک مٹھائی کی ڈلی میرے منہ میں ڈال دی کہنے لگیں کہ یہ شگن کی مٹھائی ہے۔

مٹھائی کا مزہ تو اچھا تھا مگر اس میں کچھ کڑواہٹ مل ہوئی تھی۔ میں نے سوچا پستہ یا بادام شاید کڑوا ہوگا۔

"پھر انہوں نے دودھ کا گلاس میری طرف بڑھایا۔

پیئو۔ میری جان" انہوں نے بڑے پیار سے دودھ اپنے ہاتھ سے پلایا۔ دودھ خوشبودار تھا گلاب کی سی خوشبو تھی اس میں مگر ساتھ ہی ایک ہلکی سی کڑواہٹ بھی تھی۔ سیٹھانی نے اپنا ہاتھ نہ ہٹایا، جب تک

میں نے دودھ کا گلاس ختم نہ کر لیا۔ اور پھر اُن کی آواز ایک دوسری دنیا سے آئی "اور پھیل جاؤ سب کچھ۔ اب تمہاری نئی زندگی شروع ہوتی ہے۔۔۔۔۔"

آیک لامتناہی رات میں ایک ڈراؤنا خواب دیکھتی رہی۔
دیکھتی ہوں کہ ایک ہاتھ میرے باپ نے پکڑا ہوا ہے۔
دوسرا ہاتھ میری سوتیلی ماں نے۔
ایک ٹانگ محمود نے پکڑی ہوئی ہے۔
دوسری ٹانگ اُس پستہ قد آدمی نے جو مجھے بمبئی لایا تھا۔
اور سیٹھانی کی نگرانی میں میرے بدن میں یہ لمبے لمبے اُن کے سوئے گھونپے جا رہے ہیں۔
اور میرے بدن میں سے سارا خون پانی بن کر نکل رہا ہے۔
نہ جانے کتنی دیر یہ خواب دیکھتی رہی۔
اس کے بعد جب ہوش آیا تو میں ایک گدے دار پلنگ پر پڑی تھی۔
میرے سر کے نیچے ایک مخملی تکیہ تھا۔

جب میں نے اپنی ٹھوڑی کھجانے کے لئے اپنا ہاتھ ہلانا چاہا تو معلوم ہوا کہ ہاتھ بندھا ہوا ہے۔ دونوں ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ ٹانگ سکوڑنی چاہی تو ٹانگ بھی پائے سے بندھی ہوئی ہے۔ دوسری ٹانگ بھی۔ سر بھی اسی طرح کسی چیز سے باندھا گیا ہے کہ میں صرف سامنے دیکھ سکتی ہوں اور یہ ایک بے حد آرام دہ سولی پہ چڑھا دی گئی ہوں۔

اتنے میں سیٹھانی میرے سامنے کھڑی تھی۔
کہنے لگی "عیش و آرام کرو گی یا تکلیف اٹھاؤ گی۔ اس کا فیصلہ تم پر ہے۔ دیر یا سویر سب رام ہو جاتی ہیں۔ تم بھی ہو جاؤ گی۔ ذرا ابھی یا کچھ اور دیر کے بعد؟"

میں نے پوچھا "آپ کیا چاہتی ہیں؟"

"میں چاہتی ہوں کہ اس خوب صورت بدن کو انسانیت کو آرام پہنچانے کے لئے استعمال کرو۔ جو مجرد ہیں اُن کے لئے رات کی بیوی بنو، جو اپنی بیویوں کی بدصورتی سے گھبرائے ہوئے ہیں اُن کے بدن کو تسکین پہنچاؤ، جو سیاسی، سماجی، اقتصادی ذمہ داریوں میں دبے ہوئے ہیں اُن کا دل بہلا کر اُن کو اس قابل بناؤ کہ وہ ہمارے سماج کی ذمہ داریاں اٹھا سکیں!"

"تم چاہتی ہو کہ میں رنڈی بن جاؤں؟" میں نے یہ سوال سیٹھانی سے کیا۔ اور اپنے آپ سے بھی۔ "ارے میں ماں بننے والی ہوں۔ ماں!"

"تم ماں کبھی نہیں بنو گی۔ اس بار نہیں۔ کسی بار نہیں۔ دیکھنا چاہتی ہو یہ آپریشن کس کس نے کیا ہے۔ اور بغیر کسی لوہے کے

آئے کے ؟

اتنے میں اس کے اشارے پر ایک کے بعد ایک آدمی آتا گیا اور میرے پائنتی کھڑا ہو کر میری نگاہ کے دائرے سے ابھر ہوتا گیا۔

ہندو — مسلمان — سکھ — کرسچین — پوربی بھیا — مدراسی —

نہ جانے کہاں کہاں سے یہ مشٹنڈے اکٹھے کئے گئے تھے۔

اب مجھ میں چیخنے چلانے کی طاقت نہیں تھی۔ میرا کلیجہ منہ کو آیا اور ایک ابکائی کے بعد میں نے قے کر دی اور بے ہوش ہو گئی۔

جب مجھے ہوش آیا تو میری باقاعدہ ٹریننگ شروع ہوئی۔

ایک بار حکم کی خلاف ورزی کی سزا کوڑے پڑتے تھے اور کھانا بند۔

دو بار حکم کی خلاف ورزی کی سزا ان کچھ مشٹنڈوں سے منہ کالا کرنا تھا۔

تین بار حکم کی خلاف ورزی کی سزا ایسڈ منہ پر پھینکنا تھا۔ اس کا مظاہرہ میرے سامنے ایک معصوم سی لڑکی پر کر دیا گیا تھا جو ایسڈ سے جل کر لوٹ پوٹ کر وہیں میرے سامنے ڈھیر ہو گئی۔

میں نے ایک درخواست کی کہ مجھے یہ بتایا جائے کہ مجھے اس پستہ قد آدمی نے پہچانا کیسے کہ یہ گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی ہے۔ جواب ملا "تمہاری نیلی ساڑھی سے۔ تمہارے عاشق نے دو سو روپلے لے کر یہ اطلاع دی تھی کہ اس ٹرین سے تم آؤ گی اور یہ کپڑے پہنے ہو گی۔"

یہ سننے کے بعد میں تیار ہو گئی۔ اب رہ ہی کیا گیا تھا۔

اگر میں یہ بتاؤں کہ اگلے چھ برس تک کیا ہوا تو ایک ایسی فہرست تیار ہو جائے گی کہ اس کے شائع کرتے ہی ملک میں انقلاب آ جائے گا۔ میرے گاہکوں میں کون نہیں تھا . . .

افسر — منسٹر — بڑے بڑے بیوپاری — راجہ مہاراجہ نواب — فلم سٹار — فلم پروڈیوسر۔

پہلے میرے ساتھ ایک آدمی جایا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ مجھ پر بھروسہ ہونے لگا۔ پھر مجھے جو روپیہ ملتا تھا اس میں سے ایک تہائی اپنے پاس رکھنے کی اجازت مل گئی۔

میں اپنا پرانا نام بھی بھول گئی۔ نیا نام ہی کافی تھا۔ نیلی ساڑھی۔ میرے پاس ہر شیڈ کی نیلی ساڑھیاں تھیں۔ شفون کی نیلی ساڑھی سلک کی نیلی ساڑھی۔ بنارسی نیلی ساڑھی۔ کنجی ورم کی نیلی ساڑھی بار جٹ کی نیلی ساڑھی . . . . . اور سوٹ کیس کے سب سے نیچے کاٹن کی نیلی ساڑھی۔

ایک دن مجھے چھٹی تھی (جمعہ کو یہ چھٹی میں ضرور لیا کرتی تھی)

اس دن نہ جانے کیا ہوا کہ مجھے جوہو جانے کی سوجھی۔ اور نہ جانے کیوں میں نے وہی پرانی کاٹن کی نیلی ساڑھی پہنی۔

جوہو پہنچ کر میں نے ناریل پانی پیا۔ سیل پوری کھائی۔ کوئی مجھے جانتا نہیں تھا۔ اور میں اپنی گمنامی کا فائدہ اُٹھا رہی تھی۔ ادھر اُدھر گھومتی رہی۔

ایک جگہ ایک آدمی ریت کے پُتلے بنا رہا تھا۔ میں نے بھی اُس کی پھیلی ہوئی چادر میں بیس پیسے پھینک دیئے۔

اُس سے آگے بڑھی تو کیا دیکھتی ہوں زمین میں سے دو اُلٹی ٹانگیں اُگ آئی ہیں معلوم ہوا کہ کسی بیچارے کو اُلٹا زمین میں گاڑا گیا ہے۔ پاس ہی چادر پھیلائے ایک آدمی پیسے اکٹھے کر رہا تھا۔ میں نے اُسے ایک روپیہ دیا اور پوچھا یہ آدمی کب نکلے گا۔ اس نے کہا۔ سورج چھپتے اُسے یہاں سے نکالوں گا۔ ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی پر برسوں تپسیا کی ہے تب جا کر یہ کمال حاصل کر پایا ہے کہ شتر مرغ کی طرح ریت میں سر دے کر دن بھر اُلٹا لٹکا رہتا ہے۔

مجھے نہ جانے کیا سوجھی کہ سورج جب سمندر میں ڈوبنے لگا تو پھر وہاں پہنچ گئی۔

وہ ڈھول بجا رہا تھا۔ کہہ رہا تھا۔ دیکھو۔ دیکھو۔ دنیا کا سب سے بڑا کمال۔ بارہ گھنٹے ریت میں دفن رہ کر آدمی زندہ نکل رہا ہے۔

ٹانگوں میں حرکت پیدا ہو رہی تھی۔

اور پھر وہ آدمی جو ایک نیکر پہنے ہوئے تھا۔ نکل آیا۔ اور میں اُسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ تو اپنی آنکھوں میں سے ریت نکال رہا تھا۔ لوگ تالیاں مار رہے تھے۔ جیسے کمال کر رہے تھے اور میں منہ پھاڑے دیکھ رہی تھی۔۔۔ جیسے سچ مچ کوئی مردہ زندہ ہو گیا ہو۔ اور میں ایک معجزہ دیکھ رہی ہوں۔

کیونکہ میرے سامنے شکوہ آباد کا وہ سقّے کا لونڈا کھڑا تھا۔ بندو۔

تالیاں بجنی بند ہو گئیں۔

لوگ اُمڈتے ہوئے اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

بندو اور اُس کا ساتھی پیسے بٹورنے لگے۔

آدھے اُس آدمی نے لیئے، آدھے بندو نے۔ پھر اس آدمی نے کہا "اچھا ہے۔ میں چلتا ہوں۔ کل یہ تماشا چوپاٹی پر جا کر کریں گے۔"

یہ کہا اور وہ چلتا بنا۔

اور میں وہیں کھڑی بندو کو دیکھتی رہی۔

وہ بھی مجھے دیکھ رہا تھا۔

پھر وہ اُٹھ کے آ کر میری طرف دیکھتا رہا۔

میں نے کہا "بندو۔"

اُس نے کہا "جی۔ بی بی جی۔"

"تم شکوہ آباد سے کب آئے ؟"

"کوئی سال بھر ہوا ہے ۔"

"سب خیریت ہے ؟"

"اس کے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ سب خیریت نہیں ہے ۔

"ابا تو خیریت سے ہیں ؟" میں نے کرید کر پوچھا ۔

"ابا تو جنت کو سدھارے ۔"

میں نے دل ہی دل میں انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھی ۔

"یہاں کہاں رہتا ہے ؟"

اُس نے کہا ۔" مہالکشمی کے پاس ایک جھونپڑپٹی ہے ۔"

مجھے وہاں لے چل سکتا ہے ؟

"بی بی جی ۔۔" اُس کا چہرہ خوشی اور تعجب سے پھٹا کا پھٹا ہی رہ گیا ۔

تمہاری بیوی ساتھ رہتی ہے کیا ؟"

"بی بی جی ۔۔ میری شادی نہیں ہوئی !"

"پھر تو ٹھیک ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں تمہارے ساتھ رہ سکتی ہوں ۔

اُس کا حال تو یہ تھا کہ شادی مرگ نہ ہو جائے ۔

"چلئے ۔ بی بی جی ۔"

"چلو

"سو ہم اُس مہالکشمی والی جھونپڑپٹی میں آ گئے ۔

جھونپڑی اُن پائپوں سے تو اچھی تھی جو سڑک کے کنارے کنارے پھیلے ہوئے تھے اور جن میں بے گھر لوگ آکر آباد ہو گئے تھے ۔ اور وہ لوگ اُن سے اچھے تھے جو سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر سونے کے لئے مجبور تھے ۔ جھونپڑی میں ایک ٹوٹی پھوٹی کھٹیا تھی ۔ میں اُس پر لیٹ کر ایسی سوگئی جیسے دنیا کی خبر نہ ہو ۔ چھ سال کے بعد میں پہلی بار چین کی چھٹی منا رہی تھی ۔

صبح کو میں نے دیکھا کہ بندو جھونپڑی کے باہر سو رہا تھا ۔

میں نے اُسے اُٹھایا ۔

اندر آیا تو پوچھا "مجھے تو بہت اچھی نیند آئی ۔ تم بھی اندر کیوں نہیں آ گئے ؟

"بی بی جی ! ۔۔۔ اندر تو ایک ہی چارپائی تھی ۔ اور ۔ آپ اُس پر ایسی تھکی ہاری سو رہی تھیں ۔ جیسے ۔۔ جیسے ایک بچہ سو رہا ہو ۔"

"مجھے تو ساتھ ہی سونے کی عادت ہے۔ تم بھی آجانے!"

"بی بی جی—"

"بی بی جی—"

"نام بتاؤں دو چار کے؟—" اور میں بتانے ہی لگی تھی۔ مگر اُس نے اتنی لجاجت سے "بی بی جی" کہا کہ میں چُپ رہ گئی۔

پھر وہ کہنے لگا۔ "قاضی جی جب نکاح پڑھ دیں گے تب ٹھیک ہے۔"

"قاضی جی؟" مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔

"قاضی جی!" میں ہنستی ہی رہی۔

اُس کے چہرے پر ایک ایسا بھولا پن تھا کہ مجھے اُس پر غصّہ بھی آ رہا تھا اور ہنسی بھی آ رہی تھی۔

"کیا تمھیں نہیں معلوم کہ میں پچھلے چھ برس سے کیا کرتی رہی ہوں؟"

"بی بی۔ میں نہیں جاننا چاہتا۔—"

"۔۔۔۔۔۔ کہ ایک ایک رات میں چھ چھ کو ۔۔۔۔۔۔"

"بی بی جی۔ خدا کے لیے چُپ رہیے۔ میں نہیں جاننا چاہتا ۔۔۔۔ قاضی جی نکاح پڑھا دیں گے پھر جو جی چاہے مجھے دو بتا۔"

"قاضی جی!" اور مجھے پھر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ اور میرے منہ سے نکل گیا۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ میں ایک سقّے کے لونڈے سے بیاہ کروں گی؟"

یہ سُن کر وہ چُپ ہو گیا۔ اور باہر چلا گیا۔

دو گھنٹے کے بعد کھانے کی چیزیں لے کر آیا اور میرے سامنے رکھ دیں بغیر ایک لفظ کہے اپنا کھانا باہر لے گیا اور وہاں ہی کھایا۔

میرا جی تو اکیلے کھانے کو نہیں چاہتا تھا پھر بھی جب بھوک لگی تو زہر مار کر لیا۔ سہ پہر کو وہ آیا اور کہنے لگا۔ "میں جا رہا ہوں تم جھونپڑی کا دروازہ اندر سے بند کر لینا۔ میرے آنے تک کسی کے لیے نہ کھولنا۔"

"تم کہاں جاؤ گے؟"

"روزی کمانے۔"

"سر ریت میں دے کر اُلٹے لٹکنے کو تم روزی کمانا کہتے ہو۔"

"میں جانتی تھی وہ کیا جواب دے گا۔ میں اُس جواب کو سُننا چاہتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ کہے کہ ہر ایک کو اپنے ڈھنگ سے روزی کمانا پڑتا ہے۔ کوئی ریت میں سر دیتا ہے کوئی —؟ مگر اُس نے کچھ نہیں کہا اور چلا گیا۔

میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور کھٹیا پر لیٹ رہی۔

تھوڑی دیر میں باہر سے سیٹیاں سنائی دینے لگیں۔

میں نے ایسی سیٹیاں پچھلے چھ برس میں بہت سنی تھیں۔ میں ان کا مطلب خوب سمجھتی تھی۔

دو ایک نے دروازے پر ٹھک ٹھک بھی کی لیکن کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ پرانی لکڑی کا دروازہ جو رسّی سے بندھا ہوا تھا لات مار کے توڑ دے اور اندر چلا آئے۔ غریب بھی بُرائی کرتے ہیں اور امیر بھی۔ مگر غریب کی بُرائی میں امیروں کی سی وہ بے حیائی نہیں ہوتی۔

وہ رات کو دیر میں آیا اور کچھ کھانا ساتھ لایا۔

میں نے کہا "کیا ہوا؟"

اُس نے کہا "یہی جو تم نے دیکھا تھا۔ مگر پیسے زیادہ ملے۔ شاید تمہارے آنے کی برکت ہے۔"

"برکت؟" میرے جی میں آیا تو کہوں کیوں کچوکے دیتے ہو مگر اُس نے شاید بالکل بھولے پن سے کہا تھا۔ اس لئے میں چپ رہی۔

اُس رات کو میں سوچتی رہی کہ یہ میں کیا کر رہی ہوں۔ پھر میں نے سوچا کہ کیا یہی دن چھٹی پر ہوں۔ چھ برس ہو گئے محنت کرتے کرتے۔ کچھ دن تو چھٹی کر دوں ...... یہاں جھونپڑپٹی میں کون مجھے ڈھونڈنے آئے گا۔؟

بندو روز دو تین بجے جا تا رات گئے آتا۔

نہ میں اُس سے پوچھتی کہ کیا ہوا؟

نہ وہ مجھ سے پوچھتا کہ میں نے کیا کیا؟

نہ ہی اُس نے اُس پہلے دن کے بعد کبھی قاضی جی کی بات چھیڑی۔

وہ اپنے میلے کچیلے بستر کا ڈھیر لیتا اور باہر جا کر بچھا دیتا۔ مگر میرے لئے وہ نئی دری نئی چادر نیا تکیہ لے آیا تھا۔ کھٹیا کو بھی ٹھوک پیٹ کر ٹھیک کر لیا تھا۔

مگر میں اُس کھٹیا پر اکیلی سوتی تھی۔

اور وہ باہر فٹ پاتھ پر اکیلا سوتا تھا۔

اس طرح تین ہفتے بیت گئے۔

میری پڑوس میں دو تین عورتوں سے دوستی ہو گئی۔ میں نے انھیں بتایا کہ میرے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا اور میں بمبئی نوکری ڈھونڈنے آئی تھی۔ یہاں آ کر بندو سے ملاقات ہو گئی تھی۔ جس نے اپنی جھونپڑی میں مجھے پناہ دی تھی۔ جھوٹ بولنے کی مجھے عادت ہو گئی تھی۔

پھر ایک دن اُسے آنے میں دیر ہوئی تو میں نے سوچا کہ آج میں اُس سے کہوں گی کہ تم یہ کام چھوڑ دو۔

کہے گا کہ "روزی کمانے کا ایک ہی ذریعہ آتا ہے مجھے۔"

میں کہوں گی۔ "مجھے بھی روزی کمانے کا ایک ذریعہ ہی آتا ہے۔ مگر میں وہ چھوڑنے کو تیار ہوں۔"

پھر وہ کہے گا۔ "تو قاضی جی کو بلا لاؤں۔"

اور میں کہوں گی۔ "ہاں۔ بلا لاؤ۔"

مگر وہ اُس رات نہ آیا۔

اگلے دن نہ آیا۔

تیسرے دن نہ آیا۔

میں نے پڑوسی عورتوں سے کہا۔ اُنہوں نے اپنے مردوں سے کہا۔ انہوں نے کہا وہ معلوم کریں گے۔ اُس آدمی سے جس کے ساتھ وہ کام کرتا ہے۔

رات کو ایک آدمی اُن میں سے آیا اور کہنے لگا۔ "ہندر تو جیل میں ہے۔"

"جیل میں ہے؟ کیوں اُس نے کیا کیا؟"

"ریت میں دفن ہونا خودکشی کے برابر ہے۔ سپاہی کو ہفتہ نہیں کھلایا اس لئے وہ آتم ہتیا کے جرم میں پکڑ کر لے گیا۔ دوسرا آدمی بھاگ گیا۔ اب ہندر جیل میں ہے جب تک کوئی ضمانت پر چھڑائے نا؟"

"کتنی ضمانت دینی ہو گی؟"

"دو ہزار روپے!" اُس آدمی نے کہا جیسے دو لاکھ روپے ہوں۔ مگر میں نے سوچا۔ "اس سے کہیں زیادہ تو میں نے بچا کے رکھے ہیں۔ شاید پانچ چھ ہزار تو ہوں گے۔ مگر وہ تو پیڈر روڈ والی فلیٹ میں ہیں۔" (ہمارے) جانے۔ قسمت بدلتی ہوتی تھی)

میں اسی شام کو پیڈر روڈ والی فلیٹ میں پہنچی۔

مجھے دیکھتے ہی للیتا کماری آگ بگولا ہو گئی۔ "میں تو سمجھی تھی تو مر گئی یا کوئی بھگا کر لے گیا تجھے۔"

میں نے آواز کو قابو میں کرتے ہوئے کہا۔ "میں جا رہی ہوں۔ اپنا روپیہ لینے آئی ہوں۔"

یہ کہہ کر میں اندر اپنے کمرے میں گئی اور اپنا سوٹ کیس کھول کر روپے اور اپنا زیور نکالا۔ یہ کر ہی رہی تھی کہ ایک مسٹنڈا آدمی دیکھا پیچھے کھڑا ہے۔ ہاتھوں پر لمبے سے کالے ربڑ کے دستانے چڑھائے ہوئے۔ ہاتھ میں ایک بوتل ہے، جس میں مجھے معلوم تھا تیزاب رہتا ہے۔

"کیا کر رہی ہے حرامزادی؟"

چھ سال کے بعد آج نہ جانے کہاں سے مجھ میں ہمت آ گئی میں بولی۔ "اپنا روپیہ اور زیور لے جا رہی ہوں۔ اور دیکھتی ہوں کون مجھے روکتا ہے۔"

اُس بدمعاش نے اپنے سڑے ہوئے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ "تو جاؤ۔ میری جان۔"

اور جب میں اُس کے پاس سے گزرنے لگی تو اُس نے میرے منہ پر تیزاب کا وار کیا۔

جانتی تھی تیزاب کا کیا اثر ہو گا۔ میں ایک دو عورتوں کو دیکھ چکی تھی جو اپنا گلا سڑا چہرہ لئے اپنی زندگی کے آخری دن اُس

چکلے میں گذار رہی تھیں کیونکہ کہیں اور وہ اپنا منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ گئی تھیں ۔

مگر میں تو مرنے کے لئے ہی تیار تھی۔ کیوں نہ اس ظالم کو بھی ساتھ نہ لیتی جاؤں۔ میں نے اپنے چہرے کی ناقابل برداشت اذیت کے باوجود اُس کے ہاتھ سے بوتل چھین کر اُس کو اُس کے سر پہ دے مارا ۔ بوتل ٹوٹ گئی اور آدھا تیزاب جو اُس میں تھا وہ اُس آدمی کے چہرے پر گر پڑا۔ ایک غضب ناک چیخ اُس کے منہ سے نکلی اور اُس چیخ کا کھلنا تھا کہ اُسکے کھلے ہوئے منہ میں بھی تیزاب گر گیا اور وہ آدمی پھر نہ چیخ سکا ۔

میرا منہ جل رہا تھا، پھنک رہا تھا، مگر وہ روپیہ اور زیور اب بھی میرے ہاتھ میں تھا۔ اُسے لے کر میں باہر آئی تو دیکھا پولیس کی ریڈ ہوئی ہے۔ للیتا کماری بڑے ٹھسّے سے صوفے پر بیٹھی پولیس انسپکٹر سے بات کر رہی تھی "انسپکٹر صاحب میری تو ڈانس کلاس ابھی چھٹی ہے ۔ اس کی لڑکیاں اپنے اپنے گھر جا رہی ہیں - آپ کو کچھ غلط فہمی ہوئی ہے ۔ . . . . کیا منگاؤں آپ کے لئے ۔ کچھ ٹھنڈا یا گرم . . . . "

"انسپکٹر صاحب"

اب میں اُن کے سامنے ہی کھڑی تھی ۔ اور تیزاب میرے منہ پر بہہ رہا تھا۔ اور میرے گوشت کے لوتھڑے لٹک رہے تھے" اس سے پہلے کہ میں بے ہوش ہو جاؤں ــــ یا شاید مر جاؤں ــــ میں ایک بیان دینا چاہتی ہوں"

بس حضور یہی سب کہا تھا اُس بیان میں میں نے ۔

میرا چہرہ جس پر پٹیاں بندھی ہیں اب اس قابل نہیں ہے کہ آپ دیکھیں لیکن ایک زمانہ تھا لوگ اس چہرے کی تعریف کرتے نہیں تھکتے تھے ۔

بس مجھے یہی کہنا تھا آپ سے ۔

اب مجھے اجازت دیجئے ۔

بندو میرا انتظار کر رہا ہے ۔

وہی ایک آدمی ہے جو انسان کا چہرہ نہیں دیکھتا ۔

اُس چہرے کے پیچھے جو روح ہے اُس کو دیکھتا ہے ۔

اور اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ مجھے اُس کے پاس جانا ہے کیونکہ قاضی صاحب ہمارا انتظار کر رہے ہیں ۔

ایلینیز

ممتاز مفتی

یہ ایک انوکھے سفر کی کہانی ہے۔

آپ نے عجیب و غریب سفروں کی کہانیاں سنی ہیں۔ شہزاد کے سفر۔ الف لیلوی سفر۔ گلیور کے سفر۔ بالشتیوں میں، دیوقامتوں میں۔

لیکن مایم کی ماں کا یہ سفر بالکل انوکھا تھا۔ وہ کبھی عازم سفر نہ ہوئی تھی۔ نہ ہی رخت سفر باندھا تھا۔ نہ ہاتھ میں لگام تھامی تھی نہ پاؤں رکاب پر رکھا تھا۔

نہ وہ کبھی جہاز پر سوار ہوئی تھی نہ جہاز طوفان سے ٹکرایا تھا نہ وہ بہہ کر کسی انجانے جزیرے کے ساحل پر جا لگی تھی۔ پھر پتہ نہیں کیسے — اس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ ایک انجانی بے کانی مخلوق اس کے ارد گرد جھمگھٹا لگائے کھڑی اسے یوں دیکھ رہی ہے جیسے وہ عجوبہ مخلوق ہو۔

یہ سفر اس لحاظ سے انوکھا تھا کہ اماں نے خود حرکت نہ کی تھی۔ بلکہ ایک ایلین ماحول خود بخود چل کر اس کے ارد گرد آ کھڑا ہوا تھا۔

وہ سوچنے لگی — اللہ یہ میں کہاں آگئی ہوں۔ یہ کون لوگ ہیں۔ یہ لوگ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں۔

ان ایلینز میں بہت سے بڑے مانوس سے دکھتے تھے۔ جیسے وہ انھیں جانتی تھی جیسے وہ اس کے ہم سفر رہے تھے۔ لیکن پتہ نہیں کیوں ایک نظر میں وہ مانوس دکھتے دوسری نظر میں ایسے لگتا جیسے بیگانہ ہوں۔ ایلینز۔

پھر اماں کو اپنے آپ پر شک پڑنے لگا۔ ——— میں کون ہوں ——— کہاں ہوں۔ میرا مصرف کیا ہے۔ کس لئے ہوں کیوں ہوں۔

اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا ——— وہ سوچتی رہی۔ محسوس کرتی رہی۔ سوچتی رہی حتیٰ کہ وہ بیمار پڑ گئی۔ ڈاکٹر نے ٹوٹیاں لگا کر اسے دیکھا۔

ڈاکٹر تو صرف SYMPTOMS دیکھتے ہیں انھیں بیماری سے دلچسپی ہے۔ انسان سے نہیں انھیں ابھی تک شعور نہیں ہوا کہ بیماری روح سے پھوٹتی ہے۔ ڈاکٹر بھلا کیا کہتا، بولا مریضہ کو کوئی بیماری نہیں، صرف کمزوری ہے بڑھاپا ہے۔

جس کا علم جسم تک محدود ہو وہ کیسے سمجھے گا کہ بڑھاپا عمر سے نہیں ہوتا بلکہ جینے کی امنگ نہ رہے تو اعضا بوڑھے ہو جاتے ہیں۔

اماں میں جینے کی امنگ نہ رہی تھی ۔

جینے کی امنگ بھی قائم رہتی ہے جب کوئی خواہش کوئی خیال کوئی امید کوئی فرد کوئی مطمح نظر کوئی سراب آپ کو انگلی پکڑ کر چلائے جینے کی امنگ تبھی قائم رہتی ہے جب آپ کی اپنی حیثیت ہو ۔ اہمیت ہو ۔ آپ کو احساس ہو کہ آپ کا کوئی مصرف ہے ۔

کئی ایک سال سے اماں محسوس کر رہی تھی کہ اس کا کوئی مصرف نہیں رہا ۔ وہ ایک فالتو ہستی ہے ۔

رضائی میں پڑی ہوئی سلوٹ میں جنبش ہوئی ۔ ہڈیوں کے ایک ڈھانچے نے سر نکالا ۔ بے نور آنکھوں نے صائم کی طرف دیکھا ۔ نگاہیں صائم سے پار ہو گئیں ۔ اگر آسیہ کے لئے صائم میں کوئی مفہوم ہوتا تو یقیناً نگاہ صائم پر رک جاتی ——— آنکھوں میں لگاؤ کی چمک لہراتی لیکن صائم تو عرصہ دراز سے اس کے لئے اجنبی بن چکا تھا ۔

صائم آسیہ کا اکلوتا بیٹا تھا جو اس وقت ماں کی چارپائی کی پائنتی پر بیٹھا ہوا تھا ۔ اس وقت کمرے میں ماں اور بیٹے کے سوا کوئی نہ تھا ۔

آٹھ دن سے وہ اس کی پائنتی پر بیٹھا تھا ۔ آٹھ دن سے آسیہ مر رہی تھی ۔

دفعتاً اس ہڈیوں کے ڈھانچے میں تڑپ پیدا ہوئی ۔ آسیہ کی مضطرب لیکن کراکری آواز گونجی ۔ اب کیا دیر ہے ۔ اب کس کا انتظار ہے ۔ تم مجھے لے جاتے کیوں نہیں ۔ اس نے اردگرد کی فضا کو مخاطب کر کے کہا ۔ آسیہ کے بات کہنے کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کمرے میں صائم کے علاوہ اور لوگ بھی موجود تھے ۔

شاید روح ہو ہیولے ہوں ، فرشتے ہوں ۔

آٹھ دن سے وہ آسیہ کے اردگرد منڈلا رہے تھے ۔ آٹھ دن سے وہ انہیں ڈانٹ رہی تھی ۔

میرا منہ کیا تک رہے ہو ۔ مجھے لے جاتے کیوں نہیں ۔ اب کیا دیر ہے ۔

اس نے گھر کے باقی لوگوں سے بات کرنی چھوڑ رکھی تھی ۔

گھر میں صرف چند ایک لوگ ہی تو تھے ۔ صائم اس کی دو نوجوان بیٹیاں سلما ستارہ ایک بیٹا سمیع بہو اسما اور صائم کی بیوی سمینہ عرصہ دراز سے آسیہ ان سب افراد کی زندگیوں سے خارج ہو چکی تھی ۔

اگرچہ ان سب کے دلوں میں بوڑھی اماں کی بڑی عزت تھی ۔ لیکن عزت تو کوئی تعلق نہیں ہوتا ۔ عزت تو کوئی جذبہ نہیں عزت تو تہذیب کی ایک مصنوع ہے جس طرح پلاسٹک کے پھول ہوتے ہیں ۔ اماں وہ شہد کی مکھی تھی جس کے اردگرد پلاسٹک کے پھولوں کا باغ سجا ہوا تھا ۔

صرف ایک گھرانے کو اماں سے قلبی تعلق تھا ۔ وہ ڈاکٹر صولت کا گھر تھا ۔ ڈاکٹر صولت اماں کے بھائی کا بیٹا تھا اس کا گھر ایک جزیرہ تھا جہاں جدیدیت کی آندھی اثر انداز نہ ہوئی تھی ۔ جہاں ماضی ابھی تک حال کا بہروپ دھارے آلتی پالتی مار کر بیٹھا تھا ۔

ڈاکٹر صولت کا گھر واحد گھر تھا جہاں اماں کے لئے ایلینز نہیں بستے تھے۔ جہاں وقت کو دوام مل گیا تھا جہاں ابھی تک ۱۹ سنہ عیسوی رائج تھی۔ جہاں بڑی اماں کو محسوس ہوتا کہ وہ اصلی پھولوں پر بیٹھی ہے۔

لیکن صائم کے سبب ڈاکٹر صولت کا گھر ایک ODD مقام تھا اسے صولت سے شکایت تھی کہ اس نے گھر کو حنوط کر رکھا ہے۔ اور اس حنوط شدہ گھر نے آسیہ کو اس قابل نہ چھوڑا تھا کہ کہیں اور رہ سکے صولت کی نسبت صائم کا تعلق آسیہ سے کہیں زیادہ پرانا اور گہرا تھا۔

آسیہ اور صائم نے سال ہا سال اکٹھے مل کر دکھ سہے تھے۔ اکٹھے مل کر دکھ سہنا گہرا تعلق پیدا کر دیتا ہے۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب گرد و پیش ایلین نہ تھا۔ جب آسیہ اپنے دور میں زندگی بسر کر رہی تھی۔ جب لوگ اس کی بات سمجھتے تھے۔ اسے اہمیت دیتے تھے۔ جب زندگی میں اس کا ایک مقام تھا، مفہوم تھا۔

ان کے دکھوں کی وجہ صرف حالات کی ناسازگاری تھی۔ اس ناسازگاری کی بنیاد ایک عام سا حادثہ تھا کہ خاوند نے دوسری شادی کر لی تھی اور آسیہ کو ہمیشہ کے لئے گھر کی نوکرانی کی حیثیت دے دی گئی تھی۔

جس باورچی خانے میں اسے دن رات کام کرنا پڑتا تھا۔ وہاں سے اسے اپنے اور اپنے بیٹے کے لئے طعام نہیں ملتا تھا۔ اس لیے مالک اور مالکن کو کھانا کھلانے کے بعد اسے اپنا چولہا جھونکنا پڑتا۔

مالک کے باورچی خانے کا ایک فائدہ ضرور تھا کہ جب وہاں ہنڈی پکتی تو آسیہ ہنڈیوں سے اتاری ہوئی ٹوپیاں لے لیتی اور ان سے اپنی ہانڈی پکاتی جب وہاں کریلے پکتے تو کریلوں سے چھیلا ہوا چھلکا نوکرانی کو مل جاتا۔ نوکرانی کے بیٹے کے لئے یہ کریلے تھے۔ ٹوپیاں ہنڈیاں تھیں۔ چھلکے سبزیاں تھیں۔

نوکرانی کے بیٹے نے بچپن میں رات کے وقت کبھی کھانا نہ کھایا تھا۔ اس لئے کہ مالک رات گئے گھر آتا تھا اور نوکرانی کو انہیں کھانا کھلانے سے پہلے چھٹی نہیں ملتی تھی۔ کھانا کھلا کر جب وہ آؤٹ ہاؤس میں پہنچتی تو بیٹا سو چکا ہوتا۔ پھر وہ چولہا جھونکتی۔ چھلکے پکاتی اور جب ہانڈی تیار ہو جاتی تو بیٹے کو جگاتی۔ اسے کھانا کھلاتی۔

بیٹا کھا تو لیتا تھا۔ مگر جاگتا نہ تھا۔ اس لئے اسے یاد نہیں تھا کہ بچپن میں اس نے کبھی رات کا کھانا کھایا ہو۔

پھر مالک کا سٹیٹس اونچا ہو جانے پر ایک ٹرینڈ باوردی نوکر رکھنا لازم ہو گیا۔ اس لیے آسیہ کو نکال دیا گیا۔ اور ماں بیٹا آزاد ہو گئے۔

آزادی نے انہیں نئے مسائل سے دوچار کر دیا الاؤنس بہت قلیل تھا ضروریات بڑھتی ہی چلی جا رہی تھیں۔

بڑھتی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ماں بیٹے کو محنت مزدوری کرنی پڑی انہوں نے مل کر چارپائیاں بنیں۔ کتابوں پر جلدیں باندھیں کاغذ کے پھول بنائے۔ پتنگ بنائے۔ دھاگا خرید کر اس پر مانجھا لگایا تاکہ ڈور بیچ سکیں۔ بچوں کے کھلونے بنائے آسیہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا محنت مزدوری کرے۔ اس کی خواہش تھی کہ ایک سلائی مشین خریدے اور اکیلی سلائی کا کام کرے لیکن اتنے پیسے نہ تھے۔ پھر کسی مخیر نے قرض کے طور پر ایک پرانی گھسی پٹی مشین خرید دی اور وہ کپڑے سینے لگی۔

آسیہ ہرفن مولا عورت تھی۔ وہ ہر کام کر سکتی تھی۔ وہ ہر عام سے عام کام میں بھی انفرادیت کی کلیاں ٹانکا کرتی تھی۔ انوکھے کام سوچا کرتی انوکھی چیزیں بنایا کرتی۔ لیکن یہ اس دور کی بات ہے جب ہاتھ کے کام کی قدر نہ تھی قیمت نہ تھی۔ ان کا باہمی تعلق بہت گہرا تھا۔ اس تعلق کے کئی رخ تھے۔ ماں بیٹے کا تعلق مظلومیت کا تعلق۔ غربت کا تعلق۔ مزدوری کا تعلق دکھ کا تعلق۔

اگر صائم علم حاصل نہ کرتا۔ اور وہ دونوں ہمیشہ کے لئے مزدور رہتے۔ محنت اور مشقت بھری زندگی بسر کرتے تو یہ تعلق جوں کا توں قائم رہتا۔ لیکن علم قینچی بن کر آیا اور اس نے اس عظیم تعلق کے پرزے اڑا دیئے۔

شاید علم دوست اس پر احتجاج کریں اور اپنی جواز پسندی کے تحت تاویل پیش کریں کہ جو خلوص بھرے تعلق کے پرزے اڑا دے وہ علم نہیں ہو سکتا۔ مجھے کسی حتمی علم کا پتہ نہیں میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ جو رائج الوقت ہو وہی علم ہوتا ہے۔ ہر دور میں رائج الوقت علم کا خصوصی رخ ہوتا ہے۔

آسیہ کے دور میں۔ ایمان لاتا تھا ——— صائم کے دور میں شک کرنا۔ تاریخ شاہد ہے کہ علم کا رخ ہمیشہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا رہا ہے صائم کے زمانے میں عقل و خرد کا دور تھا۔ جوں جوں وہ علم حاصل کرتا گیا جوں جوں عقل و خرد کی آنکھیں کھلتی گئیں توں توں جذبہ مضحکہ خیز ہوتا گیا۔ تعلقات کٹتے گئے۔

صائم کو آسیہ کے خلاف کئی ایک شکایات پیدا ہو گئیں۔ اماں ایسے مرد سے شادی کرنے پر کیوں رضا مند ہوئی جو کسی ایک عورت کا ہو کر نہیں رہ سکتا تھا بلکہ جسے عورت ذات سے دلچسپی تھی۔ اماں نے اپنے ہی گھر میں نوکرانی بن کر رہنے کو کیوں منظور کیا ——— اماں نے ظلم کے خلاف آواز بلند کیوں نہ کی۔ اماں نے اندھی وفاشعاری کو کیوں اپنائے رکھا شاید اماں غم خور ہو شاید اماں ایذا پسند ہو۔

آہستہ آہستہ صائم کی نگاہ میں مظلوم اماں تسکین پسند آسیہ نظر آنے لگی دکھی اماں ایذا پسندی کی لذت سے سرشار دکھائی دینے لگی یوں باہمی مظلومیت کا تعلق ٹوٹتا گیا۔ دکھ کا تعلق ٹوٹتا گیا۔ مزدوری کا تعلق ٹوٹتا گیا۔ ایذا پسند کے لئے محنت جدوجہد نہیں ہوتی۔ دکھ دکھ نہیں ہوتا۔ بلکہ انا کی تسکین ہوتی ہے بلغم کے لیے جو بٹر ہوتا ہے۔

اس عقل و دانش بھری سوچ بچار کی توجہ سے ایک ایسا دن آیا جب دونوں کے درمیان صرف ایک تعلق باقی رہ گیا۔ بیٹے اور ماں کا تعلق۔ لیکن بیٹے اور ماں کا تعلق تو ایک عارضی تعلق ہے جو صرف اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک بیٹا ماں کا محتاج ہوتا ہے وہ تو ماں کا بیٹے سے تعلق ہے جو واحد دائمی تعلق ہے۔

چونکہ صائم ماں کا محتاج نہیں رہا تھا اس لئے وہ تعلق بھی ٹوٹ چکا تھا۔ صرف برائے نام باقی تھا اس برائے نام تعلق کو ہم رسمی طور پر احترام بھی کہتے ہیں۔

احتراماً صائم آٹھ روز سے اماں کی پائنتی پہ بیٹھا تھا۔ اور آٹھ روز سے اماں مسلسل مر رہی تھی۔

دیر تک وہ رضائی میں پڑی ہوئی سلوٹ کی طرف دیکھتا رہا۔ کوئی جنبش نہ ہوئی۔

دفعتاً اس کے ذہن میں ایک خیال اُبھرا شاید اس نے پھر سے غور سے اماں کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہ میں ڈر نہیں بلکہ امید کی جھلک تھی۔ جیسے اس شاید — نے آنکھوں میں دیا روشن کر دیا ہو۔

چونکہ اماں نے منہ رضائی میں ڈھانپ رکھا تھا۔ صائم نے بیٹھے بیٹھے اندازہ لگایا کہ ماں کا دل کہاں ہوگا۔ پھر وہ اس مقام کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا کہ حرکت ہے یا نہیں۔

وہ مقام بالکل ساکت تھا۔

اس کے دل سے ایک ہلکی سی آواز آئی جیسے کسی نے اطمینان کا لمبا سانس لیا ہو۔

پھر ایک سرگوشی سی اٹھی۔ اچھا ہوا بیچاری اس عذاب سے مخلصی پا گئی۔

اس کے اندر رچی بسی ہوئی عقل بول رہی تھی۔

پتہ نہیں کبھی کبھی وہ سرگوشیوں میں کیوں بولتی تھی۔ ایسے کیوں بولتی تھی جیسے وہ احساس گناہ سے بھیگی ہو۔

اس کے اندر رچی بسی عقل تو گھر کی ملکہ تھی۔ عرصہ دراز سے گھر پر اس کا راج تھا پھر وہ سرگوشیوں میں بات کیوں کرتی تھی۔ کس سے ڈرتی تھی۔ صائم کے دل میں وہ کون تھا جس کے ڈر سے سہم جاتی۔ شرمسار ہو جاتی۔ ندامت سے بھیگ جاتی اس کی آواز زیر لبی ہو کر رہ جاتی۔

صائم کو تو اپنی عقل پہ ناز تھا۔ وہ اپنے آپ کو دانشور سمجھتا تھا۔ محفلوں میں جان بوجھ کر بلند آواز میں ایسے ادراکی نقطے بیان کرنے کا عادی تھا جو دوسروں کو چونکا دیں۔

محفلوں کی بات چھوڑیئے۔ اس نے کئی بار اپنی عقل و دانش کے بل بوتے پہ ماں سے کہہ دیا تھا اماں جب تم مروگی تو میں دیگیں چڑھا دوں گا۔ غریبوں کو کھانا بانٹوں گا۔ شکرانے کے نفل پڑھوں گا کہ یا اللہ تیرا بڑا احسان ہے کہ تو نے میری ماں کو اتنی لمبی عمر دی اور مجھے ماں کے ساتھ اتنی دیر اکٹھے رہنے کا موقعہ عطا کیا۔ اور اماں میں گھر والوں سے کہہ دوں گا کہ میری ماں کے مرنے پہ کوئی نہ روئے۔ کوئی بین نہ کرے۔ رونا اور بین کرنا تو ناشکری کے مترادف ہے۔

آسیہ کی عمر ۹۰ سال کی تھی۔ صائم سمجھتا تھا کہ ساٹھ ستر سال کے بعد موت زحمت بن جاتی ہے۔

صائم خود ستر سال کا ہو چکا تھا خود اس کے اپنے اردگرد ایلین ماحول قائم ہو چکا تھا۔ اس کی اپنی بیٹیاں سلما اور ستارہ اس کے خیالات اور احساسات سے بیگانہ تھیں بالکل ایسے ہی جیسے وہ خود ماضی میں اماں سے بیگانہ ہوا تھا۔

اماں سے ایلین بننے کی بات تو سمجھ میں آتی تھی۔ اماں جدید تعلیم سے آراستہ نہیں تھی۔

لیکن سلما ستارا کے ایلین بننے کی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ صائم کا ماں سے تعلق تو علم نے کاٹا تھا۔ لیکن اولاد سے کٹنے کی ذمہ داری کس پر تھی۔

اس ڈر کے مارے کہ اس کے اپنے بچے اس سے کٹ نہ جائیں وہ مسلسل علم حاصل کرتا رہا تھا۔ رائج الوقت علم زمانے کے ساتھ ساتھ چلتا رہا تھا تاکہ پیچھے نہ رہ جائے — پھر بھی وہ پیچھے رہ گیا تھا۔ کیوں؟

اس مسئلہ پر وہ سوچتا رہا تھا سوچتا رہا تھا ایک بات تو یقینی تھی کہ وہ بے علمی کی وجہ سے پیچھے نہیں رہا تھا۔ دانش کی وجہ سے پیچھے نہیں رہا تھا۔ نئے فکر سے ناواقفیت کی وجہ سے پیچھے نہیں رہا تھا۔ صائم نے کبھی نہ سوچا تھا کہ شاید وہ علم ہی کی وجہ سے پیچھے رہ گیا ہو

شاید نئی نسل علم و دانش چھوڑ کر پھر سے جذبے کی طرف چل پڑی تھی یہ سوچے بغیر کہ جذبہ تو راستہ ہوتا ہے منزل نہیں منزل کیسی — ان کے جذبے کا تو کوئی رخ ہی نہ تھا۔ صرف شدت ہی شدت تھی، ہانڈی آگ پر چڑھی تھی مگر ہانڈی میں تھا کیا

سوچ سوچ کر وہ ہار گیا مگر سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا تھا۔

مثلاً سلما کو فلم اس لئے پسند آتی کہ اس میں کوئی خاص اداکار ہوتا۔ اگر وہ اداکار ہوتا تو سب کچھ آپ ہی آپ ہو جاتا فلم کی کہانی عمدہ ہو جاتی۔ فوٹوگرافی شاندار ہو جاتی۔ مکالمے چست ہو جاتے۔

ستارہ کوئی ٹی وی سیریز اس لیے ناپسند ہوتی کہ اس میں کام کرنے والی کسی ایکسٹرا عورت کی شکل وصورت ایسی ہوتی کہ دیکھ کر اسے گھن آتی۔

سلما سمجھتی کہ کالج کی فلاں پروفیسر اس قدر عمدہ پڑھاتی ہے کہ ایک ایک لفظ دل نشین ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ بڑی پیاری ہے کتنی پیاری ہے وہ۔ سلما یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھی کہ کوئی بدشکل پروفیسر اچھا پڑھا سکتی ہے۔

ستارہ سمجھتی تھی کہ فلاں مضمون اس لیے اچھا ہے کہ فیشن ایبل سرکلز میں اس کا ذکر رہتا ہے اور فلاں مضمون اس لئے بُرا ہے کہ اس میں دقیانوسی سوچیں بھری پڑی ہیں۔

اتفاقاً صائم نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے میں سلما کھڑی تھی۔ بال لٹک رہے تھے چہرا ستا ہوا تھا۔ سر دروازے کی چوکھٹ سے لگا ہوا تھا۔ ٹکٹکی باندھے وہ آسیہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

سلما حزن وملال کی تصویر بنی کھڑی تھی۔

گھر کے سارے افراد حزن وملال سے بھرے ہوئے تھے۔ سارا ماحول حزن وملال سے بوجھل ہو رہا تھا۔

اس لئے نہیں کہ ماں یا دادی اماں مر رہی تھی۔

بلکہ اس لئے کہ گھر میں موت گھس آئی تھی چاروں طرف موت منڈلا رہی تھی۔ سارا گھر موت سے یوں لبالب بھرا ہوا تھا جیسے انار دانوں سے بھرا ہوتا ہے۔

ان جانے میں گھر کا ہر فرد آرزومند تھا کہ وہ بوجھ اٹھ جائے۔ بوجھل بوردم دور ہو جائے۔ گھر کا موڈ بحال ہو جائے۔ چاہے بوڑھی اماں پہ کچھ بیت جائے۔

سلما نے اشارے سے پوچھا کہ بڑی اماں کا کیا حال ہے۔

صائم نے مایوسی میں سر ہلا دیا۔

سلما کی اداسی اور گہری ہو گئی۔ سر ڈھلک گیا بال لٹکنے لگے اور ساتھ ہی آنکھوں میں امید کی کرن ناچنے لگی۔

سلما ایک جذباتی لڑکی تھی۔ اسے آسیہ سے بڑی محبت تھی لیکن کیا کرتی، اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے مجبور تھی۔ اس کی یہ جھیتی

سہیلی شانی کے بیاہ کو صرف آٹھ دن باقی رہ گئے تھے۔ اس نے شانی سے وعدہ کر رکھا تھا کہ اس کے بیاہ پر ملتان آئے گی۔ وہ چاہتی تھی کہ چاہے کچھ ہو جائے لیکن اس کے ملتان جانے میں رخنہ نہ پڑے اور اگر اماں یونہی پڑی رہیں تو وہ ملتان نہ جا سکے گی۔

پہلے ہی اماں کی بیماری کی وجہ سے سلمٰی کی ساری روٹین تباہ ہو چکی تھی۔

مثلاً فون ہی لیجئے۔

فون اس برآمدے میں fix کیا ہوا تھا جو اماں کے کمرے سے ملحق تھا۔ اماں کی وجہ سے سلمٰی فون کو آزادانہ طور پر استعمال نہیں کر سکتی تھی۔

پہلے تو عادی طور پر وہ ہر آنے والی کال کو بڑے شوق سے موصول کیا کرتی تھی۔

ان کالوں میں زیادہ تر رونگ نمبر ہوتے تھے وہ ان رونگ نمبروں کو بڑے نخرے سے جھاڑ پلا دیا کرتی۔ یا بڑے تہذیب یافتہ انداز سے رونگ نمبر کا مذاق اڑا دیتی۔

خاص سہیلیوں کے علاوہ سلمٰی کو کسی خاص رائٹ یا رونگ نمبر سے دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن رونگ نمبر کو کاٹنے میں کتنا مزا آتا تھا واٹ فن --- اظہار لگاؤ کے جواب میں اظہار بے نیازی میں کتنی لذت ہوتی ہے

اماں کی بیماری کی وجہ سے وہ سہیلیوں سے بھی بات نہیں کر سکتی تھی۔ پہلے تو وہ فون پر گھنٹوں باتیں کیا کرتی تھی۔ پتہ نہیں کیا باتیں کرتی تھی۔ پاس کھڑے شخص کے بھی کچھ پلے نہیں پڑتا تھا۔

فون پر وہ لمبے لمبے وقفوں کے بعد ایک ایک لفظ بولتی۔ ہیں۔ اچھا۔ کیوں۔ بور۔ موڈ نہیں۔ وہ کیسے ایسے الفاظ یا پھر معانی خیز ہنسی۔ چھوٹی ہنسی لمبی ہنسی۔ مہذب ہنسی جس میں معنی نہ ہوتی البتہ وانکے زیروبم میں جاذبیت ضرور ہوتی ہے۔

سلمٰی کے لئے اماں کی صحت یا بیماری اہم نہ تھے۔ اہم بات تو یہ تھی کہ اس کی روزمرہ بحال ہو جائے۔

ستارہ کو بھی اماں سے بڑا لگاؤ تھا لیکن وہ بھی مجبور تھی۔

ستارہ نے اپنی تمام تر اہمیت کا انحصار ہر امتحان میں کلاس میں فرسٹ آنے پر رکھا ہوا تھا۔ اماں کی بیماری کی وجہ سے سارے گھر پہ جو بوجھ پڑا ہوا تھا۔ وہ اس کی پڑھائی میں مخل ہو رہا تھا۔ اسے فکر لگ گیا تھا کہ کہیں رابعہ اس کی پوزیشن ہتھیا نہ لے۔

رابعہ وہ بدصورت بھدی لڑکی تھی جو رٹا لگا لگا کر ہر امتحان میں اس کے پیچھے پیچھے چڑیل کی طرح لگی ہوئی تھی اور ہر بار سیکنڈ آتی تھی کہیں وہ چڑیل میری جگہ نہ لے لے۔ ستارہ کو صرف یہی ایک فکر لگا رہتا تھا۔ ہے اللہ۔ اماں کی بیماری کیا مصیبت ہے۔ اس مصیبت سے کب جان چھٹے گی اسے اس بات پر غصہ آتا تھا کہ اماں ڈاکٹر کا علاج کیوں نہیں کراتی۔

ستارہ کی بات سچی تھی۔ عرصہ دراز سے اماں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ علاج نہیں کرائے گی۔ اسے ڈاکٹروں پر اعتماد نہیں تھا۔

اب کیا حال ہے۔ صالح کی بیوی سکینہ نے کمرے میں داخل ہو کر پوچھا۔

صالح نے مایوسی میں سر ہلا دیا۔

سمینہ چارپائی پر بیٹھ گئی وہ حزن و ملال سے بکھر رہی تھی۔

سمینہ اور آسیہ کے مابین خدا ترسی کے سوا کوئی تعلق نہ تھا۔ سمینہ ایک مذہبی عورت تھی مذہب اس کے لئے صرف خوفِ خدا تھا۔ وہ بیچاری خود اس گھر میں اکیلی تھی۔ وہ خود الیز میں ٹھہری ہوئی تھی۔ وہ کر ہی کیا سکتی تھی۔

اگرچہ آسیہ اور سمینہ میں ساس بہو کا رشتہ تھا لیکن وہ رشتہ ہمیشہ برائے نام رہا تھا۔ سارا قصور آسیہ کا تھا۔ اگر وہ حکم چلانا جانتی تو ساس کا مرتبہ حاصل کر لیتی۔ لیکن وہ تو ازل سے حکم بجا لانا جانتی تھی۔ چوکی پہ بیٹھ کر حکم چلانا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس لیے بیٹے کے گھر میں اس کی کوئی حیثیت قائم نہ ہو سکی تھی۔ کیسے ہوتی خود بیٹے نے اسے قائم نہ ہونے دیا تھا۔ جب بھی اماں دل کی بات کرتی تو صائم عقل و دانش کی قینچی سے اسے کاٹ دیتا اماں تم نہیں سمجھتی۔۔

بیٹے کے گھر سے ماں کا صرف ایک تعلق تھا

آسیہ میں خدمت اور کام کا جذبہ اس قدر گھر کر چکا تھا کہ جس گھر میں بھی وہ جا کر ٹھہرتی اس گھر کے چھوٹے چھوٹے کام شروع کر دیتی۔ ٹوٹی ہوئی چیزیں جوڑ دیتی۔ صوفوں کے کپڑے دھو کر پھر سے چڑھا دیتی۔ پردے رنگ کر کے نیا بنا دیتی۔ ٹوٹے ہوئے سوٹ کیس مرمت کر دیتی۔ پرانے کپڑوں کو جوڑ کر کے گوزیاں بناتی رضائی کے ابرے تیار کرتی۔ میز پوش تکیے کے غلاف اور کیا کیا۔

آسیہ کی اس عادت کی وجہ سے لوگ اس کی قدر کرتے تھے۔

بیٹے کے گھر سے ماں کا بس یہی ایک تعلق تھا اسی واسطے سمینہ اسے عزیز رکھتی تھی۔

کسی نے کبھی نہ سوچا تھا کہ یہ تعلق تو نہیں یہ تو مفاد ہے۔ بہر طور سمینہ کا حزن و ملال دلی تھا۔ کیونکہ وہ خدا ترس عورت تھی۔

کیوں ابا۔ سمیع نے داخل ہو کر پوچھا کیا حال ہے اماں کا۔

ویسا ہی ہے صائم نے کہا۔

اوہ ۔۔ سمیع خاموش ہو گیا!

کچھ دیر کمرے پر خاموشی طاری رہی۔

اماں کو ضرور دوا کھانی چاہیے سمیع بولا۔

ہاں ۔۔ صائم نے کہا۔ لیکن اماں مانے بھی۔

ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم اماں کے لیے کچھ نہیں کر رہے سمیع نے کہا۔

ہاں۔

ایک فیلنگ آف گلٹ ہے۔ سمیع گویا اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔

سمیع ازلی طور پہ مشنری کارکن تھا۔ اس کے لئے دفتر دفتر نہ تھا بلکہ مقصدِ حیات تھا۔ کام اس کی زندگی کا مرکز تھا۔ اور یہ مرکز پھیل کر سارے دائرے پہ محیط ہو چکا تھا۔ باقی تمام رشتے اور تعلق لگاؤ سمٹ سمٹا کر دائرے کی لکیر پر یوں کھڑے تھے جیسے اوور لوڈ بس میں مسافر پائیدان پہ لٹکے ہوتے ہیں۔

اوہ سمیع چونکا مجھے تو جانا ہے دفتر میں فنکشن شروع ہو چکا ہو گا - ابو میں واپسی پر ڈاکٹر سے اَوں اس نے یوں کہا جیسے صرف ڈاکٹر کے آنے سے اماں سے تعلق استوار ہو جائے گا - سنس آف گلٹ دور ہو جائے گا -

اماں سے پوچھ لو صائم نے کہا -

اماں - اماں جی سمیع نے آواز دی -

اماں نے کوئی جواب نہ دیا -

پھر سمیع گھوم کر اماں کے سرہانے کی طرف جا کھڑا ہوا - اس نے اماں کے منہ سے رضائی اتار دی -

اوہ --- وہ زیر لب چلایا - اماں تو - اماں تو ---

کیا کہا --- کئی ایک چیخیں گونجیں -

اماں گزر گئیں کیا -

ہائے اللہ --- اماں چلی گئیں -

پڑوس والے کہتے ہیں کہ صائم کے گھر سے چیخوں کی آوازیں بلند ہوئیں -

کچھ لوگ کہتے ہیں - نہیں چیخیں نہیں وہ تو بگڑے ہوئے قہقہوں کی آوازیں تھیں -

---

میں نے وہ آوازیں نہیں سنیں - لیکن میں محسوس کرتا ہوں جیسے صائم کی ماں مری نہیں بلکہ صائم کے گھر سے منتقل ہو کر میری ماں بن کر میرے گھر آ بیٹھی ہے - جیسے یہ کہانی صائم کی ماں کی نہیں بلکہ میری ماں کی ہے شاید تمہاری ماں کی ہو ہم سب کی ماؤں کی ہو - مجھے ایسے لگتا ہے جیسے وہ گھر گھر بیٹھی ہے اور اس کے اردگرد ایلینز یوں ناچ رہے ہیں جیسے وحشی قربانی کرنے سے پہلے بَل کے اردگرد ناچتے ہیں -

---

اسٹل لائف

جیلانی بانو

آپ بھی ہمارے ساتھ چلئے۔ اکیلے گھر میں کیا کریں گے؟

جاتے جاتے صادق کی بیوی آمنہ نے کہا۔

اکیلا — صادق نے سنسان گھر کو دیکھ کر سوچا۔ آمنہ اور بچے نہ ہوں تو گھر خالی ہو جاتا ہے! خود اس کا وجود جیسے بے معنی ہو۔ اس گھر میں کوئی اہمیت ہی نہ رکھتا ہو۔ مگر یہ اچھا ہی ہوا کہ وہ آمنہ کے ساتھ نہ گیا۔ اس کے باوجود صادق کو ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کا کچھ حصہ آمنہ اپنے ساتھ سمیٹ کر لے گئی ہے۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ "زو" کے بند، وں کو اچھلتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ اور پھر اتنے بڑے گھر میں تنہا بیٹھا اخبار بھی پڑھ رہا ہے۔ جانے کیوں یہ احساس اب اس کے ساتھ رہنے لگا تھا کہ وہ ٹکڑوں میں بکھر رہا ہے۔ جیسے پرانی دیواروں کا چونا غیر محسوس طور پر چپکے چپکے جھڑتا رہتا ہے۔ وہ بھی بکھر رہا ہے۔ ٹوٹ رہا ہے۔

صبح شیو کرتے میں کئی بار یوں لگتا جیسے وہ آفس پہنچ گیا ہے۔ سرد مہر سخت لوہے کی کرسی پر بیٹھا شرما صاحب کے طنز برداشت کر رہا ہے۔ مگر آمنہ کی آواز پر چونک پڑتا۔

"پونے دس ہو گئے۔ کہیں آج پھر آپ لیٹ نہ ہو جائیں۔"

وہ جلدی سے بشرٹ ہینگر سے اتارتا جیسے بشرٹ کے بغیر وہ پورا نہ ہو گا۔ اسی طرح جلدی جلدی اپنے آپ کو کپڑوں میں چھپا کر وہ مکمل انسان بن جاتا۔ آفس بھی پہنچ جاتا۔ مگر رہ رہ کر یہی خیال آتا تھا جیسے وہ ابھی تک گھر میں بیٹھا آمنہ کی بڑبڑ سنے جا رہا ہے۔

اپنے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کا احساس اب صادق کے لئے اذیت ناک بنتا جا رہا تھا۔

آمنہ اور بچوں کے جاتے ہی اسے احساس ہوا کہ انہیں روک لیتا۔ آپا جان پکنک منانے جا رہی ہیں تو جانے دو۔ دولھا بھائی نے کار کیا خرید لی ہے کہ اتراتے اتراتے پھرتے ہیں۔ اور آمنہ تو جیسے قید میں رہتی ہے۔ اسے تو گھر سے باہر گھومنے کا بہانہ چاہئے۔

جانے سے پہلے آمنہ نے کئی بار پوچھا۔

"میں بھی آپا جان کے ساتھ "زو" چلی جاؤں؟"

اور ہر بار صادق نے کہنا چاہا — نہیں نہیں مت جاؤ۔

"چلی جاؤ۔ بچوں کی تفریح ہو جائے گی۔" اپنی آواز پر صادق خود ہی چونک پڑا۔ یہ کون بول رہا تھا —؟ یہ بات آمنہ

سے کوئی دوسرا آدمی کہہ رہا تھا جو اس کے وجود کی پرچھائیں بن کر اس سے دور ہٹ رہا تھا۔ اسے الگ الگ حصوں میں بانٹ رہا تھا۔

پھر اس نے سوچا۔ آمنہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میں اکیلا ہو گیا ہوں۔ اکیلا ہو کر کیا کروں گا! میرا کچھ حصہ آمنہ سمیٹ کر لے گئی ہے۔ اور بہت سا ڈھیر شرما صاحب نے فائلوں میں سمیٹ لیا ہے۔

"یہ ساری فائلیں کل پٹ اپ کرنا ہیں۔ یاد رکھیے۔"

ان فائلوں کو وہ بھلا بھول سکتا ہے! جو فائلیں آفس میں ڈوری سے بندھی رکھی ہیں ان میں وہ خود بھی بندھا ہوا ہے۔ آفس کی لائٹ بند ہے۔ کمرے میں اندھیرا ہے۔ دروازے پر قفل لگا ہوا ہے۔ اتنا ظلم! صادق کی سانس گھٹنے لگی۔ وہ بند دروازے پر اپنے سر مارنے لگا تو اب سر میں درد شروع ہوا۔

"ڈیڈی — مور کیسے بولتا ہے! میاؤں" پپو جانے کس آدمی کو اپنا ڈیڈی مان کر اس سے کہہ رہا تھا۔ جیسے پپو سمجھتے ہی ہو۔

ڈیڈی کیوں نہیں آتے زور دیکھنے۔ اب میں مور کی آواز اسی ڈیڈی کو سناؤں گا جو سامنے کھڑا ہے۔ اور آمنہ یہ واقعہ ہنس ہنس کر سنائے گی۔

"جو سفید بشرٹ والا نظر آیا پپو اسے ڈیڈی ڈیڈی پکار رہا تھا۔"

ہاں پپو بھی مجھے صرف سفید بشرٹ کی وجہ سے پہچانے گا۔ اس نے بہت دکھی ہو کر سوچا۔ ممکن ہے اب وہ سب آتے ہوں۔ صادق نے کھڑکی کھول لی ——— تو وہ آ گئے — وہی کار ——— دولھا بھائی کی بھڑکیلی بشرٹ۔ آمنہ کی شوخ ساری — مگر نہیں، وہ ہوتے تو صادق کی سفید بشرٹ کو بھی پہچان لیتے۔

سڑک کی بھیڑ بھاڑ — کاروں کے ہارن — بسوں کی قطاریں — پیٹرول کی بو میں بسی ہوئی وہ لڑکی جس کے چہرے پر آنکھوں کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ان کھوجتی، ڈھونڈتی ہوئی آنکھوں کو صادق روز اپنی بس میں دیکھتا ہے کسی کے انتظار میں بے چین، بیقرار آنکھیں۔ کسی کو نہ پا کر مایوس تھکی ہوئی آنکھیں۔ بس میں آنے والے ہر آدمی کو اٹھ کر وہ بیقراری سے دیکھتی ہے اور پھر مایوسی سے بیٹھ جاتی ہے۔ بیچاروں اور بجھی ہوئی الجھی ہوئی، گم ہوتی ہوئی سڑکوں کو دور دور تک دیکھے جاتی ہے ——— وہ کہاں ہے —؟ کون ہے جس کی تلاش اس لڑکی کی سدھ بدھ کھوئے ہوئے ہے۔ آفس پہنچنے کے بعد بھی صادق یہی سوچے جاتا۔ کسی دن وہ آدمی اس لڑکی کے پاس آ بیٹھے تو مجھے کتنا سکون ملے ———

ایک دن لڑکی کے برابر والی سیٹ پر وہ عورت آ بیٹھی جو بس میں سوار ہوتے ہی دوسروں کے شخصی معاملات میں دخل اندازی شروع کر دیتی ہے۔

"کوئی اور آنے والا ہے —" اس نے بڑی تجسس بھری نظر لڑکی پر ڈالی تھی۔

لڑکی پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر نیچے کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔

"کوئی نہیں — یہ میری عادت ہے۔"

صادق چونک پڑا۔ اسے لڑکی پر رحم آنے لگا۔ بچاری۔ اس لڑکی کا بھی کوئی حصّہ کسی سڑک پر رہ گیا ہے۔ میری طرح — اکیلے گھر میں اب سچ مچ جی گھبرانے لگا۔

خواہ مخواہ اماں پرسوں ممبئی چلی گئیں۔ گھر کیا سونا ہو گیا۔ جاتے وقت اماں کتنا گھبرا رہی تھیں۔ جیسے دو ہفتے کے لئے نہیں ہمیشہ کے لیے جا رہی ہوں۔

کہیں جاؤں تو دل گھر ہی میں لگا رہتا ہے۔ اماں کی بات پر صادق چونک پڑا۔ اماں بھی شاید ٹوٹ رہی ہیں۔

ٹرین میں بیٹھنے کے بعد اماں نے کھڑکی سے باہر کھڑے ہوئے صادق کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا تھا۔ پھر انجن نے وسل دی، اماں کے ہاتھ کی گرفت سخت ہو گئی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کا ہاتھ اماں کے ہاتھ سے کھسکتا گیا — جیسے برف کا ٹکڑا آپ ہی آپ پانی بن بن کر جانے کب غائب ہو جاتا ہے — اس کا اور اماں کا ہاتھ بھی الگ ہو گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد صادق نے محسوس کیا کہ وہ بھی اماں کے ساتھ چلا گیا ہے۔ اماں کے پاس ٹرین میں بیٹھا ہے اور ٹرین کھیتوں جنگلوں ندیوں اور پہاڑوں کو کاٹتی ہوئی دوڑ رہی ہے — اپنی جیب سے پلیٹ فارم ٹکٹ نکالتے وقت صادق کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسٹیشن پر ہے یا ٹرین میں۔ آفس میں مٹھا صاحب کے طنز بھی برداشت کر رہا تھا اور اس لڑکی کے سامنے بس میں بھی بیٹھا تھا، جو اپنے وجود کے بچھڑے ہوئے حصّے کی تلاش میں ہے۔

جب آدمی اتنے ٹکڑوں میں بٹا ہوا ہو، بیک وقت اتنی جگہ موجود ہو تو بھلا وہ کسی ایک کا ہو سکتا ہے —؟ مگر آمنہ کا اصرار تھا کہ صادق صرف اسی کا ہو رہے۔ میری باتیں سنو — میری صورت دیکھو — مجھے پیار کرو — وہ آمنہ کے سارے احکام بجا لاتا — کیونکہ وہ تسلیم کر چکا تھا کہ اسے بہت سی عدالتوں کے فیصلے قبول کرنا ہیں۔ آمنہ کے پیار بھرے حکم — خدا کے پُرجلال احکام اور سماج کے طنز بھرے فیصلے — (یہ فائلیں کل تک پُٹ اپ کرنا ہیں۔ یاد رکھیے)

یہ سب میرے آقا ہیں جنھوں نے الگ الگ زنجیروں میں میرے ٹکڑے باندھ رکھے ہیں۔ اس کے باوجود ایک دن آمنہ بڑے پریشان لہجہ میں اپنی ساس سے کہہ رہی تھی "اماں یہ نہ جانے کیوں اتنے کھوئے کھوئے سے رہنے لگے ہیں۔ کسی ڈاکٹر کو دکھا لاؤ نا۔"

ڈاکٹر — صادق کے سامنے اُمید کی لو جھلملانے لگی — ایک بار کسی چوراہے پر کار نے ایک بوڑھے کو کچل دیا تھا۔ اس کے بدن کے تین چار ٹکڑے الگ الگ بے حس و حرکت سڑک پر بکھرے پڑے تھے۔ جیسے کینوس پر اسٹل لائف — لوگ اس بھیانک منظر کو دیکھ کر ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ مگر ایک چھوٹا سا بچہ وہاں کھڑا چلا رہا تھا۔

"دادا کو جلدی سے ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔ ڈاکٹر دادا کو پھر جوڑ دے گا۔"

"ڈاکٹر مجھے بھی جوڑ دے گا — صادق نے سوچا — شاید وہ اماں سے پوچھے۔ ان کے باقی ٹکڑے کہاں کہاں ہیں —؟

گھبرا کے صادق نے اخبار اٹھا لیا۔

چاند تک جانے والے خلاباز موت اور زندگی کی کشمکش میں گرفتار تھے۔ ان کے راکٹ میں کوئی ٹکنیکل خرابی ہو گئی تھی۔

صادق نے اخبار میز پر رکھا اور آن کی آن میں وہ راکٹ کے اندر تھا۔ ہزاروں میل پر زوں والے اندھیرے خوں میں پھنسا ہوا۔ اس کے سر پر مشینوں کا بوجھ تھا۔ اس کے باوجود آج اس کے سر سے سارے بوجھ اتر گئے تھے۔ مجھے چاند کو اپنے پیروں تلے روندنا ہے۔ وہ چاند جو دنیا کے ہر شاعر کو محبوب سے زیادہ حسین نظر آتا تھا۔ وہ چاند جو رام چندر جی کے بچپن میں ناقابلِ حصول تھا۔ سادا، کسے چاروں اور خلا تھی ـــــ سرد ـ بے مہر ـ بے حس ـ نیچے ـ بہت نیچے زمین ایک حقیر تارے کی طرح چمک رہی تھی ـــ ننھی سی دنیا ـــ؟ اس نے ناک سکوڑ کے بڑی حقارت سے دیکھا۔ اور پھر اسے دنیا کے اتھاہ پر بے حد خوشی ہوئی ـــ حقیر ناقابلِ التفات ـــ بالآخر دنیا کے سارے بکھیڑوں سے نجات مل ہی گئی ـــ وہ بچ کر یہاں تک آ گیا ـ یہ کیسی انوکھی خوشی تھی۔ اپنی ذات کا احساس ساری کائنات پر محیط تھا۔ عرب فلسفیوں نے عجم والوں سے کہا تھا کہ کائنات موہوم نہیں ہے۔ موجود ہے۔ مگر یہ بات غلط تھی۔ آج کائنات موہوم ہے ـــ میں جو کائنات کی کشش سے اپنے آپ کو آزاد کر چکا ہوں۔ میں نے خدا، گناہ اور محبت کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اپنے تمام حواسوں سمیت آزادی کی لذت چکھنے کے لیے۔

"ہیلو ہیلو" مائیک کہہ رہا تھا۔

" زمین کی طرف لوٹ آؤ۔ آگے خطرہ ہے"۔ صادق کو جیسے کسی نے شوٹ کر دیا۔ وہ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح بے سہارا ہو کر نیچے آ رہا۔

یروشلم فتح ہو گیا۔ اس نے اخبار کی دوسری خبر پڑھی اور اپنی بے بسی کا درد اس کی رگ رگ میں سما گیا۔ اس کا ذمہ دار کون ہے ـــ؟ یروشلم کو کس نے ڈھا دیا۔ دیوارِ گریہ گر پڑی ہے ـ آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا۔ اب ہم کہاں کہاں روتے پھریں گے!

جانے آمنہ اور بچے اس وقت کہاں ہوں گے! جانے میں خود اس وقت کہاں ہوں! کبھی ایسا لگتا ہے جیسے وہ یہودی ہے اور دیوارِ گریہ کے نیچے کھڑا قہقہے لگا رہا ہے۔ گولان کی پہاڑیوں پر عربوں کے ساتھ چھپتا پھر رہا ہے۔ شرما صاحب بن کر اپنے آپ کو ڈانٹ رہا ہے ـــ ہائے میری آزادی ـ آگے خطرہ ہے ـ یروشلم فتح ہو گیا ـــ اس کے چاروں طرف بندر اچھل کود میں مصروف ہیں۔ اماں جس ٹرین میں جا رہی تھیں وہ رک گئی ہے ـــ آگے خطرہ ہے دکھ کے مارے وہ رو بھی نہیں سکتا ـ دیوارِ گریہ شکست ہو چکی ہے۔ آگے خطرہ ہے۔ اماں اس کا ہاتھ اپنے ساتھ لے گئی ہیں اور بس میں بیٹھی ہوئی لڑکی ہر مسافر کو امید بھری نظروں سے دیکھ کر بوڑھی کے ساتھ بیٹھ جاتی ہے ـــ یہ بھی وہ نہیں ہے ـــ

مگر وہ تو آفس کی فائلوں میں بندھا اندھیرے کمرے میں رکھ دیا گیا ہے۔ ان فائلوں کو مت بھولو۔ اس اندھیرے کمرے کو مت بھولو جہاں تم ڈوری سے بندھے پڑے ہو۔

"آپ بھی ساتھ چلئے۔ اکیلے گھر میں کیا کریں گے۔؟

اب کیا کر سکتا ہوں ـــ!

صادق نے تھک کر سگریٹ سلگا لیا۔ آگے خطرہ ہے۔ یروشلم فتح ہو گیا ہے۔ گولان کی پہاڑیوں پہ صرف بارود کا دھواں ہے اور لاشوں کی سڑاند۔ میں بھی کہاں کہاں بھٹکتا پھرا۔ پہاڑوں کے اندر غاروں میں جہاں خدا انسان سے ہم کلام ہوا کرتا تھا۔ مگر آج ان غاروں میں انسان کے لئے کوئی پیغام نہیں تھا۔ صرف موت کے فرمان تھے۔ اور پھر صادق پرتھم کی عبادت گاہوں میں گھسا۔ بندروں کے پنجروں میں۔ اور ہر جگہ سے لوٹ آیا۔

"اچھا ہوا آپ نہیں گئے۔ سخت بوریت ہوئی۔" وہ سب ہنستے چلتے واپس آ گئے۔

"اخوہ بہت تھک گئے۔"

"ڈیڈی مور کیسے بولتا ہے بتاؤں؟ میاؤں۔" پپو بے انتہا خوش تھا۔

"ڈیڈی شیر آدمی کو چھوٹے چھوٹے پیس کر کے کھا لیتا ہے۔"

"ڈیڈی۔ میں آپ کے لیے ریڈ گلاب لایا ہوں۔"

صادق نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے پھول پکڑنا چاہا مگر وہ نیچے گر پڑا اور گرتے ہی سرخ سرخ پنکھڑیاں بن کر بکھر گیا۔ انسان کے کٹے ہوئے اعضا کی طرح۔ کینوس پہ اسٹل لائف کی طرح ——

"پپو — میرے بیٹے یہ کیا ہوا —؟ دیکھو — دیکھو یہ کیا ہوا —؟"

صادق نے انتہائی خوف زدہ ہو کر بڑی امید بھری نظروں سے پپو کی طرف دیکھا — مگر پپو یہ کیوں نہیں کہتا —— ڈیڈی کو کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔ ڈاکٹر ڈیڈی کو جوڑ دے گا۔

تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میرے ٹکڑے نہیں جوڑے جائیں گے —!

———

مرد

رام لعل

لکھنؤ شہر کو اس کے شمالی مضافات سے ملانے والی سڑک اب سنسان پڑی رہتی ہے۔ کچھ عرصہ تک اس کی حیثیت ایک بائی پاس کی سی تھی جب شہر کو گومتی کی باڑھ سے بچانے کے لئے ایک نئی سڑک نکالی جا رہی تھی۔ جب سے اس سڑک پر ٹریفک جاری ہو گیا ہے اس سڑک پر آمد و رفت بالکل کم ہو گئی ہے۔ صرف تیزاب کے کارخانے کے ٹھیلے شیشے کی بڑی بڑی بوتلیں لادے آتے جاتے رہتے ہیں یا شاہی عمارت کے کھنڈرات کے پیچھے بنی ہوئی رفیوجی کالونی کے لوگ ہی ادھر سے ہو کر مین روڈ کے موڑ کی طرف بڑھ جاتے ہیں جہاں بسیں، ٹیمپو، ملیح آباد اور کاکوری کی طرف جانے والی ٹیکسیاں اور رکشے تانگے وغیرہ کثرت سے ملتے ہیں۔

اس روز جمعرات کی وجہ سے تیزاب کا کارخانہ بند تھا۔ اس کے آگے صبح آٹھ بجے ایک جیپ رکی ہوئی تھی جس کے اندر بیٹھے ہوئے پانچ ادھیڑ آدمی بظاہر تو بڑی بے نیازی سے سگریٹیں پھونک رہے تھے اور ہولے ہولے باتیں بھی کر رہے تھے لیکن ان سب کی نظریں بار بار انہی کھنڈرات کی طرف اٹھ جاتی تھیں جہاں سے ہو کر رفیوجی کالونی میں رہنے والا امین آباد کا کوئی دکاندار یا صبح سویرے کسی دفتر میں پہنچنے والا کلرک یا شہر کے کسی حصے میں فٹ پاتھ پر بیٹھ کر سامان بیچنے والا پٹڑی دکاندار اسی سنسان سڑک پر آتا اور بغیر ادھر ادھر دیکھے مین روڈ کے اسی موڑ کی طرف چلا جاتا تھا۔

"وہ میرا رام جا رہا ہے۔ آج نظیر آباد میں دکان لگائے گا۔"

"جانے دو، یار!"

"میں اسے روک تھوڑے ہی رہا ہوں۔"

"تم یہ سوچو، کہیں آج چھٹی تو نہیں ہے اس کے اسکول کی! کہیں وہ آئے ہی نہیں!"

"نہیں یار، آج کوئی چھٹی وٹی نہیں ہے۔"

"پھر وہ ابھی تک گھر سے نکلی کیوں نہیں؟"

"وہ ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے نکلتی ہے۔ میں نے کئی روز تک اس کا پیچھا کر کے معلوم کر لیا ہے۔ پونے نو کی بس پکڑ کر وہ اگلے اسٹاپ پر اترتی ہے وہاں سے بس اسٹینڈ کے سامنے سے ہو کر اسکول پہنچ جاتی ہے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ اس کالونی میں کوئی اور لڑکی نہیں ہے۔ ورنہ ہمارا سارا پلان دھرا رہ جاتا!"

"پھر کوئی دوسرا طریقہ نکال لیا جاتا۔"

"ساڑھے آٹھ تو ہو گئے یار۔ وہ ابھی تک آئی کیوں نہیں؟"

"آتی ہوگی۔ لیکن تم سب ایک ہی طرف اس طرح مت دیکھو۔ صرف ایک آدمی کھنڈر کی پگڈنڈی پر نگاہ رکھے۔ ملہوترہ تم آگے بیٹھے ہو تم ہی اُدھر دیکھتے رہو۔"

"لا پھر ذرا اِدھر بڑھا دے۔ سردی اور بے چینی کی وجہ سے آج سگریٹیں بھی زیادہ پینی پڑ رہی ہیں۔"

اس کے بعد کچھ لمحوں تک بالکل سناٹا سا ہو گیا۔

ملہوترا اینٹوں کے بھٹے کا مالک ہے۔ یہ جیپ بھی اُسی کی ہے۔ دوسرا سنت رام بترا ہے جو سرگودھا سوپ فیکٹری کا پارٹنر ہے۔ وہ یونائیٹڈ کول کمپنی کے منشی دیا رام کا بہنوئی ہے۔ دیا رام بھی اُسی جیپ میں موجود ہے جو کسی وجہ سے بالکل خاموش ہے۔ چوتھا شخص پریم سنگھ ہے جس کے شہر میں بیس چالیس رکشے چلتے ہیں۔ اور پانچواں پٹڑی دکانداروں کی یونین کا صدر ہے جس کا نام ملک راج بھلہ ہے۔ اُس کی ایک دکان نکسن مارکیٹ میں بھی ہے جہاں امریکہ کے پرانے کوٹ وغیرہ کثرت سے بکتے ہیں۔ وہ سب کے سب ایک ہی کالونی میں رہتے ہیں جو یہاں سے پانچ میل دُور ہے۔ شہر کے مغربی سرے پر مغربی پنجاب کے ایک ہی شہر کے ہٹے والوں نے یہاں آکر ایک پورا گاؤں خرید لیا تھا اور پلاٹ بیچ بیچ کر ایک الگ کالونی بسالی تھی جو اب لکھنؤ کا حصہ بن چکی ہے۔

سگریٹوں کا دھواں اُڑتا رہا۔ کسی کسی کی ہلکی ہلکی کھانسی بھی اُبھرتی اور ڈوبتی رہی اور اُن کی بے چین نظریں بھی اُسی پگڈنڈی پر جمی رہیں جہاں سے ایک خاتون ٹیچر کی آمد متوقع تھی۔ غالباً اضطراب اور مایوسی کے ردعمل نے ہی بھٹے اور جیپ کے مالک ملہوترا کو یہ انکشاف کرنے پر مجبور کر دیا۔ "وہ میرا سالا دلیپ ہے نا، اُس کی جب شادی ہوئی تھی تو اس کی دلہن بھی اُس کے ساتھ نہیں رہتی تھی۔ وہ جب بھی اُس کے قریب جانے کی کوشش کرتا وہ زور زور سے چیخیں مارنا شروع کر دیتی! اپنے مرد سے ملنے کے تصور سے ہی اس کی روح فنا ہونے لگتی تھی۔ گھر کی عورتوں نے اُسے بہت سمجھایا۔ بھلی مانس یہ تو دنیا کا دستور ہے۔ اسی ملاپ سے ہی انسانی مخلوق بڑھتی آئی ہے۔ اور تو اور اُس کے اپنے گھر والوں نے بھی اُسے یہی باتیں کہیں۔ لیکن صاحب، وہ کب ماننے والی تھی! آخر ایک دن اُس کے باپ نے ہی یہ رائے دی، دونوں کو کمرے میں بند کر دیا جائے۔ چلانے دو جتنا وہ چلا سکتی ہے! جانور بھی تو نئے تھان پر آکر اسی طرح بسترا تا ہے، سینگ مارتا ہے۔ کچھ روز بعد پھر صبر کر لیتا ہے۔ وہی ہوا۔ اب وہ بال بچوں والی ہے۔ ہنسی خوشی سے رہ بھی رہی ہے دلیپ کے ساتھ۔"

یہ کہہ کر وہ خود ہی ہنسنے لگا۔ دوسرے لوگوں نے اُس کی طرف بس گمبھیر نظروں سے ہی تاکا۔ پٹڑی دکانداروں کے صدر ملک راج بھلہ نے منشی دیا رام کے ہاتھ سے سلگتی ہوئی سگریٹ سے کر اپنی سگریٹ لگائی اور ناک سے دھواں چھوڑتے ہوئے بولا —

"یار منشی، تم نے بھی یہی تجربہ کیا ہوتا! اپنے مدن کا بھی آج گھر بسا ہوا ہوتا نا!"

منشی دیا رام نے کوئی جواب نہ دیا لیکن اس کے بزرگ بہنوئی سنت رام بترا نے اپنے سر کی پگڑی کو سہلاتے ہوئے سب کو تنبیہہ کی۔ "جو ہو چکا سو ہو چکا۔ اب تو جو کچھ سوچ کر یہاں اکٹھے ہوئے ہو اس پلان کو پورا کرنے کی فکر کرو۔"

اسی لمحے کالونی اور شاہی محل کے کھنڈر کے درمیان انھیں ایک رنگین ساڑی کی جھلک دکھائی دے گئی۔ سب کی آنکھیں اچانک چمک چمک گئیں۔ لیکن اُن کے چہروں پر ایک عجیب سا خوف بھی چھا گیا اور وہ سب کے سب یوں سناٹے میں آگئے جیسے کو

...ی کرتے ہوئے پکڑ لئے گئے ہوں!

اُس عورت کو سڑک تک پہنچنے میں بس ایک آدھ ہی منٹ لگا۔ ملہوترہ جیپ اسٹارٹ کرکے فوراً اُس کے قریب لے گیا۔ باقی چاروں ... جو اپنے مہذب سماج کے خاصے معتبر لوگ تھے ماہر شکاریوں کی طرح بڑی تیزی سے اُس عورت پر جھپٹ پڑے۔ ایک نے اُس کے ... ہاتھ رکھا باقی تینوں نے اُسے پلک جھپکتے ہی اُٹھا کر جیپ کے اندر ڈال دیا۔ اور پھر فوراً ہی جیپ دوڑنے لگی۔

راستے میں کتنی آبادیاں پڑیں۔ بھیڑ بھاڑ والی سڑکیں، اونچی اونچی عمارتیں، اسکول، کالج، اسپتال، کارخانے اور لال ہری بتی ... دکھانے والے ٹریفک کے جزیرے بھی لیکن کسی کو پتہ نہیں چل پایا کہ اس شہر کے پانچ مہذب بزرگوں نے ایک نوجوان عورت کو رسیوں ... سے باندھ کر اور اُس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر بالکل بے بس کر رکھا ہے اور اُسے اغوا کرکے اپنی کالونی میں لئے جا رہے ہیں اور اُس کی ... ن کے نتھنے ایسی دلچسپی سے الٹ پلٹ رہے ہیں جیسے اپنے اس کارنامے کے لئے فال نکال رہے ہوں!

کالونی اپنے صبح کے معمول میں مبتلا تھی۔ دودھ بیچنے والے سائیکلوں کے آگے پیچھے بڑے بڑے کین لٹکائے ہر گھر کے سامنے ... ر کر اپنے بندھے ہوئے گاہکوں کے برتنوں میں دودھ بھر رہے تھے۔ جو لوگ دفتروں اور دکانوں کی طرف جانے کے لئے نہا دھو کر ... وں سے نکل پڑے تھے وہ تیز رفتار جیپ کی دھول سے بچنے کے لئے لمحہ بھر کے لئے ٹھٹک کر ایک طرف کو ہو جاتے۔ جیپ ایک ... ٹے سے مکان کے سامنے جا کر رک گئی اور ان لوگوں نے گرد و پیش سے بہت محتاط ہو کر رسیوں سے جکڑی ہوئی عورت کو اتارا ... اور ہاتھوں ہاتھ اٹھائے ہوئے مکان کے اندر لے گئے۔ اُسے فوراً ایک کمرے کے اندر ڈال کر بند بھی کر دیا۔ گھر کی عورتوں نے بہت ... ان ہو کر یہ سب دیکھا لیکن کچھ پوچھنے کی کسی کو ہمت نہ پڑی۔ بس سوالیہ نظروں سے ہی ان لوگوں کی طرف اور ایک دوسرے کی طرف دیکھتی رہیں ... ن میں ایک تو مدن کی بوڑھی دادی تھی جو دیوار کے پاس اترتی ہوئی دھوپ میں بیٹھی اپنے پوپلے ہونٹوں سے چھوٹا سا حقہ گڑگڑا رہی تھی۔ ... مدن کی ادھیڑ ماں اور تیسری اُس کی پھوپھی۔

اُس واقعے کے فوراً بعد پانچوں مرد ایک عجیب سے احساسِ جرم میں مبتلا نظر آنے۔ ملہوترا تو اپنی جیپ لے کر فوراً چل دیا، یہ کہہ کر —"مجھے اینٹیں ڈھونے والے ٹرک ڈرائیوروں کو پے منٹ کرنی ہے۔" وہ دراصل وہاں سے فوراً کھسک لینا چاہتا تھا۔ کہیں کوئی مصیبت ... ن نہ پڑ جائے! اُس کے جانے کے بعد ملک راج بھلہ نے منشی دیا رام کو ایک طرف لے جا کر سمجھایا —"دیکھو منشی! ابھی تک تو خوش قسمتی ... سے سب ٹھیک ٹھاک ہو گیا ہے۔ ہمیں کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ اُس وقت اپنی گلی میں بھی کوئی موجود نہیں تھا۔ سوائے بینک منیجر کی بیوی ... اور ورکشاپ والے منچندہ کی بہن کے جو میری شکل دیکھتے ہی اپنے اپنے دروازوں کے اندر ہو گئی تھیں۔ پھر بھی میں کہتا ہوں عورت ... ذات کی ایک چھٹی حس بھی ہوتی ہے جو سب کچھ بھانپ جاتی ہے۔ سمجھے! کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے جاتے ہی یہاں عورتوں کی بھیڑ لگ جائے اور ... ہم سب کے وارنٹ نکل جائیں!"

ان دونوں کی بات سننے کے لئے سرگودھا سوپ فیکٹری کا پارٹنر سنت رام بترا بھی اُن کے قریب پہنچ گیا۔ اُس نے فوراً کہا۔

—"میں دن بھر دروازے کے باہر چارپائی ڈال کر پہرا دینے کے لئے تیار ہوں۔ کوئی چڑیا تک اندر نہیں پھٹک سکے گی!"

رکشوں کا مالک پریم سنگھ جو بنا کچھ کہے چپکے سے باہر نکلا جا رہا تھا اُس کی بات سن کر پلٹ آیا اور بولا —"بیوقوفوں کی سی بات مت

کرو بترا! سب کام معمول کے مطابق ہونے چاہئیں۔ اگر تم نے آج خلاف معمول دروازے پر بیٹھ کر چوکیداری کی تو اگر کسی کو معلوم نہیں بھی ہوگا تو بھی اُسے معلوم ہو جائے گا!"

اس پر سنت رام بترا بھڑک اٹھا — "تو پھر کیا کروں؟ گلی محلے کی سب عورتوں کو بلا بلا کر اندر بھیجتا جاؤں؟"

ملک راج بھلا نے اس کے دونوں کاندھوں پر اپنے مضبوط ہاتھ رکھ دیے۔ بڑے پیار سے سمجھایا — "غصہ کیوں دکھلاتے ہو یار! مانا کہ تم منشی کے بہنوئی ہو۔ اس گھر کی عزت کو اپنی ہی عزت سمجھتے ہو۔ لیکن ہم نے بھی محلے داری اور دوستی کا کچھ حق ادا کیا ہے۔ کیا ہمیں بھی کوئی مناسب مشورہ دینے کا حق دیتے ہو کہ نہیں؟ پریم سنگھ کے کہنے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ کوئی کام کسی کو بلا وجہ چونکا دینے والا نہیں ہونا چاہیے۔!"

"میں تو صرف اتنا جانتا ہوں، سارا بنا بنایا کھیل یہی عورتیں بگاڑ دیں گی!" یہ بات قطعی طور پر کہہ کر بترا نے ہاتھ بڑھایا اور بھلا کی جیب سے سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس نکال لی اور سگریٹ سلگانے لگا۔ جب سگریٹ کے دو تین لمبے لمبے کش لے چکا تو اچانک اُسے جیسے یاد ہو آیا۔ پھر سے تیز ہو کر بولا — "وہ مدن کہاں ہے، مدن! میں کہتا ہوں اُسے بھی تو ڈھونڈ کر لے آؤ۔ جس کی خاطر اتنا جوکھم اٹھا کر ہم اُس کی عورت کو لے آئے ہیں!"

مدن کے ذکر پر سب ہی لوگ چونک پڑے۔ بھلا نے کہا — "نالائق سے میں نے کل رات ہی کہا تھا آج کام پر مت جانا۔"

"مدن کہیں دور نہیں گیا ہے۔" اُس کی ماں نے رسوئی کی کھڑکی میں سے سر نکال کر بتایا۔ "ابھی آپ لوگوں کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے اسکوٹر سے حسین گنج تک گیا ہے کسی آدمی سے روپے کا تقاضا کرنے کے لیے۔ آتا ہی ہوگا۔"

یہ سن کر اُس کے پھوپھا کو اور بھی طیش آیا۔ چلا کر بولا "یہ تو ہو، ہم سب تو جیل میں پہنچ جائیں اور وہ اپنے تقاضے کرتا پھرے۔ اسے تو فوراً آ کر اپنی عورت سے میل کرنا چاہیے۔"

منشی نے اچانک ہاتھ بڑھا کر اُس کے منہ پر رکھ دیا۔ بہت دھیرے سے کہا "شور کیوں مچاتے ہو بھائی جی۔ کوئی سن لے گا تو میرے سمدی کو فوراً خبر پہنچ جائے گی۔ ابھی تک تو وہ یہی سمجھ رہا ہوگا اُس کی بیٹی اسکول میں پڑھانے گئی ہوئی ہے!"

"منشی ٹھیک کہتا ہے۔ اب سب لوگ اِدھر اُدھر بکھر جاؤ تو اچھا ہے۔ مدن کا سسر معلوم ہو جانے پر پولیس کو بھی لے کر آ سکتا ہے۔"

سردار پریم سنگھ کی تجویز پر سب لوگ باہر نکل گئے۔ گھر میں وہی تین ہی عورتیں رہ گئیں۔ مدن کی ماں نے آنگن میں بھی دھوپ اترا دیکھ کر ایک چارپائی لا کر ڈال دی۔ پھر اُس پر ایک ٹاٹ پھیلا کر لال مرچوں کا بورا اٹھا لائی۔ وہ اور اُس کی نند دل کر مرچیں پھیلانے لگیں۔ بڑھیا جو ابھی تک ایک طرف بیٹھی حقہ گڑگڑا رہی تھی اچانک جلتے ہوئے تمباکو کی راکھ اُلٹ کر بولی۔ "بہو کو کھانے پینے کے لئے کچھ دیا؟"

مدن کی ماں اپنی نند کی طرف سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ کر بڑبڑائی۔ "ناں، میری ہمت تو نہیں پڑتی اندر جانے کی!"

"میں ہی اُس کے پاس چلی جاتی پر تم جانتی ہو وہ کتنی ناک چڑھی ہے!" اُس کی نند نے مرچوں کو بینتے ہوئے کہا۔

"ہوں، وہ ناک چڑھی نہ ہوتی تو آج اِس طرح رسیوں سے باندھ کر یہاں لے آئی گئی ہوتی! پورے سو گھر دیکھ کر اس لڑکی کو

تماہیں نے اپنے بیٹے کے لئے۔ کتنے چاؤ سے بیاہ رچایا تھا ان کا! لیکن قسمت ہی کھوٹی تھی اس کی! اس کی عمر کی لڑکیاں دو دو بچوں
ی مائیں بھی بن بیٹھی ہیں۔ ایک یہ ہے، ابھی تک ناک پر غصّہ دھرے پھرتی ہے۔ مجھ جنم جلی کی قسمت بھی تو کھوٹی تھی!"

اُس کی نند نے کہا۔" پر، بھابی تمہارا کیا قصور تھا اس میں! بالکل نہیں تھا!"

" قصور! میرا قصور بس اتنا تھا کہ میں نے اُس کے باپ کی منت سماجت مان لی وہ ہر روز اُن کے پاس کوئلے کے ٹال پر
جا بیٹھتا تھا۔ بار بار کہتا تھا میری بیٹی کا رشتہ نہ ٹھکراؤ۔ میری بیٹی جیسی سوشیل اور نیک لڑکی تم لوگوں کو اور کہیں نہیں ملے گی۔"

" ہاں بڑی سوشیل نکلی اُس کی بیٹی! یہاں سے جاتے ہی کہلوا بھیجا میں اپنے جہیز کی ایک ایک چیز واپس لے کر دم لوں گی!"

" ہاں، بڑا جہیز دے دیا تھا نا اُس کے باپ نے! ابھی تک ایک طرف بندھا ہوا رکھا ہے۔ دیکھ لیں آ کر وہ لوگ جو اُن
کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔"

" اب تو وہی لوگ یہ بھی کہتے پھرتے ہیں مدن بہت ہمت والا نکلا۔ چھوٹے چھوٹے کاروبار کر کے پیسہ جوڑ لیا، مکان بنا لیا
ر اب تو اُس نے اسکوٹر بھی لے لیا ہے!"

" مکان تو ابھی ادھورا ہے گا بہن۔ تم جانتی ہو سیمنٹ اور لوہے کے پرمٹ نہیں مل رہے ہیں۔ نہیں تو اُوپر دو کمرے اور
ن گئے ہوتے! بہن غریبی تو چلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ آج ہے کل نہیں ہے۔ پو پھرا کرنے سے سب دلدر دُور ہو جاتے ہیں۔"

اچانک مدن کی ماں کی آنکھوں میں آنسو چھلک پڑے۔ بولی۔" پر یہ سب اچھا نہیں لگا مجھے کہ عورت کو اس طرح باندھ کر گھر میں
ے آیا جائے! اس کا مطلب تو یہ ہوا نا عورت ذات ہی اتنی گری ہوئی ہے!"

دروازے پر اسکوٹر کی آواز سن کر وہ دونوں چپ ہو گئیں۔ مدن اسکوٹر کو دھکیلتا ہوا اندر لے آیا تو اُس نے اپنی ماں اور
پھوپھی کی طرف ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ سمجھ گیا جو منصوبہ کل شام کو بنایا گیا تھا وہ پورا کیا جا چکا ہے۔ لیکن اُس کے چہرے پر فوراً
ی الجھن کے آثار پیدا ہو گئے۔ وہ نہ تو ماں کے پاس گیا نہ ہی پھوپھی یا دادی کے پاس۔ آنگن میں ہی اِدھر اُدھر ٹہلتا پھرا۔ عورتوں
ی نظریں اُس پر برابر جمی رہیں۔ وہ بھی اُسے کچھ نہ کہہ سکیں۔ جیسے کسی کے پاس کہنے کے لئے کچھ بھی نہ رہ گیا ہو۔ وہ اچانک بند کمرے کی
ف بڑھنے لگا تو اُن کے دل ایک انجانے خوف سے دھڑک اُٹھے۔ لیکن اُس کی ماں اور پھوپھی سر جھکائے مرچیں بینتی رہیں۔ اُس کی
دادی حقّہ گڑگڑاتی رہی۔

کمرے کے اندر روشنی نہیں تھی۔ وہ اندر گیا تو پہلے تو اُسے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ وہ اپنے پیچھے بند کئے ہوئے دروازے کے ساتھ
یہ لگائے سانس روکے ہوئے کھڑا رہا۔ پھر اُسے اپنے پلنگ پر رسیوں سے جکڑی ہوئی --- اپنی بیوی نظر آئی جو چار سال کے بعد پھر وہاں
ے آئی گئی تھی۔ اُس کا منہ بندھا تھا۔ لیکن آنکھیں کھلی تھیں۔ اُسی کو دیکھ رہی تھیں۔ اُس کی آنکھوں سے بے شمار آنسو بہہ بہہ کر اُس کے
لوں پر خشک ہو چکے تھے۔

دونوں کتنی دیر تک ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ مدن کا دل ایک طویل مدّت کی علیحدگی کی وجہ سے غصّے اور نفرت سے
ا ہوا تھا جس کے لئے وہ اپنی بیوی کو ہی ذمہ دار سمجھتا تھا۔ لیکن اس وقت وہ اُس دلدوز منظر کی زیادہ دیر تک تاب نہ لا سکا۔ آگے بڑھ کر

اُس نے اُس کے منہ سے کپڑا نکال لیا۔ کافی دیر سے کپڑا ٹھنسا رہنے کی وجہ سے اُس کے خوب صورت ہونٹوں کے کونے سوج گئے تھے! اُس کے پاس بیٹھ کر اُس نے رسیوں کے بندھن بھی کھول دیئے۔ اُس کی نازک کلائیاں، پنڈلیاں اور کاندھے بھی سوج گئے تھے۔ اُس کی جلد پر لال لال نشان نظر آ رہے تھے۔ جنھیں وہ دھیرے دھیرے سہلاتا رہا۔ وہ آزاد ہو کر بھی بے حس و حرکت پڑی رہی۔ بس حیرانی سے ہو اس کی طرف دیکھتی رہی۔ مدن نے اُسے اُٹھا کر بٹھلاتے ہوئے کہا۔ ”اُن لوگوں نے بڑا ظلم کیا تمہارے ساتھ! لیکن ساری اسکیم میرے بھیا کی تھی۔ بھگوان اُسے غارت کرے!“

تب بھی اُس نے کوئی جواب نہ دیا تو مدن نے کہا۔ ”تمہیں اس طرح مجبور کر کے تو میں کبھی نہیں رکھنا چاہوں گا۔ چاہو تو ابھی واپس چلی جاؤ۔ لیکن اب میں کسی کو بھی تمہیں ہاتھ نہیں لگانے دوں گا۔ جاؤ گی؟“

یہ کہہ کر اُس نے دروازہ بھی کھول دیا۔ کتنی دیر تک دروازے کے پاس کھڑا رہا۔ انتظار کرتا رہا۔ لیکن اُس کی بیوی پلنگ پر ہاتھ ٹکائے بیٹھی ہی رہی۔ وہ اب بھی بڑی حیرانی سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایکا ایک مدن نے برآمدے میں ماں کی جھلک دیکھ لی۔ وہ ہاتھ میں دودھ سے بھرا ہوا ایک گلاس لئے کھڑی تھی۔ اُس نے اُس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور جا کر بیوی کے سامنے کر دیا۔ اُس کی بیوی نے گلاس لے لیا اور گھونٹ گھونٹ دودھ پینے لگی۔ پی چکی تو گلاس تپائی پر رکھ دیا۔ اور اُٹھ کر کھڑی ہو گئی لیکن لڑکھڑا کر پھر بیٹھ گئی تھی۔ اُس کی ٹانگیں بندھی بندھی رہنے کی وجہ سے بہت دُکھنے لگی تھیں۔ مدن نے آگے بڑھ کر اُس کی ٹانگوں کو سہلانا چاہا تو اُس نے اُس کا ہاتھ پرے ہٹا دیا اور پھر اُٹھنے کی کوشش کی۔ اُٹھ کر کپڑے ٹھیک کئے اور دھیرے دھیرے چل کر دروازے کی طرف گئی جس کے سامنے اندر عورتیں کھڑی تھیں۔ وہ بھی اُسے آتا دیکھ کر ایک طرف ہٹ گئیں۔ لیکن اُس نے دروازے کے پاس پہنچ کر دروازہ بند کر دیا۔ اندر کنڈی چڑھا دی اور پھر مدن کے پاس آ کر اُس کے سینے سے لپٹ کر رو پڑی۔ ”یہ کام تم نے اُن لوگوں سے کیوں کرایا؟ کیا تم مر گئے تھے! تم خود بھی تو مجھے اُٹھا کر لے آ سکتے تھے!!“

راکھی

اختر جمال

کہانی کے رشتہ سے اور ترقی پسند تحریک کے رشتہ سے تو کرشن جی میرے بڑے بھائی تھے مگر جب میں نے انھیں سرخ ریشم کی راکھی بھیجی تو پھر یہ روحانی رشتہ حقیقی رشتہ بن گیا۔ سرخ راکھی میں نے اس لیے چنی تھی کہ وہ تحریک کا بھی رنگ تھا اور خون کا بھی رنگ۔

یہ ۱۹۴۸ء کی بات ہے میں ان دنوں فرسٹ ایئر میں پڑھتی تھی۔ میری ایک سہیلی گرجا اکثر رکشا بندھن کے تہوار کی بات کیا کرتی تھی "راکھی پر یہ کروں گی وہ کروں گی سب بھائیوں کے گھر جاؤں گی" مجھے بھی راکھی کا تہوار بچپن سے پسند تھا۔ گرجا کی باتیں سن کر میرا دل مچل اٹھا کاش میرا بھی کوئی بڑا بھائی ہوتا، تو میں بھی تھال میں نا ریل مٹھائی اور بہت سی چیزیں سجا کر ساتھ راکھی لے جاتی۔ ننھے بھائیوں کو خدا سلامت رکھے مگر بڑے بھائی کی بات ہی اور ہوتی ہے اس روز یہ حسرت شدید آرزو بن گئی۔ گرجا نے کہا یہ تو بڑی آسان بات ہے راکھی باندھنے سے تمھیں بڑا بھائی مل جائے گا۔"

"سچ ـــ!"

"ہاں راکھی کا پوتر بندھن مانو خون کا رشتہ ہوتا ہے اور تم جیسے راکھی باندھوگی وہ تمہارا ایسے ہی بھائی ہو جائے گا جیسے سگا بھائی ہوتا ہے۔"

گھر آئی تو سوچ میں پڑ گئی کہ کسے راکھی باندھوں۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ اللہ میاں نے بہن بھائی اپنی مرضی سے بنا دیئے ورنہ ساری عمر بھائی بہن ڈھونڈنے میں گذر جاتی۔ ان ہی دنوں میں لائبریری سے کرشن جی کی کچھ کتابیں لائی تھی۔ اس روز کتاب پڑھتے پڑھتے میں نے سوچا ایسی باتیں کرنے والا ـــ ایسے سوچنے والا ـــ اتنے خوب صورت دل کا انسان ہی مجھے بڑا بھائی مل گیا۔

دوسرے دن کالج جا کر میں نے گرجا کو پیسے دیئے کہ مجھے ایک لال ریشم کی راکھی منگوا دے۔

گرجا نے پوچھا "لال ہی ہونا چاہیئے اس لئے کہ لال رنگ خون کا بھی رنگ ہے۔ اور اس تحریک کا بھی جس سے ہم سب محبت کرتے ہیں۔"

"کسے باندھو گی؟"

پہلے راکھی لادے ـــ ابھی نہیں بتاتی بعد میں بتاؤں گی۔

دوسرے دن گرجا ریشم کی لال راکھی لے کر آئی وہ سرخ دھاگے مجھے دنیا کی سب سے مقدس چیز معلوم ہوتے

قرآن شریف کے اوراق کی طرح ـــــ خوب صورت اور مقدس ! اور میں نے ایک اچھا سا کاغذ لے کر کرشن جی کو ایک خط لکھا۔ پھر راکھی درمیان میں رکھ کر خط پوسٹ کر دیا۔

چند دن گذرنے کے بعد جب جواب نہ آیا تو مجھے سخت فکر اور بے چینی ہوئی کہ خدا جانے راکھی پہنچی بھی یا ڈاک میں ہی کھو گئی۔ ایک دن میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب کرشن جی کا خط ملا۔ انہوں نے لکھا تھا " میری اچھی بہن ـ آپ کا خط ملا۔ راکھی بھی مل گئی۔ اس عزت افزائی اور مجھ خلوص محبت کے جذبے کے لئے میں جس قدر اپنی بہن کا شکریہ ادا کروں کم ہے میں اس سے بہت پہلے آپ کو خط لکھتا مگر تہوار کے دوسرے روز ہی مجھے بمبئی سے باہر جانا پڑا اور مسافت میں خط نہ لکھ سکا۔ اس تاخیر کی معافی چاہتا ہوں آپ کی راکھی ہماری دوسری افسانہ نگار بہن سرلا نے باندھی اس طرح یہ سمجھئے کہ یہ رشتہ اور بھی مضبوط ہو گیا۔ سرلا بہن اور بھابی آپ کو سلام کہتی ہیں آپ اپنے گھر میں سب کو میرا سلام کہیے ۔

آپ " شاہد " کے لئے کیوں نہیں لکھتی ہیں ؟ آپ کا بھائی

کرشن چندر

میں نے خوشی خوشی گھر میں سب کو خط دکھایا اور دوسرے دن کالج میں گرجا اور حامدہ کو بتایا۔

پھر میری کرشن جی سے خط و کتابت جاری رہی۔ جب کبھی میں نے انھیں خط لکھا انہوں نے بڑی شفقت سے جواب دیا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کاش میں بھی کرشن جی کی سی کہانیاں لکھ سکوں اور سچ مچ ان کی بہن کہلا سکوں اگلے سال ہمارے کالج میں ترقی پسند پروفیسر آئے ۔ جاں نثار اختر، صفیہ اختر اور احسن ۔ ان لوگوں کے آنے سے کالج میں ادب اور ترقی پسند تحریک کا چرچا بڑھ گیا۔ میں ۴۷ء سے یعنی جب میٹرک میں پڑھتی تھی انجمن کی باقاعدہ ممبر بن چکی تھی ۔ مگر میرا تعلق اس گروپ سے اب تک صرف تلمی تھا صفیہ آپا، جاں نثار اختر اور احسن نے بھوپال کی انجمن میں جان ڈال دی اس کے باقاعدگی سے اجلاس ہونے لگے جن میں میں بھی کبھی کبھی شرکت کرنے اور کہانیاں پڑھنے لگی ۔

اسی سال انجمن ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس کی تیاریاں زور شور سے شروع ہوئیں جس کے لئے ہم سب نے چندہ جمع کیا اور بہت کام کیا مجھے سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ کرشن جی بھوپال آ رہے ہیں اور میں بے چینی سے کانفرنس کی گھڑیاں گن رہی تھی ۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کرشن جی ہمارے گھر ٹھہریں آپا کی بھی یہی خواہش تھی لیکن کانفرنس کے منتظمین نے ان کے قیام کا انتظام اختر سعید کے گھر کیا تھا ۔ ان کا خیال تھا کہ ہمارا گھر شہر کا آخری سرا ہے وہاں سے منٹو ہال کا فاصلہ بہت زیادہ تھا اختر سعید کا گھر شہر میں تھا اور وہاں سے انھیں آنے جانے اور سب سے ملنے جلنے میں آسانی ہو گی ۔ میں نے اختر سعید اور احسن سے کہا کہ آپ نے کرشن جی کو اپنے گھر رکھ کر میرے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے مگر پھر ان لوگوں کی دلیل میری سمجھ میں آ گئی اور میں خاموش ہو گئی ۔

کرشن جی صبح کی ٹرین سے آ رہے تھے اور ان کے ساتھ بہت سے ادیب بھی آ رہے تھے جن میں سے عصمت آپا ۔ مجروح ، مہندر ناتھ ، عادل رشید وغیرہ کے نام معلوم ہو چکے تھے ۔ بھوپال کے ادیب ، طالب علم اور مزدور بڑی تعداد میں اسٹیشن

پہنچے تھے ۔

گاڑی آئی تو سیکنڈ کلاس کے ڈبہ سے کرشن جی، مہندر ناتھ، مجروح اور رشید عادل وغیرہ باہر آئے ۔

کرشن جی نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور بولے "میں تمہیں دیکھتے ہی پہچان گیا کہ یہ چھوٹی سی لڑکی ضرور ہماری بہن ہے" پھر بولے "لیکن اپنے خطوں سے تم ذرا بڑی معلوم ہوتی تھیں" پھر کرشن جی نے مہندر ناتھ اور سب لوگوں سے میرا تعارف کرایا ۔ ہم اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں جانے کے لئے آ گئے ۔

میں نے کرشن جی سے بھابی اور بچوں کے متعلق پوچھا۔ انہوں نے سب کا ذکر کیا۔ پھر پوچھا "مجھ سے مل کر تمہیں مایوسی تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں کیوں؟"

ہنسنے لگے "قرۃ العین حیدر جب مجھ سے پہلی مرتبہ ملی تھیں تو انھیں بڑی مایوسی ہوئی تھی ۔"

پھر کرشن جی میری پڑھائی وغیرہ کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ ان سے کہا گیا کہ آپ پہلے سفر کی تھکن اتار لیں تو تفصیلی پروگرام طے ہوگا۔ احسن نے کہا کہ وہ فرصت ملتے ہی کرشن جی کو ہمارے گھر لے کر آئیں گے ۔

اسی روز سہ پہر کو کرشن جی ہمارے گھر آئے ان کے ساتھ عصمت آپا، شاہد لطیف، عادل رشید، مہندر ناتھ اور مجروح بھی تھے۔ شام کو کافی ہاؤس میں بھوپال کے ادیبوں کی طرف سے استقبالیہ تھا اس لئے ان لوگوں کو وہاں جلدی پہنچنا تھا۔ اس لئے یہ طے ہوا کہ استقبالیہ سے واپسی پر پھر وہ لوگ آئیں گے اور اطمینان سے باتیں ہوں گی۔

کافی ہاؤس میں جانے کے دوران کرشن جی بھوپال کے ادیبوں سے بات چیت کرتے رہے، وہ بھوپال آ کر بہت خوش تھے اور سب نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کر رہے تھے۔ اور ان میں لکھنے کی اُمنگ بڑھا رہے تھے۔ عام طور پر بڑے ادیبوں کا رویہ یہ ہوا کرتا ہے کہ ہم کسی کو نہیں جانتے۔ مگر ان کے برخلاف کرشن جی کے طرز عمل سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سب کو جانتے ہیں۔ پھر کرشن جی نے مجھ سے کہا کہ آؤ تمہیں جوش صاحب سے ملوائیں۔ ہم اس جانب گئے جہاں جوش صاحب اور جاں نثار اختر وغیرہ بیٹھے تھے میں نے جوش صاحب کو سلام کیا کرشن جی نے ان سے کہا "جوش صاحب یہ ہماری بہن ہیں بالکل سُرخ"

جوش صاحب بولے "مگر یہ تو سفید ہیں" میں سفید لباس میں تھی ۔

پھر بولے "لکھتی ہو ـــ"

میں نے کہا "جی ــ کہانیاں ـــ"

"اچھا ـــ" ایک دو باتیں کر کے میں ایک طرف بیٹھ گئی۔ صفیہ آپا میرے کان کے قریب منہ لا کر بولیں "کافی ہاؤس میں اندر کمرے میں چلنا" پھر عصمت آپا کے کان میں بھی کوئی بات کی وہ دونوں کھڑی ہو گئیں تو میں بھی ان کے پیچھے ہو لی ـــ جب ہم اندر کمرے میں آئے تو پتہ چلا کہ صفیہ آپا کیوں بلا رہی تھیں ۔ صفیہ آپا کا یہ پروگرام تھا کہ خواتین مردوں سے علیحدہ کمرے

میں چلے گئیں۔ نفیس ایک ناشتے دان میں دہی بڑے رکھے سب کی منتظر تھیں۔ منیبہ آپا نے یہ دہی بڑے خاص طور سے عصمت آپا کے لئے تیار کرائے تھے اور دہی بڑے اتنے زیادہ نہ تھے کہ مردوں کو شریک کیا جاتا۔ مردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ دہی بڑے اتنے باقی بچ گئے کہ عصمت آپا نے کہا "رات کو یہی کھائیں گے۔" ہم چاروں نے چھوٹے سے کمرے میں اطمینان سے بیٹھ کر چلے پئے اور پھر صفیہ آپا اور عصمت آپا تصویر میں شامل ہونے چلی گئیں۔ نفیس کا پردہ تھا اس لئے میں ان کے ساتھ ٹھہر گئی۔

کافی ہاؤس سے واپسی پر کرشن جی، مہندر ناتھ، عادل رشید اور مجروح سلطانپوری میرے ساتھ گھر آئے۔ آسن کرشن جی کو ادھر اُدھر لے جانا چاہتے تھے۔ میں نے کہا اب اور جگہ کل لے جائیے گا۔ ہمارے ہاں اتنی دیر ہو گئی کہ پھر اور جگہ کا پروگرام نہ بن سکا۔ کرشن جی زیادہ تر سیاست پر باتیں کرتے رہے پنڈت نہرو ——— کانگریس ——— آپ نے ان دنوں بھوپال میں مولانا ابوالکلام آزاد کی انجمن اتحاد و ترقی قائم کی تھی ——— اور یہ ہندو مسلم اتحاد کے لئے کام کر رہے تھے۔ ان سب کی باتیں سن کر اس وقت میری نظر میں مستقبل کے ہندوستان کی تصویر ابھر رہی تھی۔ ذہن اور روح کی پوری آزادی کے ساتھ زندگی گذارنے کا تصور ——— یہ سب انقلاب کے بعد ہی ممکن ہو سکے گا۔

گھر سے رخصت ہوتے وقت کرشن جی نے مجھے دس روپے دیئے میں نے لینے میں تکلف کیا تو بولے "یہ تمہاری راکھی کے ہیں تمہیں تو جھگڑ کر لینا چاہئے تھا۔" میں نے سلام کر کے روپے لے لئے کرشن جی نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور پھر سب سے کہا "کانفرنس کی مصروفیت بہت زیادہ ہے۔ مگر میں پھر آنے کی کوشش کروں گا۔"

کانفرنس کا اجلاس کئی دن جاری رہا ایک دن کالج کے لڑکوں نے بھی ڈرامہ اسٹیج کیا انہوں نے عورتوں کا ایسا عجیب و غریب روپ دھارا کہ عصمت آپا کو بڑی کوفت ہوئی انہوں نے مجھ سے کہا "لڑکیوں کا پارٹ لڑکیوں کو ہی کرنا چاہیے تھا یہ تم لوگوں کی سزا ہے کہ یہ سوانگ بھر کر تمہارا مذاق اڑا رہے ہیں۔ توبہ توبہ دیکھو تو شرم آتی ہے۔"

میں نے ان سے کہا کہ "ہم لوگ اپنے ڈرامے علیحدہ کرتے ہیں اور پھر ہم بھی جی بھر کر ان کا سوانگ بھرتے ہیں۔ ہاں ڈبیٹ میں ضرور ہم لوگ لڑکوں کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔"

عصمت آپا کے لئے ہم لوگوں نے چائے کا انتظام ان کمروں میں کیا تھا جو طالبات کے لئے مخصوص تھے ——— عصمت آپا نے طالبات سے بہت سی باتیں کیں۔ مجھے عصمت آپا اپنی عبارت کی طرح بے تکلف سادہ اور خوب صورت معلوم ہوئیں اور بہت پسند آئیں۔ جب میں نے انھیں آٹوگراف البم دی تو انہوں نے یہ جملہ لکھا "ہیروئن بن جاؤ۔ کسی فرد کے دل کی نہیں اپنے ملک کی۔" مجھے آٹوگراف بہت پسند آیا کیونکہ یہ میرے اپنے خیالات کے عین مطابق تھا۔

کانفرنس کے پہلے اجلاس کی صدارت کرشن جی نے کی اس میں بہت سے لوگوں نے مضامین پڑھے اور تقاریر کیں کرشن جی کا خطبۂ صدارت بہت بصیرت افروز تھا۔ کرشن جی آٹوگراف البموں کی یورش میں گھرے ہوئے تھے۔ جب میں نے البم بڑھایا تو بولے۔ "تمہیں بھی ابھی آٹوگراف لینا ہے۔"

میں نے کہا "پھر میں بھول نہ جاؤں۔"

انھوں نے ایک جملہ لکھا : "میری پیاری چھوٹی بہن - تم نے اپنے لئے جو راستہ چنا ہے وہ بہت مشکل ہے مگر میں امید کرتا ہوں کہ اب تم اس پر ثابت قدم رہو گی۔"

بعد میں آنے والے برسوں میں جب ہر طرف سے پریشانیوں اور مشکلات نے مجھے گھیرا تو یہ اوٹوگراف ایک روشنی کا مینار بن کر مجھے راہ دکھاتا رہا -

کانفرنس کے افسانوی اجلاس کی صدارت مہندر ناتھ نے کی تھی، مہندر ناتھ سب کو ادیب کم اور ہیرو زیادہ معلوم ہوئے تھے، وہ چند فلموں میں کام بھی کر چکے تھے لیکن جب انہوں نے اپنا خطبۂ صدارت پڑھا تو سب کو قائل کر دیا کہ وہ ادیب پہلے ہیں اور ہیرو بعد میں ——— انہوں نے سیاسی اور سماجی مسائل کا بڑا اچھا تجزیہ کیا تھا اور افسانہ نگاروں کو زندگی کی بھرپور ترجمانی کی دعوت دی تھی -

اسی اجلاس میں کرشن جی نے اپنا مشہور افسانہ "مہالکشمی کا پل" پڑھا تھا ان کا کہانی پڑھنے کا انداز بہت دلنشیں تھا بس جیسے باتیں کر رہے ہیں - میرا سر فخر اور خوشی سے اونچا ہو گیا اور میں نے سوچا میرا بھائی بہت عظیم ہے -

آخری اجلاس مشاعرہ کا تھا - منٹو ہال میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی - عورتوں کا انتظام گیلری میں تھا جہاں چکیں ڈالی گئی تھیں بھوپال میں مشاعروں کی خاص روایات تھیں اس لئے ترقی پسند ادیبوں کی یہ کوشش تھی کہ یہ مشاعرہ سابق روایات سے بڑھ چڑھ کر ہو -

میں اسٹیج کے قریب ہی صوفے پر کرشن جی کے ساتھ بیٹھی تھی - بھوپال کے شعراء نے پہلے پڑھا - احسن کے گھر سے کسی عزیز کی موت کی خبر آئی انہوں نے کہا کہ وہ نظم پڑھ کر چلے جائیں گے، انہوں نے اپنی مشہور نظم "مرحوم ساتھی" سنائی - یہ نظم میں پہلے بھی سن چکی تھی - یہ مرثیہ رنج و غم میں ڈوب کر لکھا گیا تھا - اس روز یہ نظم میرے احساسات پر چھاتی چلی گئی - اور مجھے احسن سے بہت ہمدردی محسوس ہوئی - میں نے سوچا انھیں اس وقت دس بارہ میل دور سائیکل پر اکیلے نہیں جانا چاہیے تھا - میں نے کرشن جی سے کہا کہ "ہمارے یہ پروفیسر صاحب بیچارے اتنے بیمار رہتے ہیں، پارٹی کا اتنا کام کرتے ہیں - انھیں اس وقت اکیلا نہیں جانا چاہیے تھا ان کا گھر بہت دور ہے -

کرشن جی نے بہت غور سے میری طرف دیکھا اور بولے "تم نے پہلے نہیں کہا ورنہ ہم کسی کو ان کے ساتھ کر دیتے مگر اب تو وہ جا ہی چکے ہیں۔"

اس مشاعرے میں بہت سے مہمان شعراء نے پڑھا مجروح سلطانپوری نے بہت اچھی غزلیں سنائیں اور آخر میں جوش صاحب کے پڑھنے پر رات کے دو بجے مشاعرہ ختم ہوا -

دوسری صبح کرشن جی اور سب ادیبوں کی روانگی تھی - اس روز صبح کالج کھل گیا تھا - کالج گئی تو پتہ چلا کہ آج سب مہمان جا رہے ہیں - مجھے افسوس ہوا کہ کرشن جی کو خدا حافظ نہ کہہ سکوں گی - منٹو ہال اتنی دور تھا کہ سواری ملنے کی کوئی امید نہ تھی - میں اسی فکر میں ٹہل رہی تھی کہ احسن چند لوگوں کے ساتھ جیپ میں آئے اور کہا میں نے سوچا آپ کو بھی ساتھ لے لیں تاکہ آپ

کرشن جی کو خدا حافظ کہہ سکیں"۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ اور جیپ میں بیٹھ گئی۔

بھوپال کا اسٹیشن —— ! سیدھا سادھا سا منکسر المزاج ریلوے اسٹیشن ہے لکڑی کی سیڑھیاں —— !

کرشن جی نے کہا یہ بہت اچھا ہوا کہ احسن تمہیں لئے آئے ہیں روانگی سے پہلے تم سے ملنا چاہ رہا تھا۔ ہم سب اسٹیشن پر کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ ایک میلا کچیلا چھوٹا سا بچہ وہاں مانگتا ہوا آیا کرشن جی نے کہا دیکھو کتنا خوب صورت اور پیارا بچہ ہے۔ اس کے دانت کتنے خوب صورت اور چمک دار ہیں۔ ہمارے ملک میں ایسے ان گنت بچے ہیں جنھیں صاف کپڑوں اور کتابوں کی ضرورت ہے۔

پھر کرشن جی ہری ما کے متعلق باتیں کرنے لگے بھوپال کے چند روزہ قیام میں ہری ما نے انھیں بہت متاثر کیا تھا۔ وہ ایک پر خلوص اور نڈر مزدور لیڈر تھے۔ اسٹالن سے انھیں بے پناہ محبت تھی۔ اور اس زمانے میں سب کو ہی اسٹالن سے عقیدت تھی۔ کرشن جی نے ہری ما کے لئے کہا" یہ بہت پیارا آدمی ہے —— ! یہ آدمی فولاد ہے !"

پھر مہندر ناتھ، مجروح سلطانپوری، عادل رشید بھوپال کے ادیبوں سے بات چیت میں مصروف تھے۔ بمبئی کے سب مہمانوں کو بھوپال بہت پسند آیا تھا اور وہ سب بھوپال کے قدرتی مناظر کی تعریفیں کر رہے تھے۔

گاڑی آئی کرشن جی نے میرے سر پہ ہاتھ رکھا اور بولے" اب ہم تم سب کو بمبئی بلائیں گے تم کانفرنس میں ضرور آنا"

بھوپال سے جا کر کرشن جی نے بڑا پیارا سا خط لکھا اور بھی چند لوگوں کو انہوں نے خط لکھے۔ جب احسن نے مجھ سے اپنے نام کے خط کا ذکر کیا تو میں نے کہا کہ" کرشن جی کا وہ خط مجھے دکھائیے"۔ احسن نے کہا" آپ بھی اپنے نام کا خط دکھائیے۔ میں نے کہا" پہلے آپ اپنے نام کا خط لا کر دکھائیں تب میں بھی اپنا خط پڑھواؤں گی"۔ پھر اس کے بعد یہ معمول ہو گیا کہ اگر ان کے نام کرشن جی کا کوئی خط آتا تو وہ مجھے پڑھوا لیتے۔ کرشن جی کی محبت ہمارے درمیان ایک قدر مشترک بن گئی۔

مئی ۱۹۴۹ء میں بھیونڈی کانفرنس میں شرکت کے لئے ہم سب بمبئی گئے بھوپال سے کافی بڑا وفد گیا تھا۔ جاں نثار اختر اور صفیہ آپا پہلے سے بمبئی تھے اور عصمت آپا کے گھر مقیم تھے۔ جب ہم لوگ بمبئی پہنچے تو بمبئی کے دوسرے ادیبوں کے ہمراہ کرشن جی اسٹیشن پر تھے۔ ایک جگہ بڑے اسٹیشن پر اتر کر ہم لوگ لوکل میں بھیونڈی روانہ ہوئے۔

بھیونڈی میں ایک اسکول کی ایک بہت عالیشان بلڈنگ میں کانفرنس منعقد ہوئی۔ کانفرنس کئی دن جاری رہی۔ سارے ہندوستان سے مندوب آئے ہوئے تھے۔ تلنگانہ تحریک اپنے شباب پہ تھی مخدوم جیل میں تھے اس لئے ادیبوں میں بے انتہا جوش تھا۔

بمبئی کے ادیبوں میں مہندر ناتھ، کیفی اعظمی، ساحر اور نیاز حیدر وغیرہ ہم سب کا بہت خیال رکھتے تھے اور بہت زیادہ خاطر مدارات کرتے تھے۔ طالب علم والنشہ بھی ہر وقت مہمانوں کی آؤ بھگت میں لگے رہتے تھے۔ کرشن جی، عصمت آپا اور ملک راج آنند وغیرہ روزانہ بمبئی، آیا جایا کرتے تھے باقی ادیب وہیں ٹھہر گئے تھے۔

مہندر ناتھ صبح ہم لوگوں کو اپنی نگرانی میں ناشتہ کرواتے تھے۔ میں اور سیدہ یحییٰ اوپری منزل میں ایک کمرے میں ساتھ ٹھہرے

میرا چھوٹا بھائی راشد احسن اور بھوپال کے دوسرے ادیبوں کے ساتھ نیچے کی منزل میں تھا۔ پانی کے نل میدان میں ایک ساتھ بہت سے لگے ہوئے تھے۔ صبح سویرے میں اور سیدہ صابن اور تولیہ لے کر منہ دھونے جاتے تو مہندر بھیا کو بڑی کوفت ہوتی وہ اصرار کرتے کہ پانی یہیں منگواتے ہیں کمرہ میں اور سیدہ دونوں اصرار کرتے کہ ہمیں نل پر جا کر قطار میں کھڑے ہو کر منہ دھونے میں بڑا مزا آتا ہے۔ ہم لوگ اپنے وہاں کے قیام کو پک نک کی طرح منا رہے تھے۔ بعد میں موتی اور زہرہ بھی ہمارے ساتھ آکر رہنے لگیں تو پھر اور بھی اچھا لگنے لگا اکثر کانفرنس کے لیے اور پورا اجلاس ہوتے تو ہم چاروں چپکے سے نکل جاتے اور ادھر ادھر گھومتے ۔!

ایک دن دوپہر کے اجلاس میں میں نے بھی تقریر کی مہندر ناتھ نے کرشن جی کو بتایا کہ ان کی تقریر تو بالکل "سرخ تھی" کرشن جی نے کہا افسوس ہم کل دوپہر کے اجلاس میں آسکے اور اپنی بہن کی تقریر نہ سن سکے۔"

کانفرنس کا آخری دن بہت یادگار تھا ۔۔! اس روز مخدوم اور سردار جعفری اور سب نظر بند ساتھیوں کو یاد کیا گیا۔ اور انتہائی جوشیلی تقاریر ہوئیں معلوم ہوتا تھا کہ ساری بمبئی سرخ ہو گیا ہے۔ آخر میں بڑے جوش و خروش سے مخدوم کا ترانہ گایا گیا۔

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی   آزادی کے پرچم کے تلے

کرشن جی نے مجھ سے کہا تھا کہ "تمہاری بھابی انتظار کر رہی ہیں اور کانفرنس کے بعد ہم سب کو گھر لے کر چلیں گے"۔ میری بھابی سے اب تک ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ کانفرنس ختم ہونے کے بعد کرشن جی نے یہ پروگرام بنایا کہ ہم لوگ صبح وارسوا آجائیں ۔!

دوسرے دن صبح ہم سب بمبئی روانہ ہوئے جاں نثار اختر ہم سب کو عصمت آپا کے گھر لے گئے ۔ عصمت آپا کا گھر بہت خوب صورت تھا۔ اور سمندر کا نظارہ وہاں سے انتہائی دلفریب تھا۔ میں ناشتہ کر کے گئی تھی مگر عصمت آپا نے بڑے اصرار سے ہم سب کو دوبارہ ناشتہ کرایا اور پھر مجھ سے بولیں "کہ یہ تو تمہاری استانی ہیں ان کے ساتھ تمہیں مزا نہیں آئے گا چلو میں تمہیں بمبئی کی سیر کراؤں۔"

میں بڑی خوشی سے تیار ہو گئی۔ بھیڑ میں نہانے کا علیحدہ انتظام نہ تھا اس لئے عصمت آپا کے گھر جا کر میں نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے بال دھوئے بہت دن بعد بال دھوئے تھے اس لئے بُری طرح الجھ گئے تھے مجھے کنگھے سے بال نوچتا دیکھ کر عصمت آپا میرے پاس آئیں کنگھا میرے ہاتھ سے لے کر بڑی شفقت سے بولیں "لاؤ میں سلجھا دوں"۔ پھر انہوں نے بڑی آہستہ آہستہ جلدی سے میرے بال سلجھا دیئے ۔ اور بولیں "تمہارے بال اتنے خوب صورت ہیں انھیں باندھنے کی ضرورت نہیں کھلا چھوڑ دو ۔۔۔ اور میرے ساتھ آؤ۔"

پھر انہوں نے ٹیکسی منگوائی ۔ شاپنگ بیگ لیا۔ راستہ میں مہدی بھائی کا گھر تھا اس لئے پہلے وہ مجھے ان کے گھر لے گئیں۔ کچھ دیر وہاں زہرہ کے پاس بیٹھ کر پھر ہم بازار گئے جہاں سے عصمت آپا نے شاپنگ کی۔ سودا سلف خریدتے ہوئے بولیں "میں زیادہ تر یہیں سے سودا لیتی ہوں"۔ پھر بمبئی کی فلمی زندگی سے سیاست تک پھر راستہ بھر دلچسپ باتیں کرتی

رہیں۔۔۔ پھر انہوں نے مجھ سے میرے لکھنے کے متعلق کچھ سوالات کئے۔ میں نے بہت شرما کر دو چار پرچوں کے نام بتائے جن میں میں لکھا کرتی تھی۔ انہوں نے لکھنے پر بہت ہمت افزائی کی اور کہا یہ بہت اچھی بات ہے کہ تمہارا گھرانا اتنا روشن خیال ہے اور تمہیں ہر طرح کی آزادی حاصل ہے۔ جب ہم لوٹے تو دوپہر کا وقت ہو گیا تھا۔ آتے ہی ہم نے کھانا کھایا۔ اور پھر ہم لوگ کرشن جی کے گھر جانے کے لئے وارسوا روانہ ہو گئے۔ مجھے عصمت آپا کے ساتھ گذارا ہوا وہ دن ہمیشہ یاد رہے گا مجھے وہ سب کے لئے ماں کا ایک سمندر معلوم ہوئیں۔

وارسوا پہنچے تو کرشن جی ہم سب کے منتظر تھے۔ کرشن جی کا گھر ان دنوں سرائے بنا ہوا تھا۔ تلنگانہ کے ادیب ایک کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اوپر کے حصہ میں مجاز، ساحر اور غالباً نیاز حیدر بھی وہیں رہتے تھے۔ مجھے بھابی نے بڑی محبت سے اپنے کمرے میں جگہ دی۔ مجھے بھابی سے ملنے کی جب سے ہی تمنا تھی جب سے میں نے راکھی بھیجی تھی۔ میرے ذہن میں بھابی کا بہت خوب صورت اور دلکش تصور تھا۔ مگر وہ ایک سیدھی سادھی گھرستن نکلیں۔ میری آرزؤں کے مطابق نہ ہوتے ہوئے بھی مجھے وہ پسند آئیں۔ ان کی سادگی بے تکلفی اور اخلاق نے مجھے گرویدہ کر لیا۔ وہ انتہائی بے تکلفی اور رازداری سے اپنی گھریلو باتیں کیا کرتی تھیں۔ ان کے سامنے بہت سے مسائل تھے وہ کہانیوں کی دنیا سے بہت دور حقیقت کی ٹھوس اور سنگلاخ دنیا میں رہتی تھیں۔ اس لئے انھیں یہ پسند نہ تھا کہ کرشن جی صرف کہانیوں کے ہو کر رہ جائیں۔ وہ چاہتی تھیں وہ کوئی اور کام بھی کریں۔ ایسا کام جس میں ان کا مالی فائدہ ہو۔ جب میں کرشن جی کی حمایت میں کچھ بولتی تو وہ کہتیں "تم بھی اپنے بھائی کی طرح کہانیوں کی دنیا میں رہتی ہو۔" شاید وہ ٹھیک ہی کہتی تھیں ہم نے اپنے بہترین تصورات، آرزوئیں۔ اور سپنے۔ اور سب کے لئے اچھی زندگی کا خواب دیکھنے کا نام ہی تو انقلاب رکھا تھا۔

کرشن جی نے اپنی مسہری بھابی کے لئے خالی کر دی تھی اور وہ خود برآمدے میں ایک چارپائی پر سوتے تھے۔ وہ اتنی لمبی چوڑی مسہری تھی کہ میں نے اس پر لیٹ کر سوچا کہ یہ کرشن جی کی مسہری ہے یا اردو افسانہ نگاری کا میدان! میں نے بھابی سے کہا کہ آپ دونوں بچیوں کو میرے ساتھ سلا دیا کیجیے۔ اکثر جب بچیاں کی نیند نہیں ہوتی تو بھابی خود میرے ساتھ لیٹ جاتیں۔ ہم دونوں رات گئے تک باتیں کیا کرتے۔ دوپہر میں بھی اکثر میں اور بھابی برآمدے میں بیٹھ کر باتیں کرتے۔ وہ اپنے میکے کا بھی ذکر کیا کرتی تھیں۔ کرشن جی کا چھوٹا سا کنبہ تھا۔ ایک لڑکا اور دو لڑکیاں۔ بچپن میں کاکا بہت پیارا بچہ تھا۔ سارے دن شرارتیں کرتا۔ وہ میرے چھوٹے بھائی کے ساتھ کھیلا کرتا۔ راشد کو بچپن کا کاکا بہت پسند آیا تھا۔ لڑکیاں بیحد حساس اور سمجھدار معلوم ہوتی تھیں اور سب بڑی محنت سے اسکول کا کام کیا کرتی تھیں اور صبح سویرے جلدی سے اسکول کے لئے تیار ہو جاتی تھیں۔ مجھے کرشن جی کے گھر کا ماحول اپنے گھر سے ملتا جلتا لگا۔ کیونکہ ابا جی کی سیاسی زندگی میں ہمارا گھر بھی اسی طرح سرائے بنا رہتا تھا۔ اور مستقل مہمان آیا جایا کرتے تھے۔

کرشن جی کے گھر میں گھنے اور لمبے درخت تھے اور گھر سے باہر چمکتی ہوئی ریت اور ناریل کے درخت نظر آتے تھے اور پھر دور تک پانی۔ سمندر کا نظارہ اتنا خوب صورت لگتا تھا کہ جا کر وہاں سے لوٹنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میں، راشد اور حمزہ

اکثر وہاں سمندر کے کنارے جاتے — اور خوب صورت سیپیاں اکٹھی کرتے۔
کرشن جی کے گھر میں درختوں کے گھنے اور ٹھنڈے سایوں میں بیٹھ کر واقعی کہانی لکھنے کی آرزو ہوتی تھی اور یہ کوئی تعجب نہیں کہ اس گھر میں کرشن جی نے اتنی بہت سی خوب صورت کہانیاں لکھیں۔

اکثر میں، راشد، کرشن جی اور احسن سب سیر کی غرض سے بس میں سوار ہو کر اندھیری سے ممبئی جاتے۔ ایک دن بس میں بہت سی مچھیرن عورتیں اور مرد سوار تھے۔ کرشن جی مجھ سے کہنے لگے ان عورتوں اور مردوں کو دیکھو — ایسے خوب صورت بدن مچھیروں کے ہی ہو سکتے ہیں۔ محنت ان کی خوبصورتی کا راز ہے۔ میں نے غور سے آبنوسی رنگ کے دھوتیوں میں ملبوس مچھیروں کو دیکھا تو مجھے ان کے لمبے لمبے بازو دیکھ کر ایسا لگا کہ سمندر کی سب مچھلیاں ان کے بازوؤں میں چھپ گئی ہیں۔ وہ مرد اور عورتیں کسی اور ہی دنیا کی مخلوق معلوم ہو رہے تھے۔ اتنے صحت مند اور تندرست کہ ان کے کالے رنگ میں زندگی حسن اور چمک تھی جو بجائے خود ایک حسن تھی۔

صبح ناشتہ پر بھابی بہت مزیدار کچوڑے تلا کرتی تھیں۔ میں سیڑھیاں اتر کر جب ان کے باورچی خانے میں جاتی تو بھابی کو ایک سلیقہ مند گھرستن کے روپ میں دیکھتی۔ صاف ستھرا باورچی خانہ اور چم چم کرتے ہوئے برتن۔ مجھے ہندوؤں کا باورچی خانہ ہمیشہ سے بہت پسند تھا۔ اپنی ہندو سہیلیوں کے گھر میں مجھے سارے گھر میں باورچی خانہ پسند آیا کرتا تھا اور ان کے چولھے اور چوکے کے پاس بیٹھ کر کھانا کھانے کو جی چاہتا تھا۔ اکثر میں بھابی کے ساتھ کچوڑے تلنے لگتی اور جب جب گرم گرم کچوڑے لے کر کمرے میں آتی تو کرشن جی فرش پر آئینہ رکھے شیو بنانے میں مصروف ہوتے۔ وہ جلدی جلدی شیو ختم کرتے اور سب کو ناشتے کے لئے بلاتے یہ کہہ کر کہ کچوڑے ٹھنڈے ہو جائیں گے۔

اکثر جب ہم سب ناشتہ کر رہے ہوتے تو نیاز حیدر ایک عجیب عالم میں کمرے میں داخل ہوتے۔ غالباً زیادہ مصروفیت کی وجہ سے انھیں اپنے حلیہ سے سروکار نہیں رہتا تھا اور صفائی کی طرف زیادہ توجہ دینے کی فرصت نہ ملتی تھی۔ ایک دن کرشن جی بیزاری کے عالم میں بولے "میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ روز نہایا کرو یا اجلے کپڑے پہنا کرو، بالوں میں کنگھا کرو یا ناخنوں کا بڑھانا بند کرو۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ اگر تم دو وقت نہیں تو صبح ضرور منجن سے دانت صاف کر لیا کرو۔"

میں سب کے لئے پیالیوں میں چائے بناتی۔ نیاز حیدر بالکل سیاہ چائے پیتے۔ کرشن جی کہتے "اتنی کالی چائے صحت کے لئے اچھی نہیں ہوتی ہے" ان کی مراد صحت کے لئے اچھی نہ تھی اور انھیں کوئی کب تک سمجھاتا مگر کرشن جی برابر سمجھاتے رہتے تھے۔ نیاز حیدر کہیں باہر سے آتے تو کرشن جی ان سے کئی سوال کرتے کہاں گئے تھے؟ کیوں گئے تھے؟ ہر قسم کے سوال معلوم کرنے کے لئے کہ وہ پی کر تو نہیں آئے ہیں۔ نیاز حیدر اس زمانے میں ریڈیو پالیسی کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ اور نوجوانوں میں بہت مقبول تھے۔ ان کی نظم "ساتھیو آؤ کہ ہنگامہ آرائی ہے" بمبئی کانفرنس میں بہت مقبول ہوئی تھی۔

جب کرشن جی نیاز حیدر، ساحر اور مجاز کو بہت زیادہ پیتے ہوئے دیکھتے تو بہت کڑھتے تھے۔ ایک شام میں

کبھی نہ بھولوں گی جب کرشن جی برآمدے میں ٹہلتے جاتے تھے اور آہستہ آہستہ غم سے کہہ رہے تھے۔" انہوں نے وعدہ کیا تھا مگر اب یہ پھر پی کر آگئے۔ یہ بڑے وسی قسم کا ٹھرا پیتے ہیں۔ اپنے کو تباہ کر رہے ہیں۔ کیا کیا جائے نہیں مانتے۔" یہ بات میں نے ان کے۔ن سے بارہا سنی۔" یہ اتنے پیارے پیارے لوگ ہیں کیسے اچھے شاعر ہیں مگر یہ سب اپنے کو تباہ کر رہے ہیں۔ انھیں کوئی نہیں رک سکتا۔ کسی کی نہیں سنتے۔"

میں انقلابیوں کے کردار کا یہ رُخ دیکھ کر سوچ میں پڑ گئی تھی کہ جب یہ اپنے کو نہیں سدھار سکتے تو یہ سماج اور ملک کی حالت بھلا کیا بدلیں گے۔ شاید بھابی ٹھیک ہی کہتی تھیں ہم سب کہانیوں کی دنیا میں رہتے تھے اور انقلاب کی باتیں کرتے۔"

ابا جی اور امی جب بمبئی آئے تو خلافت ہاؤس میں مقیم ہوئے پھر ہم لوگ بھی وارسوا سے خلافت ہاؤس چلے گئے۔

بھابی اور کرشن جی نے ہمیں بڑی محبت سے رخصت کیا اور کہا کہ امی اور ابا کو ساتھ لے کر ضرور کسی دن آؤں میں ایک دن میں امی کو ساتھ لے کر کرشن جی کے گھر گئی۔ امی کو ان کا گھر بہت پسند آیا اور بھابی سے مل کر وہ بہت خوش ہوئیں کرشن جی نے امی سے اس ۔۔۔۔ بہت دیر تک احسن کے متعلق گفتگو کی۔ اور امی ان کی باتوں سے احسن کے متعلق مطمئن ہو گئیں۔ یہ سچ ہے کہ کرشن جی اگر ہمارے معاملات میں دلچسپی نہ لیتے تو میرا شمار ان ہی لوگوں میں ہوتا جو زندگی بھر شادی نہیں کرتے ہیں۔ اس لئے کہ اس زمانے میں میرے خیالات کچھ اس طرح کے تھے انقلابیوں کو محبت اور شادی وغیرہ ہرگز نہیں کرنا چاہیے اور اپنی زندگی انقلاب کے لئے وقف کر دینا چاہیئے بہر حال احسن یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گئے کہ اگر ہم ہاتھ پکڑ کر چلیں گے تو منزل قریب آجائے گی۔ اس زمانے کی بہت سی باتیں ہیں اور بہت سی یادیں ہیں لیکن اگر میں اپنی ذات کو درمیان میں لائی تو مضمون بہت طویل ہو جائے گا۔

شادی کے بعد زندگی کے اکثر خوش کن لمحوں میں، اپنے بچوں کی خوشیوں میں جب میں نے اپنے ماں باپ کو یاد کیا تو کرشن جی کو بھی یاد کیا اور ان کے لئے دعا کی۔

شادی کے تین سال بعد جب ہم لوگ سیالکوٹ آئے تو میں نے سیالکوٹ سے کرشن جی کو خط لکھا۔ کرشن جی نے مجھے لکھا۔ "تمہارے سیالکوٹ جانے اور احسن کی ملازمت کا حال جان کر میرے سر سے ایک بوجھ اتر گیا۔ میں تمہاری وجہ سے بڑی ذمہ داری محسوس کرتا تھا۔" پھر انہوں نے نصیحت کی کہ" تم نے ان چند سالوں میں اتنی مشکلات اٹھائی ہیں کہ اب تمہارا حق ہے کہ تم کچھ آرام کرو۔ احسن کی صحت، اپنی تعلیم اور بچے کی دیکھ بھال پر توجہ دو۔"

۵۵ء میں ہندوستان جانا ہوا۔ دلی میں میرا قیام خالہ کے گھر پہ تھا اور بھوپال جانے سے پہلے دو روز کو ٹھہری تھی۔ معلوم ہوا کہ کرشن جی دہلی میں ہیں اور سرلا بہن کے گھر مقیم ہیں میں سرلا بہن سے بھی ملنے کی بہت مشتاق تھی کرشن جی کی آمد کا ہوا تو اسی روز صبح سرلا بہن کے گھر گئی۔

سرلا ان دنوں زچگی میں تھیں ایک ننھے سے بچے کو گود میں لئے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں سانولا رنگ بڑی بڑی کالی آنکھیں اور پیاری سی مسکراہٹ۔ دور سے دیکھ کر معلوم ہو جاتا تھا کہ کرشن جی کی بہن ہیں۔ وہ بہت پیار سے ملیں اور ہم بہت

تک دوسرے سے گھل مل گئے۔ ان دنوں انہوں نے لکھنا بہت کم کر دیا تھا۔

کرشن جی کی کشمیری بھاوج بھی مجھے بہت اچھی لگیں۔ اور جب میں نے ماتا جی کو وہاں دیکھا تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کیونکہ مجھے ماتا جی سے ملنے کی بڑی آرزو تھی۔ ماتا جی نے مجھے گلے سے لگا کر پیار کیا اور میرے پاس بیٹھ کر دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ کرشن جی کے بچپن کی باتیں — کشمیر کی باتیں — دلی کی باتیں — ان کی باتوں میں بڑا رس لگتا تھا ایسا لگتا تھا جیسے کہانی سنا رہی ہیں۔ یہ کچھ ان کا ہی اثر تھا کہ ان کے بیٹوں اور بیٹی نے بھی کہانی سے رشتہ جوڑ لیا۔

جب کرشن جی گھر آئے اور انہوں نے وہاں مجھے بیٹھے دیکھا تو خوشی اور تعجب کا اظہار کیا۔ میرے بیٹے کو گود میں اٹھا لیا۔ پھر احسن کی صحت اور ملازمت وغیرہ کے بارے میں پوچھا پھر میری تعلیم اور سرگرمیاں — میں نے ان کو ایبٹ آباد اور کاکول کے متعلق بتایا اور وہ یہ جان کر خوش ہوئے کہ ہم لوگ پاکستان میں خوش اور مطمئن ہیں۔

پھر انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ "تمھیں پنجاب کے لوگ کیسے لگے!"

میں نے کہا کہ پنجاب کے لوگ بہت اچھے ہیں اور مجھے وہاں محبت ہی محبت ملی ہے۔ کرشن جی یہ سن کر خوش ہوئے۔ پنجاب کے لوگوں کی باتیں کرنے لگے۔ "وہاں کے لوگوں میں تمھیں فرق لگتا ہوگا وہاں کے لوگ قدآور، صحت مند اور خوبصورت ہوں گے۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا وہ بولے۔ "خالص گھی اور دودھ خوب ملتا ہوگا۔" ان دنوں واقعی مل جاتا تھا۔

دوپہر کے کھانے پر ماتا جی نے مزیدار لوبیا کی پھلیاں اور چاول پکائے تھے۔ انہوں نے کہا "ہم تمھیں آج کشمیری مزا کھلائیں گے۔" دسترخوان پر سب لوگ آ گئے اور ہم سب نے فرش پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کرشن جی دہلی والے گھر کے متعلق سنانے لگے کہ پہلے ایک زمانے میں وہ منٹو اور مجاز ایک عرصہ تک اسی گھر میں ساتھ رہے ہیں۔ اس زمانے میں خوب محفلیں جمتی تھیں۔ سب جمع ہوا کرتے تھے۔ پھر پوچھا "ہاں فیض بھی تو رہا ہو گئے ہیں تم ان سے ملیں؟ کیسے ہیں وہ؟"

فیض صاحب ان ہی دنوں رہا ہوئے تھے مگر میری ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ بہرحال سنی سنائی معلومات کی بنا پر میں نے کرشن جی کو ان کے متعلق بتایا اور وہ ان کی خیریت معلوم کر کے خوش ہوئے۔ پھر کرشن جی نے پنجاب کے کچھ اور ساتھیوں کا پوچھا ان میں سے کچھ کے نام میں نے سن رکھے تھے زیادہ تر کو میں نہیں جانتی تھی اس لئے کہ ہمارا لاہور میں کبھی زیادہ قیام نہیں رہا۔

کرشن جی ان دنوں بچوں کے لئے کتابیں لکھ رہے تھے چند کتابیں انہوں نے میرے چھوٹے بھائی کو دیں۔

کرشن جی کو کسی ضروری کام سے جانا تھا مگر انہوں نے بیوی سرلا شرما سے کہا کہ آج وہ کہیں نہیں جائیں گے اور وہ کام کل دیکھا جائے گا۔ پھر کرشن جی نے مجھ سے کہا کہ "ہم آج تمھیں دہلی کی سیر کرائیں گے تم نے پہلے بھی دہلی دیکھی ہے؟"

میں نے انھیں بتایا کہ بچپن میں کبھی کبھی امی اور ابا کے ساتھ دہلی آنا ہوتا تھا۔ کہنے لگے اب تو دہلی بالکل بدل گئی ہے۔ خاص کر نئی دہلی اور شرنارتھیوں کی آبادیاں ہر طرف پھیل گئی ہیں۔"

انھوں نے ٹیکسی منگوائی اور ہمیں دہلی کی سیر کرائی۔ انڈیا گیٹ — اور بہت سی عمارتیں — نئی دہلی کی خوبصورت سڑکیں اونچے اونچے درختوں کا ٹھنڈا سایہ۔ کرشن جی اس لمحے لاہور کو یاد کرنے لگے — لاہور کی مال روڈ پھر انھیں مری کی یاد آئی مری کی مال روڈ۔

پیڑ جیسے درخت ـــ اتفاق سے میں نے اس وقت تک مری نہیں دیکھی تھی کیونکہ ایبٹ آباد کا موسم اتنا اچھا تھا کہ ہمیں کہیں اور جانے کی ضرورت ہی نہ محسوس ہوئی۔ کرشن جی کہنے لگے کہ جو بات مری میں تھی وہ کہیں بھی نہیں ہے۔ پھر انہوں نے بتایا کہ وہ فیملی وہاں جا کر کچھ عرصہ گزارنے اور ناول لکھنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔

واپسی میں ہم نے ایک ریسٹوران میں چائے پی۔ میرے بیٹے کے لئے نچلا بیٹھنا مشکل تھا۔ وہ دوڑنا شروع کر دیتا۔ کرشن جی اسے گود میں لے کر شیشے کی الماریوں کے پاس گئے اور کہا کہ اپنے لئے پیسٹری پسند کر لو ـــ اس نے ایک دو پیسٹریاں چنیں اور پھر انہیں توڑ توڑ کر پھینکتا رہا ـــ جب وہ توڑ چکا تو کرشن جی نے کچھ اور پیسٹریاں پسند کرنے کو کہا ـــ وہ اس کے توڑ توڑ کر پلیٹ میں ڈالنے پر میں نے کہا کرشن جی یہ کھا نہیں رہا ضائع کر رہا ہے " کرشن جی نے کہا نہیں وہ ضائع نہیں کر رہا وہ کھیل رہا ہے ـــ اسے کھیلنے دو ـــ اسے کھیلتا ہوا دیکھنا مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے "

واپسی پر انہوں نے ہمیں اردو بازار میں آتا یا خالہ کا گھر گلی میں تھا اور میں نے ان سے کہا کہ میں جامع مسجد کے پاس ہی اتر گئی انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور پھر خدا حافظ کہہ کر ٹیکسی میں بیٹھ گئے ـــ جب ٹیکسی روانہ ہوئی تو میری نظر جامع مسجد کے خوب صورت اور عظیم ستونوں پر پڑی اور میں نے سوچا کہ کرشن جی بھی ایسے ہی بلند اور عظیم ہیں!

یہ مضمون یہاں تک ڈائری، خطوط اور یادداشت کی مدد سے کرشن چندر نمبر کے لئے لکھا گیا تھا۔ "شاعر" کا کرشن چندر نمبر شائع ہو رہا تھا۔ مگر پھر ان ہی دنوں جنگ چھڑ گئی اور حالات کچھ ایسے ہوئے کہ یہ مضمون روانہ نہ کیا جا سکا ـــ نہ ہی کرشن جی سے خط و کتابت ممکن رہی۔ انہیں میں ہر سال راکھی کے موقعہ پر خاص طور پر یاد کیا کرتی تھی ـــ اور دور بیٹھے ان کے لئے اس روز بہت دعائیں کرتی تھی۔ ایک دور دراز بہن کی راکھی دعا ہی بن جاتی ہے۔

ایک دفعہ ۴۹ء میں ڈاک کی گڑبڑ سے کرشن جی کو میری راکھی نہ پہنچ سکی تھی انہوں نے مجھے خط لکھا "اب خط لکھ رہا ہوں تو سب سے پہلے ایک شکایت بھی ہو جائے تم سے کہ تم نے راکھی نہیں بھیجی تہوار کے دن تمہاری راکھی کا بہت انتظار کیا۔ بھوپال سے ایک اور راکھی بھی آئی تھی لیکن جس راکھی کا مجھے انتظار تھا وہ نہیں ملی۔ شاید ہم پھوکٹ میں بھائی بنے تھے۔ (بمبئی والوں کی اصطلاح ہے) خیر پھر بھی پھوکٹ کی ایک راکھی تو بھیجی جا سکتی تھی ہم تم سے بے حد خفا ہیں جی مجھے۔"

۶۹ء میں پورے چودہ برس بعد ہندوستان جانے کا موقعہ ملا اتفاق سے جس دن میں نے بمبئی کا سفر کیا وہ راکھی کا دن تھا۔ ریل کے ڈبے میں ہر طرف خوب صورت اور چمکدار راکھیاں نظر آ رہی تھیں میرا جی چاہ رہا تھا کہ جلدی سے بمبئی پہنچوں اپنے سب بہن بھائیوں اور امی کو دیکھوں ـــ اور کرشن جی کے راکھی باندھوں۔

میں نے قریب بیٹھے ہوئے ایک نوجوان سے پوچھا "کیا آج راکھی ہے" اس نے پیار سے اپنی راکھی کو چھو کر کہا "نہیں جی ـــ راکھی کل تھی۔ آج دوسرا دن ہے۔ کل میں اپنی بہن کے گھر گیا تھا۔ آج واپسی ہوئی ہے" میں نے سوچا کہ راکھی کا دن میرا پورا سفر ہی میں گذرا جس دن میں نے سرحد پر قدم رکھا تھا وہ راکھی کا دن تھا اور آج مجھے ٹرین میں دوسرا دن تھا ـــ!

کرشن جی کو راکھی باندھے ہوئے مجھے اکیس برس ہو چکے تھے ---! اور میرا اتنا دل چاہتا تھا کہ انھیں اپنے ہاتھ سے ... ڈاک کے جانے کتنے لفافوں میں راکھیاں کھو چکی تھیں اور جب سے پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات خراب ... میری اپنے گھر والوں سے بھی خط و کتابت بند تھی۔ پھر دوپہر کے بارہ بجے بمبئی کا اسٹیشن آیا۔

دوپہر کو کھانے کی میز پر چودہ برس بعد ہم سب بہن بھائی یکجا ہو کر بیٹھے۔ بچپن میں رام چندر کے بن باس کا حال ... تھی کہ کتنا کٹھن کیا۔ سیتا جی ساتھ تھیں لچھمن ساتھ تھے پھر اب اچھا جنگل --- خوب شریفے اور رام پھل ... تھے۔ اب جب اتنے ہی سال بعد میں ماں اور بہن بھائیوں کے ساتھ یکجا ہوئی تو مجھے وہ چہرہ تڑپ کر یاد آیا ... درمیان تھا۔ ابا کا چہرہ --- مگر میں نے ان کا نام بھی نہ لیا۔ اس لئے کہ سب میرے آنے کی خوشی میں مگن ... سب کو اداس نہیں کرنا چاہتی تھی ---!

... نے مجھے بتایا کہ کرشن جی کا گھر بالکل قریب ہے۔ ہماری سڑک چودہ ہے اور ان کی پندرہ --- پھر ہم نے ... شام کو راکھی لے کر چلیں گے۔

شام کو ہم راشد احسن اور تزئین کرشن جی کے ہاں گئے۔ کھار کا علاقہ بہت خوب صورت ہے۔ گھنے سایہ دار ... سڑک کے دونوں طرف تھے۔

جب ہم کرشن جی کے گھر پہنچے تو وہ گھر میں ہی تھے۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ کرشن جی ان برسوں ... بدل گئے تھے اور ان دنوں ان کی صحت بہت خراب ہو رہی تھی۔ کچھ عرصہ ہوا دل کا دورہ پڑ چکا تھا۔ اور اس لئے ... اور کمزور نظر آ رہے تھے۔

وہ بڑی شفقت سے ہم سب کا حال پوچھتے رہے۔ تزئین کو پیار کیا اور اپنے پاس بٹھا لیا۔ میں نے سلمیٰ بھابی کے ... پوچھا تو انھوں نے کہا کہ "مخدوم کی یاد میں ایک جگہ جلسہ ہے سلمیٰ اس کی صدارت کر رہی ہیں ابھی آ جائیں گی۔"

کرشن جی کا ڈرائنگ روم سلیقہ اور نفاست سے آراستہ کیا گیا تھا۔ سلمیٰ بھابی کا سلیقہ ہر طرف بول رہا تھا۔ میں نے ... سے کہا کہ میں آپ کے لئے راکھی لائی ہوں۔ وہ بہت خوش ہو کر بولے "پھر جلدی سے باندھو" اور اپنا ہاتھ ... بڑھایا۔ میں نے ان کے راکھی باندھی انھوں نے مسکراتے ہوئے راکھی کو دیکھا اور کہا "بہت خوب صورت راکھی" ... پھر انھوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور اکیس روپیہ میرے ہاتھ پر رکھے۔ ان سے روپیہ لیتے ہوئے اس روز مجھے بڑی ... ہوئی ---

"اب آپ کی طبیعت کیسی رہتی ہے؟"

پھر انھوں نے بتایا کہ "اب تو ٹھیک ہوں مگر بہت بیمار رہا۔ ڈاکٹروں نے ملنے جلنے اور بولنے چالنے کو بھی منع کر دیا ... پرہیز کیا مگر اب میں بالکل ٹھیک ہوں --- آرام اب بھی کر رہا ہوں۔

میں نے سرلا اور ماتا جی کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ ماں جی کا انتقال ہو گیا ہے اور جس دن یہاں بمبئی میں

میرا جشن منایا جا رہا تھا اس روز ان کا انتقال ہوا۔ عجیب بات ہے۔ اور وہ جشن میرے لئے دکھ بن گیا۔

پھر وہ ماتا جی کی بیماری کا تذکرہ کرنے لگے اور پھر ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں —!

کرشن جی نے کہا: "اب تم لوگ کھانا کھا کر جانا۔" میں نے کہا: "امّی کھانے پر سب کا انتظار کریں گی۔" اس بات پر وہ بولے: "پھر چائے چلے گی۔" نوکر سے کہا کہ "وہ کشمیری سیب جو کل آئے ہیں لے آؤ — اور جلدی سے چائے بناؤ۔"

نوکر ایک بڑی پلیٹ میں سیب لایا۔ کرشن جی سیب چھیلنے لگے۔

میں نے کہا: "لایئے میں چھیلوں۔"

انہوں نے کہا: "تم مجھے اس خوشی سے کیوں محروم کرنا چاہتی ہو جو مجھے اس وقت سیب چھیل کر محسوس ہو رہی ہے — تم لوگ کھاؤ —" وہ چھیل چھیل کر ہمیں سیب دیتے رہے۔ سرخ سرخ کشمیری سیب دیکھ کر میں نے شرارت سے کہا: "یہ سیب تو ہمارے کشمیر کے ہیں۔"

کرشن جی ہنس پڑے: "ہاں کشمیر — اکشمیر کے ہیں۔"

اسی لمحہ سلمیٰ بھابی اندر آئیں۔ میں نے انھیں تصویروں میں دیکھا تھا۔

ہم گلے مل لئے تو وہ بولیں: "میں نے آپ کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔ میں نے آپ کی تصویر دیکھی تھی اور آپ کو بہت پڑھا ہے۔"

میں نے کہا: "میں نے بھی آپ کو بہت پڑھا ہے مگر افسوس اتنے عرصہ سے رسالے آنے جانے بند ہو گئے اس لئے کوئی نئی چیز نہیں پڑھی پھر مجھے نقوش کا پرچہ یاد آیا جو میں ایک طرف رکھ کر بھول گئی تھی میں نے کرشن جی کو وہ پرچہ دیا۔ وہ پرچہ لے کر بہت خوش ہوئے طفیل بھائی کو پوچھا — اور پھر کہا پاکستان سے اردو کے اتنے اچھے اچھے پرچے نکلتے ہیں کہ جی خوش ہو جاتا ہے۔ یہ بہت زیادتی ہے رسائل ایک جگہ سے دوسری جگہ ضرور آنا جانا چاہیے — پھر ادب کی باتیں ہونے لگیں ہندوستان اور پاکستان میں اردو کا مستقبل — سیاست — جنگ اس روز کرشن جی کی باتیں سن کر مجھے احساس ہوا کہ انہیں تقسیم بھی تقسیم نہیں کر سکی ہے۔ وہ آج بھی ہندوستان اور پاکستان میں قدم جمائے کھڑے ہیں۔ "میرا لاہور —" "میرا پاکستان —" "اردو —" اور "وہاں سب میرے ہیں۔" ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ سن کر میں سوچنے لگی کہ ادب کے لئے نہ کوئی حد ہے۔ نہ مقام۔ نہ وقت —! ادب تو ازل سے ابد تک کا ایک لامتناہی سمندر ہے۔

سلمیٰ بھابی نے بتایا کہ "جن دنوں جنگ ہو رہی تھی کرشن جی کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ میں ان سے کہا کرتی تھی کہ تمہاری تو سی آئی ڈی میں رپورٹ کرنی چاہیئے کہ تم تو پاکستانی ہو۔ جس دن لاہور پہ بمباری ہوئی انہوں نے سارے دن کچھ کھایا پیا نہیں۔ سارے دن قالین پر پڑے — میرا لاہور — میرا لاہور کہتے رہے۔"

کرشن جی ان کی بات کے جواب میں مسکرائے۔

ہم نے چلنا چاہا تو کرشن جی نے کہا: "پھر کسی دن تم سب ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ۔" سلمیٰ بھابی سے پوچھا: "انھیں کب

بلائیں ۔ ؟"

میں نے کہا کل ہم لوگ مجروح بھائی کے ہاں مدعو ہیں ۔

" پھر — پرسوں — پرسوں ٹھیک ہے "

" جی ہاں پرسوں ہم ضرور آئیں گے ۔ انشاء اللہ !

تیسرے دن ہم سب کرشن جی کے ہاں گئے ۔ میں نے احسن سے کہا کہ کرشن جی ابھی بیماری سے اُٹھے ہیں انہیں زیادہ باتیں نہیں کرنی چاہئیں اس لئے ہم لوگ ذرا دیر سے چلیں گے ۔ ہم کوئی ساڑھے سات بجے کے قریب وہاں پہنچے ۔

سلمیٰ بھابی اور کرشن جی کا جوڑا اتنا خوب صورت ہے کہ یہ لگتا ہے کہ قدرت نے اپنے ہاتھ سے یہ جوڑا بنایا ہے ۔

کرشن جی نے اس دن بہت سی باتیں کیں ۔ وہ بیماری میں بھی اردو کانفرنس کی فکر مول لئے بیٹھے تھے ۔ اُردو کے ادیبوں کے مسائل !

کرشن جی نے بتایا کہ بینکوں کو قومی ملکیت میں لینے پر ہم نے بھی اندرا گاندھی کو مبارک باد کا تار دیا ہے اور اس طرف توجہ دلائی ہے کہ اب زمینوں کی باری بھی جلدی آنا چاہیے ۔ پھر انہوں نے کہا کہ " یہ کام بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا ۔ انھوں نے کہا کہ ترقی کی جانب جب بھی قدم آگے بڑھتا ہے رجعت پسند طاقتیں فوراً بلوے شروع کرا دیتی ہیں ۔ ہندو مسلم بلوے شروع ہوتے ہی وہ آگے بڑھتا ہوا قدم رک جاتا ہے اور یہ لڑائی جھگڑے اہم قومی کاموں کی توجہ ہٹا لیتے ہیں ۔ اور یہی رجعت پسند طاقتوں کا مفاد ہے ۔" کرشن جی نے یہ باتیں اس وقت کہی تھیں جب فسادات شروع نہ ہوئے تھے ۔ مجھے بعد میں ان کی باتیں یاد آتی رہیں ۔

جن دنوں میں بمبئی میں تھی میں نے یوم مسجد اقصیٰ پر وہ شاندار جلوس دیکھا تھا جس میں سب مذہب اور ملتوں کے لوگ شامل تھے ۔ اور پھر میں نے وہ بھیانک باب بھی دیکھا تھا جو احمد آباد اور گجرات کے فسادات کا دردناک باب تھا ۔ مگر اس روز کرشن جی کی باتیں سن کر میرے دل میں یہ امید بندھی کہ یہ اندھیرا ایک نہ ایک دن ضرور چھٹ جائے گا ۔ سورج کو کون روک سکتا ہے ؟ اور انسانیت کا مستقبل روشن ہے ۔

سلمیٰ بھابی اپنے بھائی اور بہن کو تڑپ تڑپ کر یاد کرنے لگیں ۔ انہوں نے دکھ سے کہا " مجھے اپنی بہن کے گھر جانا اور وہاں پانی کا ایک گلاس پینا بھی نصیب نہیں ہوا ۔" میں نے اس لمحہ زہرہ کی طرف دیکھا میرے دل میں بھی یہ حسرت تھی کہ زہرہ میرے گھر نہ آ سکی ۔ کاش وہ دن آ سکے جب ہم آزادی سے ایک دوسرے کے گھر آ اور جا سکیں خدا جانے دونوں ملکوں کے تعلقات کبھی اچھے ہوں گے یا نہیں ؟

پھر کھانا لگ گیا ۔ کھانے پر سلمیٰ بھابی نے بہت زیادہ اہتمام کیا تھا ۔ انہوں نے کہا " اتفاق سے آج کل ہمارے پاس ایک بہت اچھا باورچی بھی ہے اور اس لئے مجھے باورچی خانے میں زیادہ نہیں جانا پڑتا ۔"

انہوں نے سب کو پلیٹیں دیں اور خود تھال اٹھا لیا ۔ میں نے کہا آپ تھال میں کھاتی ہیں ۔ ہنس کر بولیں " اس لئے کہ کرشن جی اکیلا پن نہ محسوس کریں ۔" پھر کہا " نہیں دراصل سچی بات یہ ہے کہ مجھے ہندوؤں کا کلچر اتنا پسند تھا ۔ اور کلچر کی اس تبدیلی کے بجائے

مجھے پتہ چلا کہ یہ شخص اندر سے مسلمان ہے۔ سخت مولوی۔ اور میں مولویوں سے تنگ آئی ہوئی تھی۔ مگر یہ تو سخت مولوی ہے۔ پاکستانی ہیں اور اس لیے میں تھال میں کھانا کھاتی ہوں۔"

میں نے دل میں سوچا کہ اکیس برس پہلے جب میں نے کرشن جی کے راکھی باندھی تھی تو میں نے بھی ان کے واسطے سے رنگوں کی پھوار اور دیوالی کے جلتے ہوئے دیپ دیکھنے کی آرزو کی تھی مگر مجھے بھی یہ محسوس ہوا تھا کہ کرشن جی اندر سے مسلمان ہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ وہ نہ ہندو ہیں نہ مسلمان وہ تو بس انسان ہیں اور سب مصلحتوں کا فرق مٹا کر ان کو ایمان کا [illegible]

سلمیٰ بھابی کا بیٹا ماشاء اللہ بہت ذہین اور پیارا ہے۔ میرے بیٹے سے اس کی فوراً دوستی ہو گئی اور وہ دونوں گھومنے نکل گئے جب ہم نے چلنے کا ارادہ کیا تو پتہ چلا کہ دونوں غائب ہیں۔

جب وہ دونوں لوٹے تو ہم نے اجازت چاہی اور پھر آنے کا وعدہ کیا مگر میرا ویزا نہ بڑھ سکا اور مجھے دوسرے ہی دن بھوپال روانہ ہونا پڑا۔ بہت سے لوگوں سے ملاقات نہ ہو سکی۔ مہندر بھیا سے ملاقات نہ ہو سکنے کا خاص طور پر افسوس رہا۔ عصمت آپا اور قرۃ العین حیدر سے کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر مل آئی تھی۔ ان سے بھی دوبارہ ملنے کی آرزو رہ گئی۔

بھوپال جاتے ہی ہمارا ویزا ایک ماہ کے لیے بڑھ گیا۔ ایک ماہ بھوپال گزار کر میں تزئین اور طارق کو ساتھ لے کر بمبئی آ گئی۔ احسن کو ان کے گھر والوں نے روک لیا اور مجھے اپنی امی کے پاس رہنا نصیب نہ ہوا تھا میں چند روز اپنی امی بہن بھائیوں کے ساتھ گزارنا چاہتی تھی۔

بمبئی کے دوران قیام عارف کی شادی طے پا گئی اور اس سلسلہ میں بھاگ دوڑ کی وجہ سے مجھے کرشن جی کے گھر جانے کا موقعہ نہ مل سکا ایک دن میں اور زہرہ شادی کا بلاوا دینے گئے وقت بہت کم تھا اس لیے ہم دونوں زبانی ہی سب کو بلا رہے تھے۔ کرشن جی کے گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ سلمیٰ بھابی کہیں گئی ہوئی ہیں۔ کرشن جی آرام کر رہے تھے۔ میں نے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ وہ گہری نیند سو رہے تھے۔ میں نے آہستہ سے دروازہ بند کیا۔ اور پھر قدموں کی چاپ کیے بغیر ہم باہر آ گئے۔ ان کے سیکرٹری صاحب ان کی اردو میں لکھی ہوئی ناول کو دیوناگری رسم الخط میں لکھ رہے تھے۔ میں نے سلمیٰ بھابی کے نام رقعہ لکھ کر سیکرٹری صاحب کو دیا۔

راستے میں سلمیٰ بھابی مل گئیں انہوں نے اندر چلنے اور بیٹھنے پر اصرار کیا مگر ہم بہت جلدی میں تھے شادی کا بلاوا ہمیں مجروح بھائی اور جاں نثار اختر کے ہاں بھی جانا تھا۔ میں نے کہا کہ کسی دن اطمینان سے آؤں گی اور پھر جی بھر کر باتیں [illegible] مگر افسوس اس کے بعد سلمیٰ بھابی اور کرشن جی سے ملاقات نہ ہو سکی۔ بھاگ دوڑ میں وقت ہی نہ ملا۔ بلکہ امی سے بھی اطمینان سے باتیں کرنے کی حسرت دل میں رہ گئی۔ زہرہ سے بھی بس دوڑتے بھاگتے بات چیت ہو سکی۔ جب ہم دونوں بس میں بیٹھتے ہوتے تو ہم سب کچھ بھول کر دو منٹ پہلے سے بے نیاز ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے اور باتیں کرنے لگتے [illegible] دیکھتا اس لیے کہ ہمیں ریزگاری واپس لینے سے کوئی دلچسپی نہ ہوتی تھی۔ کیو میں کھڑے ہوئے لوگ دیکھتے کہ بس آ [illegible] کیوں نہیں ہماری وجہ سے پوری قطار رک جاتی تھی۔ ایک دن ایک کنڈکٹر بولا "آپ لوگ آپس میں گھر جا کر [illegible]

اتنی دیر سے آپ کے سامنے یہ ساریاں لئے کھڑا ہوں خدا کے لئے پسند کر لیجیے"۔ ہم اس روز بھائی کی بہو کا سامان خرید رہے تھے۔ ہم اسے کیا بتلاتے کہ ہم چودہ برس بعد تو ملے ہیں اور اب دو روز بعد اتنے ہی سالوں کے لئے یا اس سے بھی بڑا جدائی کا پہاڑ ہمارے درمیان کھڑا ہو جائے گا۔ مگر یہ چند لمحے ہی تو ہمارے اپنے ہیں!

میں جس دن ممبئی سے رخصت ہوئی وہ دیوالی کا دن تھا۔ سارا ممبئی روشنی کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا۔ روانگی سے پہلے میرا کرشن جی اور سلمیٰ بھابی سے ملنے کو بھی بہت جی چاہا مگر افسوس کہ یہ ممکن نہ ہو سکا۔

ٹرین چلنے کو ہوئی تو سب بہن بھائی نیچے اتر گئے۔ زہرہ بولی "آپا میں تو اگلے اسٹیشن کا ٹکٹ لے لیتی ہوں ہم ایک گھنٹہ اور ساتھ گذار سکتے ہیں!"

میں نے کہا: "نہیں — جان اب تم اتر جاؤ۔ آخر تو مجھے جانا ہی ہے اور پھر تم اکیلی خدا جانے کس اسٹیشن پر اترو گی تو مجھے فکر رہے گی۔ میں تمہیں سب بہن بھائیوں کے ساتھ رخصت کرنا چاہتی ہوں" وہ آنکھوں میں آنسو لئے اتر گئی۔

جب تک اسٹیشن نظر آتا رہا ان سب کے چہرے دکھائی دیتے رہے جہاں تک انسانی طاقت ساتھ دے سکتی تھی وہ سب دوڑتے رہے۔ میرا بیٹا اور بیٹی چلتی ریل میں دروازوں سے لٹکے ہوئے تھے۔ میں نے دونوں کو بڑی مشکل سے اوپر کھینچا۔ جب میں نے ڈبے میں سوار مسافروں سے اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کی تو مجھے محسوس ہوا کہ آنسو تو اور آنکھوں میں بھی تھے۔

سفر میں تا حدِ نظر میری آنکھوں کے سامنے روشنیاں جھلمل کرتی رہیں۔ روشنیاں ہی روشنیاں — ایسا چراغاں میں نے زندگی میں پہلے نہیں دیکھا تھا۔ کبھی نہ ختم ہونے والا چراغاں۔ ممبئی سے بھوپال تک کا وہ سفر روشنی کا سفر بن گیا۔

پھر مجھے وہ سب روشن دمکتے چہرے معلوم ہوئے۔ امی کا چہرہ — زہرہ کا چہرہ — راشد، جاوید، عارف اور ناہید طلعت کے چہرے! کرشن جی کا چہرہ — سلمیٰ بھابی کا چہرہ —!

دیوالی کی روشنی نے میرے دل میں اُمید کا دِیا روشن کر دیا۔ میں نے سوچا ہماری سرحدیں ایک دن محبت کی سرحدیں بن جائیں گی۔ دیوالی کی روشنیوں نے اس رات کا اندھیرا ختم کر دیا تھا!

بھوک پریت

جوگندر پال

ٹھہرو برادر۔

ٹھہر گیا برادر۔

اپنی داستان کو آگے بڑھانے سے پہلے مجھے تھوڑا سا رو لینے دو۔

تھوڑا سا کیوں برادر؟ خوب خوش ہو کے رو لو۔

نہیں برادر، خوب خوش ہو کے روتا چلا گیا تو تمہیں اپنی داستان بھول جائے گی۔

ہاں، داستان بھول گئی تو میرے پاس سنانے کو کیا رہے گا؟

لیکن تمہاری داستان ایسے طربیہ مقام پر آ پہنچی ہے برادر، کہ میرے آنسو تھمنے میں نہیں آ رہے۔

ہاں برادر، خوشی کے موقع پر جو تھوڑا سا رو لیتا ہے اُس کا دکھ بھی ہنستا بستا رہتا ہے۔

نہیں، اتنی عاقبت اندیشی سے کام لو گے تو اپنی عاقبت کو خواہ مخواہ بگاڑ لو گے۔

وہ تو بگڑ ہی چکی ہے برادر۔

پوری داستان سناؤ برادر، داستان کا اختتام تو تم پہلے بھی بتا چکے ہو۔

ہاں۔ جب ساری داستان پیش آ چکے تو اُسے سنانا ہی باقی رہ جاتا ہے —— تو پھر یہ ہوا برادر، کہ شہزادی نے میرے گلے میں اپنی باہیں حمائل کر دیں۔ خدام نے حکومت کا تخت اپنی جگہ سے اٹھا کر وہیں ہمارے پیچھے لا رکھا اور اُس تخت پر نیم دراز ہو کر محبت کرنے لگے ——

ٹھہرو برادر۔

ٹھہر گیا برادر۔

مجھے رونا آ رہا ہے کہ میرے ساتھ بھی یہ سب کچھ پیش کیوں نہ آیا۔

روتے ہو برادر، نہ داستان کو آگے بڑھنے دیتے ہو۔

تمہاری داستان تو وہاں آ ہی پہنچی ہے جہاں اسے پہنچنا ہے —— لو بھوکے ہو تو کھجور کھا لو۔

بڑے مزے کی کھجور ہے برادر۔

ہاں، یہ لو یہ پانی بھی پی لو۔

بڑا میٹھا پانی ہے برادر ——— اب اپنی داستان آگے بڑھاتا ہوں۔

وہ تو یہاں آ ہی پہنچی ہے۔

کہاں؟

اس صحرا میں، جہاں ہم بیٹھے ہوئے ہیں۔

ہاں برادر، ٹھہرو مجھے بھی ذرا رو لینے دو۔

تم یہاں اپنی شہزادی کی گود میں سر دھر لو اور میں یہاں تمہاری ہی گود میں سر دھر کر بساط بھر رو لیتا ہوں۔

ٹھہرو برادر، پہلے مجھے آرام سے اپنا سر کہیں ٹکا لینے دو، پھر تم میری گود میں اپنی جگہ بنا لو.... لیکن ——— یہ کیا برادر، تمہارے وہی نہیں۔

ہاں! — ارے ہاں! ——— میری گود برادر؟

اپنی ساری داستان یاد کرو برادر ——— یاد کرو، تمہاری گود کہاں رہ گئی؟

اور کہاں رہتی؟ وہیں حکومت کے تخت پر شہزادی کے سر کے نیچے۔

اور تم اُسے بڑے آرام سے وہیں بھول آئے!

ہاں، بھول تو آیا برادر! شہزادی کے بال اتنے گھنے تھے کہ وہاں سے اٹھتے ہوئے کہیں دکھائی ہی نہ دی۔

یہ تو بہت برا ہوا برادر۔

ہاں، برا تو ہوا برادر۔

اب ایک ہی چارہ ہے: شہزادی کو ڈھونڈو، ورنہ تمہاری گود ہی نہ رہی تو جی کر کیا کرو گے؟

بس جی لوں گا برادر۔

پر جیو گے بھی کیسے؟

ہاں، جیوں گا بھی کیسے؟

جینا ہے تو پہلے اپنی گود کو ڈھونڈو۔

کہاں ڈھونڈوں، برادر؟

حکومت کے تخت پر!

حکومت کے طلسمی تخت کی طرف جو بھی بڑھتا ہے برادر، تخت اُسے واپس اچھال دیتا ہے۔

تو پھر اُن خدام کو ڈھونڈو، کہ تخت تمہاری پشت پر ڈال جائیں۔

وہ خدام تو شہزادی کے محل میں ہیں۔

اور شہزادی کا محل؟

میرے خیال میں، برادر۔

اور تمہارا خیال، برادر؟

میرے پاس ہی ہے پر پتہ نہیں کہاں ہے۔

تمہارے پاس ہی ہے برادر، تو تمہارے پاس ہی ہوگا۔

پتہ ہی نہیں کہاں ہے برادر، تو کیا پتہ، کہاں ہوگا؟

ٹھہرو برادر،

ٹھہر گیا برادر۔

اگر تمہارا خیال بھی تم سے کھو گیا ہے تو پھر کیا فکر، کہ تم نے کیا کیا کھویا ہے؟

ہاں برادر، تمہاری بات لگتی تو ٹھیک ہے۔

تو پھر مزے سے اپنی داستان کو آگے بڑھاؤ۔

آگے کیسے بڑھاؤں برادر، اُسے تو جہاں پہنچنا تھا، پہنچ لی۔

ہاں، اِس صحرا میں۔

ہاں برادر، اب ایک یہی ممکن ہے کہ پیچھے جا کے پھر یہاں تک آ جاؤں۔

ہاں، یہاں سے آگے کی کیا خبر؟

ہاں برادر، جو کچھ ابھی پیش ہی نہیں آیا اُس کی کیسے خبر؟

ٹھہرو برادر۔

ٹھہر گیا برادر۔

مجھے خبر ہے کہ آگے جا کے ہمارے ساتھ کیا پیش آئے گا۔

کیا پیش آئے گا۔ برادر؟

ہم اِس صحرا سے نکلنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔

تو پھر آؤ برادر، آگے ہی چلیں۔

نہیں برادر، تم پیچھے جاؤ کہ تم پیچھے سے ہی آئے ہو۔

اور تم برادر؟

میں کہیں سے بھی نہیں آیا برادر، اِس لئے چلتا ہوں اپنے آگے کہیں بھی جا پہنچوں گا۔

کیا تمھیں اجنبیوں سے خوف محسوس نہ ہوگا؟

نہیں برادر، میں کسی سے بھی مانوس نہیں ہوں، اِس لئے مجھے کوئی بھی اجنبی معلوم نہیں ہوتا۔

تو پھر چلو برادر، ہم ایک دوسرے کی طرف پیٹھ موڑ کے اپنے اپنے سفر پہ تیز گام روانہ ہو جائیں۔

ہاں چلو ——

ٹھہرو برادر۔

ٹھہر گیا برادر۔

تم کہاں سے ہوتے آ رہے ہو؟

شہزادی کے محل سے۔

تعجب ہے!

نہیں برادر، اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ میرا منہ غلطی سے ادھر گھوم گیا اور تمہارا اُدھر۔

لیکن میں بھی شہزادی کے محل سے ہی ہو کر آ رہا ہوں۔

تعجب ہے!

نہیں برادر! اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ یہ راستہ بھی شہزادی کے محل کو ہی جاتا ہوگا۔

ہاں، جاتا تو ہوگا برادر، نہیں تو تم وہاں کیسے جا پہنچتے؟

ہاں، سبھی راستے شہزادی کے محل کو ہی جاتے ہیں۔

ہاں، وہ راستے بھی جن پر ابھی ہمارا جانا نہیں ہوا۔

ہاں کسی بھی راستے پر نکل پڑو، وہیں جا پہنچو گے۔

ہاں برادر، کسی بھی راستے سے لوٹ آؤ۔

ہاں برادر، لیکن لوٹ ضرور آؤ۔

ہاں، ورنہ بچھڑ جاؤ گے۔

نہیں، ابھی تو لوٹے ہیں، ابھی بچھڑنے کا ذکر مت چھیڑو۔

ہاں، بچھڑنے کا ذکر چھیڑ دیں گے تو ملیں گے کیسے؟

ہاں برادر، ملن کا ذکر چھیڑو —— کیا تم میری شہزادی سے مل آئے ہو؟

مل تو آیا ہوں برادر ——

ٹھہرو برادر۔

ٹھہر گیا برادر۔

پہلے مجھے بتاؤ ——

نہیں۔ پہلے میری سنو برادر —— تمہاری گود میں شہزادی کے بالوں کے نیچے دبی ہوئی پڑی تھی۔ میں نے چپکے سے اُسے اٹھا لیا جاتے جاتے اپنی گود میں بھول آیا۔

بت تیرے کی! ـــ تو پھر میں تمہاری ہی گود کو اپنی سمجھ کے اٹھا لایا ہوں۔

میری ہی گود میں پڑے ہو برادر، اسی لئے مجھے اتنے اچھے لگ رہے ہو۔

اور تم مجھے، برادر۔

اور ایک دوسرے کی گود میں پڑے پڑے ہم یہاں جنت میں آ پہنچے ہیں۔

ہاں برادر، نخلستان اپنے ہزار قدموں سے چل کر خود آپ یہاں آ پہنچا ہے۔

اور خدام نے ہمارے پیچھے حکومت کا تخت ڈال دیا ہے۔

نہیں برادر، پیچھے مڑ کر نہیں دیکھو، ورنہ یہ طلسمی تخت تمہیں واپس اچھال دے گا۔

ہاں، ہم اپنے خیال سے اچھل آئے برادر، تو کسی کام کے نہ رہیں گے۔

اچھل بھی آتے تو کیا مضائقہ ہے برادر۔

ہاں، اپنے خیال سے اچھل کر باہر آ گئے تو نفع کیا اور نقصان کیا؟

نفع اور نقصان کو چھوڑو برادر، یہ لو یہ کھجور کھاؤ۔

بڑے مزے کی کھجور ہے برادر۔

ہاں، یہ لو یہ پانی پیو۔

بڑا میٹھا پانی ہے برادر۔

ہاں ـــ اب سو جاؤ۔

بڑی نیند آ رہی ہے برادر۔

ٹھہرو برادر۔

ٹھہر گیا برادر

اگر ہم سو گئے تو ہمیں جگائے گا کون؟

جو سلاتا ہے وہی جگا بھی دیتا ہے۔

تو آؤ، سو جائیں۔

ہاں برادر، سو جائیں۔

کیا تم سو گئے ہو برادر؟

نہیں برادر، شہزادی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔

لیکن مجھے تو لگ رہا ہے کہ سو رہے ہو۔

ہاں برادر، شہزادی کے بال اتنے گہرے ہیں کہ نیند میں اترنے کا احساس ہوتا ہے۔

ہاں برادر، اور پہرا اتنا شفاف کہ نیند میں ڈوب کر بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ابھی سطح کے نیچے نہیں گئے ہیں۔
ہاں، ہم خواب میں بھی اُسے دیکھتے رہتے ہیں۔
ہاں، اور وہ ہمیں۔
ہاں، ہم سو جاتے ہیں تو ہماری قسمت جاگ پڑتی ہے۔
ہاں، ہماری خوابیدگی میں چاند سے بن برسنے لگتا ہے۔
تو آؤ برادر، چپکے سے سو جائیں۔
ہاں آؤ ——— نہیں، اُدھر نہیں برادر، اِدھر آؤ۔
ہاں، اُدھر تو نیند ابھی جاگ رہی ہے۔
ہاں، جاگ رہی ہے تو چوروں کو اپنے اندر کیوں کر گھسنے دے گی؟
ٹھہرو برادر۔
ٹھہر گیا برادر۔
بھوک نے پھر میرے کلیجے میں ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا ہے۔
لو برادر، کھجور کھاؤ، ورنہ بھوک تمہارا کلیجہ کھائے گی۔
بڑے مزے کی کھجور ہے برادر۔
یہ لو یہ پانی بھی پی لو۔
بڑا میٹھا پانی ہے برادر۔
ہاں، اب سو جاؤ۔
ہاں، اب تو آنکھوں کے کواڑ اپنے آپ بند ہو رہے ہیں۔
ہاں، وقت آ گیا ہے برادر، اب چپکے سے نیند کے باطن میں داخل ہو جاؤ۔
لیکن کواڑ بند ہو گئے برادر، تو باہر کیسے نکلو گے؟
لیکن برادر، اندر داخل ہی نہ ہوئے تو باہر کیسے نکلو گے؟
ہاں ——— تو شب بخیر برادر! ——— میں چلتا ہوں۔
ہاں، جاؤ۔
ہاں، چلتا ہوں۔
پھر آ گئے برادر، گئے بھی نہیں کہ پلٹ آئے ہو۔
خدا کا شکر ادا کرو برادر، کہ پلٹ آیا ہوں، نہیں تو پل ہی میں ہزاروں کوس کی مسافت طے کر کے کون پلٹتا ہے؟

ہاں! خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ لوٹ آئے ہو، مگر برادر گئے کہاں تھے؟

کہیں نہیں برادر، بس شہزادی کی رفاقت میں حکومت کے تخت پر ہوا میں پرواز کرتا رہا، اور پرواز کر رہا تھا کہ اچانک تمہاری آوازیں سنائی دیں اور تمہیں کوس کوس کر اس طرح تخت سے نیچے قدم رکھا جیسے ابھی زمین پر ہی تھا۔

لیکن تم تھے تو ہوا میں ہی۔

ہاں، اور کہاں؟

تو اچھا ہی ہوا برادر، کہ زمین پر لوٹ آئے۔ خدا نے ہمیں پر عطا نہیں کئے تو اُس کی رضا یہی ہے کہ ہم دھرتی پر پڑے رہیں۔

پر دھرتی پر نیند نہیں آتی برادر۔

ہاں، یا آتی ہے تو یہی خوف لاحق رہتا ہے کہ اب آنکھیں نہیں کھولیں گے۔

ٹھہرو برادر۔

ٹھہر گیا برادر۔

بھوک مجھے پھر تنگ کر رہی ہے۔

تو کیا ہوا برادر، لو یہ کھجور کھالو۔

بڑے مزے کی کھجور ہے برادر۔

لو پانی بھی پی لو۔

بڑا میٹھا پانی ہے برادر۔

پیٹ بھر گیا ہے تو اپنی شہزادی کی داستان شروع کر دو برادر۔

شہزادی کی داستان شروع کر دوں؟

ہاں برادر۔

اگر مجھے اجازت دو برادر، تو حرف بحرف سچائی بیان کر دوں۔

ہاں برادر، خدا کا فرمان ہے کہ ہمیشہ سچ بولو۔

تو سچی بات یہ ہے برادر، کہ اپنی خوشی کے لئے میں نے ہمیشہ جھوٹ بولا ہے۔

اسی لئے خدا نے تمہیں اس بے کراں صحرا میں دھکیل دیا ہے۔

ہاں برادر، اور تمہیں بھی۔

ہاں مجھے بھی، برادر —— لو اور کھجور کھالو، بھوک سے دیوانے ہوئے جا رہے ہو۔

ریت کی اس مٹھی کو پرے ہٹاؤ برادر —— اور مجھے سو جانے دو۔

ہاں برادر، آنکھ لگ کر نہ بھی کھلی تو کون سی کھجور آ جائے گی؟

مار گزیدہ

سائرہ ہاشمی

ڈاکٹر زاہد سے بات کرنے سے پہلے مجھے احساس کی اس شدت کا گمان تک بھی نہ تھا۔ میں تو بس یونہی مینٹل ہاسپٹل چلا آیا تھا۔

میرے ذہن کے اس خوابیدہ گوشے کو رات راحیلہ کی دہکتی قربت نے جگایا تھا اور پھر برسوں پہلے کا ایک عریاں جسم مجھے یاد آ گیا تھا۔ ایک نادر مجسمہ جو آنکھیں بند کئے میرے سامنے کھڑا تھا۔ لیکن سفر کا وہ ایک قدم میرے لئے کرشے کوس بن گیا تھا اور میں نے گھبرا کر اپنی آنکھوں کو بند کر لیا تھا۔ اور ندرت کو اپنے گھر سے چلے جانے کو کہا تھا۔ اُس کی خوب صورت آنکھیں حیرانی اور شرم سے پھیل گئی تھیں۔ اُس کے آنسو اُس کی گالوں پر بہنے لگے تھے۔ اُس کے ہونٹ کپکپا کر ساکت ہو گئے تھے۔ میں نے بند آنکھوں سے ہی چیخ کر کہا تھا "چلی جاؤ ندرت، چلی جاؤ۔ مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔ مجھے تمہاری کوئی خواہش نہیں۔ میں تم سے محبت نہیں کرتا۔ دوبارہ یہاں نہ آنا۔" اور پھر وہ چلی گئی۔ اور جب اُس کے بھاگتے قدموں کی چاپ ڈوب گئی تو میں یوں تنہا رہ گیا تھا۔ جیسے اِس لمحے سے پہلے اور بعد میں کوئی لمحہ اتنا زندہ نہیں تھا۔ وہ لمحہ جو اپنی تخلیق کی ساعت میں قید ہو گیا تھا۔

اکثر جب میں جام کو ہاتھ میں لئے پینے لگتا ہوں یا اپنے کمرے کی نیم تاریک روشنی میں کسی دوشیزہ سے بہت ہی خوب صورت باتیں کرتا ہوں تو وہ لمحہ کہیں نہ کہیں سے آ کر میرے سامنے ٹھہر جاتا ہے۔ پھر میرے ہاتھ ایک لمحہ کے لئے کانپ جاتے ہیں اور ٹھنڈک کی تکلیف دہ لہر مجھے ہراساں کر دیتی ہے۔ حالانکہ ندرت سے میں نے انتقام لیا تھا۔

ایسی ہی لہر میں نے رات محسوس کی تھی جب راحیلہ کے کمرے میں بیٹھ کر میں نے آنے والے دل پسند لمحوں کی دھند سے راحیلہ کو جھانکا تھا۔ اور پھر وہی لمحہ کہیں سے آن کر میرے ذہن پہ رقصاں ہو گیا۔ میں گھبرا کر بغیر معذرت کئے۔ یا خدا حافظ کہے، انٹر کانٹی نینٹل کے لمبے کاریڈار سے بھاگتا باہر آ گیا تھا۔ وہ لمحہ جو ندرت کی مانند ہی بے ضرر تھا لیکن انوکھا، میری دسترس سے دُور اور پرے۔ میری مضبوط گرفت میں نہ آنے والا۔

اُس روز مسز رفاقت نے فون پر کہا تھا "مائی سویٹ بوائے، راحیلہ گھریلو کرائسس سے بہت گھبرائی ہوئی اور پریشان ہے۔ اس لئے اس کو بہلانے کے لئے میں نے چند قریبی دوستوں کو مدعو کیا ہے۔ ضرور آنا۔"

اور جب میں نے انٹر کون کا گیٹ عبور کیا ہے تو میں آنے والے وقت کی خوب صورتی سے دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔ رعنائی مے۔ خوبصورت ماحول۔ جواں جسم اور پھر بے باک قہقہے۔ انٹر کون کی خوبصورت عمارت پوری طرح روشنیوں کی نہائی تھی لیکن کمروں میں کہیں کہیں جلتے لیمپ۔ ایسے لگ رہے تھے جیسے کوئی چھپی آنکھوں سے اشارہ کر رہا ہو۔ بلا رہا ہو۔

درختوں کے نیچے یو۔ بی۔ ایل کے روشن نیون سائن بورڈ تھے۔ اور سرخ لائٹس میں لکھا ہوا ہوٹل کا نام اس طرح لگ رہا تھا جیسے تازہ خون کی سرخی منجمد ہو گئی ہو۔ درختوں کی شاخوں میں اُلجھا ہوا اور میٹھا میٹھا اندھیرا تھا۔ اور درختوں کے اوپر اندھیرے کا دبیز ہالہ تھا۔ اپنی گاڑی کو لاک کرتے ہوئے میں ایک بہت ہی ماڈرن دُھن گنگنا رہا تھا۔ جب بار میں گیا ہوں تو بیرا ٹرے میں بوتل اور گلاس رکھے لے جا رہا تھا۔

مجھے دیکھ کر مسز رفاقت نے کہا تھا۔

یونانی بوائے تم ہمیشہ دیر سے آتے ہو۔ راحیلہ تمہارا انتظار کرتے کرتے بور ہو رہی ہے۔

میں نے جھک کر مسز رفاقت کی گال پہ ایک بھرپور بوسہ لیا تھا۔ اور راحیلہ کے پاس بیٹھ گیا تھا۔

راحیلہ نے جب میرا ہاتھ پکڑا تو وہ بہت ٹھنڈی ہو رہی تھی۔

اسلم صاحب۔ آپ وقت کی اہمیت سے بالکل غافل لگتے ہیں۔ بہت انتظار کروایا۔ راحیلہ نے برف کی ڈلی میرے گلاس میں ڈالتے ہوئے مسکرا کر مجھے دیکھا تھا۔

میں ہنس دیا تھا اور زمرد کو دیکھنے لگا تھا جو گلاس کو پکڑے پاؤں سے تال دیتی سوچوں میں گم تھی۔ اُس نے خالی گلاس زور سے تپائی پر رکھا اور کھڑی ہو گئی۔

میوزک کے خوابناک لہریے دل کو دھڑکاتے ہوئے ہمارے چاروں طرف پھیل رہے تھے۔ جیسے کوئی خوب صورت روح اس ہال کی چار دیواری سے اُڑ کر فضائے بسیط میں گم ہونا چاہتی ہو۔ اونچی۔ بہت اونچی۔ بہت دور۔ نیلے آسمان کی پہنائیوں سے بھی پرے۔ ہال پر موجود سب لوگ خوش تھے۔ ہمارے پاس خوب صورت جسموں کی گرمی تھی۔ اور پھر ہم سب جو ایک دوسرے سے اجنبی اجنبی سے لگ رہے تھے۔ ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔

میں نے اٹھ کر زمرد کے خوب صورت جسم کے گرد اپنے بازو ڈال دیے اور تیز سروں کا ساتھ دیتے ہوئے تھرکنے لگے تھے۔ راحیلہ نے اپنی آنکھیں بند کر کے سر کو صوفے کی پشت پہ رکھا ہوا تھا۔ اور مسز رفاقت فخر الدین کے ساتھ لگی بیٹھی پی رہی تھیں۔ ہم سب آگے پیچھے گھومتے جا رہے تھے۔

زمرد جی آپ کا جسم واقعی ڈانس کے لیے بنا ہے۔ اگر آپ ڈانس نہ کریں تو یہ آپ کے ساتھ بڑی زیادتی ہو۔ آپ کو بازوؤں میں لے کر محسوس ہوتا ہے کہ جسم کا گداز اور لوچ کیا معنی رکھتا ہے۔

اُس نے جھٹکے سے اپنے آپ کو مجھ سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

تم جانتے ہو کہ عورت کو کیسے خوش کیا جاتا ہے۔ اسی لیے تم مجھے اچھے بھی لگتے ہو۔ لیکن میں خوش ہونے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ مجھے کئی دنوں سے کوئی کنٹریکٹ نہیں ملا۔ اس لیے چپ چاپ ناچتے جاؤ۔ اُس نے کاؤنٹر کے پاس جا کر نیا گلاس اُٹھایا اور میرے کندھے کے ساتھ سر لگا دیا۔

اور جب میں اپنے آپ سے خوش خوب صورت جسم کی لذت سے مسحور ہو رہا تھا تو مجھے قدرت کی حیران اور روتی ہوئی آنکھیں

ار کے چاروں طرف سے جھانکتی نظر آنے لگیں۔ اور میرے بازو زمرد کے جسم کے ساتھ لگے اکڑے گئے تھے۔ اُس محرومی سے خوفزدہ سے جو نُدرت کی یاد سے وابستہ تھی۔ میں نے زمرد کو اپنے اور بھی نزدیک کر لیا تھا۔ میں اِس جسم سے لگا اُس جسم کو یاد نہیں کرنا چاہتا تھا جو کبھی بھی پوری طرح میری گرفت میں نہیں آیا تھا اور جس کی یاد مجھے اُس پیاسے کی یاد دلاتی تھی جو انتہائی تشنہ لبوں تب پہنچ سکا ہو۔ وہ جسم ایسا ہی تو پیمانہ تھا۔ وہ ایسا نہیں تو محو تھا۔ اور پھر میں خوفزدہ ہو کر زمرد کی تپش کے باوجود سرد ہو گیا تھا۔

یہ آنکھیں...... یہ آنکھیں مجھ سے کس بات کا انتقام لینا چاہتی ہیں۔ میں نے اپنے آپ سے پوچھا تھا۔

اور زمرد کہہ رہی تھی "وہ پروڈیوسر کا بچہ ابھی تک نہیں آیا۔ اُسے اب تک آ جانا چاہیے تھا۔"

اور مسز رفاقت کہہ رہی تھیں "بے بی میں تمہاری بے چینی سمجھتی ہوں تم فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اور جب سمٹتے تال کے ساتھ میں راحیلہ کے پاس بیٹھا ہوں تو میں نے گندی باتوں کو اپنے ذہن سے پوری طرح جھٹک دیا تھا۔ میں ندرت کے بارے میں تو کم از کم کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو ایسا ورق تھا جس پر میں اپنے حسب مرضی کوئی تحریر نہیں لکھ سکا تھا۔ میں تو اُسے ایسا صفحہ سمجھنا چاہتا تھا جو ہوا کی تیزی میں اُڑتا کہیں گم ہو گیا ہو۔ بغیر کوئی سوچ چھوڑے لیکن کس رات نے اُس ماحول میں گھرا میں اُس کی پھڑپھڑاہٹ کو سن رہا تھا۔ میں نے راحیلہ کے اُداس چہرے کو دیکھ کر کہا تھا۔

"راحیلہ ان خوب صورت لمحوں کو یُوں ضائع کیوں کر رہی ہو۔ کیا یہ سب خوب صورتیاں اور مسرتیں تمہارے دل کو خوش نہیں کر سکتیں۔ میں نے بظاہر یہ لفظ راحیلہ سے کہے تھے لیکن میں اپنے دل کے اندر اُس برف کی سل کو پگھلانا چاہتا تھا جو ندرت کی آنکھوں کے تصور سے میرے اندر اُتر آئی تھی۔ وہ مجھے کیوں یاد آ رہی تھی؟

راحیلہ نے میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ سامنے روشنی کے مدھم گلوب کو دیکھ رہی تھی اور جب میں نے جھک کر اُس کی آنکھوں میں جھانکا تو اس کی آنکھیں نم آلود تھیں۔ نُدرت کی آنکھیں...... ندرت کی آنکھیں۔ نہیں تو... نہیں تو۔

"اسلم صاحب ایسی عورت کیسے خوش رہ سکتی ہے۔ جس کا شوہر اُس کو ٹھکرا چکا ہو۔ جس کا بچہ اس سے بچھڑ چکا ہو۔ جس کی زندگی کو لامتناہی اکیلے پن اور دکھ کا سامنا ہو۔ اُس نے گلاس کو پاس پڑی تپائی پر رکھ دیا اور اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنی گود میں رکھ کر خاموش ہو گئی۔

اُس کی گود میں پڑے دو ساکن ہاتھ مجھے اُن ہاتھوں کی یاد دلا رہے تھے جو نُدرت کے چہرے پر دھرے تھے۔ میں اُن ہاتھوں کو یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں اُس جسم کو یاد نہیں کرنا چاہتا تھا جس کی شدید خواہش کے باوجود میں نے اُسے چھوڑ دیا تھا۔ اُس وقت میں نے سوچا تھا۔ عورت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ سب عورتیں برابر ہی تو ہیں اور پھر میں نے اپنی انا کی اتنی بڑی قیمت وصول کی تھی۔ مجھے تو بہت خوش ہونا چاہیے تھا۔ پر نجانے کیا بات تھی کہ میں ندرت کے تصور کے ساتھ ہمیشہ خوفزدہ اور ٹھنڈا ہو جاتا ہوں۔ کیا میرا یہ گناہ دوسرے گناہوں سے مختلف اور انوکھا تھا۔ میں سوچنا چاہتا۔ لیکن میرا ذہن منجمد ہونے لگتا اور میں گھبرا کر کسی بہت ہی ضروری کام میں اپنے آپ کو لگا کر اُسے بھول جانے کی کوشش کرتا۔ اُس جسم کے بارے میں میں

کیوں سوچتا جاتا تھا جو پوری طرح میری انگلیوں کی پوروں سے مَس بھی نہیں ہُوا تھا۔ وہاں بیٹھے مجھے فاروق یاد آ گیا۔

چند دنوں بعد میرے دوست فاروق نے آ کر کہا تھا "معلوم ہے دوست ندرت کا کیا حال ہے؟"

میں نے کبھی کبھار اُس کے متعلق سوچا تو تھا۔ لیکن میں اُس کی یاد کی کسی گرفت میں قید نہیں تھا۔ شکست کو یاد رکھنا شکست خوردگی کی نشانی ہے۔

"کیوں کیا ہُوا اُسے؟" میں نے اپنے آفس میں بیٹھے ہوئے اُن آخری ساعتوں کو یاد کیا تھا اور مسکرا کر فاروق سے پوچھا تھا۔

"وہ پاگل ہو گئی ہے اور زنجیروں میں بندھی اپنے سر کو چاروں طرف ٹیکتی ہوئی کہتی رہتی ہے" روشنی بند کر دو۔ روشنی بند کر دو۔ کیا تم دیکھ نہیں سکتے کہ میں عُریاں ہوں۔ میں کتنی عُریاں ہوں۔ اور تم یوں بے تعلقی سے کھڑے میرا تماشا دیکھ رہے ہو۔ سب روشنیاں گل کر دو۔ اندھیرے میں روح کے گھاؤ نظر نہیں آتے۔ اندھیرا تو ایسا نقاب ہے جو سب کچھ چھپا لیتا ہے۔' اور پھر وہ چیخ چیخ کے رونا شروع کر دیتی ہے۔ اور اپنے دونوں ہاتھوں کو چہرے پر رکھ لیتی ہے۔ شاید اس کو اپنی دونوں بند آنکھوں کا اندھیرا مطمئن کر دیتا ہے۔ اور پھر وہ اپنی ساکت آنکھوں سے چپ چاپ اپنے سامنے دیکھنے لگتی ہے اور دیکھے ہی چلی جاتی ہے۔ اور پھر جانتے ہو کیا ہوتا ہے۔ ندرت کی امّی اس کی ساکت آنکھوں پر پیار کرتے ہوئے کہتی ہیں۔

میری بچی۔ دیکھو میری طرف دیکھو۔ اپنی ماں کو دیکھو میری ندرت ..... اور ندرت بڑبڑانے لگتی ہے۔

"روشنی میں جسم عُریاں ہو جاتا ہے۔ روشنی بجھا دو۔ روشنی بجھا دو۔"

فاروق کی آواز کسی اندرونی غم سے بوجھل تھی۔

اور میں جوان گزشت لذتوں سے آشنا۔ اپنے گمان میں قید اس ساری بات کو ایک عام واقعہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا پسینے سے شرابور ہو گیا تھا۔ میں نے فاروق سے بہت کچھ پوچھنا چاہا تھا۔ لیکن میں تو ہنس بھی نہیں سکا تھا۔ حالانکہ میں نے زور زور سے قہقہے لگانے چاہے تھے۔ میں نے اپنی فتوحات کی لسٹ میں ایک اور جسم کا اضافہ کرنا چاہا تھا... لیکن میرا دل ساکن ہو گیا تھا۔ اور میں خالی خالی نظروں سے فاروق کو دیکھنے لگا تھا۔ ہم دونوں خاموش بیٹھے رہ گئے تھے۔

فاروق کے جانے کے بعد میں نے اپنے سامنے رکھی کھلی فائل کو آگے بڑھا کر پڑھنا چاہا تھا۔ جس کے لئے میرا پی اے کئی دفعہ آ چکا تھا لیکن میں ندرت کے ہیولے کو دیکھ رہا تھا۔

یوں تو درجنوں لڑکیوں کی منتیں سُنی تھیں۔ میں نے تو عورت کو ہمیشہ ہی ایک کھلونا سمجھا تھا۔ ایسا کھلونا جس کو پھینکا بھی جا سکتا ہو۔ میں نے محبت کے خوب صورت لفظوں کو خراج سمجھ کر لیا تھا۔ لیکن یہ کیا ہوا کہ اِس سب سے بڑے خراج کو وصول کرتے ہوئے میں بکھر کر رہ گیا تھا۔

پھر میں آفس ٹائم سے بہت پہلے ہی اُٹھ کر گھر آ گیا۔ میں نے سر جھٹک کر اُس تکلیف دہ سوچ کو اپنے ذہن سے نکالنے کی کوشش کی تھی۔ اُس ہنسی کو بھولنا چاہا تھا جو ندرت کے لبوں سے میں نے سُنی تھی۔ ان آنکھوں کی پُرکشش چمک کو مٹا دینا چاہا تھا جو میرے لاشعور میں نہ جانے یوں محفوظ ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا تھا" ندرت کیا تھی۔ ندرت تو کچھ بھی نہیں تھی۔ ندرت کا میرا

...اس میں کوئی حصہ نہیں تھا۔ اُن درجنوں عورتوں کی طرح جو صرف ایک رات کا ساتھ تھیں اور جن کو میں نے دوبارہ کبھی ملنے کی خواہش نہیں کی تھی۔“ پھر میں اپنے کمرے میں بیٹھا چُپ چاپ اُس کے متعلق سوچنے لگا۔ ندرت جو روشنی میں اپنا چہرہ نہیں دکھانا چاہتی۔ ندرت جو روشنی سے ڈر کر اپنا مُنہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیتی ہے۔ ندرت جو سراپا روشنی تھی اور میں نے اُس روشنی کو پانے کے لئے بڑی تگ و دو کی تھی اور ”آخر کار میں نے اُس روشنی کو گُل کر ہی دیا نا۔“ میں نے ہنس کر اپنے آپ کو خوش کرنا چاہا لیکن کوشش کے باوجود میں ہنس نہیں سکا تھا۔ میں اپنی انا کی جیکا چوند میں ہر اس سب کو شکست دینا چاہتا ہوں۔ کسی کے مجھ سے آگے بڑھے ہوئے دو قدم مجھے مشتعل کرنے کے لئے کافی ہیں۔ میں تو اپنے میں ہمیشہ ہی خوش رہا تھا۔ لیکن اُس روز اپنی انا کے اندھیرے سیاہ ... کو دیکھ رہا تھا۔

سگریٹوں کے ادھ جلے ٹکڑے میرے ایش ٹرے میں پڑے سُلگ رہے تھے۔ اور میرے دل پہ ایسا بوجھ تھا جو میری ... کے باوجود میرے سینے میں ہر لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ان تمام جسموں کی قطار میں صرف ایک چہرہ تھا۔ جس پہ دو ہاتھ دھرے ... بوجھل ہو گئی تھی۔ اُس بوجھل یاد کی طرح ”ندرت منصور علی۔ آخر میں تم سے شکست کھا ہی گیا۔“ میں نے جذباتی ہو کر بے بسی سے اپنے آپ سے کہا تھا۔ میں یادوں میں گُم ہو گیا تھا ..... ”اسلم صاحب بہت گہری سوچوں میں ہیں آپ۔“ ... نے اداس لہجے میں پوچھا تھا۔ اور میں نے چونک کر یوں اُسے دیکھا تھا جیسے کسی نے گہری نیند سے اچانک جگا دیا ... نے راحیلہ کے غمگین چہرے کو دیکھا۔ اُس کے چہرے کی اُداسی مجھے اور بھی اُداس کر گئی۔ میرے دل میں اُس وقت اُس ... نہ جانے کیوں رحم پیدا ہو رہا تھا۔ میں اُس کی آنکھوں میں آئے آنسو پونچھ دینا چاہتا تھا۔ حالانکہ عورت کے آنسو مجھے ہمیشہ ... دیتے ہیں۔ راحیلہ کو مسز رفاقت نے دُور سے دیکھ کر کہا تھا ”جاناں تمہارا گلاس ابھی تک خالی نہیں ہوا۔ اتنی سُستی ہی ... اپنے مہمانوں کو کس طرح زیادہ خوش کر سکتی ہو۔ دیکھو کتنی جاندار اور دلکش دھن بج رہی ہے۔ اُٹھو نا۔ اسلم بھی بور ہو رہا ہے ... تم۔ میرا دل نہیں چاہتا۔ راحیلہ کی آواز میں اُداسی اور اندرونی چھُپا غم تھا۔

”اٹھو بھئی۔ جوان لوگ جب یوں سُست ہو جائیں تو ہم بوڑھے لوگ تو بالکل ہی رُٹ جائیں گے۔ کیوں ٹھیک ہے نا ... “ مسز رفاقت نے اُس کی طرف اپنا گلاس لہراتے ہوئے پوچھا تھا۔

”تمہارا گلاس خالی کیوں ہے اسلم بیٹے۔ ایسی دلنشین راتوں میں خالی گلاس کو ہاتھ میں تھامے رکھنا بہت بڑی ... ہے۔“

میں مسز رفاقت کو دیکھ کر مُسکرایا تھا اور پھر راحیلہ کا اُداس چہرہ مجھے اور بھی اُداس نظر آنے لگا۔ وہ بھی یادوں کے ... بھری تھی اور میں بھی چُپ چاپ بیٹھا تھا۔

”راحیلہ تمہارا بیٹا کتنا بڑا ہے؟“ میں نے بے خیالی میں ہی پوچھ لیا تھا۔ مجھے محسوس ہُوا تھا جیسے وہ اُن گذرے لمحوں کو یاد ... جو اُس نے ایک مرد کے ساتھ گذارے تھے۔ وہ اپنے بیٹے کے اُن نرم نرم گیلے بوسوں کو یاد کر رہی ہو جو معصوم ہونٹوں سے ... چہرے پہ ثبت کئے گئے تھے۔

"میرا بیٹا۔ اُس کی غمگین آنکھوں میں خوشی کی روشنی صرف ایک لمحہ کے لئے ہوئی تھی۔ دوسرے لمحے وہ جوت بجھ گئی تھی ٹمٹماتے دیئے کی مانند۔ یا دکی تُند ہوا سے۔

میرا بیٹا . . . . میرا بیٹا چھ سال کا ہے۔ وہ بہت ہی خوب صورت ہے۔ اس کی آنکھوں میں ماتا کی گرمی کی تپش تھی اور آنکھیں ماضی میں دیکھ رہی تھیں۔

ماضی تو کوئی حقیقت نہیں۔ بس لذتوں کے وہ لمحے ہیں جو ایک زنجیر کی صورت حال سے مستقبل میں بدلتے رہتے ہیں میرے لئے تو بس حال کا زمانہ ہی زندہ ہوتا ہے جس میں آئینے میں کھڑا اپنے آپ کو دیکھتا اور پوری طمانیت کے ساتھ مسکراتا ہوں اور میرے لبوں میں سگریٹ کا دھواں آنے والی لذتوں سے مخمور ہو کر یوں لگتا کہ فضا میں غائب ہو جاتا ہے۔ ندرت منصور ہی کو حاصل کرنے کی تگ و دو میں میرے اندر کبھی وہ جوش پیدا نہیں ہوا تھا جو دلشی اور صرف پاکیزہ اور الوہی خوشی ہوتا ہے دوسروں کے زندہ اور جاندار جذبوں کی میرے نزدیک کوئی وقعت نہیں اور یہ عورت جو میرے نزدیک لذت حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ ندرت کو میں اتنا کیسے سمجھ سکتا تھا۔ بات تو یہ ہے کہ میں نے کبھی عورت کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ میرے نزدیک اُس کی ذات میں ایسی تو کوئی الجھی ہوئی بات ہی نہیں تھی جو بہت مشکل ہو۔ پھر بھی میں نہ جانے کیوں ماضی کی گندی باتوں کے متعلق سوچ رہا تھا۔ حالانکہ راحیلہ کا گداز جسم میرے ساتھ تھرک رہا تھا۔

"وقت سب سے بڑا مرہم ہے راحیلہ ڈیئر۔ چھوڑو اُن باتوں کا ماتم جو تم کو دھوکہ دے گئیں۔ جب تک تم پورے دل سے ہنس سکتی ہو۔ تم وقت کو مات دے سکتی ہو۔ میں نے اُس کے سرد ہاتھ کو تھام لیا تھا۔ میں اپنی لگاتار آتی یادوں سے پریشان ہو اٹھا تھا۔ میں اور راحیلہ مدہم روشنی کی گود میں بیٹھے تھے۔ ہمارے خالی گلاسوں کو بیرا نئے سرے سے بھر گیا تھا۔ اور جب جاز کے تیز پُر شور ریدو سر ہمارے کانوں سے ٹکرائے تو سب لوگوں نے اپنے ہاتھ تیزی سے گلاسوں کی طرف بڑھا دیئے تھے۔ ہم دونوں نے بھی اپنے گلاسوں کو اٹھا لیا تھا۔

راحیلہ نے کہا تھا۔ "اسلم صاحب میں ہمیشہ خوش رہتی ہوں لیکن گذری یادیں بعض اوقات ایسے ابھر آتی ہیں جیسے زندگیوں کے بند دروازوں سے سائے۔ اور یہ عمر کی زندہ دلی۔ ان کی دعوتیں۔ پارٹیاں اور زینت سے لوگوں کی محفلیں میں نہیں رہ سکتی اسلم صاحب۔ اس نے میرا ہاتھ زور سے دبایا تھا۔ میں تم کی بڑی شکر گذار ہوں۔ وہ میرا بہت خیال کرو اور پھر جب ہم دونوں تال کی لہروں پر تیر رہے تھے تو مجھے ایسا لگا۔ جیسے میرا وجود ہلکا پھلکا ہو کر دھند میں اڑ رہا ہو۔ پاس کسی اور انجانی ہستی کا بھی وجود ہو۔ جو کہہ رہا ہو۔

"اسلم۔ عورت تو ازل سے حوا ہے اور سانپ کے ورغلانے میں ہمیشہ ہی آجاتی ہے۔ اپنی حفاظت سے نکل کر جادو کے پھندے میں پھنس جاتی ہے۔ عورت محبت کے زہر کو ہنس کر پیتی ہے اور جانتے ہوئے بھی اپنے آپ کو ... کر دیتی ہے۔" یہ آواز کس کی ہے . . . . . . میں نے سُروں کی دھند سے اِدھر اُدھر جھانکتے ہوئے اپنے آپ سے پوچھا۔ راحیلہ میرے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا تھا اور مجھے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ اُسے مسکراتے دیکھ کر مجھے ندرت کی ہنسی یاد آ رہی تھی۔ ندرت

ہاسپٹل کے گرد آلود فرش پر بیٹھی خلاؤں میں دیکھتی رہتی ہوگی۔ اور پھر جیسے چوڑے میدانوں میں اڑتی گرد اور تپش سے گھبرا کر ن ذہن موٹی سلاخوں سے لگی دوسری عورتوں کو دیکھتے دیکھتے اپنے دن گذار دیتی ہوگی۔۔ مجھے ندرت کو اپنے ذہن سے جھٹک دینا چاہیے۔ لیکن میں بے بس تھا۔ فاروق ندرت کے بھائی کا دوست تھا۔ ایک روز اس نے آکر کہا تھا۔

دوست۔ عورت بھی کتنی نازک سی چیز ہے۔ ٹوٹ گئی تو ٹوٹ گئی۔ کوشش کے باوجود بھی نہیں جڑتی۔ میں نے اس سے ... بارے میں پوچھنا چاہا تھا۔ میں نے اس کی بربادی سے لذت لینی چاہی تھی۔ میں تو کب کا احساس گناہ کے اس بوجھ سے ... سے ہی چھٹکارا حاصل کر چکا تھا جو پہلی بار مجھے محسوس ہوا تھا، لیکن میرے اندر سے کوئی چیز ابھی خوش نہیں تھی۔ میں خارج ... دائرہ منتظر رہا تھا اور فاروق نے کہا تھا۔

مجھے کبھی کبھی ندرت کی بے بسی پر بڑا غصہ آتا ہے۔ بھلا ندرت کو کس بات کی سزا ملی۔ اس سے کس بات کا انتقام لیا گیا۔ ... ہاسپٹل میں جانے سے پہلے اس کا گھر میں بھی علاج کرنے کی کوشش کی گئی...... لیکن اس کی ذہنی حالت اور بھی بدتر ہوگئی۔ ... کمروں میں گھومتی ساری بہنوں کے سویٹ آنٹ کرتی رہتی تھی۔ اور پھر اپنے کمرے میں جاکر اپنے ہاتھ چہرے پر رکھ لیتی۔ ... تو اس کی توجیہ عجیب ہی انداز میں کرتا تھا۔ وہ سارا خاندان تو بہت صحت مند جسمانی کا مالک ہے۔ ان کے ہاں ... اور بے جا حیا۔ دونوں کو ہی دخل نہیں.... کیا تم اس بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟

... آنکھوں میں لکھے گئے سوال کو پڑھ کر میں نے بہت کچھ بتانا چاہا تھا۔ ان لڑکیوں کے تصور کی مانند جو میری مردانگی ... نہ چھوٹیں..... عورتوں کی رسوائی میرے لیے کوئی نئے معنی نہیں رکھتی تھی۔ لیکن پھر بھی میں ندرت کے بارے میں ... کے اس رسوائی کو آگے نہیں بڑھانا چاہتا تھا جو ندرت کی بیماری سے لوگوں کے ذہنوں میں پیدا کر دی تھی ... فاروق زبردستی مجھے باغ جناح میں لے آیا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کے ذہن پر کوئی بوجھ تھا۔ جیسے ...... اس کی آنکھوں میں اداسی کے سائے سے تھے۔ فاروق اور میں ایک نسبتاً اداس کنج میں پھر رہے ... لوگوں کا ہجوم تھا۔ غمگین چہرے، تھکے چہرے۔ اداس چہرے۔ سب آپس میں گڈمڈ تھے۔ وہاں پر ہنسی کا ... سہے جا رہی تھی۔ اور فاروق کی معیت میں میرے اندر احساس گناہ بھی تھا۔ جو میری فطرت کے ... سے چھٹکارا پانے کی خواہش پر بھی نہیں پا رہا تھا۔ میں کس چیز پر نادم ہو رہا تھا...... میرا کون سا ... اپنے آپ سے پوچھا تھا.... اور ندرت کا وجود ان لانبے درختوں کے درمیان کسی صلیب پر لٹکا ... سامنے جھول گیا....... میں مداوا کرنا چاہوں بھی تو کس چیز کا مداوا کروں.... اور مداوا میرے بس میں کب ... زندگی کے ہنگاموں سے تھک کر میں رات کے پچھلے پہر آکر اپنے کمرے میں بستر پر لیٹتا ایک جسم اندھیرے ... میری بند آنکھوں کے سامنے ٹھہر جاتا اور پھر میں درجنوں ہی ادھ جلی سگریٹوں کا ڈھیر لگا دیتا۔ اور تھک کر ... دھندلے شیشوں پر ملگجی روشنی کے دائرے سے ان کر شیشوں کے پھولوں کو داغ کر دیتے۔ اور نوکر آکر بیڈ ٹی ... صاف کرنے کے لئے لے جاتا اور سہما سہما میرے کمرے کی بے ترتیبی کو درست کرتا رہتا۔ الله پھولوں کو ...

جاتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر مجھے معلوم ہوتا کہ رات گذر گئی ہے۔ لمبی سیاہ رات۔

میری یادوں میں ندرت کا بس اتنا ہی تو حصہ تھا۔ اور وہ ندرت جو مینٹل ہاسپٹل کی سلاخوں سے لگی کھڑی تھی، اُس کا تو خیال بھی مجھے شدت سے نہیں آتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں تو اُس کے بعد بھی کئی لڑکیوں سے ملا تھا۔ وہ کوئی اکیلی تو نہیں تھی۔ یہ کیا بات تھی کہ اس کی یاد کے ساتھ شکست اور محرومی کی کسک مجھے پریشان کر دیتی۔ وہ کسک کیا تھی؟ ندرت کو نیچا دکھا دینے کی جلن یا میرے اندر کوئی اور بھی جذبہ تھا جو دوسروں سے الگ تھا۔ تب میرا ذہن بوجھل سا ہو جاتا اور ساری سوچیں گردش کی مانند میری کنپٹیوں کو گرما دیتیں۔ میں خاموش دیوان پر لیٹا خالی ذہن سا ہو جاتا اور پھر الجھا ہوا سا آفس میں چلا جاتا۔ کسی خوب صورت آواز والی ٹیلی فون مجھے ساری رات کی تھکاوٹ سے نجات دلاتا لگتا۔ میں زیر لب سیٹی بجاتا۔ فائلوں کے اوراق الٹتا۔ ۔ ۔ ۔ سرسری نظر سے دیکھ کر دستخط کر دیتا اور پھر شام کے خیال سے خوش ہو کر زور سے سگریٹ کا کش لے کر دھواں اڑاتا۔ اور اس کے ساتھ ہی رات کی تھکن دور ہو جاتی۔ لیکن اس روز وہاں پھرتے ہوئے میں فاروق کو کیا بتاتا۔ یہ اپنی فتوحات کے قصے کہہ سکتا تھا۔ لیکن میں نے تو ہمیشہ ندرت سے شکست کھائی ہے اور اس شکست کو فتح میں بدلنے کے لئے میں نے جو راہ چنی وہ بھی مجھے دھوکا دے گئی۔

اُس دن سکندر حیات کے گھر دعوت تھی۔ مخلوط پارٹی کی اس گہما گہمی میں میں نے ندرت کو دیکھا تھا۔ وہ فاروق کی بہن کے پاس کھڑی باتیں کر رہی تھی اور میں کوشش کے باوجود اپنی توجہ کسی اور طرف مبذول نہ کر سکا۔ میں اس کو دیکھ رہا تھا۔ جو حسین نہیں تھی لیکن اُس کے چہرے پر ایک انوکھی موہنی تھی۔ اُس کی ہنسی میں انوکھا سا ترنم تھا۔ میرے سب طرف خوب صورت چہرے تھے اور پھر مجھے عورتوں کی توجہ حاصل کرنے کے لئے کبھی بھی زیادہ تگ و دو نہیں کرنی پڑی۔ یہ میرا دل اُس کو دیکھ کر [illegible] سے دھڑکا تھا۔

”ڈیم سر“ میں نے اپنے آپ سے کہا تھا اور ان کے پاس پڑے میز سے گلاس اٹھانے کے لئے چل پڑا۔ بڑے سے مخملی لان میں شیشم کے درختوں کی اوٹ سے چاند جھانک رہا تھا اور تیز روشنی میں پھولوں کے رنگ اور بھی اچھے لگ رہے تھے۔ درختوں کے پرے سرمئی بادلوں کا رنگ تھا اور میرے سب طرف ہنسی کا جلترنگ تھا اور ندرت کا چہرہ تھا جو سب سے دلکش نظر آ رہا تھا۔

سکندر حیات میرے پاس آیا۔ اُس نے میرے انہماک کو دیکھ کر کہا تھا۔

’یار کیا بات ہے۔ چلو تعارف کروا دوں‘ وہ مجھے اُن کے پاس لے گیا۔

’بھئی یہ میرے دوست اسلم ہیں۔ اور یہ ہیں ندرت اور یہ ہیں پنکی رحمان۔ اپنے نام کی مناسبت سے بھی زیادہ گلابی پنکی رحمان نے مجھے سلام کیا اور ندرت کا ماتھے تک گیا ہاتھ ایک ساعت کو رکا اور پھر وہ بڑی لاپرواہی سے نیچے جھک گئی تھی۔ اس کے خوبصورت ہونٹوں پر ہنسی سی تھی۔ وہ میرا وہم تھا اور پھر۔ میں نے اپنی تمام صلاحیتیں مرعوب کرنے میں لگا دی تھیں۔ لیکن وہ لاپرواہ اور لاتعلق سی کھڑی رہی تھی۔ اُس نے ایک دفعہ بھی میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ پنکی رحمان کی ہنسی کے جلترنگ میں میں ایک اور آواز سننے کی خواہش میں وہاں کھڑا بے سروپا باتیں کرنے لگا تھا

...بہت سی فتوحات میں ایک مغرور شہنشاہ کی مانند گھرا رہتا تھا۔ ایک دم اُداس ہو گیا تھا۔ مجھے لگا جیسے نُدرت کہہ رہی ہو۔
"کیوں اس قدر اُچھل کود کر رہے ہو۔ میں ایسی ٹہنی تو نہیں جس کو تم جھکا کر توڑ سکو۔"

"دیکھا جائے گا۔" میں نے اپنے آپ کو سمجھایا تھا۔ میں جو زندگی کی تمام شیرینیوں سے شرابور رہنا جانتا تھا۔ اس ایک وقتی شکست سے کیسے بچ سکتا تھا۔ میں جو دوستوں میں اپنی کامیابیوں کا ذکر بڑے فخر سے کرتا تھا۔ یوں ایک دم ہراساں ہونے والا تو نہیں تھا۔ پر نُدرت کی لاپرواہی نے میرے غرور کے تناور پودے کو مرجھا سا دیا تھا۔ نُدرت کا بے نیازی کا انداز ...یت تانہ یانہ تھا۔ ایک چیلنج تھا۔ جس کو میں نے اُس کی آنکھوں میں دیکھا تھا اور مان لیا تھا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے درختوں کے مٹیالے اندھیرے کے پیچھے چاند کے روشن چہرے کو دیکھا اور پھر اُس ...ن کو چھپانے کے لیے دوسرے لوگوں میں شامل ہو کر زور زور سے قہقہے لگانے لگا تھا۔

اُس وقت اگر نُدرت کو میں ایک دفعہ بھی اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا لیتا تو شاید وہ سب کچھ نہ ہوتا۔ جو بعد میں ہُوا۔ میرے ...کے زہر نے نُدرت کی زندگی کو ڈس لیا۔ فاروق سے باتیں کرتے میں چُپ ہو کر سوچنے لگتا۔ اور جب وہ اپنے بھائی کے ساتھ جانے لگی تو میری روح کھنچ کر میری دو آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔ صرف ایک خواہش کے لئے۔ کتنا اچھا ہو اگر نُدرت جاتے ہوئے صرف ایک دفعہ ہی میری طرف دیکھ لے تو میں اپنے اندر اکٹھے ہونے زہر کو ہنس کر مٹا دوں۔ لیکن گاڑی کے ...ٹ سے اُس کا صرف تھوڑا سا چہرہ نظر آیا تھا اور پھر اُن کی گاڑی لمبی سیاہ سڑک کے موڑ پر مڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

میں چپ چاپ کھڑا چاند کے نیچے جمع ہوتے سفید بادلوں کو دیکھتا رہا تھا۔
سکندر حیات نے کہا تھا۔
"کہو دوست اُداس کیوں ہو......؟"

تمھیں معلوم ہے اُداسی جیسے لفظ کا میری زندگی میں کوئی دخل نہیں اور میں نے ایک زوردار قہقہہ لگانے کی کوشش کی تھی ...س قہقے کے کھوکھلے پن سے ڈر کر میں نے جلدی سے انھیں خدا حافظ کہا اور پوری رفتار سے اپنی گاڑی کو سٹارٹ کیا تھا اور ...ٹر بریک کی تیز آواز دور تک گونج گئی تھی۔

اور پھر باغِ جناح میں اُس روز میں اور فاروق رات گئے تک گپیں ہانکنے کی کوشش میں رہے تھے۔ فاروق مجھ سے کچھ ...جھنا چاہتا تھا۔ لیکن میرے پاس بتانے کے لئے کوئی ایسی بات نہ تھی جو مجھ پہ اپنے فخر کو ظاہر کر سکتی۔ اور میں رنگ و نور کے طوفان میں اپنے اندر سمٹ گیا تھا...... یہ سوچیں...... یہ اندھیرے۔

راحیلہ کے سر کا بوجھ میرے کندھے پر تھا اور پھر راحیلہ نے کہا تھا۔
"اسلم صاحب آپ میرے شوہر سے بہت مشابہت رکھتے ہیں۔" راحیلہ میرے اور قریب آگئی تھی۔
"میرے لئے خوشی کی بات ہے راحیلہ ڈیئر۔" میں نے اُس کے کان میں سرگوشی کی۔

"راحیلہ بیٹی تھک تو نہیں گئی ہو۔" مسز رفاقت اپنے مہمانوں کو الوداع کہہ رہی تھیں۔

"مم ڈیئر آپ میرا کس قدر خیال رکھتی ہیں۔" راحیلہ نے ان کے پاس جا کر کہا تھا۔

"مائی بے بی۔ یو آر مائی لائف۔ خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔"

فخرالدین نے اپنی ٹائی درست کرتے ہوئے کہا تھا۔ "بے بی تمہاری ماں تو بہت ونڈر فل ہیں۔ ایسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔"

زمرد نے اکتائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ "مسٹر فخرالدین آپ اور پیجئے۔ ابھی آپ ہوش میں ہیں۔ کوئی بہت تیز سا تاکہ آپ کو ہماری رفاقت آنٹی ہی ونڈر فل نہ لگیں۔ بلکہ ساری دنیا ہی ونڈر فل ہو جائے۔"

"شریر لڑکی۔ پروڈیوسر کے نہ آنے سے اتنی دل برداشتہ ہو گئی ہو کہو تو میں تمہیں دو ہزار ماہانہ پہ نوکر رکھ لوں۔ چلو تم میرے ساتھ۔" فخرالدین نے مسز رفاقت کے کندھے پہ اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے ہنس کر کہا تھا۔

"میں ابھی جوان ہوں اور اتنی مایوس بھی نہیں۔ شکریہ میں بوڑھے لوگوں کو پسند نہیں کرتی۔" اور اس نے زور سے تپائی کو ٹھوکر ماری تھی۔ "یہ پروڈیوسر کا بچہ۔ سؤر کی اولاد کہیں اور منہ کالا کر رہا ہو گا۔"

"ٹچ۔۔۔ ٹچ۔ اتنی مایوسی۔ میری آفر اب بھی موجود ہے۔" اور فخرالدین نے زور کا قہقہہ لگایا۔

زمرد اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پہ غصہ تھا۔ "آنٹی اب میں چلوں گی۔" اس نے راحیلہ کے پاس آ کر مجھے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ اور مسز رفاقت نے اس کی پیشانی کو چوم کر کہا تھا۔

"میں موجود ہوں۔ فکر کیوں کرتی ہو۔ میری پہنچ سے کوئی بھی باہر نہیں۔"

"ذرا مجھے گاڑی تک تو چھوڑ آؤ۔" اس نے زبردستی میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ جاتے ہوئے میں نے راحیلہ کو دیکھا وہ اپنی ماں کے پاس بالکل خاموش کھڑی تھی اور مدہم روشنی میں بالکل ہی بے جان لگ رہی تھی، اس کی ساڑھی کے جھلملاتے ستارے چمک رہے تھے۔ پر اس کی آنکھوں کی جوت بجھی ہوئی تھی۔ باقی لوگ تھکے ہوئے لگ رہے تھے۔ جیسے وہ سب لوگ وقت کے سحر میں قید حقیقت کی تلخیوں سے آنکھیں چرائے اس جگہ اکٹھے تھے لیکن پھر بھی ایک دوسرے سے دور اور نا

زمرد نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔ "میرے ساتھ چلو۔ آج میں بہت ہی اداس ہوں۔ اور اکیلی بھی۔"

"پھر کبھی سہی۔" میں نے سیاہ آسمان کو دیکھتے ہوئے جواب دیا تھا۔ آسمان مجھے راحیلہ کی مانند لگ رہا تھا چمکیلا لیکن اداس

ایک اداس غمگین عورت کو قابو کرنا نسبتاً زیادہ آسان ہوتا ہے۔ اور میں تو بہت سے تجربات کر چکا تھا۔

"تمہاری مرضی۔" اس نے پورے زور سے پٹ کو بند کیا تھا اور جب میں نے مسکرا کر اسے خدا حافظ کہنے کے لئے ہاتھ ہلایا تو اس کی گاڑی گیٹ کو پار کر چکی تھی۔ مجھے کس بات کی جلدی تھی مجھے اپنی طاقت کا احساس تھا۔ "زمرد کو کبھی نہ کبھی میری کشش کھینچ ہی لائے گی۔" میں نے راحیلہ کے غمگین چہرے کے متعلق سوچتے ہوئے اپنے آپ سے کہا تھا مجھے دوسروں کے غمزدہ چہروں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میں تو زندگی کو ایک گیند سمجھ کر اپنے آگے آگے بھگاتا چلا آیا تھا۔

اور جب ہم تھکے قدموں سے چل رہے تھے تو راحیلہ نے کہا تھا۔

"بہت دکھی ہوں اسلم صاحب"۔ ہوٹل کے لمبے کاریڈار میں اندھیرا سا تھا۔ دُور کسی بلب کی دھیمی روشنی تھی۔ کسی اور ... پر کوئی دروازہ بند ہوا تھا۔ کہیں تھکی ہوئی قدموں کی چاپ تھی۔۔۔ حرکت مکمل طور پر ٹھہری ہوئی لگ رہی تھی۔

رات بہت گزر گئی ہے راحیلہ۔ اب تمہیں آرام کرنا چاہیے۔ لیکن وہ ایک معصوم بچے کی مانند میرے ساتھ تک اپنے کمرے ... دروازے پر کھڑی تھی۔ پھر اس کی سسکیوں کی ہلکی سی آواز لمبے کاریڈار میں پھیل گئی۔ میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ میرا دل کسی انجانے ... خدشے سے دھڑک رہا تھا۔

راحیلہ چُپ چاپ مسہری پر بیٹھ گئی۔ وہ میری طرف دیکھ نہیں رہی تھی۔ سائڈ ٹیبل پر اس کے بیٹے کی تصویر رکھی تھی۔ اس نے اس کو اٹھایا آہستہ سے چوما اور پھر الٹ کر رکھ دیا۔

کمرے کا خوابگوں ماحول مجھ پر جادو کر رہا تھا یا میری رگوں میں سارے شراب کی تیزی تھی جو میں نے اپنے اندر انڈیل لی ... پھر اور بھی کچھ تھا۔

راحیلہ نے مجھے بیٹھنے کو نہیں کہا تھا۔ میرے قدم قالین کی زمین میں گڑے ہوئے تک رہے تھے۔

"رات تھوڑی ہی باقی ہے۔" میں نے ٹیبل لیمپ کو جلا کر گھڑی کے ڈائل کو دیکھا تھا۔

"رات تو کبھی ختم نہیں ہوتی۔ رات کا تو کوئی کنارا نہیں مجھے ڈر لگ رہا ہے اسلم صاحب۔ مت جائیے۔ مت جائیے"

راحیلہ نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا تھا۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا تھا اور کوئی تسلی بھرا لفظ کہنا چاہتا تھا۔ میں راحیلہ کے سانس کی باگ کو اپنے ہاتھ میں لے کر اُسے اپنی مرضی کے مطابق موڑنا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا میرا جذبہ وقتی ہے۔ اور صبح جب میں ... دنیا میں شامل ہو جاؤں گا تو میرے ذہن سے سب کچھ مٹ جائے گا اور میں بڑے مطمئن انداز سے سارے کام کروں گا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر روشنی کو گل کر دیا تھا۔ مکمل اندھیرے میں ہم دونوں بیٹھے تھے۔ باہر کی روشنیاں کمرے میں مدھم جال سا ... رہی تھیں۔

"اسلم صاحب! میں نے بارہا مر جانے کی خواہش کی ہے لیکن مَمّ ڈھال بن کر میرے سامنے کھڑی ہو جاتی ہیں"۔۔۔۔

میں اس کی کوئی بات نہیں سُن رہا تھا۔ اور روتے ہوئے ہوئے کانپ رہی تھی۔ وہ خوف یا خوشی تھی۔ میں نے اس بارے میں ... نہیں چاہا تھا۔

میں بڑے سکون کے ساتھ سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھنا چاہا تھا لیکن پھر یکایک نہ جانے کیا ہوا کہ ندرت کا سراپا ... دم اُس مٹے مٹے اندھیرے میں ابھر آیا۔ اُس نے اپنے ہاتھ آنکھوں پر رکھے ہوئے تھے۔ اور اس کی پوروں کے درمیان سے ... بہہ رہے تھے۔

"آج ہی میں اِس اذیت میں کیوں گرفتار ہو گیا ہوں۔ ایسی اذیت جس کا تصور بھی میرے ذہن میں نہیں تھا۔

"راحیلہ مجھے معاف کرنا۔ اب میں جاؤں گا۔ میرا جی ٹھیک نہیں۔" میں نے پہلی دفعہ خوفزدہ ہو کر کہا تھا۔

راحیلہ یوں کھڑی ہو گئی تھی جیسے اُسے شدت کا غم اپنی گرفت میں لے رہا ہو۔ پھر ہم دونوں کچھ لمحے کھڑے رہے۔ جاتے ہوئے میں نے جھک کر اُس کے بیٹے کی تصویر کو سیدھا کر کے رکھتے ہوئے اُسے دیکھا۔ وہ اب بھی ساکت کھڑی تھی۔ ندرت کی طرح...

آج کی رات ندرت میری یادوں سے کیوں وابستہ ہو گئی ہے۔ کیا میں اُس کے انتقام کا شکار ہو رہا ہوں۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو اُس کے بارے میں سوچتا ہوا پا رہا تھا۔

تیز قدموں سے چلتا ہوا میں نیچے آیا تھا۔ لمبے کاریڈار میں میرے پیچھے سسکیاں سی گونج رہی تھیں یا شاید باہر لان میں تیز ہوا چل رہی تھی۔

جب میں لان میں آیا تو درختوں کے پار سے دھوپ کی گلابی جھلک رہی تھی اور ساری فضا پر اُداسی اور غنودگی چھائی ہوئی تھی۔

میں نے اکیلی سڑک پر گاڑی کی سپیڈ تیز کرتے ہوئے اپنے ذہن کو خالی کرنا چاہا تھا لیکن میرا ذہن اور دل پرانی یادوں سے بھاری ہو رہا تھا۔ . . یادیں جن کا ہر زاویہ ندرت کے چہرے میں ڈھل رہا تھا۔

میں اتنا مشتعل کیوں تھا۔ مجھے کن باتوں کا رنج تھا۔ میں نے تو ندرت کی ذات سے اپنے کسی دُکھ کو وابستہ نہیں سمجھا تھا۔ لیکن ندرت میرے حافظے کی سطح پر اُبھر رہی تھی۔ جیسے سیاہی کے پہلو سے روشنی کی خوابیدہ سی کرن جھانک رہی ہو۔

اُس روز اپنی کھڑکی میں کھڑے میرے ذہن پر مینٹل ہسپتال کی موٹی سلاخیں اُبھر رہی تھیں۔ جن کے پیچھے ندرت کا جسم قید تھا۔ ہاں . . . . . وہ وہاں قید تھی لیکن اُس کی روح تو تمام رنجشوں سے بالاتر تھی۔ میری یاد سے دُور۔ میرے دیئے ہوئے زخموں [illegible]!

میں نے ایک روز فاروق سے کہا تھا۔ "تم آخر ندرت کے معاملے میں اتنا تعلق کیوں محسوس کرتے ہو۔ مینٹل ہوسپٹل میں سبھی لوگ کسی نہ کسی وجہ سے ہی آتے ہیں۔"

تب فاروق نے دُکھ سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"دوست کبھی کبھار وہ لوگ جن کو ہم سرسری جانتے ہیں یوں ہمارے دل میں بیٹھ جاتے ہیں جیسے وہ ہمیشہ سے وہاں تھے اپنے سے قریب تر۔ میری داستان تو بہت لمبی نہیں اور اب کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اور سب سے زیادہ تم کو تو کوئی غم نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ باتیں میرے حافظے میں محفوظ ہیں۔ تم اُن کو کبھی یاد نہیں کر سکتے۔ تمھیں کبھی یاد نہیں آ سکتیں۔ تم اُن کو جانتے ہی کب ہو۔

میں نے پوچھا تھا۔ "تم میرے اور ندرت کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"

"صرف ایک لفظ کہ تم جو اُس کی بربادی کے ذمہ دار ہو اس قدر بے حس کیوں ہو۔ کبھی جی بھر کر اُس کی بربادی کا ماتم تو کر لیا ہوتا تاکہ اُس کے ساتھ کوئی انصاف ہو جاتا۔"

"میں کوئی الزام اپنے سر نہیں لے سکتا۔ اُس کا ذہن اُس کی بربادی کا سبب ہے۔ میں کیا کر سکتا تھا؟" میں فاروق کو کیسے سناتا کہ ندرت جو میری انا کی بھینٹ چڑھ گئی ہے میرے لئے ایک چیلنج تھی۔ اور میں نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا۔"

"دوست تمھیں الزام کون دے رہا ہے۔ میں تو بس بات کر رہا ہوں۔ میں تو اس دکھ کی داستان بھی تمھیں نہیں سنانا چاہتا تھا جو میری بہن نے روتی آنکھوں سے مجھے سنائی تھی لیکن تمہارا سویا ضمیر کسی طور جاگ جائے تو۔ اور تم اس کے لئے ماتم کرو جو تمہارے لئے برباد ہو گئی۔ ایسا نہ ہو جب تم اُس کے لئے ماتم کرنے کی خواہش کرو تو موت کے اندھیروں میں جا چکی ہو۔"

"کیا تم بھی ندرت سے محبت کرتے تھے؟" میں نے اُن کی باتوں کی کاٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا تھا۔ اس نے میز پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا اور طنز سے ہنس کر کہا تھا۔ اس "بھی" کا بھی کوئی جواب نہیں دوست میں تو اب بھی اُس سے محبت کرتا ہوں۔ کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا تمھیں۔ اور خاص طور پر اب اُس کے ٹوٹ ٹوٹ کر دکھ سے کپکپا رہے تھے۔

میں اُسے کیا جواب دے سکتا تھا۔

"زندگی میں بعض ایسی غلطیاں انسان سے سرزد ہو جاتی ہیں جن کا کوئی مداوا نہیں ہوتا۔ تم بھی ایک ایسی ہی غلطی ہو جو ندرت سے سرزد ہوئی اور اب تو وہ اس غلطی پر پچھتا بھی نہیں سکتی۔ اچھا ہی ہوا۔ اس کی آرزو زندہ ہوئی تھی؟" جانتے ہو چند روز پہلے میری بہن ثریا ندرت کی امی کے ساتھ اُسے ملنے ہاسپٹل گئی تھی۔ جانتے ہو وہاں پر اُس نے کیا دیکھا؟"

"بتاؤ۔ اگر یہ ساری بات اس کوشش میں ہے کہ مجھ پر کوئی الزام ثابت کر سکو تو یہ تمہاری بھول ہوگی۔" میں نے اُس وقت اپنے دل کو ہر قسم کی یادوں سے خالی پاتے ہوئے کہا تھا۔ میری آواز میں لاپرواہی تھی۔ میں گناہ کے احساس کا قائل ہی نہیں تھا۔

فاروق چپ بیٹھا رہا تھا جیسے کسی بہت ہی تلخ مزے کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"ندرت اور ثریا دوست تھیں۔" اُس نے بھاری آواز میں کہا تھا جیسے آنسوؤں کا ایک سیلاب ہو جو سر سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہا ہو۔

"ندرت کے ہاسپٹل جانے پر ثریا بہت روئی تھی۔ اور میں اُس سے کچھ پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں جو ندرت سے کوئی تعلق محسوس نہیں کرتا تھا۔ میں اپنے اندر کے چھپے جذبوں کو کیسے عیاں کرتا۔

مینٹل ہاسپٹل میں میٹرن کے کمرے میں بیٹھ کر ثریا نے سوچا تھا ندرت صاف ستھرے لباس میں کسی چارپائی پر خاموش اور اداس بیٹھی ہوئی خلاؤں میں تکتی۔ اندر پھول ہوں گے۔ گھاس کا سبزہ ہوگا۔ تتلیوں کے نگین پر ہوں گے۔ لیکن جانتے ہو وہاں کیا تھا۔ وہاں پر گرد آلود زمین کی برہنگی تھی۔ سورج کی روشنی میں تپتا آسمان تھا۔ بارکوں کے برآمدوں میں بیٹھی عورتیں تھیں۔ جن کی آنکھیں خالی تھیں۔ جن کے چہرے تمام جذبوں سے تہی تھے۔ جن کے ہاتھ ساکن تھے اُن کی آنکھیں آنے والوں کو دیکھتی تو تھیں لیکن اُن میں پہچان کی روشنی نہیں تھی۔ کسی کسی چہرے پر ہنسی تو تھی لیکن وہ ہنسی اس لئے نہیں تھی کہ وہ اپنے آپ کو پہچانتی ہیں۔

ثریا کا دم اُس کے سینے میں گھٹ رہا تھا اور وہ خوفزدہ سی ندرت کی امی کے ساتھ لگی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ ... ثریا کو لگا تھا جیسے یہ فاصلہ کئی میلوں پر محیط ہو گیا ہو۔ اُس نے بڑے بڑے درختوں کے گرد آلود پتوں کو دیکھا تھا اور اُسے لگا تھا جیسے سب

طرف ویرانی ہی ویرانی ہو۔ اتنے میں ایک سانولی سلونی سی پندرہ سولہ سالہ لڑکی نے آکر اُسے سلام کیا اور کہا۔

"سہیلی کیا تم میری شادی میں آئی ہو۔ پر میرے پاس تو صابن ہی نہیں۔ یہاں آرا جوڑا کر لے گئی اور پھر اوپر سے ناراض بھی ہوگئی ہے۔ میری میڈن جی آپ یہاں آسا کو ڈانٹیں گی نا؟"

میڈن نے اسے پیار سے کہا تھا۔ میں یہاں آرا سے تمہارا صابن واپس دلاؤں گی۔ وہ پگلی ثریا سے پھر کہنے لگی۔

"سہیلی تمہیں معلوم ہے بغیر صفائی کے بغیر انسان کہیں جا سکتا ہے۔ میں کپڑے دھوؤں گی۔ خوب صورت بنوں گی اور پھر اپنے سسرال جاؤں گی۔ ٹھیک بات ہے نا سہیلی؟" اور میری بہن کے گلے میں کوئی چیز اٹک گئی تھی۔ اس نے اپنے آنسوؤں کو بہنے سے بڑی مشکل سے روکا تھا۔

ندرت کی ماں نے اس کو اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ اور کہا تھا "بیٹی ایک دن تم ضرور دلہن بنو گی۔ تمہارا دولہا آئے گا۔ اور تمہیں ڈولی میں بٹھا کر لے جائے گا۔"

وہ ندرت کی ماں سے لگی ہنسنے لگی تھی۔ خوش ہو رہی تھی۔ اور میری بہن نے اس کے ڈھیلے قمیض اور پاجامے کو دیکھ کر سوچا تھا "کیا ندرت بھی ایسے ہی میلے لباس میں ہوگی۔ کیا اس کے بال ایسے ہی بے ترتیب اور الجھے ہوئے ہوں گے اور کیا وہ بھی ننگے پاؤں پھرتی رہتی ہوگی۔ اور اس کے چہرے پر ایسی ہی اپنے حالات سے بے خبر مسکراہٹ ہوگی۔ یہ سب کچھ سوچ کر اس کا دل بند ہو رہا تھا۔ پگلی کہہ رہی تھی۔

"میڈن جی مجھے صابن ضرور دلا دینا۔ کہیں مہمان آ جائیں اور میں گندی ہی بیٹھی رہوں" اور پھر اس نے ثریا کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

"میرے کپڑے دیکھو گی؟" میری بہن نے روتی آنکھوں سے سر ہلا دیا تھا۔ پھر پگلی نے چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی مختلف چیزیں نکالی تھیں۔ صابن کا چھوٹا سا ٹکڑا۔ ٹوٹے دندانوں والی کنگھی۔ موتیوں کا معمولی ہار اور پھٹے ہوئے گلابی کپڑے۔ وہ ہر چیز کو بہت پیار اور محبت سے دیکھ رہی تھی۔ اور میری بہن کا دل ایک بوجھ کی مانند اسے اپنے سینے میں چھپا ہوا لگ رہا تھا۔

ثریا اور ندرت کی ماں ایک بڑے سے پرانے پیپل کے درخت کے نیچے کھڑی تھیں۔ ثریا نے اپنے سامنے بیٹھی [illegible] عورتوں کو دیکھا جو [illegible] تھیں لیکن وہ سب چپ چاپ ایک دوسرے کے ساتھ لگی بڑی ترتیب سے بیٹھی ہوئی [illegible] کے [illegible] ہوتے تھے۔ ان کے کپڑے گرد آلود تھے۔ ان کے چہروں پر زندگی کی کوئی تازگی نہیں تھی [illegible] رہی تھی [illegible] ابھی تک نظر نہیں آئی تھی وہ ندرت کی ماں سے پوچھنے کی خواہش پر بھی نہیں پوچھ رہی تھی۔ [illegible] طرح [illegible] پیدا [illegible] وہ بھی ابھی اپنے ترتیب سے بنے بالوں کو بکھرا کر ان کے درمیان [illegible] چاپ بیٹھ جائے گی۔ اس نے ندرت کی ماں کا ہاتھ [illegible] سے پکڑ لیا تھا۔ وہ ندرت کا نام لیتے ہوئے بھی ڈر رہی تھی۔ وہ واپس [illegible] کو اس بیماروں [illegible] میں دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اُس ندرت کو ایسے یوں دیکھ بیٹھی جو اس [illegible]

پگلی نے پھر کہا تھا "سہیلی میں یہ ساری چیزیں سنبھال کر اس لئے رکھتی ہوں کہ کوئی چرا کر نہ لے جائے۔" [illegible] وہ اس پگلی کے پاس بیٹھ کر اس کی چیزوں کو ترتیب سے باندھ دے اور رکھے۔

دیکھو سہیلی انسان جن جذبوں کی، جن چیزوں کی زیادہ حفاظت کرتا ہے وہی چُرائی جاتی ہیں۔

میٹرن کا سفید بے داغ لباس اور سیاہ چھتری۔ اس تمام ماحول میں اُس کا پورا وجود ہی صرف ہوشمند دنیا کی نشانیاں تھیں ... احساس سے عاری عورتیں۔ گرد آلود پتے۔ مٹیالی زمین اور پارکوں کی سلاخوں کی ویرانی اور کرختگی ..... ان سب باتوں نے ... کے اندر ایک خوف پیدا کر دیا تھا۔

دو تین نسبتاً اُجلے بستروں کے پاس سے گزر کر جب وہ آگے بڑھی ہیں تو اس پارک میں اندھیرا تھا اور جب ثریا نے ... سلاخ پکڑ کر اندر جھانکنے کے لئے اپنا سر سا تھ لگایا ہے تو وہ خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ آئی تھی اور اس نے اپنی آنکھیں بند ... لی تھیں۔ وہ اتنی دلخراش حقیقتوں کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی جو سب کی سب اُس کے سامنے عریاں کھڑی تھیں ... سب ... دوردگی برہنگی سے بے خبر تھیں اور خالی نگاہوں سے ان کو وہاں کھڑے دیکھ رہی تھیں۔ اُن کے چہرے گرد آلود تھے۔ ... مختلف حالتوں میں بیٹھی تھیں یا سلاخوں کو پکڑے باہر دیکھ رہی تھیں۔

ندرت کی امی نے گھبرا کر میٹرن سے کہا تھا "میٹرن صاحبہ آپ میری بچی کو یہاں ان سب کے درمیان کیوں ... لے آئی ہیں" ثریا کو محسوس ہوا تھا جیسے ندرت کی امی اپنی عمر سے کہیں بوڑھی ہو گئی ہوں۔ اُن کی آواز کہیں پاتال سے ... آتی تک رہی تھی اور ثریا نے جلدی سے آنکھیں کھول کر ندرت کو دیکھنے کی کوشش کی تھی۔

"یہ ندرت نہیں ہو سکتی" اُس نے ایک گندے بالوں اور اُجاڑ چہرے کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے ... آپ سے کہا تھا "یہ ندرت نہیں ہو سکتی" اور ندرت کی امی پارک کی سلاخ کو پکڑے رونے لگی تھی اور ندرت اُن تمام عورتوں ... سے دور الگ کھڑی اُسے دیکھ رہی تھی۔

میٹرن نے اپنی نظریں دوسری طرف کرتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"... صاحبہ یہ پرائیویٹ وارڈ ہے۔ روشنی کو دیکھ کر بہت شور کرتی ہے اور جب تک اندھیرا نہ ہو جائے پریشان رہتی ہے لیکن دوسرے ... اندھیرے سے ڈرتے ہیں۔ یہ کشمکش اس کی ذہنی صحت کے لئے اچھی نہیں تھی۔ ایسا مجبوراً کرنا پڑا ہے۔"

... کی امی کا چہرہ سفید ہو گیا جیسے کسی نے خون کی بوند بوند نچوڑ لی ہو۔

... نے آہستہ سے پکارا تھا "ندرت ..... ندرت ادھر دیکھو میں ثریا ہوں۔ میں تمہیں ملنے آئی ہوں" لیکن وہ بالکل ... آنکھیں بند کئے کھڑی تھی اور کسی طرف بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔

... ندرت کی امی نے میٹرن سے پوچھا تھا۔ "میٹرن صاحبہ میری بیٹی کب تک ٹھیک ہو جائے گی" اُن کی آواز میں منت ... اور تمنا کا درد بھی ایسا درد جو صرف بیٹی کے اُجڑنے پر ماں کے دل میں ہی پیدا ہو سکتا ہے۔

... نے چھتری گھماتے ہوئے جواب دیا تھا۔ "بیگم صاحبہ ہمارا کام تو صرف اِن کی دیکھ بھال ہے۔ باقی کام تو بڑے ... کے ذمہ ہے۔" اور ثریا نے ندرت کی ماں سے کہا تھا۔

"... آپ ندرت کو گھر لے چلیں۔ وہ یہاں پاگل ہو جائے گی۔ مر جائے گی۔"

ندرت کی ماں نے کہا تھا "بیٹی گھر میں مجھ سے اس کا درد نہیں دیکھا جاتا۔ وہ جب روشنی کو دیکھ کر چیخنے لگتی ہے تو میرا دل ڈوب ڈوب جاتا ہے اور پھر گھر کے دوسرے لوگ۔ زندگی اندھیرے میں کس طرح گذر سکتی ہے۔"

ندرت نے آگے بڑھ کر سلاخ کو پکڑ لیا تھا۔ وہ ثریا کو نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی امی کو نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظریں سورج کی روشنی پر تھیں جو پارک کے پیچھے سے سیدھی پیپل کے بوڑھے درخت کے پتوں پر پڑ رہی تھی۔ پھر اس کے چہرے پر خوف کی تیز لہریں پیدا ہوئی۔ اس کے ہونٹ کانپ کر ساکن ہو گئے اور وہ بڑبڑانے لگی۔

یہاں پر کتنی چمک اور روشنی ہے۔ وہ دیکھو تیز بلب جل رہا ہے۔ سب طرف روشنی ہے۔ اور میں یہاں کھڑی ہوں ...... میرے کپڑے کہاں ہیں ...... اور وہ بڑبڑاتی ہوئی پیچھے کو ہٹ کر دیوار سے لگ کر [illegible]

[illegible]

... تو ں میں بانٹ دی تھیں۔ اُس کے خالی ہاتھ اُس کے پہلو میں لٹک گئے تھے جیسے وہ دو سخت لکڑیاں ہوں جن کو وہ ہلا ... نہ سکتی ہو۔

اور جب وہ بڑے گیٹ کو پار کر کے باہر آنے لگی تو بچی اپنے تھیلے کو کندھے پر لٹکائے اداس نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی ... نے ثریا سے زور سے کہا تھا۔

"... جب میں ڈولی میں بیٹھوں گی تو مجھے دیکھنے ضرور آنا۔ آج تو میرا سامان یہاں آ ... سنے لیا ہے۔ جب وہ واپس ... شہری ہو جاؤں گی۔" ثریا نے اپنا سر ہلایا تھا۔ جب خدا حافظ کہنے کے ... ثریا نے اپنا ہاتھ اٹھایا تو وہ بچی اور ... آئی تھی۔

"... میری شادی میں ضرور آنا۔" اور ثریا اُس ڈولی کے بارے میں سوچنے لگی تھی جس میں ندرت کو بیٹھنا تھا۔ اُن آنکھوں ... جن کا جواب کبھی سنائی نہ دیں گے ثریا کے بول کے گیت اُس کے ... ہم تو ٹوٹ چکے تھے جو اُس نے ... سنے تھے۔

... کہہ رہی تھیں "کئی ڈولیاں کبھی نہیں اٹھتیں میری بیٹی۔ ماں باپ کے کندھے ان کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے ... کے کندھوں کا ہی بوجھ بنی رہ جاتی ہیں۔ بیٹی تمہاری ڈولی کبھی کہیں نہیں جائے گی۔ یہ انتظار ... انتظار بہت جان لیوا ہے۔

ثریا نے یہ سب باتیں اتنی دفعہ دہرائی ہیں کہ مجھے لگتا ہے جیسے میں بھی ان کے ساتھ ساتھ ... پل بیت گیا ہے۔ جیسے میں نے بھی وہاں کی ویرانی کو اپنے اندر گھستے محسوس کیا ہے۔

نہیں۔ ہم سب بھی تو ندرت ہیں۔ تم کس کس کے لیے غمزدہ ہو گے کس کس ...

... رہا۔ میں تو خدا کو بھی الزام نہیں دے سکتا۔ اس تمام داستان میں تمہارا تو ذکر ... کر سکتا ہوں۔ میں تو جانتا بھی نہیں کہ ندرت کی بربادی میں تمہارا کتنا حصہ ... کا مہرہ بن کر اُسے مات دی۔"

[illegible]

... میں آئی تھی۔ . . . . . اور میں شاید اُسے بھول بھی جاتا تھا۔

... پر بیٹھا مجھے دیکھتا رہا۔ اُس کی آنکھوں میں غم کے گہرے سائے تھے ... [illegible]

... لٹکا دیا . . . . . .

... دروازہ بند کر کے جب باہر گیا تو [illegible] اس سا ...

[illegible]

کہا میں فاروق کو بتا دوں ۔ وہ کہانی جو میری مجروح انا سے شروع ہو کر اس رات پر ختم ہوتی ہے۔ جب میں نے ندرت کو اپنے کمرے سے چلے جانے کو کہا تھا۔ نکل جانے کو کہا تھا۔ میں نے سوچا تھا میں ندرت کو فتح کر چکا ہوں۔ میں ندرت کو مٹا چکا ہوں۔ . . . اس سے زیادہ مجھے کیا چاہیے۔ ندرت کی یہی سزا تھی۔

فاروق کے جانے کے بعد میں نے سیٹی بجا کر اپنے ذہن کو ہلکا کرنا چاہا۔ میں نے خوش ہونا چاہا کہ ایک عورت میری مردانگی کی بھینٹ چڑھ گئی۔ ندرت کو آخر کار میں نے شکست دے ہی دی۔ ہو سکتا ہے . . . ہو سکتا ہے۔ میرا ذہن بھاری ہو رہا تھا۔ کیا میں خوش ہوں . . . . . ہو سکتا ہے . . . . . .

شکست اور فتح ۔ دفتی جذبے۔ بے وقعت احساس . . . . لیکن پھر بھی زندگی کے لئے ضروری۔

فاروق اور ندرت کے خاندانوں کے ساتھ میں سکندر حیات کی وجہ سے ہی تو متعارف ہوا تھا۔ میرے اندر کا شیطان بڑے خوب صورت انداز سے ان کو مرعوب کرنے کی کوشش میں تھا۔ میں جو کئی لڑکیوں کو دوستی کے خوب صورت جال میں پھنسا چکا تھا۔ اس بات کا اندازہ کر چکا تھا کہ ندرت کو ڈھب پر لانے کے لئے مجھے نئے طریقے اختیار کرنے پڑیں گے۔ مجھے شرافت کا لبادہ اوڑھنا پڑے گا۔ جو شریف لڑکیوں کے دل میں اترنے کے لئے کارگر ہوتا ہے۔

اور پھر کس طرح میں ندرت کو ان سب باتوں کا یقین دلانے میں کامیاب ہوا تھا۔ جس پر میرا اپنا کبھی بھی یقین نہیں تھا۔ یہ میری زندگی کا سب سے الجھا ہوا اور بڑا جارحانہ حملہ تھا۔ میں اکیلے میں اپنی مٹھیاں بھینچ لیتا میں اس وقت سے انتظار میں تھا۔ جب آگے بڑھ کر میں اس کی ساری پاکیزگی کو روند سکوں گا۔ لیکن اس کی معصوم اور خود اعتمادی سے بھرپور نظریں مجھے اپنی ہی نظروں میں حقیر بنا دیتیں۔ تب نفرت کا عجیب کڑوا کسیلا احساس میرے اندر بھر جاتا۔ میں اس کے تقدس کو اپنے پاؤں تلے روندنا چاہتا تھا۔ اور اس سے پوچھنا چاہتا تھا۔

"کہو ندرت خانم کیا ہوا تمہارا وہ تقدس اور پاکیزگی"۔ لیکن وہ کتابوں کے ورق پلٹتی ہوئی میرے پاس دفتر میں بیٹھی رہتی۔ آہستہ آہستہ باتیں کرتی رہتی اور میں اپنے ناٹک میں نئے اور زیادہ دل لبھانے والے رنگ بھرتا رہتا۔ میں جانتا تھا اس کے دل کو تسخیر کئے بغیر اس کے جسم کی طرف بڑھنا ایک شدید غلطی ہوگی۔ تب میں چپ چاپ بیٹھا اس کے جسم کے خطوط کو دزدیدہ نظروں سے دیکھتا اور اس کے دیکھنے پر آنکھیں جھکا کر بڑے رسان سے مسکراتا۔

میں اس کی موجودگی میں اپنی زندگی کا سب سے مشکل کردار کرنے پر مجبور ہو جاتا۔

ایک روز میں نے کہا تھا "ندرت زندگی تمہارے بغیر ادھوری اور نامکمل لگتی ہے۔ میں اسے ٹٹولنا چاہتا تھا۔ اس کے جذبات کی شدت کا صحیح اندازہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے اندرونی احساس سے کانپ سی گئی تھی۔ اس کے معصوم چہرے پر حیا کی سرخی تھی۔ وہ محبت کے الوہی جذبے میں گرفتار تھی۔ اس کے چہرے پر چھائے رنگوں کو دیکھ کر میں دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔

ہاں اب وہ میرے قابو میں آنے والی ہے۔ میں کامیاب ہونے والا ہوں۔

اور جب میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر اُس کے ہاتھ کو چھونا چاہا تو وہ ہمیشہ کی طرح سکڑ سی گئی تھی۔ اور اُس نے آہستہ سے کہا تھا۔

"اسلم محبت لمس اور گرفت نہیں۔ یہ تو انسان کے اندر یوں دوڑنے لگتی ہے جیسے خون کے ساتھ روانی۔ میں بہت حساس ہوں اور اگر تم مجھے نازک بھی سمجھ لو تو ٹھیک ہی ہوگا۔ چھوٹی سی بات میری ساری ہستی کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ نہ جانے میں اس طرح کی کیوں ہوں۔ لیکن اِس پر میرا بس بھی تو نہیں۔ میں جب اپنے اندر جھانکتی ہوں تو ڈر جاتی ہوں۔ میرا توڑنا کتنا آسان ہے۔ مجھے مٹانا کوئی مشکل نہیں۔ اور خاص طور پر اُس کے ہاتھوں جو مجھے ساری کائنات لگتا ہے۔" وہ آہستہ سے ہنس پڑی . . . .

اور دفتر کی دودھیا روشنی میں بیٹھی وہ کوئی غیر مرئی ہستی لگ رہی تھی "لیکن یہ مت سمجھنا میں اخلاقی طور پر بھی کمزور ہوں۔ میں گھنٹوں تمہارے پاس بیٹھ کر باتیں کر سکتی ہوں۔ میرے لئے تمہارا اتنا ہی قرب کافی ہوگا۔ مجھے اپنے آپ سے ڈر لگتا ہے اسلم۔ لیکن میں کمزور نہیں ہوں۔" اُس کی آواز میں اعتماد اور یقین تھا۔ اپنے آپ پر۔ مجھ پر۔ میں کچھ نہیں بولا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کون سی راہ اختیار کرنا پڑے گی۔ پھر میں نے زور سے قہقہہ لگایا تھا اور کہا تھا۔

"یہ باتیں تو بڑی ماورائی سی ہیں ندرت۔ اِن کی خوب صورتی ہمیں اپنے اندر سمیٹ تو لیتی ہے۔ لیکن ہمیں مکمل طور پر خوش نہیں کر سکتی اور میں پورے طور پر خوش ہونا چاہتا ہوں۔" میں نے اپنے اندر چھپی خواہش کو آواز دے ہی دی آخر کار۔ وہ میری بات کے مفہوم کو پانے کی کوشش میں سیدھا میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

"خوب صورت جذبے اپنا صلہ خود ہیں اسلم۔" پھر وہ ہنس پڑی۔ اور بڑے یقین سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اُس کا یہ یقین ہی مجھے زہر آلود کر رہا تھا۔ اُس کے انداز میں فاختہ کی سی بے بسی اور لاچاری نہیں تھی۔ وہ کیوں اپنے پر اتنا یقین رکھتی تھی۔ کیوں۔

تو کیا میں تم سے ماورائی محبت کروں؟ کیا میں تمہاری محبت سے تمہیں نکال دوں۔ کیا میں اپنے جذبوں کی نفی کر دوں۔

"کیا حرج ہے آخر اس میں۔ اگر کر سکو تو۔" اُس نے سن کر بہت سکون سے جواب دیا۔ اور ہنستی ہوئی اٹھ کر چلی گئی۔

"ماورائی محبت۔ خوب صورت جذبے اپنا صلہ خود ہیں۔" میں نے بیزاری اور نفرت سے اُس کے کہے ہوئے الفاظ کو دہرایا اور زور سے پاؤں کو زمین پر مارا۔

"یہ لڑکی آخر اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے؟ میں اِن سب باتوں پر یقین نہیں کرتا۔ یہ جذبے کیا ہیں اور اِن کی سچائی سب بکواس۔ سب بکواس۔ صرف جسم ہے زندہ اور جاندار جسم۔" میں نے ندرت کے جسم کے بارے میں سوچتے ہوئے کہا۔

خوب صورت جذبے جو ندرت کے لئے اُس کے اندر سمٹ گئے تھے۔ اور میرے لئے اُس کے جواں جسم کی لائنوں اور زاویوں میں مجسم ہو گئے تھے۔ وہ تو اتنی حساس تھی کہ کوئی خوب صورت چیز۔ کوئی خوب صورت لفظ اُس کے ہاتھوں کو لرزش میں مبتلا کر دیتا تھا اور وہ یوں کانپنے لگ جاتی تھی جیسے نرم ٹہنی ہو۔ لیکن وہ اِن تمام باتوں کے باوجود کتنی سخت بھی تھی۔ وہ خوبصورتی

سے متاثر تھی لیکن میں جو اپنی جسمانی خوب صورتی کا سب سے بڑا ہتھیار رکھتا تھا اُس کے سامنے بے بس ہو جاتا تھا۔ اور میری یہ بے بسی میرا اپنے پر یقین ڈگمگا رہی تھی۔ ندرت میری پہنچ سے کس طرح دور ہو سکتی تھی۔ پر وہ مجھے بہت ہی دور لگ رہی تھی اور میں دیوانہ وار اُس کو اپنے انتقام کے پنجے میں دبوچ کر مسل دینے کی شدید خواہش رکھتا تھا۔ میری تمام خوبصورتی اُس کے سامنے اس کے نازک وجود کی کیا حقیقت تھی۔ اور اُس کی یہی حقیقت ایک تلخ زہر بنتی جا رہی تھی۔ اُس کے اور میرے درمیان ایسی لائن تھی جس کو عبور کرنے کے لئے میں کوئی بھی قیمت چکانے کو تیار تھا۔ یہ خواہش اُس کے جسم کی شدید خواہش تک ہی تو تھی اور میں تو ہمیشہ جسموں کا ہی خریدار رہا تھا۔

میں جب بھی اُس کو فون کرتا تو ایسے ایسے خوبصورت الفاظ میں باتیں کرتا۔ جن میں سچائی اور شرافت کا پَرتو ہو۔ اور جو کھوکھلی آواز بن کر میرے اندر گونجتے رہتے تھے۔

میں اِس کھیل سے تھک چکا تھا۔ جس کا کوئی انجام مجھے نظر نہیں آتا تھا۔ سچائی اور شرافت کی ایکٹنگ کرتے کرتے میرے اعصاب جواب دے رہے تھے۔ وہ میرے پاس آتی تھی اور مزے اور آرام سے باتیں کرتی رہتی جیسے اُس کو میرے وجود کی طاقت سے کوئی خوف نہ ہو۔ مجھے لگتا تھا وہ مجھے نہیں دیکھتی بلکہ اپنے اندر پیدا محبت کے خوب صورت جذبے کی پرستش کر رہی ہو۔ اس نے اپنے لئے ایک خوب صورت اور نازک جال بُن رکھا تھا اور آنکھیں بند کئے اُس کے اندر بیٹھی سب طرف سے غافل ہو چکی تھی۔ اور پھر بھی میرے ہاتھوں کی گرفت سے دُور تھی۔ اُس کے چھونے کی خواہش پر بھی میں آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ حالانکہ وہ میرے آفس میں اکیلی ہی ہوتی تھی۔ لیکن میں اپنی کرسی پر بیٹھا سر دھنتا رہتا اور غصے کے مارے پیچ و تاب کھاتا رہتا۔

ایک روز میں نے پوچھا تھا۔ "ندرت کیا تم وجود کی حقیقت سے بالکل بے خبر ہو؟"

اُس کی ہتھیلیاں پسینے سے نم ہو گئی تھیں اور اُس نے اُن کو دوپٹے سے پونچھتے ہوئے کہا تھا۔ "اِس وجود کا تو پتہ ہے۔ لیکن اپنے وقت پر . . . . . ." اور جلدی سے چلی گئی تھی۔

پھر میں نے ندرت کو ملنا چھوڑ دیا اور شکست خوردہ ہو کر اس جذبے کو بھولنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ میں نے اپنے چپراسی سے کہہ دیا تھا کہ جب مس ندرت آئیں تو کہہ دینا کہ میں مصروف ہوں۔ چند روز بعد جب وہ میرے دفتر کا دروازہ کھولنے لگی تو چپراسی نے کہا تھا۔

مس صاحبہ۔ صاحب بہت مصروف ہیں۔ آپ سے نہیں مل سکتے۔

میں اندر اپنی کرسی پر بیٹھا تن سا گیا تھا اور اپنے اس نئے وار کا اثر دیکھنا چاہتا تھا۔ جو مجھے زندگی میں پہلی بار آزمانا پڑا تھا۔

چند ساعتوں تک باہر خاموشی رہی تھی۔ میرے سٹینو کی ٹائپ مشین کی ٹک ٹک میرے سر میں ہتھوڑوں کی مانند لگ رہی تھی اور دفتر کے خوب صورت رنگ ایک دم بے جان سے نظر آنے لگے تھے۔ میری زبان پر کڑوا سا مزہ تھا جو میری شکست نے پیدا کیا تھا۔

چپراسی نے ایک دفعہ پھر کہا تھا۔

"مس صاحبہ۔ صاحب نے ہدایت کی ہے کہ کوئی فالتو آدمی اُن کے دفتر میں نہ آنے پائے۔" ندرت کی آواز سنائی دی تھی۔ ۔ ۔ اُس نے کہا تھا۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے بابا۔" اُس کی آواز میں بے یقینی اور غصہ تھا۔ "مس صاحبہ کہہ جو دیا کہ صاحب مصروف ہیں۔ آپ نہیں جا سکتیں۔" چپراسی کی آواز میں بدتمیزی تھی۔ اور اندر بیٹھا میں دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔

"بے کار کا درد سر۔ مفت کا جھنجھٹ۔" میں نے فائلوں کو آگے رکھ کر اُن پر بڑی روانی سے دستخط کرنے شروع کیے اور میرے بٹن سے سیٹی کی مدھم آواز میرے کمرے میں بھر گئی تھی۔ لیکن ساتھ کے کمرے سے ٹائپ مشین کی کھٹ کھٹ مجھے جانے ہمیشہ سے زیادہ کیوں احساس ہو رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"اوہ۔ اتنا شور کیوں ہے آخر۔ کیا تم لوگ آرام سے کام نہیں کر سکتے۔" میں زور سے چلایا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے ٹائپ مشین کی کھٹ کھٹ میرا مذاق اُڑاتے ہوئے کہہ رہی ہو۔

"شکست خوردہ۔ ۔ ۔ شکست۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شکست۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم ہار گئے ہو۔" ٹائپ مشین چیختی رہی اور میں نے گھبرا کر اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ "نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ ۔ ۔ میں نے اُسے لوٹایا ہے میں نے اُس پر فتح حاصل کی ہے۔ ۔ ۔ جھوٹ ہے۔ ۔ ۔ جھوٹ ہے۔" کلاک کی ٹک ٹک کہتی رہی اور میں سر کو ہاتھوں میں تھامے فائل کے کھلے کاغذ گھورتا بیٹھا رہا تھا۔

فون کی گھنٹی کی مسلسل ٹرن۔ ٹرن۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سے گھبرا کر جب میں نے ریسیور کو اٹھایا تو ندرت کی آواز سنائی دی اور میں نے پوری بات سنے بغیر فون کو کریڈل پر رکھ دیا۔ اور اپنی پہلی ناکامی پر غصے کے مارے میں نے چپراسی کو بلا کر بلاوجہ خوب ڈانٹا تھا۔

اگلے چند روز میں نے اپنا زیادہ وقت کلب میں گزارا تھا۔ اور تاش کے پتوں میں۔ بیئر کی بوتلوں میں۔ جسم کے لوچ میں اور بے وجہ کے لگائے گئے قہقہوں میں میں نے اپنی اس شکست کو بھولنے کی کوشش کی تھی۔

"پھر کیا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ ۔ ۔ ۔ میں اب بھی بہت سے جسموں پر قبضہ کر سکتا ہوں۔" میں اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کرتا تھا۔

اُس روز میرے سر میں شدید درد تھا۔ اور میں اپنے کمرے کی کھڑکی کھولے کمرے میں بستر پر بیٹھا تھا۔ دیوار پر پھیلی بیل کے پتے سوکھ کر گر رہے تھے۔ شہد کی مکھیاں جو بہار میں سارا وقت ان پھولوں کے بھیتر میں گھسی شہد اکٹھا کرتی رہتی تھیں۔ نظر نہیں آ رہی تھیں۔ صرف چند مکھیاں کبھی کبھار آ کر بیٹھتی اور پھر شروع سردیوں کی ہوا سے گھبرا کر واپس اُڑ جاتیں۔ آسمان دھندلا تھا جیسے ہلکی سی کہر کی چادر نے ساری فضا کو ڈھانپ رکھا ہو۔ میں سگریٹ پیتا ہوا ٹائم کے نئے پرچے کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ دروازہ آہستہ سے کھلا۔ دبے قدموں کی چاپ میری کرسی کی پشت پر آ کر رک گئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ ندرت تھی۔

میں اپنی آخری ناکامی کے مٹ جانے پر دل ہی دل میں خوش ہو اٹھا۔ یہ میرا بچھایا جال تھا۔ وہ کس طرح بچ کر جا سکتی تھی بھلا
ندرت کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کا چہرہ زرد اور غمگین تھا۔

میں نے اپنے چہرے کو تمام جذبات سے عاری بناتے ہوئے سگریٹ کے دھوئیں کو اپنے سامنے پھیلا دیا۔ دھوئیں کی ہلکی تہ کے پار سے ندرت کے آنسو چمک رہے تھے۔ جو اس کی زرد گالوں پر ایک دھار کی طرح چپکے چپکے بہہ رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھیں خزاں زدہ بیل پر اٹکی اکیلی کلی پر جما دیں تھیں۔

"ناراضگی کی وجہ تو بتا دو۔" ندرت کی آواز میں زمانوں کی محرومی تھی۔ وہ کھڑی کھڑی ویرانے میں اکیلی شاخ کی طرح کانپ رہی تھی۔

وجہ تو کوئی نہیں۔ بس دل نہیں چاہتا۔" میں نے اپنی آواز میں ساری لاپروائی لاتے ہوئے جواب دیا۔

اسلم تم چاہتے کیا ہو۔ وہ جھک کر میرے بستر کی پائنتی کے پاس بیٹھ گئی۔ جیسے غم کا بوجھ برداشت نہ کر پا رہی ہو۔

"صرف اپنے پر اعتبار۔" میں بدستور ٹائم کے ورقے پلٹ رہا تھا۔

"وہ تو تمہیں دیتے کیا اس تمام عرصے میں تم اتنا بھی نہیں جان سکے تمہیں معلوم ہو جانا چاہیے تھا اسلم کہ میرے جیسی لڑکی جب ایک مرد کے دفتر میں اکیلی آتی ہے تو وہ اس پر اعتبار کرتی ہے اور آج جب میں تمہارے گھر چلی آئی ہوں تو اعتبار کے بھروسے ہی تو آئی ہوں

"یہ جھوٹ ہے اور خالی باتیں مجھے مطمئن نہیں کرتیں۔" میں غصے سے بولا اور تازہ جلی سگریٹ کو میں نے زور سے ایش ٹرے میں مسل کر بجھا دیا۔

اسلم ان چند دنوں کی اذیت اور کرب نے میرے اندر کا سارا حوصلہ اور غرور نچوڑ لیا ہے! اسلم یہ محبت اتنی جان لیوا اور دردناک ہوتی ہے۔ اور دوسرا شخص اتنا عزیز اور پیارا لگتا ہے یہ تو مجھے اب ہی معلوم ہوا ہے۔ میں تو اس پرندے کی مانند ہوں جو فضائے بسیط میں بغیر کسی منزل اور نشان کے اڑتا پھرے۔ اکیلا اور دکھی۔ بغیر کسی منزل کے مجھے کونسی راہ جانا ہے میں نہیں جانتی۔ میں کیا کروں بولو میں کیا کروں تمہیں حاصل کرنے کیلئے مجھے کن ظلمات کو پار کرنا ہوگا۔ کونسی گہرائیوں میں چھلانگ لگانی پڑے گی بولو مجھے کونسے کانٹوں کو چننا ہوگا بولو . . . . بولو۔ وہ بے اختیار ہو کر آگے بڑھی اور میرا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑنے لگی اور بے اختیار ہو کر رونے لگی۔ تم نے مجھے ڈس لیا ہے اسلم۔ تم نے . . . تم نے۔ میں نے شاید ایک لمحے کے لئے اپنے دل میں اس کے لئے رحم محسوس کیا تھا۔ لیکن [illegible] لمحے میرے اندر کا انسان تھا۔ جو دوسروں کو کچلنے میں ہی لذت پاتا ہو۔ میرا زہری میرا سب سے بڑا ہتھیار تھا۔ [illegible] خود پرست اور خود غرض شکاری میرے اندر [illegible] مجروح کرنا چاہتا تھا۔

"یہ غلط ہے۔" اس نے میرا گریبان چھوڑ دیا اور اجازی میرے سامنے کھڑی رہی۔

"یہ غلط نہیں ہے۔ تم مجھے اس لئے نہیں ملتی رہی ہو کہ تم کو مجھ سے کوئی لگاؤ تھا۔ تم محض وقت گزارنے کے لئے ایک دلچسپ مشغلہ بنا کر میرے جذبات کو بھڑکاتی رہی ہو۔ اور اب جب میں آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ تم ایسی شرافت کا ڈھونگ رچا

جو تمہارے کردار میں کہیں بھی موجود نہیں۔ تم دوسروں سے کھیلنا چاہتی ہو۔

وہ ایک دم کرسی پر بیٹھ گئی اور خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ پھر اُس نے سر جھکا لیا۔ اور رونے لگی۔ میرے کمرے کی کھڑکی سے اَن گنت گھروں کی روشنیاں جھانک رہی تھیں۔ چھتوں پر ٹیلی ویژن کے اینٹینا کھڑے تھے۔ روشنیوں کے درمیان سمایا ہوا اندھیرا تھا۔ اور میں کسی مناسب لفظ کی تلاش میں تھا جو ندرت کے نازک احساسات اور خیالات پر ایک تازیانہ بن کر گرے اور میں اُس کے تڑپنے کا تماشہ دیکھ سکوں۔ میں اس موقعہ کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اتنے مہینوں کی تگ و دو کی قیمت وصول کرنے کا موقعہ آ گیا تھا۔ وہ بے بس اور اکیلی تھی اور سرتاسر میرے جادو میں جکڑی ہوئی۔ جسے وہ محبت کا نام دے رہی تھی۔ ندرت جس کا کوئی وجود نہیں۔ میرے سامنے بیٹھی لڑکی کا شاداب وجود میرے اس قدر نزدیک تھا۔ میری دسترس میں۔ میرا دل اچانک اسے اپنی گرفت میں لینے کے لئے مچل اُٹھا۔ اُس کا خوب صورت جسم کپڑوں میں لپٹا ہوا تھا۔ اور پھر اس جسم کو عریاں دیکھنے کی خواہش میرے اندر پیدا ہوئی۔ میرا خون تیزی سے میری رگوں میں دوڑنے لگا۔

"کیا میری شرافت تمہارے میرے درمیان ایک دیوار ہے اور کیا اس دیوار کے اس پار بھی تم میرے منتظر ہو گے؟ اگر مجھے اس بات کا پورا یقین ہو تو میں تمہارے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔"

وہ کھوئی کھوئی سی آواز میں بولتی رہی اور مجھے لگا جیسے یہ آواز اُس کی اپنی نہ ہو۔ کمرے میں اندھیرا تھا اور باہر بھی دنیا خاموش تھی۔ اُس کی آواز میں انجانے اندیشوں کا ارتعاش تھا۔ وہ سہمی ہوئی تھی اور میں اپنی کامیابی پر ہنس رہا تھا۔

میں بستر سے نیچے اتر آیا۔ کھڑکی سے نظر آتا آسمان تاریک ہو گیا تھا۔ اِکا دُکا تارے زیادہ واضح اور روشن نظر آ رہے تھے۔ میں نے سگریٹ جلائی اور دھوئیں کے گہرے مرغولے کو اُس کے منہ پر چھوڑ دیا۔

"ندرت میرے اور تمہارے درمیان یہ اجنبی پن کیوں ہے"۔ اُس وقت مجھے اپنے اندر کی بڑھتی ہوئی ہوس کو روکنا انتہائی مشکل لگ رہا تھا۔

"اسلم تمہارا ذرا سا بھی غلط قدم مجھے توڑ کر رکھ دے گا۔ تم جانتے ہو۔ اچھی طرح جانتے ہو میں تمہارے جال میں پھنسنا نہیں چاہتی تھی۔ میں تمہاری باتوں کے جادو نے مجھے بے بس کر دیا۔ اور اگر تم مجھے اب ڈس بھی لو تو میں اُف نہیں کروں گی کچھ نہیں اپنا بچاؤ بھی کر نہ سکوں گی۔" وہ بہت ہی تھکی ہوئی لگ رہی تھی اور اندھیرے میں بیٹھی وہ ایسی چڑیا کی مانند سہمی ہوئی تھی جو شکاری کی زد پر ہو۔

جب میں نے دروازہ بند کر کے اُس کی طرف قدم بڑھایا تو وہ بدستور سر جھکائے رو رہی تھی۔ میرے تیز قدموں کی آہٹ سے خوفزدہ ہو گئی۔ میرے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے میں نے اگلا قدم اٹھانے سے پہلے سوچا تھا "کیا ہوا اگر ندرت کا جسم نہ ہو۔ تو ہم جسموں میں کیا فرق ہے۔ لیکن دوسرے لمحے غصے کی تیز لہر میرے اندر دوڑ گئی۔ میں اتنے مہینوں اس لڑکی کی خاطر اپنا وقت ضائع کر رہا ہوں۔ اور یہ لڑکی لذتوں کی بھوک سے احساس میں ریت بن کر میرے تمام مزے کو کرکرا کرتی رہی ہے۔

"یہ میرے اس کمرے میں آ کر بھی اپنی حفاظت کا سوچتی رہی ہے۔ میں نے میز کو زور سے نفرت بھری ٹھوکر ماری۔ یہ ٹھوکر

ندرت کی پاکیزگی اور شرافت کو بھی۔ جس کی حیثیت میرے اندھے جذبات کے سامنے کچھ نہیں تھی۔

"ندرت خانم دوسروں کے جذبات کو اُبھارنا اور پھر دُور کھڑے ہو کر دوسروں کا تماشا دیکھنا اتنا آسان نہیں۔ اِس کی کچھ قیمت دینی پڑتی ہے۔"

"یہ تم ہو۔ یہ تم ہو جس کے لئے میں نے اتنی ذہنی اذیت برداشت کی۔ اِتنے دِنوں کرب اور عذاب میں مبتلا رہی۔" وہ بیزاری سے بولی۔

"میں شکست کا عادی نہیں ہوں ندرت خانم۔ ہم دونوں میں سے ایک کو ہارنا ہوگا اور وہ تم ہو ندرت خانم تم۔ تم کوئی نہیں ہو، صرف ایک جسم ہو جس کی خواہش مجھے تھی اور ہے۔ اور اب میں ہمیشہ کی طرح۔ دوسرے جسموں کی طرح اِس کو بھی روند ڈالوں گا۔ اور تم کچھ نہ کر سکو گی۔ کچھ نہ سکو گی۔ کیا کہو گی اور کیونکر کہو گی۔ میں اس تپش کا عادی نہیں ہوں اور تمہیں اِس کی قیمت دینی پڑے گی۔" میں آگے بڑھ گیا۔ اور وہ کچھ اور پیچھے ہٹ گئی "قیمت کا تعین صرف تمہارے ہی اختیار میں نہیں ہے۔" اُس نے آگے بڑھ کر اپنی پوری طاقت سے ایک تھپڑ میرے منہ پر دے مارا۔

اور پھر نہ جانے کیسے ایک وحشی کی طاقت سے میں نے اُس کو دبوچ لیا۔ اور جب روشنی جلا کر میں نے اُس کو دیکھنا چاہا تو اُس نے اپنی بہتی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لئے۔ اور گھٹی گھٹی آواز میں کہنے لگی۔

"روشنی بجھا دو خدا کے لئے روشنی بجھا دو۔" میں نے اُس پہ ایک نظر ڈالی جو خواہش اور انتقام کی تپش سے دہک رہی تھی۔ پر یکایک نہ جانے مجھے کیا ہوا تھا کہ اُس برہنہ جسم کا تقدس اور پاکیزگی مجھے ایسی لگی تھی جو میری پہنچ سے بہت دور ہو۔ جو سامنے موجود ہوتے ہوئے بھی کہیں نہ ہو۔ جو شبنم کی مانند ہاتھوں کی پوروں سے اوجھل ہو جانے والی ہو۔ میں وہاں کھڑا پسینے سے شرابور ہو گیا تھا۔

"روشنی بجھا دو۔ خدا کے لئے روشنی بجھا دو۔ کھڑکی بند کر دو۔" اس کی آواز ایسے آ رہی تھی جیسے کوئی ڈوبتا انسان مدد کے لئے پکار رہا ہو۔ میں نے اُس کو آخری حربہ آزماتے ہوئے کہا تھا۔

"کیا تم اس جسم کے تقدس کی حفاظت کرنا چاہتی تھیں لیکن اب جبکہ تم میری پہنچ سے اس قدر نزدیک ہو۔ مجھے ترس آ گیا [illegible] یہ میرا انتقام تھا جو میری مجروح انا کے سب زخم مندمل کر گیا۔" اُس کے ہاتھ ابھی تک اُس کے چہرے پر دھرے تھے۔ [illegible] ہوتے ہوئے بھی میں جانتا تھا کہ اپنے جی میں ہمیشہ کی طرح جھوٹ بول رہا ہوں میں اگر اُس کی طرف بڑھنا بھی چاہتا تو [illegible] نے گھبرا کر اپنی آنکھوں کو بند کر لیا تھا اور اسے اپنے گھر سے چلے جانے کو کہا تھا۔ اور پھر وہ چلی گئی تھی۔ اور [illegible] حسین مجسمے کو بھلانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ وہ مجسمہ جو ہمیشہ میرے لاشعور کے پردے پر ابھرا رہتا اور پھر مجھے [illegible] کوشش میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ پر پچھلی رات جب [illegible] کی کشش مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی تو ندرت اپنی [illegible] دیوانہ وار قہقہے لگا رہی تھی اور اُس کے چہرے پر دھرے دونوں ہاتھ آنسوؤں سے تر تھے۔

گھن

قیوم راہی

تھوڑی ہی دور سامنے مخالف سمت والے فٹ پاتھ پر جب اس نے جبار کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو فوراً ہی اپنی نظریں پھیر لیں اور بدن کترا کر تیزی سے دوسری سڑک پر مڑ گیا جیسے کوئی قرض دار اس شخص کو دیکھتے ہی گھبرا کر چھپنے کی کوشش کرنے لگتا ہے جس سے اس نے قرض لے رکھا ہو اور کئی بار اسے ٹال چکا ہو۔

لیکن اس نے اپنے دوست جبار سے نہ تو کچھ قرض لیا تھا اور نہ ہی اس سے کوئی لڑائی جھگڑا تھا اس کا، پھر بھی وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس وقت جبار سے آمنا سامنا ہو اور نوبت بات چیت تک پہنچ جائے ـــ دراصل ان دنوں کچھ عرصے سے وہ ایک عجیب قسم کی بیزاری اور بے دلی کا شکار ہوتا جا رہا تھا جس کے باعث وہ تنہا ہو گیا۔ وہ کبھی تھا جی ہی نہیں چاہتا کسی سے ملے، بات کرنے کو سب باتیں کھوکھلی اور بے معنی معلوم ہونے لگی تھیں حتیٰ کہ زندگی تک کا مقصد مشکوک ہو گیا تھا ـــ وہ تو بس ان دنوں بے کلی کے تپتے ہوئے ریگ زاروں میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔

اس منزل پر پہنچنے سے قبل اسے ایک لمبا سفر طے کرنا پڑا تھا۔ اس سفر کے دوران حقائق کی روشنیوں نے اس کو بہت سے ایسے گوشوں سے روشناس کرایا تھا اور تب اس نے کتنے ہی لوگوں کے ظاہر و باطن کا تماشا دیکھا تھا۔ یہ تماشا دیکھ کر پہلے پہل اس کا خون کھولتا تھا۔ اور کبھی کبھار وہ بے قابو ہو جایا کرتا تھا۔ اس کا جی چاہتا منافقت کے ہر ناگ کو سختی سے کچل ڈالے، اور دوسرے ... لیکن جلد ہی جب اس کو اپنی بے بسی کا احساس ہوا تو اس کے خیالات نفرتوں کی آنچ میں تپنے لگے، پھر اس نے لاتعلقی کا راستہ اپنا لیا، یہاں تک کہ تنہائیاں اس کا مقدر بن گئیں ـ گھر پر اس کا جی نہیں لگتا تھا۔ جو وہ پہلے ایک آس کے ساتھ اس کو تکتی تھیں، پھر ان میں شکایت کی جھلک ہوتی تھی، اور اب مایوسی کے سائے ڈولتے تھے۔ احساس تھا کہ وہ بیوی بچوں کے جائز مطالبات پورے نہیں کر پاتا ـ اس سلسلے میں اس نے مسلسل تگ و دو کی تھی، بڑے بڑے ... تھے، تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ خاصے تجربے اور اہلیت سے بھی مالا مال تھا۔ اور یوں کئی بہتر ملازمتوں کے لئے موزوں فرد تھا۔ اسی لئے اس نے مستقبل کے لئے خوشحال زندگی کے خواب دیکھے تھے۔ جن کے لئے وہ خود کو حق بجانب سمجھتا تھا۔ لیکن مسلسل نظر انداز ہونے کے باعث اس کے خوابوں کے دھنک رنگ پیرہن تار تار ہو کر محدود فضاؤں میں بکھر گئے تھے، اس کی امیدوں کا محل مسمار ہو گیا تھا اور وہ کف افسوس ملتا رہ گیا تھا حتیٰ کہ اس نے شکست تسلیم کر لی تھی اور اس موضوع پر سوچنا ترک کر دیا تھا ـــ گھر میں اس کی نگاہیں بھٹکی بھٹکی رہتی تھیں اور اکثر اس کے ذہن و دل میں دھواں سا پھیلنے لگتا تھا۔
چند دنوں سے اس کے مزاج کی تلخی اور بجھی بجھی سی کیفیت نقطۂ عروج تک پہنچ گئی تھی، تب ہی سے اس نے خود کو تیاگ

پینے پر مجبور پایا تھا۔ چنانچہ کچھ دنوں سے اس نے خود کو دفتری اوقات کے بعد گھر کے ایک چھوٹے کمرے میں مقید کر لیا تھا اور اس کے منہ کو چپ سی لگ گئی تھی، گہری اور بڑا سرار چپ ——— بیشتر اوقات وہ طرح طرح کی حوصلہ شکن سوچوں میں ڈوبا رہتا تھا، کبھی کبھار اس کی بیوی نے اسے آہیں بھرتے ہوئے بھی دیکھا تھا، ایک دو بار اس نے شوہر سے اس بارے میں دریافت بھی کیا تھا لیکن اس نے بے تکے جواب دے کر بیوی کو ٹال دیا تھا۔ چنانچہ بیوی کو بھی ٹھنڈے سانس بھر کر خاموش ہونا پڑا تھا۔ رہا سوال بچوں کا، تو وہ اُن سے بھی کترایا کترایا رہتا تھا، الگ تھلگ، جیسے کوئی متعلق واسطہ ہی نہ ہو اُن سے یوں بچے بھی اس سے بات کرتے ہوئے اس کے سامنے جاتے ہوئے سہم جاتے تھے، اس لئے زیادہ وقت باپ کی نظروں سے اوجھل ہی رہتے تھے۔ دوستوں اور دیگر ملنے والوں سے بھی گھر پہ کوئی نہیں آتا تھا، پہلے ہمیشہ باہر ہی ملاقاتیں ہوتی رہی تھیں، اُن کی باتوں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی، بلکہ بعض اوقات تو کوفت محسوس ہونے لگتی تھی ——— چنانچہ گوشۂ تنہائی میں پناہ لے کر اس نے ان لوگوں سے چھٹکارہ حاصل کر لیا تھا۔ اس کے باوجود وہ ہر لحظہ بے قرار اور مضطرب بلکہ ایک عذاب میں مبتلا رہتا تھا۔

لیکن آج اچانک ایک رو بہا کر اسے گھر سے "باہر" لے آئی تھی۔

جبار نے اس کو نہیں دیکھا تھا اس لئے جبار اپنی راہ پر گامزن رہا ——— اور وہ مخالف سمت چلتا چلتا دور نکل گیا، آپ ہی آپ اس کے قدم کسی دوسری سڑک پر مڑ جاتے تھے، ——— وہ ابھی تک طے نہیں کر پایا تھا کہ اس کو کدھر جانا ہے، کیوں جانا ہے۔ کیا کرنا ہے ——— ایک کشادہ سڑک پر مڑتے ہوئے اس نے دیکھا دور مغربی افق پر سورج غروب ہو رہا تھا، ——— ایک دن زندگی کا بھی یہی انجام ہوتا ہے۔ اس نے گہرا سانس لے کر سوچا ——— فرق اتنا ہے کہ یہ سورج کل پھر طلوع ہو جائے گا، لیکن زندگی کا سورج ایک بار غروب ہو جائے تو پھر طلوع نہیں ہوتا۔

" یہ دنیا، یہ محفل میرے کام کی نہیں "۔ قریب ہی کسی ریستوران میں رفیع کی درد بھری آواز گونج رہی تھی۔ اس نے یہ گانا کافی دنوں کے بعد سنا تھا ——— پہلے اسے اس کی دُھن اور ساز پسند تھے، لیکن اب رفیع کی آواز سوز میں ڈوبی ہوئی تھی اور اس کے دل، اس کے سارے جسم میں سرایت کر گئی تھی۔ اور ایک ایک بول کا مطلب آپ ہی آپ اس پر عیاں ہوتا جا رہا تھا، فٹ پاتھ پہ کھڑے ہو کر سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لیتے ہوئے اس نے پورا گانا سنا اور اس کے سینے میں ایک قسم سی پگھلتی رہی۔

کیوں نا ایک پیالی چائے پی لی جائے ——— اس نے سوچا، اور اس کے قدم ریستوران کی جانب بڑھ گئے، اسے ایکا ایکی جماہی آئی، کتنی ہی راتوں سے وہ بے چین تھا، کبھی یوں ہوتا کہ رات گئے تک نیند نہیں آتی تھی، پھر تھوڑی دیر تک سوتا اور آنکھ کھل جاتی، طرح طرح کے پریشان کن خیالات اس کے حواس پر چھانے لگتے اور وہ ایک انجانے خوف سے سہما ہوا، دم سادھے، آنکھیں میچے سونے کی کوشش کرتا رہتا۔ آنکھیں کھولتا تو اسے بے کراں اندھیرے اور بے اماں سناٹے میں یوں لگتا جیسے وہ اپنے کمرے کی بجائے قبر میں لیٹا ہوا ہو، ——— کروٹیں بدل بدل کر وہ تنگ آ جاتا حتیٰ کہ رات کے پچھلے پہر اس کی آنکھیں مُندھ جاتیں ——— سوتے میں بھی اسے سکون نہیں ملتا تھا۔ بے تُکے، ڈراؤنے مایوس کن خواب اس کا پیچھا ہی نہیں چھوڑتے تھے ——— جب وہ ریستوران میں سب سے الگ تھلگ ایک گوشے میں بیٹھا تو اسے محسوس ہوا کہ وہ تھک چکا

تھا اور اب بیٹھنے کے بعد اس کو آرام ملا تھا — فوراً ہی اسے کئی دن قبل کی ایک دوپہر یاد آگئی جب وہ مسلسل کئی گھنٹے بند کمرے میں دفتر کا کام ختم کرنے کے بعد باہر دھوپ میں آیا تھا۔ کچھ اسی قسم کا آرام اسے اس وقت ملا تھا۔ کافی دیر وہ دھوپ کی تمازت سے لطف اندوز ہوتا رہا تھا۔

بیرے نے چائے کی پیالی اس کے سامنے رکھی تو اس کے خیالات کا دھاگہ ٹوٹ گیا۔ آج وہ ضرور آرام سے سوئے گا۔

اس نے جلدی جلدی گرم چائے پی ڈالی، گویا اسے کوئی اشد ضروری کام یاد آگیا ہو۔ پھر اس نے بل ادا کیا اور باہر نکل آیا۔

تھوڑی دیر وہ فٹ پاتھ پر کھڑا سگریٹ پیتا رہا۔ پھر اس نے اس سڑک کا رخ کیا جس پر بہت سے سینما ہاؤس تھے، کافی دیر تک وہ وقت گذارنے کے لئے ایک ایک سینما ہاؤس میں داخل ہوتا رہا اور تصاویر کے سٹلوں کو یوں دیکھتا رہا جیسے اسے ان میں بے حد شوق ہو —— جب وہ اس شغل سے اکتا گیا تو اسے بھوک محسوس ہونے لگی اور وہ ایک نان چھولوں والے کے کیبن کی طرف بڑھ گیا۔ روٹی کھانے کے بعد وہ ایک ایسے راستے پر ہو لیا جہاں بہت کم آمد و رفت تھی —— اس سڑک پر چلتے چلتے اسے ریلوے اسٹیشن کا خیال آیا اور وہ فوراً ہی ادھر چل پڑا۔

دکان کے بعد جب وہ رات گئے تک گھومتا رہا حتیٰ کہ اس کی آنکھیں شل ہو گئیں۔ تب اسے گھر کی یاد آئی —— موسم گذشتہ ہفتے سے بہتر ہو گیا تھا۔ وہ پہلی سی ٹھنڈ نہیں تھی۔ ادھر لگاتار چلنے کے باعث اس کا جسم گرم تھا۔

گلی سنسان تھی۔ محلے کے بازار کی تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ سوائے ایک ریستوران کے جو عموماً دیر سے ہی بند ہوتا تھا — اندر بھی سناٹا تھا اور باہر بھی خاموشی — خاموشی اور ویرانی بھی —— اس کے پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے اور ٹانگیں جسم کا بوجھ سہنے پر احتجاج کر رہی تھیں۔ اس نے دھیرے سے کنڈی کھٹکھٹائی، اس کی بیوی نے دروازہ کھولا اور وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ سب بچے سوئے ہوئے تھے۔

"کھانا لاؤں؟" اس کی بیوی نے آہستہ سے پوچھا۔

"نہیں۔"

وہ کپڑے تبدیل کرنے کے لئے کوٹھری میں چلا گیا۔

جب اس نے جوتوں میں سے پاؤں باہر نکالے تو کھنچی ہوئی، دکھتی ہوئی انگلیوں کو آزادی ملی۔ انگلیوں کو حرکت میں لایا تو ان میں ایک ٹیس سی محسوس ہوئی۔ اس تکلیف میں اسے ایک انجانا سا، انوکھا سا لطف آیا —— اس کی آنکھیں نیند کے خمار سے بری طرح بوجھل تھیں اور بدن کا جوڑ جوڑ ٹوٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا —— اس نے دیکھا برابر والے پلنگ پر اس کی بیوی منہ ڈھانپے لیٹی تھی۔ اس نے اس سے کوئی بات کرنے کے بارے میں سوچا، لیکن تکان اور نیند کے باعث اس پر غنودگی کا غلبہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس لئے وہ بتی بجھا کر بستر پر دراز ہو گیا۔ اس نے لحاف اوڑھا تو وہ گرم تھا —— اس کی آنکھیں آپ ہی آپ بند ہو گئیں۔ بھاری بھاری پپوٹے —— دکھتا ہوا، گرا گرا جسم —— آج اسے بستر میں لیٹ کر بڑا آرام مل رہا تھا۔ نہ سوچوں کی یلغار۔ نہ سونے کی کوشش میں کروٹیں بدلنا —— بس چند ہی منٹوں کے بعد وہ گہری اور پرسکون نیند کی آغوش میں بے سدھ پڑا تھا۔

نشیب

ریاض میرزا

اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا، جسم ٹھنڈے پسینے میں تر ہو گیا، کنپٹی زور زور سے پھڑکنے لگی اور اسے [illegible] دماغ کی شریان پھٹنے والی ہو۔ جانے کب تک وہ اسی حالت میں کھڑا رہا۔ ساکت، گم صم، لرزتے ہاتھوں میں اپنے [illegible] کا بوجھ اٹھائے ہوئے۔ اس کا جی چاہا کہ اس گھر کے در و دیوار کو جلا کر خاک کر ڈالے اور اس آگ میں گھر کے [illegible] سوکھی گھاس کی طرح . . . .

”میں نے کہا نازو کے ابا! ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“ باورچی خانے سے اس کی بیوی کی تیز اور نوکیلی آواز [illegible] سوچ کو تہ و بالا کر رہی، وہ وہیں کھڑا رہا، شاید دوسری آواز کا انتظار کر رہا تھا۔

”نازو کے ابا . . . . . .“

عبدالستار کے چہرے پر ایک زہر خند پھیل گیا اور وہ دروازے کی جانب بڑھنے لگا، آہستہ قدم، تھکا ہارا۔

نازنین اس کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی، جو اس وقت دسویں جماعت میں پڑھ رہی تھی۔ پہلے اس کی بیوی اسے [illegible] ابا کہہ کے پکارا کرتی تھی، عبدالرحمن اُن کا سب سے بڑا بیٹا تھا، جو ان کی شادی کے پانچویں برس میں بڑی دعاؤں اور منتوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ پھر تو گویا دبستان کھل گیا، عبدالرحیم، آمنہ، عائشہ، عبدالکریم اور پھر نازنین، نازنین پیدا ہوئی تو بڑی خوبصورت بچی تھی، گھر کے سارے لوگ اسے بے پناہ پیار کرتے تھے۔ اور ماں باپ تو اسے ہر دم یوں سینے سے لگائے رہتے جیسے وہ ان کی اکلوتی اولاد ہو، اس کا نام بھی انہوں نے سب سے مختلف اور ماڈرن قسم کا رکھا، اور لاڈ پیار کی سبب سے [illegible] گیا، عبدالستار گھر لوٹتا تو سب سے پہلے اسی کا پوچھتا۔

”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ اس کی بیوی نے اس کے چہرے کے تغیر کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”سب ٹھیک ہے۔“ اس نے جلدی جلدی کھانا حلق میں انڈیلتے ہوئے کہا۔

”لگتا ہے جیسے آپ پریشان ہیں، کیا پریشانی ہے؟“

”کوئی پریشانی نہیں، بس ذرا کاروبار کے مسائل ہیں۔“

”کتنی دفعہ کہا ہے، بچے بڑے ہو گئے ہیں، کاروبار سنبھالنے کے قابل ہیں، اب آپ آرام کریں سب کچھ ان [illegible]

”اب ایسا ہی کروں گا۔“

عبدالستار کا کاروبار پھیلا ہوا تھا۔ عبدالرحمن اور عبدالرحیم اس میں پہلے ہی شریک تھے، دونوں بزنس کا کام سنبھالے ہوئے

اور رحیم دوسرے شہروں میں جا کر کتابوں کے آرڈر حاصل کرتا۔ عبدالستار خود دکان پہ بیٹھتا اور یہ ذمہ داری وہ کسی دوسرے کے سپرد کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اگرچہ اس کی دکان دوسری کتابوں کی دکانوں سے الگ تھلگ اور شہر سے کچھ فاصلے پر تھی، مگر چند ہی سالوں میں اس نے بزنس میں اتنی ترقی کر لی تھی، اور دکان اتنی چل نکلی تھی کہ دوسرے دکاندار اس سے جلنے لگے تھے۔

اس نے تیس برس سرکاری ملازمت کی تھی بادقار اور باعزت طور سے ریٹائر ہوا تھا وہ ایک نہایت محنتی سرکاری قواعد و ضوابط کا پابند، انتہائی ایماندار اور قابلِ اعتماد اہل کار تھا۔ افسران اس پہ بھروسہ کرتے تھے اور اس کی حسنِ کارکردگی اور اہلیت و قابلیت پہ خوش تھے، اس نے کبھی حکومتی کاروبار میں نہ تو کبھی تساہل برتا اور نہ کبھی حکام بالا کے اعتماد کو ٹھکرایا تھا۔ اس نے بڑے بڑے سخت گیر اور راشی افسروں کے ساتھ کام کیا تھا، مگر اس کے خلاف اس کے ریکارڈ میں کہیں سرخ اندراج نہ ہوا۔ عمر بھر وہ حکومت کی نہایت اہم اور کلیدی آسامیوں پہ کام کرتا رہا۔ جہاں من برستا، پیسے کی بارش ہوتی، وہ چاہتا تو ملازمت کے چند ہی سالوں میں اتنا کما سکتا تھا کہ اس کی اگلی نسلیں ایک امیرانہ ٹھاٹھ کی زندگی بسر کر سکتی تھیں، مگر وہ جانتا تھا کہ یہ ٹھاٹھ یہیں پڑا رہ جائے گا اس کی اولاد زیادہ ہوتی چلی گئی اور وسائل کم اور سالہا سال سے سخت پریشانیوں کا سامنا ہوتا لیکن وہ خدا کا بندہ انھیں برداشت کرتا اور کبھی تنگ دستی کی شکایت کسی سے نہ کرتا۔

"تمھارا توکل ہمیں تو لے ڈوبے گا۔" اس کی بیوی اسے طعنے دیتی۔ اسے اپنے ہمسائے میں رہنے والے خورشید احمد کی مثال دیتی جو کسی سرکاری دفتر میں ایک ادنیٰ سا ملازم تھا۔ مگر اس کے بچے انگریزی سکولوں میں پڑھتے تھے۔ اس کا ذاتی مکان بھی تھا اور اس کی بیوی نہایت قیمتی لباس پہنتی تھی، گھر میں ٹی وی بھی تھا اور فرج بھی۔

مگر اس کی عاقبت .... وہ اسے سمجھانا چاہتا تو وہ اس کی بات ٹوک دیتی۔" عاقبت کی کون جانے، ہم تو یہاں بھی جہنم ہی میں ہیں۔"

وہ شاید سچ ہی کہہ رہی تھی، وہ سوچتا۔ اس نے میرے گھر میں کوئی سکھ بھی تو نہیں دیکھا، مگر ...... مگر ... رشوت! اور وہ یوں کانپنے لگتا خوف سے، جیسے بخار میں مبتلا ہو، اور اسے یوں لگتا جیسے وہ اپنے رعشہ زدہ ہاتھوں میں کبھی وہ نوٹ تھام نہیں سکے گا جو رزق حرام ہوں۔

اس وقت وہ ایک بے بس، مجبور و مظلوم مجرم کی طرح اپنی روتی ہوئی بیوی کے سامنے کھڑا ہوتا، اور زبان حال سے فریاد کرتا۔

"مت رو، رحمٰن کی ماں، مجھے معاف کر دے، میں بزدل ہوں، ڈرپوک ہوں مجھ میں اتنی ہمت نہیں، میں اپنے بچوں کا قاتل اور تمہارا مجرم ہوں۔"

زندگی یوں ہی گزرتی رہی۔ اس کی بیوی ہر روز اپنے نصیبے کا ماتم کرتی رہی وہ ہر روز اس کے سامنے ایک مجرم کی طرح کٹہرے میں کھڑا ہو کر فریاد کرتا۔ دفتر میں اس کے سامنے ہزاروں کے نوٹ رقص کرتے۔ اس کا دل دھڑکتا، اس کی آنکھیں خیرہ ہو جاتیں، اس کا ذہن منتشر ہوتا مگر اس کا ضمیر

رکتا، اور شام جب وہ دفتر بند کر کے اٹھتا، تو اس کے ہاتھ خالی ہوتے مگر اس کا دل مطمئن، آلودگی کا ایک اور دن گزر گیا تھا، اور اس کا دامن اس میں تر نہ ہوا تھا، وہ بڑے فخر سے باہر نکلتا، آج بھی اس نے اپنا دفاع کر لیا تھا، غلاظت کے اندھے کنوئیں میں گرنے سے اپنے آپ کو بچا لیا تھا، یہ بات وہ اپنی بیوی کو آج بھی بتلائے گا۔

ریٹائرمنٹ پہ اس کی کئی وداعی دعوتیں ہوئی تھیں، اس کی نیک نامی، شرافت، کام سے والہانہ لگن، بے داغ سروس اور بے لوث خدمت اور ایمانداری کی تعریفیں ہوئی تھیں، اس کی تصاویر اخبارات میں چھپی تھیں، ہر روز دعوت کے اختتام پر جب وہ گھر لوٹتا تو اسے اپنے میں ایک بلندی کا احساس ہوتا، ان دنوں پہلی بار اسے یہ احساس ہوا کہ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں ایک بڑا آدمی ہے بڑائی صرف دولت سے نہیں ملتی، جاہ و منصب اور اقتدار ہی اس کا ذریعہ نہیں، بڑائی اور عزت بے لوث خدمت اور ایمانداری سے بھی حاصل کی جاتی ہے۔ اس نے اپنے ماضی کے ایک ایک دن کا حساب کیا اور اسے لگا جیسے ہر نیا دن گزرے ہوئے دن سے زیادہ بہتر، روشن، امید افزا اور قابل فخر رہا۔

اور اب اس کے سامنے مستقبل تھا، صدیوں تک پھیلا ہوا مستقبل، وسیع و عریض پیچ در پیچ، مسائل سے بھرپور فرائض اور ذمہ داریوں کا بوجھ اپنے کندھوں پہ اٹھائے ہوئے، زرد رو مستقبل اور محدود وسائل پنشن نہ ہونے کے برابر اور اخراجات لامحدود تین بچے کالج میں زیر تعلیم اور تین بچے سکول جاتے تھے، ایک بیٹی شادی کی منزل پہ، جو اب جوانی کو خیرباد کہہ رہی تھی، اور اس کی اس وقت سب سے زیادہ فکر تھی، پراویڈنٹ فنڈ کی رقم میں سے وہ دو کام کرنا چاہتا تھا، بیٹی کی شادی اور کوئی کاروبار، شادی کے لئے رشتے کا انتظار تھا دراصل یہ انتظار تو پچھلے کئی برسوں سے تھا، دو تین رشتے آئے مگر پھر انہوں نے خبر تک نہ دی، رشتے کرانے والی وچولی نے ایک دفعہ عبدالستار سے کہا۔

"بھائی جی، لڑکے والوں سے آپ یہ تو کہہ دیا کریں کہ یہ مکان آپ کا ذاتی ہے"۔

عبدالستار کا رنگ یہ بات سن کر پھیکا پڑ گیا، وہ یہ جھوٹ بولنے کے لئے تیار نہ ہو سکا۔

"بہن جی، اس نے پوچھا، میرے اور میری اولاد کے پاس شرافت ہے، کیا اس کا کوئی مول نہیں"۔

وچولی نے رحم بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب میں کہا۔

"بھائی جی، یہ سکہ اب رائج الوقت نہیں"۔

عبدالستار کو یوں لگا جیسے وچولی نے اس کی داڑھی نوچ لی ہو، اور جیسے آمنہ، عائشہ، سکینہ اور نازمین اس کے گرد ایک وحشیانہ ناچ میں مصروف ہوں اور ان کے مونہوں سے آگ کے شعلے نکل رہے ہوں اور ان شعلوں میں ان کی چتائیں جل رہی ہوں اور پھر یکدم ان چتاؤں میں سے ان کی بے گور و کفن لاشیں اٹھ کر اس کی طرف بڑھنے لگی ہوں، ان کے مسخ شدہ چہروں پہ خوفناک ہنسی تھی وہ زبان حال سے پکار پکار کر کہہ رہی تھیں۔

"آخر، تم نے ہمیں جنم کیوں دیا تھا؟"

"تم رشتے کی تلاش جاری رکھو بہن، کسی غریب گھر کا رشتہ ہو، باقی اللہ پہ چھوڑ دو، میں یوں ہی تو بیٹھا نہیں رہوں گا، جلد ہی کوئی

... شروع کروں گا، پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

کاروبار کے لیے اس کے پاس کوئی منصوبہ نہ تھا، اس سلسلے میں اس نے پہلے کبھی سوچا ہی نہ تھا، ساری زندگی ہی وہ دفتر کے کام میں کھپا رہا تھا۔ اب اس نے لوگوں سے معلومات حاصل کرنا شروع کیں، کئی مہینوں کی چھان بین اور معلومات کے بعد اسے دو کام پسند آئے، دواؤں کی دکان یا پھر کتابوں کا کاروبار، دونوں ہی شریفانہ کاروبار تھے۔ ادویات کی دکان شروع کرنے کے لئے زیادہ سرمائے کی ضرورت تھی جو اس کے لئے ممکن نہ تھا، تجربے کے علاوہ اس میں کچھ ایسے رموز بھی تھے، مثلاً بلیک مارکیٹنگ جسے اس کا صاف اور شفاف ذہن قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا، البتہ کتابوں کا بزنس ضرور ایسا تھا جس میں عزت سادات بھی قائم رہتی تھی، اور زیادہ سرمائے کی ضرورت بھی نہ تھی، اور اس میں ناجائز اور گھٹیا ذرائع سے آمدنی بڑھانے کے امکانات بھی بہت کم تھے، یوں بھی اچھی اچھی کتابیں رکھنے اور پڑھنے کا اسے ذوق اگرچہ تھا مگر عدیم الفرصتی اور محدود آمدنی کی بنا پر یہ شوق آج تک تشنہ ہی رہا تھا، چنانچہ طے اس فیصلے پر وہ مطمئن بھی تھا اور خوش بھی، اور اب وہ اسے جلد از جلد عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا، دکان کا ایک خوب صورت سا نقشہ اس نے اپنے دل و دماغ میں سجا رکھا تھا۔

بہت کوشش سے اسے ایک چھوٹی سی دکان مل گئی، یہ دکان اگرچہ شہر سے دور تھی، مگر اس کاروبار کے لئے موزوں جگہ پر واقع تھی، یہاں سے کچھ ہی فاصلے پر لڑکیوں کا کالج تھا، اور لڑکوں کا سکول بھی زیادہ دور نہ تھا، دکان کی کامیابی کے لئے یہ بات خاصی ہمت افزا اور باعث تسلی تھی۔

دکان کی تزئین اس نے بڑے اہتمام سے کی، حسن کاوی اور سلیقے سے اس کی زیبائش کی اور فراخ دلی سے پیسہ لگایا، اپنی بیوی کی مخالفت کے باوجود، اس کے بعد اب کتابوں کے انتخاب کا مسئلہ تھا، اقبال اور غالب کو تو وہ عظیم شعرا کی حیثیت سے جانتا تھا، کبھی کبھار انھیں پڑھنے کا موقعہ بھی اسے ملا تھا، مگر ادبا اور شعرا کے بارے میں اس کی واقفیت بہت محدود تھی، چنانچہ اس سلسلے میں اس نے معلومات اکٹھا کیں، وہ دانشوروں اور ادیبوں سے ملا، ادب کے اساتذہ سے ملا، علما سے بات چیت کی، بڑی بڑی دکانوں میں گیا اور اس طرح اس نے صاف ستھرے اور اعلیٰ پایہ کی کتابوں کی فہرست تیار کی، اعلیٰ ادب کی کتابوں کے ساتھ ساتھ اس نے یہ بھی خیال رکھا کہ یہ کتابیں نفیس اور عمدہ چھپی ہوں، خوب صورت ہوں، اس کا خیال تھا کہ شائستہ لوگوں اور شستہ ذوق رکھنے والوں کے لئے یہ دکان علم و ادب کا کعبہ بن جائے گی، علم کے پیاسے اور ادب کے جویا دور دور سے اس کی زیارت کے لئے آیا کریں گے اور جب دکان سجی تو واقعی اس کے خوابوں کی تعبیر تھی، علم و فن کے شاہکار ہیرے، موتی اور جواہرات کی طرح پوری آب و تاب سے جگمگا رہے تھے۔ ضلع کے ڈپٹی کمشنر نے اس کا افتتاح کیا اور شہر والوں نے بڑے فخر سے "دارالادب" کا ذکر کیا، افتتاحی تقریب میں حاضرین نے عبدالستار کے مقدس ارادوں کی تکمیل کی دعائیں کیں اور داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے مگر حاضرین نے چائے پی اور بل دیئے، کسی نے ایک کتاب نہ خریدی، عبدالستار نے ڈپٹی کمشنر کو دیوان غالب کا ایک نہایت قیمتی نسخہ پیش کیا جو انہوں نے بخوشی قبول کر لیا، ضلع کے دوسرے حکام اور معززین شہر کے دلوں میں بھی یہ خواہش تھی کہ اتنا بیش قیمت نسخہ نہ سہی کچھ کم قیمت کی کتاب انھیں بھی پیش کی جاتی تو یہ موقعہ ایک عہد آفریں اور یادگار تقریب بن جاتا، اگر عبدالستار اتنی استطاعت نہ رکھتا تھا، ہمت

نے رخصت ہوتے وقت للچائی ہوئی نظروں سے ڈپٹی کمشنر کے تحفے کی طرف دیکھا اور حسرت بھری نگاہوں سے علم و ادب کے قدر دانوں کو دیکھتے ہوئے گھروں کو روانہ ہوئے، کچھ لوگوں نے وہیں سے سینما کا رخ کیا جہاں آج جمعۃ المبارک کے دن ایک نئی اور مشہور فلم کا افتتاح ہوا تھا، اور جس کا ٹکٹ حاصل کرنے کے لئے شو ٹائم سے بہت پہلے پہنچنا ضروری تھا۔

وہ باقاعدگی سے صبح نو بجے دکان کھولتا اور رات آٹھ بجے تک بیٹھا رہتا، مگر ایک ہفتے میں پہلے وہ ایک دن کچھ لوگ اس دکان کا چرچا سن کر اسے دیکھنے ضرور آئے۔ انہوں نے کتابوں کی ورق گردانی بھی کی۔ عبدالستار کے اعلیٰ انتخاب کی داد بھی دی اور بغیر کچھ خریدے واپس چلے گئے۔ کچھ نے تبصرہ کے طور پر کہا کہ کتابوں کی قیمتیں تو آسمان سے باتیں کرنے لگی ہیں۔ اس ہفتہ میں ایک خریدار آیا۔ اس نے مقدمہ شعر و شاعری مانگی جو نصاب کی کتاب تھی، عبدالستار نے پیش کی تو خریدار جو ایک طالب علم تھا، نے یہ کہہ کر واپس کر دی کہ مجھے تو اس کا سستا ایڈیشن چاہیے۔ اتنا مہنگا تو میں AFFORD نہیں کر سکتا، اور پھر اسی کتاب میں میری سگرٹ کی دو ڈبیا بھی شامل ہیں، جن کے لئے ڈیڈی مجھے الگ خرچ تو دیتے نہیں، ویسے تو کتابوں کے بغیر بھی کام چلتا ہے مگر ہمارے ایک استاد ہیں جو اس کے خریدنے پہ اصرار کر رہے ہیں، ورنہ کلاس سے نکال دینے کی دھمکی دیتے ہیں یوں لگتا ہے جیسے اس کتاب کی فروخت میں ان کا بھی کمیشن ہے۔"

دیکھنے میں وہ لڑکا جو غالباً انٹر کا طالب علم تھا، بڑا بھولا بھالا سا لگتا تھا، مگر اس کی باتوں میں ایک درشتگی تھی، اس کی نفاست میں بدقماشی اس کے ہاتھوں کی انگلیوں کے پورے سیاہ ہو رہے تھے جو بے تحاشہ سگریٹ نوشی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ وہ ایک شیطانی ہنسی ہنستے ہوئے دکان سے باہر نکلا تو عبدالستار کو یوں محسوس ہوا جیسے کچھ تعفن کم ہو گیا ہو، اس طالب علم کی باتوں پہ وہ جتنا سوچتا اتنا ہی خوفزدہ ہوتا جاتا۔ کیسا زمانہ آ گیا تھا جس وقت وہ طالب علم تھا، وہ تو کچھ اور ہی وقت تھا۔ احترام کا زمانہ، کتابوں کا احترام، استاد کا احترام!

ایک مہینہ گزر گیا، ایک کتاب بکی، "بانگ درا" وہ بھی اس لئے کہ نصاب میں شامل تھی اور شاید اس کتاب میں کسی استاد کا کمیشن نہ ہو، اور شاید اس لئے بھی کہ اس کا کوئی دوسرا یا چیپ ایڈیشن نہیں تھا، ادھر گھر میں ہر لمحہ اس کی مخالفت بڑھتی جا رہی تھی، پراویڈنٹ فنڈ کا روپیہ زیادہ تر دکان کی نذر ہو چکا تھا۔ باقی بڑی تیزی سے گھر کے مصارف پہ خرچ ہو رہا تھا، پنشن بہت معمولی تھی۔ اور آمنہ کے لئے ایک رشتہ بھی آیا ہوا تھا۔ وہ لڑکا کسی دفتر میں ایک معمولی سا کلرک تھا۔ مگر اس کے بہاتی والدین کا مطالبہ تھا کہ لڑکی والے شادی دھوم دھام سے کریں، بارات بھی زیادہ آئے گی اور جہیز بھی خاطر خواہ ملنا چاہیے وہ لوگ اپنے مطالبات میں اس لئے بھی بضد تھے کہ ایک تو لڑکی معمولی شکل و صورت کی تھی اور دوسرے وہ لڑکے سے عمر میں بھی بڑی تھی، اور اس پہ پردہ ڈالنے کے لئے ضروری تھا کہ شادی دھوم دھام سے ہو۔

عبدالستار پہ قبیلداری کا بوجھ زیادہ تھا، رشتہ بھی زیادہ برا نہ تھا۔ جیسے کیسے بھی ہوا، اس نے یہ شادی کر دی۔ اگرچہ وہ کچھ تو نہ ہوا جو لڑکے والے چاہتے تھے بہرحال برادری میں ناک زیادہ نہ کٹی، رقمیں ضرور ہوئیں تو عمر بھر کمائی کی، وہ کمائی سادگی سے لوگوں کو بتایہ دنیا کمال کی شرافت ہے تو لڑکے والے بھی زیادہ خوش نہ ہوئے تھے، حالانکہ اس شادی نے بہت [illegible]
[illegible] تھی اور دکان کا

دکان کی صورت یہ تھی گویا قبرستان ہو۔ سارا دن بیٹھا بیٹھا اخبار پڑھتا رہتا، دوپہر کو مکھیاں مارتا۔ اور شام کے وقت کبھی سامنے والی سڑک پر کسی گاہک کے انتظار میں بھی رہتیں کوئی بھولا بھٹکا گاہک ادھر آن نکلتا تو شیخ ستار کرسی سے اٹھ کر خندہ پیشانی اور خوش اخلاقی سے پیش آتا۔ جیسے بڑے نامور رائٹرز اور شہرۂ آفاق کتابوں کے بارے میں اس سے بات کرتا۔ گاہک بڑی بے دلی سے اس کی باتیں سنتا اور پھر یہ کہہ کر چلتا بنتا کہ آپ تو خود ایک عظیم ادیب معلوم ہوتے ہیں، یا کسی کتاب کا نام لیتا جس کا نام اس نے پہلے کبھی نہ سنا ہوتا۔ دکان بند کرتا تو اس کی اس دن کی آمدن صفر ہوتی، وہ دل مسوس کے بوجھل قدموں اور نیم دلی سے وہ گھر کی طرف قدم بڑھاتا اور سوچتا۔ وہ لڑکوں کا سامنا کیسے کرے گا۔ کس طرح ان کے اور اپنی بیوی کے طعنوں کا جواب دے گا؟ اس کے اندر جو احساس جرم پیدا ہوگیا تھا اس میں ہر نئے دن اضافہ ہوتا۔ اس نے اپنے بال بچوں کو دھوکہ دیا تھا، شاید عمر بھر دھوکہ دیا تھا اور اب اسے اپنے گھر میں یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ اولاد کے دلوں میں اس کے لیے کوئی عزت کسی قسم کا احترام نہ رہا تھا اس کی بزرگی دم توڑ رہی تھی گھر کے سربراہ کی حیثیت سے وہ ختم ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی شخصیت، اس کا وقار مجروح ہو رہا تھا۔ اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اگر یہی صورت رہی، وہ خالی ہاتھ گھر واپس لوٹتا رہا تو اس گھر میں اس کا مقام اس کی ہستی ختم ہو جائے گی۔ گھر کے تمام چھوٹے بڑے افراد اس کے خلاف ہو جائیں گے اور وہ تنہا رہ جائے گا۔ وہ تنہا وہ اس متحدہ طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ اس لئے کہ یہ محاذ حق پر ہوگا اور وہ شکست کھا جائے گا۔ اپنے آپ کو قائم رکھنے کے لئے یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ جینے کے لئے ان سے کنارہ اختیار کرے مر جائے اس طرح وہ ادب میں تو زندہ رہے گا۔ یا پھر اگر وہ جسم کی موت نہیں چاہتا تو اس کی بقا کے لئے اسے کوئی دوسرا پیشہ یا اسی پیشے میں کسی اور صورت کو پیدا کرنا ہوگا یعنی دارالادب کی بجائے کوئی دارالصحت جس میں نسخے کی ادویات پور بازاری میں بکتی ہوں۔ یا پھر کباب جہاں تکے پندرہ روپے سیر اور مرغ کی ٹانگ پانچ روپے میں بکتی ہو اور شام جب وہ اپنے سارے دن کا حساب کرے تو آمدن پانچ سو روپوں سے کم نہ ہو۔ ایک ہمدرد دوست نے یہ مشورہ بھی دیا کہ اپنا پرانا کاروبار، اثر استعمال کر کے سیکرٹوں کی ایجنسی حاصل کرے اس طرح ایک میں ہزاروں بلکہ لاکھوں روپیہ کمائے دنوں میں وارے نیارے ہو جائیں۔ غربت و افلاس کے دلدر دور ہو جائیں اور وہ ایک خوشحال اور باعزت زندگی گذارے۔ کتاب فروشی سے زیادہ ذلیل دھندہ اور کوئی نہیں۔

دھندے کو یکسر تبدیل کر کے نیا کاروبار شروع کرنا تو اسے ممکن نظر نہ آیا۔ سیکرٹوں کی ایجنسی اور ٹھیکے کی طرف اس کا دل مائل نہ ہوا اور ادویات بیچنے کے لئے وہ اپنے دماغ کو تیار نہ کر سکا۔ بہرحال اس نے سوچا کہ وہ ادب کی کتابوں کی بجائے علم کی کتابیں رکھے۔ دارالادب سے دارالعلم بن جائے۔ علم کی کتابوں سے مراد سکولوں اور کالجوں کے نصاب کی کتابیں تھیں۔ چنانچہ رفتہ رفتہ اس کی دکان سے ناول اور افسانوں اور ادب کی کتابیں ہٹتی چلی گئیں اور ان کی جگہ اردو کی پہلی جماعت کے قاعدے، سلیٹیں، تختیاں، پنسلیں سیاہیاں اور دوسری نصابی کتابیں آتی چلی گئیں۔ وہ چند ایک ادب کی کتابیں بڑے دکھ اور افسوس سے اٹھاتا، انہیں لاہور سے نصابی کتابیں لے آتا، وہ اب بھی مطمئن تھا، اس لئے کہ کاروبار میں جس شرافت اور دیانت کا وہ آرزومند تھا، وہ پہلی سی تھی۔ دکان میں اب رونق رہنے لگی۔ سکول کے بچوں سے شام کے وقت اور دن میں کالج کی لڑکیوں سے دکان بھری رہتی، نئی کلاسز

کی ابتدا اور امتحانات کے دنوں میں تو ہجوم اس قدر رہتا کہ اپنی مدد کے لئے اسے اپنے بڑے لڑکے کو بھی اپنے ساتھ دکان پر رکھنا پڑتا سارا دن باپ بیٹا مصروف رہتے، گاہکوں کو چیزیں دیتے دیتے تھک جاتے کبھی تو کھانے کا ہوش بھی نہ رہتا، اور شام جب وہ آمدن کا حساب کرتے تو خالص آمدن پندرہ بیس سے زیادہ نہ ہوتی، مصروف دنوں کے علاوہ باقی دوسرے دنوں میں یہ آمدن پانچ دس تک ہی رہتی، اس کے جوان سال بیٹے نے کاروبار میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔ مگر وہ اس صورتِ حال سے مطمئن نہ تھا وہ اپنے باپ کو مشورے دینے لگا تھا، یہ تو محض 'کمیشن' ہی ہے 'ٹکٹ' تو ہے ہی نہیں، سارا دن ٹانگیں تھکاتے رہو، چیخ چیخ چیخ، اور شام صرف سبزی ترکاری کے لئے پیسے گٹھڑی میں باندھ کر گھر چلو، یہ کموں کا کاروبار اسے تو پسند نہ تھا، چنانچہ اس نے توسیع اور فروغ کا منصوبہ بنایا۔ اور بیکار دنوں میں آمدن کا سامان یوں پیدا کیا کہ فلمی رسالے اور رنگارنگ ڈائجسٹوں سے دکان کو مزین کیا، اور کامیاب ہوا اسکولوں کے لڑکے اور خاص طور پر کالجوں کی لڑکیاں فلمی رسائل کی مستقل اور باقاعدہ خریدار تھیں، فلمی رسالے کی اشاعت کے مخصوص دن سے پہلے ہی وہ ان رسائل کے بارے میں بڑی بے چینی سے پوچھتی رہتیں، اور جس وقت رسائل دکان پر پہنچ جاتے وہ بڑے جوش وخروش، بڑی جستجو اور اشتیاق سے رسائل خریدتیں۔ اور جنسی اور جاسوسی ڈائجسٹوں کی وجہ سے اب دارالادب پر کم عمر بچوں کی بجائے بالغوں اور ننئے نئے نوجوان ہونے والے لڑکوں کا ہجوم رہنے لگا۔ اور یوں یہ دکان چل نکلی، اس کا سہرا دونوں باپ بیٹے کے سر دل پر تھا۔

ادھر شیخ عبدالستار کی دوسری لڑکی کے لئے بھی وہی دو چار ایک رشتے لائی تھی، مگر وہ لوگ گھر بار کی حالت دیکھ کر اسے ناپسند کر گئے تھے، اس کی شادی شدہ لڑکی بھی اپنے گھر میں ایک بدتر اور خستہ حال زندگی گزار رہی تھی، شیخ ستار کو اس کا قلق تھا اور وہ مقدور بھر کوشش کر رہا تھا کہ اب ایسا نہ ہو، وہ دن رات اپنے حالات کو بہتر بنانے میں مصروف تھا، گھر میں تھوڑی بہت خوشحالی ضرور ہوئی تھی مگر لڑکی بیاہنے کے لئے یا رشتہ لینے کے لئے جس شان وشوکت اور طمطراق کی ضرورت ہوتی ہے وہ منزل شاید ابھی دور تھی، اس کی بیوی تو اس غم میں بیمار رہنے لگی تھی، اور کئی بار اس سے کہہ چکی تھی کہ یہ مقدس کاروبار جو اس نے اپنی عاقبت بنانے کے لئے شروع کر رکھا ہے، چھوڑ دے۔

"تو کیا چوریاں کروں، ڈاکے ماروں۔"

"اس کاروبار سے تو وہ بھی بہتر ہیں۔"

کئی بار تلخی ہوئی۔ کئی کئی دن وہ ایک دوسرے سے روٹھے رہے، کئی بار معاملہ اس سے بھی آگے بڑھ گیا۔ ڈاکے نہ مار سکتے تھے تو اتنی فوج بڑھانے کی کیا ضرورت تھی، اب بھی سب کے لئے زہر لے آؤ۔ اور پھر خود اطمینان سے بیٹھ کے علم کا کاروبار کرنا اس کے طعنے خوفناک صورت اختیار کرتے جا رہے تھے،

ایک دن وہ دکان میں تنہا بیٹھا یہی سوچ رہا تھا اور کسی کا سمجھایا ہوا یہ خیال اس کے ذہن میں تقویت پکڑ رہا تھا کہ جوتوں کا کاروبار کرتے اس کے ایک کاروباری دوست نے اسے راز کی بات بتائی تھی۔

جوتوں کے کاروبار میں بڑا فائدہ ہے، دس روپے کا جوتا پچاس میں بیچ دو یا ساٹھ میں، سب چلتا ہے، گاہک صرف ظاہر

... دیکھتا ہے ، اسے خاک پتہ نہیں چلتا کہ اندر کیا ہے ، یہ تو اسے اسی وقت پتہ چلتا ہے جب وہی جوتا دس دن بعد اس کے ... ہے لیکن اسمیں سے آپ کا ضمیر مجروح نہیں ہوتا ، اس لئے خود گاہک نے پسند کیا ہے ۔" میرے نزدیک ۔ اس نے حتمی طور پر کہا ... سے زیادہ منافع بخش کاروبار اور کوئی نہیں ، اور منافع بھی جائز ۔ نہ بلیک کا دھندہ اور نہ ہی اشیائے خوردنی میں ملاوٹ کا چکر ، ... اور گاہک بھی خوش ۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ مشورہ بالکل صحیح تھا ، اور وہ دکان کو تبدیل کرنے کا منصوبہ بھی اپنے ذہن میں تیار کر ... ایک نوجوان اندر داخل ہوا ، اس نے ادھر ادھر کتابوں کو الٹ پلٹ کے دیکھا ، شتار کو یوں لگا جیسے وہ کچھ گھبرایا ہوا ... دو مرتبہ وہ کاؤنٹر تک اس کے پاس آیا اور کچھ کہتے کہتے رک گیا ۔

"آپ کو کوئی خاص کتاب چاہئے ۔"

وہ کچھ سنبھل گیا جیسے دکاندار نے اس کے منہ کی بات پکڑلی ہو ، اور ذرا پراعتماد لہجے میں کہنے لگا "جی ہاں ۔ خاص کتاب ... ہے یہ ایک معنی خیز اور پُراسرار سی مسکراہٹ تھی ۔

"وہ ہے ۔" شیخ ستار نے بڑے ادب سے کتاب کا نام جاننا چاہا ۔

"جی وہ ... کی کتاب ہے ۔" اس کا نام ہے ... ۔" شیخ ستار نے ڈالی بری نظر ڈالی ، مصنف اور کتاب کے نام ، وہ دونوں ... واقف تھا ۔

"... نصاب کی کتاب ہے یا ادب کی ؟"

"جی ، یہ دلچسپ کتاب ہے ، جنرل بک ہے ، آپ کتابیں لینے لاہور تو جاتے ہی ہوں گے وہاں سے مل جائے گی ، میں اس کے ... ایڈوانس رقم دے سکتا ہوں ۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے ، میرا تو یہ کاروبار ہے ، ایڈوانس کی ضرورت نہیں ، میں جمعے کے دن بازار کا اور تلاش کر کے یقینا ... دیکھئے آپ اسے لینے کے لئے ضرور آجائیے ، ایسا نہ ہو میرے پاس پڑی رہے ، کتاب بھلا آج کل کہاں بکتی ہے ؟"

"آپ بے فکر رہیں میں ہفتے کی صبح یا آپ فرمائیں تو جمعہ کی شام کو ہی آجاؤں ۔"

"آپ ہفتہ کے روز ہی تشریف لائیں ، جمعہ کو مجھے واپسی میں دیر بھی ہو سکتی ہے ، ناحق آپ کو آنے کی زحمت ہو گی ۔"

... نصابی کتابوں کی مارکیٹ میں اس نے اس کتاب کو بہت تلاش کیا ، دکانداروں نے ہنسی میں ٹال دیا ، کچھ نے مذاق اڑایا ، ... نے نکھیوں سے اسے دیکھا ، کہیں طنز بھی ہوا ، وہ کچھ سمجھا اور کچھ نہ سمجھ سکا ، بہرحال ایک دکاندار نے اسے کتاب کے ملنے کا پتہ ... دکان کیا تھی ، ایک تاریک سی غار تھی ، کتابیں وہاں بکھری پڑی تھیں ، گھٹیا کاغذ پہ چھپی ہوئی کتابیں ، بغیر جلد کے ، بغیر کسی ترتیب ... ہوئی کتابیں ۔ اس دکان کا دروازہ ایک تنگ و تاریک گلی میں کھلتا تھا ، وہیں سے وہ داخل ہوا ، اسے یوں لگا جیسے دوزخ ... داخل ہو رہا ہو ۔ اور جانے اسے کچھ یوں لگا جیسے اس دوزخ کا ایک در جنت میں بھی کھلتا ہے ۔

دوسرے دن اس نے دکان ابھی کھولی ہی تھی کہ وہ نوجوان آن پہنچا ، شیخ ستار نے کتابوں کے بنڈل میں سے وہ کتاب ... اس کو دی ، لڑکا مسکرایا ، کتاب کی قیمت جو بہت زیادہ تھی بخوشی ادا کی اور تیزی سے باہر نکل گیا ۔

"آج بوہنی تو بہت اچھی ہوئی ہے۔" ستار نے دل میں کہا اور دکان جھاڑنے میں مصروف ہوگیا۔ واقعی وہ ایک اچھا دن تھا۔ سارا دن گاہک آتے رہے، اس دن خوب بکری ہوئی دوسرے دن اس کے پاس جو گاہک آئے ان میں سے اکثر نے اسی کتاب اور اسی قسم کی چند ایک دوسری کتابوں کا مطالبہ لیا، چند ایک نے رقمیں بھی پیشگی جمع کرا دیں۔ خفیہ دکان کے پچھلے دروازے سے باہر جاتے ہوئے ایک کتاب اس نے اپنی جیب میں ڈال لی، سفر میں پڑھنے کے لئے۔ گاڑی میں بیٹھ کر اس نے کتاب جیب سے نکالی اور بڑے تجسس سے اسے بغور دیکھا اور پھر اس کے پہلے صفحے پر نظر ڈالی۔ ایک مظلوم لڑکی کی خود نوشت داستان تھی، دکھ کی داستان مشکلات اور مصائب میں گھری ہوئی ایک معصوم، شریف گھرانے سے تعلق رکھنے والی لڑکی کی کہانی، دوسرا صفحہ اور پھر تیسرا اور پڑھ چکا۔ پھر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، خوف سے اس کے کان سرخ ہو گئے۔ اس کے جسم کا رواں رواں کانپنے لگا، اس کا ہم نشین بھی جو ٹکٹکی لگائے اس کے ساتھ ساتھ پڑھتا جا رہا تھا۔

"صفحہ الٹیے۔" اس نے کہا۔ اور ستار نے بدحواس ہو کر کتاب بند کر دی۔

"آپ نہیں پڑھنا چاہتے تو مجھے دیجئے سفر کے لئے بڑی دلچسپ اور مزیدار کتاب ہے۔"

"نہیں نہیں۔ مجھے اگلے اسٹیشن پر اترنا ہے۔" وہ سخت گھبرایا ہوا تھا۔ اگلے اسٹیشن پر اس نے ڈبہ تبدیل کر لیا، اور سوچنے لگا کہ ان کتابوں کا کیا کرے۔ وہ انھیں اس دریا میں گرا دے گا۔ اس نے سوچا جو ابھی آنے والا ہے، دریا آگیا مگر دریا میں اس بنڈل کو پھینکنے کی اسے جرأت نہ ہوئی۔ اس نے سوچا۔ گھر پہنچ کر وہ انھیں جلا دے گا، خاکستر بنا ڈالے گا، اسے یوں لگا جیسے وہ کوئی جرم کر کے آیا ہو، قتل کا جرم، انسانیت کے قتل کا جرم!

گھر پہنچا تو اس کی بیوی نے اسے خوشخبری دی، رشتہ پکا ہو گیا ہے، اگلے ماہ شادی کی تاریخ بھی مقرر کر دی گئی ہے۔ جہیز کے علاوہ پانچ ہزار انھیں نقد دینا ہوگا۔ رات بھر وہ سوچ میں ڈوبا رہا، اپنے خوابوں میں اس نے کتابوں کے کئی بنڈل جلا دیے مگر پھر جب آنکھ کھلتا تو اسے یوں لگتا جیسے کئی اور بنڈل جمع ہو گئے ہیں، اور وہ ان بنڈلوں کے نیچے پڑا کراہ رہا ہو، اور اس کے پاس کئی دوسری کتابیں خاکستر ہو گئی ہوں، اقبال، غالب، میر، سرسید، حالی، شبلی، آزاد کی کتابیں اور اسے یوں لگا جیسے وہ خود بھی کسی کتاب کا ایک مظلوم کردار ہو، مظلوم اور معصوم، ایک ننگا اور مخش کردار!

عائشہ کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ محلے والوں نے انگلیاں دانتوں میں داب لیں، خود ستار کی بیوی حیران رہ گئی تھی۔

"نیت نیک ہو، تو کاروبار میں خود خدا برکت دیتا ہے۔" ایک براتی نے مرغ کی بوٹی ناک منہ میں دباتے ہوئے کہا۔ "دکان تو چھوٹی سی تھی، پر فضل ربی زیادہ ہے۔ کتابوں کے کاروبار میں پھلتے کم ہی لوگوں کو دیکھا ہے۔"

دوسرے نے فرنی کی ساتویں پلیٹ خالی کرتے ہوئے کہا۔

"کھانا بہت اچھا پکا ہے، اور کسی چیز کی کمی نہیں۔" ایک نے دوسرے سے کہا۔

"پیسے کی بات ہے بھائی۔ پہلی لڑکی کی شادی پہ تو کسی کو پیٹ بھر کر کھانے کو نہ ملا تھا۔"

[illegible]ندمی کا اتنا شہرہ اس چھوٹے سے شہر میں ہوا کہ چند ہی دنوں میں نازمین کے لیے ایک نہایت معزز اور اونچے گھرانے سے [illegible] کیا لڑکا نہ صرف خوبصورت اور نیک تھا بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بڑے وسیع کاروبار کا مالک مگر ناز ابھی صرف آٹھویں جماعت میں [illegible] تھا۔ اس کے سامنے ابھی دو بڑے منصوبے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ پہلے موٹر خرید لی جائے۔ پھر کوٹھی تعمیر کروائے اور اپنا معیارِ زندگی [illegible] بڑھائے پھر ناز کی شادی کرے۔ ناز جو اسے سب سے زیادہ عزیز تھی۔ لڑکے والے یہ رشتہ کسی صورت چھوڑنے کے لیے تیار نہ [illegible] تین سال انتظار کرنے پر بھی آمادہ تھے۔

[illegible] الادب اب تک ایک وسیع کاروباری ادارہ بن چکا تھا۔ عبدالرحمٰن اور رحیم بھی اس میں شریک ہو گئے تھے، رحمٰن دکان [illegible] میں ایک چھوٹا سا پریس لگا لیا تھا۔ اور اب وہ اس قسم کی کتابیں خود ہی چھاپنے لگے تھے اور پھر ایک دفعہ ایسا ہوا کہ رحیم [illegible] بھی خود ہی لکھ لی اور سب سے پہلے رحمٰن کو پڑھائی۔

[illegible] دوسرے کی محتاجی کیوں ہو؟ اس نے اپنے بھائی سے کہا، جب کہ ہم خود ان سے بہتر لکھ سکتے ہیں۔"

[illegible]ن نے کتاب پڑھنے کے بعد کہا "یقیناً یہ کتاب ان سب سے بہتر اور پُرلطف ہے جو آج تک ہم بیچتے رہے ہیں۔"

[illegible] کتاب دو ہی دن [illegible] بعد چھپ گئی، رحیم خود شہر شہر گیا اور ہزاروں کی تعداد میں کتاب بیچ آیا، اسی ماہ میں انھیں کتاب کا [illegible] شائع کرنا پڑا۔ لڑکیوں میں یہ کتاب خاص طور پر بہت مقبول ہوئی، خواتین کے کالج کی تقریباً پچاس فیصد لڑکیوں نے [illegible] اس کی بے حد تعریف کی، دوسری لڑکیوں نے ان سے مستعار لے کر پڑھی، والدین سے چھپ چھپ کر، نصف رات [illegible] روشنی میں، گھر کے غسل خانوں میں گھس کر اور کالج کے چار دیواری کے کسی سنسان گوشے میں بیٹھ کر اور بعض جرأت مند [illegible] تو کلاس روم ہی میں اسے پڑھ ڈالا۔ پھر اسے پڑھ کر افسردہ ہوگئیں، یہ افسردگی کی ایک خاص کیفیت تھی، جو تشنگی کا نتیجہ ہوتی ہے [illegible] جذبات مشتعل ہو گئے اور وہ لاشعوری طور پر عجیب عجیب نازیبا حرکات کرنے لگیں، خالی کمروں کے کونوں میں سرگوشیاں ہونے [illegible] اور کچھ مادر دھاڑ پر اتر آئیں، اپنی سہیلیوں کے ساتھ اور چند ایک نے تو اپنے استادوں سے گستاخیاں بھی کیں، ان کا طرزِ عمل [illegible] رہا تھا، دراصل یہ طرزِ عمل سمجھ میں آ بھی کیسے سکتا تھا، مگر قابلِ رحم حالت ان خاموش طبع لڑکیوں کی تھی جو زبان کھول [illegible] تھیں۔ گھاس زہر کو اپنے جسم میں لحظہ لحظہ اترتا ہوا محسوس کر رہی تھیں۔

[illegible] کاروبار بھی پھیلتا چلا گیا، دوسری دکان شہر کے ایک اور علاقے میں لے لی، ایک دو ملازم بھی رکھ لیے گئے، شیخ مختار [illegible] کی تعمیر کی طرف متوجہ ہو گیا، نقشے تیار کرنے لگا، پھر تعمیر شروع کرا دی اور چند مہینوں میں ایک عظیم الشان کوٹھی تیار ہو گئی، [illegible] نام "قصرِ ادب" رکھا گیا۔

[illegible] ادب تقریباً ایک لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر ہوا، اس کے کمرے میں قیمتی فانوس آویزاں تھے اور باہر سامنے والے [illegible] سنگ مرمر سے بنایا گیا تھا۔ ٹیوٹا موٹر کار بھی خرید لی گئی تھی، اور ضروریاتِ زندگی کے علاوہ تعیش کا سامان بھی کوٹھی میں موجود تھا۔

[illegible] کی چہل پہل بھی تھی، پہلے پہل تو شہر کے لوگ اس تبدیلی کو دیکھ کر حیران رہ گئے، اور سوچنے لگے کہ کہیں کوئی ڈربی کی لاٹری [illegible] ہے یا چھپر پھاڑ کے مولا نے دولت کی بارش کی ہے۔ قارون کا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہے، یا کہیں سمگلنگ کا بیوپار ہے،

اس لیے کہ عبدالستار نے تیس سال کی ملازمت میں اس دولت کا ایک معمولی سا حصہ بھی نہ دیکھا ہوگا اور نہ کبھی سوچا ہی ہوگا کہ ایک دن ان
سے کاموں میں شریک ہوگا، مگر پھر لوگوں کو یقین ہوگیا کہ کاروبار ہی کا فضل ہے۔ ستار کے لونڈے، لاہور میں بھی تو کتابوں کا بزنس شروع
کر چکے تھے

عمارت کی خوب بڑے اہتمام سے کی گئی۔ تقریباً سال بھر شہر بھر کے لوگ کوٹھی کے حسن اور اندرونی تزئین کو سراہ رہے تھے تعریف کر رہے تھے اور جلنے والے جل
معلوم کوٹھی میں کبھی کبھار ہو کا ایک جھونکا سا اپنے بیچ سے گزرتا ہوا محسوس کر رہے تھے یہ احساس تقریباً سبھی کو ہوا جیسے کسی بدروح کے قریب سے گزرتے ہوئے ہوتا
ہوتا ہے، ایک آدھ نے گھر والوں سے تو اس کا ذکر بھی کر دیا، مگر انہوں نے قطعاً نفی میں سر ہلا کر اسے احباب اور کرم فرماؤں کا وہم قرار
دیا، یہ احساس اہلِ خانہ کی نظر میں، محض لوگوں کے جذبۂ حسد کی پیداوار تھا، یہ تعفن ان کے سینوں کے جلنے کے نتیجے کے طور پر پیدا ہو رہا تھا
اہلِ خانہ رات ایک ساتھ بیٹھ کر اس موضوع پر بحث کر رہے تھے، دولت کی جلن خوفناک احساسات کو جنم دیتی ہے، وہ ہنستے رہے،
کھلکھلا کے ہنستے رہے قہقہے لگاتے رہے کبھی کبھار یوں لگتا جیسے یہ قہقہے ہسٹیریائی ہوں۔

عبدالستار نے فیصلہ کیا کہ اب وہ حج کو جائے گا، دنیوی کام تو اب مکمل ہی تھے، کچھ عاقبت کی فکر بھی کرنا چاہیئے وہ دیکھ رہا تھا
کہ اس کے بیٹے اتنی خوبی سے نبھا رہے تھے کہ وہ خود تقریباً عضوِ معطل بن چکا تھا، اور پھر جس رب نے انھیں اتنا سب کچھ دیا تھا
اور وہ بھی اتنی قلیل مدت میں، اس رب کا شکر ادا کرنا فرض تھا، چنانچہ وہ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر بذریعہ ہوائی جہاز حج کی سعادت
حاصل کرنے کے لئے روانہ ہوگیا اور ڈیڑھ ماہ تک زیارتیں وغیرہ کر کے واپس آگیا، اس کے چہرے پہ اب کوئی دوسرا ہی نور تھا
جو دولت، عزت اور شہرت کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ کسی روحانی لگن سے جنم لیتا ہے، تو جلال و جمال کا سنگم ہوتا ہے۔

حاجی عبدالستار ہر چند کہ اب امورِ دنیوی میں حصہ نہیں لینا چاہتا تھا، مگر نازنہ پروین اس کی آنکھوں کا سکھ اور کلیجے کی ٹھنڈک
تھی، جانے کیوں اس کے دماغ میں یہ خیال پختہ ہو چکا تھا کہ وہ سب کچھ جو اسے حاصل ہوا ہے وہ نازنہ ہی کے مقدر سے ہے اور نازنہ
کی شادی ہونا ابھی باقی تھی اور وہ یہ شادی اتنی دھوم دھام سے کرنا چاہتا تھا کہ ایک مثال بن جائے، اور واقعی یہ مقدر ہی کی
تو بات تھی کہ بے شمار رشتے آ رہے تھے، اعلیٰ سے اعلیٰ امرا و شرفا کے ہاں سے، ان کے گھروں سے جن کی شہرتیں اور زمینیں
دور دور تک پھیلی تھیں اور نازنہ ابھی دسویں جماعت کا امتحان دینے والی تھی۔

حاجی عبدالستار دکان پہ اب بہت کم جاتا تھا، زیادہ تر گھر پہ ہی مصروفِ عبادت رہتا، گھر کے سب لوگ آج فلم دیکھنے گئے
تھے اور وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں بڑے فخر سے چکر لگا رہا تھا، ناگاہ اس کی نظر نازنہ کے بستر پہ پڑی اور اس کے قدم
اچانک رک گئے اس نے نازنہ کے تکیے کے نیچے رکھی ہوئی اپنے ادارے کی تازہ ترین کتاب کو پہچان لیا تھا، اس کتاب کا عنوان تھا
"حرامزادی" اور اس کے سرورق پہ ایک عریاں لڑکی کی رنگین تصویر تھی، یہ کتاب اتنی ہر دلعزیز ہوئی تھی کہ اب تک چوری چھپے لاکھوں کی
تعداد میں فروخت ہو چکی تھی اور ابھی اس کی مانگ تھی، اس کتاب کا مصنف اس کا چھوٹا فرزند تھا۔ اور یہ تیور بتا رہے تھے کہ وہ مستقبل
ایک عظیم ادیب بننے والا ہے۔

عبدالستار نے دھڑکتے ہوئے دل اور لرزتے ہاتھوں سے وہ کتاب اٹھائی، اور اسے کھول کر جگہ جگہ سے دیکھا، کتاب

کئی صفحات پہ مختلف فقرے سرخ روشنائی سے خط کشیدہ تھے، اور متعدد مقامات پہ ان کے متن پہ اپنے خیالات کا اظہار کیا گیا تھا، یہ مقامات اور مناظر نہایت فحش تھے، اور رنازنے بڑی فراخ دلی سے اپنے الفاظ میں ان کی داد دی تھی، بلکہ بعض جگہ اضافے بھی کئے تھے۔ جنھیں پڑھ کر حاجی عبدالستار کی آنکھیں شرم سے بند ہو گئیں۔ اسی کتاب میں ایک جگہ اسے رقعہ دکھائی دیا جو رنازنے اپنے محلے کے ایک لڑکے کے نام لکھا تھا، اور جس میں اس کتاب کے کئی جملے نقل کئے گئے تھے۔ اس کے علاوہ اپنے ننگے جذبات اور عریاں خواہشات کا بے دھڑک اظہار کیا گیا تھا اور سچے عشق کا واسطہ دے کر اپنے گرم جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی التجا کی گئی تھی۔

وہ دیر تک اس خط کو اپنے رعشہ زدہ ہاتھوں میں لئے گم سم کھڑا رہا۔ وہ نہیں جانتا تھا کیا کرے اور وہ کر بھی کیا سکتا تھا؟ پہلے تو یہ اس کے ذہن سے گزرا، اس گھر کو آگ لگا دے، بزنس کو آگ لگا دے اور یہ آگ جو دوزخ کی آگ سے کم نہیں، اس کے تن بدن میں پھیل جائے، اور سب کو جلا کر خاکستر کر دے، مگر شاید وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ ایسا کرنے کے لئے جس جذبے، جس جنون کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اس میں کہاں تھا۔ وہ قوت اب اس میں کہاں رہی تھی، جس کے سہارے وہ بیس برس تک زندہ رہا تھا۔ زندہ! وہ اپنے وقت کا سیمسن تھا، مگر اب وہ طاقت اس سے چھن گئی تھی، محروم ہو گیا تھا، کر دیا گیا تھا۔ نہتہ ہو گیا تھا، اس کی آمدنی کو کم کر کے وہ پھر سے تنگ دستی، افلاس اور سپلے چالی کو آواز دینا نہیں چاہتا تھا۔ اب وہ صرف کانپ سکتا تھا، رو سکتا تھا۔

فلم دیکھ کر سب لوگ واپس آ گئے تھے۔ ان کے چہرے دمک رہے تھے جیسے کوئی خوشی چھپا رہے ہوں جیسے ان کے اندر چٹکیاں لے رہی ہو اور جس کا اظہار کرنے سے وہ جھجک رہے ہوں، مگر رناز حیران تھی۔ قدرت اور فطرت کی دولت سے بھی، اپنا برقعہ ایک طرف پھینک کر اس نے کہا

"توبہ، توبہ کس قدر واہیات اور فحش فلم تھی۔"

اس کے بھائیوں نے زیرِ لب مسکرا کر اس کی بات کی تائید کی۔

رنازہ کی بیوی نماز پڑھنے کے لئے غسل خانے میں وضو کر رہی تھی۔

اور ادھر سارے بھائی بہن تفصیل سے فلم کے عریاں رقص اور مناظر پہ تبادلۂ خیالات کر رہے تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بھائی بہن نہ ہوں بے تکلف دوست ہوں اور بے محابا سیکس پہ گفتگو کر رہے ہوں، کسی کلب میں بیٹھے ہوئے۔

"میرے خیال میں اپنی نئی کتاب کا نام بھی میں کچھ اسی قسم کا رکھوں گا، یہ نام لوگوں میں خاصہ پاپولر ہو چکا ہے۔" حرامزادی کے صمد نے کہا۔

باقی بھائی بہنوں نے اس تجویز کی بھرپور حمایت کی۔

حاجی عبدالستار ابھی تک کمرے میں بیٹھا تھا، کسی کو اس بات کا علم نہیں تھا۔ پھر وہ بھاری قدموں سے باہر نکلا، اور حسبِ معمول رناز پروین اپنے باپ سے لپٹ گئی اور عبدالستار کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی بچھو نے اسے ڈس لیا ہو اور زہر اس کے جسم میں اتر رہا ہو، اس نے اپنی بیٹی کو اپنے سے الگ کرنا چاہا۔

"ہم نے آج بڑی سیکسی فلم دیکھی ہے، بڑی خراب ......"۔

اور عبدالستار کو محسوس ہوا جیسے کسی گٹر کا منہ کھل گیا ہو اور تعفن پھیلنے لگا ہو۔ اس نے سے اپنے آپ سے جدا کرنا چاہا، مگر اس نے اپنے باپ کو اور مضبوطی سے پکڑ لیا، اور عبدالستار کو یوں لگا جیسے نازاس کی بیٹی نہیں بلکہ جس نے [illegible] بُری نظر ڈالی۔ "گندم ہے" "اچھی صورت بھی کیا بُری شے ہے" "حرامزادی" اور "خطرناک" کا ایک کردار ہے۔ اس نے دوسرے بیٹے بیٹیاں، اس کی بیوی اور وہ خود بھی سب کے سب اہم کردار ہیں۔ سب کے سب ہیرو، سب کے سب [illegible] مگر کیا ہو سکتا ہے؟

حاجی عبدالستار نے اپنی بیٹی کے ہاتھ کا لکھا ہوا رقعہ اپنے مصنف بیٹے کے بریف کیس میں رکھ دیا تاکہ وہ اس کی [illegible] کا ایک باب بن سکے۔

اس رات جب وہ کھانا کھانے میز پر بیٹھے اور رنگ رنگ کی نعمتیں دسترخوان پر چنی گئیں تو کھاتے ہوئے انھیں یوں [illegible] ہوا جیسے گھر کے در و دیوار سے بُو آ رہی ہو۔ جیسے غلاظت کے ڈھیر لگ رہے ہوں۔ اور پھر یہ بُو ایک خوفناک سمندر بن کر [illegible] میں پھیل گئی۔ جیسے کوئی بدرو بہنے لگی ہو اور جیسے وہ سب اس بدرو میں گر پڑے ہوں۔

بیڑیاں

احمد سعید

"تم بس چلے آؤ"

"یار اتنی جلدی؟ مجھے ذرا پاؤں تو جما لینے دو"

"میں کہتا ہوں، بکواس نہ کرو۔ اسی ہفتے، ہفتہ اور اتوار — چھٹی کے دن — اکٹھے گزاریں گے"

"لیکن پانچ سات پونڈ آنے جانے کا کرایہ؟"

"واپسی کی ٹکٹ میرے ذمے رہی"

[illegible] آٹھ برس بعد میں اپنے عزیز دوست ڈاکٹر اصغر کی آواز ٹیلی فون پر سن رہا تھا، اس سے باتیں کر رہا تھا۔ میری [illegible] تدرے مایوسی کے گہرے سکوت کو توڑتی ہوئی اس کی آواز لندن سے کوئی [illegible] اڑھائی سو میل دور سے آ رہی تھی [illegible] خط مل گیا تھا۔ اس میں میں نے اپنا قیام انگلستان میں مستقل پتہ اور فون نمبر درج کر دیا تھا۔

"[illegible] تمہیں سٹیشن پر لینے آؤں گا۔ آنے سے پہلے اطلاع کر دینا" اصغر نے دس منٹ تک مجھ سے باتیں کر کے فون

[illegible] کا بلند قہقہہ سننے اور نیلی، شفاف آنکھوں میں خلوص چھلکنے اور انگلستان میں، دوسری شادی کئے "جنگل" [illegible] کی داستان اس کی زبانی سننا چاہتا تھا۔

[illegible] لاؤنس میں سے جب میں نے اصغر کو ملنے کے لئے اڑھائی پونڈ کا ریل کا ٹکٹ خریدا تو مجھے اپنے دکھ بھول [illegible] جانے والی چھوٹی سی ریل گاڑی جیسی گاڑی جانا تھا۔ وکٹوریہ سٹیشن، جو سابق برطانوی سلطنت کی مانند بے [illegible] بے شمار پلیٹ فارموں پر کھڑی ایک گاڑی سے۔ اس میں بیٹھتے ہی میری نظروں کے سامنے اصغر اور اس [illegible] چہرے ابھرنے لگے، جیسے کھوئے ہوؤں کا پتہ ملنے پر کوئی ان سے ملنے جا رہا ہو۔ دو ہفتے پہلے اصغر کی بڑی [illegible] کے ہاں آنے کی دعوت دی تھی، باپ جیسا ناک نقشہ، منہ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہنسی [illegible] ہنستی ہوئی اصغر کی بیٹی۔ اس کی لندن میں ہی شادی ہو گئی تھی، اس نے وہیں سے درس و تدریس کا [illegible]

[illegible]

پہلے باندھ دی گئی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ایسی بیڑیاں پہن کر ان حالات کے قیدی، اصغر نے زندگی میں آخری جُوا کھیلا تھا۔ اس نے انگلستان میں ایک انگریز عورت سے شادی کر لی جس نے اسے تین چار برس کے عرصے میں دو بچوں کا تحفہ دیا۔

میں میکانیکی انداز میں ایک نظر انگلستان کے مشہور و معروف ہری ہری مناظر پر ڈال لیتا۔ جب کہ میری آنکھوں کے سامنے اصغر کی زندگی کی جھلکیاں تیزی سے ابھر کر غائب ہو رہی تھیں۔ دھڑ۔ دھڑ۔ دھڑ۔ دھڑ۔ دھڑ کرتی یک لخت دوسری لائن نمودار ہو کر پاس سے گذرتی گاڑی نے میرے خیالات کا تانتا وقتی طور کے لئے توڑ دیا۔ اس کے بعد میری نگاہیں انگلستان کے دیہی مناظر پر پڑیں۔ اس کے صاف ستھرے کھیتوں پر جو گوبر کی گھٹی ہوئی حجامت کی طرح منڈھے ہوئے لگتے تھے۔ جدھر نظر اٹھتی کوئی ذی جان چیز دکھائی نہ دیتی، نہ کوئی مویشی، نہ دوشیزہ یا مٹیار۔ اور تو اور گائے بھینسوں کے گلوں میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آواز تک سنائی نہیں دیتی تھی۔ گاڑی خاصی رفتار سے جا رہی تھی، غالباً ساٹھ ستر میل فی گھنٹہ کے حساب سے یہ راستے میں تین چار سٹیشنوں پر رکی۔ ان کی طرزِ تعمیر سے مجھے ہندو پاک کے ریلوے سٹیشن یاد آ گئے۔ انگریز فاتح نے کس کس جگہ اپنے نقوش چھوڑے تھے۔

اِس دورِ غلامی میں اصغر کی زندگی میں ایک خوفناک موڑ آیا تھا جس میں اس نے دنیا کے تیاگ لے لیا تھا، بیراگیوں کا روپ دھار لیا تھا۔ گیروے کپڑے پہن لیے جو جوگیا رنگ کے چوغے پر مشتمل تھے، بال چھوڑ دیئے اور کلائی میں کڑا پہن لیا ——— اپنی ایک شاگرد سکھ لڑکی سے ناتمام محبت کا نتیجہ! ۔ چونکہ اصغر نے ٹیوشنیں پڑھا پڑھا کر زندگی کے مینارے ہی طے کئے تھے، اس کی منزلیں پار کرتا گیا تھا۔ اِدھر اس کی ناتمام محبت کے واقعہ کو جیسے بھلانے کے لئے اُس کے والدین نے ... کے نشۂ جذبات پر شادی کی منوں مجبول ڈال دی تھی ——— اس کی منت سماجت کر کے اس کی شادی کر دی۔

بیس پچیس برس بعد جب اس کا بس چلا اس نے انگلستان میں پہنچنے کے دو ایک برس بعد ایک انگریز عورت سے شادی کر لی۔ اس نے اس کے بعد تین چار برس میں دو تین کھیپوں میں اپنے تمام بچوں کو انگلستان بلوا لیا۔ لیکن اپنی بیوی کے نام طلاق نامہ بھیج دیا۔ اس کی اس حرکت کی جن لوگوں نے سخت مذمت کی ان میں میں بھی شامل تھا۔ لیکن میں اصغر کے جذبات کا خون نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چونکہ اس کی شادی اس کے والدین نے اصغر سے کی تھی۔ اس میں اس کا کیا قصور تھا۔ میں اُسے اس کی پہلی بیوی کے ناکردہ گناہ کی سزا سے روکنا چاہتا تھا۔ دوسری شادی کرنے سے نہیں۔ میں نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی ہموطن اور ہم مذہب عورت سے شادی کرے۔ ۔ ۔ ۔ اس کے نتیجے میں اصغر کی انگریز بیوی اس سے الگ ہو گئی اس نے اس سے طلاق لے لی، ایک میان میں دو تلواریں نہیں سما سکتی تھیں۔ اس واقعہ کے بعد اصغر کا مجھ سے کیا برتاؤ ہو گا، میں یہ جاننا چاہتا تھا۔ یوں تو میں نے اسے کبھی خفا ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ انتہائی مفلسی میں جوانی بسر کرنے کے باوجود اس میں جانے تلخی کیوں نہیں پیدا ہوئی تھی اور وہ گھر آئے کو خندہ پیشانی سے ملتا اور اس کی حتی المقدور خاطر تواضع کرتا ——— یہ سب چیتے سوچتے

گاڑی میری منزل مقصود پر پہنچ گئی۔

ہم نے پلیٹ فارم میں داخل ہوتی ہوئی ٹرین میں سے دُور سے دیکھا کہ اصغر مخالف سمت سے مجھے ڈھونڈتا آگے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے ہاتھ ہلایا۔ جواباً اس کا ہاتھ ہلا اور وہ ہنسی نکال کر قدرے تیزی سے قدم بڑھا کر میرے استقبال کے لئے آگے بڑھا ---- نیم قہقہہ ---- ہم بغلگیر ہوئے۔

تم نے اچھا کیا آ گئے۔ اس نے مخصوص پرانی چاہت سے کہا تاہم اس میں پہلے سا بے ساختہ پن نہیں تھا۔ ہمارے دو ہیولوں کے انداز میں بغلگیر ہونا جس میں طرفین کافی عرصہ ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے۔ پھر جب میں نے اپنا بیگ اٹھایا، جو اس دوران میں اس سے ملنے کے لئے میں نے ہاتھ کھلے چھوڑنے کے لئے پلیٹ فارم پر رکھ دیا تھا، تو اس نے فوراً میرے ہاتھ سے لے کر خود اٹھا لیا ---- انگلستان میں قلی نہیں ملتے، نہ ہی مسافر چھوٹے چھوٹے بوجھ دوسروں سے اٹھوانا پسند کرتے ہیں یا اس کی اجرت ادا کر سکتے ہیں۔ یہ بیگ ہلکا تھا لیکن اصغر اسے اٹھا کر میری عزت افزائی کرنا چاہتا تھا ---- انگلستان میں قیام کا نتیجہ۔ اس کے آداب و اخلاق کا اثر! گھر آئے مہمان کا اوورکوٹ یا برساتی وغیرہ اتارنے یا پہنانے میں اس کا بوجھ کم سے کم کرنا انگریزوں کے ضابطۂ اخلاق کا ایک حصّہ ہے۔

اسی طرح جب ہم سٹیشن سے باہر نکلے تو اصغر کار سٹینڈ میں پہنچ کر ایک طرف مڑا۔ اس نے ایک گاڑی کے سامنے رک کر اس کا دروازہ کھولا اور مجھے اس میں بیٹھنے کی دعوت دی۔ اصغر کی کار! مجھے اسے خوشحال دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی، ایسے شخص کو اس عمر میں کار کا مالک زندگی بھر چلتے چلتے جس کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے۔

اس نے گاڑی سٹارٹ کی، موڑی اور یہ جا وہ جا ---- راستہ صاف تھا۔ ہمارے ہاں کی طرح کسی گائے، بھینس یا چھکڑے نے اسے روک نہیں رکھا تھا۔

اور گاڑی چند منٹوں بعد صاف کھلی سڑک پر یوں لڑھکنے لگی جیسے بلیرڈ (BILLIARD) کی میز پر اس کا گیند۔

"سناؤ کیسے آئے ----؟"

"کچھ تو طالع آزمائی کرنے اور کچھ تحقیق اور کتاب کے لئے ناشر ڈھونڈنے۔"

اس نے پھر میرے بڑے بھائی، اس کے اور میرے بیوی بچوں کی خیر خیریت پوچھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس میں پہلے سا جوش و خروش، والہانہ پن نہیں تھا، نہ ہی شکوہ شکایت۔ اگر کچھ کہا سنا تو میں نے، بڑے دبے الفاظ، اشارے کنایے میں۔ اس کے جواب میں وہ معنی خیز انداز میں سر ہلاتا رہا جیسے اس نے مقدر سے سمجھوتہ کر لیا ہو! ایسا شخص جس نے آج تک زندگی کی جدوجہد میں ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ چنانچہ میں نے اس کا دل کریدنا چاہا، بڑی احتیاط سے۔

"اچھا، تو پھر خدا کے فضل سے تمہارے پاؤں یہاں خوب جم گئے!" وہ اس کوٹھی کا ڈاکٹر تھا جس میں سے ہم اس وقت گزر رہے تھے۔

وُہ قصبہ جس میں وہ تعینات تھا، سٹیشن سے کوئی بیس پچیس میل دُور تھا۔

"کبھی وطن ـــ اور لاہور ـــ آنے کا بھی ارادہ کیا ہے کہ نہیں؟"

"ـــــ ناصر ـــ کا کیا حال ہے ـــ؟" ناصر اس کا چھوٹا بھائی تھا، لیکن دونوں میں کافی عرصہ سے خط و کتابت بند تھی۔

اس کی وجہ اصغر کا اپنی بیوی ـــ ناصر کی بھابی ـــ کو طلاق نامہ بھیجنا تھا، جو ناصر نے پھاڑ دیا تھا اور بھابی کو کہا تھا کہ جو جی چاہے کرے۔

"کیوں، ابھی تک خط و کتابت ـــ؟"

"ـــــ . . . چھوڑو یار۔"

اس وقت کار ٹنڈ منڈ پہاڑی ٹماٹیلوں اور بے برگ درختوں میں سے گذر رہی تھی۔

"کہاں جاؤں ـــ کہاں ـــ رہوں ـــ" اصغر نے فقرہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔ میرے استفسار کرنے پر کہ ناصر نے اس کے الاٹ شدہ مکان پر قبضہ کر لیا تھا اور ڈاکٹر بننے کے بعد اصغر کی کلینک کی جگہ اپنی کلینک کھول لی تھی۔ اصغر سے کسی قیمت پر چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔ ناصر دنیادار، سیانا آدمی تھا، ایک کاروباری ڈاکٹر۔ اس نے اصغر کی تمام خوبیوں یا کمزوریوں سے گریز کیا جن کے باعث اسے پریکٹس میں نقصان ہوا تھا۔ اس کے برعکس اس نے دوست احباب اور عزیز و اقارب سے فیس لینے کا اصول بنایا۔ بہت کم مریض ہوتے جنہیں وہ دوا داروں میں رعایت دیتا اور کسی کو بل وصول کئے بغیر نہ چھوڑتا لیکن اصغر کی طرح ہر شخص سے بڑی مٹھاس سے بات کرتا۔

مجھے معلوم تھا وہ انہی اصولوں کی بدولت ہزاروں میں کھیل رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے آمدنی میں مستقل اضافہ کرنے کے لئے چند اداروں سے بھی کاروباری معاہدہ کر رکھا تھا۔

اصغر کا جواب سن کر میں قدرے سناٹے میں آ گیا۔ اپنے اکلوتے بھائی کو اصغر نے جس طرح اپنے بچوں کی طرح پالا پوس کر بڑا کیا تھا اور نامساعد حالات میں بھی ڈاکٹری کی تعلیم جاری رکھوائی تھی، نہایت قابل تعریف تھا۔ اس کے جواب میں ناصر نے دو تین برس تک اصغر کے بیوی بچوں کی کفالت کی تھی اور ان سے بڑی شفقت سے پیش آیا تھا اور آخر میں اپنی بھابی کو اس نے طلاق ہونے سے بچا لیا تھا۔

ناصر نے اس کے باوجود بھائی کا احسان نہیں چکایا تھا۔ اصغر کی زبانی یوں لگتا تھا جیسے اس نے اس کا بہت کچھ چھین لیا ہو۔ میرا بھی ناصر کے بارے میں ایسا ہی تاثر تھا۔ جیسے اسے بھائی کو بے گھر کرنے کا ایک بہانہ چاہیئے تھا۔

ع ـــ بالم آؤ ہمارے من میں

قدرے توقف کے بعد اصغر نے اچانک سہگل کا دبو اس میں سے ایک مشہور گانا گانا شروع کر دیا۔ تیس پینتیس بر

..انی فلم اور پرانا گانا جو عاشق کے کردار۔ دیوداس کی ناکام محبت کی عکاسی کرتا تھا۔ یہی دُور اصغر کی بھی ناکام محبت کا تھا ...... وہ گانا گاتے وقت مجھے چند بار معنی خیز انداز میں دیکھ کر مسکرایا اور اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"اصغر، یار مرد بنو ——"

"دکھ کے دن بیت نا ہیں ——" اس نے جواب میں دیوداس کے آخری اور المیہ دوسرے گانے کے بول گائے۔

اس اثنا میں ہم ایک جدید طرز کے قصبہ میں داخل ہو گئے۔ اس کی منصوبہ بندی، نئی عمارات اور ان کی طرزِ تعمیر سے لگتا تھا کہ یہ لاہور یا کراچی کی نئی آبادی کا حصہ ہو۔

اصغر نے ایک دو موڑ مڑے اور گاڑی ایک نئے بنگلے میں جا کھڑی کی۔

بنگلہ بنے نیارا

رہے اس میں کنبہ سارا

اب کے میں نے سہگل کا ایک طربیہ گانا گایا جو اس نے اپنی کسی فلم، غالباً دھرتی ماتا یا پریذیڈنٹ میں گایا تھا۔ یہ گانا بڑا بر موقعہ تھا کیونکہ اصغر کی زبانی پتہ چلا تھا کہ اس نے یہ گھر حال ہی میں خریدا تھا اور اس میں اس کے بیوی بچے آباد تھے۔ ہفتہ اور اتوار کے دن اس کی مطلقہ انگریز بیوی، الزبتھ، کے بطن سے دو بچے اس سے معاہدہ کے مطابق باپ کے ساتھ ہر ہفتہ دو روز گذارنے آ جاتے ہیں۔ ان دن اس گھر میں بڑی رونق ہوتی ہو گی۔ ... یہی تھا اصغر انہیں اُن کی ماں کے ہاں سے لینے مجھ سے چھٹی لے کر چلا گیا۔ وُہ اس وقت بجھا بجھا سا لگتا تھا۔ لیکن اصغر کی بیوی اور بچے مجھے مل کر بڑے خوش ہوئے۔ بچوں کا ایک "انکل" لاہور سے آیا تھا۔

کوئی ایک گھنٹہ میں اصغر اپنے دو مغلیے بچوں کو قریبی گاؤں سے لے آیا جو وہاں سے دس بارہ میل دُور تھا۔ اس وقت وہ خوش تھا۔ اس کے دونوں بچے، جن کی عمر بالترتیب پانچ اور سات برس تھی، اپنے سوتیلے بھائی بہنوں سے زیادہ پیارے لگ رہے تھے۔ میں نے اس دوران میں اصغر کی بیوی سے ان کی نجی زندگی کے بارے میں چند اہم سوال پوچھنے کی جسارت کی۔ اس نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ وُہ آسودہ حال تھے۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ وُہ اب بھی فقط اپنے بچوں کی ماں کی حیثیت سے بات کر رہی تھی، اصغر کی رفیقۂ حیات کی طرح نہیں۔ اس کی تنہائیوں کی ساتھی نہیں، جس کے بننے کے وُہ ناقابل تھی۔

سب نے میری خوب خاطر تواضع کی اور اصغر نے مجھے قصبے کی سیر کرائی۔ اس کی بار میں BEER پلوائی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ مجھے کچھ دیر باہر گھمائے پھرائے۔

اگلے روز شام کو اس نے اپنے بچوں کو چھوڑنے گاؤں جانا تھا۔ اس نے مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ شاید وہ مجھ سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا تھا۔

اس نے گاؤں سے نکلتے ہی گاڑی یکدم تیز کر دی۔ جیسے وہ بچوں کو ان کی ماں کے فوراً حوالے کر کے واپس آنا چاہتا تھا،

ہو۔ ہم دس پندرہ منٹ میں گاؤں پہنچ گئے۔ اصغر نے گاڑی ایک کوٹھی کے باہر روک لی اور بچوں کو باہر نکلنے کو کہا۔ اس نے اُس کے چہرے پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی ــــــ وہ اپنی مطلقہ بیوی سے میری ملاقات کروانا بھی چاہتا تھا اور نہیں بھی ــــ وہ سٹیئرنگ پر سر جھکا کر ایک لحظ کے لئے سوچنے لگا۔ بچوں کی ماں ان کی منتظر لگتی تھی۔ ان کی آواز سُن کر وُہ باہر نکلی اور کار کی طرف بڑھی۔ غالباً یہ اس کا معمول تھا

اس نے آتے ہی اصغر کا شکریہ ادا کیا، پھر بچوں کو پیار کیا۔ اصغر کو مجبوراً میرا اس سے تعارف کروانا پڑا۔ جب اسے پتہ چلا کہ میں پاکستان سے آیا ہوں تو اس نے مجھے اندر آ کر کچھ نہ کچھ پینے کی دعوت دی۔ مجھے اس میں قدرے اصرار کا عنصر بھی محسوس ہوا۔ اخلاق کا یہ تقاضا تھا کہ میں انکار نہ کروں، لیکن اصغر کی اجازت کے بغیر نہیں۔ اس لئے میں نے اس سے نظروں نظروں میں اجازت چاہی۔ اس نے مسکرا کر جھوٹ موٹ کی ہنسی ہنستے ہوئے مجھے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔

الزبتھ خاصی صحت مند اور دلکش جسمانی خطوط کی مالک عورت تھی۔ عمر کوئی چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ قدرے بے تکلف، چُست اور باعزم عورت۔ وُہ اور اصغر ایک دوسرے سے آنکھ نہیں ملاتے تھے۔ میں نے اس لئے وہاں زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا، گو مجھے اس سے ملنے اور باتیں کرنے کی خواہش ضرور تھی۔ میں نے اس کے پیش کردہ مشروبات، میں سے نقطہ کافی پینا پسند کیا۔

الزبتھ نے ادھر اُدھر کی باتیں کرتے کرتے، جن میں بیشتر میرے انگلستان اور اس کے لوگوں کے بارے میں تاثرات کے بارے میں تھیں، مجھ سے مخاطب ہو کر اچانک کہا۔

"مجھے آپ لوگوں سے شکایت ہے۔"

اصغر یہ سُن کر معنی خیز انداز میں کھنکارا، جیسے مجھے اور الزبتھ کو بھی کسی تکلیف دہ موضوع چھیڑنے سے احتراز کرنے کو کہہ رہا ہو۔ میں نے بھی سوالیہ لیکن تجسس انداز میں پہلے الزبتھ پھر اصغر کی طرف دیکھا، اور جواب دیا۔

"کیا ــــ کیسی شکایت؟"

"تم عورت کے ساتھ مرد کو بھی بیڑیاں پہنا دیتے ہو۔" الزبتھ نے قدرے جذباتی ہو کر کہا۔

میں اس کا اشارہ فوراً سمجھ گیا کہ وُہ ہمارے ہاں کے شادی شدہ مرد کو عمر بھر کا قیدی سمجھتی تھی! کہ دونوں کے لئے ایک دوسرے سے الگ ہونا کتنا مشکل اور بعض اوقات ناممکن ہو جاتا ہے۔

"میڈم، بات لمبی ہو جائے گی ــــ دونوں طرف کی ذمہ داریاں ــــ"

"کیا وکٹورین دَور کی باتیں کرتے ہو ــــ آپ لوگ مختصر سی زندگی کو بھی عذاب اک جہنم بنا دیتے ہو۔"

LIZA LEAVE IT ALEASE IT'S OVER (لزا، برائے مہربانی یہ بات نہ کرو۔ یہ معاملہ اب ختم ہو گیا ہے) اصغر نے قدرے لرزتی آواز میں الزبتھ سے درخواست کی۔ اس کے ردِعمل کے طور پر الزبتھ آنسو ضبط نہ کر سکی۔

اصغر جیسے انسان آپ کے ہاں بھی بہت کم ملتے ہوں گے۔ میں نے خود کو بڑا خوش قسمت سمجھا ہوا ہے ——— پالیا" الزبتھ نے جیسے ہوا کو پکڑنے کی بے سود کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں میڈم۔ لیکن فقط انفرادی خوشی کا نام زندگی نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"خواہ مرد جہنم میں عمر بھر جلتا رہے۔ اب۔ اب تو آپ لوگ خوش ہونا —!" الزبتھ نے تنک کر جواب دیا اور اٹھ بیٹھی۔

"یار۔ تم کیا بحث میں اُلجھ گئے۔ کبھی تو انسان کو انسان سمجھا کرو —۔ فرشتہ نہیں — چلو — جس کی زندگی میں ازلی اذیت لکھی ہو۔ اُسے اس کے جہنم میں جلنے دو —" اصغر بھی بے قابو ہو کر اٹھا، میں نے الزبتھ سے گستاخی کے لئے معافی چاہی اور جانے کے لئے اجازت چاہی اور ہم اس کے گھر سے باہر آگئے۔

ع — دُکھ کے دن بیتت ناہیں

اصغر نے پانچ منٹ گاڑی میں خاموش اور مغموم رہنے کے بعد یہ گانا شروع کیا۔

تصویرِ شبِ غم

فاروق خالد

میں صبح کی سیر کو جا رہا تھا کہ ایک نسبتاً الگ تھلگ کوٹھی کے لان میں ایک ننھی منی پیاری سی بچی کو کھیلتے پایا۔ اس کے بال بہت اور ملائم تھے اور پیچھے سے بندھے ہوئے تھے، فراک ہلکا پیازی تھا۔ سفید براق زرد تک جاتے ہوئے موزوں کے باہر جوتے گہرے سرخ رنگ کے تھے۔ وہ اطراف میں لہلہاتے ہوئے پھولوں کو اور زیادہ ہنسنے پر مجبور کر رہی تھی اور ان کے پاس کھڑی جانے کیا باتیں کر رہی تھی۔ وہ مسحور کن حد تک واضح اور خوب صورت تھی۔ میں قریب پہنچتے ہوئے بولا۔

"ہیلو بے بی، آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟"

"کھیل رہی ہوں"۔ اس نے متبسم نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیسا کھیل، کچھ مجھے بھی تو پتہ چلے"۔ میں اس کے ساتھ باتوں میں شریک ہو گیا۔ اور پھولوں کی ہنسی بھول گیا۔

"جی ابھی ابھی یہاں ایک تتلی تھی، نہ جانے کہاں غائب ہو گئی ہے!"

"وہ تو اب بھی یہاں ہے"۔

"کہاں ہے؟" جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو۔

"میرے بالکل پاس ہی"۔ اور میں مسکرا دیا۔

"مجھے تو دکھائی نہیں دیتی"۔ اس نے چونکتے ہوئے پوچھا "کہاں ہے بتایئے نا!"

"یہیں ہے!"

"یہاں کہاں؟"

"یہیں ہے لیکن آپ کو نظر نہیں آ سکتی"۔

"مجھے نظر نہیں آ سکتی؟" وہ اپنی گول مٹول آنکھیں میرے چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے بولی "کیا میری آنکھیں نہیں ہیں"۔ اس کی نگاہیں اُجلی تھیں اور پورا چہرہ وسیع کا سا۔

"وہ تو ہیں، لیکن آپ اس تتلی کو نہیں دیکھ سکتیں"۔

"اچھا آپ ہی اسے پکڑ دیں"۔ وہ اس ساری بحث سے بیزار ہوتے ہوئے بولی اس بچی نے کچھ اس لہجے میں اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا کہ میں بہت کچھ چھوڑ چھاڑ کر جو بھی وہ چاہ رہی تھی کرنے کو تیار ہو جاتا، لیکن میں شرارت کرنے کے موڈ میں تھا چنانچہ اس کی گول مٹول اور بڑی بڑی آنکھوں میں ظاہر ہوتے ہوئے بولا۔

"یہ کیا ہے، میں تو اُسے جب جی چاہے پکڑ سکتا ہوں۔"

"پکڑ سکتے ہیں؟" اُس نے تعجب زدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل پکڑ سکتا ہوں۔"

"تو پکڑ دیجئے نا۔" وہ میری طرف مسکراتے ہوئے بولی اور تمام پھولوں نے بھی ایک لمحے میری جانب یوں دیکھا گویا سفارش کر رہے ہوں۔

"تو کیا واقعی پکڑ دوں؟"

"ہاں ہاں بھئی ذرا جلدی کیجیے۔"

"اچھا پکڑتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا لیکن وہ فوراً ہی میرے ہاتھ کو جھٹلاتے ہوئے بولی "بتلائیے نا کہاں ہے تتلی؟"

"معلوم نہیں ہے۔" میں نے پوری طرح شکست تسلیم کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن آپ تو اُسے پکڑ رہے تھے۔"

میرا متحرک ذہن بالکل ساکن تھا اور میں اُس کے ہلکے گلابی فراک کو دیکھ رہا تھا اور یاد کر رہا تھا کہ مجھے کوئی آواز دے رہا ہے۔ ایک سرگوشی سنائی دی "لیکن آپ تو اُسے پکڑنے جا رہے تھے۔" اُس کی نگاہوں میں اشتیاق تھا اور لہجے میں اک سوال۔ [پھر] اُس نے میرے بالوں کی سمت ہاتھ لہرایا اور چلائی — "وہ رہی وہ رہی۔"

"کہاں، کہاں؟" میں نے پلٹ کر پوچھا۔

"یہ دیکھئے، یہ دیکھئے!"

اور یہ دیکھتے ہوئے میں پیچھے کی سمت بھاگا، جہاں ایک زرد، خوش رنگ تتلی اُڑی جا رہی تھی۔ اِس خوش رفتار تتلی کی پرواز میں ایک جھلاہٹ سی تھی اور ایک پسند آنے والی بے نیازی کیفیت۔ میں بھاگا، دوڑا اور اُس کے پیچھے بہت دور تک دوڑتا چلا گیا۔ تا آنکہ کھیت تھے اور چند ایک مکانات۔ یہ مضافات کا علاقہ تھا اور شہر سے بہت دور، اِس لئے مکانات اور تعمیرات جلد ہی غائب ہو گئیں اور چند درخت قریب آتے دکھائی دیئے، یہ بھی جلد ہی میرے قریب سے بھاگ گئے اور پھر دیکھتے دیکھتے میدان، کھیت شروع ہو گئے، میں پوری قوت سے بھاگ رہا تھا اور تتلی کو پا لینے کی کوشش بے قرار، [میں نڈھال] تھا۔ تتلی گہرے سبز پودوں پر سے ہوتی ہوئی کہیں چلی گئی اور میں اِس بارش کے جمع شدہ ذخیرے کے کنارے کھڑا دیکھتا رہ گیا۔ آسمان گہرا نیلا تھا۔ اور بے حد صاف تھا اور فضا میں روپہلی کیفیت دبے پاؤں چلی آ رہی تھی، لحظہ بعد ہی سورج کی زرفشاں آفتابی کرنیں رات کے نئے پٹے نم کشیدہ دھوئیں کو جیسے کاٹتی ہوئی نمودار ہوئیں اور سماں صاف ہو گیا۔ آگے خودرَو پودوں اور بے ترتیب اُگے ہوئے درختوں کی بہتات تھی اور علاقہ خاصا پُرخیز تھا۔ میں پیچھے مڑنے کو تھا کہ ایک مختصر سی عمارت سے ملحقہ باغ میں ایک چھوٹی سی بچی مرغیوں کو دانہ ڈال رہی تھی۔ اُس کا قد تین مرغیوں کے برابر رہا ہوگا۔ اُس کے بالوں میں ایک سرخ ربن بندھا ہوا تھا اور کپڑے بے حد نفیس

اور عمدہ تراش کے تھے۔ اُس کی رنگت زیتونی تھی اور آنکھوں میں جو چمک تھی وہ قدرتی رنگوں کے ملاپ سے جنم لینے والی چڑیا سے مشابہ تھی۔ اس بچی کے دائیں ہاتھ میں گیہوں کے دانے تھے اور وہ ٹک ٹک، ٹک ٹک کرتے ہوئے مرغیوں کو پاس بلا رہی تھی میں پاس چلا گیا اور فضا میں پھیلی ہوئی نیم گرم پھوار تلے اس لڑکی کو دانہ چگتی ہوئی مرغیوں کے پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے دیکھتا رہا۔ لڑکی نے میری طرف دیکھا تو اس لمحے مجھے صرف اس کے دانت دکھائی دیے، میں بھی مسکرا دیا۔ اُس نے مجھے کچھ کہنے کا موقع نہ دیا اور بولی

"ہماری مرغیاں ہیں۔"

"کتنی ہیں؟" میرے لبوں پر مسکراہٹ ابھی قائم تھی۔

"کتنی ہیں! میں بتاتی ہوں۔" وہ ایک سمت میں گھوم گئی اور ننھے سے ہاتھ کو ٹیلے سے اٹھاتے ہوئے گننے لگی —— "ایک، دو، تین اور اور اور چار۔" . . . . .

"چار ہیں؟" میں نے یوں پوچھا جیسے یقین نہ آ رہا ہو۔

"ہاں چار ہیں، آپ خود گن لیجئے" — لیکن اُس نے مجھے گننے کا موقع نہ دیا اور آخری فیصلہ دے دیا "چار ہیں اور چار۔"

"لیکن آپ نے کہاں سے لی ہیں؟"

"کہاں سے لینی ہیں، ہماری اپنی ہیں۔" اسے جیسے میری باتوں کی سمجھ نہ آ رہی ہو، وہ میری طرف ایک سیدھ میں دیکھ کر بولی۔ "ہم نے بازار سے خریدی ہیں میرے ابو لائے تھے۔"

"اچھا!" میں نے ہنستے ہوئے پھر سوال کیا۔ "کیا آپ اسکول جاتی ہیں؟"

"نہیں! ابھی نہیں۔ ابھی میں صرف کھیلتی ہوں۔"

"اور کیا کرتی ہیں۔"

"اور میں نے کیا کرنا ہے، کچھ بھی نہیں۔ اُس کا لہجہ بڑا کاٹ دار تھا۔ "کھانا کھاتی ہوں، سوتی ہوں کھیلتی ہوں اور اپنی مرغیوں کے ساتھ کھیلتی ہوں۔ اور ہمارے پاس ایک سفید کتا بھی ہے چھوٹا سا، تیز بھاگنے والا۔"

"اچھا — اور کیا کرتی ہو؟"

"اور کچھ بھی نہیں!"

"کیا مطلب؟"

"پہلے آپ مطلب بتائیں۔" وہ بھولپن سے بولی۔ "آپ کیا کہتے ہیں؟" اُس نے یہ پوچھا اور میں فیل ہو گیا۔

ہم باتیں کر رہے تھے کہ اچانک وہ الگ جاتے ہوئے بولی۔ "اب میں چلتی ہوں، مجھے پھول لانے ہیں۔"

"کیسے پھول؟" میں نے اسے ذرا روکتے ہوئے پوچھا۔

"اپنے باغ میں سے۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "ہمارے باغ میں بڑے اچھے اچھے پھول کھلتے ہیں۔" یہ کہتے

ہوئے وہ باغ میں چلی گئی اور سامنے پھیلے ہوئے سبزہ زار میں کھل اٹھی۔ میں اُس کے قریب پہنچا اور بند کرتے ہوئے بولا۔

"میں بھی چلتا ہوں۔"

"کہاں!" اُس نے میری طرف چمکتی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کہاں جائیں گے، مجھے تو بہت سے پھول لانے ہیں۔"

"تو کیا ہوا میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا اور ہم باغ میں نکل آئے۔ یہ ایک عام سا چلڈرن پارک تھا جو یہاں پہ رہائش پذیر لوگوں نے اپنے بچوں کی سہولت اور مصروفیات کے لیے خود ہی ترتیب دے رکھا تھا۔ باغ میں ایک طرف ایک بہت بڑا الکڑی کا بنچ تھا بلندی ٹھیک طرح سے زمین میں گاڑا نہیں گیا تھا کیونکہ اس کا ایک حصہ بہت نیچا تھا اور دوسرا حصہ بری طرح سے اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔ نیچے پہ جو گھاس کبھی تھی وہ بھی جگہ جگہ سے اُدھڑی ہوئی تھی۔ پودے ابھی تازہ تازہ لگائے گئے تھے جن پہ کوئی قابلِ ذکر پھول نہیں لگا ہوا تھا۔ میں نے یہ سب دیکھتے ہوئے اُس سے پوچھا۔

"تمہیں کیسے پھول تلاش کرنے ہوں گے؟"

"تو پہلے آپ یہاں کبھی نہیں آئے۔"

"اوں ہوں! کبھی نہیں۔" میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"تو پھر آپ کیسے پھول تلاش کر سکیں گے۔"

"کر لوں گا۔" میں گویا ظاہر ہوتے ہوئے بولا۔

"کیسے کریں گے؟"

وہ بہت ضدی تھی لیکن میں نے بھی بالکل ایسا ہی جواب دیا۔ "بس کر لوں گا، آپ بتائیے آپ کو کل کتنے پھول چاہئیں۔" میں نے اُس کا بایاں بازو تھامتے ہوئے پوچھا۔ "کس قسم کے پھول ہونے چاہئیں اور کتنے رنگوں میں۔"

اُس نے چپکے سے اپنے لبوں پہ انگلی رکھ لی، جیسے کچھ سوچ رہی ہو اور بولی ——— "چار ہاں کل چار ہونے چاہئیں، نہیں! نہیں پانچ وہ ہنستے ہوئے بولی۔" پانچ اچھے اچھے اور خوبصورت رنگوں والے پھول۔"

"پانچ؟"

میرے اس غیر ضروری حد تک پھیلے ہوئے سوال کے جواب میں اُس نے سر ہلا دیا جو کہ ایک مکمل جواب تھا اور ہلکے سے ہنس دی مجھے یہ ہنسی بڑی بھلی دکھائی دی اور میں نے اُس کے کھلکھلاتے ہوئے بالوں کو ایک طرف کر دیا۔

"ایک تو میں ابھی آپ کو دے سکتا ہوں۔"

"دے سکتے ہیں؟ کیسے! کس رنگ میں۔" اُس کی آواز میں گہری حدت تھی اور لہجے میں جیسے کسی خوش کن جذبے کی مٹھاس حاصل تھی۔

"ڈیک! ـــــ رنگ اُس کا عنابی ہے اور پتیاں گہری سیاہ۔" میں نے بے چین ہوتے ہوئے اُس کے کالے ریشمیں بالوں کو اوپر سے کر دیا اور میرا ہاتھ اُس کے چھوٹے سے معصوم سر پہ کافی دیر سلامت رہا، میری آنکھوں میں نمی تھی اور دل میں ایک آلاؤ۔

"کہاں ہے وہ!" وہ ایک دم سے چلائی۔ "آپ مجھے وہ پھول لاکر دیں۔"

"لیکن میں تمہیں وہ پھول نہیں دے سکتا، کیونکہ تمہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

"مجھے ضرورت ہے، مجھے پانچوں پھول چاہئیں۔ وہ ضد کرتے ہوئے بولی۔" آپ مجھے وہ پھول لاکر دیں لیکن فوراً ہی اُس نے جیسے مجھے میزان میں رکھ دیا ہو اور یک لہجہ صاف بولی۔ "نہیں! مجھے کوئی پھول نہیں چاہیے، میں خود تلاش کر لاؤں گی، آپ...

میں ازحد پریشان ہو گیا اور جلدی سے اُس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا اور اُسے مزید کچھ کہنے سے روکتے ہوئے بولا۔ "نہیں، نہیں ـــــ نہیں! میں جاتا ہوں، میرا انتظار کرنا۔" میں نے اُس کی طرف الوداعی نظروں سے دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔ آگے وادی کھلی جگہ تھی اور ہر سو ایک پُررعب سناٹا طاری تھا جیسے کان لگائے کچھ سن رہا ہوں۔ کبھی کوئی پرندہ خوش الحان آواز میں گاتا اوپر سے گذر جاتا اور پھر وہی تاثر انگیز خاموشی چھا جاتی۔ فضا میں خوشگوار تمازت تھی اور بے قرار لطافت۔ اس پرسکون ماحول کے بیچوں بیچ بادلوں کے سادہ اور پُرپیچ صفحات ورق در ورق اُڑتے چلے جا رہے تھے۔ مجھے اچھے اچھے پھول درکار تھے اور خوشنما رنگوں سے مہین پروں والی تتلیاں۔ آگے ایک کشادہ سڑک تھی جس کے دو رویہ شیشم کے گھنے پیڑ تھے ہیں ان درختوں تلے آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا کہ ایک سمت اسکول جاتی ہوئی بچیاں دکھائی دیں۔ چھوٹی چھوٹی بچیاں گلے میں کتابوں کے بیگ لٹکائے نیچے تلے قدم اُٹھائے چلی جا رہی تھیں۔ اِن کے لباس اُجلے اور کلف لگے کپڑوں میں ایک انجانا مستقبل سمٹا ہوا تھا۔ ہر بچی سی جیتے جاگتے خوش رنگ کھلونے کی مانند متحرک تھی اور چہرے پہ خوشی اور فراغت سے عبارت آشنائی لئے ہوئے تھی۔ پہلو بہ پہلو دو بچیاں ہاتھوں میں ایک تصویروں والی کتاب تھامے گزرتی دکھائی دیں۔ یہ دونوں محویت کے عالم میں رنگین تصویریں دیکھ رہی تھیں۔ میں بھی ان کے ساتھ ساتھ تھا۔

"یہ دیکھو ـــ یہ دیکھو اس تصویر میں اس انگریز لڑکی کا فراک کتنا خوب صورت ہے۔"

"اور یہ جوتے کتنے شاندار ہیں۔" ساتھ چلتی ہوئی بچی نے جواب دیا۔ "مجھے یہ تصویریں بہت اچھی لگتی ہیں۔

"اور مجھے بھی!"

"سچ! ـــ کیا واقعی۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں، دیکھو تو سہی کتنی پیاری لڑکی ہے۔" وہ یک لخظ ٹھہرتے ہوئے بولی۔ "اور یہ دیکھی ہے ـــ ہائے کیسا خوب صورت باغ ہے اور فوارے میں سے پانی بالکل نکلتا ہوا لگ رہا ہے۔"

"اور ادھر دیکھو، یہ گانے والی چڑیا کی تصویر۔"

"ہاں سلمیٰ ـــ لیکن یہ بتاؤ کیا واقعی گانے والی چڑیا ہوتی ہے۔"

"ہوتی کیوں نہیں ہے۔"

"اور ناچنے والی بُلبل؟"

"وہ بھی ہوتی ہے لیکن یہ ...."

"اور چالاک لومڑی؟"

"وہ بھی ہوتی ہے لیکن یہ دیکھو اس تصویر میں پانی میں تیرتی ہوئی مچھلیاں صاف دکھائی دے رہی ہیں۔ کیوں ہے نا۔"

"دکھاؤ ذرا۔" سلمیٰ کی سہیلی اور آگے کو جھکتے ہوئے بولی۔ "اچھا۔ لیکن سلمیٰ ایک بات مانو گی یہ کتاب ایک دن کے لئے [illegible] میں خوب اچھی طرح سے دیکھ کر کل لوٹا دوں گی۔"

"نا بھئی یہ تو میں نہیں کر سکتی اور پھر اگر اور دیکھنے کے لئے آ گئیں تو؟" سلمیٰ نے ابھی یہ کہا ہی تھا کہ پاس سے گزرتی ہوئی [illegible] کی ہم عمر لڑکیاں واقعتاً قریب لپکتی چلی آئیں اور چند ایک جھلاہٹ میں بولیں۔ "ہمیں بھی دکھاؤ، ہمیں بھی دکھاؤ نا۔"

"بس اب ختم۔ اور میں کسی کو نہیں دکھاؤں گی۔" سلمیٰ نے یہ کہتے ہوئے کتاب بند کر دی اور اسکول کے گیٹ میں داخل ہو گئی۔ اب سب کچھ واقعی ختم ہو گیا تھا میں نے ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور قریب آتی ہوئی ایک بس میں بیٹھ کر شہر [illegible] لیا۔ شہر پہنچ کر میں نے دلکش رنگوں والی تصویریں خریدیں جو انواع اقسام کی تھیں اور جن میں رنگوں کا ایک طوفان موجزن تھا۔ تصویریں میں نے ایک لفافے میں رکھ لیں اور وہاں سے ہوتا ہوا ایک بہت ہی مشہور اور قابل دید باغ میں چلا گیا۔ یہاں ایک دوست کی وساطت سے میں نے چند ایک اچھے اچھے دیدہ زیب پھول جمع کئے۔ ان پھولوں میں رنگ قوسوں اور دائروں میں چکر کاٹتے ہوئے اپنا راستہ بھول رہے تھے۔ یہ پھول جو بھول رہے تھے میں انہیں تنہائی کی سرحد سے نکال کر ننھوں کے عزائم [illegible] میں ڈالنے لے چلا۔ اب دوپہر کا سورج میرے سر پہ تھا اور ہواؤں میں جو خنکی تھی وہ مجھے راس نہیں آ رہی تھی۔ مجھے تتلی کے پروں کی بھی ضرورت تھی مگر سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انہیں کہاں سے حاصل کروں۔ میں نے سوچا اگر میں یہ پر نہ لے کر گیا تو وہ بچی ناراض ہو جائے گی لیکن میں کہاں جاؤں اور کس جگہ تلاش کروں یہ سوچ سوچ کر میں تھک گیا۔ تھکاوٹ زچ کر رہی تھی اور میں [illegible] کے ہاتھوں نڈھال تھا۔ میں نے تتلی کو رہنے دیا، اگر نہیں ملتی تو کیا کروں۔ اسے کوئی اچھی سی تصویر دے دوں گا اور وہ بچی جو مرغیوں کو دانہ ڈال رہی تھی اسے ملنے چل دیا لیکن راستے میں اُس کا گھر زیادہ نزدیک تھا جس نے مجھ سے تتلی کے پروں کی فرمائش کی تھی لیکن فوراً ہی ایک دوسرے خیال نے مجھے دبوچ لیا کہ یہ تصویریں جن کی ہیں انہیں ملنا بھی تو ضروری ہے [illegible] ہو کر مبادا۔ اسکول بند ہو جائے، چنانچہ میں نے سب سے پہلے ایسے ہی کیا اور اُس پرائمری اسکول کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے ان بچیوں کی شکلیں اچھی طرح سے یاد تھیں جنھوں نے تصویروں کی آرزو کی تھی اور اُس بچی کا نام بھی ابھی تک ذہن میں تازہ تھا جس کے پاس وہ کتاب تھی، سلمیٰ! ہاں۔" میں مطمئن ہو گیا اور چل دیا مگر اُس جگہ جہاں وہ اسکول واقع تھا، کے گرد و نواح میں [illegible] چٹیل اور صاف تھی اور چار دیواری کے اندر بھی کوئی چہل پہل دکھائی نہ دے رہی تھی۔ میں افسردہ دل لئے بوجھل قدموں واپس لوٹ آیا اور اُس راستے پر ہو لیا جہاں میں صبح سیر کو جایا کرتا تھا مگر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ بچی اس وقت بھی پودوں کے پاس

کھڑی پھولوں سے باتیں کر رہی ہو ـــــ میرے ذہن نے جیسے ایک تھپڑ رسید کیا۔ لیکن دیکھ لینے میں کیا حرج ہے، کچھ عجیب پاگل طبیعت تھی۔ میں چلتا رہا اور وہاں پہنچ گیا۔ کوٹھی کا گریبان کھلا تھا اور کوئی دربان وہاں موجود نہ تھا۔ میں اندر داخل ہوا اور وہاں جتنے پھول تھے سب افسردہ تھے اور دردناک خاموشی کے بوجھ تلے دبے چپ چاپ کھڑے تھے اور اس بچی کا کہیں نشان تک دکھائی نہ دیتا تھا۔ تصویریں اب میرے ہاتھ میں یوں تھیں جیسے جلاوطن لاشیں اور پھول میں اپنے ہاتھ میں یوں پکڑے ہوئے تھا جیسے بے گناہوں کے گریبان۔ وقت ایک بہتے ہوئے آئینے کی مانند میرے سامنے سے گزر رہا تھا اور میں اس میں ابہام و خواب کے لڑھکتے ہوئے تودوں کو گرتا دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً مجھے اس کوٹھی کے طویل رہگزر میں چار بھاگتے ہوئے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر سامنے پہنچا تو دیکھا، وہ لڑکی اور اس سے ذرا دور ایک اور لڑکی باہر کی طرف دوڑی چلی آ رہی ہے۔ مین گیٹ کے قریب وہ ایک بھیل پہنچنے والے کے قریب آ کھڑی ہوئیں۔ میں نے اُس کی طرف مسکرا کر دیکھا اور اُس کے سفید موزوں کے ساتھ براؤن جوتوں کی دوستی پہ بہت خوش ہوا۔ میں اُس کی طرف دیکھتے ہوئے اور زیادہ وضاحت سے مسکرایا شاید کہ وہ میری مسکراہٹ جان لے لیکن اُس نے ایک مختصر سا وقفہ ڈال کر مجھے فوراً فراموش کر دیا تھا۔

"بے بی، یہ تصویریں دیکھیں بھلا کیسی ہیں۔" میرے چہرے پہ ایک بے معنی ہنسی تھی۔ "دیکھیے اچھی ہیں کیا؟" لیکن ان دونوں لڑکیوں نے اپنی نگاہیں مجھے صرف چند سیکنڈ کے لئے دے کر جلد ہی واپس لے لیں اور تب ان میں خوف اور حیرت کی چنگاریوں کو بھر لیا۔

"آپ کا نام کیا ہے؟" میں نے موہوم ارادے کے ساتھ ایک اور کوشش کر ڈالی لیکن اسی دوران اندر سے ایک چندھیائی ہوئی آنکھوں والا عمر رسیدہ شخص نمودار ہوا۔ بچیاں بھاگ کر اُس کے پاس پہنچیں اور میری طرف بے یقینی سے دیکھنے لگیں۔ اُس شخص کے سر پہ عمر کا تاج تھا اور پاؤں میں فراغت کی زنجیریں۔ اس فارغ الاوقات شخص نے مجھے پتھرائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور میں اُسے قریب آتا پا کر بتدریج اپنی مسکراہٹ کو سکڑتا پا رہا تھا کہ وہ دور ہی سے دھاڑا۔ "کیا بات ہے، کیا چاہیے ہے؟"

یہ مجھ سے ایک سوال کیا گیا تھا، میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں، اس ضمن میں اگر مجھے کئی سال بھی ودیعت کئے جائیں تو صحیح جواب نہ دے سکوں گا۔ میں اُلٹا چل آیا اور خود کو فضاؤں میں تلاش کرنے لگا۔ ابھی میں زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ وہ آواز پھر سنائی دی، وہ شخص چلایا۔

"اے! کون ہو تم؟"

"چار آنے پاؤ، چار آنے پاؤ۔" فروٹ فروش نے مجھے قریب آتے ہوئے دیکھ کر آواز لگائی۔ میں اجنبی سایوں کو ساتھ لیے جا رہا تھا تھوڑی دیر بعد میں اسی جگہ پہنچ گیا جہاں وہ چلڈرن پارک تھا۔ اب سہ پہر ہونے کو تھی اور دھوپ میں جو تمازت تھی وہ خنکی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ باغ میں نہ مرغیاں تھیں اور نہ وہ بچی۔ چند بچے جھولا جھول رہے تھے اور بعض پودوں کی جڑوں میں رینگتا ہوا پانی محویت کے عالم میں دیکھ رہے تھے۔ پھول میرے ہاتھوں غفلت کی نیند سو گئے تھے اور تصویریں الگ سہمی ہوئی تھیں۔ میں اسی باغ میں بچوں کے ایک جھنڈ کے پاس گیا، ان بچوں کو کپڑے پہنانے اور سنوارنے میں ان کے والدین نے خاصا اہتمام کیا تھا اور یہ واضح کرنے کی پوری

کوشش کی تھی کہ یہ کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، اُن کی اہلیت کیا ہے۔ یہ بچے ایسے تمام خاندانوں کی مالی حیثیت کی واضح گواہی تھے ان بچوں کے کپڑے ایسے صاف تھے کہ یہ خیال خواہ مخواہ ذہن کی نچلی سطحوں کو تنگ کرتا تھا کہ یہ روز ہی ایسے صاف ونفیس کپڑے پہنتے ہوں گے۔ اِن میں دو لڑکے ایسے بھی تھے جن کی عمر زیادہ نہ رہی ہوگی مگر ان کے پاس ریسٹ واچ موجود تھی اور ایک چھوٹی عمر کی بچی نے کانوں میں بندے اور کلائی میں چوڑیاں پہن رکھی تھیں، تھوڑی دیر وہ بچی بھی آنگن میں جو جسم مرغیوں کو دانہ ڈال رہی تھی، اس کے کپڑے بھی کافی اچھے تھے۔ میں نے اُسے پاس بلایا اور کہا "میں تمہارے لئے پھول لے آیا ہوں"

"تو دے دیجئے" اُس نے صحیح جواب دیا۔ میں نے پھول اُسے دینے چاہے تو اس نے میرے دینے سے پہلے ہی ٹہنیاں جھپٹ لیا اور پرے پھینکتے ہوئے بولی "یہ کوئی پھول ہیں، مرے ہوئے اور دو سال پرانے" وہ اُن مرے ہوئے پھولوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "آپ اچھے اچھے خوب صورت پھول کیوں نہیں لائے"

میں نے اِن لاشوں کو دوبارہ اُٹھا لیا اور سانس لیتے ہوئے دشواری محسوس کرنے لگا۔ "میرے پاس بہت اچھی تصویریں بھی ہیں، آپ انہیں رکھ لیجیے" اِس وقت میرے ذہن میں تصویروں کا اور کوئی مصرف نہیں تھا چنانچہ میں نے یہ سب تصویریں انھیں پیش کر دیں۔ تمام بچے لپکتے ہوئے انھیں لینے کے لئے بڑھے۔ جس بچے کے ہاتھ پر ریسٹ واچ تھی وہ تصویر کو الٹ کر دیکھتا ہوا بولا "یہ کیسی تصویر ہے، اس میں نہ کوئی بلڈنگ ہے اور نہ کوئی محل" اس نے تصویر کو میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "یہ ٹانگوں والا گھوڑا آپ نے کہاں سے حاصل کیا ہے، اسی قسم کے گھوڑے پر کوچوان ہمیں اسکول لے جاتا ہے"

باقی دو بچے میری دی گئی تصویروں کو موڑ تروڑ کر کاغذ کی کشتی بنانے میں مشغول تھے اور سامنے بودوں میں پھیلتے ہوئے پانی میں ڈالنا چاہتے تھے میں نے ان بچوں سے سب تصویریں واپس لے لیں اور نہتے زخم لئے واپس آ گیا۔ جب میں اس خود ساختہ جن سے نکلا تو معلوم ہوا کہ سب تصویریں میں نہیں لا سکا ہوں گو اِن سب کا خیال میرے ساتھ تھا۔ شام دبے پاؤں چلی آ رہی تھی پرندوں کے سایے لمبے ہو رہے تھے۔ جہاں سے اب میں گزر رہا تھا وہاں میرے قدموں کے دائیں طرف کچے مکانات تھے اور بائیں طرف بھی اسی قسم کی رہائش گاہیں تعمیر تھیں۔ گندے پانی کے جوہڑ جا بجا قائم تھے اور ایک عجیب طرح کی بو چہار جانب پھیلی ہوئی تھی۔ دور سے قہقہوں کے چھپاکے آ رہے تھے مگر قریب پہنچنے پر معلوم ہوا یہ آوارہ کتوں کے رونے کی آوازیں تھیں۔ فضا مردہ اور دھوئیں سے لیس دار تھی اور یہاں ایک عجیب نوعیت کی مخلوق اِدھر اُدھر بکھری پڑی دکھائی دے رہی تھی۔ عورتیں کمزور اور نحیف تھیں اور صاف پتہ چلتا تھا کہ انھیں کپڑوں اور اچھی خوراک کی اشد ضرورت ہے۔ یہ عورتیں اپنے مکانوں کے کھلے اور دروازوں سے بے نیاز صحنوں میں گھریلو کام کر رہی تھیں، نل سے پانی نکالتے ہوئے اِن کے جسم ایک طے شدہ پروگرام کے تحت جنبش کرتے دکھائی دیتے تھے اور چہروں پر مسکراہٹ تھی اور نہ رنج بلکہ ایک مستقل قسم کی خوفناک رضامندی گہرائی تک کھدی ہوئی تھی۔ جو مرد تھے وہ بیٹھے حقہ پی رہے تھے، اونچی اونچی آوازوں میں باتیں کرتے سنائی دیتے اور یا پھر وحشت کے عالم میں اپنے بچوں کو بے دردی سے پیٹتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ لوگ اِس قدر بے کار اور عام تھے جیسے دھوپ کی کرنوں میں جھلسے ہوئے خالی ذرات۔ میں جلد از جلد یہاں سے نکلنے کو بے تاب تھا کہ اِس صحرائے وحشت کے آخری سرے پر دھول میں لپٹی ہوئی ایک کم سن بچی آہ و زاری کرتی دکھائی پڑی۔ وہ

وقفوں سے رو رہی تھی اور اس کے غلیظ اور میل سے پُر ہوئے رخساروں پر آنسوؤں کی بہتی ہوئی لکیریں یوں دکھائی دے رہی تھیں جیسے یہ قدرت کی صناعی بے کار پر خطِ تنسیخ کھینچ رہی ہوں۔ شام کے پھیلتے ہوئے اندھیرے میں اس کا ناتواں وجود ایک مظلوم ہیولے کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ یہی تماشا اگر کسی اسٹیج پر یا کسی کلچرڈ سوسائٹی کے ترتیب کردہ پروگرام کے ذیل میں آتا تو یقیناً تفریح بن جاتا مگر اس جگہ زندگی کے دم گھونٹنے والے گھٹے گھٹے ماحول میں، مردار خور بستیوں کے بیچوں بیچ ایک دوسرے سے متصادم اور بے تکلی سطح پر پھیلی ہوئی بیہودہ سازشوں کے درمیان یہ روتا ہوا بے مایہ جسم مجھے ایک گالی کی طرح لگا۔ میں قریب پہنچا، بچی کی عمر یہی کوئی آٹھ نو سال رہی ہوگی مگر اس کے رونے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ یوں لگتا تھا جیسے اُسے مسلسل کئی سال تک اذیت دی جاتی رہی ہو۔ اُس کے ہونٹ سوجے ہوئے تھے، جنھوں نے خوبصورت اور چمک دار دانتوں کو بھی بہت حد تک بدوضع بنا دیا تھا۔ اس کے سر کے بال آپس میں الجھ کر رہ گئے تھے جیسے ایک دوسرے سے دست و گریباں رہے ہوں۔ پورے چہرے پر ایک ناقابلِ بیان تلخی چھائی ہوئی تھی جسے آنسو دھونے میں ناکام رہے تھے۔ میں نے قریب پہنچ کر اُسے دلاسا اور پیار سے اُٹھانا چاہا مگر وہ اُسی حالت میں پڑی رہی اور میرا ہاتھ فضا میں سے ہوتا ہوا خاک سے جا لگا۔ اُس کا دایاں بازو کہنی کے اوپر سے غائب۔ اس نے ایک پھٹے رنگ کا میلا خوردہ فراک پہنا ہوا تھا جو اس مفلوک الحال بچی سے زیادہ خاک دھول اور وقت کی مار کھائی ہوئی ایک بہت پُرانی حقیقت کی ملکیت معلوم ہوتا تھا۔ اس اپاہج اور معدوم ہوتی ہوئی بچی کے پورے وجود میں ایک ایسا کرب سمٹا ہوا تھا جسے اگر میں بیان بھی کرنا چاہوں تو نہیں کر سکتا۔ میں قریب ہی بیٹھ گیا اور اس کے بدرنگ چہرے پر لرزاں و ترساں ہونٹوں کو بمشکل خشک کرتے ہوئے بولا۔

"مُنّی تم کیوں رو رہی ہو، کیا بات ہے؟" میری آواز میں گہری شدت تھی "شاباش چُپ ہو جاؤ، تم رو نہیں" میں کوشش کے باوجود اُسے اپنے آپ سے مخاطب نہ کر سکا، یہ خوف لئے جیسے یہ میرا جملہ نہیں سمجھ پائے گی اور مجھے بعد ازاں تغیر و تبدل کے احساس تلے ہلاک ہونا پڑے گا۔ وہ اب خاموش تھی مگر ہچکیوں پر سوار ایک نامعلوم منزل کی طرف رواں تھی اور جب میں نے اُسے دیکھنے کے لئے تصویریں دیں تو وہ یک لخت رک سی گئی اور ایک مدھم سی بے جان مسکراہٹ اُس کے لبوں پر طلوع ہوتی دکھائی دی یہ بعینہٖ وہی مسکراہٹ تھی جیسے مرنے کے بعد لاش کے چہرے پر ابدی طور پر ثبت ہو جاتی ہے۔

"کیا بات ہے، تم کیوں رو رہی تھی؟" میں نے اور قریب ہوتے ہوئے پوچھا "کیا ہوا، بولو کیا بات ہوئی ہے؟" رات کا اندھیرا پھیل رہا تھا اور وقت گھلنے کے ساتھ ساتھ اس بچی کے چہرے کے نقوش دم بہ دم غیر واضح ہوتے جا رہے تھے اور یہ پھیلتی ہوئی سیاہی انھیں پوری طرح سے مٹانے میں مصروفِ عمل تھی۔ آسمان بتدریج سیاہ ہوتا جا رہا تھا اور زمین کے اس خطے کے عین اوپر اپنا وجود مٹا دینا چاہتا تھا۔ میں نے تمام تصویریں اسے دے دیں اور پھول بھی اور بولا۔

"یہ اچھی اچھی خوب صورت تصویریں، انھیں تم رکھ لو اور یہ سارے پھول بھی تمہارے ہیں۔" میں ایک تصویر اُسے دیتا ہوا بولا۔ "دیکھو کتنے خوب صورت درخت ہیں اور نیچے ایک ہرن بھی کھڑا ہے۔"

وہ اچانک کھڑی ہو گئی اُس کی حرکت میں ایک اضطرابی کیفیت پنہاں تھی اور چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی ایک طرف کو چل دی۔

پھول زمین پر پڑے رو رہے تھے اور تصویریں حسن و خبر سے عاری اس جُدا ہوتے ہوئے ماحول میں سے نکلنے کو بے تاب تھیں اور وہ لڑکی اپنی آنکھوں کو لئے، اپنے نازک رخساروں اور سیاہ بالوں کی ویران لٹوں کو لئے دور اور دور لحظہ بہ لحظہ ایک گناہ گار جیسے کی مانند تاریک تر ہوتی جا رہی تھی۔ واپس آ کر میں نے کچھ بھی نہ کھایا اور بستر پر لیٹ گیا، جوتے ویسے ہی پاؤں میں تھے اور آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔ اندازاً کوئی بیس پچیس منٹ بعد کا عمل ہوگا کہ وہی لڑکی مجھے ملنے آئی، اُس نے وہی بوسیدہ فراک پہنا ہوا تھا اور چہرے پر آنکھیں لئے ہوئے تھی میں نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیئے جیسے اُسے پکڑ کر قریب کر لینا چاہتا ہوں لیکن مجھے اُس کا صرف بائیاں بازو اپنے کی طرف لپکتا دکھائی دیا اور یہ وضاحت جانتے ہوئے نامعلوم کس سوچ نے میرے شعور پر دستک دی کہ میں بھی اپنا بائیاں بازو نہ [illegible] ہچکیوں وہ میرے ہاتھ کے سہارے پاس آتے ہوئے بولی۔

"یہ سب پھول آپ وہاں بھول آئے تھے اور تصویریں بھی وہیں چھوڑ آئے تھے، یہ آپ کی ہیں انھیں رکھ لیں۔" اُس نے میری طرف بڑھا اور کہا "جب پیٹ بھوکا ہو تو حسن کوئی معنی نہیں رکھتا اور تب خوبصورتی کی تعریف ممکن نہیں رہتی۔"

میں نے تصویریں لے کر ایک طرف رکھ لیں اور کوشش کرتا ہوا بولا "آپ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کیسے آئی ہیں یہاں اتنی۔۔۔"

"میں آپ کو ملنے آئی ہوں، آپ میرے لئے پھول لائے تھے اور اچھی اچھی خوبصورت تصویریں اور میرے پاس آنسو تھے اور حالات، آنسوؤں نے ان تصویروں کا رنگ بگاڑ دیا تھا اور دھول نے پھولوں سے روشنائی چھین لینی تھی چنانچہ سوچا آپ کو واپس کر آؤں" اُس کی آواز میں لرزتے پتوں کی سی سرسراہٹ تھی۔ "میں ایک ہی طرح کی لڑکی ہوں اور ہم سب کے آنسو بھی ایک سے ہیں۔ جیسے ہمارے خون کا رنگ ایک جیسا ہے۔ یہ مختلف تصویریں جو مختلف خوب صورتیاں لئے ہوئے ہیں آپ انھیں دیں جن کے پاس کئی طرح کے اور کئی رنگوں میں موزے ہیں۔ جن کی نازک اور کم عمر کلائیوں میں چمکتی چوڑیاں ہیں یہ تصویریں اُن ہاتھوں میں ہی جچ سکتی ہیں۔ آپ اگر مجھے کچھ دینا چاہتے ہیں تو کھانا لا کر دیں جس کا ہر لقمہ مشکل اور روٹی کی ہر صورت بعینہٖ وہی صورت ہوتی ہے ان تصویریں لا کر دیں تو اچھا ہے، اِن کاغذی تصویروں اور خوشنما پھولوں کو میں کیا کروں۔" اُس کے لبوں پر میں نے پہلی مرتبہ ایک غیر فانی مسکراہٹ پھیلتے دیکھی۔

"میں آج رات تمہارے پاس آئی ہوں لیکن میں سب کے پاس جانے کو تیار ہوں۔ میں ہر ایک کے پاس جانے کو تیار ہوں صرف امید کی اِس بجھتی ہوئی شمع کو ساتھ لئے کہ کبھی تو کوئی محسن اور ہمدرد دکھائی دے گا۔"

"سنو تمھیں کیا چاہیے۔" میں نے چپکے سے پوچھا بھلا کتنا کچھ تمہارے لئے کھانے کو لاؤں۔"

وہ ایک فلک شگاف قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ آواز کے اِس بہاؤ میں بلا کا شور تھا، جب تلاطم ختم ہوا تو وہ بڑی مشکل سے ہنسی جذب کرتے ہوئے بولی۔

"میں جاتی ہوں، آج کی رات بھی بیکار گئی۔" وہ جاتے جاتے مڑی اور ایک لہجہ گویا ہوئی۔ "پہلے میرے باپ نے میری امی کو مارا اور وہ برتن توڑ دیا جس میں ہم سب پانی پیتے تھے، اُس نے سب کو گالیاں دیں اور پھر خود کو گالیاں دیتا

ہوا باہر چلا گیا۔ بعد میں ماں نے مجھے بہت پیٹا اور وہاں اُس کچی مٹی پر زور سے پٹختے ہوئے واپس چلی گئی —— ہمیں کس نے کے لئے بہت کچھ چاہیئے اور پھر کل رات شمو بھی تو رو رہی تھی، اُسے بھی تو بھوک لگتی ہے، اُس کا چھوٹا بھائی بیمار ہے اُسے بھی روٹی چاہیئے اور وہاں بھی کچھ ضرورت ہے اور وہاں اور وہاں بھی تو کچھ ضرورت ہے اور وہاں اور وہاں —— اور وہاں بھی ضرورت ہے"

صبح چار بجے میری آنکھ کھل گئی، جوتے ابھی تک پاؤں میں بندھے تھے اور میں آدھا بستر پہ اور آدھا بستر کے نیچے پڑا سو رہا تھا۔

ابّو

سلمان معید

سردیوں کے دن تھے۔ نصرت اپنے بنگلے کے رنگا رنگ پھولوں سے بھرے وسیع و عریض لان میں پچھلے پہر کی مدھم اور اُداس دھوپ میں تنہا بیٹھی اپنے شوہر میجر سرفراز کے لئے، جسے ہندوستان کی قید میں صعوبتیں جھیلتے ایک برس ہو چکا تھا، سویٹر بُن رہی تھی۔ اتنے میں اس کا ڈھائی تین سالہ گول مٹول سرخ و سپید بچہ، پپو بھاگتا ہوا آیا اور اپنی ماں کے ساتھ لپٹ کر اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بے حد ہراساں لہجے میں اپنی توتلی آواز میں بولا:

"امی امی۔ باجی لوتی ہیں!"

یہ سن کر نصرت نے سویٹر بننا بند کر دیا اور دونوں ہاتھوں میں یوں سر پکڑ لیا جیسے کسی ناقابل حل مسئلے کا حل ڈھونڈ رہی ہو۔

"امی، کیا ہوا؟ درد ہے سر میں؟ دبا دوں؟" پپو نے ماں کی گردن میں اپنی گداز باہیں حمائل کرتے ہوئے انتہائی سنجیدگی سے پوچھا۔

"نہیں بیٹا۔" نصرت نے رقت بھرے لہجے میں یہ کہتے ہوئے فرطِ محبت سے بچے کو اپنے ساتھ بھینچ کر اس کا ماتھا چوم لیا۔ اور پھر اسے گود میں اُٹھا کر اپنی آٹھ دس سالہ اکلوتی بیٹی شانہ بیگم کو، جسے وہ پیار سے بے بی کہتی تھی، چپ کرانے اپنے گھر کے اندر چلی گئی۔

بے بی اپنے کمرے میں، ہاتھوں میں اپنے ابّو کی تصویر لئے، بستر پہ لیٹی سسکیاں بھر بھر کر رو رہی تھی۔ نصرت جونہی اندر داخل ہوئی اس نے کروٹ بدل لی جیسے وہ اپنی ماں سے اپنی اشکبار آنکھیں چھپانا چاہتی ہو۔ نصرت پپو کو گود سے اتار کر بے بی کے بستر پہ بیٹھ گئی اور اپنے دل میں اُٹھتے غم کے طوفان پر قابو پاتے ہوئے بولی:

"بیٹی، تم آج پھر رو رہی ہو۔ تمہارے آنسو تقدیر کا لکھا مٹا تو نہیں سکتے۔" اس نے بے بی کا کاندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "چپ ہو جاؤ بیٹی۔ اللہ نے چاہا تو تمہارے ابّو جلد لوٹ آئیں گے۔" یہ کہتے کہتے اس کی آواز لڑکھڑا گئی۔ اس نے بہت چاہا کہ اس کی آنکھوں کے کونوں سے نکلتے آنسو واپس پلٹ جائیں، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ جبھی ننھے پپو نے اپنے ننھے منے ہاتھوں سے تالیاں بجا کر اچھلتے ہوئے، جیسے کوئی پہیلی بوجھتے ہوئے کہا:

"امی لوتی ہیں، امی لوتی ہیں۔"

"میں کب رو رہی ہوں بیٹا، رو تو تمہاری باجی رہی ہے۔" نصرت نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے یوں کہا گویا وہ کوئی

انتہائی بلند حوصلہ عورت ہو۔ منہ دوسری طرف کئے لیٹی، چہرہ بازوؤں میں چھپائے بے اختیار آنسو بہاتی بے بی کی سسکیاں اور بلند ہوگئیں۔ "بیٹی، اللہ پہ بھروسہ رکھو۔" یہ کہتے ہوئے نصرت کھڑی ہوگئی اور اپنی ساڑھی کے پلّو سے دوبارہ آنسو پونچھتے ہوئے گھوم کر بستر کے دوسری طرف چلی گئی۔ ماں کو اپنے سامنے پاکر بے بی نے تکیے میں منہ چھپا لیا۔ جلدی میں اس کے باپ کی تصویر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر بستر پہ گر گئی۔ اس نے جھٹ سے تصویر اٹھانا چاہی، لیکن اس سے پہلے اس کی ماں نے اُسے اٹھا لیا۔ تصویر کے نیچے یہ حروف تحریر تھے:

"پیارے ابو، آپ اب میرے خوابوں میں کیوں نہیں آتے؟"

تصویر کے نیچے لکھے اس سوال نے نصرت کے حوصلے کے تمام بند جیسے ایک دم سے توڑ دیئے۔ اس کے سینے میں پلتا غم آنسوؤں کی صورت اس کی آنکھوں سے بہنے لگا۔ پل بھر میں اُس کے رخسار بھیگ گئے۔ "چپ ہو جاؤ بیٹی۔ تمہارے ابو تنہا ...... دشمن کی ...... قید میں نہیں۔" نصرت سسکیاں بھر رہی تھی۔ "...... ان کے ساتھ ...... اور بھی ...... بہت سی بیٹیوں کے ...... باپ ہیں ......" اس نے تصویر کے نیچے لکھا ہوا بے بی کا سوال دوبارہ پڑھا اور دو غم سے زور زور سے رونے لگی۔ "چپ ہو جا بیٹی ...... حوصلہ کر ...... صبر سے کام لے۔" وہ روتے ہوئے اپنی بیٹی کے سر میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

یہ منظر اس گھر میں کئی بار دیکھا جا چکا تھا۔ کبھی ماں بیٹی کو چپ کراتی اور کبھی بیٹی ماں کو۔ دونوں چھپ چھپ کر رونا چاہتیں لیکن ننھا پپو جو سمجھ بوجھ کی سرحد سے ابھی بہت پرے تھا کبھی اپنی باجی امّی کے رونے کی اور کبھی اپنی امّی کو اپنی باجی کے رونے کی خبر کر دیتا۔ اور یوں کبھی ماں بیٹی کی ڈھارس بندھاتی اور کبھی بیٹی ماں کی۔ اسی دوران پپو انہیں سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے ایک طرف کھڑا رہتا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی امّی اور باجی کیوں اور کس لئے روتی ہیں اس نے نہ تو کبھی اپنی باجی کے آنسوؤں کا ساتھ دیا تھا اور نہ اپنی امّی کے آنسوؤں کا، کیونکہ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ "ابو" کسے کہتے ہیں ــــ اگرچہ اس نے ہوش سنبھالنے سے لے کر اب تک یہ لفظ بارہا سنا تھا اور اپنے ابو کی تصویر بھی دیکھی تھی، لیکن یہ تصویر اسے ابو کا مفہوم نہ سمجھا سکی تھی ــــ اس کے علاوہ چونکہ اس نے اپنی باجی کو ابو کی تصویر کے سامنے ہمیشہ روتے ہوئے ہی دیکھا تھا اس لئے اس کا خیال تھا کہ ابو کے لئے صرف رویا ہی جاتا ہے، ہنسا نہیں جاتا۔ جبھی ایک رات اس نے اپنی امّی کے ساتھ بستر پہ لیٹے لیٹے بے ساختہ پوچھا تھا: "امّی، کیا ابو کے لئے صرف روتے ہی ہیں؟"

اس اچانک سوال پہ نصرت چونک گئی تھی اور ننھے پپو کو سینے کے ساتھ لگا کر بلک بلک کر رونے لگی تھی۔ اور ماں کے آنسوؤں نے جیسے پپو کے اس خیال کی تصدیق کر دی تھی کہ ابو کے لئے صرف رویا ہی جاتا ہے، ہنسا نہیں جاتا ــــ اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ آئے دن اپنی امّی سے ابو کے بارے میں عجیب عجیب سوالات پوچھا کرتا:

"امّی کیا ابو بھی ہنستے ہیں؟"

"امی، کیا ابو بھی لڑتے ہیں؟"
"امی، کیا ابو بھی ٹی۔وی دیکھتے ہیں؟"
"امی کیا ابو بھی کار چلاتے ہیں؟"

اور جب اُسے ان تمام سوالوں کا جواب اثبات میں ملتا تو وہ کسی سوچ میں پڑ جاتا اور اپنی بڑی بڑی سیاہ اور چمکیلی آنکھیں مٹکاتے ہوئے انتہائی بھولپن سے کہتا:۔

"تو پھر (پھر) انکل بھی تو ابو ہی ہوئے۔ ڈرائیور بھی تو ابو ہی ہوا۔ وہ بھی تو کار چلاتا ہے۔ وہ بھی تو ہمارا ٹی۔وی دیکھتا ہے۔"

اس پر نصرت سر پکڑ کر بیٹھ جاتی۔ ننھے کو ابو کا مطلب سمجھانا اسے حساب کا ایک ایسا سوال معلوم ہوتا جیسے دنیا کا کوئی حساب داں نہیں حل کر سکتا ہو ——— چنانچہ وہ اکتاہٹ بھرے مغموم لہجے میں فقط اسی پر اکتفا کرتی۔

"بولیں، ابو ہوتے ہیں بیٹا۔" یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں آپ سے آپ آنسو اُمڈ آتے۔ اور پپو جیسے فوراً بوجھ لیتا کہ اس کی ماں رو رہی ہے ——— وہ بھاگتا بھاگتا اپنی باجی کے پاس جاتا اور ہانپتے ہوئے کہتا "باجی امی رو رہی ہیں ———" اور یوں کبھی اس کی باجی اپنی امی کو چپ کراتی اور کبھی امی باجی کو!

...... لیکن آج تو سماں ہی اور تھا۔ ایک طرف بے بی تکیے میں منہ دیئے پھپھک پھپھک کر رو رہی تھی۔ دوسری طرف نصرت اپنا چہرہ دونوں ہتھیلیوں کی اوک میں چھپائے سسکیاں بھر رہی تھی۔ قریب ہی بستر پر اس کے شوہر کی فوجی وردی میں کھنچوائی گئی تصویر پڑی تھی جس کے نیچے لکھا تھا: "پیارے ابو! آپ اب میرے خوابوں میں کیوں نہیں آتے؟" خوابوں میں نہ آنے والا ایک باپ بھی تھا اور شوہر بھی، ایک بیٹا بھی تھا اور وطن کا محافظ بھی — محافظ جو کبھی غازی بن جاتا ہے کبھی شہید اور کبھی ——— قیدی! ——— نصرت کا خاوند اور بے بی کا باپ قیدی تھا ——— زندہ ہوتے ہوئے بھی ان سے اوجھل! اس لیے وہ رو رہی تھیں — ماں اور بیٹی نے وہ تمام آنسو بہانے کی قسم کھا رکھی تھی جو وہ ایک برس سے ایک دوسرے کے سامنے پیتی رہی تھیں۔ آج جیسے وہ دونوں سچ بول رہی تھیں۔ اس لئے کہ آج کوئی کسی کے آنسو نہیں پونچھ رہا تھا۔ کوئی کسی کو چپ نہیں کرا رہا تھا، کوئی کسی کی جھوٹی ڈھارس نہیں بندھا رہا تھا۔ اور ننھے پپو کے لئے یہ منظر بالکل نیا اور ان دیکھا تھا۔ اپنے ماں باجی کرتے گھر سے بیک وقت ابھرنے والی ماں اور بہن کی سسکیوں کے درمیان وہ جیسے خود کو تنہا تنہا اور اجنبی سا محسوس کر رہا تھا اور اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اسے اس موقع پر کیا کرنا چاہیے۔ وہ کبھی اپنی باجی کے ساتھ لپٹ کر اپنی توتلی آواز میں کہتا "باجی، نہ لوئیں" کبھی اپنی ماں کے ساتھ لگ کر کہتا "امی، مت لوئیں۔"

ماں اور بہن کی ڈھارس بندھانے کا یہ کیسا ڈھنگ تھا جس سے ان کی سسکیاں بند ہونے کی بجائے اور بڑھ گئی تھیں، آنسو مچلنے، بلنے اور بہنے لگے تھے ———

اس کی لاکھ کوشش کے باوجود جب اس کی ماں اور بہن نے رونا بند نہ کیا تو اس نے سوچا کہ اسے بھی ان کے آنسوؤں میں شریک ہو جانا چاہیئے ـــــ اس نے رونا چاہا ـــ اپنے ان دیکھے باپ کی تصویر کو دیکھتے ہوئے اس نے رونے کی بہت کوشش کی ـــ لیکن وہ اپنی آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہ لا سکا!

ـــ اسی روز شام کو باہر برآمدے میں اپنے کھلونوں کے ساتھ کھیلنے کے دوران پپو فرش پر گر پڑا اور زور زور سے روتے ہوئے اندر چلا۔ اس کی امی اور باجی نے جب اس سے رونے کی وجہ پوچھی تو اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے جیسے ٹوٹ کر قدرے توقف کے بے ساختہ کہا:

"مجھے بھی ـ ابو ـ یاد آ رہے ہیں!"

بات اتنی کہ بات کچھ بھی نہیں

احمد جمال پاشا

بات اتنی کہ بات کچھ بھی نہیں، یعنی خیر سے میں کچھ گھر گھسنا اور شرمیلا واقع ہوا ہوں۔ ملاقاتیوں سے مجھے الجھن اور لمبی چوڑی باتوں سے وحشت ہوتی ہے۔ جس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ میں بڑا آدمی ہوں اور مغرور ہوں۔ لیکن میں بلا کسی کے مطلب کی پروا کیے بس گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر تک اپنے آپ کو محدود رکھتا ہوں۔

دفتر میں اس لئے سر نہیں اٹھاتا کہ بے بھاؤ کی پڑ جائیں، بلکہ کوئی ملاقاتی گلے نہ پڑ جائے۔ اسی لئے احتیاطاً گھر میں باہر سے تالا لگا کر پچھواڑے سے داخل ہوتا ہوں۔ تاکہ آنے والا "آؤٹ" کی تختی اور تالا دیکھ کر باہر ہی سے آؤٹ ہو جائے۔ مگر پھر بھی وہ پچھواڑے ہی سے کیچ کر لیتا ہے۔ میز پڑھتا رہتا ہے تالا بند رہتا ہے۔ مگر گھیرنے والوں کا سلسلہ خیال کی رفتار سے جاری رہتا ہے۔

میں پڑھنے میں بے حد اڑیل تھا۔ صرف ناول پڑھتا۔ ہر سال فیل ہونے کے بعد پرنسپل صاحب ہاتھ جوڑتے کہ "اب میں اُن کے کالج کو معاف کر دوں۔ میرے جیسے لڑکوں کی وجہ سے کالج کی ایڈ تک بند ہو سکتی ہے۔" پڑھنا، فیل ہونا، اور معاف کرنا جاری رہنے کے باوجود شاید ہی کوئی کالج ایسا بچا ہو، جس کا رزلٹ میں نے فیل نہ کیا ہو۔

بدقسمتی دیکھئے، میرے ساتھ کے بے شمار پڑھنے والے، سماج کی اونچی سے اونچی کرسیاں گھیرے ہوئے ہیں۔ سب کے کارنامے مجھے منہ زبانی یاد ہیں۔ اور کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں میرے منہ سے نکل ہی جاتے ہیں۔

میرے سر پر کوئی سینگ نہیں کہ لوگ مجھے دیکھنے آئیں۔ اس کے باوجود صبح سے میرا دربار لگنے لگتا ہے۔ وہ بھی اس شان سے کہ دودھ والی کے لئے دروازہ کھولا گیا اور دو چار آدمی اندر، مہتر آیا تو ساتھ میں لوگ بھی آ گئے۔ بچے اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلے تو گھر میں کچھ اور آدمی داخل ہو گئے۔ نوکر سودا ترکاری لینے نکلا تو کچھ اور چلے آئے۔

آنے والوں میں کسی کو رشوت لیتے پکڑ لیا گیا تھا۔ اب وہ چاہتا ہے کہ اگر میں اس کے بڑے افسر سے چھوٹوں ہی کہہ دوں "ارے بھائی! یہ اپنا آدمی ہے" تو وہ کھٹ سے بحال ہو جائے گا۔ کسی کی لڑکی کی شادی اس لئے رکی ہوئی ہے کہ ہونے والا داماد ابھی تک بیکار ہے۔ اس کو نوکری دلانا اس لئے بھی ضروری ہے کہ ہمارے مہربان لڑکی کے ہاتھ پیلے کرتے ہی تیرتھ یاترا پر چلے جائیں گے۔ ان کا کام نہ کرنے کا یہ مطلب ہوا کہ ایک طرف تو ایک نیا گھر نہ بس پائے، دوسری طرف ان کی یاترا میں دیر، کا پاپ بھگتیں۔ کسی کو مکان کی ضرورت ہے۔ اگر میں چاہوں تو کھٹ سے الاٹ ہو جائے۔ کسی کے باپ نے خون کر دیا تھا۔ اب پھانسی پانے والا ہے۔ اگر میں رحم کی سفارش کر دوں تو اگلا خون کرنے کے لئے چھوڑ دیا جائے گا۔ کسی کا

جینا اس کے پڑوسی نے حرام کر دیا ہے۔ اگر میں پولیس سے اُس کے ہوش ٹھکانے لگوا دوں تو وہ محلہ چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔ زندگی حلال ہو سکے گی۔ کسی کی لڑکی کا ایک کتا پیچھا کرتا ہے ــ اور کسی بھی وقت کاٹ سکتا ہے ــ میں کتے کو سمجھا دوں کہ ـــ بیٹا! لڑکیوں کے پیچھے بھاگنا بہت بڑی بات ہے ـ اس طرح بلا عزت کا خیال کئے نہیں بھاگا کرتے۔ اگر تم نے لڑکی کو کاٹنے کی کوشش کی تو میں تمہیں میونسپلٹی کی کتا گاڑی میں بند کروا کے چلتا کر دوں گا ـــ کسی کو پریشانی ہے کہ فلاں اخبار اُس کی غلط خبریں نہیں چھاپتا جو صحیح سے کہیں زوردار ہوتی ہیں۔ میں اُسے ڈانٹ پلا دوں تو اس کا کاروبار چل سکے ـــ کوئی چاہتا ہے کہ اس کے ہمسائے کے دشمن کی طرف پکڑ دھکڑ والے اس لئے رُخ نہ کریں کہ یہ اُس کے گاڑھے پسینے کی کمائی ہے۔ اگر میں منع کر دوں تو ان کا حال پتلا ہوگا نہ پسینہ ـــ

میری بیوی کو یہ بھیڑ چاڑ سخت ناپسند ہے اُسے حیرت ہے کہ جس آدمی سے چنے کی دال منگاؤ تو مونگ کی اٹھا لائے۔ فرمائش لفافے کی ہو تو تار کا فارم لئے گھر میں گھُسے ـ جسے مالک مکان ہمیشہ گھر سے نکالنے کی دھمکی دے کر کرایہ بڑھاتا رہے۔ جو دوں ٹول کی قابلیت نہ ہونے کی وجہ سے کوڑیوں کا مال اشرفیوں میں لا کر گھر کا بجٹ فیل کرتا رہتا ہو۔ دفتر میں جس کی بڑے صاحب کی بے جا گھڑک تک پر گھگی بندھ جاتی ہو وہ ہر روز کے حاتم طائیوں کے سات سوال کیسے پورے کر سکتا ہے۔

میری بیوی اس کے باوجود خاموش رہتی ہے ـ خاموشی پیٹی کوٹ گورنمنٹ کی پالیسی ہے ـ گورنمنٹ کوئی بھی ہو ہمیشہ سب سے اچھی پالیسی خاموشی ہوتی ہے ـ حکومت میں رہنے کے لئے سوچنا، سمجھنا اور خاموش رہنا ضروری ہے۔ گھر کی حکومت کی خاموشی کی وجہ یہ ہے کہ آنے والوں کا گھر کے بجٹ پر بہت خوشگوار اثر پڑتا ہے ـ بڑی راحت ملتی ہے۔ کوئی خالی ہاتھ نہیں آتا۔ اگر آیا بھی تو کام ہو جانے پر ہاتھ بھر جائے گا۔

آنے والا آتے ہی شروع ہو جاتا ہے " صاحب! لڑکا مقابلے کے امتحان میں آ گیا۔ انٹرویو میں بھی آ گیا تو سمجھئے مار لیا اس نے پالا۔ بس اب ناگر جی کے ہاتھ میں ہے ـــ" میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا ـــ" اچھا اچھا ناگر جی! ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ کہہ دوں گا ـ جائیے! جائیے ـ سمجھئے انٹرویو میں تو وہ آ گیا ـ"

اُس کے جانے کے بعد بیوی پوچھتی ہے "سمجھے بھی؟ کون ناگر جی! ناگر جی اپنا کام تو کر نہیں پاتے۔ ناپ تول کر تو نمبر دیتے ہیں۔ اب ایسے بھی گئے گذرے نہیں کہ آپ کے کہنے سے انٹرویو میں "فیور" کرنے لگیں ؟" اور میں حیرت سے پوچھتا ہوں "کون ناگر جی؟ لو اور سنو، میں نے آج تک کبھی کسی کے لئے کہا ہے؟ تم ناگر جی! ناگر جی کی رٹ کیوں لگائے ہوئے ہو ـ؟ ـــ میرا مطلب سمجھ کر وہ خاموش ہو جاتی ہے۔ اتنے میں کھاٹ بنے کے ساتھ ایک صاحب گھر میں داخل ہوتے ہیں ـ میں غور کرتا ہوں کہ ان میں کون صاحب ہیں اور کون کھاٹ بنے؟ وہ کہتے ہیں " جی وہ دفتر سے ٹور پہ گیا تھا فرسٹ کا کرایہ ملا تھا۔ بھیڑ بہت تھی۔ جلدی میں مجبوراً سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لینا پڑا۔ معاملہ طول پکڑ گیا۔ معطل ہوں اگر منتری جی چاہیں تو معاف کر دیں ورنہ اس فرسٹ اور سیکنڈ کے جھگڑے میں بال بچے بھوکوں مر جائیں گے ـــ" میں پوچھتا ہوں ـ کون ہے آج کل؟ ـــ "جی وہ سکسینہ صاحب!" ـــ "ارے وہ سکسینہ اپنا پرانا کلاس فیلو ـ جاؤ کہہ دوں گا ـ!" پھر میں اُس وقت تک طلوع

ـے اُس کی سنتا رہتا ہوں، حتیٰ کہ وہ میرے رُعب سے چُپ ہو کر چلتا نہیں بنتا۔

دفتر میں ابھی پہلی چائے بھی نہیں ختم کر پایا کہ کوئی نہ کوئی نازل ہو جاتا ہے۔ پہلی چائے پر میں نے اس لئے زور دیا ہے کہ جب تک دو چار دور چائے کے نہ چل جائیں۔ ایک آدھ راؤنڈ لگا کر دفتر کی خیریت اور سیاست نہ معلوم کر لی جاتے ایک آدھ پھیرا اسٹرک پر بھروسے کی پان کی دوکان کا نہ لگا لیا جائے۔ کام شروع کرتے نہ اچھا لگتا ہے۔ نہ موڈ بنتا ہے۔ کم از کم مجھ تک۔ ملاقاتی بلا اس کی پرواہ کئے، کہ میں نے سلام کا جواب دیا ہے یا نہیں۔ بس آتے ہی شروع ہو جاتا ہے "صاحب! پاسپورٹ پھنسا ہوا ہے۔ آپ حکم کر دیں۔" میں بلا سر اُٹھائے کہتا ہوں۔ "جائیے! مل جائے گا۔" اور وہ دعائیں دیتا ہوا چلا جاتا ہے۔

قسم لے لیجئے جو یہ تک معلوم ہو کہ پاسپورٹ کا دفتر کہاں پہ واقع ہے۔

اتنے میں ایک بڑے میاں اپنے پوتے کی انگلی پکڑے داخل ہوتے ہی فرماتے ہیں۔ "بھئی تمہارے پوتے نے انٹر کا امتحان دیا ہے۔ حساب میں ذرا کچا ہے۔ کاپی مسٹر خان کے پاس بھیجوائی گئی ہے۔ یہ رہا اس کا رول نمبر۔ آپ لکھ دیں تو اس کی فرسٹ کلاس پکی ہو جائے گی۔"

"جی بالکل! میں آج ہی اُسے لکھ دوں گا۔ اپنا تو پرانا کلاس فیلو ہے!"

بڑے میاں دعائیں دیتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ میں اب کام شروع ہی کرنے والا ہوتا ہوں کہ ایک سردار جی ٹپک پڑتے ہیں۔

"جی! وہ زو کا ٹھیکہ دلا دیجیے۔۔!"

میں حیرت سے انہیں دیکھتا ہوں۔ کہ کیا یہ مع فیملی کے زو میں رہنا چاہتے ہیں؟ یا سوائے ان کے عجائب گھر پہ کسی اور کا حق ہی نہ ہے۔ مگر وہ بڑی گمبھیرتا سے کہتے ہیں۔

"جانوروں کے لئے جانوروں کی سپلائی کا ٹنڈر بھرا ہے۔ مگر زو میں تو چیتر دینا، صاحب ہی کی چلتی ہے۔ جانوروں کا پیٹ بھرنے کے بہانے اگر اپنی بھی پرورش ہو جائے تو کیا حرج ہے بادشاہو۔؟"

اور میں مسکرا کے کہتا ہوں۔ "وہ چیتر دیدی! اپنا پرانا کلاس فیلو۔ کہہ دوں گا۔ جاؤ۔" اور وہ اپنا کارڈ دے کر جانوروں کے راشن میں حصہ بٹانے کی اُمید میں خوشی خوشی چلا جاتا ہے۔

غرض گھر ہو یا دفتر۔ آنے والوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ کوئی بڑا سا مٹھائی کا ڈبہ لئے چلا آ رہا ہے کہ "یہ رشوت میں معطل ہو گیا تھا۔ آپ نہ کہتے تو بڑے صاحب ہرگز نہ بحال کرتے۔" کوئی صاحب آگرے کا پیٹھا اور والموٹ سے لئے چلے آ رہے ہیں کہ آپ کی مہربانی سے ہونے والے داماد کو نوکری مل گئی۔ لڑکی کے ہاتھ پیلے ہو گئے۔ آپ کی کرپا سے کل یاترا کے لئے روانہ ہو جاؤں گا۔"

کمال تو یہ ہے کہ پھانسی بھی عمر قید میں بدل گئی۔ خونی باپ کا بیٹا آئس کریم کا دھندا کرتا ہے۔ اس لئے دنیا بھر میں

بانٹنے کے لئے درجن بھر بریڈ جینٹ چڑھا گیا —

پڑوسی کے محلہ چھوڑ کر بھاگنے کی خوشی میں وہ صرف شکریہ ادا کر کے چلا گیا — مگر بعد کو گھر میں پتہ چلا کہ ولایتی کپڑے سے بہترین تھان ہماری بیوی کے جہیز کا، ہم تک پہونچا تھا۔ اب ہماری بیوی خفا ہیں کہ "دنیا بھر کے فضول لوگ آپ کے پاس آتے ہیں، آخر کوئی ٹیلر ماسٹر کیوں نہیں آتا — ؟"

اس خوشخبری کے ساتھ کہ کُتّے نے لڑکی کا پیچھا کرنا چھوڑ دیا ہے وہ ہمیں ایک عدد ولایتی پلا تھما گئے۔

فلاں خبریں چھپوانے والے آئے تو باچھیں کھلی ہوئی تھیں اور مونچھیں دو بج کر دس بجا رہی تھیں — بولے۔ آپ کی بڑی مہربانی، کسی بھی قسم کے اسمگل کئے ہوئے مال کی ضرورت ہو، بلا تکلف فرمایئے گا۔ نمونہ مفت پیش کر دوں گا"!

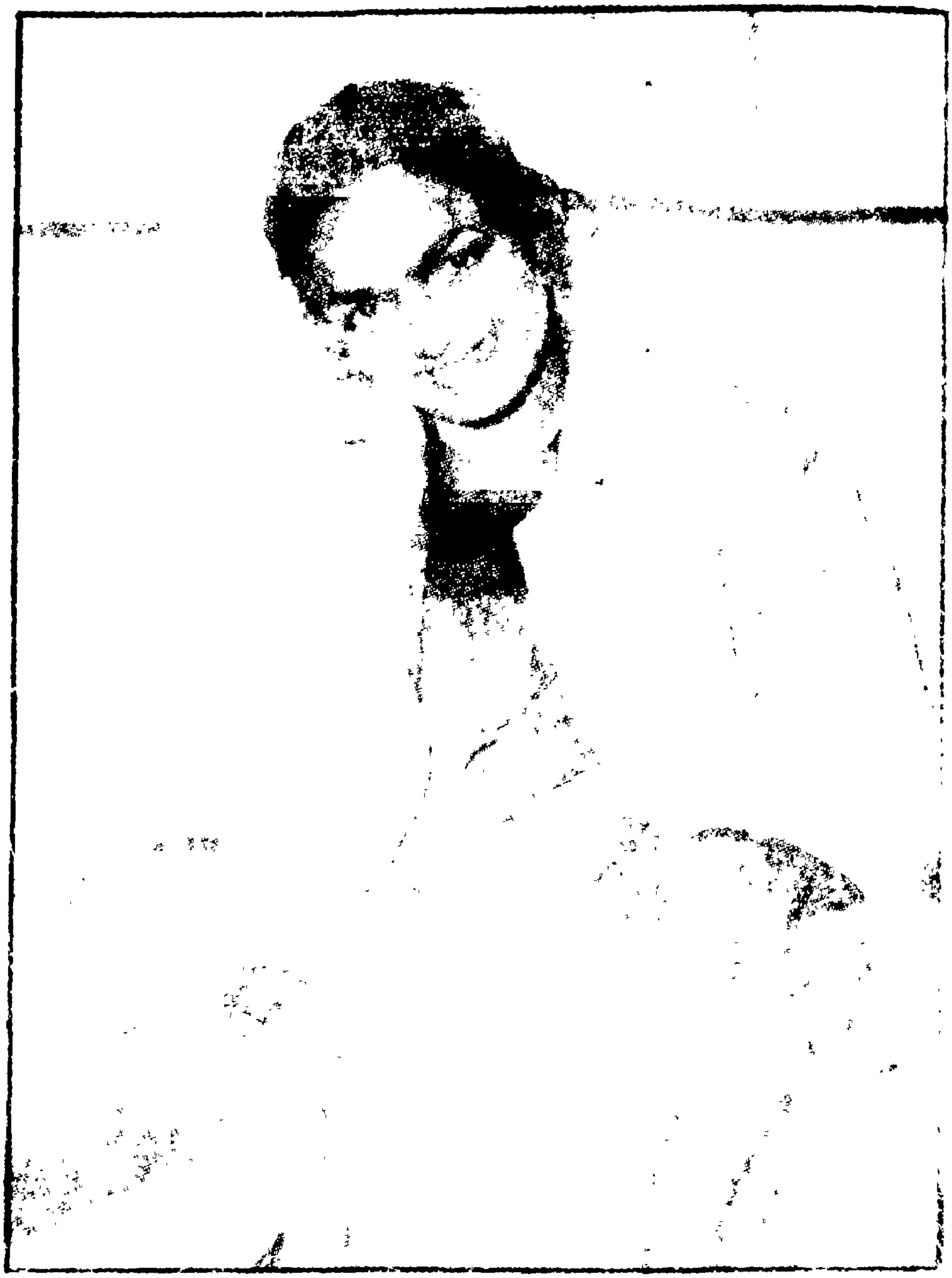
اُن کے جانے کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ وہ سوئی میں تاگا ڈالنے والی مشین ہوی کی نذر کر گئے ہیں — حالانکہ وہ بلا شبہ کے نہ صرف تاگا ڈال سکتی ہیں بلکہ سی ٹانک سکتی ہیں —

گاڑھے پسینے والے نہیں آئے — بہت سے نہیں آئے مگر یقین ہے کہ ضرور اُن کا پسینہ دو نمبر کی کمائی دیکھ کر پتلا ہو چکا ہو گا۔ ورنہ لدے پھندے آتے۔

سیکنڈ کلاس میں سفر کرنے والے مہاشے میری خیال سفارش سے اتنے شیر ہو چکے ہیں کہ اب بلا ٹکٹ تک سفر کرنے پر تیار ہیں —

معلوم نہیں جن صاحب کا پاسپورٹ بننا تھا — جن کے پوتے کی تھرڈ کلاس کاپی پر فرسٹ کلاس نمبر ملنے تھے با جو صاحب آدمیوں کے بجائے جانوروں کا ٹھیکہ بنانا چاہتے تھے — اُن سب کا کیا حشر ہوا — ؟

ڈاکٹروں کے لئے کہا جاتا ہے کہ ہر سو میں نوّے مریض خود ہی لوٹ پوٹ کے اچھے ہو جاتے ہیں — اسی طرح گھیرنے والوں کے زیادہ تر کام بن ہی جاتے ہیں — دنیا کا دستور ہے کہ یہ ہمیشہ ایسے ہی لوگوں کو گھیرتی ہے — جو اُس کے کام نہ آتے ہوں — شاید آپ پوچھ بیٹھیں کہ لوگ آپ کو کیوں گھیرے رہتے ہیں — ؟ — تو میں جواب دوں گا کہ "بات اتنی ہے بات کچھ بھی نہیں — میرے پاس لوگ صرف اس لئے آتے ہیں کہ میں اُن میں سے کسی کے بھی کام نہیں آ سکتا — یوں بھی میں ہر کامیاب افسانہ کی طرح سوائے اپنے کسی کے بھی کام کا نہیں — مگر مجھے یقین ہے کہ میرے پاس صرف وہی لوگ آتے ہیں جن کا کام ہونے والا ہوتا ہے"۔



ایک منفرد رنگ والی افسانہ نگار — خدیجہ مستور

خدیجہ مستور

کے دوسرے ناول

زمین

کا پہلا باب

سفر

"میری بیٹی۔ میری بیٹی۔ میری بیٹی کہاں ہے؟" بوڑھا اپنے بال نوچ کر زور زور سے چیختا اور پھر سر جھکا لیتا۔ چیخنے کے بعد جیسے اسے قرار آجاتا اور پھر گھنٹوں وہ ایک ہی طرح سے سر جھکائے بیٹھا رہتا۔ اس کے پاس سے سب لوگ ناآشنائی سے گزر جاتے۔ کوئی اس سے نہ بولتا۔ کوئی اسے جواب نہ دیتا۔ شاید اسے جواب دینے کی کسی میں بھی سکت نہ تھی، یا پھر سب اپنے آپ میں گم تھے مگر ساجدہ کو ایسا محسوس ہوتا کہ بوڑھے کی یہ چیخ اس کے کلیجے سے دراتی ہوئی گزر جاتی ہے۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ بوڑھے کے پاس جائے، اسے تسلی دے لیکن وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکتی تھی۔ آخر وہ اس سے کیا کہے گی؟

ایک باپ جس کی بیٹی کو لوگ جبراً چھین لے گئے ہوں، وہ اس سے کن الفاظ میں ہمدردی کرے گی؟ صبر جیسا لفظ سن سن کر تو اس کے کان پک گئے تھے۔ بوڑھے سے وہ صبر کی بات نہیں کر سکتی۔

جب بھی بوڑھا چیختا تو ساجدہ الفاظ کی تلاش میں پریشان ہوتی رہتی۔ اسے کیا پتہ تھا کہ جبر کا نشانہ بننے والوں کی تسلی کے لئے آج تک الفاظ پیدا نہیں ہوئے تھے۔

وہ اپنا جی بہلانے کے لئے بوڑھے سے نظریں چرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی۔ عورتوں اور مردوں کے چہروں پر اسے بے سروسامانی برستی محسوس ہوتی۔ حالانکہ سب نے اپنا اپنا ٹھکانہ بنالیا تھا۔ فوجیوں کی خاکی کی ہوئی لمبی لمبی بدرنگ بارکوں میں، درختوں کے سائے تلے، دریوں کی چھتوں کے نیچے تمبوؤں کے پُراسرار اندھیروں کے اندر۔ زمین کے اس ٹکڑے نے سب کو پناہ دے دی تھی۔ اس نے سب کے قدموں کی تھکن اپنے سینے میں جذب کر لی تھی۔

ابا نے بھی ایک گھنے درخت کے نیچے، موٹی چادروں کی دیواریں بنا کر اسے بٹھا دیا تھا اور اس نے سفر کی دہشت کے بعد پہلی بار سکون کی سانس لی تھی۔

والٹن کیمپ کی یہ تیسری شام تھی۔ امدادی کمیٹیاں سورج ڈھلنے سے پہلے ہی کیمپ کے پُرجوش نعروں کے درمیان چنے کی دال اور نرم و گرم روٹیاں بانٹ گئی تھیں اور اب حقہ پینے والوں کی ٹولیاں، ننھے ننھے الاؤ جلا کر ان کے گرد بیٹھی تھیں۔ حقے کے ہر کش پر دھوئیں کی ننھی سی بدلی اٹھتی اور ہوا میں گم ہو جاتی۔ لوگ بہت زور زور سے باتیں کر رہے تھے وہ اپنی اپنی بپتا کے ترازو میں دکھوں کا زیادہ سے زیادہ بوجھ بھرنے کی کوشش میں ڈنڈی مار رہے تھے۔ عورتوں کی ٹولیاں الگ بیٹھی تھیں۔ خنک ہوا میں ان کے میلے کچیلے آنچل پھڑ پھڑا رہے تھے۔ ان کے چہروں پر گھروں کی چھت کے سائے کی محرومیت برس رہی تھی۔ لڑکیاں اب تک دہشت زدہ سی تھیں، کبھی کبھی اپنے آس پاس سے گزرنے والے نوجوان لڑکوں کو دیکھ کر پیشانی تک سر ڈھانک لیتیں۔ بس صرف بچے

تھے جنھیں دنیا کی کوئی فکر نہ ستا رہی تھی۔ وہ اسی طرح اچھلتے کودتے پھر رہے تھے جیسے عید بقر عید اپنی گلیوں میں کھیلا کرتے تھے۔

نومبر کا آدھا مہینہ گزر چکا تھا شام ہوتے ہی خنکی ہونے لگتی۔ یوں ہی ادھر اُدھر دیکھتے دیکھتے ساجدہ کو سردی کا احساس بھی ہوتا تھا۔ ایک بچہ اس کے اتنے پاس سے دوڑتا ہوا گزرا کہ اس کا پاؤں کچل گیا۔

"شاید چھپی چھپول کھیل رہے ہیں۔" وہ اپنا پاؤں سہلاتی ہوئی اٹھی اور اماں دلیں ما ہرا کھردرا کمبل شانوں پر پھیلا لیا کھانا ابھی تک کہیں پاس اسی طرح رکھا ہوا تھا۔ ابا کو بھوک نہ لگ رہی تھی اور وہ ابا کے بغیر کھانا کھانے کو تیار نہ تھی۔

فورتھ ایئر کی اپنی بچی کھچی کتاب کمبل سے نکال کر وہ بجلی کے کھمبے کے پاس زمین پر پلتھی مار کر بیٹھ گئی۔ ابھی اس نے ایک ہی سطر پڑھی تھی کہ ایک عورت اس کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ وہ اپنے دودھ پیتے بچے کو سلانے کے لئے دھیمے تھپک تھپک کر ٹہل رہی تھی۔

"انگریجی پڑھ رہی ہو کہ اردو؟" عورت نے پوچھا۔

"انگریزی۔"

"کیا کرو گی انگریجی پڑھ کر؟"

"کچھ نہیں۔" اس نے اکتا کر کہا۔ وہ عورت سے جان چھڑانا چاہ رہی تھی۔

"تمہاری اماں کہاں ہیں؟"

"گذر گئیں۔" اس کی آواز میں دکھ تھا۔

"چچ چچ۔ گذر گئیں۔ تمھاری سادی ہوگئی ہے؟"

نہیں!۔ وہ عورت کو نظر انداز کرنے کے لئے سر جھکا کر جیسے بڑے انہماک سے پڑھنے لگی مگر کتاب کا ہر لفظ ایس بن گیا تھا۔ صلاح الدین۔ صلاح الدین۔ صلّو۔

اس نے کتاب بند کر دی عورت شاید اسے مغرور سمجھ کر جا چکی تھی۔

وہ جب سے یہاں آئی تھی اسے یاد نے اس کے دل کو کس کس طرح تڑپایا تھا۔ مدائی ننھی ننھی یادوں کو بھی اس طرح جوان کر دیتی ہے کہ ان کے خیال ہی سے دل پر دستک کا احساس ہوتا ہے۔ اسے یاد آیا کہ جب پہلی بار صلاح الدین اس سے ملا تھا تو اس نے یہی بتایا تھا۔ "میرا نام صلاح الدین ہے۔ مگر اماں مجھے صلّو کہتی ہیں۔ سب مجھے صلّو کہتے ہیں۔ تم بھی یہی کہا کرو۔"

"اچھا۔" اس نے بے حد سعادت مندی سے اقرار کر لیا تھا۔ اس کے بعد تو اس نے خوش ہو کر اسے اپنی ساری رام کہانی سنا ڈالی تھی۔ ہم گاؤں سے آئے ہیں وہاں ہماری زمین ہے۔ وہاں بہت سے درخت ہیں۔ آموں کے درخت۔ آموں پر جب بور آتا ہے تو کوئلیں بہت بولتی ہیں۔ اور جب وہ ہماری امیوں کو کھاتیں تو میں غلیل سے انھیں مار ڈالتا۔

"ہائے تم انھیں کیسے مار ڈالتے ہو؟" وہ حیران ہوگئی تھی۔

"تو، مارنا کون سا مشکل کام ہے، وہ تو کوئل ہے۔ لوگ تو آدمیوں کو مار ڈالتے ہیں۔ میری اماں کے پاس آنا۔ ہاں۔ ہم یہاں

پڑھنے کے لیے آئے ہیں۔ ابا نے زبردستی اماں کو میرے ساتھ بھیجا ہے۔ ان کا یہاں جی تو نہیں لگتا۔ پھر وہ بڑے آدمیوں کی طرح اپنے بال جھٹکتا چلا گیا۔

دو نرسیں چند پاپٹ پکڑے بڑی تیزی سے آ رہی تھیں۔ وہ ایک لمحے کو اس کے پاس رکیں۔ ہمارے ملک کی آبادی تو ابھی سے بڑھ رہی ہے۔ وہ آگے بڑھ گئیں۔ ساجدہ ہنس پڑی۔ تو کیا وہ صرف یہ خوش خبری سنانے کے لیے اس کے پاس رکی تھیں؟

صبح وہ ذرا دیر کو زچہ خانے کی طرف گئی تھی۔ وہاں کے کمرے پلنگوں پر زچائیں چادریں اوڑھے پڑی کراہ رہی تھیں اور نوزائیدہ بچے ماؤں کے دوپٹوں میں لپٹے پڑے تھے۔ شاید مائیں ننھوں کے لباس کہیں راستے میں لٹا آئی تھیں یا اپنی جان بچانے کے لیے گھروں سے نکلتے وقت وہ ان زندگیوں کے جنم کو بھول گئی تھیں۔ انھیں یہ احساس ہی کہاں ہوگا کہ موت اور جنم بڑے سے بڑے تغیر کو ٹھوکر مار کر اپنے کو منوا لیتی ہیں۔

وہ اپنی جگہ کھڑی ہو گئی اور حقہ پینے والوں کی ٹولیوں میں نظریں دوڑا کر ابا کو ڈھونڈھنے لگی۔

بوڑھا پھر چیخنے لگا۔ "کہاں ہے میری بیٹی؟ کہاں ہے میری بیٹی۔ ظالمو میری بیٹی کو لا دو۔" لوگوں نے سر اٹھا کر ادھر دیکھا اور پھر حقہ پینے لگے۔

ساجدہ بے قرار سی ہو کر بوڑھے کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ اس سے کیا کہے گی، کیا سنے گی؟ اس وقت اس کے ذہن میں کچھ بھی نہ تھا۔ وہ اس کے پاس جانے کے لیے لمبے لمبے قدم اٹھا رہی تھی اور جب بوڑھا بابا اس سے دو تین قدم کے فاصلے پر رہ گیا تھا تو ایک شخص نے اپنے دونوں ہاتھ بوڑھے کے شانوں پر رکھ دیے تھے۔

"بابا۔ تم کس بیٹی کو پکار رہے ہو؟ وہ بیٹی نہیں تھی بابا۔ وہ لوٹ کا سب سے قیمتی مال تھی۔ وہ تمہارے چیخنے سے واپس نہیں آئے گی۔ تمہاری آواز اس تک نہیں پہنچ سکتی۔"

بابا وحشت زدہ آنکھیں پھاڑے اس آدمی کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ساجدہ کا جی چاہا کہ وہ آگے بڑھ کر اس ظالم آدمی کے منہ پر ایک تھپڑ مار دے۔ وہ اس سے کہے کہ عورتوں کو لوٹ کا مال کہنے والے لوٹنے والوں پر طنز کرتے ہوئے اونچے تو نہیں ہو جاتے۔ پھر بھی وہ ضبط کیے چپ چاپ کھڑی رہی۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔" بوڑھا چیخا۔ "وہ میری بیٹی تھی۔ وہ مال خزانہ نہیں تھی۔ میری بیٹی۔ میری بیٹی۔"

"بابا تمہاری بیٹی کے اغوا کا بدلہ چکایا گیا ہے۔ وہاں بھی بہت سے باپ تمہاری طرح رو رہے ہوں گے۔ لوٹ کا مال واپس بھی مل جائے تو پورا نہیں ہوتا۔"

"اچھا۔" بوڑھے نے آستینیں چڑھا لیں۔ "اچھا تو تم نے بھی بیٹیاں لوٹی ہیں۔" بوڑھے نے آدمی کو اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ گرتے گرتے بچا۔ اس نے ساجدہ کی طرف دیکھا اور کھسیانی ہنسی ہنس دیا۔ "بابا میں تم کو نہیں سمجھا سکتا، میں تم کو تسلی نہیں دے سکتا" وہ جیسے ساجدہ سے کہہ رہا تھا۔ "میں تم کو کیسے سمجھاؤں۔ لوگ یوں ہی بدلہ لیتے ہیں۔ یہ بہت پرانا چلن ہے بابا۔ تم نہیں جا-

اس جیل کے قید خانے میں صدیوں سے کتنے بے گناہ قید کاٹتے چلے آ رہے ہیں۔

بوڑھے نے کیا سنا کیا سمجھا۔ وہ تو اب مارے غصے کے اس کی طرف گھور رہا تھا۔ آدمی مسکراتے چل دیا اور حقہ پینے والوں کی ٹولی میں غائب ہو گیا۔

"بابا!" ساجدہ نے آگے بڑھ کر آہستہ سے پکارا۔ بوڑھے نے اجنبیوں کی طرح اس کی طرف دیکھا اور پھر اس کی طرف سے پیٹھ موڑ کر یوں بیٹھ گیا جیسے اب وہ کسی سے نہیں بولنا چاہتا۔

ساجدہ کچھ نہ کہہ سکنے کی حسرت دل میں لئے اپنے ٹھکانے کی طرف چل پڑی۔ جب وہ حقہ پینے والوں کی ایک ٹولی کے پاس سے گزری تو اسے ابا کی آواز سنائی دی۔ وہ وہیں رک گئی۔

"تم یہاں کہاں پھر رہی ہو بیٹیا؟" ابا نے تازہ ٹوٹے حقے کے کش لگاتے اور پھر کپڑے جھاڑتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ ساجدہ نے دیکھا کہ ابا اس آدمی سے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملا رہے ہیں جو بوڑھے کی بیٹی کو قیمتی مال کہہ کر تسلی دے رہا تھا۔

وہ اپنے چادر دری کے گھر میں آ کر بکس کی ٹیک لیتے ہوئے آرام سے پاؤں پھیلا کر بیٹھ گئی۔ اب اسے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ ابا شاید کچھ حقہ پینے بیٹھ گئے۔ اس نے سوچا۔ اگر ابا اسی طرح خالی پیٹ حقہ پیتے رہے تو جانے ان کی اس گرتی ہوئی صحت کا کیا انجام ہو گا۔

اب عشاء کی اذان ہو رہی تھی۔ اس کے بعد لوگوں کے بولنے کی آوازیں ختم ہو گئی تھیں۔ نماز کے بعد رات دس گیارہ بجے تک گراموفون ریکارڈ بجتے رہتے۔ پاکستان میں صحیح سلامت پہنچنے کی خوشی کا اظہار۔ رات کو شدت انتہا کر جاتا۔ بعض اچھی آوازوں والے لڑکے خود بھی ایک آدھ تان لگا دیتے۔ ساجدہ کو یہ سب کچھ اچھا نہ لگتا۔ وہ بڑی یکسوئی کے ساتھ کچھ سوچنا چاہتی تھی۔ وہ اپنی یادوں کو ایک انجانی سی مسرت سے ہمکنار ہونا چاہتی تھی۔ مگر روز یہی ہوتا کہ ہزاروں بار کے سنے ہوئے گھسے پٹے ریکارڈ اس کی یادوں کی شمعیں بجھا جاتے۔ اس وقت اسے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کی یادیں ایک گھسا ہوا ریکارڈ ہیں جس پر رکھی ہوئی سوئی ایک ہی جگہ اٹک گئی ہے۔

ابا جب اپنا چھوٹا سا حقہ اٹھائے آئے تو وہ آدمی بھی ان کے ساتھ تھا۔ "اچھا تو اب کل ملاقات ہو گی ناظم صاحب۔"

"خدا حافظ۔" ناظم چلا گیا۔

"یہ کون ہے ابا؟ کیا دلی کی گلیوں کا رہنے والا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں، سجو بیٹیا یہ تو کانپور کے رہنے والے ہیں۔ بڑا لائق آدمی ہے۔ یہاں حکومت نے بحالیات کے محکمے میں کام دے دیا ہے۔ کیا کہنے، واہ، واہ، بہت نفیس آدمی ہے۔" ابا بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ "روٹی کھا لیجئے ابا!" اسے افسوس ہو رہا تھا کہ ابا اس بیہودہ آدمی کی تعریف کر رہے ہیں۔ ابا سے تو جو بھی پیار سے بول دے اچھا ہو جاتا ہے۔

ساجدہ نے روٹی اور دال کا پیالہ ابا کے سامنے رکھ دیا اور پھر ان کے ہاتھ سے حقہ لے لیا۔ ابا ہنس پڑے۔ "بیٹیا کو تو میرے حقے سے دشمنی ہے۔"

"روٹی کھا لیجیے۔ دھوئیں سے پیٹ نہیں بھرتا ہے۔"

"قسم لے لو بٹیا، جو مجھے ذرا سی بھوک لگی ہو۔ دوپہر کی روٹی ابھی تک ہضم نہیں ہوئی۔ تم کھاؤ۔ رات گئے بھوک لگی تو میں کھاؤں گا۔"

وہ لیٹے ہوئے بستر کو بچھا کر لیٹ گئے۔ ساجدہ کو اکیلے کھانا کھانا زہر لگ رہا تھا۔

"ابا ہم لوگ کسی گاؤں میں آباد ہوں گے۔ کہاں ہوگا سرگودھا؟ بس سرگودھا کے آس پاس۔ کیوں ابا؟ میں وہاں کسی اسکول میں بچوں کو پڑھاؤں گی۔"

گاؤں۔ وہ بھی سرگودھا کا گاؤں۔ کیا رکھا ہے وہاں؟ اری پگلی گاؤں میں کیا رکھا ہے؟

"سکون!"

ابا نے لالٹین کے ہلکے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر اپنی بیٹی کو دیکھا "تھک گئی ہے میری بٹیا۔ گھر کے بغیر اداس ہے۔ روٹی کھا لو، پھر آرام سے سو جاؤ۔ بس کیمپ سے نکلنے کی دیر ہے۔ میری بٹیا نے پڑھائی شروع کر دی تو پھر خوش رہے گی۔ ایم۔ اے تک پڑھاؤں گا۔ اب کیا ہے اب تو اپنے ملک میں ہیں۔"

اس نے دکھ سے ابا کی طرف دیکھا۔ اونچی دکان پر نیچی تنخواہ کے عوض حساب کتاب کرتے ساری زندگی گزر گئی۔ ابا اس کے لئے اس سے زیادہ اور کیا سوچ سکتے تھے کہ اسے ایم اے تک پڑھا دیں پھر انھیں ایک لائق داماد مل جائے اور بس۔ حساب کی پوتھی میں دل اور دلداری کے کوئی ہندسے نہیں ہوتے۔ اب وہ ابا سے کیسے کہتی کہ وہ گاؤں میں کیوں آباد ہونا چاہتی ہے؟

ابا سو گئے تھے اور ہلکے ہلکے خراٹے لے رہے تھے۔ وہ بھی اپنا بستر بچھا کر لیٹ گئی۔ درخت کی شاخوں کے بیچ سے کہیں کہیں آسمان نظر آ رہا تھا۔ کوئی بسیرا لینے والا پرندہ جانے کیوں پھڑپھڑایا اور ایک پتہ ٹپ سے ساجدہ کے اوپر آ گرا جسے اٹھا کر وہ آہستہ آہستہ انگلیوں سے مسلنے لگی۔ اس کی انگلیاں نمی محسوس کر رہی تھیں۔ اس نے ایک لمحے کو سوچا۔ ابھی یہ پتہ پوری طرح سوکھا نہیں تھا۔ ابھی اس میں زندگی باقی تھی۔ سلمیٰ کی دی ہوئی ادبی کتابوں کو پڑھ پڑھ کر وہ کچھ زیادہ ہی حساس ہو گئی تھی۔

اب کسی طرف سے گراموفون ریکارڈوں کی بوچھار شروع ہو گئی تھی۔ "آئیے آ جائیے، آ جائیے۔ پھر مری آغوش میں آ جائیے"

"رم جھم برسیں بادروا، مست ہوائیں آئیں۔" "سو جا راج کماری سو جا۔ سو جا میں بلہاری سو جا۔"

کوئی بہت زور سے دھاڑا۔ "بند کرو۔ کان پک گئے ان گانوں کو سن سن کر۔ پھینک دو ان ریکارڈوں کو۔ شرم نہیں آتی انھیں بجاتے۔" سب ریکارڈ یوں خاموش ہوئے جیسے ٹوٹ گئے ہوں۔

"بجو اپنے ملک کے گانے بجاؤ۔"

"میرے مولا بلا لو مدینے مجھے، میرے مولا بلا لو ——" "اب ہوئی کوئی بات۔ واہ۔" کوئی بے پناہ داد دے رہا تھا۔

ساجدہ نے جھک کر ابا کو دیکھا۔ کہیں اس داد و بیداد نے انھیں جگا تو نہیں دیا۔ مگر ابا ٹھنڈی ہوا میں بڑی غفلت کی نیند سو رہے تھے۔ ان کے چہرے پر بڑی پیاری سی مسکراہٹ تھی شاید وہ کوئی بہت اچھا خواب دیکھ رہے تھے۔

"وہ چلے جھٹک کے دامن مرے دست ناتواں سے ——" وہ چلے؟ یہ کسی لڑکے کی آواز تھی جو ٹوٹنگی کی طرز پر گا رہا

ساجدہ غور سے سننے لگی۔ بچپن میں سنی ہوئی یہ طرز آج اسے بہت اچھی لگ رہی تھی۔

"ایسے چپ رہو۔ پاکستان میں اب یہ بری عادتیں نہ چلیں گی۔ وہاں روشنی ہے" پیچھے دیوانہ رہا ہو اب یہاں بھی۔ تان لیتی ہوئی آواز دم توڑ گئی۔ اس کے ساتھ ہی سب خاموش ہو گئے کیونکہ اب بوڑھا چیخ رہا تھا "اس کا دامن میرے ہاتھ میں رہ گیا ہے۔ میری بیٹی کہاں ہے؟ وہ کہاں ہے؟"

ساجدہ نے ایک لمحے کو سوچا اگر بوڑھے کی بیٹی کی طرح اسے بھی اغوا کر لیا جاتا تو — اب یہ ایک دم دہشت طاری ہو گئی۔ یہ تو صرف خیال ہی سے دہشت طاری ہو گئی تھی۔ اسے کیا پتہ تھا کہ جیتے جاگتے انسان اتنے زہریلے ہوتے ہیں جن کے توڑ کا آج تک کوئی ٹیکہ ایجاد نہیں ہوا۔

بوڑھے کے روپ میں ابا کو دیکھ کر وہ رو پڑی اور جب اس کے دل کا غبار اس کے سینے سے چھٹ گیا تو اسے احساس ہوا کہ وہ تو بوڑھے کے لئے رو رہی تھی۔ رونے کے بعد جب اسے قرار آیا تو وہ بغیر کسی … کے گہری نیند میں ڈوب گئی۔ سونے سے پہلے آج اس نے آسمان کو دیکھتے ہوئے یہ بھی نہ سوچا تھا کہ لوگ آسمان کو چھت کیوں کہتے ہیں اور اگر یہ چھت ہے تو پھر انسان اس کے تلے خود کو اتنا غیر محفوظ کیوں سمجھتا ہے۔ سونے سے پہلے اسے گھر کی چھت بے طرح یاد آتی۔

وہ خواب میں صلاح الدین کو دیکھ رہی تھی۔ وہ سامان باندھے لاہور روانہ ہونے کے لئے تیار تھی اور کیمپ میں پھر پھر کر سب گلی محلے والوں سے مل رہی تھی۔ ان سے پوچھ رہی تھی کہ کون کہاں جا رہا ہے۔ اور وہ جو ابھی نہیں جا رہے تھے ان سے [illegible] کر رہی تھی۔ انہیں تسلی دے رہی تھی، وہیں اسے صلو کچھ ڈھونڈتا نظر آیا۔

"تم ابھی تک گئے نہیں۔ تم یہاں کیسے آ گئے؟ کیا تم نے اپنی اماں کو محفوظ مقام پر پہنچا دیا ہے؟"

"تم ہم سب کی فکر نہ کرو۔ میں تم سے ملنے آیا ہوں۔ ابا نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم سب سرگودھا چلے جائیں گے۔ یا اس پاس کسی گاؤں میں رہیں گے۔"

"سرگودھا کے کسی گاؤں میں؟" اس نے اپنے اطمینان کے لئے پھر سے پوچھا۔ "ہم لوگ لاہور جا رہے ہیں۔"

"پروا نہ کرو۔ میں تو شہر میں ہی کسی کالج میں لیکچرر ہو جاؤں گا۔"

"مگر۔ مگر مجھے کیسے معلوم ہوگا صلو؟" وہ رو رہی تھی۔

"مت رو۔" "تمہیں ڈھونڈ ہی لیں گے کہیں نہ کہیں۔" وہ ہنسا تو اس کے خشک ہونٹوں کی پپڑی سے خون کا ایک قطرہ ابل پڑا۔ وہ اس قطرے کو اپنے پلو میں جذب کرنا چاہتی تھی مگر صلو ایک دم نظروں سے غائب ہو گیا۔

اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اتنی سرد رات میں پسینے سے نہا گئی تھی۔ اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہلے "تمہیں ڈھونڈ ہی لیں گے کہیں نہ کہیں۔" وہ حیران تھی کہ کیا خواب اتنے سچے بھی ہوتے ہیں۔

دور سے بیماروں کے چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شاخوں سے جھانکتے ہوئے آسمان پر صبح کا دور دور پتہ نہ تھا۔ اس نے خیمہ کا کونہ سرکا کر باہر جھانکا۔ جانے کون لالٹین اٹھائے جھک جھک کر ہر طرف آہستہ آہستہ پھر رہا تھا۔ بیماروں کی آواز اور پھر کسی

کا ایسے پراسرار طریقے سے پھرنا۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے ڈر کے مارے کمبل سے چہرہ چھپا لیا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ابا کو بتا دے مگر اس سے بولا نہ گیا۔ "ہو گا کوئی۔ کیمپ میں چور ڈاکو تو آنے سے رہے۔" اس نے اپنے آپ کو تسلی دی پھر اسے ایک دم محسوس ہوا کہ لالٹین کی روشنی کمبل سے چھن کر اس کی آنکھوں میں گھس رہی ہے۔ اس نے آنکھوں پر سے کمبل ذرا سا سرکایا۔ لالٹین اس کے سامنے ڈول رہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور پوری طاقت سے چیخ پڑی۔ ساتھ ہی بوڑھے کی آواز اس کی آواز میں شامل ہو گئی۔ "یہیں ہے۔ وہ یہیں ہے۔ وہ ابھی چیخی تھی۔ میری بیٹی۔ میری بیٹی۔"

کیمپ کے بہت سے لوگ جو اس کی چیخ سن کر ادھر آ رہے تھے۔ واپس لوٹ گئے۔ وہ جانے کیا کہہ رہے تھے۔ شاید جاگ پڑنے کی وجہ سے ناراض ہو رہے تھے۔ ابا ساجدہ کے سر پر ہاتھ رکھے بوڑھے کو گھور رہے تھے۔

"تم راتوں کو بھی شور مچاتے ہو۔ بھاگ جاؤ یہاں سے۔" ابا نے بوڑھے کو گھورا مگر وہ ڈری ہوئی ساجدہ کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ کون کیا کہہ رہا ہے اسے اس کی پروا نہ تھی۔

"بابا، میں چیخی تھی۔ میں ڈر گئی تھی۔" ساجدہ اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کیا سب لڑکیاں ایک ہی طرح چیختی ہیں؟"

"ہاں بابا۔" ساجدہ نے اپنا ٹھنڈا ہاتھ بڑھا کر بابا کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"میں سمجھا۔ میں سمجھ گیا۔ کیا تم بھی قیمتی مال ہو؟"

"چلو بابا۔ چلو تو یہاں سے اب بکواس بند کرو۔" ابا نے بابا کے شانے پر سختی سے ہاتھ رکھا تو لالٹین بوڑھے کے ہاتھ سے گر پڑی۔ "یہ لالٹین اٹھا کر رکھ دو بیٹیا۔ جانے کس کی اٹھا لایا ہو گا۔" ابا بوڑھے کو تقریباً کھینچتے ہوئے لے چلے۔ "اپنے بستر پر لیٹ کر چپکے سے سو جاؤ۔ صبح تمہاری بیٹی آ جائے گی۔"

ابا جب بوڑھے کو چھوڑ کر واپس آئے تب بھی بڑبڑا رہے تھے۔ "پاگل ہو گیا ہے۔ سب کی نیندیں حرام کر دی ہیں۔" اپنے بستر پر لیٹ گئے۔ "سو جاؤ بیٹیا۔ سو جاؤ۔ ابھی تو آدھی رات گزری ہے۔ خدا کسی کو پاگل نہ کرے۔"

ساجدہ نے ابا کو کوئی جواب نہ دیا۔ ان کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ وہ بوڑھے کو جس طرح کھینچتے ہوئے لے گئے تھے اس کا درد ابھی تک محسوس کر رہی تھی۔

ابا سو گئے تھے مگر وہ ایک لمحے کو بھی آنکھ نہ جھپکا سکی۔ شاخوں سے چھنتے ہوئے نیلے آسمان کو اس نے سفید ہوتے دیکھا۔ پرندوں کا شور سنا اور جب وہ پر پھڑپھڑا کر اڑ رہے تھے تو ننھی ننھی شاخوں اور پتوں کو کمبل پر سے چھنتے ہوئے اس نے عجیب سی مسرت محسوس کی۔ اس نے چادر کی دیوار ایک طرف سرکا دی اب لوگ لوٹوں اور کٹوروں سے وضو کر رہے تھے۔

اس نے آہستہ سے پکارا۔ "ابا صبح ہو گئی۔" اسے صبح ہمیشہ خوب صورت لگتی تھی۔ ابا نے کروٹ لے کر محبت سے اس کی طرف دیکھا۔

"تم اٹھ گئیں بیٹیا۔ کیا کرتی تھیں؟"

"دعا"

"کیا دعا مانگ رہی تھیں؟"

"بس یوں ہی سی دعا تھی۔" وہ ہڑبڑا گئی۔ "بس یہی کہ گزشتہ اللہ ہمارے گناہوں کو معاف کر دے۔" اس نے یوں ہی کہہ دیا۔

"ہمارے گناہ کیا ہوتے ہیں بیٹی؟" ابا ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ "ہم نے کبھی کون سا گناہ کیا ہے۔ جب تمہاری اماں نے منہ موڑا تو تم کو پالتے رہے یہ بھی نہ دیکھا کہ دنیا میں کچھ اور بھی ہے۔" وہ روٹھا ٹھا کر باہر چلے گئے تو ساجدہ کو ہنسی آ گئی۔ خود تو ابا ہمیشہ یہی دعا کرتے تھے مگر آج اس کی زبان سے نکلی ہوئی دعا بھی ان کے لئے طعنہ بن گئی۔

نماز کے بعد لوگ دعائیں مانگ رہے تھے۔ جانے وہ کون سی دعائیں مانگ رہے تھے۔ ساجدہ کو ایک بار تو ایسا محسوس ہوا کہ اتنے سارے پھیلے ہوئے ہاتھوں میں ساری دنیا کی آسائشیں سمیٹ لینے کی تمنائیں جھلک رہی ہیں۔ اسے اماں یاد آ گئیں۔ اماں کی بہت سی باتیں وہ بھول چکی تھی مگر کچھ یاد بھی رہ گئی تھیں۔ اماں جب اپنے کسی عزیز کو دولت کے پیچھے بھاگتے دیکھتیں تو بڑے دکھ سے کہتیں "کوئی سونے کا نوالہ کھا کر دیکھے تو جانوں۔" ابا ان کو چھیڑتے "بھئی انسان تو نوالہ تو لگ سکتا ہے۔" وہ بیچارے ابا اماں کی قناعت پسندی سے بہت خوش رہتے اور جب اماں مر گئیں تو ابا رو رو کر سب کو یہی بتاتے تھے کہ اس قناعت پسند بی بی نے مجھ سے کبھی کوئی فرمائش ہی نہیں کی۔

اب سوئے ہوئے بچے آنکھ کر ادھم دھاڑ رہے تھے۔ کچھ دور بیٹھے بچے کھانے پینے کی فرمائش کر کے ماؤں کے آنچل کھینچ رہے تھے۔ عورتیں انہیں جھڑک رہی تھیں۔ پیٹ رہی تھیں۔ ایک عورت کی آواز سب سے اونچی تھی۔ "ارے کمبختو ہم یہاں کون سا گھر واکرتے ہیں۔ دن سے بیٹھے خیرات کی روٹیاں توڑ رہے ہیں۔"

ساجدہ کو یہ الفاظ تیر کی طرح محسوس ہوئے۔ وہ سوچنے لگی بعض لوگ کسی بھی بات سے خوش نہیں ہوتے۔ جذبات کی قدر کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہ آخر اتنے انجانے پن سے کیوں کام لیتے ہیں۔ وہ نوجوان لڑکے یاد آ گئے جو میلی میلی شلواروں اور قمیصوں میں تھے مگر سینکڑوں روپیوں سے تیار کی ہوئی کھانے کی دیگیں اور نانوں کے جھوے کیمپ میں پہنچا رہے تھے۔ کھانا بانٹتے ہوئے ان کے چہرے مسرت سے تمتما اٹھتے۔ وہ سب سے کہتے "پاکستان تمہارا ہے بھائیو، ہم تو تمہارے خادم ہیں۔"

بچوں کا ایک شور برپا ہوا۔ ریڑھیوں پر لدی ہوئی دیگیں اور نانوں کے جھوے اتارے جا رہے تھے۔ بچے ماؤں کے آنچل چھوڑ کر اب دیگوں کے گرد مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہے تھے۔ ایک گورے سے جوان لڑکے نے نعرے کی طرح آواز لگائی۔ "آج ہم چائے بھی لائے ہیں بادشاہو۔ سلیم جی نے بھجائی ہے۔" پھر وہ بچوں کو ایک طرف کرنے لگا۔ "بس ذرا دیر صبر کرو بچو۔ چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے۔" لڑکے نے پھرتی سے اینٹوں کا چولہا بنایا اور پھر سوکھی ہوئی شاخیں، پتے اور کاغذ کے ٹکڑے ٹھونس کر آگ جلا دی۔ چائے گرم ہو رہی تھی۔ اور پھر وہ بڑی خوشی کے بچوں کو گھیرے میں لے کر ناچنے لگا۔ "چائے پیو گرم گرم، روٹی کھاؤ نرم نرم۔" بچے بھی اس کے ساتھ گا رہے تھے۔

"چائے پیو ——"

ساجدہ کو یہ سب کچھ اتنا پیارا لگا کہ وہ گلاس اٹھا کر تقریباً بھاگتی ہوئی وہاں پہنچ گئی اور بچوں کے گھیرے کو توڑ کر اس نے اپنا گلاس لڑکے کی طرف بڑھا دیا۔ لڑکا مسکرا کر کھڑا ہو گیا۔

"سب سے پہلے میں چائے پیوں گی۔"

"باجی آپ ہمارے حصّے کی چائے بھی پی لیں۔ ابھی میں نے بھی نہیں پی۔"

"سچ!" ساجدہ نے اسے پیار سے دیکھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"غلام محمد۔ ویسے سب لوگ مجھے گامے کہتے ہیں۔ پیارا کا نام ہے باجی۔ اور یہ دیگ میں لایا ہوں باجی۔ میں نے چندہ جمع کیا تھا۔ باجی۔ لوگ مجھے لڑکا سمجھ کر چندہ نہیں دیتے تھے۔" لڑکے نے ایک ہی سانس میں اپنا کارنامہ سنا دیا۔

"پھر تو یہ چائے بہت مزے کی ہوگی۔"

"پی کے دیکھیں باجی۔" لڑکے نے اس کا گلاس لبالب بھر دیا۔

ساجدہ آنے کو تو آ گئی تھی مگر جب اس نے لوگوں کو دیگوں کی طرف آتے دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ ان میں کوئی عورت نہ تھی۔ وہ جس طرح آئی تھی اس سے بھی زیادہ تیزی سے بھاگ پڑی اور جب وہ اپنی جگہ پر پہنچی تو دیکھا کہ ابا انگوچھا کندھے پر ڈالے، کٹورا اور گلاس لئے دیگوں کی طرف جا رہے ہیں۔

ساجدہ اپنے بکس پر بیٹھ کر مزے مزے چائے پینے لگی۔ گڑ کی بنی ہوئی اس نیم گرم چائے نے اس وقت سارے دائقوں کو مات کر دیا تھا۔

"اتنی اچھی چائے تو خود میں نے بھی کبھی نہیں بنائی۔" جیسے اب بھی وہ لڑکے سے باتیں کر رہی تھی اور بار بار مسکرائے جا رہی تھی۔

"میں نہیں کھاؤں گا۔ میں نہیں کھاؤں گا۔ میری بیٹی کہاں ہے؟" میں نے اس کی چیخ سنی تھی۔

اس نے گلاس رکھ دیا۔ مسرت کے لمحے بوڑھے کی چیخوں تلے دم توڑ گئے۔ جانے بابا نے کب سے کچھ نہیں کھایا ہوگا۔ وہ بابا کو کس طرح تسلی دے۔ وہ اس وقت سخت الجھن محسوس کر رہی تھی۔ ایک مرد لٹتا ہے۔ دوسرا لوٹ پر طنز کرتا ہے۔ تیسرا لوٹ کے غم میں پاگل ہو جاتا ہے اور ——

ابا کھانے پینے کا سامان لئے جوانوں والی چال سے واپس آ رہے تھے۔ کیا یہ مسرت اور بے فکری صرف اسے دکھانے کے لیے ہے۔ ابا کو اپنا گھر چھوٹنے کا غم ہے، اور وہ اس غم کو کس کس طرح چھپا رہے ہیں۔

"لو بیٹیا۔ خوب گرم ہے۔ ایسی مزے کی چائے تم نے کبھی کاہے کو پی ہوگی۔ اور یہ دیکھو حلیم ہے، ساری رات پکائی جاتی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے تم کھچڑا پکاتی تھی۔"

ساجدہ نے گلاس اٹھا لیا اور ساری کے پلو سے پکڑ کر آدھی چائے اپنے گلاس میں ڈال لی اور گلاس ان کی طرف بڑھا دیا۔

"ابا کیا سچ مچ آپ بہت خوش ہیں؟"

"ہاں بیٹیا۔ زندہ سلامت اپنے ملک میں آ گئے۔ خوش نہ ہوں گا۔" وہ چائے کے گھونٹ پینے لگے۔

"تو پھر آپ تھوڑی سی نان کھا لیجئے۔ آپ نے رات کو بھی کچھ نہیں کھایا۔"

"نہیں بیٹا۔ تم کھاؤ۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے معدے کے منہ پر ڈھکن رکھ دیا ہو۔ بھوک تو لگتی ہی نہیں۔"

ساجدہ نے ابا کو غور سے دیکھا کہ وہ بڑے سکون سے چائے پی رہے تھے۔ بھوک نہیں لگتی۔ وہ سوچنے لگی۔ اماں نے بارہ سال تک پائی پائی جمع کر کے دو کمروں کا پکا مکان بنوایا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا، جب وہ چھوٹی سی تھی تو ایک کچی کوٹھری میں رہتی تھی۔ اماں ساری رات سامان کو ادھر سے ادھر رکھتی رہتیں اور ابا چھت کے سوراخوں کو بند کرنے کی کوشش میں چھینک چھینک کر بے حال ہو جاتے تو پھر انہیں غصہ آنے لگتا۔ اماں انہیں چائے بنا کر پلاتیں اور تسلی دیتیں "کوئی سدا تو اس گھر میں نہیں رہنا۔"

نئے گھر میں آ کر اماں نے بڑے فخر سے کہا تھا "دیکھا تم نے ساجدہ کے ابا، میں نے پائی پائی جوڑ کر محل بنایا ہے۔" انہوں نے اپنے محل میں موتیے کا پودہ لگایا تھا اور چنبیلی کی بیل دیوار پر چڑھائی تھی۔ وہ اپنے محل کو طرح طرح سے سجانے میں لگی رہتیں مگر محل بنتے بناتے ہوئے وہ اتنی تھک گئی تھیں کہ کچھ ہی دن بعد ساون کی ایک چھم چھم برستی رات میں وہ ایسے سکون سے پاؤں پھیلا کر سوئیں کہ پھر نہ اٹھیں۔ مگر ابا نے اماں کی جگہ کو جلدی ہی پر کر دیا تھا وہ منہ اندھیرے اٹھتے گھر کی صفائی کرتے، چائے بناتے اور موٹی چھوٹی روٹیاں پکاتے۔ پھر اسے پیار سے جگاتے۔ ناشتہ کراتے اور جب وہ کپڑے بدل کر تیار ہو جاتی تو گھر میں تالا ڈال کر اسے اسکول چھوڑتے اور خود دکان چلے جاتے۔ کچھ دن بعد اس نے تو خود ہی گھر سنبھال لیا تھا۔ ابا اسے گھر صاف کرتے دیکھتے تو ناراض ہونے لگتے "یہ تمہارا کام نہیں بیٹا۔ تم کو اس لئے تھوڑی پڑھا رہا ہوں کہ ایسے گھٹیا کام کرو؟" وہ رنجیدہ ہو جاتی "اور یہ کام آپ کے لئے بڑھیا ہیں؟ ابا ایسی باتیں نہ کیا کریں۔"

شام کو جب ابا دکان سے لوٹتے تو گھوم پھر کر گھر کی ایک ایک چیز کو دیکھتے پھر موتیے اور چنبیلی میں پانی ڈالتے۔

"بیٹا۔ یہ چنبیلی کی پتیاں کون نوچتا ہے؟" ابا اس سے پوچھتے تو وہ شرمندہ ہو جاتی چپکے سے کسی کام میں لگ جاتی۔ وہ ابا کو کیسے بتاتی کہ جب آپ رات کو حقہ پینے دوستوں کے پاس جاتے ہیں تو صلو اس سے ملنے آتا ہے۔ وہ اسے دیکھ کر ساری باتیں بھول جاتی ہے اور بس یوں ہی پتیوں کو توڑنے لگتی ہے۔

اس نے پھر غور سے ابا کی طرف دیکھا مگر ان کے سپاٹ چہرے پر کچھ بھی نظر نہ آ رہا تھا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ابا کو گھر نہ دار رہا ہو۔ وہ تو چنبیلی کی ایک پتی کا ٹوٹنا بھی برداشت نہ کر سکتے تھے۔ کبھی کبھی وہ بڑے چاؤ سے کہتے تھے "سجو کی اماں کا بنایا ہوا محل میں اپنے داماد کے نام کر دوں گا، ہاں، وہ بھی کیا یاد کرے گا، ہماری بیٹیا کے پاؤں دھو دھو کر پیئے گا۔"

اور جب پاکستان بننے کے بعد فساد کی آگ تیز ہوئی اور اپنا محلہ بھی خالی ہونا شروع ہوا تو بھی ابا گھر چھوڑنے کو راضی نہ تھے مگر جب انہیں احساس ہوا کہ گھر پہ ایک چھوڑ دس دامادوں کی یلغار ہونے والی ہے تو گھر کے دروازے بند کرنا بھی بھول گئے تھے۔ اور پناہ گزینوں کے کیمپ میں انہوں نے سر جھکائے جھکائے اپنے محل کا نوحہ پڑھا تھا "بائی چن چن محل بنایا، لوگ گھر میرا"——

سوچتے سوچتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ماضی کی یادوں کے ویرانے سے بچنے کے لئے۔ وہ باہر دیکھنے لگی جانے کیوں بہت سے لوگ ایک ہی جگہ جمع ہو رہے تھے۔ اس ہجوم میں اسے ڈاکٹر بھی نظر آ رہا تھا۔

"لوگ کیوں جمع ہو رہے ہیں ابا؟"

"معلوم نہیں بیٹا۔" ابا نے اچٹتی سی نظر سے باہر دیکھا۔" چائے سے میرے پیٹ کو بہت فائدہ ہوا ہے۔"

اچھا؟ وہ اتنی دیر سے یوں ہی چائے کا گلاس پکڑے بیٹھی تھی۔ اب اسے یاد آیا تو چائے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔

بوڑھے کی ایک چیخ بلند ہوئی۔ "میری بیٹی۔ میری بیٹی۔" لڑکوں کے بولنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں مگر دوری کی وجہ سے سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ سب کیا کہہ رہے ہیں۔

"ابا، جا کر دیکھئے تو سہی۔ کیا بات ہے؟" وہ بے چین ہو رہی تھی۔

"کیا دیکھوں بیٹا۔ بیچارہ پاگل ہو گیا ہے۔" ابا چلم میں تمباکو بھرنے لگے۔" ابھی چپ ہو جائے گا۔ تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔" بوڑھا تھوڑی دیر کے ساتھ خاموش ہو گیا۔ لوگ بکھرنے لگے۔ اسے سب لوگ بیحد سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ اسے موت کے بعد چھا جانے والی ویرانی کا احساس ہو رہا تھا۔

"ابا کہیں بوڑھا بابا مر تو نہیں گیا؟ سب جمع ہونے کے بعد سب بکھر گئے۔ آخر کیوں؟"

"کچھ بھی نہیں بیٹا۔ میں ابھی ذرا دیر پہلے اسے دیکھ کر آ رہا ہوں۔ درخت تلے آرام سے بیٹھا تھا۔ تم یوں ہی ساری دنیا کی فکر میں مبتلا رہتی ہو۔" ابا آنکھیں موند کر حقے کے کش لگانے لگے۔

اسے اباکی بے حسی پر غصہ آ رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ابا سے کہے۔ آپ کے خیال میں تو بوڑھا حساب کتاب کی پوتھی ہے۔ اور اس پوتھی میں صرف رقم درج ہوتی ہے جذبات نہیں۔

وہ باہر نکل آئی اور ہر طرف دیکھنے لگی۔ اس کی نظریں بوڑھے کو تلاش کر رہی تھیں۔ جس درخت تلے وہ گھنٹوں چپ چاپ بیٹھا رہتا تھا اب وہاں بچے کھیل رہے تھے۔ اس نے دیکھا ناظم تیز تیز قدم اٹھاتا اس کی طرف آ رہا تھا۔ جب وہ اس کے قریب آ گیا تو اس نے بے اعتنائی سے نظریں جھکا لیں۔

"آپ کے ابا کہاں ہیں؟"

"بوڑھے بابا کو کیا ہوا؟ لوگ جمع تھے اور وہ چیخ رہا تھا۔ اب کہیں نظر نہیں آتا۔"

"ڈاکٹر نے اسے پاگل خانے بھیج دیا ہے۔ سنا ہے کل رات وہ سب کو تنگ کرتا رہا۔ آپ بھی ڈر گئی تھیں؟"

"تو بابا کو پاگل خانے بھیج دیا گیا۔ لوگ اسے رخصت کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔" اس کا دل بھر رہا تھا۔ "خدا حافظ بابا۔" اس نے دل ہی دل میں کہا۔ اسے دکھ تھا کہ وہ بابا کو الوداع نہ کہہ سکی۔ اسے اس وقت یہ احساس ہی نہ تھا کہ بابا ان سب باتوں سے بہت دور جا چکا ہے۔ اس کا دماغ چیخوں کا ایک ریکارڈ ہے جیسے باجے کی سوئی اس وقت تک بجاتی رہے گی جب تک گھس نہ جائے گی پھر ریکارڈ میں گڑھے پڑ جائیں گے اور پاگل خانے کو اس سے نجات مل جائے گی۔

"آپ بہت رنجیدہ ہیں؟ شاید بابا وہاں ٹھیک ہو جائے۔ یہ پاگل خانے حساس لوگوں کے لئے ہی بنائے گئے ہیں۔"

"مجھے تو آپ بھی بہت حساس لگتے ہیں۔" ساجدہ نے جل کر کہا۔

"مجھے تو آپ بڑے حساس معلوم ہوتے ہیں۔" وہ بے ساختہ ہنس پڑا اور پھر ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ "اگر کبھی سائنس دانوں نے فضا میں بکھری ہوئی چیزوں کو ریکارڈ کر لیا تو پتا چلے گا۔ پھر یہ مہذب انسان کون کون سا لباس پہن کے سب ننگے نظر آ جائیں گے اور تہذیب کا لباس پہن بیٹھے ہیں۔ مگر ان میں آپ شامل نہیں ہوں گے۔ ابا اندر ہیں۔ ابا ناظم صاحب آئے ہیں۔" وہ چند لمحے ہٹ کر کھڑی ہو گئی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ ناظم اسے کتنی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

ابا جیسے جھپٹ کر باہر آئے۔ "اوہ تو آپ آ گئے۔ آپ کو ہمارا کتنا خیال ہے۔ ایسے لوگ کہاں ہوتے ہیں۔ بیٹھیے اندر چلیے۔" ابا خواہ مخواہ ہنسے جا رہے تھے۔

"ابھی میں جلدی میں ہوں۔ پھر آؤں گا تو بیٹھوں گا۔ اچھا اب آپ نے نہیں بتایا۔ آپ وہاں کیا کیا چھوڑ آئے ہیں؟"

"ارے ناظم صاحب نہ پوچھیے کہ کیا کیا چھوڑ آیا ہوں۔ پانچ کمروں کا مکان۔ ایک بہت بڑی کپڑے کی دکان، وہاں دو دو منشی کام کرتے تھے۔ کیا دن تھے وہ بھی۔" ابا نے لمبی ٹھنڈی آہ بھری۔ ساجدہ نے آنکھیں پھاڑ کر ابا کو دیکھا۔

"مجھے افسوس ہے رمضان صاحب میں آپ کو منشی نہ دلا سکوں گا۔" وہ ہنسا۔ "بہر حال یہ لیجیے کاغذات اپنا کلیم لکھیے گا اور دو گواہوں کے دستخط کرا لیجیے گا۔"

ساجدہ نے غصے سے تلملاتی ہوئی نظروں سے ناظم کو گھورا اور پھر چند قدم بڑھ کر ابا کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی وہ ناظم سے پوچھنا چاہتی تھی کہ تم میں اتنی ہمت کہاں سے آ گئی کہ میرے ابا کا مذاق اڑاؤ۔ مگر وہ ایک لفظ نہ کہہ سکی۔ غصے سے اس کے پاؤں کانپ رہے تھے۔

ابا نے کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھے۔ "ایک گواہ کیا۔ چار گواہوں کے دستخط کراؤں گا۔"

"اچھا تو میں چلتا ہوں۔ کل آؤں گا۔"

"بس آپ کی مہربانی چاہیے۔ جبر کھا کے تو انسان بندر لگتا ہے۔"

ابا جیسے اس کے سامنے گھگھیا رہے تھے۔

"آپ فکر نہ کریں۔ ایک دو دن میں آپ کو گھر مل جائے گا بس ایک تالہ توڑا اور آپ کو گھر میں بٹھایا۔"

"کیا آپ تالے توڑنے کا کام کرتے ہیں؟" ساجدہ کی آواز کانپ رہی تھی۔ ابا کے سامنے کسی غیر مرد سے بات کی پہلی بار جرأت کی تھی۔

"پہلا تالا میں نے یہیں آ کر توڑا تھا۔" اس نے ساجدہ کی طرف دیکھے بغیر بہت سنجیدگی سے کہا۔ "اچھا خدا حافظ رمضان صاحب" اور بڑے سکون سے نپے تلے قدم اٹھاتا چل دیا۔

"تم۔ تم سچ بیٹا۔" ابا غصے سے بولنے لگے۔ "بھلا تم کو ایسی بات کہنی چاہیے تھی؟ مردوں کی بات چیت میں تمھیں دخل دینے کی کیا ضرورت تھی۔ ٹھیک ہے تم نے برقع اوڑھنا چھوڑ دیا۔ مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ———"

"ابا میں نے آخر ایسی کیا بات کہہ دی کہ آپ کو غصہ آ رہا ہے۔ وہ آپ کا مذاق اڑا رہا تھا۔ مجھے غصہ آ گیا۔"

"وہ میرا مذاق اڑا رہا تھا؟ مذاق تو تم اڑا رہی تھیں۔ تمہاری زبان اور پاؤں دونوں کھل گئے ہیں۔ آج صبح تم لوگوں کے ہجوم میں جانے کیسے پہنچ گئیں۔ رات بوڑھے سے ہمدردی کرنے چلی گئیں اور ــــ

وہ سر جھکائے اندر چلی گئی۔ اسے اچھی طرح احساس تھا کہ ابا آج پہلی بار حساب کتاب میں غلطی کر کے شرمندہ ہیں۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ابا چند ہی منٹوں بعد اندر آ گئے۔ اسے یوں روتے دیکھ کر وہ جیسے گھگھیانے لگے "کیوں رو رہی ہو بٹیا۔ میں نے تو تم کو کچھ نہیں کہا۔ کیا تم مجھ سے ناراض ہو گئی ہو بٹیا۔ مت رو نہیں تو ــ۔ ابا کی آواز بھرا گئی۔ "میں بھی رونے لگوں گا۔"

ساجدہ نے جلدی سے آنسو پونچھ لئے "میں آپ کی بات پر نہیں رو رہی ابا۔ بس یوں ہی جی بھر آیا تھا۔" اس نے بڑے انداز سے چہرہ اٹھا کر مسکراتے ہوئے ابا کو دیکھا ابا کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔

"وہ بٹیا۔ بات یہ ہے کہ میں چاہتا ہوں تم سکھی رہو۔ اور دیکھو نا۔ یہاں تو اپنی گلی محلے کے بس دو چار ہی جاننے والے ہیں اور پھر ــ وہ ٹھنڈا حقہ اٹھا کر گڑگڑانے لگے۔

"روٹی کھا لیجئے ابا۔ وہ برتن اٹھانے لگی۔ وہ چاہتی تھی کہ اب اس موضوع پر کوئی بات نہ ہو۔ ابا کا شرمندہ چہرہ دیکھ دیکھ کر اسے رحم آ رہا تھا۔ دیانتداری کے ڈھنڈورے نے ساری زندگی انھیں چھوٹی سی تنخواہ کے سہارے زندہ رہنے پر مجبور رکھا اور جب انھیں احساس ہوا کہ یہاں تو انھیں کوئی جانتا بھی نہیں تو انھوں نے ایک ہی ضرب میں ڈھنڈورے کے چمڑے کو پھاڑ دیا مگر اب اندھے خوں کو دیکھ کر سر جھکائے بیٹھے تھے۔ "روٹی کھا لیجئے ابا۔" اس نے پھر کہا۔

"ہے۔ وہ۔" وہ جیسے سوچتے سوچتے چونک پڑے۔

"کب سے آپ کے سامنے رکھی ہے۔" وہ ہنسنے لگی۔

"اچھا۔ اچھا۔ میں نے دیکھا ہی نہیں۔ تھوڑی سی کھائے لیتا ہوں۔ پیٹ میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا ہے۔"

"یہ بھوک کا درد ہو گا ابا۔ دو نوالے کھاتے ہیں اور بس، دو کوڑی کی صحت نہیں رہ گئی۔ آج ڈاکٹر کے پاس ضرور جائیے گا۔"

برتن رکھنے کے بعد وہ اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ وہ ابا کو اتنا کمزور دیکھ کر سخت پریشان تھی۔ پھر وہ بھی تو ابھی تک نہیں آیا۔ شاید وہ کسی اور قافلے سے آ رہا ہو۔ شاید ہوائی جہاز سے آ گیا ہو۔ اگر وہ آ جاتا تو ابا کو کسی اچھے سے ڈاکٹر کو دکھاتی۔ پھر اسے یاد آنے لگا کہ صلو نے اس کے ہر دکھ درد کو بٹایا تھا۔ جب وہ دس گیارہ سال کی تھی اور اماں مر گئی تھیں۔ اور جب وہ گلی میں کھڑی اماں کی میت کو جاتا دیکھ کر زور زور سے رو رہی تھی تو صلو نے آ کر اسے اپنے شانے سے لگا لیا تھا۔ "مت رو منی۔ مت رو۔" وہ مردوں کی طرح اسے چپ کرا رہا تھا اور وہ سچ مچ چپ ہو گئی تھی۔ صلو اسے بہلانے کے لئے دن میں کئی بار اس کے پاس آتا۔ اسے چڑیلوں اور بھوتوں کی کہانیاں سناتا اور اسے یقین دلاتا کہ اس نے ایک بار اپنی آنکھوں سے پری دیکھی تھی۔ اسے کبھی یقین نہ آتا۔ "بھلا پریوں کو کیا پڑی ہے جو زمین پر آ بسیں۔" صلو بگڑ کر چلا جاتا۔

جب وہ ساتویں کلاس میں پڑھتی تھی تو اس نے اماں کے دوپٹے نکال کر اوڑھنا شروع کر دیئے اور بس اسی وقت سے

اس نے صلو کو ڈانٹ دیا تھا کہ وہ اب گھر نہ آیا کرے۔ انھیں دنوں میٹرک کا امتحان دے کر کالج چلا گیا تھا۔ تب اسے محسوس ہوا کہ وہ اس کے لیے بے چین ہے۔ اس نے چھٹیوں کے دن گن گن کر کاٹے تھے۔

ابا دوا لے کر واپس آ گئے اور ایک خوراک پی کر لیٹ گئے۔

"ابا اب کیا حال ہے؟"

"بس ٹھیک ہوں بیٹا۔" انھوں نے کروٹ لی اور پھر اس طرح سمٹ لیٹے کہ گھٹنے پیٹ میں آ رہے ہوئے لگ رہے تھے۔

"میں سر دبا دوں ابا؟ ذرا دیر سو لیں گے تو طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔" وہ ابا کے سر ہانے بیٹھ کر آہستہ آہستہ ان کا سر دبانے لگی۔ انھوں نے آنکھیں بند کر لیں اور تھوڑی دیر بعد ہلکے ہلکے خراٹے لینے لگے۔

دوا سے فائدہ تو ہوا ہے۔ ساجدہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر جب ابا کے بستر پر سے اٹھی تو اسے احساس ہوا کہ نیند کا دور شروع ہونے والا ہے۔

وہ ابا کے سرہانے سے اٹھ کر اپنے بستر پر آ گئی۔ وہ پہلے بھی دیر تک جاگ رہی تھی۔ وہ اپنے بستر پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔ اگر نیند آ جائے تو کتنا اچھا ہو۔ وہ سوچنے لگی۔ ایک ذرا سی دیر کے لیے انسان ساری فکروں سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے اور کبھی کبھی میٹھا میٹھا خواب بھی دکھائی دے جاتا ہے۔ وہ صلاح الدین کو یاد کرنے لگی۔ ایک بار اس نے صلو سے کہا تھا کہ اسے رات کو نیند نہیں آتی۔ اور صلو نے اسے بڑی حیرت سے دیکھا تھا۔ "پھر تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں۔ سچو! محبت کے سلسلے میں تو انسان بڑی غفلت کی نیند سوتا ہے۔ اسے پتے ہیں جیسے میٹھے خواب دکھائی دیتے ہیں۔"

مگر آج جب وہ اسے یاد کرتے کرتے سو گئی تھی تو پہلے جیل میں جیسے کیڑے پڑ گئے تھے۔ بوڑھے کی چیخیں جانے کہاں سے سنائی دے رہی تھیں۔ پھر وہ بھی اس کے ساتھ چیخنے لگی۔

"کیا بات ہے بیٹا؟" ابا بستر پر بیٹھے تھے اور اسے پریشان نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"کیا ہوا ابا؟" وہ پسینے میں شرابور تھی۔

"کچھ نہیں۔ تم سو رہی تھیں اور تمھارے گلے سے عجیب سی آواز نکل رہی تھی۔ جیسے تم چیخنا چاہ رہی تھیں۔ کیا کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی تھیں؟"

"ہاں ابا، میں سفر کا خواب دیکھ رہی تھی۔ وہی جب اندھیری رات میں ٹرین پر حملہ ہوا تھا۔" وہ جھوٹ بول دی۔

"اب تو اپنے پاکستان میں ہو بیٹا۔ اب ان باتوں کو بھول جاؤ۔" ابا ہنسنے لگے۔ "تمھاری اماں، اللہ اسے جنت نصیب کرے، کبھی کسی بات سے ڈرتی نہیں تھی۔"

"اب آپ کا درد کیسا ہے؟" اسے ابا کا چہرہ بہت پیلا نظر آ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ دوا کی ایک خوراک اور دے دو۔ تمھاری اماں ایک چورن بناتی تھیں۔ کبھی میرے پیٹ میں درد ہوتا تو ایک چٹکی کھلا دیتیں۔ بس اسی وقت ٹھیک ہو جاتا۔" ابا نے ٹھنڈی سانس بھری۔

دوا پلاتے ہوئے ساجدہ نے سوچا کہ آج ابا کو اماں اتنی کیوں یاد آ رہی ہیں۔ وہ تو اس کے خیال سے کبھی اماں کا ذکر ہی نہ کرتے تھے۔

"ابا سچ سچ بتائیے آپ کو زیادہ تکلیف تو نہیں۔"

"ارے نہیں۔" وہ کھڑے ہو گئے۔ "میں ذرا ٹہل لوں تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔ باہر رونق ہو گی، جی بہل جائے گا۔"

ابا حقہ اٹھا کر باہر چلے گئے تو وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر دعا مانگنے لگی۔ "اے اللہ تو ابا کا ہر دکھ درد مجھے دے دے۔" اس نے اتنے خلوص سے دعا مانگی تھی کہ اسے اپنے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

وہ باہر نکل کر کھڑی ہو گئی۔ اب کیمپ میں خاصی گہما گہمی تھی۔ سرخی پوڈر سے لپی تپی چند بیگمات عورتوں سے ان کے دکھ درد پوچھتی پھر رہی تھیں۔ کچھ لوگوں کا سامان ریڑھوں پر رکھا جا رہا تھا۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کے عزیز واقربا ملنے آئے تھے۔ وہ گلے مل مل کر مسرت کے آنسو بہا رہے تھے۔ ایک لڑکا اس کے پاس سے گاتا ہوا گزر گیا۔ "بچھڑے ہوئے میں کے پھر خدا نے کر ملا دیا۔"

جانے وہ کس سے ملنے کو بیتاب تھا۔ وہ کس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے سوچا۔ یہاں سب انتظار کی کیفیت میں مبتلا ہیں۔ جیسے سب پلیٹ فارم پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہ بھی تو یہاں بیٹھی انتظار کر رہی ہے۔ وہ ابھی تک اسے ڈھونڈنے نہ آیا تھا۔

اس نے دیکھا، ابا دور سے ٹہلتے ہوئے چلے آ رہے ہیں اور راستے میں رک رک کر لوگوں سے باتیں کرتے جا رہے ہیں۔ انھیں کیمپ کی نظامت سے رہنے والی ذرا ذرا سی بات کا علم رہتا۔ کتنے لوگ آئے ہیں۔ کتنے خاندان چلے گئے۔ کتنے جانے والے ہیں اور کون کہاں جا رہا ہے۔ جانے والی بات سناتے ہوئے ابا کی آنکھوں میں چمک آ جاتی۔ "ایک دن ہم بھی چلے جائیں گے۔ بہت جلدی، سنا تم نے بیٹا؟ کوئی ہم سدا تو یہاں نہیں رہیں گے؟"

اب سورج ڈھل گیا تھا۔ بسیرا لینے والے پرند درختوں پر شور مچا رہے تھے۔ وہ ایکدم اداس ہو گئی۔ بیگمات اب واپس جا رہی تھیں۔ اور کھانے کی دیگیں ریڑھے پر سے اتاری جا رہی تھیں۔ بجلی کے کھمبوں پر کم پاور کے بلب پکے پھوڑوں کی طرح پک اٹھے۔ اس نے دیکھا کہ ابا اس کی طرف آ رہے ہیں۔ مگر اب وہ کچھ اس طرح چل رہے تھے جیسے خود کو گھسیٹ رہے ہوں۔

وہ لپک کر ابا کے پاس پہنچ گئی تو انھوں نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔

"ابا، آپ کی طبیعت ٹھیک تو ہے نا؟"

"ٹھیک ہوں بیٹیا۔ بالکل ٹھیک ہوں۔ لوگ کہہ رہے تھے آج گوشت کی دیگیں آئی ہیں۔ تم لپک کر برتن تو اٹھا لاؤ بیٹیا۔"

"آپ اندر چل کر لیٹیے، کھانا آ ہی جائے گا۔"

"ارے نہیں بیٹیا۔ تم دیکھتیں نہیں لوگ کس طرح دیگوں پر ٹوٹے پڑتے ہیں۔" وہ ہنسنے لگے۔ "ساری بوٹیاں ختم ہو جائیں گی۔ تم میرے آرام کی خاطر بھوکی رہ جاؤ گی۔ سالن کی خوشبو آ رہی ہے نا؟" انھوں نے ساجدہ کے شانے سے ہاتھ ہٹا لیا مگر ہاتھ ہٹاتے ہی وہ پیٹ پکڑ کر اس طرح جھک گئے جیسے گر پڑیں گے۔

"بھاڑ میں جائے کھانا۔ آپ اندر چلیے۔" جب وہ ابا کو سہارا دے کر اندر لا رہی تھی تو اس نے محسوس کیا کہ ان کے بدن کانپ رہے ہیں۔

ابا کو لٹا کر اس نے دوا کی شیشی اٹھائی تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

"کیوں ابا؟"

اس دوا سے فائدہ نہیں ہو رہا۔ ڈاکٹر سے کہو کہ —— ابا نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"میں ڈاکٹر کے پاس جاتی ہوں ابا۔ میں اسے ابھی لاتی ہوں۔" وہ باہر نکل کر پوری طاقت سے بھاگنے لگی۔ اس نے تب تو سنا کہ ابا اسے پکار رہے تھے۔ "رک جاؤ بیٹا۔ پہلے کھانا تو کھا لو۔ لوٹ آؤ بیٹیا۔ میں ٹھیک ہوں۔"

ڈسپنسری تک پہنچتے پہنچتے اس کی سانس پھول گئی۔ اسٹول پر بیٹھا ہوا کمپونڈر بڑے مزے سے نان کے ساتھ بوٹیاں اڑا رہا تھا۔ جب وہ ڈسپنسری کے اندر جانے لگی تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

"ڈاکٹر صاحب ڈاک کے لیے گئے ہیں بی بی۔" نوالہ نگلنے کے بعد اس نے بتایا۔

"کب آئیں گے؟"

"آجائیں گے بی بی۔ اب دیکھو نا، جب تک بندہ ٹہلے نہیں روٹی کیسے ہضم ہو؟ بس آتے ہی ہوں گے۔"

"میرے ابا بہت بیمار ہیں۔" وہ کمپونڈر کو التجا سے دیکھنے لگی "جب ڈاکٹر صاحب آئیں تو ان سے کہنا منشی رمضان صاحب کو ذرا دیکھ لیں۔" یہ پیغام اس نے بالکل اسی طرح دیا جیسے ایک بار رات کو اپنی گلی میں رہنے والے ڈاکٹر کو دے آئی تھی۔ اس وقت بھی ابا کے پیٹ میں سخت درد اٹھا تھا۔ ڈاکٹر چند منٹ بعد آگیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ آپریشن کرا کے اپنڈکس نکلوا دیں۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد ابا بہت ہنسے تھے۔ "کل کو ڈاکٹر صاحب کہیں گے کہ پیٹ ہی بدلوا لو۔" ساجدہ نے کیسا کیسا سمجھایا مگر ابا تو آپریشن کی بات ہی سننے کو تیار نہ تھے۔ باپ کی کم علمی بعض وقت اسے خون کے آنسو رلاتی۔

وہ چند منٹ تک کھڑی ڈاکٹر کا انتظار کرتی رہی اور پھر یہ سوچ کر دوڑ پڑی کہ ابا اکیلے ہیں مگر جب وہ ابا کے سامنے پہنچی تو وہ اکیلے نہیں تھے۔ ان کے پاس بہت سے لوگ جمع تھے اور ڈاکٹر بھی سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ ساجدہ کو دیکھ کر لوگ ابا کے پاس سے ہٹ گئے۔ ابا کے سرہانے رکھی ہوئی لالٹین ٹمٹما رہی تھی۔

"آپ یہاں ہیں، میں آپ کو ڈسپنسری میں تلاش کر رہی تھی۔ اب ابا کی طبیعت کیسی ہے؟" وہ ڈاکٹر کو امید بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ "ابا ٹھیک ہیں نا، آپ کو کس نے بتایا کہ میرے ابا بیمار ہیں؟"

"میں نے ان کو ادھر سے گزرتے دیکھا تو بلا لیا تھا۔" ایک بزرگ سے آدمی نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"میں پوچھ رہی ہوں میرے ابا کیسے ہیں۔" وہ تقریباً چیخ پڑی۔ سب خاموش رہے کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔

"میں ڈیوٹی پر تھا۔ اگر میں گھومنے نہ گیا ہوتا تو ——" اس نے ساجدہ کی وحشت زدہ آنکھوں میں جھانک کر سر جھکا لیا۔ "مجھے اپنے جرم کا احساس ہے۔"

"اللہ کی مرضی۔ اللہ کی مرضی۔" کئی آوازوں نے ایک ساتھ کہا۔ تب اسے احساس ہوا کہ ابا مر گئے اور اس احساس کے ساتھ ہی وہ سر سے پاؤں تک سن پڑ گئی۔ اس نے ڈاکٹر کو جاتے دیکھا، لوگوں کو بیٹھتے دیکھا۔ پھر وہ ایک کمزور شاخ کی طرح جھکنے لگی تو کئی ہاتھوں نے اسے تھام لیا۔

جب وہ ہوش میں آئی تو اس نے دیکھا کہ دو ادھیڑ عمر کی عورتیں بیٹھے بیٹھے ایک دوسرے کا سہارا لئے سو رہی تھیں اور دو سپارے ان کے سامنے کھلے ہوئے تھے۔

وہ آہستہ سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ابا کے چہرے سے چادر سرکا کر لالٹین کی بتی اونچی کر دی۔ سرد، اداس اور ویران چہرہ جیسے اس سے سرگوشی کر رہا تھا۔ "ارے بٹیا۔ زندگی کے حساب میں بھی غلطی ہو گئی۔ اب تم کیا کرو گی؟"

اس نے اپنا چہرہ ان کے ٹھنڈے چہرے پر رکھ دیا اور اس طرح گھٹ گھٹ کر رونے لگی کہ کہیں کوئی اس کے آنسوؤں کی آہٹ نہ سن لے۔ کوئی اس کے غم کی راہ کو صبر کے لفظوں سے کھوٹا نہ کر دے۔

اور جب اس کے سر کو آہستہ سے کسی نے اٹھایا تو پو پھٹ چکی تھی اور دور سے اذان کی آواز آ رہی تھی۔

عورتوں نے اس سے جانے کتنے بہت سے سوال کر ڈالے تھے۔ "تمہارا کوئی عزیز ہے کہ نہیں؟" "اب تم کس کے پاس رہو گی؟" "اب تم کہاں جاؤ گی؟"

وہ ان کے ہر سوال پر انکار میں گردن ہلا دیتی۔

"کوئی نہیں تو پھر کیا ہوا۔ کیا ہم مر گئے ہیں۔" ایک عورت نے بڑی ہماہمی سے کہا۔

"ہمارے ہوتے ہوئے تم اکیلی نہیں ہو۔" دوسری عورت نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا تو اسے ایسا لگا جیسے ایک مضبوط ہاتھ اسے تھپک رہا ہے۔ "مت روؤ بٹی، مت روؤ۔" احساس کی محرومیت پر وہ بری طرح تڑپ گئی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ زور زور سے چیخے۔ "ابا مر گئے، ابا مر گئے۔" اس نے عورت کا ہاتھ آہستہ سے ہٹا دیا۔

اب سورج کی کرنیں چادر کے کھسکے ہوئے کونے سے اندر جھانک رہی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ چائے اور کھانے کی دیگیں ریڑھے پر سے اتاری جا رہی ہیں پھر اس نے غلام محمد کی آواز سنی۔ "گرم چائے۔ چائے پیو بادشاہو چائے۔"

پھر وہ بچوں کے بیچ میں ناچنے لگا۔ "چائے پیو گرم گرم نان کھاؤ نرم نرم۔"

ساجدہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان بند کر لئے آج کی صبح کل کی صبح سے کتنی مختلف تھی۔ غلام محمد کی آواز آج اسے کتنی بری لگ رہی تھی۔

کیمپ کے منتظم ایک گھاٹ اور چند آدمیوں کے ساتھ جب اس کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے تو وہ سب کچھ سمجھ گئی۔ "بیٹی۔" کیمپ کا بزرگ منتظم کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

"ابا کا آخری لباس خریدنے کے لئے میرے پاس کچھ روپے ہیں۔" اس نے بے حد صبر سے صاف لہجے میں کہا۔

"میں صرف تم سے اجازت لینے آیا ہوں بیٹی، مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ رمضان بھائی میرے بھائی تھے۔ غسل دینے کے

بیٹے کو آخری دیدار کرا دوں گا۔"

انتہائی کوشش کے باوجود وہ بزرگ کو جواب نہ دے سکی۔ اس کے ہاتھ جھوٹے سے تمبس کی طرف بڑھے اور پھر جیسے مفلوج ہو گئے اور وہ ابا کو کلمے پڑھتے ہوئے اٹھا کر لے گئے۔

چادروں کی دیوار ایک طرف کر گئی تھی۔ دونوں عورتیں اس پر ہاتھ رکھے آہستہ آہستہ رو رہی تھیں مگر اس کی آنکھیں اب دھلے پیالے کی طرح صاف تھیں۔ اب صرف تنہائی کا احساس اور مستقبل کا خیال اس کے سامنے کھڑا جیسے دھمکیاں دے رہا تھا۔

غلام محمد نے شاید میت اٹھتے دیکھ لی تھی۔ بچوں کے زمرے کو توڑ کر وہ ساجدہ کے پاس آ گیا تھا۔ وہ سر جھکائے چپ چاپ کھڑا تھا۔

"جاؤ بیٹے اپنا کام کرو۔" ایک عورت نے اس کی طرف مڑ کر کہا۔

"باجی کیا آپ کے ابا ——؟" غلام محمد بات پوری نہ کر سکا۔

"ہاں! گامو میرے ابا مر گئے۔" وہ بڑی مشکل سے بولی اور پھر اس نے دیکھا کہ گامو جیسے الھڑ لڑکے کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر اس کے میلے گریبان میں جذب ہو رہے ہیں۔ گامو کے آنسوؤں نے اس کے ضبط کے سارے بندھن توڑ دیئے۔

"صبر کرو، ہمت رو۔" ایک عورت اسے سمجھا رہی تھی۔

"لو، بیچاری روئے نہ تو کیا کرے۔ کوئی رشتے ناطے کا بھی نہیں جو ساتھ دے۔ ہائے ہائے کیسا قہر ٹوٹا ہے۔"

ساجدہ ایک دم چپ ہو گئی۔ ہمدردی کے یہ الفاظ اسے ہتھوڑے کی چوٹ لگ رہے تھے۔

"باجی! آپ میرے ساتھ چلیے۔ میری اماں ہیں۔ ہمارا چھوٹا سا گھر ہے۔ میری کوئی بہن نہیں۔ میں آپ کی خدمت کروں گا۔ میں آپ کو ——"

"ارے لڑکے ذرا عقل کی بات کرو۔ ایک جوان لڑکی تمہارے ساتھ جائے گی تو دنیا کیا کہے گی؟"

گامو بگڑ اٹھا۔ "اجی چھوڑو، کیا کہے گی دنیا؟

ماسی یہ دنیا نہیں، پاکستان ہے پاکستان اور یہ میری باجی ہیں، باجی۔"

"گامو!" وہ بہت پیار سے بولی۔ "تم میری فکر نہ کرو۔ میں اپنی مدد آپ کر سکتی ہوں۔" اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "جاؤ! لوگ چائے کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ چائے گرم گرم۔ روٹی کھاؤ نرم نرم۔" وہ بازوؤں میں سر چھپا کر آنسو پونچھنے لگی۔

اس نے گامو کے سسکنے کی آواز سنی اور جب اس نے سر اٹھایا تو وہ جا چکا تھا۔ دنیا اور پاکستان سب اس کے ذہن میں گڈمڈ ہو کر رہ گئے۔

زندگی کے خاتمے کے تمام مراحل گزر چکے تھے۔ اور اب شام ہو رہی تھی۔ بادلوں کے چند سیاہ ٹکڑے ہوا میں جیسے ڈر رہے تھے اور بسیرا لینے والے پرندے درخت پر شور مچا رہے تھے۔ پرندوں کی سیٹیوں جیسی آوازیں آج اس کی زندگی میں کوئی امنگ پیدا نہ کر رہی تھیں۔ اسے لگ رہا تھا کہ ہر آواز اس کے کانوں میں درد کی ٹیس بن رہی ہے۔

دونوں عورتیں تھوڑی دیر کے لئے اٹھ کر گئیں اور پھر آ گئیں۔ اس وقت وہ دونوں اس کے مستقبل کے لئے بڑی فکر مند نظر آ رہی تھیں۔

"میں کہتی ہوں کہ میرا دیور اتنا اچھا لڑکا ہے کہ بس کچھ نہ پوچھو۔ ہر ایک تعریف کرتا ہے۔ کانپور میں زیوروں کی بہت بڑی دکان تھی۔ سب لُٹ گئی۔ خیر دکان تو یہاں بھی مل جائے گی۔ تیس چالیس سیر سونا تو کپڑوں میں چھپا کر نکال لائے ہیں۔" سنار کی بھاوج نے چند لفظوں میں ساری رام کہانی سنادی۔

"اور میرا بھائی۔ ماشاءاللہ بارہ جماعتیں پڑھا ہوا ہے۔ وہاں جلسے جلوسوں میں پڑ گیا۔ کہتا تھا کہ اب تو پاکستان جاکر ہی پڑھوں گا۔ میں تو کہتی ہوں پاکستان کے لئے اس نے رات دن ایک کر دئے۔ سچ پوچھو بہن تو پاکستان بنایا اسی نے۔ اللہ اس کی لمبی عمر کرے۔ صورت شکل ایسی کہ دیکھے سے بھوک پیاس اڑے۔"

ساجدہ نے آنکھیں پھاڑ کر دونوں عورتوں کو دیکھا۔ تو اسے دو جونکیں نظر آئیں۔ بالکل ویسی ہی جونکیں جنہیں ایک بار حکیم نے اماں کے پیروں میں چپکا دیا تھا اور جب وہ اماں کا خون چوس چوس کر پھول رہی تھیں تو وہ مارے ڈر کے باہر بھاگ گئی تھی۔ مگر یہ جونکیں تو ان سے زیادہ خطرناک تھیں وہ اس کی خود اعتمادی کی دیوار کو ڈھا رہی تھیں۔

بچپن میں اماں اسے ایک کہانی سنایا کرتی تھیں۔ ایک تھا بادشاہ۔ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔ تو بیٹا اس بادشاہ کی سات بیٹیاں تھیں ایک بار بادشاہ نے اپنی ساتوں بیٹیوں کو اپنے پاس بلایا اور باری باری سب سے پوچھا کہ تم کس کی قسمت کا رزق کھاتی ہو چھ بیٹیوں نے کہا کہ ابا حضور ہم آپ کی قسمت کا رزق کھاتے ہیں۔ مگر سب سے چھوٹی بیٹی نے کہا کہ ابا حضور میں اپنی قسمت کا لکھا کھاتی ہوں بادشاہ چھوٹی بیٹی سے ناراض ہو گیا اور اس نے خادموں کو حکم دیا کہ چھوٹی بیٹی کو ڈولے میں بٹھا کر جنگل بیابان میں چھوڑ دیا جائے چھوٹی بیٹی جنگل میں حیران پریشان پھرتی تھی۔ نہ کھانے کو روٹی تھی نہ پینے کو پانی پھر خدا کا کرنا کچھ ایسا ہوا کہ چھوٹی شہزادی کو وہیں خزانہ ملا اور اس خزانے سے اس نے ایک بہت بڑا محل تعمیر کرایا اور ———

خود اعتمادی کی یہ کہانی ختم بھی نہ ہوئی کہ ساجدہ بول پڑتی۔" اماں میں سب سے چھوٹی بیٹی ہوں۔" اسے چھوٹی بیٹی سے بہت محبت ہو گئی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اماں کے مرنے کے بعد اس نے چھوٹی عمر میں گھر سنبھال کر ابا کو بہت سی فکروں سے آزاد کر دیا تھا مگر ابا اسے تنہائی کے حبس ڈولے میں بٹھا کر انسانوں کے جنگل میں چھوڑ گئے تھے وہاں وہ خود اعتمادی کا خزانہ کھودنے کی طاقت کھو بیٹھی تھی۔

"بہن تمہارے پاس تو اتنا بھی نہیں کہ کیمپ سے نکل کر دو وقت کی روٹی کھا سکو۔" ——— سنار کی بھاوج فخر سے کہہ رہی تھی ——— علم کو چاٹنے سے پیٹ تو نہیں بھر جاتا۔"

"واہ جی واہ" ——— پاکستان بنانے والے کی بہن کو تاؤ آ گیا ——" سونے میں کھوٹ ملا ملا کر چار پیسے کما لئے تو ہمارے منہ لگتی ہو! ٹھیک کہتا ہے میرا بھائی، جاہلوں سے اس طرح بھاگو جیسے کمان سے تیر۔"

"ذرا میں دیکھوں تمہارا تیر کمان۔" ——— سنار کی بھاوج نے آستین چڑھا کر ہاتھ لہرایا تو ساجدہ آنکھیں بند کیے زور سے چیخی ———

——— اور پھر چیختی چلی گئی۔" ابا۔ ابا۔"

دونوں عورتیں گھبرا کر اسے تسلی دینے لگیں۔

"ہم نے تو کچھ نہیں کہا۔ خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔"

"ہم نے کچھ نہیں کہا۔ مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوتا کوئی ہم ضد کر رہے ہیں۔ ہم نے سوچا بیچاری بے سہارا ہے کہاں جائے گی۔"

اس نے جیسے کچھ نہیں سنا۔ بس وہ چیخ چیخ کر روئے جا رہی تھی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ اس کے پاس ایک ہجوم جمع ہو گیا ہے۔ اس نے اپنے سر پر ایک نرم نرم سا ہاتھ محسوس کیا تو وہ خاموش ہو گئی اور آنکھیں کھول کر اس نرم ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ہجوم میں گھری ان ایک موٹی موٹی آنکھوں والی سادہ سی لڑکی نے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا بادشاہ کی سب سے چھوٹی شہزادی کی طرح اسے محسوس ہوا کہ اس نے خزانے کا سراغ پا لیا ہے۔

"مجھے سب معلوم ہے اب تم اکیلی نہیں ہو۔" لڑکی اسے اس طرح لپٹا رہی تھی جیسے اپنے سینے میں سمو لے گی "اب تم میرے ساتھ رہو گی ساجدہ۔"

اس نے حیرت سے اپنا نام سنا اور لڑکی کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ تم کون ہو تم کیا ہو۔ مجھے کہاں لے جاؤ گی؟ لڑکی ان سوالیہ نظروں کو بڑے پیار سے دیکھ رہی تھی اور جیسے ان سوالوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"میں ان کو جانتا ہوں بیٹی تم اطمینان سے ان کے ساتھ چلی جاؤ۔ تم اکیلی ہو۔ یہ تم کو سہارا دیں گی۔" لڑکی کے ساتھ کیمپ کے بڑے منتظم کھڑے تھے۔

"شکریہ۔" اس کی شکر گزار نگاہ جب لڑکی پر پڑی تو جیسے اس نے سہم کر اپنا سر لڑکی کے کاندھے پر رکھ دیا۔

"آپ رخصت ہوں بیٹی۔ میں سامان لے چلتا ہوں۔" منتظم کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

لڑکی اسے لپٹائے آگے بڑھ گئی۔ اس نے ایک بار مڑ کر کھنے درخت کو دیکھا۔ وہ اسے خزاں میں ٹنڈ منڈ نظر آیا۔ باقی عورتیں مرد اور بچے سب اسے جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ وہ سب جیسے اسے خدا حافظ کہہ رہے تھے۔

پرانی لمبی کار میں پچھلی سیٹ پر وہ لڑکی کی گود میں منہ چھپائے نڈھال سی پڑی تھی اور ناہموار سڑک پر تیز چلتی ہوئی کار بے حد شور مچا رہی تھی تو لڑکی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آہستہ سے پکارا۔

"ناظم بھائی۔ کار ذرا آہستہ چلاؤ کوئی حادثہ نہ کر بیٹھنا۔"

ساجدہ نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ جس خزانے کا سراغ پایا تھا اس پر تو ناگ بیٹھا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ چلتی کار سے کود جائے۔ ناگ جاسے۔ اس نے بے بسی سے لڑکی کو دیکھا۔

"لیٹی رہو۔ درد کے مارے سر میں درد ہو رہا ہو گا۔" لڑکی نے پیار سے اس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا تو وہ سسک کر رو پڑی۔ وہ ان کے ساتھ جا رہی تھی جس نے اس کے باپ کا مذاق اڑایا تھا اور جس نے پاکستان آ کر پہلا تارہ توڑا تھا۔

"تم انھیں تسلی بھی نہیں دے سکتیں سلیمہ۔ میں اناڑی ڈرائیور ہوں کہیں واقعی حادثہ نہ کر بیٹھوں۔" ناظم نے کار کی رفتار اور تیز کر دی "میرا بھائی کار کو غائب پا کر سخت برہم ہو گا۔"

آنسو پونچھ کر وہ بند شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ درختوں سے لدی پھندی سڑک پر کہیں روشنی نہ تھی بادلوں نے اور بھی اندھیرا

کر رکھا تھا۔ اور اب وہ سوچ رہی تھی کہ آئندہ کیا ہوگا۔ اس سوال کا جواب نہ پا کر اس کا دل بیٹھنے لگا اس کا جی چاہا کہ وہ اتنے زور زور سے چیخے کہ اس کی آواز میلوں ادھر تک پہنچ جائے مگر اس نے اپنی اس خواہش کو ہونٹ بھینچ کر سینے میں دفن کر لیا۔ بے بسی اور شدید تنہائی کے احساس کے ساتھ انسان کیسی کیسی انہونی باتیں سوچنے لگتا ہے۔ اس نے بھی سوچا کہ صنوبر کیمپ میں ضرور آئے گا جب اسے نہ پائے گا تو لوگوں سے پوچھے گا۔ بڑے منتظم سے ملے گا۔ اس سے پتہ معلوم کرے گا۔

اب اندھیرا راستہ ختم ہو گیا تھا۔ اب سڑک کے دونوں طرف بجلی کے کھمبے روشن تھے۔ کار ایک کوٹھی کے پھاٹک پر داخل ہو کر پورچ میں کھڑی ہوگئی تو اس نے تیز روشنی میں دیکھا کہ کوٹھی کا رنگ و روغن اڑا ہوا تھا وہ بے حد پرانی لگ رہی تھی۔ لان کے چاروں طرف اونچے اونچے درخت گزرے ہوئے برسوں کا پتہ بتا رہے تھے۔ ہوا میں دیسی گلابوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔

کار سے اترتے ہی اسے خوشبو کے ساتھ سردی کا ایسا احساس ہوا کہ وہ کانپنے لگی۔ ناظم کار سے اترتے ہی غائب ہو گیا۔ سلیمہ اس کا ٹھنڈا ہاتھ تھام کر بڑے دروازے سے اندر داخل ہوگئی۔ گیلری میں بچھی ہوئی دبیز قالین پہ چلتے ہوئے اسے محسوس ہوا کہ اس کے پاؤں دھنس رہے ہیں۔ وہ ایک لمحے کو کھڑی ہوگئی۔

"کیا بات ہے سجو؟" سلیمہ نے پوچھا۔

"میں تھک گئی ہوں۔" ساجدہ نے آہستہ سے کہا۔

"بس اتنا سا چل کر تھک گئیں؟" وہ مسکرا دی۔

"میں تو بہت دور سے سفر کر کے آ رہی ہوں باجی۔" ساجدہ کی آواز بھرا گئی۔ اسی لمحے اسے کمرے کے کھلے ہوئے دروازے سے ایک سریلی آواز سنائی دی "تم نے گھر کو خیرات خانہ سمجھ رکھا ہے۔ تم کو یہ بھی خیال نہیں کہ اب تمہارے باپ کتنے تھک چکے ہیں۔ پہلے تمہاری ماں گھر کے کام کے بہانے تاجی کو اٹھا لائیں اور اب تم ـــ تمہیں پتہ ہے کہ آٹا مہنگا ہو رہا ہے؟"

"کیا آپ آہستہ نہیں بول سکتیں۔ آپ ایک شخص پر حکومت کرتے کرتے یہ کیوں سمجھنے لگیں کہ سب آپ کے غلام ہیں۔" ناظم کی آواز تھی۔ سلیمہ جیسے ساجدہ کو گھسیٹنے لگی۔ "تم بہت تھک گئی ہو سجو۔ جلدی سے چلو، تم اپنے کمرے میں ذرا دیر آرام کرو گی تو تھکن دور ہو جائے گی۔"

دبیز قالین۔ خیرات خانہ۔ مہنگا آٹا۔ یہ کون سی جگہ ہے اللہ۔ یہ ساری چیزیں ایک جگہ کیسے جمع ہوگئیں۔

"سلیمہ بیٹی۔ کہاں ہو میری جان؟" اب وہ سریلی آواز گیلری میں گونجی۔

"آتی ہوں امی۔" سلیمہ نے مڑ کر جواب دیا اور ایک چھوٹے سے اجاڑ کمرے میں داخل ہوگئی جہاں ایک رنگین پایوں والا نواڑی پلنگ اسے آرام کی دعوت دے رہا تھا۔

"سلیمہ باجی ـــ" ساجدہ خالی خالی نظروں سے سلیمہ کو دیکھنے لگی۔

"تم آرام کرو سجو۔ تاجی ابھی تمہارے لئے چائے بنا دے گی۔ صبح تمہارا کمرہ صاف کر کے تمہارا سامان لے آئے گی۔ کھانے کے وقت میں آ کر تم کو لے جاؤں گی پھر تم کو سب سے ملاؤں گی۔ ہاں نا؟" سلیمہ اسے معصوم معصوم نظروں سے دیکھ کر مسکرائی۔

گئی۔ اب بادل آہستہ آہستہ گرج رہے تھے اور کھلی ہوئی کھڑکی سے ہوا کے تیز جھونکے اندر آ رہے تھے۔ اس نے اُٹھ کر کھڑکی بند کر دی اور پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ درد کے مارے اس کا سر جیسے پھٹا جا رہا تھا اس وقت اس کے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیت ایک کراہ بن کر رہ گئی تھی۔

"لو چائے پی لو۔ اور یہ رہا تمہارا بستر۔" لڑکی نے بستر پلنگ پر رکھ دیا اور چائے کی پیالی اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

"تم تاجی ہو؟" ساجدہ نے لمبی چوڑی لڑکی کو ذرا غور سے دیکھا۔ بھدے نقوش کے باوجود وہ بے حد معصوم لگ رہی تھی۔

"ہاں۔ میں تاجی ہوں۔" وہ مسکرائی۔ "اچھا ہوا تم آ گئیں۔ اتنے بڑے گھر کا کیسے کام کر کر کے تھک جاتی تھی۔"

"تاجی سلیمہ باجی سے کہنا کہ میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔ اچھا، کہہ ضرور دینا۔ خواہ مخواہ وہ مجھے بلانے آئیں گی۔"

"ارے واہ۔" تاجی زور سے ہنسی۔

"ہنسنے کی کیا بات ہے؟" ساجدہ نے اسے غصے سے دیکھا تو وہ چپ ہو گئی۔

"پیالی خود لے آنا۔ میں جا رہی ہوں۔" تاجی نے بھی اسے غصے سے دیکھا اور چلی گئی۔ ساجدہ نے اُٹھ کر دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی۔ الٹا سیدھا بستر بچھایا روشنی گل کر کے لیٹ گئی اور درد کی شدت سے کراہتے کراہتے کب سو گئی اسے پتہ بھی نہ چلا۔

ہم جلیس، ہم صفیر

منظور الٰہی

شیخ محمد اکرام، حمید احمد خان، ممتاز حسن، ایک ایک کر کے ستارے ماند پڑ گئے۔ ان احباب کی صحبت ایک نعمت تھی۔ پہروں باتیں ہوتیں لیکن جی سیر نہ ہوتا۔ شراب لطف پے در جام می ریزی و می ترسم کہ زود آخر شود ایں نشہ۔ ومن دہ ماہ اہتمام طویل صحبتوں میں بسا اوقات ایک وجدانی کیفیت طاری ہوتی۔ وہ یادیں زیست کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ اردو اور فارسی کے شہ پارے، تنقیدی جائزے، احیائے دین کی تحریکیں، اسلامی روایت کی بنیاد استوار کرنے میں صوفیائے کرام کا حصہ، نقاشی اور فن تعمیر میں مسلمانوں کے آثار —— یہ جانتے ہوئے کہ وہ نقوش مٹ بھی ہیں اور ان اصول بھی انہوں نے برصغیر میں مسلمانوں کے ثقافتی کارنامے اجاگر کئے اور اس عظیم الشان وراثت کی لاج رکھ لی جسے ہم ہند اسلامی تہذیب کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہمارے ماضی کی تابناک روایات کے یہ امین مغربی علوم میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ انہیں برصغیر کی اسلامی ثقافت کا نمائندہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

۱۹۶۲ء میں میرا تقرر بحیثیت سیکرٹری تعلیمات مغربی پاکستان ہوا تو پہلی مرتبہ پروفیسر حمید احمد خان سے نیاز حاصل ہوا۔ وہ اُس وقت اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل تھے۔ بکمال شفقت انہوں نے مجھے اپنے کالج آنے کی دعوت دی۔ وہ طلبا کی تکالیف سے بخوبی واقف تھے۔ لیبارٹریوں میں سامان کی کمی، لائبریری کے لیے گرانٹ کی ضرورت، ملحقہ ہاسٹل سے ناخواندہ مہمانوں کے انخلا کا مسئلہ، توسیع عمارت کا منصوبہ۔ اُن کی دُور رس نگاہ سے ادارے کی جزئیات مخفی نہ تھیں۔ چائے کے وقفے میں مجھے احساس ہوا کہ لڑکوں کے گروہ میں ان کی حیثیت ایک مشفق باپ کی تھی اور انہیں وہ مقام حاصل تھا جو برسوں کی بے لوث خدمت، ذاتی دلچسپی اور ہمدردانہ روش کا ثمر ہوتا ہے۔ وہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے تو مجھے سنڈیکیٹ کی نشستوں اور نجی محفلوں میں اُن کی دلآویز شخصیت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اُن دنوں یونیورسٹی کو بہت سی الجھنیں درپیش تھیں، طلبا میں ہیجان، انتظامیہ اور تدریسی شعبوں میں رقابت، شخصیات کا ٹکراؤ، سازشیں اور الزام تراشیاں، طلبا کو خانہ جنگی میں ملوث کرنے کی سعی، یہ منفی رجحانات ادارے کے ضعف کا باعث تھے اور اس کی سربراہی کانٹوں کی سیج تھی لیکن اُس پرآشوب دور میں بھی پروفیسر صاحب کی کوشش رہی کہ جادۂ اعتدال سے نہ ہٹیں، نظم و ضبط بے لاگ ہو، درپیش مسائل مروجہ قاعدے کے مطابق حل کئے جائیں۔

سنڈیکیٹ کی میٹنگ میں وہ اپنا نقطۂ نظر مختصر مگر جامع الفاظ میں بیان کرتے۔ مسئلے کے نشیب و فراز سمجھا کے باقی ممبروں کی رائے طلب کرتے۔ کسی مد کی تیاری میں عملہ غفلت یا نااہلیت کا ثبوت دیتا تو چیں بجبیں ہو جاتے، چہرہ سرخ ہو جاتا لیکن شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹتا، قوتِ برداشت آڑے آ جاتی، درشتی ملائمت میں بدل جاتی۔ میٹنگ کے دوران وہ سب کے ساتھ یکساں سلوک روا رکھتے تھے، چھوٹے بڑے کی تمیز نہ تھی۔ بعض چیئرمین عمر یا منصب کے لحاظ سے سینئر ممبروں کو SIR کہہ دیتے ہیں یا اُن کے آنے

تعلیماً اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں لیکن وہ اس نازبرداری کے قائل نہ تھے۔ وہ لاشعوری طور پر معلم کی مسند پر فائز تھے جس کا احترام سب پر واجب تھا۔

اساتذہ میں حمید احمد خان کا مقام بہت بلند تھا۔ ہزاروں جویائے علم اُن کے چشمے سے بہرہ مند ہوئے لیکن صاحب کردار ہونے کے لحاظ سے اُن کا رتبہ بلند تر تھا۔ وہ تملق سے گریزاں تھے۔ وزارت میں ردّ و بدل ہوا اور ایک بزرگ کو محکمہ تعلیم سونپا گیا۔ حمید احمد خان سلام کے لئے نہ گئے۔ وزیر صاحب بہت جز بز ہوئے، کہیں خفگی کا اظہار بھی کیا۔ خان صاحب کا مؤقف تھا: "وزیر صاحب مصروف آدمی ہیں، میں نے مخل ہونا مناسب نہ سمجھا، کوئی کام تھا تو مجھے یاد فرما لیتے۔"

علامہ مشرقی کے بعد طلباء کے ہنگامے اور پولیس کی فائرنگ تاریخی واقعات ہیں۔ اُس روز گورنر نتھیا گلی میں تھے۔ لاہور واپس آنے پر انہوں نے یونیورسٹی یونین اور منسلک اداروں کے عہدیداروں کو براہِ راست بلوا بھیجا تاکہ اضطراب کی کیفیت ختم ہو۔ ملٹری سیکرٹری نے خان صاحب کو فون پر کہا کہ آپ بھی فلاں وقت پہنچ جائیں۔ خان صاحب کا جواب تھا: "چونکہ چانسلر نے میرے طلبا کو میری وساطت سے نہیں بلوایا اس لئے میں جانے سے قاصر ہوں۔" ملٹری سیکرٹری نے دوبارہ تحمّل سے کہا کہ چانسلر کو رنج ہیں اور یہ ان کا حکم ہے لیکن خان صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔ پی۔ اے کو کہہ دیا کہ پھر فون آئے تو بتا دے کہ ضرورت نہیں۔ اتفاق سے مرکزی سیکرٹری تعلیمات ایس ایم شریف لاہور آئے ہوئے تھے۔ صورتِ حال کا علم ہوا تو انہوں نے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی لیکن عافیت کوشی عبث تھی۔ خان صاحب کا فیصلہ اٹل تھا۔ نواب کالاباغ سخت برہم ہوئے۔ آٹھ دس ماہ اُن کی خفگی برقرار رہی لیکن وہاں بھی یہ وضعداری تو دیکھی کہ خان صاحب کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا بلکہ پہلی ٹرم کے ختم پر مزید چار سال کی توسیع کر دی۔ نواب صاحب کا ذکر چل نکلا ہے تو متذکرہ میٹنگ کی تفصیل بیان کر دوں جو شام کے وقت گورنر ہاؤس میں ہوئی۔ شدید حبس تھا۔ شاید اسی وجہ سے خلافِ معمول نواب صاحب نے سفید کھدر کا تہمد وار کرتا پہن رکھا تھا۔ شروع میں اُن کا لہجہ مشفقانہ تھا: "آپ جذبات کی رو میں بہہ گئے ہیں۔ بیس سال آپ ہمارے بچے ہیں اور کوئی باپ نہیں چاہتا کہ بچوں کو تکلیف ہو۔ یہ ناصحانہ آپ کو سب اختلاف نے گمراہ کیا ہے۔ اُس کا اپنا اثر رسوخ نہیں۔ اس لئے آپ کو آلۂ کار بنایا۔" نواب صاحب کے لہجے میں ٹھہراؤ اور خود اعتمادی تھی۔ انہوں نے انگریزی زبان میں بات جاری رکھی۔

"آپ کو اس ملک پر حکومت کرنے کے سبز باغ دکھلائے گئے ہیں لیکن کسی خوش فہمی میں نہ رہیئے۔ انقلاب برپا ہوا تو کوئی فوجی جرنیل ہی حکومت سنبھالے گا۔ ترکی سے جنوبی ویٹ نام تک کسی طالب علم کو اقتدار سونپا گیا؟ ہر جگہ مارشل لا نافذ ہوا ہے۔" پھر کچھ بے ربط ہوکر نام لیے بغیر وہ ایک سیاسی حریف پر برس پڑے: "اس شخص پر صدر ایوب کی بے شمار عنایات ہیں لیکن وہ ناشکرا ہے۔ ہم سات سو برس سے اپنے علاقے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ صاحب صدر نے ہماری جاگیریں واپس لے لیں لیکن ایک ایسے شخص کو یاک پر قابض رہنے دیا۔" یکدم نواب صاحب طیش میں آگئے: "لیکن میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ مجھے کسی کا خوف نہیں۔" میں نے دبے لفظوں میں کہا کہ باری تعالیٰ کی ذات مستثنیٰ کر دیں ورنہ یہ کلمہ کفر ہو گا۔

کچھ عرصے بعد بڑے اندوہناک حالات میں نواب صاحب کی موت ہوئی۔ پروفیسر حمید احمد خان کسی تقریب پر میانوالی گئے۔ پرسا دینے کے لئے نواب صاحب کے گھر گئے، پھر قبر پر جا کر فاتحہ پڑھی جبکی شرافت ہو تو ایسی۔ ایک اصولی بات پر اختلاف تھا۔ کوئی کدورت باقی نہ تھی۔

عہدوں اور مناصب کے پیچھے بھاگنا ان کی فطرت میں نہ تھا۔ ۱۹۶۳ء میں اُن کے وائس چانسلر بننے کی تجویز ہوئی انہوں نے سرسری طور پر ایک آدھ مرتبہ یاد دہانی کروائی۔ وہ بھی اس لئے کہ اسلامیہ کالج میں ملازمت ختم ہو رہی تھی اور توسیع کے لئے وہ انتظامیہ کمیٹی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے میں متامل تھے۔

مجھے اس بات پر ناز ہے کہ ہماری چار سالہ رفاقت کے دوران یونیورسٹی اور محکمہ تعلیمات کے درمیان روایتی چشمک معدوم تھی۔ اختلاف کی بجائے دوستی اور تعاون کا جذبہ کارفرما تھا۔ خان صاحب کی تھری پیس بے داغ شخصیت ایسی تھی کہ از خود انسان کے دل میں توقیر پیدا ہوتی۔ ایک سال محکمہ تعلیم کی سعی سے پنجاب یونیورسٹی کو نیا اضافہ گرانٹ ملی۔ تدریسی شعبوں کے چند سربراہ سیکرٹریٹ میں مجھے ملنے کے لیے آئے۔ میں نے نیم سنجیدگی سے پوچھا: یہاں آنے سے پہلے آپ حضرات نے وائس چانسلر صاحب کی اجازت حاصل کر لی تھی؟ "ہمیں انہوں نے ہی شکریہ ادا کرنے کے لئے آپ کے پاس بھجوایا ہے۔" یہ تھا وسیع القلبی کا عالم۔

نیو کیمپس کی تعمیر شروع ہوئی تو منتظمین نے سب سے پہلے وائس چانسلر کا گھر بنانے کی پیشکش کی۔ خان صاحب کا جواب تھا "تدریسی شعبوں اور لیبارٹریز کی تعمیر کو اولیت دیجئے۔ وائس چانسلر کا گھر اُس کے بعد بنے گا۔" چنانچہ پانچ برس تک وہ پرانے مکان ہی میں رہے جہاں وہ چھتیس برس قبل بحیثیت لیکچرار مقیم تھے۔ وہ درویش صفت انسان وائس چانسلر کے گھر میں صرف ایک برس رہا۔ کاش پاکستان میں ایسے چند اور لوگ ہوتے۔

حمید احمد خان دوسری ٹرم کے دو برس ہی گزار پائے تھے کہ صوبائی سیکرٹری تعلیمات کے ساتھ اختلافات نے شدت اختیار کر لی۔ ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت اخبارات میں مہم چلائی گئی جس سے وائس چانسلر کی اہانت مقصود تھی۔ جرمن موسیٰ سے عین اس وقت غلط الزام حاصل کئے گئے جب وہ اپنے عہدے سے سبکدوش ہو رہے تھے۔ حمید احمد خان کی غیرت کسی لچک کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ یونیورسٹی سے علیحدگی ناگزیر ہو گئی۔ لوگوں نے اس اقدام کو سراہا۔ اصول پرستی کی خاطر یہ قربانی رائیگاں نہیں گئی۔ قدرتی طور پر خان صاحب بے حد دل گرفتہ تھے۔ فرمانے لگے "مسٹر ایس۔ اے۔ رحمن کے علاوہ اس سلسلے میں صرف آپ کو ملنے آیا ہوں۔" مارشل لا کا نفاذ ہو چکا تھا۔ حسبِ وعدہ حقیقتِ حال سننے گورنر کے گوش گزار کی گئی لیکن گورنمنٹ کا پہیہ چلتا ہی رہا۔ بیوروکریسی کے ماتھے پہ کلنک کا ٹیکہ لگنا تھا۔ ایک طرح زیادتی کا ازالہ نہ ہو سکا۔

زخم ہا برداشتیم و فتحہا کردیم لیک
ہرگز از خونِ کسے رنگیں نشد دامانِ ما
عرفی

وہ مشرقی وضعداری کی تصویر تھے۔ اماں کا انتقال ہوا تو میں ترقی پا کر بورڈ آف ریونیو میں جا چکا تھا۔ گویا محکمہ تعلیم اور یونیورسٹی سے کوئی تعلق نہ رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سیاہ اچکن پہنے ہوئے خان صاحب چلے آ رہے ہیں۔ اُس روز انہوں نے فرمایا تھا "یہ کیسے ممکن تھا کہ والدہ کا انتقال ہو گیا" والدہ کی ذات میری زندگی کا محور تھی۔ میں نے اُن کی شخصیت کا بھرپور تاثر قبول کیا۔ میرے لیے وہ سبھی کچھ تھیں۔ ان کے انتقال پر مجھے بے حد صدمہ ہوا تھا۔ ہر روز صبح سویرے لاہور سے کریم آباد چلا جاتا۔ اُن کی قبر پر جا کر تلاوت کرتا اور رات گئے لوٹتا۔ دس بارہ روز یہی عالم رہا۔ صحت گر رہی تھی۔ دودھ کی کچی لسی پی لیتا، کوئی غذا نہیں کھا سکتا تھا۔ مجھے نصیحت کی کہ کثرت سے

عبادت کریں، اور والد مرحوم پر ایک مبسوط مضمون لکھیں تاکہ دل کا بوجھ ہلکا ہو۔

حمید احمد خاں کی ذات میں سنجیدگی کا عنصر غالب تھا۔ اُن کی وضع قطع، سوچ کا انداز، کام کی لگن، اسلامی افکار سے شغف، لوگوں سے تعلقات کی نوعیت ایک بھاری بھرکم شخصیت کے مختلف پہلو تھے۔ بایں ہمہ وہ خوش مزاجی سے محروم نہ تھے۔ ایک تقریب میں چہرے پر بشاشت کھل رہی تھی۔ میں نے سبب پوچھا تو کہنے لگے "آج اپنے ڈاکٹر کے پاس گیا تھا۔ معائنے کے بعد اُس نے کہا تمہارا دل ایک نوجوان کے دل کی طرح مضبوط ہے۔ میں نے کہا یہ بھی خوب رہی۔ وقت پیری شباب کی باتیں!" بعض اوقات اپنی غلطی پر ہنس دیتے۔ قیام کیمبرج کے دوران مجھے ایک کوٹ کی ضرورت پڑی۔ سلے سلائے کپڑے ایک شوروم میں بکتے تھے۔ دکان کے باہر لکھا تھا "برٹن"۔ میں نے اندر داخل ہوتے ہی کہا "گڈ مارننگ مسٹر برٹن"۔ سیلزمین مسکرا دیا۔ "جناب میں مسٹر برٹن نہیں ہوں۔ برٹن کی برطانیہ میں ساڑھے چھ سو شاخیں ہیں"۔ ایک اور موقع پر ہم ایک سربراہ مملکت کے استقبال کے لیے ایئرپورٹ پر ان کے ہوائی جہاز کا انتظار کر رہے تھے لیکن جھنڈے والی گاڑیوں کا سلسلہ ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ پروفیسر صاحب فرمانے لگے "توقف کیجیے، ابھی کارہائے نمایاں آ رہی ہیں۔"

مولانا ابوالکلام آزاد خشک مزاجی کو نحوست کا نام دیتے ہیں لیکن سنجیدگی اور خشک مزاجی دو مختلف چیزیں ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ انہیں غلط کاری اور ناحق بات برداشت کرنے کا یارا نہ تھا۔ ایسے موقع پر چہرہ تمتما اٹھتا لیکن دوستوں کے لیے جو گرمجوشی اُن کے دل میں تھی وہ بھی کتاب کی مانند پڑھی جا سکتی تھی۔

یونیورسٹی پراویڈنٹ فنڈ کی رقم خطیر ایک ہی بنک میں جمع تھی جسے پالیسی کے تحت منتقل کرنا تھا۔ وائس چانسلر نے ایک کثیر رقم بذریعہ چیک نکلوانی چاہی لیکن متعلقہ بنک نے حریص ہونے کا ثبوت دیا اور چیک آنر نہ کیا حالانکہ ایسی حرکت کرنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ سنڈیکیٹ کی میٹنگ میں انہوں نے یہ قصہ سنایا۔ چہرے کے اتار چڑھاؤ سے ظاہر تھا کہ سینے میں طوفان بپا ہے۔ ایک اور میٹنگ میں انہوں نے بڑے غصے کے ساتھ ایک سربراہ شعبہ کا ذکر کیا جس نے اپنے سرٹیفکیٹ پر III ڈویژن کو II ڈویژن بنا کر یونیورسٹی کو دھوکا دیا تھا۔ اور حمید احمد خاں کا چہرہ مسرت سے جگمگا رہا تھا جب اُن کے دیرینہ ایک قدیمی دوست شیخ محمد اکرام کو علمی خدمات کے اعتراف میں یونیورسٹی کی طرف سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری ملی۔ یہی کیفیت اُس وقت تھی جب ایک کتاب کی تعارفی تقریب میں ممتاز حسن صاحب کی دستار بندی ہوئی۔ حلقۂ یاراں میں بریشم کی طرح نرم، رزم حق و باطل میں شمشیر برہنہ۔

جامعہ عثمانیہ میں رسول پاک کی سیرت پر ایک مضمون لکھ کر حمید احمد خاں نے مقابلے میں پہلا انعام حاصل کیا۔ ممتحن کو شک گزرا کہ ایک طالب علم ایسا مضمون نہیں لکھ سکتا۔ جستہ جستہ سوال کرنے کے بعد اُس کی تسلی ہوئی۔ علم و تحقیق کے میدان میں وہ جوانوں کا عزم اور شاہین کا تجسس رکھتے تھے۔ پچاس برس کی عمر میں کیمبرج سے ایم لٹ کی ڈگری حاصل کرنا اسی کا کرشمہ تھا۔

بقول شخصے وہ غالب شناس اور غالب دوست تھے۔ ایک ایک مصرع کی چھان پھٹک کے بعد انہوں نے تصحیح شدہ نسخہ حمیدیہ کی طباعت کروائی۔ غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر مجلس یادگار غالب کے قیام کا سہرا بھی اُن کے سر ہے۔ مجلس کے

زیرِ اہتمام متنی صحت کے ساتھ غالب کی تمام تصنیفات کی اشاعت غالبیات میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ تنقید و تاثرات پر چار کتابیں اس پہ مستزاد ہیں۔ حمید احمد خان غالب کے عقیدت مند، اقبال کے گرویدہ، اُردو زبان کے عاشق اور نظریۂ پاکستان کے مجاہد تھے۔ ایک تقریر میں انہوں نے کہا تھا: "غالب ہماری ایک ہزار سالہ تہذیب کا نمائندہ اور اقبال کا پیشرو تھا۔ اُس کی عظمت سے انکار کرنا اسلاف کو بھولنا اور اپنی تہذیب سے انکار کرنا ہے۔" وہ خوب سمجھتے تھے کہ ہماری تہذیب کا پاک و ہند کے اسلامی تمدن کے ساتھ کیا رشتہ ہے اور مسلمانانِ ہند کے عربی، فارسی اور علاقائی زبانوں میں لکھے ہوئے شاہکار محفوظ کرنے کی کیا اہمیت ہے۔ شعبۂ تاریخ ادبیات کا انعقاد اسی جذبے کے تحت کیا گیا تھا۔

دریغا کہ کام و لب از کار ماند
سخن ہائے ناگفتہ بسیار ماند

———

ایک گوشہ

ممتاز مفتی

کے بارے میں

لوک تماشا

ممتاز مفتی

باپ اور بیٹے کے باہمی تعلق میں دو رنگ ہوتے ہیں۔ لاگ اور لگاؤ۔ لگاؤ نمایاں ہوتا ہے لاگ ڈھکا چھپا یوں جیسے ابلے ہوئے انڈے میں زردی ہوتی ہے۔ لگاؤ میں وسعت ہوتی ہے لاگ میں گہرائی شدت۔ عکسی اور میرے تعلق میں لاگ میں بھی شدت ہے اور لگاؤ میں بھی۔ یہ شدت تصادم کی شدت نہیں بلکہ حالات کی پیدا کردہ شدت ہے۔

بہرحال یہ مضمون میں اس لئے نہیں لکھ رہا کہ عکسی کے عیب یا خوبیاں گنواؤں۔ اس سے بھی غرض نہیں کہ اپنی تحلیل نفسی کا رعب جماؤں۔ دراصل یہ مضمون تو بذات خود ایک معمہ ہے۔ تحلیل نفسی کا طالب علم ہونے کے باوجود میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ نفسیات کے کس اصول یا قانون کے تحت چھبیس سال کی عمر میں دفعتاً عکسی نے اپنی پرانی شخصیت کی کینچلی اتار پھینکی۔ ایسا کیوں ہوا کہ ایک رات پرانا عکسی معدوم ہو گیا اور ایک نیا عکسی ابھر آیا۔ اس واقعہ پر میں آج تک عالم حیرت میں ہوں اور یہ مضمون اسی حیرت کا اظہار ہے۔

ہمارے باہمی تعلقات کے خارجی رخ کی کہانی بڑی مختصر رہی۔ پہلے لوگ عکسی کو جاننے کے لئے کہا کرتے تھے "اچھا تو تم ممتاز مفتی کے بیٹے ہو۔" اب مجھے جاننے کے لئے پوچھتے ہیں۔ "اچھا تو یہ عکسی مفتی کے والد ہیں۔"

پہلی مرتبہ جب میں عکسی مفتی کے والد کے طور پر جانا گیا تو مجھے ایک دھچکا سا لگا۔

یہ ۱۹۶۶ء کی بات ہے۔ ان دنوں عکسی گارڈن کالج میں لیکچرار تھا۔ کالج میں کوئی تقریب تھی اس تقریب کی نوعیت کچھ اس قسم کی تھی کہ عکسی نے کہا "ابو میرے ساتھ چلئے۔ ضروری ہے۔" کالج میں پرنسپل سے میرا تعارف کرایا گیا۔ ایک صاحب بولے "یہ ممتاز مفتی ہیں۔" جب اس پر پرنسپل صاحب کے چہرے پر روشنی کی کوئی کرن نمودار نہ ہوئی تو دوسرے صاحب بولے "آپ عکسی مفتی کے والد ہیں۔" اس پر پرنسپل صاحب مجھے بڑے تپاک سے ملے۔

تقریب کے اختتام پر میرے دو ایک دوست مل گئے اور ہم سب ایک ریستوران میں جا بیٹھے۔ برسبیل تذکرہ میں نے پرنسپل صاحب سے تعارف کا قصہ سنایا۔

اس پر عکسی بولا "آج پہلی مرتبہ ابو کو عکسی کے والد کی حیثیت سے متعارف کرایا گیا اور ان پر گراں گزرا ہے۔ میرا دل گردہ ملاحظہ ہو کہ چھبیس سال سے یہی کہتے ہیں کہ یہ ممتاز مفتی کا بیٹا ہے اور میں اسے برداشت کئے جا رہا ہوں۔"

یہ تو ۱۹۶۶ء کی بات تھی ۱۹۷۴ء کا یہ عالم ہے کہ وزیٹرز (ملاقاتی) مجھ سے کہتے ہیں "جی آپ سے نہیں ہمیں مفتی صاحب سے ملنا ہے۔" اور مجھے خندہ پیشانی سے جواب دینا پڑتا ہے "جی اس وقت مفتی صاحب گھر پر نہیں ہیں۔" میرے بے تکلف

دوست مجھے فون کرتے ہیں تو کہتے ہیں "بھئی ہمیں جعلی مفتی سے بات کرنا ہے اصلی سے نہیں۔"

۱۹۶۰ء میں میں نے علی پور کا ایلی عکسی کے نام ان الفاظ میں معنون کی تھی "اپنے بیٹے، دوست اور ساتھی عکسی مفتی کے نام"۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم دوست تھے ساتھی تھے۔ تب مجھے علم نہ تھا کہ ایک ایسا دن بھی آنے والا ہے جب ہم اجنبی ہو جائیں گے۔

پچیس سال ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیے زندگی کے راستے پر جوتے چٹخاتے پھرے۔ رسمی قیود سے بے نیاز، تکلف اور دکھلاوے سے آزاد لیکن آج ——— آج ہم ایک دوسرے کے سامنے یوں کھڑے ہیں جیسے دو اجنبی ہوں ہماری شخصیتوں کے رنگ جدا ہیں جاتے خیالات مختلف ہیں۔ ہمارے رخ متضاد ہیں۔ ایسا کیوں ہوا۔ بظاہر اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ صرف وہی ایک واقعہ ہے جو ۱۹۶۷ء میں وقوع پذیر ہوا۔ وہ جسکی توجیہہ میں آج تک نہیں سمجھ سکا۔ یہ کایا پلٹ تبدیلی تنکی جیسی نہیں تھی۔ تتلی کی کایا پلٹ میں تو سنڈی پہ پھول دار پر اگ آتے ہیں۔ عکسی کی کایا پلٹ تو تخیلی پرندے دیپک کی سی تھی جو پرانا ہو کر دیپک راگ الاپتا ہے۔ جس کے اگنی سروں سے اس کے پروں میں آگ لگ جاتی ہے اور وہ جل کر خاک ہو جاتا ہے پھر اس کے خاکستر سے ایک نیا دیپک پیدا ہوتا ہے۔

معلوم نہیں کس نے نواز نے دیپک چھیڑا تھا اور اس کے اثرات عکسی پر مرکوز ہوئے، مجھے تو صرف اتنا پتہ ہے کہ اس روز پرانا عکسی معدوم ہو گیا تھا اور ایک نیا اجنبی عکسی وجود میں آ گیا تھا۔

سائنس صرف تدریجی کایا پلٹ کو مانتی ہے۔ فوری کو نہیں۔ شاید پیرا سائیکالوجی مانتی ہو لیکن فی الحال ہم پیرا سائیکالوجی کو نہیں مانتے لہٰذا یہ بات آج تک میرے لیے معمہ ہے۔

شخصیت بذاتِ خود ایک معمہ ہے جسے نفسیات حل نہیں کر سکی جو سائنسی اصولوں کے احاطے میں نہیں آ سکا۔

شخصیت بنیادی طور پر تضادات کا مجموعہ ہے جیسے گدڑی ہوتی ہے جس پر رنگ رنگ اور طرح طرح کے پیوند لگے ہوتے ہیں یہ سرخ ہے، وہ کالا ہے یہ گاڑھا ہے وہ ریشم ہے شخصیت پرائمری سکول کے بچے کی جیب کے مصداق ہوتی ہے جس میں چاک ہوتا ہے چنے ہوتے ہیں۔ گھڑی کی ٹوٹی ہوئی کمانی ہوتی ہے نیل پالش کی خالی شیشی ہوتی ہے اور شوخ رنگوں والے بنٹے ہوتے ہیں۔

بات یہاں پر ختم نہیں ہوتی جیب میں سوراخ ہونے کی وجہ سے جیب کی وہ ایک چیزیں پھسل کر کوٹ کے اندر ادھر ادھر جا گرتی ہیں جنہیں ڈھونڈ نکالنا مشکل ہوتا ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ شخصیت میں رنگ رنگ کی چیزیں آتی کہاں سے ہیں۔ اور وہ الٹی سیدھی کیوں ہوتی ہیں۔ گھوڑے کے پاؤں۔ اونٹ کا سر چڑیا کا جسم چوہے کی دم۔ پھر تعجب کی بات ہے کہ شخصیت کا مالک دیکھنے میں عجیب الخلقت نظر نہیں آتا۔

آج کے عکسی میں اک مست قلندر ہے اک بے داغ انگریز ہے ان دنوں کا انگریز جب موجوں نے سلطنت برطانیہ پر غروب نہ ہونے کی قسم کھا رکھی تھی ایک ماڈ مداری ہے۔ ایک بودھ بھکشو ہے ایک عمر خور فلسفی ہے اور سب سے بڑھ کر ایک لوک دیوانہ ہے جس نے اسے کامی بنا رکھا ہے۔ اس حد تک کامی کہ وہ لوک تماشہ بن کر رہ گیا ہے۔

ایسی شخصیت سے آپ کیا رابطہ پیدا کر سکتے ہیں۔ مست قلندر سے بات کرو تو وہ بے داغ انگریز کھڑا گھورتا ہوتا ہے ماڈ مداری سے

بات کرو تو عموماً فلسفی جواب دیتا ہے۔ بدمعاشوں سے بات کرو تو کیا دیکھتے ہیں آپ کہ دیوانے کامی نے اسے ان سنی کر دیا ہے۔
دیوانہ کامی آج کے عکسی کی شخصیت کا جزوِ اعظم ہے۔ وہ اس کے سر پر یوں سوار ہے۔ جیسے سرمایہ دار کے سر پہ منافع کی ہوس سوار رہتی ہے۔

اگر دیوانے کامی کا عنصر نہ ہوتا تو کسی انگریز ، ماہرِ فلسفی اور نقاد کے ہاتھوں یوں پٹ جاتا جیسے ٹینس کو رٹ پر ریڈ کا اینڈ ڈیفنڈرز کے ہاتھوں پٹ جاتا ہے۔

اس دیوانے کامی کی وجہ سے وہ گھر میں ہمارے ساتھ رہتے ہوئے بھی ہمارے ساتھ نہیں ہوتا مثلاً وہ مجھ سے کہتا ہے۔
"ابو میں اپنے کام سے اُدھر جا رہا ہوں اگر آپ کو کوئی سگریٹ بھیجنا ہو تو دے دیجیے"
چند ساعت کے بعد جب میں سگریٹ لے کر باہر آتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ تو سلا ہی گیا۔
آخر وہ اپنی بیوی سے پوچھا کرتا ہے "کیوں میں ناشتہ کر چکا ہوں کیا"
کھانے کی میز پر کسی سے سن کر کہ نمک کم ہے وہ چونک کر کہتا ہے " اچھا تو نمک کم ہے میں بھی سوچ رہا تھا کہ بات کیا ہے۔ کھانے میں ذائقہ کیوں نہیں۔

اس دیوانے کامی کی وجہ سے اس کی گھر میں ایڈجسٹمنٹ نہیں ہو پاتی۔ گھر میں وہ ایسے پرزے کی مصداق ہے جو کہیں فٹ نہیں بیٹھتا اور گھر اس کے لئے یوں ہے جیسے ریلوے سٹیشن کا ویٹنگ روم ہو جہاں وہ بیٹھا کسی گاڑی کا انتظار کر رہا ہو۔

عکسی کو گھر کے کام سے سخت چڑ ہے۔ وہ حتی الوسع گھر کا کام نہیں کرتا۔ اس کی دانست میں گھر ایک چھکڑا ہے جو مرد کے پیچھے اس لئے باندھ دیا گیا ہے کہ وہ زندگی بھر بیل کی طرح قدم قدم رینگتا رہے اور پرواز کی اہمیت کھو بیٹھے شادی سے پہلے وہ اکثر کہا کرتا تھا میں اس لڑکی سے بیاہ کروں گا جو عہد سے وعدہ کرے کہ وہ مجھے گھر کا کام کرنے کے لیے نہیں کہے گی۔

صرف کام ہی نہیں بلکہ اس کی توجہ کے مرکز میں نہیں آتا۔ مرکز میں لانا ہو تو اس کے لئے گھر میں کسی کا عالم پیدا کرنا ضروری ہے۔ کوئی بیماری۔ کوئی ہنگامہ۔ کوئی جھگڑا۔ کوئی فتنہ۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے گھر کے لوگوں سے لگاؤ نہیں۔ دقت یہ ہے کہ وہ لگاؤ کو راستے کی رکاوٹ سمجھتا ہے شعوری طور پر اظہارِ جذبہ سے گریز کرتا ہے اور مسلسل اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ ایسی صورت حال پیدا ہونے نہ پائے کہ اسے اظہار کرنا پڑے۔

مثلاً وہ اپنے بیٹے انس سے پیار کرتا ہے۔ اس حد تک پیار کرتا ہے کہ جب انس ماں پہ توجہ مرکوز کر لیتا ہے تو عکسی جل کے کباب ہو جاتا ہے اس کے باوجود اکثر ایسا ہوتا ہے کہ طلبِ توجہ کے لیے انس عکسی کا دامن تھام لیتا ہے مگر عکسی کام کی دیوانگی میں اس حد تک کھویا ہوتا ہے کہ اسے پتہ ہی نہیں لگتا کہ کسی نے دامن تھاما ہوا ہے اس وقت وہ اپنا دامن یوں چھڑا لیتا ہے جیسے کانٹا لگا ہو۔

ویسے فرصت ملے تو وہ انس سے کھیلتا ہے لیکن فرصت ملے جب۔ کام ہو تو فرصت نہیں ہوتی کام نہ ہو۔ تو کام نہ ہونے کا غم ہوتا ہے کام حاصل کرنے کی تڑپ ہوتی ہے ایسے میں فراغت کہاں۔

اپنی دانست میں وہ اپنی بیوی تہمینہ کا بہت خیال رکھتا ہے۔ لیکن خیال رکھنا بھی ممکن ہے جب رکھنے کو دیا ہو۔ نتیجہ یہ ہے کہ تہمینہ ایک اکیلی اور تنہا لڑکی ہے۔ ادھر تہمینہ بھی آسانی سے ہار ماننے والی نہیں۔ وہ بہت تیز اور ذہین ہے۔ اپنے تحفظ اور تسلی کے لئے اس نے ایک ہاتھ سے تالی بجانا سیکھ لیا ہے۔

گھر کے دوسرے لوگ بہنیں اور اس عکسی کے لئے یوں ہیں جیسے تھیٹر کی سٹیج کی سائڈ زمیں چھپے ہوئے کردار ہوں کبھی کبھار براہ اتفاق یہ لوگ عکسی کی توجہ کے مرکز میں آجاتے ہیں تو وہ چونک اٹھتا ہے "ہائیں یہ بھی ہیں کیا؟" پھر احساس ندامت کی وجہ سے وہ ان لوگوں کو بہلانے کی شدید کوشش کرتا ہے۔

گھر میں صرف ایک شخص ہے۔ باپ۔ باپ کے وجود سے عکسی آج تک بے نیاز نہیں ہو سکا باپ کے لئے اس کے دل میں عظیم جذبہ ہے۔ وہ اکثر اپنے باپ سے کہا کرتا ہے "ابو آپ کی محبت میرے لئے سب سے بڑی ہے اور میں اس لت پت سے کبھی آزاد نہیں ہو سکتا۔"

جذباتی لت پت سے عکسی بہت خائف ہے۔ یہ خوف بذات خود اس حقیقت کا غماز ہے کہ اس کے دل کی گہرائیوں میں لت پت کا لاوا کھول رہا ہے جسے دبائے رکھنے کے لئے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگانے میں مصروف رہتا ہے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ گھر میں رہتے ہوئے بھی عکسی گھر میں نہیں ہوتا۔ یہ غیر حاضری گھر والوں کے لئے مایوس کن ہو لیکن عکسی کے لئے دفاعی خود کا کام دیتی ہے۔ دفتر کے ناموافق حالات چٹکیاں نہیں بھرتے۔ ورنہ اس کے جسم پر جا بجا نیل پڑے ہوتے۔

اس کام کی دیوانگی فوک لور پیرم کو زہ ہے۔

عکسی کی سب سے بڑی خوشی اس بات میں ہے کہ فوک لور کا کوئی ایسا پراجیکٹ اپنے ذمے لے جو آسان نہیں بلکہ کٹھن ہو۔ اس حد تک کٹھن کہ اس کے بس کی بات نہ ہو۔ ایسا کام مل جائے تو اس کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ آہا ہا ہا۔ ساتھ ہی دل میں گھبراہٹ سی پیدا ہو جاتی ہے۔ شاید میں اسے نباہ نہ سکوں۔ اب کیا ہوگا۔ کیا مصیبت ہے۔ ہُرّا آہا۔ اور کیا مصیبت ہے۔ دونوں مل کر رقص کرتے ہیں ایک دہشت ہے اور دوسرا اطمینان ہے اس تضاد سے اس کے قدم اکھڑے رہتے ہیں۔ کیفیت مذبذب۔

اس وقت عکسی کی حالت ایسی ہوتی ہے جیسی پھپھولال رانی ہوا کرتی تھی۔ جو ایک آنکھ سے ہنستی تھی دوسری سے روتی تھی۔ ایک آنکھ سے پھول جھڑتے تھے دوسری سے موتی۔

عکسی بیک وقت روتا ہنستا ضرور ہے پر نہ پھول جھڑتے ہیں نہ موتی گرتے ہیں۔ جب وہ کام اپنے ذمے لیتا ہے تو آنکھیں ملفوف ہو جاتی ہیں دیکھتی ہیں پر نہیں دیکھتیں۔ کان سنتے ہیں پر نہیں سنتے صرف وہی بات سنتے ہیں جو کام سے متعلق ہو۔ ذہن صرف اسی بات کو توجہ میں لاتا ہے جو محبوب سے متعلق ہو۔

جب تک کام چلتا رہے عکسی اس کے ساتھ دوڑتا رہتا ہے۔ کام کے متعلق اس کا اصول ہے کہ اگر دوڑنے سے گزارہ ہو جائے تو چلنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب کام ختم ہو جاتا ہے تو وہ تھکاوٹ سے چور چور ہو کر دھڑام سے گر پڑتا ہے۔ اس کے اعضا یوں ٹوٹ کر رہ جاتے ہیں جیسے پلاسٹک کے منکے میں پرویا ہوا الاسٹک کا دھاگا ٹوٹ گیا ہو۔ پھر وہ لاش کی طرح پڑا رہتا ہے۔ "بابو ہمت نہیں رہی

جان نہیں۔ ان کچھ بھی نہیں رہا۔

اس وقت اس کی کیفیت ایسی ہوتی ہے جیسے کسی غرق شدہ کشتی کا وہ مسافر جسے سمندر میں ڈبکیاں کھانے کے بعد کوئی بہتا ہوا لکڑی کا تختہ ہاتھ لگ گیا ہو۔ جو تھکا ہارا تختے سے چمٹا ہوا سمندر میں خس و خاشاک کی طرح بہے جا رہا ہو بہے جا رہا ہو۔

لیکن اس تھکاوٹ کے باوجود چوری چھپے اس کی نگاہیں کسی خفیہ منزل کی طلب سے سرشار رہتی ہیں۔ پھر دفعتاً عکسی چیخ مار کر کہتا ہے۔ جزیرہ جزیرہ وہ۔ وہ۔ اور جزیرہ کیا ہوتا ہے۔ کوئی نیا کام پہلے سے بڑھ کر کٹھن پہلے سے بڑھ کر بس سے باہر۔

اگر طالب اور مطلوب کے درمیان مشکلات حائل نہ ہوں تو طلب کا وجود ہی باقی نہ رہے شاید اسی لئے عکسی کی جملہ مشکلات کام کے بارے میں ہیں۔ اس کے ہم کار یہ پسند نہیں کرتے کہ وہ کام کرے۔ وہ چاہتے ہیں کہ حسب دستور وہ کرسی پر بیٹھے افسری کرے۔ عہدہ بڑھانے کی جد و جہد کرتے تنخواہ بڑھانے کی تجاویز سوچے بات بھی درست ہے۔ عکسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ دیوانہ وار کام کر کے دوسروں کی پوزیشن خراب کرے۔

میں نے ساری عمر فقر کے دشت کی بادیہ پیمائی کی ہے اور عقل و خرد کے موتی چنے ہیں۔ ویسے تو اصولاً میں ان موتیوں کو نگاہ غیر سے چھپائے پھرتا ہوں لیکن آپ سے کیا پردہ ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ کام کرنے کی چیز نہیں وہ تو لٹکائے رکھنے کی چیز ہے جس طرح دلہن ماتھے پہ جھومر لٹکائے رکھتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر کام کرنا لازم ہو جائے تو کاغذ پر کرو۔ کاغذ پہ فروغ فن کا ادارہ بناؤ۔ کاغذ پہ کارہائے نمایاں کرو تعمیر کرو تخلیق کرو لیکن خبردار یہ وہ کاغذ سے نیچے قدم رکھنے نہ پائیں۔

تیسری بات یہ کہ جو کام کل ہو سکتا ہے وہ آج کیوں کیا جائے ——————— اور جو کام کل ہو سکتا ہے وہ پرسوں بھی ہو سکتا ہے دس دن کے بعد بھی ہو سکتا ہے۔ پھر جلدی کیوں؟

پہلے میری عقل و دانش کا بڑا رعب تھا لیکن جب سے عکسی کے سر کام کا بھوت سوار ہوا ہے یار لوگ مجھ پر ہنستے ہیں کہتے ہیں جب ساتھی بیٹے پر اثر نہ ڈال سکا تو دوسروں کے سامنے عقل و خرد کا زعم کس برتے پر!

ہر باپ اپنی زندگی میں چند ایک امریکائیں دریافت کرتا ہے پھر وہ اپنے بیٹے سے مخاطب ہوتا ہے "بیٹا میں نے خوار ہو کر فلاں امریکا دریافت کی ہے۔ اگر تو اسے اپنے پلے باندھ لے تو ——— لیکن کسی بیٹے نے آج تک باپ کی کوئی امریکہ قبول نہیں کی۔ وہ بضد ہوتا ہے کہ وہ از خود دریافت کرنے پر مصر ہے چاہے اس میں کتنی ہی ذلت و خواری سہنی پڑے۔

مجھے یاد ہے میرے والد صاحب نے بھی مجھے عقل و خرد کے موتیوں سے نوازنے کی کوشش کی تھی ایک روز کمال شفقت سے کہنے لگے بیٹا سچ سچائی بڑی اعلیٰ اور ارفع چیز ہے لیکن اعلیٰ ارفع چیز ہر زید بکر کے سامنے پیش نہیں ہوتی لہٰذا بیٹے حتی الوسع سچ نہ بولنا۔

اور بیٹے میں نے اپنی ساری زندگی عورت کو جاننے کی مسلسل کوشش میں صرف کی ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تنوع پیدا کرنے والے اوصاف، حسن، عشوہ، ادا، لبھاہٹ، شرم حیا سب فریب نظر ہیں اندر سے وہ سب ایک سی ہیں۔

والد کی بات سن کر میرے دل میں خیال آیا کہ بڑے میاں بڑے زندہ دل کس چالاکی سے مجھے اس نشاطِ باغ میں چہل قدمی سے محروم رکھنے کی کوشش فرما رہے ہیں۔

سیانے کہتے ہیں کہ شخصیت کو تربیت سے گہرا تعلق ہے ہوتا۔ میرے تجربے میں نہیں آیا۔ میرے والد نے میری شخصیت کو اپنا رنگ دینا چاہا۔ شاید اسی لئے میری شخصیت میں متضاد رنگ ابھر آئے۔ میں نے عکسی کو اپنے رنگ میں ڈھالنا چاہا لیکن ———
میری دانست میں تو تربیت ہمارے گھر کے بیک یارڈ کی کیاری کے مصداق ہے۔ مولی بیجو تو پتے پھوٹتے ہیں۔ پتے نکلتے ہیں ڈنٹھل بنتے ہیں لیکن نیچے مولی نہیں بنتی۔ گوبھی بیجو تو ڈنٹھل نکلتے ہیں۔ پتے پھوٹتے ہیں بڑھتے ہیں۔ بڑھ کر گولہ سا بن جاتے ہیں لیکن گولہ خالی ہی رہتا ہے اس میں گوبھی کا پھول نہیں بنتا۔ زراعت دان کہتے ہیں اس زمین کا مزاج ہی ایسا ہے۔ میں نے عکسی میں وہ وہ اوصاف بوئے جو میری دانست میں بنیادی ترقی کے ضامن ہوتے ہیں۔ نہ جانے زمین کے مزاج کی وجہ سے یا کیوں میں نے مولی بوئی تو گاجر پھوٹ نکلی۔ بینگن بوئے تو کدو اگ آیا۔ پیاز بوئی تو اس میں سے لہسن کی تریاں نکلیں۔ تربیت کی بات چھوڑئیے وہ تو ایک مصنوعی چیز ہے۔ اصلی چیز تو یہ ہے کہ عملی صورت پیدا کر کے دکھاؤ۔

کہتے ہیں خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ میں نے زندگی بھر ہی ایک محبتیں کیں مگر خربوزے نے رنگ نہ پکڑا۔
عکسی نے کسی لڑکی سے محبت نہیں کی۔ نوجوانی میں وہ لڑکیوں میں دلچسپی لیتا تھا لیکن اب۔ اب وہ ان سے خائف ہے اگرچہ یہ خوف بذاتِ خود دلچسپی کا ایک روپ ہے بہرحال نوجوانی میں اس نے عورت کو محبوب نہیں مانا۔ یہ مسئلہ بھی دلچسپ اور قابلِ تحقیق ہے کہ عورت کی جانب مرد کا رخ پشت بہ پشت کس طرح بدلتا ہے۔

عکسی کا پردادا عورت کا پجاری تھا اگرچہ اس نے تپسیا کے لئے ایک نمائندہ عورت کو چن لیا تھا۔ عکسی کے دادا نے عورت کو صرف ایک رنگین چھیڑ چھاڑ کا درجہ دیا۔ والد نے چھیڑ چھاڑ اور پوجا کا امتزاج بنا دیا۔ ایسا امتزاج جس میں پوجا کا عنصر حاوی تھا۔ عکسی نے ایک منفرد رخ اختیار کیا جس میں نہ تو پوجا تھی اور نہ چھیڑ چھاڑ۔ اس نے عورت کو ایک ساتھی سمجھا۔
نوجوانی میں عکسی نے کئی ایک سنگتیں لیں۔ آزمانے کے لئے۔ دیکھوں اس میں ساتھی بننے کی صلاحیت ہے یا نہیں۔ قربتیں حاصل ہوئیں لیکن کوئی قرب حاصل نہ ہوا۔
البتہ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ عورت بنیادی طور پر ساتھی کی متلاشی ہوتی ہے لیکن اگر مرد ساتھ کے تسلسل کی [illegible] اسے اہانت سی لگتا ہے۔

عورت چاہتی ہے کہ دستِ سوال دراز کرو تو وہ اپنا پرس الماری میں رکھ کر مقفل کر دیتی ہے۔ بھکاری نہ ہو تو اسے غصہ آنے لگتا ہے اس کو منہ سامنے یوں جھٹلاتی ہے جیسے وہ جھنجھنا ہو۔ پھر بھی دستِ سوال دراز نہ کرو تو وہ چڑ جاتی ہے۔ وہ چند ایک لڑکیاں جو عکسی کے قریب آئیں انہوں نے مسلسل شکست ہی شکست کو دیکھ کر بوکھلا گئیں پھر پرس جھلانے لگے۔ ہونٹ بٹوہ بنانے لگے۔ سر جھک جھک گئیں۔ آنکھیں کشتی کی طرح ڈولیں لیکن وہ الھڑ لڑکا میٹھا ساتھ پن کی مالا جپتا رہا۔ اسے علم نہ تھا کہ دستِ سوال بڑھانے کو عورت اپنی توہین سمجھتی ہے۔ عورت کی اہمیت کا انحصار اسی بات پر ہے کہ دستِ سوال دراز ہو۔ چاہے مست

سوال منہ زبانی ہی رہے۔ مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ یہ گمان قائم رہے کہ بھکاری آشنا کو اہمیت دیتا ہے۔

ہاں تو عکسی ساتھ پن کی مالا جپتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا قربتیں فاصلوں میں بدل گئیں فاصلے نفرتوں سے بھر گئے۔ پھر چاروں طرف سے آوازے اٹھے۔ شبانہ جی عکسی تو فلرٹ ہے۔

پرانے زمانے میں فلرٹ کا مطلب تھا کہ شادی کرنے کے خیال کے بغیر رنگین وقت کٹی کرنا اب یہ مفہوم ہے کہ دست سوال دراز کرنے کے بغیر خالی چھیڑ چھاڑ۔

ہاں تو اتنے طویل قرب کے باوجود ہم دونوں اجنبی کیسے بن گئے اس حد تک اجنبی کہ ہماری شخصیتوں کے رنگ جدا جدا ہیں خیالات ایک دوسرے کی ضد میں محسوسات مختلف ہیں۔ مثلاً میں غصہ کھاتا ہوں وہ سمجھتا ہے کہ غصہ پینے کی چیز ہے۔ میں بات کہہ دینے کا قائل ہوں چونکہ میرا خیال ہے کہ بات کہہ دینا خلوص کا مظہر ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ بات کہہ دینا اچھا وصف نہیں بلکہ جذباتیت کی نشانی ہے اور جذباتیت خوبی نہیں

میں مافوق الفطرت کو مانتا ہوں اس کا کہنا ہے کہ مافوق الفطرت چاہے حقیقت ہی کیوں نہ ہو وہ اس قابل نہیں کہ اس پر توجہ کی جائے میں روح کو مانتا ہوں وہ کہتا ہے روح بھی مادے کی ایک لطیف شکل ہے۔

مجھے ادب سے دلچسپی ہے اس کا ایمان ہے کہ ہمارا ادب حقائق سے گریز سکھاتا ہے۔ ہمارا ادب جذبات کا جھنجھنا ہے اور ادیب اس جھنجھنے کو بجا بجا کر دل خوش کرتے رہتے ہیں۔

میں پیر پرست ہوں وہ خدا پرست ہے۔ میرا خدا ایک ڈکٹیٹر ہے اس کا خدا ایک آٹومیٹزم ہے۔ میں جذبات پرست ہوں وہ جذبات کو خود فریبی کی راہ ہموار سمجھتا ہے۔

میں چائے کا متوالا ہوں وہ چائے سے گریز کرتا ہے مجھے مرچ سے رغبت ہے اس کے نزدیک مرچ زہر ہے۔ میں لباس کو اہمیت نہیں دیتا وہ لباس کو اہم سمجھتا ہے مجھے انگریزیت سے نفرت ہے۔ وہ انگریزیت کو پسند کرتا ہے میں سائنس سے مایوس ہوں اس کا ایمان ہے کہ سائنس ہی ایک واحد معبد ہے چونکہ وہ دور حاضر کی زبان ہے۔

میں عقیدت پرست ہوں وہ عقیدہ پرست ہے میں مذہب کو جذبہ سمجھتا ہوں وہ اسے ادراک سمجھتا ہے۔

ایسا کیوں ہوا۔ پچیس سال ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلنے والے دو افراد ایک دوسرے سے اس قدر دور کیسے جا پہنچے اجنبی کیسے بن گئے ہیں تو نہیں سمجھ سکا شاید آپ سمجھ سکیں خاصی طویل داستان ہے۔

بچپن میں عکسی ایک گول مٹول بچہ تھا۔ جب وہ مدرسے میں داخل ہوا تو اس کے چہرے پر ذہانت یا شرارت کی کوئی کرن نہ تھی۔ چہرہ گونگا۔ انداز بے حس۔ اکتاہٹ بھرا۔ کھیلنے کودنے کا شوق نہ تھا کھیل کود سے دلچسپی نہ تھی۔ ساتھی بننے یا بنانے کی نہ تو خواہش تھی اور نہ صلاحیت وہ ایک اکیلا بچہ تھا۔ اکیلا گونگا اور بے جان جب وہ تین سال کا ہوا تو نہ جانے کیوں۔ اس کا باپ گھر چھوڑ کر چلا گیا جب وہ چار سال کا ہوا تو امی اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی گئی۔ پھر باپ واپس آ گیا۔ اسے سمجھ میں نہ آیا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کبھی باپ چھوڑ کر چلا جاتا ہے کبھی امی۔ اسے گردوپیش پر اعتماد نہ رہا۔ اپنے باپ پر اعتماد نہ رہا کہ کب اسے چھوڑ کر چلا جائے۔ اس کے دل میں ڈر پیدا ہو گیا۔

پھر عکسی اور اس کا باپ دونوں کے لیے رہ گئے یوں اکیلے جیسے کوئی والی وارث نہ ہو۔ وہ دونوں اکٹھے سوتے تھے اکٹھے جاگتے تھے۔ اکٹھے باتھ روم جاتے تھے۔ اکٹھے مدرسے جاتے تھے اس کا باپ سکول ماسٹر تھا۔ جب وہ جماعت کو سبق دیتا تھا تو عکسی دیوار سے لگ کر کھڑا رہتا۔ انتظار کرتا کہ کب ابا فارغ ہو۔ کب واپس آئے کہیں اسے چھوڑ کر چلا نہ جائے۔ جب باپ سٹاف روم میں دوسرے اساتذہ کے پاس بیٹھا ہوتا تو عکسی کسی کونے میں دبک کر بیٹھ رہتا۔

وہ دونوں اکیلے رہتے تھے نہ دوست نہ رشتہ دار نہ ساتھی۔ عکسی کو علم نہ تھا کہ یہ تنہائی باپ کے مکافاتِ عمل کا نتیجہ ہے۔

شاید اس تنہائی بے اعتمادی اور بے نام خوف کی وجہ سے عکسی گونگا اور بے جان ہو گیا ہو۔

پھر وہ تنہائی ٹوٹی تو ایک امی گھر آ گئی۔ یہ امی وہ امی تو نہ تھی۔ یہ تو ایک نئی امی تھی۔ وہ ابھی گھبرا گیا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی جڑیں ہو گئیں اور گھر گھر بن گیا۔

جس گھر میں عکسی پرورش پا رہا تھا۔ وہاں کتابیں تھیں کاغذ تھے قلمیں تھیں غربت تھی موسیقی تھی۔ آزادی تھی مادر پدر آزاد آزادی۔ باپ منشی تھا۔ ہر وقت لکھتا رہتا تھا اور جب بھی لکھتا ساتھ ریڈیو پر گانے لگا لیتا۔ چونکہ موسیقی کے بغیر وہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ کام ختم ہوتا تو وہ کتاب کھول کر پڑھنے لگتا۔ دوست آ جاتے تو بولنے لگتا پھر بولتا ہی چلا جاتا۔

غربت کی وجہ سے موسیقی کا واحد ذریعہ ریڈیو تھا۔ ریڈیو پر وہ ایسا سٹیشن تلاش کیا کرتا جہاں شدھ راگ ہو رہا ہو۔ اگرچہ شدھ راگ کی سوجھ بوجھ نہ تھی۔ نہ سُر کی نہ تال کی لیکن شدھ راگ سن کر اس کے دل میں کچھ کچھ ہوتا تھا اور یہ کچھ کچھ تخلیق میں مدد کرتا تھا۔

عکسی کو شدھ راگ سے بیر تھا اس لئے جب بھی موقعہ ملتا وہ سوئی گھما کر فلمی موسیقی لگا دیتا۔

پھر ایک روز ایک عجیب واقعہ عمل میں آیا۔ باپ بیٹھا کام کر رہا تھا۔ ریڈیو چل رہا تھا لیکن ریڈیو پر شدھ کی بجائے فلمی گیت ہو رہے تھے۔ عکسی آیا اور اس نے سوئی گھما کر شدھ راگ لگا دیا۔ باپ چونکا۔ اس نے بیٹے کی طرف حیرت سے دیکھا۔ عکسی کے چہرے پر بیداری کی پہلی کرن ناچ رہی تھی۔ پھر بھی باپ نے اسے اہمیت نہ دی وہ سمجھا کہ شاید مجھے خوش کرنے کے لئے پیالکا نکالا ہے۔

پھر عکسی کی چھوٹی بہن سویرا نے شکایت کی کہنے لگی بھائی مجھے فلمی گیت سننے نہیں دیتے۔ باپ نے عکسی سے پوچھا۔ تم سویرا کو فلمی گیت سننے کیوں نہیں دیتے۔ عکسی غصے میں بولا۔ اسے شدھ گانا اچھا کیوں نہیں لگتا۔ اس کے چہرے پر بیداری کی وہ اولین کرن بالکل نمایاں ہو گئی تھی۔

پھر میرا تبادلہ کراچی ہو گیا۔ کراچی میں ہیڈ آفس کا دفتر تھا جہاں عکسی اور میں دن کا بیشتر حصہ گزارتے تھے اس دفتر میں سازندے تھے قلم تھے۔ پروڈیوسر تھے کیمرے تھے حفیظ جالندھری تھے۔ ٹیپ ریکارڈر تھے۔ احمد بشیر تھا۔ جو شومین شپ۔ پارچہ فروشی۔ گدھا گاڑی بانی۔ صحافت۔ کلرکی اور ریڈیو نویسی سے گھوم پھر کر اسسٹنٹ ڈائرکٹر کی کرسی پر آ بیٹھا تھا۔ دفتر میں ابن انشا تھا جو ابھی پورے طور پر ابن انشا نہ بنا تھا ابھی اس میں شیر محمد کا رنگ تھا۔ ابھی اس کا مزاج دکھ کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ ابھی وہ آوارہ گرد نہیں بنا تھا اس کے اندر کا مست ابھی بیدار نہیں ہوا تھا۔ ان دنوں وہ صرف شاعر تھا۔ شاعر بھی نرا نہیں بلکہ سادھو شاعر۔ وہ جنون جس نے اسے شاعر بنایا تھا ان دنوں پورے جوبن پر تھا۔ ان دنوں وہ سمجھتا تھا کہ وصال "تیرے سامنے بیٹھ کے رونا تے دکھ تینوں نئیں او دسنا" کی کیفیت کا نام ہے

اس کے علاوہ دفتر میں عنایت خان ستار نواز تھا اور نادر خان تھا جو بعد میں پیارنگ بن گیا۔ نتیجہ یہ تھا کہ دفتر میں عکسی اور میرے لیے گیت تھے ٹھمریاں تھیں، حفیظ جالندھریاں تھیں، فلمی تصویریں تھیں، ابن انشائیاں تھیں احمد بشیریاں تھیں قہقہے تھے اور بس باتیں ہی باتیں باتیں ہی باتیں۔

دفتر کے باہر قیصر تھا جو کہ دن دو میرا واحد دوست تھا۔ قیصر ایک سنڈور سی تھا جو دن بھر امریکی سفارت خانے میں دیوانوں کی طرح کام کرتا اور دفتر سے باہر نکل کر کافی ہاؤس کے ایک کونے میں جا بیٹھتا۔ پھر سگرٹ کافی، سگرٹ کافی۔ سگرٹ سے سگرٹ سلگاتا۔ پیالے پر پیالہ کافی پیتا اور بالآخر آدھی رات کے وقت کہیں جا کر ڈھیر ہو جاتا۔

کراچی پہنچ کر ہم نے قیصر کو کافی ہاؤس کے کونے سے نکال لیا۔ اس پر قیصر نے ہم سے انتقام لیا۔ اس نے ہم دونوں کو کراچی کے سنڈور سے بنا دیا۔ ہم تینوں کیفیت یہ پائیں جانے پیتے بازاروں میں گنڈیریاں چوستے، سٹالوں پر کھڑے ہو کر چاٹ کھاتے۔ کھوکھوں سے تکے کباب لے کھاتے اور گھٹیا فلم دیکھتے۔

عکسی کا کوئی اپنا دوست نہ تھا۔ لہٰذا وہ میرے دوستوں کے حلقے میں ہی رہا کرتا تھا۔ میرے دوستوں سے اس کا صرف ایک مطالبہ تھا کہ اسے دوست سمجھا جائے دوست کا بیٹا نہیں۔ اس سے ایسا سلوک نہ کیا جائے جیسا بڑے چھوٹوں سے کرتے ہیں وہ بڑے چھوٹے کے امتیاز کے سخت خلاف تھا۔ احمد بشیر اور عکسی پرانے دوست تھے۔ وہ دونوں ۱۹۴۵ء سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ احمد بشیر نے عرصہ دراز سے اسے مساوی حقوق دے رکھے تھے۔ احمد بشیر خود مارگزیدہ تھا اس کے والد نے اسے کبھی برابری کا درجہ نہ دیا تھا۔ ابن انشا نے عکسی کو بحیثیت دوست تسلیم کر لیا۔ قیصر عکسی کا پرانا ساتھی تھا۔ لے دے حفیظ جالندھری تو حفیظ نے تو عکسی کے باپ کو بھی برابری کا درجہ نہیں دیا تھا۔ باقی رہے شہاب اور اشفاق۔

کراچی میں اشفاق کی وجہ سے میں شہاب سے متعارف ہوا تھا۔ ابھی تعلقات ابتدائی منازل میں تھے۔ ویسے شہاب کی سرشت ایسی ہے کہ وہ اپنے کو بڑا نہیں سمجھتے دوسرے کو چھوٹا نہیں سمجھتے۔ البتہ ایک بات ضرور ہے کہ وہ تو چھوٹے کو سمجھتے ہی نہیں۔ کہنے کو نہیں اشفاق اندر سے پیدائشی چودھری ہے۔ وہ کسی کو برابر کا نہیں سمجھتا۔ وہ تو پورے پر بیٹھ کر بھی چوکی پر بیٹھا رہتا ہے۔ عکسی کو برابری کا درجہ دے دینے کے باوجود اس کا انداز مربیانہ تھا۔ کراچی میں عکسی نے صرف ابن انشا احمد بشیر اور قیصر کو اپنایا۔ یوں وہ میرے حلقۂ احباب میں بیٹھ بیٹھ کر جوان ہونے سے پہلے ہی بوڑھا ہو گیا۔

ہاں تو میں یہ کراچی کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے کی بات کر رہا تھا۔ جب ہم آوارہ گردی کرتے کرتے تھک جاتے تو احمد بشیر کے گھر جا بیٹھتے۔

احمد بشیر کا گھر گویا گاؤں کا دارا بھی تھا اور شہر کا کلب بھی، مسافر خانہ بھی تھا۔ راگ رنگ کا چوبارہ بھی۔ وہاں ہر وقت منڈلی لگی رہتی تھی۔ احمد بشیر کی مالکن اس کی بیوی مودی پیارنگ سے موسیقی سیکھتی تھی۔ سبق ختم کرنے کے بعد پیارنگ محفل موسیقی لگا کر بیٹھ جاتے وہ گاتے اور ہم سب آدھی آدھی رات تک بیٹھے سنتے۔ عکسی بھی ان محفلوں میں سر جھکائے بیٹھا رہتا۔ ایک روز محفل کے دوران طبلچی بازار سے سگرٹ خریدنے چلا گیا۔ پہلے تو پیارنگ طبلے کے بغیر ہی گاتے رہے پھر عکسی نے لپک کر جوڑی اپنے سامنے رکھ لی اور از خود تین

تال بجانی شروع کر دی۔ خالی تالی کے سب کچھ اس پر محفل میں حیرانی کی رو دوڑ گئی چونکہ اس سے پہلے عکسی نے کبھی جوڑی کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

اگلے ہی روز میں نے عکسی کو ایک جوڑی خرید دی پھر چند ایک ماہ وہ دیوانہ وار طبلہ بجاتا رہا۔ احمد بشیر نے کہا میں کسی طبلچی سے کہہ دوں کہ وہ باقاعدہ آکر تمہیں سکھاتا رہے۔ عکسی نے انکار کر دیا۔ جب وہ طبلہ بجاتا تو اس کا منہ سرخ ہو جاتا کان کھڑے ہو جاتے آنکھوں میں دیئے روشن ہو جاتے۔

دو سال ہم کراچی میں رہے اس کے بعد یہ سے میرا تبادلہ پنڈی ہو گیا۔ پنڈی آکر عکسی نے طبلہ بجانا چھوڑ دیا۔ جب سے اس کی جوڑی آج تک ہمارے کاٹھ کباڑ میں پڑی ہے۔ اس دوران میں عکسی ایف اے کر چکا تھا۔

پنڈی آکر میں نے اسے گارڈن کالج میں داخل کرا دیا۔ گارڈن کالج میں داخلے کے بعد عکسی میں ایک تبدیلی پیدا ہوئی۔ پہلے وہ اپنا بیشتر وقت میرے ساتھ گزارا کرتا تھا۔ اب وہ زیادہ تر وقت گھر سے باہر گزارنے لگا۔

ایک روز میں نے پوچھا۔ آج کل کہاں رہتے ہو تم۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے ابو۔ وہ بولا۔ آج تک میں آپ کے دوستوں کے حلقے میں رہا ہوں۔ آپ کی سوسائٹی نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے۔ میرا کوئی ساتھی نہیں۔ دوست نہیں۔ کوئی ہم عمر میرے قریب نہیں آتا۔ وہ کہتے ہیں تم ہم میں سے نہیں ہو۔ میں ان کے مشاغل میں شمولیت نہیں کر سکتا۔ کرتا ہوں تو اکھڑا اکھڑا رہتا ہوں۔ لیکن اب۔ اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے میں اپنے دوست بناؤں گا۔ ساتھیوں کا ایک حلقہ بناؤں گا۔ اپنے مشاغل پیدا کروں گا۔

عکسی کی بات سن کر مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ مجھے کبھی خیال نہ آیا تھا کہ اپنی سوسائٹی میں رکھ کر میں نے عکسی کو بوڑھا کر دیا ہے۔ کہ میں نے اپنا آپ اس پر ٹھونس رکھا ہے کہ میں اس کے راستے کی رکاوٹ تھا الٹا میں تو یہ خوش فہمی رچائے سمجھتا تھا کہ میں نے اسے پوری آزادی اور برابری دے رکھی ہے۔

اس کے بعد چند ایک مہینے ہم دونوں کے راستے الگ رہے۔ اس زمانے میں ہم چکلالہ کی کریسینٹ لائینز میں ریکارڈنگ کے ایک کوارٹر میں رہتے تھے۔ ایک روز میں نے دیکھا کہ ریکارڈنگ کے صدر دروازے کے قریب اپنا ایزل رکھے عکسی کینوس پر تصویر بنا رہا ہے۔ اس وقت وہ تصویر میں رنگ بھر رہا تھا۔ سامنے آئل کلرز کی ٹیوبیں تھیں ہاتھ میں برش کی جگہ چاقو تھا۔

"تصویر پینٹ کر رہے ہو" میں نے پوچھا۔

"ہاتھ آزما رہا ہوں" وہ بولا۔

عکسی کی یہ پینٹنگ آج بھی ہمارے گھر میں آویزاں ہے۔ میں خود تو تصویر کشی کے فن میں کورا ہوں لیکن واقف کار لوگوں کا کہنا ہے کہ عکسی کی اس تصویر میں بڑی جان ہے انفرادیت ہے۔ اس کے بعد کسی سے سیکھے بغیر کسی کو استاد مانے بغیر عکسی نے سات آٹھ کینوس بنا ڈالیں۔ گھوڑوں کا ایک ڈھیر۔ قلعے کا بیرونی منظر۔ درختوں کا جھنڈ۔ مری کا شہر دھوپ چھاؤں میں۔

مری کا شہر ڈاکٹر عفت شہاب کو اس قدر پسند آئی کہ انہوں نے اسے لے جا کر اپنے ڈرائنگ روم میں سجا لیا۔

ایک روز عفت نے کہا عکسی تو تصویریں بنانے کا کاروبار کیوں نہیں کرتا۔ بڑا پیسہ ہے اس کاروبار میں۔

پیٹ کے لیے تصویریں بناؤں عکسی ہنسا۔

پیٹ کے لیے نہیں میرے لیے بناؤ وہ بولی

اچھا۔ عکسی پھر ہنسا۔

ہمارے ہاں جو مہمان آتے ہیں وہ تمہاری تصویروں میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں پھر میں تمہاری سیلز مین بن جاتی ہوں۔ میں نے انھیں ایک ہزار روپیہ فی تصویر آمادہ کر لیا ہے۔

اچھا۔ عکسی ہنسا۔ بڑی قیمت پڑ رہی ہے میری تصویر کی۔

تمہاری تصویر کو کون پوچھتا ہے وہ بولی۔ یہ تو میری سیلز مین شپ کا اعجاز ہے۔ تصویر کا دو سو روپیہ تمھیں دے دیا کروں گی باقی آٹھ سو میرا کمشن ہوگا۔

انہی دنوں عکسی نے ایک نیا پینترا بدلا۔ اس میں ایک فرنگی نے انگڑائی لی اور وہ بڑی تیزی اور شدت سے مسٹر بننے لگا۔ عالم مشہور نہیں بلکہ ضمیر جعفری والا مسٹر جس کے متعلق انہوں نے کہا ہے کہ کھلتے کھلتے ڈیڑھ گھنٹے میں کہیں مسٹر کھلا سوٹ شوٹ کالڑائی کے بعد وہ ہونٹ بنا بنا کر انگریزی بولنے لگا۔ پہلے ہی عکسی کی اردو سے انگریزیت کی بو آتی تھی چونکہ دسویں تک اس نے انگریزی پبلک سکول میں تعلیم پائی تھی۔ اب اس کی انگریزی سے آکسفورڈ کی بو آنے لگی۔ اس پر گھر والوں کے لیے خاصی مشکل پیدا ہو گئی۔

طبلہ نوازی اور مصوری تو خیر چل گئے تھے۔ انگریزیت گھر والوں کے حلق میں کانٹا بن کر پھنس گئی۔ گھر [illegible] ٹھیٹھ پنجابی تھے بوریہ نشین تھے باپ سالہا سال سے ادیب ہونے کے باوجود اردو پنجابی میں بولتا تھا اور وہ بھی معمول کے طور پر نہیں بلکہ خاص تقریباً پر۔ وہ ادیبوں کی محفلوں میں بیٹھنے اور گفتگو کرنے کے انداز کو اپنا نہ سکا تھا اس پر ادبی کلف نہ چڑھتی تھی۔ عکسی کے اس نئے رنگ سے وہ بہت پچھتایا۔ انگریزی تو خیر اسے آتی تھی۔ دفتری انگریزی نہیں بلکہ جدید انگریزی۔ لیکن وہ لکھنے والی انگریزی تھی بولنے والی نہیں۔

آپ تو جانتے ہی ہیں لکھنے والی انگریزی کو کون پوچھتا ہے وہ نہ آپ کو بنا سکتی ہے نہ سنوار سکتی ہے اور بولنے والی انگریزی کیا نہیں کر سکتی اس کا تو راج پاٹ ہے۔ ہمیشہ رہا ہے۔

ان دنوں عکسی بڑی شدت سے انگریزیت کے جوہڑ میں ڈبکیاں کھاتا رہا۔ کالج کے سیمناروں۔ ڈسکشنز۔ ڈیبیٹس۔ ماک۔ پارلیمنٹ۔ ہاؤس آف کامنز۔ ڈیکلے میشنز میں حصہ لیتا رہا۔

پھر اسے عشق کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ کسی لڑکی سے عشق ہوتا تو بات سمجھ میں آتی چونکہ باپ اس کیفیت کے مبلہ کو الف سے [illegible] واقف تھا۔ عشق ہوا بھی تو الیکٹرانک مشینوں سے جن کے متعلق باپ جاہل مطلق تھا اس انوکھے عشق میں عکسی کی کیفیت مجنوں کی سی ہو گئی۔ مجنوں صحرا نوردی کیا کرتا تھا عکسی نے جنک شاپ نوردی شروع کر دی روز وہ باری باری شہر کے تمام کباڑیوں کی دوکانوں پر جاتا۔ وہاں پڑی ہوئی مشینوں کو دیکھتا انھیں سمجھنے کی کوشش کرتا۔ چلا آتا پھر گھر آکر آہیں بھر بھر کر مجھے سمجھاتا۔ ابو ہزاروں کا ریکارڈر سینکڑوں پر بک رہا ہے نایاب سٹیج ساؤنڈ سسٹم کوڑیوں کے حساب مل سکتا ہے کباڑیے کو علم ہی نہیں کہ وہ

نایاب ہے۔

اس زمانے میں پہلی مرتبہ عکسی کو احساس ہوا کہ وہ ایک غریب باپ کا بیٹا ہے۔

اس کے باوجود گھر میں کئی ایک مشینیں آگئیں۔ ریکارڈ چینجر۔ مائیک۔ لاؤڈ سپیکر۔ ٹیپ ریکارڈر۔

آج بھی کباڑیوں کی دکانوں کا جائزہ لینا اس کا مرغوب مشغلہ ہے۔

انہی دنوں اس نے اپنا معمول پھر سے بدل لیا۔ وہ زیادہ تر وقت گھر پہ بسر کرنے لگا۔

ایک دن میں نے پوچھا عکسی تم نے باہر جانا کیوں چھوڑ دیا۔

پہلے تو وہ خاموش رہا پھر میرے اصرار پہ کہنے لگا۔ بے کار ہے بابا۔ بالکل بے کار۔ مجھ میں دوسروں کو دوست بنانے کی صلاحیت ہی نہیں۔ میں نے بہت کوشش کر دیکھی۔ میں نے اپنی سرشت کو بدلنے کی کوشش کی۔ میں نے اپنا رنگ بدلنے کی کوشش کی۔ لیکن سب بے کار۔ میں ان میں سے نہیں ہوں ابو۔ میں ان کے مشاغل اپنا نہیں سکتا۔ میرے خیالات مختلف ہیں احساسات مختلف ہیں دلچسپیاں مختلف ہیں مجھ میں نوجوانی کا وہ سوڈا واٹ نہیں۔ ابو۔ ابو وہ رک گیا۔ دراصل آپ کی سوسائٹی میں رہنے کی وجہ سے میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ ہم عمروں کی باتیں مجھے گھٹیا لگتی ہیں۔ نوجوانوں کے مشاغل بے معنی نظر آتے ہیں۔

زندگی بھر عکسی نے صرف چار ایک ہم عمروں سے تعلقات پیدا کئے۔ لیکن کوشش کے باوجود یہ تعلقات دوستی تک نہ پہنچ سکے۔

ڈاکٹر جہانگیر عکسی کا واحد دوست ہے اگر ان کی دوستی آج تک نبھ رہی ہے تو اس کا سہرا جہانگیر کے سر ہے سینٹ میری سکول میں وہ ایک دوسرے کے ساتھی بنے تھے لیکن یہ ساتھ ایک ہاتھ کی تالی بجانے کے مترادف ہے پھر مظفر ہے نجم ہے عارف ہے افضل ہے۔ ان سب سے عکسی کے دوستانہ تعلقات ہیں منہ زبانی کے تعلقات۔

یہ تعلقات عکسی نے اس زمانے میں پیدا کئے تھے جب وہ بی اے میں تھا۔ بی اے کے بعد اس نے ایم اے نفسیات میں داخلہ لے لیا۔ ایم اے کے اختتام پر لیبارٹری میں پریکٹس کے لئے لاہور گورنمنٹ کالج میں جانا پڑا۔

لاہور میں وہ چھ ماہ بانو قدسیہ کے گھر میں رہا۔ بانو قدسیہ کے گھر کا نام داستان سرائے نہیں بلکہ رنگ پچکاری ہونا چاہیے۔ چھ ماہ عکسی اس رنگ پچکاری میں بھیگا بیڑا بن کر بیٹھا رہا۔

ایم اے کرنے کے بعد وہ گارڈن کالج میں لیکچرار ہو گیا۔

انہی دنوں میں نے عکسی سے کہا۔ مجھ سے ایک وعدہ کرو کہ تم گورنمنٹ سروس نہیں کرو گے۔

کیوں۔ اس نے پوچھا۔

اگر گورنمنٹ سروس کرنی ہے تو سی ایس پی کرنا لازم ہے میں نہیں چاہتا کہ تم بے عزتی کی نوکری کرو۔

میں سی ایس پی کروں گا ابو۔

اس کے بعد وہ تیاری میں مصروف ہو گیا۔

عکسی کو مطالعہ کا شوق نہ تھا۔ اسے امتحان پاس کرنے کا گر آتا تھا۔ اسی لیے وہ ہر امتحان میں اچھی پوزیشن حاصل کیا کرتا

تھا۔ وہ کہا کرتا تھا، ابو

امتحان مطالعہ یا محنت سے پاس نہیں ہوتا۔ سوجھ بوجھ کے زور پر ہوتا ہے۔

ڈیڑھ سال کے بعد عکسی میرے پاس آیا کہنے لگا۔ ابو میں نے سی ایس پی کی تیاری کر لی ہے میں اچھی پوزیشن حاصل کر لوں گا۔

بڑی خوشی کی بات ہے میں نے جواب دیا۔

لیکن اس نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا کیا یہ ضروری ہے کہ میں سی ایس پی بنوں۔

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم عزت کی نوکری کرو۔

میں سی ایس پی کو عزت کی نوکری نہیں سمجھتا۔

میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

میں سی ایس پی بننا نہیں چاہتا وہ بولا۔

تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا۔

اس لئے کہ آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں محنت کرنے سے جی چراتا ہوں۔ اب فیصلہ آپ پر ہے اگر آپ بضد ہیں کہ میں سی ایس پی بنوں تو میں امتحان دے دوں گا ورنہ نہیں۔

میری بدقسمتی یہ ہے کہ میں نے اپنے بچوں کو یہ خوش فہمی دے رکھی ہے کہ میں بہت وسیع انقلب ہوں اور ان کی رضامندی کے بغیر کوئی کام کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ بہرحال اس روز میرا جی چاہتا تھا کہ فراخ دلی کا وہ ڈھونگ چاک کر کے رکھ دوں۔ لیکن مجھ میں جرأت نہ ہوئی۔ مجبوراً سینے پر پتھر رکھ کر میں نے عکسی کی بات مان لی۔

پھر ۱۹۶۷ء میں وہ واقعہ پیش آیا۔ وہ ایک زلزلہ تھا جس نے عکسی کی شخصیت کے ایوان کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ پچیس سال کی عادتیں جڑوں سمیت اکھاڑ دیں۔ پچیس سال کے تعلقات کے نقوش دھو ڈالے۔ اس واقعہ نے گویا عکسی کو ایک بے سروسامان مہاجر بنا دیا۔ مجھے علم نہیں کہ وہ واقعہ کیا تھا۔ اس کی تفصیلات کیا تھیں۔ اس کی نوعیت کیا تھی۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ اس روز کوئی ہاتھی چینی کی دوکان میں گھس آیا تھا۔

وہ واقعہ رات کے پچھلے پہر ہوا جب ہم گہری نیند سو رہے تھے۔ صبح سویرے جب میں باتھ روم جانے کے لئے جاگا تو میں نے دیکھا کہ عکسی کے کمرے کی بتی جل رہی ہے۔ یہ تفصیل بہت حیران کن تھی۔ چونکہ عادی طور پر عکسی صبح نو بجے کے قریب جاگا کرتا تھا۔ صبح سویرے جاگنا اس کے لئے ممکن نہ تھا۔ خیال آیا دیکھوں تو سہی بات کیا ہے۔

میں نے کمرے میں جھانکا تو میرا منہ مارے حیرانی کے کھلا کا کھلا رہ گیا عکسی کھڑا نماز پڑھ رہا تھا۔

عکسی نے عید کے سوا کبھی نماز نہ پڑھی تھی۔ اسے اسلام یا دینیات سے نہ تو واقفیت تھی نہ دلچسپی۔ اگرچہ اُمی باقاعدہ طور پر نماز پڑھتی تھی۔ لیکن باپ کی وجہ سے گھر کے ماحول میں اسلام کی جھلک نہ تھی

بہر حال باتھ روم سے فارغ ہو کر میں بھی سو گیا۔ دوبارہ جاگا تو عکسی کی اتی نے مجھے اشارہ کیا۔ بولی۔ ذرا اٹھ کر عکسی کے کمرے میں جھانک کر تو دیکھیے میں نے دیکھا تو عکسی بیٹھا قرآن کریم کی تلاوت کر رہا تھا۔ جب وہ چائے پینے کے لئے کمرے سے باہر نکلا تو اسے دیکھ کر میں ڈر گیا۔ منہ سرخ ہو رہا تھا۔ چہرہ سوجا ہوا تھا۔ آنکھیں پھٹی پھٹی سی تھیں۔ انداز میں دیوانگی نمایاں تھی۔ اسے تخت پوش پر بیٹھے ہوئے دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے کسی درگاہ کے دروازے پر کوئی مست بیٹھا ہو۔

اس روز عکسی نے چائے پینے سے انکار کر دیا حالانکہ وہ چائے کا رسیا تھا۔ صرف چائے ہی نہیں اس روز اس نے تمام معمولات کو بدل دیا گھر والے حیران تھے میں گھبرا گیا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے عکسی سے پوچھا۔ کیا بات ہے عکسی۔

ضرور کوئی بات ہے عکسی کی امی بولی۔

عکسی نے اپنی ABNORMAL کیفیت کو دبانے کی شدید کوشش کی جس کی وجہ سے اس کا چہرہ اور بھی بھیانک ہو گیا۔ بولا۔ کچھ نہیں ابو۔ کچھ بھی تو نہیں۔

کچھ تو ہے۔ میں نے کہا۔

نہیں نہیں وہ بولا۔ کوئی خاص بات نہیں۔ کوئی خاص بات نہیں۔ ایک عام سا مشاہدہ ہے۔ عام سا مشاہدہ۔ جو بہت سوں کو ہو گا۔ بہت سوں کو آپ کو بھی ہو گا ابو۔

لیکن ہوا کیا میں نے پوچھا۔

ایک مشاہدہ ایک ویژن وہ بولا۔ پاکستان کی آنے والی عظمت کا ویژن۔ ابو مجھے یہ سورج میرے کمرے کے اندر گھس آیا۔ اس وقت اس میں حدت نہ تھی صرف نور ہی نور تھا میں چکا چوند ہو کر رہ گیا ابو۔

پھر وہ سورج سمٹ کر پاکستان بن گیا۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ دیر تک خاموش بیٹھا فضا کو گھورتا رہا۔ اس وقت اس کے چہرے پر دیوانگی کے اثرات بالکل ہی نمایاں تھے۔

ابو یہ مشاہدہ صرف مجھے ہی نہیں۔ بہت سوں کو ہو گا۔ پچاس سال کے اندر اندر سب اس کا تماشہ کریں گے۔ سب۔

وہ پھر خاموش ہو گیا۔

ابو آپ پاکستان کو نہیں جانتے۔ نہیں جانتے۔ اس کی آواز پھٹی پھٹی تھی۔ میں جانتا ہوں۔ اب میں جانتا ہوں میں نے ان آنکھوں سے دیکھا ہے۔ لیکن میں بتا نہیں سکتا کہ کیا دیکھا ہے۔ اسے بیان نہیں کیا جا سکتا صرف دیکھا جا سکتا ہے۔ مشاہدہ کیا جا سکتا ہے وہ پھر خاموش ہو گیا جیسے بیتی بات کا پھر سے مشاہدہ کر رہا ہو۔

بابو وہ بولا پاکستان نے دنیا کی راہنمائی کرنی ہے۔ دنیا کو راستہ دکھانا ہے۔ اب میں سوں سرونٹ ہوں ابو۔ مجھے پاکستان کی بیداری عطا کر دی گئی ہے بہت سوں کو یہ جاگرتی عطا کی جائے گی۔ بہت سوں کو مجھے اب پڑھنا ہے۔ مطالعہ مطالعہ مطالعہ۔

اس کے بعد عکسی اپنے کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گیا اس نے فزکس۔ فلاسفی۔ پارا سائیکالوجی تصوف اور ای ایس پی کی کتابوں کا ذخیرہ جمع کر لیا اور دیوانہ وار مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔

اس کے باوجود اس کی کیفیت وہی کی وہی رہی۔ منہ سرخ اور سوجا ہوا آنکھیں پھٹی پھٹی چہرے پر وہی وحشت۔ سارا دن وہ اپنے کمرے میں بند رہتا۔ ہمیں اس کے کمرے میں جاتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ جیسے آسیب زدہ ہو۔

پھر عکسی کے ایک دوست نے لات مار کر عظمت پاکستان کا وہ مینار پاش پاش کر دیا۔ بولا یہ سب نقشہ دونا دا ایک لڑکی سے اٹھایا ہوا ہے۔

اس لڑکی سے میں مل چکا تھا۔

ایم اے کے بعد میں نے عکسی سے صاف کہہ دیا تھا کہ اپنا جیون ساتھی خود تلاش کرے۔ میں نے کہا تھا جب تم تلاش کر چکو تو مجھے بتا دینا۔ پھر میرا کام شروع ہوگا۔ اس کے لواحقین سے میں خود جا کر ملوں گا۔ ان کی منتیں کروں گا۔ ہاتھ جوڑوں گا۔ اس پر بھی اگر وہ راضی نہ ہوئے تو ہم لڑکی کو اغوا کر لیں گے۔

اغوا کرنے کی کیا ضرورت ہے عکسی جھنجھلا کر بولا۔ بڑی ضرورت ہے میں نے سنجیدگی سے کہا۔ تمہیں نہیں پتہ۔ اپنے چناؤ کی لڑکی کو ہر قیمت پر حاصل کرنا از بس ضروری ہوتا ہے۔ ناکامی ہو جائے تو شدید دھچکا لگتا ہے۔ ناکامی تسلیم کر لو تو تمہاری میں میں ایک ٹوٹ رہ جاتی ہے جس طرح شیشے کے گلاس میں بال آ جائے تو وہ ناکارہ ہو جاتا ہے۔

ایک روز عکسی میرے پاس آیا بولا ابو آپ مصروف تو نہیں۔

میں نے کہا۔ نہیں۔

بولا ذرا باہر چل کر میرے دوست سے مل۔

جب میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو دیکھا کہ وہ بیٹھی ہوئی ہے۔ یہ میرے ابا ہیں عکسی بولا اور یہ میری دوست ہیں — ہاں میں اس لڑکی سے مل چکا تھا۔ جب وہ چلی گئی تو عکسی کہنے لگا ابو اگر میں اس لڑکی کو جیون ساتھی بنا لوں تو — آپ کی کیا رائے ہے

کیا تمہیں اس لڑکی سے محبت ہے میں نے پوچھا۔

محبت وحبت نہیں۔ میں اسے پسند کرتا ہوں۔

وہ اک چٹ کپڑی لڑکی تھی۔ میں نے زندگی میں کبھی چٹ کپڑی لڑکی نہ دیکھی تھی۔ لڑکیاں تو رنگدار ہوتی ہیں دھاری دار ہوتی ہیں البتہ میں نے زندگی میں چند ایک چٹ کپڑی خواتین ضرور دیکھی تھیں۔ چٹ کپڑی سے یہ نہ سمجھ بیٹھئے کہ وہ صرف سفید لباس پہننے کی شوقین ہوتی ہیں یا سادہ سی رہنا پسند کرتی ہیں۔ بے شک وہ سفید اور سادہ لباس پہنتی ہیں سنگار سے بے نیاز ہوتی ہیں۔ نہیں ایسی بات نہیں۔ یہ بے نیازی خالص بظاہر ہوتی ہے۔ سنگار جب درجہ کمال پہ پہنچتا ہے تو ایک ایسی کیفیت عمل میں آتی ہے کہ دیکھنے والے کو یوں لگتا ہے جیسے محترمہ سنگار سے بے نیاز ہو۔ چٹ کپڑی سنگار کے اس درجہ کمال سے واقف ہوتی ہے۔ اسے اپنی ہر حرکت پر قدرت ہوتی ہے اسے ہر ہر سری جنبش کا شعور ہوتا ہے اور اس کے اثرات کا واضح علم ہوتا ہے۔

یوں جان لیجئے کہ چٹ کپڑی نسائیت کا ایک خاص رخ ہے ایک PATTERN ہے ایک طریق کار ہے ایک کردار ہے۔ میری دانست میں چٹ کپڑی نسائیت کی دودھ بھری کڑاہی کی بالائی ہوتی ہے۔ چٹ کپڑی کا ڈسا پانی نہیں مانگتا۔ لیکن اگر چٹ کپڑی

مہربان ہو جائے تو پھر جنت میں جانے کی آرزو نہیں تھی۔

عکسی کے دوست نے مجھے بتایا کہ دونوں کے درمیان شادی کے عہد و پیمان ہو چکے تھے۔

عکسی نے کہا تھا میرا انتظار کرو۔ پھر ایک روز عکسی کو اس کا خط ملا۔ لکھا تھا۔ گھر والے میری شادی ایک کپتان سے کرنا چاہتے ہیں۔ میری کوئی نہیں سنتا اگر تم کچھ کر سکتے ہو تو کرو۔

عکسی نے یہ بات مجھے نہ بتائی۔ پتہ نہیں کیوں۔ شاید اس لئے کہ عادی طور پر وہ حتیٰ الوسع مجھے تکلیف دینے سے گریز کیا کرتا تھا۔ یا شاید اس لئے کہ اسے ڈر تھا کہ کہیں میں اپنی جذباتیت کی وجہ سے صورت حال کو اور خراب نہ کر دوں۔

عکسی نے کہا سیدھی بات ہے۔ لڑکی کے متعلقین پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ خاندان متمدن ہے۔ لڑکی سے میرے تعلقات پاکیزہ اور خوشگوار ہیں۔ ان میں ناخوشگواری یا غیر مناسب کا عنصر نہیں۔ کیوں نہ خود ان سے مل کر بات کروں وہ سمجھ جائیں گے یقیناً سمجھ جائیں گے۔

جب عکسی نے ان سے بات کی تو سمجھنے کی بجائے وہ گھورتے رہے۔ گھورنے پہ بھی عکسی نہ سمجھا تو وہ تو تو میں میں پر اتر آئے۔ انہوں نے عکسی اور اس کے خاندان کو بے نقط سنائیں اور پھر اسے گھر سے باہر نکال دیا۔ اور چیٹ کپڑی چپ چاپ بیٹھی سنتی رہی۔

عکسی کے دوست کی زبانی یہ تفصیلات سن کر میں سخت گھبرا گیا۔ گو یہ میرا ایمان تھا کہ عکسی نے مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا پھر بھی مجھے شک پڑنے لگا کہ شاید صدمے کی وجہ سے اس کا ذہن گڈمڈ ہو گیا ہو۔ اور تناؤ کی وجہ سے رات کے وقت اس کے کمرے میں سورج طلوع ہو گیا ہو۔

کئی ایک دن میں نے اسی تذبذب میں گذارے۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ عکسی کو واقعی مشاہدہ ہوا تھا یا یہ سب دماغ کا خلل تھا۔

آخر میں نے قدرت اللہ سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

میرے حلقہ احباب میں صرف قدرت اللہ ہی ایسا فرد ہے جو روحانیات اور عقل و دانش دونوں کو ہم آہنگ سمجھتا ہے۔ انھیں متضاد نہیں جانتا۔ جس کا ایمان ہے کہ عقل و خرد روحانیت کے لئے باعث تقویت ہے۔ میں نے قدرت سے کہا مجھے صرف اتنا بتا دیجیے کہ یہ مشاہدہ تھا یا چیٹ کپڑی کا اعجاز۔

میری بات سن کر ڈاکٹر عفت قہقہہ مار کر ہنسیں بولیں اس واقعہ کو چیٹ کپڑی سے کوئی تعلق نہیں۔

آپ اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہیں۔

ہاں میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں وہ بولیں اس لیے کہ میں جانتی ہوں۔

آپ کیسے جانتی ہیں۔

میں چیٹ کپڑی کے متعلق ہر تفصیل جانتی ہوں۔

آپ کو کیسے علم ہے۔

عکسی مجھے یہ تفصیل سے آگاہ رکھتا تھا۔ مجھے پتہ ہے کہ لڑکی کا واقعہ بالکل الگ ہے۔ چونکہ دونوں واقعات صرف آٹھ دس دنوں کے وقفے سے ہوئے ہیں اس لئے غلط فہمی کی گنجائش ہے۔

تو کیا واقعی مشاہدہ ہوا تھا؟ میں نے قدرت سے پوچھا۔

یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ مشاہدہ ہوا ہے یا نہیں۔ البتہ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ دماغی خلل نہیں۔ نہ ہی خود فریبی ہے۔ قدرت نے کہا۔

ڈاکٹر عفت بولیں میری دانست میں عکسی کو ملک سے باہر بھیج دینا چاہیے۔ ایک تو تبدیلی ہو جائے گی دوسرے عکسی کو باہر جانے کا بہت شوق ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ عکسی کو سکالرشپ دلا کر چیکوسلواکیہ بھجوا دیا گیا۔

پراگ میں عکسی ڈیڑھ ایک سال مقیم رہا۔ اس دوران میں اس پر وہی کیفیت طاری رہی وہی دیوانگی وہی مطالعے کا جنون وہی اللہ ہو اللہ ہو۔

پراگ سے عکسی کا ہر خط جو مجھے موصول ہوتا رہا اسی کیفیت کا غماز تھا۔ اگرچہ اپنے خطوں میں وہ ذاتی کیفیت کا غماز تھا۔ اگرچہ اپنے خطوں میں وہ ذاتی کیفیت کے اظہار سے گریز کرتا پھر بھی بات چھلک کر باہر نکل آتی۔ اس کے خطوط میں خدا اور شدت نمایاں تھے۔ ان کے علاوہ جا بجا اللہ اور پاکستان کا تذکرہ ہوتا۔ مثلاً ایک خط ملاحظہ ہو۔

ابو! چیک ایک مایوس قوم ہے۔ انہوں نے اپنی امیدوں کے سارے انڈے مارکسزم کی ٹوکری میں ڈال رکھے تھے۔ مارکسزم کا زمینی وعدہ ایفا نہ ہوا۔ جس سے انہیں دھچکا لگا اور سارے انڈے ٹوٹ گئے۔

اہل مشرق کے پاس اللہ ہے۔ اہل مغرب کے پاس زر ہے چیک کے پاس نہ اللہ ہے نہ زر ہے پھر وہ کس امید پر جئے۔ اسے پتہ نہیں کہ وہ کیوں اور کدھر جا رہا ہے اور اس کی منزل کیا ہے۔ زندگی کا مقصد کیا ہے۔

اس کی گہری مایوسی سے ایک طوفان ابھر رہا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے پاکستان میں ایک طوفان جنم لے رہا ہے۔ چیک کے دل میں ابھرنے والا طوفان مثبت نہیں پاکستان میں ابھرنے والا مثبت ہے۔ پاکستان میں عظیم واقعات رونما ہونے والے ہیں۔ اللہ ایک عظیم پلانر PLAYNER ہے ابو۔ وہ معجزوں کو پسند نہیں کرتا۔ وہ چھوٹے چھوٹے واقعات سے عظیم نتائج پیدا کرتا ہے۔ پاکستان میں عظیم نتائج رونما ہوں گے۔ انشا اللہ۔

۱۹۶۹ء میں عکسی چیکوسلواکیہ سے واپس آ گیا لیکن یہ وہ عکسی نہیں تھا جس کے ساتھ میں نے زندگی کے پچیس سال گزارے تھے۔

مجھے علم نہیں کہ پراگ میں اس پر کیا بیتی البتہ اس بیتی کی شدت کا احساس ضرور ہوتا تھا۔ وہ نوٹ بکیں جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا اس کے مشاغل کا پتہ دیتی تھیں۔

ان کاپیوں میں مضامین نہیں بلکہ مختصر نوٹ لکھے ہوئے تھے۔ ان کا موضوع وحدانیت تھا کہیں اعداد کی بنیاد پر وحدانیت کا

مسئلہ حل کیا ہوا تھا کہیں روشنی اور رنگ کی بنیاد پر۔ کہیں ایٹم کی مدد سے وحدانیت پر روشنی ڈالی گئی تھی کہیں سبز پتے کی ساخت کی مدد سے۔

عکسی کی واپسی پر ہم سب نے مل کر فیصلہ کیا تھا کہ عکسی سے پراگ کی بات نہیں کریں گے۔ شاید اسی وجہ سے سارا گھر پراگ سے یوں بھرا ہوا تھا جیسے پھوڑا پیپ سے بھرا ہوتا ہے۔

آخر ایک روز بے خبری میں بات میرے منہ سے نکل گئی۔ بے سبب ہی ایک دن میں نے کہہ دیا۔ یوں معلوم پڑتا ہے کہ پراگ میں تم پھانسی پر لٹکے رہے۔

عکسی کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ کہنے لگے ہاں ابو پھانسی پر لٹکا رہا۔ کاش وہ دن پھر سے لوٹ آئیں اور میں ایک بار پھر پھانسی پر لٹک جاؤں۔ لیکن اب شاید ایسا کبھی نہ ہو۔ کبھی نہیں۔ کھو دیا ابو سب کھو دیا۔ اب میں ایک خالی برتن ہوں یوں لگتا ہے جیسے غبارے کی ساری پھونک نکل گئی ہو۔ اب میں ایک چھچھڑا ہوں چھچھڑا۔ زندگی کا کوئی مقصد نہیں۔ یا کوئی منزل نہیں کوئی مفہوم نہیں اب میں ایک خلا ہوں محض ایک خلا۔

پھر جیسے سمیر نکیب کی آمد پر وہ خلا بھر گیا۔

سمیر نکیب ایک مصری نوجوان تھا۔ خوش شکل رنگین مزاج۔ ہنس مکھ۔ وہ یونیسکو کا ایک ایکسپرٹ تھا جسے پاکستان کے لوک گیت جمع کرنے کے لیے یہاں بھیجا گیا تھا۔

وزارت تعلیم کے لیے سمیر نکیب کی آمد ایک غیر معمولی بات تھی۔ یونیسکو نے پہلے بھی کئی ایک مطالبات کیے تھے لیکن وہ اپنی نوعیت میں کاغذی تھے۔ یعنی کاغذ پر لکھے ہوئے موصول ہوتے تھے جن کا جواب کاغذ پر دے دیا جاتا تھا۔ یونیسکو کا یوں ایک جیتے جاگتے آدمی کو بھیج دینا اور عملی کام کا مطالبہ کرنا۔ واقعی یہ بات معمول سے بہت ہٹ کر تھی۔ اس قدر ہٹ کر کہ وزارت تعلیم کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔

بہرحال انہوں نے سمیر نکیب کو انٹرکام میں ٹھہرا دیا۔ بولے آپ چند ایک روز آرام کر لیں جب تک ہم لوک گیتوں کا انتظام کیے دیتے ہیں۔

دفعتاً وزارت کو خیال آیا کہ گیتوں کا بادشاہ ریڈیو پاکستان ہے۔ انہوں نے ریڈیو سے بات کی۔ ریڈیو نے کہا ہم تو صرف وہ گیت اکٹھے کرتے ہیں جنہیں لوگ سنتے ہیں۔ وہ گیت اکٹھے نہیں کرتے جو لوگ گاتے ہیں۔

اس پر وزارت کا دل ڈوب گیا۔

ادھر انٹرکام میں سمیر نکیب بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ کرتا رہا۔ پھر وہ اکتا کر اٹھ بیٹھا۔ اور ٹہل ٹہل کر انتظار کرنے لگا۔

انٹرکام کا مغربیت زدہ ماحول اس کے لیے جاذب توجہ نہ تھا وہ تو مغربیت سے اکتایا ہوا تھا اور خالص مشرقیت کے ماحول میں رہنے کا خواہش مند تھا۔ پھر اسے ایک خیال آیا۔ اس نے سوچا جب تک میں ذاتی طور پر کوشش کیوں نہ کروں۔ پاکستانی لوک گیتوں کا اتا پتہ پوچھوں۔ کسی رنگین مزاج نے اسے ہیرا منڈی کا پتہ بتا دیا۔

ہیرا منڈی سمیر نکیب کو بہت پسند آئی۔ وہاں مشرقیت کی جھلک تھی جو اسے نئی نظر آئی دو مہینے وہ ہیرا منڈی کی بائیوں سے

گیت سنتا اور چٹکیاں بجاتا رہا پھر کسی نے یہ کہہ کر کہ یہ لوک گیت نہیں یہ تو چوبارہ گیت ہیں اس کا دل توڑ دیا۔ اس پر وہ سیدھا سیکرٹری تعلیم سے جا کر ملا بولا میں تو انتظار کرتے کرتے تھک گیا آپ نے ابھی تک لوک گیتوں کا کوئی انتظام نہیں کیا۔

ان دنوں قدرت اللہ شہاب وزارت تعلیم کے سیکرٹری تھے انہوں نے عکسی کو سمیز گیب کا معاون مقرر کر دیا۔

عکسی نے سمیز گیب کو سمجھایا کہ بھئے آدمی۔ پاکستانی لوک گیتوں کو اکٹھا کرنا آسان کام نہیں پاکستانی لوک گیت بائیوں کے چوبارے میں نہیں ملتے نہ ہی آرٹ کونسلوں میں ملتے ہیں انہیں اکٹھا کرنے کے لئے دور افتادہ گاؤں میں جانا پڑے گا۔ ان گاؤں میں جہاں شہر کے اثرات ابھی تک نہیں پہنچے جہاں وہ دم توڑ رہے ہیں۔ وہاں پہنچنے کے لئے پیدل چلنا ہوگا۔ مقامی لباس پہننا ہوگا۔ ٹرک ہوٹلوں سے کڑک چائے پینے کی عادت ڈالنی ہوگی۔

تین روز عکسی سمیز گیب کو ٹریننگ دیتا رہا یونیسکو کے فوک لور ایکسپرٹ کے لیے یہ ایک انوکھی ٹریننگ تھی۔ پھر وہ دونوں سندھ بلوچستان مکران تھر پارکر سرحد کے دور افتادہ دیہات کی طرف نکل گئے جہاں مظلوم پاکستانی کلچر مغرب زدہ شہر۔ کالا صاحب اور ملا ازم سے چھپا ہوا بیٹھا ہے۔ جہاں پاکستانی لوک گیت کس مپرسی کے عالم میں دم توڑ رہے ہیں۔ جہاں پاکستانی دیہات کے منفرد ساز دیوار پر ٹنگے ٹنگے کرم خوردہ ہو چکے ہیں۔ پتہ نہیں عکسی نے وہاں کیا دیکھا۔ شاید اس نے پاکستانی عظمت کے اس ویژن کی تعبیر کی جھلک دیکھی ہو شاید پاکستان کے درخشندہ مستقبل کی کرن پھوٹی اس کے دل کی گہرائیوں میں چمکی ہو۔ شاید پاکستان کے اس اونچے چاکر کو راستہ مل گیا ہو۔

بہر حال جب وہ لوٹا تو اس کی تمام تر توجہ پاکستان کی لوک ریت پر مرکوز ہو چکی تھی۔ پہلے اس کی دیوانگی کا مرکز مطالعہ تھا اب لوک ریت ہے۔ لوک ریت کے جنون نے اسے کملا بنا رکھا ہے۔ جس کی وجہ سے شہر کے فرزانوں کی نگاہ میں وہ لوک تماشہ بنا ہوا ہے

اَن کہی باتوں کی تفہیم

مظہر الاسلام

قدریں بظاہر ٹوٹنے اور بکھرنے کے عمل کی زد میں محسوس ہوتی ہیں لیکن اگر تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ قدروں کے ٹوٹنے بکھرنے اور پھر بننے کا عمل محض ایک تکنیکی مسئلہ ہے ورنہ اصل بات تو یہ ہے کہ قدریں اپنی بقا کے لیے اذیت کے ایک مسلسل اور ناگزیر عمل سے گزرتی ہیں اور پھر عذاب کے انہی لمحوں میں خود بخود اُن کی تجدید ہوتی رہتی ہے۔ میں اپنی بات کی مزید وضاحت اس طرح کروں گا کہ کوئی بھی قدر ٹوٹتی یا بکھرتی نہیں، صرف اپنی بقا کے لیے ایک دلچسپ اور مشکل عمل سے گزر کر نئی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس پورے عمل میں قدروں کی اساس مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ ان صورتوں کا دارومدار اس نفسیاتی رویئے سے تشکیل پاتا ہے جو انسان کی ذہنی زندگی کے شعوری اور لاشعوری ادراک سے پھوٹتا ہے۔ چنانچہ انسان شعوری یا لاشعوری طور پر جن قدروں کو معصوم بچوں کی طرح کندھوں پر بٹھا کر پاتا ہے ایک مخصوص نفسیاتی وقفے کے بعد انہیں خود ہی منتشر کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ لیکن جس طرح وہ انسان کبھی نہیں مرتا بلکہ نئے نام کے ساتھ پھر سے نمودار ہو جاتا ہے اسی طرح قدریں بھی ایک نئے روپ کے ساتھ ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ لہٰذا قدروں اور انسانوں کا یہ دائمی سلسلہ تاقیامت جاری رہے گا اور یہی قدر مشترک ظاہر کرتی ہے کہ قدریں انسانوں کے رحم و کرم پر اور انسان قدروں کے رحم و کرم پر ہیں، اور اس جنگ کی پشت پناہی کرنے والا نفسیاتی عمل پوری طرح ممتاز مفتی کے افسانوں کی گرفت میں ہے۔ ممتاز مفتی نے اپنے افسانوں میں انسانوں سے ڈری ہوئی قدریں اور قدروں سے ڈرے ہوئے انسانوں کا نفسیاتی فلسفہ اس فنی مہارت اور چابکدستی سے پیش کیا ہے جس نے مفتی کو اپنے ہمعصر لکھنے والوں سے منفرد حیثیت عطا کی ہے۔ آپا میں آپا کا کردار بھی ایک ایسی قدر کے طور پر ظاہر ہوتا ہے جو کہانی بیان کرنے والی لڑکی کے نفسیاتی عمل سے ٹوٹتا اور پھر نئے سرے سے وجود میں آتا ہے۔ اس افسانے میں آپا سے زیادہ اہم کردار کہانی بیان کرنے والی لڑکی کا ہے۔ آپا تو اس کے لاشعور میں چھپی ہوئی صرف ایک خواہش ہے اور جب یہ خواہش شعور کی سطح پر نمودار ہوتی ہے، تو ایک قدر کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔

"آپا اس کتاب کو مجھ سے چھپا کر دراز میں مقفل رکھتی مجھے کیا معلوم نہ تھا رات کو وہ بار بار میری طرف اور کبھی گھڑی کی طرف دیکھتی رہتی، اسے یوں مضطرب دیکھ کر میں دو ایک جھوٹی انگڑائیاں لیتی اور پھر کتاب بند کر کے رضائی میں یوں پڑ جاتی جیسے مدت سے گہری نیند میں ڈوب چکی ہوں، جب اسے یقین ہو جاتا کہ میں سو چکی ہوں تو دراز کھول کر کتاب نکال لیتی اور اسے پڑھنا شروع کر دیتی۔ آخر ایک دن مجھ سے نہ رہا گیا میں نے رضائی سے منہ نکال کر پوچھ ہی لیا، آپا یہ — ہارٹ بریک ہاؤس کا مطلب کیا ہے، دل توڑنے والا گھر، اس کے کیا معنی ہوئے۔ پہلے تو آپا ٹھٹھک گئی، پھر وہ سنبھل کر اٹھی اور بیٹھ گئی، مگر اس نے میری بات کا جواب نہ دیا، میں نے اس کی خاموشی سے جل کر کہا، اس لحاظ سے تو ہمارا گھر بھی ہارٹ بریک ہے،

بھٹے گئی میں کیا جانوں ۔

کتاب کو چھپا کر رکھنے والی آپا کہانی بیان کرنے والی لڑکی کے نفسِ لاشعور کے پردے پر جلتی بجھتی تصویر ہے اور لڑکی کبھی کبھی لاشعور میں جھانک کر تمام گمنام کارروائی کا ادراک حاصل کر لیتی ہے۔ لیکن پھر اپنے اردگرد دجلے کی طرح بنی ہوئی نفسیات کے ہاتھوں مجبور ہو کر سب کچھ دبا جاتی ہے۔ لڑکی آپا سے نہیں دراصل اپنے آپ سے سوال کرتی ہے " یہ ہارٹ بریک ہاؤس کا کیا مطلب ہے اور پھر خود ہی جواب دیتی ہے اس لحاظ سے تو ہمارا گھر بھی ہارٹ بریک ہے۔ کچھ اسی طرح کی صورت حال مفتی کے افسانے "جھکی جھکی آنکھیں" میں بھی ہے۔ اس افسانے میں مرکزی کردار عذرا کا نفسِ لاشعور ہر وقت پنجرے میں بند طوطے کی صورت میں اس کے سامنے پڑا رہتا ہے۔

" اس روز وہ اپنے طوطے سولی سے کہہ رہی تھی، سولی چاہے تم کوئی بھی ہو تم میرے ہو تمہیں مجھ سے کوئی بھی نہیں چھین سکتا کوئی بھی نہیں۔"

سولی کے ہونے کا ادراک اور پھر اس سے قطع تعلق کا احساس شعور اور لاشعور کے درمیان خیالات اور ہونے یا نہ ہونے کی جنگ ہے۔ لاشعور جانتا ہے لیکن جاننے نہیں دیتا، بلکہ عمل میں کہیں کہیں ظاہر کر دیتا ہے۔

" وہ سوچ رہی تھی سولی بے زبان ہو کر بھی سمجھتا ہے اس وقت غالباً پہلی مرتبہ اس کے دل میں سولی کو آزاد کرنے کی خواہش محسوس ہوئی۔"

نفس لاشعور کے ادراک کا احساس اور پھر اس کے اندر چھپی ہوئی حقیقت کو ظاہر کر دینے کی خواہش ان لاشوں میں دم مارتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ شعور کی سطح سے پیچھے ہونے والی کارروائی عذرا کے بند بند میں پھڑپھڑانے لگتی ہے۔ لیکن شعور اقدار سے ڈرا اور سہا ہوا ہے۔ وہ کچھ نہیں جاننا چاہتا، اس لیے کہ اگر وہ جان کر اُسے تسلیم کرے تو بننے کے ساتھ ساتھ بہت کچھ ٹوٹ بھی جائے گا۔ لیکن نفسِ لاشعور کی ظاہر ہونے کی خواہش دباؤ کے ردِ عمل کے طور پر اور زیادہ بے چین اور مضطرب ہونے لگتی ہے۔

" سولی اپنے پنجرے میں یوں مضطرب تھا جیسے آسے سر نو قید کیا گیا ہو۔ وہ چاروں طرف دیکھ دیکھ کر پھڑپھڑاتا اور ان دیواروں کی اجنبیت محسوس کر کے بار بار چیختا ہے۔ شام کے وقت نذر نے سولی کا پنجرہ عذرا کے پلنگ کے قریب رکھ دیا۔ سولی نے عذرا کو دیکھ کر چیخنا بند کر دیا۔ اپنی گردن موڑ کر اپنے بازوؤں پر رکھ دی، اور عذرا کی طرف ٹکٹکی باندھ کر بیٹھ گیا۔

دبی ہوئی خواہش کو تسلیم نہ کرنے سے جو صورتحال پیدا ہوتی وہ پنجرے میں بند عذرا کے لاشعور کے مضطرب ہونے سے ظاہر ہوتی ہے۔ نذر جو کہ شعور کی سطح پر مثبت اور لاشعور کے اندر منفی حیثیت کا حامل ہے پنجرہ پھر عذرا کے قریب رکھ کر لاشعور میں دبی ہوئی چنگاری کو ہوا دیتا ہے لیکن جذبات کے مجروح ہونے کی انتہائی صورت وہ ڈراؤنی چپ ہے وہ طوطے کی آنکھوں میں دبک کر بیٹھ جاتی ہے۔

"سولی کی چیخ نے اسے بیدار کر دیا اس نے اپنا ہاتھ آہستہ سے چھڑا لیا اور اٹھ کر سونی کے پنجرے کے قریب جا بیٹھی وہ سولی سے باتیں کرنا چاہتی تھی، پوچھنا چاہتی تھی تم میرے ہو نا سولی۔"

جان کر نہ جاننے کے عمل کے درمیان تضاد طوطے کی وہ چیخ ہے جو عذرا کو بیدار کر دیتی ہے اور وہ ایک بار پھر جانی ہوئی بات کو جاننے کی کوشش میں لگ جاتی ہے۔ اس افسانے میں نفسیاتی تضاد کی جنگ صرف ایک قدر کی بقا کیلئے لڑی جاتی ہے۔ مفتی نے اپنے تمام افسانوں میں ایسی ہی صورت حال کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اپنے کرداروں سے سطحی اور خارجی واسطہ نہیں رکھتا، بلکہ ان کے داخلی رویوں تک رسائی حاصل کر کے انہیں بے نقاب کر دیتا ہے۔ اسی لیے کرداروں کے اندر دبی ہوئی خواہشات اور گھناؤنا پن مفتی کے افسانوں میں ایک ظالم حقیقت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ یہ حقیقت صرف ایک رخ کی ہی نمائندگی نہیں کرتی بلکہ ایک دوسرے کے اندر سے پھوٹنے والے تمام مسائل اور پھر ان کی انتہا کو بھی ظاہر کر دیتی ہے مگر مفتی نے اس تمام سفر کے لیے وہ نفسیاتی راستہ منتخب کیا ہے جو اجتماعی اور انفرادی رویوں کے باہمی ربط سے تعمیر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کا استعمال، میاں کی مٹھی، بچڑا دو دھیا سویرا اور ذاتی معاملہ، اس سلسلے کے اہم افسانے ہیں۔

اپنے خیالات کو ایک مکمل تقسیم کی شکل دینے اور پھر اس تقسیم کے لیے کرداروں کا انتخاب کرنے کے سلسلے میں ہر فنکار کو ایک تجزیاتی عمل سے گزرنا پڑتا ہے اور بڑے فنکار کی نشانی یہ ہوتی ہے کہ وہ اس تجزیاتی عمل کے دوران زندگی کے وسیع مطالعے اور ذہنی کشادگی کی مدد سے خود ہی سوال اٹھاتا اور خود ہی اس کا جواب دینے کی کوشش کرتا ہے۔ افسانے میں واقعات اور کرداروں سے یہ کام لینے کے لیے افسانہ نگار کو نہ صرف انتخاب کے مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے بلکہ محرکات کے تخلیقی اور تاریخی پہلوؤں کو بھی مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔ مفتی اپنے افسانوں میں تاریخی نفسیاتی شعور کی مدد سے سوالیہ کردار تخلیق کرتا ہے۔ اور پھر واقعات کی مدد سے ان کے جوابات فراہم کرتا ہے۔ "ریت کی لہریں" کا مرکزی کردار باقر افسانے کے ابتدائی حصے میں ایک سوال اور بعد میں خود ہی اپنا جواب بن جاتا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے قریب مفتی پر یہ الزام بھی تھا کہ وہ کہیں کہیں مبہم ہو جاتا ہے۔ لیکن آج کے دور میں شاید نئی نسل یہ جانتی بھی نہیں کہ ان کی طرح ایک دور میں مفتی بھی ذرا مشکل سے سمجھ میں آیا کرتا تھا۔ ذہنی ارتقا کے ساتھ ساتھ مفتی کا فن ایک ایسے مقام پر آ چکا ہے جہاں اسے بہتر طور پر سمجھا اور سراہا جا سکتا ہے۔ لوگ مفتی کو جنس کا افسانہ نگار سمجھتے ہیں۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ جنس مفتی کے افسانوں میں صرف حوالے کے طور پر آتی ہے۔ اصل مقصد تو ان جبلتوں کا تجزیہ کرنا ہے جو حیات کے اصول مرتب کرنے میں انسان کی ڈوری ہلاتی ہیں۔ جنس جہاں خود ایک مسئلہ ہے وہاں بہت سے مسائل پیدا کرنے کا موجب بھی بنتی ہے۔ سیاسی اور معاشی گھٹن کے عالم میں کچے کوٹھوں، پکے مکانوں، حویلیوں اور جنگلوں کے اندر جنسی کشمکش مفتی کے افسانوں میں خام مواد کے طور پر سامنے آتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مفتی مسئلے کو درمیان سے شروع کرتا ہے اور پھر ماضی اور حال کی طرف پھیلا دیتا ہے۔ اور شاید اسی وجہ سے مفتی کے افسانوں میں کھڑکی کا ذکر بہت آتا ہے۔ کھڑکی دراصل مفتی کا [illegible] ہے جس کی مدد سے وہ نفرت، چاہت، گھٹن، خواہشات اور

ضروریات جسم کا بغور مشاہدہ کرتا ہے ۔ اور اسی مشاہدے کو افسانے میں استعمال کرتے ہوئے کھڑکی کا سہارا اس کے لیے ایک لازمی جزو کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے ۔ مفتی کے ہر تیسرے افسانے میں کھڑکی کا ذکر ضرور آتا ہے ۔ بلکہ "سوپورہ کی کھڑکی" افسانہ تو صرف کھڑکی کی مدد سے ہی تشکیل پاتا ہے ۔ اس کے علاوہ مفتی نے محل اور کوٹھے کا ذکر بھی بہت کیا ہے ۔ محل کو وہ ایک بھرپور علامت کے طور پر استعمال کرتا ہے ۔ جہاں کہیں بھی محل کا ذکر آیا ہے وہاں اس کے اندر کا کھوکھلا پن افسانے کا جواز بنا ہے ۔ شان و شوکت اور شرافت کے پس پردہ نفسیاتی رویوں کی کشمکش اور پھر قدروں کا احترام ایک ایسی تکون ہے جو "وقار محل" میں پوری طرح نظر آتی ہے ۔ اور اگر قدروں سے ڈرے ہوئے انسانوں اور انسانوں سے ڈری ہوئی قدروں کے حوالے سے اس افسانے کو دیکھا جائے تو "محل" ایک مکمل اور بھرپور قدر کا درجہ حاصل کر لیتا ہے ۔ "وقار محل" کی لڑکی اپنے جنسی اور نفسیاتی حوالے سے قدروں کو توڑ دیتی ہے اور باپ اپنے نفسیاتی عمل سے انہیں جوڑنے کی کوشش میں جانے کون کون سے ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے ۔ لہٰذا مفتی اپنے تخلیقی ادراک سے جو سیاق و سباق ترتیب دیتا ہے وہ مفتی کے فن کو دائمی حیثیت بخشتا ہے جہاں تک "کوٹھے" کے ذکر کا تعلق ہے یہ وضاحت کر دوں کہ مفتی کے افسانوں میں جس "کوٹھے" کا ذکر ہے وہ طوائف کا کوٹھا نہیں، بلکہ عام کچے پکے مکانوں کا کوٹھا ہے ۔ جہاں کھڑا ہو کر ہر شخص اپنے صحن میں جھانک سکتا ہے ۔ میں یہاں یہ ضرور کہوں گا کہ مفتی کے ہاں ایک نفسیاتی منطق ہر لحظہ موجود رہتی ہے ۔ اور دوسرے لفظوں کی طرح کوٹھے کا بھی ایک نفسیاتی پس منظر ہے جس کا تعلق کھڑکی سے ہے ۔ اور کوٹھا تو ہندوستان کی ایک سطح ہے ۔

اس تجزیے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مفتی نے بلا شبہ اپنا ایک سکول تخلیق کیا ہے ۔ اور اب اس سکول کی تجدید اور ارتقا کا سلسلہ جاری ہے ۔ اس کے علاوہ مفتی نے اپنے مخصوص نظریاتی رویے سے طبقات کی نفسیات کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے ۔ طبقاتی نفسیات کی جتنی خوبصورت عکاسی مفتی نے کی ہے مشکل سے ہی کسی اور افسانہ نگار کے ہاں نظر آئے گی ۔ ایسے موضوع کی ترسیل کے لیے مفتی کے کردار قدرتی ترتیب کے ساتھ حرکت کرتے ہیں ۔ چار گوٹ میں تینوں طبقوں کی نفسیات کی مکمل تصویر کشی کی گئی ہے ۔

"جہاں ادائیگی کے لیے پرس سبز نوٹ اگلتے ہیں اور ساتھ ہی گرہ سے کھولے ہوئے میلے سکے کھنکتے ہیں پھیری والوں کے آوازے فقیروں کی صدائیں ، دفتر کے بابوؤں کی دبی دبی آہیں ، صاحبوں کے "اے ہٹ جاؤ آگے سے" اور مزدوروں کے ننگے بے تکلف قہقہے گونجتے ہیں ۔"

ان لائنوں میں جو کیفیت بیان کی گئی ہے وہ مختلف طبقوں کی نفسیات اور نفسیات کے عمل دخل سے ترتیب پانے والی عادات کو ظاہر کرتی ہے اور ان کے مخصوص رویئے اُن کے حال کے ساتھ ساتھ ماضی کو بھی سامنے لا کھڑا کرتے ہیں ۔ یہی نہیں آگے چل کر مفتی نے نفسیاتی عمل کے تضادات اور ان کے ماخذ بھی دریافت کیے ہیں اور ان تضادات کی روشنی میں ان لوگوں کی نفی کی ہے جو کسی بھی نظریے کو صرف فیشن کے طور پر اپنا لیتے ہیں ۔ اس سلسلے میں مفتی نے ان انقلابیوں پر بھی طنز کی ہے جو صرف اپنی باتوں اور حلیئے کی مدد سے انقلابی بننا چاہتے ہیں ۔ چار گوٹ کی لائنیں ہیں ۔

" لمبے بالوں والا کمیونسٹ شاعر حلوہ کھاتے ہوئے جوش میں اُٹھ بیٹھتا ہے "یہ مہنگائی حکومت کا قصور ہے" وہ تقریر شروع کرتا ہے لیکن چچا بیچ ہی میں بول اُٹھتا ہے "تو کیا گھی کھائے بغیر نہیں رہ سکتا" وہ سب ہنس پڑتے ہیں اور لمبے بالوں والے کی کوئی بات نہیں سنتا اور وہ چپ چاپ بیٹھ کر حلوہ کھانے لگتا ہے ۔"

یہ صورت صرف اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ لمبے بالوں والا کمیونسٹ اندر سے کھوکھلا ہے وہ اپنے نظریات اور اُن کی عملی صورت سے ایماندار نہیں ۔ وہ نظریات کو صرف اپنی ذات کے مفاد کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے ۔ نظریہ ذات کی نفی کر کے اجتماع کو اہمیت دیتا ہے ۔ لیکن وہ گھی کھائے بغیر نہیں رہ سکتا اور چاہے کسی کو ملے یا نہ ملے ۔ یہی نہیں بلکہ مفتی کے افسانوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی بھی نظریے کے ساتھ وابستگی کو عملی صورت میں بھی واضح اور پختہ دیکھنا چاہتا ہے ۔ اس کے نزدیک غلط مسلک پر سختی سے قائم آدمی اس شخص سے کہیں بہتر ہے جو اپنے مسلک کے ساتھ سنجیدہ نہ ہو ۔ مثلاً چارکوٹ میں برائے نام انقلابی کے ساتھ ساتھ مفتی نے مُلّا کا بھی تجزیہ کیا ہے ۔

مسجد کا مُلّا وضو کرتے ہوئے اجو کی طرف دیکھتا ہے ، لاحول پڑھتا ہے اور پھر دیکھتا ہے اس کی آرزو ہے کہ اجو صراطِ مستقیم پر آجائے ۔ دل ہی دل میں وہ جانتا ہے کہ صراطِ مستقیم سے اس کا حجرہ قریب تر ہے بہت قریب " مُلّا کے ظاہر و باطن کا تضاد ایک خاص نفسیاتی پس منظر رکھتا ہے ۔ لیکن یہاں پر مُلّا نام نہاد انقلابی سے مختلف نہ ہونے کے باوجود مختلف ہے ۔

"لمبے بالوں والا اسنتے اکی رُک جاتا ہے " ہاں " وہ اجو کی طرف دیکھتا ہے " یہ سب حکومت کا قصور ہے ۔"

ان دونوں میں مُلّا اور انقلابی کے عمل کے نتائج میں تو کوئی فرق نہیں ، لیکن صرف اُن کے نفسیاتی حوالے انہیں اپنے عمل کے انداز میں جُدا کرتے ہیں ۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ کوئی بھی کام چاہے وہ کسی بھی طریقے سے کیا جائے اگر اس کا مخصوص نتیجہ نکلتا ہو تو تمام چیزیں ثانوی حیثیت اختیار کر جاتی ہیں اور نتیجہ بنیادی حیثیت اختیار کر لیتا ہے ۔ عمل اور نتیجے کی ایسی ہی کیفیت مفتی کے کئی اور افسانوں میں بھی ملتی ہے جسے اس نے بڑے عمدہ تجزیے سے پیش کیا ہے ۔

شروع میں میں نے کہا تھا کہ مفتی نے قدروں سے ڈرے ہوئے انسانوں اور انسانوں سے ڈری ہوئی قدروں کو کردار اور واقعات کی مدد سے اپنے افسانوں کے قالب میں اُتار دیا ہے ۔ لہٰذا اب اگر اس سطح پر میں یہ کہوں کہ مفتی نے اس خاموش ، مگر شعور و عمل کو ظاہر کر کے ثقافتی خلیج کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے تو شاید مزید وضاحت کی ضرورت محسوس نہ ہو ۔ مفتی نے جذبات و احساسات کے اندر چھپی ہوئی ان قدروں کو چھیڑا ہے ۔ جو جنسی ، سیاسی یا معاشی کسی بھی حوالے سے بالآخر ثقافتی تغیر کا موجب بنتی ہیں ۔ اس سلسلے میں مینا کے پاؤں ، گڑیا گھر ، بابا گھونٹ والا ، ریت کی لہریں اور جوار بھاٹا کی مثال دی جا سکتی ہے ۔ اور اسی لیے میرا خیال ہے کہ اپنے فن اور موضوع کے لحاظ سے مفتی کے افسانے ، تاریخ میں ایک اہم باب کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ مفتی نے اپنے دور تک چلی ہوئی فنی اور موضوعاتی یکسانیت اور اکتاہٹ کو ختم کر کے افسانے کو ایک نیا نثری موضوعاتی آہنگ عطا کیا ۔ اس نے ایسے جملے لکھے جو آج بھی نئے افسانے میں جا بجا دیکھے جا سکتے ہیں ۔

خط کا مضمون اس کا پیچھا کر رہا تھا اور لوند لوند اس کے دل کی گہرائیوں میں ٹپک رہا تھا ۔

اس نے وہ پیغام کانوں سے نہیں بلکہ جسم کے بند بند میں سُنا۔

تڑپ اُداسی بن کر اس پر چھانے جا رہی تھی۔

گونگے الفاظ ناچ ناچ کر اسے پریشان کر رہے تھے۔

تنگ سڑک یوں گھومتی ہوئی نکل گئی تھی جیسے چلتے چلتے کھو گئی ہو۔

بجلی کے کھمبے حیرانی سے بُت بنے کھڑے تھے۔

اندھیرے کے بڑے بڑے بھیانک ٹکڑے چمگادڑوں کی طرح پر پھڑپھڑاتے پھر رہے تھے

اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنے جسم کو اُٹھا نہیں سکتا۔

تاریک اندھیرے کا ایک کلہاڑا اس کی طرف بڑھا۔

درختوں کی ٹہنیوں میں گرتی ہوئی بوندیاں یوں سنائی دے رہی تھیں، جیسے کوئی ہچکیاں لے رہا ہو۔ دور جاتی ندی بین کر رہی تھی۔

رقص وہ جہنم ہے جو جب تک نسائیت کی آہوں سے نہ بھیگے خوشبو نہیں دیتا۔

سمندر کی تھکی ہاری لہروں کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔

مفتی کی افسانہ نگاری کو مفتی کی شخصیت سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ مفتی کی شخصیت نے مفتی کی افسانہ نگاری کو اور افسانہ نگاری نے اس کی شخصیت کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ اسی لیے پچھلے چند سالوں میں لکھے جانے والے افسانوں پر اس کی شخصیت کا بہت گہرا اثر ہے۔ ان افسانوں میں مفتی نے modern کے حوالے سے رشتوں کی نئی پہچان کی ہے اور اس نئے نفسیاتی عمل کا سراغ لگایا ہے۔ جو قدروں کی تجدید کے بعد پوری شدت کے ساتھ حرکت کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں "باپ اور بیٹا" کی مثال بڑی جاندار اور ٹھوس ہے۔

مفتی بدستور لکھ رہا ہے۔ اپنے ہمعصروں میں وہ ایسا افسانہ نگار ہے جس کے فنی نظریے نے نئے دور کے تقاضوں کو اپنے اندر سمو لیا ہے۔ اور وہ بڑی جرأت اور بیباکی سے اس کا اظہار کر رہا ہے اور اسی لیے اس کا نام ہند و پاک کے افسانہ نگاروں کی فہرست میں نمایاں اور اہم مقام رکھتا ہے۔

علی پور کا ایلی

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

علی پور کا ایلی کے پہلے ایڈیشن کی جلد کے ساتھ ایک چٹ لگی ہوئی تھی جس پر یہ لکھا ہوا تھا ”اسے آدم جی انعام بھی ملا“ اور کچھ عرصہ بعد اس کے بارے میں ابن انشا صاحب نے کہا ”اس سے مشہور ہے کہ اس پر آدم جی انعام نہیں ملا“ اور یہ جملہ بھی اس کے ہر ایڈیشن کے ساتھ چھپا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ جب ۱۹۶۱ء کا آدم جی انعام ملنے والا تھا تو یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ اس ناول کو انعام ملنا چاہیے یا ملے گا یا نہ دیا جائے گا۔ مگر انعام ”تلاش بہاراں“ کو دے دیا گیا۔ مولوی عبدالحق بقید حیات تھے اور میں ان کی خدمت میں بیٹھا تھا۔ ان کے ناول کے سلسلے میں ذوق پر مجھے کبھی اعتماد نہیں ہوا۔ جب پہلا آدم جی انعام ”خدا کی بستی“ کو دیا گیا تھا تو میں نے مولوی صاحب سے کہا تھا ”آپ نے ترازو میں تول کر انعام دیا ہے۔“ اور ان سب کتابوں کو جو مولوی صاحب کے کمرے میں ایک پلنگ پر پھیلی ہوئی تھیں۔ دیکھ کر اشارہ کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا ”آخر ان سب کتابوں سے تو وزن میں یہ سب سے بھاری ہے۔“ مولوی صاحب ہنس دیئے تھے۔ پھر آئندہ سال ”تلاش بہاراں“ کو انعام ملنے کے بعد میں ان کے پاس گیا وہ تو الگ بیٹھے تھے مگر باتیں کرتے تھے میں نے کہا ”آپ کی انعام دینے کے سلسلہ میں ”علی پور کا ایلی“ اس قدر زیادہ بڑی کتاب تھی کہ ترازو ہی ٹوٹ گئی لہذا اس کا وزن نہ ہو سکا اور اس کم وزن کی کتاب ”تلاش بہاراں“ کو آپ نے انعام دے دیا۔“ مولوی صاحب تھوڑی دیر کے بعد غش میں آجاتے تھے۔ کچھ نہیں سمجھا کہ انہوں نے یہ بات پوری سنی یا نہیں۔ مگر میں یہ سب ... عجیب واقعہ تھا کہ ایک ناول کی سب سے بڑی تعریف یہ ہو کہ ”اسے آدم جی انعام ملا“ اور دوسری کی تعریف یہ کی جائے کہ ”آدم جی انعام نہیں ملا۔“ انعام ملنا یا نہ ملنا بے معنی ہو گیا اور ایک حد تک جن ناولوں کے بارے یہ کہا جاتا ہے کہ انہیں انعام ملا یا نہیں ملا وہ بھی بے معنی ہو گئیں۔ اس بنا پر مجھے ”علی پور کا ایلی“ سے ایک مبہم سا تعصب ہو گیا اور میں اسے بھی ایسی چیز ماننے لگا جو میرے پڑھنے کے قابل نہیں ہے۔ اس تعصب کو ختم ہوتے بھی عرصہ گزر گیا۔ پھر ایک دن جمیل صاحب کے یہاں اس کا وہ ایڈیشن رکھا ہوا دیکھا جو ”ہماری لائبریری“ کے سلسلہ کا ہے۔ ممتاز مفتی کی افسانہ نگاری سے بھی بہت پہلے ہی سے واقف تھا اور اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا کرتا تھا۔ میں نے یہ طے کیا کہ ”علی پور کا ایلی“ کو ضرور پڑھ کر دیکھوں گا اور جمیل صاحب سے کتاب عاریتاً لے لی۔ پڑھنا شروع کیا تو اس میں ایسا محو ہوا کہ دن دن بھر اور رات میں کافی دیر تک پڑھتا رہا۔ ساتھ لئے لئے پھرا اور کراچی کی بسوں میں دفتروں میں جہاں بھی ذرا سا وقت مل گیا اس کی طرف رجوع ہو گیا۔ کتاب ضخیم تھی اور جلد پیپر بیک۔ جب میں نے اسے جمیل صاحب کو واپس دیا تو اس کے بلا مبالغہ آٹھ الگ الگ ٹکڑے ہو چکے تھے۔ کچھ لوگوں نے اسے میرے ہاتھ میں دیکھ کر تعجب سے یہ بھی کہا ”اتنی موٹی کتاب پڑھ رہے ہیں؟“ میں نے جواب دیا چھوٹی یا موٹی کی مجھے کوئی پروا نہیں یہ کتاب حد سے زیادہ دلچسپ ہے اور میرے

لئے۔ میں غیر ادبی یا ادبی کوئی موٹی کتاب نہیں پڑھتا اور یہ مجھے آج کی سب ادبی کتابوں سے زیادہ دلچسپ معلوم ہو رہی ہے جلد سے جلد ختم ہو جاتی ہیں۔ غرض اس کتاب کو ایک نئی قسم کی نفرت سے میں نے شروع کیا مگر یہ میرے لئے دلچسپ اور قابل وقعت ہوتی گئی اور آخر میں اس شعر پر پوری اتری کہ جادو وہ ہے جو سر چڑھ کر بولے۔ مشفق محمد طفیل ایڈیٹر "نقوش" نے اس کا فسانۂ آزاد سے مقابلہ کیا اور ان سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے کہا "علی پور کا ایلی" اور "فسانۂ آزاد" میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ "خدا لگتی کہہ ناول کے میدان میں پہلا ٹکتا ہوا قدم ہے اور اللہ کرے اس میدان کے ادب میں پورے طور پر تسخیر کا نشان ہے۔" انہوں نے کہا "اس پر ایک مفصل مضمون لکھ ڈالیے۔" میں نے اسے پھر پڑھا اور اس پر مضمون لکھنا شروع کیا۔ مگر یہ دیکھ کر کہ رسالہ نقوش سو گیا ہے مجھے بھی نیند آ گئی اور وہ مضمون رد کیا۔ مگر اب جب اس تصنیف کو مقبول ہوئے بارہ برس ہو گئے میں نے اسے پھر پڑھا اور اس پر مضمون لکھ ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔ نقوش نہ معلوم کب نکلے گا مگر مضمون کو تیار رہنا چاہیے۔ لکھنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ میں نے اب ان تمام ناولوں پر مضمون لکھنے کی ٹھان لی ہے جو ۱۹۴۷ء سے اب تک وجود میں آئی ہیں اور جو ہماری ناول نگاری میں ایک نیا بلند ناول کے اس مضمون میں پہلے دور کے نقوش ابھار رہی ہیں۔ میری رائے ہے کہ "علی پور کا ایلی" ان آدھے درجن ناولوں میں سے جو ہمیشہ اہم مانی جاتی رہیں گی۔

ممتاز مفتی صاحب ناول کا واضح شعور رکھتے ہیں اور اس لئے ان کے سلسلے میں انعام کی کوئی اہمیت نہ ہونا چاہیے کیونکہ انعام تو بیشتر ایسے لوگوں کو ملتا ہے جن کو ناول کا کوئی شعور نہیں ہوتا اور وہ اپنی ناول کے بابت یہ نہیں بتا سکتے کہ اس میں ہے کیا۔ برخلاف اس کے مفتی صاحب انکسار کے ساتھ فرماتے ہیں۔

"اپنی دانست میں میں نے ناول نہیں بلکہ ایلی کی سرگزشت لکھی تھی۔ مقصد تھا کہ ایلی کی شخصیت کا ارتقا پیش کروں۔ اس لیے چند ایک بظاہر غیر متعلق تفصیلات پیش کرنے سے گریز نہیں کیا۔ یہ اور بات ہے کہ ایلی ایسا کردار ہے جو مشاہدات کے سمندر میں ڈبکیاں کھاتا ہے لیکن جب کنارے لگتا ہے تو بطخ کی طرح پر جھاڑ کر پھر سے جوں کا توں خشک ہو جاتا ہے ۔۔۔۔۔

بہرحال اردو ادب میں کوئی طویل کہانی ایسی نہ ملے گی جس کی تفصیلات براہ راست زندگی سے اخذ کی گئی ہوں اور رکھ رکھاؤ کے بغیر ایک جگہ ڈھیر کر دی گئی ہوں ۔۔ اس لحاظ سے یہ کتاب آپ بیتی ہے۔

(پیش لفظ، طبع ثانی)

پیش لفظ طبع اول ۱۹۶۱ء میں وہ پہلے ہی فرما چکے تھے:۔

.. .. — یہ روداد ہے۔
ایک ایسے شخص کی جس کا تعلیم کچھ نہ بگاڑ سکی۔
جس نے تجربے سے کچھ نہ سیکھا۔
جس کا ذہن اور دل ایک دوسرے سے اجنبی رہے۔

جو پلا بڑھا، جوان ہوا اور باپ بننے کے باوجود بچہ ہی رہا۔
جس نے کئی ایک محبتیں کیں لیکن محبت نہ کر سکا۔ جس نے محبت کی پھلجھڑیاں اپنی انا کی تسکین کے لئے جلائیں لیکن سپردگی کے عظیم جذبے سے بیگانہ رہا اور شعلہ جوالہ نہ پیدا کر سکا۔

جو زندگی بھر اپنی انا کی دھندلی بھول بھلیوں میں گھومتا رہا حتیٰ کہ بالآخر نہ جانے کہاں سے ایک کرن چمکی اور اسے نہ جانے کدھر کو لے جانے والا ایک راستہ مل گیا۔

اس داستان کے بیشتر واقعات اور مرکزی کردار حقیقت پر مبنی ہیں۔ باقی کردار حقیقت اور افسانہ کی آمیزش ہیں۔ حقیقت سے گریز کی وجہ میرا عجز ہے اور ان کرداروں کی عظمت کو اجاگر کرنا میرے بس کی بات نہ تھی لہٰذا افسانوی رنگ شامل کر کے میں نے اپنے عجز کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔

ظاہر ہے کہ دو پیش لفظوں میں جو کچھ ہمیں ملتا ہے اسے باقاعدہ تنقید سی کہا جا سکتا مگر وہ ممتاز مفتی صاحب کے ناول کے سلسلے میں شعور کا ضرور اندازہ دیتا ہے اور اس میں سے حسب ذیل خاص باتیں سامنے آتی ہیں۔

اول یہ کہ وہ مستقل واقعیت پسند ہیں۔ وہ اپنا مخصوص تجربہ پیش کرنا چاہتے ہیں اور اس طرح کہ وہ بالکل صحیح رہے۔ یہ بات ہمیں ناول کی بنیاد تک لے جاتی ہے۔ اٹھارویں صدی میں ناول کی ابتدا کرنے والوں کے سامنے بھی یہی مخصوص مقصد تھا اور یہی مقصد آج بھی تمام اچھے ناول نگاروں کا ہوتا ہے۔ مگر وقت کے ساتھ اسی مقصد میں اور بھی مقاصد شامل ہو گئے۔ خاص طور سے بیسویں صدی میں تجربہ یا زندگی کے حالات کو نظریہ یا تخییل کے اثر سے بدل کر پیش کرنا بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اسی سے ناول نگار مفکر کے روپ میں سامنے آتا ہے اور ناول متاثر کرنے کے علاوہ ذہنی بحث کا مواد بھی پہنچاتی ہے۔ مفتی صاحب اس جھنجھٹ میں نہیں پڑ رہے ہیں۔ وہ نہایت غیر جانبداری سے ایک سرگزشت ایک روئیداد کو بے کم و کاست بیان کر دینا چاہتے ہیں۔ ہمارے یہاں ناول کا ارتقا عجیب سا ہے۔ ابتدا کے ناول نگار اسے فسانہ سمجھ کر بہت سے ذہنی، خیالی اور مبالغاتی چیزیں اس میں داخل کرتے رہے اور آج کل کے ناول نگار جدید تجربوں کی راہ پر چل کھڑے ہوئے۔ اس لئے ہمارے یہاں ایسی ناول جسے ناول کا NORMA کہا جائے ڈھونڈے نہیں ملتی۔ مفتی صاحب اس قدیم اس "خالص ناول" کی راہ پر چل رہے ہیں اور "علی پور کا ایلی" اپنے نام سے ہی اور پھر مواد سے بھی زندگی کی اس طرح ترجمانی ہے جیسی واقعیت پسندوں اور فطرت پسندوں نے کی تھی۔ جدید دور میں اس راہ پر چلنا اور قدم میں لغزش نہ آنا بھی ایک کمال ہی کے دائرے میں آتا ہے اور ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ وہ اسے کہاں تک حاصل کر سکے ہیں۔

دوسرے یہ کہ واقعیت پورے طور پر ہمکنار رہنے کی کوشش سے اس ناول میں دو خصوصیات پیدا ہونا لازمی تھیں اور انہیں مفتی صاحب نے نہایت فراخ دلی سے پیدا ہونے دیا۔ اول یہ کہ تجربوں کا ڈھیر لگتا چلا گیا اور اس میں سے انہوں نے چھننے کی کوشش نہیں کی۔ ناول کو آج کل انتخاب اور ارتفع کے اصولوں کے ماتحت لانے کی کوشش کی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سی تفصیلات غائب ہو جاتی ہیں اور بہت سی سکڑ اکر رکھی جاتی ہیں۔ قاری کو ناول نگار کے اشاروں سے خود بہت کچھ اپنی طرف سے شامل کر لینا پڑتا ہے۔ اسی طرح ناول نگار اور صاحب ذوق دونوں کی تخییل کے ساتھ ساتھ چلتے رہنے سے بنتی ہے۔ وہ اکثر لوگوں کے لئے

مبہم اور منتشر بھی ہو جاتی ہے اور بیشتر لوگ اسے اپنی اپنی طرح پر سمجھتے ہوئے اسے پڑھ جاتے ہیں۔ مفتی صاحب اس کے قائل نہیں ہیں اور اس معاملے میں بھی وہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے ناول نگاروں کے ساتھ ہیں جو تفصیلات کو زیادہ سے زیادہ واضح طریقہ پر پیش کرنے کے قائل تھے اور زندگی کا واضح سے واضح نقشہ پیش کرتے تھے۔ اس لئے علی پور کا ایلی میں ہمیں جدید فن کاری سے انکار بلکہ اختلاف ملتا ہے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پرانا طریقہ اب بھی کتنا زوردار ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اسی وجہ سے اس کی ضخامت بڑھ گئی ہے جس پر کچھ لوگوں کو اعتراض ہے۔ ناول کے سلسلے میں ہمارے یہاں کوئی واضح نظریہ نہ ہونے کی وجہ سے کچھ لوگ اسی تصنیف کو ناول کہتے ہیں جو کم از کم ایک ہزار صفحوں کا ہو لیکن زیادہ تر لوگ ضخامت سے گھبرا جاتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ناول حد سے حد چار سو صفحوں کی ہو۔ علی پور کا ایلی کی ضخامت زیادہ تر لوگوں پر بار ہے۔ میں اسے ایک قسم کی بدمذاقی سمجھتا ہوں اصل میں ضخامت کا دارومدار فن پر مبنی ہوتی ہے اور مفتی صاحب کا جو مواد ہے اور جس طرح وہ اسے پیش کرنا چاہتے ہیں وہ اتنی ضخامت کے بغیر ادا ہی نہیں ہو سکتا تھا جتنی کہ ناول کی ہے۔ ان باتوں سے یہ نتیجہ بھی نکل سکتا ہے کہ مفتی صاحب بغیر سوچے سمجھے روانی کے ساتھ ناول مرتب کرتے گئے ہیں اور انھیں فنکاری سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ یہ سب تفصیلات اور طوالت کیا محض لاپرواہی کی وجہ سے ہے یا اس کے پیچھے کوئی مستقل فنی صورت چھپی ہوئی ہے اور ہے تو وہ کس حد تک دلکش ہے۔

تیسرے یہ کہ تخلیق کار کی حیثیت سے وہ تمام قوت کردار نگاری پر صرف کرنا چاہتے ہیں اور خاص طور پر ناول کے ہیرو ایلی کی ہستی زیادہ نمایاں کرکے اس کو دائمی حقیقت بنا دینا چاہتے ہیں۔ جدید ناول کردار نگاری کے سلسلے میں بھی باغی ہے اور بالکل دو تعاقی کردار پیش کرنے کے بجائے اشاریت وغیرہ پر عمل کرتی ہے مفتی صاحب اس کے بھی خلاف ہیں اور ان کی وہ راہ ہے جو ''ڈون کوئکزوٹ'' سے شروع ہو کر ''پکوک پیپرز'' تک بھی آتی ہے اور آج بھی سومرسٹ ماہم وغیرہ کی راہ ہے۔ غرض اس معاملے میں بھی وہ ناول نگاری کے تمام الجھاووں کو الگ کر دیتے ہیں۔ ضخامت اور وسعت کے لحاظ سے اس کتاب میں کردار کا ابھرنا اور نئے نئے کردار کا ہر موڑ پر سامنے آتے رہنا لازمی ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ یہ کس قدر زندہ ہیں اور کیسے مل جل کر ایک دنیا تخلیق کرتے ہیں اور یہ دنیا کس حد تک دلکش ہے پھر ناول کا مرکزی کردار ہی سب سے زیادہ مصنف کی توجہ کا مرکز ہے۔ اس کے بابت یہ بنیادی باتیں وہ پیش لفظ ہی میں کہہ دیتے ہیں۔ یہ باتیں نہایت معمولی ہیں مگر معمولی ہونے ہی کی وجہ سے تعجب انگیز بھی اور اسی قسم کی مصداق ہیں کہ حقیقت مجاز سے زیادہ تعجب انگیز ہوتی ہے۔ غرض یہ ناول صاف صاف طور پر اس قسم کا ناول ہے جسے کرداری ناول کہا جاتا ہے اور اس کی کامیابی یا کمال آخر کار اس کے ہیرو کی تخلیق کی کامیابی یا کمال سے وابستہ ہونا چاہئے اور اگر ایلی دنیائے ناول نگاری کے ان کرداروں میں سے ایک ٹھہرتا ہے جس کو حقیقت سے زیادہ حقیقی اور ایک معاشرے کا مکمل نمائندہ کہا گیا ہے تو ناول کو عظیم درجہ میں جگہ دینا ضروری ہو جاتا ہے۔

غرض ہم اس ناول کو یہ جان کر اور مان کر شروع کرتے ہیں یہ ناول کی بنیادی روح یا سیدھی سادی راہ سے ہٹنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان جدید ضروری یا غیر ضروری آلائشوں سے پاک ہے جو تجربہ کی طرح اس پر تھوپی جا رہی ہیں۔ ہمیں پیش لفظوں میں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ کچھ لوگ اسے ناول کہنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی رائے کو کوئی سا بھی وقعت

نہیں دینا چاہیئے۔ یہ لوگ ناول میں رومان دیکھنا چاہتے ہیں اور وہ علی پور کا ایلی میں بس اسی حد تک ہے جتنا کہ ایلی کے کردار سے ممکن تھا۔ اس کو جنگ و نیا و تہذیب سے غداری کے مترادف ہوتا اس لئے مفتی صاحب رومانی رنگ بڑھانے سے گریز کیا۔ ان سے عام ناولوں کو پڑھنے والے اسے غیر دلچسپ کہیں گے۔ مگر میں نے پڑھ کر دیکھا ہے اور بہت سے لوگ میرے ہم رائے ہیں کہ اس میں بے پناہ دلچسپی ہے۔ ویسی دلچسپی ہی جیسی ناول کا اعلیٰ ذوق رکھنے والے ڈھونڈتے ہیں اور ویسی دلچسپی جو جیسی ایک فرد کے دنیا سے کشمکش سے خاص طور پر عشق بازی کی کشمکش سے پیدا ہوتی ہے اس میں ایک مسلسل عشقیہ قصہ بھی ہے جو بڑے جذبات کے ساتھ سامنے آتے اور بڑے دلکش کردار کے مختلف پہلو دکھاتا ہے۔ ایلی اور شہزاد کا عشق بھی عجیب حقیقت ہونے کی وجہ سے اچھا خاصا رومانی ہے اور اس میں ہنسنے کو تو اس کے پیچھوں کو ہم بڑی دلچسپی سے نکلتے ہوئے دیکھنے کے منتظر رہتے ہیں۔ دور میں ایلی کا ایک اور عشق پیدا ہے اور وہ بھی بڑا دلچسپ ہو جاتا ہے ایک اس وجہ سے کہ وہ اپنی جگہ عجیب ہے اور دوسرے اس وجہ سے وہ ایلی کی شہزاد کی طرف توجہ کو ختم نہیں کرتا۔ پھر جب ہمیں ایلی سے شروع ہی سے دلچسپی ہو جاتی ہے تو اس کی ہر بات جو ایک حد تک ماتحت ہی ہے ہمارے لئے نہایت درجہ دلچسپ ہو جاتی ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اسے ناول کے سلسلے کے تعصبات سے ذہن کو خالی کر کے پڑھیں تو زندگی کا جو منظر یہ پیش کرتی ہے وہ حد سے زیادہ دلچسپ ہو جائے گا اور ضخامت ہماری دلچسپی کی راہ میں کسی طرح حائل نہ ہو گی بلکہ ہمارا دل چاہتا ہے کہ یہ اور بھی ضخیم ہوتی تو اچھا تھا۔

(۲)

مفتی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ اس کتاب میں زندگی کی تفصیلات ایک جگہ ڈھیر کر دی گئی ہیں۔ ڈھیر کا لفظ بے ترتیبی کی طرف اشارہ کرتا ہے مگر کسی ڈھیر پر غور کیجیے تو اس میں بھی ایک ترتیب ضرور نظر آئے گی۔ یہ ترتیب انسان کی دی ہوئی تو کسی طرح نہ ہو گی مگر قدرت نے انسان کے ڈھیر کئے ہوئے مواد سے ایک ترتیب ضرور پیدا کر دی ہو گی۔ اناج کے ڈھیر کو دیکھیے اس کی ایک چوٹی ہو گی اور سارا مواد اس سے شروع ہو کر ایک مثلث کی شکل ضرور اختیار کر گیا ہو گا۔ "علی پور کا ایلی" بھی اسی قسم کی ترتیب قدرتی ترتیب رکھتا ہے۔ اس کی ابتدا ایلی یا ایلیاس کے گھر کا سین سب میں پہلے سامنے لاتا ہے باپ علی احمد دو مائیں ایک سگی ماں ہاجرہ اور ایک سوتیلی صفیہ صاف صاف ایک دوسرے سے مختلف اور اپنی جگہ پر منفرد ہیں۔ ایلی کو بچہ ہی کہا جا سکتا ہے مگر وہ ان میں سے ہر ایک سے ایک خاص ردعمل رکھتا ہے۔ علی احمد مستقل کردار ہے۔ وہ ایلی کو ملازم کی طرح سمجھتے ہیں اور ایلی ان کی آواز سن کر دھک سے رہ جاتا ہے اور ان کا حقہ بھرنے لگ جاتا ہے۔ ہاجرہ بھی ایک ملازمہ کی طرح ہے جو قناعت اور وفاداری سے زندگی گزار رہی ہے اور وضع دار اور حسین صفیہ کے حکم پر چل رہی ہے ایلی صفیہ سے نفرت کرتا ہے اور گھن کھاتا ہے مگر اس کے حکم پر چلنے سے انکار نہیں کر سکتا۔ اس طرح وہ ماحول پورے طور پر ہمارے سامنے آجاتا ہے جو ایلی کے کردار کے سلسلے میں بنیادی ہے۔ ناول کی یوں ابتدا بڑی معنی خیز اور فنی لحاظ سے بڑی مناسب ہے۔ علی احمد اور ایلی جو تمام داستان پر حاوی رہیں گے پوری انفرادیت کے ساتھ سامنے آجاتے ہیں اور ایلی کا عورتوں کی طرف ردعمل جو داستان

کی بنیادی چیز ہوگا پورے طور سے ظاہر ہو جاتا ہے ۔ ہاجرہ کو وہ ہیروئن اور صفیہ کو وہ ویلن سمجھتا ہے اور علی احمد کے ہر حکم پر چلنے کو تیار ہے ۔ علی احمد اس سے محبت کرتے ہیں جو اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ کھانا کھاتے وقت گوشت کی بوٹی اسے دو انگلیوں سے اٹھا کر دیتے ہیں ۔ یہ محبت بڑے خاص قسم کی گوشت کی بوٹی دو انگلیوں سے اٹھا کر دینا ایسا پیار ہے جو ثابت کرتا ہے کہ علی احمد کا خاص رجحان تو اپنے کام کی طرف ہے یا پھر عورتوں سے تعلق پیدا کرنے میں ہے مگر وہ ایلی کی طرف باپ کے فرائض اور باپ کی محبت کے تقاضے پورے کرنے سے گریز ہی کریں گے ۔ بہر حال ابتدا ایک نرگس ہے جس میں ساری ناول دکھائی دے گئی ہے اور اس سے علی پور کی طرف گریز اور اس کا مناسب بیان نہایت قدرتی ہے ۔ اس کا آصفی محلہ ایک چھوٹی سی دلکش دنیا ہے اور اس کے بادشاہ اور ملکہ علی احمد اور صفیہ کے نقوش اور بھی گہرے کر کے سامنے لائے جاتے ہیں ۔ فرحت بھی دبے پاؤں اس گھر میں آ جاتی ہے ۔ صفیہ اور ہاجرہ کے آپس میں تعلقات انوکھا انتقام اور نرالا امتحان کے واقعات کے ذریعہ روشن ہو جاتے ہیں ۔ پہلا باب "گرد و پیش" اسی طرح مکمل ہو جاتا ہے ۔ ہر باب کی ایک سرخی ہے اور اس کے ہر حصہ کی ماتحت سرخی ہے جو حاشیے میں چھپی نظر آتی ہے ۔

ظاہرہ یہ تاثر ہوتا ہے ناول کی قاشیں اور اس پر چھوٹی قاشیں کر دی گئی ہیں، مگر یہ سب قدرتی اور منطقی تسلسل سے جڑی ہوئی ہیں ۔ سرخیوں پر سرخیوں کا استعمال وضاحت میں اور دھیان لگا رہنے میں خاص مدد کرتا ہے ۔ کتاب ایک ڈھیر ہے اور معمولی ڈھیر بھی نہیں بلکہ بڑے سائز کے قریب بارہ سو صفحوں کا چوڑا اور اونچا ڈھیر ہے ۔ ایک پہاڑی کہئے مگر اس پر جانے کا راستہ چکر کا ہی مگر صاف ہے ۔ ہر چوٹی اور موڑ پر نشان کے تختے لگے ہوئے ہیں اور سفر کرنے والے کی راہ نمائی کرتے ہیں اور ہر ہر گوشے کی نوعیت کا علم ہم پہونچاتے ہیں ۔ "علی پور کا ایلی" قدرتی طور پر ایک بے شکل پہاڑی ہے مگر مفتی صاحب نے پورے شعور کے ساتھ اور فنکارانہ آنچ اور جدت کے ساتھ اس پر چلنے والے کے لئے ہر ہر قدم پر دلچسپ راہبر کے فرائض ادا کئے ہیں ۔

بے خیالی میں یہ مان لینا ممکن ہے ناول کا کوئی اسٹرکچر نہیں ہے مگر غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ایک بے ہنگم ڈھیر کو ناول نگار نے نہایت صحیح اور سائنسی شکل دینے کی کامیاب کوشش کی ہے ۔ ہر باب کی بڑے حروف میں لکھی ہوئی سرخی اور پھر اس کے ماتحت درجنوں چھوٹے حروف میں لکھی ہوئی سرخیاں ایک عظیم ڈھیر کو جو قدرت کا بنایا ہوا ہے انسان کے ذہن نشین کراتے اور مواد کو ایک فارم دینے میں خاص طور پر ممد ثابت ہوتی ہیں ۔ اس لئے یہ کہنا بالکل غلط ہوگا کہ ناول کا کوئی خاص فارم نہیں ہے ۔ ناول زندگی کی طرح بے ہئیت ہے مگر اس پر مصنف نے ایک فارم عائد ضرور کیا ہے ۔ یہ عام طور سے جو فارم ناولوں میں نظر آتے ہیں ان سے مختلف ہی نہیں بلکہ ان کا متضاد ہے مگر غور کرنے والوں پر روشن ہو جاتا ہے کہ یہ بالکل نئی چیز ضرور ہے اور مفتی صاحب کا شعور داد کے قابل ہے کہ انہوں نے فارم کو بھی خوبی سے چھپایا ہے یا مواد بھی وہ اسی خوبی سے چھپ گیا ہے کہ ناول نگاری میں ایک بالکل نئی اور اچھوتی ہئیت کا اضافہ ہوتا ہے ۔

ظاہر ہے کہ اس ہئیت کو قدم بقدم طے کرنا ایسا طول عمل ہوگا کہ تنقید بھی کتاب کے برابر ضخیم ہو جائے گی ۔ ہر چھوٹی سرخی ایک دلچسپ واقعہ سامنے لاتی ہے اور بڑی سرخی ان کا ایک مستقل ترتیب میں آ جانا دکھاتی ہے ۔ واقعات نئے اور دلچسپ ہیں اور ہر ایک سے یا تو کوئی نیا کردار ابھرتا ہے یا جانا پہچانا ہوا کردار کوئی نئی چھب دکھاتا ہے ۔ تفصیل سے ہٹ کر ہم دیکھتے ہیں تو علی احمد ۔ ایلی

اور کچھ آگے چل کر شہزاد کے قصے پلاٹوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ علی احمد کے معاشقوں کے قصوں کا تار جس سے ایلی ضمنی طور پر وابستہ ہے ایک دلچسپ لکیر بناتا ہے۔ پھر ایلی اور شہزاد کے عجیب و غریب عاشقہ کا پلاٹ اس طرح آتا ہے کہ وہ ناول کا مرکزی پلاٹ ہو جاتا ہے۔ مگر اصل پلاٹ ایلی کی سرگزشت کا ہے۔ یہ ناول کو علی پور سے باہر لے جاتا ہے۔ لاہور اور امرتسر کے واقعات اس میں شامل کرتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کا وہ علاقہ جو علی پور کو مرکز مان کر اور امرتسر کو مدار مان کر دائرے میں لایا جا سکتا ہے ناول کا ماحول ہے۔ ایلی دلی اور بمبئی کی بھی خبر لیتا ہے مگر جہاں بھی جائے یہ ماحول اس کے ساتھ ہے اور ساتھ نہیں تو اس کے دل اور اس کے کردار میں رچا بسا ہے۔ پنجاب اور اس کا وہ مخصوص حصہ جسے علی پور کہتے ہیں ایک واقعاتی گھرنی اور عجیب کائنات کی طرح پوری ناول پر حاوی رہتا ہے اور مختلف بلکہ گوناگوں قصوں اور کردار کو ایک اتحاد میں لاتا ہے۔ اس طرح اس وسیع پیمانے پر پھیلے ہوئے مواد میں ایک تخیلی اتحاد صاف طور پر موجود نظر آتا ہے۔ ناول کی سرخی "علی پور کا ایلی" نہایت سادہ، نہایت سیدھی۔ سپاٹ اور اردو میں سرخی دینے کی رسم کو دیکھتے ہوئے نہایت درجہ بلکہ ممکن حد تک بے مزا ہے مگر یہ انگریزی اور یورپی ناولوں کی سرخیوں سے بالکل ہم آہنگ ہے اور ان کی طرح بغیر کسی دکھاوے کے ناول مواد کے ہر ہر جزو میں پروئی ہوئی نظر آتی ہے۔ اتحاد کا تانا اسی سے شروع ہوتا ہے اور سارا مواد اس سے ابل کر نکلتا ہوا اور تمام میں پھیلتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایلی جو بنیادی طور پر علی پور ہی کا ہے ایک طرف علی محمد سے متعلق ہے اور ان کی تمام دلچسپیوں میں ایک مبصر کی طرح شریک ہے۔ پھر اس کی اپنی بھی دلچسپیاں اور مصروفیات ہیں۔ اسے تعلیم حاصل کرنا ہے اور ملازمت پر آتا ہے اور اس سلسلے میں وہ واقعات کا منفرد مرکز نظر آتا ہے۔ اس کا خاندانی گھر ہے اور اس میں اس کے عزیز ہیں جن سے بھی اس کے تعلقات ہیں مگر اس کی سب سے خاص دلچسپی اپنے ایک عزیز کی بیوی اور اپنے سے کافی بڑی چھ بچوں والی شہزاد سے ہو جاتی ہے۔ شہزاد بھی اپنی جگہ پر بڑی دلکش اور زندہ دل عورت ہے اور ایلی کے اس عشق کا قصہ ناول کا سب سے زیادہ دلچسپ پلاٹ ہو جاتا ہے۔ کسی پراسرار اصول کے ماتحت ناول کو عشقیہ قصہ ہی مانا جاتا ہے اور عام ناول میں روایتی عشق کے واردات اور ایک معشوق کے لئے دو عاشقوں میں کش مکش سے ہی سارے قصے کی تعمیر ہوتی ہے۔ ممتاز مفتی کو جیسے کسی روایتی امر سے کوئی تعلق نہیں ہے ویسے روایتی عشق بازی بھی ان کے دائرے سے خارج ہے۔ ایلی اور شہزاد کے عشق میں ایک یہ بات حد سے زیادہ حقیقی ہے کہ ہم اسے بجا اور پرخلوص عشق ضرور کہیں گے۔ یہ عشق ناممکن بھی کہا جا سکتا ہے اور لوگوں کی نظروں میں بہت زیادہ مضحک بھی ہو سکتا ہے مگر اس کی واقعیت میں ایسا زور اور ایسی عظمت ہے کہ ہم اس کے مظاہرے پر ایک عجیب تخیلی دنیا میں کھو جاتے ہیں اور آخر میں اسی کو ناول کا حاصل اور ممتاز مفتی کا اہم ترین تجربہ مان لیتے ہیں۔ اس قصے کے مدارج بہت ہیں اور بہت دلچسپ ہیں اور ان میں سے بہت ہی خاص کا ذکر کر کے ہم اس کی اہمیت، نوعیت اور جدت کا کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں۔

ایلی کی زندگی میں شہزاد اس کے ایک قریب عزیز کی دولہن کی طرح داخل ہوتی ہے اور علی پور کے اصلی محلے کے سب سے خاص مکان یا محل میں آ کر رہنے لگتی ہے۔ وہ ایلی سے کافی بڑی ہے اور پھر جلد ہی چھ بچوں کی ماں ہو جانے کی وجہ سے اس سے اور بھی دور ہو جاتی ہے۔ مگر دونوں کا دل قریب ہے۔ شہزاد اس کی طرف ایسی توجہ دکھاتی ہے جیسے کوئی چاہنے والی بھاوج چھوٹے دیور کی طرف دکھائے اس معاملے میں اگر عشق بھی آ جاتا ہے تو وہ پاک قسم کا ہے۔ دونوں کا تعلق جنس سے بالاتر ہے۔ ایلی کے جنسی رجحان کو

وہ یہ کہہ کر رد کرتی ہے کہ وہ اسے دوسری عورتوں کی طرح نہ سمجھے۔ ایلی اس کی طرف آکر ٹھیک پر پڑا رہتا ہے۔ اسے مشین چلاتے ہوئے یا اور کام کرتے ہوئے دیکھتا رہتا ہے۔ اس کے بازوؤں پر ایلی کی نگاہیں نظر رہتی ہے۔ شہزاد بھی جب دیکھو "چمن سے" اس کی طرف آجاتی ہے۔ ان کی یہ بجھی بجھی سی محبت میں جنس داخل ہوئے بغیر نہیں رہتا اور ایک دفعہ جب شہزاد سامان کی الگ کوٹھری میں ہے تو ایلی اس پر حملہ کر دیتا ہے مگر نا کامیاب رہتا ہے۔ اس سے ان دونوں کے تعلقات میں فرق نہیں آتا اور آگے چل کر ایک دن یہ طے ہو جاتا ہے کہ ایلی شہزاد کو بھگا لے جائے گا۔ وہ اس کام کے قانونی پہلو پر ایک مشہور وکیل سے رائے لیتا ہے اور وکیل یہ سمجھ کر کہ محبوبہ بچوں کی ماں ہے ایلی کو کسی دماغ کے ڈاکٹر سے رائے لینے کا مشورہ دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس عشق میں دماغی خلل کو بہت کچھ دخل ہے۔ شہزاد ایلی کے ذہن میں بس جاتی ہے اور ہر وقت اس کے تصور میں "چمن سے" آجاتی ہے۔ وہ لاہور میں تعلیم کی غرض سے آکر رہتا ہے اور قریب کے گھر میں رہنے والی ایک اونچے خاندان کی لڑکی سے اس کے پینگ کانٹے شروع ہوتے ہیں اس لڑکی کو سائیکل پر بیٹھے ہوئے وہ لاہور کے مختلف مقامات پر جاتا ہے۔ دونوں بہت قریب آجاتے ہیں اور یہ بھی امکان نظر آتا ہے کہ دونوں کی شادی ہو جائے مگر اس عشقیہ معاملے کے دوران بھی شہزاد اس کے تصور میں آتی رہتی ہے۔ ایلی کی ماں اس کی ایک جگہ منگنی کی رسم بھی پوری کر دیتی ہے مگر اس سے بھی ایلی کی شہزاد کی طرف توجہ میں کوئی فرق نہیں آتا۔ علی احمد جن کا خاص مشغلہ عورتوں سے لگاؤ کرتے رہنا ہے ایلی کو زندگی سے بھی متعارف ہونے کا موقعہ دیتا ہے اور ایلی کو ایک رنڈی پھانس لینے کی بھی ناکام کوشش کرتی ہے۔ ایلی خود بھی ایک دن ایک گندے رنڈی خانہ کی گندگی میں کود پڑتا ہے۔ مگر آخر میں ایسا کچھ ہوتا ہے کہ ایلی اپنی تعلیم ختم کر کے اسکول کی ملازمت پا لیتا ہے اور شہزاد سے اس کی شادی ہو جاتی ہے۔ دونوں کی زندگی بڑی خوشگوار نظر آتی ہے مگر آگے چل کر شہزاد کو اپنی پہلے شوہر کی لڑکی کی غلط شادی کی بنا پر ایلی سے سخت شکایت ہو جاتی ہے۔ دونوں کے درمیان کشیدگی سی رہتی ہے اور آخر میں شہزاد دق سے مر جاتی ہے۔ اب سے ایلی کی توجہ اپنے شہزاد سے لڑکے عالی کی طرف رہتی ہے۔ وہ بمبئی میں صحافی کی حیثیت ملازم ہوتا ہے اور جب تقسیم ہند کے سلسلے میں لاہور میں فسادات ہوتے ہیں تو "عالی عالی" کرتا ہوا لاہور بھاگ آتا ہے۔

یہ خاص پلاٹ کا بہت ہی زیادہ مختصر خلاصہ ہے اس میں بہت سے چھوٹے چھوٹے پلاٹ معاون کی طرح شامل ہوتے گئے ہیں۔ علی احمد کے ٹین کا سپاہی بن کر متعدد معاشقے کرنے کا ایک طویل قصہ ہے۔ ایلی کے تعلیم اور اس کے بعد ملازمت حاصل کرنے کا بھی ایک الگ پلاٹ ہے۔ اس کے مختلف عزیزوں کے بھی قصے ضمناً ساتھ ہو جاتے ہیں۔ ہر پلاٹ مناسب تفصیل کے ساتھ سامنے آتا رہتا ہے ہر سلسلے میں ڈرامائی سین بڑی مناسب اور موزوں مکالموں کے ساتھ سامنے آتے رہتے ہیں۔ کتاب کی ضخامت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے مگر کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ کوئی جملہ یا لفظ بھی بلا ضرورت ہے اور اسے ناول سے خارج کر کے ناول کو بہتر فارم دیا جا سکتا ہے بنیادی طور پر ناول کرداری قسم کی ہے یعنی اس کا مقصد ایک فرد کو مختلف واقعات سے گزرتے ہوئے دکھانا ہے مگر اس میں ڈرامائی ناول یعنی ایسی ناول کے جو مختلف لوگوں کے درمیان کشمکش دکھائے اور وقت کے ساتھ اس کشمکش کے درجے ہوں عناصر بھی شامل ہو جاتے ہیں اور یہ کہتے ہی بنتا ہے کہ یہ ناول زور کے ساتھ ڈرامائی بھی ہے۔ مقامات بھی بدلتے ہیں مگر یہ محسوس ہوتا ہے کہ علی پور اور اس کا آصفی محلہ اور اس میں بھی ایلی کا خاندانی محل ایک اسٹیج ہے اور اسی پہ سارا قصہ دکھایا جا رہا ہے۔ امرتسر

دہیہ اور دوسرے مقامات پر کچھ ضمنی سین ضرور دکھائے گئے ہیں مگر یہ مرکزی اسٹیج سے اس قدر متعلق ہیں کہ اتحادِ تاثر میں کسی طرح فرق نہیں آتا۔ آخر میں فارس کے تصورات میں جو دنیا رہ جاتی ہے اس میں علی پور اس کے خاص قسم کے مکانات۔ آصفی مسجد اور اس کے خاص محل سے رہنے والے بڑے دلکش طریقہ پر زندہ نظر آتے رہتے ہیں۔ اتحاد کے ساتھ تنوع کو ہم آہنگ کرنے کی بڑی اچھی مثال قائم ہوئی ہے۔ مفتی صاحب فن کاروں سے زیادہ زندگی کی طرف متوجہ ضرور ہیں اور اسی کو اہمیت دیتے ہیں اور ناول کو ایک ڈھیر کہہ دینے میں کوئی سبکی محسوس نہیں کرتے مگر ان کی ناول شاید لاشعوری اور قدرتی طور پر مواد کو اس طرح سمیٹتی اور ایک مستقل شکل یا ہیئت میں تبدیل کرتی جاتی ہے کہ ان کی غیر معمولی فنکارانہ صلاحیت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ ضخامت ڈرا دینے والی چیز ضرور ہے اور بیشتر ضخیم ناولوں کا مواد ناول نگاروں کی گرفت سے نکل ہی جایا کرتا ہے اس لئے سطحی نظر رکھنے والے لوگ ضخامت اور بے ترتیبی کو ہم معنی سمجھتے ہیں۔

"علی پور کا ایلی" اپنے کمیوں کی صاف روح ہے۔ اسنے وسیع مواد کو ترتیب میں سے آنا۔ ایک مستقل دوام کا تاثر دینا اور دلچسپی کو قائم رکھنا ہی وہ کمال ہے جو مفتی صاحب کو ناول نگاروں کی صف اول میں کھڑا کر دیتا ہے۔ طفیل صاحب نے ضخامت میں لطف پیدا کرنے کا خیال کرتے ہوئے "علی پور کا ایلی" کا سرشار کے "فسانۂ آزاد" سے مقابلہ کیا ہے۔ "علی پور کا ایلی" فسانۂ آزاد کا سا جنگل کا جنگل ضرور سامنے لاتا ہے مگر اس جنگل کی ایک بڑی اہم اور فنکارانہ ترتیب بھی ہے جو فسانۂ آزاد ایسی بے تکان چیزوں کو بہت پیچھے چھوڑ آتی اور اردو ناول کو ایک کٹر تجربہ سے ایک دلکش تعمیر میں ارتقا کرکے پہونچ جاتی ہوئی دکھاتی ہے۔ فسانۂ آزاد کو اگر اس سے مقابلہ میں لایا جا سکتا ہے تو تضاد کے لئے یعنی یہ واضح کرنے کے لئے کہ محض ناول نما فسانہ اور صحیح معنوں میں ناول کے درمیان کیا فرق ہے۔ "علی پور کا ایلی" کے بعد شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ ناول اپنے پورے رنگ و روپ کے ساتھ اردو ادب میں کھپ گئی۔ مفتی صاحب اس کے لئے داستان۔ سرگزشت۔ ڈھیر وغیرہ کے الفاظ استعمال کریں اپنی نقاد کی حیثیت سے اس کی بابت ناول کا لفظ استعمال کرنے سے ہچکچائیں مگر ان کے اندر جو فن کار ہے وہ ان تنقیدی شکوک سے بالاتر ہے اور اس کی موج خرام نے گل کترے ہیں اور ایک بالکل نیا انفرادی اور دلکش چمن ایجاد کر دیا ہے۔

(۳)

مفتی صاحب کی تخلیقی قوت کا سکّہ ان کے افسانوں ہی سے جم چکا تھا مگر "علی پور کا ایلی" اس کے بڑے پیمانہ پر عمل اور کامیاب عمل کی مثال سامنے لاتا ہے۔ تخلیق قصہ گوئی کے ذریعہ بھی ظاہر ہو سکتی ہے مگر اس کا خاص میدان باوجود کچھ جدید ناول نگاروں کے سخت اختلاف کے کردار نگاری ہی رہا۔ "علی پور کا ایلی" میں ہر جگہ کردار منڈلاتے نظر آتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی منفرد زندگی کا واضح اور دلکش نقش ضرور چھوڑ جاتا ہے مگر ناول نگار کی عظیم تخلیقی قوت کا بیان ظاہر ترین لافانی کردار کے ذریعہ خاص طور پر ہوتا ہے اور یہ کردار پہلو بدلتے۔ ارتقا کرتے حقیقت سے ہمکنار رہتے ہوئے حقیقت سے زیادہ حقیقی ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ اردو ادب میں ان کا کوئی ثانی نہیں نظر آتا۔

علی احمد کا کردار سب میں پہلے سامنے آتا ہے اور پوری ناول پر ایک مستقل نہ بدلنے والے شخص کی طرح چھایا رہتا ہے۔ اس کی زندگی کی ہر دلچسپی مقرر ہو کر ایک خاص شبیہ کی ہو گئی ہے۔ وہ اپنے کام میں چوکس ہے۔

اس کے ابا عام طور پر ایک چٹائی پہ بیٹھے ڈیسک پر رکھے ہوئے رجسٹر میں لکھنے میں مصروف رہتے

تھے۔ وہ تمباکو نوشی کا شغل فرمایا کرتے تھے اور ان کی دمڑی مصروفیت کے علاوہ وہ پیش ہوتی تھی اور اس کے پودوں کو ادھر اُدھر سرکائے رہنے کی عادت تھی جو انہیں بے حد گراں گزرتی تھی۔

اس عالم میں وہ ہمیشہ میٹھے نظر آتے ہیں اور میٹھے میٹھے آواز نکالتے ہیں۔ اپنی حقہ بھر دو۔ حقہ بھی اس کے کردار کا ایک حصہ ہے اور پھر ان سب سے زیادہ دلچسپی عورتوں میں ہے ان ایک با ہمتہ بیوی با برہ اپنی ماں ہیں جو اب محض نوکرانی ہو کر رہ گئی ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ ایک بنی ٹھنی ہوئی صفیہ ہیں جو زیادہ تر ان کے مسہری کی زینت بنتی ہیں۔ لہٰذا صفیہ ان کے بے پناہ جنسی رجحان کی ایک مثال ہے ورنہ

"دادا کی وفات کے بعد علی احمد نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ بابرہ کو ہمیشہ کے لئے اور پھیلنے اور رانا ہوگا کو نذر بنے پر مامور کر دیا اور خود کمر ہمت باندھ کر اپنے جذبہ تسخیر کو مطمئن کرنے چل نکلے۔ وہ اپنی ایستادہ چال، اٹھی ہوئی چھاتی، فراخ پیشانی اور رنگین تبسم نگاہوں سے مردانہ وار تسخیر کرتے پھر نکلنے میں ڈان کوئیٹ کی سی پر جوش تڑپ لڑنے کے بعد اس میدان کارزار کی دہلیز پر بچے کی طرح اس امید پر گر پڑتے کہ انہیں کوئی شفقت بھرا ہاتھ تھپک تھپک کر سلا دے گا اس لحاظ سے ان کی شخصیت جنگجو سورما مین کے سپاہی اور دودھ پیتے بچے کی دلچسپ آمیزش سے بنی تھی اور چونکہ ان کا جنسی پہلو شخصیت کے جملہ پہلوؤں پر حاوی تھا اس لئے یہ آمیزش درحقیقت ان کی تمام زندگی کا تاروپود تھا۔ مین کا سپاہی جنگجو سورما"

علی احمد اس صفت کے تمامتر زندہ ہونے کی وجہ سے یک طرفہ کردار یا کیریکیچر بھی کہا جا سکتا ہے۔ حالانکہ ان کی زندگی کے اور بھی پہلو ہیں۔ وہ اپنی کے محبت دار باپ ہیں اور اس کی ترقی کے لئے اپنی بساط بھر سب کچھ کرتے ہیں۔ وہ گھر کے اپنی حد تک اچھے خاصے منتظم بھی ہیں اور عام انسانی فرائض کی ادائیگی میں کوئی خاص کوتاہی نہیں کرتے مگر زیادہ تر ان کا مین کے سپاہی والا پہلو ہی سامنے آتا رہتا ہے اور بڑی والہانہ دلچسپی کے ساتھ وہ عورتوں کو فتح پر فتح حاصل کرتے ہیں ایسے ہیرو کی طرح مصروف نظر آتے ہیں جس کا ایک اور ایک ہی مقصد حیات ہو۔ ان میں مجلسی زندگی کی جملہ سوجھ بوجھ بھی موجود تھیں۔ انہیں لکھنے سے تو عشق تھا عشق۔ یہ عشق گھر کا حساب اور پیدائش اور موت کی تاریخوں کے نوٹ کرنے پر محدود تھا۔ ایک جنرل رجسٹر کے علاوہ وہ گھر سے متعلقہ ہر فرد کا ایک رجسٹر کھولے ہوئے تھے۔ پھر ان کے کردار میں روپے پیسے کی احتیاط کا پہلو بے حد اہم تھا۔

حتیٰ کہ وہ عورت پر بھی روپیہ خرچ کرنے کے قائل نہ تھے اور ان کا خیال تھا کہ عورت کو تسخیر کرنے کے لئے سب سے ضروری چیز دعدے میں روپے کا تصرف نہیں۔ ان کا ایمان تھا کہ عورت کی خوشی حقیقت سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ محض تخیل سے وابستہ ہے اور اسے روپے پیسے جیسی ٹھوس چیز سے کیا تعلق۔

ان کے کردار پورے طور پر پہلودار (ROUND) کرنے کی مفتی صاحب کوشش کرتے ہیں اور ہمیں یہ محسوس کرا دیتے ہیں کہ ان کی زندگی کے سب ہی انسانی پہلو ہیں اور وہ ہرگز کیریکیچر نہیں کہے جا سکتے مگر ان کی جنسی زندگی کے مناظر پر مناظر ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں۔ ہر ایک منفرد، نیا اور نہایت درجہ دلچسپ اور ان کے کردار کی تمام زندگی اسی بات میں سمٹ آتی ہے عورت دیکھتے ہی یہ مین کا سپاہی کس طرح زندہ ہو جاتا ہے۔ کس ہوشیاری سے عورت کو تسخیر کر کے اپنے مخصوص کمرے میں لے جاتا ہے۔ یہ کمرہ ایک قلعہ ہے جس میں پکارے جانے پر

بھی ایلی کو داخل ہوتے ہوئے بڑا ڈر لگتا ہے کیونکہ وہاں ہر وقت رجسٹر پہ علی احمد کے قلم چلتے رہنے کے علاوہ کسی جنسی حرکت کے ہونے رہنے کا بھی امکان ہے جس کو راز میں رکھنا کم دنیا ہے۔

غرض علی احمد کا سارا قصہ اور اگر سارا نہیں تو اس کا اہم ترین اور دلچسپ ترین حصہ ان کی مختلف عورتوں کو ڈوری کو بٹنے کی طرح تسخیر کرنے کے واقعات کا احاطہ کرتا رہتا ہے۔ یہ واقعات بہت ہیں اور ہر ایک کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس لئے ان میں سے کسی کا اقتباس کرنا طول عمل ہے اور ان کا خلاصہ کرنے سے ان کی زندگی ہی ختم ہو جاتی ہے۔ ان میں ایلی بھی اسی طرح شریک نظر آتا ہے جیسے ڈون کیخوٹے کے ساتھ سانکو پانزا۔ مرد ائیٹیریک یہ دونوں کردار یورپ کی تمام ناول نگاری میں ڈکنس کے مسٹر پکوک اور سام ویلر تک ماحول کے حساب سے روپ بدل بدل کر آتے رہے ہیں۔ مفتی صاحب کے درمیان میں بھی وہ آفاقی اور دائمی نائب ہیں۔ اور علی پور کا ایلی میں وہ علی احمد اور ایلی کے ذریعہ پنجاب کے اس علاقے سے متعلق ہو کر جو ناول کا مخصوص ماحول ہے پیش ہوتے ہیں۔ علی احمد ہر قسم اور ہر طبقہ کی عورت کے آتے ہی ڈون کیخوٹے کی طرح اپنا بھالا تان کر کھڑا ہو جاتا ہے اور ایلی سانکو پانزا کی طرح اس کی بیدلی سے مدد میں مصروف نظر آتا ہے۔ گھریلو لڑکیاں جیسے سارہ امبتورہ۔ وضعدار عورتیں جو بیویاں بن کر رہنا چاہتی ہیں اور رہ جاتی ہیں۔ کسبیاں جو وقتی تعلق ہی کو کافی سمجھتی ہیں۔ ایک ہندو عورت جو علی احمد سے تعلق تو کر لیتی ہے مگر اس کے یہاں کا پانی نہیں پیتی اور ایلی کو اس کے لئے کنوئیں سے پانی نکال کر ایک بوتل میں بھر کر لانا پڑتا ہے سب ہی ان کے دائرے میں آتی ہیں اور ان سے دم کے دم میں تسخیر ہو جاتی ہیں۔ اپنے رشتہ کی عزیز کی جوان بیوی شہزاد بھی ان کی توجہ کا مرکز ہو جاتی ہے اور وہ اس سے جس طرح تکلف لیتے ہیں اس کا منظر بھی عجیب ہے وہ کس کھلم کھلا لگاوٹ کی ہنسی ہنستے ہیں اور شہزاد کا نام لیتے جاتے ہیں۔ مگر ان کا وار خالی جاتا ہے مگر ان کی جنسی فطرت ایسی خوبی سے سامنے آجاتی ہے کہ جس کی مثال ملنا ناممکن ہے۔ مفتی صاحب نے جس تفصیل سے اور جتنے جزویات کے ساتھ ان کے حالات بیان کئے ہیں وہ کردار نگاری کے لئے بڑے ضروری ہیں خاص طور سے مزاحیہ کردار نگاری کے لئے۔ شیکسپیئر نے فالسٹاف کو پورے طور پر جمانے کے لئے ایک نہیں تین تین ڈرامے لکھے۔ ڈکنس نے پکوک کو پر اثر بنانے کے لئے ہزار صفحے کے قریب کالے کئے۔ ہمارے یہاں سرشار کا خوجی بھی اب تک اردو کا سب سے زیادہ مزاحیہ کردار اسی وجہ سے ہے کہ وہ ہزاروں صفحوں پہ بار بار آتا ہے۔ علی احمد خوجی سے تو کم ہی جگہ گھیرتے ہیں اور اس سے کہیں زیادہ پہلودار اور واقعاتی ہیں۔ وہ اپنے ماحول کے عظیم مضحک نمائندہ ہیں اور آفاقی مزاج کے بھی نمائندہ ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ اردو ناول نگاری میں اس سے بہتر مزاحیہ کردار اب تک نہیں پیش ہوا تو غلط نہ ہوگا۔

"علی پور کا ایلی" کا کردار نگاری میں دوسرا اہم شاہکار شہزاد ہے۔ یہ حسن، جوانی اور زندہ دلی کی صورت ہے اور حسین عورت کی بیباکی اس میں عجیب و غریب کرشمے دکھاتی ہے۔ اس کا سب میں پہلے ذکر شریف سے اس کی شادی کے سلسلے میں آتا ہے۔ اس نے شریف پر تھیلی میں بند مینڈک پھینکا۔ شریف بیان کرتا ہے:۔

> واقعی وہ شہزادی ہے۔ اسم بامسمیٰ ہے۔ مجھے چھپ چھپ کر دیکھنے کے بعد ایک روز وہ مکان کی دہلیز سے باہر آگئی۔ اور میرے روبرو اس نے ایک مینڈک کے ذریعہ اظہار محبت کر دیا۔
>
> ...... اس نے مینڈک کو ایک تھیلی میں ہی رکھا تھا اور جب میں سو رہا تھا تو وہ تھیلی میرے سینے پہ

پھینک دی، وہ میں ڈر کر اٹھ بیٹھا اور وہ ہنسنے لگی ۔

اور پھر آپی کی نگاہوں تلے ایک شوخ حسینہ آ کھڑی ہوئی ۔ اور پھر شادی میں رخصتی کے بعد ریل کے ڈبے میں ایک مٹیالی گٹھڑی اسے دکھائی دیتی ہے ۔

> مٹیالی گٹھڑی میں جنبش ہوئی دو سفید حنا میں بھیگے ہوئے ہاتھ ایلی کی طرف لپکے تازہ خون کی بو کا ایک ریلا آیا ۔ ایلی بھاگنے کی سوچ رہا تھا کہ گٹھڑی کے پٹ کھل گئے دو گلابی جھیلیں جھلکیں جن میں سیاہ گلاب ابھر رہے تھے ۔ مخملیں بیر بہوٹیاں رینگ رہی تھیں اور بالآخر ایک چمکدار تبسم اور ایلی یوں کھڑا تھا جیسے پتھر کا بن چکا ہو ڈر کے دوسرے رنگ جھلملا کر معدوم ہو چکے تھے ۔

شہزاد کی کردار نگاری اس کے دوسرے رنگوں پہ تاثر کے ذریعہ ہوتی ہے ۔ آصفی محلہ میں آتے ہی وہ ہر شخص کے لئے حسن و ناز کا عجیب کرشمہ ہو جاتی ہے مگر ایلی اس سے سب سے زیادہ متاثر نظر آتا ہے جسے اس کے حسن کی ہر ہر ادا دمانیت کا مظاہرہ نظر آتی ہے ۔ اس کی چال جھم سے آ جانا ۔ اس کا دوپٹہ اوڑھنے کا انداز ۔ اس کے ماتھے پہ تل ۔ اس کے گورے گورے کھلے بازو ۔ اس کے چھوٹے چھوٹے سنگ مرمر کے پیر اس کا لگاؤ اس کی بے نیازی ۔ وہ چیز جسے محلے والے بے شرمی کہتے ہیں ۔ اس کی بے پناہ ذہانت جس کی بنا پر وہ سب کے باوجود دل سے شوخی کرنے کا بہانہ نکال لیتی ہے بار بار بیان ہوا ہے اور یہ سب ایک سچے عاشق کے نقطہ نظر سے جس کی بنا پر اس میں حد درجہ کا حسن ٹپکنے لگا ہے ۔ مفتی صاحب شہزاد کو دنیا کی حسین ترین چیز کی طرح پیش کر دیتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایلی کے تاثرات ہی کی ترجمانی نہیں کر رہے ہیں بلکہ شہزاد سے انھیں خود ویسا ہی دلی تعلق ہے جیسے ایلی کو تھا ۔ وہ ساری ناول ان کے تجربہ کی چیز ہے ہی مگر اس تمام تجربہ میں جس چیز نے ان کے دل کو سب سے زیادہ چھوا ہے اور جس چیز نے ان کے تخیل کو سب سے زیادہ آباد اور دلکش کیا ہے وہ شہزاد یا شہزاد کی طرح کی کوئی محبوبہ ہے ۔ ایلی کے شہزاد سے بڑھتے ہوئے تعلقات کی نفسیاتی تحلیل اس طرح ہوتی ہے کہ قاری کو وہ اپنا خود کا حال معلوم ہونے لگتا ہے ۔ یہی کردار نگاری کا کمال ہے اور ان تمام معاملات میں حد سے زیادہ واقعیت کے ساتھ جو رومانی پیچیدگی تعجب پیدا کرتی رہتی ہے اس کے انکشاف میں مفتی صاحب کردار نگاری کے اعلیٰ ترین درجہ پہ پہنچ جاتے ہیں ۔ کتاب کے وہ مقامات جن میں شہزاد جھم سے آ جاتی ہے عجیب طرح روشن اور دلکش ہو جاتے ہیں ۔ ان کو بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے اور تکرار کے باوجود ان کا لطف کم نہیں ہوتا ۔ شریف کی اجازت سے پہلے پہلے ایلی کو چائے پہ بلانے آنا ۔ پھر اکیلے میں ایلی سے پیار کا نہ ملنا ۔ مختلف ملاقاتوں میں ایک وقت اتنا قریب اور اس وقت اتنا دور ہو جانا عجیب کرشمہ قدرت کی طرح آنکھوں کے سامنے پھرتا رہتا ہے ۔ ایلی کے عشق میں جسمانی محبت کو دخل نہیں ہے ۔ ایسی محبت سے اسے اپنے باپ کے معاشقوں کی وجہ سے نفرت ہو چکی ہے اور قاری بھی شہزاد کے جسمانی حسین تاثرات کے باوجود اسے آسمانی چیز ہی کی طرح جاننے لگتا ہے ۔ وہ اسے قبول بھی کرتی ہے مگر ٹالتی بھی ہے ۔ وہ اسے ستاتی بھی رہتی ہے ۔ اس کے گالوں کو سہلاتی ہے اس کے چٹکی بھی لے لیتی ہے مگر وہ شادی شدہ عورت ہے اور اپنے کو پسپا نہیں ہونے دیتی ۔ ناول کا وہ سین جس میں ایلی بند بیٹھک میں چھپا بیٹھا ہے اور انتظار کر رہا ہے ۔ شہزاد وہاں آئے تو اس پہ حملہ آور ہو شہزاد کو پورے طور پہ سامنے لے آنے کا کمال ہے :۔

> دروازہ کھلا شہزاد اندر داخل ہوئی ۔

ایلی بجلی کی تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور ایک ہی بار اندر سے کنڈی لگا دی۔ شہزاد نے زور سے ایک سی چیخ ماری۔

کنڈی لگانے کے بعد وہ شہزاد کے روبرو کھڑا ہو گیا۔

ایک ساعت کے لئے وہ گھبرا گئی مگر اسے پہچان کر مطمئن ہو کر بولی "تم یہاں؟" ایلی کی خاموشی اور اس کے دہشت بھرے انداز کو دیکھ کر وہ از سر نو گھبرا گئی۔ "یہ سب کیا ہے؟" وہ بولی "تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

ایلی جواب دیئے بغیر اس کی طرف بڑھا۔

"پاگل ہو گئے ہو کیا؟" وہ زیر لب چلائی۔

وہ سمجھتی تھی کہ ایلی اس پر حملہ کرنے والا ہے۔ اسے معلوم نہ تھا کہ دراصل وہ اپنی شدید کمتری کی نعمت مٹانے کی ناکام کوشش کر رہا ہے اور اپنا اصلی روپ چھپانے کے لئے اس نے شیر کی کھال پہننے کی مضحکہ خیز کوشش کی ہے۔

"خدا کے لئے۔" وہ چلائی "ہٹ جاؤ۔ یہ کیا دیوانگی ہے؟"

وہ چپ چاپ آگے بڑھتا گیا۔

"ضرور تم پاگل ہو گئے ہو۔" وہ بولی "تم اپنے حواس میں نہیں ہو۔"

"ہاں ——" ایلی نے بھیانک آواز میں جواب دیا "نہیں ہوں۔"

"کوئی سن لے گا۔ دیکھ لے گا۔ پاگل نہ بنو۔" وہ چلائی "پاگل نہ بنو۔ پاگل نہ بنو۔"

ایک رنگین دھندلکا ایلی کے قریب تر آ گیا اور قریب اور قریب اور وہ دیوانہ وار اس کی طرف بڑھتا گیا۔ اس کے ہونٹ شہزاد کا خون چوسنے کے لئے جونک کی طرح آگے بڑھے۔ ہاتھ بازو، منہ سر جسم، وہ دیوانہ وار اس کے جسم کا ایک ایک حصہ چوسنے لگا۔ پہلے تو شہزاد نے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی پھر وہ تھک کر۔ ہار کر ایک لاش کی طرح میز پر گر پڑی۔ بھیانک خاموشی طاری ہو گئی۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے اس کی دہشت ختم ہوتی جا رہی ہو۔ اس نے دیوانہ وار مٹھی میں نیا ایندھن دھکیلنے کی کوشش کی۔ بار بار چراند۔ ریشمیں کپڑے کے پھٹنے کی آواز آئی۔

"ایلی پاگل نہ بنو۔" ایک بار پھر مردہ جسم کے اس تودے میں حرکت ہوئی "پاگل نہ بنو۔" مدھم آواز میں مبہم سا احتجاج دیکھ کر وہ اور بھی بپھر گیا۔

دھپ —— ایک ہوائی سی چھوٹ گئی اور معاً گرد و پیش تاریک ہو گئے۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ ڈوب گیا ہو چاروں طرف اندھیرا تھا۔ گہرا اندھیرا۔ خفت ناکامی کا گھٹا ٹوپ اندھیرا۔ خود ساختہ دہشت کا سہارا ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔ وہ دیوانگی ختم ہو چکی تھی اور اس کے عقب میں ندامت اور شکست کے

منفی احساسات کا ریلا اوڑا آ رہا تھا۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے اس کے منہ میں گھاس کا تنکا ہو۔ وہی تنکا جو پورس اپنے منہ میں لے کر سکندر کے حضور میں حاضر ہوا تھا۔

اس تو ہنت کو مٹانے کے لئے ایلی ایک بار پھر آگے بڑھا اور دیوانہ وار شہزاد کے بند بند چومنے لگا اور بالآخر تھک کر بچے کی طرح اس کے قدموں میں سر رکھ کر پڑا۔ "مجھے تم سے محبت ہے شہزاد مجھے تم سے"۔ اپنے پاؤں پر آنسوؤں کے قطرے محسوس کر کے شہزاد اٹھ بیٹھی اور اس کا بازو ایلی کی طرف بڑھا اور اسے تھپکنے لگا۔

اس کیفیت میں کتنا اطمینان تھا۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے ماں کا ہاتھ سرزنش کرنے کی بجائے معاف کر دینے کے بعد تھپک رہا ہو۔

ماں کا ہاتھ عجیب نفسیاتی اشارہ ہے۔ شہزاد عورت کے تمام منصب بڑی پیچیدگی کے ساتھ ادا کر رہی ہے۔ وہ ماں بھی ہے۔ بیوی بھی اور محبوبہ بھی عشوقانہ انداز پوری بیباکی کے ساتھ اس میں شروع ہی سے دکھائی دیتے رہے ہیں۔ وہ ایک شخص کی قانونی بیوی بھی ہے اور بچے پیدا کرنے میں زرخیز بھی کہی جا سکتی مگر ایلی کی طرف اس کا رجحان مادرانہ بھی ہے۔ ہمارے معاشرے کے لوگ عورت کے بابت ڈھر سے آراء پا پوں راے دے دینے کے عادی ہیں۔ مفتی صاحب ان لوگوں سے کس قدر بالاتر ہیں اور عورت کی پیچیدہ اور غیر مطمئن فطرت کا کتنا زبردست مشاہدہ رکھتے ہیں۔

شہزاد کا رویہ متضاد سوالات ایلی کے دل میں لاتا ہے اور ہم بھی ان سوالات میں پڑ کر تعجب کے عالم میں آ جاتے ہیں۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا شہزاد ایلی سے محبت کرتی ہے۔ اس سلسلے میں وہی معاملہ سامنے آتا ہے کہ نہ اعتبار مجھے ہے نہ اعتبار انھیں۔ مگر یہ صاف ہے کہ شہزاد کی اس زمانے میں جب ایلی بھیٹی سے کر علی پور آتا ہے اور شراب بھی موجود ہوتا ہے حرکات سے محبت ٹپکتی ہے اور وہ بڑی ذہانت سے بیباکی کے روپ میں چھپاتی رہتی ہے۔ وہ ایلی کو ڈھونڈنے جاتی ہے اور اسے گھسیٹ کر لے آتی ہے۔ اپنے شوہر کے سامنے ایک فرضی محبوب کی باتیں کرتی ہے جن کا اشارہ اپنی طرف ہوتا ہے۔ وہ اس پردے میں صاف صاف عشق کا اظہار کرتی ہے اور اکیلے میں اس کی تصدیق بھی کر دیتی ہے۔ گھر میں اور محلہ میں ہر ایک کو شبہ ہے کہ وہ ایلی سے عشق لڑا رہی ہے اور وہ اس عشق کو کبھی بیباکی میں اور کبھی ذکاوت کی باتوں میں چھپا لیتی ہے۔ اس کا جسم سے آ جانا۔ اس کا بچپن سے آ جانا قیامت ہے۔ وہ وارفتہ بھی ہو جاتی ہے کہ اپنے کو سنبھالے رہتی ہے۔ وہ اپنے میاں کی افسردگی سے نفرت کا اظہار بھی کرتی ہے اور ایلی سے محبت کا بھی۔ اس کی محبت میں جنس کا مقام بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ اپنے کو اس سے بالاتر سمجھتی ہے اور پاک عشق کرنا چاہتی ہے۔ اس کے میاں سے ایلی رقابت محسوس کرتا ہے تو اسے سمجھاتی ہے کہ جسمانی تعلق کچھ نہیں ہے۔ کئی بار وہ کہہ دیتی "تم مجھے سمجھے کیا ہو" "تم مجھے نہیں سمجھے"۔ حقیقت میں وہ ایسا راز حیات ہے جس کو سمجھنا مشکل ہے۔ مفتی صاحب بھی نہیں بتا سکتے کہ وہ شوخ تند خو کیا ہے۔ مگر وہ ایسا کرشمہ ہے جسے انہوں نے محسوس کیا ہے اور وہ ہمیں محسوس کرانے میں پورے کامیاب ہیں۔ ایلی اس کے پاس سے چلا جاتا ہے۔ دوسری عورتوں کی طرف متوجہ ہوتا رہتا ہے مگر وہ اس کے دل و دماغ میں ایسی بس گئی ہے کہ بچپن سے تصور

میں آجاتی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ بھی کامیاب زندگی گزار رہی ہے۔ گھر کے ہر کام میں فرد ہے اور دھڑا دھڑ بچے بھی ہو رہے ہیں۔ ایلی سے ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی ناز کبھی نیاز اور آخر میں اس چھ بچوں کی ماں سے کنوارا ایلی شادی کر لیتا ہے۔ ایلی نوکر ہے اور وہ اس کے گھر کی ہی نہیں دل کی بھی شہزادی بنی رہتی ہیں۔ شادی کے بعد وہ دھیمی پڑتی جاتی ہے۔ سخت بیمار بھی ہوتی ہے مگر ہومیوپیتھی کی دوا سے ہنستے سے پڑ جاتی ہے مگر اپنی شریف سے لڑکی کے بارے میں اس کا ایلی سے جھگڑا ہو جاتا ہے وہ بالکل دوسری چیز ہے۔ ایلی اس سے الگ بھی ہو جاتا ہے اور سارا ناول بدل اس کی طرف سے بھر جاتا ہے۔ آخر میں وہ دق ہو کر مر جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی قیامت کے حسن پر پانی پھر گیا۔ شہزاد کے ارتقا کے سلسلے میں مجھے ناول نگار کی حیثیت سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر اس کے آخری دور کا کردار نہ دکھایا جاتا تو حسن اور خوبی کی مکمل تصویر ہمارے تخیل پر ثبت رہتی۔ ٹولسٹوئے نے اناکا رینہ کو اس درجہ پر پہنچنے سے پہلے ہی مار ڈالا۔ فلابیر نے میڈم بواری کے ساتھ بھی یہی کیا۔ مگر مفتی صاحب بالکل رومانی فنکار نہیں ہیں۔ وہ کامل ریلسٹ ہیں۔ وہ اس حسین مجسمہ کو رفتہ رفتہ مٹتا بھی دکھاتے ہیں اور اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ فنکار کو کچھ چیزیں چھوڑ بھی جانا چاہیے۔ بہرحال جس حسن و خوبی سے انہوں نے شہزاد کو پیش کیا ہے وہ ان کے تجربہ کا اور اس کو نہایت کامیابی سے پیش کرنے کا حق ہے۔ اردو ناول نگاری کی وہ سب سے زیادہ حسین اور واقعیاتی ہیروئن ہو جاتی ہے۔ وہ پنجاب کے حسن و کرشمہ کا اشارہ ہے۔ وہ ہر کرشمہ ساز عورت کا اشارہ ہے۔ وہ شیکسپیئر کی کلیوپاترا کو نگر کی سیلانات۔ ٹولسٹوئے کی انا۔ فلابیر کی ایما اور ہر عظیم ہیروئن کے ساتھ برابر کا مقابلہ کرتی ہے۔ اردو کی بساط ہی کیا ہے۔ ——— وہ ہماری ناول نگاری میں سب سے بڑا فنی شاہکار ہے۔

(۴)

مگر ناول کی ریڑھ کی ہڈی، روح رواں اور جان ایلی ہے اور مفتی صاحب اسی کی طرف خاص طور سے متوجہ ہیں۔ دوسرے کردار اس کی ضمن میں آتے ہیں اور اس کی طویل اور وسیع سرگزشت کی سطح پر چھوٹے چھوٹے نقوش بنا کر چلے جاتے ہیں۔ ان نقوش میں علی احمد اور شہزاد کے نقوش زیادہ حصہ گھیرتے ہیں۔ ایلی کے کردار واضح کرنے کے لئے ہی ساری ناول لکھی گئی اور اس کو مفصل طور پر سامنے لانے کے لئے پوری ناول کے خلاصے کی ضرورت ہے۔ اسی کے بابت پیش لفظوں میں مفتی صاحب نے اظہار خیال کیا ہے۔ ان کی رائے میں ایلی ایسا کردار ہے تمام تجربے اور تعلیم کے باوجود نہیں بدلتا۔ جس کے خیالات اور جذبات میں ہمیشہ کشمکش رہی جس کی بنا پر وہ اپنا کوئی کردار نہ بنا سکا۔ دوسرے الفاظ میں وہ اخلاقی اور نفسیاتی معیار سے بالکل بے کردار شخص ہے مگر پھر بھی وہ مستقل حقیقت ہے۔ اسے پنجاب کے اس خطہ کا نمائندہ کہا جا سکتا ہے جس کا مرکز علی پور ہے اور جس کا دائرہ امرتسر اور لاہور تک بھی جاتا ہے۔ وہ دلی اور بمبئی میں بھی مقیم رہتا ہے مگر اپنی مخصوص پراسرار صفت نہیں کھوتا۔ ایسا بھی جو پانی میں ڈبکیاں لگاتا ہے مگر پر جھاڑ کر پھر جوں کا توں خشک ہو جاتا ہے۔ شاید بلکہ یقیناً ایسے لوگ کسی خاص جغرافیائی علاقہ سے مخصوص نہیں کئے جا سکتے۔ شاید بلکہ یقیناً ہر شخص کے اندر باوجود شدید اختلاف کے ایک ایلی چھپا ہوا رہتا ہے۔ وہ معمولی نہایت ہی معمولی ہستی ہے اور اسی لیے نہایت درجہ معمولی ہے۔ ہمارے تصور میں ایک معمولی انسان ہے مگر یہ معمولی انسان کہیں ڈھونڈھے نہیں ملتا اس لئے اسے نایاب

ہو بہو ویسے ہی ہیں جو ان کے باپ تھے۔ مفتی صاحب نے وہ دل لیا ہے اور اسے انہوں نے صفحۂ ناول پر اتار دیا ہے۔ ناول کا شروع ہی سے یہ تاثر رہا کہ ناول انسان کی نشو و نما ہے۔ فیلڈنگ نے ٹوم جونس میں انسانی کردار پیش کیا جو تمام ناول نگاروں کے لئے آج بھی مثال ہے۔ مفتی صاحب نے بھی ان میں ایسا کردار پایا ہے شاید وہ خود ایلی ہیں اور ساری سرگزشت ان کی آپ بیتی ہے۔ ان میں ادیب کی اعلیٰ صلاحیتیں بھی ہیں جو ایلی میں نہیں ہیں مگر ان کی نظر ایلی کی ان صلاحیتوں پر ہے جو نہایت معمولی نہایت عام ہیں اور جن میں پنجاب کا ہر آدمی ہندوستان کا ہر آدمی اور دنیا کا ہر آدمی ان کا حصہ دار ہے۔ دوسرے ناول نگار جب اپنے کو اپنی ناول میں پیش کرتے ہیں تو اپنی مخصوص صلاحیتوں کو سامنے لاتے ہیں یا انکساری میں اپنے کو اصلیت سے گرا کر پیش کر دیتے ہیں مفتی صاحب کو نہ بڑھانے سے غرض ہے نہ گھٹانے سے۔ ان کے ذاتی تجربے سے جو آدمی محض آدمی نکلتا ہے وہ ہمارے سامنے پیش کر دیا گیا ہے

عموماً بڑا آدمی اور اس کا کوئی بڑا کام سنسنی پیدا کرکے عام آدمی کے لئے دلچسپ ہو جاتا ہے۔ ایلی میں کوئی بھی بڑائی چھو کر بھی نہیں گزری اور نہ اس نے کوئی بڑا کام ہی کیا۔ وہ نہایت معمولی گھر میں پیدا ہوا۔ نہایت معمولی ماحول سے زندگی بھر گزرتا رہا۔ احساس کمتری کے سوا اسے کوئی احساس نہیں ہوا۔ قوت ارادہ کا تو اس کے اندر سوال ہی نہیں اٹھتا۔ زمانے کے اثرات اسے جیسے بہاتے گئے وہ بہتا رہا۔ ٹوم جونس یا سکل ہے کہ تجربہ اسے ہیرو بنا ہی دیتا ہے۔ جرمن ناولوں میں جنہیں BILDUNGS ROMAN کہا جاتا ہے ایک معمولی لڑکا ارتقا کی منزلیں طے کرتا ہوا نظر آتا ہے اور آخر میں غیر معمولی مقام حاصل کر لیتا ہے۔ ایلی یوں بھی ارتقا نہیں کرتا۔ وہ ڈبکی لگانے کے بعد بہ جھاڑ کر ویسے کا ویسا ہی رہ جاتا ہے۔ اسے کسی قسم کی قدروں سے سروکار نہیں جو وہ اپنے کو بہتر بنائے۔ وہ مٹی میں گرا ہوا پودا ہے جس کا تنہ اور سب مٹی اور پانی کے اثر سے بڑھ جاتا ہے مگر جس میں ذہنی یا اخلاقی شعور یا رجحان آنے کا سوال نہیں۔ باپ کا زور اگر نہ ہوتا تو وہ تعلیم بھی نہ حاصل کرتا۔ بسر اوقات کی ضرورت نہ ہوتی تو وہ ملازمت بھی نہ کرتا۔ اگر وہ جاندار نہ بنایا گیا ہوتا تو وہ حقیقتاً بھی نہیں۔ وہ ایسا آدمی ہے جس کو ہم چھوٹتے ہی بڑا گھٹیا کہہ دیں گے مگر وہ اس حد سے زیادہ گھٹیا پن کی وجہ سے نہایت درجہ دلچسپ ہو جاتا ہے۔

مفتی صاحب کے ہم وطنوں سے یعنی لاہور اور امرتسر کے جوار کے لوگوں سے ملئے تو ان میں ہر شخص ہر شریف خاندان اوسط طبقہ کا فرد ایلی معلوم ہوگا۔ ایک قصباتی ماحول کے ایک خاص گھر میں پلا ہوگا۔ والد معمولی ملازمت پر رہے ہوں گے مگر مستعد اور کام میں چوکس ہوں گے جس کی وجہ سے اس کی زندگی ایک معمولی دھرّے پر لگ گئی ہوگی۔ بچپن کھیل میں، یا گھر کے معمولی کام بدل بدل کر کرنے میں گزرا ہوگا۔ زبردستی اسکول اور کالج بھی گیا ہوگا اور کسی نہ کسی طرح تعلیم نپٹا کر معمولی ملازمت پر بھی آ گیا ہوگا۔ رسمی طور پر اس کی منگنی اور شادی بھی ہو گئی ہوگی۔ اگر اس میں کوئی غیر معمولی بات ہوگی تو وہ اس کی عورتوں کی طرف توجہ سے نمایاں ہوگی مگر یہ بات بھی غیر معمولی نہ کہی جا سکے گی کیونکہ اس کے خاندان میں ہر شخص اور اس کے ساتھیوں میں ہر شخص کو اسی کی طرح کی جنسی دلچسپی رہی ہوگی۔ عشق و حسن کا معیار اگر پست نہیں تو اعلیٰ بھی نہیں ہوگا۔ زندگی سے لگاؤ بھی جبلی سطح کا ہوگا اور اس میں ان خاص جذبات کے زور کی کوئی گنجائش نہ ہوگی جو اعلیٰ انسانیت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسے ہم اچھا آدمی نہیں کہہ سکتے تو برا بھی نہیں کہیں گے۔ اس میں خود غرضی بھی واجبی واجبی ہوگی۔ وہ ایک گھٹیا سا علم ہوگا جو زمین پر اپنا جسم بڑھاتا گھٹاتا بڑا نظر آئے گا۔ وہ اچھا عمل اور

برائیوں میں پڑنے کا برابر اہل اور نا اہل ہوگا۔ اسے ہم خالص جذباتی IMPULSIVE بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ وہ جذباتی طور پر بالکل ٹھنڈا نظر آئے گا اور اگر کوئی زور میں اس کے جذبات ابھار بھی دے گا تو وہ تھوڑی دیر میں پھر ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ جانوروں سے بہتر اور انسانوں کے دائرے میں اسی لئے لایا جا سکے گا کہ وہ ایک ٹک بندھی انسانیت کے طریقوں میں بچپن ہی سے رچا ہوا ہوگا۔ مفتی صاحب ایلی کو اسی قسم کا آدمی دکھانا چاہتے ہیں جب بھی ایک جگہ وہ اسے بھجبانے مونے کپڑے سے بھی تشبیہ دے جاتے ہیں۔ غرض ایلی کوئی خاص آدمی نہیں ہے۔ وہ ہر آدمی EVERY MAN کی تصویر ہے۔

اس کے حالات بھی ایسے ہی معمولی ہیں صرف اس فرق کے ساتھ کہ وہ ان شہروں اور ان قصبوں اور ان گاؤں سے مخصوص ہیں جہاں ایلی جاتا ہے۔ اس کی لاتعداد مردوں اور عورتوں سے ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ ان میں وہ سب سے مختلف اور اس طرح مختلف نظر آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر شخص کے ساتھ تولا جا رہا ہے اور اس کا وزن سب سے کم نکل رہا ہے اور ناولوں کے ہیرو اس لئے دلچسپ ہوتے ہیں کہ وہ وزن میں سب سے کچھ نہ کچھ زیادہ ضرور نکلتے ہیں۔ ایلی کی دلچسپی ہی یہ ہے کہ وہ ہر کام میں نا اہل ثابت ہوتا ہے اور ہر شخص سے ہر بات میں کم نظر آتا ہے۔ یہ ایک عجیب راز ہے جس کو مفتی صاحب نے دریافت کر لیا ہے اور اسی کی بنا پر ہم ایلی کو حد سے زیادہ دلچسپ پاتے ہیں۔ اس کی باتیں حماقت ہیں مگر ہم کو ان پر ہنسی نہیں آتی۔ نہیں وہ ہرگز احمق نہیں ہے۔ اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کا کوئی خاص تاثر بھی نہیں ہے۔ مگر پھر بھی ہم اسے سپاٹ نہیں کہہ سکتے۔ اس میں بے پناہ سادگی ہے اور خلوص ہے۔ وہ مکر و بازی کر ہی نہیں سکتا۔ وہ کسی کو برا نہیں سمجھتا۔ وہ مردم شناس بھی نہیں ہے مگر کسی کے دھوکے میں بھی نہیں آتا۔ شہزاد کے سلسلے میں اس کے اندر ڈھلملاہٹ کے باوجود ایک عزم اور استقلال آجاتا ہے اور وہ ناس سے ہر مخالفت کے باوجود شادی کر لیتا ہے یوں تو اسے دل پھینک کہہ سکتے ہیں مگر شہزاد سے اس کی محبت میں استقلال ہے۔ وہ کسی سے جھگڑتا نہیں مگر شہزاد ہی سے اس کا جھگڑا ہو کر رہتا ہے شہزاد کے عشق اور آخر میں شہزاد سے جھگڑا ہی اسے جذباتی سطح پر نہایت درجہ معمولی رویہ کے انسان سے اوپر لے آتے ہیں۔ آخر میں اس کے ملاقاتیوں کا دائرہ وسیع ہوتا ہے اور اس کی "ذہنی" قسم کے لوگوں سے ملاقاتیں بھی ہوتی ہیں جن میں وہ کچھ زیادہ منفعل کردار دکھائی دیتا ہے۔ اس کے مذہب کے بابت مفتی صاحب بتاتے ہیں۔

> غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ اگرچہ وہ بے حد ڈرپوک تھا لیکن اللہ پر اس کا ایمان ڈر کی بنیاد پر قائم نہ تھا۔
>
> اللہ کا تخیل جو اس کے دل میں قائم ہوا تھا۔ وہ جیمس جینز کی فلکیات ہالڈس ہکسلے کے سائنس کا عجز سے متعلق مضامین برٹرینڈرسل کے فزکس ستیانا کے جذبات کا ونٹ کومین کے مشاہدات اور ایچ جی ویلز کی سائنٹفک فکشن کتابوں سے اخذ تھا۔
>
> ڈر کے بجائے اس کا دل اللہ تعالیٰ کی عظمت کے جذبات سے معمور تھا......
>
> ہندویت اور عیسائیت کے مطابق اللہ کی محبت کا تخیل اس کے لئے قابل قبول تھا۔ اسلام کے مطابق تو صرف اللہ ہو اللہ ہو تھا عظمت عظمت عظمت عظمت محبت کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا

تھا اور اس بے پناہ عظمت کا اسے کچھ کچھ احساس تھا۔ جو اس نے مغربی علما کی تحریروں سے اخذ کیا تھا اسلام سے نہیں۔

لیکن اس کی جذباتی دنیا ذہنی خیالات سے دور اپنے ہی رنگ میں بستی تھی۔

معلوم ہوتا ہے کہ ایلی ویسا نارمل نہیں ہے جیسا کہ وہ اپنی سرگزشت سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی ذہنی دنیا بھی ہے اور وہ جدید ترین خیالات سے ہم آہنگ بھی ہے مگر وہ ایسی واقعاتی دنیا میں ہے جہاں وہ محض انسان ہی ہو کر رہ گیا ہے۔ ایلی کی اور اس کی دنیا کی ذہنی اور گردوپیش کی سطح ایک ہے۔ اس لئے وہ نمائندہ اور نارمل انسان ہے۔ آخری دور میں وہ معمہ بھی ہو جاتا ہے اور یہیں خیال آتا ہے کہ کب وہ معمہ نہیں تھا۔ سب سے بڑا معمہ یہی ہے کہ ہر چیز صاف اور معمولی ہو مگر پھر بھی وہ ہمیں ہر قدم پر تعجب میں ڈالے اور معمہ سے زیادہ معمہ ہوتی جائے۔ ایلی اپنی تمام سادگی کے باوجود اور سادگی کی وجہ ہی سے ایسی ہی چیز ہے۔

سطحی نظر سے دیکھنے پر یہ محسوس ہوگا کہ یہ ایلی کی ظاہری سرگزشت ہے اور اس طرح کردار نگاری کے سلسلے میں بیسویں صدی سے پہلے ہی کی راہ پر چل رہی ہے مگر غور سے دیکھنے کی ایسی ضرورت نہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ جدید ناول کی طرح یہ مرکزی کردار کی اندرونی زندگی کو بھی ہر قدم پر سامنے لاتی ہے ظاہرہ واقعات کے ساتھ ساتھ ایلی کی اندرونی دنیا بھی سامنے آتی رہتی ہے۔ شروع ہی سے اس کا اپنی سوتیلی ماں صفیہ کی طرف ردعمل اور اس کے مہندی لگے ہوئے ہاتھوں سے اسے نفرت کا بھی تجزیہ ہوتا رہتا ہے۔ شہزادہ عشق ایلی کی اندرونی یا ذہنی کشمکش کا اظہار ہے وہ گوئمگو کا عالم وہ یقین اور بے یقینی کا چکر جو اس کے دماغ میں چل گیا ہے پوری نفسیاتی تفصیل کے ساتھ بیان ہوتا رہتا ہے۔ شہزاد اس کے سر پر بری طرح سوار ہوتی ہے اور جب وہ دوسری عورتوں کی طرف بھی متوجہ ہے اور ان سے عشق بھی لگا رہا ہے۔ تو بھی شہزاد چھن سے اس کے سامنے آتی رہتی ہے۔ اس کی اندرونی اور بیرونی دنیائیں ساتھ ساتھ چلتی نظر آتی ہیں اور اس کی کردار نگاری اس طرح دو سطحوں پر کردار نگاری کی مثال ہے جیسی جدید ترین ناولوں میں خاص طور پر جیمس جوائس کی "جولیسس" میں ملتی ہے مفتی صاحب INTERNAL MONOLOGIC کے فن سے بھی واقف ہیں اور اسے بھی بڑی چابک دستی سے برتتے ہیں۔ اپنے افسانوں میں انہوں نے جدید نفسیات کو افسانہ سے ہمکنار کرنے کی کوشش کی ہے مگر اس سلسلے میں کمال پر ایلی کے کردار کو واضح کرنے میں پہنچے ہیں۔ مر جانے کے بعد بھی شہزاد ایلی کے لئے ایک زندہ حقیقت ہے جو اسے جگہ جگہ پر دکھائی دیتی ہے۔ جب وہ تقسیم کے نتیجے میں ترک وطن کر کے بھاگ رہا ہے تو اس کے تصور میں شہزاد اسی طرح آتی ہے۔

شہزاد کھڑکی سے چلا کر بولی "میں رکاوٹ تھی۔ میں دور ہو گئی۔ میں دور ہو گئی" وہ بولی "ایلی نیا جیون جیو۔ نیا جیون جیو"

شہزاد کے بعد اس کی محبت کا ظاہری مرکز اس کا شہزاد سے لڑکا عالی ہو جاتا ہے۔ وہ بمبئی میں یہ سن کر کہ گرداس پور ہندوستان میں آگیا۔ پاگل سا ہو جاتا ہے۔ ہزار جتن کرتا ہے کہ امرت سر اور ملی پور پہنچ جائے۔ تمام کوششیں ناکامیاب ہوتی ہیں۔ وہ تھک جاتا ہے۔

اس کی آنکھوں تلے عالی دونوں ہاتھ اٹھائے رو رہا تھا ......

پرمٹ دفتر میں وہ ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے "عالی عالی" اس کے دل میں کوئی رو رو کر تھکا ہوا بچہ بلک رہا تھا۔

بہرحال ناول کے آخری صفحات میں یہ دوہری کردار نگاری بڑی فراوانی سے نمایاں ہے اور ناول کا خاتمہ یوں ہوتا ہے :

حضور حضور ——— ایلی کا دل دھک دھک کر رہا تھا ۔

مفتی صاحب نے پیش لفظ میں اپنے فن کی طرف کوئی خاص اشارہ نہیں دیا ۔ ناول میں ایک جگہ وہ دوستوفسکی کے بزرگ کارمازاف کا ذکر کرتے ہیں اور ہم کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ ان کی کردار نگاری دوستوفسکی سے گہرے طور پر متاثر ہے ۔ ایلی کے کردار میں دوستوفسکی کے فن کا والہانہ پن اور فن سے بے نیازی ہے مگر وہ اپنے کردار کی تحلیل نفسی میں جدید ناول نگاروں کے لئے ماڈل ہے مفتی صاحب بھی اس ماڈل پر چلنے میں پورے کامیاب ہیں ۔ اور یہ کامیابی کسی ملک کی ناول میں بھی عظیم ہو سکتی ہے ۔ اردو ناول نگاری میں تو یہ ایک مستحکم جھنڈا گاڑ دیتی ہے ۔

(۵)

مجھے محسوس ہوا کہ اس ناول پر تنقید کرنے میں تنقید کے پرمل ہی نہیں گئے بلکہ جل کر راکھ ہو گئے اور وہ راکھ بھی اڑ گئی ۔ اس کا رخ واقعیت کی طرف ہے جو ناولوں کی جان اور واقعیت بھی یہاں انگریزی اور فرانسیسی والے سے زیادہ روسی ناول کی تفصیل اور جزویات میں گہری دلچسپی کے ساتھ برتی گئی ہے اور پھر جدید واقعیت کی پیچیدگی یا پیچیدہ عالموں سے دلچسپی کا بھی خیال رکھا گیا ہے جس کی وجہ سے ناول ضخیم ہو جانا لازمی تھا اور اس دور کی ضخیم ترین ناول ہو بھی گئی ہے مگر مفتی صاحب نے جو کمال دکھایا ہے اسے جانچنے وقت تمام اصول ٹوٹ جاتے ہیں اور پھر یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہاں ایک فن اپنی پوری زندگی کے ساتھ موجود ہے اور اپنا تخیلی اثر جماتا چلا جاتا ہے ۔ یعنی اس ناول میں وہ جادو ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے میتھو آرنلڈ کا سب سے اہم اصول یہ تھا کہ ادب کو زندگی پر تنقید ہونا چاہیے مگر ٹولسٹوئے کی "اناکارینہ" پر مضمون میں اسے اپنا اصول توڑتے ہوئے اس کی تعریف میں یہ کہا کہ یہ تنقید حیات نہیں ہے بلکہ ہو بہو حیات ہے ۔ مفتی صاحب کی واقعیت نگاری اور نفسیات نگاری کے بابت بھی ایسا ہی کچھ کہہ دینا پڑتا ہے ۔ یہاں زندگی کا نقشہ نہیں ہے جس کے حدود ناپے جا سکیں یا جس کے تاثرات کے صحیح یا غلط ہونے کا اندازہ لگایا جا سکے یہاں زندگی ہے زندگی ہی ہے اور مکمل زندگی ہے ۔ مفتی صاحب اسے ڈھیر کہتے ہیں مگر یہ محض ڈھیر نہیں ہے ۔ اس میں ترتیب ہے مگر وہ ترتیب ہے جس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کیونکہ وہ ہو بہو زندگی کی طرح ہے اور اسی طرح اپنے زور سے پڑھنے والے کو پسپا کر دیتی ہے ۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ وہ فن کاری میں کامیاب ہیں ان کا کوئی مقصد نہیں ہے اور وہ فضول کی بکواس کا ایک ڈھیر لگا گئے ہیں ۔ مگر ان کی ناول کا منظر ہمیں یہ کہنے سے روک دیتا ہے بلکہ منہ بند کر دیتا ہے اور ہم اس کے خلاف کچھ کہنا نادانی مان لیتے ہیں ۔ یہ ناول ہے ۔ اس معنوں میں ناول نہیں کہ ایک دلچسپ قصہ سنا کر ہمیں محظوظ کرتی ہے بلکہ اس معنے میں ناول کہ یہ ایک زندگی کی اور ایک گروہ کی زندگی کی مکمل تصویر ہے اور یہ تصویر خاص طور پر ایک مرکزی کردار کے ضمن میں لائی گئی ہے ۔ اس میں وہ پھیلاؤ ہے اور جزوئیات کی طرف وہ توجہ ہے جس کے برتنے میں روسی ناول نگار سب سے آگے ہیں ۔ اس میں زندگی کا سا چڑھاؤ اور اتار ہے اور قصہ ہیرو کے بچپن سے شروع ہو کر ایک زندگی کے آغاز تک جاتا ہے ، اس کی کوئی ٹکی بندھی ہیئت نہیں ہے مگر وہ وسیع ہیئت کا تاثر ضرور دیتا ہے ۔ یہ ایک عظیم دریا کی طرح ہے جس کا مخرج ایلی کا گھر ہے اور پھر وہ پھیلتا ہوا آصفی محلے ، علی پور ، امرت سر ، لاہور تک جاتا ہے ۔ وہ سارا خطہ جو گرد ہے

ستے سے کہ لاہور تک جب اس کی وسعت میں آ جاتا ہے۔ جو یہ بمبئی تک پھیل کر سمندر کو بھی اپنے میں ملا لیتا ہے۔ اس کی سطح پر کثرت سے انسان پھیلے نظر آتے ہیں۔ جتنی وسعت بڑھتی جاتی ہے اتنی ہی انسانوں کی تعداد بھی بڑھتی جاتی ہے۔ کچھ انسان مرکزی ہو جاتے ہیں اور بار بار آتے رہتے ہیں۔ یہ ایلی کے قریبی عزیز ہیں۔ سب سے زیادہ ایلی خود ہے جس کو ہم اس سیلاب میں ہر جگہ ڈبکی کھاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اس کو اس کا شناور کہنے کو جی چاہتا ہے مگر وہ شناوری سے طبیعت اور مقصد نہیں رکھتا۔ وہ بہا چلا جاتا ہے سب لوگوں کی طرح گو سب سے مختلف ہے۔ وہ نہ۔ وہی ہے مگر اس کی انفرادیت کی ندرت متعین نہیں ہو سکتی اور ہم اسے ہر جگہ اور ہر وقت محسوس ضرور کرتے رہتے ہیں۔ ناول میں بس رہی وہ ہے اور شہزاد تک اس کے ذہن کی پیداوار ہے۔

یہ محسوس ہوتا ہے کہ مفتی صاحب اور ایلی ایک ہی شخص اور مفتی صاحب کے جاننے والے یہ تصدیق کرتے ہیں کہ "علی پور کا ایلی" ایک خود نوشتہ سوانح ہے مگر میں سوال کرتا ہوں کہ کیا ممکن ہے؟ یہ کتاب تاریخ نہیں ناول ہے اور ناول میں اس کا مصنف اپنے کو نذر پیش کرتا ہے مگر وہ پورا کا پورا اپنے کو اتار نہیں سکتا۔ نام بدلنے سے اور تخیل کے دائرے میں آنے سے مصنف خود دوسرا آدمی ہو جاتا ہے اس لئے ایلی اور مفتی صاحب ایک نہیں ہو سکتے اور ایلی تاریخ کا فرد نہیں بلکہ تخیل کی تخلیق ہے اس لئے اس کی سرگزشت کتنا ہی واقعیات کا نقشہ ہو مگر وہ زندگی کی ایک نظریہ حیات کے مطابق اور ایک فنی نظر کے مطابق تعمیر ہوا ہے علی پور کے آصفی محلہ کی سماجی اور اخلاقی قدریں ہیں۔ ان کا مذہب عالم اسلام ہے جو ہندویت اور تصوف سے متاثر ہے۔ ایلی اس مذہب پر اٹھایا جاتا ہے۔ مگر تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے وہاں سے بالاتر ہو گیا ہے۔ وہ توہمات میں عقیدہ کرنے سے انکار کرتا ہے۔ اسلام کا دینی دربدیہ اسے کوئی علم نہیں ہے مگر جدید یورپین فلسفیوں سے اس نے ایک عظیم تصور خدا حاصل کر لیا ہے۔ وہ خدا کے ساتھ اخلاقی قدریں وابستہ نہیں کرتا مگر اس کی عظمت کا احساس رکھتا ہے اس کے والد عورتوں کے شائق ہیں۔ وہ ان کی عیاشی کو دیکھ رہا ہے اور اسے عورت سے جسمانی تعلق سے نفرت ہو جاتی ہے۔ شہزاد کے حسن کا وہ گرویدہ ہو جاتا ہے اور اس کے دل میں اعلیٰ عشق اور پست عشق کے درمیان کشمکش ہوتی ہے اور وہ شوہر والی چھ بچوں کی ماں سے شادی کر ہی لیتا ہے۔ اس کا ادب کی طرف دھیان ہے اور وہ اعلیٰ ترین شاہکار سے دلچسپی لیتا ہے اور آخر میں وہ صحافی ہو جاتا ہے۔ وہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں پیش کرتا مگر ظلم زدوں سے وابستہ نظر آتا ہے۔ اس میں احساس کمتری کے باوجود ہمت اور استقلال بھی آ جاتا ہے۔ اسے سیاست سے کوئی غرض نہیں ہے مگر پاکستان بننے پر وہ خوش ضرور ہوتا ہے۔ اسے اپنے وطن سے لگاؤ ضرور ہے مگر وہ پاکستان میں آ جانے کو نیا جیون سمجھتا ہے۔ اس کے ذریعہ کوئی مستقل نظریہ حیات اس طرح سامنے نہیں آتا کہ خواہ مخواہ کو ٹھونس ٹھانس معلوم ہو مگر اس کا ایک جدید نظریہ حیات ضرور ہے۔ اس میں قوت ارادہ کی کمی صاف صاف نمایاں سہی مگر وہ اپنے ارادے کا پکا بھی ہے اسے اپنی طرح پر جو کچھ کرنا ہے وہ کر گزرتا ہے اور اپنے ماحول کی خلاف ورزی کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ بات یہ ہے کہ اس کے نقطۂ نظر کو مفتی صاحب نے بالکل خارجی کر دیا ہے اور کہیں تجریدی نہیں ہونے دیا۔ اس کے واقعیات اور عمل نقطۂ نظر سے اس قدر ہم آہنگ ہیں کہ واقعیات ہی واقعیات دکھائی دیتے ہیں اور نظریات بالکل چھپ جاتے ہیں یہ ڈرامہ نگاری اور ناول نگاری کی حد ہے شیکسپیر کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے کردار کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ ان سے کوئی واضح نقطۂ نظر نکال لینا ناممکن ہے مفتی صاحب نے ایلی کو بھی اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ اپنا اور اس

نقطۂ نظر بالکل چھپانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

اسی طرح وہ تخلیق کے سلسلے میں بھی مرقع کاری سے اپنی بے نیازی کا اظہار کرتے ہوئے اپنی ناول کو ایک ڈھیر کر دیتے ہیں یعنی ہموارانہ ترتیب، انتخاب اور تفحص سے منہ موڑ لیتے ہیں مگر اس ناول کے مختلف حصوں میں بیانات میں جو بہت کم ہیں اور مکالموں میں جو بڑی فراوانی سے لائے گئے ہیں زبردست ڈرامہ نگاری کا شعور نظر آتا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کی قوت اور اس میں مشق مسلم ہے اور بیان طویل چیز کو ربط دینے میں بھی وہ کامیاب ہیں۔ وہ کسی فن سے تابع نہیں ہیں اور فن ان کے سامنے ہاتھ باندھے نظر آتا ہے اور وہ اس کا احترام کرتے ہوئے جدھر چاہتے ہیں ادھر اس کی باگ موڑ دیتے ہیں۔ وہ صرف ایک اصول کے قائل ہیں جو حافظ کے اس شعر سے ادا ہوتا ہے ؎

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند آنچہ استادِ ازل گفت ہماں می گویم

مگر وہ ایسی طوطی ہیں جس کو استادِ ازل نے ناول نگار ہونے کی صلاحیت دی ہے اور پھر شعور اور مشق سے انہوں اس صلاحیت کو آگے بڑھا کر وہ اس مقام پر آگئے ہیں۔ وہ بے ساختگی سے اور ظاہرہ بے پروائی سے لکھتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کے تجربہ کا دریا امڈتا چلا آ رہا ہے اور وہ اسے بغیر شعوری زور لگائے ہوئے فن میں تبدیل کرتے چلے جا رہے ہیں۔ فن اپنی قدرتی جگہ لئے ہوئے ہے اور اس کے سیلاب میں ایسا چھپ گیا ہے کہ اس کی طرف توجہ جانا ممکن نہیں رہ گیا ہے۔ فن کاری مشکل کام ہے اور اس میں کامیابی کی داد دی جا سکتی ہے مگر فن کو چھپانا کمال ہے اور مفتی صاحب اس کمال پر پہنچ گئے ہیں۔ سطحی نظر یہی کہہ سکتی ہے کہ "علی پور کا ایلی" میں کوئی فن نہیں اور اس کے مصنف نے فن سے بے نیازی کا اعلان بھی کر دیا ہے مگر غور کی نظروں کو یہاں وہ فن نظر آئے گا جو فن سے اوپر چلا جاتا ہے اور حقیقت کو اس طرح سامنے لاتا ہے جہاں فنکار بول اٹھے۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

آخر میں میں اس بات پر واپس آتا ہوں کہ اسے آدم جی انعام نہیں دیا گیا۔ ممکن ہے کہ اس بات میں پبلک سے شکایت ہو اور اس سے انعام دینے والوں کی نااہلی کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ مصلحتوں کے ماتحت انعام دیتے ہیں اور اس کتاب کو کسی مصلحت سے انہوں نے انعام نہیں دیا ہوگا۔ اس بات کو طے کرنے والے نقاد ہوں گے اور میں ان کو ہی نہیں بلکہ ان کے ایسے لوگوں کو ناول پر تنقید کرنے کا نااہل قرار دے چکا ہوں۔ وہ ناول کا کوئی ذوق نہیں رکھتے اور اسے کچھ ٹکے بندھے اصولوں سے جانچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ "علی پور کا ایلی" کے ایسے اوریجنل شاہکار کو کیسے محسوس کر سکتے ہیں اور عام طور پر بھی نقاد کسی نئے ناول کو سمجھنے کے اہل نہیں ہوتے برڈسٹ نے اپنی عظیم اور ضخیم ناول کے بابت کہا ہے۔ "مجھے اس کی قدر کرنے کی نقاد سے کوئی امید نہیں ہاں ان صاحبان ذوق سے امید ہے جو بجائے اصولوں کے اپنے ادبی پرکھ رکھتے ہیں۔" "آگ اور شر سے دو تانی باردو" کی ضخامت سے لوگ ڈر گئے ہمارے نقاد بھی اس کی ضخامت کی شکایت کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے یہ شکایت کی ان سے میں نے کہا "آپ کو پڑھنے کا شوق تو ہے ہی نہیں ورنہ ضخامت اس کے اور آپ کے درمیان حائل نہ ہوتی۔" اصل بات یہی ہے کہ ہمارے یہ دفتر نقاد کے لیے

ادب لکھنے بند ہو گئے تھے یا سو رہے تھے اور وہ جو طالب علم نکل رہے ہیں وہ بھی ان کے سے ہوتے ہیں۔ "علی پور کا ایلی" کو وہ مقبولیت نہیں حاصل ہے جو آج دوسرے ناولوں کو ملی۔ مگر مجھے یقین ہے کہ یہ آہستہ آہستہ لوگوں کے دلوں میں گھر کرتی جائے گی اور اس سے لوگ ناول کے آشنا نہ راز ہوتے جائیں گے۔ ممکن ہے کہ یہ ناول نگاری کے سلسلے میں ماڈل ہو جائے کیونکہ یہ اس سب آلائش سے پاک ہے جو فن و سنگر کے بہلنے ناول سے وابستہ کی جاتی ہے۔ میں نے ایک کتاب "ناول کیا ہے؟" پچیس برس پہلے لکھی تھی۔ اس وقت تک "علی پور کا ایلی" وجود میں نہیں آئی تھی۔ اب اگر کوئی شخص مجھ سے یہ سوال کرے تو اس کا جواب میں یہ دوں گا "علی پور کا ایلی کو پڑھ ڈالو معلوم ہو جائے گا کہ ناول کیا ہے۔ کیا ہونا چاہیے کہ وہ عظیم ناول کے دائرے میں آ جائے"۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی ناول میں ناول کی روح نہایت آزادی سے وسیع اور عظیم سفر طے کرتی نظر آتی ہے۔ اس دور کی ناولوں میں یہی اس کی انفرادی صفت ہے۔

گھاس کا سانپ

بانو قدسیہ

ممتاز مفتی بالکل گھاس کا سانپ ہیں۔

سارا رنگ روپ پھنکار کوڑیالا پن سانپ کا لیکن زہریلے دانت ندارد۔ چاہے گلے میں ہار بنا کر ڈال لیجیے۔ چاہے بچوں کی محفل میں ربڑ کی گیند کے ساتھ بھول جائیے۔ ممتاز مفتی بنیادی طور پر بے ضرر ہے۔ پھنکار بہت، رنگ روپ دبدبہ جاہ و حشمت بہت۔ لڑائیاں بہت، نااتفاقیاں ملنے لگنے کی باتیں۔ دھمکیاں جا بجا۔ یہ سب اس کوبرا سانپ کی نشانیاں ہیں۔ جسے بدقسمتی سے زہر نصیب نہیں ہو سکا۔

دراصل ممتاز مفتی ہر لمحہ ہر جگہ تعلق خاطر کو ہنرمندی سے چھپا کر غلاف میں لپیٹ کر استادی داؤ پیچ دکھا کر نام رکھتا ہے۔ ان کہے رہنے کی ایسی لت پڑ گئی ہے کہ اگر اس کی محبوبہ اس کے سامنے آ بیٹھے تو وہ خود منہ موڑ کر پان بنانے میں مشغول ہو جائیگا۔

ممتاز مفتی کو جب میں نے پہلی بار دیکھا تو ان کا ایک سکینڈل بٹالے سے لے کر گورداسپور تک زبان زد تھا۔ سکول کی لڑکیاں ممتاز مفتی کا نام لے کر ایسے لرزتی تھیں جیسے صرف ہمارے زمانے کی لڑکیاں جنسی کتاب کا نام سن کر کانپنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ ممتاز مفتی کو اس سکینڈل نے وقت کا میٹنی آئیڈل بنا دیا تھا۔ یہ ممتاز کی ہنرمندی تھی کہ صنف نازک کا ہر دل اسے زمانے کا اول عاشق سمجھنے لگا تھا۔ دراصل عورتوں کو ایک بیماری یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے عاشق کو کم اور کسی دوسری عورت کے عاشق کو زیادہ آئیڈیل سمجھتی ہیں۔

اس سکینڈل سے لے کر "لبیک" کے سکینڈل تک کئی مرحلے کئی منزلیں کئی چھوٹے چھوٹے راز ایسے ہیں جن کو میں صرف اس لیے فاش نہیں کر سکتی کہ ممتاز مفتی نے کمال ہنرمندی سے مجھے اپنا دوست بنا رکھا ہے۔ اور دوستوں کے راز فاش کرنا، دوستوں کے دشمنوں سے پیار کرنا، دوستوں کے رشتہ داروں کو دوست بنانا ان کے مسلک کے خلاف ہے اور چاہے میرے مسلک نہیں لیکن مجھے گھاس کے سانپ سے خوف آتا ہے کیونکہ میں بنیادی طور پر ڈسے جانے سے کہیں زیادہ پھنکار سے ڈرتی ہوں۔

بظاہر ممتاز مفتی اپنے متعلق بات نہیں کرنے دیتے۔ بات نہیں ہونے دیتے۔ ان کی تعریف کرنے لگو تو وہ پنکھے کی طرف دیکھ کر کہیں گے واہ واہ اشفاق یار یہ تین بلیڈوں والا پنکھا تو میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ ہو سکے تو اسلام آباد جانے سے پہلے مجھے بھی ایک ایسا پنکھا خرید دے۔ میں غلطی سے کہہ بیٹھوں مفتی جی دیکھئے آپ کی تصویریں کتنی خوب صورت آئی ہیں تو فوراً کہیں گے تیرے پیروں کا کیا حال ہے بہتر تو یہ ہوتا کہ تو میرے ساتھ مل کر کرشن نگر والے بابا سے مل لیتی۔

شہاب صاحب کہنے لگے "مفتی جی نے ہماری بہت خدمت کی۔ صبح کا سفر گھر کی راحتوں سے بچ گیا تو فوراً رخ دوسری طرف موڑ کر کہیں گے ڈرائیور نے یہ کچھ اور قسم کی روح تھی ہم اسے سمجھے نہیں۔ کیوں بھئی قدسیہ؟"

ان بڑے اور اصلی مفتی کے نیچے ایک اور مفتی رہتا ہے جسے اسکینڈل سے عشق ہے۔ جسے صرف ایک آرزو رہتی ہے کہ بات ہوتی رہے۔ ایک گھر سے دوسرے گھر تک ایک بچے سے دوسرے بچے تک لوگ کانوں میں کہتے پھریں۔ صرف یہ بتانے کے لئے کہ شہر میں ایک ایسی بھاری کتاب پھر رہی ہے جس نے ہر سچے ادیب نے اپنی زندگی کو بے نقاب کر دیا ہے۔ بھالی صاحب کیا حوصلہ ہے اس نے تو انہیں آپ کو بھی نہیں چھوڑا ——— بات کچھ ہو کیسی ہو لیکن مرکزی خیال ممتاز مفتی ہو۔

یہ اسکینڈل کو رد پھیلا ہوا سے میں گھومنے والے سکینڈل سے زوردار تھا۔

"ممتاز مفتی پور کا ایلی" ابھی ہم دم بخود ہی رہ گئے تھے کہ مفتی جی نے "لبیک" جیسی کتاب لکھ کر مبلغے کی بولتی بند کر دی اور صرف اپنا نام پاک باری کر دیا۔

غالباً اس جیسی SCANDALOUS کتاب عرصہ تک نہیں لکھی جا سکتی۔

میری ادھیڑ عمر کی پھوپھی کانوں پر انگلیاں رکھ کر میرے کمرے میں آئیں۔ "توبہ توبہ توبہ خانہ کعبہ کو یہ تمہارے مفتی جی کالا کوٹھا کہتے ہیں۔ ان کی شفاعت کون کرے گا ... یہ کیسے بخشے جائیں گے بھلا؟"

میرا خیال تھا کہ پھوپھی جان اس کے بعد لبیک کو ہاتھ نہیں لگائیں گی لیکن تھوڑی دیر کے بعد میں اُن کے کمرے میں گئی تو وہ کانوں کے دونوں طرف دوپٹہ اڑسے دھڑا دھڑ لبیک پڑھ رہی تھیں اور اپنے بخشے جانے کا سامان کر رہی تھیں۔ میں نے اس کی وجہ صرف یہ سمجھی کہ بڑی عمر کی عورتوں کو سکینڈل سے بڑا قلبی لگاؤ ہوتا ہے۔

کچھ دن بعد ایک درمیانی عمر کے مہمان نے شیو کا پانی مانگنے کے ساتھ ساتھ مجھ سے کہا — "یہ تمہارے دوست ہیں؟"

"کون؟"

"مفتی صاحب"

"ہاں لوگ یہی سمجھتے ہیں"

"ان کی کتاب اچھی نہیں —"

"کونسی کتاب؟"

"لبیک"

"اچھا —"

"میں نے یونہی چلتے چلتے ذرا اس کا مطالعہ کیا تھا —"

میں اس چلتے چلتے کی ذرا وضاحت کر دوں۔ اشفاق صاحب کے ایک عزیز دوست ہیں۔ جو ٹیلی ویژن کے پروگرام پر پوری رد و کد کے ساتھ تمام تفاصیل سمیت بڑی سیر حاصل بحث کیا کرتے ہیں۔ لیکن اگر کہیں اُن سے پوچھ لیا جائے کہ بعض ب

آپ نے نکھار دیکھا تھا۔ تو وہ فوراً کہیں گے "نہیں جی اُس وقت تو میں مہمانوں میں بیٹھا تھا بس صرف چلتے چلتے چند سیکنڈ کے لئے دیکھا امانت کچھ بے شمار نکھار ہو تھا"

اس کے بعد وہ تمام پروگرام کی ساری تفاصیل سے آپ کو کوئی پون گھنٹہ نوازتے رہیں گے۔

"شیبو کا پانی ذرا جلدی بنا دو ——" میرے مہمان نے آرڈر دیا۔

"اچھا جی——"

"رات میں نے ذرا یونہی چلتے چلتے لبیک کا مطالعہ کیا عجیب کتاب ہے نہ دینی ہے نہ افسانوی نہ رپورتاژ ہے نہ ناول —— کتاب کی ایک فارم ہونی چاہیے ورنہ ادیب SERIOUS نہیں لگتا مسخرہ لگتا ہے ——"

جب مفتی جی موجود نہ ہوں تو مجھے ان کے خلاف باتیں کرنے میں بڑا لطف آتا ہے کیونکہ اس طرح مجھے ان کے مسلک پر چلنے سے آزادی کا احساس ہوتا ہے۔

"فارم کیا ہوتا ہے ایسی کتابوں کا——"

"میرا خیال تھا کہ تم برا مان جاؤ گی —— کیتلی اتار دو۔ میں رات سے سو نہیں سکا ——"

میں نے کیتلی اتار دی۔

"کیوں نہیں سو سکے؟"

"میں ذرا یونہی لبیک کا مطالعہ کرنے بیٹھ گیا تھا۔ یہ کتاب JOLTS دیتی ہے یہ اچھی کتاب نہیں ہے —— تم نے پڑھی۔ دوسروں کے جذبات سے کھیلتا ہے مفتی۔"

"پڑھوں گی جی——"

"مت پڑھنا——"

"کیوں؟——"

"تمہارا ایمان کمزور ہے جس طرح نو بالغوں کو جنسی کتابیں نہیں پڑھنی چاہئیں اسی طرح کمزور ایمان والوں کے لئے یہ کتاب بے راہ روی کا باعث ہو سکتی ہے——"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی——"

"اس کتاب میں عزت اور توقیر کے الفاظ کی بڑی کمی ہے۔ سوائے شہاب صاحب کے جن کے مفتی صاحب سائیکو فینٹ ہیں انہوں نے اچھے الفاظ استعمال نہیں کئے۔"

"کس کے لئے——"

"اللہ میاں کے لئے —— اُس مقدس سرزمین کے لئے——"

"لیکن عزت اور توقیر الفاظ میں تو نہیں ہوتی——"

"تم بحث کرنا چاہتی ہو حالانکہ میں نے یہ کتاب اچھی طرح سے نہیں پڑھی —— میں اس پر بحث نہیں کر سکتا۔
رشید کا [illegible] ،،،،"

"اس کتاب پر مجھے ایک شدید اعتراض ہے ـــ"

"فرمائیے ـــ"

"مفتی جی نے زائرین کے جذبات کو بڑا مجروح کیا ہے کیا وہ سمجھتے ہیں کیا ایک وہی جذبے والے ہیں ۔"

"ہاں یہ بڑی غلطی ہے ـــ"

"کہیں بندوبستی قافلوں کا ذکر ہے۔ کہیں زائرین معلموں سے جھگڑ رہے ہیں۔ کہیں دوکاندار کے منہ پر چیزیں مار رہے ہیں صرف مفتی صاحب کا رُخ درست ہے صرف وہی دعا سننے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟ وہ کون ہوتے ہیں لوگوں کی عقیدت سے کھیلنے والے کوئی تسبیحیں خریدے کھجوریں خریدے جانماز مول لے ـــ یہ ماسے لگتے ہیں حج کے ـــ"

"میں منع کر دوں گی آئندہ ایسے نہیں کریں گے"

"حالانکہ شہاب صاحب نے ایک جگہ غالباً ۲۲۸ صفحے پر انھیں منع بھی کیا ہے کہ مسجد نبوی میں کسی خصوصی حیثیت سے آنا اچھا نہیں لگتا اس کے باوجود اُن کی انا کہیں جھکنے نہیں دیتی ـــ وہ ہر جگہ V.I.P بنے بیٹھے ہیں"

"آپ نے ۲۲۸ صفحے تک کتاب پڑھ لی ـــ"

"ساری نہیں کہیں کہیں سے BY THE WAY یہ شہاب صاحب کون ہیں؟"

"اشفاق صاحب کے دوست ہیں ـــ"

"اشفاق تو مفتی جی کی طرح اُن کی سائیکو فینسی نہیں کرتا ـــ" "اشفاق بھی کرتے ہیں لیکن وہ محسوس نہیں ہونے دیتے۔ مفتی اناڑی ہیں ۔"

"BIG OFFICER ہیں؟ کیا DESIGNATION اُس کا ـــ"

"مجھے تو معلوم نہیں"

"کیا وہ واقعی ایسے آدمی ہیں جیسا کہ مفتی جی نے PAINT کیا ہے۔ کیا واقعی شہاب کے جانے کے بعد مفتی کو ریورس گیر لگ گیا تھا صفحہ ۲۷۲ پر مفتی صاحب نے اس کا ذکر کیا ہے ـــ"

"آپ نے کتاب وہاں تک پڑھ لی ہے؟ ـــ"

"نہیں بیچ بیچ میں سے ٹھونگا ٹھانگی کی ہے ـــ"

"شہاب صاحب واقعی بزرگ آدمی ہیں کہ مفتی صاحب انھیں BUILD کرنے کی کوشش کر رہے ہیں"

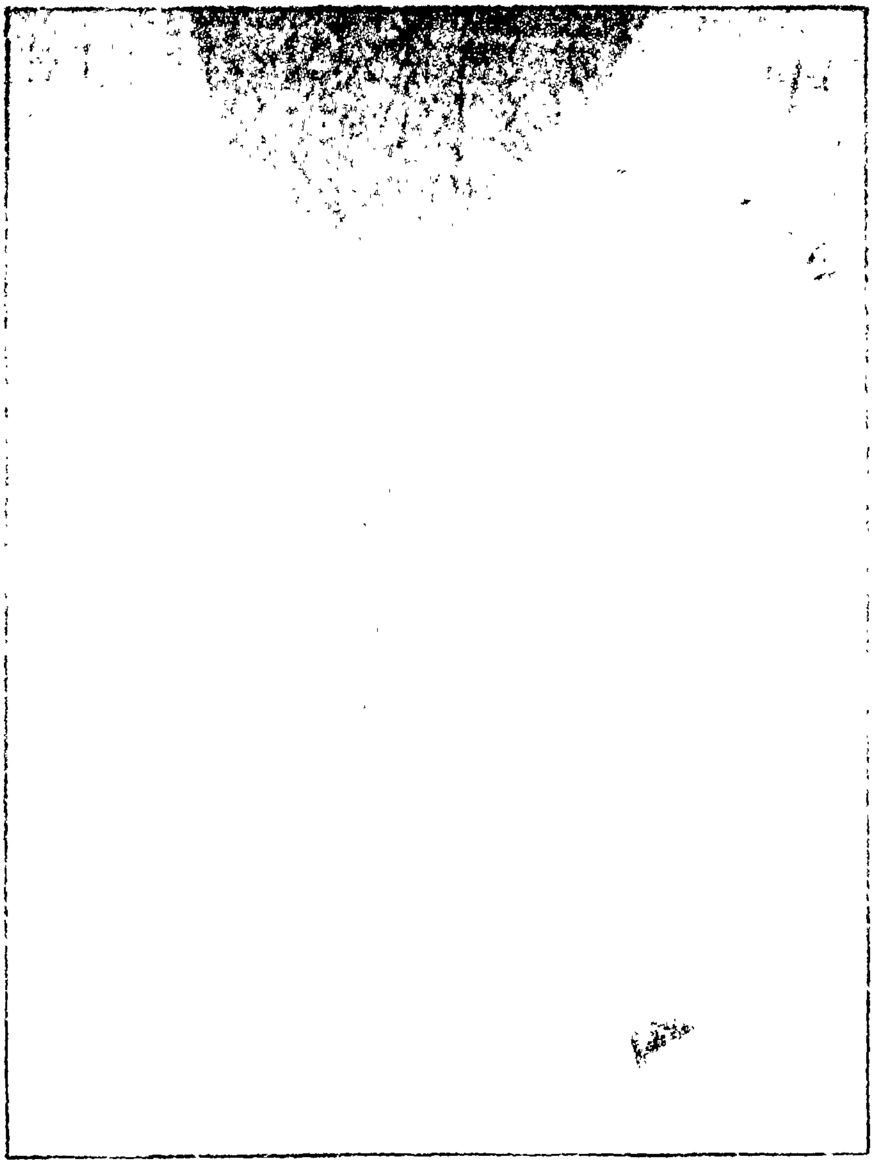
"میں شہاب صاحب سے واقف نہیں ہوں" میں نے جواب دیا۔

"لیکن ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ وہ اشفاق صاحب کے دوست ہیں"

"کم از کم اشفاق صاحب اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں"

انہوں نے زور کا قہقہہ مارا اور پھر پرسوچ کر بولے "میں ابھی تک سمجھ نہیں سکا کہ اس کتاب کو لکھنے کی کیا ضرورت تھی"

"آپ پریشان نہ ہوں غالباً کسی کتاب کو لکھنے کی کوئی [illegible] نہیں ہوتی بیچارے ادیب کا حال اُس بندکمرے جیسا ہوتا ہے



بانو قدسیہ اور ممتاز مفتی

جس میں آتشدان کی کیلی لکڑیوں سے دھواں بھر جاتا ہے کہ

"تم اگر چند دن کے لئے مجھے یہ کتاب LEND

میری آٹو گراف شدہ کاپی وہ صاحب لے جا

ان کا خیال ہے کہ اس کتاب کے خلاف تحریک چلانی

میری ایک بھابھی اس کتاب کو پڑھ کر بڑی

ہے اُس کا خیال ہے کہ ادیب کو ویسی ہی زندگی بسر

اُس کی اس دیرینہ آرزو نے اس کے تشنگی

باقی رہتی ہے اور ادیب کے فن سے کہ کتاب یہ

"ماموں جی — یہ کتاب مفتی جی نے لکھی ہے

"ہاں کیوں —"

"کمال ہے حد ہو گئی — ہم تو مفتی جی کو اور طرح

"کیسا آدمی ؟ —"

"جیسے وہ علی پور کے ایلی ہیں — جیسے و

— یہ تو اور طرح کے مفتی جی نکلے —"

"کیسے ؟ —"

"وہ مفتی جی تو جنسی کہانیاں لکھتے تھے،

"یہ کیسا لکھتے ہیں ؟"

"لکھتے تو اچھا ہیں لیکن کون سے سچے

اُن کے کردار کے مطابق ہے —"

"میرا خیال ہے دونوں مفتی جھوٹے ہیں :

"ہیں ماموں جی — ؟"

"ادیب کا ذہن اُس کا جذبہ اُس کی سوچ

پورا بدل نہیں سکتا —"

"ہم تو سمجھتے تھے کہ ایلی پڑھ کر ماموں جی خیال

رہے ہیں —"

"تو یہ کتاب انہوں نے کیسے لکھی — اس کے تو ا

کیسے ہوا؟ ———

"— یہ دل بھی اسی سینے میں دھڑکتا ہے —"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے مامی جی —"

"یہی تو مشکل ہے کہ ایسے ہی ہوتا ہے۔"

"علی پور کا ایلی لکھنے والا لبیک کیسے لکھ سکتا ہے —"

"ایسا ہی شخص تو یہ دو کتابیں لکھ سکتا ہے۔ دراصل تو دریا میں زور چاہیے طغیانی کی صورت اختیار کرے یا شہر بھر کو بجلی مہیا کر دے یا اوپر والے کی مرضی ہے۔ جن پانیوں میں زور شدت نہیں ہوتا اُن کے رُخ تو کوئی نہیں موڑتا۔ ان کے سر دل پر کوئی انجینئر بند باندھنے نہیں آتے یہ تو اپنے سمرن سمرن کرتے بڑے پانیوں سے ملنے چپ چاپ چلے جاتے ہیں چھوٹے پانیوں کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی۔"

"یہ شہاب صاحب مجھے اچھے نہیں لگے —"

"شہاب صاحب کسی کو بھی اچھے نہیں لگتے —"

"مفتی جی کو بھی نہیں ——— ہیں مامی جی —"

"غالباً مفتی جی کو بھی نہیں —"

"ہائے لبیک پڑھ کر تو یہ اندازہ نہیں ہوتا —"

"اپنے سے بڑے آدمی کو پسند کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ اس میں اپنی ہیٹی ہوتی رہتی ہے —"

آپ شہاب صاحب سے ملی ہیں؟

"ملی ہوں —"

"کیسے ہیں؟"

"کم کم سے رہتے ہیں جیسے کار کا چالان کروا کے آئے ہوں —"

"مفتی جی نے اُن کے متعلق ایسی باتیں کیوں لکھی ہیں یہ صریحاً خوشامد لگتی ہے —"

میں اپنی بھابھی کو یہ نہیں سمجھا سکی کہ مفتی جی کو سکینڈل کے بعد حجاب پسند ہے۔ پردہ برقعے کی شکل میں ہو آئینے کی شکل میں ہو حق کی اوٹ ہو نظریے کا سراب ہو مفتی جی کو حجاب ہر رنگ ہر سائز ہر MAKE کا پسند ہے۔

جب دو شخص آپس میں قریب آنے پر ٹوٹ جانے کا احتمال رکھتے ہوں؛ اُن کی چھٹی حس بار بار لال سگنل دیتی ہو تو عموماً وہ ایک دوسرے کو چھوڑ کر کوسوں دُور نکل جاتے ہیں اگر بوجوہ کشش زیادہ ہو اور بھاگنے کے امکانات کم ہوں تو وہ اپنے درمیان خوشامد کا پردہ ڈال لیتے ہیں۔ یہ پردہ جام سے جام ٹکرانے کی طرح بڑا لطیف سا شور پیدا کرتا رہتا ہے۔ طوائفوں کے گھروں میں شیشے کی نلکیوں سے بنے ہوئے پردوں سے بھی ایسی ہی آوازیں آیا کرتی ہیں —

مفتی کو خوشامد کے پردے سے عشق ہے۔

اگر مفتی کسی حرم کا مالک ہوتا تو دنیا میں یہ اکلوتی حرم ہوتی جہاں مفتی کی گھر والیاں سب کی سب آپس میں محبت سے رہتیں اور انھیں علم نہ ہوتا کہ مفتی کہاں رہتا ہے۔

کیونکہ مفتی خوشامد کے پردے میں خود بیٹھ کر اپنا وجود ہر ایک سے چھپا لیتا۔ ہر زوجہ دوسری زوجہ کے سامنے بے نقاب ہوتی لیکن مفتی اور اس کے درمیان خوشامد کے جام کھنکتے رہتے اور کسی کو کبھی بھی علم نہ ہو پاتا کہ مفتی اس سے کوسوں دور ہے۔

مفتی نے اپنے اور شہاب صاحب کے درمیان بھی تعریف کا بڑا خوبصورت پردہ لٹکا رکھا ہے۔ اس کی بنکی شفاف ہے۔ اس کی بنکی باریک مہین کی طرح سہری ہوئی ہے —لیکن غالباً شہاب سا سب ہی جانتے ہیں کہ پردے کی دوسری جانب سے مفتی نے بڑے سلیقے بڑی دانشمندی بڑی ہنرمندی سے یہ پردہ لٹکا رکھا ہے۔

پتہ نہیں مفتی جی خود مجروح ہونے سے ڈرتے ہیں کہ انھیں سونا تھ کے بڑے بت کے ٹوٹنے کا ڈر ہے۔ بہرکیف یہ بات میں ان سے پوچھ نہیں سکتی کیونکہ ان کے مسلک دوستی میں سوال پوچھے تو جا سکتے ہیں لیکن ان کا جواب منانہ ضروری نہیں۔ میں مفتی جی سے یہ پوچھ تو سکتی ہوں کہ شہاب صاحب اصل میں کون ہیں۔

لیکن وہ جواب دیں نہ دیں اس کی انھیں مکمل آزادی ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک دوستی کی اصل جان آزادی ہے۔

میں ان سے یہ پوچھ سکتی ہوں کہ سچ سچ بتائیے کیا واقعی آپ اس راہ کے رہرو ہیں۔ لیکن جو جواب وہ دیں مجھے ماننا پڑے گا۔ کیونکہ ان کے نظریے کے مطابق دوستی میں جبر اچھی چیز نہیں۔

میں ان سے یہ سوال تو کر سکتی ہوں کہ کیا واقعی لبیک کے پس منظر میں کچھ روحانی قوتیں کارفرما ہیں۔ اور کیا وہ کچھ ذاتی تجربات حاصل کر چکے ہیں۔

لیکن اگر وہ یہ سن کر خاموش ہو جائیں تو مجھے بھی خاموش ہونا پڑے گا۔ کیونکہ دوستی میں ایک دوسرے کی خاموشی کا احترام بڑا اخلاقی فرض ہے۔

اور یوں سمجھیے جب تک میں اس سوسائٹی کا دیا کھاتی ہوں اور اس میں رہتی ہوں مجھے ہر اخلاقی فرض کے سامنے سارے ہتھیار ڈالنے ہی پڑیں گے۔

حجاب کی بات ہو رہی ہے تو مجھے ایک اعتراف کرنا پڑے گا کہ جب مفتی جی مُصر ہوئے کہ میں اس کتاب پر کچھ لکھوں تو میں نے بڑی انکساری سے کہا: "مفتی جی یہ کتاب میری گرفت میں نہیں آ سکتی کیونکہ یہ میرا سبجکٹ نہیں۔ میں سادہ سادہ سوشل مسائل کی تیرک چھوٹی چھوٹی کمینی باتوں کو سمجھتی ہوں۔ اس کتاب اور میرے درمیان ایک گہرا حجاب ہے —"

"بیانِ درد کوئی بہانہ نہیں سنا جائے گا۔"

"مفتی جی اوّل حجاب یہ ہے کہ میں عورت ہوں اور میں اس کتاب کے جذبے کو نہیں سمجھتی۔"

"کیا مطلب؟ —"

"آپ نے سنا ہوگا کہ عورت طالب دنیا ہے محنت طالب عقبیٰ ہے اور مرد طالب مولیٰ ہے میں مولیٰ سے لگن کی بات نہیں سمجھتی مجھ سے آپ سے ڈی کی قیمت پوچھ لیں۔ کوٹھی کتنے کینال کی اچھی لگتی ہے میں اس پر بات چیت کر سکتی ہوں۔ بچوں کے مستقبل کے لئے کون کون سے معززین شہر اچھے دوست ہو سکتے ہیں۔ مجھے ان کے متعلق بہت کچھ پتہ ہے ———"

"خیر خیر باوجودیکہ تم عارف دنیا ہو تمہیں لکھنا پڑے گا کوئی اور وجہ؟ ———"

"دوسری وجہ ہے کہ میں ڈرامے لکھتی ہوں چھوٹی موٹی ادیب ہوں مجھے اپنی تعریف کا شوق ہے میں کسی دوسرے شخص کی تعریف کو وقت کا زیاں سمجھتی ہوں ———"

"اس بار ایک دوست کی خاطر تمہیں قربانی دینی ہوگی ——— اور کوئی وجہ؟ ———"

"ایک وجہ اور بھی ہے لیکن وہ میں آپ کو نہیں بتاؤں گی؟ ———"

"بتاؤ بتاؤ دوستوں میں کیسا پردہ؟

مفتی جی جب کوئی اچھا ادیب ایک خوب صورت کتاب لکھتا ہے تو میں حاسد کے سو نہیں سکتی۔ میں آپ کی کتاب کو سمجھتی تو نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ یہ انوکھی اچھی اور بڑی مزہ لینے والی کتاب ہے۔ اگر آپ مجھے اس کی تعریف سے بری کر دیں تو کچھ لکھ دوں"

"تم بے شک اس کی تعریف نہ کرنا ———" مفتی جی نے PANICKY ہو کر اجازت دے دی۔

دیکھ لیجئے میں نے پوری کوشش کی ہے کہ کتاب کا کوئی مثبت پہلو آپ کے سامنے نہ آ سکے۔ اور دیکھ لیجئے مفتی صاحب اس وقت دل ہی دل میں پچھتا رہے ہیں کہ انہوں نے مجھے لبیک پر لکھنے کے لئے کیوں کہا۔

احرام تلے

مسعود قریشی

مفتی بہت ظالم ہے۔ بےپردہ در۔ ایذا پسند۔ اپنی اس حرکت سے حرم میں بھی باز نہیں آیا۔ احرام تلے تانک جھانک جاری رکھی۔ دوسروں کے بھی پردے کھولے۔ اپنے بھی۔

اُس کے ہاتھ میں قلم نہیں کیمرہ ہے۔ لوگ خوش ہوتے ہیں کہ تصویر اترے گی۔ خوبصورت کپڑے پہنتے ہیں۔ بناؤ سنگھار کرتے ہیں۔ پوز بناتے ہیں۔ مسکراہٹ اور خوش اخلاقی کا ملمع چڑھاتے ہیں۔ لیکن مفتی کے کیمرے میں فلیش لائٹ نہیں ایکسرے لائٹ ہے۔ تصویر اترتی ہے تو بیرونی پردے اور ملمع بالکل غائب۔ یہاں تک کہ کھال بھی اتر جاتی ہے ننگی حقیقتیں۔ وہ بھی جسم کی نہیں (اس حد تک تو تصویر کافی لوگوں کو قابلِ قبول ہوتی، بلکہ خوش آیند) بلکہ دل کی۔ دماغ کی روح کی ننگی تصویریں جنہیں دوسروں سے تو کیا لوگ خود اپنے سے چھپائے چھپائے پھرتے ہیں۔ اب اس حرکت پر لوگ اسے گالیاں نہ دیں تو کیا اس کا منہ چومیں؟ میں نے کئی دفعہ دیکھا ہے کہ جب اسی کا آئینہ کسی نے اُس کو دکھایا تو یہ خود بھی مرجھا کر رہ گیا اور قہقہوں کے پردے میں گالیاں بکنے لگا۔ یہ حرکت ہی ایسی ہے۔

مفتی نے سفاک مسیحا کی طرح نشتر زنی کا یہ عمل اپنی تمام ادبی زندگی میں جس استواری سے جاری رکھا ہے اُس کا کریڈٹ اسے نہ دینا ظلم ہوگا۔ اسی لیے اس بت خانے کے مُردار کو کعبے میں گاڑنے کا فتویٰ بجا ہے۔ اسی استواری کے انعام میں شاید کعبے والے نے اسے وہاں بلا لیا۔ وہ تو محض ایک اتفاق سمجھیے کہ شہاب کی شامت آئی اور وہ اسے حج پر لے گیا۔ اپنے بھی پردے کھلوائے دوسروں کے بھی۔ یہاں تک کہ دامنِ یزداں بھی سلامت نہ رہا۔ اگر کوئی رند اسے نائٹ کلب لے جاتا تو سفاک عکاسی کا یہ عمل مفتی وہاں بھی جاری رکھتا۔ اور ممکن ہے کہ عریاں جسموں کے نیچے کسی رندِ پارسا کی عبا و قبائے تقویٰ کی تصویر کھینچ لیتا۔

شعور و لاشعور کی تہوں میں چھپی حقیقتوں کی عکاسی کا عمل مفتی نے "ان کہی" سے لے کر "لبیک" تک ایمانی جنون کے ساتھ جاری رکھا ہے۔ اس دوران اپنے بیگانے ہو گئے۔ دوست دشمن بن گئے۔ پھبتیاں، جھڑکیاں، تیز لفظوں اور تُند نظروں کے سنگریزوں سے لہولہان ہوا لیکن شہیدوں کی شانِ بےنیازی سے اپنے راستے پر گامزن ہے۔ وہی پہلے سی لگن۔ وہی حق گوئی میں نتائج سے بےپروائی۔ وہی نشتر کی تیزی۔ وہی ماہرانہ چابکدستی سے

نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

فیض کو شروع زندگی میں جب ہلکے پھلکے سطحی رومانوی جذبات کے شاعرانہ اظہار سے زندگی کے گمبھیر پیچیدہ واقعات

تجربات کے موزوں پیرایۂ اظہار کا مرحلہ درپیش تھا تو اُس نے ان فنی دشواریوں کا ذکر یوں کیا۔

"میں جانتا ہوں کہ یہ تجربات کا قصور نہیں، شاعر کے ذہن کا عجز ہے۔ ایک کامل اور قادر الکلام شاعر ان مشکلات کو آسانی سے سر کر لیتا ہے۔ اسے اظہار کے یا نئے اسالیب ہاتھ آجاتے ہیں یا وہ پرانے اسالیب کو کھینچ تان کر اپنے مطالب پر موزوں کر لیتا ہے۔"

میرا خیال تھا کہ "ان کہی" کے مصنف کو "لبیک" کی تحریر میں اس دشواری، اس عجز یا کم از کم اس "کھینچ تان" سے دو چار ہونا پڑا ہوگا۔ کہاں "ان کہی" کی آیا مدہ کہاں "لبیک" کی حمیدہ کورہ! لیکن کتاب پڑھتے وقت اس کشمکش کا کہیں احساس نہیں ہوتا۔ لفظ اور مطلب میں کہیں کھینچا تانی نہیں۔ تجربات کی ندرت نئے اندازِ بیان کو ساتھ لائی اور تاثر انتہائی نیک روی سے قلبِ قاری پر نازل ہوتا ہے۔ یہ شاید اس لیے ممکن ہوا کہ مفتی تحت الشعوری محرکات کا عکاس ہے۔ رومان و محبت کی محفل ہو یا ایمان و عقیدت کی مجلس۔ اُس کی نظر انسان کے ظاہری عمل پر نہیں اندرونی ردِعمل پر ہوتی ہے۔ اس لیے تو "میزابِ رحمت" کے نیچے ہمہ وقت کھڑا رہنے والا فقیر اور اس کا مذاق اُڑانے والا نظم و نسق کا متوالا سرفراز بظاہر مختلف ہوتے ہوئے بھی اصل میں ایک ہیں اور بدلی برستی ہے تو دونوں "میزابِ رحمت" کے نیچے گتھم گتھا نظر آتے ہیں۔

اس رپورتاژ کے کچھ حصے مفتی سے سُنے۔ پھر چند قسطیں سیارہ ڈائجسٹ میں پڑھیں اور اب اسے کتابی صورت میں اوّل تا آخر پڑھا۔ بالکل آخر تک۔ یعنی قاسم محمود کی آپ بیتی بھی پڑھ ڈالی اور اس کتاب میں سب سے زیادہ تعجب خیز یہی گیارہ صفحے ہیں۔ اس سے پہلے اس رپورتاژ کے بارے میں مختلف لوگوں سے تبادلۂ خیال ہوا۔ جن میں ادیب، غیر ادیب، حاجی، غیر حاجی، دُنیا دار اور دیندار بھی شامل تھے۔ کسی کی بات میں ان مقدس ہیجان کا شائبہ تک بھی نہ تھا جس کا بکثرت اظہار قاسم محمود کی آپ بیتی میں درج خطوط سے ہوا۔ جن صاحب نے لکھا کہ "مفتی صاحب کی تحریر کفر ہے ان کے نظریات باطل ہیں" ان سے تو کوئی گلہ نہیں، کیونکہ ان کا ارشاد سر آنکھوں پر، لیکن اعتراض بالکل غیر متعلق ہے۔ مفتی نے اپنے اسلامی نظریات تو تراشے ہی نہیں۔ وہ تو سیدھا سادھا پیدائشی مسلمان ہے۔ اگر یہ اعتراض زندگی کے بارے میں مفتی کے نظریات پر ہوتا تو میں سب سے پہلے آمنّا و صدقنا کہتا۔ میں خود قائل ہوں کہ سخت بے ہودہ اور باطل نظریے رکھتا ہے۔ جن سے کئی دفعہ دوست مشکل میں پھنسے۔ عظیم فنکار محمود حسین مرحوم اس کی واضح مثال ہے۔ لیکن "لبیک" میں مفتی نے کوئی نئے اسلامی نظریات پیش ہی نہیں کیے۔ اگر وہ یہ حرکت کرتا تو سب سے پہلے قدرت اللہ اس کی سرزنش کرتے۔ پابندِ صوم و صلوٰۃ بیوی اور دوست اس کا ساتھ چھوڑ دیتے۔ اُس نے احکامِ حج یا نظریاتِ اسلام سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ صرف حاجیوں سے واسطہ رکھا، ان کے جذبات ان کے ردِعمل اور اپنی اندرونی کشمکش سے، یا پھر ایک بے پایاں جذب و مستی ایک ہمہ گیر سرشاری کی فضا پیدا کی ہے۔ اس بنا پر اسے سفاک پردہ دری کا طعنہ تو دیا جا سکتا ہے، الحاد کا نہیں۔ یہ تو رہا باطل نظریاتِ اسلام کا معاملہ۔ لیکن کمال تو اُن لوگوں نے کیا جنہوں نے مفتی پر اشتراکیت کی مقصد براری کا الزام لگایا۔ اشتراکی، مفتی سے یوں ناراض، کہ سخت رجعت پسند ہے

ہے ۔ مُسرورِ حضوری اور معجزاتِ روحانی کی باتیں کرتا ہے اور ان صاحبان کو یہ شکوہ کہ اشتراکیت کا پرچار کرتا ہے اس ستم ظریفی پر اور کیا کہا جائے کہ ؎

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

حجرۂ مبارک میں بیٹھا مفتی سوچتا ہے :-

"میرا جی چاہتا ہے کہ میں تیرے قدموں میں کھڑا ہو کر نعرہ لگاؤں کہ اے عظیم ترین انسان ۔ میں جو ننگِ انسانیت ہوں میں تجھے سلام کرتا ہوں ۔ تو جو میرا سلام قبول کرلے تو میری خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ رہے ۔ اور تجھے کوئی پوچھنے والا نہیں کہ ایسے شخص کا سلام کیوں قبول کیا جو انسانیت کے نام پر کلنک کا ٹیکہ ہے ۔"

(صفحہ ۲۲ باب حجرۂ مبارک)

کیا یہ روح کسی لادین اشتراکی کی ہے یا عاشقِ رسول کی ۔
مکہ معظمہ سے رخصت ہوتے وقت اُس کے جذبات یہ ہیں -

"اُس روز مکہ معظمہ میں میری تمام تر توجہ خانۂ خدا پر مرکوز تھی ۔ میرے خیالات اور جذبات اللہ کے لیے وقف ہو چکے تھے ۔ ہر جگہ ہر محاذ پر مجھے اللہ دکھائی دے رہا تھا ۔ وداع ہونے والے زائرین کے چہروں پر ، ان کی نگاہوں میں ، حرم شریف کے دروازے پر ، مکے کی گلیوں میں ، کوچوں میں ، سڑکوں پر ، اللہ نے چاروں طرف سے میرا محاصرہ کر رکھا تھا ۔ میں اُس سے یوں بھرا ہوا تھا جیسے مالٹا رس سے بھرا ہوتا ہے ۔ مجھ میں کسی غیر کی گنجائش ہی نہ رہی تھی ۔"

(صفحہ ۲۰۳ باب طوافِ وداع)

حرمِ کعبہ میں جس پر یہ کیفیتیں گزری ہوں مجھ جیسا محروم مسلمان تو اسے اللہ کا مقبول بندہ سمجھتا ہے ۔ چلیے آپ مقبول بندہ نہ بھی سمجھیئے کیونکہ آپ کو اس کے الفاظ و تراکیب سے اختلاف ہے ۔ آپ کو گوارا نہیں کہ وہ خانۂ خدا کی بجائے اللہ کا کوٹھا کہتا ہے ۔ لیکن اتنی سی بات پر اس پنجابی زدہ اردو ادیب پر اشتراکیت کا الزام تو نہ لگائیے ۔

اپنی اپنی قسمت ہوتی ہے ۔ وہ بھی ہیں کہ محض کھوکھلے نعروں سے ہی شیرِ اسلام بن جاتے ہیں اور وہ بھی ہیں کہ جذب و مستی کی کیفیت اور جذبۂ ایمانی کی انسانی تصویر کھینچ کر ملعون و مقہور ٹھہرائے جاتے ہیں ۔ اور ان کی کھال کھینچ لی جاتی ہے ۔

۔مشاہدہ حق گوئی کی گفتگو سنیے ۔
رلویں میں محبت کا طوفان
م ھقیں ۔ پیشانی منور ر
رسے وجود کے فتیلے
ں ۔ صرف کوٹھا رہ
۔ اس کی اوٹ میں

نہ سرد الفاظ میں کہاں ملے گی منفی محسوسات
راتی انداز تحریر اپنے عروج پر ہے ۔ روحانی
مجھانے کے لیے صاحب حال بزرگوں نے
ت کو مدنظر نہیں رکھا ؟ یہاں تک

ی تصویریں کھینچی ہیں ۔ بات فلسفہ ج
ز ہوتا ہے ۔ ایسے باب کا جو ماضی کی
نے کو کتنا خوبصورت انسانی پیراہن

فلے میں تحلیل ہو
۔ ان کے
سے بچھڑتی
بر نور بن
گیا تو

مو پر کا دوسرا رخ دیکھیے
جعت پر دنیاداری میں

" جب بھی کوئی وداع ہونے والا دروازے سے باہر نکلتا تو اللہ محبت بھری نظروں سے اُسے دیکھتا ہے اور اپنی اُنگلی آگے بڑھا کر کہتا، مجھے چھوڑ کے نہ جاؤ، مجھے ساتھ لے چلو۔" (صفحہ ١٩٥، باب طوافِ وداع)

اور کس بے دردانہ تکنیک سے اپنی محرومی کا ذکر کیا ہے:

" اس نے ملتجی نظروں سے میری طرف دیکھا اور انگلی بڑھا دی ۔" نہیں نہیں، میں تمہیں ساتھ نہیں لے جا سکتا۔" میں نے کہا "...... میں تیرے دوار پہ آ سکتا ہوں، میں تیرے حضور حاضری دے سکتا ہوں، میں تجھے سجدہ کر سکتا ہوں، تیرے پاس رہ سکتا ہوں، لیکن صرف چند ساعتوں کے لیے، چند لمحات کے لیے، چند دنوں کے لیے۔ میں تجھے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ میں تجھے ہمیشہ ساتھ نہیں رکھ سکتا۔"

(صفحہ ١٩٦ - ١٩٥، باب طوافِ وداع)

یہ کتاب تین ہستیوں سے بھرپور ہے ۔ اللہ، رسول اللہ اور اللہ کا ایک بندہ قدرت اللہ۔ باقی سب لوگ، سب واقعات انہی کے واسطے سے اُبھرتے ہیں۔ قدرت اللہ اتنے نہ اُبھرتے تو اچھا ہوتا۔ قدرت اللہ کی ذات کے لیے ۔ مفتی کی عزت کے لیے اور قاری کی ذہنی آسودگی کے لیے ۔ لیکن پھر شاید مفتی یہ رپورتاژ ہی نہ لکھتا۔ سخت خوشامدی ہے اور یہ اُردو ادب کی بڑی محرومی ہوتی ۔

مافوق الفطرت واقعات کا بیچ جھوٹ مفتی کی گردن پر۔ ماننے کو عقل نہ وہ دل نہیں مانتا۔ نہ ماننے سے اس نازک باب میں مفتی پر دروغ گوئی کا الزام آتا ہے ۔ اور یہ الزام دینے کا الزام میں اپنے سر لینا نہیں چاہتا، اس لیے ماننے نہ ماننے کا معاملہ ہر قاری کی اپنی افتادِ طبع پر چھوڑتا ہوں ۔

ایک بات جو سمجھ نہیں آئی وہ پیراگراف کے عنوانات ہیں ۔ اتنی رواں [illegible] تحریر پر لیبلوں کی برکتیں لگانے اور پڑھنے والے کی سوجھ بوجھ کی توہین کرنے کی کیا ضرورت درپیش تھی ۔ یہ عنوان تو چیخنے لگتے ہیں " اے پڑھنے والو! شاید تم سمجھ نہ پاؤ، اس پیرے میں دراصل مرکزی خیال میں ہوں ۔ اب تو سمجھ گئے نا ؟"

مفتی بوڑھا ہو کر اب سب کو بچہ سمجھنے لگا ہے شاید ۔

نظمیں

غزلیں

○

فراق گورکھپوری

بہتر یہی کہ ربط نہ رکھیں کسی سے ہم
تنگ آ گئے ہیں دوستی و دشمنی سے ہم

دنیا کے آبگینے میں آنے نہ پائے بال
لیتے ہیں سانس بھی بہت آہستگی سے ہم

اس جا تو ہر دریچہ و دروازہ بند ہے
نکلے صدا لگاتے ہوئے کس گلی سے ہم

ماتم کی انجمن ہو کہ بزمِ نشاط ہو
شامل ہیں اک ادائے کنارہ کشی سے ہم

کچھ پوچھنا نہیں ہے بتانا بھی کچھ نہیں
واقف ہیں چشمِ یار تری آگہی سے ہم

مشہور ہیں جہاں میں وہ نامِ فراقؔ سے
آؤ تمہیں ملائیں گے اک آدمی سے ہم

جب دل ٹکڑے ہو جائے گا

فیض احمد فیض

اب کیوں اُس دن کا ذکر کرو
جب دل ٹکڑے ہو جائے گا
اور سارے غم مٹ جائیں گے
جو کچھ پایا کھو جائے گا
جو مل نہ سکا وہ پائیں گے
یہ دن تو وہی پہلا دن ہے
جو پہلا دن تھا چاہت کا
ہم جس کی تمنا کرتے رہے
اور جس سے ہر دم ڈرتے رہے
یہ دن تو کتنی بار آیا
سو بار بسے اور اُجڑ گئے
سو بار لٹے اور بھر پایا

اب کیوں اُس دن کی فکر کرو
جب دل ٹکڑے ہو جائے گا
اور سارے غم مٹ جائیں گے
تم خوف و خطر سے در گزرو
جو ہونا ہے سو ہونا ہے
گر ہنسنا ہے تو ہنسنا ہے
گر رونا ہے تو رونا ہے
تم اپنی کرنی کر گزرو
جو ہوگا دیکھا جائے گا

فیض احمد فیض

○

یہ موسمِ گُل گرچہ طرب خیز بہت ہے
احوالِ گُل و لالہ غم انگیز بہت ہے

خوش دعوتِ یاراں بھی ہے یلغارِ عدو بھی
کیا کیجیے دل کا جو کم آمیز بہت ہے

یوں پیرِ مغاں شیخِ حرم سے ہُوئے یک جاں
میخانے میں کم ظرفیٔ پرہیز بہت ہے

اِک گردنِ مخلوق جو ہر حال میں خم ہے
اِک بازوئے قاتل ہے کہ خوں ریز بہت ہے

کیوں مشعلِ دل فیضؔ چھپاؤ تہِ داماں
بجھ جائے گی یوں بھی کہ ہوا تیز بہت ہے

میں دیکھتا ہی رہ گیا

ایس اے رحمٰن

دیروز میرے چھُٹ گئے
امروز و فردا لُٹ گئے
دل کے سہارے گھُٹ گئے
آنسو کہانی کہہ گیا
میں دیکھتا ہی رہ گیا!

چھائے ہیں اندھیرے گھنے
کچھ چوہدری ایسے بنے
ہراک کو چبوائیں چنے
دل میرا سب کچھ سہہ گیا
میں دیکھتا ہی رہ گیا!

دھن ہی خدا کیسے ہُوا
مَن بے سوا جیسے ہُوا
گُم رہنما ایسے ہُوا
دریا ہی اُلٹا بہہ گیا
میں دیکھتا ہی رہ گیا!

○

ایس اے رحمٰن

ہوئے صیدِ ستم چپ، چشمِ نم چپ
ہے چپ ہر سُو، زبانیں چپ، قلم چُپ

ستمگر ہے ستم کاری پہ نازاں
رہیں گے عدل کے کب تک قدم چُپ

کچھ ایسی بات تھی میرے بیاں میں
ہُوا ہے سامعِ رودادِ غم چپ

نشانِ زندگانی غلغلہ ہے
جو رکھتے ہیں زباں رہتے ہیں کم چپ

مفر کس کو یہاں رسمِ فغاں سے
جہاں میں ہے فقط راہِ عدم چپ

جفا کا ہاتھ جب اُٹھے کسی پر
نہیں ممکن رہیں تا دیر ہم چپ

جھکیں گے سر وہیں سب خود سروں کے
جہاں ہونا ہے سر دارا و جم چپ

سخن معیارِ ظرفِ آدمی ہے
کبھی رکھتی ہے انساں کا بھرم چپ

جتائے محسنوں نے اپنے احساں
کرم کر کے رہے اہلِ کرم چپ

کبھی جرمِ ضعیفی کا ہے پردہ
کبھی عہدِ وفا کی ہے قسم چپ

زبانِ دل سمجھتے ہیں وہی کچھ،
جنھیں کر دے لگن کا زیر و بم چپ

ہے ناطق چشم، لب خاموش میرے
سخن سے ہو گئی آخر بہم چپ

کھُلا اب تک نہ رازِ ذوقِ سجدہ
گپھائیں چپ، اندھیرے چپ، صنم چپ

پتا منزل کا پوچھا ہی کیسے ہم
رہے رستے کے سارے پیچ و خم چپ

صدا

ایس اے رحمٰن

حالات ہیں، خیالات ہیں
چھپ چھپ کر
تم
دیکھتے رہتے ہو مجھے
بڑھتا ہوں تمھاری طرف
میں نصف قدم
اور تم
گم

ہیں
لمحات ہیں ضُم!
اور تم
گُم!

قوس ست رنگ، فضا میں اُبھری
پر کھلے سمٹی ہوئی تتلی کے
گوشش ہیں مبہم قُم
تم!
جال پھیلا، ہوئے حلقے تنگ
کھُل گئے رنگ

انگ میں، رنگ میں، آہنگ میں
مسکراتی سی نظر
گاتی سی نظر
تم!
رِم جھم، رِم جھم
بوندیاں پیاسی زمیں پر ٹپکیں
بجلیاں چمکیں
بڑھتا ہوں دے کے صدا

میری ویران نگاہوں میں الم
یک دم
رازوں کے راز، طلسموں کے طلسم
تم
نُور کی لے کے ردا
گُم!

ایس۔ اے رحمٰن

آؤ کوئی علاجِ غمِ آرزو کریں ۔۔۔ نوکِ مژہ سے چاکِ گریباں رفو کریں

ڈھونڈیں سراغِ منزلِ جاناں جو گم ہُوا ۔۔۔ پھر راہِ یار میں کفِ پا کو لہو کریں

مسدود راستوں نے پکارا ہے شوق کو ۔۔۔ پھر اہتمامِ دار و رسن کو بہ کو کریں

کرتی ہے بار بار تقاضا نمازِ عشق ۔۔۔ خونِ جگر سے اہلِ محبت وضو کریں

پھیلائے گرد و زرد رہے ہیں وقت کے غبار ۔۔۔ شمعِ نفس جلائیں، زبانِ دف و ھو کریں

اُٹھے جفا کا ہاتھ تو سالم نہ رہ سکے ۔۔۔ پھر گوہرِ وفا کی بحال آبرو کریں

رہبر اگر ہوں راہزن، ہم اپنے خون سے ۔۔۔ پاسِ وفا کی اُن کے دلوں میں نمو کریں

چھینی ہو جس سے وقت نے احساس کی متاع ۔۔۔ اُس قلب کو پھر آشنائے رنگ و بو کریں

کھوئے ہوئے وقار سے تجدیدِ رابطہ ہو ۔۔۔ آؤ پھر اپنے آپ کی ہم جستجو کریں

پھر فرد کا ہو رشتہ جماعت سے استوار ۔۔۔ پھر دورِ جام کے لیے مرکز سبو کریں

سرگشتہ پھر رہے ہیں کئی تشنہ جاں ابھی
پیش اُن کو میرا سادہ سفالی کدو کریں

O

ایس۔ اے رحمٰن

سر منڈاتے ہی پڑ گئے اولے / ناگہانی پہ کوئی کیا بولے
بات کرنے سے پہلے لازم ہے / ہر کوئی اپنی بات کو تولے
علم بالا ہے خود نمائی سے / اپنے لفظوں میں شہد بڑ بولے
چلتی رہتی ہے وقت کی چکی / ساتھ چلتے ہیں اس کے ہچکولے
یار لوگوں کو مل گئی شہ ہی / بڑھ کے گولے سکے رہ گئے گولے
جن کی جھولی پھٹی تھی، کیا کرتے / بخت والوں نے بھر لیے جھولے
سچ کا سادہ سا اک لبادہ ہے / جھوٹ کے ہیں مگر کئی چولے
گوش آشوب کیوں صدا واعظ؟ / بات وہ کان میں جو رس گھولے
کتنے سننے کی ریت ابھی ہے / دل کی گرہیں مگر کوئی کھولے
یا کسی کو بنائے تو اپنا / یا کسی دوسرے کا خود ہو لے
راہِ حق میں جو سر کٹے تو کٹے / پر نہ ایمان کا قدم ڈولے
ہلکا ہوتا ہے اس سے اکثر جی / دل جو بھر آئے، تھوڑا سا رو لے
شیخ بھی ہو گئے زمانہ شناس / گاتے پھرتے ہیں آج کل ڈھولے
لوٹ آئی ہے ندی توبہ کی / دامن آلودہ! وقت ہے دھو لے

راکھ میں ڈھونڈتے ہو چنگاری
تم بھی زرداں ہو کس قدر بھولے

احسان دانش

ہم عقیدہ نہیں رکھتے کسی سادھو کی طرح
اپنی درویشی ہے سلطانیٔ باہُو کی طرح

منصفی کون کرے گا ترے ابرو کی طرح
یہ مرے عشق و ہوس میں ہے ترازو کی طرح

میرے سجدے دل کو ضد ہے کوئی بیجا تو نہیں
کچھ تو محرابِ حرم ہے ترے ابرو کی طرح

ہم قدم ان کا تصوّر ہو تو آتا ہے نظر
دشت بے آب گزرگاہِ لبِ جُو کی طرح

لوٹ کر آ ہی گیا نشو و نما کا موسم
ورنہ ہر شاخ تھی سُوکھے ہُوئے بازو کی طرح

باغ کی پُشت پہ چھوڑا تو ہے فطرت نے انار
چاند نکلا تو ہے اک شاہدِ خوش رو کی طرح

صبح سبزے پہ وہ آہستہ خرامی اس کی
دھان کے کھیت میں چرتے ہُوئے آہو کی طرح

دل تری یاد سے شاداب، نگاہیں ویران
ہونٹ ہیں خشک، قدم تر ہیں لبِ جو کی طرح

اُن کے آنے کا پتہ دیتی ہے ہر موجِ نفس
من کے مندر میں سلگتے ہُوئے خوشبو کی طرح

بام و در کبھی تمھیں دیکھیں یہ کہاں ان کی مجال
چاندنی اوڑھ کے آجاؤ کبھی خوشبو کی طرح

ہائے رُک رُک کے وہ زینے سے اُترنا ان کا
بوئے بارود سے سہمے ہُوئے آہو کی طرح

تذکرہ چھڑ گیا اُن کا جو کبھی اے دانشؔ
اشک پلکوں پہ لرزنے لگے جگنو کی طرح

احسان دانش

○

اشک افشانی کو سخن زندگانی کر دیا
کتنے مشکل مسئلے کو تم نے پانی کر دیا

میرے اسلوبِ نگارش کو دعا دو دوستو
معتبر یہ کارِ الفاظ و معانی کر دیا

اس میں کھیتوں کی خطا کیا، شامتِ اعمال ہے
جس نے بازاروں کو مفلس کی جوانی کر دیا

کوچے کوچے اب انھیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں لوگ
ہم نے ہر اہلِ نظر کو اپنا ثانی کر دیا

آج کی تاریخ سے سب نامہ و پیغام بند
اُن سے جو کچھ عرض کرنا تھا زبانی کر دیا

علم والوں سے بھی جب کشکول میں آئی نہ بھیک
میں نے اپنا مشغلہ آوارہ خوانی کر دیا

دورِ نو نے مصر کے بازار کو دے دی شکست
ہر جوانی کو زلیخا کی جوانی کر دیا

تشنہ لب رکھا جو موسم نے سمندر پر مجھے
میں نے اپنی فرصتوں کا خون پانی کر دیا

کندنی کرنوں نے دن بھر بالیوں کو چاٹ کر
کھیتیوں کے سبز قالینوں کو دھانی کر دیا

جب مری بیداریوں سے روشنی چھننے لگی
میں نے نیندوں کو سپردِ باغبانی کر دیا

بے توقف آنسوؤں کے سوت جاری ہیں ہنوز
تو نے یکجا کتنے دریاؤں کا پانی کر دیا

ہم سے دیوانے تو مر جاتے مگر تیرا کرم
شدتِ غم کو دلوں کی شادمانی کر دیا

تھا جو دو روحوں میں باہم فیصلہ دانش کبھی
ہم نے اس کو بھی رقم کر کے کہانی کر دیا

احسان دانش

اوّل سے آدمی ہے خدا کی تلاش میں / جلوہ ہے اپنے جلوہ نما کی تلاش میں
دل کو سرورِ شبلی و سرمد کی جستجو / آنکھیں نگارِ لالہ قبا کی تلاش میں
میں اُس جگہ ہوں کربِ پیمبر سے سرفراز / خود چارہ گر جہاں ہے دوا کی تلاش میں
ہر موڑ پر ہیں لاکھ یزیدانِ کج نہاد / جانِ حسین و دشتِ بلا کی تلاش میں
جب اُن سے پہلی بار ملی تھی نگاہِ شوق / اب تک ہوں میں اُس آب و ہوا کی تلاش میں
ہوں گے وہ کوئی جن کو ملی رہنما سے راہ / ہم کھو گئے ہیں راہ نما کی تلاش میں
اس میری جستجو کا نہ جانے ہو کیا مآل / نکلا ہوں میں حرم سے خدا کی تلاش میں
یہ اور بات ہے کہ میسّر کہیں نہیں / اہلِ وفا ہیں اہلِ وفا کی تلاش میں
قسمت بُری تھی گرم بگولوں نے آلیا / نکلے تھے گھر سے بادِ صبا کی تلاش میں
کس سامری نے دُھول یہ آنکھوں میں جھونک دی / انساں ہے خوار اپنی انا کی تلاش میں

دانش یہاں بُتوں کا نظارا بھی ہے بہت
تم گھر سے چل پڑے ہو خدا کی تلاش میں

○

احمد ندیم قاسمی

کتنے سر تھے جو پروئے گئے تلواروں میں
گنتیاں دب گئیں تاریخ کے طوماروں میں

شہر ہیں یہ کہ تمدّن کے عقوبت خانے
عمر بھر لوگ چُنے رہتے ہیں دیواروں میں

ان کو دیکھا غمِ مزدور میں گریاں ان کو
شب کو جو لوگ سجے بیٹھے تھے درباروں میں

آپ دستار اُتاریں تو کوئی فیصلہ ہو
لوگ کہتے ہیں کہ سر ہوتے ہیں دستاروں میں

آج بھی ملتے ہیں منصور ہزاروں ، لیکن
اب انا الحق کی صلابت نہیں کرداروں میں

نہ کرو ظلِّ الٰہی کی بُرائی کوئی
دوستو کفر نہ پھیلاؤ نمک خواروں میں

وہی ہر دور کے نمرود کے مجرم ہیں جنھیں
پھول کھلتے نظر آ جاتے ہیں انگاروں میں

جو بھی آتا ہے وہ ہنستا ہُوا لُٹ جاتا ہے
بس گیا ہے کوئی آسیب سا بازاروں میں

انقلاب آنے سے پہلے کا یہ منظر ہے عجیب
دشت میں پھول، بگولے ہیں چمن زاروں میں

رُت بدلتی ہے تو معیار بدل جاتے ہیں
بلبلیں خار لیے پھرتی ہیں منقاروں میں

یوں تو کہنے کو بس اک بار ہی میں کڑکا تھا
دیر تک کون گرجتا رہا کہساروں میں

چُن لے بازارِ ہنر سے کوئی بہروپ ندیمؔ
اب تو فن کار بھی شامل ہیں اداکاروں میں

○

احمد ندیم قاسمی

میں اس فریب ہی میں رہا مبتلا سدا
ہر آشنا رہے گا مرا آشنا سدا

حیراں ہوں یہ کون سا معیارِ عدل ہے
جو مجھ میں بس گیا، وہی مجھ سے جُدا سدا

یوں مجھ پہ ٹوٹ ٹوٹ کے برسی ہیں رحمتیں
کٹ کٹ کے گر پڑا مرا دستِ دعا سدا

میں بولتا نہیں ہوں مگر دیکھتا تو ہوں
لب میرے سل چکے مگر آنکھیں ہیں وا سدا

یا ربّ تُو اوجِ عرش سے اُترے تو یہ بتاؤں
اس عدل گہ میں مارا گیا بے خطا سدا

یہ زندگی تو جیسے فقط مشقِ مرگ ہے
میں تو غمِ حیات میں مرتا رہا سدا

مر جاؤں گا کہ صرف خدا کو ثبات ہے
مانگوں گا میں خدا سے مگر خوں بہا سدا

صدیوں کے کارواں بھی کہیں آس پاس ہیں
کانوں میں گونجتی ہے صدائے درا سدا

سچّا ہوں میں کہ مجھ پہ مسلط ہے سچ کا خوف
لہرائے میرے سامنے یہ اژدھا سدا

کچھ آگے کفر ہے، تو چلو کفر ہی سہی
کیوں نارسا رہے مری فکرِ رسا سدا

ہر حادثے کے بعد یہ الجھن رہی ندیمؔ
بندے سے بے نیاز رہا کیوں خدا سدا

افریقہ

احمد ندیم قاسمی

دھرتی نے بدل لیا ہے محور
صحراؤں پہ برف گر رہی ہے
قطبین پہ ریت اُڑ رہی ہے
یورپ کے افق پہ — لڑکھڑاتی
اک فوج سیاہ سورجوں کی
گر گر کے غروب ہو رہی ہے
شب رنگ جبینِ افریقہ سے
اک صبح طلوع ہو رہی ہے
حبشی نے زمیں کی باگ تھامی
اعزاز بنی سیاہ فامی

دن آ گئے

احمد ندیم قاسمی

دب کے رہنے کے دن جا چکے
کچھ نہ کہنے کے دن جا چکے
وار کرنے کے دن آ گئے
وار سہنے کے دن جا چکے

اب تو قدریں پگھلنے لگیں — اور معیار گلنے لگے
جو جواہر لہو سے ڈھلے — مٹھیوں سے پھسلنے لگے
جن کے ہاتھوں میں ہتھیار تھے — اب وہی ہاتھ ملنے لگے
اب تو سورج اُترنے لگا — اور سائے تو ڈھلنے لگے
اب تو پتھر بھی مڑنے لگا — اب تو پربت بھی چلنے لگے
گرم صحراؤں کی کوکھ سے — سرد چشمے اُبلنے لگے
جو دلوں میں چھپے تھے دئے — اب تو آنکھوں میں جلنے لگے
وقت پیچھے کہیں رہ گیا — لوگ آگے نکلنے لگے
اِدھر اُدھر کا کیا تذکرہ — اندر اندر بدلنے لگے

دب کے رہنے کے دن جا چکے
کچھ نہ کہنے کے دن جا چکے
وار کرنے کے دن آ گئے
وار سہنے کے دن جا چکے

○

جمیل مظہری

ممنونِ انتظارِ گوشِ شعور ہوں میں
پہنچوں گا دیر سے کچھ آوازِ دور ہوں میں

جو کچھ ہُوا وہ بیشک میرا قصور لیکن
اے نازِ کبریائی کس کا قصور ہوں میں

اب تو یہی قلق ہے میرا بھی مجھ پہ حق ہے
تجھ سے قریب ہو کر اپنے سے دور ہوں میں

ابلیسیت بھی مجھ میں قدوسیت بھی مجھ میں
دونوں کے رابطے کا پہلا فتور ہوں میں

اک میرا دل چکائے کس کس کا قرض آخر
ممنونِ نار ہوں میں ممنونِ نور ہوں میں

ہستی کا کارخانہ بگڑے تو کیوں نہ بگڑے
کچھ ناصبور ہو تم، کچھ ناصبور ہوں میں

اُٹھتی نہیں ہے ساقی مجھ سے تیری امانت
شیشے کو کیا بچاؤں خود چور چور ہوں میں

ہم میں جمیلؔ شاید صدیوں کا فاصلہ ہے
اہلِ شعار تم ہو اہلِ شعور ہوں میں

رباعیات

اختر انصاری

○

آیا یہ غم و یاس کا بھبکا کیسا!
شعلہ یہ کسی ٹیس کا لپکا کیسا!
او نغمۂ انبساط گانے والے
آنسو یہ تری آنکھ سے ٹپکا کیسا!

○

کس درجہ رہے بے خود و بے راہ نہ پوچھ
کس قہر کی غفلت رہی اللہ نہ پوچھ
اب جاکے ہُوا شعورِ ہستی پیدا
بالغ ہُوئے کس عمر میں ہم آہ نہ پوچھ

○

احساس کے تاروں کو جھنجھوڑا میں نے
غفلت کی کلائی کو مروڑا میں نے
ٹپکے مہ و خورشیدِ درخشاں کیا کیا
جب اپنی شبِ غم کو نچوڑا میں نے

○

واعظ! مرے اذکار کی لذت مت پوچھ
مخمورِ وظائف کی حلاوت مت پوچھ
کل پچھلے پہر عالمِ مدہوشی میں
جو مجھ کو ملا لطفِ عبادت مت پوچھ

○

ہنس ہنس کے زمانے کو ہنسانے والے
گفتار کو عنبر میں بسانے والے
کیوں تو نے نظر بچاکے آنسو پونچھا
محفل کو طرب زار بنانے والے!

○

یہ عمر کی بل کھاتی ہوئی چڑھتی ندی
ہو جائے گی کل لقمۂ سیلِ ابدی
تو جشنِ حیات آپ منا لے اپنا
دنیا نہ منائے گی تری جشنِ صدی

○

گر گر کے سنبھلتے ہیں سنبھلنے والے
ہر سانچے میں ڈھل جاتے ہیں ڈھلنے والے
گلشن بھی کہیں گل کدہ ہے اور کہیں
جلتے ہیں بغیر آگ کے جلنے والے

○

دیتا ہوں غمِ عشق کی بانہوں کو خراج
اس زیست کی اُلجھی ہوئی راہوں کو خراج
مجھ سے نہ رکھے چشمِ تضرع خالق
دیوانے سے ملتا نہیں شاہوں کو خراج

○

ہاتھوں میں مرے ساغرِ جم بھی ہوتا
میں بہرہ ورِ ذوقِ نعم بھی ہوتا
شہ رگ سے بھی جو قریب تر ہے میرے
اے کاش وہ نزدیکِ شکم بھی ہوتا

○

حالات کو رو براہ کر لیتا ہوں
ناجنسوں سے نباہ کر لیتا ہوں
ابلیس کی بھی دل شکنی خوب نہیں
گاہے گاہے گناہ کر لیتا ہوں

○

بالیدگیِ جسم کی خاطر نہ جیے
چاکِ جگرِ زیست ہی دن رات سیے
یہ جانِ نزار و بدنِ کاہ نما
یوں بھی ہے بہت قبر کے کیڑوں کے لیے

○

تقدیر سے فرصت نہ ملی پر نہ ملی!
تنشیط کی دولت نہ ملی پر نہ ملی
دیتے ہی رہے نفس کو اپنے مہلت
سنے ہے ہمیں مہلت نہ ملی پر نہ ملی

○

ترکیبِ زماں ہے کس کی سازش یا رب
ہر نقش یہاں کس کی تراوش یا رب
یہ ہستیٔ برباد، یہ جانِ ناشاد
میری ہے کہ تیری آزمائش یا رب

○

اب زہر ہی مرغوب ہے، پینے دے مجھے
زخمِ جگرِ زیست کو سینے دے مجھے
راس آئے گی یا رب نہ مجھے راحتِ مرگ
میں خوگرِ آزاد ہوں، جینے دے مجھے

○

اک روز مرا وقت بھی آ جائے گا
ہر بزم میں ماتم بھی کیا جائے گا
کچھ کام بھی آئے گا مرے حشر کے دن؟
اخبار میں اک شذرہ جو لکھا جائے گا

○

گلشن مرے خوابوں کے دہکتے ہی رہے
تخئیل کے طائر بھی چہکتے ہی رہے
اس دل نے بہت خاک اُڑائی لیکن
سینے میں جو تھے زخم مہکتے ہی رہے

○

ناظورۂ نیکی و بدی کی چھل بل
گندم سے کے خمارِ سرمدی کی چھل بل
آزردہ و دل تنگ ہیں پچھلی صدیاں
اللہ رے بیسویں صدی کی چھل بل

○

توفیقِ ازل ہے اک فسانہ اے دل!
تقصیر کے وعدے پہ نہ جانا اے دل!
اب وقت کے مرہم کی توقع بھی نہیں
زخموں سے ہے چُور خود زمانہ اے دل!

○

اذکار کی گرمی سے پھُکے جاتے ہیں!
دم سیلِ حقائق سے رُکے جاتے ہیں
اللہ رے افزونیِ سرمایۂ ذہن
اس بوجھ سے نوشانے جھکے جاتے ہیں

○

جیسے شبِ غم بیت رہی ہو کوئی
یا وقت نے خود چوٹ سہی ہو کوئی
یہ کرب، یہ لذت، یہ تفکر، یہ نشاط
خالق نے غزل جیسے کہی ہو کوئی!

○

اُس حال پہ تُف جس میں یہ حالت ہو جائے
مائل بہ کرم جورِ مشیت ہو جائے!
اللہ کرے فطرتِ سفاک مجھے
غارت کرے اور خود بھی غارت ہو جائے!

ادا جعفری

○

راستہ روک رہی ہو جیسے یاد راہوں میں کھڑی ہو جیسے
نکہتِ موجۂ گل یوں آئے بھید سا کھول رہی ہو جیسے
اٹھتے اٹھتے کوئی محبوب نگہ اپنے سائے سے ڈری ہو جیسے
یا کسی خواب نے آنکھیں کھولیں یا عبادت کی گھڑی ہو جیسے
گھر کے آنگن میں نہ اُترے سورج رات گھبرا سی گئی ہو جیسے
وہ جو دیوار میں چنوائی گئی کوئے جاناں کو چلی ہو جیسے
وہ جو گیتوں کی دھڑکتی لو تھی شعلۂ جاں میں ڈھلی ہو جیسے
قرض تھا حرفِ تمنّا کس پر زندگی پوچھ رہی ہو جیسے
ہم جسے سنگِ گراں سمجھے تھے اپنی ہی سادہ دلی ہو جیسے
پھر شرارہ کوئی ارزاں ہوگا راکھ پلکوں پہ جمی ہو جیسے

مہرباں چشمِ گہربار ادا
اور کسی شے کی کمی ہو جیسے

مگر مجھے بتاؤ کیوں

ادا جعفری

مجھے یہ آئینہ دکھاؤ کیوں
ازل کے دن سے آج تک
مری تمام زندگی بس ایک حرفِ آرزو
مرا غبارِ چار سُو

تمھارے پاس کیا نہیں
تمھارے پاس کیا نہ تھا
جو میں نہ تھی تو کیا ہُوا

تمھاری بزمِ ناز میں جمال بھی جلال بھی
جو التفاتِ جاوداں تو اجتنابِ بیکراں
تمام آفتابِ جاں
وہ روشنی وہ خیرگی
کہ تم کہاں
تمھاری بزمِ دلبری میں اپنی سمت دیکھ لوں
نہیں مری مجال بھی

مرا ہر اک خیال بھی
تو پھر مجھے بلاؤ کیوں
محبتوں کی آڑ میں
جنوں کو آزماؤ

میں بے قرار و خستہ تن
بس اک شرارِ عشق میرا پیرہن
مرا وجود اک نگاہِ مضطرب
نگاہ جس کے پاؤں میں ہیں بیڑیاں پڑی ہوئی
کہ باوجودِ سرخوشی
میں ناتمام داستاں
جو دلربا نہیں تو پھر
یہ داستاں سناؤ کیوں
میں بے نوا میں نارسا
مگر مجھے بتاؤ کیوں !!

ادا جعفری

○

گھر کا رستہ بھی ملا تھا شاید
راہ میں سنگِ وفا تھا شاید

اک ہتھیلی پہ دیا ہے اب تک
ایک سورج نہ بجھا تھا شاید

اس قدر تیز ہوا کے جھونکے
شاخ پر پھول کھلا تھا شاید

لوگ بے مہر نہ ہوتے ہوں گے
وہم سا دل کو ہُوا تھا شاید

خون دل میں تو ڈبویا تھا قلم
اور پھر کچھ نہ لکھا تھا شاید

تجھ کو بھُولے تو دعا تک بھُولے
اور وہی وقتِ دعا تھا شاید

موجۂ رنگ بیاباں سے چلا
یا کوئی آبلہ پا تھا شاید

وقت کا ہر آن بدلتا لہجہ
ہم سے کچھ پوچھ رہا تھا شاید

کیوں اداؔ کوئی گریزاں لمحہ
شعر سننے کو رُکا تھا شاید

○

حال کھُلتا نہیں جبینوں سے
رنج اُٹھائے ہیں کن قرینوں سے

رات آہستہ گام اُتری ہے
درد کے ماہتاب زینوں سے

ہم نے سوچا نہ اُس نے جانا ہے
دل بھی ہوتے ہیں آبگینوں سے

کون لے گا شرارِ جاں کا حساب
دشتِ امروز کے دفینوں سے

تُو نے مژگاں اُٹھا کے دیکھا بھی
شہر خالی نہ تھا مکینوں سے

آشنا آشنا پیام آئے
اجنبی اجنبی زمینوں سے

جی کو آرام آگیا ہے اداؔ
کبھی طوفاں کبھی سفینوں سے

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا

ظہیر کاشمیری

خزاں کی سانسیں اکھڑ چکی ہیں، بہار دھومیں مچا رہی ہے
گلوں کے چہرے دمک اٹھے ہیں، نسیم جھومے بجا رہی ہے
چمن کی سرخ و کبود وسعت قدم قدم جگمگا رہی ہے
بکھر چکا ہے غبارِ شب، آفتابِ تازہ ابھر رہا ہے جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا، وہ عالمِ پیر مر رہا ہے

گرسنہ چہروں، دریدہ جاموں پہ بارشِ رنگ ہو رہی ہے
فراخ دنیا شہنشہوں کے غرور پر تنگ ہو رہی ہے
غلام و آقا کے درمیاں اک بے اماں جنگ ہو رہی ہے
جو رنگ ماضی میں ڈوب چکا ہے، وہ آدمی پھر ابھر رہا ہے جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا، وہ عالمِ پیر مر رہا ہے

سروں سے آ کر ٹل گئے ہیں، فراقِ دیروز کے زمانے
مؤرخِ عشق لکھ رہا ہے، وصالِ امروز کے فسانے
جنوں نے امکاں کی وسعتوں میں سجا دیے ہیں نگار خانے
شکن شکن گیسوئے زمانہ، نئی پھبن سے سنور رہا ہے جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا، وہ عالمِ پیر مر رہا ہے

نئے عزائم کی سرخوشی سے، دیار و صحرا چہک اٹھے ہیں
روایتوں کی گھٹی فضا میں گلِ بغاوت مہک اٹھے ہیں
جہانِ کہنہ کی وادیوں میں شرارِ فردا لپک اٹھے ہیں
بشر کا قاتل نظامِ باطل خود اپنی جاں سے گزر رہا ہے جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا، وہ عالمِ پیر مر رہا ہے

ہے آدمِ نو کی آمد آمد، ہجومِ رجعت بکھر رہا ہے
پرانی قدروں کا ہر محافظ خود اپنے سائے سے ڈر رہا ہے
زمیں پہ لرزہ ہوا ہے طاری، سروں سے پانی گزر رہا ہے
یہ انقلابِ اُمم کا لمحہ، رقم نیا باب کر رہا ہے جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا، وہ عالمِ پیر مر رہا ہے

آمدِ رفتگاں

ظہیر کاشمیری

ہجر کے دشت کا فاصلہ کٹ گیا   وصل کی محفلیں پھر فروزاں ہوئیں
آنکھوں میں کھلے پھول تمہید کے   بام و در کی فضائیں چراغاں ہوئیں
راستے سربسر مشکبو ہوگئے

آملے پھر سے بچھڑے ہوئے قافلے

جاں سے پیاروں کی آمد کا چرچا ہوا   منتظر صورتیں نغمہ خواں ہوگئیں
جاگ اٹھیں، گئے دور کی خواہشیں   دلربائی کی رسمیں جواں ہوگئیں
چھڑ گئے ناز و انداز کے سلسلے

آملے پھر سے بچھڑے ہوئے قافلے

یوسفو! خوابِ زنداں کا موسم گیا   لو کشادہ ہے دامانِ مصرِ وطن
ہے زلیخا جمالوں سے نسبت تمہیں   آؤ تازہ کرو پھر سے جشنِ کہن
نوجواں ہوگئے عشق کے حوصلے

آملے پھر سے بچھڑے ہوئے قافلے

عشرتِ رقص و مستی کی رت آگئی   رنگ خوشبوؤں کے گلزار پر چھا گئے
آرزوؤں کی باہیں کشادہ ہوئیں   حلقۂ بزمِ یاراں میں تم آگئے
اب نہ ہوں گے جدائی کے شکوے گلے

آملے پھر سے بچھڑے ہوئے قافلے

رنگیں سویرے

ظہیر کاشمیری

صحنِ چمن پر، بادِ سحر نے، شبنم کے موتی لٹائے
دشت و دمن کی اُجلی زمیں پر کرنوں نے سہرے سجائے
پنگھٹ پہ لہرائے خوش رنگ آنچل، ساحل پہ جاگے مچھیرے
آئے ہیں رنگیں سویرے

ڈھوروں کو لے کر نکلے گوالے، ماضی کے قصے سناتے
کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر رواں ہیں، دہقان تانیں اُڑاتے
محنت کشوں نے دھرتی پہ ہر سُو، محنت کے موتی بکھیرے
آئے ہیں رنگیں سویرے

پھوٹے ہیں خوشیوں کے دلکش ترانے، آسودہ دیوار و در سے
سینوں میں چاہت کے ارماں سجائے، نکلے ہیں لوگ اپنے گھر سے
تازہ اجالوں کی تازہ فضا میں ہنستے ہیں خوش باش چہرے
آئے ہیں رنگیں سویرے

اُڑتے اندھیروں کے ساتھ اُڑ چلے ہیں، خوابِ گراں کے زمانے
بزمِ جہاں میں چھڑنے لگے ہیں، آئی رُتوں کے فسانے
آئی رُتوں نے لہرا دیے ہیں، خوشیوں کے چنچل پھریرے
آئے ہیں رنگیں سویرے

اپنے پائیں باغ کو دیکھ کر

ظہیر کاشمیری

صبح کے ساتھ اُٹھے، رُوئے نہالاں سے نقاب
نورِ تازہ سے بڑھی، سرو سمن کی تب و تاب
گل بر انداز خلاؤں میں چھڑے چنگ و رباب
شاخساروں پہ سرِ شام ہوا کھیلتی ہے
کنج در کنج بہاروں کی ادا کھیلتی ہے
بند کلیوں پہ حسینوں کی حیا کھیلتی ہے

بارشِ ابر سے خوش پوش ہُوا سبزۂ تر
بہرِ نظارۂ گل مل گئی نرگس کو نظر
آج کانٹوں پہ بھی تلنے لگے شبنم کے گہر
ہر طرف کیف لُٹاتے ہیں زرِ گل کے ایاغ
ہر روش پر ہیں فروزاں، رُخِ لالہ کے چراغ
یہ چمن آنکھ کی ٹھنڈک، یہ چمن دل کا فراغ

ہر ثمر بارِ شجر، دعوتِ نظارہ ہے
ہر ثمر فطرتِ فیّاض کا شہ پارہ ہے
یہ چمن لذّت و الوان کا گہوارہ ہے
یہ چمن اصل میں تحریکِ نمو ہے لوگو
رجعت و مرگ و تساہل کا عدو ہے لوگو
اس کے ذرّوں میں شہیدوں کا لہو ہے لوگو

خاموش رہو

ابنِ انشا

کچھ کہنے کا وقت نہیں یہ — کچھ نہ کہو، خاموش رہو
اے لوگو خاموش رہو — ہاں اے لوگو، خاموش رہو

سچ اچھا، پر اس کے جلو میں زہر کا ہے اک پیالہ بھی
پاگل ہو؟ کیوں ناحق کو سقراط بنو، خاموش رہو

حق اچھا — پر اس کے لیے کوئی اور مرے تو اور اچھا
تم بھی کوئی منصور ہو جو سولی پہ چڑھو؟ خاموش رہو

اُن کا یہ کہنا سورج ہی دھرتی کے پھیرے کرتا ہے
سر آنکھوں پر، سورج ہی کو گھومنے دو — خاموش رہو

محبس میں کچھ حبس ہے اور زنجیر کا آہن چبھتا ہے
پھر سوچو، ہاں پھر سوچو، ہاں پھر سوچو، خاموش رہو

گرم آنسو اور ٹھنڈی آہیں، من میں کیا کیا موسم ہیں
اس بگیا کے بھید نہ کھولو، سیر کرو، خاموش رہو

آنکھیں موند کنارے بیٹھو، من کے رکھو بند کواڑ
انشا جی لو دھاگا لو اور لب سی لو، خاموش رہو

شان الحق حقی

○

وہ مزا رکھتے ہیں کچھ تازہ فسانے اپنے
بھولتے جاتے ہیں سب درد پرانے اپنے

حال میں اپنے کچھ اس طرح مگن ہیں گویا
ہم نے دیکھے ہی نہیں اگلے زمانے اپنے

کر کے اک بار تری چشم فسوں گر کے سپرد
پھر نہ پوچھا کبھی ہم دل کو خدا نے اپنے

ہم وہی ہیں کہ جہاں بات کسی نے پوچھی
خوش گماں ہو کے لگے داغ دکھانے اپنے

بزم یاراں میں وہ اب کیف کہاں ہے باقی
روز جاتے ہیں کہیں جی کو بہلانے اپنے

ہمنشیں دوست کی صورت تو کہاں ملتی ہے
جس سے وہ ہے جو دشمن کو نہ جانے اپنے

دور کتنا ہی ترے بام سے بھٹکا ہو خیال
طائروں کو کبھی بھولے ہیں ٹھکانے اپنے

بستیاں دل کی بھی ویراں ہیں نگاہوں کی طرح
ہیں ابھی ہم کو بہت شہر بسانے اپنے

نو بنو روز دکھاتی ہے کرشمے دنیا
آسماں کے وہی انداز پرانے اپنے

ذکر سے اُس کے سنوارا ہے سخن کو حقی
خوش مزا لگتے ہیں کانوں کو ترانے اپنے

شان الحق حقّی

○

یوں تو ہر سمت سے اُٹھتی ہیں بڑی آوازیں
نہ کوئی جوت نہ جھنکار، نری آوازیں

گونج اُٹھیں تو سرِ بزم قیامت کر دیں
یہ گلوگیر شکنجوں میں کسی آوازیں

کھوج کیا لیجیے، ہیں صرف لہو کی لہریں
وہ جو بنتی ہیں کبھی رنگ کبھی آوازیں

پھوٹ نکلیں گی کسی دن گل و گلشن کی طرح
ہیں بہت خاک کے تودوں میں دبی آوازیں

کبھی ملتے ہیں نہ تیغ تڑپتے ہوئے بول
کبھی ہوتی ہیں صلیبوں پہ چڑھی آوازیں

جا کے منجدھار میں کیا موج سے ٹکر لیں گی
یہ کناروں سے بندھی گھاٹ لگی آوازیں

وہ بھی دن تھے کہ کھنچے رہتے تھے ساز ان کے لیے
ان دنوں ساز سے رہتی ہیں کھنچی آوازیں

کان ہر چند ترستے ہیں مگر دھیان میں ہیں
وہ لہکتے ہوئے بول اور وہ کھلی آوازیں

تم الجھتے ہو وہاں اپنی الاپیں حقّی
نہ سنی جائیں جہاں کان پڑی آوازیں

○

جس نے اک خس کے لیے صحرا کو چھانا ہوئے گا
کون ہوگا کوئی ہم سا ہی دوانہ ہوئے گا

تم کو دل کی راہ سے خلوت میں آنا ہوئے گا
چشمِ وا میں تو سجن سارا زمانہ ہوئے گا

خود رہو دنیا میں یا پہلو میں بسا دو!
سُن رکھو، پھر ایک دن پیچھا چھڑانا ہوئے گا

تو نہ ان داتا سہی پر من کا داتا کون ہے
دل نے جو کھو یا صنم تجھ سے ہی پانا ہوئے گا

ہائے وہ دل وہ ادا دم بھر نہ نظروں میں بھی
یاد میں اب جس کی اک جیون بتانا ہوئے گا

اللہ اللہ خاکِ گلشن کی کرشمہ زائیاں
اس کی تہہ میں، سوچیے، کیا کارخانہ ہوئے گا

جن کو آتی ہے نظر اب بھی کشش تاروں کے بیچ
ان کی نظروں میں وہی عالم پرانا ہوئے گا

اور نکتے اک طرف، کھلتا نہیں اس تل کا بھید
تم کہو حقّی بھلا کچھ تم نے جانا ہوئے گا

○

رضی اختر شوق

اے خدا صبر دے مجھ کو نہ شکیبائی دے
زخم وہ دے جو مری روح کو گہرائی دے

خلقتِ شہر یونہی خوش ہے تو پھر یونہی سہی
ان کو پتھر دے مجھے ظرف پذیرائی دے

جو نگاہوں میں ہے کچھ اس سے سوا بھی دیکھوں
یا ان آنکھوں کو بجھا یا انھیں بینائی دے

تہمتِ عشق تو اس شہر میں کیا دے گا کوئی
کوئی اتنا بھی نہیں طعنۂ رسوائی دے

جو ترے دل میں ہے اِس بات سے منکر تو نہ ہو
حرف مشکل ہے تو آنکھوں ہی کو گویائی دے

بارِ دنیا نہ سہی بارِ صداقت اُٹھ جائے
ناتواں جسم کو اتنی تو توانائی دے

مجھ کو اس شہر کی درماندہ خرامی سے الگ
پھر مرے خواب دے اور پھر مری تنہائی دے

رضی اختر شوق

○

یہ نخلِ جاں کا ثمر تلخ عمر بھر کا ہے
نہ پوچھ ہم سے کہ کیا ذائقہ ہنر کا ہے

ہجومِ سنگ میں بھی اس خیال سے خوش ہوں
کہ میری ذات سے اک جشن رہگزر کا ہے

جو مثلِ خاک سرِ رہگزار بیٹھے ہیں
ابھی نظر میں کوئی سانحہ سفر کا ہے

عجب تھے شہرِ چراغاں کے دیکھنے والے
دھوئیں کی سمت نہ دیکھا کہ کس کے گھر کا ہے

ابھرتی دھوپ میں، میں بھی ذرا سی دیر کو ہوں
مرا وجود بھی سایا سا رہگزر کا ہے

دیے جلے ہیں مگر دل بجھے بجھے سے ہیں شوق
بہت دنوں سے یہ منظر ہمارے گھر کا ہے

○

یہ کہہ رہا ہے کوئی میرے ساتھ چل جاؤ
تم اپنے دائرہ ذات سے نکل جاؤ

بکھیر دو مری موجِ نفس میں نغمے سے
مرے لہو میں کوئی گیت بن کے ڈھل جاؤ

سب ہی درخت نئے برگ و بار لائے ہیں
بدل رہی ہے ہوا تم بھی اب بدل جاؤ

سلامتی سے سوا ہے شکستگی کا نشہ
پگھل رہے ہو تو سوچو نہیں پگھل جاؤ

کسی کو راس نہیں جن محبتوں کی فضا
تم اس فضا میں بہت دور تک نکل جاؤ

اب اس ہوا سے گزر جاؤ ایک بار ہی شوق
یہ کیا کہ تم کبھی بکھرو، کبھی سنبھل جاؤ

رضی اختر شوق

○

ں ترے جبرِ بصارت کی گواہی دوں گا
نہ چاہے بھی تو میں تجھ کو دکھائی دوں گا

جھ د نوں موسمِ جاں کا ہے یہی رنگ تو میں
ہر لبِ زخم کو اک تازہ نوائی دوں گا

در پھیلیوں گا جو لوٹاؤ گے آواز مری
انا گونجوں گا کہ صدیوں کو سنائی دوں گا

ٹو بچھڑنے کو بچھڑ جائے مگر تیرے بعد
سب خدا رکھتے ہیں میں کس کی دہائی دوں گا

ہیں کہ اس شہر میں پرچھائیں کی مانند ہوں شوق
اس اندھیرے میں بھلا کس کو سجھائی دوں گا

○

ایک ہی آگ کے شعلوں میں جلائے ہوئے لوگ
روز مل جاتے ہیں دو چار ستائے ہوئے لوگ

وہی میں ہوں، وہی آسودہ خرامی میری
اور ہر سمت وہی دام بچھائے ہوئے لوگ

خواب کیسے کہ اب آنکھیں ہی سلامت رہ جائیں
وہ فضا ہے کہ رہیں خود کو بچائے ہوئے لوگ

تیرے محرم تو نہیں اے نگہِ ناز مگر
ہم کو پہچان کہ ہیں تیرے بلائے ہوئے لوگ

زندگی دیکھ یہ انداز تری چاہت کا
کن صلیبوں کو ہیں سینے سے لگائے ہوئے لوگ

پھر وہی ہم ہیں وہی حلقۂ یاراں بھی ہے شوق
پھر وہی شہر وہی سنگ اٹھائے ہوئے لوگ

نور بجنوری

○

شہر یاروں کے غضب سے نہیں ڈرتے یارو
ہم اصولوں کی تجارت نہیں کرتے یارو

خونِ حسرت ہی سہی، خونِ تمنا ہی سہی
ان خرابوں میں کوئی رنگ تو بھرتے یارو

پھر تو سر خاک نشیں، عرشِ بریں پہ ہوتا
صرف آہوں سے مقدر جو سنورتے یارو

سولیاں جھوم کے ہوتی ہیں ہم آغوشِ جہاں
کاش ہم بھی انہی راہوں سے گزرتے یارو

سر کہیں، سر پہ سجائی ہوئی دستار کہیں!
زندگی کے لیے یوں بھی نہیں مرتے یارو

چاند تسخیر کیا، قلب نہ تسخیر کیا
اس جزیرے میں بھی اک بار اترتے یارو

○

تجھے مشہور ہونا تھا مجھے بدنام ہونا تھا
مری جاں اپنی چاہت کا یہی انجام ہونا تھا

تجھے شمع فروزاں کی طرح جلنا تھا محفل میں
مجھے ویرانۂ دل میں چراغِ شام ہونا تھا

تری آنکھوں کی جھیلوں میں کئی مہتاب ڈھلنا تھے
مرے ہاتھوں میں اپنے آنسوؤں کا جام ہونا تھا

بھٹکنا تھا بگولے کی طرح سرِ دشت میں مجھ کو
تجھے مسند نشینوں کے لیے انعام ہونا تھا

نہ ہوتے بند کیوں مجھ پر ترے محلوں کے دروازے
مجھے آخر حریفِ گردشِ ایام ہونا تھا

بٹھانا چاہتا تھا مسندِ یزداں پہ میں تجھ کو
مجھے ناکام ہونا تھا مجھے ناکام ہونا تھا

نور بجنوری

سر وہی، سنگ وہی، اذیتِ آزار وہی
ہم وہی، لوگ وہی، کوچۂ دلدار وہی

اک جہنم سا دہکتا ہوا تا حدِ سفر
وقت کی آگ وہی، شعلۂ رفتار وہی

شیشۂ چشم پہ چھایا ہوا اک زلف کا عکس
قریۂ دار وہی، سایۂ دیوار وہی

عرصۂ حشر کبھی ختم بھی ہوگا کہ نہیں
وہی انصاف کی میزان، گنہگار وہی

تم سلامت رہو، یوسف کی ضرورت کیسی
اہلِ فن! آج بھی ہے رونقِ بازار وہی

میں بھی زندہ ہوں، ترا حسن بھی تابندہ ہے
چاند سے زخم وہی، پھول سی مہکار وہی

نور ہیں اب بھی محبت کو عبادت جانوں
ہے مرے ہاتھ میں ٹوٹی ہوئی تلوار وہی

○

نور بجنوری

روح چیخی ہُوئی، جسم دہکا ہُوا
دستِ سائل بھی کاسہ بھی ٹوٹا ہُوا
میرے باہر زمان و مکاں نوحہ گر
میرے اندر کوئی مجھ پہ ہنستا ہُوا
ہر نظر نیم جاں عقل کے زہر سے
ہر صحیفے میں اک سانپ بیٹھا ہُوا
وحشیوں کو بگولے اُڑا لے گئے
شہر کی طرح صحرا بھی سونا ہُوا
ایک اندھی کرن بین کرنے لگی
قریۂ دل میں شاید سویرا ہُوا
کوہکن، تیشہ و سنگ سے بے نیاز
قیس، پھولوں کے بستر پہ سویا ہُوا
اس جنم میں بھی جسموں کی منڈی لگی
اس جنم میں بھی چاہت کا سودا ہُوا
تیر بن کر لگا آج احساس پر
ایک پتّہ ہواؤں میں اُڑتا ہُوا

○

بشیر بدر

ہماری شہرتوں کی موت بے نام و نشاں ہوگی
نہ کوئی تذکرہ ہوگا نہ کوئی داستاں ہوگی

اگر میں لوٹنا چاہوں تو کیا پھر لوٹ سکتا ہوں
وہ دنیا ساتھ جو میرے چلی تھی اب کہاں ہوگی

پرندے اپنی منقاروں میں سب تارے چھپا لیں گے
جوانی چار دن کی چاندنی ہے پھر کہاں ہوگی

درختوں کی یہ چھالیں بھی اُتر جائیں گی چپکے کب
یہ دنیا دھیرے دھیرے ایک دن پھر سے جواں ہوگی

ہوائیں روئیں گی سر پھوڑ لیں گی ان پہاڑوں سے
کبھی جب بادلوں میں چاند کی ڈولی رواں ہوگی

کسے معلوم تھا ہم لوگ اک بستر پہ سوئیں گے
حفاظت کے لیے تلوار اپنے درمیاں ہوگی

پسینہ بند کمرے کی اُمس کا جذب ہے اس میں
ہمارے تولیے میں دھوپ کی خوشبو کہاں ہوگی

کسی گمنام پتھر پر بہت سے نام لکھ دو گے
تو قربانی ہماری اس طرح سے جاوداں ہوگی

زمینیں تو مرے اجداد نے ساری گنوا دی ہیں
مگر یہ ایک مٹھی خاک خود اپنا نشاں ہوگی

سمندر بوڑھے ہو جائیں گے اور اک فاختہ مچھلی
ہمارے ساحلوں اور جنگلوں کی حکمراں ہوگی

○

بشیر بدر

قدم جمانا ہے اور سب کے ساتھ چلنا بھی
ہم اپنی راہ کے پتھر ہیں اور دریا بھی

مگر جو فاصلہ پہلے تھا اور بڑھتا گیا
میں اُس کے پاس گیا وہ اِدھر سے گزرا بھی

بہت ذہین و زمانہ شناس تھا لیکن
وہ رات بچوں کی صورت لپٹ کے رویا بھی

یہ خشک شاخ نہ پھر سبز ہو سکی اُس نے
مجھے گلے سے لگایا پلک کے چوما بھی

چراغ جلنے سے پہلے ہمیں پہنچنا ہے
ڈھلے ہوئے ہیں پہاڑوں کو آج کہہ ابھی

ہزاروں میل کا منظر ہے اس نگینے میں
ذرا سے آدمی دریا ہے اور صحرا بھی

اثر وہی ہوا آخر اگرچہ پہلے پہل
ہوا کا ہاتھ گلوں کے بدن پہ پھسلا بھی

انھیں تو حفظ تھے سب لوگ اپنے نام بنام
ہمیں کو یاد نہ آیا کسی کا چہرہ بھی

ابھی زمانے سے شاید ہو سو برس پیچھے
تمھارا دل بھی سلامت ہے اور چہرہ بھی

○

کوئی نہ جان سکا وہ کہاں سے آیا تھا
اور اُس نے دھوپ سے بادل کو کیوں ملایا تھا

یہ بات لوگوں کو شاید پسند آئی نہیں
مکان چھوٹا تھا لیکن بہت سجایا تھا

وہ اب وہاں ہے جہاں راستے نہیں جاتے
میں جس کے ساتھ یہاں پچھلے سال آیا تھا

سنا ہے اس پہ چہکنے لگے پرندے بھی
وہ ایک پودا جو ہم نے کبھی لگایا تھا

چراغ ڈوب گئے کپکپاتے ہونٹوں پر
کسی کا ہاتھ ہمارے لبوں تک آیا تھا

بدن کو چھوڑ کے جانا ہے آسماں کی طرف
سمندروں نے ہمیں یہ سبق پڑھایا تھا

تمام عمر مرا دم اسی دھوئیں میں گھٹا
وہ اک چراغ تھا میں نے اُسے بجھایا تھا

○

فضا ابن فیضی

سب کو خوابوں کے نہ ایوان میں رکھ
میں حقیقت ہوں تو مجھے دھیان میں رکھ

راہزن پھرتے ہیں بستی بستی
گھر کا سرمایہ، بیابان میں رکھ

شب پرستوں کی ہے دنیا پیارے
اپنے سورج کو گریبان میں رکھ

دیکھ پھر، لوگ ہیں کتنے باوزن
میں ہوں پتھر، مجھے میزان میں رکھ

کیا کرے گا تو یہ مٹھی بھر دھوپ
آگ سینے کے خیابان میں رکھ

عقل و دل میں ہے توازن لازم
یوں نہ جذبات کو ہیجان میں رکھ

تیرے امروز پہ جو کچھ بیتے
اپنے فردا کو نہ بحران میں رکھ

بے صدا فتنۂ احساس ہوا
انگلیاں اب نہ یہاں کان میں رکھ

کسی دستک کا اُجالا نہ سہی
شمع یادوں کی تو دالان میں رکھ

فرحت انگیز ہے باھر کی ہوا
کھڑکیاں ذہن کے ایوان میں رکھ

ہے در و بستِ معانی ان سے
ملکہ، لفظوں کی پہچان میں رکھ

شہر تا شہر ہے زخموں کا پڑاؤ
اپنا خیمہ ابھی میدان میں رکھ

تو ہے غالب کے لیے شیفتہ سا
منتخب شعر ہوں، دیوان میں رکھ

اے فضاؔ لے کا یہ شعلہ نہ بجھے
اتنا آہنگ تو اوزان میں رکھ

○

مظہر امام

کوئی نگاہ و دل کا خریدار ہی نہ تھا
ہم نے دکاں سجائی تو بازار ہی نہ تھا

لے دے کے ایک وصل کی خیرات مانگ لی
جیسے کچھ اور، شوق کو، آزاد ہی نہ تھا

نایاب تھے گہر ہی کی مانند خشت و سنگ
یا اس نگر میں کوئی گنہگار ہی نہ تھا

اک دوسرے کے غم میں تھے سب اس طرح شریک
جیسے کسی کو مجھ سے سروکار ہی نہ تھا

سب ساتھ لے کے آئے تھے اپنی متاعِ جاں
میری طرح وہاں کوئی دلدار ہی نہ تھا

وہ کیا بدلتے حسن کا معیار اے امامؔ
اہلِ ہوس کے سامنے معیار ہی نہ تھا

○

افضل منہاس

شوق سے دے فاقہ مستی، لیکن ارزانی نہ دے
پیاس کے بدلے مجھے مانگا ہوا پانی نہ دے

مرمریں سوچوں کو بخشا میں نے مخمل کا گداز
مجھ کو ہر دکھ دے مگر ان کو پریشانی نہ دے

آنچ دے کر میں نے کنکر کو بنایا ہے گُہر
تو کسی ناسنخِ کو اس کی تابانی نہ دے

میں نے منزل پر لگایا ایک پھل والا درخت
ہوں مگر تنہا، سبھی تو اس کی دربانی نہ دے

ہر بھنور سے بچ نکلتا ہوں یہ تیری دین ہے
اب بہت ہی تھک چکا ہوں سانس طوفانی نہ دے

میں نے شعروں کا کفن اپنے لیے خود سی لیا!
دنیا چاہے بھی کوئی تو مجھ کو عریانی نہ دے

میں نے اپنا سب اثاثہ دوسروں کو دے دیا
کیسے ممکن ہے کہ ابراہیمؑ قربانی نہ دے

میرے کاسے میں تری رحمت کے تازہ پھول ہوں
یہ اگر مل جائیں، بیشک مجھ کو سلطانی نہ دے

اس قدر بھٹکے ہوئے ظالم کو میں کیا نام دوں؟
تیر جو مارے، مگر معصوم کو پانی نہ دے

کر لیا افضلؔ نے ہر پیوند پہ سورج طلوع
اس فقیری کا مگر اس کو کوئی ثانی نہ دے

یوسف جمال انصاری[1]

گُل و شبنم ہوں ترا خون پسینہ جیسے
تجھ پہ نازاں ہو بہاراں کا مہینہ جیسے
کوئی دیکھے تو سرِ شام یہ اُڑتے بادل
بال بکھرائے ہو اک شوخ حسینہ جیسے
یوں تجھے آئینۂ دل میں لیے پھرتا ہوں
کہ محبّت کی انگوٹھی پہ نگینہ جیسے
سوز کو ساز کے پردے میں چھپانے والے
ختم ہو تجھ پہ محبّت کا قرینہ جیسے
میرے ہر شعر میں دھڑکن ہے تری چاہت کی
شاعری ہو مرے احساس کا زینہ جیسے
تجھ پہ پہلی وہ نظر، ثبت مری یاد پہ ہو
وہ گھڑی اور وہ دن اور وہ مہینہ جیسے
دل میں ہے یاد تری، دھیان میں عالم تیرا
کسی ویرانے میں پوشیدہ دفینہ جیسے
چین لینے نہیں دیتی تری چاہت کی خلش
خونِ دل میں ہو رواں کوئی سفینہ جیسے
بات یہ ہے کہ گلے اُن کو لگایا تھا کبھی
اب ہے گیتوں کا سمندر مرا سینہ جیسے

[1] افسوس کہ ۶ ستمبر کو وفات پا گئے ۔

○

سجاد باقر رضوی

درد کے ساگر کو لہریں دے، دکھ کے پہاڑ کو حرکت دے
روح کے بے حس سناٹوں کو گویائی کی قوت دے

ہجر کی کڑوی نیندوں میں بھی خواب ہیں میٹھی یادوں کے
خوابوں کو تعبیر عطا کر اور یادوں کو صورت دے

خالی رہنے والا کیسہ اور بھر آنے والا دل
اپنا تو مقسوم یہی ہے اب آگے جو محبت دے

تو رازق ہے عالمیں کا دنیا کو دے سیم و زر
دل کے عالم پر بھی نظر رکھ، ہم کو درد کی دولت دے

اہلِ ہوس کا حاصل دنیا دنیا کا حاصل ہے ہوس
اے غمِ دل، ہم تیرے اہل ہیں، جو کچھ تیری عنایت دے

سنگ سروں کو دلوں کو وحشت کانٹے آبلہ پاؤں کو
گل چہروں کو رنگت و نکہت، شعلہ لبوں کو نمازت دے

کیسے کیسے موسم دل سے بے آواز گزرتے ہیں
اے مرے دل اب کے خوں ہو کر موسم گل کی شہادت دے

اس کی اک تصویر بنا لوں دل کے صورت خانے میں
یادوں سے کچھ رنگ نچوڑ لوں اے غم دنیا مہلت دے

لفظ کی کاشت کرے گا باقر اب کے موسم باراں میں
معنی کی یہ فصل ہو دونی، دل کی زمیں کو طاقت دے

اقبال ساجد

دنیا کی کیا مجال چمن سے نکال دے
مجھ کو حدودِ ملکِ سخن سے نکال دے

طاقت تو ہے عدو میں مگر حوصلہ نہیں
ورنہ مری زبان دہن سے نکال دے

کیا سوچتا ہے کاٹ رگ و پے کی رسّیاں
اب خون کا عذاب بدن سے نکال دے

ہاتھوں کو خود صلیب بنا اپنے واسطے
موقع ہے زندگی کو گھٹن سے نکال دے

سورج کو سب کے سامنے اب بے نقاب کر
ظلمت کا زہر پہلی کرن سے نکال دے

پہنائے وسعتوں کو نیا دائرہ کوئی
اس چرخ کو نظامِ کہن سے نکال دے

پھر دوسروں کے واسطے خوشبوں کا باب کھول
خود کو تو قیدِ رنج و محن سے نکال دے

مانگی ہے مجھ سے کس نے نئی نیکیوں کی بھیک
کس نے کہا زکوٰۃ سخن سے نکال دے

سینے سے پھر لگائیں گے تجھ کو پرانے لوگ
ساجد جدیدیت کو تو فن سے نکال دے

اقبال ساجد

کیا آن کا ذکر، آنا بھی شہید کی
نام آوری کے شوق نے مٹی پلید کی

مجھ کو ادب کی دار پہ کھینچو گے میں کیوں
شہزادیِ سخن سے محبت شدید کی

کل رات میرے ساتھ ستارے بھی رو پڑے
دیکھی گئی نہ اُن سے تباہی اُمید کی

اُجڑے ہوئے مکان کے نقش و نگار دیکھ
سینے میں سے جھانکتی خواہش نوید کی

اُس میں بھی اب نہیں رہا بکنے کا حوصلہ
مجھ میں بھی ختم ہو گئی قوت خرید کی

ماتم سرائے دہر میں ایسے بھی لوگ ہیں
نامِ حسینؓ لب پہ ہے خو ہے یزید کی

جذبوں نے آنکھ کھول کے پہلی کرن کے ساتھ
ہر صبح جمع کی ہے اکائی اُمید کی

یوں خواہشوں نے خواب میں میلے لگا لیے
بچے منا رہے ہوں خوشی جیسے عید کی

ساجد میں اُس کے حسن کی توصیف کیا کروں
کافی ہے جیتی جاگتی خواجہ فرید کی

کھلتے ہیں جستجو کے یہ در کس کے واسطے
نکلی حصارِ شب سے سحر کس کے واسطے

خوابیدہ سیپیوں میں نہ جانے شعاعِ مہر
کس کس کا کھٹکھٹائے گی در کس کے واسطے

چھنتے ہیں گلستانِ اُفق سے گلِ شفق
مہتاب خو، ستارہ نظر کس کے واسطے

یہ کون پانیوں کے سفر پہ نکل پڑا
پڑتے ہیں موج موج بھنور کس کے واسطے

لکھوں میں جاگنے کا عمل کیوں ورق ورق
ترتیب دوں کتابِ ہنر کس کے واسطے

پھر جمع کر رہے ہیں برائی کے شہر میں
لوگ اپنی نیکیوں کے ثمر کس کے واسطے

سب جاہلوں کے سامنے تخلیق کا زیاں
رکھوں نمائشوں میں ہنر کس کے واسطے

اچھا نہیں ہے دل میں عمل ٹوٹ پھوٹ کا
جذبوں کو کر رہا ہے کھنڈر کس کے واسطے

اقبال ساجد

O

سرخ لہو سے یہ پھلواڑی کرتا ہوں
میں لفظوں کی کھیتی باڑی کرتا ہوں

شعر و سخن کی دنیا میں اک مدت سے
نئے نئے تیار کھلاڑی کرتا ہوں

آڑے وقت میں سایہ ہی کام آتا ہے
خود کو پیچھے اس سے اگاڑی کرتا ہوں

تو بھی اب اندر سے خارِ بغض نکال
صاف میں دل سے شک کی جھاڑی کرتا ہوں

تو بھی اپنے جسم کے اندر ایندھن ڈال
میں بھی تیز لہو کی گاڑی کرتا ہوں

دھت رہتا ہوں اپنے خوں کے نشے میں
رقص خوشی سے پی کے تاڑی کرتا ہوں

ویسے تو انساں ہوں سیدھا سادہ میں
باتیں لیکن ترچھی آڑی کرتا ہوں

O

عارض کی آنچ، گرمیٔ لب اس سے چھین لے
خوشبو، مٹھاس، ذائقہ، سب اس سے چھین لے

اک صبح اس کے تازہ بدن کی شفق چرا
اک شام روشنی کا سبب اس سے چھین لے

وہ سنگ ہے تو اس میں سے مرمر نکال دے
اور پھول ہے تو رنگِ طرب اس سے چھین لے

تتلی کے پاس چھوڑ نہ رنگوں کی دھوپ چھاؤں
جتنا بھی اس کا حسن ہے سب اس سے چھین لے

سادہ ورق پہ لمس کی تصویر بھی بنا!
پھر اس کے بعد حسنِ طلب اس سے چھین لے

وہ دائرے میں رقص کے ہو جائے منجمد
پہلی نظر میں موجِ طرب اس سے چھین لے

ساجد زرہ بدن پہ اسے ناز ہے بہت
گاہک نہ بن لگا کے نقب اس سے چھین لے

لاحاصل

یحییٰ امجد

صبح کی ٹھنڈی روشنیوں کی خواہش ہے
اس خواہش کی رکھشا میں بیٹھے دُکھے ہوئے سب دل!
رات کی سرحد لامحدود۔
وجود
عمل کی خواہش میں جیتا ہے،
عمل کی ہمت سے ڈرتا ہے۔
میں تو ہار چکا سو بار اذانِ سحر پہ ایمان لانے سے
ریشم کے فرغل میں جو افلاک سے اُترے شہزادے
سب شہروں میں اذانِ سحر کا شور مچاتے ہیں
رات میں ان ہنگاموں سے یہ ڈرتا ہوا دل ڈر جاتا ہے
جادو بھری صداؤں کے باطن سے اُچھلتا نور کا فوارہ میں دیکھ نہیں سکتا
اور اندھے پن میں روتا ہوں
اپنے سے تنہا ہوتا ہوں
آہوں اور اشکوں میں جیتا ہوں
اور ڈرتا ہوں
میرے لہو کا دیپ جیسے تو رات کے ساتھ کہیں نہ یہ دکھیارا گھر بھی جل جائے
آدھی رات کا سورج ہو پھر شب کی حدیں صدیوں کے افق تک جا پہنچیں
ان سوچوں سے اور عمل کی رنگیں خواہشوں سے
اور ہمت سے میں ڈرتا ہوں
اس منزل سے دل ڈرتا ہے
لاحاصل سے دل ڈرتا ہے

سچ سچ ثابت ہوگا میرے دل کا کہا بھی!

مجتبیٰ امجد

رات کی گپھی میں ہم بیٹھے اونگھتے ہیں
اور کہتے ہیں :
صبح کے روشن میدانوں میں جا کے رُکیں گے
یہ پاپی دل ایسی ہی باتوں سے تو جل جاتا ہے
جب دن اپنے پر پھیلائے میدانوں پہ اُترتا ہے
رات کی گپھی غاروں کے پاتالوں میں گر جاتی ہے
تم کن نیندوں، کن خوابوں میں کھیل رہے ہو
اس گھر کی دیواریں دلوں پہ خدا کا سایہ ہیں
گھر کو جلا کر روشنیوں میں جینے کی خواہش کرتے ہو
مورکھو!
پھر تو رات کی گپھی کا یہ اونگھنا بھی باقی نہ رہے گا
تم ہو گے اور غاروں کی دہشت ہو گی
میں تو اپنے لہو کی شمع جلا کر اک فصیلِ نور میں گھر جاؤں گا
تم دیکھو گے چاروں اور بکھرتی ہو گی
دن کی تیبار بھی
بجھتے ہوئے چہروں سے کھیلتی ـــــــ نئی نئی خوشبوؤں کی ہوا بھی
سچ سچ ثابت ہوتا میرے دل کا کہا بھی!

ہاں چلے حلقۂ زنجیر کی بات

(سمیع القاسم کی نظم "ماتیسر من سورۃ السلاسل" کا آزاد ترجمہ)

امجد اسلام امجد

نہیں سلاخوں کے بس میں مجھ کو ہلاک کرنا
فصیلِ زنداں نہ روک پائے گی راہ میری
فضول ہے یہ شبِ سیہ کی تبہ کاری
کہ میرے خوں میں چمکتے دن کی نفیریاں ہیں
نظر میں اپنے ہی رنگ چھائے ہیں
اور ہونٹوں پہ جو صدا ہے وہ حرفِ جاں ہے
گئے ہوؤں کی عزیز روحو،
کبھی تو برزخ کی سرحدوں سے نکل کے آؤ
کبھی تو میرے زفاف کی شب میں مجھ کو دیکھو
کبھی تو دیکھو کہ کیسے میں نے فنا سفر میں
جبین اپنی بلند رکھی،
کبھی تو دیکھو کہ کیسے میں نے
پسیدہ غم میں جانے والوں کی مغفرت کی دعائیں مانگیں
مغنّیوں کی صدائیں راتوں میں گونجتی ہیں
لرز رہے ہیں تمام سازوں کے تار جیسے
کبھی نہ سوئیں گے اہلِ نغمہ
مرے وطن اے متاعِ ہستی ــــ کبھی تو سُن لے
کہ ذرّہ ذرہ تری سماعت کا منتظر ہے
قبول کر لے ہمارا نغمہ
جو پھول بن کر نواحِ زنداں کی شور مٹی میں کھِل اُٹھا ہے

بہت بڑی ہیں قفس نشینوں کی داستانیں
اور ایک بے باک قہقہہ ہے یہ گیت اُن پر
جو اس کی بندش کے مدّعی ہیں
بہت بڑی ہیں قفس نشینوں کی داستانیں
میں ان کے آخر کے ظلم صفحوں کو ایک اک کر کے پھاڑتا ہوں
کبھی کبھی جب مری بصیرت شکست کھاتی ہے اور سوچیں،
بہت بھلا کر بھٹکنے لگتی ہیں، میری آنکھوں
میں کوند جاتا ہے اپنے والد کا وہ تبسّم
جو موت لمحے میں اُس کے چہرے پہ ضَو فگن تھا
دکھائی دیتے ہیں قاتلوں کے سیاہ چہرے
جو خوف و دہشت کے سرد جالے میں کانپتے ہیں
مجھے قفس کے محافظوں سے خطر ہی کیا ہے!
کہ اُن کے بس میں نہ گیت میرے نہ پھول میرے نہ میری چاہت
مجھے قفس کے محافظوں سے خطر ہی کیا ہے!
کہ دسترس میں نہیں ہیں اُن کی وہ کنجیاں، جن سے میری
جبیں بھری ہُوئی ہیں
مجھے کسی عارضے کا ڈر ہے نہ ان فصیلوں میں بربریت
کے شاہکاروں کا خوف کوئی،
کہ جب بھی چاہوں،
نئی مسرّت سے پُر زمینوں کی سُرخ مٹّی میں منہ چھپانا
ہے میرے بس میں
نہیں ہے کچھ بھی سلاخِ زنداں کی دسترس میں
کہ میری ساری حیات لمحہ ہے ـــــ ایک لمحہ
زمانِ چاہت کے لاکھ قرنوں میں ایک لمحہ
یہ قید میری، مرے لیے ہے فقط تماشا
قضا ہے جس طرح کھیل کوئی ـــــ!!!

○

امجد اسلام امجد

دل کے دریا نے کسی روز اُتر جانا ہے
اتنا بے سمت نہ چل، لوٹ کے گھر جانا ہے

اُس تک آتی ہے تو ہر چیز ٹھہر جاتی ہے
جیسے پانا ہی اُسے، اصل میں مر جانا ہے

جو گہر تھا اُسے پتھر کی طرح ہم نے گنا
وہ جو پتھر تھا اُسے ہم نے گہر جانا ہے

بول اے شامِ سفر! اذنِ رہائی کب ہے!
دل نے رکھنا ہے کہ تاروں نے ٹھہر جانا ہے

کس لیے اُٹھتے ہُوئے چاند کا رستہ روکیں
اس کو ہر طور سوئے دشتِ سحر جانا ہے

گُل کھلا ہے تو اسی خاک میں ملنا ہے اُسے
اور خوشبو کو ابھی اگلے نگر جانا ہے

وہ ترے حسن کا جادو ہو کہ میرا غمِ دل
ہر مسافر کو کسی گھاٹ اُتر جانا ہے

سجّاد رضوی

غالب ہُوئے ہیں خستہ و ناچاران دنوں — پھرتے ہیں میرؔ گلیوں میں کیا خواران دنوں
سوداؔ کا آشنا نہیں کوئی زمانے میں — ناسخؔ کا نام لینا ہے بےکاران دنوں
انشاؔ و مصحفیؔ کو نہیں پوچھتا کوئی — آتشؔ کے شعر پڑھنا ہے آزاران دنوں
بیرنگ ہے کلامِ انیسؔ و دبیرؔ آج — بیکار سحر کاریِ اشعاران دنوں
اقبالؔ کو بھی کوئی نہیں جانتا یہاں — ان کا بھی کتنا سرد ہے بازاران دنوں
دولخت زندگانی ہُوئی ہے، عجب نہیں — سایے سے اپنے بھاگے جو دیواران دنوں
منصور کو شعورِ انا الحق نہ ہو تو پھر — آئے کہاں سے حوصلۂ داران دنوں
بزمِ سخن میں، رونقِ محفل نہ بن سکیں — لطفِ کلام و لذتِ گفتاران دنوں
جینا تو کام اہلِ جنوں کا ہے آج کل — جو مر چکے ہیں، ہیں وہی ہشیاران دنوں
اب مردہ دل تو مرتے ہیں جینے کے واسطے — اور زندہ دل ہیں جینے سے بیزاران دنوں
دل کو نگہ کی برف نے ماؤف کر دیا — ٹھنڈی پڑی ہے آتشِ افکاران دنوں
یا دل کی برف ہی کا پگھلنا محال ہے — یا بجھ گیا ہے شعلۂ رخساران دنوں
ہر صیقلِ خیال سے بڑھتا ہے دمبدم — آئینۂ شعور پہ زنگاران دنوں
جلوے تو منتظر ہیں کہ دیکھے کوئی مگر — خالی پڑا ہے روزنِ دیواران دنوں
شہروں کی تنگ گلیوں سے اب جائیے کہاں — ملتے نہیں ہیں دشت کے آثاران دنوں
اک نقطۂ خیال سے آگے نہ بڑھ سکے — یوں رُک گئی ہے گردشِ پرکاران دنوں
چہرے جو رشکِ لالہ و گل تھے کبھی وہ ہیں — بےرنگ مثلِ صفحۂ اخباران دنوں
چلنا ہو بزم کو تو کفن باندھ کر چلو — چلتی ہے بات بات پہ تلواران دنوں

سونی پڑی ہیں بزمِ تمنّا کی خلوتیں ٹھنڈا پڑا ہے شوق کا بازار ان دنوں

فرصت کہاں کہ بزمِ تمنّا سجائیں اب ہیں اہلِ بزم برسرِ پیکار ان دنوں

ہر ہر قدم پہ دست و گریباں ہیں راہرو بے دست و پا ہے قافلہ سالار ان دنوں

سب لوگ نرگسی ہوں جہاں میں تو کیا کرے حیراں نہ ہوں جو نرگسِ بیمار ان دنوں

ہر موڑ پر ہے تاک میں اک رہزنِ خیال راہِ طلب میں چلنا ہے دشوار ان دنوں

شہرِ کمال میں کوئی مسکن نہ مل سکے سر پہ اٹھائے پھرتے ہیں گھر بار ان دنوں

سر پھوڑنے کو منّتِ اعدا اٹھائیے ملتا نہیں ہے سنگِ درِ یار ان دنوں

جاتے ہو چاند پر کہ زمیں تنگ ہو گئی یا بڑھ گئی ہے وسعتِ رفتار ان دنوں

اب گردشِ فلک کا گلہ کس طرح کریں ہیں دیدنی زمین کے اطوار ان دنوں

لرزاں ہیں چاند اس کی نحوست کے خوف سے اپنی زمیں ہے کوکبِ دُم دار ان دنوں

چرخِ کہن کو اب تو زمیں مات دے گئی حیراں کھڑا ہے گنبدِ دوّار ان دنوں

گم سم ہیں طائرانِ چمن خوفِ زیست سے رکھتے ہیں زیرِ پر سبھی منقار ان دنوں

لٹتی ہے آج عصمتِ الفاظ چوک میں خاموش ہے زبانِ گہربار ان دنوں

خوش ہے، غمِ کشاکشِ دنیا نہیں رہا کرتا ہے رقص مرغِ گرفتار ان دنوں

خاموشیوں میں ڈوب گئے وادیوں کے گیت نوحہ کناں ہے نغمۂ کہسار ان دنوں

فصلِ بہار میں چمنستاں اداس ہے چڑیوں کو یاد ہی نہیں چہکار ان دنوں

ہے محتسب کمالِ معاصی کے باوجود اوروں کے احتساب پہ تیار ان دنوں

ہے کاروانِ اہلِ نظر فرد فرد آج کچھ یوں بڑھی ہے شورشِ پندار ان دنوں

اس کے بغیر بن نہیں پڑتی ہے بزم میں عاشق بنے ہیں سادہ و پرکار ان دنوں

معشوقِ تندخو کو بغرضِ نیازِ عشق کرتے ہیں جوڑ توڑ سے ہموار ان دنوں

اُستاد نورِ علم سے بیگانہ ہو گئے بیزار شوق سے ہوئے فنکار ان دنوں

محرومِ آہِ نیم شبی سے ہے زندگی بے نالۂ سحر ہے دلِ زار ان دنوں

غنچہ لبی ہے باعثِ نفرت زمانے میں — کیا دلفریب ہے دہنِ مار ان دنوں
ہے گفتگوے اہلِ صفا باعثِ ملال — ہے دلپذیر خطبۂ عیار ان دنوں
عیسیٰ ہوں چارہ گر تو وہ دشمن دکھائی دیں — دشمن دکھائی پڑتا ہے غمخوار ان دنوں
شوکیس میں ہیں یوسفِ کنعاں بقیدِ زیست — ملتا نہیں ہے کوئی خریدار ان دنوں
ہے دامنِ نگاہ پہ ویرانیوں کا راج — یادوں کے آستاں پہ ہے ادبار ان دنوں
مومن ہوئے ہیں کفر کی گہرائیوں میں غرق — ایماں بنا ہے شیوۂ کفار ان دنوں
موری میں بہ گئیں سبھی نازک خیالیاں — مٹی میں مل گئیں سبھی اقدار ان دنوں
اک قطرہ مے بہت ہے اسے بہرِ بے خودی — ہے تنگ تنگ ظرف قدح خوار ان دنوں
کیسے کسی سے آبلہ پائی کی داد لیں — راہیں تمام ہو گئیں بے خار ان دنوں
مٹی کے مول بک نہ سکیں جو ہنر خیال — کیا لگ رہے ہیں گلیوں میں طومار ان دنوں
شاعر مرے تو پھر کفن بھیک مانگیے ! — ہے کفر موت بندۂ نادار ان دنوں
انساں کی لاش گلیوں میں کھنچتی پھرے مگر — اُٹھے جنازۂ سگِ زردار ان دنوں
فنکار کی رگوں سے لہو کھینچ کھینچ کر — پیتے ہیں خوب حاشیہ بردار ان دنوں
لب پر شمارِ سبحۂ صد دانہ ہے مدام — دل ہو گئے ہیں بستۂ زنار ان دنوں
قرآں بلند کرتے ہیں نیزوں پہ رات دن — بنتے ہیں دینِ حق کے طرفدار ان دنوں
واعظ کے لب مذمتِ سلطاں میں خشک ہیں — دل ہے ہلاکِ حسرتِ دربار ان دنوں
سب دیکھتے ہیں، منہ سے کوئی بولتا نہیں — دل سو رہے ہیں، آنکھیں ہیں بیدار ان دنوں
گزریں قیامتیں کہیں ان کو خبر نہ ہو — ہلتے نہیں ہیں دل کے مگر تار ان دنوں
کتنی کڑی ہے دھوپ مگر بیٹھیے کہاں — آئے کہاں سے سایۂ دیوار ان دنوں
آتی ہے قولِ غالبِ آشفتہ سر کی یاد — دیوار و در ہوئے در و دیوار ان دنوں

سجاد دوستوں کو دکھاتے ہیں دل کے داغ
کہنے کو یوں سناتے ہیں اشعار ان دنوں

○

کسریٰ منہاس

حال پوچھو نہ دکھ بھرے دل کا — بجھ نہ جائے چراغ محفل کا
بے نیازی نے ان کو سمجھایا — سخت مشکل ہے مرحلہ دل کا
اک تلاطم تھی زندگی جن کی — لے رہے ہیں وہ نام ساحل کا
تیری صورت ہے سامنے میرے — دل ہے آئینہ ربطِ کامل کا
وقت بھی ساتھ ساتھ چلتا ہے — بڑھ گیا اور زور قاتل کا
کسی امید کا اشارہ ہے — بجھ کے جلنا چراغِ محفل کا
کہہ دو اِن تند و تیز موجوں سے — ڈوب جائے نہ نام ساحل کا
اُٹھ گیا کون لے کے انگڑائی — رنگ بدلا ہُوا ہے محفل کا
دلِ پُر شوق کیا ارادہ ہے — فاصلہ بڑھ رہا ہے منزل کا
رات غم کی کٹی سلیقے سے — ہُوا آسان وقت مشکل کا

دہر میں با وقار ہیں کسریٰ
جن کو پاس عظمتِ دل کا

رشید انور

○

پھول رستے میں جو بکھرا ہوا پایا ہوگا
میرا افسانہ تجھے یاد تو آیا ہوگا

اپنی پلکوں پہ ستارے سے سجائے ہوں گے
جشنِ ہجراں بھی کسی طور منایا ہوگا

میں نے سورج کو ندامت سے ڈوبا دیکھا
دھوپ میں کوئی دیا تم نے جلایا ہوگا

گر تصوّر میں کبھی مجھ سے ملے بھی ہوگے
ایک پرچھائیں کو سینے سے لگایا ہوگا

جب کبھی دیکھ کے حالات کو روٹھے ہوگے
سوچتا ہوں کہ تجھے کس نے منایا ہوگا

ہجر کی آگ میں تم جس سے لپٹ کر روئے
آگ میں جلتا ہُوا میرا ہی سایا ہوگا

آج پھر روح مری مجھ سے جدائی مانگے
اُس نے گھبرا کے مجھے آج بلایا ہوگا

میرے مٹنے کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے
نقش پانی پہ کئی بار بنایا ہوگا

دل میں محشر سا بپا آج ہُوا ہے انور
وقت نے پھر کوئی آئینہ دکھایا ہوگا

اُمید فاضلی

○

اپنی فضا سے اپنے زمانوں سے کٹ گیا
پتھر خدا بنا تو چٹانوں سے کٹ گیا

پھینکا تھکن نے جال تو کیوں کر کٹے گی رات
دن تو بلندیوں میں اُڑانوں سے کٹ گیا

وہ سر کہ جس میں عشق کا سودا تھا کل تلک
اب سوچتا ہوں کیا مرے شانوں سے کٹ گیا

پھرتے ہیں پھن اُٹھائے ہُوئے اب ہوس کے ناگ
شاید زمیں کا ربط خزانوں سے کٹ گیا

ڈوبا ہُوا مِلا ہے مکینوں کے خون میں
وہ راستہ جو اپنے مکانوں سے کٹ گیا

مِل کر جُدا ہُوا تھا کوئی اور اس کے بعد
ہر ایک لمحہ اپنے زمانوں سے کٹ گیا

کس کے نام کروں؟

احسن علی خاں

مہر و خلوص و غم کی دولت، کس کے نام کروں
سامنے آئیں اہلِ وراثت، کس کے نام کروں

سیر چمن کی، عیش محل کے، میرے پاس نہیں
تپتے دشت، تڑپتی وحشت، کس کے نام کروں

میری جاں ہے ایک ہی سچ کا صدقہ اور ابھی
قرض بہت ہیں حرفِ صداقت، کس کے نام کروں

کل کی دکھتی یادیں دفنا دینا میرے ساتھ
آج کے درد و کرب کی شدت، کس کے نام کروں

اچھا، آج کی محرومی بھی میرے نام سہی
کل کیا ہوگا، کل کی قسمت، کس کے نام کروں

احسن علی خاں

○

یہ اپنی بیچارگی کا عالم، گنہ نہیں ہے تو اور کیا ہے
نہ اپنے بس میں سنوارنا ہے، نہ اپنے بس میں بگاڑنا ہے

جو خواب دیکھا تھا آخرِ شب، وہ صبح ہوتے بکھر چکا ہے
دیا تھا ہم نے ہی خود کو دھوکا، سحر پہ الزام آگیا ہے

وہ قافلہ تھا کہ کوئی لشکر، یہاں سے گزرا ہے کون ایسا
کہ دور تک آج رہگزر پر غبار کا رقص ہو رہا ہے

میں کھوئے انساں کو ڈھونڈتا ہوں، انا گزیدہ دلوں میں ناصح
تجھے مبارک ہو یہ تجسس، کہاں ہے شیطاں، کہاں خدا ہے

وہ راہبر ہے اگر تو پھر کیا، وہ راہزن ہے اگر تو پھر کیا
جو راہ میں ساتھ ہو لیا ہے، وہ اجنبی میرا آشنا ہے

○

کب تک تری بیداد کا غم کرتے رہیں گے
زندہ ہیں تو اُمیدِ کرم کرتے رہیں گے

اضداد کا ٹکراؤ ہے فطرت میں ہماری
ہم آب اور آتش کو بہم کرتے رہیں گے

سجدے ہیں جبیں میں تو بایں کعبہ و کاشی
تعمیر نئے دیر و حرم کرتے رہیں گے

میخانہ بھی مل جائے تو ہم پیرِ مغاں سے
شکوہ کہ صراحی میں ہے کم کرتے رہیں گے

ہر درد کا درماں ہے یہی دردِ محبت
ہر درد کو اس درد میں ضم کرتے رہیں گے

جمنا پرشاد راہی

○

کہسارِ تغافل کو صدا کاٹ رہی ہے
حیراں ہوں کہ پتھر کی ہوا کاٹ رہی ہے

پیشانیٔ ساحل پہ کوئی نام نہ اُبھرے
ہر موج سمندر کا لکھا کاٹ رہی ہے

الفاظ کی دھرتی پہ ہوں مفہوم گزیدہ
اب جسم پہ کاغذ کی قبا کاٹ رہی ہے

محجوب ہیں مغرور درختوں کی قطاریں
ہر شاخ کو شمشیرِ انا کاٹ رہی ہے

کیا اپنی خبر دوں کہ تری وضعِ خموشی
خود سلسلۂ حرف و نوا کاٹ رہی ہے

فنکار کا خوں دامنِ تخلیق پہ گویا
تصویرِ مصوّر کا گلا کاٹ رہی ہے

ہر روح پسِ پردۂ ترتیبِ عناصر
ناکردہ گناہوں کی سزا کاٹ رہی ہے

○

سمجھ سکا نہ کوئی رازِ ہائے خاموشی
مجھے صلیب ملی بر بنائے خاموشی

اُچھالیے نہ ہوا میں صداؤں کے خنجر
کہ چاک ہو نہ سکے گی ردائے خاموشی

کہاں کا ظرف کہ جب دورِ خودنمائی ہے
اُتار پھینک سمندر قبائے خاموشی

خروشِ خواہشِ ہستی لہو میں ڈوب گیا
رگوں میں تیر رہی ہے نوائے خاموشی

اُٹھا لیا ہے جو خنجر تو سوچتا کیا ہے
مری زباں قلم کر برائے خاموشی

اب اس کی اندھی عقیدت عجب مقام پہ ہے
تراش لے نہ کوئی بُت خدائے خاموشی

میں آگہی کی کڑی دھوپ سہہ نہ پاؤں گا
شعورِ ذات نہ دے انتہائے خاموشی

مختار ھاشمی

○

نیک فال آئینے، بدشگون آئینے، سرد و گرم آئینے، نرم و سخت آئینے
یوں مقدس تھے ارباب اوہام میں جیسے کرتے ہوں تعمیرِ بخت آئینے

کوئی بے نام نقشِ جمال آفریں لوحِ گیتی پہ شاید اُبھرنے کو ہے
اپنی شاخوں کے عکاس پتوں پہ بھی ہے سجائے ہوئے ہر درخت آئینے

آئینہ خانوں میں دیکھنا ہے عبث ایک آواز کے زیر و بم کا اثر
بازگشت ان میں کہسار جیسی کہاں، یہ تو ہیں اے صدا لئے کرخت آئینے

کسبِ جلوہ سے اس درجہ گھبرا گیا شیشۂ گر سنگ باری پہ مائل ہُوا
جلوے بکھرے تو حیرت فزا بن گئے، نجیرہ نجیرہ نظر، لخت لخت آئینے

شیشہ اپنی جگہ سنگ اپنی جگہ۔ اس توازن میں دونوں کی ہے زندگی
اور اگر پتھروں میں گداز آ گیا نسبتاً ہو ہی جائیں گے سخت آئینے

منعکس کچھ شعاعیں ہوئیں بھی تو کیا! مرتسم کچھ شبیہیں ہوئیں بھی تو کیا
حظ اُٹھانا جب ان کا مقدر نہیں کیوں لیے بیٹھے ہیں کور بخت آئینے

نسبتِ جام و آئینہ سے زندہ ہیں نشانِ جمشیدی و نازِ اسکندری
گو نہیں تھے، مگر قدر زا بن گئے، وجہِ زیبائشِ تاج و تخت آئینے

○

وہ سمندر بڑے نفیس آثار ہیں جن میں سیپیں ہوں سیپوں میں گوہر بھی ہوں
اُن سرابوں سے پھر کیسے منھ موڑیے جن سرابوں کی تہ میں سمندر بھی ہوں

قید زنداں میں اے صاحبانِ جنوں سر کا ٹکرانا بیکار جاتا نہیں
کچھ تو رخنے پڑے کچھ تو روزن ہُوئے، عین ممکن ہے دیوار میں در بھی ہوں

سرخ رُو تو کہیں چل کے ہونا ہی ہے شہرِ خرد ہو کہ دشتِ جنوں
بزمِ شیشہ گراں بھی چلو دیکھ لیں جن کے ہاتھوں میں ممکن ہے پتھر بھی ہوں

سہمے الفاظ مفہوم میں تلخیاں چہرے پتھر کے، دل میں مگر زرمیاں
یہ تعارف مکمّل نہ کہلائے گا ہم کہ جو اپنے سموں کے اندر بھی ہوں

سوچتا ہوں مبادا یہ یکسانیت عشق کی طبعِ آزاد پر بار ہو
چند سجدے قیودِ وفا میں سہی کچھ حدودِ تعین سے باہر بھی ہوں

ماتمِ یک شہرِ آرزو

جگن ناتھ آزاد

احتشام حسین کے بعد

ایک ظلمت ہے کہ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے
دوستو، شمع کی لو تیز کرو
یہ اُمنڈتی ہوئی ظلمت یہ ٹھٹھرتی ہوئی رات
سارے ماحول کو یخ کر دے گی
ہاتھ ہو جائیں گے سُن
پاؤں ٹھٹھر جائیں گے
قافلے گرمیٔ رفتار کے جب راہ نہ پائیں گے ٹھہر جائیں گے
ولولوں کو تپش انگیز کرو
جذبۂ شوق کو مہمیز کرو
دوستو! شمع کی لو تیز کرو

بنّے بھائی

کیوں مری آنکھ سے آنسو ہیں رواں
وہ مرا کیا لگتا تھا
نہ مرا بھائی نہ رشتے کا عزیز
نہ ملاقات بھی ہر روز کی اُس سے
مگر اس کے بادصف
اُس کو جس رنگ میں دیکھا وہ بھلا لگتا تھا

(۲)

کیوں مری آنکھ سے آنسو ہیں رواں

وہ مرا کیا لگتا تھا
کیوں مرے دل پہ ہے اک بوجھ سا اس وقت آزاد
جنسِ نایاب کوئی جیسے گنوا بیٹھا ہوں

(۳)

لوگ کہتے ہیں شرافت میں وہ لاثانی تھا
اور انساں بھی ہیں جن میں اسی خوبی کی فراوانی ہے
لوگ کہتے ہیں وہ سچّا تھا کھرا تھا دل کا
اور انساں بھی ہیں، سچّے بھی کھرے بھی دل کے
لوگ کہتے ہیں سخنور تھا وہ تھا نثر نگار
اُس کا مشرق و مغرب کے ادیبوں میں شمار
لیکن اس دور میں
شاعر ہو کہ ہو نثر نگار
جس میں ہو اس کی کمی کون سا ایسا ہے دیار

(۴)

کس لیے اُس کا تبسم مجھے یاد آتا ہے
مسکراتا ہُوا چہرہ اُس کا
بات کیا ہے کہ مری آنکھوں سے ہٹتا ہی نہیں
اُس کے چہرے سے حسین تر چہرے
دیکھے ہوں گے مری آنکھوں نے نہ جانے کتنے
مگر اس وقت کوئی یاد نہیں
فقط اس وقت وہی چہرہ مرے سامنے ہے

(۵)

کیا وہ یاد آتا ہے لہجے کی حلاوت کے سبب
اپنے بہتے ہوئے دریائے محبت کے سبب
یہ محاسن مگر اوروں میں بھی اکثر ہوں گے

(۶)

اُنہی باتوں میں کوئی بات یہ مانا نہ سہی
پھر بھی کوئی بات تو ہے
جو سمجھ میں مری آتی ہی نہیں
اور میں سوچتا ہوں
کیوں مری آنکھ سے آنسو ہیں رواں
وہ مرا کیا لگتا تھا
کیوں مرے دل پہ ہے اِک بوجھ سا اس وقت آزادؔ
جنسِ نایاب کوئی جیسے گنوا بیٹھا ہوں

مرا دشمن مرا دوست

(سلام مچھلی شہری کی یاد میں)

وہ خرد مند کہ دیوانہ رہا ساری عمر
اپنی محفل کا وہ دیوانہ بھی ہشیار گیا

یار جانی کہ جو تھا ہوش میں اک پیکر حلم
اور نشے میں جو تھا ایک بت طناز گیا

ہائے وہ دوست کہ مجموعۂ اضداد تھا ایک
پیکر حسن گیا پیکر آواز گیا

گالیاں جب تری یاد آتی ہیں کھلتا ہی نہیں
پیکر صبح کہ مجموعۂ پرواز گیا

کتنے آداب ترے جینے کے یاد آتے ہیں
ناک خاموش تھی اک شعلہ کفنا کر گیا

تجھ سے لڑنا تھا مجھے کتنے ہی جھگڑوں کا حساب
اب تو ہونا ہے کہاں جیت کہ میں ہار گیا

عمر آزادی تری جس سے لڑائی میں کٹی
وہ ترا ایک عدو وہ ترا اک یار گیا

نیک تھا یہ تھا کہ اچھا کہ برا یار سلام
آپ کے دور میں کچھ ایسے ادا دیتے ہیں

تیرے دشنام سے لبریز سے نام خطوط
ان میں بھی عظمت آدم کے نشاں ملتے ہیں

جیسے ظلمات کے عالم میں بلندی پہ رواں
نور برساتے ستاروں کے جہاں ملتے ہیں

پھر مرے دل کو ہے ملامت اسی لذت کی تلاش
ترے ہر لفظ میں جو تیر نہاں ملتے ہیں

تو نے ہم کو نہ کبھی ہم نے تجھے پہچانا
وہم جس طرح دماغوں میں رواں ملتے ہیں

کیا کوئی جذبۂ حسد کا ہے کہ ہے جذبۂ خلوص
جس میں [illegible] ملتے ہیں

ہم میں دو رشتے تھے اک قرب کا اک بعد کا تھا
دو ہی کم ظرف ہیں یہ رشتے کہاں ملتے ہیں

یاد آتا ہے ترا جوش قیامت سے مجھے آج
کتنی دلچسپ یہ سب بات نظر آتی ہے

اس کو چوبیس برس آج گزرتے ہیں مگر
رات وہ آج کی ہی رات نظر آتی ہے

وہ حقیقت وہ ٹھٹھرتی ہوئی کشمیر کی رات
محض تصویر خیالات نظر آتی ہے

اب بھی وہ پھول کراچی میں شگفتہ ہے سلام
اب بھی اس پھول میں اک بات نظر آتی ہے

دور وہ ختم ہوا آج مگر اب بھی وہ آنکھ
ایک تصویر مدارات نظر آتی ہے

کہ وابستہ ہیں اس حسن کی یادیں تجھ سے
جس سے ہر رات وہی رات نظر آتی ہے

جیت کیسی تھی وہ کیا ہار تھی اب تو پیارے
بازیٔ بزم وفا مات نظر آتی ہے

مرے شاہ پارے تھے قرطاس پہ سچ ہے کہ نہیں — تجھ کو عنواں نہ ملا تیرے فسانے کے لیے
جو لکھے تو نے بنے تھے ترے پاس مگر — کوئی تصویر نہ تھی ان میں سجانے کے لیے
تجھ کو وہ لمحہ نہ پایا سب میسر نہ ہو — تو نے جس کے لیے الزام زمانے کے لیے
عہدِ نو آ ہی پہنچا ہے یہ ہے میرا بھی خیال — وقت سازش ہے فقط تم کو مٹانے کے لیے
ترکِ شہ نوشی ہو یا کثرتِ مے نوشی ہو — مضطرب ہے ملک الموت بہانے کے لیے
ترے انجام کو دیکھا ہے تو پایا ہے ثبوت — قدر دانی ہے یہاں محض دکھانے کے لیے

فقط آہ جگرِ تیر و تبر ہے یہ چمن
نہ تو نالے کے لیے ہے نہ ترانے کے لیے

تو تو اب روٹھ گیا اور میں یہ سوچتا ہوں — "بدلِ لذتِ آزار کہاں سے لاؤں"
یاد آتا ہے یہ مصرع بھی تری یاد کے ساتھ — "اب تجھے اے ستم یار کہاں سے لاؤں"
یوں تو دنیا ہے دل آزار مگر یار سلام! — تجھ سا محبوب دل آزار کہاں سے لاؤں
تو عداوت کا مرقع تھا محبت کی شبیہہ — اب تری زیست کے اطوار کہاں سے لاؤں
آج مٹتی ہوئی تہذیب کے لب پہ ہے سوال — "تجھ سا اس دور میں فن کار کہاں سے لاؤں"
بس میں تجھ سے نظر آجاتے تھے اکّا دُکّا — آج وہ کوچہ و بازار کہاں سے لاؤں

اپنے ہی آپ سے اب بزمِ سخن پوچھتی ہے
"مجمعِ سبحہ و زنّار کہاں سے لاؤں"

موت فن کار کی اعزاز لیے آتی ہے — زندگی بے کسیِ غم کے سوا کچھ بھی نہیں
آشنا موت ہے، فن کار کی ہر خواہش سے — زیست بیچاری پہ یہ بھید کھلا کچھ بھی نہیں
ہم فقیروں کی سمجھ میں نہ کبھی آئی یہ بات — نام ہے محض ہوا اور ہوا کچھ بھی نہیں
یہ جو توصیفِ سخن ہے یہ جو ہے نثر کی داد — غور سے دیکھیں تو جھولی میں پڑا کچھ بھی نہیں
خار تلووں کو ملے ہیں کہ نہیں آنکھوں کو پھول؟ — کیوں تجھے وہم ہے یہ تجھ کو ملا کچھ بھی نہیں
موت جس راز کے ہر نکتے کو پہچان گئی — زندگی کو ابھی اُس شے کا پتا کچھ بھی نہیں

موت لائے گی صلہ تیری جگر کاری کا
زندگی میں ترا فن کار صلہ کچھ بھی نہیں

سراج الدین ظفر

کراچی ہو کہ پنڈی ہو کہ ہو لاہور کی دنیا
اُٹھے جاتے ہوں جب ایک ایک کرکے ہم نشیں اپنے

تعلق ٹوٹتا جاتا ہے مجھ سے اب وطن میرا
تو پھر آزاد دل کیسے لکھوں یہ سب ہے چمن میرا

ابھی تازہ تھا غم یوسف ظفر کا اور ناصر کا
مرے اخلاص میری دوستی کو ناز تھا جس پر

خبر آئی سراج الدین ظفر بھی ہو گیا رخصت
وہ میرا ابر میرا ہم نظر بھی ہو گیا رخصت

خراباتی تھا اور اسرار کا گنجینہ رکھتا تھا
بباطن مستِ جامِ مصطفےٰ تھا اور بظاہر بھی

کرامت ایک بر خرقہ پشمینہ رکھتا تھا
غزالِ شہر سے رسم و رہِ دیرینہ رکھتا تھا

کراچی کا سفر ہے اور پہلے کی طرح اب بھی
مگر دل ڈوبتا جاتا ہے میرا اس تصور سے

ہزاروں زحمتیں میرے دل و جاں میں سمائیں گی
سراج الدین ظفر تجھ کو مری آنکھیں نہ پائیں گی

سخن کی محفلیں ہوں یا سمندر کا جزیرہ ہو
نیا ماحول ہوگا اور نئی بزمِ سخن ہوگی

نظر آئے گی مجھ کو چار جانب ایک ویرانی
سمجھ پائے گا کون اس میں مرے دل کی پریشانی

ابھی تو موسمِ گل کے بہت انعام باقی تھے
ابھی تشریح کا محتاج ہر مصرع تھا کاکل تھا

ابھی تو شعر کے پردے میں سو الہام باقی تھے
ابھی تو اس نوشتے میں بہت ابہام باقی تھے

میں اے دانندۂ رازِ گل و مل ہوں اس الجھن میں
نسیمِ صبح کا لہجہ لیے لفظوں کے ہونٹوں پر

گل و مل کے اب اسرارِ کہن تک کون پہنچے گا!
غزالوں کے تعاقب میں ختن تک کون پہنچے گا

عبودیت کا عالم اور رازِ ہُو کے پردے میں
مے عشقِ محمدؐ سے بیاں سرشار ہے تیرا

ہمیشہ یاد رکھے گا غزل کا ساز تو تجھ کو
ترستا ہی رہے گا نعت کا انداز تو تجھ کو

صدیق کلیم اور ان کا فن

مظفر بخاری

پروفیسر صدیق کلیم ہمارے دور کے معروف شاعر اور نقاد ہیں۔ زمانۂ طالب علمی ہی سے انھیں شاعری کے ساتھ ساتھ تنقید سے بھی شغف رہا ہے۔ چنانچہ اُن کی شاعری اور تنقید کی عمر تقریباً یکساں ہے۔ اسی سبب وہ پختہ شعری شعور کے ساتھ ساتھ گہری تنقیدی نگاہ کے حامل بھی ہیں۔ تنقید کے میدان میں اُن کی "چیخوف" اور "شیکسپیئر" پر دو کتابیں پہلے شائع ہوئی تھیں۔ اور اب حال ہی میں اُن کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "فکرِ سخن" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ شیلے پر انگریزی میں لکھی گئی کتاب اِس شاعر کے فکری ارتقاء کی داستان ہے جسے یورپ میں بھی سراہا گیا ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ انھوں نے مختلف زبانوں سے اُردو میں ترجمہ شدہ تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ "نئی تنقید" کے عنوان سے بھی شائع کروایا تھا۔ یہ کتاب اردو تنقید میں ایک بہت ہی اہم دستاویز ہے جس میں دُنیا کے بہترین تنقیدی مقالات کا معیاری ترجمہ شامل ہے۔ اس کتاب نے اُردو تنقید کو ایک نئی جہت اور زبان بخشی ہے۔

"فکرِ سخن" میں اہم ادبی موضوعات اور شخصیات پر نہایت اوریجنل اور پُرمغز مقالے شامل ہیں۔ کلیم صاحب نے خود کو کسی مدرسۂ فکر سے منسلک کئے بغیر ایک نہایت متوازن نظریۂ تنقید پیش کیا ہے۔ جو اِس کتاب کے آخری مضمون "جدید ادبی تحریک" میں واضح طور پر سامنے آتا ہے۔

شاعری کے میدان میں کلیم صاحب کا پہلا مجموعہ "دمِ نیم سوز" کے نام سے ۱۹۵۵ء کے لگ بھگ شائع ہوا تھا۔ اور دوسرا مجموعہ "روشنیوں کا سفر" کے عنوان سے ۱۹۷۲ء میں چھپا۔ پختہ تنقیدی نظر کے سبب وہ تمام عمر ایک کم گو اور نسبتاً خاموشی سے لکھنے والے رہے ہیں۔ بطورِ شاعر نام پیدا کرنے کی خواہش آغاز میں تو رہی تھی لیکن رفتہ رفتہ دب سی گئی۔ چنانچہ اُن کا شمار اُن شعرا میں کیا جاسکتا ہے جو شدید تخلیقی ضرورت کے تحت ہی لکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے قلم سے نکلا ہوا ہر لفظ کامل احساسِ ذمہ داری کا مظہر ہے۔

باوجود اِس امر کے کہ انھیں زبان پر مکمل عبور حاصل ہے، اُن کے ہاں قاری کو محض الفاظ کی گھن گرج سے متاثر کرنے کا رجحان قطعاً دکھائی نہیں دیتا۔ اُن کی زبان ان کے شعری تجربے کی صداقت کی واضح دلیل ہے۔ وہ اپنے تجربات اور عہدِ جدید کے تقاضوں کی اِس حد تک پابندی کرتے ہیں کہ اُن قارئین کی ایک بڑی اکثریت کے ردِ عمل سے بے نیاز ہوجاتے ہیں جن کے ذوق کی پرورش و تربیت روایت پرور روایتی انداز میں ہوئی ہے۔ چنانچہ جب عام قاری کو الفاظ اور رمزیہ تصاویر (IMAGES) کے استعمال کا ڈھنگ نامانوس نظر آتا ہے تو وہ ابہام اور پھیکے پن کی شکایت کرتا ہے۔ یہ صورتِ حال بالخصوص صرف اُن چند نظموں کے بارے میں ہے جو "دمِ نیم سوز" کی اشاعت کے بعد کے کچھ عرصے میں لکھی گئیں۔ لیکن یہ نظمیں اِس لحاظ سے بہت اہم ہیں کہ اِن کے

ذریعے کلیم صاحب کی شاعری نئے دور سے مربوط اور ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔

" دمِ نیم سوز " میں ۱۹۳۹ء سے ۱۹۵۵ء تک کے زمانے کی نظمیں شامل ہیں۔ یہ زمانہ تحریک ترقی پسند مصنفین کے عروج کا زمانہ ہے اور اس دور کے شعرا کی اکثر و بیشتر نظموں پر اس تحریک کی چھاپ واضح دکھائی دیتی ہے۔ نوجوان شعرا بالخصوص اس تحریک سے متاثر تھے مجھے اس وقت اس تحریک کے حسن و قبح سے قطع نظر یہ کہنا ہے کہ اس دور میں بھی کلیم صاحب کی نظر ادب کی دائمی اقدار پر تھی۔ اکثر ترقی پسند شعرا کی نظموں کے برعکس ہمیں دمِ نیم سوز کی نظموں میں موضوعات کا تنوع، تجربے کی ہمہ گیری، ایک نوع کی آفاقیت اور ایک رومانی اور جمالیاتی انداز نظر آتا ہے۔ کچھ نظموں میں ترقی پسند آدرشوں کی جھلک بھی ملتی ہے لیکن نہایت فن کارانہ خوب صورتی کے ساتھ۔ مثال کے طور پر "ترغیب" "شاہکار" "عہدِ محبت" "مہارانی" اسی قبیل کی نظمیں ہیں ؎

بھوک جو آن کے لگتے ہوئے نشتر کی طرح
یا کسی زہر میں بجھتے ہوئے خنجر کی طرح
میری دکھتی ہوئی آنتوں میں ابھی باقی ہے
اور تو ہے کہ پسِ پردہ چھپی جاتی ہے
اور فسردہ ہیں طرب خیز چراغاں راہیں
پُر گھنی شاخوں میں بہکی ہوئی شاداں راہیں
ایک ناکام محبت ہے ہوس کار نہیں
تیری الفت کا طلب گار، گنہگار نہیں

(شاہکار)

"مہارانی" کا آخری بند ملاحظہ ہو ؎

نئی رانی کی مسرت کے یہ ساماں ہوں گے
ایک روز اس کے مقدر پہ بھی خنداں ہوں گے
زیست کیوں مفلس و نادار کے پہلو میں کٹے
میری محبوب نے چاہا کہ مہارانی بنے

(مہارانی)

کلیم صاحب نے آنکھیں بند کر کے مروجہ طریقہ اور اسلوب نہیں اپنایا۔ بلکہ ایک حساس اور باشعور فن کار کی مانند روحِ عصر کو جانا پہچانا اور اس کا اظہار کیا ہے۔ اُن کا عصری شعور اور مخصوص اندازِ فکر اُن کے الفاظ بندش و تراکیب اور رمزیہ تصاویر میں جھلکتا ہے۔

ہیئت کے اعتبار سے " دمِ نیم سوز " کی نظمیں کم و بیش کلاسیکی تکنیک ہی میں ہیں لیکن یہ مجموعہ کئی اور لحاظ سے بہت اہم ہے

ان نظموں سے کلیم صاحب کا روایت کے بارے میں رویہ متعین ہوتا ہے۔ اور پھر اس رویے کا مکمل اور پختہ اظہار اُن کے دوسرے مجموعہ کلام "دھنک" میں واضح طور پر ہوا ہے۔ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر ہیں کہ جس طرح ماضی حال کو متعین کرتا ہے اسی طرح حال ماضی کو بھی متاثر کرتا ہے۔ یعنی حال و ماضی میں فرق یہ ہے کہ شعوری حال ایک طرح سے اور کسی حد تک ماضی کی آگاہی کا نام ہے چنانچہ کلیم صاحب نثر میں بھی اور شعر میں بھی روایت کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے۔ اُن کے ہاں روایت کا مطلب اپنے سے پہلی نسل کے طریقوں اور کامیابیوں کا آنکھ بند کرکے اتباع کرنا یقیناً نہیں ہے۔ روایت کا وہ حصہ جو عہدِ نو کا ساتھ نہیں دے سکتا وہ بلا جھجک رد کر دیتے ہیں لیکن روایت کے زندہ اور توانا عنصر کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے۔ روایت کے اسی زندہ اور توانا عنصر میں جب وہ اپنے عصری شعور، تخلیقی ضرورت اور تجربے کی صداقت کو شامل کرتے ہیں تو نہایت جاندار شاعری معرضِ وجود میں آتی ہے ؎

گر رہے ہیں گھنیری ٹہنی سے
زرد پتے ندی کے دھارے پر
اور کھیتی ہیں آب کی موجیں
کونپلوں کے سبھی اشارے پر

دور تک کھیت کی لکیروں سے
ذہن پر خواب آفریں لہریں
پھر ابھرتی ہیں یاس و حرماں سے
میری تخئیل کی غمیں لہریں

زندگی اک کدال ہے گویا
میرے سینے پہ چلتا رہتا ہے
زندگی اک تپک ہے شعلہ ہے
میرے سینے پہ جلتا رہتا ہے

(کنارِ آب)

کلیم صاحب کی نظموں کی ایک اور خصوصیت اُن کا اعتدال پسندی کا رویہ ہے۔ زبان ہو یا اظہار، اسلوب یا رمزیت، شاعر کہیں بھی افراط و تفریط کا شکار نہیں ہوتا۔ نہ تو شاعر قاری کو الفاظ کے شکوہ سے متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور نہ ہی بے جا جدت پسندی سے اُسے چونکانے کی ؎

رقص گاہوں میں جواں جسم
تھرکتے ہیں مچلتے ہیں کہیں
ہیں فریاد کناں خود ہی لپٹ جاتے ہیں
تلخیٔ مے سے تھکن دور ہوئی
گردشِ خون کی اس سے تیز ہوئی ہے
کیسے معلوم کہاں رات بسر ہو جائے؟

"لندن کی ایک شام" (روشنیوں کا سفر)

اس میانہ روی کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ کلیم صاحب کو بڑا شاعر کہلانے کا شوق نہیں اور دوسری بڑی وجہ اُن کا عالمانہ ذہن اور وسعتِ مطالعہ ہے۔ ان دونوں عوامل نے اُن میں ایک احساسِ ذمہ داری اور محتاط رویے کو جنم دیا ہے۔ یہ احساسِ ذمہ داری اور محتاط رویہ اگرچہ [illegible] کی ذہن کی نمایاں خصوصیت رہی ہے لیکن جدید ذہن بہت حد تک اس سے عاری ہے۔

کلیم صاحب کی نظموں میں جدید دور کے مسائل، الجھنیں اور جدید انسان کے اندر کی توڑ پھوڑ کا اظہار تو ہے لیکن اس مقصد کے حصول کے لئے انھوں نے اپنے فن کو بے راہ روی، توڑ پھوڑ اور بے مقصد بغاوت کا شکار نہیں ہونے دیا۔ اُن کی نظموں میں ابھرنے والا انسان شکست و ریخت کا شکار سہی، آدھا سہی لیکن اُن کی ہر نظم آدھی نہیں پوری ہے شکست و ریخت کی شکار نہیں بلکہ ایک مکمل اکائی ہے۔

شاعر اپنے ارد گرد ایک گمبھیر قسم کی ابتلا، معاشی بحران، اخلاقی اقدار کی شکست و ریخت، افراد میں ہزیمت اور شکست خوردگی کا احساس دیکھتا اور محسوس کرتا ہے لیکن ان عوامل کو براہ راست شعر میں منتقل نہیں کر دیتا۔ بلکہ یہ سارا مواد قلبِ ماہیت کے عمل سے گزرتا ہے اور مکمل، جامع اور خوب صورت فن پاروں کا روپ دھار لیتا ہے اور پھر یہ فن پارے دلوں میں خوف، ہزیمت، شکست خوردگی اور ٹوٹ پھوٹ کے احساس انشراح (CATHARSIS) کا سبب بنتا ہے اور ایک نوع کا حظ عطا کرتا ہے (جسے میں اب بھی ادب کا بنیادی فریضہ سمجھتا ہوں) اور قاری کے ڈولتے ہوئے ایمان کو تقویت دیتا ہے اور پھر زندگی اپنی تمام تر بدنمائیوں کے باوصف حسین نظر آنے لگتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

اب تو اک اک سانس پہ جی کی دھڑکن ہے ناگزیر
موت کی بے مہر ظلمت روشنی پہ چھا گئی
دھیرے دھیرے کس نہج پہ آ گئی یہ زندگی
دھیرے دھیرے بجھ گئی گہنا گئی یہ زندگی
ہم ہیں اک سلجھی ہوئی گمبھیر الجھن کے اسیر

یہ سنہری دلکشی زہراب ہو کر رہ گئی
پھر بھی انساں کی قسم اِس زندگی سے پیار ہے
شاید اب بھی آرزو کی روشنی بڑھتی رہے
شاید اب یہ تیرگی خود ہی سحر پیدا کرے
حُسن کی تخلیق ہی انسان کا اظہار ہے
شوق پھر زندہ ہُوا ہے آس پھر بیدار ہے

"اُلجھن" (روشنیوں کا سفر)

شاعری میں کلیم صاحب کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اُن کی نظمیں ایک طرف تو اُن اذہان کو مطمئن کرتی ہیں جو شاعری پر مقصد کی ہلکی سی پرچھائیں بھی نہیں چاہتے اور دوسری طرف اُن قارئین کو بھی جو شاعری کو بامقصد دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ بڑا جان جوکھوں کا کام تھا جو کلیم صاحب نے بطریقِ احسن سرانجام دیا ہے۔

زبان کے بارے میں کلیم صاحب کے رویے پر بہت کچھ کہنے کی گنجائش ہے۔ "دم نیم سوز" کی زبان کے بارے میں ایک فاضل نقاد نے کہا تھا کہ "زبان اپنی حدود سے باہر چھلانگیں مارتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔" اُن کا یہ احساس اپنی جگہ بالکل درست تھا۔ لیکن یہ حدود ہمارے روایتی اور پھر ترقی پسند شعرا کی متعین کی ہوئی تھیں۔ دوسرے درجے کے شاعر ہمیشہ پہلے سے متعین حدود کے اندر رہ کر ہی شاعری کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ نئی ہئیت اور زبان کی نہ ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ اور نہ ہی انھیں وضع کرنے پر قادر ہوتے ہیں۔ یہ ضرورت ایک نہایت ہی حساس اور خود مختار ذہن کو پیش آتی ہے۔ جو اپنے دور کی تیزی سے لیکن خموشی سے رونما ہونے والی تبدیلیوں کو محسوس کر سکے۔ اور اُن کا اظہار اُس کی زبردست تخلیقی ضرورت بن جائے۔

لیکن نئی لسانی تشکیل میں کلیم صاحب نے بے جا اسراف سے قطعاً کام نہیں لیا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے ہاں غیر ضروری ابہام راہ نہیں پاتا۔ کلیم صاحب کی چند نظموں میں جو تھوڑا بہت ابہام ہے، وہ ہمیشہ سے شاعری کا جزو رہا ہے کیونکہ اس کے بغیر شاعری سپاٹ اور سامنے کی چیز بن کر رہ جاتی ہے۔ یہ تخلیقی ابہام ہے اور اُس شعوری ابہام سے بالکل مختلف جو ہمارے جدید تر شعرا قارئین کو چونکانے کے لئے پیدا کرتے ہیں۔

"خلوص" کلیم صاحب کی ذات اور فن کی ایک اور نمایاں خصوصیت ہے۔ وہ نہ خود کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں نہ قارئین کو انہوں نے ہیئت اور زبان دونوں میں اپنے تجربات کے تقاضوں کو اولیت دی ہے۔ جب تک نظم آزاد اُن کی تخلیقی ضرورت نہیں تھی، انہوں نے پابند نظم لکھی۔ جب نئی ہئیت کی ضرورت پیش آئی۔ انہوں نے نئی ہئیت اپنائی۔ لیکن پابند نظم ترک نہیں کی۔ ان کے ہاں تجربہ ہی ہئیت کو متعین کرتا ہے۔

"روشنیوں کا سفر" میں ہمیں پابند، معرّیٰ اور آزاد، ہر قسم کی نظمیں ملتی ہیں۔ کہیں کہیں ہئیت کے تجربات بھی ہیں۔ لیکن زبان کی تازگی، شگفتگی اور مناسبت، نیز طرزِ احساس و اظہار کی ندرت اور میانہ روی نے اِن سب نظموں کو ایک لڑی میں پرو کر ایک

خوب صورت وحدت کی شکل بخش دی ہے۔ نظموں کے متنوع تجربات بالآخر ایک نقطے پر مرکوز ہوتے نظر آتے ہیں اور اس روشن نقطے سے وہ نظریۂ حیات پھوٹتا ہے جو اپنے اندر دائمی اخلاقی اقدار لئے ہوئے ہے اور جس کا اظہار ادب کی دائمی اقدار کے ذریعے ہوا ہے۔

کلیم صاحب اپنی شاعری میں کسی پہلے سے طے شدہ یا خود ساختہ فلسفے کی آمیزش نہیں کرتے اور اس لحاظ سے جمالیاتی مدرسہ شاعری کے بہت قریب ہیں لیکن شاعری کو محض ذہنی تعیش کا ذریعہ بھی نہیں بناتے۔ اُن کی شاعری میں مقصدیت یوں گھل مل اور رچ بس گیا ہے جیسے پھول میں خوشبو۔ اور یہ مقصد اخلاقی اقدار کا احیا اور ایک بہتر انسانی معاشرے کی تشکیل ہے۔ حریتِ فکر اور حب الوطنی جس کے امتیازی اوصاف ہیں۔ اور یہ وہ مقصد ہے جسے کوئی بھی حساس شخص نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس مقصد کا اظہار کلیم صاحب نے ہمیشہ تخلیقی سطح پر کیا ہے اور کہیں بھی ان کی شاعری پروپیگنڈہ کی سطح پر نہیں آتی۔

اُن کے فن کی ایک اور صفت اس کا مسلسل ارتقا ہے۔ "دردِ نیم سوز" کے مطالعے کے بعد جب ہم "روشنیوں کا سفر" پڑھتے ہیں تو سب سے پہلے اُبھرنے والا خوشگوار تاثر یہ ہے کہ شاعر کہیں رُکا نہیں۔ بالکل ایسے جیسے وقت نہیں رُکتا۔ چنانچہ ان کے فن میں سال خوردگی یا کہنگی کے قطعاً آثار نہیں ملتے۔ ان کا اپنا ایک مخصوص اسلوب ہے جو مسلسل ارتقا پذیر بھی ہے۔ وہ ادب کی دنیا میں اُٹھنے والی وقتی روشوں کی چکا چوند سے متاثر نہیں ہوتے۔ کیونکہ ان کے پاس خود اعتمادی اور خلوص کے علاوہ ایک تجزیاتی ذہن ہے جو انھیں تشکیک اور بے راہروی کا شکار نہیں ہونے دیتا۔

امن اور جنگ

صدیق کلیم

امن اور جنگ کی پھر بات چلی چلتی گئی
زاویے بدلے بدلتے ہی رہے
امن کا دَور ہے یہ
جنگ ہو سکتی نہیں
جنگ انساں کی گھٹی میں سہی
امن ہو سکتا نہیں
جنگ ہو کے ہی رہے گی آخر
امن انساں کی جبلّت میں نہیں
امن کا دور نہیں
زاویے دائرے بن جاتے ہیں

لوگ سرگوشی میں ہیں پوچھتے ہیں
در و دیوار سے بھی پوچھتے ہیں
جنگ کب ہوگی ؟ نہیں ہوگی ؟ بتاؤ ہوگی ؟

حکم ہے جنگ کرو
صبح سے شام تلک
خون ۔ میدان میں ۔ افلاک میں خون
حکم ہے بند کرو
اپنے خوں خوار جیالے شہباز
ہاتھ کو روکتے ہیں
دل مگر رکتا نہیں

امن اور جنگ کے رسیا لوگو!
امن اور جنگ کے مابین سیہ رنگ فضا
صبح کی پہلی کرن کا دھارا
سرخ گمبھیر اُفق شام ڈھلے
یہ ہر اک لمحہ سیہ رنگ فضا
ساتھیو! ہم وطنو!
آج اس کالی فضا میں خاموش
اپنے شہباز کبوتر نہ بنیں
فاختہ آ جائے
تو بہار آ جائے
امن اور جنگ کی پھر بات چلی چلتی گئی

شاید اب کوئی مسیحا آئے

صدیق کلیم

تشنگی اور بڑھی
پیاس بجھتی ہی نہیں
رقص کی لے تیز کرو
سرخ لہروں کی نئی راہ غبار آلودہ
خون کا پیاسا ہر اک بار پئے خون کا پیاسا ہی رہے
مرے شہباز جھپٹ!

یہ نہیں مانتے ہیں
آج کیوں بجث میں ہیں؟
کالے کوّے جو چلیں ہنس کی چال
مرے شہباز جھپٹ!

دوستو! ساتھیو!
شاید اب کوئی مسیحا آئے
کوئی تدبیر کرو
پیاس بجھتی ہی نہیں
ہونٹ ہونٹوں سے جدا ہوتے نہیں
مرے شہباز جھپٹ!

شاید اب کوئی مسیحا آئے
آخری بار مگر داؤ چلے
مرے شہباز جھپٹ!

ملاقات

صدیق کلیم

یہاں آس پاس اِر دگرد
لرزتے دِیے ناچتے ہیں
یہاں باغ ہیں ہر طرف
جگنوؤں کی امر مشعلیں ہیں
مدھر گیت ہیں
اِک ناس ہے
یہاں ہم ملے ہیں
کبھی بادلوں کے جھکولوں میں دل جاگتا ہے
سحر جاگتی ہے
پرندوں کے نغمے رسیلی خوشی بخشتے ہیں
یہاں پانیوں پر دھنک ناچتی ہے
یہاں تم مرے ساتھ ہو
کوئی کون ساگر میں اُترے
جہاں سیپ منہ کھولتے ہیں
جہاں آنسوؤں کی لڑی ہے
مگر لہر ساحل سے ٹکرا کے کہتی رہے گی
"یہ دم بھر کو آ کر یہاں مل گئے ہیں"
یہ وحشی، یہ آزاد دنیا
سخی رات روشن ستاروں کا سونا اُگلتی رہے گی
سدا چاند کی ناؤ چلتی رہے گی
اور رقصاں رہے گی امر جگنوؤں کی برات
کہ ہم تم یہاں پر ملے ہیں

جان پہچان

صدیق کلیم

دکھ سہنے والوں سے کون ملے گا ؟
کون کہے گا ؟ کیسے ہو ؟
ہر جانب ـ خوشبوؤں کا سیلاب
سانسوں کی نرم ہوائیں
تیز تنفس
اپنا سندر سپنا مخمل کا اک جنگل ہے
اپنا حاصل لیکن
کالی راتوں کا اک زہریلا جام
زیست کا پیکر ہر دم اک ہنگام
ہر جانب ہے اک ہیجان !
کس کو کس کی ہے پہچان ؟

صدیق کلیم

○

اپنے پیاروں پر جو گزری، آنا جانا بھول گئے
ایسا ایسا کھیل رچا تھا، کھیل تماشا بھول گئے

پیاری ہی، مدھ ماتی صورت والے سندر سپنا بھول گئے
کیسا میٹھا زہر پیا ہے؟ زہر پلانا بھول گئے

مخمل ایسے تن پر جب برسا من مندر ٹھہرا ہے
مست مدھ اندھیارے جاگے، ہم دیا جلانا بھول گئے

کون کہے گا؟ کون کسی کا! کس کا ہاتھ اور کس کا دامن
ہاتھوں ہاتھ چکا دُ سودا، بے کار فسانہ بھول گئے

بلبل چہکے، کوئل کوکے، سمے سمے یاد ستانے!
کیوں آدھی رات کو رونے والے جوت جگانا بھول گئے

○

ہم پہ اس بار جو گزری ہے وہ ہم جانتے ہیں
بکھرے پتوں کی کھنک ہی کو ارم جانتے ہیں

روح میں اُتری ہوئی آگ کی وحشی تلخی
ہم تو اس وعدۂ فردا کا بھرم جانتے ہیں

دیے بجھنے بھی رہے بجھ کے جھلکتے بھی رہے
یہ بھی اپنا ہی کرم اہلِ ستم جانتے ہیں

دین بھی ان کیلیے دنیا بھی اُن کی خاطر
لوگ بت خانے کو صدیوں سے حرم جانتے ہیں

کون پھر آئے گا دروازے پہ دستک دے گا
ایسی مشکل ہے کہ سب اہلِ قلم جانتے ہیں

ایک گوشہ

مہندر ناتھ

کے بارے میں

ورق ورق کھو گئی زندگی میری

کرشن چندر

چند دن ہوئے میں نے خواب دیکھا کہ مہندر جی حسبِ معمول خوابی لباس پہنے اپنے بستر پر اکڑوں بیٹھے کچھ لکھ رہے ہیں۔ ایک فل سکیپ کاغذ ان کے گھٹنوں پر پھیلا ہوا تھا۔ میں نے قریب جا کر ان سے پوچھا۔ "مہندر جی کیا لکھ رہے ہیں؟" ―― یکدم بھڑک کر بولے "دیکھئے نا بھائی صاحب لوگ سمجھتے ہیں چونکہ میں مر چکا ہوں۔ اس لئے اب میں لکھنے سے بھی قاصر ہوں۔ حالانکہ دیکھئے اب بھی میں برابر لکھ رہا ہوں۔"

میں نے جھک کر ان کے گھٹنوں پر پھیلے ہوئے کاغذ کو دیکھا۔ دائیں بائیں دونوں طرف وہ کاغذ ان کی تحریر سے پُر تھا اور کاغذ کے عین مرکز میں ان کی تحریر کا عنوان تھا میں نے اور جھک کر اس عنوان کو پڑھا۔

"ورق ورق کھو گئی زندگی میری"

یکایک میری آنکھ کھل گئی۔ دل کی کیا حالت ہوئی بتا نہیں سکتا۔ جب طبیعت اعتدال پر آئی۔ تو اٹھا۔ باتھ روم میں جا کر آنکھیں دھوئیں۔ پھر ایک نوٹ بک پر اس عنوان کو لکھ لیا۔ سوچا۔ اس سفرنامے کا یہی عنوان ہوگا۔ اس سفرنامے کے چند باب یہاں پیش کئے جا رہے ہیں۔

جب فلمز ڈویژن نے یہ طے کیا کہ کرشن چندر کے ادب اور زندگی پر بیس منٹ کی ایک دستاویزی فلم تیار کی جائے۔ انہوں نے مہندر جی کو بلوا کے یہ کام ان کے سپرد کر دیا۔ کچھ دن بمبئی میں شوٹنگ ہوتی رہی۔ پھر پونا اس مقصد کے لئے گئے۔ پھر پونا سے لوٹنے پر کشمیر جانے کا پروگرام بنا۔ جہاں ہم دونوں بھائیوں کے بچپن اور جوانی کی گم شدہ تصویریں تھیں۔

فلمز ڈویژن کا دیا ہوا ہزار۔ روپیہ خرچ ہو چکا تھا کشمیر جانے کے لئے ایک معقول رقم کی ضرورت تھی۔ اتفاق سے اس دستاویزی فلم پر ایک بینک نے مہندر جی کو پچاس ہزار روپے قرض دیئے۔ کشمیر کا پروگرام بننے لگا۔ کون کون لوگ جائیں گے مہندر جی بولے "آپ ہوں گے اور سلمیٰ بھابی۔ میں اور درگا۔ کپور صاحب اور پونم۔ جس کمپنی سے فلم کیمرہ کرائے پر لیا جائے گا اس کا کیمرہ مین اور ایک اسسٹنٹ اور ہاں رام چندر۔ ڈائریکٹر آف فوٹوگرافی بھی ہوگا۔ اور جس بلڈنگ کے مالک کے فلیٹ میں وہ رہتا ہے۔ اس کی بیٹی رانی بھی چلنے کو کہہ رہی تھی اور درگا کا دل ستیش اور نوتن کے بغیر نہ لگے گا۔ اس لئے ان دونوں کو بھی لے جانا پڑے گا۔ اور ہاں اپنے دوست مدھوسودن کا تو نام ہی بھول گیا۔ جو یہ فلم ڈائریکٹ کر رہا ہے۔ پریم ہیلی چلنے کو کہہ رہا ہے اس کی بیوی بھی جائے گی اور۔ . . . . "

میں نے انھیں ہاتھ سے روک کر کہا "بس بس۔ پندرہ آدمی تو یہی ہو گئے۔ کس کی بارات لے جا رہے ہو؟"

مہندر جی مسکرا کر بولے۔ "ابھی فہرست مکمل کہاں ہوئی ہے؟ بہن سرلا کو لکھ دیا ہے اور اس کے دونوں لڑکے وجے اور متا بھی۔ یہ لوتی جی بھی چلیں گے۔ بھائی آدم کو لکھ دیا ہے۔ اس کی بیوی کملا بھی چلے گی اور اس کا بیٹا بلی اور بچی انیلا اور۔ . . . . . "

میں نے تعجب سے ان پر اک نگاہ ڈالی۔ کہا "اتنے لوگوں کو پہاڑ پر لے جانا؟ کوئی ٹھیکیدار ہی کر سکتا ہے!

مہندر جی نے بینک کا چیک میرے سامنے پھرا کر کہا "آدھا ٹھیکیدار تو ہو چکا ہوں" — وہ مسکرا رہے تھے۔

" سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ روپیہ کہاں گیا۔ میری سنو تو صرف چھ آدمی لے جاؤ۔ تم چلو میں چلتا ہوں ڈائریکٹر چلے گا اور کیمرہ مین۔ دو آدمی اور ساتھ لے لو۔ کل ملا کے چھ آدمیوں کا یونٹ ہوگا بیس پچیس ہزار میں سب معاملہ نپٹ جائے گا۔ باقی رقم آپ اپنے لیے بچا سکتے ہیں تیس ہزار کی رقم کم نہیں ہوتی۔"

مجھے سنجیدہ دیکھ کر مہندر جی کے چہرے پر اداسی کی لہر دوڑ گئی بولے "بھائی صاحب۔ مجھے روپیہ بچا کر کیا کرنا ہے۔ بال بچے میرے نہیں۔ رہی درگا۔ اس کا کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ کیا کروں گا روپے جمع کر کے۔ جی چاہتا ہے اس موقع پر سارا خاندان چلے۔ سارے دوست چلیں۔ اور آپ کاٹ چھانٹ کر رہے ہیں۔ رہنے دیجئے۔ مجھے میری خوشی پوری کرنے دیجیے۔"

پھر میں کچھ نہ بولا۔ کشمیر جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ پھر بھی کچھ دوست رہ گئے۔ پریتم سیلی اور اس کی بیوی رام پیاری کو عین وقت پر کسی ضروری شوٹنگ پر جانا پڑ گیا۔ ریوتی جی، دس چلے گئے۔ یمنا اور دینو بھی تیار نہیں ہوئے۔ پھر بھی جموں ریلوے اسٹیشن پر جب سب اکٹھا ہوا تو بائیس آدمی تھے۔ مجھے معلوم تھا بائیس آدمیوں پر پچاس ہزار کی رقم کم پڑے گی۔ اس لئے کچھ رقم میں اپنی جیب میں ڈال کر لے آیا تھا۔ مہندر جی کو میں نے نہیں بتایا۔ روپے پیسے کے معاملے میں وہ بچوں کی طرح معصوم تھے۔

اسٹیشن پر ہمارا ... سنٹرل ریزیڈنٹ ایڈیٹر آف ہندوستان ٹائمز اپنے ساتھ کار لینے کے لئے آئے تھے۔ حکومت کی جانب سے انہوں ہی نے سب انتظام کر رکھا تھا۔ جموں ہوٹل میں آٹھ کمرے بک تھے۔ باقی لوگوں کے رہنے کے لئے سرکٹ ہاؤس میں انتظام کیا گیا تھا۔ مہندر جی کے بچپن کے دوست کورتی دت رینہ اور ان کے بڑے بھائی بھی آئے تھے۔ اس رات جموں ہوٹل کے بار اور اس کے ڈائننگ ہال میں بڑی گہما گہمی تھی۔ مہندر جی سب کی خاطر و تواضع میں مشغول بھاگے پھر رہے تھے۔ ان کی وہ موہنی مسکراہٹ سب کے لئے تھی اور سب کو خوش دیکھ کر وہ خود بھی خوش تھے۔

جموں میں ایک دن شوٹنگ کی۔ ان میں بادل کے بار بار ... کاٹنے پڑے کیونکہ ... بہت لمبی ہو گئی تھی۔ دوسرے دن جموں سے پونچھ کے لئے روانہ ہو گئے۔

انفارمیشن کے مہتمم پوری صاحب نے ایک اسٹیشن ویگن کا انتظام کیا۔ اپنے محکمے کی طرف سے ایک موٹر اور ایک جیپ ویگن، ریزیڈنٹ صاحب نے اپنے محکمے سے عنایت کی اور حکومت کشمیر نے اس قافلے کے دورہ کشمیر کے لئے ایک انفارمیشن آفیسر سردار نریندر سنگھ کو ہماری دیکھ بھال کے لئے مامور کیا۔ یوں تو ساتھ چلنے کا وعدہ رینہ وبھالی نے بھی کیا تھا اور وزیر مالیات گردھاری لال ڈوگرا نے بھی، مگر عین وقت پر سرکاری کاموں میں الجھ کر رہ گئے۔

ہمارا قافلہ جب جموں سے پونچھ کی جانب چلا تو کچھ دیر دریائے چناب کی نہر نے ہمارا ساتھ دیا۔ راستے میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں خیمے دکھائی دیئے۔ ان میں چھمب کے علاقے کے وہ ریفوجی رہتے تھے جن کے گھر بار ہندوستان اور پاکستان کی پچھلی لڑائیوں نے تباہ کر دیئے تھے۔ یہاں سے سرحد بہت قریب تھی۔ مگر ریفوجیوں کے بچے اس پاس کی نفرت سے بے خبر دھوم مچاتے ہوئے ریت میں کھیل رہے تھے۔ عورتیں قمیص شلوار پہنے نہر سے پانی کے گھڑے بھر رہی تھیں۔ شہتوت کے پیڑ کے نیچے ایک بڈھا حقہ پی رہا تھا۔ اس کے قریب اس سے منہ موڑ کر ایک نوبیاہتا جوڑا ایک دوسرے کو میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھنے میں مصروف تھا۔

میں نے مہندر کی طرف دیکھا۔ کچھ کہا نہیں۔ مجھے پتے ... ان کے درمیان بہت کم بات ہوتی تھی۔ گفتگو تو دراصل فاصلے کو مٹانے کے لئے ہوتی ہے جب دونوں فریق ایک دوسرے کو سمجھنا چاہتے ہیں مگر میرے اور مہندر کے درمیان کوئی دیوار نہ تھی اس لئے کوئی گفتگو نہ تھی۔ بس ہوں، ہاں، چند جملے یا ایسی خاموشی جس کی قوت اظہار گویائی سے بڑھ کر ہوتی تھی۔ اس لئے ... گفتگو ... خود کلامی تھی ... آج وہ اس جہاں میں نہیں ہے۔ میں گھنٹوں اس سے باتیں کیا کرتا ہوں۔ اچھا آپ ... مہندر سے پوچھا، کچھ یاد آ رہا ہے؟

"سیالکوٹ":

سیالکوٹ یعنی سیالوں کی بستی۔ سیال ہندو بھی ہوتے ہیں اور مسلمان بھی ہوتے ہیں۔ ایک زمانے میں سیال قبیلہ اس علاقے کا مشہور قبیلہ تھا۔ سیال عورتیں اپنی خوب صورتی اور ناز کی کے لئے مشہور تھیں۔ اور مرد اپنی وجاہت کے لئے پھر وہ سب پنجاب میں گھس گیا۔ لاہور میں ہمارا ایک سیال دوست رہتا تھا۔ برج موہن سیال وہ ہمارے کالج کی ایک لڑکی دلیپ کور پر عاشق تھا فلائنگ کلب میں شامل ہو کے روز اس کے گھر کے اوپر اپنا ہوائی جہاز دوڑایا کرتا تھا۔ ایک روز اپنے ہوائی جہاز میں اڑان کے کرتب دکھلاتے دکھلاتے اپنی محبوبہ کے گھر کے سامنے ٹیل کرتے کرتے گر گیا اور ہوائی جہاز سمیت جل گیا۔

"جل رہا ہے!" مہندر نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

میں نے کہا "عشق کی آگ کبھی بجھتی نہیں۔ اس سیال کی چتا آج بھی جل رہی ہے۔ مگر کیا بات ہے۔ مہندر جی۔ ہم لوگ کسی سے عشق نہیں کرتا۔ بس افیئر (AFFIAR) ہوتے ہیں۔"

"یہ سب ٹیلیفون کا قصور ہے" نسلمی نے اچانک کہا۔

ہم نے اور مہندر نے چونک کر نسلمی کی طرف دیکھا۔

"ہاں" نسلمی نے کہا "یہ سب ٹیلیفون کا قصور ہے۔ آج کل محبت ٹیلیفون سے شروع ہوتی ہے۔ ٹیلیفون پر کاٹ دی جاتی ہے۔ لطیف جذبہ کہاں سے آئے گا؟"

مہندر جی نے زور سے قہقہہ لگایا۔ پھر چپ ہو گئے۔ اور کہا میں اس طرف جدھر سیالکوٹ تھا۔ ڈاکٹر اقبال کا وطن۔ ایک دفعہ ہم دونوں بھائی اپنے باؤجی کے ساتھ سیالکوٹ گئے تھے۔ (ہم اپنے تایا جی کو باؤجی کہا کرتے تھے) ہم دونوں بہت چھوٹے تھے اور ڈاکٹر اقبال کا نام بھی نہیں جانتے تھے۔ سیالکوٹ کے قریب قصبہ گھرل میں اپنے قرابت داروں میں ایک شادی تھی۔ شادی میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ مگر جس دن ہم وہاں پہنچے۔ رات گذرنے کے بعد صبح ہوئی تو میں نے باؤجی کو چپکے چپکے اپنے بستر کے کنارے روتے دیکھ لیا۔ سمجھ میں نہ آیا۔ کیا بات ہوئی۔ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ مہندر نے کہا اس کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آیا۔ بہت سال گزر گئے۔ وہ آنسو معمہ ہی رہے۔ پھر ایک دن جب مہندر کی محبوبہ کی شادی کی تاریخ قرار پائی۔ تو مہندر نے بڑے دل گداز لہجے میں مجھ سے کہا "آج سمجھ میں آیا باؤجی کیوں رو رہے تھے۔" پھر آہ بھر کر بولے انسان کو سمجھنا آسان ہے۔ بھائی صاحب آنسوؤں کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔"

ہمارا قافلہ اب جموں کے مضافات سے دور سیلی سڑک پر بھاگ رہا تھا۔ دو رویہ ریتیلے میدان تھے۔ یا بوکے کھیت یا بنجر پہاڑیاں۔ جن میں کانٹے دار جھاڑیوں کے سوا کچھ اگتا نہ تھا۔ ہمارے قافلے کے سب لوگ تین گاڑیوں میں سما نہ سکتے تھے۔ اس لئے نو آدمیوں کو صبح کی بس میں پونچھ کے لئے روانہ کر دیا تھا۔ گرمی دم بدم بڑھتی جا رہی تھی۔ جموں سے راجوری کی طرف دریا پر پہنچے تو وطن کے پہاڑوں سے ٹھنڈی ہوائیں آنے لگیں اور جھاگ اڑاتی ہوئی تیلی لہریں خوش آمدید کے پیام دینے لگیں۔ ڈاک بنگلے میں کھانے کا انتظام تھا۔ اتفاق سے وہ بس جس میں باقی کے نو ساتھی سوار تھے۔ یہیں راجوری کے بازار میں

مسافروں کے کھانے کے لیے رک گئی تھی۔ ہمیں معلوم ہوا تو ہم نے ایک اسٹیشن ویگن بازار بھیج کر باقی ساتھیوں کو بھی یہاں کھانے کے لئے بلوا لیا۔ کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کیا۔ ڈاک بنگلے والوں نے ہمارے لئے چار کمرے کھول دیئے تھے۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد جو باہر نکلا تو مہندر جی کو چپ چاپ نچلی منزل کے برآمدے کے فرش پر بیٹھا ہوا پایا۔ میں بھی ان کے قریب جا کے بیٹھ گیا۔ انہوں نے قریب میں پھیلی ہوئی بجری کی چند کنکریاں اٹھا رکھی تھیں اور انہیں ایک ایک کر کے چھوٹے بڑے وقفوں کے بعد لان کی گھاس پر پھینک رہے تھے۔ چھوٹا وقفہ۔ چھوٹی یاد۔ بڑا وقفہ۔ بڑی یاد۔ یہ جو بجلی کی طرح کوند جائے یا وہ لمحہ جو ماہ و سال کی کوئی خوب صورت تصویر بن کر دل کے دریچے میں اتر جائے۔

میں نے مسکرا کر کہا "مہندر جی: یہ کس شیطان کو کنکریاں مار رہے ہو" وہ بولے "دل کے شیطان کو بھائی صاحب۔ چلا جاتا ہے اور مجھے لاہور لئے جا رہا ہے۔ یاد ہے ہم لوگ رات کی گاڑی سے لاہور نکلتے تھے اور صبح راولپنڈی پہنچ جاتے تھے۔ پھر صبح کا ناشتہ راجہ بازار میں روپ سنگھ کے ڈھابے پر کرتے تھے اور پھر——؟"

"اور پھر" میں نے کہا "کوہ نور بس سروس کی کسی لاری پر سوار ہو کر راولپنڈی سے مری۔ مری سے کوہالے۔ کوہالے سے اُڑی اور اُڑی سے براستہ علی آباد پونچھ پہنچ جاتے تھے۔ وہ راستہ کتنا خوب صورت تھا۔

پھر میں نے کہا "اب تک تو یہ راستہ پھیکا اور بدرنگ رہا گرمی سے جھلس گئے۔ جموں پونچھ روڈ پر سفر کرنے کا ہمارا یہ پہلا موقع ہے۔"

مہندر جی مسکرا کر بولے "یہی سوچ کر میں نے اس سڑک کو معاف کر دیا کہ اس راستے پر ہماری کوئی یاد نہیں۔ اور یادیں ہی تو ہیں جو ہر سفر میں رنگ بھرتی ہیں۔ میں اس کے لئے اجنبی۔ یہ میرے لئے اجنبی۔ لیکن اس اجنبی کے لیے اجنبی نہیں جس نے چند میل پہلے ایک چھوٹے سے نخلستان میں تپتے ہوئے سفر سے گزر کر گاڑی روک کر چودہ سال کی نوخیز کلی سے پانی کے لیے پوچھا تھا اور ہم وہ سب لوگوں کو ایک ڈھلوان سے ایک پرانی باؤلی پر لے گئی تھی۔" مہندر نے ایک کنکری پھینک کر کہا "اس کی آنکھیں گہری سبز تھیں۔"

"اور اب وہ کبھی بڑی نہ ہو سکے گی۔ ہمیشہ چودہ سال کی رہے گی۔ اور دوسری بار جب ہم اس سڑک سے گزریں گے اور اس نخلستان کی باؤلی کا پانی پئیں گے۔ تو شاید وہ وہاں نہ ہو گی لیکن اس دوسرے سفر پر اس کی سبز آنکھوں کا افسوں دیر تک جادو جگاتا رہے گا۔" میں یہ کہہ کر چپ ہو گیا۔

مہندر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے "مگر یہ تو سچ ہے کہ سڑکیں بھی پالتو جانوروں کی طرح ہوتی ہیں۔ دھیرے دھیرے مانوس ہوتی ہیں۔ پالتو جانوروں کی طرح کبھی کبھی کھو بھی جاتی ہیں۔ جیسے وہ سڑک ہم سے کھو گئی ..... ہماری بچپن سے جوانی تک کی سڑک۔"

اس کے بدلے میں یہ نئی سڑک ہمیں مل گئی۔ ٹھیک ہے ہمارے لئے یہ اجنبی ہے لیکن اس سڑک کی انسیت ان لوگوں سے پوچھو۔ جو بار بار اس سے گزرے ہیں۔ اس پر چلے ہیں۔ راستے کے ندی نالے جنھوں نے پیدل پار کئے ہیں ان کے لئے کسی

ندی کے بہاؤ میں جل پڑی تھی۔ کسی کچے کوٹھے کے آنگن میں کوئی شمع فروزاں تھی ......"

مہندر ہنس کر بولے "ارے بھائی صاحب آپ کی شاعری ...... بس اب اٹھئے۔ چلنے کی تیاری کریں۔ شام ڈھلتے پونچھ پہونچ جانا چاہئے۔

سندربنی کا ذکر ہی بھولتا جا رہا ہوں۔ اونچے اونچے پہاڑ سے لدے ہوئے پہاڑوں کے خطرناک موڑ کاٹتے ہوئے جب سندربنی راستے میں آئی تو پہاڑ یک لخت پیچھے ہٹ گئے۔ اور ایک خوبصورت دور دور تک پھیلی ہوئی وادی نظر آئی۔ میلوں تک کھیت تھے اور جنگل پیچھے ہٹ گئے تھے۔ کسی زمانے میں یہ سب کھیت جنگل ہوں گے اسی مناسبت سے لوگوں نے اس کا نام سندربن رکھ دیا ہوگا۔ جو اب بگڑ کر سندربنی ہو گیا ہے۔ کچھ لوگ اسے سنٹر بنی بھی کہتے ہیں۔ مگر ہے یہ سندربن۔ ایک سندربن بنگال میں بھی ہے۔ وہاں تو ابھی گھنے جنگل موجود ہیں۔ مگر یہاں کاٹ ڈالے گئے ہیں۔ اور اب وہ کھیتوں سے دور دور سہمے سہمے سے کھڑے انسان کی اس بربریت کے گواہ ہیں جو اس نے جنگلوں اور اس کے باسیوں پر روا رکھی ہے۔

مہندر نے کہا "دیکھئے سلمیٰ جی یہاں کے درخت کیسے شکست خوردہ نظر آتے ہیں۔ ڈرے ڈرے سے مظلوم اور مجبور نظر آتے ہیں۔ جیسے گیر کے جنگلوں کے شیر۔ مگر ابھی پیچھے جو گھنا جنگل ہم چھوڑ کر آئے وہاں ان درختوں کا مزاج ہی کچھ اور تھا۔ کتنے خوددار اور آزاد نظر آ رہے تھے۔ اپنے آپ میں مگن، مغرور، سربفلک بلند اور مضبوط، وہاں انھیں اپنی اہمیت کا احساس تھا اور یہاں اپنی ہزیمت کا ......"

سرلا بولیں "ہائے انسان نے جنگلوں کو تباہ کر کے بڑا پاپ کیا ہے۔ جہاں جہاں سے جنگل کٹتے جا رہے ہیں بارش کم ہوتی جا رہی ہے۔"

میں نے کہا "گھنے بھرے پرے جنگل میں چرواہے کی بنسی کی تان کا جو مزا ہے۔ وہ میدانوں میں نہیں۔"

"آپ کو تو ہمیشہ بنسی کی تان کی پڑی رہتی ہے۔ کہیں کوئی چرواہا نظر نہیں آئی کیا؟" سلمیٰ نے طنزیہ لہجے میں کہا پھر مہندر سے مخاطب ہو کے بولی "مہندر جی راستے میں کہیں کوئی چرواہا نظر آ جائے تو گاڑی رکوا لیجئے گا۔ کرشن جی کے ساتھ اس کی ایک تصویر لے لیں گے۔ سب ہنسنے لگے۔

اب پہاڑ بلند ہوتے جا رہے تھے اور چٹانوں کے ٹیرس نما کھیت نمودار ہو رہے تھے۔ کس طرح تین چار ہزار فیٹ نیچے کے پانیوں کو چھوٹی چھوٹی موریوں کو کھود کر اوپر لایا گیا تھا۔ بجلی یا ڈیزل کی طاقت کے بغیر۔ اس سے یہاں کے ان پڑھ کسانوں کی محنت اور مہارت کا پتہ چلتا ہے۔ کھیتوں کے کنارے کنارے پھل دار پیڑ بھی نظر آنے لگے تھے۔ خوبانی، ہاڑی۔ سیب اور چیری کے بوٹے کہیں کہیں کیلوں کے جھنڈ۔ یہاں کے کیلے دیکھنے میں زعفرانی رنگ کے ہوتے ہیں اور بڑے بڑے۔ مگر مزے میں لیس دار ہوتے ہیں۔ وہ ذائقہ نہیں جو ہری چھال کے کیلے میں ہوتا ہے۔ زیادہ تر پیڑ خوبانیوں اور ہاڑیوں کے ہیں۔ بہت اونچائی پر

یہیں ایک لڑکا خوبانیاں بیچتا ہوا ملا۔ سر پر گول ٹوپی۔ گلاب سے رخسار اور ٹوکری اشرفیوں کی طرح چمکنے والی سنہری خوبانیوں سے بھری ہوئی۔ ممی نے جب قیمت پوچھی تو حیرت سے چیخ کر رہ گئی۔

ایک روپیہ؟۔۔ ارے اس خوبانیوں سے بھری ٹوکری کے لئے صرف ایک روپیہ۔

مہندر جی نے اس بچے کو جب دو روپے دیئے تو پہلے تو وہ حیرت سے دو روپوں کو دیکھتا رہا۔ پھر مارے خوشی کے ٹوکری سمیت خوبانیوں کو چھوڑ کر اوپر بھاگ گیا۔ جہاں قریب دو سو فیٹ کی اونچائی پر ہم اس کا خوبانیوں کے پیڑوں میں گھرا ہوا گھر دیکھ سکتے تھے۔

سرلا مہندر جی سے بولی۔۔ دیکھو بھاپا جی۔۔ ہم لوگ اٹھتیس برس کے بعد یہاں آئے ہیں۔ مگر خوبانیوں کی قیمت نہیں بدلی۔ بیچارہ دو روپے پا کر کتنا خوش ہوا۔ شاید اسے یقین نہ آیا ہوگا۔ سوچتا ہوگا کہیں ہم اس سے دو روپے نہ چھین لیں یا اپنا ارادہ نہ بدل لیں۔

مہندر جی کہنے لگے۔ یہاں دو روپے کی ٹوکری اور بمبئی میں یہی پھل چار روپے کیلو ملتا ہے۔

ایک موڑ پر شادی کا دولہا نئے کپڑے پہنے عورتوں میں گھرا نظر آیا۔ پنجابی شلوار اور قمیض کا فیشن جواب تک سارے راستے میں عورتوں میں نظر آ رہا۔ یہاں آ کر یکایک مغلئی شلوار اور گھیرے دار قمیض میں بدل گیا۔ سر پہ داغستانی ٹوپی۔ سوتی پہاڑی گیت گا رہی تھیں۔ نوجوان لڑکیاں دولہا سے مذاق کر رہی تھیں۔ چند لمحوں میں یہ منظر بھی تحلیل ہو گیا۔ کیونکہ ہم نے گاڑی روکی نہیں تھی۔ اس کی رفتار بہت دھیمی کر دی تھی۔ ایسا لگا جیسے ماضی کا ایک پیارا لمحہ چند پل کے لئے آنکھوں میں چمک چمک گیا اور پھر اسی ماضی کے دھندلکے میں کھو گیا۔

" لگتا ہے فلمی گیت ابھی یہاں تک نہیں پہنچے "۔ مہندر نے طنزاً کہا اور گاڑی موڑ سے گزر گئی۔

اب ہماری سڑک اور اونچائی پہ جا رہی تھی۔ اور پہاڑ ایک دوسرے کے بہت قریب ہوتے جا رہے تھے۔ جیسے گھیرا باندھ کر ہمارے گرد ایستادہ ہوں۔ ہوا میں برف اور چیڑھ کی مہک تھی۔ اور جب ہوا سرسراتی تو چیڑھ کے جھومروں کی پائیل اُفق تا اُفق رقص کناں ہو جاتی۔ اس پہاڑ کی چوٹی کے قریب ایک جھرنا نظر آیا جس کے پانی کو ایک باڑلی میں باندھ کر لوہے کے ایک بڑے نل سے گزار دیا تھا۔ اور اب یہ پانی اس نل سے ایک موٹی دھار بن کر آ رہا تھا۔ کئی فوجی گاڑیاں یہاں کھڑی پانی لے رہی تھیں۔ ہم نے بھی یہاں گاڑی روکی۔ خوبانیاں دھو کر کھائیں۔ پانی کیا تھا پگھلی ہوئی برف تھی۔ ٹھنڈا مصفا اور شیریں۔ چاروں طرف کوئی آبادی نہ تھی۔ کوئی گھر نہ تھا۔ بس چیڑھ کے درختوں کے مزین جنگل اور ان کے اوپر سورج چمکتا ہوا مگر اتنی بلندی پر اس کی چمک میں کوئی حدت نہ تھی۔

آگے بڑھے تو قریب ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد بھمبر گلی نظر آئی۔ بھمبر کا درہ۔ اس درے سے تین راستے پھوٹتے ہیں ایک راستہ پونچھ کو جاتا ہے۔ جو ہماری منزل تھی۔ دوسرا راستہ تتا پانی کو جاتا ہے۔ تیسرا راستہ مینڈر کی جانب مڑ جاتا ہے۔

" گاڑی روکو " مہندر نے کہا۔

مہندرا در میں دھیرے سے گاڑی سے نکل کر ذرے پر کھڑے ہو گئے۔ ایک دوسرے کے بہت قریب بہت ہی تنہا یادوں کا ایک ہجوم تھا۔ جو غول بیابانی کی طرح بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ جب ہم چھوٹے سے تھے تو تتا پانی گئے تھے۔ اپنی ماں جی کے ساتھ۔ تتا پانی میں کچھ نہیں تھا۔ ایک دھرم شالہ تھی۔ ایک ڈاک بنگلہ تھا۔ اور گرم پانی کا ایک نالہ تھا جو چند سو گز کے فاصلے پر پونچھ کے دریا سے جا ملتا تھا۔ چاروں طرف سے آب و گیاہ مغرور پہاڑ کھڑے تھے۔ کسی آتش فشاں سلسلے کی مانند۔ سرلا ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی، ہم دونوں ہی بھائی تھے جو سخت سردی کے موسم میں دن بھر اس گرم پانی کے نالے میں نہاتے رہتے تھے۔ اس نالے کے کنارے کنارے پگھلی گندھک کا بودار مواد زرد بالائی کی جھالروں کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ اور کہیں کہیں اس نالے کی چھوٹی چھوٹی ڈابوں میں پانی کی اندرونی حدت سے اس قدر اُبلتا تھا کہ ہم لوگ جب کپڑے کی چھوٹی چھوٹی پوٹلیوں میں بلبے چاول باندھ کر ڈال دیتے تو چند منٹ میں وہ چاول پک جاتے تھے۔ کئی طرح کے درجۂ حرارت رکھنے والے چشمے تھے۔ گرم، معتدل گرم، شدید گرم۔ اُبلتا ہوا پانی کہ ہاتھ ڈالو تو آبلا پڑ جائے۔ اور چند سو گز کے فاصلے پر دریائے پونچھ کا پانی برف کی طرح سرد تھا۔ ہمیں بڑا عجیب سا لگتا تھا۔ ماں جی ہمیں یہاں سے لے آتی تھیں۔ کھانے پینے اور دیگر رسد کا سامان ہم پونچھ سے لے کے آتے تھے۔ باؤ جی ساتھ نہیں آتے تھے۔ انھیں سفر کی صعوبتیں زیادہ راس نہیں آتی تھیں۔ بنجاب بھی وہ ماں جی کی طرح ہر سال ہمارے ساتھ نہیں جاتے تھے۔ پانچ سات سال کے بعد جاتے تھے۔

دوسرا راستہ مہنڈر کو جاتا تھا۔ اور جب اس ذرے پر کھڑے ہو کر ہماری نگاہ تتا پانی سے مہنڈر کی طرف مڑی تو بے اختیار میں نے اور مہندر نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ لیے اور ہر لحظہ یہ گرفت مضبوط ہوتی گئی۔ کہیں یادوں کے اس ریلے میں ہم کھو نہ جائیں پھر نہ جانے کس وقت گاڑی سے نکل کر سرلا بھی ہمارے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ کیونکہ سرلا مہنڈر ہی میں پیدا ہوئی تھی۔ یہیں پر اس کا بچپن گزرا تھا۔ باؤ جی ڈاکٹر تھے۔ مہنڈر کے مقام پر دو مرتبہ ان کا تقرر ہوا۔ ایک بار جب ہم بچے تھے دوسری بار جب ہم جوان تھے۔

اس مہنڈر کی وادی میں مہندر کا پہلا عشق ہوا۔ مہنڈرا اور مہندر میں زیادہ فرق بھی نہیں ہے۔ لگتا تھا سامنے سے پہاڑ پھٹ گئے ہیں۔ اور وہ نم آنکھوں سے اس وادی کو دیکھ رہا ہے۔ سیب کے اس باغ کو جہاں وہ حسین و جمیل ونتی کے ساتھ ٹہلا کرتا تھا۔ کھیلا کرتا تھا۔ ونتی جسے میں بھی دل ہی دل میں چاہتا تھا مگر میں نے کبھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا۔ پہلی بار ایک ہی لڑکی سے ہم دونوں نے پیار کیا۔ ونتی کا نام میں نے نہیں بدلا۔ اس کا نام ونتی ہی تھا اور میرے پہلے ناول "شکست" کی جو ونتی ہے یہ وہی ونتی ہے چمپئی رنگت، گدرایا ہوا بدن، کمر اور کولھوں کی زیبائی دلکش، ہنستی تھی تو فضا میں سیب کے پھول کھل جاتے تھے اور گالوں میں گڑھے پڑتے تھے۔ اس لئے وہ اکثر ہنستی تھی۔ اور بات بے بات پہ ہنس دیتی تھی۔ اس کی شادی پوٹھوہار کے کسی خاندان میں ہوئی تھی۔ مگر مہنڈر اس کا مائیکہ تھا۔ وہ چند مہینوں کے لئے اپنے مائیکے آئی تھی۔ اور محبت کے جال میں اس طرح اُلجھ گئی جس طرح جھیل کی شاخیں ایک دوسرے سے اُلجھ جاتی ہیں۔ ونتی تو شکست ہی کی ونتی ہے۔ لیکن "شکست" کا میں — میں نہیں ہوں۔ مہندر ہے۔ شاید زیادہ تر مہندر ہے اور کہیں کہیں میں ہوں۔ کسی عجیب کیمیاوی عمل سے میں نے دونوں کرداروں کو ملا کر ذہن کی کٹھالی میں ایک

نیا مرکب تیار کیا ہے۔ مگر وتی تو خالص وتی ہے۔ جیسی وہ تھی، جیسی وہ ہمیشہ رہے گی۔ "شکست" میں اگر مہندر کا کردار ہے۔ تو "یرقان" کے افسانے میں میرا کردار ہے۔ ان دنوں میں واقعی یرقان کے موذی مرض میں گرفتار تھا۔ اور مہینوں بستر پر لیٹا رہا تھا۔ وہ اکثر مجھے دیکھنے آئی تھی اور میرے سرہانے بیلے کے پھول رکھ جاتی تھی۔ کتنے برسوں کے بعد بیلے کے ان پھولوں کی مہکتی صدا میرے کانوں میں آ رہی ہے۔ چاندی کی گھنٹیاں سی بج رہی ہیں باؤجی کو معلوم تھا کہ وتی مہندر سے محبت کرتی ہے، اس لئے جب وہ باغ سے گزرتی تو وہ اس کی جھولی سیبوں سے بھر دیتے تھے۔

پھر وہ دن آیا۔ جب وتی کو مائیکے سے سسرال جانا تھا۔ وہ مجھ سے ملنے آئی تھی اور روز کی طرح اس نے میرے سرہانے بیلے کے پھول رکھ دیئے تھے۔ اور کہا "میں جا رہی ہوں۔" جانے کیسے اس سمے میں نے اپنے آنسوؤں کو روک لیا اور مسکرا کر اُسے الوداع کہی۔ ان آنسوؤں سے تکیہ تو بعد میں گیلا ہوا تھا۔ مگر وہ اُس وقت میرے آنسو نہ دیکھ سکی تھی۔ شاید اُس نے وہ آنسو محسوس کر لئے ہوں گے۔ کیونکہ دیر تک اس کا ہاتھ میری گرم پیشانی پر لرزتا رہا تھا۔ اور مہندر اسے مہندر سے سنگی ہیر کے میدان تک یعنی کم و بیش سات میل کی دوری تک چھوڑنے گیا تھا اور جب واپس آیا تو اُس کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ اُس رات مجھ سے وہ گلے لپٹ کر رویا بھی تھا اور میں اُس کا کندھا تھپتھپاتا رہا۔ جانے دونوں چاہنے والوں میں کیا عہد و پیمان ہوئے میں نے مہندر سے کبھی نہیں پوچھا۔ شاید وتی نے دوسرے سال کی چھٹیوں میں بھی آنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر وہ نہیں آ سکی اس سے پہلے وہ پوٹھوہار کی کسی ندی میں نہاتے نہاتے ڈوب گئی اور اس طرح مہندر کی پہلی محبت کا ستارہ بھی ڈوب گیا۔

مہندر کی اس وادی میں مہندر نے پہلی بار جوانی میں قدم رکھا۔ اب تک وہ بہت دُبلا پتلا لڑکا تھا جو اکثر بیمار رہتا تھا۔ پھر یکا یک اُسے ورزش کی سوجھی اور چند سالوں میں وہ کڑیل تومند جوان بن گیا۔ جس کے بدن کی خوب صورتی کو دیکھ کر رشک آتا تھا۔ اسی مہندر کے ہسپتال میں وہ دق زدہ عورت آئی تھی۔ جس سے باؤجی نے ٹوٹ کر پیار کیا تھا۔ اور وہ بیمارن جس کا ذکر "یادوں کے چنار" میں ہے اور جس نے باؤجی سے پیار کیا تھا۔ اور وہ گوری چٹی پگلی جو کسی کے قابو میں نہیں آتی تھی۔ باؤجی بڑی محنت سے اُس کا علاج کرتے تھے۔ آٹھ دس دن کے بعد جب وہ ٹھیک ہو جاتی تو اس کے رشتہ داروں کو بلوا کر اس کے گاؤں روانہ کر دیتے۔ جہاں سے وہ دو چار دن بعد پھر پاگل ہو کر واپس آ جاتی۔ یہ کس طرح کا پاگل پن تھا؟ اس وقت سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ آج آتا ہے۔ کس کس کو یاد کیا جائے؟ یادوں کے اودے انگور ہوا میں جھول رہے ہیں اور ہر انگور کا قطرہ ماضی کی نلکی سے چھن کر مے ناب بن گیا ہے۔

سرلا نے گھٹے گھٹے لہجے میں کہا کہ "جی چاہتا ہے۔ یہ سامنے کے پہاڑ پھٹ جائیں اور مہندر کی وادی سامنے آ جائے۔"

مہندر نے اپنی بھیگی آنکھیں اُلٹے ہاتھ سے پونچھیں۔ پھر میرا ہاتھ چھوڑ کر چپ چاپ گاڑی میں جا کر بیٹھ گیا۔

بھمبر گلی سے سوہرن کورٹ کا راستہ اونچے اونچے پہاڑوں اور چیڑھ کے گھنے جنگلات سے ہو کر گزرتا ہے، راستے میں آبادی بھی نہیں۔ کہیں کہیں اکا دکا گھر نظر آتے اور پہاڑ کو کاٹ کے چند کھیت اور مکمل سناٹا، جیسے فطرت نے سانس روک لیا ہو۔ مجھے اور مہندر کو یہ اکا دکا گھر بہت پسند تھے۔ گرمی کی چھٹیوں میں جب بھی ہم لاہور سے پونچھ آتے کچھ دنوں کے لئے پک نک منانے کے لئے

جنگل کے ان اکیلے باسیوں کے گھروں میں قیام کرنے کے لئے نکل جاتے، پہاڑوں، جنگلوں، ندی نالوں، چشموں اور آبشاروں سے محبت اسی زمانے میں پیدا ہوئی اور انسان نے جنگل کے ساتھ کس طرح اپنا تعلق جوڑا تاکہ یہ جنگل کا نقصان ہو نہ اس کا اپنا۔ آج یہ بات ہم بھول چکے ہیں اور فطرت کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اور اس طرح اپنی تباہی کے سامان پیدا کر رہے ہیں۔ کیونکہ فطرت کے بغیر اور درخت کے اور پتوں کے بغیر اور کھلی صاف ہوا کے بغیر انسان جی نہیں سکتا۔ آج ٹوکیو جیسے متمدن شہر میں ہوا اتنی گندی ہو چکی ہے کہ جاپانی بچے اسکول جاتے ہوئے بھی آکسیجن کا نقاب پہن کر جاتے ہیں۔

مگر اڑتیس برس کے بعد بھی یہاں امن ہے اور چین ہے اور فطرت اپنے پُرسکون انداز میں چاروں طرف پھیلی دکھائی دیتی ہے۔ ایک پہاڑ کا موڑ کٹتا ہے تو دوسرا پہاڑ سامنے آجاتا ہے۔ پھر یکایک حیرت انگیز اور چونکا دینے والے انداز میں پہاڑ یکایک پیچھے ہٹ کر ایک خوبصورت وادی کو سامنے لے آتے ہیں۔ یہ سوہرن کوٹ کا مقام ہے۔ نیم دائرے میں پھیلی ہوئی ایک وسیع آبادی۔ پونچھ کا دریا دو تین دھاروں میں بہہ کر ایک جگہ سنگم بناتا ہوا۔ دریا کے کنارے تک چاول کے کھیت اور سرسبز کھیتوں کی منڈیروں پر پھل دار درختوں کی گھنی قطاریں سجے کوٹھوں کی چھت پر لال مرچوں کے تاپیچے اور آنگن میں مائیں اور بہوئیں گھیرے دار مغلئی شلواریں پہنے کام میں مصروف اور بچے اتنے نڈر کہ بچوں کی طرح دھوم مچاتے ہوئے دریا کے کنارے تک چلے گئے ہیں۔

سہ پہر ختم ہو رہی تھی۔ درختوں کے سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ ہمارے تانگے نے سوہرن کوٹ کے ڈاک بنگلے میں چائے پی۔ یہیں پر افسانہ نگار شبنم سوہرن کوٹی سے ملاقات ہوئی اور محمد دین پانڈے ایم۔ ایل۔ سی بھی بڑی محبت سے ملے۔

سوہرن کوٹ جس کا اصلی نام کبھی سورن کوٹ سنہری وادی رہا ہوگا۔ پونچھ کی سب سے خوبصورت وادی ہے۔ اور پہلگام سے ٹکر لے سکتی ہے۔ بلکہ ایک اعتبار سے پہلگام سے بہتر ہے۔ کیونکہ ابھی یہاں سیاحوں کی آمد و رفت نہیں ہے۔ یہ ابھی تک اسی طرح صاف شفاف دُھلی دُھلائی ان چھوئی فطرت کی بہاریں وادی ہے۔ جیسے آج سے چالیس برس پیشتر تھی --- کوئی ہوٹل نہیں۔ کوئی ٹورسٹ لاج نہیں۔ سیاحوں کی کوئی کھلواڑ نہیں۔ ٹوٹتے ہوئے ڈبے نہیں۔ لالچی نگاہیں نہیں۔ بھیک مانگتے ہوئے فقیر نہیں۔ جیب کاٹنے والے دکاندار نہیں۔ جسم بیچنے والی قحبائیں نہیں۔ فطرت خوددار، آسودہ اور سادہ مزاج ہے۔

چائے پی کر مہندر جی نے کہا "آئیے بھائی صاحب۔ اخروٹ کا وہ پیڑ ڈھونڈیں"

زیادہ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ میں سمجھ گیا۔ بہت عرصہ ہوا جب ہم بچے تھے تو سوہرن کوٹ کی خوبصورتی کا حال سن کر ضد پکڑ لی تھی۔ ہم سوہرن کوٹ جائیں گے، سوہرن کوٹ جائیں گے۔ اس قدر اصرار کیا۔ اتنی ضد کی ایسے چیخ چیخ کر روئے کہ باؤ جی اور ماں جی کو ہمیں پک نک پر سوہرن کوٹ لانا پڑا۔ حالانکہ یہ جگہ پونچھ سے صرف سولہ میل کے فاصلے پر ہے۔ مگر میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ باؤ جی سفر سے ہمیشہ گھبراتے رہے۔ چاہے وہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو۔ مگر آخر انہیں ایک دن ہمارے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے اور وہ ہمیں سوہرن کوٹ لے جانے پر مجبور ہو گئے۔

پو پھٹنے سے پہلے ہم پونچھ سے روانہ ہوئے تھے۔ دوپہر کا کھانا ہم نے سوہرن کوٹ میں ایک اخروٹ کے گھنے سایہ دار پیڑ کے نیچے کھایا۔ کیا کھایا یہ تو سب یاد نہیں ہے۔ لیکن ماں جی کے ناشتے دان میں کلاڑی کی بھجیا اس قدر لذیذ تھی کہ

زبان پر آج تک اس کا مزہ باقی ہے۔ کلاڑی ایک طرح کی گول روٹی کے مانند موٹی ٹکیا ہوتی ہے۔ جو کاٹیج پنیر کو سکھا کر بنائی جاتی ہے۔ دیہات کے اکثر گھروں میں یہ پنیر کی موٹیاں ایک موٹی رسی سے گزار کر آنگن یا گھر کے اندر ٹانگ دی جاتی ہیں۔ اسے پکانے کے لئے اُسے پھر سے پانی میں کئی گھنٹے رکھ کر نرم کرنا پڑتا ہے۔ بعد میں اسے یا تو شوربے کے ساتھ پکایا جاتا ہے۔ یا انڈے کی بھجیا کے مانند۔ مگر بے حد لذیذ ہوتی ہے۔ اس دن تو ہم اسے کھاتے کھاتے مرغی بھی بھول گئے کھانا کھا کے ہم نے اسی پیڑ سے سبز سبز اخروٹ توڑے اور ان کی چھال پتھر سے کوٹ کر علاحدہ کر لی۔ پھر اندر کے بالائی ایسے نرم گودے کو نکال کر کھاتے رہے۔ یہ باؤ جی اور ماں جی کی جوانی کا زمانہ تھا۔ باؤ جی کی گوری رنگت۔ ماں جی کا گیہواں رنگ۔ باؤ جی کی چوڑی پیشانی اور ماں جی کی ابھری بڑی بڑی آنکھیں آج بھی یاد ہیں۔ ان کے ساتھ ان کے تین بچے تھے۔ میں اور مہندر اور مہندر سے چھوٹا بھوشن جو چھ سال کا ہو کے مر گیا۔ مگر وہ دن کتنا خوب صورت تھا کہ ہم تینوں بھائی دریا کے کنارے کے پتلے پانیوں میں بار بار نہاتے رہے اور ماں جی گھاس کے تنکوں کی پن چکی بنا کر پانی میں چلاتی رہیں۔ آج سب کچھ یاد آ رہا ہے۔ ضرور اس اخروٹ کے درخت کو ڈھونڈا جائے گا۔ وہ تو ایک تصویر کی طرح ہمارے ذہن میں بلند تھا۔

مگر آج وہ درخت نہیں ملا۔ اخروٹ کے پیڑ کی عمر تو لمبی ہوتی ہے۔ ماں باپ نہیں رہے۔ بھوشن نہیں رہا۔ مگر ایک امید تھی کہ وہ اخروٹ کا درخت زندہ ہو گا تو ہم ایک پل دو پل اس کی چھاؤں میں بیٹھ کر اپنے ماں باپ کو اپنے بھائی بھوشن کو اس پکنک کے دن کو واپس لے آئیں گے۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے جو جاتے ہیں وہ واپس نہیں آتے۔ صرف ان کی یادیں شہد کے چھتے کے مانند ذہن کی ٹہنیوں پر لٹکتی رہ جاتی ہیں۔

ایک بار پھر اسکول کے چند لڑکے پکنک منانے کے لئے یہاں آئے تھے۔ ان دنوں ہم پر کرکٹ کا کھیل سوار تھا۔ ہم نے آٹھ نو اور لڑکوں کو جمع کر کے کرکٹ کی ایک ٹیم بنا ڈالی تھی۔ اسے ہسپتالی ٹیم کہتے تھے۔ BLINDTITTER اور مہندر اپنی تیز باؤلنگ کے لئے مشہور تھا۔ پکنک بھی ہوئی۔ میچ بھی کھیلا گیا۔ دریا کے کنارے گھاس کے ایک خوب صورت قطع میں وکٹیں گاڑی گئیں اور کھیل شروع ہو گیا۔ کھیل کے بعد کھانا اور کھانے کے بعد دو دو چار چار کی ٹولیوں میں لڑکے بٹ گئے۔ کوئی اوپر پہاڑوں کو نکل گیا۔ کسی نے جنگل کی راہ لی۔ کوئی دریا کے کنارے کنارے اوپر چلنے لگا۔ میں نے اور مہندر نے چلتے چلتے پیڑوں کے جھنڈ سے گھرا ہوا ایک خیمہ ڈھونڈ لیا۔ مگر ہمیں اس خیمے کے زیادہ نزدیک جانے کی اجازت نہیں ملی۔ ایک باوردی چپڑاسی نے بتایا کہ پونچھ کے اسسٹنٹ ریزیڈنٹ بہادر پکنک کے لئے اپنی دونوں بچیوں کو لے کر آئے ہوئے ہیں۔ یہ زمانہ انگریزوں کا تھا اور پونچھ کے راجاؤں نے جو در اصل کشمیر سرکار کے ماتحت تھے۔ بڑا جھگڑا کر کے یہاں ریزیڈنسی کی ایک شاخ کھلوا لی تھی اور اس کے ذریعے اس علاقے کے سارے بڑے افسر پنجاب سے یہاں آتے تھے۔ کشمیر سے نہیں۔

وہ دونوں سفید فام لڑکیاں دریا میں پیڑوں کی اوٹ میں نہا رہی تھیں۔ میں نے اور مہندر نے بید مجنوں کے پیڑوں کی جھکی ڈالیوں میں چھپ کر وہ منظر دیکھا۔ وہ دونوں عمر میں ہم سے بڑی تھیں، جوان، حسین۔ سنہرے بالوں والیاں اور سرو قد۔ شاید جل پریاں ایسی ہی ہوتی ہوں گی۔ اس سے پہلے ہم نے کسی جوان لڑکی کو اس حد تک ننگا نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے ان کے حسن نے

بس ہچکچے سے رہ گئے تھے۔ اتنی خوب صورت ہوتی ہیں انگریز لڑکیاں۔ ان دنوں ہم پر ہی کیا سب پر گوری رنگت کا رعب طاری تھا اور اس کی فوقیت بھی اور اس کا CATHERSIG اس وقت ہوا جب مہندر نے ممبئی میں آ کر ماہی گیر لڑکیوں کا حسن دیکھا اور میں نے کیرالا جا کر وہاں کی سیاہ فام سندریاں دیکھیں۔ یا پھر جمیکا کی حبشی حسینائیں۔ بہت بعد میں معلوم ہوا کہ حسن رنگ کا محتاج نہیں ہوتا۔ مگر اس وقت تو ہم مبہوت سے ہو گئے تھے اور بہت دیر تک ان انگریز لڑکیوں کو نہاتے ہوئے دیکھتے رہے تھے۔

ایک بار اور ہم سوہرن کوٹ آئے تھے۔ یہ جوانی کا زمانہ تھا۔ تین چار خاندان مل کر پکنک منانے آتے تھے۔ گیان چند اور دیوان چند دونوں بھائیوں کے خاندان اور گورکشن سنگھ کا خاندان اور رام لال مٹی کا خاندان اور ہم لوگ۔ کچی پکی۔ کھٹی میٹھی جوانیاں تھیں۔ جذبے کنوؤں کے سایوں کی طرح زمین پر لرزاں تھے۔ نگاہوں میں محبت کی نوخیز کلیاں پھوٹی تھیں اور جھجک، کرب، اضطراب اور اجتناب نے رنگ، آنچ اور چبھن کے سامان پیدا کر دیئے تھے۔ آج وہ چبھن باقی نہیں ہے جس طرح شرابیں وقت گذرنے کے بعد پختہ ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح یادیں ایام کے تہ خانے میں میٹھی ہوتی جاتی ہیں مجھے مہندر اور کملا کا بار بار ایک دوسرے کو چور نگاہ سے دیکھنا یاد ہے۔ اور ماں جی کی ڈانٹ "اوں ہوں۔ چھوٹے کاکا۔ ادھر کڑیوں میں مت کھیلو"۔ ماں جی مجھے بڑا کاکا اور مہندر کو چھوٹا کاکا کہتی تھیں۔ آج ماں جی اس جہاں میں نہیں ہیں مگر میں ان سے پوچھنا چاہتا ہوں "ماں جی کیا مہندر تمہارے پاس ہے؟ کیا وہاں بھی وہ لڑکیوں میں کھیلتا ہے۔ وہ فاسٹ باؤلر!"

شام کے سائے گھنیرے ہو چلے تھے۔ اسی لئے سوہرن کوٹ میں زیادہ دیر رکنا مناسب نہ تھا۔ حالانکہ وہاں سے ہٹنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے پونچھ کی جانب چل پڑے۔ کافی فاصلے تک دریائے پونچھ کی جانب چل پڑے۔ کافی فاصلے تک پونچھ کی خروش روانی ساتھ رہی۔ بیچ بیچ میں نکالی صاحب کا نالہ پڑا۔ پھر اکا دکا بجلی کے قمقمے نظر آنے لگے۔ ہم پونچھ کے مضافات میں تھے۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ جب ہم پونچھ کے ڈاک بنگلے میں داخل ہوئے تو ڈپٹی کمشنر غلام نبی نائیک اور سپرنٹنڈنٹ پولیس اور دیگر افسر اور عمائدین شہر ہمارے استقبال کے لئے موجود تھے۔ پرانے اور نئے ڈاک بنگلے کے سارے کمرے ہمارے لئے کھول دیئے گئے تھے۔ تھوڑی دیر میں اوم (میرا سب سے چھوٹا بھائی) اور اس کی بیوی کملا اور کملا کا بھائی پروین کمار۔ مینی اور اس کی بیوی چارو مینی۔ رویندر جانی اور تلک راج جانی، ارجن ناتھ مصری اور دوسرے احباب بھی آ گئے۔ ہم لوگ دن بھر کے تھکے ہوئے تھے اس لئے شب کا شغل مختصر ہی رہا۔ کھانا کھا کے جلد ہی سو گئے۔

صبح جب میں اُٹھا تو مہندر جی مجھ سے پہلے جاگ رہے تھے۔ اور پرانے ڈاک بنگلے کی اس روش پر چہل قدمی کر رہے تھے۔ چوطرفہ یوکلپٹس کے پیڑوں سے گھری ہوئی تھی۔ یہ وہی پیڑ تھے جنھوں نے ہمارا بچپن دیکھا تھا۔ ہماری جوانی اور اب اڑتیس سال کے بعد ہم انھیں دیکھ رہے تھے۔ یہ پیڑ کتنے سربلند اور تناور ہو چکے تھے۔ بچپن میں باؤ جی مجھے انگلی سے لگائے اور مہندر کو کندھے پر بٹھائے یہاں رابرٹ کے ساتھ آتے جو عیسائی لیڈی ڈاکٹر کا شوہر تھا۔ اور خود کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ باؤ جی کو شروع ہی سے عجیب و غریب کردار عام نارمل حالات سے ہٹے ہوئے کردار بہت پسند تھے۔ رابرٹ سے ان کی دوستی تھی اور وہ دونوں اپنے بچوں کو لے کر ہفتے میں ایک بار اس ڈاک بنگلے تک سیر کرنے کے لئے آتے تھے کیونکہ اس ڈاک بنگلے کے باغیچے کے پھول دور دور تک مشہور تھے۔

میں اور مہندر کچھ کہے سنے بغیر سحر کے نیم اجالے میں پونچھ کے ڈاک بنگلے سے باہر چل دیئے۔ قریب ہی میں ہمارا پلے گراؤنڈ تھا۔ وکٹوریہ جوبلی ہائی اسکول کا پلے گراؤنڈ۔ مگر اب اس کھیل کے میدان کے آدھے حصے میں کالج تعمیر ہو چکا تھا اور دریا کی جانب اس پلے گراؤنڈ کے کنارے جو پاپلین کے پیڑ تھے۔ وہ سب کاٹ ڈالے گئے تھے۔ آگے چلے تو سوچا فوارے والا باغ آئے گا جس کے دو رویہ بلند قامت سرو ہمارے منتظر ہوں گے۔ سرو تو موجود تھے مگر باغ تباہ ہو چکا تھا وہ انار کے پیڑ کہاں تھے۔ اور وہ ناشپاتیوں کے پیڑ، خوبانی، سیب، الوچہ اور گوگوشوں کے درخت جن پر ہم پلے گراؤنڈ سے آتے جاتے یلغار کیا کرتے تھے اور باغ کے مالی دور دور تک ہمارے پیچھے بھاگتے تھے۔ مگر وہ چست لڑکوں کا دوڑ کا مقابلہ کیسے کر سکتے تھے۔ وہ فوارہ باغ جو نشاط باغ کی نقل میں بنایا گیا تھا۔ اس کا اب کچھ باقی نہ تھا۔ نہ فوارے نہ ٹینس کورٹ، نہ انگور کی جھکی ہوئی بیلیں کچھ تو باقی نہ تھا۔ سنا ہے کہ جب قبائلی ادھر حملہ آور ہوئے اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ تو شہر میں ایندھن کی سخت کمی محسوس ہونے لگی۔ لوگوں نے مجبور ہو کر تمام باغات کے پیڑ کاٹ کر ایندھن کے لئے چولہے میں جھونک دیئے۔ اخروٹوں والی سڑک پر اخروٹ کا ایک پیڑ باقی نہ بچا تھا۔ کون جیتا کون ہارا اس کا فیصلہ تو تاریخ کرے گی۔ لیکن دو طرفہ درختوں کا جس طرح صفایا ہوا اور قتلِ عام ہوا اس کا فیصلہ کون کرے گا؟

اب ہم ڈیوڑھی سے گزر کر قلعہ مبارک کی طرف جا رہے تھے۔ آنکھیں پرنم تھیں۔ اس لئے ہم دونوں ایک دوسرے سے نگاہیں چرائے چلے جا رہے تھے۔ قلعہ مبارک سے ذرا پہلے ٹھاکر مین سنگھ کی کوٹھی ہوا کرتی تھی جو پولو کا بہت عمدہ کھلاڑی تھا۔ جانے وہ کوٹھی کہاں گئی۔ قلعے سے ایک فرلانگ کے بعد چھوٹی سی پہاڑی پر وزیر زراعت کا بنگلہ تھا۔ پہاڑی کے نیچے سڑک کے کنارے جس جھرنے کی ہمیں تلاش تھی۔ وہ ہمیں مل گیا۔ حکومتیں بدلیں۔ حالات بدلے۔ تاریخ بدلی مگر یہ جھرنا اسی طرح رواں دواں تھا۔ ماں جی جب راج محل کو رانی جی کے ہاں جاتی تھیں تو اسی جھرنے کا پانی پیا کرتی تھیں اور دربار میں حاضر ہونے سے پہلے باؤ جی بھی یہیں رک کر اس جھرنے کا میٹھا پانی پیا کرتے تھے۔ آج ماں جی نہیں۔ باؤ جی نہیں ہیں مگر میں اس جھرنے کی دھار میں ان کا تبرک لمس محسوس کر سکتا ہوں۔ جیسے ماں جی میرا منہ چوم رہی ہوں۔ مہندر اوک بڑھائے اس جھرنے کا پانی پی رہا ہے۔ اٹھائیس سال کی پیاس آج بجھی ہے۔ شاید کوئی اس کے کانوں میں کہہ رہا ہے چھوٹے کاکا چھوٹے کاکا......!

میں نے مہندر سے کچھ نہیں کہا۔ ایسے لمحوں میں کچھ کہنا ایسے لمحوں کی تقدیس کو تباہ کر دیتا ہے۔ ہم دونوں یہاں سے چپکے سے واپس ہو لئے۔ پھر وہی قلعہ، وہی ڈیوڑھی۔ وہی پلے گراؤنڈ وہی ڈاک بنگلہ۔ مہندر چپکے سے اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں اپنے کمرے میں۔ آدمی بچپن سے بڑھاپے تک جانے میں ساٹھ برس لیتا ہے۔ ہم نے بڑھاپے سے بچپن تک جانے میں صرف ساٹھ منٹ لئے تھے۔

ناشتے کے بعد بہت سے لوگ ملنے کے لئے آ گئے۔ درشن سنگھ اکالی، خواجہ منیر حسین میر۔ ڈاکٹر نذیر حسین۔ ڈاکٹر بھٹی۔ سردار بدھی سنگھ، بشیر احمد شیخ، ہزاں چند وکیل، تحصیل دار غلام محمد گگڑ، چودھری بدری ناتھ، منموہن سنگھ دھیر، سکھ راج بالی، مہتہ راجہ رام، خواجہ غلام قادر بانڈے۔ جہانگیر میر، بابو ہری کرشن رینہ اور دوسرے بہت سے نئے پرانے چہرے، اسکول اور کالج بند تھے۔ مگر ہمارے یونٹ کی آمد

کی خبر آگ کی طرح شہر میں پھیل چکی تھی اور لوگ جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ ڈاک بنگلے کے سارے لان ان لوگوں سے بھر چکے تھے۔ گوری دت رینہ، مہندر جی کا تعارف ان کے پرانے ساتھیوں سے کرا رہا تھا۔ لوگ آنکھوں میں خوشی کے آنسو لئے گلے مل رہے تھے۔ زور زور سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ کمر میں ہاتھ ڈال کر بغل گیر ہو رہے تھے۔ جیسے اڑتیس برس کی جدائی کو چند لمحوں میں ملیا میٹ کر دینا چاہتے ہوں۔

کچھ دیر کپور صاحب نے ہماری شوٹنگ ڈاک بنگلے میں کی۔ نئے گیسٹ ہاؤس میں نہیں جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔ بلکہ پرانے ڈاک بنگلے میں جہاں ہم سکول اور کالج کے دنوں میں ٹھاکر موہن سنگھ اور ٹھاکر سکھ چین سنگھ کے ہمراہ پلے گراؤنڈ میں کھیلنے کے بعد آتے تھے۔ یہ دونوں ٹھاکر بچے راجہ صاحب والیٔ ریاست کے قریبی رشتہ دار تھے۔ اس لئے ان کی وجہ سے ہمارے لئے ڈاک بنگلہ کا ایک کمرہ کھول دیا جاتا۔ یہاں ہم قریب کے ڈونگس کے چشمے کا پانی منگواتے اور لیموں کا شربت پیتے یا لیمونیڈ۔ پھر گراموفون کے ریکارڈ بجائے جاتے۔ مہندر کو گانے کا بہت شوق تھا اور وہ بہت اچھا گاتا بھی تھا۔ سہگل کے اکثر ریکارڈ بجائے جاتے اور جانکی بائی الٰہ آباد والی اور کالو قوال۔ ٹھاکر موہن سنگھ کو فلم لیلیٰ مجنوں کے گانے بے حد پسند تھے۔ جنھیں ماسٹر نثار اور مس کجن نے گایا تھا۔ کبھی کبھی ہم چاروں شاہی اصطبل سے گھوڑے نکلواتے۔ خوب صورت بے صبر گھوڑے۔ میں تو گھوڑے پر چڑھنے سے ہمیشہ ڈرتا تھا۔ مگر ٹھاکر موہن سنگھ، مہندر اور سکھ چین اچھے شہسوار تھے اور اکثر گھوڑے دوڑاتے ہوئے نکالی صاحب کے نالے تک چلے جاتے تھے۔ میں صرف ڈاک بنگلے تک آتا تھا اور یہاں ان کی واپسی کا انتظار کرتا تھا۔ مہندر کو سب کچھ یاد آ رہا تھا کہہ رہا تھا "بھائی صاحب۔ موہن سنگھ کس غضب کا کھلاڑی تھا ٹینس کا۔ نوارے والے باغ میں راجہ صاحب کا ٹینس کورٹ تھا۔ اس میں ٹھاکر موہن سنگھ راجہ صاحب کے ساتھ ٹینس کھیلا کرتا تھا۔ ہم لوگ کورٹ کے قریب کرسیوں پر بیٹھے تکا کرتے تھے۔ ہمیں ٹینس کورٹ میں کھیلنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کورٹ میں صرف شاہی خاندان کے افراد کھیل سکتے تھے۔ موہن سنگھ بہت عمدہ شکاری بھی تھا۔ اس نے مہندر کو بندوق چلانا سکھایا۔ مہندر جنگل میں اڑتے ہوئے تیتر اور جھیل سے اٹھتی ہوئی مرغابی کو اپنے نشانے سے گرا لیتا تھا۔ جبکہ میرا نشانہ مرغابی یا تیتر سے سو فیٹ دور نکل جاتا تھا۔ اور بندوق کے فائر کے دھچکے سے کندھے میں شدید درد ہوتا تھا۔ مہندر نے ان دنوں کی یاد سے محظوظ ہو کر میری طرف مسکرا کر کہا۔ "آج پھر ٹھاکر موہن سنگھ کے ساتھ شکار پر جانے کو جی چاہتا ہے۔ مگر ٹھاکر موہن سنگھ ہے کہاں؟ جنت کی کسی وادی میں فرشتوں کے ساتھ ٹینس کھیل رہا ہو گا۔" میں نے مہندر سے کہا۔ اور مہندر کا چہرہ چند لمحوں کے لیے افسردگی کے غبار میں کھو گیا۔

شوٹنگ دیکھنے کے لئے بھیڑ لگ گئی تھی اور ہماری حفاظت کے لئے چند فوجی بھی تعینات کر دیئے گئے تھے مگر یہاں ہمیں کس سے ڈر تھا۔ سب اپنے تھے۔ سب سلیقے اور قاعدے سے شوٹنگ دیکھ رہے تھے۔ مدھو سودن اور مہندر ایک دوسرے سے مختلف شاٹ کے متعلق مشورہ کرتے ہوئے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ ہر شاٹ میرے، مہندر، ادم اور سرلا کی زندگی کا ورق تھا۔ ورق الٹتے الٹتے ہم ڈاک بنگلے سے نکل کر توپ خانے کے میدان میں پہنچے۔ یہاں ہر روز ٹھیک بارہ بجے توپ داغی جاتی تھی۔ اب وہ توپ خانہ کہاں — ہاں جیل موجود ہے۔ اور وہیں موجود ہے کہ جہاں وہ تھا۔ وہیں ڈاک خانہ ہے۔ وہی پولیس لائنز، وہی ہسپتال کو جاتی ہوئی درختوں

سے گھری ہوئی سڑک ہے ـ اب ہم ہسپتال کے برآمدے کے قریب آ پہنچے ہیں ارے وہی تو ہسپتال ہے ـ وہی اس کا چھتا ہوا برآمدہ کے سامنے وہی پھولوں سے بھرا ہوا باغیچہ اس برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر بائیں طرف باؤ جی کھلے میں ایک میز کے سامنے بیٹھا کرتے تھے ـ مریضوں کو دیکھنے کے لئے ایک عجیب شوق اور اضطراب کے عالم میں ہم تینوں بھائی اُس چھتے ہوئے برآمدے کی جانب بڑھ گئے ـ جب سب کچھ وہی ہے تو پتاجی بھی وہیں ہوں گے ـ میز کے سامنے کرسی پر بیٹھے نسخے لکھتے ہوئے مریضوں کو دیکھتے ہوئے کبھی کبھی کچھ گنگناتے ہوئے ـ گورا چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں چوڑی پیشانی اور ہاتھ بالائی سے بھی زیادہ ملائم . . . . . . اور آگے بڑھے تو عجیب دھچکا سا لگا ـ وہاں تو کوئی اور ہی ڈاکٹر بیٹھا تھا ـ دریائے پونچھ کے دونوں کناروں کے بیچ بہت سا پانی بہہ گیا تھا ـ اور کتنی ہی پرانی تصویریں بہا لے گیا تھا ـ

" یہ ہیں ڈاکٹر شرما " ایک آواز آئی ـ

مہندر نے ہاتھ ملایا ـ میں نے بھی ـ چند لمحے تو ہم ساکت سے کھڑے رہے ـ نوجوان اور ہنس مکھ ڈاکٹر تھا ـ جیسے کسی زمانے میں میرے والد رہے ہوں گے ـ شرما جی اپنے علاقے کے بہترین پلاسٹک سرجن مانے جاتے ہیں ـ اُن کی بیوی اُما شرما بھی ڈاکٹر ہیں ـ

ہسپتال میں کافی بھیڑ ہو گئی تھی ـ اسکول اور کالج کے بہت سے لڑکے لڑکیاں جمع ہو گئے تھے ـ اور اپنا تعارف خود کرا رہے تھے یا میرے چھوٹے بھائی ادم کا برادر کا ملکی اور اس کی بہن انیلا ان کا تعارف ہم سے کرا رہی تھی ـ عزیز شہریوں میں سے اس وقت کچھ نام یاد رہ گئے ہیں ـ ڈاکٹر سردن ناتھ آفتاب ـ کرشن لال گپتا، رمن لال ورما، سجاد حسین، ششی بھوشن شرما ـ مہتہ بھگوان داس، شہزاد حسین عبدالعزیز مستری ـ سردار نند سنگھ ـ ادھم سنگھ ـ سردار سنگھ ـ چودھری بدری ناتھ ـ خواجہ غلام محی الدین ـ اے بی سیوا سنگھ ـ ارجن ناتھ مصری اس موقع پر بھی خاص طور سے اپنی دکان سے پان بنوا کر لائے تھے ـ جتنے دن ہم پونچھ میں رہے ـ مصری صاحب مفت سوڈا اور پان سے ہماری تواضع کرتے رہے ـ ان کی دکان پردین کمارمینی کی دکان کے بالکل سامنے ہے ـ میرے بچپن کے زمانے میں یہ دکان کتابوں اور کاپیوں کی ہوا کرتی تھی اور دیوالی اور دسہرے کے دنوں میں ہم یہاں سے پٹاخے اور پھلجھڑیاں خریدا کرتے تھے ـ

ہسپتال میں شوٹنگ کرنے کے بعد ہم پاپیادہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئے ـ دائیں طرف سے ایک پگڈنڈی گھوم کر اوپر ایک کوٹھی میں جاتی تھی ـ سب سے اوپر چیف میڈیکل آفیسر رام گوپال ماتھر کا گھر ہوا کرتا تھا ـ نیچے ہمارا ـ دونوں بنگلے گھنے باغات سے گھرے ہوئے تھے ـ

کسی گائیڈ کی مدد کے بغیر ہم چاروں ـ میں ـ مہندر ـ ادم اور سرلا اُدھر چلے گئے ـ جدھر بچپن ـ لڑکپن اور جوانی کے خوب صورت ایام بیتے تھے ـ ہاں وہی گھر ہے ـ وہی دیوار ہے ـ دیوار سے اوپر اٹھا ہوا وہی خوبانی کا پیڑ ہے ـ یا شاید کوئی دوسرا ہے ـ جوں جوں ہم گھر کے قریب پہنچتے جاتے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جاتی ـ اب گھر کی دیوار مڑنے کو ہے ـ موڑ کے بعد گھر کا دروازہ آئے گا ـ موڑ پر رک کر میں نے مہندر سے کہا ـ یاد ہے مہندر اس کونے پر دیوار سے لگ کر تم پتھروں سے کھیلا کرتے تھے اور جب میں سکول سے واپس آتا تھا ـ تو تمہیں یہاں اس جگہ انگور کی بیل کے نیچے پتھروں سے محوِ گفتگو پاتا تھا ـ وہ انگور کی بیل اب نہیں رہی ـ

مگر گھر کا دروازہ تو وہی ہے۔ دل کی عجیب حالت تھی۔ اچانک ہم دروازے سے چند قدم پہلے رُک گئے۔ اور عجیب محویت کے عالم میں کھلے دروازے کی طرف تکنے لگے۔ وقت پیچھے کو لوٹ گیا تھا اور ہر دم یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ابھی گلابی کنارے والی کریم رنگ کی ساڑھی پہنے ماں جی اس دروازے سے برآمد ہوں گی اور کہیں گی "اتنے برس کہاں رہے بڑے کاکا۔ چھوٹے کاکا۔ سرلا۔ ادھ ادم کہاں تھے تم۔ چلو جلدی سے اندر آجاؤ۔ تمہیں بھوک لگی ہوگی۔ میں نے تمہارے لئے مکھن اور شہد بھرے پراٹھے تیار کئے ہیں۔ ایک ایک گلاس میٹھے قاہوے پی لو۔" ہم چاروں کو ماں جی کے ہاتھ کے تیار کئے یہ پراٹھے بہت پسند تھے۔ جن پر آدھ انچ سے زیادہ مکھن کی تہہ جما کر وہ اس پر شہد انڈیل دیتی تھیں۔

مگر ادھ کھلا دروازہ ادھ کھلا ہی رہا۔ ماں جی اس دروازے سے باہر نہ آئیں۔ ہم لوگ اک دھچکے سے ماضی سے حال میں آ گئے۔ اور دروازے کے اندر چلے گئے۔ وہی آنگن تھا مگر اب اس آنگن میں بمباری سے بچنے کے لئے ایک بنکر بھی بنا دیا گیا تھا۔ شہد میں زہر گھل گیا تھا۔ پہاڑ کی ایک چوٹی پر اگر پاکستانی چوکی تھی تو بالمقابل دوسرے پہاڑ کی ایک چوٹی پر ہندوستانی چوکی تھی اور ہم دونوں چوکیوں کو صاف صاف دیکھ سکتے تھے۔ اسی قدر قریب تھی باہمی نفرت!

ڈاکٹر شرما گھر دکھانے لگے تو مہندر نے بے قرار ہو کر کہا۔ "آپ نہ دکھایئے۔" "سنئے یہاں ماں جی کی رسوئی تھی۔" مہندر نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا۔

ڈاکٹر شرما بولے۔ "آج بھی ہم لوگوں کی یہی رسوئی ہے۔"

ایک کمرے کی طرف اشارہ کر کے مہندر نے کہا۔ "اور یہ باتھ روم ہونا چاہیے۔"

"ہاں۔" ڈاکٹر شرما بولے۔ "یقیناً اب بھی یہی باتھ روم ہے۔"

پھر ہم اندر کے تین کمروں میں گئے۔ جی چاہتا تھا کہ ماں جی کو آواز دوں۔ باؤ جی کو آواز دوں۔ مرحوم بھائی بھوشن کو بلاؤں۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پایا۔ پھر چوتھے کمرے کی طرف چلے گئے جو ہمارا اسٹڈی روم تھا۔ اور جس کا ایک دروازہ باہر باغ میں کھلتا تھا۔

اس دروازے سے باہر گئے۔ کدھر گئیں وہ سیب کے پیڑوں کی قطاریں۔ کدھر گیا وہ باغ۔۔۔۔ چاروں طرف پھیلا ہوا جس میں ہمارے بچپن کی شرارتیں بکھری پڑی تھیں۔ معلوم ہوا کہ قبائلی حملے کے دوران یہ باغ بھی کاٹ ڈالا گیا۔

"ڈاکٹر شرما بولے۔ یہاں پھر سے باغ لگایا جائے گا۔ میں نے دہلی سے تین سو پودے منگائے ہیں۔"

گھوم گھام کے پھر ہم بے اختیار رسوئی کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر شرما کی بیوی مسز اوما شرما ہمیں دیکھ کر مسکرا رہی ہیں مگر ہم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔ عالم رویا میں ماں جی رسوئی میں بیٹھی چار تھالیوں میں ہمارے لئے کھانا پروس رہی ہیں۔ ایک کونے میں نوکر برتنوں سے کچھ کھڑبڑ کر رہا ہے۔ حالانکہ اس وقت دوپہر ہونے کو ہے لیکن چشم تخیل میں شام ہو گئی ہے۔ رسوئی میں لالٹین جگ رہی ہے۔ ماں جی سر پر پلو ڈالے طلائی چوڑیوں سے بھری کلائی والے ہاتھ سے پانی کے گلاس رکھتی ہیں کھانے کو کہتی ہیں۔ مگر ہم ضد کرتے ہیں۔ "ہمیں اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاؤ ماں جی۔" ماں جی پہلے تو ڈانٹتی ہیں۔ پھر ممتا بھرے جذبے سے سرشار ہو کر کھانے کے

ننھے لقمے تیار کرتی ہیں۔ چڑیا کے بچوں کی طرح ہم باری باری اپنا منہ کھول دیتے تھے اور اس میں لقمہ ڈال دیتی تھیں اور کتنا مزے دار کتنا میٹھا کتنا لذیذ ہوتا تھا وہ لقمہ۔ حالانکہ وہی روٹی تھی۔ وہی دال تھی۔ وہی آلو۔ وہی گوبھی۔ وہی مٹر گوشت۔ مگر جانے کیا بات ہے اپنے ہاتھ سے کھانے میں وہ مزا نہ تھا جو ماں جی کے ہاتھ سے کھانے میں تھا اور بہت دیر کے بعد یہ بات سمجھ میں آئی کہ مائیں جب اپنے پیارے بچوں کے لئے کھانا پکاتی ہیں تو وہ ہر سالن میں اور روٹی کے ہر ٹکڑے میں اپنی محبت کی مٹھاس بھر دیتی ہیں۔ کھانا تو تاج انٹر کانٹی نینٹل اور نایو شارٹون میں بھی عمدہ ملتا ہے مگر وہ آگ پر پکایا جاتا ہے اور یہ روح کی مدھم مدھم آنچ پر تیار ہوتا ہے۔

سرلا رو رہی تھی۔ مہندر جی دم بخود تھے۔ ادم آبدیدہ۔ اس وقت سب نے ہم کو اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ جیسے ہم کسی غیر مرئی ہستی کے روبرو پیش ہوں۔ ماضی سے آنے والی ہواؤں میں ماں جی کے آنچل کی خوشبو تھی۔

دوسرے دن علی الصبح میں اپنے محترم دوست دیانند کپور سے ملنے گیا۔ ان کا گھر ڈاک بنگلے کی سڑک پار کر کے دریا کے قریب ہے۔ اس سے پہلے ان کا گھر کشمیری محلے میں ہوا کرتا تھا اور شری رام لال مینی مرحوم کی دکان کے قریب ہی ان کی کتابوں کی دکان تھی۔ مگر میں نے دیانند کپور کو کبھی اپنی دکان پر کچھ بیچتے نہیں دیکھا۔ مقامی شعرا اور ادیبوں کا ان کی دکان پر جمگھٹا رہتا تھا۔ ان کی دکان پر ہی میری ملاقات پہلی بار چراغ حسن حسرت مرحوم سے ہوئی۔ دیانند جی سے میں اور مہندر اکثر ادبی رسالے پڑھنے کے لئے مانگ کر لے جاتے تھے خصوصاً افسانہ جوگی اور مانسرور۔ اور مانسرور رسالے کو ہم دونوں بھائیوں نے اس لئے پڑھنا شروع کیا کہ اس کے ایڈیٹر کا نام گوری شنکر لال اختر تھا اور ہمارے باورچی کا نام بھی گوری شنکر تھا۔

کپور صاحب کے ہاں چائے پی۔ گذری ہوئی باتوں کی یاد تازہ کی۔ اور انھیں شام کے لئے شوٹنگ میں شریک ہونے کی دعوت دے کر چلا آیا ———— واپس آیا تو معلوم ہوا کہ کئی گھروں سے ناشتہ آ چکا ہے۔ پونچھ کی دو چیزیں بہت مشہور ہیں۔ مکی اور موٹھی۔ چنانچہ ناشتے پر یہ دونوں چیزیں موجود تھیں۔ مکی کے ٹرڑے مکی کے پراٹھے۔ موٹھی کا سالن اور کئی قسم کے ساگ۔ گیسٹ ہاؤس والوں نے نان وغیرہ ناشتہ تیار کیا تھا مگر ہم لوگ تو مکی کے پراٹھوں اور موٹھی پر بری طرح گرے۔

اتنے میں کیپٹن ارورہ بھی آ گئے۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو یہ صاحب اردو کے مشہور نقاد مالک رام کے قریبی رشتے دار ہیں اور چونکہ ایک ادبی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے اردو شعر و شاعری سے بے حد شغف ہے۔ ہزاروں شعر زبانی یاد ہیں۔ جنھیں ایک فوجی کے منہ سے سن کر ہمیں بڑی حیرت ہوئی۔ یہ مجھے مہندر، سلمیٰ، کملا، ملی اور انیلا کو اپنے ساتھ موتی محل لے گئے۔ جو کبھی راجگان پونچھ کا خاص محل تھا۔ میں نے وہ کمرہ بھی دیکھا۔ جو راجہ بلدیو سنگھ کی خواب گاہ رہ چکا تھا۔ آج بھی اس کمرے میں راجہ بلدیو سنگھ کا ہی پلنگ بچھا ہوا تھا۔ جس کی مچھر دانی کے پیتل کے چوکھٹ پر پیتل ہی کے حروف میں انگریزی میں B-S لکھا ہوا ہے۔

میں نے کپتان صاحب سے کہا "راجہ بلدیو سنگھ بڑی آن والا راجہ تھا۔ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔"

کیپٹن صاحب ہنس کر بولے: "صاحب آج بھی اس کی یہی حالت ہے۔"

"کیا مطلب؟" مہندر نے پوچھا۔

کیپٹن صاحب ہنس کر بولے "ایک دن میں رات کو اس پلنگ پر سو گیا۔ دوسری صبح کو میں نے اپنے آپ کو پلنگ کے بجائے فرش پر سوتا ہوا پایا۔"

"نہیں نہیں۔"

"نہیں۔ واقعی سچ کہتا ہوں۔"

میں نے کہا: "ممکن ہے کسی نے آپ سے مذاق کیا ہو اور سوتے میں آپ کو بستر سے اٹھا کر فرش پر ڈال دیا ہو۔"

"اب حقیقت جو بھی ہو" کیپٹن اروڑہ بولے "واقعہ یہی ہے۔ جو میں نے بیان کیا۔ اس واقعے کے چند روز بعد ہی ہمارا ایک دوست میجر اس پلنگ پر سو گیا۔ رات کو اس کے لحاف میں آگ لگ گئی۔ خود بخود اور وہ جلتے جلتے بچا۔۔۔"

مہندر نے کہا۔ "ممکن ہے میجر صاحب شراب کے نشے میں اپنا جلتا ہوا سگریٹ بجھانا بھول گئے ہوں۔"

کیپٹن اروڑہ بولے "آپ اس کی توجیہ جس طرح چاہے کر لیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اب اس بستر پر رات کے وقت کوئی نہیں سوتا۔"

سلمیٰ بولیں: "کیپٹن صاحب یہ دونوں بھائی دہریے ہیں۔ یہ تو مانیں گے نہیں لیکن میں ان باتوں کو مانتی ہوں ابھی اس دنیا میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جن کی سائنسی توجیہ محال ہے۔"

موتی محل سے واپس آئے۔ تو قلعہ مبارک کے علاوہ شہر کے مختلف مقامات پر شوٹنگ کرتے رہے۔ لنچ سے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ پہلے واپس ڈاک بنگلے میں پہنچے۔ تو لڑکے لڑکیوں اور پرانے دوستوں اور نئے چہروں کا ایک ہجوم تھا۔ ماسٹر دینا ناتھ رفیق بھی ملنے کے لئے آ گئے تھے۔ جنہوں نے اسکول میں مجھے اور مہندر کو پڑھایا تھا۔ ہم دونوں نے اُن کے پاؤں چھوئے ماسٹر جی بناوٹی غصے سے ہاتھ اٹھا کر بولے۔ "دو دن ایک چانٹا؟ کہاں گم رہے اتنے دن؟" ـــــ پھر اکدم ہنس پڑے اور ہم دونوں کو گلے سے لگا لیا۔ اس ہجوم میں سائیں داس جی بھی تھے۔ جو اپنی بیوی کے ساتھ ہمیں دیکھنے آئے تھے۔ سائیں داس جی۔ باؤ جی کے کمپاؤنڈر ہوا کرتے تھے۔ مسز سائیں داس بولیں۔ تم دونوں اتنے چھوٹے سے تھے۔ وہ اپنے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر بولیں اور میرے گھر آ کر میری رسوئی میں شوق سے میرے ہاتھ کا کھانا کھایا کرتے تھے۔ میرے گھر کی مکی کے ٹوڑھے تمہیں بہت پسند تھے۔ پھر اپنے پرانے ساتھی مہتر راجہ رام ملے۔ ماسٹر محمود الحسن۔ راجندر سنگھ۔ بابو تکورام بنوترہ۔ پرسرام گھئی۔ ترلوک ناتھ بھسین۔ چودھری لچھمن داس کپور اور رتن لال کپور اور اپنے ہم جماعت ٹھاکر پنجاب سنگھ اور رہر بنس لال ٹنڈن۔

کالج کے بہت لڑکے لڑکیوں نے فرمائش کی کہ ان کے ساتھ تصویر کھنچوائی جائے چنانچہ ان لوگوں کے ساتھ بھی شوٹنگ ہو گئی۔ شوٹنگ کے بعد ایک شوخ و شنگ حسینہ شانوں پر بال بکھرائے ہماری طرف بڑھی اور بولی۔

"مجھے افسانے لکھنے کا بہت شوق ہے۔ میں کیسے ایک اچھی افسانہ نگار بن سکتی ہوں؟"

پیشتر اس کے کہ میں کوئی جواب دیتا۔ مہندر جی مسکرا کر بولے۔

"دیکھئے ایک ابھی افسانہ نگار بننے کے لئے آپ افسانے تو کرشن جی کے پڑھا کیجیے۔ لیکن خط مجھے لکھا کیجئے۔"

اس پر ایک زور کا قہقہہ پڑا۔ مگر وہ لڑکی ذرا نہیں جھینپی فوراً بولی۔

"اچھا چاچا جی۔"

اس پر وہ قہقہے بلند ہوئے کہ کچھ نہ پوچھیے سلمیٰ نے اس لڑکی کی پیٹھ تھپک کر کہا "اب آپ کو کسی سے افسانہ نگاری کے گر سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

کچھ دیر یہ جن کلدیپ چندر شرما۔ شری شام لال نائب تحصیلدار۔ چودھری جیالال سوری اور چودھری مہیشر ناتھ کپور سے باتیں ہوتی رہیں پھر لنچ کا وقت ہو گیا۔ شام کو پانچ بجے گیتا بھون میں شہریوں نے ایک جلسے کا اہتمام کیا تھا۔ اور اس سے پہلے چار بجے کے قریب ہمیں ایک جلوس کی صورت میں بازار سے گیتا بھون لے جایا جائے گا۔ سب پروگرام طے کر کے لوگ رخصت ہوئے۔ تو ہم نے لنچ لیا۔ پھر پونے چار بجے گاڑیوں میں سوار ہو کے قلعہ مبارک پہونچ گئے وہاں سینکڑوں شہری استقبال کے لئے موجود تھے۔ جلوس چلا تو فضا کرشن چندر زندہ باد۔ مہندر ناتھ زندہ باد۔ سرلا دیوی زندہ باد۔ سلمیٰ صدیقی زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی۔ ہمیں ہاروں سے لاد دیا گیا۔ رادھا رام ٹی اسٹال سے لے کر پروین کمار مینی کی دکان تک سارا بازار دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ اور چپے چپے پر خوشنما ڈیوڑھیاں بنائی گئی تھیں۔ ایک اندازے کے مطابق ایک سو پچاس ڈیوڑھیاں سجائی گئی تھیں۔ جہاں ہم سب کو روک کر ہار پہنائے جاتے تھے۔ اور شری اندر راج شرما اور لالہ ہنس راج۔ وجے گپتا اور ست دیو گپتا اور کمار صاحب اپنے اپنے کیمروں سے فوٹو لئے جاتے تھے۔ بہت کم وقت میں لوگوں کو اطلاع دی جا سکی۔ پھر بھی گیتا بھون میں سینکڑوں لوگ جمع ہو چکے تھے۔ سب سے پہلے جناب محمد دین باندے نے تقریر کی۔ پھر ہمارے محترم رفیق استاد دینا ناتھ نے ایک نظم پڑھی۔ ارجن ناتھ مقری نے ایک گیت سنایا۔ پھر مہندر جی نے ایک جذباتی تقریر کی۔ میں نے بھی۔ مگر سرلا تو جذبات میں اس قدر ڈوب چکی تھی کہ وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ دیگا بھی خاموش رہی۔ صنف نازک کی نمائندگی سلمیٰ نے کی۔ اور لوگوں کو بتایا کہ جب یہ دونوں بھائی بیمار ہوتے ہیں تو مرنے سے پہلے پونچھ کے درشن کرنے کا تذکرہ ضرور کرتے ہیں اور اب کہ جب میں نے پونچھ کے لوگوں کی محبت اور یہاں کے علاقے کی خوبصورتی دیکھی ہے میں سمجھتی ہوں ان کا تذکرہ بے جا نہیں ہے۔ سلمیٰ تو زبردست مقرر ہیں اس لئے انہوں نے ایک ہی تقریر میں اہل پونچھ کے دل جیت لئے۔

جلسے کے خاتمے کے بعد چائے مٹھائی سے تواضع ہوئی۔ اس چائے پارٹی میں کوئی ڈھائی تین سو افراد شریک تھے۔ پھر جب شام ڈھلنے لگی اور رات بڑھنے لگی تو ہم لوگ چائے کی پارٹی سے فارغ ہو کر پیادہ شری پروین کمار مینی کے گھر کی طرف روانہ ہوئے جہاں رات کا کھانا تھا۔ یہ گھر کملا کا مائیکہ ہے جو میرے سب سے چھوٹے بھائی اوم کی بیوی ہے کملا کی بڑی بہن بملا سے مہندر جی کی شادی کی بات چلی تھی۔ یہ دونوں ایک دوسرے کو بہت پسند بھی کرتے تھے۔ اور دونوں خاندان کے افراد میں بہت میل ملاپ بھی تھا اور اس امر کی زبردست خواہش بھی تھی کہ مہندر اور بملا کی شادی ہو جائے لیکن اس زبردست خواہش اور اصرار کے

باوجود یہ شادی نہ ہو سکی۔ کیونکہ بملا ایک امیر گھرانے کی لڑکی تھی۔ اور مہندر جی اردو کے فری لانس ادیب بننے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ یعنی انہوں نے ادب کے ساتھ غریبی قبول کرتے ہوئے اپنی محبت کو قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

راستے بھر جنرل چند جی شکایت کرتے رہے۔ "دیکھئے کل شام آپ نے سردار بدھی سنگھ کے ہاں چائے کی دعوت قبول کی۔ وہاں آپ کے والد کے دوست سردار سنت سنگھ تھے۔ سردار بدھی سنگھ تھے۔ آپ کے دوست سردار گوربخش سنگھ کی ہمشیرہ موجود تھی۔ سردار بدھی سنگھ کی بڑی لڑکی جو سہارن پور میں لیڈی ڈاکٹر ہے وہ اور اُس کی چھوٹی بہن جو یہاں کالج میں پڑھتی ہے وہ موجود تھی۔ اور آپ کا سارا خاندان اس چائے پارٹی میں موجود تھا۔ مگر آپ نے میرے گھر کا کھانا قبول نہیں کیا۔ حالانکہ آج رات آپ پردین کے ہاں کھانا کھا رہے ہیں۔"

مہندر ناتھ نے معذرت کرتے ہوئے کہا: "بھائی صاحب اس وقت تو ہم صرف تین دن کے لئے پونچھ آئے ہیں۔ مگر اگلے سال تیس دن کے لئے آنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ پھر ہم آپ کے ہاں ایک دن نہیں سات دن کھانا کھائیں گے۔ اس بار معافی دے دو بھائی صاحب!" جنرل چند جی نے مہندر کو گلے سے لگا لیا۔ شکایت دھل گئی۔

پردین کے گھر میں بڑی رونق تھی۔ شہر کے عمائدین۔ ہندو۔ مسلم۔ سکھ سبھی حضرات موجود تھے۔ چارو، کملا، اپلا اور پردین کی ماتا جی سبھی اصرار سے سب کو کھانا کھلا رہی تھیں۔ مہندر ایک پلیٹ میں کھانا ڈال کے پلیٹ اٹھا کے کھانے کے کمرے سے باہر آ گیا میں اس کے ساتھ نہیں گیا۔ مجھے معلوم ہے کہ یادوں کے آنگن میں وہ اس وقت اکیلا کھڑا ہے۔ اور ماضی کی تمام ناآسودہ آرزوئیں اور حسرتیں اپنا آنچل پھیلائے اس کے سر پر سایہ فگن ہیں۔ کیا سوچ رہے ہو مہندر؟ گیا وقت واپس نہیں آتا۔ بملا بیوہ ہو چکی ہے۔ اب تو اس کی یادوں کا سہاگ بھی لُٹ چکا ہے۔ اور اب وہ بھی اتنی اکیلی ہے کہ جتنے اکیلے تم ہو۔ اس راکھ کو مت کریدو، شاید کسی چنگاری سے تمہاری روح جل جائے ....

آنگن میں شور ہے۔ صحن میں شور ہے۔ کھانے کے کمرے میں شور ہے۔ لوگ باتیں کر رہے ہیں۔ کوئی مجھ سے کہہ رہا ہے۔ پونچھ سے واپسی پر آپ کو سوہرن کوٹ میں دو گھنٹے کے لئے رکنا ہو گا۔ مہندر جی نے ہم سے وعدہ کر لیا ہے۔ مہندر جی نے ہم سے یہ بھی کہا ہے کہ وہ اگلے سال سوہرن کوٹ میں چھ مہینے رہ کر آپ کی سوانح حیات لکھیں گے ...... کچھ عورتیں کھل کھلا کر ہنس رہی ہیں۔ قہقہے کھنک رہے ہیں۔ لوگ باتیں کر رہے ہیں — مہندر یادوں میں گھرا اکیلا کھڑا ہے ....

قریب ایک ماہ کی شوٹنگ کے بعد کشمیر کے مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے ہم لوگ واپس بمبئی آ گئے۔ چند ماہ فلم کی ترتیب و تدوین میں لگ گئے۔ پہلے چھ ہزار فیٹ کی فلم بنی۔ پھر چار ہزار فیٹ کی۔ پھر تین ہزار فیٹ کی۔ آخر میں کاٹ پیٹ کے انیس سو فیٹ پر فلم تمام ہوئی اور فلم ڈویژن کے حوالے کر دی گئی۔ فروری ۷۴ء میں مہندر جی کو فلم ڈویژن سے پچپن ہزار کا چیک مل گیا۔ جو ہاتھوں ہاتھ بٹ گیا۔ بلکہ چودہ ہزار قرضہ اوپر رہا۔ میں نے مہندر جی سے بہت کہا۔ آپ آدمی تین دیکھئے۔ تین ہو تو بھائی دیکھئے۔ مگر کچھ رقم اپنے پاس رکھ لیجئے۔ باقی قرض دوسری دستاویزی فلم میں اُتار دیں گے۔

مگر یہ بات مہندر جی کے اصول کے خلاف تھی۔ کہنے لگے بھائی صاحب آپ فکر کیوں کرتے ہیں۔ امید ہے کہ مجھے فلم ڈویژن سے

ایک دن سارا برف ختم ہو جائے گی۔ یہ ظلم کشمیر کی حکومت سے۔ دو ایک جگہ اور بات کر رہا ہوں۔ دیکھ لینا دو ایک سال میں آپ کو ایسی فراغت دے دوں گا کہ آپ اس دن رات کی محنت سے بچ کر آرام سے سورن کورٹ میں رہ کر باقی زندگی صرف لکھنے پڑھنے میں گزار سکیں گے —— میں کہا کرتا: مہندر کو بس میری فکر تھی۔ اپنی نہیں۔

دس مارچ کو ساحر کے ہاں ڈنر تھا۔ اتنی اچھی صحت ہو چلی تھی مہندر جی کی کہ کلکتے سے آیا ہوا میرا دوست امرت لعل تن گجرال کہہ اٹھا: "مہندر بھائی میں نے آپ کو اتنا بشاش کم دیکھا ہے۔ ٹچ وڈ۔ صحت بھی بہت عمدہ ہو رہی ہے۔"

مہندر ہنس کر بولے: "شراب چھوڑ دی ہے۔ اُبلا کھانا کھاتا ہوں۔ اور ٹہلنے سیر کو جاتا ہوں۔ میں نے اتنے سالوں میں خود اپنے آپ کو اتنا تندرست محسوس نہیں کیا تھا۔"

ان دنوں راہی صاحب سے میں اردو کے معاملے میں الجھا ہوا تھا۔ اخباروں میں بیانات پہ بیانات آ رہے تھے۔ انہی دنوں میں دلی یونیورسٹی نے مجھے نظام خطبات کے لئے مدعو کر لیا۔ انیس مارچ کو میں دلی فرنٹیئر میل سے روانہ ہوا۔ چلنے سے پہلے میں نے مہندر کو فون کیا۔ ہمیشہ کا قاعدہ یہ تھا کہ بمبئی سے باہر جانے سے پہلے میں ضرور ان سے مل کر جاتا تھا۔ مگر آج بہت دیر میں اٹھا تھا۔ دیر میں تیار ہوا تھا۔ اگر مہندر جی کے گھر جاتا ہوں تو گاڑی چھوٹ جائے گی۔ سوچا فون پہ ہی بات کر لوں۔

مہندر جی سے فون پہ معذرت چاہی۔ وہ بولے "میں اسٹیشن پہ آیا جاتا ہوں۔ میں نے آپ کے لئے ریشم کا ایک کاڑھا ہوا عمدہ کرتا سلوایا ہے۔ وہ بھی لیتا آؤں گا۔"

میں نے کہا: "مہندر جی۔ چند دن کے لئے تو جا رہا ہوں۔ واپسی پہ آ کر پہن لوں گا۔" بس یہ آخری گفتگو تھی۔

بیس مارچ کو دلی پہنچا۔ سیدھا بھائی اوم کے گھر گیا۔ ناشتہ کیا۔ کھانا کھایا۔ پھر بھائی کشن لال جی کے ہاں ہری رام روڈ چلا گیا۔ پرسہ دینے کے لئے۔ کیونکہ ان کے بڑے بیٹے جگ موہن کا ایک موٹر ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا تھا۔ وہاں جا کے معلوم ہوا کہ سلمیٰ کا فون آیا تھا۔ میں آتے ہی فون کر لوں۔ میں نے بمبئی فون لگایا۔ کچھ عرصہ تک فون نہیں ملا۔ جب فون ملا تو سلمیٰ کی آواز سنائی دی۔ کہہ رہی تھیں: "فوراً آئیے۔ مہندر کو ہارٹ اٹیک ہو چکا ہے۔ حالت نازک ہے۔ فوراً پہلا ہوائی جہاز پکڑ کر آ جائیے۔"

دو تین گھنٹے بھاگم بھاگ سیٹ حاصل کرنے کے لئے کوشش کرتا رہا۔ کسی ہوائی جہاز پر جگہ نہ ملی۔ چار بجے کے قریب سلمیٰ کا فون آیا۔

"مہندر جی کی حالت بہتر ہے۔ کے۔ ای۔ ایم ہاسپٹل کے INTENSIVE وارڈ میں داخل کیا ہے۔ ابھی ابھی ان کو چائے اور ٹوسٹ کھلا کے آئی ہوں پھر جا رہی ہوں۔ آپ فوراً آ جائیے۔"

میں نے کہا: "ابھی تک تو کسی ہوائی جہاز میں سیٹ نہیں ملی۔ کوشش کر رہا ہوں۔ اس وقت نہیں تو صبح کے پلین سے آ جاؤں گا۔"

"پہلا پلین پکڑ کر آ جائیے۔"

اس وقت میں خلا میں تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا ہو رہا ہے۔ کشن لال جی کے ساتھ بیٹے کو بیٹھا تو پتا نہیں گیا۔ رات کے ساڑھے نو بجے یکایک میں نے کشن لال جی کے گلے سے لگ کر رو رو کر کہا: "نہیں رہے۔ نہیں رہے۔ کون کہتا ہے کہ میرا بھائی اس

دنیا میں نہیں ہے۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ جانی صاحب میرا بھائی اس دنیا میں نہیں ہے۔ (بعد میں معلوم ہوا ٹھیک ساڑھے نو بجے ان کا انتقال ہو گیا تھا۔)

رات بھر جاگتا رہا۔ کبھی باتھ روم جاتا۔ کبھی بستر پہ لیٹتا۔ کبھی اُٹھ کر ٹہلتا۔ موہن کملا، کشن لال جی کی دھرم پتنی، ساتھ والے پلنگ پر بیٹھی بہ بہ میری نگہداری کر رہی تھیں۔ لاکھ دل کو سمجھایا۔ سلمیٰ نے فون پہ کہا ہے۔ نند جی کی حالت بہتر ہے۔ میں صبح جاؤں گا۔ صبح ان کو ٹھیک کروں گا۔ وہ مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔

کب صبح ہوئی۔ کیسے اُٹھا۔ کب گاڑی میں بیٹھا۔ کب گاڑی پالم پہنچی۔ کب ہوائی جہاز میں سوار ہوا۔ کب سنتا کروز کے اڈے پہ اُترا۔ میں نہ دلی میں تھا نہ بمبئی میں تھا۔ میں خلاء میں تھا۔ یکایک ایئر پورٹ کے دروازے پر سامنے دیاس کھڑے نظر آئے۔ ان کے پیچھے سلمیٰ۔ ان کے پیچھے راہی۔ ان کے پیچھے شیام کشن نگم ان کے ساتھ کملیشور۔ بھارتی۔ بیس پچیس دوست انہیں دیکھ کر میں سمجھ گیا۔ آگے ایک قدم نہ بڑھ سکا۔ ایئر پورٹ کی سیڑھی پہ دھم سے بیٹھ گیا اور گھٹنوں میں سر دبا لیا۔ وہ لوگ مجھے اٹھا کر اندر ہال میں لے گئے۔

ساری زندگی وہ پتھروں سے کھیلا۔ پتھروں میں رہا۔ پتھروں سے لڑتا رہا۔ پتھروں سے سر ٹکراتا رہا۔ اور ساری زندگی پتھر کی اس دیوار میں کوئی دریچہ اس کے لیے نہیں کھلا۔ وہ میرا ساتھی۔ میرا یار۔ میرا دوست۔ میرا بھائی۔ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ جو بے نواؤں کا ہمنوا تھا۔ غریب ادیبوں کا غمگسار تھا۔ فلمی ادیبوں کا خدمت گذار تھا۔ ہم سب سے روٹھ کر ایک ہی دن میں چلا گیا۔ اور زندگی اور موت کے اس دوراہے پر کھڑا میں سوچتا ہوں کیسے تجھ کو واپس بلاؤں اور کہاں سے تجھ کو ڈھونڈوں اور کیسے تجھے پکاروں اور ایسا کہاں سے لاؤں۔ ۔ ۔

"ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے"

مہندر ناتھ — ایک یاد

جاں نثار اختر

مہندر سے میری پہلی ملاقات دسمبر ۱۹۴۸ء میں ہوئی جب ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں شرکت کے لئے وہ بھوپال آیا تھا۔ میں اس وقت حمیدیہ کالج بھوپال میں شعبۂ اردو کا صدر تھا۔ اس کانفرنس کا پروگرام بھی میری صدارت میں بنایا گیا تھا۔ بمبئی سے کرشن چندر، عصمت چغتائی، مہندر ناتھ، مجروح سلطان پوری، عادل رشید وغیرہ آئے تھے۔ کرشن چندر نے افتتاحیہ جلسہ کی صدارت کی جس کا افتتاح علامہ سلیمان ندوی نے کیا تھا۔ ۲۸ دسمبر کی شام جو ادبی تخلیقات کا دوسرا اجلاس تھا اس کی صدارت مہندر ناتھ کے سپرد تھی۔ مہندر نے ادب اور جنس کے موضوع پر بہت بلیغ اور بصیرت افروز خطبۂ صدارت پڑھا اس موضوع کا تاریخی جائزہ پیش کرتے ہوئے مہندر نے اس کا اعتراف کیا تھا کہ ترقی پسند ادب اپنے ابتدائی دور میں جنسی مریضانہ ذہنیت کا علاج کرنے کے بجائے خود اس کا شکار ہو کر رہ گیا تھا۔ مہندر ناتھ نے انسانوں میں جنسی محبت کے ساتھ روحانی رفاقت اور خیال کی ہم آہنگی پر زور دیا۔ ایسی رفاقت جو ایک نئے سماج کی بنیاد بن سکے یہ پہلا دن تھا جب میں نے مہندر کو ایک باشعور ادیب کی حیثیت سے پہچانا مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے مہندر کا یہ مضمون رسالہ 'افکار' میں شائع ہوا تھا جو اس وقت بھوپال سے نکلتا تھا۔ غالباً اس کے کسی مجموعے میں یہ مضمون شامل نہیں۔ میں نے اس وقت تک مہندر کی بہت کم کہانیاں پڑھی تھیں لیکن اس ملاقات کے بعد مجھے جس رسالہ میں اس کی کہانی مل جاتی ضرور پڑھتا تھا۔

مہندر سے دوسری ملاقات بھیمڑی کانفرنس میں ہوئی اور میں نے محسوس کیا کہ مہندر ایک ایسا جوشیلا اشتراکی ادیب ہے جو لشکر کے پیش پیش مقابل میں ہم بھی ہوں تو کا دلدادہ ہے۔ کانفرنس میں اس کا وجود ادیبوں اور فن کاروں کی فوج کے سپہ سالار کی حیثیت سے علیحدہ نظر آ رہا تھا۔ جب سارے ادیب اپنے اُن ساتھیوں کو جو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند تھے یا سیاسی مصلحتوں کی بنا پر روپوش تھے۔ نام لے لے کر پکار رہے تھے مہندر کی آواز سب سے اونچی اور الگ سنائی دے رہی تھی، ایسا لگ رہا تھا کہ یہ آواز تمام حدبندیوں کو توڑ کر ان تک ضرور جا پہنچے گی۔

اس کانفرنس کے مینی فسٹو میں جس انتہاپسندی کا مظاہرہ کیا گیا تھا اور ادیبوں کو جس طرح سرخ رنگ میں رنگ جانے کے حکم صادر ہوئے تھے اُس کے نتیجے میں بہت سے ساتھیوں کا انجمن سے الگ ہو جانا یقینی تھا۔ اس غلط اقدام پر میری اور مہندر کی خاصی بحث ہوئی۔ نہ مہندر مجھے قائل کر سکا نہ میں مہندر کو۔ میں تو خیر دو دن بعد بھوپال لوٹ گیا لیکن وقت نے خود بتا دیا کہ رندیوے کی پالیسی مبنی ادیبوں کا منشور کتنا غلط تھا۔ میں نے اس زمانے میں بہت سوچا کہ مہندر ایک متوازن دماغ رکھتے ہوئے میری بات کیوں نہ مانا۔ آخر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس میں پارٹی سے وفاداری کا جذبہ اس حد تک تھا کہ وہ اسے وقتی طور پر اندھا بنا دیتا تھا۔ میرے دل میں اس کی عزت بڑھ گئی کیونکہ جذبہ چاہے کیسا ہی کیوں نہ ہو ہر چیز سے بڑا ہوتا ہے اور اس کی عظمت سے انکار نہ

کیا جا سکتا۔

میرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

سنہ ۱۹۵۱ء میں جب میں سنٹرل گورنمنٹ کے ایک آرڈیننس کے تحت اپنی سروس چھوڑنے پر مجبور ہو گیا اور بمبئی چلا آیا تو مہندر ناتھ سے میری ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور مجھے اس کو پاس سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس وقت وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کا سکریٹری تھا۔ انجمن کے جلاسوں کا سلسلہ بہت باقاعدہ چلتا تھا۔ دیودار ہال میں یعنی گوکھلے بلڈنگ میں یا پھر عرب بلڈنگ میں ترقی پسند مصنفین کے جلسے ہوتے رہتے جس کے لئے پوری دوڑ دھوپ مہندر کو کرنی پڑتی تھی۔ عرب بلڈنگ میں تو اکثر ہال کی صفائی کرتے اور دریاں بچھاتے ہوئے میں نے اسے دیکھا تھا۔ بلکہ بعض اوقات مجھے اس کا ہاتھ بٹانا ہوتا تھا۔

مہندر شدید قسم کا جذباتی انسان تھا۔ اس کی وہ کہانیاں جن میں اس کی جذباتیت ابھر کر سامنے آئی ہے "ہماں میں رہتا ہوں" "ڈیڑھ روپیہ" "چائے کی پیالی" "اگر ہم مر جائیں" "جنوب کا ساحل" "چاندی کے تار" "حنائی انگلیاں" اس کے ادبی شاہکار ہیں۔ وہ اپنی عملی زندگی میں بھی جذباتی تھا جس کی سب سے بڑی مثال وہ گوشہ ہے اس کا زندگی بھر کا نباہ ہے۔ اس کی سب سے بڑی کمزوری کرشن چندر رہا۔ اس کے معاملے میں وہ زندگی بھر جذباتی رہا۔ کرشن کا ہر دکھ درد اس کا اپنا دکھ درد تھا۔ وہ ہنس راج رہبر ہو یا کوئی اور وہ کرشن کے مخالف کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔ شاعر نے جب کرشن چندر نمبر شائع کیا اس وقت ایک مضمون محمد طفیل نے پاکستان سے بھیجا تھا جو سعادت حسن منٹو کا لکھا ہوا تھا اور جسے طفیل نے اپنے رسالے میں شائع کرنا مناسب نہ سمجھا تھا اور منٹو سے خرید کر اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا۔ یہ مضمون بہت کچھ کرشن کے خلاف تھا۔ ظاہر ہے کہ مہندر کیسے گوارا کرتا کہ اسے کرشن نمبر میں شامل کیا جائے جس کی تکمیل اور ترتیب میں اس کا بڑا ہاتھ تھا۔ مہندر نے وہ مضمون مجھے دکھایا تھا اور بے طرح بگڑا ہوا تھا۔ میں نے کہا بھی کہ منٹو تو اب ہے نہیں، تم یہ ناراضگی کس پر ہو رہے ہو۔ نہیں چھاپنا چاہتے ہو تو نہیں چھاپو، بات ختم ہو جاتی ہے مگر وہ دیر تک نارمل نہ ہو سکا۔

اس کی یہی جذباتیت تھی جس سے اس کے قریبی دوست پیار کرتے تھے۔ اپنے دوستوں کے لئے کیا غیروں تک کی مدد کے لئے وہ اٹھ کھڑا ہوتا تھا اور جو کچھ اس سے بن پڑتا اس سے دریغ نہ کرتا تھا۔ ایسا اس کی زندگی میں بہت کم ہوا کہ کسی مسئلے پر اس کا کسی دوست سے جھگڑا ہو گیا ہو۔ ایک مرتبہ جب ساحر فلم رائٹرس ایسوسی ایشن کے صدر تھے اور مہندر سکریٹری، ان کا آپس میں اختلاف ہو گیا۔ مہندر میرا جتنا دوست تھا اتنا ہی ساحر بھی تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ بیچ میں پڑ کر ان دونوں کا آپس میں میل کرا دوں۔ اس سلسلے میں بات چیت کی غرض سے میں دو چار بار مہندر سے ملنے گیا۔ اس دوران مہندر مجھے خوش مذاقی سے U. THANT کہہ کر پکارنے لگا تھا۔ بہرکیف صلح تو آخر میں ہو ہی جانا تھا البتہ اس تلخی کا اثر مہندر پر کافی دنوں تک رہا۔

ایک کمزوری جو مہندر میں زندگی بھر رہی وہ یہ تھی کہ وہ دوسروں کے حق کے لئے تو لڑ سکتا تھا اپنے حق کے لئے لڑنا نہیں جانتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی میں اسے کچھ نہ مل سکا۔ نہ کوئی خطاب، نہ وہ شہرت جس کا وہ مستحق تھا۔ آخر زمانے میں البتہ مہندر میں کبھی کبھی تلخی ابھر آتی تھی۔ وہ جس طرح دوسروں کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتا تھا، شاید اس کے دل کے

کسی کو شبے میں یہ خواہش بھی تھی کہ کوئی دوسرا بھی اس کے لئے کچھ کر دکھائے۔ اس کے انتقال سے پندرہ بیس دن پہلے کی بات ہے۔ میں اس شام اس کے پاس بیٹھا تھا کہنے لگا الماری میں سے بوتل نکال لو۔ میں نے کہا تم نہ پیو گے تو میں بھی نہیں پیوں گا بولا "چلو یار! ایک پیگ آج میں بھی پی لیتا ہوں۔" نہ جانے شراب پیتے ہوئے اس میں کیا بات امڈ آئی کہنے لگا "سمجھ میں نہیں آتا ہم میں ایسی کیا کمی ہے کہ نہ ہماری کتابوں پر کبھی کوئی انعام ملتا ہے، نہ کوئی خطاب سے نوازتا ہے۔ نہ باہر ہی سے کوئی بلاوا آتا ہے۔ اب اتنا بھی برا ہم نہیں لکھتے۔" میں نے ہنس کر کہا "یہ سارے انعام اگر ہم لوگوں کو بھی ملیں گے تو دو، لیکن ہیں یہ POS THOMUS AWARDS کے لئے انکا نام لکھ کر رکھ لو۔ یہ مرنے کے بعد مجھے اور تمہیں کچھ نہیں دیں گے۔" آج جب مجھے سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ دیا گیا اور دو ہفتے کے لئے روس آنے کی دعوت۔ تو مجھے بے طرح مہندر کی یاد آئی۔ کاش وہ تھوڑے دن اور انتظار کر لیتا۔

مہندر کے تعزیتی جلسوں میں بہت سے دوستوں نے یہ بات بڑے فخر سے کہی کہ مہندر بیس سال تک انجمن ترقی پسند مصنفین کا سکریٹری رہا اور بارہ سال تک فلم رائٹرس ایسوسی ایشن کا سکریٹری رہا۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ یہ بات کم سے کم ہمارے لئے شرمناک ہے آخر وہ کون ہے جو یہ لکیر کھینچتا ہے کہ اس ادیب کو اس سے زیادہ آگے نہیں دیا جانا چاہیے۔ مہندر ناتھ فلم رائٹرس ایسوسی ایشن کا کبھی وائس پریسیڈنٹ یا پریسیڈنٹ کیوں نہیں چنا گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ کوئی اعزازی عہدہ ہو، انعام ہو، خطاب ہو یا بیرونی ممالک سے دعوت نامے ہوں، ان کے لیے بڑے جوڑ توڑ کرتے ہوتے ہیں۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ بغیر کچھ کوشش کئے سب کچھ مل جائے۔ مجھے اپنا کہا ہوا ایک شعر یاد آ رہا ہے ؎

انعام ہو، خطاب ہو ویسے ملے کہاں
جب تک سفارشوں کو اکٹھا کیا نہ جائے

مہندر جہاں دوستوں کے دکھ درد میں شریک ہوا جاتا تھا وہاں اُن کی خوشیوں سے بھی خوش ہونا اسے آتا تھا۔ میں نے سنہ ۱۹۶۳ء میں جب مہندر سے ایک دن برسبیل تذکرہ کہا کہ میں ایک فلم پروڈیوس کرنے جا رہا ہوں تو وہ ہنسنے لگا کہ یہ عذاب تمہارے بس کا نہیں۔ لیکن جب میں نے بیس ہی دن بعد اسے "بہو بیگم" کا مہورت کارڈ لے جا کر دیا تو وہ خوشی سے اچھل پڑا اور کہنے لگا "یار تجھے مان گئے۔" پھر ہنس کر بولا۔ مہورت کا دن اور وقت جوتشی سے نکلوایا ہے یا خود ہی نکال لیا ہے۔" میں نے کہا، "جوتشی کا تمہیں کیوں خیال آیا۔" کہنے لگا۔ "یونہی، تمہارا بس چلتا تو تم مہورت ہی کیوں کرتے۔"

مہندر کبھی توہم پرست نہیں رہا۔ لیکن نہ جانے ایک دفعہ کیوں محاقی طور پر وہم اس کے دل میں جاگ اٹھا تھا۔ یہ بات ہے اُس دن کی جب مجھے پہلا دل کا دورہ پڑا تھا۔ آناً فاناً کتنے احباب گھر پر جمع ہو گئے مجھے جب اسٹریچر پر ایمبولنس کار میں اسپتال لے جانے لگے تو کسی نے مجھے چادر اڑھا دینی چاہی، اسی لمحہ مہندر نے چیخ کر کہا۔ "نہیں، چادر نہیں اڑھاؤ۔"

مرنے سے آٹھ دن قبل اس نے مجھے افسانوں کا مجموعہ "تنہا تنہا" بھیجا تھا۔ اس مجموعے کی کئی کہانیاں مجھے پسند آئیں۔ میں نے سوچا تھا کہ میں زبانی مہندر سے ان کہانیوں کے بارے میں اظہار خیال کروں گا۔ لیکن وہ موقع نہ آ سکا۔ اچانک رات کو مجھے خبر ملی کہ

مہندر پر دل کا دورہ پڑا ہے اور اسے اسپتال منتقل کر دیا گیا ہے۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ مہندر مر جائے گا۔ لیکن وہ واقعی مر گیا۔ بہت سے دوستوں نے اس کی میت پر پھول چڑھائے۔ مجھ سے یہ بھی نہ ہو سکا۔ میں تو صرف اپنے آنسوؤں ہی کے پھول اس کے نذر کر سکتا تھا۔

دنیا اتنی بے مروت اور زمانہ اتنا مصروف ہے کہ دوست دوست کو بھول جاتے ہیں۔ ادیب ادیب کو بھول جاتے ہیں۔ انسان انسان کو بھول جاتا ہے۔ البتہ تاریخ ادب ان ناموں کو ضرور اپنے سینے سے لگا کر رکھتی ہے جنھوں نے اپنی جذباتی اور ذہنی زندگی ادب کی آبیاری میں صرف کر دی۔ مہندر کا نام بھی ادبی تاریخ کے صفحوں میں زندہ رہے گا۔ وقت کے ساتھ ہر یاد دھندلی پڑ جاتی ہے۔ مجاز اور مخدوم جیسے ساتھیوں کی یاد کبھی کبھی ہمیں چونکا کر گزر جاتی ہے۔ یوسف ظفر جس کے بارے میں ہمارے بڑے افسانہ نگاروں کی رائے تھی کہ "اب اردو ادب میں ایک گورکی پیدا ہوا ہے۔" آج کسے یاد ہے۔ مہندر بے چارہ تو "گورکی" بھی نہ تھا۔ اسے اگر کوئی بھول جائے تو کس کو کس سے گلہ ہو گا۔ پھر بھی مجھے اعتبار ہے کہ مہندر بحیثیت ایک انسان اک نہ اک دل میں ضرور زندہ رہے گا۔ مجھے اپنے بیٹے سلمان کا ایک مصرعہ یاد آ رہا ہے۔ مہندر کا کوئی نشان مزار نہ سہی۔ کوئی کتبہ نہ سہی شاید اس سے زیادہ مناسب ہم اس کے لئے کچھ نہ سوچ سکیں گے۔ ؎

اک نہ اک دل میں تو یہ آدمی زندہ ہو گا۔

مہندر ناتھ کی شخصیت
(خطوط کے آئینے میں)

محمد طفیل

بھائی کرشن چندر، تسلیمات!

آپ کا حکم سر آنکھوں پر ــــــ مگر ــــــ

میں مہندر ناتھ سے بغیر اُن کا مدّاح ہوں۔ اُن کی انسان دوستی کا گرویدہ، اُن کے فن کا دلدادہ۔ اگر میں اُن سے ایک بار بھی ملا ہوتا تو باقی باتیں اپنے "کشف" سے لکھ ڈالتا۔ مگر افسوس ایک بار بھی ملنا نصیب نہ ہُوا۔

انھوں نے مجھے متعدد بار بمبئی بلایا۔ لیکن وہ خود اتنی جلدی میں تھے کہ انھیں دھیان ہی نہ رہا کہ میں نے کسی کو بلا رکھا ہے۔

اِن حالات میں میں کیا عرض کروں؟

آپ کا

محمد طفیل

۱۹۶۶ء میں، مہندر ناتھ نے لکھا تھا۔

حضور! آپ کو کرشن چندر پر مضمون لکھنا ہی ہوگا۔ یوں تو ایک ہی ملاقات کافی ہوتی ہے ایک مضمون کے لئے، آپ تو تین چار بار مل چکے ہیں کرشن جی سے! مجھے یقین ہے۔ جب آپ کرشن جی پر مضمون لکھیں گے تو واقعی ایک معرکے کی چیز ہوگی۔ اب ٹالنے کی کوشش نہ کیجیے گا بس لکھئے!

۱۹۷۰ء میں، کرشن چندر نے لکھا:-

پہلے لکھ چکا ہوں کہ بیس مارچ کو مہندر جی کی پہلی برسی ہے۔ اِس موقع پر ہم لوگ ایک خصوصی "مہندر ناتھ یادگار نمبر" شائع کر رہے ہیں۔ جس میں تمہاری شرکت اشد ضروری ہے۔ کوئی مضمون، کوئی خاکہ جو چاہو بھجوا دو۔ تمہارے پاس تو مہندر جی کے خطوط بھی ہیں۔ اُن کا حوالہ بھی اپنے مضمون میں دے سکتے ہو۔ تمہارے مضمون

کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔

[میں سوچنے لگا۔
جب مہندر ناتھ نے مضمون مانگا تھا تو عزت اور تھی جب
کرشن چندر نے مضمون مانگا ہے۔ صورت اور ہے۔
بہرحال میں نے مہندر ناتھ کے خطوط اکٹھے کیے اور چشم تر
پڑھنے لگا۔]

۱۹۵۸ء میں لکھا:۔

گھر میں صرف میں ہوں اور میری بیوی اور بیوی سیواجی کی اولاد ہے یعنی مراٹھن ہے۔ وہ بھلا بیمار کیا ہوگی۔ اس لئے خدا کا قہر مجھ پر ہی نازل ہوتا ہے۔ شاید دہریہ ہونے کی وجہ سے، اور کیا عرض کروں کہ قوتِ برداشت اتنی ہے کہ خدا سے بھی گلہ نہیں کر سکتا۔

[مہندر ناتھ کی عادت کسی سے شکایت کرنے کی نہ تھی۔
وہ اپنی آگ میں خود بھسم ہونے کے قائل تھے۔]

۱۹۶۱ء میں لکھا:۔

آپ کا مرنے والے بچوں کو سلام تا قیامت ملتا رہے گا۔ ہندوستان کی آبادی ۴۲ کروڑ ہو گئی ہے۔ ایک دو بچے پیدا کر کے میں کونسا تیر ماروں گا۔ خدا آپ کے اور باقی لوگوں کے بچے سلامت رکھے۔

[مہندر ناتھ کے کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ بڑھتی ہوئی آبادی سے
بھی پریشان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے چپکے سے اپنے وجود کی
نفی کر دی۔]

۱۹۶۲ء میں لکھا:۔

ادھر دو تین تازہ نمبر ملے۔ صرف لاہور نمبر نہیں ملا۔ اگر بھیج دیا ہے تو یہ نمبر مجھے ملنا چاہیے تھا۔ لاہور سے میری یادیں وابستہ ہیں۔ بچپن اور جوانی کے دن اسی شہر میں گزرے۔ ایم۔ اے تک وہیں تعلیم حاصل کی۔ اس لئے لاہور نمبر سے مجھے محروم مت کرو۔ نہیں بھیجا ہے تو بھیج دو پیارے!

[مہندر ناتھ نے لاہور کا نام لیا۔ میرے بھی دل کی دھڑکن تیز

ہوگئی - اب میں انھیں ڈھونڈنے بھی نکلوں تو ڈھونڈ نہ سکوں گا -]

۱۹۵۸ء میں لکھا :-

اس وقت سورج درختوں کی اوٹ میں ہے - میرے کمرے کی دیواریں سورج کی روشنی میں چمک رہی ہیں ناریل کے پتے اس نرم ہوا میں ناچ رہے ہیں -

آج کل بمبئی کا موسم بڑا ہی خوشگوار ہے - اتنی خوبصورت دھوپ! آسمان صاف شفاف اور روشن ہے کہ آدمی اپنا چہرہ آئینے کی بجائے آسمان میں دیکھ سکے لیکن دیکھنے کی ہمت نہیں - آئینے میں چہرہ دیکھنا آسان ہے - لیکن آکاش کی کھلی بے داغ پیشانی کے سامنے اپنا چہرہ رکھنا حوصلے کا کام ہے -

کچھ دنوں سے گرمی بہت کم ہے - سردیوں کا آغاز ہے - یہاں تو سردیوں کا موسم ہوتا نہیں - بڑی ہلکی ہلکی سی ٹھنڈک بلکہ یوں کہا جائے تو بہتر ہے کہ گرم گرم سی ٹھنڈک!

[انسانوں کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ جو شخص مناظر قدرت سے دلچسپی رکھتا ہے - وہ لغویات سے دلچسپی نہیں رکھتا -]

۱۹۶۰ء میں لکھا :-

ادب عالیہ نمبر مل گیا ہے - یہ نمبر سب نمبروں سے بازی لے گیا - میں اس سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ خوبصورت حسین اور حسین تر نمبر نکالنے کا سہرا تمہارے ہی سر ہے - اس سے پہلے اور شاید اس کے بعد کوئی ایڈیٹر اتنے شاندار، باوقار اور بامقصد نمبر نکال سکے گا - نمبر نکالنے میں جس ذوق جمال کا تم نے ثبوت دیا اور اردو ادب کی جیسی تم نے تاریخ مرتب کی اس کی وجہ سے اردو ادب میں تم تو امر ہو گئے ہو -[1]

[کسی کی تعریف کرنا دل گردے کا کام ہے - یہ شیوہ یا تو ادیبوں کا ہے یا ان کا، جن کے مزاج میں شرافت ہے اور دل کشادہ!]

۱۹۶۰ء میں لکھا :-

میری ایک اور عرض ہے کہ مرنے سے پہلے تم ایک ایسا نمبر نکالو جس کی وجہ سے تمہیں گالیاں ملیں یعنی اتنا خراب، اتنا بدصورت، اتنا بے مقصد اتنا بے معنی نمبر کہ اس سے بے ادبی کی شاندار روایات قائم ہوں جنھیں ہر بڑا

---

[1] آنجہانی نے اپنے خطوط میں میری اتنی تعریف کر رکھی ہے کہ انھیں پڑھ کر شرمندہ ہوتا رہا - کیا وہ سب سے ایسی ہی اوٹ پٹ محبت کرتے تھے ؟ جواب اعجؔ

افسانہ نگار یا شاعر اچھی خاصی بیہودہ نظمیں اور افسانے لکھتا ہے۔ اس لئے تمہیں پورا حق ہے کہ اس طرف بھی توجہ دیں تاکہ اس میدان میں بھی تمہارا کوئی ثانی نہ ہو۔

[وہ مزاجاً بظاہر برعکس مزاج رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جنہوں کو بھی ان کی زندگی میں دخل تھا۔ ویسے بھی کردار کی سب عملی خوبیاں سے باعمل شرارتیں زیادہ قیمت رکھتی ہیں۔]

۱۹۵۴ء میں لکھا:-

ادھر بیماریوں نے آگھیرا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ کرشن جی کی چھوٹی بچی بالکل بولتی نہیں ہے۔ وہ خود کچھ عرصے سے بیمار ہیں۔ ادھر میں بیمار ہوں۔ بھیا اس جھنجھٹ میں کچھ نہ لکھ سکا۔ آپ یہ لکھا کہ کرشن چندر پر مضمون لکھ کر بھیجو۔ یا کسی سے لکھواؤ۔ میں کرشن چندر پر مضمون تو لکھ سکتا ہوں لیکن مواد اتنا زیادہ ہے کہ وہ ایک کتاب ہی میں سما سکتا ہے۔

[مہندر ناتھ سب سے پیار کرتے تھے۔ ہاں تاہم سے بھی۔ لیکن کرشن چندر سے تو ان کی محبت بے مثال تھی۔ قابل رشک حد تک بے مثال۔]

۱۹۵۹ء میں لکھا:-

طبیعت ناساز تھی اور ابھی تک ہے۔ معدہ خراب ہے اور خراب رہتا ہے۔ نزلے کی شکایت ہے۔ لوگ زیادہ شراب پی کر اپنا معدہ خراب کر لیتے ہیں۔ یہاں میرا الٹا ہی حال ہے یعنی شراب نہ پی کر معدہ خراب کر لیا ہے۔ خیر یہاں تو بھگوان کی کرپا سے شراب پینا ممنوع ہے۔ کو دیسی شراب ملتی ہے اور کافی سستی ملتی ہے۔ لیکن ایسی شراب کا بھی کیا پینا جو معدے کے ساتھ ساتھ دماغ کو بھی خراب کر دے۔ — تمہاری کوئی تازہ تخلیق؟ کتابی، جسمانی یا روحانی؟ ادھر میں تینوں چیزوں سے منکر ہو گیا ہوں۔

[کسی کا شراب نہ پینا، شرافت و نجابت کی دلیل تو نہیں مگر ایسے لوگ مجھے اچھے لگتے ہیں۔ مہندر ناتھ کے بارے میں میرا خیال تھا کہ چسکی لگا لیتے ہوں گے لیکن وہ تو مطلق نکلے۔]

۱۹۶۶ء میں لکھا:-

ایک زمانے کے بعد آپ کا خط ملا۔ یہ بیان کر کے بے حد خوشی ہوئی کہ ہم سب زندہ ہیں۔ خدا کرے معاہدۂ تاشقند کی روح زندہ و تابندہ رہے اور دونوں ملکوں کے درمیان دوستی کی راہ و رسم جاری رہے۔ اور اس فانی دنیا سے کوچ

کرتے وقت کم سے کم ایک دوسرے سے مراسلات کا سلسلہ تو قائم رکھ سکیں۔

[یہ سوچ کسی صلح کل قسم کے انسان ہی کی ہو سکتی ہے۔ اگر ان کی جگہ کوئی متعصب ذہن ہوتا تو وہ نہ جانے کیا کیا کچھ کہتا۔]

۱۹۶۲ء میں لکھا:۔

خدا کرے آپ مجھے قتل کرنے میں کامیاب ہوں۔ دراصل میں بیمار ہو کر مرنا نہیں چاہتا۔ شہید ہونا چاہتا ہوں۔ کسی ادیب کے ہاتھوں شہید ہو جاؤں تو میری موت کے بعد اچھے خاصے مقبرے بن سکیں گے۔ یوں سسک سسک کر مرنا کہاں کی شرافت ہے۔

بہت سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ ابھی شہید ہونا عقلمندی نہیں۔ کچھ عرصہ اور انتظار کیا جائے۔ اس لئے کہ اس دوران میں ایک افسانہ ہو گیا اور وہ بھی بہت اچھا اور شاندار افسانہ جسے پڑھ کر آپ ضرور میری درازیٔ عمر کے لیے خدا کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھائیں گے اور قتل کرنے کی تمنا جو آپ کے دل میں ہے اُسے فوری طور پر ملتوی کر دیں گے۔

[میں نے بے تکلفی کی فضا میں لکھا ہو گا کہ افسانہ بھیج دیجیے ورنہ قتل کر دوں گا۔ فن کار مرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ لیکن جب اچھی تخلیق کی آمد آمد ہو تو وہ اپنے ہوس کی باتیں ہونے والے ارادے کو بھی ملتوی کر سکتا ہے۔]

۱۹۵۲ء میں لکھا:۔

ایک علمی ادارے میں نوکری کر لی تھی۔ اور اسی مہینے اُس علمی ادارے سے چھٹکارا نصیب ہوا ہے۔ ایک فلم "زلزلہ" تیار کی ہے۔ اس میں بطور آیاب ایڈیٹر، ڈائیلاگ رائٹر اور ساتھ ہی چیف اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے کام کیا ہے۔ یعنی پیٹ بھرنے کے لیے ایک ادیب کو کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔

[فلمیں تو کئی بڑے ادیبوں نے بنائیں۔ منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور خواجہ احمد عباس نے کہ بطور ایڈیٹر یا تو مہندر ناتھ نے کام کیا یا سعادت حسن منٹو نے۔]

۱۹۵۲ء میں لکھا:۔

اس دور ابتلا میں ذہن کے سامنے کئی تصویریں اُبھرتی ہیں۔ ماضی حال اور مستقبل نگاہوں کے سامنے گھوم جاتے

ہیں۔ زندگی کی مشکلات اتنی بڑی اور زیادہ ہیں کہ اُن کا سامنا آسان نہیں

بمبئی کے ادیب بھی آج کل بہت کم لکھتے ہیں۔ پیٹ کی بھوک نے دوچار کر دیا ہے اور ہم سب لوگ بے بس سے ہو کر رہ گئے ہیں۔ پھر بھی ہمت نہیں ہارتے۔

[بمبئی کے ادیبوں سے ادب کو کوئی گلہ نہیں۔ جیسے جیسے بھی لکھا، خوب لکھا۔ اور ناموں کے ساتھ مہندر ناتھ کا نام بھی نمایاں ہے۔ مفلسی زحمت ضرور ہے مگر ذلت نہیں۔]

۱۹۷۰ء میں لکھا:-

آپ کی والدہ محترمہ کی اچانک موت کی خبر پڑھ کر بے حد رنج ہوا۔ ماں کی محبت عجیب و غریب ہوتی ہے۔ بڑی نایاب، حسین اور دلفریب چیز۔ یہ واقعی ایک المناک ٹریجڈی ہے۔ جس کا سامنا ہر انسان کو کرنا پڑتا ہے۔ سوائے صبر کے اور کوئی چارہ نہیں۔ اپنے غم میں مجھے بھی شریک کریں کیونکہ ماں سب کی سانجھی ہوتی ہے۔

[جو شخص کسی کے دکھ درد میں شریک ہو، صرف وہی شخص انسان کہلانے کا مستحق ہے۔ باقی سب دوستی کے فریب۔ مہندر ناتھ ان معنوں میں قابلِ پرستش تھے۔]

۱۹۶۹ء میں لکھا:-

آج کل ہندوستان میں مشاعروں کا زور ہے۔ اس دوران کافی غزل گو شعرا ادھر تشریف لائے۔ کاش آپ بھی شاعر ہوتے تو اس طرح آپ سے ملاقات ہو جاتی یا میں شاعر ہوتا تو اسی بہانے پاکستان کا ایک چکر لگا لیتا۔ نہ ہوئی قدرت۔

[مہندر ناتھ یاروں کے یار تھے۔ متعدد مرتبہ مجھے بمبئی بلایا مگر میں ہمیشہ بات کو کل پر ٹالتا رہا۔ اب تو بات واقعی کل پر ٹل گئی ہے۔]

۱۹۶۶ء میں لکھا:-

بمبئی میں پچھلے دنوں کافی ہنگامہ رہا۔ پانی کی اتنی قلت تھی کہ پینے کے لیے ذرا کم ملتا تھا۔ نہانے کے لئے سمندر رہے لیکن پینے کے لئے کافی دوڑ دھوپ کرنی پڑتی ہے۔ مون سون دغا دے گئی تھیں۔ قیامت کا سماں تھا۔ لیکن اب بارش اتنے زوروں سے ہو رہی ہے کہ خدا بچائے۔ چاروں طرف پانی ہی پانی ہے۔ جھیلیں پانی سے بھری پڑی ہیں۔ اب ہر شخص خوش ہے۔ خدا نے اپنے وجود کا احساس انسانوں کو کرا دیا ہے۔ اب بھی لوگ اس کی ہستی کے منکر ہوں تو کیا ہو سکتا ہے۔

[ایک خط میں مہندر ناتھ نے لکھا تھا کہ دہریہ ہوں۔ اس لئے خدا کا
تو مجھ پر ہے۔ اقرار وہاں بھی خدا کی ہستی کا تھا۔ اقرار یہاں پر بھی ہے
باقی اللہ جانے۔]

۱۹۵۷ء میں لکھا:

تم وعدہ کیوں کرنے لگے۔ خطوط نمبر چھاپا۔ اس میں سے مہندر ناتھ کا نام غائب تھا۔ شخصیات نمبر چھاپا اُس میں ہمارا نام غائب! ارے بھئی کیا ہماری شخصیت، شخصیت ہی نہیں؟ اتنی بے اعتنائی کیوں؟ پھر اتنا پیار کیوں؟ بتاؤ تو! کبھی کبھی تم سے گلے شکوے کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ویسے زندگی میں یہ پہلا موقعہ ہے کہ تم سے گلا کر رہا ہوں یا کسی سے گلہ کیا ہے۔

مجھے یہ گمان تھا کہ مہندر ناتھ ابھی ہمارا لمبا ساتھ دیں گے۔ اس لئے
کھسکنے والے دوستوں کو راضی کر لیا جائے یا ان کا حق ادا کر دیا
جائے مگر انہوں نے تو اتنی جلدی کی کہ میں شرمندہ ہو گیا۔

۱۹۵۸ء میں لکھا:

ارے بھئی ایک عرصہ سے بیمار تھا۔ سلسلہ کلام سے شروع ہوا اور انجام بہت برا ہونے والا تھا کہ آپ ایسے دوستوں نے آواز دی۔ ٹھہرو جانے والے راہی! کہ میں ٹھہر گیا اور پھر تندرست ہو گیا۔"

وقت سے پہلے مرنا بھی کونسی بہادری ہے۔ جب تک سانس آتا ہے۔ جیئے جاؤ۔ مرنے کے بعد کس نے پوچھا ہے۔ اگر کوئی پوچھتا بھی ہے تو فائدہ؟

[غالباً مہندر ناتھ بھی میرے ہمنوا تھے کہ موت سے کیا ڈرنا۔ زندگی سے
خبردار رہنا چاہیے۔
افسوس کہ ۲۰ مارچ ۱۹۷۰ء کو انہی نے آواز نہ دی اور وہ
چلے گئے۔ دوستی کا باب ختم ہو گیا۔ ادب کی رونق مدھم پڑ گئی۔]

حکیم ناشاد عرف مہندر ناتھ

راہی معصوم رضا

جنوری ۱۹۷۴ء تک مہندرناتھ تھے۔ جنوری ۱۹۷۴ء سے مہندرناتھ نہیں ہیں۔ جب مہندرناتھ تھے تو ان پر لکھنے کا خیال نہ آیا اور جب مہندرناتھ نہیں ہیں تو لکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے۔ کیونکہ ان دنوں ہم تمام ادیب اپنے آپ کو روشنائی کے لئے بیچ رہے تھے۔ اس عہد میں مہندرناتھ نے روشنائی کے لئے اپنے آپ کو نہیں بیچا۔ ہم سب نے اپنے بکنے کا کوئی نہ کوئی جواز ڈھونڈ لیا۔

روشنائی کے لئے اپنے کو بیچا کئے ہم
تاکہ صرف اس نے کچھ لکھنے سے باز نہ رہے
کہ قلم خشک تھے اور لکھنے سے مجبور تھے ہم

مہندرناتھ نے کسی شرط پر حالات سے صلح نہیں کی۔ ایک شعر یاد آ گیا

مصلحت کی شرطوں پہ رہن دل نہیں رکھتے ۔۔۔ جان بیچ دیتے ہیں، قرض اتارنے والے

مہندر نے جان دے کر زندگی کا قرض اتار دیا اور ہم لوگ آڈیٹوریم میں بیٹھے ہیرو کی ہیروئک موت پر خوش ہو کر تالیاں بجا رہے ہیں۔ رو رہے ہیں کہ وہ مر گیا۔ خوش ہیں کہ ہم نہیں مرے۔ ویسے بھی دیکھا جائے تو مہندرناتھ کے مرنے سے نقصان کم ہوا فائدے زیادہ ہوئے۔ ڈرکا (مہندر کی بیوہ) کو ۲۲ انچ کا ایک ٹیلی ویژن مل گیا۔ یہ ٹیلی ویژن اسے مہندرناتھ کی زندگی میں نہیں مل سکتا تھا۔ کیونکہ مہندر کے پاس ٹیلی ویژن پر خرچ کرنے والے روپے ہی نہیں تھے۔ آج ڈرکا کو تین چار سو روپے ماہوار کی مستقل آمدنی ہے۔ مہندر کی زندگی میں یہ آمدنی نہ تھی نہ ہو سکتی تھی۔ دوستوں کو غم غلط کرنے کے لئے شراب پینے کا بہانہ مل گیا۔ ریوتی۔ راہی معصوم رضا۔ نند رومانی۔ نیاز حیدر۔۔۔ سب کو مہندر کی زندگی پر تقریر کرنے کا موقع ——— اس چال کے دن پھر گئے جس میں مہندرناتھ زندہ تھے۔ اور بالکل شریف بھوتوں کی طرح اس چال سے پھر ان کی لاش نکلی میرے خیال میں شری ساؤنڈ کے پیچھے والی گلی نے اپنی زندگی میں اتنی کاریں اور اتنے پڑھے لکھے لوگ نہ دیکھے ہوں گے۔ فلمی اور غیر فلمی ادیب۔ ہندی۔ اردو۔ انگریزی اور مراٹھی کے صحافی۔ کئی بڑے ڈائریکٹر۔ کئی ہیرو۔ کئی بڑے رسالوں کے ایڈیٹر۔۔۔۔ بڑا ہنگامہ تھا۔ بڑی چہل پہل تھی۔ لوگ الگ ٹکڑیوں میں کھڑے تھے۔ بات ہر جگہ مہندر کی بے وقت موت سے شروع ہوتی اور پھیل جاتی فلمی اسکینڈلز۔ ریلیز ہونے والی فلمیں۔۔۔ سلیم جاوید اور کے۔ نارائن وغیرہ کی برائی۔ ڈرکا کی فکر۔ کرشن جی کی تنہائی کا خیال۔۔۔ ریوتی کہہ رہے تھے کہ وہ مہندر میموریل فنڈ کے لئے لاکھ دو لاکھ جمع کر سکتے ہیں۔ صابر دت اس مہندر نمبر کا ذکر کر رہے تھے جو مہندر کے اظہار تشکر پر انہوں نے ترتیب دینا شروع کر دیا تھا۔۔۔۔ عاقل ہزاروی اپنی بھاری آواز میں اپنے آپ کو مہندر کا پرسہ دے رہے تھے۔ ادریس دہلوی چپکے چپکے ایک گروہ سے دوسرے گروہ میں شامل ہو رہے تھے جیسے جل رہے ہوں سرگوشی کر رہے ہوں۔۔۔۔۔

اور مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ مرنا شاید جینے سے زیادہ دلچسپ اور کار آمد کام ہے کیونکہ شاید ہم سب کو مہندر کے مرنے کے بعد پتہ چلا کہ وہ کتنا بڑا آدمی تھا ۔۔۔۔ بس پانچ برس پہلے مر گئے ہوتے تو جوانا مرگ کا خطاب بھی مل گیا ہوتا ۔ موت زیادہ دھوم دھام کی بھی ہو گئی ہوتی کیونکہ تب انجمن ترقی پسند مصنفین کی پوری طاقت بھی بڑے اہتمام سے مہندر کا سوگ منا رہی ہوتی ۔ پر یہ مہندر ناتھ ایسے بارے میں سوچتے ہی نہیں تھے یعنی آدمی مرنے کے لئے صحیح زمانہ تک انتخاب نہ کر سکا ۔ مہندر میں دنیوی سمجھ داری تھی ہی نہیں ۔ سابق کلاس فیلو اور حال منسٹر آئی ۔ کے ۔ گجرال نے بانده ہیں دو بڈ روم ہال کا فلیٹ دینے کا وعدہ کیا تو یہ پاگل آدمی تن گیا کہ " میں تو نہیں بکتا ۔ چار سو فلیٹ دو ۔ میں یہ نہیں ۔ فلم رائٹرز ایسوسی ایشن ہوں !۔۔۔۔۔۔ " ٹھینگا ہیں آپ مہندر جی ۔ دو بڈ روم کا فلیٹ آپ سے بڑا تھا اور آپ کے مرنے کے بعد بھی آپ سے بڑا ہے ۔ درگا آج اس فلیٹ کو بیچتیں تو لکھ پتی ہو گئی ہوتیں ! پر مہندر کو تو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ لاکھ روپے ہوتا کیا ہے ۔ کیونکہ مہندر ناتھ پیدائشی پاگل تھے ان کے ناول 'رات اندھیری ہے' میں ایک کردار ہے حکیم ناشاد کا جو بڑے پر خلوص اور صاف گو آدمی تھے ۔ یہ خیال ہے ناول کے ہیرو جگدیش کا جو بی ۔ اے پاس ہے ۔ مہندر جی بھی بی اے پاس تھے ! پر مجھے جگدیش سے زیادہ حکیم ناشاد میں مہندر کی جھلک ملی ۔ حکیم ناشاد کی آواز بھی مہندر سے ملتی ہے ۔ سنئے !

" اس کمرے میں بھی لکھتا ہوں ۔ اس غربت کے باوجود کتابیں پڑھتا ہوں ۔۔۔۔۔ میں پاگل نہیں ۔۔۔۔ ہوش مند انسان ہوں کھرے کھوٹے میں تمیز کر سکتا ہوں ۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ میں کسی کی چاپلوسی نہیں کر سکتا ۔ کیا کروں یہ میری فطرت ہے "

(رات اندھیری ہے ص : ۹۱)

مہندر ناتھ کا المیہ یہی تھا کہ وہ پاگل نہیں ، ہوش مند تھے ، کھرے کھوٹے میں تمیز کر سکتے تھے ۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ کسی کی چاپلوسی نہیں کر سکتے تھے ۔ مہندر ناتھ یہی تو ٹھیک نہیں تھا ۔ کیونکہ یہی ان کی فطرت تھی ——— ارے یہی تو ٹھیک نہیں تھا ! :-

وہ چلائی ! جگدیش ۔ جگدیش ۔۔۔۔۔ اس کی آواز سارے محلہ میں پھیل گئی ایک آدمی دوسرے کمرے سے نکل آیا ۔

" کیا بات ہے میڈم "

" یہ جگدیش دروازہ نہیں کھولتا "

" دیکھتی نہیں ۔ دروازہ بند ہے ۔ تالا لگا ہوا ہے ۔ اندر کوئی نہیں ۔ صرف روشنی ہے "

(رات اندھیری ہے ۔ ص ۱۳۶)

اور باہر کیا ہے مہندر جی ۔ نہ دروازہ ہے ، نہ تالا ، نہ روشنی ، نہ جگدیش ۔۔۔۔۔۔ باہر تو صرف اندھیرا ہے اور پوچھ سے بھاگ مہندر ناتھ کے پاس آئی ہوئی کنواری آتما کا دم گھٹ رہا ہے ۔۔۔۔۔ کوئی اسے چوتھے مالے سے نیچے دھکیل دیتا ، وہ مر جاتی شاید مہندر جی جیتے ۔۔۔۔ پر مہندر اس قیمت پر جینا چاہتے ہی نہیں تھے ۔ اچھا ہوا مر گئے کیونکہ اس جہاں کے دیش میں جینا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔

مقالے

خیر البشرؐ کے حضور میں

ممتاز حسن

میرے نزدیک بہترین نعت وہ ہے جس کا تاثر ہمیں حضور رحمت اللعالمین کی ذاتِ گرامی سے قریب لائے جس میں حضورؐ کی مدح ہو یا حضورؐ سے خطاب کیا جائے۔ صحیح معنوں میں نعت وہ ہے جس میں حسن پیکر نبوت کے صوری محاسن سے لگاؤ کی بجائے مقصد نبوت سے دل بستگی پائی جائے، جس میں جناب رسالتمآب سے صرف رسمی عقیدت کا اظہار نہ ہو بلکہ حضورؐ کی شخصیت سے ایک قلبی تعلق موجود ہو۔ وہ مدح یا خطاب بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ اور وہ شعر نظم ہو یا غزل، قصیدہ ہو یا مثنوی، رباعی ہو یا مثلث، مخمس ہو یا مسدس اس سے نعت کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ البتہ نعتیہ کلام کی معنوی قدر و قیمت کا دار و مدار اس کے نفس مضمون پر ہے۔ اگر اس کا مقصد ذاتِ رسالت کی حقیقی عظمت کو واضح کرنا اور آقائے دوجہاں کی بعثت کی جو اہمیت نوعِ انسانی اور جملہ موجودات کے لیے ہے، اسے نمایاں کرنا ہو تو وہ صحیح طور پر نعت کہلانے کا مستحق ہے۔ بغیر رسالت سے قرب کا جذبہ یقیناً ایک نعتیہ پہلو رکھتا ہے۔ البتہ اگر شاعر کی توجہ صرف حضورؐ کے حسن و جمال ظاہری پر مرکوز ہے اور اس سے آگے نہ بڑھ سکے کہ حضورؐ کے قد کا سایہ نہ تھا، یا حضورؐ کے سر کے بال آخر وقت تک سیاہ تھے۔ تو اس شاعری میں وہ رنگ و بو نمایاں نہ ہوگا، جو حقیقی نعتیہ کلام کا ہے۔ کسی نے کہا ہے:

معراج کی رتیا دھوم مچی اک راج دلارا آوت ہے

یا ایک اور نعت ہے:

بے نقاب آج تو اے گیسوؤں والے آجا
کملی والے مجھے کملی میں چھپا لے آجا

اسی طرح کچھ اور گیت ہیں جو اس عاشقانہ اور جذباتی شاعری کی یاد دلاتے ہیں جو ہندوؤں کے ہاں عام ہے اور جس کا مرکز کرشن جی مہاراج کی ذاتِ والا صفات ہے۔ مثلاً:

مدینے میں مورا پیا بالا ہے رے

یا

مستی ہے یاد چشم رسول انامؐ کی

اس سے بھی آگے بڑھیے تو اس قسم کے شعر نظر آئیں گے:

اے دوستو فرقت میں مری مرتے ہو ناحق
اے چارہ گرو فکرِ دوا کرتے ہو ناحق

اچھا نہ کبھی ہوں گا میں بیمارِ نبیؐ ہوں

یہ اس ذاتِ گرامی کے متعلق کہا گیا ہے جو جسم و روح کی بالیدگی اور توانائی کا سرچشمہ ہے!

تقریباً یہی حال ہماری میلاد کی محفلوں کا ہے جہاں اکثر تاریخی واقعات اور حقائق کا تذکرہ کرنے کی بجائے ذکرِ رسولؐ ایک افسانوی اور جذباتی رنگ اختیار کر لیتا ہے اور سننے والے نوعِ بشر کے سب سے بڑے قائد کی زندگی اور پیغام سے بڑی حد تک ناآشنا رہتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تعلیماتِ رسالت سے قلبی تعلق پیدا ہونے کے بعد ذاتِ رسالت اور پیکرِ رسالت سے دلی تعلق، جذبات والہانہ شیفتگی پیدا ہونا لازم ہے اور اس مقام پر پہنچ کر ہر دل جو کچھ ہو سنے وہ سننے کے لائق ہے۔ جن لوگوں کے دل میں اسلامی تعلیمات پورے طور سے نہیں اتری ہیں مگر حضورؐ کا نام سنتے ہی بے قرار ہو جاتے ہیں ان کا درجہ بہت سے علما اور فقہا سے بلند ہے اور شمعِ رسالت کے ان پروانوں کا تو کیا کہنا جنہوں نے اپنی جانیں دے دیں مگر حضورؐ کی شان میں کوئی نازیبا کلمہ سننا گوارا نہ کیا۔

اردو نعت کا تفصیلی تذکرہ کرنے سے پہلے یہ مناسب ہو گا کہ ہم ایک ایسے پہلو پر غور کر لیں جس کی نزاکت اس کی اہمیت سے کم نہیں۔ یہ مسئلہ ذات و صفات کا ہے جو خدا اور رسولؐ دونوں میں مشترک ہے اگرچہ خدا معبود ہے اور رسول عبد مگر اپنے اپنے مقام پر دونوں وحدہٗ لاشریک ہیں۔ شرک، دونوں جگہ گناہ ہے۔ شرک فی اللہ بھی اور شرک فی الرسولؐ بھی۔

ذات اور صفات کا باہم گہرا تعلق ہے۔ صفات ذات کی مظہر ہیں۔ مگر اس کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں جس طرح کسی انسان کی عکسی تصویر اس کی شخصیت کا پتا تو دیتی ہے مگر اس پر حاوی نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح صفاتِ خداوندی ذات کی نشان دہی کرتی ہیں مگر ہمیں از خود عینِ ذات تک پہنچا نہیں سکتیں۔

اس میں شک نہیں کہ ذاتِ خداوندی کا جلوہ کائنات کے ہر مظہر میں جھلکتا ہے اور یہ سب مظاہر ایک حد تک رہنما ہیں لیکن یہ رہنمائی بھی اسی صورت میں ممکن ہے کہ ادراکِ صفات کو شعورِ ذات کا وسیلہ سمجھا جائے۔ اگر اس کی بجائے تماشائے صفات مقصود بالذات کی حیثیت اختیار کر لے تو یہی وسیلہ راستے کی رکاوٹ بن جائے گا۔ یہ زمین، یہ آسمان، یہ چاند، یہ ستارے، یہ کائنات کے دلکش اور نظر افروز منظر، یہ سب کے سب ذاتِ خداوندی کے پرتو ہیں۔ البتہ اگر انسان ان کی رنگا رنگی میں محو ہو جائے تو یہی پرتو اس کی آنکھ کا پردہ بن جائے گا۔ کسی نے کہا ہے:

آسمانِ یار را پنہاں ز چشم می کند
صد تفو بر ہستیِ دنیا و مافیہا تفو

یہی وجہ ہے کہ صفات کو ایک بتکدہ کہا گیا ہے جہاں جبینِ شوق صنم پرستی پہ مائل نظر آتی ہے۔ اقبال فرماتے ہیں:

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں

اس نکتے کی مزید وضاحت انھوں نے معراجِ نبوی ؐ کے سلسلے میں ایک اور شعر میں کی ہے:

مردِ مومن در نسازد با صفات
مصطفیٰ راضی نشد الّا بذات

لیکن یہ لازم نہیں آتا کہ انسان دنیا کے کام کاج میں ہاتھ ڈالنے کے بعد خدا سے غافل ہو جائے۔ ہمیں تو دنیا اور آخرت دونوں میں اپنے لیے بہتری چاہنا ہے۔ فی الدنیا حسنۃً وّ فی الآخرۃ حسنۃً۔ اکابر صوفیہ کا مقولہ "دست در کار و دل بایار" اسی مسلک کا اظہار ہے یعنی دنیا سے دلچسپی تو صحیح ہے مگر دل بالکل صحیح نہیں۔ اکبر الٰہ آبادی نے اسی طریق فکر و عمل کی تشریح کی ہے۔

دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

اگر ذاتِ خداوندی سے قرب حاصل کرنے کے لیے صفات کے نگار خانے سے گزرنا لازم ہے تو ذاتِ رسالت کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ صفاتِ رسالت ذاتِ رسالت کی پردہ پوشی کرنے کی بجائے حقیقتِ رسالت کو نمایاں کرتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو رسول کا ایک انسان کی حیثیت سے پیدا ہونا اور دوسرے انسانوں کے درمیان رہ کر ان کے ساتھ زندگی بسر کرنا بے معنی ہو جاتا۔

صفاتِ رسالت محض پیکرِ نبوی ؐ کے حسن و جمال کا نام نہیں ہے۔ یہ نام ہے اس خُلقِ عظیم کا جو ساری نوعِ انسانی کے لیے ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم مقصدِ بعثت سے اس وقت تک واقف نہیں ہو سکتے جب تک کہ ہم پہ حضور خیر البشر ؐ کی سیرت کے مختلف پہلو منکشف نہ ہوں۔ جنابِ رسالت مآب ؐ کی زندگی سارے انسانوں کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ ہے خواہ ہم انھیں ایک بچے کی حیثیت سے دیکھیں یا ایک جوان اور بوڑھے کی حیثیت سے۔ حضور ؐ ایک شہری، ایک فرمانروا، ایک خاوند، ایک باپ، ایک قائد، ایک مجاہد، ایک سپاہی، ایک سپہ سالار، ایک جج، ایک مقنن، ایک منتظم سبھی کچھ ہیں۔ ہم اس زندگی کے جس پہلو پہ نظر ڈالیں وہ اسی اسوۂ حسنہ کا مظہر ہے جس کا ذکر خود قرآن نے کیا ہے۔ اگر حضور ؐ کی زندگی چند مافوق الفطرت واقعات کا مجموعہ ہو کر رہ گئی ہوتی اور اس میں عام انسانوں کے رنج و راحت، مسرت و غم، مصیبت اور کامرانی یہ سب موجود نہ ہوتے تو ہم بحیثیت انسان اس زندگی سے کوئی سبق نہ سیکھ سکتے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضور ؐ کی زندگی میں انسانی رنج و غم اور کرب و الم کی ساری کیفیتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ذاتِ رسالت کے شعور کے لیے صفاتِ رسالت کا ادراک اور سیرتِ رسول ؐ کی پیروی ناگزیر ہے۔ اصل چیز بہرحال ذاتِ رسالت ہے۔ مگر ذات و صفات لازم و ملزوم ہیں۔ خلاصہ یہ کہ نعتِ رسول ؐ کی بنیاد یا تو عشقِ ذات

ہے، یا ادراکِ صفات - یا تو وہ ذاتِ رسالت سے ایک گہرے اور والہانہ جذبے کا اظہار ہے یا صفاتِ رسالت کی عکاسی۔ دونوں کا مقصد اور حاصل یہ ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے انسان کی شخصیت اور کردار ہمارے سامنے آئیں اور ایک مثالی حیثیت سے زندگی میں ہمارے لئے مشعلِ راہ کا کام دیں۔

جنابِ رسالت مآبؐ پر درود و سلام بھیجنا نہ صرف تسکینِ خاطر اور فلاحِ دارین کا باعث ہے بلکہ یہی ایک ایسا عمل ہے جس میں فرشتے اور خود ذاتِ خداوندی دونوں انسان کے ساتھ شامل ہوتے ہیں۔

خدا کے جتنے احسان اولادِ آدم پر ہیں ان میں سب سے بڑا احسان ظہورِ محمدیؐ ہے اور اولادِ آدم ہی پر کیا یہ احسان ساری کائنات پر ہے۔ لولاک لما خلقت الافلاک۔ محمدؐ بن عبداللہ محسنِ اعظم ہیں۔ یہ خود احسانِ اعظم بھی ہیں ذاتِ محمدیؐ کا ظہور کون و مکاں کی تخلیق کا نقطۂ عروج ہی نہیں بلکہ منتہائے مقصود بھی ہے۔ ذاتِ محمدیؐ الطافِ ایزدی کی سب سے بڑی نعمت ہے وہ بجائے خود ایک رحمت ہے، سب سے بڑی رحمت جس کے بغیر زندگی اور کائنات کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ غالبؔ نے کیا خوب کہا ہے۔

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود
رحمۃ للعالمینی ہم بود

آج ہم مسلمانوں کی سب سے بڑی بدبختی یہ ہے کہ ہم نے سیرتِ رسولؐ کو بالائے طاق رکھ دیا ہے اور ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اس مثالی سیرت کی رہنمائی سے محروم ہو گئے ہیں۔ غور فرمایئے کہ صداقت اور امانت وہ صفات ہیں جو رسالت مآبؐ میں بعثت سے قبل موجود تھیں اور جن کے دوست دشمن سب قائل تھے

کہا تیری ہر بات کا یاں یقیں ہے
کہ بچپن سے صادق ہے تو اور امیں ہے

آج ہمارے نام نہاد اسلامی معاشرے میں کتنے آدمی ایسے ملتے ہیں جنہیں صادق اور امین کہا جا سکتا ہے۔

کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ اس مملکت پاکستان میں، جسے اسلامی ہونے کا دعویٰ ہے جب آئینی قراردادِ مقاصد منظور کی گئی تو خدا اور قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کا نام تو دیا گیا مگر اس رسولؐ کا کہیں ذکر نہ آیا جس کے توسط سے ہم نے خدا کو پہچانا اور جس کی تعلیمات کا یہ کرشمہ ہے کہ ہم میں محمد علی جناحؒ جیسے حق پرست مجاہد پیدا ہوئے اور ہوتے رہیں گے۔

جہاں تک اردو نعت کا تعلق ہے اردو کے بعض اساتذہ کے نعتیہ کلام میں زیادہ تر استادانہ صنعت گری پائی جاتی ہے۔ مثلاً امیر مینائی نے جو غزل کے شاعر تھے اور اس حیثیت سے مشہور ہیں معراج پر جو کچھ کہا ہے اس میں زیادہ تر الفاظ پر زور ہے:

کس کے آنے کی فلک پر ہے خبر آج کی رات
آنکھ سورج سے ملاتا ہے قمر آج کی رات
کہکشاں کہتی ہے قسمت کا ستارہ چمکا

ہوگا اس زور سے حضرت کا کنہ یا کی رات

حوریں فردوس سے نکلی ہیں نچھاور کرتے

یہ ہے رسکھے طبق اس دو پہر آن کی رات

مگر میں ایسی نعتوں کی مثالیں زیادہ دینا نہیں چاہتا جو میرے خیال کے مطابق نعت کے معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ البتہ یہ ضرور چاہتا ہوں کہ اردو نعت کے چند ایسے نمونے آپ کی خدمت میں پیش کروں جو میرے نزدیک نعت کہلانے کے مستحق ہیں۔ میری رائے میں اردو میں کوئی نعت حالی کے مسدس کی برابر موجود نہیں ہے :-

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا

مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا

وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ

یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

ان چند شعروں میں کوئی تکلف کوئی مبالغہ کوئی طباعی کوئی صنعت گری نہیں۔ مگر جو تاثر ان میں موجود ہے اس کی نظیر اردو شاعری میں نہیں ملتی۔ حضور رسالت پناہؐ کا اپنا ارشاد ہے کہ اَلْخَلْقُ كُلُّهُمْ عِيَالُ اللّٰهِ وَاَحَبُّهُمْ اِلَى اللّٰهِ مَنْ اَنْفَعُهُمْ اِلَى الْخَلْقِ یعنی ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے اور خدا کو سب سے عزیز وہ انسان ہے جو خلق خدا کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچائے۔ حالی کے یہ شعر اسی حدیث اور صاحب حدیث کی تصویر ہیں۔ اور اس قدر پُر اثر ہیں کہ انسان کی ساری زندگی کا رُخ بدل سکتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جو خلوص اور سادگی حالی کے ان اشعار میں جھلکتی ہے وہ خود حالی کی روحانی پاکیزگی کی آئینہ دار ہے۔ حالی کی زندگی سراپا خلوص ہے۔ اور جب تک کسی انسان کی زندگی سراپا خلوص نہ ہو، حضور رسالت مآب سے کسی قسم کے قلبی تعلق کا پیدا ہونا ناممکن ہے۔ ان اشعار کو نعت کی حیثیت سے دیکھا جائے تو ان کی سب سے بڑی خوبی یہ نظر آئے گی کہ ہر شعر میں رسالت کا پرتو ہے۔ سرکار دو عالمؐ کو گیسوؤں والا اور کسی ایسے ہی پیارے نام سے خطاب کرکے جذبات عقیدت کی تسکین کی کوشش کرنا اور بات ہے اور حضورؐ کی بشر دوستی اور انسان نوازی کی طرف توجہ دلا کر دنیا کو مقصد نبوت سے آگاہ کرنا اور بات۔ یہی حالی کی عظمت ہے۔ ان میں عشق ذات اور شعور صفات دونوں بیک وقت موجود ہیں۔ حالی کی دوسری نعت جس کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں اُس میں سرورِ کونینؐ سے خطاب ہے۔ حالی سرکار دو جہاںؐ کے دربار میں اُمت کی فریاد لے کر پہنچتے ہیں :

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقت دعا ہے ۔۔۔ اُمت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے ۔۔۔ پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

شاید درد و غم کی یہ عرضداشت بہت طول پکڑ جاتی مگر ایک مقام پر پہنچ کر حالی اپنے آپ کو روک دیتے ہیں، کہ کہیں فریاد

تسکابت کی صورت اختیار نہ کرے :

ہاں حالیؔ گستاخ نہ بڑھ حدِ ادب سے
باتوں سے ٹپکتا ہے تری اب صاف گلا ہے
ہے تجھ کو خبر بھی کہ ہے کون مخاطب
یاں جنبشِ لب خارج از آہنگ خطا ہے

یہ عجز، یہ انکسار، یہ ادب، یہ سب محبت ہی کے کرشمے ہیں۔ میر کا کہنا سچ ہے کہ :

عشق بن یہ ادب نہیں آتا

حالیؔ کے بعد میرے ذہن میں جس شخص کا نام آتا ہے وہ ظفر علی خاں ہیں۔ ان کی طبیعت کا سا تنوع کہیں اور کم ملے گا۔ طنز و ظرافت ہجو و مذمت، قومی جذبہ، سیاسی نعرہ بازی، غرض شاعرانہ صناعی اور قادر الکلامی کا کون سا مظاہرہ ہے جو ان کے کلام بلاغت نظام میں نہ ملتا ہو۔ یہ ان کی سعادت ہے کہ وقتی اور ہنگامی نافیہ پیمائی کے ساتھ ساتھ انہوں نے نعت گوئی بھی ان کے لیے مقدر کی۔ وہ ایک آدھ نعت تو ایسی لکھ گئے ہیں جو اُردو کے کسی انتخاب سے الگ نہیں رکھی جا سکتی۔

وہ شمع اُجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اک روز جھمکنے والی تھی سب دنیا کے درباروں میں

یہ اور اس نعت کے دوسرے اشعار اُردو کے مشہور ترین نعتیہ اشعار میں سے ہیں۔ ان کی دوسری مشہور نعت وہ ہے جس کا مطلع ہے :

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمھیں تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمھیں تو ہو

یہ نعت جہاں اپنی معنویت کے اعتبار سے بلند ہے، وہاں اپنے والہانہ جذبۂ محبت کی وجہ سے نعتوں میں بے نظیر ہے۔ ہر شعر جوشِ عقیدت اور خلوصِ بیان کا بھرپور نمونہ ہے۔ پڑھیے اور بار بار پڑھیے۔

اکبر الہ آبادی کے کلام میں حکمت اور معرفت کے جو موتی ہیں وہ بیشتر طنز و ظرافت کی نذر ہو گئے ہیں، لیکن انھوں نے نعت میں جو کچھ کہا ہے وہ بھی قابلِ توجہ ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں :

دُرفشانی نے تری قطروں کو دریا کر دیا
دل کو روشن کر دیا، آنکھوں کو بینا کر دیا
خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کر دیا

اقبال کا شمار با قاعدہ نعت گویوں میں نہیں ہے۔ ان کی ابتدائی شاعری میں ایک آدھ روایتی نعت ملتی ہے جیسے انھوں

نے اپنے مجموعۂ کلام میں شامل نہیں کیا۔ جیسے :

نگاہِ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردہ میم کو اٹھا کر
وہ بزمِ یثرب میں آ کے بیٹھیں ہزار منہ کو چھپا چھپا کر

اس قسم کی نعت کو ن خدا ادب ہی سے متجاوز نہیں ہے ، دین کے دائرے سے بھی باہر ہے۔ کوئی اور شاعر تو صاف صاف کہہ گیا ہے :

ذکی کیونکر نہ ہر دم احمدِ بے میم کی رٹ ہو
کہ الفت میں لحاظِ کفر و ایمان ہو نہیں سکتا

اس قسم کے افکار و اقوال اکثر صوفیا اور ان کے معتقدین پر وارد ہوتے ہیں، اور ان کی صفائی یہ پیش کی جاتی ہے کہ یہ حالتِ سکر کے واردات ہیں۔ اور ہم بھی عقیدت کی وجہ سے انھیں قابلِ مواخذہ نہیں سمجھتے۔ یہاں صحو اور سکر سے بحث نہیں البتہ یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اول تو معتبر صوفیہ حالتِ سکر کی کہی ہوئی باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ دوسرے یہ کہ سکر اور جہاں کہیں بھی جائز سمجھا جائے دربارِ نبوی میں جائز نہیں ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے :

با خدا دیوانہ باش و با مصطفیٰ ہشیار باش

بارگاہِ رسالت مقامِ ادب ہے۔ یہاں کسی قسم کی گستاخی اور ریا کی خطا کاری ہے۔ یہاں جو باریاب ہو اسے احتیاط سے سنبھل کر بیٹھنا ہوگا۔

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ اینجا

خدا اور بندے کا فرق اسلام کے بنیادی تصورات میں سے ہے۔ رسول کی بشریت پر قرآن نے اور خود رسولؐ نے بار بار زور دیا ہے۔ قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ اور مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ اس پر شاہد ہیں۔ البتہ ہمارے نعت گو تصوف کی سکر انگیز روایتوں سے متاثر ہو کر اس بنیادی حقیقت کو پس پشت ڈال دیتے ہیں اور یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ خود حضور سرورِ انبیاؐ کی زندگی میں ایک لمحہ بھی سکر کا نہیں ہے۔ اقبالؔ کا مندرجہ بالا شعر بھی روایتی نعت کا نمونہ ہے اور ابتدائی کلام ہونے کی وجہ سے نظر انداز کر دینے کے لائق ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اسے اپنے مرتب کردہ مجموعے میں جگہ نہیں دی۔

اقبالؔ کی ابتدائی غزلوں میں کہیں کہیں نعتیہ اشعار ملتے ہیں :

سراپا حسن بن جاتا ہے جس کے حسن کا عاشق
بتا اے دل حسیں ایسا بھی ہے کوئی حسینوں میں

پھڑک اٹھا کوئی تیری ادائے مَا عَرَفْنَا پر
ترا رتبہ رہا بڑھ چڑھ کے سب ناز آفرینوں میں

ایک آدھ مقام کے علاوہ اقبال نے عام طور پر اردو میں براہِ راست نعت گوئی نہیں کی۔ جہاں حضورؐ کی محبت کا جذبہ اُمڈ آیا ہے، وہاں بھی حدِ ادب ملحوظ ہے۔ تعریف کی ہے تو مؤذنِ رسولؐ کی یا ... جنہیں حب ... کے شہد ... سے لہو کا آبگینہ ... یہ دونوں نظمیں عشقِ رسولؐ سے معمور ہیں۔ بلالؓ والی نظم کے دو شعر یہ ہیں۔

چمک اُٹھا جو ستارہ ترے مقدر کا
حبش سے تجھ کو اٹھا کر حجاز میں لایا
ہوئی اسی سے ترے غم کدے کی آبادی
تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی

بلالؓ پر اقبال کی ایک اور نظم بھی ہے جس سے پہلے اسکندر رومی اور اس کی فتح یابیوں کا ذکر ہے۔ اس کے بعد اسکندر کا مقابلہ بلالؓ سے کیا گیا ہے۔ دوسرا بند یہ ہے:

لیکن بلال وہ حبشی زادۂ حقیر
فطرت تھی جس کی نورِ نبوت سے مستنیر
جس کا امیں ازل سے ہوا سینۂ بلال
محکوم اس صدا کے ہیں شاہنشہ و فقیر
ہوتا ہے جس سے اسود و احمر میں اختلاط
کرتی ہے جو غریب کو ہم پہلوئے امیر
ہے تازہ آج تک وہ نوائے جگر گداز
صدیوں سے سن رہا ہے جسے گوشِ چرخِ پیر
اقبال کس کے عشق کا یہ فیضِ عام ہے
رومی فنا ہوا حبشی کو دوام ہے

یہاں دو شخصیتوں کا تقابل کیا گیا ہے۔ ایک تو وہ شخصیت ہے جس کا شمار دنیا کے سب سے بڑے فاتحین میں ہوتا ہے، جس کی شہرت کی بنیاد قوتِ اقتدار اور دوسرے انسانوں پر غلبہ حاصل کرنے کی خواہش پر ہے اور چونکہ یہ خواہش اور یہ غلبہ خود بے بنیاد ہے، اس لیے وہ شخصیت اور اس کی شہرت بھی بے بنیاد ہے۔ آج اسکندر رومی کو تاریخ کے اوراق میں تو دیکھا جاسکتا ہے، مگر عام انسانوں کے دلوں سے اس کی یاد اٹھ گئی ہے۔ آج نہ اس کی سلطنت باقی ہے نہ قصہ عظمت۔ اس کے برعکس اس دوسری شخصیت کو دیکھیے۔ ایک ادنیٰ انسان جو دنیا کے سب سے بڑے انسان کی صحبت سے فیض یاب ہو کر فضا میں ایک ایسی صدا بلند کرتا ہے جو آج بھی ہمیں برابر سنائی دیتی ہے۔ اذان اور اس کا پہلا مؤذن دونوں زندہ جاوید ہیں اور وہ اس لیے کہ اس صدا کا مقصد انسانوں کو فاتح اور مفتوح یا کالے اور گورے میں تقسیم کرنا نہیں ہے، بلکہ بڑے اور چھوٹے، امیر اور غریب، محتاج اور غنی، بندہ

اور آقا کی تمیز کو دُور کرنا، سب کو ایک دوسرے سے ملانا اور ایک ہی صف میں لا کھڑا کرنا ہے۔ اور ان کو یہ یاد دلاتا ہے کہ وہ کچھ بھی کیوں نہ سمجھیں، انسانوں کی حیثیت سے سب برابر ہیں اور وہ خدا جس کے وہ سب بندے ہیں، ان سب سے بڑا ہے اور اس سے بڑا کوئی نہیں۔

"طرابلس" والی نظم ایک خاص جذبۂ عقیدت سے معمور ہے۔ آخری بند ہے:

حضور دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
بہ باغِ دہر میں ہیں یوں تو رنگ رنگ کے پھول
وفا کی جس میں ہو بُو وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

ایک ابتدائی نظم میں ہندوستان کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

"ترانۂ ملی" میں ملتِ اسلامیہ کا سرچشمۂ الہام وہی ایک ذاتِ رسالت ہے جو تسکین اور توانائی دونوں کی ضامن ہے:

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا — اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

یہی جذبہ آپ "شفاخانۂ حجاز" میں بھی پائیں گے:

اوروں کو دیں حضور یہ پیغامِ زندگی
میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں

حضورؐ کی ذات سے اقبال کو جو لگاؤ ہے وہ اتنا گہرا اور مستقل ہے کہ ان کا فکر و خیال اکثر بے ساختہ نعت کی طرف کھنچا چلا آتا ہے۔ مثلاً اُن کا یہ شعر جو ایک مشہور غزل کا مقطع ہے۔

ہوا ہو ایسی کہ ہندوستاں سے اے اقبال
اُڑا کے مجھ کو غبارِ رہِ حجاز کرے

اقبال نے خدا سے مسلمانوں کی بدحالی کا شکوہ کیا اور اس شکوے کا جواب بھی سنا۔ "جوابِ شکوہ" کیا ہے، سارا جواب تو ایک ہی شعر میں موجود ہے، اور وہ اس نظم کا آخری شعر ہے:

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

یہی کیفیت "صدیقؓ" والی نظم کی ہے جس میں ابوبکر صدیقؓ کا حضورِ رسالت مآبؐ کی خدمت میں اپنا سارا اثاثہ دین کے لیے قربان کر دینے کا ذکر ہے۔

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس　　صدیقؓ کے لیے ہے خدا کا رسول بس

"جنگِ یرموک کا ایک واقعہ" میں بھی جذبہ جھلکتا ہے :

اک نوجوان صورتِ سیماب مضطرب

آ کر ہوا امیرِ عساکر سے ہم کلام

اے بوعبیدہؓ رخصتِ پیکار دے مجھے

لبریز ہو گیا مرے صبر و سکوں کا جام

جاتا ہوں میں حضورِ رسالت مآبؐ میں

لے جاؤں گا خوشی سے اگر ہو کوئی پیام

یہ جذبۂ سرفروشی، یہ شہادت کی تمنا، ذاتِ رسالت سے یہ والہانہ عقیدت نعت کی انتہا ہے۔ مگر یہاں بھی نعت براہِ راست نہیں کہی گئی ہے یعنی شاعر نے براہِ راست حضورِ رسالت مآبؐ سے خطاب نہیں کیا۔ بالِ جبریل کی ایک غزل کا شعر ہے :

خبر ملی ہے یہ معراجِ مصطفیٰؐ سے مجھے

کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

اس طرح کی بالواسطہ نعت ایک فنی نزاکت اور شاعرانہ بلاغت کی حامل ہے، جو براہِ راست مدحِ رسولؐ میں مشکل سے ملتی ہے۔ براہِ راست اور بلاواسطہ نعتیہ خطاب ہر شاعر کے بس کی بات بھی نہیں۔ یہ کام حالیؔ، اقبالؔ، سعدیؔ اور جامیؔ جیسے شاعر ہی کر سکتے ہیں۔ اقبالؔ نے بلالؓ کے واسطے سے بھی رسولؐ کو دیکھا ہے۔ اور خود بھی حضورِ رسالت مآبؐ میں باریابی کی سعادت حاصل کی ہے۔ "بالِ جبریل" ہی میں دو ایک مقام ایسے ہیں جہاں شاعر خود دربارِ رسالت میں حاضر ہے، اور دل کے جذبے کو الفاظ کا جامہ پہنا کر خیر البشرؐ کے حضور میں زبان کھول رہا ہے۔

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب

گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ

ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب

اور حکیم سنائی کے مزار کی زیارت کے بعد انھوں نے جو نظم کہی ہے، اس کے چند شعر تو ایسے ہیں کہ جنھیں نعت کی معراج کہنا چاہیے :

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے ۔ غبار راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا
نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر ۔ وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

اس کے بعد وہ منزل ہے جہاں اقبال مسلمانوں کے تشتت و افتراق اور ان کی زبوں حالی سے افسردہ خاطر ہوکر نہایت رسالت سے توجہ اور امداد کے ملتجی ہیں۔ یہاں ان کی التجا فریاد کی صورت اختیار کرلیتی ہے اور یہ شاید وہ مقام ہے جہاں وہ آقائے دوجہاں کی ذات گرامی سے بہت زیادہ قریب ہیں۔

شیرازہ ہوا امت مرحوم کا ابتر
اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

اس راز کو کر فاش اب اے روح محمدؐ
آیات الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

واقعہ یہ ہے کہ مسلمان پر جب مصیبت آتی ہے تو وہ خدا سے امداد کا طالب ہوتا ہے مگر سہارا رسولؐ کا لیتا ہے۔ آغا حشر کاشمیری کسی وقت بھی اولیا اللہ کے زمرے میں شمار کیے جانے کے قابل نہیں سمجھے گئے۔ ساری عمر ڈرامے لکھے۔ شعر کہے اور زندگی کی رنگینیوں سے وابستہ رہے۔ مگر جب قوم کی زبوں حالی نے انھیں بے قرار کیا اور دکھے ہوئے دل کی پکار نے "شکریہ یورپ" کی صورت اختیار کی تو انھوں نے خدا کو رسولؐ ہی کا واسطہ دیا۔

خوار ہیں بدکار ہیں ڈوبے ہوئے ذلت میں ہیں
کچھ بھی ہیں لیکن ترے محبوبؐ کی امت میں ہیں

نعت گویوں کا کوئی تذکرہ کرامت علی شہیدی رحمۃ اللہ علیہ کے ذکرِ خیر کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ وہ حج کو گئے اور بعد ادائے حج مدینہ منورہ کو روانہ ہوئے اثنائے راہ میں بیمار ہوئے لیکن بیماری کی حالت میں بھی مدینے تک پہنچ گئے۔ وہاں روضۂ مبارک کو دیکھتے ہی اس عاشقِ رسولؐ نے فرطِ اشتیاق سے جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ پروانہ اپنی ہی آگ میں جل بجھا۔ ان کا ایک شعر ہے :۔

تمنا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائرِ روحِ مقید کا

یہ شعر خدا جانے کس وقت کہا تھا کہ پیش گوئی کی طرح پورا ہوا۔ اقبال نے حجاز میں موت مانگی تھی، شہیدی کو خاص مدینے میں ملی۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدای بخشندہ

ہمارے زمانے میں محمد علی جوہر مرحوم عشاقِ رسول میں سے ہو گزرے ہیں۔ ان کی زندگی اخلاص اور ایثار سے پُر تھی۔ ان کا ایک نعتیہ شعر تبرک کے طور پر ہدیۂ قارئین ہے:

جب اپنی پوری جوانی پہ آگئی دنیا
تو زندگی کے لیے آخری پیام آیا

حسرت موہانی اپنی مستقل مزاجی اور عشقِ رسول میں محمد علی سے بھی آگے ہیں۔

حسرت مجھے اس جانِ جہاں سے ہے تعلق
سمجھے کہ نہ سمجھے کوئی جانے کہ نہ جانے

پاکستان کے قومی ترانے کے شاعر نے ولادت رسول پر جو چند شعر کہے ہیں وہ بھی عقیدت کا ایک نادر نمونہ ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان اشعار کا حفیظ کی شاعری اور اُردو کے نعتیہ کلام میں ایک خاص مقام ہے۔

سلام اے آمنہ کے لال اے محبوبِ سبحانی
سلام اے فخرِ موجودات فخرِ نوعِ انسانی
سلام اے ظلِّ رحمانی سلام اے نورِ یزدانی
ترا نقشِ قدم ہے زندگی کی لوحِ پیشانی

نعت مشہور نعت گویوں کے کلام میں کم ملتی ہے اور غیر نعت گو شعرا کے ہاں مقابلتہً زیادہ۔ غالب کے تین شعر جنھیں لوگ اکثر غزل کے شعر خیال کرتے ہیں، غور سے دیکھیے تو نعت کے سوا کچھ نہیں ہیں اور نعت بھی کس پائے کی!

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے
لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں
رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ
رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں
کرتے ہو مجھ کو منعِ قدم بوس کس لیے؟
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

پہلے شعر میں "الفقر فخری" کی طرف اشارہ ہے اور دوسرے دو شعروں میں معراج کی طرف۔

محسن کاکوروی عمر بھر دامنِ رسولؐ سے وابستہ رہے۔ ان کا کلام تقریباً تمام تر نعت ہی پر مشتمل ہے لیکن جو نعتیں انھوں نے رسمی اہتمام اور روایتی شان و شکوہ سے کہی ہیں ان کا وہ رتبہ نہیں، جو ان کے بے ساختہ کلام کا ہے۔ "سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل" والا قصیدہ بڑے مرتبے کی چیز ہے اور اس کا حسنِ مطلع بہت مشہور ہے۔

سب سے اعلیٰ تری سرکار ہے سب سے افضل
میرے ایمانِ مفصل کا یہی ہے مجمل

مگر محسن کے اس قصیدے اور ان کی بہت سی دوسری نعتوں سے زیادہ مؤثر ان کی وہ نظم ہے جو انھوں نے ایک لمبی اور خطرناک بیماری سے شفا پانے کے بعد فی البدیہہ کہی اور جو نظرِ ثانی سے بھی محروم رہی۔ ابتدا کے چند شعر سنیے :-

یہ بیٹھے بٹھائے مجھے کیا ہوا — تڑپنے لگا دل اچھلنے لگا

زمیں پر بہت آنسو آنے لگے — فلک تک مرے نالے جانے لگے

محسن اپنے منظرِ موت کا ایک خیالی نقشہ کھینچتے ہیں :-

چلی آتی ہیں ہچکیاں دم بدم

مجھے یاد کرتے ہیں اہلِ عدم

اس کے بعد انھوں نے چار پانچ شعر ایسے کہے ہیں جو ان کے سارے نعتیہ کلام کا حاصل ہیں :

خطا ہو کے محسن نہ پھیریں مجھے — فرشتوں سے کہہ دو نہ گھیریں مجھے

نہ میں نے کیا کچھ نہ جانا کبھی — بجز سجدۂ آستانِ نبی

جس بے تکلفی، جس عقیدت، جس اعتماد سے محسن کاکوروی نے یہ شعر کہے ہیں وہ ان کی نعت کے لیے خاص ہیں۔

سید انشا ایک بحرِ مواج تھے۔ جدھر جی چاہا چل دیے۔ غزل، ہزل، مدح، ہجو سبھی کچھ کہا۔ مگر ایک آدھ نعت بھی ایسی کہہ گئے ہیں جو ان سے یادگار ہے۔ دیکھیے کیا پاکیزہ کلام ہے۔

آپ خدا نے جب کہا صلِ علیٰ محمد — کیوں نہ کہیں پھر انبیا صلِ علیٰ محمد

عرش سے آتی ہے صدا صلِ علیٰ محمد — نورِ جمالِ مصطفےٰ صلِ علیٰ محمد

صلِ علیٰ نبینا صلِ علیٰ محمد

چودھری دلو رام کوثری کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ آخر عمر میں کوثر علی کوثری ہو گئے تھے۔ مگر ہندو رہے جب بھی اور مسلمان ہوئے جب بھی، ان کی ساری عمر مدحِ رسول میں گزری۔ اپنے آپ کو فخریہ حسانِ ثانی کہتے تھے۔ ایک نعت کے چند شعر ہیں :

مجھے نعت نے شادمانی میں رکھا

کہ مدحت نے شیریں زبانی میں رکھا

میں لکھتا رہا نعت اور حق نے [illegible]

قمر کو مری [illegible] میں رکھا

کوثری اپنی نعت گوئی پر نازاں ہیں۔ دیکھیے انھوں نے اپنا مقابلہ حسان بن ثابت سے کس طرح کیا ہے :

نبی کے ہوئے نعت گو دو برابر — کہ [illegible] خوانی میں رکھا

ہے حسان پہلا تو میں دوسرا ہوں! — نہیں ذی اوّل میں ثانی میں رکھا

ہندو شعرا اور بھی بہت سے ایسے ہیں جن کے ہاں نعتیہ کلام موجود ہے اور بلند پایہ ہے اور اس لحاظ سے قابلِ داد ہے کہ انھوں نے اختلافِ مذہب کے باوجود جنابِ رسالت مآب کے مرتبے کو جانا اور پہچانا۔

ہمارے زمانے میں تلوک چند محروم، جگن ناتھ آزاد، بال مکند عرش ملسیانی اور دوسرے ہندو شعرا نے نعتیں کہی ہیں مگر ان میں سب سے اونچا مقام پنڈت ہری چند اختر مرحوم و مغفور کا ہے۔ ان کی وہ نعت بڑی مشہور ہے جس کا مطلع ہے:

کس نے ذرّوں کو اُٹھایا اور صحرا کر دیا
کس نے قطروں کو ملایا اور دریا کر دیا

اور اس کا آخری شعر تو نعت میں اپنا ثانی نہیں رکھتا:

آدمیت کا غرض ساماں مہیّا کر دیا
اک عرب نے آدمی کا بول بالا کر دیا

اس میں کسے شک ہو سکتا ہے کہ حضورؐ کی بعثت کا مقصد خود انسانیت کے معیار کو بلند کرنا تھا۔ مگر اس غیر مسلم کی سعادت کا کیا کہنا جس کی بصیرت نے ہم مسلمانوں سے بڑھ کر حضورؐ کی سیرت کے اس پہلو کو دیکھا، سمجھا اور سمجھایا۔

ہماری نئی نسل کے شعرا کا کلام بھی نعت کی دولت سے خالی نہیں ہے اور یہ ہمارے اور اُن کے لیے باعثِ سعادت ہے۔ اُن کی نعتوں میں رسم و روایت کی وضعداری کی بجائے ایک دلی خلوص نظر آتا ہے، اور یہ اردو زبان کے لیے ایک درخشاں مستقبل کا پیش خیمہ ہے۔

اب تک میں نے اُردو نعت کا ذکر کیا ہے لیکن اُردو کے شاعروں کی نعت گوئی کے مقام کا اندازہ کرنے کے لیے بہتر ہوگا کہ فارسی اور عربی کی نعت پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔ یہ اس لیے بھی مفید ہے کہ اُردو نعت پر عربی اور فارسی دونوں کا اثر ہے۔ عربی کا کم اور فارسی کا زیادہ۔ فارسی شاعری میں سعدی، خسرو، جامی اور اقبال کا درجہ سب سے اُونچا ہے۔ سعدی کہتے ہیں:

حسن یوسف دمِ عیسیٰ ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اور دیکھیے:

کریم السجایا جمیل الشیم — نبی البرایا شفیع الامم
امام رسل پیشوای سبیل — امین خدا مہبط جبرئیل
شفیع الوریٰ خواجہ بعث و نشر — امام الہدیٰ صدر دیوان حشر
یتیمی کہ ناکردہ قرآں درست — کتبخانۂ چند ملت بشست
تو اصلِ وجود آمدی از نخست — دگر ہر چہ موجود از فرع تست

ان کے نزدیک حق و باطل کی تمیز کا معیار محض رسول کی تعلیم اور اسوۂ رسول کی پیروی ہے:

محال است سعدی کہ راہِ صفا   تواں رفت جز در پی مصطفیٰ
خلاف پیمبر کسی رہ گزید   کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

یہی بات ہمارے زمانے میں اقبال نے کہی:

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

سعدی کے ہاں شاید فارسی سے بھی بڑھ کر ان کے عربی اشعار کا درجہ ہے اور ان کے یہ شعر تو زندۂ جاوید ہیں۔

بلغ العلیٰ بکمالہ   کشف الدجیٰ بجمالہ
حسنت جمیع خصالہ   صلوا علیہ و آلہ

جتنی شہرت ان شعروں کو ہوئی ہے وہ شاید کسی بھی زبان میں نعت کے کسی اور شعر کو نہیں ہوئی۔ خسرو سراپا سوز ہیں اور جس انداز سے حضور کا تذکرہ ان کی زبان پر آتا ہے وہ ان کی سوختہ جانی کا آئینہ دار ہے:

نمی دانم چہ منزل بود شب جای کہ من بودم
بہ ہر سو رقصِ بسمل بود شب جای کہ من بودم
خدا خود میرِ مجلس بود اندر لامکاں خسرو
محمدؐ شمعِ محفل بود شب جای کہ من بودم

ان کی ایک مشہور غزل بھی اصل میں نعت ہے اور کس درجے کی نعت:

اے چہرۂ زیبای تو رشکِ بتانِ آزری
ہر چند وصفت می کنم در حسن ازاں بالاتری
من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری
آفاقہا گردیدہ ام مہرِ بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزی دیگری
خسرو غریب است و گدا افتادہ در شہرِ شما
باشد کہ از بہرِ خدا سوی غریباں بنگری

رہے اقبال تو انھوں نے براہِ راست نعت اردو سے زیادہ فارسی میں کہی ہے۔ "رموزِ بیخودی" کے آخر میں "عرضِ مصنف بحضور رحمۃ للعالمین" کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے وہ جوشِ عقیدت کا مرقع ہے۔

اے ظہور تو شباب زندگی — جلوہ ات تعبیر خواب زندگی
اے زمین از بارگاہت ارجمند — آسمان از بوسۂ بامت بلند
شش جہت روشن ز تاب روی تو — ترک و تاجیک و عرب ہندوی تو

محمد عربی کی شخصیت اور ان کے پیغام کی آفاقی اہمیت کو اقبال کے سوا اور کون ایسے مختصر اور سیدھے سادے لفظوں میں بیان کر سکتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ جس کا حق تھا اسی کو ملا۔

اقبال کے فارسی کلام میں جا بجا جو اشارے ملتے ہیں وہ ایک مستقل نعت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً مصطفیٰ کمال پاشا کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

امتی بود کہ ما از اثر حکمت او
واقف از سر نہانخانۂ تقدیر شدیم

وہ پہلی جنگ عظیم کے بعد حجازی عربوں کی دنیائے اسلام کے غدر سے وفائی کا گلہ کرنا چاہتے ہیں، مگر اپنے آپ کو روک دیتے ہیں اور کیوں؟

متاع قافلۂ ما حجازیاں بردند
ولی زباں نکشائی کہ یار ما عربی است

ایک اور شعر میں یہی دل کی بات اور انداز سے کہی ہے:

در قبای عربی خوشترک آئی بنگاہ
راست بر قامت تو پیرہنی نیست کہ نیست

اقبال جہاں ذات خداوندی سے مخاطب ہیں وہاں بھی ان کے لیے نعت کا کوئی نہ کوئی پہلو نکل آتا ہے:

تو بر نخل کلیمی بی محابا شعلہ می ریزی — تو بر شمع یتیمی صورت پروانہ می آئی

عبد اور معبود کے فاصلے کے باوجود خدا اور رسول اقبال کے لیے ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں:

با خدا پوشیدہ گویم با تو گویم آشکار
یا رسول اللہ او پنہان و تو پیدای من

"اسرار خودی" میں جہاں ارتقائے خودی کا بیان ہے وہاں اس ارتقا کی منزل بھی صاف دکھائی دیتی ہے۔

شعلہ ہای او صد ابراہیم سوخت
تا چراغ یک محمدؐ بر فروخت

مسلمان کا جو تعلق رسولؐ کی ذات سے ہے اسے اقبال ہی بیان کر سکتے تھے:

در دل مومن مقام مصطفیٰ است — آبروی ما ز نام مصطفیٰ است

اور اگر کہیں یہ خیال آتا ہے کہ اپنے اعمال کی وجہ سے قیامت کے دن رسولؐ کے سایے میں پناہ نہ ملی تو کیا ہوگا۔

مست مئی گردیدت مولای ما

وای ما اے وای ما اے وای ما

جاوید نامے میں اقبال نے جنت کی بزم سجائی ہے اور جنتیوں کو جمع کر دیا ہے۔ اس محفل میں بہت کچھ ہے اور جو کچھ ہے بہت خوب ہے میں صرف تین اشعار پر اکتفا کروں گا۔

غالب کی زبان سے اقبال نے کہلایا ہے:

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست

رحمت للعالمینی انتہاست

یہ غالب کے اسی شعر کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود	رحمۃ للعالمینی ہم بود

پھر وہ حلاج کی زبان سے کہلاتے ہیں:

ہر کجا بینی جہان رنگ و بو	آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نور مصطفیٰ او را بہاست	یا ہنوز اندر تلاش مصطفیٰ است

ان چند شعروں میں حقیقت او معرفت عشق رسالت اور عرفان محمدؐ سورج کی طرح تاباں اور درخشاں ہے۔ اقبال کے لیے تخلیق کائنات کی ساری غرض و غایت ذات مصطفویؐ ہے۔ او سارا عالم امکان اسی ایک محور کے گرد گھوم رہا ہے۔

اقبال نے نعت میں بہت کچھ کہا ہے، اور اپنی انفرادیت کی شان پورے طور سے برقرار رکھتے ہوئے کہا ہے لیکن ذیل کے اشعار میں پوری سیرت النبیؐ بیان کر دی ہے:

طور موجی از غبار خانہ اش	کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش
بوریا ممنون خواب راحتش	تاج کسریٰ زیر پای امتش
در شبستان حرا خلوت گزید	قوم و آئین و حکومت آفرید
ماند شبہا چشم او محروم نوم	تا بہ تخت خسروی خوابیدہ قوم
وقت ہیجا تیغ او آہن گداز	دیدہ او اشکبار اندر نماز
در دعای نصرت آمین تیغ او	قاطع نسل سلاطین تیغ او
از کلید دین در دنیا کشاد	ہمچو او بطن ام گیتی نزاد

در نگاہ او یکی بالا و پست

با غلام خویش بر یک خوان نشست

اس سے بڑھ کر "ارمغان حجاز" کی رباعیوں پر نظر ڈالیے تو وہاں سوز عشق کی کچھ اور ہی کیفیت ہے۔ یہ کائنات دو عالم کے خوف سے اقبال خدا سے درخواست کرتے ہیں کہ ان کے اعمال کا سرکار کو علم نہ ہو۔

به پایان چون رسد این عالم پیر
شود بی پرده هر پوشیده تقدیر
مکن رسوا حضور خواجه ما را
حساب من ز چشم او نهان گیر

ان کی وہ رباعی بھی دیکھیے جہاں وہ عالم تخیل میں حج کو گئے ہیں اور تھکے ہوئے ہیں پاس ادب ملحوظ رکھتے ہیں:

تنم وا ماند و جانم در تگ و پوست
سوی شهری که بطحا در ره اوست
تو باش این جا و با خاصان بیامیز
که من دارم هوای منزل دوست

فارسی میں غالباً اقبال کی بہترین نعت "جوئے آب" ہے جو جرمن شاعر گوئٹے کی مشہور نظم "نغمہ محمد" کا آزاد ترجمہ ہے۔ گوئٹے اسلام، قرآن اور جناب رسالتمآب کی ذات سے گہرے طور پر متاثر ہے۔ "نغمہ محمد" ایک غیر مسلم کی تصنیف ہونے کے باوجود دنیا کی بہترین نعتوں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔ اقبال کا فارسی ترجمہ اقبال اور گوئٹے دونوں کی روحانی بصیرت اور شاعرانہ عظمت کا آئینہ دار ہے۔

در راه او بهار پری خانه آفرید — نرگس دمید لاله دمید و سمن دمید
گل عشوه داد و گفت یکی پیش ما بایست — خندید غنچه و سر دامان او کشید
ناآشنای جلوه فروشان سبز پوش — صحرا برید و سینه کوه و کمر درید

زی بحر بیکرانه چه مستانه می رود
در خود یگانه از همه بیگانه می رود

صد جوی دشت و مرغ و کهستان و باغ و راغ — گفتند ای بسیط زمین با تو سازگار
ما را که راه از تنک آبی نبرده ایم — از دستبرد ریگ بیابان نگاه دار
وا کرده سینه را به هواهای شرق و غرب — در بر گرفته همسفران زبون و زار

زی بحر بیکرانه چه مستانه می رود
با صد هزار گوهر یک دانه می رود

دریای پر خروش ز بند و شکن گذشت — از تنگنای وادی و کوه و دمن گذشت

یکساں ہو سیل کردہ نشیب و فراز را　　　از کاخ شاہ و بارہ و کشت و چمن گزشت
بیتاب و تیز و تند و جگر سوز و بیقرار　　　در ہر زماں بتازہ رسید از کہن گزشت
زی بحر بیکرانہ چہ مستانہ می رود
در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

جس فصاحت اور خوب صورتی سے یہ نظم جناب رسالت مآب کی سیرت کی یکسوئی، انسانیت نوازی اور ایک مسلسل اور مستقل تخلیقی جدوجہد کی عکاسی کرتی ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ آخری بند کا تیسرا شعر خود حضور کے اس قول کا آئینہ ہے کہ من استوی یوماہ فھو مغبون۔ جس شخص کے دو دن ایک ہی جیسے گزر جائیں وہ بڑے گھاٹے میں ہے۔

فارسی کے سارے نعت گو شعرا کا تذکرہ کرنا میرے محدود علم اور وقت سے باہر ہے۔ مگر ایک آدھ اور شعر کے ذکر کے بغیر تسلی نہیں ہوتی۔ حافظ نے کوئی مستقل نعت نہیں کہی، مگر غالب کی طرح غزل میں چلتے چلتے ایک آدھ نعتیہ شعر کہہ جاتے ہیں جو بڑے بڑے نعت گویوں کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں:

نگار من کہ بہ مکتب نرفت و خط ننوشت　　　بغمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد

یا

اگرچہ عرض ہنر پیش یار بی ادبیست　　　زباں خموش و لیکن دہاں پر از عربیست

جامی کا پایہ نعت میں بلند ہے۔ نمونے کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

نسیم الصبح زُرمنی ربی نجد و قبلها　　　کہ بوی دوست می آید ازاں پاکیزہ منزلہا

اور یہ شعر بھی غالباً انہی کا ہے:

لا یمکن الثناء کما کان حقہ　　　بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

جامی کے دو اور شعر سنیے:

خوشا مسجد و مدرسہ و خانقاہی　　　کہ در وی بود قیل و قال محمد
بہ صدق و صفا گشتہ بیچارہ جامی　　　غلام غلامان آل محمد

جامی کی فریاد بھی سننے کے قابل ہے۔ اور آج بھی حسب حال ہے:

اے بہ سراپردۂ یثرب بہ خواب　　　خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب
دیدۂ عالم بہ تو روشن شود　　　گلخن گیتی بہ تو گلشن شود

اور یہ فریاد کرنے والا شاعر اپنے رسول سے کیسے دل میں کھب جانے والے انداز میں خطاب کرتا ہے:

بندۂ تو ہم عجم و ہم عرب　　　اے عربی نسب و امی لقب
گرد درت ابطحی و یثربی　　　خاک درت مشرقی و مغربی

فیضی کے افکار اور کردار کے بارے میں لوگوں کی جو رائے بھی ہو، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کا دل حبِ رسولؐ سے معمور تھا۔ اس نے جو نعتیہ اشعار کہے ہیں وہ محض الفاظ کی صنعت گری نہیں، واردات قلبی ہیں۔

فیضی کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

اُمّی و دقیقہ دانِ عالم ‎ ‎ بی سایہ و سایہ بانِ عالم

اور ذیل کے اشعار تو تاریخِ نعت کا قابلِ فخر حصہ ہیں:

ما طائرِ قدسیم نوا را نہ شناسیم ‎ ‎ مرغِ ملکوتیم ہوا را نہ شناسیم
بربانِ شہ و تیم زبانی نشاید ‎ ‎ از ما نغم آموز کہ لا را نہ شناسیم
با اہلِ جدل نکتۂ توحید نگوئیم ‎ ‎ در وحدتِ حق چون و چرا را نہ شناسیم
در کشفِ حقائق سبق آموز ضمیریم ‎ ‎ ترتیبِ دلیلِ حکما را نہ شناسیم

اصحابِ یقینیم گمان ما نہ پسندیم
اربابِ صوابیم خطا را نہ شناسیم

اور آخر میں یہ کہ:

بر دانشِ ما انجم و افلاک بخندند
گر صاحبِ لولاک لما را نہ شناسیم

غالب کے ہاں فارسی میں بھی نعتیہ کلام موجود ہے۔ ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

ہر کس قسم بہ آنچہ عزیز است می خورد ‎ ‎ سوگندِ کردگار بجانِ محمدؐ است
تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است ‎ ‎ اما کشادِ آن ز کمانِ محمدؐ است

اور مقطع کیا غضب کہا ہے:

غالب ثنائی خواجہ بہ یزداں گذاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

گرامی، فارسی زبان کے مایۂ فخر شاعر تھے۔ متاخرین میں اقبال کے علاوہ ان سے بڑا کوئی شاعر برصغیر میں نہیں پیدا ہوا۔ ان کے دو شعر ہیں:

خاور دمد از شبم بہ این تیرہ شبی ‎ ‎ کوثر چکد از لبم بہ این تشنہ لبی
اے دستِ ادب کہ در حریمِ دلِ ماست ‎ ‎ شاہنشہِ کونین رسولِ عربی

اور قدسی کی نعتیہ غزل کس کو یاد نہ ہوگی جس کا مطلع ہے۔

مرحبا سیدِ مکی مدنی العربی ‎ ‎ دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

کسی اور کا شعر ہے۔ یاد نہیں کس کا۔

موسیٰ ز ہوش رفت بیک جلوۂ صفات
تو عینِ ذات می نگری در تبسمی

ایک اور شاعر نے دیکھیے کیا نکیلا شعر کہا ہے :

دل از عشق محمدؐ ریش دارم
رقابت با خدای خویش دارم

فارسی کے نعتیہ اشعار کا تذکرہ ایسا ہے کہ شروع ہو جائے تو ختم ہونے میں نہیں آتا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اُردو کی وہ نعتیں جن میں سے بعض کا تذکرہ میں نے کیا ہے اور جنھیں میں اُردو کی بہترین نعتیں سمجھتا ہوں ایک مجموعے کی صورت میں خوشنما انداز سے چھاپی جائیں تاکہ ہم ان کے ذریعے از سر نو محمد عربیؐ کی شخصیت سے آشنا ہو سکیں۔ خدا کا شکر ہے کہ موجودہ مجموعے کی اشاعت سے میری یہ آرزو پوری ہو رہی ہے۔ اس مجموعے میں کوشش کی گئی ہے کہ اُردو کی قابلِ قدر نعتیں یکجا کر دی جائیں۔ غیر مسلم شعرا کا کلام خاص طور پر شامل کیا گیا ہے مسلمان شعرا کا کلام جس حد تک حاصل ہو سکا اس کا انتخاب مجموعے میں شامل ہے۔ البتہ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے ایسے نعتیہ کلام کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جس میں خدا اور بندے کا فرق ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ اس مجموعے میں ان نعتوں کو جن کا تعلق یا تو کردار رسالت اور ختمی مرتبت کے اسوۂ حسنہ سے ہے یا ذاتِ رسالت سے گہری دل بستگی کا اظہار ہے عام روایتی غزل نما نعتیں جو ذاتِ رسالت کو زیب نہیں دیتیں انھیں حتی الامکان منتخب نہیں کیا گیا ہے۔ یہ انتخاب ایک ذاتی نوعیت کا ہے جس کی بنیاد لازماً میرے ذاتی ذوق پر ہے۔ اس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور میری تو یہ تمنا ہے کہ ایسے اور انتخاب بھی چھپیں۔ مجھے یقین ہے کہ بہت سے اس سے بہتر ہوں گے۔

یہی کام اب فارسی، بنگالی اور پاکستان کی دوسری زبانوں میں بھی انجام پانا چاہیے۔ بنگالی میں قدما کے علاوہ خود ہمارے زمانے میں قاضی نذر الاسلام نے یادگار نعتیں لکھی ہیں اور ان میں کہیں کہیں ایسے شعر بھی ہیں جنھیں اردو بھی کہا جا سکتا ہے اور بنگالی بھی۔ ایک نعت کا پہلا مصرع ہے :

نام محمدؐ بول

اسی طرح پنجابی، سندھی اور پشتو میں ایسی ایسی نعتیں موجود ہیں جن کی سادگی اور بے ساختہ پن کا تقاضا ہے کہ انھیں یکجا کیا جائے۔
عربی میں غالباً سب سے پہلی نعت حضرت ابوطالب بن عبدالمطلب کی ہے جس کا ایک شعر بہت مشہور ہے۔

وعرضت دینا لا محالۃ انہ
من خیر ادیان البریۃ دینا

اور غالباً سب سے بے ساختہ وہ اشعار ہیں جو مدینے کی لڑکیوں نے حضورؐ کی آمد پر گائے۔

طلع البدر علینا — من ثنیات الوداع
وجب الشکر علینا — ما دعیٰ للہ داع

نعتیہ اشعار حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب، جناب خدیجۃ الکبریٰؓ، جناب سیدۃ النسأ، جناب ابوبکر صدیقؓ، جناب علی ابن ابی طالب علیہ السلام، جناب عائشہ صدیقہؓ اور بہت سے اصحاب کبار اور ائمہ اطہار سے بھی منسوب ہیں۔

عربی میں چند نعتیہ قصیدے زبان زد خلائق ہیں یا تھے۔ ان میں بوصیری کا قصیدہ بردہ

امن تذکر جیران بذی سلم

اور کعب بن زہیر کا "بانت سعاد"

بانت سعاد فقلبی الیوم متبول

سب سے زیادہ مشہور ہیں، مگر ان کے علاوہ بے شمار اشعار اور قصیدے نعت کے مضمون میں موجود ہیں۔ اگر ان کا انتخاب ایک مجموعے کی صورت میں چھپ سکے تو بہت اچھا ہو۔

میں لکھتے لکھتے کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ لازم ہے کہ اپنی طبیعت پر جبر کر کے اس ذکر جمیل کو مختصر کروں۔ البتہ جی یہ ضرور چاہتا ہے کہ حسانؓ بن ثابت کا ایک ایسا شعر اور پیش کروں جس سے بڑھ کر آج تک کسی زبان میں نعت کا کوئی شعر نہیں کہا گیا ہے۔ حسانؓ فرماتے ہیں:

خلقت مبرأ من کل عیب
کأنک قد خلقت کما تشاء

یعنی اے محمدؐ تو ہر عیب سے پاک پیدا کیا گیا ہے، گویا تو بعینہٖ ایسا پیدا کیا گیا ہے جیسا کہ تو خود چاہتا تھا۔

اس شعر کے کیا کہنے۔ اگر ہم لوگوں کو یہ اجازت ہوتی کہ اللہ میاں سے یہ کہہ سکیں کہ ہمیں کیسا بنایا جائے، تو خدا معاف رہے بہت سی فرمائشیں کرتے۔ اپنی جسمانی، دماغی اور روحانی کوتاہیوں اور کمزوریوں کا کس کو احساس نہیں رہے، اور ہم میں سے کون ایسا ہے جس نے کسی نہ کسی وقت یہ خواہش نہ کی ہو کہ کاش خدا نے مجھے یوں نہیں یوں بنایا ہوتا۔ مگر یہ تو ہم عام آدمیوں کی باتیں ہیں۔ دنیا کے سب سے بڑے انسان نے اپنے متعلق کیا سوچا۔ یہ کون جان سکتا ہے۔ اور پھر یہ تصور کہ اس انسان کو خدا نے اس کی اپنی خواہش اور معیار ہی کے مطابق بنا دیا، تو اس کو اور اس کی ذات کے کمالات کو کون پہنچ سکتا ہے؟

کراچی
۲۶ دسمبر ۱۹۷۰ء

دیباچہ نعتوں کا مجموعہ "خیر البشرؐ کے حضور میں"

تاریخ گوئی کے بارے میں

(ایک خط حفیظ ہوشیارپوری کے نام)

حامد حسن قادری

جناب مکرم۔ السلام علیکم

کرم نامہ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کا تذکرہ عزیزی خالد حسن قادری نے اکثر لکھا۔ مگر تعارف کی کوئی تقریب نہ تھی۔ مدت کے بعد بہانہ خوب نکل آیا۔ آپ کی تاریخ اخبار "الجمعیتہ" میں چھپی تھی۔ یہاں سب لوگوں نے بہت پسند کی۔ میں نے علامہ فاروقی صاحب کو تعریف لکھی کہ اس مصرعہ پر خوب شعر کہتی۔ بہترین تاریخ تھی۔ اس کے بعد رسالہ "نقش" کراچی میں بھی آپ کی تاریخیں دیکھیں۔ یہ بھی خوب میں تاریخ کا ایک تاریخی عنوان بھی نکلتا تھا۔ ——— "شہادت کی تاریخ"

میری تاریخ گوئی کا عجیب عالم ہے۔ علم و ادب کے مشاغل میں شاید تاریخ گوئی سے زیادہ فضول و غیر نافع کوئی شغل نہ ہوگا۔ مگر میں نے اس میں بڑا وقت ضائع کیا ہے۔ پچاس سال سے زیادہ اس خبط میں مبتلا ہوں۔ کئی ہزار مادے نکالے ہیں۔ صدہا تاریخیں نظم میں ہوں اور مرتب ہیں۔ تین ضخیم مجلدات قلمی تیار ہیں۔ قرآن مجید کی کم سے کم ۱۵۰ آیتوں سے تاریخیں نکالی ہیں۔

آپ نے میری جو تاریخیں ملاحظہ فرمائیں وہ مشہور لوگوں کی وفات کی ہوں گی۔ لیکن میں نے ان کے علاوہ بے شمار تاریخیں دوسرے حالات و واقعات کی لکھی ہیں۔ اپنے حالات۔ گھر کے واقعات۔ اعزہ و احباب کے معاملات۔ روزمرہ کے اتفاقات کے متعلق کثرت سے تاریخیں کہی ہیں۔ بات سے بات۔ بات بات پہ تاریخ کہی ہے۔ تاریخ گوئی کے لئے مجھے ہمیشہ کاغذ قلم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کالج جا رہا ہوں۔ راستے میں کوئی بات دیکھی، تاریخ کہہ دی۔ سونے کو لیٹا ہوں۔ کوئی بات یاد آئی اور تاریخ ہو گئی۔ بعض تاریخیں آپ بھی سنیئے:۔

۱۔ ایڈورڈ ہشتم کی تاج سے دست برداری کی تاریخ ——— "نذر سودائے عشق تاج کیا"

۱۹ء ۳۶

۲۔ خالد حسن نے بڑے بھائی ساجد حسن قادری کو امتحان میں یونیورسٹی سے طلائی تمغا ملا تو کہا:۔

یافت او تمغا ز یونیورسٹی
یافتم تاریخ تمغا یافتہ

۱۹ ۴۷

۳۔ ایک شخص نے آگرہ میں بہ ترتیب دکھایا کہ دو شب و روز سے زیادہ برابر بائیسکل پر چکر لگاتا رہا۔ میں نے کہا۔

بریں مردانہ ہمت آفریں باد

مشہور مصرعہ ہے۔ "آفریں باد بریں ہمت مردانہ تو" تاریخ میں سے رکو انکالا تو سنہ نکل آیا۔ اور مصرعہ بھی مرتب ہو گیا۔

۴۔ خالد حسن قادری نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں دوسرے لڑکوں کی شرکت سے بڑی شاندار نمائش کی۔ میں نے نائش کے پورے شعر میں تاریخ نکالی۔

زندگی زندہ دلی کا نام ہے ۔ مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

۵ ۔ پروفیسر محمد طاہر فاروقی نے ایک جوتا بنوایا تھا ۔ ان سے ایک عزیز کو پسند آیا ۔ انہوں نے ان سے [illegible] ان کا [illegible] ختم ہوا میرا قطعہ تاریخ تیار ہو گیا ۔ اور سنا دیا ۔

آپ نے دلیا [illegible] ورنہ [illegible]
آپ سمجھیں کہ [illegible] تو یہ [illegible]

۶ ۔ ایک بزرگ صوفی شاعر کے دیوان کی تاریخ کہی تھی جو دیوان میں شائع ہوئی ۔

تاریخ یہ [illegible] لطافت کہئے

المخزن [illegible] شریعت کہئے — [illegible] طریقت کہئے

یک [illegible] راز حقیقت کہئے — کہئے [illegible] کرامت کہئے

۷ ۔ سیماب اکبر آبادی مرحوم کے منظوم ترجمہ قرآن مجید کی تاریخ : [illegible] ۱۳۶۶ھ

۸ ۔ مجھے [illegible] ہفتہ مسلسل بخار رہا تو کہا : کہ آجکل میرے [illegible] جار

۹ ۔ شفا ہوئی تو کہا : کہ شکر خالق ذوالجلال [illegible]

۱۰ ۔ بہت سے اعزہ چلے گئے تو کہا : [illegible] ۱۳۶۶ھ

۱۱ ۔ پرمٹ جاری ہوا تو کہا : [illegible] ۱۹۶۱ء

۱۲ ۔ کراچی میں ایک عزیز میرے [illegible] چھوٹا کم عمر [illegible] مطہر [illegible] نام [illegible] ان کو متعدد تاریخیں نکالی تھیں ایک یہ تھی [illegible]

۱۳ ۔ میں ہوائی جہاز سے اترا تو کہا : [illegible] ۱۹۶۰ء

۱۴ ۔ ایک عزیز بڑی عمدہ داڑھی رکھے ہوئے کے [illegible] میں نے [illegible] قطعہ [illegible]

[illegible]

۱۵ ۔ ایک اور نوجوان عزیز [illegible] میں بڑے متقی [illegible] انہوں نے [illegible] میں نے بہت سی تاریخیں کہہ [illegible] [illegible]

۱۶ - ایک سال عید میں قربانی نہ ہو سکی تو کہا — عید الضحیٰ کیا جو قربانی نہ ہو - ۱۳۶۷ھ

۱۷ - گرمیوں میں ایک رات گرمی صحن میں بجلی کی روشنی میں بڑی دیر تک پڑھتا رہا، دو بجے کے قریب بجلی بند کی تو دیکھا کہ تمام صحن چاندنی سے بھرا ہوا ہے - پورا چاند تھا بجلی کی تیزی میں چاندنی معلوم ہی نہ ہوتی تھی میری زبان سے نکلا۔ "سامنے بجلی کے غائب چاندنی" فوراً تاریخ کا خیال آگیا - اس مصرعے کے عدد نکالے تو پورے ۱۳۶۷ھ !

۱۸ - ایک رات کو جب سونے کے لئے لیٹ گئے - باہر دروازے پر کسی فقیر نے صدائیں دینی شروع کیں - جاڑوں کا زمانہ - فقیر چلائے جاتا ہے اور یہاں کوئی اٹھتا نہیں - آخر بیوی اٹھیں اور چھوٹے لڑکے کو زبردستی اٹھا کر فقیر کو روٹی دلوائی - مجھے تاریخ کی سوجھی -

یہ شکر ہے قسمت نے شدا کا　　　عثمان کے دستگیر ہو تم
تاریخ کا پایا رمز مضمون　　　"اک دہ سے غنی فقیر ہو تم"
۱۹ء　　۲۸

۱۹　مارچ کے لڑکوں نے امتحان سے اسٹرائک کر دی - میں نے کہا :-

یہ لڑکوں کی ہڑتال کیا اور کیوں　　　نہ عقل آئی تعلیم و تادیب سے
ہے آزادی ایسی تو تاریخ ہے　　　کہ "آزادی اخلاق و تہذیب سے"
۱۹　　ء　　۲۰

۲۰ - لڑکی کے ہاتھ میں بچھو نے کاٹ لیا - میں نے کہا - "یہی طبیعتِ کژدم کا اقتضا ہے یہی" ۱۹۵۰ء

۲۱ - ایک عزیز کو پچاس سال سے زیادہ کی عمر میں پہلی مرتبہ پتلون پہننے کا شوق ہوا میں نے خدمت میں عرض کیا -

تن گئے بھائی بھی پتلون میں آج　　　ان کی ٹانگوں کو سلاخیں کہئے
خوب پتلون کی نکلی تاریخ　　　"شجرۂ شوق کی شاخیں کہئے"
۱۹　　ء　　۵۰

۲۲ - گذشتہ رمضان میں اکثر مقامات پر ۲۹ روزے ہوئے آگرے میں ۳۰ ہوئے میں نے کہا -

روزوں میں ہمیں ہیں سب سے افضل　　　کیا کوئی ہماری کر سکے ریس
تاریخ یہ قادری ہے کیا خوب　　　"تیس ایک ہمارے سب کے انتیس"
۱۳　　ھ　　۷۰

۲۳ - ایک عزیز کو تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونے کا بہت افسوس تھا - میں نے کہا -

"ثالث بالخیر جاتے آپ"
۱۹　　۵۱

۲۴ - میں چھتری لگائے کالج جا رہا تھا - اتفاق سے بازار میں کسی کی پگڑی میں چھتری کی کانپ الجھ گئی اور ذرا مشکل سے نکلی راستے ہی میں یہ قطعہ ہو گیا -

آج الجھ کر کسی کی پگڑی سے　　　کانپ چھتری کی پوچھتی تھی مزاج
چلتے چلتے یہ ہو گیا تاریخ　　　"میری چھتری اٹک گئی خوب آج"
۱۹ء　　۵۱

۲۵۔ اس کے بعد ایک دن مطلع صاف تھا۔ چھتری نہ لی۔ راستے میں یکایک بڑے زور کی گھٹا آگئی اور چند منٹ میں تاریک ہوگئی ——

"نہیں ہے آج ہی بارش میں چھتری" —— ۱۳۷۰ھ

۲۶۔ چند احباب میرے لئے آگرہ آرہے تھے۔ مگر حالات ایسے تھے کہ میں پذیرائی کے لئے تیار نہ تھا۔ تار دے کر روک دیا اور یہی میں نے تاریخ بھی دے کے تار کہ "سیر و تماشا کا موقع نہیں"

۲۷۔ ایک دوست ماش کی دال بالکل نہیں کھاتے۔ اور میں روہیل کھنڈ کا رہنے والا ہوں جہاں ماش کی دال اور ماش کی کھچڑی بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ وہ مہمان بے تکلف تھے۔ میں نے یہ تاریخ کہہ کر سنائی۔

ماش طاہر سوز رہ روہیل کھنڈی　　قدر نشناسیدا اگر غیر بود

دال آں خورد مر و گفتم تاریخ　　ماش الذاں علی الخیر بود

یہ میں نے ادھر بارہ پندرہ سال کی تاریخیں لکھ دی ہیں۔ شروع کے تیس پینتیس سال میں بھی اس طرح کے متفرقات میں میری تاریخ گوئی کا زمانہ اس صدی کے ساتھ ہوا۔ انیسویں صدی کے ختم اور بیسویں صدی کے آغاز پر چند ماہ کے اندر بعض بڑے آدمیوں کا انتقال ہوا ملکہ وکٹوریہ، امیر عبدالرحمان خاں والی کابل۔ امیر مینائی۔ حکیم عبدالحمید خاں دہلوی (برادر حکیم اجمل خاں) رستم ہند غلام پہلوان میں نے ہر ایک کی تاریخ کہی تھی۔ اور ان کے ساتھ ایڈورڈ ہفتم اور امیر حبیب اللہ خاں کی تخت نشینی کی بھی۔

امیر مینائی کی تاریخ ایک مشہور مصرع سے خوب نکلی تھی — "آں قدح بشکست وآں ساقی نماند"

اور تاریخیں معمولی تھیں۔ مثلاً حکیم صاحب کی — شد ہائے غروب مہر طب یونان —— ۱۹۰۰ء

رستم ہند کی ..... ندا آمد پئے سال از دل زار　شباب و رستم ہندوستان مرد　۱۹۰۱ء

ایک عزیز کے مکان میں پانی کا ہینڈ پمپ لگا تو کہا :۔ "خزانہ آب شیریں کا ہے یا پمپ" ۱۳۲۷ھ

میں پہلی مرتبہ لاہور گیا تو شالامار باغ سے واپسی میں راستے میں تاریخ ہوئی —— "دیکھ کر آئے ہیں شالامار باغ" ۱۹۱۱ء

ایک بھائی پاس ہوئے　"ہوگئے بی اے ظہیر عالم" — ۱۳۳۰ھ

دوسرے بھائی نے الہ آباد سے ایل ٹی کیا — "فریدی واہ تم استاد نکلے" ۱۳۳۲ھ

ایک دوست نے منشی فاضل پاس کیا — "منشی فاضل ہوئے" ۱۳۳۲ھ

یہ خرافات کہاں تک لکھوں گا۔ تو یہ ایک لطیفہ اور سن لیجئے۔ میرے ایک کرم فرما ہیں۔ سید عابد کانپوری۔ بڑے عابد و زاہد۔ دراز ریش کسی اتفاق سے بچپن میں ان کا عقیقہ نہ ہو سکا تھا۔ چالیس سال کی عمر میں ان کو خواب میں بشارت ہوئی کہ عقیقہ کرو انہوں نے فوراً تعمیل کی۔ سر منڈوایا۔ دو بکرے ذبح کئے۔ جشن کیا۔ لڈو بانٹے مجھے کانپور سے صرف عقیقے کی اطلاع ملی۔ بشارت کا علم نہ تھا۔ ان حضرت سے میری ایسی بے تکلفی نہ تھی مگر اس لطیفے نے گدگدی پیدا کر دی اور میں نے یہ قطعہ ان کو لکھ بھیجا۔ انہوں نے جواب میں تعریف بھی کی۔ اور برا بھی مانا اور بشارت کا حال لکھا۔

مسنون ہے عقیقہ کوئی فرض تو نہیں　پیری میں کیا ضرور اسے ہائیے بجا

زگمیں دل سے دور نہیں ہے کہ ریہ جشن　ہاں شادیانے گائیے ڈھولک بجا بجا

مادر میں زر خشک کا [illegible] نہیں ندو زندہ وہی ہمیشہ کو رب نے نہیں تبا
تو نمل بن جواں تو نبا بن گئے ہیں پیر تو ریشہ بند خلق پہ اے زندہ دل تبا

تاریخ یہ لکھے جو کوئی تو ہدا زماں
ایسی دراز پر یہ حقیقہ دیا عجب

۱۲ ۵ ۴۹

ان تاریخوں کی مشق ہوئی بہت بے وقت ہو جاتی ہیں۔ کہیں کہیں میں نے اشعار اور مسلسل تاریخیں بھی کہی ہیں۔ ایک مرتبہ کسی تحریک پر صنعت زبر و بینات میں چند تاریخیں کہی تھیں۔ آپ واقف ہوں گے کہ یہ بڑی محنت کا کام ہے۔ اس میں ہر حرف کے ملفوظ کے عدد لئے جاتے ہیں یعنی الف کا ایک نہیں بلکہ ۱۱ عدد لیتے ہیں۔ مصطفیٰ کمال پاشا کو ۱۹۲۲ء میں لوزان کانفرنس کی سعی میں کامیابی حاصل ہوئی تو میں نے کہا تھا۔

اے کمال اکمل ہنر لاریب عادل و شیر دل و دریا دل
نازن زیرکی و ہمت تو حل کند عقدہ ہا مشکل
سعی در مجلس لوزان کردی بحقیقت شدہ فتح کامل
حامد از زبر و بینہ گفت زرہ فتح بیینے حاصل

۱۳۴۱ھ

کاف ۔ را ۔ دال ۔ ہا ۔ فا ۔ تا ۔ حا ۔ جیم ۔ با ۔ یا ۔ نون ۔ یا ۔ حا ۔ الف ۔ صاد ۔ لام

۱۰۱ + ۲۰۱ + ۳۵ + ۶ + ۸۱ + ۲۰۱ + ۹ + ۹۰ + ۳ + ۱۱ + ۱۰۹ + ۱۱ + ۹ + ۱۱۱ + ۹۵ + ۵۱ = ۱۳۴۱ھ

بھی نئی ترکیب سے تاریخیں مرتب کی ہیں۔ مولانا احسن مارہروی کی تاریخ وفات کہی تھی۔

حضرت احسن نقاد و سلیم و عالم ہوگئے منزلت افزائے خلود جنت
بکرمی، عیسوی، ہجری و فصلی ہیں یہ سال "پاک دل" "زندہ سادات" "زہ" "فخر حکمت"

فصلی ۱۳۴۸ + ۱۱

ہجری ۱۳۵۹ + ۵۱

عیسوی ۱۹۴۰ + ۵۰

بکرمی ۱۹۹۰

میں اپنی رو میں لکھتا چلا گیا۔ اب طے کر سوچتا ہوں تو اپنے اوپر ہنسی آتی ہے۔ کہ لمبی چوڑی خود ستائی ہوئی بہرحال آپ کو تاریخ گوئی کا خاص ذوق و شوق ہے۔ اس لئے امید ہے کہ یہ تحریر دلچسپی سے خالی نہ رہی ہوگی۔

اس طرح کی متفرق اور معمولی باتوں کی تاریخیں میرے علم میں کسی نے اس کثرت سے نہیں کہیں۔ قدیم زمانے میں بھی مجھے ایک ملا عبدالقادر بدایونی ملے جنہوں نے بات بات پہ تاریخ کہی ہے۔ اُن کی "منتخب التواریخ" اکبر بادشاہ کے عہد کی مشہور تاریخ ہے۔ یہ ۱۰۰۴ھ میں تمام ہوئی۔

سال ملا صاحب نے رحلت کی۔ اکبر بادشاہ سے دو سال بڑے تھے اور دس سال پہلے وفات پائی۔ اکبر کے درباری و مصاحب تھے تاریخ کی ورق
شب اکبری حکومت و سیرت کے چشم دید حالات لکھے ہیں۔ ملا صاحب نے اکبری دینداری بھی دیکھی اور بے دینی بھی۔ حالات سے ذیل میں جا بجا
قطعات تاریخ یا صرف مادے بھی لکھے ہیں۔ آخر اپنے معتقد دور دوں سکے۔ آپ بھی چند تاریخیں دیکھیے جن سے تمام تاریخیں مع واقعات کے ایک
عنوان انتخاب کو صرف یہاں جمع کر دی ہیں۔ ۲۲ تاریخیں ہیں

۱۔ خان زمان جس سے اکبر بادشاہ کو سرکشی کا اندیشہ تھا خود حالت ہوا تو یہ تاریخ ہوئی — "فتح خیر" ۹۷۴ھ

۲۔ مولانا علاءالدین لاری نے آگرہ میں درس و تدریس کے لیے خس پوش مدرسہ بنایا۔ "مدرسہ خس" ۹۶۹ھ

۳۔ کوہ سوالک کے پہاڑیوں نے حسین خان کے لشکر پر زہر آلود تیر برسائے ملا صاحب نے تاریخ نکالی — "تیغ بے مزہ" ۱۰۳۰ - ۵۲ = ۹۷۸ھ

۴۔ اکبر بادشاہ ہر سال اجمیر شریف حاضر ہوتا تھا آگرہ سے اجمیر تک جا بجا مینار اور چاہ بنوائے تھے اور بادشاہ نے عمر بھر میں جو ہزاروں ہرن شکار کئے تھے ان کے سینگ ان میناروں میں لگوائے تھے اس مناسبت سے ملا صاحب نے تاریخ کہی "میل شاخ" ۹۸۱ھ

۵۔ بادشاہ نے دین الٰہی کی بنیاد ڈالی تو کہا — "کفر شائع شد" ۹۸۳ھ

۶۔ اس کے بعد راہ اجتہاد کھلی تحلیل و تحریم موقوف ہوئی۔ اسلام کا نام تقلید رکھا گیا۔ وحی، نبوت، ملائکہ، معجزات وغیرہ سے انکار کیا گیا تو ملا صاحب نے فرمایا — "فتنہ ہائے امت" ۹۸۷ھ

۷۔ پھر احکام شرع میں تغیر کیا گیا تو کہا — "احداث بدعت" ۹۹۰ھ

۸۔ یہ فرمان شاہی صادر ہوا کہ علوم عربیہ ترک کر کے بجز نجوم و طب و فلسفہ کچھ نہ پڑھا جائے ملا صاحب کیا خوب تاریخ نکالتے ہیں —
"کساد فضل" ۹۹۵ھ

۹۔ نوروز کی تقریب میں دیوان عام کو تصویروں سے آراستہ کیا گیا — "شیوع معصیت" ۹۹۶ھ

۱۰۔ ایک شخص ملا احمد کی بے دینی بیان کرنے کے بعد ملا عبدالقادر لکھتے ہیں کہ انہی حرکتوں کی وجہ سے ایک دن میرزا فولاد بیگ نے آدھی رات کے وقت اس شخص کو گھر سے باہر بلا کر قتل کر دیا۔ اس کی ایک تاریخ ہوئی — "زہے خنجر فولاد" ۹۹۶ھ اور دوسری "خوک سقری" ۹۹۶ھ۔ اس کے بعد ملا عبدالقادر لکھتے ہیں کہ بادشاہ نے یہ واقعہ سنا تو نہایت غضب ناک ہوئے۔ بیگمیں میرزا فولاد کی شجاعت کے قائل تھے تمام اہل حرم میرزا کی سفارش کرتے تھے اس لیے بادشاہ جان بخشی پر راضی معلوم ہوتے تھے۔ مگر اتفاق یہ ہوا کہ بادشاہ نے حکیم ابوالفتح کو میرزا کے پاس بھیجا، اس سے پوچھا "تو نے تعصب مذہبی کے سبب سے ملا احمد کو مارا ہو گا؟" میرزا نے جواب دیا "اگر تعصب ہوتا تو اس سے بڑے عالم کو مارتا"۔ حکیم نے یہ جواب جا کر بادشاہ سے کہا۔ بادشاہ نے کہا بدترم زادہ ایست نباید زندہ گذاشت۔ چنانچہ میرزا فولاد کو ہاتھی کے پاؤں سے باندھ کر تمام شہر لاہور میں گشت کرایا گیا حتیٰ کہ وہ درجہ شہادت کو پہنچے۔ اس کے بعد ملا صاحب لکھتے ہیں کہ ملا احمد کی قبر پر محافظ مقرر کر دیئے گئے تھے۔ اس پر عوام اہل لاہور نے اس کی لاش قبر سے نکال کر جلا دیا۔

۱۱۔ تحویل نوروز اور آغاز سال جلوس شاہی اسی ذی الحجہ کی تقریب میں بادشاہ نے کوشش و اہتمام سے لوگوں کی داڑھیاں منڈوائیں ملا

صاحب نے تاریخ کہی ——— "بلفتہ ریش با برباد دادہ مقصد سے جندسے" ۱۰۰۰ھ

۲۔ فیضی و ابوالفضل نے جب داڑھی منڈوائی تو یہ تاریخ ہوئی "شریعتِ جدید" ۱۰۰۱ھ

۳۔ ملا صاحب اپنے متعلق لکھتے ہیں کہ حق سبحانہ نے بعض ملاہی و مناہی سے جن میں فقیر مبتلا تھا توبہ کی توفیق کرامت فرمائے۔ بطریق تفاول بالفظ استقامت (۱۰۰۱ھ) سے تاریخ نکالی ملک الشعراء فیضی نے اس کی یہ تاریخ کہی۔

"نَقَدْ تابَ شَیخُنا عنِ الحبیبةِ فتاریخُهُ : سابقُ التوبۃِ"

فیضی نے توبہ کی دوسری "ت" کے بھی ۴۰۰ عدد لئے ہیں۔ یہ اصل میں "ۃ" ہے اور اس "ۃ" کے عدد اکثر پانچ لئے جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے زمانے میں بھی بعضوں نے اس کے ۴۰۰ لئے ہیں مثلاً سرسید احمد خاں کی تاریخ کسی نے نکالی ہے۔ "انّ العاقبةُ للمتّقین" اس میں "عاقبہ" کی "ت" کے ۴۰۰ لینے سے ۱۳۱۵ھ نکلتے ہیں۔

۴۔ بعض بڑے لوگ بادشاہ کے مرید اور چیلے ہوئے اور دین الٰہی قبول کیا اور داڑھی کو خیرباد کہہ کر جرد و مرد (منڈ منڈ) ہو گئے تو ملا عبدالقادر نے تاریخ کہی "مُو تراشیدند" ۱۰۰۴ھ اس خامہ فرسائی کی آپ سے معذرت نہ کروں گا۔ اس لئے کہ ملا صاحب کی یاد تازہ کی ہے اور اس میں آپ کو شریک کیا ہے۔ یہ تو ملا جی کے لطائف تواریخ تھے۔ ان کے علاوہ معظم و اہم واقعات ولادت و وفات و فتوح وغیرہ کی تاریخیں بڑی کثرت سے ہیں۔

ان باتوں میں آپ کے خط کا جواب رہ گیا۔ اگرچہ میں علمی و ادبی سرگرمیوں کا اب صفر ہے۔ انتہا یہ کہ کچھ شعرا اچھے تھے وہ بھی ہجرت کر گئے۔ یہ عجب اتفاق ہے کہ آگرے میں اردو فارسی کی کتابوں کی کوئی بڑی دکان کبھی ہوتی ہی نہیں۔ چالیس سال سے تو میں دیکھ رہا ہوں۔ پہلے بھی نہ تھی۔ اسی زمانے میں ایک دکان درسیات کے سلسلے کی تھی اس کے ذریعے سے ہم کالج کے لئے دوسری علمی کتابیں بھی دہلی لکھنؤ حیدرآباد وغیرہ سے منگا لیتے تھے اب وہ دکان بھی ختم ہو گئی۔ اس کے مالک حال ہی میں ہجرت کر گئے۔

لیکن آپ کو جن کتابوں کی ضرورت ہو وہ میں مہیا کر سکتا ہوں۔ یعنی کتابوں کے نام آپ بھیجئے میں نول کشور لکھنؤ اور دہلی وغیرہ سے منگا کر آپ کو بھیج دوں گا۔ قیمت ادا کرنے کی دشواری اس طرح حل ہو سکتی ہے کہ میں آپ کو کتابیں رجسٹرڈ بھیجدوں گا۔ آپ قیمت یہاں کسی کو بھیج دیجئے گا جس کو میں لکھوں۔ اس میں تبادلہ زر کا سوال پیدا نہ ہو گا اس لئے کہ یہاں کا روپیہ یہاں رہے گا وہاں کا وہاں دونوں روپے برابر سمجھے جائیں گے۔ اس لئے آپ اس معاملے میں تردد نہ کریں۔

جامعہ ملیہ دہلی کی فہرست اس خط کے ساتھ بھیجتا ہوں اور فہرستیں بھی آپ کہیں تو حاصل کر کے اور بھیجوں۔

"جلوۂ خضر" عنقا ہے۔ مجھے اپنے لیے بھی نہ ملا۔ کالج میں بھی نہیں۔ قدیم تذکروں میں نکات الشعرا۔ ریاض الفصحا۔ تذکرۂ ہندی یا مقدمہ یا گلزار ابراہیم۔ چمنستان شعرا۔ گل عجائب شاید مل جائیں گے۔ سب انجمن ترقی اردو کے ہیں۔ ممکن ہے آپ کے پاس موجود ہوں۔

تصوف کے تذکرے۔ مکتوبات ملفوظات نئے کتبوں میں تو کہیں نظر نہیں آئے۔ ہوں تو نول کشور کے ہاں ہوں۔ اس کی فہرست منگا کر بھیجوں گا

والسلام

احقر حامد حسن قادری

واردات سرمد

ڈاکٹر سید عبداللہ

واردات سرمد میں ہمیں ایک ایسا شاعر ملتا ہے جس نے "برائے شعر گفتن" شاعری نہیں کی بلکہ واردات قلبی کی سچی ترجمانی کرتے ہوئے جو کچھ لکھا بانداز خلوص لکھا۔ ان کے کلام میں حسن و عشق کے تجربات بھی ہیں اور حیات و کائنات کے بارے میں فکری و جذباتی تجربے اور تجزیے بھی۔ میں سید تقی میر کے مانند یہ "شاعر بھی" یا محبت کہہ کے غم دین و دل کا بار گراں بڑے حوصلے سے اٹھاتا نظر آتا ہے۔ وہ شعلوں میں شبنم اور آگ میں پھول اگانے کی حکمت جانتا ہے ..... زندگی کے راز جذبے کی زبان میں بیان کرتا ہے۔ اور بعض اوقات سادگی و بے تکلفی سے فن کے دیئے روشن کرتا دکھائی دیتا ہے ...... وہ روایت کی لطافتوں کا شناسا ہے اور اس کے فن کی نمود روایتوں کے آئینے میں ہوتی ہے ..... اس کے یہاں الفاظ کا طلسم، بیان کا جادو، تغزل کی شیرینی اور لہجے کی نزاکت، غرض یہ وہ شے موجود ہے جو اچھی غزل کے لئے ضروری اور برتر تہذیب کے لئے لازمی ہے۔ اس کے یہاں ہجر و وصل کے قصے، حکایتیں اور شکایتیں دنیائے عاشقی کی پرانی ریت کے مطابق ہیں مگر شاعر کا انداز بیان بہرحال اپنا ہے ؎

ہیں وہی وصل و جدائی کے فسانے لیکن
پھر بھی سرمد کا ہے انداز جدا کہتے ہیں

میں سرمد اور ان کی شاعری سے پہلی دفعہ روشناس ہو رہا ہوں اور یہ قدرتی بات ہے کہ نئے شاعر سے ذہنی تعارف پیدا کرنے میں خاصی دیر لگتی ہے اور یہ بھی قدرتی ہے کہ ایسے شاعر کی تخلیقات سے گہرا رابطہ پیدا ہونے سے پہلے قاری اس کے کلام کے بارے میں بیگانگی سی محسوس کرتا ہے بلکہ شاید صحیح یہ ہو کہ وہ اپنے مطالعہ کا آغاز قدرے تعصب سے کرتا ہے ..... یہ تعصب (شاید نادانستہ) یوں پیدا ہوتا ہے کہ قاری کے نگارخانہ ذہن میں پہلے ہی بہت سی تصویریں موجود ہوتی ہیں۔ لہٰذا کسی نئے نقش کے ابھرنے پر اس کے سامنے اہم یہ سوال ہوتا ہے کہ اس نئی تصویر کو اس نقش کدے میں جگہ کہاں دی جائے اور یہ بھی کہ جگہ دینے کے لئے کوئی جواز بھی ہے یا نہیں خصوصاً جب کہ اس شاعر کا نام اس سے پہلے ایک دفعہ بھی سننے میں نہ آیا ہو۔

میں نے کچھ ایسے ہی جذبات سے واردات سرمد پر نظر ڈالی مگر یہ حقیقت ہے کہ میں اس دیوان کے مطالعہ میں جتنا آگے بڑھتا گیا میرا تعجب دلچسپی میں بدلتا گیا... تعجب اس امر کا تھا کہ یہ شاعر اب تک کیوں چھپا رہا؟ اس کے جاننے والوں نے اس گنج مخفی کو باہر کیوں نہ نکالا ...... اور خود شاعر کے لئے (جو اظہار و ابلاغ پر مجبور اور اس کے لئے مضطرب ہوا کرتا ہے) یہ کیونکر ممکن ہوا کہ اس نے اتنی دیر.. ...... بلکہ تمام عمر پردے میں رہنا گوارا کیا اور وہ اپنے کلام و پیغام کو باہر کی دنیا سے چھپاتا رہا..... یہ بڑے بڑے سوال تھے جن کو سوچ کر میں تعجب کرتا رہا۔ ان سوالوں کے باوجود کلام مانوس ہوتا گیا اور وہ لطائف سامنے آتے گئے جو کسی شاعر کو قاری کا منظور نظر بنا سکتے ہیں۔

یہاں یہ عرض کر دوں کہ واردات سرمد کے شروع میں شاعر کے فرزند یحییٰ امجد کا لکھا ہوا ایک دیباچہ ہے۔ میں نے اسے دانستہ نہیں پڑھا تاکہ اس نئے شاعر سے براہ راست آگاہی حاصل کروں ..... اور دیوان کے داخلی نقوش کے ذریعے سے نقش کار (النقاش) تک خود پہنچنے کی کوشش کروں۔

مجھے ان نقوش کے اندر ایک پرکشش شخصیت نظر آئی۔ یہ واردات سرمد کے شاعر کی شخصیت ہے .... محبتوں اور عقیدتوں کے شاعر کی شخصیت جس کے نزدیک زندگی ذوق نظر اور ناموس وفا کا نام ہے اور حسن و عشق ادب گاہ زندگی کے چند ایسے لمحوں سے عبارت ہیں جن میں پھول کھلتے ہیں مگر یہ وہ مقام ہے جہاں گل چینی کے آداب اپنی ایک شریعت رکھتے ہیں .... یعنی بقول عرفی یہاں کا معمول دیدن ہے چیدن نہیں۔ ہاں نگاہ اور ذوق نگاہ کے لئے اس چمن کی ساری وسعتیں کھلی ہیں ؎

عشق کیا ہے فقط ایک ذوق نظر
حسن کیا، ایک طرز بیاں دوستو

سرمد کے نزدیک زندگی بذات خود بھی ذوق نظر کے سوا کچھ نہیں ؎

ہے حقیقت میں سرمد یہ ذوق نظر
ورنہ کیا خیر و شر، ورنہ کیا زندگی؟

حسن و عشق ..... بلکہ "خیر و زندگی" کے بارے میں یہ نقطہ نظر قلب کی ایک خاص تہذیب اور نظر کے بعض خاص آداب سے ابھرا ہے جس پر مسلمانوں کے پچھلے معاشرے میں خاص زور دیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں کردار ایک خاص سانچے میں ڈھالے جاتے تھے اور وہ سانچا خود اقبالی صوفیانہ مشرب اور دین داری کے اصولوں اور ضابطوں کے ذریعے تیار ہوتا تھا۔

سرمد کی شاعری میں ایک ایسی ہی شخصیت، ایک ایسا ہی کردار بڑا نمایاں نظر آتا ہے ۔۔ وہ شاعر جو زندگی کی عقیدت رکھتا ہے وہ محبت کرتا ہے مگر آداب محبت کا بھی پاس کرتا ہے ...... وہ ایک وضع دار شاعر ہے۔ وہ زندگی کو ایک تفریح ایک امانت خیال کرتا ہے۔ وہ دل کی توقیر بھی رکھتا ہے اور اس کے معنی سمجھتا ہے ..... وہ غم دل کا شاعر ہے مگر غم دین سے بھی بے نیاز نہیں ...... وہ حسن کی ناپائیداری کو تسلیم کرتا ہے مگر اس کے حسن و دلکشی کا بھی معترف ہے .... زندگی اس کی نظر میں شعلہ بھی ہے اور شبنم زدہ بھی ...... یہ شاعر ان تینوں وادیوں سے گزر کر شاعر بنا ہے۔

سرمد کے کلام میں (مجنوں گورکھپوری کے الفاظ میں ایک طرح کی "انتخابیت" ہے یعنی اس میں پرانے اساتذہ کے مختلف رنگ ملتے ہیں (.... اور شاعر نے اس کا بر ملا اعتراف بھی کیا ہے) ..... میں نے یہ ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے کہ سرمد پچھلے شعرا میں سے کن خاص شاعروں سے زیادہ متاثر یا فیض یاب ہوئے ہیں۔ سرمد کے یہاں میر، مصحفی، درد، حسرت، اقبال، فراق اور فیض کے لہجے بہت نمایاں ہیں۔ سرمد ان میں سے میر تقی میر کے سب سے زیادہ مداح ہیں۔

یہی ظاہر ہے۔ میر کی طرز فکر، گہرا احساس، حقائق زندگی کے گوناگوں اختلافات، زبان و بیان کی سادگی و پرکاری ..... یہ سب ناقابل گرفت اور ناقابل اظہار کیفیات میں ڈھلے ہوئے ہیں، سرمد نے خود کہا ہے ؎

کس درجہ منفرد رہا انداز میر کا
یاروں نے زورِ طبع دکھایا تو کیا ہوا

—

سرمد مقام میر کسی کو نہ مل سکا
کتنے ہی یوں تو صاحبِ دیوان ہو گئے

اگرچہ یہ تسلیم ہے کہ میر کا انتخاب رنگ اپنانا سہل نہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ ناممکن ہے ، تاہم اگر سرمد کے لئے ممکن ہوتا تو وہ میر ہی کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرتے . . . . چنانچہ ایک موقعہ پر صاف کہہ بھی دیا ہے کہ ؂

یہ سوز و ساز ، یہ انداز سرمد
مرا دل بھی ہے گویا میر کا دل

سرمد نے میر کی زمین میں متعدد غزلیں لکھی ہیں میر سے کسی لہجے اپنائے ہیں کہ بعض لمحات میں یہ بھی محسوس ہونے لگتا ہے کہ میر ان کے لئے ذوق افزا نہیں چنانچہ ؂

سرمد کلام میر سے تسکین نہ ہو سکی
میں گرچہ معترف بھی ہوں اُن کے کلام کا

. . . . . بااین ہمہ یہ امر واقعہ ہے کہ میر کے نقشِ قدم پر چلنے کی آرزو سرمد کو ستاتی رہی لیکن یہ ممکن اس لیے نہ ہوا کہ جہاں میر کا کلام ہمہ رنگ کے مضامین کا بحرِ ناپیدا کنار ہے وہاں سرمد کے کلام میں ایک طرح کی یک رنگی ہے . لہٰذا ان کے یہاں رنگِ میر کچھ کھلا نہیں .

ان سب باتوں کے باوجود سرمد تغزل کا ایک خاص معیار قائم کرتے نظر آتے ہیں . . . . اور جس میں روایت کی چاشنی کے ساتھ ساتھ ایک آدمی کا مزاج کام کرتا دکھائی دیتا ہے .

سرمد کی انفرادیت اس بات میں ہے کہ وہ دین و دل کے شاعر ہیں . ان کے یہاں دین و دل کی سرگزشت ملی جلی ملتی ہے . جذبۂ دینی وحمیتِ قومی کا یہ رویہ انھیں ، اقبال کی قومی شاعری کی طرف لے جاتا ہے اور ان سے خطاب بہ مسلمان لکھواتا ہے . . . . کبھی امیر جماعت اسلامی سے اظہارِ عقیدت کرتا ہے اور کبھی اظہارِ ناراضگی . کبھی پاکستان کے حق میں نظمیں لکھواتا ہے . گویا کلام میں جذبۂ محبت کی طاقتوں کے ساتھ اس ذمے داری کا احساس بھی ہے کہ وہ مسلمان ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ مسلمان ہو کر اس کے سماجی فریضے کیا ہیں ؛ وہ ملت کی سربلندی اور دین کی اقامت کا طلب گار ہے اور ان سب غایتوں کا پُرجوش داعی ہے جو دینِ اسلام سے وابستہ ہیں .

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ سچا دینی جذبہ بھی بہرحال (بلکہ حقیقتاً واصلاً) جذبۂ عشق و محبت ہی کا ایک انعکاس ہے . اس جذبے کا منبع ہی خلوص و عقیدت ہے جس کا دوسرا نام عبودیت اور نیازِ عشق ہے . یہ جذبہ قلبِ انسانی کو سرشار رکھتا ہے اور عاشقانہ اوصاف پیدا کرتا ہے . اسی لیے کہا گیا ہے کہ دنیا کی اعلیٰ ترین شاعری کسی نہ کسی دینی جذبے ہی کی مرہونِ منت ہوتی ہے . سرمد کا دینی جذبہ ان کی حمد و نعت میں کھل کر نمودار ہوا ہے . ان کی حمدیہ نظموں میں ایک عارف کا عرفان اور ایک عاشقِ حقیقی کی عبودیت نظر آتی ہے . . . . . ان کی نعتوں میں ایک اضطرابِ شوق ہے

جواد ب کے دامن سے بندھا ہوا ہے ۔ . . . . ذات رسول کا یہ عاشق مقام رسالت کا شناسا ہے ۔
ان کے دیوان میں اگرچہ ایسی نظموں کی تعداد کم ہے مگر جتنی ہیں ان میں وہ ایک نیاز آئین، صاحب عشق و عرفان شاعر معلوم ہوتے ہیں
تو میں کہہ رہا تھا کہ سرمد دین و دل کے شاعر ہیں اور اس معاملے میں اگر وہ مظہر جانجاناں کی صف میں رکھے جائیں تو شاید یہ غلط
فیصلہ نہ ہوگا۔ یہ مظہر وہی برگزیدہ ہستی ہیں جنہوں نے عاشقی بھی کی اور شاعری بھی، اور اس تیغ ستم کو بھی چوم لیا جو آشفتگی کے ہر میدان میں، اہل دل
کی منتظر رہتی ہے ۔ وہ جرم دین داری میں شہید ہوئے اور حیات ابد پا گئے ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

غزل گو سرمد

سرمد کے کلام سے فوراً یہ محسوس ہوجاتا ہے کہ یہ شاعر غزل گوئی کی تمام مسلمہ روایتوں سے آگاہ اور فن غزل کے جملہ تقاضوں سے باخبر
ہونے کے علاوہ، فیاض ازل سے وہ مزاج بھی لے کر آیا تھا جو رچی ہوئی غزل گوئی کے لیے ضروری ہے۔
پہلے ذکر آچکا ہے کہ سرمد کے یہاں انتخابیت ہے یعنی ایک خاص قسم کی اثر پذیری . . . . اور یہ کوئی عیب کی بات نہیں ۔ شاعر جس
روایت یا جس خاص شاعر سے متاثر ہوتا ہے اس کا رنگ اپنانے کی کوشش کرتا ہے ۔ چنانچہ مصحفی اور آگے چل کر حسرت کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ
وہ دوسروں کا نقش جلد قبول کرتے ہیں . . . . بلکہ فارسی شاعری کی حد تک اور اسلوب کے دائرے میں اقبال بھی سابقوں کے نقش قبول کرتے ہیں
. . . . تو یہ کوئی عیب کی بات نہ ہوئی، چنانچہ کلام سرمد میں کہیں اعتراف کے ساتھ اور کہیں بلا اعتراف بہت سے شعرا کے نقوش موجود ہیں۔
سرمد نے پرانے شعرا میں سے، میر، جرأت، مصحفی اور نئے زمانے کے شعرا میں حالی، اقبال اور جدید میں فراق، فیض اور جگر کا اعتراف کیا
ہے . . . . حسرت کی زمین میں بھی چند غزلیں ہیں اور کئی غزلوں میں اس کی غزل کے خاص لہجے اپنائے گئے ہیں۔
مقصد اس گفتگو سے یہ ہے کہ سرمد غزل کی روایت سے بخوبی آشنا اور اچھی غزل کے رموز و لطائف سے پوری طرح باخبر ہیں۔
مگر اس سے یہ سمجھ لینا غلط ہوگا کہ سرمد نے مذکورہ شعرا کی محض نقل کی ہے یا ان کا رنگ چرایا ہے، واقعہ یہ ہے کہ سرمد کی غزل کا ایک
منفرد شخصی نقش بھی ہے جو کچھ تو مخصوص طرز احساس میں اور کچھ خاص طرز بیان اور خاص لہجے میں منعکس ہوا ہے۔
یہ طرز احساس، ''آگ میں پھول کھلانے'' کی حکمت ہے یعنی غم اور کرب کو (بزنگ تسلیم و رضا) شادمانی بنانے کا تجربہ ۔ یہ اسی کا
نتیجہ ہے کہ ؎

سینے میں چراغِ درد روشن   چہرے پہ سکون کی ضیائیں

کیا جانے وہ آئیں یا نہ آئیں   ہم آگ میں پھول کیا کھلائیں

تو معلوم ہوا کہ شاعر کا دل درد و کرب سے معمور رہے مگر یا تھا کھلا ہے . . . . چہرے پر سکون ہے . . . . گفتگو میں وقار بھی ہے اور گھلاوٹ

ہیں ..... شاعر ایک جگر دار آدمی ہے جو آگ کے شعلوں کو گل گلزار بنا رہا ہے .... یہ جگر داری کا رویہ شاعر نے زندگی کے مکتب سے سیکھا ہے ۔ وہیں سے یہ تربیت بھی پائی ہے کہ صد ہزار غموں اور دکھوں کے باوجود اوروں کے لئے غم کا زہر نہیں گھولنا چاہیے، بات میٹھی اور حوصلہ افزا ہی کرنی چاہیے ...... یہ طرزِ احساس اور یہ رویہ شاعر کی غزل میں مسلسل اور ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے، وہ خود کہتے ہیں:

ہم کرب کے نغموں میں سموتے رہے سرمد
اس حسنِ تغزل کا صلہ جانیے کیا ہے؟

سرمد کا غزلیہ کلام ایسے ہی کرب سے نکلے ہوئے نغموں پر مشتمل ہے ...... اور یہ نغمے زندگی کے بارے میں اس نظریے سے پیدا ہوئے ہیں کہ زندگی طوفان تو ہے مگر اس کے عقب میں، لطافتوں کے چمن بھی کھلے ہوئے ہیں ..... اور زندگی کے تعلوں کے متوازی تبسم کی آسودگی بخش لطافت بھی ہے ؎

زندگی شعلہ بھی ہے تبسم بھی ہے طوفان بھی ہے
گرچہ پل بھر کا بھی سہارا [illegible] کوئی نہیں

اب معلوم ہوا کہ سرمد کی نظر میں زندگی کرب آمیز ہونے پر بھی بڑی سہانی ہے ۔ مگر افسوس ہے کہ ناپائیدار ہے، اس کی حیثیت ایک "نیم نگاہ" سے زیادہ نہیں ... یعنی وہ حسین ادا جسے آدمی عمر بھر یاد رکھے اسے یہ بھی احساس ہو کہ اس سے آگے بھی بہت کچھ ہے مگر مقدر میں بس یہی ہے، یہی ایک جھلک ..... یہی ایک تبسم ..... یہی ایک رکی ہوئی نگاہ (اور بقول میر [illegible] ہے مگر اس میں بھی تامل سا)۔

بیان ہو چکا ہے کہ سرمد کے احساس کے مطابق زندگی محض ذوقِ نظر ہے ..... مگر اسے کیا کیجیے کہ یہ ذوقِ نظر بھی "نیم نگاہ" تک ہی ہے۔ سرمد نے اپنے اس احساس کی تشکیل و تجسیم کے لیے آنکھ اور نگاہ کی دو علامتوں سے کام لیا ہے۔ خصوصاً نیم نگاہی کی، چنانچہ انہوں نے اپنی غزل میں حسن کی جو بھی اور جتنی بھی ستائش کی ہے اس میں سب سے زیادہ نیم نگاہی کی ادا کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ یہ نیم نگاہی حیا اور مجبوری کی ترجمان ہے ... یہ وہی ہے جسے غالب نے بھی تیرِ نیم کش کہا تھا۔

سراپائے محبوب میں آنکھ اور نگاہ کی کشش کا کون معترف نہیں، مگر سرمد کے کلام میں اس رنگِ بیدار کے لئے توصیف[1] کا جو عالم ہے وہ اپنا خاص رنگ رکھتا ہے۔ اور اس سے بڑھ کر وصف کیا ہو سکتا ہے کہ شاعر کی نظر میں وہ "چشمِ سرمہ سا" گویا خدا کی کتاب ہے ؎

[1] نیم نگاہی کے اشعار:

کم نگہی کی آن سلامت — اس عالم کو یونہی تڑپاؤ
وہ اک خموش نگہ ایک داستانِ جمال — یہ سوچتے ہی رہے ترکِ مدعا کرتے
نگہ اٹھاؤ کہ رک جائے ایک پل شاید — کہ زندگی تو اڑی جا رہی ہے ہوا کی طرح

ہے باعثِ زیست بلکہ خود زیست — اور یوں وہ سادہ سی نظر ہے

تقدیرِ حسن و عشق اسی میں ملی مجھے
وہ چشمِ سرمہ سا بھی خدا کی کتاب ہے

اس شعر کو پڑھ کر ولی دکنی (یا نورنگ آبادی) کی ستائشِ حسن کے انداز یاد آجاتے ہیں جن میں اسی قسم کی لطیف تشبیہات سے کام لیا ہے۔ سرمد نے شرمسار آنکھ کی کرشمہ زائی کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے

سرمد جھکی وہ آنکھ ندامت سے جس گھڑی
نظارہ دیدنی تھا دل بے قرار کا

سجدات شوق کی روش گند رہی ہے ان پہ باسی   چہرہ بھی تھا ملول سا چشم بھی شرمسار سی

دل میں یوں ڈوب گئی شام فراق   تیری خاموش نظر ہو جیسے

دل پہ سو بار قیامت گزری   ہر نظر پہلی نظر ہو جیسے

کچھ تم بھی دے نہ سکے سہارا نگاہ کا   کچھ تھے بھی بے پناہ ستم روزگار کے

گزارش ہے کہ چشم سرمہ سا اور نیم نگاہی کی بات ضمناً آگئی ہے۔ کہنا یہ ہے کہ سرمد کے طرزِ احساس میں تشنہ کامی اور محرومی کی ایک دبی دبی لہر پائی جاتی ہے۔ اور یوں خیال گزرتا ہے کہ زندگی ان کے لئے ناتمام بھی ہے اور اس میں بھی ایک طرح کا جبر اور مجبوری ہے جس کی ترفیع کے لئے وہ قدیم عارفوں کی طرح، رضا تسلیم کو وسیلہ بناتے ہیں۔ یہ "جبر رضا آفریں" کوئی نیا مسلک یا مشرب نہیں اکثر اہل درد اور اہلِ استقامت نے بالآخر، اسی نسخہ شناسی سے دوا پائی ہے اور اسی کی مدد سے وہ زندگی کے زہر کو اکسیر بنا کر مقاصد حیات کے لئے توانائی حاصل کرتے رہے ...... سرمد نے اپنے حالات و حوادث میں یہ تجربہ حاصل کیا ہے جو نظری نہیں عملی تحصیل ہے۔ بہرحال مجبوری کا یہ احساس سرمد کی غزلوں میں نمایاں ہے۔ درج ذیل شعر والی ساری غزل، اس خاص شعور کی ترجمان ہے

ستم بھلانے پڑے، آہ تھام لینی پڑی   بپاس خاطر احباب مسکرانا پڑا

اسی مجبوری و محرومی کی ایک شکل یہ ہے کہ باہمہ قرب اور باہمہ نزدیکی، تشنہ کامی کا احساس غالب ہے۔

میں انتہائے قرب میں بھی ان سے دور تھا   دل کا قصور تھا کہ نگہ کا قصور تھا

بے مہر کتنی گردش لیل و نہار ہے   رہ کر ترے قریب بھی دل سوگوار ہے

سرمد کے ہاں احساس کا یہ تموج بے جہت اور حادثاتی نہیں ایک فلسفہ زندگی سے ابھرا ہے جس کی تہذیب تجربات حیات اور حوادث

سے ہوتی ہے۔ ان کی غزل کے برگ ہائے پریشاں کو جمع کیجیے تو ان کی ایک سے آگہی ..... یعنی منظم شعور کی ایک صورت نمودار ہوتی ہے۔

جو لوگ غزل کو محض حسن و عشق کی کہانی سمجھتے ہیں وہ اس صنف کی رمز سے بے خبر ہیں۔ غزل صرف شیریں فرہاد کی داستانِ محبت نہیں، یہ ایک اجتماعی اسلوب، ایک تہذیب، ایک طرزِ زندگی، ایک طورِ احساس، ایک مشرب، ایک منہاجِ دانش، ایک میزانِ ادب ہوتی ہے جس میں شاعر (غزل گو) باندازِ لطف و ایما رموزِ حیات و کائنات بیان کرتا رہتا ہے۔ کسی کے یہاں یہ آگاہی واضح اور واضح تر ..... اور کسی کے یہاں مخفی اور زیرِ سطح ہوتی ہے۔ مگر ہوتی ضرور ہے اور اس کا انکشاف ہمدردانہ تجزیے ہی سے ہو سکتا ہے۔

سرمد کی غزل میں آگہی کے کچھ آئینے چمک رہے ہیں۔ ان میں کچھ تو احساس کا فیض ہیں اور کچھ تعبیر و شعوری تجزیے کا فیضان۔ شاعری میں جب بھی آگہی کا ذکر آتا ہے وہاں اس سے مراد وہ آگہی نہیں ہوتی جو کسی فلسفی کی منطق یا حکیم کی برہان سے پیدا ہوتی ہے بلکہ اس سے مراد جذبے کی وہ ترفیع و تطہیر ہوتی ہے جو قلب کی سچائی سے نکل کر یقین کی ایک شکل اختیار کر لیتی ہے خواہ منطق اس کا ساتھ دے یا نہ دے۔ یہ کبھی محض سادہ اور معلوم حقیقتوں کو تعبیر کے ذریعے نئی صورت عطا کرتی ہے۔ کبھی فکر کی مدد سے ان حقیقتوں کا تجزیہ کر کے مخفی سچائی کا منہ دکھاتی ہے، کبھی تجزیے کے بعد اپنا ایک نظامِ استدلال تیار کرتی ہے جس سے صداقت ایک منظم فکر کی صورت میں برآمد ہوتی ہے۔

سرمد کی آگہی میں احساس کے آئینے جذبے کے پرتو سے روشن ہوتے ہیں مگر ان جذبوں میں حد درجہ سچائی حد درجہ خلوص ہے۔ ان کی نظر میں زیست لذتِ احساس کا دوسرا نام ہے ؎

زیست ہے لذتِ احساس وگرنہ انسان　　ہے وہ تنکا کہ ہوا جس کو اڑا لے جائے

وہ اپنی غزل میں صرف یہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے زندگی میں کیا دیکھا، کیا پایا ..... اور اس کو پانے کے لیے کیا کچھ کھویا۔ زندگی کی حدیں کیا ہیں؟ کیا اس میں کچھ ہے بھی یا یہ محض فریبِ نظر (ذوقِ نظر) اور فریبِ خیال (طرزِ بیان) ہی ہے یا کوئی بڑی حقیقت بھی اس میں جلوہ فگن ہے؟

سرمد نے متعدد غزلوں میں اس راز سے (اپنے احساس کی روشنی میں) پردہ اٹھایا ہے چنانچہ درجِ ذیل شعر والی پوری غزل نکتۂ زندگی کی تفسیر پیش کرتی ہے ؎

بے لقا زندگی بے وفا زندگی　　ہے کسی ماہ جبیں کی ادا زندگی

یہ اشعار بھی ساتھ ہی پڑھ لئے جائیں تو مدعا زیادہ واضح ہو جائے گا ؎

ہو اگر بے نیازِ تمنا زندگی　　ہے یہ خوابِ حقیقت نما زندگی

ہے حقیقت میں سرمد یہ ذوقِ نظر　　ورنہ کیا خیر و شر، ورنہ کیا زندگی

مگر شاعر کو یہ احساس بھی ہے کہ اس ذوقِ نظر کے سایے میں کہیں بہاریں ہیں تو کہیں خارزار بھی ہیں ؎

یہ زندگی ہے شعلہ بھی شبنم بھی آہ بھی　　عنوان بے شمار مری داستاں کے ہیں

کتنے طویل سلسلے وہم و گماں کے ہیں　　نازک ہے دل کا آئینہ، غم دو جہاں کے ہیں

جو نقش ہے جاذبِ نظر ہے   کیا جانیے کس کی رہگزر ہے؟

کتنی حسین ہے زندگی فانی نہیں ہے زندگی   کس کی یہ جلوہ گاہ ہے کس کی یہ رہگزار ہے

یہ سفرِ ہستی ہے جو وقت کی ناؤ میں کائنات کو منزل بہ منزل پے بہ پے اڑائے لیے جا رہا ہے .... تغیر، وقت اور ہر ا کا مقدر ہے اور تلون احوال دنیا کی ہر شے کا نصیبہ ..... اسی کا نام سلسلۂ خیر و شر ہے، یہی فراق و وصال کی کہانی ہے، اسی کے اندر غم و طرب کے قصّے ورق در ورق لپٹے ہوئے ہیں۔ سرمد کی یہ غزل ان سب خیالات کی آئینہ دار ہے ؎

قسمت گو کروٹیں بدلتا رہا   آرزو کا چراغ جلتا رہا

یاس تھی ہر قدم پہ دامنگیر   دل الجھتا رہا سنبھلتا رہا!

تھی کٹھن بے حساب راہِ حیات   تو مرے ساتھ ساتھ چلتا رہا

ہم نشاط و غم و فراق ہیں گم   سلسلہ خیر و شر کا چلتا رہا

لذتِ آگہی غنیمت تھی   لحظہ لحظہ جہاں بدلتا رہا

رہگزر راجنبی سی تھی لیکن   دل تری نکہتوں سے بہلتا رہا

آرزو تو حسین تھی سرمد

زیست کا رنگ کیوں بدلتا رہا

سرمد کے یہاں آگہی کی حد یہی ہے .... اور اس کے باوجود انھیں اس امر کا بھی پورا احساس ہے کہ ان کی یہ آگہی کہیں محض پندارِ آگہی ہی نہ ہو ..... یہ سرمد کا انکسار ان کا خلوص ہے!

بہر حال یہی سفینے، یہی آبگینے، یہی آئینے واردات سرمد کے اوراق میں ہیں ..... اور دیوان کے ہر ہر صفحے کو روشن کر رہے ہیں۔

اب بات اسلوب غزل اور زبان و بیان کی آتی ہے۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ سرمد غزل کی روایت اور اس کے لہجوں سے پوری طرح باخبر ہیں ...... اور اس اسلوب پر قادر ہیں جو ایک اچھے غزل گو اور معیاری تغزل کے لیے ضروری ہے اور پوری ذمے داری کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ سرمد فنِ غزل گوئی کے باخبر شناساؤں میں سے ہیں، وہ یہ جانتے ہیں کہ غزل کے مزاج سے متناسب الفاظِ چرب و تراکیبِ نغز و شیریں سے کلام میں کس طرح گھلاوٹ پیدا کی جا سکتی ہے۔ ان کی غزل میں ایما و اشارہ استعطاف و التفات اور کنایہ و رمز کے وہ جملہ لطائف موجود ہیں جو کلام کو بامزہ بنا رہے ہیں۔ وہ بار بار جن پرانے اساتذہ کا ذکر کرتے ہیں ان کے کلام کے پہلو میں، ان کا کلام بھی تربیت اور تہذیب اور حسنِ بیان کا اچھا نمونہ پیش کرتا ہے ..... اور اس پر تواضع، بے تکلفی، انکسار اور خلوص و نیاز کا یہ عالم ہے کہ شاعر کے یہاں تعلی اور پندارِ فن کا شائبہ تک نہیں ملتا۔ گویا سرمد کا فن، اظہارِ عجز ہے نہ کہ پندارِ آگہی ..... یہی شرافت سرمد کو ایک امتیازی مقام عطا کرتی ہے۔ وہ اپنی غزل کے بارے میں خود کہتے ہیں ؎

نہ تھا عرضِ غم کا جو حوصلہ تو غزل سنا کے گزر گیا   جو امینِ رازِ نشاط تھے، وہی اشکبار چلے گئے

یہ خاص بات یہ ہے کہ میں سرمد کی بے ساختگی اور سہل نگاری سے خاص طور سے متاثر ہوا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ شاعری ایک ایسا فن ہے جس کے ہزار پہلو ہیں مگر سہولتِ اظہار پر قدرت ، ایک ایسی ودیعت ہے جو کسی کسی کو میسر آتی ہے ۔

یہ معلوم ہے کہ سہل نگاری کی بھی کئی قسمیں ہیں ، ایک سہل برائے خواص ہوتا ہے یعنی خواص ادبا جسے سہل کہتے ہیں ، دوسرا سہل برائے خاص و عام ہوتا ہے کہ عام خواندہ اہل ذوق اسے سہل سمجھتے ہیں اور خواص بھی اسے عامیانہ نہیں سمجھتے ۔ تیسرے سہل برائے عام ہے جو خواص کی نظر میں عامیانہ بن جاتا ہے یعنی جس میں سہولت کی خاطر ادبی لطافت ضائع کر دی گئی ہو اور آخر میں چوتھے سہل ممتنع ہے کہ جس کی سہولت لطافت ادبی کی ہم رکاب رہتی ہے ۔ اس حد تک کہ اس کی تقلید ممکن نہیں ہوتی یا کلام کو سہل دیکھ کر اس سے زیادہ بلیغ اور سہل نہیں بنایا جا سکتا ۔

یہ آخری مرتبہ بہت کم شاعروں کو ملا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ سرمد سے چونکہ میرا تعلق دیر سے خصوصی نوعیت کا رہا ہے اس لئے سہولت کے وہ انداز جو میرے مخصوص ہیں کچھ سرمد کے یہاں بھی آگئے ہیں ۔ صرف فرق یہ ہے کہ میرے سہل اشعار پہلو دار اور تہ دار ہیں اور سرمد کے کلام میں پہلو داری زیادہ نہیں ۔ ۔ ۔ بیان ایک ہی معنی تک پہنچاتا ہے اس میں دوسرے مطالب کی طرف چھپے ہوئے اشارے نہیں پائے جاتے ۔

دامن کو جھٹک کے جانے والے — تو پاس سے بھی قریب تر ہے

ہر گام نئی تڑپ نیا جوشش — کیا جانیے کون ہم سفر ہے

دل مائل گریہ ہے مسلسل — شاید شبِ غم کی یہ سحر ہے

دل میں ہیں ہزار آرزوئیں — اور فرصتِ عمر مختصر ہے

سرمد کے حسنِ بیان میں مناسب اور توجہ خیز ردیف بندی کا بڑا حصہ ہے ، مگر ان کی ردیفیں ہیجانی ، طوفانی اور گھن گرج والی نہیں اس انداز و یادِ معنی کے لئے ہیں اور ان کی مدد سے لطیف سا ترنم پیدا کرنا مقصود ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ان کے یہاں لمبی بحروں والی بھی چند غزلیں ہیں ان میں بھی ملائمت ، اور " نرم سیر " آہنگ ہے جو شاعر کی طبیعت کی لطیف روایت کے مطابق دھیمی موسیقی کا اہتمام کرتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ بہت سی ردیفیں جدید شعرا کے انداز کی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ اور کچھ پرانے شاعروں (میر ، حسرت اور فیض و فراق وغیرہ) کی ۔

اچھی غزل کو پرکھنے کا میرا ایک ذاتی معیار بھی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اور وہ یہ ہے کہ دورانِ مطالعہ جس شاعر کے بہت سے اشعار خود بخود دل میں سما جائیں اور بلاسعی و تکلف یاد ہو جائیں ہیں اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ کم از کم میرے اپنے تاثراتی معیار کے مطابق ، یہ میرے قلب کے ترجمان ہیں ۔ یہ بالکل قدرتی امر ہے کہ یہ محض ذاتی پسند کا معاملہ ہے مگر اس ذاتی پسند کے مسئلے کو بھی سرسری سمجھ کر ٹالا نہیں جا سکتا کیوں کہ اس ذاتی پسند میں گہری جاذبیت اور کشش شامل ہوتی ہے جو بلاسعی اور بے ساختہ ، بلکہ جبر سے قاری کے ذہن پر نقش ہو جاتی ہے ۔ شعروں کا از خود یاد ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس میں قاری سے زیادہ شاعر کی قوتِ تسخیر کا عمل دخل ہوتا ہے ۔ پھر یہ بھی ہے کہ اس میں شاعری کے اس بڑے حصے کا مطالعہ بھی شامل ہوتا ہے جس نے کم از کم یہ تو سکھا ہی دیا ہے کہ کس شاعر اور کس شعر کو یاد رکھا جا سکتا اور کیسے اشعار از خود دل میں بیٹھ جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ قبولِ شعر میں یہ قاری کا حصہ ہے مگر شعر کی اپنی تسخیر و تاثیر کے بغیر یہ بھی ممکن نہیں ۔ اگر اس معیار کی کوئی وقعت ہے تو اس اعتراف میں کوئی مضائقہ نہیں کہ واردات سرمد کے مطالعہ کے دوران مجھے بہت سے اشعار از خود یاد ہو گئے تھے جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس شاعری میں کوئی نہ کوئی جادو ضرور ہے ۔

ایک معیار اور بھی ہے اور وہ ذاتی تاثر سے ذاتی واردات سے متعلق ہے۔ میں نے اساتذہ سے سنا ہے کہ جو اشعار اتنے زبانزدِ عام ہو جاتے ہیں کہ خطاب و مدعا کا مقبولِ عام عنوان بن سکیں ان کی خوبی میں کلام کی گنجائش نہیں ہوتی ...... کلام کا عنوان وہی اشعار بن سکتے ہیں جن میں کسی تجربے کی آفاقی سچائی اور حسنِ بیان نے مدعا کو قبولِ عام کی سند دے دی ہو۔

اب میں وارداتِ سرمد سے اپنا ایک انتخاب پیش کرتا ہوں جس میں مذکورہ بالا معیاروں والے اشعار بھی شامل ہیں۔

تھے دور تو دل سے بھی قریں تھے
ہیں پاس تو کتنے فاصلے ہیں

ستم بھلانے پڑے آہ تھام لینی پڑی
بپاسِ خاطرِ احباب مسکرانا پڑا

محبت جھک گئی سجدے میں آخر
بجھا کر شمعیں علم و آگہی کی!

فنا انجامِ مسجودِ ملائک ۔۔۔ کوئی حد بھی ہے آخر دل کشی کی
بہت مشکل ہے انکارِ حقیقت ۔۔۔ حقیقت کون سمجھا گمرہی کی
کسی کا حسن بے پایاں بھی سرمد ۔۔۔ کرامت ہے مری صنعت گری کی

ہے باعثِ زیست بلکہ خود زیست ۔۔۔ اور یوں تو وہ سادہ سی نظر ہے
جو نقش ہے جاذبِ نظر ہے ۔۔۔ کیا جانیے کس کی رہ گذر ہے
ہر گام نئی تڑپ نیا جوش ۔۔۔ کیا جانیے کون ہم سفر ہے

تم جن راہوں کی منزل ہو، ہم ان راہوں پہ ہو لیں گے
تم چاہے کوئی آواز نہ دو، رستے کے نشاں خود بولیں گے

جہاں میں آئے تو جنت سی چیز کھو بیٹھے ۔۔۔ چلے جہاں سے تو اب نقدِ جاں لٹا کے چلے
چمن میں رہ کے کسی کا بھی دل نہیں توڑا ۔۔۔ گلوں کی قدر کی کانٹوں سے بھی نبھا کے چلے

وفا شعار تھے رسمِ وفا نبھا کے چلے　　ترے فقیر سوئے دار مسکرا کے چلے

کتنے طویل سلسلے وہم و گماں کے ہیں　　آباد ہے دل کا آئینہ غم دو جہاں کے ہیں

ہو اپنے آپ سے غافل کوئی تو کیا کیجے　　بشر کا دل تو خدا کی کتاب ہے ساقی

جب دل ہوا اداس، اداس جہاں ہو گیا اُدھر　　دل شاد کام تھا تو جہاں شاد کام تھا

غمِ جہاں کو غمِ جاناں بتاتے ہیں علاج　　کوئی بتاؤ یہ انداز خرد ہے کہ جنوں
داغِ الفت بھی بڑی چیز تھی ایسے ورنہ　　جو جلے اس دلِ ناداں کے نہایت تھے فزوں

مزاجِ دل نہ سمجھ پائے ایک عمر تلک　　تجھے بھلا بھی دیا تیرا انتظار بھی ہے

وہ مہرباں ہے کبھی نامہرباں ہے　　غافل وہ تیرے حال سے غافل کہاں ہے

تم کیا گئے کہ روٹھ گئے زندگی سے ہم　　اجڑے ہیں کس خلوص سے وابستگی سے ہم

ہنس ہنس کے سنے نالے بھی آہیں بھی فغاں بھی　　جس کو سنا ہے گل خنداں سے گلہ ہے

چلے بھی آؤ کہ پھر یہ سماں رہے نہ رہے　　دعا قبول فلک مہرباں رہے نہ رہے

ہے ربط تیرے تصور سے میرے سجدوں کو　　جبیں جھکے کی کوئی آستاں رہے نہ رہے

لٹا بھی دے کسی در پہ متاعِ دل ہمدم　　نہیں ہے دم کا بھروسہ یہ جاں رہے نہ رہے

مت بے وفا کہو دل خانہ خراب کو　　ایسا نہ ہو کہ تم بھی نہ دامن بچا سکو

دل کے آئینے میں تصویر سی ہے   آؤ نزدیک سے آکر دیکھو
وہ تو ہیں اب بھی رگِ جاں سے قریب   غم کو سینے میں چھپا کر دیکھو
دل کو آئینہ بنا کر دیکھو   زنگِ افکار ہٹا کر دیکھو

تہمتِ جرأت تری محتاط نگاہوں کا سکوت   دل میں پیوست ہوا تیرِ نظر کی صورت
غمِ دنیا، غمِ عقبیٰ، غمِ ہر سود و زیاں   کیا یہی ہے غمِ جاناں سے مفر کی صورت

اے چارہ گر نہ چھیڑ مرے دل کے زخم کو   اک یادگار یہ کسی مہرباں کی ہے
کیونکر نہ ہو فسانہ و حقیقت میں کشمکش   بیچے کی رہزن ہے جو کرتے بیاں کی ہے

ماحول نہیں ہے تیرا دشمن   ماحول پہ اعتبار کر لے
آئیں گے بہار کے زمانے   کچھ اور بھی انتظار کر لے

طلوعِ نو بھی آئی جا رہی ہے   محبت داستاں در داستاں ہے

ہر اک کے بس میں نہیں ہم نوائے نغمہ   بڑا خلوص ہے درکار گمرہی کے لئے
خیالِ دوست کے لمحوں کو جاوداں کر لے   سکوں نہیں ہے زمانے میں آدمی کے لئے

رکتا تو نہیں ہے وقت ہمدم   روئیں کہ جناب مسکرائیں

تھی کٹھن بے حساب راہِ حیات   تو مرے ساتھ ساتھ چلتا رہا

ہم کسی اجنبی راہ میں رک گئے   لوگ آتے رہے لوگ جاتے رہے
زندگی اک فریضہ تھا نبھتا رہا   زخم کھلتے رہے مسکراتے رہے
آپ تو خیر دامن چھڑاتے رہے   آرزو کے دیے جھلملاتے رہے

ابھی دیس سے ابھی لوٹ آئیں
کس سے پوچھیں کسی کا نشاں دوستو

یہ انتخاب میرا انتخاب ہے۔ دوسرے قاری اس باغ سے اور دوسرے پھول چن سکتے ہیں ــــ ان اشعار ہی سے یہ واضح ہو جائے گا کہ شاعر کی دلکشی میں بھی وہ عزم اور استقامت کے پیکر نظر آتے ہیں جو غم حیات کو نظر انداز کرتے رہے ہیں۔ عرفان بھی ہے اور آگہی بھی، ایمان بھی ہے اور ایقان بھی ــــ وہی ذوق نظر ــــ اور وہی طرز بیان جو سعدی کو زمانے کے اچھے غزل گوؤں میں مقام بلند کا مستحق قرار دیتا ہے ــــ کم نامی اور اس کے بعد یہ بلند مقامی اور یک اچنبھے کی بات ہے۔ کبیر احمد نے یہ دیوان مرتب کر کے سعد مشہدی ہی کا ثبوت نہیں دیا ادب پر خاص احسان کیا ہے۔

مطالعۂ میرؔ کے امکانات

نثار احمد فاروقی

میر تقی میرؔ کی شاعرانہ عظمت و رفعت کے سامنے سب نے عقیدت سے سر جھکایا ہے۔ انھیں اپنی زندگی کے ابتدائی دور ہی میں شہرت و مقبولیت نصیب ہوگئی تھی۔ وہ ایک مسلمہ روایت کے مطابق ۱۱۳۵ھ / ۲۳-۱۷۲۲ء میں پیدا ہوئے،[1] اور انہوں نے ۱۱۵۲ھ / ۱۷۳۹ء کے بعد کسی وقت دہلی میں سکونت اختیار کی اور یہاں سید سعادت علی امروہوی کی ترغیب و تحریک سے "زبانِ اردوے معلّیٰ شاہجہان آباد" میں شعر گوئی کا آغاز کیا۔[2] گویا خود میرؔ نے اپنے قول کے مطابق ۱۲-۱۰ سال کی عمر میں ریختہ کہا۔ ۱۱۶۵ھ / ۵۲-۱۷۵۱ء کے لگ بھگ جب وہ اپنا تذکرہ نکات الشعراء مرتب کر رہے تھے،[3] ان کی عمر ۳۰ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ خواجہ میر دردؔ کے بیان میں انہوں نے دردؔ کے والد بزرگوار خواجہ محمد ناصر عندلیب (متوفی ۱۱۷۲ھ / ۵۹-۱۷۵۸ء) سے اپنی ملاقات کا بھی حوالہ دیا ہے:

> "ایامے کہ فقیر بخدمت آں بزرگوار شرف اندوزی شدہ از زبان مبارکش می فرمود کہ
> میر محمد تقی تو میرِ مجلس خواہی شد۔ الحمد للہ والمنۃ کہ حرفِ آں سر سلسلۂ خدا پرستاں
> مؤثر افتادہ"[4]

گویا نکات الشعراء کی تالیف کے وقت تک خود میرؔ کو یہ احساس ہوگیا تھا کہ وہ "میرِ مجلس" ہوچکے ہیں۔ اُن کا کلام گلی کوچوں میں پڑھا جاتا تھا اور اُس کی اثر انگیزی کا یہ عالم تھا:

میرؔ دریا ہے سُنے شعر زبانی اُس کی
اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اُس کی

خاطر بادیہ سے دیر میں جاوے گی کہیں
خاک مانند بگولے کے اُڑانی اُس کی

ایک ہے عہد میں اپنے وہ پراگندہ مزاج
اپنی آنکھوں میں نہ آیا کوئی ثانی اُس کی

---

[1] اس کا مدار "نوادر الکلام" کی ایک عبارت پر ہے۔ تفصیل کلیاتِ میرؔ مرتبہ عبد الباری آسی کے مقدمہ میں ملے گی۔

[2] سید سعادت علی کے بارے میں ایک مضمون دہلی کالج میگزین میر نمبر میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں جو میری کتاب "تلاشِ میرؔ" میں بھی شامل ہے۔

[3] نکات الشعراء کے زمانۂ تالیف کے لیے ملاحظہ ہو مقدمۂ دستور الفصاحت۔ مرتبہ امتیاز علی عرشی، صفحات ۴۲-۴۶۔

[4] نکات الشعراء (طبع اول) ۱۴۵

مرثیے دل کے کتنی کہہ کے دیے لوگوں کو
شہرِ دلّی میں ہے سب پاس نشانی اُس کی

لیکن وہ ایک ایسے پُرآشوب دور میں پیدا ہوا کہ اُسے فراغِ خاطر کے ساتھ اپنے فن پر ریاض کرنے کے مواقع نہیں ملے۔ مغلیہ سلطنت کا زوال بہت ہی خلفشار، سیاسی ہیجان، ریشہ دوانیوں اور دسیسہ کاریوں کا عہد ہے۔ میر خود ان حالات کی بے رحمی کا شکار ہوا اور اُسے حوادث کے سیلاب میں ایک بے سہارا تنکے کی طرح بہنا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اُس نے اپنی سوانح عمری "ذکرِ میر" لکھی تو اپنے بارے میں ضروری اور بنیادی باتیں بھی نہیں بتائیں۔ تمام تر اپنے عہد کے سیاسی واقعات کی تاریخ بیان کر دی ہے۔ "ذکرِ میر" کو پڑھنے والا کوئی شخص بھی یہ محسوس کر سکتا ہے کہ اس کتاب کا نام "ذکرِ عہدِ میر" ہونا چاہیے تھا۔ اس میں میر اپنے دادا اور پردادا کے نام تک نہیں بتاتا، اپنی ولادت، تعلیم، تربیت، سکونت کسی بات کا ذکر وضاحت سے نہیں کرتا۔ والد کا نام بھی ایک موقع پر ضمناً بیان کر دیا ہے۔ وہ اگر کسی نواب کے دربار سے متوسل رہا تو اُس کا منصب کیا تھا؟ تنخواہ کتنی تھی؟ اُس نے کب اور کہاں شادی کی؟ کتنا بڑا کنبہ تھا؟ حلقۂ احباب کیسا تھا؟ اس کے مکروہات و مرغوبات کیا کیا تھے؟ غرض کوئی ایسا سوال سوچ لیجیے جس کا جواب کسی کی سوانح عمری میں ڈھونڈا جاتا ہے، وہ جواب آپ کو "ذکرِ میر" میں نہیں ملے گا۔ اس کے برعکس آپ دیکھیں گے کہ میر نے بہت سرسری انداز میں اپنے اجداد کے حجاز سے گجرات اور وہاں سے آگرہ کو منتقل ہونے کا بیان کیا ہے، پھر اپنے باپ کی صوفیانہ طرزِ زندگی کا ذکر اور اُن کے مختصر حالات و ملفوظات ہیں۔ یہ ملفوظات تمام تر میر کے خلّاق ذہن کی اختراع ہیں، اگر اُن کے باپ اوسط درجے کے درویش یا صوفی بھی ہوتے اور آگرے میں ان کی وہ مقبولیت ہوتی، جو میر نے بتائی ہے، تو اُن کا حال کہیں نہ کہیں ضرور ملتا۔ اُس عہد کے تمام تاریخی اور نیم تاریخی ماخذ اُن کے وجود سے بے خبر ہیں۔

والد کے انتقال کے بعد میر نے نادر شاہی حملے کا بیان کیا ہے اور یہاں سے جو تاریخی وقائع کا سلسلہ شروع ہوا ہے تو انتہا تک ہی لکھتے چلے گئے ہیں۔ کہیں کہیں درمیان میں سرسری اور ضمنی طور پر اُن کی اپنی شخصیت بھی نمودار ہو جاتی ہے مگر اس کی حیثیت کسی ڈرامے کے غیر اہم کردار کی ہے۔ پھر وہ وقائعِ سیاسی کے ملبے میں گم ہو جاتے ہیں۔

جس شاعر کے کلام میں ایسی خود پسندی اور اتنی انانیت ہو، وہ اپنی سوانح عمری لکھتے ہوئے خود کو اپنے ماحول میں اتنا گم کر دے، یہ عجیب طرح کا تضاد ہے۔ لیکن آپ اس پر غور و تامل کریں تو معلوم ہوگا کہ میر اُس ماحول کی پیداوار تھا، جو بے یقینی، تشکیک، ناپائیداری اور کس مپرسی سے عبارت تھا۔ اُس وقت حالات کی کشاکش شخصیتوں کو ابھارنے کی فضا نہیں رہی تھی —— میر کے ذہن و مزاج، شخصیت و افکار اور افتادِ طبع کو سمجھنے کے لیے اس سے بہتر پیرایہ اور اس سے زیادہ بلیغ ترسیل ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ اُس کے عہد کی سیاسی اور سماجی تاریخ کا آئینہ سامنے رکھ دیا جائے۔ تاریخ میں بڑی وسعتیں پنہاں ہوتی ہیں۔ یہ صرف سیاسی وقائع نہیں ہوتے۔ اس میں پورا سماج، اُس کی طرزِ بود و ماند، آدابِ خورد و نوش، پہننے اوڑھنے، رسوم، رواج، میلے، تہوار، عقاید، توہمات، سب کچھ شامل ہوتے ہیں۔ اسی طرح اقتصادی عوامل، تہذیبی رشتے، ثقافتی محرکات اور ان سب کا فعل و انفعال اور تاثیر و تاثر مل کر تاریخ کو معنی خیز اور عبرت انگیز بناتے ہیں۔ سیاسی حالات بھی اپنے سماجی پس منظر اور معاشرتی تعبیروں سے جدا ہو کر

سمجھ میں نہیں آتے۔

جس طرح میر کی زندگی اُس کے عہد کے سیاسی خلفشار اور سماجی معاشرہ میں گم ہو گئی ہے اسی طرح یہ دور اُن کی شاعری کا جُزو بن گیا ہے۔ خود میر کو بھی اس کا احساس ہے کہ وہ "دل اور دلّی" کے مرثیے لکھتا ہے۔ یہ "دلّی" دراصل اُس ہند ایرانی شائستگی کی علامت ہے جس کے آثار میر کی نگاہوں کے سامنے برباد ہو رہے تھے۔

پہلا تاریخی واقعہ جس کا حوالہ "ذکرِ میر" میں آیا ہے[1] وہ نادر شاہ کا حملہ (مارچ ۱۷۳۹ء) ہے۔ اس میں میر کے اوّلیں مربی نواب صمصام الدولہ کام آ گئے تھے۔ آخری واقعہ غلام قادر روہیلہ کا قلعۂ معلّٰی پر قبضہ کرنا اور پھر مادھو جی سیندھیا کے ہاتھوں گرفتار ہونا ہے[2] (مارچ ۱۷۸۹ء)۔ اس طرح ذکرِ میر میں پورے پچاس سال کی تاریخ کے اہم واقعات کا حوالہ ملتا ہے اور عجیب اتفاق ہے کہ سر جادو ناتھ سرکار کی مشہور کتاب "زوالِ سلطنتِ مغلیہ" (FALL OF THE MUGHAL EMPIRE) کی پہلی جلد بھی مارچ ۱۷۳۹ء سے شروع ہوتی ہے اور تیسری جلد کا اختتام مارچ ۱۷۸۹ء کے وقائع پر ہوتا ہے۔ اس طرح سرکار کی کتاب کو ہم "ذکرِ میر" کی تاریخی تفسیر کہہ سکتے ہیں۔ ان دونوں کتابوں کا تقابلی مطالعہ بھی اہم نتائج کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

میر جتنا عظیم شاعر ہے اُتنا ہی بڑا بدنصیب بھی ہے۔ غالب اور اقبال کو بہترین دماغ اور قلم مل گئے، اور اُن کی تشریح و تعبیر کے اتنے پہلو سامنے آ گئے کہ اب انہیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ میر عظمت شاعرانہ میں ان دونوں سے کم پایہ نہیں ہے، مگر اُس کی زندگی اور فن پر ابھی تک کوئی سنجیدہ تحقیقی و تنقیدی کام نہیں ہوا۔ مولانا عبدالباری آسی کا مرتبہ کلیاتِ میر اور اُس کا مقدمہ، مولوی عبدالحق مرحوم کے مضامین جو ذکرِ میر اور نکات الشعرا کے مقدموں کی صورت میں شامل ہیں، اثر لکھنوی کی مرتبہ مزامیر کا دیباچہ — یہ سب کام اچھے ہیں مگر ابتدائی اور اشاراتی ہیں۔ تنقیدِ میر کے موضوع پر ڈاکٹر سید عبداللہ کی کتاب "نقدِ میر" اُن کے متفرق مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ اگرچہ میر کے طالب علموں کے لیے بہت نافع ہے، مگر کوئی مربوط اور منظم مطالعہ یہ بھی نہیں ہے۔

خواجہ احمد فاروقی کی کتاب "میر تقی میر : حیات اور شاعری" اس موضوع پر پہلی باضابطہ کتاب ہے، جسے انہوں نے بقول خود سولہ سال تک خونِ جگر کھا کر اور اُس کا ایک تیار مسودہ کھو کر دوبارہ لکھا ہے۔ اس کتاب پر ساہتیہ اکاڈمی کا انعام بھی دیا جا چکا ہے۔ مصنف کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ انہوں نے میر کو "تاریخی پس منظر" میں دیکھنے اور اُس کی سماجی تعبیر کرنے کی طرف پہلا قدم اٹھایا ہے۔ لیکن اسے دیکھ کر بھی افسوس ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کتاب سے زیادہ نئی معلومات اُس تبصرے میں مل جاتی ہیں جو قاضی عبدالودود صاحب کی تصنیف "عیارستان" میں شامل ہے۔ فاروقی صاحب نے میر کے عہد کا مطالعہ تو خیر کیا ہی نہیں، کلیاتِ میر کو بھی اوّل سے آخر تک شاید ہی پڑھا ہو۔ اس کتاب میں نہ تنقیدی بصیرت ہے، نہ تحقیقی ژرف نگاہی۔ بس کمال ہے تو یہ کہ اتنی ضخیم

---

[1] میر کی آپ بیتی : ۹۲ ـ

[2] میر کی آپ بیتی : ۱۹۲ ـ

کتاب لکھ کر بھی اُنھوں نے میر کو ویسا ہی اچھوتا چھوڑ دیا ہے جیسا کہ وہ اِس کتاب کے چھپنے سے پہلے تھا۔

تصانیفِ میر کے اچھے اور قابلِ استناد متون بھی موجود نہیں ہیں۔

۱۔ **نکات الشعرا**:۔ تین بار چھپ چکی ہے[1] لیکن ضروری حواشی اور متعلقہ حوالوں کے ساتھ اُس کے ایک انتقادی متن کی ضرورت ابھی باقی ہے۔

۲۔ **ذکرِ میر**:۔ صرف ایک بار ۱۹۲۹ء میں چھپی تھی۔ ۱۹۵۷ء میں اس کا اردو ترجمہ شائع ہوا۔ مگر فارسی متن تمام علمی نسخوں سے مقابلہ کرنے کے بعد تیار ہونا چاہیے تھا۔ ابھی تک کسی نے اس کی اہمیت کا احساس نہیں کیا۔

۳۔ **کلیاتِ میر**:۔ متعدد بار چھپ چکی ہے۔ نسخۂ فورٹ ولیم تو میر کی زندگی میں مرتب ہوا تھا اور اُن کی وفات سے چند ماہ بعد شائع ہوا۔ مگر یہ بھی جدید اصولِ ترتیب کے مطابق نہیں ہے۔ اس نسخہ کو علمی مجلس دلی نے ۱۹۶۸ء میں چھاپا ہے۔ مگر اس کی دوسری جلد ہنوز باقی ہے۔ ایسا کوئی نسخہ ابھی تک مرتب نہیں ہوا جس میں دستیاب علمی نسخوں سے بھی مدد لی گئی ہو۔

۴۔ **فیضِ میر**:۔ دو بار چھپی ہے۔ ساتھ ہی ترجمہ بھی ہے۔ اسے پروفیسر مسعود حسن رضوی نے مرتب کیا ہے اور تصانیفِ میر میں یہی ایک ایسا رسالہ ہے جو سلیقے سے چھپ گیا ہے۔

۵۔ **دیوانِ فارسی**:۔ ابھی تک نہیں چھپا۔

۶۔ **دریائے عشق** (نثر): اس کا متن دلی کالج میگزین: میر نمبر میں شامل ہے۔

متون کی انتقادی ترتیب و تدوین کے بعد دوسرا مرحلہ اُن کی تاریخی بازیافت کا ہوتا ہے یعنی یہ طے کیا جائے کہ کون سا دیوان کب مرتب ہوا؟ اِس سے فنکار کے شعوری ارتقا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ جزوی طور پر کلامِ میر کی تاریخی ترتیب کا کام تذکروں کی مدد سے کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً نکات الشعرا میں میر نے اپنی جن غزلوں کا انتخاب کیا ہے اُن کے بارے میں یہ طے ہو جاتا ہے کہ وہ غزلیں ۱۱۶۵ھ/۵۲-۱۷۵۱ء تک کہی جا چکی تھیں۔ اسی طرح جو کلام "مخزن نکات"، "چمنستانِ شعرا"، "تذکرہ میر حسن" یا "طبقات الشعرا قدرت اللہ شوق" میں ملتا ہے وہ سب میر کے سفرِ لکھنؤ سے پہلے کا قرار پاتا ہے۔ اُن کا یہ سفر ۱۱۹۶ھ/۸۲-۱۷۸۱ء میں ہوا ہے۔ کلامِ میر کی تاریخی ترتیب کے موضوع پر ابھی تک کسی نے قلم اٹھانے کی زحمت نہیں کی۔ حالانکہ یہ مطالعہ اہم نتائج تک ہماری رہنمائی کر سکتا ہے۔

---

[1] مرتبہ حبیب الرحمٰن خاں شیروانی۔ مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق اور طبع سوم مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی (گورکھپور)

میر کا کچھ غیر مطبوعہ کلام بھی قدیم بیاضوں اور تذکروں میں محفوظ ہوگا۔ اُسے تلاش کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ چنانچہ میر کے بعض مراثی اور مثنویاں دریافت ہو کر چھپ بھی چکی ہیں۔

میر میں ایک جامع فرہنگ اردو اور فارسی کی تیار ہونا باقی ہے۔ اس سے اُن کے کلام کی لسانیاتی مطالعہ کرنے میں مدد ملے گی۔ میر سے پہلے کون سے الفاظ اور محاورات استعمال ہوئے ہیں اور کن الفاظ کو خود میر نے چلن دیا ہے؟ کون سے محاورات اُس نے فارسی سے ترجمہ کیے ہیں اور زبان کے بنیادی ڈھانچے میں کون سی تبدیلیاں کی ہیں جن کی وجہ سے اُس کی زبان اور اسلوب اس کے معاصرین و متقدمین سے ممتاز ہو گیا ہے۔ اُس کے اُسلوبِ نظم و نثر کا فنی اور تکنیکی مطالعہ و تجزیہ بھی ہنوز باقی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے بعض مضامین میں اس طرح کی کوشش ملتی ہے مگر یہ اور زیادہ سائنٹفک سطح پر ہونا چاہیے۔

میر کی غزل، قصیدہ، مثنوی اور دوسری اصناف سخن کا علیحدہ علیحدہ انتقادی مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اُن کی فارسی نثر و نظم پر ابھی بہت ہی کم لکھا گیا ہے۔ "ذکر میر" سوانح عمری کی تعریف پر کہاں تک پوری اُترتی ہے اور معاصر تاریخ کے ماخذ کی حیثیت سے کتنی قابل اعتماد ہے؟ دونوں موضوع ابھی تک تشنہ ہیں۔ مورخوں نے ذکر میر کی طرف بہت کم اعتنا کیا ہے۔ سرکار کی کتاب "زوال سلطنت مغلیہ" میں اس کا حوالہ کتابیات میں تو موجود ہے مگر متن کتاب میں اس سے استفادے کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ سب سے آخر میں میر کے افکار کا تجزیہ ہے۔ اُن کے مذہبی عقائد، صوفیانہ افکار، اخلاقی تصورات، فلسفیانہ نظریات، معاشرتی اور تہذیبی اقدار کس حد تک روایاتی ہیں اور کہاں اُن کی جڑیں گہرے علم و عرفان کی زمین میں پیوست ہیں؟ یہ سب جانے بغیر ہم میر کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے۔ جب ان سب پہلوؤں پر گفتگو ہو جائے گی تب میر کے اصل خط و خال اُجاگر ہوں گے اور اُسے کسی ابہام کے بغیر سمجھنا ممکن ہوگا۔

میر پر جو کام ہونا باقی ہیں انھیں ہم تنقید اور تحقیق کے، دو بڑے خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ تحقیق میر کے تین اہم پہلو ہیں: پہلا تو ذاتی اور سوانحی ہے۔ اس میں ابھی تک اُن کے خاندان کا مسئلہ ہی طے نہیں ہو سکا ہے۔ انھوں نے ذکر میر کے آغاز ہی میں لکھا ہے:

"میرے آبا و اجداد ملکِ حجاز کو خیر باد کہہ کر ...... ہندستان میں پہلے پہل دکنی ساحلوں کی طرف آئے تھے اور وہاں سے یہ پورا قبیلہ احمد آباد (گجرات) میں آکر بس گیا۔ پھر ان میں سے کچھ تو مستقل طور پر وہیں رہ پڑے اور کچھ نے آگے بڑھ کر تلاش روزگار کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ میرے جدِ اعلیٰ دارالخلافہ (اکبر آباد) آ گئے ..."[1]

میر نے شیخ عبدالعزیز عزت اور اُن کے فرزند سے اپنی "قرابت قریبہ" کا اعتراف کیا ہے[2]۔ اور عزت کے حوال میں لچھمی نراین شفیق اورنگ آبادی نے لکھا ہے:

---

[1] میر کی آپ بیتی (طبع اول، ۱۹۵۷ء) : ۳۱ -

[2] میر کی آپ بیتی (طبع اول، ۱۹۵۷ء) : ۲۵ - فارسی متن میں غلطی سے نام قمرالدین خاں چھپا ہے۔ صحیح فخرالدین خاں ہے۔ تاریخ محمدی : ۵۷ -

"نسبش بہ محمد بن ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما می رسد، یکے از اجداد او در تصاریف ایام از کہ معظمہ بہ ہند افتاد بقصبے آباے
او در قصبہ ذعبانی از توابع اکبرآباد توطن گرفت[1]"

عزت کا شجرہ خاندان اس طرح بنتا ہے:-

ملا عبدالرحیم اکبر آبادی
(ف ۱۰۹۹ھ)

- شیخ عطاء اللہ (ف ۱۱۱۰ھ)
- شیخ عبدالعزیز عزت[1]
(ف ۱۰۸۹ھ)
  - سعد الدین خاں
  (ف ۱۱۱۸ھ)
    - قطب الدین خاں
    - حفیظ الدین خان[4]
    مخاطب بہ سعد الدین خان
  - فخر الدین خان[3]
  (ف ۱۱۴۳ھ)

اگرچہ صحیح ہے کہ عزت اور میر تقی کے اجداد ایک ہی قبیلے سے تھے، تو میر بھی "شیخ صدیقی" ہوئے۔ وہ اپنے اور اپنے برادر خورد محمد رضی کے ناموں کے ساتھ التزاماً لفظ "میر" لکھتے ہیں۔ اپنے برادر علاتی حافظ محمد حسن یا اُن کے بیٹے محمد حسن کو میر نہیں کہتے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ محمد علی نے دوسری شادی کسی شیعہ خاتون سے کی ہوگی جو سیادت کا دعویٰ بھی رکھتی ہوں گی۔ اس بارے میں یہ لحاظ رکھنا چاہیے کہ تورانی میں سلسلۂ نسب ماں کی طرف بھی ملایا جاتا ہے اور سیادت کی حد تک ایرانیوں نے بھی اس رسم کو قبول کر لیا تھا۔ ایسے لوگوں کو زیادہ سادات کہا جاتا ہے۔ اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد ہندوستان میں شیعیت کے فروغ کا ایک دور آیا تھا۔ خود اورنگ زیب کے جانشین بہادر شاہ

---

[1] تین تذکرے (مرتبہ: نثار احمد فاروقی) شائع کردہ مکتبہ برہان دہلی ۱۹۶۸ء صفحہ ۴۴۔ قصبہ ڈبائی آج کل ضلع بلند شہر میں ہے اور علی گڑھ سے قریب ہے۔

[2] یہ عہد اورنگ زیب کی مشہور شخصیت ہیں اور اس زمانے کی تقریباً کل تاریخوں میں ان کا حال ملے گا۔

[3] ان کا حوالہ ذکر میر میں دو جگہ آیا ہے۔ مگر نام غلطی سے قمر الدین خاں لکھا ہے۔ نظر بظاہر یہ طباعت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ انہوں نے ستر سال کی عمر میں ۱۱۴۳ھ میں انتقال کیا۔ تاریخ محمدی: ۵۷

[4] نسخہ لاہور (مملوکہ پروفیسر محمد شفیع مرحوم) میں جو عبارت زائد ہے اور جسے ہم نے میر کی آپ بیتی کے دیباچے میں نقل کیا ہے۔ اس میں انہیں حفیظ الدین خاں کا حوالہ ہے۔ میر کی آپ بیتی ۱۱۲-۱۱۳۔

اول نے شیعی عقائد اختیار کر لیے تھے اور ماں کی طرف سے سیّد ہونے کا دعویٰ بھی کر دیا تھا۔ قصّہ یہ ہے کہ بہادر شاہ اوّل کی ماں ایک کشمیری راجا (راجوری) کی لڑکی تھی، جو اورنگ زیب کو نذر کی گئی تھی۔ اُس کے بارے میں یہ افسانہ گھڑا گیا کہ حضرت غوث الاعظم کی اولاد میں سے ایک نہایت مقدس بزرگ "سیّد شاہ میر کشمیر میں وارد ہوئے تھے اور راجا اُن کا اس حد تک معتقد ہو گیا تھا کہ اپنی ایک بیٹی اُن سے بیاہ دی تھی جس کے بطن سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ پھر سیّد شاہ میر حج کرنے کی غرض سے روانہ ہو گئے اور کبھی واپس نہ آئے۔ ان بچوں نے اپنے نانا کے پاس پرورش پائی اور جب شاہجہان نے راجا سے خراج طلب کیا تو اس نے یہی لڑکی بادشاہ کو "ڈولے" کی رسم کے طور پر بھیج دی جو شاہزادہ اورنگ زیب سے بیاہ دی گئی۔ اُس کا نام "کلمۃ النسا بیگم" تھا، مگر نواب بائی بیگم کہلاتی تھی۔ اس کے بطن سے بہادر شاہ اوّل پیدا ہوا۔ لہٰذا اس نے بھی سیّد ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ نواب بائی کے نسب کا یہ افسانہ بہادر شاہ اوّل کے عہد میں نہیں گھڑا گیا، بلکہ اورنگ زیب کے زمانۂ اقتدار میں بنایا گیا تھا اور اسی لیے سلسلۂ نسب بھی حضرت غوث الاعظمؒ سے ملایا تھا۔ زمانۂ مابعد میں اگر یہ بات شائع کی جاتی تو ظاہر ہے کہ یہ نسب کہیں اور جا کر ملتا۔

میرا خیال ہے کہ اتنی کم سنی میں شیعی عقائد کی طرف میر کا مائل ہونا تعلیم یا مطالعہ کا نتیجہ نہیں ہو سکتا بلکہ انھوں نے یا تو اپنی ماں سے قبول کیا[1] اور مادری سلسلے سے ہی وہ اپنے تئیں سیّد سمجھتے رہے۔ انھوں نے اپنے باپ سے جو کلمات منسوب کیے ہیں غالباً اُن میں سے دو چار فی صد کا انتساب بھی محمد علی عرف علی متقی سے درست نہیں ہے۔ لیکن یہ ملفوظات یا واقعات و اشارات بے مقصد بھی نہیں ہیں۔ ان کے لکھنے سے میر کا منشا کچھ اور باتوں کا ثابت کرنا ہے جنھیں ان واقعات کے بین السطور میں پڑھا جا سکتا ہے۔ مثلاً وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ میرے باپ بھی تفضیلی عقائد رکھتے تھے۔ اِس کے ثبوت میں ایک واقعہ تو انھوں نے یہ بیان کیا ہے کہ "ایک دن میرے والد نے اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں عرض کیا کہ میں نے آپ کی خدمت میں رہ کر اپنے عقائد جیسا کچھ درست کر لیے ہیں وہ آپ پر واضح ہی ہیں لیکن حاکمِ شام کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا "کسی دن بتائیں گے۔"

مدت بعد، ایک صبح، منہ اندھیرے، محترم خال خواجہ سرا شاہجہانی کی مسجد میں تشریف لائے۔ میرے والد کے ملازم ان کے وضو کے لیے پانی لانے کو دوڑے۔ مگر والد صاحب خود اٹھے، لوٹا لیا اور شاہ صاحب کو وضو کرانے لگے۔ اُس وقت شاہ صاحب نے فرمایا: "میاں علی متقی۔ تمام عمر اُس کا نام میری زبان پر نہیں آیا۔ اِس کے لیے میں خدا کا شکر کس طرح ادا کروں۔" میرے والد کہتے تھے خدا کا شکر ہے کہ اس کے بعد میں نے بھی کبھی اُس کا نام نہیں لیا۔"[2]

یہاں حاکمِ شام سے حضرت امیر معاویہؓ (ف ۶۰ھ / ۶۷۹ء-۶۸۰ء) مراد ہیں۔ میر نے غالباً اپنے باپ کے تفضیلی عقائد اختیار کرنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی میں خلفائے ثلاثہ پر حضرت علی کی فضیلت تو مانتا ہی ہوں، مگر حضرت معاویہ کے باب میں کیا عقیدہ رکھوں؟ یہ سم

---

[1] ایسا امکان یہ بھی ہے کہ سیّد امان اللہ جنھیں میر نے "منہ بولے چچا" کہا ہے، میر کے عقائد پر اثر انداز ہوئے ہوں۔ وہ بیانہ کے رہنے والے تھے، قدیم زمانے سے سادات کی بستی رہی ہے۔ بیانہ کے سادات کا ذکر ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی میں ملتا ہے۔

[2] میر کی آپ بیتی ۴۲ . . .

نہیں آیا کہ مرشد نے اتنی سی بات کا جواب دینے کے لیے مہلت کیوں طلب کی تھی۔ محرم خاں نوابیہ ... کی عمدہ حوالہ ہے
...دارِ مخاطب بہ محرم خاں (ف ۱۰۹۵ھ) ہے اور یہ غالباً شیعی عقیدہ رکھتا تھا۔ خواجہ حسن مودودی ... ۱۲۰۹ھ/۹۵-۱۷۹۴ء
کے ملفوظات "لطائف اکبری"[1] میں بھی ایک ایسی ہی عبارت ملتی ہے:

"ایک روز الٰہ آباد میں ایک شخص فقیر کے پاس آیا اور پوچھنے لگا کہ حضرت ... شام کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ میں نے کہا کہ اسے جو بھی آپ کہیں اس سے بھی وہ بدتر ہے مگر میں کچھ نہیں کہتا۔ مجھے اس سے کیا سروکار۔ میں اس کا نام اپنی زبان پر کیوں لاؤں؟ مجھے اس کا نام لینے سے کراہیت آتی ہے۔"

ملفوظات کے جامع خواجہ حسن مودودی کہاری ہیں[2]۔ جو میر کے ہم عصر بھی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ میر نے یہ واقعہ اُن سے سن رکھا ہو۔

اپنے باپ کی شیعیت کے اثبات میں دوسرا اشارہ انھوں نے "رویتِ باری" کا مسئلہ چھیڑ کر کیا ہے۔ شیعی عقیدہ یہ ہے کہ "لا تدرکہ العیون بمشاهدة العیان ولکن تدرکہ القلوب بحقائق الایمان" (خدا کو یہ ظاہری آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں ... اس کا دیدار حقائقِ ایمان کے ذریعے سے قلب کو ہوسکتا ہے۔)

میر نے لکھا ہے کہ ایک دن اسد اللہ نامی درویش نے اُن کے باپ سے سوال کیا کہ مجھے خدا کی رویت کے مسئلے میں کچھ تردد ہے۔ درویشوں کی دو جماعتیں ہیں۔ ایک کا خیال ہے کہ ایک دن ہم اُس حضرت ماہ (خدا) کو بدرِ کامل کی طرح (عیان و برملا) دیکھیں گے ... دوسرے گروہ کا عقیدہ ہے کہ اُس آفتاب کا دیکھنا انسانی بصارت کے امکان میں نہیں۔ والد نے فرمایا کہ ہم فقیروں کو کچھ فکر نہیں۔ سب پر یہ طے شدہ ہے کہ وہ عینِ کائنات ہے تو جدھر نظر ڈالتے ہیں وہ دکھائی دیتا ہے اور جس کسی میں دیکھنے میں جلوہ دکھاتا ہے، وہ معنی ہے اور ہر صورت میں جلوہ گر ہے۔ ناظر ہو تو اُس کا دیدار نصیب ہوتا ہے۔"

رویتِ باری کا مسئلہ بحث و تمحیص کے گرماگرم مسائل میں سے ایک رہا ہے۔ اسے معتزلہ نے اتنی ہوا دی کہ تسنن اور اعتزال کے درمیان حدِ فاصل بن گیا۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ رویت کے لیے جسمانیت، جہت اور لون وغیرہ لازم ہیں اور خدا ان سب سے منزہ ہے ... قرآن مجید میں ہے "لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ" (الانعام ۶/۱۰۳) اسی طرح حضرت موسیٰ نے خدا سے رویت کا مطالبہ کیا تو ارشاد ہوا کہ "لن ترانی" (الاعراف ۷/۱۴۳) ان کے مخالفین یعنی اشاعرہ کہتے تھے کہ قرآن میں نص صریح موجود ہے "وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ" (القیامۃ ۷۵/۲۳) اور حضرت موسیٰ سے خدا نے یوں تو کہا تھا کہ تم مجھے نہیں

---

[1] لطائف اکبری ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ اس کی تلخیص مفتی محمد رضا انصاری نے رسالہ برہان دہلی میں شائع کی تھی مذکورہ بالا اقتباس کے لیے دیکھیے برہان جلد ۶۷، شمارہ ۱ (جولائی ۱۹۷۱ء) ص ۵۱۔

[2] خواجہ حسن مودودی کے لیے دیکھیے انیس الاحباب (قلمی۔ علی گڑھ) طبقات سخن (قلمی) ورق ۱۷-الف، سفینۂ ہندی ۶۲-۶۳۔ مسرت افزا: ۵۷
خمخانۂ جاوید ۲: ۲۴۸، صحیفہ (لاہور) شمارہ ۳۹۔

دیکھ سکتے۔ یہ کب کہا تھا کہ "میں دیکھا نہیں جاتا"[1] یعنی حضرت موسیٰ نے بھی رؤیتِ باری کو محال نہیں سمجھا تھا ورنہ وہ خدا سے ایک امرِ محال کے لیے خود ہی مطالبہ نہ کرتے۔ وہ بہر حال معتزلہ سے زیادہ علم رکھتے تھے کہ کیا ممکن ہے اور کیا محال ہے[1]۔

جن احادیث سے رؤیتِ باری کا اثبات ہوتا تھا ان سے معتزلہ منکر ہو گئے اور جہاں حدیث کی صحت میں شک کرنے کی گنجائش کم نظر آئی وہاں کہتے تھے کہ حدیث ناسخِ قرآن نہیں ہو سکتی۔ اشاعرہ کا کہنا تھا کہ خدا "موجود" ہے اور ہر موجود کو دیکھنا ممکن ہے باقی رہیں رویت کی قیود، جہت زمان لون وغیرہ، یہ تو اس عالم کی شرائط ہیں۔ یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ آخرۃ میں رویت کس شان کی ہوگی[2]

اصل عقیدہ رؤیت باری کے مستحیل ہونے کا در اصل معتزلہ کا ہی ہے مگر اس پر اتنی جرح و تعدیل ہوئی کہ اسے "اہل سنت والجماعت" ہونے کی نشانی سمجھ لیا گیا۔ اسی وجہ سے شیعوں نے بھی مسلک معتزلہ اختیار کر لیا۔

میر نے اپنے والد کا جو نظریۂ توحید پیش کیا ہے وہ صرف رویت کی حد تک معتزلہ سے مطابقت رکھتا ہے۔ لیکن یہاں بھی میر نے "جواب گریز" دینے کی کوشش کی ہے۔ فلسفۂ وحدت الوجود کا معتزلہ یا امامیہ فرقہ سے کچھ سروکار نہیں۔ یہ مسلک اشاعرہ کا ہے۔ میر کے باپ رویت کے مسئلے میں تو معتزلی ہیں اور نظریۂ توحید میں اشعری، اور دوسرے امور میں شیعہ۔ یہ ایسا تضاد ہے جو میر کی سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا میر خود اس مسئلے کو پورے فلسفیانہ سیاق و سباق میں سمجھے ہوئے نہیں ہیں انھیں یہ معلوم تھا کہ مسئلہ رؤیت حضرات اہل سنت اور امامیہ کے درمیان وجہ امتیاز ہے لہٰذا انھوں نے ایک ایسا مکا مہ تیار کیا جسے دونوں طرح معنی پہنائے جا سکیں۔

یہاں ایک بات پر اور توجہ کر لیجیے۔ میر کے والد بزرگوار سے یہ سوال کس نے کیا ہے؟ یہ ایک درویش ہے جس کا نام اسد اللہ ہے۔ یہ میر کے والد کا پیر بھائی ہے۔ رہنے والا "کبود جامہ" کا ہے پیشہ "سیرابہ پز" یعنی نہاری پکا کر بیچنے والا۔ میر کے والد نے اپنے پیر سے کہا تھا کہ کوئی صورت ایسی ہو کہ مجھے اپنی موت کا علم پہلے سے ہو جائے۔ پیر نے کہا کہ جب تم اس "سیرابہ پز کبود جامہ" کو دیکھو تو سمجھ لینا کہ سالِ آیندہ تک زندہ نہ رہو گے۔ ۱۱۴۵ھ/۳۲-۱۷۳۱ء میں کسی وقت اسد اللہ نے خواب میں اپنے پیر سے ہدایت حاصل کی کہ تم فوراً آگرہ کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ میرے اور علی متقی کے درمیان ایک اشارہ ہے جو تمہارے پہنچنے سے سمجھ جائیں گے۔

اسد اللہ بہت معمولی حیثیت کا آدمی ہے۔ ہندوستان میں جس طرح صبح کو نہاری پکا کر بیچنے کا رواج ہے اسی طرح ایران میں "سیرابہ" پکاتے ہیں یہ نانبا سر اور آب کا مرکب ہے۔ خانِ آرزو نے اہلِ زبان سے تحقیق کر کے اس کے معنی لکھے ہیں۔ اس "کلہ و پاچہ" یعنی سری [illegible] ہوتی تھی۔ میر نے ایک لفظ چراغِ ہدایت میں نیا دیکھا جو عام کتب لغات میں نہیں ملتا اور جس کی تشریح

---

[1] الاشعری: مقالات الاسلامیین

[2] تفسیر الکشاف ۱، ۱۹۸

[3] ظہر الاسلام ۴/۹۲

[4] میر کی آپ بیتی۔ ص ۲

نے محض اہلِ زبان سے ذاتی تحقیق کرنے کے بعد کی ہے تو انہوں نے یہ لفظ استعمال کرنے کے شوق میں شاہ کلیم اللہ اکبر آبادی سے اسد اللہ کو بیعت کرایا۔ اب یہ ضروری تھا کہ اس کا ایران سے کچھ رشتہ پیدا کیا جائے تاکہ "سیر ابو یہ" کہلانے کا جواز پیدا ہو لہٰذا اُسے "کبود جامہ" کا باشندہ بنایا گیا۔ اس میں لباسِ درویشی سے لفظی مناسبت بھی اتفاق سے موجود ہے۔ یہ ایران میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ عموماً دیہات میں نہاری فروش کی دکان نہیں ہوتی۔ خیر یہ مان لیا کہ اُس کی دکان تھی۔ خود میر نے لکھا ہے کہ کساد بازاری تھی اور تجارت بالکل ٹھپ پڑی تھی[1]۔ اس عالم میں شاہ کلیم اللہ اکبر آبادی آگرے سے کبود جامہ تک اُسے خواب میں یہ حکم دینے پہنچ گئے کہ تمھیں علی متقی کو موت کی خبر دینے کے لیے آگرہ جانا ہے۔ یہی بشارت وہ خود آگرہ ہی میں علی متقی کو بھی دے سکتے تھے۔ اتنا سا رمز بنانے کے لیے ایک غریب نہاری فروش کو تقریباً ڈھائی ہزار میل پیدل چلا کر آگرہ بھجوانے کی کیا ضرورت تھی؟

مگر یہ نہاری فروش اسد اللہ اتنی علمیت کا آدمی بھی ہے کہ رویتِ باری جیسے دقیق فلسفیانہ مسائل پر علی متقی سے گفتگو کرتا ہے۔ آج بھی اچھے خاصے تعلیم یافتہ حضرات اِس مسئلے پر آسانی سے بحث نہیں کر سکتے۔ میر نے یہ قطعاً نہ سوچا کہ وہ کون سا مکالمہ کس کردار کی زبان سے ادا کرا رہے ہیں۔

اسی طرح کی ایک مثال وہ ہے کہ علی متقی ایک دن رنج کے عالم میں بہ امان اللہ کی موت کا حلوہ تقسیم کر رہے تھے کہ ایک "شکر رنگ" خوش وضع نوجوان جس کا نام احمد بیگ تھا، آیا اور "شکر انگور" کے کچھ دانے ہاتھ پر رکھ کر نذر گذرانے اور کہا کہ ابھی تازہ ولایت سے آ رہا ہوں اور حج کو جانے کا ارادہ ہے۔ اس شہر میں آیا تو آپ کی درویشی کا آوازہ سنا۔ مشتاقِ دیدار ہو کر خدمتِ سامی میں حاضر ہوا ہوں۔

یہ واقعہ بھی شاید ہی کبھی خارج میں واقع ہوا ہو۔ میر نے "شکر انگور" کا لفظ استعمال کرنے کے شوق میں پوری داستان وضع کر لی۔ یہ انگور کی ایک قسم ہے اور ایران سے مخصوص ہے۔ احمد بیگ اگر ایران سے حج کرنے کی خاطر نکلا تھا تو ظاہر ہے اس سفر میں آگرہ تک پہنچنے کے لیے کئی ماہ کا عرصہ درکار ہے۔ اتنی مدت تک انگوروں کا محفوظ رہنا ممکن نہیں۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اُس نے ان کی حفاظت کے لیے کچھ موسمی تدابیر اختیار کی ہوں گی تو اِس شبہ کا رفع کرنا کس طرح ممکن ہے کہ ایران سے عرب کی طرف جاتے ہوئے آگرہ کسی طرح درمیان میں نہیں آ سکتا تاوقتیکہ اُس کا سفر بالقصد نہ کیا جائے۔

میر نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک دن ماموں (سراج الدین علی خان آرزو) نے مجھے کھانے پر بلایا اور پھٹکارنا شروع کر دیا۔ میں بہت روٹھا اور کھانے میں ہاتھ ڈالے بغیر اُٹھ گیا۔ جب اُن سے نبھتی نہ دیکھی تو شام کو اُن کے گھر سے نکلا اور جامع مسجد کا رستہ لیا۔ اتفاق سے راہ بھول گیا اور قاضی حوض پہ آ نکلا جو وزیر الممالک اعتماد الدولہ کی حویلی کے پاس ایک چھوٹی سی نہر ہے۔ یہاں میں نے پانی پیا۔ کسی نہر یا حوض سے پانی پینا کوئی ایسی اہم بات نہیں ہے کہ اُس کا تذکرہ کسی سوانح عمری میں کیا جائے۔ یہاں "آب کشیدن" کے محاورہ کا استعمال مقصود تھا۔ اصل واقعہ اتنا ہوگا کہ حافظ محمد حسن نے خان آرزو کو کوئی خط لکھا ہوگا جس سے متاثر ہو کر اُنہوں نے میر کے ساتھ "دشمنوں کا سا"

---

[1] میر کی آپ بیتی ، ۷۰ ۔

برتاؤ شروع کر دیا۔ میر کے باپ کا جب انتقال ہوا تو میر ۱۰-۱۱ سال کے تھے اور اسی زمانے سے انھیں عسرت میں سرگرداں پھرنا پڑا۔ سوتیلے بھائی حافظ محمد حسن نے باپ کے ترکے کی تین سو کتابوں میں سے بھی میر کو اس کا حصہ نہیں دیا اور باپ کی زندگی ہی میں یہ کہہ دیا تھا کہ میر ان کتابوں کا کیا کریں گے۔ پھر میر دلی آئے تو یہاں بھی محمد حسن نے اپنے حقیقی ماموں خان آرزو کو لکھ بھیجا کہ میر تقی فتنہ روزگار ہے اس کی تربیت ہرگز نہ کی جائے — خان آرزو نے بھی ایک کم سن یتیم پر رحم نہ کیا اور بھانجے کے ورغلانے میں آگئے۔ آخر اس کے کیا اسباب ہو سکتے ہیں؟ یہ بات ملحوظ رہنی چاہیئے کہ ہمارے سامنے صرف میر کا بیان ہے اور محمد حسن یا خان آرزو کا بیانِ صفائی موجود نہیں ہے۔ یک طرفہ بیان پر جو فیصلہ کیا جائے گا وہ ظاہر ہے کہ منصفانہ نہیں ہو سکتا۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ محمد حسن اور آرزو کے سلوک کا سبب میر کا مذہب رہا ہوگا۔ اُنھوں نے اپنے ابتدائی ماحول ہی میں تشیع کے اثرات قبول کر لیے تھے اور یہ بات اُن کے باپ کی زندگی ہی میں ظاہر ہو چکی ہوگی کہ میر شیعیت کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ حافظ محمد حسن (ان کے نام کے ساتھ لفظِ حافظ ہی بتا رہا ہے کہ یہ شیعہ نہیں تھے اور میر نے بھی کہیں ان کے نام کے ساتھ لفظ میر نہیں لکھا) نے اسی وجہ سے باپ کی متروکہ کتابوں میں سے انھیں حصہ نہیں دیا۔ اُنہوں نے باپ سے بھی یہی کہا ہوگا کہ محمد تقی شیعہ ہو گیا ہے آپ کی سب کتابیں تصوف کی ہیں یا مذہب تسنن سے علاقہ رکھتی ہیں، میر ان کتابوں کا آخر کیا کرے گا؟ اسی لیے شاید انھوں نے خان آرزو کو بھی لکھ بھیجا ہو کہ میر کی تربیت نہ کریں۔[1]

اٹھارویں اور انیسویں صدی کے اسلامی ہند کی معاشرت میں مذہبی عقائد کی بہت اہمیت تھی۔ ایک ہی فرقے میں فروعی اختلافاتِ عقائد بھی اکثر افتراق کا سبب بن جاتے تھے۔ ہمارے موجودہ معاشرے میں بھی اہلِ سنت ہی کے دو گروہ "دیوبندی" اور "بریلوی" کہلاتے ہیں ان میں عقائد کی سطح پر کبھی کبھی اتفاق بہت مشکل ہو جاتا ہے اور اکثر یہ اختلافات شادی بیاہ یا دوسرے سماجی روابط کے قیام میں خاصی رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ میر اگر اُسی خاندان کے تھے جس سے عبدالعزیز عزت اکبرآبادی (ف ۱۱۸۱ھ) کا تعلق تھا تو یہ خاندان عقائدِ اہلِ سنت میں بہت راسخ رہا ہے۔ خود عزت نے شیعیت کے رد میں ایک کتاب "کشف الغطا" لکھی تھی اور وہ عملاً بھی اپنے عقائد کی ترویج میں کوشاں رہتے تھے چنانچہ ان کی ترغیب سے ایزد بخش رسا (ف ۱۱۱۹ھ) نے مذہبِ تشیع چھوڑ کر عقائدِ اہلِ سنت کو اختیار کیا تھا ایک ایسے خاندان کا فرد اگر اپنے عقائد تبدیل کرے تو اُس دور کی سماجی زندگی میں اُس کے لیے دشواریاں پیدا ہو جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے —

اس کے باوجود جب میر پر جنون کا حملہ ہوا تو عزت کے بیٹے فخر الدین خان کی بیوی نے اُن کے علاج پر بہت روپیہ صرف کیا تھا۔

میر نے بہت سی باتوں کو وضاحت سے نہیں لکھا۔ وہ یہ نہیں بتاتے کہ ان کے والد کی وفات کے بعد سارے ملوا نے اُن کے خلاف کیوں بغاوت کر دی اور اتنے کم سن بچوں (محمد تقی اور محمد رضی) کو زمانے کے رحم و کرم پر کیوں چھوڑ دیا؟ صرف میر

---

[1] حافظ محمد حسن کے بیٹے محمد محسن تھے جن کا حال نکات ... (طبع اوّل) میں ہے۔ تالیف تذکرہ کے وقت ان کی عمر بیس سال تھی۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ وہ ۵۰ کے لگ بھگ پیدا ہوئے تھے۔ اس سے حافظ محمد حسن کی عمر کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ محمد علی کی وفات (۱۱۴۲ھ) کے وقت وہ شادی شدہ اور صاحبِ ا

سے مبہم بیانات کی بنیاد پر دُوسروں کو ظالم اور بے رحم مان لینا قرینِ انصاف نہیں ہے۔ ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میر نے اُس زمانے میں کوئی معاشقہ بہت شدومد کے ساتھ کیا تھا اور اُس جذباتی ہیجان کی لہریں اُن کی شاعری میں بھی نظر آتی ہیں۔ جیسے وہ "جنون" بتا رہے ہیں وہ اسی "حضرتِ عشق" کی کرامات معلوم ہوتی ہیں۔ انھوں نے چاند میں ایک صورت کے نظر آنے اور اُس سے تنہائی میں گفتگو کرنے کا بیان کیا ہے۔ میر کی شاعری میں "چاند"، "چاندنی"، "مہتاب"، "مہتابی"، "گلِ مہتاب"[1]، "قمر" اور "ماہ" کے الفاظ اتنی کثرت سے آئے ہیں کہ انھیں دیکھ کر مجھے گمان ہوتا ہے کہ جن صاحبزادی سے میر عشق فرماتے تھے اُن کا نام بھی کچھ "چاندنی" یا "مہتاب" یا "قمر" وغیرہ رہا ہوگا۔ عالمِ جنون میں میر اس کا نام لے کر اُس کے تصور سے باتیں کرتے تھے اور یہ نام لے کر سوتے سے چونک اُٹھتے تھے۔ اس کی تاویل اپنی سوانح عمری میں وہ اس طرح کر رہے ہیں کہ "چاندنی رات میں ایک حسین پیکر . . . . کرۂ قمر سے میری طرف آتا اور مجھے بیخود کر دیتا تھا۔ جدھر بھی آنکھ اٹھتی اسی رشکِ پری پر پڑتی جس طرف دیکھتا اسی غیرتِ حور کا تماشا کرتا۔ میرے گھر کے در و بام اور صحن گویا ورقِ تصویر ہو گئے تھے یعنی ہر سمت وہی حیرت افزا چہرہ نظر آتا۔ کبھی چودھویں کے چاند کی طرح سامنے، کبھی سیرگاہِ دل میں محوِ خرام اگر گلِ مہتاب پر نظر پڑ جاتی تو جان اور بھی بیقرار ہو جاتی۔ ہر رات اُس پری پیکر سے ملاقات ہوتی اور ہر صبح اُس کی جدائی میں وحشت . . . . چار مہینے تک وہ گلِ شب افروز نت نئے انداز دکھاتا رہا اور اپنے فتنۂ خرام سے قیامت ڈھاتا رہا . . . . . وہ خیالی صورت ہر وقت نظروں کے سامنے رہتی اور اُس کی مشکیں زلفوں کا دھیان سر میں"

خان آرزو سے اُن کے تعلقات شاید اسی معاشقے کی وجہ سے خراب رہے ہوں۔ ورنہ ان سے اتنی سنگ دلی کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ ایک یتیم بچے کی نہ صرف پرورش سے گریز کریں بلکہ وہ بیمار ہو تو اُس کی دوا دارو سے بھی کوئی دلچسپی نہ رکھیں۔ اس موقع پر فخر الدین خاں کی بیوی کا ہمدردانہ رویہ بھی ایک عورت کی نفسیات کا اشاریہ ہے جو ایسے حالات میں فطری طور پر دلسوزی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ اُس دَور کے سماج کا گہرا مطالعہ اسی لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر یہ راز سمجھ میں نہیں آسکتا کہ اُس زمانے میں کسی شریف گھرانے کی لڑکی سے معاشقہ کرنا آسان کام نہیں تھا اور اس کا صریح مطلب پورے ماحول کی مخالفت کو دعوت دینا ہوتا تھا۔ اب میر کے اس معاشقے کی تفصیلات کا دستیاب ہونا تو ممکن ہی نہیں، لیکن میر کے سوانح کی دلکشی اور رنگینی میں اضافے کی خاطر اگر کچھ اشارات بھی مل سکیں تو لیسا غنیمت ہے، اور میرا خیال ہے کہ یہاں داخلی شواہد کا اصول سب سے زیادہ معاون ثابت ہوگا۔

میر نے اپنے اولین استادوں میں میر جعفر علی عظیم آبادی اور سید سعادت علی امروہوی کا تذکرہ کیا ہے یعنی وہ خان آرزو کو اپنا استاد بھی تسلیم کرنا نہیں چاہتے۔ میر جعفر ایک مجہول شخصیت ہیں اور ایسا گمان ہوتا ہے کہ وہ شیعی مسلک رکھتے ہوں گے۔ سعادت علی

---

[1] گلِ مہتاب کو ہندی میں "چاندنی" کہتے ہیں۔

[2] میر کی آپ بیتی: ۹۷۔

[3] میر کی آپ بیتی: ۹۷–۹۶۔

کے بارے میں ہمیں معلوم ہے[1] کہ وہ امروہہ کے مشہور بزرگ حضرت سید شاہ شرف الدین نقوی الواسطی معروف بہ "شاہ ولایت" کی اولاد میں تھے اور امروہہ کے محلہ حقانی میں بستے تھے[2]۔ شاہ ولایت ابن بطوطہ کے معاصرین میں سے ہیں ان کی اولاد میں بعض نے مذہب امامیہ قبول کر لیا تھا اور بعدت کا تعلق اسی شاخ سے تھا۔

میر نے خان آرزو کے تلمذ سے اپنی برأت کا اظہار کرنا بھی شاید اسی اختلاف عقائد کی وجہ سے ضروری سمجھا ہو۔ ورنہ خود میر کی فارسی تحریریں اس کی گواہ ہیں کہ انہوں نے فارسی کی حد تک جو کچھ سیکھا ہے وہ سب خانِ آرزو کا فیضان ہے۔ اور نکات الشعرا میں جو خانِ آرزو کی زندگی میں مرتب ہوا ہے، انہوں نے خود بھی آرزو کو "استاد و پیر و مرشد" لکھا ہے[3]۔

میں نے ۱۹۵۷ء میں "ذکرِ میر" کا اردو ترجمہ "میر کی آپ بیتی" کے نام سے شائع کیا تھا، اس وقت مجھے یہ احساس ہوا کہ "ذکرِ میر" میں جو فارسی محاورات استعمال کیے گئے ہیں وہ فارسی کی مروجہ کتبِ لغات میں عام طور سے نہیں ملتے اور خانِ آرزو کی مرتبہ "چراغ ہدایت" میں لازماً موجود ہیں اور ان میں سے بھی اکثر محاورات کے لئے خانِ آرزو نے لکھا ہے کہ اہلِ زبان سے تحقیق کر کے لکھا گیا۔ غور سے مطالعہ کرنے پر اندازہ ہوا کہ "ذکرِ میر" کا پہلا تہائی حصہ میر نے اس طرح لکھا ہے کہ ایک ہی سلسلے کے محاورے اپنی کتاب کے ایک پیراگراف میں استعمال کر لیے ہیں اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ کتاب چراغِ ہدایت اُن کے سامنے کھلی ہوئی رکھی ہو۔ مثلاً یہ جملے دیکھیے:

"دستے بہم رسان کہ ادیسندد، جانے پیدا کن کہ باو پیوندد۔ دست بدست بہ از خود رہ کہ ازیں راہ، ایں راہ مُدِّر دست، دست بدست است۔ زینہار دست بر دست منہ، کہ چوں دستہا خشک شوند، راہ بست است"[4]

دوسرے مرتبہ پر میر "دست" کے محاوروں پر یوں ہاتھ صاف کیا ہے:

"دست دستِ ظالماں بود۔ دست کجی سے کرد۔ دست پشتی سے نمود و زند دستِ چوب بر سرے کشیدند، دست بہ بار دے زباں میرسید، مد تیغ با می آختند، دستگاہ می ساختند، از دست شہریاں ہیچ نمی آمد زیرا کہ دست و دلِ ایشاں سرد شدہ بود، ہا کسے دست پا چہ می شد و کسے دست بزیر سرِ ستوں می نمود......"[5]

---

[1] حضرت شاہ ولایت کے لئے ملاحظہ ہو: مقاصد العارفین (قلمی)، مؤلفہ حضرت شاہ عضدالدین جعفری۔ نسخہ مملوکہ راقم نیز نخبۃ التواریخ، تاریخ اصغری، تذکرۃ الکلام اور تاریخ سادات امروہہ۔

[2] اصغر حسین، تاریخ اصغری۔

[3] نکات الشعرا، (ترجمہ میر معز فطرت)۔

[4] ذکرِ میر/۲۹ - میر کی آپ بیتی/۵۵۔

[5] ذکرِ میر صفحہ ۸۰۔ میر کی آپ بیتی/۱۲۲۔

میر کی آپ بیتی کے پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے وقت میر کی فارسی نگاری کے اس پہلو پر تفصیل سے بحث کرنے کا موقع نہیں تھا۔ میں نے صرف مقدمہ میں اس کی طرف اشارہ کر دیا تھا کہ ذکر میر کے محاورے چراغ ہدایت کے سوا کسی دوسری لغت میں شاذ ہی ملتے ہیں۔ اب اس موضوع پر دوسرے ایڈیشن میں خاصی تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب نے ایک موقع پر یہ لکھ دیا تھا کہ "میر نہ منصف ہیں نہ راست گفتار۔ ان کا حافظہ بھی زیادہ مضبوط نہیں"۔ بعض حضرات نے اس ریمارک پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور اسے میر کے استخفاف پر محمول کیا۔ اس ناگواری کا ایک سبب تو مشرق کی روایتی "میر پرستی" ہو سکتی ہے اور دوسری وجہ میر پر علمی تحقیق کا فقدان بھی ہے۔ اگر ہمارا علم میر کے بارے میں اتنا محدود نہ ہوتا جتنا کہ وہ آج ہے تو اس ریمارک پر خفگی کا اظہار نہ کیا جاتا۔

میر نے اپنی سوانح عمری کے آغاز ہی میں لکھا ہے کہ ان کے دادا کو "فوج داری نواح" اکبرآباد کا عہدہ مل گیا تھا اور یہ کہ انھوں نے ملازمت کے زمانے ہی میں گویا راہ ہی میں انتقال کیا۔ دادا کا نام انھوں نے ظاہر نہیں کیا۔ "فوجداری نواح" خاصا بڑا عہدہ تھا اور آج کل کے ڈپٹی کمشنر کے برابر تھا۔ اگر ان کے دادا واقعی "فوجدار نواح" تھے تو ان کا زمانہ اورنگ زیب کا عہد رہا ہوگا اور عہد عالمگیری کے بیشتر امرا کا حال تاریخوں میں دستیاب ہے۔ ان میں کوئی شخصیت ایسی نہیں ہے جسے نواح اکبرآباد کی فوجداری کا عہدہ حاصل ہو اور اس پر جد میر ہونے کا گمان کیا جا سکے۔

پہلے یہ اندازہ کر لیجیے کہ "فوجدار" کس حیثیت کا حاکم ہوتا تھا۔ شکر اللہ خان خاکسار (ف ۱۱۰۸ھ) جو میرزا عبدالقادر بیدل (ف ۱۱۳۳ھ) کے مربی اور ممدوح اور نواب عاقل خان رازی (ف ۱۱۰۸ھ) کے داماد تھے، ۱۰۹۸ھ میں فوجدار نواحی جہاں آباد یعنی نواح دہلی کے فوجدار تھے اور ان کا زمانہ وہی ہے جو میر کے دادا کا عہد ہونا چاہیے۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اگر جد میر اس عہدے پر تھے تو وہ کس مرتبے کے حاکم ہوں گے۔

اسی طرح بہادر شاہ اول کے عہد میں چین قلیچ خاں گورکھپور کے فوجدار تھے۔ یہ ہفت ہزاری تھے۔ نواب محمد امین خان بہادر جو بعد کو محمد شاہ کے وزیر اعظم ہوئے پہلے مراد آباد کے فوجدار تھے۔ عہد عالمگیری میں نواب ارادت خان واضح "نواح اورنگ آباد" کے فوجدار تھے۔ انھیں ارادت خان خطاب اور ہفت صدی ہزار ذات منصب ملا ہوا تھا۔

فوجداری کا عہدہ عموماً منصب کے ساتھ ملتا تھا یعنی خطاب بھی عطا ہوتا تھا اور جاگیر بھی۔ میر کے دادا ہفت ہزاری نہ سہی ہزاری منصب پر بھی ہوتے تو ممکن نہ تھا کہ اس دور کے معاصر تاریخوں میں ان کا حوالہ نہ آتا۔ دوسرا نکتہ یہ کہ وہ بقول میر حالت ملازمت میں مرے تھے۔ مغلیہ طریق کار کے مطابق اگر کوئی حاکم سرکاری ملازم خدمت کی حالت میں فوت ہوتا تھا تو قاضی کا مصدقہ وراثت نامہ داخل ہونے پر اس کے ورثا کے نام پوری تنخواہ جاری ہو جاتی تھی یا اس متوفی کے بیٹے کو وہی خطاب اور منصب دے دیا جاتا تھا۔ اگر میر کے دادا نواح اکبرآباد کے فوجدار ہوتے تو ان کے انتقال پر یہ منصب محمد علی عرف علی متقی کو اور پھر خود میر کو ملنے میں بظاہر کوئی مانع نہ ہونا چاہیے تھا۔ میرا خیال ہے کہ میر نے اپنے دادا کا عہدہ بڑھا کر بیان کیا ہے۔

---

[1] دلی کالج میگزین، میر نمبر (مرتبہ نثار احمد فاروقی) ۱۹۶۲ء

دوسری مثال حافظے کی کمزوری کی بھی دیکھ لیجیے۔ انہوں نے ایک درویش احسان اللہ کی خدمت میں اپنی حاضری کا بیان لکھا ہے۔ اس میں ہے کہ "شہر کے صوبیدار کا مصاحب آیا اور اُس کی درخواست پیش کی کہ نصرت یار خان قدم بوسی کے لیے حاضر ہو رہا ہے ... جب صوبیدار دروازے پر آیا ہاتھی سے اُتر پڑا اور دوڑ کر شرف پابوسی حاصل کیا اور پانچ اشرفیاں نذر کیں ...[1]"

اِس میں ایک عبارت سے مترشح ہے کہ میر امان اللہ اس ملاقات کے وقت وہاں موجود تھے اور میر بھی اُن کے ساتھ گئے تھے۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ ہدایت اللہ رکن الدولہ نصرت یار خان سادات بارہہ میں سے تھا۔ یہ نواب شہامت خان کا بھتیجا اور ہفت ہزاری منصب دار تھا۔ اس نے ۲۱ رمضان ۱۱۴۴ھ کو ساٹھ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اس کی وفات سے تقریباً ایک سال کے بعد میر کی ولادت ہوئی ہے۔ نصرت یار خان نام کا دوسرا کوئی صوبیدار آگرہ میں نہیں ہوا۔ میر نے اُس کا نام سن رکھا ہوگا لیکن ذکر میر لکھتے وقت انہیں یہ دھیان نہ رہا کہ جس گورنر کو وہ درویش کی خدمت میں حاضر کر رہے ہیں وہ اُن کی ولادت سے پہلے ہی مر چکا تھا۔

اسی طرح بایزید نامی ایک فقیر سے ملاقات کرنے گئے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ "ایک دن عصر کی نماز کے بعد اُن سے ملاقات کرنے گئے۔" یہ لکھتے لکھتے حافظے نے دھوکا دیا اور چار سطروں کے بعد لکھتے ہیں "اسی دوران میں عصر کا وقت ہو گیا ہم اٹھے اور اُن کے ساتھ نماز پڑھی۔"

"ذکرِ میر" کے سلسلے میں دو باتیں خاص طور سے بحث و تمحیص کا مطالبہ کرتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کتاب میں جو تاریخی واقعات آئے ہیں وہ میر نے اپنی معلوماتِ عامہ سے فراہم کیے ہیں یا اُن کا کوئی ماخذ تحریری بھی رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ ذکر میر کا زمانۂ تالیف کیا ہے؟ ساتھ ہی یہ تعین کرنا بھی ضروری ہے کہ تاریخی ماخذ کی حیثیت سے ذکرِ میر کا پایۂ استناد کیا ہے۔ اس کی بحث میں نے میر کی آپ بیتی طبع ثانی کے مقدمہ میں کی ہے۔

(۲)

یہ اُن امور کی طرف کچھ سرسری اشارے ہیں جن کا تعلق میر کی سوانح اور اُن کے عہد کے وقائع تاریخی سے ہے۔ ان کا تذکرہ اسی لیے کیا گیا کہ اس امر کو ثابت کیا جا سکے کہ میر کی تحقیق اور اُس کے بارے میں معلوم حقائق کی تاویلات میں ابھی بہت کچھ بحث و نظر کی گنجائش باقی ہے۔

میر کا کلام سمجھنے کے لیے اُس عہد کے معاشی اور سماجی ڈھانچے کو اچھی طرح دیکھنا بھی ضروری ہے۔ اور اس کے لئے سب سے پہلے حکومت اور سرکاری نظام کا علم ہونا چاہیے۔ میر اور سودا کی شاعری میں ایسی اصطلاحیں بکثرت استعمال ہوئی ہیں جن کے مفہوم کو اب سمجھنا ممکن نہیں رہا ہے تاوقتیکہ تاریخ کی کتابوں سے رجوع کیا جائے۔ مثلاً سرکاری عہدوں میں بخشی، میر بخشی، اور اس عہدے کے دوسرے مراتب یا احدی' والاشاہی، یساول، کمیں پوش، میر دہ، نجیب، بارگیر، مینگ باشی، قدر انداز، ذوالقدر، ڈہلیت، سہ بندی وغیرہ۔ اسلحہ میں بان، جزائر، رہکلہ، غازی خان، شیر دہان، زنبورک، فوجی اصطلاحوں میں التمش، برغار۔

---

[1] میر کی آپ بیتی : ۵۸

چنڈاول، تول وغیرہ۔ اسبابِ شاہی میں تختِ رواں، کوکبہ، اختہ بیگی، ماہی مراتب، چتر، توغ یہ ایسے الفاظ ہیں کہ عام کتابوں میں بھی ان کی قابلِ اطمینان تشریح نہیں ملتی۔ اگر اُس سماج کی کوئی مفصل تاریخ لکھی جائے یا اُس عہد کے کسی نشکار کی زندگی کا گہرا مطالعہ کرنا مقصود ہو تو ان الفاظ کا پس منظر ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

معاشی ڈھانچے پر گفتگو کرتے ہوئے یہ ملحوظ رکھا جائے کہ آج کی حکومتوں کے زیرِ انتظام جو محکمات ہیں وہ اُس زمانے میں تمام تر عوام کی ذمہ داری تھے۔ تعلیم اور صحتِ عامہ کا محکمہ بھی سرکاری نہیں تھا۔ صنعت و حرفت کے کارخانوں کا بھی حکومت سے سروکار نہیں تھا، بلکہ بادشاہِ وقت اپنی ضروریات کی چیزیں عوام کے کارخانوں سے حاصل کرتا یا سرکاری کارخانہ جات میں ہنرمندوں کو ملازم رکھا جاتا تھا۔ جاگیرداروں کی مالی حالت خراب ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اہلِ حرفہ بے روزگار ہو جاتے تھے۔ شہر آشوب کا موضوع اسی لئے مختلف پیشہ وروں کی بے روزگاری اور کساد بازاری ہوتا ہے کہ ان لوگوں پر حکومت کی اقتصادی کمزوری کا براہ راست اثر پڑتا تھا۔

میر کے عہد میں عام لوگوں کے لیے معاشی ذرائع یہ تھے:

۱۔ سرکاری منصب و جاگیر۔ ۲۔ زراعت۔ ۳۔ صنعت و حرفت۔ ۴۔ سپاہ گری۔

میر کے عہد میں جاگیرداروں کا حال بہت ابتر ہو چکا تھا اور آئے دن کی یورشوں اور خانہ جنگیوں نے زراعت اور صنعت و حرفت کو بھی بہت نقصان پہنچایا تھا۔ سپاہ گری ایسا پیشہ تھا جسے آج کل کی اصطلاح میں سرکاری ملازمت کی برابر سمجھا جا سکتا ہے مگر مرکز کی کمزوری سے یہ بھی "نیم سرکاری" اور پہلے سے زیادہ غیر یقینی ہو گیا تھا۔ چند امرا تو خود مختار ہو کر اور اپنی الگ فوج سے کر مرکز سے دور جا بیٹھے تھے۔ باقی امیروں کا حال کسی جواری کا سا تھا جو ہمہ وقت طالع آزمائی میں مصروف رہتا ہے۔ اُن کی سپاہ کو بروقت تنخواہ نہیں ملتی تھی تو وہ ڈیوڑھی پر دنگا کرتے تھے۔

ان امرا میں دراصل اقتصادی شعور کی کمی تھی اور یہ اپنی فوج کی تنظیم بھی کسی پلان کے تحت نہیں کرتے تھے۔ اپنے روپوں کی وصولیابی کی فکر ہی میں ایک فوجی اپنے سردار کی حفاظت آخر وقت تک کرتا تھا کیوں کہ اُس کے مارے جانے کا مطلب کئی کئی ماہ کی بقایا تنخواہ کا بھی سوخت ہو جانا تھا۔ سپاہی کے گھر والے اس عرصے میں بنیے سے اُدھار لے کر کھاتے رہتے تھے اور آہستہ آہستہ گھر کا سب ساز و سامان بنیے کے پاس رہن ہو جاتا تھا۔ اگر سپاہی مالِ غنیمت لے کر واپس آ گیا تب تو اُس کا بڑا حصہ بنیے کی اصل اور سود میں چلا گیا ورنہ گھر والوں کے لیے فاقہ کشی کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔

اُس وقت فوج میں رجمنٹ بھی نہیں تھے۔ ہر سپاہی کسی منصب دار کا نوکر ہوتا تھا اور وہ منصب دار اپنے سے بڑے امیر سے الحاق کر لیتا تھا۔ اس طرح چھوٹی بڑی ٹکڑیاں مل کر پوری فوج بن جاتی تھی مگر اُس فوج کی ایک متحدہ کمان نہیں تھی ہر گروہ کا سپاہی صرف اپنے آقا ہی کا حکم مانتا تھا اور اُسی کا مفاد دیکھتا تھا۔ اُس کے کمزور ہونے کی صورت میں وہ باغیانہ سرگرمیاں بھی اختیار کر لیتا تھا اور اس سے خلق آزاری کا آغاز ہوتا تھا جس کی مثالوں سے ذکرِ میر بھی خالی نہیں ہے۔

ہر منصب دار جو فوج رکھتا تھا اُسے مختلف کاریگر اور ماہرینِ فن بھی رکھنے ہوتے تھے مثلاً لوہار، بڑھئی، جراح، نعل بند وغیرہ۔

ایک سہ ہزاری امیر کے پاس کم سے کم دو ہزار سوار اور کچھ تعینہ ضرور ہوتے تھے۔ معاشی بدحالی کے زمانے میں یا اس منصب دار کا زوال ہونے پر یہ سب بے روزگار ہو جاتے تھے۔ میر اور سودا کی شاعری میں جہاں معاشی زبوں حالی کا رونا ہے یا اس عہد میں اہلِ حرفہ کی ناقدری کا بیان آیا ہے اُس کا عالمانہ تجزیہ ہو ہی نہیں سکتا جب تک ان سب کی صحیح پوزیشن اور اُس سماج میں اُن کے رول کا پورا علم نہ ہو۔

ایک اور پہلو رسوم و رواج کا ہے۔ یہ رسمیں کچھ تو مذہبی عقائد سے پیدا ہوتی ہیں اور کچھ کا سرچشمہ عوام کے میل جول میں تھا۔ جاگیردارانہ عہد کی بہت سی رسمیں اور رواج اب ختم ہو چکے ہیں بہت سے توہمات بھی دم توڑ گئے ہیں مگر شاعری میں ان کا حوالہ موجود ہے۔ لباس، گفتار، کھانے پینے اور رہنے سہنے کے آداب سمجھنے سے بھی کلام کا صحیح پس منظر اور اُس کا مفہوم ذہن نشین ہوتا ہے۔ اس کی ضرورت صرف میر کی شاعری کی بازیافت ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ عمومی طور پر اس عہد کے شاعروں کا کلام ان تفصیلات کے بغیر سمجھ میں نہیں آتا۔ میر کی شاعری میں چونکہ سماجی روابط کے حوالے بکثرت اور اُن حالات کا عکس زیادہ شدت سے آیا ہے اور اُنہوں نے طویل عمر بھی پائی ہے اور اتفاق سے وہ پوری عمر اسی زوال آمادہ دور میں صرف بھی ہوئی ہے اس لیے اُنھیں ایک علامت مان کر اس طرح کا جو مطالعہ کیا جائے گا وہ دوسرے شاعروں کو سمجھنے میں بھی اتنا ہی مفید ہوگا۔

قاطع برہان کی حمایت میں

(مولوی رجب علی ارسطو جاہ کا ایک معرکہ آرا مکتوب)

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری

سید رجب علی نام، نعمان بہادر ارسطو جاہ خطاب اور انگریزی کا نام سید علی بخش۔ ارسطو جاہ جگراؤں ضلع لدھیانہ پنجاب میں ایک معزز سنہ ۱۲۱۱ہجری مطابق سنہ ۱۷۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی کتب درسیہ ریاست مالیر کوٹلہ میں ختم کیں۔ ۲۵ برس کے سن میں دہلی گئے اور تین سال تک مفتی صدر الدین خان آزردہ کے مدرسے میں مزید تعلیم حاصل کی۔ تحصیل علوم کے بعد تلاش روزگار کے سلسلے میں بھوپال گئے اور وہاں ملازمت کی۔ کچھ عرصہ کے بعد کپورتھلہ گئے یہاں ۳۰ روپے ماہوار کے نوکر ہوئے۔ ایک دن راجہ کپورتھلہ نے اپنی ریاست کے معاملے میں تمام اہل کاروں سے صلاح و مشورہ کیا لیکن انھیں پوچھا نہیں۔ مہاراجہ کے اس طرز عمل پر ارسطو جاہ خفا ہوئے اور فوراً ملازمت کی پوشش اتار دی۔ اُن ہی ایام میں لارڈ لارنس گورنر پنجاب انبالہ میں مقیم تھے۔ ارسطو جاہ یہاں تشریف لائے اور صاحب ممدوح کے دفتر میں ۴۰ روپے ماہوار پر ملازمت کی۔ قسمت کی یاوری دیکھیے کہ ایک دن لارڈ لارنس کو عرب سے ایک خط آیا۔ اور وہ زبان عربی میں تھا صاحب بہادر نے اپنے منشیوں سے اس خط کا ترجمہ کروانا چاہا تھا لیکن کوئی قابل آدمی نہ ملا۔ جو اس کا جواب ان کے منشا کے مطابق لکھتا آخر کار ارسطو جاہ نے قلم برداشتہ اس کا جواب لکھا۔ صاحب بہادر اس جواب سے اس قدر مانوس ہوئے کہ انہوں نے ارسطو جاہ کو میر منشی کے عہدہ پر ممتاز کیا اور انھیں مبلغ پانچ ہزار روپیہ بطور انعام دیا۔

ارسطو جاہ اپریل سنہ ۱۸۵۳ء میں اس جلیل القدر عہدے سے مستعفی ہو کر وطن آ گئے۔ سنہ ۱۸۵۴ء میں وہ لارڈ لارنس ریذیڈنٹ راجستھان کی ملاقات کے لئے گئے۔ اس زمانے میں ان کے صاحبزادے مولوی سید شریف الحسن خان صاحب ریذیڈنٹ کے میر منشی تھے۔ ارسطو جاہ پٹیالہ، انبالہ، دہلی، ریواڑی اور جے پور کی راہ سے بھاؤ پور کے متصل ریذیڈنٹ کے لشکر میں جب کہ وہ دورہ پر تھے پہنچے اور پھر جے پور سے رخصت ہو کر براہ ٹونک و اکبر آباد وغیرہ دلی میں آئے یہاں مولوی حیدر علی (متوفی ۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۱ء) صاحب منتہی الکلام سے مباحثے اور مناظرے ٹھہرے۔

ارسطو جاہ دلی میں کچھ عرصے کے لئے قیام کر کے جگراؤں گئے۔ دریں اثنا ہنگامہ غدر رونما ہوا۔ اور وہ برطانوی حکام کی ہدایت پر انبالہ پہنچے اور وہاں سے فوج لے کر دلی آئے اور دلی کو تسخیر کیا۔

ارسطو جاہ سنہ ۱۲۷۸ھ مطابق سنہ ۱۸۶۲ء میں سکھر، کراچی اور بمبئی کے راستے سے حج کرنے کے لئے گئے۔ یہ سفر تقریباً دو سال کی مدت میں ختم ہوا۔

ارسطو جاہ کو مذہب سے بڑی واقفیت تھی۔ اسی لئے مولانا اور مولوی کہلاتے تھے۔ انھیں لکھنؤ کے مشہور و معروف مجتہد مولانا حامد حسین صاحب قبلہ فردوس مآب (متوفی سنہ ۱۳۰۶ھ) سے گہرا رابطہ قائم تھا۔ مولانا موصوف سنہ ۱۲۸۴ھ میں ان کی دعوت پر جگراؤں

گئے تھے۔

ارسطوجاہ عربی اور فارسی کے ایک جیّد عالم تھے۔ ائمہ معصومین کی مدح میں شعر بھی کہتے تھے۔ ان کی تصانیف یہ ہیں:۔

کشف العظاؔ، تفسیر سورۂ ہل اتیٰ وسراکبر، تفسیر سورۂ والفجر، وافادات علیہ۔

ان کا انتقال ۷۵ برس کی عمر میں ۲۰ جمادی الآخر ۱۲۸۶ھ ہجری مطابق ۱۸۷۰ء میں جگراؤں میں ہوا۔ تاریخ وفات یہ ہے ۔

جاہ است لقب پس ارسطو　　مولہ بنجاب اہل ایماں
از دہر چو رفت گفت جعفر　　راہی جناں رجب علی خاں

ارسطوجاہ نے دو فرزند چھوڑے۔ دونوں علم و فضل سے آراستہ تھے۔ مولوی شریف الحسین خان شریف العلماؔ اور مولوی شریف الحسن [1][2]

ریاض الجناں میں ارسطوجاہ کی شان میں ایک قصیدۂ طولانی درج ہے۔ چند شعر یہ ہیں ۔

ہزار حیف کہ از سر حوادث دہر　　نماند سایہ آں ابر خلق را بر سر
ہزار سال اگر چرخ چرخہا بہ زند　　نیامدش بہ نظر آں چناں بلند اختر
یتیم پرور و مسکین نواز و مہماں دوست　　ملک طبیعت و قدسی نہاد و نیک سیر
وظیفہ اش ہمہ یاد خدائے عزوجل　　وتیرہ اش ہمہ احیائے دین پیغمبر
ہمیشہ ماند بصدق و صفا مروج دیں　　کہ داشت نیت صادق بہ مذہب جعفر

ارسطوجاہ اور مرزا غالب کے درمیان گہرے تعلقات قائم تھے۔ آپس میں خط و کتابت بھی جاری تھی۔ مرزا ان کا نام نہایت ادب و احترام سے لیتے تھے۔ جب احباب کے نام خط لکھتے تھے تو ارسطوجاہ کی خیریت بھی دریافت کیا کرتے تھے۔ مرزا یکم دسمبر بروز جمعہ ۱۸۴۸ء مطابق ۴ محرم ۱۲۶۵ھ کو منشی جواہر سنگھ جوہر کے نام خط کے اختتام میں لکھتے ہیں کہ:۔

" نیز سلام من لبشوق تمام بخدمت سیدی و مولائے مولوی رجب علی خاں بہادر سلمہ اللہ تعالیٰ رسانند[3]"

مرزا غالب ارسطوجاہ کی غیر معمولی قابلیت اور جوہر شناسی کے مداح تھے۔ انہوں نے موصوف کی تصانیف خاص کر "تفسیر سورہ ہل اتیٰ" اور "تفسیر سورۂ والفجر" کی بے حد تعریف کی۔ وہ مارچ ۱۸۵۲ء کے ایک خط میں ارسطوجاہ کو ان کی تصانیف اور اپنی کتاب مہر نیمروز کے بارے میں لکھتے ہیں۔

" خدائے دادگر را سپاس و بخت خداداد را آفرین کہ خواجہ خستہ نوازند۔ رہی پرورست بابستگان کمند سری دارد با آویختگان فتراک نظرے۔ فرد ۔

---

[1] ارسطوجاہ کے حالات تذکرۂ بے بہا صہ ۱۴۰ - ۱۵۸ مولفہ سید محمد نوگانوی سے ماخوذ ہیں۔

[2] کلیات نثر غالب صہ ۱۷۵ مطبوعہ نولکشور ۱۸۶۸ء

خود پیش خود کفیلِ گرفتاریِ منست
ہر دم بہ پرسشِ دلِ مایوس می رسد

آہنگ آنست کہ نامہ بنگارش ساز دادہ آید۔ وہنوز ندانستہ ام کہ زخمہ برین تار بچہ ہنجار رود ان توان کہ در داز پردۂ شکفام سخن کدام نور دانرہم باید کشود۔ یارب آن نیایشنامہ کہ در ماہ مارچ سال یک ہزار و ہشتصد و پنجاہ و یک عیسوی روان داشتہ ام تا مارچ سال دگر بعد از نہ نامہ ہرزہ عنوان و نہ فرستند کہ عبارت از موعظہ با قرامت ابرواہا آن نامہ خو دانہ فراوانی بار مضامین شوق بر بر ندگان آن مایہ گرانی کرد کہ آن بسکروی گراں مایگاں یعنی بریدان ڈاک انگریزی راہی بطول دو صد کردہ جز لغزش یکساں تراشتند برید۔ بارے گلۂ دیر رسیدن عرضداشت آں چناں دل نشین نیست کہ سپاس زود رسیدن ایں منشور عطوفت کہ بہ بیدوں پاسخ نگار آمد آں ما از یاد بزود داد دانست کہ دزنگرانی نیز بار گرانی نہ داشت۔ اگر گاہے ناگاہے در اندیشہ گذشتہ باشد کہ خدام مخدوم پاسخ چرا نہ نگشتند۔ خود را بداں فریفتہ باشم کہ چوں نگارش من در گزارش سپاس روحانی ارمغانی یعنی تفسیر سورۂ ہل اتی بود۔ ہر آئینہ جواب نہ داشت۔ ایں بار از میرزا خاور نیز سپاس پذیرفتم کہ بسخن دلیری کرد۔ وبندہ را پیش خواجہ نام برد تا یاد آوردند۔ بروان داشتن نامہ روان پرور ندہ۔ زمان رفتہ است کہ جزوی از تاریخ تاجداران تیمرخاندنیہ بنظرگاہ آں والی ولایت ولائے مرتضوی فرستم ذرہ بہ در را مہر گستر آں سواد جزوی چند بیش نیست۔ بعد حمد و نعت و منقبت و مدح والی عصر و سبب تالیف کتاب کہ آئین نامہ طرازاں ہنگامہ آراست از کشورکشایان تا نصیرالدین سلطان ہمایون بسخن راندہ ام۔ باقی داستان بہ فرو است۔ امید کہ اگر مرگ اماں دہد بندۂ فرمان پذیر بزود فرستادن آن اجزا از بندگی و فرماں پذیری نشان دہد اوراق تفسیر سورۂ والفجر در سر آغاز ایں ماہ نظرفروز آمد و سواد آں بیاض از راہ مردمک دیدہ بہ سویدائے دل فرو رفت نشگفت کہ فیصلہ ازاں باب در ورقی جداگانہ رقم پذیرد و غازۂ عارضِ نامۂ اعمال من گردد۔"[1]

ارسطو جاہ کا خط قاطع برہان کی حمایت میں

ایام غدر میں مرزا اپنے گھر میں دروازہ بند کرکے بیٹھ گئے۔ ان کے پاس دساتیر[2] اور مولوی محمد حسین تبریزی ثم دکنی کی مشہور

[1] کلیات نثر غالب ص ۱۱۳ ۔

[2] دساتیر کی شرح غالب کے دوست مولوی نجف علی خان نے ۱۸۶۵ء میں "سفرنگ دساتیر" کے نام سے شائع کی تھی۔ اس کا اشتہار اودھ اخبار

(بقیہ حاشیہ آئندہ صفحے پر)

فرہنگ برہان قاطع کا ایک ایک نسخہ موجود تھا۔ مرزا نے بقول حالی جب برہان کو اول کر سرسری نظر سے دیکھنا شروع کیا تو پہلی ہی نظر میں کچھ بے ربطیاں سی معلوم ہوئیں۔ پھر زیادہ غور سے دیکھا تو اکثر لغات کی تعریف غلط پائی ...... طریقہ بیان اکثر بھونڈا اور اصول لغت نگاری کے خلاف پایا۔ انہوں نے یادداشت کے طور پر اعتراضات قلمبند کئے اور آخر کار ایک کتاب مرتب ہو گئی جس کا نام قاطع برہان رکھا گیا۔[1]

مرزا ۴ اکتوبر ۱۸۶۱ء بروز جمعہ کو مرزا تفتہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"برہان قاطع کی اغلاط بہت نکالی ہیں۔ دس جزو کا ایک رسالہ لکھا ہے اس کا نام قاطع برہان رکھا ہے۔ اب اس کے چھپنے کی فکر ہے۔ اگر یہ مدعا حاصل ہو گیا تو ایک جلد چھاپے کی تم کو بھیج دوں گا۔ ورنہ کاتب سے نقل کروا کر تم کو ایک جلد بھیج دوں گا۔ بہت سودمند نسخہ ہے۔"[2]

قاطع برہان پہلی مرتبہ ۱۸۶۲ء میں مطبع نولکشور لکھنؤ سے چھپی۔ امیر اللہ تسلیم نے تاریخ طباعت کہی ؎

مرتب شد چو این نادر کتابے — ز فکر غالب عالی جنابے
زہے غالب شہ ملک معانی — خداوند جہان نکتہ دانی
گر از وقت انجامش [illegible] — خیال آمد پے تاریخ سالش
نوشتم مصرعی شرح مطالب
عجائب معجزہ تحقیق غالب[3]

قاطع برہان کے چھپنے پر ادبی حلقوں میں گویا قیامت برپا ہو گئی۔ اور بقول غالب معتقدان برہان قاطع برچھیاں اور تلواریں پکڑ پکڑ کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ معترضین نے قاطع کے جواب میں کئی کتابیں لکھیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) نمبر ۱۳ جلد ۷ ص ۲۱۹ مورخہ ۲۸ مارچ ۱۸۶۵ء مطابق ۹ شوال ۱۲۸۱ھ روز سہ شنبہ میں ان الفاظ میں چھپا تھا۔

"اہل خرد کو مژدہ ہو کہ کتاب دساتیر کی شرح تصنیف کی ہوئی اشرف الفضلا مولوی نجف علی خان صاحب قاضی زادہ جھجر کی جن کی تصنیف ہر علم میں قابل تحسین ہے۔ چنانچہ شرح غیر منقوط ان کی تعلقات حریری پر قریب سو جز کے ہے۔ علی الخصوص دری اور پاژندی زبان کو موبدان زردشتی سے سیکھا۔ طبع ہو کر مع عبارت دساتیر کے۔ نسخہ دساتیر کی احتیاج باقی نہ رہے۔ واقع شہر دہلی بلی ماروں کے محلے میں حکیم محمد حسن خان مرحوم کے مکان میں نواب محمد حسین خان عرف چھوٹے مرزا صاحب کے پاس موجود ہیں۔ شرح اس کی قیمت کی محصول ڈاک کے ایک روپے دو آنہ ہے۔ جن صاحبوں کو مطلوب ہو قیمت بھیج کر طلب فرما دیں اور لطف اٹھا دیں۔"

[1] یادگار غالب ص ۲۳ مطبوعہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

[2] اردوئے معلی حصہ دوم ص ۲۱ مطبع مجتبائی ۱۸۹۹ء

[3] نظم ارجمند ص ۳۵۶۔

قاطع القاطع (مولوی امین الدین پٹیالوی) محرق قاطع (مولوی سعادت علی)
ساطع برہان (مرزا رحیم بیگ) مؤید برہان (مولوی احمد علی)
مندرجہ بالا تصانیف کے جواب میں درج ذیل کتابچے غالب اور ان کے حامیوں نے لکھے۔
دافع ہذیان (مولوی نجف علی خان) لطائف غیبی[1] (سیف الحق) سوالات عبد الکریم (غالب)
نامۂ غالب (غالب)۔
تیغ تیز (غالب)
مرزا غالب نے قاطع برہان مزید اضافوں کے ساتھ دوسری مرتبہ دسمبر ۱۸۶۵ء میں چھپوائی اور اس کا نام درفش کاویانی رکھا۔ مرزا اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں :۔

"قاطع برہان کہ صنعت نقش بند خیال من است۔ نہ نامۂ اعمال من است کہ در ایں جہاں من خواہند سپرد۔ ہمدریں جہاں خواہد ماند۔ در دل فرود آمد کہ بمقامے چند کلامے چند بیفزایم۔ و ایں مجموعہ را کہ قاطع برہان نام نہادہ ام سپس درفش کاویانی خطاب دہم ۔

نازم بجز ام کلک و طرز رقمش
ناماست نہ تیزی بدم تیغ دمش

چوں اسم کتاب قاطع برہاں بود
گردید درفش کاویانی علمش "

غالب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اور ابھی بہت کام کرنا باقی ہے۔ کاش کوئی صاحب قلم قاطع برہان، قاطع القاطع، محرق قاطع، ساطع برہان، شمشیر تیز تر، لطائف غیبی، تیغ تیز اور دافع ہذیان وغیرہ کا مطالعہ کرنے کے بعد درفش کاویانی کا متن مرتب کر کے شائع کرتا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مرزا نے جو اعتراضات برہان قاطع پر کئے ان کی حمایت ایرانی مصنف رضا قلی خاں کی فرہنگ ناصری سے بھی ہوتی ہے۔ قاطع برہان کی اہمیت و افادیت پر حالی نے اپنی تجی تلی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

" اگر انصاف سے دیکھا جائے تو قاطع برہان کے لکھنے سے مرزا کی سلامتی طبع اور ذوق صحیح کا کافی ثبوت ملتا ہے۔ اور جیسا کہ وہ (مرزا) ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ :

" فارسی زبان کے قواعد و ضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزین ہیں جیسے فولاد میں جوہر۔"[2]

اسلوب احمد انصاری نے قاطع برہان کا مطالعہ بنظر غائر کیا تھا۔ وہ مرزا کی اس تصنیف سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ انہوں نے کتاب کی حمایت

---

[1] آزاد (آب حیات ص ۹۱۵) حالی (یادگار غالب ص ۱۵) مالک رام (ذکر غالب ص ۲۹) اور عرشی رامپوری (مکاتیب غالب ص ۳۰) کی رائے میں لطائف غیبی مرزا غالب کی تصنیف ہے۔ [2] یادگار غالب ص ۴۳ ۔

میں مرزا کو ایسی قابل قدر تصنیف پر آفرین کہی - اور ایک معرکہ آرا اور معلوماتی مکتوب مورخہ ۱۱ اپریل ۱۸۶۵ء کو غالب کے نام لکھا جو ۲ مئی ۱۸۶۵ء مطابق ۵ ذی حجہ بروز سہ شنبہ ۱۲۸۱ھ کو اودھ اخبار لکھنؤ میں شائع ہوا تھا - یہ خط لب منقد کے برابر ہے اور اس کا مو راقم الحروف کی نظر میں ابھی نہیں گزرا ہے - ماہرین غالبیات کے لئے اس کا مطالعہ کرنا بے حد سودمند ہوگا - ذیل میں خط من و عن درج کیا جاتا ہے -

* اودھ اخبار - نمبر ۱۸ ، ۲ مئی ۱۸۶۵ء مطابق ۵ ذی حجہ ۱۲۸۱ھ روز سہ شنبہ جلد ۷ صفحہ ۲۹۰ کالم ۲ - جناب مرزا اسد اللہ خان بہادر غالب دہلوی -

نقل مکتوب جناب معلی القاب زبدہ اولاد حضرت خاتم المرسلین بحر مواج علم و یقین مولانا و بالفضل اولینا ارسطو جاہ مروی سید رجب علی خان بہادر بنام نامی فخر المتاخرین وارث منطق ایران زمین رشک عرفی و فخر طالب مولانا اسد اللہ خان غالب -

سرنامہ

بعونہ تعالیٰ در شاہجہان آباد بسامی مطالعہ فخر زماں و زمانیاں نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ
اسد اللہ خان بہادر غالب تخلص عرف مرزا نوشہ سلمہ اللہ والبقاء موصول باد - راقم آثم
سید رجب علی عفی عنہ از جگراؤں یازدہم اپریل ۱۸۶۵ء ٹکٹ چسپانیدہ شد -

عبارت مکتوب

ہوالمستعان فی کل حین و آن　　　لائح خاطر اشراقات مظاہرہ

تاباں اختر سپہر فصاحت درخشاں نیر سمار بلاغت فروغ انجمن ہمہ دان مسلم الثبوت ہفت زبانان آرایش وسادۂ فارسیاں مصداق ان من الشعر لحکمۃ وان من البیان لسحرا - دریں زماں غالب الشعرا مرزایان مرزا حصل اللہ مرامہ مقامہ - بعد از سلامی کہ مد سینش از ایوان کیواں برتر باشد و شوقی کہ در وسعت آباد چرخ اطلس گنجد یاد کہ قاطع برہان را از آغاز انجام دیدم - سوگند برابطہ کہ دلہائے ایمانیاں باہم دگر از روز ازل محکم و مشید کردہ اند از تحقیقات و تدقیقات آں یگانہ گوہر دریاے معنی حظی برداشتہ ام کہ خامہ از شرحش بوجوہ قاصر سیما افادات طبع نقاد و ذہن وقاد کہ در خاتمہ لقالب عبارات سحر آیات ریختہ اند و نغ نکات فرزانہ سرمزدم عبدالصمد و شعر نظیری کہ حسب حال خود نوشتہ اند ــــ ز فلک آمدہ بودی بو مسیح الخ خواندہ - دلم بدرد آمد و بج آنکہ اگرچہ ہرزہ گرداں کوئے سفاہت را کہ سعادت مساعد ایں طائفہ نشدہ باشد - راہ عند بیہودہ باشند محل تردد نیست کہ تہ از خورشید درخشاں مانع افاضہ انوار نتواند شد و کم مایہ دوں فطرت کہ از عروج براوج افلاک معانی بمراحل پست بودہ باشد - بسان یکمل سرسبزگی خود با سرو باغ ارم دعویٰ برابری کند - در نگاہ مایہ شناساں چقدر رسوا شدہ باشد - حسب حال آں علوی خیال ایں ست -

خاقانی آں کساں کہ براہ تو می روند　　　زاغ اند و زاغ را روش کبک آرزوست
گیرم کہ مار چوبہ کند تن بشکل مار　　　کو زہر بہر دشمن و کو مہرہ بہر دوست

حرف ناشناس بے سعادت اعتراض بر بو الہوس کردہ شگفت - بو الہوسی بر روئے کار آوردہ - شرح عبدالواسع ہانسوی بر بوستہ

ہم نہ دیدہ۔ او لفظ بوالہوس را از خط نسخ گفتہ۔ بل بلا داد معنی بسیار نوشتہ۔ دامن قاتل من دوست و داماں آل رسول را بنادرستی ترکیب عربی و فارسی از تہمت بوالہوس بمعنی کنیت پاک داشتہ۔ نامثل وحید العصر فرید الدہر مولوی نجف علی خان رفع ہمزہ سرائی معترض در شرح معنی آیات چنانچہ می بایست کردہ و سیف الحق ربطالعفریکی شمشیری کشیدہ کہ از زبانہ اش سنگ سخا را خاکستری شود۔ حال مورد چہ بودہ باشد۔ در قاطع برہان اکثر بیان غلطی ہمچناں دیدم کہ زعفراں زار خندہ حضار را بوجہ آرد۔ و تاب طاقت خواندن نماند منجملہ آں در لفظ قافلہ سالار رفت و بعد ش انچہ نوشتہ اند معاذ اللہ نسبت بہ وفات حضرت قاب قوسین مرتبت صلوات اللہ علیہ و آلہ لا حول و لا قوۃ الا باللہ۔ قلم ایں وقت ہم از بیانش از دست می افتد۔ عجب خبطی و طرفہ مالیخولیائے است۔ استغفر اللہ نعت ما ہوجی شمہ مختصر تفصیلی کہ دریں باب کردہ اند۔ بجا کہ اگر طابع کتاب ایں صنعت را بکار بردہ ایں شعر بحالش صادق ہے

من و مرغ من ہر دو آں چناں مجہول
کہ ہر دو را دو مرغ خوب می باید

وغیرہ برہمہ ہویدا است۔ دریں بارہ جواب آں جناب صحیح کہ بہ زبان ہرزہ دیوان کوہ قاف باشد۔ از فرط خندہ سرشارم پس لغزش قلم را معذور خواہند داشت۔

دو غلطی کہ ازاں مکرم در تمام ایں کتاب در اشتقاق داشتراک بوقوع آمدہ۔ بر ذیل نشند و ذو ندور است۔ قابل التفات نیست۔ چرا کہ در کتاب <u>درۃ الغواص فی اغلاط الخصوص</u> غلطی ہائے علمائے متبحر درج است۔ منجملہ آں لفظ <u>جدہ</u> بضم جیم است کہ دو منزل ایں طرف از مکہ معظمہ زادہا اللہ شرفاً و تعظیماً بر ساحل دریائے شور است و اکثر علما و فضلائے عرب و عجم و ہند جدہ بفتح جیم بتلفظ می آرند و می گویند کہ قبر حضرت حوا در آں جاست کہ نسبت بہ انسان جدہ است۔ بفتح جیم باید خواند و عند التحقیق غلط است و ایں کتاب نزدم موجود و از ایں جنس دراں مندرج۔ لیکن کثرتی کہ دکنی در اغلاط بکار بردہ مصداق الاکثر حکم الکل است و طرفہ کہ آں مکرم سر رشتہ لغات در ہمہ برہان قاطع را بہ براہین متین قطع کردہ اند۔ ناطقہ را یارا سئے شرحش نیست کہ خط و عداقی است۔

دل من داند و من دانم و داند دل ما

للہ درکم والسلام علیکم و قلبی لدیکم۔ چہارم ذی قعدہ سنہ ۱۲۸۱ھ مطابق یازدہم اپریل سنہ حال مقام جگرانو ضلع لودھیانہ۔

سالک کی اداریہ نگاری کا اوّلین دَور

ڈاکٹر عبد السلام خورشید

عبدالمجید سالکؔ کی صحافتی زندگی کا آغاز مجلاتی صحافت سے ہوا - ۱۹۱۴ء میں "فانوسِ خیال" کے نام سے ایک ادبی رسالہ جاری کیا - وہ بند ہوا - تو لاہور آ کر شمس العلما مولوی سید ممتاز علی کے ادبی معاون بنے "تہذیب النسواں" اور "پھول" کی ادارت کرتے رہے - سید امتیاز علی تاج نے ۱۹۱۰ء میں "کہکشاں" کے نام سے ایک علمی و ادبی مجلہ نکالا - تو اس میں گمنام کے قلمی نام سے افسانے، نظمیں غزلیں اور مضامین لکھتے رہے - وہ سیاست سے عملی طور پر لاتعلق تھے کہ ایک دن مولانا ظفر علی خان سید ممتاز علی سے مل کر سالک کے کمرے میں آئے - کہنے لگے - آپ جیسا ادیب اور شاعر اور بچوں اور عورتوں کے رسالوں میں محدود ہو کر رہ جائے - یہ دردناک بات ہے - اب ذرا کھلی فضاؤں میں کام کیجئے اور گشتہ بہار ہو کر قلم کے جوہر دکھائیے - ہرچند سالک نے کہا کہ میں نے تو آج تک کسی روزانہ اخبار کا دفتر بھی نہیں دیکھا - میں روزانہ اخبار نویسی کیا جانوں اور سیاسی مقالہ نگاری سے مجھے کیا واسطہ؟ لیکن مولانا کا اصرار غالب آیا اور وہ یکم اپریل ۱۹۲۰ء کو "زمیندار" سے وابستہ ہو گئے "سرگزشت" میں لکھتے ہیں: "پہلے ہی دن سے مجھے مقالۂ افتتاحیہ لکھنے اور کسی قدر ترجمہ کرنے کی خدمت تفویض ہوئی - اور میں ملک کے سب سے بڑے اخبار کا ایڈیٹر بن گیا" مولانا ظفر علی خان نے چند دن ان کا کام دیکھا - تو ادارت کی پوری ذمہ داری انھیں سونپ دی اور خود سیاسی دوروں میں مصروف ہو گئے - ۱۵ مئی ۱۹۲۰ء کو وہ ایک تقریر کے سلسلے میں گرفتار ہو گئے اور پانچ سال کے لئے اسیرِ فرنگ ہو گئے - تین چار مہینے بعد اُن کے فرزند مولانا اختر علی خان بھی گرفتار ہو گئے - کیونکہ حکام نے انھیں "زمیندار" کا ایڈیٹر قرار دے دیا تھا - سالک اپنی "سرگزشت" میں لکھتے ہیں "میں نے اپنی شہادت میں کہہ بھی دیا کہ اختر علی خان کو ایڈیٹری سے کوئی تعلق نہیں - لکھنے والا تو میں ہوں - لیکن قانون نے تسلیم نہ کیا - اور اختر تین سال کے لئے مرتبۂ اسیری پر فائز ہو کر لاہور سنٹرل جیل میں بھیج دیئے گئے" ۴ نومبر ۱۹۲۱ء کو مولانا عبدالمجید سالک بھی گرفتار ہو گئے - اور انھیں ایک سال قید کا حکم سنا دیا گیا - گرفتاری کا سبب ایک اداریہ تھا - جس کا عنوان تھا "خونخوار انگریز" ۱۹۷۴ء کے آغاز میں مجھے ایک صاحب نے "مشرق" کے فیچر نگار ریاض بٹالوی کے توسط سے ۱۱ ستمبر ۱۹۲۱ء سے ۲۷ اکتوبر ۱۹۲۱ء تک کے کچھ شمارے بھیجے - حسنِ اتفاق ملاحظہ فرمائیے کہ پہلا پرچہ اُٹھایا - تو "خونخوار انگریز" کے عنوان سے اُن کا اداریہ مطالعے میں آ گیا - اس کا پورا متن پیش کرتا ہوں : -

"جس قوم میں روحانیت کا شمہ بھی باقی نہ رہے - اور جس کے افراد شب و روز نا وبت کی متعفن ہوا میں سانس لیتے ہوں - ان کے اخلاق اور ان کی انسانیت کو بعض ایسی بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں - جن سے وہ انسان نہیں رہتے - بلکہ خون آشام درندے بن جاتے ہیں - خونخوار کا لفظ بعض انسانوں کے لیے اب

تک مجازی معنوں میں استعمال ہوتا رہا اور ظالم و سنگ دل اشخاص خونخوار کہلاتے رہے۔ لیکن ان سطور کے عنوان میں لفظ خونخوار اپنے اصلی اور لغوی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ۲۳ اگست کو لکھنؤ کے اجلاس کانگرس میں سکرٹری صاحب ڈسٹرکٹ کانگرس کمیٹی میرٹھ نے یہ واقعہ بیان کیا کہ اُن کے شہر میرٹھ میں ایک انگریز تھا۔ جو بچوں کو ذبح کر کے اُن کا خون پیا کرتا تھا۔ پولیس نے اسے گرفتار کر کے اُس کا چالان کر دیا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے سول سرجن کی سفارش پر اس کو کسولی بھیج دیا اور اپنے فیصلے میں تحریر کیا کہ یہ شخص دیوانہ ہو گیا ہے۔ علاج سے تندرست ہو جائے گا۔ اس کو دو سو روپے ماہوار علاج کے لئے دیا جائے۔ سنا گیا ہے کہ اس انگریز نے تقریباً پچاس بچے محض اپنی خون پیاس بجھانے کی خاطر قتل کئے اور ان کی نعشیں کسی نامعلوم مقام پر پھینک دیں یا گاڑ دیں ہیں۔

"مجازی معنوں میں تو بارہا سنا کہ انگریز محکوم قوموں کا خون چوس رہے ہیں۔ لیکن حقیقی و لغوی معنوں میں سننے کا اتفاق آج ہی ہوا اگر یہ واقعہ درست ہے تو ایک خونی کو دو سو روپے ماہوار وظیفہ دے کر کسولی کے سرد مقام پر بھیج دینا کہاں کا انصاف ہے؟ اگر یہ انگریز دیوانہ تھا۔ تو صرف بچوں ہی کو کیوں قتل کرتا تھا۔ ذرا کسی بڑے آدمی پر بھی عشق خون آشامی کی کوشش کر کے مزہ دیکھتا۔ لیکن پھر بھی کیا ہوتا۔ پھر بھی دیوانہ قرار دیا جاتا، اور دو سو روپے ماہوار مقرر ہو جاتے جس حکومت کے با اختیار حکام اپنے اختیارات کا ایسا نا جائز استعمال کریں۔ اس قسم کے طرفدارانہ فیصلے لکھیں۔ پھر جو ان فیصلوں پر نکتہ چینی کرے۔ اُسے ۱۵۳۔ الف کے ماتحت ماخوذ کر لیں۔ ایسی حکومت سے کس امر کی امید فلاح ہو سکتی ہے؟"

[۱۱ ستمبر ۱۹۲۱ء۔ صفحہ ۲، ۳]

سالک "سرگذشت" میں لکھتے ہیں کہ "اس زمانے میں جمعیت العلما قائم ہوئی۔ جس کے صدر مفتی کفایت اللہ اور ناظم مولانا احمد سعید قرار پائے اور پانسو علمائے جلیل القدر کے دستخطوں سے ترک موالات کا ایک فتویٰ صادر ہوا۔ جس کو حکومت نے ضبط کر لیا۔ لیکن میں نے دوسرے ہی دن زمیندار میں وہ تمام آیات و احادیث مع ترجمہ شائع کر دیں۔ جن کی بنا پر اس فتویٰ کی ایک ایک دفعہ مرتب کی گئی تھی اور حکومت کو چیلنج دیا کہ زمیندار کے اس پرچے کو ضبط کرے۔ لیکن ارباب حکومت اس چیلنج کو پی گئے۔" زمیندار کے جو شمارے میرے زیر نظر ہیں۔ اُن سے اس واقعے کی تفصیلات کا علم ہو جاتا ہے یاد رہے کہ فتوے اگست ۲۱ء میں صادر ہوا۔ اس کے دس مہینے بعد ضبطی کا حکم جاری ہوا اور قریب قریب تین مہینے بعد اُن اخبارات کی ضبطی کا فیصلہ ہوا۔ جن میں یہ فتوے درج کیا گیا تھا۔ حکومت نے ستمبر ۲۱ء میں اس کا جواز یہ بتایا کہ فتویٰ مذہبی نہیں سیاسی تھا۔ اس لئے ضبطی سے یہ منشا نہیں تھا کہ مسلمانوں کے احکام مذہبی میں دست اندازی کی جائے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے سالک نے لکھا۔

"— سبحان اللہ کیا منطق ہے۔ فتوے پر تقریباً پانسو علمائے دین کے دستخط ہیں۔ آیات قرآنی اور احادیث رسولؐ سے نصیں پیش کی گئی ہیں۔ سرتاپا ایک مذہبی تحریر اور ایک دینی حکم ہے اور اس کے متعلق ارشاد ہوتا

ہے کہ یہ سیاسی فتویٰ ہے۔ لہٰذا اس کا ضبط کرنا جائز ہے ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سیاسی فتوے اور مذہبی فتوے کی تقسیم چہ معنی دارد۔ اگر کسی مسئلہ سیاسی میں ہم اپنے مذہب کے احکام معلوم کرنا چاہیں اور علما قرآن و حدیث سے بدلائلِ قطعی ہمیں ایک حکم دیں۔ تو کیا اس حکم اور اس فتویٰ کی حیثیتِ مذہبی ساقط ہو جاتی ہے؟ ـــــ جن لوگوں کے نزدیک قسطنطنیہ، مکہ، مدینہ، جزیرۃ العرب اور تمام مقاماتِ مقدسہ کو غیر مسلم فوجوں کے قدموں سے ناپاک کر دینا بھی مذہب میں دست اندازی کا مترادف نہ ہو۔ ان کے لئے فتویٰ کیا شے ہے؟ وائے بحالِ ما۔ وائے بر بے حرمتی دینِ خدا۔"

[۱۱ ستمبر ۲۱ء ۔ صفحہ ۲]

۱۶ ستمبر ۲۱ء کو پولیس کی ایک بھاری جمعیت نے "زمیندار" کے دفتر کی تلاشی لی۔ اور تیرہ مہینے گیارہ دن پرانے "زمیندار" کی تہتر کاپیوں پر قبضہ کر لیا اور مدیر زمیندار کو ڈپٹی کمشنر نے حکم دیا کہ وہ اس فتوے سے کوئی اقتباس بھی شائع نہ کرے۔ نوکر شاہی کی سعیِ ملاحظہ ہو کہ اتنا عرصہ خاموشی رہی اور اس دوران میں صرف مجلس خلافت پنجاب اس فتوے کی باون ہزار کاپیاں پمفلٹ کی شکل میں اور تیس ہزار کاپیاں اشتہارات کی شکل میں صوبے بھر میں تقسیم کر چکی تھی۔ ۱۸ ستمبر کے شمارے میں مولانا ظفر علی خان کی ایک نظم اس موضوع پر چھاپی گئی۔ چونکہ یہ جیل سے بھیجی گئی تھی۔ اس لئے اس پر اُن کا قلمی نام "مسلم" درج تھا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

باقی نہ رہا جب کوئی ڈھنگ اور جفا کا ۔۔۔ فتویٰ ہی لیا چھین انھوں نے علما کا

فتویٰ تو پھر اک پرزۂ کاغذ ہے کہ اس کو ۔۔۔ بازیچہ بنا سکتی ہے سرکار صبا کا

قرآن کی آیات کو کاغذ سے مٹا دو ۔۔۔ اور چھاپ لو اس پر سبق اقرارِ وفا کا

مٹتا ہے مٹانے سے کبھی نامۂ تقدیر؟

قانون کہیں ضبط ہوا بھی ہے خدا کا؟

ایک دن بعد اس موضوع پر سالک نے ایک فصل افتتاحیہ قلمبند کیا۔ فتوے کی ضبطی کو مداخلت فی الدین قرار دیا اور لکھا:

"مسلمانانِ ہند سے ہماری یہ استدعا ہے کہ وہ اپنی اس مذہبی توہین کا نہایت مردانہ وار صبر و استقلال سے مقابلہ کریں اور اس کے جواب میں موجودہ نظامِ حکومت کی تباہی و بربادی کے وہ وسائل و ذرائع استعمال کریں جن کا حکم جمعیت العلماء، خلافت کانفرنس اور کانگرس نے دے رکھا ہے یعنی ترکِ موالات کے تمام مدارج و منازل مکمل کر دیں۔ کھدر پہن لیں۔ جیل میں جانے کے لئے تیار رہیں اور اس حکومت کے خلاف امن پسندانہ جنگ کرنے کے لئے اپنے تحمل و برداشت کی طاقتوں کو مجتمع کر لیں۔ مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ پروردگارِ عالم اپنے دینِ قیم کی اس تمام بے حرمتی کو دیکھ رہا ہے۔ اس کی لاٹھی میں آواز نہیں۔ جو طاقتیں اسلام کی توہین پر تلی ہوئی ہیں ان کے لئے آخر میں ناکامی و نامرادی کے سوا کچھ نہیں۔"

[۱۹ ستمبر ۲۱ء]

اس افتتاحیے میں علمائے کرام سے اپیل کی گئی کہ وہ اپنے زاویہ ہائے عزلت سے نکلیں اور ترک موالات کی تبلیغ و منادی کے لئے کمربستہ ہوجائیں کیونکہ صرف فتویٰ دے دینا اور اس کے ضبط ہوجانے پر خاموشی سے بیٹھے رہنا علمائے حق کی شان سے بعید ہے۔"

اس کے بعد "ہمارا آئندہ نظامِ عمل" کے عنوان سے ایک اور افتتاحیہ لکھا۔ اور فتوے کی ضبطی اور بزرگانِ ملت کی گرفتاریوں کی مذمت کرتے ہوئے اپیل جاری کی کہ خطاب یافتہ اپنے خطاب چھوڑیں۔ سکولوں اور کالجوں کے وہ طلبہ جنھیں اپنے مذہب اور اپنی قوم کی حرکت کا ذرہ برابر خیال بھی ہے وہ تعلیم ترک کرکے ہمہ تن خدمت خلافت کے لئے کمربستہ ہوجائیں۔ جن وکلا کے دلوں میں ذرا بھی غیرتِ ملی کی جھلک باقی ہے۔ ان پر لازم ہے کہ اب وہ عقل و شعور سے کام لیں اور ضروریاتِ ملت کا احساس کرکے اپنے اس پیشۂ ممنوعہ کو چھوڑ دیں۔ جو بر دے فتوی حرام قرار دیا جا چکا ہے۔" اس کے بعد کہا گیا کہ سیاسی آزادی معاشی آزادی سے ہم رنگ اور معاشی آزادی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ایک ارب بیس کروڑ روپے دشمنانِ اسلام اور دشمنانِ خلافت کی جیب میں نہ چلے جائیں۔ جو ہم بدیشی چیزوں پر صرف کرتے ہیں۔ لوگوں سے اپیل کی گئی کہ وہ نہ صرف غیر ملکی کپڑے، بلکہ ہر غیر ملکی چیز کا استعمال ترک کردیں اس کے بعد لکھا:۔

"اب ترکِ موالات کی صرف دو شقیں باقی ہیں جن پر ہمیں آئندہ عمل کرنا پڑے گا یعنی خلاف ورزیِ قانون اور عدم ادائے محصولاتِ سرکاری لیکن جب تک جمعیت العلماء، خلافت کمیٹی اور کانگرس ان تدابیر کے اختیار کرنے کا قطعی حکم نہ دیں۔ اس وقت تک خاموش رہنا اور ان تدابیر کے اختیار کرنے کی تیاری کرنا لازم ہے کہ ہم اپنے دل سے قید و بند کا خوف بالکل دور کر دیں اور جیل کو اپنی آزادی کا گھر سمجھیں" تکالیف و مصائب کی پروا نہ کریں اور عدمِ تشدد کو اس وقت تک اپنا عقیدۂ مذہبی سمجھیں۔ جب تک علمائے کرام اس کے خلاف فتوے نہ دے دیں۔ اگر عدمِ تشدد اور تحملِ مصائب کی روح سرتاپا ہمارے اندر حلول کر جائے۔ تو یقیناً ہم قانون کی خلاف ورزی اور ٹیکس ادا کرنے سے انکار۔ یہ دونوں کام نہایت کامیابی کے ساتھ انجام دے سکتے ہیں۔"

[۲۴ ستمبر ۲۱ء]

اگلے دن اسی موضوع پر ایک اور افتتاحیہ چھاپا گیا۔ جس میں مرکزی قانون ساز کونسل کے ان مسلمان ممبروں کی مذمت کی گئی جنھوں نے فتوے کی ضبطی میں حکومت سے تعاون کیا۔ اسی دن کے شمارے میں جمعیت العلمائے ہند کے اس فیصلے کی اطلاع دی گئی کہ فتویٰ بدستور چھپتا رہے اور اس کی تبلیغ و اشاعت جاری رہے ۲۸ ستمبر کے شمارے میں اسی موضوع پر ایک افتتاحیے کے دوران میں تجویز کی گئی کہ اس فتوے کو اشتہار کی صورت میں چھاپ کر ایسے مقامات پر چسپاں کیا جائے۔ کہ حکومت فتوے کی ضبطی کے بے سود شغل سے کنارہ کش ہونے پر مجبور ہو جائے۔" اس افتتاحیے میں حکیم محمد اجمل خان سے اپیل کی گئی کہ تحریک کی رہنمائی اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ کیونکہ محمد علی، شوکت علی، ظفر علی خان اور ڈاکٹر کچلو کی مفارقت کے بعد اب مسلمانوں کی نگاہیں رہ رہ کر آپ ہی کی طرف اٹھ رہی ہیں۔"

۷ اکتوبر ۲۱ء کے شمارے میں سالک کا وہ معرکۃ الآرا افتتاحیہ درج ہے جس کی طرف انہوں نے "سرگذشت" میں اشارہ کیا تھا۔ اس کا عنوان ہے "خدا کا کلام اور دنیا کی حکومت، ضبطیِ فتوے سے کیا مراد ہے؟" پہلے وہ نو آیات قرآنی ترجمے سمیت دی گئیں۔

جو فتویٰ میں مندرج تھیں۔ نمونے کے طور پر پہلی آیت کا ترجمہ ملاحظہ ہو:"جن کافروں نے دین کے معاملہ میں تم سے قتال کیا۔ تم کو اپنے ممالک سے بے دخل کر دیا اور تمہارے اخراج یعنی بے دخل کرنے میں مدد دی۔ ان سے دوستی اور باہمی امداد کرنے سے خدا تمہیں روکتا ہے اور جو لوگ ایسے کفار سے موالات رکھیں وہ سب ظالم ہیں۔" آیات کے بعد جو کچھ لکھا ہے۔ اس کا ایک مختصر اقتباس ملاحظہ فرمایئے: ضبطی فتوے کے سلسلے میں پولیس کے حکام کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ متفقہ فتوے کی نقول اور وہ تمام تحریریں مطبوعہ یا غیر مطبوعہ جن میں فتویٰ مکمل یا اس کا کچھ حصہ مندرج ہو بحق تاج برطانیہ ضبط کر لی جائیں۔ مندرجہ بالا آیات قرآنی اور ان کا ترجمہ بھی اسی فتوے کا ایک حصہ ہے۔ اگر وہ تمام کاغذات اور کتابیں، جن میں یہ آیات مندرج ہیں، قابلِ ضبطی قرار دی گئی ہیں۔ تو پھر زمیندار کا یہ پرچہ اور ہندوستان بھر کے قرآن مجید بھی اسی تحت میں آ جاتے ہیں اور ان کی ضبطی بھی بروئے اعلان حکومت ضروری ٹھہرتی ہے۔" افتتاحیے میں جمعیت علمائے ہند کی تعریف کی گئی کہ اس نے ضبطی کے بعد فتوے کی دس ہزار کاپیاں چھاپ کر تقسیم کر دیں۔ اور اس خلاف ورزی کے لیے کانگرس سے بھی مشورہ لینا ضروری نہ سمجھا۔ کیونکہ یہ ایک خالص مذہبی مسئلہ ہے جس میں کانگرس کوئی رائے نہیں دے سکتی اور مسلمان اس مسئلے میں کسی دنیاوی مصلحت یا سیاسی دُور اندیشی پر عمل نہیں کر سکتے۔"

قومی مسائل پر دوسرے اداریے

غلّے کی گرانی اناج کی کمی اور گرانی کا سبب یہ بتایا گیا کہ انگریزوں نے ہندوستان سے اناج بہت بڑی مقدار میں برآمد کر دیا۔ حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ برآمد روک دے۔ اور بلدیات، مزدور جماعتوں اور رفاہِ عام کی انجمنوں کو مشورہ دیا گیا کہ وہ مہنگے داموں اناج خرید کر عوام کے ہاتھ سستے داموں بیچیں۔ اور خسارہ خود برداشت کریں تاکہ لوگ بھوکوں نہ مریں۔ اس کے ساتھ ہی لکھا کہ "یہ مصیبتیں چند روزہ ہیں۔ خدائے تعالےٰ عنقریب ہندوستان کو آزادی بخشے گا۔ درآمد و برآمد کا نظام ہمارے اپنے قبضے میں ہو گا۔ پھر انشاء اللہ تمام مشکلیں رفع ہو جائیں گی اور ہندوستان کی زرخیز سرزمین پر رہنے والوں کو کبھی قحط کی بلائے آسمانی سے واسطہ نہ پڑے گا۔ خدا وہ مبارک دن ہندوستان پر جلد لائے۔" (۱۷ ستمبر)

بیوی کرے، میاں بھرے اُس زمانے میں برما ہندوستان ہی کا جزو تھا۔ وہاں کے بعض افسروں کی بیگمات نے آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیا۔ تو حکومت کی طرف سے افسروں کے نام ہدایات جاری ہوئیں کہ وہ اپنی بیویوں کو ایسے کاموں سے روکیں۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اس رائے کا اظہار کیا گیا کہ اب "تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی ہندوستانیوں کے حرم کی چار دیواری میں بھی گھسی جا رہی ہے۔ اور میاں بیوی کے درمیان نفاق و شقاق کے اسباب پیدا کیے جا رہے ہیں۔" (۱۷ ستمبر)۔

مسلمان اور عدم تشدد علی برادران کی گرفتاری کی افواہوں پر تبصرہ کرتے ہوئے حکومت کو بتایا گیا کہ اگر یہ دو رہنما نہ ہوتے تو مسلمان تشدد پر اُتر آتے۔ یہ خفیہ انجمنیں بناتے۔ انقلاب پسند جماعتیں مرتب کرتے۔ بم پھینکتے۔ قتل و خونریزی سے اپنے دل کا بخار نکالتے اور خدا جانے کیا کچھ کرتے — ایسے ذی اثر اور حیرت انگیز اقتدار رکھنے والے رہنماؤں کو گرفتار کرنا دانش مندی اور عاقبت اندیشی سے بالکل بعید ہے اور اس کا اندیشہ ہے کہ ان کی گرفتاری کے بعد مسلمان عدم تشدد پر عامل نہ رہ سکیں اور

خدمات کی بے انتھک پھر اور رنگ لائے۔ (۱۸ ستمبر)

مذہبی رہنماؤں کی گرفتاری

سناتن دھرمی ہندوؤں کے بہت بڑے پیشوا شنکرت گورو سری شنکرا چاریہ، مولانا حسین احمد مدنی اور پیر غلام مجدد سرہندی کی گرفتاری اور کراچی کے مقدمہ بغاوت پر تجاویز منظور کیا گیا۔ اور مسلمانوں سے اپیل کی گئی کہ اٹھو اور ترکِ موالات کے تمام مراحل پر عمل پیرا ہو جاؤ۔ ایسی حکومت سے، جو تمہارے خدا اور رسول کے نام کی بے عزتی کر رہی ہے، موالات رکھنا یقیناً کسی مسلمان کا شیوہ نہیں۔ عدم تشدد پر سختی سے عمل کرو۔ کیونکہ تمہارے رہنماؤں کا خون بہانے کا مرحلہ آسانی سے نازل کیے۔ اور پھر ملازمتیں چھوڑ دو۔ وکالتیں چھوڑ دو۔ بدیسی کپڑا چھوڑ دو۔ روزمرہ زندگی میں ترکِ موالات کر کے آزادی حاصل کرو۔ کیونکہ یہی تمہارے تمام امراض کا علاج ہے۔ (۲۴ ستمبر)

سرزمین بے آئین

صوبہ سرحد کو سرزمین بے آئین کا نام دیا گیا۔ جو لغوی اعتبار سے بھی درست تھا۔ کیونکہ اس صوبے کو آئینی اصلاحات سے محروم رکھا گیا تھا۔ ایک تندرست بات کے خلاف احتجاج کیا گیا کہ پنجاب سے کسی کو وہاں جانا ہو تو باڑی اندر تک کا ٹکٹ دیا جاتا ہے۔ اس سے آگے کا ٹکٹ نہیں دیا جاتا۔ کیونکہ ڈپٹی کمشنر پشاور نے داخلہ ممنوع کر رکھا ہے۔ (۲۴ ستمبر) صوبہ سرحد کے بزرگ حاجی جان محمد اور ان کے ساتھیوں سے انگریزوں کے سلوک کی مذمت کی گئی۔

قومی درس گاہوں کو ترجیح

جب تحریک عدم تعاون کے دوران میں سرکاری درس گاہوں سے طلبہ نکل آئے اور ان کے لیے رہنماؤں نے الگ یونیورسٹیاں بنالیں۔ تو ان سے بھی فارغ التحصیل طلبہ گریجویٹ بن کر نکلنے لگے۔ سالک نے ایک اداریے میں ہدایات سے اپیل کی کہ وہ خالی اسامیوں کو پُر کرتے وقت اُن نوجوانوں کو ترجیح دیں، جنھوں نے آزاد قومی درس گاہوں میں تعلیم پائی ہو۔ اسی قسم کا مطالبہ تجارتی اداروں سے بھی کیا گیا۔ (۲۶ ستمبر)

عورتیں اور کھدر

۲۴ ستمبر کو لاہور کی تاریخ میں پہلی مرتبہ مسلمان عورتوں کا ایک اجتماع بریکٹ علی اسلامیہ ہال میں ہوا جس سے علی برادران کی والدہ اُم الاحرار بی اماں نے خطاب کیا۔ انہوں نے عورتوں سے کہا کہ تم اپنے مردوں سے کمخواب، اطلس، مخمل اور لٹھا مت مانگو بلکہ کھدر پہنو۔ گاڑھا پہنو۔ اور دوسروں کو پہنواؤ۔ ۲۶ ستمبر کے شمارے میں لاہور کی ایک خاتون ف۔ ب صاحبہ کا ایک مضمون چھپا جس میں مسلمان عورتوں کو چرخہ کاتنے اور کھدر پہننے کی تلقین کی گئی۔ زمیندار نے اس پر ایک اداریہ چھاپا جس میں موصوفہ کی تائید میں آواز بلند کی۔ اور عورتوں سے اپیل کی کہ وہ زمیندار میں اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

تاجور نجیب آبادی

"خواتین نجیب آباد کی سرگرمی" کے عنوان سے ایک شذرے میں مولانا تاجور نجیب آبادی کی ہمشیرہ اور اہلیہ محترمہ کو خراج عقیدت ادا کیا گیا کہ وہ خواتین کی مجالس خلافت میں پیش پیش ہیں اور مولانا تاجور سے کہا گیا "آپ دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں۔ حضرت مولانا محمود الحسن سے آپ کو شرفِ نیاز حاصل ہے کیا آپ کو معلوم نہیں کہ خدا کا کلام فتوے کی صورت میں ضبط ہو چکا ہے اور ہندوستان کے آسمان کے نیچے اسلام کی انتہائی توہین کی جا چکی ہے؟ غالباً آپ کو سب کچھ معلوم ہو گا۔ پھر یہ کیا ہے کہ آپ اب تک سرکاری یونیورسٹی سے تعلق برقرار رکھے بیٹھے ہیں اور دیال سنگھ کالج سے جو سرکاری یونیورسٹی سے

ملحق ہے۔ چند روپوں کے عوض تعلیم دے کہ اس حکومت سے صریح موالات کر رہے ہیں جس نے دنیا بھر میں ہماری مذہبی روایات کو پامال کر دیا۔ کاش آپ اپنی محترم ماں، بہن اور بیوی ہی کی جرأتِ ایمانی و حرارتِ دینی سے سبق حاصل کرتے ۔" (۰ اکتوبر)

لارڈ لارنس کا بُت

لاہور کی مال روڈ پر لارڈ لارنس کا ایک بت عرصے تک نصب رہا جس پر لکھا تھا "کیا تم اپنے آپ پر قلم سے حکومت کرانی چاہتے ہو یا تلوار سے"؟ مجسمے کے ایک ہاتھ میں تلوار تھی اور دوسرے ہاتھ میں قلم۔ اسے عوام اپنی غیرت کے لئے ایک چیلنج قرار دیتے تھے۔ اس لئے بلدیہ لاہور نے فیصلہ کیا کہ مجسمے کو اپنی جگہ سے ہٹا دیا جائے۔ "زمیندار" نے اس پر بلدیہ کو مبارک باد دی اور لکھا: "ہمارے نزدیک تو اس کا اچھا مصرف یہ ہے کہ اسے از سر نو ڈھلوا کر اس کا ایک فوارہ بنایا جائے۔ جو جلیانوالہ باغ کے بیچوں بیچ نصب کر دیا جائے اور اس پر لکھا جائے:-

" اس سرزمین کی مٹی میں ان غیرت مند محبانِ وطن کا خون موجود ہے جنھوں نے موت گوارا کی لیکن قلم کی محکومی اور تلوار کی غلامی کو پسند کرنا اپنے وقارِ قومی کے منافی سمجھا۔ (۱۶ اکتوبر)

متفرق مسائل

گوجرہ کے سید مہدی شاہ اور کالرا کے ملک عمر حیات خان ٹوانہ کی مذمت کی گئی کہ وہ مسلمانوں کی طرف سے وائسرائے کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ حکومت کو بتایا گیا۔ کہ اس نے دو لاکھ روپے کی جو رقم امریکہ میں تحریک آزادیٔ ہند کو ختم کرنے کے لئے منظور کی ہے وہ کسی کام نہیں آئے گی۔ راولپنڈی کے مسلمانوں سے اپیل کی گئی کہ وہ اپنا محمود ترک کر دیں۔ اور تحریک میں شامل ہو جائیں۔ اپنی قوم کی فلاح و بہبود کے لئے ایک پارسی رہنما کے ایک کروڑ روپے کے عطیے پر تبصرہ کرتے ہوئے ہندو اور مسلمان دولت مندوں سے کہا گیا کہ وہ بھی اپنی دولت اپنی اپنی قوم کے فائدے کے لئے صرف میں لائیں۔ کسی زمانے میں کانگرس کے ممتاز رہنما سر سریندر ناتھ بنرجی کی خلافت دشمن حرکتوں پر نکتہ چینی کی گئی۔ اور ان سے مطالبہ کیا گیا کہ غلط بیانات سے حکومت کو دھوکا نہ دیں۔ "اس حکومت کے خزانے سے گراں قدر تنخواہ لینا اور اس کو دھوکا دینا شریفوں کا قاعدہ نہیں جس کا نمک کھاؤ۔ اس کی خیر خواہی کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہ دو۔" (۹ اکتوبر)

بین الاقوامی سیاست پر تبصرے

اُس زمانے کے "زمیندار" میں بین الاقوامی سیاست کے مختلف پہلوؤں پر بھی ادارتی تبصرے کئے جاتے تھے کبھی افتتاحیے کی صورت میں کبھی شذرات کے روپ میں اور کبھی مضامین کی شکل میں۔ اس سلسلے میں چند اداریوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

عقدہ آئرلینڈ

آئرلینڈ کے حریت پرستوں کے قائد ڈی ویلرا کے اس مطالبے کی حمایت کی گئی کہ آئرلینڈ کو اسی قسم کا درجہ نوآبادیات دیا جائے۔ جیسا آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور کینیڈا کو حاصل تھا۔ اور اس میں یہ شق شامل ہو کہ آئرلینڈ جب چاہے۔ تو قلمرو برطانیہ سے انقطاعِ تعلق کرے۔ حکومتِ برطانیہ پر نکتہ چینی کی گئی کہ وہ السٹر اور جنوبی آئرلینڈ کے درمیان منافرت کو فروغ دے رہی ہے اور مطالبہ کیا گیا کہ ڈی ویلرا کو السٹر کے پروٹسٹنٹ فرقے کے ساتھ براہ راست رابطہ پیدا کرنے دیا جائے۔ تاکہ دونوں حصوں میں مفاہمت ہو جائے اور ایک متحدہ آئرلینڈ آزادی کی زندگی بسر کر سکے۔ (۱۱ ستمبر)

توسیعِ سلطنت یا لینن کی حکومت؟

برطانیہ میں بے روزگاروں اور مزدوروں کے اضطراب اور ہنگامہ آرائی کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ برطانیہ صنعت و حرفت پر توجہ دینے کی بجائے توسیعِ سلطنت اور جوع الارض کے امراض میں مبتلا ہے اور اس نے قلمرو برطانیہ کے طول و عرض میں اپنے لیے طرح طرح کے مسائل پیدا کر رکھے ہیں۔ برطانیہ کے وزیر اعظم لائیڈ جارج سے خطاب کرتے ہوئے لکھا گیا: "کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ تو جغرافیہ میں برطانی اقتدار کا حلقہ وسیع کرنے میں مصروف رہیں اور ادھر بیکاروں کا شور و غل غیر مطمئن مزدوروں کے ہیجان سے مل کر شورِ محشر برپا کر دے۔ اگر ایسا ہوا۔ تو اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟ اول: کشت و خون۔ دوم: انقلابِ حکومت۔ سوم: آخر میں بولشوزم۔ اب مسٹر لائیڈ جارج بتائیں کہ ان دونوں چیزوں میں کونسی پسند ہے۔ توسیعِ سلطنت برطانیہ یا لینن کی حکومت؟" (۱۰ ستمبر)

ڈیڑھ کروڑ کنواریاں

پہلی عالمی جنگ کے دوران میں جو عظیم جانی ضیاع ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مردوں کی آبادی کم ہو گئی اور عورتوں کی زیادہ اور اندازہ کیا گیا کہ کم و بیش ڈیڑھ کروڑ عورتوں کو کنوارا رہنا پڑے گا اور اس طرح بد اخلاقی کو بھی فروغ حاصل ہو گا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے یورپ کی توجہ اس طرف دلائی گئی کہ اگر اسلام کی پیروی کرتے ہوئے ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کی اجازت ہو جائے۔ تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ اور اس سلسلے میں ترکیہ کی مثال پیش کی گئی۔ جہاں پے در پے تین جنگوں میں جانی ضیاع کے باوجود یہ مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔ (۱۷ ستمبر)

وسطی ایشیا میں آزادی کی ہوائیں

۲۵ ستمبر کو ایک شذرے میں بتایا گیا کہ "بولشویک بیرونی ممالک میں اپنے اثر و اقتدار سے غلامی کے اثرات دور کرنے میں برابر مصروف ہیں۔ ریاست ہائے قفقاز، جارجیا، آرمینیا اور آذربائی جان میں جمہوریتیں قائم ہو چکی ہیں اور ریاست ہائے ترکمان، بخارا، مرو، سمرقند اور خیوا میں بھی آزادی کی ہوائیں چل رہی ہیں۔" یہ بھی کہا گیا کہ ایران اور افغانستان پر دباؤ بڑھ رہا ہے اور حکمرانوں سے مطالبہ کیا گیا کہ اگر وہ یہ خطرہ قریب نہیں لانا چاہتے تو ہندوستان کی اندرونی بے چینی دور کرنے کی تدابیر اختیار کریں۔

یونانیوں کی شکستِ فاش

مصطفےٰ کمال پاشا (کمال اتاترک) کے ہاتھوں یونانیوں کی شکست پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک افتتاحیے میں ہندی مسلمانوں سے اپیل کی گئی کہ وہ انگورہ فنڈ میں دل کھول کر چندہ دیں۔ اور لکھا: "اگر آج ہم نے اس فرض کو نہ پہچانا۔ تو یاد رکھنا چاہیے کہ مسلمان آئندہ دنیا میں عزت، حرمت، آزادی و حریت کی زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ اگر انگورہ میں مصطفےٰ کمال پاشا کی طاقت خدانخواستہ کمزور پڑ گئی۔ تو ہندوستان کے مسلمان مغربی طاقتوں کے گوناگوں اثرات اور بوقلموں اقتدارات کے ماتحت تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ اور ساتھ ہی ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ بھی ایک مدت دراز تک کھٹائی میں پڑ جائے گا۔" (۱۵ ستمبر)

افغانستان

۱۹۱۹ء میں افغانستان اور برطانیہ کے درمیان جنگ کے بعد جو معاہدہ ہوا وہ عملاً اس بات کا مظہر تھا کہ برطانیہ نے افغانستان کی آزادی اور خودمختاری تسلیم کر لی ہے۔ اس کے بعد فریقین میں صلح کے مستقل سمجھوتے کے لیے بات چیت شروع ہوئی۔ جو ۱۹۲۱ء کے آغاز میں کامیابی کے مرحلے میں داخل ہوئی۔ اس دوران میں افغانستان نے سردار ولی خان کو لندن میں اپنا ایلچی مقرر کیا۔ تو برطانیہ نے یہ تقرر اس بنا پر ٹھکرا دیا کہ حکومتِ افغانستان کا معاملہ برطانیہ سے نہیں، حکومتِ ہند کے ساتھ ہے۔

۲ اکتوبر کے "زمیندار" میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا گیا کہ جب برطانیہ اور افغانستان کے تعلقات مساویانہ ہیں تو پھر افغانستان حکومت ہند کے ساتھ کیوں گفتگو کرے اور مستقل سمجھوتے کے لئے بات چیت کے دوران میں ایلچی نہ قبول کرنے کو "نہایت غیر مہذب اور توہین آمیز" قرار دیا گیا۔

۲۷ اکتوبر کے شمارے میں ایک مفصل افتتاحیہ دیا گیا۔ اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا گیا کہ افغانستان نے بالشویکوں کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کر لیا ہے اور ترکیہ اور ایران کے ساتھ باہم امداد کے سمجھوتے کر لئے ہیں۔ لیکن اس بات پر افسوس کا اظہار کیا گیا کہ حکومت ہند اور افغانستان کے درمیان جو بات چیت ہو رہی ہے۔ اس بارے میں عوام کو اعتماد میں نہیں لیا جاتا۔

اتحادِ عالمِ اسلامی

ایران سے انگریزوں کی بے دخلی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ "خدا کا شکر ہے کہ ایشیا میں دو ممالک یعنی ایران و افغانستان تو انگریزی اثر سے آزاد ہوئے۔ اب خدا تعالےٰ کہیں عراق، عرب، فلسطین، شام اور حجاز کی بھی سن لے تاکہ ہم خلافتِ اسلامیہ کا نظام از سر نو استوار کریں۔ انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔ اور اسلام کی فتح و نصرت کا وقت قریب ہے۔" (۲۱ اکتوبر) اس کے بعد ۲۷ اکتوبر کے شمارے میں ایک اور افتتاحیہ درج ہوا جس کا یہ اقتباس خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ "سلطنت عثمانیہ کے بکھرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ترکوں نے بولشویکوں کی دوستی اختیار کی۔ افغانوں نے آزادی حاصل کی اور ایرانی، افغان اور ترک متحد ہو گئے۔ وسط ایشیا کی ان طاقتوں کا اتحاد اور بولشویکوں کی امداد نے اگر سرحدِ ہندوستان پر کوئی نیا گل کھلا دیا۔ اور اُدھر مضطرب جرمنی انہی مظلوموں میں شامل ہو گیا تو ظاہر ہے کہ ایشیا میں انگریزی اقتدار کا قائم رہنا ایک امر محال ہے۔" ایسے میں برطانیہ کو خبردار کیا گیا کہ وہ ترکوں کے مطالبات مان لے۔ اُن کا وطن لوٹا دے۔ جزیرۃ العرب سے اپنی فوجیں ہٹا لے۔ اور ہندوستان کو آزاد کر دے تاکہ اُسے چین نصیب ہو۔

ایران میں آزادی کی لہر اور کمیونسٹ

"ایران میں آزادی کی لہر" کے عنوان سے ۲۶ اکتوبر کا افتتاحیہ اسلوب نگارش اور مطالب اور تجزیۂ مطالب کے اعتبار سے خصوصی اہمیت کا حامل۔ اس کا آخری پیراگراف درج ذیل ہے:۔

"آپ لکھتے ہیں کہ بولشویکوں نے ایران میں اپنے اغراض و مقاصد کی اشاعت کی اس لئے ایران برطانیہ کو اپنا دشمن خیال کرنے لگا۔ حالانکہ یہ سراسر غلط ہے۔ خود بالشویکوں کے سالارِ اعظم موسیو لینن کا قول ہے کہ "جنگ یورپ نے تمام دنیا کے ممالک میں شہنشاہیت پسند طاقتوں کی دست بُرد کے طفیل سے ایسے حالات پیدا کر دیئے ہیں کہ ان کی مادی و اخلاقی ذلت حد انتہا تک پہنچ چکی ہے اور یہی وجہ انقلابی تحریکات کی ہے۔ یاد رکھو کہ جو ملک خوشحال ہو۔ جہاں کے لوگ سیاسی حقوق کے اعتبار سے خوش و خرم ہوں۔ جس ملک میں لوگوں کو پیٹ بھر کر کھانا مل جاتا ہو۔ وہاں بولشویکوں کا پروپیگنڈا ہزار سال تک بھی انقلاب پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ حقیقت میں موسیو لینن کا یہ قول سراپا صداقت پر مبنی ہے۔ اچھا یہ تو بتائیے کہ ایران میں تو بولشویکوں نے انقلاب کا فتنہ برپا کیا۔ لیکن کیا ہندوستان، مصر، آئرلینڈ میں بھی انقلابی

تحریکات کا باعث حقیقی بولشویکوں کی مبلغانہ کارپردازیوں کا نتیجہ ہے؟ ہندوستان نے اس زمانے میں ہوم رول کا مطالبہ زور شور سے کیا تھا۔ جب بولشویک کا نام و نشان تک نہیں تھا اور لینن کے خواب کی تعبیر عقل انسانی سے بعید نظر آتی تھی۔ مصر اس زمانے سے آزادی کی جدوجہد میں مصروف ہے۔ جب روس میں انقلاب کی تحریک کرنے والے سُولی پر لٹکائے جا رہے تھے۔ آئرلینڈ اس وقت سے انگلستان کے خلاف جدوجہد کر رہا ہے۔ جب زار روس خدا کی طاقت اور رائے جمہور کی قوت کو سرمایۂ تذلیل سمجھتا تھا اور کسانوں کے سامنے انا ربکم الاعلیٰ سے فرعونی ادعا میں بلند آہنگ ہو رہا تھا۔ حقیقت میں آج کل حکومتِ برطانیہ کے شہنشاہیت پسندوں کا یہ شیوہ ہو رہا ہے کہ جب وہ کسی مظلوم ملک و قوم کی جدوجہدِ آزادی کے اصلی وجوہ و اسباب دنیا پر ظاہر کرنے میں اپنی ہتک اور ذلت دیکھتے ہیں۔ تو اس تمام جدوجہد کی ذمہ داری بولشویکوں کے سر پر ڈال کر کہہ اُٹھتے ہیں کہ ہم تو بالکل بے گناہ اور معصوم ہیں۔ یہ سب کارستانیاں تو لینن کے چیلے چانٹوں کی ہیں۔ حالانکہ سارا کیا دھرا خود انہی کا ہوتا ہے۔ اور بولشویک غریب خواہ مخواہ بدنام کیے جاتے ہیں۔"

شریفِ مکہ حسین | پہلی عالمی جنگ کے بعد بھی چند سال تک حجاز کی حکمرانی رہی۔ اس زمانہ شریف مکہ حسین کے ہاتھ میں رہی ہندوستان کے مشہور اخبار "سٹیٹسمین" نے خبر دی کہ حسین خلافت کا مدعی بننے کی فکر میں ہے۔ اور برطانیہ اس پر راضی ہے۔ ایک اداریے میں حسین کے اس ارادے کو اُس خطرے سے منسوب کیا گیا۔ جو عراق میں برطانیہ کے ہوائی اڈے کی وجہ سے دنیائے عرب کے لئے پیدا ہوا۔ "زمیندار" نے لکھا:

"شریف اور اُس کے صاحبزادوں کے لئے اب بھی موقعہ ہے کہ وہ اپنی گذشتہ غلط کاریوں کی تلافی کریں۔ اور اپنے وجود کو اسلام کے لئے اور خلافتِ مقدسہ کے لئے مفید بنائیں۔ اگر وہ اب بھی صراطِ مستقیم پر آ جائیں۔ تو ملتِ اسلامیہ اُن کے قصور معاف کرنے کو تیار ہے۔" (۱۶ اکتوبر)

بین الاقوامی سیاست کے اور بہت سے مسائل پر اظہارِ خیال کیا گیا۔ مثلاً تیل کے سلسلے میں برطانوی استعمار کی سرگرمیاں۔ اہلِ مراکش پر ظلم۔ ترکیہ اور یونان کے درمیان خونین معرکے وغیرہ۔

حاصلِ بحث | مولانا عبدالمجید سالک کی اداریہ نگاری کے اولین دور کا یہ تجزیہ نہایت نامکمل ہے۔ کیونکہ وہ یکم اپریل ۱۹۲۰ء کو "زمیندار" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور ۴ نومبر ۱۹۲۱ء کو گرفتار ہو گئے۔ گویا انہوں نے ڈیڑھ برس سے زیادہ عرصے تک اداریہ نگاری کے فرائض انجام دیئے۔ اس دور کے "زمیندار" کے فائل نہیں ملتے۔ صرف ستمبر، اکتوبر ۱۹۲۱ء کے اکیس متفرق شمارے حاصل ہو سکے۔ جن کی بنا پر یہ تجزیہ مرتب کیا گیا ہے۔ گرفتاری کے بعد انھیں ایک سال قید بامشقت کاٹنی پڑی۔ واپس آئے۔ تو مولانا غلام رسول مہر بھی ادارہ "زمیندار" سے منسلک تھے۔ دونوں کے درمیان دائرۂ کار کی تقسیم اس طرح ہوئی کہ افتتاحیہ مہر صاحب لکھتے اور شذرات سالک قلمبند کرتے۔ اس کے علاوہ انہوں نے "افکار و حوادث" کے نام سے ایک مستقل مزاحیہ کالم لکھنا شروع کر دیا۔ مارچ ۱۹۲۷ء تک یہ کالم "زمیندار" میں چھپتا رہا۔ ۴ اپریل ۱۹۲۷ء کو "انقلاب" جاری ہوا۔ تو یہ کالم نئے اخبار میں منتقل ہو گیا۔ اور دسمبر ۱۹۴۹ء تک جاری رہا۔

"افکار و حوادث" کے آغاز کے سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مزاح نگاری کا سلسلہ اولین دور ہی سے شروع ہو چکا تھا۔ کیونکہ بعض اداریے اسی رنگ میں لکھے گئے اور "جذبات و افکار" کے عنوان سے بھی کبھی کبھار ایک آدھ کالم آجاتا تھا۔ اداریہ نگاری کے سلسلے میں یہ حقیقت پیش نظر رکھنی ضروری ہے کہ اس کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا۔ رہائی کے بعد اداریہ نگاری جاری رہی۔ لیکن افتتاحیہ نگاری مہر صاحب کے سپرد ہوئی۔ "انقلاب" کی بائیس سالہ زندگی میں یہی تقسیم کار رہی رہی لیکن مولانا مہر یا مولانا سالک کے علاوہ کوئی ہیں۔ کانفرنس کے سلسلے میں برطانیہ گئے۔ یا آشوب چشم کے مرض میں مبتلا ہو کر کسولی میں قیام رکھا۔ کبھی دبیسے عبل ہمسایہ افغانستان گئے۔ تو سالک افتتاحیہ نگاری بھی کرتے رہے۔

جس دور کا ہم نے تجزیہ کیا ہے وہ نہایت بحرانی اور خطرناک دور تھا۔ جیسا کہ اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے سالک نے بین الاقوامی اور قومی، دونوں قسم کے مسائل پر برطانوی سامراج کے خلاف ڈٹ کر لکھا اور اس سلسلے میں کوئی مصلحت روا نہ رکھی۔ تحریک خلافت کے اس دور میں "زمیندار" برعظیم کا اہم ترین روزنامہ تھا اور اس کی قیادت نہایت مؤثر تھی۔ گویا سالک نے اداریہ نگاری کے ذریعے سے تحریک خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات میں ایک نمایاں کردار ادا کیا۔ اور اس کے۔ قید بھی کاٹی۔ بحرانی ادوار میں صحافت پر جذباتی اثرات اتنے نمایاں ہو جاتے ہیں کہ استدلال کا عنصر پسپا ہو جاتا ہے لیکن سالک کی اداریہ نگاری میں جذبات کے پہلو بہ پہلو استدلال بھی کار فرما تھا۔ وہ اس دور میں زبان اور اسلوب نگارش کے سلسلے میں مولانا ظفر علی خان کی تحریروں سے متاثر تو ضرور تھے۔ لیکن جہاں تک ممکن ہوا۔ انہوں نے آسان زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تاکہ اسے زیادہ سے زیادہ لوگ سمجھیں اور تحریکِ ترکِ موالات کو آگے بڑھا سکیں۔

اردو لغت کی باتیں

ڈاکٹر سہیل بخاری

بولیاں اتنے پرانے جگ میں بنی ہیں کہ نہ ہم اس جگ کو جانتے ہیں اور نہ اسے سوچ ہی سکتے ہیں۔ بولیوں کی جڑیں بیتے دنوں کے گہرے اندھیرے میں گڑی ہوئی ہیں اور ان کی بیلیں کم سے کم لاکھوں برس پر پھیلی ہوئی ہم تک پہنچی ہیں۔ اس بیچ میں انہوں نے جو بل پکڑا اور بولوں کی جو جھا جتھا اکٹھی کی اس کا حال ان کتابوں سے جانا جا سکتا ہے جو ان کے بولنے یا جاننے والوں نے لکھی ہیں۔ ایسی کتاب جس میں کسی بولی کے بول ایک خاص ڈھنگ سے اکٹھے کیے گئے ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے معنی بھی بتائے گئے ہوں لغت کہلاتی ہے۔

لغت عربی میں یوں تو بول کو کہتے ہیں جس کی جمع لغات آتی ہے۔ پر وہ کتاب بھی جس میں بول اپنے معنی کے ساتھ اکٹھے کر دیے گئے ہوں لغت کہلاتی ہے۔ فارسی میں اسے فرہنگ کہتے ہیں۔ انگریزی میں یہ گلوسری، ووکیبلری اور ڈکشنری کہلاتی ہے اور سنسکرت ہندی وغیرہ میں اسے کوش۔ ساگر۔ شبدسوا اور مالا کا نام دیتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے بال کی کھال نکالنے کے لیے ان بولوں میں فرق بھی مان لیا ہے۔ وہ اصطلاحوں کی فہرست کو ایک نام دیتے ہیں، تھوڑے سے بولوں کی فہرست کو دوسرے نام سے پکارتے ہیں، ہم معنی یا ہم قافیہ بولوں کی کتاب کا تیسرا نام رکھتے ہیں اور سارے بولوں کی کتاب کو چوتھے نام سے یاد کرتے ہیں پر دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ ان میں سے ہر نام ہر بھانت کی فہرست کے لیے بولا جاتا ہے البتہ انگریزی میں ڈکشنری، عربی فارسی اور اردو میں لغت، سنسکرت میں کوش اور ہندی میں مالا نام زیادہ رکھا جاتا ہے۔

لغت لکھنے کی ریت بہت پرانی ہے اور دنیا کی ہر بول میں سدا سے چلی آ رہی ہے اس لیے یہ بات پورے بھروسے سے نہیں کہی جا سکتی کہ کس بولی کا لغت سب سے پہلے لکھا گیا اور کس نے اور کیوں لکھا کیونکہ تاریخ کال سے پہلے کی کوئی ایسی لکھاوٹ ہم تک نہیں پہنچی جس سے اس بات کا نیاؤ کیا جا سکے۔ اس سے جس بولی میں جو سب سے پرانا لغت ملتا ہے اسی کو پہلا لغت سمجھنا اور کہنا پڑتا ہے۔ یونان کے اتھینیس نے ایسے دس لوگوں کے نام گنائے ہیں جنھوں نے یونانی بولی کے لغات لکھے ہیں پر یہ سب لغات اب نہیں ملتے۔ اس لیے زینوڈوٹس نے جو ایک لغت "گلوسا" کے نام سے لکھا تھا اسی کو ہم یونانی بولی کا پہلا لغت کہہ سکتے ہیں۔ یہ شخص اسکندریہ کے بڑے کتب خانے کا پہلا مہتمم تھا اور اس نے بطلیموس اول اور دوم کا زمانہ دیکھا تھا۔ انگریزی بولی میں کوکریم نے پہلا لغت لکھا جو لندن میں ۱۶۲۳ء میں چھپا تھا۔ اس کے پیچھے اس بولی میں بہت اچھے اچھے لغت لکھے گئے تھے جن میں بلاؤنٹ، فلپس، بیلی، جانسن، ٹاڈ اور شیریڈن کے لغات کے ساتھ ساتھ ویبسٹر (نیویارک ۱۸۲۸ء) کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ ان لغات کے علاوہ امپیریل ڈکشنری (گلاسکو ۱۸۵۰-۵۵ء) مرے اور بریڈلے کی کتاب آکسفورڈ انگلش ڈکشنری وٹنے کی کتاب سنچری

ڈکشنری (نیویارک ۱۹۵۵ء) اور اسٹینڈرڈ ڈکشنری (نیویارک ۱۹۱۳ء) وغیرہ کے نام بھی کافی مشہور رہیں۔

انگریزی میں اب تک جو لغات لکھے گئے ہیں ان میں عام لغات کے ساتھ ساتھ دوسری بھانت کے لغات بھی ملتے ہیں جن میں کوئی بولوں کا اچار (تلفظ) بتاتا ہے۔ کسی میں بولوں کی بناوٹ دکھائی گئی ہے۔ کسی میں کچّے بولوں کو اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ کسی میں ہم معنی بول جمع کر دیئے گئے ہیں۔ کسی میں ہم قافیہ بولوں کا ذکر ہے۔ کوئی بولوں کے ٹکڑے کرکے دکھاتا ہے۔ کوئی تلازمے دیتا ہے۔ کوئی ایک ایک بول کے کئی کئی چالو روپ دکھاتا ہے۔ کوئی بولنے والوں کے خاندانی ناموں سے بحث کرتا ہے۔ کوئی گنوارو بول پیش کرتا ہے اور کسی میں بھانت بھانت کے علوم کی اصطلاحیں جمع ہیں۔

سنسکرت لغات میں امرکوش کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ اس کا لکھنے والا امرسنگھ ایک ہزار عیسوی سے پہلے گزرا ہے۔ یہ کتاب اتنی مشہور اور مانی ہوئی ہے کہ ہندوستان میں گھر گھر سے اس کی چھاپیں نکلتی رہتی ہیں اور اسے کتنی ہی لپیوں میں چھاپا گیا ہے۔ یہ لغت کلکتے سے ۱۸۰۸ء اور ۱۸۳۴ء میں، بمبئی میں ۱۸۶۰ء اور لکھنؤ میں ۱۸۶۳ء میں چھپا۔ ۱۸۶۰ء میں مدراس سے گرنتھ لپی میں اور ۱۸۵۸ء میں ملیالم کی لپی میں چھاپا گیا۔ مہیشور نامی ایک شخص نے اس کی ایک شرح بھی لکھی جو امر وویک کے نام سے ۱۸۶۷ء میں بنارس میں شائع ہوئی۔ سنسکرت کا دوسرا مشہور لغت شبد کلپدرم کے نام سے راجا رادھا کانت دیو نے لکھا جو کلکتے سے ۱۸۲۲ء اور ۱۸۵۸ء کے درمیان آٹھ جلدوں میں شائع ہوا۔ اس کی دوسری چھاپ ۱۸۸۶ء میں نکلی۔ بھٹاچاریہ نے شبد ستوم مہاندھی سات حصوں میں کلکتے سے ۱۸۶۹ء اور ۱۸۸۰ء کے درمیان میں شائع کیا۔ ہل یدھ نے ابھدھان رتن مالا لکھا جو لندن سے ۱۸۶۱ء میں نکلا۔ تارا ناتھ ترک واچسپتی نے واچسپتیم نامی لغت لکھا جو کلکتے میں ۱۸۷۳ء میں چھپا۔

ان لغات کے علاوہ مدنی کرنے مدنی کوش لکھا جو بنارس میں ۱۸۶۵ء میں اور کلکتے میں ۱۸۶۹ء اور ۱۸۷۰ء میں چھپا۔ اس میں سنسکرت کے ایسے بول اکٹھے کر دیئے گئے ہیں جن کا اچار تو ایک ہے پر ان کی جڑیں الگ الگ ہیں۔ ہیرو چند نے دھاتو منجری کے نام سے ایک لغت سنسکرت بول کی جڑوں پر لکھا جو لندن میں ۱۸۶۵ء میں چھاپا گیا اور بھیم آچاریہ جھلکی کرتے نیائے (فلسفہ) کی اصطلاحات کا ایک لغت نیائے کوش کے نام سے لکھا جو بمبئی سے ۱۸۷۵ء میں نکلا۔ ان مشہور لغات کے سوا اور بھی چھوٹے چھوٹے لغات لکھے گئے جن کا ذکر یہاں غیر ضروری ہے۔

عربی لغات میں خلیل ابن احمد (متوفی ۱۶۰ھ) کی کتاب العین کا نمبر سب سے پہلے آتا ہے جو اس نے ۷۴ سال کی عمر میں لکھی تھی۔ بعد کی کتابوں میں ابونصر اسماعیل جوہری (متوفی ۳۹۳ھ) کی کتاب الصحاح، ابوالحسن علی ابن اسماعیل ابن سیدہ (متوفی ۴۵۸ھ) کی کتاب المحکم، زمخشری (متوفی ۵۳۸ھ) کی کتاب اساس البلاغت، ابوالفضل ابن منظور جمال الدین (متوفی ۷۱۱ھ) کی کتاب لسان العرب، ابوطاہر مجد الدین ابن یعقوب فیروز آبادی (متوفی ۸۱۷ھ) کی کتاب القاموس، سید محمد مرتضیٰ زبیدی (متوفی ۱۲۰۵ھ) کی کتاب تاج العروس جو قاموس کی شرح ہے۔ بطرس البستانی کی محیط المحیط، صراح، منتخب اللغات شاہجہانی، محمد لاد کی مؤید الفضلا، اقرب الموارد، منتہی الارب، شمس اللغات، احمد بن محمد ابوالفضل المیدانی (متوفی ۵۱۸ھ) کی السامی فی الاسامی اور معلوف الیسوعی کی المنجد وغیرہ نہایت مشہور لغات ہیں۔

ان کے علاوہ کچھ دوسری کتابیں بھی لکھی گئیں جن میں سے کچھ مصادر کے معنی شامل ہیں جیسے خواجہ محمد اشرف لکھنوی کی فرہنگ المصادر (۱۰۹۷ھ) اور امان الحق کی امان اللغات (۱۰۷۱ھ)۔ کسی خاص علم و فن کی اصطلاحیں جمع کر دی گئی ہیں اور ان کا مطلب سمجھایا گیا ہے جیسے خواجہ شمس الدین کی کتاب اصطلاحات صوفیہ (مطبوعہ مطبع نامی لکھنؤ ۱۳۱۱ھ)۔ کچھ علم طب اور دواؤں کے بارے میں لکھی گئی ہیں جیسے بحر الجواہر (۱۸۶۳ء)، حکیم نور الدین محمد کی الفاظ الادویہ (نولکشور پریس کانپور)، حکیم تاج محمد کی میزان الادویہ (نولکشور پریس کانپور)، حکیم محمد نصیر کی فرہنگ نصیری (نولکشور پریس کانپور)، حکیم سید محمد مومن شیرازی کی مخزن الادویہ۔ فارسی میں کہاوتیں جمع کر دی گئی ہیں جیسے سید حسین شاہ حقیقت کی خزینۃ الامثال (نولکشور پریس لکھنؤ ۱۸۷۳ء)۔

فارسی لغت کی کتابوں میں سب سے پہلا نمبر برہان قاطع کا آتا ہے جو محمد حسین تبریزی نے لکھی تھی۔ اس کی کئی نقلیں چھپ کر نکل چکی ہیں۔ حال ہی میں اسے ڈاکٹر معین سے نئے سرے سے مرتب کر کے تہران سے چھاپا ہے۔ ایک اور مشہور کتاب دہلی کے بادشاہ غازی الدین حیدر کے زمانے میں ہفت قلزم کے نام سے لکھی گئی تھی، ۱۸۲۲ء میں سات جلدوں میں چھپی۔ ان کے علاوہ اسدی طوسی کی کتاب لغت فرس، جمال الدین انجو کی فرہنگ جہانگیری، اللہ داد فیضی سرہندی کی مدار الافاضل (۱۰۰۱ھ)، غیاث الدین کی غیاث اللغات (لکھنؤ ۱۲۴۲ھ)، گلیڈون کی فارسی ہندوستانی لغت (کلکتہ ۱۸۰۹ء)، مولوی کریم الدین کی کریم اللغات، مولوی محمد تصدق حسین کی لغات کشوری، عبداللہ خویشگی کی فرہنگ عامرہ، حبیب اللہ آموزگار کی فرہنگ آموزگار، فرہنگستان ایران کا واژہ نو، سید احمد حسین کی نقش بدیع، ہیم کی فارسی انگریزی لغت اور جوزف انڈرسن بیج بالی کی پریکٹیکل ڈکشنری آف پرشین لینگویج (لندن ۱۸۴۴ء) بھی مشہور کتابیں ہیں۔

اردو میں جو لغت کی کتابیں لکھی گئیں ان کی ایک فہرست نیچے دی جاتی ہے۔

۱۔ بحر الفضائل فی منافع الافاضل۔ محمد ابن قوام کرخی نے ۱۴۰۶ء میں ترتیب دی۔ اس میں اردو بولوں کی ترتیب ابجد پر رکھی گئی ہے اور ان کے معنی فارسی میں دیئے گئے ہیں۔

۲۔ تحفۃ الہند۔ یہ کتاب عالمگیر کے زمانے میں مرزا محمد ابن فخر الدین محمد نے کوکلتاش خان کے کہنے پر لکھی تھی۔ اس میں بھی اردو بولوں کے معنی فارسی میں لکھے گئے ہیں اور کتاب کو موضوعات کے اعتبار سے ابواب میں بانٹا گیا ہے۔

۳۔ فرانسسکو ماریہ دو تورنو کا لغت ڈکشنری لنگوا اندوستانیکا جو پادری جیری میں ۱۷۰۴ء میں مکمل ہوا۔

۴۔ جان جوشوا کیٹیلار (۱۶۵۹ء سے ۱۷۱۸ء تک) کا ہندوستانی لغت۔ مؤلف پروشیا کا باسی تھا۔ اس نے ہندوستانی بولی کا لغت ولندیزی بولی میں لکھا ہے۔

۵۔ غرائب اللغات۔ مولوی عبد الواسع ہانسوی۔ اس میں اردو بولوں کے معنی فارسی میں لکھے گئے ہیں۔

۶۔ عجائب اللغات۔

۷۔ ڈیوڈل کا لغت ۱۷۴۳ء۔ یہ ہندوستانی اور فارسی کا مختصر سا لغت تھا۔

۸۔ نوادر الالفاظ۔ سراج الدین علی خان آرزو ۱۱۶۵ھ / ۱۷۵۲ء۔ یہ لغت غرائب اللغات کی غلطیاں درست کر کے لکھا گیا۔

۹۔ زبدۃ الاسما۔ سنہ ۱۸۱۱ء۔

۱۰۔ فرگوسن کا ہندوستانی لغت۔ پہلی بار ۱۷۷۳ء میں چھپا۔

۱۱۔ ڈاکٹر ہنری ہیرس کا ہندوستانی انگریزی لغت مدراس ۱۷۹۰ء۔

۱۲۔ جان گلکرسٹ کا ہندوستانی لغت ۱۷۹۰ء میں کلکتے سے نکلا۔

۱۳۔ کپتان جوزف ٹیلر اور ڈاکٹر ولیم ہنٹر کا ہندوستانی انگریزی لغت (مولفہ ۱۸۰۵ء) پہلی بار ۱۸۰۸ء میں کلکتے سے چھپا پھر ایڈنبرا (انگلستان) سے ۱۸۲۰ء میں نکلا۔

۱۴۔ کپتان ٹامس روبک کا ہندوستانی انگریزی لغت۔ ۱۸۱۰ء۔ اس کی تیاری میں گلکرسٹ، ہنٹر اور ہیرس کے لغات سے مدد لی گئی۔

۱۵۔ مفتاح ساطع۔ ۱۲۳۶ھ۔

۱۶۔ دلیل ساطع۔ ۱۲۴۹ھ۔

۱۷۔ نفائس اللغات ۱۲۵۳ھ۔

۱۸۔ نفائس اللغات۔ علی اوسط رشک لکھنوی ۱۲۵۶ھ۔

۱۹۔ انفس اللغات۔ اوحد الدین احمد بلگرامی ۱۲۵۵ھ مطبع مصطفائی لکھنؤ۔

۲۰۔ انفس النفائس۔ ۱۲۶۱ھ۔

۲۱۔ منتخب النفائس۔ مولوی عبد الاحد ۱۲۶۲ھ۔

۲۲۔ جان شیکسپیئر کا ہندوستانی انگریزی لغت۔ لندن ۱۸۱۷ء۔ بار چہارم ۱۸۴۹ء۔

۲۳۔ جے۔ ٹی۔ ٹامسن۔ اردو اینڈ انگلش ڈکشنری۔ دسمبر ۱۸۲۷ء۔

۲۴۔ ولیم ییٹس۔ ہندوستانی انگریزی لغت۔ بپٹسٹ مشن پریس کلکتہ ۱۸۴۷ء۔

۲۵۔ ناسٹے برائس۔ ہندوستانی انگریزی لغت۔ (رومن لپی) کلکتہ ۱۸۴۷ء۔

۲۶۔ ڈنکن فاربس۔ ہندوستانی انگریزی لغت۔ لندن ۱۸۴۸ء۔ مختصر ہندوستانی انگریزی لغت لندن ۱۸۶۱ء۔

۲۷۔ برٹرینڈ۔ پیرس ۱۸۵۸ء۔ فرانسیسی زبان میں لکھا گیا۔

۲۸۔ برائس۔ لندن ۱۸۶۴ء۔

۲۹۔ ایچ آندرس۔ اردو انگلش لغت۔ مطبوعہ بار ہفتم بپٹسٹ مشن پریس کلکتہ ۱۸۶۹ء۔

۳۰۔ جان پلیٹس۔ ۱۸۷۴ء۔

۳۱۔ فیلن۔ بنارس ۱۸۷۶ء۔

۳۲۔ فرانسوا ڈیوگل۔ ہندوستانی فرانسیسی لغت۔ ۱۸۷۶ء۔

۳۳- سرمایہ زبانِ اُردو - جلال لکھنوی سنہ

۳۴- کیگن - اردو لاطینی اور انگریزی کا لغت - رومن کیتھولک آرفن پریس سردھنہ سنہ ۱۸۹۲ء -

۳۵- امیر اللغات - امیر مینائی سنہ ۱۸۹۱ء مفید عام پریس آگرہ -

۳۶- فیروز اللغات - مولوی فیروز الدین سنہ ۱۹۰۶ء فیروز سنز لاہور -

۳۷- فرہنگ آصفیہ - منشی سید احمد دہلوی سنہ ۱۹۰۸ء -

۳۸- نور اللغات - چار جلدیں - مولوی نور الحسن نیر کاکوروی - سنہ ۱۹۲۴ء تا ۱۹۳۱ء -

۳۹- جامع اللغات - چار جلدیں عبد المجید ایم اے جامع اللغات کمپنی لاہور سنہ ۱۹۳۳ء

۴۰- اسٹینڈرڈ اردو ڈکشنری - آغا محمد باقر - سنہ ۱۹۴۸ء علمی پرنٹنگ پریس لاہور -

۴۱- نسیم اللغات نسیم امروہوی - سنہ ۱۹۵۵ء - استقلال پریس لاہور -

۴۲- فرہنگ اثر - نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی سنہ ۱۹۶۱ء - سرفراز قومی پریس لکھنو -

۴۳- جدید نسیم اللغات - فاضل لکھنوی نسیم امروہوی، آغا باقر - شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور سنہ ۱۹۶۱ء -

ان کے علاوہ کچھ ایسی کتابیں بھی لکھی گئیں جن میں کئی کئی بولیوں سے مترادفات لے کر جمع کر دئیے گئے ہیں ان کو عام طور سے نصاب کہا جاتا ہے - ان میں سے کچھ کے نام یہاں لکھے جاتے ہیں -

۱- اجے چند نامہ - اجے چند بھٹناگر - سنہ ۹۶۰ھ

۲- اللہ خدائی - اس کا لکھنے والا شاہجہان بادشاہ کے زمانے میں گزرا ہے - اس کا تخلص تجلی تھا - اس کتاب کی عبارت زدو اور اس کا سن تصنیف سنہ ۱۰۶۰ھ ہے -

۳- مطبوع الصبیان (خالق باری) - اس کا لکھنے والا عالمگیر کے زمانے کا خسرو ہے -

۴- مفتاح الافواہ - حافظ احسن اللہ لاہوری سنہ ۱۱۹۶ھ -

۵- گوہر منظوم - محمد علی محمد سنہ ۱۲۶۶ھ

۶- نصاب فخر وری - خدا بخش سنہ ۱۲۸۰ھ -

۷- خیابان گلشن - محمد علی محمد - سنہ ۱۲۸۰ھ -

۸- قادر نامہ غالب - اسد اللہ خاں غالب دہلوی سنہ ۱۱۸۰ھ

۹- نصاب نادر الترتیب - عزیز الدین احمد - سنہ ۱۲۹۴ھ

۱۰- نصاب فیض شاہجہانی - حافظ غلام احمد فروغی سنہ ۱۳۰۸ھ

۱۱- نصاب حیات عزیزی - " " " سنہ ۱۳۰۹ھ

۱۲- نصاب بے نظیر - " " " سنہ ۱۳۱۶ھ

۱۴۔ نصاب نذر سلطانی۔ حافظ غلام احمد قزوینی سنہ ۱۳۲۳ھ۔

ان کتابوں کے علاوہ کچھ کتابیں اصطلاحات پر لکھی گئیں جن میں فرہنگ اصطلاحات جہاز رانی (کلکتہ سنہ ۱۸۱۱ء) کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ یہ کتاب کپتان ٹامس روبک نے لکھی جو فورٹ ولیم کالج میں نائب سکریٹری تھے۔ اس کتاب میں انھوں نے جہاز کے حصوں کے نام، جہاز رانی کی اصطلاحات، دریا کی قواعد، پیڑ کے بول لکھے ہیں۔ کچھ کتابیں محاوروں اور کہاوتوں وغیرہ پر بھی لکھی گئیں جیسے مرزا جان طپش کی شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان (سنہ ۱۲۰۷ھ) اس کتاب میں اردو محاوروں کے معنی فارسی میں لکھے ہیں اور ان کی سند کے لیے شاعروں کے شعر بھی دیے ہیں۔ منشی چرنجی لال کی کتاب مخزن المحاورات (سنہ ۱۸۶۶ء) فیلن کا ہندوستانی امثال کا لغت (سنہ ۱۸۷۹ء) مولوی سبحان بخش کی کتاب محاورات ہند (سنہ ۱۸۹۰ء) جس میں مقولے، کہاوتیں اور محاورے جمع کئے گئے ہیں ٹلیس کی کتاب ہندوستانی محاورات (لندن سنہ ۱۹۱۲ء) نلٹ کی کتاب محاورات اُردو (کلکتہ سنہ ۱۹۱۰ء) وزیر بیگم ضیا کی کتاب محاورات نسواں (سنہ ۱۹۰۹ء) جس میں عورتوں کی بول چال کے محاورے اور بول اکٹھے کئے گئے ہیں۔

ان کتابوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ لغت لکھنے میں بہت سی سکڑی گھاٹیوں سے نکلنا ہوتا ہے۔ ان میں سے پہلی کٹھنائی بولوں کو اکٹھا کرنا ہے۔ یہ لکھنے والا اپنے بس بھر تو اپنی کتاب کے لئے زیادہ سے زیادہ بول ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتا ہے پھر بھی ہر لغت میں بولوں کی بہت کچھ کمی رہ جاتی ہے۔ سچ پوچھیے تو دنیا کی کسی بولی میں آج تک کوئی ایسا لغت نہیں لکھا گیا جس میں اس بولی کے سارے کے سارے بول ملتے ہوں۔ کارن یہ ہے کہ کوئی ایک آدمی کسی پوری بولی کو نہ جانتا ہے اور نہ جان سکتا ہے اور جو یہ کام ایک سے زیادہ آدمی کریں تو یہ تو ہو سکتا ہے کہ جتنے زیادہ آدمی اس کام میں مل جائیں گے لغت میں بول اتنے ہی بڑھ جائیں گے پر لغت میں کچھ نہ کچھ کمی پھر بھی رہ جائے گی اور وہ کبھی سو فی صدی پورا نہیں ہو سکے گا۔ ہم روزانہ ایسے بول بھی سنتے رہتے ہیں جو لغت میں لکھنے سے چھوٹ گئے ہیں۔ پر لغت سے رہ جانے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بول بولی سے باہر کے ہیں یا باہر کر دیئے گئے ہیں۔ اس پر بھی جو لوگ ہر بول کے لئے بول چال کی جگہ لغت کی سند مانگیں یا مانیں تو یہ ان کی بھول ہی کہلائے گی۔

جب دو بولیاں ملتی ہیں تو آپس میں کچھ لین دین بھی کرتی ہیں۔ ایک بولی دوسری بولی کے دیس میں پہنچ کر اسے کچھ دے دیتی ہے اور اپنے ہی دیس میں دوسری بولی کے آجانے پر اس سے کچھ لے لیتی ہے۔ بولیوں میں یہ لین دین سدا سے ہوتا آیا ہے اور ایک کے بول دوسری کے یہاں مانگے جاتے رہے ہیں۔ اسی لئے آج کی دنیا میں کوئی ایک بولی بھی ایسی نہیں ملتی جو بدیسی بولوں سے خالی ہو۔

ہندوستان میں جب آریائی، فارسی اور انگریزی بولیاں باہر سے آئیں تو انہوں نے دیسی بولیوں کو بہت کچھ دیا اور بہت کچھ ان سے بھی لیا۔ جس کے کارن انہیں سنسکرت، ہسک ہندی اور انڈین انگلش کے نام دئے گئے یہی اُردو کے ساتھ ہوا کہ ایک طرف تو اس نے باہر سے آنے والی آریائی، فارسی اور انگریزی سے کھرے میٹھے بہت سے بول لے لئے اور دوسری طرف راجستھانی، ہریانی برج بھاشا، پنجابی اور دکنی وغیرہ کے دیسوں میں پہنچ کر اُن سے بھی بہت کچھ سمیٹا اس لئے اُردو کی بھی آج بہت سی بھانتیں ہوگئی ہیں جیسے اکبر آبادی اردو، دہلوی اردو، لکھنوی اُردو، لاہوری اُردو، حیدرآبادی اُردو، ڈھکنی اُردو۔ اس کا ثبوت اردو کے ان لغات سے ملتا ہے جو آج تک الگ الگ نگروں میں لکھے گئے ہیں۔ مولوی عبدالواسع ہانسوی کے لغت غرائب اللغات میں ہانسی حصار کی بولی کا پٹ

بھی ملتا ہے جیسا کہ سراج الدین علی خان آرزو نے بھی اپنی کتاب نوادر الالفاظ میں کہا ہے۔ دہلی کے باسی منشی سید احمد کی کتاب فرہنگ آصفیہ میں ہریانی ملی اردو ملتی ہے۔ کاکوری (اودھ) کے رہنے والے مولوی نورالحسن نیر کی کتاب نوراللغات میں اودھی ملی اردو کا نمونہ ملتا ہے اور مولوی فیروزالدین کے لغت فیروزاللغات اور عبدالمجید کے لغت جامع اللغات دونوں میں پنجابی ملی اردو پائی جاتی ہے کیونکہ دونوں پنجاب کے رہنے والے تھے۔ آگرہ اور حیدرآباد دکن میں ایسے بڑے لغت تو نہیں لکھے گئے پر ان مردوں کی بول چال سننے سے پتہ چلتا ہے کہ اکبرآبادی اردو میں راجستھانی اور برج بھاشا کا میل ہے اور حیدرآبادی اردو پر دکن کا رنگ چڑھا ہوا ہے اور یہ رنگ اردو کے ٹکسالی لہجے اور اپار کو بھی بدل گیا ہے۔

سنسکرت اور پراکرت کے گرامر نویسوں نے بول کی تین بھانتیں بتائی ہیں:

۱۔ تت سم: ہماری بولی کے وہ بول جو سنسکرت میں بھی اسی روپ میں ملتے ہیں۔

۲۔ تدبھو: ہماری بولی کے وہ بول جو سنسکرت میں کچھ بدلے ہوئے ملتے ہیں۔

۳۔ دیسی: ہماری بولی کے وہ بول جو سنسکرت میں نہیں ملتے۔

اردو میں مجھے چار بھانت کے بول ملتے ہیں۔

۱۔ دیسی:- یہ وہ بول ہیں جو ہماری بولی میں سدا سے برسے جا رہے ہیں۔ ان میں کچھ تو ایسے ہیں جو اردو کی کچھ پڑوسی بولیوں میں بھی شروع ہی سے ملتے ہیں جیسے گھوڑا۔ روٹی۔ یعنی وہ ان سب کا ملا جلا مال ہیں اور کچھ بولوں کا چلن اردو کے سوا کسی بولی میں نہیں ملتا جیسے چھار چھار۔ بھڑ بھونجا۔

۲۔ بدیسی:- یہ دوسری بولیوں کے وہ بول ہیں جو اردو میں بیوں سے تیوں لے لیے گئے ہیں اور بول چال میں کام آ رہے ہیں یہ اصیل بھی کہے جاتے ہیں۔ جیسے کتاب۔ منزل۔ شام۔

۳۔ بگاڑ: یہ وہ بول ہیں جن کی دیسی آوازوں کی جگہ عربی فارسی کی بدیسی آوازیں رکھ کر اردو بولنے والوں نے ہی ان کا روپ بگاڑ دیا ہے اور یہ اب بدیسی لگنے لگے ہیں جیسے بخشش۔ سوئی۔ خیرات۔ قینچی۔ ترجمہ۔ ان کا ٹھیک ٹھیک حال تبھی کھل سکتا ہے جب ایک طرف تو اردو میں ان کی جڑیں ڈھونڈی جائیں اور دوسری طرف بدیسی (عربی، فارسی، ترکی) بولیوں میں ان کے چلن کا کھوج لگایا جائے۔ لغت لکھنے والوں کے لیے ایسے بول بہت کچھ الجھن کھڑی کر دیتے ہیں کیونکہ ان کی جانچ پرکھ کھوجی کا کام ہے اور لغت کار کھوج کا بوجھ اپنے سر نہیں لے سکتا۔ وہ ایسے کسی بول کو بدیسی لکھ دے تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ دوسری طرف جو کوئی اس کی یہ بات نہ مانے تو اس پر بھی کوئی روک نہیں لگائی جا سکتی۔

۴۔ موڑ رو:- یہ وہ بدیسی بول ہیں جن کی بدیسی آوازیں اردو بولنے والوں نے دیسی آوازوں سے بدل لی ہیں یا انہیں اپنے لہجے میں ڈھال لیا ہے اور ان کا روپ کچھ دیسی سا ہو گیا ہے جیسے فیر (انگریزی فائر)۔ چراگ (فارسی چراغ)۔

بول جمع کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرا کام یہ ہے کہ کتاب کو الگ الگ حصوں میں بانٹا جائے اور بولوں کو الگ الگ بابوں اور فصلوں میں رکھا جائے۔ اس کے لیے عربی کے لغت لکھنے والوں کے یہاں یہ عام ریت ہے کہ وہ بول کے آخری اچھر (حرف) کو باب اور

پہلے اچھر کو فصل مان کر بول بانٹ دیتے ہیں۔ ان کے یہاں ان اچھروں سے باب بنتے ہیں انھیں اچھروں سے فصلیں بھی بنتی ہیں جیسے عرض کے بول کو دونوں کے باب اور ض کی فصل میں رکھتے ہیں اور عرض کو ض کے باب اور ع کی فصل میں لکھتے ہیں۔ یوں وہ بابوں کے ناموں کے سے دو ہی اچھر کام میں لاتے ہیں۔ فصلوں کے ناموں میں کام آتے ہیں اس کا کارن یہ ہے کہ وہ خالی اکھروں (حروف صحیح) سے ہی کام لیتے ہیں اور سروں (حروف علت) کو چھوڑ دیتے ہیں اور یہ عربی کی لپی کی کمی ہے جس میں سروں کو وہ مقام ہی نہیں دیا گیا جو اکھروں کو ملا ہے۔

بابوں اور فصلوں کے ناموں کی بات سے ہٹ کر ان کی بانٹ دیکھی جائے تو عربی بول کے لئے اس سے اچھا اور کوئی ڈھنگ نہیں ہو سکتا کیونکہ اس بولی میں سارے روپ جڑوں کے ہی ہیر پھیر سے بنتے ہیں جن میں جڑ کا آخری اچھر باقی رہتا ہے جیسے "ضرب" کی جڑ سے بنے ہوئے تضارب، مضروب، مضراب وغیرہ جن بولوں کا آخری اچھر جڑ کی طرح ب ہی ہے۔ یوں ایک جڑ سے بننے والے سلے کے سارے بول ایک ہی باب میں اکٹھے ہو جاتے ہیں پر یوں بول بول کا سمجھاؤ الگ الگ ہوتا ہے اس لئے یہ ڈھنگ فارسی اردو جیسی بولیوں میں کام نہیں دے سکتا جنھیں ٹھیک جوڑ کہتے ہیں اور جن کی جڑوں پر اگ لگوٹے (سابقے) اور پچھ لگوٹے (لاحقے) لگا لگا کر بول بنائے جاتے ہیں۔

عربی کی دیکھا دیکھی فارسی کے بھی بہت سے لغات میں بے سوچے سمجھے یہی بانٹ رکھی گئی ہے حالانکہ ان میں جڑوں پر لگوٹے (سابقے اور لاحقے) چپکا کر بول بنائے جاتے ہیں۔ اس کا پھل وہاں یہ نکلا کہ ایک جڑ سے بننے والے بول اکٹھے ہونے کی جگہ کتنے ہی بابوں میں بکھر گئے۔ اس کی مثال کے لئے فرہنگ جہانگیری کا دیکھ لینا کافی ہو گا۔ اردو میں فارسی سے بھی زیادہ لگوٹے (سابقے اور لاحقے) ملتے ہیں اور انھیں کے بل بوتے پر وہ اتنی پھیلی پھولی ہے اس لئے یہاں یہ بانٹ اور بھی بے تکی ٹھہرتی ہے یہی سبب ہے کہ اردو کا ایک آدھ چھوٹا سا لغت عربی کے اسی ڈھنگ پر لکھا ہوا پایا ہے۔

فارسی کے کچھ لغات میں بول کے پہلے اچھر کو بھی باب بنایا گیا ہے۔ انگریزی کے بھی لغات میں بولوں کی بانٹ اسی ڈھنگ پر رکھی گئی ہے اور اردو میں بھی اکا دکا لغت کو چھوڑ کر یہی ریت ملتی ہے کیونکہ ان تینوں ہی بولیوں میں ٹکڑوں کا میل دخل ہے۔ اب رہی فصل کی بات تو اس سے انگریزی لغات سرے سے خالی ہیں۔ ان میں بول اپنے پہلے اچھر پھر دوسرے اور پھر تیسرے اچھر کے حساب سے جمائے جاتے ہیں اور یوں ایک اچھر سے شروع ہونے والے بول آخر تک ایک ہی سانس میں لکھتے چلے جاتے ہیں ہاں فارسی اور اردو کے کچھ لغات میں بول کے دوسرے اچھر کو فصل بھی ٹھیرایا گیا ہے جو عام طور پر اکھر (حروف صحیح) ہی ہوتا ہے کیونکہ ان بولیوں کی لپی بھی عربی ہے جس میں چھوٹے سروں (زیر زبر پیش) کو تو دھیان میں ہی نہیں لاتے اور بڑے سروں کے لئے ا، و، ی سے کام لیتے ہیں جو کہیں سُر اور کہیں اکھر ہوتے ہیں اس سے یہ ہوتا ہے کہ جو بول او ۔ اَو ۔ اُو سے شروع ہوتے ہیں جیسے اول ۔ اَوَل ۔ اوّل یا اُو پر ختم ہوتے ہیں جیسے رُو ۔ لو ۔ تو یا جن کے بیچ میں یہ سُر آ جاتے ہیں جیسے مول ۔ مَرل ۔ مُرل وہ ایک ہی جگہ اکٹھے ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ تینوں سُر الف اور واو سے ہی لکھے جاتے ہیں اسی طرح اِے اور اَے سے شروع ہونے والے جیسے اَین اور ایک یا ان پر ختم ہونے والے بول جیسے نے اور لے اکٹھے ہو جاتے ہیں اور جو یہ سُر بولوں کے بیچ میں آ پڑتے ہیں تو ای کے سُر والے بول بھی ان کے ساتھ مل جاتے ہیں جیسے بیر (بَے رہ بے رہ بی ر) جبکہ ان سب کی جڑیں اور جڑوں کے ساتھ ساتھ ان کے معنی بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ اس ڈھنگ سے گڑبڑ یہ ہوتی ہے کہ ایک جڑ سے بننے والے

بول پورے لغت میں جگہ جگہ بکھر جاتے ہیں اور کسی کسی جڑوں کے بول اکٹھے ہو جاتے ہیں جس سے جڑوں کا سمجھنا کٹھن ہو جاتا ہے۔

سنسکرت اور دیوناگری لپی میں لکھی جانے والی دوسری بولیوں جیسے ہندی وغیرہ میں پہلے اکثر (حرف صحیح) کو باب اور اس کے پیچھے آنے والے پہلے سُر (حرف علت) کو فصل کہا جاتے ہیں۔ اردو میں بھی بول ہمزہ سے شروع ہوتا ہے یا سُر سے اس لیے اردو لغت میں پہلے ہمزہ یا پہلے اکثر کو باب اور پہلے سُر کو فصل ماننا چاہیے۔ ہماری بولی کے لغت کے لیے یہی طریقہ سائنٹفک ہے۔ اس سے ایک جڑ کے بول ایک ہی جگہ لکھے جاتے ہیں جیسے پور۔ پورا۔ پوران۔ پورنا۔ پوری۔ پورتی وغیرہ اور بولوں کی جڑوں کے معنی اور بول بننے کے ڈھنگ سمجھنے میں بھی سہارا مل جاتا ہے۔

بول کی پونجی اکہرے بولوں، سماسوں (مرکبات)، مقولوں، محاوروں اور کہاوتوں سے بنتی ہے۔ ان کو لغت میں لکھنے کے کئی ڈھنگ ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ خالی جڑ کی سرخی بنائی جائے اور اس سے بننے والے بولوں، مقولوں اور کہاوتوں وغیرہ کو اس کے پیٹ میں لکھ دیا جائے پر ایسا لغت خالی جڑوں کا لغت بن کر رہ جائے گا کیونکہ بول کی پوری کی پوری پونجی ان جڑوں کے پیٹ میں سما جائے گی۔ دوسرا ڈھنگ یہ ہے کہ سماس کی بھی سرخی بنائی جائے اور رہا مقولوں، محاوروں اور کہاوتوں ہی کو بول کے پیٹ میں رکھا جائے پر اس صورت میں بولوں کی ترتیب کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ ڈھانے کے بعد اچھل کا بول پہلے لکھا جائے یا اچھا خاصا کا سماس۔ تیسرا ڈھنگ یہ ہے کہ جڑ اور جڑ کے ساتھ اس سے بننے والے بولوں کی الگ الگ سرخیاں بنائی جائیں اور سماسوں، مقولوں، محاوروں اور کہاوتوں کو اس بول کے پیٹ میں لکھا جائے جو ان میں پہلے آتا ہے۔ اردو لغات کے لیے یہی تیسری اور آخری ترتیب ٹھیک لگتی ہے۔

کسی بولی میں جس طرح کوئی نیا بول بنتا ہے اس کے بولنے کا ڈھنگ بھی اس گھڑی طے کر دیا جاتا ہے جیسے ہم اُچارن (تلفظ) کہتے ہیں اور ایک بول کا اچارن ایک ہی ہوتا ہے۔ ہم نے مہینوں کے نام تو بولیوں نے دو دو اچارنوں سے نہیں پکارے ہوں گے پر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ عرب کے داؤد کو انگریزی میں ڈیوڈ، یوسف کو جوزف، یشوع کو جوشوا اور یوحنا کو جون بولا جاتا ہے ایک ایک نام کے ان دو دو اچارنوں میں سے ایک اصل اور دوسرا بدلا یا بگڑا ہوا ہے۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ بولنے والوں کے گلے کی خرابی، دیس دیس کی الگ الگ آب و ہوا یا دھرتی کی بناوٹ (پہاڑ، جنگل، ریگستان وغیرہ) سے اُچارن بگڑ جاتا ہے پر میں نے یہ دیکھا ہے کہ یہ بگاڑ خالی لپی سے جنم لیتا ہے۔

بول جب تک کانوں سے سنا جاتا ہے اس کا اچارن ٹھیک رہتا ہے پر جیسے ہی وہ کاغذ پر آتا ہے اور پھر کاغذ سے ہی پڑھا جاتا ہے تو اس کا اچارن بگڑ جاتا ہے کیونکہ آواز اور اکھر کا ناتا سماج کی ایک من مانی ریت ہے جسے اس سماج سے باہر کے لوگ نہیں سمجھ پاتے۔ لپی آوازیں بند کرنے کے لیے بنی تھی اور آج سنسار میں بولیوں کی طرح لپیوں کی بھی بہت بڑی گنتی ملتی ہے پر ان میں سے کوئی ایک لپی بھی اتنی پکی نہیں ہے کہ کسی ایک بولی کی آوازوں کو بھی پوری طرح جکڑ سکے اور بولوں کا ٹھیک ٹھیک اچارن بتا سکے اس لیے ہر لپی کا کام ریت کے سہارے چلتا ہے جس میں اکھروں کی بناوٹ اور ملاوٹ جیسے کئی موڑ پیچ آتے ہیں۔ ان میں انگریزی کی رومن لپی تو بہت ہی کچی ہے۔ کھیں موسا پرچیں خود آ کی کہاوت اسی پہ ٹھیک بیٹھتی ہے۔ کارن یہ ہے کہ اس میں سروں کے لیے خالی پانچ ہی اکھر ملتے ہیں اور پانچ اکھروں سے کام نہیں چلتا کیونکہ سروں کی گنتی اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اس میں نہ تو کھنچے سُر کے لیے کوئی علامت یا اکھر ہے نہ ہندوستانی

بولیوں کی بھاری آوازوں (کھ، گھ، بھ، پھ وغیرہ) کے لئے اور نہ عربی فارسی کے بہت سے اکشروں (خ، ذ، ز، غ، ف، ق وغیرہ) ہی کے لئے کوئی اچھر ملتا ہے۔ اس کے ایک ایک اچھر کی کئی کئی آوازیں مانی جاتی ہیں اور پھر دیس دیس میں اس کے ایک ایک اچھر کی آوازیں بھی الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ ترکی میں جلال کو رومن لپی جلال اور مصر میں جمال کو گمال یا گمیل لکھتی ہے۔

اردو کی عربی لپی میں بھی سروں کا کوئی دھیان نہیں ہے۔ چھوٹے سروں کے لئے تین علامتیں (زیر زبر پیش) تو ہیں پر انہیں پر اعراب لگانے کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ لمبے سروں کے لئے ا، و، ی کا سہارا لیا جاتا ہے جو دوسری جگہ اکشر (حروف صحیحہ) کا بھی کام دیتے ہیں اور پڑھنے والوں کو بھول بھلیوں میں پھنسا دیتے ہیں۔ و تو ہی ہے اور یائے ہوز کی آوازوں میں بھی گھپلا ہو جاتا ہے۔ ی جب بول کے بیچ میں آتی ہے تو یائے معروف اور یائے مجہول کا بل مٹ جاتا ہے۔ شیر کو شیر اور شیر دونوں طرح پڑھ سکتے ہیں۔ اس لپی پر کئی سروں کی علامتیں ہی سرے سے نہیں ملتیں۔ اس میں ایک ایک بول کو کئی طرح لکھا جاتا ہے اور ایک ہی بول پونچ، پہنچ، پوہنچ، پہونچ اور پھونچ کے پانچ روپوں میں لکھا ہوا مل جاتا ہے اس لئے اس لپی کی پڑھائی میں بھی اٹکل ہی سے کام چلتا ہے۔

سنسکرت اور ہندی کی دیوناگری لپی ان دونوں لپیوں سے کچھ اچھی ہے کیونکہ اس میں سروں کے لئے علامتیں ملتی ہیں اور زیادہ جیسا لکھو ویسا پڑھو کی آسانی رہتی ہے پر اس میں بھی کئی سروں کے لئے علامتیں نہیں ملتیں اور عربی فارسی کے خاص اچھروں (غ، ق، ز وغیرہ) کے لئے بھی اچھر نہیں ہیں۔ چل (متحرک) اور اَچل (ساکن) اچھروں کی لکھاوٹ کا ڈھنگ تو ہے پر اس کی پابندی نہیں ہے۔ یوں اس لپی کے پڑھنے میں بھی بہت کچھ اٹکل سے کام چلانا پڑتا ہے۔

لپیوں کی کھوٹ کے کارن ہی لکھاوٹی روپ دیکھ دیکھ لوگوں کا اچار بھی بگڑ جاتا ہے۔ وہ جب اردو کے پیار کو اُردو ہی میں پیار اور پھوڑا کو پھوڑا بولنے لگے ہیں۔ انگریزی میں عربی مثل اونٹ (کیمل)، فلٹن کو فوٹن، اَرد وکٹیلی کو کٹیل، کھاٹ کو کوٹ، فارسی دیدار کو تھیٹر، خاکی کو کھاکی کہنے لگے ہیں۔ اور مہابک میں فارسی خرامیم (رحم ہیں) اکو براہیم، فارسی خرد کو کرتو اور فارسی دروغ کو دروگھ پڑھتے چلے آرہے ہیں تو عربی کے اولوالعزم کو اولو۔ العزم اور فارسی خوار کو خ وار بھی پڑھ سکتے ہیں۔

یوں تو بولی کے سماج میں جہاں ہر ایک بول کا اچار کانوں سے سنا جاتا ہے لغات میں اچار دیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی پر دوسرے دیس میں جہاں لوگوں کو اس کا اچار سننے کو نہیں ملتا اور خالی لکھاوٹوں ہی سے کام چلانا پڑتا ہے لغات میں بولوں کا اچار دینا بہت ضروری ہو جاتا ہے۔ عربی، فارسی اور انگریزی کے لغات میں یہ ریت بھی ملتی ہے۔ عربی فارسی میں یہ تمام عبارتوں سے اور انگریزی میں علامتوں سے لیا جاتا ہے۔ ان کی دیکھا دیکھی اردو کے لغات میں بھی کہیں کہیں اس کا جتن کیا گیا ہے پر بہت ہی بے دلی سے کیا گیا ہے کیونکہ ہماری بولی میں سروں کی علامتیں نہ ہونے کے برابر ہیں اور جب تک علامتیں نہیں بنیں گی یہ کام بھی ٹھیک نہیں ہو سکے گا۔

لغت میں معنی لکھنے کے کئی طریقے کام میں لائے جاتے ہیں۔

۱۔ تصویری۔ جس بول کے معنی بتانا ہوتے ہیں اس کی تصویر بنا دیتے ہیں جیسے شیر، چرخا وغیرہ۔ یہ طریقہ دوسری بولیوں جیسے عربی اور انگریزی وغیرہ کے لغات میں تو دیکھنے میں آتا ہے پر اردو میں اس کا چلن نہیں ہے۔

۲۔ تعریفی۔ بول کے آگے اس کی تعریف لکھ دی جاتی ہے جیسے مثلث۔ تین خطوط مستقیم سے گھری ہوئی شکل۔ یہ طریقہ اصطلاحوں کے

معنی بتانے میں کام آتا ہے

۳۔ تشریحی۔ کبھی اس چیز کی خصوصیات اور اس کا استعمال وغیرہ بتا دیا جاتا ہے جس سے وہ بول گھڑا گیا ہے جیسے ساہل۔ راجوں کا ایک آلہ جو لوہے یا پتھر کے گول ٹکڑے پر ڈوری یا دھاگہ باندھ کر تیار کیا جاتا ہے اور راج اس کو لٹکا کر دیوار کی سیدھ ناپتے ہیں۔

۴۔ مترادف۔ کبھی کسی دوسری بولی کا کوئی ہم معنی بول ہی لکھ دیتے ہیں یا اسی بولی کا کوئی ایسا بول بھی دے دیتے ہیں جو معنی میں اس سے ملتا جلتا ہو جیسے اچھا۔ خوب۔ مناسب۔ نیک۔ ستھرا وغیرہ۔

۵۔ بہروپ۔ کبھی بول کے معنی بتانے کے لیے گرامر کے اصولوں کی مدد سے اس بول کا دوسرا روپ گھڑ کر دے دیا جاتا ہے جیسے ڈھانکنا۔ ڈھانپنا۔ یا کھینچنا۔ چلنا۔

بہت سے لغات سامنے رکھ کر ایک نیا لغت لکھ ڈالنے کی ریت آج کی نہیں بہت پرانی ہے اور کچھ بری بھی نہیں ہے کیونکہ سنسار میں ہمیشہ سے دیا جلتا چلا آیا ہے پر ان میں ایسے لغات کی گنتی بہت تھوڑی سی ہے جن کے لکھنے والوں نے بولوں کے لکھاوٹی روپوں پر کم اور بول چال پر دھیان زیادہ دیا ہو۔[1] یہ کام بہت محنت اور دقت چاہتا ہے اور کھوج کا کام بہت کم لوگ کرتے ہیں۔ یہ سچی بات یہ ہے کہ بولی کا روپ بول چال پر دھیان دے کر ہی نکھارا جا سکتا ہے۔ پراکرت کے ایک نامی گرامر نویس لکشمی دھر نے اپنی کتاب "شڈ بھاشا چندرکا" میں یہ بات کھول کر لکھی ہے اور اسے اپنی گرامر کا ایک اصول بنا دیا ہے کہ جہاں جہاں لکھاوٹی روپ اور بول میں بل پایا جائے وہاں وہاں روپ کو چھوڑ کر بول چال کو اپنانا چاہیے کیونکہ بولی بول چال کا ہی دوسرا نام ہے۔

اردو کے لغات میں وہ بدیسی بول تو ہوتے ہی ہیں جو عام طور پر اردو زبانوں میں بولے جاتے ہیں پر کچھ لغات میں ایسے ایسے بدیسی بول بھی بھر دیئے گئے ہیں جو اردو میں کبھی بولے نہیں گئے اور جن کی اب بھی کوئی ضرورت نہیں پڑتی۔ لکھنے والوں کو ایسے لغات لکھنے میں بہت بڑی آسانی یہ ہے کہ انھیں ادھر کے بول ڈھونڈنے کے لئے اردو بولنے والوں کے یہاں مارا مارا پھرنا نہیں پڑتا۔ اور جب انھیں بہت سے بول بدیسی بولیوں کے لغات میں ایک جگہ مل جاتے ہیں جنھیں نقل کرکے وہ اپنے اپنے لغات کو بڑے سے بڑا بنا سکتے ہیں تو وہ اردو کی بول چال سے ناطہ کیوں جوڑیں۔ ایسے لغات میں اچار (تلفظ) سے زیادہ بولوں کے لکھاوٹی روپ پر دھیان اور زور دیا گیا ہے اس لئے یہی ادبی لکھاوٹ کی جو کھوٹیں اوپر بتائی جا چکی ہیں وہ سب ان میں پائی جاتی ہیں۔ کبھی یہیں سے جنم لینے والا بگڑا ہوا اچار سامنے آتا ہے، تو کبھی ایک ہی بول کے کئی کئی روپ دیکھنے کو ملتے ہیں جو لکھاوٹ کی الگ الگ ریتوں سے بن گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے لغات سے بولی کے پیاسوں کی پیاس نہیں بجھ سکتی۔

اردو ہی کیا دنیا کی ہر بولی کا یہ اصول ہے کہ بدیسی (دخیل) بول کا اصلی اچار کچھ بھی ہو جب وہ ایک بار اس بولی میں چالو ہو گیا تو جس طرح بولنے والے اسے بولیں گے اسی طرح ٹھیک مانا جائے گا۔ انگریزی میں سیکڑوں بدیسی بول اصلی اچار سے ہٹ کر بولے جا رہے ہیں جیسے

---

[1] فاضل لکھنوی صاحب کے لکھے ہوئے لغت "جدید نسیم اللغات" میں بول چال کی طرف زیادہ جھکاؤ ملتا ہے۔

کھائی، کوٹ، کیمپ اور انگریزی بولنے والے ان پڑھ اور پڑھے لکھے سب کے سب ان کے چولو اچار کو ٹھیک مان رہے ہیں۔ ان میں سے ایک بھی تو یہ نہیں کہتا کہ انھیں کھائی، کھاٹ اور کیمپ بولا جائے پھر اردو والوں سے ہی یہ تقاضا کیوں کیا جاتا ہے کہ وہ نقل کو نقص، شمع کو شمع اور غزل کو غزل بولیں جبکہ وہ بھی ان بدیسی بولوں کو اپنے دیسی لہجے میں ڈھال کر بول رہے ہیں۔ اردو کے لغات بھی بدیسی بولوں کا بدیسی اچارہ تو دیتے ہیں پر دیسی اور چالو اچار نہیں دیتے۔ یہی کارن ہے کہ ہمارے لغات سے اردو بول چال کا رنگ نہیں جھلکتا اور یہی ان کی سب سے بڑی کھوٹ ہے۔

انگریزی کے کچھ لغت کار لغت میں بول کے ساتھ ساتھ اس کتاب کا نام بھی لکھ دیتے ہیں جس میں وہ پہلی بار آیا ہے اور وہ اس کو تاریخی لسانیات سمجھتے ہیں پر نہ یہ تاریخی لسانیات کے ہی معنی میں اور نہ کسی بول کے لکھاوٹ میں آ جانے سے اس کی گھڑائی کا ٹھیک ٹھیک بناؤ ہی ہو سکتا ہے کیونکہ بہت لکھنے والا ہر بول نہیں لکھتا ہے۔ کا مصنف ایک بول کو چھوڑ دیتا ہے اور اس کے پیچھے آنے والا اسے اپنی کتاب میں لکھ دیتا ہے تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ وہ بول پہلے مصنف کے زمانے تک نہیں بن پایا تھا۔ پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بول پہلے کی کسی کتاب میں لکھا گیا ہو اور وہ کتاب لغت لکھنے والے کے ہاتھ نہ آ سکی ہو یا وہ کتاب ہی مٹ چکی ہو۔ اس لئے اس بات کا بناؤ کہ کون سا بول پہلے بنا اور کون سا پیچھے بنا خود بولوں پر دھیان جمانے سے ہی ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر سب سے پہلے جڑیں بنیں۔ ان کے پیچھے ٹکڑے بنے اور پھر جڑوں پر ٹکڑے بڑھا بڑھا کر دوسرے بول گھڑے گئے ہیں۔ پھر جڑیں بھی دو بھانت کی ہیں۔ ابتدائی اور ثانوی۔ ان میں سے ابتدائی پہلے اور ثانوی پیچھے ڈھالی گئیں۔ بول کے ایسے ہی مطالعے کو تاریخی لسانیات کہتے ہیں اور دنیا کی ہر بول کی طرح ہماری بولی بھی اس مطالعے کا راستہ دیکھ رہی ہے۔

کسی بولی کا لغت لکھنے والوں کے سامنے ایک کٹھنائی یہ ہے کہ وہ کس بول کو اپنا اور کس کو پرایا مال سمجھیں۔ انہیں یہ کون بتائے کہ فلاں بول اسی بولی کا ہے اور فلاں بول بدیسی (دخیل) ہے۔ اس کے لئے انہوں نے یہ راستہ نکالا ہے کہ وہ کسی مصنف کا جملہ یا کسی شاعر کا شعر لکھ دیتے ہیں جس میں وہ بول آیا ہے۔ اس سے ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ فلاں مصنف یا شاعر جس نے یہ بول لکھا ہے اسی بولی کا ہے اس لئے یہ بول بھی اسی بولی کا مال ہے۔ ایسی سند کو دوسرے لغت کاروں کی طرح ہمارے لغت کار بھی کافی سمجھتے ہیں پر ان کا یہ جتن کھوٹ سے خالی نہیں ہے۔ آخر یہ کیسے مان لیا جائے کہ جس ادیب یا شاعر نے (چاہے وہ اسی بولی کا ہو) یہ بول لکھا ہے وہ ٹھیٹھ دیسی بول ہی لکھتا ہے اور کبھی بدیسی بول نہیں لکھتا ہوتا یا وہ سدا ٹھیک بول ہی بولتا ہے کوئی کھوٹا بول کبھی نہیں بولتا۔ پھر اس نے کبھی تو یہ بول ٹکسالی کہہ کر نہیں لکھا ہے۔ بول کے ٹھیک یا ٹکسالی ہونے کا دعویٰ تو لغت کار کرتا ہے اور اپنے دعوے کا بوجھ ادیب یا شاعر پر ڈال دیتا ہے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

اردو کے ادیب اور شاعر الگ الگ دیسوں کے باسی ہیں اور ان دیسوں کی اردو میں مقامی بولیوں کا پٹ بھی ملا ہوا ہے اس لئے ان لغات میں ہر وہ شعر یا جملہ جو لکھا گیا ہے اس کا شاعر یا ادیب کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو کھری اور بے میل اردو کا نمونہ نہیں کہا جا سکتا اور اس کی اردو ٹکسالی اردو نہیں مانی جا سکتی اس لئے سند دینے کا یہ ڈھنگ غلط ہے۔ مولوی نذیر احمد کی مثال سامنے ہے وہ اپنی کتابوں میں کہیں کہیں اپنی جنم بھوم بجنور (یو پی۔ بھارت) کی بول چال بھی لکھ گئے ہیں جو ٹکسالی اردو سے ہٹی ہوئی ہے۔ مولوی صاحب اردو کے بہت بڑے

ادیب ہی ان کے منہ سے نکلا ہوا بول یا ان کے قلم سے نکلا ہوا اہم لفظ ٹکسالی نہیں مانا جا سکتا۔ لغت کار مولوی صاحب کے نام کی دہائی دیتا ہے ایسی بول چال اور ایسے بول کو ٹکسالی نہیں کہا جا سکتا۔

بولی کا سہارا عوامی ہے۔ اس میں کسی ایک کا اجارہ نہیں۔ کوئی وہ سند چلتا ہے۔ ہر کوئی ادیب یا شاعر پورے سماج کی کچھ نہیں رہے سکتا۔ ہر بولی کے سماج میں پڑھے لکھوں کے ساتھ ساتھ ان پڑھ بھی ہوتے ہیں اور گنتی میں ان سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں اس لیے بولی کی سند صرف پڑھے لکھوں ہی سے نہیں ان پڑھوں سے بھی لینا چاہیے۔ اس لیے اور بھی ضروری ہے کہ ان پڑھوں کی بول چال پڑھے لکھوں سے زیادہ کھری اور بے میل ہوتی ہے۔ پھر بولی کا دریں بھی نگروں میں نہیں دیہات میں ہوتا ہے۔ ایک نگر میں کتنی ہی بولیاں بولنے والے بستے ہیں اس سے نگر بسیوں کی بول چال میں بدیسی بولوں کا زیادہ میل ہو جاتا ہے اور وہ کھچڑی بولی بولنے لگتے ہیں بلکہ دیہات کے رہنے والوں کی بول چال میں ملاوٹ سے بہت کچھ بچی رہتی ہے۔ محنت اسی لغت کار کی سوارت ہوتی ہے جو نہیں صرف پڑھے لکھوں کے ساتھ ساتھ ان پڑھوں کی بول چال بھی سنتا ہے اور نگر باسیوں کی بول چال کے ساتھ ساتھ دیہات والوں کی بول چال کو بھی سامنے رکھتا ہے۔ لغت کے لیے ضروری ہے کہ وہ بول چال کا رنگ دکھائے اور یہ رنگ تبھی چوکھا ہو سکتا ہے جب کچھ دکھ بھر کے اسے ڈھونڈنے کا جتن کیا جائے۔ سند میں کسی ادیب کا جملہ یا شاعر کا شعر لکھنے سے کہیں اچھا اور ضروری ہے کہ لغت کار لغت میں اس دیس (علاقے) کا نام لکھ دے جہاں وہ بول یا محاورہ بولا جاتا ہے۔

اردو میں اب تک جتنے لغت لکھے گئے ہیں وہ سب کے سب ادبی ہیں اور ادیبوں اور شاعروں کی سندیں سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں اس لیے بولی کے طالب علم کو پورا فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ ان سے اردو کی عوامی بول چال کا ٹھیک ٹھیک حال معلوم نہیں ہوتا۔ اردو کے لہجے کا اندازہ نہیں ہوتا۔ بولوں کے اچار کا پتا نہیں چلتا۔ ان کی اصل نسل ظاہر نہیں ہوتی اور اس علاقے کا کھوج نہیں ملتا جس میں کوئی خاص بول بولا جاتا ہے۔ اس لئے اردو میں ایسے لغات تیار ہونے چاہئیں جن میں اوپر لکھی ہوئی باتوں کی طرف پورا دھیان دیا گیا ہو اور جو بولی کا سچا رنگ روپ دکھا سکیں۔

اردو ادب میں جذبات کا عنصر

محمد شمس الدین صدیقی

اس غرض سے کہ ذہن میں کوئی پراگندگی نہ پیدا ہو پہلے یہ طے کرلینا چاہیے کہ جب ہم ادب اور جذبات کے موضوع پر گفتگو کر رہے ہیں تو کس کے جذبات مراد لے رہے ہیں۔ کیونکہ ادبی اثرات کی بحث میں تین فریق ممکن ہیں جن کے جذبات پر توجہ دی جا سکتی ہے اور بعض اوقات ہم اپنی گفتگو میں تینوں کے جذبات کو گڈمڈ کر دیتے ہیں۔ جذبات' قاری کے بھی ہو سکتے ہیں' مصنف کے بھی اور کسی خیالی کردار کے بھی جسے مصنف نے اپنی تصنیف میں پیش کیا ہو۔ مثال کے طور پر جب ہم امتیاز علی تاج کے ڈرامے انار کلی کی جذباتی قدروں کی بات کرتے ہیں تو کیا ہم اس سے وہ جذبات مراد لیتے ہیں جو ہم میں اس ڈرامے کو پڑھتے ہوئے یا اسٹیج پر دیکھتے ہوئے پیدا ہوتے ہیں' یا وہ جذبات جو مصنف نے اس ڈرامے کو لکھتے وقت محسوس کیے تھے یا خود ڈرامے کے کرداروں کے جذبات؟ عام گفتگو میں یہ ممکن ہے کہ ہم تینوں ہی مُراد لیں۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ جذبہ سچا اور کھرا ہونا چاہیے تو اس وقت ہمارے ذہن میں یہ خیال ہوتا ہے کہ مصنف کو درحقیقت وہی کچھ محسوس کرنا چاہیے جس کا اس نے اپنی تصنیف میں تاثر دیا ہے یا ادعا کیا ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ کسی ڈرامے یا ناول میں پُراثر مقامات و احوال ہونے چاہئیں تو ہمارے ذہن میں یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اس ڈرامے یا ناول کے کردار پُراثر جذبات کا مظاہرہ کریں اور جب ہم کسی نظم یا ادب پارے کو ہیجان خیز یا پُرسوز یا جوش انگیز قرار دیتے ہیں تو اس وقت ہم اپنے ذاتی جذبات و تاثرات کو جو اس نظم یا ادب پارے کے پڑھنے سے پیدا ہوئے ہیں بیان کر رہے ہوتے ہیں۔ اور ایک حد تک ان تینوں مفہوموں میں سے ہر ایک بقیہ دونوں کی بھی دلالت کرتا ہے کیونکہ یہ بات مشکوک ہے کہ کوئی مصنف کسی جذبہ و احساس کو خود محسوس کیے بغیر اپنے تخلیق کردہ کرداروں میں پُراثر جذبات کا اظہار کر سکے۔ اسی طرح کسی مصنف کے لیے اپنے قارئین کے جذبات کو مرتعش کرنے کا یقینی طریقہ یہ ہے کہ وہ خود اپنے آپ میں یا اپنی تخلیق کردہ تخیلی شخصیتوں میں اُن جذبات کا مظاہرہ کرے۔ اگرچہ ادب میں جذبات کے عنصر کا ذکر اس قدر مبہم' ڈھیلے ڈھالے انداز میں کیا جاتا ہے تاہم اپنی موجودہ بحث کے لیے ہم اسے زیادہ تر ایک مفہوم کی حد تک محدود رکھنے کی کوشش کریں گے یعنی قارئین کے جذبات۔ گویا ادب میں جذبات کے عنصر سے ہماری بالعموم مراد ہوگی پڑھنے والوں کے جذبات کو بیدار یا مرتعش کرنے کی طاقت جو ادب میں پائی جاتی ہے۔

پہلا سوال ہم یہ اٹھا سکتے ہیں کہ وہ کونسے جذبات ہیں جنہیں ادب اپیل کرتا ہے؟ اس کے جواب میں ہم ادبی جذبات کو شمار کرنے یا ان کی طبقہ بندی کرنے کی لاحاصل کوشش نہیں کریں گے کیونکہ یہ جذبات بہت متنوع اور پیچ در پیچ ہیں اور ان کی طبقہ بندی یا ان کا شمار محال ہے۔ تاہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ دو قسم کے جذبات ایسے ہیں جنہیں ہم جائز و بجا ادبی جذبات کے دائرے سے خارج قرار دے سکتے ہیں۔ ایک تو نافعِ ذات جذبات ہیں جن کو اپیل کرنا ادب کا کام نہیں۔ دوسرے تکلیف دہ جذبات بھی

ادبی اپیل کے لیے موزوں نہیں۔ نافع ذات جذبات سے ایسے تمام جذبات مراد ہیں جو ہمیں کسی چیز کو اپنے ذاتی مفاد یا استعمال کے لیے حاصل کرنے پر اُکسائیں (مثلاً بخل یا لالچی پن یا ہوسناکی) یا ہمیں ایسے خطرے سے بچنے کے لیے اُکسائیں جو ہماری ذاتی سلامتی کو لاحق ہے (مثلاً ہول یا دہشت) یا ہمیں کسی ایسی مسرت یا گزند یا احسان کا بدلہ لینے یا دینے پر اُکسائیں جو ہمیں شخصی طور پر ملا ہے مثلاً انتقام یا ذاتی شکرگزاری) دوسروں میں ایسے جذبات کا تصور ہم میں ایسا احساس بیدار کر سکتا ہے جو ادبی صفت یا خصوصیت رکھتا ہو لیکن بذاتہ ان میں سے کوئی جذبہ خواہ کیسا ہی لائق تعریف اور مسرت بخش سہی ادبی جذبہ نہیں ہے۔ کسی شخص نے اگر میرے ساتھ کوئی نیکی کی ہے، مجھ پر احسان کیا ہے، مجھے قیمتی مدد دی ہے یا کری یا روزگار دلایا ہے تو اس کا شکرگزار ہونا یا احسان ماننا اچھی بات سہی لیکن یہ کوئی ادبی جذبہ نہیں ہے۔ البتہ کسی کی دیانت داری یا ایثار یا کرم گستری کی صفت کی توصیف کرنا ادبی جذبہ ہے کیونکہ ایک صورت میں یعنی اول الذکر صورت میں جذبہ نافع ذات اور شخصی ہے اور دوسری صورت میں عالمگیر۔ ادبی جذبات کو اسی دوسری قبیل سے ہونا چاہیے۔

یہ بات کہ تکلیف دہ جذبات ادبی اپیل کے لیے موزوں نہیں اس قدر واضح ہے کہ اس میں بحث کی کوئی گنجائش نہیں۔ مثال کے طور پر تنفر و کراہت، حقارت، حسد، غضب و غصہ، جلاپا جیسے جذبات ادبی اثرات کے دائرے سے خارج ہیں کہ یہ تکلیف دہ ہیں اور کوئی صحت مند ذہنی کیفیت کا حامل شخص کبھی تکلیف دہ احساسات کا آرزومند نہیں ہوتا۔ البتہ بعض مریضانہ ذہنی کیفیت والوں کو مکروہ و ناخوشگوار جذبات میں بھی دلکشی محسوس ہوتی ہے۔ ایسے جذبات کی آرزو جو صحت مند مذاق کے لیے تکلیف دہ یا مکروہ و ناپسندیدہ ہوں بعض اوقات تھکے ہوئے چور چور اور بہت زیادہ ہیجان زدہ احساسات یا قوائے تاثر کا نتیجہ ہوتی ہے اور بعض اوقات کسی افسردہ و پژمردہ فلسفے یا حقائق زندگی کے بارے میں قنوطی طرز نظر کا۔ لیکن وجہ خواہ کچھ ہی ہو اور خواہ یہ جذبات کہیں پائے جائیں، کسی فرد میں یا کسی معاشرے میں، یہ ہمیشہ غیر صحت مندی اور بیماری کی علامت ہیں اور ان جذبات کو تسکین دینے کی افتاد مزاج یا میلان ادبی زوال کا یقینی ثبوت ہے۔ لیکن تخیل کی حقیقت پسندانہ چمک یا شوخی اور ہیئت کی حیرت انگیز رنگینی یا خوش بیانی بھی کبھی ایسی تصویروں سے اچھا ادب نہیں پیدا کر سکتی جس میں روح کی بنیادی سوقیت اور اوچھا پن یا شہوانی جذبات یا واقعات کے آگے مجہول خود سپردگی یا گھناؤنے، رذیل اور اٹکل پچو مصائب و محن کی نقشہ کشی کی گئی ہو۔ ایسی تصویریں صحت مند ذہن میں سوائے حقارت، گھن یا تکلیف کے اور کوئی احساسات نہیں پیدا کر سکتیں۔

تاہم ایسی صورتیں ہو سکتی ہیں کہ تکلیف دہ جذبات اور تجربات و مشاہدات اعلیٰ ادبی اثرات کا پُرمنفعت منبع بن جائیں۔ یہاں ہمارا اشارہ المیے کی طرف ہے جس پر توجہ دیتے ہوئے ہم سوز و گداز کے مسئلے سے دوچار ہوتے ہیں۔ یہ انسانی فطرت کا جانا بوجھا خاصہ ہے کہ دوسروں کی تکلیف کا تصور لازماً ہم میں تکلیف دہ جذبات و احساسات نہیں پیدا کرتا۔ ہم المیہ کہانیوں، ناولوں اور ڈراموں کو ایسے جذبات کے ساتھ پڑھتے ہیں جنہیں تکلیف دہ نہیں قرار دیا جاتا بلکہ ایک لحاظ سے مسرت بخش کہا جاتا ہے۔ درحقیقت ایسے کئی اعلیٰ اور مسرت بخش جذبات ہیں جو تکلیف ہی کے تماشے سے اُبھارے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ غیر مستحق تکالیف یا غم ہمیشہ اُس ذہن میں جو اُسے تصور کرتا ہے، ترس اور ہمدردی پیدا کرتا ہے اور ترس اور ہمدردی کا جذبہ دو لحاظ سے مسرت بخش

ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ترس اور ہمدردی یا وہ کوشش جو اس سے تحریک یافتہ ہے درحقیقت اس تکلیف کو کم کرتی ہے جس پر ہم ترس کھاتے ہیں۔ جب ترس اور ہمدردی صاف طور پر لاحاصل ہو تو پھر وہ تکلیف میں بدل جاتی ہے۔ مثلاً کسی ایسے دوست کی اذیت پر ترس کھانا جو ایک ناقابلِ علاج مرض کی وجہ سے بسترِ مرگ پر پڑا ہے باعثِ تکلیف ہے لیکن کسی ایسے دوست کے رنج و ملال پر ترس کھانا اور اس سے ہمدردی کرنا جسے بے جا طور پر ملامت یا بہتان کا نشانہ بنایا گیا ہو باعث تکلیف نہیں ہے کیونکہ ہمارے ترس کھانے اور ہمدردی کرنے سے دوست کا ذہنی اور جذباتی بار ہلکا ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ترس اور ہمدردی کے جذبات اس وقت مُسرت بخش ہوتے ہیں جب ہم جانتے ہیں کہ جن تکالیف و مصائب پر ہم ترس کھا رہے ہیں اور ہمدردی کر رہے ہیں وہ خیالی و فرضی کردار ہیں کیونکہ وہ نظم یا افسانے یا ناول یا ڈرامے میں پائے جاتے ہیں یا پھر وہ رفتہ و گذشتہ ہیں جیسے کہ سوانح یا تاریخ میں۔ ایسی صورتوں میں ہمیں اپنی طرف سے کوئی عملی کوشش کیے بغیر اور اس تکلیف کے عنصر کے بغیر جو حقیقی آلام و مصائب کے علم سے پیدا ہوتا ہے، کریم النفس جذبے کی مُسرت ملتی ہے اسی طرح پُرجوش توصیف و پسندیدگی فی الاصل تکلیف مصیبت کی برداشت پر دلالت کرتی ہے۔ سورما یا وہ صفات جیسے جرأت، جان نثاری، برداشت، عالی ظرفی، اولوالعزمی اور مسائل پر رُوحِ انسانی کی فوقیت وغیرہ، ان سب کا ثبوت تکلیف ہی کے پیمانے سے ملتا ہے اور حقیقت میں انہی صفات کا اظہار مذکورہ تکلیف ہے، جو ادبی جذبات کو ابھارتی ہے۔ یہ علم کا انسانی عزم، ہول اور دہشت پر منبس سکتا ہے اور انسانی محبت موت سے زیادہ طاقت ور ہے بہت خوشی اور طاقت بخشنے والا ہے۔ بعض اوقات پامال شدہ اخلاقی قانون کے صحیح ثابت ہونے کا تماشا ہمیں ایک خاص قسم کی سنجیدہ مُسرت بخشتا ہے۔ عام طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمدردی کے کسی بھی عمل میں ایک بنیادی مُسرت ہوتی ہے خواہ ہمدردی کی اساس کوئی تکلیف دہ تجربہ ہی کیوں نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ایسا ادب بھی سوز و گداز یا شکوک و شبہات پر مشتمل ہوتا ہے پڑھنے والوں کے لیے دل کش ہوتا ہے۔ جدید شعراء میں جو سربرآوردہ نام نظر آتے ہیں ان کی شاعری میں تشکک کا عنصر بھی ہے اور ناآسودگی کا بھی جس کی وجہ سے ان کے کلام میں ایک خاص قسم کا سوز پیدا ہو گیا ہے اور پڑھنے والے ان کی شاعری پڑھ کر ایک قسم کا عمیق اگرچہ نیم ماتمی اطمینان و تسکین محسوس کرتے ہیں کیونکہ یہ علم کہ دوسرا بھی اسی طرح سوچتا اور محسوس کرتا ہے جس طرح ہم کرتے ہیں اور وہ ہمارے ہی تجربے اور تاثر کو ایسے خوبصورت اور پُراثر انداز میں پیش کر رہا ہے کہ ہم نہیں کر سکتے، یہ علم بجائے خود ہمارے انسانی برادری اور روحانی رفاقت کے قلبی احساس میں جوش و سرگرمی بیدار کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس کے مماثل اسباب کی وجہ سے تجربے اور تاثر کے تمام پہلو، خواہ وہ اندوہگیں ہی ہوں، اگر عالمگیر ہیں اور عام انسانی قسمت کا ایک حصہ ہیں تو ہمارے ذہن میں ایک فرحت بخش ہمدردی ابھارتے ہیں۔ مثال کے طور پر انسان کی امنگوں اور اس کی واقعی تحصیل میں جو فرق ہوتا ہے یہ ایک عالمگیر تجربہ ہے جو اُداس کرنے والا ہے۔ اسی طرح زندگی کی رفتار اور سرگرمی، وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ پیری میں جس طرح کم ہو جاتی ہے اور انسان کی تخیل اور ولولے میں جو زوال آ جاتا ہے اور آخر میں جس طرح موت سب امتیازات کو مٹا کر بلند ترین اور پست ترین افراد کو ایک ہی مٹی میں پہلو بہ پہلو لٹا دیتی ہے، یہ سب تجربات و مشاہدات دل میں سوز و گداز پیدا کرنے والے ہیں ان طریقوں سے انسانی تکالیف و آلام بہترین ادبی محرکات فراہم کر سکتے ہیں۔ لیکن ایک عمومی اصول کے طور پر یہ طے کیا جا سکتا ہے

کہ اچھا ادب کبھی تکلیف کو محض اُس کی بجائے اور من وجہ طور پر نہیں پیش کرتا بلکہ صرف اس لیے کہ کسی ایسے جذبے کو اُبھارے جو صحت مند ہے اور اُن وسیع معنوں میں مسرت بخش ہے جن کی طرف قبل ازیں اشارہ کیا جا چکا ہے۔

اگر ہم نافع ذات اور تکلیف دہ جذبات کو مستثنیٰ کر دیں تو ادبی اپیل کے لیے انسانی جذبات و احساسات کا سارا وسیع میدان کھلا ہوا ہے۔ اگر کوئی کتاب کسی بھی انسانی جذبے کو اپیل کرنے کی دائمی قوت رکھتی ہے تو وہ اسی بات سے ادب کے دائرے میں داخل ہے۔ مختلف النوع ادبی جذبات کی طبقہ بندی مشکل بھی ہے اور بے سود بھی۔ اس لیے کہ جامع و مانع طور پر ممکن نہیں ہے۔ مشہور انگریز نقاد رسکن نے شعر و ادب کی تعریف کرتے ہوئے ایسی طبقہ بندی کرنے کی کوشش کی تھی اور بتایا تھا کہ ادب کے اعلیٰ جذبات کیا ہیں رسکن کے مطابق بنیادی ایجابی جذبات چار ہیں یعنی محبت، احترام، توصیف اور خوشی اور بنیادی سلبی جذبات بھی چار ہیں یعنی نفرت طیش، خوف اور غم۔ وہ کہتا ہے کہ یہ جذبات باہم ممزوج ہو کر شاعرانہ احساس تخلیق کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ رسکن کی طبقہ بندی بہت محدود قسم کی ہے۔ مثلاً بعض نظموں کو پڑھ کر امن و سکون کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ اس تاثر کو رسکن کے دیئے ہوئے کسی جذبے یا جذبات کے امتزاج سے موسوم نہیں کیا جا سکتا۔ امن و سکون کو ہم خوشی کے جذبے سے ضرور علیحدہ رکھیں گے۔ مثلاً اقبال کی نظم ایک شام (دریائے نیکر کے کنارے پر) کا تاثر امن و سکون کا ہے نہ کہ خوشی کا۔ علاوہ امن و سکون کے مثال کے طور پر دوسرے ادبی اثرات کو دیکھئے جیسے آرزو مندی، قناعت، آرام، مزاح، حسن پرستی وغیرہ۔ ان تاثرات واحساسات کو رسکن کی طبقہ بندی کے تحت لانا محال ہے اسی طرح ادبی ہیئت کے جو جمالیاتی و ذہنی اثرات ہوتے ہیں انہیں بھی اس طبقہ بندی کی گرفت میں نہیں لایا جا سکتا جیسے احساس نغمگی یا آہنگ و قافیے کا تاثر وغیرہ۔

ادبی اثرات کو بعضوں نے صرف یہ کہہ کر محدود و متعین کرنے کی کوشش کی ہے کہ ادب، خصوصاً شاعری، احساس حسن کو اپیل کرتی ہے۔ یہ لوگ حسن کے لفظ کو اس قدر وسیع مفہوم میں استعمال کرتے ہیں کہ اس کے ذیل میں تمام ادبی احساسات، جذبات و تاثرات کو گھسیٹ لاتے ہیں۔ چنانچہ وہ منظر کو بھی حسین قرار دیتے ہیں، عورت کو بھی، نغمے کو بھی اور نظم کو بھی، خیال کو بھی اور عمل کو بھی غرض ان لوگوں کے نزدیک حسن کا مفہوم ہے لذت و مسرت جس نے معروضی شکل اختیار کر لی ہو۔ آسان لفظوں میں یوں سمجھئے کہ ان کے نزدیک لذت و مسرت جب وہ کسی شے کی صفت کے طور پر محسوس کی جائے تو حسن ہے۔ حسن کی اس وسیع تعریف میں یقیناً بے شمار ادبی جذبات شامل ہو جائیں گے۔ لیکن ساتھ ہی غیر ادبی جذبات بھی شامل ہو جائیں گے۔ مثلاً اس تعریف کے لحاظ سے ایک صحت مند شخص کو بھوک کے وقت جو غذا ملے گی وہ بھی حسین کہلائے گی۔ ظاہر ہے کہ ہم غذاؤں کو اس طرح حسین نہیں قرار دے سکتے۔ عام استعمال کی رو سے ہم فطری طور پر حسن اور حسین کے الفاظ کو ذرا محدود مفہوم میں برتتے ہیں نہ کہ اتنے وسیع معنوں میں۔ حسن کا مفہوم ہمارے ذہنوں میں جو کچھ ہے وہ ایک ایسی چیز ہے جو ان تمام احساسات و جذبات و تاثرات کا احاطہ نہیں کر سکتی جنہیں ادب اپیل کرتا ہے۔ حسن کا تعلق خصوصیت کے ساتھ بصارت سے ہے اور کسی حد تک سماعت سے۔ میں جب یہ سطر لکھ رہا ہوں تو ایک کھڑکی کے قریب بیٹھا ہوا ہوں جہاں سے دور تک وسیع منظر دکھائی دے سکتا ہے۔ درمیانی فاصلے پر ایک درخت ہے جس پر میری نظر کاغذ سے اُٹھتے ہی فوراً پڑ جاتی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس کے سبز پتے زرد اور سنہرے ہوتے جا رہے ہیں کہ خزاں کی آمد آمد ہے ان پ

کا رنگ فرحت بخش ہے اور انہیں دیکھ کر مجھے مسرت ہوتی ہے۔ پتوں میں مختلف رنگوں کا امتزاج اور کہیں ان کا گھنا ہونا کہیں خالی خالی ہونا بہت خوبصورت لگتا ہے۔ اس کے علاوہ خود درخت کی شکل بھی فرحت بخش ہے اور میں اسے متناسب و متشاکل قرار دے سکتا ہوں۔ رنگوں اور شکل کی دلکشی میں درخت کی ہلکی ہلکی جنبش جو ہوا کے چلنے سے پیدا ہو رہی ہے۔ یہ بھی مجھے بھلی لگ رہی ہے۔ غرض میں اس درخت کو ایک حسین چیز قرار دے دیتا ہوں۔ اس کا رنگ اور اس کی شکل مل کر میرے دل میں ایک خاص جذبہ پیدا کر رہے ہیں جو نہایت سادہ اور اساسی محسوس ہوتا ہے۔ خواہ وہ کوئی سے طرقِ عمل ہوں جن کی وجہ سے یہ ادراک ممکن ہوا ہے اور خواہ اس کے عضویاتی تصرفات کی کوئی سی توجیہہ کی جائے، مجھے اس توجیہہ یا تجزیے کی بھی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس موقع پر مجھے حسن کا تاثر اپنے سادہ ترین اور مفصل ترین شکل میں محسوس ہو رہا ہے۔ اس کا کوئی تعلق کسی قسم کی اخلاقی صفت سے نہیں ہے اور نہ ہی انسانی عمل یا کردار سے۔ لیکن اب میں اپنی نظر کو درخت سے ہٹا کر سارے وسیع منظر پہ ڈالتا ہوں جو دور تک پھیلا ہوا ہے۔ مجھے تفصیلات کی گونا گونی نظر آتی ہے۔ تاہم میں ان کا ایک کل کی حیثیت سے ادراک کر سکتا ہوں۔ وہ لمبی اور اونچی افقی لائن جو میرے سامنے ایک پہاڑ کی نیم کردی جسمیت کے ادبر نظر آ رہی ہے۔ وہ مشرقی پہاڑوں کے گہرے رنگ کی ڈھلوانیں جن کے دامن میں ایک دریا بہہ رہا ہے۔ دریا کا وسیع پھیلاؤ جو ایک خاموش جھیل کی طرح پڑا ہوا ہے اور آسمان سے زیادہ نیلا نظر آ رہا ہے۔ کھیت ہی کھیت جن کے بیچ میں کہیں کہیں کوئی جھونپڑا بھی ہے اور نیچے کی طرف نظروں کے سامنے قصبے کے مکانات کی چھتیں جو درختوں کے جھرمٹ ہوئے پتوں کے بیچ میں سے نظر آ رہی ہیں، جب میں اس سارے منظر پر نظر دوڑاتا ہوں تو بے اختیار کہہ اٹھتا ہوں "واہ کتنا حسین منظر ہے"۔ لیکن اب جو جذبہ یا تاثر مجھ سے یہ الفاظ کہلوا رہا ہے اگر میں اس کا مقابلہ صرف درخت کے دیکھنے کے تاثر سے کرتا ہوں تو یہ دیکھتا ہوں کہ یہ نہ صرف عمیق تر ہے بلکہ زیادہ پیچ در پیچ بھی ہے۔ رنگ اور شکل اور جنبش کی دلکشی اس میں موجود ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ میری قوت تخیل نے بھی اس میں عمل دخل حاصل کر لیا ہے اور تخیل کا مقصد ہے مسرت انگیز ذہنی تحریکات کو افزوں کرنا۔ اس وسیع و عریض منظر کو دیکھ کر ذہن میں دوسرے تجربات و مشاہدات بھی مبہم طور پر مجھے یاد آتے ہیں۔ یہ سامنے کا پہاڑ مجھے ایک اور پہاڑ کی یاد دلاتا ہے جسے میں نے کشمیر میں دیکھا تھا اور پہاڑوں کے بارے میں جن شاعروں اور ادیبوں کے تاثرات میں نے پڑھے ہیں وہ بھی مبہم طور پر ذہن میں بیدار ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کئی غیر واضح مگر فرحت بخش یادیں ابھر آتی ہیں۔ ان سب باتوں پر مستزاد یہ کہ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس منظر میں ایک قسم کی اخلاقی تحریکِ ذہنی یا خیال افروزی بھی ہے۔ امن و سکون، پر قرار استحکام، اور سکون بخش طاقت کا اشارہ سا ہے، دریا میں امن و سکون کا مفہوم رکھتا معلوم ہوتا ہے، دور مکانات اور ان کی چھتوں سے نکلتا ہوا دھواں گھریلو زندگی اور محبت اور امن چین کا خیال پیدا کرتا ہے، پہاڑ ایک قسم کی رفعت و طاقت کا تاثر دیتے ہیں۔ غرض بے شمار ذہنی تحریکات اور نیم ساختہ یادیں میرے جذبہ و تاثر میں مل گئی ہیں تاہم اب سب کے مجموعی اثر کو میں لفظِ حسین ہی سے ادا کرتا ہوں۔

اس مثال سے ظاہر ہو گیا ہو گا کہ حسن کا تاثر فطری طور پر ایسے احساس پر منطبق کیا جاتا ہے جو اپنی سادہ ترین اور ابتدائی شکل میں بصارت اور سماعت کی دلپذیر چیزوں سے تحریک پاتا ہے لیکن اس کی بلند تر صورتوں میں یہ سادہ احساس کئی اور مسرت انگیز

احساسات سے مخلوط ہو جاتا ہے جو کسی دلپذیر شے سے تحریک پا نے ہیں یا اس سے مربوط ہوتے ہیں۔ خارجی اشیاء کی یہ محرک خیال یا جذبہ انگیز طاقت اس حقیقت پر منحصر ہے کہ مادی اور ذہنی و روحانی چیزوں سے بے شمار مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً امن چین نہ صرف ایک ذہنی حالت ہے بلکہ جسمانی بھی ہے اور جو کوئی چیز بدیہی طور پر استوار او غیر متغیر ہے وہ سکون وقرار اور روحانی امن کا نہ صرف اشارہ دے سکتی ہے بلکہ اس کی تحریک بھی کر سکتی ہے۔ مثلاً پہاڑ یہی تاثر دے سکتا ہے۔ ایک گہرے اور آہستہ آہستہ بہتے ہوئے دریا کو دیکھ کر جو جذبہ یا تاثر ہم پر طاری ہوتا ہے اور ایک پُرسکون مبنی بر راستی زندگی پر دھیان دینے سے جو جذبہ یا تاثر پیدا ہوتا ہے یہ دونوں بالکل ایک جیسے تو نہیں لیکن ایک دوسرے کے مماثل ضرور ہیں اور ایک جذبہ دوسرے کا اشارہ دیتا ہے۔ ہم جس طرح دریا کو حسین قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح اس کے مماثل زندگی کو بھی حسین قرار دینے لگتے ہیں۔ اس طرح اگرچہ احساس حسن کی ابتدائی اور سادہ ترین شکل طبیعی اشیاء سے براہ راست تحریک پا کر حاصل ہوتی ہے تاہم ہم لفظ حسین ایسی بہت سی چیزوں کے لیے استعمال کر لیتے ہیں جو ہم میں طبیعی حسن والی چیزوں سے پیدا شدہ تاثر کے مماثل تاثرات و جذبات پیدا کرتی ہیں۔ اس طرح تمام مادی چیزوں کے حسن کا احساس ان کی اخلاقی مشابہتوں کی خیال افزائی کی طاقت کے سبب کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔ پہاڑ ہمیں اس وقت اور بھی زیادہ خوبصورت نظر آتا ہے۔ جب وہ ہمیں امن چین اور راستی کام کی یاد دلاتا ہے۔ دریا اور بھی حسین دکھائی دیتا ہے۔ جب ہم اسے امن و سکون کے مفہوم کے ساتھ وابستہ کر دیتے ہیں۔ رسکن کے نظریے کے مطابق تو حسن کے اثر کی توجیہہ یوں ہوتی ہے کہ حسن ایک قسم کی اشارتی زبان ہے جس کے ذریعے روحانی صفات محسوس اشکال میں ظاہر کی جاتی ہیں لیکن اس نظریے پر یہ فوری اعتراض وارد ہوتا ہے کہ یہ سادہ اور اساسی احساس کی توجیہہ مرکب اور فرعی انداز سے کرتا ہے تاہم یہ درست ہے کہ حسن کے احساس کے تمام برتر اور ترقی یافتہ اشکال بڑی حد تک ایک اخلاقی عناصر سے عبارت ہوتے ہیں۔

قطعیت و صحت کے ساتھ ان چیزوں کی خصوصیات بیان کرنے کی کوشش ترک کر کے جنہیں ہم حسین قرار دیتے ہیں یا ان جذبات کی خصوصیات بیان کرنے کی کوشش چھوڑ کر جو ہم میں بیدار ہوتے ہیں۔ ہم وثوق کے ساتھ اس بات کو بیان کرتے ہیں کہ ادب جن بے شمار جذبات و احساسات کو استعمال کرتا ہے۔ انہیں احساس حسن کی شکلوں میں تحلیل کرنا محال ہے سوائے اس کے کہ ہم لفظ حسن کو من مانے طور پر ایسے وسیع مفہوم میں استعمال کریں کہ عام استعمال اس کی اجازت نہیں دیتا۔

شاید ادبی جذبات کا ایک عمیق تر اور وسیع تر اگرچہ غیر متعین وصف یا خاصہ اس بیان میں مل سکتا ہے کہ یہ سب زندگی سے ہماری دلچسپی کی مختلف صورتیں ہیں۔ زندگی جو کچھ بھی ہے ہمارے علم کے مطابق وہ ہماری ان طاقتوں اور صلاحیتوں کا خلاصہ ہے جنہیں ہم روبہ عمل ہوتے دیکھتے ہیں۔ جب یہ طاقتیں اور صلاحیتیں کسی کمزوری یا مزاحمت کے بغیر عمل کرتی ہیں تو ہم اسے لذت یا مسرت قرار دیتے ہیں وہ صلاحیتیں جتنا زیادہ عمل کرتی ہیں اور جتنی سہولت سے عمل کرتی ہیں۔ ہم اتنی ہی زیادہ زندگی کے حامل ہوتے ہیں اور جتنی زندگی ہو گی اتنی زیادہ لذت و مسرت۔ جو کچھ بھی ہمارے احساس زندگی کو بڑھاتا ہے ہمیں لذت و مسرت دیتا ہے اور جو کچھ بھی اسے کم کرتا ہے یا اسے خطرے میں ڈالتا ہے ہمیں تکلیف دیتا ہے۔ اب یہ ممکن ہے کہ ادبی یا حسن کارانہ احساس کے مختلف منبعے یا تقریبیں اس بات میں ایک اساسی سبب اشتراک پالیں کہ یہ سب کسی قسم کی ہمدردی کے ذریعے اس احساس زندگی کو اکسانے اور بڑھا

کی طاقت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر طاقت کے لیے ہمارا جذبۂ توصیف ایک قسم کا ایسا احساس ہے کہ ہم بھی ایک ہمارا دانہ یا کم از کم تخیلی حصہ اس طاقت میں بڑھلتے ہیں جس کی ہم توصیف کرتے ہیں۔ اسی لیے کسی بھی قسم کی طاقت ہو ہمیشہ توصیف کا معروض ہوتی ہے۔ سوائے اس کے کہ ہماری سلامتی کو محدود کردے۔ بلکہ ایسی صورت میں ہمارا جذبۂ توصیف جذبۂ خوف میں بدل جاتا ہے اسی طرح حسن کا احساس ہمیشہ یہ دلالت کرتا ہوا نظر آتا ہے کہ اس سے شعوری زندگی کا ایک نیا اور ہیجان خیز احساس: ایک حیاتی احساس مسرت پیدا ہوتا ہے۔ محبت اور خوشی کی سب شکلیں اس سے بھی زیادہ ظاہر طور پر ایسے جذبات و احساسات ہیں جو ہماری سرگرمیوں کو تر و تازہ کرتی اور ہمارے احساس زندگی کو وسیع کرتی ہیں۔ ہمارے عمیق ترین اخلاقی جذبات بھی (جیسے جذبات انصاف و احترام اور مذہبی مناہی وغیرہ) ہمیں اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ طبعی روابط سے برتر ایک اور زندگی ہے جو تمام اعمال پر قانون عائد کرتی ہے۔ لیکن خود اس کی تحدید کرنا یا اس کو پابند کرنا مشکل ہے' اور وہ مبہم' ناقابل تعین جذبات جو اکثر اوقات بہت شدید ہوتے ہیں جیسے موسیقی سننے پر یا کسی خاص لمحے میں ایک مبنی منظر دیکھنے پر یا مردوں عورتوں کو ایک بڑے ہجوم کی شکل میں دیکھنے پر یا کسی ایسے موقعے پر پیدا ہوتے ہیں جبکہ انسانیت اور بنی نوع انسان کا تصور بڑی قوت کے ساتھ ہم پر طاری ہوتا ہے۔ ایسے احساسات مبہم' مبہم و واضح' غیر متشخص آرزوؤں سے عبارت ہوتے ہیں جن کا مدعا کسی برتر' خالص تر' نفیس تر چیز پر متکی ہوتا ہے۔ ایسے احساسات اپنے ساتھ ایک ہلکا سا حزن بھی شامل رکھتے ہیں لیکن تکلیف دہ نہیں ہوتے۔ یہ احساسات و جذبات ہمارے اندرون میں ایک ناآسودہ غیر مطمئن روحانی زندگی کی عمیق ہلچل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ایسے ہی لمحات میں ہم بہت ہیجان خیز طور پر اپنی زندگی کی شدت اور اصلیت کا اور اپنی تمناؤں اور اشتیاقات کے پرجوش ہونے کا احساس کرتے ہیں۔

لیکن حسن کارانہ احساس کی ماہیت کی بحث سے قطع نظر کر کے جو دراصل علم جمالیات سے تعلق رکھتی ہے' آئیے تنقید کے زیادہ علمی مسئلے پر متوجہ ہوں کہ ہم کس طرح ادب کے اہم ترین عنصر یعنی "جذبات" کی پیمائش اور تخمین کر سکتے ہیں؟ اس سوال کا تفصیل سے جواب دینے سے قبل ہمیں یہ ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ بہت سے لوگوں میں ایک خاص قسم کا جذبہ بیدار کر دینے کی عارضی طاقت کسی تحریر کی ادبی قدر و قیمت کا یقینی ثبوت نہیں ہے۔ بالفاظ دیگر اپنے دور میں قبولیت عام حاصل کر لینا کسی تحریر کی دائمی قدر و قیمت کی یقینی علامت نہیں ہے۔ بعض اوقات تو معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے کیونکہ ایسی مقبولیت عام طور پر حسب ذیل اسباب پر مبنی ہوتی ہے اور یہ اسباب اعلیٰ ترین ادبی صفت سے مطابقت نہیں رکھتے۔ ایک سبب تو جدت ہو سکتا ہے خواہ مواد میں یا طریق اظہار میں۔ کوئی نئی چیز یا انوکھی اور نادر وجۂ تحریک یا غیر طبعی نفسیات یا تاحال نادریافت شدہ تجربہ یا اظہار کی ندرت یا ایسی ہی کوئی اور بات کسی کتاب کو کچھ عرصے کے لیے شہرت و اشاعت دے سکتی ہے اور مقبول ہو سکتی ہے لیکن وہ ادب پارہ جو سوائے پڑھنے والوں کے تجسس یا شوق دریافت کو جنبش دینے کے اور کوئی جوہر اپنے اندر نہیں رکھتا۔ دائمی طور پر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگرچہ دس بیس سال تک ایک نسل کے افراد کے لیے مقبول رہ سکتا ہے۔ دوسرا سبب کسی تحریر کے مقبولیت حاصل کرنے کا یہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی معاصر تحریک کی نمائندگی کرتی ہے خواہ وہ تحریک اقتصادی ہو کہ سیاسی کہ مذہبی۔ ایسی کتاب ایک قسم کی باقاعدہ جدوجہد کی دستاویز ہوتی ہے۔ ناولوں کو اس قسم کی باقاعدہ جدوجہد میں بآسانی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ایک مؤثر ناول سے زیادہ

اگر استدلال کسی تحریک کی تائید میں ادا کیا ہو سکتا ہے کہ اس میں منطقی سوال کو بھرپور انداز میں اٹھانے کے لیے بہترین مواقع اور سہولتیں میسر ہیں۔ ناول نگار اپنے نظریے کے مطابق منحرف اور اڑیل حقائق کو موڑ سکتا ہے حسب لحظہ کردار اور واقعات اختراع کر سکتا ہے اور ہنرمندی کے ساتھ نہایت ہی مایوس کن عقیدے کو بھی بظاہر خوشنما واتفاقی لباس پہنا سکتا ہے جو لوگ اس تحریک سے ہمدردی رکھتے ہیں اس کی بالوضاحت نقشہ کشی کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ صداقت کو انسانی لباس میں پیش کرنا اسی کا نام ہے۔ جو لوگ اس تحریک کے مخالف ہوتے ہیں وہ اگرچہ ایسے ناول سے برافروختہ ہوتے ہیں لیکن پھر بھی یہ دیکھ کر اس میں دلچسپی لیتے ہیں کہ جھوٹ کی حمایت میں بظاہر خوشنما واقعات کو کس طرح اختراع کیا گیا ہے اور کہتے ہیں کہ افسانے کو صداقت کے لباس میں پیش کرنا اسی کا نام ہے۔ اور جو لوگ اس تحریک سے نہ ہمدردی رکھتے ہیں نہ اس کے مخالف ہیں وہ بھی اسے قصے کی خاطر پڑھتے ہیں۔ اس طرح ناول مقبول ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات کوئی کتاب اپنی اصلاحی نوعیت کی وجہ سے مقبول ہو جاتی ہے اور اپنی ادبی خوبی کے مقابلے میں کہیں زیادہ مقبول ہو جاتی ہے کیونکہ جس سماجی یا اخلاقی یا مذہبی یا سیاسی اصلاح کی طرف وہ متوجہ کرتی ہے اس کی ضرورت عام طور پر لوگ محسوس کرتے ہیں اس لیے اس کتاب کو پسند کرنے لگتے ہیں۔ لیکن اگر مجوزہ اصلاح روبہ عمل آجائے تو پھر ایسی کتاب کی حیثیت صرف تاریخی یا باستانی رہ جاتی ہے۔ بالفرض تحریک اصلاح ناکام ہو جائے تو واقعات کی منطق ہی اس کتاب کو بے سود بنا دیتی اور وہ جلد ہی فراموش کر دی جاتی ہے۔

لیکن مقبولیت حاصل کرنے کا آسان ترین نسخہ ہے دلکش معمولی پن۔ عوام کی بڑی اکثریت بڑی کتابوں کی عظمت کو تسلیم تو کرتی ہے لیکن عام طور پر انہیں پڑھتی نہیں کیونکہ بڑی کتابیں ہلکی پھلکی تفریحی چیز نہیں ہوتیں۔ درآنحالیکہ فوری اور وسیع مقبولیت حاصل کرنے والی کتاب تقریباً ہمیشہ ہلکی پھلکی تفریحی چیز ہوتی ہے۔ عوام اسی لیے ایسی تحریروں کے دلدادہ ہوتے ہیں کہ ان کے پڑھنے میں ذہن و فکر پر ذرہ برابر بار نہیں پڑتا اور وہ سو فیصد توجہ کی متقاضی نہیں ہوتے۔ بڑی کتاب اگرچہ مشکل نہ ہو ہمارے جذبات و احساسات اور ذہن و فکر کو اس طرح اکساتی ہے کہ ہماری قوتیں اور صلاحیتیں اس کتاب پر شوق و خواہش اور لذت و مسرت کے ساتھ متوجہ ہو جاتی ہیں، جس سرگرمی سے ہم اسے پڑھتے ہیں وہ اس کو اور تحریک دیتی ہے لیکن وہ ہلکی پھلکی تفریحی تحریر ہرگز نہیں ہوتی۔ ہم اسے نیم توجہ سے نہیں پڑھ سکتے بلکہ وہ ساری توجہ چاہتی ہے۔ ساری قوتوں اور صلاحیتوں کی متقاضی ہوتی ہے اسی لیے سینکڑوں آدمی اسے مشکل بھی قرار دیتے ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ گذشتہ چند برسوں میں بیشمار گھٹیا ناول، افسانے اور رسالے وغیرہ شائع ہوئے ہیں جنہوں نے اگرچہ قارئین کا حلقہ وسیع کر دیا ہے لیکن پڑھنے والوں کی ذہنی ساعت کو ڈھیلا کر دیا ہے اور انہیں سنجیدہ ادب کی طرف غیر مائل کر دیا ہے۔ لیکن یہ بات ظاہر و باہر ہے کہ ایسی تحریریں جو صرف نیم گرم جذبات کو جنبش دیتی ہیں اور قاری کے ذہن و فکر کو نہیں اکساتیں، زندہ نہیں رہ سکتیں وہ دوسری ایسی تحریروں کے سیلاب میں بہ جاتی ہیں اور جلد ہی فراموش کر دی جاتی ہیں۔

اس ناپائیدار اور سطحی اثر کو جو کسی کتاب کا پڑھنے والوں پر ہوتا ہے اور جسے مقبولیت کہا جاتا ہے نظر انداز کر کے آئیے یہ جاننے کی کوشش کریں کہ ادب کے جذباتی اثرات کی دائمی قدر و قیمت کی جانچ اور پیمائش کن معیاروں سے ہو سکتی ہے۔ ایسے معیار پانچ ہو سکتے ہیں، جو حسب ذیل ہیں۔

۱۔ جذبات کی دیانت یا مناسبت و معقولیت

۲۔ جذبات کی گہرائی یا زور و قوت

۳۔ جذبات کا تسلسل یا پختگی و استقلال

۴۔ جذبات کی وسعت یا تنوع

۵۔ جذبات کا رتبہ یا کیفیت و نوعیت

آئیے ان نکات پر ذرا تفصیل سے گفتگو کریں۔

کسی جذبے کو دیانت دارانہ یا مناسب و معقول قرار دینے سے ہماری مراد یہ ہے کہ اس کے لیے مناسب سبب موجود ہو۔ ایک اعلیٰ درجے کا جذبہ محض اس بناء پر کہ اس کے لیے کافی سبب موجود نہیں ہے اپنی ادبی قدر و قیمت کھو بیٹھتا ہے۔ اس طرح بقول ریکن یہ ممکن ہے کہ آتشبازی کا ایک زبردست مظاہرہ یا سڑک پر دو رویہ عظیم الشان دکانوں کی قطار کسی شخص میں پرجوش توصیف کا جذبہ بیدار کرے لیکن یہ جذبہ یا تاثر ادبی نہیں ہے کیونکہ اس کا سبب گھٹیا اور غیر وقیع ہے۔ حقیقت میں آتشبازی کے مظاہرے یا دوکانوں کی شوکت و سجاوٹ ایسی چیزیں نہیں ہیں کہ توصیف کی مستحق ہوں۔ البتہ کسی کلی کا کھل کر پھول بن جانا جو جذبۂ توصیف بیدار کرتا ہے وہ شاعرانہ تاثر ہے اور روحانی قوت و تاثیر اور حیاتی حسن کے اس مظاہرے کی جس قدر بھی توصیف کی جائے ناکافی ہے۔ لہٰذا کسی کتاب کی قدر و قیمت متعین کرتے وقت یہ سوال ہمیشہ جائز ہوگا کہ آیا جو جذبہ یا تاثر یہ کتاب بیدار کرتی ہے وہ صحت مند ہے تو آیا اس کے لیے مناسب و کافی اسباب ہیں جو خود کتاب ہی میں فی نفسہٖ موجود ہیں؟ یہ عین ممکن ہے کوئی کتاب ایسے اسباب کی بناء پر جو حقیقی اور دائمی نہیں وقتی طور پر شدید جذبات و تاثرات کو انگیخت کر دے خصوصاً اگر اس میں معاصرانہ مقبول عام احساس سے فائدہ اٹھایا گیا ہو۔

ادب میں سستی جذباتیت کی تمام شکلیں کافی اسباب کے بغیر مہر و شفقت یا سوز و گداز کے جذبات کو انگیخت کرنے کی کوششوں پر مبنی ہوتی ہیں۔ یہ تاثرات و احساسات لذت بخش یا مسرت انگیز ہوتے ہیں اور جب وہ بغیر کسی قسم کی محنت و دقت کے صرف کئے حاصل ہو جاتی ہیں جیسے کہ ادب میں تو فطری طور پر اس بات کی ترغیب ہوتی ہے کہ معمولی سے جواز پر انہیں دل کھول کر بے اعتدالی کی حد تک برتا جائے۔ سستی جذباتیت میں ڈوبے ہوئے مصنف کی مقبولیت کا راز یہی ہے لیکن ہماری معقول تر قوت فیصلہ یہ پہچان لیتی ہے کہ جو احساسات و تاثرات اس آسانی کے ساتھ بیدار کیے جا سکتے ہیں یا خود اپنی خاطر شعوری طور دل کھول کر برتے جاتے ہیں اپنے اندر ایک کھوکھلاپن رکھتے ہیں۔ ہم اپنے عمیق تر اور صادق تر احساسات کو محض اپنے آپ کو گدگدانے کے لیے استعمال نہیں کر سکتے۔ جذباتیت پرست مصنف اپنے تاثرات بڑے مبالغے کے ساتھ پیش کرتا ہے اور خارجی مظاہر کے تمام اتفاقات و حوادث کو بروئے کار لا کر ہماری ہمدردی کا شکار کھیلتا ہے۔ لیکن سچا آرٹسٹ اپنے تاثرات و احساسات کو اس قدر ارزاں نہیں کر دیتا اور جو جذبہ یا تاثر وہ ہم میں انگیخت کرتا ہے وہ انسانی زندگی کی عمیق صداقتوں پر مبنی ہوتا ہے۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ جذبہ و تاثر کی تقریب تو معمولی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کا سبب خفیف نہیں ہونا چاہیے۔ عام طور پر یہ تخیلی قوت کا ثبوت ہے کہ مصنف کسی کردار یا شدید جذبے کو اس طرح جامع طور پر سمجھ لے کہ یہ بھی دیکھ سکے کہ وہ حقیر اور غیر وقیع اعمال و افعال

میں اپنے آپ کو کس طرح ظاہر کر سکتا ہے۔ ایسی صورتوں میں ہماری ہمدردیاں تو مصنف کی اپیل اور موثر ہو جاتی ہے کیوں کہ یہ غیر ارادی معلوم ہوتی ہے۔

گویا ہم ایک عالمگیر قانون کے طور پر یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ اعلیٰ اور دائمی ادبی قدر و قیمت کا حامل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ جذباتِ عمیق اور شایانِ شان اسباب سے ابھریں اور یہ کہ جب اس قانون کی خلاف ورزی کی جاتی ہے تو جو جذبہ آرٹ یا ادب کی کسی تخلیق سے تحریک پاتا ہے وہ ضعیفانہ یا خطیبانہ یا ہیجانی و نمائشی ہو جاتا ہے یا کسی اور طریقے سے باطل ہو جاتا ہے۔

یہ بات تو بالکل ظاہر و باہر ہے کہ جذبات کی ادبی قدر و قیمت ان کی گہرائی یا زور و قوت سے بھی ناپی جاتی ہے یہ ادب کا سب سے فطری اور سب سے زیادہ ناقابلِ تردید معیار ہے۔ کسی کتاب کے بارے میں یہ سوالات بالکل قدرتی ہیں کہ آیا وہ آپ کو متاثر کرتی ہے، آیا وہ آپ کے جذبات کو اکساتی، ابھارتی، ہیجان بخشتی اور وسیع کرتی ہے، آیا وہ آپ کو ایک نیا وژن دیکھنے کی آنکھ اور ایک نئے احساس والا دل عطا کرتی ہے یا نہیں؟ اگر ان سوالوں کا جواب اثبات میں ملے تو وہ کتاب بلاشبہ اچھی ادبی کتاب ہے اور جس قدر شدت سے وہ یہ منصب ادا کرتی ہے اتنی ہی بڑی ادبی کتاب قرار پاتی ہے۔ مشہور امریکی مصنف ایمرسن کہتا ہے کہ کتابوں کا کام ہی تخلیقی تحریک پیدا کرنا ہے۔ بظاہر خیال ہے کہ گہرائی اور زور و قوت کا تعلق فاعلی جذبات سے بہ نسبت انفعالی جذبات کے زیادہ ہے اور شدید جذبات پر ان خصوصیات کا زیادہ اطلاق ہو سکتا ہے۔ بہ نسبت احساسات کی نرم و ملائم کیفیات کے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مؤخر الذکر جذبات و کیفیات بھی اتنے ہی زور و قوت والے ہو سکتے ہیں جتنے کہ اول الذکر۔ اقبال کی نظم گورستانِ شاہی مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔ یہ امر تسلیم کیا جانا چاہیے کہ جذبات کی مختلف قسموں کے لیے کوئی قطعی مشترک پیمانہ نہیں بنایا جا سکتا۔ اس سوز و گداز کا جو نرم و ملائم اور واجب الرحم ہے اس سوز و گداز سے مقابلہ کیونکر ممکن ہے جو کڑا اور اپنے آپ کو لیے دیئے رہنے والا ہے۔ اور یہ کہنا کیونکر ممکن ہے کہ ایک دوسرے سے زیادہ زور و قوت والا ہے۔ اس سے بھی زیادہ مشکل یہ ہے کہ سوز و گداز یا رفعت و جلال یا ایسے حسن کے تاثرات، و جذبات میں کوئی مشترک قانون دریافت کیا جائے اور پھر جذبات کی وہ صورتیں ہیں جو فکر و غوص سے وجود میں آتی ہیں جو عمیق اور وسیع صداقتوں کے ادراک سے پیدا ہوتی ہیں اور بادی النظر میں یوں لگتی ہیں کہ نرم و ملائم اور فکر سے پرورش یافتہ ہونے کی وجہ سے کم اثر و زور کی مالک ہوں گی لیکن وہ کم ہیجان خیز ہوں تو ہوں بہت غامض ہوتی ہیں۔ مثال کے لیے اقبال کی نظم بچہ اور شمع ملاحظہ کیجیے۔ نیز انفرادی مزاج پر بھی بہت کچھ منحصر ہے۔ ایک شخص فطری طور پر ایک خاص قسم کے جذبے سے زیادہ متاثر ہوتا ہے اور دوسرا شخص دوسرے جذبے سے۔ گویا یہ بات بلاتکلف تسلیم کی جا سکتی ہے کہ جذباتی اثرات کی طاقت کا کوئی پیمانہ یا تخمینہ تقابلی فضیلت کے لیے دقیق معیار کا کام نہیں دے سکتا۔ تاہم یہ درست ہے کہ خواہ کسی قسم کا جذبہ ہو اور خواہ اس کا سبب کچھ ہی ہو مثلاً فطرت کا کوئی نظارہ یا کوئی انسانی عمل یا کوئی صداقت، ہر صورت میں جذبے کی شدت یا زور و قوت کی بات کرنا قرینِ عقل معلوم ہوتا ہے اور تحریر کی قدر و قیمت یقیناً بڑی حد تک اسی سے ناپی جاتی ہے۔

اس کی یہ شدت اکثر صورتوں میں مصنف کی فطرت پر اولین انحصار رکھتی ہے۔ ضروری ہے کہ وہ خود پہلے دل کی گہرائی

تک محسوس کرے ورنہ وہ ہمیں بھی محسوس نہیں کرا سکتا۔ اس لیے ہر بڑے مُصنف کے لیے مزاج کا کس بل اور جذبات کی گہرائی، لطافت، دولت مندی اور ضخامت ضروری ہے۔ بعض اوقات ایک شخص جو بہت اچھی طرح محاسن وصفات سے مزین ہے ادبیات میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے سے اسی لیے محروم رہ جاتا ہے کہ وہ اس اندرونی کس بل کا حامل نہیں ہے۔ اس کے برعکس ایسے مصنف بھی ہوتے ہیں جن کا اثر تقریباً تمام تر ان کی فطرت کی پُرجوش تندی و شدت سے ماخوذ ہوتا ہے۔ انگریزی ادب میں آخرالذکر کی مثال کے طور پر بائرن کو پیش کیا جا سکتا ہے اور اول الذکر کے لیے کوپر اور اڈیسن کو۔

لیکن ہمیں یہ بھی نہیں سمجھنا چاہیے کہ جو جذبہ بہت اظہار پسند اور سرکش و پُرشور ہے وہی توانا ترین اور پختہ ترین ہے۔ حق یہ ہے کہ سرکشی، برہمی اور ہنگامہ اکثر وہیں ملتا ہے۔ جہاں ضبطِ نفس کی کمی ہو یا کسی صلاحیت کا اپنے اصلی راستے سے انحراف ہو۔ جو جذبہ حقیقت میں بہت گہرا ہوتا ہے وہ بالعموم خاموش اور بے شور ہوتا ہے۔ چونکہ اس وقت زیر بحث ہے اس کے لحاظ سے مثالی شاعر یا مصنف کی فطرت بھرپور، پُرجوش، شدید لیکن مستحکم و میانہ رو ہوتی ہے، اس کی فطرت میں توانا و قوی جذبہ اس کے عزم محکم کے تابع ہوتا ہے۔ اس کی مثال کے طور پر شیکسپیئر کا نام لیا جا سکتا ہے۔

بلاشبہ ہمارے جذبات میں ہلچل پیدا کرنے کی طاقت ایک حد تک مصنف کے ملکۂ اظہار پر منحصر ہوتی ہے۔ ہیئت کے مسئلے سے کسی اور فرصت میں ہم تفصیلی بحث علیحدہ کریں گے۔ البتہ یہاں اتنا کہہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جو بات کسی شخص کے ذہن میں صاف و واضح ہو وہ اس کا صفائی و وضاحت کے ساتھ تو ضرور اظہار کر سکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اس کا اظہار زور و قوت کے ساتھ بھی کرے۔ بالفاظ دیگر یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے خیال کو ظاہر کر دے لیکن وہ خیال اس کے دل و دماغ میں جو تاثرات پیدا کرتا ہے انہیں ظاہر نہ کر سکے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایسے کئی لوگ موجود ہیں جن کی فطرت میں قوی احساس تو ہے لیکن مناسب ملکۂ اظہار انہیں حاصل نہیں۔ ایسے کئی شاعر اور مصنف ہیں جن کا ملکۂ اظہار ان کے شعری و ادبی جذبے کی ضخامت نہیں ہے۔ انگریزی کے شاعر براؤننگ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

جذبے کی گہرائی یا زور و قوت نہ صرف شعری ادب کے لیے فضیلت کا ایک معیار ہے بلکہ نثری ادب کے لیے بھی نثر کی کئی قسمیں ایسی ہیں جن میں جذبے کا عنصر تحریر کا اولین مقصد نہیں ہوتا اس لیے ذہن و فکر کے عنصر کے مقابلے میں کم اہمیت رکھتا ہے۔ تاہم جہاں کہیں بھی ہم نثری تحریروں میں زور و قوت، توانائی، کشش و بشاشت اور آب و تاب کی صفات بتاتے ہیں وہ اصل میں مختلف جذبات مرتعش کرنے کی یہی ضمنی طاقت ہے۔ سوائے خالص سائنسی اور علمی تحریروں کے جنہیں ہم کسی طرح ادب میں شمار نہیں کر سکتے ہر تحریر میں جذبات کو متاثر کرنے کی طاقت کم یا زیادہ ضرور ہونی چاہیے۔ یہی مہارت یا استادی ہے جو بڑے بڑے نثر نگاروں میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے اگرچہ اُن کے اثر و تاثیر کے ذرائع ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ شبلی اور محمد حسین آزاد کی مثالیں دیکھیے دونوں کا درجہ بحیثیت نثار کے بہت اونچا ہے لیکن دونوں کے ذرائع و وسائلِ اثر آفرینی مختلف ہیں۔ ہم اس تاریخی کتاب کو درخشاں و تاباں یا پُر اثر و کارگر قرار دیا کرتے ہیں جس میں افراد اور واقعات ہماری ہمدردیوں کو اسی طرح متاثر کرتے ہیں جیسے اگر ہم انہیں درحقیقت اپنے زمانے میں دیکھتے تو متاثر ہوتے۔ ایک تابناک تاریخی کتاب ہم پر وہی تاثر طاری کرتی ہے جو کوئی اچھا

ما اُٹھ سکتا ہے۔ لیکن تاریخی تحریروں کی بنیادی خوبی ان کی تابانی یا تاثر آفرینی نہیں بلکہ واقعات کی صحت و صداقت اور رائے کی ثابت قدمی ہوتی ہے۔ اور جو جذبات انگیخت کیے جائیں اگر ان کے لیے صحیح اسباب موجود نہ ہوں یا رہ جانب دارانہ ہوں یا صداقت کو چھپانے والے ہوں تو جذباتی اثر کی گہرائی تاریخ کے اس اولین مقصد کے لیے رکاوٹ بن جاتی ہے اور ہم اس کتاب کو خواہ اچھی ادبی کتاب ماننے میں اچھی تاریخ قرار دینے میں تامل کرتے ہیں۔

جذبات کی ادبی قدر و قیمت کا تیسرا معیار ان کا تسلسل یا پختگی و استقلال ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ کسی تحریر کا یا آرٹ کے کسی کارنامے کا جذباتی اثر ایک سطح پر قائم رہے۔ اگر ہمارا احساس کسی لمحے میں یا افتادہ کو ایک سطح پر ایک دم اتر آئے تو نہ صرف ہم جذباتی طور پر جھٹکے سے بچتے ہیں بلکہ ہمیں ایک ناخوشگوار بے آہنگی کا بھی تجربہ ہوتا ہے اور یہ ایک ادبی نقص ہے۔ بعض اوقات جذبات کو ایک سطح پر قائم رکھنے میں ناکامی کا احساس اس قدر اچانک ہوتا ہے کہ ہنسی آجاتی ہے اور تحریر مضحکہ خیز بن جاتی ہے نظیر اکبر آبادی کے یہاں ایسی کئی مثالیں مل سکتی ہیں۔

ادب یا آرٹ کی ہر تخلیق میں وحدت احساس ضروری ہے لیکن تنوع بھی لازم ہے کسی جذبے کو ایک ہی سطح پر لمبے عرصے تک قائم رکھنا مشکل ہے اور اگر وہ شدید نہیں ہے تو بہت ناقابلِ برداشت حد تک بیزار اور اکتا دینے والا ہو جائے گا۔ آرٹ کی ہر تخلیق میں جذبے کا تدریجی اتار چڑھاؤ اور روشنی و سایہ ضروری ہے تاہم موسیقی کی اصطلاحوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ نغمے میں زیر و بم تو ہونا چاہیے لیکن سُر مدّ و تمام رہے۔ گویا بالفاظ دیگر تحریر اپنے مخصوص جذباتی موڈ سے خارج نہ ہو جائے۔ ایسے حصے اس میں نہیں ہونے چاہئیں جن میں مصنف پاؤں گھسیٹ گھسیٹ کر بدقت چلتا ہوا محسوس ہو یا واقعات اور صداقتوں پر تو اس کی توجہ مرکوز ہو لیکن وہ انھیں اس طرح پیش کر رہا ہو کہ ہماری ادبی قوت مدرکہ کو اپیل نہ کریں۔

ادبی تخلیقات میں جذبے کو برقرار رکھنے کی ضرورت کے پیش نظر ہی وحدت کے ادبی و انشائی اصول وضع کیے گئے ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ آرٹ کی کسی تخلیق میں ایسی کوئی چیز داخل نہیں ہونی چاہیے جو اس کے مقصدِ اصلی سے غیر متعلق ہو اور غیر متعلق ہر وہ چیز ہے جو اس تخلیق کے جذباتی اثر کو کم کرتی یا اسے منقطع کرتی ہو یا پھر اسے کسی اور ہی موڈ میں بدل دیتی ہو۔ البتہ اصل موضوع سے ہٹی ہوئی باتیں، ضمنی بیانات یا قصے یا اور کوئی چیز جو تعمیری وحدت کے قوانین کے لحاظ سے ناپسندیدہ ہو اس وقت نظر انداز کی جاسکتی ہے جب تحریر کی دلچسپی میں کمی نہ ہو اور جو جذبات و احساسات یہ زائد حصے انگیخت کرتے ہیں وہ بقیہ حصے کے ساتھ ہم آہنگی رکھتے ہوں۔ اس کے برعکس کوئی حصہ خواہ اپنی جگہ کتنا ہی حسین اور مبنی بر صداقت ہو اگر وہ پڑھنے والوں کی جذباتی دلچسپی کو گھٹا دیتا ہے یا تصنیف کے بنیادی و اصلی احساس کے دھارے سے مطابقت نہیں رکھتا تو اسے کتاب سے نکال دینا چاہیے۔

ایک سطح پر قائم اور مسلسل جذبہ قارئین میں پیدا کرنے میں اگر ناکامی ہو تو اس کی وجہ عام طور پر یہ ہوتی ہے کہ خود مصنف کے اپنے جذبات مستحکم و مستقل نہیں اور کافی حد تک شدید نہیں اور وہ اپنے موضوع کو کلی حیثیت سے نہیں دیکھ رہا ہے بلکہ اس کے صرف چند نمایاں جاذب توجہ یا مؤثر و دلنشین حصوں کو دیکھ رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ اِدھر اُدھر گھٹیا سطح پر گر پڑتا ہے اور

ایک سطح پر قائم اثر کی ضرورت محسوس کرتا ہے تو اصل احساس کی کمی کی تلافی کے لیے تصنع و آورد سے کام لے کر تاثر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح تفنّس تحریر وجود میں آتی ہے جو اصل جذبات سے مطابقت نہیں رکھتی یا پھر ادبی منافقت و عدم خلوص کی کوئی اور شکل وجود میں آجاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ ادب کی زیادہ طویل ہیئتوں میں ایک سطح پر قائم رہنے والے جذبے کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے۔ مختصر ہیئتوں میں جیسے داخلی و غنائی شاعری میں شدید اور مختصر جذبہ ظاہر ہوتا ہے جو زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ بعض لوگوں نے اسی لیے کہا ہے کہ سچی شاعری ہمیشہ داخلی و غنائی ہی ہوتی ہے کیونکہ اعلیٰ شاعری کے لیے جس درجے کے جذبے کی ضرورت ہے وہ دیر تک قائم رہ ہی نہیں سکتا۔ لیکن ان تمام رایوں کی تردید بڑے شاعروں کی طویل نظموں میں موجود ہے جیسے کالی داس، ہومر، ڈانٹے، ملٹن، فردوسی وغیرہ کی شاعری میں۔ اسی طرح کئی بڑے ناول نگار موجود ہیں جنہوں نے اعلیٰ درجے کے لمبے لمبے ناول لکھے ہیں۔ یہ سب طویل ادبی تحریریں مصنفین کی اس صلاحیت کی دلیل فراہم کرتی ہیں کہ وہ جذبات کو دیر تک ایک سطح پر قائم رکھ سکتے ہیں۔

یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ ادب کے کسی کارنامے کی قدر و قیمت خاصی حد تک اس کے جذباتی اثرات کی وسعت یا تنوع پر منحصر ہوتی ہے۔ عظیم وسعتِ تاثر نہایت کمیاب خوبی ہے۔ ادب میں بھی بڑا مقام اس کے بغیر بھی حاصل کرنا ممکن ہے جیسے کہ میر تقی میر کی مثال سے ظاہر ہے۔ حسن شناسی و قدر فہمی کی صلاحیت میں وسعت بھی بڑی کمیاب چیز ہے۔ ہم میں سے اکثر آدمی وسیع المشرب مذاق رکھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ قارئین کی اکثریت ادبی فضیلتوں کے وسیع احاطے سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی اور اکثر اوقات ان فضیلتوں کی نشاندہی کیے جانے کے باوجود ان کی حسن شناسی و قدر فہمی سے وہ قاصر رہتے ہیں۔ ایسے کتنے لوگ ہیں جو ناسخ اور میر دونوں ہی کے کلام سے حقیقی طور پر لطف اندوز ہو سکتے ہوں یا میر امن کی باغ و بہار اور سرور کے فسانۂ عجائب سے یکساں طور پر حظ اٹھا سکتے ہوں؟ اور اگر ایک دوسرے سے مختلف جذباتی اثرات کی حسن شناسی و قدر فہمی کی صلاحیت اس قدر شاذ ہے تو ظاہر ہے کہ ان جذباتی اثرات کے پیدا کر سکنے کی صلاحیت تو اور بھی کمیاب ہوگی۔ ادب جن جذباتی اثرات پر انحصار رکھتا ہے انہیں پیدا کرنے کی طاقت یا صلاحیت اس وقت تک نہیں حاصل ہو سکتی جب تک کہ مصنف کی فطرت میں کس بل اور تندی و شدت نہ ہو اور نہ ہی موضوعات کے کسی وسیع دائرے میں ان صفات کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ جذبات کے وسیع دائرے کے لیے مصنف کے شخصی تجربات و مشاہدات میں وسعت کی ضرورت ہے، حقیقت یہ ہے کہ اکثر افراد کی صلاحیتیں اور قوتیں چند مخصوص حدود ہی کے اندر اپنے انتہائی کمال پر پہنچا سکتی ہیں۔ کسی ایک سمت میں دلچسپی کی شدت کا عام طور پر مطلب ہوتا ہے دوسری سمتوں میں دلچسپی کی کمی۔ سچ یہ ہے کہ شدت خواہ کسی جگہ ہو اس کا مطلب محدود ہونا ہوتا ہے۔ اکثر دیکھا جائے گا کہ ایک متناسب، وسیع الادراک اور رواداری کیرکٹر اس شخصی جلا یا کس بل میں خام ہوگا جو حتمی ادبی اثر پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اس کے برعکس جن مصنفین کی شخصیت بہت زیادہ نمایاں اور محنتی و جفاکش نظر آتی ہے اور جنہوں نے اپنے زمانے کے ادب پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں وہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کی حد بندیاں یا مجبوریاں بہت نمایاں ہوتی ہیں۔ مثلاً وہی میر تقی میر کی مثال لے لیجئے کہ وہ صرف غم و عشق اور غم زندگی کے جذبات و تصورات میں اپنا کمال دکھلاتے ہیں، دوسرے جذبات و تصورات ان کے ہاں کم ہیں اور اگر ہیں بھی تو ان کے اظہار میں وہ خام ہیں۔

ڈراما اور ناول لکھنے والوں کو جذباتی اثرات کے وسیع احاطے پر قبضہ و اقتدار کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے کیونکہ ان کا

کام غنائی شاعروں کی طرح داخلی نہیں ہوتا بلکہ یہ مصنفین لوگوں کی زندگی کا وسیع غیر جانب دارانہ نقشہ کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود اکثر ناول نگاروں کا میدان زیادہ وسیع نظر نہیں آتا۔ کسی بھی مقبول یا مشہور ناول نگار کا کام دیکھیئے۔ معلوم ہوگا کہ وہ صرف ایک دو ہی چیزیں اچھی طرح پیش کر سکتا ہے اور ایک دو ہی قسم کے کرداروں کا ماہر ہے۔ چنانچہ اس کے ناولوں میں بار بار اسی ٹائپ کے کردار ملتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک ناول نگار سے وہ کردار ہٹا کر دوسرے ناول میں لگا دیا جائے تو کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوگا اور اگر ناول نگار مقصدی ناول لکھتا ہے، یعنی کوئی مسئلہ پیش کرنا چاہتا ہے یا کوئی خاص صداقت ذہن نشین کرانا چاہتا ہے تو یہ ناصحانہ رویہ اس کے ادبی اثرات کے دائرے کو اور بھی محدود کر دیتا ہے۔ یہ اعتراض نہ صرف مقصدی ناولوں پر وارد ہوتا ہے بلکہ ادب کی ہر اس صنف پر وارد ہوتا ہے جس میں ناصحانہ رجحان غالب ہو۔ ان مصنفین کا جذباتی احاطہ بالعموم وسیع ہوتا ہے جو زندگی پر غیر جانب دارانہ نظر ڈالتے ہیں۔ معروضی و غیر شخصی رویہ رکھتے ہیں اور زندگی کو پیش کرنا یا اس کی ترجمانی کرنا اپنا مقصد بناتے ہیں۔ انگریزی ادب میں والٹر اسکاٹ اور شیکسپیر کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے اور اردو ادب میں سرشار یا پریم چند کو۔

جذبات کو اپیل کرنے کی طاقت کے لحاظ سے ادب کی قدر و قیمت آخر میں جذبات کے رتبے یا کیفیت و نوعیت سے متعین ہوتی ہے۔ یہ معاملہ ایسا ہے جس پر بڑی تنقیدی بحثیں ہو چکی ہیں۔ کیونکہ یہ کہنا کہ ادبی قدریں ان جذبات کے رتبے یا کیفیت و نوعیت پر منحصر ہوتی ہیں جنہیں اپیل کی جاتی ہے یہ مفہوم رکھتا ہے کہ ان جذبات میں اعلیٰ اور ادنیٰ کا امتیاز موجود ہے۔ لیکن اگر یہ تسلیم کر لیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے جانچنے کا معیار کیا ہے؟ کن جذبات کو ہم اعلیٰ قرار دیں گے اور کنہیں ادنیٰ؟ اس مسئلے پر نقادوں میں پورا اتفاق نہیں ملتا۔ یہ تو بدیہی بات ہے کہ ہم فطری و جبلی طور پر بعض جذبات کو دوسرے جذبات کے مقابلے میں اعلیٰ سمجھتے ہیں۔ ادب جن جذبات و احساسات کو اپیل کرتا ہے کسی نہ کسی مفہوم میں اعلیٰ سمجھے جا سکتے ہیں۔ تاہم یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ بعض جذبات اعلیٰ کہلانے کے زیادہ مستحق ہیں جیسے ہمدردیٔ بنی نوعِ انسان کا جذبہ، محبت اور خصوصاً مامتا اور ایثار و قربانی کا بے خوف حق گوئی کا جذبہ۔ اسی طرح بعض تاثرات بھی اعلیٰ کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں۔ وہ جذبہ یا تاثر جو ادب کے خالص ہیئتی عنصر اور اس کی موسیقی و آہنگ وغیرہ سے پیدا ہوتا ہے۔ بلاشبہ ایک جائز اور قابلِ قدر جذبہ یا تاثر ہے اور شاعری کا اثر خاصی حد تک اسی تاثر کا مرہونِ منت ہوتا ہے لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ جذبہ یا تاثر اس جذبے اور تاثر سے کم رتبے کا ہے جو نظم کے مفہوم یا نفسِ مضمون سے پیدا ہوتا ہے۔ حفیظ، عظمت اللہ خاں، حامد اللہ افسر وغیرہ کی گیت نما نظموں کی موسیقی و آہنگ قابلِ تعریف و ستائش ضرور ہے لیکن کیا یہ سب نظمیں مل کر بھی اقبال کی نظم ذوق و شوق یا ساقی نامہ یا مسجد قرطبہ سے کمتر درجے کی نہیں ہیں؟ اور کمتر خاص طور پر اسی لیے تو ہیں کہ جو جذبات و احساسات یہ گیت نما نظمیں ہم میں پیدا کرتی ہیں وہ نہ صرف کیفیت و نوعیت میں بلکہ رتبے میں بھی ان جذبات و احساسات سے کمتر ہیں جو اقبال کی کوئی نظم ہم میں پیدا کرتی ہے یہ بات اس قدر روشن ہے کہ اس پر مزید بحث کی ضرورت نہیں لیکن بعض اوقات ایسے نقاد بھی منظرِ عام پر آتے ہیں جو اپنی جمال پرستی کی دھن میں اس قدر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ موسیقی و آہنگ کو اولین اہمیت دینے لگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو صنفِ ادب موسیقی کی طرح براہِ راست جذبات کو اپیل کرنے کی طاقت رکھتی ہے وہی اعلیٰ ترین ہے۔ انگریز نقاد والٹر پیٹر ایسا ہی نقاد ہے جو کہتا ہے کہ وہ فن جو ذہن و فکر کو چھیڑے بغیر براہِ راست جذبات کو مرتعش کرے وہی موسیقی کے

قریب ترین فن ہے اور اسی لیے برتر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اسی لیے غنائی شاعری حسن کارانہ لحاظ سے نظم کی بلند ترین اور مکمل ترین قسم ہے ظاہر ہے کہ ایک فن کے معیاروں پر دوسرے فن کو جانچنے کی یہ کوشش مبالغہ آمیز اور غلط ہے۔ دنیا بھر کے دانشمند لوگوں نے یہ امر ضروری قرار دیا ہے کہ شاعری محض آوازوں کا کھیل نہ ہو بلکہ کچھ معنی و مفہوم بھی رکھتی ہو۔ سب جانتے ہیں کہ موسیقی و آہنگ اور ہیئت کی دوسری خوبیاں اپنی اہمیت ضرور رکھتی ہیں۔ تاہم یہ ثانوی اہمیت رکھتی ہیں اور اولین اہمیت مواد یا نفسِ مضمون کو حاصل ہے اسی لیے جو جذبات یا تاثرات ہیئت کے اثر سے پیدا ہوتے ہیں وہ ان جذبات و تاثرات سے کمتر درجے کے ہیں جو ادبی تخلیق کے مافیہ یا مشتملات سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ شاعری جو محض لفظی یا موسیقانہ صفات کی وجہ سے ہمیں متاثر کرتی ہے۔ بہت بلند درجے کی شاعری نہیں ہو سکتی۔

ادب کی ایسی شکلیں بھی ہیں جو ہمارے حافظے یا تخیل میں مسرت بخش احساسات کی شبیہہ اتار کر اپنا اثر پیدا کرتی ہیں۔ اس طرح کا ادب ہمارے حواسِ خمسہ کی لذتوں کی نقشہ کشی کرتا ہے۔ لیکن حواس کی منزلوں میں بھی ایک درجہ بندی پائی جاتی ہے۔ چونکہ لامسہ اور ذائقہ کے احساسات میں دوسروں کے ساتھ شرکت نہیں کی جا سکتی اس لیے انہیں باصرہ، سامعہ اور شامہ کے مقابلے میں کم تحریک بخش یا جذبہ انگیز تسلیم کیا جاتا ہے چنانچہ وہ شعر و ادب جو لامسہ اور ذائقہ کے احساسات کو نقشہ کشی سے اپنی دلکشی حاصل کرتا ہے اعلیٰ رتبے کا نہیں قرار پائے گا۔ اسی طرح اگر باصرہ و سامعہ کے لذائذ کی شبیہہ اتارتے ہوئے اگر کوئی ادبی تحریر صرف ان کی حسی دلآویزی کی حد تک رک جائے اور اس سے آگے نہ بڑھے تو ایسی تحریر بھی جو جذبات برانگیختہ کرتی ہے وہ اعلیٰ رتبے کے نہیں ہوتے۔

اخلاقی صفات یا مادی اشیا کی اخلاقی تحریک بخشی و جذبہ انگیزی سے انگیخت پانے والے جذبات رتبے میں ان جذبات سے بلند ہیں جو محض مادی یا محسوس اشیاء سے انگیخت پاتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر اخلاقی جذبہ خالص حسی یا جمالیاتی جذبے کے مقابلے میں برتر ادبی قدر و قیمت رکھتا ہے۔ کسی شجاعانہ عمل یا پُر رفعت تحمل یا اور کسی بڑے جذبے کی توصیف کا جذبہ اپنی نوعیت اور کیفیت میں اعلیٰ و برتر جذبہ ہے اور اسی لیے ادب میں زیادہ قابلِ قدر ہے، اس کے مقابلے میں حسی دلآویزی کی توصیف کا جذبہ کمتر اور قابلِ قدر ہے خواہ کتنی ہی نزاکت و نفاست سے محسوس کیا ہوا ہو اور کتنی ہی لطافت سے اظہار پایا ہوا ہو۔ اخلاقی جذبے کی اصلاح یہاں اس تنگ اور محدود مفہوم میں نہیں برتی گئی ہے کہ اس سے مراد صرف وہ جذبہ ہو جو کسی نفس کو درست قرار دے کر اس کی پسندیدگی یا نادرست قرار دے کر اس کی ناپسندیدگی سے پھوٹ نکلتا ہو، بلکہ اس کا وسیع تر مفہوم مراد ہے یعنی وہ جذبہ جو زندگی سے ہماری ہمدردی و یگانگت کی ایک شکل ہے۔ مشہور انگریز نقاد میتھو آرنلڈ نے اخلاقی جذبے کو اسی وسیع مفہوم میں استعمال کیا ہے اپنے ایک مقالے میں وہ انگریزی شاعری کو اخلاقی تصورات سے تعرض کرنے والی قرار دے کر کہتا ہے کہ اخلاقی کے لفظ کو وسیع معنوں میں سمجھنا چاہیے، کس طرح جینا چاہیے کے سوال پر روشنی ڈالنے والی ہر بات اخلاقی کہلائے گی۔

گویا ایک کلیے کے طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ جو جذبات انصرامِ حیات سے گہرا تعلق رکھتے ہیں برتر رتبے کے ہوتے ہیں بہ نسبت ان جذبات کے جو انصرامِ حیات سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ چنانچہ برترین جذبات وہ ہیں جو زندگی کی فیصلہ کن قوتوں سے یا شفقت و محبت کے احساسات سے اور اچھے برے کی اخلاقی تمیز یا ضمیر و ایمان سے متعلق ہوتے ہیں۔ کسی کتاب کی دائمی قدر و قیمت جاننے کے لیے یقینی پیمانہ یہ ہے کہ ہم یہ سوال کریں کہ آیا وہ انسانی زندگی کی عمیق ترین چیزوں کے ساتھ ہماری ہمدلی و ہمدردی کو تحریک دیتی ہے یا

نہیں۔ مگر اس سوال کا جواب نفی میں ہو تو خواہ اس کتاب میں اور کتنے ہی محاسن ہوں وہ اعلیٰ ادب میں شمار نہیں ہو گی۔

اگر یہ پیمانہ صحیح ہے تو ظاہر ہے کہ اعلیٰ ادب ہمیشہ واضح طور پر اخلاقی خاصے کا حامل ہو گا اور واقعہ بھی یہی ہے کہ دنیا کا جتنا بھی اعلیٰ ادب ہے وہ اخلاقی خاصے کا حامل ہے۔ اخلاقی سے مراد ناصحانہ نہیں ہے بلکہ یہ لفظ ان وسیع معنوں میں استعمال کیا گیا ہے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا۔ دوسری خصوصیات اور صفات اگر مساوی درجے کی ہوں تو وہ دو کتابوں میں وہ کتاب برتر قرار پائے گی جو ایسے جذبات کو انگیخت کرے جو ہماری فطرت کو تقویت بخشنے اور وسعت دینے کے باعث ہوں۔ یعنی بالفاظِ دیگر صحت مند جذبات کو انگیخت کرے۔ ان نقادوں سے اتفاق کرنا مشکل ہے جو ادب اور آرٹ کو ایسی لذتوں اور مسرتوں کے بخشنے کے پیمانے سے جانچتے ہیں جن کا کوئی تعلق بقول ان کے اخلاق سے نہیں ہوتا۔ جو بحث ہم نے اب تک کی ہے اس کی روشنی میں آرٹ برائے آرٹ کا مقولہ بے معنی ہے اور بالعموم ایسے آرٹ کی پشت پناہی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو کمزور یا شہوت پرستانہ ہو۔ آرٹ خود اپنی غایت آپ نہیں ہے۔ بلکہ اس لیے ہے کہ انسان کی مسرتوں کا باعث ہو اور ان میں اضافہ کرے۔ چنانچہ آرٹ کے لیے خالص غیر اخلاقی معیار یا پیمانہ مقرر کرنا سخت نادانی ہے اور اخلاقی شرائط و احوال سے قطع نظر کرکے فنکارانہ تصنیفوں کے وسیع احاطے کی توقع رکھنا بھی بے سود ہے ایسی کوششیں کرنے والے افراد فروتر یا ادنیٰ آرٹسٹک محرکات کی نچلی سطح پر اتر آتے ہیں یا اپنی محنت و توجہ کو محض صناعی و کارگری پر بیدریغ لٹانے لگتے ہیں۔ آرٹ یا ادب کا جو دبستان ایسی کوششوں میں مصروف ہوا اس کا انجام آخر کار کمزوری و تنگ دامانی ہی ہوتا ہے اور اس دبستان کی تخلیقات اعلیٰ جذبات اور بنی نوعِ انسان کی بلند تر دلچسپیوں سے عاری ہوتی ہیں۔

ادب کو خالص غیر اخلاقی معیار سے جانچنے کا میلان دو وجوہ سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ دوسرے فنونِ لطیفہ کے اصول و قواعد کو ہو بہو ادب پر منطبق کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ موسیقی میں کوئی واضح اخلاقی کیفیت نہیں ہوتی موسیقی سے پیدا شدہ جذبات و احساسات انصرامِ حیات سے کوئی ایسا قطعی ربط نہیں رکھتے کہ انھیں اخلاقی کیفیت قرار دیا جا سکے۔ مصوری اور مجسمہ سازی کے فن بھی ہیئت اور رنگ کی محبت کو تسکین دینا اپنا اہم منصب سمجھتے ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ مصوری اور مجسمہ سازی کے فن کسی قسم کی اخلاقی کیفیت کے حامل نہیں ہوتے لیکن خالص جمالیاتی خواہشات کی تسکین ان فنون میں بہ نسبت ادب کے بہت زیادہ نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ادب کی اعلیٰ ہیئتیں بیشتر اوقات درحقیقت بنیادی طور پر اخلاقی منشا کے منبعے سے نہیں پھوٹتیں۔ اکثر شاعر کسی ناصحانہ نیت کے تحت شعر نہیں کہتے اور جو شاعر ناصحانہ نیت سے شعر کہتے ہیں ان میں سے بیشتر حقیقی شاعری کے بجائے محض منظوم وعظ ہی پیش کر سکتے ہیں۔ آرٹ برائے آرٹ کے دعویدار یہ کہنے میں تو ضرور حق بجانب ہیں کہ قطعی اخلاقی کیفیت ادب کے لیے لازمی نہیں ہے کیونکہ ایسی شاعری اور ایسا ادب ضرور ممکن ہے جس کے لیے کسی اخلاقی کیفیت کا ادعا یا اثبات کرنا مشکل ہے لیکن ان کا یہ کہنا غلط ہے کہ صرف ایسی ہی غیر اخلاقی قدروں کے پیمانے سے ادب کو جانچنا چاہیے۔

واقعہ یہ ہے کہ ادب میں ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کوئی جذبہ کُلّی طور پر اخلاقی کیفیت سے عاری ہو۔ اگرچہ ہم مادی حسن کے نظارے سے یا اس کی تخیلی نقشہ کشی سے پیدا ہونے والے جذبے کو خالص جمالیاتی جذبہ قرار دیتے ہیں لیکن اس میں بھی تقریباً ہمیشہ کوئی نہ کوئی اخلاقی معنی خیزی یا خیال افروزی ضرور ہوتی ہے۔ حواس کے لیے جو چیز حسین ہے وہ ضرور کسی جوابی اخلاقی کیفیت کا اشارہ کرتی

ہے۔ اسی لیے محسوس حسن کو آرٹ میں اخلاقی احساس کو بیدار کرنے کے لیے اور جب یہ بیدار ہو جائے تو اُسے عمیق تر بنانے کے وسیلے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو اعلیٰ شاعری اخلاقی کیفیت سے مالا مال ہوتی ہے اور ہماری اخلاقی حس کو مؤثر طریقے سے اپیل کرتی ہے وہ نہ کبھی پھیکی اور سپاٹ نہیں ہوتی بلکہ حسین اور متنوع خیالی پیکروں اور تمثالوں سے بھرپور ہوتی ہے۔ اس طرح ہمارے حافظے میں حسین مناظر اور آوازیں نہایت پُراسرار طور پر ہمارے عمیق اور نرم و نازک تجربات کے ساتھ مربوط ہو جاتے ہیں اور اپنے مطالعے کی یادوں میں ہم محبت، غم اور شدید جذبات کے ساتھ ساتھ ان حسی دلفریبیوں کو بھی ذہن میں تازہ کر لیتے ہیں جن میں وہ جذبات مجسم ہوتے ہیں۔

چنانچہ یہ مانتے ہوئے بھی کہ اخلاقی کیفیت ادب کا لازمہ نہیں ہے یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ تمام صحت مند جذبات کوئی نہ کوئی اخلاقی نسبتیں ضرور رکھتے ہیں نیز یہ کہ وہ جذبات رتبے کے لحاظ سے بلند ترین ہیں جو واضح طور پر اخلاقی ہیں اور نتیجتاً ادب کی برترین قسمیں کبھی خالص غیر اخلاقی معیاروں سے نہیں جانچی جا سکتیں۔

اعلیٰ ادب میں اخلاقی کیفیت کی اہمیت اُجاگر کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم ادبی اصولوں پر نقاد کے نقطۂ نظر سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ نقاد اخلاقی کیفیت کو نظر انداز نہیں کر سکتا لیکن اسے اخلاقی کیفیت پر اس کی ادبی قدر و قیمت ہی کے حوالے سے توجہ دینی چاہیے اور صرف یہ سوال اُٹھانا چاہیے کہ مصنف بلند ترین اثرات کیونکر پیدا کر سکتا ہے؟ تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ادب میں جذبات کے عنصر کی بحث ختم کرنے سے پہلے ہم ادب اور عمل اخلاق کے تعلق پر ایک نظر ڈال لیں۔

اخلاق کا مطالبہ بہت سادہ ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ کسی مصنف کو ایسی چیز نہیں لکھنی چاہیے جو انسانی جذبات و کیفیات کو کھوٹا یا ذلیل کرنے، نیک و بد کی تمیز یعنی ضمیر کو کند یا مُردہ کرنے اور عزم و حوصلے کو کمزور کرنے کا باعث ہو۔ اخلاق کا یہ مطالبہ قطعی اور لازمی ہے کیونکہ انسانی فطرت میں اخلاق اگر برترین حیثیت نہیں رکھتے تو پھر وہ اخلاق کہلانے کے مستحق ہی نہیں۔ اخلاق کسی قسم کے سمجھوتوں اور مفاہمتوں کے روادار نہیں ہوتے۔ جو چیز بھی اخلاق سے تصادم میں آئے اُسے اخلاق کے آگے سر جھکا دینا چاہیے۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا ادب کے جائز مقاصد و ذرائع اور اخلاق کے اس مطالبے میں کوئی ٹکراؤ ہے؟ اگر کوئی شاعر یا ناول نگار اس مطالبے کی اطاعت کرے تو کیا وہ اپنے جذباتی اثرات پیدا کرنے کی طاقت کو مقید و محدود یا ان کے دائرے کو تنگ پائے گا؟ بعض لوگ اس سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ادب اپنے وسیع ترین دائرے میں انسانی زندگی کی تصویر کشی کے سوا کچھ نہیں۔ اس لیے اُسے انسانی فطرت کو پورے طور پر دکھانا چاہیے۔ اس کا اچھا اور بُرا پہلو، اس کے حیوانی و تاریک جذبات اور ساتھ ہی روشن و نرم و نازک کیفیات و احساسات، یہ سب کچھ ادب کو پیش کرنا چاہیے۔ آرٹ سارے عرصۂ زندگی پر مکمل آزادیِ حرکت و عمل کا تقاضا کرتا ہے، اسے کوئی درس دینے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے بلکہ جو کچھ اُسے نظر آتا ہے یا جو کچھ وہ تصور کر سکتا ہے اسے پیش کرنا چاہیے۔ چنانچہ اسی لیے اُسے اخلاق کی حدود کا پابند نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاق کا ادب سے کوئی تعلق نہیں ہے، شاعر، ناول نگار یا ڈراما نگار کو لکھتے وقت رک کر یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ جو کچھ وہ لکھ رہا ہے وہ اخلاقی و روحانی اصلاح کا باعث ہوگا یا نہیں۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو آرٹ کے امکانات کا دائرہ بری طرح سکڑ جائے گا۔ یہ لوگ مزید کہتے ہیں کہ ہم بہت سی ایسی چیزوں کی توصیف و ستائش کیا کرتے ہیں جو اچھی نہیں ہیں مثلاً ہم قوت و اقتدار کو بھی سراہتے ہیں، خواہ اس کا حامل نیک دل و مہربان ہو یا بد باطن خبیث چنانچہ ہم نپولین کو بھی سراہتے ہیں اور

اشوک اعظم کو بھی، تیمور کو بھی سراہتے ہیں اور اورنگ زیب کو بھی۔ اسی طرح ہم شدید مغلوب کن جذبے کو بھی قابل داد سمجھتے ہیں خواہ خود اپنے لیے اسے پسند نہ کریں چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہم مشہور عشاق کی داد دیتے ہیں جیسے مجنوں، فرہاد وغیرہ۔ اسی طرح ہم کلیوپیٹرا اور لیڈی میکبتھ کی بھی داد دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس قسم کی توصیف و ستائش کے جذبات کو اپیل کرنا ادب میں جائز ہے خواہ ایسا کرتے ہوئے اخلاق کی حدود کی خلاف ورزی ہی کیوں نہ ہوتی ہو۔ ادب اور آرٹ کو اس سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے کہ جس چیز کی وہ تصویر کشی کر رہا ہے اس کا اخلاقی اثر کیا مترتب ہوگا۔ اسے تو صرف اس بات سے غرض ہونی چاہیے کہ وہ انسانی کردار اور انسانی اعمال و افعال اور جذبات و احساسات کو پیش کرے اور پورے طور پر صداقت کے ساتھ پیش کرے۔

یہ سب باتیں یوں بظاہر ٹھیک معلوم ہوتی ہیں لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ادب جو انسانی زندگی اور کردار کی نقشہ کشی کرتا ہے تو اس کا کوئی مقصد کوئی غرض بھی ہوتی ہے، نقشہ کشی محض نقشہ کشی کے لیے نہیں ہوتی۔ ادب میں یہ مقصد ہے پڑھنے والوں کے جذبات و احساسات کو بیدار کرنا۔ اگر انسانی زندگی کے کسی پہلو کی نقشہ کشی سے صرف ناخوشگوار، گھناؤنے، نفرت انگیز یا پست و ذلیل جذبات و احساسات ہی بیدار ہوتے ہیں تو ایسی نقشہ کشی خود ادب کے مقصد کے بھی منافی ہے اور اخلاقی قوانین کے بھی۔

لیکن یہ ماننے میں ہمیں تامل نہیں کہ بہت سی کتابیں ایسی بھی ہیں جو ادب کی شرائط کو اچھی طرح پوری کرتی ہیں، حسن، طاقت اور صداقت کو پیش کرتی ہیں، تکنیکی مہارت کا مظاہرہ کرتی ہیں لیکن اس کے باوجود ان کا اخلاقی اثر مجموعی طور پر اچھا نہیں ہوتا کیونکہ وہ برائی کو اس انداز میں پیش کرتی ہیں کہ وہ دلکش اور موجب ترغیب ہو جاتی ہے۔ ایسی کتابیں ہمارے ضمیر یا نیکی بدی کی تمیز کو کند یا باطل کر دیتی ہیں، ہمارے عزم و حوصلے کو کمزور کر دیتی ہیں یا معاشرے کی اخلاقی صحت اچھی زندگی بسر کرنے کے جن قوانین پر منحصر ہے ان پر ہماری توجہ اور ہماری عزت کو گھٹا دیتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ ناممکن ہے کہ بغیر اخلاقی قوانین کو پس پشت ڈالے بلند ترین ادبی اثرات حاصل کیے جائیں؟ اس سوال کا جواب یقیناً نفی میں ہے۔ اس قسم کا اخلاقی اثر ادبی قدر و قیمت کا جزو کبھی نہیں ہوتا۔ ایسی کتابیں اپنی اخلاقی کمی یا نقائص کی وجہ سے بلند پایہ نہیں ہوتیں بلکہ ان کے باوجود بھی اچھا ادب کہلاتی ہیں اور اگر ان میں یہ کمیاں یا نقائص نہ ہوں تو اور بھی بلند پایہ اور پُر عظمت ہو جائیں۔ مثال کے طور پر شوق لکھنوی کی مثنویاں بہار عشق اور فریب عشق دیکھیے۔ ان مثنویوں میں زبان، روزمرہ، محاورہ، بندش کی چستی، اودھ کے زوال پذیر معاشرے کی بھرپور نقشہ کشی جیسی خوبیاں ضرور موجود ہیں لیکن ان کا مجموعی اخلاقی اثر پڑھنے والوں پر اچھا نہیں ہوتا۔ اسی لیے وہ عظیم ادب میں شمار نہیں ہو سکتیں اور شمار ہوتی بھی نہیں۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ شاعر یا ڈرامہ نویس یا ناول نگار کو پوری آزادی ہونی چاہیے کہ وہ انسانی کردار اور اعمال و افعال کے پورے احاطے کی نقشہ کشی کرے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یقیناً اسے یہ آزادی حاصل ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ یہ نقشہ کشی جائز ادبی اثرات پیدا کرنے کی غرض سے کرے۔ یہ آزادی اُسے عملی اخلاق کی خلاف ورزی کرنے کا حق نہیں دیتی۔ ایک مصنف کی کتاب خواہ نثر میں یا نظم میں ہر قسم کی بدی اور فسق و فجور کو پیش کرتے ہوئے بھی اخلاقی ہو سکتی ہے اور یہ نقشہ کشی اعلیٰ ادبی قدر و قیمت کی حامل ہی نہ ہوگی اگر اخلاقی نہ ہو۔ ہر دبستان کے نقاد اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ انسانی زندگی کی نقشہ کشی کی فضیلت کا ایک لازمہ یا ناگزیر شرط اس کی صداقت ہے یعنی انسانی فطرت کے قوانین سے مطابقت۔ اور آدمی کی اخلاقی فطرت کے حقائق بھی اتنے ہی واقعی اور اہم ہیں

جتنی دوسری حقیقتیں بلکہ ادب میں تو یہ زیادہ ہی اہم ہیں۔ انسانی کردار کی تہ میں اخلاقی وجدانات موجود ہوتے ہیں اور انسانی اعمال کی تہہ میں اخلاقی قوانین۔ فرض کی ادائیگی کا جذبہ عالمگیر اور مطلق و قائم بالذات ہے۔ اس کی خلاف ورزی سے لازماً ادراک کی بے حسی یا کمینہ پن عزم و ارادے کی کمزوری، حوصلوں اور بلند مقاصد کی عدم پابندگی اور انتشار و تضاد پیدا ہوتا ہے جو آخر کار تباہی و بربادی پر منتج ہوتا ہے۔ یہ حقیقتیں ہیں۔ ضروری ہے کہ مصنف ان حقیقتوں کے ساتھ ہم آہنگ و مطابق ہو۔ اگر اس کا مشاہدہ و مطالعہ ان حقیقتوں کو توڑ مروڑ کر غلط پیش کرتا ہے یا ان کا انکار کرتا ہے تو وہ باطل ہے اور اگر اس کا مشاہدہ و مطالعہ ان حقیقتوں کو اس پر منکشف ہی نہیں کرتا ہے تو وہ سطحی ہے۔ جب کبھی ادب جرم و گناہ کی ماہیت اور اس کے نتائج سے آنکھیں بند کر لیتا ہے تو وہ بنیادی حقیقتوں کے غیر مطابق ہو جاتا ہے اور نہ صرف اخلاق کو صدمہ پہنچاتا ہے بلکہ آرٹ کو بھی۔ آرٹ کا تقاضا ہے صداقت اور اخلاق کا تقاضا بھی یہی ہے۔ کوئی کتاب محض اس وجہ سے غیر اخلاقی نہیں ہو جاتی کہ اس میں جرم و گناہ کی تصویریں پیش کی گئی ہیں اور نہ اس وجہ سے اخلاقی بن جاتی ہے کہ اس میں اولیا یا نیک افراد کی شبیہ اتاری گئی ہے۔ اخلاقی یا غیر اخلاقی ہونے کا فیصلہ کتاب کے مجموعی ادبی اثر کی بناء پر کیا جاتا ہے کہ اس کا اثر بدی یا جرم و گناہ کو دلکش اور مستحسن بنا کر قارئین کو مائل بہ شر کرنے والا ہے یا انہیں اس سے دور کرنے والا ہے۔ اگر کسی برائی کے مجسمے کو مصنف عمدگی سے پیش کرے تو اس پیشکش کی داد دی جا سکتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہو گا کہ آیا پڑھنے والا اس برائی کے مجسمے کی طرح بننے کے لیے نفسی و ذہنی طور پر مائل ہو جاتا ہے؟ اگر اس کے نفس و ذہن پر ایسا اثر مترتب ہوتا ہے جو اسے اس طرف مائل کرتا ہے تو یقیناً وہ کتاب غیر اخلاقی ہے۔

جو بحث سطور بالا میں کی گئی ہے اگر ٹھیک ہے تو اس سے ظاہر ہے کہ اعلیٰ ترین ادبی تکمیل کے لیے صحت مند اخلاق کی پابندی کوئی مزاحمت نہیں پیدا کرتی بلکہ اس کے برعکس حقیقی معنوں میں عظیم ادب اخلاقی سلامت فہمی اور میتھیو آرنلڈ کے الفاظ میں اعلیٰ سنجیدگی کا ضرور حامل ہوتا ہے۔ ہونا بھی یہی چاہیے۔ وہ حزنیہ تمثیل جو بقول ارسطو رحم یا ترس اور خوف و دہشت کے جذبات کی معرفت تزکیۂ روح کرتی ہے، وہ رزمیہ نظم جو تاریخ یا سانحات کے وسیع اسٹیج پر انسانی عمل کی بلند ترین رسائیاں پیش کرتی ہے، وہ طربیہ تصنیف جو صحت مند اور دیرپا مسرت کے سرچشموں کو نمایاں کرتی ہے یا زندگی کی پرفریب اور باطل چیزوں کو صحت بخش تضحیک کا نشانہ بناتی ہے، وہ افسانہ یا ناول جو مردوں اور عورتوں کی زندگی کی متحرک تصویر پیش کرتا اور واقعات و حوادث کی جاندار نقشہ کشی کرتا ہے۔ یہ سب ادبی تحریریں اگر انسانی فطرت کی عمیق ترین حقیقتوں کو نظر انداز کر دیں تو کیونکر مبنی بر صداقت قرار دی جا سکتی ہیں؟ اگر ان کے لکھنے والے ان حقیقتوں کی صحیح طور پر تخمین کرنے کی اخلاقی صلاحیت نہیں رکھتے تو وہ پھر کیونکر یہ صادق ہو سکتی ہیں؟ ذہنی آسودگی اس آرٹ سے پیدا ہوتی ہے جس میں راستی و صداقت کی روح ہو۔ فن کی حیات راستی و صداقت ہے اور جو فن اخلاقی صداقت و راستی کے منافی ہے وہ اصل میں زندگی ہی کے منافی ہے۔ (ونچسٹر سے مستفاد)

عالمی ادب میں اقبال کا پیغام

عبد المغنی

ہر ادب اپنی ایک مخصوص فضا رکھتا ہے، جس کے پس منظر میں ہی اس کے تخلیقی نمونے ردِعمل آتے ہیں اور پورے طور پر سمجھے اور سمجھائے جاسکتے ہیں۔ کوئی پارۂ ادب اپنے معاشرے سے الگ ہو کر وجود پذیر یا ورنہ قابلِ فہم نہیں ہو سکتا۔ تمام ادبی تخلیقات ایک خاص ماحول سے تعلق رکھتی ہیں۔ کسی بھی ادب کا جب ایک سانچہ معین ہو جاتا ہے تو اس میں کئے جانے والے ہر تجربے کی ایک روایت ہوتی ہے، جس کے نقوش و اشارات ہی اس تجربے کی عمومی تشکیل کرتے ہیں۔ ادبیات لسانیات پر مبنی ہوتی ہیں، ایک زبان کے اپنے محاورات اور استعارات ہوتے ہیں، جو اس کے ادب کا تار و پود تیار کرتے ہیں۔ انسان کی دوسری سرگرمیوں کی طرح ادب بھی وقت اور مقام کی حدود کا فطری طور پر پابند ہے۔

اس عملی حقیقت کے باوجود عالمی اور آفاقی ادب کی گفت و گو موجودہ بین الاقوامی صدی میں عام ہو گئی ہے اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس گفتگو کی لَے بڑھتی جا رہی ہے۔ اس صورتِ حال کا سبب واضح ہے۔ انسانوں کے مختلف اقوام و ادوار میں تقسیم ہونے کے باوجود، انسانیت کا بنیادی تصور تو ایک ہی ہے۔ قدیم زمانے میں یہ بات اولادِ آدم اور بندگانِ خدا کی حیثیت سے کی جاتی تھی۔ اب حیاتیات و نفسیات کی تحقیقات کے علاوہ سائنسی انکشافات، صنعتی ایجادات اور سیاسی و معاشی حالات و واقعات نے بھی اس بات کی تصدیق کر دی ہے۔ اس طرح یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ ملک اور دور کے پس منظر کے باوجود ادب کا ایک پہلو عالمی و آفاقی بھی ہے۔ ایک ادبی تخلیق کی خصوصیت جو بھی ہو، اس کے اندر ایک عمومیت بھی ہے یا ہو سکتی ہے۔ کسی ادبی نمونے کا پہلا تعلق تو یقیناً اس زبان کے متکلمات سے ہوگا جس میں وہ پیش کیا گیا ہے، لیکن دوسرے مرحلے پر اس کا رشتہ دوسری زبانوں سے بھی قائم ہو سکتا ہے۔ اگر یہ رشتہ نہیں ہوتا تو ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ ممکن نہیں ہوتا۔

اب سوال یہ ہے کہ ادب کے خصوصی و عمومی اور مقامی و عالمی پہلوؤں کے درمیان تناسب و توازن کی صورت کیا ہوگی؟ اس کا کون سا حصہ محدود ہوگا اور کون سا آفاقی؟ یہ ادبی تنقید کا بہت ہی نازک اور پیچیدہ سوال ہے، اور اس میں بحث و نزاع کی کافی گنجائش ہے۔ اس سلسلے میں میں صرف اپنے مطالعے اور غور و فکر کے نتائج پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ معلوم ہے کہ ہر ادبی تخلیق مرکب ہوتی ہے دو اجزا سے۔ ایک مواد اور دوسرے ہیئت جہاں تک ہیئت اور مواد کو الگ الگ اکائیوں میں بانٹ کر دیکھنے کا تعلق ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ لسانی وسیلۂ اظہار کی تخصیص کے سبب ہیئت ایک بالکل مقامی اور محدود عنصر ہے۔ جب کہ مواد کے اندر عالمی و آفاقی ہونے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ انسانی ذہن پورے عالمِ انسانیت کے لئے یکساں ہے، لیکن زبانیں مختلف اور متفرق ہوتی ہیں۔ فن کے تنوع میں فکر کی وحدت کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ جدا جدا اسالیب کے درمیان موضوع مشترک ہو سکتا ہے۔ الفاظ کی رنگا رنگی میں معانی کی یکتائی پائی جا سکتی ہے۔

لیکن کیا مختلف ادبیات کے صرف مواد، موضوع، فکر اور معنی کا موازنہ کرکے ان کے باہمی اوصاف کا تعین کیا جاسکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔ اب جب مواد و ہئیت دونوں ہی اجزاء سے مرکب ہے تو صرف ایک جزو کو لے کر پورے مرکب پر کوئی قطعی حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ ترجمے سے کسی تحریر کا صرف مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے۔ اس کی قدر و قیمت کی ادبی تعیین نہیں ہوسکتی۔ تنقید ادب کے مسلمہ اصول کے مطابق، ادب ایک ایسا تخلیقی مرکب ہے جس کے موضوع اور اسلوب کے درمیان ایک عضویاتی ارتباط ہوتا ہے۔ چناں چہ اس کے عناصر ترکیبی کو ایک دوسرے سے علاحدہ کرکے دیکھنے کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کی پوری حقیقت گرفت میں نہ آئے اور اس کی نوعیت و اصلیت کا ایک ناقص تصور ہمارے سامنے آئے۔ اس ناقص تصور سے ایک ادب پارے کی سالمیت ہی ختم ہو جاتی ہے، لہٰذا اس صورت میں دوسرے ادب پاروں کے ساتھ اس کا موازنہ کسی صحیح نتیجے پر نہیں پہنچا سکتا۔

دوسری طرف، اگر کسی خاص ہئیت کو تنقید و تقابل کا معیار مان لیا جائے، تب بھی یہی خرابی لازم آئے گی۔ بلکہ یہ مواد کو معیار ماننے سے بھی زیادہ غلط اور ناقابل عمل صورت ہوگی۔ ہر ادب کی اپنی ایک ذہنیت ہوتی ہے جس کا ہی اظہار اس کے مختلف اصناف و اسالیب میں ہوتا ہے۔ چنانچہ اس ذہنیت کو نظر انداز کرکے اس ادب کا کوئی مطالعہ نتیجہ خیز اور درست نہیں ہوگا۔ ایک زبان ایک خاص سماج میں پروان چڑھتی ہے اور اس سماج کے مختلف اداروں اور مسلمہ قدروں ہی کی مطابقت میں اس کے ادب کی ہئیتیں تشکیل پاتی ہیں۔ لہٰذا محض کسی ہئیت کو الگ سے لے کر اس کا موازنہ دوسرے ادب کی ہئیت سے کرنا ایک فعل عبث ہے۔

تب ادبیات عالم کے تقابلی مطالعے کا صحیح نہج کیا ہے؟ میرے خیال میں اس نہج کے دو بنیادی عوامل ہیں۔

۱۔ ہر ادبی تخلیق میں فکر و فن کا جو مرکب ہو اس کی مجموعی قدروں کا تعین کیا جائے۔ پھر مختلف ادبیات کی قدروں کے مجموعوں کا تقابلی مطالعہ کرکے ان کے باہمی اوصاف کی تشریح کی جائے۔ ایک زبان کا ادب پارہ اپنے عناصر ترکیبی کے جو نتائج پیش کرے ان کا موازنہ دوسری زبان کے ادب پارے کے عناصر ترکیبی کے نتائج سے کرکے ایک تقابلی میزان کل نکالنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔ اس طرح مختلف ادبیات کا ایک کلی تناسب اور اس کی روشنی میں مختلف ادبی نمونوں کے مراتب کی نسبت معلوم ہوسکتی ہے۔

۲۔ لیکن عالمی ادبیات کے اس موازنے کا آخر معیار کیا ہوگا؟ جب تک ایک عمومی و اصولی معیار ایسا نہیں دریافت ہو جائے جس کا اطلاق آفاقی طور پر کیا جاسکے، کوئی موازنہ وہ تقابلی نتائج نہیں پیدا کرسکتا جن کا ذکر اوپر کیا گیا۔ یہ معیار متقابل ادبی تخلیقات کی اندرونی ترکیب کا تنقیدی تجزیہ کرکے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ کسی بھی ادبی تخلیق کی قدر و قیمت معین کرنے کے لئے ایک تنقیدی مطالعے کا بنیادی اصول کیا ہوتا ہے؟ اس سلسلے میں بحثیں تو بہت کی جاسکتی ہیں اور کی جاتی رہی ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ جدید ادبی تنقید میں مواد و ہئیت کی عضویت کے تسلیم کرلئے جانے کے بعد اب یہ حقیقت بالکل واضح ہوگئی ہے کہ ایک ادیب جس نسبت سے اپنے مواد کو ہئیت میں ڈھالتا ہے وہی اس کے نمونۂ تخلیق کے وصف کی تعیین کا معیار بن سکتی ہے یعنی ہر ادیب کا ایک تخلیقی مسئلہ ہوتا ہے، جو اس کے ادب کے دونوں عناصر ترکیبی پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایک ادبی تخلیق کو دیکھ کر جو ضروری سوال اٹھتے ہیں وہ یہ ہیں:

ا : اس تخلیق کا موضوع کیا ہے؟

ب : اس موضوع کو کس اسلوب سے ادا کیا گیا ہے؟

ان سوالوں کا تعاقب کرتے ہوئے، سب سے پہلے تو تخلیق کے مواد کی نوعیت آشکار کی جائے گی، اس کے تمام مضمرات کا تجسس کر کے اس کی اہمیت واضح کی جائے گی، اور ساتھ ہی ہیئت کے مقابلے میں اس کی پیچیدگی کا سراغ لگایا جائے گا۔ اس کے بعد دیکھنا پڑے گا کہ یہ مواد اپنی مخصوص نوعیت و اہمیت اور پیچیدگی کے ساتھ ایک خاص ہیئت میں کس طرح بروئے اظہار آیا، جو ہیئت اظہار کے لیے اختیار کی گئی وہ کہاں تک موزوں تھی اور کتنی مؤثر ثابت ہوئی۔

یہ معیار ادبی تخلیقات کے مستقل بالذات مطالعے کے لیے بھی آتا ہی ناگزیر ہے جتنا ان کے تقابلی مطالعے کے لئے خواہ یہ تقابل ایک ہی زبان کی ادبیات کے درمیان ہو یا مختلف زبانوں کی ادبیات کے مابین، اس معیار کی یہ عمومیت اور ہمہ گیری، عالمی ادبیات کے تقابلی مطالعے کے لئے اِس کی موزونی اور نتیجہ خیزی کی ایک اور دلیل ہے۔ یہ تنقید ادب کا سب سے جامع معیار ہے جس میں تجزیہ تقابل کی تمام شرطیں بدرجۂ کمال پوری ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا ادب کے آفاقی مطالعے کے لئے یہ ایک بہترین معیار ہے۔

اس اصولی مؤقف سے اقبالؔ کا مقام عالمی ادب میں متعین کرنے کے لئے چند اجتماعی حقائق پر ایک نظر ڈال لینا بھی مناسب ہوگا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ اب تک ادب کے عالمی مطالعے کا انداز کیا ہے؟ میرا خیال ہے کہ ایک آفاقی معیار سے ادبیاتِ عالم کے مطالعے کی کوئی سنجیدہ اور باضابطہ کوشش اب تک نہیں ہوئی ہے۔ مشرقی ادبیات اور مغربی ادبیات کے درمیان کسی تنقیدی موازنے کی کوئی مثال میرے سامنے نہیں ہے۔ اس معاملے میں اہلِ مشرق بڑی مجبوریوں سے دوچار رہے اور نتیجۃً ان کی کوتاہیاں چند در چند ہیں۔ بین الاقوامی دورِ حاضر کی علمی و عملی سہولتیں ان کے نصیب میں بہت ہی کم آئیں۔ اس کے علاوہ ان کے ذہن پر مغرب کی مرعوبیت ایسی طاری رہی کہ وہ مغربی ادبیات کے ساتھ اپنی ادبیات کا تقابل کرنے کی جرأت ہی نہیں کر سکے۔ تنقید کی ابیدگی بھی مشرق میں اتنی کم ہوئی کہ خود اس خطے کی زبانوں کی ادبیات کا کوئی تقابلی مطالعہ نہیں کیا جا سکا دوسری طرف اہلِ مغرب نے جدید علم و حکمت کے تمام اثاثوں اور دعوؤں کے باوجود، اس سلسلے میں ایک یکسر غیر علمی اور غیر حکیمانہ روش اختیار کی۔ انہوں نے اپنے خطے کی زبانوں کی ادبیات کا تو ہر جہت سے مطالعہ کیا اور اپنی تنقیدوں کا انداز اکثر و بیشتر بین الاقوامی رکھا اس کے علاوہ، ان میں کچھ لوگ ایسے بھی پیدا ہوئے جنھوں نے مشرقی زبانوں اور ان کے ادبوں کا بھی الگ الگ مطالعہ کیا لیکن مشرقی ادبیات کے متعلق ان مغربی مستشرقوں کا رویّہ عام طور پر سرپرستانہ رہا، اور انہوں نے ان کے تقابلی مطالعے کی بھی کوئی ضرورت نہیں سمجھی۔ اس صورت حال کی وجہ یہ ہے کہ سائنس اور صنعت کی طرح تہذیب اور ادب میں بھی اہل مغرب نے اہل مشرق کو اپنے سے بہت کم تر اور بالکل پس ماندہ تصور کیا اور مشرقی ادبیات کو اس قابل ہی نہیں سمجھا کہ ان کا سنجیدہ تنقیدی مطالعہ کر کے ان کی عالمی قدر و قیمت تہذیب حاضر کے پس منظر میں واضح کریں اور مغربی ادبیات کے ساتھ ان کا موازنہ کر کے ان کے آفاقی مقام کی تعیین کریں چنانچہ مغرب کی ادبی تنقیدوں میں مشرقی ادبیات کے حوالے گویا مفقود ہیں۔

میں اس صورت حال کو اہلِ مغرب کی ادبی نو آبادیت اور سامراجیت پر محمول کرتا ہوں۔ بہر حال، یہ ادب کا ایک سیاسی اور سراسر غیر ادبی تصور ہے لیکن لطیفہ یہ ہے کہ اس تصور کے فروغ میں اہلِ مشرق نے بھی مغرب والوں کے ساتھ بھرپور تعاون کیا ہے جب سے میکاؤلے کی نسل ایشیا میں پروان چڑھی ہے اس نے یہ تبلیغی مہم اپنے سر لے لی ہے کہ ہر جہت سے مشرقی ادبیات کو ناقص محض

قرار دیتے ہوئے اس کی تشکیل تو بالکل مغربی معیارِ ادب پر کر ڈالی ہے۔ چنانچہ اس صدی کی دوسری چوتھائی سے جو ادبی تنقیدیں مشرقی ادبیات میں شروع ہوئی ہیں ان کا نصف صدی کا کارنامہ یہی ہے کہ وہ مغربی ادبیات کے حوالوں سے بھری ہوئی ہیں اور ان میں مشرقی ادیبوں کا جو کچھ موازنہ مغربی ادیبوں کے ساتھ ہے وہ صرف یہ دکھانے کے لیے کہ مشرقی ادب میں وہ کیا کیا نقائص ہیں جن کو مغربی ادب کے معیار سے دور کیا جانا چاہیئے۔

ظاہر ہے کہ ادبی مطالعے کا یہ انداز کہ ایک قسم کے ادبی تصورات کو اصول موضوعہ تسلیم کر کے دوسری قسموں کے تمام ادبی تصورات پر حکم لگا دیا جائے اور پھر اسی اصول موضوعہ کے مطابق تمام ادبی نمونوں کی قدر و قیمت معیّن کی جائے، کسی طرح عالمی ادب کا آفاقی معیار بننے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ یہ تو بالکل مقامی علاقائی اور محدود قسم کا تصور ہے، جو بجائے اوصاف و اقدار کے محض اغراض و مفادات پر مبنی ہے۔ لہٰذا ادب کے جس مرکب اور متناسب معیار کی نشان دہی میں نے ادبیات عالم کے تقابلی مطالعے کے صحیح نہج پر بحث کے دوران کی ہے اسی پر توجہ مرکوز کرنی پڑے گی۔ اس لئے کہ اس کے مضمرات و عوامل بالکل اصولی اور آفاقی ہیں اور اس میں کوئی نقطۂ نظر پہلے سے طے شدہ نہیں ہے جس کو خواہ مخواہ عائد کرنا مقصود ہو، بلکہ وہ ایک یکسر عملی و تجربی معیار ہے جس میں تنقیدی تجربے اور تقابل کے معروف و مسلم طریقوں سے موضوعِ مطالعہ کی حقیقت و اہمیت دریافت کرنی ہے۔ اگر انسانیت کی کوئی آفاقی قدریں ہیں تو ان کی تعیین عالم انسانیت ہی کے معیار و منہاج پر کی جا سکتی ہے۔

اس آفاقی معیارِ ادب پر جب ہم اقبال کی شاعری کو پرکھتے ہیں تو ہمیں اس کے اندر حسب ذیل دو نکتے نمایاں طور پر نظر آتے ہیں:۔

۱۔ اقبال کا فنی مسئلہ ان کی صف کے دوسرے تمام عالمی شعرا کے مقابلے میں سب سے زیادہ پیچیدہ اور دشوار تھا۔ اقبال نے ایک ایسے دور میں شاعری کی جب سائنس اور صنعت کی ترقیات اور سیاسیات و معاشیات کی تحریکات نے پرانی دنیا کے پورے نظام کو تہ و بالا کر کے ایک نئی دنیا کے پیچ و تریچ اور رنگ برنگ مسائل کھڑے کر دیئے تھے، علوم و فنون کے سارے انداز بدل رہے تھے، اور انسانی ذہن نت نئی گتھیوں اور الجھنوں سے دو چار تھا۔ شعور کی گرہوں کے ساتھ ساتھ لاشعور کی تہیں بھی دریافت کی جا رہی تھیں۔ ان حالات و کیفیات سے اقبال کو اپنی تعلیم و تربیت کے دوران براہِ راست سابقہ پڑا انہی کے بقول وہ "اس آگ میں مثل خلیلؑ" ڈالے گئے۔

اس کے علاوہ اقبال نے عالم انسانیت کی "تشکیل جدید" کا ایک نہایت وسیع اور وزنی نصب العین بھی اختیار کر لیا، اور اپنی شاعری کو اس کی تکمیل کا ایک وسیلہ قرار دیا۔ پھر اپنے وقت کے دھاروں کے بالکل برخلاف انہوں نے اسلام جیسے انتہائی مرکب اور جامع نظریۂ حیات و کائنات کو اپنا نصب العین بنایا۔ اس طرح ایک طرف اسلامی نظام زندگی کا احیا اور دوسری طرف اس احیا کے ذریعے انسانیت کی تشکیل جدید، تفکر کی دوہری مشقت اقبال کے ذہن پر پڑی۔ اس مشقت میں بہت زیادہ اضافہ دو خاص وقتوں سے ہو گیا۔ ایک یہ کہ اقبال اپنی تربیت کے لحاظ سے باضابطہ ایک فلسفی تھے، جس کے سبب علم و فکر کا ایک بارِ گراں ان کے دماغ پر تھا۔ دوسرے، ان کے ملک کی غلامی انھیں ایک سیاسی جدوجہد پر بھی ابھار رہی تھی، چنانچہ انھیں وکالت و قیادت کی عملی زحمتوں سے بھی گذرنا پڑا اور سیاست کے الجھیڑوں سے نمٹنے کی ضرورت بھی لاحق ہوئی۔

۲۔ اپنی شخصیت اور اپنے زمانے کی یہ ساری پیچیدگیاں ہی وہ مواد تھیں جنھیں اقبال کو ہیئت شاعری میں ڈھالنا تھا۔ یہ امر واقعہ

ہمارے سامنے ہے کہ اقبال کے اشعار شعریت کے کسی بھی معیار کے مطابق اعلیٰ قسم کے اشعار ہیں۔ اس لئے یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ اقبال اپنی فکر کو فن بنانے میں پوری طرح کامیاب ہوئے۔ انہوں نے اپنے نصب العین کو ایک شعری وجود عطا کر دیا۔ ان کے تصورات استعارات میں ڈھل گئے، ان کی آواز نغمہ بن گئی۔ اس کارنامے سے اقبال کا فنی خلوص اور فکری سوز دونوں واضح ہو جاتے ہیں۔ اقبال نے اپنے موضوع ذہنی کو ایک جمالیاتی معروضیت بخشی اور اپنی شخصیت کو اپنے فن میں گم کر دیا۔ ان کے شاعرانہ احساسات کی سالمیت قابل رشک ہے۔ کلام اقبال میں مواد و ہیئت کی عضویت کمال درجے پر ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کی تخئیل اپنے مختلف عناصر کے موزوں اسالیب اظہار خود تراشتی ہے۔ ان کے الفاظ ان کے معانی کے ساتھ بالکل پیوستہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دقیق سے دقیق اور ثقیل سے ثقیل خیالات بھی حسن تخئیل و ترنم کی ہمآہنگی و لطافت کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ اقبال کے نظام فکر ہی کی طرح ان کا اپنا ایک نظام اساطیر بھی ہے، جس کے استعارے، تلمیحیں اور کنائے اپنا ایک مخصوص رنگ و آہنگ رکھتے ہیں، اور ان کے اشارات و علامات نے احساسات و جذبات کی ایک خاص الخاص دنیا بسائی ہے۔ اس دنیا کی امتیازی شان یہ ہے کہ یہاں شاعری کی صنعت نصب العین کی فطرت سے کامل طور پر ہم آہنگ ہے ؎

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو
کہ فطرت خود بہ خود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

اقبال کے سامنے جیسے اور جتنے فنی مسائل تھے ویسے اور اتنے ہی فنی وسائل انہوں نے ان کے حل کے لئے مہیا کئے۔ ان کا فن ان کی فکر کا روشن آئینہ ہے۔

حسن آئینہ حق ، دل آئینہ حسن
دل انساں کو ترا حسن کلام آئینہ

ان حقائق کے پیش نظر، عالمی ادب میں اقبال کا مقام متعین کرنے کے لئے، سب سے پہلے یہ دیکھ لینا چاہیئے کہ مشرقی ادبیات میں ان کی جگہ کیا ہے۔ مشرق میں جو زندہ زبانیں پائی جاتی ہیں ان سب کے مشاہیر شعراء کی صف اولیں میں سے ہم سب سے پہلے، رومی، حافظ، سعدی اور خیام کا موازنہ اقبال کے ساتھ کرنا چاہیں گے۔ اس سلسلے میں یہ نکتہ تو بالکل واضح ہے کہ نہ صرف افکار کی گراں مایگی اور وسعت کے اعتبار سے بلکہ اصناف و اسالیب کی کثرت اور تنوع کے لحاظ سے بھی اقبال کی جامعیت کا مقابلہ ان میں کوئی ایک شاعر تنہا نہیں کر سکتا۔ لہٰذا موازنے کی جہت یہی ہو سکے گی کہ اقبال کے کسی ایک ہی پہلو کا تقابل ان میں سے ہر ایک کی پوری شاعری سے الگ الگ کیا جائے۔ موازنے کی یہ جہت ہی یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ مجموعی طور پر فارسی کا کوئی ایک شاعر بھی اقبال کے برابر نہیں ٹھہرتا۔ اس کے بعد دیکھئے تو رومی کی مثنویات کا حجم جو بھی ہو، اقبال کی فارسی مثنویاں (اسرار و رموز وغیرہ) اور اردو مثنوی (ساقی نامہ) ملا کر، بہ اعتبار وصف رومی کی شاعری پر ایک وقیع اضافہ ہیں۔ "صوفیت" میں "پیر رومی" اور "مرید ہندی" کا رشتہ جو بھی ہو، شاعری میں معاملہ مختلف ہے۔ ایک تو تنقید میں شعراء کے اپنے بیانات پر انحصار نہیں کیا جا سکتا،

دوسرے شاعروں کے بارے میں رومی نے متعلق اقبال کا کوئی بیان میرے علم میں نہیں ۔ بہرحال فکر و فن کی مجموعی شعریت کا جو انداز کلام اقبال میں ہے وہ کلام رومی پر ایک قدم زائد ہے۔ اقبال نے رومی کے بہترین عناصر کو جذب کر کے ان کے محاسن میں توسیع کرنے کے علاوہ کچھ نئے اوصاف کا اضافہ بھی کیا ہے۔

حافظ کے دیوان کا موازنہ اگر صرف "پیام مشرق" کے باب "غزلیات" سے "باقی" سے کرلیا جائے تو معلوم ہوجائے گا کہ خود حافظ کی زمین پر اقبال کے تصرفات کیا کچھ ہیں۔ اس کے علاوہ "زبورِ عجم" اور "بالِ جبریل" کی غزلیں حافظ کی حدود تغزل سے معاملہ آگے نکلی ہوئی ہیں۔ حافظ کے تغزل کی جتنی بھی خصوصیات بتائی جاتی ہیں وہ تو اقبال کی غزلوں میں بدرجۂ اتم ہیں ہی، ان کے علاوہ شعریت کی جو نئی نئی تہیں، نئے نئے اشارے، تازہ بہ تازہ استعارے، لطیف سے لطیف کنائے اور خیال انگیز تلمیحیں ہیں وہ جدت طرازانہ تخیلات و تصورات اور نہایت دبیز احساسات و جذبات کا پیرایۂ اظہار بن کر غزلیات، حافظ پر ایک اضافہ ہی تو ہیں۔ دیوان حافظ کی مے باقی غزلیاتِ اقبال میں نہ صرف تازہ تر ہوگئی ہے۔ بلکہ اس کا نشہ دو آتشہ ہوگیا ہے۔

خیام کی رباعیات "پیامِ مشرق" کے حصہ رباعیات کے ساتھ ملا کر پڑھی جائیں تو یہ عجیب و غریب نکتہ دریافت ہوگا کہ اقبال کی فکر انگیزی میں خیام کی عیش کوشی سے زیادہ آب و تاب اور انبساط و نشاط ہے، رباعیاتِ اقبال کے مسرت و بصیرت کے مرکب میں رباعیاتِ خیام کے مسرتِ محض کے مفردے سے زیادہ زور اور اثر ہے۔ اقبال نے بصیرت کو مسرت بنایا ہے۔ جبکہ خیام نے مسرت کو بصیرت بنانے کی کوشش کی ہے۔ نتیجہ آسانی سے قیاس کیا جا سکتا ہے۔

سعدی کا موازنہ شعریت میں اقبال کے ساتھ کرنا کوئی بہت موزوں کام نہیں ہے، اقبال کا تفوق اس معاملے میں ظاہر ہے۔ جہاں تک دانشوری کا تعلق ہے۔ اقبال کے اجتماعی تصورات سعدی کی شخصی اخلاقیات سے بہت ممتاز ہیں اور ان کی آفاقی اہمیت واضح تر۔

اردو شاعری میں میر و غالب نے روایتِ ارتقا کو جہاں تک پہنچایا تھا اقبال نے اس سے بہت آگے بڑھا دیا۔ میر کا فنی تجربہ تو بہت ابتدائی اور سادہ قسم کا تھا اور اس کی جو کچھ دل ربائی ہے وہ اس کی اسی معصومیت پر مبنی ہے۔ غالب کا تجربہ یقیناً بلوغت کی پیچیدگی رکھتا ہے لیکن اقبال نے اسی بالغانہ پیچیدگی کو درجۂ کمال پر پہنچایا اور غالب کے یہاں جو کچھ ناہمواریاں اور سلوٹیں رہ گئی تھیں ان کو بالکل دور کر کے نفاستِ بیان کا ایک انتہائی معیار قائم کیا۔ معانی کے تنوع اور تخیل کی وسعت میں تو اقبال کا موازنہ میر و غالب کے ساتھ کرنا ہی فضول ہے۔

سنسکرت کے کالی داس اور عربی کے امرأ القیس کا اقبال کے ساتھ موازنہ ویسا ہی ہوگا جیسے کسی تجربے کے آغاز کا تقابل اس کی ہیئت عروج کے ساتھ کیا جائے۔

یہاں میں ایک تنقیدی نکتہ پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ یہ کہ اقبال کی شاعری درحقیقت مشرقی ادبیات کی تمام شاعرانہ روایات کا نقطۂ عروج ہے۔ فارسی، سنسکرت اور عربی میں شاعری کے جتنے تجربات اقبال سے قبل ہو چکے تھے۔ ان سب کے بہترین احساسات و نقوش کو اپنے اندر سمیٹ اور سمو کر اقبال کے فن نے ارتقا کا ایک نیا مرحلہ طے کیا، جو اس وقت مشرقی شاعری کی منزلِ آخریں نظر آرہا ہے

اُردو زبان مشرق کی مذکورہ تینوں کلاسیکی زبانوں کی بہترین لسانی روایات کی اہم ترین نمائندہ ہے، اور اقبال کی اردو شاعری نے بھی ان زبانوں کے تمام شعری وسائل کی ترکیب اور ارتکاز اپنے اندر کر لیا ہے۔ اقبال کا فن مشرق میں اپنے پیش روؤں کے کارناموں کی توسیع اور تجدید کرتا ہے۔ اقبال کی شاعری ہی مشرقی ذہن کی بہترین نمائندہ ہے اور عالمی سطح پر اس کی آفاقی اہمیت کا پس منظر یہی ہے۔ اسی پس منظر میں اس شاعری نے وہ فکری و فنی قدریں ترتیب دی ہیں جو بین الاقوامی ادب کا ایک مثالی معیار پیش کرتی ہیں۔

ٹیگور کی شاعری اقبال کے مقابلے میں ٹھوس قدریں بہت کم رکھتی ہے۔ اتنی کم کہ اگر نوبل پرائز کی سیاسی سفارش نہیں ہوتی تو شاید اس مقدمے کا ذکر کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ ٹیگور کا نغمہ صرف تھکے ہوئے ذہن کے لئے وقتی فرحت کا ایک سامان مہیا کرتا ہے یا زیادہ سے زیادہ ایک متصوفانہ جذب کا حامل ہے، جب کہ اقبال کا نغمۂ انسانی روح کے اندر وہ عرفان و انبساط پیدا کرتا ہے جس سے حیات کی تزئین و تنظیم کے ساتھ ساتھ کائنات کی تسخیر و تشکیل کا حوصلہ اور شعور بیدار ہوتا ہے۔ ٹیگور ہمارے ذہن کو سُلاتے ہیں اور اقبال جگاتے ہیں۔ ٹیگور کا کلام کائنات کی حرکت کو ایک نقطے پر جامد دیکھنا چاہتا ہے اور زندگی کی الجھنوں سے گریزاں ہے، جب کہ اقبال کی شاعری ترقی پذیر وجود کا ساتھ دیتی اور الجھنوں کے حل میں اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ اقبال جدید ذہن کی پیچیدگیوں کو آئینہ دکھاتے ہیں، اس ترکیب کے ساتھ کہ قدیم احساسات بھی جھلک اٹھتے ہیں، جب کہ ٹیگور صرف قدیم ذہن کا بہت ہی سادہ سا انعکاس کر پاتے ہیں۔ اقبال کے نقوش کلام میں جو دبازت ہے ٹیگور اس سے بہرہ ور نہیں۔

اب عالمی سطح پر صرف تین شعراء ایسے ہیں جن کے ساتھ اقبال کا موازنہ کرنے سے ادبیات عالم میں اقبال کا مقام واضح ہو جائے گا۔ ایک اطالوی شاعر، دانتے (۱۲۶۵ - ۱۳۲۱ء) دوسرے انگریزی شاعر، شیکسپیئر (۱۵۶۴ - ۱۶۱۶ء) تیسرے جرمن شاعر گیٹے (۱۷۴۹ - ۱۸۳۲ء) یہ تینوں شعراء وہ ہیں جو نہ صرف مغربی ادبیات کے سرخیل سمجھے جاتے ہیں، بلکہ اہل مغرب نے انہیں پوری دنیا کے بہترین و عظیم ترین شعراء ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں تک ان تینوں کے درمیان ترتیب مدارج کا تعلق ہے اس میں اختلاف کیا جاتا ہے اور ٹھیک جس طرح عالمی سطح پر ان شعراء کی قدر افزائی میں یورپ والے بجائے اصولی و ادبی معیار کے ایک براعظمی و ایشیائی تعصب سے کام لیتے ہیں، اسی طرح براعظمی سطح پر ان کے درمیان ترتیب مدارج میں یورپ کے متعلقہ ممالک اور خطے قومی سیاست کی عصبیت اور علاقائی جانب داری سے کام لیتے ہیں۔ بہر حال ہمیں اہلِ مغرب کی قومی و علاقائی سیاست و عصبیت سے کوئی مطلب نہیں۔ ہمارے مقصد کے مناسب بات یہی ہے کہ ہم نے گذشتہ سطور میں عالمی ادب کے آفاقی و اصولی معیار کی جو تعیین کی ہے اس کی روشنی میں اقبال کا موازنہ دانتے، شیکسپیئر اور گیٹے کی شاعری سے کریں۔

تیرھویں، چودھویں صدی کی اطالوی میں دانتے نے جو شاعری کی کیا واقعی وہ شاعری کے اعتبار سے بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی "ڈوائن کومیڈی" (طربیہ خداوندی) کے تخیل و تفکر کے لحاظ سے؟ کیا اطالوی زبان اور اس کی شاعرانہ روایت دانتے کے مفروضہ عظیم تخلیق کی متحمل ہو سکتی؟ میں سمجھتا ہوں کہ دانتے کا فنی مسئلہ تو بہت معمولی تھا اس لئے کہ اپنے وقت اور اپنی ادبی و فکری روایات میں اس شاعر کو کسی خاص اور قابلِ ذکر پیچیدگی سے سابقہ درپیش نہیں تھا۔ لیکن لسانی وسائل کا ایک دشوار مسئلہ ضرور اس کے لئے سدِ راہ تھا۔ چنانچہ دانتے کے لئے شعری تجربے کی گنجائشیں بہت ہی محدود تھیں اور وہ شاعرانہ مہم کے طے کرنے میں بہت دور تک نہیں جا سکتا تھا۔ لہٰذا دانتے کی

شاعری اپنی جگہ عظیم ہوتے ہوئے بھی لطافت و نفاست کے اس درجۂ کمال پر نہیں کہ آفاقی معیار سے اس کا موازنہ پورے طور پر اقبال کی شاعری کے ساتھ کیا جا سکے۔ ڈوائن کومیڈی ہی کی طرح جاوید نامہ ایک فائق تر تخلیق ہے۔

سولہویں سترھویں صدی کے انگریزی شاعر شیکسپیئر سے اپنے تاثر کا اظہار اقبال نے اپنے ابتدائی دور کی ایک نظم "شیکسپیئر" (بانگِ درا) میں کیا ہے اور اس کے حسنِ کلام کو "دلِ انسان" کا "آئینہ" بتایا ہے۔ لیکن پیامِ مشرق، زبورِ عجم، جاوید نامہ، بالِ جبریل اور ضربِ کلیم کے اقبال کی شاعری شیکسپیئر کی شاعری سے اسی طرح ایک درجہ آگے ہے جس طرح "پیرِ رومی" کی شاعری ہے۔ بلاشبہ شیکسپیئر کا خاص کارنامہ اس کے منظوم ڈرامے ہیں اور اس کے فن کا اصل جوہر انہی میں پوری طرح نمایاں ہوا ہے، جب کہ اقبال کے کلام میں اس صنفِ سخن کی کوئی اہمیت جاوید نامہ کی تمثیلی ہیئت اور بعض دوسری تمثیلی نظموں کے باوجود نہیں۔ لیکن ہم عالمی ادب کے آفاقی معیار کی تعیین کے سلسلے میں یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ محض ایک خاص ہیئت تقابلی مطالعے کا کوئی تنقیدی اصول نہیں بن سکتی۔ لہٰذا شیکسپیئر اور اقبال کے موازنے میں کسی مخصوص ہیئت پر انحصار کرنے کے بجائے توجہ اس نکتے پر مرکوز کرنی پڑے گی کہ اعلیٰ شعریت کے اعتبار سے دونوں کے درمیان کیا نسبت قائم ہوتی ہے۔ شیکسپیئر ڈراما نگاری کا یقیناً عظیم ترین ماہر ہے اور کردار نگاری میں اس کا جواب نہیں لیکن جوہرِ شاعری میں اقبال کا فن عظیم تر ہے۔ اس بات کا فیصلہ کرنے کے لئے میں ایک کسوٹی اہلِ نظر کے سامنے رکھتا ہوں۔ شیکسپیئر کے ڈراموں سے شاعرانہ عناصر کو نکال کر یکجا کر دیا جائے۔ اس لئے کہ شاعری ڈرامے کا صرف ایک اسلوب ہے اور اس کی اصلیت ڈرامے کے ہیولے سے ماورا ہے۔ اس کے بعد شیکسپیئر کے سانیٹوں کو بھی ان شاعرانہ عناصر میں جوڑ کر، شیکسپیئر کی صرف شعریت کا ایک مجموعہ تیار کر لیا جائے۔ اب اس مجموعے کا موازنہ اقبال کے تمام شاعرانہ عناصر کے مجموعے سے کیا جائے۔ میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس خالص شاعرانہ تقابل میں اقبال کا فن شیکسپیئر سے عظیم تر ثابت ہوگا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شیکسپیئر کے شاعرانہ عناصر کا حجم اور وزن اقبال کے عناصرِ شعری کے مقابلے میں بہت کم نکلے گا۔ ایک قدم آگے بڑھ کر اگر مشہور انگریزی نقاد "میتھیو آرنلڈ" کے مقولے "اعلیٰ سنجیدگی" کو معیار تسلیم کر کے اقبال اور شیکسپیئر کا موازنہ کیا جائے تو شیکسپیئر کا سرمایۂ فن اقبال کے مقابلے میں اتنا قلیل ہوگا کہ دونوں کے درمیان تقابلی مطالعے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی جا سکے گی۔

اٹھارہویں، انیسویں صدی کے جرمن شاعر، گیٹے، کا ذکر اقبال نے اپنے ابتدائی دور کی ایک نظم "مرزا غالب" (بانگِ درا) میں بڑے احترام کے ساتھ کیا ہے۔ اس کے علاوہ "پیامِ مشرق" کو گیٹے کے سلامِ مغرب کا جواب ہی کہا جاتا ہے۔ گیٹے کا سرمایۂ شاعری بھی دانتے اور شیکسپیئر سے کچھ زیادہ ہے۔ بہرحال اگر گیٹے کی دوسری تخلیقات سے قطع نظر کر کے صرف اس کی شاعری پر توجہ مرکوز کی جائے تو اقبال کے مقابلے میں یہاں بھی معاملہ مجموعی طور پر وہی نظر آتا ہے جو شیکسپیئر اور اقبال کے موازنے میں دیکھا جا چکا ہے۔ اقبال کے عناصرِ شاعری گیٹے سے زیادہ ہیں اور گیٹے کے جوہرِ شاعری میں ایسی کوئی چیز نہیں جو اقبال کے یہاں بلند تر پیمانے پر نہیں پائی جاتی ہو، جب کہ کلامِ اقبال کی تمام اعلیٰ قدریں گیٹے کے یہاں پائی ہی نہیں جاتیں۔ رہی یہ بات کہ گیٹے کی شخصیت بڑی مرکب، ہمہ جہت اور قد آور تھی، تو بلاشبہ اس سلسلے میں مغربی ادبیات کی کسی شخصیت کا پورے معنی میں اقبال کے ساتھ موازنہ اگر ہو سکتا ہے تو وہ گیٹے ہی کی ایک شخصیت ہے۔ لیکن شخصیت کے لحاظ سے جو قد و قامت اقبال کا ہے۔ کیا گیٹے اس کے قریب بھی کہیں پھٹک سکتا ہے؟ اقبال کی شخصیت نے پورے دور کو پیامِ انقلاب دیا اور ان کے ذہن نے انسانی ارتقا کے ایک نہایت نازک مرحلے پر عمیق ترین بصیرت کا ثبوت دیا، اور ان کی

لکوسنے ایک وسیع الاثر تحریک کی رہ نمائی کی، سبب کہ گیٹے کے ذہن و فکر یورپی نظامِ اجتماعی کی روایتی حدود سے باہر نہیں نکل سکے۔ بجز ان شخصی ہنگاموں کے جو اس رومان زدہ شاعر نے معاشرتی اخلاق کی "زنجیروں" کو توڑ کر دفتاً فوقتاً بپا کئے۔ گیٹے کی شخصیت کا سفلہ پن اس کے مشہور ڈرامے "فاؤسٹ" کے واقعات و احساسات سے معلوم ہو جاتا ہے، خواہ اس کو اعترافِ جرم کی ایک عبرت انگیز دستاویز ہی کیوں نہ سمجھا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ گیٹے کی شخصیت سالم نہیں تھی، اس کے احساسات منتشر تھے اور اس کے یہاں فنی معروضیت کا بھی کوئی مستقل معیار نہیں، جبکہ اقبال کی شخصیت کی سالمیت، جمعیت اور شاعرانہ معروضیت بالکل واضح ہے۔

دانتے، شیکسپیئر اور گیٹے پر اقبال کے شاعرانہ تفوق کے اسباب عالمی سطح سے مطالعہ کرنے کی صورت میں بہ آسانی سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں نمایاں ترین تنقیدی نکات حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ اقبال کا انفرادی تجربہ ایک عظیم ترین فنی روایت کی بنیاد پر وجود میں آیا۔ میں بتا چکا ہوں کہ اقبال کی شاعری مشرقی ادبیات کے بہترین عناصر کی جامع ہے۔ اس شاعری کو عربی، سنسکرت اور فارسی شاعری کے صدیوں کے فنی تجربات ورثے میں ملے۔ اقبال سے پہلے مشرق کی ان کلاسکی زبانوں میں چند اہم ترین شعرا پیدا ہو چکے تھے، یہاں تک کہ اردو میں بھی کم از کم دو عظیم فن کاروں کی تخلیقات سامنے آ چکی تھیں۔ یہ بات دانتے، شیکسپیئر اور گیٹے کو اس پیمانے پر نصیب نہیں ہوئی تھی۔ دانتے تو گویا اطالوی میں پہلا اہم شاعر تھا۔ شیکسپیئر کے انگریزی متقدمین کے تجربات معمولی قسم کے تھے۔ یہی صورتِ حال جرمن میں گیٹے کو درپیش تھی۔ ان تینوں زبانوں میں مذکورہ تینوں شعرا کے پیشروؤں میں کسی ایسے شاعر کا نام نہیں لیا جا سکتا جو کسی تخلیقی عظمت کا حامل ہو۔ اطالوی اور انگریزی میں تو قصہ یہ ہے کہ دانتے اور شیکسپیئر تک ان زبانوں کی لسانی سلاست بھی مکمل نہیں ہوئی تھی اور ان کے اظہار و بیان کا ڈھانچہ زیرِ تشکیل تھا۔ ان فن کاروں کی استعمال کی ہوئی زبان میں متروکات کی کثرت اسی حقیقت کی دلیل ہے۔ جہاں تک ان مغربی زبانوں کے پس منظر میں یونانی اور لاطینی کی روایات کا تعلق ہے یہ بالکل واضح ہے کہ یورپ کی ان قدیم کلاسکی زبانوں میں شعری روایت کا وہ سرمایہ موجود نہیں جو عربی، فارسی اور سنسکرت میں ہے، خواہ دوسری اصناف ادب کی جو بھی ثروت ان کے اندر پائی جاتی ہو۔ اقبال سے پہلے عربی و فارسی شاعری کے وسائلِ بیان و اظہار کی بلاغت ان زبانوں کے صنائع و بدائع کے نہایت ترقی یافتہ نظام سے ہی عیاں ہے۔ مشرق کی کلاسیکی شاعری کی بالیدگی، پیچیدگی اور باریکی و نفاست کا مقابلہ مغرب کی کلاسکی شاعری قطعاً نہیں کر سکتی۔

۲۔ تیرھویں صدی کے دانتے، سولھویں صدی کے شیکسپیئر اور اٹھارھویں صدی کے گیٹے کے مقابلے میں بیسویں صدی کے اقبال کے مسائلِ فن جتنے زیادہ تھے اتنے ہی وسائلِ فن بھی مہیا ہوئے۔ سائنس اور صنعت، سیاست اور معیشت کی ترقیات نے عصرِ حاضر کے ادب و شاعری کے سامنے جو مسائل کھڑے کر دیئے ہیں ان کا تصور بھی قبل کے ادوار میں نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ خود ادبیات کی جو ترقیاں اقبال کے زمانے میں ہو چکی تھیں ان کا کوئی سراغ دانتے، شیکسپیئر، گیٹے کے زمانوں میں ظاہر ہے کہ نہیں ملتا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ بین الاقوامی ادب اور عالمی شاعری کا کوئی تخیل گیٹے، شیکسپیئر اور دانتے کے سامنے تھا ہی نہیں، یہ تو صرف اقبال ہی کو نصیب ہوا۔ چناں چہ دنیا کے عظیم ترین شاعروں میں اقبال وہ تنہا شاعر ہیں جنھوں نے شعوری طور پر اعلان کر کے آفاقی قدروں کو سامنے رکھ کر، ایک عالمی شاعری کا نمونۂ کمال تخلیق کیا۔ اس اعتبار سے فکر و فن، فلسفہ و شاعری دونوں میں اقبال نے مشرق و

مغربی تمام ہی ادبیات کی بہترین روایات اور عظیم ترین تجربات کو اپنی منفرد تخلیقات میں ترکیب دے کر ایک بہتر اور عظیم ترین فن کا ہی کا ثبوت دیا۔ ساتھ ہی انہوں نے شعر و ادب کو پیش آنے والے مشکل ترین مسائل کو اپنی فنی ریاضت اور فکری بپولات کے بل پر موثر ترین وسائل شعری میں تبدیل کر دیا، اور اس طرح ادبی و شعری اظہار و بیان کے امکانات بے حد وسیع کر دیئے۔

جدید ترین احساسات اور دقیق ترین افکار کو نفیس ترین شاعری میں ڈھالنے کا جو کارنامہ اقبال نے انجام دیا ہے اس کی عظمت کا اندازہ کرنے کے لئے انگریزی کے دو جدید شعرا ییٹس اور ایلیٹ کے ساتھ اقبال کا تقابلی مطالعہ کر کے دیکھا جا سکتا ہے کہ یہ شعرا اقبال کے مقابلے میں کتنے کچے اور چھوٹے ہیں ییٹس تو دورِ جدید کے مسائل کی تاب ہی نہ لا سکا اور بالعموم اپنے وطن آئرلینڈ کے مرغ زاروں میں بناہ گیر رہا۔ چناں چہ اس کے فن پر حقیقی زندگی کی جو کچھ پرچھائیاں ہیں وہ سطحی اور مقامی سیاست تک محدود ہیں اور ان کی شعری قدر و قیمت بہت مشتبہ ہے، یہی وجہ ہے کہ آفاقیت کی اس کی معدودے چند کوششیں بہت ہی مختصر اور ہلکی ہیں۔ دوسری طرف، ایلیٹ پر مسائل حیات بجلی بن کر گرے اور انہوں نے اس کے فن کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ چناں چہ اس کی شاعری اس کی مشہور ترین نظم کے عنوان کے مطابق ایک "خرابہ" ہے جس میں اس نے "تباہ شدہ ٹکڑوں کو فراہم" کرنے کی کوشش کی ہے اس معاملے میں ایلیٹ کی فنی الجھنوں کی انتہا یہ ہے کہ اپنی مذکورہ نظم کے اشارات کی ایک شرح اس کو لکھنی پڑی، اس کے باوجود یہ تخلیق اور اس کی دوسری تمام اہم تخلیقات ادب کے اکثر قارئین کے لئے "مسائل تصوف" ہیں جن کے اسرار و رموز سے لطف اہلِ ارادت ہی اپنی خوش عقیدگی کی بدولت لے سکتے ہیں ان دونوں کے برخلاف اقبال نے نہ صرف یہ کہ عصر حاضر کے تمام اہم اور بنیادی مسائل کو اپنی شاعری میں بالکل جذب کر لیا ہے، بلکہ ان سے وسائل فن بھی پیدا کئے ہیں۔ انہوں نے واقعات کو استعارات میں بدل دیا ہے اور حقائق کو علامات کی لطافت عطا کی ہے۔ تاریخ اقبال کی چابک دست فن کاری اور خلاق تخیل کے ہاتھوں تلمیح بن گئی ہے۔ انہوں نے زندگی کے ٹھوس عناصر کو اپنے فن کے رنگ و آہنگ میں ڈبو کر اساطیر بنا دیا ہے۔ اقبال کے کلام میں کائنات کی ہر ادا شاعرانہ تمثیل و ترنم کے ساتھ نقش پذیر ہوئی ہے۔ دورِ حاضر کے ادب و شاعری میں تاموسیت کی کوشش ایلیٹ نے بھی کی، مگر اس کو شعریت کا روپ دینے میں کامیابی حاصل کی صرف اقبال نے اس کے علاوہ جس طرح اقبال کی شعریت لطیف و لطیف ترین ہے اسی طرح ان کی تاموسیت بھی بخلاف ایلیٹ کے، ہمہ گیر اور وسیع ترین ہے

اقبال کے پیشِ نظر شاعری کے ذریعے ایک نصب العین کی ترجمانی تھی۔ جب کہ دانتے، شیکسپیر اور گیٹے کے سامنے اتنا سنجیدہ اور پیچیدہ کوئی تصور نہیں تھا۔ اس طرح بخلاف اپنے ہم صف دوسرے شعرا کے اقبال کے فن پر فکر کا دباؤ انتہائی حد تک بڑھا ہوا تھا۔ اس صورتِ حال کے باوجود، اقبال نے شاعرانہ ایمائیت کے جس کمال کا ثبوت دیا ہے وہ دنیا کے ادب میں ایک نادر اور بے نظیر واقعہ ہے بلاشبہ دانتے کے پاس بھی مسیحیت کا تصور تھا اور گوئٹے بھی کچھ افکار رکھتا تھا جن میں مسیحی قدریں بھی شامل تھیں، اور ان اقدار فکر کا سراغ شیکسپیر کے تخیل میں بھی ملتا ہے، مگر نصب العین کی وہ محیط با ضابطگی جو اقبال نے اسلامی نظریۂ کائنات اور نظام حیات کی صورت میں اختیار کی کسی دوسرے شاعر کے یہاں قطعاً نہیں پائی جاتی۔ عظیم ترین عالمی شعرا کی سطح سے ذرا نیچے اتر کر اگر ہم باضابطہ فکری و نظریاتی شاعری کا تجسس کریں تو ملٹن پر نگاہ پڑتی ہے، لیکن ملٹن کی شاعری شعریت کے اعتبار سے ایسی نہیں کہ اس کا موازنہ اقبال کے کلام کے ساتھ کیا جا سکے اس کے علاوہ مسیحی نصب العین کے باوصف، ملٹن کے تصور کی آفاقیت بہت ہی مشتبہ ہے، وہ عیسائیت کے اندرونی فرقہ وارانہ مناظروں

میں اس درجہ محو تھا کہ عالم انسانیت کو کوئی پیام دینے کے لئے اس کا ذہن فارغ نہیں تھا۔ چنانچہ ملٹن کا مطمع نظر عالم مسیحیت سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ اس کے برخلاف، مشرق اور ملت اسلامیہ کے پس منظر کے باوجود اقبال نے بالکل واضح کر دیا ہے کہ ان کا مقصود نظر پوری انسانیت ہے اور اسلام کا اصولی تصور انہوں نے سراسر آفاقی سطح پر پیش کیا ہے۔ اسی لئے اقبال اسلام کو محض کسی ملت سے نسلی یا جغرافیائی مذہب کے طور پر نہیں، بلکہ ایک آفاقی فلسفے، ایک عالمی نظریے اور ایک انسانی دعوت کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔

"مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق"

بہرحال، اقبال نے زندگی کے ایک نصب العین کو شاعری کی ہیئت میں، اس کے تمام لوازم و عناصر کے ساتھ نافذ کیا، اس طرح کہ نصب العین کی اصولی قطعیت شاعری کے تخلیقی عمل میں اگرچہ برقرار رہی مگر اس نے ایک ایمائی پیرایہ اختیار کر لیا۔ یہ فکر اور فن کی مستقل بالذات ہستیوں کے درمیان ایک ازدواج کامل کی مثال تھی۔ یہ خلوص فن کا تخلیقی امتزاج تھا۔ اقبال کے مفکرانہ سوز اور شاعرانہ گداز نے مل کر ایک ایسی ہیئت اظہار اختیار کی جس کی کوئی نظیر عالمی ادب کی پوری تاریخ میں نمودار نہیں ہوئی ہے۔ اقبال کی شاعری درحقیقت مشرقی اور مغربی ادبیات کا، ایک آفاقی پیمانے پر، نقطۂ اتصال بھی ہے اور نقطۂ عروج بھی۔ شاید یہ واقعہ بیسویں صدی ہی میں رونما ہو سکتا تھا، اور اگر جدید تہذیب میں آفاقی نقطۂ نظر عمومی طور سے بروئے عمل آ جائے تو اب یہ واقعی ممکن ہے کہ پورے معنے میں عالمی ادب کی تخلیق ہو جس کی قدر و قیمت صحیح معنیٰ میں ایک بین الاقوامی معیار تنقید سے متعین کی جاسکے۔

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

(اقبال)

ایک گوشہ

منظور الٰہی

کے بارے میں

۲۷ر دسمبر ۱۹۷۵ء کو منظور الٰہی صاحب کی کتاب "درِ دلکشا" کی تعارفی تقریب ہوئی۔ صدارت جسٹس انوار الحق صاحب نے فرمائی اور مضامین سیّد وقار عظیم، احمد ندیم قاسمی، ممتاز مفتی، میرزا ادیب اور پروفیسر مرزا محمد منوّر نے پڑھے۔ اِس وقت ہم اُن میں سے دو مضمون پیش کر رہے ہیں۔ چونکہ یہ تقریب اُس وقت ہوئی، جب یہ پرچہ تقریباً چھپ چکا تھا اس لیے بہ امرِ مجبوری اس حصّے کو آخر میں رکھنا پڑا۔ اور ان میں سے صرف دو مضمون چھاپ سکے۔ [ادارہ]

"درِ دلکشا" کی تعارفی تقریب

صدارتی خطبہ، جسٹس انوار الحق

خواتین و حضرات! میرے لئے اس تقریب میں شمولیت باعثِ مسرت و افتخار ہے۔

مسرت کی وجوہ تو کئی ہیں لیکن باعثِ فخر اس لئے کہ نہ میں شاعر، نہ ادیب، نہ نقاد، ہاں ان حضرات کی کاوشوں کا مداح ہونے کا مجھے اعتراف ہے۔ میری ان کوتاہیوں کے باوصف مجھے اس فرض کے لئے منتخب کیا گیا ہے، میں سمجھتا ہوں یہ محض منظور الٰہی صاحب کی مروت و شفقت ہے، یا شاید وہ احترام اور لگاؤ جو میرے دل میں سالہا سال سے ان کے لئے اور ان کے خاندان کے لئے موجزن رہا ہے لیکن یہ میری قیاس آرائی ہے۔ اصل وجہ تو منظور الٰہی ہی جانتے ہوں گے۔ لیکن جیسا کہ خود انہوں نے ایک موقع پر اس مصرع کا سہارا لیا ہے۔ کہ

دل دریا سمندروں ڈونگھے کون دلاں دیاں جانے ہو

میں اس قصے کو یہیں چھوڑتا ہوں۔

لیکن، خواتین و حضرات، یہ حقیقت ہے کہ اہلِ دانش اور اہلِ قلم حضرات کے اس تابناک اجتماع میں، اور خصوصاً ان تمام عالمانہ اور پُرخیال اور مقالوں اور تقاریر کے بعد جو آج اس محفل میں پڑھے گئے ہیں میرے لئے یہ ایک نامناسب جسارت ہوگی کہ میں منظور کی کتاب کے محاسن پر کوئی تبصرہ کروں، ان کے اسلوبِ بیان کے متعلق کوئی رائے پیش کروں یا ان کے خیالات و جذبات کی گہرائی و پاکیزگی، ان کے احساسات کی شدت، ان کے تجربے کی وسعت و ارتقا، اور ان کی ذہنی، رومانی اور روحانی پروازوں کے بارے میں کچھ عرض کروں۔ ان تمام پہلوؤں پر اردو ادب کے ماہرین اپنی آرا نہایت ہی دلپذیر اور مؤثر انداز میں پیش کر چکے ہیں۔ میں ان سے متفق ہوں کہ "درِ دلکشا" اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ تصور ہوگی۔ اسے سفرناموں میں جگہ دی جائے گی یا آپ بیتیوں میں، میرے لئے یہ کہنا مشکل ہے۔ بہرحال زندگی بھی تو ایک سفر ہے۔

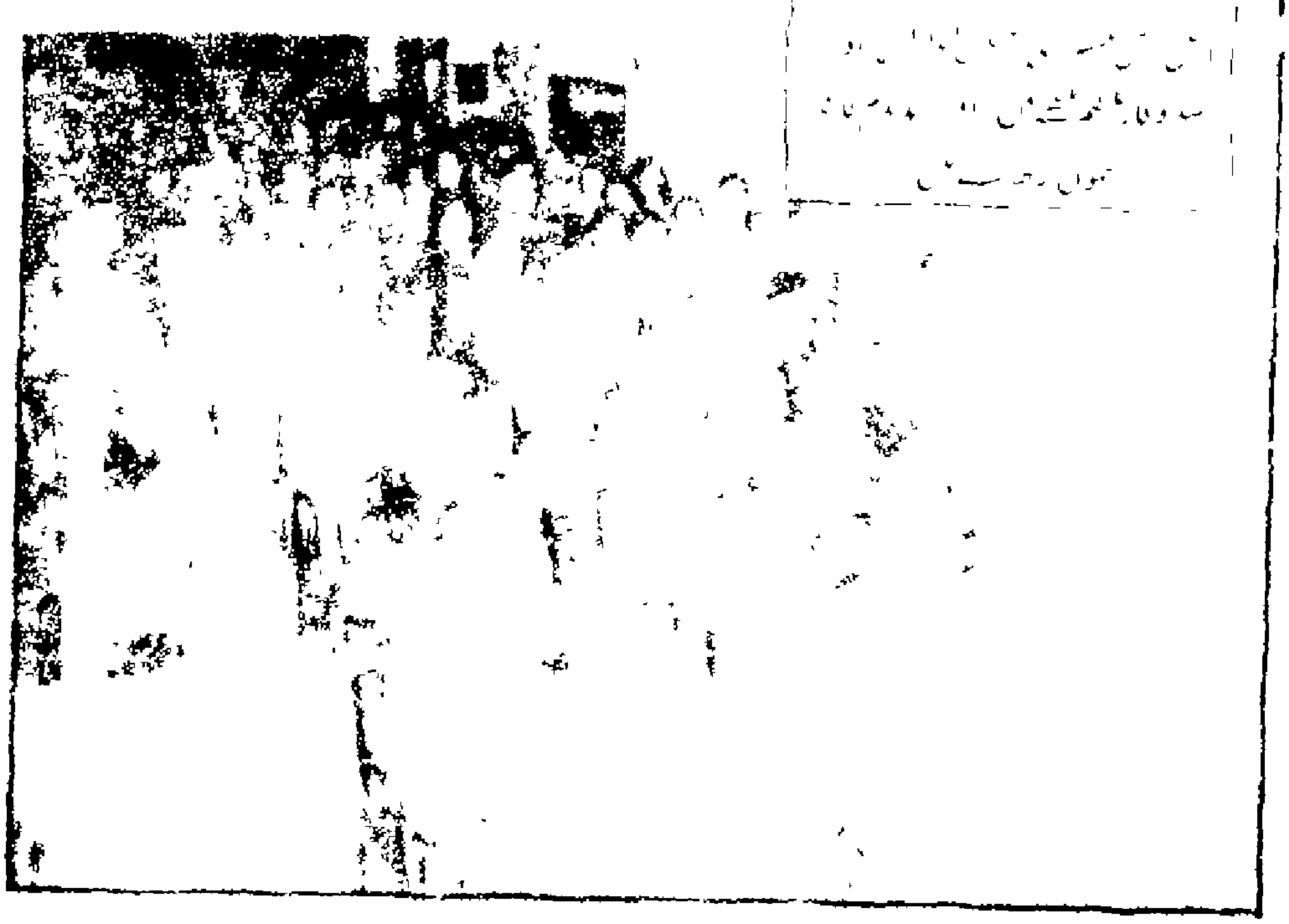
مجھے اپنی طرف سے محض چند غیر اہم اور شاید غیر متعلقہ باتوں کا اضافہ کرنا ہے۔

آج سے پینتیس سال پیشتر جب میں نے پرانی انڈین سول سروس میں شمولیت کی تو اکثر یہ اعتراض سننے میں آتا تھا کہ اس سروس کے ارکان نہ تو انڈین ہیں، نہ سول (یعنی خوش اخلاق) اور نہ سرونٹ (یعنی خادم)۔ جو ارکان شکل و صورت سے بظاہر ہندوستانی نظر آتے تھے، انہیں نفرت یا حقارت سے "کالے صاحب" کے لقب سے نوازا جاتا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حالات بدلتے گئے لیکن اس ملک کے اور بہت سے المیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سول سروس پر اعتراضات جاری رہے۔ آج اس محفل میں کوئی موقع محل نہیں کہ ان وجوہات کا تجزیہ کیا جائے جن کے باعث یہ تاثر پاکستان کے قیام کے بعد بھی قومی حلقوں میں بدستور قائم رہا، بلکہ تقویت پکڑتا گیا، حتیٰ کہ وہ دن بھی آیا کہ حکومت نے سی۔ایس۔پی کو ہی ختم کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس انجام پر سوائے سی۔ایس۔پی حضرات اور ان کی بیگمات کے کسی نے بھی آنسو نہیں بہائے۔







منظور الٰہی نے خاکی وردی اتارنے کے بعد کم و بیش پچیس برس اس سروس کے رکن کی حیثیت سے ملک و ملت کی تعمیر یا تخریب میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ملک کے مختلف صوبوں میں بے شمار اہم اور ذمہ دار عہدوں پر فائز رہے۔ اور ان تمام مراحل سے گذرے، ان تمام محرکات و عوامل سے دوچار ہوئے، جو روح کی بالیدگی اور ارتقا میں حائل ہوتے ہیں۔ اخلاق اقدار کو پست و پامال کرتے ہیں۔ ذہن میں رعونت اور تکبر، دل میں اقتدار و اختیارات کا احساس اور نشہ پیدا کر کے اپنے ہی ہم وطنوں کے لئے احترام آدمیت کے جذبے کو مجروح کرتے ہیں۔

لیکن حیرت ہے، بلکہ آفرین ہے اس مرد مومن پر کہ ان حالات و تجربات سے گذرتے ہوئے بھی اس نے اپنی انسانیت، شرافت، انکسار، دیانت اور جذبات و عمل کی پاکیزگی کو برقرار رکھا۔ اختیارات و اقتدار کو خدمت خلق کا محض ایک ذریعہ سمجھا۔ اور حتی المقدور نادار، بے کس اور بے وسیلہ افراد کی امداد کو اپنا شیوہ بنایا۔ بلکہ اپنے زیر نگرانی انتظامیہ کو انصاف اور اصولوں کی راہ پر چلانے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے کہ ان مقاصد کے حصول میں منظور صاحب کو اکثر مشکلات کا سامنا بھی ہوا۔ بااثر حضرات کی مخالفت بھی مول لینا پڑی لیکن وہ اپنے اصولوں پر قائم رہے۔

یہی وجہ تھی کہ وہ جہاں بھی رہے، ایک شریف النفس اور انصاف پسند افسر کے نام سے یاد کئے گئے۔ ان کے طریقہ کار اور حسن سلوک کا یہ ایک لازمی نتیجہ تھا کہ جلد ہی انھیں اپنے معاصرین میں احترام کا ایک خاص مقام حاصل ہو گیا۔ اور ہم میں سے جنھیں قریب سے منظور الٰہی کو دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کے دل میں منظور کے لئے احترام کے ساتھ محبت بھی شریک ہو گئی۔

اب جو مجھے منظور صاحب کی تازہ تصنیف دیکھنے کا موقع ملا۔ تو عجیب الجھن میں گرفتار ہو گیا۔ آخر کار سول سروس کے ہی ایک مرد مجاہد جناب رستم کیانی مرحوم کی ایک حکایت یا ہدایت سے رہنمائی ملی اور یہ الجھن دور ہوئی۔ آپ بھی اس کی تفصیل سن لیجئے۔

غالباً ۱۹۶۰ء کا ذکر ہے۔ سول سروس کے ایک بزرگ رکن کو مغربی پاکستان کی گورنری سے تبدیل کر کے وفاقی وزیر مقرر کیا گیا۔ چند نوجوان اور جونیئر افسر، جو ابھی تک اپنے ذاتی مسائل میں الجھے ہوئے تھے، اس تبادلے پر بحث میں پڑ گئے لیکن یہ فیصلہ نہ کر پائے کہ یہ ترقی تھی یا تنزلی۔ چنانچہ انہوں نے سول سروس ایسوسی ایشن کے صدر، جو اس وقت مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بھی تھے، کی طرف رجوع کیا۔ حسن اتفاق سے میں بھی اس وقت ان کی خدمت میں حاضر تھا۔ نوجوان افسروں کی مشکل اور الجھن کی روئداد سن کر کیانی صاحب اپنے مخصوص انداز میں مسکرائے، اور کہا کہ براہ راست تو میں آپ کے سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ البتہ اپنے گاؤں کے دو دوستوں کا قصہ سنا دیتا ہوں، شاید آپ کے لئے مفید ثابت ہو۔ دقیق مسائل کو سمجھانے کا کیانی مرحوم کا یہی انداز تھا!

کہنے لگے کہ دو نوجوان تھے، ان پڑھ اور جاہل، لیکن نیک اور مذہب کی طرف مائل۔ ایک کا نام تھا دوست علی، اور دوسرے کا علی دوست۔ گاؤں کے ملا کی زیر تربیت ان کا یہ پختہ ایمان تھا کہ حضرت علیؓ دنیا کی سب سے عظیم ہستی ہیں۔ لیکن خدا کا کرنا کیا ہوا کہ ایک دن کوہاٹ سے ایک تبحری مولوی گاؤں میں وعظ کے لئے آیا، اور اس نے شد و مد سے بیان کیا کہ رسول اللہ ؐ عظیم ترین انسان تھے اور حضرت علیؓ ان کے دست راست اور فدائی۔ ملا تو چلا گیا، لیکن دونوں دوستوں کو ایک ذہنی الجھن میں پھنسا گیا۔ وہ دن رات بحث کرتے اور جھگڑتے۔

ابھی یہ جھگڑا جاری تھا کہ پشاور سے ایک بڑا مولوی بھی گاؤں میں آ دھمکا۔ اس نے ایک نیا شوشہ چھوڑا۔ کہنے لگا اللہ تعالیٰ سب کائنات کا خالق ہے اور محمدؐ اس کے رسول ہیں۔ اور ان کے بعد حضرت علیؓ کا رتبہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نئی صورت حال سے سادہ لوح دوستوں کی پریشانی اور الجھن میں ناقابل برداشت حد تک اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ وہ کیانی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، جن کا معمول تھا کہ تعطیلات کا اکثر و بیشتر حصہ اپنے گاؤں میں گزارتے۔ نوجوان دوستوں نے عرض کی ہماری رہنمائی فرمائیں ورنہ ہمارے جھگڑے کی نوبت

قتل تک پہنچے گی، آخر مذہب کا معاملہ ہے!

گیانی صاحب کہنے لگے کہ میں نے دیکھا دونوں صالح لیکن ناپختہ نوجوان ہیں۔ گاؤں کے مُلّا نے ان کے دلوں کی وسعت کو محدود کر دیا ہے۔ میں نے کہا حضرت علیؓ کی عظمت کو تو تم دونوں مانتے ہی ہو، اللہ اور رسولؐ کو بھی مانو اور اس جھگڑے میں نہ پڑو کہ ان تینوں میں سے کون کس سے بڑا ہے۔ تینوں تم سے یقیناً بڑے ہیں۔ وقت آنے پر تم ان کے درجات بھی سمجھ جاؤ گے۔

کہانی ختم کرتے ہوئے گیانی صاحب جونیئر افسروں سے مخاطب ہوئے "تم سب سے صوبائی گورنر اور وفاقی وزیر دونوں بڑے ہیں۔ تم اس جھگڑے میں کیوں پڑتے ہو، جاؤ اپنا کام کرو۔"

میں نہیں کہہ سکتا کہ نوجوان افسر اس جواب سے کہاں تک مطمئن ہوئے۔ بلکہ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس قسم کا کوئی واقعہ گیانی صاحب کے گاؤں میں پیش آیا بھی، یا انہوں نے فی البدیہہ یہ نکتہ سمجھانے کے لئے وضع کر لیا۔ لیکن آج مجھے اس جواب سے ضرور اطمینان ہوا ہے۔

سول سروس کے رُکن کی حیثیت سے تو میں منظور الٰہی کی شرافت اور عظمت کا قائل برسوں سے تھا، "درِ دلکشا" کے مطالعے کے بعد یہ سوال ذہن میں ابھرا کہ کیا منظور بطور مفکر و ادیب زیادہ عظیم نہیں؟ کیا اس کے لطیف جذبات و احساسات، اس کا تبحرِ، سلیس اور جاذب اسلوب بیان اس کی منظر نگاری اس کی انسان دوستی، اُردو زبان اور نثر پر اس کی قدرت، اس بات کی نشاندہی نہیں کرتی کہ آئندہ چل کر منظور کا نام بطور ادیب و مصنف زیادہ مقبول و مشہور ہوگا، اور لوگ ان کے انتظامی کارناموں کو ثانوی حیثیت دینے لگیں گے؟

جب سے دوست علی اور علی دوست کا قصہ یاد آیا ہے، میرے ذہن نے ان سوالوں پر بحث بند کر دی ہے۔ کیوں کہ دونوں حیثیتوں سے منظور عظیم ہے اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ لوگ اسے ایک انتظامیہ افسر کی حیثیت سے سراہیں یا ایک ادیب و مصنف کا مقام دیں۔

آخر میں مجھے ایک اور بات کہنے کی اجازت دیجئے۔ منظور کی سرشت و ذہنی ارتقا میں جن عناصر نے نمایاں کردار ادا کیا ہے ان کی جھلک ان کی عملی زندگی، خیالات اور تحریروں میں صاف عیاں ہے۔ موزوں اور صالح والدین کا انتخاب تو ہمارے بس میں نہیں۔ لیکن علامہ اقبال کی تعلیمات سے استفادہ تحریک پاکستان کے محرکات کا مطالعہ اور اللہ اور رسولؐ کے احکامات کی پابندی تو کافی حد تک انفرادی اور اجتماعی کوشش سے ہماری مشعلِ راہ بن سکتی ہیں۔

اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ ہم میں سے ہر وہ شخص جو ان تجربات سے گزرا ہے اور انہیں بیان کرنے پر قادر ہے، تحمل یا کوتاہی سے کام نہ لے۔ اور اپنے مشاہدات و احساسات سے نئی پود کو روشناس کرائے۔ یہ درست ہے کہ بدلتے ہوئے حالات اور نظریات کے تقاضے بھی نئے اور مختلف ہوتے ہیں اور پھر "جنریشن گیپ" (GENERATION GAP) کا مسئلہ بھی ہے لیکن ان تغیرات کے باوجود انسانی زندگی اور مسائل میں ایک لافانی تسلسل بھی ہے جس کے باعث گزرے ہوئے واقعات اور ان سے متاثرہ افراد کا ردِ عمل اپنی اہمیت رکھتے ہیں۔ اور اہل بصیرت کے لئے سچائی اور انصاف کے اصولوں پہ چلنے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

ہم اُمید کرتے ہیں کہ منظور الٰہی صاحب اب اپنی صلاحیتیں اپنے طویل عرصہ ملازمت کے تجربات و مشاہدات کو بھی اپنے مخصوص انداز میں بیان کرنے کے لئے بروئے کار لائیں گے اور جلد ہی ایک اور تعارفی تقریب کا اعلان کریں گے۔

خواتین و حضرات! امید ہے آپ سب مجھ سے متفق ہوں گے اگر میں یہ کہوں کہ آج کی محفل واقعی نہایت پُر مغز اور پُر لطف رہی۔ میں آپ سب حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اس کو رونق بخشی۔

درِ دلکشا

پروفیسر مرزا محمد منوّر

کتاب کھولیں تو ابوالمعانی مرزا عبدالقادر بیدلؒ کا مشہور اور بھرپور شعر استقبال کرتا ہے اور کتاب کی وجہ تسمیہ بڑے دلدار انداز میں سمجھا دیتا ہے۔

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیرِ سرو و سمن درآ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دل کشا بچمن درآ

ورق الٹیں تو حضرت علامہ اقبالؒ کا پرگداز اور بے نیازانہ شعر سلام پیش کرتا ہے ؎

دل بکسے نباختہ، با دو جہاں نساختہ!!
من بحضورِ تو رسم روز شمار این چنیں

مگر ان دونوں شعروں کا استقبال اور سلام ان کے سلام اور استقبال کا سا ہے، جو سلیوٹ بھی ماریں اور دل بھی دہلا دیں --- یہ دونوں شعر انتباہ ہیں اور صاحب کتاب کے باب میں کڑی آگاہی بخشتے ہیں، وہ یہ کہ صاحب کتاب کی دنیا وہی نہیں جو خارج میں جلوہ گر ہے بلکہ ایسی ہی یا اس سے بھی حسین تر اور دلآویز تر دنیا اس کے سینے میں آباد ہے، نیز یہ کہ صاحب کتاب دنیا کے حساب میں الجھنے والا نہیں۔ مزید یہ کہ غم کا تحمل بھی کرے گا۔ خوشی بھی سہہ جائے گا، عموماً دلجو ہونے کے باوصف اس کا عادی رجحان اپنے عقیدے کے مرکز ہی کی جانب ہی رہے گا، ظاہر ہے ایسا شخص سیرگاہ کوہستان نہیں جا سکتا، ایسا شخص خدانخواستہ عاشق بھی ہو جائے تو اُس کا عشق بالعموم سینے کے اندر ہی پلتا اور سینے کے اندر ہی جلتا ہے۔ اُس چراغ کی لو باہر تشریف لانے کو وضعداری کے خلاف جانتی ہے یعنی صاحب کتاب کا نیاز بھی رکھ رکھاؤ اور وضع احتیاط سے بے نیاز نہ ہوگا۔

آگے کتاب کا متن شروع ہوتا ہے۔ عنوان ہے "عذرِ گناہ" یہاں نظیری نیشاپوری کا ایک شعر کسی بارعب حاجب دربار کا فرض ادا کر رہا ہے ؎

بزمِ خاص است در و نقطہ بدستور بیار!
معنیٔ دُور طلب کن، سخن دُور بیار

صاحب درِ دلکشا، شیخ منظور الٰہی فرمائیں گے کہ یہ انتباہ انہوں نے اپنی ذات کو کیا تھا۔ یہ انتباہ دوسروں کے لئے نہیں۔ مگر حق یہ ہے کہ "گفتہ آید در حدیثِ دیگراں" کا مضمون بہرحال موجود ہے۔ اور پھر یہ کہ جو شخص اپنے آپ کو انتباہ کرنے کا عادی ہو اُسے ہر دم متنبہ رہنا چاہیے ---

ہاں یہ بزمِ خاص ہے۔ یہاں علم و تحقیق، اور دانش و ذوق کے مُنار جلوہ بار ہیں۔ مجھ میں ہمت نہ تھی۔ شیخ صاحب کے حکم کی تعمیل میں چلا آیا، ورنہ اس محفل میں آ کر کچھ عرض کرنے کی ہامی بھرنا پہاڑ کا سر پر اٹھانا ہے یہ تو وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّور والا معاملہ ہے

امابعد ۔۔ میں نے ان تین اشعار کے انتباہ کے باوصف دردِ دلکشا کو عام سفرناموں مضمونوں یا افسانوں کی طرح پڑھنا شروع کر دیا، چند ورق نکل گئے، احساس ہوا نہیں بھائی، یہ عبارت اس طرح پڑھنے کی نہیں، یہاں تیرنا نہیں ڈوبنا ہوگا، یہ مطالعہ تفریح تو ہے مگر رکھ رکھاؤ اور ٹھہراؤ کے ساتھ، حضرت وحشتِ کلکتوی مرحوم کے بقول ؎

یہ مے ہے شیخ جی اک سانس میں پیتے نہیں اسکو ۔۔۔ حضور آہستہ آہستہ، جناب آہستہ آہستہ

اور جب غور سے پڑھنا شروع کیا تو پہلی سطریں ہی غار تھیں، میں کھو گیا ۔۔ سن لیجئے:۔

"وقت اور حادثات ہماری شخصیت پر تعمیری اور تخریبی تجربے کرتے رہتے ہیں۔ ہر لحظہ ہم کچھ کھوتے کچھ پاتے ہیں۔ لیکن جبلی طور پر بھی ہم بدل جاتے ہیں: شاید کہا جا سکے کہ ایک اہم حادثہ ہو جانے کے بعد ہم وہ نہیں رہتے جو پہلے تھے .... وقت گزر جاتا ہے یا ہم خود گزر جاتے ہیں؟ ——— وہ شخص جسے میں جانتا تھا غبارِ کارواں میں کھو گیا، پھر اس خاک سے اک اور ہستی نے جنم لیا جو مجھ سے تکلیف دہ طور پر مختلف تھی، جیسے کوئی اجنبی ہو ——"

ان سطور کو ایک سے زیادہ بار پڑھا ۔۔ خاص طور پر یہ جملے "شاید یہ کہا جا سکے کہ ایک اہم حادثہ ہو جانے کے بعد ہم وہ نہیں رہتے جو پہلے تھے ۔۔ وقت گزر جاتا ہے یا ہم خود گزر جاتے ہیں؟ ——— کتاب ہاتھ میں رہی اور رشتۂ خیال ہاتھ سے نکل گیا۔ کبھی حضرت علامہ کی Reconstruction کے یہ الفاظ لوحِ ذہن پر ابھرے:

we become by ceasing to be what we are — Life is a passage through a series of deaths ———

اور کبھی ولیم جیمز کے کلمات جو ان کے مضمون Energies of Men کا حصہ ہیں ذہن کے صفحے پر مرتسم نظر آئے:

Religious crisis, love crisis indignation crisis may awake in a very short time powers similar to those reached by years of patient Yoga-practice

آپ نے دیکھا کہ "دردِ دلکشا" کے لفظاً سادہ فقرے معناً کتنے پُرکار اور خیال انگیز ہیں ۔ تلقین یہ ہے کہ دل کا دروازہ کھول اور کھلا رکھو جب بات بنے گی ——— آنکھوں سے بھی پڑھو، دل سے بھی۔ حق یہ ہے کہ میرا بڑا وقت صرف ہوا۔ تجسس اور سوچ کا نظاہر بھولا بھولا انداز کتاب کا عمومی مزاج ہے ——— چند سطریں دیکھئے:

"آرزو سے تہی دامن زندگی تسکینِ قلب کا باعث نہ ہوئی، ہوتی بھی کیسے، کسی خلش کے بغیر زندگی بسر نہیں ہو سکتی۔" صفحہ ۱۸

"مسلسل رفاقت رومان کا رنگ روغن لوٹ لیتی ہے۔" صفحہ ۱۵

"اے لمحۂ گریزاں ساکت ہو جا، مجھے اس مرقع کو اپنی ذات میں سمو نے دے ازلی فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہونے دے۔" صفحہ ۹

"قوسِ قزح ہو کہ انسانی مسرت اسے مقید کر لینا انسان کے بس کی بات نہیں۔" صفحہ ۱۰۲

"دوسری کوٹ والی عورت ابھی خوابِ خرگوش میں تھی۔ نیند کی وجہ سے وہ خوب صورت مناظر سے محروم رہی۔ زندگی کا بھی یہی حال ہے ہم سوتے ہیں اور احساسِ زیاں تک نہیں ہوتا۔" صفحہ ۵۰

مطالعۂ کتاب کے دوران میں جس چیز نے سب سے زیادہ مجھے متاثر کیا وہ صاحبِ کتاب کی قدرتِ اظہار ہے۔ نازک سے نازک جذباتی منظر کو بھی اسی طرح پوری مہارت اور کامل اعتماد کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جس طرح کسی نفسیاتی اور جذباتی کیفیت کی نزاکت کو۔ یہ وصف بغیر ذخیرۂ الفاظ کی فراوانی اور طبیعت کی نفاست کے میسر نہیں آتا۔ پھر ذخیرہ الفاظ وسعتِ مطالعہ بھی چاہتا ہے ذوقِ جستجو بھی اور ذہنِ اخاذ بھی ـــ ورنہ بات نہیں بنتی۔ ہمارا عالم تو یہ ہے کہ کوئی رنگ دیکھا یا آہنگ۔ پسند کیا بلکہ مسحور ہوئے اور چاہا کہ اس کیفیت کو قلمبند کر دیں تو عاجز۔ الفاظ نہیں ملتے ـــ کبھی کہتے ہیں واہ اور ہائے جیب، کبھی کہتے ہیں سبحان اللہ اور بس۔ زبان بیانِ گنگ، قوتِ گویائی بھی دیدۂ حیراں ـــــــ مثلاً مسجدِ قرطبہ کی توصیف کا ایک ننھا سا جز ملاحظہ ہو وہی مسجدِ قرطبہ جس کے باب میں حضرت علامہ نے فرمایا تھا ؎

کعبۂ اربابِ فن، سطوتِ دینِ مبیں!
تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں
ہے تہِ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر
قلبِ مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں

یعنی مسجدِ قرطبہ کا جواب باہر نہیں، مومن کے قلب میں ہے ـــ ہاں تو شیخ منظور الٰہی صاحب کی قدرتِ بیانی ملاحظہ ہو۔

"سنگِ یشب، سنگِ موسیٰ، سنگِ سرخ کے ستونوں کی طویل روشیں ملگجے سایوں میں کھو جاتی ہیں۔ چار سو ایک حسین جھٹپٹا ہے۔ انجانے گوشوں سے چھنتی ہوئی روشنی منظر کو لطیف نورانی چادر اوڑھا دیتی ہے۔ ستونوں سے ابھرتی ہوئی دوہری محرابیں چھت کو سہارا دیتے ہیں۔ محرابوں پہ قرمزی اور پیلی دھاریوں کی وہ فراوانی ہے کہ نظر پھسلتی چلی جاتی ہے اور ایک نکتے پر ٹھہرنے نہیں پاتی۔ اس سے عمق کا دلکش تاثر ملتا ہے۔" صفحہ ۲۶

اب الحمرا کے ایک ایوان کی تصویر کشی دیکھیے:

"سنہرے پھول کی طرح کھلتا ہوا، ہوادار گنبد جیسے بادل ساکت ہو جائیں یا زنک یلغار کر آئیں۔ اور اوپر سنہری چھتری تن جائے۔ صحنِ عنا میں کھجور کی شاخ ایسی سبک قوسیں ستونوں سے ابھر کر خیرہ کن رعنائی کا منظر پیش کرتی ہیں ـــ دیوار پر سنہرا کام جیسے سورج کی شعاعیں طلا کاری میں ڈھل جائیں یا پتھر پر کروشیا اور سوزن کا باریک نمونہ ـــ" صفحہ ۲۸

چند سطروں کے بعد الحمرا ہی کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"الحمرا کے معمار عرب خیمے سے ضرور متاثر ہوئے ہوں گے ہوادار اور لطیف خیمہ گاڑنے کے لئے نیزوں کی بجائے ترشے ہوئے نازک ستون ـــ وہ سنگِ مرمر تراشتے رہے حتیٰ کہ ستون پھول کے شاخچے کی طرح نازک ہو گئے، شجر کی جگہ دیوار پر زردوزی، ہم آہنگ رنگوں سے ہر چیز فضا میں تیرتی معلوم ہوتی ہے۔" صفحہ ۲۸

شیخ صاحب نے قرطبہ اور الحمرا کی سیر کرتے کرتے حضرت علامہ کی طرح حال کو ماضی سے پیوست کر دیا ہے یعنی وہ ہسپانیہ میں مسلمانوں کی آمد، قیام، ترقی، علم پروری اور ہنر نوازی کی داستان کے چند ورق بھی الٹتے ہیں۔ وہ اوراق جو شوکت کے داستان سرا اور عبرت کے مورخ ہیں۔ شوکت مٹ گئی۔ عبرت باقی رہ گئی۔ شیخ صاحب خود بھی اداس ہو جاتے ہیں قاری کو بھی اداس کر دیتے ہیں۔ اور میں حضرت علامہ کے اشعار گنگنانے لگتا ہوں ؎

ہسپانیہ تو خونِ مسلماں کا امیں ہے — مانندِ حرم پاک ہے تو میری نظر میں!
پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں — خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں!
غرناطہ بھی دیکھا مری آنکھوں نے ولیکن — تسکینِ مسافر نہ سفر میں نہ حضر میں

مگر بات ہو رہی تھی دردِ دلکشا کے مصنف کے قادر الطباع ہونے کی۔ سوئٹزرلینڈ کے ایک منظر کی تصویر اور تاثیر ملاحظہ ہو۔

"دلکشی کے باوجود برف باری کا منظر افسردگی کا پہلو لئے تھا۔ شاید ہر خوبصورت منظر میں افسردگی کا شائبہ ضرور رہتا ہے— دھنی ہوئی روئی ایسے گالے ہماری جد و جہد سے بے خبر۔ ہمارے رنج و غم سے بے خبر دھیرے دھیرے زمین کی طرف آ رہے تھے جیسے فضا میں معلق ہوں۔ کوئی جلدی نہ ہو۔ ٹہنیاں پتوں سے یکسر عاری تھیں لیکن عریاں نہیں۔ برف کی دبیز تہ ان پر جم گئی تھی۔" صفحہ ۶۶

منظر سے اثر پذیری کی تاثیر کا نفاست ترجمان بیان دیکھیے:

"سر سبز ڈھلوانوں پر گھر وندے یوں رکھے تھے جیسے لڑھک جائیں گے۔ درختوں کے جھنڈ میں گھری تنہا کاٹیج اپنی سندرتا میں مگن تھی۔" صفحہ ۶۱

"اب سُود کی آنکھوں میں حسرت و درماندگی کی نمود تھی جیسے آغازِ خزاں میں سبز پتیوں پر زردی کی پہلی دھاری کھنڈ جائے۔" صفحہ ۶۱

"میکا تیھر کی صحت اچھی نہیں تھی۔ اس کے چہرے اور اعصاب پر تند جذباتی تجربوں کا اثر نمایاں تھا۔" صفحہ ۷۴

یہ آخری فقرہ کتنا لطیف اور کیسا غماز ہے۔ کیا اگر شیخ صاحب اس مفہوم کو "ہوں کا توں" لکھ دیتے تو بیان زیادہ پُر اثر ہو جاتا؟ ؏

برہنہ حرف نگفتن کمال گویائیست

برہنہ نویسوں کو غور کرنا چاہیے کہ آیا وہ خود برہنہ ہیں یا ان میں مضامین کے لئے مناسب الفاظ کی قبائے جیا تیار کرنے کی اہلیت نہیں؟—

بہرحال کتاب کا سوانح کے بعد حاوی حصہ سیر ہے۔ ملک ملک کی سیر تمام کائنات اللہ کی کتاب بسیط ہے اور ہر مسلمان کو سیروا فی الارض کا فریضہ بقدر ہمت ادا کرنا چاہیے۔ اگر وہ مشاہدۂ کائنات کرتا ہے اور آنکھ کھول کر کرتا ہے تو سیر کا ہر لمحہ عبادت ہے۔ اس لئے کہ وہ نقش اور نقاش، قدرت اور قادر کے رشتے کا مطالعہ ہے — پھر اپنا مقام بھی پہچانتا ہے اور اپنے خالق کو بھی —

مگر حق یہ ہے کہ کائنات کو جاننے کے لئے اور اس کے عبارات کو پہچاننے کے لئے ہمیں بھی اپنے اندر کوئی حوالہ موجود ہونا چاہیے۔ اسی حوالے سے بات سمجھ میں آئے گی ورنہ نظر تیرتی ہوئی گزر جائے گی۔ یہ سارے مناظر — ملک ملک کے مناظر — ہزاروں آدمی ہر روز دیکھتے ہیں مگر ہر ایک کے اندر ایسی اخاذ قوت نہیں ہوتی جو اپنی خاص شناخت، اور اپنے معین رویے کی روشنی میں اشیاء سے تاثیر پذیر

ہو اور پھر اس تاثیر کی تصویر کرے ۔ تفصیر باہر کے منظر کی باہر ہی باہر نہیں ہو جاتی بلکہ پہلے وہ منظر دل میں نقش ہوتا ہے پھر باہر نکلتا ہے ۔
اگر دل اس اہمیت سے خالی ہے تو باہر کچھ بھی نہیں۔ حضرت بیدل نے کیا خوب کہا ہے ؎

بہ جیب تست اگر خلوتے و انجمنے ست!
برون خویش کجا میروی جہاں خالیست

تکنا اور بات ہے۔ دیکھنا اور بات ہے۔ تکنا آنکھوں کے بے توجہ کھلے رہنے کا عمل ہے، دیکھنا توجہ کا طالب ہے۔ یہ دیکھنا یا PERCEPTIVE انتخابی بھی ہے اور ہر دیکھنے والے کے اندرونی حوالے کے مطابق اہم بھی ہے اور غیر اہم بھی — مولانا روم فرماتے ہیں ؎

طالب ہر چیز لے یار رشید جز ہماں چیزے کہ میجوید ندید

صاحب "دردِ دلکشا" کے بھی کچھ حوالے ہیں اور ان حوالوں کا بھی کوئی مرکزی حوالہ ہے — کتاب کے آغاز ہی میں یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ شیخ صاحب کی پرورش ایک ایسے گھرانے میں ہوئی جو بڑا مذہبی گھرانہ تھا۔ جہاں بزرگوں کے دل اسلام کی محبت سے سرشار تھے اور وہ بزرگ از روئے عمل اپنے عقیدے کی محبت کا مجسمہ تھے۔ ملت اسلامیہ کی بہبود کے لئے وہ لوگ سرگرم کار رہتے تھے خصوصاً صاحب کتاب کے والد بزرگوار شیخ محبوب الٰہی صاحب۔ جو ہماری مرکزیہ مجلس اقبال کے جملہ ارکان کے مہربان بیگانہ جان تھے — ان بزرگ کی یاد میں لکھا ہوا "دردِ دلکشا" کا مضمون "غروبِ عظمت" اس امر پر شاہد عادل ہے — ایسے ماحول میں پلنے والا شخص جہاں دین کو منافقت اور اخلاق کو تظاہر سے سروکار نہ ہو عموماً اپنے عقائد کے معاملے میں کچا نہیں ہوتا — چنانچہ اسلام، ملت۔ پاکستان اور پاکستان سے وابستہ جذبات ہمیں اس سیر میں بار بار جلوہ دکھاتے ہیں۔ صاحب کتاب کو دکھ ہے کہ اہلِ پاکستان اور خصوصاً نئی پود تحریک پاکستان کی فکری اساس کے شعور سے محروم ہو گئی ہے شیخ صاحب کو فلسطین، الجیریا، مشرقِ اوسط وغیرہ کے مسلمانوں کی کیفیت سے بھی بھرپور دلچسپی ہے — ویسی ہی جیسی کسی بھی صاحب یقین مسلمان کو ہو سکتی ہے — شیخ صاحب یورپ امریکہ، جاپان کے مختلف علاقوں اور شہروں کی سیر کرتے کرتے اپنے مرکز سے غافل نہیں ہو جاتے۔

پاکستان تو کہیں بھی ان کی نظر سے اوجھل نہیں ہوتا۔ انھیں وی ٹے میں مری کا خیال آتا ہے، سوئٹزرلینڈ کے ذکر میں مظفر آباد اور اسلام آباد کا رنگ بھرا جاتا ہے۔ پورٹوریکو کے جزیرے میں مشرقی پاکستان کی یاد ستانے لگتی ہے۔ گجرات کے کسانوں کی ہمت اور نواحِ پشاور۔ ثمر فروش باغبانوں کی مثبت اہمیت کا دھیان آتا ہے۔ انھیں پھر یہ یقین ہے کہ ان کی قوم کے افراد جوہر کی رو سے اور پنہاں امکانات کے اعتبار سے دنیا کی کسی قوم سے کم نہیں، لہٰذا وہ صورتِ حالات کے باعث اداس تو ہو جاتے ہیں مایوس نہیں ہوتے — کوئی مومن مایوس ہوتا بھی کب ہے؟

سونار دیش پر لکھا ہوا مضمون تصویر کشی، حسن بیان اور تاثیر کے لحاظ سے کسی بھی دوسرے مضمون سے کم نہیں الٹا کچھ زیادہ ہی دلجو ہے اس لئے کہ مشرقی پاکستان تو اپنا وطن تھا — تھا ہی کیوں۔ قائدِ اعظم کے فرزندوں کے لئے وہ اب بھی اسی طرح مشرقی پاکستان ہے۔ ان کی طبیعت کا تجسس ہر ملک اور ہر علاقے میں اس بات کے درپے رہتا ہے کہ وہاں کے باشندوں کے اجتماعی شعور سے آگاہ ہو۔ چنانچہ وہ ہر مقام پر کسی مرد یا کسی عورت کو تعزیہ کے لئے ڈھونڈ لیتے ہیں۔

شیخ صاحب محبت والے آدمی ہیں ـــــ دوستوں کے داغِ جدائی کے ستم رسیدہ

غم دوستوں کے فوت کا ـــ ان کے جوانا موت کا
ہے دیکھ شیشے میں مرے ـــ ان حسرتوں کا خون ہے
جو عیش غم انجام ہے ـــ جو گردشِ ایام ہے!
ہر رگ بتِ گلفام سے ـــ سب دل میں مرے مر گئیں
کس طرح پاؤں میں حزیں ـــ قابو دل بے صبر پر!

ان کے ان یاروں میں جنہوں نے بہت دور جاکر بستیاں بسا لی ہیں۔ کرنل احمد حسین اور نذیر احمد صاحب ان کے نہایت قریبی رشتہ دار بھی تھے۔ چودھری نیاز احمد، میاں محمد شفیع اور امان اللہ نیازی ان کے قریبی دوست تھے ـــــ یہ مضمون بڑا پُرگداز۔ پُرسوز اور دلدوز ہے دوستوں عزیزوں اور بزرگوں کے جنازوں کو کندھا دینا۔ اور ان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو کر رہ جانا انسانی زندگی کے المناک ترین حادثات میں سے ہے ـــ آدمی سوچتا رہ جاتا ہے کہ "زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے" ـــــ اور پھر نہ آسمان کی طبیعت پر کوئی اثر پڑتا ہے اور نہ زمین کا طور بدلتا ہے ـــــ شیخ صاحب کے اپنے الفاظ میں یوں کہہ لیجئے:

"کیسے کیسے لوگ اٹھ گئے لیکن چاند پر خونیں لکیر نہیں۔ دامانِ صبا میلا نہیں ہوا۔ پہاڑ کی اوٹ میں شرمیلا چشمہ ڈوبتے سورج کی کرنوں سے زرنگار رہے، ہاں دلوں کے زخم کون دیکھ سکتا ہے۔"

کتاب کی زبان کلاسیکی ادبی زبان ہے۔ جس نے ایک وسیع المطالعہ شخص کے دل و دماغ میں پرورش پائی ہے۔ وہ دل و دماغ جو ایک دوسرے سے دُور نہیں یہاں قلب او مومن دماغش نم مومن ـــــ والی بات ہے۔ بیان کا اخلاص بہر جملہ عیاں۔ ـــ یہ تحریر فرمائشی نہیں۔ یہ رہائشی ہے یعنی اُن کے اپنے ذاتی مشاہدات و جذبات ہیں جو بیان ہوئے ہیں۔ ان کے مزاج کا شرمیلاپن اور انکسار کا رویہ شاہد ہے کہ یہ تحریر شوقِ اشتہار و نمائش کے لئے بھی عمل میں نہیں آئی لہٰذا اسے آرائشی بھی نہیں کہا جا سکتا۔

یہ تحریر صنائع بدائع کے پُر تکلف استعمال سے مبّرا ہے کہیں بھی احساس نہیں ہوتا کہ محض کسی مجرد یا مرکب تشبیہ کو جگہ دینے کے لئے جملوں کی ترتیب اور ترکیب کو زیادہ بنتیرا دیا گیا ہے تاہم ایک بات بالکل عیاں ہے کہ یہ تحریر خواص پسند ہے اور بیکن کی تقسیم کے مطابق یہ کتاب ان کتابوں میں سے ہے جنھیں نگلا نہیں جا سکتا، جنھیں چبانا پڑتا ہے۔ جملے چھوٹے چھوٹے ہیں۔ آرام سے چلتے ہیں، ہوائی جہاز کے سفر کا مسئلہ ہو یا کسی نتھیے سے ہوٹل یا قہوے میں نشستِ گپ کا۔ بیان کا انداز ایک ہی ہے۔ دھیمی سی شوخی تو یہاں وہاں موجود ہے جو ایک لطیف سا حظِ خاطر عطا کرے گر بے ساختہ قہقہہ پھوٹتا دکھائی نہیں دیتا۔ خود شیخ صاحب کو کم از کم میں نے تو قہقہہ لگاتے کبھی نہیں دیکھا۔ گو خیر میرے اُن سے کوئی بے تکلفی کے مراسم بھی نہیں ـــــ بہرحال ان کی تحریر میں فقرے بازی نہیں پائی جاتی، وہ زندگی میں بعض محترمات سے بھی دوچار ہوئے ہیں اور ان کے لئے انہوں نے اپنے دل میں اس کی میٹھی میٹھی سی آنچ بھی کبھی محسوس کی ہے مگر ان محترمات کے ساتھ جو مکالمات رہے وہ بھی باادب باملاحظہ ہوشیار کا لہجہ لئے ہوئے ہیں۔ غالب نے کہا تھا ؏

معشوق شوخ و عاشق دیوانہ چاہیئے

مگر شیخ صاحب نہ ابن زیدون کی سی جرأتِ رندانہ دکھا سکتے ہیں اور نہ انھیں ولّادہ جیسی کوئی فتنۂ الفت دربار ہی مل سکتی ہے۔ انھیں معشوق بھی بلکہ دکھاؤ والا چاہیئے ——— تحریروں سے یہی کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ اندر کی بات خدا جانے۔ کبھی کبھی فنکار اصحاب قلم اپنی تحریروں کے ذریعے اپنا تعارف کرانے کے بجائے انھیں چہرۂ دہود کا سہرا بنا لیتے ہیں، سہرا کتنا ہی تابندہ ہو مگر چہرہ تو چھپ جاتا ہے۔

حیرت تو اس امر پہ ہے کہ شیخ صاحب نے شعوری عمر کا بیشتر حصہ ملازمت میں بسر کر دیا۔ ان کی چھپی ہوئی تحریریں بہت ہی تھوڑی ہیں پھر انھوں نے ایسا متین، معتدل، بااَدب خوش آہنگ اسلوب کس طرح پال لیا؟ —— یہ تو بڑے جاں جوکھوں کا کام ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لکھتے زیادہ رہے ہیں اور چھپواتے کم رہے ہیں۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ کوئی صاحب قلم چند مضمون لکھے اور صاحبِ طرز ادیب بن جائے ——— ان کی دقتِ نظر اور صلاحیتِ بیانی انھیں زوردار افسانہ نگار بھی بنا سکتی ہے اور ممکن ہے وہ افسانے لکھتے بھی رہے ہوں یہ کتاب یقیناً اردو نثر کے ادبی سرمائے میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے آخر میں ان کے عمومی اسلوبِ نگارش کا ایک مختصر سا نمونہ پیش کرتا ہوں، جو دردِ دکشا کے غالب مزاج کا نمائندہ ہے

گو ہے دنیا کی رنگینیاں دامن کھینچتی ہیں کا ہے خونِ جگر سے ہم آرزوؤں کی آبیاری کرتے ہیں —— عمر بھر مجھے یہ جاننے کی تمنا رہی کہ دھنک کے اس پار کیا ہے۔ ست رنگ کمان کے سرے پر ضرور کوئی طلسماتی دنیا ہوگی لیکن قوس کے اس کنارے پر کچھ نہ تھا، بس اک غیر مرئی خوشیوں کا آثاثہ تھا، ایک لطف کی نظر، دو میٹھے بول تھے

انہ تو کرشمۂ و نہ خسروِ غنایتے "

———————

تبصرے

لکھنے والوں کی کئی قسمیں ہیں۔ بعض لوگ اپنے لیے لکھتے ہیں، بعض محض علم کے لیے اور بعض دوسروں کے لیے!

یوں تو ہر علم و ادب کا کوئی نہ کوئی قاری ہوتا ہے اور اس طرح ہر عالم اور ادیب کسی نہ کسی سطح پر دوسروں کے لئے لکھ رہا ہوتا ہے۔ لیکن بعض بے غرض ادیب اور مصنف ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا مقصد ان دہ ہوتا ہے۔ اپنی ذات کا ..... یعنی اپنے اظہار علم یا ادعائے علم کا کوئی شائبہ درمیان میں نہیں ہوتا۔ وہ کچھ چاہتے ہیں تو یہی کہ علم کا ہر جویندہ ان کی کاوش سے مستفید ہو۔

پروفیسر سلیم اختر نے جو دو کتابیں لکھی ہیں ..... (۱) اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ اور (۲) تنقیدی دبستان ... ان کا مطمح نظر بھی یہی ہے۔ ان کتابوں کے ذریعے انہوں نے متعلقہ علم کو طالبان علم کے ہر طبقے تک پہنچانے کی کوشش کی ہے .... بعض لوگوں کی نظر میں یہ کام آسان ہے لیکن میرا ذاتی تجربہ ہے کہ تھنا یہ کام مشکل ہے اتنا کوئی اور کام نہیں ...... پرانی ضرب المثل کے مطابق دریا کو کوزے میں بند کر دینے سے زیادہ کون سی مہم مشکل ہو گی ..... اور یہ مدنظر رہے کہ یہ دریا بھی آج کل کے دریا ہیں کہ ان کے سرے کنارے کا کوئی پتہ نہیں چلتا .... عصر حاضر کے علوم .... علوم و فنون ادب ..... بھلا ان کی کوئی انتہا ہے؟ اور پھر کوزے بھی ویسے نہیں رہے اب کوزے بھی پیچ در پیچ اور عجیب و غریب ہیں۔ تو کہہ یہ رہا ہوں کہ مختصر اور مجمل کتاب نگاری کا فن بے حد پیچیدہ اور مشکل ہے ..... اور میں بڑی ذمے داری کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ پروفیسر سلیم اختر اس مشکل سے نہایت خوش اسلوبی و کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں۔

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ

یہ مجمل کتاب مختصر مگر جامع ہے۔ میں نے شروع سے لے کر آخر تک اسے ایک بے رحم نکتہ چیں کی نظر سے پڑھا اور کوشش کی کہ اس کے کسی خلا کا سراغ لگاؤں۔ میں اس وقت یہ سطور خود بھی بڑے تعجب کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ کتاب کے اتنے وسیع تاریخی احاطے میں مجھے ایسا کوئی خلا نہیں ملا جو قابل گرفت ہو۔

خلا سے میری مراد یہ ہے کہ ادبا کے اس وسیع تذکرے میں یہ بالکل ممکن تھا کہ کوئی اہم نام رہ جاتا ..... لیکن کم از کم مجھے ایسا اہم نام کوئی نہیں ملا جسے مصنف نے چھوڑ دیا ہو۔

معیار شناسی میں فرق مراتب کی بات جدا ہے ...... یہ ہو سکتا ہے کہ مصنف کی رائے میں الف اور ب میں جو فرق ہے بعض قارئین کی رائے میں وہ نہ ہو۔ اس شخصی رائے کا ہر حال میں احترام کرنا چاہیے۔

سلیم اختر کی سب سے بڑی آزمائش معاصر ادب کے تعلق میں تھی۔ میں نے دیکھا ہے کہ وہ اس آزمائش میں بھی پورا اترا ہے۔ مجھے تسلیم ہے کہ سب لوگ اس سے خوش نہ ہوں گے مگر مصنف کا ضمیر مطمئن ہے اور راقم الحروف کا ذوق بھی مطمئن ہے کہ دانستہ کوئی زیادتی سرزد نہیں ہوئی۔

میں نے خود ایک زمانے میں اردو ادب کی ایک صدی پر مبنی سی کتاب لکھی تھی۔ کوشش یہ کی تھی کہ ہر لکھنے والے کا نام شامل ہو جائے مگر احتجاجی پوسٹ کارڈ پھر بھی موصول ہوتے تھے۔

میرے نزدیک اس مختصر ترین تاریخ ادب اردو کی دو خوبیاں ایسی ہیں جو اسے ایک ممتاز حیثیت دیتی ہیں۔ اوّل یہ کہ اردو کے پورے ادب کے متعلق ناگزیر طور پر یہ ضروری معلومات قاری کو مل جاتی ہیں . . . . اور بعد از مطالعہ وہ اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ اردو ادب کی تاریخ کو جانتا ہے۔

دوسری خوبی مصنف کی ذہنی غیر جانبداری ہے، ہر کسی کو معلوم ہے کہ اردو کے آغاز اور گہوارہ اول سے متعلق متضاد نظریے موجود ہیں اور ان کے بارے میں یک گونہ نزاعات بھی برپا ہیں . . . . لیکن سلیم اختر نے تاریخی سیاق و سباق کے حوالے سے اردو کا پہلا گہوارہ سندھ کو قرار دیا ہے، پھر غزنی اور پشاور کے درمیان کے علاقے کو اس کے بعد پنجاب کو . . . . اور سلسلہ وار تاریخ کے ساتھ ساتھ باقی علاقوں کو . . . . . . یہ بالکل مدلل اسلوب بحث ہے۔

اردو کا نام سب سے پہلے کس نے استعمال کیا۔ سب سے پہلے نثر کس نے لکھی؟ نظم کس نے لکھی۔ دیوان کس نے مرتب کیا؟ یہ سب متنازع فیہ مسائل ہیں۔

میرے نزدیک اردو میں شاعری کا پہلا مجموعہ پنجاب میں مرتب ہوا جو حضرت نوشہ گنج بخش کی کتاب گنج شریف کی صورت میں سید شرافت نوشاہی کی جمع و تدوین سے شائع ہو چکا ہے . . . . . اس کا زمانہ سلیم شاہ سوری اور دور اکبری کے درمیان ہے جبکہ محمد قلی قطب شاہ کا دیوان (جو اب تک اولیں مجموعہ سمجھا جاتا ہے) چند سال بعد کی تصنیف ہے۔

بہرحال یہ مسائل تحقیق کے تابع ہیں اور ظاہر ہے کہ تحقیق کا قدم بڑھتا رہتا ہے اور تغیر اس کی تقدیر ہے . . . . اگر سلیم اختر کی کتاب کے بعد، کوئی اور دریافت سامنے آ جائے تو اس میں اسے قصور وار نہ ٹھہرایا جائے۔

میں جس کتاب پر تبصرہ کر رہا ہوں، نہایت مفید کتاب ہے۔ عام طلبہ کے لئے، میرے جیسے قارئین کے لیے اور سہل حوالے کے لیے بھی۔ میری سفارش ہے کہ جب وہ کتاب کو دوبارہ چھاپیں تو اشاریہ ضرور چھاپیں اس سے ہر کسی کو اپنا نام ڈھونڈنے میں آسانی ہو گی۔

تنقیدی دبستان

یہ مختصر کتاب تنقید کے مختلف طریقوں کی تفصیل پر مشتمل ہے۔ اس میں تشریحی تنقید، تاریخی تنقید، عمرانی تنقید، رومانی تنقید، جمالیاتی تنقید، تاثراتی تنقید، سائنٹفک تنقید، مارکسی تنقید، نفسیاتی تنقید، تقابلی تنقید اور امریکہ کے تنقیدی دبستانوں کے خصائص مختصر مگر تشفی بخش

انداز میں جمع کر دیئے گئے ہیں، ان کے لیے پروفیسر سلیم اختر نے مستند ترین ماخذ سے استفادہ کر کے ان کی تدوین میں اپنی ذہانت و آگاہی سے تجزیاتی کام لیا ہے ۔

میرے نزدیک اس کتاب کا مضمون "تنقید اور دبستان" خیال افروز اور فکر انگیز ہے . . . . اس میں شاید پہلی مرتبہ ادب میں دبستان کے مسئلے پر اطمینان بخش بحث سامنے آئی ہے ۔

میں نے اس بحث میں خاص طور سے اس لئے دلچسپی لی ہے کہ آج کل ادب میں جبر اور منصوبہ بندی کا سوال سب کو پریشان کر رہا ہے ۔

اب قابل غور مسئلہ یہ ہے کہ اگر ادب میں پہلے سب سوچے سمجھے اور طے شدہ خیالات کا استعمال و اظہار، جبر میں شامل ہے تو ادب میں دبستانوں کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے کیونکہ یہ بھی تو بالآخر، چند طے شدہ اور رائج شدہ خیالات کی تکرار تک ہی پہنچاتے ہیں . . . . . ہو سکتا ہے کہ دبستانی تنظیم میں شعوری طور سے جبر شامل نہ ہو لیکن غیر شعوری طور سے جبر کا ایک پہلو اس میں ضرور موجود نظر آتا ہے ۔

مقام مسرت ہے کہ سلیم اختر نے دبستان کی تعریف، اس کے مفہوم، اس کی آزادیوں اور پابندیوں پر عمدہ تجزیاتی بحث کی ہے ۔

مصنف نے اردو تنقید کے مختلف مسلکوں کی بھی نشاندہی کی ہے اگرچہ یہ بھی کہا ہے کہ اردو میں تنقید کے دبستان موجود نہیں البتہ مسالک اور رجحانات ہیں ۔

میں عرض کرتا ہوں کہ سلیم اختر کی یہ رائے غلط نہیں اردو میں دبستانوں کے نہ ہونے کا ایک سبب یہ ہے کہ اردو کا موجودہ ادب تقلیدی دور سے گزر رہا ہے نتیجتہً اس کی تنقید بھی تقلید کے راستے پر چل رہی ہے ۔ جس دن اردو ادب، اپنے ماحول میں اپنی روحانی شخصیت کا نقش بٹھائے گا اسی دن یہاں بھی منفرد مسلک وجود میں آجائیں گے ۔ فی الحال تو سب کچھ مانگے تانگے کا ہے

تنقیدی دبستان، مجلات میں بڑا مقام رکھتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ کوئی قاری بھی اس کے مطالعہ سے فیض یاب ہوئے بغیر نہ رہے گا ۔

لکھنؤ کی تہذیبی میراث

مصنف : ڈاکٹر صفدر حسین ۔ صفحات : ۲۳۶ ۔ کتابت و طباعت : عمدہ ۔ قیمت : بیس روپے ۔ ناشر : بارگاہِ ادب مظفر منزل ۔ حیدر روڈ ۔ اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور ۔ مبصر : میرزا ادیب ۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار کا ایک نسبتاً غیر معروف ناول "جام سرشار" انیسویں صدی کے لکھنؤ کی ایک ایسی ہستی کا افسانۂ حیات سناتا ہے جس کا تعلق نوابوں کے ایک روایتی خاندان سے ہے ۔ یہ صاحب خود بھی نواب ہیں اور عام نوابوں کی طرح عیش پسند واقع

ہوئے ہیں۔ اِن کے شب و روز خوشامدیوں کی محفل میں گزرتے ہیں۔ ایک ایسے ہی خوش نصیب شخص کے متعلق شاہ عالم ثانی نے کہا تھا

اب تو آرام سے گزرتی ہے شب و لا یام سے گزرتی ہے
بادہ و جام سے گزرتی ہے عاقبت کی خبر خدا جانے

اس نواب کو اپنی ایک خواص سے محبت ہو جاتی ہے۔ وہ اس سے نکاح پڑھوا لیتے ہیں۔ چونکہ نواب کی اب پہلی سی حالت نہیں رہی اور خواص کسی بازاری عورت کی بیٹی ہے۔ اس لئے وہ نواب کے محل سے نکل کر بازار کی رونق بن جاتی ہے۔ نواب کو جب اس حقیقت کا علم ہوتا ہے تو وہ اسے قتل کر کے خود پانی میں ڈوب مرتے ہیں اور اس طرح یہ افسانہ اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ عیش پرست نواب نے اس عورت کو قتل کیوں کیا اس کا مقصد تو صرف عیش کرنا تھا۔ اسے کیا پڑی تھی کہ ایک بازاری عورت کے لئے اپنی جان گنواتا؟ یہ سوال بہت اہم ہے اور اس وجہ سے اہم ہے کہ نواب کا اقدام قتل پرانے لکھنؤ کی اس تہذیب سے متاثر ہے جسے اودھ کے دورِ زوال کا پروردہ کہا جاتا ہے اور جس کا عینی شاہد اور سخت گیر نقاد افسانہ آزاد اور جام سرشار کا مصنف رتن ناتھ سرشار بھی ہے۔

نواب جو لکھنوی تہذیب کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔ انسانیت کے اس جوہر سے محروم نہیں جسے ہم اپنی زبان میں غیرت مندی کہتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اودھ کے اس عام ماحول میں سانس لے رہا ہے جس میں زندگی کی اعلیٰ قدریں پنپ نہیں سکتیں اس کے باوجود وہ غیرت مند ہے جو اپنی منکوحہ کو بازاری جنس بنتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ اس طرح یہ غیرت مندی جو انسانیت کا جوہر ہے، لکھنوی تہذیب کا ایک رخ بن کر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

ہم نے اوپر عرض کیا ہے کہ سرشار اودھ کی تہذیب کا عینی شاہد بھی ہے اور اس کا سخت گیر نقاد بھی۔ اس نے اس تہذیب کی تمام کمزوریوں کو چن چن کر بیان کر دیا ہے مگر اس تہذیب میں اپنی کچھ خوبیاں بھی تھیں اور ان خوبیوں سے نہ تو جام سرشار کا مصنف قطع نظر کر سکتا تھا اور نہ کوئی اور نقاد۔

یہ لکھنؤ جس کے ایک نواب نے غیرت مندی کا ثبوت دیا تھا رتن ناتھ سرشار کا لکھنؤ تھا۔ اس سے کافی مدت بعد جب اختر شیرانی کو دوسری یا تیسری مرتبہ لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا تھا تو وہ ایک پوری نظم اس خطہ ارض کے بارے میں کہنے پر مجبور ہو گئے تھے اور اس خوبصورت نظم کا پہلا شعر ہے۔

بعد مدت کے نظر آیا دیارِ لکھنؤ
دل فدائے لکھنؤ، آنکھیں نثارِ لکھنؤ

ہمارے ہاں نقادوں کا عمومی" طریقہ راسخہ" یہ رہا ہے کہ وہ دلی کی شان بڑھانے کے لئے لکھنؤ کی اخلاقی سطحیت کا رونا ضرور روتے ہیں۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ دلی کے مقابلے میں لکھنؤ ایک بازاری، مبتذل اور سطحی تہذیب کا علمبردار تھا۔ تاریخ اس کی تائید نہیں کرتی۔ واقعہ یہ ہے کہ اودھ کی تہذیب عیش پرستیوں کے باوصف اپنے کچھ ایسے پہلوؤں کی رونمائی بھی کرتی تھی جو صاف اور شفاف تھے، جن کے اندر زندگی کا حسن بھی تھا اور زندگی کی گہرائی اور گیرائی بھی۔

سید عابد علی عابد مرحوم کا یہ قول نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ دلی کا دورِ زوال لکھنؤ کے دورِ زوال سے کچھ مختلف نہیں تھا ــــ دونوں شہروں میں تہذیبی رنگ یکساں تھا اور ڈاکٹر سید صفدر حسین نے اپنی اس کتاب میں اسی لکھنؤ کی تہذیبی میراث کی نشان دہی کی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے تاریخی واقعات کی روشنی میں نوابانِ لکھنؤ کے لکھنؤ کو ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے اور اپنی اس کوشش کے طفیل پرانے لکھنؤ کا پورا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے پھیلا دیا ہے۔ اس کوشش میں انہوں نے سینکڑوں کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اور جو کچھ لکھا ہے تاریخی حوالے سے لکھا ہے۔

انہوں نے اپنی تصنیف کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

پہلے حصے کا تعلق دلی کے زوال سے ہے ــ یہ بات اس بنا پر بہت اہم ہے کہ دلی کے زوال کے بعد ہی اودھ کی شان و شوکت ظاہر ہوتی ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب دلی کے سخن ور اور اہلِ فن دلی سے نکل کر اودھ کے مختلف حصوں ـــ بالخصوص فیض آباد اور لکھنؤ پہنچ جاتے ہیں۔

دوسرے حصے میں انہوں نے اودھ کی سیاسی تاریخ کے نہایت اہم واقعات قلم بند کئے ہیں۔

تیسرا باب بہت طویل ہے۔ اس باب میں ڈاکٹر صاحب نے اودھ کی تہذیب کے ہر رخ، ہر پہلو اور ہر گوشے کی تفصیل بتا دی ہے۔ اودھ کی تہذیب کے بنیادی عناصر کو سمجھنے کے لئے اس باب کا مطالعہ بہت ضروری ہے

آخری باب میں انہوں نے دلی اور لکھنؤ کے تمدنی اور تہذیبی مزاج پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس کا مطالعہ دونوں تہذیبوں کے فرق کو بڑی خوب صورتی سے واضح کرتا ہے۔

کتاب کے مصنف نے تیسرے باب کے آغاز میں تہذیب اور ثقافت کے موضوع پر گفتگو کی ہے اور واضح کیا ہے کہ ثقافت کے بنیادی عناصر کیا ہیں اور ان کی شیرازہ بندی سے کس طرح ایک خاص گروہ، جماعت یا قوم کی ثقافت تشکیل پذیر ہوتی ہے۔ یہ بحث خاص طور پر فکر انگیز اور خیال افروز ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا اندازِ بیان بڑا سلجھا ہوا اور ادیبانہ ہے۔ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں واضح طور پر کہہ دیتے ہیں اور یہی ان کے طرزِ نگارش کی بڑی خوبی ہے۔

لکھنؤ کی تہذیبی میراث ــ ایک اہم تصنیف ہے اور ہمارے ادب میں ایک مستقل اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

"خیر البشر کے حضور میں"

مرتب: ممتاز حسن، ناشر: ادارہ فروغ اردو، لاہور۔ صفحات: ۲۸۸، قیمت: ۱۸ روپے۔ مبصر: سلیم اختر۔

اشعار کی مانند اگر اصناف کا بھی "آمد" اور "آورد" کے لحاظ سے جائزہ لیں تو بلاشبہ قصیدہ اور اس سے وابستہ دیگر اندازِ مدح

اُردو کی شاعری قرار پائیں گے لیکن قصیدہ اور مدح کی دوسری صورتوں جیسے نعت میں فرق اس سے ہو جاتا ہے کہ اول الذکر ادبی منفعت کے لئے ایک عام دنیا دار کے لئے لکھا جاتا ہے جو ۹۹ فی صد صورتوں میں قصیدہ میں بیان کی گئی کرداری صفات اور شخصی اوصاف سے تہی داماں ہوتا ہے اس لئے قصیدے کا تاثر ہمیشہ مبالغہ کا مرہونِ منت رہا ہے اس کے برعکس نعت کا محرک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت، عقیدت اور احترام کے جذبات ہیں — وہ جذبات جن کی اساس خلوص نیت بنتا ہے اس لئے بہت کچھ کہہ کر بھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا — کا احساس باقی رہ جاتا ہے جبکہ قصیدہ لکھنے والا غالب کی مانند باپ (امجد علی شاہ) کے لئے لکھا ہے لیکن اس کے مرنے پر بیٹے (واجد علی شاہ) کے نام کر دیتا ہے اور ڈھٹائی سے یہ کہتا ہے: "خدا نے بھی تو یہی کیا تھا" (ملاحظہ ہو مکتوب بنام: یوسف مرزا، ۲ر نومبر ۱۸۵۹ء) لیکن وفورِ شوق میں قلم ڈبونے والے نعت خواں کے سامنے ایسا کوئی مقصد نہیں چنانچہ جگر مراد آبادی کے الفاظ میں وہ یوں کہہ سکتا ہے -

کچھ اور نہیں کام جگرؔ مجھ کو کسی سے
کافی ہے بس اک نسبت سلطان مدینہ

"خیر البشرؐ کے حضور میں" نعتوں کے انتخاب پر مشتمل ہے اور مرتب نے سہل انگاری سے بچتے ہوئے، قدیم اور کلاسیکی شعرا سے لے کر آج کے شاعر تک سب کے کلام کو کھنگالا ہے چنانچہ اس مجموعہ میں قدیم جدید اور ہندو مسلمان سبھی آنحضرت صلعم کو نذرانہ عقیدت پیش کرتے نظر آتے ہیں موضوع کیونکہ ایک ہے اس لئے ترتیب بلحاظ اسماء ہے چنانچہ ایک نگاہ میں شعراء کے نام کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ نعت کا محرک جذبہ آنحضرت صلعم سے محبت اور عقیدت ہے اس لئے جہاں تک اس جذبہ کی صداقت اور نعت کی صورت میں اس کے اظہار کا تعلق ہے تو اس لحاظ سے کسی ایک نعت گو کو دوسرے نعت گو پر فوقیت نہیں دی جا سکتی لیکن جہاں تک فن کا تعلق ہے تو اس معیار پر یقیناً پرکھ ہو سکتی ہے لیکن مرتب نے فن کے علاوہ ایک اور معیار بھی ملحوظ رکھا ہے اور وہ یوں ہے :-

"ایسے نعتیہ کلام کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جس میں خدا اور بندے کا فرق ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ اس مجموعہ میں ان نعتوں کو جن کا تعلق بانوکردار رسالت اور رحمتی مرتبت کے اسوۂ حسنہ سے ہے یا ذاتِ رسالت سے گہری دل بستگی کا اظہار ہے۔ عام روایتی غزل نما نعتیں جو رسالت کو زیب نہیں دیتیں انھیں حتی الامکان منتخب نہیں کیا گیا ہے۔" (مقدمہ، ص ۵۰)

ظاہر ہے یہ خاصا سخت معیار ہے اور اس لئے انتخاب بھی بے حد کڑا ہے چنانچہ ولیؔ سے شروع کر کے آج کے شاعر تک عام اردو شاعری میں سے صرف ۱۳۲ نعتوں کا انتخاب کیا گیا ہے اس لئے کوئی نعت بھی فنی حسن سے عاری نظر نہ آئے گی۔ چند مثالوں سے اندازہ ہو جاتا ہے

آدمیت کا غرض ساماں مہیا کر دیا
اک عرب نے آدمی کا بول بالا کر دیا (پنڈت ہری چند اختر)

چیخ اٹھنا چاہتی ہے غم سے گھبرا کر زمیں
رحمت للعالمیں یا رحمت للعالمیں! (ادیب سہارنپوری)

مجھے لکھنا ہے اک انسانیت کا باب تابندہ!
منور جس کے ہوں الفاظ مصرعے جس کے رخشندہ
مجھے اک محسن انسانیت کا ذکر کرنا ہے
مجھے رنگ عقیدت فکر کے خاکے میں بھرنا ہے (جگن ناتھ آزاد)

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب (اقبال)

یہ محض چند مثالیں ہیں اس انداز کے اشعار کی کمی نہیں، کتاب آفسٹ پیپر پر نہایت اہتمام سے طبع کی گئی ہے ویسے تو ادارہ فروغ اُردو کا نام ہی حسن معیار کا ضامن ہے۔ مرتب نے ابتدا میں مفصل مقدمہ لکھا ہے جسے نعت کے فن پر ایک اہم مقالہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

"غزالاں تم تو واقف ہو....."

از: ادا جعفری، ناشر: مکتبہ فنون لاہور۔ صفحات: ۱۷۵، قیمت: ۱۰ روپے۔ مبصر: سلیم اختر۔

تقسیم ملک کے فوراً بعد ترقی پسند ادب کی تحریک کے حوالہ سے جو شاعرات ابھریں ان میں سے ادا جعفری اس بنا پر ممتاز ہیں کہ اب تک زندہ ہیں ورنہ اس ربع صدی نے تو بے شمار شعراء کو زندہ ہونے ہوئے بھی درگور دیا ہے۔ ادا اس سے قبل دو اور شعری مجموعے بھی دے چکی ہیں "میں ساز ڈھونڈتی رہی" اور "شہر درد" اور اب یہ تیسرا مجموعہ "غزالاں تم تو واقف ہو....." اس لحاظ سے بے حد اہم مجموعہ ثابت ہوتا ہے کہ اس میں ادا کا فن پختگی پا کر نہ صرف نکھرا اور ستھرا ہوا نظر آتا ہے بلکہ اس میں وہ جذباتی ابلیوں کی اس شاعری سے بہت آگے نکل آئی ہے جنھیں "شہر درد" کی اہم ترین خصوصیت قرار دیا جا سکتا ہے۔ اب اس کی وژن میں پھیلاؤ آ چکا ہے جس کا احساس اس مجموعہ کی پہلی نظم "مسجد اقصیٰ" کے مطالعہ سے ہی ہو جاتا ہے۔ جو موضوع کی جذباتیت کی بنا پر ایک ایسی جذباتی نظم کی صورت اختیار کر سکتی تھی جس میں جذبات بے ساختہ یوں چھلک جاتے ہیں کہ پھر وہ اخبار کے سنڈے ایڈیشن کے قابل رہ جاتی ہے۔ مگر ادا جعفری ماتم کے برعکس اسے بھی عزم سفر کے لئے تحریک بنانے کی داعی ہے چنانچہ اس کے بقول:-

قافلے لٹتے ہی رہتے ہیں گزرگاہوں میں
لوٹنے والوں نے کیا عزم سفر بھی لوٹا؟
دجلہ خوں تو نئی بات نہیں ہے، یہ کہو
وہ بجرا ڈوبا ہے، سفینہ ہے کہ ساحل ڈوبا

"کوئی آئینہ" ایک اور بہت اچھی نظم ہے اس میں بھی عزم و عمل کی تلقین ہے لیکن بانداز دگر۔ یہاں مسجد اقصیٰ کی مانند واشگاف انداز نہیں اپنایا بلکہ لطیف کنایوں سے کام لیتے ہوئے یوں کہا ہے:-

جہاں قدسیوں کے جلتے ہیں پر   وہیں ثبت ہے ترا نقش پا
تجھے کون آ کے بتائے گا   تجھے کون راہ دکھائے گا

کوئی آئینہ، کوئی آئینہ!

"کوئی آئینہ" کے فوراً بعد آنے والی نظم "سواد شب" میں بھی یہی خیال ہے لیکن رات اور اس سے وابستہ امیجز سے کام لیتے ہوئے ایک عجب پُر اسراری کیفیت ابھاری گئی ہے۔ نظم کے آخری دو اشعار شاعرہ کا پیغام بن جاتے ہیں:

اب کے تقدیر انھیں ہاتھوں سے زنجیر کرو
یاں نکارو، کوئی چارہ کوئی تدبیر کرو
تیشۂ حرف شکایت سے کوئی رات کٹی؟
آج کی رات ہے تاریک، مسافت بھی کڑی

مختلف اوقات اور جدا گانہ موضوعات پر لکھی گئی ان تینوں نظموں کا بنیادی جذبہ ایک ہی ہے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ دیگر ناقدین کو اس مجموعہ کی کس خصوصیت نے بطور خاص متاثر کیا ہوگا۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو مجھے ادا کی بعض نظموں کے اس پہلو نے خصوصی طور سے متاثر کیا ہے اس لئے نہیں کہ عزم و عمل کی شاعری یا اس کی تلقین اردو شاعری میں طرح نو ہے ویسے بھی اقبال کے بعد اس انداز کی شاعری میں کوئی ایسی دلکشی نظر نہیں آتی لیکن اس مجموعہ میں یہ انداز چونکاتا اور دل کو بھاتا ہے کہ گذشتہ دو دہائیوں سے ہم عصر شعرا نے دروں بینی، باطن پرستی، ذات کے خول اور مسائیگی کی لوٹ پھوٹ کا جو CULT بنا لیا ہے اس کی بنا پر شاعری میں انسان کے اندر دہ نے اب اچھی خاصی پر درتش کی صورت اختیار کر لی ہے۔ چنانچہ ہم عصر شعرا کے اس تناظر میں ادا کا انداز سخن اور یہ طرز تخاطب بے حد اہم ہو جاتا ہے اور "عجب" کیوں؟" ایسی بلیغ نظم کا مطالعہ کریں تو ادا کا یہ مخصوص رجحان اپنی منطقی صورت اختیار کرتا نظر آتا ہے۔ اس نظم کی روح ادا کی غزل کے ایک شعر میں یوں سمٹ آئی ہے:

جادۂ تمنا ہے دار کی بلندی تک
جانے والے جا پہنچے فاصلہ ہی کتنا تھا

—اور اسی کو ادا جعفری کی شاعری کا موٹو قرار دیا جا سکتا ہے۔

خاک نشیں

میرزا ادیب اُردو کے انتھک لکھنے والوں میں سے ہیں۔ انہوں نے گزشتہ چالیس سال میں بہت کچھ لکھا ہے اور مختلف اصناف میں لکھا ہے۔ انھیں کسی بھی منزل پر تھک کر بیٹھنا نہیں آتا۔ انہوں نے زمانہ طالب علمی میں لکھنے کا آغاز کیا۔ اس وقت وہ شعر کہتے تھے۔ اس کے بعد وہ نثر کی طرف متوجہ ہوئے۔ صحرا نورد کے خطوط اور صحرا نورد کے رومان ان کے دو مجموعے ہیں جنہوں نے انھیں دنیائے ادب میں متعارف کرایا اور صرف متعارف ہی نہیں کرایا بلکہ ایک لازوال شہرت بخشی۔ اس کے بعد انہوں نے یکے بعد دیگرے افسانوں کے کئی مجموعے شائع کرائے اور صنف افسانہ میں کئی کامیاب افسانے لکھے۔ پھر وہ ڈرامے کی طرف متوجہ ہوئے۔ اب تک ان کے متعدد یک بابی اور FULL LENGTH ڈرامے چھپ چکے ہیں۔ ڈرامے کی صنف میں ان کا کام اتنا وقیع ہے کہ مختلف لکھنے والوں نے آغا حشر کے بعد اُردو ڈرامے میں انھیں سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔

خاک نشیں میرزا ادیب کے ڈراموں کا تازہ مجموعہ ہے ایک سو چالیس صفحے کا یہ مجموعہ تین ڈراموں پر مشتمل ہے۔ اس کا پیش لفظ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :۔

> "میرزا صاحب اُردو زبان کے وہ واحد ادیب ہیں جنھوں نے برسوں سے صرف ڈرامے کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنا رکھا ہے۔ آج سے سینتیس سال پہلے انہوں نے ابتدا افسانہ نگاری سے کی تھی اور اس فن میں بھی انہوں نے وہ شہرت حاصل کی تھی کہ ان کی دو تصانیف صحرا نورد کے خطوط" اور "صحرا نورد کے رومان" آج بھی اسی طرح مقبول و زندہ ہیں۔ اب یہی صورت ان کے ڈراموں کے ساتھ ہے :"

"خاک نشین" ایسا مجموعہ ہے جس میں شامل کیے ہوئے تینوں ڈراموں میں ایک ربط اور ایک اشتراک نظر آتا ہے جس کے بارے میں تفصیل آخر میں آتی ہے پہلے تینوں ڈراموں پر ایک ایک کر کے نہایت اختصار سے اظہار خیال کرتا ہوں۔

مجموعے کا پہلا ڈراما ——— اور نسبتاً طویل ڈراما "خاک نشیں" ہے جس کا مرکزی کردار گاؤں کے سکول کا ایک مدرس ہے جس نے بچوں کی تربیت اور تعلیم کے لئے ایک سکول کھول رکھا ہے۔ وہ نجی اور ذاتی سکول ہے جس میں کسی سے فیس وغیرہ لینا تو ایک طرف رہا۔ ماسٹر صاحب غربا کے بچوں کی کتابوں کا پیوں تک کی کفالت کرتے ہیں۔ مدرسہ ان کے لیے ایک آدرش اور ایک تربیت گاہ ہے جس کا واحد مقصد یہ ہے کہ غربا کے بچے یہاں سے تعلیم حاصل کر کے بہتر زندگی گذار سکیں ماسٹر صاحب بچوں کو انتہائی شفقت اور محبت سے پڑھاتے ہیں اور بچے بھی ان سے والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں۔ یہ سلسلہ کچھ عرصہ تک بخوبی چلتا رہتا ہے تا آنکہ گاؤں کا چودھری اپنے باغ کی توسیع کے لیے مدرسے کی زمین کے حصول کو اپنا مقصد بنا لیتا ہے اور ہر طرح سے مدرسے پر قبضہ کرنے پر کمربستہ ہو جاتا ہے لیکن غریب مدرس ترغیب، تحریص اور دباؤ سے بھی مدرسہ چھوڑنے پر رضامند نہیں ہوتا مدرسہ مدرس کا ایک آدرش ہے اور میرزا ادیب علامتی انداز میں یہ بتا رہے ہیں کہ انسان کو اپنا آدرش کسی حالت میں بھی نہیں چھوڑنا چاہیئے خواہ مخالف قوتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اسے کسی قسم

کا خسارہ برداشت کرنا پڑے۔

دوسرا ڈراما" اسیر نغمہ ساز" ایک مصور کے بارے میں ہے جسے ایک گونگی گداگر لڑکی کی آنکھوں میں ایسی لازوال چمک نظر آتی ہے جسے وہ تصویر میں منتقل کرنا چاہتا ہے۔ اونچی سوسائٹی اور اس سوسائٹی کی چمک دمک اُسے اپنے آدرش سے بھٹکانے کی کوشش کرتی ہے مگر وہ اس ظاہری چمک دمک کو ٹھکرا کر بالآخر ایک پراسرار تخلیقی لمحے میں آنکھوں کی اس لازوال چمک کو کینوس پر منتقل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ مصور کسی بھی تخلیقی فنکار کی علامت ہو سکتا ہے۔ اس ڈرامے میں میرزا ادیب نے یہ سوال قاری کے سامنے رکھا ہے کہ فنکار کو اپنا آئیڈیل عزیز ہونا چاہیئے یا مادی مفادات کا حصول؟ اور ظاہر ہے کہ میرزا ادیب" آئیڈیل" کے حصول کے حق میں ہیں۔

تیسرا ڈراما" تتلی" ایک غریب معلمہ کے متعلق ہے جو محض درس و تدریس سے لگن کی بدولت ایک امیر گھرانے کی بچی کے توسط سے طبقہ امرا میں پہنچتی ہے اور اس گھرانے کی بہو بننے والی ہوتی ہے لیکن اس گھرانے کے افراد کے ہاتھوں اپنے سابقہ غریب محسنوں کے ساتھ بدسلوکی دیکھ کر امیر گھرانے کو ترک کر کے انھیں غریب محسنوں کے ہاں لوٹ جاتی ہے۔ اس ڈرامے میں دو طبقات کے مزاجوں کا فرق دکھایا گیا ہے اور غریب طبقے کو" عزت نفس" کا احساس دلایا گیا ہے۔

تینوں ڈراموں میں جو چیز مشترک ہے وہ یہ ہے کہ ان کے مرکزی کردار بقول مصنف خاک نشین ہیں یعنی طبقہ غربا سے تعلق رکھتے ہیں۔ "خاک نشین" کا سکول ماسٹر" اسیر نغمہ ساز" کا مصور اور" تتلی" کی معلمہ بنیادی طور پر ایک جیسے کردار ہیں۔ تینوں افراد وہ ہیں جنھیں دنیا میں مادی آسائشیں نہیں ملیں۔ تینوں کو اپنے آدرش آسائشوں کے مقابلے میں بمراتب عزیز ہیں۔ تینوں کو اپنے ذاتی اور اپنی صلاحیتوں کا احساس ہے اور وہ انھیں کسی قیمت پر بھی ذاتی منفعت کے لیے استعمال کرنے کو تیار نہیں۔ تینوں کا ٹکراؤ معاشرے کی مستحکم قوتوں سے ہوتا ہے اور وہ ان کے سامنے سرنگوں نہیں ہوتے۔ اس لحاظ سے تینوں ڈرامے ہمیں یہ پیغام دیتے ہیں کہ معاشرے کی بہبود کے لیے کام کرنے والوں کو سب سے زیادہ محبت اپنے آدرش کے ساتھ ہونی چاہیے۔ اس آدرش کے حصول کے لئے اسے ہر مخالف قوت کے حربوں کو ناکام بنا دینا چاہیے اور کسی قیمت پر بھی اپنے مقصد سے دستبردار نہیں ہونا چاہیئے۔ ڈراما نگار کے خیال میں آدرش سے محبت کی یہ بے پناہ صلاحیت خاک نشینوں ہی میں مل سکتی ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ تینوں کردار دراصل میرزا ادیب ہی کی شخصیت کے مختلف رُوپ ہیں۔

یہاں بعض کٹر قسم کے ترقی پسند حضرات یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ طبقہ غربا کو محض قناعت پسندی کا سبق دینا ترقی پسندی نہیں ہے۔ ترقی پسندی تو اس چیز کا نام ہے کہ مظلوموں کو ظالموں کے خلاف درس پیکار دیا جائے۔ میرے خیال میں ایک ایسے معاشرے میں جہاں

ترقی پسندی تو اس چیز کا نام ہے کہ مظلوموں کو ظالموں کے خلاف درس پیکار دیا جائے۔ میرے خیال میں ایک ایسے معاشرے میں جہاں حرص و ہوس نے اچھے اچھوں کو اسیر کر لیا ہو" درس قناعت" بھی ترقی پسندی ہی کی ذیل میں آتا ہے۔ چند صدیاں پہلے جب صوفیا اور شعرا نے لوگوں کو" مال و دولت" کے حصول سے نفرت دلائی اور انھیں قناعت کا درس دے کر درباروں کے مضر اثرات سے محفوظ رکھا تو درحقیقت انھوں نے اپنے ماحول کے مطابق ایک عظیم ترقی پسندانہ کارنامہ انجام دیا تھا۔ یہی کیفیت میرزا ادیب کے ان ڈراموں کی ہے جو راتوں رات رئیس بننے کے خواب دیکھنے والے افراد کے اس دور میں مادی منفعت کی بجائے آدرش کی محبت کا درس دیتے ہیں۔

ڈرامے کے فن پر میرزا ادیب کی گرفت قابل داد ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ ڈراما دراصل سٹیج کی چیز ہے۔ میرزا ادیب

کے یہ ڈرامے سٹیج پر کھیلے جانے کے نقطۂ نظر سے بڑے موزوں ہیں۔ ان کو سٹیج کرنا آسان ہے۔ اس کے لئے لمبی چوڑی آرائش کی ضرورت نہیں۔ مناظر محدود ہیں اور ان میں گنی چنی اور سستی سی چیزیں پڑی ہوئی دکھائی گئی ہیں جو خاک نشیں مرکزی کرداروں کا مناسب برگ و ساز ہے اس لیے ان کے لئے سٹیج بنانا کوئی مشکل کام نہیں۔ ڈرامے زمانی وقفے کے لحاظ سے مختصر ہیں اور محدود وقت میں انھیں دلچسپی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ کرداروں کی تعداد کم ہے۔ مکالمے مختصر، چست اور سیدھے سادے ہیں جن کی ادائیگی آسان ہے مگر پُر زور ہیں۔

"خاک نشین" سے اندازہ ہوتا ہے کہ میرزا ادیب کا فن مسلسل ترقی کر رہا ہے۔ میرزا ادیب ان لوگوں میں نہیں جو دُنیائے ادب میں وارد ہوتے ہی متحیر اور متعجب کرتے ہیں اور پھر تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں بلکہ ان لوگوں میں ہیں جو مسلسل لکھتے ہیں، اچھا لکھتے ہیں اور اپنے فن کے ارتقا سے کبھی غفلت نہیں برتتے۔

(خواجہ محمد زکریا)

چاند چہرہ ستارہ آنکھیں

مصنف: عبید اللہ علیم۔ **ناشر:** سیپ پبلیکیشنز، کراچی ۱۔ **قیمت:** بارہ روپے۔ **تبصرہ نگار:** لطیف عارف۔

عبید اللہ علیم اردو شاعری میں ایک ایسی آواز بن کر سامنے آئے ہیں کہ ہر سنجیدہ شاعری کا قاری متوجہ ہوا ہے۔ سحر خیز لوگوں کا مشاہدہ ہے کہ علی الصبح ایک ستارہ نظر آتا ہے جو قامت میں دوسروں سے بڑا اور روشنی و تابناکی کے اعتبار سے بھی منفرد نظر آتا ہے۔ علیم ایسا ہی ایک درخشندہ ستارہ ہیں۔ انہوں نے نظم اور غزل میں غنائی اور جمالیاتی احساس کو یوں مقید کیا ہے کہ اُن کا قاری ایک خوشگوار تحیّر سے دوچار ہوتا ہے۔ مجموعے کا نام اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ علیم نے حسنِ بت" کی پرستش کی اُس کو شاعری میں سمونے کے لیے کتنے بلند معیار کو سامنے رکھا ہوگا۔ اسی معیار نے اُن کی شاعری کو رنگ و آہنگ دیا ہے۔ اسی معیار نے صورت و معنی دیے ہیں اور اسی معیار نے آوازوں اور خطوط کو یکجا کیا ہے۔ یہ تمام خصوصیات جس طرح علیم کی شاعری میں جمع ہوئی ہیں اُن کے ہم عمر اور ہمعصر شعرا میں شاذ ہی ملیں گی۔

مجموعے کا نام ہماری توجہ اس بات پر مبذول کراتا ہے کہ وہ رومان پسند شاعر ہیں۔ ہر نظم اور ہر غزل میں عجیب اور بے نام تشنگی، محبوب سے قربت اور دوری شعلے کی مانند لو دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ علیم نے اپنے شدید داخلی جذبات و احساسات کی روشنی کو جس چیز سے جلا دی ہے وہ اُن کے داخلی کرب کا ردِعمل ہے۔ اُن کی خارجی زندگی میں جو تلخی، تیزی و طراری ہے، وہ اُن کی شاعری میں مفقود ہے۔ اُن کے ہاں محض اُداسی نہیں بلکہ سرشاری کا احساس بھی ہے۔ اپنے محبوب سے جس نوعِ دلنوازی کے وہ خواہاں ہیں وہ انھیں حاصل بھی ہے۔ دو محبت کرنے والے انسانوں کے درمیان سوال آہستہ آہستہ، جواب آہستہ آہستہ" والے ڈرامے کا پیرایہ حد مناسب انداز میں سامنے آتا ہے۔

وہ چاند چہرہ، ستارہ آنکھیں
وہ مہرباں سایہ دار زُلفیں!

ان دو مصرعوں میں محبوب کا سراپا مکمل طور پر سمو دینا علیم ہی کا کام ہے۔ کسی انسان سے ملاقات پر سب سے پہلے ہماری آنکھیں چہرے، آنکھیں اور سایہ دار زلف ہی سے متعارف ہوتی ہیں۔ عام طور پر شعرا صندلی بانہوں کا، نیم باز آنکھوں کا، دہکتے ہوئے رخساروں کا اور خدا جانے

جسم انسانی کے کن کن حصوں کا ذکر کرتے ہیں کہ حسن سامنے سے غائب ہونے لگتا ہے اور ایک ایسی عورت کی تصویر بنتی ہے جو محبوبہ نہیں معلوم ہوتی بلکہ سیلز گرل معلوم ہونے لگتی ہے ۔

لیکن ملیم کا انداز اچھوتا ہے ۔ وہ ہمیں چونکاتا ہے ۔ چاند حسنِ کمل کی علامت ہے ۔ اسی لیے انھوں نے چہرے کو چاند کہا ۔ اسی طرح ستارہ روشنی اور تابناکی کا سمبل ہے اور جب نگاہ گھنی سیاہ دراز زلفوں تک پہنچی تو ملیم ان دو مصرعوں سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے ۔ یہ بات نہیں ہے کہ وہ اِس بات پر قادر نہیں ہیں ۔ بلکہ کہنا میں یہ چاہتا ہوں کہ حسن اس قدر مکمل ہے کہ دو مصرعوں کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی ۔ جو تصویر رنگ و آہنگ روشنی اور نور سے بنائی گئی ہے وہ مکمل ہے اور چاندنی کی طلسماتی فضا اِس میں اس طرح شامل ہے کہ ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے ۔

لیکن محبت میں جو پیچ و خم اور گریز پاسے آتے ہیں ۔ حسین خوابوں کے تاج محل ٹوٹتے ہیں ہیں شیش محل کرچی کرچی ہو جاتے ہیں اور جب حقیقت اور آئیڈیل آپس میں ٹکراتے ہیں تو وہ افسردگی پیدا ہوتی ہے جو زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے ۔ یہ تصادم انھیں تلخ نہیں بنا دیتا ۔ ہاں ملیم کو حیرت ضرور ہوتی ہے ۔ لیکن وہ اپنے زخموں سے کھیلنے کے لیے نیا عزم پیدا کرتے ہیں ۔

آیئے اب یہ دیکھیں کہ ملیم کی شاعری میں کون سے عناصر ایسے ہیں جن پر اُن کی شاعری کی عمارت کھڑی ہے ۔ سب سے پہلے میں امیجز (IMAGES) کا ذکر کروں گا ۔ شاعر اگر استعاروں پر قدرت رکھتا ہے تو یہ اُس کی ذہانت کی دلیل ہے ۔ یہ بات ہمیں ارسطو نے بتلائی تھی ۔ کرلرج کہ ارسطو کے بعد سب سے بڑا نقد ہے ۔ کہتا ہے کہ بڑا شاعر وہ ہے جو ایسے امیجز استعمال کرتا ہے جو ہماری توجہ کو فوراً اپنی طرف منعطف کرلیں ۔ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ شدتِ احساس کے پیشِ نظر اُن میں تبدیلی بھی کی جائے ۔ جب تجربہ روح کی گہرائیوں میں اترتا ہے تو امیج (IMAGE) تجسیم کی شکل اختیار کرلیتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں شاعر الفاظ میں تصاویر کا نگارخانہ بناتا ہے ۔ اور یہی وہ مقام ہے جب تخیل کا عمل دخل شروع ہوتا ہے اور شاعری میں توانائی پیدا ہوتی ہے ۔ وہ جدت پیدا ہوتی ہے جو شعر کو تاثیر دیتی ہے اور پھر جذبات و احساسات بولنے لگتے ہیں ۔ احساسات کو گویائی دینے کے لئے امیجز کی ضرورت پڑتی ہے اور شاعر کے اردگرد کا ماحول ہی نہیں ساری کائنات اس کی ممد و معاون ثابت ہوتی ہے ۔ امیجز کے ذریعے ہمیں دو باتوں کا پتہ چلتا ہے کہ شاعر کا ذہن کس طرح کام کر رہا ہے دوسرے یہ کہ اُس کی نفسیاتی کیفیت کیا ہے ۔ امیجز شاعر کے تجربے اور مشاہدے کو ہمارے سامنے لاتے ہیں ۔ یہ تصاویر دراصل ایک طرح کا انکشاف ہوتی ہیں اور جسم زدن میں تمام پیچیدہ عمل کو موزونیت اور صفائی کے ساتھ مقید کر لیتی ہیں ۔ اِس طرح کہ ہر چیز آئینے کی مانند صاف و شفاف نظر آنے لگتی ہے ۔

سوال یہ ہے کہ آخر شاعر امیجز کو استعمال ہی کیوں کرے ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ داخلی حقیقت یعنی احساسات اور خارجی حقیقت یعنی اشیائے میں ربط اِسی طرح پیش کیا جاسکتا ہے ۔ شاعر کسی جذبے کو محسوس کرتا ہے لیکن اس جذبے کی ترسیل امیجز کے ذریعے ہی ظاہر ہوسکتی ہے ۔ ملیم نے بھی تصویر کشی کی ہے ۔

چاند سا دل ہو ، چاندنی سا گداز
———
ایک نظارہ ہوں آنسو سے گہر ہونے تک
———

بنا گلاب تو کانٹے چبھا گیا اک شخص

نرم کونپل پہ شبنم کے موتی تال پر صبح کی گنگنائیں

خورشید بکف کوئی کہاں ہے

بوٹا بوٹا دھوپ جلا ہے، شجر شجر بے سایہ ہے

شب کو چاند سہی اچھا نہ دن کو مہر اچھا

خواب بن کر تو برستا ہے شبنم شبنم

صفحۂ دہر پر کرب کی خونچکاں آیتیں ثبت ہیں

اُداس یادوں کی مضمحل رات بیت بھی جا

رات مہتاب اور صبح گلاب

یہ تصویریں ہمارے تمام حواس کو متاثر کرتی ہیں۔

دوسرا عنصر جو علیم کی شاعری میں اہم ہے وہ ملسیاتی احساس ہے۔ علیم کبھی کبھی تو مختلف آوازوں کو یکجا کرتے ہیں جیسے مختلف ساز ایک ساتھ بجائے جائیں اور وہ ایک سے، ایک نغمہ، ایک دھن پیدا کرتے ہیں یا پھر وہ رنگوں کے امتزاج سے نقوش ابھارتے ہیں۔ جب کسی جذبے کی تجسیم کی جاتی ہے تو اس کے صرف ایک ہی معنی ہیں کہ پارے کو قید کر دیا گیا ہے۔ اور ایسی کیفیت جو سیماب صفت ہو الفاظ میں قید کر دینا معمولی مرصع کاری نہیں ہے۔ پھر علیم تو ایسی مختلف تصاویر بناتے ہیں کہ ہر تصویر مختلف حواس پر اثر انداز ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ یہ ان کی شعوری کوشش نہیں ہے۔ بلکہ ان کی شاعری کا آہنگ بھی ایسا ہے۔ اُن کا تو کمال صرف یہ ہے کہ تمام تصاویر کو متعلق کرتے ہیں اور ترتیب یوں قائم ہو جاتی ہے کہ نظم ایک زنجیر معلوم ہوتی ہے۔ اگر زنجیر کی ایک کڑی کو بھی الگ کیا گیا۔ تو ساری زنجیر بکھر جائے گی۔

مرے خدایا! میں زندگی کے عذاب لکھوں کہ خواب لکھوں

یہ میرا چہرہ! یہ میری آنکھیں

بجھے ہوئے سے چراغ جیسے

جو پھر سے جلنے کے منتظر ہیں

(چاند چہرہ ستارہ آنکھیں)

سچّے سُر کی سچائی میں پھول رہے ہیں بدن
لہروں لہروں گاتی جائے جیسے مست پون
دیکھو ساون گاتا آیا
اپنے آنگن گاتا آیا

(گیت)

اُداس یادوں کی مخمل رات بیت بھی جا
کہ میری آنکھوں میں اب لہو ہے نہ خواب کوئی
میں سب دیے طاقِ آرزو کے بجھا چکا ہوں

(مرثیہ)

علیم نے اپنے تخلیقی عمل سے بڑی ہی خوبصورت تراکیب تراشی ہیں۔ طاقِ آرزو، سچے سُر کی سچائی، خونچکاں آیتیں، مسیحِ دستِ قلم، زلفوں کا سیلاب، آئینوں کے باطن، خورشیدِ کفِ دعا، بے ہزار، جراتِ رسائی، ظرفِ کبریائی، گدائے کوئے سخن، تابِ نوائی ان تراکیب میں نیاپن ہے اور جن مصرعوں میں انہیں استعمال کیا گیا ہے وہ اِس قدر معنی خیز ہیں کہ یوں احساس ہوتا ہے کہ اگر یہ تراکیب نہ تراشی گئی ہوتیں تو مصرع بے معنی ہو جاتا۔ ان تراکیب نے جو دلکشی پیدا کی ہے وہ سیاق و سباق کا ماحصل ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علیم کسی خیال کو کسی احساس کو جسم عطا کر رہے ہیں کہ قاری اِس تجسیم کو نہ صرف یہ کہ محسوس کرے بلکہ دیدۂ بینا سے دیکھ لے۔

وہ خواب خواب فضائے طرب نہیں آتی

زندگی کی لے کڑی دھوپ بچا لے مجھ کو

تیرے پیار میں رسوا ہو کر جائیں کہاں دیوانے لوگ

ابھی نہ کوئی پیمبر، نہ ہیں کوئی اوتار

باہر باہر چُپ سادھے رکھ، اندر اندر ہنستی جا

ایسے مصرعے پڑھ کر فراق صاحب یاد آتے ہیں۔ بڑے شاعر اور ادیب کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ وہ شاعری اور ادب پر یوں چھا جاتا ہے جیسے ساون کے موسم میں بادل آسمان پر چادر سی تان دیتے ہیں۔ فراق صاحب نے یہ کارنامہ شاعری میں اور نثر میں یہ کارنامہ رشید احمد صدیقی صاحب نے دکھایا ہے۔ کوئی اچھا شعر کہنے والا اس دور میں فراق صاحب کے اثر سے آزاد نہیں۔ اسی طرح اچھی نثر لکھنے والوں کو رشید صاحب کی گرفت سے رہائی نہیں۔ مختار مسعود اور مشتاق یوسفی دونوں نے اپنے لئے نئی راہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے مگر غور سے

دیکھیے تو ان دونوں نثر نگاروں کی تحریروں میں بین السطور رشید احمد صدیقی صاحب جھانکتے ہوئے مسکراتے نظر آتے ہیں۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ علیم ہی نہیں اس دور کے ہر اچھے شاعر پر فراق صاحب کا اثر پایا جاتا ہے۔ علیم کی نظم "دیوی" اُس کی بہترین مثال ہے۔

میں اب تک اس بات پر زور دیتا رہا ہوں کہ علیم الفاظ سے تصویر بناتے ہیں لیکن تصویر دیکھنا بھی تو ایک فن ہے۔ جو لوگ محض اخبار کی تصاویر کو تصاویر سمجھتے ہیں اُن سے مجھے کچھ نہیں کہنا۔ اِس دور میں صادقین نے برش اور رنگ، خطاطی اور دائروں کے ذریعے نئے معنی دیے اب ہر شخص اگر غالب یا صادقین کو سمجھ سکے تو پھر یہ دونوں بڑے فن کار خود اپنی نظر میں گر جائیں گے۔ اسی طرح علیم نے الفاظ کے ذریعے جو تصاویر بنائی ہیں وہ "دیدۂ بینا" چاہتی ہیں۔ مجھے تو یوں معلوم ہوا کہ جیسے علیم میر کی زبان میں یہ کہہ رہے ہوں "بعوام کار ندارم"۔

علیم کی شاعری کو سمجھنے کے لیے یہی نہیں کہ اُن سے یاری کرنی پڑتی ہے بلکہ میرے خیال میں اُن الفاظ سے بھی یاری کرنا ضروری ہے جو تصاویر بناتے ہیں کہ الفاظ خود بھی تصویر کا ایک حصہ ہوتے ہیں اگر الفاظ سے یاری نہ کی گئی تو اس کا امکان ہے کہ تصویر کا کوئی نہ کوئی حصہ مخفی رہ جائے گا۔

ایک اور بات جو میرے نزدیک علیم کی شاعری میں اہم ہے وہ موسیقی ہے۔ کہا جاتا ہے اور صحیح کہا جاتا ہے کہ شاعری اور موسیقی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مگر بات اتنی سی نہیں۔ علیم تو جہاں تصویر بناتے ہیں اُسے گویائی بھی دیتے ہیں اور اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ مترنم گویائی بخشتے ہیں۔ وہ مختلف آوازوں کو یوں یکجا کرتے ہیں جیسے باکمال موسیقار مختلف سازوں سے بیک وقت کسی نغمے کی لے کو چھیڑ رہے ہوں۔ انگریزی زبان کا شاعر W. B. YEATS یہ بتاتا ہے کہ انسان کی شخصیت کے ان گنت زاویے ہیں۔ ان میں ہم آہنگی اور توازن موسیقی ہی سے قائم کیا جا سکتا ہے کہ کائنات میں موسیقی کا ایک مکمل نظام موجود ہے اور جب تک ان دونوں میں توازن اور ہم آہنگی نہ ہو، موسیقی ممکن نہیں۔ جب سے انسان کی تاریخ ملتی ہے خلفشار بھی اس تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ انسان نزاع سے آج تک رہائی حاصل نہیں کر سکا اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ اِس نزاع کی قید سے انسان کو کبھی رہائی ملے گی بھی نہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نزاع اور خلفشار پر قابو پانے کی کوشش انسان نے ہمیشہ کی ہے۔ علیم کے مزاج میں (اور میں اُن کے شعری مزاج کی بات کر رہا ہوں۔ اُن کے شخصی مزاج کی بات اُن کا سوانح نگار کرے گا) اُسے مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ علیم اس بات پر قادر ہیں کہ الفاظ سے تصاویر بناتے ہیں اور جب چاہتے ہیں اُن سے موسیقی کا کام لیتے ہیں ؎

لوگ اپنے دل کی بات ڈھونڈتے ہیں نغموں میں

میلوں دور....

جہاں نشریاتی لہریں کمزور پڑ جاتی ہیں فلپس کے بے حد حسّاس ٹی وی سیٹ واضح تصویر پیش کرتے ہیں۔

فلپس خریدنے کے حق میں ایک اور دلیل!

ٹیلیویژن سیٹ کی کوالٹی کا اندازہ لگانے کیلئے اس کا بغور جائزہ لینا چاہیے۔ اور اس کی فنی خوبیوں سے بھی واقفیت حاصل کرنا چاہیئے۔ لیکن سب سے اہم دیکھنے کی چیز ہے حساسیت یعنی ٹی وی اسٹیشن سے میلوں دور واضح تصویر [illegible] تجربے سے اس بات کی تصدیق ہو چکی ہے کہ فلپس ٹیلیویژن سیٹ اس قدر حسّاس ہیں کہ ان پر تصویر [illegible] بھی صاف اور واضح نظر آتی ہے۔ جہاں آپ کے ٹیلیویژن اسٹیشن سے منتشر ہونے والی لہریں کمزور پڑ جاتی ہیں

فلپس ٹیلیویژن الیکٹرانکس اور ٹیکنالوجی کی جدید بین الاقوامی تحقیقات کا نتیجہ ہے۔ اس [illegible] تنصیب اور انتخاب میں کوالٹی کا حد سے زیادہ خیال رکھا جاتا ہے۔ ہر ایک ٹیلیویژن سیٹ کو فیکٹری سے باہر آنے تک جانچ پڑتال کے تقریباً دو سو پچاس مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور اس طرح فلپس ٹیلیویژن سیٹ [illegible] کسی قسم کی کوئی تکنیکی خامی باقی نہیں رہتی۔

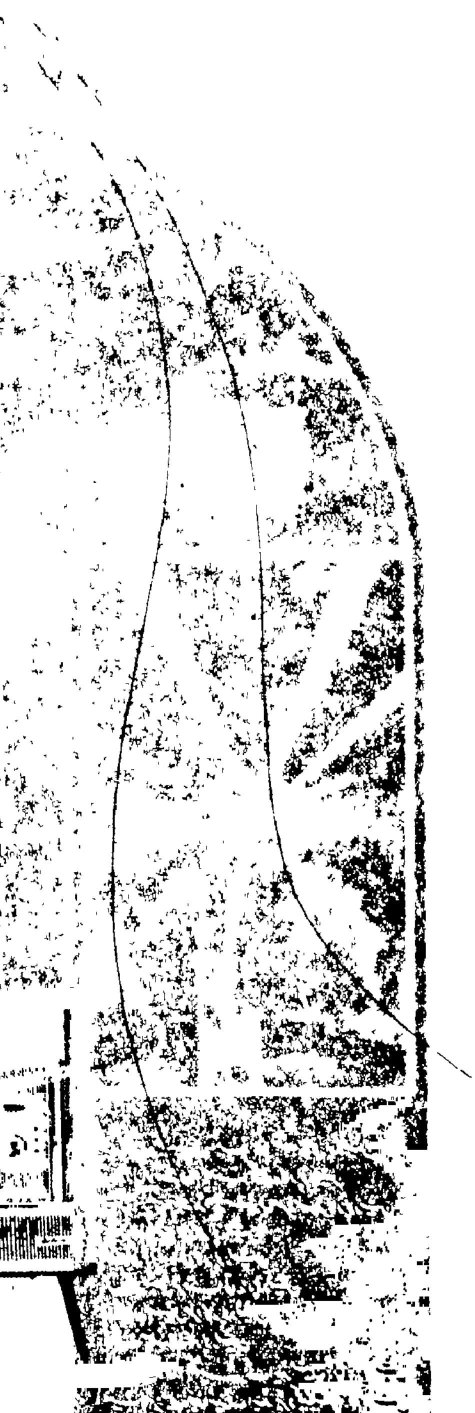
فلپس نے ہر کرشمہ سے زیادہ ٹیلیویژن سیٹ فروخت کر کے ٹیلیویژن کی صنعت میں دنیا بھر میں اوّلین مقام حاصل کر لیا ہے۔ پاکستان میں بھی اب تک فلپس ٹیلیویژن تعداد میں سب سے زیادہ فروخت ہوا ہے۔

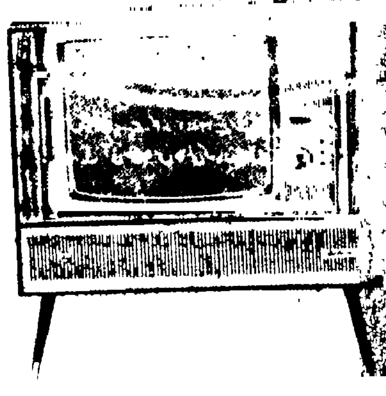
فلپس کی دیدہ زیب کیبنٹ ڈرائنگ روم کی سجاوٹ کو دوبالا کرتی ہے۔ رولنگ شٹر اور [illegible] کی صورت میں بھی ہے۔

اضافی خوبیاں:

سیمو میٹک فائن ٹیوننگ کے خودکار نظام کی بدولت تصویر کی کوالٹی ہمیشہ قائم رہتی ہے اور [illegible] بیرونی [illegible] کوئی فرق نہیں پڑتا۔ [illegible] تصویر کو اپنی جگہ قائم رکھنے میں مدد کرتا ہے۔ گریڈ [illegible] انتہائی [illegible] اور سیاہ و سفید رنگوں کے صحیح امتزاج کے ساتھ ابھرتی ہے۔ [illegible] کی وجہ سے [illegible] تصویر نہیں [illegible]۔

فلپس - دنیا بھر میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والا ٹیلیویژن





فلپس

مستند گارنٹی اور معیاری فروخت سروس

[illegible] فلپس ٹیلیویژن کے ساتھ مستند گارنٹی اور معیاری فروخت سروس [illegible] حاصل کرتے ہیں۔ فلپس کے [illegible] کراچی [illegible] فلپس ٹی وی سروس [illegible] ہر فلپس ڈیلر کے ہاں فلپس ٹی وی کے [illegible] بھی موجود رہتے ہیں۔

PHILIPS



ہر طرف تعمیر ہی تعمیر.....اور سیمنٹ کی بے تحاشہ مانگ

عوامی حکومت کی بے مثال سماجی اور اقتصادی پالیسیوں کی بدولت سرکاری اور نجی دونوں شعبوں میں تعمیر و ترقی کی رفتار بہت تیز ہو گئی ہے۔ کراچی اسٹیل ملز اور پورٹ قاسم جیسے عظیم منصوبے اور متعدد دیگر کیمیائی کھاد کے کارخانے، سیمنٹ فیکٹریاں، بھاری انجینئرنگ کے کارخانے اور کیمیکل پلانٹ بڑی تیزی کے ساتھ تکمیل کے مراحل طے کر رہے ہیں۔ ملک میں اس وقت تقریباً ۲۰ لاکھ مکانوں کی کمی ہے جسے پورا کرنے کے لئے حکومت نے لاکھوں پلاٹ الاٹ کئے ہیں۔ مالیاتی اداروں کو مکانوں کی تعمیر کے لئے قرضے دینے کی ہدایت کی ہے اور کم لاگت کے مکان نیز بڑے بڑے شہروں میں کئی منزلہ عمارتوں کی تعمیر کی حوصلہ افزائی کے لئے تعمیرات کو باقاعدہ صنعت کی حیثیت دے دی ہے۔

شہروں میں تعمیرات کی کثرت کے ساتھ ساتھ دیہی علاقوں میں سیمنٹ کا استعمال بڑھ جانے کی وجہ سے سیمنٹ کی مانگ میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے۔ سیمنٹ کارپوریشن آف پاکستان نے ۱۹۷۲-۷۳ء کی ۲۸ لاکھ ۵۰ ہزار ٹن کی پیداوار کے مقابلے میں ۱۹۷۴-۷۵ء میں ۳۲ لاکھ ۶۸ ہزار ٹن سیمنٹ تیار کیا ہے اور اب سیمنٹ کے کارخانے رات دن کام کر کے اپنی گنجائش کی ۹۵ فیصد کی حد تک پہنچ چکے ہیں لیکن پیداوار اور مانگ میں اب بھی بہت فرق ہے اور یہ فرق ۱۹۷۸ میں اس وقت دور ہو گا جب سیمنٹ کے موجودہ زیر تعمیر کارخانے کام شروع کر دیں گے۔ دراصل ۱۹۶۸ کے بعد سیمنٹ کا کوئی نیا کارخانہ لگانے کی طرف سابقہ حکومتوں نے توجہ ہی نہیں دی اس کا خمیازہ قوم کو آج بھگتنا پڑ رہا ہے چنانچہ آج تعمیرات کی لاگت کم کرنے اور سیمنٹ کی بچت کی بہت ضرورت ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ آپ

- ماہرانہ مشورے حاصل کیجئے
- تعمیر میں بے جا صرف سے گریز کیجئے
- سیمنٹ رکھنے کا مناسب انتظام کیجئے



ضرورت سے زیادہ سیمنٹ استعمال نہ کریں

سیمنٹ کارپوریشن آف پاکستان